وفیاتِ معارف

اربابِ علم و فضل کے انتقال پر ماہنامہ ’معارف‘ اعظم گڑھ میں شائع
ہونے والی تحریروں (جولائی ۱۹۱۶ء تا دسمبر ۲۰۱۲ء) کا انسائیکلوپیڈیا

مرتبہ:
ڈاکٹر محمد سہیل شفیق

قرطاس

جملہ حقوق محفوظ

قرطاس

سلسلۂ مطبوعات - ۱۴۰

مئی ۲۰۱۸ء

قیمت : روپے

قرطاس

پرنٹرز، پبلشرز اینڈ بک سیلرز

فلیٹ نمبر A-15، گلشن امین ٹاور، گلستان جوہر، بلاک 15، کراچی

موبائل: 0321-3899909، ای میل: saudzaheer@gmail.com

ویب سائٹ: www.qirtas.co.nr

ISBN: 978-969-9640-02-5

ش ف ی

۹۲۰ وفیاتِ برہان / مرتب: ڈاکٹر محمد سہیل شفیق۔-

کراچی: قرطاس، ۲۰۱۸ء۔

۷۹۴ص۔ (قرطاس سلسلۂ مطبوعات نمبر ۱۴۰)

اشاریہ شامل ہے

آئی ایس بی این:

۱۔شخصیات۔ ۲۔وفیات۔ ۳۔برہان (دہلی) ۱۹۳۸ء۔۲۰۱۸ء۔

الف۔مرتب۔ ب۔(سلسلہ مطبوعات)۔

انتساب

سہیل

مشمولات

فہرست مشمولات ۷

مقدمہ ۲۱

وفیات

(جولائی ۱۹۱۶ء تا دسمبر ۲۰۱۲ء)

نمبر شمار	تاریخ اشاعت	شخصیت	صفحہ نمبر
۱	اگست ۱۹۱۶ء	علامہ شبلی نعمانی	۲۹
۲	اکتوبر ۱۹۱۶ء	مولانا لطف اللہ	۳۴
۳	فروری ۱۹۱۷ء	نواب وقار الملک	۳۴
۴	اپریل ۱۹۱۷ء	اہلیہ مرحومہ سید سلیمان ندوی	۳۵
۵	اپریل ۱۹۱۷ء/ جون ۱۹۱۹ء	جسٹس مولانا سید کرامت حسین	۳۶
۶	نومبر ۱۹۱۷ء	فرزند مولانا حبیب الرحمٰن شروانی	۳۷
۷	نومبر ۱۹۱۷ء	مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی	۳۷
۸	نومبر ۱۹۱۷ء	نواب میر نورالحسن خان کلیم	۳۷
۹	مئی ۱۹۱۸ء	مولوی سید احمد دہلوی	۳۹
۱۰	جون ۱۹۱۸ء	مولوی عبدالغنی وارثی عظیم آبادی	۳۹
۱۱	نومبر ۱۹۱۸ء	نواب حاجی محمد اسحاق خان بہادر	۳۹
۱۲	نومبر ۱۹۱۸ء	ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری	۴۰
۱۳	دسمبر ۱۹۱۸ء	مولانا عبداللہ غازی پوری	۴۰
۱۴	فروری ۱۹۱۹ء	شیخ ولایت علی	۴۰
۱۵	جون ۱۹۱۹ء	سر ولیم کروکس	۴۱
۱۶	جون ۱۹۱۹ء	ڈاکٹر پال کارس	۴۱
۱۷	جون ۱۹۱۹ء	مسز سنہا	۴۱
۱۸	اکتوبر ۱۹۱۹ء	پروفیسر ہیکل	۴۱
۱۹	نومبر ۱۹۱۹ء	ڈاکٹر مرسیر	۴۱
۲۰	جنوری ۱۹۲۰ء	جنرل ہوریس کارپینٹر	۴۱
۲۱	فروری ۱۹۲۰ء	مسٹر ہنری فرک	۴۲
۲۲	مارچ ۱۹۲۰ء	ڈاکٹر ڈی۔اے۔اسمتھ	۴۲
۲۳	اپریل ۱۹۲۰ء	مسٹر گارنز	۴۲
۲۴	اپریل ۱۹۲۰ء	سر ہرمان دیبر	۴۲
۲۵	اپریل ۱۹۲۰ء	ڈاکٹر سیسل لیسٹر (Lyster)	۴۲
۲۶	اپریل ۱۹۲۰ء	لیڈی میسن	۴۲
۲۷	مئی ۱۹۲۰ء	چھتری زمیندار	۴۳
۲۸	جون/ستمبر ۱۹۲۰ء	راما نجم	۴۳
۲۹	اگست ۱۹۲۰ء	ٹامس میرس	۴۳
۳۰	ستمبر ۱۹۲۰ء	مسٹر تلک	۴۳
۳۱	ستمبر ۱۹۲۰ء	پروفیسر ٹی گجر	۴۴
۳۲	اکتوبر ۱۹۲۰ء	پروفیسر ڈُنٹ	۴۴
۳۳	اکتوبر ۱۹۲۰ء	سر چارلس لایل	۴۴
۳۴	نومبر ۱۹۲۰ء	مفتی محمد عبداللہ ٹونکی	۴۴
۳۵	فروری ۱۹۲۱ء	آرتھر ہیورڈ	۴۴
۳۶	ستمبر ۱۹۲۱ء	اکبر الہ آبادی	۴۵
۳۷	دسمبر ۱۹۲۱ء/ اکتوبر ۱۹۲۳ء	ایم۔مہدی حسن	۴۵
۳۸	فروری ۱۹۲۲ء	پاپائے رومہ بنڈکٹ پانزدہم	۴۶
۳۹	جون ۱۹۲۲ء	سر الزڈبرڈ	۴۶

۴۰	اکتوبر ۱۹۲۲ء	مولانا رشید احمد سالم انصاری	۴۶
۴۱	دسمبر ۱۹۲۲ء	مولانا محمد یونس فرنگی محلی	۴۷
۴۲	دسمبر ۱۹۲۲ء	ایس۔ پرسی۔ اسمتھ	۴۷
۴۳	جنوری ۱۹۲۳ء	مولانا شوکت میرٹھی	۴۷
۴۴	جنوری ۱۹۲۳ء	ڈاکٹر الکزنڈر کرم برون	۴۷
۴۵	فروری ۱۹۲۳ء	مولانا حکیم سید عبدالحئی	۴۷
۴۶	فروری ۱۹۲۳ء	سر آئزک بیلی بالفور	۴۹
۴۷	فروری ۱۹۲۳ء	پروفیسر رائز ڈوڈ	۴۹
۴۸	مئی ۱۹۲۳ء	سارہ برنہارڈ	۴۹
۴۹	مئی ۱۹۲۳ء	لارڈ کارنیورن	۴۹
۵۰	دسمبر ۱۹۲۳ء	فرنچ ایم۔ پیری	۴۹
۵۱	جون ۱۹۲۴ء	سر آسوتوش مکرجی	۴۹
۵۲	ستمبر ۱۹۲۴ء	مولانا شاہ بدرالدین	۴۹
۵۳	نومبر ۱۹۲۴ء	مولوی ابوالحسنات ندوی	۵۰
۵۴	دسمبر ۱۹۲۴ء	جوزف کونرو	۵۰
۵۵	فروری ۱۹۲۵ء	مولانا عین القضاۃ	۵۰
۵۶	اپریل ۱۹۲۵ء	شیخ احمد علی شوق	۵۱
۵۷	مئی ۱۹۲۵ء	ملاّ حاجی عبدالرزاق خان	۵۱
۵۸	اگست ۱۹۲۵ء	مولانا مفتی محمد یوسف بہاری	۵۲
۵۹	جنوری ۱۹۲۶ء	مولانا عبدالباری فرنگی محلی	۵۲
۶۰	جنوری/ مارچ ۱۹۲۶ء	ایڈورڈ براؤن	۵۳
۶۱	مارچ ۱۹۲۶ء	مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی	۵۶
۶۲	جون ۱۹۲۶ء	مولوی نورالہدیٰ ندوی بہاری	۵۹
۶۳	جون ۱۹۲۶ء	نواب عماد الملک مولانا سید حسین بلگرامی	۵۹
۶۴	جنوری ۱۹۲۷ء	عبدالحلیم شرر لکھنوی	۶۱
۶۵	جنوری ۱۹۲۷ء	میر علی محمد شاد	۶۲
۶۶	اپریل ۱۹۲۷ء	شمس العلماء حافظ نذیر احمد	۶۲
۶۷	جون ۱۹۲۷ء	شیخ غلام قادر گرامی	۶۲
۶۸	جون ۱۹۲۷ء	شیخ خضری	۶۳
۶۹	ستمبر ۱۹۲۷ء	مولوی بشیر الدین احمد	۶۳
۷۰	ستمبر ۱۹۲۷ء	ڈاکٹر یعقوب صروف	۶۳
۷۱	جنوری ۱۹۲۸ء	حکیم حافظ اجمل خان	۶۳
۷۲	مارچ ۱۹۲۸ء	سر رابرٹ ہڈسن	۶۴
۷۳	اپریل ۱۹۲۸ء	پروفیسر لیفر سڈگ	۶۴
۷۴	اگست ۱۹۲۸ء	ابوالفضل عباسی چریا کوٹی	۶۴
۷۵	اگست ۱۹۲۸ء	وحید الدین سلیم پانی پتی	۶۴
۷۶	اگست ۱۹۲۸ء	سید امیر علی	۶۵
۷۷	ستمبر ۱۹۲۸ء	مولانا حکیم برکات احمد بہاری ٹونکی	۶۵
۷۸	دسمبر ۱۹۲۸ء	مولانا حافظ احمد	۶۵
۷۹	دسمبر ۱۹۲۸ء	مفتی عزیز الرحمٰن	۶۵
۸۰	فروری ۱۹۲۹ء	شیخ عبدالعزیز شادیش	۶۶
۸۱	دسمبر ۱۹۲۹ء	مولانا حبیب الرحمان عثمانی	۶۶
۸۲	جنوری ۱۹۳۰ء	مولوی مظہر الحق	۶۷
۸۳	فروری ۱۹۳۰ء	صاحبزادہ آفتاب احمد خان	۶۷
۸۴	مارچ/ اپریل ۱۹۳۰ء	مولانا عبدالحئی سہارنپوری	۶۸
۸۵	اپریل ۱۹۳۰ء	ڈاکٹر قاسم علی منصوری	۶۸
۸۶	مئی ۱۹۳۰ء	سلطان جہاں بیگم	۶۸
۸۷	جولائی ۱۹۳۰ء	نواب حبیب اللہ خان	۶۹
۸۸	جولائی ۱۹۳۰ء/ اپریل ۱۹۳۱ء	پروفیسر ٹومس آرنلڈ	۶۹
۸۹	جولائی ۱۹۳۰ء	قاضی سلیمان منصور پوری	۷۴
۹۰	جولائی ۱۹۳۰ء	سید جالب دہلوی	۷۴
۹۱	اگست ۱۹۳۰ء	احمد تیمور پاشا	۷۵
۹۲	اکتوبر ۱۹۳۰ء	سر آرتھر کونل ڈائل	۷۷
۹۳	نومبر ۱۹۳۰ء جنوری/فروری ۱۹۳۱ء	مولانا حمید الدین	۷۷
۹۴	جنوری ۱۹۳۱ء	مولانا محمد علی جوہر	۸۵
۹۵	فروری ۱۹۳۱ء	نواب عبدالسلام خان رامپوری	۸۶
۹۶	ستمبر ۱۹۳۱ء	صلاح الدین خدا بخش	۸۶
۹۷	جنوری ۱۹۳۲ء	مولانا عبدالماجد بدایونی	۸۷
۹۸	نومبر ۱۹۳۲ء	سر سید علی امام	۸۸
۹۹	جنوری ۱۹۳۳ء	خواجہ کمال الدین	۸۸
۱۰۰	مئی ۱۹۳۳ء	مولوی جنید نعمانی	۸۸
۱۰۱	جولائی ۱۹۳۳ء	مولانا سید انور شاہ	۸۹

۱۰۲	جولائی ۱۹۳۳ء	سر فخر الدین	۸۹
۱۰۳	جولائی ۱۹۳۳ء	مولانا علی حیدر نظم طباطبائی	۸۹
۱۰۴	جولائی ۱۹۳۳ء	مولوی محبوب عالم	۹۰
۱۰۵	جولائی ۱۹۳۳ء	خان بہادر میر ناصر علی	۹۰
۱۰۶	نومبر ۱۹۳۳ء	شاہ نادر خان	۹۰
۱۰۷	جنوری ۱۹۳۴ء	حافظ احمد علی خان شوقؔ	۹۰
۱۰۸	مارچ ۱۹۳۴ء	نواب صلابت بہادر	۹۱
۱۰۹	اپریل ۱۹۳۴ء	مولانا غلام محمد شملوی	۹۱
۱۱۰	اگست ۱۹۳۴ء	ریاض خیر آبادی	۹۱
۱۱۱	نومبر ۱۹۳۴ء	احقر بہاری	۹۱
۱۱۲	جون ۱۹۳۵ء	مولوی حاجی سر رحیم بخش	۹۷
۱۱۳	جولائی ۱۹۳۵ء	مولانا شاہ سلیمان قادری چشتی پھلواروی	۹۷
۱۱۴	اگست ۱۹۳۵ء	مولوی سید ممتاز علی	۹۹
۱۱۵	اکتوبر ۱۹۳۵ء	علامہ سید رشید رضا	۱۰۰
۱۱۶	فروری ۱۹۳۶ء	مولانا خلیل الرحمٰن	۱۰۰
۱۱۷	فروری/ اپریل ۱۹۳۶ء	علامہ راشد الخیری	۱۰۰
۱۱۸	اپریل ۱۹۳۶ء	حافظ ہدایت حسین	۱۰۱
۱۱۹	اپریل ۱۹۳۶ء	مولانا شیر علی	۱۰۱
۱۲۰	جون ۱۹۳۶ء	ڈاکٹر مختار احمد انصاری	۱۰۱
۱۲۱	اگست ۱۹۳۶ء	سر فضل حسین	۱۰۲
۱۲۲	اکتوبر ۱۹۳۶ء	پرنس کائتانی	۱۰۳
۱۲۳	اکتوبر ۱۹۳۶ء	پروفیسر گویدی	۱۰۳
۱۲۴	اکتوبر ۱۹۳۶ء	پروفیسر اسنوک ہرخرونیے	۱۰۳
۱۲۵	اکتوبر ۱۹۳۶ء	مولوی نور الحسن نیّر	۱۰۳
۱۲۶	اکتوبر ۱۹۳۶ء	مارماڈیوک پکتھال	۱۰۳
۱۲۷	نومبر ۱۹۳۶ء	منشی پریم چند	۱۰۳
۱۲۸	دسمبر ۱۹۳۶ء	نواب سید محمد علی حسن خان	۱۰۴
۱۲۹	اگست ۱۹۳۷ء	پروفیسر باور	۱۰۴
۱۳۰	جولائی ۱۹۳۷ء	ڈاکٹر سر راس مسعود	۱۰۵
۱۳۱	جنوری ۱۹۳۸ء	شیخ مشیر حسین قدوائی	۱۰۵
۱۳۲	مئی ۱۹۳۸ء	ڈاکٹر محمد اقبال	۱۰۵
۱۳۳	اکتوبر ۱۹۳۸ء	نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر	۱۰۶
۱۳۴	نومبر ۱۹۳۸ء	پیر احسان اللہ شاہ	۱۰۷
۱۳۵	نومبر ۱۹۳۸ء	سیٹھ ابراہیم	۱۰۷
۱۳۶	دسمبر ۱۹۳۸ء	مصطفٰے کمال اتاترک	۱۰۸
۱۳۷	دسمبر ۱۹۳۸	مولانا شوکت علی	۱۰۸
۱۳۸	مارچ ۱۹۳۹ء	ولیم میکڈوگل	۱۰۸
۱۳۹	مئی ۱۹۳۹ء	مولانا محمد عرفان خان	۱۰۹
۱۴۰	جون ۱۹۳۹ء	مولانا سلیمان اشرف	۱۰۹
۱۴۱	اکتوبر ۱۹۳۹ء	سگمنڈ فرائڈ	۱۱۰
۱۴۲	دسمبر ۱۹۳۹ء	مولانا سید عنایت احمد نقوی بدایونی	۱۱۲
۱۴۳	دسمبر ۱۹۳۹ء	ایڈورڈ ویسٹر مارک	۱۱۳
۱۴۴	مارچ ۱۹۴۰ء	مولانا فضل حق رامپوری	۱۱۴
۱۴۵	مارچ/ اپریل ۱۹۴۰ء	مولانا معین الدین اجمیری	۱۱۴
۱۴۶	مارچ ۱۹۴۰ء	جان ون سنک	۱۱۶
۱۴۷	اپریل ۱۹۴۰ء	پروفیسر مارگولیوتھ	۱۱۶
۱۴۸	جولائی ۱۹۴۰ء	مہاراجہ سر کرشن پرشاد	۱۱۶
۱۴۹	جولائی ۱۹۴۰ء	نواب اختر یار جنگ	۱۱۷
۱۵۰	جولائی ۱۹۴۰ء	خواجہ عبد الرؤف عشرتؔ لکھنوی	۱۱۷
۱۵۱	جولائی ۱۹۴۰ء	مفتی محمد انوار الحق	۱۱۷
۱۵۲	ستمبر ۱۹۴۰ء	عبد الحمید سعید بے	۱۱۷
۱۵۳	اکتوبر ۱۹۴۰ء	مولانا ابوبکر محمد شیث جونپوری	۱۱۸
۱۵۴	نومبر ۱۹۴۰ء	لیون ٹرائسکی	۱۱۹
۱۵۵	دسمبر ۱۹۴۰ء/ مارچ ۱۹۴۱ء	مولانا ابو المحاسن محمد سجاد	۱۱۹
۱۵۶	دسمبر ۱۹۴۰ء	مولانا عبد العزیز	۱۲۲
۱۵۷	فروری ۱۹۴۱ء	محمد پاشا محمود	۱۲۲
۱۵۸	اپریل ۱۹۴۱ء	سر شاہ سلیمان	۱۲۲
۱۵۹	مئی ۱۹۴۱ء	مولانا حاجی معین الدین ندوی	۱۲۳
۱۶۰	اگست ۱۹۴۱ء	مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی	۱۲۳
۱۶۱	جنوری ۱۹۴۲ء	سر اکبر حیدری	۱۲۴
۱۶۲	اپریل ۱۹۴۲ء	حامد نعمانی	۱۲۴
۱۶۳	جولائی ۱۹۴۲ء	مولانا حیدر حسن خاں محدث ٹونکی	۱۲۴
۱۶۴	ستمبر ۱۹۴۲ء	مولانا محمد سورتی	۱۲۵

۱۶۵	ستمبر۱۹۴۲ء	نواب محمد یار جنگ بہادر	۱۲۵
۱۶۶	اکتوبر۱۹۴۲ء	فضل حق آزاد عظیم آبادی	۱۲۵
۱۶۷	نومبر۱۹۴۲ء	وصلؔ بلگرامی	۱۲۶
۱۶۸	نومبر۱۹۴۲ء	نصیر بیرسٹر	۱۲۷
۱۶۹	دسمبر۱۹۴۲ء	مولانا عبدالقادر قصوری	۱۲۷
۱۷۰	دسمبر۱۹۴۲ء	سر محمد یعقوب	۱۲۸
۱۷۱	دسمبر۱۹۴۲ء	دیا نرائن نگم	۱۲۸
۱۷۲	فروری۱۹۴۳ء	مولانا محمد معزاللہ خیرآبادی	۱۲۸
۱۷۳	مئی۱۹۴۳ء	سید سجاد حیدر یلدرم	۱۲۸
۱۷۴	مئی۱۹۴۳ء	منشی محمد احتشام علی کاکوروی	۱۲۹
۱۷۵	جون۱۹۴۳ء	شمس العلماء عبدالرحمٰن شاطرؔ	۱۳۰
۱۷۶	اگست/ستمبر۱۹۴۳ء	مولانا اشرف علی تھانوی	۱۳۰
۱۷۷	دسمبر۱۹۴۳ء	مولانا عنایت اللہ دہلوی	۱۳۶
۱۷۸	دسمبر۱۹۴۳ء	سید محفوظ علی بدایونی	۱۳۶
۱۷۹	جنوری۱۹۴۴ء	مولانا محمد حفیظ اللہ	۱۳۷
۱۸۰	اپریل۱۹۴۴ء	مولانا سید محمد عیسیٰ الہ آبادی	۱۳۸
۱۸۱	جولائی/اگست۱۹۴۴ء	مولوی محمد بہادر خاں (نواب بہادر یار جنگ)	۱۳۸
۱۸۲	اگست/نومبر۱۹۴۴ء	مولانا الیاس کاندھلوی	۱۴۲
۱۸۳	ستمبر۱۹۴۴ء	مولانا عبیداللہ سندھی	۱۴۶
۱۸۴	ستمبر/اکتوبر۱۹۴۴ء	خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوبؔ	۱۴۶
۱۸۵	نومبر۱۹۴۴ء	مولانا حافظ فضل رحمٰن ندوی	۱۴۷
۱۸۶	دسمبر۱۹۴۴ء	چودھری خوشی محمد ناظرؔ	۱۴۷
۱۸۷	جولائی۱۹۴۵ء	مولوی ضیاء الحسن علوی	۱۴۹
۱۸۸	اکتوبر۱۹۴۵ء	ڈاکٹر نکلسن	۱۵۱
۱۸۹	دسمبر۱۹۴۵ء	مولانا ابوعماد شبلی (فقیہ ندوہ)	۱۵۲
۱۹۰	مارچ/اپریل۱۹۴۶ء	نواب فصاحت جنگ جلیلؔ	۱۵۳
۱۹۱	اپریل۱۹۴۶ء	پروفیسر حافظ محمود خان شیرانی	۱۵۶
۱۹۲	دسمبر۱۹۴۶ء	منشی محمد اویس وارثی	۱۵۷
۱۹۳	مارچ۱۹۴۷ء	مولانا حاجی محمد عمر	۱۵۸
۱۹۴	اپریل۱۹۴۷ء	حکیم حبیب الرحمٰن	۱۵۸
۱۹۵	جون۱۹۴۷ء	مولانا شاہ محی الدین پھلواروی	۱۶۰
۱۹۶	اکتوبر۱۹۴۷ء	مولانا عبداللہ عمادی	۱۶۱
۱۹۷	فروری۱۹۴۸ء	مہاتما گاندھی	۱۶۳
۱۹۸	فروری۱۹۴۸ء	ڈاکٹر ضیاء الدین	۱۶۴
۱۹۹	مارچ۱۹۴۸ء	مولوی عبدالرزاق کانپوری	۱۶۴
۲۰۰	مارچ۱۹۴۸ء	نواب غلام احمد کلامی مدراسی	۱۶۴
۲۰۱	مئی۱۹۴۸ء	ثناء اللہ امرتسری	۱۶۶
۲۰۲	مئی۱۹۴۸ء	یعقوب بخش راغب قادری بدایونی	۱۶۸
۲۰۳	مئی۱۹۴۸ء	مولانا عبدالرؤف داناپوری	۱۶۸
۲۰۴	اکتوبر۱۹۴۸ء	قائداعظم محمد علی جناح	۱۶۹
۲۰۵	فروری۱۹۴۹ء	سر تیج بہادر سپرو	۱۷۱
۲۰۶	مارچ۱۹۴۹ء	سروجنی نائیڈو	۱۷۱
۲۰۷	مارچ/اپریل/ جون۱۹۴۹ء	سید حسین	۱۷۱
۲۰۸	نومبر۱۹۴۹ء	مولانا اصغر حسین نبولوی	۱۷۳
۲۰۹	دسمبر۱۹۴۹ء	مولانا محمد ابوالقاسم سیفؔ بنارسی	۱۷۴
۲۱۰	دسمبر۱۹۴۹ء	سیٹھ جمال محمد	۱۷۴
۲۱۱	جنوری/اپریل۱۹۵۰ء	مولانا شبیر احمد عثمانی	۱۷۵
۲۱۲	جنوری۔مارچ۱۹۵۰ء	موسیٰ جاراللہ	۱۸۱
۲۱۳	مارچ/مئی۱۹۵۰ء	سر شیخ عبدالقادر	۱۸۲
۲۱۴	اپریل۱۹۵۰ء	پروفیسر محمد نعیم الرحمٰن	۱۸۵
۲۱۵	ستمبر/دسمبر۱۹۵۰ء	مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی	۱۸۶
۲۱۶	جنوری۱۹۵۱ء	سردار پٹیل	۱۹۰
۲۱۷	فروری۱۹۵۱ء	سیمابؔ اکبرآبادی	۱۹۰
۲۱۸	مئی۱۹۵۱ء	آرزوؔ لکھنوی	۱۹۰
۲۱۹	مئی۱۹۵۱	صفیؔ	۱۹۰
۲۲۰	جون/ جولائی/ دسمبر ۱۹۵۱ء	مولانا فضل الحسن حسرتؔ موہانی	۱۹۰
۲۲۱	اکتوبر۱۹۵۱ء	مرزا محمد عسکری	۱۹۹
۲۲۲	اکتوبر۱۹۵۱ء	مولوی مہیش پرشاد	۱۹۹
۲۲۳	نومبر۱۹۵۱ء	لیاقت علی خان	۱۹۹
۲۲۴	فروری۱۹۵۲ء	مولانا اکرام اللہ خان ندوی	۲۰۰
۲۲۵	فروری۱۹۵۲ء	ملا رموزی (احمد صدیق)	۲۰۰
۲۲۶	فروری۱۹۵۲ء	مولانا حیدر زمان صدیقی	۲۰۰

۲۲۷	اکتوبر۱۹۵۲ء	شری مشروالا	۲۰۱
۲۲۸	نومبر۱۹۵۲ء	میر غلام بھیک نیرنگ	۲۰۱
۲۲۹	جنوری/ مارچ۱۹۵۳ء	شیخ عبدالقادر سرفراز	۲۰۱
۲۳۰	فروری۱۹۵۳ء	مولانا مفتی کفایت اللہ	۲۰۴
۲۳۱	اپریل۱۹۵۳ء	آصف علی	۲۰۶
۲۳۲	اپریل۱۹۵۳ء	شفیق الرحمٰن قدوائی	۲۰۶
۲۳۳	اگست۱۹۵۳ء	مولوی ریاض حسن خان خیالؔ	۲۰۶
۲۳۴	دسمبر۱۹۵۳ء	مولانا سید سلیمان ندوی	۲۰۷
۲۳۵	جنوری۱۹۵۴ء	سلطان عبدالعزیز آلِ سعود	۲۰۸
۲۳۶	جنوری۱۹۵۴ء	علامہ یوسف علی	۲۰۹
۲۳۷	اپریل۱۹۵۴ء	مولانا مسعود عالم ندوی	۲۰۹
۲۳۸	مئی۱۹۵۴ء	مولانا قطب الدین عبدالوالی	۲۰۹
۲۳۹	نومبر۱۹۵۴ء	رفیع احمد قدوائی	۲۱۰
۲۴۰	فروری۱۹۵۵ء	پنڈت کشن پرشاد کول	۲۱۱
۲۴۱	مارچ۱۹۵۵ء	مولوی سید مقبول احمد	۲۱۱
۲۴۲	اگست۱۹۵۵ء	خواجہ حسن نظامی	۲۱۱
۲۴۳	ستمبر۱۹۵۵ء	قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی	۲۱۲
۲۴۴	ستمبر۱۹۵۵ء	مولانا عبدالحق مدنی	۲۱۲
۲۴۵	نومبر۱۹۵۵ء	پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی	۲۱۲
۲۴۶	نومبر۱۹۵۵ء/ مارچ۱۹۵۶ء	مولانا شاہ حلیم عطا	۲۱۳
۲۴۷	نومبر۱۹۵۵ء	مولوی اقبال احمد خان سہیلؔ	۲۱۶
۲۴۸	جنوری۱۹۵۶ء	مولانا اسلم جیراج پوری	۲۱۶
۲۴۹	فروری۱۹۵۶ء	قاضی عبدالغفار	۲۱۶
۲۵۰	مارچ۱۹۵۶ء	اچاریہ نریندر دیو جی	۲۱۷
۲۵۱	مئی۱۹۵۶ء	نواب امیر حسن خان	۲۱۷
۲۵۲	جولائی۱۹۵۶ء	مناظر احسن گیلانی	۲۱۸
۲۵۳	جولائی۱۹۵۶ء	مولوی بشیر الدین	۲۱۸
۲۵۴	جولائی۱۹۵۶ء	سید مرتضیٰ علی دہلوی	۲۱۹
۲۵۵	ستمبر۱۹۵۶ء	غلام محمد (گورنر جنرل پاکستان)	۲۱۹
۲۵۶	ستمبر۱۹۵۶ء	مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی	۲۱۹
۲۵۷	اکتوبر۱۹۵۶ء	مولانا عبدالسلام ندوی	۲۱۹
۲۵۸	اکتوبر۱۹۵۶ء	مولوی محمد مبین کیفی چریا کوٹی	۲۲۱
۲۵۹	نومبر۱۹۵۶ء	رضا علی وحشتؔ	۲۲۱
۲۶۰	دسمبر۱۹۵۶ء	مولانا ظفر علی خان	۲۲۱
۲۶۱	مارچ۱۹۵۷ء	مرزا سلطان احمد	۲۲۳
۲۶۲	مارچ۱۹۵۷ء	مولانا سید شاہ محمد قمر الدین پھلواروی	۲۲۴
۲۶۳	اگست۱۹۵۷ء	سر آغا خان	۲۲۴
۲۶۴	اگست۱۹۵۷ء	مولانا آزاد سبحانی	۲۲۴
۲۶۵	جنوری۱۹۵۸ء	مولانا حسین احمد مدنی	۲۲۵
۲۶۶	جنوری۱۹۵۸ء	رام بابو سکسینہ	۲۲۵
۲۶۷	مارچ/ دسمبر۱۹۵۸ء	مولانا ابوالکلام آزاد	۲۲۵
۲۶۸	اپریل/ جولائی۱۹۵۸ء	ڈاکٹر عبدالحق	۲۳۴
۲۶۹	جولائی۱۹۵۸ء	ابوظفر ندوی	۲۴۰
۲۷۰	جولائی۱۹۵۸ء	سید عبدالحکیم دیسنوی	۲۴۱
۲۷۱	جولائی/ستمبر۱۹۵۸ء	نواب اسمٰعیل خاں	۲۴۱
۲۷۲	اکتوبر۱۹۵۸ء	مولوی محمد امین زبیری	۲۴۵
۲۷۳	اکتوبر۱۹۵۸ء	ڈاکٹر بھگوان داس	۲۴۶
۲۷۴	نومبر۱۹۵۸ء	مولانا اختر احسن اصلاحی	۲۴۶
۲۷۵	مارچ۱۹۵۹ء	پروفیسر محمد الیاس برنی	۲۴۶
۲۷۶	مارچ۱۹۵۹ء	خلیفہ عبدالحکیم	۲۴۶
۲۷۷	جولائی۱۹۵۹ء	مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی	۲۴۷
۲۷۸	جولائی۱۹۵۹ء	ڈاکٹر عبدالوہاب عزام مصری	۲۴۸
۲۷۹	ستمبر۱۹۵۹ء	مفتی عبدالقادر	۲۴۸
۲۸۰	اکتوبر۱۹۵۹ء	چودھری محمد علی ردولوی	۲۴۹
۲۸۱	اکتوبر۱۹۵۹ء	کاکا محمد اسمٰعیل مدراسی	۲۴۹
۲۸۲	نومبر۱۹۵۹ء	عبدالمجید سالکؔ	۲۵۰
۲۸۳	نومبر۱۹۵۹ء	حاجی رشید الدین	۲۵۰
۲۸۴	نومبر۱۹۵۹ء	مولوی سید محمد احمد کاظمی	۲۵۱
۲۸۵	دسمبر۱۹۵۹ء	مولانا احمد سعید	۲۵۱
۲۸۶	جنوری۱۹۶۰ء	مفتی عبداللطیف	۲۵۱
۲۸۷	مارچ۱۹۶۰ء	نواب حمید اللہ خاں	۲۵۱
۲۸۸	اکتوبر۱۹۶۰ء	جگر مراد آبادی	۲۵۲
۲۸۹	جنوری۱۹۶۱ء	مولوی عبدالمجید	۲۵۲

نمبر	تاریخ	نام	صفحہ
۲۹۰	فروری ۱۹۶۱ء	شاہ مصطفٰے احمد ردولوی	۲۵۳
۲۹۱	مئی ۱۹۶۱ء	ڈاکٹر سید عبدالعلی	۲۵۳
۲۹۲	جون ۱۹۶۱ء	سید امجد حسین حیدر آبادی	۲۵۴
۲۹۳	اگست ۱۹۶۱ء	پروفیسر سید نواب علی	۲۵۴
۲۹۴	اگست ۱۹۶۱ء	خان بہادر ظفر حسین خان	۲۵۴
۲۹۵	ستمبر ۱۹۶۱ء	مولوی عبدالحق	۲۵۵
۲۹۶	ستمبر ۱۹۶۱ء	مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری	۲۵۵
۲۹۷	جنوری ۱۹۶۲ء	ڈاکٹر حفیظ سید	۲۵۶
۲۹۸	مارچ ۱۹۶۲ء	شعیب قریشی	۲۵۶
۲۹۹	مئی ۱۹۶۲ء	مولانا عبدالشکور	۲۵۶
۳۰۰	اگست ۱۹۶۲ء	مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمٰن	۲۵۷
۳۰۱	ستمبر ۱۹۶۲ء	مولانا عبدالقادر رائے پوری	۲۵۷
۳۰۲	ستمبر ۱۹۶۲ء	مولوی عبدالغنی انصاری	۲۵۷
۳۰۳	اکتوبر ۱۹۲۶ء	ڈاکٹر سید محی الدین زور قادری	۲۵۸
۳۰۴	نومبر ۱۹۶۲ء	مولانا سعید انصاری	۲۵۸
۳۰۵	جنوری ۱۹۶۳ء	عبدالمجید خواجہ	۲۵۸
۳۰۶	مارچ ۱۹۶۳ء	ڈاکٹر راجندر پرشاد	۲۵۹
۳۰۷	اپریل ۱۹۶۳ء	مولوی محمد شفیع	۲۵۹
۳۰۸	جولائی ۱۹۶۳ء	ڈاکٹر سید ہادی حسن	۲۵۹
۳۰۹	ستمبر ۱۹۶۳ء	مولانا عبدالغنی پھولپوری	۲۶۰
۳۱۰	اکتوبر ۱۹۶۳ء	سید صدیق حسن	۲۶۰
۳۱۱	دسمبر ۱۹۶۳ء	مسٹر کینیڈی	۲۶۱
۳۱۲	دسمبر ۱۹۶۳ء	مولانا محفوظ الرحمٰن نامی	۲۶۱
۳۱۳	فروری ۱۹۶۴ء	سید ظہیر الدین علوی	۲۶۱
۳۱۴	جون ۱۹۶۴ء	پنڈت جواہر لال نہرو	۲۶۱
۳۱۵	اگست ۱۹۶۴ء	پروفیسر حامد حسن قادری	۲۶۲
۳۱۶	اگست ۱۹۶۴ء	سید ہاشمی فرید آبادی	۲۶۳
۳۱۷	اگست ۱۹۶۴ء	مولانا صلاح الدین احمد	۲۶۳
۳۱۸	جنوری ۱۹۶۵ء	مولانا صبغۃ اللہ شہید فرنگی محلی	۲۶۳
۳۱۹	فروری ۱۹۶۵ء	چرچل	۲۶۳
۳۲۰	مارچ ۱۹۶۵ء	حمید صدیقی [زائر حرم]	۲۶۳
۳۲۱	اپریل ۱۹۶۵ء	مولانا محمد یوسف	۲۶۴
۳۲۲	جون ۱۹۶۵ء	مولانا بدر الدین علوی	۲۶۴
۳۲۳	دسمبر ۱۹۶۵ء	ملا طاہر سیف الدین	۲۶۴
۳۲۴	دسمبر ۱۹۶۵ء	مولانا بدر عالم میرٹھی	۲۶۴
۳۲۵	فروری ۱۹۶۶ء	شری لال بہادر شاستری	۲۶۵
۳۲۶	فروری ۱۹۶۶ء	تلوک چند محروم	۲۶۵
۳۲۷	فروری ۱۹۶۶ء	منشی احترام علی کاکوروی	۲۶۵
۳۲۸	جون ۱۹۶۶ء	نیاز فتح پوری	۲۶۵
۳۲۹	ستمبر ۱۹۶۶ء	نواب ناظر یار جنگ	۲۶۶
۳۳۰	ستمبر ۱۹۶۶ء	سید قطب	۲۶۶
۳۳۱	دسمبر ۱۹۶۶ء	مولوی مجید حسن	۲۶۶
۳۳۲	فروری ۱۹۶۷ء	مولوی محمد یحیٰ تنہا	۲۶۶
۳۳۳	مارچ ۱۹۶۷ء	نواب میر عثمان علی خاں	۲۶۶
۳۳۴	جون ۱۹۶۷ء	نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی	۲۶۷
۳۳۵	ستمبر ۱۹۶۷ء	مولانا مسعود علی ندوی	۲۶۷
۳۳۶	دسمبر ۱۹۶۷ء	مولانا شاہ وصی	۲۶۸
۳۳۷	جنوری ۱۹۶۸ء	مولانا محمد ابراہیم بلیاوی	۲۶۸
۳۳۸	فروری ۱۹۶۸ء	حافظ محمد ابراہیم	۲۶۸
۳۳۹	اپریل ۱۹۶۸ء	سعید الحق دیسنوی	۲۶۹
۳۴۰	ستمبر ۱۹۶۸ء	سید نجیب اشرف ندوی	۲۶۹
۳۴۱	نومبر ۱۹۶۸ء	رئیس احمد جعفری	۲۶۹
۳۴۲	دسمبر ۱۹۶۸ء	مولانا حمید الدین	۲۷۰
۳۴۳	فروری ۱۹۶۹ء	مولانا لقاء اللہ عثمانی	۲۷۰
۳۴۴	فروری ۱۹۶۹ء	نواب شوکت خاں	۲۷۰
۳۴۵	مئی/ جون/ جولائی ۱۹۶۹ء	ڈاکٹر ذاکر حسین خان	۲۷۰
۳۴۶	ستمبر ۱۹۶۹ء	ہمایوں کبیر	۲۹۱
۳۴۷	نومبر ۱۹۶۹ء	محمد اجمل خان	۲۹۱
۳۴۸	جنوری ۱۹۷۰ء	مفتی محمد قائم فرنگی محلی	۲۹۲
۳۴۹	مارچ ۱۹۷۰ء	ڈاکٹر محمد اسحٰق	۲۹۲
۳۵۰	جون ۱۹۷۰ء	مولانا محمد یعقوب مجددی بھوپالی	۲۹۶
۳۵۱	جون ۱۹۷۰ء	سید محسن الحکیم	۲۹۶
۳۵۲	اکتوبر ۱۹۷۰ء	جمال عبدالناصر	۲۹۷

٣٥٣	فروری ١٩٧١ء	روش صدیقی	٢٩٧
٣٥٤	اپریل ١٩٧١ء	مولانا عبدالقادر سروری	٢٩٨
٣٥٥	مئی ١٩٧١ء	حکیم حافظ خواجہ شمس الدین لکھنوی	٢٩٨
٣٥٦	مئی ١٩٧١ء	سید اختر علی تلہری	٢٩٨
٣٥٧	جولائی ١٩٧١ء	سری پرکاش جی	٢٩٨
٣٥٨	جولائی ١٩٧١ء	پروفیسر محمد حبیب	٢٩٩
٣٥٩	جولائی ١٩٧١ء	مولانا سید محمد ہاشم ندوی	٢٩٩
٣٦٠	اگست ١٩٧١ء	خیر بہوروی	٢٩٩
٣٦١	اگست ١٩٧١ء	تسکین قریشی	٢٩٩
٣٦٢	ستمبر ١٩٧١ء	مولانا عبدالحفیظ بلیاوی	٣٠٠
٣٦٣	اکتوبر/نومبر/ دسمبر ١٩٧١ء	ڈاکٹر سید محمود	٣٠٠
٣٦٤	نومبر ١٩٧١ء	سید اسد اللہ کاظمی	٣١٥
٣٦٥	نومبر ١٩٧١ء	افقر موہانی	٣١٥
٣٦٦	نومبر ١٩٧١ء	عارف عباسی	٣١٥
٣٦٧	دسمبر ١٩٧١ء	ڈاکٹر سید عبداللطیف	٣١٥
٣٦٨	دسمبر ١٩٧١ء	غلام رسول مہر	٣١٦
٣٦٩	جنوری ١٩٧٢ء	خواجہ غلام السیدین	٣١٦
٣٧٠	جنوری ١٩٧٢ء	مولانا احتشام الحسن کاندھلوی	٣١٦
٣٧١	فروری ١٩٧٢ء	شیخ ظہور الحسن	٣١٧
٣٧٢	فروری ١٩٧٢ء	پنڈت رام ناتھ کنزرو	٣١٧
٣٧٣	مارچ ١٩٧٢ء	یحییٰ اعظمی	٣١٧
٣٧٤	اپریل ١٩٧٢ء	مولانا سید فخر الدین احمد	٣١٧
٣٧٥	اپریل ١٩٧٢ء	شیخ محمد اسماعیل	٣١٧
٣٧٦	اگست ١٩٧٢ء	ڈاکٹر عبدالستار صدیقی	٣١٧
٣٧٧	دسمبر ١٩٧٢ء	پروفیسر سید احتشام حسین	٣١٨
٣٧٨	جنوری ١٩٧٣ء	مرزا احسان احمد	٣١٨
٣٧٩	ایضاً ١٩٧٣ء	مولانا عبدالمجید حریری	٣١٩
٣٨٠	فروری ١٩٧٣ء	سید عبدالرحمٰن بافقیہ تھنگل	٣١٩
٣٨١	فروری ١٩٧٣ء	غلام احمد فرقت کاکوروی	٣١٩
٣٨٢	جون ١٩٧٣ء	چودھری خلیق الزماں	٣١٩
٣٨٣	جون ١٩٧٣ء	مولانا عبدالصمد رحمانی	٣٢٠
٣٨٤	ستمبر ١٩٧٣ء	مولانا ضیاء الدین احمد بدایونی	٣٢٠
٣٨٥	نومبر ١٩٧٣ء	ڈاکٹر عبدالمعید خان	٣٢٠
٣٨٦	نومبر ١٩٧٣ء	ڈاکٹر تاراچند	٣٢١
٣٨٧	دسمبر ١٩٧٣ء	سلام مچھلی شہری	٣٢١
٣٨٨	جنوری ١٩٧٤ء	مولانا شبلی ندوی	٣٢١
٣٨٩	جون ١٩٧٤ء	ڈاکٹر فریدی	٣٢١
٣٩٠	اگست ١٩٧٤ء	مفتی امین الحسینی	٣٢٢
٣٩١	اگست ١٩٧٤ء	شیخ انس یاسین	٣٢٢
٣٩٢	اگست ١٩٧٤ء	مولوی حسین حسان ندوی	٣٢٣
٣٩٣	جنوری ١٩٧٥ء	شاہ معین الدین ندوی	٣٢٣
٣٩٤	مارچ ١٩٧٥ء	ڈاکٹر اعجاز حسین	٣٢٦
٣٩٥	مارچ ١٩٧٥ء	ڈاکٹر مسیح الزماں	٣٢٦
٣٩٦	مارچ ١٩٧٥ء	مولانا ظفر احمد عثمانی	٣٢٦
٣٩٧	مارچ ١٩٧٥ء	حکیم محمد اسحاق	٣٢٧
٣٩٨	اپریل ١٩٧٥ء	شاہ فیصل	٣٢٧
٣٩٩	مئی ١٩٧٥ء	ڈاکٹر رادھا کرشنن	٣٢٧
٤٠٠	ستمبر ١٩٧٥ء	مولانا ابوالوفاء افغانی	٣٢٩
٤٠١	اکتوبر ١٩٧٥ء	مولانا محمد شاہد فاخری	٣٢٩
٤٠٢	نومبر ١٩٧٥ء	مولانا محمد میاں	٣٢٩
٤٠٣	نومبر ١٩٧٥ء	شورش کاشمیری	٣٢٩
٤٠٤	دسمبر ١٩٧٥ء	پروفیسر سید مسعود حسن	٣٣٠
٤٠٥	جنوری ١٩٧٦ء	ڈاکٹر میر ولی الدین	٣٣٠
٤٠٦	فروری/ مارچ ١٩٧٦ء	مولانا عبدالباری ندوی	٣٣١
٤٠٧	فروری ١٩٧٦ء	مرزا مرتضیٰ بیگ	٣٣٢
٤٠٨	مارچ ١٩٧٦ء	ڈاکٹر عبدالعلیم	٣٣٢
٤٠٩	اپریل/مئی ١٩٧٦ء	ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی	٣٣٢
٤١٠	اپریل ١٩٧٦ء	میاں مہر محمد خاں شہاب	٣٣٧
٤١١	جون ١٩٧٦ء	شاہ فخر عالم بھاگلپوری	٣٣٨
٤١٢	جون ١٩٧٦ء	محمد یوسف صدیقی	٣٣٨
٤١٣	جون ١٩٧٦ء	مولانا حافظ عبدالعزیز	٣٣٨
٤١٤	جولائی ١٩٧٦ء	مولانا محمد عثمان فارقلیط	٣٣٨
٤١٥	جولائی ١٩٧٦ء	مفتی سید محمد مہدی حسن شاہ جہان پوری	٣٣٩

۴۱۶	اگست ۱۹۷۶ء	احمد زکی	۳۴۰
۴۱۷	ستمبر ۱۹۷۶ء	مولانا محمد اویس نگرامی ندوی	۳۴۲
۴۱۸	نومبر ۱۹۷۶ء	مولانا مفتی محمد شفیع	۳۴۴
۴۱۹	نومبر ۱۹۷۶ء	ڈاکٹر وحید مرزا	۳۴۶
۴۲۰	دسمبر ۱۹۷۶ء	مولانا سید ریاست علی ندوی	۳۴۷
۴۲۱	جنوری ۱۹۷۷ء	مولانا عبدالماجد دریابادی	۳۴۹
۴۲۲	جنوری ۱۹۷۷ء	نواب علی یاور جنگ بہادر	۳۵۱
۴۲۳	فروری ۱۹۷۷ء	رشید احمد صدیقی	۳۵۵
۴۲۴	فروری ۱۹۷۷ء	فخر الدین علی احمد	۳۵۷
۴۲۵	جون ۱۹۷۷ء	شاہ عزالدین پھلواروی ندوی	۳۵۹
۴۲۶	جون ۱۹۷۷ء	مولانا مفتی محمد عتیق فرنگی محلی	۳۶۰
۴۲۷	جون ۱۹۷۷ء	پروفیسر اختر اورینوی	۳۶۱
۴۲۸	جولائی ۱۹۷۷ء	پروفیسر سینتی کمار چٹرجی	۳۶۲
۴۲۹	اگست۔ستمبر ۱۹۷۷ء	مولانا محمد سلیم کیرانوی	۳۶۳
۴۳۹	ستمبر۔اکتوبر ۱۹۷۷ء	عبدالرزاق قریشی	۳۶۵
۴۳۱	نومبر ۱۹۷۷ء/ اپریل ۱۹۷۸ء	مولانا محمد یوسف بنوری	۳۶۸
۴۳۲	اپریل ۱۹۷۸ء	ڈاکٹر ظفر الہدیٰ	۳۷۰
۴۳۳	اپریل ۱۹۷۸ء	اعجاز صدیقی	۳۷۱
۴۳۴	اپریل ۱۹۷۸ء	پنڈت ہردے ناتھ کنزرو	۳۷۲
۴۳۵	جون ۱۹۷۸ء	ماہر القادری	۳۷۲
۴۳۶	جولائی ۱۹۷۸ء	ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی	۳۸۰
۴۳۷	ستمبر ۱۹۷۸ء	مولوی عبدالحمید ندوی	۳۸۲
۴۳۸	دسمبر ۱۹۷۸ء/ جنوری ۱۹۷۹ء	ڈاکٹر سید عابد حسین	۳۸۲
۴۳۹	دسمبر ۱۹۷۸ء/ جنوری ۱۹۷۹ء	مولانا عبدالعزیز میمن	۳۸۶
۴۴۰	مارچ/ اپریل ۱۹۷۹ء	ڈاکٹر یوسف حسین خان	۳۹۲
۴۴۱	جون/ جولائی ۱۹۷۹ء	بشیر احمد ڈار	۳۹۷
۴۴۲	جون ۱۹۷۹ء	مولانا فضل اللہ رحمانی	۴۰۰
۴۴۳	جولائی ۱۹۷۹ء	مولوی محمد الحسنی	۴۰۱
۴۴۴	جولائی ۱۹۷۹ء	محمد اسحٰق جلیس	۴۰۳
۴۴۵	ستمبر ۱۹۷۹ء	مولانا عبدالسلام قدوائی	۴۰۳
۴۴۶	اکتوبر ۱۹۷۹ء	مولانا ابوالاعلیٰ مودودی	۴۰۵
۴۴۷	دسمبر ۱۹۷۹ء	شاہ اسعد الرحمٰن قدسی	۴۰۶
۴۴۸	جون/ جولائی ۱۹۸۰ء	قاضی محمد عدیل عباسی	۴۰۷
۴۴۹	ستمبر ۱۹۸۰ء	شاہ آفاق احمد ردولوی	۴۰۹
۴۵۰	ستمبر ۱۹۸۰ء	مولانا محمد اکبر ندوی	۴۱۰
۴۵۱	نومبر ۱۹۸۰ء	ظفر احمد صدیقی	۴۱۱
۴۵۲	مارچ ۱۹۸۱ء	مولانا امتیاز علی خان عرشی	۴۱۳
۴۵۳	نومبر ۱۹۸۱ء/ فروری ۱۹۸۲ء	آصف علی اصغر علی فیضی	۴۱۵
۴۵۴	جنوری ۱۹۸۲ء	نواب چھتاری	۴۱۷
۴۵۵	فروری ۱۹۸۲ء	محمد ثانی حسنی	۴۱۷
۴۵۶	اپریل ۱۹۸۲ء	سید حسام الدین راشدی	۴۱۷
۴۵۷	اپریل ۱۹۸۲ء	مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی	۴۱۸
۴۵۸	اپریل ۱۹۸۲ء	جوش ملیح آبادی	۴۱۸
۴۵۹	اپریل ۱۹۸۲ء	رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری	۴۱۸
۴۶۰	مئی ۱۹۸۲ء	پروفیسر عبدالمنان بیدل	۴۱۸
۴۶۱	جون ۱۹۸۲ء	مولانا محمد زکریا سہارنپوری	۴۱۹
۴۶۲	اکتوبر ۱۹۸۲ء	شیخ عبداللہ	۴۲۰
۴۶۳	فروری ۱۹۸۳ء	حفیظ جالندھری	۴۲۱
۴۶۴	فروری ۱۹۸۳ء	احسان دانش	۴۲۱
۴۶۵	فروری ۱۹۸۳ء	نشور واحدی	۴۲۲
۴۶۶	مارچ ۱۹۸۳ء	نیاز احمد صدیقی	۴۲۲
۴۶۷	جولائی ۱۹۸۳ء	سکندر علی وجد	۴۲۳
۴۶۸	اگست ۱۹۸۳ء	مولانا قاری محمد طیب	۴۲۴
۴۶۹	نومبر ۱۹۸۳ء	معین الدین حارث	۴۲۵
۴۷۰	فروری/ مارچ ۱۹۸۴ء	سعید انصاری	۴۲۶
۴۷۱	فروری ۱۹۸۴ء	پروفیسر کلیم الدین احمد	۴۲۷
۴۷۲	فروری ۱۹۸۴ء	قاضی عبدالودود	۴۲۹
۴۷۳	جون ۱۹۸۴ء	مولانا مفتی عتیق الرحمٰن	۴۳۰
۴۷۴	نومبر ۱۹۸۴ء	شریمتی اندرا گاندھی	۴۳۱
۴۷۵	نومبر ۱۹۸۴ء	مولانا ابوالجلال ندوی	۴۳۳

۴۷۶	نومبر ۱۹۸۴ء	ڈاکٹر عبد اللطیف	۴۳۴
۴۷۷	نومبر ۱۹۸۴ء	شاہ نصر احمد پھلواروی	۴۳۴
۴۷۸	نومبر ۱۹۸۴ء	ڈاکٹر محمد ایوب قادری	۴۳۵
۴۷۹	دسمبر ۱۹۸۴ء	مولانا عبد الرحمٰن پرواز اصلاحی	۴۴۰
۴۸۰	فروری ۱۹۸۵ء	پروفیسر محمد مجیب	۴۴۳
۴۸۱	جون/ جولائی ۱۹۸۵ء	مولانا سعید احمد اکبر آبادی	۴۴۳
۴۸۲	جون ۱۹۸۵ء	مولانا شاہ امان اللہ پھلواروی	۴۵۱
۴۸۳	نومبر ۱۹۸۵ء	مولوی محمود الحسن	۴۵۳
۴۸۴	جنوری ۱۹۸۶ء	شوکت سلطان	۴۵۳
۴۸۵	فروری ۱۹۸۶ء	امین الدین	۴۵۶
۴۸۶	مارچ ۱۹۸۶ء	مولانا ابوسلمہ شفیع احمد	۴۵۷
۴۸۷	جون ۱۹۸۶ء	ڈاکٹر عبد الحئی عارفی	۴۵۹
۴۸۸	جون ۱۹۸۶ء	انور نعمانی	۴۶۱
۴۸۹	ستمبر ۱۹۸۶ء	محمد طفیل	۴۶۱
۴۹۰	ستمبر ۱۹۸۶ء	قدرت اللہ شہاب	۴۶۲
۴۹۱	ستمبر ۱۹۸۶ء	محمد مسلم	۴۶۲
۴۹۲	ستمبر ۱۹۸۶ء	ڈاکٹر سید عبد اللہ	۴۶۲
۴۹۳	نومبر ۱۹۸۶ء	مولانا محمد عمران خان ندوی الازہری	۴۶۵
۴۹۴	فروری ۱۹۸۷ء	مولانا ابوالحسن علی فراہی اصلاحی	۴۶۶
۴۹۵	اگست ۱۹۸۷ء	اہلیہ سید سلیمان ندوی	۴۶۷
۴۹۶	دسمبر ۱۹۸۷ء/ فروری ۱۹۸۸ء	سید صباح الدین عبد الرحمٰن	۴۶۸
۴۹۷	جنوری ۱۹۸۸ء	اے۔ کے۔ بروہی	۴۷۳
۴۹۸	فروری ۱۹۸۸ء	خان عبد الغفار خان	۴۷۳
۴۹۹	فروری ۱۹۸۸ء	مولانا محمد ہاشم میاں فرنگی محلی	۴۷۴
۵۰۰	فروری ۱۹۸۸ء	مرزا نیاز احمد بیگ	۴۷۴
۵۰۱	جون ۱۹۸۸ء	سید علی نقی نقوی	۴۷۵
۵۰۲	جولائی ۱۹۸۸ء	اختر انیس	۴۷۵
۵۰۳	جولائی ۱۹۸۸ء	مجنوں گورکھپوری	۴۷۵
۵۰۴	ستمبر ۱۹۸۸ء	جنرل ضیاء الحق	۴۷۶
۵۰۵	اکتوبر ۱۹۸۸ء	عبد الرحمٰن خان نشتر	۴۷۸
۵۰۶	دسمبر ۱۹۸۸ء	منشی عبد العزیز انصاری	۴۷۸
۵۰۷	دسمبر ۱۹۸۸ء	منشی اقبال احمد	۴۷۸
۵۰۸	دسمبر ۱۹۸۸ء	مولانا ابوالعرفاں خان ندوی	۴۷۹
۵۰۹	دسمبر ۱۹۸۸ء	پروفیسر سید حسن	۴۸۰
۵۱۰	جنوری ۱۹۸۹ء	سید اطہر حسین (آئی۔ اے۔ ایس۔)	۴۸۱
۵۱۱	مئی ۱۹۸۹ء	مشہود اویس	۴۸۲
۵۱۲	مئی ۱۹۸۹ء	مولانا عبد القدوس ہاشمی ندوی	۴۸۲
۵۱۳	جون ۱۹۸۹ء	آیت اللہ خمینی	۴۸۴
۵۱۴	ستمبر ۱۹۸۹ء	استاد محمد احمد دہمان	۴۸۴
۵۱۵	ستمبر ۱۹۸۹ء	ڈاکٹر احمد عبد الستار الجواری	۴۸۵
۵۱۶	ستمبر ۱۹۸۹ء	ڈاکٹر صبحی المحمصانی	۴۸۶
۵۱۷	نومبر ۱۹۸۹ء	سید محامد علی عباسی	۴۸۶
۵۱۸	جنوری ۱۹۹۰ء	اہلیہ سید ابوالحسن علی ندوی	۴۸۶
۵۱۹	مارچ ۱۹۹۰ء	مولانا مفتی حافظ محمد رضا انصاری فرنگی محلی	۴۸۷
۵۲۰	مارچ ۱۹۹۰ء	مولوی حافظ محمد منصور نعمانی ندوی	۴۸۸
۵۲۱	اپریل ۱۹۹۰ء	پروفیسر مشیر الحق	۴۸۹
۵۲۲	اگست ۱۹۹۰ء	شاہ غلام خالد	۴۹۰
۵۲۳	اکتوبر ۱۹۹۰ء	سراج منیر	۴۹۰
۵۲۴	اکتوبر/ نومبر ۱۹۹۰ء	مولانا حافظ محمد یوسف کوکن مدراسی	۴۹۰
۵۲۵	دسمبر ۱۹۹۰ء	مولانا ابواللیث	۴۹۲
۵۲۶	فروری/ اپریل ۱۹۹۱ء	مولانا قاضی سجاد حسین	۴۹۳
۵۲۷	مارچ ۱۹۹۱ء	مولانا حافظ محمد تقی امینی	۴۹۵
۵۲۸	اپریل/ مئی ۱۹۹۱ء	مولانا سید منت اللہ رحمانی	۴۹۸
۵۲۹	مئی ۱۹۹۱ء	میکش اکبر آبادی	۵۰۰
۵۳۰	مئی ۱۹۹۱ء	مولانا قاضی محمد زین العابدین سجاد میرٹھی	۵۰۰
۵۳۱	مئی ۱۹۹۱ء	مولانا عبد المالک جامعی مدنی	۵۰۰
۵۳۲	جون ۱۹۹۱ء	مسٹر راجیو گاندھی	۵۰۱
۵۳۳	جون ۱۹۹۱ء	مولانا عبد المجید ندوی	۵۰۱
۵۳۴	اگست ۱۹۹۱ء	مولانا محمد یوسف	۵۰۲
۵۳۵	اگست ۱۹۹۱ء	ڈاکٹر سید ابراہیم ندوی	۵۰۳
۵۳۶	اگست ۱۹۹۱ء	مولانا محمد سلمان خاں بھوپالی ندوی	۵۰۳
۵۳۷	ستمبر ۱۹۹۱ء	عبد اللہ کنون	۵۰۳
۵۳۸	نومبر ۱۹۹۱ء	مولانا محمد احمد پرتاب گڑھی	۵۰۵

۵۳۹	دسمبر۱۹۹۱ء	صباح الدین عمر	۵۰۶
۵۴۰	جنوری۱۹۹۲ء	ڈاکٹر عبدالمنعم النمر	۵۰۶
۵۴۱	فروری۱۹۹۲ء	منشی عطاء اللہ	۵۰۸
۵۴۲	اپریل۱۹۹۲ء	مولانا محمد شمیم کیرانوی	۵۰۸
۵۴۳	اپریل۱۹۹۲ء	مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی	۵۰۹
۵۴۴	اپریل/ جون۱۹۹۲ء	کرنل بشیر حسین زیدی	۵۱۰
۵۴۵	جون۱۹۹۲ء	مولوی عبیدالرحمٰن خان شروانی	۵۱۲
۵۴۶	جون۱۹۹۲ء	محمد مجید زبیری	۵۱۴
۵۴۷	ستمبر۱۹۹۲ء	پروفیسر مسعود حسن	۵۱۵
۵۴۸	ستمبر۱۹۹۲ء	الحاج مولوی عین الحق اعظمی	۵۱۹
۵۴۹	نومبر۱۹۹۲ء	پروفیسر ڈاکٹر معظم حسین	۵۱۹
۵۵۰	دسمبر۱۹۹۲ء	حکیم عبدالقوی دریابادی	۵۲۳
۵۵۱	دسمبر۱۹۹۲ء	مولانا حامد الانصاری غازی	۵۲۵
۵۵۲	فروری۱۹۹۳ء	مولوی نورعظیم ندوی	۵۲۶
۵۵۳	مئی۱۹۹۳ء	مفتی شوکت علی فہمی	۵۲۷
۵۵۴	مئی۱۹۹۳ء	گوپال متل	۵۲۷
۵۵۵	مئی/ جون۱۹۹۳ء	مالک رام	۵۲۷
۵۵۶	جولائی۱۹۹۳ء	مولوی عبدالباری	۵۳۳
۵۵۷	اگست۱۹۹۳ء	پروفیسر نورالحسن	۵۳۳
۵۵۸	اگست۱۹۹۳	ڈاکٹر محمد معظم جیراج پوری	۵۳۶
۵۵۹	اکتوبر۱۹۹۳ء	شانتی رنجن بھٹاچاریہ	۵۳۶
۵۶۰	جنوری۱۹۹۴ء	ڈاکٹر حافظ غلام مصطفےٰ	۵۳۶
۵۶۱	جنوری۱۹۹۴ء	مولانا محب اللہ لاری ندوی	۵۳۷
۵۶۲	جنوری۱۹۹۴ء	اسلام احمد	۵۳۷
۵۶۳	جنوری۱۹۹۴ء	مولوی عزیز الرحمٰن	۵۳۸
۵۶۴	فروری۱۹۹۴ء	مولانا ابوالحسن عبیداللہ رحمانی	۵۳۸
۵۶۵	فروری۱۹۹۴ء	ڈاکٹر غلام محمد	۵۳۹
۵۶۶	فروری۱۹۹۴ء	مولانا شاہ عبدالرحیم مجددی	۵۴۱
۵۶۷	مارچ۱۹۹۴ء	حافظ محمد عرفان	۵۴۱
۵۶۸	اپریل۱۹۹۴ء	مولانا کوثر نیازی	۵۴۱
۵۶۹	اپریل۱۹۹۴ء	شاہ ودود احمد	۵۴۲
۵۷۰	جولائی۱۹۹۴ء	میر اکبر علی خان	۵۴۲
۵۷۱	جولائی۱۹۹۴ء	بیگم سلطانہ حیات	۵۴۲
۵۷۲	ستمبر۱۹۹۴ء	مولانا نجم الدین اصلاحی	۵۴۳
۵۷۳	اکتوبر۱۹۹۴	مولانا سید اخلاق حسین دہلوی	۵۴۴
۵۷۴	نومبر۱۹۹۴ء	حاجی عبدالرحمٰن	۵۴۵
۵۷۵	دسمبر۱۹۹۴ء	پروفیسر رشید الظفر	۵۴۵
۵۷۶	جنوری۱۹۹۵ء	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	۵۴۶
۵۷۷	جنوری۱۹۹۵ء	معین احمد علوی کاکوروی	۵۴۷
۵۷۸	فروری۱۹۹۵ء	پروفیسر منظور حسین شور	۵۴۷
۵۷۹	اپریل۱۹۹۵ء	رام لعل نابھوی	۵۵۰
۵۸۰	جولائی۱۹۹۵ء	مولانا انعام الحسن کاندھلوی	۵۵۰
۵۸۱	دسمبر۱۹۹۵ء	مولانا محمد اسحاق سندیلوی ندوی	۵۵۱
۵۸۲	دسمبر۱۹۹۵ء	مولانا پروفیسر محمد اشرف خاں سلیمانی	۵۵۲
۵۸۳	دسمبر۱۹۹۵ء	مولانا سید محمد مرتضیٰ مظاہری	۵۵۲
۵۸۴	جنوری۱۹۹۶ء	ڈاکٹر محمد طاہر	۵۵۳
۵۸۵	فروری۱۹۹۶ء	ڈاکٹر نعیم احمد	۵۵۳
۵۸۶	فروری۱۹۹۶ء	بدرالدین طیب جی	۵۵۳
۵۸۷	فروری۱۹۹۶ء	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی	۵۵۴
۵۸۸	مارچ۱۹۹۶ء	پروفیسر محمد رضوان علوی	۵۵۶
۵۸۹	اپریل۱۹۹۶ء	مولانا عبدالصمد شرف الدین	۵۵۶
۵۹۰	جولائی/ستمبر۱۹۹۶ء	مولانا بدرالدین اصلاحی	۵۵۷
۵۹۱	اگست۱۹۹۶ء	مولانا قاضی اطہر مبارکپوری	۵۶۰
۵۹۲	ستمبر/ دسمبر۱۹۹۶ء	پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی	۵۶۳
۵۹۳	نومبر۱۹۹۶ء	رام لعل	۵۶۹
۵۹۴	نومبر۱۹۹۶ء	ابوریحان	۵۶۹
۵۹۵	دسمبر۱۹۹۶ء	قاضی محمد جلیل عباسی	۵۷۰
۵۹۶	دسمبر۱۹۹۶ء	سید غلام محی الدین	۵۷۰
۵۹۷	جنوری۱۹۹۷ء	امجد علی غزنوی	۵۷۰
۵۹۸	جنوری۱۹۹۷ء	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۵۷۰
۵۹۹	جنوری۱۹۹۷ء	ڈاکٹر وحید اختر	۵۷۱
۶۰۰	مارچ۱۹۹۷ء	شیخ عبدالفتاح ابوغدہ	۵۷۱
۶۰۱	اپریل۱۹۹۷ء	پروفیسر عثمان ادہمی	۵۷۱
۶۰۲	مئی۱۹۹۷ء	محمد فاروق نعمانی	۵۷۱

۶۰۳	جون ۱۹۹۷ء	مولانا محمد منظور نعمانی	۵۷۲
۶۰۴	جولائی ۱۹۹۷ء	مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی	۵۷۴
۶۰۵	جولائی ۱۹۹۷ء	پروفیسر ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری	۵۷۶
۶۰۶	جولائی ۱۹۹۷ء	پنڈت آنند نرائن ملا	۵۷۷
۶۰۷	ستمبر ۱۹۹۷ء	پرنس انجم قدر	۵۷۷
۶۰۸	ستمبر ۱۹۹۷ء	میجر علی حماد عباسی	۵۷۷
۶۰۹	اکتوبر ۱۹۹۷ء	قاری سید صدیق احمد باندوی	۵۷۸
۶۱۰	اکتوبر ۱۹۹۷ء	سید یوسف	۵۷۸
۶۱۱	جنوری ۱۹۹۸ء	مولانا امین احسن اصلاحی	۵۷۹
۶۱۲	جنوری ۱۹۹۸ء	پروفیسر خلیق احمد نظامی	۵۸۴
۶۱۳	فروری ۱۹۹۸ء	مولانا عثمان احمد قاسمی	۵۸۶
۶۱۴	فروری ۱۹۹۸ء	مولوی حافظ محمود خاں بھوپالی	۵۸۸
۶۱۵	مارچ ۱۹۹۸ء	پروفیسر حبیب الحق ندوی	۵۸۸
۶۱۶	مارچ ۱۹۹۸ء	منشی عتیق احمد	۵۸۸
۶۱۷	مارچ ۱۹۹۸ء	ایم۔حبیب خان	۵۸۸
۶۱۸	اپریل ۱۹۹۸ء	پروفیسر مقبول احمد	۵۸۹
۶۱۹	مئی ۱۹۹۸ء	شہاب الدین دسنوی	۵۸۹
۶۲۰	مئی ۱۹۹۸ء	مولانا شاہ عون احمد قادری	۵۹۱
۶۲۱	مئی ۱۹۹۸ء	مولانا ابوبکر اصلاحی	۵۹۲
۶۲۲	مئی ۱۹۹۸ء	مولانا شاہ حسن مثنی ندوی	۵۹۲
۶۲۳	مئی ۱۹۹۸ء	منشی محمد حنیف	۵۹۲
۶۲۴	نومبر ۱۹۹۸ء	مولانا عبدالرحمٰن [امیر شریعت خامس]	۵۹۲
۶۲۵	نومبر ۱۹۹۸ء	مولانا افتخار احمد فریدی	۵۹۳
۶۲۶	نومبر ۱۹۹۸ء	حکیم محمد سعید	۵۹۴
۶۲۷	دسمبر ۱۹۹۸ء	مولانا صدر الدین اصلاحی	۵۹۷
۶۲۸	دسمبر ۱۹۹۸ء	پروفیسر محمد اسلم	۵۹۹
۶۲۹	دسمبر ۱۹۹۸ء	پروفیسر قیام الدین احمد	۶۰۰
۶۳۰	فروری ۱۹۹۹ء	جی۔عبدالرشید	۶۰۱
۶۳۱	مارچ ۱۹۹۹ء	حیات اللہ انصاری	۶۰۲
۶۳۲	جون ۱۹۹۹ء	شیخ عبدالعزیز بن باز	۶۰۳
۶۳۳	جون ۱۹۹۹ء	مولانا شاہ عبدالحلیم جون پوری	۶۰۴
۶۳۴	جون ۱۹۹۹ء	پروفیسر محب الحسن	۶۰۴
۶۳۵	جولائی ۱۹۹۹ء	ڈاکٹر سید عبدالحفیظ سلفی	۶۰۵
۶۳۶	اگست ۱۹۹۹ء	حکیم عبدالحمید	۶۰۶
۶۳۷	اگست ۱۹۹۹ء	شیخ علی طنطاوی	۶۰۹
۶۳۸	اگست ۱۹۹۹ء	ڈاکٹر محمد مصطفےٰ زرقاء	۶۰۹
۶۳۹	اگست ۱۹۹۹ء	خلیل الرب	۶۱۰
۶۴۰	ستمبر ۱۹۹۹ء	شیخ محمد مجذوب	۶۱۰
۶۴۱	ستمبر ۱۹۹۹ء	مولانا عبدالرشید نعمانی	۶۱۰
۶۴۲	ستمبر ۱۹۹۹ء	مولانا قاضی محمد معین اللہ ندوی	۶۱۱
۶۴۳	ستمبر ۱۹۹۹ء	شمس پیرزادہ	۶۱۱
۶۴۴	ستمبر ۱۹۹۹ء	میر مقصود علی خاں	۶۱۲
۶۴۵	دسمبر ۱۹۹۹ء	ڈاکٹر عطا کریم برقؔ	۶۱۲
۶۴۶	دسمبر ۱۹۹۹ء	مولانا عبدالرؤف رحمانی	۶۱۳
۶۴۷	جنوری ۲۰۰۰ء	مولانا حکیم زماں حسینی	۶۱۳
۶۴۸	جنوری ۲۰۰۰ء	مولانا محمد اسحاق سنبھلی	۶۱۴
۶۴۹	جنوری ۲۰۰۰ء	ڈاکٹر حامد اللہ ندوی	۶۱۴
۶۵۰	جنوری ۲۰۰۰ء	مولوی احتشام علی ندوی	۶۱۵
۶۵۱	فروری ۲۰۰۰ء	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی	۶۱۵
۶۵۲	جولائی ۲۰۰۰ء	مولانا محمد ناظم ندوی	۶۲۰
۶۵۳	اگست ۲۰۰۰ء	سید علی سردار جعفری	۶۲۱
۶۵۴	اکتوبر ۲۰۰۰ء	عبدالسلام سلامؔ سندیلوی	۶۲۳
۶۵۵	دسمبر ۲۰۰۰ء	پروفیسر نور الحسن ہاشمی	۶۲۳
۶۵۶	مارچ ۲۰۰۱ء	عزمیؔ خیر آبادی	۶۲۴
۶۵۷	اپریل ۲۰۰۱ء	ریاض الدین احمد	۶۲۴
۶۵۸	اپریل ۲۰۰۱ء	پروفیسر محمد یونس نگرامی ندوی	۶۲۵
۶۵۹	مئی ۲۰۰۱ء	کالی داس گپتا رضاؔ	۶۲۶
۶۶۰	مئی ۲۰۰۱ء	پروفیسر نجم الاسلام	۶۲۶
۶۶۱	مئی ۲۰۰۱ء	علامہ محمد بن صالح العثیمین	۶۲۷
۶۶۲	مئی ۲۰۰۱ء	محمد امین مسعود صدیقی	۶۲۷
۶۶۳	جون ۲۰۰۱ء	ڈاکٹر عبدالرب عرفان	۶۲۸
۶۶۴	اگست ۲۰۰۱ء	اورنگ زیب خاں قتیلؔ شفائی	۶۲۸
۶۶۵	اگست ۲۰۰۱ء	بیگم قدسیہ اعزاز رسول	۶۲۹
۶۶۶	جنوری ۲۰۰۲ء	مولانا مفتی سید عبدالرحیم لاجپوری	۶۲۹

۶۶۷	جنوری۲۰۰۲ء	مولانا سید احمد ہاشمی	۶۳۰
۶۶۸	جنوری۲۰۰۲ء	پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد	۶۳۲
۶۶۹	جنوری۲۰۰۲ء	الحاج عبدالقیوم	۶۳۲
۶۷۰	جنوری۲۰۰۲ء	عبدالمجیب سہالوی	۶۳۳
۶۷۱	جنوری۲۰۰۲ء	ڈاکٹر خورشید احمد فارق	۶۳۳
۶۷۲	اپریل۲۰۰۲ء	ڈاکٹر سلامت اللہ	۶۳۵
۶۷۳	اپریل۲۰۰۲ء	پروفیسر آل احمد سرور	۶۳۵
۶۷۴	مئی/ جون۲۰۰۲ء	ڈاکٹر ضیاءالدین ڈیسائی	۶۴۰
۶۷۵	مئی۲۰۰۲ء	مولانا مجاہد الاسلام قاسمی	۶۴۴
۶۷۶	مئی۲۰۰۲ء	والی آسی	۶۴۶
۶۷۷	جون۲۰۰۲ء	مولانا شہاب الدین ندوی	۶۴۶
۶۷۸	جون۲۰۰۲ء	صہبا لکھنوی	۶۴۸
۶۷۹	جون۲۰۰۲ء	ڈاکٹر ابو محمد سحر	۶۴۹
۶۸۰	جولائی/ اکتوبر۲۰۰۲ء	عبداللطیف اعظمی	۶۵۰
۶۸۱	جولائی۲۰۰۲ء	کیفی اعظمی	۶۵۴
۶۸۲	جولائی۲۰۰۲ء	مولوی محمد مسعود خاں	۶۵۶
۶۸۳	نومبر۲۰۰۲ء	فضل الرحمٰن نعیم صدیقی	۶۵۷
۶۸۴	نومبر۲۰۰۲ء	پروفیسر اکبر رحمانی	۶۵۸
۶۸۵	مارچ۲۰۰۳ء	ڈاکٹر محمد حمید اللہ	۶۵۹
۶۸۶	مارچ۲۰۰۳ء	پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی	۶۶۳
۶۸۷	مارچ۲۰۰۳ء	بیگم حمیدہ سلطان احمد	۶۶۳
۶۸۸	مارچ۲۰۰۳ء	پروفیسر انا مری شمل	۶۶۴
۶۸۹	مارچ۲۰۰۳ء	مولوی مفتی نسیم احمد قاسمی	۶۶۴
۶۹۰	اپریل۲۰۰۳ء	پروفیسر ظہیر احمد صدیقی	۶۶۴
۶۹۱	اگست۲۰۰۳ء	سید ہاشم علی اختر	۶۶۵
۶۹۲	اگست۲۰۰۳ء	ڈاکٹر ابن فرید	۶۶۶
۶۹۳	اگست۲۰۰۳ء	ابوالفیض سحر	۶۶۷
۶۹۴	اکتوبر۲۰۰۳ء	پروفیسر علی محمد خسرو	۶۶۸
۶۹۵	اکتوبر۲۰۰۳ء	ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی	۶۷۰
۶۹۶	دسمبر۲۰۰۳ء	خالد مسعود	۶۷۱
۶۹۷	فروری۲۰۰۴ء	مولانا سید شاہ رضوان اللہ قادری مجیبی	۶۷۳
۶۹۸	جون۲۰۰۴ء	شاہ اقبال احمد ردولوی	۶۷۳
۶۹۹	جون۲۰۰۴ء	مقبول احمد لاری	۶۷۵
۷۰۰	ستمبر۲۰۰۴ء	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	۶۷۶
۷۰۱	نومبر۲۰۰۴ء	ڈاکٹر مقبول احمد	۶۷۹
۷۰۲	نومبر۲۰۰۴ء	مولانا محمد رضوان القاسمی	۶۸۰
۷۰۳	فروری۲۰۰۵ء	سید علی جواد زیدی	۶۸۱
۷۰۴	مارچ۲۰۰۵ء/ مئی۲۰۰۶ء	مشفق خواجہ	۶۸۵
۷۰۵	مارچ۲۰۰۵ء	جسٹس خواجہ محمد یوسف	۶۸۹
۷۰۶	مارچ۲۰۰۵ء	پروفیسر نثار احمد فاروقی	۶۹۱
۷۰۷	مارچ۲۰۰۵ء	پروفیسر عتیق احمد صدیقی	۶۹۳
۷۰۸	اپریل۲۰۰۵ء	معین احسن جذبی	۶۹۴
۷۰۹	اپریل۲۰۰۵ء	چودھری سبط محمد نقوی	۶۹۴
۷۱۰	مئی۲۰۰۵ء	ڈاکٹر شوقی ضیف	۶۹۶
۷۱۱	مئی۲۰۰۵ء	پروفیسر سید عبدالرحیم	۷۰۰
۷۱۲	مئی۲۰۰۵ء	امیر احمد صدیقی	۷۰۱
۷۱۳	جون۲۰۰۵ء	مولانا شاہ ابرار الحق حقی	۷۰۲
۷۱۴	جولائی۲۰۰۵ء	الحاج ابراہیم سلیمان سیٹھ	۷۰۳
۷۱۵	جولائی۲۰۰۵ء	مولانا شاہ شرف عالم ندوی	۷۰۴
۷۱۶	ستمبر۲۰۰۵ء	ملک فہد بن عبدالعزیز	۷۰۴
۷۱۷	ستمبر۲۰۰۵ء	ڈاکٹر رفیق زکریا	۷۰۶
۷۱۸	دسمبر۲۰۰۵ء	پروفیسر عبدالحلیم ندوی	۷۰۸
۷۱۹	دسمبر۲۰۰۵ء	شان الحق حقی	۷۰۹
۷۲۰	جنوری۲۰۰۶ء/ جنوری۲۰۰۷ء	ڈاکٹر غلام مصطفےٰ [خان]	۷۰۹
۷۲۱	جنوری۲۰۰۶ء	ڈاکٹر سید معین الرحمٰن	۷۱۳
۷۲۲	فروری۲۰۰۶ء	عبداللہ عباس ندوی	۷۱۷
۷۲۳	مارچ۲۰۰۶ء	مولانا سید اسعد مدنی	۷۱۸
۷۲۴	اپریل۲۰۰۶ء	رشید حسن خان	۷۲۰
۷۲۵	جون۲۰۰۶ء	مولانا مجیب اللہ ندوی	۷۲۶
۷۲۶	اگست۲۰۰۶ء	مولانا حکیم محمد مختار اصلاحی	۷۲۸
۷۲۷	اگست۲۰۰۶ء	پروفیسر خورشید الاسلام	۷۳۱
۷۲۸	اگست۲۰۰۶ء	مولانا محمد عارف سنبھلی	۷۳۱

۷۲۹	ستمبر ۲۰۰۶ء	احمد ندیم قاسمی	۷۳۲
۷۳۰	اکتوبر ۲۰۰۶ء	پروفیسر عبدالمغنی	۷۳۳
۷۳۱	اکتوبر ۲۰۰۶ء	عثمان غنی	۷۳۴
۷۳۲	نومبر ۲۰۰۶ء	نجیب محفوظ	۷۳۵
۷۳۳	جنوری ۲۰۰۷ء	مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری	۷۳۷
۷۳۴	اپریل ۲۰۰۷ء	ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری	۷۳۸
۷۳۵	اکتوبر ۲۰۰۷ء	مولانا مختار احمد ندوی	۷۳۹
۷۳۶	اکتوبر ۲۰۰۷ء	مولانا عبدالکریم پاریکھ	۷۴۰
۷۳۷	اکتوبر ۲۰۰۷ء	پروفیسر گیان چند جین	۷۴۰
۷۳۸	اکتوبر ۲۰۰۷ء	قرۃ العین حیدر	۷۴۱
۷۳۹	اکتوبر ۲۰۰۷ء	ڈاکٹر سید فرید احمد برکاتی	۷۴۲
۷۴۰	اکتوبر ۲۰۰۷ء	رام چندر گاندھی	۷۴۲
۷۴۱	نومبر ۲۰۰۷ء	شیخ نذیر حسین	۷۴۲
۷۴۲	مارچ ۲۰۰۸ء	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	۷۴۵
۷۴۳	اپریل ۲۰۰۸ء	پروفیسر افغان اللہ خاں	۷۴۷
۷۴۴	جون ۲۰۰۸ء	مولانا انظر شاہ کشمیری	۷۴۸
۷۴۵	جون ۲۰۰۸ء	محتشم عبدالغنی	۷۴۸
۷۴۶	جون ۲۰۰۸ء	ڈاکٹر صابر کلوروی	۷۴۹
۷۴۷	جولائی ۲۰۰۸ء	پروفیسر افضل الدین اقبال	۷۴۹
۷۴۸	جولائی ۲۰۰۸ء	غلام محمد بنات والا	۷۴۹
۷۴۹	جولائی ۲۰۰۸ء	مولانا پروفیسر سید محمد اجتباء ندوی	۷۴۹
۷۵۰	ستمبر ۲۰۰۸ء	ڈاکٹر محمد اسحاق جم خانہ والا	۷۵۰
۷۵۱	اکتوبر ۲۰۰۸ء	صلاح الدین اویسی	۷۵۱
۷۵۲	اکتوبر ۲۰۰۸ء	الحاج منظور علی لکھنوی	۷۵۲
۷۵۳	نومبر ۲۰۰۸ء	پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد	۷۵۳
۷۵۴	جنوری ۲۰۰۹ء	عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی	۷۵۵
۷۵۵	فروری ۲۰۰۹ء	فضا ابن فیضی	۷۵۵
۷۵۶	مئی ۲۰۰۹ء	مولانا عبدالسلام رامپوری	۷۵۶
۷۵۷	مئی ۲۰۰۹ء	پروفیسر قمر رئیس	۷۵۷
۷۵۸	جولائی ۲۰۰۹ء	مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی	۷۵۷
۷۵۹	اگست/ستمبر ۲۰۰۹ء	مولانا حبیب ریحان خان ازہری ندوی	۷۵۹
۷۶۰	اگست ۲۰۰۹ء	شیما رضوی	۷۶۰
۷۶۱	نومبر ۲۰۰۹ء	مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی	۷۶۰
۷۶۲	نومبر ۲۰۰۹ء	حکیم عزیز الرحمٰن مئوی	۷۶۰
۷۶۳	نومبر ۲۰۰۹ء	ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری	۷۶۰
۷۶۴	مئی ۲۰۱۰ء	پروفیسر اسرار احمد	۷۶۱
۷۶۵	جولائی/دسمبر ۲۰۱۰ء	پروفیسر مختار الدین آرزو	۷۶۲
۷۶۶	ستمبر ۲۰۱۰ء	فرزند محمد سمیع صدیقی [شعبۂ مالیات کے امین]	۷۶۳
۷۶۷	دسمبر ۲۰۱۰ء	ڈاکٹر عمر خالدی	۷۶۴
۷۶۸	جنوری ۲۰۱۱ء	مولانا مرغوب الرحمٰن	۷۶۵
۷۶۹	جنوری ۲۰۱۱ء	ڈاکٹر محمود احمد غازی	۷۶۵
۷۷۰	اپریل ۲۰۱۱ء	مولانا مفتی محمد ظفیر الدین	۷۶۵
۷۷۱	اپریل ۲۰۱۱ء	ڈاکٹر احمد لاری	۷۶۶
۷۷۲	مئی ۲۰۱۱ء	ایرج افشار	۷۶۶
۷۷۳	اگست ۲۰۱۱ء	پروفیسر عبدالقوی دسنوی	۷۶۷
۷۷۴	اگست ۲۰۱۱ء	ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی	۷۶۹
۷۷۵	اگست ۲۰۱۱ء	پروفیسر فضل الرحمٰن فریدی	۷۷۰
۷۷۶	اکتوبر ۲۰۱۱ء	ڈاکٹر شانتی سروپ	۷۷۰
۷۷۷	جنوری ۲۰۱۲ء	ڈاکٹر راج بہادر گوڑاس	۷۷۱
۷۷۸	جنوری ۲۰۱۲ء	نواب رحمت اللہ خاں شروانی	۷۷۲
۷۷۹	فروری ۲۰۱۲ء	مظہر امام	۷۷۳
۷۸۰	فروری ۲۰۱۲ء	پروفیسر شہریار	۷۷۳
۷۸۱	فروری ۲۰۱۲ء	پروفیسر مغنی تبسم	۷۷۳
۷۸۲	جون ۲۰۱۲ء	مولانا حکیم محمد عرفان الحسینی	۷۷۳
۷۸۳	جون ۲۰۱۲ء	مولانا امین الدین شجاع الدین	۷۷۴
		اشاریہ	۷۷۵

شبلی نعمانی، علامہ

علامہ شبلی نعمانی تعمدہ اللہ برحمتہ

(اکثر حضرات ہم سے علامہ مرحوم کے حالاتِ زندگی کے طالب ہیں، بہار اسٹوڈنٹس کانفرنس نے علامہ مرحوم پر سب سے بہتر مضمون نگار کے لیے انعام مقرر کیا، سوانح و حالات کے لیے اکثر اشخاص کے خطوط آتے ہیں، مطول لائف تو جب لکھی جائے گی، اس وقت اس مختصر رسالہ پر قناعت کرتے ہیں کہ منتظر احباب کو زحمت انتظار سے کسی قدر نجات مل سکے، اس مضمون سے پنجاب کے ان بعض اخبارات کی تحریروں کی تصیح بھی ہوجائے گی، جو حادثۂ وفات کی تقریب نے مولانا کے مرحوم کے سوانح زندگی کے متعلق انھوں نے لکھی تھیں)

اسلام کا گہرا بادل ایک ہزار سال سے برابر ہندوستان کی اقلیم پر مصروف بارش ہے، کتنی بار بادل ابر نیساں بن کر برسا اور اس عجائب زار ہند کا دامن لعل و گہر سے بھر گیا لیکن ۱۸۵۷ء میں سارے ملک پر ایک خونی بادل نے تراوش کی، جس سے ہر جگہ تو خون برسا، لیکن کہیں کہیں خون کے قطروں کے بجائے سرخ یاقوت کے دانے برسے، جن میں سے ایک کو قدرت نے شبلی کے نام سے موسوم کیا۔

ہندوستان کی سیر حاصل زمین نے علوم وفنون میں جو بالیدگی پیدا کی، اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، تاہم مختلف دروں میں جو کلام و اسرارِ شریعت میں بحرِ العلوم اور شاہ ولی اللہ، ادب و معانی میں قاضی عبدالمقتدر، ملک العلماء دولت آبادی، اور ملا محمود جونپوری، فلسفہ و منطق میں ملا نظام الدین اور ملا محبّ اللہ بہاری، ادب و شاعری میں مسعود سعد سلمان، خسرو اور فیضی، تاریخ وخبر میں ضیا برنی، ابوالفضل اور آزاد بلگرامی کو پیدا کیا، لیکن اس کی آغوش کا آخری فرزند (شبلی) وہ تھا جو ملا محمود بھی تھا اور فیضی بھی، محبّ اللہ بھی اور کم ازکم وہ یگانہ انفراداً ان میں سے شروع کے دو ایک کو چھوڑ کر اکثر کے برابر اور مجموعاً ان میں سے اکثر سے بہتر تھا۔

اسلام نے اپنی تیرہ صدیوں میں ہر آن یہ ثبوت دیا ہے کہ اس کی کیاریاں ہر موسم میں نیا پھول کھلا سکتی ہیں، اور اس کے دنگل سے ہر میدان کے لئے نئے پہلوان پیدا ہوسکتے ہیں، عہد اول سے اس وقت تک ہر قرن کی تاریخ اس دعوے کی بہترین مثال ہے، اس نے عقل ونقل کی پہلی ٹکر کھائی تو ابن عطاء اور علاّف کو پیدا کیا اور پھر ہر دور میں ابن فورک، غزالی، شیخ الاشراق، ابن حزم، ابن رشد، رازی ابن تیمیہ، ابن قیم، قاضی عضد، احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ اور بحرالعلوم اپنی خاک سے پیدا کئے، ناممکن تھا کہ اس قرن جدید میں اس موسم کے مناسب حال کوئی نخل تازہ برآور نہ ہوتا اور اس میدان کے لائق کوئی پہلوان دنگل میں نہ اترتا، انیسویں صدی کا مطلع خورشید اسلام کا مغرب ہے، فضل وکمال کے کتنے آفتاب و ماہتاب تھے جو اس تاریکی میں نگاہوں سے اوجھل ہوگئے، لیکن صدی کا نصف شب ۱۸۵۷ء تھا کہ مطلعِ سحر سے چند نئے ستارے نمودار ہوئے۔

عصرِ انقلاب: دنیائے اسلام اس گردش ایام میں ایک عجیب انقلاب کے خطرناک دور سے گزر رہی تھی، علم وعمل کے قدیم و جدید نظامات باہم متصادم تھے اور یہ عالم تھا کہ دوسری صدی کی ضروریات جو یونان اور ایران کے تصادم سے پیدا ہوئی تھیں، یورپ کے تصادم سے دفعتہً پیدا ہوگئیں، لیکن اس دورِ ماضی میں اسلام کا خزانہ جس قدر زر و جواہر سے مالا مال تھا، اسی قدر اس جنس کا اس دور میں کال تھا، ناچار گوشہ نشین گداگروں کو جو جوش دین سے لبریز تھے، ان مہمات کے لئے کمربستہ ہونا پڑا، جن کا سرانجام صرف منصور ومہدی و مامون کے بس کی بات تھی، ان فقرائے اسلام کا جیب و دامن گو خزانوں سے خالی تھا، لیکن قلب وسینہ دوسرے قسم کے زر و جواہر کا مخزن تھا۔

جدید عقل و فلسفہ وتمدن کا حملہ متواتر دنیائے اسلام کے ہر گوشہ پر تھا، لاجرم صدائے ''وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ'' [الحجر:۹] کے مطابق ہر گوشہ سے علمائے ملت لبیک کو دوڑے، ترکستان، روس، ایران، قسطنطنیہ، عراق، شام، مصر، تونس، الجزائر، مراکش، ہر جگہ مصلحین ومجددین نے ظہور کیا، ہندوستان کی اسلامی آبادی تمام ممالک اسلام کی آبادی سے تعداد میں بڑی بھی تھی، اس لئے ضروری تھا کہ جو بھی یہاں اس کام کو اٹھائے، اس کی شخصیت بڑی اور اس کی عظمت ہمہ گیر ہو، یہی سبب ہے کہ اصلاح و تجدید کی آواز جس سرعت، نظام اور بلند آہنگی کے ساتھ یہاں اٹھی، دوسرے ملکوں میں نہیں اٹھی اور جو فروغ اور تکمیل اس کو یہاں میسر ہوئی دیگر بلاد اسلامیہ کو نصیب نہیں ہوئی۔

ہندوستان کا دورِ اصلاح: ہندوستان کا دورِ اصلاح جن افراد پر مشتمل تھا، ان میں دو قسم کے لوگ تھے، ایک وہ جنہوں نے زمانہ کی ضرورتوں سے قطعاً چشم پوشی کرلی اور حرفِ قدیم کی حفاظت ہی کو ملت کے لئے ذریعہ نجات سمجھا، اور یقیناً ان کا بہت بڑا احسان ہے کہ جو کچھ بزرگوں کے ترکہ میں پایا تھا، اس کو سینوں سے لگائے رکھا اور دشمنوں کے دست بُرد سے محفوظ رکھا، حضرت مولانا قاسم صاحب اور مولانا رشید احمد صاحب اور دوسرے علمائے مقدسین پر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہوں کہ انہوں نے اس کام کو خوبی سے انجام دیا اور ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کے دلوں کو اپنے فیض سے روشن رکھا۔

دوسرا گروہ وہ پیدا ہوا جس نے قدیم کو چھوڑ کر صرف جدید کے حصول پر اپنا سارا زور صرف کیا، اس گروہ کا سرعسکر یقیناً وہی تھا جس کے بوڑھے غمزوں میں کچھ نہ کچھ بات تھی، اور جس کی ریشِ سفید کی درازی سحر کی چھٹکی ہوئی چاندی ا تھی، سرسید، محسن الملک، مولوی سید کرامت علی جونپوری (کلکتہ)، مولوی نذیر احمد، مولانا الطاف حسین حالی اس جماعت کے ارکانِ عظام تھے۔

مولانا شبلی نعمانی:

مولانا شبلی مرحوم اس بزم میں سب سے پیچھے آئے، لیکن سب سے پیچھے نہیں بیٹھے، ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ ان دوگروہوں کے مجمع البحرین تھے، یعنی قدیم علوم سے بہرہ ور تھے اور جدید سے اپنے ہمصروں کی طرح آشنا، پھر قدیم علوم میں بھی اللہ تعالیٰ نے گونا گونی کے ساتھ مختلف صلاحیتیں اور قابلیتیں ان کی ذات میں دویعت رکھی تھیں، اس لئے تماشا گاہِ عالم میں کمال کا جو جوہر انہوں نے دکھایا یقین ہے کہ دنیا زمانہ تک اس کی مثال پیش نہ کرسکے گی۔

شبلی زخیلِ زمزمہ سنجان چشم گرفت — بااین کہ ہیچ گونہ زخیل وحشم نداشت

مولانا کے حریف تلوار کا صرف ایک ہی وار جانتے تھے، یا فقیہ ومحدث یا متکلم و فلسفی تھے، یا فقط انشا پرداز یا زبان آور خطیب، یا سخن فہم وسخن سنج، لیکن یہ یگانہ روزگار مجموعہ ہرعلم وفن تھا، جس رستہ پر قدم رکھا میدان میں سب سے آگے نظر آیا، علوم دینی و مشرقی میں جوتبحر ان کونصیب تھا، اس سے یہ جدید ارکان یکسر خالی تھے اور قدیم علماء جدید مسائل سے بے خبر تھے، تاریخ کا وہ اس بازار میں تنہا جوہری تھا، فلسفہ وکلام کا وہ امام تھا، شاعری کا کہنہ مشق استاد تھا، انشاء پردازی کے پامال کوچہ میں بھی اس کی راہ الگ تھی۔انشاء پردازی (تحریر) وزبان آوری (تقریر) ان دونوں کشوروں میں یکساں صرف اسی کا سکہ رواں تھا، سخن سنجی اس کے طائرِ کمال کے شہپر تھے۔

اس میں دوسری جامعیت یہ تھی کہ وہ صرف دماغ نہ تھا ہاتھ بھی تھا، قومی تحریکوں کے عواقب پر جہاں اس کی نظر پہنچی، حریف اس کے دیکھنے سے قاصر تھے، اس کا دماغ جن دینی وملی کارناموں کا تماشا دیکھتا تھا، اور دکھانا چاہتا تھا، بہت سی آنکھیں اس کے دیکھنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتی تھیں، قومی، تعلیمی، اجتماعی، سیاسی، ادبی، مذہبی غرض عمل کا کوئی گوشہ نہ تھا، جس کی طرف اس کا ہاتھ نہ بڑھا، بااین ہمہ اس کا مخصوص فن صرف تاریخ اور کلام رہا۔

حالاتِ زندگی: مولانا مرحوم ہندوستان کے آشوب ایام اور بحران انقلاب یعنی ۱۸۵۷ء میں، صوبہ متحدہ کے ضلع اعظم گڑھ میں، بندول نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے جس کی نسبت وہ خود فرماتے ہیں۔

فضل بندول اگر تو نشناسی — آدمی نیستی تو نسناسی

اُن کا خاندان اس ضلع میں ممتاز، متمول اور صاحبِ اعزاز خاندان تھا، ان کے پدر بزرگوار اعظم گڑھ کے کامیاب وکیل تھے۔

اس زمانہ میں فارسی زبان شرفاء کی تعلیم کی زبان تھی، مولانا نے تمام فارسی نصاب اس اثناء میں مکمل کیا، پھرعربی تعلیم شروع کی، خاندان کے اور بہت سے اعزہ و احباب شریک تعلیم تھے۔غازی پور میں ایک چشمۂ رحمت ہے، یہ چشمۂ فیض وہاں سے بھی سیراب ہوا ہے، مولانا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی جو اس عہد کے فاضلِ اجل اور مولانا عنایت رسول صاحب چریا کوٹی جو تحقیقات مذہبی میں گویا سرسید کے استاد تھے، کے برادر اصغر تھے، وہ ان دنوں مدرسہ غازی پور کے صدر مدرس تھے، مولانا شبلی نے مولانائے ممدوح سے نصاب عربی کی متوسطات سے انتہا تک تعلیم حاصل کی۔

مولانا فاروق چریا کوٹی، فلسفہ، منطق، ہندسہ، ادب عربی اور ادب فارسی میں خاک ہند کے آخری فرزند تھے، ان کے بعد علماء میں ان تمام فنون کے ایسے جامع شاید ہی اٹھیں، اس ہیچمدان کو بھی فخر رہے گا کہ جس طرح اس نے مولانا شبلی کے دامن تربیت میں پرورش پائی ہے، اسی طرح ندوہ میں مولانا محمد فاروق کے آغوشِ تعلیم میں بھی تین برس تک پلا ہے، اس نسبت سے میرا روحانی باپ، روحانی بھائی بھی تھا۔

مولانا محمد فاروق کو اپنے شاگرد سے اس قدر اُنس اور محبت تھی کہ وہ خود اپنے کو ''بیشۂ دانش کا شیر'' اور شاگرد کو ''بچہ شیر'' کہتے تھے، یعنی استاد نے شاگرد کا سجع کہا تھا ''اَنَا اَسَد وَاَنْتَ شِبْلِیْ'' ۲؎ (یعنی میں شیر ہوں اور میرا شاگرد بچۂ شیر) مولانا کی تعلیم کے آخر زمانہ میں مولانا فاروق صاحب غازی پور چھوڑ کر خود مولانا کے گھر اعظم گڑھ آگئے تھے۔

مولانائے مرحوم نے اس ذات والا صفات کے آغوش میں معقولات کی جس حد تک تعلیم پائی تھی تمام ہندوستان میں اس سے زیادہ ہونا ناممکن تھا۔اس وقت ہندوستان کے گوشوں میں مستقل درسگاہوں کے مالک لکھنؤ میں مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی، دہلی میں مولانا نذیر حسین صاحب محدث، لاہور میں مولانا فیض الحسن سہارنپوری ادیب، رامپور میں مولانا عبدالحق خیرآبادی منطقی، مولانا ارشاد حسین صاحب فقیہ اور سہارنپور میں مولانا احمد علی محدث تھے اور دیوبند کا مجمع العلماء ان سب سے الگ تھا۔

مولانا عبدالحیٔ کمسن تھے، اس زمانہ کے کہن سال ان کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، اور یہی اثر ان کے شاگردوں میں بھی تھا، مولانا نذیر احمد صاحب طریقۂ اہل حدیث کے پابند تھے اور اس عہد کے عام علمائے احناف کی نگاہوں میں یہ طریقہ ضلالت کے ہم پلہ شمار ہوتا تھا، مولانا فاروق صاحب غالی حنفی تھے اور آخر تک رہے اور یہی اثر مولانا پر بھی ایک مدت تک رہا، اس لئے ان دو درسگاہوں کو چھوڑ کر کم وبیش وہ ہرجگہ گئے، دیوبند میں مولانا کے ایک عزیز حبیب (مولوی محمد عمر صاحب) تعلیم پاتے تھے، ان کے بلاوے پر وہاں تشریف لے گئے، چند روز ٹھہرے، شریک تعلیم نہ ہوئے اور واپس آئے۔

مولانا کے رفقائے تعلیم کا بیان ہے کہ اس عہد میں مولوی فاروق کی معقولات دانی کا شور تھا، مولانا شبلی جس درسگاہ میں جاتے تھے ''بچہ شیر'' کو شیر سمجھ کر ہرطرف سے طلبہ مناظرہ ومباحثہ کے لئے ٹوٹ پڑتے تھے اور یہ پہلوان یکہ وتنہا دنگل سے فخر وغرور

کے ساتھ کامیاب باہر آتا تھا، سہارنپور اور لاہور میں (اچھی طرح یاد نہیں) مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی سے کہ اس زمانہ میں وہ بھی برابر کے طالب العلم تھے، جامع مسجد میں ایک منطقی بحث پر مناظرہ ہوا اور ہر فریق اپنے کو فتحیاب سمجھ کر اٹھا۔

اعظم گڑھ سے مولانا رامپور تشریف لے گئے، وہاں مولوی عبدالحق صاحب خیر آبادی کی درسگاہ میں گئے، چند طالب العلم مناظرہ و مباحثہ کے لئے لپٹ پڑے، پھر وہاں نہ گئے، رامپور میں مولوی ارشاد حسین صاحب ایک مشہور عالم دین اور فقیہ تھے، ان کے درس میں جا کر فقہ کی اعلیٰ کتابیں پڑھیں اور جب ان کا ذکر آتا مولانا اپنے استاد کی فقہ دانی و تبحر کی بہت مدح فرماتے تھے رامپور سے ادب کی تکمیل کے لئے لاہور مولوی فیض الحسن صاحب کی خدمت میں پہنچے، مولوی فیض الحسن صاحب اس زمانہ کے اصمعی اور ابوتمام سمجھے جاتے تھے، ہندوستان کے پورے اسلامی دور میں قاضی عبدالمقتدر کے سوا یہی ایک فرد تھا جو عربی شاعری کا صحیح مذاق رکھتا تھا، ان کی شرح حماسہ اور دیگر ادبی تصنیفات اس کی شاہد عدل ہیں اور اب ان کا عربی دیوان بھی چھپ گیا ہے جو اہل زبان کی ٹکر کا ہے۔

لاہور میں مولانا صرف چند مہینے رہے، حماسہ شاید یہاں شروع کی تھی، وقت نہ تھا، تو مولوی فیض الحسن صاحب اورینٹل کالج سے آتے جاتے راستہ میں پڑھاتے تھے۔

لاہور سے مولانا سہارنپور، مولانا احمد علی صاحب کی خدمت میں کہ محدث حنفی تھے، حاضر ہوئے، یہاں علم حدیث کی تحصیل فرمائی، مولانائے مرحوم اپنے تمام اساتذہ میں مولانا احمد علی صاحب کے اخلاق و آداب، سادگی طبع و وضع اور اتباع سلف کے بے حد معترف تھے اور ادب سے ان کو ''ہمارے مولانا'' کہا کرتے تھے۔

عمر ۱۹ برس کی تھی، سال ۱۸۷۶ء تھا، ترمذی شریف زیر درس تھی کہ خاندان کے بعض اعزہ نے بغرض حج سفر حجاز کا ارادہ کیا، جو حوصلہ مند طالب العلم کے لئے یہ بہترین موقع تھا، چنانچہ استاد محدث سے اجازت لے کر سفر حجاز کے لئے روانہ ہوگئے، فریضۂ حج ادا کیا، مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ تشریف لے گئے، ایک عالم وجد تھا جو عاشقِ رسول پر طاری تھا، اس عالم میں ایک قصیدہ اور ایک قطعہ [۳] فارسی زبان میں انشا فرمایا جو سرتاپا شوق اور آرزو ہے۔

مدینہ منورہ میں بہت سے کتب خانے ہیں، اس وقت مولانا پر حنفیت کا رنگ غالب تھا کہ تمام ہندوستان حنفیت اور وہابیت کی ہنگامہ آرائی میں مشغول تھا، چنانچہ وہاں پہنچ کر اسی قسم کی کتابوں کی جستجو فرمائی، فرماتے تھے کہ فنونِ حدیث کا جو سامان نظر آیا کہیں نہ دیکھا، ابن عبدالبر کی کتاب التمہید کو موطائے امام مالک کی شرح نقد ہے لیکن درحقیقت وہ فنون حدیث کا دائرہ معارف ہے، ایک بار میں نے پوچھا تھا، تو فرماتے تھے کہ مدینہ کے کتب خانوں میں دیکھی تھی۔

سفرِ حجاز کے بعد عجیب عجیب واقعات بیان فرمایا کرتے تھے، منجملہ ان کے ایک ہندی درویش کا قصہ تھا، جس کے دونوں پاؤں کانٹوں سے چھلنی ہوگئے تھے، موچنے سے کانٹے نکال رہا تھا کہ مولانا جا کر کھڑے ہوگئے، اشارہ کیا کہ تم بھی نکالو، پھر سوز و گداز کی لے میں یہ شعر پڑھا۔

آبلے روتے ہیں خوں، رنج بڑا ہوتا ہے ۔۔۔ کوئی کانٹا جو کفِ پا سے جدا ہوتا ہے

عربوں کی فیاض طبعی اور شرافت خلق کے بھی بعض عجیب واقعات بیان فرمایا کرتے تھے۔

اس سفر سے واپس آ کر ''ظاہری طلبِ علم'' کا دور ختم کر دیا، لیکن واقعاً اب سے ''حقیقی طلبِ علم'' کا دور شروع ہوتا ہے، مولانا فطری شاعر تھے، اکثر اردو اور فارسی میں اور گاہے گاہے عربی میں شعر موزوں فرماتے تھے، کتب بینی کی ابتدا سے عادت تھی، فرماتے تھے کہ اعظم گڑھ میں رہتا تھا تو بازار میں ایک کتب فروش کی دوکان تھی، وہاں جا کر اردو فارسی کے دیوان دیکھا کرتا تھا اور کبھی کبھی گھر بھی لے آتا تھا۔

اعظم گڑھ کے قیام کے زمانہ میں لکھنؤ اور اطراف کے بعض معززین وہاں مقیم تھے، ان کے شوق سے مشاعرے ہوتے تھے، طرحیں دی جاتی تھیں، غزلیں پڑھی جاتی تھیں، مولانا میر مشاعرہ بنتے تھے، اس زمانہ کی بعض غزلیں مشکل سے مجھے ملی ہیں، اس زمانہ میں پیامِ یار اور اودھ پنچ کا عنفوان شباب تھا، بڑے شوق سے ان کے نمبر پڑھتے تھے اور زبان کے مزے لیتے تھے۔ اودھ پنچ کی بعض طویل نظمیں اب تک یاد تھیں۔

اس وقت تک فارسی زبان ہندوستان کے شرفاء کی علمی زبان تھی، اس عہد میں بلکہ علی گڑھ پہنچنے تک تمام خط و کتابت فارسی میں کرتے تھے اور قلم برداشتہ لکھتے تھے، اس زمانہ کے اکثر فارسی خطوط میرے پاس ہیں۔ [۴]

مشاعروں کے علاوہ ان کا سب سے بڑا شغل اس زمانہ میں غیر مقلدوں کی تردید بلکہ تعذیب تھی، فرماتے تھے کہ ''انسان عیسائی ہوسکتا ہے لیکن غیر مقلد نہیں ہوسکتا''۔ لیکن عجائبِ روزگار دیکھو کہ یہ تعصب کا دریائے جوش، بے تعصبی کے کس نشان تک اتر آیا، اس زمانہ میں غیر مقلدین کی تردید میں اردو، فارسی اور عربی میں کئی رسالے لکھے، بعض خود ان کے نام سے اور بعض دوسروں کے نام سے چھپے ہوئے ملتے ہیں، اسی عہد کا عربی رسالہ ''اسکات المعتدی'' ہے جس کے مؤلف کی نادانستہ داد سفر بیت المقدس میں ایک فاضل نے خود مولانا کے سامنے دی تھی اور جب ان کو معلوم ہوا کہ یہی اس کے مؤلف ہیں تو وہ بہت خوش ہوئے۔

اس عالم میں درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا، مولوی حمید الدین صاحب اسی زمانہ کے فیض یافتہ ہیں، مولانا اس عہد میں بڑے متقشف اور مذہبی جابر تھے، تارکین و غافلین صلوٰۃ کو سخت تنبیہ فرماتے تھے۔

گھر کے لوگوں کو فکر تھی کہ اب یہ دنیا کا کوئی کام کریں، گھر کی زمینداری کا کاروبار ان کے سپرد ہوا، لیکن علم و دانش کا رئیس اس سے عہدہ برآ نہ ہوسکا۔

اکثر فارسی خواں لوگ اس زمانہ میں اردو میں وکالت کا امتحان دے کر وکیل بنتے تھے، خود مولانا کے والد اور نیز استاد مولانا فاروق صاحب اسی قسم کے وکیل تھے۔ ناچار مولانا نے بھی وکالت کا امتحان دیا اور دوسری بار میں کامیابی حاصل کی اور چند مہینے تک اعظم گڑھ اور بستی میں وکالت کی بھی لیکن اس متقشف عالم کے لئے صدق و کذب اور صحت خطا کی تبدیل سخت نفرت انگیز فرض تھا، مولانا ایک مقدمہ کا عجیب و غریب واقعہ فرماتے تھے:

> ''کسی ٹھاکر نے اپنی کمسن لڑکی بیاہ دی تھی، داماد جوان ہوکر سُسر کو پسند نہ آیا، ادھر سے رخصتی کا تقاضا تھا اور ادھر سے شدید انکار تھا، ناچار شوہر نے عدالت میں مقدمہ دائر کردیا، لڑکی کا باپ مولانا کے والد کے پاس مقدمہ لے کر آیا، وکیل نے مولانا سے فرمایا کہ جوابِ دعویٰ تم لکھ دو، مولانا نے قصہ پوچھا تو ساری داستان اس نے کہہ سنائی، ہنس کر فرمایا کہ جب تم خود اقرار کرتے ہو کہ لڑکی اس سے بیاہی جاچکی ہے تو اب کیا ہوسکتا ہے، جاؤ لڑکی کو رخصت کردو، وہ ہنستا ہوا وکیل صاحب کے پاس آیا، وکیل صاحب نے مولانا سے فرمایا کہ ''بس آپ وکیل بن چکے''۔ آخر خود تحریر لکھی اور مقدمہ کی روداد بنائی، مقدمہ لڑا گیا اور جیتا گیا''۔

وکالت چھوڑ کر کچھ دن امانت کے صیغہ میں نوکر ہوئے، رمضان کے زمانہ میں شدید گرمی میں روزے رکھ کر گھوڑے پر سوار گاؤں گاؤں پھرا کرتے تھے۔ نہ افطار کی فکر نہ سحری کا سامان اور اسی طرح پورا مہینہ گزارے گئے، آخر اس کوچہ میں بھی جی نہ لگا کہ ہادی فطرت پکار رہا تھا کہ شبلی تو اس سے بلند تر کام کے لئے پیدا ہوا ہے، ناچار پھر گھر میں بیٹھ کر مطالعۂ درس و تدریس میں مشغول ہوئے اور قصائد و رسائل لکھنے شروع کئے۔

یہ وہ عہد ہے کہ سرسید کے شور سے تمام ہندوستان گونج رہا تھا، مولوی محمد حسین آزاد کی ''سنینِ اسلام'' نئی نئی نکلی تھی، وہ اکثر زیر مطالعہ رہتی تھی، اسلام و عرب کے مفاخر پڑھ پڑھ کے وجد کرتے تھے، یہ پہلی بار تھی کہ ان کے دل نے قوم کا درد محسوس کیا، مولانا کے ایک نوجوان بھائی مہدی مرحوم علی گڑھ میں پڑھتے تھے، ۱۸۸۲ء میں قدرت کی اس زنجیر نے مولانا کو کالج میں کھینچا، بھائی سے ملنے گئے تو پیر میکدہ کو دل دے آئے۔

پیر کہن سال نے جوہر دانش، ناصیۂ شباب پر نمودار پایا، بے اختیار مصر ہوئے کہ آپ ہمارے مدرسہ میں کیوں نہیں رہتے، مولانا نے قبول فرمایا اور فارسی و عربی کے پروفیسر مقرر ہوگئے اور آخر اتنے انقلابات اور گردشوں کے بعد دائرہ تقدیر کا خط مرکز تک پہنچا۔

سید صاحب نے خود اپنی کوٹھی میں رہنے کے لئے کمرہ دیا، مولانا حالی بھی قیام فرماتے تھے، مسٹر آرنلڈ بھی آگئے تھے، شب و روز کچھ عجیب سی صحبت رہتی تھی، قدیم و جدید کی آمیزش اور آویزش کی یہ صورت غیب سے نکل آئی۔ سید صاحب کا کتب خانہ دیکھ کر مولانا فرماتے تھے کہ میں باغ باغ ہوگیا، مصر و یورپ کے تمام جدید و قدیم مطبوعات الماریوں میں بہ ترتیب سجے تھے۔ فرماتے تھے کہ میں کئی کئی گھنٹے الماریوں کے پاس کھڑا رہتا تھا اور کبھی تھک کر انہیں الماریوں کے پاس زمین پر بیٹھ جاتا تھا۔

سنینِ اسلام کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پہلے سے تھا، تاریخ کی ان نئی کتابوں کو دیکھ کر ان کے اشہب شوق کو نئی مہمیز لگی اور تاریخی تصنیف و تحقیق کا ولولہ پیدا ہوا، پہلے چھوٹے چھوٹے تاریخی رسالے اور قومی نظمیں لکھیں، گذشتہ تعلیم اور مثنوی صبح امید وغیرہ اسی فصل کے میوے ہیں، اول سارے بلادِ اسلامیہ کی تاریخ لکھنے کا خیال آیا، پھر اس کو گھٹا کر تاریخ بنی العباس شروع کی، لیکن جس قدر آگے بڑھتے گئے، میدان زیادہ کشادہ، فراخ اور نتیجہ صبر آزما اور دیر طلب نظر آنے لگا، ناچار ''نامورانِ اسلام'' کی منزل پر مسافر نے دم لیا اور المامون شروع ہوکر ختم ہوئی، اس کے بعد رفتہ رفتہ اور کتابیں تصنیف ہوئی، بعض بعض اہم مباحث پر کانفرنس میں رسائل لکھ کر پیش کئے اور قبولِ عام کی سند حاصل کی۔

۱۸۹۲ء میں ''سیرۃ النعمان'' سے قلم نے فراغت پائی تھی اور ''الفاروق'' کا تخیل تھا کہ مصر و شام و روم کا سفر پیش آیا، مسٹر آرنلڈ کی معیت میں قسطنطنیہ روانہ ہوئے، وہاں سے مصر ہوتے ہوئے چھ مہینے کے بعد ہندوستان واپس آئے، جدید اسلامی ہندوستان کا یہ پہلا علمی سفر تھا، جو کسی عالم کی ہمت نے قبول کیا، ان مسافرتوں میں انہوں نے کیا کیا تماشے دیکھے، ان کا خامۂ نقاش خود سفرنامہ میں ان کی رنگین تصویریں دکھا چکا ہے۔

واپس آکر کالج میں وہ قصیدہ پڑھا جس کا مطلع یہ ہے،

قاصدِ خوش خبر امروز نواساز آمد — کز سفر یار سفر کردہ ما باز آمد
از سفر شبلی آزادہ بہ کالج برسید — یا مگر بلبل شیراز بہ شیراز آمد
دوستاں مژدہ کہ آں بلبلِ خوش لہجہ دگر — اندریں تازہ چمن زمزمہ پرداز آمد

سید صاحب اس زمانہ میں کالج کے برائے نام سکریڑی تھے، اصل سید محمود بن گئے تھے، جن کے طرزِ عمل سے ہر شخص نالاں تھا، مولانا نے کئی بار استعفیٰ دیا، مسٹر بک نے نامنظور کیا۔ آخر ۱۸۹۸ء کی مئی میں کالج سے رخصت لی۔ سید صاحب اور مسٹر بک مُصر تھے کہ مولانا یہاں شش ماہ قیام کریں، ابھی وہیں تھے کہ جون ۱۸۹۸ء میں سید صاحب نے انتقال کیا۔ ۱۶ سال کی خدمت کے بعد ۱۸۹۸ء میں کالج کی پروفیسری سے وہ مستعفی ہوکر اپنے وطن اعظم گڑھ چلے آئے۔ ''الفاروق'' زیر ترتیب تھی، مولانا نے ۱۸۸۴ء میں نیشنل اسکول ایک انگریزی کا مدرسہ یہاں قائم کیا تھا، اب واپسی کے

بعد اس کے انتظام وترقی میں بھی مصروف ہوئے۔علی گڑھ میں صحت اچھی نہیں رہی تھی، آب وہوا کی تبدیلی کی غرض سے ۱۸۹۹ء میں کشمیر گئے، لیکن وہاں کی آب وہوا راس نہ آئی، علیل ہوگئے، تاہم ’’الفاروق‘‘ کی تالیف وتحریر جاری تھی، فرماتے تھے کہ ’’الفاروق‘‘ کی آخری سطریں جس دن قلم نے لکھی ہیں سخت بخار تھا، گھنٹوں تک ہوش نہ آیا، اس مرض نے اس قدر طول کھینچا کہ مہینوں تک لکھنا پڑھنا یک قلم متروک ہوگیا اور بمشکل صحت ہوئی، قصیدۂ کشمیریہ میں یہی واقعات منظوم ہوئے ہیں اور اسی مرض سے صحت پر مولانا حالی نے وہ تہنیت لکھی جس کا مطلع یہ ہے،

للہ الحمد پس ازنا خوشی و رنج دراز
شبلی ما بمراد از سر بالیں برخاست

یہیں کے قیام کے زمانہ میں ’’الفاروق‘‘ چھپ کر نکلی، یہاں کچھ ہی روز قیام رہا، کہ ان کے والد کے انتقال کے سبب سے کچھ ایسی خانگی الجھنیں پیدا ہوگئیں کہ وہ وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور سیدھے حیدرآباد کا رخ کیا، وہاں مولوی سید علی بلگرامی نے ان کو اپنا مہمان کیا اور انہی کی تحریک سے حیدرآباد میں علوم وفنون کی نظامت کا عہدہ قبول فرمایا اور پھر یہیں الغزالی، سوانح مولانائے روم، علم الکلام اور الکلام اور موازنہ بہ ترتیب تصنیف ہوئی اور موازنہ کے سوا اور کتابیں یہیں سے چھپ کر شائع ہوئیں۔

ہم نے اب تک ندوۃ العلماء کی داستان نہیں چھیڑی، ندوۃ العلماء کا تخیل مولانا محمد علی صاحب کانپوریؒ اور دیگر ارباب فہم کی تجویز تھی، مولانا اس قسم کے کاموں کے لئے سراپا انتظار تھے، دوسرے ہی اجلاس سے شریک ہوگئے، مصر وقسطنطنیہ کے سفر نے تعلیم ونصاب تعلیم وطریقۂ اصلاح تعلیم کے متعلق بہت سے نئے خیالات پیدا کردیئے تھے، چنانچہ اسی جوش میں دارالعلوم کا خاکہ تیار کیا اور اب بھی اس کو کوئی پڑھے گا تو فوراً کہہ دے گا کہ مصنف قسطنطنیہ کی فضا میں کھڑا ہوکر مسلمانانِ ہندوستان کے لئے راہ بتارہا ہے، مولانا مسلمانوں کی ہر قسم کی اصلاح کو علماء کی اصلاح پر منحصر رکھتے تھے، اور علماء کی اصلاح طریقۂ تعلیم کی اصلاح پر موقوف جانتے تھے، اس بناء پر دارالعلوم اور ندوہ ہی ان کے نزدیک کام کا اصلی طریقہ تھا، مولوی محمد علی صاحب کے استعفاء کے بعد ندوہ میں جب انحطاط شروع ہوا تو خود لکھنؤ چلے آئے اور دارالعلوم کو تقریباً ۱۹۰۴ء میں اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اس کے بعد ندوہ کی جو خدمتیں انہوں نے انجام دیں اور جس حد تک اس کو ترقی دی اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، خیرہ چشموں سے کامیابی کی یہ درخشندگی دیکھی نہ گئی، رخنہ اندازی شروع کی، یہاں تک کہ ۱۹۱۳ء میں ملول ہوکر علیحدہ ہوگئے۔

دنیاوی حیثیت سے مولانا نے جو وقار حاصل کیا وہ بھی کم نہ تھا، ۱۸۹۲ء میں سلطان ترکی نے تمغۂ مجیدی عنایت کیا، ۱۸۹۴ء میں شمس العلماء کا خطاب عطا ہوا، الہ آباد یونیورسٹی کے فیلو مقرر ہوئے، اسی زمانہ میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ممبر ہوئے۔ ۱۹۰۰ء میں امیر عبدالرحمٰن خان والی کابل نے ترجمہ کا محکمہ قائم کیا، اس کے لئے ہندوستان سے مولانا کا انتخاب کیا لیکن مولانا نے جانے سے انکار کیا، تقریباً ۱۹۰۸ء میں اڈنبرا مسلم سوسائٹی کے پریسیڈینٹ ہوئے، ۱۹۱۰ء میں شملہ گورنمنٹ اورینٹل کانفرنس میں مدعو ہوئے، ۱۹۱۲ء میں الہ آباد کی سرکاری ورنیکلر اسکیم کمیٹی میں شریک ہوئے اور گورنمنٹ نے مولانا ہی کی تجویز پر مسئلہ کا فیصلہ کیا، ڈھاکہ یونیورسٹی کے جلسوں میں بلائے گئے، حکام صوبہ اور والیان ریاست اکثر خلوص سے ملتے تھے، گزشتہ موقع تاج پوشی میں ہزمجسٹی نے شرف ملاقات بخشا، بھوپال، رامپور، جزیرہ اور حیدرآباد کے رؤسا مولانا کے قدردان تھے، انہیں کے ہاتھوں حیدرآباد میں مشرقی یونیورسٹی کی پہلی اینٹ رکھی گئی۔

مولانا کے مُرغِ شہرت کی پرواز ہندوستان کی فضا سے نکل کر دوسرے ملکوں تک وسیع ہوچکی تھی، ہندوستان، مصروشام وترکی وجزائر ملایا، بلکہ انگلینڈ سے پیرس اور برلن سے علمی استفتا اور سوالات ہمیشہ آیا کرتے تھے، مسٹر آرنلڈ انگلینڈ سے، موسیو بوا پیرس سے، ڈاکٹر محمود لبیب برلن سے علمی استفادہ کرتے تھے، ۱۸۹۵ء کی اورینٹل کانفرنس میں جو اٹلی میں منعقد ہوئی تھی شرکت کا ارادہ تھا کہ دفعتہً بیمار ہوگئے اور نہ جاسکے، ۱۹۱۳ء میں ترکی کی طرف سے مدینہ یونیورسٹی کے قیام کا جو خیال تھا اس کے واضعین نصاب میں مولانا کا بھی نام تھا۔

ادھر وقفِ اولاد کی مہم اٹھائی اور باحسن وجود اس کو کونسل تک پہنچا کر کامیابی کے ساتھ ختم کیا، اشاعت اسلام کی عظیم الشان اسکیم کئی بار لکھی اور ہر بار قدم آگے بڑھا کر پیچھے ہٹ گئے، ندوہ میں قرآن پاک کا درس جاری کیا۔آخر میں دارالمصنفین کا ارادہ تھا کہ قوم میں اہل کمال پیدا ہوں، سب سے آخری اور اہم تصنیف ’’سیرۃ نبوی‘‘ زیرتالیف ونظر تھی، کچھ اجزاء تیار ہوچکے تھے، کچھ باقی تھے کہ پندرہ روز کی علالت کے بعد ۱۸/ نومبر ۱۹۱۴ء مطابق ۲۸/ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ کو صبح کے وقت وفات پائی، ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے تھے، اور ۵۷ برس کی عمر پائی، ہنگامۂ مشرق (غدر) میں ظہور کیا اور ہنگامۂ مغرب (جنگ یورپ) میں مخفی ہوئے، ’’بدأ الاسلام‘‘ سیرۃ نبوی میں پہلی تصنیف کی اور سیرۃ نبوی پر آخری دم توڑا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔[البقرۃ:۱۵۶] اس جاں کاہ حادثہ پر ہندوستان سے مصر اور مصر سے یورپ تک تمام عالم نے ماتم کیا۔

تصنیفات: بہ ترتیب زمانہ حسب ذیل تصنیفات یادگار چھوڑیں، رسالہ گزشتہ تعلیم، الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ، المامون، رسائل شبلی، سیرۃ النعمان، الفاروق، سفرنامہ، الغزالی، علم الکلام اور الکلام، سوانح مولانائے روم، موازنہ انیس و دبیر، شعرالعجم، مقالات شبلی، مضامین عالمگیر، سیرۃ النبی، مجموعۂ کلام اُردو، یہ تمام تصانیف اردو زبان میں ہیں، عربی

میں اسکات المعتدی، بذالاسلام، الجزیه، النقد علی التمدن الاسلامی اور بعض مضامین ہیں جو مصری رسالوں میں لکھے، فارسی میں دیوان شبلی، دستۂ گل، بوئے گل اور بعض خطوط۔

یہ امر قابل افسوس ہے کہ مولانا کا کوئی سلسلہ تصنیف مکمل نہیں ہوا۔ ناموران اسلام کے سلسلہ میں صرف المامون اور الفاروق مرتب ہوسکی، علم کلام کے سلسلہ میں علم الکلام اور الکلام، الغزالی اور سوانح مولوی روم تصنیف ہوئی۔ شعر العجم کی پانچ جلدوں میں سے چار جلد چھپ سکیں، پانچویں جلد کے اجزاء بحالت مسودہ موجود ہیں، سیرۃ النبی کی ناتمامی کا داغ تو اخیر وقت تک ان کے دل میں رہا، اپنی زندگی میں دوستوں سے فرماتے تھے کہ ''سیرۃ کو تمام ہی کرنا ہے، گو جان دے کر ہی سہی''۔ آخر اسی مقولہ کے مطابق اسی دھن میں اس بزرگ نے جان ہی دی۔ رَحِمَهُ اللهُ رَحْمَةً وَاسِعَةً۔

آہ! کہ بہت کچھ کہنا ہے، لیکن کیا کیا جائے کہ ہمارے سینوں میں جو کچھ وسعت ہے وہ کاغذ کے صفحوں میں نہیں۔

حدیث عشق خوش بوداست و شبلی خوشتر ک کرداست
شنیدن می تواں زیں حرف رنگین داستانے را

(''س''، اگست ۱۹۱۶ء)

---

۱ مولانا شبلی کی مثنوی صبح امید کے بعض اشعار کی طرف تلمیح ہے۔
۲ اس فقرہ کے لطف کو سمجھنے کے لئے تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے، مولانا کا نام شبلی تھا، جو ایک مشہور بزرگ کا نام مشہور ہے مگر حقیقت میں یہ نسبت شبلہ کی طرف ہے جو ان کا وطن تھا، اب ''میرا شہر کا بچہ'' یہ تلمیح ادھر ہی ہے۔ ''س''
۳ یہ دونوں ''کلیات شبلی'' میں موجود ہیں۔
۴ مکاتیب شبلی میں چھپ گئے ہیں۔ ''س''

لطف اللہ، مولانا

فاجعہ علمیہ یعنی
مولانا لطف اللہ صاحب کی وفات

در روزگار عشق تو ما ہم فدا شدیم — افسوس کز قبیلۂ مجنون کسے نماند

قدیم عربی مدارس کے در و دیوار اگرچہ ظاہری شان و شوکت کے لحاظ سے روز بروز بلند ہوتے جاتے ہیں، لیکن جھک کے دیکھتے ہیں تو سنگ بنیاد متزلزل نظر آتا ہے، ہماری قدیم تعلیم و تربیت کی جو یادگاریں، ان مدارس کا اساس تھیں، ایک ایک کرکے مٹ گئیں، ایک مولوی لطف اللہ صاحب مرحوم رہ گئے تھے لیکن ۱۸/ اکتوبر ۱۹۱۶ء کو صرصر فنا نے ہماری علمی انجمن کے اس چراغ کو بھی گل کردیا، اناللہ و انا الیه راجعون۔

مولوی لطف اللہ صاحب مرحوم میں قدیم تعلیم و تربیت کی تمام خصوصیات بکمال وجوہ موجود تھیں، علم اخلاق، اور مذہب قدیم تعلیم و تربیت کا مایہ خمیر تھا، اور انہی محاسن کی بناء پر ہمارے علماء قوم میں عزت، رسوخ اور اثر پیدا کرتے تھے، مولوی لطف اللہ صاحب مرحوم کی ذات میں نہ صرف یہ محاسن جمع ہوگئے تھے، بلکہ وہ ان اوصاف میں عموماً اپنے اقران و اماثل میں ممتاز کیے جاتے تھے۔

اشاعت علم خالصۃً لوجہ اللہ ہمیشہ ہمارے علماء کا تمغۂ امتیاز رہا ہے اور مولوی لطف اللہ صاحب مرحوم نے اپنی عمر کا ایک کافی حصہ اس نیک کام میں صرف کیا، ہندوستان میں آج جس قدر علمی سلسلے قائم ہیں، اور جو علماء آج مسند نشین درس و تدریس ہیں، ان میں اکثر ایسے ہیں جنھوں نے مولوی لطف اللہ صاحب مرحوم کے خرمن فیض کی خوشہ چینی کی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے دولت دنیا سے بھی مولوی صاحب مرحوم کو کافی حصہ عطا فرمایا تھا، وہ ریاست حیدرآباد میں بمشاہرہ ایک ہزار مدتوں افتاء کی خدمت انجام دیتے رہے، لیکن اخیر میں جب آنکھوں سے معذور ہوگئے، تو مستعفی ہوکر اپنے وطن علی گڑھ میں گوشہ نشین ہوگئے اور وہاں سے مرکر اٹھے۔ (''س''، اکتوبر ۱۹۱۶ء)

وقار الملک، مولانا

قافلہ کا آخری مُسافر
نواب وقار الملک مرحوم

علم والے علم کا دریا بہا کر چل دیئے — واعظان قوم سوتوں کو جگا کر چل دیئے
کچھ سخنور تھے کہ سحر اپنا دکھا کر چل دیئے — کچھ مسیحا تھے کہ مردوں کو جلا کر چل دیئے

نواب محسن الملک کی وفات پر ہم نے تدبر و سیاست کا ماتم کیا، مولانا نذیر احمد کے مرنے پر سحر نگاری اور بزم آرائی کا مرثیہ پڑھا، مولانا شبلی کی موت پر ہم نے علم کے فقدان پر نوحہ کیا، لیکن نواب وقار الملک کی رحلت پر ہم قوم کا ماتم کرتے ہیں اور الوالعزمانہ اخلاق کی گم شدگی پر فریاد۔

یہ ہستی گراں مایہ جس نے ہماری دنیا کو ۲۷، جنوری ۱۹۱۷ء میں الوداع کہا، ہمارے کارفرما قافلہ کا آخری مسافر تھا، اس کے بعد وہ دور جو انقلاب ہند کے بعد شروع ہوا تھا ختم ہوگیا، وہ دور جو انگریزی کالجوں کی کائنات نہیں، بلکہ بوریا نشین مدارس کا نتیجہ تھی، گزر گیا، وہ دور جو قدیم تعلیم اور قدیم اخلاق کے دنوں کو پیش کرتا تھا، منقطع ہوگیا، یعنی آئندہ ہماری قسمت کے مالک عربی مدارس کے شملے نہ ہونگے، بلکہ انگریزی درسگاہوں کے ہیٹ ہونگے، اب مشرق، مشرق کی قومیت پر حکومت نہیں کرے گا، بلکہ مغرب، اب لیڈری اور رہبریٔ جمہور کے لئے جوش دل اور اخلاص عمل ضروری نہ ہوگا بلکہ صرف ایک کامیاب عہدہ اور ایک عمدہ سوٹ فیا ویلاہ علی فقید الاسلام ویا خیباه للمسلمین۔

مرحوم کوسب سے پہلے میں نے دارالعلوم ندوہ میں دیکھا، غالباً ۱۹۰۳ء یا ۱۹۰۴ء میں، پست قد، فربہ جسم، چھوٹی گردن، کچی پکی لمبی داڑھی، سرگھٹا ہوا اور سر پر ایک ترکی ٹوپی منڈھی ہوئی، ساتھ ایک ملازم اور اس کے کندھے پر جانماز۔

۱۹۰۶ء میں دارالعلوم کی طرف سے مولانا شبلی مرحوم کے زیر ہدایت طالبعلموں کا ایک وفد بریلی ومرادآباد ورامپور وامروہہ میں مدرسہ کے لئے چندہ کی فراہمی کے لئے گیا تھا، اس وفد میں راقم الحروف بھی تھا، یہ وفد امروہہ میں دارالعلوم کے ایک مدرس مولانا سیدعلی زینبی کے مکان پر ٹھہرا تھا اور من جملہ دوسرے ممتاز اصحاب کے نواب صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہوا، موصوف کی جس چیز نے ہم کو گرویدہ کیا وہ انکی بے مثال خاکساری اور تواضع تھی، چندگم نام و بے نشان طالب علموں کی ایسی قدر ومنزلت فرمائی جو بیان سے باہر ہے، مرحوم کا مکان گلی کے اندر تھا۔ اللہ اکبر! مسلمانوں کا یہ مسلم لیڈر چندبے مایہ طالب علموں کی مشایعت میں گھر سے گلی اور گلی سے سڑک تک چلا آیا اور یکّہ پر ان کوسوار کرکے واپس گیا اور دوسری دفعہ اصرار کرکے اپنے گھر پر مدعو کیا۔

مولانا شبلی مرحوم نے جب ندوہ میں قدم رکھا تو اپنے قدیم احباب کو ندوہ کی مالی اعانت کی طرف متوجہ فرمایا، مرحوم کا جو جواب آیا وہ کچھ اب بھی یاد ہے، ان کو غالباً چھ سو کے قریب حیدرآباد سے پنشن ملتی تھی، نصف علی گڑھ کی نذر، پھر نصف کا سالانہ حساب لکھا تھا، جس میں غریبوں، بیواؤں اور یتیموں کے سلسلۂ امداد کے بعد چند روپے رہ جاتے تھے جو ان کے ذاتی صرف میں کام آتے تھے، آخر میں لکھا تھا کہ آپ فرمائیں تو اسی میں سے کاٹ کر کچھ حاضر کروں۔

مولانا شبلی مرحوم، نواب وقارالملک کے سچے اور پکے کیرکٹر کے ثبوت میں دو واقعے بیان فرماتے تھے، ایک طرف تو اس واقعہ کا کہ وہ کبھی سرسید کی ماتحتی میں ملازم رہے تھے، ان کو سرکار کہتے تھے، حیدرآباد کے وفد میں سرسید کے ساتھ مولانا شبلی بھی گئے تھے، انہوں نے خود اپنا دیکھا ہوا واقعہ بیان کیا کہ ایک مجلس میں سرسید اور سروقارالامراء دونوں تشریف فرما تھے، نواب صاحب ہاتھ جوڑ کر سرکار ایک طرف سروقارالامراء کو کہہ رہے تھے، تو دوسری طرف حسب دستور اسی طرح سرسید کو بھی، حالانکہ وہ حیدرآباد میں اس وقت بہت بڑی شخصیت بن چکے تھے۔

لیکن سرسید نے جب زبردستی سید محمود کو اپنا جانشین بنایا تو نواب صاحب نے نہایت صفائی سے انہیں لکھا کہ اسلام میں دو ہی شخص گزرے ہیں، ایک معاویہ جنھوں نے یزید کو اپنا جانشین بنایا اور ایک آپ جو محمود کو اپنا جانشین بنارہے ہیں، اور اس پر بس نہیں کی بلکہ اس زمانہ میں روزانہ ''پیسہ'' اخبار میں سرسید کے خلاف ایک نہایت پرزور مضمون لکھ کر بھیجا، لیکن اس واقعہ کے چند ہی روز بعد سرسید نے وفات پائی، مرحوم نے تار بھیج کر اس مضمون کو رکوا دیا، غالباً ۱۹۱۰ء تھا، یوپی کے کوئی لیفٹیننٹ گورنر ولایت واپس جارہے تھے، ان کی مشایعت کے لئے معززین اسٹیشن جارہے تھے، مولانا شبلی مرحوم عالمانہ شان سے ایک سبز عبا پہن کر تشریف لے گئے، جب واپس آئے تو فرمایا کہ مجھ کو نواب وقارالملک کو معمولی سادہ کپڑوں میں دیکھ کر بڑی شرم آئی۔ ان چند واقعات سے مرحوم کے پورے کیرکٹر کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

(''س''، فروری ۱۹۱۷ء)

اہلیہ ندوی، سید سلیمان

اہلیہ مرحومہ سید سلیمان ندوی

آخر خدا کی مرضی پوری ہوئی، دو ماہ شدید علالت کے بعد میری رفیقۂ زندگی نے ۲۷ سال کی عمر میں اس عالم کو الوداع کہا، استاد مرحوم کی وفات کے بعد یہ دوسرا سانحہ ہے، جس نے میرے سکون خاطر کو درہم کردیا، اپنے یکسالہ صغیر الحسن بچہ کو چھوڑ کر بڑی بے کسی میں جان دے دی۔ یہ ۱۲/ اپریل ۱۹۱۷ء کا واقعہ ہے، لیکن اب تک حواس بجا نہیں ہوئے۔ میری حیات منزلی کی اس بربادی کے غم میں جن احباب نے تعزیت ناموں کے ذریعہ سے شرکت کی ہے، ان کا ممنون ہوں، لیکن بہتر ہوتا کہ میرے بجائے دعائے خیر سے اس مرحومہ کو یاد کرتے کہ اب میری قلبی تسلی اسی کی روحانی تسلی میں ہے، خدا عفت ووفا کے اس پیکر کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

مرحومہ نے تیرہ سال تک میری زندگی کی رفاقت کی، دس برس سے صحت خراب تھی، اور کبھی کامل صحت اس عرصہ میں اس کے تن زار کو میسر نہ آئی، علاج کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہوا، پچھلے دس برس میں اس انتشار حال اور پراگندگی خاطر کے باوجود مجھ سے جو کچھ قوم وملت کی خدمتیں انجام پاسکیں وہ بجائے خود تعجب انگیز ہیں کہ اس طویل عرصہ میں کبھی میرے دل ودماغ نے فراغ خاطر نہ پایا۔

میں مرحومہ کی زندگی میں غالب مغفور کا یہ شعر پڑھا کرتا تھا:

میں بھی تمہیں بتاؤں کہ مجنوں نے کیا کیا　　فرصت کشاکشِ غم پنہاں سے گر ملے

اس پیکر وفا نے اپنی جان دے کر بھی علم وملت کی خدمت گزاری کے لئے کشاکش غم پنہاں سے فرصت عطا کی، لیکن ایک ایسا کانٹا دل میں چبھ کر رہ گیا جو شاید عمر بھر نہ نکلے۔

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا　　عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوب غم کا حوصلہ　　تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے
گوش محروم پیام و چشم محروم جمال　　ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

مرگ یار
وارداتِ حالیہ

ہم سفر وادیٔ ہستی میں وہ دلبر نہ ہوا | شمع اس راہ میں اس کا رخ انور نہ ہوا
ہجر کا خوف کبھی اور کبھی ہجر کا رنج | چین گا ہے دل مضطر کو میسر نہ ہوا
تیر جو آئے فلک سے ہدف ان کا میں تھا | ظلم کہئے نہ کبھی اس کو جو مجھ پر نہ ہوا
درد اُٹھ اٹھ کر میرے دل میں ٹھہر جاتا ہے | کیوں رگ دل کی جگہ سینہ میں نشتر نہ ہوا
یہ تماشائے جہان خواب ہے میں مانتا ہوں | پر یہ کیوں خواب میرے واسطے شب بھر نہ ہوا
کس سے کیجئے دل شیدا گلۂ تنہائی | مسند آرا مرے پہلو میں جو دلبر نہ ہوا
نازبیجا تو اٹھایا ہے، پہ مرنے والے | میں ترے نازبجا کا کبھی خوگر نہ ہوا
تیرے جانے پہ گماں تھا کہ ہو محشر برپا | تو گیا اور بپا دہر میں محشر نہ ہوا
دل کو کیوں مورد احساس بنایا یا رب | حسرت اس کی ہے کہ یہ دل ہوا پتھر نہ ہوا
حیف اس خون کی قسمت جو مژہ سے ٹپکے | قطرۂ اشک ہوا ، بادۂ احمر نہ ہوا
گر قضایائے جہاں قابلِ تغییر نہیں | کیوں نہ کہئے کہ مرے واسطے داور نہ ہوا
دل میں بیٹھا ہو کوئی اس سے تسلی تو نہیں | پردۂ دل میں جو ہے برسرِ منظر نہ ہوا
قہر آلود نظر میں نگہ لطف بھی تھی | لطف فرما نہ رہا جب وہ ستم گر نہ ہوا

باعثِ رنج ہے اس امید کا پیدا ہونا
یارب اس خرمنِ امید میں اخگر نہ ہوا

غمزدہ
سلیمان
("س"، اپریل ۱۹۱۷ء)

<u>حسین، سید کرامت، جسٹس مولانا</u>

جسٹس مولانا سیّد کرامت حسین

جسٹس سید کرامت حسین کی ناگہانی موت گو عام دنیائے علم کے لئے کچھ کم باعث حسرت نہیں ہے لیکن ہمارے لئے اس سے زیادہ غم افروز ہے۔ مرحوم ہماری مجلس کے نائب صدر تھے اور ہمیشہ اپنے قیمتی مشوروں سے ہماری اعانت کرتے تھے۔ وہ خود بھی علمی مشاغل میں مصرف رہتے تھے، آخر عمر میں "المرآۃ" نام ایک ضخیم کتاب عورتوں کے حقوق و خصائص پر تصنیف فرما رہے تھے۔ ان کی سادگی اخلاص کار، ایثار اور خالص علمی خدمات ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ وہ لکھنؤ کے خاندان اجتہاد سے تھے، انہوں نے عربی کی تکمیل کے بعد انگریزی کی طرف توجہ کی اور لندن جا کر بیرسٹر ہوئے، انکو فلسفہ سے خاص ذوق تھا، جدید فلسفہ کے دقائق کو اردو میں لکھنے کی ابتداء انہیں سے ہوئی، سالمات کی اصطلاح انہیں کی بنائی ہوئی ہے، اردو میں افراد کا سیہ کے نام سے ان کا بڑا اچھا رسالہ ہے، وہ ہندوستان واپس آ کر علی گڑھ کالج میں پہلے قانون کے پروفیسر ہوئے۔ اسی زمانہ میں مولانا شبلی سے ان کی ملاقات اور راہ و رسم ہوئی۔ عربی فلسفہ یعنی عربی فیلالوجی سے ان کو بڑی مناسبت تھی۔ المقدسہ کے نام سے عربی میں ان کا ایک رسالہ نہایت مفید ہے۔ آخر میں الہ آباد ہائیکورٹ میں جج ہوگئے تھے۔ اس سے الگ ہونے کے بعد لکھنؤ میں قیام کیا تھا۔ مسلم گرلز اسکول انہیں کے وقف سے وجود میں آیا۔

اس زمانہ میں دارالمصنفین نیا نیا قائم ہوا تھا ہمارے ارکان خاص میں سے مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی اور مولوی عبدالباری صاحب ندوی، جدید فلسفہ کے عشاق میں تھے اور اس وقت ان کے نزدیک سب سے بڑا کام یہ تھا کہ اردو زبان میں جدید فلسفہ کی اہم کتابوں کو منتقل کیا جائے، اس بناء پر جسٹس سید کرامت حسین صاحب سے اس تجویز کو خاص تعلق تھا اور اسی لئے وہ دارالمصنفین کے نائب صدر منتخب ہوئے اور جب تک جیتے رہے وہ اس راہ میں ہماری رہنمائی کرتے رہے۔

ان سے ملنے کا اتفاق اس وقت ہوا جب وہ ہائی کورٹ کی ججی سے پنشن پا کر لکھنؤ میں مہاراجہ صاحب محمود آباد کے مکان قیصر باغ میں مقیم تھے۔ غالباً دو تین بار ملاقات ہوئی، دراز قد، گداز بدن، خشخاشی داڑھی، سانولا رنگ، پورے متین و سنجیدہ اور بھاری بھرکم۔ ("س"، اپریل ۱۹۱۷ء)

اضافہ: جسٹس سید کرامت حسین مرحوم اپنی آخر عمر میں "عورت" کے متعلق ایک جامع و مبسوط تالیف کی تیاری میں مصروف تھے، چنانچہ جس روز کتاب کے آخری مسودات ختم ہوئے، اسی روز روح نے بھی تن سے مفارقت کی، کتاب کا نام المرأۃ ہے، ضخامت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مسودہ چھوٹی تقطیع پر مع اقتباسات و حوالہ جات کے دو ہزار صفحوں سے زاید پر ختم ہوا ہے، کتاب کی تقسیم دو مختلف حصوں میں ہے، حصہ اول کا نام الحجاب ہے، اس میں تمام تر مذہبی حیثیت سے یہ بتایا گیا ہے کہ پردہ کے کیا معنی ہیں، اور اسلام نے پردہ کی کیا تعریف قرار دی ہے، حصہ دوم میں عقلی و سائنٹفک اصول پر مرد و عورت کے قوائے دماغی و جسمانی میں موازنہ کیا گیا ہے اور دونوں کے حدود عمل کی تعین کی گئی ہے، مصنف مرحوم کے انتقال کے بعد یہ اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ جواہر ریزے ضایع ہو جائیں گے لیکن مقام مسرت یہ ہے کہ کتاب سر راجہ صاحب محمود آباد کے قبضہ میں آ گئی ہے، گو یہ ضرور ہے کہ مسودات غیر مرتب حالت میں ہیں، اور اشاعت سے قبل ان کی کافی تصحیح و نظر ثانی کی ضرورت ہے، بلکہ شاید درمیان سے کچھ اجزاء غائب بھی ہیں، راجہ صاحب موصوف کی علم دوستی سے توقع ہے کہ کتاب کی اشاعت صرف اسی صورت میں پسند فرمائیں گے جو مصنف محترم کے پایۂ علمی کے

شایانِ شان ہو۔ ("س"، جون ۱۹۱۹ء)

فرزند شروانی، حبیب الرحمٰن

فرزند مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی

ماہ گزشتہ میں ہماری مجلس کے دو محترم ارکان بلکہ اساطین کو "وداعِ عزیز" کے دو جانگزا صدمے برداشت کرنے پڑے، مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کو اپنے "محبوب" فرزند کی مفارقت دائمی کا داغ اٹھانا پڑا اور حسام الملک نواب سید علی حسن خان کو اپنے برادر بزگوار نظام الملک نواب سید نورالحسن خان کی دائمی جدائی کا غم سہنا پڑا، یہ دونوں بزرگوار ہماری مجلس کے دست و بازو ہیں، ان کا صدمات سے دو چار ہونا ہمارے لئے لازمۂ غم اور داعیۂ ماتم ہے،

لایحزن اللہ "الحبیب" فانّنی لآخذ من حالاتہ بنصیب

مرنے والوں کے لئے دعائے مغفرت انسان کے غم کا علاج نہیں، لیکن اس کی روحانی تشفی کا باعث ہے، اللھم الحقھما بالرفیق الاعلی۔ ("س"، نومبر ۱۹۱۷ء)

اسمٰعیل میرٹھی، محمد، مولوی

مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی

بقول علامہ مرحوم، مولانا حالی کے بعد کسی نے سننے کے لائق کچھ کہا ہے، تو وہ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب میرٹھی ہیں، افسوس کہ دوسرا حالی بھی اس مہینہ ہماری دنیا سے رخصت ہوگیا، مرحوم کا سہل و رواں کلام ہمارے بچوں کا ابتدائی سبق تھا، وہ اپنی پیرانہ سالی کی مرتعش زبان سے چھوٹے چھوٹے بچوں کو اس پیار سے سمجھاتے تھے کہ وہ نصیحت کی گرانباری کو کھلونا سمجھ کر اٹھا لیتے تھے، افسوس کہ یہ کھلونے بنانے والا بھی اب نہ رہا، سرکاری خدمت سے گوشہ نشین ہوکر وہ ہمہ تن علمی خدمات میں مصروف ہوگئے تھے، تدوین کلام خسرو کے سلسلہ میں قران السعدین کی تقریظ وتحشیہ سے فارغ ہوکر حیات خسرو کی ترتیب میں مصروف تھے، اس کے علاوہ قواعد اردو اور لغات اردو کی تکمیل کا کام شروع ہو رہا تھا، جو افسوس کہ ناتمام رہا، میرٹھ میں ایک مدرسہ بنات المسلمین بھی آپ کے اعمال حسنہ کی یادگار ہے۔ ("س"، نومبر ۱۹۱۷ء)

کلیم، نورالحسن خان، نواب میر

ایک درویش امیر کی وفات

رضی الدولہ نظام الملک نواب میر نورالحسن خان کلیم مرحوم

ولادت۔ ۲۱/رجب ۱۲۷۸ھ ۔ وفات۔ ۸/محرم ۱۳۳۶ھ

ترک اور مغل بادشاہوں کے عہد میں جو سادات عجم وقتاً فوقتاً ہندوستان آتے گئے، ان میں سادات بخاری کا خاندان بھی امتیاز خاص رکھتا ہے۔ سید جلال بخاری پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے بخارا چھوڑ کر سب سے پہلے سرزمین ہند میں قدم رکھا اور شہر ملتان میں اقامت اختیار کی، اس کے بعد چھ پشتیں یہیں رشد و ہدایت اور تزکیہ و تعلیم میں گزریں، بہلول لودی کے عہد میں اس خاندان کے ایک اور بزرگ سید جلال نامی دلّی آئے، بادشاہ نے قنوج میں ان کو جاگیر عطا کی اور اس تقریب سے یہ خاندان دلی سے قنوج کو منتقل ہوگیا۔ قنوج میں پانچ پشتیں گزری تھیں کہ دلّی کا آفتاب اقبال لب بام آگیا، سید لطف علی، سید عزیز اور سید اولاد علی خان انور جنگ، تین پشتیں حیدرآباد کے زمرۂ متوسلین میں داخل ہوکر حیدرآباد منتقل ہوگئیں، سید اولاد علی خان نے یہاں بڑا اقتدار حاصل کیا، ۵ لاکھ کے جاگیردار تھے، انور جنگ کے خطاب سے مخاطب تھے، آخر یہیں ۱۲۱۸ھ میں وفات پاکر مدفون ہوئے۔

انور جنگ کے صاحبزادہ سید اولاد حسن صاحب ایک مستند فاضل اور جید عالم تھے، شاہ عبدالعزیز صاحب اور جناب شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی کے شاگرد اور جناب مولانا سید احمد صاحب بریلوی کے مرید تھے، حیدرآباد کی طلب کے باوجود دائرۂ قناعت سے باہر نکلنا مناسب نہ سمجھا اور تمام عمر علم و دین کی خدمت میں فقیرانہ بسر کردی۔

مولانا سید اولاد حسن صاحب قنوجی کا خلف الرشید وہ بزرگوار ہے، جس کو امیر الملک والا جاہ نواب سید صدیق حسن خان بھوپال کے نام سے ہم جانتے ہیں، جن کے فضل و کمال نے ہندوستان کی آبرو نہ صرف ہند بلکہ مصر و شام و قسطنطنیہ میں رکھ لی، نواب صاحب موصوف کے فرزند اکبر، نواب سید نورالحسن خان مرحوم تھے، جن کا تذکرہ ان صفحوں میں لکھنا ہے، نواب مرحوم کے نانا منشی جمال الدین خان مدارالمہام ریاست بھوپال تھے، ان کی مدارالمہامی کا زمانہ متعدد وجوہ کی بنا پر بھوپال کی تاریخ میں یادگار رہے گا، منشی صاحب موصوف کے دیگر احسانات کے علاوہ ہندوستان کے ارباب علم ان کی اس علم پروری کو بھول نہیں سکے کہ انھوں نے امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے فضل و کمال کے اصلی خط و خال کو انہیں کی دی ہوئی عینک سے پہچانا، یعنی شاہ صاحب کی خیر الکتب (ماسٹر پیس) حجۃ اللہ البالغۃ منشی صاحب موصوف ہی کے دست کرم سے پہلی بار ۱۲۸۶ھ میں مطبوع ہوکر شائع ہوئی۔

حالات: سید نورالحسن خان بتاریخ ۲۱/رجب ۱۲۷۸ھ میں بھوپال میں پیدا ہوئے، ابتدائی کتابیں اور دیگر علوم معقول و منقول کی تعلیم مختلف اساتذہ وقت سے حاصل کی، فن حدیث کا درس خود اپنے والد ماجد سے لیا، وہ طبعاً نہایت ذہین اور طباع تھے، عربی زبان کے فاضل اور ادب فارسی کے ماہر تھے، شعر و سخن سے طبعی ذوق تھا، عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں دادِ سخن دیتے تھے اور کلیم تخلص کرتے تھے، تصوف کی چاشنی ان

کی طبیعت میں غالب تھی، شیخ وقت مولانا فضل رحمان صاحب گنج مراد آبادی سے وہ بیعت تھے اور خلافت کی اجازت بھی ان کو حاصل تھی، یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ ایک شخص جو امارت اور دولت کے آغوش میں پل کر جوان ہوا تھا، کیونکر علم و معرفت کے فیضان کو وہ برقرار رکھ سکا۔

منشی جمال الدین خان مرحوم کے انتقال کے بعد نواب شاہجہان بیگم والیہ بھوپال نے نانا کی جگہ نواسہ کی عنایت کرنی چاہی، لیکن ان کی بیباک اور لاابالی طبیعت نے اس قید کو گوارا نہ کیا، بھوپال کے گزشتہ عہد میں ان کی حیثیت ایک شاہزادہ کی تھی، سرکار بھوپال سے بارہ ہزار کی جاگیر عنایت تھی، بتقریب جشن تاج محل فرزند وحید رضی الدولہ نظام الملک میر محمد نورالحسن خان بہادر کا خطاب عطا فرما کر مہر طلائی عنایت کی، دربار میں ان کی چوتھی کرسی تھی اور اکثر وایسرائے و گورنر جنرل اور ایجنٹ گورنر جنرل کی مشایعت اور مزاج پرسی کی عزت ان کو دی جاتی تھی، شاہ اڈورڈ ہفتم، پرنس آف ویلز کی حیثیت سے جب کلکتہ میں رونق افروز ہوئے تھے تو ۲۴ / دسمبر ۱۸۷۵ء کے دربار دارالحکومت میں یہ بھی بزمرۂ امرائے ریاست شریک تھے ۱۸۷۷ء کے دربار قیصری کے موقع پر بھی درباری امراء کی حیثیت میں فرمانروائے بھوپال کے عقب میں ان کی کرسی تھی۔

نواب شاہجہاں بیگم کی وفات کے بعد بھوپال ترک کر کے لکھنو میں اقامت، اختیار کرلی تھی، یہاں نہایت سادہ، اور خاموش زندگی بسر کرتے تھے، وہ ایک مدت سے مراق کے عارضہ میں مبتلا تھے، چند مہینوں سے ان کی ایک انگلی میں زخم نکل آیا تھا، ضعف بدرجہ غایت ہوگیا تھا، پچھلی دفعہ ستمبر ۱۷ء میں جب میں نے ان کو دیکھا تو ان کی ہئیت اس قدر بدل گئی تھی کہ میں ان کو پہچان نہ سکا، دو قدم چلنے میں ان کے پاؤں کو لغزش ہوتی تھی، آخر ۸/محرم ۱۳۳۶ھ کے شور ماتم میں اس عالم کو الوداع کہا، لیکن جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے، دنیاوی شمع حیات کے بجھ جانے سے شعلۂ حقیقت مردہ نہیں ہوتا۔

جلسہ تھا رات بھر کا کھلا کچھ نہ صبحدم   پروانے کیا ہوئے ہیں، گیا ہے کدھر چراغ
روشن ہے اک چراغ دل عاشقان مدام   ہوتا ہے گل جہاں میں، وقت سحر چراغ

نواب مرحوم صورۃً نہایت وجیہ، خوش اندام، بالا قامت، سرخ رنگ، آفتابی چہرہ اور کشادہ چشم تھے، اخلاقاً نہایت سادہ، خاموش، منکسر المزاج، درویش دل اور فیاض طبع تھے، طمطراق اور نمائش ان کی طبیعت میں نہ تھی، تصوف کا مذاق ہر علم و فن پر غالب آ گیا تھا، والد مرحوم کی وراثت میں ان کو جو کتب خانہ ملا، کتب تصوف کے علاوہ اس کی تمام تر نادر کتابیں جس نے مانگیں اس کے حوالہ کردیں، بداحتیاطی کے بعد جو کچھ بچ رہیں وہ ندوہ کے حصہ میں آئیں۔

تصنیفات: اپنے والد مرحوم کی طرح وہ بھی کثیر التصنیفات، عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ان کی تصنیفات موجود ہیں، آخر میں تصوف کا رنگ تصنیفات میں بھی غالب آ گیا تھا، تذکرۂ طور کلیم فارسی میں شعراء کا تذکرہ اچھا لکھا ہے، صرف تصوف میں ان کے ۶۰ رسالے ہیں، جن میں سے اکثر چھپ چکے ہیں۔

اشعار فی البدیہہ نظم کرتے تھے، کلام برجستہ ہوتا تھا، چونکہ طبیعت لاأبالی اور بے پرواہ تھی کچھ کہا محفوظ نہ رکھا، ان کے ایک عزیز نے ان کے اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ ''عالم خیال'' اور ''واردات دل'' کے نام سے جو ان کے پاس محفوظ رہ گیا تھا، زبردستی شائع کردیا ہے، اس مجموعہ میں اکثر غزلیں بڑے بڑے اساتذہ کی طرحون پر لکھی ہیں اور نہایت عمدگی سے کامیابی حاصل کی ہے، ایک مشہور طرح ہے، نظر آج اور ادھر آج، اس پر داغ و امیر کی غزلیں ہیں، نواب مرحوم اس طرح میں کہتے ہیں اور صرف ایک قافیہ نظر کی پابندی کے ساتھ،

بیخود ہوں کچھ ایسا نہیں اپنی خبر آج   بیڈھب کسی بدمست نے پھینکی ہے نظر آج
منظور لبھانا ہے، ستم کا ہے بہانہ   کچھ صلح کا پہلو ہے جو لڑتی ہے نظر آج
بسمل ہے ادھر شیخ ادھر رند قدح خوار   بے پر کی اڑاتا ہے ترا تیر نظر آج

اس شعر کو پڑھیئے:

اے جذبۂ دل کوئی تو آتا ہے وگرنہ   کیوں جانب در جاتی ہے پھر پھر کے نظر آج

یہ دو شعر کس قدر پر کیف ہیں،

دل میں بھی روشنی اسی کے جمال کی   ممنون جلوہ، دیدۂ بیدار ہی نہیں
تعبیر کے ہزار طریقے ہیں عشق میں   ظالم سے یاں مراد ستمگار ہی نہیں

مرید ہوتے ہیں سب رند و پارسا اُسکے   بھری ہوئی شراب طہور آنکھوں میں

دیوانگی بھی اپنی ہے تجویز عقل سے   دانائیوں سے پھنستے ہیں، نادانیوں میں ہم
جا اے خیال غیر کہ فرصت یہاں نہیں   ہیں جلوہ نگاہ کی مہمانیوں میں ہم

یہ پوری غزل مرصع ہے، ردیف و قافیہ کو کتنا اچھا نباہا ہے،

حواس و ہوش دیتے ہیں جواب آہستہ آہستہ   چلا آتا ہے وہ مست شراب آہستہ آہستہ
ہوئے نشہ میں آخر بے حجاب آہستہ آہستہ   کہاں تک لے گیا دور شراب آہستہ آہستہ
غرض کیا تھی ترے جلوہ کو میرے دیدہ و دل سے   لگالاتے ہیں یہ خانہ خراب آہستہ آہستہ
نہ پوچھو باز پرس عاشقان میدان محشر میں   سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ
پسینا بھی جو مدہوشی میں آیا تو یہی سمجھے   چھڑکتا ہے وہی گویا گلاب آہستہ آہستہ
ہمارا جذبۂ دل جب اسے بے تاب لاتا ہے   شکوہ حسن کہتا ہے، جناب آہستہ آہستہ

ایک دو فارسی شعر بھی مرحوم کے سن لینے چاہئیں کہ یہی ان کی زندگی کی یادگاریں ہیں،

حسن بتاں ہو شر بامی کشد مرا　　بے اختیار سوے خدامی کشد مرا
نیرنگ دلربائی اور انگہ کیند　　گا ہے نباز ، گہ بادامی کشد مرا
وہ خانقاہ دمیکدہ بریک طریقہ ام　　اُو بسکہ سوے خود ہمہ جامی کشد مرا

نگار من بنگا ہے تو ان ادا کر دن　　ہزار نکتہ کہ آمد بگفتگو محتاج
بشوق روے تو صد گل شنیدہ ام آنچمن　　بذوق چشم تو گشتم بصد سبو محتاج

زننگ و نام گزشتم بشوق محل تو　　کہ بارقیب ندیم بپاسبان گستاخ
فغان جوش بیانی کہ دراو بگہ دوست　　ہمہ خموش نشستند ومن ہماں گستاخ

گرفتہ آہم ازینجا بخاک افتادن　　ادب زسایہ دیوار یارمی خیزد
سرور نشہ صدساغرِ شراب طہور　　زگردشِ نگہ چشم یارمی خیزد

اے در ہواے نگہت زلف دوتاے تو　　آوارہ بوے مشک زتاتا آمدہ
اے ترجمان جنبش لبہاے لعل تو　　بانگ رباب و زمزمۂ تار آمدہ
ای دل خنک مباش کہ اندر جہانِ عشق　　سوزوگداز ، گرمیٔ بازار آمدہ

رباعی ہے:

ہمہ رابستۂ گیسوے پریشان داری　　غمزۂ خاص بہرگبرو مسلمان داری
مثلے ہست کر الجنس الی الجنس یمیل　　بہردل بردنِ ماصورت انسان داری

رحمہ اللہ تعالیٰ و تعمذہ

(نومبر ۱۹۱۷ء)

دہلوی، سید احمد، مولوی

مولوی سید احمد دہلوی

مولوی سید احمد صاحب دہلوی، مولف فرہنگ آصفیہ نے جو ہماری زبان کے تنہا لغت نویس تھے، ۱۰؍مئی ۱۹۱۸ء کو انتقال کیا۔ یہ سن کر افسوس ہوا کہ مرحوم کے جنازہ میں بیس پچیس آدمی سے زیادہ نہ تھے۔　　(''س''، مئی ۱۹۱۸ء)

وارثی عظیم آبادی، عبدالغنی، مولوی

مولوی عبدالغنی صاحب وارثی عظیم آبادی

اس مہینہ ہماری قوم کے ایک اور فاضل نے داغِ مفارقت دیا، یعنی جناب مولوی عبدالغنی صاحب وارثی عظیم آبادی نے وہ مضافات بہار میں سے استھاداں نام ایک مردم خیز قصبہ میں پیدا ہوئے تھے، عربی کے فاضل انگریزی کے عالم تھے، عربی کی تعلیم آرہ کے مدرسہ میں پائی تھی۔ اس وقت انگریزی کا نیانیا دور تھا، انہوں نے عربی کتابیں ختم کر کے اس وقت علی گڑھ کے مدرستہ العلوم میں انگریزی پڑھی، جب کہ وہ ایک اسکول کا جھوپڑا تھا، انگریزی تعلیم کے بعد انہوں نے بانکی پور میں اخبار نویسی کی زندگی اختیار کی، پھر حیدرآباد گئے، اور مترجمی کے عہدے پر ممتاز ہوئے اور آخر رفتہ رفتہ اسسٹنٹ جنرل سرکار حیدرآباد ہوئے۔ حیدرآباد میں اس بزم کے ممبر تھے جس کے صدر نشین علامہ شبلی، مولوی عبدالحلیم شرر اور مولوی عزیز مرزا مرحوم تھے، چند مہینہ ہوئے کہ پنشن پا کر خانہ نشین ہوئے تھے کہ دفعتہً ۱۰، جون ۱۹۱۸ء کی شب کو درد سینہ سے وفات ہوئی۔

مرحوم کو اخلاق وتصوف سے فطری ذوق تھا، اسی لئے ان کی تصنیفات زیادہ تر اسی موضوع پر ہیں، بوذاسف و بلوہر جو اصل میں ایک ہندی قصہ اور بودھ کی زندگی اور تعلیم کا خلاصہ ہے۔ مسلمانوں کے عہد عروج میں اس کا عربی میں ترجمہ ہوا تھا، پھر کلیلہ ومنہہ کی طرح وہ عربی سے دنیا کی اکثر زبانوں میں منتقل ہوا۔ مولوی صاحب مرحوم عربی سے اردو کا نہایت عمدہ ترجمہ کر کے ہندوستان کی کھوئی ہوئی دولت کو پھر ہندوستان واپس لائے، یہ قصہ اس قدر پر اثر اور ہندی تمثیلات سے اس قدر مملو ہے کہ شبہ ہوتا ہے کہ کیا موجودہ انجیل اسی سے ماخوذ ہے، عربی میں اخلاق کی ایک اور چھوٹی سی کتاب ہندوشاہ کی ''الکلم الروحانیہ فی الحکم الیونانیہ'' ہے، مرحوم نے اس کو بھی اپنی زبان میں منتقل کیا۔ اولیاء اللہ کے حالات میں امام شعرانی کی ایک مستند ضخیم کتاب عربی میں ہے، اس کو بھی نعمتِ عظمیٰ کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا، عربی کی الف لیلہ اور ابن شداد کی سیرۃ صلاح الدین کا ترجمہ بھی انہوں نے بعض امرائے دکن کی فرمائش سے کیا تھا۔ لیکن شائع نہیں ہوا۔ آج کل رسالہ الناظر میں (شاید لین پول کی) انگریزی تاریخ اسپین کا نہایت صحیح ترجمہ عربی ناموں کی صحت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ پچھلی بار جب مولوی صاحب سے وطن میں ملنے کا اتفاق ہوا تو فرماتے تھے کہ اب اس فرصت میں امام شعرانی کی لائف پوری کروں گا، افسوس کہ خود ان کی لائف پوری ہوگئی۔

(''س''، جون ۱۹۱۸ء)

خان بہادر، محمد اسحاق، نواب حاجی

نواب حاجی محمد اسحاق خان بہادر

(مولانا عبدالسلام ندوی)

نہایت افسوس ہے کہ علی گڑھ کالج کے آنریری سیکریٹری نواب حاجی محمد اسحاق خان بہادر نے پچھلے مہینے دل کی حرکت بند ہوجانے سے دفعتہً انتقال کیا، مرحوم مختلف

خوبیوں کے بزرگ تھے اس لئے قوم میں مختلف حیثیتوں سے ان کا ماتم کیا جارہا ہے، ہم بحیثیت ایک علم دوست بزرگ کے ان کی موت پر آنسو بہاتے ہیں۔ (نومبر ۱۹۱۸ء)

بجنوری، عبدالرحمٰن، ڈاکٹر

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری

(مولانا عبدالسلام ندوی)

۷/ نومبر ۱۹۱۸ء کو علی گڑھ کالج کے ایک نوجوان فرزند کا داغ مفارقت بھی ہمیں اٹھانا پڑا یعنی ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے بھوپال میں انتقال کیا، مرحوم نہایت علم دوست شخص تھے حال ہی میں جب ہم بھوپال گئے تھے ان سے ملاقات ہوئی تھی، اور انھوں نے شعرالہند کے متعلق ہمیں مفید مشورے دیئے تھے۔ (نومبر ۱۹۱۸ء)

غازیپوری، عبداللہ، مولانا حافظ

مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازیپوری

جناب مولانا عبداللہ صاحب غازی پوری کا واقعہ وفات علماء کے طبقہ میں خاص حیثیت سے اثر انگیز ہے، مولانائے مرحوم نے گو طبعی عمر پائی لیکن اس خیال سے کہ وہ اس عہد میں اگلی صحبتوں کے تنہا یادگار تھے۔ ہم ان کے لئے اس سے دراز عمر کے متوقع تھے، مولانا اتباع سنت، طہارت تقویٰ، زہد و ورع، تبحر علم، وسعتِ نظر اور کتاب وسنت کی تفسیر وتعبیر میں یگانۂ عہد تھے، اپنی عمر کا بڑا حصہ انہوں نے علم دینیہ خصوصاً کتاب مجید اور حدیث شریف کے درس وتدریس میں گزارا اور سینکڑوں طلبہ انکے فیض تربیت سے علماء بن کر نکلے، ابتداً چشمۂ رحمت غازیپور میں، پھر مدرسہ احمدیہ آرہ میں اپنا مسندِ درس بچھایا، آخر عمر میں دلّی کے دارالحدیث میں قیام فرمایا، لیکن خانگی حوادث کے باعث پریشان حال رہے، اب افسوس کہ یہ شمع نور و ہدایت ۲۱/ صفر ۱۳۳۷ھ مطابق ۲۶/ نومبر ۱۹۱۸ء کو ہمیشہ کے لئے بجھ گئی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

مجھے لکھنؤ میں مولانا عبدالحئی صاحب ناظم ندوہ کی قیام گاہ پر مولانا سے ملاقات کی سعادت ایک دو دفعہ حاصل ہوئی دُبلے، پتلے، نحیف، داڑھی کے بال خفیف، سادی وضع، صورت سے متواضع اور حلیم معلوم ہوتے تھے۔

مرحوم کا اصلی وطن گو مؤ ضلع اعظم گڑھ تھا، مگر قیام بیشتر غازی پور میں رہا، اس لئے غازیپوری کے نام سے شہرت پائی، ابتدائی تعلیم چشمۂ رحمت غازی پور میں ہوئی، یہاں مولوی رحمت اللہ صاحب غازی پوری، اور مولوی فاروق صاحب چریا کوٹی سے پڑھا، پھر جونپور جاکر مدرسۂ امام بخش میں مفتی محمد یوسف صاحب فرنگی محلی سے درسیات پڑھیں اور آخر میں حدیث کی کتابیں مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی سے پڑھیں اور مسلک میں انہیں کی تعلیم کا اثر ان پر غالب ہوا۔ ("س"، نومبر ۱۹۱۸ء)

علی، ولایت، شیخ

شیخ ولایت علی

(سجاد انصاری)

شیخ ولایت علی مرحوم بی۔اے، ال ال، بی ہمارے ان نوجوانوں میں تھے جن سے قوم کو اپنی جوان بختی کی امید تھی، تعلیم جدید کی اعلیٰ لیاقت کے ساتھ ان کا مشرقی اخلاق و معاشرت عجیب و دلکش تھا ان کی شیریں گفتاری، جس میں سادگی اور ظرافت کا نمک ملا ہوتا تھا، ان کے ہم بزم دوستوں کے لئے عجیب نعمت تھی اور ان کی پر بہار انشا پردازی جس سے کامریڈ اور نیوایرا کے صفحات گل ریز رہتے تھے ہمیشہ کے لئے خزاں رسیدہ ہوگئی، وہ ان لوگوں میں تھے جو حوادث زمانہ اور سختی ہائے ایام کا خندہ جبینی اور ہنسی خوشی کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں، ان کی آزاد روی اور حریت فکری خطرہ کی ہر قید و بند سے بے پروا تھی اور ماہوار وسیع آمدنی کے مالک تھے لیکن ان کے کام دوہن اور جان و تن کے لئے وہ بیگانہ چیز تھی، وہ حقیقت میں مجالس قومی فقرائے وطن اور احباب واعزہ کا حق تھی، غفرله الله و رحمه، جناب سجاد انصاری کے ہم ممنون ہیں کہ ان کی نظم نے ہمارے ماتم کا فرض ادا کردیا۔ ("س")

اے پیکر انبساطِ ہستی!	تو حسن تبسم جہاں تھا
اک صبح امید کی جھلک تھی	اک حرف پیام آسمان تھا
سیماب نشاط تھا سراپا	دیوانۂ عیش کامران تھا
تھیں دل میں بہار کی فضائیں	گو سامنے منظر خزاں تھا
ہر بات میں بذلہ سنجیوں سے	اک سحرِ تجلّی بیان تھا
تیرے اندازِ گفتگو میں	اک محشر حسن داستان تھا
تحریر کی دلفریبیوں میں	افسونِ بہار بوستان تھا
اللہ رے مذاق نکتہ سنجی	گویا شاعر کا راز دان تھا
اک انجمن صفات تھا دل	حسن فطرت کی چیستان تھا
حریت صدق آشنا کا	سیمائے غیور پر نشان تھا
کیونکر کرتا تو جبہہ سائی	بیگانۂ رسم آستان تھا
خوداری بے نیاز میں بھی	اک عالم بیخودی نہاں تھا
اخلاص کی خاکسار یوں میں	افسانۂ دورِ پاستان تھا
ایثار تھا غمگساریاں تھیں	ہر دل کے سکوت کی زبان تھا
تیرا مرنا تھا اک قیامت	ہر ایک ستمکش فغان تھا

اللہ سے کس طرح گلہ ہو یہ کیا اندازِ امتحان تھا
یہ غمکدہ فضائے گیتی رہنے کے لئے ترے کہاں تھا
فردوس خلوص کا فرشتہ اس فتنہ سرا مین مہمان تھا
اب خلد میں نازشِ چمن ہے
سرمایۂ حسن انجمن ہے

(فروری ۱۹۱۹ء)

کروکس، ولیم، سر

سر ولیم کروکس

ماہ گذشتہ میں علمی دنیا کے لیے سب سے اہم حادثہ یہ ہوا کہ کیمسٹری کے استاد اعظم سر ولیم کروکس نے وفات پائی، موصوف کا شمار اس وقت دنیا کے ممتاز ترین علمائے سائنس میں تھا، اور ممالک برطانیہ میں تو یقیناً ان سے بڑے درجہ کا کوئی شخص اس وقت نہ تھا، کیمسٹری میں ہیلیم کا عنصر انہیں نے دریافت کیا اس کے علاوہ ان کے متعدد اکتشافات تھے، جدید اہل سائنس کے گروہ میں شاید وہ پہلے شخص تھے جو عالم ''روحانیات'' کے وجود کے قائل ہوئے۔ (''مولوی عبدالماجد''، جون ۱۹۱۹ء)

کارس، پال، ڈاکٹر

ڈاکٹر پال کارس

ان کے چند ہی روز بعد یورپ کے ایک اور نامور فاضل ڈاکٹر پال کارس نے بھی انتقال کیا، ڈاکٹر موصوف کا مولد جرمنی تھا، لیکن مسکن امریکا تھا، وہ مشرقی فلسفہ و مذاہب کے عالم تھے، اور ہندو فلسفہ و مذہب سے انہیں خاص شغف تھا، چنانچہ فلسفہ گوتم بدھ وغیرہ پر ان کی متعدد تصنیفات ہیں، امریکا کا مشہور فلسفیانہ رسالہ مونسٹ انہیں کی اڈیٹری میں نکلتا تھا۔ (''مولوی عبدالماجد''، جون ۱۹۱۹ء)

سنہا، مسز

مسز سنہا

مسٹر سنہا، اڈیٹر ہندوستان ریویو (الہ آباد) کی زوجہ محترمہ مسز سنہا، جنھوں نے حال ہی میں وفات پائی ہے، اپنی وفات سے چند روز پیشتر وصیت نامہ تحریر کرگئی تھیں، جس کی رو سے ایک ایک لاکھ روپیہ لاہور، الہ آباد اور پٹنہ کی یونیورسٹیوں کو پہنچنا ہے، لاہور اور الہ آباد کی یونیورسٹیاں اس سرمایہ سے ایک ایک پروفیسر شپ قائم کریں گی اور پٹنہ یونیورسٹی میں اس سے ایک کتب خانہ و دار المطالعہ قائم ہوگا۔ (ستمبر ۱۹۱۹ء)

ہیکل، پروفیسر

پروفیسر ہیکل

ماہ اگست میں علمی دنیا کا سب سے بڑا حادثہ پروفیسر ہیکل کی وفات ہوا، پروفیسر موصوف ڈارون و ہکسلی کا ہمعصر، اور بہ لحاظ شہرت و وقعت ان کا ہمسر تھا۔ وفات کے وقت اس کی عمر ۸۵ سال سے متجاوز تھی، ہیکل کا وطن جرمنی تھا، لیکن اس کی عظمت تمام دنیا میں مسلّم تھی اور سائنس کی دنیا میں کوئی شخص اگر اس وقت استاذ الاساتذہ کی حیثیت رکھتا تھا، تو ہیکل تھا، اس کا اصلی مضمون بیالوجی (علم الحیات) تھا، جس میں، اسے متعدد اکتشافات و مجتہدانہ نظریات کا شرف حاصل ہے، لیکن اس کے علاوہ فلسفہ وغیرہ میں بھی اس کی تصانیف موجود ہیں۔ اس کی مشہور کتاب اردو میں بھی ''معمائے کائنات'' کے عنوان سے زیر ترجمہ ہے۔ (''س''، اکتوبر ۱۹۱۹ء)

مرسیر، ڈاکٹر

ڈاکٹر مرسیر

ڈاکٹر مرسیر اس وقت انگلستان میں امراض عصبی و دماغی کے نہایت ممتاز ماہر تھے، جنون و متعلقات جنون پر ان کی متعدد تصانیف تھیں، نفسیات پر بھی وہ بعض اہم تصانیف کے مصنف تھے ان کا ایک خاص کارنامہ یہ ہے کہ ۱۹۱۲ء میں انھوں نے ''نیولا جک'' (جدید منطق) کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی، جس میں ارسطو، مل، ہیگل وغیرہ کے متعارف نظامات منطق پر اعتراضات کی بھرمار کرکے انھوں نے اپنا ایک جدید نظام منطق پیش کیا، اس پر علمی حلقوں میں ایک غلغلہ برپا ہوگیا اور اب تک علمی رسائل میں برابر بحث و مناظرہ کا سلسلہ جاری رہا، ڈاکٹر موصوف نے دفعتہً ستمبر گزشتہ میں وفات پائی، ان کی وفات سے انگلستان کی بزم علمی کا ایک رکن رکین اٹھ گیا۔

(نومبر ۱۹۱۹ء)

کارپینٹر، ہوریس، جنرل

جنرل ہوریس کارپینٹر

امریکہ کے نامور جنرل ہوریس کارپینٹر، جنھوں نے ابھی وفات پائی ہے، ان کی جائداد کی کل قیمت ۷۲۱۲۰۰ پونڈ (ایک کروڑ ۸۲ لاکھ روپیہ) نکلی، یہ ساری رقم ان کے وصیت نامہ کے مطابق تین امریکی یونیورسٹیوں میں تقسیم ہورہی ہے، نیویارک کے ایک اور متوفی رئیس مسٹر لینی، ۱۰ ہزار پونڈ (ڈیڑھ لاکھ روپیہ) کا ترکہ بوسٹن یونیورسٹی کے لیے چھوڑ گئے ہیں۔ (جنوری ۱۹۲۰ء)

فرک، ہنری، مسٹر

مسٹر ہنری فرک

مسٹر ہنری فرک، امریکہ کے ایک مشہور دولت مند تھے، جنھوں نے حال ہی میں وفات پائی ہے، اپنے بعد وہ ۲۹۰۰۰۰۰۰ پونڈ کی جائداد چھوڑ گئے ہیں، وصیت نامہ کے بموجب اس دولت قارون میں سے ۵۰ لاکھ پونڈ کی رقم ان کے احباب، اعزہ و ملازمین کو ملے گی، اور باقی ۲۴۰۰۰۰۰۰ پونڈ (یا ۳۶ کروڑ پونڈ) امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں اور تعلیم گاہوں میں تقسیم ہوں گے!! (''س''، فروری ۱۹۱۹ء)

اسمتھ، ڈی، اے، ڈاکٹر

ڈاکٹر ڈی، اے، اسمتھ

ماہ گذشتہ میں آکسفرڈ سے ڈاکٹر ڈی، اے، اسمتھ، ال، ڈی کی وفات کی خبر موصول ہوئی۔ ڈاکٹر موصوف مشرقی علوم سے خاص شغف رکھتے تھے، اور تاریخ ہند کے ایک مستند عالم سمجھے جاتے تھے۔ تقریباً ۱۸۷۰ء میں وہ ہندوستان میں ایک سویلین کی حیثیت سے آئے تھے، اور صوبہ متحدہ کے مختلف اضلاع میں مختلف مناصب پر فائز رہ کر کوئی بیس سال ہوئے پنشن لے کر وطن واپس گئے۔ ہندوستان کے سی (۳۰) سالہ قیام میں وہ نادر سکہ جات، کتبات وغیرہ بیش بہا تاریخی مواد فراہم کرتے رہے اور ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انھوں نے تاریخ ہند پر متعدد تصانیف شایع کیں، مثلاً اکبر اعظم، راجہ اشوک کا دورِ حکومت، وغیرہ جن میں سے بعض کتابیں ہندوستانی یونیورسٹیوں کے اعلیٰ نصابِ درس میں بھی داخل ہیں، ان کی آخری ضخیم تصنیف ''آکسفرڈ ہسٹری آف انڈیا'' حال ہی میں شایع ہوئی تھی۔ رایل ایشیاٹک سوسائٹی نے تمغوں اور دیگر اعزازات سے ان کی علمی خدمات کا بار بار اعتراف کیا تھا۔ (مارچ ۱۹۲۰ء)

گارنر، مسٹر

مسٹر گارنر

مسٹر گارنر، جن کی وفات کی خبر حال میں شایع ہوئی ہے، ایک مشہور سیاح تھے، جنھوں نے سالہا سال افریقہ کے جنگلوں کی خاک چھانی تھی، آج سے تقریباً تیس سال قبل انھوں نے اس دعویٰ کا اعلان کیا تھا کہ بندروں میں بھی باہم ایک طریقہ کی گفتگو ہوتی ہے۔ ۱۸۹۲ء میں وہ مقام گیبون میں مقیم ہوئے، جہاں بندروں کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ صنف گوریلا کی بکثرت آبادی ہے، یہاں کئی مہینہ تک انھوں نے اپنے تئیں ایک بڑے قفس آہنی میں ایک چمپانزی کے ساتھ مقید رکھا، اور اس کے ذریعے سے بندروں کی باہمی ''گفتگو'' سنتے رہے، لیکن ان کے اس دعویٰ کو سائنٹفک حلقوں میں زیادہ مقبولیت نہ حاصل ہوئی، اور جمہور محققین کا فیصلہ اس وقت یہ ہے کہ نطق وگویائی کی قوت انسان کے لیے مخصوص ہے، جس میں بندر وغیرہ کوئی صنف حیوانات اس کی شریک نہیں۔
(اپریل ۱۹۲۰ء)

دیبر، ہرمان، سر

سر ہرمان دیبر

سر ہرمان دیبر، جنھوں نے ۹۷ سال کی عمر میں وفات پائی ہے اور جن کے قوائے جسمانی و دماغی آخر وقت تک پوری تندرستی کی حالت میں رہے، ان کی کتاب ''طویل العمری'' سے متعلق حال میں دوبارہ شایع ہوئی ہے، طویل العمری کے مختلف نسخے مختلف اشخاص نے تجویز کیے، لیکن سر ہرمان دیبر کے نزدیک اس کا راز صرف تین چیزوں میں شامل ہے، اولاً جسمانی محنت و ورزش، یعنی انسان کاہل نہ ہو، بلکہ تازہ ہوا میں کافی طور پر چلتا پھرتا رہے، دوسرے یہ کہ اپنی طبیعت کو قانع رکھے، قناعت کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ فکر و مایوسی اس کے پاس نہ آئے گی اور طبیعت بشاش رہے گی، تیسری اور سب سے اہم شرط یہ ہے کہ کھانے پینے میں بے اعتدالی نہ کرے، بلکہ ہمیشہ اعتدال ملحوظ رکھے، شرائط بالا کی پابندی کے ساتھ مصنف مرحوم کا دعویٰ ہے کہ ہر شخص انہی کی سی عمر وصحت حاصل کرسکتا ہے۔ (اپریل ۱۹۲۰ء)

لیسٹر، سیسل، ڈاکٹر

ڈاکٹر سیسل لیسٹر (Lyster)

انگلستان کے ڈاکٹر سیسل لیسٹر (Lyster) اکسریز کے اثر سے مرض سرطان میں مبتلا ہوکر وفات پاگئے، رسالہ سائنس سفنگر لکھتا ہے کہ ان کی وفات ڈاکٹر بل کی اس رائے کی ایک تازہ شہادت بہم پہنچاتی ہے کہ اکسریز جواب تک اس مرض کا علاج سمجھا جاتا ہے وہ بجائے اس مرض کو دور کرنے کے اور اس کی تخلیق کا سبب بنتا ہے۔
(اپریل ۱۹۲۰ء)

میسن، لینی

لینی میسن

ماہ گذشتہ میں سائنٹفک رسالوں نے دنیا کے فربہ ترین لڑکے کی خبرِ وفات شائع کی ہے، اس کا نام لینی میسن تھا، وہ لیسٹر انگلستان کا باشندہ تھا، اس کا سن پندرہ سال کا تھا، اس کی کمر کی پیائش ۲/۱-۱۶۴ انچ کی، سینے کی ۶۹ انچ کی، اور ران کی ۳۸ انچ کی تھی، اس کی وفات کے بعد بلحاظ فربہی اس کی جانشینی کا قرینۂ انتخاب امریکہ کے ایک ہشت سالہ لڑکے کے پر پڑا ہے۔ (اپریل ۱۹۲۰ء)

چھتری زمیندار

چھتری زمیندار

وسط اپریل گذشتہ میں بمقام بردوان ایک چھتری زمیندار نے ۶ بجے شام کو وفات پائی، متوفی کا تعلق چونکہ سورج بنسی خاندان سے تھا، اس لئے نعش شب میں نہیں جلائی جاسکتی تھی، دوسرے روز صبح سویرے متوفی کے ایک عزیز نے نعش کا فوٹو لیا، لیکن جب فوٹو تیار ہوا تو اس میں پانچ شکلیں اور بھی نظر آئیں، جن میں سے ایک شکل مرحوم کی زوجہ متوفیہ اور ایک مرحوم کے بچہ کی پہچانی گئی، جس کا مدت ہوئے انتقال ہوچکا ہے، باقی تین شکلیں بہت دھندلی آئی ہیں، ان کی شناخت نہ ہوسکی، بنگال کے اخبارات اس روایت کے ذمہ دار ہیں، اور بنگال کے سائنٹفک حلقوں میں اس خبر نے ایک خاص تحریک پیدا کردی ہے۔ (مئی ۱۹۲۰ء)

نجم، راما، مسٹر

مسٹر راما نجم

اس وقت دنیا کا سب سے بڑا ریاضی دان ایک ہندوستانی تھا، مسٹر راما نجم کی بابت، جس کے کمالات ریاضیہ کا ذکر آج سے ٹھیک ایک سال قبل معارف میں آچکا ہے، بعض علماءِ فن کا خیال تھا کہ نیوٹن کے بعد سے دنیا میں اس دماغ کا ریاضی دان نہیں پیدا ہوا ہے اور اس کا تو سب کو اعتراف تھا کہ انھوں نے بعض وہ مسائل حل کردیئے جو پوری ایک صدی سے لاینحل چلے آرہے تھے، سخت افسوس ہے کہ ماہ گذشتہ میں اسی ہستی نے دق میں مبتلا ہوکر دنیا کو اپنے فیض سے ہمیشہ کے لئے محروم کردیا، مرحوم کا سن کل ۳۲ سال کا تھا۔

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

(جون ۱۹۲۰ء)

مدراس کے نامور ریاضی دان راما نجم کی خبر وفات کسی پچھلے معارف میں درج ہوچکی ہے، یورپ کے اعلیٰ علمی رسائل مدت تک ان کے ماتم میں سوگوار رہے، اور متعدد ماہرین فن کے قلم نے اس حادثۂ عظیم پر علم وفن کی جانب سے فریضۂ تعزیت ادا کیا، کیمبرج یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر جی، ایچ، ہارڈی نے سائنٹفک ہفتہ وار نیچر میں جو تعزیت نامہ شائع کیا ہے، اس میں بار بار اس قسم کے فقرہ ملتے ہیں۔ ''یہ بالکل یقینی ہے کہ مرحوم کی مہندسانہ فضیلت اعلیٰ ترین پایہ کی تھی اور وہ ایک استثنائی قوت فکر واجتہاد کا شخص تھا''۔ اس کے تقریباً بیس مقالات شائع ہوئے، جنھوں نے زمانۂ جنگ ہی میں تمام دنیائے ریاضیات کو اپنی جانب متوجہ کرلیا''۔ اس کے پیش نظر صرف وہ مسائل تھے، جن تک معدودے چند افراد کی رسائی ہوسکتی ہے''۔ اس کی قوت استنباط بالکل حیرت انگیز تھی، جس کی کوئی نظیر کسی یوروپین ریاضی دان میں میری نظر سے آج تک نہیں گزری''۔ اس نوعمری میں وہ جتنے کارنامہ چھوڑ گیا، وہ عجیب وغریب ہیں، اور آج سے بیس سال کے بعد عجیب تر معلوم ہوں گے''۔

لیکن مرنے والے کے کمالات فن سے کہیں زیادہ عجیب یہ واقعہ ہے، کہ ایک غریب ایشیائی کی وفات کے متعلق ''عالی دماغ''، ''متمدن'' یورپ کے اکابر فن کو اس قسم کے الفاظ استعمال کرنا پڑے۔

؎ سوزندگی نثار ہوں اس ایک موت پر (ستمبر ۱۹۲۰ء)

میرس، ٹامس

ٹامس میرس

ماہ گذشتہ میں ایک شخص مسمّٰی ٹامس میرس نے امریکہ میں وفات پائی، جس کی بابت خیال ہے کہ وہ دنیا کا معمر ترین شخص تھا، وفات کے وقت اس کی عمر ۱۲۶ سال کی تھی، اس کے گھر میں انجیل کا ایک نسخہ تھا، جس پر اس کی تاریخ ولادت ۱۵؍جنوری ۱۷۹۴ء درج تھی، اس کا مولد نارتھ ویلز (انگلستان) تھا، اس کو نپولین کے زمانہ کی لڑائیاں خصوصاً جنگ واٹرلو بطور چشم دید واقعات کے اچھی طرح یاد تھیں، پچاس برس سے اس کی سکونت امریکہ میں تھی، اس کی عمر ۲۶ سال کی تھی جب اس کی معشوقہ کا انتقال ہوگیا، اس وقت سے وہ برابر عورت کی صحبت سے محترز رہا۔

(اگست ۱۹۲۰ء)

تلک، مسٹر

مسٹر تلک

ہندوستان کے لئے ماہ گذشتہ کا اہم ترین حادثہ مسٹر تلک کا انتقال تھا، اپنی سیاسی حیثیت سے قطع نظر کرکے مسٹر تلک ملک کی علمی زندگی کے بھی ایک بہت بڑے عنصر تھے، وہ سنسکرت زبان کے ماہر اور ہندوؤں کے علوم قدیمہ کے ایک زبردست عالم تھے، قدامت وید کے متعلق انہوں نے جو فاضلانہ مقالہ پہلی اورینٹل کانفرنس کے سامنے ۱۹۲۰ء میں پیش کیا تھا، اسے مستشرقین کے حلقہ میں خاص وقعت کے ساتھ دیکھا گیا۔ اس کے بعد سے مسٹر تلک نے ویدوگیتا کے متعلق بلند پایہ تصانیف ومضامین سنسکرت اور انگریزی میں شائع کئے، اور ماہرین فن ان کی وسعت نظر وتبحر علمی کا ہمیشہ اعتراف کرتے رہے، ہندوستان اپنی بزم علمی کے اس رکن رکین کے اٹھ جانے پر جس قدر بھی تاسف کرے، بجا ہے۔ (ستمبر ۱۹۲۰ء)

ٹی گجر، پروفیسر

پروفیسر ٹی گجر

پروفیسر ٹی گجر، جنھوں نے ماہِ گذشتہ میں وفات پائی، مغربی ہندوستان کے بہترین ماہر کیمیائیات تھے، ان کی سائنٹفک اور کیمیاوی عظمت یورپ کے علمی حلقوں میں مسلّم تھی، اوران کے بعض کارنامے ان کے معاصرین کے لیے باعثِ رشک تھے۔

(ستمبر ۱۹۲۰ء)

ونٹ، پروفیسر

پروفیسر وُنٹ

ماہ گزشتہ کا ایک اہم علمی حادثہ جرمنی کے نامور پروفیسر وُنٹ کی وفات ہے، پروفیسر موصوف فن نفسیات (سائیکولوجی) میں اس وقت استاذ الاساتذہ کا مرتبہ رکھتے تھے، ان کے زمانہ سے پیشتر نفسیات کو عام فلسفہ کی ایک شاخ سمجھا جاتا تھا، ونٹ ہی نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ نفسیات بذات خود ایک مستقل فن ہے، جس کے نتائج کی بنیاد قیاس واستدلال پر نہیں بلکہ تجربات واخبارت پر ہے، چنانچہ سب سے اول انہیں نے نفسیات کے لیے معمل (تجربہ گاہ) قائم کیا، جس میں مادی علوم کے معلموں کی طرح سارا کام تجربات کی مدد سے انجام پانے لگا اور ایک جدید فن نفسیات طبیعی (سائیکو فزکس) کی بنا ڈالی، اس کے علاوہ فلسفہ واخلاق، منطق وغیرہ پر بھی ان کی گراں پایہ و ضخیم تصانیف ہیں، ابتداً وہ وجود روح کے منکر اور مادیت کے پیرو تھے، لیکن رفتہ رفتہ روح کے قائل اور بالآخر سخت مذہبی آدمی ہوگئے تھے، وفات کے بعد ان کی عمر ۸۸ سال سے متجاوز تھی۔ ("س"، اکتوبر ۱۹۲۰ء)

لایل، چارلس، سر

سر چارلس لایل

ماہ گزشتہ میں انگلستان کے ایک مشہور مستشرق سر چارلس لایل کی وفات ہوئی موصوف مدت تک ہندوستان میں ممتاز ملکی مناصب پر مامور رہے تھے، ۱۸۹۸ء میں چیف کمشنر صوبہ متوسط کے مرتبہ سے پنشن پائی اور اس کے بعد بارہ برس تک انڈیا آفس میں کام کرتے رہے، مسلمانوں کے علوم والسنہ، خصوصاً فارسی، عربی اور اردو کے وہ ایک مستند عالم خیال کئے جاتے تھے اور شعراء عرب کے متعدد دواوین ان کے تحشیہ ومقدمہ کے ساتھ شائع ہوئے، وہ برٹش اکاڈیمی کے فیلو تھے اور ایڈنبرا، آکسفورڈ، اسٹراسبرگ، مختلف یونیورسٹیوں سے ال۔ال۔ڈی، پی۔ایچ۔ڈی، ڈی۔لٹ وغیرہ کی اعزازی ڈگریاں رکھتے تھے، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے آخری ایڈیشن میں ہندوستانی (اردو) لٹریچر پر مضمون انہی کے قلم سے تھا، ان کی عمر ۷۵ سال کی تھی۔ (اکتوبر ۱۹۲۰ء)

ٹونکی، عبداللہ، مفتی محمد

مفتی محمد عبداللہ صاحب ٹونکی

اخبارات سے یہ خبر معلوم ہوچکی ہوگی کہ جناب مولانا مفتی محمد عبداللہ صاحب ٹونکی نے ۷/نومبر ۱۹۲۰ء کو بعارضۂ فالج بھوپال میں انتقال کیا، مفتی صاحب مرحوم عربی درسگاہوں کی قدیم تعلیم کے بہترین نمونہ تھے، ہندوستان کے مشاہیر علماء میں ان کا شمار تھا، وہ ادب میں مولانا فیض الحسن صاحب اور دینیات میں مولانا احمد علی صاحب محدث کے شاگرد تھے، مولانا فیض الحسن صاحب کے انتقال کے بعد اورینٹل کالج لاہور کی پروفیسری کی جگہ ان کو ملی اور ان کی عمر کا بڑا حصہ اسی درسگاہ میں گزرا، اخیر زمانہ میں وہ دارالعلوم ندوہ کے مدرس مقرر ہوئے تھے اور اس کے بعد مدرسۂ عالیہ کلکتہ کے صدر مدرس ہوئے اور یہیں سے بیمار ہوکر اپنے صاحبزادہ جناب مفتی انوارالحق صاحب ایم، اے ناظم ومشیر تعلیمات بھوپال کے پاس گئے تھے جہاں انہوں نے وفات پائی، غالبًا وفات کے وقت مفتی صاحب مرحوم کی عمر ستر (۷۰) کے قریب ہوگی، تعلیمی خدمات کے علاوہ مفتی صاحب کا بڑا کارنامہ انجمن مستشار العلماء لاہور ہے، جو ایک قسم کا دارالافتاء ہے۔ مرحوم نے بعض عربی کی درسی کتابوں پر حواشی بھی لکھے تھے۔ ان کی وفات سے علماء کی صف میں ایک ایسی جگہ خالی ہے جس کے بھرنے کی اب آئندہ امید نہیں۔

("س"، نومبر ۱۹۲۰ء)

ہیورڈ، آرتھر

مسٹر آرتھر ہیورڈ

لندن کے امپریئل کالج آف سائنس میں مسٹر آرتھر ہیورڈ سائنس سے متعلق ایک تجربہ کرتے کرتے وفات پا گئے، وہ کچھ عرصہ سے فن تصویر کشی (فوٹوگرافی) سے متعلق تجربات میں مشغول تھے، اور آخری تجربہ ایک تاریک کمرہ کے اندر کررہے تھے، کمرہ میں روشنی کا کسی۔۔۔۔ ان سے گذر نہ تھا، اور اس کی چھت اور دیواریں سیاہ رنگ سے رنگی ہوئی تھیں، کمرہ اندر سے بند تھا، کہ دفعتہً زور سے ایک تڑاقا ہوا، مسٹر موصوف کے استاد پروفیسر بون باہر تھے، وہ یہ آواز سن کر دوڑے کمرہ کے اندر انھوں نے جھانکا تو معلوم ہوا بجلی کی روشنی ہورہی ہے، ایک ہتھوڑا لے کر انہوں نے دروازہ توڑا اور اندر گئے تو دیکھا کہ مسٹر ہیورڈ خون میں شرابور پڑے ہوئے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہوگئے، پروفیسر بون کی رائے میں جس آلہ سے وہ تجربہ کررہے تھے، اتفاقاً پھٹ گیا اور اس کے اندر جو زہریلی گیس تھی، اس کے صدمہ سے ان کی گردن سخت مجروح ہوئی اور

یہی باعث ہلاکت ہوا۔ (فروری ۱۹۲۱ء)

اکبرالہ آبادی

غمِ اکبر!

محرم ۱۳۴۰ھ میں ہماری زبان کا زندہ دل شاعر اس دنیا سے چل بسا۔ اس گلستان نما خزاں آباد کی بہتر (۷۲) بہاریں اس کی آنکھوں نے دیکھیں، وہ اس وقت عالم وجود میں آیا تھا، جب ہندوستان انقلاب کی کروٹیں لے رہا تھا، اس لئے لامحالہ اس کی زبان سے وہی نالے بلند ہوئے جو قوموں کے انقلاب اور ملکوں کے تغیرات کی خبر دیتے ہیں۔ اس کے ضخیم دیوان کے اوراق ہماری سیاسی، اخلاقی، معاشرتی، تخیلی اور تعلیمی انقلابات کی تاریخ ہے۔ آئندہ نسلیں اس کے صفحات کو پڑھیں گی اور انیسویں بیسویں صدی کے اسلامی ہندوستان کی تصویر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گی۔ اس کی زندگی میں شاید ہی کوئی ایسا اہم واقعہ گزرا ہو جس کو اس نے اپنے کاشانۂ خیال میں جگہ نہ دی ہو۔ زبان خلق نے اس کو لسان العصر کا خطاب دیا اور اس سے بہتر لقب اس کے لئے دوسرا نہیں ہوسکتا تھا۔ اس میں تین صفتیں ایک ساتھ جمع تھیں، وہ فطری فلسفی، پاک مشرب صوفی اور زندہ دل شاعر تھا، اس کا نمک ظرافت ہمارے عیوب کے زخموں پر کسی قدر تیز چرکا لگاتا ہو، تاہم اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ درحقیقت نمک نہیں مرہم تھا۔ سرسید کے زمانہ سے لے کر اب تک تمام ہندوستان تمدن جدید کے حسن منظر پر والہ وشیدا تھا، لیکن صرف ایک اکبر کی زبان تھی جو برملا اس کے عیوب ونقائص واشگاف کرتی رہتی تھی۔

وہ مکروہات عالم سے آزردہ اور حیات دنیا سے بیزار تھا۔ اشعار کے علاوہ اس کا شاید ہی کوئی خط اس بیان سے خالی ہو۔

وہ اکثر اپنے خطوط میں مجھے لکھا کرتے تھے:

اوّلیت ناشدہ ختم است من آخر شدہ ام

آخر اس شکوہ سنج حیات کی حیات بھی آخر ہوگئی۔

موحوم کو سب سے پہلے میں نے شاید ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء میں مولانا شبلیؒ کے پاس دیکھا تھا، دُبلا پتلا بدن، چہرہ پر جھریاں، گال سُکڑے ہوئے، چشم گریاں، مگر دل خنداں، اس کے بعد لکھنؤ اور الہ آباد میں بار بار ملاقاتیں ہوئیں، جیسے جیسے ملتا گیا، ہنسوڑ شاعر کے بجائے دانائے فطرت حکیم کے رنگ میں وہ مجھ پر ظاہر ہوتا گیا۔ ایک دفعہ ایک خط میں مجھے لکھا تھا۔

اپنے غم خانہ کا دروازہ کرو بند اکبر
اب نہیں کوئی سوا موت کے آنے والا

اب اس کے غمِ خانہ کا دروازہ ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا اور وہ موت جس کے آنے کی وہ راہ دیکھا کرتا تھا، آگئی۔

بوڑھے اکبر! مبارک ہو کہ تیرے دل کی مراد پوری ہوگئی اور تجھے مسرت جاوید نصیب ہوئی۔ ("س"، ستمبر ۱۹۲۱ء)

حسن، ایم۔ مہدی

ایم مہدی حسن افادی الاقتصادی

ماہ گزشتہ میں ایم مہدی حسن (افادی الاقتصادی) کا انتقال ادبیات اردو کے لئے ایک سخت حادثہ ہوا، مرحوم ایک سحرنگار ادیب اور ایک خاص طرزِ انشاء (اسٹائل) کے موجد تھے، معارف کے افق پر یہ برق ایک سے زائد بار چمکی اور یقین ہے کہ ناظرین کے دلوں میں "شبلی سوسائٹی اور معاصرانہ چشمک" کے لکھنے والے کی یاد ابھی بالکل تازہ ہوگی، مرحوم کو مولانا شبلی کی ذات سے گہرا تعلق تھا، اسی لئے وہ معارف کو بھی بہت عزیز رکھتے تھے اور دارالمصنفین کی مجلس انتظامی کے رکن تھے، ادب وانشاء کا ایسا ذوقِ سلیم رکھنے والے افراد مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ۲۲/نومبر کو یہ ماہتاب کمال پیوند خاک ہوگیا۔ اِنَّالِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

گورگھ پور وطن تھا، مشرقی تعلیم کے ساتھ انگریزی تعلیم حاصل کی تھی۔ قرق امینی سے تحصیلداری تک بتدریج ترقی کی تھی۔ نہایت مہذب اور سنجیدہ تھے، مزاج میں نفاست اور لطافت حد درجہ تھی۔ ("س"، دسمبر ۱۹۲۱ء)

اردو کے لطیف انشا پرداز ایم مہدی حسن مرحوم (افادی الاقتصادی) کی یاد اب تک ان کے قدردانوں کے دلوں میں باقی ہوگی، مرحوم کی زندگی کی خالص خصوصیت لطافت پسندی تھی، جس سے ان کی زندگی کا کوئی شعبہ خالی نہ تھا، رہنا سہنا، پہنا اوڑھنا، پڑھنا لکھنا، سفر اور قیام، خیال اور تصور، تحریر اور تقریر ہر شے میں ان کی یہ خصوصیت نمایاں تھی، مولانا شبلی مرحوم کے لٹریچر کے وہ شیدا تھے، وہ ڈھونڈھ کر عمدہ سے عمدہ لفافے اور کاغذ مولانا کے پاس بھیجتے تھے کہ وہ ان پر ان کو خط لکھیں، جب دارالمصنفین سے کتابیں منگواتے تھے تو فرمائش ہوتی تھی کہ کتاب کی ایک ایک فرد دیکھ لی جائے کہ وہ داغدار نہ ہو، پیکٹ بھدا نہ بندھے، وہ شے لطیف اور جنس لطیف کے سچے ناقد، عاشق اور قدردان تھے، ان کی تحریر کا طرز بھی اسی انداز کا تھا، وہ ایک نہایت ہی لطیف طریقہ انشا کے اردو میں موجد تھے، جو پستی واتبذال سے پاک اور شگفتگی اور رنگینی سے معمور ہوتا تھا، ان کے رنج کے خطوط بھی اسی عطر میں ڈوبے ہوتے تھے اور اپنے مراسلت رکھنے والوں سے بھی اسی اہتمام اور توجہ کے طالب رہتے تھے، ان کے مضامین ۱۸۹۸ء سے ۱۹۲۱ء تک متعدد رسائل میں طبع ہوتے رہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک رفیقۂ زندگی (بیوی) بھی انھیں کے خیال کے مطابق عطا کیا تھا اور یہ سب سے بڑی دولت ہے، جو ایک شوہر کو میسر آسکتی ہے، مرحوم نے ان کی تعلیم و تربیت اپنے ہی اصول پر کی تھی کہ وہ بالکل ان کا عکس آئینہ بن گئیں، انتہا یہ ہے کہ طریقۂ تحریر اور خط میں بھی اپنے شوہر مرحوم کی پوری تقلید انھوں نے کی، اب جب کبھی ان کا خط آتا ہے، دل کانپ جاتا ہے کہ الٰہی! مہدی مرحوم کی تحریر!

مہدی بیگم نے اپنے شوہر کی زندگی میں ان کی بہترین خدمت کی ہوگی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے مرنے کے بعد جو خدمت انھوں نے اپنے شوہر کی انجام دی، وہ گذشتہ سے بدر جہا بہتر اور گران تر ہے، انھوں نے اپنے شوہر کے متفرق مضامین اور تحریروں کو اخبارات اور رسائل کے پرانے فائلوں سے نکال کر یکجا جمع کیا اور ان کا ایک مجموعہ نہایت صفائی، عمدگی اور حسن سلیقہ کے ساتھ بہترین کاغذ پر چھپوا کر شائع کیا ہے اور اس کا نام افادات مہدی رکھا ہے، مہدی مرحوم کی جسمانی اولادیں متعدد ہیں، مگر ان کی یہ روحانی اولاد ہمیشہ یادگار رہے گی۔

("س"، اکتوبر ۱۹۲۳ء)

بنڈکٹ پانزدہم، پاپائے رومہ

پاپائے رومہ، بنڈکٹ پانزدہم

آغاز سال رواں میں پاپائے رومہ، بنڈکٹ پانزدہم نے انتقال فرمایا، ان سطروں کے شائع ہونے تک ان کے جانشین کا بھی انتخاب ہوچکا ہوگا، جس وقت سے پاپائیت کا باضابطہ عہدہ قائم ہوا ہے، صدہا افراد اس منصب پر مامور رہ چکے ہیں، بلکہ اگر ابتدائی عیسوی صدیوں کے بشپ صاحبوں کو بھی اس فہرست میں شامل سمجھا جائے تو شاید شمار سیکڑوں سے متجاوز ہوجائے، سوال صرف اس قدر ہے کہ اس طویل و عظیم فہرست میں کسی غیر یورپی شخص کا بھی نام تلاش کرنے سے مل سکتا ہے؟ مسیحیت کے حدود تو ماشاء اللہ ایشیاء، افریقہ کے گوشہ گوشہ تک وسیع ہوچکے ہیں اور ان ممالک میں کروڑوں باشندہ "ابن اللہ" کے کلمہ گو موجود ہیں، پھر کیا اب تک ان بے شمار نفوس میں ایک شخص بھی یورپی مسیحیوں کی ہم سطح و ہم پلہ نہیں پیدا ہوسکا ہے؟

("س"، فروری ۱۹۲۲ء)

الزڈبرڈ، سر

سر الزڈبرڈ

سر الزڈبرڈ، جو ایک خاص دوا، "بروس کسٹرڈ پوڈر" کے کارخانہ کے مالک تھے، چند ماہ ہوئے، انہوں نے وفات پائی، تو معلوم ہوا، انہوں نے محض اشتہارات کے بل پر جو دولت کمائی، اس کی آمدنی سے ۶۵۳۶۵۶ پونڈ کی قیمت کی مستقل جائداد چھوڑ گئے ہیں! چند اور مشہور مشترین کی دولت کے اعداد ذیل سے، مغرب میں اشتہار کی قوت زرخیزی کا اندازہ ہوگا۔

لارڈ برٹن (تاجر شراب)	۷،۰۰۰،۰۰۰	پونڈ
سر فریڈرک وِلس (تاجر تمباکو)	۲،۹۱۸،۱۱۴	=
مسٹر پیٹر رانیسن (مالک کارخانۂ خیاطی)	۱،۱۱۹،۶۶۱	=
مسٹر ولیم دہائیلی (مالک بساط خانہ)	۱،۴۵۲،۸۲۵	=
سر ہنری ٹیٹ (تاجر شکر)	۱،۲۶۳،۵۶۵	=
مسٹر جی فلفرڈ (مالک دواخانہ)	۱،۳۱۱،۰۰۰	=
مسٹر لینڈلی میپل (مالک کارخانہ فرنیچر)	۲،۱۵۸،۲۹۲	=
مسٹر چارلس لی (چٹنی فروش)	۱،۰۷۰،۱۳۷	=
مسٹر سی، پوٹ (دوا فروش)	۴،۲۹۴،۴۲۳	=
مسٹر اینو (مالک کارخانہ نمک ہاضم)	۱،۶۱۱،۶۰۷	=
مسٹر ہینز (چٹنی و اچار فروش)	۱۱،۲۲،۰۰۰	= (ڈیلی میل)

(جون ۱۹۲۲ء)

سالم انصاری، رشید احمد، مولانا

مولانا رشید احمد صاحب سالم انصاری

ماہ گزشتہ کا سب سے بڑا علمی حادثہ جناب مولانا رشید احمد صاحب سالم انصاری کی وفات ہے، مرحوم نے تقریباً بیس پچیس برس مسلسل ہماری زبان کی خدمت کی۔ عربی و فارسی کے وہ لائق ادیب تھے، ان کا علمی شوق و ذوق فطری تھا۔ ان کی زندگی کا اکثر حصہ مطالعہ اور کتب بینی میں صرف ہوتا تھا، قلمی کتابوں کی تلاش اور جستجو میں انہوں نے ہندوستان کا گوشہ گوشہ چھان ڈالا تھا۔ آخر میں ذی الحجہ ۱۳۴۰ھ میں جب علی گڑھ میں خاکسار اُن سے ملنے گیا تو ان کو بستر مرگ پر پایا اور یہی ان کا مرض الموت تھا، اس عالم میں بھی جتنی دیر ان کے پاس بیٹھنے کا اتفاق ہوا وہ علمی تذکرے کرتے رہے اور جہانگیر نامہ کے ایک قلمی نسخہ کو بڑی محنت سے ترتیب دیا تھا، اس کی اشاعت کا تذکرہ کرتے رہے۔ اردو مترجمات میں المدینۃ والاسلام، النصرانیۃ والاسلام، کتاب التوحید، الفوز الکبیر، وغیرہ مفید تالیفات یادگار چھوڑی ہیں، ترک موالات کے سلسلہ میں مرحوم علی گڑھ کالج چھوڑ کر جامعہ ملیہ میں چلے آئے تھے اور یہیں سے رخصت ہوئے، خدا مغفرت ارزانی فرمائے۔

("س"، اکتوبر ۱۹۲۲ء)

فرنگی محلی، یونس، مولانا محمد

مولانا محمد یونس فرنگی محلی مرحوم

بے مہریٔ دہر بین کہ دریکٔ ہفتہ گل سر زد و غنچہ گرد و بشگفت و بریخت

نہایت رنج و افسوس اور حسرت و اندوہ کے ساتھ ہم ناظرین کو یہ خبر سناتے ہیں کہ ملک کی بزم دانش کا ایک نوجوان ممبر اٹھ گیا، مولانا محمد یونس فرنگی محلی مرحوم نے پچھلے مہینہ لکھنؤ میں بمرضِ دق وفات پائی۔ مرحوم مولانا عبدالحئی مرحوم فرنگی محلی کے نواسے تھے اور اپنے ذاتی علم و فضل میں اپنے ہمعصر نوجوانوں میں ممتاز تھے۔ ۲۴، ۲۵ برس سے زیادہ عمر نہ تھی، معقولات اور فلسفہ سے ان کو خاص دلچسپی تھی اور اپنی عمر کا بڑا حصہ انہیں کی تحقیق اور کاوش میں بسر کیا۔ خود اپنے ذاتی شوق سے انگریزی اور فلسفۂ جدید حاصل کیا۔ دارالمصنفین اور معارف سے مرحوم کو خاص محبت تھی، کئی سال سے ان کی صحت مخدوش تھی، بااین ہمہ وہ اپنے علمی انہماک سے باز نہیں آتے تھے۔ گزشتہ سال عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر ہوکر گئے تھے، وہاں مرض نے طول پکڑا، آخر وطن آکر اس شہید علم نے جان دی، مرحوم کی ایک کتاب ''روح الاجتماع'' دارالمصنفین سے چھپ کر شائع ہوچکی ہے اور اپنی ایک اور دوسری تصنیف ابن رشد کا مسودہ دارالمصنفین میں بھیج چکے تھے جو عنقریب چھپ کر شائع ہوگی۔ مرحوم کے دوستوں کو ان کی ذات سے بڑی بڑی توقعات تھیں اور خیال تھا کہ ان کی کوششوں سے فرنگی محل کی عقلی اور فلسفیانہ شان پھر دوبارہ زندہ ہوگی۔ افسوس کہ دستِ اجل نے امان نہ دی، اناللہ۔ (''س''، دسمبر ۱۹۲۲ء)

اسمتھ، ایس۔ پرسی

مسٹر ایس، پرسی اسمتھ

مسٹر ایس، پرسی اسمتھ کی موت تاریخ عالم کا حادثۂ عظیم ہے، وہ مسوری قوم کی تاریخ، روایات، مذہب اور تمام دوسری خصوصیات کے لیے سند تھے۔ انھوں نے چالیس سال تک نیوزی لینڈ میں اسی قبیلہ کے ساتھ گزارے تھے۔ ۱۹۰۰ء میں وہاں سے واپس آکر اسی قوم کے متعلق مضامین و رسائل لکھا کرتے تھے، حال ہی میں ان کی کتاب کا جو انھوں نے اسی قوم کی تاریخ پر لکھی ہے، چوتھا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ (دسمبر ۱۹۲۲ء)

میرٹھی، شوکت، مولانا

مولانا شوکت میرٹھی

اردو فارسی کے قدیم خدمت گزاروں میں ایک مولانا شوکت میرٹھی تھے جو خود کو ''مجدد السنۂ مشرقیہ'' کے خطاب سے مخاطب کرتے تھے۔ انھوں نے خاقانی، عرفی اور غالب کے دیوانوں کی عجیب وغریب شرحیں لکھی ہیں اور ہمیشہ اپنے مذاق کے مطابق وہ کچھ نہ کچھ کرتے اور کہتے رہتے تھے۔ افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ انھوں نے ایک طویل علالت اور کبرسنی کے بعد وفات پائی۔ اب شاید ایسے لوگ بھی ہمارے ہندوستان میں آئندہ پیدا نہ ہوں گے۔ (جنوری ۱۹۲۳ء)

کرم برون، الکزنڈر، ڈاکٹر

ڈاکٹر الکزنڈر کرم برون

اڈنبرا یونیورسٹی کے مشہور ماہر کیمیات ڈاکٹر الکزنڈر کرم برون کا ۸۵ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ انھوں نے تقریباً ۵۰ سال تک یونیورسٹی میں خدمات انجام دی تھیں اور تمام دنیا میں اپنے فن کے مستند استاد تسلیم کیے جاتے تھے۔ (جنوری ۱۹۲۳ء)

عبدالحئی، سید، مولانا حکیم

مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب

ناظم ندوۃ العلماء

چند مہینوں سے معارف کا پہلا صفحہ علم وفن کے بزرگوں پر ماتم کے لئے مخصوص ہوگیا ہے، آج ہم دوسروں پر ماتم کرتے ہیں، کل دوسرے ہمارا ماتم کریں گے، دنیا کی یہ بزم ماتم اس فانی کائنات کے وجود کے ساتھ قائم ہے اور اسی کے ساتھ قائم رہے گی۔ یہ حوادث آباد عالم جس کو ہم تم قائم مستمر اور مسلسل جان رہے ہیں، ہر آن و ہر لحہ اس طرح بدل رہا ہے کہ غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ جو نقشہ، جو کیفیت، جو صورت حال اس آن ہے وہ اس آن نہیں، ایک مستمر تغیر اور ایک مسلسل انقلاب جاری ہے اور پردہ دار کُلَّ یَوۡمٍ ھُوَ فِیۡ شَاۡنٍ [الرحمٰن: ۲۹] (ہر روز ایک نئے رنگ میں جلوہ گر ہے) لیکن بااینہمہ انقلاب وتغیر بظاہر اس کے قیام، استمرار اور تسلسل میں فرق نہیں آتا، سمندر کی لہریں ہر آن بدل رہی ہیں، مگر سمندر کی صورت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا، صورتیں مٹتی جاتی ہیں، شکلیں فنا ہوتی جاتی ہیں، مگر اس آئینہ خانہ کی آبادی اور صورت گری میں کوئی فرق نہیں آتا۔

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی
ہزاروں اٹھ گئے رونق وہی باقی ہے مجلس کی!

دوسری فروری ۱۹۲۳ء کی شام کو اس مجلس کا جو ممبر اٹھا ہے، اس کا اس دنیا میں مجازی نام عبدالحئی تھا، مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب ناظم ندوۃ العلماء جدید کے اولین علماء تھے سادات رائے بریلی کے مشہور خانوادۂ علم وعمل سے تھے، جس کے بعض افراد سلاطین کے درباروں میں اور بعض فقر وتصوف کی خانقاہوں میں ممتاز تھے، بعض درس و تدریس کی چٹائیوں پر اور بعض تالیف وتصنیف کی مسندوں پر جلوہ آراء تھے، اس خاندان

کے آخری رکن مولانا سید احمد صاحب شہید بریلوی تھے، جو سید صاحب کے نام سے عموماً مشہور ہیں اور جو مولانا اسمٰعیل صاحب شہید کے پیر تھے اور وہ اپنے عہد کے اس فرقہ کے جو ہندوستان میں اسلام کی غربت کی چارہ سازی کے لئے اٹھا تھا اور جو دینی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے مسلمانوں کو بیدار کرنا چاہتا تھا، امام اور امیر المومنین تھے، بنگال سے لے کر پنجاب تک غدر سے پہلے مجاہدین کا جو سیلاب سکھوں کے مقابلہ کے لئے اٹھا تھا، اس کا منبع سید موصوف ہی کی ذات تھی، بالآخر سکھوں کے ایک معرکہ میں پٹھانوں کی بیوفائی سے اپنے رفقائے خاص کے ساتھ بہادری سے شہید ہوئے اور شکست خوردہ جماعت سرحد پار یاغستان کی پہاڑیوں میں پناہ گزین ہوئی اور مجاہدین کے نام سے اب تک قائم ہے، چمرقند اس کا صدر مقام ہے اور سید صاحب کے دوبارہ ظہور کی منتظر ہے۔

مولانا عبدالحئی مرحوم کے والد ماجد بھی ایک فاضل یگانہ تھے۔ شعر وسخن، تاریخ و سیر کے ماہر اور داستانِ کہن کی بولتی زبان تھے، ان کا سفینہ ایک یادگار چیز ہے اور ان کا تذکرہ ان کے عہد کا تاریخی سرمایہ ہے، مولانا عبدالحئی مرحوم کو یہ ذوقِ فن باپ ہی سے وراثت میں ملا تھا۔

مولانا مرحوم نے ابتدائی تعلیم کے بعد لکھنؤ میں مولانا سید امیر علی صاحب ملیح آبادی، مولانا فتح محمد صاحب تائب اور مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی سے تعلیم پائی، حدیث شیخ حسین صاحب محدث یمنی سے بھوپال میں پڑھی، پھر کانپور آئے، اس وقت ندوۃ العلماء کا مرکز یہی شہر تھا، مولانا سید محمد علی صاحب ناظم تھے، ان کی نگاہ انتخاب فوراً اس جوہر قابل پر پڑی، وہ دن ہے اور ان کی وفات کا دن ہے کہ ندوہ ان کی خدمات سے کبھی محروم نہ رہا۔ ندوہ پر کیا کیا انقلابات آئے، کتنے ارکان بدلے، کتنے منتظمین آئے اور کتنے گئے، کتنے معتمد اور ناظم عزل ونصب ہوئے، کتنے فتنے اور حوادث پیدا ہوئے، مگر ان تمام حالات وحوادث کے طوفان میں ثبات واستقلال کی صرف ایک چٹان تھی، جو اپنی جگہ پر تھی اور وہ مولانا سید عبدالحئی صاحب مرحوم کی ذات تھی۔

باوجود شغلِ مطب فرائض ندوہ اور مذہبی رجوع عام کے وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھا کرتے تھے، اسلامی ہندوستان کے پورے ہزار سالہ عہد میں شعراء ومشائخ اور سلاطین کے سینکڑوں تذکرے اور تاریخیں لکھی گئیں، لیکن آزاد بلگرامی کی تصنیفات کو چھوڑ کر کوئی مختصر سا رسالہ بھی مستقل یہاں کے علماء اور فضلائے فن کے حالات میں نہیں لکھا گیا، مولانا مرحوم نے اس نقص کو محسوس کیا، اور پورے بیس برس اس کام پر انہوں نے صرف کئے اور اس عرصہ میں ہندوستان کی اس سرحد سے سرحد تک کوئی کتب خانہ چھوڑا جہاں ان کو ذوق طلب کھینچ کر نہ لے گیا ہو اور بالآخر تقریباً آٹھ دس جلدوں میں علماء ہند کی پوری سوانح عمریاں جمع کیں، اس کا مقدمہ لکھا، جس میں ہندوستان کے اسلامی علوم و فنون کی تاریخ مرتب کی، عربی میں ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا ایک صفحہ بھی نہیں، جو کچھ معلوم ہے وہ انگریزی کی زبانی، مرحوم نے ہندوستان کی اسلامی تاریخ، سلاطین اسلام یہاں کے اسلامی تمدن، مساجد، مدارس، عمارات، شفاخانے اور دیگر خصوصیات پر ایک پوری کتاب تیار کی، جو دارالمصنفین کے اہتمام سے جامعہ ملیہ پریس میں چھپ رہی ہے (افسوس کہ یہ کتاب چھپ نہ سکی)۔

مرحوم کے تذکرۂ شعرائے اردو کا ذکر اس سے پہلے ہی پرچہ میں آیا تھا اور اس کے چند صفحے بھی ناظرین کے نذر کئے گئے تھے، تذکرہ کا آخری باب یعنی متاخرین کا حصہ انہوں نے ہمارے پاس نہیں بھیجا تھا، معلوم نہیں کہ وہ ترتیب بھی پاسکا تھا یا نہیں، سورت کانفرنس کی خواہش پر انہوں نے گجرات کی علمی تاریخ لکھ کر پیش کی تھی، جو ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے چھپ کر شائع ہوئی ہے، علاوہ ازیں چند اصلاحی رسائل، نور ایمان، اصلاح وغیرہ چھپے ہیں، طبیب العائلہ (فیملی ڈاکٹر) طب میں بھی ان کا ایک رسالہ اردو میں چھپا ہے۔

مرحوم نے اپنی معنوی یادگاروں کے ساتھ چند ظاہری اولادیں بھی چھوڑی ہیں، ان کے بڑے صاحبزادے کی عمر ۲۴، ۲۵ کے قریب ہوگی، مگر باپ کو یہ دھن تھی کہ علم و فن کا کوئی شعبہ اس یادگار خاندان کی ملکیت سے باہر نہ چھوٹے، ندوہ میں عربی کتابیں انہیں پڑھوائیں، حدیث دیوبند بھیج کر، طب خود پڑھائی، علوم عربیہ سے فارغ کرکے ان کو انگریزی شروع کرائی، چند سال میں بی ایس سی کی ڈگری حاصل ہوئی، پھر لکھنؤ میڈیکل کالج میں داخل کیا اور اب دو برس ان کے ختم تعلیم میں باقی ہیں۔ [۱] خدا سے دعا ہے کہ برادر عزیز کامیابی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کریں۔ علم وفن اور دین وملت کی خدمت میں اپنے نامور باپ کے جانشین ثابت ہوں۔ (''س''، فروری ۱۹۲۳ء)

---

[۱] ان کا نام ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب ہے، جو باپ کے بعد نواب علی حسن خان کے اخیر زمانہ میں ندوۃ العلماء کے ناظم مقرر ہوئے اور اب تک اسی عہدہ پر قائم ہیں، لکھنؤ میں ڈاکٹری کے پیشہ کے ساتھ صلاح وتقویٰ، زہد وورع کے ساتھ معروف ہیں اور خاموشی کے ساتھ تبلیغ دین میں مصروف رہتے ہیں۔

مرحوم کے دوسرے صاحبزادے جو دوسری بیوی سے ہیں اس وقت بالکل ہی کم سن تھے، اس لئے ان کا ذکر اس وقت نہ کیا جاسکا، آج وہ سید ابوالحسن علی ندوی کے نام سے مشہور روزگار ہیں اور تبلیغ دین کے کام میں پورے انہماک کے ساتھ مصروف ہیں۔ وہ تین سال سے حجاز میں دعوت کے کاموں میں لگے ہیں، امسال حجاز اور مصر کی فضائیں ان کی دعوت کے نغموں سے مسحور ہیں اور اسی مناسبت سے وہ ایک سال سے حجاز اور مصر میں مقیم ہیں، اللہ تعالیٰ نے عربی تقریر وتحریر کی دولت ان کو عنایت فرمائی ہے جس کو وہ بحمداللہ کہ دین کی راہ میں لٹارہے ہیں۔ (''س''، یادِ رفتگاں، کراچی: مجلس نشریات اسلام، ۱۹۳۸ء، ص ۵۰)

بالفور، ائزک بیلی، سر

سر ائزک بیلی بالفور

سر ائزک بیلی بالفور کی موت علمی دنیا کا حادثہ سمجھا جاتا ہے۔ سرمذکور ۳۴ سال تک اڈنبرا یونیورسٹی کے علم نباتات کے اعلیٰ پروفیسر رہے ہیں۔ (فروری ۱۹۲۳ء)

رائز ڈوڈ، پروفیسر

پروفیسر رائز ڈوڈ

اسی ماہ میں عالمِ تاریخ کا سب سے بڑا حادثہ پروفیسر رائز ڈوڈ کی موت ہے، پروفیسر مرحوم سنسکرت، تاریخِ ہند قدیم اور عہدِ بودھ کے مستند عالم تھے۔ آپ کی zbogogid خاصی دقتِ نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ ۱۸۴۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔

(فروری ۱۹۲۳ء)

برنہارڈ، سارہ

سارہ برنہارڈ

گذشتہ مارچ میں دنیا کی سب سے مشہور ایکٹرس سارہ برنہارڈ کی ۷۴ سال کی عمر میں موت ہوئی۔ مرتے وقت اس نے اپنے کفن کے متعلق بھی دریافت کیا جو ۴۰ سال سے ہر وقت اس کے پاس رہتا تھا۔ (مئی ۱۹۲۳ء)

کارنیوورن، لارڈ

لارڈ کارنیوورن

فرانسیسی ماہرین مصریات کا خیال ہے کہ لکسر میں جو مقبرہ برآمد ہوا ہے وہ توتن خیمن کا نہیں ہے، بلکہ اس کے دوسرے جانشین ہارن ہیب کا ہے، حال ہی میں پروفیسر اڈورڈ نوبلے نے پیرس کی مجلس علمی کے سامنے اس موضوع پر ایک عالمانہ لکچر دیا اور اس میں اپنے اس دعویٰ کو ثابت کیا ہے، اور بتایا ہے کہ ۱۹۰۸ء میں ایک امریکن نے ہارن ہیب کے مقبرہ کے نام سے جو جگہ دریافت کی تھی، دراصل وہی توتن خیمن کا مقبرہ ہے۔

اسی سلسلہ میں یہ معلوم کرنا سخت افسوس ناک ہے کہ اس اکتشاف کے روح رواں لارڈ کارنیوورن کا مصر ہی میں بخار سے انتقال ہوگیا، اس پر تمام حلقوں میں عجیب چہ میگوئیاں ہورہی ہیں، چنانچہ بہت سے روحانیت کے قائل لوگوں کا خیال ہے کہ فرعون کی لاش کی کوئی ہمزاد حفاظت کرتا تھا یا اس پر کچھ نقوش اس قسم کے تھے جن کا اثر لارڈ موصوف پر مہلک ثابت ہوا۔ (مئی ۱۹۲۳ء)

ایم پیری، فرنچ

فرنچ ایم، پیری

مشہور ترک دوست فرنچ ایم، پیری لوطی، کی ۷۳ سال کی عمر میں موت کا تمام دنیا کو علم ہوچکا ہے، لیکن اس سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے کہ اس کے مکان میں جاپانی، چینی اور ترکی وضع کے کمروں کے علاوہ ایک مسجد بھی تھی۔ (دسمبر ۱۹۲۳ء)

مکرجی، آسوتوش، سر

سر آسوتوش مکرجی

گذشتہ ماہ کا سب سے بڑا علمی اور تعلیمی حادثہ سر آسوتوش مکرجی کی وفات ہے، بنگال کا یہ سپوت فرزند گو ایک نامور بیرسٹر، ایک قابل جج ہائیکورٹ، ایک بڑا مصنف، ایک مشہور ریاضی دان تھا، تاہم اس کی ناموری، قابلیت، بڑائی اور شہرت کا سب سے بڑا مظہر یہ تھا کہ اس نے تقریباً بیس برس تک ہندوستان کی سب سے بڑی درسگاہ کلکتہ یونیورسٹی پر بہ حیثیت وائس چانسلر سب سے عمدہ اور بہتر حکمرانی کی ان کی اس تعلیمی فرمان روائی کا زمانہ بنگال کی تعلیمی ترقی، اور امتحانات کی وسعت اور یونیورسٹی کے انتظامات کی خوبی اور معاملات تعلیمی میں حکومت کے مقابلہ میں پوری قوت کے ساتھ اپنے حقوق کی حفاظت کے لحاظ سے ہندوستان کا تعلیمی عہد زریں کہا جاسکتا ہے، موصوف نے اپنے بست سالہ عہد فرمان روائی میں یہ ثابت کردیا کہ جہاں تک یونیورسٹی کا تعلق ہے بنگال حکومت کی بے جا قید سے آزاد اور خود مختار ہے، ۲۹ مئی ۱۹۲۴ء ان کی وفات کا دن بنگال کے دائرہ تعلیم کے لیے ایک سانحہ عظیم ہے۔ ("س"، جون ۱۹۲۴ء)

بدرالدین، شاہ، مولانا

مولانا شاہ بدرالدین

ابھی گزشتہ مہینہ کے معارف میں ہم نے حضرت امیر شریعت صوبہ بہار اور امارت شرعیہ صوبہ بہار کا تذکرہ کیا تھا، خیال میں بھی نہ تھا کہ اس کے ایک ہی مہینہ کے بعد ہم کو حضرت ممدوح کی دائمی مفارقت کا ماتم کرنا پڑے گا، حضرت مولانا شاہ بدرالدین سجادہ پھلواری اس عہد کے جنید وشبلیؒ تھے، ان کا زہد و ورع، نزاعت و ارتقاء، علم و عمل، صورت و سیرت، ہر چیز نمونۂ سلف تھی، کم و بیش چالیس برس تک یہ علم و عرفان کی شمع صوبۂ بہار میں روشن رہی اور اس کی روشنی دور دور تک پھیلتی رہی، ان کے شب و روز کے چوبیس گھنٹے ذکر و فکر اور مطالعۂ کتب کے سوا اور مشاغل میں کمتر صرف ہوتے تھے، ان کی نشست گاہ ایک کتب خانہ تھی، ان کے چاروں طرف کتابوں کا انبار لگا رہتا تھا اور اس کے بیچ میں یہ زندہ کتب خانہ جلوہ فرما رہتا تھا، اس عہد میں یہی ایک ہستی تھی جو ظاہر و

باطن، علم و معرفت، حقیقت و شریعت کا مجمع البحرین تھی اور جس سے ہزاروں اور لاکھوں علم و معرفت کے پیاسے سیراب ہوتے رہتے ہیں، پھلواری کا سجادہ اس بزرگ ذات کی رونق افروزی سے چشمۂ خورشید تھا، افسوس کہ یہ آفتاب اب ہمیشہ کے لئے ڈوب گیا۔

وہ میرے والد مرحوم کے پیر بھائی تھے، دونوں مولانا شاہ علی حبیب صاحب قدس سرہ، سجادہ نشین پھلواری سے مستفید تھے، خاکسار کو آغاز عمر میں ۱۸۹۸ء میں پھلواری کی خانقاہ میں چند ماہ بسلسلۂ طلب علم والد ماجد مرحوم کے حسب ہدایت رہنے کا اتفاق ہوا تھا، اس وقت سے اخیر عمر تک اس ہیچمدان پر خاص نظر عنایت تھی، کبھی کبھی مکرمت ناموں سے سرفراز فرماتے، تو ''اعزا خواں'' کے الفاظ سے خطاب فرماتے، دارالمصنفین کی کتابوں کو پسند فرما کر قیمتاً منگواتے تھے اور معارف کو بھی اپنے مطالعہ سے سرفراز فرماتے تھے۔ (''س''، ستمبر ۱۹۲۴ء)

ندوی، ابوالحسنات، مولوی

آہ! ابوالحسنات ندوی

ہمارے لئے یہ کتنا غم ناک سانحہ ہے کہ آج ہمارا قلم اس کا ماتم کرے جس کا قلم کل تک قوم و ملت کا ماتم گسار تھا، ۱۲/ ربیع الثانی ۱۳۴۳ھ کا واقعہ ہے کہ مولوی ابوالحسنات ندوی نے اس عالم آب و گل کو خیر باد کہا، وہ ہماری کوششوں اور ندوہ اور دارالمصنفین کی تعلیم و تربیت کی سب سے بڑی کمائی تھے، ان کی موت نے ہماری علمی مجلس کو وہ صدمہ پہنچایا ہے جس کی تلافی شاید آخر وقت تک نہ ہوسکے، اب جب دن آئے تھے کہ وہ ملک و قوم کی دماغی و ذہنی رہبری کرسکیں تو یک بیک دستِ قضا نے ہم سے وہ ہمارا بڑا سرمایہ چھین لیا، جس سے ہم بڑی توقع رکھتے تھے۔

مولوی ابوالحسنات ایک نہایت ہی ذہین، طباع اور بلند حوصلہ نوجوان تھے، (پٹنہ کے ضلع میں اشرف پوران کا وطن تھا، ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی میں حاصل کی، مجھ سے ان کی ملاقات ۱۹۱۲ء میں الہلال کلکتہ میں ہوئی، میں نے ان کو جوہر قابل پاکر خود پڑھانا شروع کیا، جب کلکتہ چھوڑا تو انہیں لکھنؤ ندوہ میں بھجوا دیا۔ جہاں انہوں نے چند سال تعلیم پائی) ندوہ کی تعلیم کے بعد ۱۹۱۸ء میں وہ دارالمصنفین آئے اور آخر دم تک ان کا رشتہ اس علمی مجلس سے بندھا رہا۔ یہاں رہ کر انہوں نے جو علمی مضامین لکھے ہیں وہ تاریخی حیثیت سے ہمیشہ یادگار اور قابل مطالعہ رہیں گے، تحریک خلافت کے سلسلہ میں ان کے مضامین نے خاص اہمیت حاصل کرلی تھی اور وہ ''ترک و خلافت'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوگئے تھے، اس کے علاوہ ہندوستان کے اسلامی مدارس پر ایک پُرازمعلومات مبسوط مضمون لکھا تھا، جسے وکیل امرتسر شائع کرنے والا ہے، اس کے ساتھ ہی اورنگ زیب کے خطوط کی ترتیب کا کام شروع کررہے تھے، لیکن پانچ سال کی مسلسل علالت نے ان کی امیدوں کے برآنے کا موقع نہ دیا اور وہ اپنے خیالات اپنے ساتھ لے گئے، زمانۂ علالت ہی میں انہوں نے جمال الدین افغانی کی سوانح عمری کا مواد بھی جمع کرنا شروع کیا تھا، مگر افسوس کہ زمانہ نے ان کو کچھ کرنے کی مہلت نہ دی، انہوں نے شاعرانہ طبیعت پائی تھی، فارسی کے ساتھ خاص ذوق تھا اور ان کی فارسی و اردو کی غزلیں قصائد و ترکیب بند عرصہ تک پڑھنے والوں کو گرم رکھیں گے۔ مرحوم نے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں اپنے بعض فارسی قصیدے حضرۃ الاستاذ کی خدمت میں بھیجے تھے، جن کو دیکھ کر مولانا نے مرحوم کی استعداد کی تعریف کی تھی، جن کا ذکر مکاتب شبلی میں ہے۔

مرحوم پانچ سال سے مسلسل بیمار تھے، ابتداء میں پاؤں میں درد ہوا، وہ درد زخم ہوا اور زخم نے ناسور کی صورت اختیار کرلی۔ اس کے ساتھ ہی بخار رہنے لگا۔ علاج کے لئے انہوں نے کلکتہ، لکھنؤ وغیرہ کے طویل سفر کئے، اسی سلسلہ میں وہ راجگیر (بہار) کے پہاڑی مقام پر گئے ہوئے تھے کہ وہاں کی خاک نے اس قیمتی گوہر کو ۱۲، ربیع الثانی کو ہمیشہ کے لئے اپنی آغوش میں لے لیا، ان کا وطن بہار تھا، وہیں پیدا ہوئے اور وہیں سپرد خاک بھی، خاندان میں صرف ایک بھائی ہیں، خداوند تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے کہ ہمارے پاس اس دعا کے سوا اور کیا ہے۔ (''س''، نومبر ۱۹۲۴ء)

کونرو، جوزف

جوزف کونرو

گذشتہ ماہ کا علمی حادثہ مسٹر جوزف کونرو کی موت ہے، مسٹر موصوف انگریزی کے مشہور افسانہ نگار تھے، ان کا اصلی وطن پولینڈ تھا، لیکن ۱۸۷۸ء میں انھوں نے مستقل طور سے برطانوی رعایا کی حیثیت سے انگلستان میں اقامت اختیار کرلی، ان کے افسانے ہر طبقہ اور ہر عمر کے لوگوں میں بہت مقبول ہوئے ہیں۔ (دسمبر ۱۹۲۴ء)

عین القضاۃ، مولانا

مولانا عین القضاۃ

(عبدالسلام ندوی)

موجودہ زمانہ میں جبکہ علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے تصوف کی صورت بالکل مسخ ہوچکی ہے، اس سلسلے کے مشہور بزرگ مولانا عین القضاۃ صاحب کی وفات مسلمانوں کے لیے ایک سخت قومی مصیبت ہے۔

مولانائے مرحوم، مولانا عبدالحئی صاحب کے فرنگی محلی کے ارشد تلامذہ میں تھے، وہ تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد انھی کے زمانہ میں مصروف درس و تدریس ہوگئے تھے اس زمانہ میں انھوں نے درس نظامیہ کی مشہور و متداول کتاب ہبذی پر ایک نہایت

مبسوط حاشیہ بھی لکھا تھا، جس میں مولانا عبدالحئی صاحب کے طرز تحریر کی وضاحت اور جامعیت پائی جاتی ہے لیکن اس کے بعد حلقہ ارادت میں شامل ہوکر علم وعمل کا بہترین نمونہ بن گئے اور تمام عمر نہایت زہد وتوکل کے ساتھ بسر کردی۔

ان کی زندگی ہمارے فقراء وصوفیہ کے لئے اس حیثیت سے نہایت سبق آموز ہے کہ انھوں نے یہ زاہدانہ طرز معاشرت فقر وفاقہ سے مجبور ہوکر نہیں اختیار کیا تھا، بلکہ کئی ہزار روپیہ ماہوار کے صرف سے ایک عظیم الشان مدرسہ قرآنیہ جاری کررکھا تھا، اور اس کے مصارف وہ خود اپنی جیب خاص سے بالکل نامعلوم طریقہ پر ادا فرماتے تھے، اس کے علاوہ سال میں ایک بار تمام شہر کو عام دعوت دیتے تھے، جس کا سلسلہ صبح سے شام تک قائم رہتا تھا۔

اب بعض لوگوں نے ان کی سوانح عمری لکھنے کا ارادہ کیا ہے، اور ہمیں توقع ہے کہ یہ کتاب جلد سے جلد شائع ہوکر ہمارے فقراء اور صوفیہ کے لئے موجب بصیرت ہوگی۔ (فروری ۱۹۲۵ء)

شوقؔ، احمد علی، شیخ

جناب شیخ احمد علی شوقؔ

نہایت افسوس ہے کہ کہنہ ادیب وشاعر شیخ احمد علی صاحب متخلص بہ شوق نے ۲۷/اپریل کو گونڈہ میں انتقال کیا، مرحوم ۱۸۸۲ء اور ۱۸۹۰ء کے درمیان لکھنؤ سے ''آزاد'' نام کا اخبار نکالتے تھے، جو اس عہد کے معزز ومشہور اخباروں میں تھا اور اس زمانہ کے ادباء کا مظہر خیال تھا اور سرسید کی تحریکات سے کافی ہمدردی رکھتا تھا، کئی چھوٹی چھوٹی مثنویوں کے بھی وہ مصنف تھے، اسیرؔ مرحوم کے وہ شاگرد تھے اور غالباً وہ اس خانوادۂ تربیت کی آخری یادگار باقی تھے، انہیں کے عہد میں اردو کی نئی شاعری کا آغاز ہوا، مرحوم ان قدیم شعراء میں تھے، جنہوں نے اس نئے رنگ کے قبول کرنے میں جھجک نہیں کی۔

ترانۂ شوق کے علاوہ ان کی غالباً آخری مطبوعہ مثنوی عالم خیال کے چار رخ اردو شاعری میں ایک نئی چیز ہے، کاش ان کے احباب واعزہ ان کے کلام کا مجموعہ شائع کرکے انکی روحانی یادگاروں کو زندہ رکھ سکیں۔ (''س''، اپریل ۱۹۲۵ء)

عبدالرزاق، ملا حاجی

ایک روشن خیال روشن ضمیر افغانی مصلح عالم کی وفات

ملا حاجی عبدالرزاق خان

اسلامی دنیا میں آج جس چیز کا سب سے زیادہ رونا ہے، وہ ایسے علمائے کاملین کا وجود ہے، جو دین ودنیا دونوں کے علوم وضروریات پر پوری نظر رکھتے ہوں جو علوم مذہبی اور علوم عصری دونوں کو یکجا تطبیق دینے کے خواہشمند ہوں، جو مذہب اور تمدن کو باہم منطبق کرسکتے ہوں، جو زمانہ حال کی ضروریات کے مطابق احکام مذہبی پر نظر رکھ کر ملک وقوم کی رہبری کا فرض انجام دے سکتے ہوں، جو مساجد کی امامت کے ساتھ صفوف جنگ بھی درست کرسکتے ہوں، جو رموز علمی کے پہلو بہ پہلو نکات سیاسی کو بھی سمجھ سکتے ہوں، ایسے علمائے مصلحین کا وجود کچھ نہ کچھ مصر وہندوستان وترکی وروس وتونس میں تو معلوم تھا، مگر افغانستان کی نسبت کسی ایسی مفید مقدس ہستی کا علم نہ تھا۔ امان، افغان کابل مورخہ ۲۴/رمضان المبارک ۱۳۴۳ھ سے ابھی اس کا حال معلوم ہوا اور ساتھ ہی وفات کی خبر پڑھی۔

ملا حاجی عبدالرزاق خان افغانستان کے امام وقت اور مشہور مدرس وعالم تھے، ہندوستان میں آخری تعلیم پائی تھی، ان کا سلسلۂ فیض بڑا وسیع تھا، افغانستان کے تمام نوجوان علماء ان کے شاگرد یا شاگرد کے برابر ہیں، ان کا تعلق ایک قدیم علمی خاندان سے تھا، مروجہ اسلامی ومشرقی علوم کے حصول کے بعد وہ ۴۰ سالوں سے درس وتدریس میں مشغول تھے اور آخر وقت تک یہی شغل جاری رہا، اگرچہ وہ تمام فنون میں درس دیا کرتے تھے، لیکن ریاضی، ہئیت اور حدیث میں ان کو کمال تھا، وہ اسلامی تاریخ، جغرافیہ واخلاقیات میں بھی واقفیت نام رکھتے تھے۔ ان علمی مشاغل کے باوجود موجودہ سیاست سے بھی کافی دلچسپی رکھتے تھے اور اسلامی اور ملکی سیاست سے اچھی طرح آگاہ تھے، وہ اسلام کی موجودہ ضروریات کی بناء پر علوم جدیدہ کی تحصیل کو ضروری سمجھتے تھے، چنانچہ انھوں نے اپنے چھوٹے بچے کو نئے مدرسہ میں داخل کردیا تھا اور اپنے دوسرے صاحبزادہ کو جو درسی کتابیں ختم کرچکے تھے جامع ازہر بھیجنا چاہتے تھے، لیکن سیاسی اسباب اس میں مانع آئے۔

حاجی صاحب مرحوم ایک متقی، پرہیزگار اور حق گو عالم تھے، ان کے دل میں اسلامی درد تھا۔ انھوں نے اسی سبب سے بہت کچھ مصائب کا سامنا بھی کیا ہے۔

دو گزشتہ امیروں کے زمانہ میں وہ دربار میں ملازم رہے، امیر حبیب اللہ خان مرحوم کے زمانہ میں مدرسہ شاہی کے مدرس ہوئے، اس خدمت کے علاوہ وہ فارغ اوقات میں طلبہ کو درس دیتے اور کتاب سراج الاحکام کی تصنیف میں مشغول رہتے، اس کے بعد وہ آخری عدالت مرافعہ ''میزان تحقیق'' کے صدر مقرر ہوئے، امیر امان اللہ خان کے ابتدائی عہد سے انھوں نے سرکاری ملازمت سے سبکدوشی حاصل کرلی تھی اور اپنے آخری ایام طلبہ کی تعلیم میں بسر کررہے تھے۔ وفات سے ایک ہفتہ پہلے زکام وبخار کی شکایت پیدا ہوئی اس نے نمونیا کی مہلک صورت اختیار کرلی اور وہ ۱۶/رمضان المبارک کو اس دنیا کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ گئے، دوسرے دن جنازہ اٹھایا گیا، تمام علماء، اکابر، اعلیٰ عہدہ دار اور وزراء شریک تھے، نماز میں خلقت کا ہجوم تھا، نماز کے بعد جنازہ کو لوگ

ان کے وطن غزنی لے گئے اور وہیں دفن کیا۔ (مئی ۱۹۲۵ء)

بہاری، محمد یوسف، مولانا مفتی

مولانا مفتی محمد یوسف بہاری

دارالعلوم ندوہ کے تعلیم یافتہ علماء میں مولانا مفتی محمد یوسف صاحب بہاری ایک لائق فاضل تھے، افسوس کہ انھوں نے ۵/اگست ۱۹۲۵ء کو بعارضہ فالج لکھنؤ میں انتقال کیا، وہ ندوی علماء میں فنون ادب عربی میں کامل دستگاہ رکھتے تھے، فراغت کے بعد اپنی زندگی دارالعلوم پر وقف کردی تھی اور اس وقت وہاں وہ ادیب اول کے عہدہ پر ممتاز تھے، باوجود اس کے کہ ان کو دوسری جگہ بیش قرار تنخواہیں ملتی تھیں، تاہم انھوں نے جس خلوص اور ایثار سے تقریباً دس برس مدرسہ کی خدمت کی وہ تعریف وستائش کی مستحق ہے، وہ نہایت خاموشی کے ساتھ اپنی خدمات ادا کررہے تھے، عربی رسائل میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے، عربی خواں طلبہ کی سہولت کے لیے شبلی بک ڈپو کے نام مصری مطبوعات کی بہم رسانی کا کام بھی انجام دیتے تھے، افسوس کہ ان کی جواں مرگی نے ہماری صف میں ایک ماتم برپا کردیا اور مدرسہ نے اپنے ایک لائق فرزند کے ساتھ اپنے ایک فاضل مدرس کو کھودیا، خدا مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے، مولوی ابوالحسنات ندوی مرحوم کی وفات کے بعد ہماری برادری میں یہ دوسرا صبر آزما سانحہ پیش آیا ہے، مسلمانوں میں جو قحط رجال ہے اس کو دیکھتے ہوئے، ان نونہالان چمن کی بے وقت پژمردگی کس قدر پُرحسرت ہے۔

؎ حسرت ان غنچوں پہ ہی جو بن کھلے مرجھا گئے

("س"، اگست ۱۹۲۵ء)

فرنگی محلی، عبدالباری، مولانا

فرنگی محل کی آخری شمع بجھ گئی!

آہ! مولانا عبدالباری!

وَمَا کَانَ قَیْسٌ ھُلْکُہٗ ھُلْکُ وَاحِدٍ

قیس کا مرنا صرف ایک آدمی کا مرنا نہیں ہے

وَلٰکِنَّہٗ بُنْیَانُ قَوْمٍ تَھَدَّمَا

بلکہ پوری قوم کی بنیاد کا گر جانا ہے۔

دریغا! کہ آج قلم کو اس مجسمۂ علم و اخلاص کا ماتم کرنا ہے جس کے وصف و مدح کا فرض اس کو بارہا ادا کرنا پڑا ہے، دارالعلم والعمل فرنگی محل کی کہنہ عمارتوں میں فضل و کمال، ایمان و معرفت اور زہد و ورع کی جو آخری شمع جل رہی تھی وہ ۱۹، ۲۰ کی درمیانی شب میں ہمیشہ کے لئے بجھ گئی۔

فرنگی محل کے متاخرین میں حضرت استاذ استاذی مولانا عبدالحیٔ کے بعد مولانا عبدالباری کی ذات نمایاں ہوئی تھی، جو بزرگ اجداد کی بہت سی روایایت کی حامل تھی، ارشاد و ہدایت، وعظ و نصیحت، درس و تدریس، درس و تدریس، تلاش و مطالعہ، تحریر و تالیف ان کے روزانہ مشاغل تھے، ان دینی و علمی مناقب کے ساتھ دین و ملت کی راہ میں ان کا جان فروشانہ جذبہ اور مجاہدانہ اخلاص ہمرنگ شہدا تھا۔

ذاتی اخلاق، جود وسخا، تواضع و انکسار، علم کی عزت، صداقت، حق گوئی ان کے اوصاف گراں مایہ تھے، وہ بے کسوں کے ملجا، مسافروں کے ماویٰ اور تنگدستوں کے دستگیر تھے، عبادت گزار، شب زندہ دار اور حق کے طلبگار تھے۔ ہندوستان میں ان کی ذات ذی اقتدار علماء کی حیثیت سے اس وقت فرد تھی، جدید تعلیم یافتوں کی سیاسی جدوجہد کو مذہبی تحریک بنادینا یقیناً انہیں کا کارنامہ شمار کیا جائے گا۔ اس لئے ان کی یہ غیر متوقع موت صرف فرنگی محل کا نہیں بلکہ اسلام کا سانحہ ہے اور بنابریں ان کی جواں مرگی ہمیشہ کے لئے تاریخ اسلام کا ایک اندوہناک واقعہ شمار ہوگا۔

شمع بجھ گئی، مگر اس کے دھویں کی سیاہی سے جریدۂ عالم پر یہ ہمیشہ لکھا نظر آئے گا:

رفتم و ازرفتن من عالمے تاریک شد
من مگر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم

مولانا مرحوم کا سن غالباً ۴۷ کے قریب ہوگا، مولانا عبدالحیٔ صاحب کے شاگرد خاص مولانا عین القضاۃ صاحبؒ سے لکھنؤ میں تحصیل کی، پھر حجاز گئے، وہاں حدیث کی سند لی، ملک شام کا سفر کیا، علماء سے فیض اٹھایا، مدینہ منورہ سے ہندوستان واپس آئے اور خدام کعبہ میں پر جوش شرکت کی، پھر مجلس خلافت اور جمعیۃ العلماء کی تاسیس میں حصہ لیا۔ ترک موالات کے علمبردار بنے۔

دوسری طرف فرنگی محل میں مدرسۂ نظامیہ کے نام سے ایک باقاعدہ مدرسۂ عربیہ کی بنیاد ڈالی اور اس کو ایک باقاعدہ مدرسہ بنایا، جس سے متعدد اصحاب فکر اور اہل قلم طلبہ پیدا ہوئے۔

انہوں نے اپنے بعد اپنی تالیفات وتصنیفات کی فہرست یادگار چھوڑی ہے، وہ فقہ حنفی کے پرجوش حامی تھے اور ان کی قلمی و علمی کوششیں زیادہ تر اسی کے متعلق صرف ہوتی رہیں، ان کی چھوٹی بڑی تصنیفات و رسائل کی فہرست ۱۰۰ کے قریب ہوگی، جن میں سب سے زیادہ مفید و کارآمد ان کی اردو تفسیر تھی، جو افسوس کہ ناتمام رہی، امام محمد کی سیر کبیر کا کام بھی ان کے پیش نظر تھا، علم حدیث میں بھی ان کے ایک دو رسالے ہیں۔ افسوس کہ یہ چشمۂ فیض اب ہمیشہ کے لئے خشک ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مرحوم کی خدمت میں نیازمند، ندوہ کے ایک خادم کی حیثیت سے اس وقت سے

تھا، جب وہ حجاز سے لوٹ کر آئے تھے اور مولانا شبلی مرحوم سے کبھی کبھی ملنے آیا کرتے تھے، یہ واقعہ ۱۹۰۸ء یا اس کے پس و پیش کا ہوگا، اس کے بعد وہ ندوہ کے رکن منتخب ہوئے تو اور تعلق پیدا ہوا.....مگر ایک دو سال کے بعد ۱۹۱۴ء میں استعفا دے دیا، طرابلس کی جنگ کے زمانہ میں شوکت علی مرحوم نے جب خدام کعبہ کی مجلس کی بنیاد ڈالی اور وہ اس کے صدر ہوئے اور یہیں سے ان کی سیاسیات کا ذوق بڑھنا شروع ہوا تو قرب اور بڑھا، ۱۹۱۳ء میں ہنگامۂ مسجد کانپور میں محمد علی و شوکت علی اور راجہ صاحب محمود آباد اور سرعلی امام اور لارڈ ہارڈنگ کی گفت و شنید میں مسلمانوں کی مذہبی نمائندگی کا فریضہ انہیں نے انجام دیا، اس کے بعد جب گزشتہ بڑی جنگ کے خاتمہ میں ترکی اور ملک شام وعراق و حجاز کے حصے بخرے ہونے لگے تو اس زمانہ میں مشہور پین اسلامی مصنف مشیر حسین قدوائی لندن میں تھے، مولانا سے ان کا سلسلۂ نیاز قدیم تھا، وہ لندن سے مولانا کو اسلامی سیاسیات کی مختلف تجویزیں لکھ لکھ کر بھیجا کرتے تھے اور ادھر محمد علی شوکت علی صاحب نے ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی تھی، ان دوگونہ تعلقات کی بنا پر مولانا اسلامی سیاسیات میں بیش از بیش بڑھتے چلے گئے، یہاں تک کہ ۱۹۱۸ء میں لکھنؤ میں ترکی اور خلافت کے مسائل پر غور کرنے کے لئے ایک بڑی نمائندہ کانفرنس جس میں تمام ہندوستان کے اکابر علماء اور زعماء اور عام مسلمان جمع ہوئے تھے، اس دردناک سانحہ کے وقت بھی اس سے زیادہ دردناک سانحہ یہ تھا کہ لکھنؤ کے رہنما متحد نہ تھے، مولانا عبدالباری ایک طرف اور چودھری خلیق الزماں اور بعض جدید تعلیم یافتہ لیڈر دوسری طرف نبرد آزما تھے، کانفرنس کا وقت آ گیا۔ رفاہ عام میں مجمع ہوگیا، نمائندے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے، دونوں طرف دو صدر، ایک طرف سے مسٹر فضل الحق صاحب کلکتہ اور دوسری طرف سیٹھ ابراہیم پونہ صدارت کے منتظر تھے، مگر گتھی سلجھتی نہ تھی، یہاں تک کہ کانفرنس شروع ہوگئی، بے مزہ تقریروں اور تفرقہ انداز گفتگوؤں میں صبح سے شام ہوگئی، یہاں تک کہ جلسہ اخیر عصر کو ختم کیا جارہا تھا کہ مولوی سید ظہور احمد صاحب مرحوم وکیل و سکریٹری مسلم لیگ نے مجھ سے کہ اسٹیج پر صدر کے قریب بیٹھا یہ تماشا دیکھ رہا تھا رسمی طور سے پوچھا کہ آپ تو کچھ نہیں کہیں گے، میں نے کہا اگر آپ اجازت دیں۔ صدر سیٹھ ابراہیم صاحب نے جن سے میری پونہ کی ملاقات تھی، خوشی سے اجازت دی، میں کھڑا ہوگیا، اللہ تعالیٰ کا عجیب فضل و کرم کہ خدا جانے مجھ میں کہاں سے ایسی موثر گویائی آگئی کہ ۱۵ منٹ کی تقریر میں صدر سے پائیں گریہ وبکا کا محشر بپا ہوگیا اور بگڑا ہوا جلسہ دم کے دم میں بن گیا، مولانا کو اس سے بڑی خوشی ہوئی اور برملا فرمایا کہ آکر ایک عالم ہی کی سیاست کامیاب ہوئی اور یہی واقعہ مولانا کے اس عاجز کے ساتھ حسن ظن کا سبب بن گیا، بڑی نوازش فرمائی، ۱۹۱۹ء کے دسمبر میں امرتسر کی خلافت کانفرنس میں جب یورپ کو وفد جانا طے ہوا تو میرا نام علماء کے نمائندہ کی حیثیت سے داخل فرمایا اور انہوں نے اپنی بہت سی تجاویز کے ساتھ یورپ کو روانہ فرمایا، وفد کو پہنچانے بمبئی تک آئے، اس موقع پر بمبئی میں جو شاندار استقبال ہوا وہ بھی یادگار تھا، چند اسٹیشن پہلے سے ٹرین سے اتار کر ہم لوگ اسپیشل سے بمبئی لائے گئے، بہرحال اس سفر میں ہفتہ بھر کی رودادِ سفر مولانا کو لکھتے رہنا میرے سپرد تھا، چنانچہ اس خدمت کو برابر انجام دیتا رہا۔ اور وہ خطوط ہندوستان بھر کے اخباروں میں اس زمانہ میں چھپے تھے، واپسی پر مولانا نے اپنے مدرسۃ نظامیہ کی طرف سے ایک مجمع میں مجھے ایڈریس پیش کردیا، اخباروں میں یہ اعلان کیا کہ اب ان کی واپسی کے بعد ملت کی خدمت ان کے سپرد کر کے سیاسیات سے دست کش ہوتے ہیں، مولانا کی یہ شفقت اور اخلاص وفد حجاز تک قائم رہا۔ حجاز کے مسائل میں ان کی رائے دوسری تھی، اس سلسلہ میں ان سے اختلاف رائے ہوا، تاہم ذاتی تعلق اخیر وقت تک قائم رہے۔ (”س“، جنوری ۱۹۲۶ء)

براؤن، ایڈورڈ

علمی دنیا میں نئے سال کا سب سے افسوس ناک سانحہ مشہور انگریز مستشرق پروفیسر ایڈورڈ جی براؤن کی وفات ہے، موصوف نے اس مہینہ کے آغاز میں غالباً ساٹھ پینسٹھ سال کی تخمینی عمر میں انتقال کیا، وہ پہلے کیمبرج میں فارسی کے لکچرر تھے، پھر ۱۹۰۲ء میں وہ عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے، انھوں نے طب کی تعلیم بھی حاصل کی تھی، عربی میں وہ پروفیسر پامر کے شاگرد تھے، ان کی سب سے جامع، مبسوط اور مشہور تصنیف لٹریری ہسٹری آف پرشیا کی ضخیم جلدیں ہیں، موصوف نہ صرف علمی حیثیت سے بلکہ ایک بے تعصب عالم، ایک ہمدرد مشرق اور ایک شریف انسان ہونے کے لحاظ سے بھی نہایت بلند درجہ تھے، قومی تنگ ظرفی اور مذہبی عصبیت سے وہ قطعاً مبرا تھے، ان آنکھوں کو یہ عزت حاصل ہے کہ انھوں نے مرنے والے کی زیارت کی تھی، آئندہ معارف میں ان کے کچھ حالات سپرد قلم ہوں گے، ہندوستان میں ان کو ہم سے بہتر جاننے والے اشخاص بلکہ ان کے شاگرد موجود ہیں، کیا بہتر ہو اگر ان میں سے کوئی صاحب ہماری مدد فرمائیں اور براؤن پر ایک عمدہ مضمون لکھ کر عنایت فرمائیں اور اگر احباب پسند کریں تو معارف کا ایک نمبر صرف براؤن پر شائع کیا جائے کہ ان کے احسانات کا یہ ادنیٰ ترین معاوضہ ہے۔ (”س“، جنوری ۱۹۲۶ء)

پروفیسر براؤن

(مولوی سید محمد طاہر)

۱۹۲۶ء کے آغاز ہی میں ایک ایسا ایران دوست دنیا سے اُٹھ گیا جس کا ثانی کوئی دوسرا نظر نہیں آتا، یعنی تقریباً چونسٹھ سال کی قابل قدر زندگی کے بعد ۶/ جنوری

۱۹۲۶ء کو پروفیسر براؤن نے اس دار فانی کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہا، ابتدائے عمر سے اخیر دم تک اس لائق ہستی نے مشرقی علوم وادب کی کوئی خدمت اٹھا نہ رکھی، تمدن اسلام اور اہل ایران سے جو دلچسپی پروفیسر موصوف کو تھی اس کا اندازہ ذیل کی چند سطور سے بخوبی ہوسکتا ہے۔

ایڈورڈ گرینوائل براؤن کی پیدائش ۷/ فروری ۱۸۶۲ء کو انگلستان کے ایک قصبہ یولی میں ہوئی، ان کے والد سر بنجامن براؤن نے انھیں ابتدائی تعلیم اُن کی ایک درسگاہ میں دلوائی جس کے بعد وہ کیمبرج کے پیروک کالج میں داخل ہوئے، جہاں سے انھوں نے ۱۸۸۲ء میں علم طب اور ۱۸۸۴ء میں علوم مشرقی میں اعزاز کے ساتھ گریجویٹ کی ڈگریاں حاصل کیں ۱۸۸۲ء میں ان کے والدین نے ان کے اشتیاق کو دیکھ کر تعطیل کے دو ماہ قسطنطنیہ میں گذارنے کی اجازت دی اور جب تحصیل علوم سے فارغ ہوئے تو ۱۸۸۷ء میں انھوں نے ایران کا سفر کیا جہاں دس مہینے ایرانیوں کی ''اندرونی'' حالت کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔

ان کے والدین کی دلی خواہش یہ تھی کہ وہ ڈاکٹری (طب) میں مہارت حاصل کریں اور ان کے مہربان استاد ڈاکٹر رائٹ نے بھی پرزور اصرار کیا تھا کہ اگر دنیا میں آرام سے بسر کرنا ہے تو علوم مشرقی کے خیال سے درگذرو، لیکن فطری شوق کم نہ ہوسکا اور گو ڈاکٹری سند حاصل کی لیکن اس کو اپنا پیشہ نہیں بنایا، عربیؔ، فارسیؔ اور ترکی زبانوں ہی کی بدولت نام ونمود اور شہرت حاصل کی۔

اپنی مشہور کتاب ''ایرانیوں کے ساتھ ایک سال'' کے دیباچہ میں وہ اپنے اوائل عمر کا ایک واقعہ خود لکھتے ہیں، کہ ۱۸۷۷-۷۸ء میں جب ان کی عمر محض چودہ پندرہ سال کی تھی، جنگ روم و روس شروع ہوئی، بیان ہے کہ ترکوں کی بہادری اور جان توڑ کوششوں کا حال پڑھ کر مجھے ان سے ایک گونہ ہمدردی ہوگئی اور ترکی معاملات سے اس قدر دلچسپی بڑھی کہ اسکی حکومت کے تحفظ کو اپنی جان سے عزیز سمجھنے لگا، پلونا میں ترکی کی شکست کا مجھے ایسا صدمہ ہوا کہ گویا خود میرے وطن اور قوم پر تباہی آگئی، میری دلی خواہش تھی کہ کسی طرح ترکی سپاہ میں داخل ہوکر ان کے ملک کی حفاظت میں اپنی جان تک قربان کرڈالو، وغیرہ وغیرہ

''تاریخ ادبیات ایران جلد دوم میں'' ایک جگہ لکھا ہے کہ اسلام اور عربؔ وعجم کے تمدن سے مجھے دلی الفت تھی۔ پروفیسر براؤن کو اسلام اور اہل اسلام سے جو ارادت تھی وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں، آج دنیائے اسلام عموماً اور ایران خصوصاً براؤن کا زیر بار احسان ہے، تمدن اسلام کا بیش بہا ذخیرہ جس کو ہم اپنے حافظہ سے بھی کھو چکے تھے، اسی کی بدولت ایک مرتبہ پھر ہمارے سامنے آگیا، یہ براؤن ہی تھا جو مغربی نژاد تھا، مغرب کا تعلیم یافتہ تھا، مغرب میں پرورش پائی تھی، اور مغرب ہی میں اپنی تمام عمر بسر کی تھی، تاہم وہ مشرق کا دلدادہ تھا، جب کبھی کوئی مشرقی معاملہ پیش آیا اس نے سررشتہ انصاف کو ہاتھ سے نہ چھوڑا اور وہ اپنے وطن والوں کے خلاف مشرق والوں کی پشت پناہی کے لیے کھڑا ہوگیا، مگر افسوس کہ آج پورے مشرق میں براؤن کا کوئی جانشین نظر نہیں آتا جو اسی کی طرح سچا اور با انصاف ہو، یورپین ہومگر ایشیائی تہذیب کا شیدائی، انگریز ہومگر ایران کا ہمدرد، عیسائی ہومگر اسلام کا فداکار، معارف نے پروفیسر موصوف کی سالگرہ کے موقع پر بالکل صحیح لکھا تھا کہ ''پروفیسر موصوف عام مستشرقین کی طرح صرف پیشہ کے طور پر اوریئنلسٹ نہیں بلکہ حقیقت میں ان کو مشرق، مشرقیاتؔ اور اسلامی علوم سے عموماً اور ایران سے خصوصاً ایک شغف، ایک عشق ہے، انھوں نے نہ صرف علمی حیثیت سے بلکہ اپنے رتبہ کے نیچے اُتر کر سیاسی حیثیت سے بھی مشرق اور ایران کی گراں بہا خدمتیں انجام دی ہیں''۔ (معارف ماہ مارچ ۱۹۲۲ء)

اس سالگرہ کے وقت یورپ کے مشہور مستشرقین نے مضامین لکھے اور ان کا مجموعہ ایک یادگار کی صورت میں ''براؤن میموریل ودلوم'' کے نام سے پروفیسر موصوف کی خدمت میں پیش کیا اور جس کا نام ان کے نام کی رعایت سے (E.G.B) عجب نامہ رکھا۔

اس عیسائی نما مسلمان نے اسلامی طرز وانداز، اور مسلمانوں کی بودوماند کو اپنا شعار قرار دے دیا تھا، نواب سید نصیر حسین صاحب خیال کیمبرج کے ایک اردو رسالہ نوائے کیمبرج جنوری ۱۹۲۱ء میں پروفیسر براؤن سے اپنی ملاقات کے ذکر میں رقم فرماتے ہیں کہ:

''ایک زینہ پر چڑھے، بائیں ہاتھ قدیم ہندوانی وضع کا دروازہ ملا اور اس پر نہایت چوب خوش خط نستعلیق میں نصر من الله فتح قریب، [الصّف:۱۳] لکھا پایا، حیرت ہوئی، ''دق الباب کیا''، آواز آئی come in (اندر آیئے) (جواب) منم مسافر، مشتاق شما۔

''بسم اللہ تشریف برآرید۔ اطاق فقیر است بسم اللہ''۔

اندر گئے تو معمولی کمرا، چارطرف میزیں پڑی، اور ان پر بے ترتیب کتابوں اور مسودات کا انبار، ایک طرف آتشدان روشن، اس کے قریب ایک سوفا اور دو تین آرام کرسیاں، بس باقی ہوس....... کمرے کا مالک مسکراتا ہوا آگے بڑھا، پذیرائی کی، ایک خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا، ''بفرمائید نوے بخاری'' (آگ کے پاس بیٹھو) دیکھا تو ہمارے رضا توفیق اور فہمی بے بھی کھڑے ہیں، سلام علیک وعلیک السلام ہم سب بیٹھے۔ ''یا اللہ''۔ کرسیاں آگ کے قریب کھنچ آئیں، اور صحبت گرم ہوگئی....... ایرانؔ کا ذکر، وہاں کے سفر کا حال، فارسی ادبا کی نقلیں، حکایات، اس ملک کے گذشتہ کارناموں کا فخریہ تذکرہ اور اس کی موجودہ حالت پر افسوس شروع ہوگیا۔

''دوبارہ ہم خیال مسافرتِ ایرانؔ وارید؟''۔ ''خیر حالا پیر شدم (افسردہ ہوکر)

''جوانی کجائی کہ یادت بخیر'' آقا پائے گدا ہم لنگ شدہ است''...... باتوں میں دیر ہوگئی معافی مانگی، رخصت طلب ہوئے، آقا براؤن نے ایرانی تہذیب کے موافق دعا دے کر اور پھر ملنے کا وعدہ لے کر اور ذرا خم ہوکر تا دم دروازہ پہنچایا۔ اور سب کو رخصت کیا، ''خدا حافظ، خدا حافظ شانی امان اللہ''۔

ذیل میں پروفیسر براؤن کی تصانیف کی ایک معمولی فہرست پیش کی جاتی ہے جس سے ان کی قابلیت اور عملی لیاقت کا حال ظاہر ہوسکتا ہے:

(۱) بابیانِ ایران ۱۸۸۹ء، پروفیسر براؤن نے ۱۸۸۷ء میں اپنی سیاحتِ ایران میں جو جوئی باتیں دریافت کی، ان کا اس رسالہ میں مفصل ذکر کیا گیا ہے، چونکہ مرزا علی محمد باب کے جدید مذہب نے اُس زمانہ میں بہت زور پکڑ لیا تھا، چناچہ اب تک وہی حال ہے اور ایرانیوں کا ایک بڑا گروہ اس مذہب کا معتقد ہے پروفیسر موصوف نے اس کا حال خاص کر درج تحریر کیا ہے، رسالہ مذکورہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں چھپا تھا۔

(۲) ایک سیاح کی سرگذشت (۱۸۹۱ء)، بیان حالات باب میں یہ ایک کتاب کی صورت میں فارسی انگریزی ترجمہ کے چھاپی گئی، بابی مذہب پر مفصل بحث کی گئی ہے۔

(۳) بابیوں کے قلمی نسخوں کا بیان (۱۸۹۲ء) مذہب باب کے متعلق ۲۷ قلمی کتابوں کی فہرست اور ہر کتاب کا مفصل ذکر ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں چھاپا گیا۔

(۴) ایرانیوں کے ساتھ ایک سال (۱۸۹۳ء) جس کا ذکر قبل میں آچکا ہے، سفر ایران کے مفصل واقعات درج ہیں، پروفیسر براؤن نے سخت تکلیفیں اٹھا کر ایران کے ہر طبقہ کے لوگوں کی سوسائٹی میں رہ کر ان کے اندرونی حالات معلوم کئے ہیں جس سے ایران کے خواص وعوام کی زندگی، طرز واطوار اور خیالات کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

(۵) تاریخ جدید (۱۸۹۳ء) مرزا علی محمد باب کے متعلق نئی تاریخ اور اس کی زندگی کا حال اصل فارسی سے انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

(۶) ایک قدیم تفسیر قرآن، (۱۸۹۴ء) جس کا مفصل ذکر ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں چھپا تھا۔

(۷) ایران کی مختلف زبانوں کی شاعری (۱۸۹۵ء) اس پر تنقیدی نظر کے ساتھ مفصل بحث ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں چھپی۔

(۸) فارسی قلمی نسخے (۱۸۹۶ء)، کیمبرج یونیورسٹی لائبریری کی کل قلمی کتابوں کی مکمل فہرست اور ہر ایک پر مفصل بحث کتاب کی صورت میں شائع ہوئی۔

(۹) گبری زبان کا نمونہ (۱۸۹۷ء)، ایران کی گبری زبان کے متعلق مفصل ذکر ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں چھاپا گیا۔

(۱۰) غدر زنجان کا چشم دید واقعہ (۱۸۹۷ء)، (۱۸۵۰ء) میں باب کے معتقدین نے جو بمقام زنجان ایک ہنگامہ مچایا تھا، اس کا چشم دید حال اصل کتاب فارسی سے انگریزی میں پروفیسر براؤن نے ترجمہ کرکے شائع کیا۔

(۱۱) فرقۂ حروفی کے مذہب اور کتابوں پر نظر (۱۸۹۸ء و ۱۹۱۳ء) ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں اس مذہب کا مفصل ذکر کیا گیا اور حروفیوں کی مذہبی کتابوں پر بحث کی گئی ہے، پھر ۱۹۱۳ء میں دوبارہ نہایت اضافہ کے ساتھ ایک طویل مضمون چھپا تھا۔

(۱۲) چہار مقالہ نظامی عروضی، سمرقندی، (۱۸۹۹ء) پروفیسر براؤن نے اس کا انگریزی ترجمہ سوسائٹی کے جرنل میں چھپوایا، اب علیحدہ کتاب کی صورت میں بھی شائع ہوگیا۔

(۱۳) نهایت الارب فی اخبار الفردوس و العرب (۱۹۰۰ء) اس پر مفصل بحث سوسائٹی کے جرنل میں چھپی۔

(۱۴) اسلامی قلمی نسخوں کی دستی فہرست، (۱۹۰۰ء و ۱۹۲۲ء) کیمبرج یونیورسٹی کی لائبریری کی کل قلمی کتابوں کی فہرست جو اسلام اور تمدنِ اسلام سے تعلق رکھتی ہیں، ایک کتاب کی صورت میں شائع ہوئی، پھر اسی کا سلسلہ دوسری جلد میں ۱۹۲۲ء میں چھاپا گیا۔

(۱۵) تذکرۃ الشعراء (۱۹۰۱ء) دولت شاہ سمرقندی کے فارسی تذکرۃ الشعراء کو پروفیسر موصوف نے بعد تہذیب وتحشیہ شائع کیا۔

(۱۶) تاریخ ادب ایران جلد اوّل، (۱۹۰۲ء) اوائل سے زمانہ فردوسی تک فارسی نظم و نثر پر معتبر ذرائع سے مفصل بحث کی گئی ہے، فارسی ادب پر اس سے بڑھ کر کوئی دوسری کتاب اس وقت موجود نظر نہیں آتی، فارسی شعراء اور مصنفین اور ان کی تصنیفات کا واضح طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

(۱۷) لباب الالباب، ۱۹۰۳ء تذکرۂ عوفی جو شعرائے فارس کا سب سے پرانا اور معتبر تذکرہ مانا گیا ہے، پروفیسر براؤن اور میرزا محمد قزوینی نے تالیف کیا۔

(۱۸) تاریخ طبرستان مصنفہ محمد ابن اسفندیار (۱۹۰۵ء) جس کا خلاصہ کر کے انگریزی ترجمہ پروفیسر موصوف نے شائع کیا۔

(۱۹) تاریخ ادب ایران جلد دوم (۱۹۰۶ء) بعد زمانۂ فردوسی سے زمانۂ شیخ سعدی تک فارسی ادب کی مفصل تاریخ ہے، اس سلسلۂ تاریخ ادبِ ایران سے پروفیسر براؤن کی ادبی خدمات کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔

(۲۰) فارس کے واقعاتِ حال کا مختصر افسانہ (۱۹۰۹ء) ملک ایران کی اس زمانہ کی خلاصہ تاریخ ہے، حکومت ایران کی حالت عوام کی نظروں کے سامنے پیش کی ہے، بیرونی مداخلت پر منصفانہ تنقید ہے۔

(۲۱) انقلاب ایران ۱۹۰۵ء۔۶ (۱۹۱۰ء) حکومت روس کی بیجا مداخلت کے نتائج، ایران کی بیکسی، برٹش گورنمنٹ کی پولیٹیکل چالیں اور ایرانیوں کی سادہ لوحی سے ان بیرونی اقوام کی دست درازیاں، حکومت ایران کی کمزوری، رعایا پر ناجائز دباؤ وغیرہ وغیرہ، ان پر ایک مفصل کتاب ہے جس سے پروفیسر موصوف کی ہمدردی اور انصاف

پسندی کا پورا پتہ چلتا ہے۔

(۲۲) تاریخ گزیدہ، مصنفہ حمداللہ مستوفی قزوینی، (۱۹۱۰ء) جسے پروفیسر براؤن و پروفیسر نکلسن نے بعد تہذیب وتحشیہ شائع کیا۔

(۲۳) کتاب نقطۃ الکاف، (۱۹۱۰ء) حاجی مرزا جانی کا شانی کی لکھی ہوئی سب سے پرانی کتاب کی تاریخ جسے پروفیسر براؤن نے ایک قلمی نسخہ سے تالیف کیا۔

(۲۴) سانحۂ فارس، (۱۹۱۲ء) ماہ دسمبر ۱۹۱۱ء میں فارس میں جو ایک سانحہ عظیم حکومت کی کمزوری کے باعث ظہور میں آیا، اس کے اسباب اور نتائج وغیرہ پر بحث کرکے محض چند یوم کے عرصہ میں یکم جنوری ۱۹۱۲ء کو شائع کرکے پبلک کے سامنے پیش کیا اور جس سے خاص مطلب برٹش گورنمنٹ کی امداد اور ہمدردی تھی۔

(۲۵) تبریز کی خونی حکومت اور انگریزوں کی جواب دہی (۱۹۱۲ء) واقعہ گذشتہ پر ایک مفصل کتاب لکھی اور جس میں یہ دکھلایا ہے کہ حکومت برطانیہ کا کیا فرض ہے، ماہ اکتوبر ۱۹۱۲ء میں شائع ہوئی، ایران اور اہل ایران سے پروفیسر براؤن کی دلچسپی کا اس سے پورا پتہ معلوم ہوتا ہے۔

(۲۶) اخبار و نظم ایران موجودہ (۱۹۱۴ء) حال کے شعرائے فارس کا تذکرہ اور ان کی نظم کا انتخاب ایرانی اخبارات اور رسائل کا ذکر، دو جلدوں میں۔

(۲۷) مواد متعلقہ مذہب باب (۱۹۱۸ء) بابیوں کے احوال کہاں سے دستیاب ہوئے، یا ہوسکتے ہیں ان پر مفصل بحث ہے۔

(۲۸) تاریخِ ادب ایران جلد سوم (۱۹۲۰ء) زمانۂ سعدی سے زمانۂ ملّا عبدالرحمٰن جامی تک شعراء کی نظم کا انتخاب معہ ترجمہ انگریزی درج کتاب ہے۔

(۲۹) طبّ عرب (۱۹۲۱ء) عربی زبان کی ان کتابوں کا خلاصہ جن میں دواؤں کا بیان ہے، اس موضوع پر دیگر زبانوں کی کتابوں کے حوالوں سے بحث بھی کی گئی ہے۔

(۳۰) ادب ایران جلد چہارم، (۱۹۲۵ء) زمانہ جامی کے بعد سے زمانہ حال تک، اس کتاب سے پروفیسر براؤن کی انتہائی دلچسپی کا پتہ جو انھیں فارسی ادب سے تھی ملتا ہے، پروفیسر موصوف کی یہ آخری تصنیف ہے۔

متفرقات: ترقی شاعری کی تاریخ جسے ایڈورڈ گب نامکمل چھوڑ کر مرے تھے، پروفیسر براؤن نے اس کو مدون ومکمل کیا، چھ جلدوں پر منقسم ہے، نہایت مشروح اور مفصل کتاب ہے، ایڈورڈ گب کی ماں نے اپنے شوقین بیٹے کی یادگار میں ایک ''وقف'' قائم کرکے فارسی عربی اور ترکی زبانوں کی کتابوں کا ذخیرہ جمع کیا، چنانچہ پروفیسر براؤن نے گب میموریل کی کتابیں بھی اپنی جانفشانیوں سے ترتیب دیں، علاوہ ان کے اور بہت سے مضامین ورسالے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے میگزین میں برابر نکلتے رہے، جس کا ذکر خالی از طوالت نہیں۔

اس مختصر فہرست سے براؤن کی ادبی وعلمی خدمات کا بخوبی پتہ چلتا ہے، اسلام اور ایران کے اس ہمدرد نے مصنف مزاجی کسی حالت میں ترک نہ کی، جسکا حال پروفیسر موصوف کی کتابوں کے مطالعہ سے ہمیں پوری طرح معلوم ہوتا ہے، آج براؤن ہم سے دور اور بہت دور کسی دوسری دنیا کی سیر میں مصروف ہیں، مگر ان کے کارنامے مثل روزِ روشن ہویدا ہیں، ہمارے دل براؤن کے نام پر بے اختیار تحسین کرتے ہیں، براؤن کا نام صفحۂ ہستی پر اس وقت تک کے لیے ثبت ہے، جب تک جمشید اور نوشیروان، رستم و اسفندیار فردوسی وسعدی، حافظ وجامی کا نام باقی ہے، ؎

سعدؔ یا مرد نکو نام نمیرد ہر گز
مردہ آنست کہ نامش بنکوئی نبرند

(مارچ ۱۹۲۶ء)

ندوی، عبدالرحمان نگرامی، مولانا

ہماری جماعت کا لعل شب چراغ گم ہوگیا

آہ! عبدالرحمانؔ

اس دو سال کے عرصہ میں ندوۃ العلماء نے اپنے کیا کیا گوہر آبدار کھوئے! ابوالحسنات مرحوم، مفتی یوسف مرحوم اور آہ کس زبان سے کہیں عبدالرحمان مرحوم! دارالعلوم ندوہ نے اپنی تیس برس کی مدت میں جتنے کارآمد اور علم دین کے خادم پیدا کئے، یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ عبدالرحمان ان سب سے بہتر تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کی ذات میں علم وعمل کی ساری خوبیاں جمع کردی تھیں۔

لَیْسَ مِنَ اللهِ بِمُسْتَنکَر اَنْ یَجْمَعَ الْعَالَمَ فِی وَاحِد

خدا سے یہ محال نہیں، کہ دنیا کو ایک ذات میں جمع کردے۔

مرحوم کا وطن نگرام تھا، جو ضلع لکھنؤ کا ایک مردم خیز قصبہ ہے یہاں کے انصاریوں کا خاندان مدت سے اپنے آس پاس اور اطراف اودھ میں علم وارشاد کی مسند ہے، مرحوم اسی خاندان کے فرزند تھے، وفات کے وقت ستائیس سال کی عمر تھی، گویا ۱۹۰۷ء کی پیدائش ہوگی، ابتدائی تعلیم گھر پر اپنے اعزہ سے حاصل کی غالباً ۱۹۰۷ء میں وہ دارالعلوم میں داخل ہوئے، اسوقت میں مدرسہ میں ادبیات کا معلم تھا اور مرحوم نے کچھ ابتدائی کتابیں مجھ سے پڑھیں تھیں، مرحوم کا بچپن آنکھوں کے سامنے ہے، اسی زمانہ سے جب وہ مدرسہ میں بہت چھوٹے سے تھے، وہ اچھی صاف اور سلجھی ہوئی تقریر کرتے تھے، چھوٹی سی عمر اور چھوٹے سے قد میں ان کی یہ ادا سی دل فریب تھی کہ وہ جلسوں میں تماشہ بن جاتے تھے۔ مولانا شبلی مرحوم جو اچھی استعداد اور قابل جوہر کے ہمیشہ جویاں رہتے تھے وہ خاص طور سے مرحوم کی تربیت سے دلچسپی رکھتے تھے، ایک دو

دفعہ جلسوں میں وہ اپنے ساتھ ان کو لے کر گئے، مدرسہ سرائے میر (اعظم گڑھ) کے پہلے یا دوسرے اجلاس میں مولانا جب ان کے ساتھ لائے تو اس بچہ کی زبان سے ایسے اچھے خیالات اور ایسی سنجیدہ تقریر سن کر لوگ حیرت میں آگئے۔

۱۹۰۸ء میں آریوں نے شدھی کا پہلا فتنہ اٹھایا تھا، مولانا شبلی مرحوم اس سے بے حد متاثر ہوئے تھے، گروکل کے اصول پر مولانا نے خدام الدین کی ایک جماعت بنائی تھی، جس میں ان طلبہ کو داخل کیا تھا، جن کے والدین یا اولیاء اپنے بچہ کو صرف مذہب کی خدمت کے لیے وقف کرسکیں، یہ بچے سادہ پہنے، سادہ کھانے اور سادہ رہنے کا عہد کرتے تھے اور زمین پر سوتے تھے، اس جماعت میں جو طلبہ داخل ہوئے ان میں ایک یہ مرحوم بھی تھے، یہ جماعت مٹ گئی، اس کا بانی رخصت ہوگیا، حالات بدل گئے، مگر عبدالرحمٰن مرحوم نے اس حیثیت سے جو عہد کیا تھا، اس کو اخیر تک پورا کیا۔

مرحوم نے سات آٹھ برس دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی، غالباً ۱۹۱۵ء میں انہوں نے مدرسہ سے تعلیم کی فراغت حاصل کی، اس سے ایک سال پہلے دیوبند جاکر مولانا محمود حسن صاحب سے بیعت کی اور اجازت حاصل کی، ۱۹۱۴ء میں مولانا شبلی مرحوم نے جو کام چھوڑے تھے ان کے متوسلین اور شاگردوں نے ان کا بار اپنے ناآزمودہ کار کندھوں پر اٹھالیا، ان میں ایک دارالمصنفین کا قیام اور دوسرا مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کا چلانا تھا، میرے ساتھ مولانا مسعودعلی اور مولانا عبدالسلام ندوی نے دارالمصنفین کا کام سنبھالا اور دوسری طرف مولانا حمید الدین صاحب کے زیر ہدایت مولانا شبلی متکلم ندوی نے مدرسہ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا، تعلیم سے فارغ ہوکر مرحوم بھی وابستگانِ شبلی کی جماعت میں داخل ہوگئے اور چار برس تک مدرسہ سرائے میر میں رہ کر درس و تدریس کا فرض انجام دیا اور مدرسہ میں زیر تربیت چند اچھے لڑکے پیدا کئے، اس اثناء میں اضلاع مشرقی میں جونپور سے گورکھ پور تک ان کی اصلاحی تقریریں مقبول ہورہی تھیں، اسی زمانہ میں حضرت مولانا حمیدالدین صاحب کے زیرسایہ قرآن پاک کا فیض حاصل کیا۔

ترک موالات کے شباب میں جب سرکاری مدارس توڑے جارہے تھے، مدرسہ عالیہ کلکتہ پر چھاپا مارا گیا اور اس کی جگہ مولانا ابوالکلام صاحب نے مدرسہ اسلامیہ جامع مسجد کلکتہ قائم کیا، اس وقت مرحوم سرائے میر سے کلکتہ گئے اور مدرسۂ اسلامیہ جامع کلکتہ کی صدری مدرسی کا عہدہ قبول کیا، مولانا ابوالکلام قید ہوئے، مدرسہ کی مالی حالت جیسی تھی وہ ظاہر ہے، اس مدرسہ کو مرحوم نے چند سال تک جس ایثار، جس محنت، جس جفاکشی سے چلایا وہ حد درجہ حیرت انگیز ہے، مدرسین کو سنبھالنا، لڑکوں کو تسکین دینا اور پھر شہر میں اس کا اثر قائم رکھنا معمولی بات نہ تھی، اس تمام مدت میں شاید ہی ان کو اپنے ذاتی معاوضہ کی فکر ہوئی یا ان کو وہ ہر ماہ مل سکا ہو، اس راہ میں کئی کئی وقت ان پر ایسے گزرے کہ فاقوں تک نوبت پہنچ گئی، لیکن پیشانی پر بل تک نہ پڑنے دیا۔

کلکتہ میں اس زمانہ میں شہر خلافت کمیٹی کے وہ صدر منتخب ہوئے اور پورے شہر کو اپنے اخلاص، ایثار و محبت سے گرویدہ بنالیا، خلافت کانفرنس کلکتہ میں وہ صدر استقبالیہ بنائے گئے اور کامیاب خدمات انجام دیں، جن کی یاد اب تک اہل کلکتہ کے دل میں ہے۔ ۱۰، مارچ کو جب میری زبانی کلکتہ میں ان کی وفات کی خبر پہنچی تو وہاں کے قومی کارکنوں کو سخت صدمہ ہوا وہ متوقع تھے کہ اجلاس جمعیۃ العلماء کے موقع پر میرے ساتھ وہ مرحوم بھی ہوں گے اور جب ان کو معلوم ہوا کہ میرے ساتھ وہ نہیں بلکہ ان کی حسرتوں کی نعش آئی ہے تو چہروں پر ایک عجیب عالم طاری ہوگیا۔

مدرسۂ اسلامیہ کلکتہ کے بانیوں نے جب مدرسہ کو بند کرنے کا تہیّہ کرلیا، تو ان کے دوستوں نے ان کو وہاں سے ہٹالینا مناسب سمجھا، چنانچہ وہ میرے اصرار پر کلکتہ سے لکھنؤ آئے اور ۱۹۲۳ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ادب وتفسیر کی خدمت ان کے سپرد کی گئی، جس کو انھوں نے آخر تک انجام دیا۔

ان کو وجع مفاصل کی اکثر شکایت رہتی تھی، مئی ۱۹۲۵ء میں وہ اس عارضہ میں بیمار تھے اور نقیہ ہوگئے تھے، اس وقت سے جو ان کی علالت کا سلسلہ شروع ہوا وہ ۶/ مارچ ۱۹۲۶ء کو ختم ہوا، بیچ بیچ میں تندرست بھی ہوگئے، مگر مسلسل صحت قائم نہیں رہی، ستمبر ۱۹۲۵ء میں ان کو معدہ وجگر کی خرابی کی بیماری ہوئی اور یہ ممتد رہی نومبر میں کچھ افاقہ ہوا تو وہ انبالہ ندوۃ العلماء کے جلسہ میں گئے، وہاں سے واپس آکر پھر طبعیت خراب ہوئی، مدرسہ سے رخصت لے کر مکان گئے اور اس کے بعد وہ اکثر رخصت ہی پر رہے، بہرائچ میں ان کے بعض اعزہ مطب کرتے ہیں، ان کے اصرار پر وہ بغرض علاج بہرائچ گئے اور وہاں اصل مرض میں افاقہ ہوتا رہا کہ دفعتہً ان کے داہنے پاؤں میں سرطانی پھوڑا نمودار ہوا۔ جس پر ۵/ مارچ ۱۹۲۶ء کو عمل جراحی کیا گیا، جو بظاہر کامیاب ہوا، یہ پھوڑا اس قدر کم اہم سمجھا گیا کہ ان کے وطن میں بھی اطلاع کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

۵/ مارچ ۱۹۲۶ء کا دن گزر کر رات کو کچھ گھبراہٹ کے آثار ظاہر ہوئے، مگر صبر و استقلال کے اس مجسمہ نے تیمارداروں کو خود مطمئن کردیا، ۶/ مارچ ۱۹۲۶ء کو صبح کو نماز فجر کے وقت نبض جب غیر منتظم پائی گئی، تو ان کے طبیب و معالج و رفیق و عزیز حکیم صاحب لکھتے ہیں کہ ''اس وقت انہوں نے جو جوابات دیئے وہ ایسے شخص کی زبان سے جس کی حالت بالکل غیر ہورہی ہو، حد درجہ حیرت انگیز تھے، اس کے بعد خود وضو کیا اور نماز فجر ادا کی، ادھر سلام پھیرا اور ادھر ایک ہچکی کے ساتھ عبدالرحمان، رحمان کے پاس پہنچ گیا، اس دن کو شام کو بعد مغرب لکھنؤ سے دارالمصنفین خبر پہنچی، یہ تار برقی نہ تھی ایک بجلی تھی جو دل پر گری اور تمناؤں کے خرمن کو خاک وسیاہ کرگئی۔

مرحوم کی وفات سے نوجوان طبقۂ علماء میں جس رکن کی کمی ہوئی اور ہندوستان

میں مذہبی، اصلاحی تحریک کو جو صدمہ پہنچا، اس کا یقین ان کو کس طرح دلائیں جو اس سے واقف نہ تھے، وہ ان لوگوں میں نہ تھا، جو مسائل مذہبی اور ضروریات زمانہ میں تطبیق دیتے وقت مذہب کا پلہ ہلکا کر دیتے ہیں، وہ ہمیشہ سے ایک خاموش مذہبی آدمی تھا، تقویٰ اور دینداری اسکے فضل وکمال کا زیور تھا، اکثر وہ لوگ جو اصلاحی خیالات رکھتے ہیں عملاً مذہب میں کمزور ہوتے ہیں مگر اس کی ذات خشک وتر کا مجموعہ تھی، وہ حددرجہ مذہبی اور حد درجہ مصلحانہ تھا۔

اس کی تحریر وتقریر کا ایک ایک حرف مذہبی واخلاقی اصلاحات کا دفتر ہے۔

اس کے قلمی خیالات کا پہلا عکس مقالہ خواتین اسلام ہے، اس کو رسالہ کی صورت میں ہر ہائنس سرکار عالیہ بھوپال کے اعلان پر غالباً ۱۹۱۸ء میں مرحوم نے لکھا تھا، یہ رسالہ ۵۷ صفحوں کا اپنے موضوع میں منفرد ہے، اس میں آیات واحادیث کی روشنی میں عورتوں کے فضائل، مناقب، حقوق، فرائض اور اولیات بیان کئے ہیں، اتفاق سے میرا بھوپال جانا ہوا، تو معلوم ہوا کہ ہر ہائنس نے اس کو پسند فرمایا اور دیکھا کہ اپنے دستِ خاص سے جابجا اس پر بعض مباحث کے متعلق مزید تفصیل چاہی ہے، میں اس رسالہ کو بھوپال سے اپنے ساتھ لیتا آیا اور جون جولائی ۱۹۲۱ء کے معارف میں تھوڑی تمہید کے ساتھ شائع کیا۔

سرائے میر کے قیام کے زمانہ میں مدرسہ کے طلبہ کے لئے حدیث وادب کی تعلیم کے لئے لآلی الحکم نام سے مرحوم نے ایک رسالہ لکھا اور وہ چھپا، اس میں وہ حدیثیں یکجا کی گئی ہیں جو معنوی تعلیم کے علاوہ لفظی حیثیت سے بھی ادب عرب کی جان ہیں، انہی دنوں میں میری تالیف لغات جدیدہ کو جس کی ترتیب عربی سے اردو ہے، انہوں نے بدل کر اردو سے عربی کر کے میرے پاس بھیجا، وہ مسودہ اب تک غیر مطبوع ہے، اسی زمانہ میں عیدالضحیٰ کا ایک عربی اردو خطبہ لکھا تھا۔

قیام کلکتہ کے زمانے میں سیاسی مضامین مختلف مذہبی اور فرضی افسانوں کی صورت میں لکھے، اور اخبارات میں شائع ہوتے رہے، اس قسم کے مضامین کا ایک مجموعہ ''درس آزادی'' کے نام سے لاہور کے ایک تاجر کتب نے شائع کیا ہے، ''عدم تشدد کی فتح''، ایک اور سیاسی رسالہ کا عنوان ہے، جو کلکتہ میں لکھا گیا تھا، خلافت کانفرنس کلکتہ کا استقبالیہ خطبۂ صدارت بھی مطبوع ہے، انجمن تبلیغ الاسلام نگرام کے صدر کی حیثیت سے یہ سن کر کہ آریہ سیتارتھ پرکاش کو عراق عرب میں شائع کرنا چاہتے ہیں، مرحوم نے مولانا ثناء اللہ امرتسری کی حق پرکاش کا حشو وزوائد نکال کر عربی میں ترجمہ کیا۔ اور اس کا نام نورالحق رکھا اور وہ زیر طبع ہے، ندوہ میں میری فرمائش سے عربی میں منطق پر ابتدائی رسالہ لکھا، عزیز مرحوم کے اصلاحی خیالات کا سب سے بڑا مظہر سچ لکھنؤ تھا، جس کے وہ شریک انشاء تھے، دو سال سے ہر ہفتہ وہ کسی نہ کسی مفید عنوان پر نہایت سادہ عبارت اور پرتاثیر انداز میں مضامین لکھا کرتے تھے۔

مرحوم نے ندوہ میں انگریزی بھی پڑھی تھی اور اس میں تھوڑی استعداد بھی پیدا کی تھی، قدیم عربی تصنیفات کا مطالعہ کا بھی شوق تھا اور اس میں بڑی وسعت نظر پیدا ہوگئی تھی، مرحوم کا اصل فن ادب نہ تھا، تاہم وہ اس فن کی مشکل کتابیں پڑھاتے تھے، عربی میں برجستہ انشاء پردازانہ مضامین لکھتے تھے، چنانچہ رسالہ الجامعہ کلکتہ میں دو تین مضامین ان کے نکلے تھے، عربی میں بلاتکلف گفتگو کرتے تھے اور اسی طرح فلسفہ وکلام کی کتابیں بھی وہ دیکھتے تھے، مگر اصلی ذوق ان کا اصلاحی وتجدیدی ہی تھا، اسی لئے علامہ ابن تیمیہ کی تصانیف کے وہ بے حد شائق تھے، سرائے میر کے قیام کے زمانہ میں حضرت مولانا حمید الدین سے تفسیر کا جو فیض اٹھایا، وہ اثر ان پر مستقل قائم ہوگیا، مشہور کتب احادیث پر بھی ان کی خاصی نظر تھی۔

یہ فضل وکمال، تقریر وتحریر، مطالعہ، و وسعت نظر تو الگ چیزیں ہیں، مرحوم کی زندگی کا اصلی جوہر اس کے اخلاق تھے، سرتاپا انکسار، سرتاپا تواضع، حددرجہ فروتن، مگر اسی کے ساتھ حددرجہ بے نیاز، غنی نفس، بلند حوصلہ، اپنے اساتذہ اور بزرگوں کا حددرجہ لحاظ رکھنے والا مطیع وفرمانبردار مگر اسی کے ساتھ خدا کے سوا ہر بڑائی سے نڈر اور ہر کبریائی سے بے خوف، ترک موالات کے زمانہ میں اعظم گڑھ اور کلکتہ میں ان کی سیاسی تقریریں حددرجہ بلا انگیز ہوتی تھیں مگر اس کا دل کبھی خوف سے آشنا نہیں ہوا، بڑوں بڑوں کے سامنے اظہار حق میں خاکساری وتواضع کے اس پیکر کی آنکھ نہیں جھپکی، اس کا پورا عہد جوانی وشباب اس زہد وسادگی سے گزرا کہ زہد وسادگی کو بھی اس کی جوانی پر رحم آگیا ہوگا، گاڑھے کا لمبا کرتا، سادی دو پلی ٹوپی اور اسی کا پائجامہ جو پہلے پہنا، وہ اخیر تک جسم پر رہا، ترک موالات سے اس کی وفاداری بہتیروں کی طرح صرف دکھاوے کی نہ تھی، بلکہ وہ جلوت میں جس طرح ظاہر کرتا تھا، خلوت میں بھی اسی طرح تھا، میں نے شیروانی پہننے کے لئے بہت اصرار کیا، مگر غریبانہ تبسم کے سوا جو اس کے چہرے کا نور تھا اور کبھی کچھ جواب نہ دیا، جاڑوں میں کبھی ایک دو کمبل سے زیادہ نہیں اوڑھا، وہی بچھونا وہی اوڑھنا۔

وہ انسان کی صورت میں ایک فرشتہ تھا، اس نے نوجوان ہوکر اپنے اخلاق اور دینداری سے بوڑھوں کو شرمایا، ایک دفعہ ایک تقریب سے جس میں ہم سب شریک تھے، وہ صرف اس لئے اٹھ آئے کہ اس میں انگریزی باجہ بجے گا، عبدالرحمٰن! تو گیا اور ہمیشہ کے لئے گیا، تو نے علماء اور مسلمانوں کے سامنے اپنی زندگی کا نمونہ پیش کیا، اہل ایمان کی شہادت ہے کہ تیری زندگی خدا کے حضور معتبر ٹھہری، تو رحمت الٰہی کی گود میں مسرور ہوگا، لیکن ہم تیری جدائی میں اشک بار ہیں، تیرا جسم لحد خاکی میں ہے، مگر تیری یاد تیرے دوستوں کے دلوں میں ہے، تیری روحانی آرزو پوری ہوچکی، لیکن تیری ذات سے ہماری مادی آرزوئیں ناتمام رہیں اور شاید اب وہ ہمیشہ کے لئے ناتمام ہیں، مرنا

ایک دن سب کو ہے، افسوس اس کا ہے کہ تو آیا اور گیا، مگر لوگ تجھے پہچاننے نہ پائے۔
(''س''، مارچ ۱۹۲۶ء)

۱؎ جن میں سے ایک آج مولانا امین احسن اصلاحی کے نام سے مشہور ہیں۔

بہاری، نورالہدیٰ ندوی، مولوی

مولوی نورالہدیٰ ندوی بہاری

مولانا عبدالرحمان مرحوم کے ماتم سے ابھی آنکھیں خشک نہیں ہوئی تھیں کہ ہم کو ندوہ کے ایک دوسرے قابل فرزند مولوی نورالہدیٰ ندوی کے ماتم میں اشک بار ہونا پڑا، جو مقاصد ندوہ کی تکمیل میں ابھی تگ ودو کر رہا تھا، مرحوم نے تقریباً سات سال تک ندوہ میں عربی کی تعلیم حاصل کی، پھر تین سال مدرسۃ الٰہیات کانپور میں بسر کر کے انگریزی شروع کی اور اس سال بی اے آنرز کا امتحان دیا تھا اور اس کے بعد ہم ان سے مقاصد ندوہ کے مطابق ہر قسم کی علمی توقعات قائم کر سکتے تھے، جن کے آثار ان کی زندگی کے نہایت ابتدائی دور سے نمایاں تھے اور تعلیمی ترقی کے ساتھ ساتھ ان میں بھی تدریجی ترقی ہوتی جاتی تھی، چنانچہ وہ پہلے ندوہ میں طلبہ کے قلمی رسالہ الاصلاح کے اڈیٹر رہے، پھر کلکتہ میں ایک روزنامہ کو اڈٹ کیا، رسالہ حور جو کلکتہ سے نکل کر چند ماہ کے بعد بند ہوگیا، انہیں کے دست و بازو کے بل پر نکلتا رہا۔ معارف میں بھی انہوں نے بعض مضامین لکھے تھے، لیکن اب تکمیل کے بعد جب کہ یہ توقعات باضابطہ اور مستقل صورت اختیار کرتیں:

این ماتم سخت است کہ گویند جوان مرد

(''س''، جون ۱۹۲۶ء)

بلگرامی، سید حسین، نواب عمادالملک مولانا

آہ! عمادالملک مرحوم

نواب محسن الملک، نواب وقارالملک اور مولانا شبلی کی وفات کے بعد ہماری بزم علم میں ادب صرف ایک چراغ سے روشن تھی، لیکن افسوس کہ ۳؍ جون ۱۹۲۶ء کو باد حوادث کے جھونکوں نے اس کو بھی گل کر دیا، نواب عمادالملک بہادر مولوی سید حسین بلگرامی کی وفات ایک ایسا جاں گداز حادثہ ہے، جس پر قدیم و جدید دونوں گروہ یکساں رنج والم کے ساتھ ماتم کریں گے، ایک طرف تو وہ انگریزی زبان کے بہت بڑے عالم اور انشاء پرداز تھے، دوسری طرف قدیم مشرقی علوم وفنون میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے اور ان کے بقا و قیام اور اشاعت میں نہایت دلچسپی اور ہمدردی کے ساتھ ہر ممکن اعانت کے لئے آمادہ رہتے تھے، دائرۃ المعارف، دارالمصنفین، ندوہ، مسلم یونیورسٹی، غرض اس وقت قدیم و جدید علوم وفنون کے جس مرکز قدر ہندوستان میں قائم ہیں سب کے سب ان کی علمی دلچسپی، علمی اعانت اور علمی سرپرستی کے ممنون تھے، اب انکے در و دیوار سے ایک مدت تک ان کے ماتم کی صدائے بازگشت آتی رہے گی کہ:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

نواب صاحب مرحوم کا خاندان اودھ کے مشہور مردم خیز قصبہ بلگرام سے تعلق رکھتا ہے، لیکن ان کے دادا ماجد چونکہ اعلیٰ انگریزی سرکاری ملازمت کے سلسلہ سے بہار، بنگال میں رہتے تھے، اس لئے ان کی پیدائش اور ابتدائی نشوونما کا دور بہار اور بنگال میں گزرا، وہ ضلع گیا میں ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے اور چودہ پندرہ سال کی عمر تک خانگی طور سے مقامی علماء سے عربی و فارسی کی تحصیل کی، اس طرح عربی کی متوسطات تک تعلیم کے بعد انگریزی کی طرف توجہ کی، پہلے بھاگلپور میں، پھر پٹنہ میں اور اس کے بعد کلکتہ کے انگریزی اسکولوں میں تعلیم پا کر ۱۸۶۱ء میں آنرز کے ساتھ درجۂ اول میں بی۔اے پاس کیا، تعلیم سے فارغ ہوکر اپنے علمی ذوق کی مناسبت سے ملازمت کے لئے سررشتۂ تعلیم کو پسند کیا اور کیننگ کالج لکھنؤ میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے، لیکن قدرت کو ان سے بلند کام لینا تھا، وہ انگریزی زبان کے بہت بڑے ادیب تھے، ۱۸۷۲ء میں سرسالار جنگ اعظم جو اس وقت دولت آصفیہ کے مدارالمہام تھے، بطریق سیر وسیاحت لکھنؤ آئے، ان کو انگریزی کے اچھے پرائیویٹ سکریٹری کی ضرورت تھی، جو انگریزی مراسلات کے کاموں کو انجام دے سکے، لکھنؤ میں جنرل بارو نے اس کے لئے ان کا انتخاب کیا اور ان کو پسند کیا اور حیدرآباد طلب فرمایا، چنانچہ وہ ۱۸۷۳ء میں حیدرآباد پہنچ کر سرسالار جنگ کے پرسنل اسسٹنٹ مقرر ہوئے اور ۱۸۷۴ء تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے، اس کے بعد سرسالار جنگ یورپ کے سفر سے جب واپس آئے تو ان کو اپنا پرائیویٹ سکریٹری اور صیغۂ متفرقات کا معتمد مقرر کیا، جس میں سررشتۂ تعلیم اور متعدد چھوٹے چھوٹے محکمے شامل تھے۔ اس کے جب اعلیٰ حضرت نواب میر محبوب علی خان بہادر مسند آراء سلطنت ہوئے تو نواب صاحب کو اپنا پرائیویٹ سکریٹری مقرر فرما کر علی یار خان موتمن جنگ بہادر کا خطاب عطا فرمایا اور چند سال کے بعد ان کو عمادالدولہ اور پھر عمادالملک کے خطابات عطا ہوئے، تھوڑے زمانہ کے بعد وہ ریاست کے محکمۂ تعلیمات کے ناظم یعنی ڈائریکٹر اور شہزادہ ولی عہد میر عثمان علی خان بہادر کی تعلیم و تربیت کے نگران مقرر ہوئے، انہوں نے اپنی مفوضہ سرکاری خدمات کو جس خوبی سے ادا کیا اس کا اعتراف انگریزی گورنمنٹ نے بھی کیا، گورنمنٹ انگریزی نے ۱۹۰۳ء میں ان کو اپنی مجلس وضع قوانین کا رکن نامزد کیا، پھر چند سال کے بعد جب اصلاحات مارلے نافذ ہوئیں، تو وہ وزیر ہند کی مجلس کے رکن ہوکر انگلستان چلے گئے اور ۱۹۰۸ء

سے ۱۹۰۹ء تک اس معزز منصب پر وہاں رہے، وہاں ان کی صحت اچھی نہیں رہی، اس لئے مستعفی ہوکر ہندوستان واپس آگئے، اب اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خان کی جگہ پر حیدرآباد کی مسند پر اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خان جلوہ فرما تھے، نواب سالار جنگ ثالث جواب بھی نوجوان ہی تھے، مدارالمہام مقرر ہوئے تھے، اعلیٰ حضرت عثمان علی خان نے نواب عمادالملک کو ان کی مدد کے لئے مشیرالمہام مقرر کیا، لیکن یہ زمانہ جلد ختم ہوگیا اور نواب صاحب گوشہ نشین ہوکر صرف علمی مشاغل میں مصروف ہوگئے۔

نواب صاحب کو حقیقت میں صرف علمی ہی ذوق تھا اور وہ اسی لئے بنے تھے، ان کا سارا دن کتابوں کے مطالعہ میں گزر جاتا تھا، دقیق علمی کتابوں سے تھک جاتے تھے تو انگریزی افسانوں کی کتابیں پڑھا کرتے تھے، عربی کی الف لیلہ سے ان کو بڑی دلچسپی تھی، اخیر زمانہ میں ان سے جب ملاقات ہوئی، اس کی تعریف ضرور فرمائی، ان کا ذاتی کتب خانہ بہت اعلیٰ درجہ کا تھا، جس میں عربی، فارسی، انگریزی فرنچ کی عمدہ عمدہ کتابیں تھیں، کچھ خاندانی قلمی کتابیں تھیں، مگر اکثر خود انکے ذاتی ذوق وشوق کا نتیجہ تھیں، میں نے ۱۹۰۸ء میں اس کتب خانہ کو دیکھا تھا، عربی شعراء کے سادہ اشعار کو نہایت پسند کرتے تھے، انگریزی نہایت سادہ اور سہل ممتنع لکھتے تھے اور نہ صرف انگریزی نثر میں کمال رکھتے تھے، بلکہ انگریزی کے بہت بڑے شاعر بھی تھے، مگر اس کے باوجود ان کو یہ بڑا کمال حاصل تھا کہ اردو گفتگو اور تحریر میں کوئی انگریزی لفظ نہیں بولتے تھے، بلکہ ہندوستانیوں سے وہ انگریزی میں بات کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور اس کے عجیب عجیب واقعے سننے میں آئے ہیں، اخیر عمر میں مولانا شبلی مرحوم کی تحریک سے انہوں نے قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ شروع کیا تھا جو سولہ پاروں تک ہوکر ضعفِ بصارت وعلالت کی وجہ سے رک گیا، اس ترجمہ میں بالکل بائیبل کی زبان اختیار کی ہے، انگریزی کے علاوہ فرانسیسی زبان کے بھی ماہر تھے اور اس سے بے تکلف ترجمہ کرسکتے تھے، بنگالہ میں نشوونما ہونے کی وجہ سے بنگالی زبان بھی بے تکلف بولتے تھے، ان کو اردو شاعری سے بھی ویسی ہی دلچسپی تھی، چنانچہ میر کے کلام کا انتخاب بھی انہوں نے کیا تھا جو چھپ گیا ہے، ان کی اردو تحریر بالکل سادہ لیکن رواں ہوتی تھی اور انہوں نے بہت سے علمی، ادبی، فلسفیانہ اور تاریخی مضامین لکھے، جن کا مجموعہ رسائل عمادالملک کے نام سے ابھی چھپا ہے، وہ ہمیشہ علماء وفضلاء کے قدردان رہے، ان کو ایک عالم یا طالب العلم کی صحبت میں چاہے وہ کتنی ہی کم حیثیت کیوں نہ ہو، بڑا لطف آتا تھا۔

مولانا شبلی مرحوم سے ان کا تعلق سرسید کے زمانہ سے اور انہیں کے واسطہ سے ہوا تھا، چنانچہ مرحوم ان کی بڑی قدر فرماتے تھے، ''الفاروق'' کی تالیف میں ان کی حوصلہ افزائی کو بھی دخل ہے، جامعہ عثمانیہ جس کا پہلا نام حیدرآباد کی مشرقی یونیورسٹی پڑا ہوا تھا، اس کے نصاب اور خاکہ کی تیاری کے لئے مولانا شبلی مرحوم کا انتخاب انہیں کے اشارہ سے ہوا تھا اور ۱۹۱۴ء میں مولانا شبلی مرحوم کی ماہانہ تنخواہ میں دوسو ماہوار کا اضافہ نواب صاحب ہی کی تحریک سے اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خان نے منظور فرمایا۔

مولانا شبلی مرحوم سے اسی تعلق اور دارالعلوم ندوہ کی تعلیم میں مشرقی ومغربی علوم و فنون کی جامعیت کی بناء پر اس سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے، چنانچہ ۱۹۰۸ء میں انہوں نے ندوہ کو اپنا قیمتی کتب خانہ عطا فرمایا اور ہر موقع پر طلباء ندوہ کی سرپرستی وقدردانی کرتے رہے، آج دائرۃ المعارف حیدرآباد میں ندوہ کے جو فارغ التحصیل طلبہ کام کررہے ہیں، وہ ان کی اس قدردانی وسرپرستی کے مشکور ومعترف ہیں اور ندوہ سے اپنی اس دلچسپی کو حیدرآباد کی تعلیمی کانفرنس کی صدارتی تقریر میں ظاہر بھی کردیا ہے۔

مولانا شبلی کی نسبت اور ایک علمی مرکز ہونے کی حیثیت سے انہوں نے دارالمصنفین کے ساتھ ابتدا ہی سے اپنا شغف ظاہر فرمایا اور جس کو اخیر زندگی تک قائم رکھا، چنانچہ جب دارالمصنفین قائم ہوا تو انہیں کی سفارش سے مولانا شبلی مرحوم کی تین سو ماہوار سرکار آصفیہ نے دارالمصنفین کے نام منتقل کردی، اس کے ساتھ خاص اپنی جیب سے انہوں نے اس کے لئے سالانہ سو روپے کی رقم مقرر فرمائی اور مجھے لکھا کہ دارالمصنفین پہلا انسٹیٹیوشن ہے جس کے لئے میں یہ مستقل رقم مقرر کرتا ہوں، لیکن یہ رقم ان کے حوصلہ کے مطابق نہ تھی، اس لئے اس پر ہمیشہ تاسف وندامت کا اظہار کرتے رہے، وہ دارالمصنفین کی مجلس منتظمہ کے پہلے صدر نشین تھے اور اخیر تک اس تعلق کو قائم رکھا، معارف کا بالاستیعاب ہمیشہ مطالعہ فرماتے تھے اور جو مضمون پسند آتا اس پر خوشی ظاہر کرتے اور اس کے لکھنے والے کے حالات دریافت فرماتے، مولانا عبدالباری ندوی سے ان کا تعارف اسی طرح ہوا، دارالمصنفین کی تصنیفات جب ان کی خدمت میں بھیجی جاتی تھیں تو ان کو لازمی طور پر پڑھتے تھے اور اگر ضعف وعلالت کی وجہ سے خود نہیں پڑھ سکتے تھے تو دوسروں سے پڑھوا کر سنتے تھے اور ان تصنیفات پر مجھے جو خط لکھتے تھے، اس میں ان کی داد دیتے تھے، اور اپنی مسرت کا اظہار کرتے تھے، علمی حیثیت سے ان کی سب سے بڑی یادگار مجلس دائرۃ المعارف حیدرآباد ہے، جو ہندوستان میں اپنے قسم کی پہلی یادگار ہے، آج ہندوستان میں عربی زبان کی قدیم ونادر کتابوں کی طبع و اشاعت کا کوئی سامان نہیں ہے، جدید تعلیم یافتہ گروہ کو تو اس کی پروا ہی نہیں، لیکن قدیم تعلیم یافتہ جماعت نے بھی اس کی طرف توجہ نہیں کی، نواب صاحب مرحوم پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور حیدرآباد میں اس غرض کے لئے ایک مستقل انجمن دائرۃ المعارف کے نام سے قائم کی، جو ہر سال عربی کی نادر الوجود کتابوں کو اڈٹ کرکے شائع کرتی ہے، چنانچہ ابھی حال میں قائم کی، مستدرک اور امام رازی کی مباحث شرقیہ جیسی اہم اور نادر الوجود کتابیں شائع ہوچکی ہیں اور متعدد نادر الوجود قلمی کتابوں کی تصحیح ہورہی ہے، نواب صاحب مرحوم کی یہ ایک ایسی یادگار ہے جو اگر مستقل

طور پر قائم رہی تو ہمیشہ علماء و فضلاء کو اپنا گرویدۂ احسان رکھے گی اور اس سے ریاست حیدرآباد کے علمی وقار میں بھی نمایاں اضافہ ہوگا۔

خاکسار کی ملاقات ان سے پہلے پہل حیدرآباد میں ہوئی، جس کی صورت یہ ہوئی کہ مرحوم نے مولانا شبلی کی تحریک سے اپنا جو کتب خانہ ندوہ کو دے دیا تھا، اس کتب خانہ کو حیدرآباد سے لانے کے لئے مولانا مرحوم نے میرا انتخاب کیا، چنانچہ سب سے پہلی دفعہ میں حیدرآباد روانہ ہوا، جناب مولوی عبدالغنی صاحب وارثی کے یہاں جو میرے وطن کے قریب کے اور عزیز بھی تھے اور مولانا کے دوست تھے، قیام ہوا اور انہوں نے مولانا شبلی مرحوم کی خواہش کے مطابق نواب صاحب سے جا کر ملایا اور اس سلسلہ سے تقریباً ایک مہینہ تک نواب صاحب کے پاس روزانہ آنے جانے کا کام جاری رہا، وہ ایک ایک کتاب نکال کر مجھے دیتے تھے اور میں اس کو علیحدہ رکھتا جاتا تھا، اس کے بعد سے آخر عمر تک نواب صاحب کے علمی تعلقات کا سلسلہ برابر جاری رہا، خصوصاً حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کی وفات کے بعد جو نومبر ۱۹۱۴ء میں ہوئی، ان کی شفقتِ بزرگانہ سے یہ تعلقات برابر بڑھتے رہے، خط و کتابت کا آغاز اس طرح ہوا کہ استاذ مرحوم کی وفات پر جو اردو مرثیہ میں نے لکھا تھا وہ ان کے پاس بھیجا، جواب میں ایک ایسا نکتہ حوالۂ قلم فرمایا جو ہمیشہ میرے لئے رہنما ثابت ہوا، فرمایا، عرض ہنر اس وقت تک نہیں کرنا چاہئے جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ اب اس ہنر میں میرا کوئی حریف نہ ہوسکے گا، حیدرآباد جب جانا ہوتا تو شفقت سے ملتے، دیر تک باتیں کرتے رہتے تھے، اسلامی علوم و فنون و تمدن و تاریخ گفتگو کا موضوع ہوتا، ہمیشہ اپنے مکتوبات سے ممنون فرماتے، افسوس کہ دست اجل نے اس سلسلہ کو بند کردیا، ان کی تصنیفات میں اردو کا ایک مجموعۂ مضامین اور انتخاب دیوان میر ہے، ایک زمانہ میں عربی کا بھی ایک رسالہ جاری کیا تھا، ان کا انگریزی ترجمۂ قرآن جو پندرہ سولہ پاروں تک پہنچا تھا وہ ہنوز مسودہ کی صورت میں ہے، اخیر زندگی میں سہو غالب ہوگیا تھا اس لئے وہ ایک ہی قسم کی بات باربار کرتے رہتے تھے، اخیر زمانہ میں جب ان سے ملاقات ہوئی، عربی کی الف لیلیٰ کے ذریعہ سے مسلمانوں کے تمدن پر ایک کتاب لکھنے کی برابر فرمائش کرتے تھے، افسوس کہ یہ جلیل القدر ہمیشہ کے لئے اٹھ گیا اور اب کوئی اس کی جگہ لینے والا نہیں۔

(''س''، جون ۱۹۲۶ء)

شررلکھنوی، عبدالحلیم

مولانا شررؔ

عین اس وقت جب ہم اردو رسالوں کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈال رہے ہیں، اردو کا وہ سب سے پرانا رسالہ اور اس کا وہ اڈیٹر یاد آتا ہے جس نے سال کے آخری مہینہ کی آخری تاریخوں میں ہماری دنیا کو الوداع کہا، یعنی مولانا عبدالحلیم شرر صاحب لکھنوی، اڈیٹر دل گداز، مولانا ہمارے انشاء پردازوں میں سب سے پرانے انشاء پرداز تھے، اکہتر (۷۱) برس کی عمر میں بعارضۂ فالج وفات پائی، مرحوم نے اپنی عزت اور شہرت تنہا خود اپنے قلم سے حاصل کی تھی، وہ اپنی شہرت کے لئے کسی نامور ہستی سے انتساب کے ممنون نہ تھے، انہوں نے اپنے تمام معاصرین میں سب سے زیادہ اپنی زبان کی خدمت کی فرصت پائی، ہمارے خیال میں ۱۸۸۲ء سے انہوں نے اپنے کام کا آغاز کیا اور جو اخیر زمانۂ وفات دسمبر ۱۹۲۶ء تک قائم رہا، بیچ بیچ میں کبھی کبھی حیدرآباد کے قیام کی مصروفیتیں پیش آجاتی تھیں، تاہم ان کا تسلسل کبھی ٹوٹنے نہیں پایا، ۴۶ برس کا عہد خدمت ان کے کسی معاصر کو میسر نہیں آیا، پھر ان کی ادبی اور علمی خدمات کی گوناگونی اور کثرت بھی ان کا خاص امتیاز ہے اور یہ کہنا بھی سچ ہے کہ انہیں کی تصنیفات نے اردو میں سینکڑوں انشاء پرداز پیدا کئے اور ملک میں تاریخ کا مذاق پیدا کیا اور سنجیدہ تصنیفات کے لئے حسن قبول کا راستہ صاف کیا۔

خاکسار کو مولانا کا پہلا شرف نیاز ۱۹۰۴ء میں حاصل ہوا اور یاد آتا ہے کہ وہ اس وقت حیدرآباد سے واپس آئے تھے اور اتحاد اور پردۂ عصمت نکالنا شروع کیا تھا، وہ عربی زبان کے مستند عالم تھے، بچپن میں وہ اپنے نانا کے ساتھ واجد علی شاہ کے ٹیابرج میں رہے تھے اور اس طرح جب ہوش سنبھالا، تو اپنے کو سخنورانِ اردو کی آغوش میں پایا، لکھنؤ آکر عربی علوم کی باقاعدہ تعلیم مولانا عبدالحئی صاحب مرحوم فرنگی محلی کے حلقۂ درس میں پائی تھی اور حدیث کی تعلیم دہلی میں جا کر مولانا سید نذیر حسین محدث سے حاصل کی تھی، اسی لئے مولانا کا میلان زیادہ تر اہل حدیث کے مسلک کی طرف تھا اور عقائد میں وہ سخت اور غالی اشعری تھے، امام ابوالحسن اشعری سے ان کو خاص عقیدت تھی، عربی کے ساتھ ان کو انگریزی سے بھی واقفیت تھی اور کسی قدر فرنچ سے بھی آشنا تھے، یورپ کی بھی سیر کر آئے تھے، واپسی میں جب وہ جبرالٹر (جبل طارق) سے گزرے ہیں تو مسلمان مورخ کی آنکھوں کے سامنے اندلس (اسپین) کی تصویر کھنچ گئی، وطن پہنچ کر سب سے پہلے اس کی یاد میں آنسو گرائے اور اسپین پر ایک پردرد مضمون لکھا جو اس زمانہ میں بہت مقبول ہوا تھا۔

بظاہر وہ صرف ایک ناولسٹ یا فسانہ نگار تھے اور اسی حیثیت سے لوگ ان کو زیادہ تر جانتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ عربی علم و ادب، محاضرات و تاریخ کے بھی ماہر تھے، ان کے مضامین کا بڑا ماخذ آغانی کی ضخیم جلدیں ہوتی تھیں اور وہ ان کو نہایت پسند تھیں، وہ روایتوں میں تنقید اور جانچ پڑتال نہیں کیا کرتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ ان کو اپنے موضوع کے لحاظ سے اس کی ضرورت بھی نہ تھی، ان کی تصنیفات میں منصور موہنا، درگیش نندنی، فتح اسپین، مقدس نازنین، ملک العزیز ورجنا، فردوسِ بریں اور فلورا

فلورنڈا مشہور ناول ہیں، تاریخوں میں تاریخ سندھ اور تاریخ سسلی اور سوانح عمریوں میں خاتم المرسلین، ابوبکر شبلی، جنید بغدادی ان کی مشہور تالیفات ہیں، مرحوم گو شاعر تھے، شرؔر تخلص تھا مگر غیر مقفی اشعار کے نمونوں کے علاوہ آغاز شباب کے بعد کبھی انہوں نے اپنا کوئی کلام شائع نہیں کیا، ان کا آخری علمی کارنامہ تاریخ اسلام ہے۔ جس کو وہ جامعہ عثمانیہ کی فرمائش سے لکھ رہے تھے اور کچھ حصے اس کے لکھ بھی چکے تھے۔

مرحوم اخلاق کے لحاظ سے باوضع، خاکسار، پابند اوقات اور ملنسار تھے، چھوٹوں سے ملنے میں ان کی عزت اور تعظیم اور ان کے کارناموں کی قدر شناسی میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے تھے، چوک میں منشی نثار حسین صاحب اڈیٹر پیاؔم یارا اور خواجہ عشرؔت کی دکان پر ان کی شام کی نشست ان کی وضعداری کی دلیل تھی، ان کی کتابوں کی بڑی مانگ تھی اور تمام مطبع والے بے پوچھے گچھے ان کی کتابیں چھاپتے رہے، مگر انہوں نے کبھی کوئی باز پرس نہ کی، مرحوم رات کو جاگ کر کام کرنے کے عادی تھے، چنانچہ وہ رات کا کھانا ایک بجے کھا کر سوتے تھے، ان کی موت نے ۷۵ءھ سے شروع ہونے والے عہد علمی کا خاتمہ کر دیا۔

''دل گداز'' جو ان کا خاص رسالہ تھا، جس میں وہ زیادہ تر تاریخی مضامین اور قصص شائع کیا کرتے تھے، اس کا آخری نمبر جو ان کے قلم سے نکلا، وہ دسمبر ۱۹۲۶ء کا ہے، یہ ''دلگداز'' کی چھبیسویں جلد کا آخری نمبر ہے، لیکن اس کی اشاعت کا زمانہ چھبیس برس سے یقیناً زیادہ ہے، حیدرآباد کی اقامت کے زمانہ میں اس کی اشاعت میں ناغہ ہو جاتا تھا، ''دلگداز'' کے علاوہ تین اور رسالے بھی اپنے نام سے نکالے ہیں، موجودہ پردہ کے خلاف پردہ عصمت انہوں نے نکالا، سب سے پہلے انہیں نے مسلمانوں میں ہندو مسلم اتحاد کی باقاعدہ تحریک کی اور اس کے لئے اتحاد نکالا، کچھ دنوں کے لئے تصوف کا بھی ایک رسالہ نکالا تھا جس کا نام اس وقت یاد نہیں آتا، مہذب نام ایک اور صحیفہ نکالا تھا، بہرحال وہ جو کچھ تھے، ہماری زبان کے نامور مصنف، ہندوستان کا فخر اور لکھنؤ کی آبرو تھے، ان کے فانی جسم نے مفارقت کی، مگر ان کی ابدی زندگی انشاء اللہ ہمیشہ قائم اور باقی رہے گی۔ (''س''، جنوری ۱۹۲۷ء)

شاؔد، علی، میر

جناب میر علی محمد شاؔد مرحوم عظیم آبادی

ابھی نثر اردو کے ماتم سے ہم فارغ نہیں ہوئے تھے کہ نظم اردو کے پرانے استاد عظیم آباد کے مشہور باکمال شاعر میر علی محمد شاد کی موت کی خبر آئی، ۸/ جنوری ۱۹۲۷ء کو غالباً ۸۲ برس کی عمر میں اپنے وطن عظیم آباد پٹنہ میں وفات پائی، ساٹھ برس سے زیادہ کی مشق سخن تھی، لاکھوں شعر ان کے نتائج فکر ہیں، میؔر اور انیؔس کے مقلد اور متبع تھے، اس دور میں وہ یورپ میں زبان اردو کے تنہا استاد رہ گئے تھے، ہموطنی کے باوجود کبھی ان کی ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوسکا، البتہ تحریری نیاز ایک مدت سے جاری تھا، کچھ دنوں سے ہوش و حواس بھی بجا نہ تھے، تاہم شعر برابر وردِ زبان تھا:

آخر ہے عمر، ضیق میں، دل بھی ہے جان بھی
مردانہ باش! ختم ہے یہ امتحان بھی!!

مرحوم کی تصنیفات میں دیوان اور کلام منظوم کے علاوہ نوائے وطن وغیرہ نثر کی کتابیں بھی ہیں، مرحوم کا ایک طویل والا نامہ بھی میرے پاس رکھا ہے، جس میں اپنی تصنیفات کی پوری کیفیت لکھی ہے، افسوس کہ ان کا پورا کلام کوششوں کے باوجود بھی یکجا ہو کر طبع نہ ہوسکا، جو کام کہ ان کی غایت احتیاط کی بناء پر ان کی زندگی میں نہ ہوسکا، شاید اب ان کے مرنے کے بعد انجام کو پہنچ جائے، اپنے طرز کے وہ تنہا مالک تھے اور زمانہ کا رنگ دیکھ کر توقع نہیں کہ اس طرز کا سخن ور پھر پیدا ہوسکے۔

(''س''، جنوری ۱۹۲۷ء)

احمد، نذیر، شمس العلماء حافظ

شمس العلماء حافظ نذیر احمد کلکتہ

افسوس ہے کہ شمس العلماء حافظ نذیر احمد صاحب محقق آثار قدیمہ عجائب خانہ کلکتہ نے گزشتہ ماہ اس دارفانی کو الوداع کہا، مرحوم بنگال کے ان چند ممتاز اہل علم میں تھے جن پر اس صوبہ کو ناز تھا، معارف کے صفحات بھی اکثر ان کے مضامین سے زینت پاتے رہے ہیں، ہندوستان کے قلمی کتب خانوں اور نادر علمی جواہر کے گوشہ گوشہ سے ان کو واقفیت تھی اور ایشیاٹک سوسائٹی کی طرف سے کتابوں کی تلاش میں انہوں نے تمام ہندوستان کو چھان ڈالا تھا، چند سال سے عجائب خانہ کلکتہ میں آثار قدیمہ کی تحقیق کا کام ان کے سپرد ہوا تھا، افسوس کہ بنگال کا یہ نادر محقق اس عجائب خانہ عالم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا۔ (''س''، اپریل ۱۹۲۷ء)

گرامؔی، غلام قادر، شیخ

حضرت گرامؔی

ہندوستان کے کہنہ مشق اور فارسی کے مسلم الثبوت شاعر حضرت گرامی نے ۲۶/ مئی ۱۹۲۷ء کو چند روزہ علالت کے بعد اس دنیائے فانی کو الوداع کہا، مرحوم پنجاب کے ضلع جالندھر کے رہنے والے تھے، فارسی شاعری سے ان کو فطری لگاؤ تھا، کچھ دنوں امرتسر کے ایک اسلامی مدرسہ میں معلم رہے، پھر اعلیٰ حضرت نظام سابق مرحوم کی قدر شناس نگاہ نے ان کو تاکا اور اپنے دربار کا فارسی شاعر مقرر کیا، اخیر عمر میں حیدرآباد سے جالندھر آ کر جب

قیام کیا تو ان کی صحبت اور فیض اثر سے متعدد نوجوان اردو شاعر پیدا ہوئے، جن میں ابوالاثر حفیظ اور سالک کے نام سب سے اونچے ہیں، ڈاکٹر اقبال نے بھی جب سے فارسی میں کہنا شروع کیا، ان سے استفادہ میں دریغ نہیں کیا، زبان کے معاملہ میں وہ ان کی سند تھے، افسوس ہے کہ اب کشورِ ہند ایسے یگانہ نامور کے وجود سے خالی ہوگیا۔

مرحوم سے صرف ایک دفعہ آل انڈیا شعراء کانفرنس دہلی منعقدہ ۱۹۲۳ء میں ملاقات ہوئی تھی، بے حد ملنسار، متواضع اور مرنجان آدمی تھے، ایک سال پہلے تک ان کے اکثر خطوط میری عزت بڑھاتے رہتے تھے اور کبھی کبھی معارف کے صفحوں کو بھی اپنے نغموں سے معمور کیا کرتے تھے، مولانا شبلی مرحوم کے تعلق اور ان سے حیدرآباد کی یک جائی اور شاعری کی ہم پیشگی کا اثر یہ تھا کہ وہ مولانا مرحوم کی اس یادگار کو بزرگانہ محبت کی نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے، افسوس کہ یہ فیض اب ہمیشہ کے لئے بند ہوگیا۔

(''س''، جون ۱۹۲۷ء)

خضری، شیخ

شیخ خضری

شیخ خضری کی وفات، شیخ خضری کا جو مصر کے مشہور علماء میں تھے، پچھلے مہینہ میں انتقال ہوگیا، یہ مفتی عبدہٗ کے صحبت یافتہ تھے، اور وہاں کی جامعہ مصریہ میں اسلامی تاریخ کے پروفیسر رہ چکے تھے اور کئی مفید کتابوں کے مصنف تھے، جن میں سے ان کی تاریخ اسلام سب سے مشہور کتاب ہے، جس کی تلخیص یا ترجمہ جامعہ ملیہ میں ''تاریخ امت'' کے نام سے کیا گیا ہے، جو عام طور سے نہایت پسند کی گئی اور بے حد مقبول ہوئی۔

(''ر''، جون ۱۹۲۷ء)

احمد، بشیرالدین، مولوی

مولوی بشیرالدین احمد مرحوم

افسوس ہے کہ اردو کے ایک کہنہ مشق مصنف کی جسمانی یادگار مولوی بشیرالدین احمد خلف مولانا ڈپٹی نذیر احمد صاحب مرحوم نے بھی اپنی جگہ خالی کی، ۲۴/ اگست کی شب کو بعارضۂ فالج دہلی میں وفات پائی، تاریخ بیجاپور، فرامین شاہی، عصائے پیری اور کئی تاریخی اور ادبی کتابوں کے وہ مصنف تھے اور اس عہد میں بسا غنیمت تھے۔

(''س''، ستمبر ۱۹۲۷ء)

صروف، یعقوب، ڈاکٹر

ڈاکٹر یعقوب صروف

اڈیٹر المقتطف کی وفات، علمی حلقہ میں یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ مصر کے مشہور علمی، صنعتی، زراعتی اور فلسفیانہ رسالہ المقتطف کے دوسرے اڈیٹر ڈاکٹر یعقوب صروف نے بھی جولائی ۱۹۲۷ء کو وفات پائی۔ یہ وہ شامی اہل قلم ہے جس نے عربی ممالک میں سب سے پہلے سائنس، حکمیات، فلسفہ اور اختراعات جدیدہ کے معلومات بہم پہنچائے اور پورے پچاس برس اس نے اس اہم خدمت کو انجام دیا۔ ۱۸۷۶ء میں اس نے اس رسالہ کو جاری کیا تھا اور اب تک اسی طرح پوری شان کے ساتھ جاری رہا۔ ان کی پیدائش ۱۸ء میں ہوئی تھی۔ بیروت امریکن کالج میں تعلیم پائی تھی اور پھر وہیں ریاضیات کے پروفیسر مقرر ہوگئے تھے۔ وہیں اس رسالہ کی اشاعت کا اس کو اور اس کے رفیق فارس نمر کو جو پہلے وفات پاچکا ہے، خیال آیا تھا۔ ترکی حکومت نے اپنی اجازت سے ان کی ہمت افزائی کی۔ آخر یہ مصر میں آکر تکمیل کو پہنچا۔ یعقوب صروف کے بعد فواد صروف نے اس رسالہ کی زمامِ ادارت اپنے ہاتھ میں لی ہے۔

(''ر''، ستمبر ۱۹۲۷ء)

خاں، اجمل، حکیم حافظ

مسیح الملک مرحوم

حکیم اجمل خاں

ہمارے شمسی سال کے خاتمہ کو تین راتیں باقی تھیں کہ نصف شب کو ہمارے ملک کا آفتاب غروب ہوگیا، مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی اچانک وفات درد دل سے ہوئی، ہائے یہی ''درد دل'' ان کی زندگی کا سرمایہ تھا اور یہی ان کی وفات کا بہانہ بن گیا، وہ جس کی مسیحائی سے لاکھوں نے زندگی پائی تھی، خود اس کی زندگی کسی کی مسیحائی کی ممنونِ احسان نہ بنی، حکیم صاحب کی وفات خاندان کا ماتم نہیں، دلّی کا ماتم نہیں، قوم کا ماتم ہے، فضل و کمال کا ماتم ہے، اخلاق و شرافت کا ماتم ہے، سنجیدگی و متانت کا ماتم ہے، اخلاق و ایثار کا ماتم ہے، عقل و رزانت کا ماتم ہے، فکر و اصابت کا ماتم ہے، آزادی و حریت کا ماتم ہے کہ ہندوستان اور مسلمانانِ ہند کے طالع و بخت کا ماتم ہے۔

مرثیہ ہے ایک کا اور نوحہ ساری قوم کا

ہندوستان کا وہ کونسا شریف انسان ہے جس کی گردن اس شریف خانی یادگار کی شخصی یا قومی منت سے گراں نہیں، وہ کونسی قومی مجلس ہے جو ان کے احسانات کے بوجھ سے دبی نہیں ہے، مسلمانوں کا وہ کونسا کام ہے جو ان کی مشکل کشائی کا ممنون نہیں، علی گڑھ ہو کہ ندوہ، دیوبند ہو کہ جمعیۃ العلماء، مسلم لیگ ہو کہ کانگریس، خلافت ہو کہ طبیہ کانفرنس، ہندوستان دواخانہ ہو کہ طبیہ کالج سب ان کے خوان منت کے برابر کے ریزہ چین تھے، جامعہ ملیہ یعنی قوم کے خواب حریت کی تعبیر حسّی، اس کا وجود مستقل اگر تھا، تو صرف حکیم صاحب کے دستِ بازو سے۔

ایک روشن دماغ تھا ، نہ رہا　　ملک کا جو چراغ تھا ، نہ رہا

حکیم صاحب کی وفات سے یوں ہر قومی درس گاہ اور ہر قومی مجلس، جو ان کی رائے ومشورہ واعانت وسفارش سے، یا ان کے بذل وعطا اور جود وکرم سے مستفید تھی، متاثر ہوئی، لیکن جامعہ ملیہ جس کی ہستی صرف ان کی ذات سے قائم تھی اور جس کی امارت صرف اسی ایک ستون پر کھڑی تھی، وہ متزلزل ہوکر رہ گئی، یہ تسکین ہے کہ حکیم صاحب کی یادگار کے نام سے اس کو پکارا جارہا ہے اور قوم میں ان کی اس یادگار کی بقا و قیام کا کافی احساس نظر آتا ہے، اگر اس یادگار کے لئے قوم میں عملاً بھی یہی سرگرمی رہی تو اس قوم محسن اعظم کی موت جامعہ کی زندگی کا سبب بن جائے گی، ہمیں یقین ہے کہ منت پذیر قوم اور احساس شناس ملک اس علمی وتعلیمی یادگار کی مالی اعانت و امداد میں اپنے فرض کا پورا احساس کرے گا۔

جامعہ کے کارکنوں نے اس یادگار کی بقا وقیام کے لئے ملک وقوم سے آٹھ لاکھ روپے کی اپیل کی ہے، ملک کے بڑے بڑے رہنماؤں نے اس اپیل کی تائید کی ہے، ضرورت ہے کہ مسلمان اپنی مسابقت الی الخیر کا علمی ثبوت دیں، تاکہ جامعہ جو کم سے کم احسان اوروں کا اٹھاسکتی ہے وہ اٹھائے، عنقریب جامعہ کی طرف سے مختلف وفود صوبوں میں دورہ کرنے کے لئے نکلیں گے، اس وقت ہر صوبہ کے مسلمانوں کو اس کار خیر اور صدقہ جاریہ میں شرکت کرنی چاہئے۔

مرحوم سے میری ملاقات ۱۹۱۰ء میں ندوہ کے جلسہ کی تقریب سے مولانا شبلی مرحوم کے ذریعے سے ہوئی، یہ تعلق قومی کاموں کے سلسلہ میں بڑھتا ہی گیا اور خلافت، جمعیۃ العلماء اور کانگریس کی تحریکوں کے ساتھ عہد بہ ترقی پذیر رہا، سیاسیات میں میرا شمار انہیں کی جماعت کے ساتھ ہمیشہ رہا۔　　(''س''، جنوری ۱۹۲۸ء)

__ہڈسن، رابرٹ، سر__

سر ہڈسن کی وفات

گزشتہ دسمبر کا ایک اہم معاشرتی حادثہ سر رابرٹ ارنڈیل ہڈسن کی وفات ہے، سر ہڈسن انجمن صلیب احمر انگلستان کے صدر تھے اور انھوں نے انجمن کی ترقی وتوسیع میں بہت کچھ حصہ لیا تھا اور اپنی بااثر شخصیت کی بناء پر اس انجمن کے لیے ایک کروڑ نوے لاکھ پونڈ جمع کئے تھے۔

کیا ہندوستان کی تمام انجمنوں کی متحدہ آمدنی بھی کبھی اس کے برابر ہوگی جس غریب ملک میں صحیح وتندرست لوگ بھوکے مرتے ہوں وہاں مریضوں کو کون پوچھتا ہے۔

(''ن''، مارچ ۱۹۲۸ء)

__لیفر سڈگ، پروفیسر__

پروفیسر لیفر سڈگ

پروفیسر لیفر سڈگ سابق پروفیسر کیمیا سڈنی یونیورسٹی آسٹریلیا نے تھوڑے دن ہوئے کہ وفات پائی، اور مرنے کے بعد ۴۶ ہزار گنی کی گراں قدر رقم چھوڑ گئے اور یہ ساری رقم وصیت کے ذریعہ سے رفاہِ عام کے مختلف کاموں کے لئے وقف کرگئے جس کی تفصیل یہ ہے، ۲۵۰۰ گنی خاص شہر سڈنی کے لئے جس کے نفع سے دو علمی انعام دیئے جائیں گے، ۱۵۰۰ کیمبرج یونیورسٹی کے مسیحی کالج کے لیے، ۱۰۰۰ گنی معدنیات ملکی کے مدرسہ کے لیے، ۵۰۰ گنی نیوسوٹ ویلز کی ملکی انجمن کے لئے اس طریقہ سے ساری دولت آسٹریلیا کی مختلف انجمنوں اور لندن کی کیمیاوی انجمن کو دے دی۔

(''م''، اپریل ۱۹۲۸ء)

__چریاکوٹی، ابوالفضل عباسی__

علامہ ابوالفضل عباسی چریاکوٹی

ماہ رواں کے افسوس ناک علمی حادثوں میں دو مشہور مسلمان مصنفین اور اہل قلم کی وفات ہے، ایک سید امیر علی بالقابہ اور دوسرے مولوی سید وحیدالدین سلیم پانی پتی، اس سے پہلے چند ماہ ہوئے کہ ایک اور کہنہ مسلمان فاضل مصنف علامہ ابوالفضل عباسی چریاکوٹی وکیل گورکھپور کی وفات کی خبر ملی تھی ان بزرگوں کا یکے بعد دیگرے یوں رخصت ہوتے جانا علم اور قوم کی بدنصیبی ہے۔

علامہ ابوالفضل عباسی چریاکوٹی استاذنا محمد فاروق صاحب یاکوٹی کے شاگرد تھے اور ان چند مستثنیٰ علماء میں تھے، جنہوں نے اس عہد میں جب انگریزی کفر سمجھی جاتی تھی، انگریزی تعلیم حاصل کی، چنانچہ علی گڑھ کالج کے ان طلبہ میں تھے، جو اس کے سب سے کم دیر یا مشرقی شعبہ علوم میں داخل تھے، مرحوم وکالت کے ساتھ ہمیشہ مذہبی وتاریخی تالیف وتصنیف میں مصروف رہتے تھے، چنانچہ قرآن پاک کا اردو ترجمہ الاسلام، تاریخ اسلام، انگریزی میں قانون محمدی کی بعض کتابیں، انتخاب دواوین اور ایک دو اصلاحی افسانے یادگار چھوڑے، ''الاسلام'' اور ''تاریخ اسلام'' مرحوم کی بہترین تصنیفات ہیں، مرحوم کی عمر غالباً کم وبیش ستر (۷۰) ہوگی۔　　(''س''، اگست ۱۹۲۸ء)

__سلیم پانی پتی، وحیدالدین__

مولوی وحیدالدین سلیم پانی پتی

مولانا وحیدالدین سلیم پانی پتی، عربی اور اردو کے ادیب تھے، وہ مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری کے شاگرد تھے، لاہور کے مشرقی شعبہ میں تعلیم پائی تھی اور

وہیں سے تحریر وانشاء اور ترجمہ وتالیف کا شوق اپنے ساتھ لائے تھے، ۱۸۹۰ء کے بعد سے غالباً سرسید مرحوم کے علمی مددگار مقرر ہوئے، یعنی سرسید کی تصنیفات اور مضامین کے لئے عربی کتابوں سے معلومات فراہم کیا کرتے تھے، پھر معارف نام کا ایک علمی رسالہ انہوں نے علی گڑھ سے نکالا، جس نے اہل علم میں بڑی عزت حاصل کی، چند سال نکل کر یہ بند ہوگیا، پھر ۱۹۰۴ء کے قرب میں وہ علی گڑھ گزٹ کے اڈیٹر ہوئے اور بالآخراس سے بھی الگ ہوکر خانہ نشین ہوگئے، ۱۹۱۰ء میں جب لکھنؤ سے مسلم گزٹ نکلا، جس نے مسلمانوں کی اس نئی سیاسی بیداری میں خاصہ حصہ لیا، تو مولانا شبلی مرحوم کے مشورہ سے وہی اس کے اڈیٹر مقرر ہوئے اور حق یہ ہے کہ انہوں نے بڑی خوبی سے اس فرض کو انجام دیا، مسلم گزٹ کے بند ہونے کے بعد وہ پھر خانہ نشین ہوگئے اور آخر غالباً ۱۹۱۶ء میں یا اس کے گردوپیش زمانہ میں وہ حیدرآباد گئے اور جامعہ عثمانیہ میں اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے اور اسی منصب پر اس مہینہ میں انہوں نے ملیح آباد (ضلع لکھنؤ) میں وفات پائی، مرحوم کی عمر ستر سال کے قریب ہوگی۔

مرحوم نے چھوٹے بڑے مضامین بے شمار لکھے، ان کی خاص خصوصیت زودنویسی تھی، وہ قلم برداشتہ لکھتے تھے اور بڑے بڑے ہفتہ وار اخبار کو ایک رات میں بیٹھ کر پورا کرلیتے تھے اوران کی کوئی مستقل تصنیف، ''وضع اصطلاحات علمیہ'' کے سوا دوسری نہیں، نئے الفاظ کے تراشنے اور وضع کرنے میں ان کو پوری مہارت تھی، علی گڑھ گزٹ اور مسلم گزٹ کی اڈیٹری کے زمانہ میں بہت سے اردو الفاظ وضع کرکے انہوں نے پھیلائے ہیں، منجملہ ان کے ایک لفظ ''نمائندہ'' جو آج اس قدر کثیر الاستعمال ہے، انہیں نے اس لفظ کو جدید فارسی اخبارات سے لے کر اردو میں علی گڑھ گزٹ کے ذریعہ سے رائج کیا۔

حق مغفرت کرے عجیب آزاد مرد تھا

(''س''، اگست ۱۹۲۸ء)

امیر علی، سید

جسٹس سیّد امیر علی مرحوم

سید امیر علی مرحوم تمام تر جدید تعلیم کی پیداوار تھے، مگر انہوں نے بزرگوں کے سُنے سُنائے معلومات اور ذاتی کدوکاوش سے یورپ میں اسلام کی بڑی خدمت کی، وہ یورپ میں تمام اسلامی کاموں اور تحریکوں کے رکن رکین سمجھے جاتے تھے ان کے مذہبی اور سیاسی خیالات سے گو ہم موافقت نہ کرسکیں، مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کے قلم کی ضوافشانی سے اسلام کے متعلق یورپ کے بہت سے خیالات باطلہ کے بادل پھٹ گئے، ان کی دو کتابیں اسپرٹ آف اسلام اور ہسٹری آف سارا سینس ہمیشہ یادگار رہیں گی، ان دونوں کتابوں کے ترجمے اکثر اسلامی زبانوں میں موجود ہیں، حتیٰ کہ عربی میں بھی ہوچکے ہیں، ۷۹ سال کی عمر میں اس جہان فانی کو الوداع کہا، مرحوم سے ۱۹۲۰ء میں کئی دفعہ لندن میں ملنے کا موقعہ ملا تھا، رحمۃ اللہ تعالیٰ۔ (''س''، اگست ۱۹۲۸ء)

ٹونکی، برکات احمد بہاری، مولانا

مولانا حکیم برکات احمد صاحب بہاری ٹونکی

پچھلے مہینہ ایک اور فاضل زمانہ نے اپنی جگہ خالی کردی، یکم ربیع الاول ۱۳۴۷ھ کو استاد الوقت مولانا حکیم برکات احمد صاحب بہاری ٹونکی نے وفات پائی، مرحوم اس عہد کے ان یگانہ اساتذہ میں تھے، جن کے حلقہ درس نے سینکڑوں کاملین فن پیدا کئے، جناب عبداللہ صاحب ٹونکی کی طرح مرحوم کا خاندان بھی بہار سے ٹونک جاکر آباد ہوا تھا، یہ پندرہ برس مولانا عبدالحق خیرآبادی کی صحبت میں رہ کر علوم عقلیہ وحکمیہ میں سرآمد روزگار بنے تھے، ساتھ ہی علم حدیث اور علوم دینیہ کا فیض قاضی محمد ایوب بھوپال سے حاصل کیا تھا، والی ٹونک انکی پوری قدردانی فرماتے تھے اوران کو اپنی ریاست کا فخر سمجھتے تھے، دور دور سے طلبہ آکر ان کے حلقۂ تعلیم میں شریک ہوتے تھے اور کامیاب ہوکر واپس جاتے تھے، افسوس کہ یہ سرچشمۂ فیض ہمیشہ کے لئے خشک ہوگیا، ''رحمۃ اللہ وبرکاتہ'' ۱۳۴۷ھ تاریخ وفات جس نے نکالی ہے اس پر بھی خدا کی رحمت، رحمۃ اللہ وبرکاتہ علیہ۔

مرحوم کی بعض فلسفیانہ تصنیفات شائع ہوئی ہیں، مشہور تصانیف حسب ذیل ہیں: انہار اربعہ تصوف میں، القول الضابط فی تحقیق الوجود الرابط، اتمام الکلام فی تحقیق الاجسام، فلسفہ میں، حاشیہ برحاشیہ خیرآبادی، برحاشیہ شرح مواقف کلام میں، حاشیہ برجامع ترمذی، حدیث میں، مرحوم نہ صرف اپنے علم وفضل میں، بلکہ اپنے محاسن اخلاق میں بھی پرانے بزرگوں کی شان رکھتے تھے، کتب بینی کا یہ عالم تھا کہ وہ رات بھی جس میں ان کی وفات ہوئی مطالعہ سے ناغہ نہ گئی، نوجوان دنیا ان بوڑھے بزرگوں کی مثال پیدا نہ کرسکے گی۔ (''س''، ستمبر ۱۹۲۸ء)

احمد، مولانا حافظ / عزیز الرحمٰن، مفتی

مولانا حافظ احمد / مفتی عزیز الرحمٰن صاحب

یہ مہینہ بھی آہ ماتم کی صدا سے خالی نہیں، شکر کا مقام تھا کہ اب تک دیوبند میں اکابر کی صحبت یافتہ اور اکابر کی زندہ یادگاریں موجود تھیں، مگر افسوس کہ یہ بھی یکے بعد دیگرے ہم سے رخصت ہورہی ہیں، مولانا حافظ احمد صاحب مہتمم مدرسہ عالیہ دیوبند خلف الصدق حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ گزشتہ مہینہ حیدرآباد میں سپرد خاک ہوئے اور اب اس مہینہ ۱۸/ جمادی الثانی ۱۳۴۷ھ کو دائرہ قاسمیہ کے مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمٰن نے ۷۲ برس کی عمر میں دیوبند میں بمرض فالج انتقال

کیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مرحوم نے مولانا مملوک العلی صاحب اور مولانا فضل رحمان صاحب گنج مراد آبادی، اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے ظاہر و باطن کا فیض اٹھایا تھا، کم سخن، متین، حلیم اور سادہ مزاج تھے، تقویٰ اور دینداری، ان کے چہرہ کمال کا خط و خال تھی، حدیث کی درس و تدریس کے ساتھ کتب فقہ کی جزئیات پر ان کی وسعت نظر بدرجہ اتم تھی، فتاویٰ کے جوابات مختصر لیکن قل و دل دیتے تھے اور بیالیس برس تک اس خدمت کو انجام دیا۔ ایسے متقی اور محتاط فقیہ اور محدث آئندہ کہاں پیدا ہوں گے۔

زمانہ کا رنگ پلٹ رہا ہے، انقلاب کی لہریں دیواروں تک پہنچ گئی ہیں، جن کے رہنے والے زمانہ کے اس سیلاب سے اپنے گوشۂ عافیت کو محفوظ سمجھتے تھے، علماء کے خیالات بھی بدل رہے ہیں، اختلاط، میل جول اور مبادلہ آرا سے ان کے نقطۂ نظر میں بھی فرق آرہا ہے، یہ زمانہ علمائے اسلام کے لئے حد درجہ نازک ہے، ایک طرف تو تقویٰ، دینداری، اسلام کی اصلی روح کی حفاظت اور دوسری طرف نئے نئے مسئلے، نئے نئے فتوے اور نئے نئے سوال سامنے آرہے ہیں، مغربی تمدنی قوانین اور اسلامی فقہ اور احکام کے درمیان تطبیق، اگر ممکن ہو اور قانون اسلامی کی ترجیح، اگر تطبیق ناممکن ہو حد درجہ نازک، لیکن ساتھ ہی حد درجہ ضروری کام ہے، خوشی ہوتی اگر مرحوم اور ان کے رفقاء کے زمانہ کے لوگ اس کام کو کر جاتے کہ آئندہ ایسے وسیع النظر علماء کا پیدا ہونا تو ممکن ہے، مگر دنیا کا رنگ دیکھتے ہوئے ایسے محتاط، متقی اور دیندار علماء کے پیدا ہونے کی توقع کم ہے۔
(''س''، دسمبر ۱۹۲۸ء)

شادیش، عبدالعزیز، شیخ

شیخ عبدالعزیز شادیش

افسوس ہے کہ اس مہینہ شیخ عبدالعزیز شادیش نے مصر میں وفات پائی، یہ مفتی محمد عبدہ کے شاگردوں میں تھے اور طبعاً نہایت پرجوش تھے، نوجوان ترکوں کی انجمن اتحاد و ترقی کے زمانہ میں یہ اس کے سرگرم حامی تھے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ یہ اس کی مذہبی روح تھے، انور پاشا مرحوم کے دست و بازو تھے، بلقان کے بعد انہوں نے قسطنطنیہ سے ''الھدایہ'' نام کا ایک علمی، مذہبی، اصلاحی رسالہ عربی میں نکالا تھا، جنگ عظیم میں یہ اتحادیوں کے خلاف عرب میں جہاد کے واعظ اور مبلغ تھے، ترکی کے موجودہ انقلاب میں بھی شریک ہوئے اور چاہتے تھے کہ اس انقلاب کے ہاتھ سے معتدل مذہبی اصلاحات اور اتحاد اسلامی کا سررشتہ نہ چھوٹے، اس لئے انگورہ میں دنیائے اسلام کی ایک علمی و ادبی انجمن بنائی، جس کے کتب خانہ میں تمام اسلامی زبانوں کی کتابیں جمع کی جائیں تاکہ ایک نظر میں تمام اسلامی دنیا کی مختلف دماغی سطح معلوم ہوجائے اور اتحاد اسلامی کی مجسم شکل سامنے آجائے، مگر مصطفیٰ کمال پاشا کی سرعت رفتار کا وہ ساتھ نہ دے سکے، ناچار مصطفیٰ کمال نے جب خلافت کی قبا اتار پھینکی اور اپنے کو جیسے وہ تھے سب کے سامنے ظاہر کردیا، تو شیخ نے انگورہ چھوڑ کر مصر میں قدم رکھا اور سیاسیات سے یکسر تائب ہوکر اپنے استاد کے نقشِ قدم پر چلے، یعنی مصر کے تعلیمی محکمہ میں وہ ابتدائی تعلیم کے انسپکٹر مقرر ہوگئے۔

اس خدمت کے ساتھ ساتھ انہوں نے چند ہی سال کے اندر مصری طلبہ کو خطرناک قومیت کے جذبات سے بچانے کا کام اصلاحی حیثیت سے شروع کردیا، پہلے ان کے لئے مکارم الاخلاق کے نام سے ایک انجمن قائم کی، جس نے اپنے چند ہی اجلاسوں میں طلبہ کو مغربی اخلاق و تمدن کی پیروی سے ہٹا کر اسلامی اخلاق و تمدن کی طرف یک گونہ متوجہ کرنا شروع کردیا، پھر اس کے بعد نوجوان مسلمانوں کی انجمن ینگ کرسچن مینس ایسوسی ایشن کی طرز پر انجمن شبان المسلمین قائم کی اور طلبہ میں اسلامیت کے جذبات پیدا کرنے کی کوشش کی، یہ کام ابھی یہیں تک پہنچا تھا کہ موت نے ان کو ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا کردیا، درحقیقت ان عام حالات کی بناء پر جن کے سیلاب میں مصر بہتا جاتا ہے، مرحوم کا وجود بہت مفید ہو رہا تھا، امید ہے کہ مرحوم کے رفقاء ان کاموں کو ان کے بعد بھی باقی رکھیں گے۔ (''س''، فروری ۱۹۲۹ء)

عثمانی، حبیب الرحمٰن، مولانا

مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی

اس مہینہ کا سب سے بڑا علمی اور تعلیمی حادثہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمان عثمانی کی وفات ہے، دیوبند کا مدرسہ عالیہ اگر ہمارے پرانے مذہبی مدارس کی روح ہے تو اس میں شک نہیں کہ اس مدرسہ عالیہ کی روح حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب عثمانی تھے، مرحوم شاید اس مدرسہ کے مقدس بانیوں کی آخری یادگار تھے، وہ ایک مشہور عالم متبحر، اور عربی کے ادیب تھے، دیگر علوم کے علاوہ عربی نظم و نثر پر ان کو یکساں قدرت حاصل تھی، اسلامی تاریخ سے بھی ان کو ذوق کامل تھا، اردو انشاء میں ان کا سلیقہ خاصہ تھا۔ رسالہ القاسم ان کی علمی کوششوں کی پوری تاریخ ہے، ان کی اردو تصانیف ''اسلامی کی اشاعت کیونکر ہوئی'' ایک ضخیم کتاب ہے، ان سب کے ساتھ جس چیز میں وہ اپنی جماعت میں سب سے زیادہ ممتاز تھے، وہ ان کا تدبر حسن سیاست اور نظم و نسق کی قوت تھی، انہوں نے ۱۳۲۵ھ سے ۱۳۴۸ھ تک جب تک ان کی جان میں جان رہی، مدرسہ دیوبند کے اہتمام اور نظم و نسق کی خدمت انجام دی۔

ان کی محنت، جان کا ہی اور مسلسل خدمات کے ساتھ ساتھ اگر ان کی جسمانی مخافت، کمزوری اور دائم المرضی کو دیکھا جائے تو تعجب ہوتا تھا کہ کیونکر وہ اس بارگراں کو

اٹھائے ہوئے ہیں، ان سب سے مافوق ان کا اخلاص، تقویٰ، تواضع اور ہر ایک سے حسن خلق کا برتاؤ تھا، راقم الحروف کو مولانا سے سب سے پہلے اپنے ختم طالب العلمی کے بعد ہی دیوبند میں ۱۹۰۸ء میں ملنے کا اتفاق ہوا، اس وقت سے لے کر آخر تک ان کا یکساں طریق محبت قائم رہا، سب سے آخری دفعہ اسی سال علی گڑھ میں ان کی زیارت ان کے ہم نام نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خان شروانی کے دولت کدہ پر ہوئی، دیکھا کہ ضعف ولاغری سے فضل وکمال کا یہ ماہ درخشاں اب ہلال بن کر رہ گیا ہے، اب یہ ہلال بھی محاق ہوکر دنیا کی نگاہوں سے چھپ گیا ہے، اناللہ۔

(''س''، دسمبر ۱۹۲۹ء)

مظہرالحق، مولوی

مولوی مظہرالحق صاحب پٹنہ

جس طرح ہمارا پرانا سال ایک بڑے قومی حادثہ یعنی پرانی تعلیم کے ایک بہترین نمونہ (مولانا حبیب الرحمان عثمانی دیوبندی) کے دائمی فقدان پر ختم ہوا، اسی طرح ہمارے نئے سال کا آغاز بھی ایک بڑے قومی حادثہ یعنی نئی تعلیم کے ایک بہترین نمونہ (مولوی مظہرالحق صاحب بیرسٹر پٹنہ) کی دائمی جدائی سے ہوا، مولوی مظہرالحق صاحب مرحوم کی قومی و سیاسی حیثیت تو الگ ہے، ان کی اخلاقی اور علمی حیثیت بھی کچھ کم قابل ذکر نہیں ہے، وہ فارسی سے واقف، عربی سے آشنا، انگریزی کے ادیب وخطیب اور فلسفہ کے نہایت دقیقہ رس طالبعلم تھے، ان کے علمی کارناموں کا آغاز طوفان نوح کی بحث سے ہوا، الپنچ پٹنہ اور وقت گورکھپور ان کے ابتدائی علمی مباحث کے جولان گاہ تھے، ان کی سب سے آخری علمی تحریر غالباً وہ ہے جو ابھی پونہ سے شائع ہونے والی انگریزی کی کتاب تصوف و روحانیت پر مقدمہ ہے، وہ نسباً فاروقی تھے، اس لئے ان کی اخلاقی قوت و جرأت کیا سلطنت اور کیا قوم دونوں کے مقابلہ میں برابر تھی، وہ جس کو حق سمجھتے تھے اس کے اظہار میں نہ ان کو سلطنت کی پروا ہوتی تھی اور نہ قوم کی، ان کا یوروپین طرز معاشرت کو الوداع کہہ کر دفعتہً مشرقی اور غالی مشرقی بن جانا ان کی بے مثال اخلاقی جرأت کا نمونہ ہے، مرحوم کی آخری عمر روح و روحانیت کی تحقیق میں صرف ہوئی، خدا ان کی روح کو اپنی مغفرت کی لازوال دولت سے مالا مال کرے، اب وہ وہاں پہنچ چکی ہے، جہاں کے کشف راز کے لئے وہ بے قرار تھی۔ (''س''، جنوری ۱۹۳۰ء)

خان، آفتاب احمد، صاحبزادہ

صاحبزادہ آفتاب احمد خان

صاحبزادہ آفتاب احمد خان مرحوم جو مفلوج ہوکر دو سال پہلے سے خاموش ہو چکے تھے، اب وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئے، علی گڑھ کالج نے قومی خدمت گذاروں کی سب سے پہلی جو جماعت پیدا کی تھی، اُس میں صاحبزادہ مرحوم سب سے پیش پیش تھے، وہ سرسید کی پالیسی کے سخت ترین مقلد تھے، وہ مسلمانوں کی سیاسی علمی، تعلیمی، تجارتی، دینی دنیاوی غرض ہر قسم کی ترقی کا ذریعہ جدید تعلیم کو سمجھتے تھے، یہی اُن کا عقیدہ تھا، اسی عقیدہ پر وہ جئے اور اسی پر مرے اُن کے قومی کاموں کا آغاز علی گڑھ کالج اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے ہوا، اور اسی پر خاتمہ ہوا، وہ جس مسلک پر تھے، اس پر پوری مضبوطی سے قائم رہے، اُن میں مسلمانوں کی تعلیمی خدمت گذاری کا مخلصانہ ولولہ تھا، اور مسلم یونیورسٹی کی خدمت کا بھی پورا ارادہ رکھتے تھے، مگر افسوس کہ علی گڑھ کی مکدر فضا اُن کی خدمات کو راس نہ آئی، اور یونیورسٹی کو اُن کی کوششوں سے کوئی فیض نہ پہنچ سکا، مرحوم کا دل پسند فلسفہ یہ تھا کہ مسلمان عبدیت اور نیابت الٰہی دونوں کے درمیان تطبیق دیں، یعنی یہ کہ ایک طرف تو وہ خدا کے آگے سر جھکائیں اور اپنے کو اس کا لاچار بندہ سمجھیں، دوسری طرف خدا کی خلافت و نیابت سے سرفراز ہوکر عالم اور کل قوائے عالم پر اپنے علم کے زور سے حکمرانی کریں۔

مرحوم ۴؍مئی ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے تھے، ۱۸۷۸ء میں علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے تھے، ۱۸۹۱ء میں بیرسٹری کی تعلیم کے لئے ولایت گئے، ۱۸۹۴ء میں کامیاب ہوکر واپس آئے، اور علی گڑھ میں پریکٹس شروع کی، اور ساتھ ہی کالج اور کانفرنس کی خدمت بھی، ۱۹۱۷ء میں انڈیا کونسل کے ممبر ہوکر انگلینڈ گئے، اور ۱۹۲۴ء میں اس عہدہ سے مستعفی ہوکر ہندوستان آئے، مرحوم کو درحقیقت انگلینڈ کی صحت بخش آب و ہوا ہی نے کھالیا، وہاں کی آب و ہوا ان کو بالکل راس نہ آئی، واپسی کے بعد وہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوگئے، مگر ان کی ناتندرستی نے ان کو فرصت نہ دی، ۱۹۲۶ء میں اس عہدہ کی میعادِ انتخاب کے خاتمہ پر جنوری ۱۹۲۷ء میں مسلم یونیورسٹی پر جو نوٹ لکھا، وہ مرحوم کی زندگی کا آخری تحریری کارنامہ اور مسلم یونیورسٹی میں طبی شعبہ کا قیام ان کا آخری عملی کارنامہ ہے، کیونکہ اس کے چند روز بعد جنوری ۱۹۲۷ء میں ان پر فالج کا پہلا حملہ ہوا، اور تین برس اسی امید و بیم کی حالت میں بسر کیا، اور آخر ۱۸؍جنوری ۱۹۳۰ء (شعبان ۱۳۴۸ھ) میں فالج کا دوسرا حملہ ہوا جس سے وہ جانبر نہ ہوسکے مرحوم مرنج و مرنجان، خوش اخلاق، متواضع اور خاکسار تھے، مگر اپنی رائے کے سختی سے پابند تھے، مسلمانوں کی ترقی کے اسباب وعلل و نتائج اور ذرائع و وسائل کے جو سبق انھوں نے سرسید مرحوم سے شروع میں پڑھے تھے وہ آخر تک ان کو یاد رہے، ایسے پختہ ایمان لوگ حقیقت میں قدر کے لائق ہیں، اور بعض خاص حیثیات سے وہ اپنی قوم کی تعمیر کے لیے بے حد ضروری اجزا ہیں۔

مرحوم نے اپنے زمانہ میں ایجوکیشنل کانفرنس کو بیحد ترقی دی، اُس کو مالی حیثیت

سے بہت حد تک مستغنی اور بے پروا کردیا، اس کی علیحدہ عمارت بنوائی، اس میں تعلیمی کتب خانہ جمع کیا، جو گویا تعلیم، فلسفہ تعلیم اور طریقۂ تعلیم کے بہترین ذخیرہ کا اعلیٰ ترین نمائش خانہ ہے، وظائف کے شعبہ کو ترقی دی، ریاستوں سے کانفرنس کے لیے ماہوار امدادی رقمیں مقرر کرائیں، مگر ان سب کے باوجود افسوس یہ ہے کہ ان کی زندگی کا ہر کارنامہ ناتمام سارہا، خدا مغفرت فرمائے۔ (''س''، فروری ۱۹۳۰ء)

سہارنپوری، عبدالحئی، مولانا

مولانا عبدالحئی سہارنپوری

ہندوستان میں عربی علم و ادب و لغت و محاورات کے جو چند مخصوص ماہرین ہیں۔ ان میں ایک مولانا عبدالحئی صاحب سہارنپوری استاد جامعہ عثمانیہ بھی تھے، افسوس کہ انہوں نے ۲۷/ رمضان ۱۳۴۸ھ کو بمقام حیدرآباد دکن، مرض طاعون میں مبتلا ہوکر وفات پائی، مرحوم کے دادا شیخ الحدیث مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری تھے، جو اپنے زمانے میں علم حدیث کے مرجع کل تھے، ان کے صاحبزادہ اور مرحوم مولانا عبدالحئی صاحب کے والد مولانا عبدالرحمان صاحب ادب عربی کے نامور عالم اور عربی کے شاعر تھے، انہوں نے اندلس کی تباہی کے مشہور مرثیہ کی بحر وقافیہ میں مولانا حالی مرحوم کے اشارہ سے ہندوستان کی تباہی کا بہت پُردرد مرثیہ لکھا تھا، مولانا عبدالحئی مرحوم کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان تھی، عربی کے شاعر اور عربی ادب و امثال اور محاورات کے بڑے عالم تھے اور سرکار نظام کی اعانت سے وہ عربی محاورات کا ایک ضخیم لغت فراہم کررہے تھے، افسوس کہ یہ عظیم الشان کارنامہ بھی ان کی موت سے ناتمام رہا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

میری ان کی ملاقات دارالعلوم ندوہ میں ۱۹۰۶ء میں ہوئی تھی، جہاں آکر وہ بعض فنون کی تکمیل اور جھوائی ٹولہ میں طب کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہ دارالعلوم کا عجیب زمانہ تھا، مولانا شبلی مرحوم زندہ تھے، مولانا حمیدالدین صاحب اور مولانا ابوالکلام صاحب کئی کئی مہینے آکر مولانا مرحوم کے پاس رہتے تھے اور ہر وقت علمی چہل پہل اور علم و ادب کی گفتگو رہتی تھی، اس صحبت میں مرحوم بھی شریک رہتے تھے۔

ان کے والد حیدرآباد میں مطب کرتے تھے، اس تعلق سے حیدرآباد جاکر رہے اور جامعہ عثمانیہ میں استاد مقرر ہوئے، ساتھ ہی ولی عہد بہادر نواب معظم جاہ بہادر (ہزہائنس پرنس آف برار) کی استادی و اتالیقی کے منصب پر بھی سرفراز ہوئے، آخر میں ان کی روحانی بے تابی نے حضرت مولانا تھانویؒ کی طرف متوجہ کیا، مرید ہوئے اور اجازت پائی، مولانا کی دعوت پر ایک دفعہ حیدرآباد بھی تشریف لے گئے، آخر میں قرآن پاک بھی حفظ کرلیا تھا، رمضان کے دن تھے، رات کو تراویح پڑھاتے تھے، اسی حال میں بیمار ہوئے اور صبر و شکر کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوئے۔ (''س''، مارچ ۱۹۳۰ء)

تصحیح: پچھلے شذرات میں مولانا عبدالحئی سہارنپوری مرحوم کے تذکرہ میں ان کے والد ماجد کا نام غلطی سے حبیب الرحمان لکھ گیا تھا، صحیح نام عبدالرحمان تھا، اس سلسلہ میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی اپنے والا نامہ مورخہ، ۶/ ذیقعدہ ۱۳۴۸ھ میں ارقام فرما رہے ہیں:

> ''مولوی عبدالحئی صاحب مرحوم بڑے مخلص دوست، ہمدرد وبہی خواہ اسلام بزرگ تھے، انجمن اسلامیہ کے مقاصد کی تائید میں متواتر دورے ایامِ فرصت میں فرماتے تھے، شگفتہ طبع بدلہ سنج تھے۔ وفات سے دو سال پہلے کلام مجید بڑے اہتمام سے حفظ کیا، پارسال بڑے اہتمام سے محراب میں سنایا امسال بھی ۲۰/ رمضان مبارک کی شب کو تراویح میں کلام پاک سنانے کی حالت میں مبتلائے طاعون ہوئے، ۲۷/ ماہ مبارک یوم جمعہ کو وفات پائی، جناب کو بالخصوص بہت تاسف ہے۔''

(''س''، اپریل ۱۹۳۰ء)

منصوری، قاسم علی، ڈاکٹر

ڈاکٹر قاسم علی منصوری

مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ کیمیا کے نوجوان لائق صدر ڈاکٹر قاسم علی منصوری ایم، اے۔ ایم، ایس، سی (کینٹب) پی، ایچ، ڈی، (گوٹنجن) جو ہماری قوم میں اس فن کے مستند ماہر اور یورپ کی درسگاہوں کی متعدد سندوں کے مالک تھے، ۱۰/ مارچ ۱۹۳۰ء کی صبح کو کسی بیماری میں دل کی حرکت بند ہوجانے سے وفات پاگئے، مرحوم کے دل کا یہ عارضہ کیمیائی تجربہ گاہ کے بعض خاص قسم کی گیس کے اثر سے شروع ہوا تھا، جس سے وہ بالآخر نجات نہ پاسکے، اس طرح ہم ان کو شہید علم کا درجہ دے سکتے ہیں، مرحوم کی اس غیر متوقع وفات سے ہمارے ملک کے حلقۂ علم و فن کو بڑا صدمہ پہنچا، خدا مغفرت فرمائے۔ (''س''، اپریل ۱۹۳۰ء)

سلطان جہاں بیگم

والیۂ بھوپال سلطان جہاں بیگم

خادمہ ملت ومخدومہ امت کا ماتم

علیا حضرت سلطان جہان بیگم سابق فرمانروائے کشور بھوپال جن کے نامِ نامی کے ساتھ ہمیشہ قلم کو یہ لکھنے کی عادت تھی کہ خلداللہ ملکہا، خدا ان کی حکومت ہمیشہ قائم

رکھے، اب وہاں کو سدھاریں جہاں کی حکومت واقعاً ہمیشہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی مغفرت کی لازوال دولت، اور اپنی رضا و خوشنودی کی غیر فانی سلطنت عطا فرمائے۔

علیا حضرت کی وفات ایک ایسا سانحہ ہے جس کا ماتم نہ صرف بھوپال، نہ صرف ہندوستان نہ صرف مسلمان بلکہ تمام دنیا کر رہی ہے، اور کرے گی وہ نہ صرف اسلام کی بلکہ مشرق کی وہ آخری تاجدار خاتون تھیں جن کے کارناموں پر مرد سلاطین اور امراء بھی رشک کر سکتے ہیں، ان کا دور حکومت جو تیں ۳۰ سال سے کم نہیں رہا بھوپال کی تاریخ کا زرین عہد ہے۔

سلطانہ مرحومہ مشرقی و مغربی تعلیم وتمدن کا ایسا مجمع البحرین تھیں، جو آج مصلحین امت کا آئیڈیل ہے، اُن کی مشرقی تعلیم پوری اور مغربی واقفیت بقدر ضرورت تھی، وہ نہ صرف فرمانروا تھیں، بلکہ ہندوستانی خواتین کی رہنما مسلمانوں کی واحد یونیورسٹی کی رئیسۂ علیا، مذہبی تعلیم کی سب سے بڑی حامی، مذہبی علوم وفنون کی سب سے بڑی سرپرست ہندوستان کی معتدل نسوانی اصلاحات کی سب سے بڑی مبلغ، مسلمان عورتوں میں سب سے بڑی کثیر التصانیف اور سب سے بہتر مقررہ، لیکن ان ہر قسم کے انتظامی، اصلاحی، ملکی، علمی اور تعلیمی کارناموں سے بڑھ کر اُن کا حقیقی شرف، اُن کی مذہبی گرویدگی، دینی عقیدت اور ایمانی جوش و ولولہ تھا۔

وہ ہر قومی و مذہبی وعلمی تحریک پر سب سے پہلے لبیک کہتی تھیں، اور اُس کے لئے عملی قدم اٹھاتی تھیں، مسلم یونیورسٹی، مدرسۂ دیوبند، دارالعلوم ندوہ، اور ووکنگ مشن چھوٹے بڑے بیسیوں تعلیمی و مذہبی ادارے اُن کی امداد و اعانت کے طوقِ منت سے گرانبار ہیں، دارالمصنفین اور سیرۃ نبویؐ کو کہا جائے کہ انھیں کے دستِ کرم اسے اُن کی بنیاد پڑی، خصوصاً سیرۃ النبیؐ جیسی اہم کتاب کا عالمِ وجود میں آنے کا شرف صرف ان کی ذاتِ گرامی کے لئے مخصوص ہے، امید ہے کہ تنہا ان کی یہی نیکی شفاعتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے استحقاق کے لئے کافی ہوگی۔

سلطان مرحومہ کی ہستی میں رعب و شفقت کی عجیب آمیزش تھی اور اُن کے اخلاق میں عجیب کشش تھی۔ اُن کا دربار حد درجہ سادہ ہوتا تھا، دربار کے آداب بھی تمام تر شرعی تھے، پردہ کے پیچھے وہ تشریف رکھتی تھیں، کورنش و تسلیمات و رکوع و سجود کا وہاں دخل نہ تھا، سب سے پہلے السلام علیکم کی بلند آواز اُن کی طرف سے آتی تھی، شاید ہی کوئی اُن سے ملا ہو اور اُن کے اخلاق و معلومات کی وسعت سے وہ متاثر نہ ہوا ہو، علامہ شبلی مرحوم غالباً ۱۹۰۶ء میں اُن سے ملے، تو ایسے متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنے جذبات الندوہ کے چند صفحات میں ظاہر کئے، مجھے دو تین دفعہ اُن کے حضور میں باریابی کا شرف حاصل ہوا، مگر ہر دفعہ دیر تک وہ اس اخلاق سے مصروفِ کلام رہیں، کہ مخاطب یہ بھول جاتا تھا کہ وہ کسی خود مختار فرمانروا سے باتیں کر رہا ہے۔

ان کو تصنیف و تالیف کا شوق تھا اور اس کے لیے ایک خاص محکمہ تھا، اس سلسلہ میں ان کے مسودات بارہا دیکھے ان کے برمحل اعتراض اور باموقع سوجھ حیرت انگریز تھی، اپنی تصنیفات کے مسودوں پر وہ خود نظر ثانی کرتی تھیں اور اپنے قلم سے ان پر نشان بناتی تھیں۔

اُن کو رسولِ پاک علیہ الصلوٰۃ سے بے مثال عقیدت تھی، جس کی کھلی دلیل خود سیرۃ نبویؐ کا وجود ہے، مگر اس کے علاوہ ان کی گفتگو، تحریر، تقریر ہر چیز سے اُن کا یہ جذبہ ظاہر ہوتا تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں سیرۃ کی پہلی جلد لے کر جب اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تھا تو بڑے اشتیاق سے انھوں نے دریافت کیا تھا کہ عالمِ رویا میں رسول انام علیہ السلام کی زیارت کس طرح ہوسکتی ہے عرض کی کہ کتبِ حدیث و سیرت کے مطالعہ اور درود وسلام کی کثرت سے۔

سلطانہ! تو آج سب سے بڑے سلطان کے دربار میں حاضر ہے، تیری ایک ایک نیکیاں انشاء اللہ اس دربار میں تیری سفارشی ہوں گی، قبول و مغفرت کا تاج تیرے سر پر ہوگا، اور رضا و خوشنودی کے مروارید تیرے گلے میں، سلطانہ! اب زمانہ ہزاروں کروٹیں بدلے گا، مگر تجھ کو نہ پائے گا تاہم تیری زندۂ جاوید نیکیاں تجھ کو تا ابد زندہ رکھیں گی۔

ہر گز نمیرد آنکہ دِلش زندہ شد بعشق
ثبت است برجریدۂ عالم دوامِ تو

(''س''، مئی ۱۹۳۰ء)

خان، حبیب اللہ، نواب

نواب حبیب اللہ خان

یہ سال مسلمان والیان ریاست کے لئے خاص طور سے اندوہناک ثابت ہوا، مرحومہ سرکار یہ بھوپال کے سانحہ وفات کے بعد ان کے پوتے حبیب اللہ خان، رامپور کی اسلامی ریاست کے مسند نشین پھر نواب صاحب والی ٹونک کی وفات کے سانحے یکے بعد دیگر پیش آئے اور دنیا کے انقلابات کے نئے نئے نقشے آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے، کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال ولاکرام [الرحمن: ۲۶۔۲۷]، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرنے والوں کو مغفرت اور ان کے جانشینوں کو توفیق حسن عمل عطا فرمائے۔ (''س''، جولائی ۱۹۳۰ء)

آرنلڈ، ٹومس، پروفیسر

پروفیسر آرنلڈ

پچھلے مہینے کی علمی سوانح میں دو فاضلوں کی وفات کا سانحہ خاص طور سے اہم

ہے، ان میں سے ایک مغرب نژاد اور دوسرا مشرقی تھا، پہلے کو ہندوستان اور ہندوستان کے مسلمان پروفیسر آرنلڈ کے نام سے جانتے ہیں، یہ فلسفہ کے عالم ہونے کے ساتھ عربی اور اسلامیات کے بھی ماہر تھے، یہ ہندوستان آکر پہلے اسلامیہ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے، اور پھر بعد کو محمڈن کالج علی گڑھ میں پروفیسر ہوکر آئے اور یہیں ان کی شہرت کا ستارہ چمکا، ان کی خاص خصوصیت علم کے ساتھ ان کا حسن اخلاق تھا، وہ مشرقی علماء کے ساتھ ہمیشہ گھل مل کر رہتے، اور لاہور ہو یا علی گڑھ ہر جگہ انھوں نے اپنے رفیق علماء سے کچھ سیکھا اور ان کو کچھ سکھایا، اور خصوصیت کے ساتھ لاہور میں قاضی ظفرالدین صاحب مرحوم اور علی گڑھ میں مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے ساتھ ان کے دوستانہ اور علمی تعلقات رہے، اور ان واقعات کا نتیجہ لاہور میں ان کی تالیف **السواء السبیل فی معرفة العرب والدخیل** اور علی گڑھ میں ان کی مشہور تصنیف دعوت اسلام ہے۔

مولانا شبلی مرحوم اور ان میں تعلقات ٹھیک استاد اور شاگرد کے تھے، مگر یہ فیصلہ مشکل ہے کہ ان میں استاد کون اور شاگرد کون تھا، مولانا نے ان سے کچھ فرنچ سیکھی تھی، اور انھوں نے ان سے عربی، مولانا مرحوم کے سفر ترکی میں سمرنا تک وہی رفیقِ سفر تھے، مولانا نے اپنے سفرنامہ میں اس کا حال لکھا ہے، سفر روم والے فارسی قصیدہ میں لکھتے ہیں،

آرنلڈ آنکہ رفیق است وہم استاد مرا

استاد کے استاد سے ۱۹۲۰ء میں لندن میں میری ملاقات ہوئی تھی، وہ اس وقت انڈیا آفس سے متعلق تھے، مولانا مرحوم کے تعلق کے سبب سے مجھ سے بڑی محبت سے پیش آئے، اکثر وہ میرے پاس اور میں ان کے پاس انڈیا آفس میں آیا جایا کرتے تھے اور گھنٹوں وہ اپنی پرانی صحبتوں کا تذکرہ لطف و مسرت کے ساتھ کیا کرتے تھے، میں نے دیکھا کہ علی گڑھ کی صحبتوں کے پرانے نقوش ان کے لوحِ دل پر ہنوز تازہ تھے۔

اسی زمانہ میں وہ انڈیا آفس سے نکل کر اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز لندن میں چلے آئے تھے اور اس تعلق سے ہندوستان کے مسلمان طلبہ جو اس اسکول میں جاتے تھے، ان کے ذریعہ سے نامہ و پیام بھی باہم قائم تھا، ابھی ان کے ایک شاگرد کا خط آیا تھا کہ وہ دعوت اسلام (پریچنگ آف اسلام) کا دوسرا اڈیشن کثیر اضافوں کے ساتھ چھپوانا چاہتے ہیں، ہندوستان کے متعلق تم سے کیا مدد مل سکتی ہے، میں نے مذاقاً جواب دیا تھا کہ جب ڈاکٹر صاحب خود لکھیں گے تو اس شرط کے ساتھ میں مدد دوں گا کہ طبع اول کے دیباچہ میں جہاں مولانا شبلی مرحوم کی امداد کا شکریہ ہے، وہاں طبع ثانی کے دیباچہ کے حاشیہ پر میرا ذکر خیر بھی کردیا جائے، کہ میں بھی اس بزم عالی کے حاشیہ نشینوں میں شامل ہوسکوں، مگر افسوس،

آن قدح بشکست وآں ساقی نماند

ہندوستان سے جاکر ان کا سب سے بڑا علمی کام تو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی تالیف میں شرکت ہے کہ اس کے متعدد اڈیٹروں میں سے ایک وہ بھی تھے اور سب سے آخری کام مسلمانوں کے فن مصوری کی تاریخ ہے، ابھی کچھ مہینے ہوئے تھے کہ وہ مصر کی قومی یونیورسٹی میں لیکچر دینے آئے تھے، اور ان کا خیال تھا کہ اس میں ہندوستان کی اسلامی تاریخ اور سلاطینِ ہند کے تمدنی کارناموں کی پوری تفصیل کریں گے، معلوم نہیں یہ کارنامہ کہاں تک پہنچا۔

آرنلڈ علی گڑھ کالج میں دس برس رہے اور اس طرح رہے کہ اس وقت ان کو کامل مسلمان نہ سہی تو نیم مسلمان تو ضرور ہی ماننا پڑے گا، مسلمانوں کی صورت، مسلمانوں کی وضع، مسلمانوں کا تمدن، مسلمانوں کے عالموں کی صحبت، ہر چیز مسلمان نما تھی، اور کہا جاسکتا ہے کہ آرنلڈ نے اپنے زمانہ کے کالج میں وہ روح پیدا کردی تھی کہ اس کی مثال کالج کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔

فروری ۱۸۹۸ء میں جب انھوں نے دس برس کے بعد کالج چھوڑا تھا، اس وقت الوداعی پارٹی کے موقع پر مولانا شبلی مرحوم نے یہ دوشعر موزوں کرکے پڑھے تھے:

آرنلڈ آنکہ دریں شہر و دیار آمد و رفت
دلبرے بود کہ مارا بہ کنار آمد و رفت
آمد از ان گونہ بکالج کہ بہ گلزار نسیم
رفت ز انساں کہ تو گوئی کہ بہار آمد و رفت

یہی دوشعر اس وقت ان کی دائمی وداع کے موقع پر پڑھے جاسکتے ہیں۔

("س"، جولائی ۱۹۳۰ء)

آہ آرنلڈ!

(شیخ عنایت اللہ)

ابھی ہم فقید العلم پروفیسر براؤن کے نوحہ سے فارغ نہیں ہوئے تھے، اور ان کے ماتم کی صدائیں ابھی قصر علم کے ہر در و دیوار سے آرہی تھیں کہ ہمیں ایک اور محبّ الاسلام والمسلمین یعنی پروفیسر ٹومس آرنلڈ کا ماتم کرنا پڑا، ان کے سفر مصر اختیار کرنے اور جامعہ مصریہ میں خطبات دینے کا ذکر ناظرین نے معارف کے شذرات میں پڑھا ہوگا، مصر سے براہ قسطنطنیہ مراجعت کئے ابھی ہفتہ عشرہ گذرا تھا کہ اچانک ۹/ جون (۱۹۳۰ء) کو صرف ایک دو دن کی علالت کے بعد بعارضہ قلب اس جہان فانی سے رخصت ہوگئے، جس کسی نے اس المناک خبر کو سنا، حیران و ششدر رہ گیا، کیونکہ انتقال سے ایک دو دن پہلے ہر کسی نے ان کو اسکول میں اپنے فرائض میں مشغول اور ملاقاتیوں سے حسب

معمول بہ جبین خندان ملتے دیکھا تھا، واپسی پر نہایت ہشاش بشاش تھے، جس کسی سے ملتے اس کے مناسب حال اپنے تاثرات اور تجارب سفر میں سے چیدہ چیدہ حالات سنا کر خود بھی مسرور ہوتے اور دوسروں کو بھی محظوظ کرتے پہلی ہی ملاقات میں مجھ سے اپنے قیام قسطنطنیہ کا خوشی خوشی ذکر فرمایا، اور کہنے لگے ''عنایت اللہ تم نے قسطنطنیہ دیکھا ہے'' میں نے عرض کیا ''نہیں'' فرمانے لگے کہ ''میں وہاں پورے نو دن رہا، اور ہر ایک قابل دید شے کی خوب سیر کی، بے شمار لائق دید عمارات اور مقامات میں سے قصر سلطانی خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے، جو اب ایک موزیم کی صورت میں تبدیل کر دیا گیا ہے، صرف خاص خاص زائروں کو داخلہ کی اجازت ملتی ہے، میں وہاں ایک عرصہ تک رہا، اور تم سے کیا بیان کروں کہ وہاں ارض و سماء کے کیا کیا خزانے جمع ہیں، ترکوں نے بیسیوں ملکوں کو تہ و بالا کیا، اور اپنے گھر کو سجایا، مصر کو لوٹا، ایرانیوں پر کئی دفعہ فتحیاب ہوئے، غرض صدیوں تک دنیا و جہاں کے نوادر و تحائف سے اپنے پایہ تخت اور قصور و محلات کو مالا مال کرتے رہے، علاوہ دیگر لاتعداد نفائس کتب کے میں نے وہاں ایک مصور نسخہ دیکھا جو خود شاہ طہماسپ کے لیے تیار ہوا تھا، اور اس کے ذاتی شاہی کتب خانہ میں رہ چکا تھا العرج اور بہت سے آثار و یادگارِ زمانہ اشیاء کا ذکر بڑے لطف سے کرتے تھے، انہیں کیا معلوم تھا کہ عنقریب وہ خود ایک افسانہ روزگار بن جانے والے ہیں۔

ان کی ذات مستجمع الصفات اس بات کی محتاج نہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں سے ان کا از سر نو تعارف کرایا جائے، ہند یعنی اسلامی ہند کے ساتھ ان کا پرانا اور گہرا تعلق تھا، سرسید مرحوم کے زمانہ میں علی گڑھ کالج میں دس سال درس دیتے رہے، پھر لاہور گورنمنٹ کالج میں فلسفہ کے پروفیسر اور پنجاب یونی ورسٹی کی اورینٹل فیکلٹی کے ڈین کی حیثیت سے چھ سال گذارے، غرض اپنی عمر کے سولہ سال ہندوستان کی نذر کئے، اپنی مشہورِ عالم تصنیف پریچنگ آف اسلام (Preaching of Islam) (دعوت اسلام) نو سال کی مسلسل محنت کے بعد یہیں بزمانہ قیام علی گڑھ لکھی جس کا ایڈیشن اولین جو ۱۸۹۶ء میں شائع ہوا، سرسید مرحوم کی وصیت کے مطابق میرے ایک بزرگ ہمنام کے قلم سے اردو میں ترجمہ ہوکر ''دعوت اسلام'' کے عنوان سے اردو دان اصحاب سے روشناس ہو چکا ہے، ۱۹۰۴ء میں انڈیا آفس (لندن) میں اسسٹنٹ لائبریرین مقرر ہوئے، اور ۱۹۰۹ء سے ۱۹۲۰ء تک گورنمنٹ کی طرف سے ہندوستانی طلباء مقیمانِ انگلستان کے تعلیمی مشیر اور نگران کار مقرر رہے، اور ۱۹۲۰ء سے تا آخر حیات اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز (لندن یونی ورسٹی) میں عربی کی مسند دراست کو زینت بخشی، ہندوستان سے اسکول مذکور میں ہندوستانی طالب علموں کو عربی اسلامی مضامین کے مطالعہ کے لیے جو چیز کھینچ لاتی تھی، وہ آپ ہی کی ذات بابرکات تھی۔

مولانا شبلی مرحوم و مغفور کے ساتھ ان کی جو مخلصانہ دوستی تھی، وہ ہر ایک کو معلوم ہے، اور ایک کلاسیکل (Classical) چیز بن کر ہمارے ہاں ایک ادبی روایت کی حیثیت اختیار کر چکی ہے، فی الواقع یہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کے قدر شناس تھے، اور مشرقی عالم نے مغربی فاضل کے دل پر اپنی شخصیت اور اخلاص و مودت کا جو گہرا نقش چھوڑا تھا، وہ اس ایک واقعہ سے ظاہر ہے، کہ جب ایک دفعہ مجھے ان کے دولت خانہ پر شرف ملاقات حاصل ہوا، اور دوران گفتگو میں مولانا شبلی کا ذکر خیر آ گیا تو فرمانے لگے کہ میں انہیں ایک برادر عزیز کی طرح چاہتا تھا، اور مجھے یقین ہے کہ وہ بھی میری محبت کا جواب محبت سے دیتے تھے، پھر گرمجوشی کے ساتھ اس فارسی قطعہ کی طرف اشارہ کیا جو مولانا مرحوم نے ان کے علی گڑھ سے رخصت ہونے کے موقع پر لکھا، اور جو اب بھی ان کے کتب خانہ کی دیوار پر آویزاں تھا، غرض مولانا کی زندہ دلی، بذلہ سنجی اور ان کے شگفتہ ظریفانہ لطائف کی یاد میں بے اختیار ہنستے تھے، اور فرماتے تھے کہ اگر ان سے مجھے کوئی شکایت تھی تو یہ کہ وہ میرے ساتھ عربی کی تعلیم کے خشک کام میں سرکھپائی کرنے سے گریز کرتے تھے، جب میں ان سے کہتا کہ مجھے عربی پڑھاؤ، تو جواب دیتے کہ ''نہیں، نہیں تم پہلے ہی سے بہت کچھ جانتے ہو، میں کچھ اپنے لیے بھی تو رکھوں''۔

ہندوستان کے ساتھ ان کا تعلق خاطر آخر وقت تک قائم رہا، چنانچہ جامعہ مصریہ میں پچھلے سال جو خطبات دیئے، ان میں عام اسلامی تاریخ کے علاوہ، ان کا دوسرا موضوع خاندان تیموریہ کی تاریخ تھا، ان کے مصر سدھارنے سے قبل جب میں نے پوچھا کہ آپ وہاں کس مضمون پر لکچر دینگے تو جواب دیا کہ خاندان تیموریہ مغلیہ پر، کیونکہ مجھے مصری طلبہ اور دیگر اشخاص سے گفتگو کر کے معلوم ہوا کہ وہ لوگ ہندوستانی مسلمانوں کو حقیر جانتے ہیں، بدین وجہ کہ ان کی نظر ہند کے موجودہ انحطاط پر ہے، مگر وہ اسلامی ہند کی گذشتہ عظمت و شان (Glory) سے ناواقف ہیں، میں انہیں بتانا چاہتا ہوں، کہ اسلامی ہند ایک وقت میں کیا تھا، اور اب بھی اقوام اسلامیہ میں اس کا کیا درجہ ہے؟

کیا بلحاظ وسعتِ علم اور کیا بلحاظ وست اخلاق، پروفیسر آرنلڈ جیسے عالم کا صفحہ ہستی سے اٹھ جانا ہر حالت میں ماتم خیز تھا مگر ایسے وقت میں جب کہ انگلستان میں پہلے ہی سے دوسرے یورپی ممالک کی نسبت عامہ مستشرقین کا بالعموم اور اسلامی روایات سے ہمدردی رکھنے والے علماء کا بالخصوص قحط ہے، ان کی موت اور بھی زیادہ المناک اور تاسف انگیز ہے، اور جہاں تک اسلامی تاریخ اور علوم و فنون کی تحقیق و تفتیش کا تعلق ہے، ان کا انتقال فی الواقع ایک ناقابل تلافی نقصان ہے، اسلامی السنہ اور اسلامی تاریخ و تمدن کے درس و مطالعہ کے مدعی تو کئی ایک ہیں، مگر روح اسلام اور اسلامی روایات کے کماحقہا سمجھنے کی جو توفیق قدرت کی طرف سے انہیں عطا ہوئی تھی، وہ بہت کم لوگوں کے حصہ میں آئی ہے، اسلامی تعلیم اور اصول کی تشریح و توضیح میں وہ جس سلامت روی، جس بصیرت اور جس ہمدردانہ خوش فہمی کا ثبوت دیتے، اس سے اگر ایک طرف اعتدال پسند

اور منصف مزاج فرقہ علمائے سے خراج تحسین وصول کرتے تھے، تو دوسری طرف پادری زویمر وامثالہ ان پر پاسداری اور بے جا سرگرمی کا الزام لگاتے اور ان کی تحریروں پر نہایت تلخ لہجہ میں معترض ہوتے تھے۔

ان کی بے بدل کتاب پریچنگ آف اسلام (Preaching of Islam) نہ صرف فن تاریخ نویسی کا ایک اعلیٰ نمونہ اور اسلامی تاریخی ادب میں ایک بیش بہا اضافہ تھا، بلکہ اس کی تحریر سے انہوں نے اسلام کے بے داغ چہرے سے جو داغ مٹایا، وہ عامہ مسلمین کی ایک بہت بڑی خدمت تھی، جو انہوں نے سرانجام دی اور جس کے احسان گرانبار سے کافہ مسلمین کی گردن کبھی ہلکی نہیں ہوسکتی، چونکہ وہ کتاب ایک غیر مسلم محقق کے قلم سے نکلی تھی، اس لیے رائے عامہ پر اس کے نتائج تحقیق کا بہت اچھا اثر پڑا اور مخالفین نے ازراہ تعصب اور جہالت اسلام کے بزور شمشیر پھیلائے جانے کی جو رٹ لگا رکھی تھی، اس کا بہت حد تک سدباب ہوگیا، اگر آج اسلام کی پرامن اشاعت معتدل علمائے مستشرقین کے درمیان مسلمات میں سے ہے، تو یقیناً ہوا کا رخ پلٹنے اور اس صحیح رائے کے پیدا کرنے میں ڈاکٹر صاحب کی پرزور اور ناقابل تردید تحقیق کا بہت سا حصہ ہے، اگرچہ انہوں نے ''دعوت اسلام'' میں صرف بے لوث علمی تحقیق کی داد دی تھی، مگر بلحاظ نتیجہ کے اس میں اسلام کی مدافعت اور حمایت کا جو پہلو پیدا ہوگیا تھا، اس کی بنا پر بعض اچھے پڑھے لکھے آدمیوں کو یہ گمان بلکہ یقین ہوتا تھا کہ اس کا مصنف مسلمان ہے، اگرچہ ڈاکٹر صاحب عقیدۃً مسلمان نہ تھے، لیکن اگر مکارمِ اخلاق، انسانی ہمدردی، اخلاص و صداقت، تلطف و ملائمت اور فرض شناسی کا نام اسلام ہے، تو بلاشبہ وہ نہ صرف مسلمان تھے، بلکہ ہمارے آج کل کے مردم شماری کے اکثر مسلمانوں سے بہتر تھے۔

ان کی اس معرکۃ الآرا تصنیف کی خاص کر جرمنی میں ہمیشہ سے بہت قدر و منزلت رہی ہے اور ان کی یہ وقعت اور قبولیت بدین لحاظ کوئی معمولی بات نہیں کہ جرمن علماء بالعموم انگریز مصنفوں کو خاطر میں نہیں لاتے، اور یہ امر باعث تعجب نہیں، کیونکہ جیسا کہ اہل خبر سے پوشیدہ نہ ہوگا، نہ صرف انگریزی زبان میں مشرقیات کا ذخیرہ مقابلۃً کم ہے، بلکہ تاحال انگریز مصنفین باستثناء چند یورپی اور خصوصاً جرمن مستشرقین کے خوشہ چین رہے ہیں، لیکن اگر کسی انگریز مستشرقین کی کوئی تصنیف جرمن معیار تحقیق پر پوری اتری ہے تو وہ ڈاکٹر صاحب کی ''دعوت اسلام'' ہے، خصوصاً پروفیسر گولڈ زیہر (Gold Ziher) متوفی ۱۹۲۳ء ان کے بہت مداح اور قدر شناس تھے، اسی طرح دیگر علماء بھی احترام کے ساتھ اس کا ذکر کرتے ہیں، آرنلڈ صاحب مجھ سے ایک دفعہ بیان فرماتے تھے کہ میں نے ڈاکٹر بیکر (Becker) (مشہور وممتاز جرمن مستشرق) سے ایک دفعہ سوال کیا کہ کیا وجہ ہے کہ تم جرمن عالم لوگ باوجود اپنے بے مثال تبحر علمی اور شوق تحقیق کے اشاعت اسلام کی تاریخ کے مسئلہ پر توجہ نہیں کرتے، اور اس ضروری موضوع پر اپنی زبان میں کوئی کتاب تیار نہیں کرتے، تو (جوہر شناس) ڈاکٹر نے جواب دیا کہ ''اس کی یہ وجہ ہے کہ ہم لوگ آپ کی کتاب پڑھتے ہیں''۔

فی الواقع مشرق ومغرب میں وہ اپنے موضوع پر ایک واحد اور بے بدل کتاب ہے، اگرچہ فرانسیسی محققین نے افریقہ میں اشاعت اسلام کے متعلق حال میں بہت کچھ لکھا ہے، اور دیگر اقطاع وممالک اسلامی کے متعلق بھی مزید معلومات جمع ہوتی جارہی ہیں، مگر تمام عالم اسلامی کا اس لحاظ سے سوائے پروفیسر صاحب کے کسی نے احاطہ نہیں کیا، اس کا دوسرا ایڈیشن جو ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا، چند سال سے ختم ہوچکا ہے، اور ایسا کمیاب ہوتا جارہا ہے کہ جن دو ایک مصری صاحبوں نے اس کے عربی ترجمہ کرنے کی اجازت لے رکھی ہے، وہ اصل کے دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں کچھ مدت سے اس کے تیسرے ایڈیشن کی فکر میں تھے، اور نئے مواد کی جمع و ترتیب میں مشغول تھے، مگر افسوس کہ اجل نے مہلت نہ دی، جب میں نے ایک دفعہ اس کے اردو ترجمہ کا ارادہ ظاہر کیا تو انہوں نے نہ صرف میرے ارادے کو بنظرِ استحسان دیکھتے ہوئے شرف قبولیت بخشا تھا بلکہ اپنے چند ایک دیگر مقالات کا حوالہ دیا تھا، جو انہوں نے ایک انسائیکلوپیڈیا کے لیے لکھے تھے، اور فرماتے تھے، کہ جب تم کسی آیندہ وقت ترجمہ کرو تو ان مقالات کا ترجمہ بھی شامل کرلینا جو بلحاظ اپنے مضمون کے ضمیمہ یا تتمۂ کتاب کا کام دیں گے۔

ایک مدت سے انہیں اسلامی آرٹ (Art) کے مطالعہ وتحقیق کی طرف خاص رغبت ہوگئی تھی، اور اپنی عمر کے کم از کم آخری دس سال انہوں نے زیادہ تر اسی موضوع کے مطالعہ میں صرف کئے، Mr.Binyon کی معیت میں شاہان مغلیہ کے درباری مصوروں پر انہوں نے جو کتاب لکھی وہ اپنے موضوع پر ایک نہایت دلچسپ بلکہ دلفریب کتاب ہے، مگر اسلامی فن تصویر پر ان کی جامع تصنیف **التصویر فی الاسلام** ہے، جو ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی مجھ سے ایک دفعہ ازراہ شکایت اور افسوس ذکر کرتے تھے کہ انگلستان میں بہت کم ایسے لوگ ہیں جو اس موضوع پر کام کرتے ہوں، اور جن کے ساتھ میں اس مضمون پر تبادلہ خیالات کرسکوں چنانچہ ان کی آخری کتاب ''اسلامک بک'' پروفیسر Grohmann کی شرکت میں لکھی گئی، سنہ رواں (۱۹۳۱ء) کے آغاز میں لندن میں ایرانی (Art) فنون کی جو عظیم الشان بین الاقوامی نمائش اور کانگریس منعقد ہورہی ہے، یہ انہیں کی اولین تجویز وتحریک کا نتیجہ ہے، مگر افسوس وہ خود اس میں حصہ لینے کے لیے اس وقت زندہ نہیں ہیں، Art پر ان کی تصانیف کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

۱۔ سلاطین مغلیہ کے درباری مصورین ۱۹۲۱ء
(The govt. painters of The great Moguls 1921)

۲۔ اسلام میں مصوری ۱۹۲۸ء (Painting in Islam 1928)

۳۔ بہزاد اور اس کی تصویریں ظفر نامہ کے قلمی نسخہ میں

(Bihzad and his paintings in the Zafar nama)

۴۔ اسلامی کتاب ۱۹۳۰ء (The Islamic Book 1930)

عربی کی تعلیم کے متعلق ان کے چند خاص اصول وقواعد تھے، جن پر وہ ایک مدت العمر کے تجربہ کے بعد پہنچے تھے، اسکول میں ان کی تعلیم انہیں اصول پر مبنی تھی، اور فرماتے تھے کہ ان کی نگہداشت اور استعمال سے ہمیشہ تسلی بخش اور عمدہ نتائج مترتب ہوئے ہیں۔ یہ امر پوشیدہ نہیں، کہ کچھ عرصہ سے وہ انہیں اصول پر ایک عربی گریمر کی ترتیب دینے میں مصروف تھے، مگر افسوس کہ کئی ایک دیگر کاموں کی طرح یہ مفید کام بھی انجام نہ پاسکا، وہ اس بات کے سخت مخالف تھے کہ طالب علموں کے نصاب تعلیم میں، خواہ وہ متبدی ہوں یا منتہی، مشکل کتابوں کو خواہی نخواہی داخل کیا جائے، وہ کتابیں جن کی سب سے بڑی خصوصیت اور وجہ شہرت محض یہ ہے کہ ان میں مغلق الفاظ کی بھرمار ہے، ایسی کتابوں کو وہ طالب علموں کی ترقی میں سخت حارج سمجھتے تھے، ان کی رائے یہ تھی کہ ہر درجہ میں اس کے مناسب نصاب خواہ لمبا ہو مگر آسان اور بے فائدہ مغلقات سے پاک، تاکہ طالب علم کی نظر سے زیادہ ممکن کتابیں گذر جائیں، اور وہ مختلف قسم کی نثر اور نظم اور لٹریچر کے مختلف اصناف سے نسبۃً قلیل عرصہ میں آشنا ہوسکیں، بجائے اس کے کہ وہ ایک ہی مشکل کتاب پر عرصہ تک بے فائدہ سر پٹکتے رہیں، اسی لیے وہ عربی میں عجائب المقدور (تاریخ تیموری) اور مقامات حریری اور فارسی میں درّہ نادرہ اور تاریخ وصاف وغیرہا قسم کی کتابوں کو درسی نصاب کے لیے بالکل نامناسب خیال کرتے تھے اور کہا کرتے کہ یہ تو قدیم ادبی نوادر (Literary Curissities) ہیں۔ جب طالب علموں کو زبان میں دخل حاصل ہوجائے تو بعد میں اگر وہ چاہیں اور از راہ شوق بطور خود پڑھ سکتے ہیں، اور افسوس کیا کرتے کہ ہندوستان میں ابھی تک ذمہ دار لوگ نہ قدیم مدارس میں نہ جدید تعلیم گاہوں میں، اس قدیم طرز تعلیم کی غلطی پر متنبہ نہیں ہوئے، اور اسی قسم کے غلط طریقہ ہائے تعلیم کو ہندوستان میں علوم عربیہ کی موجودہ پستی اور کساد بازاری کا ایک قوی سبب جانتے تھے۔

علاوہ ازیں اسلامی ہند کے موجودہ علمی جمود پر افسوس کیا کرتے، ایک دفعہ مجھ سے فرمانے لگے، کہ جس زمانہ میں میں ہندوستان میں تھا، تمہاری یونیورسٹیوں میں بیش قرار تنخواہوں والے مشرقی پروفیسر مقرر نہ تھے، یہ تبدیلی حالات بہت مبارک اور خوش آیند ہیں، مگر اس سے ابھی تک علمی فضا میں وہ حرکت اور وہ زندگی پیدا نہیں ہوئی، جس کی بجا طور پر توقع کی جاسکتی تھی، تمہاری کرسی ہائے دراست کی علمی پیداوار صفر کے قریب قریب ہے، مگر ساتھ ہی ساتھ مخصوص حلم و انکسار کے ساتھ کہتے، کہ میں کون ہوں؟ جو اس بارہ میں شکایۂ لب کشائی کروں، مگر حقیقت میں یہ کوئی شکایت نہ تھی، بلکہ ان کی سچی دلسوزی کا اظہار تھا، اور سچ بھی یوں ہے، کہ اس ملک کی حالت پر جتنا نوحہ کیا جائے کم ہے، جہاں کے اکثر حاملان علم اور مدعیان فن کا اولین اور آخرین علمی کارنامہ وہ کتاب ہوتی ہے جو وہ ڈگری حاصل کرنے کے لیے لکھتے ہیں، خصوصاً اسلامی تاریخی تحقیقات کی کس مپرسی اور عام پستی پر افسوس کرتے اور کہتے کہ تمہارے ملک کے اساتذہ کا نام ہم لوگ ہندوستان سے باہر بہت کم سنتے ہیں۔ میں نے جواباً عرض کیا کہ ہم لوگ خود ہندوستان میں رہ کر نہیں سنتے، آپ ساتھ سمندر پار کیا سنیں گے، اس قسم کی تحقیقات کا بار دہ زیادہ عربی اور فارسی کے اساتذہ پر ڈالتے اور کہتے کہ چونکہ تاریخی مصادر و مآخذ جہاں تک قرون اولیٰ کا تعلق ہے، بیشتر عربی میں ہیں اور جہاں تک ہند کی اسلامی تاریخ کا واسطہ ہے، فارسی میں لہٰذا وہ لوگ اس کام کے زیادہ اہل ہیں، مگر وہ اس بات کو فراموش کر جاتے کہ اس کے لیے محض عربی دانی یا فارسی دانی کافی نہیں، بلکہ جوش عمل شرط اولین ہے، اور اس علمی شغف، اس دارفتگی و سرشاری، اس علمی عشق کی ضرورت ہے، جس نے پچھلی صدی میں شبلی پیدا کیا، اور وہ ذاتی شوق، وہ طبعی رجحان، خدمت علم کا وہ سچا جوش و ولولہ اور علم کی پرستاری کا وہ جذبہ جس کو حکومت دریاست کی سرپرستی، نہ سرکاری عہدوں کی پیش قرار تنخواہیں پیدا کرسکتی ہیں اور جو نہ کسی مشرقی یا مغربی یونیورسٹی کی سند سے حاصل ہوسکتا ہے۔

ان کی تمام زندگی جونہایت سادہ اور ہر قسم کے تکلف سے مبرا تھی، الفقرُ فخری کی علمی تفسیر تھی، دوران مکالمہ جب ایک دفعہ میری زبان سے نکل گیا، کہ مجھے لذائذ زندگی (Amenities of Life) سے متمتع ہونے سے احتراز نہیں، تو مارے تعجب کے چونک اٹھے، اور فرمانے لگے، کہ ''عنایت اللہ! تمھیں اپنے استاد کے سامنے ایسے بات کہتے شرم نہیں آتی لاحول ولا قوۃ لِـ محض دنیاوی آسایش کیا چیز ہے، پھر فرمایا، Inayatullah live the life of a scholar (عنایت اللہ ایک اسکالر کی زندگی بسر کرو) ان کے یہ پراثر الفاظ جب تک زندہ ہوں میرے کانوں میں گونجتے رہیں گے، کہا کرتے کہ میں غریبوں کے گھر پیدا ہوا اور ساری عمر غربت میں بسر کی، مگر میں نے کبھی اس بات پر افسوس نہیں کیا، اور نہ یہ بات لائق افسوس ہے، کیونکہ مجھے اپنی جگہ اس خیال سے کامل اطمینان اور تسلی ہے، کہ میں نے اپنا وقت حتی الامکان صرف ایسے کام میں صرف کیا ہے جس کو اپنی رائے میں مفید سمجھتا ہوں، جرمنی جانے سے پہلے ایک دفعہ میں نے ان سے دریافت کیا کہ آیا مجھے وہاں تین ماہ کے لیے ایک سو پونڈ کی رقم کافی ہوگی تو کہنے لگے کہ کیا تم وہاں نوابوں کی طرح رہنا چاہتے ہو، تمہیں کیا معلوم کہ جرمن طالب علم کس طرح رہتے ہیں، اور ان میں سے بعض کسی قدر عسرت زدہ ہوتے ہیں، اور ساتھ ہی ان کے علمی ذوق وشوق پر عش عش کرتے اور کہتے کہ وہ ہزار تکلیف

جھیلتے ہیں مگر دامن طلب ہاتھ سے نہیں چھوڑتے، قیام جرمنی میں مجھے خود کئی ایک ایسے واقعات دیکھنے اور سننے کا اتفاق ہوا جن سے ان کے قول کی پوری تصدیق ہوتی تھی، مگر ان کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

اپنے شاگردوں کے لیے وہ سفر و قیام جرمنی ایسا ہی ضروری سمجھتے تھے جیسا کہ ذی استطاعت مسلمان کے لیے سفر حج، جرمن علماء کا ان سے بڑھ کر کون قدر شناس ہوسکتا ہے، اپنے طلبہ کے لیے جرمن زبان کی تحصیل ازبس ضروری جانتے تھے، تاکہ وہ جرمن ذخیرہ مشرقیات سے مستفید ہوسکیں، خود جرمن خوب بولتے تھے اور لکھتے تھے۔

ان کے ستودہ خصال میں زندہ دلی، نرمی، اور حلم وانکسار کے پہلو خاص طور پر نمایاں تھے، جس سے وہ ہر کہ ومہ کے دل میں گھر کر لیتے تھے، خواہ کسی سے چند لمحوں کے لیے ملتے، مگر اس کے دل پر اپنے حسن اخلاق اور شگفتگی طبع کا گہرا نقش چھوڑ جاتے تھے، عام طور پر کہا جاتا ہے، کہ ہر شخص کے دوست بھی ہوتے ہیں اور دشمن بھی، مگر جہاں تک مجھے علم ہے ان کے جاننے والوں سے میں نے کبھی ایک حرف ان کے خلاف نہیں سنا جوان کے غیر معمولی حسن سیرت کی دلیل ہے، خصوصاً اپنے شاگردوں کے ساتھ ان کا برتاؤ نہایت مشفقانہ تھا انکو ہمیشہ تلطف اور مہربانی کے کلمات سے پکارتے مثلاً ''مائی ڈیر عنایت اللہ'' یا ''مائی ڈیر ہمدانی'' ان کا معمولی طرز تخاطب تھا، راقم الحروف کے ساتھ جو کچھ ان کا حسن سلوک اور حسن ظن تھا، اور اس خاکسار پر اس سحاب کرم کی جانب سے مہربانی وعنایت کی جو مسلسل بارش رہتی، اس کے تذکرہ کو میں خودستائی کے الزام کے خوف سے عمداً حذف کرتا ہوں ان کی عنایت بے غایت کی یاد سے میرا دل تشکر وامتنان کے جذبات سے ہمیشہ مملور رہے گا۔

باوجود دنیائے علم ودانش میں بلند پایہ رکھنے کے بیحد منکسر المزاج تھے، اور کوئی ایسی بات نہیں سن سکتے تھے جس میں ان کی تعریف یا توصیف کا ذرا سا بھی پہلو ہوان میں نہ تو ہمارے بدقسمت ملک کے بعض تنگ ظرف علمائے طرز قدیم کا تبخ تھا، اور نہ بعض جدید تعلیم یافتہ دیسی حضرات ''دکاترہ'' ۲؎ اور ''پرافاسرہ'' ۳؎ کا بے محل پر غرور دفتری رعب وادب اور برگشتہ کی سردمہری اور بیگانگی تھی۔

آرنلڈ مرحوم کے پسماندگان میں ایک دل شکستہ بیوہ اور ایک شادی شدہ صاحبزادی ہے جن صاحبوں نے ان کی پریچنگ آف اسلام کا پہلا ایڈیشن دیکھا ہے، ان کو یاد ہوگا کہ مصنف نے اس کو اپنی اہلیہ کے نام معنون کیا تھا، اور ساتھ ہی دیباچہ میں ان کی امداد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ان کا حسن قبول میری محنت کا بہترین صلہ ہے، اس ضمن میں ایک چھوٹے سے واقعہ کا ذکر شاید بے محل نہ ہوگا جس سے ان کی خوشگوار خانگی زندگی اور پسندیدہ پُرمحبت ازدواجی تعلقات پر دلچسپ روشنی پڑتی ہے، روانگی مصر سے دو تین دن پہلے جب میں ان کی خاص طلبی پر ان کے دولت خانہ پر حاضر خدمت ہوکر بیٹھا ہم کلام تھا، تو دفعتہً ٹیلیفون پر کسی نے ان کو بلایا، اور دریافت کیا کہ کیا آپ فلاں کام کے لیے آج شام آسکتے ہیں، تو ڈاکٹر مرحوم نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ میں عنقریب چند ماہ کے لیے مصر جانے والا ہوں، میری بیوی نہیں چاہتی کہ میں ایسی حالت میں بشرط امکان اس سے دور رہوں، اس ناقابل تردید بناء معذرت کوسننا میرے لیے دلچسپی اور لطف سے خالی نہ تھا۔

جہاں تک مجھے علم ہے ان کا انگلستان کے کسی کلیسا کے ساتھ مطلق کوئی تعلق نہ تھا، عام عقائد میں وہ ریشنلسٹ (عقلی) (Rationalist) تھے، اور تحقیق مسائل میں ان کا آزادقدم کسی خاص مذہب کا پابند نہ تھا، ان کا مسلک جو کچھ بھی تھا عقلی اور اخلاقی تھا، ڈاکٹر اسٹینٹن کوائٹ (Dr. Stanton Coit) جو یہاں کی ایک ایتھکل سوسائٹی (Ethical Society) کے سکریٹری ہیں، ان کا بیان ہے کہ ڈاکٹر صاحب کبھی کبھی ہمارے جلسوں میں آنکلتے تھے۔ (اپریل ۱۹۳۱ء)

۱؎ اس قسم کے مشرقی رسمی کلمات ان کی زبان سے بے ساختہ نکل جاتے تھے، علاوہ ازیں بوقت ضرورت اردو صاف بولتے اور پڑھتے تھے۔

۲؎ دکتور کی جمع ۳؎ پروفیسر کی مذاقیہ جمع

منصور پوری، سلیمان، قاضی

قاضی سلیمان صاحب منصور پوری

وہ مشرقی فاضل جس کی موت پر آج ہم کو ماتم کرنا ہے وہ قاضی محمد سلمان منصور پوری سابق جج پٹیالہ اور سیرت کی مشہور کتاب ''رحمۃ للعالمین'' کے مصنف ہیں، وہ علم وعمل، زہد وکمال اور فضل وورع دونوں کے جامع تھے، روشن دل اور دماغ تھے، ان کے جدید وقدیم دونوں خیالات حد اعتدال پر تھے، عربی زبان اور علوم دین کے مبصر عالم تھے، توراۃ وانجیل پر فاضلانہ وناقدانہ نگاہ رکھتے تھے، غیر مسلموں سے مناظرہ کے شائق تھے، مگر ان کے مناظرہ کا طرز سنجیدگی، متانت اور عالمانہ وقار کے ساتھ تھا، مسلکاً اہل حدیث تھے، مگر اماموں اور مجتہدوں کی دل سے عزت اور ان کی محنتوں اور جانفشانیوں کی پوری قدر کرتے تھے۔

وہ ندوۃ العلماء کے دیرینہ رکن تھے اور اسی وساطت سے ان سے تعارف حاصل ہوا، اور تعارف نے باہم انس ومودّت کی صورت پیدا کی، جب مل جاتے دیر تک ہم ذوقی کا لطف قائم رہتا، سیرۃ، جدید مناظرات وکلام اور محاسن اسلام کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو رہتی، اور اس لطف میں تھوڑی دیر کے لئے ہر چیز فراموش ہوجاتی، چند سال ہوئے کہ دارالمصنفین بھی ان کے فیض قدوم سے منور ہوا تھا، بلند قامت، خوش رو، خوش لباس، وجیہ، گھنی داڑھی، سپید صافہ باندھا کرتے تھے۔

ان کی مستقل تصنیفات میں رحمۃ للعالمین، الجمال والکمال (تفسیر سورۂ یوسف) اورسفرنامۂ حجاز، یادگار ہیں، ان کے علاوہ چھوٹے بڑے بیسوں رسائل ان کے قلم سے نکلے، مگر سب سے زیادہ ''رحمۃ للعالمین'' نے قبولیت حاصل کی، اسلامی مدرسوں میں داخل ہوئی، کورسوں میں شامل ہوئی، لوگوں نے ذوق وشوق سے پڑھا، خدا رحمۃ للعالمین کے مصنف کواپنی رحمت عالم سے نوازے۔

سات آٹھ برس ہوئے کہ وہ ایک دفعہ حج کر چکے تھے، واپس آکرانہوں نے اپنا سفرنامہ لکھا، دوسری دفعہ امسال حج کو گئے تھے، مکہ معظّمہ سے ایک دوست کا خط آیا تھا کہ قاضی سلیمان صاحب امسال حج کوتشریف لائے ہیں اور اپنے ''ہمنام'' کا ذکر خیر بڑی محبت سے کرتے ہیں اور اس بشارت کی خوشی پوری بھی نہ ہونے پائی تھی کہ صابر منزل قرول باغ دہلی سے ایک خط نے آکراس کا خاتمہ کردیا، اس میں لکھا تھا کہ قاضی صاحب نے بیمار ہوکر واپسی میں جہاز پر دم توڑا، آہ! اس بحرِہستی میں خدا جانے کتنے جہاز ڈوبے، اورڈوبیں گے۔

درین بحر کشتی فروشد ہزار
کہ پیدان نشد تختۂ برکنار

(''س''، جولائی ۱۹۳۰ء)

جالبؔ دہلوی، سید

سیّد جالبؔ دہلوی

اس مہینہ اردوصحافت کواپنے ایک دیرینہ اہل قلم کی خدمات سے ہمیشہ کے لئے محرومی ہوئی، سید جالب دہلوی جو نہ صرف بحیثیت ایک کہنہ مشق اخبارنویس کے قابل ذکر ہیں، بلکہ مرحوم علم کے ایک سچے طالب اور عاشق تھے، ان کی کہنہ مشقی، اخباری وسعت اطلاع، عام معلومات کی آگاہی، تاریخی ذوق، کتب نادرہ سے سچاعشق ان کی زندگی کی خصوصیات تھیں، ہر ہفتہ نخاس جاکر معمولی دوکانوں پر بیٹھ کر قلمی کتابوں کے منتشر و پراگندہ اوراق چن کربقیمت اٹھالاتے تھے، گھرلاکران کی خدمت کرتے، ترک دیکھتے، ہندسے جوڑتے، عبارتیں ملاتے اور اوراق کو جوڑ کر کتاب کو درست کرتے، مرحوم نے کبھی فارغ البالی کی زندگی نہیں بسر کی، مگراسی عالم میں انہوں نے لاہور، دہلی اورلکھنؤ کے بازاروں سے سات آٹھ ہزار کتابوں کا ذخیرہ فراہم کیا، جن میں بعض بعض بہت نادر کتابیں تھیں، ان کا ارادہ تھا کہ ان کتابوں کے لئے وہ کوئی خاص مکان بنوائیں، یاکسی قومی درسگاہ کے حوالہ کردیں، خدا جانے مرحوم کی وفات کے بعد ان پسماندوں کا کیا حشر ہوا، [1] مرحوم ساکہنہ مشق اخبارنویس اوراخبارنویسی کے ایک ایک فن کا واقف کارشاید ہی مسلمانوں میں کوئی دوسرا ہو، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، ان کا سب سے بڑا کمال ان کا حافظہ تھا، جو ادنیٰ ادنیٰ چیزوں سے لے کر بڑے بڑے اشخاص سے متعلق معلومات ان کے خزانہ میں محفوظ رہتے تھے۔

سید جالب مرحوم پیسہ اخبار کے بعد غالباً سب سے پہلے ہمدرد میں ظاہر ہوئے، ہمدرد کے بند ہونے پرلکھنؤ آکرہمدم کی ادارت کا فرض انجام دیا اورابھی دوسال ہوئے ہمدم سے علیحدگی کی صورت میں روزنامہ ہمت جاری کیا، سید جالب کا وجود اگر لکھنؤ میں نہ ہوتا تو بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ اخباری حیثیت سے لکھنؤ کا کوئی وزن نہ ہوتا، سید جالب مرحوم کا قلم نہایت محتاط، مرنج ومرنجان اورطرزِ ادا نہایت صاف، سہل اور رواں تھا، ان کی عام معلومات اس قدر وسیع تھیں کہ جس مسئلے پر کچھ لکھتے تھے اس کے ہر پہلو کو نمایاں کردیتے تھے، ان کی خاص بات یہ تھی کہ ۱۹۲۰ء سے لے کر ۱۹۳۰ء تک ہندوستان کی سیاسیات میں لحہ بہ لحہ طوفانی انقلابات پیدا ہوتے رہے، نشیب وفراز، جوش وسکون ہرایک دورآیا اورگزرگیا، مگراپنے محتاط اظہار خیال اورمتین طریقۂ تعبیر کی وجہ سے وہ ہرایک طوفان سے اپنی کشتی ہمیشہ سلامت لے گئے، ہمت گواب بھی اسی طرح نکل رہا ہے، مگراس صوبہ کے لوگوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی قدرشناسی کا ثبوت دیں، مالی سرمایہ کے بغیر یہ کام چل نہیں سکتا، صرف ہمت سے ہمتؔ کب تک نکلتا رہے گا۔

(''س''، جولائی ۱۹۳۰ء)

[1] مرحوم کے وارثوں نے یہ کتابیں جامعہ ملیہ دہلی کو دے دی تھیں، میں نے انبار کی صورت میں کتب خانہ میں ان کو دیکھا۔

پاشا، احمد تیمور

مرحوم احمد تیمور پاشا

مصر کے ان جدید تعلیم یافتہ اصحاب میں، جنھوں نے گزشتہ ربع صدی میں عربی علم ادب اور اسلامی علوم وفنون کی بیش ازبیش خدمت انجام دی، ایک ہستی احمد تیمور پاشا کی ہے، افسوس ہے کہ انھوں نے گزشتہ ماہ اپریل میں وفات پائی، ان کی مفید تالیفات کے علاوہ وقیع علمی مقالات مصروشام کے ممتاز رسالوں میں شائع ہوتے رہتے تھے اور معارف نے بھی ان کے مضامین ایک سے زیادہ مرتبہ اپنے صفحات میں پیش کئے۔

احمد تیمور پاشا نومبر ۱۸۷۱ء میں مصر کے ایک متمول کرد خاندان میں پیدا ہوئے، یہ خاندان محمد علی پاشا کے عہد میں موصل سے مصر میں آکر آباد ہوا اوراس کے مورث اعلیٰ تیمور بن محمد بن اسمٰعیل بن کرد محمد علی پاشا کے دورِحکومت مصر میں کے دست راست تھے۔

احمد تیمور پاشا ابھی چند ہی دن کے تھے کہ ان کے والد اسمٰعیل تیمور پاشا کا انتقال ہوگیا اوران کی تربیت ان کی شاعرہ وادیبہ بہن عائشہ نے کی، انھوں نے ان کو بچپن ہی میں ایک فرانسیسی مدرسہ ''مارسیل'' میں داخل کردیا، چند سال کی تعلیم وتربیت

کے بعد جب انھیں عربی علم وادب سے زیادہ شغف ہوا تو فرانسیسی مدرسہ سے نکل کر گھر ہی پر عربی علوم وآداب کی باقاعدہ تحصیل شروع کی اور اس عہد کے مشہور اساتذۂ مصر کے سامنے زانوے ادب تہ کیا، چنانچہ ان کے اساتذہ کی فہرست میں مصر کے ممتاز فاضل شیخ رضوان بن محمد مغلاتی، شیخ حسن طویل، شیخ محمد محمود ترکزی شنقیطی، شیخ محمد عبدہ اور علامہ طاہر جزائری وغیرہ ہیں، انھیں اساتذہ سے علوم عربیہ صرف ونحو، فقہ، منطق، حدیث اور علوم قرآن میں مہارت حاصل کی اور ان علوم کے ماسوا فرانسیسی زبان میں خاص دستگاہ پہلے حاصل ہو چکی تھی۔

تحصیلِ علوم کے بعد انھیں دنیاوی اعزاز واکرام کا نمایاں حصہ عطا ہوا، انھیں خاندانی وجاہت جو کچھ حاصل تھی، اس کی بنا پر ''پاشا'' کے خطاب سے سرفراز کر کے امورِ مملکت میں شریک کیا گیا، اور ''مجلس الشیوخ'' کے رکن منتخب کیے گئے، لیکن انھیں ان امور سے فطرۃً دلچسپی نہیں تھی، اس لیے مجلس الشیوخ سے مستعفی ہو کر دیگر علمی و اصلاحی مشاغل میں مصروف ہوگئے، چونکہ موصوف نے شیخ محمد عبدہ کا فیضِ صحبت اٹھایا تھا، اس لیے اصلاحی کاموں سے ان کو زیادہ دلچسپی تھی، چنانچہ اپنے عہدہ سے مستعفی ہو کر اپنا کافی وقت ''جمعیۃ الہدایۃ الاسلامیۃ'' کی خدمت میں صرف کرنے لگے، پھر ''جمعیۃ الشبان المسلمین'' کے نام سے ملک کے مختلف اہل علم کی معیت میں ایک انجمن کی بنیاد ڈالی، اور اس کے سرگرم رکن رہے۔

اور اپنے علمی مذاق کے لحاظ سے مصر و شام کی اہم علمی انجمنوں ''دار الآثار العربیۃ''، ''المجمع العلمی المصری'' اور ''المجمع العلمی العربی دمشق'' وغیرہ کے بھی رکن تھے، اور ان اداروں کی طرف سے عربی علم وادب کی جو کتابیں شایع ہوتی رہتیں، ان کی تصحیح و مقابلہ وتحشیہ میں معاونت کرتے، چنانچہ عربی علم ادب کی مشہور کتاب ''کتاب الاغانی'' کا معتدبہ حصہ انھیں کی زیرنگرانی شایع ہوا ہے، اور ان انجمنوں کی طرف سے مصر وشام کے جو ممتاز رسائل المقتبس، المنار، الزہرا، اور المجمع العلمی العربی وغیرہ بطور آرگن شایع ہوتے ہیں، ان میں ان کے علمی مضامین برابر شایع ہوتے رہتے۔

موصوف کا سب سے زیادہ علمی کارنامہ ان کا مشہور کتب خانہ ''کتب خانۂ احمد تیمور پاشا'' ہے، انھیں کتابوں کے جمع وترتیب کا خاص ذوق تھا، اپنے عہدِ شباب ہی سے انھوں نے نفیس اور نادر کتابوں کا ذخیرہ جمع کرنا شروع کیا جس کا سلسلہ زندگی کے آخری لمحوں تک قایم رہا۔

کتب خانہ احمد تیمور پاشا، میں کتابوں کی تعداد اگرچہ ۱۵ ہزار سے زیادہ نہیں ہے، لیکن جس قدر کتابیں ہیں ان کا معتدبہ حصہ نادر قلمی کتابوں پر مشتمل ہے، جو اولاً مصر، شام، شمالی افریقہ اور دیگر مقالات کے مختلف گوشوں سے بے دریغ روپیہ صرف کر کے حاصل کی گئیں، علاوہ ازیں مشرق ومغرب کے مشہور کتب خانوں میں جو نادر قلمی نسخے تھے، ان کی نقل منگائی گئی اور جن کی نقل نہ کی جا سکی، ان کے فوٹو حاصل کئے گئے، چنانچہ اس طریقہ سے اس کتب خانہ میں شمالی افریقہ، عراق، شام، یمن اور حجاز کے کتب خانوں کے نادر نسخوں کی نقل حاصل کرنے کے علاوہ یورپ کے کتب خانوں میں سے قسطنطنیہ، پیرس اور روما وغیرہ سے نسخوں کی نقلیں حاصل کی گئیں، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس کتب خانہ میں ایسا ذخیرہ جمع ہوگیا کہ مصر کے بعض اہل علم کا خیال ہے کہ کتب خانہ احمد تیمور پاشا، مصر و شام کے دوسرے کتب خانوں، ''دار الکتب مصریہ قاہرہ'' اور ''مکتبہ ظاہریہ دمشق''، وغیرہ سے زیادہ بہتر ہے۔

احمد تیمور پاشا نے اپنی زندگی ہی میں اس کتب خانہ کے لئے ایک شاندار عمارت تعمیر کی اور پورے کتب خانہ کو وقف عام کر دیا اور اس کے اخراجات اور کتابوں میں مزید اضافہ کے لئے جائداد کا ایک معقول حصہ الگ کر دیا۔

موصوف کو زیادہ تر علم ادب، لغت اور تاریخ عرب و اسلام وغیرہ سے خاص شغف تھا، اس لئے ان کی تالیفات بھی زیادہ تر انھیں علوم کے دائرہ میں ہیں، ہم ذیل میں المنار اور المقتطف وغیرہ سے ان کی تصنیفات ورسائل کا ایک نقشہ پیش کرتے ہیں۔

۱۔ **کتاب معجم اللغة العامیہ**، مصر میں یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ مصر کی عامیانہ زبان کو علمی زبان قرار دیا جائے اور فصیح عربی کے بجائے اسی زبان کو قبول کرلیا جائے، مصنف اس جماعت کے ہم خیال نہ تھے اور انھوں نے پوری کاوش سے مصر کی عامیانہ زبان پر عبور حاصل کیا، اور عامی الفاظ کے عربی وغیر عربی ہونے کی تحقیق کی، اور اس زبان کے غیر علمی ہونے کے ثبوت بہم پہنچائے، اور اسی سلسلہ میں عامی زبان کا ایک لغت تیار کرلیا اور پھر اس کا ایک ذیل بھی لکھا۔

۲۔ **کتاب معجم الفوائد**، یہ مصنف کے اثنائے مطالعہ کے اقتباسات کا مجموعہ ہے، جو مختلف علمی و ادبی مباحث پر مشتمل ہے، ان تمام مباحث کو یکجا کر کے ان پر حواشی و تعلیقات چڑھائے گئے، اور سب کو ایک مرتب شکل میں جمع کیا گیا ہے۔

۳۔ **ترجمہ ابی العلاء المعری**، اس میں مشہور عرب شاعر ابوالعلا معری کے سوانح حیات ہیں اور اس کے مختلف فیہ حالات خصوصاً اس کے عقائد پر جامع تنقید کی گئی ہے، علامہ رشید رضا مصری کا خیال ہے کہ ابوالعلا معری پر اس سے بہتر مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوا۔

۴۔ **کتاب وفیات القرنین الثالث عشر و الرابع عشر للهجرة**، یہ قدیم عرب مورخین کے طرز پر تیرہویں اور چودہویں صدی کے اہل علم کے حالات میں ہے۔

۵۔ **مفتاح الخزانہ**، یہ بغدادی کی خزانة الادب کی جامع فہرست مضامین ہے۔

۶۔ **نظرة تاریخیہ فی حدوث المذاهب الاربعة**، یہ فقہ اسلامی کے مذاہب اربعہ کی ابتدا اور عہد بعہد کی تدریجی ترقی اور مختلف ممالک میں ان کے نشر و اشاعت کی

ایک مختصر جامع تاریخ ہے، اس رسالہ کا اردو ترجمہ معارف کی کسی گزشتہ جلد میں کئی نمبروں میں شائع ہو چکا ہے۔

۷۔ رسالة تاریخ الیزیدیه، یہ فرقہ یزیدیہ کے حالات میں ہے۔

۸۔ رسالة العلم العثمانی، یہ عثمانی پرچم کے اصل، اس کے ماخذ اور اس کی گزشتہ تاریخ اور پھر اس سے مصری پرچم تیار کرنے کے حالات میں ہے۔

۹۔ رسالة قبر سیوطی، علامہ سیوطی کی قبر کی تحقیق وحالات میں ہے۔

۱۰۔ رساله تنقیح لسان العرب، عربی کی مشہور لغت لسان العرب کی تصحیح وتنقیح۔

۱۱۔ رسالـه تـنـقیـح الـقـاموس المحیط، اس میں عربی کے دوسرے مشہور لغت قاموس کی تنقید وتصحیح کی گئی ہے۔

۱۲۔ ذیـل طبـقـات الاطباء، یہ طبقات الاطباء ابن ابی اصیبعہ کا ذیل ہے، جس میں اطباء اور حکماء کے حالات ہیں۔

۱۳۔ التصویر عندالعرب، اس میں عربوں کے فن مصوری پر بحث کی گئی ہے۔

۱۴۔ الاثار النبویه، اس میں آنحضرت ﷺ کے موئے مبارک اور دیگر متبرک آثار کا تذکرہ ہے، جو مختلف مقامات میں محفوظ ہیں۔

لیکن افسوس ہے کہ بجز چند مضامین اور رسائل کے ان کی تالیفات کا معتد بہ حصہ ابھی تک قلمی ہے، اگرچہ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ مرتب ہو چکی ہے، مگر مصنف کا مشغلہ اصلاح، ترمیم واضافہ کا ایک مستقل سلسلہ جاری تھا، جس کی وجہ سے مصنف کو ایسی تسلی نہ ہو سکی کہ وہ کتابیں پریس کے حوالہ کی جاتیں، اب توقع ہے کہ ان کے صاحبزادے اسمٰعیل بک وغیرہ جو ان کے صحیح جانشین ہیں، ان کی تالیفات کو جلد تر شائع کریں گے۔ (''ز''، اگست ۱۹۳۰ء)

کونن ڈائل، آرتھر، سر

سر آرتھر کونن ڈائل کی وفات

دو ماہ کی علالت کے بعد سر آرتھر کونن ڈائل نے ۷/ جولائی ۱۹۳۰ء کو قلب کی بیماری میں انتقال کیا، شرلاک ہومس کے افسانوں کی وجہ سے ان کو جو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی وہ محتاج بیان نہیں، آخری عمر میں انھیں روحوں کے ساتھ غایت درجہ کا اعتقاد ہو گیا تھا، وہ اسے ایک قسم کا مذہب خیال کرتے تھے، جس کی اہمیت ان کے نزدیک لٹریچر، فنون، لطفیہ، سیاسیات بلکہ دنیا کی ہر چیز سے زیادہ تھی اور انھیں اس بات سے تکلیف ہوتی تھی کہ لوگ ان کو شرلاک ہومس کے مصنف کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ سر آرتھر کو بچپن ہی سے تصنیف کا شوق تھا، پہلی کتاب انھوں نے چھ سال کی عمر میں لکھی اور مدرسہ کے ابتدائی ساتھیوں میں بحیثیت افسانہ گو کے شہرت حاصل کی، بعد میں انھوں نے طب پڑھی اور کئی سال تک مطب کرتے رہے، مصنفوں کے زمرہ میں ان کا شمار اس وقت ہوا جب ۱۸۸۸ء میں انھوں نے ''مائکا کلارک'' لکھی، گزشتہ جنگ عظیم میں ان کا بڑا لڑکا مارا گیا اور اسی حادثے نے آخر عمر میں انھیں عالم ارواح کا دلدادہ بنا دیا۔ (''م ۔ ع''، اکتوبر ۱۹۳۰ء)

حمید الدین، مولانا

الصلوٰۃ علی ترجمان القرآن

آہ! مولانا حمید الدین

الصلوٰۃ علیٰ ترجمان القرآن (مفسر قرآن کی نماز جنازہ) وہ صدا ہے جو آج سے ساڑے چھ سو برس پیشتر مصر وشام سے چین کی دیواروں تک ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی نماز جنازہ کے لیے بلند ہوئی تھی، حق یہ ہے کہ یہ صدا آج پھر بلند ہوا اور کم از کم ہندوستان سے مصر وشام تک پھیل جائے کہ اس عہد کا ابن تیمیہ ۱۱/ نومبر ۱۹۳۰ء (۱۹/ جمادی الثانیہ ۱۳۴۹ھ) کو اس دنیا سے رخصت ہو گیا، وہ جس کے فضل وکمال کی مثال آئندہ بظاہر حال عالم اسلامی میں پیدا ہونے کی توقع نہیں، جس کی مشرقی ومغربی جامعیت عہد حاضر کا معجزہ تھی، عربی کا فاضل یگانہ اور انگریزی کا گریجویٹ، زہد وورع کی تصویر، فضل وکمال کا مجسمہ، فارسی کا بلبل شیراز، عربی کا سوقِ عکاظ، ایک شخصیت مفرد، لیکن ایک جہانِ دانش، ایک دنیائے معرفت! ایک کائنات علم! ایک گوشہ نشین مجمعِ کمال، ایک بینوا سلطان ہنر، علوم ادبیہ کا یگانہ، علوم عربیہ کا خزانہ، علوم عقلیہ کا ناقد، علوم دینیہ کا ماہر، علوم القرآن کا واقف اسرار، قرآن پاک کا دانائے رموز، دنیا کی دولت سے بے نیاز، اہل دنیا سے مستغنی، انسانوں کے ردوقبول اور عالم کے داد وتحسین سے بے پروا، گوشہ علم کا معتکف اور اپنی دنیا کا آپ بادشاہ، وہ ہستی جو تیس برس کامل قرآن پاک اور صرف قرآن پاک کے فہم وتدبر اور درس وتعلیم میں محو، ہر شے سے بے گانہ، اور ہر شغل سے ناآشنا تھی، افسوس کہ ان کا علم ان کے سینہ سے سفینہ میں بہت کم منتقل ہو سکا، مسودات کا دفتر چھوڑا ہے، مگر افسوس کہ اس کے سمجھنے اور ربط ونظام دینے کا دماغ اب کہاں، جو چند رسالے چھپے وہ عربی میں ہیں، جن کے عوام کیا علماء تک ناقدر شناس، ان کی زندگی ہمارے لیے سرمایہ اعتماد تھا، اور ان کا وجود دارالمصنفین کے لیے سہارا تھا، افسوس کہ یہ اعتماد اور یہ سہارا جاتا رہا، اور صرف اسی کا اعتماد اور سہارا رہ گیا، جس کے سوا کسی کا اعتماد اور سہارا نہیں، اس سے زیادہ افسوس یہ ہے کہ یہ ہستی آئی اور چلی گئی، لیکن دنیا ان کی قدر ومنزلت کو نہ پہچان سکی اور ان کے فضل وکمال کی معرفت سے ناآشنا رہی،

تو نظیریؔ ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
بازپس رفتی وکس قدرِ تو نشناخت دریغ

زندگی گمنامی میں گزاری، مرنے کے بعد بھی گمنامی کا گوشہ تلاش کیا، متھرا میں جہاں اپنے ایک ہموطن ڈاکٹر سے جو دس برس سے ان کے معالج خاص تھے، علاج کرانے تشریف لے گئے تھے، وہیں انتقال فرمایا، عمر شریف سرسٹھ (۶۷) برس کے قریب تھی، مگر دائمی دردِ سر کی شکایت کے سوا قویٰ بہت اچھے تھے۔

ہم گنہگار اور ان کی مغفرت کی دعا کیا مانگیں کہ ان کے انفاس متبرکہ ہمہ تن یادِ خدا، صبر و رضا، شکر و تسلیم میں صرف ہوتے تھے، ان کی نماز ہمہ تن لطف محویت ہوتی تھی، ان کو دیکھ کر خدا یاد آتا تھا، اپنی زندگی ہی میں اپنی مغفرت کے کئی خواب دیکھے تھے۔

خداوندا! ہمیں توفیق دے کہ ان کے نقش قدم پر چل کر ہم بھی تیری مغفرت کے سزاوار و مستحق ٹھہریں اور مرنے والے کو اپنی رضا و محبت کی بہشت عطا فرما کہ وہ اسی کا طالب تھا۔

اواخر عمر میں مرحوم کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ وہ چند مستعد طلبہ کو اپنے مذاق کے مطابق تیار کریں، چنانچہ کم از کم دو طالب العلموں کی خاص طور سے انھوں نے دماغی تربیت کی، ہم سب کی دعا ہے کہ وہ مدرسہ اصلاح المسلمین کو سنبھال لیں۔ جو مرحوم کی سب سے بڑی مادی یادگار ہے، تفسیر کے اجزاء جو مکمل ہوں گے، ان کی اشاعت کی فکر کی جائے گی، مگر آہ! کہ اس ناقدر شناس دنیا میں ان جواہر ریزوں کی کون قدر کرے گا، اور کون سرمایہ بہم پہنچائے گا۔

رحمۃ اللہ علی ذاک الجسد ("س"، نومبر ۱۹۳۰ء)

مولانا حمید الدینؒ

ولادت ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۲ء - وفات ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء

فغان کہ گشت نیوشندۂ سخن خاموش
وگرچہ گونہ تسلی کنم من این لب و گوش

اس سے پہلے ہندوستان کے جن اکابر علماء کا ماتم کیا گیا ہے وہ کل وہ تھے، جن کی ولادت اور نشوونما انقلاب زمانہ سے پہلے ہوئی تھی، آج سب سے پہلی دفعہ ہم نئے عہد کے سب سے پہلے عالم کی وفات کے ماتم میں مصروف ہیں ہم ایک ایسے گریجویٹ عالم کا ماتم کرتے ہیں جو اپنے علم وفضل، زہد و ورع، اور اخلاق و فضائل میں قدیم تہذیب کا نمونہ تھا، لیکن جو اپنی روشن خیالی، جدید علوم وفنون کی اطلاع و واقفیت اور مقتضیات زمانہ کے علم وفہم میں عہد حاضر کی سب سے بہتر مثال تھا، اس سے پہلے ان تمام علماء نے جو نئے علم کلام کا اپنے کو بانی کہتے اور سمجھتے ہیں، جو کچھ کہا اور لکھا، وہ دوسروں سے سنی سنائی باتیں تھیں لیکن اس جماعت میں یہ پہلی ہستی تھی، جس نے فلسفہ حال کے متعلق نفیاً یا اثباتاً جو کچھ کہا اور لکھا وہ اپنی ذاتی تحقیق اور ذاتی علم و مطالعہ سے!

آج ہمارے سامنے ایسے متعدد علماء کی مثالیں ہیں جنھوں نے عربی علوم کی تکمیل کے بعد انگریزی تعلیم شروع کی، اور بی۔اے اور ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کی سندیں حاصل کیں، لیکن اس طرح کہ

جو پڑھا لکھا تھا نیاز نے اسے صاف دل سے بھلا دیا

نئے رنگ نے پرانے کو اتنا پھیکا کر دیا کہ ان پر اس کا نشان بھی نظر نہیں آتا، لیکن آج ہم جس ہستی کا تذکرہ کررہے ہیں، اس کا یہ حال تھا کہ اس کے نئے رنگ کی شوخی سے اس کے پرانے رنگ کا گہرا پن اور بڑھ گیا تھا اور اس کو دیکھ کر یہ سمجھنا بھی مشکل تھا کہ یہ علی گڑھ کالج اور الہ آباد یونیورسٹی کا گریجویٹ ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ اس کی سادگی کو دیکھ کر عوام بظاہر اس کو عالم بھی بمشکل ہی باور کرسکتے تھے، مگر وہ تھی، جو ابنائے زمانہ میں کوئی نہیں۔

ولادت: اعظم گڑھ سے دو اسٹیشن پہلے پھریہا ایک گاؤں ہے وہی مولانا کا پدری وطن تھا، اسی پھریہا کو عربی شکل دے کر مولانا اپنے نام کے ساتھ کبھی کبھی فراہی لکھا کرتے تھے، مولانا شبلی مرحوم اور مولانا حمید الدین ممیرے پھپھیرے بھائی تھے مولانا حمید الدین کے والد مولوی عبدالکریم صاحب مولانا شبلی کے ماموں تھے، دونوں بھائیوں کی پیدائش چھ برس آگے پیچھے ہوئی، مولانا شبلی ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے، اور مولانا حمید الدین صاحب ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۲ء میں، مولانا حمید الدین کے حقیقی چھوٹے بھائی شیخ حاجی رشید الدین صاحب ہیں، جو علی گڑھ کالج کے پرانے تعلیم یافتوں میں ہیں اور سرسید کے عہد کے طالب العلم اُن سے اچھی طرح واقف ہیں۔

مولانا کا اصلی نام تو حمید الدین تھا مگر وہ اس نام کو جو درحقیقت عربی قاعدہ سے لقب ہے، اپنے لیے معنوی حیثیت سے بلند سمجھتے تھے، اس لیے وہ عربی تصانیف میں اپنا نام عبدالحمید لکھتے تھے، اور تمام بڑے بڑے عالمانہ آداب والقاب کو چھوڑ کر صرف معلم کہلانا اپنے کو پسند فرماتے تھے، بنابریں، وہ اپنا نام المعلم عبدالحمید الفراہی کتابوں کی لوحوں پر لکھا کرتے تھے۔

تعلیم: مولانا نے پہلے حفظ شروع کیا، اور قرآن مجید کے حافظ ہوئے، اور فارسی کی ابتدائی کتابیں اس ضلع کے ایک دیہات چتارا کے باشندہ مولوی مہدی حسین صاحب سے پڑھیں، اس زمانہ میں شرفا کی تعلیم کا فارسی ادب سب سے اہم جزو تھا، مولانا کو ادبیات سے فطری لگاؤ تھا، چنانچہ فارسی زبان اور فارسی ادب کا ذوق بچپن سے اُن میں نمایاں تھا، اس وقت مولانا شبلی مرحوم عربی کی اعلیٰ کتابیں اعظم گڑھ میں مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی سے پڑھ رہے تھے، مولانا فاروق صاحب اپنے عہد کے سب سے بڑے عالم

ہونے کے ساتھ فارسی کے بھی بہت بڑے ادیب اور استاد تھے، مولانا حمید الدین صاحب کی آمد ورفت یہاں بھی رہا کرتی تھی، اور یہ عالمانہ صحبتیں ان کو ملا کرتی تھیں۔

ابھی مولانا کی عمر سولہ برس کی تھی کہ فارسی کے سب سے مشکل گو شاعر خاقانی شروانی کے تتبع میں ایک قصیدہ لکھا جس کی ردیف آئینہ اور قافیہ جو ہر کیفر وغیرہ ہے، سلطان عبدالحمید خان کی مدح میں ہے، مطلع ہے۔

بے جلوۂ رخِ تو بود مضطر آئینہ
خار افگند بہ پیرہن از جوہر آئینہ

بعد کے شعر ہیں:

گیسوے ہچو شب تو بیار اے وہم بصبح
فرمائے تو بیادر واز خاور آئینہ
گستاخ دیدہ است بروے تو لاجرم
چشمِ سپید یافت بدیں کیفر آئینہ
آئینہ واگذار دبیادر دو دیدہ ام،
چشمِ بودز آئینہ بہتر ہر آئینہ
دربزم انس خویش چراجاے دادہ
تامی شود برابر تو اکثر آئینہ
کے باضمیر شاہ شود ہمسر آفتاب
کے روے ہچو ماہ ترا ہمسر آئینہ

۲۸ شعروں کا قصیدہ تھا، لوگوں کو پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی یہ فارسی یہ لطف زبان، یہ شیرینی، اور یہ شکوہ دیکھ کر سب کو تعجب تھا، مولانا شبلیؒ فرماتے تھے، کہ میں نے اس کو لیجا کر مولانا فاروقؔ صاحب کو دکھایا، اور پوچھا کہ آپ کے نزدیک یہ کس کا کلام ہے، انھوں نے فرمایا یہ تو نہیں بتا سکتا، مگر قدما میں سے کسی کا معلوم ہوتا ہے، مولانا شبلیؒ نے فرمایا یہ حمیدؔ کا ہے، حیرت ہوگئی۔

مولانا حمید الدین صاحب فطرۃً نہایت ذہین نہایت طباع، اور نہایت دقیقہ رس تھے، ان کا ذہن نہایت صاف تھا، وہ اول ہی وہلہ میں بے کج و پیچ حقیقت کی منزل مقصود تک پہنچ جاتے تھے، ان کا تیر نظر مسائل کی تشریح اور مشکلات کے حل میں ہمیشہ نشانہ پر بیٹھتا تھا، دماغ اتنا سلجھا تھا، کہ کتنا ہی پیچیدہ مسئلہ ہو وہ اس کی اصل تہہ تک پہنچ جاتے تھے، اور اگر وہ مناظرہ پر اتر آتے تو کیسی ہی غلط بات ہو وہ اس کی ایسی عمدہ عمدہ دلیلیں پیش کرتے تھے کہ حریف ساکت ہوجاتا تھا، اور سمجھ لیتا تھا کہ یہ مولانا کی اصلی رائے ہے، مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ مسکرا کر فرماتے کہ یہ غلط تھا اصلیت یہ ہے۔

فارسی کے بعد مولانا نے عربی کی تعلیم شروع کی اور بھائی (مولانا شبلیؒ) سے عربی پڑھنے لگے، چنانچہ متوسطات تک مولانا شبلی ہی سے تعلیم پائی، مولانا شبلی جب یہاں سے باہر نکلے تو یہ بھی گئے، لکھنؤ جاکر مولانا حمید الدین صاحب نے فرنگی محل میں مولانا عبدالحئی صاحب فرنگی محل سے کچھ پڑھا، اس زمانہ میں لکھنؤ میں خواجہ عزیز الدین صاحب عزیزؔ لکھنوی (پروفیسر فارسی کیننگ کالج لکھنؤ و مصنف قیصر نامہ) لکھنؤ میں فارسی کے نہایت مستند استاد اور شاعر تھے انہی کی صحبتوں میں شرکت کا اتفاق ہوتا رہا، اور ان دونوں بھائیوں سے خواجہ صاحب کے اسی فارسی کے رشتہ سے تعلقات محبت عزیزانہ حیثیت تک پہنچ گئے تھے، لکھنؤ کے بعد مولانا نے لاہور جاکر مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری سے عربی ادب کی کتابیں پڑھیں، اس زمانہ میں یہاں نیا نیا اورینٹل کالج کھلا تھا، مولانا فیض الحسن صاحب اپنے عہد کے مشہور ادیب اس میں مدرس تھے، ان کا نام سن کر دور دور سے طلبہ پڑھنے آتے تھے، لیکن مولانا حمید الدین صاحب نے مولانا فیض الحسن صاحب سے خارج میں پڑھا اور یہیں ان کی ملاقات مولوی وحید الدین صاحب سلیمؔ پانی پتی سے ہوئی، اور وہ دوستی تک پہنچی، جو آخر تک قائم رہی اور اسی دوستی کی کشش تھی کہ مولوی وحید الدین صاحب سلیم جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد تک پہنچے۔

مولانا بیس برس کی عمر میں ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۴ء میں عربی تعلیم سے فارغ ہوگئے، اور عربی ادب میں بھی وہ کمال حاصل کیا کہ سچ یہ ہے کہ وہ اس میں اپنے استادوں سے بھی گوئے سبقت لے گئے، ان کا عربی دیوان اس بیان کا شاہد ہے۔

انگریزی تعلیم: اس زمانہ میں انگریزی پڑھنا کفر سمجھا جاتا تھا، مگر یہ کفر مولانا نے توڑا، نج کے طور پر انگریزی کچھ پڑھ لینے کے بعد کرنل گنج اسکول الہ آباد میں داخل ہوگئے، انٹرنس کا امتحان پرائیویٹ طور پر دے کر ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے، یہ علی گڑھ کالج کے اوجِ شباب کا زمانہ تھا، سرسید اس کے ناظم اعلیٰ مسٹر آرنلڈ اور بک وغیرہ اس کے پرنسپل اور پروفیسر، اور مولانا شبلی اس کے مدرس، مولانا حالی وہاں کے مقیم وساکن تھے ہر وقت علمی مسائل وتحقیقات کے چرچے رہتے تھے، اور ان بزرگوں کی صحبتیں حاصل تھیں جنھیں ہر ہونہار طالب العلم کے فطری جوہر کے چمکنے کا موقع حاصل تھا، مسٹر آرنلڈ فلسفہ پڑھاتے تھے مولانا کو فلسفہ جدید کا ذوق انھیں کی تعلیم سے ہوا۔

اس زمانہ میں کالج کے ہر طالب العلم کو عربی و فارسی بھی لازماً پڑھنی پڑتی تھی، مگر سرسیدؔ نے ان کے متعلق مسٹر بک کو لکھ کر بھیجا کہ حمید الدین عربی و فارسی کے ایسے ہی فاضل ہیں جیسے آپ کے کالج کے استاد اور پروفیسر ہیں، اس لیے ان کو مشرقی علوم کے گھنٹوں سے مستثنیٰ کردیا جائے چنانچہ وہ مستثنیٰ کئے گئے۔

مولانا حمید الدین صاحب کی تالیف وتصنیف کا عہد طالب العلمی ہی سے شروع ہوگیا تھا اور خود بزرگوں نے فرمایش کر کے شروع کرایا، اسی زمانہ میں علی گڑھ کالج کے

دینیات کے لیے سرسید نے مولانا شبلی مرحوم سے عربی میں سیرۃ نبوی پر ایک مختصر رسالہ لکھوایا تھا، جس کا نام ''تاریخ بدرالاسلام'' ہے، پھر مولانا حمیدالدین صاحب سے اس کا فارسی میں ترجمہ کرایا استاد و شاگرد کے یہ دونوں عربی و فارسی رسالے اسی وقت چھپ گئے تھے۔

سرسید کو طبقات ابن سعد کا ایک ٹکڑا وفود نبوی کے متعلق کہیں سے ہاتھ آیا تھا، اس وقت تک یہ چھپی نہیں تھی، سرسید نے مولانا حمید الدین سے اس کا فارسی ترجمہ کراکے چھپوایا، اس کی زبان ایسی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ عہد سامانی کا کوئی نثر نویس فارسی لکھ رہا ہے۔

غالباً ۱۸۹۲ء میں یا اس کے پس و پیش الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔اے کی سند حاصل کی۔

۱۸۹۵ء میں عربی میں ایم۔اے کا امتحان دینا چاہا تھا، مگر نہیں دے سکے، [1] ۱۸۹۶ء میں مدرستہ الاسلام کراچی میں مدرسی کی کوشش کی، سرسید نے سرٹیفکیٹ دیا، [2] اسی زمانہ میں مسٹر آرنلڈ انگریزی میں عربی کی ایک مختصر کتاب کا ترجمہ کرانا چاہتے تھے، اس کے لیے مولانا ہی کا نام ان کے ذہن میں تھا۔ [3]

ملازمت: بہر حال مولانا کا تعلیمی عہد ختم ہوگیا، ۱۸۹۷ء وہ مدرستہ الاسلام کراچی میں مدرس مقرر ہوگئے یہ مسلمانوں کا ایک انگریزی کا بہت پرانا اسکول ہے، اس کی عمارت بہت شاندار، اور اسٹاف اعلیٰ ہے، اور سندھ میں اس کو کافی شہرت حاصل ہے مولانا اس میں ۱۹۰۶ء تک رہے، ۱۹۰۰ء میں امیر عبدالرحمان خان والی کابل ایک ترجمہ کا محکمہ قائم کرنا چاہتے تھے، اس میں ابن خلدون کا ترجمہ بھی پیش نظر تھا، اس کے لیے مولانا شبلی نے ان کا انتخاب کیا، مگر کسی وجہ سے یہ تجویز عمل میں نہ آسکی، اور وہ کراچی میں بدستور رہے اور درس و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا شغل جاری رکھا یہیں کے قیام کے زمانہ میں ۱۹۰۳ء میں انکا فارسی دیوان شایع ہوا، اور شبلی مرحوم کے بار بار کے تقاضے سے جیسا کہ مکاتیب شبلی جلد دوم میں ان کے خطوط سے ظاہر ہے، علمی مباحث پر نقد و نظر کی طرف توجہ فرمائی، اور خصوصیت کے ساتھ قرآن پاک کے نظم و بلاغت میں انہماک پیدا ہوا اور جمہرۃ البلاغت نام کا رسالہ لکھا جس کا خلاصہ مولانا شبلی مرحوم نے خود اپنے قلم سے الندوہ کے دسمبر ۱۹۰۵ء میں شایع کیا۔

اسی زمانہ میں (غالباً ۱۹۰۴ء میں) جب اُس وقت کے وائسرائے لارڈ کرزن نے سواحل عرب خلیجِ فارس کا سیاسی بحری سفر کیا تھا، اور سواحل کے عرب شیوخ اور امراء کو اپنی ملاقات کے لیے جمع کیا تھا، تو مولانا ہی کا انتخاب ترجمان کی حیثیت سے ہوا تھا، وہ اس سفر میں لارڈ کرزن کے ساتھ تھے عرب سرداروں کے سامنے لارڈ کرزن کی طرف سے جو عربی تقریر پڑھی گئی تھی، وہ انھیں کی لکھی ہے۔

۱۹۰۶ء میں گورنمنٹ نے علی گڑھ کالج کو ایک معتد بہ عطیہ عربی تعلیم کے لیے دیا تھا جس کے لیے شرط یہ تھی کہ اس کا پروفیسر کوئی یورپین ہو، چنانچہ جرمن فاضل یوسف ہارویز کا اس کے لیے انتخاب ہوا ساتھ ہی مولانا کا انتخاب مددگار پروفیسر کی حیثیت سے ہوا، اور وہ علی گڑھ چلے آئے علی گڑھ میں بھی وہ زیادہ دن نہیں رہے بہر حال جتنے دن بھی رہے، اپنے علمی کاروبار میں مصروف رہے، ہارویز صاحب مولانا سے اپنی عربی کی تکمیل کرتے تھے، اور مولانا ان سے عبرانی سیکھتے تھے، اور ساتھ ہی قرآن پاک کی تفسیر اور تفسیر کے مقدمہ کے اجزاء کی تالیف کا کام جاری تھا۔

مولانا شبلی مرحوم کے تعلق کے سبب سے، پھر خود مولانا حمیدالدین صاحب کے ذاتی فضل و کمال کے باعث علی گڑھ کے علمی حلقہ سے ان کے روابط قائم ہوگئے تھے، خصوصاً نواب صدریار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی رئیس حبیب گنج کی ذوق آشنا اور قدر شناس نگاہوں سے وہ کہاں بچ سکتے تھے، چنانچہ اکثر آمد و رفت رہتی تھی، نواب صاحب ممدوح نے مولانا کی وفات کے بعد جو والا نامہ مجھے لکھا ہے اس میں رقم فرماتے ہیں:

> ''مجھ کو مولانا سے دیرینہ نیاز حاصل تھا، ابتدائی ملاقات کا ذریعہ علامہ شبلی مرحوم تھے، علی گڑھ کی پروفیسری کے زمانہ میں ملا، پھر حیدرآباد میں علی گڑھ کے دور میں بھی تدبر قرآنی کا شغف جاری تھا روزانہ ۳ بجے شب سے صبح کے نو بجے تک اس میں وقت صرف کرتے تھے، ملاقات کے وقت نتائج تحقیق بیان فرماتے، اس زمانہ میں دیگر کتب سماوی کا مطالعہ اور اس کی مدد سے مطالب قرآنیہ کا حل خاص کر پیش نظر تھا اس حالت میں علی گڑھ چھوڑا''۔

اجزا جو لکھتے جاتے تھے وہ مولانا شبلی مرحوم کی خدمت میں بھیجتے رہتے تھے، اور مولانا اس کے متعلق اپنی رائے خطوط میں اور زبانی ظاہر فرماتے تھے، شروع شروع میں استاد کو اپنے شاگرد کے اس نظریہ سے اختلاف تھا کہ قرآن پاک کے مطالب و معانی مرتب و منظّم ہیں، اور وہ مولانا حمیدالدین صاحب کی اس کوشش کو رائگاں سمجھتے تھے لیکن جب انھوں نے ان کی تفسیر کے متعدد اجزا دیکھے تو قائل ہوتے چلے گئے اور آخر داد دینے لگے، اور حوصلہ افزائی کرنے لگے، اور آخر آخر میں تو وہ مولانا حمیدالدین کی نکتہ دانی کے اس درجہ قائل ہوگئے تھے کہ قرآنی مشکلات کے حل میں وہ ان سے مشورہ لینے لگے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''تفسیر ابی لہب اور جمہرۃ البلاغہ کے اجزا بغور دیکھے، تفسیر پر تم کو مبارکباد دیتا ہوں، تمام مسلمانوں کو تمھارا ممنون ہونا چاہئے، بلاغت کے بعض اجزاء معمولی اور سرسری ہیں، ارسطو کا رد البتہ قابل قدر ہے''۔ (جون ۱۹۰۵ء)

علی گڑھ کے قیام ہی کے زمانہ میں انھوں نے اقسام القرآن لکھی یعنی اس مشکل کا حل فرمایا کہ خدا نے قرآن مجید میں قسمیں کیوں کھائی ہیں، اس سوال کے جواب میں سب سے پہلے امام رازی نے تفسیر کبیر میں جستہ جستہ فقرے لکھے تھے، پھر ابن القیم نے التبیان فی اقسام القرآن لکھی، مگر مولانا حمید الدین صاحب کی تحقیقات نے اپنی الگ شاہراہ نکالی، اور حقیقت یہ ہے کہ اس بارے میں انھوں نے ایسی دادِ تحقیق دی کہ تیرہ سو برس میں اسلام میں کسی نے نہیں دی، مولانا شبلی مرحوم نے اُن کے اس رسالہ کا خلاصہ نہایت مسرت اور خوشی کے ساتھ الندوہ اپریل ۱۹۰۶ء میں شایع کیا، اور عربی رسالہ اقسام القرآن کے نام سے الگ شایع ہوا اس کے بعد اس رسالہ کو مزید تحقیقات سے موید کرکے امعان فی اقسام القرآن کے نام سے علی گڑھ میں چھپوایا اس وقت سے لے کر آج تک مختلف مدعیانِ تحقیق نے اقسام القران پر جو کچھ کہا ہے وہ تمام تر مولانا کے خوانِ علم کی زلہ ربائی ہے۔

اس کے بعد اگست ۱۹۰۶ء میں اقسام القرآن کے علاوہ سورہ ابی لہب اور سورہ قیامت کی تفسیریں چھپیں اور اہل علم نے ان کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا علامہ سید رشید رضا صاحب المنار مصر جو خود تفسیر لکھ رہے تھے، انھوں نے ان پر مداحانہ اور معترفانہ تقریظ لکھی اور تحسین کی۔

۱۹۰۴ء کے بعد جب مولانا حمید الدین صاحب کراچی یا علی گڑھ سے وطن آتے جاتے تو لکھنؤ میں بھائی کے پاس کچھ دن ٹھہر کر آتے جاتے، اور ۱۹۰۵ء سے مولانا خاص طور سے تقاضا کر کے بلواتے اور اپنے پاس ٹھہراتے، مقصود یہ تھا کہ ندوہ کے طلبہ ان سے فائدہ اٹھائیں، چنانچہ انھیں کے اصرار سے کئی دفعہ وہ ندوہ میں آکر رہے اور طلبہ کو کبھی فلسفہ جدیدہ اور کبھی قرآن کے سبق پڑھائے میں بھی اس زمانہ میں ندوہ کا طالب العلم تھا، مولانا کے ان درسوں سے مستفید ہوا۔

اس زمانہ میں مولانا ابوالکلام صاحب، مولانا شبلی مرحوم کے پاس ندوہ میں مقیم تھے اور الندوہ کے مددگار اڈیٹر تھے، وہ مولانا حمیدالدین صاحب کی ان صحبتوں سے مستفید ہوتے رہے، اور قرآن پاک کے درس ونظر کے نئے راستوں کے نشان پانے لگے، اور بالآخر الہلال کے صفحات میں اس جادہ پیمائی کے مختلف مناظر سب کی نظروں کے سامنے آئے، اسی زمانہ میں، ندوۃ العلماء نے ان کو اپنی مجلس انتظامی کا رکن بنایا، اور آخر زمانہ تک وہ برابر رکن رہے۔

مولانا حمیدالدین صاحب علی گڑھ میں دو سال کے قریب رہے، اس کے بعد ۱۹۰۸ء میں الہ آباد یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے، کالج کے درس کے علاوہ بقیہ اوقات وہ تالیف وتصنیف میں صرف کرتے تھے، یہیں سے انھوں نے سورۂ تحریم کی تفسیر شایع کی، اور خالص فارسی میں یعنی عربی الفاظ کی آمیزش کے بغیر حضرت سلیمان علیہ السلام کے مواعظ کا عبرانی سے فارسی نظم (مثنوی) میں ترجمہ شروع کیا تھا، مولانا کا الہ آباد ہی میں قیام تھا کہ ان کے اہل برادری میں ایک نئے عربی مدرسہ کے قیام کی تحریک پیدا ہوئی، مولانا شبلی اور مولانا حمید الدین صاحب مرحوم نے اس تحریک کی عنان اپنے ہاتھ میں لی اور ۱۹۱۰ء اعظم گڑھ میں مولانا حمیدالدین صاحب کے قریہ بہا سے ایک اسٹیشن بعد سرائے میر نام کے مقام میں آبادی سے باہر ایک باغ میں اس مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی، مولانا شبلی نے اس کی نظامت کا بار مولانا حمیدالدین صاحب کے کندھے پر رکھنا چاہا، ۱۹/اپریل ۱۹۱۰ء کے ایک مکتوب میں وہ لکھتے ہیں:

”کیا تم چند روز سرائمیر کے مدرسہ میں قیام کر سکتے ہو، میں بھی شاید آؤں، اور اس کا نظم ونسق درست کر دیا جائے، اس کو گروکل کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہئے، یعنی سادہ زندگی اور قناعت اور مذہبی خدمت مطمع زندگی ہو“۔

اس مدرسہ نے رفتہ رفتہ ان دونوں بزرگوں کے زیر ہدایت ترقی شروع کی، اور یہ لوگ کبھی کبھی اس کو دیکھتے رہے۔

مولانا ۱۹۱۳ء تک الہ آباد میں رہے۔

حیدر آباد دکن میں دارالعلوم کے نام سے ایک قدیم عربی مدرسہ تھا، جس نے حیدرآباد کی علمی وتعلیمی ترقی میں کارنمایاں انجام دیا تھا، اس کا الحاق مدراس یونیورسٹی کے شعبۂ مشرقیات سے تھا، غالبًا ۱۹۰۸ء میں مدراس یونیورسٹی نے اس الحاق کو توڑ دیا، اب ریاست کے تعلیمی محکمہ کے ذمہ دار افسروں کو اس قدیم مدرسہ کے جدید انتظامات و تغیرات کی فکر لاحق ہوئی اور اس کے لیے نواب عماد الملک مرحوم سابق ناظم تعلیمات حیدرآباد دکن، اور مسٹر المالطیفی آئی۔سی۔ایس جو اس وقت ناظم تعلیمات تھے، اور مسٹر حیدری وغیرہ نے اہل فن کی مجلس بنائی جس کے ایک ممبر مولانا شبلی مرحوم تھے، مولانا نے اس کے لیے ایک اسکیم مرتب کی، اور ایک مشرقی یونیورسٹی کی بنیاد رکھنے کی تجویز پیش کی، یہ تجویز اسی وقت الندوہ میں مولانا نے شایع بھی کردی تھی، مولانا شبلی مرحوم کا اس وقت کا تخیل یہ تھا کہ عربی زبان کی یہ ایک یونیورسٹی ہوگی جس میں جدید علوم کی بقدر ضرورت آمیزش ہوگی، یہ اسکیم مدت تک زیر بحث رہی، اس اسکیم کے مطابق دارالعلوم کو چلانے کے لیے مولانا حمید الدین صاحب کا انتخاب ہوا، اور وہ اس کے صدر (پرنسپل) بنائے گئے، اور ۱۹۱۴ء کے اوائل میں الہ آباد سے حیدرآباد چلے گئے۔

حیدرآباد جا کر اس نئی مشرقی یونیورسٹی کے خاکہ بنانے میں مصروف ہوئے، درس وتدریس کے علاوہ مدرسہ کی انتظامی نگرانی بھی ان کو کرنی پڑتی تھی، انھوں نے رفتہ رفتہ مدرسہ کی ظاہری و باطنی ترقیوں کی کوششیں شروع کیں، مسٹر المالطیفی سے ان کے خیالات کا اتحاد نہ ہوا، بالآخر ایک دو سال کے بعد مسٹر المالطیفی کی جگہ راس مسعود صاحب نے لی، اور انھوں نے ان کے ساتھ مل کر کام شروع کیا۔

مولانا شبلی مرحوم کی فرمائش سے نواب عماد الملک مرحوم نے قرآن پاک کے انگریزی ترجمہ کا جو کام شروع کیا تھا، وہ نصف کے قریب انجام پاچکا تھا، مگر اس میں جابجا نقائص تھے، نواب صاحب نے مولانا حمیدالدین صاحب کی موجودگی سے فائدہ اٹھایا، اور مدت تک یہ شغل جاری رہا کہ مولانا روزانہ صبح کو نواب صاحب کے یہاں جاتے، اور نواب صاحب بااین ہمہ ضعف پیری انگریزی ترجمہ پر مل کر غور کرتے اور مناسب مشورہ ملنے پر اصلاح و ترمیم کرتے، اس طرح اُن کے ترجمہ کے کئی پاروں پر نظر ثانی ہوئی، پھر یہ کام رک گیا، لیکن یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ نواب صاحب مرحوم کی وفات کے بعد یہ اصلاح شدہ اجزاء اس طرح کاغذات میں مل گئے کہ پھر ان کا پتہ نہ چلا، میں نے نواب صاحب مرحوم کے خلف الرشید نواب مہدی یار جنگ بہادر کو تحریری و زبانی کئی دفعہ ان کی تلاش کی طرف توجہ دلائی، مگر انھوں نے ان کے ملنے سے مایوسی ہی ظاہر کی۔

مولانا شبلی مرحوم اس وقت سیرۃ نبوی ﷺ کی پہلی جلد لکھ رہے تھے، یہود و نصاریٰ اور اہل کتاب کے مناظرانہ مسائل اور قرآن پاک کے استدلالات میں وہ برابر اپنے بھائی سے مشورے لیتے رہتے تھے، جو مکاتیب (۵۷۔۷۳) سے ظاہر ہیں، سیرت جلد اول کے مقدمہ میں حضرت اسمٰعیلؑ کی سکونت اور قربانی کے متعلق جو باب ہے، اس کا مواد مولانا حمیدالدین ہی نے بہم پہنچایا تھا، جس کو آئندہ چل کر مولانا حمید الدین صاحب مرحوم نے بڑھا کر اور پھر اور زیادہ استقصاء کر کے **الرای الصحیح فی من ھو الذبیح** کے نام سے الگ شائع کردیا۔ (''س''، جنوری ۱۹۳۱ء)

ا مکاتیب شبلی جلد دوم بنام مولانا حمیدالدین صاحب خط نمبر:۱
۲ ایضاً، خط نمبر:۲ ۳ ایضاً، خط نمبر:۳
۴ ابھی حال میں دارالمصنفین نے مولانا کے اس رسالہ کو خوبصورت ٹائپ میں چھپوایا ہے۔ (یادِ رفتگان، ص: ۱۱۹)

(۲)

پچھلے نمبر میں مولانا حمیدالدین صاحب مرحوم کے قیام حیدرآباد کے عہد تک کے وقعات گذر چکے ہیں، ا اب اس کے بعد کے حالات لکھے جاتے ہیں۔

مولانا حمیدالدین صاحب فطرۃً نہایت تنہائی پسند، گوشہ نشین، اور بڑے لوگوں سے ملنے جلنے سے وہ عمداً بہت بچتے تھے، اس لیے حیدرآباد دکن جا کر بھی جو ایک عالم کا مرکز، اور خوش قسمتیوں کا عجائب خانہ ہے، اُن کی حالت میں کوئی تغیر نہیں ہوا، سوا اپنے حلقہ کے خاص لوگوں کے جن سے ان کو اتحاد ذوق تھا، اور کہیں آتے جاتے نہیں تھے، اب وہ زمانہ ہے جب مولانا شبلی مرحوم اور ندوۃ العلماء کے دوسرے ارکان کے درمیان کشیدگی پیدا ہوگئی تھی، جس کا سبب سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ یہ کنزرویٹو اور لبرل کی پرانی جنگ تھی۔

اواخر ۱۹۱۳ء میں مولانا شبلی نے دارالعلوم ندوہ کی معتمدی سے استعفا دیا، تو اپنی پرانی تجویز یعنی ایک دارالمصنفین اور دارالتکمیل کی بنا ڈالنے کا خیال آیا، مگر یہ خیال ہنوز دل میں تھا یا کاغذ کے صفحہ پر تھا، اس کے لیے کبھی لکھنؤ کبھی کسی اور مقام کی فکر تھی، اسی اثنا میں اگست ۱۹۱۴ء میں مولانا کے عزیز بھائی مولوی اسحٰق صاحب وکیل ہائیکورٹ الہ آباد کے انتقال نے ان کو بالکل سرد کردیا اور لوٹ کر اعظم گڑھ کو اپنا ٹھکانا بنایا، اور اس کے لیے زمین و بنگلہ وقف کیا، اور چاہا کہ مدرسہ سرائے میر اور اپنے نیشنل ہائی اسکول (جس کو ۱۸۸۴ء میں یہیں قائم کیا تھا) اور دارالمصنفین کو ملا کر ایک علمی و تعلیمی ادارہ بنالیں، اس عزم و یاس کے عالمِ کشمکش میں مولانا حمیدالدین صاحب کو لکھا:

''بھائی! اچھا ہونا کیا، **ولن یصلح العطار ما افسد الدھر** دو دن اچھا رہا تو چار دن بیمار رہتا ہوں لیکن بات چیت کرتا ہوں، لوگ سمجھتے ہیں کہ کوئی شکایت نہیں، نظام جسم برہم ہوچکا ابھی ابھی سردی لگی حالانکہ دوپہر کا وقت ہے۔

افسوس یہ ہے کہ سیرت پوری نہ ہوسکی، اور کوئی نظر نہیں آتا کہ اس کام کو پورا کرسکے......اور اگر دارالمصنفین قایم ہوا تو تمھارے سوائے کون چلائے گا''۔

یہ اکتوبر ۱۹۱۴ء کا خط ہے۔ ۲۸ اکتوبر کو لکھا:

''برادرم، وقت تو یہ تھا کہ ہم چند لوگ یکجا ہوتے اور کچھ کام کرتے لیکن میری دنیا طلبی کا یہ حال ہے کہ خود بے نیاز ہوگیا ہوں، لیکن عزیزوں کی بے تعلقی شاق ہوتی ہے، سید سلیمان بھی تعلق موجودہ ۲ پر راضی نہیں ذرا اشارہ ہو تو میرے پاس آجائیں میں خود روک رہا ہوں''۔

مرا گر تو بگذاری اے نفسِ طامع
بے بادشاہی کنم در گدائی

اس کے تین ہی ہفتہ کے بعد مولانا شبلی نے ۱۸؍نومبر ۱۹۱۴ء کو انتقال کیا، مولانا حمیدالدین صاحب وفات سے ایک دن اور میں دو دن پہلے پہنچا تھا، مجھے حکم دیا کہ ''سب چھوڑ کر سیرت'' مولانا حمیدالدین صاحب جب پہنچے تو مصنفِ سیرت کی مقدس زبان خاموش ہوچکی تھی، آنکھیں کھول کر بھائی کی طرف دیکھا اور چپ ہوگئے، اس خاموش نگاہ حسرت میں وصیتوں اور فرمائشوں کے ہزاروں معنی پوشیدہ تھے جن کو اہل نظر ہی سمجھ سکتے ہیں۔

اس موقع پر ہم جان نثاروں میں صاحب ہوش وہی تھے، ماتم کے آنسو بھی خشک نہیں ہوئے تھے کہ انھوں نے تیسرے دن اس وقت مولانا شبلی مرحوم کے جو چند تلامذہ جمع ہوگئے تھے، اُن کی ایک مختصر سی جماعت نعمانیہ بنائی جس نے اپنا یہ مقصد قرار دیا کہ

وہ مولانا شبلی کے ادھورے کاموں کی تکمیل کرے گی، مدرسہ سرائمیر کی صدارت مدرسین مولانا شبلی صاحب متکلم ندوی کے سپرد ہوئی، اس کی نظامت مولانا مسعود علی ندوی نے اپنے سرلی، دارالمصنفین کی تشکیل اور تاسیس کے لیے اسی جماعت کے ارکان نے ماہوار چندے لکھوائے اور اس کا اہتمام بھی مولانا مسعود علی صاحب ندوی نے اپنے ذمہ لیا، اور سب سے زیادہ یہ کہ شبلی منزل میں ان کاموں کی انجام دہی کی خاطر تنہا قیام گوارا کیا۔

اس کے بعد میں اور وہ دونوں مل کر سرکار عالیہ نواب سلطان جہاں بیگم مرحومہ و الیہ عالیہ بھوپال کی طلبی پر بھوپال گئے، سرکار عالیہ نے تسلی دی اور سیرۃ کی تصنیف کی رقم کو بدستور ہم دونوں کے نام جاری فرما دیا، اور یہی دارالمصنفین کے وجود ونشوونما کے لیے ابرکرم کی پہلی بارش تھی۔

حیدرآباد جا کر مولانا نے کوشش فرمائی اور نواب عمادالملک کی تائید سے وہ کوشش کامیاب ہوئی، اور مولانا کا تین سو ماہوار کا وظیفہ دارالمصنفین کے نام منتقل ہوا، یہ دارالمصنفین کی بقا کی بہترین ضمانت بنی، اس کے بعد گو باقاعدہ مجلس انتخاب نہیں ہوا تھا، تاہم ان کی حیثیت صدر مجلس کی اور میری ناظم کی تھی، بعد کو باقاعدہ تاسیس اور وضعِ دستور العمل کے بعد یہی قانونی شکل بن گئی اور وہ آخر تک دارالمصنفین کی مجلس عاملہ کے صدر نشین رہے۔

مولانا شبلی مرحوم نے اپنے دو مذکورہ بالا آخری خطوط میں جو کچھ لکھا تھا وہ مولانا حمیدالدین مرحوم کی آئندہ زندگی کا نصب العین بن گیا، دارالعلوم حیدرآباد کے تغیر اور جامعہ عثمانیہ کے مفید و مبارک تخیل کی سودمندی کی خاطر انھوں نے چندے حیدرآباد کا قیام گوارا کیا، مگر ان کا دل اور کاموں میں لگا تھا۔

مولانا حمیدالدین صاحب کے تصور نے مجوزہ دارالعلوم کی شکل ہی بدل دی، مسلم یونیورسٹی اور ہندو یونیورسٹی کے وجود نے ''کنزرویٹو آیڈیا'' میں بھی انقلاب پیدا کردیا، مولانا حمیدالدین صاحب ہی تھے جنھوں نے عصری علوم وفنون کی اردو زبان میں تعلیم کی تجویز پیش کی، اور اس کا خاکہ تیار کیا، ان کا تخیل یہ تھا کہ دینیات کی تعلیم عربی میں ہو، اور باقی تمام علوم یہاں تک کہ اصول فقہ بھی اردو میں پڑھایا جائے، لیکن راس مسعود صاحب اور نواب سر حیدر نواز جنگ حیدری صاحب نے ان کے اس تخیل کو کہ علوم کی تعلیم کی زبان اردو ہو، قبول کیا، مگر یہ کہ تمام لڑکوں کو دراصل دینیات کی عربی تعلیم دی جائے قبول نہیں کیا، اور یہی درحقیقت حیدرآباد سے اُن کی دل برداشتگی کا سبب ہوا ۱۹۱۷ء سے جامعہ عثمانیہ کی تیاری اور کتابوں کے ترجمہ کا اور اصطلاحات کے وضع کرنے کا کام شروع ہوا، وہ اس مجلس کے رکن تھے، اور وضع اصطلاحات میں مفید مشورے دیتے تھے، اور جامعہ کے نقشِ تخیل کی رنگ آمیزی میں مصروف تھے، تا آنکہ اگست ۱۹۱۹ء میں باقاعدہ اس کی افتتاح کے نوبت آئی۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی جو اس زمانہ میں صدر الصدور ہوکر حیدرآباد پہنچ چکے تھے، اور وہ جامعہ عثمانیہ کے سب سے پہلے وائس چانسلر مقرر ہوئے تھے، وہ اپنے والا نامہ مذکور میں فرماتے ہیں:

''جامعہ عثمانیہ کی بنیاد رکھنے والوں میں مولانا کے ہاتھ بھی تھے''۔

مگر بعض وجوہ کے باعث یہ ہاتھ فوراً اپنی جگہ سے ہٹ گیا، گو ظاہری سبب یہ بھی تھا کہ حیدرآباد کی آب و ہوا مرحوم کو راس نہیں آئی، اُن کے دردسر کی عارضی بیماری نے دائمی صورت اختیار کرلی، اس درد کے دورہ سے وہ بے چین ہوجاتے تھے، اور پھر کسی کام کے قابل نہیں رہتے تھے، بااین ہمہ یہاں کے قیام کے دوران میں خردنامہ یعنی مواعظ سلیمانی کی تکمیل کی، اور چھپوائی، پھر اسباق النحو کے نام سے عربی صرف ونحو کے آسان صورت میں نئے اصول پر اردو میں دو رسالے مرتب کئے اور انجمن ترقی اردو کی طرف سے وہ چھپے، اپنے استاد ادب مولانا فیض الحسن صاحب مرحوم کا عربی دیوان تصحیح کرکے چھپوایا، الرای الصحیح تصنیف کی، اور تفسیر کے بعض مقدمات لکھے، اسی کے ساتھ درس قرآن کا ایک حلقہ قائم کیا، مغرب کے بعد یہ مجلس جمع ہوتی تھی، مولانا تقریر فرماتے تھے، لوگ شکوک پیش کرتے تھے، وہ جواب دیتے تھے، تھوڑی دیر کے بعد مجلس ختم ہوجاتی تھی، ہمارے فاضل دوست مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی جو اس وقت جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر ہیں، وہ اس مجلس کے خاص لوگوں میں تھے، ایک دو دفعہ مجھے بھی شرکت کا اتفاق ہوا، کبھی کبھی مولوی وحیدالدین صاحب سلیم مرحوم بھی اس میں بیٹھتے تھے۔

مولانا حیدرآباد میں ۱۹۱۹ء تک رہے، اور عین اس وقت جب جامعہ عثمانیہ کا ہیولیٰ صورت قبول کررہا تھا انھوں نے استعفا دے دیا، ذمہ دار ارکان حکومت چاہتے تھے کہ مولانا قیام کریں، مگر وہ اپنی طبعی بے نیازی اور استغنا کو راہ دے کر متوکلاً علی اللہ ایک ہزار ماہوار کی جگہ چھوڑ کر وطن چلے آئے، حیدرآباد میں جب تک وہ رہے بے ہمہ اور باہمہ رہے، علم کی قدر ومنزلت اور بے نیازی کو انھوں نے پوری طرح نباہا اور جو لوگ ان سے ذاتی طور سے واقف تھے، اور ان کا حلقہ بہت محدود تھا، اُن پر مولانا کی جدائی بڑی شاق گذری بااین ہمہ وہ ان کے رنگ طبع کو دیکھ کر ان کو مجبور نہ کرسکے مولانا کو حیدرآباد سے نہ کوئی پنشن مل سکی، اور نہ کوئی وظیفہ ہوا نہ کسی اور قسم کی مالی امداد کے پانے کی انھوں نے کوشش کی، چونکہ وہ الہ آباد یونیورسٹی سے حیدرآباد بھیجے گئے تھے اس لیے الہ آباد یونیورسٹی کی طرف سے کل بتیس تینتیس روپے کی ان کو پنشن ملی۔

اعظم گڑھ واپس آکر مولانا نے اپنے وطن پھریہا میں قیام فرمایا، خاندانی موروثی زمینداری کا کچھ کام کبھی کبھی دیکھ لیتے تھے ایک دو لڑکوں کو کچھ پڑھا دیتے تھے، ورنہ زیادہ تر وقت یاد الٰہی، نماز، تلاوت، اور قرآن پاک کے غور وفکر میں بسر ہوتا تھا، اب وقت آیا کہ مولانا مدرسۃ الاصلاح سرائمیر کی طرف توجہ فرمائیں۔

مدرسۃ الاصلاح سرائمیر:

دنیا کا قاعدہ ہے کہ جب تک کسی چیز کا ڈھنڈورانہیں پیٹا جاتا لوگ اس کو حقیقت باور نہیں کرتے تھوڑے کو بہت کرکے دکھانا اس عالم فریب کا خاصہ ہے، مگر مولانا کی طبیعت کا رنگ الگ تھا، وہ اعلان وتعلّی سے بہت دور بھاگتے تھے، اور بہت کو تھوڑا کہہ کر بھی وہ دکھانا نہیں چاہتے تھے۔

مدرسۃ الاصلاح سرائمیر کی بنیاد میں گو بہتوں کا ہاتھ شریک ہوا لیکن اُس کے تخیل کی تعیین اور اس تخیل کے مطابق مدرسہ کو چلانا اس کا نصاب درس بنانا مدرسوں کو اپنے انوکھے خیال سے متفق کرنا خاص طلبہ کو اپنے مذاق کی تعلیم دینا اور پورے مدرسہ کو اپنے نہج کے مطابق لے چلنا خاص انھیں کا کام تھا۔

مدرسۃ الاصلاح کیا ہے؟ آج جب کہ ہر بڑے شہر کی گلی گلی میں، بلکہ قصبوں اور دیہاتوں تک میں عربی کے مدرسے قائم ہیں، اور ہر سال اُن کی تعداد بڑھتی رہی جارہی ہے، مولانا کا ایک نئے مدرسہ کے قیام پر اپنی زندگی وقف کردینا، اور اپنی عمر کے آخری پورے بارہ برس اس پر تصدق کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اس کے جواب میں بجائے اس کے کہ ہم خود کچھ کہیں مدرسہ کی مطبوعہ روداد سے ایک اقتباس نقل کردیتے ہیں، اور یہ وہ تحریر ہے، جو خود مولانا نے لکھی تھی، یا ان کی فرمایش سے لکھی گئی اور ان کی نظر سے گذر کر اصلاح پاچکی تھی:

> ''مسلمانوں کی موجودہ پستی جواُن کی زندگی کے ہر شعبہ پر طاری ہے، زیادہ تر نتیجہ ہے اس خرابی کا جو ان کی مذہبی تعلیم میں صدیوں سے پیدا ہوگئی ہے، جب تک مسلمانوں کی مذہبی تعلیم اپنے صحیح نہج پر قائم رہی وہ برابر دین و دنیا کے تمام شعبوں میں ترقی کرتے رہے، لیکن جب سے یہ شاہراہ کج ہوئی، دینی مدارس اور مذہبی پیشواؤں کی کثرت کے باوجود مسلمانوں کا زوال شروع ہوا، اور برابر بڑھتا گیا.....''۔

ان حالات میں خدانے ایک جماعت کو اپنی توفیق بخشی سے سرفراز کیا، اور اس نے طے کرلیا کہ جس اسلوب پر علوم دینیہ کی تعلیم ہورہی ہے، وہ قطعی ناقص اور غیر منتج ہے، جب اسلام ہماری دینی و دنیاوی فلاح کا جامع ہے تو اسلامی تعلیم کے یہی معنی ہوں گے، کہ وہ نہ صرف ہماری عبادات کا دستور العمل ہو، بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں وہ ہمارے لیے مشعل ہدایت ہو، اب ہمارے درد کا اگر کوئی علاج ہے تو وہ محض رسمی تعلیم اور نصاب مروج کو ختم کرنا نہیں بلکہ مذہبی تعلیم کو اس کے صحیح معنوں میں جاری کرنا ہے، یعنی وہ وسعت و جامعیت جو اسلام کا مفہوم ہے، اور ''تفقہ فی الدین'' اسی سے عبارت ہے، اس جماعت نے اس بلند معیار تعلیم کو پیش نظر رکھ کر ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی جس کا نام ''مدرسۃ الاصلاح'' ہے۔

مدرسۃ الاصلاح کا دعویٰ ہے کہ اس نے مذہبی تعلیم کی مستقیم کو پالیا ہے اس نے اسے اپنا مقصد اساسی قرار دیا ہے......وہ مقصد اساسی اور وہ صراط مستقیم کیا ہے، وہ وہی ہے جس پر آنحضرت ﷺ نے اپنی امت کو چھوڑا تھا، اور جس کی آخری خطبہ میں وصیت فرمائی تھی، کہ میں تمھارے لیے کتاب اللہ چھوڑے جاتا ہوں، جب تک اسے مضبوط پکڑے رہوگے ہرگز گمراہ نہ ہوگے مدرسۃ الاصلاح کا دعویٰ ہے کہ مسلمانوں کے انحطاط وتنزل کا اصلی سبب یہی ہے کہ وہ قرآن مجید کی تعلیم کو آہستہ آہستہ کم کرتے گئے، اور وہ علوم جو قرآن مجید کے لیے آلہ اور وسیلہ ہوسکتے تھے، ان کی تحصیل میں اس قدر مصروف ہوگئے کہ وہ خود مقصود بالذات بن گئے، یہاں تک کہ ہوتے ہوئے قرآن مجید کے درس و تدریس کے لیے انھوں نے بالکل جگہ نہ چھوڑی اور اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ محض تلاوت و حفظ الفاظ پر اکتفا کرلیا گیا اور ہم پر رسولِ خداؐ کی یہ شکایت منطبق ہونے لگی یارب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجوراً[الفرقان: ۳۰] (اے میرے پروردگار! میری قوم نے اس قرآن کو ایک چھوڑی ہوئی چیز سمجھ لیا ہے) لیکن اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مدرسۃ الاصلاح نے یہ راز پالیا اور قرآن مجید کو سرچشمہ ہدایت و ترقی تسلیم کرکے جملہ علوم کی تعلیم اس کی تعلیم کے ماتحت کردی وہ ادب، فقہ، حدیث، تاریخ، سیر، منطق وحکمت کی تعلیم دیتا ہے لیکن اس طور پر کہ جس علم کی طرف قدم بڑھے، قرآن کی روشنی میں اور جو دروازہ کھلے قرآن ہی کے اندر سے کھلے۔

اس تشریح کے بعد آپ نے سمجھا ہوگا کہ مدرسۃ الاصلاح کیا ہے؟ اور مولانا نے اس مدرسہ کو ترقی دے کر ملت کی کیا اصلاح کی؟ اور انھوں نے گراں بہا معاوضہ، اعلیٰ اعزاز دنیاوی منصب اور شہروں کی لذت بخش زندگی کو چھوڑ کر، سادگی، قناعت اور گمنامی کے ساتھ اپنی عمر کا ایک جگ کیوں ایک دیہات میں بیٹھ کر عربی کے ایک مدرسہ کی خدمت گذاری میں بسر کردیا۔

یہ مدرسہ مولانا کے گھر سے ایک اسٹیشن کے فاصلہ پر ہے، مولانا ہر ہفتہ میں تین دن شب و روز مدرسہ میں بسر فرماتے تھے، اور سن کر تعجب ہوگا کہ اس اہتمام کے ساتھ آتے تھے کہ اپنے قیام تک کے لیے کھانا پکوا کر ساتھ لاتے تھے، یا بعد کو پک کر آجاتا تھا، اسی مدرسہ میں مولانا کی ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی، جس میں وہ قیام فرماتے تھے۔

اس مدرسہ کی بنیاد محض توکل پر ہے، اور مولانا کو اپنے خدا پر یہ اعتماد تھا کہ کبھی مدرسہ کے متعلق ایک دفعہ بھی یہ تصور اپنے دل میں نہیں لائے کہ کل کیا ہوگا، وہ کہتے تھے اور برملا کہتے تھے کہ ''خدا دیگا'' اور یہ ہم سب کا مشاہدہ ہے کہ ان کا خدا ان کو دیتا تھا انھوں نے کبھی اپنے مدرسہ کے لیے کسی سے چندہ نہیں مانگا، اور کبھی علم اور قوم کے لیے بھی غیر کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا ایک دفعہ مدرسہ ہی کی خاطر کلکتہ کی راہ سے رنگون گئے اور مقصد مدرسہ کا سرمایہ ہی تھا، مگر اپنی زبان سے کسی تاجر وسوداگر سے مدرسہ کے لیے

تحریک نہیں کی، مگر بہرحال کامیاب آئے۔

انھوں نے سب سے پہلے اپنے مدرسہ کے لیے ایک اچھی خاصی وسیع مسجد بنوائی، اس کے بعد درسگاہ کے لیے ایک چھوٹا سا بنگلہ بنایا، پھر ایک دارالاقامہ بنوایا جس کی تین سمتیں بن چکی ہیں ایک باقی ہے کتب خانہ کے لیے ایک مکان بنوایا، مسجد کے علاوہ تمام عمارتوں کی چھتیں کچی، یعنی کھپروں کی ہیں، کتب خانہ زمین کچھ کتابیں اوروں کی دی ہوئی ہیں، مگر زیادہ خود اپنا ذاتی کتب خانہ مدرسہ کو عنایت فرمادیا تھا، اور جو ان کی وفات کے بعد مدرسہ کے اندر آ بھی گیا ہے۔

مدرسہ کا ماہانہ خرچ تعمیرات کے علاوہ پانچ چھ سو ہے، بعض مخلصین نے کچھ جائداد دیں، اعظم گڑھ، رنگون اور کلکتہ میں مدرسہ کے نام وقف کی ہیں، کچھ مدرسہ نے رنگون میں خود خریدا ہے، مگر ہنوز آمد وخرچ برابر نہیں ضلع کے مسلمان سالانہ عشر اور قربانی کی کھالوں اور نقد چندوں سے امداد بھی فرماتے ہیں، تاہم یہ تمام سرمایہ مدرسہ کی روز افزوں ضرورتوں کے لیے کافی نہیں۔

یہ مدرسہ اسٹیشن سرائمیر کے پاس ایک میدان میں واقع ہے، ادھر ادھر دور تک آبادی سے خالی ہے، چاروں طرف دور ہٹ کر مسلمانوں کے دیہات ہیں یہیں کے باشندے اس کے ممبر، خادم اور کارکن ہیں، جو موقع پر جمع ہوکر کام کو انجام دیتے ہیں، اور چلے جاتے ہیں، انتہائی سادگی اور صفائی اس مدرسہ کا جزو اعظم ہے۔ مدرسین میں بعض پرانے مدرسوں کے تعلیم یافتہ ہیں چند دارالعلوم ندوۃ العلما کے فارغ التحصیل ہیں اور بعض خود مدرسہ کے پڑھے ہوئے ہیں، مدرسہ کے سب سے پرانے خادم ایک سادہ وضع بزرگ مولانا محمد شفیع صاحب ہیں، جو نہایت اخلاص کے ساتھ شروع سے آج تک مدرسہ کی نگرانی اور مالی انتظام کررہے ہیں۔

مدرسہ کے یہ مدرسین جس سادگی، اخلاص اور ایثار کے ساتھ زندگی بسر کررہے ہیں، اس کی مثال ہم کو کسی اسلامی درسگاہ میں نہیں معلوم سب سے بڑی تنخواہ اعلیٰ مدرس مولانا شبلی صاحب ندوی کی ہے پینتیس ۳۵ روپے درآنحالیکہ ان کے پڑھائے شاگرد اور ان کے ساتھی اس سے دوگنی چوگنی زیادہ تنخواہ پارہے ہیں۔

مولانا علماء کی گداگرانہ خصلت سے سخت نفرت رکھتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ مولویوں کے مدرسہ سے بھی گداگری ہی کی لعنت دور ہوجائے، چنانچہ مدرسہ کے لیے بھی انھوں نے جائداد خریدی جس کا سال بسال منافع آتا ہے، اور صرف اپنی کوشش سے تمام عربی مدارس کے برخلاف اس مدرسہ میں تجارتی وصنعتی آمدنیوں کے ذرائع پیدا کئے، خود اپنی طرف اور مدرسہ کے بعض مخلص ہمدردوں کی طرف سے کچھ سرمایہ لگا کر مدرسہ میں آٹا پینے کی مشین مع انجن کے لگائی اور اس سے مدرسہ کو روزانہ کی آمدنی ہوجاتی ہے، مدرسہ کے اندر جوتا بنانے کا ایک شعبہ قائم کیا جہاں اچھے جوتے پمپ اور شو وغیرہ بنتے ہیں۔

مدرسہ کی تعلیمی کیفیت یہ ہے کہ تمام مدرسین مولانا کے زہد وتقویٰ اور فضل وکمال سے ان کے گرویدہ تھے، سب سے پہلے مدرسین کو اپنا ہم خیال بنایا، ان سے قرآن مجید کے مباحث اور علوم عالیہ کے مسائل میں اپنی تحقیقات بیان فرماتے رہتے تھے، ان کو اپنا طریقہ تعلیم سمجھاتے اور بتاتے تھے، عربی میں صرف ونحو کی تعلیم میں سب سے زیادہ وقت برباد ہوتا تھا خود مولانا نے صرف ونحو کے دو رسالے لکھے جن کا مدار تمامتر مشق پر ہے، وہ دونوں رسالے وہاں پڑھائے جاتے ہیں، اور وہ کافی ہوتے ہیں، نصاب تعلیم سے تمام غیر ضروری علوم نکال دیئے ہیں، قدیم منطق وفلسفہ کی ایک ایک دو دو کتابیں رہنے دی ہیں، ادب عربی پر خاص زور دیا، فقہ کی تعلیم فقہ اسلامی کی حیثیت سے دیجاتی ہے، حدیث کسی عصبیت کے بغیر پڑھائی جاتی ہے، اور تعلیم کا اصلی مرکز ومحور قرآن مجید کو رکھا گیا ہے۔

مولانا جب تک زندہ رہے خود مدرسین اور اعلیٰ طلبہ کا ایک حلقہ بنا کر اس کو پورے قرآن مجید کا درس کئی دفعہ مختلف نقطہ ہائے نظر سے دیا، ساتھ ساتھ جدید فلسفہ کی بعض شاخیں بھی ان طلبہ کو خود پڑھائیں چنانچہ بعض مستعد طلبہ نے مولانا کے اس درس سے پورا فائدہ اٹھایا جن میں قابل ذکر مولوی امین احسن صاحب اصلاحی ہیں، ہماری آئندہ توقعات ان سے بہت کچھ وابستہ ہیں۔

مولانا اخیر عمر میں تصنیف وتالیف کے بجائے اپنا تمامتر وقت انھیں طلبہ کے غور و پرداخت اور تعلیم وتربیت پر صرف فرماتے تھے، اور انھیں کو اپنی زندگی کا ماحصل سمجھتے تھے۔ ("س"، فروری ۱۹۳۱ء)

---

۱ معارف کے پچھلے نمبر (جنوری ۱۹۳۱ء میں لکھا گیا تھا کہ دارالعلوم حیدرآباد کا تعلق مدراس یونیورسٹی کے شعبہ مشرقیات سے تھا، مگر حیدرآباد سے ایک دوست مطلع کرتے ہیں کہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ مشرقیات سے اس کا الحاق تھا، انڈین یونیورسٹیز ایکٹ کے بعد یہ الحاق ٹوٹ گیا۔

۲ دکن کالج پونہ کی اسسٹنٹ پروفیسری

جوہر، محمد علی، مولانا

مولانا محمد علی

ماتم یہ زمانہ میں بپا "تیرے" لیے ہے

مولانا محمد علی نے ۱۴؍ شعبان ۱۳۴۹ھ مطابق ۴؍ جنوری ۱۹۳۱ء کو تریپن ۵۳ برس کی عمر میں لندن میں وفات پائی، اس مسافر نے غالبؔ کے اس مصرع کو اپنے شعر میں دہرا کر اپنی مسافرانہ موت کی آپ پیش گوئی کی تھی۔

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور

افسوس وہ پر درد آواز جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۰ء تک ہندوستان اور دنیائے اسلام کے ہر قیامت آفرین سانحہ میں صدائے صور بن کر بلند ہوتی رہی، ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی، وہ بیقرار دل جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بیتاب ہوجاتا تھا، اور اوروں کو بیتاب کرتا تھا، دریغا کہ قیامت تک کے لیے ساکن ہوگیا، وہ اشک آلود آنکھیں جو دین و ملت کے ہر ماتم میں آنسوؤں کا دریا بن جاتی تھیں، حسرتا کہ ان کی روانی ہمیشہ کے لیے بند ہوگئی، وہ مترنم لب جو ہر بزم میں خوشنوا بلبل بن کر چہکتے تھے، ان کے ترانے اب ہمارے کان نہ سنیں گے، وہ آتشیں زبان جو ہر رزم میں تیغ براں بن کر چمکتی تھی اس کی تابش اب کسی معرکہ میں ہماری آنکھوں کو نظر نہ آئے گی، وہ پرجوش سینہ جو ہمارے مصائب کے پہاڑوں کو سیلاب بن کر بہالے جاتا تھا، اس کا تلاطم ہمیشہ کے لیے تھم گیا، وہ پرزوردست و بازو جو شب و روز کی خدمت گذاری اور نبردآزمائی میں مصروف تھے، وہ اب ایسے تھکے کہ پھر نہ اٹھیں گے، اور افسوس کہ شکست خوردہ فوج کا وہ آخری سپاہی جو اعدا کے نرغہ میں تنہا لڑ رہا تھا، آخر زخموں سے چور ہوکر ایسا گرا کہ پھر کھڑا نہ ہوگا، الوداع! محمد علی! الوداع! والسلام الیٰ یوم القیام۔

تو ملت کا عزادار تھا، حق ہے کہ ساری ملت تیری عزادار ہو، تو امت محمدیہؐ کا سوگوار تھا، فرض ہے کہ پوری امت محمدیؐ تیرا سوگ کرے، تو نے دنیائے اسلام کا ماتم کیا تھا سزاوار ہے کہ دنیائے اسلام تیرا ماتم کرے، ہندوستان کا ماتم دار، طرابلس کا سوگوار، عراق کے لئے غمزدہ، بلقان کے لئے اشکبار، شام پر گریاں، انگورہ پر مرثیہ خواں، حجاز کا سوختۂ غم اور بیت المقدس کے لیے وقف الم، اے ہند کے آوارہ گرد مسافر! تیرا حق سرزمین اسلام کے چپہ چپہ پر تھا، مناسب یہ تھا کہ تیری لیے اولین قبلہ اسلام کا سینہ پھٹ جائے اور تو اس میں سما جائے۔

وہ مشرق کی زمین میں پیدا ہوا لیکن مغرب کی آب و ہوا میں نشو و نما پائی، مشرق کی مٹی سے اس کا جنم بنا لیکن مغرب کے ہتھیاروں سے اس نے اپنا جسم سجایا، اس کا دماغ مغربی، مگر دل مشرقی تھا، وہ مشرق کی حمایت میں بار بار مغرب سے مغرب کے ہتھیاروں سے لڑا، اور اس نے اس کا لوہا مانا، وہ مشرق کا آفتاب تھا، یہ آفتاب بھی اگر مشرق میں طلوع ہوکر مغرب میں ڈوبا، تو دنیا کا کوئی نیا واقعہ نہ ہوا، اور اسی لیے حق تھا کہ مشرق و مغرب کا متحدہ مرکز (بیت المقدس) اس کا مدفن بنے، اے مشرق و مغرب کے مالک! تو اپنی رضامندیوں کے پھول سے اس کا دامن بھر دے۔

محمد علی کے کارناموں میں اس کی غزل خوانی کوئی بڑا درجہ نہیں رکھتی، لیکن جس طرح اس کی آخری پیشنگوئی کی صداقت کو دنیا نے دیکھا اور تسلیم کیا کہ وہ آزاد غلام ہندوستان کو واپس نہ آیا، اسی طرح اس کے مرنے پر معلوم ہوا کہ اس نے زنداں خانہ میں بیٹھ کر اپنے جن واردات کو نظم کیا تھا، وہ سرتاسر صداقت تھے، اور پیشگوئیوں کی عجیب وغریب مثالیں، اس نے کہا تھا،

اللہ ہی کے رستہ میں جو موت آئے تو اچھا
اکسیر یہی ایک دعا میرے لیے ہے

محمد علی! مبارک کہ یہ تیری پرتاثیر دعا، اکسیر بنی، اور تیرے حق میں قبول ہوئی۔

مولانا محمد علی کا ماتم جس طرح دنیا میں ہوا مشرق و مغرب میں ہوا، یورپ اور ہندوستان میں ہوا، مصر اور شام میں ہوا، فلسطین اور اس کے بیت القدس میں ہوا، وہ شاید ہی کسی کے لیے ہوا ہو، صاحب دل شاعر کی اس پیشگوئی کی صداقت سے آج کس کو انکار ہے؟

''ماتم یہ زمانہ میں بپا میرے لیے ہے''

(''س''، جنوری ۱۹۳۱ء)

رامپوری، عبدالسلام خان، نواب

نواب عبدالسلام خان رامپوری

نواب عبدالسلام خان مرحوم رامپوری سب جج ان لوگوں میں تھے جن کو کتابوں کا عاشق زار کہنا چاہئے، وہ عمر بھر نوادر کتب کے جمع کرنے میں مصروف رہے اور وہ ان کو اس قدر عزیز رکھتے تھے کہ ان کے لیے ہر قسم کی تکلیف گوارا کر لینا راحت جانتے تھے، مونڈہ پانڈے ضلع مراد آباد ریلوے اسٹیشن کے قریب ان کا گاؤں تھا، وہاں یہ ان کا کتب خانہ تھا، ابھی ایک ہی دو برس ہوئے کہ ان کا انتقال ہوا، ان کے صاحبزادوں نے اب اپنے کتب خانہ کی (۱۱۴۸) کتابیں مسلم یونیورسٹی کی لٹن لائبریری کو پانچ برس کے واسطے مستعار دے دی ہیں، کتابیں لائبریری میں پہنچ چکی ہیں اور ان کی فہرست تیار ہو رہی ہے، امید ہے کہ ہماری مسلم یونیورسٹی ان جواہر پاروں کی قدر کرے گی اور اس مدت میں ان سے کچھ فائدہ اٹھائے گی۔ (''س''، فروری ۱۹۳۱ء)

خدا بخش، صلاح الدین

مسٹر صلاح الدین خدا بخش

بعض اتفاقات بھی عجیب ہوتے ہیں، پچھلے رسالہ میں مسٹر صلاح الدین خدا بخش (جن کو اب مرحوم کہنا پڑتا ہے) کی بعض تحریروں کا گلہ کیا گیا تھا۔ ابھی وہ رسالہ چھپ کر تیار ہی ہوا تھا کہ کلکتہ سے ان کی اچانک وفات کی خبر آئی، اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے اور اپنی مغفرت سے سرفراز کرے، ان کے قلم سے گو ایسی باتیں مستشرقین یورپ کی ترجمانی میں اکثر نکلتی رہیں، تاہم انکی ایسی پرجوش مخالفت قوم میں پہلے کبھی

نہیں ہوئی، جیسی اس دفعہ ہوئی اور اس کے اثر کے سامنے ان کو مجبوراً مسلم آؤٹ لک لاہور میں اپنا معذرت نامہ شائع کرنا پڑا، جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی گہری عقیدت اور مستشرقانہ الزامات کی بے حقیقی کا اعتراف اور ان کے جوابات کے لئے اپنی بعض تصنیفات کا حوالہ درج تھا، کس کو خبر تھی کہ ان کا یہ معذرت نامہ حقیقت میں ان کی پوری عمر کا آخری توبہ نامہ ثابت ہوگا، لیکن حسن خاتمہ کی توفیق دینے والے کی حکمتوں اور مصلحتوں کو کون سمجھ سکتا ہے؟

بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

مرحوم خدابخش خان سابق چیف جسٹس عدالت عالیہ، حیدرآباد دکن اور بانی کتب خانۂ مشرقی بانکی پور کے فرزند ارجمند تھے، علم کی محبت باپ سے ورثہ میں پائی تھی، بیرسٹر تھے، کلکتہ میں پریکٹس کرتے تھے، جرمن زبان سے جرمن مستشرقین کی کتابوں اور مضمون کے ترجمے انگریزی میں کرتے رہتے تھے، اب ان کی کتابوں میں اسلام کے متعلق جو کچھ بھلی بری باتیں ہوتی تھیں وہ ان کو اسی طرح رہنے دیتے تھے، اس لئے کبھی کبھی ان میں نہایت زہریلا مواد ملا ہوتا تھا، شعر و شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔

("س"، ستمبر ۱۹۳۱ء)

بدایونی، عبدالماجد، مولانا

مولانا عبدالماجد بدایونی

افسوس ہے کہ اس سال کا خاتمہ بھی ماتم پر ہوتا ہے، خطیب الامت مولانا عبدالماجد بدایونی رحمۃ اللہ علیہ کا ناگہانی سانحۂ ارتحال ہمارے لئے ذاتی اور قومی دونوں حیثیتوں سے وہ غم ہے جو بھلائے نہیں بھولتا۔

۱۴/ دسمبر ۱۹۳۱ء کی نصف شب کو یہ واقعہ لکھنؤ صدر میں پیش آیا تو میں وہاں اس صبح کو موجود تھا، ۸ بجے صبح کو خبر ہوئی جب ۹ بجے کے بعد وہاں پہنچا تو مرحوم کی زندہ روح خدا کے پاس اور مردہ لاش بدایوں کو منتقل ہو چکی تھی۔

مولانا عبدالماجد بدایونی کون تھے؟ لکھنے والے ان کے محامد و اوصاف صفحوں میں لکھیں گے اور بیان کرنے والے گھنٹوں بیان کریں گے، لیکن اس سارے دفتر کو صرف ایک لفظ میں اگر ادا کرنا چاہیں تو کہہ سکتے کہ وہ ہستی جو سرتاپا محبت تھی، خدا سے محبت رسول سے محبت، آل رسول سے محبت، اکابر سے محبت، دوستوں سے محبت، کارکنوں سے محبت، عزیزوں سے محبت۔

حضرات علماء کے طبقہ میں ان کی ذات ہر حیثیت سے قابل فخر تھی، ان تمام لوگوں پر جنھوں نے طرابلس کے زمانہ سے اسلامی جدوجہد میں شرکت کی، ان بیس برسوں میں مختلف دور گزرے، یعنی کچھ آرام و سکون، پھر کچھ سعی و محنت، کچھ عزلت گزینی اور پھر ہنگامہ آرائی، کچھ توقف، پھر تیز رفتاری، اس طرح ان کی زندگی کے ایام وقتاً فوقتاً گزرتے رہے، مگر جماعت علماء میں یہی ایک ہستی تھی جس کی زندگی کے ایک لمحہ کو بھی اس وقت سے چین نصیب نہ ہوا، ہر وقت و ہر نفس ان کو کام کی ایک دھن لگی ہوئی تھی، جس کے پیچھے ان کا آرام چین خانگی سکون، اہل وعیال اور جان و مال ہر چیز قربان تھی، یہ بھی سماں گزرا ہے کہ ان کے گھر میں کفن دفن کا سامان ہو رہا ہے اور وہ مردہ قوم کی مسیحائی کے لئے کانپور ولکھنؤ کی تگ و دو میں مصروف ہیں، خدام کعبہ، طرابلس، بلقان، کانپور خلافت، کانگریس، تبلیغ، تنظیم، مسلم کانفرنس، یہ تمام وہ مجالس ہیں جو ان کی خدمات سے گراں بار ہیں، ان مشغولیتوں میں اپنے مدرسہ "شمس العلوم" کو جس کی خود انھوں نے بنیاد ڈالی تھی، ناتمام چھوڑا، اس کے لئے کتب خانہ کی عمارت بنوائی، کتابیں جمع کیں، وہ بھی نامکمل رہا، یہاں تک کہ ان کی منزلیں دفعتہً پوری ہوگئیں۔

مرحوم کی قوتِ خطابت غیر معمولی تھی، ان کی تقریر جذبات اسلامی کی ترجمان ہوتی تھی، ان کی شاعری و سخنوری گو مختنی تھی، مگر شاندار تھی، ان کی عالمانہ شان اور معقول ومنقول سے پرانی دل آویزی اس عالم میں بھی نمایاں تھی، ان کا دراز قد، بڑی داڑھی، سیاہ عمامہ، بڑا کرتہ، اس پر جبہ، گلے میں بڑا کالا رومال یا چادر، مست چال جھوم جھوم کر متانت سے چلنا، اب تک نگاہوں کے سامنے ان کی تصویر بنا کر کھڑی کر دیتا ہے۔

مرحوم نے عراق کا سفر اپنے بزرگوں کے ساتھ کیا تھا اور حجاز و مصر کا سفر میرے ساتھ ۱۹۲۴ء میں کیا، بے گوش تو وہ تھے ہی، مگر ان جیسا بے زبان رفیق سفر ملنا بھی ممکن نہیں۔ وہ بہت کچھ تھے، مگر سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنے ہر دوست، ہر ہمعصر ہر رفیق کے محبوب وحبیب تھے، ان کا ہر ملنے والا یہی سمجھتا تھا کہ وہ اسی سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں، ان کی ہستی محبت کا آئینہ خانہ تھی، ہر آئینہ دل میں وہی ہر طرف چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ سال کا آغاز تھا کہ میں نے اپنے رفیق یورپ (محمد علی مرحوم) کا ماتم کیا تھا، آج سال کا اختتام ہے کہ اپنے رفیق حجاز و مصر کا ماتم کرتا ہوں، رفیقو! رخصت، اب تم وہاں ہو جہاں تمہارے رفیق ملائکۃ اللہ اور عباد الرحمٰن ہیں اور سب سے بڑھ کر وہ رفیق اعلیٰ ہے جس کی رفاقت سب رفاقتوں سے بڑھ کر ہے، عربی کے یہ چند شعر بے اختیار نظم ہوگئے۔

رحمۃ اللہ علیک   خیر اخلاف الکرام
نم قریر العین فی   قبرک الی یوم القیام
کنت فی الدنیا سلامًا   صِرتَ فی دار السّلام
اسکت الموتُ خطیب   القوم حسّانَ الکلام

بزرگوں کے بہترین خلف   تم پر اللہ کی رحمت ہو،

قیامت تک اپنی قبر میں میٹھی نیند سوتے رہو،
تم دنیا میں باعث سلامتی تھے اب تم دارالسلام میں پہنچ گئے،
افسوس، موت نے قوم کے خطیب اور حسان زمانہ کو خاموش کر دیا،

(''س''، جنوری ۱۹۳۲ء)

علی امام، سید، سر

سر سید علی امام

افسوس ہے کہ گذشتہ ماہ اکتوبر کے خاتمہ پر نئی تعلیم کے ایک بہترین نمونہ کا خاتمہ ہوگیا، سر سید علی امام صوبہ بہار کے مشہور خاندان کے سپوت نے اس عالمِ فانی کو الوداع کہا، مرحوم نے ارادہ کیا تھا کہ وہ امسال سفرِ حج اختیار کریں گے، مگر افسوس کہ اس سفر سے پہلے ان کو سفر آخرت پیش آ گیا، مرحوم ایک کامیاب بیرسٹر کے علاوہ ہماری زبان کے مشہور مقرر اور اپنے زمانہ عمل میں اسلامی سیاسیات کی بساط کے نامور مہرہ تھے، وہ یکسر نئی تعلیم، تمدن، اور نئے خیالات کے باوجود اپنے مشرقی علوم وتمدن سے اپنے خاندانی اثر سے بہت کچھ واقف تھے، غالباً ۱۹۰۸ء میں مسلم لیگ منعقدہ امرتسر کی ایک ہی کامیاب صدراتی تقریر تھی، جس نے ان کو مسلمانوں کا سیاسی رہنما بنا دیا ہنگامہ کانپور کے وقت میں وہ وائسرائے کی مجلس وزارت کے رکن رکین تھے، اس ہنگامہ کے فرو کرنے اور مسلم یونیورسٹی کی قانونی ترتیب میں غالباً ان کا بڑا حصہ تھا، خدا مغفرت فرمائے۔[۱] (''س''، نومبر ۱۹۳۲ء)

---

[۱] ان کی وفات کے کچھ دن بعد صوبہ بہار اڑیسہ کے سرکاری عربی مدارس کی ترتیب نصاب کے سلسلہ میں رانچی کے سفر کا اتفاق ہوا، شہر سے باہر علی امام کا وہ ناتمام قصر واقع ہے جس کے سربفلک ستونوں، مناروں اور سقف کی زبانِ حال، انسانی آرزوؤں کی ناتمامی کی داستان سنا رہی ہے، اس عظیم الشان قصر کا دامن قسم قسم کے نادر درختوں سے بھرا ہے اور ہائے افسوس کہ اس عظیم الشان قصر وباغ کے ایک دور افتادہ گوشہ میں اس کے ایک چھپّر کے نیچے اس کا اولوالعزم بانی دوگز مٹی کے فرش پر تنہا پڑا سو رہا ہے، زبان نے اس فرش خاک پر سونے والے کے لئے دعائے مغفرت مانگی اور آنکھوں نے آنسوؤں کے چند پھول تربت پر چڑھائے اور زبانِ حال نے پڑھا:

آئے تھے دنیا میں اس دن کے لئے۔ (یادِ رفتگاں، ص ۱۴۲)

کمال الدین، خواجہ

خواجہ کمال الدین

عیسوی سال کے خاتمہ پر ۲۸/ دسمبر ۱۹۳۳ء کو عیسوی مذہب کے سب سے بڑے نقاد اور عیسوی ممالک میں اسلام کے مشہور مبلغ خواجہ کمال الدین نے افسوس ہے کہ وفات پائی، وہ کئی برس سے سل کے مرض میں مبتلا تھے اور اس حالت میں بھی وہ تصنیف وتالیف میں ہمیشہ مصروف رہے، احمدی جماعت میں ہمارے نزدیک وہ عام مسلمانوں سے سب سے زیادہ قریب تھے، اس لئے ان کے مشن کا بار اٹھانے میں عام مسلمان اور امراء نے بھی شرکت کی تھی اور شاید یہ راز نہ ہو کہ مسیح الملک حکیم اجمل خان مرحوم اور مولانا شبلی مرحوم نے ان کی امدادی تحریکوں میں سب سے زیادہ دلچسپی لی، مولانا مرحوم نے ایک دفعہ علماء کے بالمقابل نوجوان تعلم یافتوں میں سے خواجہ صاحب کے عزم تبلیغ کو سامنے رکھ کر یہ شعر خود انہیں کے خط میں لکھا تھا:

کامل اس فرقہ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

گو ہم کو خواجہ صاحب کے بہت سے خیالات اور تاویلات سے اتفاق نہیں تاہم یہ کہنا اظہار واقعہ ہے کہ انہوں نے ۱۹۱۲ء سے لے کر ۱۹۳۲ء تک اپنی پوری بیس برس کی زندگی اسلام کی تبلیغ اور اس کے محاسن کی اشاعت اور یورپ میں اسلامی لٹریچر کی فراہمی میں صرف کی اور نیز یہ کہ ان تصنیفات کے بڑے حصہ کا موضوع ''احمدیت'' نہیں ''محمدیت'' ہے، افسوس کہ ان کی موت سے دنیا کی مذہبی بزم میں ایک اہم جگہ خالی ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ ان کے ان اعمال صالحہ کے صدقہ میں ان کو اپنی مغفرت سے نوازے اور ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے۔

میں نے ان کو سب سے پہلے ندوہ کے اس اجلاس لکھنؤ ۱۹۱۲ء میں دیکھا جس میں مصر کے عالم سید رشید رضا صدر تھے اور سب سے پہلی ملاقات اسی ۱۹۱۲ء میں بنگلور کی ایک تعلیمی کانفرنس میں ہوئی، جس میں ایک مکان میں کئی روز ایک جگہ قیام رہا، پھر مولانا شبلی کے تعلق سے یورپ کی تبلیغی اور مذہبی تحریکات کے سلسلہ میں خط وکتابت ہوتی رہی انہیں کی دعوت پر ان کے مسلم ریویو میں کئی مضمون لکھے۔ (''س''، جنوری ۱۹۳۳ء)

نعمانی، جنید، مولوی

مولوی جنید نعمانی

یہ خبر نہایت حسرت وافسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے چھوٹے بھائی مولوی جنید صاحب نعانی سب جج کانپور نے دوسال کی صحت وعلالت کی کشمکش کے بعد ۱۲/ اپریل ۱۹۳۳ء کو دہلی میں وفات پائی، مولانا مرحوم کے صرف یہی ایک بھائی تھے جو ان کی وفات کے بعد زندہ تھے، آخر انہوں نے بھی اس دنیا کو الوداع کہا، یہی وہ بھائی تھے جن کی نسبت مولانا نے اپنے بھائی محمد اسحاق صاحب مرحوم الہ آباد ہائی کورٹ کے پردرد نوحہ میں ۱۹۱۴ء میں یہ فرمایا تھا:

اے خدا شبلی دلِ خستہ بایں موئے سپید　　لے کے آیا ترے درگہِ عالی میں امید
مرنے والے کو نجات ابدی کی ہو نوید　　خوش و خرم رہے چھوٹا مرا بھائی یہ جنید

افسوس کہ یہ بھائی اپنے بڑے بھائی کے بعد اٹھارہ برس سے زیادہ خوش وخرم نہ رہ سکا، دعا ہے کہ مرحوم کو اب آخرت کی ابدی خوشی وخرمی حاصل ہو۔ (’’س‘‘، مئی ۱۹۳۳ء)

انور شاہ، سید، مولانا

مولانا سیّد انور شاہؒ

دین و دانش کی دنیا کا مہر انور ۳؍صفر ۱۳۵۲ھ (۲۹؍مئی ۱۹۳۳ء) کی صبح کو دیوبند کی خاک میں ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا، یعنی مولانا سید انور شاہ صاحب جانشین شیخ الہند و صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند نے دو برس کی علالتہ بواسیر اور ضعف و نقاہت کے بعد ۵۹ برس کی عمر میں وفات پائی، مرحوم کا وطن گو کشمیر تھا، مگر تعلیم سے فراغت کے بعد ایک مدت تک مدینہ منورہ میں اقامت کی، پھر واپس آکر استاد کی خواہش اور اصرار سے دارالعلوم کی صدارت کی ذمہ داری قبول فرمائی، اور جس کو حضرت شیخ کے زمانۂ جنگ میں ہجرت کے بعد سے ۱۹۲۹ء تک اس طرح انجام دیا کہ چین سے لے کر روم تک ان کے فیضان کا سیلاب موجیں لیتا رہا اور ہند اور بیرون ہند کے سینکڑوں تشنگان علم نے اس سے اپنی پیاس بجھائی۔

مرحوم کم سخن لیکن وسیع النظر عالم تھے، ان کی مثال اس سمندر کی سی تھی جس کی اوپر کی سطح ساکن لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گراں قیمت خزانوں سے معمور ہوتی ہے، دو وسعت نظر، قوتِ حافظہ اور کثرت حفظ میں اس عہد میں بے مثال تھے، علوم حدیث کے حافظ اور نکتہ شناس، علوم ادب میں بلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعر و سخن سے بہرہ مند اور زہد و تقویٰ میں کامل تھے، اللہ تعالیٰ اپنی نوازشوں کی جنت میں ان کا مقام اعلیٰ کرے کہ مرتے دم تک علم و معرفت کے اس شہید نے قال اللہ و قال الرسول کا نعرہ بلند رکھا۔

مرحوم کو سب سے پہلے ۱۹۰۶ء یا ۱۹۰۷ء میں دیوبند میں دیکھا، جب وہ اور مولانا حسین احمد صاحب مدنی سرزمین عرب سے تازہ وارد ہند تھے، مدرسہ دیوبند میں میری حاضری کی تقریب سے طلبہ اور مدرسین کا ایک جلسہ ترتیب پایا تھا، جس میں انہوں نے میری عربی تقریر کے جواب میں تقریر فرمائی تھی، پھر جب جب حاضری ہوتی رہی یا خلافت اور جمعیۃ کے جلسوں میں بار بار ملاقاتیں ہوتی رہیں، ۱۹۲۹ء میں جب وہ پشاور کے اجلاس جمعیۃ العلماء کے صدر تھے، میں بھی حاضر تھا، حضرت مرحوم سے ملاقاتوں میں علمی استفادہ کے موقعے ملتے رہے، ہر سوال کے وقت ان کی خندہ پیشانی سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ سوال سے خوش ہوئے، اہل کمال کی یہ بڑی پہچان ہے، کیونکہ وہ مشکلات سے عبور کر چکتا ہے، اب جب اس سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ شبہ کے اصل منشاء کو سمجھ جاتا ہے اور جواب دے کر خوش ہوتا ہے۔

مرحوم معلومات کے دریا، حافظہ کے بادشاہ اور وسعت علمی کی نادر مثال تھے ان کو زندہ کتب خانہ کہنا بجا ہے، شاید ہی کوئی کتاب مطبوعہ ہو یا قلمی، ان کے مطالعہ سے بچی، میری تصنیفات میں سے ارض القرآن ان تک پہنچی تھی اور اس پر اپنی رضا ظاہر فرمائی، مرحوم آخری ملاقاتوں میں زیادہ تر قدیم عربی نصاب کی اصلاح پر مجھ سے گفتگو فرمایا کرتے تھے۔ (’’س‘‘، جولائی ۱۹۳۳ء)

تصحیح: گزشتہ شذرات میں بعض غلطیاں رہ گئی ہیں، جن کی اصلاح مناسب ہوگی ورنہ آگے چل کر وہ شاید تاریخ کی غلطیاں بن جائیں، مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے وقت یاد سے ستاون برس لکھ دی گئی تھی، مگر ان کے رفقائے خاص سے معلوم ہوا کہ انسٹھ برس تھی، اسی شذرہ کے آخر میں علم و حرفت چھپ گیا ہے، حالانکہ وہ علم و معرفت ہے، امید ہے کہ ناظرین اس کو قلم سے درست کرلیں گے۔ (’’س‘‘، اگست ۱۹۳۳ء)

فخر الدین، سر

سر فخر الدین

۱۹؍جون ۱۹۳۳ء کی صبح کو مشرقی ہند کے مرکزی شہر پٹنہ کے جسم سے روح نے مفارقت کی، سر فخر الدین وزیر تعلیمات جو وہاں کے سب سے زیادہ ہر دلعزیز مسلمان تھے، ۶۵ برس کی عمر میں وفات پائی، ان چند مہینوں کے اندر اس شہر کے وہ پرانے نئے تعلیمیافتہ اصحاب جو وہاں کی مجلس کی شمعِ بزم افروز تھے، ایک ایک کر کے رخصت ہوگئے، سر علی امام کی وفات پر سیاسی تدبر و قابلیت کا ماتم ہوا، حسن امام کے مرنے پر قانون دانی کا نوحہ پڑھا گیا، لیکن سر فخر الدین کی رحلت پر انسانیت اور اس کی شرافت کا ماتم ہے۔

مرحوم نیک دل، متواضع، فیاض، مشرقیت پسند اور دیندار تھے، اسی لئے انکی وفات پر پورے صوبہ نے ماتم کیا، شہر کے سب سے بڑے میدان میں پورے شہر نے نماز جنازہ پڑھی اور صوبہ کے سب سے مقدس مقام پھلواری شریف میں اپنے مرشدین کے مقبرہ میں جگہ پائی، اللہ تعالیٰ مرحوم کی روح پر اپنی مغفرت کے پھول برسائے۔

(’’س‘‘، جولائی ۱۹۳۳ء)

نظم طباطبائی، علی حیدر، مولانا

مولانا حیدر علی نظم طباطبائی

نظام دکن کی مجلس میں فرماں روایان اودھ کی بزم دوشیں کا ایک ٹمٹماتا چراغ مدت سے جل رہا تھا، افسوس کہ وہ ۳؍مئی ۱۹۳۳ء کی شب کو چمنستان روزگار کی بیاسی

بہاریں دیکھ کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا، مولانا حیدر علی نظم طباطبائی لکھنوی المخاطب بہ نواب حیدر یار جنگ بہادر نے بیاسی سال کی عمر میں وفات پائی، لکھنؤ وطن تھا، اخیر شاہ اودھ کے دربار کی خزاں دیکھی تھی، مٹیا برج کلکتہ کی شاعرانہ مجلسوں کی یادگار تھے، علوم عربیہ کے علاوہ شعر و سخن کے فنون پر کامل عبور رکھتے تھے، اس عمر کے باوجود اخیر تک علمی کاموں میں مصروف و منہمک رہے، شرح غالب اور بعض رسائل و مقالات یادگار ہیں، اللہ تعالیٰ کرم فرمائے۔

حیدرآباد دکن کے سفر میں اخیر وقت میں ان سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔

("س"، جولائی ۱۹۳۳ء)

عالم، محبوب، مولوی

مولوی محبوب عالم

اس ماہ کے شذرات کا صفحہ وفات نامہ ہوا چاہتا ہے، مگر احسان فراموشی ہوگی اگر ملک کے سب سے بوڑھے صحیفۂ نگار مولوی محبوب عالم اڈیٹر پیسہ اخبار لاہور کا ماتم نہ کیا جائے، ۲۸/ مئی کو انہوں نے اس دارِ فانی کو الوداع کہا، وہ اردو کے سب سے پہلے روزنامہ اخبار (پیسہ) کے اڈیٹر تھے، انہوں نے صرف اپنی محنت و کوشش سے سرمایہ حاصل کیا اور ملک میں تاریخ اور سیاحت ناموں کے پڑھنے کا ذوق پیدا کیا اور خود بھی یورپ اور ممالک اسلامیہ کے دو سفر کئے اور سیاحت نامے لکھے، مگر افسوس کہ اب ان کو وہ سفر پیش آیا جس کا سفر نامہ انسانوں کے ہاتھ نہیں، فرشتوں کے ہاتھ لکھتے ہیں، اس ان دیکھی منزل کے بوڑھے مسافر پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو۔

مرحوم نے ۷۴ برس کی عمر پائی۔ ("س"، جولائی ۱۹۳۳ء)

تصحیح: منشی محبوب عالم مرحوم کے تذکرہ میں یہ لکھا گیا ہے کہ وہ اردو کے پہلے روزانہ اخبار کے بانی اور اڈیٹر تھے، اس سے مراد مسلمانوں میں تھی، یعنی اردو کے پہلے اسلامی روزانہ اخبار کے وہ بانی اور اڈیٹر تھے، اردو میں منشی نولکشور لکھنو کا اودھ اخبار ان کے اخبار سے پہلے نکلا تھا اور اب تک نکل رہا ہے۔ ("س"، اگست ۱۹۳۳ء)

علی، میر ناصر، خان بہادر

خان بہادر میر ناصر علی

مدیر "صلائے عام" دہلی

اردو کے ایک اور کہنہ صاحب قلم استاد کی وفات پر دو آنسو بہانا ہے، ایک زمانہ تھا کہ اس کی انشاء پردازی اور نکتہ نوازی پر ملک کے اچھے اچھے اہل قلم رشک کرتے تھے مگر افسوس کہ نوجوانوں نے اس کو بھلا دیا، یہ خان بہادر میر ناصر علی، مدیر صلائے عام دہلی تھے، مرحوم نے عمر کی چھیاسی ۸۶ بہاریں دیکھ کر ۱۲/ جون ۳۳ء کو دہلی میں وفات پائی، ان کے قلم میں جو نزاکت اور ان کی انشاء میں جو لطافت تھی وہ اب بھی ہماری زبان کا سرمایہ ہے، مگر افسوس ہے کہ آخر میں وہ یہ ساری جگر کاوی ان ناقدر شناس انگریز افسروں کے لئے کرتے تھے جو ہندوستانی زبان کو امتحان کے لئے سیکھتے تھے اور اسی لئے ان کی یہ ادبی کوششیں عام نگاہوں سے چھپ کر رہ گئی تھیں، خدا اپنے دربار میں ہمارے بوڑھے صاحب قلم کی آبرو رکھے۔ ("س"، جولائی ۱۹۳۳ء)

خان، نادر، شاہ

شاہ نادر خان

حادثۂ افغانستان

اکتوبر ۱۹۳۳ء میں افغانستان کو جاتے ہوئے، نومبر کے لئے جب میں شذرات قلمبند کر رہا تھا تو یہ خیال نہ تھا کہ میری واپسی اس قدر جلد ہوگی اور اسی طرح ۳۰/ اکتوبر کی صبح کو کابل سے روانہ ہوتے ہوئے یہ خیال بھی نہ تھا کہ ۸/ نومبر ۱۹۳۳ء کو سہ پہر کو افغانستان میں یہ عظیم الشان واقعہ پیش آئے گا، ۳/ نومبر کی رات کو غزنین و قندھار و چمن ہو کر میں اور ڈاکٹر سر اقبال کوئٹہ پہنچے اور میں ملتان میں دو روز ٹھہر کر ۸ کی دوپہر کو لکھنؤ پہنچا اور ۹ کی صبح کو شاہ نادر خاں کی شہادت کی وہ خبر سنی جس کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔

افغانستان کی سرزمین ناگہانی سیاسی واقعات کے ظہور کے لیے ہمیشہ سے مشہور ہے، مگر آج جب دشمن ہر قدم پر کمین میں ہیں، اس قسم کے واقعہ کا پیش آنا حد درجہ افسوسناک ہے، افسوس اشخاص کی حیات و موت کا اتنا نہیں، جتنا افغان قوم کی حیات و موت کا ہے۔

ہم کو معلوم ہے کہ اس وقت ملک کی ترقی کے لئے وہاں کیا کیا تدابیر زیر غور تھیں، مگر افسوس کہ واقعات نے اب نیا پہلو بدلا ہے تاہم ہم کو امید ہے کہ موجودہ کار فرمایان حکومت کی دانشمندی سے مصیبت کی وہ بلائیں افغانستان کے سر سے دور ہو جائیں گی، جو اس وقت منڈلا رہی ہیں۔

دعا ہے کہ شاہ شہید کو مغفرت اور ملک کو امن و امان نصیب ہو۔

("س"، نومبر ۱۹۳۳ء)

شوق، احمد علی خان، حافظ

حافظ احمد علی خان شوق

یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی جائیگی کہ رامپور کے مشہور علم دوست فاضل اور وہاں کے مشہور شاہی کتب خانہ کے سابق ناظم اور متعدد کتابوں کے مترجم و مصنف حافظ احمد

علی خان صاحب شوقؔ نے اوائل رمضان المبارک ۱۳۵۲ھ میں تقریباً پینسٹھ اور ستر کی عمر کے درمیان میں انتقال فرمایا، مرحوم نہایت بااخلاق، بامروت، علم دوست اور صاحب کمال تھے، قلمی اور نادر کتابوں کے خاص ماہر تھے، معارف کے ناظرین کبھی کبھی ان کی تحقیقات سے مستفید ہوا کرتے تھے، ان کی سب سے بہتر کتاب تذکرہ کاملین رام پور ہے، اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے۔ (''س''، جنوری ۱۹۴۳ء)

بہادر، صلابت، نواب

نواب صلابت بہادر

یہ خبر نہایت حسرت و افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ اعلیٰ حضرت خسرو دکن خلد اللہ ملکہ کے چھوٹے بھائی نواب صلابت خان بہادر نے ستائیس سال کی عمر میں چند روز بیمار رہ کر رحلت فرمائی، مرحوم شاہی خانوادہ آصفی کے ایک رکن رکین ہونے کے علاوہ مشرقی علوم و ادب سے پوری دلچسپی رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ مرحوم نوجوان شہزادہ کے سر پر اپنے الطاف و رحمت کا تاج رکھے اور اعلیٰ حضرت برادر اکبر اور دیگر اعزہ کو صبر و سکون اور رضا بالقضا کی غیر فانی دولت سے ممتاز فرمائے۔ (''س''، مارچ ۱۹۳۴ء)

شملوی، غلام محمد، مولانا

مولانا غلام محمد شملوی

یہ خبر نہایت رنج و افسوس کے ساتھ درج کی جاتی ہے کہ ندوۃ العلماء کے مشہور سفیر و وکیل مولانا غلام محمد صاحب شملوی نے ۲۹/ مارچ ۱۹۳۴ء کو وفات پائی، ندوۃ العلماء کے مقاصد کی اشاعت اور اس کے لیے مالی امدادوں اور چندوں کے حصول میں ان کی کوششیں بہت کامیاب تھیں، وہ جوانی میں تارک الدنیا فقیر ہو گئے تھے، اور جنگلوں میں رہتے تھے، ندوۃ العلماء کے ابتدائی اجلاسوں کے روحانی اثرات نے ان کو دوبارہ دنیا میں داخل کیا اور ندوۃ العلماء کی خدمت کا ایسا ولولہ ان میں پیدا کیا کہ مرتے دم تک سرد نہیں ہوا، وہ بڑے پرجوش مقرر، روشن خیال عالم اور صاحب عزم محنتی تھے، ندوہ کی خدمت میں انہوں نے ہندوستان کی گلی گلی کی خاک چھانی، اور ہر چھوٹے بڑے سے ملے، مدت سے ان کی صحت خراب تھی، وفات کے وقت ان کی عمر ستر کے قریب ہوگئی، تاہم ان میں ایسی ہمت تھی جو جوانوں کو شرماتی تھی، خدا مغفرت فرمائے۔

(''س''، اپریل ۱۹۳۴ء)

ریاضؔ، خیرآبادی

ریاضؔ خیرآبادی

ملک میں یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ ہماری زبان کے مشہور کہنہ مشق اور استاد شاعر حضرت ریاض خیرآبادی نے نوے برس کی عمر میں ۱۷/ ربیع الآخر کو وفات پائی، مرحوم اپنے صف سخن میں باکمال و بے مثال شاعر تھے، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی مغفرت کی شراب طہور سے سیراب فرمائے۔ (''س''، اگست ۱۹۳۴ء)

احقؔر بہاری

احقؔر بہاری مرحوم

(معین الدین اور دائی)

بہار کی سرزمین جس قدر مردم خیز ہے، اسی قدر مردم خوار بھی ہے، خدا جانے کیا بات ہے کہ وہاں کے لوگوں کو شہرت طلبی سے شرم آتی ہے، اہل وطن بھی قدر شناسی نہیں کرتے، اس لئے یہاں کے اچھے اچھے جوہر قابل بلبلہ کی طرح ابھرتے اور دب جاتے ہیں، اگر بہار کے کچھ لوگوں کے نام زندہ ہیں تو یہ وہی ہیں جن کا آوازۂ کمال دوسرے صوبوں تک پہنچا اور وہاں کے لوگوں نے قدر شناسی کر کے ان کو شہرت بخشی، بہار کے ان گمنام اہل کمال میں ایک احقر بہاری مرحوم ہیں، یہ بہار کے ایک پرانے کہنہ مشق استاد سخن تھے، شعر و شاعری کے بڑے بڑے معرکے طے کئے تھے، پچاس ساٹھ برس کے ریاض میں دیوان یادگار چھوڑا ذیل کے صفحات میں ناظرین کو اسی گمنام صاحب کمال سے روشناس کرنا ہے۔

مختصر حالات: بشارت حسین نام، احقر تخلص، ضلع عظیم آباد پٹنہ کے ایک گاؤں بڑا ڈیہہ میں پیدا ہوئے، سال ولادت ۱۲۷۶ھ ہے، ان کے والد ماجد شیخ اکبر حسین اس قریہ کے ایک ممتاز متمول اور ذی عزت رئیس تھے، وہ وہیں پیدا ہوئے اور اپنی تمام زندگی وہیں گزار دی۔

احقر مرحوم کی ابتدائی تعلیم اسی گاؤں ہی میں ہوئی، فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں وہاں پڑھا کر ان کے والد نے تعلیم کی غرض سے ۱۲۸۸ھ میں ان کو پٹنہ بھیجا، مولوی خدابخش صاحب جو اس وقت کے ایک لائق عالم تھے، ان کی تعلیم کے لئے مقرر کئے گئے، کچھ عرصہ ان کے زیر تعلیم رہنے کے بعد وہ بہار چلے آئے اور یہیں متعدد علماء کے زیر سایہ علم کی خوشہ چینی کرتے رہے، بایں ہمہ ان میں عربی کی کوئی ایسی اچھی لیاقت نہ تھی، لیکن فارسی اچھی جانتے تھے۔

۱۲۹۵ھ میں ان نکاح قصبہ بہار شریف کے شیر پور محلّہ میں میر حیدر حسین صاحب کی چھوٹی صاحبزادی سے ہوا، اس کے بعد انھوں نے بڑا ڈیہہ چھوڑ کر محلّہ شیر پوری کی بود و باش اختیار کر لی۔

احقر مرحوم فطری شاعری تھے اور برجستہ کلام موزوں فرماتے، یوں تو بچپن ہی

سے ان کو شاعری کا شوق تھا لیکن اٹھارہ انیس برس کے سن میں ان کی شاعری اس زمانہ کے مشہور شعراء کے حلقہ میں عزت اور قدر کی نظر سے دیکھی جانے لگی تھی۔

لکھنؤ کا قیام: شاعری کے بڑھتے ہوئے ذوق نے ان کو بہار میں بیٹھنے نہ دیا، ۱۳۰۳ھ میں وہ لکھنؤ گئے، وہاں کی ادبی دلچسپیوں نے انھیں بہت محظوظ کیا، اور وہاں کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ اس سے وہ کسی طرح جدا نہیں ہونا چاہتے تھے، لیکن گھر کے تعلقات نے واپسی پر مجبور کیا، اور انھیں لکھنو چھوڑنا پڑا، لکھنو چھوڑنے کا جو صدمہ ان کے دل کو پہنچا وہ ان کی اس رباعی سے ظاہر ہے:

وہ عہدِ شباب وہ جوانی میری　　وہ بزمِ سخن وہ شعر خوانی میری
وہ اہل ہنر وہ لکھنو کے جلسے　　افسانۂ خواب ہے کہانی میری

ازلؔ لکھنوی سے تلمذ: لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں وہ ازل لکھنوی سے اصلاح لیا کرتے تھے، اور انھیں سے ان کا رشتہ تلمذ تھا، چنانچہ ایک شعر میں وہ اپنے لائق استاد پر اس طرح فخر کرتے ہیں،

سب جانتے ہیں احقر شاگرد ہوں ازلؔ کا استاد مانتے ہیں اردو زبان والے

احقر کا سلسلۂ تلمذ یہ ہے: احقرؔ۔ازلؔ، صباؔ، آتشؔ، مصحفیؔ،......

احقر مرحوم کو آتش کے اتباع کا بڑا شوق تھا، اور اس میں ان کو کد تھی، لکھتے ہیں:

آورد میں لذت خاک نہیں آمد کا مزا ہے اے احقرؔ
وہ چال نہ چل جو لوگ کہیں آتشؔ کے چلن کو چھوڑ دیا

دکن کا سفر: احقرؔ مرحوم ایک دفعہ حیدرآباد دکن بھی گئے، وہاں دربار میں بھی ان کو باریابی حاصل ہوئی اور قدرداں سخن کی نظروں میں وہ کافی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے گئے، ریاست میں ایک اچھی جگہ بھی دی گئی، لیکن کسی وجہ سے ناپسند کیا، اور وہاں سے چلے آئے، تاہم ان کو دکن کی یاد آتی رہی کہتے ہیں:

فرقت سے آپ کی ہمیں غربت وطن میں ہے
یاں کا لبد ہے، روح ہماری دکن میں ہے

کانپور میں قیام اور ترک شاعری: حیدرآباد سے واپس آنے کے بعد وہ زیادہ تر کانپور میں رہنے لگے، ان کے اسی زمانہ قیام میں مسجد کانپور کے شہید ہونے کا ہنگامہ برپا ہوا، جس میں بے گناہ مسلمانوں کی خونریزی اور قید و بند کے مناظر ان کی نگاہوں کے سامنے گزرے، ان کی اسلامی حمیت جوش میں آئی اور بلاخوف وخطر حکومت کے بے جا تشدد کے اظہار میں ستر (۷۰) بند کا ایک مسدس لکھ کر عام جلسہ میں سنایا، جس کا حاضرین پر بے حد اثر ہوا، آخر حکومت کی جانب سے وہ مسلسل ضبط کیا گیا اور ہمیشہ کے لئے وہ صفحہ ہستی سے مٹ گیا، اس مسدس کے لکھنے پر وہ بغاوت کے الزام میں گرفتار کئے گئے اور مقدمہ چلایا گیا، اس مقدمہ سے تو خیر کسی طرح رہائی ہوگئی، لیکن یہ حکم برقرار رہا کہ وہ آئندہ کسی جلسہ میں کوئی نظم نہ پڑھیں، احقرؔ مرحوم اس واقعہ کے بعد کانپور سے چلے آئے، اس کے بعد ہی ان کے نوجوان ہونہار صاحبزادہ ناظم مرحوم کا عالم شباب میں انتقال ہوگیا، اس حادثہ کا ان کے دل پر بڑا گہرا اثر ہوا اور آخر شاعری کے تفریحی مشاغل سے بالکل کنارہ کش ہوگئے، ان کی آخری غزل یہ ہے:

احقر سے جو پوچھا کیوں تم نے اب شغل سخن کو چھوڑ دیا
بولے کہ گیا جب موسم گل بلبل نے چمن کو چھوڑ دیا

سفرحج: احقر مرحوم نے اپنی زندگی میں دو بار حج کیا تھا، ایک مرتبہ کمسنی میں اپنے برادر معظم کے ساتھ اور دوسری مرتبہ جوانی میں چنانچہ اس رباعی میں اسی کی طرف اشارہ ہے:

کس جانہ تمھیں حضور ہم نے دیکھا　　ایمن گئے کوہ طور ہم نے دیکھا
لیکن نہ ملا پتہ یہ قسمت اپنی　　ڈھونڈھا تمھیں، دور دور ہم نے دیکھا

وفات: پچاس ساٹھ برس کی شاعری کے بعد بہتر (۷۲) برس کی عمر میں احقر مرحوم نے ۱۳۴۸ھ میں دسویں رمضان المبارک کو شہر پٹنہ محلّہ سلطان گنج میں انتقال کیا، اور وہیں سپرد خاک کئے گئے۔

کلام کا نمونہ:

چلے ہو گھر سے جو بن سنور کر بتاؤ صحبت کہاں رہیگی　　تو ہنس کے بولے تمھیں غرض کیا جہاں رہیگی وہاں رہیگی
بقا ہے ذات خدا کو تنہا فنا ہے ہر چیز کو جہاں میں　　نہ یہ رہیگی نہ وہ رہیگی وہی رہیگی جہاں رہیگی

بجا نہیں ہماری پیری میں فکرِ عقبیٰ　　تھکتے ہیں جب مسافر منزل کو ڈھونڈھتے ہیں
وحشت تو لے گئی تھی چنوانے خاک بن میں　　مٹی ہماری لائی پھر گھیر کر وطن میں
کھلنے نہ پائے پردہ مجھ زار و ناتواں کا　　یارو لپیٹ دینا اچھی طرح کفن میں

شیشۂ دل غیر کے لائق نہیں　　اس مرقع میں تری تصویر ہو
کثرتِ عصیاں نہیں وجہ نجات　　جرم بیحد ہوتو کیا تعزیر ہو

وصل میں تم کیا تمھاری ''ہائیں'' کیا　　آج موقع پر اجی ڈر جائیں کیا
عمر کافی بتکدہ میں بیٹھ کر　　اٹھکے اب پیری میں کعبہ جائیں کیا

جو ہر تو ہے پہ قدر گہر کب وطن میں ہے　　نے آبرو عقیق یمانی یمن میں ہے

دونوں کا حال ایک ہے اس گل کے ہجر میں　　پہلو میں دل ہے بلبلِ نالاں چمن میں ہے

پھنکا جاتا ہوں مثلِ طورول سینہ میں جلتا ہے　　یہ کس کے منھ سے کلمہ لن ترانی کا نکلتا ہے
نہ کہنا پھر کہ کیسا دل مرا بے چین کر ڈالا　　جگر کو تھام لو نالہ مرے منھ سے نکلتا ہے
طلب کرتے ہیں وقت نزع اے جان اس لیے تمکو　　کہ تم بھی دیکھ لو عاشق کا کیونکر دم نکلتا ہے
چلا جاتا ہے یہ کہہ کر مرے رونے پہ وہ ظالم　　یہ طفلِ اشک ہر ہر بات پر یوں ہی مچلتا ہے

ہوتا ہے آرزو سے فقط آدمی ذلیل　　حاصل ہو مدعا جو کوئی مدعا نہ ہو
لے تو چلے ہیں داب کے ہم بھی بغل میں دل　　دھڑکا ہے یہ پسند بھی ہو ان کو یا نہ ہو
قصہ فضول حجت و تکرار نا روا　　دل پھیر دیں حضور اگر کام کا نہ ہو
ہم جانتے ہیں لطف شبِ انتظار کا　　وعدہ بھی وہ کریں تو الٰہی وفا نہ ہو
پیش خدا بیان کریں سب بتوں کا حال　　روز جزا کسی کا اگر سامنا نہ ہو

کیوں نہ ہو سوز جگر اشک رواں سے زائل　　خاصیت آگ بجھانے کی ہے ہر پانی میں
مینھ برستے ہیں جو یاد آتا ہے وہ گل احقر　　اور ہوتے ہیں مرے داغِ جگر پانی میں

حرم کا زاھدوں کو دردسر ہو　　جبین میری ہو تیرا سنگ در ہو
ٹھرا ے موت جلدی کیا پڑی ہے　　مہیا کچھ تو سامانِ سفر ہو
بہت عاصی سہی رندِ سیہ کار　　مگر اے واعظو تم بھی بشر ہو
اٹھاؤ سر زرا آنکھیں ملاؤ　　اجی کھوئے ہوئے کیوں اسقدر ہو
ہمارے سامنے احقر تعلیٰ　　تمھیں ہم جانتے ہیں جس قدر ہو

حاصل اتنا تو ہوا خوگرِ حرماں ہوکر　　سختیاں ہم پہ گذرنے لگیں حرمان ہوکر
کیا ملا مائل حسن رخ خوباں ہوکر　　رہ گئے کوچۂ کاکل میں پریشان ہوکر
ان سے بھی اپنا شباب اب نہیں دیکھا جاتا　　آئینہ ہاتھ سے رکھ دیتے ہیں حیران ہوکر
سچ کہا حضرت منصور نے یا جھوٹ کہا　　آدمی دیکھ لے محور رخ جانان ہوکر
بندما دیر کو ترغیب حرم دیتے ہو　　واعظو شرک سکھاتے ہو مسلمان ہوکر
طعن ہم رندوں پر اے زاہد مغرور نکر　　ہوش رہتا نہیں مستِ مئے عرفان ہوکر
نفس امارہ کو کر زور سے زیر اے احقر　　مور ناچیز سے دبتا ہے سلیمان ہوکر

دلکی آشفتگی تو کیا جانے　　ایسی باتیں تری بلا جانے
دیکھ لے اسکو جسکا جی چاہے　　شرط یہ ہے کہ دیکھنا جانے
باوفا لوگ جانتے ہیں مجھے　　ارے او بے وفا تو کیا جانے

بے خبر ہو جو خانۂ دل سے　　کعبۂ و دیر کو وہ کیا جانے
قصہ زلف پوچھئے تو کہوں　　اور باتیں مری بلا جانے
نہ رہا لطف زندگی احقر　　اب میں جیتا ہوں کیوں خدا جانے

جو یہ کمسن سمندِ ناز کو مہمیز کرتے ہیں　　ہمیں پامال کیا کیا سبزۂ نوخیز کرتے ہیں
ہنسی آتی ہے ہم کو واہ رے بیماریٔ الفت　　مرض بڑھتا ہے اتنا جس قدر پرہیز کرتے ہیں
لگے آگ اس شفق کو رات گزری یار جاتا ہے　　ہم اب جام صبوحی اشک سے لبریز کرتے ہیں
قیامت ہے یہ سرمہ اور بھی ان خوش نگاہوں کا　　چٹا کر سنگ چھریوں کو یہ ظالم تیز کرتے ہیں
ثنائے ابروئے خمدار میں لکھتے ہیں شعر احقر　　طبیعت کند جب ہوتی ہے یوں ہم تیز کرتے ہیں

کلام پر رائے: احقر کے کلام کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، (۱) اردو غزلیات، (۲) رباعیات، (۳) واسوخت، (۴) فارسی کلام۔

غزلیات: ہمارے پرانے شاعروں کی طرح احقر کے کلام کا بھی بڑا ذخیرہ غزلیات پر مشتمل ہے، ان کے سوانح زندگی سے آشکارا ہے کہ وہ لکھنؤ کے دلدادہ تھے، وہ طرز شاعری میں بھی بالکل لکھنو کے پیرو اور مقلد تھے، زبان کی صحت کا خیال، محاورہ اور روزمرہ کا لحاظ، لفظی صناعی، مشکل ردیفوں میں سخن آرائی، سب کچھ لکھنؤ کے طرز پر ہے، تاہم میؔر کے طرز سخن کو بھی ہاتھ سے جانے دینا نہیں چاہتے اور غالبًا یہی ان کی بڑی خصوصیت ہے، ملاحظہ ہو،

احقر سے جو پوچھا کیوں تم نے اب شغل سخن کو چھوڑ دیا　　بولے کہ گیا جب موسم گل بلبل نے چمن کو چھوڑ دیا
دل پھنس کے کسی کی زلفوں میں کس طرح الٰہی چھوٹ گیا　　معلوم نہیں کیا پیچ پڑا کالے نے جو من کو چھوڑ دیا
آتے ہیں عجیب انداز سے وہ ڈالے ہوئے رخ پر بالوں کو　　زلفیں جو ہٹیں اک شور ہوا سورج نے گہن کو چھوڑ دیا
اب آنکھ کسی پر کیا ڈالیں نظروں میں کوئی جچتا ہی نہیں　　آنکھوں پہ ترے صدقہ کر کے جنگل میں ہرن کو چھوڑ دیا
چونکے نہ کسی دن خواب سے ہم غفلت میں بسر کی عمر اپنی　　اے وائے غضب کب آنکھ کھلی جب روح نے تن کو چھوڑ دیا
تھے آسرے جتنے ٹوٹ گئے یارانِ وطن سب چھوٹ گئے　　اے داد ئ غربت تو نے سنا کیوں ہم نے وطن کو چھوڑ دیا

آورد میں لذت خاک نہیں آمد کا مزا ہے اے احقر
وہ چال نہ چل جو لوگ کہیں آتش کے چلن کو چھوڑ دیا

احقر کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ گو ان کی شاعری کا زیادہ حصہ گل و بلبل کے افسانوں سے بھرا ہوا ہے، پھر بھی تصوف کے آب و نمک سے ان کی شاعری خالی نہیں،

یہ عشق کی ہے سرکار احقر غصہ بھی یہاں ہے پیار بھی ہے　　ہر زخم جگر کے پھائے میں کافور بھی ہے زنگار بھی ہے
کیا مٹی میں ملایا ہے تو نے کیا بات ہے اسمیں اے ساقی　　جو رند ہے اس میخانے کا مدہوش بھی ہے ہشیار بھی ہے

یہ راز کی باتیں ہیں اس کو سمجھے تو کوئی کیونکر سمجھے انسان ہے پتلا حیرت کا مجبور بھی ہے مختار بھی ہے

حیران ہیں تیرے مذہب سے سب گبر و مسلمان اے احقر

اے واہ رے تو سبحان اللہ تسبیح بھی ہے زنار بھی ہے

ایک شعر میں وحدت شہود کا مسئلہ بیان کیا ہے:

فقط نہ صنعت صانع مری نگاہ میں ہے

عیاں گلوں میں ہے کانٹوں میں ہے گیاہ میں ہے

دنیا کی بے ثباتی:

احقر مسافرانہ بسر کررہے ہیں ہم

دنیا میں کیا لگائیں دل اپنا ، سراتو ہے

جناب داغؔ آسمان کو اس طرح دھمکاتے ہیں:

کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں

اگر نہ آگ لگا دوں تو داغؔ نام نہیں

اسی مضمون کو حضرت احقر اس طرح ادا کرتے ہیں:

چار نالوں میں ابھی ڈھادوں تجھے

اے فلک تیری بھی کچھ بنیاد ہے

جناب جلیل اپنی توبہ شکنی کا سبب کالی گھٹا کو ٹھہرا کر خود کو بے قصور ثابت کرنے کی اس طرح کوشش کرتے ہیں،

توبہ تو کرچکا تو مگر کیا کہوں جلیل

کالی گھٹا کو دیکھ کے نیت بدل گئی

مگر اس احقر شاعر کو بھی دیکھئے کہ وہ اپنی توبہ شکنی کا عذر کس طرح پیش کرتا ہے:

توبہ تو کی تھی واعظا تجھ سے مگر کہوں میں کیا

آج ذرا سی پی گیا ابر بہار دیکھ کر

حضرت امیر نے ایک شعر میں اپنی نازک دماغی اس طرح دکھائی ہے:

دوزخ مجھے قبول ہے اے منکر و نکیر

لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا

لیکن احقر بھی کچھ کم بد دماغ نہیں وہ اپنے سنگدل معشوق کے فیصلہ پر رضامندی ظاہر کرتے ہیں، لیکن سوال و جواب اور بحث کرنے کے لئے تیار نہیں:

اس بت سے کون بحث حضور خدا کرے

احقر اسی پہ چھوڑ دو جو فیصلہ کرے

بیگانگی خلق سے تنگ آکر غالبؔ نے اپنے کو اس طرح سمجھایا ہے:

بیگانگی خلق سے بیدل نہ ہو غالبؔ

کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

لیکن احقر بیگانگی خلق کی پرواہی نہیں کرتا، اگر کوئی اس سے بے وفائی کرتا ہے تو یہ بجائے رنجیدہ خاطر ہونے کے خود بھی منھ پھر لیتا ہے:

دنیا نے مجھ سے پھیر لی آنکھیں تو کیا ہوا

کچھ غم نہیں ہے کوئی نہیں ہے تو خدا تو ہے

''عشق بتاں'' سے پچھتا کر جناب مومن اپنی شرمندگی اور ندامت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومنؔ

آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

لیکن ذرا احقر کی شرمندگی کو دیکھئے:

خدا کے سامنے ہم جائیں کیونکر

بتوں پر عمر بھر شیدا رہے ہیں

جناب مومنؔ کے شعر میں افسوس کے ساتھ غصہ بھی ملا ہوا ہے، لیکن احقر کے اس شعر میں ایسی عاجزی ندامت، پیاس اور حسرت پائی جاتی ہے کہ انسان پڑھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

غالب کا ایک بہت مشہور شعر ہے:

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش اشک سے

بیٹھے ہیں ہم تہیہ طوفان کئے ہوئے

احقر کے طوفانِ آب کا منظر یہ ہے:

رو رو کے ہجریار میں طوفان اٹھاؤں گا

بیٹھا ہوں آج ساتھ لئے چشم تر کو میں

جناب ریاض کا شعر ہے:

بڑے صاف ظاہر بڑے پاک باطن

ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

ہمیں کوئی کلام نہیں کہ شعر اپنی سادگی برجستگی اور طرز بیان کے اعتبار سے آپ اپنی نظیر ہے، احقر کا شعر بھی اس سے کم نہیں،

ہمارے سامنے احقرؔ تعلّی

تمھیں ہم جانتے ہیں جس قدر ہو

واعظوں اور شاعروں میں ہمیشہ سے لاگ چلی آتی ہے، لیکن احقر کے طرز بیان میں کچھ ایسی لذت ہے کہ ان کی مذمت میں تلخی نہیں پائی جاتی:

دیکھو احقر سے نہ الجھو واعظو

تم ہو دیوانے تو یہ مجذوب ہے

دوسری جگہ غریب زاہد کو باتوں باتوں میں کیسا لیا ہے:

زاہد سے اور تجھ سے احقر ملاپ کیسا
کیسی ذلیل تیری اوقات ہوگئی ہے

رعایت لفظی جو فن شاعری میں ایک قابل قدر چیز سمجھی جاتی ہے، احقر کے یہاں بھی کثرت سے ملتی ہے، چنانچہ ان کی ایک غزل ''صنعت مرصع'' میں ہے:

مجھ کو فگار دیکھ کر حالت زار دیکھ کر — رودیا یار دیکھ کر، آگیا پیار دیکھ کر
ہجر کی رات الامان ظلمت گورتھی عیاں — قبر کا پھر گیا سماں یہ شب تار دیکھ کر
میں ہوں بلا کا سخت جان آپکی نازکی عیان — دوہری نہ ہوں کلائیاں، کیجئے وار دیکھ کر
توبہ تو کی تھی واعظا، تجھ سے مگر کہوں میں کیا — آج ذری سی پی گیا، ابر بہار دیکھ کر

احقر مرحوم شعرائے لکھنؤ کی پیروی میں سخت زمین میں اکثر غزل کہتے اور اس بارے میں ان کو کسی حد تک اصرار معلوم ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر غزلیں سنگلاخ زمینوں میں ملیں گی، مشکل ردیفوں کو نباہنا ان کا خاص کمال ہے، ''دھوپ'' پر ان کی طبع آزمائی ملاحظہ ہو، حق یہ ہے کہ خوب نباہا ہے اور یہ نہ صرف کوہ کندن وکاہ برآوردن ہے، بلکہ اس غزل کے بعض بعض شعر اپنی بلندی خیال اور جدت مضمون کے لحاظ سے قابل داد ہیں:

کب دشمن رندان قدح نوش ہوئی دھوپ — جب آئی گھٹا جھوم کے روپوش ہوئی دھوپ
ٹھہرا نہ کوئی عکس رخ یار کے آگے — خورشید چھپا شرم سے، روپوش ہوئی دھوپ
اے ابر کرم یاد جو آئی تری رحمت — میدان قیامت کی فراموش ہوئی دھوپ
وہ آئے دمِ صبح، لبِ بام، چھپا مہر — دن بھر کے بکھیڑوں سے سبکدوش ہوئی دھوپ

پیری میں نہیں جامِ صبوحی کا مزا کچھ
احقؔر سبب توبہ مئے نوش ہوئی دھوپ

روزانہ کی بول چال میں شعر کہنا جتنا دشوار ہے، اتنا ہی شاعری کا کمال بھی ہے اور جناب احقر کی خصوصیات کلام میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے، وہ یقیناً روزمرہ کا استعمال ہے، وہ شعر اس طرح لکھتے ہیں، جیسے کوئی شخص گفتگو کررہا ہو، یہاں ان کے کلام سے چند غزلیں پیش کی جاتی ہیں:

مئے سے انکار کوئی بات ہے یہ — پیجئے پیجئے برسات ہے یہ
شوق سے لیجئے دل حاضر ہے — آپ سے عذر کوئی بات ہے یہ
بھیجئے خلد میں یا دوزخ میں — آپ راضی ہوں بڑی بات ہے یہ
ہوسِ خلد ہے طاعتِ زاہد — بات بس قبلہ حاجات ہے یہ

ایک دل ہے مانگنے والے ہزار — کسی مصیبت میں ہماری جان ہے
یہ نصیحت اور یہ عہدِ شباب — تو بھی اے ناصح بڑا نادان ہے
دیکھ لو بیمارِ غم کو دیکھ لو — کوئی دن کا اور یہ مہمان ہے

بخشدو احقؔر کو اے بندہ نواز
ہوگئی اس سے خطا، انسان ہے

گالیاں سن کے چپ رہوں کب تک — میرے منھ میں زبان ہے کہ نہیں
خانۂ دل میں کیوں نہیں آتے — یہ تمھارا مکان ہے کہ نہیں
ہو کرم غیر پر مرے آگے — یہ ستم مہربان ہے کہ نہیں
ان بتوں کو خدا سے کیا نسبت — وہ یقین یہ گمان ہے کہ نہیں

لکھنو کے ذوقؔ اور میرؔ صاحب کے میخانہ کی جرعہ نوشی ملاحظہ ہو:

کچھ بات ہی ایسی ہے جس سے دم بھر بھی اسے آرام نہیں — اب حال تو یہ ہے احقر کا گر صبح رہا تو شام نہیں
کر طعن نہ مجھ پر اے واعظ ناداں یہ اچھا کام نہیں — پہنچے گی کبھی تو آہ مری کچھ عرش بتوں کا نام نہیں
دل خانۂ شادی تھا میرا آباد تھی اک دن یہ بستی — اب دیکھتے کیا ہو سینہ کو اس گھر میں خوشی کا نام نہیں
قربان کروں کیا چیز یہ ہو دل جو پسند اے جاں تمھیں — مفلس کا سمجھ لو مال اس کو کیا، دام اس کا کچھ دام نہیں
ہیں عاشق زلف روئے صنم بس عشق ہمارا مذہب ہے — اب رہتے ہیں ہم جس منزل میں وان کفر نہیں اسلام نہیں
یہ کافر و مومن دیر و حرم اسرار ہیں اس کی حکمت کے — جو واقف ہے وہ واقف ہے، ہیں خاص یہ باتیں عام نہیں
آتی ہیں صدائیں کانوں میں دن رات یہی کہتا ہے کوئی — چلنے کے لئے تیار رہو ہونے کا یہاں کچھ کام نہیں
گھبرائے جو بندے محشر میں رحمت نے صدائیں دیں بڑھکر — لکھے سے ملا کر دیکھا ہے تم لوگوں پر کچھ الزام نہیں
پوچھے جو کوئی احوال مرا کچھ بیچ کی حالت کہہ گزروں — ایسا ہی فسانہ ہے جسکا آغاز نہیں انجام نہیں
کیا دور ہے کیسی گردش ہے اے چرخ کہن یہ بدعت نو — اغیار کو بخشے خم ساقی یاروں کے لئے اک جام نہیں
اے چرخ ستمگر خوب ہمیں رسوائے زمانہ تو کرلے — ہم عشق کے بندے ہیں ہم کو اندیشۂ ننگ و نام نہیں

دن آگئے مرنے کے لیکن دل میں ہے ہوسنا کی ابتک
اندھیر یہ کیسا ہے، احقر کچھ فکر چراغ شام نہیں

رباعیات: احقر نے رباعیان بھی بہت کم کہی ہیں، سب کو معلوم ہے کہ رباعی کا کمال یہ ہے کہ چار مصرعوں کے کوزے میں، وسیع و عمیق معانی کا دریا بند کردیا جائے اور طرز اور ایسا ہو کہ سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔

اخلاص عمل کے متعلق اکثر شعرا نے بہت کچھ کہا ہے، اور بہت خوب کہا ہے، لیکن احقر کا انداز ملاحظہ ہو:

یوں لاکھ زبان پر ہو جاری توبہ — ہو کام تو کام کی ہے ساری توبہ
اخلاص اگر نہیں تو طاعت بے سود — بگڑی کو بنائے کیا ہماری توبہ

اختلاف مذاہب کی صوفیانہ حقیقت یوں واضح کرتے ہیں:

گیسو تیرے ہیں روئے زیبا تیرا   کعبہ تیرا صنم، کلیسا تیرا
کچھ مومن و برہمن جو سوچیں احقرؔ   ہوجائے دلوں سے دور میرا تیرا

جوانی دیوانی کس کی نہیں ہوتی، اس وادی سے احقر بھی گزرے تھے، شباب نے جہاں گم کردہ راہ کیا تھا، پیری نے وامانده راه کردیا ہے، لیکن جوانی کی یاد اس عہد میں بھی جوش و ولولہ سے خالی نہیں، کس مزہ سے کہتے ہیں، سب کچھ کہہ دیا اور کچھ نہیں کہا،

احقر عہد شباب توبہ توبہ   وہ ضبط وہ اضطراب، توبہ توبہ
کچھ ہم سے نہ پوچھئے جوانی کا حال   توبہ توبہ جناب توبہ توبہ

ان سیہ کاریوں کے بعد طلب مغفرت بھی شعراء کا عام مضمون ہے، احقر کی طلب عفو کا رنگ یہ ہے،

احقر اف رے سیاہ کاری تیری   بے جا نہیں یار بے قراری تیری
ہو طالبِ عفو دیکھ مایوس نہ ہو   سن لے شاید جناب باری تیری

ایک رباعی میں اپنے خالق سے تقسیم وتقدیر کا گلہ اس پیرایہ میں کرتے ہیں:

گل رویوں کو عیش باغ بخشا تو نے   مجھ کو دلِ داغ داغ بخشا تو نے
کیا ضد تھی کہ پھونکنے کو گھر بار مرا   جلتا ہوا اک چراغ بخشا تو نے

شراب رباعیات کا خاص مضمون ہے، احقر کے میخانہ سخن میں دیکھئے کہ یہ شراب کس کس رنگ میں آتی ہے:

کیونکر رہے غم سے میرا سینہ خالی   گھنگور گھٹا ہو اور مینا خالی
ساقی اک جام، میکدہ کا صدقہ   برسات کا جاتا ہے مہینا خالی

لا مجھ کو شرابِ ناب ساقی دیدے   اس ابر میں آفتاب ساقی دیدے
کل روز حساب خیر دیدینگے حساب   لے آج تو بے حساب ساقی دیدے

عاشقانہ رنگ کی رباعیوں کا اندازہ یہ ہے:

ہے ہے اسی درد سر نے مارا مجھ کو   کافر تری نظر نے مارا مجھ کو
موت آگئی عشق زلف ورخ میں احقرؔ   آخر شام و سحر نے مارا مجھ کو

اپنے محبوب کے زلف ورخ کو شام وسحر سے تشبیہ دینا مشہور عام ہے، لیکن اس شام وسحر کی تشبیہ اور ابہام سے موت کا ثبوت بہم پہنچانا شاعرانہ جدت ہے۔

شاعری کی ایک مقبول صنف منظرکشی بھی ہے، احقر کے کلام میں اس کی مثالیں کم ملتی ہیں، تاہم ایک رباعی میں موسم بہار کا منظر کس دلکش طریقہ سے کھینچا ہے:

کیا بن کے نئی دلہن بہار آئی ہے   پھولوں کا گلے میں دیکے ہار آئی ہے
غنچے کیا کیا چٹک رہے ہیں احقر   جوبن پہ صبا جو ہاتھ مارا آئی ہے

شراب کے متعلق ان کی ایک رباعی ہے اور واقعی خوب ہے اور کیا عجب کہ یہ وہی رباعی ہو جس کو کہ انھوں نے حیدرآباد کے کسی بزم مشاعرہ میں پڑھ کر حضرت برترؔ جیسے ممتاز شاعر سے خراج تحسین وصول کیا تھا، رباعی یہ ہے:

کیا بزم میں بے حجاب آئی ہے   بدلی ہے تو بن کے آفتاب آئی ہے
انگور میں چھپ رہی تھی ظالم جاکر   اب کہ کھنچکے میرے سامنے شراب آئی ہے

یورشین واسوخت: ان کے کلام میں ایک چیز جو آج سے پچیس سال قبل یقیناً بڑی انوکھی ہوگی، ''یوریشن واسوخت'' ہے، جس میں اردو زبان میں انگریزی الفاظ کھپائے ہیں، احقر جیسے پیرانہ سال اور کہنہ خیال شاعر کے لئے نظم میں انگریزی کے پورے پورے لفظ کو اس بے تکلفی اور استادی سے کھپا دینا کہ انگریزی اور اردو کے اندر کوئی فرق نہ معلوم ہو، اعجاز ہے، شاعر نے ہر ایک شعر میں انگریزی کے ایک دو لفظ کو ایسے عمدہ موقع اور محل پر استعمال کیا ہے کہ اس سے شاعر کے متعلق بجا طور پر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ نہ صرف فن شاعری کا ایک باکمال استاد ہے بلکہ انگریزی زبان پر بھی قدرتِ تام رکھتا ہے، اس واسوخت کے سلسلہ میں ایک دلچسپ نقل بیان کی جاتی ہے، ایک روز احقر کے ایک گریجویٹ دوست ملنے آئے، سلسلۂ گفتگو میں انگریزی کا کوئی لفظ احقر کے صحیح ادا نہ کرنے پر ان کے ایک دوست کو ہنسی آگئی، احقر کو اس کا بڑا صدمہ ہوا، اور اسی وقت سے انگریزی پڑھنی شروع کردی، اور تھوڑے ہی عرصہ میں انگریزی زبان پر کامل عبور حاصل کرلیا، یہ یورشین واسوخت ان کی اسی کوشش کا ایک کرشمہ ہے، یہاں اس کے تین شعر نقل کئے جاتے ہیں:

نیم سے عشق کے میں تو کبھی آگاہ نہ تھی   خبر شادی و سورو مجھے واللہ نہ تھی
لو ہے کیا چیز، فلشن کسے کہتے ہیں بشر   بلوڈ ورڈ ہے کیا، کہتے ہیں کس شی کو لور
سرپرائز مجھے اس بات کا ہے حد سے سوا   ایک ہی لُک میں مراہاٹ پہ پاور نہ رہا

فارسی کلام: ان کے فارسی کے کلام کا بہت کم ذخیرہ ہے، مگر جو کچھ ہے اس سے ان کی فارسی پر قادرالکلامی کا پتہ چلتا ہے، یہاں ان کی صرف ایک فارسی نعت بدیہ ناظرین ہے:

اے اول پیشینیاں اے آخرِ پیغمبران   ہستی عجب سرّ نہاں گاہے چنین گاہے چنان
صدجان چرمن قربان ترا روحی فداک اے خوش ادا   نازیست این بامعجزه دل می بری از بیدلان
محمود احمد نام تو عرش معلیٰ بامِ تو   مستیم ما از جامِ تواے ساقیِ کوثر نشان
درجسم چون جان آمدی بادرد و درمان آمدی   خورشید تابان آمدی کردی زمین آسمان
آکے المناکم کنی از رانج وغم پاکم کنی   سربستہ فتراکم کنی اے شہسوار لامکان
خورشید اذ دویت خجل مویت کمندہ مرغِ دل   خویت بہ قرآن متصل، اے پیشوائے مرسلان
توجان پاکان آمدی محبوبِ سبحان آمدی   باعہد و پیمان آمدی پشت و پناہ امتان

اے احقر اندوہگین، تاچند باشی این چنین
یا صبرکن ازنازنین، یا جان بدہ برآستان

(نومبر۱۹۳۱ء)

۱؎ امید ہے کہ یہ پورشین واسوخت جواس وقت تک غیر مطبوعہ ہے عنقریب ان کے مجموعہ کلام کے ساتھ شائع ہوکر ہدیہ ناظرین ہو۔

رحیم بخش، سر، مولوی حاجی

مولوی حاجی سر رحیم بخش مرحوم

مولوی حاجی سر رحیم بخش مرحوم نے اس مہینہ ۴/مئی ۱۹۳۵ء کو اسّی برس کے قریب عمر پاکر اپنے وطن ٹھسکہ میرانجی ضلع کرنال میں وفات پائی، انہوں نے اسکول کے ایک معمولی مدرس عربی و فارسی کی حیثیت سے ملازمت شروع کی اور ترقی کرکے چیفس کالج لاہور کے بورڈنگ کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے، یہیں موجودہ ہزہائنس نواب صاحب بھاول پور کے والد مرحوم زیرتعلیم تھے اور ان کی نگرانی میں تھے، ممدوح الشان جب مسندنشین ہوئے تو اپنے لائق اتالیق کی دیانت ومحنت و جفاکشی کو دیکھ کر اپنی سرکار میں ایک اعلیٰ عہدہ پر رکھ لیا، یہاں بھی انہوں نے خوبی سے کام انجام دیا، جس کی وجہ سے سرکار برطانیہ اور سرکار بھاول پور دونوں کو ان پر برابر کا اعتبار ہوگیا، اس لئے نواب ممدوح کی وفات اور نواب حال کی نابالغی میں وہ مجلس نیابت کے صدر مقرر ہوئے اور بڑی عزت و ہردلعزیزی حاصل کی، اس کے بعد ریاست سے پنشن پائی اور قومی وملکی کاموں میں مصروف رہنے لگے۔

غربت سے امارت اور معمولی درجہ سے اعلیٰ رتبہ تک ترقی کی مثالیں دنیا میں کم نہیں، لیکن ایسی مثالیں کہ ادنی سے اعلیٰ مرتبہ تک پہنچنے کے بعد بھی اس کو اپنی پہلی حالت فراموش نہ ہو اور اس نعمت کے شکرانے میں دینی وقومی خدمات میں انہماکِ زندگی کا فرض قرار پاجائے، بہت کم ہیں، مرحوم کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی، ندوۃ العلماء کے بھاول پور میں جو کامیابی ہوئی، وہ تمامتر مرحوم ہی کے اخلاص کا نتیجہ تھی، ندوۃ العلماء کو ارکان نے ان کی ان خدمات کی قدر پہچان کر ان کو سرپرست وحامی ندوۃ العلماء کا منصب دیا تھا، اخیر زمانہ میں انہوں نے تبلیغی کاموں میں دلچسپی لی اور اپنی دولت کا اچھا خاصہ حصہ نیک کاموں میں خرچ کیا ان کی زندگی سادہ تھی اور ہمیشہ سادہ رہی، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے مرید تھے، اس لئے وہ علماء دیوبند کا بھی ادب کرتے تھے، مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کے ممبر بھی تھے، اس لئے وہاں بھی ان کو خدمت کا موقع ملا دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال حسنہ کو قبول فرما کر ان کو اپنی مغفرت کی عزت سے نوازے۔

(''س''، جون ۱۹۳۵ء)

پھلواروی، سلیمان قادری چشتی، مولانا شاہ

شاہ سلیمان صاحب پھلواروی

ہندوستان کے مشہور پرانے عالم و واعظ وخطیب مولانا شاہ سلمان صاحب قادری چشتی پھلواروی نے جن کے نغموں نے ہمارے ملک کے پورے طول وعرض کو کم ازکم نصف صدی تک پرشور رکھا تھا، وفات پائی، ۲۷/صفر ۱۳۵۴ھ کی تاریخ جمعہ کے دن اور صبح ۷ بجے کا وقت تھا کہ یہ طوطیِ خوشنوا ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا، پھلواری صوبہ بہار میں عظیم آباد پٹنہ سے ملحق ایک مردم خیز مشہور قصبہ ہے جہاں ڈیڑھ سو برس کے عرصہ میں بہت سے باکمال، اہل علم، علماء، صلحاء، مشائخ اور شعراء پیدا ہوئے، مرحوم بھی یہیں کے رہنے والے اور یہاں کے بزرگوں کے مستند ومعتبر خانوادہ کے چشم و چراغ تھے، ستھتر، اٹھتر برس کی عمر پائی، غالباً ۱۲۷۶ھ میں پیدا ہوئے۔

مرحوم کی جوانی کے عہد میں تین باکمالوں کے درس کی مسندیں ہندوستان میں بچھی تھیں، فرنگی محل لکھنؤ میں مولانا عبدالحئی صاحب، سہارنپور میں مولانا احمد علی صاحب اور دلّی میں مولانا سید نذیر حسین صاحب کی، شاہ صاحب مرحوم نے فیض کے ان تینوں سرچشموں سے فائدہ اٹھایا، پہلے فرنگی محل آئے اور یہاں سے فارغ ہوکر سہارنپور اور دہلی گئے، دلّی کے قیام کا زمانہ جس کو ان کی تعلیم کا آخری عہد کہنا چاہئے، ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۰ء ہے۔

لکھنؤ کے قیام میں درسیات کوختم کرنے کے بعد انہوں نے طب پڑھی اور اسی طبیب کی حیثیت سے انہوں نے دنیا میں اپنی زندگی کا آغاز کیا، چنانچہ شروع میں حکیم محمد سلیمان کہلائے اور اسی کا اثر تھا کہ شاعری میں جس کا چسکا ان کو بچپن سے تھا اور لکھنؤ کی صحبت میں جس کا چٹخارہ اور بڑھ گیا تھا، اپنا تخلص حاذقؔ رکھا تھا، وہ زیادہ تر اردو اور عربی میں کمتر فارسی میں شعر کہتے تھے، غزلیں بھی کہتے تھے اور لکھنؤ کے مشاعروں میں پڑھتے بھی تھے، صوبہ بہار کے مشہور عالم شاعر شوق نیموی ان کے ہم درس و ہم صحبت و ہم استاد تھے، شاہ صاحب مرحوم کی زبان سے ان کے اس عہد کے ایک دوشعر سنے تھے۔

اس عہد کے نوجوان علماء نے جو زمانہ انقلاب سے متاثر اور قوم وملت کی تباہ حالی کے درد سے بے تاب ہوکر روشِ زمانہ کے مطابق کچھ کام کرنا چاہتے تھے، ندوۃ العلماء کے نام سے پہلے کانپور میں اور پھر لکھنؤ میں ایک انجمن کی بنیاد ڈالی، مولانا سید محمد علی صاحب، مولانا شبلی صاحب، مولانا عبدالحق صاحب حقانی، مولانا سید ظہور الاسلام صاحب فتح پوری، مولانا ابراہیم صاحب آروی، مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی وغیرہ اس جماعت کے ممتاز ارکان تھے، اسی انجمن کا پلیٹ فارم تھا جس میں شاہ صاحب مرحوم کی خطیبانہ قوت بیان وتسخیر قلوب کا شہرہ عام ہوا، ندوۃ العلماء کا کانپور

سے لکھنؤ آنا اور وہاں دارالعلوم کی بنیاد پڑنا بھی شاہ صاحب ہی کی تحریک و تجویز کا نتیجہ ہے، ورنہ وہ کھینچ کر کب کا دہلی پہنچا ہوتا۔

ندوہ کی مجلسوں سے مرحوم کی خوش بیانیوں کی داستان اڑ کر ملک کی انجمنوں اور مجلسوں اور کانفرنسوں میں عام ہوئی، سرسید مرحوم نے شاہ صاحب مرحوم کی وہ تقریر جو انہوں نے ندوہ کے ایک سالانہ جلسہ میں کی تھی، اپنے اخبار میں شاہ سلیمان کا ''نیچریانہ وعظ'' کی سرخی سے چھاپی، سرسید کے بعد نواب محسن الملک مرحوم نے ان کو اپنی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں جو ان دنوں تعلیم یافتہ مسلمانوں کا واحد مجلسی مرکز تھا کھینچا، مرحوم کی خوش بیانی نے ان ''نیچری مسلمانوں'' کو بھی مسحور کیا، رنگون وغیرہ نواب صاحب کے ساتھ شاہ صاحب بھی کانفرنس کے کاموں میں شریک تھے اور صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے زمانہ تک شریک رہے۔

مرحوم وسیع النظر عالم، بذلہ سنج ادیب، خوش بیان خطیب، پراثر واعظ، موقع شناس مقرر اور بڑے بڑے بزرگوں کے حلقہ سے فیضیاب صوفی تھے، ان کو تاریخ کا شوق اور عربی نظم ونثر کا اچھا ذوق تھا، اچھے کتب خانوں اور کتابوں کی تلاش رہتی تھی اور اس حیثیت سے وہ اپنے ہمعصروں میں پورا امتیاز رکھتے تھے۔

وہ مذہب کے لحاظ سے وسیع المشرب تھے، وہ سب کچھ تھے اور سب کے ساتھ تھے:

باما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد

تاہم دو باتوں میں وہ نہایت سخت تھے، ایک تو اعتزال کے خیالوں سے بہت برہم ہوتے تھے اور دوسرے حضرت علی مرتضیٰ اور اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کی محبت و تعظیم میں بے حد غلو فرماتے تھے اور اس راہ میں جب جوش میں آتے تھے، تو بڑوں بڑوں پر ہاتھ صاف کردیتے تھے۔ اس قسم کے ان کے دوستانہ مناظروں کے کئی منظر میں نے اپنی طالب علمی میں دیکھے ہیں۔

ان کا خاندان صوفیہ کا مجمع تھا، تصوف کی گودوں میں پیدا ہوئے، پرورش پائی اور پروان چڑھے اور عمر بھر اسی رنگ میں رہے اور یہی رنگ ان پر غالب تھا، قادری بھی تھے اور چشتی بھی تھے، جہاں اپنے گھر سے فیض پایا تھا، حاجی شاہ امداد اللہ صاحبؒ سے بھی نسبت رکھتے تھے، پنجاب، مدارس، شمالی بہار اور صوبہ متحدہ میں ان کے مریدوں کی بڑی تعداد تھی۔

ان کے وعظوں میں عجب اثر تھا، کبھی رلاتے اور کبھی ہنساتے تھے ان کے سنجیدہ چٹکلے اور ظریفانہ نکتے لوگوں کو بے حد محظوظ کرتے تھے، ان کی آواز بہت بلند، سریلی اور مؤثر تھی، ان کا لحن نہایت دل پذیر تھا، مثنوی خاص انداز سے پڑھتے تھے کہ سننے والے جھوم جھوم جاتے تھے، ان کے وعظوں سے ہر خیال اور ہر قماش کے لوگ یکساں دلچسپی رکھتے تھے، جاہل، عالم، مولوی مشائخ دڑھ منڈے اور بزرگ ریش، نئے پرانے تعلیم یافتہ اور اہل علم سب لذت اندوز ہوتے تھے۔

میرے ساتھ مرحوم کے گوناگوں تعلقات تھے، مجھے اپنے عزیز سے کم نہیں سمجھتے تھے میرے والد مرحوم ان کے ہم پیر اور ان کے خسر کے مسترشد تھے، میرے بھائی مرحوم طب میں ان کے شاگرد تھے، میں نے بچپن میں پھلواری کے قیام کے زمانہ میں ان سے ابتدائی منطق کے دو چار سبق پڑھے تھے، وہ جب ۱۹۰۲ء میں ندوہ کے معتمد تعلیمات منتخب ہوئے تھے اور مستقل قیام ندوہ میں اختیار فرمایا تھا تو ان کی بزرگانہ عنایات اور حوصلہ افزائیوں نے میری علمی ترقیوں میں مدد دی، یاد ہے کہ اسی زمانہ میں نواب محسن الملک مرحوم دارالعلوم ندوہ کے معائنہ کے لئے تشریف لائے تھے، شاہ صاحب نے مجھے اور میرے ہم درس مولانا ظہور احمد صاحب وحشی شاہ جہاں پوری کو امتحاناً پیش فرمایا تھا، میں نے نواب صاحب کے خیر مقدم میں عربی میں ایک قصیدہ لکھا تھا، شاہ صاحب نے یہ کہہ کر مجھے پیش کیا کہ یہ میرے عزیز ہیں اور آپ کو قصیدہ سنائیں گے، نواب صاحب نے مزاحاً فرمایا کہ یہ جب آپ کے عزیز ہیں تو میں ان کا امتحان نہیں لوں گا کہ امتحان سے پہلے ہی ان پر ایمان لاچکا، شاہ صاحب نے فرمایا یہ میرے ہم نام بھی ہیں، نواب صاحب نے فرمایا تو اور ابھی یہ امتحان سے بالاتر ہیں۔

میں نے اپنا قصیدہ پڑھا، جو افسوس ہے کہ اب موجود نہیں تو نواب صاحب نے فرمایا کہ میں تو اس پرانی ادب دانی کا قائل نہیں، عرب کا کوئی اخبار منگوا لیجئے اس کو یہ پڑھیں، تو البتہ، اس زمانہ میں اللواء اور المؤید عربی کے مشہور اخبار تھے، وہ منگوائے گئے اور میں نے ان کو پڑھا اور صحیح ترجمہ کیا، تو بے حد خوش ہوئے، شاہ صاحب بھی بے حد محظوظ ہوئے اور اس زمانہ کے اخبارات وکیل، وطن اور کرزن گزٹ میں نواب صاحب کے اس معائنہ کی جو کیفیت چھپوائی، اس میں میرا ذکر خاص طور سے فرمایا، یہ اخبارات میں میرا پہلا ذکر تھا ان کی اس تحریر میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ ''ملک وملت کی خدمت کے لئے انشاء اللہ صوبہ بہار ہر دور میں ایک سلیمان پیش کرتا رہے گا''، رحمہ اللہ۔

بات میں بات یاد آتی ہے، ندوہ کے ایک جلسہ میں جو لکھنؤ میں غالباً ۱۹۱۵ء میں تھا چار سلیمان جمع ہوگئے تھے، قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری مصنف رحمۃ للعالمین، مولانا سلیمان اشرف صاحب بہاری (استاد دینیات مسلم یونیورسٹی) مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی اور خاکسار سلیمان، شاہ صاحب نے فرمایا کہ آج کل کئی کئی سلیمان پیدا ہوگئے ہیں، لیکن ان میں سلیمان بن داؤد میں ہوں،

پریاں نئی نئی ہیں سلیمان نئے نئے

(شاہ صاحب کے والد ماجد مرحوم کا نام داؤد تھا اور اسی لئے ان کی مہر میں وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ [النمل: ۱۶] کندہ تھا) مجمع بے اختیار ہنس پڑا۔

پھر فرمایا ''پہلے سلیمان فرد تھا اور اب رباعی ہے، چار چار سلیمان یکجا ہیں''۔

افسوس کہ یہ رباعی قاضی سلیمان کی وفات سے چند سال گزرے کہ مثلث بن چکی تھی اور اب ے/صفر کو قطعہ ہوگئی، اب اس رباعی کے صرف دو مصرعے باقی ہیں، خدا جانے یہ بھی کب اس صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ جائیں، وَاللّٰہُ ھُوَالْبَاقِی۔

شاہ صاحب کے چٹکلے اور تقریری دل آویز نکتے اس قدر ہیں کہ ان کو جمع کریں تو رسالہ بن جائے، رنگون میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ تھا، مولوی نے کانفرنس والوں پر کفر کا فتویٰ لگایا تھا، شاہ صاحب بھی نواب محسن الملک مرحوم کے ساتھ اس جلسہ میں گئے تھے۔تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو فرمایا یہاں کے مولویوں نے اہل کانفرنس پر کفر کا فتویٰ لگایا ہے۔جس میں شاید میں بھی داخل ہوں، مگر غور تو کیجئے کہ نواب محسن الملک تو مہدی ہیں (نام مہدی علی تھا) ان کو کون مسلمان دجال کہے گا اور مجھ پر تو کفر کا فتویٰ لگ ہی نہیں سکتا کہ خود اللہ تعالیٰ کی شہادت ہے کہ وَمَا کَفَرَ سُلَیْمَانُ وَلٰکِنَّ الشَّیٰطِیْنَ کَفَرُوْا [البقرۃ:۱۰۲] (سُلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا، بلکہ شیطانوں نے کفر کیا) مجمع ان نکتوں سے بے حد محظوظ ہوا اور مولویوں کی فتویٰ گری کا بادل شاہ صاحب کے ان دو چٹکلوں سے ہوا ہوگیا۔

پورے پچاس برس تک ہندوستان کا گوشہ گوشہ ان کے پر کیف و پر اثر خطبوں سے معمور رہا ہے، جس جلسہ میں وہ ہوتے تھے، ان کے سوا ہر آواز ماند پڑ جاتی تھی، جلسہ کے اہم موقعوں پر ان کی طوطی گفتاری بڑی بڑی پیچیدگیوں کو حل کر دیتی تھی، شاید ۱۹۰۰ء میں ندوہ کا عظیم الشان اجلاس پٹنہ میں تھا، شرکاء میں ملک کے مشہور ممتاز ارباب عمائم ایک طرف اور اس عہد کے مشہور تعلیم یافتگان جدید آنریبل جسٹس شرف الدین، سید علی امام، سید حسن امام، نصیر حسین بیرسٹر، شیخ سر عبدالقادر وغیرہ دوسری طرف شریک جلسہ تھے، یہ پہلا موقع تھا، جس میں دستار بند اور ہیٹ پوش ایک جگہ مل کر بیٹھے تھے اور ملک وملت کے درد کا درماں سوچ رہے تھے، حسن امام صاحب کی تقریر کے ایک بے محل فقرہ پر علماء میں برہمی پیدا ہوئی، شاہ صاحب فوراً کھڑے ہوگئے اور ایسی تقریر کی کہ سب ڈھل گیا، فرمایا، آج پہلا موقع ہے کہ نئے اور پرانے مل رہے ہیں، ایک دوسرے سے شکوے ہورہے ہیں، بدگمانیاں دور ہورہی ہیں۔ پھر ایک دو فقروں کے بعد حافظ کا یہ شعر اس مزہ سے پڑھا کہ فریقین مسکرا کر رہ گئے۔

للّٰہ الحمد میانِ من واو صلح فتاد
حوریاں رقص کناں نعرۂ مستانہ زدند

ندوہ کے اسی اجلاس میں نصیر حسین صاحب بیرسٹر پٹنہ نے جو اب صوفی صافی ہوچکے ہیں ایک نہایت پرجوش و پراثر تقریر کی تھی، اثر یہ تھا کہ صدر سے لے کر پائیں تک جو تھا رو رہا تھا، بڑے بڑے عمامہ والوں اور ہیٹ پوشوں کو میں نے خود دیکھا (میری عمر اس وقت ۱۵، ۱۶ برس کی ہوگی) کہ وہ ڈھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے، شاہ صاحب کی موقع شناسی ملاحظہ ہو، اسی عالم میں کہ لوہا گرم تھا کہ چندہ کی تحریک شروع کردی، نصیر حسین صاحب نے اپنا کوٹ اور ویسٹ کوٹ اور جو کچھ ان کی جیبوں میں تھا مع گھڑی کے ندوہ کی نذر کردیا، اسی حالت میں شاہ صاحب نے برمحل ایک شعر اپنی مخصوص لے میں ایسا پڑھا کہ سارے مجمع میں جادو کرگیا، مجھے صرف ایک مصرع یاد ہے۔

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم

یہ عالم ہوگیا کہ ہر طرف سے روپے، کپڑے، گھڑیاں اور زیورات برسنے لگے، علماء نے جبّے اور دستاریں اتار اتار کر نذر کردیں، یاد آیا ایک بزرگ اس میں حضرت شاہ امداداللہ صاحب مہاجر مکی کے خلیفہ تھے، ان کے سر پر پیر کی دستار تھی، جوش میں آکر وہ بھی انہوں نے اتار ڈالی، وہ دستار جلسہ میں نیلام ہوئی اور جناب مولانا حبیب الرحمان شروانی جیسے قدر شناس کی قسمت میں آئی۔

بات کہاں سے کہاں جانکلی۔

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

معلوم نہیں عہد ماضی کہ یہ کہانیاں حال کے ناظرین کو بھی لذیذ معلوم ہوں یا نہ ہوں، اس لئے اپنے مزہ کے لئے ان کو بے مزہ کرنا مناسب نہیں۔

شاہ صاحب کی ذات عجیب جامع ہستی تھی، ایسے لوگ اب پیدا نہ ہوں گے، زمانہ بدل رہا ہے، ہوا کا رخ اور طرف ہے، وہ قدیم و جدید کے درمیان حلقۂ اتصال تھے، اب قدیم بھی جدید ہورہا ہے اور جدید جدید ترین بن رہا ہے۔ دعا ہے کہ ان کے اخلاف برادرم شاہ حسین میاں صاحب اور ان کے بھائی اپنے بزرگ باپ کے سچے جانشین ثابت ہوں۔ ("س"، جولائی ۱۹۳۵ء)

علی، سید ممتاز، مولوی

مولوی سید ممتاز علی

اخبارات کی زبانی ناظرین تک یہ خبر پہنچی ہوگی کہ ہماری زبان کے پرانے ادیب و مصنف اور مسلمان لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے مشہور مبلغ مولوی سید ممتاز علی صاحب مہتمم تہذیب نسواں لاہور نے وفات پائی۔ اناللہ، مرحوم کا وطن، دیوبند تھا، عربی کی تعلیم پائی تھی، اور ساتھ ہی جدید تعلیم سے بھی بہرور تھے، اس زمانہ میں سرسید مرحوم کی تحریک کا شباب تھا، اس شمع کے گرد جو پروانے جمع ہوگئے تھے، ان میں ایک یہ بھی تھے، مسلمانوں میں وہ پہلے شخص تھے جس نے تعلیم نسواں کی تبلیغ کی، اور اس تبلیغ میں ان کو کامیابی حاصل ہوئی تھی، وفات کے وقت ان کا سن ستر (۷۰) کے قریب ہوگا ابھی اسی سال کے اخیر جنوری میں لاہور میں ملاقات ہوئی تھی، اسی وقت وہ زار و نزار، اور حبس بول کی شکایت میں مبتلا تھے، آخر وہ اس تکلیف سے جانبر نہ ہوسکے اور چل بسے،

اللہ تعالیٰ ان پر رحمت فرمائے، نہایت خوش خلق متواضع اور مرنج و مرنجان بزرگ تھے۔
("س"، اگست ۱۹۳۵ء)

رضا، سید رشید، علامہ

سید رشید رضا مصری

افسوس ہے کہ ۲۲/ اگست ۱۹۳۵ء (جمادی الاولیٰ ۱۳۵۴ھ) کو مصر بلکہ دنیائے اسلام کے سب سے بڑے عالم علامہ سید رشید صاحب المنار نے داعی اجل کو لبیک کہا، یہ مفتی عبدہ مرحوم کے سب سے ممتاز شاگرد اور سید جمال الدین افغانی کے فیوض و برکات سے بیک واسطہ مستفید تھے، شام وطن تھا، لیکن سلطان عبدالمجید خان کی دار و گیر سے گھبرا کر چلے آئے تھے اور آخر یہیں کے ہو کر رہ گئے، عمر اس وقت ستر ۷۰ سے کم نہ ہوگی، پھر بھی ان کی جسمانی قوت اور کام کی طاقت بہت اچھی تھی، اسلام کے اصلاحی مسائل ان کی تصانیف کا خاص موضوع تھا، المنار جس کی اشاعت دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ میں تھی، ان کی اڈیٹری میں نکلتا تھا، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ پورا رسالہ انہیں کے قلم کا مرہون ہوتا تھا، ان کی سب سے اہم تصنیف تفسیر المنار تھی، جو افسوس کہ ان کی وفات سے ناتمام رہ گئی، یہ تفسیر زمانۂ حال کی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر لکھ رہے تھے۔ وہ عقیدہ میں سلف کے پیرو اور فقہ میں غیر مقلد تھے، ان کی انشاء پردازی قدیم و جدید دونوں خوبیوں کو لئے ہوئی تھی، فقہ، تفسیر اور حدیث میں ید طولیٰ رکھتے تھے، ان کی آخری تصنیف "الرمی المحمدی" ہے، جس کا ہندوستانی ترجمہ کلکتہ سے شائع ہو چکا ہے، قدیم و جدید خیالات کی تطبیق ان کی ہر تحریر میں ہوتی تھی اور وہ اسی کے اس زمانہ میں اسلام کے لئے مفید خدمت سمجھتے تھے۔

اس زمانے میں جب ایسے روشن خیال و روشن ضمیر علماء جو ایک طرف متقی و پرہیزگار اور دوسری طرف زمانۂ حال کی ضرورتوں سے باخبر ہوں، انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں، سید رشید رضا کا ہمارے درمیان سے اٹھ جانا آج اسلام کا سب سے بڑا حادثہ ہے، وہ دنیائے اسلام کے کاشانہ میں ہدایت کے چراغ تھے، افسوس کہ یہ چراغ اب ہمیشہ کے لئے بجھ گیا، اور اس سے زیادہ افسوس یہ کہ اس چراغ کے گل ہونے سے المنار کی وہ روشنی بھی بجھ جائے گی جس کی کرنیں ہر ماہ تمام دنیا میں پھیلتی تھیں، **ولعل اللّٰہ یحدث بعد ذلک امراً۔**

میری ان کی پہلی ملاقات ہندوستان میں ۱۹۱۲ء میں ہوئی، جب وہ اس سال مولانا شبلی مرحوم کی تحریک سے ندوۃ العلماء کے اجلاس لکھنؤ میں صدر ہو کر آئے، پھر ۱۹۲۴ء میں مصر جا کر ان سے ملا اور مجلس خلافت مصر اور شیوخ ازہر سے میری ملاقات کا ذریعہ بنے، آخر میں ۱۹۲۶ء کی موتمر اسلامی میں مکۂ معظمہ میں ملاقاتیں ہوتی رہیں، مکاتبات کا سلسلہ بھی تھا۔ ("س"، اکتوبر ۱۹۳۵ء)

خلیل الرحمٰن، مولانا

مولانا خلیل الرحمٰن

افسوس کہ مولانا خلیل الرحمٰن صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماء نے ۴/ فروری ۱۹۳۶ء کی شب کو اپنے وطن سہارنپور میں اس دار فانی کو الوداع کہا، مولانائے مرحوم مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری (محشی بخاری و تلمیذ مولانا شاہ محمد اسحٰق دہلوی) کے چشم و چراغ تھے، مولانا احمد علی مرحوم پچھلی صدی کے آخری دور میں ہندوستان کے ان باکمالوں میں تھے جن کی مسندِ درس سے علم دین کی شمع روشن تھی اور تشنگانِ علم اس سرچشمہ سے سیراب ہونے کے لئے سینکڑوں میل کی منزلیں پاپیادہ طے کرکے وہاں تک پہنچتے تھے، مولانا خلیل الرحمٰن نے علم کے اسی گہوارہ میں آنکھ کھولی اور اپنے والد ماجد کے دامنِ فیض میں تعلیم و تربیت پاکر فارغ التحصیل ہوئے۔

مرحوم ندوۃ العلماء کے دور اول کے محسنین میں سے تھے، مولانا محمد علی مونگیریؒ ناظم ندوۃ العلماء کی معیت میں اس ملی و علمی خدمت میں شریک ہوئے اور آخر تک رہے، مرحوم خوش خلق، متواضع، رحمدل، اور عزیزوں سے دلی محبت فرمانے والے تھے، اتفاق وقت کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی ہنگامہ خیز اسٹرائک کا واقعہ انہی کے دور نظامت میں پیش آیا تھا، اس نازک وقت اور ناسازگار حالات میں بھی مولانائے مرحوم دارالعلوم کے طلبہ کے ساتھ جس عدیم المثال شفقت و محبت سے پیش آئے، اسکی یاد اس عہد کے فارغ التحصیل علمائے ندوہ کے دلوں میں ہمیشہ کے لئے باقی رہ گئی، اور مدت گزرنے کے بعد انہیں جب کبھی مرحوم سے شرف ملاقات کا موقع حاصل ہوا انھوں نے ان کے دل کو شفقت و محبت سے لبریز پایا ندوۃ العلماء کی خدمات انجام دینے کے علاوہ مرحوم کی زندگی کا ایک اہم کارنامہ صحیح بخاری کے اس نادر نسخہ کی اشاعت ہے، جس پر ان کے والد ماجد کے حواشی ثبت ہیں، یہ نسخہ مدتوں عربی مدارس میں صحیح بخاری کے لئے واحد مدار رہا ہے، مرحوم نے اسی (۸۰) سال سے زیادہ عمر پائی، اگرچہ آخر عمر میں چراغ سحری ہو کر گوشہ نشین ہوگئے تھے، لیکن ان کے وجود گرامی سے ہندوستان کے پچھلے دور کی دینی تعلیم و تہذیب کی شمع روشن تھی، افسوس کہ وہ بھی گل ہوگئی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمت کے سایہ میں لے اور ان کے صاحبزادگان مولوی منظور النبی ندوی و مولوی عقیل الرحمٰن صاحب ندوی کو توفیق صبر عطا فرمائے۔ ("ر"، فروری ۱۹۳۶ء)

الخیری، راشد، علامہ

علامہ راشد الخیری

ہم نے یہ خبر بھی دلی رنج و افسوس سے سنی کہ ۳/ فروری کو مولانا راشد الخیری نے اس دار فانی کو خیر باد کہا اور ہندوستان کا طبقۂ نسواں اپنے ایک بڑے معلم اور اپنے

حقوق کے ایک بڑے محافظ سے، اور ہندوستانی زبان اپنے ایک بڑے محسن کی خدمات سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگئی، مرحوم شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد کے عزیز قریب اور طرزِ تحریر میں ابتداً ان کے پیرو تھے، مرحوم نے اپنی ادبی زندگی رسالہ مخزن کی ادارت سے وابستہ ہوکر شروع کی، پھر ۲۷ سال گزرے کہ عصمت کے نام سے ایک زنانہ رسالہ جاری کیا، اور ساری عمر طبقۂ نسواں میں بیداری پھیلانے اور انہیں تعلیم و تربیت کے زیور سے آراستہ کرنے میں گزار دی، ہندوستان کے طبقۂ نسواں کو بیدار کرنے کی خدمت دو بزرگوں شمس العلماء مولوی ممتاز علی (تہذیب نسواں) اور مولانا راشد الخیری (عصمت) نے انجام دی افسوس کہ یہ دونوں ۶ ماہ کے اندر ہم سے جدا ہوگئے، مولانا راشد الخیری کی تحریک نسواں کا یہ امتیازی وصف تھا کہ وہ حقوق نسواں کے سب سے بڑے حامی کے ساتھ شریعت اسلامی کی حدود کا پاس نگاہ میں رکھتے تھے اور حقوق نسواں کے حامیوں کے اس گروہ کے سب سے بڑے مخالف تھے جو عورتوں کو مغرب کی کورانہ تقلید کی طرف لے جانے والا ہے، وہ ہندوستانی زبان کے مشہور ادیب، اور صاحب طرز انشا پرداز تھے، انہیں لال قلعہ کی پاکیزہ زبان لکھنے پر قدرت حاصل تھی، وہ انسانی درد و مصیبت اور معاشرتی زندگی کا خاکہ کھینچنے میں کمال رکھتے تھے، ان کی صبح زندگی و شام زندگی، ڈپٹی نذیر احمد کی توبۃ النصوح وغیرہ کے پہلو میں رکھے جانے کے قابل ہیں، اور بلاشبہ ان کی کتابیں پڑھ کر آنسوؤں کا ضبط کرلینا دشوار ہے، خداوند تعالیٰ ان پر اپنی رحمت کے پھول برسائے اور پسماندگان کو توفیق صبر دے، توقع ہے کہ ان کے خلف الصدق جناب رازق الخیری جو مرحوم کی زندگی ہی سے رسالۂ عصمت کے مدیر ہیں اور چھوٹے صاحبزادے جناب صادق الخیری جو ان کے ایک دوسرے زنانہ رسالہ جوہر نسواں کو چلا رہے ہیں، ان رسائل کو زندہ رکھیں گے، کہ یہ ان کی زندگی کی بہترین یادگاریں ہیں۔

("ر"، فروری ۱۹۳۶ء)

حسین، ہدایت، حافظ / الخیری، راشد، علامہ / علی، شیر، مولانا

حافظ ہدایت حسین / علامہ راشد الخیری / مولانا شیر علی

میری علالت کے زمانہ میں ملک و ملت کی کئی نامور ہستیوں نے اس دنیائے فانی کو الوداع کہا حافظ ہدایت حسین صاحب مرحوم اس صوبہ کے مسلمانوں کی بڑی دولت تھے، اس دولت کا چھن جانا ہماری سب سے بڑی محرومی ہے، دلی کے پایہ تخت کی بھی ایک یادگار مٹ گئی، یہ مولانا راشد الخیری کی ذات تھی، جس نے اپنی ساری عمر مسلمان عورتوں کی علمی و ادبی و تعلیمی خدمت گزاری میں بسر کردی، دکن کے خزانہ کا بھی ایک قیمتی ہیرا گم ہوگیا، یعنی مولانا شیر علی صاحب سابق مدرس اعلیٰ دارالعلوم ندوہ و سابق استاد کلام جامعہ عثمانیہ نے وفات پائی، مرنے والے مرگئے، مگر ان کے کارنامے دنیا میں یادگار رہ گئے۔

از صدائے سخن عشق ندیدم خوشتر — یادگارے کہ دریں گنبد دوار بماند

("س"، اپریل ۱۹۳۶ء)

انصاری، مختار احمد، ڈاکٹر

ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم

۹؍ مئی ۱۹۳۶ء کی شام کو سات بجے کے قریب میں ڈیرہ دون کی ایک سڑک سے گزر رہا تھا کہ پیچھے سے ایک موٹر تیزی سے آئی اور نکل گئی، میں نے دیکھا کہ اس پر ڈاکٹر انصاری بیٹھے ہیں، سر کھلا تھا اور چہرہ سے بے حد تکان معلوم ہوتا تھا، رات گزر گئی اور صبح کو ان کی قیام گاہ کی تلاش کی، معلوم ہوا کہ وہ رات ہی دلّی چلے گئے، لیکن جب شام ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ رات دلّی نہیں گئے، راستہ سے سیدھے جنت کو سدھارے، دل دھڑکا آنکھیں پرنم ہوئیں اور سینہ سے آہ کا ایک شعلہ اٹھا، جس نے صبر و تمکین کی متاع کو جلا کر خاکستر بنا دیا۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری گو نسب و وطن کے لحاظ سے ضلع غازی پور کے ایک ممتاز قصبہ یوسف پور کے ایک نہایت شریف خاندان سے تھے، مگر درحقیقت ان کا تعلق پورے ہندوستان سے تھا، اس یوسف کا کنعان، وہ محدود مقام نہ تھا، جس کو یوسف پور کہتے ہیں، بلکہ پورا ہندوستان تھا، اسی لئے آج پورے ہندوستان نے ان کی موت کا ماتم کیا، کیا مسلمان، کیا ہندو، کیا سکھ، کیا عیسائی سب نے یہی جانا کہ آج ان کا حقیقی بھائی اس دنیا سے چل بسا۔

میں نے ڈاکٹر انصاری کو سب سے پہلے ۱۹۱۲ء میں اس وقت دیکھا جب وہ بلقان کی جنگ میں طبی وفد لے کر ترکی جارہے تھے اور اس تقریب سے لکھنؤ اسٹیشن سے گزر رہے تھے، مولانا شبلی اور بہت سے لوگ لکھنؤ اسٹیشن پر ڈاکٹر صاحب کو الوداع کہنے گئے تھے، اس وقت ڈاکٹر صاحب کی عمر ۳۰، ۳۲ برس کی تھی، کھلتا ہوا رنگ، دُبلا پتلا چھریرا بدن کشیدہ قامت، ہنستا چہرہ، انوری یا قیصری مونچھیں، جسم پر چست خاکی وردی، ڈاکٹر صاحب کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھولے کھڑے تھے، گاڑی نے جیسے ہی سیٹی دی، لوگوں کی آنکھیں بھر آئیں اور مولانا شبلی مرحوم نے اسی جوش میں جھک کر ڈاکٹر صاحب کے بوٹ کو بوسہ دیا اور رخصت کیا، وہ بھی عجیب منظر تھا۔

ڈاکٹر صاحب کا سب سے پہلا شجاعانہ اسلامی کارنامہ ۱۹۱۸ء میں مسلم لیگ دہلی کے صدر کی حیثیت سے وہ یادگار خطبہ ہے جس میں سب سے پہلے خلافت اور مقامات مقدسہ کی نسبت مسلمانوں کے جذبات کا بے خوفی سے اظہار کیا گیا اور مذہبی کتابوں کے حوالہ سے مسلمانوں کے دعوؤں کے دلائل پیش کئے گئے تھے، اس کے بعد تو ان کا یہ

جنون بڑھتا ہی رہا اور خلافت کانگریس اور ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں میں انہوں نے وہ کچھ کیا جو ہندوستان کے کسی مسلمان نے نہیں کیا۔

وہ ہندو مسلم اتحاد کے منادٗ، عالم اسلامی کے سفیر اور آزادی وطن کے مبلغ تھے، وہ جلسوں میں بہت کم بولتے تھے، مگر جب بولتے تھے تو وہ کہتے تھے جس کی صداقت دلوں میں گھر کر جاتی تھی، صداقت اور شرافت ان کا خمیر تھا، صداقت کی خاطر ان کو کبھی کبھی اپنے عزیز ترین دوستوں کا ساتھ چھوڑنا پڑتا تھا اور شرافت کے سبب سے ان دوستوں کے غیظ و غضب اور جفاکشی کو پوری متانت اور سنجیدگی کے ساتھ برداشت کرتے تھے، اس قسم کے کتنے مناظر خود میری آنکھوں کے سامنے گزرے ہیں۔

ان کا گھر مہمانوں کے لئے، ان کی جان دوستوں کے لئے اور ان کا مال ضرورت مندوں کے لئے وقف تھا، ناواقف ان کو دولت مند سمجھتے تھے، مگر جاننے والوں کو معلوم ہے کہ کبھی ان پر ایسے دن بھی گزرے کہ قرض لے کر مہمانداری کا فرض انجام دیا جاتا تھا اور اس حالت میں بھی قومی جلسوں کا پورا بار اپنے کندھوں پر اٹھائے اور سینکڑوں اپنے جاننے والوں اور نہ جاننے والوں کو اپنا مہمان بنائے ہوئے تھے۔

وہ فیاضی کا مجسمہ، لطف و محبت کا پیکر اور حسن اخلاق کا فرشتہ تھا، متانت اور سنجیدگی ان کی طینت اور غور و فکر ان کی عادت تھی، وہ وطن کے خدمت گار، انسانیت کے غمخوار اور اسلام کے پرستار تھے، وہ دنیا میں اتحاد اسلامی کے پیغامبر اور ملک میں ہندو مسلم اتحاد کے مبلغ تھے، ان کی پالیٹکس کے سولہ برسوں میں طوفان سیاست کے سینکڑوں جھونکے اٹھے اور سیاسی انقلاب خیال کے بیسیوں حادثے پیش آئے، مگر صداقت اور راست بازی کا یہ پہاڑ جوں کا توں اپنی جگہ پر جما رہا۔

نہرو رپورٹ کے سلسلہ میں وہ وقت آیا جب اپنوں نے ان کو غیر بنایا آشناؤں نے ان کو بیگانہ سمجھا اور دوستوں نے دشمن قرار دیا، بلکہ کلکتہ خلافت اور آل پارٹیز کانفرنس میں وہ وقت بھی آیا جب ان کے اپنے دست و بازو نے ان کو دھکے دیئے اور مسلمانوں نے ان پر حملہ کی نیت کی، تاہم یہ شرافت و متامت کا مجسمہ خاموش رہا اور اپنوں کی بدسلوکی کے ذکر اور دوستوں کی جائز شکایت سے کبھی اپنے لب کو آلودہ نہیں کیا۔

اب زمین کا یہ فرشتہ ہمارے شور و شر کی سرزمین سے بہت دور امن و راحت کے آسمان پر چلا گیا، اس کا جسم خاکی دلی کے ایک کھنڈر میں ہزاروں من مٹی کے نیچے دبا ہے، اب زمانہ کے حوادث اس کو رنجیدہ، عالم اسلامی کی زبوں حالی اس کو آلودہ اور وطن کی غلامی اس کو افسردہ نہیں بنائے گی، اس کا تن خاکی اب ایک تھکے ہوئے مسافر کی طرح زمین کے بچھونے پر ابدی نیند سو رہا ہے اور اس کی روح ہماری مدح و ستائش سے بے پروا اور ہمارے نوحہ و ماتم سے بے خبر اپنے نیک اعمال کا محضر لئے خدا کے سامنے ہے، امید ہے کہ مغفرت کا نورانی خلعت اس کے جسم پر اور نوازش کا تاج اس کے سر پر ہوگا۔

آہ! کیسا دل دوز منظر ہے، وہ حاذق جس سے دردِ دل کے ہزاروں مریضوں کو شفا ہوئی، جس نے اپنے تیس برس کے معالجہ میں ہزاروں کو موت کے خطرہ سے بچایا ہو، وہ ایک ریلوے سفر میں گاڑی کے ایک ڈبہ میں ڈبہ کے ایک تختہ پر موت کے پنجہ کو آہستہ آہستہ اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھتا ہے اور اس بے کسی اور بے بسی کے عالم میں اپنے کو مجبور پاتا ہے اور چالیس منٹ کے اندر ستاون برس کی عمر میں اس کی ہستی کا چراغ گل ہو جاتا ہے۔

دہلی کے اسٹیشن نے بیسوں دفعہ اس کے جلوس و استقبال کے رنگین منظر اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوں گے، ۱۰ رمئی ۱۹۳۶ء کی صبح کو اسی اسٹیشن نے اسکی بے روح لاش کو گاڑی سے اترتے دیکھا، استقبال کرنے والوں کا ہجوم اب بھی تھا، مگر چہروں پر مسکراہٹ کے بجائے رنج و غم، آنکھوں میں نور کی جگہ آنسوؤں کے قطرے دل میں خوشی و مسرت کے بدلہ غم و الم کا اضطراب۔

طرابلس اور بلقان کے ہنگاموں نے ہمارے چند جدید تعلیمیافتہ نوجوانوں کو سوتے سے بیدار کر دیا تھا، محمد علی مرحوم اس قافلہ کے رہبر اور ڈاکٹر انصاری اس قافلہ کے سب سے پر جوش رہرو تھے۔ افسوس کہ ان دونوں دردمندوں نے دل ہی کی آزار میں وفات پائی۔ دل کا درد مجاز بن کر نمودار ہوا اور ان کی قومی زندگی کا باعث ہوا اور وہی حقیقت بن کر ان کی موت کا سبب ہوا، محمد علی مرحوم نے پہلے داغ مفارقت دیا اور اب،

داغِ فراق صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

("س"، جون ۱۹۳۶ء)

حسین، فضل، سر

سر فضل حسین

سر فضل حسین کا ماتم ملک کے گوشہ گوشہ میں برپا ہے، مرحوم کے سیاسی مسلک سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو، مگر ان کی قابلیت، تدبر، بے خوفی، دلیری، ہردلعزیزی اور قومی بہی خواہی سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو، وہ ان حکومت پسندوں میں نہ تھے جو اپنی شخصی ترقی کو صرف اپنی خاندانی ترقی کا زینہ بناتے ہیں، بلکہ ان میں جو حکومت کا ساتھ دے کر اپنی سمجھ کے مطابق قوم و ملک کی بھلائی کرتے ہیں، مرحوم کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ وہ جس محفل میں ہوتے تھے اس پر چھا جاتے تھے، وہ فطری لیڈر تھے اور دوسرے ان کے ساتھ چلنے پر مجبور تھے، وائسرائے کی کونسل کے ممبر ہو کر گویا یہ کہنا چاہئے وہ صرف ممبر نہیں رہے تھے، بلکہ اپنی دانائی، عزم، حسن تدبیر اور دلائل کی قوت کی بناء پر پوری کونسل کی عنانِ سیاست کے تنہا مالک تھے۔

مرحوم مرض دق کے بیمار تھے، پھرمجلسِ حکومت کی رکنیت سے علیحدہ ہوکر انہوں نے آرام نہیں کیا، بلکہ سیاسیات پنجاب کی الجھی ہوئی گتھی کو اپنی شبانہ روز کی محنت سے سلجھانے میں مصروف ہوگئے اور یہ ان کا کمال سمجھنا چاہئے کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک متحدہ سیاسی پارٹی بنانے میں کامیاب ہوگئے اور خود اعتمادی یہ تھی کہ ہر مخالف کوشش کو بے حقیقت سمجھ کر اپنے کام میں بے خوف لگے رہے، گو ہم کو یہ معلوم ہے کہ اس متحدہ پارٹی کی پراگندہ اوراقِ کتاب کا شیرازہ کس نے باندھا، تاہم مرحوم کی مہارت فن کی داد دینی پڑتی ہے کہ خود شیرازہ بند کو بھی یہی محسوس ہوتا تھا کہ ان منتشر اوراق کا شیرازہ خود ان کی ذات ہے، پروردگار عالم ان پر رحمت فرمائے اور اپنے فضل و کرم سے آخرت کی عزت سے بھی ان کو نوازے۔ (''س''، اگست ۱۹۳۶ء)

کائتانی، پرنس اگویدی، پروفیسر اہرخردنیے، اسنوک، پروفیسر

پرنس کائتانی / پروفیسر گویدی / پروفیسر اسنوک ہرخردنیے

امسال مرحوم مارماڈیوک پکتھال کے علاوہ ن کو ہم سب جانتے تھے، کئی نامور مستشرقین نے وفات پائی، اٹلی کے پرنس کائتانی اور پروفیسر گویدی اور لائڈن کے پروفیسر اسنوک ہرخردنیے نے امسال ہماری دنیا کو الوداع کیا، پرنس کائتانی تاریخ اسلام کے عالم اور گویدی عربوں کے ریاضیات اور جغرافیہ کے ماہر اور اسنوک ہر خردنیے 'محمڈنزم' نامی کتاب کے مصنف ہیں جس کو انھوں نے خطبہ کی صورت میں امریکہ کی ''مجلسِ تاریخِ مذاہب'' میں پیش کیا تھا اور بھی دوسری کتابیں اور مضامین ان کے قلم سے نکلے تھے۔ (''س''، اکتوبر ۱۹۳۶ء)

پکتھال، مارماڈیوک

مارماڈیوک پکھتال

مارماڈیوک پکھتال انگریزی کے بلند پایہ انشاء پرداز انگریز تھے، مدت تک مصر اور ترکی میں رہے تھے اور وہیں اسلام کے تاثرات نے ان کے دل میں گھر کیا تھا اور اسلام کے سچے پیرو ہوگئے تھے، ۱۹۲۰ء میں لندن میں ان سے جمعہ کی نماز میں اسلامی جماعت خانہ میں ملاقات ہوا کرتی تھی، وہ بالکل مسلمانوں کی طرح نماز پڑھا کرتے تھے، جماعت خانہ میں ان کی ترکی ٹوپی نماز کے لئے رکھی رہتی تھی، جس کو وہ نماز کے وقت پہن لیتے تھے، لارڈ کرومر کے زمانہ میں مصر میں تھے۔

ترکی اور رواں عربی زبان بولتے تھے اور جانتے تھے، ترکوں کی ہمدردی میں طرابلس کے زمانہ میں کچھ رسائل لکھے تھے، لندن میں ان سے گھنٹوں باتیں ہوا کرتی تھیں، اس کے بعد ہی وہ بمبئی کرانیکل کے ایڈیٹر ہوکر آگئے، چنانچہ وہاں بھی ان سے ملاقات ہوئی، پھر وہ حیدرآباد دکن چادرگھاٹ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر اور وہاں کی سول سروس کے اتالیق ہوگئے تھے، اس زمانہ میں جب حیدرآباد جانا ہوا، محبت سے مجھے اپنے یہاں بلاتے رہے، اسی زمانہ میں قرآن پاک کا ترجمہ شروع کیا، غالباً ۱۹۲۷ء میں مدراس میں جب ان سے ملاقات ہوئی تو اپنے انگریزی ترجمہ کا ذکر کیا، اور سورۂ مریم کا ترجمہ دیکھنے کو دیا، وہ کہتے تھے کہ مولوی محمد علی لاہوری کے غلط سلط ترجمہ کو انگریزوں کے ہاتھوں میں دے کر شرماتا ہوں اور جی چاہتا ہے کہ اس کا ایک آتشیں ترجمہ کروں جو دلوں کو گرمادے، چنانچہ حیدرآباد کی مالی امداد سے مصر جاکر اس ترجمہ کو پورا کیا اور چھپا اور یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے، یہ وہ نومسلم انگریز تھے جو ایمان کے ساتھ عملاً نماز و روزہ کے پابند تھے، اللہ تعالیٰ ان پر رحم و کرم فرمائے۔

(''س''، اکتوبر ۱۹۳۶ء)

نیّر، نورالحسن، مولوی

مولوی نورالحسن صاحب نیّر

افسوس کہ اس مہینہ مولوی نورالحسن صاحب نیر، بی، اے۔ ایل، ایل، بی خلف حضرت محسن کاکوروی نے ایک مدت کی علالت کے بعد وفات پائی، وہ انگریزی کے ساتھ عربی کے بھی عالم تھے، ندوہ العلماء کے ممتاز رکن اور دارالعلوم کے سابق معتمد تھے، وہ سخنور، سخن سنج، سخن شناس، سخن دان سب کچھ تھے، ان کی زندگی کا سب سے اہم کارنامہ اردو لغت نوراللغات کی تالیف ہے، خدا ہمارے اس ادیب شاعر کو اپنی رحمت کے انعام واکرام سے سرفراز فرمائے۔ (''س''، اکتوبر ۱۹۳۶ء)

پریم چند، منشی

منشی پریم چند

افسوس ہے کہ اس جلسہ میں ہندی اور ہندوستانی کا وہ ادیب موجود نہ تھا، جس کا قلم ان دونوں دریاؤں کا سنگم تھا، یعنی منشی پریم چند، ماسوف علیہ نے اسی مہینہ اپنے دوستوں کو آخری الوداع کہا اور اس دنیا سے رخصت ہوگئے، ان کے قلم نے کم از کم پچیس برس تک اپنے دیہاتی بھائیوں کی کہانی اپنے شہری بھائیوں کو سنائی، وہ زبان کے پرجوش فصیح و بلیغ نہ تھے، ان کی عبارت تکلف و بناوٹ سے پاک اور حددرجہ سادی تھی، ان کی کہانیوں کا اثر ان کی زبان میں نہ تھا، بلکہ ان کے بیان میں تھا، انہوں نے ہمارے دیہاتی تمدن، ہندوستانی وضع وآداب اور ہندی اخلاقی آن بان کی جو تصویر کھینچی ہیں وہ ہمارے ادبی مرقع کی زندہ جاوید یادگاریں ہیں۔

(''س''، نومبر ۱۹۳۶ء)

خان، سید محمد علی حسن، نواب

نواب علی حسن خاں مرحوم

ایک نواب عالم کی وفات

ہندوستان کے ان پرانے مسلمان خاندانوں میں سے جو شرافت نسب کے ساتھ علم اور دولت دونوں کے جامع ہیں، اب خال خال گھرانے رہ گئے ہیں، انہیں میں سے ایک والا جاہ نواب سید صدیق حسن خان مرحوم کا خاندان تھا، جن کے چھوٹے صاحبزادہ صفی الدولہ حسام الملک شمس العلماء نواب سید محمد علی حسن خان مرحوم نے ۱۹؍ نومبر ۱۹۳۶ء مطابق ۳۰؍ رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ کی صبح کو اپنی کوٹھی بھوپال ہاؤس لال باغ لکھنؤ میں بہتر برس کی عمر میں وفات پائی، افسوس ہے کہ ایک پرانے خاندان کے فضل و کمال اور جاہ وجلال کی یادگار آج مٹ گئی۔

مرحوم ان لوگوں میں تھے جن کی آنکھوں نے مسلمانوں کے علمی و تعلیمی، سیاسی و تمدنی انقلاب کے مناظر دیکھے، وہ پیدا تو ایک ''کنزرویٹو'' گھرانے میں ہوئے اور اسی ماحول میں تعلیم وتربیت پائی، لیکن فطرت کی طرف سے وہ ایک اثر پذیر اور حساس دل لائے تھے، باوجود اس کے کہ وہ بھوپال میں پیدا ہوئے جہاں حددرجہ قدامت کی حکومت اور سطوت تھی اور ممکن نہ تھا کہ نورمحل میں نئی روشنی کی ایک کرن بھی پہنچ سکے، مگر استعداد طبع دیکھئے کہ خود بخود ادھر طبیعت کا میلان ہوا، سرسید کی جدید تعلیمی تحریک میں اور پھر ندوۃ العلماء کی مذہبی تحریک میں شریک ہوئے اور ہر قسم کی جانی و مالی خدمتیں انجام دیں، مدت تک ندوہ کے اعزازی ناظم رہے، دارالمصنفین کے اساسی ارکان میں تھے اور لکھنؤ کی ہر سنجیدہ تحریک میں ان کا نام سرفہرست رہتا تھا۔

وہ عربی زبان کے عالم، فارسی زبان کے ماہر اور اردو کے مشاق اہل قلم تھے، فارسی شعر وسخن اور محاورات پر ان کو عبور کامل حاصل تھا، فارسی کا مشکل سے کوئی اچھا شعر ہوگا جو ان کو یاد نہ ہو، خود بھی فارسی میں اکثر اور اردو میں کمتر شعر کہتے تھے، انہوں نے اپنے والد ماجد کے زمانۂ عروج میں دنیا بھر کے مشرقی علماء وفضلاء کی صحبتیں اٹھائی تھیں اور سوائے علمی و ادبی چرچوں کے ان کے کانوں میں کوئی بات پڑی بھی نہ تھی، ان کے لئے ان کے والد نے ہرفن کے باکمال استاد مقرر کئے تھے جن کے سایۂ تربیت میں وہ پل کر جوان ہوئے۔

وہ ہماری زبان کے مصنف تھے، متعدد مذہبی اور تاریخی کتابیں ان کے قلم سے نکلیں، شعراء کے تذکرے ان کی جوانی کی یادگار ہیں، فطرۃ اسلام اور مآثر صدیقی ان کی بہترین کتابیں ہیں، آخر میں ''مردم دیدہ'' کے نام سے ان باکمالوں کے حالات لکھ رہے تھے، جن سے ان کو ملنے کا اتفاق ہوا اور ان کی تعداد کچھ کم نہیں، ان میں بڑا حصہ شعراء کا تھا۔

وہ مولانا شبلی مرحوم کے بے تکلف دوستوں میں تھے اور ایک دوسرے کے سچے قدردان تھے، یہی وراثت منتقل ہوکر ہم تک پہنچی، موصوف کو ہم لوگوں سے اس درجہ محبت اور شفقت تھی جو خاندانی محبت سے کسی طرح کم نہ تھی اور اس کو اس وضعداری سے نباہا کہ تیس برس کے عرصہ میں ایک دفعہ بھی اس میں فرق نہ آیا، وہ مجسم اخلاق، حددرجہ پاک باطن اور نیک طینت تھے، شر وفساد سے طبعی نفور اور ہنگامہ آرائیوں سے کوسوں دور تھے، تمول کے باوجود خاکسار اور علم وفضل کے باوجود ملنسار تھے۔

مذہبی خیالات میں گو وہ عقلیت کی طرف مائل تھے، لیکن اسی کے ساتھ مذہبی پابندی ان میں اتنی سخت تھی کہ ان کی ایک نماز بھی ان کے مقررہ وقت سے ٹلنے نہیں پاتی تھی، رسم ورواج، بدعات کا ان کے گھر میں نشان نہ تھا اور اس بارے میں وہ نہایت سخت تھے، ان کی محفل میں علم وفن، شعر وسخن اور قومی مسئلوں کے سوا کوئی اور مذکور نہ تھا، عربی کتابیں ان کو پڑھے ہوئے مدت ہوچکی تھی اور پھر ان کا کوئی مشغلہ نہ رہا، تاہم جب ذکر آجاتا تو ان کو بھولے ہوئے خواب کی طرح بہت سی باتیں یاد آجاتیں۔

نورمحل کے رہنے والے! تو بڑے باپ کا چشم و چراغ اور ایک پرانے خاندان کا چراغ سحر تھا، ۵؍ نومبر ۱۹۳۶ء کو تیرا آخری دیدار نصیب ہوا، خیال نہ تھا کہ علم وفضل کا یہ ٹمٹماتا ہوا دیا اتنا جلد بجھ جانے والا ہے، اب تو وہاں ہوگا جہاں خدا چاہے نور کے سوا ظلمت کا گذر نہیں، صفی الدولہ! حسام الملک! اب تو وہاں ہے جہاں کسی کی دولت ہے اور نہ کسی کا ملک ہے، تیرے اعمالِ نیک کی دولت اور تیرے کارخیر کی مملکت تیرے ساتھ ہے، دعا ہے کہ وہ شہنشاہ علی الاطلاق اپنے ملک لازوال کی دولت جاوید سے تجھ کو سرفراز فرمائے۔ (''س''، دسمبر ۱۹۳۶ء)

باور، پروفیسر

پروفیسر باور

پچھلے مارچ میں جرمنی کے ہالے یونیورسٹی کے علوم مشرقیہ کے پروفیسر باور کا انتقال ہوگیا، وہ لسانیات کے ماہر تھے، وہ یورپ کی تقریباً جملہ زبانوں کے جاننے کے علاوہ ساری سامی زبانوں سے واقف تھے اور تورانی زبانوں خصوصاً چینی زبان میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ اس حیرت انگیز وسیع لسانیاتی واقفیت کے سبب سے وہ راس شمرہ کی کھدائیوں میں بعض نئے خطوں کے کتبوں کے برآمد ہونے پر ان کو حل کرسکے، ماسوف علیہ کو امام غزالی کی احیاء العلوم سے خاص دلچسپی تھی، اس کے متفرق ابواب کے ترجمے اکثر شائع کرایا کرتے تھے، اسلامی علم مرایا ومناظر پر بھی بعض اچھے مضمون لکھے تھے، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے شریک ناشر بھی تھے اور فلک، حاء، حفص

الفرد، وغیرہ عنوانوں پر اس میں مقالے لکھے تھے، ''حرف تہجی کی ابتداء'' پر ان کی ایک جرمن تالیف اس وقت مطبع میں ہے۔ (''س''، جولائی ۱۹۳۷ء)

مسعود، سر راس، ڈاکٹر

سر راس مسعود

افسوس ہے کہ ۳۰/ جولائی ۱۹۳۷ء کی دوپہر کو ڈاکٹر سر راس مسعود کا بھوپال میں بعارضہ تپ میعادی انتقال ہوگیا، باہر والوں کو ان کی بیماری کی کوئی خبر نہ تھی، یکایک پہلی اگست کے اخباروں سے ان کی وفات کی اطلاع ملی، مسلمانوں کے لئے عموماً اور ان کے دوستوں کے لئے خصوصاً یہ سانحہ ہی المناک ہے، وہ ہماری قوم میں تعلیمی مسائل کے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے، سرسید کے پوتے اور جسٹس سید محمود کے بیٹے تھے، تعلیم سے فارغ ہوکر وہ پہلے پٹنہ میں ہیڈ ماسٹر ہوئے، وہاں سے کٹک پروفیسر ہوکر گئے، پھر حیدرآباد میں ناظم تعلیمات اور اس کے بعد مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور آخر میں ریاست بھوپال میں وزیر تعلیم ہوئے، ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے تھے، ۴۸ برس کی عمر پائی، جاپان کا تعلیمی نظم ونسق اور انتخاب زریں (اردو اشعار کا انتخاب) وغیرہ بعض رسالہ اور مضامین ان کی علمی اور ادبی یادگار ہیں، مرحوم نے دو جوان لڑکے پہلی بیوی سے چھوڑے ہیں، بڑا لڑکا تعلیم سے فارغ ہوکر اب یورپ سے واپس آگیا ہے۔

مرحوم بڑے وجیہہ، کشیدہ قامت، سرخ وسفید، ہنس مکھ اور ملنسار تھے، جس مجلس میں ہوتے سب پر چھا جاتے، باتوں کے دھنی اور زبان کے میٹھے تھے، ہر شخص سے جھک کر ملتے تھے، ایک ذاتی واقعہ ہے، مگر بیان کے قابل ہے، بارہ تیرہ برس ہوئے جب وہ حیدرآباد میں ناظم تعلیمات تھے، تو میرا حیدرآباد جانا اور ایک دوست کے ہاں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا، جن سے پہلے کو ان سے بہت میل ملاپ تھا، مگر یکایک بیچ میں ایسی شکرنجی ہوگئی تھی کہ ملنا جلنا اور بات چیت تک بند ہوگئی تھی، میں جب ان سے جاکر ملا تو انہوں نے پوچھا کہاں ٹھہرے ہو، میں نے جگہ بتائی تو وہ چپ سے ہوگئے ہیں مطلب سمجھ گیا، دوتین دن کے بعد دیکھتا کیا ہوں کہ وہ بے تکلف وہاں چلے آرہے ہیں، میرے ان دوست کو اچنبھا سا ہوگیا اور اس دن وہ ان کے حسن خلق کے قائل ہوگئے، چند سال ہوئے کہ کابل کے سفر میں میں اور وہ ساتھ تھے، دن رات یک جا رہنے کا اتفاق ہوا، مرحوم کی مجلسی خوبیاں بھولنے کے قابل نہیں، ان کی وفات سے ایک بڑے خاندان کی یادگار مٹ گئی اور تعلیمی مسائل کی ایک قابل ذکر ہستی فنا ہوگئی، دعا ہے کہ اللہ تعالی اس بااخلاق کو اپنے اخلاق ربانی سے نوازے۔

(''س''، اگست ۱۹۳۷ء)

قدوائی، مشیر حسین، شیخ

شیخ مشیر حسین قدوائی

گزشتہ سال کے خاتمہ پر ۲۳/ دسمبر ۱۹۳۷ء کو شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی بیرسٹرایٹ لا دتعلقہ دار گدیہ (بارہ بنکی صوبۂ اودھ) نے انسٹھ (۵۹) برس کی عمر میں دل کی پرانی بیماری سے وفات پائی، مرحوم اسلام کے پرجوش سپاہی تھے، عمر بھر فرنگستان کی وادیوں میں اپنے قلم سے مصروف جہاد رہے، ووکنگ مشن کی قلمی کوششوں میں ان کا حصہ نہایت اہم ہے، جنگ عظیم کے زمانہ میں ووکنگ ہی میں مقیم تھے، یورپ کے بڑے بڑے مشاہیر سے ملاقاتیں رکھتے تھے اور دنیائے اسلام کے اکثر اکابر سے ان کی ذاتی واقفیت اور مراسلت تھی، وہ اتحاد اسلامی کی تحریک کے بانیوں اور ملک کے سیاسی آزادی کے حامیوں میں تھے، ۱۹۲۰ء میں فیض آباد خلافت کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے انہوں نے جو خطبہ پڑھا تھا وہ ہندوستان میں ترکی اور یورپ کے معاملات کے متعلق پہلا ذریعہ علم تھا، مرحوم اپنی اخیر زندگی تک اسلام کی خدمت میں مصروف رہے، ان کی وفات سے شاید چند ہی روز پہلے ان کی آخری انگریزی تصنیف ''اسلام اور بولشزم'' چھپ کر نکلی تھی، اللہ تعالی اس سپاہی کی مجاہدانہ قلمی خدمات کو حسن قبول اور تاثیر بخشے اور اس کو بہشت بریں کی نعمت عطا فرمائے۔

مرحوم سے واقفیت تو ہندوستان ہی میں تھی، مگر میرا ان کا ساتھ ۱۹۲۰ء میں انگلستان میں ہوا، جہاں وہ وفد خلافت کے ساتھ آکر مقیم ہوئے تھے، مرحوم انگلستان کے قیام میں بھی نمازوں کی پابندی کیا کرتے تھے اور وضو اور طہارت کا اہتمام رکھتے تھے، مرحوم ندوہ کے پرانے رکن تھے، ندوہ کی سرکاری امداد کے معاملہ میں ان کی کوششیں بھی شامل تھیں، غالباً ۱۹۰۸ء میں اسی سلسلہ میں جب انگریز انسپکٹر آف اسکولس ندوہ کو دیکھنے کے لئے آیا تو مرحوم اس کے ساتھ تھے، اس زمانہ میں میں نے مسئلہ ارتقاء اور قرآن مجید پر ایک مضمون لکھا تھا، انہوں نے مجھے پیش کرتے ہوئے خاص اس مضمون کا ذکر کیا۔ (''س''، جنوری ۱۹۳۸ء)

اقبال، محمد، ڈاکٹر

ماتم اقبال

وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ [الواقعۃ: ۱] آخر موت اور حیات کی چند ہفتوں کی کشمکش کے بعد ڈاکٹر اقبال نے دنیائے فانی کو الوداع کہا، صفر کی انیسویں اور اپریل کی اکیسویں کی صبح کو عمر کی اکسٹھ بہاریں دیکھ کر اور شاعری کی دنیا میں چالیس برس چہچہا کر یہ بلبل ہزار داستان اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا، وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت، اور اسلام کا فخر تھا، آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہوگئی، ایسا عارف فلسفی، عاشق رسول

شاعر، فلسفہ اسلام کا ترجمان اور کاروانِ ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا، اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو، اس کے دہن کا ہر ترانہ بانگِ دار، اس کی جانِ حزیں کی ہر آواز زبورِ عجم، اس کے دل کی ہر فریاد پیامِ مشرق، اس کے شعر کا ہر پرواز بالِ جبریل تھا، اس کی فانی عمر گو ختم ہوگئی، لیکن اس کی زندگی کا ہر کارنامہ، جاوید نامہ بن کر انشاء اللہ باقی رہے گا، امید ہے کہ ملت کا یہ غمخوار شاعر اب عرشِ الٰہی کے سایہ میں ہوگا، اور قبول و مغفرت کے پھول اس پر برسائے جارہے ہوں گے، خداوند! اس کے دلِ شکستہ کی جو ملت کے غم سے رنجور تھا، غمخواری فرما! اور اپنی ربانی نوازشوں سے اس کے قلبِ حزیں کو مسرور کر۔

مرحوم کی زندگی کا ہر لمحہ ملت کی زندگی کے لیے ایک نیا پیام لاتا تھا، وہ توحید خالص کا پرستار، دین کامل کا علمبردار، اور تجدید ملت کا طلبگار تھا، اس کے رونگٹے رونگٹے میں رسول انام علیہ السلام کا عشق پیوست تھا، اور اس کی آنکھیں جسمِ اسلام کے ہر ناسور پر اشکبار رہتی تھیں، اس نے مستقبلِ اسلام کا ایک خواب دیکھا تھا، اسی خواب کی تعبیر میں اس کی ساری عمر ختم ہوگئی، ع

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں

کہنے کو تو ہم میں ملت کے غمخواروں کی کمی نہیں، اور نہ امت کے دوستداروں کی قلت، مگر واقعہ یہ ہے کہ نئی تعلیم نے اپنے ساٹھ ستر برس کے طویل عرصہ میں دو ہی سچے مسلمان غمخوار پیدا کئے، ایک محمد علی مرحوم اور دوسرا اقبال مرحوم، دونوں مرحوموں پر خدا کی بڑی رحمت ہو، ان کے دلوں میں اسلام کا حقیقی سوز تھا، اور رسول رحمت ﷺ کے ساتھ سچا عشق، نئے زمانہ کی جھوٹی آب و تاب، اور نئے تمدن کی ظاہری چمک دمک سے ان کی آنکھیں خیرہ نہ تھیں، آفتابِ اسلام کی ضیا باری کے مقابلہ میں ان کے سامنے جدید تہذیب و تمدن، اور زمانہ حال کی تجدیدات کی نئی روشنی مہِ نخشب کے مصنوعی نور سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھی، خدا ان کی قبروں کو اپنے نور سے بھر دے۔

اقبال کی قومی شاعری بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ شروع ہوئی بیسویں صدی کے اس پیغام رساں نے اپنے اڑتیس برس شاعرانہ پیغاموں سے ملت کے نوجوانوں میں نئی امنگ بھر دی اور نئے سفر کے قطعِ منزل کے لیے ان میں نئے سرے سے ہمت پیدا کردی، اقبال کا یہ دعویٰ حرف حرف سچا تھا،

اقبال کا ترانہ بانگِ دار ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اقبال کی تصنیفات زمانہ میں یاد رہیں گی، وہ اسلام کا غیر فانی لٹریچر بن کر انشاء اللہ رہے گا، ان کی شرحیں لکھی جائیں گی، تشریحیں کی جائیں گی، نظریے ان سے بنیں گے، ان کا فلسفہ تیار ہوگا، اس کی دلیلیں ڈھونڈھی جائیں گی، قرآنِ پاک کی آیتوں، احادیث شریفہ کے جملوں، مولانا رومی اور حکیم سنائی کے تاثرات سے ان کا مقابلہ ہوگا، اور اس طرح اقبال کا پیام اب دنیا میں انشاء اللہ ہمیشہ زندہ رہے گا، اور اقبال زندہ جاوید!

اقبال صرف شاعر نہ تھا، وہ حکیم تھا، وہ حکیم نہیں جو ارسطو کی گاڑی کے قلی ہوں، یا یورپ کے نئے فلاسفروں کے خوشہ چیں، بلکہ وہ حکیم جو اسرارِ کلامِ الٰہی کے محرم اور رموزِ شریعت کے آشنا تھا، وہ نئے فلسفہ کے ہر راز سے آشنا ہو کر اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں کھول کر دکھاتا تھا یعنی بادہ انگور نچوڑ کر کوثر و تسنیم کا پیالہ تیار کرتا تھا۔

وفد کابل جن تین ممبروں سے بنا تھا، افسوس ہے کہ اس میں یکے بادیگرے دو چل دیئے، سر راس مسعود اور اقبال، اب صرف ایک رہ گیا ہے، اور معلوم نہیں کہ وہ بھی کتنے دن کے لیے ہے، آہ!

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند

مولانا شبلی مرحوم نے اقبال کو اسی وقت پہچان لیا تھا، جب ہنوز ان کی شاعری کے مرغِ شہرت نے پر و بال نہیں پیدا کئے تھے، چنانچہ انہوں نے پیشگوئی کی تھی کہ حالی و آزاد کی جو کرسیاں خالی ہوں گی، ان میں سے ایک اقبال کی نشست سے پر ہوجائے گی، افسوس کہ آج اڑتیس برس کے بعد وہ کرسی خالی ہوگئی، اور اب اسے کے بھرنے کی کوئی صورت نہیں۔

اقبال! ہندوستان کا فخر، اقبال! اسلامی دنیا کا ہیرو، اقبال! فضل کمال کا پیکر اقبال! حکمت و معرفت کا دانا اقبال! کاروانِ ملت کا رہنما اقبال! رخصت رخصت! الوداع سلام اللہ علیک و رحمته الیٰ یوم التلاق! (''س''، مئی ١٩٣٨ء)

خان بہادر، مزمل اللہ، نواب سر

نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر

حاتم یوپی کی وفات

ہمارے صوبہ کے حاتم نواب سر مزمل اللہ خاں بہادر نے ستمبر کی آخری تاریخوں میں اپنے وطن بھیکم پور ضلع علی گڑھ میں وفات پائی، مرحوم کئی سال سے لگاتار بیمار تھے، بخار اور کھانسی کی تکلیف تھی، ضعف کبھی بڑھ جاتا کبھی گھٹ جاتا، اور آخر اتنا بڑھا کہ پھر نہ گھٹا، چوہتر (٧٤) برس کی عمر میں دنیا کے ہر اُتار چڑھاؤ کو دیکھ کر اور ہر سرد و گرم کو آزما کر دین و دنیا دونوں کی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہو کر ٢٨/ ستمبر ١٩٣٨ء کو اس ہری بھری دنیا کو الوداع کہا۔

مرحوم شروانی خاندان کے چشم و چراغ تھے، اور جیسا کہ وہ فرمایا کرتے تھے، سرسیّد کی گودوں میں کھیل کر جوان ہوئے تھے، عربی و فارسی کی تعلیم پائی تھی، اور انگریزی اتنی جانتے تھے کہ اخبار پڑھ اور گفتگو سمجھ لیتے تھے، فارسی کے شاعر تھے، مرزا

سنجر طہرانی سے اصلاحیں لی تھیں، فارسی کا پورا دیوان مرتب تھا، ان کی غزلیں اور نظمیں کئی دفعہ ان کی زبان سے سنیں اور شاید ایک دو دفعہ معارف میں بھی چھپیں، تقریر شگفتہ اور پر مذاق کرتے تھے۔

مولانا شبلی مرحوم کے دوستوں میں تھے، اسی کا اثر یہ تھا کہ وہ مولانا کے کاموں اور تحریکوں سے دلچسپی رکھتے تھے، ندوہ کی طرف ان کا التفات مولانا ہی کے دم قدم اور قلم کے اشاروں سے ہوا، اور دارالمصنفین کی طرف ان کی چشم کرم بھی اسی نسبت کی مرہون ہے، دارالمصنفین اپنی چوبیس برس کی عمر میں حیدرآباد و بھوپال کی سرکاروں کے علاوہ اگر کسی محسن کے فیض سے مستفید ہوا ہے تو وہ بھیکم پور کے رئیس کی ذات تھی، مرحوم نے دارالمصنفین کی مسجد پانچ ہزار کے خرچ سے بنوائی، اور اس کے لیے دری کا فرش اور پردے بنوا کر بھیجے۔

علی گڑھ کالج ایجوکیشنل کانفرنس، مسلم یونیورسٹی، اسلامیہ اسکول اٹاوہ، الہ آباد یونیورسٹی، ہندو یونیورسٹی، دارالعلوم ندوۃ العلماء اور دارالعلوم دیوبند غرض اس صوبہ کا کوئی علمی و تعلیمی ادارہ ایسا نہیں جو ان کے چشمہ فیض سے سیراب نہیں، بلکہ سن کر حیرت ہوگی کہ جمعیۃ العلماء اور کانگریس تک ان کے خوانِ نعمت سے مستفید تھے، وہ ہر قوم اور ہر فرقہ کے نیک کاموں کی امداد میں حصہ لیتے تھے، مسلمان ہندو، عیسائی پارسی کی کوئی تخصیص نہ تھی، غرض جو آیا وہ اپنے نصیب کا حصہ پا گیا۔

ہر کجا چشمۂ بود شیریں
مردم و مور و مرغ گرد آیند

مرحوم اپنی ذاتی دولت مندی کے باوجود بیحد سادہ زندگی بسر کرتے تھے، ایک دفعہ انھوں نے اپنے ململ کے کُرتے کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ تین آنے گز کا ہے اور انھی کے گاؤں کا بنا ہوا ہے لیکن اس ذاتی کفایت شعاری سے بچایا ہوا سرمایہ بے تکلف سال دو سال میں قوم و ملک کے کسی کام کے نذر کر دیتے تھے، وہ اکثر ایسے موقع پر شعر پڑھا کرتے تھے۔

نہ کس می دہاند نہ کسی می دہد
خدامی دہاند خدامی دہد

مرحوم سے آخری ملاقات پچھلے جاڑوں میں بھیکم پور میں ہوئی، وہ خود بھی اپنی زندگی سے مایوس تھے اور ایسے ہی کلمات اُن کی زبان پر تھے، دیر تک حج کے واقعات اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے حالات بیان فرماتے رہے، زندگی کے اختتام اور کسی نیک عمل کے قبول کی حسرت ظاہر کی، میں نے تسلی دی کہ حاتم کی بیٹی دربارِ رسالت میں اپنے باپ کی فیاضی کی بدولت عزت کی مستحق ٹھہری، پھر کوئی سبب نہیں کہ آپ کی تمام عمر کی فیاضی کے کام دربارِ الٰہی میں قبولیت کے مستحق نہ ٹھہریں۔

افسوس کہ ہمارے صوبہ کا یہ حاتم ہم سے رخصت ہوگیا ہر نیک تحریک کا مددگار، ہر اچھے کاموں کا معاون ہر ضرورت پر ہر ایک کے کام آنے والا جاتا رہا، خداوند رحیم و کریم کی بارگاہ بے نیاز میں دعا ہے کہ وہ مرحوم کے اعمال نیک کو قبول فرما کر اس کو اپنی مغفرت کی دولت سے مالا مال کرے اور مرحوم کے خورد سال جانشین کو عمر و اقبال اور توفیقِ خیر سے بہرہ مند فرمائے۔ (''س''، اکتوبر ۱۹۳۸ء)

احسان اللہ، شاہ، پیر

پیر احسان اللہ شاہ صاحب

علمی حلقوں میں یہ خبر غم و افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ جھندم گوٹ ضلع حیدرآباد سندھ کے مشہور عالم پیر احسان اللہ شاہ صاحب جو قلمی کتابوں کے بڑے عاشق تھے چوالیس برس کی عمر میں ۱۳/ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو اس دنیا سے چل بسے، مرحوم حدیث و رجال کے بڑے عالم تھے، اور ان کے کتب خانہ میں حدیث و تفسیر و رجال کی نایاب قلمی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا، ان کے شوق کا یہ عالم تھا کہ مشرق و مغرب مصر و شام و عرب و قسطنطنیہ کے کتب خانوں میں ان کے کاتب اور ناسخ نئی قلمی کتابوں کی نقل پر مامور رہتے تھے، مرحوم ایک خانقاہ کے سجادہ نشین اور طریق سلف کے متبع، اور علم و عمل دونوں میں ممتاز تھے، اللہ تعالیٰ مرحوم پر اپنے انوار رحمت کی بارش فرمائے۔ (''س''، نومبر ۱۹۳۸ء)

ابراہیم، سیٹھ

سیٹھ ابراہیم مہتمم مدرسہ عمر آباد

عمر آباد مدراس میں حاجی عمر (روشن کمپنی) کا خاندان ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ حاجی صاحب امرتسر کے علمائے غزنویہ کے فیض سے مستفیض اور توحید و سنت کے متبع تھے، کامیاب تاجر تھے، اپنے ہی نام سے شمالی آرکاٹ میں ایک زمین خرید کر عمر آباد نام کا ایک مقام آباد کیا تھا اور وہاں ایک بڑے عربی مدرسہ دارالسلام کی بنیاد رکھی تھی، چند سال ہوئے کہ انہوں نے وفات پائی اور تین صالح اولادیں اپنی یادگار چھوڑیں، اسماعیل، ابراہیم اور اسحاق، سب سے بڑے اسماعیل تو کاروبار کے نگراں ہیں اور ابراہیم نے جو منجھلے تھے مدرسہ کی دیکھ بھال، اس کے قیام و ترقی کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا تھا، ابھی پچھلے سال جوہری طنطاوی کی تفسیر کا اردو ترجمہ ایک ہزار روپے کے صرف سے مطبع معارف میں چھپوایا تھا، مدرسہ کے لئے کتب خانہ تنہا اپنی ذات سے کتابیں خرید کر فراہم کیا تھا، اس کے لئے ایک عمارت بھی بنوائی تھی، افسوس کہ یہ پھول کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گیا، یعنی ۳۰/ رجب ۱۳۵۷ھ کو اس دنیائے ناپائیدار کو الوداع کہا، رحمہ اللہ تعالیٰ۔ (''س''، نومبر ۱۹۳۸ء)

اتاترک، مصطفےٰ کمال

غمِ کمال

آخر اس عیسیٰ نفس کو بھی موت آگئی جس نے بیمار ٹرکی کو شفا، اور اس کو موت کے پنجہ سے چھڑا کر زندگی بخشی تھی، دنیا نے اس کا ماتم کیا، اور عجیب تر یہ ہے کہ انھوں نے بھی اس کا ماتم کیا جنھوں نے اس کو تختہ دار پر چڑھانے میں کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی تھی لیکن اس کی تلوار نے ہر بیڑی کو کاٹا اور ہر زنجیر کے ٹکڑے کئے اور پرانی ٹرکی کو جلا کر اس کی راکھ سے ایک نئی ٹرکی بنا کر کھڑی کی ۱۹۲۰ء میں کون خیال کرسکتا تھا کہ اتحادیوں کے پنجۂ ستم سے بچ کر یہ شکار صحیح وسلامت نکل آئے گا، مگر اس کی تدبیروں نے آخر ہر تدبیر کو شکست دی، ڈاکٹر اقبال نے سچ کہا:

قاہری با دلبری پیغمبری است

ایسا سیاسی پیغمبر اگر کوئی ہوا ہے تو وہ مصطفیٰ کمال اتاترک تھا، جو تاج وتخت، خدم وحشم، باڈی گارڈ اور محافظوں کے دستہ کے بغیر ملک پر حکمرانی کرتا تھا، اس نے اسلام کے اس سیاسی رنگ کا دھندلا سا منظر پیش کیا تھا، جس کے دیکھنے کو خلافت راشدہ کے بعد سے مسلمانوں کی آنکھیں بیتاب تھیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی مغفرت ورحمت کے فتوحات سے سرفراز فرمائے اور ان کی اجتہادی غلطیوں سے درگزر کرے۔ (''س''، دسمبر ۱۹۳۸ء)

علی، شوکت، مولانا

مولانا شوکت علی

ہندوستان کی اسلامی دنیا گزشتہ مہینہ ایک اور صدمۂ عظیم سے دوچار ہوئی، یہ مولانا شوکت علی صاحب کی ناگہانی موت کا سانحہ ہے، یہ وہ شخصیت ہے جس نے تیس برس تک مسلمانوں کی خدمت کی، وہ نہ عالم تھے، نہ مقرر تھے، وہ جیسا کہ خود کہا کرتے تھے سپاہی تھے، ان تھک کام کرنے والے، نڈر، پردل اور پرامید، وہ کبھی کسی حال میں ناامید نہیں ہوتے تھے، ان کی تقریر چند فقروں کی ہوتی تھی، مگر وہ فقرے لوگوں میں روح پھونک دیتے تھے، وہ اپنے ساتھیوں کو بھی کبھی مایوس نہیں ہونے دیتے تھے، یہ انہیں کا کام تھا کہ ۱۹۲۰ء سے مرتے دم تک سارے ہندوستان کو چھان مارا تھا، تیس برس کی جانکاہ محنت کے بعد موت نے سپاہی کی کمر کھول دی اور وہ ابدی آرام کے لئے دائمی نیند سوگیا، جامع مسجد دلّی کی سیڑھیاں ان کی خواب گاہ بنیں چشم اعتبار اس کے لوح مزار پر یہ شعر کندہ پائے گی:

زباں دانِ محبت بودہ ام دیگر نمید انم

ہمی دانم کہ گوش از دوست پیغامے شنید اینجا

حزیں از پائے رہ پیمابسے سرگشتگی دیدم

سر شوریدہ بربالین آسائش رسید اینجا

میری ان کی سب سے پہلی ملاقات ۱۹۱۲ء میں ہوئی، بنگلور میں اسلامی تعلیمی کانفرنس تھی، وہ لکھنؤ کی سمت سے اور مجھے مولانا شبلی مرحوم نے بمبئی سے بھیجا تھا، ہم دونوں کا ساتھ اس گاڑی میں ہوگیا، جو دونوں سمتوں کے مسافروں کو لے کر بنگلور جاتی تھی، رات کا وقت تھا، وہ اس زمانہ میں نوکری سے الگ آغا خان کے سکریٹری کی حیثیت سے مسلم یونیورسٹی کے لئے چندہ جمع کررہے تھے، وہ پہلے بھی صاحب تھے اور اس وقت بھی پورے صاحب تھے۔

اس وقت ایک واقعہ یاد آگیا، تھوڑی دیر کی گفتگو کے بعد میں نے عشاء کی نماز کی تیاری کی، مرحوم نے اس وقت کہا مولانا! میرا بھی جی نماز پڑھنے کو بہت چاہتا ہے، مگر کیا کروں، وضو کے پانی سے قمیض کے کف اور کالر خراب ہوجاتے ہیں، بات آئی گئی ہوگئی چند ہی سال کے بعد خدام کعبہ اور خلافت کی تحریک میں وہ اٹھے، تو پھر دیکھا کہ نہ وہ کوٹ ہے، نہ پتلون ہے، نہ کف ہے، نہ کالر، موٹے کپڑے کا کُرتا اور پائجامہ ہے۔ وضو بھی ہوتا ہے، نمازیں بھی ہوتی ہیں، جسم کی ضخامت کے سبب سے سجدہ میں جھک نہیں سکتے تھے، چارزانو بیٹھ کر نماز پڑھتے تھے، جھک کر سجدہ کرتے تھے، اللہ مغفرت فرمائے۔ (''س''، دسمبر ۱۹۳۸ء)

میکڈوگل، ولیم

ولیم میکڈوگل

گذشتہ نومبر میں انگلستان کے مشہور ماہر نفسیات ولیم میکڈوگل کا انتقال ہوگیا، وہ ۱۸۷۱ء میں لنکاشائر میں پیدا ہوا، مانچسٹر میں تعلیم پا کر کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوا، اور آخر میں لندن یونیورسٹی سے طب کی ڈگری حاصل کی، لیکن نفسیات میں اس کا مطالعہ اتنا گہرا تھا کہ وہ لندن یونیورسٹی میں اس کا لکچرار مقرر ہوا، اور پھر ذہنی فلسفہ کا پروفیسر ہوکر آکسفورڈ چلا گیا، ۱۹۲۰ء میں وہ ممالک متحدہ بلا لیا گیا، جہاں وہ ہارورڈ اور ڈیوک یونیورسٹی میں معلّمی کے فرائض انجام دیتا رہا۔

اس نے مندرجہ ذیل کتابیں لکھی ہیں، جن میں سے ہر ایک کے بہت سے اڈیشن شائع ہوچکے ہیں، (۱) خلاف معمول نفسیات کا ایک خاکہ، (۲) ذہین اجتماع، (۳) نفسیات کردار کا مطالعہ، (۴) مردوں کی قوتیں، (۵) زندگی کا مذہب اور سائنس، (۶) بورنیو کے غیر شائستہ قبائل، (۷) معاشرتی نفسیات کا مقدمہ، (۸) نفسیات کا ایک خاکہ، (۹) ''زندگی کی سیرت اور طور طریقے، ان میں ''معاشرتی نفسیات کا مقدمہ'' زیادہ مقبول ہے، نفسیات سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ کے لئے ''نفسیات کا ایک خاکہ'' بھی

مفید اور ضروری کتاب ہے، زندگی کی سیرت اور طور طریقے'' آسان اور عام پسند ہے۔

ولیم میکڈوگل نے نفسیات کے اتنے مختلف نظریئے قائم کئے ہیں، کہ ان پر آئندہ بہت سی کتابیں اور شرحیں لکھی جائیں گی، لیکن اس نے سب سے زیادہ ''جبلت'' پر لکھا ہے، جبلت کی تعریف اس نے یہ کی ہے کہ یہ حسب منشا کام کرنے کی ایک فطری اور پیدائشی صلاحیت کا نام ہے، جو انسان کے علاوہ جانوروں، پرندوں اور کیڑوں پر بھی پائی جاتی ہے، ولیم میکڈوگل کے خیال کے مطابق چودہ جبلتیں ہوتی ہیں، مثلاً نقل، کھیل، خوشی، محبت، نفرت، غصہ، رنج، لڑائی، فرار، بے چینی، غول بندی، جنسی خواہش وغیرہ، بعض ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ جبلتیں صرف تین ہی ہوتی ہیں، خود غرضانہ، معاشرتی اور جنسی، مگر میگڈوگل نے دکھایا ہے کہ ان تینوں میں سے ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ قسمیں ہیں، جن میں مذکورہ بالا چودہ جبلتوں کی تطبیق صحیح صحیح ہوجاتی ہے۔

ولیم میکڈوگل کا خیال ہے کہ ایک انسان اپنی جبلتوں کا محض تودہ نہیں ہوتا، اور نہ وہ ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ رہتی ہیں، بلکہ ان میں باہمی ربط ہوتا ہے، اور یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ انسان جبلت کے تغیر میں مجبور ہے، صحیح تربیت اور نشو و نما سے جبلت جذبہ میں اور جذبہ وجدان میں بدلا جاسکتا ہے، ولیم میکڈوگل نے سارا زور افراد اور اقوام کے وجدان پر دیا ہے، جس سے ایک قوم کو دوسری قوم کا مطالعہ کرنے میں بڑی سہولتیں پیدا ہوگئی ہیں۔ (''ص۔ع''، مارچ ۱۹۳۹ء)

خان، محمد عرفان، مولانا

مولانا محمد عرفان خاں

ایک مجاہد کا ماتم

مولانا محمد عرفان خاں صاحب معتمد خلافت بمبئی کی ناگہانی وفات کی خبر اخباروں کے ذریعہ آپ تک پہنچی ہوگی، مرحوم ہزارہ سرحد کے رہنے والے تھے، اور سلسلہ خیرآباد کے عالم معقولات اور مدرس تھے، ۱۹۲۰ء کی قومی تحریکات نے درس و تدریس کی مسند سے اٹھا کر قوم و ملت کے عملی کاموں سے ان کو وابستہ کردیا، ان کی سب سے مخلصانہ خدمت ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۴ء میں ملکانوں کے فتنہ ارتداد کے موقع پر ان کی جانبازی، ایثار اور محنت ہے، ان کے علاقوں میں بیسیوں میل پیادہ اور بھوکے پیاسے سفر کرنا اور ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں مارے مارے پھرنا ان کی زندگی کا اہم کارنامہ ہے، اس کے بعد انھوں نے جمعیۃ العلماء دہلی سے وابستہ ہوکر جمعیۃ کے کاموں کو کچھ زمانہ تک انجام دیا، اور شریف حجاز اور ابن سعود کی لڑائی کے زمانہ میں حجاز جاکر معاملات کی تحقیقات کے لیے نامزد ہوئے، پھر ۱۹۲۶ء میں موتمر اسلامی کی شرکت کے لیے گئے اور وہاں سے واپسی پر وہ بمبئی کی مجلس خلافت کے کاموں میں مصروف ہوگئے، اور اسی مصروفیت میں ان کی زندگی کے آخری سال بسر ہوئے، ان کی عمر اس وقت پچاس سے زیادہ نہ ہوگی، بلند و بالا مضبوط اور قومی تھے، ایک دفعہ وہ قومی تحریکوں کے سلسلہ میں قید بھی ہوئے تھے، اور اسی قید میں انھوں نے یہ سعادت پائی کہ حافظ قرآن ہوئے۔

مرحوم نہایت دوست پرور ہنس مکھ، ظریف اور فیاض تھے، صوبہ سرحد سے وہ مدتوں جلاوطن رہے، جلاوطنی کا دور ختم ہوا تب بھی وطن جاکر اپنی خدمات کی وسعت کو انھوں نے محدود کرنا پسند نہیں کیا، تمام عمر مجرد رہے، اور اسی طرح پوری عمر گذار دی، ایک طرف وہ فقیر بے نوا تھے، دوسری طرف حد درجہ غیور اور شریف، غالب کا مصرع آج ہی صادق آیا ہے:

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

(''س''، مئی ۱۹۳۹ء)

اشرف، سید محمد سلیمان، مولانا

مولانا سید محمد سلیمان اشرف

چار سلیمانوں کی رباعی قاضی محمد سلیمان صاحب مصنف رحمۃ للعالمین کی وفات سے مثلث ہوگئی تھی، شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کی رحلت سے وہ فرد بن گئی تھی، اب اخیر اپریل ۱۹۳۹ء میں مولانا سلیمان اشرف صاحب (استاذ دینیات مسلم یونیورسٹی) کی موت سے مصرع ہوکر رہ گئی، دیکھنا یہ ہے کہ یہ مصرع بھی دنیا کی زبان پر کب تک رہتا ہے۔

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

مولانا سید محمد سلیمان اشرف صاحب مرحوم بہار کے ایک مردم خیز دیہات کے رہنے والے اور شرفائے سادات کے خاندان سے تھے، ان کے والد مرحوم حکیم عبداللہ صاحب اور ان کے اعمامِ محترم مولانا عبدالقادر صاحب، مولوی عبدالرزاق صاحب، مولوی عبدالغنی صاحب و مولانا عبیداللہ صاحب اہل علم و فقر تھے، مولانا مرحوم نے درس کا بڑا حصہ مولانا محمد احسن صاحب استھانوی بہاری سے حاصل کیا تھا اور کچھ دن دارالعلوم ندوہ میں بسر کئے تھے، اور آخر میں منطق و فلسفہ کی آخری کتابیں مولانا ہدایت اللہ خان صاحب رامپوری ثم الجونپوری سے پڑھی تھیں، جو یورپ میں خیرآبادی سلسلہ کے خاتم تھے، مولانا سید سلیمان اشرف صاحب مرحوم کو حقیقت یہ ہے کہ اپنے استاد کے ساتھ عقیدت ہی نہیں، بلکہ عشق تھا، ان کے حالات وہ جب کبھی سناتے تھے، تو ان کے طرز بیان گفتار کی ہر ادا سے ان کی والہانہ عقیدت تراوش کرتی تھی۔

مرحوم خوش اندام، خوش لباس، خوش طبع، نظافت پسند، سادہ مزاج اور بے تکلف تھے، ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی خودداری اور اپنی عزت نفس کا احساس تھا، ان کی

ساری عمر علی گڑھ میں گذری جہاں امراء اور ارباب جاہ کا تانتا لگا رہتا تھا، مگر انھوں نے کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی، اور نہ ان میں سے کسی سے دب کر یا جھک کر ملے جس سے ملے برابری سے ملے اور اپنے عالمانہ وقار کو پوری طرح ملحوظ رکھ کر، علی گڑھ کے سیاسی انقلابات کی سیاسی آندھیاں بھی ان کو اپنی جگہ سے ہلا نہ سکیں، علی گڑھ کے عشرت خانہ میں ان کی قیامگاہ ایک درویش کی خانقاہ تھی، یہاں جو آتا جھک کر آتا، اگر مجلس سازگار ہوئی تو دعائیں لے کر گیا، ورنہ الٹے پاؤں ایسا واپس آیا کہ پھر ادھر کا رخ نہ کیا۔

وہ نہایت فیاض، کشادہ دست اور سیر چشم تھے، دو تین سال کے علاوہ ان کی ساری عمر تجرد کی حالت میں گذری کوئی اولاد نہ تھی، خاندان کے عزیزوں سے طبیعت کو چنداں مناسبت نہ تھی، جو کچھ تھا احباب کی نذر تھا، استادزادوں اور دوستوں اور دوستوں کی اولادوں کے ساتھ وہ کچھ کیا جس کو اس زمانہ میں مشکل سے کوئی دوسرا کر سکتا ہے، انتہا یہ ہے کہ مرتے دم جو کچھ چھوڑا وہ بھی نذرِ احباب۔

ان کی مجلس سدا بہار تھی، وہ خود سدا بہار تھے، فکر و غم کا ان کے ہاں گذر نہ تھا، اپنی ضعیف والدہ کی اطاعت اور اپنے ایک دیوانہ بھائی کی رفاقت اور خدمت میں عمر اس طرح گذاری کہ اس کی نظیر مشکل ہے، ان کی مجلس میں پچھلے علماء کے حالات اور ان کی خوبیوں کے تذکرے اکثر رہا کرتے کبھی کبھی کسی علمی مسئلہ پر اظہار خیال ہوتا، ان کی تقریر و وعظ میں بڑی دلچسپی اور گرویدگی تھی، ادھر بیس (۲۰) برس سے تقریر چھوڑ دی تھی، ایک دو جگہیں مخصوص تھیں جہاں وہ سال میں ایک دفعہ میلاد پڑھا کرتے تھے، ان کے مذہبی خیالات علمائے بریلی کے مطابق تھے اور ان کے بڑے مداح تھے، پھر بھی ان کی ملاقات اور میل جول ہر خیال کے لوگوں سے تھا وہ کسی سے مناظرہ نہیں کرتے تھے اور جب کرتے تھے تو گھ جاتے تھے طبیعت میں ظرافت اور لطافت تھی غصہ بھی جلد آجاتا تھا، اپنے مزاج کے خلاف ایک حرف سن نہیں سکتے تھے۔

تحریر و تالیف کا بھی ذوق تھا، خسرو کی ایک مثنوی پر مقدمہ لکھا ہے، حج کے مسائل اور عربی کے فضائل پر دو رسالے لکھے ہیں، ایک کتاب مبین نام عربی فیلالوجی پر لکھی تھی، جس پر ہندوستانی اکیڈمی نے پانچ سو کا انعام دیا تھا اور بھی متفرق مضامین لکھے تھے، یونیورسٹی میں علوم اسلامیہ کے درس کے علاوہ عصر کے بعد قرآن پاک کی تفسیر پڑھایا کرتے تھے، خاص خاص شوقین طالب علم اس میں شریک ہوتے۔

ان کی وفات سے دو تین ہفتے پہلے ان سے علی گڑھ میں ملاقات ہوئی تھی، کمزور و نحیف تھے، مسلسل بخار نے ان کو نیم جان کر دیا تھا، پھر بھی حسب دستور بعد عصر اپنی قیامگاہ کے برآمدہ میں مونڈھے پر بیٹھے تھے، احباب آس پاس حلقہ باندھے اور وہ مصروف خوش کلامی تھے میں نے عمر پوچھی تو ٹال گئے، میں نے اپنی عمر کے اندازہ سے ان کا اندازہ لگا کر عرض کیا کہ عجیب نہیں کہ آپ کی پیدائش ۱۸۷۸ء کی ہو، ہنس کر بولے، مجھے تو اپنی عمر آپ معلوم نہیں اور آپ کو معلوم ہے، یہاں تک کہ سنہ بھی بتادیا، اس انکار پر بھی میرا قیاس یہی ہے کہ ان کی پیدائش کا سال قریب قریب یہی ہوگا، اور اس وقت ان کی عمر ساٹھ پینسٹھ کے بیچ میں ہوگی، دیکھنے میں تنومند، اور صحیح معلوم ہوتے تھے، مگر اندر سے کھوکھلے ہو چکے تھے، اخیر ملاقاتوں میں اپنے وطن کے بعض دوستوں کی بے وقت موت اور عزیزوں کی محبت کی محرومی سے بے حد متاثر تھے، رحمۃ اللہ علیہ۔

(''س''، جون ۱۹۳۹ء)

فرائڈ، سگمنڈ

سگمنڈ فرائڈ

گذشتہ ستمبر میں آسٹریلیا کے مشہور محلل نفسی سگمنڈ فرائڈ کا پچاسی سال کی عمر میں لندن میں انتقال ہوگیا۔

نفسیات میں اس کا موضوع جنسی جبلت تھا، پچاس برس تک وہ اس پر غور و فکر کرتا رہا، شروع میں اس نے پانچ سال تک وائنا میں عصبی المزاجی پر تحقیقات کی، ۱۸۹۶ء میں جب اس نے اپنے لکچروں میں یہ دعویٰ کیا کہ عصبی المزاج اشخاص کے مرض کا سبب ان کی جنسی جبلت میں پایا جاتا ہے، تو عام طور سے اسے مضحکہ انگیز سمجھا گیا، لیکن عصبی المزاجی کے مریض رفتہ رفتہ سگمنڈ فرائڈ کی طرف رجوع کرنے لگے، ان میں بعض ایسے تھے، جو جانوروں سے غیر معمولی طور سے خوفزدہ رہتے تھے یا گفتگو میں ہکلاتے تھے، یا تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اپنے ہاتھوں کو پانی سے دھوتے رہتے تھے، یا سر کے درد یا کسی اور بیماری میں مدتوں سے مبتلا رہتے تھے، یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مفلوج تھے، ان میں سے اکثر جنون کی حد تک پہنچ چکے تھے، فرائڈ ان تمام امراض کا علاج نفسیاتی طریقہ سے کرنا چاہتا تھا، مگر اس سے اس کو اب تک واقفیت نہیں ہوئی تھی۔

اس قسم کے امراض کا علاج عموماً مصنوعی نیند کے ذریعہ سے کیا جاتا تھا، ایک دن فرائڈ کے ایک دوست ڈاکٹر جوزف بردار نے اس سے اپنی ایک مریضہ کا واقعہ بیان کیا، مریضہ کی عمر اکیس سال تھی، اس کا باپ ایک مہلک مرض میں مبتلا تھا، وہ اس کی تیمارداری کرتی تھی، کہ ایک دن اس کے داہنے ہاتھ اور دونوں پیروں میں فالج گر گیا، ڈاکٹر مذکور نے مصنوعی نیند کی حالت میں مریضہ سے مختلف سوالات کئے، اس سے مرض کے تمام علامات ظاہر ہوتے گئے، تیمارداری کے زمانہ میں لڑکی نے اپنی بہت سی خواہشوں کو غیر سنجیدہ، غیر اخلاقی اور خود غرضانہ سمجھ کر دبا رکھا تھا، ان میں سے ہر خواہش مرض کا سبب ثابت ہوئی، مثلاً ایک شام کو وہ اپنے باپ کے پاس بیٹھی تھی کہ پڑوس کے مکان سے ناچ کے باجہ کی آواز سنی، اس کے دل میں ناچ میں شریک ہونے کی خواہش پیدا ہوئی، لیکن اس نے اس خواہش کو دبا دیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ ناچ کے باجہ

کی آواز سنتی تو زور سے کھانسنے لگتی، اس واقعہ کا حیرت انگیز حصہ یہ ہے کہ جب مریضہ کو اپنے مرض کے اسباب اور اس کی نوعیت سے واقفیت ہوئی تو اس کے سارے امراض جاتے رہے۔

فرائڈ کو اس واقعہ سے بڑی دلچسپی ہوئی، اور وہ اپنے ڈاکٹر دوست کے ساتھ کام کرنے لگا، وہ بھی عصبی المزاج اشخاص سے مصنوعی نیند میں مختلف قسم کے سوالات کرکے نفسیاتی نتائج پر پہنچنے کی کوشش کرتا تھا، اور اس نے دبے ہوئے جذبات اور خواہشوں کے ازالہ کی صورتوں پر غور و تحقیقات شروع کی۔

اس کی تحقیقات پر اعتراضات ہونے لگے، اس وقت ڈاکٹر مذکور نے فرائڈ کے ساتھ کام کرنا چھوڑ دیا، مگر فرائڈ برابر اپنے مریض کے بھولے ہوئے خیالات اور دبے ہوئے جذبات کو معلوم کرنے کے طریقوں پر غور کرتا رہا، ایک دن اس کے ایک مریض نے اپنی مصنوعی نیند کے سوال و جواب کو لفظ بلفظ دہرا دیا، اس سے فرائڈ کی تحقیقات کی نوعیت بالکل بدل گئی، اس لئے مصنوعی نیند کے طریقہ کو چھوڑ کر مریضوں سے براہ راست گفتگو کرنا زیادہ بہتر اور مفید سمجھا، وہ مریض کو اپنے دفتر میں لٹا دیتا، اور اس کے تمام افکار و خیالات کو معلوم کرنے کی کوشش کرتا، مریض شروع میں چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر کرتا، پھر رفتہ رفتہ وہ اپنی گذشتہ زندگی کے بھولے ہوئے واقعات کو دہراتا، فرائڈ اپنے نکتہ رس ذہن اور نفسیاتی تجزیہ کے ذریعہ واقعات کو ترتیب دے کر مرض کی نوعیت کو سمجھتا۔

عصبی المزاج اشخاص کی ایک بڑی تعداد کو دیکھنے کے بعد فرائڈ اس نتیجہ پر پہنچا ہے، کہ ان کے مرض کا واحد سبب ان کی جنسی پراگندگی ہے، جو محض ناخوشگوار ازدواجی زندگی اور ناکامیاب محبت کی وجہ سے نہیں ہوتی، بلکہ بچپن کے اور بہتیرے واقعات بھی اس کا سبب ہوتے ہیں، چنانچہ فرائڈ نے اپنے نظریہ کی تشریح کے لئے دو اصطلاحیں وضع کی ہیں، (Oedipus Complex اور Libido) Libido لاطینی لفظ ہے، جس کے معنی جنسی خواہش کے ہیں، Oedipus یونانی قصوں میں تھیبس کا بیٹا بتایا جاتا ہے، اس نے اپنے باپ کو قتل کرکے ماں سے شادی کرلی تھی۔

فرائڈ کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کی سب سے زبردست قوت اس کی جبلت جنسی ہے، لڑکپن میں اس کا اظہار انگوٹھا چوسنے، کھانے اور جسم سے فضلہ کے اخراج کے ذریعہ ہوتا ہے، آگے چل کر یہ جبلت یا تو شادی کے ذریعہ ایک دوسری ذات میں منتقل ہوجاتی ہے، یا غلط راستہ پر پڑ کر ناروا صورت اختیار کرلیتی ہے، یا لطیف اور بلند ہوکر تکوینی قوتوں کا باعث ہوتی ہے، فرائڈ کا خیال ہے کہ کسی ملک کا آرٹ، علم اور موسیقی وغیرہ اسی وقت ترقی کرسکتے ہیں جب اس کے افراد کی جنسی جبلت کی پست سطح کو بلند کردیا جائے۔

اسی جبلت کی بنا پر بعض اوقات لڑکے اپنی ماں سے غیر معمولی محبت اور باپ سے نفرت کرتے ہیں، جس کو فرائڈ ادیپس گرہ (Gedipus Complex) کہتا ہے، کبھی باپ کے ساتھ محبت بھی برقرار رہتی ہے، لیکن اندرونی طور پر بچوں کے دلوں میں باپ سے رشک و حسد ہوتا ہے، اسی جبلت کے ماتحت لڑکیاں باپ سے زیادہ اور ماں سے کم محبت کرتی ہیں، بچپن کے یہ ذہنی رجحانات بلوغ میں دوسری طرف منتقل ہوجاتے ہیں، مگر جو کمزور طبائع ان پر غالب نہیں ہوتے، وہ جنسی خواہشوں کی بے راہ روی سے عصبی المزاجی کے شکار ہوجاتے ہیں۔

جنگ عظیم سے پہلے وائنا میں جہاں ہر قسم کی آزادی حاصل تھی، فرائڈ کے نظریوں کا مذاق اڑایا گیا، اطباء نے اس کے خلاف احتجاج کیا کہ اس نے جنسی جبلت کو غیر معمولی اہم بنا کر بچپن کی معصومیت کے خوشگوار تخیلات کو درہم برہم کردیا ہے اور اولاد و والدین کی پر کیف محبت و شفقت کی خواہ مخواہ عیب جوئی کی ہے، لیکن جنگ کے بعد فرائڈ کے نظریہ سے عام دلچسپی پیدا ہوگئی، اس کی اصطلاحات کا حوالہ کثرت سے آنے لگا، بعض حلقوں میں فرائڈ کا نظریہ تعیش پسندی کا اجازت نامہ سمجھا گیا، مگر فرائڈ کا نظریہ ہرگز اس کا حامی نہیں، وہ تمدنی زندگی کے لئے تہذیب نفس کو بہت ضروری سمجھتا ہے، اور جنسی خواہشات کے نامناسب ضبط اور اس کی بے جا آزادی میں ایک درمیانی راستہ نکالنا چاہتا ہے۔

فرائڈ کے نظریہ کی حامی اور مخالف دونوں جماعتیں پیدا ہوگئی ہیں، حامیوں کی تعداد ممالک متحدہ امریکہ میں زیادہ ہے، مگر اس میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں، جن کو فرائڈ کے نظریہ سے پورا پورا اتفاق نہیں، وہ جنسی جبلت اور اڈیپس گردہ کو اتنی اہمیت نہیں دینا چاہتے ہیں، بلکہ ان کا خیال ہے کہ جنسی خواہشوں سے زیادہ سوسائٹی اور معاشرت شخصیت کو مجروح کرتی ہیں، چنانچہ زیورچ کے مشہور ماہر نفسیات کارل جنگ نے فرائڈ کے نظریہ سے منحرف ہوکر ''نیم مذہبی طریقۂ علاج'' کی تلقین کی، الفراڈ ایڈلر نے فرائڈ کے نظریہ پر تنقید کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ انسانی طبائع کا سرچشمہ جنسی خواہش نہیں، بلکہ جذبۂ برتری ہے، عام طور سے جسمانی کمزوری یا بزرگوں کی سختی اور دباؤ سے ان میں کمتری کا احساس پیدا ہوجاتا ہے، مگر اسی احساس کمتری کے ذریعہ کمزوری کو قوت اور کمی کو زیادتی میں تبدیل کیا جاسکتا ہے، مثلاً ڈیموستھینیز ہکلا اور بیتھوون بہرا تھا، ان دونوں میں کمتری کا احساس پیدا ہوا، اور انھوں نے اسے دور کرنے کی اتنی کوشش کی، کہ ڈیموستھینیز کی خطابت آج تک مشہور ہے، اور بیتھوون کا موسیقی کا کارنامہ اب تک فخر سے بیان کیا جاتا ہے۔

گزشتہ سال جب نازیوں نے وائنا پر قبضہ کیا تو فرائڈ کی ساری ملکیت ضبط کرلی گئی، اس زمانہ میں اس کے جبڑے میں سرطان ہوگیا تھا، وہ آخری عمر میں اپنے وطن کو چھوڑنا نہ چاہتا تھا، لیکن مجبوراً اسے چھوڑ کر لندن میں پناہ لینی پڑی، یہاں اس نے بڑی پرسکون زندگی بسر کی، صرف خطوط کے جواب دیتا تھا، اور کبھی کبھی پرانے مریضوں

کو کچھ ہدایت دے دیا کرتا تھا، لیکن اس کی زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے، چنانچہ گزشتہ ستمبر میں وہ اس دنیا سے چل بسا، گزشتہ سولہ سال سے اس کی صحت اچھی نہ تھی، اس مدت میں اس کے پندرہ آپریشن ہوئے، مگر اپنی تکلیف کے متعلق کبھی ایک لفظ زبان پر نہ لایا، اور برابر مسرور مطمئن نظر آتا تھا۔

اس جلاوطنی کے زمانہ میں اس نے ایک کتاب ''موسیٰ اور توحید'' لکھی، جس میں یہودیوں کی تاریخ، روایات وقصص پر نظر ڈال کر یہ دعویٰ کیا ہے کہ یہودی مذہب کے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام یہودی (اسرائیلی) نہ تھے بلکہ مصری تھے، فرائڈ کا بیان ہے کہ اگر یہ دعویٰ تسلیم کرلیا جائے، تو پھر یہودیوں کی تاریخ نفسیاتی طور سے بالکل واضح اور صاف ہوجاتی ہے۔ اگر حضرت موسیٰ مصری تھے تو وہ موحد تھے، کیونکہ امن ہوٹپ چہارم کے زمانہ میں مصر میں توحید پرستی شروع ہوئی، اس نے تمام مقامی دیوتاؤں کو نیست و نابود کرکے اپنے ملک میں توحید کو رائج کیا، لیکن اس کے مرنے کے بعد توحید کو فروغ نہ ہوا، اور پھر پرانے دیوتاؤں کی پرستش شروع ہوگئی، صرف ایک محدود حلقہ میں توحید باقی رہ گئی، اگر حضرت موسیؑ مصری تھے، تو وہ اسی محدود حلقہ سے تعلق رکھتے تھے، امن ہوٹپ کی وفات کے بعد طوائف الملوکی کے دور میں حضرت موسیٰ علیہ السلام غلام یہودیوں کو اپنا پیرو بنا کر ان کو مصر سے باہر لے گئے، اور انھیں قانون، رسم و رواج اور معاشرتی نظام کی تعلیم دی۔ حضرت موسیٰ تندمزاج، سرگرم، لائق اور حوصلہ مند مصری تھے، چنانچہ فرائڈ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ یہودیوں نے آخر میں حضرت موسیؑ کو قتل کر دیا لیکن ان کے قتل کے بعد توحید باقی رہی، سچائی، عدل، اور انصاف کا رواج ہوا، بتوں، سحر، جادو، اور دیوتاؤں سے عقیدت ختم ہوگئی، مگر یہودیوں کے دماغ پر اپنے پیغمبر کے قتل کا جرم محیط رہا، کہ نفسیاتی طور سے ان کا ذہن ہمیشہ پراگندہ اور منتشر رہا، ان کے ذہن کی یہ ژولیدگی اور پراگندگی اسی وقت جاسکتی ہے، جب وہ اپنے اس جرم کے ارتکاب کا صاف صاف اعتراف کرلیں۔

فرائڈ کا خیال ہے کہ یہودیوں سے جرمنوں کی نفرت کی وجہ ان کی توحید سے برگشتگی ہے، جرمن عیسوی مذہب کے پیرو ضرور ہیں، مگر ان کو جبرو اکراہ سے عیسائی بنایا گیا تھا، جس کے اثرات ان کے افعال میں غیرشعور طور پر اب تک نمایاں ہیں اور عیسائی مذہب سے ان کی برگشتگی یہودیوں کے سامی اور موحدانہ مذہب سے نفرت میں منتقل کی جارہی ہے۔

فرائڈ کے منطقیانہ دلائل، تاریخی واقعات اور انسانیاتی نتائج میں خامیاں ہیں، لیکن اس کتاب سے خاص دلچسپی لی جارہی ہے، کیونکہ فرائڈ نے قوموں کی تحلیل نفسی کرکے بعض عجیب وغریب تاریخی نظریے پیش کئے ہیں۔

(''ص۔ع''، اکوبر ۱۹۳۹ء)

بدایونی، سیدعنایت احمد نقوی، مولانا

ایک صاحبِ علم کی وفات

مولوی سیدعنایت احمد نقوی بدایونی

(مولوی سید آل علی نقوی بدایونی)

آج کل ہندوستان میں جب علوم مشرقی کے واقف کے کارروز بروز کم ہورہے ہیں، کسی پرانے صاحب علم کے سانحہ ارتحال پر دلی صدمہ ہوتا ہے، جو کہ ان کی جگہ جو آئیں گے وہ اپنے قدیم علوم کے اتنے واقف بھی نہ ہوں گے۔

بدایوں ہمیشہ سے فضل و کمال کا گھر رہا ہے یہیں ایک پرانا خاندان مولینا علاؤالدین اصولی کا تھا، مولینا ممدوح الشان علم ظاہر و باطن دونوں میں ممتاز تھے، اور یہ فخر کچھ کم نہیں کہ حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء انکے شاگردوں میں تھے، فقہ حنفی میں قدوری مولینا سے پڑھی تھی، کہتے ہیں کہ بچپن میں وہ شیخ جلال تبریزی کے فیض سے مشرف ہوئے تھے، زہد و ورع اور فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی، مگر کسی سے نذر و ہدیہ ضرورت سے زیادہ کبھی قبول نہیں فرمایا، اصولی کے لقب سے شہرت کے یہ معنی ہیں کہ وہ اصول فقہ میں کمال رکھتے تھے، زمانہ وفات معلوم نہیں لیکن بہر حال وہ ساتویں صدی ہجری میں تھے۔

مولینا اصولی کی مبارک یادگار اس زمانہ میں مولوی سیدعنایت احمد صاحب نقوی بدایونی تھے، افسوس ہے کہ موصوف نے ابھی پچھلے مہینہ ۲۳/ رمضان ۱۳۵۸ھ کو بدایوں میں وفات پائی، ان کا بڑا علمی کارنامہ علامہ کمال الدین فارسی شاگرد علامہ محمود بن مسعود شیرازی کی تنقیح المناظر کے نسخوں کی تصحیح و مقابلہ ہے، تنقیح المناظر مشہور عالم بصریات (علم المرایا و المناظر) ابن ہیثم التونی ۴۳۰ھ کے وسائل علم المناظر کی تلخیص و تشریح ہے، نواب عماد الملک مرحوم جو اسلامی علوم وفنون کے اس زمانہ میں سب سے بڑے قدردان تھے، ان کو ابھی کتاب کی اشاعت کی جو مسلمانوں کی علم نور اور علم بصر کی عظیم الشان تحقیقات پر مشتمل ہے، بڑی فکر تھی، اس کتاب کے دو نسخے ہندوستان میں موجود تھے، ایک رامپور کے اور دوسرا پٹنہ کے کتب خانہ میں، اور تیسرا نسخہ لیڈن کے کتب خانہ میں ملا، چونکہ یہ کتاب ریاضیات کے اہم مسائل پر مبنی تھی، اس لیے اس کی تصحیح کوئی آسان کام نہ تھا، چنانچہ نواب عماد الملک مرحوم نے اس کے لیے مولوی عنایت احمد صاحب نقوی کا انتخاب کیا، موصوف نے رامپور اور پٹنہ کے نسخوں کا مقابلہ کیا، اور حتی الامکان تصحیح فرمائی، اور یہ کام مئی ۱۹۲۱ء میں انجام دیا، اس کے بعد یہ نسخہ لیڈن کے نسخہ کے مقابلہ کے لیے مستشرق کرنکو کے پاس لندن بھیجا گیا، اوراس کے بعد دائرۃ المعارف حیدرآباد نے اس کو دو جلدوں میں ۱۳۴۸ھ میں چھاپ کر شائع کیا۔

مرحوم کا یہ کام چونکہ اسلامی علوم وفنون کی ترقی و بقا کی راہ میں ہمارے شکریہ کا مستحق ہے، اس لیے ان کی زندگی کے مختصر سوانح کو جو ان کے صاحبزادہ خان بہادر سید آل علی نے لکھا ہے جو ہم ذولقرنین سے لیکر شائع کرتے ہیں۔''س''

مولوی سید عنایت احمد صاحب نقوی مرحوم ومغفور بدایوں کے معزز و قدیم خاندان سادات قبائی سے تعلق رکھتے تھے، اس خاندان کے مورث اعلیٰ مولینا سید علاؤالدین اصولیؒ حضرت شاہ نظام الدین اولیاء سلطان جی صاحب بدایونی ثم الدہلویؒ کے استاد تھے، اور یہ خاندان علم وفضل اور خوشنویسی کے لیے بھی مشہور رہا ہے۔

سید صاحب مرحوم ۱۲۷۹ھ میں پیدا ہوئے، ابتداء میں اپنے گھر پر رہ کر مولینا مجید الدین صاحب مرحوم سنبھلی سے فارسی وعربی کی درس نظامی کے مطابق تکمیل کی، خاندانی ماحول کی علمی فضا، قابل اور شفیق استاد کی تربیت اور ذاتی شوقِ علم کا یہ نتیجہ تھا، کہ سید صاحب کو مدۃ العمر مطالعہ کتب اور اضافہ معلومات کا شغف رہا، اور باخبر اصحاب کو بخوبی معلوم ہے، کہ سید صاحب کا علم آخر عمر تک متحضر رہا اور وہ اپنی وسعتِ نظر روشن خیالی اور ذہانت کی وجہ سے نہ صرف مذہبی وعلمی امور میں بلکہ زمانہ حاضرہ کے واقعات و مسائل پر بھی صحیح وصائب رائے رکھتے تھے، عربی علوم کی تکمیل کے بعد سید صاحب نے امتحانِ وکالت پاس کیا، بعد کو شاعری سے بھی ذوق پیدا ہوا، اور نواب مرزا خان داغ دہلوی سے اصلاح لیتے رہے، اور ان کے ارشد تلامذہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

سید صاحب مرحوم نے ابتداً شاہجہاں پور وبدایوں میں وکالت کی، بعدازاں اپنے خاندانی تعلقات وحقوق کی بنا پر ریاست گوالیار میں تقریباً تیس سال تک منصف و مجسٹریٹ وسپرنٹنڈنٹ پولیس و پرسنل اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل پولیس کے معزز عہدوں پر تعینات رہے، پرسنل اسسٹنٹی کے زمانہ میں انھوں نے ریاست گوالیار کا پولیس مینول مرتب کیا، ۱۹۱۳ء میں ریاست گوالیار کی ملازمت سے سبکدوش ہوکر وطن میں واپس آئے اور چند سال بدایوں و سہسوان میں وکالت کرتے رہے، یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ باوجود مشاغل ملازمت اور وکالت ممدوح کا علمی شوق اور مطالعہ کتب برابر جاری رہا، ۱۹۲۰ء میں وکالت ترک کردی، بعدہ نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی مرحوم نے ان کو ایک نہایت گرانقدر اور اہم ترین خالص علمی خدمت کے لیے انتخاب کیا، علامہ ابن الہیثم کی نادر اور شہرۂ آفاق تصنیف کتاب المرایا والمناظر کے قلمی نسخہ موجودہ حیدرآباد (جس کے تمام دنیا میں صرف تین قلمی نسخے حیدرآباد و پٹنہ ورامپور میں موجود تھے) کے دیگر دونسخوں سے مقابلہ اور تصحیح اور اپنی نگرانی میں ازسرنو لکھائے جانے کا کام کئی سال تک انجام دیا، یہ کتاب سلطنت آصفیہ حیدرآباد کے زیراہتمام قبل ازیں چھپ کر شائع ہوگئی ہے، ۱۹۲۴ء کے بعد سے سید صاحب مرحوم گوشہ نشین تھے، اور عبادت الٰہی سے جو وقت بچتا تھا، باوجود ضعف بصارت زیادہ تر مطالعہ کتب میں صرف کرتے تھے۔

انتقال سے چند ماہ قبل سید صاحب بدایوں آگئے تھے، چار ماہ بعارضۂ فالج علیل رہنے کے بعد تقریباً اسی سال کی عمر میں بروز دوشنبہ ۲۳/ رمضان المبارک ۱۳۵۸ھ کو واصل بحق ہوئے اور اپنے خاندانی باغ میں اندر احاطہ درگاہ جناب مذاق میاں صاحبؒ دفن ہوئے۔

انتقال کے وقت سید صاحب مرحوم نے تین فرزند، پانچ صاحبزادیاں، پانچ پوتے پوتیاں، ۲۰ نواسے نواسیاں اور دو پرنواسے چھوڑے، تینوں صاحبزادے بفضلہٖ معزز عہدوں پر ممتاز ہیں۔ (۱) خان بہادر سید آل علی نقوی ایم۔اے۔ پی۔ای۔ایس رجسٹرار ڈیپارٹمنٹل امتحانات صوبہ متحدہ۔ (۲) ڈاکٹر سید آل محمد نقوی ایم۔بی۔بی۔ایس پرسنل فزیشن نواب صاحب ٹونک (۳) سید سبط نبی نقوی، ایم۔ایس۔سی اسسٹنٹ میٹرولاجیکل ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ ہند پونا۔

(مارچ ۱۹۳۹ء)

مارک، ایڈورڈ ویسٹر

ایڈورڈ ویسٹر مارک کا انتقال

ایڈورڈ ویسٹر مارک نے جو ایک عرصہ تک لندن یونیورسٹی میں عمرانیات کا پروفیسر تھا، گزشتہ اکتوبر میں انتقال کیا، وہ ایک عمیق النظر فلسفی اور بین الاقوامی شہرت کا مالک تھا، اوائل زندگی میں اس کو خیال پیدا ہوا کہ اخلاقی خیالات اور مذہبی اعتقادات میں گہرا تعلق ہے، چنانچہ اس نقطہ نظر سے اس نے یورپ کے علاوہ دوسری قوموں کے روایات اور اعتقادات کا مطالعہ کرنا چاہا اور اس کے لئے مراکش کو منتخب کیا، اور وہاں جاکر چار سال تک مقیم رہا، یہاں اس نے نہ صرف انسانیاتی معلومات جمع کئے، بلکہ وہاں کے لوگوں طرز زندگی وغور وفکر سے بھی واقفیت حاصل کرکے ان کے رسم و رواج کو آسانی سے سمجھا جو تمدن کے مختلف دور میں پیدا ہوتے رہے، یہاں کی تحقیقات اس نے اپنی مشہور کتاب ''اخلاقی تخیلات کی ابتدا اور نشوونما'' (The origin and development of moral ideas) میں قلمبند کی جو دو جلدوں میں ۱۹۰۶ء اور ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی تھی، یہ کتاب بہت اہم اور بلند پایہ سمجھی جاتی ہے اور اخلاقیات پر ایک فلسفیانہ مقالہ یا اخلاقی خیالات کی تاریخ کہی جاسکتی ہے، اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں تحلیلی اور تاریخی تجزیوں میں امتزاج پیدا کرکے یہ دکھایا گیا ہے کہ اخلاقی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کی ابتدا معاشرتی تکدر اور تشکر سے ہوتی ہے، ڈاکٹر ویسٹر مارک کی اور دوسری تصنیفات یہ ہیں، مراکش میں انسانی شادی، رسم اور اعتقاد کی تاریخ، (۲) اخلاق اضافیت، (۳) عیسائی مذہب اور اخلاق۔

(''ص۔ع''، دسمبر ۱۹۳۹ء)

رامپوری، فضل الحق، مولانا / اجمیری، معین الدین، مولانا

مولانا فضل حق رامپوری / مولانا معین الدین اجمیری

افسوس ہے کہ پچھلے دو مہینوں میں ہماری قدیم تعلیم کے خزانہ کے دو انمول موتی کھو گئے، ایک مولانا فضل حق صاحب رامپوری جو مدرسہ عالیہ رامپور میں مدرس اعلیٰ تھے، موصوف نے نصف صدی تک علوم اسلامیہ کی تدریس کا فرض انجام دیا تھا، ۸۱ برس کی عمر میں دار فانی کو الوداع کہا، اور اب ۱۰/ محرم ۱۳۵۹ھ کی دوپہر کو مولانا معین الدین اجمیری نے جن کو سلسلہ خیر آباد کا خاتم کہنا چاہیے وفات پائی، مرحوم مولانا برکات احمد صاحب ٹونکی کے ارشد تلامذہ میں تھے، اور عمر بھر درس و تدریس میں گذار دی، حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے احاطہ مزار میں شاہ جہانی مسجد کے زیر سایہ فضل و کمال کا یہ خزانہ زیر خاک کیا گیا، رحمہما اللہ تعالیٰ، میر احدی اجمیری نے خوب کہا:

ہے سنہ تیرہ سوانسٹھ (۱۳۵۹) عشرہ ماہ محرم ہے
ہمیں اس ابتدائی ماہ میں بے انتہا غم ہے
امام الوقت مولانا معین الدین کی رحلت ہے
بپا اجمیر میں امسال اُف دوہرا محرم ہے۔

("س"، مارچ ۱۹۴۰ء)

مولانا معین الدین اجمیری

۱۰/ محرم الحرام ۱۳۵۹ھ عین عاشورہ کے دن علم وعمل فضل وکمال، مجاہدہ و استقامت وطہارت کی ایک ایسی مسند خالی ہوئی جو غالباً عرصۂ دراز تک خالی رہے گی، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

اس سے ہماری مراد حضرت مولانا معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا سانحۂ ارتحال ہے، یہ حادثہ محض مولانا کے اہل خاندان یا مسلمانانِ اجمیر ہی کے لئے نہیں ہے، بلکہ سارا اسلامی ہند اس سے متاثر اور اپنی کم نصیبی پر نوحہ کناں ہے۔

وَمَا كَانَ قَيْسٌ" هُلْكُهٗ هُلْكَ وَاحِدٍ
وَلٰكِنَّهٗ بُنْيَانُ قَوْمٍ تَهَدَّمَا

مولانا ایک نومسلم گھرانے میں پیدا ہوئے تھے، والد ماجد مولانا عبدالرحمٰن صاحب مرحوم بلیا کے رہنے والے نومسلم راجپوت تھے اور والدہ بھی داخل اسلام ہوئی تھیں اور دانا پور (بہار) ان کا گھر تھا تعلق راجپوتانہ سے اس طرح پیدا ہوا کہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب ریاست ٹونک میں سکریٹری کونسل تھے، چار یا پانچ سو روپیہ ماہوار تنخواہ تھی، اسی علاقہ میں دیولی (راجپوتانہ) میں ۲۵/ صفر ۱۲۹۹ء کو پیدا ہوئے اور باپ کے زیر سایہ زندگی کی ابتدائی منزلیں طے ہوئیں، بچپن ہی سے سعادت و فیروز مندی کے آثار نمایاں تھے، چنانچہ دولت وثروت کی گود میں پلنے والے اس نوجوان نے ہمیشہ طالبعلموں میں مساوات ہی کی زندگی بسر کی، امیرانہ ٹھاٹھ اور رئیسانہ شان کا کبھی مظاہرہ نہ کیا۔

قسمت کی خوبی اور نصیب کی بلندی نے خاتم المحققین حضرت مولانا سید برکات احمد صاحب (بہاری، ثم) ٹونکی سے تلمذ کا رشتہ قائم کرایا، اس تعلق سے مولانا کا سلسلۂ تلمذ یہ ہے۔

حضرت مولانا معین الدین صاحب اجمیری رحمۃ اللہ علیہ
حضرت مولانا سیّد برکات احمد صاحب ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ
حضرت مولانا عبدالحق صاحب خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ
حضرت مولانا فضل حق صاحب خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ
حضرت مولانا فضل امام صاحب خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ
حضرت مُلّا عبدالواجد صاحب خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ
حضرت مُلّا اعظم صاحب سندیلی رحمۃ اللہ علیہ
استاذ الکل حضرت مُلّا نظام الدین ؒ صاحب سہالویؒ

جملہ معقول ومنقول کی تکمیل مولانا برکات احمد صاحب ہی سے ہوئی، علم ریاضی حضرت مولانا لطف اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل فرمایا، بائیس سال کی عمر میں علوم میں ایسا رسوخ ہوگیا کہ جس کی نظیر کم دیکھی گئی ہے، اسی وقت سے درس وتدریس کا سلسلہ جاری ہوگیا، ہندوستان اور ہندوستان سے باہر بلخ، بخارا، چین، افغانستان اور دوسرے ممالک سے طلبہ جوق در جوق آنا شروع ہوگئے، اسی زمانہ میں ایک خاص واقعہ نے آپ کی شہرت کو چار چاند لگادیئے۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا عبدالحق صاحب، صاحبِ تفسیر حقانی کے زیر اہتمام آریوں سے ایک مناظرہ ترتیب پایا تھا، آریوں کی طرف سے پنڈت داشنا نندجی بحث کررہے تھے، مسلمانوں کی طرف سے بڑے بڑے مناظر گفتگو کررہے تھے، تین دن سے سلسلہ جاری تھا، جب مولانا کی باری آئی تو آپ نے روح، مادّہ پرمیشر کی قدامت کے سلسلہ میں حدوث وقدم کی طویل بحث کو اس خوبی سے بیان فرمایا کہ صرف سات منٹ میں پنڈت جی لاجواب ہوگئے اور موافق ومخالف آپ کے تبحر علمی کے قائل ہوگئے، اسی قسم کا ایک مکالمہ ہز ہائنس نواب حامد علی خان مرحوم رامپور کی تحریک پر مولانا عبدالوہاب صاحب منطقی بہاری مرحوم سے ایک خالص علمی مسئلہ پر ہوا تھا، جس کا نتیجہ بصورت کتاب شائع ہوچکا ہے۔

ڈھائی سال مدرسہ نعمانیہ لاہور میں صدر مدرس رہنے کے بعد ۲۶ھ میں اجمیر کو شرف سکونت بخشا اور ۲۷ھ میں مدرسہ معین الحق قائم کیا، سرکار نظام جب اجمیر تشریف

لائے اور حضرت مولانا کے درس میں مسلسل چھ وقت شریک ہوئے تو اس قدر متاثر ہوئے کہ خلعتِ شاہانہ سے سرفراز فرمایا، اور مولانا انوار اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک پر مدرسہ معین الحق کو معینیہ عثمانیہ قرار دے کر ساڑھے بارہ سو روپے ماہانہ اس کے لئے جاری فرمایا، مولانا اس مدرسہ کے صدر مدرس ہوئے اور پندرہ سال تک یہاں درس دیا، ۳۷ھ میں کار پرداز ان مدرسہ اور مولانا میں اختلاف ہوا، چنانچہ انہوں نے استعفا دے کر محرم ۳۸ھ میں دارالعلوم حنفیہ صوفیہ کے نام سے ایک دوسرا مدرسہ قائم فرمایا، اور ۱۲ سال تک اس مدرسہ کے طلبہ کو اپنے فیوض علمی و عملی سے سرفراز فرمایا، یہ مدرسہ اب تک قائم ہے اور شہر کے غریب مسلمان اس کو چلا رہے ہیں، دارالعلوم معینیہ عثمانیہ سے علیحدگی کے باوجود اس کے اراکین، مدرسین، طلبہ اور دیگر متعلقین سے تعلقات خوشگوار رہے، ۵۱ھ میں مدرسہ کے اراکین حضرت مولانا کو پھر اپنے یہاں واپس لائے، لیکن سیاسی اختلافات کے نتیجہ کے طور پر ۱۲/ مارچ ۱۹۳۸ء کو بحکم سرکار نظام دارالعلوم معینیہ عثمانیہ سے آپ الگ ہوگئے، لیکن اس علیحدگی کے بعد بھی حلقۂ درس پوری آب و تاب کے ساتھ قائم رہا۔

اس زمانہ درس و تدریس میں دوسرے علمی مشاغل بھی جاری رہے، چنانچہ مولانا نے تصانیف کا ایک معتدبہ ذخیرہ چھوڑا ہے، جس کا اکثر حصہ ابھی طبع نہیں ہوسکا ہے، مثلاً ترمذی شریف کا ایک ناتمام حاشیہ، وجود علم و معلوم، کلی طبیعی اور مسئلہ دہر پر مکمل اور جامع تقریریں، حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی محققانہ سوانح عمری وغیرہ! یہ چیزیں انشاء اللہ جب اہل علم کے سامنے آئیں گی، اس وقت ان کو معلوم ہوگا کہ اجمیر کے اس بوریا نشین کی نگاہِ تحقیق کتنی بلند تھی۔

آخری زمانہ میں درگاہ بل کی اصلاح کے متعلق جو فتویٰ مولانا نے مرتب فرمایا تھا وہ اس قدر جامع اور موثر تھا کہ ایک طرف تو ہندوستان اور حرمین کے علماء نے اس کی تائید کی اور دوسری طرف ممبران اسمبلی نے اس بل کے ان تمام نقائص کو دور کیا، جن کا شریعت اسلام سے تصادم ہوتا تھا۔

یہ تھی مولانا کی علمی زندگی! عملی زندگی کا یہ حال تھا کہ اجمیر میں صدہا بدعات کا خاتمہ کیا، اسلامی نقطۂ نظر سے ملک کی صحیح رہنمائی میں باوجود مشکلات کے کبھی مطلق کمی نہیں فرمائی۔

تحریک خلافت میں مذہبی فتویٰ کے جرم میں دو سال کی قید و بند کو اس پامردی اور عالی ہمتی سے برداشت کیا کہ علی برادران نے قدم چوم لئے، جس زمانہ ابتلاء میں مولانا کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ العلماء اور مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ العلماء قید و نظر بندی کی تکلیفیں اٹھا رہے تھے، اس وقت تحریک کی رہنمائی کے لئے آپ ہر ہفتہ دہلی تشریف لے جاتے اور جامع مسجد میں نماز جمعہ کے بعد مسائل حاضرہ پر تقریر فرماتے، جمعیۃ العلماء کے اجلاس امروہہ کی صدارت فرمائی اور مستقل نائب صدر رہے، صوبۂ راجپوتانہ کی مجلس خلافت کو آپ کی صدارت کا ہمیشہ فخر حاصل رہا، تحریک کشمیر کے زمانہ میں مجلس احرار اسلام کے ڈکٹیٹر رہے، مسلمانوں کے سوا برادرانِ وطن بھی آپ کی سیاسی بصیرت کے معترف اور اس سے متاثر تھے۔

ان علمی اور سیاسی مشاغل کے ساتھ ساتھ سلوک اور تزکیۂ باطن کی طرف بھی پوری توجہ تھی، مولانا کے والد حضرت شاہ عبدالرزاق صاحب فرنگی محلی سے بیعت تھے اور خود مولانا شاہ صاحب کے صاحبزادہ حضرت مولانا شاہ عبدالوہاب صاحب (والد حضرت مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی مرحوم) سے بیعت تھے۔

استغناء، رجوع اللہ، توکل وغیرہ آپ کی طبیعت ثانیہ بن چکے تھے، آخری سال تو بڑے ہی صبر و استقامت اور متوکلانہ زندگی کے تھے، فرائض تعلیم و افتاء اور رشد و ہدایت کی ادائیگی کے بعد کبھی لوگوں میں بلاضرورت نہ ٹھہرتے، اربابِ دولت اہل دنیا، خصوصاً امراء و حکام سے ہمیشہ بے تعلق رہے، لیکن جب کوئی خدمتِ والا میں حاضر ہوتا تو اپنے قلب میں مولانا کے اخلاق فاضلہ کا خاص اثر لے کر واپس جاتا۔

عبادت کا یہ حال تھا کہ فرائض کے سوا نوافل و مستحبات کے بھی ہمیشہ پابند رہے، تادم واپسیں اپنے اوراد و اشغال میں فرق نہ آنے دیا، حق گوئی میں کسی بڑی سے بڑی طاقت سے بھی نہیں ڈرے، اسلاف کی سنت کے مطابق قید و بند کی مصیبت سے بھی دوچار ہوئے لیکن اس کو بھی ہنسی خوشی برداشت کیا اور ہمیشہ وہی کیا جو ایک مجاہد اور ربانی عالم کو کرنا چاہئے۔

ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت و شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ بخاری وغیرہ میں جب یہ حدیث آتی کہ حضورؐ کے مرض وفات کی تکلیف دیکھ کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بے اختیار پکار اٹھیں، "یا ابتاہ" (اے میرے باپ) سرکار دو عالمؐ نے فرمایا: لَا کَرَبَ عَلیٰ اَبِیْکِ بَعْدَ الْیَوم (آج کے دن کے بعد تمھارے باپ پر مصیبت نہیں ہے) تو اس جملہ پر حضرت مولانا بیتاب ہوجاتے، آنسو نکل آتے، چیخ نکل جاتی، بسا اوقات غشی طاری ہوجاتی، مدرسہ میں درس دیتے وقت ہر مرتبہ یہ واقعہ پیش آیا ہے۔

طلبہ اور علماء سے بہت محبت فرماتے تھے، ہونہار طالب علم مولانا کا مرکزِ توجہ بن جاتا تھا، ہر سال موسم بہار میں طلبہ کا ایک تفریحی جلسہ جس کو اجمیر کی اصطلاح میں "گوٹ" کہتے ہیں، منعقد ہوتا، اس جلسہ میں ہر ملک کے طلبہ کے مروجہ کھیلوں کا مظاہرہ ہوتا تھا، مولانا طلبہ کی خاطر اس تفریحی اجتماع میں بھی شرکت فرماتے، بیت بازی ہوتی، اس میں ایک فریق کی طرف مولانا بھی ہوتے، آپ ہی کا فریق اکثر غالب رہتا، اس لئے کہ مولانا کو اردو فارسی کے ہزار ہا اشعار یاد تھے۔

یہ واقعہ حیرت کے ساتھ سنا جائے گا کہ مولانا کو ڈیڑھ سو روپیہ مشاہرہ پاتے

تھے، لیکن تیس روپیہ ماہوار کے سوا باقی پوری رقم طلبہ، سامانِ تعلیم اور نادر کتب کی فراہمی پر صرف کردیتے تھے، کتاب کتنی ہی قیمتی ہو لیکن امکان بھر اس کو ضرور خریدتے، خواہ دوگنی، سہ گنی قیمت ادا کرنی پڑتی، مگر نسخہ خریدتے، قرآن پاک بہتر سے بہتر طباعت کے مہیا فرماتے، کلکتہ کے بہترین کارخانہ میں بھیج کر اعلیٰ قسم کی جلدیں بندھواتے تھے۔

۵/محرم الحرام ۵۹ھ کو ایسا بیمار ہوئے کہ آخر وقت تک پاؤں سے معذور رہے، دل، دماغ البتہ صحیح رہے اور اس حالت میں بھی سلسلۂ درس وتدریس جاری رہا، وفات سے دس یوم پیشتر تک حدیث کے اسباق ہوتے رہے۔

زندگی میں ہی عرصۂ دراز سے گورِ غریباں کو اپنا مسکن بنالیا تھا، احباب کے اصرار سے وہیں ایک مختصر مکان بن گیا تھا، جس کی تکمیل دارالعلوم کی اس رقم سے ہوئی، جو کمیٹی نے بطور اعتراف خدمات مولانا کو پیش کی تھی، اسی مکان میں مولانا کا انتقال ہوا، ہزارہا مسلمانوں نے جنازہ میں شرکت کی، جنازہ کی چارپائی میں لمبی لمبی بلّیاں باندھی گئیں تھیں، بیک وقت پچاسوں مسلمان کندھا دیتے تھے، پھر بھی ہجوم اور لوگوں کے اشتیاق کی کوئی حد نہ تھی۔ خواجہ اجمیری کی درگاہ میں مسجد شاہجہانی کے زیرسایہ تدفین ہوئی، قبر میں اتارتے وقت درودیوار اور درختوں پر انسانوں کا ہجوم تھا، پس ماندگان میں دو بچے (مولوی عبدالباقی صاحب اور ایک صاحبزادی) اور ایک بیوہ ہیں۔

اجمیر کے قیام کی مدت ۲۴ سال اور کل مدت حیات ۶۰ سال ہے۔

یہ کیسا عجیب اتفاق ہے کہ ٹھیک عاشورہ محرم میں جب لوگ واقعۂ کربلا سے سوگوار تھے۔ اس شہید علم وعمل نے دنیا سے کوچ کیا اور اجمیر میں اہل دل نے دوہرے محرم کا سوگ کیا۔ ("س"، اپریل ۱۹۴۰ء)

۱ مولانا کی وفات کے سلسلہ میں احباب نے خطوط اور مضامین میں جو کچھ لکھ کر بھیجا تھا، اس مضمون میں وہ تمام معلومات جمع کردیے گئے ہیں، ان سب دوستوں کی اطلاعات کا شکریہ۔

۲ معارف: مشہور یہی ہے کہ ملا اعظم سندیلی ملا نظام الدین سہالوی کے براہ راست شاگرد تھے، مگر میری تحقیق میں یہ صحیح نہیں ہے۔ ملا اعظم ملا کمال الدین سہالوی کے شاگرد تھے اور وہ ملا نظام الدین کے۔ "س"

ون سنک، جان

جان ون سنک کا انتقال

لیڈن کے مشہور مستشرق ڈاکٹر ایرنٹ جان ون سنک کا گزشتہ ستمبر میں انتقال ہوگیا، یوروپین مستشرقین میں ڈاکٹر موصوف کے علم وفضل کا پایہ نہایت بلند تھا، وہ ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے، ۱۹۱۲ء میں لیڈن یونیورسٹی میں عربی کے لکچرر مقرر ہوئے، اور پھر ۱۹۲۷ء میں اس کے شعبہ عربی کی صدارت تفویض ہوئی، وہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے چیف اڈیٹر بھی تھے۔

ان کو شروع میں سامی زبان سے بڑی دلچسپی تھی، چنانچہ انھوں نے سامی علاماتی تخیل پر بہت سے مضامین لکھے، اس کے بعد وہ سریانی زبان کی طرف مائل ہوئے اور اس زبان کے صوفیانہ لٹریچر کا گہرا مطالعہ کیا اور بربیرس کی Book of Dove اور Mystical Treatises of Isaac of Ninerer کا ترجمہ کیا، پھر سریانی زبان کے صوفیانہ لٹریچر کے نئی معلومات کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی۔

مگر وہ اسلامیات کے ایک مستند عالم کی حیثیت سے زیادہ مشہور تھے، فن حدیث پر انھوں نے مندرجہ ذیل کتابیں لکھیں:

(1) Mohammeden de joden te Medina.
(2) Handbook of early Muhamaden tradition.
(3) Concordonce et Indices de la tradition Masulmane.
(4) The Muslim Creed.

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں مختلف موضوع پر ان کے مضامین بکثرت ہیں۔

("ص۔ع"، مارچ ۱۹۴۰ء)

مارگولیوتھ، پروفیسر

پروفیسر مارگولیوتھ

انگلستان کے مشہور مستشرق پروفیسر مارگولیوتھ نے ۸۲ برس کی عمر میں وفات پائی، یہ نسلاً یہودی تھے، پھر عیسائی ہوگئے تھے، اس سے ظاہر ہے کہ ان کو اسلام اور پیغمبر اسلام علیہ السلام سے اکہری نہیں بلکہ دوہری عداوت تھی، ان کی عمر بھر کا سرمایہ اسلام پر مہذب غارت گری ہے، اور یہی سبب ہے کہ خود یورپ کے سنجیدہ طبقہ میں بھی وہ احترام کی نظر سے نہیں دیکھے گئے، ان کی سب سے بڑی کتاب آنحضرت ﷺ کی سیرت ہے جس کو دیکھ کر مولانا شبلی مرحوم بے چین ہوگئے تھے، اور اپنی سیرت نبویؐ کی اسکیم کی بنیاد ڈالی تھی، جس نے بحمداللہ کہ ملک میں سیرت پاک کی تالیف ونشرواشاعت کا ذوق عام کردیا۔

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

پروفیسر صاحب جب ۱۹۱۶ء میں ہندوستان آئے تھے تو ان سے لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تھی، پھر ۱۹۲۰ء کے سفر لندن میں ان سے ملنے اور خط وکتابت کرنے کا اتفاق ہوا۔ ("س"، مارچ ۱۹۴۰ء)

پرشاد، سرکرشن، مہاراجہ

مہاراجہ سرکرشن پرشاد

پچھلے مہینہ ملک میں کئی افسوس ناک موتیں ہوئیں یمین السلطنت مہاراجہ سرکرشن پرشاد جنھوں نے پورے ۳۷ برس تک دکن کے سیاسی وانتظامی معاملات کی سربراہی

کی، وفات پائی، ۱۹۰۲ء میں وہ دولت آصفیہ کے پیش کار وصدر اعظم مقرر ہوئے، اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ برابر اپنے عہدہ پر فائز رہے، وہ راجہ ٹوڈرمل کی یادگار تھے، اصلی وطن لاہور اور پھر دہلی ہوا، اور یہاں سے آصفجاہ اول کے ساتھ ان کا خاندان دکن کو منتقل ہوا، اور ہمیشہ شاہان آصفیہ کے سیاسی و مالی مہمات میں کار پرداز بنا رہا۔

مہاراجہ سرکشن پرشاد عربی، فارسی اور انگریزی تین زبانوں سے واقف تھے اور تینوں میں باتیں کرتے تھے، علمی مذاق صاف ستھرا تھا، شعر وسخن کا چسکا رکھتے تھے، تصوف میں وحدۃ الوجود کے عقیدہ کے نہایت سخت معتقد اور حامی تھے، اور اسی کو ہندو مسلم اتحاد کا ذریعہ سمجھتے تھے، سرکار رسالت ﷺ کی بارگاہ میں بھی کبھی کبھی عقیدت کا اظہار کرتے تھے، ان کی ایک نعت کو یہ شرف حاصل ہے کہ مدینہ منورہ میں مسجد نبویؐ کے پیچھے کتب خانہ شیخ الاسلام کی ایک دیوار پر آویزاں ہے، مرنج و مرنجان، شریف، وضعدار، اور پرانی شریفانہ خصوصیات کی اپنی آپ مثال تھے۔ (''س''، جولائی ۱۹۴۰ء)

اختر یار جنگ، نواب

نواب اختر یار جنگ

حیدرآباد میں اودھ کے ایک مشہور ممتاز مینائی خاندان کے فرد فرید نے بھی ہماری دنیائے فانی کو الوداع کہا، منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی کے خلف الرشید نواب اختر یار جنگ بہادر جنھوں نے دکن میں امیر مرحوم کی وفات کے بعد سے دکن کو شاہ دکن کی نوازشوں سے اپنا وطن بنالیا تھا اور معتمد امور مذہبی کی حیثیت سے سینکڑوں مفید خدمات انجام دیں اور ہر نیک کام کی امداد میں سبقت کی اور اب چند سال سے پنشن پاکر عزت کی زندگی بسر کر رہے تھے، اب وہ ہمیشہ کے لیے بزم حیات سے رخصت ہوگئے، اللہ تعالیٰ ان کی نیک خدمات کا نیک صلہ عنایت فرمائے، وہ شاعر بھی تھے اور اختر تخلص کرتے تھے۔ (''س''، جولائی ۱۹۴۰ء)

عشرت لکھنوی، عبدالرؤف، خواجہ

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی

خواجہ عبدالروف عشرت، لکھنؤ داروغہ حیدر بخش کی مسجد کے نیچے کتابوں کی ایک چھوٹی سی دوکان پر بیٹھا کرتے تھے، مگر خدا جانے کیا بات ہے یہ چھوٹی سے معمولی حیثیت کی دوکان نصف صدی تک لکھنؤ کے اہل علم وادب کا مرکز بنی رہی، اور میں نے بھی چالیس برس اس چھوٹی سی دکان کو اسی طرح علم وادب کے قدر شناسوں کا مرکز دیکھا، اس وقت جب لکھنؤ کا چوک بجلی اور گیس کی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا یہی دکان تھی جس پر پرانا مٹی کا چراغ جلا کرتا تھا، اور دنیا کو وضعداری کی روشنی دکھاتا تھا، افسوس کہ زبان وادب کا یہ ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی بجھ گیا۔

خواجہ صاحب گوخود غیر معمولی شاعر نہ تھے، مگر لکھنؤ کے بڑے بڑے شاعروں کی صحبت اٹھائے تھے، بحر مرحوم کے شاگرد تھے، نظم سے زیادہ نثر لکھتے تھے اور لکھنؤ کی راجدھانی اور لکھنؤ کے جانعالم کی کہانی ان کا خاص موضوع تھا، لکھنوء کی بول چال اور محاوروں اور روزمرہ کو بخوبی برتتے تھے، نیک مزاج، وضعدار اور قناعت پسند تھے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ (''س''، جولائی ۱۹۴۰ء)

انوارالحق، محمد، مفتی

مفتی محمد انوارالحق

بھوپال سے مفتی محمد انوار الحق صاحب ایم اے سابق وزیر تعلیم و حال وزیر مالیات بھوپال کی وفات کی افسوس ناک خبر آئی ہے، موصوف صاحب علم اور محبّ دین تھے، ان کی قلمی خدمات اور تحریری مجاہدات بھی خاص ذکر کے قابل ہیں، تاریخ ابوالبشر، اثبات واجب الوجود اور دوسری مذہبی کتابیں جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے بہت مفید ثابت ہوئیں، عمر بھی علمی وتعلیمی کاموں کی مشغولیت کے باوجود اخیر عمر میں سرکار بھوپال کے مالیات کے صیغہ کو جس خوبی سے سنبھالا، دوست ودشمن ہر ایک نے اس کی تحسین کی، اللہ تعالیٰ اپنے خزانہ رحمت سے اس علم وعمل کے مجسمہ کو سرفراز فرمائے۔

(''س''، جولائی ۱۹۴۰ء)

سعید بے، عبدالحمید

عبدالحمید سعید بے

افسوس ہے کہ مصر کی ایک بہت بڑی ہستی سے دنیا خالی ہوگئی، عبدالحمید سعید بے مصر کے ان جواں مردوں میں تھے جو مصر چھوڑ کر یورپ میں رہ پڑے تھے اور یہ عہد کرلیا تھا کہ جب تک مصر آزاد نہ ہولے گا وہ مصر کی زمین میں قدم نہیں رکھیں گے، مصر اور انگلستان کے گزشتہ معاہدہ کے بعد وہ مصر واپس آئے تھے، میری ان کی ملاقات ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت کے دوسرے ارکان کے ساتھ اٹلی کے پایۂ تخت رومہ میں ہوئی تھی، وہ اپنے قد وقامت اور ڈیل ڈول کے لحاظ سے شوکت علی مرحوم سے ملتے جلتے تھے اور انہی کی طرح قومی ومذہبی جوش وخروش سے بھرے ہوئے تھے ایک بہت موٹا ڈنڈا جس کے موٹھ میں اہرام مصری کی شکل بنی ہوئی تھی، اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے، انہوں نے اس وقت تک شادی نہیں کی تھی، کہتے تھے کہ غلاموں کی تعداد بڑھانے سے فائدہ کیا۔

وہ پہلے بالکل وطن پرور یا نیشنلسٹ تھے، مگر مصر آنے کے بعد ان کے حالات میں ایک نیا تغیر ہوا، انہوں نے عالمگیر اسلامی برادری (پین اسلامزم) کی تحریک مصر

کے نوجوانوں میں شروع کی، انجمن شبان المسلمین کی بنیاد ڈالی، اس کی شاخیں مصر کے اطراف میں پھیلائیں اور اس کی کوشش کی کہ دنیائے اسلام کے دوسرے حصوں میں اس کی شاخیں قائم ہوں چنانچہ بمبئی میں اس کی ایک شاخ قائم ہے۔ چند سال ہوئے کہ انہوں نے اپنی محبت سے مصر کی شبان المسلمین کا ممبر خاکسار کو بھی بنایا جامع ازہر کی طرف سے جو وفد ہندوستان آیا تھا اس کے ایک رکن انجمن شبان المسلمین کے بھی نمائندہ تھے اور مقصد یہ تھا کہ مصر و ہندوستان کی اسلامی برادریوں میں تعلقات مضبوط کئے جائیں۔

ان کی اس تحریک سے بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ مصری نوجوان جو غلام قوم کی وطن پروری یا قومیت پرستی کے سیلاب میں بہے جارہے تھے وہ پلٹے اسلام کا سفینۂ نجات ان کو دکھائی دیا، وہ مصری پارلیمنٹ کے ممبر بھی تھے۔ انہوں نے اور ان کے رفقاء نے مصر کی حکومت پر بار بار زور ڈالا کہ جب تک مصر کا سرکاری مذہب اسلام ہے احکام اسلامی کے مخالف کوئی قانون پارلیمنٹ سے پاس نہیں ہوسکتا، ہندوستان کی طرح یورپ کی برکت سے دوسرے محکوم اسلامی ملکوں میں بھی ''بدکاری'' کو قانونی جواز کی سند مل گئی ہے، مرحوم پہلے شخص تھے جنھوں نے اس کے خلاف پوری جدوجہد کی اور لوگوں نے ان کا ساتھ دیا۔

آج کل جب مسلمان عام طور سے وطن اور اسلام کے حقوق کے درمیان تطبیق کی کوئی راہ نہیں پارہے ہیں اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ ایک کے حقوق کی پاسداری دوسرے کے حقوق کی ادائیگی سے دست کشی ہے، مرحوم کی شخصیت خاص طور سے اہمیت رکھتی تھی، اور مصر کے نوجوانوں کے درمیان صحیح رہنمائی کی کفیل تھی، اللہ تعالیٰ اس جوش عشق کے مجسمہ کو اپنی مغفرت سے بامراد کرے۔ (''س''، ستمبر ۱۹۴۰ء)

شیثؔ جونپوری، ابوبکر محمد، مولانا

مولانا ابوبکر محمد شیثؔ جونپوری

افسوس ہے کہ شیث جونپوری نے دو ڈھائی برس کی سخت علالت کے بعد اپنے وطن جونپور میں ۲۳؍ شعبان ۱۳۵۹ھ مطابق ۲۶؍ ستمبر ۱۹۴۰ء کی رات کو ۳ بجے اس جہانِ فانی کو الوداع کہا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم جونپور کے ایک مشہور علمی خاندان کے فرد تھے، اُن کے دادا مولانا سخاوت علی صاحب مولانا شاہ عبدالحیٔ صاحب دہلوی اور مولانا اسماعیل شہید کے فیض یافتہ اور پورب میں توحید و سنت کے سب سے بڑے داعی، اور اس دور میں اسلامی علوم وفنون کے بہت بڑے مدرس تھے، جونپور میں بیٹھ کر تن تنہا سینکڑوں علمائے دین پیدا کئے اور پورب کے خطّے میں اُن کو جگہ جگہ پھیلا کر اس نازک موقع پر اسلام کی مورچہ بندی کی، وہ ہجرت کرکے بعد کو مدینہ منورہ چلے گئے تھے اور وہیں وفات پائی، راقم کو بھی یہ فخر حاصل ہے کہ اس کے دادا کے حقیقی بھائی انھیں کی مجلسِ درس سے مستفیض تھے۔

مولانا کا پورا خاندان اس وقت سے اب تک علمائے دین کا خانوادہ ہے، جس کی سعی وکوشش نے پورب کی سرزمین کو بڑا فیض پہنچایا، مولانا مرحوم نے نیچے کی تعلیم گھر میں پاکر مولانا عبداللہ صاحب غازی پوری سے مدرسۂ احمدیہ آراہ جاکر علوم کی تحصیل کی، اور واپس آکر اپنے خاندانی مدرسہ کے اہتمام وانتظام کا اور ساتھ ہی ملک کے مختلف گوشوں میں جاکر ہدایت وارشاد کا کام انجام دینا شروع کیا۔

موصوف سے میری ملاقات ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت کے سلسلہ میں ہوئی، یہ ملاقات دوستی، اور دوستی سے اتحاد کی اس منزل تک پہنچ گئی جس کے بعد خیال کی دوئی کا کوئی مرتبہ نہیں رہتا، ایک دفعہ میں نے کہا اور اُنھوں نے مانا تھا کہ ایک مذہب ہے جس کے دو ہی پیرو ہیں ایک وہ اور ایک میں، مقصود تقلید و عدم تقلید کے مسائل میں اعتدال سے تھا، ابھی جب ان کے مرنے سے دو ہفتے پہلے میں جونپور ان کی عیادت کو گیا، تو زبان سے ٹھیک طور پر بول نہ سکے مگر غیر مفہوم آواز میں دو انگلیوں کو اٹھا کر اپنی طرف اور میری طرف اشارہ کیا، کیسا حسرتناک منظر تھا، چلتے وقت کا سلام اور فی امان اللہ اور فی حفظ اللہ کا ابدی پیام!

میں نے علماء میں ایسا شریف، ایسا نیک باطن، ایسا دور اندیش، ایسا فیاض، ایسا سادہ مزاج اس پر ایسا مستقل مزاج، خوش اخلاق، شیریں گفتار، باغ و بہار، ایسا خشک اور ایسا تر آدمی نہیں دیکھا، ایسا متقی و پرہیزگار اور ساتھ ہی ایسا وسیع المشرب اور وسیع اخلاق، وہ مذہبی تھے اور سخت مذہبی، لیکن وہ بھی ان کو مانتے تھے جو مذہب کو نہیں مانتے تھے، وہ بے دینوں میں بھی ایسے ہی پیارے تھے جیسے دینداروں میں، اور یہ اُن کے حسنِ اخلاق کی بڑی کرامت تھی۔

وہ ۱۹۲۵ء سے لے کر ۱۹۴۰ء تک پندرہ برس مسلم یونیورسٹی میں ناظم دینیات رہے، اس عرصہ میں کئی انقلاب آئے مگر وہ اپنی جگہ پر تھے، ساتھ ہی ان کے جُبّہ و دستار کی شان میں وہ بلندی رہی کہ کوٹ پینٹ اور ہیٹ والے ان کے آگے جُھک جُھک جاتے تھے، مگر اس میل جول اور نرمی، اور نرم خوئی میں حق کے خلاف کوئی بات سن کر چپ نہیں رہ سکتے تھے، غرض وہ اپنے علم وعمل میں پہاڑ، اور اخلاق وکرم میں بہتے پانی کی طرح تھے۔

نئے تعلیم یافتوں، بلکہ نئے تعلیم کے اصل مرکز میں مذہبی وقار کو سلامت رکھنا کوئی آسان کام نہیں، انھوں نے اس مشکل کام کو آسان کر دکھایا تھا، ان کا فضل وکمال کسی خاص علم وفن میں محدود نہ تھا، یہاں تک کہ حدیث وفقہ وتفسیر سے آگے بڑھ کر شعر وشاعری اور ریاضیات تک سے ان کو یکساں دلچسپی تھی، اُن کی سادگی کو دیکھ کر کسی کو ان

کی اس گہرائی کا یقین نہیں آتا تھا، اور ان کی اس گہرائی کو دیکھ کر ان کی اس سادگی پر سب کو تعجب ہوتا تھا، اس قدر سادہ اور اس قدر رنگین!

وہ آکلہ (کینسر) کے مرض میں جس سے ایک طرف کا پورا رخسار اور جبڑا آدھے منہ تک خالی ہوگیا تھا، دو ڈھائی برس تک ہر قسم کی مصیبت اور ہر طرح کی تکلیف جھیلتے رہے، اور اس پوری مدت میں ایک دفعہ بھی بے صبری کی آہ اور تکلیف کی کراہ ان کے منھ سے نہیں نکلی، کوئی نماز ترک نہیں ہوئی، اور صبر و شکر کا دامن ایک لمحہ کے لئے ہاتھ سے نہیں چھوٹا، دیکھنے والے ان کی حالت کو دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لاتے تھے، اور وہ ہاتھ اور زبان کے اشاروں سے صبر و استقلال کی نصیحت کرتے تھے۔

آہ! کہ فضل و کمال کا یہ پیکر، حسن و اخلاق اور شرافت کا یہ پتلا دینداری اور پرہیزگاری کا یہ مرقع، تواضع اور خاکساری کا یہ سراپا، صبر و استقلال کا یہ مجسمہ ساٹھ برس دنیا کی نیرنگی کا تماشہ دیکھ کر دنیائے رنگ و بو سے مٹ گیا۔

مرحوم کی یادگار، چند اولادیں اور چند کتابیں ہیں، مگر ان سب سے بڑھ کر ان کی یادگار، ان کے حسنِ اخلاق کی یاد ہے، مرنے والے کا مدفن تو زمین کا ایک گوشہ ہے، مگر اس یاد کا مزار اُن کے دوستوں کے دل ہیں۔

بعد از وفات تربتِ مادر زمیں مجو

در سینہ ہائے مردم عارف مزار ماست

جانے والے جا! رحمت الٰہی تیری منتظر اور مغفرت الٰہی تیرے لئے چشم براہ ہوگی!

("س"، اکتوبر ۱۹۴۰ء)

ٹراٹسکی، لیون

لیون ٹراٹسکی صاحب قلم بھی تھا

دنیا لیون ٹراٹسکی (Leon Tratisky) کو صرف مزدوروں اور کسانوں میں انقلاب پیدا کرنے والے کی حیثیت سے جانتی تھی، حالانکہ انقلابی کے ساتھ وہ ایک ممتاز صاحب قلم بھی تھا، گزشتہ ۲۰/ اگست ۱۹۴۰ء کو اسٹیلن (Stalin) کے اشارہ سے جیکسن (Jackson) کے ہاتھوں وہ قتل کیا گیا، اس کی موت انقلابی دنیا کے لئے تو بڑا حادثہ ہے ہی، لیکن ادبی دنیا کے لئے بھی کچھ کم دردناک سانحہ نہیں گو اس کی حیثیت ہندوستان میں بہت کم لوگوں کو معلوم ہے، سیاسی مشاغل کے ساتھ ساتھ اس کے ساتھ ہمیشہ ادبی مشاغل بھی جاری رہے، چنانچہ ۱۹۰۵ء کے انقلاب میں جب اسے سائبیریا جلاوطن کردیا گیا تھا، اور وہ وہاں سے فرار ہوکر وائنا پہنچا، تو یہاں برابر پروڈا (Pravada) میں مضامین لکھتا رہا، ۱۹۱۳ء میں جنگ بلقان کے سلسلہ میں اس نے جو خط و کتابت کی تھی، ادبی حیثیت سے اس کی خاص اہمیت ہے، کچھ دنوں تک امریکہ میں ایک اخبار کی ادارت بھی کی، غالباً یہ کسی کو معلوم نہ ہوگا کہ وہ اسٹالن کی سوانح لکھ رہا تھا، جس کا نصف حصہ انگریزی میں ترجمہ ہوچکا تھا، باقی حصہ نظر ثانی کی وجہ سے اب تک پریس میں نہ جاسکا، یوں تو اس کے بہت سے چھوٹے چھوٹے ادبی کام ہیں، لیکن تاریخ انقلاب روس کی تین ضخیم مجلدات اس کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ ہیں، اس کتاب نے دنیا کے ادیبوں اور مصنفوں میں اس کا پایہ بہت بلند کردیا ہے، اس موضوع پر اس حسن خوبی سے لکھنا اسی کا حصہ تھا، وہ مسلم الثبوت نثر نویس اور انشاء پرداز تھا، لینن کی موت پر اس نے جو تیرہ الفاظ کہے تھے، وہ روسی ادب کے موتی تصور کئے جاتے ہیں۔

("ا۔ع"، نومبر ۱۹۴۰ء)

سجاد، ابوالمحاسن محمد، مولانا

سجاد کی یاد

۲۳/ نومبر ۱۹۴۰ء اور ۲۱/ شوال ۱۳۵۹ھ کی سہ پہر تھی کہ پھلواری سے مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد نائب امیر شریعت بہار کی وفات کی خبر آئی، دل کو یارائے ضبط نہ رہا، آنسوؤں کے چند قطرے زمین پر گرے، وہ زمین جواب مرنے والی کی خوابگاہ ہے، ابھی قلب میں یہ ہمت بھی نہیں کہ جی بھر کر ماتم کروں اور دل کے شیون کو سپرد قلم،

دریں آشوب غم عذرم بنہ گرنالہ زن گریم

جہانے راجگر خوں شد، ہمیں تنہا نہ من گریم

مرنا اور جینا دنیا کے روازنہ کے کاروبار ہیں، کون نہیں مرا اور کون نہیں مرے گا، آج وہ، کل ہماری باری ہے، اس پر بھی عزیزوں اور دوستوں کی موت پر رونے والے روتے ہیں، ان کی دائمی فراق پر ماتم اور فریاد کرتے ہیں، ان کی ایک ایک خوبی کو یاد کرکے ان کا نوحہ پڑھتے ہیں۔ عام حالت یہی ہے، لیکن بعض موتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ ان کی خبر سن کر زبان بند ہوجاتی ہے، آنسو سوکھ جاتے ہیں، دل کی حرکت بڑھ جانے کے بجائے گھٹ جاتی ہے، اندر ہی اندر گھٹن محسوس ہوتی ہے، مگر جی نہیں چاہتا کہ کچھ بول کر دل کی بھڑاس نکالئے اور آنسو بہا کر غم ہلکا کیجئے، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد مرحوم کے سانحہ کا مجھ پر بالکل یہی اثر ہوا، دن بیت گئے ہفتے گزر گئے، مہینے ختم ہوگئے مگر زبان نہ کھلی اور دل کی امانت قلم کے سپرد نہ ہوسکی، عزیزوں اور دوستوں کو تعجب ہے کہ میرا قلم جو احباب کے سوگ میں ہمیشہ اشک ریز رہتا ہے، اس پہلی دفعہ وہ اپنے فرض کو کیوں بھولا ہے، مگر یہ کیسے بتاؤں کہ اس ناگہانی اور غیر متوقع غم سے مجھے کیوں چپ سی لگ گئی، ہر چند زبان خاموش تھی، لیکن کئی دن تک سوتے جاگتے مرحوم کی صورت آنکھوں میں پھرتی اور خواب میں نظر آتی رہی، **تدمع العین و یحزن القلب ولا نقول الا مایرضیٰ ربّنا وانا الفراقک لمحزونون۔**

اکثر اکابر اور مشاہیر کی ملاقاتیں حالات کی بناء پر یاد رہتی ہیں اور یہ بھی یاد رہتا ہے کہ یہ ملاقاتیں کب ہوئیں، کہاں ہوئیں اور کیسے ہوئیں، لیکن اگر محبت کا عہد یاد کی عمر سے زیادہ ہو تو اس کو ازلی ملاقات کہہ سکتے ہیں، الارواح جنود بجندہ فما أتلفت و ما اختلف منها اختلفت، اسی اصول کی بناء پر مجھے یاد نہیں کہ دنیا میں میری ان کی ملاقات کب ہوئی کہاں ہوئی اور کیونکر ہوئی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرب مکانی، اتحادِ زمانی اور شدت ہم ذوقی کی بناء پر ہم ایک دوسرے سے اتنے آشنا تھے کہ پہلی ملاقات میں دیدشنید پر کوئی نیا اضافہ نہ کرسکی۔

اس آخری زمانہ میں وہ سال میں ایک دفعہ میرے ایام قیام وطن میں کوئی نہ کوئی کام نکال کر دیسنہ ضرور تشریف لاتے اور میری عزت بڑھاتے، ان کی تواضع میں بلندی، سادگی میں بناؤ اور خاموشی میں گویائی تھی، وہ اکیلے تھے، لیکن لشکر تھے، پیادہ تھے مگر برق رفتار تھے، وہ قال نہ تھے سراپا حال تھے، کہتے کم کرتے زیادہ تھے، ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ''راہ'' اور ''منزل'' کے فرق کو کبھی فراموش نہیں کیا انہوں نے راہ میں ہمراہیوں کے لطف کلام میں پھنس کر منزل سے ہٹنا کبھی گوارہ نہیں کیا، وہ وطن کی آزادی اور احکام مذہبی کی پیروی کے درمیان التباس اور تصادم سے کبھی بے خبر نہیں رہے، جذبۂ آزادی کی پوری قوت کے باوجود انہوں نے کانگریس یا کانگریسی حکومت کے غلط قدم اٹھانے پر کبھی بزدلانہ یا صلح پسندانہ درگزر سے کام نہیں لیا، مرحوم کی زندگی کے سوانح لکھنے والے لکھیں گے، مگر عقیدت کی یہ چند سطریں ان کے دیرینہ نیاز مند کی طرف سے یادگار اوراق رہیں، تو محسن کے شکریہ کا بار اس کے کندھے سے کم ہو۔

وطن: صوبہ بہار کے قصبہ بہار اور گیا کے درمیان کا علاقہ ہندوؤں کے عہد میں بودھوں اور جینیوں کی یادگاروں سے بھرا ہوا ہے اور راستہ میں قصبہ بہار کے چند میل آگے بڑھ کر بودھوں کی مشہور درسگاہ نالندہ کے آثار اور کھنڈر ہیں، اسی سے ملا ہوا پنہسَا نام کا مسلمانوں کا ایک گاؤں ہے جہاں سادات کے کچھ گھرانے آباد ہیں، انہی میں سے ایک گھر میں مولانا سجاد کی ولادت ہوئی۔

تعلیم وتربیت: تیرہویں صدی کے شروع میں صوبہ بہار میں مولانا وحیدالحق صاحب استھانوی بہاری کے دم قدم سے علم کو نئی رونق حاصل ہوئی، قصبہ بہار میں انہوں نے مدرسہ اسلامیہ کی بنیاد ڈالی اور بہت سے عزیزوں کی تربیت کی، ان میں سے ایک مولانا سجاد بھی تھے، عربی کی ابتدائی تعلیم انہیں کے زیرسایہ ہوئی اور ان کی پہلی شادی بھی انہیں کی دختر نیک اختر سے ہوئی، آخری تعلیم الہ آبادی کے مدرسہ سبحانیہ میں مولانا عبدالکافی صاحب الہ آبادی کے درس میں ہوئی اور وہیں ۱۳۱۷ھ سے ۱۳۲۲ھ تک رہ کر سندِ فراغ حاصل کی۔

ابتدائی کام: تعلیم سے فارغ ہوکر مدرسی کی خدمت انجام دی، اس عرصہ میں کبھی وہ مدرسہ اسلامیہ بہار میں رہے اور کبھی مدرسہ سبحانیہ الہ آباد میں، ۱۳۲۹ھ تک یعنی سات برس تک وہ اس فرض کو انجام دیتے رہے، ۱۳۲۹ھ میں گیا میں مدرسہ انوار العلوم کی نبیاد ڈالی، مولانا عبدالوہاب منطقی بہاری بھی شریک کار تھے، یہ بات مجھے یوں یاد رہی کہ شاید ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء تھا کہ مدرسۂ مذکور کے ایک جلسۂ سالانہ میں مولانا عبدالوہاب صاحب حقانی دہلوی مرحوم شریک جلسہ ہوئے تھے اور تقریریں کی تھی۔

مولانا سجاد صاحب مدرسہ انوارالعلوم کا یہ جلسہ سال بہ سال کیا کرتے تھے اور اس میں علماء کو بلاتے تھے اور ان سے تقریریں کراتے تھے، میرا خیال ہے کہ اکثر علماء سے ان کی ملاقاتوں کا آغاز انہی جلسوں میں ہوا، مجھے بھی ایک دو دفعہ ان جلسوں میں حاضری کا اتفاق ہوا۔

سیاسیات کا ذوق: ان کو سیاسیات کا ذوق جنگ عظیم میں ترکی کی شکست اور ممالک اسلامیہ کی پراگندگی سے ہوا، وہ اس وقت الہ آباد میں تھے، ان کے ایک انگریزی داں شاگرد ان سے عربی پڑھنے آتے تھے، وہ اپنے ساتھ اردو اور انگریزی اخبارات لاتے تھے، اور مولانا کو پڑھ پڑھ کر سناتے تھے، یہ آگ روز بروز بھڑکتی چلی گئی، مولانا ابوالکلام کے الہلال کی تحریک نے بنگال کے قرب کے سبب بہار پر پورا اثر کیا تھا اور بہت سے علماء نے ان کی اس تحریک پر لبیک کہا، ان میں سے مولانا سجاد کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔

رانچی کی اسیری کے زمانہ میں مولانا ابوالکلام نے ہم خیال وکارفرما علماء کی تلاش وتفتیش کا کام ایک مخلص کے سپرد کیا تھا، انہوں نے جن علماء کا نشان دیا ان میں سے ایک مولانا سجاد بھی تھے، جو اس وقت انوار العلوم گیا کی مسند درس پر تھے۔

۱۹۱۹ء سے تحریک خلافت کی ترقی کے ساتھ ساتھ مولانا کا ذوق سیاست بھی بڑھتا گیا، ۱۹۲۰ء میں مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محل کی تحریک اور مسیح الملک حکیم اجمل خان مرحوم کی تائید سے جب جمعیۃ العلماء دہلی کی بنیاد پڑی، تو موصوف اس کے لبیک کہنے والے میں سب سے اول تھے اور یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ ان کے کتنے رفیق سفر تھک تھک کر اپنی جگہ پر بیٹھ رہے تھے، مگر انہی کی ایک ہستی تھی جو آخر تک جمعیۃ کے ساتھ لگی رہی، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ انہی کی روح تھی جو اس کے قالب میں جلوہ گر ہوتی رہی۔

بہار میں امارت شرعیہ کا قیام ان کی سب سے بڑی کرامت ہے، زمین شور میں سنبل پیدا کرنا اور بنجر علاقہ میں لہلہاتی کھیتی کھڑی کرلینا ہر ایک کا کام نہیں۔

۱۹۱۸ء میں معارف میں اس تحریک کو اٹھایا گیا اور اصلاحات کے سلسلہ میں اس کو پیش کیا گیا، پھر ۱۹۲۰ء میں یورپ سے واپسی کے بعد چاہا کہ اس کو تمام ہندوستان کا مسئلہ بنایا جائے، مگر اس عہد کے جدید تعلیم یافتہ علمبرداروں نے اس کو کسی طرح چلنے نہ دیا۔ مگر بہار میں مولانا سجاد صاحب کی قوت عمل نے اس کے باوجود کو قالب بخش دیا۔

مولانا سجاد مرحوم کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ علماء سیاسیات میں بھی قوم کی رہبری کا فرض انجام دیں، مسلمانوں میں دینی تنظیم قائم ہوجائے، جس کے تحت میں ان کے تمام تبلیغی و مذہبی وتعلیمی وتمدنی کام انجام پائیں، دارالقضا قائم ہوکر مسلمانوں کے ہر قسم کے مقدمات و معاملات تصفیہ پائیں، مسلمانوں کا بیت المال قائم ہوجائے جہاں مسلمانوں کے صدقات ومبرات وزکوٰۃ کی ساری رقمیں اکھٹی ہوکر ضروریات میں خرچ ہوں اور مستحقین میں تقسیم ہوں، مولانا نے عمر کے آخر بیس برس انہی کاموں میں صرف کئے اور حق یہ ہے کہ انہوں نے ہر قسم کی مالی بے بضاعتی، مددگاروں کی کمی، رفقاء کی نامساعدت اور حالات کی مخالفت کے باوجود جو کچھ کر دکھایا وہ ان کی حیرت انگیز قوت عمل کا ثبوت اور اللہ تعالیٰ کی توفیق خاص ہے۔

بہار کی تنہا دولت: ان کا وجود گو سارے ملک کے لئے پیام رحمت تھا، مگر حقیقت یہ ہے کہ صوبہ بہار کی تنہا دولت وہی تھے، اس صوبہ میں جو کچھ تبلیغی، تنظیمی، سیاسی و مذہبی تحریکات کی چہل پہل تھی وہ کل انہی کی ذات سے تھی، وہی ایک چراغ تھا جس سے یہ سارا گھر روشن تھا، وہ وطن کی جان اور بہار کی روح تھے، وہ کیا مرے کہ بہار مر گیا۔

مرثیہ ہے ایک کا اور نوحہ ساری قوم کا

علم وفضل: فلسفہ وتاریخ کے ماہر کہتے ہیں کہ علم وعمل کم یکجا ہوتے ہیں لیکن کم یاب مثالوں میں مولانا سجاد کی ذات تھی، وہ اپنے وقت کے بڑے مشاق مدرس اور حاضر العلم عالم تھے، خصوصیت کے ساتھ معقولات اور فقہ پر ان کی نظر بہت وسیع تھی، جزئیات فقہ اور خصوصاً ان کا وہ حصہ جو معاملات سے متعلق ہے ان کی نظر میں تھا، امارت شرعیہ کے تعلق سے اقتصادی و مالی وسیاسی مسائل پر ان کو عبور کامل تھا، زکوٰۃ وخراج وقضا وامارت وولایت کے مسائل کی پوری تحقیق فرمائی تھی، ہر چند کہ سالہا سال سے درس وتدریس و مطالعہ کا اتفاق نہیں ہوا تھا، مگر جب گفتگو کی گئی ان کا علم تازہ نظر آیا۔

فہم ورائے: ان کا علم کتابی نہ تھا، بلکہ آفاقی بھی تھا، معاملات کو خوب سمجھتے تھے، ان کو بارہا بڑے بڑے معاملات اور مقدمات میں ثالث بنتے ہوئے دیکھا ہے اور تعجب ہوا ہے کہ کیونکر فریقین کو وہ اپنے فیصلہ پر راضی کر لیتے تھے اور اس لئے لوگ اپنے بڑے بڑے کام بے تکلف ان کے ہاتھ میں دے دیتے تھے، کیونکہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا عطیہ فکر رسا اور رائے صائب تھی، مسائل اور حوادث میں ان کی نظر بہت دور دور پہنچ جاتی تھی، وہ ہر گتھی کو نہایت آسانی سے سلجھا دیتے تھے، حریف کی چالوں کی تہ تک پہنچ جاتے تھے، باوجود تواضع وخاکساری کے اپنی رائے پر پوری قوت کے ساتھ جمتے تھے اور محض ہٹ اور ضد سے نہیں، بلکہ دلائل کی قوت اور مصالح کی طاقت سے وہ دوسروں سے منوانے میں کامیاب ہوجاتے تھے۔

اخلاق: وہ بے حد خاکسار اور متواضع تھے، کبھی کوئی اچھا کپڑا انہوں نے نہیں پہنا، کبھی کوئی قیمتی چیز ان کے پاس نہیں دیکھی، کھدر کا صافہ، کھدر کا لمبا کرتہ کھدر کی لمبی صدری، پاؤں میں معمولی دیسی جوتے اور ہاتھ میں ایک لمبا عصا، یہ ان کی وضع تھی، مگر اپنی اس سادہ اور معمولی وضع کے ساتھ بڑے بڑے لیڈروں اور بڑے بڑے مجمعوں میں بے تکلف جاتے تھے اور اپنا لوہا منواتے تھے، جوہر پہنچاننے والے بھی تلوار کی کاٹ دیکھتے غلاف کی خوبصورتی نہیں۔

ہر شخص کی مصیبت میں ہر وقت کام آتے تھے اور ہر ایک کی سفارش میں ہر وقت سینہ سپر ہوجاتے، اللہ تعالیٰ نے ان کو جاہ و مرتبہ بھی عنایت فرمایا، انہوں نے خود اپنی پارٹی کی وزارت بھی بنائی اور بادشاہ گر نہیں تو وزیر گر ضرور بنے، کانگریسی حکومت کے زمانہ میں ان کو اچھا اقتدار حاصل رہا، مگر خدا گواہ کہ اس اثر واقتدار کو اپنی ذات کے لئے کبھی کام میں نہیں لائے، جو کچھ کیا وہ مسلمانوں کے لئے۔

ان کی زندگی نہایت سادہ تھی، غربت وعسرت کی زندگی تھی، گھر کے خوشحال نہ تھے، امارت سے معاوضہ بہت قلیل لیتے تھے، سفر معمولی سواریوں اور معمولی درجوں میں کرتے تھے اور اسی حال میں پورب اور پچھم اور پچھّم سے پورب اور اُتّر سے دکھن اور دکھن سے اُتّر دوڑتے رہتے تھے، ان کا دن کہیں گزرتا تھا اور رات کہیں، مسلمانوں کی سلامتی اور تنظیم کی ایک دھن تھی کہ ان کو دن رات چکر میں رکھتی تھی، کہیں قربانی کا جھگڑا ہو، مسلمانوں پر مقدمہ ہو، کہیں سیلاب آئے، کہیں آگ لگے، کہیں مسلمان کا تنازعہ ہو، ہر جگہ خود پہنچ جاتے تھے، معاملہ کا پتا لگاتے تھے، مظلوموں کی مدد کرتے تھے، ان کے لئے چندہ کرتے تھے۔ جہاں سے ہوسکتا وہ ان کو لا کر دیتے تھے اور خود خالی ہاتھ رہتے تھے۔

بہار میں زلزلہ کے زمانہ میں انہوں نے جس تن دہی سے کام کیا اور ایک ایک گاؤں میں جاکر جس طرح بے گھروں اور بے خانماؤں کو مدد دی وہ ان کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہے، جس کا صلہ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بارگاہ سے ان کو عنایت فرمایا ہوگا۔

لیڈروں اور قومی کارکنوں کے پاس عام طور سے ان کے اثر کے ذریعے تین ہیں، یا دولت ہے یا حسن تقریر ہے یا زور قلم ہے، مرحوم ان تینوں سے محروم تھے، وہ غریب تھے اور غریبوں ہی میں زندگی بسر کی، زبان میں لکنت تھی، جس سے وہ بولنے پر قادر نہ تھے، اور اسی لئے تقریر بہت کم کرتے تھے اور ان کے قلم میں وہ زور بھی نہ تھا جو آج کل کی انشاپردازی کا کمال ہے، تاہم ان سب کا بدل ان کے پاس ان کا اخلاص تھا، جو ان کی ہر کمی کو پورا کر دیتا تھا، عجب نہیں کہ زبان اور قلم کا عجز ہی تھا جو ان کی قوت عمل کی صورت میں ظاہر ہوا۔

جمعیۃ العلماء کے اجلاس کلکتہ کے خطبہ میں میرے قلم سے ان کی نسبت یہ الفاظ نکلے تھے جو پہلے مدح تھی، اب مرثیہ ہے:

”۱۳۴۳ھ کے اجلاس خاص مرادآباد کے موقع پر بھی مجھے یہ عزت عطا ہوئی

تھی، مگر عین وقت پر وفد جدہ کی شرکت نے انکار پر مجبور کیا اور میں خوش ہوں کہ اس کی بدولت ایک خاموش ہستی بولی، ایک بے زبان نے زبان کے جوہر دکھائے اور ایک ہمہ تن سوز وگداز نے کاغذ کے صفحوں پر اپنے دل کے ٹکڑے بکھیرے''۔

یہ بھی مولانا ہی کی قوت جاذبہ تھی جو مختلف الخیال علماء اور مختلف الرائے سیاسی رہنماؤں اور قومی کارکنوں کو ایک ساتھ ایک پلیٹ فارم پر جمع کیے اور ایک شیرازہ میں باندھے ہوئے تھی۔

شاید یہ کم لوگوں کو علم ہو کہ مولانا کی خانگی زندگی غم سے بھری ہوئی تھی، ان کے بڑے بھائی مجذوب تھے، ان کی بیوی معذور ومختل تھیں، ان کا بڑا لڑکا جو پڑھ لکھ کر فاضل اور گھر کا کام سنبھالنے کے قابل ہوا، عین اس وقت کہ اس کے نکاح میں چند روز باقی تھے، باپ نے اس کی دائمی جدائی کا داغ اٹھایا اور یہ سننے کے قابل ہے کہ وہ لڑکا...... مرض الموت میں تھا کہ مسلمانوں کی ایک ضرورت ایسی سامنے آئی کہ باپ بیمار بیٹے کو چھوڑ کر سفر پر روانہ ہوگیا، واپس آیا تو جوان بیٹا دم توڑ رہا تھا۔

ان کی اپنی زندگی بھی دین وملت ہی کی نذر ہوئی، ترہت کے دور افتادہ علاقہ میں جہاں کے ملیریا کے ڈر سے ادھر کے لوگ ادھر جانا موت کے منہ میں جانا سمجھتے ہیں، یہ مرد خدا جان کو ہتھیلی پر رکھ کر سال میں کئی کئی دفعہ جاتا تھا اور کئی کئی دن وہاں رہتا تھا، آخری سفر بھی وہیں ہوا اور وہیں سے ملیریا کی سخت بیماری اپنے ساتھ لایا اور اسی حال میں جان جان آفریں کے سپرد کی۔

جانے والے تیری روح کو سلام! جب تو زندہ تھا تو تیری قوم نے تیری قدر نہ پہچانی اب تو عالم ابد میں ہے، میرے کان غیب سے تیری زبانِ مجاز سے یہ آواز سنتے ہیں۔

یٰلَیۡتَ قَوۡمِیۡ یَعۡلَمُوۡنَ بِمَا غَفَرَلِیۡ رَبِّیۡ
وَجَعَلَنِیۡ مِنَ الۡمُکۡرَمِیۡنَ. [یٰسین:۲۶-۲۷]
اے کاش کہ میری قوم جانتی کہ خدا نے مجھے بخشا
اور مجھے ان میں داخل کیا جن پر اسکا کرم ہوا ہے۔

(''س''، دسمبر ۱۹۴۰ء)

عبدالعزیز، مولانا

مولانا عبدالعزیز گوجرانوالہ

دو ماہ ہوئے کہ مولانا عبدالعزیز صاحب خطیب وامام جامع مسجد گوجرانوالہ نے جو دیوبند کے عالم اور وقت کے بڑے محدث تھے، وفات پائی، انہوں نے صحاح ومسانید کی مختلف کتابوں کی فہرستیں بطور اطراف بڑی محنت سے لکھی تھیں، جن میں صرف بخاری کی فہرست **نبراس الساری فی اطراف البخاری** کے نام سے چھپی ہے، مرحوم نے مجھے لکھا تھا کہ مسند ابن حنبل کی بھی ایک فہرست بنائی ہے، اور وہ اس کے چھپوانے کی فکر میں تھے، کیا اچھا ہوا گر ان کی یادگار میں ان کی یہ کتاب گوجرانوالہ کے قدرداں چھپوا سکیں، یا وہ اس نسخہ کو کسی قدر شناس کے سپرد کریں، کہ وہ اس کو چھپوا کر اس فیض کو عام کرے۔ (''س''، دسمبر ۱۹۴۰ء)

محمود، محمد پاشا

محمد پاشا محمود

مصر کی ڈاک سے یہ معلوم کر کے بڑا افسوس ہوا کہ محمد پاشا محمود جو زغلول پاشا کے وفد کے ممبر تھے، اور بعد کو الگ ہو کر مصر کی وزارت میں شامل ہوگئے تھے، وفات پاگئے، ان کو ہندوستان سے یہ نسبت تھی کہ محمد علی مرحوم کے ساتھ اوکسفورڈ میں انھوں نے بھی تعلیم پائی تھی، پیرس میں وفد خلافت اور وفد مصر کی ملاقاتوں کے سلسلہ میں ان دونوں رفیقوں میں بڑی دلچسپ گفتگو ہوئی تھی، اور خاکسار سے زغلول پاشا کی ثالثی میں صحیح بخاری کی صحت پر ایک پر لطف مناظرہ ہوا تھا، زغلول پاشا کا یہ فقرہ جو محمد پاشا محمود کو مخاطب کر کے انھوں نے کہا تھا اب تک کانوں میں گونج رہا ہے، **ودع الامام یتکلم**۔ اللہ تعالیٰ نام کی طرح اُن کی عاقبت بھی محمود فرمائے۔ (''س''، فروری ۱۹۴۱ء)

سلیمان، شاہ، سر

سر شاہ سلیمان

نئی تعلیم نے جو بہتر سے بہتر نمونے ہماری قوم میں پیش کئے اُن میں سے ایک سر شاہ سلیمان تھے، وہ مشرقی تعلیم کے ایک ممتاز خاندان کے فرد فرید تھے، ان کا آبائی وطن ضلع اعظم گڑھ ہی کا ایک ممتاز قصبہ تھا، ملا محمود جون پوری جن کا نام شمس بازغہ اور فرائد کے مصنف کی حیثیت سے آفتاب کی طرح درخشاں ہے، ان کے مورثِ اعلیٰ تھے، سر سلیمان مرحوم نے بھی ابتدائی مشرقی تعلیم حاصل کی تھی، اور عربی تعلیم سے بہرہ ور تھے، ملا محمود نے فلسفہ میں ادب کی، اور ادب میں فلسفہ کی شان پیدا کی تھی، یہی خصوصیت سر سلیمان کی ذات میں تھی، ایک طرف وہ قصائد ذوق اور مثنویات میر کو ترتیب دیتے تھے اور دوسری طرف آئن سٹائن کے نظریہ پر نقد وتبصرہ کرتے تھے۔

سر سلیمان کی فطری ذہانت بے نظیر تھی، ذہانت کی بجلی ان کی رگ رگ میں بھری تھی، وہ نہ صرف ہائی کورٹوں کے جج رہے، بلکہ قانون کے نکتہ شناس بھی تھے، ان کی لیاقت وقابلیت کی شرح کے لئے چند سطریں کسی طرح کافی نہیں ہوسکتیں، اور ان سب باتوں کے ساتھ وہ مسلمان بھی تھے، ایماناً اور عملاً مسلمان! وہ ان تنگ ظرفوں میں نہ تھے

جو رومن حروف کے چند الفاظ پڑھ لینے کے بعد اپنے کو حقائق و معارف کا سب سے بڑا عارف مان کر دین و مذہب سے بے نیاز ہو جاتے ہیں، اور بندگی کی حد سے آگے بڑھ کر خدائی کے عرش کا اپنے کو مستحق سمجھنے لگتے ہیں، مرحوم میں ان خوبیوں کے ساتھ بہت سی اخلاقی خوبیاں بھی جمع تھیں، وہ منکسر، متواضع حلیم، اور سادہ مزاج تھے، ساتھ ہی اپنی رائے کے مضبوط اور کام کے دھنی تھے، وہ عالم تھے، مگر عمر بھر طالب العلم بنے رہے۔

مرحوم ہندوستان کا وقار اور مسلمانوں کا فخر تھے، افسوس کہ ۱۳/ مارچ ۱۹۴۱ء کو ہمارے ملک کا یہ وقار اور ہماری قوم کا یہ فخر جاتا رہا، گلے کی ایک معمولی بیماری نے خناق کی اور خناق نے غالباً دماغ کے پھوڑے کی شکل اختیار کی، ۱۸۸۶ء پیدائش کا سال تھا پچپن (۵۵) برس کی عمر میں اس دنیائے فانی کو الوداع کہا، انا للہ و انا الیہ راجعون، دنیاوی قانون کا جج اب دلوں کے سب سے بڑے قاضی القضاۃ اور احکم الحاکمین کی بارگاہِ عدالت میں ہے، دعا ہے کہ وہ احکم الحاکمین جو ارحم الراحمین بھی ہے اپنی شفقت و رحمت کی کرسی پر اس کو جگہ دیگا، اور اپنی بخشش و بخشایش کی عزت سے سرفراز فرمائے گا۔

(''س''، اپریل ۱۹۴۱ء)

ندوی، معین الدین، مولانا حاجی

مولانا حاجی معین الدین ندوی

مصنف خلفائے راشدین

افسوس کہ ۵/ ربیع الثانی ۱۳۶۰ھ کو ہماری جماعت کے ایک لائق فرد مولانا حاجی معین الدین صاحب ندوی صدر مدرس مدرسۂ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ نے تقریباً پچاس ۵۰ برس کی عمر میں وفات پائی انہوں نے اپنی پوری تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حاصل کی اور ۱۹۱۲ء میں درجۂ تکمیل سے فراغت پائی، ۱۹۱۴ء کے آخر میں دارالمصنفین کے قیام پر وہ دارالمصنفین کے رفیق منتخب ہوئے اور سلسلہ سیر الصحابہ کی پہلی اور دوسری جلد خلفائے راشدین اور مہاجرین حصہ اول لکھی، ایک سال کے بعد یہاں سے کتب خانہ ندوہ کی ترتیب کے لئے لکھنؤ گئے اور اس کام سے ان کو ایسی دلچسپی ہوئی کہ بوہار امپریل لائبریری کلکتہ میں ترتیب فہرست کے کام پر مقرر ہو گئے اور وہاں سے اورینٹل لائبریری بانکی پور پٹنہ کی عربی کتابوں کی ترتیب فہرست کے کام پر لگائے گئے، اور کئی جلدیں بڑی قابلیت سے انگریزی میں مرتب کیں اور گورنمنٹ کی طرف سے چھپیں، اس جگہ کی تخفیف ہونے پر دائرۃ المعارف حیدر آباد میں قدیم ہندوستانی تاریخی مقامات کا ایک جغرافیہ عربی زبان میں ترتیب دیا جو دائرہ کی طرف سے چھپا ہے، یہاں سے نکل کر وہ چند روز رامپور کی سرکاری لائبریری میں مقرر ہوئے اور آخر صوبہ بہار کی مشہور سرکاری عربی درسگاہ مدرسہ شمس الہدیٰ کے پرنسپل مقرر ہوئے اور اسی خدمت پر وفات پائی۔

وہ نہایت خاموش طبیعت ملنسار متواضع اور نیک دل تھے، وطن صوبہ بہار کے دو مشہور گاؤں گیلانی اور استھاواں میں تھا، نوجوانی ہی میں جب وہ دارالعلوم میں پڑھتے تھے، حج سے شرف ہوئے تھے، اسی لئے وہ ہماری جماعت میں حاجی صاحب کے نام سے ایسے مشہور و متعارف تھے کہ یہ ان کے اصلی نام کا جز بن گیا تھا، انگریزی تعلیم صرف ندوہ میں چند ریڈروں تک پڑھی، مگر کام کرنے پر اپنی ذاتی محنت سے اتنی ترقی کی کہ انگریزی میں فہرست کی دو تین جلدیں ایسی لکھیں کہ اہل بصیرت نے بھی ان کی تعریف کی، آخری زمانہ میں وہ کتب حدیث کا درس دیتے تھے اور یہی ان کا آخری کارنامہ ہے۔

اللہ تعالیٰ اس مجموعہ فضل و کمال و اخلاق کو اپنی عطاء و مغفرت سے سرفراز اور اس کی خدمتوں کو قبول فرمائے۔

(''س''، مئی ۱۹۴۱ء)

فرنگی محلی، عنایت اللہ، مولانا

مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ فرنگی محل کے ممتاز عالم مولانا عنایت اللہ صاحب فرنگی محلی نے ۶/ جولائی ۱۹۴۱ء کو دفعتہً وفات پائی، انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مرحوم ابھی ۲۴، ۲۵، ۲۶ جون کو ہمارے ساتھ بھوپال میں عربی مدارس کی اصلاح کے کام میں شریک تھے، وہیں درد شکم میں مبتلا ہوئے جس کے باعث وہ کئی دن تک وہاں علیل رہے، سوء ہضم، تسلسل بول اور ضعف قلب کے عوارض ان کو پہلے سے لاحق تھے، بھوپال میں مرض کی تخفیف کے بعد وہ لکھنؤ روانہ ہوئے اور میں بھی ان ہی کی وجہ سے ان ہی کے ساتھ لکھنؤ تک آیا، لکھنؤ اسٹیشن پر پہنچ کر مرحوم نے مجھ سے کہا کہ میں آپ کی زحمتوں اور خدمتوں کا شکریہ اس لیے نہیں ادا کروں گا کہ میں آپ کو اپنے سے علیحدہ نہیں سمجھتا، یہ کہہ سن کر سلام کے بعد ہم دونوں الگ ہو گئے، یہ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ سلام رخصت آخری سلام ہے۔

مرحوم فرنگی محل کے خانوادہ میں تنہا جامع علوم و فنون ہستی باقی رہ گئے تھے، معقولات اور منقولات پر ان کو یکساں دسترس حاصل تھی، مسائل پر وہ مبصرانہ اور ناقدانہ نظر رکھتے تھے، اردو میں تاریخ، حدیث و رجال پر کئی رسالے لکھے تھے، مدرسہ نظامیہ کے صدر مدرس اور اچھے مدرس تھے، سیاسیات سے بھی دلچسپی رکھتے تھے، خلافت اور مسلم لیگ کے کاموں میں حصہ لیتے رہتے تھے، کل ۵۴ برس کی عمر پائی، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی عنایتوں سے سرفراز فرمائے۔

(''س''، اگست ۱۹۴۱ء)

حیدری، اکبر، سر

سر اکبر حیدری

افسوس ہے کہ ۸/ جنوری ۱۹۴۲ء کی شام کو سابق صدر اعظم ریاست حیدر آباد سر اکبر حیدری نے دلّی میں وفات پائی، سر اکبر حیدری ہندوستان کی سب سے بڑی اسلامی ریاست کے وزیر مالیات اور پھر صدر اعظم ہونے کے سبب سے تمام اسلامی اداروں سے ایک خاص مربّیانہ تعلق رکھتے تھے، اور اس بنا پر ان کا حادثہ وفات ہم سب کے لیے غم والم کا باعث ہوا ہے، ان کی عمر اس وقت ۲۷ برس کی تھی، مگر اس عالم میں بھی جس انہماک، مصروفیت اور بیدار مغزی سے وہ اپنے مفوضہ خدمات کو انجام دیتے تھے اس سے ان کے غیر معمولی دل و دماغ کے آدمی ہونے کا ثبوت ملتا تھا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ (''س''، جنوری ۱۹۴۲ء)

نعمانی، حامد

حامد نعمانی مرحوم

مولانا شبلی نعمانیؒ کی ایک ہی جسمانی یادگار باقی رہ گئی تھی وہ بھی مٹ گئی، یعنی ان کے اکلوتے صاحبزادہ حامد نعمانی صاحب نے ۶۲/ برس کی عمر میں ۲/ ربیع الاول ۱۳۶۱ھ مطابق ۲۰/ مارچ ۱۹۴۲ء کی شب کو جونپور میں دفعتہً وفات پائی، وہ کئی برس سے مرض قلب میں گرفتار تھے، علاجوں کے سہارے سے چلتے پھرتے تھے، مگر اندر سے کھوکھلے ہو چکے تھے، ۱۹/ مارچ کو وہ ایک ضرورت سے جونپور گئے تھے، شام کو پہنچے، اپنا کام کیا، رات کو ۳ بجے کے قریب درد دل کا دورہ ہوا، ان کے میزبان دوست ان کے کراہنے کی آواز سن کر ان کے پاس آئے، مرحوم نے کہا کہ مجھے ذرا سہارا دے کر بٹھا دو، انہوں نے اپنے سینے کے سہارے سے بٹھا دیا، اسی کے ساتھ مرحوم نے ان کو السلام علیکم کہا، اور آخری سانس لے کر نامعلوم سفر کی منزل پر روانہ ہوگئے، انا للہ و انا الیہ راجعون، ۲۰ کی صبح کو لاش کار سے اعظم گڑھ آئی، اور شبلی منزل میں باپ کے پہلو میں بیٹے کو ہمیشہ کے لیے سلا دیا گیا۔

مرحوم بڑے توانا و تندرست، قوی ہیکل، بلند و بالا، اور علی گڑھ کالج کے مشہور کھلاڑیوں میں تھے، گھوڑے کی سواری اور پولو میں بھی ممتاز تھے، تحصیلداری کے عہدہ پر فائز ہوکر پنشن پائی پھر ریاست منجھولی میں منیجر ہوئے، مگر صحت کی خرابی کے سبب سے مستعفی ہوگئے، پابند صوم وصلوٰۃ، نیک دل اور بہت رحیم المزاج تھے، اپنی ذاتی زندگی میں گو وہ بہت قانع اور منتظم تھے مگر اس طرح سے جو بچتا تھا، اس کو ہمیشہ فیاضی کے ساتھ نیک کاموں میں لگا دیا کرتے تھے، ۱۹۲۷ء میں حج بھی کیا تھا، زکوۃ کا پورا حساب رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ ان پر رحمت فرمائے اور اپنے خزانہ سے ان کو اجر جزیل عطا کرے، مولانا شبلی مرحوم کی جو صاحبزادیاں تھیں وہ تو باپ کی زندگی ہی میں وفات پا چکی تھیں، ایک یہ فرزند تھے جو چل بسے۔

افسوس کز قبیلہ مجنوں کسے نماند

(''س''، اپریل ۱۹۴۲ء)

ٹونکی، حیدر حسن خاں محدث، مولانا

مولانا حیدر حسن صاحب محدث ٹونکی کی وفات

مولانا حیدر حسن خاں صاحب محدث ٹونکی جو تقریباً دس پندرہ برس تک دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں شیخ الحدیث رہ کر دو سال ہوئے کہ ریاست کی خواہش پر اپنے وطن چلے گئے تھے، افسوس ہے کہ چند روز ہوئے کہ اپنے وطن ہی میں وفات پائی، محدث مرحوم اور ان کے بڑے بھائی مولانا محمود حسن خاں صاحب مصنف معجم المصنفین اس وقت کے علماء میں ایسے دو نامور فرد تھے کہ جن کے وجود پر علم وفضل اور ورع وتقویٰ کو ناز تھا، الحمدللہ کہ ابھی مولانا محمود حسن خاں صاحب ہم میں موجود ہیں، مگر افسوس ہے کہ ان کے چھوٹے بھائی مولانا حیدر حسن خاں صاحب نے اس عالم فانی کو الوداع کہا، ایسے زمانہ میں جب نام کے مولویوں کی تعداد گو کثرت حاصل کر رہی ہے، مگر کام کے علماء روز بروز کم سے کم ہوتے جا رہے ہیں، مرحوم کی وفات مشرقی علم وفضل کی کائنات میں حادثہ عظیم سمجھی جائے گی۔

مرحوم بڑے جامع العلوم تھے، علوم عقلیہ ونقلیہ وریاضیہ کے وہ یکساں ماہر تھے، زیادہ تر اپنے بڑے بھائی مولانا محمود حسن خاں صاحب سے پڑھا تھا، حدیث کی سند شیخ حسین صاحب عرب یمنی خزرجی سے حاصل کی تھی، استفادہ باطنی میں بھی ان کا مرتبہ بلند تھا، انہوں نے مکہ معظّمہ جا کر حضرت حاجی شاہ امداد اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ سے فیض حاصل کیا تھا، اور ماشاء اللہ زہد وعبادت بے تکلفی اور تواضع میں بزرگوں کا نمونہ تھے، علم عقلیہ وریاضیہ میں بھی ان کا درجہ بلند تھا، اور علوم نقلیہ میں وہ ماہر کامل تھے، علم حدیث کو بطرز حنفیہ بہت خوبی سے پڑھاتے تھے، رجال پر ان کی نظر وسیع تھی، ان کے درس کا طریقہ یہ تھا کہ حدیث پڑھاتے وقت احادیث کی ساری کتابیں اور اسماء الرجال اور اصول کی کوئی مستند کتاب اردگرد رکھ لیتے تھے، ہر نزاعی مسئلہ پر وہ داد تحقیق دیتے وقت اپنے شاگردوں کو ہر حوالہ کی حدیث کو نکال کر دکھاتے اور رجال پر بحث کرتے وقت راوی کی حالت زبانی بیان کر کے مزید تشفی کے لیے ان کو کتاب کھول کر اس راوی پر جرح وتوثیق کے اقوال بھی دکھا دیتے اور اصول سے اپنے مدعا کو ثابت کرتے تھے۔

ان سے اکثر مسائل میں گفتگو آتی رہتی تھی، مگر وہ ہمیشہ حاضر العلم نظر آئے، اور جب کبھی کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی، صاف اقرار کر لیتے تھے، اور دوسرے وقت وہ اس

کو دوبارہ سمجھ کر بحث میں لاتے تھے، اس علم و فضل پر بے حد منکسر، بیحد خاکسار، بیحد متواضع، اتباع سنت اور پابندی شریعت میں ممتاز تھے، ان کی نماز خضوع و خشوع اور سکون و طمانیت کی تصویر ہوتی تھی، دارالعلوم کی مدرسی کے زمانہ میں لکھنؤ کے اکثر اہل علم ان کے معترف و مداح تھے، اور مسائل میں ان کا فیصلہ قول فیصل کا حکم رکھتا تھا، اللہ تعالیٰ اس مجموعہ خوبی کو اپنے فضل و کرم سے نوازے، اور مراتب اعلیٰ عنایت فرمائے۔

("س"، جولائی ۱۹۴۲ء)

سورتی، محمد، مولانا

مولانا محمد سُورتیؒ

پچھلے مہینہ کا سب سے اندوہناک علمی حادثہ مولانا محمد سورتی کی وفات ہے، مرحوم اس عہد کے متنبی دل و دماغ اور حافظہ کے صاحب علم تھے، جہاں تک میری اطلاع ہے اس وقت اتنا وسیع النظر، وسیع المطالعہ، کثیر الحافظہ عالم موجود نہیں، صرف و نحو، لغت و ادب و اخبار و انساب و رجال کے اس زمانہ میں درحقیقت وہ امام تھے، وہ چند ماہ سے مرض استسقا میں مبتلا تھے، علی گڑھ میں ان دنوں قیام تھا اور وہیں ۷/ اگست کو بروز جمعہ وفات پائی۔

مرحوم کا اصلی وطن سورت (گجرات) تھا، وطن میں ابتدائی تعلیم پا کر یہ دلّی آئے اور رامپور میں مولانا محمد طیب صاحب مکی کا تلمذ حاصل کیا، میری ان کی پہلی ملاقات ۱۹۰۸ء میں ہوئی، جب مولانا طیب مکی رامپور چھوڑ کر دارالعلوم ندوہ لکھنؤ میں ادیب اول کے عہدہ پر فائز تھے، فاضل استاد کے ساتھ یہ لائق شاگرد بھی لکھنؤ وارد ہوا اور اس زمانہ سے لے کر اخیر تک ان کے ساتھ میری علمی رفاقت اور ذاتی دوستی کا سلسلہ قائم رہا، معارف بھی ان کے رشحات قلم سے کبھی کبھی مستفید ہوتا رہا ہے۔

مرحوم اس فضل و کمال کے باوجود ہمیشہ پریشان حال رہے اور کہیں ایک جگہ جم کر بیٹھنا ان کو نصیب نہ ہوا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے علم سے استفادہ بہت کم کیا جاسکا اور کوئی کارآمد تصنیف بھی اپنی یادگار نہ چھوڑ سکے اور نہ کوئی لائق شاگرد ہی ان کا قائم مقام ہوسکا، البتہ چند جسمانی اولاد ان کی یادگار ہیں۔

ایک زمانہ میں جامعہ ملیہ دہلی میں معلم رہے، پھر بنارس کے جامعہ رحمانیہ میں مدرس ہوئے، بعد کو بمبئی میں ایک اہلحدیث مدرسہ میں حدیث کا درس دینے لگے تھے، ٹونک کے مشہور کتب خانہ کی کشش بھی ان کو ٹونک لے جاتی تھی، انہوں نے شادی بھی ٹونک ہی میں کرلی تھی، قلمی کتابوں کی تلاش اور فراہمی اور نقل ان کا ذریعہ معاش رہ گیا تھا، اس تعلق سے وہ ٹونک، پٹنہ، رامپور، کلکتہ اور حیدرآباد کا سفر اکثر کیا کرتے تھے، لیکن آخرت کے سفر کے لئے ان کی تقدیر میں علی گڑھ کی مٹی لکھی تھی، ساٹھ کے قریب عمر پائی، سر بڑا، بدن گداز ہاتھ پاؤں بھاری تھے۔

مرحوم مسلکاً اہل حدیث تھے اور اپنے مسلک میں بے حد غالی تھے، طبیعت بے قرار اور وارستہ تھی، کسی ایک جگہ بیٹھ نہیں سکتے تھے، ساتھ ہی نہایت سادہ مزاج، بے تکلف، احباب پرور، فیاض اور مستغنی تھے، کھانے اور کھلانے کے بیحد شائق تھے، ہمیشہ مقروض اور خانہ بدوش رہتے تھے۔

مرحوم کا پایہ علم و ادب اور رجال و انساب و اخبار میں اتنا اونچا تھا کہ اس عہد میں اس کی نظیر مشکل تھی، جو کتاب دیکھتے تھے وہ ان کے حافظہ کی قید میں آجاتی تھی سینکڑوں نادر عربی قصائد، ہزاروں عربی اشعار و انساب نوک زبان تھے۔ ان کو دیکھ کر یقین آتا تھا کہ ابتدائی اسلامی صدیوں میں علماء ادباء اور محدثین کی وسعت حافظہ کی جو عجیب و غریب مثالیں تاریخوں میں مذکور ہیں وہ یقیناً صحیح ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ ("س"، ستمبر ۱۹۴۲ء)

یار جنگ، محمد، نواب

نواب محمد یار جنگ بہادر

نواب محمد یار جنگ بہادر (حیدرآباد، دکن) کی وفات کا سانحہ بھی اسی اثناء میں پیش آیا مرحوم نسلاً عرب تھے اور ایک مرنج و مرنجان بزرگ، نہایت مخلص، بے ریا باخدا، اور نیک طبع تھے، صوبہ داری کے منصب سے وظیفہ یاب ہوکر بلدہ میں مقیم تھے، حیدرآباد کی ہر علمی و تعلیمی تحریک میں وہ شریک رہتے تھے، دائرۃ المعارف اور مدرسہ نظامیہ کی اعزازی خدمت بھی ان کے سپرد تھی، دارالمصنفین سے مرحوم کو بے حد دلچسپی تھی اور ہمیشہ وہ اس کی مدد فرماتے رہتے تھے، اہل علم کے لئے ان کا گھر ایک مہمان خانہ کی حیثیت رکھتا تھا، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمتوں سے نوازے۔

("س"، ستمبر ۱۹۴۲ء)

آزاد عظیم آبادی، فضل حق

حافظ فضل حق آزاد عظیم آبادی

۲۷/ شعبان ۱۳۶۱ھ کو صوبہ بہار کے مشہور و ممتاز کہنہ مشق شاعر حافظ فضل حق آزاد عظیم آبادی نے اس دنیائے دوں کو الوداع کہا، مرحوم کی عمر اس وقت غالباً اسّی (۸۰) سے زیادہ ہوگی، کانوں سے اونچا سننے لگے تھے، مگر اس سن و سال میں بھی ان کی شاعری کے شباب کا وہی عالم تھا، غزلوں کے کہنے کا اتفاق کم ہوتا تھا، مگر قومی و علمی و اخلاقی اور فلسفیانہ نظموں کا شوق زیادہ تھا، زیادہ تر اردو میں اور کبھی کبھی فارسی میں کہتے تھے اور شاذ و نادر عربی میں بھی طبع آزمائی کی نوبت آجاتی تھی۔

پٹنہ میں سرسید مرحوم کی تعلیمی وقومی تحریک کے علمبردار قاضی رضا حسین صاحب مرحوم تھے، یہ ان کے حیدرآباد کے وفد کے ایک رکن بھی تھے، قاضی صاحب مرحوم کی فیض بخش علمی صحبتوں میں بہار کے جو چند نوجوان ابھرے، بڑھے اور پھیلے، ان میں ایک نام حافظ آزاد مرحوم کا بھی ہے، چنانچہ سرسید مرحوم کے اس ۱۸۹۱ء والے حیدرآبادی وفد میں جس کے دوسرے ممبر مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حالی وغیرہ تھے، قاضی رضا حسین صاحب کیساتھ آزاد مرحوم بھی تھے۔

میں نے ان کو سب سے پہلے ۱۹۰۰ء میں جب میری نوعمری تھی ندوہ کے اجلاس پٹنہ میں اپنا ترکیب بند پڑھتے سنا، بلند قد، اونچی آواز، خوداعتمادی کے تیور، لہجہ پرجوش، کٹہرے میں شیر کی گرج سی سنائی دیتی تھی، سامنے علماء اور مشائخ کی صفیں تھیں، جن کی تعداد کئی سو سے کم نہ ہوگی، اکثر کی نورانی شکلوں کی یاد اب بھی دل کو منور کرتی ہے، شاعر نے جب ان کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرکے یہ شعر پڑھا ہے:

نشانِ کاروانِ رفتہ ہیں دل کے اجالے ہیں
غنیمت ہی غنیمت ہیں کہ سب اللہ والے ہیں

تو تحسین وآفریں کی آوازوں سے ساری فضا گونج گئی تھی، اسی جلسہ میں آغا سنجر طہرانی بھی تھے، اور انہوں نے بھی اپنا وہ فارسی قصیدہ پڑھا تھا جس کا مطلع تھا:

ستایش می سزد البتہ یکتا ذات یزداں را
کہ اوازِ نطقِ تشریف شرف بخشید انساں را

مولانا شبلی مرحوم سے ان کی ملاقات اسی عہد جوانی کی تھی، مولانا مرحوم نے جن دنوں ۱۹۰۸ء میں اپنی ان فارسی غزلوں کا سلسلہ شروع کیا تھا، جو بوئے گل اور دستہ گل کے نام سے چھپ چکی ہیں اور ملک میں ان غزلوں کا پرجوش خیر مقدم کیا جارہا تھا اور اہل سخن ان کے جواب میں غزلیں لکھا کرتے تھے، تو ان میں سے ایک حافظ صاحب مرحوم بھی تھے، غالباً یہی سنہ تھا مولانا مرحوم کلکتہ سے لوٹ کر پٹنہ میں مولوی خدابخش خاں مرحوم (کتب خانہ والے) کے یہاں ٹھہرے تھے، خاکسار بھی حاضر تھا اتنے میں مولانا سے ملنے حافظ صاحب مرحوم بھی آگئے، اسی زمانہ میں مولانا کی ایک فارسی غزل نئی نئی شاق افتادہ بود، طاق افتادہ بود، نکلی تھی، وہ مولانا نے ان کو سنائی، انہوں نے بعد کو اس کا جواب لکھا، سب سے آخری دفعہ وہ ۱۹۲۷ء کے اجلاس ندوہ کانپور میں جس کے صدر حکیم اجمل خاں مرحوم تھے ادھر آئے تھے اور اپنی ایک نظم پڑھی تھی۔

مرحوم فطری شاعر تھے، کسی استاد سے کبھی اصلاح نہیں لی، مشکل قافیوں اور ردیفوں کا بھی شوق تھا، زبان ومحاورات وروزمرہ کے بجائے دقیق مضامین ومعانی کا شوق زیادہ تھا، اسی لئے مشکل الفاظ سے پرہیز نہ تھا، طبیعت میں ذکاوت وذہانت تھی اور اپنے لئے آپ راستہ پیدا کرنے کی دھن تھی، تقلید عام سے نفور تھے، جوانی میں شاد عظیم آبادی سے بھی بھڑتے رہتے تھے اور ''الپنچ'' میں مذاقیہ دادِ نظم بھی دیتے تھے، ادھر مدت سے خانہ نشین تھے، باہر کی آمد ورفت بند تھی، کبھی کبھی ایک آدھ کسی رسالہ میں نکل جاتی تھی، اسی حالت میں اپنے وطن شاہو بگہہ ضلع گیا میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

؎ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا (''س''، اکتوبر ۱۹۴۲ء)

وصل بلگرامی

وصل بلگرامی

اس ماہ یوپی اور بہار کے دو ممتاز شاعروں اور ادیبوں کی وفات کی اطلاع ملی، ان صفحات میں ان مرحوموں کا ذکر اس لئے ہوتا ہے کہ ہماری آئندہ نسلوں کو اپنے پچھلوں کے نام نیک کی خبر رہے، اسلامی تاریخ کا ایک بڑا اہم کارنامہ وفیات یعنی ہزاروں لاکھوں بزرگوں، فاضلوں، ادیبوں اور ممتاز لوگوں کی وفات کی تاریخ کا تعین ہے، تاریخ کی اس صنف پر بہت سی کتابیں مدون ہوئیں، کیا عجب ہے کہ شذرات کا یہ حصہ ایک دن اس عہد کے وفیات کے اوراق بن جائیں۔

وصل بلگرامی مرحوم ومغفور کے جاننے والوں اور ملنے والوں کو یہ سن کر بڑا قلق ہوگا، کہ ۲۸/رمضان المبارک ۱۳۶۱ھ کو رات کے وقت وہ ہمیشہ کے لئے ان سے جدا ہوگئے، مرحوم بڑے ملنسار، متواضع، پُرمحبت، دوستوں کے فداکار اور وقت پر ہر ایک کے کام آنے والے تھے، وہ گو ہمیشہ سے دیندار اور پابند وضع لوگوں میں تھے، جوانی میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہی سے ملتے تھے اور اب ادھر دس بارہ برس سے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی (متعنا اللہ تعالیٰ بفیوضہ وبرکاتہ) سے ان کی ارادت کا تعلق تھا اور اب وہ زیادہ تر حضرت مولانا کی خدمت میں تھانہ بھون ہی میں خانقاہ امدادیہ کے ایک حجرہ میں مقیم رہتے تھے، وہیں اسی حجرہ میں چندروز کے بخار میں اچانک وفات پائی، شیخ نے اپنے مرید کی نماز جنازہ پڑھائی اور وہیں کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔ خاکسار سے مرحوم کے تعلقات بہت پرانے تھے، ۱۹۰۶ء میں میری تعلیم ختم ہوئی اور وہ اس عمر میں تھے کہ عالمگیر کے نام سے ایک رسالہ نکال رہے تھے، ان سے بلگرام ہی کی مردم خیز زمین پر اسی زمانہ میں ملاقات ہوئی تھی، اس وقت وہ جوان شاعر اور ادیب تھے، اردو فارسی قدرے عربی اور انگریزی جانتے تھے، پھر ان کو جب وہ ادھیڑ ہوچکے تھے مولوی سبحان اللہ صاحب مرحوم رئیس گورکھپور کی سرپرستی میں گورکھپور میں دیکھا، اس کے بعد انہوں نے لکھنؤ پہنچ کر مرقع کے نام کا رسالہ جاری کیا، جو چند سال جیتا رہا، اب آخر میں وہ زاہد گوشہ نشیں ہوکر آئے اور اسی پر ان کے کارنامۂ حیات کا خاتمہ ہوگیا، اللہ تعالیٰ اس خلق محبت کے مجسمہ کو اپنی محبت سے نوازے۔

(''س''، نومبر ۱۹۴۲ء)

نصیر بیرسٹر

مسٹر نصیر بیرسٹر

بہار میں نئی تعلیم بنگال کے قرب بلکہ ملحقہ صوبہ ہونے کی وجہ سے بہت پہلے پھیلی، وہاں کے مسلمان شرفا کے جونونہال ان میں سب سے زیادہ پھلے پھولے ان میں سید علی امام، حسن امام اور مظہر الحق وغیرہ کے نام ان کے بعض سیاسی اور قومی کارناموں کی وجہ سے بہت نمایاں ہیں، انہی کے معاصرین میں ایک نام مسٹر نصیر بیرسٹر کا ہے، پٹنہ کے قریب شرفا کا ایک مشہور قصبہ نگرنہسہ ہے، وہ وہیں کے انصاری خاندان کے چشم و چراغ تھے، خاندان میں عربی و فارسی علوم کا چرچا تھا، ان کے دادا، شاہ عبدالعزیز دہلویؒ یا حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی کے شاگرد تھے اور ان نفوس قدسیہ کے برکات کا خاصہ اثر اس مغربی تعلیم یافتہ کے ذہن وخیال پر تھا، افسوس کہ ستمبر ۱۹۴۲ء کے آخر میں اس دور کی یہ یادگار شخصیت بھی مٹ گئی۔

۱۸۹۸ء میں جب خاکسار پہلی دفعہ دیہات سے نکل کر شہر (پٹنہ) میں آیا تو سب سے پہلے انہی کی کوٹھی پر جو مراد پور کی سڑک کے شمالی رخ پر تھی اس تعلق سے قیام ہوا تھا کہ میرے چھوٹے چچا مرحوم اس زمانہ میں انہی کے ساتھ رہتے تھے، عمر میں پہلا اتفاق تھا، اس لئے ان کی ہر چیز مجھے عجیب معلوم ہوتی تھی، بہت گویا، بہت ہنس مکھ، ہر وقت خوش و بشاش، شعر وسخن کے دلدادہ، علمی صحبتوں کے شائق، بزرگوں کا ادب، دین کا پاس اور مذہب کا جوش، کوٹ پتلون اور ہیٹ کے اس پتلے میں عجیب رنگین کیفیت پیدا کردیتا تھا۔

۱۹۰۰ء میں ندوۃ العلماء کا ساتواں سالانہ جلسہ پٹنہ عظیم آباد میں تھا، جو قدیم تعلیم کے ساتھ جدید تعلیم کا بھی مرکز تھا، اجلاس میں علماء کرام اور مشائخ عظام کے پہلو بہ پہلو جسٹس مولوی سید شرف الدین مرحوم کی سرکردگی میں ان نوجوان بیرسٹروں کا جھرمٹ بھی تھا اور شاید یہ پہلا دن تھا جب مقدس شملے اور ہیٹ یکجا نظر آئے تھے، اسی اثناء میں جوش وحمیت کا یہ پتلا پورے انگریزی ڈریس میں اسٹیج پر آیا اور وہ دلدوز تقریر کی کہ میری ان آنکھوں نے بڑے بڑے مقدس علماء مشائخ کو ڈھاڑیں مار مار کر روتے دیکھا، مقرر کے جوش کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنا قیمتی کوٹ، گھڑی، انگوٹھی سب نذر کردی، جن لوگوں نے اس منظر کو دیکھا تھا وہ سماں آج تک نہیں بھولے ہیں۔

یا تو میں نے ان کو انگریزی کپڑوں اور انگریزی شکل وصورت میں دیکھا، یا پھر ابھی دس برس ہوئے، ریش سپید، مخملی ٹوپی اور اچکن اور کرتے میں دیکھا اور سنا کہ اب یہ عالم ہے کہ تسبیح وسجادہ سے سروکار ہے، مرحوم کی دوسری شادی نیورہ میں ہوئی تھی، چند سال ہوئے کہ وہاں اس سے بھی بڑھ کر محو استغراق پایا، مجھ سے عزیزانہ برتاؤ تھا، جوانی میں میلاد کا پرشوق رسالہ لکھا تھا اور پیری میں شاعری پر ایک اردو مثنوی جو خاکسار کے مقدمہ کے ساتھ مطبع معارف میں چھپی تھی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی مغفرت سے سرفراز کرے، ان کے پورے حالات نقوشِ سلیمانی کے آخر میں ان کے مثنوی کے دیباچہ میں لکھے گئے ہیں۔

(''س''، نومبر ۱۹۴۲ء)

قصوری، عبدالقادر، مولانا

مولانا عبدالقادر صاحب قصوری

پنجاب کے نامور عالم اور وکیل و مجاہد سیاسیات مولانا عبدالقادر صاحب قصوری کی وفات کی خبر سے بڑا صدمہ ہوا، قصور ضلع لاہور ان کا وطن تھا اور وہیں وکالت کرتے تھے اور اچھے نامور وکیل تھے، عربی کے عالم، دینیات کے فاضل اور انگریزی سے واقف تھے، مولانا ابوالکلام کے الہلال والی تحریک سے ان کو ایسی دلچسپی تھی کہ اس کے لئے انہوں نے بہت کچھ نثار کیا، اپنے ایک صاحبزادہ کو ایک طرف عالم بنایا اور دوسری طرف کیمبرج کا گریجویٹ، اسی طرح اپنے دوسرے بیٹے کو بھی عربی وانگریزی کی تعلیم دلائی اور دونوں کو مع اپنی زندگی کے بہت سے سرمایہ کے دعوت وتبلیغ اسلام کے کاموں کی نذر کردیا، جس کا سلسلہ ایک زمانہ میں بمبئی سے لے کر مدراس تک جال کی طرح پھیلا تھا، خلافت کی تحریک میں کامیاب وکالت کو خیر باد کہہ کر قومی وسیاسی تحریکوں میں شامل ہوگئے اور اخیر تک اپنے عہد پر قائم رہے۔

مرحوم مسلکاً اہل حدیث تھے، نہایت دیندار، متواضع، ملنسار، پابندوضع، علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی تصانیف کے بڑے شائق تھے اور انہی کی تحقیقات پر ان کا عمل تھا، خلافت حجاز اور کانگریس میں بیش از بیش حصہ لیا اور اس عمر میں بھی جو غالباً اسی (۸۰) کے قریب ہوگی، وہ اپنے جذبات کے لحاظ سے ایسے ہی جوان تھے، ادھر سیاسیات کی عملی تحریکوں سے کنارہ کش تھے۔

مرحوم کو خاکسار سے گوناگوں تعلقات قلبی تھے، قومیات میں ہمیشہ ساتھ رہا خیالات میں بہت کچھ ہم آہنگی تھی، سب سے اخیر بات یہ کہ حجاز کے وفد خلافت میں جو ۱۹۲۴ء میں جدہ تک جاسکا تھا وہ خاکسار کے ساتھ تھے، گو وفد کی صدارت برائے نام میرے نام تھی، مگر ان کے مشورہ کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھایا جاتا تھا، جدہ کے نہایت پر خطر موقعوں پر جب جان کا خطرہ بھی تھا وہ برابر ہمت بڑھاتے رہتے تھے، مکلاّ، سوڈان، جدہ اور قاہرہ میں ہر جگہ وہ ساتھ تھے، افسوس کہ اس وفد کے تین ممبروں میں دو مولانا عبدالماجد بدایونی اور مولانا عبدالقادر قصوری چل بسے، اب صرف ایک باقی ہے، معلوم نہیں وہ بھی کتنے دن کے لئے۔ (''س''، دسمبر ۱۹۴۲ء)

یعقوب، محمد، سر

سر محمد یعقوب

سر محمد یعقوب کی ناگہانی وفات کا سانحہ اخباروں میں آچکا ہے، مرحوم مراد آباد کے رہنے والے تھے، ان کے والد ماجد مولوی محمد اسماعیل صاحب وکیل شاہجاپنور نہایت نیک، متین و دیندار بزرگ تھے، ندوۃ العلماء کے رکن تھے اور ۱۹۰۸ء کی تبلیغی تحریک میں مولانا شبلی مرحوم کے ساتھ تھے، سر محمد یعقوب نے گو انگریزی تعلیم پائی تھی، مگر مذہبی ذوق ورثہ میں پایا تھا اور بڑے خوش قسمت تھے، مراد آباد کی کامیاب وکالت سے لے کر کونسل کی صدارت تک اور پھر سرکار نظام کے مشیر اصلاحات کے رتبہ تک انہوں نے جو ترقی کی وہ سراسر ان کی خوش قسمتی کا نتیجہ تھی، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس عالم میں بھی خوش قسمت بنائے، وہ بہت خوش خلق، متواضع، متحمل اور حاجت مندوں اور ضرورت مندوں کی امداد میں کشادہ دست تھے، غفر اللہ تعالیٰ۔ (''س''، دسمبر ۱۹۴۲ء)

نگم، دیانرائن

دیانرائن نگم، بی۔اے

اردو زبان کے مشہور پرانے رسالہ زمانہ کے اڈیٹر دیانرائن نگم نے اسی مہینہ وفات پائی، کالج سے نکلنے کے ساتھ انہوں نے بریلی میں زمانہ کو جو اردو کا ایک معمولی رسالہ تھا، اپنی ادارت میں لیا اور اس کو کانپور لائے اور اس حد تک چمکایا کہ اردو کے رسالوں میں گنا جانے لگا، بلکہ اس وقت وہ اردو کا سب سے پرانا رسالہ ہے، پریم چند آنجہانی کو وہی سب سے پہلے اسٹیج پر لائے، ان کے علاوہ اور بہت سے اچھے لکھنے والے اور کہنے والے ہندو اور مسلمان نوجوانوں نے ان کے سایۂ قلم میں تربیت پائی اور کہنا چاہئے کہ زمانہ صرف انہی کی بدولت ہندو اور مسلمان اہل قلم کا سنگم اب تک رہا اور اس کو دیکھ کر تسکین ہوتی تھی کہ ہندو مسلمانوں کی پرانی تہذیب کے شیدائی ہندو ابھی تک زندہ ہیں۔

مدت سے جسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

امید ہے کہ زمانہ آئندہ بھی اپنے بانی کی یادگار میں اس کی بنائی ہوئی روش پر چلتا رہے گا۔ تاکہ اس اختلاف آباد ہند کی اس آندھی میں دیانرائن کا یہ دیا جلتا رہے۔

(''س''، دسمبر ۱۹۴۲ء)

خیر آبادی، محمد معز اللہ، مولانا

مولانا محمد معز اللہ صاحب خیر آبادی

ایک زمانہ تھا کہ رامپور علمائے اعلام کا مرکز تھا اور خیر آبادی سلسلہ کے تعلق کے سبب سے وہاں کا مدرسہ علوم عقلیہ کی سب سے بڑی درسگاہ تھی، لیکن مولانا فضل حق رامپوری مرحوم کی وفات پر اس کا بھی خاتمہ ہوگیا، اب پیران کہن سال میں وہاں ایک ہی صاحب رہ گئے تھے، یعنی مولانا محمد معز اللہ صاحب مرحوم، افسوس کہ ۶ رجنوری ۱۹۴۳ء کی رات کو انہوں نے بھی رحلت کی، یہ مولوی عبدالحق صاحب خیر آبادی کے آخری شاگرد اور مدرسہ کے پرانے اساتذہ اور بزرگوں کے فیض یافتہ تھے، فقہ میں مولانا ارشاد حسین صاحب مجددی سے (جو فقہ و اصول میں مولانا شبلی مرحوم کے بھی استاد تھے) اور مولانا حسن شاہ صاحب محدث رامپوری سے بھی استفادہ کیا تھا، سلسلہ نقشبندیہ اور قادریہ و چشتیہ کے مجاز بھی تھے، رامپور میں مرحوم کا علمی مرتبہ اتنا بلند تھا کہ کسی فتویٰ پر جب تک ان کے دستخط نہ ہوتے وہ عام طور پر مستند نہیں سمجھا جاتا تھا، خاکسار کو دو سال ہوئے کہ مرحوم سے ملاقات کا اور ان کے درس کے سننے کا اتفاق ہوا تھا، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے افسوس کہ پچھلے مدرسین اٹھتے جاتے ہیں اور زمانہ کی نئی آب و ہوا اس تجر اور مہارت کے نئے مدرسین عربی کی نشو و نما سے عاجز ہے۔

(''س''، فروری ۱۹۴۳ء)

یلدرم، سید سجاد حیدر

سید سجاد حیدر یلدرم مرحوم

۱۲؍اپریل ۱۹۴۳ء کی رات کو سید سجاد حیدر مرحوم نے جو ادب کی دنیا میں یلدرم کے نام سے مشہور تھے، قلب کے عارضہ سے دفعتہً وفات پائی، یہ علی گڑھ کالج کے پرانے تعلیم یافتوں میں اور اسی تعلق سے کالج کے ان چند طالب علموں میں تھے جنہوں نے مولانا شبلی مرحوم کے درس اور صحبت سے شعر و ادب کا ذوق حاصل کیا تھا، مرحوم مولانا کے درس کے اس قسم کے واقعات کو مزے لے لے کر بیان کیا کرتے تھے، ان کا اصل وطن نہٹور (یوپی) میں تھا، ۱۹۰۱ء میں بی، اے کی سند پاکر تعلیم سے فراغت پائی۔

ہماری زبان میں اس وقت ادب لطیف کا جو رواج ہے، اس کے پرانے لکھنے والوں میں سب سے پہلا نام سید حیدر مرحوم کا ہے اور چونکہ قادر مطلق کو ان سے یہ کام لینا تھا، اس لئے ان کی زندگی میں اس کا مناسب سامان بھی پیدا کر دیا یعنی یہ کہ کالج کے زمانہ ہی میں ان کو ترکی پڑھنے کا خیال ہوا، علی گڑھ میں نواب محمد اسمٰعیل خان صاحب رئیس علی گڑھ کے والد بزرگوار ہجرت کر کے مکہ معظّمہ چلے گئے تھے، وہیں نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب کی تعلیم و تربیت ہوئی، اس زمانہ میں ترکی وہاں کی سرکاری زبان تھی، اس لئے ان کو ترکی بھی پڑھائی گئی اور جب وہ ہندوستان آئے تو وہ ترکی ادب کے گویا نمائندہ ہوکر آئے، چنانچہ سرسید کے ''تماشائے عبرت'' میں وہ اسی ہیئت سے اسٹیج پر آئے ہیں اور معارف علی گڑھ میں جس کے وہ شریک اڈیٹر تھے، وہی ترکی

ادب کی اشاعت کا ذریعہ بنے۔

بہرحال سجاد حیدر مرحوم نے انہی سے ترکی زبان سیکھی اور اس کا یہ فائدہ ان کو پہنچا کہ سرکار انگریزی نے ان کو علی گڑھ کالج کے پرنسپل ماریسن صاحب کی سفارش سے اپنے ترکی سفارت خانہ میں ترجمان کی حیثیت سے لے لیا اور عراق میں ان کا تقرر ہوگیا، یہ ۱۹۰۴ء کا واقعہ ہے، جدید ترکی ادب پر فرانسیسی ادب کے بے حد اثرات تھے، مرحوم نے ترکی ادب کے انہی اثرات کو قبول کیا اور ان کو اردو ادب میں منتقل کیا، اسی زمانہ میں ۱۹۰۱ء سے مخزن لاہور نے جنم لیا تھا، مرحوم نے اسی زمانہ میں ترکی ادب کا یہ تحفہ عراق سے ہندوستان کو بھیجا اور مخزن کے خوانِ ادب میں وہ شہر بہ شہر ہاتھوں ہاتھ بٹا، اسی زمانہ میں مخزن میں ایک معاشرتی افسانہ حقوق نسواں سے متعلق چھپا تھا، استاد مرحوم کی زبانی بار بار اس کی تعریف سنی تھی ان کے ان مضمونوں کا مجموعہ ۱۹۰۸ء میں خیالستان کے نام سے چھپا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں وہ بغداد سے ہندوستان آکر دہرہ دون میں سابق شاہ افغان امیر یعقوب خاں کے اسسٹنٹ پولیٹیکل افسر مقرر ہوئے، تین سال کے بعد ترکی کے انقلاب اول کے بعد ۱۹۱۱ء میں ترکی گئے، چھ ماہ کی سیاحت کے بعد وہاں سے واپس آکر دوبارہ اپنے عہدہ کا چارج لیا، ۱۹۱۴ء میں وہ مہاراجہ محمود آباد کے پرائیوٹ سکریٹری بنے، ۱۹۱۸ء میں ڈپٹی کلکٹر ہوکر سلطان پور (اودھ) میں مامور ہوئے، ۱۹۲۰ء یا ۱۹۲۱ء میں مسلم یونیورسٹی کے قیام کے بعد وہ یونیورسٹی کے پہلے رجسٹرار اور اردو کے صدر مقرر ہوئے۔ جنگ عظیم کے بعد مصطفیٰ کمال پاشا کے انقلاب کے بعد ۱۹۲۴ء میں دوبارہ چھ ماہ کے لئے ترکی کا سفر کیا اور وہاں سے بہت سے نئے حالات کا مطالعہ کیا اور ترکی علم و ادب کے نئے اصحاب سے تعارف پیدا کیا اور بہت سی اچھی کتابوں کا تحفہ ساتھ لائے، میری ان کی ملاقات علی گڑھ کے دوران میں ہوئی تھی جو ذاتی روابط کے حد تک بڑھ گئے تھے، انہیں دارالمصنفین سے دلچسپی تھی۔

۱۹۲۹ء میں انہوں نے عراق و ایران کا سفر کیا اور وہاں سے واپسی پر پہلے ہردوئی میں ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے، ایک سال کے بعد وہ جزائر انڈمان کے یونیو کمشنر ہوکر انڈمان گئے وہاں سے واپس ہوکر غازی پور میں ڈپٹی کلکٹر ہوئے، غازی پور کے زمانہ قیام میں اپنے پرانے شوق کو پورا کیا، یعنی دارالمصنفین آکر استاد مرحوم کی قبر کی زیارت کی اور دارالمصنفین کو دیکھا، ۱۹۳۳ء میں انہوں نے فریضۂ حج ادا کیا اور ایک سال کے بعد ۱۹۳۵ء میں پینشن پاکر دہرہ دون میں سکونت اختیار کی، ۱۹۳۶ء میں راقم بھی دوماہ کے لئے دہرہ دون تبدیل آب و ہوا کے لئے جا کر رہا تھا، اس زمانہ میں ان سے بار بار ملاقاتیں ہوتی رہیں، وہ وہاں ایک اسلامیہ اسکول کے سکریٹری تھے، مگر صحت اچھی نہیں رہی تھی، اس لئے علیل رہتے تھے، ۱۹۳۷ء میں بچوں کی تعلیم کی خاطر لکھنؤ آکر رہے اور موجودہ راجہ صاحب محمود آباد کے پرائیوٹ سکریٹری بنے اسی زمانہ میں اگست ۱۹۴۲ء میں کابل کا سفر کرکے بلاد اسلامیہ کی سیاحت پوری کرلی اور ۱۲/ اپریل ۱۹۴۳ء کو ہمارے سیاح عالم نے عالم آخرت کا سفر اختیار کیا۔

وہ بغداد کے زمانہ قیام میں شاید سرکاری ملازم ہونے کے سبب سے اپنے شروع کے مضمونوں میں اپنے نام کے بجائے ''یلدرم'' لکھا کرتے تھے، جو مشہور ترکی سلطان بایزید کا لقب تھا، جس کے معنی بجلی کے ہیں، چونکہ وہ اپنے دشمنوں کی بےخبری میں ان کے سروں پر اس تیزی سے آکر گرتا تھا کہ لوگ اس کو یلدرم کہتے تھے۔

سجاد حیدر یلدرم ہماری زبان میں ایک نئی صنف ادب کے جس کو ادب لطیف کہتے ہیں بانی تھے اور اس لئے ہماری ادبی تاریخ میں ان کا ایک پایہ ہے، وہ کئی ادبی افسانوں کے مصنف اور ترکی ناولوں کے مترجم ہیں، وہ بڑے متواضع، مرنج و مرنجان، ہنس مکھ، ملنسار، شگفتہ دل، بذلہ سنج اور شریف و نرم طبع تھے، ان کے دوستوں کو ان کی یاد بہت آئے گی، ان کی وفات کا حادثہ لکھنؤ میں پیش آیا اور وہیں کی خاک کے سپرد ہوئے، اللہ تعالیٰ ان کی قبر پر اپنے فیض و کرم کے چھینٹے برسائے۔ (''س''، مئی ۱۹۴۳ء)

کاکوروی، محمد احتشام علی، منشی

منشی محمد احتشام علی کاکوروی صاحب

لکھنؤ کی سرزمین میں اپریل کے چوتھے ہفتہ میں ایک اور حادثہ پیش آیا یعنی کاکوری کے ممتاز خاندان کے رئیس جناب منشی محمد احتشام علی صاحب نے ۲۲/ اپریل کی صبح کو ۷۵ برس کی عمر میں وفات پائی، کہنا چاہئے کہ اودھ میں قدیم شریفانہ جوہر وضعداری، دینداری، مروت، سیرچشمی، غربا نوازی اور مسکین پروری کا یہ اخیر نمونہ تھا، ان کی پوری زندگی میں جس میں وسعت کا زمانہ بھی تھا اور تنگی کا بھی، ان کے ہاتھ یکساں کھلے رہے اور اس اخفاء کے ساتھ کہ بائیں ہاتھ کو بھی داہنے ہاتھ کی خبر نہ تھی، وہ مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی سے بیعت تھے، اس تعلق کو اخیر اخیر وقت تک جس طرح نباہا، وہ ان کی سعادت مندی کا نشان ہے، پابندی یہ کہ مرتے وقت سجدہ عبودیت ادا کیا ہے اور صبر و شکر کے کلمے زبان سے نکلتے رہے۔

ان کی جوانی تھی کہ ندوۃ العلماء کا غلغلہ بلند ہوا، چونکہ اس مجلس کے سر پر فضل رحمانی سایہ فگن تھا۔ اس لئے حضرت شیخ کے سارے حلقہ بگوش اس کے حلقہ میں تھے اور اسی مناسبت سے جناب منشی محمد اطہر علی صاحب مرحوم اور ان کے ساتھ میں جناب منشی احتشام علی صاحب ندوہ کے خدام میں داخل ہوئے تھے، اپریل ۱۸۹۵ء میں اس کا پہلا جلسہ لکھنؤ میں ہوا تھا، اس اپریل ۱۸۹۵ء سے لے کر ۲۲/ اپریل ۱۹۴۳ء کی صبح تک جب کہ انہوں نے زندگی کی اخیر سانس لی ہے، یکساں دلچسپی خلوص و انہماک سے اپنے فرائض کو انجام دیا ہے۔ نہ صرف رئیسوں میں بلکہ مسلمانوں میں اس قدامت خدمت

اور مخلصانہ مذہبی خدمت گزاری کی مثال شائد ہی ملے۔

خیالی گنج میں ان کی بڑی اور وسیع کوٹھی، ان کے عزیزوں کا مسکن، نوواردوں کا ماویٰ، غریبوں کا ملجا، بڑے بڑے قومی خادموں کی فرودگاہ، علماء فضلاء اور صلحاء کا مہبط اور مسلمانوں کے بڑے بڑے قومی جھگڑوں اور فیصلوں کی عدالت گاہ رہی ہے۔ گوسیلاب نکل جانے کے بعد بھی زمین پر اس کے آثار باقی تھے، افسوس ہے کہ منشی صاحب مرحوم کی وفات کا حادثہ پچھلے دور خدمت کے قدیم جواہر فضائل کو بھی اپنے ساتھ لے گیا، اِنـّا لِلّٰہ، اب ان کے جانشین فرزندوں منشی محمد انعام علی اور منشی محمد احترام علی صاحب سے امید ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کے نیک نام کو اپنی خدمات سے زندہ رکھیں گے۔

(''س''، مئی ۱۹۴۳ء)

شاطرؔ، عبدالرحمٰن، شمس العلماء

شمس العلماء عبدالرحمان شاطرؔ مرحوم

دکن ٹائمز مدراس میں یہ پڑھ کر بہت افسوس ہوا کہ مدراس کے مشہور وممتاز فلسفی شاعر مولانا شاطرؔ کا وسط اپریل ۱۹۴۳ء میں انتقال ہوگیا۔

ارکاٹ احاطۂ مدراس میں اسلامی علم وتمدن کی فراموش شدہ تاریخ کا ایک ورق ہے، نواب ارکاٹ کا محل ارکاٹ کے جنگی خاتمہ کے بعد خود شہر مدراس ہے، شمس العلماء عبدالرحمان شاطر اسی برج فلکی کے آفتاب تھے، عمر ستر کے قریب ہوگی، اردو، عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں سے واقف تھے، نواب صاحب ارکاٹ کے سکریٹری بھی تھے اور مدراس ہائیکورٹ میں مترجم بھی رہے تھے، گو وطن مدراس تھا، مگر ۱۹۰۱ء اور ۱۹۰۳ء میں حیدرآباد دکن کے بزم علمی میں اس کے شریک تھے، جب مولانا شررؔ اور داغؔ اور گرامیؔ حیدرآباد کی زینت تھے، وہ ان کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے اور ان سے اپنے ذوقِ ادب کی پرورش کرتے تھے اور اسی زمانہ سے وہ مولانا کے قریب رہنے والوں اور قریب سے جاننے والوں میں تھے اور ان کی وہی محبت تھی جو حضرت الاستاذ کی وراثت میں مجھے ملی تھی۔

عبدالرحمان مرحوم شاعر تھے، شاطرؔ تخلص کرتے تھے، اشعار حکیمانہ اور فلسفیانہ کہتے تھے، قطعات، رباعیات اور قصائد موزوں کرتے تھے، جدید سائنس اور فلسفہ کے مسائل کو اسلامی آلہیات سے تطبیق دیتے تھے، زبان سخت تھی اور مشکل الفاظ کے استعمال سے ان کو پرہیز نہ تھا، ان کی سب سے مشہور فلسفیانہ نظم ''اعجازِ عشق'' ہے، جو ایک طویل رائیہ قصیدہ ہے جس میں جدید وقدیم فلسفیانہ مسائل وآراء سے الہیات اسلامیہ کی تفسیر و تشریح کی ہے یہ نظم ۱۹۰۸ء میں لکھی گئی تھی اور اس زمانہ کے تمام اکابر و مشاہیر مولانا حالی، مولانا شبلی، مولانا نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ خاں، نواب عمادالملک، مولوی سید اکبر حسین، پروفیسر عبدالغفور شہباز، امجد علی اشہر، شاد عظیم آبادی، جلال لکھنوی، علی حیدر طباطبائی، استاد گرامی وغیرہ نے بے حد توصیف وتحسین کی تھی، ان میں سے مولانا شبلی کی جامع ومانع ومختصر تقریظ بطور نمونہ حوالہ قلم ہے:

> ''آپ کا قصیدہ میں نے دیکھا، اس سے پہلے آپ کی مختلف نظمیں نظر افروز ہوئی تھیں، میں مدت سے آپ کی قادرالکلامی اور خوش فکری کا معترف ہوں، آپ کے کلام میں فلسفیانہ خیالات جس خوبی وبرجستگی سے ادا ہوتے ہیں اس کی مثالیں اردو میں کم ملتی ہیں''۔

معارف نومبر ۱۹۲۵ء میں مرحوم اور ان کے گھر کی شاعرانہ لیاقت وقابلیت کا ذکر بسلسلہ سفر مدراس کیا گیا تھا اور اسی کے پس وپیش زمانہ میں مثلاً اپریل ۱۹۳۰ء میں ان کی کچھ نظمیں بھی معارف میں نکلی ہیں۔ دکن میں مولانا شاطر جیسے اردو کے حکیم شاعر کا وجود اس زبان کی عالمگیری کی دلیل قاطع تھی جس نے چالیس برس تک اہل دکن کو اپنی خوش نوائیوں سے مسرور ومحسوس رکھا، افسوس کہ اس سرزمین دکن کا یہ بلبل شیریں نوا ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا۔ (''س''، جون ۱۹۴۳ء)

تھانوی، اشرف علی، مولانا

مولانا اشرف علی تھانویؒ

محفل دوشیں کا وہ چراغ سحر جو کئی سال سے ضعف ومرض کے جھونکوں سے بجھ بجھ کر سنبھل جاتا تھا بالآخر ۸۲ سال ۳ ماہ ۱۰ روز جل کر ۱۵؍ رجب ۱۳۶۲ھ کی شب کو ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔

> داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
> اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

یعنی حکیم امت، مجددِ طریقت، شیخ الکل حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے مرض ضعف واسہال میں کئی ماہ علیل رہ کر ۱۹ اور ۲۰ جولائی کی درمیانی شب کو ۱۰ بجے نماز عشاء کے وقت اس دارفانی کو الوداع کہا، اور اپنے لاکھوں معتقدوں اور مریدوں اور مستفیدوں کو غمگین ومہجور چھوڑا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اب اس دور کا بالکلیہ خاتمہ ہوگیا جو حضرت شاہ امداد اللہ صاحب مہاجر مکی، مولانا یعقوب صاحب نانوتوی، مولانا قاسم صاحب نانوتوی، مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی کی یادگار تھا، اور جس کی ذات میں حضرات چشت اور حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت سید احمد بریلوی کی نسبتیں یکجا تھیں، جس کا سینہ چشتی ذوق وعشق اور مجددی سکون ومحبت کا مجمع البحرین تھا، جس کی زبان شریعت وطریقت کی وحدت کی ترجمان تھی، جس کے قلم نے فقہ وتصوف کو ایک مدت کی ہنگامہ آرائی کے بعد باہم ہم آغوش کیا تھا اور جس کے فیض نے تقریباً نصف صدی

تک اللہ تعالیٰ کے فضل وتوفیق سے اپنی تعلیم وتربیت اور تزکیہ وہدایت سے ایک عالم کو مستفید بنا رکھا تھا، اور جس نے اپنی تحریر وتقریر سے حقائق ایمانی، دقائق فقہی، اسرارِ احسانی اور رموزِ حکمتِ ربانی کو برملا فاش کیا تھا، اور اسی لئے دنیا نے اس کو حکیم الامت کہہ کر پکارا، اور حقیقت یہ ہے کہ اس اشرف زمانہ کے لئے یہ خطاب عین حقیقت تھا۔

سوانح: حضرت کی پیدائش ۵/ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ کو چہارشنبہ کے دن ہوئی، ابتدائی عربی تعلیم تھانہ بھون میں مولانا فتح محمد صاحب تھانوی سے حاصل کی ۱۲۹۵ھ سے شروع ۱۳۰۱ھ تک مدرسہ دیوبند میں رہ کر مولانا یعقوب صاحب کے حلقہ میں تکمیل کی، فراغت کے بعد ہی ۱۳۰۱ھ میں مدرس ہوکر کانپور آگئے اور چودہ سال یہاں مقیم رہے اور اپنے درس، مواعظ اور فتاویٰ سے لوگوں کو مستفید کیا۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کے ذریعہ سے بواسطہ خط کے غائبانہ بیعت مہاجر الی اللہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمتہ اللہ علیہ سے ۱۲۹۹ھ میں ہوچکی تھی، لیکن ۱۳۰۱ھ کے آخر میں ایام حج میں بعد حج حضرت حاجی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں اخذ فیض فرمایا، اور واپس آکر ۱۳۰۶ھ تک علمی مشاغل تصنیف و تالیف اور تدریس کے ساتھ ذکر وشغل بھی ضمناً معمول رہا، مگر ۱۳۰۷ھ میں رنگ نے پلٹا کھایا اور یہ رنگ بڑھتا گیا، یہاں تک کہ ۱۳۱۰ھ میں مضطربانہ اور والہانہ حج کا دوبارہ ارادہ کیا، اور حضرت حاجی صاحب کی خدمت بابرکت میں حاضر ہوکر دوبارہ ایک زمانہ خاص تک رہ کر استفادہ باطنی فرمایا، واپس آکر ۱۳۱۴ھ تک پھر کانپور میں رہے، آخر حضرت حاجی صاحب کے مشورہ کے مطابق ۱۳۱۵ھ میں کانپور سے ترک تعلق فرماکر تھانہ بھون میں متوکلانہ اقامت فرمائی، اور اس وقت سے لے کر آخری وقت تک یعنی اس ۱۳۶۲ھ تک اسی شان سے خانقاہ امدادیہ کی سہ دری میں بیٹھ کر افادہ وافاضہ میں برابر مصروف رہے اور ایک خلق کو اپنی برکات سے بہرہ مند فرمایا، اس اثناء میں اپنی مواعظ، تصانیف وملفوظات سے لاکھوں کو انسان، ہزاروں کو مسلمان اور سیکڑوں کو متقی کامل بنادیا، اور حضرت حاجی صاحبؒ کی یہ دعا یا پیشنگوئی پوری ہوئی۔

”بہتر ہوا کہ آپ تھانہ بھون تشریف لے گئے، امید ہے کہ آپ سے خلائق کثیر کو فائدہ ظاہری و باطنی ہوگا اور آپ ہمارے مدرسہ ومسجد کو ازسرِ نو آباد کریں، میں ہر وقت آپ کے حال میں دعا کرتا ہوں اور خیال رہتا ہے“۔ (۱۲/ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ)

تصانیف: حضرتؒ کی تصانیف ورسائل کی تعداد آٹھ سو کے قریب ہے، اور کل کی کل تحقیقات علمیہ حقائق دینیہ اور نکات احسانیہ سے لبریز ہیں، ان میں تفسیر البیان، شرح مثنوی، فتاویٰ امدادیہ، التعرف الی التصوف اور بہشتی زیور وغیرہ کتابیں کئی کئی جلدوں میں ہیں، ملفوظات اور مواعظ وخطابت کی تعداد سیکڑوں کی حد تک ہے، ان تصانیف میں قرآن پاک کی مشکل آیات کریمہ کی تفسیر احادیث شریف کی شرح، فقہ کے مشکل مسائل کا جواب، سلوک طریقت کے نکتے، اخلاق فضائل ورذائل کی حکیمانہ تحقیق اور اُن کے حصول وازالہ کی تدابیر اور زمانہ حال کے شکوک وشبہات کے جوابات سب کچھ ہیں، تصانیف میں متفرق علوم ومسائل اس کثرت سے ہیں کہ اگر اُن سے کسی ایک موضوع کے مباحث کو علیحدہ علیحدہ کیا جائے تو ایک ایک مستقل کتاب بن جائیں، چنانچہ حضرت کے تربیت یافتوں نے اس قسم کے بیسیوں مجموعے تیار کئے ہیں، سب سے آخر میں اس قسم کا مجموعہ ”بوادر النوادر“ کے نام سے ایک ہزار صفحوں میں چھپ کر شائع ہوا ہے، خطوط کے جوابات کا جن کے متعلق وفات کے دن تک اہتمام یہ رہا کہ آج کے خط کا جواب کل کے لئے اٹھا نہ رکھا جائے عظیم الشان دفتر الگ ہے۔

تصنیفات میں بلکہ ہر تحریر میں اہل نظر کو یہ معلوم ہوگا کہ گویا مصنف کے سامنے سارے مسائل ومواد یکجا ہیں، اور وہ سب کو اپنی اپنی جگہ احتیاط سے رکھتا جاتا ہے، عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ مصنف جس موضوع پر قلم اٹھاتا ہے اس کو اس میں ایسا غلو ہوجاتا ہے کہ دوسرے گوشوں سے اس کو ذہول ہوجاتا ہے، حضرت کی تصانیف کی خاص بات یہ ہے کہ قلم ہر ایک کی احتیاط اور رعایت کر کے اور غلو سے بچ کر اس طرح نکلتا ہے کہ جاننے والوں پر حیرت چھا جاتی ہے حضرت کا ترجمہ قرآن پاک تاثیر، سہولت بیان اور وضوح مطالب میں اپنی آپ نظیر ہے، بہشتی زیور کہنے کو تو عورتوں کی کتاب ہے، مگر فقہ حنفی کی ضروریات کے لئے انتہائی احتیاط وکاوش کا نتیجہ ہے، تفسیر القرآن کو یوں سمجھنا چاہئے کہ روح المعانی اور تفاسیر ماسبق کی اردو میں حد درجہ محتاطانہ ترجمان ہے، سلوک و طریقت کی کتابوں کا بھی یہی حال ہے۔

حضرت کی تجدید طریقت کا بڑا کمال یہ ہے کہ طریقت کو جو ایک زمانہ سے صرف چند رسوم کا مجموعہ ہوکر رہ گئی تھی، اس کو زوائد وحواشی سے صاف کر کے قدماء اور سلف صالحین کے رنگ پر لے آئے۔

کبھی فرصت سے سن لینا بڑی ہے داستان میری

علالتِ طبع: حضرت کی صحت ادھر چند سال سے روبانحطاط تھی، دو دفعہ خاص علاج کی غرض سے لکھنؤ تشریف لانا ہوا، اور دونوں دفعہ صحت وعافیت کے ساتھ مراجعت ہوئی، علالت اصلی یہی تھی کہ معدہ وجگر کا فعل صحیح نہیں رہا تھا، علاج سے طبع مبارک اصلاح پذیر ہوجاتی تھی، مگر بالکلیہ ازالہ نہیں ہوتا تھا، اس دفعہ دو تین ماہ سے طبیعت پر اضمحلال طاری تھا، چنانچہ علاج کے لئے سہارنپور تشریف لے گئے اور چند روز قیام فرماکر واپس تشریف لے گئے، لیکن طبعیت صاف نہیں ہوئی، وطن میں حکیم سعید صاحب گنگوہی کا علاج شروع ہوا، اور ورم جگر ومعدہ کا مرض تشخیص ہوا، مگر فائدہ نہ ہوا، اشتہا ساقط تھی، روزانہ اسہال کی تعداد چالیس پچاس تک پہنچ گئی اور ضعف روز بروز بڑھتا گیا، وصال سے قریب بیس روز پہلے حکیم خلیل صاحب سہارنپوری کا علاج شروع ہوا، ضعف معدہ

اور ضعف جگر کی تجویز تھی، حکیم صاحب کے علاج سے دستوں میں کمی آ گئی، مگر اشتہا بالکل ہی ساقط تھی، اور ضعف میں ترقی ہی ہوتی رہی۔

میری آخری حاضری: خاکسار جون کے آخر میں اپنے مستقر سے تھانہ بھون اور پھر بھوپال کے ارادہ سے روانہ ہوا، لیکن لکھنؤ پہنچ کر دارالعلوم ندوہ کے معاملات نے الجھالیا، لکھنؤ میں ہر روز حضرت کی شدت علالت کی اطلاعیں آ رہی تھیں، حضرت کے ہزاروں معتقدوں کی طرح خاکسار بھی زیارت کے لئے بے چین تھا، حضرت کی طرف سے سخت قدغن تھی کہ باہر لوگوں کو اس شدت علالت اور کیفیت مزاج کی کوئی اطلاع نہ دیجائے تاکہ مخلصین میں اضطراب نہ پیدا ہو اور وہ سفر کی زحمت نہ اُٹھائیں، جو پہنچ جاتے تھے عام طور سے بطور تنبیہ ان کو اندر جانے کی اجازت نہیں ملتی تھی، اس پر بھی خاکسار خلاف دستور بے اطلاع ۶/ جولائی کو لکھنؤ سے روانہ ہوگیا، اور ۷/ کی دوپہر کو عین بارش کی حالت میں اسٹیشن سے خانقاہ تک پیادہ پا بھیگتے ہوئے پہنچا، دریافت حال سے معلوم ہوا کہ افاقہ کی صورت ہے جس سے تسکین ہوئی، میرا اس طرح خلاف دستور بے اطلاع اچانک پہنچ جانا حضرت کے لئے تعجب کا موجب ہوا، میری آمد کے خبر دینے والے سے پوچھا ''تم مولوی سلیمان کو پہچانتے بھی ہو یا یونہی کہہ رہے ہو'' اس نے اثبات میں جواب دیا تو ارشاد ہوا کہ ان کی عادت بے اطلاع آنے کی نہ تھی، حضرت کے عزیز خاص مولانا جمیل احمد صاحب نے عرض کی کہ حضرت کی علالت کی خبر سن کر چلے آئے ہوں گے، نماز ظہر کے بعد مجلس میں حاضری ہوئی، ضعف سے بستر پر لیٹے تھے، مصافحہ فرمایا، خاکسار نے دستِ مبارک کو بوسہ دیا، شفقت سے بشاشت ظاہر فرمائی، سفر کا حال پوچھا، کسی خادم کے ساتھ نہ لینے پر نصیحت فرمائی، قیام کے دن پوچھے، خاکسار نے بھوپال کے سفر کی ضرورت ظاہر کی کہ سرکار بھوپال نے اپنی ریاست میں مسلمان عورتوں کے طلاق وتفریق کے مسائل کے طے کرنے کے لئے علماء اور اہل قانون کی ایک مجلس مقرر کی ہے اُسی کی شرکت کے لئے مع مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب یہاں سے جانا چاہتا ہوں، اس لئے مجلس کی تاریخ کی اطلاع تک یہاں چند روز رہنا چاہتا ہوں۔

فرمایا اللہ تعالی والیہ بھوپال پر رحمت فرمائے کہ انہوں نے مسلمان عورتوں کے حال پر رحم کھایا، خاکسار نے عرض کی کہ حضرت وہاں اب والیہ نہیں، والی ہیں، فرمایا ٹھیک ہے، غرض اس حالت میں بھی کہ ضعف پوری شدت پر تھا تکلم میں تکلف تھا، پھر بھی حاضرین مجلس پر شفقت فرما کر ملفوظات سے ذرا تھم تھم کر بہرہ ور فرما رہے تھے، اور لوگوں کے آئے ہوئے خطوط سن رہے تھے، اور بدستور جواب لکھوا رہے تھے، بلکہ بعض خطوط پر خود دست مبارک سے بھی لکھ دیتے تھے، کبھی جو قوت پاتے اور اس وقت کام کرنے لگتے یا ملفوظات ارشاد فرمانے لگتے تو تھوڑی دیر کے لئے حاضرین کو یہ خیال ہونے لگتا کہ حضرت بیمار ہی نہیں، مگر ادھر جوش بیان کم ہوا، اور اُدھر سر تکیہ پر رکھ دیا، ہمیشہ کی عادت یہ تھی کہ بڑا تکیہ پیٹھ سے لگا کر سر کو بے سہارے اونچا رکھتے تھے، یہی حال اس وقت بھی تھا، دیکھنے والوں کو تکلیف معلوم ہوتی اور اس مشورہ کو جی چاہتا تھا کہ دوسرا تکیہ اور رکھ کر اس پر حضرت سرِ مبارک کو رکھ لیں چنانچہ میں نے اپنی نادانی سے یہ عرض کیا تو ارشاد ہوا نہیں اس کی حاجت نہیں، بعد کو خواجہ صاحب (خواجہ عزیز الحسن غوری ریٹائرڈ انسپکٹر آف اسکولس یوپی) جو حضرت کے خلیفہ خاص، محرم خاص بلکہ خادم خاص ہیں نے فرمایا کہ حضرت کی ہمیشہ کی عادت یہی ہے، اس ضعف واضمحلال کی حالت میں بھی مجلس کا وقار، نظم وضبط اور اصول وقواعد کی پابندی بدستور جاری تھی، اور آخری لمحۂ حیات تک اس میں فرق نہیں آیا۔

عصر کے وقت مجلس برخاست ہوئی تو ارشاد فرمایا کہ کھانے کے الگ انتظام کی ضرورت نہیں، چند روز کے مہمانوں کے لئے اس کی ضرورت نہیں، بڑے گھر سے کھانا جائے گا اور ایک خادم خاص کو اس کی ہدایت فرمائی، اس ناسزاوار کے لئے تو یہ خیر وبرکت کا سامان تھا، یہ بھی ارشاد ہوا کہ جب چاہو اور جس وقت چاہو آسکتے ہو کوئی قید نہیں، یہاں سے اٹھ کر جب خانقاہ پہنچا تو بعد نماز حضرت والا کی طرف سے حضرت کی آخری تصنیف بوادر النوادر کا ایک نسخہ مولانا جمیل احمد صاحب نے ہدیہ لا کر عنایت فرمایا اور یہ ارشاد سامی پہنچایا کہ میرے مضامین سے اقتباسات جمع کر کے شائع کرو، اس حکم کو اپنی ہدایت ورہنمائی کا نسخہ سمجھ کر اپنی سعادت کا اظہار کیا، دوسرے دن حاضری کے موقع پر حضرت نے اپنی زبان مبارک سے خود یہ ارشاد فرمانا چاہا تو خاکسار نے حضرت کی زحمت تکلم کے خیال سے عرض کیا کہ یہ ارشاد مبارک مولانا جمیل احمد صاحب کے ذریعہ پہنچ چکا، مگر وہاں سے اُٹھنے کے بعد مولانا جمیل صاحب سے جب میں نے پوچھا کہ حضرت کا مقصود کیا ہے، یعنی اس کتاب بوادر سے اقتباس یا عام کتابوں سے انہوں نے فرمایا اس کو میں نے اچھی طرح خود بھی نہیں سمجھا، بعد کی حاضری میں موقع پا کر میں نے تفصیل چاہی تو ارشاد ہوا نہیں عام کتابوں میں جو مضمون مفید نظر آئیں ان کو یکجا کرلیا کرو۔

آخری حالات: میری حاضری ۷/ جولائی سے ۱۱/ جولائی کی دوپہر تک رہی، اشتہاء کا سقوط اور ضعف کا استیلاً اپنی حالت پر رہا، دست پانچ چھ، سات تک آتے رہے، مزید یہ کہ ہاتھوں اور پاؤں پر ورم تھا، ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کے ناخنوں میں نیلا ہٹ نمودار ہوگئی تھی جو باعث تشویش تھی، دو روز کے بعد اس میں کمی آ گئی، مگر وفات کے چند روز پیشتر وہ پھر عود کر آئی تھی۔

خدمت اور خاص کر رات کے وقت نوبت بہ نوبت جاگ کر خدمت کی سعادت خدام خاص کی خدمت میں آئی جس میں پہلا درجہ خواجہ صاحب کا ہے، ان کے علاوہ مولانا جمیل احمد صاحب، بندو میاں، (ملازم نواب صاحب باغپت) اور مولوی شبلی صاحب جونپوری نے اس خدمت خاص کی سعادت اخیر تک پائی، بعد کو مولانا ظفر احمد

صاحب بھی ڈھاکہ سے آکر اس میں شامل ہوگئے۔

حاضری کے دوسرے یا تیسرے دن استفساء ہوا کہ کھانا تو مزاج کے مطابق ہوتا ہے غرض کہ بالکل مطابق ہے، کس تواضع اور کس شفقت اور کس بلاغت سے ارشاد ہوا کہ میں معافی کا خواستگار نہیں، مستحق ہوں، اس نکتہ پر اہل نظر نے تحسین کی سعادت پائی کہ ضعف ونقاہت کے اس عالم میں بھی دل ودماغ ناقصوں کی تربیت میں مصروف ہیں اور اکرام ضیف کا نمونہ پیش کیا جارہا ہے۔

دوتین واقعے ذکر کے قابل ہیں، اسی اثنائے حاضری میں بنگال سے ایک معتقد با اخلاص کا خط آیا جس میں لکھا تھا کہ حدیث شریف میں ہے کہ جب نبیؐ کی وفات کا وقت آتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اختیار دیتے ہیں کہ خواہ وہ دنیا میں رہنا پسند کرے یا اللہ تعالیٰ کے یہاں جانا، یہ تمہید لکھ کر اس میں تھا کہ میرے اعتقاد میں نبیؑ کے متبعین خاص کو بھی اس اختیار خاص سے حسبِ استعداد حصہ ملتا ہوگا، اس لئے عرض ہے کہ ہم ناقصوں کی تربیت کے لئے حضرت والا چند روز اور اس دنیا میں قیام منظور فرمائیں خط کے جواب میں لکھوا دیا ''تم اپنے دماغ کا کسی حاذق طبیب سے علاج کراؤ'' پھر حاضرین سے خطاب کرکے فرمایا ''اول تو یہ ثابت نہیں کہ جو انبیاؑ (علیہم السلام) کو ملتا ہے اس میں اولیاء ومشائخ کو بھی حصہ ضرور ہی ملتا ہے''۔ اور اس کے بعد فرمایا ''اور اگر ایسا بھی ہو تو ان انبیاء نے کیا کیا؟ (یعنی اللہ تعالیٰ کے قرب ہی کو حیات دنیا پر ترجیح دی) ایک دفعہ بعد ظہر خط لکھوا کر فارغ ہوچکے تھے کہ اونگھ آگئی، ہشیار ہوئے تو فرمایا کہ ایسا معلوم ہوا کہ اس تخت پر ایک لفافہ رکھا ہے جس پر عبدالعزیز لکھا ہے، خواجہ صاحب نے عرض کی ابھی حضرت نے خطوط لکھوائے ہیں وہی خیال قائم رہا۔ ارشاد ہوا ہاں یہ سچ ہے مگر عبدالعزیز نام کیوں ہے، بات ختم ہوگئی، مجلس کے برخاست کے بعد خواجہ صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کی عمر کیا تھی؟ میں نے کہا اسی (۸۰) بیاسی (۸۲) برس یاد آتا ہے۔ (اب دارالمصنفین آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ شاہ صاحبؒ کی عمر شریف اکاسی برس کے قریب یعنی اسی برس کچھ مہینے ہوئی ہے بہرحال اس سے خواجہ صاحب کی نکتہ شناس نظر حضرت شاہ صاحبؒ کے تشابہ حال پر پہنچ گئی)۔

ہر چند یہ تاکید تھی کہ شدت علالت کی اطلاع باہر کسی کو نہ دی جائے، احباب اشارات وتلمیحات اور اصطلاحات میں اپنے متعلقین اور دوستوں کو اطلاع دیتے تھے، غرض یہ تھی کہ زائرین ہجوم نہ کریں، اس پر بھی دور دور سے معتقدین آجاتے تھے، ایک صاحب نے پشاور سے آنے کی اطلاع کرائی، دوسرے نے گورکھپور سے کسی نے کسی اور دور مقام سے مگر ہر ایک سے یہی ارشاد ہوا کہ اجازت نامہ کہاں ہے جب وہ معذوری ظاہر کرتے اور اعترافِ قصور کرتے تو فرماتے تمہاری غلطی کا خمیازہ میں کیوں اٹھاؤں، پھر حاضرین کی طرف خطاب کرکے فرمایا، ان کو میں محروم کرکے بھی محروم نہیں کرتا ہوں، ایک سبق دے رہا ہوں، پھر اسی معنی کا خواجہ صاحب کا ایک مصرع پڑھا، پھر ارشاد فرمایا کہ ان کے ناکام واپس جانے کا یہ اثر ہوگا کہ اس کو سن کر دوسرے لوگ آنے سے رک جائیں گے اور اس سے ان کو فائدہ پہنچے گا، غرض یہ تھی کہ لوگ اس بیکار کی زحمت اور تکلیف سے خود بھی بچیں اور حضرت کو بھی ہجوم سے بچائیں۔

ایک روز بعد مغرب یاد فرمایا اور مشورہ چاہا کہ اشتہا مطلق نہیں اور ضعف بڑھ رہا ہے گو میں اس کے نتیجہ پر راضی ہوں، مگر بہرحال اگر اس کی تدبیر کوئی ضروری ہو تو کرنا چاہئے، اس اثناء میں خیال ظاہر فرمایا کہ ''لکھنؤ میں ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب (ناظم ندوہ) کو (جو مزاج شناس تھے) لکھا جائے کہ صرف اشتہا پیدا ہونے کے لئے کوئی نسخہ تجویز کریں''، خاکسار نے عرض کی کہ حضرت چار روز خط کے جانے میں اور چار روز آنے میں لگیں گے، اتنی دیر بہت ہے، پھر رائے ہوئی کہ سہارنپور میں کوئی اچھا ڈاکٹر ہو تو بلایا جائے، مگر دوسرے ہی دن مولوی محمد حسن صاحب اور دوسرے احباب لکھنؤ کا خط آیا کہ حکیم عبدالمجید صاحب لکھنوی جن کے علاج سے پہلے بھی فائدہ ہوچکا تھا اگر اجازت ہو تو ان کو لے کر حاضر ہوں، چنانچہ اجازت کا خط لکھا گیا طالبین کے خطوط بدستور آرہے تھے، لوگ حسب دستور ہدایا منی آرڈر سے بھیج رہے تھے، مگر شدت احتیاط بدستور قائم تھی اور وہ واپس ہو رہے تھے، مگر اخلاص وصحبت کے سرمایہ کو بہت خوشی سے قبول فرما لیتے تھے، ایک قریب کے نواب صاحب کی ایک رقم آئی تو قبول فرما کر ارشاد ہوا کہ ان لوگوں کا ممنون ہوں کہ وہ دے کر اُلٹے خود ممنون ہوتے ہیں کہ اس نے (اپنی ذات کی طرف اشارہ) قبول کیا، ایک غریب نے کچھ پیش کیا تو اللہ اکبر اس کو آنکھوں سے لگایا۔

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

حضرت گو ضبط، صبر، اور استقامت سے اپنی تکالیف ظاہر نہیں فرماتے تھے اور نہ آئندہ کے خطرہ کو زبان پر لاتے تھے کہ دوسروں کو بے صبری نہ ہو، مگر بات بات سے سفر کی آمادگی ظاہر ہوتی تھی، گو اُن کی زندگی اور طرز زندگی جس صفائی، پاکیزگی اور باقاعدگی کی عادی تھی اس کا اثر یہ تھا کہ وقت آخر کے لئے کوئی کام اٹھا نہیں رکھا، کہ سالکِ کامل ہر لحظہ کو لحظہ آخر سمجھتا ہے اور اسی کی تیاری رکھتا ہے، یہی حال حضرتؒ کا تھا، کوئی چیز کرنی باقی نہ تھی، تمام انتظامات، حساب وکتاب اور وصایا سے پوری پوری فراغت تھی، عادت شریف تھی کہ آج کا کام کبھی کل پر اٹھا کر نہیں رکھا، گویا ہر وقت آمادۂ سفر تھے۔

خاکسار کو بھوپال کی مجلس کی تاریخ ۹؍ کو تار سے معلوم ہوچکی تھی، ۱۰؍ کو رفیق سفر مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کا بھی مکرمت نامہ آگیا، ۱۱؍ کو صبح کی مجلس کے بعد رخصت کی درخواست پیش کی، باایں ہمہ ضعف وقوت لیٹے ہی لیٹے دونوں ہاتھ رخصت کے لئے بڑھائے، حقیر نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر دستِ مبارک کو بوسہ دیا اور آنکھوں کو ملا، آہ! کس بلا کا رخصتانہ تھا، فرمایا ''جاؤ خدا کے سپرد کیا''۔ یہ لفظ کانوں نے پہلے

نہیں سنے تھے، آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور دیر تک چہرۂ مبارک پر جمی رہیں کہ یہ جمال جہاں آرا شاید پھر دیکھنے کو نہ ملے، سوایسا ہی ہوا۔

بعد کے آخری حالات: خاکسار کے جانے کے دو ایک روز کے بعد حکیم عبدالمجید صاحب تشریف لے آئے اور علاج اپنے ہاتھ میں لیا، پہلے روز عرق دانہ انار دیا، دوسرے روز ایک بٹیر کی یخنی دلوائی، تیسرے روز دو بٹیروں کی، مگر حکیموں کی ہر مسیحائی تدبیر محکمہ تقدیر سے رد ہوتی رہی، حکیم صاحب کا ایک ہفتہ علاج رہا، مگر حالت میں تغیر نہیں ہوا، میں نے بھوپال سے مولانا جمیل احمد صاحب کو طلب خیریت کا خط لکھا جس کے جواب میں دوشنبہ کے روز یعنی جس کی آنے والی شب میں وفات ہوئی یہ تحریر فرمایا:

"حکیم عبدالمجید صاحب آئے تھے، ہفتہ پورا کر کے کل واپس جا رہے ہیں، حکیم سمیع اللہ (حضرت کے خلیفہ حقداد خاں صاحب لکھنوی کے صاحبزادہ) رہیں گے، علاج ان ہی دونوں کا ہے، افاقہ کی صورت نہیں، دست بہت ہے، ضعف بے حد ہے، سانس میں تکلیف ہے، بائیں پاؤں میں کل سے سخت درد ہے، ہم سب پریشان ہیں"۔ (جمیل احمد، دوشنبہ)

لکھنؤ میں ثقات سے جو حاضر تھے معلوم ہوا کہ دوشنبہ کے روز دست زیادہ آئے، ظہر کے بعد ضعف زیادہ محسوس ہوا، عصر کے بعد مولانا شبیر علی صاحب کو (جو حضرت کے بھتیجے اور تمام امور خانقاہ و مدرسہ کے مہتمم و متولی تھے) یاد فرمایا، اطلاع دی گئی کہ وہ سہانپور دوا لانے گئے ہیں، محل خورد سے فرمایا کہ امانتوں کا صندوقچہ اٹھا لو (امانتیں وہ رقمیں تھیں جن کو اہل خیر حضرت کو وکیل بنا کر کارخیر کے لئے بھیجتے تھے) مختلف تھیلیاں مدوار ہوتی تھیں، ایک تھیلی میں بی بی صاحبہ نے عرض کیا کہ پانچ روپے ہیں، فرمایا چھ ہوں گے، چنانچہ ہاتھ ڈالا تو ایک روپیہ کا نوٹ اور نکلا، ارشاد فرمایا کہ یہ کل رقمیں ان کے مالکوں کو واپس کردی جائیں، یہ اس مسئلہ شرعی پر عمل تھا کہ وکیل یا موکل کی موت کے بعد وکالت ختم ہوجاتی ہے، اور ملک مالک کے تصرف میں واپس جانی چاہئے، مولانا ظفر احمد صاحب کو کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک کاغذ پر یہ بشارت نامہ لکھ کر **وجعلنا ھا وابنھا اية للعلمين** [الانبياء: ۹۱] دیا اور فرمایا میں نے سب کو معاف کیا میں کسی کی طرف سے کوئی غبار لے کر نہیں جا رہا ہوں۔

مغرب کے بعد حالت اور زیادہ نازک ہوئی، سانس کی تنگی محسوس تھی، مولانا ظفر احمد صاحب نے ڈھاکہ واپس جا کر لکھا:

آپ تھانہ بھون سے بھوپال گئے، اور یہاں سخت بھونچال آگیا کہ حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ نے دارالبقا کی طرف ارتحال فرمایا، **انا للہ وانا الیہ راجعون۔**

کادت لھاشم الجبال تزول

یہ ناچیز آخری وقت تک حاضر خدمت رہا، دل پر پتھر رکھ کر بیٹھا رہا، قلب اطہر کی طرف متوجہ رہا، تشنگی رفع کرنے کے لئے آب زمزم دیتا رہا، یہاں تک کہ آخری سانس میرے سامنے ختم ہوا۔ یٰسین اور کلمہ کی تلقین کرتا رہا، غسل بھی دیا، نماز بھی پڑھائی۔

رات کے دس بجے تھے کہ عشاء کی نماز کے لئے خدام قریب کی حوض کی مسجد میں گئے کہ اسی اثنا میں وہ دم آگیا جس دم کے لئے ہر دم تیاری رہتی تھی، اور ودیعۂ حیات کی آخری سانس اس دنیا میں لے کر واصل بحق ہوئی، **اللھم انزل علیه شابیب رحمتک وارفع درجته وارزقنامن برکاته۔**

اس وقت خدام خاص کی کیفیت خیال کے قابل ہے جو ایک طرف اپنے محبوب کے فراق میں بیقرار تھے، اور دوسری طرف مقام صبر و رضا کی تعلیم سے بہرہ ور تھے، اور حق تھا کہ حضرت سرور انبیا سید الرسل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اتباع میں وہی کہیں جو حضورؐ نے اپنے محبوب فرزند ابراہیم کی وفات کے وقت ارشاد فرمایا تھا کہ "اے ابراہیم ہم تیری جدائی سے غم گین ہیں، لیکن زبان سے ہم وہی کہیں گے جس میں ہمارے پروردگار کی رضامندی ہو"۔ تاکہ محبت اور تسلیم و رضا دونوں کا حق ادا ہو۔

تجہیز و تکفین کے متعلق یہی فیصلہ ہوا کہ صبح کو ہو، صبح کے وقت خبر کے لئے دو آدمی سہارنپور بھیجے گئے، ایک مدرسہ مظاہرالعلوم میں جس سے حضرت کو بہت روحانی تعلق تھا اور دوسرا سہارنپور کے احباب کے پاس اس صبح کی جانے والی اور آنے والی گاڑیوں میں آدھ ہی گھنٹہ کا فرق ہوتا ہے، اس لئے جو لوگ سننے کے ساتھ جس حال میں تھے اسی حال میں چل پڑے وہ تو پہلی گاڑی سے روانہ ہوسکے، مگر اس کے بعد بھی سیکڑوں آدمی اسٹیشن پر پہنچ گئے، چنانچہ دوسری اسپیشل ٹرین چھوڑی گئی اور قریب ڈیڑھ ہزار آدمی کے جنازہ کے وقت تک پہنچ سکے۔

حضرت نے ہر چیز کا انتظام پہلے سے کر رکھا تھا، یعنی ایک زمین لے کر اس کا تکیہ یا قبرستان خاص بنا کر وقف کر دیا تھا، ایک مختصر سے احاطہ کے اندر ایک زمین گھیر دی گئی تھی، جس میں کچھ درخت بھی لگا دیئے گئے تھے، چھوٹی سی مسجد اور ایک مختصر سا سائبان بھی اس میں ہے، اسی میں دوسرے اعزہ اور خدام بھی آسودہ ہیں، اسی کے بیچ میں اس مخدوم کی استراحت ابدی کے لئے زمین چنی گئی۔

جنازہ کی نماز کے لئے مولانا شبیر علی صاحب نے مولانا ظفر احمد صاحب کو اشارہ کیا، مجھے معلوم ہوا کہ پہلے تو مولانا ظفر احمد صاحب نے تواضع کرنا چاہا، مگر انھیں اپنا خواب یاد آیا تو آگے بڑھ گئے اور نماز جنازہ ادا کی، میں نے سنا کہ مولانا ظفر احمد صاحب ڈھاکہ میں تھے اور حضرت کی شدت علالت کی خبریں جارہی تھیں اور گھر سے آنے کے لئے شدید تقاضا بھی ہو رہا تھا تو انہوں نے خواب دیکھا کہ وہ تھانہ بھون پہنچے

اورحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ ایک نماز پڑھانے والا آ گیا۔

یہ واقعات تھانہ بھون میں ۱۹؍اور ۲۰؍جولائی کو پیش آئے مگر باہر والوں کو اطلاع دو دن بعد ملی، دہلی میں ۲۱؍کو اور لکھنؤ میں ۲۲؍کو مذہبی حلقوں میں اور عربی مدرسوں میں سناٹا چھا گیا۔

خاکسار اب تک بھوپال میں تھا، عنایت الٰہی دیکھئے کہ عین شب وصال کو خواب دیکھا کہ مولانا شبیرعلی صاحب مجھ سے فرمارہے ہیں کہ حضرت مولانا کو پوری صحت ہوگئی، صبح اُٹھ کر میں نے حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب سے یہ خواب بیان کیا، دونوں چُپ رہے، مفتی صاحب ۲۱؍جولائی کو اور خاکسار ۲۲؍جولائی کو بھوپال سے روانہ ہوئے، میں ۲۳؍کی دوپہر کو لکھنؤ پہنچا اور ندوہ آیا، حادثہ سے بالکل بے خبر تھا، مدرسہ پہنچنے کے ساتھ میرے بچہ سلمان سلمہ نے سب سے پہلے خبر دی، اور اتفاق دیکھئے کہ بھوپال سے خط تو میں نے خیریت کے لئے مولانا جمیل احمد کو لکھا تھا، چنانچہ انہوں نے دوشنبہ کے روز شدت علالت اور مایوسی کی اطلاع لکھی، اور اس کی دوسری طرف بلا توقع مولانا شبیرعلی صاحب کے قلم کی عبارت یہ تھی۔

حضرت مخدوم معظم دام ظلکم العالی، السلام علیکم ورحمتہ اللہ،

بعد تحریر خط ہذا ۱۹، ۲۰؍جولائی کی درمیانی شب میں حضرت والا کا وصال ہوگیا، **انا للہ و انا الیہ راجعون**۔ بجز اطلاع کے اور کیا عرض کرسکتا ہوں، کیونکہ الفاظ اظہار کے لئے نہیں ملتے۔

مصیبت زدہ شبیرعلی عفی عنہ از تھانہ بھون

۲۴؍کو سہارنپور اور دہلی سے مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہرالعلوم سہارنپور اور مولانا الیاس صاحب کاندھلوی لکھنؤ دارالعلوم میں آئے تو مزید اطلاعات اور تفصیلات معلوم ہوئیں، ۲۶؍جولائی کا لکھا ہوا مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کا غم نامہ ملا۔

مکرم محترم، دامت معالیہم

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ، امید ہے کہ آپ بھوپال سے واپس آگئے ہوں گے، میں نے دہلی پہنچ کر حضرت مولانا تھانوی کے وصال کی خبر سنی، آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا، فوراً یاد آیا کہ جس شب کو مولانا نے دنیا کو چھوڑا، یعنی دوشنبہ سہ شنبہ کی درمیانی شب اسی رات کی صبح کو جناب نے بھوپال میں مجھ سے ذکر کیا تھا کہ آپ نے مولوی شبیر علی صاحب کو خواب میں دیکھا کہ وہ کہہ رہے ہیں حضرت مولانا بالکل صحت یاب ہوگئے، آپ کا خواب سچا ہوا، مولانا نے دنیاوی تکالیف سے بالکل صحت پائی، اور رفیق اعلیٰ سے جاملے، **انا للہ وانا الیہ راجعون، رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃ واسکنہ الفردوس الاعلی**، ہندوستان ایک حکیم الامتہ مجدد الملتہ سے محروم ہوگیا۔

حضرت کے ایک خلیفہ جن کو صدق رویا کی نعمت ملی ہے، وصال کی دوسری یا تیسری شب کو خواب میں دیکھا کہ حضرت فرمارہے ہیں کہ میرے فیوض اب بھی جاری رہیں گے، اللہ تعالیٰ نے مجھے مقام شہداء (فرمایا یا مقام شہود) عطا فرمایا، حضرت نے اسہال کے مرض سے وفات فرمائی، اور حدیث نبوی ہے کہ **والمبطون شھید**، پیٹ کی بیماری سے مرنے والا شہید ہے۔

مجھ سے مولوی محمد حسن صاحب کاکوروی (علیگ) مالک انوار المطابع لکھنؤ نے جو حضرت کے خدام قدیم میں سے ہیں بیان کیا اور انہوں نے خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری بی اے (علیگ) سے سنا ان کو چھوٹی پیرانی صاحبہ سے معلوم ہوا (خواجہ صاحب کی اہلیہ بھی ساتھ تھیں) کہ جس وقت روح مبارک پرواز کررہی تھی حضرت کے داہنے ہاتھ کی شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کے بیچ میں ایک نگینہ سا چمکتا معلوم ہوتا تھا جس کو انہوں نے دیکھا اور دوسری عورتوں نے بھی دیکھا، محرم خاص حضرت خواجہ صاحب نے فرمایا کہ چونکہ جونورِ ہدایت حضرت کے ذریعہ پھیلا وہ زیادہ تر ان کی انگلیوں یعنی تصنیفات کے ذریعہ سے پھیلا، اس لئے وہ نور انگلیوں ہی کے درمیان ممثل ہوکر نظر آیا، **واللہ اعلم بالصواب**۔

حضرت کے بہت سے محبین کی طرح ایک محبّ خاص مولانا مسعود علی صاحب ندوی کو اس عقیدت و عظمت کی بنا پر جو ان کے دل میں تھی حضرت کی مغفرت کے لئے دعا مانگنے میں دلی کشمکش محسوس ہوتی تھی، انہوں نے خواب دیکھا کہ وہ خانقاہ تھانہ بھون میں حاضر ہیں کہ دفعتہً حضرت تشریف لے آئے اور ان سے فرمایا کہ میری صحت کے لئے دعا مانگا کرو۔

حل ایں نکتہ ہم ازروے نگار آخر شد

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ایک کامل زندگی کو جو کمال زہد و ورع، کمال اتباع شرع، کمال اتباعِ سنت کے ساتھ تھی، اس زمانہ میں نمونہ کے لئے پیدا کیا، وہ آئی اور ساٹھ برس کے مجاہدہ کا نمونہ دکھا کر واپس گئی، **رحمہ اللہ تعالیٰ وادخلہ اعلیٰ علیین، وصلی اللہ تعالیٰ علی النبی الامین والہ واصحابہ اجمعین واخر دعوانا ان الحمدللہ رب العلمین**۔ (''س''، اگست ۱۹۴۳ء)

تصحیح: گزشتہ پرچہ میں موت العالم کے تحت میں مولانا شبیرعلی صاحب کے یادفرمانے کا ذکر ہے، اس کے بعد اضافہ یہ کیا جائے کہ ''اسی کے ساتھ حضرتؒ نے مولانا ظفر احمد صاحب کو بھی یاد فرمایا مگر وہ بھی نہ تھے، مغرب کی نماز کو چلے گئے تھے''۔

گزشتہ پرچہ میں جس بشارت نامہ کا ذکر ہے، وہ وفات سے دو دن پہلے کا واقعہ ہے، مولانا ظفر احمد صاحب ارقام فرماتے ہیں ''وصال سے ۲ دن پہلے ظہر کے بعد جب

حضرت مسلسل باتیں کر رہے تھے اور طبیعت روبافاقہ معلوم ہو رہی تھی، دس پندرہ آدمی مجلس میں حاضر تھے، فرمایا قلمدان لاؤ قلمدان پیش کیا گیا، اس میں سے ایک پرزہ نکال کر کانپتے ہوئے ہاتھ سے تحریر فرمایا، ھنیاً الکم انموذج آیۃ وجعلنا ھا وابنھا آیۃ للعالمین، پھر مجھے بلا کر یہ تحریر عطا فرمائی اور فرمایا مجھ سے صاف نہیں لکھا گیا، اگر نہ پڑھ سکو پھر لکھ دوں، عرض کیا حضرت کو اس کے لکھنے میں بہت کلفت ہوئی، دوبارہ تکلیف نہ دوں گا، صرف لفظ اول نہیں پڑھا گیا، اس کو زبانی فرمایا جائے، ارشاد فرمایا، ھنیاً الکم مبارکباد، اس پر میں نے خوشی ظاہر کی تو ہنس کر فرمایا، ہاں خوشی کی بات ہے گزشتہ معارف میں اس واقعہ کے ذکر کے بعد جو باقی عبارت ہے اس کا تعلق مولانا ظفر احمد صاحب سے نہیں دوسرے لوگوں سے ہے، عبارت میں میرے سہو قلم سے ابہام سا ہو گیا ہے جس پر ندامت ہے۔ (''س''، ستمبر ۱۹۴۳ء)

دہلوی، عنایت اللہ، مولانا

مولانا عنایت اللہ صاحب دہلوی مرحوم

گزشتہ اکتوبر کو علمی جماعت کے پرانے ممتاز رکن مولوی عنایت اللہ صاحب دہلوی مرحوم سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد دکن نے انتقال کیا، مرحوم علی گڑھ کالج کے دور اول کے ممتاز تعلیم یافتہ تھے، علم و ادب کا مذاق اپنے نامور باپ مولوی ذکاء اللہ صاحب دھلوی سے ورثہ میں پایا تھا، طالب علمی ہی کے زمانہ سے ان کے یہ جوہر نمایاں تھے، سرسید کے بہت سے علمی اور ترجمہ وغیرہ کے کام وہی انجام دیتے تھے، اس دور کے ان کے بعض تراجم اب تک یادگار ہیں، ان میں سب سے اہم پروفیسر آرنلڈ کی مشہور کتاب ''پریچنگ آف اسلام'' کا ترجمہ ''دعوتِ اسلام'' ہے، تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۸۹۳ء میں وہ کالج لائبریری کے لائبریرین مقرر ہوئے، کچھ دنوں تک ریاضی کی پروفیسری کی۔ اعزازی خدمت اور تہذیب الاخلاق کی ادارت کے فرائض انجام دیئے، ۱۹۰۰ء میں گورنمنٹ کے سلسلۂ ملازمت میں داخل ہوئے اور جونپور کی عدالت ججی میں منصرم مقرر ہوئے، ۱۹۱۵ء میں ریاست گوالیار نے گورنمنٹ سے ان کی خدمت مستعار لے کر اپنے شعبہ فنانس کا انڈر سکریٹری بنایا۔ دوران ملازمت میں ترجمہ کا مشغلہ برابر جاری رہا اور اس میں ان کو اتنی شہرت حاصل ہوگئی کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے سلسلہ میں حیدرآباد میں جب دارالترجمہ کا قیام عمل میں آیا، تو گورنمنٹ نظام نے ان کو حیدرآباد میں منتقل کرا کے ۱۹۲۰ء میں ان کو دارالترجمہ کا ناظم مقرر کیا، ۱۴ سال تک بڑی قابلیت کے ساتھ اس خدمت کو انجام دیتے رہے، ۱۹۳۴ء میں اس سے سبکدوشی حاصل کر کے دہرہ دون کی پرسکون فضا میں قیام اختیار کیا اور یہیں ۲۲/ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو وفات پائی۔

مرحوم کا خاص کمال ترجمہ کی مہارت تھی، اس میں ان کو ایسا ملکہ حاصل تھا کہ غیر زبانوں کی کتابوں کو اس طرح اردو کے قالب میں ڈھالتے تھے کہ تصنیف کا گمان ہوتا تھا، انگریزی کتاب سامنے رکھ کر اس کا ترجمہ اس روانی کے ساتھ پڑھتے جاتے تھے کہ معلوم ہوتا اردو کی کتاب پڑھ رہے ہیں۔ وہ ضخیم سے ضخیم کتابوں کا ترجمہ چند مہینوں میں کر ڈالتے تھے، ان کے چھوٹے بڑے تراجم کی تعداد جن میں نظمیں، قصے، کہانیاں، ناول، افسانے اور ڈرامے بھی ہیں اور سنجیدہ علمی اور تاریخی کتابیں بھی پچاس ساٹھ سے اوپر ہیں، ان میں بیشتر کتابیں شائع ہو چکی ہیں، پھر بھی اس کا معتدبہ حصہ ابھی قلمی مسودہ کی صورت میں ہے، مستقل تصانیف بہت کم ہیں، لیکن ان کے بہت سے تراجم کی افادی حیثیت بھی مستقل تصانیف سے کم نہیں ہے، ان کی سب سے اہم علمی خدمت اندلس کا تاریخی جغرافیہ ہے جو ان کی سالہا سال کی محنت کا نتیجہ ہے، جس محنت و تحقیق و تلاش و جستجو سے یہ کتاب لکھی گئی ہے اسکا اندازہ صرف اہل علم ہی کر سکتے ہیں، درحقیقت یہ جغرافیہ نہیں ہے بلکہ ایک حد تک اندلس کی اسلامی فتوحات اور اسکی ابتدائی دور کی تاریخ بھی ہے، وہ طبعاً بڑے شریف، متواضع اور خاکسار تھے، ۷۳ سال کی عمر پائی۔ شادی نہیں کی اور ساری عمر عروس علم کی خدمت میں گزار دی، اللہ تعالیٰ اس شیفتۂ علم کو اپنی عنایت بے پایاں سے سرفراز فرمائے۔ (''س''، دسمبر ۱۹۴۳ء)

بدایونی، سید محفوظ علی

سیّد محفوظ علی صاحب بدایونی مرحوم

اسی مہینہ میں ۲۰/ اکتوبر کو ایک اور پرانے ادیب سید محفوظ علی صاحب بدایونی مرحوم نے فالج کے مرض میں انتقال کیا، مرحوم بدایوں کے ایک قدیم اور شریف خانوادہ کی یادگار علیگڑھ کالج کے ممتاز تعلیم یافتہ اپنے دور کے نامور ادیب اور علی گڑھ منتھلی، اولڈ بوائے، دکن ریویو، نقیب اور ہمدرد کے دور اول کے ممتاز لکھنے والوں میں تھے اور اس زمانہ میں ان کے مضامین بڑے ذوق وشوق سے پڑھے جاتے تھے، وہ سنجیدہ اور ظریفانہ دونوں طرز کے شگفتہ نگار ادیب تھے، غالباً متفرق مضامین کے علاوہ کوئی مستقل قلمی یادگار نہیں چھوڑی، ادھر برسوں سے علم وادب کا کوچہ چھوڑ کر خلوت گزینی کی زندگی اختیار کر لی تھی، وہ ابتداء سے بڑے دیندار اوظاہری وضع وقطع میں بھی پابند شریعت تھے، ناواقف شخص ان کو دیکھ کر انگریزی تعلیم یافتہ ہونے کا گمان بھی نہیں کر سکتا تھا اور یہ رنگ برابر گہرا ہوتا گیا، آخر میں بڑا ذوق وشوق اور بڑی کیفیت پیدا ہوگئی تھی اور اسی پر ان کا خاتمہ ہوا، اللہ تعالیٰ اس طالب آخرت کو اپنی رحمت ومغفرت سے سرفراز فرمائے، ہماری پرانی بزم ادب کی شمعیں ایک ایک کر کے بجھتی جاتی ہیں، جو باقی ہیں وہ بھی شمع سحر ہیں اور جب تک ہیں غنیمت ہیں، ان کے بعد یہ روشنی بھی نظر نہ آئے گی۔

مرحوم مولانا شبلی مرحوم کے زمانہ میں علی گڑھ میں پڑھتے تھے، اس نسبت سے

ان کو میرے ساتھ بھی یک گونہ محبت سی تھی اور خصوصیت کی ملاقات مرحوم دوست مولانا عبدالماجد صاحب بدایونی کی وساطت سے ہوئی اور ایسی ہوئی جو ان کے اخیر لمحہ تک قائم رہی، وہ اپنے مذہبی انقلاب کا ایک عجیب ظریفانہ واقعہ بیان فرماتے تھے۔

ایک دفعہ گرمیوں میں وہ علی گڑھ سے کہیں جارہے تھے، پیاس شدت کی تھی، گاڑی میں سوار ہوئے تو دیکھا ایک بزرگ نہایت ثقہ صورت اس میں بیٹھے تھے، سامنے نہایت نازک اور سبک صراحی جس پر سرخ یکرنگہ (ٹول) کا کپڑا منڈھا تھا اور آبخورہ بھی تھا، یہ داڑھی صاف علی گڑھ کے نوجوان تھے، پیاس کی طلب نے یہ صراحی دیکھ کر بیتاب کردیا تھا، صاحب صراحی سے پانی پینے کی اجازت چاہی، انہوں نے کہا کہ پہلے یہ تو معلوم ہو کہ آپ مسلمان بھی ہیں، میر صاحب نے کلمہ پڑھا، انہوں نے کہا کہ کلمہ تو ہندو بھی پڑھ دیتا ہے، یہ ظریفانہ شوخی کے ساتھ بولے تو اپنے اسلام کا ثبوت پیش کروں، وہ بزرگ بھی بڑے بے دھڑک نکلے، یہ ثبوت تو یہودی بھی پیش کرسکتا ہے، اب میر صاحب کا ترکش خالی ہوگیا، ہار مان لی، شرم سے پسینہ آگیا، آخر ان بزرگ نے پانی دیا اور انہوں نے پیا، اس ساقی کے ایک جام نے ان کے خیالات کی دنیا بدل دی۔

بعض اچھے سرکاری عہدوں پر رہے۔ افریقہ میں برطانی عہدہ دار ہوکر گئے کہتے تھے وہیں کی آب و ہوا نے وقت سے پہلے ان کو بوڑھا بنادیا اور سن سپید ہوگئے، ماشاء اللہ بڑی نورانی صورت پائی تھی، سپید لمبی داڑھی، کبھی کبھی سر پر عمامہ باندھتے تھے۔

وہ کہتے تھے کہ ان کے بال افریقہ کے قیام کے زمانہ میں پک گئے اور جوانی ہی میں بوڑھے ہوگئے وہ افریقہ میں ایک برٹش آفیسر کی حیثیت سے گئے تھے، وہاں سے واپسی پر وہ حیدرآباد رہے، محمد علی مرحوم سے ان کی ملاقات اور تعلقات کی وابستگی علی گڑھ کالج کے زمانہ سے تھی، محمد علی مرحوم نے جب ہمدرد نکالا تو دوسرے لکھنے والوں کے ساتھ ان کو بھی اس اخبار میں زبردستی کھینچا، تجاہل عارفانہ کے نام سے علی گڑھ کے معاملات اور حاجی نواب اسحاق خان مرحوم کے خلاف جو مزاحیہ مضمون نکلا کرتا تھا، وہ مرحوم ہی کی جدت قلم کا نتیجہ تھا۔

اخیر میں اپنے گھر میں اپنی زمینداری کے کاموں میں مصروف ہوکر رہ گئے تھے، اور دن رات اللہ اللہ کرنا ان کا کام رہ گیا تھا۔ ("س"، دسمبر ۱۹۴۳ء)

حفیظ اللہ، محمد، مولانا

آہ! شمس العلماء مولانا محمد حفیظ اللہ

سابق مدرس اعلیٰ دارالعلوم ندوہ

حضرت مولانا ابوالحسنات عبدالحئی صاحب فرنگی محلی کی آخری یادگار مٹ گئی یعنی ان کے آخری شاگرد یعنی مولانا محمد حفیظ اللہ صاحب، جو ان کی مجلس درس کی اکیلی یادگار رہ گئے تھے، ۱۳۶۲ھ کے خاتمۂ ماہ میں وفات پاگئے۔

مرحوم ۱۸۵۶ء کے آخر میں ضلع اعظم گڑھ کے چھوٹے سے گاؤں بندی میں پیدا ہوئے تھے، غدر ۱۸۵۷ء میں وہ ۶ ماہ کے تھے اور اسی قدر وہ مولانا شبلی نعمانی سے بڑے تھے، ابتدائی کتابیں گھر پر پڑھ کر وہ اپنے عزیز مولانا سلامت اللہ صاحب جیراجپوری (والد حافظ اسلم صاحب جیراجپوری) کے ہمراہ بنارس تعلیم کے لئے گئے، وہاں سے واپس آکر مدرسہ چشمۂ رحمت غازی پور میں پڑھنے کے لئے گئے، وہاں فارسی کی اونچی کتابیں پڑھیں، اس زمانہ میں غازی پور میں حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب فرنگی محلی کے شاگرد رشید مولانا غلام جیلانی صاحب تھے، ان سے باصرار عربی کتابیں شروع کیں اور چند سال میں ان سے متوسطات تک پڑھ کر انہی کے مشورہ سے فرنگی محلی لکھنؤ میں مولانا ابوالحسنات عبدالحئی صاحب فرنگی محلی کی مجلس درس میں حاضر ہوئے، یہ وہ زمانہ تھا، جب داروغہ حیدر بخش کی مسجد جو چوک میں عربی اور طب پڑھنے والوں کا گویا دارالاقامۃ تھا، نئی بن کر تیار ہوئی تھی، چنانچہ حضرت مولانا عبدالحئی صاحب کی سفارش سے ان کو اس کے حجرہ میں رہنے کی جگہ ملی، اور یہاں کئی سال رہ کر معقولات اور دینیات کی تعلیم حاصل کی، فراغت کے بعد جو غالباً ۱۸۸۰ء میں ہوئی ہوگی وہ کاکوری ضلع لکھنؤ کے ایک مقامی مدرسہ میں مدرس مقرر ہوئے، یہی سلسلہ ہے جس سے وہ جناب منشی احتشام علی مرحوم رئیس کاکوری سے ملے، کہ پھر ان کے دل الگ نہ ہوئے اگلے زمانہ میں دوستوں کی وضعداریاں، آج عجیب معلوم ہوتی ہیں، چند ہی سال کے بعد ریاست رامپور کے مشہور مدرسۂ عالیہ میں مدرس مقرر ہوئے، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ رامپور اہل علم کا مرکز تھا، مولانا عبدالحق خیرآبادی کا وہاں طوطی بول رہا تھا، اس عہد میں ان کا وہاں جانا اور اہل علم کی نگاہوں میں وقار پیدا کرنا معمولی کارنامہ نہیں، دونوں میں نواب صاحب کے سامنے ایک دفعہ کسی فلسفیانہ مسئلہ پر مناظرہ بھی ہوا، مولانا مرحوم کو زیادہ تر شوق معقولات ہی کا تھا، قدیم فلسفہ و منطق میں بڑی دسترس حاصل کی تھی، ساتھ ہی ریاضیات میں کمال پیدا کیا تھا، چنانچہ رامپور کے زمانۂ قیام میں تصریح پر ۱۳۱۲ھ میں حاشیہ لکھا، جو عام طور سے شائع ہے۔

رامپور کے زمانۂ قیام میں جنرل عظیم الدین مرحوم کا عہد دیکھا تھا، ان کے شجاعانہ کارنامے وہ خوب خوب بیان کرتے تھے، یہ تو رزم تھی، بزم میں جناب منشی امیر احمد صاحب مینائی مرحوم کی صحبت اٹھائی تھی، ان کے شاعرانہ کمالات اور بعض مشاعروں کے حالات بڑی دلچسپی سے سناتے تھے، آداب مجلس سے خوب واقف تھے اور بڑی مزہ دار باتیں کرتے تھے، لطائف و ظرافت کی بھی کمی نہ تھی، سیر و شکار کا بھی شوق تھا، بڑے قادرانداز تھے۔

رامپور سے وہ لکھنؤ آئے اور دارالعلوم ندوہ کے افتتاح کے وقت ۱۳۱۷ھ میں وہ

اس کے مہتمم اور مدرس اول مقرر ہوئے، جس پر وہ ۱۹۰۸ء تک فائز رہے، ہیچمدان نے اسی زمانہ میں ان سے مدرسہ دارالعلوم میں معقولات ومنقولات کی کتابیں پڑھیں۔

مولانا شبلی مرحوم کے وہ معاصر تھے، اس لئے جب صحبت ہوتی تو دونوں میں خوب نوک جھونک ہوتی، گفتگو کا موضوع کوئی فلسفہ کا مسئلہ یا عقل ونقل کی تطبیق کی معرکہ آرائی ہوتی۔

دارالعلوم سے وہ ۱۹۰۸ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں گئے، ۱۹۲۱ء میں وہاں سے پنشن یاب ہوئے، اسی سال وہ حج کو گئے اور وہاں سے واپس آکر لوگوں کے اصرار سے دوبارہ ندوہ کی صدر مدرسی قبول کی اور کئی سال تک یہ خدمت انجام دینے کے بعد ۱۹۳۰ء میں ندوہ سے الگ ہوکر وطن واپس آگئے تھے اور یہیں ۷/ ذی الحجہ ۱۳۶۲ھ کو وفات پائی۔

مولانا عبدالحئی مرحوم کی شاگردی کے باوجود مرحوم آخر میں عامل بالحدیث ہوگئے تھے، عدم تقلید کا میلان پہلے سے رکھتے تھے، جو شاید مولوی سلامت اللہ صاحب کی ابتدائی صحبت کا اثر رہا ہو، ان کی تصانیف میں تصریح الافلاک کا حاشیہ علمی یادگار ہے۔

۱۸۵۶ء کے آخر میں پیدا ہوئے تھے، اس حساب سے وفات کے وقت ان کی عمر تقریباً ستاسی اٹھاسی سال کی تھی، لیکن دو چار سال پہلے ان کی صحت وتوانائی قابل رشک تھی اور ان کے جسمانی قویٰ نہایت اچھے ہوتے تھے، ادھر چند برسوں سے البتہ ضعف واضمحلال کا اثر نمایاں، اور آخری زمانہ میں ذہول ونسیان کا غلبہ زیادہ ہوگیا تھا۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمت ومغفرت سے سرفراز فرمائے۔

(''س''، جنوری ۱۹۴۴ء)

الہ آبادی، سید محمد عیسیٰ، مولانا

وفاتِ عیسیٰ الہ آبادی

حضرت مولانا سید محمد عیسیٰ صاحب الہ آبادی نے جو حضرت مولانا تھانویؒ کے اولین خلفا میں تھے، ۲۵/ ربیع الاول ۱۳۶۳ھ مطابق ۲۱/ مارچ ۱۹۴۳ء کی سہ پہر کو جونپور میں جہاں وہ بغرض علاج آئے تھے ۶۳ برس کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا، اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۔ خیال تھا کہ مرشد رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ان کی ذات مرجع انام بنے گی، مگر اللہ تعالیٰ اپنی مصلحتوں کو آپ جانتا ہے، ان کا وطن محی الدین پور ضلع الہ آباد تھا، نسبتاً سادات کرام میں تھے اور گھر کے خوش حال زمیندار تھے، غالباً ۱۳۰۱ھ کی پیدائش ہوگی، بچپن ہی سے وہ زاہد ومتقی تھے، باپ کے حکم سے انگریزی شروع کی اور بی اے تک پڑھ کر چھوڑ دیا اور ایک اسکول میں انگریزی کے ماسٹر اور آخر میں گورنمنٹ کالج الہ آباد میں عربی کے پروفیسر ہوگئے۔

نوجوان ہی تھے کہ الہ آباد کانپور میں حضرت مولانا تھانویؒ کے مواعظ سننے کا اتفاق ہوا، جو بات سنی، دل میں گھر کرتی چلی گئی اور روز بروز یہ نشہ تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ بیعت وارادت سے مشرف ہوکر مجاہدہ ریاضت میں مصروف ہوئے، آخر تکمیل طریق کے بعد خلافت واجازت سے سرفراز ہوئے۔

اللہ تعالیٰ کی شان بندہ نوازی نظر آتی ہے کہ ایک انڈر گریجویٹ میں جس نے صرف انگریزی ہی کی تعلیم پائی تھی چند روز میں یہ انقلاب پیدا ہوا کہ اس نے اس عمر میں آکر سرکاری ملازمت کے ساتھ عربی تعلیم پوری کی اور قرآن وحدیث کا علم حاصل کیا اور ساتھ ہی قرآن پاک حفظ کیا اور سیرت وصورت میں یہ رنگ پیدا کیا کہ کوئی دیکھ کر یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ انگریزی کا ایک لفظ بھی جانتا ہے۔

سلوک وطریقت، مسلک ومشرب، صورت وسیرت، حتیٰ کہ نشست وبرخاست اور خط وکتابت اور گفتگو میں اپنے مرشد کاملؒ سے اس درجہ مشابہت حاصل کرلی تھی کہ ان کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا تھا۔

تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

وہ نہایت ہی عابد، زاہد، متبع سنت اور مرشد کے اصولوں کے سختی سے پابند تھے، اطراف میں حلقۂ ارشاد بھی قائم تھا، اپنے مرشد کی متعدد کتابوں کے خلاصے اور شروح شائع کئے، جن میں سب سے اہم ''انفاسِ عیسیٰ'' ہے جو سلوک اشرفی کی معتبر ترین کتابوں میں ہے، مردوں کے لئے بہشتی زیور کا خلاصہ بہشتی ثمر کا نام سے کیا، جو مکاتب میں رائج ہوئی، تفسیر بیان القرآن کا خلاصہ مترجم قرآن کے حواشی کے طور پر کیا، جو الہ آبادی میں زیر طبع تھا، حضرت مولانا تھانویؒ کی کمالات امدادیہ کے طرز پر انہوں نے کمالات اشرفیہ لکھی جو فن سلوک ومعرفت کے متعلق ان کی استعداد وصلاحیت کی آئینہ دار ہے۔ حدیث میں ازالۃ الوسن بالف من السنن اردو ترجمہ کے ساتھ ان کی مفید تالیف ہے زہد وورع، اخلاق اور سلوک کی ایک ہزار حدیثیں جمع کی ہیں۔

صاحب مقامات مستجاب الدعوات اور واردات صحیحہ سے سرفراز تھے، کالج سے پنشن لینے کے بعد اپنے گاؤں میں مقیم ہوگئے تھے اور متوسلین کو اپنے رشد وہدایت سے سیراب کرتے تھے، اسی عالم دو برس ہوئے کہ ایک شب تہجد کے لئے اٹھے تو فالج کا حملہ ہوا، اس کے بعد امسال دوسرا حملہ ہوا، جس کے بعد علاج کے لئے جونپور آئے، جہاں ۱۱/ مارچ کو تیسرا حملہ ہوا اور زبان بند ہوگئی۔ وفات کے آخری لمحہ میں آخری بار زبان کھلی اور تین دفعہ بلند آواز سے اللہ اللہ کہا اور جان، جان آفریں کے سپرد کردی۔

عجیب بات یہ ہے کہ جونپور میں وہ بالکل مسافرانہ وارد تھے، لیکن حضرت مولانا تھانویؒ کے متعدد خلفاء مجازین اور صحب یافتہ بغیر کسی ظاہری داعیہ کے عین وقت پر پہنچ گئے۔ انہی میں سے ایک نے یٰسین پڑھی، ایک نے غسل دیا، ایک نے نماز جنازہ پڑھائی اور سب نے پڑھی اور دو نے قبر میں اتارا، جونپور ہی میں محلّہ رضوی خان کی

ایک اکبری مسجد کے عقب میں ۲ بجے رات کو تدفین عمل میں آئی، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

(''س''، اپریل ۱۹۴۴ء)

بہادر خاں، محمد، مولوی

مولوی محمد بہادر خاں

(سابق نواب بہادر یار جنگ)

افسوس کہ گذشتہ مہینہ کی ۲۴؍ تاریخ کو مولوی محمد بہادر خاں (سابق نواب بہادر یار جنگ) نے حرکت قلب بند ہوجانے سے دفعتہً انتقال کیا، ان کی ناگہانی وفات نہ صرف حیدرآباد بلکہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے لیے اندوہناک سانحہ ہے، مرحوم حیدرآباد کے ایک قدیم وممتاز جاگیردار خانوادہ کے رکن، مخلص، دردمند اور علمی مسلمان، زبان آور خطیب، ریاست کے سچے وفادار، مسلمانوں کے غمگسار اور عام اہل ملک کے ہمدرد وبہی خواہ تھے، حیدرآباد کی ہر مفید اسلامی تحریک میں ان کا دست اعانت شامل رہتا تھا، وہ مجلس اتحاد المسلمین کے روحِ رواں اور آل انڈیا ریاستی مسلم لیگ کے بانی اور صدر تھے، ابھی کل ۴۱ سال کی عمر تھی جو قومی زندگی کے اعتبار سے بالکل نوجوانی کی عمر ہے، اس عمر میں مرحوم نے حیدرآباد کے مسلمانوں کی جوگوناگوں خدمات انجام دیں وہ کبھی فراموش نہ ہوں گی، اور اہل دکن کو مدتوں ان کا بدل نہ مل سکے گا، ملک وقوم کی خدمت کی خاطر انہوں نے اپنا خطاب اور جاگیر تک واپس کردی تھی، ان کی ذات سے بڑی توقعات تھیں،لیکن افسوس ان کی جوانمرگی سے اہل دکن کو ان کی صلاحیتوں اور خدمات سے فائدہ اٹھانے کا زیادہ موقع نہ مل سکا، اللہ تعالیٰ اس مخلص خادم قوم کو اپنی رحمت ومغفرت کے انعام سے سرفراز فرمائے۔ (''م''، جولائی ۱۹۴۴ء)

اگست ۱۹۴۴ء

ایک بہادر مسلمان کی موت

چار پانچ ہفتے ہوئے میں ایک گاؤں میں تھا کہ دفعتہً ایک صاحب نے ایک انگریزی اخبار کے حوالہ سے نواب بہادر یار جنگ کی اچانک موت کی اطلاع دی، موت ہر وقت آتی ہے، اور ہر وقت آسکتی ہے، تاہم جن کے مرنے کو دل نہیں چاہتا، ان کے مرنے کی خبر کا یقین بھی دفعتہً نہیں آتا، ان کا ہشاش بشاش تبسم چہرہ، ان کا صحیح وتنومند جسم، ان کا خوبصورت اور دلفریب قد بالا، ہر چیز بجلی کی کوند کی طرح سامنے آئی، اور ان کی موت کی خبر کو جھٹلا کر چلی گئی، خود جا کر اخبار پڑھا، ورقوں کو الٹا پلٹا، روایت نے صدیق کی، اور صدق نے یقین کی، اور یقین نے آنسوؤں کی صورت اختیار کی، اور اناللہ کے ساتھ دل کی گہرائی سے مغفرت کی دعا نکلی۔

مرحوم سے جان پہچان اور بار بار کی ملاقات تو بارہ تیرہ برس سے تھی، مگر ابھی اسی سال فروری مارچ اور وسط اپریل تک حیدرآباد میں دارالعلوم ندوہ کے سلسلہ سے تقریباً ان سے روزانہ ہی ملنا جلنا اور ساتھ ساتھ لوگوں کے پاس آنا جانا اور گھنٹوں بیٹھ کر ہر موضوع پر اظہار خیال کا اور ہر پہلو سے ان کے جانچنے اور پرکھنے کا موقع ہاتھ آیا، وہ ہر پہلو سے محبوب ہی نظر آئے ارادہ کے پکے، بات کے دھنی، مخلص وفادار، خداترس، عاشق رسول ﷺ مجاہد اسلام، بہادر مسلمان سپاہی، اور ہر معنی میں سپاہی، بہادر پٹھان اور بہادر مسلمان۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ زبان کے تیز ہاتھوں کے کمزور ہوتے ہیں یعنی باتوں کے دھنی ہاتھوں کے سست ہوتے ہیں۔ مگر وہ زبان اور ہاتھ دونوں کے تیز تھے، اور اسی کا کرشمہ تھا کہ صرف چند سال کے اندر کشمیر کی پہاڑیوں سے لے کر دکن کے کناروں تک پورے ہندوستان پر چھاگئے۔

بارہ تیرہ سال گذرے ہوں گے کہ مجھے ان کا نام حیدرآباد میں پہلے پہل ایک مدراسی فاضل دوست افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق کے ایک تار میں جس کو کرنول سے انھوں نے حیدرآباد میرے نام بھیجا تھا نظر آیا اس تار میں مجھے نواب بہادر یار جنگ کے ساتھ کرنول کے ایک جدید مدرسہ کے افتتاح میں بلایا تھا آنکھوں نے تار کی سطروں میں نواب بہادر یار جنگ کا نام پڑھا، دل نے کہا نواب! عیش کا پروردہ! دولت کا آفریدہ، راحت کا خوگر، محراب ومنبر سے ناآشنا، وہ قومی و مذہبی مجالس کا ہیرو ہو، میرا قیام اپنے عزیز دوستوں مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی، ومولانا عبدالباری صاحب ندوی کے گھر میں تھا، میں نے ان سے حیرت کا اظہار کیا، مولانا گیلانی نے بڑھ کر ان کی تحسین کی، اور فرمایا جی ہاں میں انھیں بچپن سے جانتا ہوں خوب بولتے ہیں، اور بڑی دلنشین تقریر کرتے ہیں، اسکول میں جب پڑھتے تھے، مجھے بلا بلا کر اپنے جلسوں میں لے جاتے تھے، تقریر کے انعامی مقابلوں میں میں انھیں تمغے اور انعام دیا کرتا تھا، آج کل میلاد کی مجلسوں میں ان کی تقریریں بہت پسند کی جاتی ہیں، یہ وہ زمانہ تھا، جب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی صدر الصدور دولتِ آصفیہ تھے، اور ان کے سبب سے میلاد کی محفلوں کی بڑی کثرت اور چہل پہل تھی، شستہ اور محتاط مقررین کی تلاش رہتی تھی، اس سلسلہ میں تازہ وارد نوجوان بہادر خاں کی حوصلہ افزائی کی جاتی رہی۔

اتفاق دیکھئے کہ چند ہی روز بعد مہاراجہ کشن پرشاد آنجہانی صدر اعظم دولتِ آصفیہ کے یہاں دعوت ہوئی، بہت سے مہمان تھے، کھانے سے فرصت ہوئی، تو ایک خوبصورت سڈول نوجوان شروانی اور ترکی ٹوپی میں ملبوس، بے تکلفی کے ساتھ آگے بڑھا، اور ادب سے ہاتھ ملا کر گویا ہوا، میں خود اپنا تعارف کراتا ہوں میں ہوں آپ کا شاگرد بہادر خاں، آنکھوں نے حیرت سے صورت دیکھی، ناآشنا پایا، تفصیل پوچھی، فرمایا آپ کی

کتابوں کو پڑھ کر علم پایا، اور خطبات مدراس کورٹ کر میلاد کی محفلوں کو گرمایا، ان کی اس تواضع سے دل شرمندہ ہوا، اور ان کی اس شرافت سے سننے والے کی گردن جھک گئی۔

اُن کی یہ تواضع اور خاکساری تنہائیوں ہی میں نہیں، ہزاروں کے مجمعوں میں اسی طرح ظاہر ہوتی تھی، مولانا گیلانی کے ساتھ ان کی ممونیت برملا ان کی زبان سے ظاہر ہوتی تھی، مولانا شروانی کی حوصلہ افزائیوں کا اعتراف علی گڑھ یونین کی پہلی تقریر میں خود میرے کانوں نے سنا، دارالمصنفین کی کتابوں کے احسان کی کہانی اسی سال مارچ میں دارالسلام حیدرآباد کے عظیم الشان جلسہ میں سب نے سنی۔

مرحوم کی تقریر میں فصاحت و بلاغت اور بدائع تینوں کے جوہر تھے، شاعری وہ نہیں کرتے تھے، مگر ان کی نثر شاعری کا نمونہ ہوتی تھی، ان کی تقریریں بار ہا سنیں، ان کی اساس تین چیزیں ہوتی تھیں، اسلامی تاریخ کے معلومات، اقبال کے اشعار، ابوالکلام کے الفاظ، انھوں نے اقبالؔ کو بہت پڑھا تھا، اور بہت سمجھ کر پڑھا تھا، بیشتر کلام ان کے حافظ کے خزانہ میں محفوظ تھا، جس کو وہ اپنی تقریروں میں بہت دلنشیں انداز میں موقع موقع سے پڑھتے تھے، اور حاضرین سے خراج تحسین وصول کرتے تھے۔

علی گڑھ یونیورسٹی یونین سے داد پانا آسان نہیں، یونین میں ان کی پہلی تقریر تھی، موضوع حیدرآباد میں مسلمانوں کی سیاسی حیثیت اور دعوائے اقتدار تھا، جب تک وہ تقریر کرتے رہے تاثیر کا دریا بہتا رہا اور ہر شخص کو تسکین ہوگئی کہ حیدرآبادی مسلمانوں کا دعویٰ بالکل صحیح ہے، ایک اچھے مقرر لیڈر کو یہ کہتے سنا کہ انھوں نے اپنے کیس کو بہت خوبی سے پیش کیا، طالب علموں نے ان پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے یہ علی گڑھ میں ان کی پہلی جیت تھی۔

جس زمانہ میں حیدرآباد میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی پہلی شورش ہوئی، اور چند مسلمان کسی ہندو محلّہ میں شہید کردیئے گئے، تو سارے حیدرآباد میں آگ سی لگ گئی تھی، ان شہیدوں کا جنازہ لاکھوں مسلمانوں نے بڑی دھوم سے اٹھایا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس مجمع کا جوش سارے شہر میں ہندوؤں کو تہ تیغ کئے بغیر ٹھنڈا نہ ہوگا، سر حیدری کی وزارت تھی، نواب بہادر یار جنگ کو تقریر کی ممانعت تھی، دم بدم مجمع کا جوش بڑھ رہا تھا، اور خطرہ سب کے سامنے تھا، اس وقت اعلیٰ حضرت نظام خلد اللہ ملکہ کی اعلیٰ سیاست نے اس شخص کو جان لیا جو اس بھڑکتے ہوئے شعلہ پر پانی ڈال سکتا تھا، مرحوم کہتے تھے کہ میں اپنے گھر میں تھا کہ خود اعلیٰ حضرت نے مجھ سے ٹیلیفون پر ارشاد فرمایا، کہ بہادر خاں! میں تم سے خواہش کرتا ہوں کہ تم اس فتنہ کو فرو کرو، عرض کی اعلیٰ حضرت! یوں نہ فرمائیں بلکہ حکم دیں، فدوی ہتھیلی پر سر رکھ کر ابھی جاتا ہے، اور حکم شاہانہ بجالاتا ہے، چنانچہ وہ تنہا اس مجمع میں گئے، اور چند منٹ کی موثر تقریر میں سارا مجمع امن و سکون کے ساتھ منتشر ہوگیا، مسز سروجنی نائیڈو مکان کی چھت سے یہ سارا تماشا دیکھ رہی تھیں، انھوں نے بعد کو مرحوم سے کہا کہ میں نے امن و سلامتی کی حالت میں اسٹیج کے لیڈر اور مقرر تو بہت دیکھے ہیں، مگر انتقام کی آگ سے مشتعل اور جوش سے بھرے مجمع کو اس طرح قابو میں لے آنا والا لیڈر اور مقرر میں نے آج ہی دیکھا۔

مرحوم کی تقریروں کا اصلی میدان مسلم لیگ کے اجلاس اور اتحاد المسلمین حیدر آباد کے جلسے ہوتے تھے، مرحوم کا مذاق مذہب آمیز سیاست تھا، اُن پر دینی سیاست کا راز کھل چکا تھا، اور وہ یہی راز سب کو بتانا چاہتے تھے، اور جیسے جیسے زمانہ گذرتا جاتا تھا، ان کا یہ رنگ تیز سے تیز تر ہوتا چلا جاتا تھا، یہاں تک کہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ کراچی کے بعد سے لیگ کے خالص دنیاوی سیاسیوں پر ان کی تقریر بار ہونے لگی تھی۔

حیدرآباد میں اگر ان پچھلے چند برسوں کے اندر جب سرحیدری کی سیاست حیدرآباد کے دستور کی ترکیب و تحلیل میں مصروف تھی، نواب بہادر یار جنگ کا وجود نہ ہوتا، تو حیدرآباد کے نظم و نسق کا کچھ اور ہی انداز ہوگیا ہوتا، بیرونی ہندو لیڈروں اور دکن کے مرہٹوں نے ریاست کی امن دوست اور وفادار غیر مسلم رعایا کو بھڑکانے میں کوئی کمی نہیں کی، اور یہ دعویٰ کیا، کہ مردم شماری کے مطابق ریاست میں دونوں قوموں کے حقوق مانے جائیں، یہ سب کچھ ہو رہا تھا مگر اس ملک کے مسلمان بالکل خواب غفلت میں تھے، اور بجز عیش و آرام ان کا کوئی دوسرا مشغلہ نہ تھا، وہاں کے مسلمان جاگیردار جو اس ملک کی بڑی قوت ہیں محو استراحت تھے، دکن کے مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ صدیوں سے حکومت کے سر پر سارا بوجھ رکھ کر آرام طلبی اور بے فکری کے عادی ہوگئے ہیں، اس بیکاری سے ان کے دست و بازو شل اور قوائے عمل معطل ہیں، ان کا کوئی قومی تخیل اور سیاسی جذبہ زندہ نہیں رہا ہے، اور کسی حال میں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ یہ ان کشورستانوں کی یادگار ہیں جنھوں نے اپنے کو بڑی مشکلوں میں ڈال کر دکن کی آصفی حکومت کو قائم کیا تھا۔

مرحوم کا بڑا کارنامہ اسی جذبہ کو زندہ کرنا تھا، انھوں نے جاگیرداروں کو جھنجھوڑ کر جگایا، اور بتایا کہ اگر انھوں نے اٹھ کر اپنی زندگی اور ملک کو اپنی ضرورت کا یقین نہیں دلایا، تو زمانہ کا سیلاب ان کے اقتدار کو بہالے جائے گا، عام مسلمانوں کو یہ یاد دلایا، کہ یہ ملک تمھارا مفتوحہ اور مقبوضہ ملک ہے، اور تم بحیثیت قوم کے اس کے کشور کشا اور فاتح ہو، اور خانوادۂ آصفی کا سرتاج تمھاری حکومت کا نمائندہ، تمھاری طاقت کا مظہر، تمھاری بادشاہی کا ستون اور تمھاری وفاداری کا مرکز ہے۔

مرحوم نے اپنے اس سیاسی تخیل کی بنا پر تکلیفیں بھی اٹھائیں، ان پر پابندیاں بھی عائد ہوئیں انکے متعلق غلط فہمیاں بھی پیدا کرائی گئیں، تاہم انھوں نے ایثار کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا، یہاں تک کہ اپنے خطاب و منصب سے بھی دستبردار ہوگئے، اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔

مرحوم کی کوششوں سے دکن کے مسلمانوں نے صدیوں کے آرام کے بعد کروٹ لی اور اتحاد المسلمین کے زیر سایہ ایک مرکز پر جمع ہوگئے، اس کی شاخیں سارے ممالک محروسہ میں قائم ہوگئیں، اس کی آواز نے ملت کی آواز کا رتبہ پایا، اس کے سالانہ اجلاس میں بیک دفعہ پچاس ہزار آدمی جمع ہوجاتے تھے۔

مرحوم کا خیال تھا اور بجا خیال تھا کہ کسی ملک کی سرکاری تعلیم سے قومی روح زندہ نہیں ہوسکتی اس لیے حیدرآباد میں وہ ایک خالص قومی اسلامی درسگاہ قائم کرنا چاہتے تھے، جو دکن میں اسلامی روح پیدا کرے اور جب تک یہ درس گاہ قائم نہ ہو، ایک اسلامی بورڈنگ کی بنا ڈالی جائے، جس میں شہر کے ہر اسکول و کالج کے مسلمان طلبہ اقامت پذیر ہوں، اور وہ بورڈنگ کی تعلیم و تربیت میں رہیں، چنانچہ انھوں نے پچھلے ہی سال قومی چندہ سے ایک لاکھ میں حیدرآباد کے گویا وسط میں ایک بہت بڑی عمارت خریدی جس میں آئندہ تعمیرات کے لیے بہت بڑی وسعت ہے یہی عمارت دارالسلام کہلاتی ہے، اور یہی ان کے اتحاد المسلمین کا مرکزی دفتر ہے اسی عمارت میں ایک قومی کتب خانہ اور ایک اسلامی دارالاقامہ اور علوم مشرقیہ کی ایک چھوٹی سی درسگاہ قائم کی تھی، اس سال کے شروع میں یہ ادارے قائم ہوئے، اور اس کے ظاہر کرنے میں مجھے مسرت ہے کہ ان کے سیاسی و مذہبی تخیلات کی آبیاری، اور ان اداروں کی سربراہی میں جو گمنام آدمی کام کر رہا ہے، وہ تمام تر دارالعلوم ندوۃ العلماء کی پیداوار ہے، ندوہ کے لیے یہ شکر کا مقام ہے کہ دین و دنیا کی جامعیت کے ساتھ جب کہیں کوئی کام شروع ہوتا ہے تو اس کے فرزند اس کے لیے بہترین اہل ثابت ہوتے ہیں، مولوی عبدالقدوس ہاشمی ندوی جو تکمیل کے بعد ہمیشہ علمی مشاغل میں مصروف رہے، مرحوم کی رفاقت کے لیے وہ بہترین رفیق ثابت ہوئے اور مرحوم بھی ان کی کماحقہ قدر کرتے تھے، بہرحال ان اداروں کی نگرانی ان کے سپرد کی، اور انھوں نے وہیں قیام اختیار کرلیا۔

اس سال فروری اور مارچ اور نصف اپریل کے چند مہینے ندوہ کی قومی امداد کے سلسلہ میں ان کے بہت قریب گذرے ہر دوسرے تیسرے ان کے مکان پر جانا ہوا، جب گیا ان کو مصروف اور بہت مصروف پایا، صبح سے شام تک ضرورت مندوں اور ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، ٹیلیفون سامنے ہوتا اور ڈاک دوسری طرف رکھی ہوتی تھی، معمولی مسلمان سے لے کر، تاجر، بیوپاری، وکیل، اہل سیاست، اہلِ مشورہ اور حکام سب ہی قسم کے اشخاص باری باری سے آتے، اور باتیں کر کے واپس جاتے تھے ملنے ملانے اور کہیں آنے جانے کے لیے کئی کئی روز پہلے وقت مقرر ہوتا اور پھر بھی ان کا کام پورا نہ ہوتا میں نے حیدرآباد کے لیڈروں میں ان سے زیادہ ہر دلعزیز کوئی آدمی نہیں دیکھا جس کا سکہ ہر کہہ ومہہ کے دل پر یکساں چلتا تھا۔

ان کی عربی تعلیم کچھ زیادہ نہ تھی، تاہم حج کے موقع پر حجاز میں اور حج کے بعد مصر میں کچھ روز ان کا قیام رہا تھا، اور اس طرح عربی کی کچھ مہارت بہم پہنچائی تھی، اور چونکہ قرآن پاک کی تلاوت کا سلسلہ برابر جاری تھا، اس لیے قرآن پاک کی آیتوں کے معنی بے تکلف سمجھ لیتے تھے، اور تفسیروں کی مدد سے قرآن پاک کے سمجھنے کی کوشش بلیغ کرتے تھے، صبح کو نماز کے بعد تقریباً نو بجے تک اپنے قریب کی مسجد میں خود ہی لوگوں کو قرآن پاک کا درس سناتے تھے، اور ہفتہ میں ایک دن شام کو ان کے ہاں اقبال کی کتابوں کا درس ہوتا تھا، اور اقبال کے فلسفہ کی گتھی سلجھائی جاتی تھی۔

مرحوم ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے تھے، وہ نسل کے سدوزئی پٹھان تھے، ان کے آباؤ اجداد ہندوستان کے آخری مغل عہد میں جب ہر شمشیر زن قسمت آزما تھا، کچھ حوصلہ مند سپاہیوں کی جمعیت کے ساتھ ہندوستان وارد ہوئے پہلے ریاست جے پور میں طرح اقامت ڈالی، اور راجہ سے کچھ جاگیر پائی، اور بعدازیں حیدرآباد وارد ہوئے اور جمعدار کے عہدہ پر فائز ہوئے اور تیس ہزار کی نسلاً بعد نسلاً جاگیر پائی، مرحوم نے اپنی یہ خاندانی داستان کئی بار سنائی مگر کیا معلوم تھا کہ یہ داستان گو اب چند ہی روز کا مہمان ہے، ورنہ اس داستان کا حرف حرف محفوظ رکھا جاتا۔

بہادر خان سا آدمی صدیوں میں پیدا ہوتا ہے، اور جب پیدا ہوتا ہے انقلاب انگیز ہوتا ہے، اس کی ذات سے امت اسلامی کو بڑی بڑی امیدیں قائم تھیں، اور خصوصیت کے ساتھ دکن کے مسلمانوں کے حق میں اس کا وجود آبِ حیات کا حکم رکھتا تھا، تاہم انسان ناچار ہے، اس کی ناچاری کا راز ایسے ہی موقعوں پر کھل جاتا ہے تقدیر کا نوشتہ اور قضا کا حکم ناقابل تغیر ہے۔ **فاذا جآء اجلھم لایستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون**۔ [الاعراف:۳۴] ۲۵/ جون ۱۹۴۴ء کو دفعۃً وہ حکم آیا اور بندہ نے بلاچون و چرا ایک لحہ کے اندر اس کی دعوت پر لبیک کہا، اور اس دنیائے دوں سے چل بسا اس پر اللہ تعالیٰ کی صدہا رحمتیں ہوں اور بے شمار نوازشیں، غالباً مارچ ۱۹۴۴ء کی کوئی تاریخ تھی، نواب دوست محمد خان (جاگیردار) کے یہاں دعوت تھی، جو مرحوم کے بڑے دوستوں میں تھے، احباب کا مجمع تھا، گفتگو علمی اور مذہبی تھی، مرحوم نے بڑے پُر اثر انداز میں کہا، آج قرآن پاک میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے جب وہ مصر سے نکل کر مدین پہنچے ہیں، یہ دعا تلاوت میں آئی۔ **رب انی لما انزلت الی من خیر فقیر** [القصص:۲۴] (اے میرے پروردگار! تو میرے لیے بہتری کا جو سامان بھی مہیا فرمائے میں اس کا محتاج ہوں) مرحوم نے اس موثر دعا کے ایک ایک لفظ کو بڑی تاثیر کی حالت میں پڑھا، اور سامعین کے سامنے اس کی تشریح کی، خدائے بے نیاز کی بارگاہ میں عرض ہے کہ اے بارالٰہا! آج جب اس دعا کا خوستگار تیری حضور میں ہے، اور تیرے گھر مہمان، تو تو اس کے لیے وہی فرما جس کا وہ محتاج ہے۔

("س"، اگست ۱۹۴۴ء)

کاندھلوی، الیاس، مولانا

حضرت مولانا الیاس کاندھلوی

افسوس ہے کہ ۲۱؍ رجب ۱۳۶۳ھ کی صبح کو مولانا الیاس صاحب کاندھلوی مقیم بستی نظام الدین دہلی نے چند ماہ کی علالت کے بعد بستی نظام الدین دہلی میں انتقال فرمایا، وہ اس عہد میں ان نفوس قدسیہ کی مثال تھے جن کے دم قدم سے ہندوستان میں اسلام کا چراغ روشن ہوا، ان کا وجود اس دعوی کی کہ ہندوستان میں اسلام بادشاہوں کے تیغ وخنجر کے سایہ میں نہیں بلکہ بے نوا فقیروں کے فیوض و برکات کے زیر سایہ بڑھا اور پھلا پھولا ہے، سب سے تازہ دلیل ہے، اللہ تعالیٰ حضرت مولانا رحمتہ اللہ کی قبر پر اپنی رحمت کے پھول برسائے۔

پایہ تخت دہلی کے اردگرد ہزاروں میواتی جن کی تعداد کم وبیش پچاس لاکھ تک پہنچ جاتی ہے، سینکڑوں برس کے شاہانہ جاہ جلال اور رعب و ہیبت کے باوجود ایسے ہی نومسلم تھے جو اسلام کے بجائے بت پرستی سے زیادہ قریب تھے اور ۱۹۰۷ء سے لے کر پچھلے آریہ فتنہ تک ان کے ارتداد کا خطرہ ہمیشہ مسلمانوں کا دامن گیر رہتا تھا، حضرت مولانا نے نہایت خاموشی کے ساتھ صرف اپنے مخلصانہ سادہ طریق اور صحیح اصول دعوت کے ذریعہ پچیس برس کی ان تھک محنت میں ان کو ان خالص و مخلص مسلمانوں کی صورت میں بدل دیا، جن کے ظاہر و باطن پر خاندانی مسلمانوں کو بھی رشک آتا ہے، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

(''س''، اگست ۱۹۴۴ء)

حضرت مولانا الیاس کاندھلوی

اللہ تعالیٰ نے اسلام کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے، اور حضور انور ﷺ نے مسلمانوں کو یہ خوشخبری سنائی ہے کہ قیامت تک امت محمدیہ میں سے ایک جماعت حق پر استوار اور قائم اور غالب قوت کے ساتھ دنیا میں موجود رہے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔ اسلام کی تاریخ کا ہر پچھلا دور اس بشارت کی خبر کو دنیا میں سناتا، اور اپنے عمل سے اسکی صداقت کو ظاہر کرتا رہے گا۔

لوگ عموماً سلاطین اور بادشاہوں کو دین کا محافظ سمجھتے ہیں، اور ان کے فاتحانہ کارناموں سے خوش ہوتے ہیں، لیکن واقعات بتاتے ہیں کہ ظاہری حکومت کی یہ طاقت اگر کسی روحانی قوت کے شمول سے محروم ہو، تو اس ظاہری حکومت کا جاہ وجلال حق کی قوت کے بجائے باطل کی قوت کے فروغ کا سامان ہوجاتا ہے، تاریخ کا ہر صفحہ اس دعوی کے ثبوت کی تازہ دلیل ہے، لیکن باطن کی قوت ظاہری طاقت کی محتاج نہیں ہوتی، اسلام کا ظہور اسی شکل سے ہوا، اور ہندوستان میں اس کی ترقی بھی کچھ اسی شان سے تقدیر الٰہی معلوم ہوتی ہے اور اسی طریقہ سے اس کی ظاہری قوت کا فروغ بھی تقدیر الٰہی میں بظاہر مقدر نظر آتا ہے، واللہ اعلم بحقیقۃ الاحوال والمبدء والمآل فی الماضی والاستقبال۔

ہندوستان میں اسلام کی ظاہری طاقت دلّی کی مغلیہ حکومت کے خاتمہ پر ختم ہوجاتی ہے، مگر عین اسی وقت اللہ تعالیٰ نے شاہانِ دہلی کا ایک اور سلسلہ کھڑا کردیا، جن کے سپرد اس سرزمین میں اسلام کی حفاظت کا کاروبار کردیا، اور جس کو وہ اس وقت سے آج تک برابر سلسلہ بہ سلسلہ اسی طرح انجام دیتے چلے آرہے ہیں، جس طرح ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلتا چلا جاتا ہے، اس سلسلہ کے مسند نشین بے تاج وکلاہ، فوج و لشکر کے بغیر اور زر و جواہر کے خزانوں سے بے نیاز اپنے دلق مرقع میں اور اپنی شکستہ حصیر و بوریا پر بیٹھ کر دلوں پر حکمرانی کررہے ہیں۔

ان شاہانِ دہلی کا مسکن گو دلّی کا ایک ویرانہ تھا، جو اب ایسا ویرانہ ہے، کہ جہاں اس سلسلہ کا ایک فرد بھی سکونت پذیر نہیں، تاہم اس کے وجود اور ظہور میں ہندوستان کے متعدد صوبے شریک ہیں، اجداد رہتک او رسون پت میں متوطن ہوکر دہلی آئے اور مادری سلسلہ ملتان ۲ سے چلا اور بہار ۳ آیا، اور یہاں سے جونپور کو منتقل ہوا، پھر اودھ کے ایک قصبہ سدھور سے پیوند ۵ ہوا، پھر وقت کے عین ۶ تقاضے پر سمٹ کر دلّی پہنچا، اور اطراف دلی کے ان قصبات سے آمیز ہوا، جو آج مظفرنگر، میرٹھ اور سہارنپور کے اضلاع میں واقع ہیں، جس کی صورت یہ ہوئی کہ سلطان سکندر لودی کے زمانہ میں ان کے نانہالی مورث کو جو سدھور میں سکونت گزین تھے، بارہہ کے پاس جاگیر میں کچھ گاؤں ملے، اور اس تقریب سے وہ خاندان سدھور سے پھلت (ضلع مظفرنگر) کو منتقل ہوگیا، اور اس طرح تقدیر الٰہی کے نقاش نے دلّی اور پھلت کے پیوند سے دلی کے ان شاہان فقر کے مرقع کو تیار کیا، اور اس تقریب سے ان بزرگوں کے دم قدم ان اطراف کے قصبات سے وابستہ ہوکر ان کے لیے سعادت کا باعث بنے، اور ان بزرگوں کی آمد ورفت سے ان اطراف ودیار میں توفیق الٰہی اور علوم نبوی نے اس دور میں جلوہ گستری کی۔

ممکن ہے کہ یہ میری وہمی خوش عقیدگی ہو، لیکن کئی سال سے میرے دل میں یہ خیال بار بار آتا رہا کہ ان بزرگوں کے انفاس قدسیہ، توجہات قلبیہ اور برکات سماویہ ہی کے اثرات ہیں جو ان اطراف میں اس زمانہ اخیر میں اکابرامت، علمائے ملت، اور سالکین حقیقت انبوہ درانبوہ وجود پذیر ہوئے، اور جن کی بدولت اس تجدید ملت کے دورہ کو جس کا آغاز حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے فرمایا تھا، جس کا اشارہ بار بار انہوں نے کیا ہے، اب تک بقا اور امتداد کی سعادت حاصل ہورہی ہے، چنانچہ ان حضرات کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک ان اطراف کے قصبات و دیہات سے جس قدر

علمائے کاملین اور صلحائے متقین پیدا ہوئے، اس دور میں اس ملک کے کسی خطہ میں پیدا نہیں ہوئے، او یہ وہ واقعہ ہے، جس کی تصدیق مشاہدہ سے صاف نظر آتی ہے، پھلت، بڈھانہ، کاندھلہ، کیرانہ، جھنجانہ، گنگوہ، نانوتہ، تھانہ بھون، انبیٹھ، رائے پور، منگلور، سہارنپور، دیوبند وغیرہ قصبوں سے اس دور میں جو مبارک اور مقدس ہستیاں عالم وجود میں آئیں اور ان کے علمی و روحانی آثار و برکات سے پورے ملک ہند کے مسلمانوں نے اس زمانہ میں جو فیض پایا، کیا اس سے کوئی انکار کرسکتا ہے۔

کاندھلہ: سہارنپور شاہدرہ (دہلی) لائٹ ریلوے لائن کے وسط میں دہلی کے رخ پر یہ قصبہ واقع ہے، اس کی پرانی آبادی کا حال تو مجھے معلوم نہیں، لیکن حضرت شاہ عبدالعزیزؒ صاحب کے زمانہ سے آج تک قصبہ کا اس سلسلۂ فیض مسلسل نظر آتا ہے۔ حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلویؒ شاہ صاحب ممدوح کے محبوب تلامذہ میں تھے، اور شمائل نبوی میں شیم الحبیب ان کا مشہور رسالہ ہے اس قصبہ کے دوسرے بزرگ مولانا مظفرحسین صاحب کاندھلویؒ ہیں، جو حضرت شاہ اسحاق صاحبؒ کے شاگرد تھے، اور علم وفضل کے ساتھ زہد وتقوی میں یگانہ تھے، اسی خانوادہ کے انتساب اور اتصال سے وہ بزرگ ہستی عالم وجود میں آئی جس کے تذکرہ کی سعادت ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

خاندان وولادت: مولانا ممدوح اسی قصبہ میں اور اسی خاندان میں پیدا ہوئے، جس کا سلسلہ نسب صدیق اکبرؓ تک پہنچتا ہے، تاریخی نام الیاس اختر تھا، جس سے ۱۳۰۳ھ کی تاریخ پیدایش ظاہر ہے، مولانا کی والدہ حضرت مولانا مظفرحسین صاحب کی نواسی تھیں، اور مولانا مظفرحسین صاحب مولانا محمود بخش کے صاحبزادہ اور حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش صاحب کے بھتیجے تھے، مولانا مظفرحسین صاحب بہت سیدھے سادھے بزرگ تھے، زہدو ورع اور اتباع سنت اور سادگی میں بے مثال تھے، گھروں اور مسجدوں میں وعظ فرماتے تھے، مستورات کو ان کے بیان سے بڑا فائدہ ہوتا تھا، ان کی ایک صاحبزادی بی بی امتہ الرحمان تھیں، جو اپنے باپ کی نمونہ تھیں، نہایت عابدہ وزاہدہ، یہاں تک کہ اکابر تک ان کے پاس حاضر ہونا اور ان سے دعائیں لینا برکت کا باعث سمجھتے تھے، انہی بزرگ خاتون کی صاحبزادی بی بی صفیہ مولانا الیاس صاحب کی والدہ تھیں، یہ بھی بہت عبادت گذار اور ذاکرہ وشاغلہ تھیں، قرآن پاک کی حافظہ تھیں، اور روزانہ دیگر اوراد ووظائف کے علاوہ قرآن کی تلاوت ایک منزل کرتی تھیں۔

مولانا کے والد حافظ اسماعیل صاحب تھے، جو بڑے فرشتہ صفت بزرگ دہلی کے آخری بادشاہ شاہ ظفر شاہ کے سمدھانہ میں بچوں کی تعلیم پر ملازم تھے، ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد وہ بستی نظام الدین میں رہنے لگے، یہاں مرزا الٰہی بخش نے (جن کی بیٹی بہادر شاہ کے ولی عہد مرزا فخرو سے منسوب تھیں) ایک مسجد بنوائی تھی، جس کو بنگلہ والی مسجد کہتے ہیں، مولانا اسماعیل صاحب نے اپنی بقیہ عمر اسی مسجد میں بسر کی اور وفات کے بعد اسی مسجد کے گوشہ مشرق وجنوب میں مدفون ہوئے، اس آبادی کے اطراف میں جو مسلمان آباد ہیں، مولانا اسماعیل کے فیض سے وہ مستفید ہوتے رہے۔

مولانا اسماعیل صاحب نے دو شادیاں کیں، پہلی سے مولوی محمد صاحب اور دوسری سے مولانا محمد یحییٰ صاحب شاگرد خاص حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اور مولانا الیاس صاحب ہوئے، اور ماشاء اللہ تینوں صاحبزادے عالم وفاضل اور صالح ومتقی، مولانا یحییٰ کے صاحبزادہ مولانا زکریا صاحب ہیں، جو بالفعل مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے شیخ الحدیث اور متعدد کتابوں کے مصنف اور موطا امام مالک کے آخری شارح ہیں۔

این خانہ تمام آفتاب است

تعلیم: مولانا نے ابتدائی تعلیم اور فارسی وغیرہ وطن کے مکتب میں اور خاندان کے بڑوں سے حاصل کی، ابتدائی عربی تعلیم کے زمانہ میں ان کو دردسر کا ایک خاص قسم کا دورہ ہوجاتا تھا، جس سے مہینوں کا ناغہ ہوجاتا تھا، اس لیے مولانا کے بڑے بھائی مولانا یحییٰ صاحب تلمیذ خاص اور خادم خاص مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ ان کو اپنے ساتھ گنگوہ لے گئے اور ان کو ایک خاص نصاب کے ماتحت پڑھا کر مولانا محمود حسن صاحبؒ کے پاس دورہ حدیث میں شرکت کی غرض سے دیوبند بھیج دیا، اس سے فراغت کے بعد مظاہر العلوم سہارنپور میں داخل ہوکر مولانا خلیل احمد صاحبؒ کے حلقہ درس میں شریک ہوئے اور ان سے اور وہاں کے دوسرے اساتذہ سے باقی فنون کی تکمیل کی، جس سے فارغ ہونے پر اسی مدرسہ میں مدرس کردیئے گئے، متوسطات تک کی تعلیم ان کے سپرد تھی۔

بیعت واستفاضہ: مولانا کے معاصروں اور دیکھنے والوں کا متفقہ بیان ہے کہ وہ فطرۃً نہایت نیک، صالح اور متقی تھے، خود مولانا یحییٰ صاحب ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور بڑی محبت رکھتے تھے، دونوں بھائی ایک دوسرے کے جان نثار اور محبّ ومحبوب تھے۔

مولانا گنگوہیؒ طالب علمی میں کسی کو مرید نہیں کرتے تھے، لیکن مولانا الیاس کو انہوں نے اسی زمانہ میں ان کی خواہش پر ان کو مرید کرلیا، مولانا گنگوہیؒ کی وفات کے بعد تکمیل علوم سے فارغ ہوکر مولانا خلیل احمد صاحبؒ کے دست مبارک پر دوبارہ تجدید بیعت کی اور تکمیل باطن میں مصروف ہوئے، اور یہاں تک ترقی کی کہ خلافت ارشاد سے مشرف ہوئے۔

بستی نظام الدین: جیسا کہ پہلے گذرا ہے کہ مولانا کے والد غدر کے بعد ہی سے بستی نظام الدین کی ایک مسجد میں مقیم ہوکر اطراف کے مسلمانوں کے رشد وہدایت میں مصروف رہتے تھے، ان کی وفات کے بعد ان کے بڑے صاحبزادہ مولوی محمد صاحب ان کے جانشین ہوئے، یہ بھی بڑے بزرگ اور نیک اور صالح تھے، عبادت وزہد وتقوی کے ساتھ پوری زندگی بسر کی، اطراف کے مسلمانوں کو ان سے فائدہ پہنچا، اور اہل

میوات میں بکثرت ان کے مرید و معتقد تھے اور دہلی کے مسلمان بھی ان سے مستفید ہوئے، مرنے سے پہلے ۱۶ سال تک ان کی تہجد کی نماز قضا نہیں ہوئی اور مرتے دم تک نماز باجماعت کے پابند رہے، عشاء کی نماز کے بعد وتر کے سجدہ میں انتقال فرمایا۔

مولانا محمد صاحب کی وفات کے بعد یہ مسجد بالکل خالی رہی، مولانا کے دوسرے بڑے بھائی مولانا یحییٰ صاحب کا اس سے پہلے ۱۳۳۴ھ میں انتقال ہو چکا تھا، اور مولانا الیاس صاحب ابھی اپنی تکمیل میں مصروف تھے، اس سے جب فراغت ہوئی تو دہلی کے مخلصین کے پیہم اصرار پر مولانا خلیل احمد صاحبؒ نے ان کو بیعت و تلقین کی اجازت دے کر دہلی بھیج دیا، اور مولانا نے اپنے بھائی کی جگہ بستی نظام الدین میں متوکلانہ اقامت شروع کی، ابتدا میں ان کو بڑی تکلیفوں کا سامنا ہوا مگر ان کے پائے استقامت کو لغزش نہیں ہوئی، آخر اللہ تعالیٰ نے ان کے کاموں میں برکت دی، اور ان کو مسلمانوں میں حسن قبول عطا فرمایا۔

سب سے پہلے انہوں نے اس مکتب کو ترقی دی جو وہاں پہلے سے قائم تھا، اور اس کو مدرسہ کی سطح پر لے آئے، شروع سے ان میں علمی کے بجائے عملی رنگ گہرا تھا، یہی گہرائی ان کے کاموں میں بھی تھی، مدرسہ قائم کیا، تو ہر طالب علم کا یہ فرض قرار دیا کہ ہر نماز کے بعد ایک طالب علم کھڑا ہو کر نمازیوں کے سامنے ایک مسئلہ بیان کردے، دوسرا ایک حدیث کا ترجمہ سنادے، تیسرا قرآن پاک کی کسی آیت کا ترجمہ اور مطلب بیان کردے، اس طرح نمازیوں کا بڑا فائدہ ہونے لگا، اور اسی سے ان کی تبلیغی کوششوں کا آغاز ہوا۔

یاد ہوگا کہ تحریک خلافت کے شباب میں ۱۹۲۴ء میں شردھانند جی کی کوشش سے آریہ تحریک نے زور پکڑا، اور خصوصیت کے ساتھ ملکھانوں اور میواتیوں میں اپنا کام شروع کیا، میوات کا بڑا علاقہ ہے جو دہلی کے پاس سے لے کر راجپوتانہ کی ریاستوں تک پھیلا ہوا ہے، خیال ہے کہ اس قوم کی آبادی پچاس لاکھ کے قریب ہے، ان کا پیشہ کاشتکاری اور مویشی پالنا ہے، لیکن یہ لوگ حد درجہ لڑاکے اور چوری، ڈاکہ اور قتل میں بدنام تھے، کہنے کو مسلمان تھے، لیکن نام بھی مسلمانوں کا نہیں، اور کام بھی نہیں، مولانا نے یہ سمجھ کر کہ یہ سارا فساد ان کی جہالت کے سبب سے ہے، میوات کے پورے علاقہ کا بڑی محنت سے دورہ فرمایا، میلوں پیادہ چل کر بیل گاڑی میں بیٹھ کر، اور جہاں سڑک تھی موٹر پر پورے علاقہ میں سالہا سال پھرتے رہے، جگہ جگہ مسجدوں اور مکتبوں کا انتظام کیا، ہر جگہ وعظ کہا لوگوں سے ملے، ان کو اپنے سے آشنا کیا، ان کو سمجھایا، ان کو دین بتلایا، کلمہ سکھلایا، جو جان چکے، اور سیکھ چکے ان کو آگے بڑھایا، ان کو دوسروں کے بتانے اور سکھانے کا کام سپرد کیا، جو اہل نظر آئے، ان کو ذکر و فکر کی تلقین کی، جو تعلیم کے قابل معلوم ہوئے ان کو تحصیل علم پر مامور کیا، اخلاص کا کام کرنے والوں کو آس پاس سے بٹورا، ان کو اپنے طرز دعوت سے آشنا کیا، اور ان کو تھوڑی تھوڑی تعداد میں اس شرط کے ساتھ کے وہ کھانے پینے اور سفر کا کل خرچ اپنی جیب سے کریں گے، گاؤں گاؤں میں بھیجا، اور اس طرح میوات کی پوری سر زمین مخلص مبلغ سپاہیوں کا کیمپ بن گئی اور چند سال کے بعد ڈاکوؤں اور چوروں کا جرائم پیشہ گروہ نیک صالح اور دیندار مسلمانوں کی جماعت بن گئی، یہ حضرت مولانا کی مساعی جمیلہ کی وہ کرامت ہے جس کو پولیس کی سرکاری رپورٹ میں بھی صحیح مان لیا گیا، اور جرائم پیشہ گروہ سے وہ خارج قرار دیا گیا۔

مولانا کا طریق دعوت بالکل سادہ تھا، خود سادہ تھے، سراپا اخلاص تھے، سراپا درد تھے، دین کے سچے غمخوار اور مسلمانوں کے بدلِ خدمت گذار، اللہ پر متوکل، ایک دھن تھی کہ دن رات ان کو بے قرار رکھتی تھی، ان کا چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، جو تھا وہ صرف دین کی خدمت، اور مسلمانوں کی غمخواری اور اصلاح کی فکر تھی، یہی ان کی تقریر تھی، یہی ان کی گفتگو اور اسی کا شب و روز ملنے جلنے والوں سے اعلان و اظہار۔

میری ملاقات: مولانا کا ذکر خیر مدت سے سن رہا تھا، ہمارے مدرسہ العلوم ندوۃ العلماء کے متعدد اساتذہ کرام جن کے سرخیل مولانا ابوالحسن علی ندوی تھے، کئی دفعہ بستی نظام الدین جا کر مولانا سے مل چکے تھے، اور بابرکت فیض سے مستفید ہو چکے تھے، بلکہ ہمارے یہاں سے کئی سال سے متواتر طلبہ کے وفود مولانا کے حلقہ مبلغین میں داخل ہو کر خدمت کیا کرتے تھے، اور واپس آ کر اپنے تاثرات بیان کرتے تھے، مگر خاکسار کو ذاتی طور سے نیاز کا شرف حاصل نہ تھا، اتفاق دیکھئے کہ گذشتہ سال مولانا ابوالحسن علی صاحب نے مولانا اور ان کے ساتھیوں کو لکھنؤ اور ندوہ میں قیام کرنے کی دعوت دی، چنانچہ شعبان کی بیچ کی تاریخ اس کے لیے مقرر ہوئی، ادھر رجب کے شروع میں جولائی کی بیچ کی تاریخیں تھیں، خاکسار تھانہ بھون میں تھا کہ مولانا کی آمد کی اطلاع ملی اور تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا، کہ واپس دہلی کے لیے اسٹیشن روانہ ہوگئے، مجھے بھی دہلی جانا تھا، اور اسی گاڑی سے، مولانا ظفر احمد صاحب کے ساتھ اسٹیشن آیا، دیکھا کہ ایک دبلے پتلے نحیف سے میانہ قد، بڑی داڑھی، کچھ کچی کچھ پکی، ہاتھ میں چھڑی، سر پر عمامہ، مگر وہ کبھی سر سے اترا، اور کبھی سر پر رکھا ہوا، اسی طرح جسم پر لمبے کرتے کے اوپر ایک عبا سا، مگر وہ بھی کبھی در بر اور کبھی باہر، ایک کمبل بچھائے ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہیں، ہم دونوں بھی سلام کے بعد پاس جا کر بیٹھ گئے، وہ اور مولانا ظفر احمد صاحب تو مدت کے رفیق اور ایک دوسرے کے محبّ اور دوست تھے، مولانا نے فوراً اپنی تبلیغ کی تقریر شروع کردی، اور ان کو اپنے کام میں شرکت کی دعوت بڑے اصرار والحاح سے فرماتے رہے، اور اپنے طریق دعوت کی توضیح بھی بیان فرماتے رہے، وہ مجھ سے بالکل ناآشنا تھے، اور میں ان کے نام اور کام سے آشنا مگر خود ان کی حقیقت سے ناآشنا تھا، میں ان کی باتوں کو چپ سنتا رہا، آخر میں یہ عرض کی کہ حضرت! ایسے لوگوں کو جو صرف

وہ دو چار دن آپ کی صحبت میں رہے ان کو تزکیہ اور تصفیہ کے بغیر مبلغ بنا کر بھیجنا کیونکر مفید ہوگا، فرمایا مکتوبات مجدد الف ثانی پڑھئے، معلوم ہوجائے گا، دوبارہ عرض کی میں نے ان کو پڑھا ہے، مگر ان سے تو اس مشکل کا حل معلوم نہ ہوا، شاید مولانا کو کچھ الجھنا سا ہوا، مولانا ظفر صاحب سے پوچھا آپ کون ہیں، انہوں نے میرا نام لیا، تو خوشی سے اچھل پڑے، کھڑے ہوگئے، سینہ سے لگایا اور مجبور کیا، کہ انہی کے ساتھ انہی کے ڈبہ میں سیکنڈ کلاس میں سفر کروں، میرا ٹکٹ بدلوایا، اور اس وقت سے لے کر کاندھلہ تک برابر ڈیڑھ دو گھنٹہ بڑے جوش و خروش سے کلام فرماتے رہے، ان کی زبان میں لکنت تھی، تقریر پر قادر نہ تھے، تقریر بھی الجھی ہوئی ہوتی تھی، مگر جوش و خروش کا سمندر ان موانع کے سارے خس و خاشاک کو بہائے لئے جاتا تھا، تھوڑی گفتگو کے بعد،

واہ ری تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا وہ بھی میرے دل میں ہے

جسمانی کمزوری اور ضعیف سینہ کے باوجود ان کے پھیپھڑے ان کی پرزور تقریر اور پرجوش گفتگو کے تسلسل اور تواتر کے سبب سے ہر وقت اس طرح ابھر ابھر کر اٹھتے تھے، کہ مجھے تو ڈر لگتا تھا کہ کہیں یہ پھٹ نہ جائیں، یا گلے کی رگیں جو بار بار پھول پھول جاتی تھیں وہ نہ پھٹ جائیں، یہ سب سہی مگر دریا اپنی روانی میں ہر خطرہ سے بے خبر اور ہر افتاد سے بے پروا تھا۔

مولانا نے اس اثنا میں جو کچھ فرمایا، میں نے اپنی استعداد کے مطابق اس کو پوری طرح سمجھ لیا، اتنے میں کاندھلہ آیا، اور وہ اتر گئے، مگر مجھ سے یہ وعدہ لے لیا کہ کل رات کو دہلی میں پھاٹک حبش خان میں ان کا تبلیغی جلسہ ہے، میں اس میں شرکت کروں، چنانچہ شریک بھی ہوا، اور تقریر بھی کی، اور مولانا نے اس کی تصدیق و تصویب بھی فرمائی۔

میں اس سفر سے لوٹ کر جب لکھنؤ آیا، تو مولانا کے اہل تبلیغ مجاہدوں کی آمد لکھنؤ میں شروع ہوچکی تھی، اور ندوہ کی مسجد میں ان کا قیام تھا، اللہ اللہ کیا سادگی کی شان پائی، سادہ تکلف سے بری، شب زندہ دار، تہجد گذار، پچھلے پہر سے ذکر و فکر میں مصروف، صبح کی نماز پڑھ کر اپنے کام کے لیے مستعد اور تیار۔

ایک دو روز کے بعد مولانا مع اپنے دوسرے رفقا کے ساتھ آئے، اور ندوہ کے مہمان خانہ میں ساتھ ہی قیام فرمایا، اور تقریباً ایک ہفتہ تک دن رات ساتھ رہا، ہر گفتگو میں شرکت اور ہر مجلس میں رفیق، جیسے جیسے ملتا جلتا تھا، ان کی تاثیر بڑھتی جاتی تھی، مولانا کی تقریر گو الجھی ہوئی اور بیان ژولیدہ بدستور تھا، مگر میں نے دیکھا کہ جو آیا وہ اثر سے خالی نہ گیا۔

ادھر کہتا گیا اور ادھر آتا تھا دل میں
اثر یہ ہو نہیں سکتا کبھی دعوئے باطل میں

لکھنؤ میں کئی جلسے ہوئے اور بار بار تقریریں ہوئیں، لوگوں نے مطلب سمجھا شرکت پر آمادہ ہوئے، کام کا آغاز ہوا، دلّی سے آئے ہوئے مبلغین لکھنؤ کے کوچہ کوچہ میں پھرے اور مسلمانوں کو کلمہ اور نماز کی تلقین کی، ایک ہفتہ کے بعد کانپور کی جانب کوچ ہوا، دو تین روز قیام رہا، خاکسار بھی ساتھ تھا، یہاں بھی ہر وقت ان کی صحبت اٹھائی، ان کی تقریریں سنیں، ان کے کام کو جانچا ان کی دھن کو دیکھا ان کے دل سے جو لگی تھی، اس کے اٹھتے ہوئے شعلوں کو خیال کی آنکھوں سے دیکھا، ہر وقت مسلمانوں کی اصلاح دین کی سربلندی، اور اعلائے کلمہ کے لیے درگاہ الٰہی میں دست نیاز دراز، آنکھیں پرنم، آواز دلگیر۔

زیادہ دیکھنے والوں اور بار بار ملنے والوں کو تو خدا جانے ان کی کیا کیا ادائیں پسند ہوں گی، لیکن مجھے اس تھوڑی سی ملاقات میں ان کی تین ادائیں بہت پسند آئیں، صبح کی نماز کے بعد مقتدیوں کے رخ بیٹھ کر وہ کام کرنے والوں کو دین کا کام سمجھاتے تھے، اور بار بار ان کی کامیابی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائیں فرماتے تھے، ان دعاؤں میں لفظ اللہ ان کے دل کی گہرائی سے نکل کر دوسروں کے دلوں کی گہرائی میں گھر کر لیتا تھا، ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد، مختلف اوقات میں ان کی زبان سے کسی قدر آواز میں یہ دعائے ماثور:

یاحی یا قیوم بر حمتک استغیث اصلح لی شانی کله ولا تکلنی الیٰ نفسی طرفة عین

(اے حی و قیوم خدا میں تری رحمت سے چاہتا ہوں کہ تو میری فریاد کو سنے، تو میری حالت کی درستی فرما دے، اور ایک لمحہ کے لیے بھی مجھے میرے نفس پر نہ چھوڑے) نکلتی تھی، اور ان کے فقر و التجا والی اللہ کی کیفیت کو ظاہر کرتی تھی، وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ رہتے تھے، اور ان میں کسی قسم کا امتیاز نہیں چاہتے تھے، وہ لکھنؤ سے کانپور اپنے ہمراہیوں کے ساتھ تھرڈ کلاس میں سوار تھے، ان کے بعض معتقد فرسٹ کلاس میں تھے، بھیڑ کا یہ عالم تھا، کہ تھرڈ میں تو ہلنا، بلکہ اپنی جگہ سے نکلنا بھی مشکل تھا، سیکنڈ میں بیٹھنے کی جگہ تھی، مگر اندر جانے کی جگہ نہ تھی، فرسٹ میں گنجایش تھی، ہر اسٹیشن پر کوشش کی گئی کہ مولانا نکل کر فرسٹ کلاس میں چلے آئیں، مگر منظور نہیں فرمایا، آخر کانپور کے قریب پہنچ کر ظہر کی نماز یا اور کسی ضرورت کی بنا پر اس درجہ میں داخل ہوئے۔

لکھنؤ کے قیام میں ایک دفعہ ایک دوست کے ہاں عصر کے وقت چائے کی دعوت تھی، پاس کوئی مسجد نہ تھی، ان کی کوٹھی ہی میں نماز باجماعت کا سامان ہوا، خود کھڑے ہوکر اذان دی، اذان کے بعد مجھ سے ارشاد ہوا، کہ نماز پڑھاؤ، میں نے معذرت کی تو نماز پڑھائی، نماز کے بعد مقتدیوں کی طرف رخ کر کے فرمایا، بھائیو! میں ایک ابتلا میں گرفتار ہوں، دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس سے نکالیں، جب سے میں

یہ دعوت لے کر کھڑا ہوا ہوں لوگ مجھ سے محبت کرنے لگے ہیں، مجھے یہ خطرہ ہونے لگا ہے کہ مجھ میں اعجابِ نفس نہ پیدا ہوجائے، میں بھی اپنے کو بزرگ نہ سمجھنے لگوں میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے اس ابتلا سے بسلامت نکال لیں، آپ بھی میرے حق میں دعا فرمائیں۔

مجھے کبھی بستی نظام الدین جانے اور ان کی مسجد میں قیام کرنے کا اتفاق نہیں ہوا، مگر جانے والوں سے سنا کہ پچھلے پہر رات کا سماں بڑا موثر ہوتا تھا، دن کے سپاہی رات کے راہب بن جاتے تھے، ہر طرف سے تہجد گذاروں اور ذاکروں، اور تسبیح خوانوں کی آوازیں بلند ہوتی تھیں، کوئی سجدہ میں ہوتا تھا تو کوئی رکوع میں کوئی گریہ و پکار میں تھا، تو کوئی دعاؤں میں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سچائی کا ایک آفتاب کیونکر متعدد ذروں کو اپنے پاس کھینچ کر روشن بنا دیتا ہے۔

مولانا کا جسمانی ضعف، پھر شب و روز کی یہ محنت اور دعوت کے کاموں میں ہمہ وقت کا یہ شدید انہاک، اور آرام و راحت کی ہر تدبیر سے کامل اعراض نے ادھر ان کو ضعیف بنا دیا تھا، مہینوں سے پیچش اور اسہال کا عارضہ پیدا کردیا تھا، اور ضعف روز بروز بڑھتا جاتا تھا، ہر علاج ناکام رہا، مگر اس حالت میں بھی کام کے انہاک اور دعوت کے جوش کا وہی عالم تھا، آخر میں یوں تو نشست و برخاست دشوار ہوگئی تھی، سہارے سے اٹھتے بیٹھتے تھے، مگر اس حالت میں بھی نماز باجماعت کا اہتمام اخیر اخیر تک رہا، بلکہ فرض نماز کھڑے ہوکر ادا فرماتے رہے، اور خدا جانے اس وقت ان کے اندر کہاں سے طاقت آجاتی تھی۔

اس زمانہ میں جو لوگ ان سے ملنے اور ان کو دیکھنے گئے، سب نے ان کی بڑی پرتاثیر کیفیتیں بیان فرمائی ہیں، برادر عزیز مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی کی تحریر اخباروں میں آچکی ہے، یہ اخیر وقت تک مولانا کے ساتھ تھے، دوسری تحریر مولانا ظفر احمد صاحب نے لکھ کر بھیجی ہے، جو تبصرۃ للناس فی ترجمۃ الیاس کے نام سے الگ چھپے گی اور اپنے اس مضمون میں بھی میں نے اس سے استفادہ کیا ہے، یہ بھی اخیر زمانہ میں مولانا سے ملے تھے، اور اس زمانہ کے احوال و تاثرات قلم بند فرمائے ہیں، اللہ تعالیٰ اس سے مسلمانوں کو نفع روزی فرمائے۔

۲۱/ رجب ۱۳۶۳ھ (۱۳/ جولائی ۱۹۴۴ء) کو وفات پائی اور اسی مقام بستی نظام الدین کی مسجد کے صحن کے باہر جنوبی و مشرقی گوشہ میں اپنے والد و برادر معظم کے پہلو میں سپرد خاک ہوئے۔

چپہ چپہ پہ ہے واں گوہر یکتاتہِ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز

ذیل میں ہم تبرکاً اس خانوادہ کا پورا سلسلہ درج کرتے ہیں،

شجرۂ نسب

مولوی محمد اشرف بن شیخ جمال محمد شاہ بن شیخ بابن شاہ بن شیخ بہاء الدین شاہ بن مولوی شیخ محمد بن شیخ محمد فاضل بن شیخ قطب شاہ، از سلسلۂ اولاد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

شجرہ

(شجرہ یہاں آئے گا)

("س"، نومبر ۱۹۴۴ء)

۱؎ انفاس العارفین، ص: ۱۵
۲؎، ۳؎، ۴؎ ص ۱۶۰، ۵؎ ص ۱۶۷، ۶؎ ص ۱۶۸

سندھی، عبیداللہ، مولانا

مولانا عبیداللہ سندھی

افسوس ہے کہ مولانا عبیداللہ سندھی نے ۲۳/ اگست ۱۹۴۴ء کو اس عالم فانی کو الوداع کہا، مرحوم نے ساری عمر اپنے خیالات کی خاطر جن کو وہ حق سمجھتے تھے تکالیف میں بسر کی، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مدت کے بعد کوئی عالم دین ایسا پیدا ہوا تھا جس نے اس طرح مجاہدانہ زندگی بسر کی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے، اور مقام اعلیٰ نصیب فرمائے۔ ("س"، ستمبر ۱۹۴۴ء)

مجذوب، عزیز الحسن غوری، خواجہ

خواجہ عزیز الحسن غوری

اس ماہ گذشتہ کا دوسرا حادثہ حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحب غوری مجذوب کی

وفات ہے، مرحوم حضرت مولانا تھانویؒ کے محبوب خلفاء میں تھے، گو کہ وہ عالم نہ تھے، گریجویٹ تھے، عمر بھر اعلیٰ سرکاری ملازمت کی، مگر ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ قلب خاشع اور وہ تقویٰ عطا ہوا تھا، جس پر بڑے بڑے علماء کو رشک ہونا چاہیے، اور شعر وسخن کی محفل میں وہ بلبل گویا تھے، کہ جس کے سریلے نغموں سے ایک مدت تک اہل درد لذت پاتے رہیں گے، اللہ تعالیٰ جنت الفردوس ان کی آرام گاہ بنائے۔

(’’س‘‘، ستمبر ۱۹۴۴ء)

ندوی، فضل الرحمٰن، مولانا حافظ

مولانا حافظ فضل الرحمٰن صاحب ندوی کیرانوی

علمائے ندوہ کی برادری میں یہ خبر بڑے افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ ان کے سب سے پرانے رفیق اور دوست مولانا حافظ فضل رحمان صاحب ندوی امام وخطیب جامع مسجد خانقاہ مجددیہ سرہند نے چند ماہ کی علالت کے بعد بمرض استسقاء بمقام مدرسۂ فرقانیہ لکھنؤ بتاریخ ۲؍اکتوبر ۱۹۴۴ء بروز جمعہ ۷ بجکر ۴۳ منٹ شام کے وقت اس دنیائے فانی کو الوداع کہا، ان کی عمر غالباً ۶۵ برس کے اندر ہوگی، کیرانہ ضلع مظفر نگر ان کا اصلی وطن تھا، مگر بچپن سے وہ لکھنؤ آئے اور دارالعلوم ندوہ میں داخل ہو کر متوسطات تک کی تعلیم پائی اور فکر معاش سے مجبور ہو کر مدرسہ ہی میں صرف ونحو کی مدرسی کی خدمت قبول کرلی، وہ استاذنا جناب مولانا محمد فاروق صاحب چریا کوٹی مدرس اعلیٰ دارالعلوم کے محبوب شاگردوں میں تھے، صرف ونحو اور ریاضیات سے بڑی دلچسپی اور مہارت رکھتے تھے، انتظامی سلیقہ بھی اچھا تھا، جن لوگوں کو مولانا شبلی مرحوم کے زمانہ کے ندوہ اور الندوہ سے تعلق رہا ہے ان کو مکتب المعین کی بھی یاد ہوگی، مرحوم اس مکتبہ کے مہتمم اول تھے، لکھنؤ میں عربی کی مصری مطبوعات کی تجارت کا آغاز انہی نے کیا، اور اب موجودہ شبلی بک ڈپو اسی کی یادگار ہے۔

مرحوم نے عین جوانی میں انابت الی اللہ کی توفیق پائی اور مدرسہ کی نوکری چھوڑ کر مولانا عین القضاۃ صاحب لکھنویؒ سے نقشبندی مجددی طریقہ میں بیعت کی اور انہی کے درسہ فرقانیہ میں مدرس بھی ہوگئے اور پھر انہی کے ہو رہے، انہی کے زمانہ میں حج سے بھی فراغت پائی ان کی وفات کے بعد لکھنؤ سے سرہند جا کر خانقاہ مجددیہ کی جامع مسجد میں خطابت و امامت قبول کی آخر میں اس کا معاوضہ چھوڑ کر حسبۃً للہ اس کام کو انجام دیتے رہے، اور متوکلانہ زندگی بسر کرتے تھے اس سلسلہ کے سارے متوسلین جو افغانستان سے گجرات تک پھیلے ہیں ان سے اچھی طرح واقف تھے اور مداح تھے، قناعت پسند زہد پیشہ، پھر بذلہ سنج، ہمیشہ بہار اور شاداں وفرحاں رہتے تھے، دوستوں کی دوستی میں بے حد پائدار اور مخلص تھے، قیام ندوہ کے زمانہ میں مولانا شبلی مرحوم کے اکثر حسابات کی رقمیں انہی کے پاس رہتی تھیں اور اسی سلسلہ سے مکاتیب میں کہیں کہیں نام بھی ہوگا۔

مرحوم نے اپنے دو بچوں میں سے بڑے کو جن کا نام مولوی محبوب الرحمٰن ہے ابتدائی تعلیم ہندوستان میں دلا کر مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ میں بھیج دیا جہاں وہ کئی سال رہ کر علوم درسی سے فراغت پا کر مزید تکمیل کی غرض سے جامع ازہر مصر چلے گئے وہاں دو سال رہ کر قدیم وجدید علوم فلسفہ وتاریخ وادب و دینیات کی تعلیم پائی اور دو سال ہوئے کہ شام وعراق ہو کر ہندوستان واپس آئے اور اس وقت سے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مدرس ہیں اللہ تعالیٰ ان کو صبر وثبات عطا فرمائے اور اپنے باپ کا حقیقی جانشین بنادے۔

(’’س‘‘، نومبر ۱۹۴۴ء)

ناظرؔ، خوشی محمد، چودھری

چودھری خوشی محمد ناظرؔ مرحوم

کشمیر جنت نظیر کا ایک پھول یکم اکتوبر ۱۹۴۴ء کی رات کو مرجھا کر گر گیا، یعنی چودھری خوشی محمد ناظر نے اس تاریخ کو بعارضۂ فالج وفات پائی۔

آج کل کے نئے نرالے ادیب، نئے ادب کے نقیب یہ سمجھتے ہیں، کہ وہی اپنے زمانہ کے نئے نرالے ہیں، حالانکہ نیا اور پرانا ہونا ہمیشہ اسی طرح سے ہوتا آیا ہے جس طرح جوان اور بوڑھا ہونا، اب اگر کوئی آج کا جوان یہ سمجھے کہ دنیا میں وہی پہلی مرتبہ جوان ہوا ہے، تو وہ کیسا احمق ہے، اسی طرح آج کے نئے ادیب وشاعر جو ادب کو زندگی سے وابستہ کرنا چاہتے ہیں، اگر وہ سمجھتے ہیں کہ وہی پہلی دفعہ یہ راگ الاپ رہے ہیں، تو اُن کے اس خیال کو حماقت کہتے ہوئے تو ڈرتا ہوں، مگر پھر کیا کہوں۔

آج جس مرحوم کی یاد کے مزار پر دو آنسو بہانا چاہتا ہوں وہ بھی اپنے دور میں نیا اور نرالا شاعر تھا، اردو ادب کے تجدیدی دور میں بیسویں صدی کا پہلا سال ۱۹۰۱ء اس حیثیت سے یادگار ہے کہ شیخ عبدالقادر کے مخزن کا جلوس انگریزی وعربی خوانوں کے جلو میں اسی سال نکلا تھا، اسی رسالہ نے اقبال کے نام کو اچھالا، خوشی محمد ناظر کو پبلک میں پیش کیا اسی میں ابوالکلام کا پہلا مضمون اخبار چھپا، حسرت موہانی نے شعر وادب پر دادِ سخن پہلے اسی میں دی، خود راقم الحروف کا پہلا مضمون ’’وقت‘‘ اسی میں شائع ہوا، اور اس زمانہ کے کتنے بوڑھے ادیب وشاعر سب سے پہلے اسی کے صفحات پر ظاہر ہوئے۔

ناظر کا وطن پنجاب میں لائل پور کے ضلع میں چک جھمرا ایک گاؤں تھا، ابتدائی اور ثانوی تعلیم دیہات کے سرکاری مدرسہ میں پائی، مگر ساتھ ہی اپنے گاؤں کے فارسی مکتب میں بھی پڑھتے رہے، اور اس لیے بچپن ہی سے شاعری اور وہ بھی فارسی شاعری سے دل کو لگاؤ پیدا ہوا انھوں نے اپنی پہلی نظم ۱۸۸۱ء میں حضرت پیران پیر شیخ جیلانیؒ

کی مدح میں لکھی، جس کا پہلا مصرع یہ تھا، ع

بلبل طبعم بہ باغ وصف تو پرواز کرد

جس کو ان کے استاذ اولین مولوی انوارالدین صاحب انور نے یوں بدل دیا، ع

بلبل طبعم بہ باغ وصف تو نے رنگین نواست

اس کے بعد اس زمانہ میں چند فارسی غزلیں بھی کہیں، جب وہ مڈل میں پہنچے، تو مولوی محمد حسین صاحب آزاد کی آب حیات اور بعض اردو دیوان ان کی نظر سے گزرے جس سے ان کو اردو میں غزل کہنے کی تحریک ہوئی، ان کی پہلی غزل کا مطلع یہ تھا:

کیا ان دنوں نگاہِ ستمگر ہے تیز تیز

تیر نظر کی چوٹ دلوں پر ہے تیز تیز

کالج کی تعلیم کے لیے یہ غالباً ۱۸۹۵ء کے پس و پیش زمانہ میں علی گڑھ آئے، یہ وہ وقت تھا، جب مولانا شبلی وہاں فارسی و عربی کے استاذ اور وہاں کے شعر و سخن کی محفل کے صدر نشین تھے، اور مولانا حالی بھی اکثر آ کر وہاں قیام فرمایا کرتے تھے۔ ناظر کو گوان سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا، مگر ان کی شاعری کو مناسبت مولانا حالی سے ہوئی اور انہی سے اصلاح لی، کالج میں اس وقت پروفیسر آرنلڈ کی تحریک سے نیچرل شاعری پر طبع آزمائی کی خاص تحریک تھی، چنانچہ ناظر نے یہاں ''اخوت اور چار موسم'' کے نام سے دو نظمیں کہیں، اور دونوں پر انعام پایا، اس کے بعد کالج کے یونین اور ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں میں نظمیں پڑھتے رہے، اور داد پاتے رہے، علی گڑھ سے واپسی کے بعد پنجاب میں حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں اہل ذوق سے خراج تحسین حاصل کرتے رہے۔

ان کی خوش نصیبی کہ ان کی قسمت میں کشمیر کا خطہ آیا، ریاست کشمیر کی سرکاری خدمت پر مامور ہوئے، اور لداخ کے گورنر اور منسٹر بندوبست و مال ہو کر بڑا حصہ کشمیر میں گذارا یہاں کی فرح بخش آب و ہوا، اور قدرتی مناظر نے ان کو اپنی شاعری کے لیے بہترین مواقع فراہم کئے، چند اصحابِ ذوق دوستوں کے شمول میں مفرح القلوب نام ایک چھوٹی سی مجلس ترتیب دی، جو کشمیر کے مختلف باغوں میں جمع ہوتی جس میں شعر و سخن کے ترانے بلند ہوتے، یہ مجلس ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۲ء تک قائم رہی، یہی زمانہ مخزن کے عروج اور ناظر کے کلام کے فروغ کا ہے، یہی زمانہ ہے جس میں ناظر نے اپنی وہ مشہور عالم نظم لکھی، جس کا نام ''جوگی'' ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ چھوٹی سی نظم ناظر کا شہ کار ہے جس کو پڑھے ہوئے گو چالیس برس سے زیادہ ہو چکے، مگر اس کا سماں اب تک آنکھوں میں ہے، مطلع تھا:

کل صبح کے مطلعِ تاباں سے جب عالم بقعہ نور ہوا

سب چاند ستارے ماند ہوئے خورشید کا نور ظہور ہوا

یہ نظم اُس زمانہ میں ہر صاحب ذوق کی زبان پر تھی، اور جس طرح مولانا حالی نے اپنے مسدس کا پیوند جو چند سال کے بعد جوڑا، وہ اصل سے میل نہ کھا سکا، اسی طرح حق یہ ہے کہ ناظر نے اپنی اس نظم کا ایک تتمہ تیس برس کے بعد جو لکھا، وہ اصل سے بے میل ہی رہا، مرحوم کی دوسری نظم کشمیر کے ایک مرقع کی تصویر ہے، جو مناظر کشمیر کے متعلق ان کی پہلی نظم ہے، اسی کا مطلع ہے:

اللہ اللہ ہے کیا حسنِ چمن پانی میں

سبزۂ لالۂ و گل، سرو و چمن پانی میں

کیسے کیسے ہیں دل افروز نظارے اس میں

کوہ پانی میں، چمن پانی میں بن پانی میں

یہ پوری نظم اسی طرح پانی میں کی مشکل ردیف کے باوجود نہایت سہل و رواں ہے۔

دوسری نظم دریائے تلودری ہے اور حقیقت یہ ہے کہ منظرکشی کی شاعری کا کامیاب نمونہ ہے:

کیا آب و تاب تجھ میں نہر تلو دری ہے

پربت کی تو ہے دیوی یا قاف کی پری ہے

سرسید اور حالی کے مرثیے بھی لکھے، مطایبات اور غزلیں بھی، مگر مناظرِ قدرت کی تصویر کشی میں ان کے قلم کی جولانی اردو میں بے مثال ہے، ماشاء اللہ ان کا دل یادِ حق سے بھی زندہ تھا، عشق الٰہی اور عشق نبوی سے بھی خالی نہ تھے۔

ترے در پہ خالق ذوالمنن جو میری جبین نیاز ہو

مجھے بیکسی پہ غرور ہو ، مجھے بینوائی پہ ناز ہو

میری یاس کی شب تار میں مرے گم کے گرد و غبار میں

ترا لطف چارہ نواز ہو، ترا نور جلوہ طراز ہو

مرا روز جلوہ فروز ہو، ترے رخ کے نور جمال سے

مری شب کی محفل انس میں تری بوئے زلف دراز ہو

میری ان کی پہلی ملاقات یاد نہیں کب ہوئی اور کہاں ہوئی، تاہم یہ یاد ہے کہ مولانا شبلی مرحوم کے تعلق سے محبت اور شفقت سے پیش آئے، اور آخری ملاقات ابھی چند سال ہوئے حمایت اسلام لاہور کے جلسۂ سالانہ میں ہوئی، لمبا قد، چھریرا بدن، بدن پر کوٹ، سر پر پنجابی صافہ، داڑھی فرنچ کٹ، مونچھیں بڑی، مزاج میں کسی قدر کم سخنی، اور کم آمیزی، بڑھاپے کا اثر نمایاں۔

ان کی نظموں کا مجموعہ نغمہ، فردوس کے نام سے ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا، اس کے مقدمہ کے طور پر کچھ اپنے حالات بھی لکھے تھے، مگر وہ حصہ چھپنے سے رہ گیا، شاید اب کسی کو توفیق ہو، ان کی عمر انتقال کے وقت ستر سے کم نہ ہوگی۔

اللہ تعالیٰ اس نغمہ فردوس کے مصنف کو فردوس بریں میں جگہ دے، ان کی نظمیں ان کے مومن دل کی پوری شہادت دیتی ہیں، غالباً سلسلہ چشت سے دل کا تعلق تھا، چنانچہ کہتے ہیں:

مرا حسبی اللہ حصار ہو، مرا لا تخف پہ قرار ہو
ہو مرا مقام بلند تر، جو کمند فتنہ دراز ہو
تجھے ناظر اتنی ہو فکر کیوں، غم و اضطراب کا ذکر کیوں
ترے فکر کار میں رات دن جو ترا غریب نواز ہو

مرنے والے کے وہ چار شعر اور سن لیجئے:

ہم پرستار خدا ہیں ہم خدا کے ساتھ ہیں
ہر گھڑی ہر لحظ، اور ہر دم خدا کے ساتھ ہیں
ساز فطرت ہے ہمارا عشق سے رنگیں نوا
نغمہ ہائے دل کے زیر و بم خدا کے ساتھ ہیں
ایک پیمانہ سے سب کو کردیا مست الست
عہد و پیمانِ ازل محکم خدا کے ساتھ ہیں
پرتوِ مہرِ ازل میں ہست و بود اپنی ہے گم
ہم مثالِ قطرۂ شبنم خدا کے ساتھ ہیں
دشتِ حرماں میں رہے نا محرمانِ کوئے دوست
اور حریم عشق کے محرم خدا کے ساتھ ہیں
سرنگوں قعرِ مذلت میں رہے باطل پرست
انتم الاعلون کے پرچم خدا کے ساتھ ہیں
شش جہت میں ساری وسائر ہے نور لم یزل
صد ہزاراں عرصۂ عالم خدا کے ساتھ ہیں
چپکے چپکے کان میں یہ کہہ رہا ہے دل کہ ہم
لی مع اللہ ہر نفس ہر دم خدا کے ساتھ ہیں
ذرہ ہو خورشید تاباں سے بھلا کیونکر جدا
ہم خدا کے ساتھ تھے اور ہم خدا کے ساتھ ہیں
منزل ہستی میں ناظر کاروانِ عشق کے
سب نشاط و عیش و رنج و غم خدا کے ساتھ ہیں

اللہ تعالیٰ خدا کی معیت کے اس مشتاق کو آخرت میں اپنے صالحوں کی معیت نصیب فرمائے۔ ("س"، نومبر ۱۹۴۴ء)

علوی، ضیاء الحسن

ضیاء الحسن علوی مرحوم

افسوس کہ میرے رفیق قدیم اور صدیق حمیم مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی نے ایک مختصر علالت کے بعد ۱۴؍ جون ۱۹۴۵ء کو الہ آباد میں جہاں وہ عربی مدرسوں کے انسپکٹر اور مشرقی امتحانوں کے رجسٹرار تھے ستاون برس کی عمر میں وفات پائی، اس حادثہ کی اطلاع مجھے ۱۸؍ جون کو لکھنو میں اسی مدرسہ میں ملی جہاں میں اور مرحوم مل کر ایک جان دو قالب ہوئے تھے، افسوس کہ ایک قالب خالی ہوگیا، اور دوسرا نیم جان موجود ہے، مرحوم مجھ سے عمر میں تقریباً پانچ برس چھوٹے (گو تعلیم کے درجہ میں وہ ایک سال بڑے تھے) اس لئے بظاہر امید یہی تھی کہ انہی کو میری جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑے گا، مگر تقدیر یہی تھی کہ مجھے ان کے فراق کا غم سہنا پڑے اس لئے امید غلط ثابت ہوئی، اور تقدیر کا فرمان نافذ ہو کر رہا۔

اکنوں چہ تواں کرد کہ تقدیر چنیں بود

مرحوم کاکوری ضلع لکھنؤ کے مشہور علوی خاندان کے چشم و چراغ تھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے حامیوں بلکہ بانیوں میں رؤساء کا جو طبقہ شامل تھا، ان میں منشی محمد اطہر علی صاحب مرحوم کا نام بہت جلی ہے، یہ خاندان قطب وقت حضرت مولانا شاہ فضل الرحمان صاحب گنج مرادآبادی رحمتہ اللہ علیہ کا ارادتمند و معتقد تھا، جو ندوہ کی تحریک کے روحانی مرکز و مدار تھے، اس لئے جب ۱۸۹۸ء (۱۳۱۶ھ) میں لکھنو میں ندوہ کا دارالعلوم کھلا تو منشی صاحب مرحوم نے اس درس گاہ کو اپنے سب سے چھوٹے بچے اور ایک ننھے بھتیجے کو نذر کیا، یہی ننھا بھتیجا مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی تھے، دارالعلوم کے طلبہ کے داخلہ میں ان کا نمبر شاید دوسرا تیسرا تھا، عربی کی پوری تعلیم یہیں حاصل کی اور یہیں سے فراغت پائی۔

یوں دارالعلوم کے سارے اساتذۂ وقت مولانا حفیظ اللہ صاحب، مولانا عبدالشکور صاحب (اڈیٹر النجم) عبداللطیف صاحب سب ہی سے تعلیم پائی تھی، مگر جس کی تعلیم نے ان کے لوح دل میں علم و فن کے ذوق کا نقش اولین بنایا، وہ دارالعلوم کے صدر مدرس مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی تھے، وہ ادب اور معقولات کے امام تھے، اور یہی دونوں فن مرحوم کی گھٹی میں پڑے، اور عمر بھر انہی سے ان کو ذوق رہا۔

۱۹۰۴ء میں مولانا شبلی مرحوم حیدرآباد سے جب لکھنؤ دارالعلوم میں پہلے پہل آئے تو جو طلبہ ان کے حلقہ میں پہلے بیٹھے، ان میں سب سے پہلا نام مولوی ضیاء الحسن مرحوم کا ہے، چنانچہ مولانا کی مردم شناس نگاہ نے ان کے ذوق اور استعداد کو تاڑ لیا، مولانا کے حیدرآباد واپس چلے جانے کے بعد مرحوم نے جو سب سے پہلا خط ان کو لکھا،

اس کا جواب مکاتیب شبلی کی دوسری جلد میں موجود ہے، خط ۱ کے آخر میں ہے:

"میں چاہتا ہوں کہ چند روز تک آپ کا اور میرا ساتھ رہتا، تاکہ میں ادب اور فلسفہ کی بعض کتابیں آپ کو پڑھاتا، اور مضمون نگاری کی بھی تعلیم دیتا، دیکھئے کب خدا موقع لاتا ہے"۔ (شبلی ۴/جنوری ۱۹۰۴ء)

اس کے بعد جون ۱۹۰۵ء میں ندوہ تشریف لے آئے اور جس موقع کا انتظار تھا، وہ جلد مل گیا، مرحوم کے بعد اس طلب میں ان کا دوسرا رفیق سفر راقم الحروف تھا، ہم دونوں نے حضرۃ الاستاذ کے سامنے زانوئے ادب تہ کئے، اور علم کلام، معقولات اور اعجاز القرآن کے اسباق شروع ہوئے، مرحوم مجھ سے زیادہ دلیر اور بے تکلف تھے، وہ پرائیوٹ صحبتوں میں بھی شریک ہوتے تھے، اور ہر روز علم کا نیا فیض حاصل کرتے تھے، اسی زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد ندوہ ہی میں مولانا کے پاس مقیم تھے، مولانا حمید الدین صاحب مصنف نظام القرآن بھی آیا کرتے تھے، اور ہفتوں ندوہ میں رہا کرتے تھے، مولانا عبداللہ عمادی اڈیٹر البیان بھی لکھنؤ میں مقیم اور اکثر صحبتوں میں شریک ہوتے تھے، خواجہ غلام الثقلین بھی آتے جاتے رہتے تھے مرحوم ان لوگوں کے ساتھ بے تکلف ملتے جلتے تھے، اور اس خوانِ ادب سے بہرہ ور ہوتے تھے۔

مرحوم کو جدید علوم کے حصول کی طرف میلان مرزا ہادی صاحب رسوا (سابق عربی پروفیسر کرسچین کالج لکھنؤ) کی صحبتوں اور ملاقاتوں سے ہوا، وہ عربی کے عالم، انگریزی کے گریجویٹ اور جدید فلسفہ اور ریاضیات کے ماہر تھے، آخر میں دارالترجمہ عثمانیہ سے متعلق ہوکر فلسفہ کی متعدد کتابیں اردو میں ترجمہ کیں۔ مولانا شبلی نے ایک دفعہ ان کو مدرسہ میں ہم چند طلبہ کو جدید فلسفہ پڑھانے کے لئے مقرر کیا تھا، مگر وہ بڑے لاأبالی تھے، چند سبق سے زیادہ کا معاملہ ان سے نہ چل سکا۔

بہر حال مرحوم نے ۱۹۰۵ء میں عربی تعلیم سے فراغت پائی، اور ۱۹۰۶ء کے مشہور جلسہ دستار بندی میں میرے ساتھ ہی ان کی بھی دستار بندی ہوئی، اس جلسہ میں انھوں نے اعجاز القرآن کے موضوع پر ایک عالمانہ تقریر کی تھی، جو بعد کو مرتب ہوکر الندوہ میں شائع ہوئی، اور مدح وتعریف کی مستحق ہوئی۔

مرحوم کو اردو ادب کا ذوق فطرۃً تھا، گھر کا ماحول مشاہیر نظم ونثر کی ان کے ہاں آمد ورفت، پیارے صاحب رشید اور مرزا رسوا جیسے نظم ونثر کے ادیبوں سے ان کے خاندانی مراسم تھے، اور پھر بچپن سے لکھنؤ کی سکونت، ان سب کا اثر یہ تھا، کہ وہ اردو روزمرہ کے جان دادہ تھے، شعر بھی کہتے تھے، مگر صرف اپنے لئے، علمی مضامین تو حضرۃ الاستاذ مرحوم کی پیروی میں لکھتے تھے، مگر عام انداز تحریر شوخ وشگفتہ روزمرہ کی بول چال کا تھا۔

مرحوم کا پہلا مضمون "صحت اور عمر کی درازی" ہے، جو المقتطف مصر کے ایک مضمون کا ترجمہ تھا، اور رسالہ الندوہ ۱۹۰۵ء میں چھپا، اس کے بعد دوسرے مضامین لکھے، جو الندوہ ہی میں چھپائے گئے، ان کا ایک ابتدائی ادبی مضمون اردوئے معلیٰ علی گڑھ میں چھپا، خواجہ غلام الثقلین ان دنوں دارالعلوم کے پاس ایک مکان میں رہتے تھے اور اسلامی کانفرنس کے صیغۂ اصلاح وتمدن کے سکریٹری تھے، اور اس تعلق سے وہ عصر جدید نام ایک ماہانہ رسالہ نکالا کرتے تھے، خواجہ صاحب کے تقاضے اور اصرار سے اس میں بہت سے اصلاحی مضمون لکھے، اور وہ چھپے۔

مرحوم نے عربی سے فراغت پاکر انگریزی کی طرف توجہ کی، جس کا آغاز لکھنؤ میں ہو چکا تھا۔ مگر انجام علی گڑھ میں ہوا، ۱۹۰۹ء میں وہاں سے میٹرک پاس کیا، حضرۃ الاستاذ نے مبارک باد لکھی۔

"مبارک، تمھارے پاس ہونے سے بے حد خوشی ہوئی، اور تمھاری نسبت حسن ظن بڑھ گیا..... اب تم ضرور کالج میں پڑھوگے، الندوہ میں تم پر نوٹ دوں گا"۔

۱۹۰۹ء میں وہ کالج میں داخل ہوئے، اور ۶ برس میں ایم اے تک تعلیم پائی، اس زمانہ میں عربی کے پروفیسر یوسف ہارویز نام ایک جرمن فاضل تھے، جنھوں نے طبقات ابن سعد کے بعض اجزا کی تصحیح کی، اور جو علی گڑھ میں ۱۹۱۴ء کی گذشتہ جنگ عظیم کے شروع تک رہے، اور اس کے آغاز ہی میں قید ہوکر بعد کو جرمنی واپس چلے گئے تھے، مرحوم کالج میں پہنچ کر ان کے حلقہ میں داخل ہوئے، اور ان پر ایسے چھائے کہ ان کے جز وکل پر حاوی ہوگئے، اُن سے مستشرقین کے معلومات حاصل کیے، کچھ جرمن زبان اور کچھ عبرانی زبان کے سبق پڑھے، مولانا شبلی اور پروفیسر ہارویز کے درمیان ربط وضبط کا واسطہ مرحوم ہی تھے۔

۱۹۱۶ء میں غالباً انھوں نے ایم اے پاس کیا، اس وقت یوپی کی گورنمنٹ عربی مدارس کی نگرانی کے لئے ایک انسپکٹر کے تقرر پر غور کررہی تھی، مرحوم سے بڑھ کر اس کام کے لئے دوسرا موزوں نہیں ہوسکتا تھا، وہ ایک طرف ٹھیٹھ مولوی اور دوسری طرف ممتاز گریجویٹ تھے، چنانچہ ۱۹۱۷ء میں وہ عربی مدرسوں کے انسپکٹر مقرر ہوئے، اور اسی عہدہ پر آخر تک قائم رہے، ابھی اسی جولائی میں وہ قید ملازمت سے چھوٹنے والے تھے، کہ اس سے چند روز پہلے قید حیات ہی سے آزاد ہوگئے۔

مرحوم نے عربی نصاب، اور اردو فارسی اور عربی کے سرکاری امتحانات کی اصلاح اور ترقی میں بہت بڑا کام کیا ہے۔ جب وہ اس عہدہ پر فائز ہوئے تھے تو نام کے سوا اس صیغہ میں کچھ اور نہ تھا، لیکن انہوں نے چند برس کے اندر اپنی محنت، لیاقت، اخلاق اور محبت سے چالیس پینتالیس مدرسوں کو اپنا ہمنوا بنالیا اور اصلاح نصاب کا وہ خاکہ جو استاذ مرحوم صرف ندوہ کی حد تک کھینچ سکے تھے ان کے لائق شاگرد کے ہاتھوں وہ پورے صوبہ کے دائرہ میں وسیع ہوگیا۔

مرحوم کو کتابوں کا بہت شوق تھا، وہ خود بھی ہر قسم کی علمی کتابیں عربی اور انگریزی کی خریداری کرتے تھے، ان کا مطالعہ برابر جاری رہتا تھا، اور اہل علم دوستوں سے مسائل علمیہ پر مباحثہ کرتے تھے۔

ان کی علمی یادگار وہ چند ابتدائی مضامین ہیں جو الندوہ میں چھپے، یا اسلامی جہازوں پر ان کا وہ مضمون ہے، جو ۱۹۱۰ء کے قریب علی گڑھ منتھلی میگزین میں چھپا، اور حضرت الاستاذ کی پسند سے انعام کا مستحق ہوا، اسی طرح عصر جدید کے اصلاحی مضامین بھی ہیں، جو کبھی ان کے نام سے اور کبھی بے نام چھپے، آخر میں ان کا طویل مضمون جو "یاد ایام" کے عنوان سے جدید الندوہ میں ۱۹۴۱ء کے آٹھ نو نمبروں میں شائع ہوا تھا ذکر کے قابل ہے، یہ گویا ان کی آپ بیتی ہے جس میں جگ بیتی کے بہت سے دلچسپ مناظر شامل ہیں، اس مضمون میں لکھنؤ کی زبان کا مزہ اور روزمرہ کا چٹخارا ایسا تھا کہ سب اہل ذوق نے اس کو بیحد پسند کیا، افسوس کہ یہ کہانی ناتمام رہی۔

ان کو ادب سے فطری ذوق تھا، الف لیلہ ولیلہ جو عربی داستان سرائی کی بے مثال کتاب سمجھی جاتی ہے، اس کے اردو ترجمہ کی امنگ ان کے دل میں ایک مدت سے تھی، چنانچہ انہوں نے ایک زمانہ سے اس کام کو شروع کر رکھا تھا، اس ترجمہ میں اس کا بھی خاص اہتمام تھا کہ عربی شعروں کا ترجمہ اردو ہی شعروں میں ہو، معلوم نہیں یہ چیز کہاں تک پہنچی، سبعہ معلقہ میں سے امراء القیس کے قصیدہ کا ترجمہ اردو نظم میں کیا تھا۔

وہ دارالمصنفین کے رکن تھے، اور استاذ مرحوم کی نسبت سے اس سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے، ان کی فرمایش سے ہمارے فاضل رفیق مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے امام رازی کی سوانح عمری اور ان کے فلسفہ پر تبصرہ کا کام انجام دیا، میں نے مناسب سمجھا کہ اس پر مرحوم سے ایک مقدمہ لکھوایا جائے جس میں امام رازی کے فلسفہ کو یورپ کے فلسفیوں کی نگاہ سے دیکھا جائے، اور موازنہ کیا جائے، افسوس کہ ان کی موت سے یہ کام بھی ناتمام رہ گیا۔

مرحوم کا بچپن مذہبی وصوفیانہ ماحول میں گذرا تھا، اس لئے باایں ہمہ ان پر یہ اثر غالب تھا، طالب علمی ہی میں حضرت مولانا شاہ ابواحمد صاحب مخدومی بھوپالی (مرید شاہ عبدالغنی صاحب مجددی مہاجر) سے لکھنؤ میں بیعت کی تھی، جو اس وقت اتفاق سے لکھنؤ آگئے تھے، اور میں نے بھی ملا مبین کی مسجد میں ان کی زیارت کی اور بھوپال میں تو کئی دفعہ حاضری کا اتفاق ہوا، چونکہ میرے بڑے بھائی صاحب مرحوم بھی انہی سے بیعت تھے، اور خلافت سے ممتاز تھے، اس لئے مرحوم ضیاء الحسن سے میری محبت کی نسبت میں اس نئے رشتہ سے اور مضبوطی پیدا ہوگئی تھی، حضرت شاہ صاحب کی وفات کے بعد مرحوم نے حضرت شاہ نجم الدین صاحب فتح پوری سے تعلق پیدا کیا جن سے وہ بچپن سے واقف تھے، کیونکہ دارالعلوم ندوہ کا افتتاح انہی کے مبارک ہاتھوں سے ہوا تھا، ان کی وفات کے بعد ایک اور بزرگ کی طرف انہوں نے رجوع کیا، جو غالباً کہیں آگرہ کے قریب کے تھے، مولانا شاہ ابوالخیر صاحب مجددی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں بھی کبھی کبھی حاضری دی ہے، ذکر وفکر واشغال میں بھی مصروف رہتے تھے، اور ان کے برکات دوستوں میں کبھی کبھی بیان کرتے تھے۔

افسوس کہ میرے تعلیمی عہد محبت کا یہ نخل بار آور عمر کی ستاون بہاریں دیکھ کر اب ہمیشہ کے لئے مرجھا گیا، حضرۃ الاستاذ نے بھی عمر اتنی ہی پائی تھی، ستاون برس کی عمر کے حساب سے ۱۸۸۸ء یا ۱۸۸۹ء کی پیدائش ظاہر ہے۔

وکنا کندمانی جذیمة حقبة
من الدھر حتی قیل لن یتصدعا

ہم دونوں ایک مدت تک بادشاہ جذیمہ کے دو مصاحبوں کی طرح ایک ساتھ رہے یہاں تک کہ کہا گیا کہ اب یہ الگ نہ ہوں گے۔

فلما تفرقا کانی ومالکا
بطول اجتماع لم نبت لیلة معا

پھر جب ہم الگ ہوگئے، میں نے اور مالک نے طول اجتماع کے ہوتے ہوئے بھی گویا ہم نے ایک رات بھی ایک ساتھ نہیں گذاری۔

مرحوم کی دو شادیاں ہوئی تھیں، پہلی بیوی سے ایک لڑکا اور لڑکی، دونوں بالغ ہیں لڑکے کا نام حسن ہے، جو امسال بی۔اے، بی۔ٹی ہوئے ہیں، اور ادبی ذوق میں اپنے باپ کی یادگار ہیں۔ دوسری بیوی سے چند بچے ہیں، اور سب چھوٹے اور کم سن۔

اللہ تعالیٰ مرنے والے کی قبر پر رحمت کے پھول برسائے۔

("س"، جولائی ۱۹۴۵ء)

---

۱ مکاتیب شبلی کی دوسری جلد میں بسلسلۂ تلامذہ ان کے خطوط شامل ہیں۔

نکلسن، ڈاکٹر

ڈاکٹر نکلسن

گزشتہ اگست میں مشہور انگریز مستشرق ڈاکٹر نکلسن نے ۷۷ سال کی عمر میں انتقال کیا، وہ عربی و فارسی زبان کے فاضل اور لندن اور کیمبرج یونیورسٹی میں ان دونوں زبانوں کے استاد رہے تھے، ان کا موضوع اسلامی تصوف تھا، اس کے وہ یورپ میں امام مانے جاتے تھے، انہوں نے اسلامیات اور تصوف پر کئی کتابیں لکھیں، اس کی بعض قدیم اور اہم کتابوں کو ایڈٹ کیا، اور انگریزی میں ان کے ترجمے کئے، شیخ ابونصر سراج کی کتاب اللمع اور مثنوی مولانا روم کی بڑی محنت سے تصحیح کی، یہ دونوں کتابیں گب

میموریل سیریز کی جانب سے شائع ہوگئی ہیں، **کشف المحجوب**، مثنوی مولانا روم اور انتخاب دیوان شمس تبریز کا انگریزی میں ترجمہ کیا، اسلامی تصوف اور صوفیائے اسلام پر مستقل کتابیں لکھیں، عربوں کی علمی و ادبی تاریخ پر ایک مبسوط کتاب لٹریری ہسٹری آف دی عربس تالیف کی ہندوستان میں ان کا نام زیادہ سراقبال مرحوم کی مثنوی اسرار خودی کے مترجم کی حیثیت سے مشہور ہے، لیکن اسلامیات سے اس دلچسپی کے باوجود ان کا دامن تعصب و تنگ نظری سے پاک نہ تھا، جس کا اثر لٹریری ہسٹری آف دی عربس میں زیادہ نمایاں ہے، اور یہ کتاب علمی و مذہبی دونوں حیثیتوں سے اعتبار کے لائق نہیں ہے۔ ("م"، اکتوبر ۱۹۴۵ء)

شبلی، ابوعماد، مولانا

مولانا شبلی (فقیہ ندوہ)

اعظم گڑھ کی سرزمین سے تین شبلی پیدا ہوئے، اور اتفاق سے تینوں کسی نہ کسی حیثیت سے ندوہ سے وابستہ رہے، ایک نے وہاں تعلیم و تربیت پائی اور شبلی متکلم کے خطاب سے مشہور ہوئے، اس وقت مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے مہتمم اور صدر مدرس ہیں، دوسرے اس کے معتمد تعلیم بلکہ روح رواں تھے، جن کو دنیا علامہ شبلی کے نام سے جانتی ہے، تیسرے مولانا شبلی فقیہ ندوہ تھے، جنھوں نے نہ وہاں تعلیم پائی اور نہ کسی خاص شہرت کے مالک ہوئے، مگر ندوہ اور ندویوں کو ان کی ذات سے ان کے دوسرے ہمنام بزرگوں سے کم فائدہ نہیں پہنچا، ندوہ کے ابتدائی چند سالوں کے علاوہ اس کی پچاس سالہ زندگی کے ہر دور میں یہ ہمارے مولانا شبلی نظر آئیں گے، اس دور کا کوئی ایسا ندوی نہیں ہے، جو ان کا شاگرد نہیں، اور ان کے سامنے اس نے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا۔

ولادت اور تعلیم و تربیت: غالباً ۱۸۷۲ء میں ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں جیراجپور میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم کے بعد عربی کی تحصیل کے لئے فرنگی محل لکھنو اور پھر مدرسہ عالیہ رامپور گئے، وہاں کئی برس رہ کر تعلیم کی تکمیل کی۔

مولانا اپنے قیام رامپور کا قصہ اکثر بیان کرتے تھے، فرماتے تھے کہ دو ڈھائی روپیہ ماہانہ کل خرچ ہوتا تھا، دن میں دونوں وقت کھانا کھاتا تھا، ۴ چراغ کے تیل پر خرچ ہوتا تھا، اور ۴ دھوبی صابون وغیرہ اور ۲/۴ حجامت وغیرہ پر۔

تکمیل تعلیم کے بعد ہی مولانا مدرسہ چشمہ رحمت غازیپور میں صرف و نحو کے مدرس مقرر ہوئے۔

ندوہ میں آمد: علامہ شبلی نعمانی مرحوم مردم شناس بھی تھے، ایک مرتبہ اتفاق سے غازیپور گئے ہوئے تھے، چشمۂ رحمت میں بھی جانے کا اتفاق ہوا، اور مولانا شبلی کا انداز تدریس دیکھ کر ان کو آمادہ کرکے اپنے ساتھ ندوہ لے آئے، غالباً مولانا ۱۹۰۶ء میں ندوہ آئے، اور ۴۰ برس تک مسلسل ندوہ کی خدمت کرتے رہے، پچھلے سال فالج کا حملہ ہوا، اس سے وہ درس و تدریس سے تقریباً معذور ہوگئے، اور کچھ دنوں کے بعد دارالعلوم ہمیشہ کے لئے ان کے فیوض و برکات سے محروم ہوگیا، اور اسی مرض میں گزشتہ ۱۷/ رمضان المبارک کو اپنے وطن میں انتقال کیا۔

مولانا میں چند خصوصیتیں ایسی تھیں کہ ہر شخص ان سے مانوس ہوجاتا تھا۔

اتباع سنت: مذہبی زندگی میں وہ اکابر علمائے خیر کی صف میں ممتاز تھے، عقائد و عبادات کے علاوہ اخلاق و معاملات اور معاشرت میں بھی سنن و مستحبات کا اہتمام رکھتے تھے، چنانچہ پوری زندگی پاجامہ کے بجائے تہبند کا استعمال رکھا، اپنا سارا کام اپنے ہاتھ سے کرتے، اور طلبہ سے کام لینا پسند نہیں کرتے تھے، بکریاں پالتے تھے، اور ان کی جملہ ضروریات اپنے ہاتھوں سے پوری کرتے، جب وہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگئے، تو بادل ناخواستہ بکریاں پالنا چھوڑ دیں۔

تواضع و اخلاق: نہایت خلیق، متواضع اور خوش مزاج تھے، کبھی کسی استاد یا طالب علم کو ان سے شکایت نہیں پیدا ہوئی، اور انھوں نے اپنی چالیس سالہ زندگی میں بھی کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا، راستہ میں ہر چھوٹے بڑے کو بلاتفریق سلام کرنے میں سبقت کرتے، مولانا حیدر حسن خان صاحب سابق شیخ الحدیث جب مکان تشریف لے جاتے، تو مولانا ہی کو اپنا قائم مقام بناتے، مگر مولانا غایت تواضع میں کبھی ان کی کرسی پر نہیں بیٹھتے بلکہ دوسری جگہ بیٹھ کر فرائض متعلقہ انجام دیتے۔

سادگی: مولانا نے ہمیشہ سادہ اور یکساں لباس پہنا، گرمیوں میں تہبند، کرتا، اور دوپلی ٹوپی اور جاڑوں میں ایک دگلا اور تہبند کے نیچے ایک روئی دار پائجامہ، ایک خاص قسم کی چپل جو شاید انہی کے لئے خاص طور سے بنوائی جاتی تھی، جسے دیکھ کر صحابہ کی تسمہ نما چپل کی یاد آجاتی تھی، شاید اس کا التزام بھی اتباعِ سنت ہی کے ذوق کے ماتحت رہا ہو، عصا بھی ہمیشہ ساتھ رکھا کرتے تھے۔

دارالعلوم ندوہ کی زیارت کے لئے دنیا کے تقریباً ہر گوشہ کے مشاہیر آئے، ندوہ کے بیسیوں ماہانہ و سالانہ جلسے ہوئے، اور سیکڑوں دعوتیں ہوئیں، مگر مولانا ان تمام مجلسوں تقریبوں اور دعوتوں میں اسی سادگی کے ساتھ شریک ہوئے، کبھی کوئی خاص اہتمام نہیں کیا۔

درس و تدریس اور مطالعہ: مولانا کا درس بہت ہی دلنشین اور دلچسپ ہوتا تھا، اثنائے درس میں دو ایک خوش کن قصے ایسے ضرور سناتے جس سے طلبہ ان کے درس سے

اکتاتے نہیں تھے، درس کی تقریر اتنی سلجھی اور دلنشین ہوتی کہ پیچیدہ سے پیچیدہ بحث کو کم فہم طلبہ بھی آسانی سے سمجھ لیتے، کوئی طالب علم اگر کوئی سوال کرتا تو بہت خوش ہوتے اور خندہ پیشانی سے اس کا جواب دیتے، بغیر مطالعہ کے کبھی کوئی کتاب نہیں پڑھاتے تھے، فرماتے تھے کہ بغیر مطالعہ کے میزان کا پڑھانا بھی حرام اور دیانت کے خلاف ہے، اخرعمر میں بینائی کمزور ہوگئی تھی اور مطالعہ سے تقریباً معذور ہوگئے تھے، تو جس جماعت کو پڑھانا ہوتا، اس جماعت کے کسی ہوشیار طالب علم کو بلالیتے اور کتاب مع حواشی وشروح پڑھواکرسن لیتے، یہ ان کی خاص خصوصیت تھی، حافظہ بھی نہایت اچھا تھا، فرماتے تھے کہ شرح وقایہ اولین کا اکثر و بیشتر حصہ زبانی سناسکتا ہوں، طلبہ اور اساتذہ کو فقہی یا علمی مسائل کی تحقیق کرنی ہوتی تو فقہی مسائل میں مولانا کی طرف رجوع کرتے تھے، اور علمی مسائل میں حضرت شاہ حلیم عطا شیخ الحدیث مدظلہ کی طرف، مولانا ہرفن کی کتاب بےتکلف پڑھا لیتے، مگر فقہ سے خاص لگاؤ تھا، ندوہ میں جب تک رہے، فقیہ اول رہے، خلافیات حدیث پر بھی پوری نظر تھی، مگر اس میں غلو نہیں تھا اور متکلمانہ و مناظرانہ طرز کے بجائے محدثانہ طرز سے پڑھاتے تھے۔

دارالاقامہ کی نگرانی: مولانا کی زندگی کا یہ سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ وہ چالیس برس تک دارالاقامہ کی نگرانی کے فرائض انجام دیتے رہے، اس طویل مدت میں سیکڑوں لڑکوں نے ان کے ہاتھوں سے مار کھائی، اور سزائیں پائیں، مگر اس کے باوجود کبھی کسی طالب علم کو ان سے کوئی شکایت نہیں پیدا ہوئی، شکایت نہ ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ جذبہ انتقام یا تذلیل کے لیے کبھی کسی کو کچھ نہیں کہتے تھے اور اگر سزا بھی دیتے تو اس میں پدرانہ شفقت کارفرما ہوتی تھی۔

مولانا نے کچھ دنوں تک چھوٹے بچوں کی نگرانی بھی کی، ان کے ساتھ ان کا سلوک بالکل مادرانہ ہوتا تھا، جب کبھی کوئی بچہ بستر پر پیشاب کردیتا تھا، تو خود اپنے ہاتھوں سے بستر دھوتے، اور ان کے کھانے، کپڑے، رہنے سہنے اور کھیلنے کودنے کا پورا خیال رکھتے تھے۔

میں ۱۹۳۹ء میں ندوہ گیا، اس وقت مولانا شبلی دارالاقامہ کے جو بڑے لڑکوں کے لئے مخصوص ہے نگران تھے، مولانا کا معمول تھا کہ فجر کی نماز کے وقت پورے بورڈنگ کا ایک چکر لگاتے، مگر اس سے پہلے اپنی چارپائی سے ہر کمرہ کے اس لڑکے کا نام لے لے کر آواز دیتے، جو نماز میں زیادہ سست ہوتا، اس پیرانہ سالی میں بھی مولانا کی آواز میں کسی قسم کا ضعف نہیں آیا تھا، پھر مولانا اپنی چارپائی سے اٹھتے، مولانا کی چپل کی آواز کے ساتھ ہی سارے طلبہ اپنے کمرہ سے باہر ہوجاتے، بعض لڑکے یہ شرارت کرتے، کہ چارپائی کے نیچے گھس جاتے، اس لیے مولانا کبھی کبھی چارپائی کے نیچے ڈنڈے کے ذریعہ سے جائزہ لیتے، اگر کوئی لڑکا ڈنڈے کی زد میں آجاتا، تو پھر ان کی خیر نہیں تھی۔

اسٹرائیک: ندوہ میں لڑکوں نے کئی مرتبہ اسٹرایک کی دو تین مرتبہ خود میرے سامنے ہوئی، لڑکے اپنے جائز مطالبات منوانے کے لیے جب اڑ جاتے اور کوئی صورت مصالحت کی باقی نہ رہ جاتی تو مولانا درمیان میں پڑکر صلح ومصالحت کرادیتے، بڑے سے بڑا انقلابی لڑکا بھی ان کے سامنے پہنچ کر بےحد معتدل بن جاتا تھا۔

کھانے کا ذوق: مولانا کھانا کھلانے کے طبعاً بڑے شائق اور فیاض تھے، بغیر گوشت کے کھانا پسند نہیں کرتے تھے، بقرعید کے دنوں میں ہمہ وقت مولانا کی انگیٹھی گرم رہتی تھی، خود اپنے ہاتھ سے گوشت پکاتے اور طلبہ و اساتذہ کو کھلاتے، مولانا عبدالسلام صاحب ندوی جب لکھنو جاتے، تو ان کی بڑی پرتکلف دعوت کرتے تھے، جس میں مرغ اور کباب خصوصیت سے ضرور کھلاتے۔

افسوس ہے کہ ایسی فیض بخش و بابرکت ذات سے ندوہ ہمیشہ کے لئے محروم ہوگیا۔ (''م۔ج''، دسمبر ۱۹۴۵ء)

جلیلؔ، فصاحت جنگ، نواب

درویش شاعر

جلیل القدر نواب فصاحت جنگ جلیل رحمہ اللہ تعالیٰ

یکم صفر ۱۳۶۵ھ مطابق ۶/ جنوری ۱۹۴۶ء کو مشہور شاعر استاد حضرت جلیل نے پچاسی برس کی عمر میں حیدرآباد دکن میں داعی اجل کو لبیک کہا، اللہ تعالیٰ اس درویش شاعر کو اپنی داد رحمت سے شاد فرمائے۔

اللہ اللہ! زمانہ کی نیرنگیاں کیا کیا انقلاب دکھاتی ہیں، بچہ جوان، جوان بوڑھا، اور بوڑھا راہ عدم کا مسافر ہوتا ہے، انگریزی کی بیسویں صدی کا پہلا سال تھا جب میری عمر ۱۶، ۱۷ برس کی ہوگی کہ میں دارالعلوم ندوہ لکھنؤ میں داخل ہوا، شعروسخن کا چسکا مکتبی بیت بازی کے سبب سے پہلے سے تھا، اب لکھنؤ آیا، جہاں کے ذرہ ذرہ کے خمیر میں شعروسخن کا عنصر ہے، مدرسہ میں بھی اس وقت طالب علم مشاعرے کرتے تھے اور غزلیں پڑھتے تھے، تجمل شاہجہاں پوری، سیدظہور احمد ناحل شاہجہاں پوری (جو بعد کو وحشی شاہجہانپوری ہوگئے تھے) دانا سہرامی (حکیم رکن الدین دانا ندوی) مصطفےٰ ملیح آبادی صدیق حسن، آثر مانکپوری، شرر بہاری (مولوی عبدالغفور شرر) اور یہ خاکسار اس میں پوری دلچسپی لیتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب امیر وداغ کے زمزموں سے ہندوستان پرشور تھا اور خاکسار کا میلان امیر مرحوم کی طرف تھا اور ان کا دیوان مراۃ الغیب پیش نظر رہتا تھا۔

صدیق حسن صاحب اثر مانکپوری حضرت جلیل کے فرزند تھے اور ان سے اور مجھ سے شعراء انشاء کی دلچسپی کے رشتہ سے یارانہ تھا، اس تعلق میں ان کے والد ماجد کی حضرت امیر مرحوم کے ساتھ شاگردی کی نسبت نے محبت کی گرہ کو اور زیادہ استوار بنا دیا تھا، مولوی صدیق حسن صاحب (حال وظیفہ یاب سرکار نظام) کے پاس ان کے والد کی غزلوں کا سفینہ تھا، میں اس کو اکثر دیکھتا اور اس کے اچھے اشعار یاد کرتا، چنانچہ ان کی ایک غزل کے یہ چند شعر اسی وقت سے یاد ہیں۔

کھول کر جوڑا نکلنا اس ہوا میں قہر ہے،
منہ تمہارا چوم لے زلفِ پریشان تو سہی
گیسو و رُخ کا اگر دو دن یہی عالم رہا
یار کا کلمہ پڑھیں ہندو مسلمان تو سہی
شعر کیا رنگین کہے ہیں وصفِ لب میں اے جلیلؔ
خون تھوکے رشک سے لعل بدخشاں تو سہی

دربار امیری سے مزید وابستگی کا باعث یہ تھا کہ مدرسہ میں ہمارے استاد و مہتمم شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ صاحبؒ اس سے پہلے جنرل اعظم الدین خاں کے زمانۂ تولیت میں رامپور کے مدرسہ عالیہ میں مدرس اول رہے تھے اور ان سے امیر مینائی مرحوم اور ان کے تلامذہ اور فرزندان عزیز اختر مینائی وغیرہ سے تعلقات تھے۔ امیر اللغات کی مجلس شوریٰ کے وہ ایک ممبر تھے، ہمارے اوقات درس میں کبھی کبھی ان کے تذکرے بھی آتے تھے اور ہم لوگ ان کو بڑے شوق سے سنتے تھے، یہ گوناگوں اسباب تھے جن کی بناء پر اختر مینائی مرحوم اور حضرت جلیل سے شاعرانہ عقیدت تھی اور اس وقت ان سطروں کے لکھنے میں بھی یہ نسبتیں اثر انداز ہیں۔

حضرت جلیل کا پورا نام جلیل حسن تھا، مانکپور ضلع پرتاب گڑھ کے رہنے والے تھے، حفظ قرآن سے مشرف، فارسی کی اعلیٰ استعداد اور عربی کی تھوڑی واقفیت تھی، لیکن شعر و سخن کے اصول و فروع اور لغت اردو کی تحقیق میں یدطولیٰ رکھتے تھے اور یہ فیض ان کو اپنے استاد حضرت امیر مینائی سے پہنچا، جوانی تھی، کہ استاذ کے قدموں آکر لگے، استاد نے بھی جوہر قابل پاکر پوری تربیت کی، امیر اللغات کی تربیت کا کام انجام پارہا تھا، جو ۱۸۸۲ء سے شروع تھا، استاد نے اس کام کا سررشتہ شاگرد کے سپرد کیا، پہلی جلد الف ممدودہ کی شائع ہوئی اور دوسری جلدوں کے مسودے تیار ہونے لگے تھے کہ رامپور میں ریاستی انقلاب کا دور آیا، اتفاق وقت کہ اسی زمانہ میں حضور نواب میر محبوب علی خاں نظام سابق کشور دکن ہندوستان آئے، اس سفر میں داغؔ بھی ہمرکاب تھے، داغؔ پہلے رامپور میں رہ چکے تھے اور امیر مرحوم سے ان کا دوستانہ تھا، اس بنا پر داغ کے سلسلہ سے امیر مرحوم نے حضور نظام کی خدمت میں باریابی پائی اور حضور نظام نے ان کو دکن آنے کا ایما فرمایا، چنانچہ کچھ دنوں کے بعد اس بڑھاپے میں ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء میں وہ دکن کو سدھارے، دکن کو کیا سدھارے، اپنے اصلی وطن کو سدھارے، یعنی دکن پہنچے، ایک مہینہ اور کچھ دن ہوئے تھے کہ وہاں وفات پائی اور مشہور عام شعر بالکل صادق آیا۔

دو چیز آدمی را کشد زور زور
یکے آب ودانہ دگر خاک گور

آب و دانہ تو میسّر نہ آیا، خاک گور میسّر آئی، شاہ خاموش کے احاطۂ مزار میں اس شعر و سخن کے مرقد پر عمر میں دو دفعہ حاضری میسر آئی، دعائے مغفرت کے پھول نچھاور کئے۔

اس سفر میں شاگردوں میں حضرت جلیل اور صاحبزادوں میں سے حضرت اختر مینائی ساتھ تھے اس غربت اور مسافرت کے عہد میں مہاراجہ کشن پرشاد نے جو شعر و سخن کے شائق اور علوم مشرقی کے بڑے قدر دان تھے، امیر کے ان دونوں عزیزوں کی بڑی قدر کی اور ان کو فوراً اپنے سایۂ عاطف میں لے لیا، اس وقت سے ان دونوں صاحبوں نے حیدرآباد کو اپنا وطن بنالیا اور تقریباً پانچ چھ برس تک صرف مہاراجہ کی سرپرستی میں زندگی بسر کرتے رہے، اس زمانہ میں ایک گلدستہ اور ایک نثر کا ماہوار رسالہ دبدبۂ آصفی کے نام سے ان کے اہتمام میں نکلنے لگا، حضرت جلیل نے اسی زمانہ میں "تذکیر و تانیث" پر ایک محققانہ کتاب لکھی، جس میں سات ہزار الفاظ کی تذکیر و تانیث کا فیصلہ درج کیا، پھر اردو کے فن عروض پر ایک رسالہ لکھا، جس میں اردو کے مستعمل اوزان و بحور کی تشریح کی، اس کے بعد اور بھی کتابیں لکھیں، جن کا ذکر آگے آئے گا۔

۱۹۰۵ء میں استاد داغ نے جو حضور نواب میر محبوب علی خاں آصف سادس کے استاد تھے، وفات پائی، تو اعلیٰ حضرت کی نگاہ انتخاب حضرت جلیل پر پڑی اور ان سے مشورۂ کلام فرمانے لگے، ۱۹۱۱ء میں جب حضور میر عثمان علی خاں بہادر تخت نشین ہوئے تو وہ مزید قدردانیوں سے سرفراز ہوئے اور اب وہ وقت آیا جو اس ماہر و کامل الفن کی قدرشناسی کے لئے مقدر تھا، چنانچہ اس وقت سے مرحوم نے اپنی رحلت تک پورے چھتیس برس اس شاہ عالی جاہ کے ظل عاطفت میں بکمال اطمینان و فارغ البالی بسر کئے اور بہت سے القاب و انعامات سے سرفراز ہوتے رہے۔

خاکسار کو سب سے پہلی دفعہ مارچ ۱۹۱۱ء میں نواب عمادالملک مرحوم کے کتب خانہ کو ندوہ میں لانے کے سلسلہ سے حضرت الاستاذ مرحوم کے حسب ایما حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا، وہ عقیدت جو حضرت جلیل سے مجھے تھی، کشاں کشاں ان کے آستانہ تک لے گئی، بڑی محنت اور شفقت سے ملے، اس کے بعد جب کبھی حیدرآباد جانا ہوا انکے ہاں ضرور حاضری دی، پرانی وضعداری اور استقامت کی یہ مثال آج تعجب سے سنی جائے گی کہ ان سے پہلی ملاقات جس مکان، مکان کے جس سائبان اور سائبان کی جس سمت میں جس کرسی پر، جس ہیئت کذائی سے ہوئی تھی، اخیر ملاقات بھی اسی مکان

میں اسی سائبان میں، اسی کرسی پر اور اسی صورت میں ہوئی۔ میانہ قد، دبلا بدن، رنگ گندمی، قریب سانولا، داڑھی میں سیاہ خضاب، آنکھوں میں سرمہ، ہاتھوں میں تسبیح، ابھی آخری زمانہ کی حاضری کے موقع پر جو جنوری ۱۹۴۵ء میں ہوئی، دیدار نہ ہوسکا، ایسے بیمار تھے کہ ذی فراش تھے، نقل وحرکت کی ممانعت تھی، یہی علالت کم وبیش قائم رہی اور مرض الموت ثابت ہوئی، محلّہ سلطانپورہ کے جس کرایہ کے مکان میں رخت اقامت ڈالا، اخیر تک اسی میں گزار دیا۔

مرحوم نہایت دیندار، تہجد گزار، تسبیح خواں، ذکر الٰہی میں تر زبان، متین، سنجیدہ، کم سخن، متواضع، خاکسار اور بڑے پابند وضع تھے، پنج وقتہ نماز باجماعت کا اہتمام تھا، عشقِ رسول میں سرمست تھے، مرحوم کے یہ اوصاف جوانی ہی سے تھے، چنانچہ حضرت امیر ایک خط میں جو مکتوبات امیر میں چھپا ہوا ہے لکھتے ہیں۔

''مجھے محبی جلیل سے سخت انفعال ہے اور ان کی کامیابی کا نہایت خیال ہے، آدمی یہ ایسے اچھے ہیں کہ جہاں ہوں وہاں اسلامی برکات پھیلیں، میں ان کی علیحدگی کو اپنی بدقسمتی جانتا ہوں مگر بجبوری گوارا کرتا ہوں''۔

یہ مجبورانہ علیحدگی بغرض طلب معاش یوں پوری ہوئی کہ استاد و شاگرد ایک قدرشناس کی تلاش میں راہی دکن ہوئے اور استاد شاگرد کو چھوڑ کر قضا وقدر کے ہاتھوں مجبور ہوکر خود اس دارالمحن سے علیحدہ ہوگیا اور یہ پیشگوئی پوری ہوئی۔

قبر ہی وادیٔ غربت میں بنے گی اک دن
اور کوئی نظر آتی نہیں گھر کی صورت (امیر)

تقدیر نے کہا شاگرد اسی وادی غربت کو اپنا گھر بنائے گا اور یہاں اس کی ظاہری وباطنی ترقی کا ایوان رفیع تعمیر پائے گا۔

حضرت جلیل نے ۱۹۰۰ء سے لے کر ۶ر جنوری ۱۹۴۶ء تک ادھیڑ عمر سے زندگی کے اخیر لحمہ تک حیدرآباد میں گزارا اور اس کو اپنا ایسا وطن بنایا جس کو مرنے کے بعد بھی نہ چھوڑا کہ وہیں آسودۂ خاک ہیں۔

مرحوم نے اپنے بعد بہت سے فرزندان معنوی و ظاہری یادگار چھوڑے، فرزندان ظاہری میں بہت سی لائق اور برسر روزگار باعزاز اولادیں اور اولادوں کی اولادیں ہیں اور فرزندان معنوی ان کی منظوم ومنثور حسب ذیل تصنیفات ہیں:

۱۔ تاجِ سخن (دیوان اول غزلیات)
۲۔ جانِ سخن (دیوان دوم غزلیات)
۳۔ معراجِ سخن (نعتیہ دیوان)
۴۔ سرتاجِ سخن (مجموعۂ قصائد)
۵۔ گلِ صد برگ (سو [۱۰۰] رباعیوں کا مجموعہ)
۶۔ عطرِ سخن (مثنوی) چند کتب ورسائل نثر میں بھی ہیں۔
۷۔ سوانحِ امیر مینائی
۸۔ تعلیم الصلوٰۃ
۹۔ معیارِ اُردو (محاورات)
۱۰۔ تذکیروتانیث (اُردوالفاظ کی تذکیروتانیث میں)
۱۱۔ اُردو کا عروض (اُردو شعر کے مستعمل اوزان)
۱۲۔ روحِ سخن (تیسرا دیوان جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہے)

حضرت جلیل کو دنیا نے جانشین امیر کہہ کر پکارا، یہ جانشینی حقیقت میں پوری پوری تھی، ظاہری و باطنی دونوں اوصاف کے لحاظ سے وہ جانشین تھے، جو زہد وتقویٰ پابندی دینی اور ذکر وفکر ومراقبہ اور خدارسی استاد میں تھی، وہ شاگرد کو ملی تھی، اسی طرح شاعری کے جو اوصاف اور خصوصیات امیر میں تھے، وہی جلیل میں تھے، بلکہ امیر میں قدیم وجدید کے جو دو رنگ تھے وہی جلیل میں تھے، مرآۃ الغیب کا پرانا رنگ اور صنم خانۂ عشق کا نیا رنگ جلیل کے قدیم وجدید کلام میں نمایاں ہیں، استاد کا اتنا صحیح تتبع امیر کے تلامذہ میں کم کسی کو نصیب ہوا۔

جلیل کی شاعری کے خاص خصوصیات کلام کی فصاحت، زبان کی صحت، محاورات کی پیروی، بندش کی چستی، فن کے اصول وفروع کی پوری پابندی اور جملہ کلام کا حشو وزوائد سے یکسر پاک ہونا ہے، جس کا اندازہ ان کے ہر شعر سے ہوتا ہے۔

موجِ ہوا حباب کو سنگِ گراں ہوئی — لیتے ہی سانس شیشۂ دل چور چور تھا

ہائے اس عالم آشنا کی نظر — ہر نظر میں جہاں ہے گویا

ہجومِ اشک میں ملتا نہیں دل — مِرا یوسف ہے گم اس کارواں میں

خم تو ہے ساقیا شراب نہیں — آسماں ہے اور آفتاب نہیں

ہمراہ ساتھیوں کے ہمارا یہ حال ہے — جیسے غبارراہ پسِ کارواں چلے
بحرِ جہاں کی سیر بھی ہونا ضرور ہے — آہستہ اپنی کشتیِ عمرِ رواں چلے

ہے آباد میرے تخیل کی دنیا — حسین آرہے ہیں حسیں جارہے ہیں

جلیلؔ آساں نہیں آباد کرنا گھر محبت کا — یہ اُن کا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں

مار ڈالا مُسکرا کر ناز سے — ہاں مِری جاں پھر اسی انداز سے

فغاں میں درد، دعا میں اثر نہیں آتا
جو تم نہیں ہو تو کوئی ادھر نہیں آتا

نگاہ برق نہیں، چہرہ آفتاب نہیں
وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

عاشقانہ کلام کے ساتھ ساتھ صوفیانہ رنگ بھی ان کے کلام میں فراوانی کے ساتھ موجود ہے۔

کر چکی ہے آپ سے باہر مجھے اس کی تلاش
یہ سفر اپنا سفر اندر وطن ہوجائے گا

حرم کیا میکدہ کیا میں اسے گھر گھر پکار آیا
یہی اب جی میں آتا ہے کہ دستک دوں در دل پر

ہستی ہے عدم مری نظر میں
سوجھی ہے یہ ایک عمر بھر میں

جانتے ہیں تجھے ہم روزِ ازل سے لیکن
یہ نہیں جانتے کیونکر تجھے ہم جانتے ہیں

راہِ طلب میں ایسا وارفتہ کون ہوگا
منزل پہ ہم پہنچ کر منزل کو ڈھونڈھتے ہیں

کریم کے جو کرم کا ظہور ہوتا ہے
خطا سے پہلے ہی عفو قصور ہوتا ہے

حُبِ نبویؐ کا ظہور ان کے نعتیہ کلام سے ہوتا ہے، ان کی ایک نعتیہ غزل جو ابھی حیدر آباد کے ایک اخبار میں نظر سے گذری، درج ذیل ہے۔

لب پہ جس دم مِرے نامِ شہ بطحا آیا
عمر رفتہ پلٹ آئی کہ مسیحا آیا
فرش پر بارش انوار تھی معراج کی رات
عرش پہ دھوم تھی ماہِ شب اسریٰ آیا
جس قدر دادیٔ غربت میں چُبھے تھے کانٹے
بھول سب ہوگئے جس وقت مدینا آیا
یانبیؐ کہہ کے جو کشتی کا اٹھایا لنگر
وجد موجوں نے کیا جوش میں دریا آیا
ہوگئی بے خودی شوق میں طے راہِ دراز
آنکھ کھولی تو نظر گنبدِ خضرا آیا
صرف حُبِ نبوی حشر میں کام آئی جلیل
طاعتیں آئیں نہ زہد آیا نہ تقویٰ آیا

آج شاعر بہت ہیں، مگر استاد کم ہیں، جو فن کے مسائل پر کامل عبور رکھتے ہوں، جو تمام اصنافِ سخن پر برابر کی قدرت رکھتے ہوں، جو لفظوں کے ہاتھوں میں نہ ہوں بلکہ لفظ ان کے ہاتھ میں ہوں، جن کے کلام سے زبان کے الفاظ، محاورات اور امثال کی تصدیق ہو، جن کا دیوان زبان کے سکوں کی ٹکسال ہو، حضرت جلیل اس دور کے جو میرؔ و مرزاؔ سے شروع ہوا تھا، بظاہر خاتم معلوم ہوتے ہیں، اب نیا زمانہ ہے، نئی شاعری ہے، نیا ذوق ہے اور نئے خیالات ہیں، پرانے قاعدے توڑے جارہے ہیں، پرانے اصول مٹ رہے ہیں، تشبیہوں اور استعاروں تک میں بے اصولی آرہی ہے، اور زبان میں کمی بیشی ہورہی ہے اور بحور کے دریا میں بھی تلاطم ہے، ہنرور شاعر اور ہنرور بادشاہ میں بھی تلازم عہدِ عباسیہ سے شروع ہوا تھا، اس کو بھی حضرت جلیل اور میر عثمان علی خاں پر اب تمام سمجھئے۔ (''س''، مارچ ۱۹۴۶ء)

تصحیح: گذشتہ مہینہ حضرت جلیلؔ کے حالات میں ان کا وطن مانک پور، ضلع الہ آباد لکھا گیا تھا، جناب محمد یعقوب صاحب ایڈوکیٹ چیف کورٹ لکھنو نے توجہ دلائی ہے، کہ مرحوم کا وطن مانک پور ضلع الہ آباد نہیں بلکہ ضلع پرتاب گڑھ اودھ تھا، مانک پور نام کی دو بستیاں قریب قریب ہیں، ایک ضلع الہ آباد میں، دوسری پرتاب گڑھ میں، مرحوم دوسرے مانک پور کے تھے۔ (''س''، اپریل ۱۹۴۶ء)

شیرانی، محمود خان، پروفیسر حافظ

پروفیسر حافظ محمود خان شیرانی مرحوم

ہم کو ابھی تک اپنے ملک کے علماء اور محققین کی پوری قدر نہیں ہوئی، کیسے افسوس کی بات ہے کہ ہماری قوم اور ملک کے ایک نامور محقق پروفیسر حافظ محمود خان شیرانی کا انتقال ۱۶/ فروری ۱۹۴۶ء کو ٹونک میں ہوگیا، اور ہم میں سے بہتوں کو اس کی خبر نہیں ہوئی۔

شیرانی مرحوم کا وطن ٹونک تھا، شیرانی پٹھان تھے، اور ان کو اپنے پٹھان ہونے پر فخر تھا، ٹونک ہمیشہ سے علماء اور محققین کا مقام رہا، وہاں کا نادر کتب خانہ اکثر محققوں کو اپنی طرف کھینچ کر لے جایا کرتا ہے، اور شیرانی کا تو وہ وطن ہی تھا، شیرانی صاحب کی انگریزی کی استعداد پوری تھی، فارسی کی تعلیم متوسط اور عربی کی معمولی مگر ان میں تحقیق و تلاش کا مادہ فطرۃً تھا، تاریخ اور خصوصاً تاریخ ادب سے ان کو بے حد شغف تھا، تاریخ کے ذوق سے ان کو کتبوں اور سکون کا شوق تھا، اسی شوق سے وہ لکھنؤ بھی آتے تھے، اور چونکہ ہمارے مدرسہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے درس اول و شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خان صاحب مرحوم بھی ٹونکی تھے، اس تعلق سے وہ کبھی کبھی ہمارے مدرسہ میں بھی ٹھہرتے تھے اور اسی واسطہ سے میری ان کی ملاقات ہوئی، اور اس کے بعد جب وہ لاہور تھے، تو کئی بار ملنا ہوا۔

مرحوم کا سال پیدایش ۱۲۹۸ھ ہے، عمر قریباً سرسٹھ برس تھی ۱۹۰۴ء میں اسکول کی

تعلیم چھوڑ کر بیرسٹری کے لیے لندن گئے، جہاں سے والد کی وفات پر ۱۹۰۶ء میں واپس آئے، پھر فوراً واپس گئے، اور ۱۹۱۴ء میں واپس آئے، بیرسٹر تو نہیں ہوئے، مگر قلمی کتابوں کا شوق پیدا ہوگیا، پیرس کے قومی کتب خانہ میں تین ماہ مصروف رہے، اور وہیں بعض فرانسیسی اہل علم کے ساتھ مل کر قلمی کتابوں اور تصویروں اور سکوں کی تجارت شروع کی پہلی جنگ ۱۹۱۴ء میں ہندوستان واپس آگئے، ۱۹۱۹ء میں لاہور آگئے، اور اورینٹل کالج میں اردو کے پروفیسر ہوگئے۔

مرحوم نیک مزاج، کم آمیز، سادگی پسند اور خاموش طبع تھے، ان کی طبیعت میں تلاش، محنت، تحقیق و تدقیق کا مادہ بدرجہ اتم موجود تھا، تاریخی تحقیقات کے ذوق سے ان کو قدیم بادشاہوں کے سکوں کے جمع کرنے کا جو شوق پیدا ہوا، وہ ان کو نہ صرف ہندوستان کے پرانے شہروں میں، بلکہ انگلستان تک ان کو لے گیا، اور اس سلسلہ میں وہاں کے مستشرقین سے بھی ان کے تعلقات قائم ہوئے، اور ان کو ان کے طریق تحقیق و تنقید سے بھی واقفیت ہوئی۔

ان کا سب پہلا تاریخی اور تنقیدی سلسلہ کا مضمون حضرۃ الاستاذ مولانا شبلی مرحوم کی شعرالعجم کی تنقید ہے، جو رسالہ اردو میں ۱۹۲۲ء سے نکلنا شروع ہوا اور کئی سال تک نکلتا رہا، اور اب انجمن کی طرف سے وہ مستقل کتاب کی صورت میں بھی شائع ہوگیا ہے، یہ تنقید درحقیقت صرف شعرالعجم کی نہیں، بلکہ ان فارسی تذکروں کی ہے، جو شعرالعجم کا ماخذ ہیں، اور شعراء کے حالات میں ان میں تاریخی تحقیق و تنقید سے کام نہیں لیا گیا ہے، بلکہ صرف دلچسپی کی مشہور عام باتوں کو جمع کردیا گیا ہے، اس زمانہ میں یورپ کے علمائے مشرقیات نے بعض شعراء پر جو مستقل مضامین لکھے ہیں، یا کتب خانوں کی فہرستوں میں ان شعراء کے دواوین کے ضمن میں جو کچھ لکھا گیا ہے، یا پروفیسر براون نے اپنی کتاب میں ان منتشر تنقیدی معلومات کو جو یکجا کردیا ہے، پروفیسر شیرانی نے ان سب کو سامنے رکھ کر اپنی ذاتی تحقیقات کے بہت سے اضافوں کے ساتھ اس سلسلہ کو لکھ کر فارسی ادب کی تاریخ کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔

مرحوم کا دوسرا کارنامہ اردو ادب کی تاریخ کی خدمت ہے، اور اس سلسلہ میں ان کی کتاب ''پنجاب میں اردو'' ذکر کے قابل ہے، گو ان کا نظریہ اب بھی محل بحث ہے، تاہم انہوں نے جو سرمایہ ادب فراہم کیا ہے وہ بہت کچھ بصیرت افروز ہے۔

اسی سلسلہ کی ایک مفید خدمت میر قدرت اللہ قاسم کے تذکرہ شعرائے اردو مجموعہ نغز کی تصحیح و اشاعت ہے، جس کو مرحوم نے بڑی محنت و جانفشانی سے ایڈٹ کیا تھا، اور پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے شائع ہوا ہے۔

ان کے علاوہ اور دوسرے مختلف لغوی، ادبی اور تنقیدی مضامین بھی خاص چیز ہیں، جو وہ اورینٹل کالج میگزین میں لکھتے رہے ہیں، ان میں سے ہر ایک مضمون طالب تحقیق کے لیے معلومات کا ذخیرہ ہے، ان مضامین میں بہت سی مشہور عام باتوں کی تصحیح اور تنقید کی گئی ہے، یا گذشتہ معلومات کے سرمایہ میں نیا اضافہ کیا گیا ہے، ان میں سے بعض مضامین کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں، ضرورت ہے کہ باقی کو بھی اسی طریقہ سے شائع کردیا جائے مرحوم کے ان تنقیدی مضامین نے ملک میں ان کی خاص حیثیت قائم کردی تھی، چنانچہ یہ پہلی مثال ہوگی، کہ کاغذی سند کی سند پر نہیں بلکہ ان کی عالمانہ تحقیق کی مثالوں کی سند پر پنجاب یونیورسٹی نے اورینٹل کالج میں ان کو اردو کا پروفیسر مقرر کیا تھا، جس خدمت کو وہ بہت دنوں تک انجام دیتے رہے، آخر ابھی چند سال ہوئے، کہ عمر کی زیادتی کی بنا پر اس سے الگ ہوئے اور ٹونک میں اقامت اختیار کی، جہاں انہوں نے فروری کے وسط میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

مرحوم کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے، چنانچہ انہوں نے سلطان ٹیپو کا ایک پردرد مرثیہ لکھا تھا جو نوجوانوں کو بے حد پسند آیا، اور ان کی محفلوں میں وہ اکثر سنایا گیا، لیکن ان کی شاعری اتفاقی تھی۔

مرحوم کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کی شاندار روایات کا بڑا اثر تھا اور خصوصاً پٹھان بادشاہوں کی علمی، تمدنی خدمات کا پرجوش تذکرہ ایک دفعہ لاہور میں ان کی زبان سے میں نے سنا تھا۔ حافظ قرآن تھے، یہ خود ایک بڑی نعمت ہے اور وسیلہ مغفرت، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ یہی معاملہ کرے۔ (''س''، اپریل ۱۹۴۶ء)

وارثی، محمد اویس، منشی

منشی محمد اویس صاحب وارثی

ناظرین معارف کو نہایت رنج و اندوہ کے ساتھ یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ ہمارے ایک دیرینہ رفیق کار اور دارالمصنفین کے پرانے اور اہم کارکن منشی محمد اویس صاحب وارثی بتیس سال کی رفاقت کے بعد ہم سے جدا ہوگئے، مرحوم نے ۱۸/ ذی الحجہ کو ایک مختصر علالت کے بعد انتقال کیا، وہ دارالمصنفین کے قیام کے آغاز سے اس سے وابستہ تھے، اور آخر دم تک بڑی جانفشانی، اخلاص، خیرخواہی اور دیانتداری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے رہے، اور ہمیشہ اس کو اپنا ذاتی کام سمجھ کر انجام دیا، مکتبہ دارالمصنفین کی ترقی میں ان کی محنت کو بڑا دخل تھا، اس کے تجارتی کاروبار میں ان کی ذات بڑا سہارا تھی، اور دفتری کاموں کا دارومدار انہی پر تھا، اب ان کا جانشین ملنا مشکل ہے، ان خوبیوں کے ساتھ مرحوم شرافت اور وضعداری کا نمونہ تھے، نہایت خوش خلق، شریف الطبع، حق گو، حق پرست، مرنجاں مرنج، اعزہ کے مددگار، احباب کے ہمدرد و غم گسار، ان کا برتاؤ ایسا تھا، کہ ہر شخص ان کو اپنا سمجھتا تھا، سب کے دل میں ان کی یکساں عزت و وقعت تھی، بتیس سالہ زندگی میں کسی کو ان سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی، وہ

دنیاوی معیار سے کوئی اونچی شخصیت کے مالک نہ تھے، نہ صاحب جاہ وثروت تھے، نہ کوئی علمی حیثیت رکھتے تھے، لیکن اگر بڑائی نام ہے اخلاق وشرافت اور سیرت وکردار کی بلندی کا تو مرحوم بہت بڑے آدمی تھے، اللھم اغفرہ مغفرۃ واسعۃ. ناظرین معارف سے بھی مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

("م"، دسمبر ۱۹۴۶ء)

عمر، محمد، مولانا حاجی

مولانا حاجی محمد عمر

کرنول علاقہ مدراس کیا ایک عالم دین کی وفات

احاطہ مدراس کا وہ خطہ جس کو اب اندھرا کہنے لگے ہیں، اور جو مدراس اور حیدرآباد دکن کے بیچ میں واقع ہے وہ بھی کبھی اسلام کی قوت کا مرکز تھا، اس میں کرنول نام مشہور مقام ہے، جہاں پہلے ایک نوابی قائم تھی، وہ مٹ چکی ہے، اور اس کا یادگار خاندان حیدرآباد دکن منتقل ہوگیا ہے، وہاں کی اسلامی طاقت کے زوال سے وہاں کے مسلمانوں کی علمی ودینی کیفیت بھی زوال کے قریب پہنچ چکی تھی، کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی حفاظت کے لیے اپنے ایک بندہ کو مامور فرمایا، ان کا نام مولانا حاجی محمد عمر صاحب تھا، ان کے علم وفضل اور نیکی وتقوی کے سبب سے حاکم ومحکوم دونوں طبقوں میں ان کو ہردل عزیزی حاصل تھی، حکومت نے شمس العلماء کے لقب سے ملقب کیا تھا، اور عام مسلمانوں نے بھی ان کی دینی قیادت اور رہبری کو قبول کیا، موصوف نے اسی ۸۰ برس کی عمر پائی، اور یہ پوری عمر علوم دینی کی تعلیم وتدریس میں بسر کرکے گذشتہ ۲۰؍ جولائی ۱۹۴۶ء کو وفات پائی، ان کی وفات سے اس علاقہ میں علوم قدیمہ کا خاتمہ ہوگیا، مرحوم مولانا احمد حسن صاحب کان پوریؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے، اور جس جلسہ میں ندوہ کی ابتدا کی تحریک کی گئی اسی میں ان کی دستار بندی ہوئی تھی، ۱۳۱۱ھ میں کان پور سے فارغ ہوکر واپسی کے بعد کرنول میں قیام کیا، اور آخر تک وہیں قیام پذیر رہے، وہاں ایک چھوٹے سے مدرسہ کا انتظام جس کی ماہوار آمدنی پندرہ بیس روپیہ سے زیادہ نہ تھی، اپنے ہاتھ میں لیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے کام میں برکت دی مرحوم کے مساعی کی بدولت آج اس کے املاک وعمارات تقریباً تین لاکھ کے مساوی ہیں، آندھرا اور مدراس علاقہ کے اردو فارسی اور عربی اساتذہ میں تقریباً تین ربع بالواسطہ یا بلاواسطہ ان سے فیض تلمذ رکھتے ہیں، کانپور میں حضرت مولانا تھانوی سے مثنوی پڑھی تھی، اور ان کے سلسلہ ادارت میں شامل تھے، مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی سے بھی فیض پایا اور مسلسلیت وغیرہ کی اجازت لی تھی، افسوس ہے کہ وہ گنجینہ علم مفقود ہوگیا، رنج اس بات کا ہے کہ یہ جگہ کچھ ایسی خالی ہوئی ہے کہ اب اس کے پر ہونے کے آثار نہیں، اسلاف کی زندگی کا نمونہ تھے، باوجود ہر طرح کے آرام کے ہمیشہ خود اختیاری فقری کی زندگی پسند کی اور دنیاوی املاک میں سے نہ زمین چھوڑی نہ مکان اور نہ نقد ہمیشہ یہی آرزو رہی کہ دنیا سے ایسے روانہ ہوں کہ ترکہ کا حساب نہ دینا پڑے، وہی بعینہٖ پیش آیا، رحمہ اللہ۔

ندوۃ العلماء کے اغراض ومقاصد سے واقف تھے، اور اصلاح نصاب کے مسئلہ سے متفق تھے، اسی لیے انہوں نے اپنے مدرسہ میں بہت سی اصلاحات جاری کیں، اور مدرسہ کو پرانے علوم کے ساتھ نئے طرز طریق سے آشنا کیا، مرحوم نے اپنا لائق جانشین چھوڑا، افضل العلماء ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب پرنسپل محمڈن کالج مدراس کو مرحوم نے پہلے عربی علوم پڑھا کر عالم بنایا، پھر افضل العلماء کا عربی امتحان مدراس یونیورسٹی سے دلا کر انگریزی پڑھائی اور ان کو ایم اے کرایا، فراغت کے بعد وہ محمڈن کالج مدراس میں پہلے استاد مقرر ہوئے پھر چند سال ہوئے کہ لندن جاکر علم تفسیر پر ریسرچ کرکے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی، اور اب وہ محمڈن کالج مدراس کے پرنسپل ہیں، اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اپنے باپ سے علم وعمل دونوں کی برکت حاصل کی ہے۔

مرحوم سے مجھے سے مدراس کے سفر میں کئی مرتبہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا، بڑے نیک وصالح اور متقی بزرگ تھے، وعظ بھی فرمایا کرتے تھے، سادہ بیان تھا، تکلف وتصنع سے تمام تر بری تھے، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی نوازشوں سے سرفراز فرمائے، اور جس مدرسہ کو انہوں نے اپنی روحانی یادگار چھوڑا ہے، وہ ان کی جسمانی یادگار کے زیر سایہ قائم وباقی رہے۔

("س"، مارچ ۱۹۴۷ء)

حبیب الرحمٰن، حکیم

حکیم حبیب الرحمٰن مرحوم ڈھاکہ

ڈھاکہ کے متعدد دوستوں کے خطوط سے یہ معلوم کرکے بڑا افسوس ہوا کہ بنگال کے جادو نگار ادیب اور نادرۂ روزگار طبیب شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن نے یکم ربیع الثانی ۱۳۶۶ھ کی شب میں ضغطہ دم (بلڈ پریشر) کی بیماری میں سنہ قمری سے اڑسٹھ اور شمسی سے چھیاسٹھ برس کی عمر میں دفعۃً وفات پائی، مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھانوی اپنے والا نامہ میں لکھتے ہیں:

"آپ کو وفیات لکھنے میں ملکہ ہے ایک اور وفات نامہ معارف میں لکھ دیجیے، آپ کے اور میرے مخلص دوست حکیم حبیب الرحمٰن صاحب کا یکم ربیع الثانی ۱۳۶۶ھ مطابق ۲۳؍ فروری ۱۹۴۷ء کی شب میں دفعۃً بلڈ پریشر بڑھ جانے سے انتقال ہوگیا، اناللہ۔

مرحوم حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے ابتدائی صرف ونحو کے شاگرد اور بڑے عاشق تھے، علامہ شبلی کے دوستوں میں تھے، مسلم لیگ کی جب بنیاد ۱۹۰۶ء

میں ڈھاکہ میں رکھی گئی اور نواب سر سلیم اللہ خان اس کے صدر ہوئے تو مرحوم جوائنٹ سکریٹری ہوئے تھے، علم طب حکیم عبدالمجید خان صاحب سے حاصل کیا، اور اس میں کمال کا درجہ پایا، بنگال میں اس وقت ان کے درجہ کا کوئی طبیب نہیں سنا گیا، ڈھاکہ میں طبیہ کالج قائم کیا، اور بڑی ہمت سے اس کو چلانے سے گورنمنٹ نے شفاء الملک کا خطاب دیا، جس کو (لیگ کی تحریک کی بنا پر) ستمبر میں واپس کردیا''۔

ان کے اس کالج سے بہت سے اطبا پیدا ہوئے اور اب بھی سلسلہ درس جاری ہے اور خدا کرے برابر جاری رہے۔

مولانا شبلی مرحوم مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے سلسلہ میں ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ تشریف لے گئے تھے، وہاں سے دو دوستوں کے نام ہم لوگوں کے لیے تحفہ میں اپنے ساتھ لائے، ایک کا نام مرزا فقیر محمد صاحب اور دوسرے کا حکیم حبیب الرحمٰن، مولانا مرحوم کے بعد ان دونوں کی دوستی و محبت کا سلسلہ اس حقیر راقم الحروف کی طرف منتقل ہوا، مرزا صاحب کا مدتوں سے پتہ نہیں، خدا جانے وہ جیتے بھی ہیں یا نہیں، حکیم صاحب مرحوم نے اخیر تک دوستی نباہی، ان کے اخلاق کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جن دوستوں سے ان کی دوستی رہی اس کو وہ اخیر تک بکمال احتیاط و اہتمام نباہتے رہے۔

خط و کتابت کی معرفت تو مولانا شبلی مرحوم کے عہد سے شروع ہوچکی تھی، مگر ملاقات جسمانی کی نوبت ۱۹۳۰ء کے آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر پٹنہ میں آئی، اس کے بعد بارہا وہ ڈھاکہ بلاتے اور اس کے لیے ڈھاکہ یونیورسٹی کے تعلق سے نئی نئی تقریبیں پیدا کرتے رہے، مگر جانا اور ملنا نصیب نہیں ہوا۔

مرحوم نسباً فاروقی اور وطناً یاغستانی علاقہ یوسف زئی کے باشندہ تھے، ان کے والد اخوند محمد شاہ صاحب مولانا عبدالحئی صاحب فرنگی محلیؒ کے شاگردوں میں تھے، لکھنؤ سے ڈھاکہ اپنے ماموں محمد نعمان صاحب مرحوم کے یہاں آئے اور یہیں شادی کرکے بس گئے، اور اس تقریب سے سرحد ہند کی یہ دولت بنگال کی قسمت میں آئی۔

حکیم صاحب مرحوم کی تعلیم جیسا کہ حسن معصومی صاحب (لکچرار فلسفہ اسلام ڈھاکہ یونیورسٹی) نے مجھے لکھا ہے، آگرہ اور بہار میں ہوئی مگر جیسا کہ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے ڈھاکہ سے لکھا ہے کہ ان کی تعلیم کا بڑا زمانہ کانپور میں گذرا، کچھ درسیات اپنے والد سے حاصل کئے، ابتدائی صرف ونحو کے کچھ اسباق جیسا کہ پہلے گذرا حضرت حکیم الامتؒ سے پڑھے، جب حضرت والا رحمہ اللہ کانپور میں درس دے رہے تھے، جس کا خاتمہ ۱۳۱۵ھ میں ہوا، اور زیادہ تر تعلیم مولانا محمد اسحاق صاحب بردوانی سے حاصل کی، معقول مولانا احمد حسن صاحب کانپوری، اور مولانا عبدالوہاب صاحب بہاری سے پڑھی، جب وہ کانپور میں مدرس تھے، حدیث مولانا مفتی لطف اللہ صاحب علی گڑھی اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے ایک شاگرد سے حاصل کی اور اجازت لی، طب حکیم عبدالمجید خان صاحب دہلوی المتوفی ۱۹۰۱ء سے پڑھی اور اس میں کمال کا درجہ حاصل کیا، ۱۹۰۴ء میں وہ تعلیم سے فارغ ہوکر ڈھاکہ لوٹے اور ایک طبیب کی حیثیت سے اپنی زندگی شروع کی، مرحوم کی تعلیم تمام تر پرانے طرز کی ہوئی تھی، مگر فطرت کے خزانہ سے وہ ایک ذہین ولطیف دماغ اپنے ساتھ لائے تھے، اپنے اسی فطری ذوق کی مدد سے تاریخ و ادب کی کتابیں پڑھیں اور طب کے بعد جن فنون سے ان کو ذوق رہا وہ بھی تاریخ و ادب تھے، اور اسی سلسلہ سے وہ مولانا شبلی کے حلقہ ادارت میں داخل ہوئے، چنانچہ ۱۹۰۶ء ان کی زندگی کے لیے بڑی اہمیت کا سال ہے، اسی سال مولانا شبلی سے ملاقات ہوئی، باتوں باتوں میں انہوں نے مولانا شبلی کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ حاجی خلیفہ کی کشف الظنون کی طرح ہندوستان کے ہر صوبہ کی تصنیفات پر ایک محققانہ کتاب لکھی جائے مولانا نے ان کے اس خیال کی تحسین کی، اور بنگال کا حصہ ان کے سپرد کیا، حکیم صاحب مرحوم کے اکثر خطوں میں ان کی اس تصنیف کے تذکرے ہوا کرتے تھے، بنگال سے متعلق ''ثلاثہ غسالہ'' کے نام سے ایک کتاب اوران کے زیر قلم تھی ''ثلاثہ غسالہ'' کا نام انہوں نے حافظ شیراز کی اس غزل سے لیا تھا، جس کو حافظ نے سلطان بنگالہ کے نام لکھ کر بھیجا تھا:

زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

اسی غزل کا ایک ٹکڑا ہے ''ثلاثہ غسالہ می رود''، ''الفارق اور حیاتِ سقراط'' ان کی طالب علمی کے رسالے ہیں، ان کی دوسری تصنیفات کے نام مساجد ڈھاکہ، ڈھاکہ اب سے پچاس برس پہلے شعرائے ڈھاکہ وغیرہ ہیں، آخری تصنیف آسودگانِ ڈھاکہ ہے، جو ابھی ۱۹۴۶ء کے اخیر میں چھپ کر شائع ہوئی، جس میں بزرگان ڈھاکہ کے مزارات کی تحقیق اور تذکرے ہیں، اس کے بعد آسودگان ڈھاکہ کا مصنف خود ڈھاکہ کی خاک میں آسودہ ہوگیا۔

ان کی ادبی تاریخ کا آغاز بھی ۱۹۰۶ء ہی سے ہوتا ہے، اس سال انہوں نے ڈھاکہ سے المشرق کے نام سے ہفتہ وار رسالہ نکالا، پھر جادو کے نام سے ایک ادبی و علمی رسالہ جاری کیا، معارف کے ابتدائی پرچوں میں بھی ان کے بعض مضامین چھپے ہیں۔

مرحوم کے قلم میں بڑی لطافت تھی، محمد حسین آزاد کی نقالی کسی سے نہ ہوسکی لیکن تھوڑی بہت اگر کسی سے ہوئی، تو عجیب بات ہے کہ وہ بنگال ہی کے جادوگران ادب سے ہوسکی، ان میں پہلا نام نواب نصیر حسین خان خیالؔ (کلکتہ) کا اور دوسرا حکیم حبیب الرحمٰن (ڈھاکہ) کا ہے، افسوس ہے کہ ان کی طبی مصروفیتوں نے ان کے ادبی کارناموں کو ابھرنے کا موقع نہیں دیا، اور ان کی یہ قوت انشاپردازی پوری طرح ظاہر نہ ہوسکی۔

ان کو اردو ادب اور بنگال کی تاریخ سے خاص ذوق تھا، اور تاریخ کے تعلق سے

قدیم سکوں کے جمع کرنے کا شوق تھا، چنانچہ ان کے جمع کردہ سکوں کا پہلا مجموعہ اس وقت ڈھاکہ کے عجائب خانہ آثار قدیمہ میں ہے، جس کا تاریخ وار کیٹلاگ بھی چھپ کر شائع ہوچکا ہے، اس کے بعد جو سرمایہ ان کے پاس جمع ہوا، اس کو دارالمصنفین کے نام منتقل کرنے کا بارہا ارادہ انہوں نے کیا، مگر ارادہ پورا نہ ہوا۔

مرحوم طبیب اور حاذق طبیب تھے، قیافہ اور نباضی میں کمال رکھتے تھے، صورت دیکھ کر اور صرف حال سن کر مرض بتادیتے تھے، حضرت حکیم الامت کی علالت کا حال مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی سے سن کر مرض کی تشخیص کی اور دوا تجویز کی، جب تھانہ بھون سے خطرناک حالت کی اطلاع آئی تو کہا کہ اب دوا بیکار ہے معلوم ہوتا ہے کہ وقت آخر آپہنچا اور آخر جیسا انہوں نے کہا ویسا ہی ہوا۔

مرحوم کی حذاقت کا ایک واقعہ مجھ سے متعلق ہے، کئی سال کی بات ہے میں نے ریڈیو پر ایک تقریر کی، مرحوم نے ڈھاکہ سے لکھا میں نے ریڈیو پر آپ کی آواز سنی جو آپ کے ضعف قلب کا اعلان کررہی تھی اس کی جلد خبر لیں، چنانچہ چند ہی روز کے بعد مجھے اسی قسم کے ایک سخت مرض کا سانحہ پیش آیا، جس سے اللہ تعالیٰ نے جانبری فرمائی۔

مگر آہ! مسیحا نفس جو دوسروں کو موت کے پنجہ سے چھڑایا کرتا تھا، آخر وہ دن بھی آیا جب وہ خود اس کے پنجہ میں گرفتار ہوا، مرحوم کو کئی مہینوں سے اپنے اس آنے والے حادثہ کا خیال تھا، جنوری ۱۹۴۷ء میں بعض دوستوں سے کہہ چکے تھے، کہ میں جب جاؤں گا، دفعتہً جاؤں گا، جس دن حادثہ پیش آیا، متعدد مریضوں کو جا کر دیکھا، مغرب بعد نشست گاہ میں بیٹھ کر دوستوں سے باتیں کیں، ہنستے بھی رہے، ہنساتے بھی رہے، اور اسی سلسلہ میں فرمایا کہ آج مولانا عثمانی ڈھاکہ میں نہیں، اس کی فکر ہے، ان کو اپنی حالت سے اندازہ ہورہا تھا کہ کوچ کی منزل قریب ہے، اس لیے کچھ وصیتیں بھی کرچکے تھے، جن میں ایک یہ تھی کہ میری نماز مولانا ظفر احمد تھانوی پڑھائیں، اور اگر وہ نہ ہوں تو پیر جی عبدالوہاب مہتمم مدرسہ اشرف العلوم پڑھائیں، چنانچہ تقدیر یہی تھی، کہ مولانا عثمانی اس دن کہیں باہر تھے، تین بجے شب کو قلب کا دورہ پڑا، ڈاکٹر کے لیے آدمی گیا، جیسے ہی اس نے چوکھٹ پر قدم رکھا ہے، مسافر عالم بالا کے سفر پر روانہ ہوگیا، آناً فاناً خبر شہر میں پھیل گئی، صبح کو تجہیز و تکفین عمل میں آئی، جنازہ میں اتنا مجمع تھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ ڈھاکہ میں شاید ہی کسی کے جنازہ میں ایسا مجمع ہوا ہو، حسب وصیت پیر جی عبدالوہاب نے نماز پڑھائی، جو لال باغ کی شاہی مسجد میں ہوئی، اور ڈھاکہ کے ایک بزرگ کے احاطہ مزار میں سپرد خاک ہوئے۔ مرحوم کے سانحہ وفات پر شہر میں کہرام ہے، عام و خاص سب ہی متاثر ہیں اہل قلم طبقہ پر مرحوم کی وفات کا جو اثر ہوا وہ ان دو عربی مرثیوں سے ظاہر ہے جو ڈھاکہ کے دو بزرگوں نے لکھ کر بھیجے ہیں۔

حبیبی! دوستوں نے تمہارے لیے مرثیے لکھے، احباب نے تمہارے فراق میں آہِ جگرسوز کھینچی، جاننے والوں نے تمہارے اوصاف گنائے، ماننے والوں نے تمہارے احسانات یاد کیے، مگر تم اس دنیا میں ہو، جہاں اس دنیا کی مدح وستایش کی حکایتیں نہیں پہنچتیں، مغفرت کی دعائیں، تمہارے لیے ہیں، غفور ورحیم ان کو قبول فرمائے۔

(''س''، اپریل ۱۹۴۷ء)

پھلواروی، محی الدین، مولانا شاہ

حضرت مولانا شاہ محی الدین پھلواروی امیر شریعت بہار

پھلواری پٹنہ سے چند میل پچھم ایک مردم خیز قصبہ ہے، جو صدیوں سے اس صوبہ کا علمی اور مذہبی مرکز ہے، یہاں خانقاہ مجیبی قائم ہے، جہاں ظاہر و باطن اور علم و عمل دونوں کے سرچشمے آکر ملتے ہیں، اس خانقاہ کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ شروع سے اب تک اس کے سجادہ نشین علم شریعت و طریقت دونوں کے جامع رہے ہیں، یعنی ہر صاحب سجادہ صوفی صافی ہونے کے ساتھ عالم دین بھی ہوتے آئے ہیں، دستار فضیلت اور خرقہ مشیخت دونوں یہاں ایک جسم پر آراستہ رہے ہیں، اور اب دو پشتوں سے یہاں کے صاحب سجادہ صوبہ کے امیر شریعت بھی ہورہے ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کے ملفوظات میں اس خاندان کے معاصر شیخ کا تذکرہ مدح کے ساتھ آیا ہے، مولانا شاہ اسمٰعیل شہید نے اپنے سفر بہار و بنگال میں اس خانقاہ میں بھی قدم رنجہ فرمایا۔

سجادہ نشین جاں حضرت مولانا شاہ محی الدینؒ خلف حضرت مولانا شاہ بدرالدین صاحبؒ نے چند سال کے اضمحلال طبع اور تسلسل علالت کے بعد ۲۹/ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۶ھ مطابق ۲۲/ اپریل ۱۹۴۷ء کی صبح کو ستر سال کی عمر میں اس دار فانی کو الوداع کہا، اور زمانہ قدیم کی ایسی یادگار مٹ گئی، جس کی زیارت سے بزرگوں کی بہت سی نشانیاں ایک ذات میں نظر آتی تھیں۔

مجھ ہیچمدان کو مرحوم سے گوناگوں تعلقات حاصل تھے، میرے والد مرحوم نے ان کے والد مرحوم کے ساتھ ان کے نانا حضرت شاہ علی حبیب صاحب قدس سرہ سے فیض ارادت اور تکمیل باطن حاصل کی تھی، میرے والد مرحوم کی پیدائش ۱۲۵۷ھ میں ہوئی تھی، اور اخذ وفیض و استفادہ جوانی میں شروع کیا، جس کے معنی یہ ہیں، کہ اس واقعہ پر اسی (۸۰) نوے (۹۰) برس گذر چکے، میرے بڑے بھائی مرحوم کی تعلیم کی تکمیل اور دستار بندی شاہ محی الدین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے ماموں مولانا شاہ عین الحق صاحب مرحوم کے ساتھ اسی خانقاہ پھلواری ہی میں ہوئی، میری عمر جب تیرہ چودہ برس کی تھی، غالباً ۱۸۹۹ء میں والد مرحوم کے حسب الحکم بغرض تعلیم اسی خانقاہ میں طالب العلم رہا، اس وقت شاہ محی الدین صاحب کی آخری کتابیں مولانا عبدالرحمان صاحب سے ہورہی تھیں، یہ مولانا عبدالرحمان صاحب ناصری گنج ضلع آرہ کے باشندہ

اور مولانا عبدالعزیز صاحب امروہوی کے شاگرد تھے، جو مولانا فضل حق صاحب خیر آبادی کے مشہور شاگرد اور ممتاز مدرس تھے، اس وقت میری عربی کی ابتدائی کتابیں تھیں، مجھے خانقاہ میں خاص حضرت شاہ صاحب مرحوم کے قریب قیام کی اور ایک ساتھ طعام کی اور زیر درس کتابوں میں شاگردی کی سعادت حاصل ہوئی، مجھے اس نسبت پر فخر اور انہیں اس پر مسرت تھی، انہیں جب دیکھتا تھا، عہد اول یاد آجاتا تھا، اور ان کو بھی خوشی ہوتی تھی، افسوس کہ اس بزرگانہ تبسم کا منظر اب ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے پنہاں ہوگیا۔

مرحوم کی پیدائش کا سال ۱۲۹۶ھ ہے، ابتدائی کتابیں اپنے والد بزرگوار امیر شریعت اول مولانا شاہ بدرالدین صاحب قدس سرہ سے پڑھیں بقیہ درسیات مولانا عبداللہ صاحب رامپوری سے حاصل کیں، اور تحصیل فراغ جیسا کہ ابھی گذرا ۱۳۱۸ھ میں مولانا عبدالرحمان صاحب سے حاصل ہوئی، طب کی تعلیم بھی پھلواری ہی کے ایک قیام پذیر بزرگ مولوی حکیم وارث حسن صاحب سے حاصل کی، مگر عملاً کبھی مطب نہیں کیا، سجادہ نشینی سے پہلے تک درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا، ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۹۲۴ء میں اپنے والد ماجد کی وفات کے بعد وہ سجادہ نشین اور صوبہ بہار کے امیر شریعت ثانی ہوئے اور اس وقت سے اخیر تک وہ ہدایت خلق اور اپنے متبعین اور معتقدین کے تزکیہ و تصفیہ و تعلیم طریقت اور اپنے نقطہ نظر سے بہار کے مسلمانوں کی قومی خدمت میں مصروف رہے، ۱۳۴۴ھ میں حج و زیارت کے لیے حجاز و عراق و شام کا سفر کیا، اور لوگوں کو اپنے برکات سے مستفید اور ان ملکوں کے بعض بزرگوں سے استفادہ کیا۔

وہ حد درجہ شریف، نیک، صلح پسند، متواضع، اور صورت اور سیرت، لباس، ہر چیز میں نمونہ سلف تھے، مذاق حال سے بھی آشنا تھے، تقریر و تحریر پر قدرت رکھتے تھے، متعدد مجالس میں شرکت فرمائی، قومی اجتماعات میں تقریریں کیں، مساجد میں وعظ و پند سنائے، تحریک خلافت کے زمانہ سے سیاسیات میں بھی شرکت کی، خلافت کانفرنس منعقدہ آرہ اور جمعیۃ العلمائے بہار کے اجلاس منعقدہ دربھنگہ کی صدارت کی وقتاً فوقتاً ان کے سیاسی خیالات اور امیر شریعت کی حیثیت سے ان کے فرامین بھی شائع ہوا کرتے تھے۔

اب ان کی وفات سے مسلمانان بہار ایک بڑی نعمت سے محروم ہوگئے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جانے والے کو اپنی نوازش بے پایاں سے اور رہ جانے والوں کو اپنی نصرت بے کراں سے سرفراز فرمائے۔ ("س"، جون ۱۹۴۷ء)

عمادی، عبداللہ، مولانا

آہ! مولانا عمادی

حیدرآباد دکن کے اخبار البلاغ سے یہ معلوم کر کے سخت صدمہ ہوا کہ ہمارے قدیم دوست مولانا عبداللہ العمادی نے حیدرآباد میں جہاں انھوں نے سکونت اختیار کر لی تھی، ۱۱رشوال ۱۳۶۶ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا، ان کی عمر اس وقت ستر برس کے قریب ہوگی، مرحوم اردو، فارسی اور عربی کے مستند ادیب اور مورخ تھے اور تقریباً ہر علم و فن سے آشنا تھے۔

مرحوم کا وطن ضلع جونپور میں امرتھوا نام ایک موضع تھا، اور عمادالدین نام کے کسی بزرگ کے خاندان سے نسبی نسبت رکھتے تھے اور اسی تعلق سے اپنے کو عمادی لکھتے تھے، اصلی نام عبداللہ تھا اور کبھی کبھی اخفائے نام کے لیے عبداللہ کا فارسی ترجمہ "خدابندہ" بھی لکھا ہے، جو سب سے پہلے نومسلم تاتاری سلطان کا نام تھا، مگر شہرت عام عبداللہ عمادی کے نام سے تھی۔

غالباً ابتدائی تعلیم کے بعد ہی یہ لکھنؤ آگئے تھے، اور مولانا عبدالعلی آسی مدراسی کے دامن تربیت میں پرورش پائی، مولانا عبدالعلی کا اصل وطن گو مدراس تھا، مگر جب سے تعلیم کے لیے لکھنؤ آئے یہیں کے ہوکے رہ گئے، یہیں فرنگی محل میں مولانا عبدالحئی صاحب فرنگی محل سے تعلیم پائی، ادب، شعر اور تاریخ گوئی میں ملکہ رکھتے تھے، اکثر کتابوں کے آخر میں جو ان کے مطبع میں چھپیں ان کی تاریخیں آپ کو مل سکتی ہیں، ان کی صحبت میں مولانا عمادی صاحب کو بھی زیادہ تر شعر و سخن اور ادب و تاریخ کا فائدہ پہنچا، مولانا عبدالعلی ایک زمانہ میں رامپور میں مدرس تھے، وہاں بھی وہ ان کے ساتھ رہے، پھر جب وہ لکھنؤ آئے، تو وہ بھی ان کے ساتھ یہاں آئے اور یہیں ان کے مرغ شہرت نے پر و بال پیدا کئے۔

مولانا آسی نے لکھنؤ محمود نگر کے محلّہ میں سکونت اختیار کی اور اصح المطابع کے نام سے ایک مطبع قائم کیا، بعد کو اس کا نام ان کے صاحبزادہ قاری عبدالولی مرحوم نے آسی پریس رکھ دیا تھا، اس مطبع میں عربی کی بہت سی کتابیں چھپ کر شائع ہوئیں، مولانا آسی کو کتابوں کی تصحیح میں بڑی مہارت اور وقت نظر حاصل تھی، عربی متوسطات کے طالب علموں کو بھی وہ باجرت تصحیح کے کام پر رکھ لیتے تھے، اور مولانا کی صحبت میں وہ کچھ نہ کچھ بن جاتے تھے، مولانا عمادی بھی انہی خوش قسمت طالب علموں میں تھے اور اپنی خداداد استعداد سے اس صحبت سے بہرۂ وافر حاصل کیا۔

مرحوم کسی درسگاہ کے باقاعدہ طالب علم نہ تھے، اور نہ علم مروجہ کی درس و تدریس کی حیثیت سے تکمیل کی تھی، مگر موہبت الٰہی رسمی طریقہ تعلیم پر موقوف نہیں، اس کا فیض عام اور بقدر استعداد و تام ہے کتب بینی کے شائق تھے اور خصوصیت کے ساتھ اردو، فارسی اور عربی کی نظم و نثر کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور ان تینوں زبانوں میں ان کو شاعری اور انشاء پردازی کی قوت حاصل تھی، اور ان زبانوں کے ہزاروں شعر ان کے خزانہ و دماغ میں محفوظ تھے اور عربی و فارسی لغات پر بھی عبور رکھتے تھے۔

مرحوم مجھ سے فرماتے تھے کہ وہ عربی کی الف لیلہ سمجھتے نہیں تھے، مگر پھر بھی وہ

اس کو دیکھا کرتے اور جو کچھ سمجھ جاتے اس پر خوش ہوتے، اور جو نہ سمجھتے، اس کو لغت سے حل کرتے یا شاید مولانا آسی سے دریافت کرلیتے، اور اس طرح ان کو عربی انشا پردازی کا ذوق پیدا ہوا، اور عربی میں مضمون نویسی کی قدرت حاصل کی، جو اس زمانہ میں غیر معمولی بات تھی۔ اسی سلسلہ میں بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں مولانا آسی کی رہبری اور ان کی اڈیٹری میں البیان نام ایک اردو عربی ماہانہ رسالہ مطبع اصح المطابع لکھنؤ سے نکلنے لگا، اس کے ہر صفحہ میں اردو کالم ہوتے تھے، ایک میں عربی اور دوسرے میں اس کا اردو ترجمہ ہوتا تھا اور آخر میں چند صفحے عربی ممالک کی خبروں اور اردو مضمونوں کے ہوتے تھے، اس رسالہ کا مبادلہ مصر و شام و تیونس کے عربی اخباروں سے ہوتا تھا، یہ اخبارات ان کے ہاں آتے تھے اور وہ اس کو پڑھا کرتے تھے اور اس کے بدولت جدید عربی کے نئے الفاظ سے ان کو پوری واقفیت ہوتی رہتی تھی اور وہ ان کو اردو میں رواج دینے کی کوشش کرتے تھے چنانچہ ان کے بعض الفاظ رواج بھی پاگئے۔

اس زمانہ میں ہمارے استاد مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی، مدرس اول دارالعلوم ندوہ لکھنؤ میں مقیم تھے، مرحوم ان کی خدمت میں آیا جایا کرتے تھے، یہ تو معلوم نہیں کہ ان سے پڑھا تھا یا نہیں مگر وہ ان کے صحبت یافتہ ضرور تھے، مولانا چریا کوٹی ۱۹۰۵ء تک لکھنؤ رہے تھے، اس کے بعد ہی اسی سال جب ان کے شاگرد رشید مولانا شبلی مرحوم دارالعلوم میں معتمد ہوکر آئے تو مولانا عمادی ان کی صحبتوں میں آنے جانے لگے اور یہی زمانہ مرحوم سے میرے آغاز ملاقات کا تھا، جو بحمداللہ اس وقت سے شروع ہوکر آخر وقت تک قائم رہا۔

ندوہ کا علمی پرچہ الندوہ جو پہلے دفتر ندوہ کے شاہ جہان پور ہونے کے سبب سے شاہ جہان پور سے نکلتا اور آگرہ میں چھپتا تھا، مولانا شبلی کے قیام لکھنؤ کے بعد لکھنؤ سے نکلنے لگا، اور اصح المطابع میں چھپنے لگا، اور مولانا عمادی کی آمدورفت اس تعلق سے زیادہ ہونے لگی، ۱۹۰۶ء میں مولانا شبلی نے اس کی سب اڈیٹری کا کام مولانا ابوالکلام کے سپرد کیا، چند ماہ کے بعد جب وہ وکیل امرتسر میں چلے گئے تو مولانا نے مرحوم کو ان کی جگہ الندوہ کا سب اڈیٹر بنایا، اس زمانہ میں انھوں نے جابر بن حیان مشہور عرب کیمیادان اور ابن خلدون وغیرہ پر چند علمی مضمون لکھے، مگر مرحوم کو کتابوں کے حوالے دینے کی عادت نہ تھی، اس سے مولانا شبلی کو ان کے حوالوں پر اعتماد نہیں ہوتا تھا، چنانچہ چند ہی ماہ کے بعد یہ خدمت خاکسار سے متعلق کی گئی، اس کے بعد اس بنا پر کہ ماہ بماہ پرچہ کا اہتمام مجھ سے نہ ہوسکا، پھر یہ خدمت عمادی صاحب کے سپرد کی گئی، اس کے بعد پھر یہ خدمت ہمارے دوست مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کو اور کبھی مجھ کو ملتی رہی اور مجھ پر اس کا خاتمہ ہوا۔

غالباً ۱۹۰۸ء کے شروع میں مولانا ابوالکلام نے اپنے والد ماجد کے مرض الموت کے سبب سے اپنے والد کے اصرار سے وکیل امرتسر کی ادارت چھوڑ کر کلکتہ گئے، تو وکیل کے مالک غلام محمد صاحب مرحوم نے مولانا عمادی کو ان کی جگہ بلایا اور وہ کئی سال اس تعلق سے امرتسر میں رہے اور وہاں انھوں نے سرسید کے تہذیب الاخلاق کو پھر زندہ کیا اور کئی نمبر اس کے نکالے اور اس کی طرف سے بعض اپنے رسائل اور دوسروں کی کتابوں کی باجازت اشاعت کی اور سرسید کے بعض رسالوں کو دوبارہ چھاپا، مرحوم نے وہاں جو رسالے لکھے ان میں سے عرب قدیم اور صناع العرب کے نام اس وقت یاد ہیں ان کے امرتسر چلے جانے کے بعد البیان کی ادارت میرے حصہ میں آئی اور تقریباً سال بھر اس کو میں چلاتا رہا۔

۱۹۱۲ء میں مولانا ابوالکلام کی ادارت میں جب کلکتہ کے افق سے ہلال (الہلال) نمودار ہوا تو چند ماہ کے بعد میں الہلال کی ادارت میں شامل ہوا، میرے کچھ ہی دنوں کے بعد مولانا عمادی بھی وہیں آگئے، اور چند مہینوں تک میں اور وہ دونوں ایک ہی ساتھ ایک جگہ الہلال کے دفتر میں رہے، اور کام کیا کئے اس زمانہ میں الہلال میں انھوں نے جو مضمون لکھے، ان میں سے اسوۂ نوح، اسوۂ ابراہیمی اور کشف ساق تین عنوان یاد ہیں۔

چند ہی مہینوں کے بعد ہم دونوں الگ ہوگئے، وہ زمیندار لاہور میں چلے گئے، اور میں حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی کے حسب الحکم دکن کالج پونا چلا گیا، نومبر ۱۹۱۴ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۲۸ھ میں جب مولانا شبلی کی اور دسمبر ۱۹۱۴ء مطابق محرم ۱۳۲۸ء میں مولانا حالی کی وفات ہوئی ہے، تو مولانا عمادی زمیندار میں تھے، اور اسی اخبار میں ان دونوں مرحومین پر پراثر مضمون لکھے، اور مولانا شبلی مرحوم کی وفات کے سلسلہ سے انہی کے تعلق کے سلسلہ سے میرے چند مسلسل مضمون نکلے پھر زمانہ کا انقلاب دیکھئے، کہ حیدرآباد دکن میں جامعہ عثمانیہ کی نصابی کتابوں کے لیے دارالترجمہ قائم ہوا، اور زمیندار کے اڈیٹر ظفر علی خان اعلیٰ حضرت حضور نظام میر عثمان علی خان کے ایام شاہزادگی کے سابقہ معرفت کے سبب سے جب دکن آئے، تو مولانا عمادی کے حیدرآباد آنے کا وہ ذریعہ بن گئے، ظفر علی خان تو سیاسی شورشوں کے طوفان میں بہہ گئے، مگر مولانا عمادی اپنے فضل و کمال اور مرنجان مرنج طبیعت کے سبب سے اپنے جگہ جمے رہے، اور ایسے جمے کہ مرکر ہٹے۔

دارالترجمہ میں وہ اپنے لغات دانی اور جدید عربی مصطلحات علمی کی واقفیت کے سبب سے بہت کارآمد ثابت ہوئے وہ دارالترجمہ کی دو جماعتوں میں سے اس جماعت میں تھے، جو اردو میں عربی مصطلحات کے رواج کے لیے کوشاں تھی، میں نے سنا ہے کہ ان کی کثرت لغات کے سبب سے اعلیٰ حضرت حضور نظام نے ان کو کبھی قاموس کہہ دیا تھا اور خیال تھا ان کو قاموس جنگ کا خطاب نہ مل جائے۔

وہ دارالترجمہ میں واضع اصطلاحات کے علاوہ مترجم بھی رہے، ان کے قلم سے

متعدد عربی تاریخوں کے ترجمے اردو میں دارالترجمہ سے شائع ہوئے ہیں، اس سلسلہ میں تاریخ طبری، طبقات ابن سعد اور تاریخ یعقوبی کے ترجمے انھوں نے غالباً کئے ہیں، مترجم کے علاوہ وہ دارالترجمہ کے ناظر مذہبی بھی رہے، یعنی دارالترجمہ کی مترجمہ اور مولفہ کتابوں پر اس حیثیت سے نظر ڈالتے تھے، کہ ان میں مذہبی معتقدات اور مذہب کے خلاف کوئی بات تو نہیں، اور غالباً اسی خدمت کے بعد ان کو پنشن ملی، مگر اس پنشن کے بعد بھی انھوں نے حیدرآباد کو نہیں چھوڑا، بلکہ وہیں توطن اختیار کرلیا، اور ان کے فرزند اور بعض عزیز حیدرآباد کی ملازمتوں پر سرفراز کے گئے، اور اب بھی ہیں۔

مرحوم حیدرآباد کی علمی مجلسوں اور محفلوں کے جز ہوگئے تھے، دائرۃ المعارف اور کتب خانہ آصفیہ جو مملکت دکن کے دو اہم اور عظیم الشان علمی مرکز ہیں، وہ ان دونوں کے مشیر اور رکن رکین تھے۔

مرحوم نہایت خلیق اور ملنسار تھے، اور اپنے ہر ملنے والے کی اتنی تعظیم و تکریم کرتے تھے، کہ بسا اوقات اس بیچارہ کو یہ غلط فہمی ہوجاتی تھی، کہ وہی مخاطب سے ہر حیثیت میں بڑا ہے لیکن اس باب میں وہ اپنی سادہ فطرت کے ساتھ تکلف کو بھی کام میں لاتے تھے، اس لئے حقیقت مشتبہ ہوجاتی تھی، ان کو شواذ اور نوادر مسائل سے بھی دلچسپی تھی اور اس لیے وہ کبھی کبھی بطور بحث کسی شاذ رائے کو ثابت کرنے کے لئے بڑا زور لگاتے تھے لطائف و ظرائف کا ذخیرہ بھی ان کے پاس کم نہ تھا، کسی بات کو وہ غلط بھی جانتے ہوں مگر کیا خوب! وہ اس طرح کہتے تھے کہ سننے والا یہ سمجھتا تھا کہ وہ اس کی تحسین کررہے ہیں۔

عزیز پروری ان کی خصوصیت تھی ایک دفعہ کلکتہ سے اپنے وطن جارہے تھے، اور بہت سے روپیوں کی ضرورت ظاہر کررہے تھے میں نے پوچھا اتنے روپے کیا ہوں گے، فرمایا جب گھر جاتا ہوں تو غریب اعزہ آتے ہیں ان کی مدد کرنے کو جی چاہتا ہے، ہر ایک کو اس کے حسب حیثیت کچھ دیتا ہوں حیدرآباد جب میرا جانا ہوتا، مرحوم باصرار مدعو کرتے، اور ماحضر پیش فرماتے، اور طعام و کلام دونوں سے بہرہ اندوز کرتے۔

مرحوم مشرقی تعلیم کے ان نمونوں میں سے تھے جن کے مٹنے کے بعد ان کی جگہ ہمیشہ خالی رہے گی، جب وہ کلکتہ سے وطن کو جارہے تھے، تو میں نے کلکتہ میں اپنی تنہائی محسوس کرکے ان کو ایک خط میں اپنا ہی ایک عربی شعر لکھ کر بھیجا تھا۔

لوانی علمت ماتجسمت بعده

منحت الفظاران تمید برکبها

جس کا ترجمہ یہ ہے اگر مجھے پہلے معلوم ہوتا کہ ان کے بعد مجھے کیا تکلیف ہوگی، تو میں ریل کو روک دیتا، کہ وہ اپنے سواروں کو لے کر اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے لیکن اب اس رفیق قدیم کو وہ سفر پیش آیا جس کو شاعرانہ طور پر بھی روکا نہیں جاسکتا، اور جس سفر پر سب کو ایک دن روانہ ہونا ہے، اور جہاں کی رفاقت کا حق رفیق اعلیٰ کے سوا کوئی رفیق و عزیز بھی ادا نہیں کرسکتا، اور جس سفر کا زادِ سفر عمل کے سوا کچھ نہیں، فرحمہ اللہ تعالیٰ۔ (''س''، اکتوبر ۱۹۴۷ء)

گاندھی، مہاتما

فدائے انسانیت گاندھی!

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے

واحسرتا کہ آج قلم کو امن و سلامتی کے اس داعی عدل و انصاف کے اس علمبردار اور اخلاص و عمل کے اس پیکر کا ماتم کرنا پڑا جو ساری عمر ملک و قوم کا غم گسار رہا، اور اس کی راہ میں جان عزیز تک قربان کردی اور کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ اس بدقسمت ملک و قوم کے ایک فرد کے ہاتھوں اس کے محسن اعظم کی شمع حیات گل ہوئی، جس کی عزت و سربلندی کے لئے اس نے اپنی پوری عمر صرف کردی اور اس کو زمین کی پستی سے اٹھا کر آسمان کی بلندی تک پہنچا دیا، لیکن دنیا کے بہت سے اکابر اور محسنین انسانیت اس درجہ عظمیٰ پر سرفراز ہوئے، پھر یہ جلیل القدر انسان اس خلعت امتیاز سے کیوں محروم رہتا، یہ تو اس کی عظمت و جلالت کی آخری اور سب سے بڑی سند ہے۔

مادیت کے اس تاریک دور میں جب کہ مہذب انسان انسانیت کی بربادی کے درپے ایٹم بم کی تیاری میں مشغول، ساری دنیا آگ و خون کے سمندر میں غرق اور امن و سلامتی کو ترستی ہے، اس محسن انسانیت نے دنیا کو الفت و محبت اور اخوت و مساوات کا پیام دیا اور اخلاق و روحانیت کا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا اور بے تیغ و تفنگ کے اخلاقی قوت سے فتح حاصل کرنا اور دلوں کو مسخر کرنا سکھایا، اور عملاً ثابت کرکے دکھا دیا کہ دنیا میں اصل طاقت اسلحہ کی نہیں بلکہ اخلاق کی ہے اور اسی کے ذریعہ دنیا میں ہندوستان کا سر اونچا کیا، اس نے مکر و فریب کی سیاست میں سچائی کی روح پھونکی وہ مظلوموں کا حامی، غریبوں کا سہارا اور بے نواؤں کا آسرا تھا، اس نے غریب بن کر غریبوں کی خدمت کی، اور غربت ہی میں اس دنیا سے سدھارا، اس نے نیکی اور سچائی کے لئے جان دی، عدل و انصاف کے لئے جان دی، اخلاق و شرافت کے لئے جان دی اس لئے اس کی موت درحقیقت ہندوستان کی عزت و ناموس اور اس کے وقار و عظمت کی موت اور عالم انسانیت کا حادثہ ہے۔

اس کی زندگی میں ہندوستان کی سیاست میں بڑے بڑے انقلاب آئے، نفرت و عداوت کی آندھیاں چلیں وحشت و درندگی کے طوفان اٹھے، سفاکی اور خونخواری کے پہاڑ ٹوٹے، لیکن یہ کوہ وقار اپنی جگہ قائم رہا اور کوئی قوت اسے ہلا نہ سکی، اس استقلال

میں جان تک دے دی اور مرکر ثابت کر دیا کہ وہ کسی خاص فرقہ وقوم کا نہیں بلکہ پورے ہندوستان کا لیڈر تھا۔

اس لحاظ سے وہ خوش نصیب تھا کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے آزادی کا بیج بویا اور اس کے نازک پودے کو سیاست کے طوفانی حوادث سے بچا کر پروان چڑھایا، لیکن یہ کتنے حسرت واندوہ کا مقام ہے کہ جب اس کے برگ وبار لانے کا وقت آیا تو باغبان خود اس دنیا سے رخصت ہوگیا اور اپنے چمن کی بہار نہ دیکھ سکا، ابھی تو آزادی کا صرف دروازہ کھلا تھا، اصل منزل مقصود دور تھی کہ کاروان آزادی کا سالار خود کوچ کر گیا، آزادی ملتے ہی نفرت وعداوت کی ایسی آگ بھڑکی جس نے ہندوستان کے حاصل اور اصل خرمن ہی کو جلا کر خاکستر کر دیا، ہندوستانیوں کی پیشانی پر ایسا کلنک کا ٹیکہ ہے جو مٹائے نہ مٹے گا، لیکن جانے والا اس جہان سے سرخرو اٹھا اور دنیا میں ہمیشہ کے لئے نیک نام چھوڑ گیا،

ہرگز نہ میرد آن کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

یہ سنت اللہ ہے کہ سچی قربانی کبھی رائگاں نہیں جاتی، قربانی کرنے والے کا مادی وجود تو ختم ہوجاتا ہے لیکن اس کا نصب العین ہمیشہ کے لئے زندہ ہوجاتا ہے اور جو روح زندگی نہ پیدا کرسکی تھی وہ موت پیدا کردیتی ہے، دنیا کی تاریخ اس کی شاہد ہے، ہندوستان کے فدائی اعظم نے اس کے لئے سب سے بڑی قربانی پیش کی ہے، یہ اپنا اثر رکھا کررہے گی اور ہندوستان کا چمن اس کے خون کی آبیاری سے لہلہائے گا۔

اگر ہماری عقلوں پر پردے نہیں پڑ گئے ہیں تو گاندھی کی موت ہندوستان کی زندگی بن سکتی ہے، اس وقت بلاتفریق مذہب وملت ہر ہندوستانی اس کی یاد میں دلفگار اور تلافی مافات کے لئے بے قرار ہے، ان جذبات سے اس کے مشن کا کام لیا جاسکتا ہے، گاندھی کی سب سے بڑی محبت اور سب سے بڑی یادگار یہی ہے کہ اس مشن کو مقصد بنالیا جائے، یہی امن وسلامتی کی راہ اور ہندوستان کی فلاح وترقی کا صحیح راستہ ہے اور اسی سے اس کی روح مسرور ہوگی، اگر ہم اتنا بھی نہ کرسکے تو ہماری محبت کے سارے دعوے باطل ہیں۔ (''م''، فروری ۱۹۴۸ء)

ضیاء الدین، ڈاکٹر

ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم

افسوس ہے کہ گزشتہ ۲۴؍دسمبر ۱۹۴۷ء کو ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم نے بعارضہ فالج لندن میں انتقال کیا، مرحوم اپنے علمی کمال میں ہندوستان کے مشاہیر میں تھے، وہ تعلیم کے ماہر اور ریاضیات کے ممتاز فاضل تھے، انھوں نے اپنی تعلیم کے زمانہ میں ان فنون میں ہندوستان اور یورپ کی درسگاہوں میں جو امتیازات حاصل کئے، وہ اس دور میں کم ہندوستانیوں کو حاصل ہوئے تھے، چند دنوں جامعہ ازہر میں بھی رہے تھے، اس لئے عربی سے بھی کچھ واقف تھے، ان کی پوری زندگی علم وتعلیم کی خدمت میں گزری اور وہ نصف صدی سے زیادہ کسی نہ کسی حیثیت سے مدرسۃ العلوم اور اس کے بعد مسلم یونیورسٹی سے وابستہ رہے، کئی مرتبہ وائس چانسلر ہوئے، ابھی تھوڑے دن ہوئے کہ اس عہدہ سے سبکدوش ہوئے تھے، برسوں مجلس مقننہ کے ممبر رہے، مالیات میں ان کی رائے اور مشوروں کو خاص اہمیت حاصل تھی، ان کو اس زمانہ کے بڑے سے بڑے اعزاز حاصل ہوئے، جن سے یونیورسٹی کو بھی فوائد پہنچے اور ان کے دور میں اس کو بڑی ترقی ہوئی، ان کا آخری کارنامہ میڈیکل کالج کا قیام ہے، چند مہینے ہوئے جدید تعلیمی نظام کے مطالعہ کے لئے یورپ اور امریکہ گئے تھے، کہ لندن میں پیام اجل آپہنچا۔

مرحوم اس دور کی پیداوار تھے، جب مسلمانوں پر مغربی تمدن مسلط تھا، اور اس کا سب سے بڑا مرکز علی گڑھ تھا، لیکن انھوں نے اس کا بہت کم اثر قبول کیا، اب تو ضعیفی کی عمر تھی، وہ ہر زمانہ میں نہ صرف عقیدے بلکہ ظاہری وضع قطع میں بھی مسلمان رہے، ان کی زندگی بڑی سادہ اور بے تکلف تھی، ان کی سادگی میں ایک صاحبِ کمال کی شانِ بے نیازی پائی جاتی تھی، شخصی طور پر بھی ان سے لوگوں کو بڑے فوائد حاصل ہوئے، ان کی ذات سے سینکڑوں غریب طالب علموں نے تعلیم حاصل کی، اور انھوں نے بہتوں کو جن کا کوئی سہارا نہ تھا، ملازمتیں اور بڑے بڑے عہدے دلوائے۔

کمزوریوں سے کوئی انسان مستثنیٰ نہیں، وہ سیاست میں علی گڑھ کی پرانی روایات کے حامی تھے، اس لیے ایک طبقہ کو ان کے خیالات اور طریقہ کار سے اختلاف رہا، لیکن ان کی علمی فضیلت اور خدمات سے کسی کو انکار نہیں، مسلمانوں میں جو صاحبِ کمال بھی اٹھ گیا، اس کا بدل نہ پیدا ہوسکا، مرحوم کی جگہ بھی مشکل سے بھر سکے گی، **اللھم اغفرہ مغفرۃ واسعۃ۔**

ان کو یونیورسٹی کے انتظامی امور اور دوسری قومی وسیاسی مشغولیتوں کی وجہ سے تالیف وتصنیف کا کم موقع مل سکا اور دو تین مختصر تعلیمی کتابوں کے علاوہ اپنے علم کے شایانِ شان کوئی علمی یادگار نہیں چھوڑی۔ (''م''، فروری ۱۹۴۸ء)

کانپوری، عبدالرزاق، مولوی

مولوی عبدالرزاق کانپوری

ماتم گسارِ برامکہ کا ماتم

مولوی عبداراق صاحب کانپوری نے جو البرامکہ کے مصنف کی حیثیت سے مشہور تھے، پچاسی برس کی عمر میں، ۱۸؍فروری ۱۹۴۸ء کو بمقام بھوپال اپنی نواسی کے گھر

میں ۳ بجے رات کو یکا یک انتقال کیا، وہ کچھ دنوں سے بیمار تھے، ان کے داماد ان کو علاج کی خاطر دلی لے گئے تھے، اور غرض یہ بھی تھی کہ ان کے بعض پچھلے مسودات وہاں چھپ جائیں کہ دلی میں ہنگامہ ہوا، اور لوگوں میں بھگڈر مچی، مولوی صاحب موصوف کو ان کے عزیز ہوائی جہاز سے بھوپال لائے، جہاں ایک زمانہ سے مختلف خدمتوں کے تعلق سے ان کا قیام تھا۔

مرحوم سے میری ملاقات غالباً ۱۹۲۱ء میں لکھنو دارالعلوم ندوہ کے اندر اس وقت ہوئی جب علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے سبب سے ملک کے اکابر و مشاہیر لکھنؤ آئے تھے، البرامکہ میں کم سنی میں پڑھ چکا تھا، مصنف سے واقف تھا شاہ سلیمان صاحب، پھلواروی اس زمانہ میں دارالعلوم میں قیام فرما تھے، مشتاقوں کا ان کے پاس ہجوم تھا انہی میں مولوی عبدالرزاق صاحب تھے، شاہ صاحب نے ان کی طرف اشارہ کرکے مذاقاً فرمایا کہ یہ برامکہ صاحب ہیں، اس تعارف سے مجھے خوشی ہوئی۔

اس کے بعد ۱۹۰۵ء میں جب حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی نعمانیؒ حیدرآباد سے قطع کرکے دارالعلوم میں معتمد ہوکر آئے، تو مرحوم کی آمد ورفت بکثرت ہونے لگی، یہ وہ زمانہ تھا، جب مرحوم نظام الملک سلجوقی لکھ رہے تھے، اور اس سلسلہ سے اپنے مسودات مولانا کو دکھانے لاتے تھے اور ان سے مشورے چاہتے تھے۔

مرحوم کی علمی استعداد اس قدر تھی کہ وہ فارسی اچھی طرح جانتے تھے، اور عربی سے مانوس تھے، اور عبارت سے مطلب سمجھ لیتے تھے البرمکہ لکھتے وقت اس سے ہی کم واقفیت تھی، اس زمانہ میں ندوہ کا دفتر کانپور میں تھا، اور اسی تعلق سے مولانا سید عبدالحئی صاحب مددگار ناظم ندوۃ العلماء جو بہت اچھے ادیب تھے، کانپور میں رہتے تھے، اور منشی عبدالرزاق صاحب جیسا کہ وہ اس وقت کہلاتے تھے البرامکہ لکھ رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو فطری مذاق بخشا تھا، اور حیات سعدی و المامون وغیرہ سے اردو میں سوانح نگاری کی ایک طرح پڑ چکی تھی، مرحوم عربی تاریخی اور ادبی کتابوں کو لفظ لفظ دیکھتے تھے، اور جہاں برامکہ یا برمکی کا لفظ دیکھتے، نشان لگا دیتے تھے، اور بعد کو اس کا مطلب سمجھ کر اس کو اردو میں لکھ لیتے، عربی اشعار کے سارے ترجے جیسا کہ سنا مولانا سید عبدالحئی صاحب کے کئے ہوئے ہیں اور پورا مسودہ حضرۃ الاستاذ کی نظر سے گذارا گیا تھا، اور شاید اسی جذبہ کے تحت مصنف نے بڑے ادب کے ساتھ مولانا کے نام اس کو منسوب کیا تھا اور یہ شعر لکھا تھا:

مسند علم اوزو جودت منبع اداب باد

آستانت قبلہ جان اولــی الالبــاب باد

کانپور میں اس وقت جدید ادبی مذاق کا مرکز منشی رحمت اللہ صاحب رعد مالک نامی پریس کانپور کا مطبع تھا، جہاں سے منشی صاحب پہلے ایک مصوّر رسالہ نکالتے تھے، اور پھر نامی جنتری نکالنے لگے تھے، منشی عبدالرزاق صاحب اس وقت جیسا کہ یاد آتا ہے، کانپور میونسپلٹی میں ملازم تھے اور وہیں رحمت اللہ رعد اور مولوی عبدالرزاق صاحب میں دوستانہ اتحاد پیدا ہوا، منشی رحمت اللہ رعد صاحب کو سرسید کی تعلیمی تحریک سے دلچسپی اور سرسید کے نورتن سے ادبی لگاؤ تھا، اس تعلق سے مولوی عبدالرزاق صاحب بھی اسی مرکز سے وابستہ ہوئے اور تاریخ کی دلچسپی کے سبب سے خاص طور سے مولانا شبلی سے ان کو زیادہ انس ہوا، مولانا نے سلسلہ فرمانروایانِ اسلام کی بنیاد ڈالی تھی، اور المامون لکھ چکے تھے، الفاروق کا غلغلہ تھا، اس مناسبت سے مولوی عبدالرزاق صاحب کے ذہن میں ''سلسلہ وزرائے اسلام'' لکھنے کا خیال آیا، اور سب سے پہلے ۱۸۹۷ء میں البرامکہ اور اس کے ۱۵ برس بعد ۱۹۱۲ء میں نظام الملک سلجوقی لکھی، اور ملک میں بہت مقبول ہوئی، البرامکہ خصوصیت سے زیادہ مقبول ہوئی، اور بہت پڑھی گئی، اور کئی دفعہ چھاپی گئی، اخیر اڈیشن ابھی چند سال ہوئے، مرحوم نے نظر ثانی کے بعد مع جدید اضافوں کے شائع کیا تھا، ان دو تصنیفات کے علاوہ انھوں نے مضامین بھی لکھے ہیں مرزا افرحت شیرازی کی کتاب آثار عجم سے لے کر ایرانی یادگاروں پر کچھ ان کے مضامین معارف علی گڑھ میں نکلے تھے، زردشت جاماسپ اور برزجمہر وغیرہ کی حکایات اور امیروں کے پرانے افسانوں سے بھی اُن کو دلچسپی تھی۔

مرحوم کی پچاسی سال کی عمر کے لحاظ سے ۱۸۶۲ء میں پیدائش ہوئی ہوگی اور اُن کے ہوش کا زمانہ سرسید اور اُن کے رفقاء کی جدوجہد کا دور تھا، وہ علی گڑھ جا کر مولانا شبلی کے یہاں بھی مقیم ہوتے تھے، اور خود مولانا بھی ندوہ کے تعلق سے کانپور آتے جاتے تھے، اس لئے اس دور کے اکابر اور مشاہیر فن سے ان کی شناسائی تھی، اسی تعلق سے میں نے اُن سے خواہش کی تھی کہ اپنے زمانہ کے دیکھے ہوئے بزرگوں اور اُن کی محفلوں کے مشاہدات یکجا کردیں، چنانچہ اس زمانہ میں جب سرراس مسعود بھوپال میں وزیر تعلیم ہوکر آئے، انھوں نے اپنے ان مشاہدات کو قلمبند کیا اور وہ سلسلہ کسی مقامی پرچہ میں چھپتا رہا، بعد کو ان مطبوعہ اوراق کو میرے پاس بھیجا کہ میں انھیں مطبع معارف سے شائع کروں، مگر یہ دوسری جنگ عظیم کا زمانہ تھا، کاغذ کی نایابی سے وہ ہمارے ہاں نہ چھپ سکا، اور مولف کو واپس کردیا گیا سنا ہے کہ وہ حیدرآباد دکن سے چھپ کر شائع ہوا۔

نظام الملک کی قدردانی نواب عمادالملک مولوی سید حسین بلگرامی نے پوری کی، ریاست آصفیہ کی طرف سے اس کے بہت سے نسخے خریدے گئے اور شاید مصنف بھی انعام سے سرفراز ہوئے اسی سلسلہ میں حیدرآباد کے ادارہ سے وہ بھوپال وارد ہوئے اور سرکار عالیہ نواب سلطان جہاں بیگم مرحومہ سے ملے انھوں نے ازراہ قدردانی اپنی ریاست میں تحصیلداری کے عہدہ پر مقرر کردیا، یہ واقعہ ۱۹۱۴ء یا ۱۹۱۵ء کا ہوگا، بعد کو جب کسی ضرورت سے میرا یہاں آنا ہوا تو سابق نواب ولی عہد بہادر کی ڈیوڑھی سے ان

کووابستہ پایا اوران کی فرمایش سے وہ اس زمانہ میں اُن کے والد نواب احمد علی خان کی سوانح عمری اور افغانان جلال آباد (ضلع مظفر نگر) کی تاریخ قلمبند کررہے تھے، میں نے مبارکباد دی کہ کیا عجب آپ بھی کسی زمانہ میں یہاں کے نظام الملک بن جائیں، مگر ولی عہد بہادر نے ۱۹۲۴ء میں وفات پائی، اورسرکار عالیہ نے ان کو تاریخ اسلام لکھنے پر مقرر فرمایا یہ اس کام کو ایک مدت تک انجام دیتے رہے، مگر پھر بساط ایسی الٹی کہ گوشہ نشین سے ہوگئے، اس کے بعد سرراس مسعود نے اپنی وزارت تعلیم کے عہد میں جب تالیف وترجمہ کا ایک سرکاری ادارہ قائم کیا، تو مرحوم اس کے اسٹاف میں داخل ہوئے اور تاریخ بھوپال وغیرہ کی طرح ڈالی مگر سرراس مسعود کا زمانہ جلد ختم ہوگیا، اور ۱۹۲۵ء میں انتقال کرگئے، تو یہ ادارہ بھی خواب پریشان ہوکر رہ گیا۔

وہ ادھر ضعف عمر کے سبب سے کمزور بھی ہوگئے تھے، تاہم کچھ نہ کچھ لکھتے پڑھتے رہتے تھے، اخیر تصنیفات تاریخ اسلام وغیرہ کے مسودات اُن کے وارثوں کے پاس ہیں اور عجب نہیں کہ وہ اُن کو شائع کریں۔

مرحوم چونکہ یوپی سے بھوپال آگئے تھے، اور وہاں کے علمی و ادبی حلقوں سے الگ ہوگئے تھے اس لیے لوگ ان کو اُن کی زندگی ہی میں بھول چکے تھے، اور انہیں خود بھی یہ خیال تھا کہ لوگ انہیں مردہ سمجھ چکے ہوں گے، اس لیے مجھ سے دودفعہ غالبًا یہ خواہش کی کہ میں ان کی زندگی کی خوشخبری لوگوں کو پہنچادوں چنانچہ معارف کے شذرات میں ان کی یہ تحریریں ہوں گی۔

مولانا شبلی مرحوم کے دوسرے دوستوں کے ساتھ میں جو ادب ملحوظ رکھتا تھا، وہی اُن کے ساتھ رکھتا تھا، اور وہ بھی مجھے اپنے عزیزوں میں شمار کرتے تھے، آج اس مساوات کے زمانہ میں نوجوان خوردی و بزرگی کے ان آداب کو شاید نہ سمجھ سکیں۔

۱۰رفروری ۱۹۴۸ء کی دوپہر کو دفتر دارالقضاء میں ٹیلیفون سے مجھے کسی نے مطلع کیا، کہ رات مولوی عبدالرزاق صاحب نے انتقال کیا، ۲ بجے نماز جنازہ ہوگی اور امن شاہ کے تکیہ میں مدفون ہوں گے لیکن افسوس کہ جب میں قبرستان میں پہنچا، تو اُن کے احباب اور اعزہ ان کو دفن کرکے واپس جاچکے تھے اور اس وقت اُن کی قبر کو مزدور پتھر سے گھیر رہے تھے، دعائے مغفرت پڑھی، اور اُن کے عزیز کے گھر جاکر جہاں انھوں نے وفات پائی تھی فرضِ تعزیت ادا کیا۔

مرحوم بلند بالا، خوش خلق اور متواضع تھے، ہر حال میں وہ اپنے علمی کاموں میں منہمک رہتے تھے، اب زمانہ کے حالات میں جو انقلاب ہورہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے ایسے شائقین و خدمت گزاراہِ علم و ادب کی توقع بہت کم کی جاسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ (''س''، مارچ ۱۹۴۸ء)

مدراسی، غلام احمد کلامی، نواب

نواب غلام احمد کلامی مدراسی

ہمارے بوڑھے قومی خدمت گذاروں میں مدراس کے ایک بزرگ نواب غلام احمد کلامی تھے، پچھلے رہنمایاں ملت کے کاموں میں یہ ہمیشہ ہاتھ بٹاتے رہے اوران کی رفاقت کا دم بھرتے رہے ندوۃ العلماء کی تحریک سے احاطہ مدراس میں جن بزرگوں کو دلچسپی تھی، ان میں ایک نام ان کا بھی ہے اسی تعلق سے ندوہ کی روداد میں اُن کے تذکرے آرہے ہیں مکاتیب شبلی میں مولانا ابوالکلام کے نام کے خطوں میں بھی ان کا ذکر ہے، افسوس ہے کہ مرحوم نے ۸۳ برس کی عمر میں ۲۵ دسمبر ۱۹۴۸ء، ۱۱/ ماہ صفرالمظفر ۱۳۶۷ھ کو بروز جمعرات بوقت عصر اس جہانِ فانی کو الوداع کہا۔

ان کا قیام اور کاروبار کولار واقع ریاست میسور میں تھا جہاں سونے کی کان ہے۔ وہ ریاست میسور کی اسمبلی میں مسلمانوں کے نمائندہ بھی رہے تھے اور وہاں کے مسلمانوں کی خدمت کرتے تھے معارف کے قدردانوں میں تھے شروع سے اخیر دم تک وہ اس کے خریدار رہے، خاکسار کو سب سے پہلے ۱۹۱۲ء میں جب مدراس میں بنگلور ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کا اتفاق ہوا تو اس تقریب سے مرحوم کی خدمت میں کولار حاضر ہونے کا بھی موقع ملا تھا، اور انہی کے توسط سے کولار کے طلائی معدن کے کارخانہ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا اس کے بعد میسور کی طرف جب جانا ہوتا ان سے نیاز حاصل ہوتا رہا کبھی کبھی خط وکتابت کا بھی اتفاق ہوتا تھا بہت نیک ملنسار اور متواضع بزرگ تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائیں۔ (''س''، مارچ ۱۹۴۸ء)

امرتسری، ثناء اللہ، مولانا

مولانا ثناء اللہ امرتسری

۱۵/اگست ۴۷ء کے بعد مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر جو قیامت گزری، اس کی تاریخ قیامت تک ناقابل فراموش رہے گی، مسلمانوں کے لئے یہ سانحہ کتنا حسرتناک ہے کہ اب امرتسر سے لے کر دلّی کے کناروں تک ساری مسجدیں بے چراغ خانقاہیں سونی، مدرسے بے نشان اور کتب خانے ویران ہوگئے، اسی حادثہ میں مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب امرتسری کے صاحبزادہ عطاء اللہ سنا ہے بحالت نماز شہید ہوئے، ان کا کتب خانہ لٹ گیا اور وہ خود مع خاندان بہ ہزار خرابی گوجرانوالہ پہنچے اور اب خبر آئی ہے کہ انہوں ۱۶/ مارچ ۱۹۴۸ء کو بعارضۂ فالج وفات پائی، اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مولانا ہندوستان کے مشاہیر علماء میں تھے، فن مناظرہ کے امام تھے، خوش بیان مقرر تھے، متعدد تصانیف کے مصنف تھے، مذہباً اہلحدیث تھے اور اخبار اہلحدیث کے اڈیٹر تھے، قومی سیاسیات کی مجلسوں میں کبھی کبھی شریک ہوتے تھے۔

مرحوم سے مجھے نیاز اپنی طالب علمی ہی سے تھا، وہ سال میں ایک دو دفعہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں آتے جاتے لکھنؤ آتے تھے اور دارالعلوم ندوہ میں تشریف لاکر احباب سے ملتے تھے، اسی سلسلہ میں مجھے بھی نیاز حاصل ہوا، ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ مرحوم مدرسہ میں تشریف لائے، میں درس میں تھا، ان کو آتا دیکھ کر ان کی طرف لپکا، مگر مرحوم نے میرے بجائے سبقت استاذی شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ صاحبؒ کی طرف کی اور حدیث کا یہ ٹکڑا پڑھا۔ کبّرِ الکبُر یعنی بڑے کو بڑائی دو۔

مرحوم ندوہ کے رکن بھی اکثر رہے، بلکہ خود ان کے بقول ندوہ کانپور میں ان کی دستار بندی ہی کے جلسہ میں پیدا ہوا، مرحوم نے ابتدائی تعلیم کے بعد کچھ دنوں مدرسہ دیوبند میں پڑھا، پھر وہ کانپور آکر مدرسہ فیض عام میں داخل ہوئے اور یہیں ۱۳۱۴ھ میں فراغت پائی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے دعووں سے پنجاب میں فتنہ پیدا ہوگیا تھا، انہوں نے مرزا کے خلاف صف آرائی کی اور اس وقت سے لے کر آخر دم تک اس تحریک اور اس کے امام کی تردید میں پوری قوت صرف کردی، یہاں تک کہ طرفین میں مباہلہ ہوا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صادق کے سامنے کاذب نے وفات پائی۔

یہ پرانے قصے ہیں جن کو دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔

موجودہ سیاسی تحریکات سے پہلے جب شہروں میں اسلامی انجمنیں قائم تھیں، اور مسلمانوں اور قادیانیوں اور آریوں اور عیسائیوں میں مناظرے ہوا کرتے تھے، تو مرحوم مسلمانوں کی طرف سے عموماً نمائندہ ہوتے تھے اور اس سلسلہ سے وہ ہمالیہ سے لے کر خلیج بنگال تک دواں اور رواں رہتے تھے۔

اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف جس نے بھی زبان کھولی اور قلم اٹھایا۔ اس کے حملے کو روکنے کے لئے ان کا قلم شمشیر بے نیام ہوتا تھا اور اسی مجاہدانہ خدمت میں انہوں نے عمر بسر کردی۔ **فجزاہ اللہ عن الاسلام خیر الجزاء۔**

وہ مصنف بھی تھے، مخالفین اسلام کے اعتراضوں کے جواب میں ان کے اکثر رسالے ہیں، ان کی تصنیفات میں دو تفسیریں خاص ذکر کے قابل ہیں، تفسیر ثنائی اردو میں اور تفسیر القرآن بالقرآن عربی میں، مرحوم کو خود بھی یہ تفسیریں پسند تھیں، مرحوم چونکہ مناظر تھے، اس لئے پہلی تفسیر میں آیات صفات کے باب میں سلفی عقائد کے بجائے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی پیروی میں تاویل کی راہ اختیار کی تھی، اس سے امرتسر کے غزنوی علمائے اہلحدیث نے ان کی بہ شدت مخالفت کی، ۱۹۲۶ء میں جب حج کی تقریب سے خاکسار اور مرحوم اور دیگر علمائے اہلحدیث کا حجاز جانا ہوا، تو یہ نزاع سلطان ابن سعود کے سامنے بھی پیش ہوا اور سلطان نے کوشش کرکے فریقین میں صلح کرادی، مرحوم مجھ سے فرماتے تھے کہ افسوس ہے کہ نجد کے علماء حضرت شاہ ولی اللہ کی قدر و قیمت سے واقف نہیں اور مجھ سے چاہتے تھے کہ میں اس باب میں سلطان سے کچھ عرض کروں۔

مرحوم کبھی کبھی قومی جلسوں میں بھی شرکت کرتے تھے، ۱۹۱۲ء میں ندوہ کی تحریک اصلاح کے سلسلہ میں جب حکیم اجمل خاں مرحوم کی دعوت پر دہلی میں ایک عظیم الشان اجلاس ہوا، جس میں سارے ہندوستان کے مسلمان نمائندے شریک تھے، تو مولانا شبلی کی تحریک پر مرحوم ہی صدر مجلس قرار پائے تھے، ۱۹۱۹ء میں جب تحریک خلافت کا پہلا ابتدائی جلسہ لکھنؤ میں ہوا، جس میں سارے ملک کے اکابر اور مشاہیر جمع تھے، اس میں بھی مرحوم شریک تھے، ۱۹۲۵ء کی جمعیۃ العلماء کے اجلاس کلکتہ میں جس میں اس خاکسار کی صدارت تھی مرحوم موجود تھے اور خاص طور سے اس لئے آئے تھے کہ جمعیۃ کے اس اجلاس میں دارالحرب میں سود کے مسئلہ پر بحث کرنے والے تھے، حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ اور دوسرے علمائے دیوبند بھی تشریف فرما تھے، انہوں نے مجھ سے کہا کہ حضرات علماء دیوبند حنفیہ کے مشہور مسلک **لاربوابین الحربی والمسلم فی دارالحرب** پر متفق ہوں تو میں بھی تائید کروں گا، مگر علماء میں نج کی گفتگو ہو کر رہ گئی، کھلے اجلاس میں کوئی بحث نہیں ہوئی۔

مرحوم ۱۹۲۶ء میں حجاز کے موتمر اسلامی نمائندہ اہلحدیث کی حیثیت سے شریک تھے اور عربی میں ایک دو مختصر تقریریں بھی اپنے طرز کی موتمر میں کی تھیں، مدینہ منورہ بھی حاضر ہوئے تھے، کہتے تھے کہ جو اہلحدیث یہاں نہ آئے وہ محبت سے خالی ہے، (اُن کا اصل فقرہ اس وقت پوری طرح یاد نہیں)۔

مرحوم کو ایک دفعہ مجھ سے شکایت بھی پیدا ہوئی، اس کی صورت یہ ہوئی کہ دس پندرہ برس ہوئے، مرحوم اور ان کے حنفی حریف مولانا عبدالعزیز صاحب خطیب گوجرانوالہ مصنف اطراف بخاری کے درمیان حدیث وَإِذَا قَرَءَ الْإِمَامُ فَانْصِتُوْا کے صحیح مسلم میں موجود ہونے یا نہ ہونے پر اخبارات میں تحریری مناظرہ ہو رہا تھا، فریقین نے اس باب میں مجھے حکم مانا، میں نے مولانا مرحوم سے کچھ پوچھے بغیر صرف دونوں کی تحریروں کو دیکھ کر فیصلہ مرحوم کے خلاف اور مولانا عبدالعزیز صاحب کے موافق کیا۔ جس پر مرحوم نے مجھے لکھا **حتی یسمع من الأخر** کی بنا پر طرف ثانی کا بیان سنے بغیر آپ نے فیصلہ کیسے کردیا، مگر ان کی یہ شکایت محض مناظرانہ تھی، ورنہ اس کے بعد بھی ان کی شفقت میرے حال پر ویسی ہی رہی، ڈاکٹر اقبال کی وفات کے بعد جب میرا لاہور جانا ہوا اور ان کو خبر ہوئی تو مجھے پیغام بھیجا کہ واپسی میں ان سے ملے بغیر نہ جاؤں، چنانچہ واپسی میں امرتسر اترا اور ان کے پاس دو دن ٹھہرا اور بہت سی باتیں ہوئیں، جن میں سے ایک جیسا کہ خیال آتا ہے، اہلحدیث کے انتشار اور پراگندگی کی گفتگو تھی، میں مرحوم کو لکھتا رہتا تھا کہ آپ آمین اور رفع یدین وغیرہ مسائل فقہ پر جن کا ہر پہلو جائز اور ثابت ہے، مناظرانہ تحریروں میں وقت ضائع نہ کریں، مگر وہ ان کی

اہمیت پر بھی مصر تھے۔

ان کی عمر میرے خیال میں اسّی سے کچھ متجاوز ہوگی، ابھی چند سال ہوئے وہ گر پڑے تھے، جس سے کولھے کی ہڈی پر چوٹ لگی تھی، جس کے سبب سے وہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگئے تھے، پنجاب کے گزشتہ حادثہ میں ان کے جوان بیٹے کی مفارقت کا اثر یقیناً پڑا ہوگا، لیکن اس کے بعد پاکستان و ہندوستان کے درمیان جو دیوار قائم ہوگئی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مجھے مرحوم کی وفات کی اطلاع بھی اس سے پہلے نہیں ہوئی اور یہ اطلاع بھی جمعیۃ العلماء دہلی کے تازہ جلسہ میں تعزیت کی تجویز سے ہوئی اِنّا لِلّٰہ، اگر کوئی صاحب ان کی وفات کی تاریخ و روز وقت و مقام سے مطلع کریں تو ممنون ہوں گا۔

مرحوم اسلام کے بڑے مجاہد سپاہی تھے، زبان اور قلم سے اسلام پر جس نے بھی حملہ کیا اس کی مدافعت میں جو سپاہی سب سے آگے بڑھتا وہ وہی ہوتے، اللہ تعالیٰ اس غازی اسلام کو شہادت کے درجات و مراتب عطا فرمائے۔ (''س''، مئی ۱۹۴۸ء)

بدایونی، یعقوب بخش راغب قادری

یعقوب بخش راغب قادری بدایونی

پروفیسر ضیاء احمد بدایونی (لکچرار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے خط سے یہ معلوم کر کے دل کو بڑا رنج ہوا کہ میرے پرانے دوست مولوی یعقوب بخش صاحب راغب بدایونی نے ۲۱/فروری ۱۹۴۸ء کو علی گڑھ میں جہاں وہ دینیات کے استاد تھے، اچانک قلب کی حرکت بند ہوجانے سے وفات پائی، جنازہ علی گڑھ سے بدایوں لے جایا گیا اور درگاہ قادریہ میں وہ سپرد خاک ہوئے، عمر غالباً ساٹھ برس کے قریب ہوگی۔

مرحوم بدایوں کے ایک نامور اور صاحب علم گھرانے سے تھے، ان کے پرنانا مولوی علی بخش صاحب صدر الصدور تھے، جن سے سرسید کے تحریری مناظرے رہے ہیں، کیا عجیب بات ہے کہ اس کا پرناتی جس کا پرنانا سرسید سے ایسا مذہبی اختلاف رکھتا تھا جس میں کفر و اسلام تک کا تفرقہ تھا وہ سرسید کی تعلیم گاہ میں دینیات کا مدرس ہوکر رہا۔

مرحوم سے میرے تعلقات بڑے پرانے تھے، ان کا آغاز شعر و سخن سے ہوا، مرحوم اردو کے اچھے شاعر تھے، انہوں نے اپنا کلام مجھے میری رائے معلوم کرنے کو بھیجا، میں نے اس کی بڑی داد دی اور اس طرح مکاتبت کا سلسلہ جاری ہوا پھر تحریک خلافت کے زمانہ میں محبّ عزیز (جن کا نام اب بھی محبت کے ساتھ زبان پر آتا ہے) مولانا عبدالماجد مرحوم بدایونی کے توسط سے معرفت اور شناسائی کا تعلق دوستی سے بدل گیا، ملاقات کا اتفاق بدایوں کے ایک جلسۂ خلافت کے سلسلہ میں ہوا، جس میں مولوی عبدالماجد صاحب بدایونی مجھے صدر بنا کر لے گئے تھے اور کئی روز ان کے مکان پر ٹھہرنا پڑا۔

مرحوم عربی کے بڑے عالم، ادب و لغت کے فاضل اور ہیئت و نجوم کے استاد تھے، عربی میں قصیدے بہت لکھے اور بہت اچھے لکھے، بدایوں کے سلسلۂ قادریہ میں حبِ رسول کی بناء پر سیادت سے بے انتہا شیفتگی ہوتی ہے، اس سلسلہ میں مرحوم کو مجھ ''بدنام کنندۂ نکونامے چند'' سے بھی محبت کی عقیدت تھی، چنانچہ اپنے عربی قصیدوں کو میری طرف نسبت دے کر میری عزت بڑھائی۔

ہیئت و نجوم سے ان کو خاص ذوق تھا، ان کے گھر میں بزرگوں کا اندوختہ بڑا اچھا کتب خانہ تھا، جس میں بعض نادر قلمی کتابیں تھیں، انہیں میں محقق طوسی اور دوسرے قدیم مسلمان علمائے ہیئت کے قدیم رسالے تھے، مرحوم نے اپنے ذوق سے ان کو پڑھ کر اور صحیح کر کے **الانجم الطوالع** کے نام سے شائع کیا، سرشاہ سلیمان مرحوم کے اشارہ سے علامہ بیرونی کی قانون مسعودی کے کچھ اجزاء کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔

مرحوم نے درس نظامیہ کے اسباق مولانا رفاقت اللہ اور مولانا فضل احمد بدایونی سے پڑھے، تبرکاً چند سبق مولانا عبدالمقتدر بدایونیؒ سے بھی پڑھے تھے۔

حدیث میں ان کا سلسلہ تلمذ مولانا سید یونس علی صاحب المتوفی ۱۳۵۹ھ بدایونی کے شاگرد مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی کے واسطے سے خاندان ولی اللّٰہی تک اور معقول میں مولانا محبّ احمد صاحب بدایونی المتوفی ۱۳۳۵ھ کے توسط سے خانوادۂ خیرآباد تک منتہی ہوتا ہے، اردو شاعری میں شیخ احمد علی شوق لکھنوی کے شاگرد تھے اور بیعت سلسلۂ قادریہ میں مولانا عبدالقادر صاحب بدایونی رحمۃ اللہ تعالیٰ سے حاصل کی تھی، عقیدہ میں سخت حنفی سنی قادری تھے، تاہم اس سختی میں لچک اتنی تھی کہ مجھ جیسے نرم و گرم سے بھی نباہ کر لیتے تھے۔

پہلے گھر ہی پر بدایوں میں پڑھانے کا شغل رکھتے تھے، ۱۹۳۸ء میں مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات میں مقیم ہوکر علی گڑھ منتقل ہوگئے تھے۔

مرحوم کی دوستی کا ایک نادر تحفہ یہ تھا کہ جب ان کا جی چاہتا، بدایوں کے پیڑے ڈاک سے اعظم گڑھ بھیجتے اور اس کے معاوضہ میں صرف ایک تشکر کا ہدیہ کافی سمجھتے، ان کا سب سے آخیر خط مجھے بھوپال میں ملا، جس میں اپنے ہونہار صاحبزادہ کا تعارف مجھ سے کرایا تھا، اللہ ان کے صاحبزادہ کو علم دنیا کے ساتھ علم دین کا حصہ بھی عنایت کریں اور اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر قائم رکھیں۔ (''س''، مئی ۱۹۴۸ء)

دانا پوری، عبدالرؤف، مولانا

مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف داناپوری

مہینوں سے اخبار نہیں پڑھتا کہ ان کو پڑھ کر ایک ایسے شخص کو جو ملک میں ہر طرح امن و امان اور مہر و محبت کا طالب ہو دلی صدمہ پہنچتا ہے، اسی لئے مولانا کی وفات کی خبر ان کے صاحبزادوں کے خطوط سے ہوئی، میں نے ان کے صاحبزادوں کو

لکھا کہ مرحوم کے کچھ ابتدائی تعلیمی حالات مجھے لکھ کر بھیجیں۔

لیکن ان کا پھر کوئی جواب نہیں آیا، البتہ اخبارات کے چند تراشے ملے، جن میں وفات کی خبر کے سوا کچھ اور نہ تھا۔

مرحوم کا وطن صوبہ بہار میں شہر داناپور متصل پٹنہ تھا، مگر وہ ایک عرصہ سے کلکتہ میں طبیب کی حیثیت سے مقیم تھے اور گویا اب وہی ان کا گھر ہوگیا تھا، مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ انہوں نے تعلیم وتربیت کن اساتذہ سے حاصل کی، مگر گفتگو اور تحریر سے پتہ چلتا تھا کہ ان کو علوم دینیہ میں پوری دسترس حاصل تھی، پھر کلکتہ میں رہ کر اور سیاسی مجلسوں میں شرکت کے سبب سے وہ زمانہ کی ضروریات اور عصری خیالات وافکار سے پوری طرح آگاہ تھے اور ان علماء میں تھے جو قدیم علوم واعتقادات فقہ کو جدید خیالات وافکار سے تطبیق دینے کی قدرت رکھتے ہیں۔

میری ان کی پہلی جان پہچان اس وقت ہوئی جب میں ۱۹۱۲ء میں الہلال کلکتہ کی ادارت میں شرکت کے لئے کلکتہ پہنچا اور اس تقریب سے کئی مہینہ کلکتہ رہنے کا اتفاق ہوا تو مختلف جلسوں میں ان سے گفتگو، بات چیت اور میل جول کی نوبت آئی، پھر ۱۹۱۷ء یا ۱۹۱۸ء میں مجلس علمائے بنگالہ کی صدر کی حیثیت سے جب میرا کلکتہ جانا ہوا اور یہ وہ وقت تھا جب اسی کے ساتھ لیگ اور کانگریس کے سالانہ اجلاس بھی وہاں ہورہے تھے اور ہندو اور مسلمان تمام ملک کے نمائندے وہاں جمع تھے اور بیت المقدس کی انگریزی فتح کا حادثہ تازہ تھا اور طبائع میں بڑا ہیجان تھا، مرحوم سے ملنے کا موقع ہاتھ آیا اور خیال آتا ہے کہ ان کی قیام گاہ پر بھی جانے کا اتفاق ہوا جو چونا گلی میں تھی اور جہاں مرحوم نے وفات پائی۔

۱۹۱۶ء میں ہندوستان میں ایک مسئلہ پر زیر بحث تھا اور وہ یہ کہ پنجاب کی ایک مسلمان عورت نے جو اپنے شوہر کے مظالم سے عدم نفقہ سے تنگ آچکی تھی، اس سے چھٹکارے کے لئے علماء سے استفتاء کیا تھا، مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی نے حنفیہ کے مسلک کے مطابق اس کو جواب دیا کہ اسلام میں اس کے لئے کوئی مخلص نہیں، اس پر آریہ اخباروں نے اسلام کو اس کی تنگ دامانی کا طعنہ دیا، اس کو پڑھ کر مولانا ابوالکلام نے بعض فقہائے تابعین اور ائمہ فقہ کے مسلک کے مطابق مولانا ٹونکی کے فتووں کی تردید کی اور لکھا کہ تین ماہ کے انتظار کے بعد بھی اگر شوہر اپنی بیوی کے نان ونفقہ کا انتظام نہ کرے اور بیوی مطالبہ کرے تو قاضی زوجین میں تفریق کرسکتا ہے، مولانا داناپوری نے مولانا ابوالکلام کے فتویٰ کی تغلیط کی اور کلکتہ کے اخبارات میں ایک مفصل مضمون اس کے جواب میں لکھا، یہ معارف کی اشاعت کا پہلا سال تھا، خاکسار نے ان تینوں صاحبوں کے فتووں پر ایک محاکمہ لکھا، جو معارف کی پہلی جلد میں ''زوجۂ غیر منفق علیہا'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اور جس میں ظاہر کیا گیا تھا کہ نہ تو مطلقاً مولانا ابوالکلام کا فتویٰ صحیح ہے اور نہ مولانا عبدالرؤف صاحب کا اور نہ تو مولانا ابوالکلام کی وسعت صحیح ہے اور نہ مولانا داناپوری کی تنگی، بلکہ یہ سب فتوے الگ الگ مختص حالات سے مخصوص ہیں، کسی کہنے والے نے مجھ سے نقل کیا کہ مولانا داناپوری نے میرے اس مضمون کو پڑھ کر فرمایا کہ ہاں! یہ مضمون ایک پڑھے لکھے شخص کا ہے۔

پھر مرحوم سے جمعیۃ العلمائے کلکتہ کے اجلاس کے موقع پر ملاقات ہوئی اور آخری ملاقات آٹھ دس برس ہوئے اس وقت ہوئی جب مسلم تعلیمی کانفرنس علی گڑھ کا اجلاس کلکتہ میں ہوا، جس میں کمال یار جنگ تعلیمی تحقیقاتی کمیٹی مقرر ہوئی تھی، یہ وقت ملکی سیاسیات کے ایک نئے پہلو کا تھا۔

مرحوم سیاسیات میں جمعیۃ العلماء کے ساتھ تھے اور اس کے بعض جلسوں کی صدارت بھی کرچکے تھے، لیکن آخر میں اس سے الگ ہوکر مسلم لیگ میں منسلک ہوگئے تھے اور جمعیۃ علمائے اسلام میں داخل ہوگئے تھے اور اس حیثیت سے وہ بنگال کی اسلامی سیاست پر بہت اثر انداز تھے۔

مرحوم علوم دینیہ کے علاوہ زمانۂ حال کے حالات وخیالات سے بھی پوری باخبر تھے جس کا ثبوت ان کے وہ مختلف خطبات ہیں جو انہوں نے مختلف مجلسوں میں پڑھے ان کا جمعیۃ العلماء کا خطبۂ صدارت ان کی سیاسی بصیرت کا آئینہ ہے، چند سال ہوئے جامعہ ملیہ دہلی میں اسلام کے سیاسی ومعاشی اور دوسرے عصری مشکلات پر جو خطبہ ارشاد فرمایا اہل بصیرت نے اس کی بے حد قدر کی ان کی زندگی کا سب سے آخری کارنامہ ابھی چند ماہ ہوئے مشرقی بنگال کے ایک مذہبی وتبلیغی جلسہ میں ان کا حکیمانہ خطبہ ہے، جس میں پاکستان کی سیاسی حیثیت اور سیاسی مجبوریوں کی بناء پر اصول خلافت کی بنیاد پر حکومت کی تاسیس کی معذوریوں کا بیان تھا، یہ خطبہ بھی ان کی سیاسی فہم وتدبر کا نمونہ ہے۔

مرحوم ایک ممتاز طبیب، ایک مشہور عالم، ایک خوش بیان خطیب اور ایک مفکر ہونے کے ساتھ مصنف بھی تھے، چنانچہ ان کی تصنیفات میں سب سے اہم کتاب ''اصح السیر'' ہے، جو افسوس ہے کہ ان کی وفات سے ناتمام رہی۔

مولانا اونچا سنتے تھے، اس لئے ہمیشہ ایک آلہ ساتھ رکھتے تھے، جس کو لگا کر دوسروں کی بات سنتے تھے، تاہم ان سے ملنے جلنے والوں کا بڑا حلقہ تھا، اور کلکتہ میں ان کو بڑی اہمیت حاصل تھی، اہل علم اور اہل سیاست دونوں میں ان کا خیر مقدم تھا، وہ متواضع، سادہ مزاج اور خلیق تھے۔ چھوٹے بڑے سب سے یکساں ملتے تھے۔

مرحوم کی عمر اس وقت ۷۴ سال کی تھی، جس کے معنی یہ ہیں کہ ۱۸۷۴ء میں ان کی ولادت ہوئی ہوگی، ۱۹/فروری ۱۹۴۸ء کی صبح کو جمعرات کے دن ۸ بجے کے قریب ان کی علالت کی ابتداء ہوئی، فرمایا کہ بخار معلوم ہوتا ہے، تھوڑی دیر کے بعد جاڑا معلوم ہوا، دن بھر کچھ بخار رہا، مغرب کی نماز تک کوئی خاص بات نہ تھی، ساڑھے سات بجے شام سے حالت بگڑی، یہاں تک کہ رات کو ایک بجے داعی اجل کو لبیک کہا، مرحوم کی

وفات سے کلکتہ کی سرزمین علم وعرفان کے نور سے محروم ہوگئی۔ اِنَّـا لِلّٰـهِ وَ اِنَّـا اِلَیْـهِ رَاجِعُوْنَ۔ اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو روشن کرے۔ (''س''، مئی ۱۹۴۸ء)

جناح، محمد علی، قائداعظم

قائداعظم محمد علی جناؔ رحمہ اللہ

افسوس ہے کہ ۱۱/ستمبر ۱۹۴۸ء کی شب کو قائداعظم محمد علی جناح کا کراچی میں بہتر (۷۲) برس کی عمر میں انتقال ہوگیا، پاکستان و ہندوستان اور عالم اسلام نے اس حادثہ پر بڑا صدمہ محسوس کیا، دوسرے دن عصر کے وقت کئی لاکھ کے مجمع میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور تدفین عمل میں آئی، عام مسلمانوں میں ان کو جو ہر دلعزیزی حاصل تھی اس کا اثر یہ ہے کہ ہندوستان اور اکثر اسلامی ملکوں، ریاستوں اور شہروں نے ان کا ماتم کیا اور ان کے لئے قرآن خوانی اور مغفرت کی دعا کی گئی۔

مرحوم کے سیاسی کارنامے آفتاب کی طرح روشن ہیں، وہ بڑے قانون داں، بڑے مناظر اور اجتماعیات کے بڑے نبض شناس تھے اور اپنے پیروؤں پر بلا کا اثر رکھتے تھے، ان کی بڑی خصوصیت اپنی بات پر جم کر دوسروں سے اپنی بات منوانے کی قوت تھی، انہوں نے اپنی اس قوت کا مظاہرہ پاکستان کے مطالبہ میں پوری طرح کیا اور بالآخر کامیابی حاصل کی اور ایک ایسی حکومت قائم کی جس کا دعویٰ ہے کہ وہ اس وقت سب سے بڑی اسلامی حکومت ہے اور آبادی کے لحاظ سے دنیا میں اس کا پانچواں درجہ ہے۔

ہندوستان کی سیاست میں مرحوم کا بڑا حصہ ہے اور ۱۹۱۶ء سے لے کر جب لیگ اور کانگریس میں ان کی کوشش سے مشہور پیکٹ ہوا، ۱۹۴۸ء تک سوائے ان چند سالوں کے جب وہ ترک موالات کی تحریک میں کانگریس سے الگ ہوگئے۔ ہمیشہ ایک لیڈر کی حیثیت سے ملک میں ممتاز رہے، ان کی نسبت ان کے دوست اور دشمن ایک بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ نہ کبھی حکومت وقت سے ڈرے اور نہ جاہ و منصب کی کوئی حرص وطمع ان کو اپنی جگہ سے ہلاسکی۔

مرحوم پاکستان کے بانی اور یہ کہنا چاہئے کہ اس کی کشتی کے تنہا ملاح تھے، ایسے طوفان حوادث کے موقع پر جب ہر ملک اندرونی و بیرونی خطروں سے گھرا ہوا ہے، ان کی وفات حد درجہ افسوسناک ہے، یہ وہ وقت ہے جب پاکستان کے حکمران اور رہنما صرف اپنی بے لوث خدمت، مخلصانہ کوشش، سادہ زندگی، ایثار، حُبِّ ملّت عاقبت اندیشی اور ذاتی اغراض سے بلند ہوکر باہمی اعتماد سے پورے ضبط ونظم کو قابو میں لاکر اپنی مملکت کو نشوونما دے سکتے ہیں اور تاریخ میں نئے شاندار کارناموں کا اضافہ کرسکتے ہیں، ورنہ ان کی ذراسی غلطی اس نئے ملک کو ایسا سخت صدمہ پہنچائے گی جس سے وہ صدیوں تک عہدہ برآنہیں ہوسکتا۔

مرحوم سے میری ذاتی ملاقات کبھی نہیں ہوئی، البتہ چار دفعہ ان کو دور دور سے اور ایک دفعہ نزدیک سے دیکھنے کا اتفاق ہوا، پہلی دفعہ میں نے انہیں اس وقت دیکھا جب ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس تھے، اور وہ پہلی دفعہ مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں میں ظاہر ہوئے، سابق مہاراجہ محمود آباد کی سرکردگی میں لکھنؤ نے ان کا شاندار شاہانہ استقبال کیا تھا، اس وقت یہ نظم موزوں ہوئی:

اِک زمانہ تھا کہ اسرار دروں مستور تھے ۔۔۔ کوہِ شملہ جن دنوں ہم پایۂ سینا رہا،
جب ہمارے چارہ فرماز ہر کہتے تھے اُسے ۔۔۔ جس پہ اب موقوف ساری قوم کا جینا رہا
بادۂ حُبِّ وطن کچھ کیف پیدا کرسکے، ۔۔۔ دور میں یوں ہی اگر یہ ساغر و مینار رہا
علّتِ دیرینہ سے گو اصلی قویٰ بیکار ہیں ۔۔۔ گوش شنوا ہے، نہ ہم میں دیدۂ بینا رہا
پر مریضِ قوم کے جینے کی ہے کچھ کچھ اُمید
ڈاکٹر اس کا اگر مسٹر علی جینا رہا

اس کے بعد دوسرے سال بمبئی میں لیگ و کانگریس کے اجلاس ہوئے، مسلم لیگ کے صدر مظہرالحق مرحوم تھے اور جینا صاحب اس اجلاس کے بانی اور داعی تھے، لیکن مسلم لیگ کا یہ جلسہ جیسا کہ اس وقت سمجھا گیا انگریزی حکومت کے چند کارندوں کی شرارت سے درہم برہم ہوگیا، یہ مرحوم قائداعظم کے دیکھنے کا دوسرا موقع تھا، اس وقت قلم نے یہ نظم لکھی:

حق و باطل مدتوں تک معرکہ آرا رہا ۔۔۔ ابر، خورشیدِ حقیقت پر بہت چھایا رہا
پر شبِ تاریک اب تاریک پہلی سی نہیں ۔۔۔ ملک میں پچھلے دنوں کچھ کچھ اجالا سا رہا
وہ زمانہ جاچکا جب بت پرستی عام تھی ۔۔۔ جب خدا کا حکم، ہر عیّار کا ایما رہا
جب متاعِ رہنمائی تھی سزاوار خرید ۔۔۔ جب کہ ہر قاروں پہ ہم کو خضر کا دھوکہ رہا
پھر بھی تمیز حق و باطل کا وہ جوہر نہ تھا ۔۔۔ جو ہمیشہ قوم میں شمع رہِ صحرا رہا
رزمگاہِ نور وظلمت بمبئی مدت سے ہے ۔۔۔ گر یہیں انوارِ حق چمکے تو کیا بے جا رہا
آیتِ قرآں کہ جاءَ الحق مصدق ہوگئی
مجلسِ آئین ہماری ''مظہرحق'' ہوگئی

تیسرا موقع یہ آیا کہ ۱۹۲۱ء میں خلافت کی تحریک کے زمانہ میں محمد علی مرحوم اڈیٹر کامریڈ کے ساتھ جناح صاحب کے دفتر میں جانے کا اتفاق ہوا، جہاں دونوں لیڈروں میں اس وقت کے مسئلوں پر گفتگو ہوئی اور جس کا خاتمہ بالآخر ایک کی دوسرے سے علیحدگی پر ہوا۔

اس کے بعد میں نے انہیں ناگپور کی کانگریس میں دیکھا جب ترک موالات کی تجویز کی مخالفت کے لئے وہ کھڑے ہوئے اور پورے جلسہ کی مخالفت کے باوجود وہ اپنی بات پر اڑے رہے اور اس کے بعد وہ کانگریس کے اجلاس بلکہ کانگریس سے نکل

گئے اور پھر اس میں شریک نہیں ہوئے، سالہا سال کے بعد ابھی دو سال ہوئے جامعہ ملیہ کی جوبلی میں انہیں دیکھا اور ان کی تقریر سنی۔

ایک بات زبان پر آکر رکتی نہیں، کسی کو پسند ہو یا ناپسند ہو اب یہ حقیقت کہ ہندوستان کا براعظم ایک بار پھر دو مملکتوں میں بٹ گیا، اب ان دونوں مملکتوں کی بقا ان کے درمیان صلح و آشتی ہو سکتی ہے۔ ان دونوں مملکتوں میں ہزارہا خاندانوں کے لاکھوں افراد بکھر گئے ہیں، ان کی سلامتی ان دونوں مملکتوں کی سلامتی و خیرخواہی ہی میں ہے، اس لئے ان دونوں میں جتنا زیادہ باہمی اتحاد اور اعتماد بڑھے۔ اتنا ہی انسانیت اور دنیا کے امن کے لئے مفید ہے۔ (''س''، اکتوبر ۱۹۴۸ء)

سپرو، تیج بہادر، سر

سر تیج بہادر سپرو

افسوس ہے کہ گزشتہ ۲۱/ جنوری کو ملک کے نامور وکیل اور قانون دان سر تیج بہادر سپرو نے ۷۳ سال کی عمر میں انتقال کیا، عرصہ ہوا ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا، جس کے بعد ان کی صحت بگڑ گئی تھی، اور جس نے بالآخر ان کی زندگی کا چراغ گل کردیا، وہ ایک بڑے قانون دان بلکہ قانون ساز اور عالی دماغ مدبر تھے، اپنے پیشہ میں بڑا نام پیدا کیا اور بڑی دولت کمائی اور صوبائی و مرکزی اسمبلیوں سے لے کر وایسرائے کی ایکزیکٹیو کونسل کی لاممبری اور پریوی کونسل کی رکنیت تک کے اعزاز ان کو حاصل ہوئے وہ سیاسیات میں اعتدال پسند تھے۔ اور اس دائرہ کے اندر انھوں نے ملک و قوم کی بھی مفید خدمات انجام دیں اور انہی حیثیتوں سے ان کا ماتم کیا گیا۔

لیکن قومی نقطۂ نظر سے ان کی سب سے بڑھ کر خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار اردو زبان کے بڑے حامی و مددگار اور ہماری پرانی مشترک تہذیب کا علمی نمونہ اور اس صوبہ میں غالباً اس کی آخری یادگار تھے اور اس فرقہ پرستی کے زمانہ میں بھی جب کہ بڑے بڑے قوم پرستوں کے قدم ڈگمگا گئے ہیں وہ اپنی جگہ قائم رہے اور مشترک زبان اور مشترک تہذیب کا دامن ان کے ہاتھ سے نہ چھوٹا، اور برسوں ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد کے صدر رہے، کل ہند انجمن ترقی اردو کے مربی و سرپرست تھے اور تقسیم ہندوستان سے پہلے تک وہ اس کے مستقل صدر تھے، ابھی حال میں انھوں نے اردو زبان کی خدمت کے لئے الٰہ آباد میں روحِ ادب کے نام سے ایک مجلس قائم کی تھی، اردو کی تاریخ میں ان کا یہ فقرہ ہمیشہ یادگار رہے کہ اردو زبان ہندو مسلمانوں کا مشترک اور ناقابل تقسیم ترکہ ہے وہ خود اردو اور فارسی دونوں کا نہایت بلند اور ستھرا مذاق رکھتے تھے، اور نہایت فصیح اور شستہ اردو بولتے اور لکھتے تھے، اردو کی متعدد نظم و نثر کی کتابوں پر ان کے دیباچے اور مقدمے ان کی ادبی یادگار ہیں۔

کئی سال ہوئے کسی مقدمہ کے سلسلہ میں اعظم گڑھ انکا آنا ہوا تو دارالمصنفین دیکھنے کے لئے بھی آئے کتب خانہ میں فارسی کی الماری میں کلیات صہبائی دیکھ کر کہا میرے دادا مولانا صہبائی کے شاگرد تھے، اور کلیات نکال کر دیر تک الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے ہندوستان میں آئندہ ان سے بھی بڑے وکیل، قانون دان اور مدبر پیدا ہونگے لیکن ہندو مسلم اتحاد اور دونوں کی مشترک تہذیب کا ایسا نمونہ شاید اب نہ پیدا ہو سکے اس لئے ان کا ماتم تنہا ایک مقنن اور مدبر کا ماتم نہیں بلکہ مشترک تہذیب کی یادگار اور اردو زبان کے ایک محسن کا ماتم ہے۔ (''م''، فروری ۱۹۴۹ء)

نیڈو، سروجنی

مسز سروجنی نیڈو

افسوس ہے کہ ہماری قومی عمارت کا ایک اور ستون گر گیا اور ۲/ مارچ کو مسز سروجنی نیڈو ہم سے رخصت ہوگئیں وہ عورت تھیں مگر اپنے اوصاف اور خصوصیات میں بہتیرے مردوں سے بڑھ کر تھیں، وہ انگریزی زبان کی نازک خیال شاعرہ، سحر طراز خطیبہ، سیاسیات کی ماہر، جنگ آزادی کی سرفروش سپاہی اور ہندو مسلم اتحاد کا عملی نمونہ تھیں، انھوں نے آزادی کی جنگ میں مردوں کے دوش بدوش قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں، وہ فرقہ ورانہ جذبات سے بلند اور صلح کل تھیں، ان کا دل بڑا وسیع تھا، اس میں مسلمانوں کے لئے بھی جگہ تھی، مسلمانوں کے ساتھ ہمیشہ ان کے دوستانہ تعلقات رہے، اور اس فرقہ ورانہ دور میں بھی ان کے خیالات اور طرزعمل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی، ہندو مسلمانوں کے بعض اختلافی مسائل میں ان کے ذاتی خیالات حکومت کی پالیسی سے مختلف تھے، جن کو وہ صاف طریقہ سے ظاہر نہ کرسکتی تھیں، لیکن ان کی جھلک ان کی تقریروں میں نظر آجاتی تھی، وہ مغربی تعلیم یافتہ تھیں، ان کی ساری زندگی سیاسی میدان میں گزری، اس کے باوجود ان میں نسوانی اور مشرقی خصوصیات موجود تھیں، دل میں نسوانی مہر و محبت، طبیعت میں خلق و مروت، مزاج میں شگفتگی و خوش اخلاقی اور تہذیب و معاشرت میں مغربی آب و رنگ کے ساتھ مشرقی روح جھلکتی تھی، وہ اپنے طرزعمل سے ہندو مسلمان دونوں میں مقبول تھیں اور دونوں کا اعتماد ان کو حاصل تھا، اس لئے ان کی موت دونوں کا قومی حادثہ ہے، ہوا کا رخ دیکھتے ہوئے اب ایسی شخصیتوں کا پیدا ہونا بظاہر مشکل معلوم ہوتا ہے۔ (''م''، مارچ ۱۹۴۹ء)

حسین، سید

سید حسین

دوسرا بڑا حادثہ مسٹر سید حسین کی وفات ہے، مرحوم ہندوستان کی تحریک آزادی

کے دوراول کی یادگار، انگریزی زبان کے بہترین خطیب وانشا پرداز اورنامور صحافی تھے، عرصہ تک الہ آباد کے مشہور پرانے اخبار انڈیپنڈنٹ کے اڈیٹر رہے، پھر وفد خلافت میں لندن گئے اور غالباً وہیں سے امریکہ چلے گئے اور پچیس تیس سال تک وہاں اپنے قلم و زبان سے ہندوستان کی خدمت کرتے رہے اور امریکہ کے سیاسی اور صحافتی حلقوں میں بڑا نام پیدا کیا، ہندوستان کی آزادی کے بعد وطن واپس آئے اور نومبر ۱۹۴۷ء میں حکومت ہند کی جانب سے مصر کے سفیر بناکر بھیجے گئے، اور وہیں گذشتہ فروری میں انتقال کیا، آئندہ مسلمانوں میں ایسے صاحب کمال مشکل سے پیدا ہوں گے، اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، ان کی وفات پر ہندوستان کے اکابر کی خاموشی حیرت انگیز ہے۔

(''م''، مارچ ۱۹۴۹ء)

سیّد حسین کی موت

۲۵/فروری ۱۹۴۹ء کی رات کو ۹ بجے ریڈیو نے خبر سنائی کہ ہندوستانی سفیر متعین مصر سید حسین نے وفات پائی، دوسرے دن شاہانہ تزک واحتشام سے سرکاری طور سے ان کی تدفین عمل میں آئی، جنازہ میں شاہ فاروق نے شرکت کی اور بعض علمائے ازہر نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔

شاید لوگوں کو یاد ہو کہ ۱۹۲۰ء میں ہندوستان سے مجلس خلافت کا جو وفد یورپ بھیجا گیا تھا، اس کے ابتدائی ممبر تین تھے، محمد علی مرحوم، سید حسین اور سید سلیمان ندوی اور اس کے بعد شیخ مشیر حسین قدوائی اور ابوالقاسم (بنگال کے نامور لیڈر) بھی شامل ہوگئے، افسوس کے اس وقت راقم کے سوا سب ہی جنت کو سدھارے، اس وفد کے سکریٹری حسین محمد حیات صاحب تھے، جو بحمداللہ اس وقت بھی بقید حیات ہیں اور یہیں بھوپال میں اعلیٰ حضرت فرمانروائے بھوپال کے سکریٹری ہیں، سید حسین کی موت کی خبر ملتے ہی میں نے حیات صاحب کو فون کیا، وہ بھی خبر سن چکے تھے، کچھ دیر تک مرحوم کی وفات پر ہم دونوں افسوس کرتے رہے۔

وہ اس وقت گو جوان نہ تھے، ۶۲ برس کی عمر تھی، مگر چہرہ مہرہ اور بالوں کی سیاہی سے اب تک جوان بنے تھے، ان کی موت دل کی حرکت بند ہونے سے ہوئی، مصر کے تازہ آنے والوں سے سنا کہ ان کی صحت اخیر دنوں میں اس حد تک گرچکی تھی کہ ان کا کسی وقت بھی ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کرلینا تعجب خیز نہ تھا۔

مرحوم بہار و بنگال کے ایک ممتاز سادات کے گھرانے میں ۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے تھے وہ اردو کے مشہور ظریف انشا پرداز سید محمد آزاد کے چھوٹے بیٹے تھے، سید مرحوم اس زمانہ میں جب بہار بنگال ایک تھے، اعلیٰ سرکاری عہدوں پر ممتاز تھے، ان کے ظریفانہ مضامین اودھ پنچ لکھنؤ اور مشیر قیصر لکھنؤ میں چھپتے تھے اور بعد کو ان کے مضامین الگ بھی چھپے، اپنے زمانے میں مشہور ادیبوں میں ان کا شمار تھا۔

سید حسین نے ابتدائی تعلیم کے بعد انگلستان کی راہ لی، شعر وسخن اور ادب وانشاء کی گودوں میں انہوں نے پرورش پائی تھی، گو وہ انگریزی کے ادیب وانشاء پرداز تھے، لیکن اردو شعر وادب میں بھی ان کو خاصہ ملکہ تھا اور جس روانی سے انگریزی میں تقریر کرتے تھے، اردو میں بھی کرتے تھے، بڑے زندہ دل، ہنس مکھ اور باغ و بہار تھے۔

انگلستان میں جاکر انہوں نے اخبار نویسی سیکھی اور ۱۹۱۴ء والی بڑی لڑائی کے بعد جب ہندوستان میں سیاسی بیداری کا طوفان اٹھا وہ ہندوستان آئے اور پہلے مسٹر بارنی من کی نگرانی میں بمبئی کرانیکل کے اڈیٹوریل اسٹاف میں داخل ہوئے اور اس کے بعد ۱۹۱۸ء میں جب موتی لال جی نہرو آنجہانی نے الہ آباد سے انڈیپنڈنٹ نکالا تو اس کی اڈیٹری کے لئے اسی نوجوان صاحب قلم کا انتخاب کیا اور ان کو خود اپنے پاس رکھا، انڈیپنڈنٹ کی شہرت کے ساتھ ساتھ سید حسین نے بھی شہرت حاصل کی، ان کو میں نے اسی زمانہ میں بعض قومی سیاسی جلسوں میں دیکھا، گورا رنگ، چھریرا بدن، بہترین انگریزی سوٹ میں ملبوس اور یہی اخیر تک ان کا فیشن رہا۔ اسی زمانہ میں جلسوں میں ان کی طرف نگاہیں اور انگلیاں اٹھتی تھیں۔

یہ وہ وقت تھا کہ کانگریس اور خلافت کے اتحاد سے ملک میں سیاسی بیداری کا سیلاب بڑھتا جارہا تھا اور آخر شکست خوردہ ترکی کے حصہ بخرہ کرنے کی تجویریں فاتح اتحادیوں میں پیش تھیں کہ وہ دسمبر ۱۹۱۹ء میں مجلس خلافت کے اس اجلاس میں جو کانگریس کے ساتھ امرتسر میں ہوا تھا اور جس میں علی برادران نظر بندی سے رہا ہوکر پہلی بار شریک ہوئے تھے، یہ طے ہوا کہ محمد علی کی قیادت میں سید حسین اور سید سلیمان ندوی کا وفد انگلستان اور یورپ کے دوسرے دارالحکومتوں میں اس غرض سے بھیجا جائے تاکہ وہ مسلمانوں کا اور ہندوستان کا نقطۂ نظر پیش کرے، محمد علی مسلمانوں کے اور سید حسین ہندوستان کے سید سلیمان علمائے دین کے نقطۂ نظر کو پیش کریں۔ اس کے علاوہ گاندھی جی نے سید حسین کو اپنے نوٹ بھی لکھوا دیئے تھے کہ وہ ان کو وزرائے برطانیہ کے سامنے اپنی طرف سے پیش کریں، جن میں ہندوستان کے نقطۂ نظر کے مسئلہ خلافت کی توضیح تھی، چنانچہ سید حسین نے انگلستان کے جلسوں اور وزیروں کی ملاقاتوں میں اسی حیثیت سے اپنے فرض کو انجام دیا۔

۳۱/جنوری ۱۹۲۰ء پہلا دن تھا، جب وفد خلافت کی یہ مختصر سی جماعت، ہنگریا جہاز سے یورپ کو روانہ ہورہی تھی، اسی تاریخ کو شام کو سید حسین سے میری پہلی ملاقات ہوئی، سفر کا پہلا یا دوسرا دن تھا کہ شام کو محمد علی اور سید حسین میں انگریزی کی ایک ضرب المثل پر جو حقیقت میں ہابیل وقابیل کے سلسلہ میں توراۃ کا ایک فقرہ ہے کہ ''میں اپنے بھائی کا رکھوالا نہیں ہوں'' مناظرہ چھڑ گیا، سید حسین اس کی تائید اور محمد علی اس کی مخالفت

کر رہے تھے، یہ حقیقت میں ان دونوں کی زندگیوں کے اصول اور عقیدہ کا اختلاف تھا، محمد علی قومی مسلمان سے مذہبی مسلمان بن چکے تھے، جن کے نزدیک ہر مسلمان کا فرض تھا کہ دوسرے مسلمان کو غلطی سے روکے اور سید حسین ابھی اس منزل سے پیچھے تھے، ان کے نزدیک شخصی آزادی اسی میں تھی کہ کسے رابا کسے کارے نباشد، یہ مناظرہ بڑے جوش وخروش سے فریقین میں جاری رہا اور بڑی مشکل سے اس کو روکا جاسکا۔

محمد علی اور سید حسین دونوں ہی لائق اور قابل تھے اور دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اٹل اور اصول اور عمل رکھتے تھے، اس لئے ان دونوں شیروں کو تھپک تھپک رکھنا بڑا مشکل تھا، یہ کام اسی کو کرنا پڑتا تھا جو دونوں کے بیچ میں واوعطف کی طرح تھا اور واقعہ یہ ہے کہ دونوں کو غصہ جلد آجاتا تھا، تاہم کام کی اہمیت کا خیال کر کے دونوں نے جس طرح بنا آٹھ مہینے کی مدت کی خیر خوبی کے ساتھ نباہا۔

وفد خلافت ستمبر ۱۹۲۰ء میں یورپ میں اپنا کام ختم کر کے امریکہ جانے کا خیال کر رہا تھا کہ ہندوستان کے حالات نے اس کو ہندوستان لوٹنے پر مجبور کیا اور تنہا سید حسین نے امریکہ جانے کا ارادہ کیا، چنانچہ ادھر وفد ہندوستان واپس ہوا اور ادھر سید حسین نے امریکہ کی راہ لی، امریکہ پہنچ کر انہوں نے ہندوستان کی بڑی خدمت کی اور امریکہ میں اپنی تقریر وتحریر سے انگریزوں کے پروپیگنڈے کا جواب دیتے رہے اور ہندوستان کی بھلائی کا کام کرتے رہے، امریکہ سے ''نوائے وطن'' کے نام سے ایک اردو کا اخبار بھی نکالا اور اس سلسلہ میں ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۶ء تک گویا چوتھائی صدی امریکہ میں رہ کر اپنی زبان اور قلم سے ہندوستان کی خدمت میں مصروف رہے، اس دوران میں دس بارہ برس ہوئے چندماہ کے لئے ہندوستان آئے تھے، ہندوستانی یونیورسٹیوں میں ان کی خاص طور سے قدر کی تھی اور لاہور سے دکن تک اکثر یونیورسٹیوں کی دعوت پر انہوں نے تقریریں کیں، پھر وہ امریکہ واپس چلے گئے اور اخیر دفعہ وہ ۱۹۴۶ء میں ہندوستان واپس آئے، جب ہندوستان میں انگریز اپنی سیاست کا آخری تماشہ دکھا رہے تھے، میری ان کی ملاقات ایک چوتھائی صدی کے بعد ۱۶/ نومبر ۱۹۴۶ء کو جامعہ ملیہ کو جوبلی میں دہلی میں ہوئی، بڑی گرم جوشی سے مصافحہ ہوا اور پچھلے گلے شکوے اور حکایات ہوئے، دوسری آخری ملاقات ۲۴/ یا ۲۵/ اگست ۱۹۴۷ء کو اسی دلی میں مولانا ابوالکلام صاحب کی کوٹھی میں ہوئی جس کے بعد وہ نومبر ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی طرف سے مصر کے سفیر ہو کر مصر روانہ ہوئے، کام کے لئے صرف ایک سال کی مہلت پائی، مگر سنا ہے کہ حکومت ہند نے ان کے کاموں کو پسند کیا۔

مرحوم نے اپنی عمر تجرد ہی کی حالت میں گزاری، اس لئے ان کی کوئی ظاہری یادگار نہیں اور اس سے زیادہ افسوس یہ ہے کہ انہوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ انگلستان اور امریکہ میں گزارا، اس لئے ملک کو ان کی قابلیت سے براہ راست فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملا۔

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دُور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

مرحوم کے اعزہ بنگال اور کلکتہ میں موجود ہیں، ان کے دو عزیزوں کی شادیاں ہمارے گاؤں (دیسنہ ضلع پٹنہ) میں سادات کے گھرانے میں ہوئی ہیں۔

مرحوم کے ناتمام افسانۂ زندگی کی ان چند سطروں کے لکھنے کی حاجت نہ تھی۔ مگر میری ان کی آٹھ ماہ کی رفاقت کے حق نے لکھنے کا تقاضہ کیا تا کہ اس مسافرِ عدم کی یاد اہل وطن میں تازہ رہے۔

'' حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا ''

(''س''، اپریل ۱۹۴۹ء)

تصحیحات: میرے ایک ہم وطن عزیز بشیر الحق صاحب بیدلؔ جوان حالات سے مجھ سے زیادہ واقف ہیں، مضمون مذکور کی غلطیوں کی تصحیح کر کے بھیجی ہے جو نذر ناظرین ہے:

اپریل کے معارف میں ''سید حسین کی موت'' کے عنوان سے جو نوٹ آپ نے دیا ہے، میرے خیال میں اس میں دو تین جگہ آپ سے تسامح ہو گیا ہے:

(۱) میرے علم میں نواب محمد آزاد کے مضامین الپنچ بانکی پور پٹنہ میں کبھی نہیں نکلے، ان کے مضامین مشیر قیصر لکھنؤ اور اودھ پنچ میں نکلتے تھے۔

(۲) آپ نے لکھا ہے کہ سید حسین اس وقت ۶۲ برس کے تھے، اور ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے تھے اس حساب سے ان کی عمر صرف ۵۳ سال ہوتی ہے، معلوم ہوتا ہے کاتب کی غلطی سے ۱۸۸۶ء کی جگہ ۱۸۹۶ء چھپ گیا ہے اس حساب سے بھی ان کی عمر ۶۳ سال ہوتی ہے۔

(۳) سید حسین صاحب کے ایک ہی بھتیجے کی شادی دیسنہ میں ہوئی ہے، گزشتہ سال کے شروع میں جس لڑکے کی شادی دیسنہ میں ہوئی وہ سید حسین کے بڑے سوتیلے بھائی ڈپٹی اشرف صاحب مرحوم کا نواسہ ہے۔

(''س''، جون ۱۹۴۹ء)

<u>نبولوی، اصغر حسین، مولانا</u>

مولانا اصغر حسین نبولوی صاحب مرحوم
سابق پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ

(ابو محفوظ الکریم معصومی)

افسوس ہے کہ ۶/ ذوالحجہ شب جمعہ کو بوقتِ نماز عشاء مولانا اصغر حسین نبولوی سابق پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ نے داعی اجل کو لبیک کہا، انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم محلّہ نبولیہ بہار شریف کے رہنے والے اور صوبہ بہار کے طبقہ علیا کے فضلاء میں سے تھے معقولات کے ساتھ منقولات میں بھی یدطولی رکھتے تھے، حدیث وسنن سے خاص شغف تھا۔

طالب علمی میں عسرت کی زندگی بسر کی، آپ کی تعلیم کے ابتدائی مراحل مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں طے ہوئے امیر شریعت حضرت مولانا سجاد صاحب مرحوم و مغفور سے شرف تلمذ تھا، دارالعلوم دیوبند میں تکمیل کی تھی اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے مشکوۃ علم وعمل سے اقتباس نور کیا تھا، فراغت کے بعد مدرسہ اسلامیہ بہار میں درس وتدریس کی مسند پر جلوہ فرما ہوئے یہیں سے مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ گئے اور مولانا حاجی معین الدین ندوی مرحوم کے بعد اس کے پرنسپل ہوئے، تقریباً دو برس ہوئے اس سے ریٹائر ہوئے اور اپنے وطن میں تبلیغ دین وتصنیف وتالیف میں مصروف تھے کہ ۶؍ ذوالحجہ کو سفر آخرت کیا، کُل نفس ذائقه الموت [العنکبوت: ۵۷] موصوف کی یادگار صرف لڑکیاں ہیں اور اولاد ذکور میں کوئی نہیں۔

آپ کو تصنیف وتالیف کا بھی ذوق تھا، مدرسہ کے فرائض اور ذمہ داریوں کے باوجود آپ نے جو قلمی کام کئے اگرچہ مختصر لیکن مفید وقابلِ قدر ہیں، سوال و جواب کی شکل میں ترمذی شریف کی ایک مفید شرح لکھی جس کا نام نـــزلِ الثـــویٰ ہے، شرح اگرچہ نامکمل چھپی ہے لیکن اپنے اختصار و جامعیت کی وجہ سے عربی درسگاہوں میں مشہور ومتعارف ہے، اس کا اردو ایڈیشن بھی شائع ہو چکا ہے، سفرنامہ حجاز بھی مرتب کیا تھا جس کا نام ارمغان حجاز ہے اس کی اشاعت بھی ہو چکی ہے فی الحال تفسیر المنار کو اردو کا جامہ پہنا رہے تھے کہ زندگی کی آخری منزل ہی طے ہوگئی، اس ترجمہ کے بعض اجزاء مثلاً تمہید تفسیر قرآن ومقدمہ تفسیر قرآن شائع ہو چکے ہیں۔

(نومبر ۱۹۴۹ء)

بنارسی، محمد ابوالقاسم سیف، مولانا

مولانا محمد ابوالقاسم صاحب سیف بنارسی

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ جماعتِ اہلحدیث کے مشہور وممتاز عالم اور نامور مناظر مولانا محمد ابوالقاسم صاحب سیف بنارسی نے ۶۱ سال کی عمر میں انتقال کیا، مرحوم کی ساری عمر دین وعلومِ دینیہ کی خدمت میں گذری، مدرسہ سعیدیہ بنارس میں چالیس سال تک حدیثِ نبوی کا درس دیا، جوان کی سب سے بڑے فضیلت ہے، درس و تدریس کے ساتھ وعظ وتبلیغ اور تالیف وتصنیف کا شغل بھی تھا، لیکن ان کی بیشتر تصانیف مناظرانہ ہیں، آریوں، عیسائیوں اور قادیانیوں سے بڑے معرکہ کے مناظرے کئے، احناف سے بھی اس کی نوبت آجاتی تھی ادھر چند برسوں کے اندران پر فالج کے کئی ہلکے حملے ہوئے جس سے ان کی صحت بگڑ گئی تھی اس کے باوجود ان کے علمی وتعلیمی مشاغل جاری تھے، کہ گذشتہ ۲۵؍ نومبر کو جمعہ کے دن پھر اچانک حملہ ہوا اور چند گھنٹوں کے اندر قـال اللّٰــہ وقـال الرسول کی یہ آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی، مرحوم کے انتقال سے ہندوستان کے طبقہ علماء میں ایک ممتاز جگہ خالی ہوگئی، اللّٰھم اغفـره مغفـرةً واسعةً۔

(''م''، دسمبر ۱۹۴۹ء)

محمد، جمال، سیٹھ

سیٹھ جمال محمد

دوسرا قومی حادثہ مدراس کے مشہور اور مخیّر سیٹھ جمال محمد کی وفات ہے مسلمانوں میں صاحبِ ثروت تاجروں کی کمی نہیں لیکن مرحوم کے اوصاف وخصوصیات کی مثال مشکل سے ملے گی، دولتِ دنیا کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کو دینداری کی دولت بھی عطا فرمائی تھی، اور ان کا دل ملک وملت کی محبت سے بھی معمور تھا، انہوں نے بڑی دولت پیدا کی اور اسی فیاضی سے اس کو قوم و ملک کی راہ میں صرف کیا، ہندوستان میں مسلمانوں کی کوئی ایسی تحریک نہیں تھی جس میں ان کی امداد شامل نہ رہی ہو، مذہبی اور تعلیمی کاموں سے خصوصیت کے ساتھ بڑی دلچسپی تھی، ندوۃ العلماء لکھنو، دارالعلوم دیوبند، مدرستہ العلوم علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، جامعہ ملیہ اور اس قسم کے تمام دوسرے اداروں کے وہ معاون ومددگار تھے، شہر مدراس اور اس کے مضافات میں کئی عربی مدرسے اپنے صرف سے چلاتے تھے، مدراس میں انگریزی خواں مسلمان طالب علموں کے لیے ایک ہوسٹل بنوایا جس میں ان کی مذہبی تعلیم وتربیت کا بھی انتظام تھا، سیکڑوں غریب طالب علموں کو وظائف دیتے تھے، حضرۃ الاستاد مدظلہ کے خطبات مدراس، محمد مارماڈیوک پکتھال اور سر اقبال مرحوم کے انگریزی خطبات بھی مرحوم ہی کے جذبہ دینی کی یادگار ہیں۔

مرحوم کو سیاسی کاموں سے بھی دلچسپی تھی، تحریک خلافت میں ان کا بڑا حصہ تھا، اس میں انہوں نے ایک لاکھ کا عطیہ دیا تھا، ایک زمانہ تک کانگریس کے بھی سرگرم رکن رہے، لیکن پھر سیاست سے الگ ہوگئے تھے، اپنی زندگی میں انہوں نے لاکھوں روپے دین وملت کی راہ میں خرچ کئے، مدراس میں ان کا دولت کدہ اہل حاجت کا ملجا و ماویٰ تھا، لیکن اس دولت وثروت کے ساتھ خود ان کی زندگی نہایت سادہ، ادھر چند برسوں سے ان کا کاروبار بگڑ گیا تھا، لیکن اس حالت میں بھی جو پہلے کے مقابلہ میں گویا غربت کی حالت تھی، ان کی فیاضی میں فرق نہیں آیا، افسوس ہے کہ ۹؍ نومبر کو اس محسنِ قوم کا انتقال ہوگیا، اللہ تعالیٰ ان کے حسنات کے طفیل میں عالمِ آخرت کی تونگری عطا فرمائے۔

(''م''، دسمبر ۱۹۴۹ء)

عثمانی،شبیر احمد،علامہ

علامہ شبیر احمد عثمانی

افسوس کہ آج قلم کو اس ہستی کا ماتم کرنا پڑ رہا ہے جو ساری عمر قوم و ملت کی غم گسار رہی، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کی وفات کا سانحہ نہ صرف پاکستان بلکہ علمی و مذہبی دنیا کا بڑا حادثہ ہے، وہ اس دور کے جلیل القدر عالم، متبحر فاضل، نامور خطیب اور صاحبِ بصیرت مدبر تھے، دینی علوم میں ان کا پایہ بہت بلند تھا، ان کی ساری عمران کی خدمت میں گذری، برسوں دارالعلوم دیوبند میں ان کا علمی فیض جاری رہا۔ پھر ڈابھیل (سورت) کی مشہور دینی درسگاہ میں چلے گئے اور وہاں کئی سال تک ان کے درس و افاضہ کا سلسلہ قائم رہا۔ قرآن مجید پر ان کا اردو حاشیہ موضح الفرقان اور صحیح مسلم کی ضخیم عربی شرح فتح الملہم ان کا بڑا علمی و دینی کارنامہ ہے، اس کے علاوہ چند چھوٹی چھوٹی تصانیف بھی ان کی یادگار ہیں۔

ملکی اور قومی کاموں میں بھی ان کا حصہ رہا ہے، وہ عرصہ تک جمعیۃ العلماء کے شریک کار رہے، پھر پاکستان کی تحریک کے بعد مسلم لیگ میں شامل ہوگئے، اور جمعیۃ علمائے اسلام کے صدر منتخب ہوئے اور پاکستان کی تبلیغ و اشاعت میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا، اس کے چند ممتاز بانیوں میں سے ایک وہ بھی تھے، قیام پاکستان کے بعد کراچی چلے گئے، اور اس کی دستور ساز اسمبلی کے رکن مقرر ہوئے، پاکستان میں ان کی حیثیت مذہبی مشیر کی تھی، اور حکومت کے ارکان پر ان کے علم و عمل، تقویٰ و دیانت، فہم و فراست، اخلاق و سیرت اور استغنا و بے نیازی کا بڑا اثر تھا، اور ان کی ذات سے پاکستان کی مذہبی اصلاح کی بڑی امیدیں وابستہ تھیں، لیکن افسوس موت نے اس کا موقع نہ دیا، اور گذشتہ ۱۳/ دسمبر کو بغداد الجدید ریاست بھاولپور میں علم و عمل کی یہ شمع دفعتہً خاموش ہوگئی، اس حادثہ سے علمی و مذہبی دنیا ایک جلیل القدر عالم سے محروم ہوگئی، اللہ تعالیٰ اس خادم دین و ملت کو اپنی رحمتوں اور برکتوں سے نوازے۔ (''م''، جنوری ۱۹۵۰ء)

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ

دسمبر ۱۹۴۹ء کے وسط میں جدہ میں تھا، ۱۳/ دسمبر کی شام کو مغرب کے بعد حکومت سعودیہ کی وزارت خارجیہ جدہ میں ایک ہندوستانی مسافر کی دعوت تھی، شہر کے کچھ معززین، اسلامی حکومتوں کے سفیر اس میں شریک تھے، ہندوستان پاکستان، مصر و عراق وغیرہ کے سفیر اور وزارت خارجہ سعودیہ کے بعض ارکان موجود تھے میں ہندوستانی کونسل کے نمائندوں پروفیسر عبدالمجید خان انڈین کونسل اور مولانا عبدالمجید الحریری کمشنر حج متعین جدہ کے ساتھ وہاں پہنچا، احباب کچھ آچکے تھے کچھ آرہے تھے، مختلف موضوعوں پر گفتگو تھی، خصوصیت سے کراچی میں اسلامی ملکوں کی جو اقتصادی کانفرنس ہورہی تھی اس میں حجاز کی طرف سے حجاز کی اقتصادی حالت کی جو مطبوعہ رپورٹ اس وقت سامنے رکھی تھی اس پر گفتگو ہورہی تھی کہ اتنے میں جدہ میں پاکستانی کونسل مسعود صاحب جو مولانا ابوالبرکات عبدالروف صاحب واناپوری کے صاحبزادہ ہیں، تشریف لائے اور نہایت افسوس کی ساتھ یہ ذکر کیا کہ آج مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی کا انتقال ہوگیا، اس خبر کے سننے کے ساتھ مجلس پر اداسی چھا گئی، میرے سامنے سے پوری نصف صدی کی معاصرانہ مسابقتوں کی ایک دنیا گزر گئی۔

۱۹۰۲ء کی بات ہے وہ دارالعلوم دیوبند میں اور راقم دارالعلوم ندوہ میں تعلیم پارہے تھے، یہ زمانہ دونوں درسگاہوں کا زریں زمانہ تھا، دارالعلوم ندوہ میں میرے ساتھ میرے ایک عزیز قریب و ہم وطن (مولوی سید محمد قاسم صاحب خلف الرشید مولانا شاہ تجمل حسین صاحب خلیفہ شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی، وحضرت مولانا شاہ امداد اللہ صاحب مہاجر مکی، (رحمہم اللہ تعالیٰ) رفیق درس تھے، وہ اپنے والد کے حکم سے ندوہ چھوڑ کر دیوبند چلے گئے تھے، اُن کو طالب علموں کی انجمن سازی اور دفتری داری کا بڑا اچھا سلیقہ تھا، چنانچہ دیوبند پہنچ کر انہوں نے اس سلیقہ کا ثبوت دیا، اور دیوبند میں طالب علموں کی تقریر و تحریر کی ایک انجمن کی بنیاد ڈالی، مولانا شبیر احمد صاحب جو ان دنوں اُنہی کی عمر کے طالب علم تھے، اور تقریر و تحریر کا فطری ذوق رکھتے تھے، ان جلسوں میں دلچسپی لیتے تھے، اور اسی مناسبت سے مولوی قاسم سے بھی ان کو محبت تھی، مولوی قاسم نے ندوہ و دیوبند کو ملانا چاہا۔ وہ میرے خطوں میں مجھ سے مولانا شبیر احمد صاحب کا تذکرہ کرتے تھے اور سلام پہنچاتے تھے، اور میرا تذکرہ ان سے کرتے تھے، اور میری طرف سے ان کو سلام پہنچاتے تھے، اس تعلق کا یہ اثر ہوا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے آشنا اور ایک دوسرے سے واقف ہوگئے، یہ وہ زمانہ تھا جب دیوبند سے القاسم اور ندوہ سے الندوہ نکل رہا تھا، اور ہم دونوں کے مضامین اپنے اپنے پرچہ میں نکلتے تھے، اور چھپتے تھے، اسی زمانہ میں مرحوم کسی تعلق سے لکھنؤ آئے، تو مدرسہ میں مجھ سے ملنے آئے، یہ میری اُن کی طالب علمانہ ملاقات کا پہلا موقع تھا یہ غالباً ۱۹۰۴ء کی بات ہے۔

۱۹۰۶ء میں میری دستار بندی ہوئی، اور دستار بندی کے جلسہ میں برجستہ عربی تقریر کی وجہ سے عربی مدرسوں میں ایک خاص شہرت حاصل ہوئی، اور اسی زمانہ میں مولانا کو بھی فراغت حاصل ہوئی وہ دارالعلوم دیوبند میں اور میں دارالعلوم ندوہ میں مدرس ہوگئے، اسی کے سال دو سال کے بعد کسی انجمن کی دعوت پر پنجاب جانے کا اتفاق ہوا، تو راہ میں سہارنپور اُتر کر دیوبند چلا گیا، یہ میری حاضری کا پہلا اتفاق تھا، ان دنوں دارالعلوم دیوبند میں میرے عزیز دوست ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب (خلف مولانا سید حکیم عبدالحی صاحب ناظم ندوہ) ندوہ کی تعلیم سے فارغ ہوکر دیوبند میں حدیث کے دورہ میں شریک تھے، میں نے اس کا اہتمام کیا کہ مجھے کوئی پہچانے نہیں منہ چادر میں

لپیٹے تھا، مدرسہ پہنچ کر سید عبدالعلی صاحب کو پوچھ کر ان کے کمرہ میں گیا، وہ مجھے یک بیک دیکھ کر زبان سے کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ میں نے اشارہ سے ان کو منع کیا اور وہ رُک گئے، اور ساتھ لے کر مدرسہ اور درس کے کمرے دکھانے لگے، اور آخر میں اوپر چھت پر دارالشوریٰ اور دارالاہتمام دکھانے لے گئے، اتفاق دیکھئے کہ ایک طالب علم جو پہلے ندوہ میں پڑھتے تھے، اور اب دیوبند میں زیر تعلیم تھے، وہ دارالاہتمام سے نکل رہے تھے، وہ مجھے دیکھنے کے ساتھ دوڑ کر مولانا حبیب الرحمان صاحب نائب مہتمم کی خدمت میں چلے گئے، اور میرا نام بتادیا، موصوف نے جو ہمہ تن متواضع اور خاکسار تھے، ایک معمولی طالب علم کے لیے یہ زحمت فرمائی کہ تشریف لائے اور اپنے ساتھ اندر کمرہ میں لے گئے، اور چائے کی دعوت فرمائی جس میں اکثر حضرات مدرسین شریک تھے، دوسرے وقت حضرت مولانا حافظ احمد صاحب مہتمم مدرسہ نے اپنے فضیلت کدہ پر کھانے کی دعوت فرمائی۔

ایک طالب علم کے لیے سب سے بڑی دعوت طالب علموں کے جلسہ کی ہوسکتی تھی، چنانچہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے جلسہ کا اہتمام فرمایا، یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ صدر مدرس تھے مگر اس خدمت سے علیحدگی کا خیال کر رہے تھے، اور حضرت مولانا انور شاہ صاحب اور حضرت مولانا حسین احمد صاحب تازہ تازہ حجاز سے ہندوستان وارد ہوئے تھے، جلسہ آراستہ ہوا، طالب علموں نے تقریریں کیں، آخر میں مولانا انور شاہ صاحب اور مولانا حسین احمد صاحب نے عربی میں تقریریں کیں، اور پھر اس کم سواد کو عربی میں تقریر کا حکم ہوا، اور اُس نے تعمیل کی۔

اس زمانہ میں آریوں کی تحریک سے شدھی کا زور تھا، اور عربی مدرسوں میں آریوں سے مناظرہ کی تعلیم دی جاتی تھی، چنانچہ جلسہ کے بعد طالب علموں نے آریہ اور مسلمانوں کے مناظرہ کا مظاہرہ کیا، طالب علموں کے دو گروہ بنے، ایک، ایک مسئلہ کا حامی تھا، دوسرا اس پر معترض، باہم سوال و جواب اور ردوقدح کا سلسلہ قائم تھا کہ ایک فریق کمزور سا پڑ گیا، مولانا شبیر احمد صاحب جو مدرسین کے ساتھ میرے قریب بیٹھے تھے، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سے اجازت لے کر مدرسین کی صف سے نکل کر طالب علموں میں مل گئے، اور اس کمزور فریق کی حمایت میں فرمانے لگے، اور آخر اپنی تقریر کی قوت اور استدلال کے زور سے ہارا ہوا میدان جیت لیا، اور سب نے ان کی ذہانت اور طباعی کی داد دی، میں نے حضرت شیخ الہندؒ کی تمام عمر میں ایک دفعہ زیارت کی، اور وہ اسی موقع پر نہایت سادگی اور خاموشی کے ساتھ ایک کمرہ میں جس میں کھری چارپائی اور ایک چٹائی اور ایک مٹی کا لوٹا تھا، تشریف فرما تھے۔

اس واقعہ پر سالہا سال گزر گئے، مولانا شبیر احمد صاحب دارالعلوم دیوبند میں درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، اور سال بہ سال ادنیٰ سے اعلیٰ کتابوں کا درس دیتے ہوئے کتبِ حدیث کا درس دینے لگے، کچھ دنوں کے بعد مدرسہ فتح پوری دہلی میں صدر مدرس ہوگئے، اسی زمانہ میں میرا بھی دلی جانا ہوا، تو مدرسہ میں اُن سے ملاقات ہوئی، مگر پھر دارالعلوم دیوبند لوٹ آئے، اسی زمانہ میں مولانا عبیداللہ سندھی حضرت مولانا شیخ الہندؒ کی طلب پر دیوبند آکر مقیم ہوئے تھے، ان کا مشن یہ تھا کہ دیوبند پر جو تعلیمی فضا محیط ہوگئی تھی، اور سید احمد شہید اور مولانا اسمٰعیل شہید کی مجاہدانہ روح جو اس حلقہ سے دبتی چلی جارہی تھی، اس کو دوبارہ زندہ کیا جائے، اور اس سلسلہ میں موتمر الانصار کی بنیاد پڑی، اور اس کا ۱۹۱۱ء یا اس کے پس وپیش زمانہ میں مرادآباد میں بہت بڑا جلسہ ہوا، جس میں علی گڑھ اور ندوہ اور دیوبند کے اکثر رجالِ علم وعمل جمع ہوئے، اور تمام ہندوستان سے مسلمانوں کا بہت بڑا مجمع اس میں شریک تھا، ندوہ سے حضرت الاستاذ مولانا شبلی مرحوم شریک ہوئے تھے، اس جلسہ میں مولانا شبیر احمد صاحب نے العقل والنقل کے نام سے اپنا ایک کلامی مضمون پڑھ کر سُنایا، حاضرین نے بڑی داد دی، اس مضمون میں گو جدید معلومات حضرۃ الاستاذ کی تصنیف سے لئے گئے تھے، مگر اس کا نتیجہ اس کے برعکس نکالا گیا تھا، یہ گویا حامیانِ عقل کے اس علم کلام کا رد تھا، جس میں خرق عادت کے وجود اور معجزات کے صدور پر ناک بھوں چڑھائی جاتی تھی، حضرت الاستاذ نے واپس آکر مجھ سے فرمایا تھا، کہ انھوں نے معلومات میری کتاب سے لی اور پھر میرا ہی رد کیا۔

دیوبند کے حلقہ میں اس زمانہ میں یہ بات برملا کہی جاتی تھی کہ مولوی شبیر احمد صاحب کو حضرت مولانا قاسم صاحب کے علوم و معارف پر پورا احتوا ہے، وہ حضرت مولانا کے مضامین و معانی کو لے کر اپنی زبان اور اپنی طرز ادا میں اس طرح ادا کرتے تھے کہ وہ دلنشین ہوجاتے تھے، یہ خیال رہے کہ مولانا قاسم صاحبؒ کے مضامین نہایت غامض، دقیق اور مشکل ہوتے تھے، جن تک عوام کی پہنچ نہیں ہوسکتی تھی، اس لئے اُن کے مضامین اور حقائق کو سمجھنا، پھر زمانہ کی زبان میں اس کی تعبیر و تفہیم کوئی آسان بات نہ تھی، اور اسی لیے مولانا شبیر احمد کی تقریر و تحریر کی تعریف کی جاتی تھی۔

۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک مسلمانوں کی سیاست کروٹ لے رہی تھی، یکے بادیگرے طرابلس، پھر کانپور کی مسجد، پھر بلقان کی جنگ، پھر یورپ کی پہلی جنگ عظیم کے واقعات پیش آئے، اور ہندو مسلمانوں کے میل ملاپ کی سیاسی تحریک بڑھتی اور پھیلتی گئی۔

یہاں پر ایک بات مجھے بے محابا کہنا ہے یہ وہ وقت تھا کہ جب مولانا ابوالکلام کا الہلال نکل رہا تھا، اور ان کی آتش بیانی سے مسلمانوں میں آگ سی لگی ہوئی تھی، اور وہ جہاد جس کے نام لینے سے لوگ ڈرنے لگے تھے، مولانا ابوالکلام نے اس کا صور اس بلند آہنگی اور بیباکی سے پھونکا کہ یہ بھولا ہوا سبق لوگوں کی زبانوں پر آگیا، الہلال دیوبند کے حلقہ میں بھی آتا تھا، اور حضرت مولانا محمود حسن کی مجلس میں پڑھا جاتا تھا،

میں نے اس زمانہ میں حضرت مولانا محمود حسن صاحب کا یہ فقرہ سنا تھا کہ ہم نے جہاد کا سبق بھلا دیا تھا، اور ابوالکلام نے ہم کو پھر یاد دلا دیا۔

اس زمانہ میں مولانا عبیداللہ صاحب سندھی حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ کے ترجمان تھے، مگر یہ حالت دیر تک قائم نہ رہی، اس حلقہ کی ایک جماعت پر مدرسہ کے مصالح مقدم تھے، اور دوسرے پر اسلام کے مصالح، مولانا محمود حسن صاحب دل سے دوسری جماعت میں شریک تھے، میں نے سُنا کہ انھوں نے ایک دفعہ فرمایا کہ ہمارے بزرگوں نے تو مدرسہ اپنے اصلی مقصد (جہاد) پر پردہ ڈالنے کے لیے بنایا تھا، بہرحال مولانا عبیداللہ سندھی کو دیوبند سے ہٹنا پڑا، اور دہلی میں مسجد فتح پوری کے ایک گوشہ میں دائرۃ المعارف کی بنیاد ڈالی، اور اس میں انگریزی خواں تعلیم یافتوں اور عربی کے فارغ التحصیل عالموں کو قرآن پاک کا درس اس جہادی اسپرٹ میں دینے لگے، جو سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کی زندگی کی روح تھی، اور مجاہدین سرحد (یاغستان و چمرقند) سے حلقۂ اتصال قائم کیا گیا، اس وقت یورپ کی جنگ کے شعلے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے، اور ہندوستان میں بغاوت کا خیال روز افزوں تھا، انگریزی حکومت کی جاسوسی اپنا کام کر رہی تھی، مولانا ابوالکلام، محمد علی، شوکت علی، حسرت موہانی وغیرہ احرار سب نظر بند تھے، یا جیل میں تھے، حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ نے ہندوستان سے ہجرت کی، اور وہ حجاز میں قید ہو کر مالٹا میں نظر بند ہوئے، اور مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا سیف الرحمٰن اور مولانا عبداللہ انصاری چھپ کر افغانستان چلے گئے، جو لوگ اب باقی رہ گئے تھے، ان میں بڑے لوگ حکیم اجمل خان مرحوم، ڈاکٹر انصاری مرحوم اور مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی تھے، ان لوگوں نے قوم کی باگ اپنے ہاتھ میں لی اور پہلے مجلس خلافت اور پھر جمعیۃ العلماء کی بنیاد ڈالی، اس وقت تک مولانا حسنؒ مالٹے میں تھے، ۱۹۲۰ء میں جو وفد خلافت لندن گیا تھا اس کا ایک ممبر یہ راقم الحروف بھی تھا، غالباً مارچ یا اپریل میں جب مسٹر فشر وزیر تعلیم قائم مقام وزیر ہند سے ملاقات ہوئی، تو میں نے حضرت شیخ الہندؒ کی اسیری و نظر بندی کے معاملہ کو ان کے سامنے پیش کیا، یاد آتا ہے کہ موصوف اسی سال کے اخیر لیا ۱۹۲۱ء کے شروع میں مالٹا سے چھوٹ کر مع خدام کے جن میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب بھی تھے، واپس آئے مگر شاید چند ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہے، اور وفات پائی، اس درمیان میں عقیدتمندوں نے ہر سمت سے ان کو بلایا، مگر خود تشریف نہ لے جاسکے، اپنے قائم مقام یا ترجمان کی حیثیت سے مولانا شبیر احمد صاحب ہی کو بھیجا، ان مقامات میں سے خاص طور سے دہلی کے جلسہ میں ان کی نیابت نہایت یادگار اور مشہور ہے گائے کی قربانی ترک کرنے کے مسئلہ میں بھی جس کو حکیم اجمل خان مرحوم نے اٹھایا تھا، حضرت مولانا شیخ الہند کی طرف سے مولانا شبیر احمد صاحب نے نہایت واشگاف تقریر فرمائی تھی، یہ ترجمانی اور نیابت مولانا شبیر احمد صاحب کے لئے نہ صرف فخر وشرف کا باعث بلکہ ان کی سعادت اور ارجمندی کی بڑی دلیل ہے۔

۱۹۲۳ء کے آخر میں گیا میں کانگریس اور جمعیۃ العلماء کے شاندار اجلاس ہوئے، جمعیۃ کے اعلیٰ اجلاس کے صدر مولانا حبیب الرحمان صاحب تھے، ان کے ساتھ حلقۂ دیوبند کے اکثر اساتذہ آئے ہوئے تھے، ان میں مولانا شبیر احمد صاحب بھی تھے کانگریس اور جمعیۃ کے یہ اجلاس ایک خاص حیثیت سے اہمیت رکھتے ہیں یعنی اس اجلاس میں کانگریس کی سیاست میں ایک اہم تبدیلی ہوئی اور پنڈت موتی لال، سی آر داس، حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری وغیرہ کی رہنمائی، میں ترک موالات کی جگہ جس میں کونسلوں اور اسمبلیوں کا بائیکاٹ بھی تھا، یہ تجویز سامنے رکھی گئی کہ ان کونسلوں اور اسمبلیوں پر قبضہ کر کے حکومت کو بے دست و پا کر دیا جائے، گویا مقصد یہ تھا کہ مقصود کے حصول کے لیے طریق جنگ اور لڑائی کے ڈھنگ کو بدلا جائے، اس تحریک کے حامیوں نے سوراج پارٹی، اپنا نام رکھا، اس وقت گاندھی جی، ابوالکلام، محمد علی وغیرہ جیل میں تھے، ان کے خالص پیرووں نے اس کی سخت مخالفت کی اور نوچنجر (نہ بدلنے والے) کا لقب پایا کانگریس کی طرح جمعیۃ میں بھی حکیم صاحب نے اس تجویز کو پیش کیا، اور اس کے فیصلہ کے لیے ارکان جمعیۃ کا خاص جلسہ ہوا، تجویز کے حامیوں کی طرف سے خاکسار نے اور مخالفوں کی طرف سے مولانا شبیر احمد صاحب نے تقریریں کیں، مولانا شبیر احمد صاحب کی اس تقریر کا صرف ایک حصہ مجھے یاد ہے جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ حضور انور علیہ الصلوۃ والسلام خانہ کعبہ کی فتح کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنیاد پر قائم کرنا چاہتے تھے، مگر چونکہ قریش نو مسلم تھے ان کو یہ بات کعبہ کی حرمت اور ادب کے خلاف نظر آئی، اس لیے حضورؐ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ارشاد فرمایا کہ اگر تمہاری قوم تازہ مسلمان نہ ہوتی، تو میں کعبہ کو ڈھا کر پھر اس کی بنیاد ابراہیمی اساس رکھتا، یہ واقعہ بیان کر کے مولانا نے فرمایا کہ ترک موالات کے بدولت ابھی ہماری قوم انگریزوں کی غلامی سے نئی نئی نکلی ہے، یہ کونسل اور اسمبلی کے چکر میں پڑ کر پھر نہ غلام بن جائے، بہرحال ووٹ لئے گئے، اور مولانا کی مخالفت کامیاب ہوئی۔

مولانا حسین احمد صاحب کا نام اس وقت تک خواص سے نکل کر عوام تک نہیں پہنچا تھا، وہ اس تمام ہنگامہ کے وقت حضرت شیخ الہند کے ساتھ مالٹے میں تھے، ساتھ ہی ۱۹۲۱ء میں ہندوستان واپس آئے، اور سب سے پہلی دفعہ ہندوستان کی سیاست میں کراچی خلافت کانفرنس میں مقرر کی حیثیت سے نمودار ہوئے اور اس مشہور انقلابی تجویز کے مؤیدین میں تھے، جس میں مسلمان فوجیوں سے فوج کی ملازمت ترک کرنے کی تحریک تھی، اس کے محرک محمد علی اور مؤید مولانا حسین احمد، پیر غلام مجدد اور سیف الدین کچلو وغیرہ تھے، آخر سب پر مقدمے چلائے گئے، اور سب کو چند سال کی قید کی سزا

ہوئی،

؎ بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

اس قید سے آزادی کے بعد حضرت مولانا حسین احمد صاحب بیش از بیش تحریکات میں حصہ لینے لگے اور آخر خلق کی زبان نے ان کو شیخ الہند کا جانشین مان لیا، اور اب حضرت شیخ الہند کے مسلک کی ترجمانی اور اُن کی جماعت کی نمائندگی مولانا موصوف فرمانے لگے، تاہم خلافت اور جمعیۃ کے جلسوں میں مولانا شبیر صاحب بھی آتے جاتے رہتے تھے، لیکن یہ آمدورفت بھی کم ہوتی رہی۔

۱۹۲۶ء میں جب سلطان ابن سعود نے مکہ معظمہ میں عالمگیر اسلامی کانفرنس بلائی، اور ہندوستان کی مختلف مجلسوں کی طرف سے وفد بھیجے گئے، تو خلافت کے وفد کی صدارت حکیم صاحب اور احرار پنجاب کے اصرار سے اس خاکسار کے حصہ میں آئی، اور اس کے ممبر محمد علی، شوکت علی، شعیب قریشی ہوئے، اور جمعیۃ العلماء کے وفد کے صدر مولانا کفایت اللہ صاحب، اور ممبر حافظ احمد سید صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب مولانا عبدالحلیم صدیقی صاحب اور مولانا عرفان صاحب مرحوم تھے، یہ کل وفد ایک ہی جہاز پر حجاز کو روانہ ہوا، اور اس طرح اس سفر میں مرحوم کو بہت پاس سے دیکھنے کا موقع ملا طبیعت میں بڑی نزاکت تھی، اور بات بات میں وہ چیز ظاہر ہوتی تھی، اس لیے رفقائے سفر ان کی بڑی رعایت کرتے تھے ایک یمنی طالب علم جو دیوبند میں ان کے شاگرد تھے، ان کی خدمت کرتے تھے، اور یہ خدمت پورے سفر حجاز میں انہوں نے کی، جدہ سے مکہ معظّمہ تک ہم سب ایک لاری میں آئے، جب مکہ معظّمہ قریب آیا تو مرحوم پر عجب کیفیت تھی، انہوں نے قران کا احرام باندھا تھا اور ہم سب تمتع کے احرام میں تھے، جیسے جیسے مکہ معظّمہ قریب آتا جاتا تھا، ان پر گریہ کا غلبہ ہوتا جاتا تھا، اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے، یہ ان کا دوسرا حج تھا، مکہ میں موتمر کے جلسے ایک ماہ کے قریب ہوتے رہے، ان میں ہم لوگ شریک ہوتے رہے اور اکثر مولانا شبیر احمد صاحب بھی شریک ہوتے تھے، اسی سفر میں مجھے علم ہوا کہ موصوف عربی تحریر و تقریر پر اچھی طرح قادر تھے، سلطان نے خلاف اور جمعیۃ کے دونوں وفدوں کو ایک ساتھ ملنے کو بلایا، اور مختلف موضوعوں پر گفتگو کی، مولانا شبیر احمد صاحب نے اس موقع پر خلافت توقع اپنے اکابر دیوبند کے عقائد اور فقہی مسلک پر اچھی اور شستہ گفتگو کی، اور سلطان اس کو دیر تک سنتے رہے۔

موتمر کی کاروائیوں میں تو مولانا نے کوئی خاص حصہ نہیں لیا، مگر موتمر کے آخری اجلاس میں ایک مضمون انہوں نے پڑھ کر سنایا، جس کو پہلے سے وہ لکھ لائے تھے، مگر اپنے رفقاء کو وہ پہلے سے نہیں دکھایا تھا، میں اس آخری جلسہ میں شریک نہ تھا، مگر وفد جمعیۃ کے ارکان کو مولانا کے اس تنہا بیان سے بڑی حیرانی تھی، بہرحال بات چپ چپ ختم ہوگئی۔

حج کے مناسک میں بھی ان کی رفاقت رہی، یہ زمانہ گرمی کا تھا، بادسموم کے جھونکے چل رہے تھے، ظہر کے وقت ذوق وشوق میں مسجد نمرہ میں نماز پڑھنے کی آرزو تھی، مگر آفتاب کی حدت اور دھوپ کی تمازت دیکھ کر ہمت نہیں پڑتی تھی، مگر مولانا کفایت اللہ صاحب اور حافظ احمد سعید نے اونٹوں کا سامان کرلیا تھا، آخر مولانا کفایت اللہ صاحب کے ساتھ اونٹ پر ان کا ردیف بن کر چلا، مجھے ہر قدم پر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب گرا، اور تب گرا، اسی خوف سے واپسی میں پیدل آیا، اسی موسم کی شدت میں مولانا شبیر احمد صاحب پیدل ہی روانہ ہوئے، مسجد کے قریب ہی پہنچے تھے کہ بادسموم کے ایک جھونکے نے ان کو آلیا، مگر بال بال بچ گئے۔

اس نماز میں آنے کا شوق اس خیال سے بھی تھا کہ سلطان امامت کریں گے، اور ایک سلطان وقت کے پیچھے ہم ہندوستان کے غلام نماز پڑھیں گے، مگر مسجد میں جماعت تیار تھی، سلطان کا انتظار رہا، وہ نہیں آئے، تو ایک مصری شیخ نے نماز پڑھائی نماز ختم ہوئی تو دیکھا کہ سلطان اپنے نجدی ہمراہیوں کے ساتھ ننگے سر اور ننگے پاؤں لمبے لمبے قدم رکھتے ہوئے آرہے ہیں، بعد کو جب سلطان سے ملاقات ہوئی تو میں نے حاجیوں کی طرف سے شکایت پیش کی کہ نماز میں آپ کا بڑا انتظار رہا۔ سلطان نے کہا ہمارے نجدی بھائی آپ جانتے ہیں کہ چھتری نہیں لگاتے، اس لیے میں نے چاہا کہ ذرا آفتاب ڈھل جائے، تو چلوں، مگر میرے پہنچنے سے پہلے ہی نماز ہوگئی، پھر کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ میں بچپن ہی سے بے گھر ہوگیا، تعلیم جیسی چاہیے نہیں ہوئی، بدوی ہوں، قرات نہیں جانتا، بدآواز بھی ہوں، اس لیے نماز پڑھانے سے گریز کرتا ہوں، میں نے مذاقاً کہا کہ سال میں ایک دفعہ لوگ آسانی سے اس آواز کو گوارا کرسکتے ہیں، مولانا شبیر احمد صاحب نے فرمایا کہ ہم ہندوستان کے مسلمان تو مشتاق رہتے ہیں کہ کسی بادشاہ یا امیر کے پیچھے نماز پڑھیں، امیر افغانستان جب ہندوستان آئے تھے، تو مسلمان سیکڑوں کوس سے اُن کے پیچھے نماز پڑھنے آئے تھے۔

مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ تک سفر میں بھی رفاقت رہی، میں گو محمد علی و شوکت صاحب وغیرہ کے ساتھ تھا، مگر ہم جنسی اور ہم مذاقی کے سبب سے اکثر جمعیۃ والوں کے یہاں آکر بیٹھا کرتا تھا، اونٹوں کا سفر تھا، بارہ روز میں منزلیں تمام ہوئیں، ہر روز ایک نئی منزل میں قیام تھا۔

ہر روز مرا نیا مقام
صبح کہیں، کہیں ہے شام
عشق کی منزلیں تمام
راہِ دور و دراز میں

میں مرحوم کی خدمت میں بیٹھتا، اور طرح طرح کی باتیں ہوتیں ایک منزل میں

مرحوم نے غدر دہلی کے زمانہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اور ان کے رفقائے جہاد، مولانا محمد قاسم صاحب، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، اور حافظ ضامن علی صاحب شہید کے واقعات اور تھانہ بھون اور شاملی پر تاخت اور مجاہدین کا حملہ اور حافظ صاحب کی شہادت کے واقعات کو اس پر اثر طریقہ سے بیان فرمایا کہ روح نے لذت پائی۔

واپسی میں مولانا جہاز پر بہت علیل ہوگئے تھے، حالت بہت نازک معلوم ہوتی تھی، دوسرے درجہ میں ان کا سفر تھا، جو جہاز کے پچھلے حصہ میں تھا، وہاں بڑی تکلیف جہاز کے بعض آلات کا دھڑ دھڑ کر کے نیچے گرنا تھا، اسی حالت میں ہندوستان پہنچے، بالآخر اُن کو صحت ہوگئی۔

اُن کی آنکھیں کمزور تھیں، ایک دفعہ تو تکلیف بہت بڑھ گئی تھی، موگا (پنجاب) کے ڈاکٹر آنکھوں کے مشہور ڈاکٹر تھے، ان سے علاج کرایا تو درست ہوگئی تھیں۔

مرحوم اب تک دارالعلوم دیوبند میں مدرس تھے، دارالعلوم دیوبند کے اکابرین میں حضرت شیخ الہند رحمتہ اللہ علیہ کی وفات کے بعد سے کچھ انتشار سا تھا، جو رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا تھا، ایک طرف مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اور مولانا حافظ احمد صاحب اور کچھ مدرسین تھے، دوسری طرف مولانا انور شاہ صاحب، مفتی عزیز الرحمٰن، مولانا سراج احمد صاحب، مولانا شبیر احمد صاحب اور بعض نوجوان مولوی عتیق الرحمٰن صاحب وغیرہ تھے، آخر دوسرا گروہ دیوبند کو چھوڑ کر گجرات میں ڈابھیل ضلع سورت میں منتقل ہوگیا، جہاں پہلے سے ایک معمولی سا مدرسہ قائم تھا، مگر عمارت اچھی خاصی تھی، مولانا انور شاہ صاحب اور مولانا شبیر احمد اور مولانا سراج احمد صاحب وغیرہ نے یہاں دوسرا دیوبند قائم کیا، بہت سے سرحدی اور ولایتی اور بنگالی، اور ہندوستانی طالب علم بھی اُن کے ساتھ آئے، اور چند سال تک زور وشور سے ان صاحبوں کا درس وہاں جاری رہا۔

اسی زمانہ میں خاکسار کو کسی جلسہ کے سلسلہ میں راندھیر ضلع سورت جانے کا اتفاق ہوا، ڈابھیل قریب ہے، مولانا شبیر احمد صاحب کو معلوم ہوا تو ایک حیدرآبادی طالب علم کو خط دیکر بھیجا، میں نے آنے کا وعدہ کیا، اور دوسرے روز ڈابھیل گیا، مدرسہ کو دیکھا، حضرات مدرسین سے ملاقات ہوئی، طلبہ سے ملا، طلبہ نے میرے لئے ایک جلسہ ترتیب دیا، جس میں تقریریں ہوئیں، رات کو قصبہ میں جلسہ کا انتظام ہوا، جس میں مختصر تقریر کی، اس کے بعد خود مولانا نے تقریر فرمائی، جس میں میری حقیر ذات کی نسبت ایک فقرہ استعمال کیا تھا، جو درحقیقت میری حقیقت ہے میری طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ مجھے اُن سے بہت اُنس ہے، اس لیے کہ یہ علماء اور تعلیم یافتوں کے درمیان ایک سفیر ومتوسط کی حیثیت رکھتے ہیں، پھر میری کتاب ارض القرآن کی تعریف فرمائی۔

اُن کے گجرات کے قیام کے زمانہ میں اُن کی آمدورفت حیدرآباد دکن کی طرف بہت بڑھ گئی تھی، شرح صحیح مسلم کی امدادی تحریک جاری تھی، اور کبھی کبھی میرا بھی جانا ہوجاتا تھا، ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک میلاد کی مجلس میں میرا ان کا ساتھ ہوگیا، اسی جلسہ میں خود حضور نظام بھی آنے والے تھے، میری تقریر ہورہی تھی کہ وہ آگئے، میرے بعد مولانا شبیر احمد صاحب نے تقریر شروع کی، حضور نظام نے بڑی داد دی، اور اہل محفل محظوظ ہوئے، لوگوں میں باہمی ترجیح کی اچھی خاصی ردوکد شروع ہوگئی، مگر الحمد اللہ دونوں مقرروں کے دل باہم صاف رہے اور زبانیں محفوظ۔

مولانا شبیر احمد صاحب بڑے خطیب ومقرر تھے، عالمانہ استدلال کے ساتھ بڑے دلچسپ قصے اور لطیفے بھی بیان کرتے تھے، جس سے اہل محفل کو بڑی دلچسپی ہوتی تھی، اور ظریفانہ فقرے اس طرح ادا کرتے تھے کہ خود نہیں ہنستے تھے، مگر دوسروں کو ہنسا دیتے تھے، ان کی تقریروں میں کافی دلائل بھی ہوتے تھے، اور سیاسی اور علمی اور تبلیغی اور واعظانہ ہر قسم کے بیان پر ان کو قدرت حاصل تھی، ذہانت وطباعی، اور بدیہہ گوئی ان کی تقریروں سے نمایاں ہوتی تھی، اکبر کے ظریفانہ اور فلسفیانہ شعر ان کو بہت یاد تھے، وہ ان کو اپنی تقریروں میں عمدگی سے کھپاتے تھے۔

ان کی تحریر بھی صاف شستہ تھی، اور اس عصر کے اچھے لکھنے والوں کے لٹریچر کو غور سے پڑھا تھا، اور اس سے فائدہ اٹھایا تھا، جمعیۃ وخلافت کے جلسوں میں علماء کی بعض تجویزوں کی انگریزی بنانے میں بڑی دقت ہوتی تھی، اس موقع پر محمد علی مرحوم نے کہا تھا کہ مولوی شبیر احمد صاحب کی عبارت کی انگریزی بنانے میں بڑی آسانی ہوتی ہے، کیونکہ اس کی ساخت انگریزی طرز پر ہوتی ہے۔

موصوف کے مضامین اور چھوٹے رسائل تو متعدد ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کے تصنیفی اور علمی کمال کا نمونہ اردو میں ان کے قرآنی حواشی ہیں، جو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ تعالیٰ کے ترجمہ قرآن کے ساتھ چھپے ہیں، ان حواشی سے مرحوم کی قرآن فہمی، اور تفسیروں پر عبور اور عوام کے دلنشین کرنے کے لیے ان کی قوتِ تفہیم حدِ بیان سے بالا ہے، مجھے امید ہے کہ ان کے ان حواشی سے مسلمانوں کو بڑا فائدہ پہنچا ہے، ان حاشیوں میں انہوں نے جابجا اپنے ایک معاصر کی تصنیف کا حوالہ صاحب ارض القرآن کے نام سے دیکر اس بات کا ثبوت بہم پہنچایا ہے کہ وہ معاصرانہ رقابت سے کس قدر بلند تھے، میں نے اپنے حلقۂ درس میں ان کے حواشی کی افادیت کی ہمیشہ تعریف کی ہے، اور ان کے پڑھنے کی ترغیب دی ہے، افسوس یہ ہے کہ یہ حاشیے بہت باریک چھاپے گئے ہیں، اس لئے اُن سے استفادہ میں مشکل پڑتی ہے، ان حواشی کی افادیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ حکومت افغانستان نے اپنے سرکاری مطبع سے قرآنی متن کے ساتھ حضرت شیخ الہند کے ترجمہ اور مولانا شبیر احمد صاحب کے حواشی کو افغانی مسلمانوں کے فائدہ کے لیے فارسی میں ترجمہ کر کے چھاپا ہے، صحیح مسلم کی شرح لکھنے کا خیال ان کو اپنی نوجوانی

کے عہد سے تھا، صحیح بخاری کی شرح تو احناف میں سے حافظ بدرالدین عینی نے بہت پہلے لکھ کر احناف کی طرف سے حق ادا کر دیا تھا، مگر صحیح مسلم کی کوئی شرح حنفی نقطۂ نظر سے اب تک نہیں لکھی گئی تھی، اس کے لیے مرحوم نے اپنے دست و بازو کو آزمایا۔

انگریزوں کے عہد میں دیوبند میں جو بعض سیاسی اختلافات پیدا ہوگئے تھے، اور کانگریسی اور لیگی خیالات میں جو آویزش تھی، اس کی اطلاع حیدری صاحب صدر اعظم حیدرآباد کے کانوں تک پہنچی تھی، اس سلسلہ میں انہوں نے مناسب سمجھا کہ مولانا شبیر احمد کو مہتمم بنا کر دیوبند بھیجیں، چنانچہ وہ اس صورت سے ڈابھیل سے واپس آکر دیوبند میں مقیم ہوئے، اور اہتمام کا کام شروع کیا، مگر ظاہر ہے کہ صرف تقرر اور منصب سے خیالات اور نظریوں کا اختلاف دور نہیں ہوسکتا تھا، چنانچہ طلبہ میں اسٹرائیک ہوئی اور بعض نامناسب واقعات پیش آئے، جن کا نتیجہ ان کا استعفاء تھا۔

اس موقع پر مجھے ایک بات یاد آئی، ۱۹۱۳ء کی بات ہے کہ ندوہ میں مولانا شبلی کے استعفٰے پر ایک عظیم الشان اسٹرائیک ہوئی تھی، جس میں علی گڑھ اور دیوبند وغیرہ ندوہ کے اہل اہتمام کے ساتھ تھے، اور ملک اور قوم کے آزاد اخبارات مولانا ابوالکلام کی رہنمائی میں طلبہ کی تائید میں تھے، اس وقت مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کا ایک مضمون ''الاعتصاب فی الاسلام'' کے عنوان سے الہلال میں نکلا تھا، اس کے جواب میں مولانا شبیر احمد صاحب کا مضمون اسی الہلال میں نکلا تھا، جس میں اسٹرائیک کو خلاف اصول بتایا تھا، اس مضمون میں ایک مصرع یہ بھی تھا،

؎ لو آپ اپنے جال میں صیاد آگیا

پھر جب دیوبند کے احاطہ تک اسٹرائکوں کا سیلاب پہنچا تو ان کا یہ مضمون مجھے بہت یاد آیا، موصوف کے حیدرآباد دکن اور نظام حیدرآباد سے گوناگوں تعلقات پیدا ہوگئے تھے، مرحوم نے اس ہنگامہ میں جو آریہ تحریک کے زمانہ میں حیدرآباد کے مسلمانوں میں پیدا ہوگیا تھا، اپنی تقریر سے بہت کچھ مسلمانوں میں سکون پیدا کیا، یہاں تک کہ حیدری صاحب نے اپنی ممنونیت ان کی ذات کی نسبت ظاہر کی، اور منصب میں ترقی کی، مگر ایک وقت ایسا آیا کہ جب نظام پر تفضیلیت کا غلبہ تھا، اور اتفاق سے وہ مکہ مسجد میں نماز پڑھنے آتے تھے، تو مرحوم نے تقریر فرمائی، جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل بہت دلنشین طریقہ سے بیان کئے تھے، اس دن لوگوں کو مرحوم کی تقریر سے بڑی خوشی ہوئی، اور ان کے بے باکانہ اظہار حق کی سب نے تعریف کی۔

مجھے خیال آتا ہے کہ مرحوم ۱۹۱۶ء یا ۱۹۱۷ء میں انجمن اسلامیہ اعظم گڑھ کی دعوت پر اعظم گڑھ آئے اور شبلی منزل میں میرے ہی پاس ٹھہرے، اس وقت ان کی شرح مسلم کی کچھ اجزاء ساتھ تھے، جن میں قرات فاتحہ خلف الامام وغیرہ اختلافی مسائل پر مباحث تھے، جن کو جابجا سے مجھے سنایا، ایک اور دفعہ اسی زمانہ میں وہ اعظم گڑھ آئے، ٹھہرے کہیں اور جگہ تھے، مجھ سے ملنے آئے میں نے چائے پیش کی، تو پینے سے انکار کیا، انکار کی وجہ نہ معلوم ہوئی مگر بعد کو خیال آیا تو قیاس ہوا کہ چائے کی پیالیاں جو جاپانی تھیں ان پر جانوروں کی تصویریں بنی تھیں، اس لئے ان میں پینے سے انکار کیا، بہرحال اس سے اُن کے تقوی اور بزرگوں کی صحبت کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔

مرحوم کی شرح مسلم جس کا نام فتح الملہم ہے لکھنے کا کام تمام عمر جاری رہا، اتنے بڑے کام کے لیے ان کو کسی ریاست سے امداد کی فکر تھی، چنانچہ اس کے لیے حیدرآباد دکن کا خیال تھا، اس کے لیے معروضہ پیش کیا اور آخر بڑے ردوکد کے بعد ریاست نے اس کی سرپرستی منظور کی، اور ہر جلد کے لیے کچھ امداد اور مصنف کے لیے ماہانہ وظیفہ منظور ہوا، اور مولانا نے جمعیت خاطر کے ساتھ اس کی چند جلدیں لکھ کر شائع کیں، اس سلسلہ میں یہ امر ذکر کے قابل ہے کہ جب ریاست نے ان کی امداد منظور کی تو مرحوم نے مجھے دوستانہ خط لکھا کہ اہل علم کی طرف سے ریاست کی اس کرمفرمائی کا شکریہ ادا کیا جائے، چنانچہ میں نے اس کی تعمیل معارف کے شذرات میں کی افسوس ہے کہ یہ کتاب ناتمام رہی۔

مرحوم سے میری آخری ملاقات اُس سال ہوئی جب جمعیۃ علمائے اسلام کا اجلاس کلکتہ میں ہوا تھا اور اس میں ان کا ایک پیغام پڑھ کر سنایا گیا تھا، جس کی اس زمانہ میں بڑی دھوم تھی، اور جس کے بعد مرحوم مسلم لیگ کی دعوت کی صف میں اہم عنصر کی حیثیت سے شامل ہوگئے، اور روز بروز ان کا تعلق لیگ سے بڑھتا ہی چلا گیا، مرحوم اس زمانہ میں بیمار تھے، نشست و برخاست سے معذور سے رہتے تھے، گھٹیے کا گمان تھا اور میرٹھ کے کسی ہومیوپیتھ کے علاج سے فائدہ ہورہا تھا، اتفاق سے اس زمانہ میں میرا دیوبند جانا ہوا تو ملاقات کو حاضر ہوا، بشاشت سے ملے، اور مجھ سے اپنے پیغام کے متعلق رائے پوچھی، تو میں نے اس کے نرم و ملائم لہجہ اور مصالحانہ انداز کی تعریف کی، اسی زمانہ میں ان کو حیدرآباد دکن کی ریاست اپنی عربی درسگاہ مدرسہ نظامیہ کی صدر مدرسی کے لیے پانچ سو ماہوار پر بلارہی تھی، مرحوم اس کے قبول وعدم قبول میں متردد تھے، مجھ سے بھی اس میں مشورہ پوچھا، مجھے اس مدرسہ کا اندرونی حال جو معلوم تھا، وہ بیان کیا، اور عدم قبول کا مشورہ دیا، بہرحال مرحوم نے بھی وہاں جانا قبول نہیں کیا، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ لیگ کی خدمتوں میں ایسے الجھتے چلے گئے، کہ پھر دوسری طرف ان کو خیال کا موقع ہی نہیں ملا، اور آخر ۱۹۴۷ء میں لیگ کے بڑے بڑے رہنماؤں کے ساتھ مرحوم بھی کراچی چلے گئے اور وہیں کے ہوگئے۔ مرحوم نے کراچی پہنچ کر کوئی سرکاری عہدہ حاصل نہیں کیا، مگر مذہبی معاملات میں ان کی حیثیت مشیر خاص کی تھی، اس لیے زبان خلق نے ان کو شیخ الاسلام کہہ کر پکارا، جو اسلامی سلطنتوں میں عموماً قاضی القضا کا لقب رہا ہے، اور زیادہ تر اس لقب کی شہرت دولت عثمانیہ میں رہی، اسی حیثیت سے مرحوم

پاکستان کی مجلس آئین ساز کے رکن بھی تھے، اس جماعت کے روح رواں تھے، جو اس آئین کو اسلامی قالب میں ڈھالنا چاہتی ہے، اور اس راہ میں مرحوم ہی کی ابتدائی کوشش کی کامیابی کا وہ نتیجہ تھا جس کو پاکستان کی آئینی اصطلاح میں قرارداد مقاصد کہتے ہیں۔

مرحوم گو مستقل طور سے پاکستان چلے گئے تھے، مگر تعجب ہوگا کہ انھوں نے نہ تو اپنا کوئی خاص گھر بنایا نہ کسی کی ذاتی کوٹھی پر قبضہ کیا، بلکہ بعض عقیدت مند اہل ثروت کے مکان میں رہے، اور اسی مسافرت میں اس مسافر نے اپنی زندگی بسر کردی۔

مرحوم مروت کے آدمی تھے اور اہل حاجت کی سعی و سفارش بدل و جان کرتے تھے، چنانچہ پاکستان کے اہل حاجت اور اہل غرض دونوں ان سے فائدہ اٹھاتے رہے، اور وہ اپنی جاہ و منزلت کا ذرا خیال کئے بغیر ہر ایک کے کام آتے رہے، اور حکام کے پاس جا جا کر بے تکلف ان کی سفارشیں کرتے رہے۔

مرحوم کا آخری کام ایک عظیم الشان عربی درس گاہ کے قیام کا خیال تھا، چنانچہ اس کے لیے انھوں نے مخلصین کی ایک جماعت بنائی تھی، میرے قیام حجاز کے آخری زمانہ میں مرحوم کی طرف سے اس جماعت کا دعوت نامہ مجھے بھی ملا تھا، اور انھوں نے مجھے بھی اس مجلس کا ایک رکن بنایا تھا۔

مرحوم کی صحت آخری دنوں میں اچھی نہ تھی، امسال پاکستان سے خیر سگالی کا ایک وفد حجاز جا رہا تھا، اس کے ممبروں میں خواجہ شہاب الدین وغیرہ کے ساتھ مرحوم کا نام بھی تھا، مگر وہ اسی علالت کے سبب نہ جا سکے اور ان کی جگہ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی گئے، مرحوم پر فالج کا اثر تھا، جس سے ان کے دل و دماغ، اور جسمانی قویٰ پر بڑا اثر تھا، اتفاق وقت یا تقدیر کا تماشہ دیکھئے کہ دسمبر میں جب سردی انتہائی نقطہ پر تھی وہ جامعہ عباسیہ کی تعلیمی ضرورت سے بھاولپور گئے، جہاں سنا ہے کہ اس وقت بڑی سردی تھی، اس کے بعد کا حال کراچی کے ایک رسالہ ندائے حرم مورخہ جنوری ۱۹۵۰ء سے نقل کرتا ہوں۔

''۱۷/صفر ۶۹ھ مطابق ۸/دسمبر ۱۹۲۹ء کو حضرت علامہ مرحوم و مغفور جامعہ عباسیہ کی ایک تقریب میں شرکت کے لیے کراچی سے بھاولپور تشریف لے گئے، ۲۲/صفر ۶۹ھ مطابق ۱۳/دسمبر کی صبح تک طبیعت بالکل ٹھیک ہی معلوم ہوتی تھی، خلاف معمول اس روز ایک پیالی کے بجائے دو پیالیاں چائے پی، اور فرمایا رات کو کچھ حرارت رہی، چنانچہ اسی وقت ڈاکٹر کو ٹیلیفون کر کے طلب کیا گیا، ڈاکٹر نے بہت خفیف حرارت بتائی اور دوا دیدی، دس بجے کے قریب سینہ میں غیر معمولی گھبراہٹ محسوس ہوئی، تو دوبارہ ڈاکٹر کو بلایا گیا، نبض کی رفتار، اس وقت اپنی طبعی رفتار سے کچھ کم تھی، ایک طبیب اور دوسرے ڈاکٹر کو بھی طلب کرلیا گیا، بھاولپور کے وزیر تعلیم اور وزیر اعظم اور وزیر مال بھی پہنچ گئے، چار پانچ انجکشن دیئے گئے، مگر نبض کی رفتار کم ہوتی گئی، آخر گیارہ بج کر ۵۰ منٹ پر یہ آفتاب علم غروب ہوگیا، اناللہ و انا الیہ راجعون۔

میت اُسی روز شام کو بذریعہ پاکستان میل، ۷ بجے کے قریب بھاولپور سے کراچی روانہ کی گئی، اسی روز شام کو پاکستان کے اس مایہ ناز عالم باعمل کو لاکھوں اشک بار آنکھوں، اور سوگواروں نے سپرد خاک کیا، ڈیرہ نواب کے اسٹیشن پر نواب صاحب بھاولپور نے میت کی زیارت کی، اور اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا''۔

کراچی کے اسٹیشن پر مسلمانوں کے بہت بڑے مجمع نے میت کو اتارا، اور پہلے مرحوم کے قیام گاہ پر لائے، اور پھر وہاں سے ان کے قیام گاہ کے سامنے ایک زمین میں جس کو عامل کالونی کہتے ہیں، دفن کیا گیا، سندھ کے اقطاع میں سے بھاولپور ہی وہ مقام ہے، جس سے دیوبند کے اکابر اور امداد اللہی سلسلہ کے مشائخ کو تعلق خاطر رہا، اس لیے اگر مرحوم کو موت اسی سرزمین پر واقع ہوئی، تو عالم مثال کے حوادث میں کوئی عجیب چیز نہیں ہوئی۔

مرحوم کی کوئی ظاہری اولاد نہ تھی، لیکن الحمدللہ کہ انھوں نے اپنی کثیر باطنی اولاد چھوڑی ہے، یہ ان کے تلامذہ ہیں، جو زیادہ تر دیوبند اور بعض ڈابھیل میں اُن کے شرف تلمذ سے مشرف ہوئے ہیں، ان میں بعض مشاہیر کے نام جو مجھے معلوم ہیں وہ یادگار کے طور پر سپرد قلم کرتا ہوں، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا ابوالماثر محمد حبیب الرحمان صاحب اعظمی، مولانا محمد یوسف صاحب بنوری، مولانا محمد منظور صاحب نعمانی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی کہ ان میں سے ہر ایک بجائے خود دائرہ علم ہے۔

مرحوم کی پیدائش ۱۳۰۵ھ معلوم ہوئی ہے، اس لحاظ سے اُن کی عمر قمری حساب سے چونسٹھ سال کی ہوئی، اس وقت جب مرحوم کے نصف صدی کے واقعات کو سپرد قلم کر رہا ہوں، میرا دل کانپ رہا ہے، اور لبِ معاصر مسافر عدم کے لیے مغفرت کی دعا میں مصروف ہیں، ایسے نادرۂ روزگار صاحب کمال صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے مرقد کو پرنور فرمائے، اور اس پر اپنا ابر رحمت برسائے، وہ اب اس دنیا میں نہیں، مگر ان کے کارنامے دنیا میں انشاء اللہ تعالیٰ حیاتِ جاوید پائیں گے۔

سالہا، زمزمہ پرداز جہاں خواہد بود
زین نواہا کہ دریں گنبد گردار زدہ است

(''س''، اپریل ۱۹۵۰ء)

جار اللہ، موسیٰ

موسیٰ جار اللہ

دوسرا علمی حادثہ دنیائے اسلام کے مشہور عالم موسیٰ جار اللہ کی وفات ہے، ان کا وطن روسی ترکستان تھا، وہ بڑے وسیع النظر عالم اور زندہ کتب خانہ تھے، اور ہر موضوع اور ہر فن پر مجتہدانہ نگاہ رکھتے تھے، روسی ترکی اور عربی فارسی میں پوری مہارت رکھتے

تھے، اردو بھی ٹوٹی پھوٹی بول لیتے تھے، ایک زمانہ تک لینن کے رفیق اور شریک کار رہے، پھر کسی اختلاف کی بنا پر جلا وطن کردیے گئے، جلاوطنی کے زمانہ میں انھوں نے تمام اسلامی ملکوں کی سیاحت کی، اس سلسلہ میں ہندوستان بھی آئے، اور کئی سال تک دہلی اور بھوپال میں مقیم رہے، چودہ پندرہ سال ہوئے دارالمصنفین بھی آئے تھے اور ہفتہ عشرہ قیام رہا تھا، ان کے علمی شغف وانہماک کو دیکھ کر علمائے سلف کی یاد تازہ ہوتی تھی، ان کا سارا وقت اور رات کا بڑا حصہ مطالعہ میں گزرتا تھا، انھوں نے اس مختصر قیام میں دارالمصنفین کے پورے کتب خانے کا جائزہ لے لیا تھا، تالیف وتصنیف کا شغل بھی تھا، عربی میں ان کی بہت سی تصانیف مسودہ کی صورت میں تھیں، لیکن چند مختصر رسالوں کے علاوہ کسی بڑی تصنیف کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی، جب سے وہ وطن سے نکلے پھر دوبارہ جانا نصیب نہیں ہوا، اور عالمِ غربت ہی میں گذشتہ مہینہ مصر میں سفرِ آخرت کیا، اللہ تعالیٰ اس شیدائے علم کو اپنی رحمت ومغفرت سے سرفراز فرمائے۔

(''م''، جنوری ۱۹۵۰ء)

موسیٰ جاراللہؒ کی بعض تصانیف

(مولانا عبدالمجید حریری)

''ہمارے فاضل اور محترم دوست مولانا عبدالمجید صاحب حریری ان علم دوست اصحاب میں ہیں جن کے تعلقات ہندوستان و بیرون ہند کے بہت سے علماء مشاہیر سے ہیں اور بنارس میں ان کا دولت کدہ اصحاب علم وکمال کا مستقل مہمان خانہ رہتا ہے، مشہور روسی عالم موسیٰ جاراللہ سے بھی اُن کے خاص روابط تھے اور وہ بنارس میں کئی سال تک ان کے مہمان رہے، جنوری کے معارف میں مرحوم موسیٰ جاراللہ کی وفات پر جو شذرہ لکھا گیا تھا، اس میں ان کے شغل تصنیف کا بھی اجمالی ذکر تھا، اس سلسلہ میں مولانا حریری نے بعض مفید معلومات لکھ بھیجے ہیں، ان کو گزشتہ شذرات کے تتمہ کے طور پر شائع کیا جاتا ہے''۔ (''م'')

حضرت الاستاذ الامام نے میرے یہاں بیٹھ کر جو رسالے ترتیب دیئے وہ بھوپال سے شائع ہوئے، ان کی سب سے بڑی دو کتابیں ہیں جن کے مسودے وہ صاف کراچکے تھے اور انہی کی اشاعت کی آرزو ان کو انقرہ لے گئی، مگر جب جمہوریہ ترکیہ نے ان مولفات کی اشاعت کی اجازت بہ خط عربی ان کو نہیں دی تب وہ شکستہ خاطر قاہرہ واپس آئے، صحت تباہ ہوچکی تھی، اختلال حواس کے آثار بھی نمایاں ہوچکے تھے، وہاں بھی یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور انھوں نے جوار رحمت الٰہی میں پناہ لی، یہ دو کتابیں یہ تھیں۔

۱۔ **تاریخ مصاحف الامصار**، اس میں انھوں نے رسم مصاحف اور اس کی تاریخ پر ایک بڑی سیر حاصل بحث کی تھی اور جامعہ فواد اول مصر کے ایک مسیحی پروفیسر ولیم آرتھر جیفرے کی اس خطرناک تالیف کی دسیسہ کاریوں سے پردہ اٹھایا تھا، جس میں اس نے تاریخ تدوین و کتاب مصحف سے متعلق تمام شواذ قرأت و روایات کو جمع کرکے یہ ثابت کرنے کی نامراد کوشش کی تھی کہ معاذ اللہ متن قرآن بھی دوسری کتب سماویہ کے متون کی طرح محفوظ نہیں رہا۔

۲۔ دوسری کتاب جس کی اہمیت پر وہ بہت زور دیا کرتے تھے، اور جس کی تالیف پر انھوں نے اپنی عمر گراں مایہ کے پورے بیس سال صرف کئے تھے، وہ **القانون المدنّی للاسلام** ہے اس کا مسودہ روس کی اکادمیہ میں اب بھی محفوظ ہے، ان کی بڑی خواہش تھی کہ ترکیہ یا کوئی اور اسلامی حکومت اس مسودہ کو اکادمیہ سے حاصل کرکے چھپوا دے مگر:

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

میرے مکرم دوست ڈاکٹر عبدالوہاب بے عزام سفیر مصر جو پچھلے ہفتہ قاہرہ واپس تشریف لے گئے ہیں، وہ کوشش کریں گے کہ شیخ کی بقیہ تالیفات کے مسودے شیخ کے مصری دوستوں سے حاصل کریں اور ان کی اشاعت کی کوئی سبیل نکالیں، دیکھے کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں۔

حضرۃ الاستاذ الامام رحمہ اللہ کی جملہ تالیفات کی تعداد سو سے زائد ہے، کچھ عربی میں ہیں، جیسے شرح بلوغ المرام، شرح طیب النشر فی القرأت، الوشیعہ شرح شاطبیہ، بقیہ ترکی زبان میں، ان میں سے پندرہ بیس کتابیں میرے پاس موجود ہیں۔

(مارچ ۱۹۵۰ء)

<u>عبدالقادر، شیخ، سر</u>

سر شیخ عبدالقادر

افسوس ہے کہ ہماری پرانی علمی و ادبی بزم کی ایک اور شمع گل ہوگئی اور گزشتہ ۹ر فروری کو سر شیخ عبدالقادر مرحوم نے چھیتر سال کی عمر میں انتقال کیا، مرحوم کی ذات گوناگوں اوصاف کی جامع تھی، وہ اردو زبان کے مشہور ادیب اور اس کے پرانے محسن اور خدمت گزار تھے، ان کا مشہور رسالہ مخزن اپنے زمانہ کا اردو کا سب سے زیادہ ممتاز اور مقبول رسالہ تھا، اردو میں سنجیدہ نگاری اور اچھے اصحاب قلم پیدا کرنے میں اس کا بڑا حصہ تھا، مرحوم کا ادبی ذوق ہر زمانہ میں قائم رہا اور وہ کسی نہ کسی حیثیت سے برابر اردو کی خدمت کرتے رہے، مخزن کے جدید دور میں بھی وہ اس کے سرپرست تھے، پاکستان

کے قیام سے پہلے تک وہ دارالمصنفین کے رکن تھے، ان علمی و ادبی کمالات کے ساتھ ان کو بڑے سے بڑے دنیاوی اعزاز بھی حاصل ہوئے اور وہ مختلف اوقات میں ہائی کورٹ کی ججی، وزارت تعلیم مرکزی پبلک سروس کمیشن کی رکنیت انڈیا کونسل کی ممبری وغیرہ جیسے مناسب جلیلہ پر فائز رہے، لیکن ان کی وضعداری میں کبھی فرق نہیں آیا، وہ نئی تعلیم کے ساتھ پرانی تہذیب وشرافت کا نمونہ اور ہر طبقہ و ہر فرقہ میں مقبول اور سب کے ساتھ ان کے یکساں تعلقات تھے، اب ایسی شخصیتیں مشکل ہی سے پیدا ہونگی، ایسی یادگاریں خواہ ہندوستان کی ہوں یا پاکستان کی کم از کم ایک دونسلوں تک دونوں کی مشترک مِلک ہیں اور ان کی موت دونوں کا نقصان ہے، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے۔ (''م''، مارچ ۱۹۵۰ء)

سر شیخ عبدالقادر

ہندوستان و پاکستان کی تقسیم نے اب ایسا کر دیا ہے کہ ایک جگہ کا حال دوسری جگہ مشکل سے معلوم ہوتا ہے بہرحال چونکہ پہلے کی شناسائی ہے، اس لئے کچھ ابھی تعلق معلوم ہوتا ہے، اس کے بعد تو ایسا نظر آتا ہے کہ یہ دو مصنوعی ملک حقیقت میں دو ملک ہو جائیں، جس میں ایک کا حال دوسرے کو شاید ہی معلوم ہو، اور اگر ہو بھی تو دل کا تعلق ظاہر نہ ہو۔

سر شیخ عبدالقادر متحدہ ہندوستان کے ایک ممتاز ادیب تھے، اگر ان کا انتقال اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے ہوا ہوتا، تو سارا ہندوستان ان کا ماتم کرتا لیکن ان کا انتقال ۱۹۵۰ء میں ہوا، جب ہندوستان میں اُن کے انتقال کی خبر کسی نے سنی کسی نے نہ سنی اور جس نے سنی اس نے یہ بھی نہ جانا کہ یہ کون ہستی تھی۔

مجھے ان کے انتقال کی خبر ان کی وفات کے کئی ہفتے کے بعد ملی، ایک اردو اخبار دیکھ رہا تھا کہ اس میں یہ خبر نظر سے گذری کہ سر شیخ عبدالقادر نے ۹؍فروری ۱۹۵۰ء کو پچھتر برس کی عمر میں لاہور میں وفات پائی، خبر پڑھنے کے ساتھ تعجب کے ساتھ زبان سے نکل گیا کہ ''ارے! شیخ عبدالقادر نے وفات پائی''، پاس والوں نے پوچھا کہ کون عبدالقادر! میں نے کہا ایک تھے، اب کیا کوئی سمجھے کہ اس ''ایک تھے'' میں پوچھنے والوں کے لیے کتنے تیر و نشتر چھپے ہیں۔

مرحوم سے میری واقفیت کو پوری نصف صدی گذر گئی، ۱۹۰۰ء میں ندوۃ العلماء کا سالانہ جلسہ بڑی ہی دھوم دھام اور تزک و احتشام سے پٹنہ عظیم آباد میں ہوا تھا، یہ پہلا اجتماع تھا جس میں ہیٹ اور عمامے ایک ساتھ جمع ہوئے، جسٹس سید شرف الدین، سید علی امام، سید حسن امام، نصیر الدین بیرسٹر اور خدا جانے کتنے نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں اور علماء اور مشائخ ایک صف میں دین و ملت کی خدمت کے لیے کمربستہ نظر آئے، یہی وہ جلسہ تھا، جس میں میں نے مرحوم کو پہلی بار دیکھا یہ ان کی جوانی کا وقت تھا، انہوں نے ایک قومی کتب خانہ کے قیام کی تجویز پر تقریر فرمائی جس کو وہ لکھ کر ساتھ لائے تھے، اس وقت میری عمر پندرہ سولہ برس کی ہوگی، عربی کی ابتدائی کتابیں زیر درس تھیں، مرحوم اس زمانہ میں ''آبزرور'' نامی ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار کے اڈیٹر تھے، علماء کے جلسہ میں ایک انگریزی تعلیم یافتہ کی تقریر ایسے انداز میں جس میں پرانے بزرگوں کی تحقیقات کا احترام اور اُن کی اس متروکہ دولت پر فخر تھا، بڑی توجہ سے سنی گئی، میری عمر کا یہ پہلا واقعہ تھا، جس میں یہ اجتماع اور یہ منظر نظر آیا، محو حیرت تھا، اور میں کیا سارا مجمع مقرر کے جادو سے مسحور تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مرحوم نے اپنی تقریر ایک ایسے انوکھے انداز سے شروع کی کہ جس میں اُن کا اور ان کے اخبار کا اشتہار بھی تھا، اور انداز بیان کی دلچسپی بھی تھی، انہوں نے کہا حاضرین اگر میں یہ کہوں کہ آپ کے بزرگوں نے آپ کے لیے ایک بڑا دفینہ چھوڑا ہے، تو آپ کو میری اس بات کا یقین نہیں آئے گا، خصوصاً اس لئے کہ میں ایک اخبار نویس ہوں، اخبار کی خبروں پر یقین کس کو آتا ہے (اس وقت ٹرنسوال میں بوئروں اور انگریزوں کی جنگ ہو رہی تھی، اس کا حوالہ دے کر کہا) ابھی یہ خبر آئی ہے کہ بوئروں کو شکست ہوئی، اور کل اس کی تصحیح یوں ہوتی ہے کہ انگریزوں کی شاندار پسپائی ہوئی۔

مرحوم کی یہ پوری تقریر اس سال کی ندوہ کی روداد میں چھپی ہوئی ہے، اسی جلسہ میں مرحوم نے مخزن کا اشتہار تقسیم کیا تھا، اور آخر بیسویں صدی کے پہلے مالی سال اپریل ۱۹۰۱ء سے انہوں نے مخزن نکالنا شروع کیا، یہ اردو کا وہ پہلا رسالہ ہے جس نے نوجوان انگریزی تعلیم یافتہ اہل قلم کو اردو کی خدمت کی دعوت دی اور جدید و قدیم ادب نوازوں کو ایک میز پر جمع کیا کتنے اس وقت کے نوآموز اور نوجوان جواب مرحوم ہو چکے ہیں، یا بوڑھے ہوگئے ہیں، اُن کے قلم کا پہلا ظہور اسی مخزن کے صفحات میں ہوا، ڈاکٹر اقبال اسی کے ذریعہ روشناس ہوئے، سید حسرت موہانی کی صورت سب سے پہلے اسی بزم میں ہم کو نظر آئی، مولانا ابوالکلام کا پہلا مضمون ''اخبار'' اسی میں نکلا، اور اسی طرح راقم الحروف کے سب سے پہلے مضمون ''وقت'' اور ''معشوقہ عرب کی یاد میں'' اسی میں چھپے، اردو ادب پر مرحوم کا یہ بڑا احسان ہے کہ انہوں نے نوجوان تعلیم یافتوں کو اردو ادب کی خدمت میں لگایا، اور اس سے زبان کو بڑا فائدہ پہنچا۔

مرحوم سے میرے تعلق خاطر کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اُن کو ندوہ کی تحریک سے دلچسپی تھی، اور وہ اس کے اکثر ابتدائی جلسوں میں شریک ہوتے تھے، اور تقریر کرتے تھے، اور اخیر اخیر تک وہ ندوہ کے رکن رہے، بارہ تیرہ برس کی بات ہے کہ دہلی کے ریڈیو اسٹیشن نے ایک سلسلہ تقریر شروع کیا تھا، ''میں کن سے متاثر ہوا'' اس سلسلہ کے پہلے نمبر میں مرحوم کی تقریر تھی، انہوں نے اپنے تاثر کا آغاز سر سید احمد خان مرحوم سے کیا تھا، اتفاق

دیکھئے کہ اس تقریر کے دوسرے نمبر کے لیے میرا نام رکھا گیا، میں نے اپنی تقریر کا آغاز مرحوم سے کیا کیونکہ عمر میں پہلی دفعہ ان ہی کی تقریر سنی، اور انہی سے اثر پذیر ہوا۔

مرحوم کا آغاز گو انگریزی اور اردو کے ادیب کی حیثیت سے ہوا، مگر اُن کو اپنی روزی کے لیے یہ میدان بہت تنگ نظر آیا، اس لیے اس وقت کے سب سے ممتاز پیشہ قانون دانی کی طرف اُن کی توجہ مبذول ہوئی، اسی لئے ۱۹۰۴ء یا اس کے قریب زمانہ میں وہ بیرسٹری کے لیے لندن سدھارے، اور چند برس کے بعد بیرسٹر ہوکر لوٹے راہ میں قسطنطنیہ کی بھی سیر کی جس کی یادگار ان کا سفر نامہ ''مقام خلافت'' ہے، واپس آکر بیرسٹری شروع کی، مگر اس پیشہ میں جیسا چاہئے ان کو فروغ نہیں ہوا، اس لئے گورنمنٹ کی ملازمتوں اور عہدوں کی طرف اُن کی توجہ ہوئی، وہ ہائی کورٹ کے جج بھی ہوئے، لندن میں انڈیا کونسل کے ممبر بھی ہوئے اور پنجاب کونسل کے صدر اور وزیر تعلیم بھی رہے، اور لیگ آف نیشنس جینوا میں ہندوستان کے نمائندہ بنے، ان کا آخری عہدہ بھاولپور ہائی کورٹ کی ججی تھی، بارہ تیرہ برس ہوئے ہونگے کہ انہوں نے انجمن حمایت اسلام لاہور میں جس کے وہ اس وقت صدر تھے مجھے یاد فرمایا تھا، میں حاضر ہوکر ان کا مہمان ہوا، اسی اجلاس میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی بھی ان کے بلاوے پر گئے تھے، اور ان کے مہمان تھے۔

اس وقت کا ایک لطیفہ یاد آیا، مرحوم کی صدارت میں اس جلسے میں انجمن کو بہت چندے مل رہے تھے، بلکہ کہنا چاہئے کہ روپے برس رہے تھے، اتفاق سے میں ایک صبح کو اُن کے مکان سے ٹہلنے نکلا، تو ایک چھوٹی سی مسجد کے دروازہ پر یہ دعا لکھی نظر آئی ''یا شیخ عبدالقادر شیاء للہ'' واپس آکر میں نے شیخ صاحب سے عرض کی کہ حضرت انجمن میں اس قدر آپ کی صدارت میں روپے برسنے کی وجہ ابھی معلوم ہوئی، انجمن نے ''یا شیخ عبدالقادر شیاء للہ'' کا عمل پڑھا ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مسلم یونیورسٹی کے لیے ایک وائس چانسلر کی تلاش تھی، اور مرحوم کے احباب اس جگہ کے لیے ان کو کھڑا کرنا چاہتے تھے، مجھ سے بھی مشورہ چاہا، میں نے اس وقت کی وہاں کی صورت حال عرض کردی، بعد کو دوسرے صاحب اس جگہ پر ہوگئے، اور مرحوم بھاولپور جج ہوکر چلے گئے، مرحوم کو علی گڑھ کی تعلیمی تحریک سے بھی دلچسپی تھی، وہ ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس مدراس کے صدر تھے، اور مسلم یونیورسٹی کے رکن بھی تھے۔

مرحوم کی شخصیت گوناگوں اوصاف کی حامل تھی، اور ہر مجلس و محفل میں ان کی یکساں قدر و منزلت تھی، وہ نیک طینت، نرم مزاج، متواضع اور ملنسار تھے، اُن کی مختلف النوع خدمات میں میرے نزدیک سب سے بڑی خدمت اُن کی ادبی خدمت ہے اور وہ بھی خاص نوع کی یعنی لکھنے والے تو بیسوں ہیں مگر ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بیسیوں کو ادیب انشا پرداز اہل قلم مصنف اور شاعر بنادیا، اور حق یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان کو اقبال بخشا، اور انھیں کے فیض نے شاہ نامہ اسلام کے مصنف حفیظ جالندھری کو روشناس کیا۔ مضمون لکھنے کے بعد اتفاق سے ماہ نو کراچی (اپریل ۱۹۵۰ء) میں ان کی زندگی کی سنین نظر سے گذرے جی چاہا کہ اوپر کے واقعات کی صحیح تعین کے لیے بعض سنین یہاں نقل کردوں۔

وہ ۱۸۷۴ء میں لودھیانہ میں پیدا ہوئے ۱۸۹۴ء میں بی اے ہوئے، ۱۸۹۵ء میں پنجاب آبزرور میں اسسٹنٹ ایڈیٹر اور تین سال کے بعد چیف ایڈیٹر مقرر ہوئے، ۱۹۰۱ء میں مخزن نکالا، ۱۹۰۴ء میں بیرسٹری کے لئے لندن گئے، ۱۹۰۱ء میں واپس آکر دلی میں بیرسٹری شروع کی، ۱۹۰۹ء میں لاہور چلے آئے، ۱۹۰۶ء میں لائل پور میں سرکاری وکیل ہوئے اور آٹھ سال تک یہ کام کرتے رہے، ۱۹۲۱ء میں لاہور ہائی کورٹ کے جج ہوئے ۱۹۲۲ء میں پنجاب لیجسلیٹیو کونسل کے صدر بنے، ۱۹۳۵ء میں وہ قائم مقام وزیر تعلیم مقرر ہوئے، ۱۹۲۴ء میں لیگ آف نیشنس میں ہندوستان کے نمائندہ ہوکر جنیوا گئے، ۱۹۲۶ء میں مسلم لیگ کے اجلاس دہلی کی صدارت کی، ۱۹۲۷ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی مدراس میں صدارت کی، ۱۹۲۸ء میں پنجاب ایگزکٹیو کونسل کے قائم مقام ممبر بنے اور سر کا خطاب پایا، ۱۹۲۹ء میں پبلک سروس کمیشن کے رکن ہوئے، ۱۹۳۰ء میں لاہور ہائی کورٹ کے ایڈیشنل جج ہوئے، ۱۹۳۴ء میں انڈیا کونسل لندن کے ممبر ہوئے، اور پانچ سال تک لندن رہے، جہاں سے ۱۹۳۹ء میں ہندوستان واپس آئے اور اسی سال کچھ عرصہ کے لیے وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل کے قائم مقام ممبر رہے، ۱۹۴۲ء میں بھاولپور ہائیکورٹ کے چیف جسٹس بنے، جہاں سے ۱۹۴۵ء میں واپس آکر لاہور میں مقیم ہوئے اور آخر یہیں فروری ۱۹۵۰ء میں سپرد خاک ہوئے۔

اوپر کی سطروں کے پڑھنے کے بعد ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے کہ مرحوم نے وقت کے اور حکومت کے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے حاصل کئے، اور بڑے بڑے دنیاوی اعزاز سے سرفراز ہوئے مگر دیکھنا کہ دنیا اگر انہیں یاد رکھے گی تو مدیر مخزن ہی کی حیثیت سے یاد رکھے گی اور ان کی قبر پر احترام کے پھول چڑھاتی رہے گی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علمی و ادبی احترام کے آگے دنیا کے سارے اعزاز ہیچ ہیں، اور آخر یہ اعزاز بھی تاریخ کے صفحوں میں آسودۂ خواب ہوجائے گا، دنیا نے کس کو یاد رکھا ہے اور کس کو یاد رکھے گی، شہرت بھی ایک فریب سراب ہے یا نقش برآب۔

مرحوم کو علماء اور اہل دین سے ایک نسبت تھی، وہ مذہبی تعلیم کی اہمیت اور ضرورت پر یقین رکھتے تھے جس کا اظہار ندوہ کے اجلاس اور اس کی تقریر اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ منعقدہ مدراس کے خطبۂ صدارت میں انہوں نے کیا تھا۔ ابھی حال میں مدراس کے ایک بزرگ نے ان کی وفات کے فوراً ہی بعد اس کا اقتباس

چھاپا ہے اور یہ معلوم کرکے کہ ان کا انتقال ہوگیا، تاریخ وفات کہی ہے بزرگوں کا ان کے حال پر یہ حسن التفات ان کی مغفرت کی بشارت ہے، رہے نام اللہ کا۔

مرحوم کی یادگار میرے پاس اُن کے ہاتھ کے دو خط ہیں ایک اردو میں ایک انگریزی میں ۱۹۴۰ء میں وزارت تعلیم ریاست بھاولپور نے اپنے جامعہ عباسیہ کے نصاب تعلیم کے سلسلہ میں مجھے بلایا تھا، ریاست بھاولپور کے فرمارؤاں کے ہمارے دارالعلوم ندوۃ العلماء پر بڑے احسانات ہیں، اسی کی امداد سے دارالعلوم کی موجودہ نا تمام عمارت اس شان سے تعمیر پائی، جی چاہتا تھا کہ بقیہ عمارت بھی انھیں کی امداد سے تکمیل پائے میں بھاولپور جاتے ہوئے شیخ صاحب مرحوم سے لاہور میں ملا اور اُن سے خواہش کی کہ وہ وہاں کے چند اعلیٰ عہدہ داروں کے نام مجھے سفارشی خط لکھ دیں چنانچہ مرحوم نے اس تعلق کی بنا پر جوان کو قدیم سے دارالعلوم ندوہ سے تھا، فوراً یہ دونوں خط لکھ دیئے ایک اردو میں کرنل قریشی صاحب کے نام، اور دوسرا انگریزی میں خان بہادر محمد حسین صاحب کے نام مگر وہاں کچھ مقامی حالات ایسے تھے کہ میں نے ان دونوں خطوں سے کام نہیں لیا، خود وزیر صاحب تعلیمات نے نواب صاحب بھاولپور کو ادھر متوجہ کیا اور انہوں نے وعدہ فرمایا اور پندرہ ہزار کی رقم منظور ہوئی، جس کی باقاعدہ اطلاع وزیراعظم صاحب بھاولپور نے مجھے دی، مگر افسوس ہے کہ بار بار یاد دہانی کے بعد یہ وعدہ پورا نہ ہوا، کاش اگر اب بھی یہ رقم مل جاتی تو اس کو ایک طرح کا تعلق شیخ صاحب کی زندگی سے بھی ہوتا، اور ہندوستان میں ایک پاکستانی فرماں رواں کی یادگار قائم رہتی۔ (''س''، مئی ۱۹۵۰ء)

نعیم الرحمٰن، محمد، پروفیسر

پروفیسر محمد نعیم الرحمٰن

پروفیسر محمد نعیم الرحمٰن مرحوم ریڈر شعبۂ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی کی وفات علمی حلقہ کا بڑا المناک سانحہ ہے، مرحوم مشہور مصنف و مترجم مولوی خلیل الرحمٰن صاحب مرحوم صاحب اندلسیات کے خلف الصدق اور خود ممتاز صاحب علم اور علم وفن کے خدمت گزار تھے، عربی، فارسی اور انگریزی کے علاوہ فرنچ اور عبرانی سے بھی واقف تھے، عربی زبان سے ان کا تعلق محض درس و تعلیم تک محدود نہ تھا، بلکہ ان کو اس کا ذوق اور ان میں اس کی خدمت کا جذبہ تھا، انجمن عربی صوبہ متحدہ کے معتمد اور اس کے سرگرم کارکن تھے، انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی میں عربی کی اہمیت اور مسلمان طالب علموں میں اس کا ذوق قائم رکھا، بہت سے علمی اور تعلیمی اداروں کے رکن اور ممبر تھے، تصنیف و تالیف سے بھی ذوق تھا، متعدد کتابوں کے مصنف، مترجم اور مرتب تھے، عربی و فارسی کی بہت سی درسی کتابیں لکھیں، ان کی قلمی یادگاروں میں مورخ عبدالواحد مراکشی تمیمی کی ''المعجب فی تخلیص اخبار المغرب'' کا اردو ترجمہ خلافت موحدین خصوصیت کے ساتھ لائق ذکر ہے، مرحوم کی عمر پچپن چھپن سال سے زیادہ نہ تھی اور صحت ایسی تھی کہ مشکل سے پینتالیس سال کے معلوم ہوتے تھے، چند مہینے بیمار رہ کر، ۲۷؍ فروری کو انتقال کیا، اللہ تعالیٰ اس خادم علم کو نعیم جنت سے سرفراز فرمائے۔ (''م''، اپریل ۱۹۵۰ء)

شروانی، حبیب الرحمٰن خان، مولانا

مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی

افسوس ہے کہ ہماری بزم دوشین کی وہ آخری یادگار شمع بھی خاموش ہوگئی، جس سے مدتوں بزم کمال منور رہی، یعنی ۱۱؍اگست کو نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی نے چھیاسی سال کی عمر میں اس خاکدان سفلی کو الوداع کہا، عمر طبعی کو پہنچنے کے بعد موت ناگزیر ہے، لیکن بعض مرنے والوں کے ساتھ ایک پورا عہد اور پوری تاریخ دفن ہوجاتی ہے، مولانا شروانی مرحوم کا حادثۂ وفات انہی میں ہے، وہ مشرقی و اسلامی تہذیب و شرافت کا نمونہ اور علم و عمل، فضل و کمال، دین و تقویٰ، وقار و متانت، اخلاق و تواضع کا پیکر اور تنہا ایک عالم تھے، کامل ساٹھ سال تک مسلمانوں کی قومی زندگی سے وابستہ رہے، اس لئے ان کی وفات شخصی نہیں بلکہ قومی حادثہ اور ایک مرقعِ کمال اور قدیم تہذیب و شرافت کا ماتم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیاوی دولت و وجاہت سے بھی نوازا تھا، وہ خاندانی رئیس تھے اور اپنے اوصاف میں دور زوال کے امراء سے بالکل مختلف تھے، وہ خود صاحب علم، اصحاب علم کے قدردان، علم دوست، علما نواز، اور علم فن کے شیدائی اور سرپرست تھے، ان کی پوری زندگی علمی مشاغل میں گزری، مسلمانوں کی علمی و تعلیمی تحریکوں میں ان کا نمایاں حصہ رہا، وہ ابتدا سے مدرسۃ العلوم، مسلم یونیورسٹی، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے رکن رکین، معاون و مددگار آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری انجمن ترقی اردو کے سرپرست اور مجلس دارالمصنفین کے صدرنشین تھے، عرصہ تک ریاست حیدرآباد کے شعبہ امور مذہبی کی صدارت پر فائز رہے، ان کی خدمات کی فہرست بہت طویل ہے، کوئی علمی و تعلیمی ادارہ ان کی اخلاقی امداد و اعانت سے محروم نہ تھا، مسلم یونیورسٹی نے ان خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی۔

وہ عربی کے عالم، فارسی کے ذوق شناس، انگریزی سے واقف، اردو کے صاحب طرز ادیب اور نکتہ سنج، سخن فہم اور سخن گو تھے، ان کا ادبی ذوق بڑا ستھرا اور پاکیزہ تھا، اسلامی علوم وفنون اور مسلمانوں کی علمی تاریخ سے ان کو عشق تھا، ان کا مشغلہ خالص علمی تھا، مختلف مذہبی، علمی، ادبی اور تاریخی موضوعوں پر دو درجن سے زیادہ چھوٹی بڑی تصانیف، ایک مجموعہ مضامین مقالات شروانی اور دیوان فارسی، ان کی علمی یادگار ہیں،

نادر کتابوں کا بڑا شوق تھا، خود اپنی تلاش ومحنت اور زرکثیر صرف کرکے ایک عمدہ کتب خانہ جمع کیا، جونوادر کتب کا بیش قیمت ذخیرہ ہے، اس کو اپنی زندگی میں مسلم یونیورسٹی پر وقف کر گئے تھے۔ان کی ذات میں جدت وقدامت کا بڑی لطیف امتزاج تھا، وہ خود پرانی تعلیم وتہذیب کی یادگار لیکن زمانہ کے حالات وضروریات سے واقف تھے، ان کا وطن علی گڑھ مغربی تعلیم کا مرکز تھا، اس لئے وہ جدید تعلیم اور نئی مفید تحریکوں کے حامی و مددگار تھے لیکن اس کے سحر سے مرعوب ومسحور نہ تھے، اور جدید تعلیم وتہذیب میں بھی اسلامی روح دیکھنا چاہتے تھے، قدیم تہذیب سے والہانہ شیفتگی تھی، ان کی تحریروں میں جہاں اس کا ذکر آجاتا اور ان کی بہت کم تحریریں اس ذکر جمیل سے خالی ہوتی تھیں، ان کا قلم بے قابو ہوجاتا اور ان کی تحریر قدیم تہذیب کا مرثیہ بن جاتی۔

صورۃً خوش جمال، کشیدہ قامت اور طبعاً نفاست و لطافت پسند تھے، وضع قطع، لباس، رفتار وگفتار، نشست و برخاست، ہر چیز میں تہذیب ونفاست نمایاں تھی، بڑے خوش لباس اور جامہ زیب تھے، بڑھاپے کے نور نے اس میں اور زیادہ لطافت اور جذب وکشش پیدا کردی تھی، زندگی کے تمام معمولات میں وضعداری کی شان تھی، پوری زندگی کسی معمول میں کوئی فرق نہیں آیا، ان کے تعلقات بہت وسیع اور مختلف ومتضاد مذاق ومشرب کے لوگوں کے ساتھ تھے، جن کو آخر تک نباہا، سیاست سے طبیعت کو ذوق ومناسبت نہ تھی، اور اس خارزار سے ہمیشہ دامن بچایا، لیکن بہت سے اصحاب سیاست سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے جو برابر قائم رہے، اور ان پر اختلاف رائے خیال کا اثر نہ پڑنے پایا، مولانا شبلی مرحوم سے ان کے بڑے گہرے اور مخلصانہ تعلقات تھے، جو ان کے بعد وراثۃً ارکانِ دارالمصنفین کے حصہ میں آئے، اور آخر تک برابر قائم رہے، وہ دارالمصنفین کے محض قانونی صدر نہ تھے، بلکہ اس کے اور اس کے کارکنوں کے ساتھ ان کو دلی تعلق تھا، چنانچہ پیرانہ سالی میں کئی مرتبہ اس اجڑے دیار میں آنے کی زحمت گوارا کی جب آنا ہوتا تو بلا لحاظ عمر ورتبہ ہر شخص کی قیام گاہ پر جاکر ملتے اور بڑی شفقت ومحبت سے خیریت وحالات پوچھتے اب اس وضعداری کی مثال کہاں ملے گی۔

مرحوم کی ذات پر ایک عزیز دور اور اس کی خصوصیات کا خاتمہ ہوگیا، جس کا ذکر اب صرف تاریخ کے اوراق میں ملے گا، اللہ تعالیٰ اس مرقع کمال کی تربت پر رحمت و مغفرت کے پھول برسائے، اللّٰھُمَّ صبب علیه شابیب رِضوانِکَ برحمتِکَ یاارحَمَ الرّحمین۔ (''م''، ستمبر ۱۹۵۰ء)

دسمبر ۱۹۵۰ء

آہ! مولانا حبیب الرحمان شروانی

اگست کی کوئی آخری تاریخ تھی، کہ لاہور کے کسی اخبار میں سرسری طور سے یہ خبر چھپی کہ مولانا شروانی کا انتقال ہوگیا، خبر پڑھ کر دل دھک سے ہوگیا اور اپنی دوری، مہجوری اور مجبوری پر بڑا افسوس آیا، میں نے مرحوم کی زندگی ہی میں ان کے واقعات اور خاندان شروانی کے بعض احوال لکھوا کر دارالمصنفین میں رکھ لئے تھے اب جب ان کا سانحہ پیش آیا تو تقدیر کی مجبوری دیکھئے کہ تدبیر کوئی کام نہ آئی۔

مرحوم نے چھیاسی سال کی عمر میں بتاریخ ۱۱/اگست ۱۹۵۰ء اس دنیائے رنگ و بو کو خیر باد کہا اور سلف صالحین سے جاملے (ان کی ولادت کی تاریخ ۲۸/شعبان ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء ہے) مرحوم سے میرے تعلقات اس قدر گوناگوں تھے کہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کو کہاں سے شروع کیا جائے اور کیا کہا جائے اور کیا چھوڑا جائے، میں نے موصوف کو سب سے پہلے ۱۹۰۰ء میں نصف صدی پہلے پٹنہ کے اجلاس ندوہ میں دیکھا تھا، بھرا شباب، مردانہ حسن و جمال، سپید رنگ سیاہ خوب صورت ڈاڑھی اور سر پر زلفیں، بلند و بالا قامت، لطیف وقیمتی لباس، جلسہ کے ہر اجلاس میں نیا جوڑا زیب بدن، کبھی سر پر عمامہ، کبھی گول ٹوپی، کبھی ترکی ٹوپی، جدھر نکل جاتے، آنکھیں اٹھ جاتیں، انگلیاں اشارہ کرتیں، لوگ ایک دوسرے کو دکھاتے اور بتاتے، اسی طرح میں نے دیکھا اور بتایا گیا کہ یہ علی گڑھ کے رئیس عالم ہیں۔

۱۹۰۱ء میں جب ندوہ آیا، تو مدرسہ ان کے ذکر جمیل سے پرشور تھا، انتظامی جلسے سال میں چند بار ہوتے اور وہ ان میں جب آتے تو جلسہ کی اہمیت اور بڑھ جاتی ۱۹۰۴ء میں جب الندوہ نکلا اور وہ اس کے اڈیٹر ہوئے اور میرے ایک دو مضمون اس میں نکلے، تو تعارف بڑھا، جب وہ آتے میں حاضر ہوتا اور وہ اپنے بزرگانہ لطف و نوازش سے نوازتے، ۱۹۰۶ء میں جب میری جماعت کی دستار بندی کا جلسہ ہوا ور خاکسار کی عربی تقریر نے حاضرین سے داد تحسین حاصل کی، اور حضرۃ الاستاذ نے خوش ہوکر اپنے سر سے دستار اتار کر میرے سر پر رکھی، تو اس جلسہ میں مولانا شروانی شریک نہ تھے، تاہم حضرۃ الاستاذ نے خود اپنے قلم سے لکھ کر ان کو اس واقعہ کی بڑی مسرت سے خبر دی، (یہ خط ''مکاتیب شبلی'' میں درج ہے) استاد کی یہ وساطت مولانا شروانی سے تقریب کا نیا ذریعہ بنی۔

۱۹۱۰ء میں جب مکاتیب شبلی کی تدوین کا خیال آیا تو استاد نے پھر مولانا شروانی سے تقریب کی کہ ان کے پاس شبلی کے جو خطوط ہوں وہ سید سلیمان کو دیئے جائیں، ۱۹۱۲ء میں جب ندوہ میں حضرۃ الاستاذ کے حسب ایما انگریزی مدارس کے نصاب تاریخ کی غلطیوں کی تصحیح کا کام میرے سپرد ہوا، تو پھر تازہ تقریب کی گئی، نومبر ۱۹۱۴ء میں جب حضرت الاستاذ بیمار ہوئے اور حالت مایوسی کو پہنچی تو خاکسار حاضر خدمت تھا، سب سے پہلے اس شدت تعلق کی بناء پر جوان دونوں دوستوں میں تھا، اس مضمون کا ایک مختصر کارڈ ان کو بھیجا ''افسوس کہ ''الفاروق'' کا مصنف اس وقت موت و حیات کی کشمکش میں

ہے''۔ ۱۸؍نومبر کو مولانا نے وفات پائی، اس کی اطلاع دی، اس کے بعد سے جو ان سے مکاتبات کا سلسلہ شروع ہوا تو آج سے دو برس پہلے تک اس وقت تک برابر قائم رہا جب تک ان کی قوت حافظ اور عام قوت جسمانی کام دیتی رہی، آج سے دو سال پہلے میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کے میٹنگ میں سب سے آخری دفعہ ان سے ملا میں نے دیکھا کہ ان کا تیر سا قد نیم کمان بن چکا ہے، وہ چہرہ جو گلاب سا تر و تازہ اور شاداب رہتا تھا، پژمردہ اور مرجھایا تھا، اسی وقت دل نے کہا کہ یہ چراغ سحر بجھا ہی چاہتا ہے۔

میرا عمر بھر یہ دستور رہا کہ حضرۃ الاستاذ کے مخصوص احباب اور دوستوں سے بزرگداشت کا تعلق رکھوں اور ہمیشہ ان کے سامنے اپنے کو چھوٹا سمجھوں، چنانچہ مرحوم سے خصوصیت کے ساتھ میری طرف سے خوردانہ اور ان کی طرف سے بزرگانہ تعلق قائم رہا، میں انہیں مخدوم لکھتا، وہ عزیز لکھتے، دارالمصنفین کی تاسیس میں مرحوم کی بزرگانہ حمایت ہمیشہ رہنما رہی، دارالمصنفین کے پہلے صدر جسٹس مولوی کرامت حسین اور دوسرے نواب عمادالملک اور تیسرے مولانا شروانی ہوئے، اس تعلق سے بھی ان سے خط و کتابت کا سلسلہ اکثر رہا، ایک دفعہ جب احباب اور بزرگوں کے محفوظ خطوط گنے تو سب سے زیادہ جن کے خطوط میرے پاس نکلے، وہ انہی کے تھے، میں نے جب انہیں اس کی اطلاع دی، تو اس پر مسرت ظاہر فرمائی اور لکھا کہ اس میں تعجب کی کیا بات ہے، اس کا الٹا ہوتا تو تعجب ہوتا۔

وہ قدیم و جدید تعلیم کا بہترین مجموعہ تھے، فارسی و عربی تعلیم گھر پر حاصل کی، عربی کی اونچی کتابیں حضرت مولانا مفتی محمد لطف اللہ صاحب علی گڑھی کے درس میں پڑھیں، انگریزی تعلیم میٹرک تک آگرہ اسکول میں پائی، ان کی جوانی تک علم و فن اور دین و تقویٰ کے باکمال اکابر موجود تھے، وہ ہر ایک کے در تک پہنچے اور ہر اک سے حسب استعداد کسب فیض کیا شیخ حسین یمنی عرب مقیم بھوپال سے سند حدیث حاصل کی، قاری عبدالرحمان صاحب پانی پتی سے فیض پایا، بیعت قطب الوقت حضرت مولانا شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادی سے کی تھی، مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی کی زیارت سے بھی فیضیاب تھے۔

ان کا سب سے پہلا مضمون جس نے لوگوں سے خراج تحسین وصول کیا وہ بآبر پر ہے۔ جو رسالہ ''حسن'' حیدرآباد میں چھپا تھا اور جس پر مصنف کو ایک اشرفی انعام ملی تھی، مولانا شبلی کی المامون پر ان کا تبصرہ ان کا پہلا تنقیدی کارنامہ ہے، جو غالباً ۱۸۸۶ء میں شوق قدوائی کے اخبار آزاد میں چھپا تھا، ان کے رسائل میں دو بہترین تاریخی رسائل ہیں، یہ دونوں ندوہ کے سالانہ جلسوں میں پڑھے گئے تھے، پہلے کا نام ''علمائے سلف'' ہے اور دوسرے کا نام ''نابینا علماء'' یہ دونوں انیسویں صدی کی یادگار ہیں، ۱۹۰۱ء میں لاہور سے جب مخزن نکلا تو اس کی محفل میں بھی یہ شریک تھے، حضرت خسرو کے غزلیات پر اس میں ان کا مضمون چھپا تھا، ۱۹۰۴ء میں الندوہ کے شریک اڈیٹر ہوئے، تو اخلاق پر ان کے مضامین نکلے۔

علی گڑھ کی مجلسوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حالات میں الصدیق لکھ کر پیش کی، حیدرآباد کی میلاد کی مجلسوں کے وہ بانی تھے، ان میں سیرۃ پر مختلف رسائل لکھے، جو چھپے اور پھیلے، معارف میں ان کے مضامین اور ان کی غزلیں اکثر زیب اوراق ہیں۔

شعر و شاعری کا ذوق ان کو آغاز سے تھا، حسرت تخلص کرتے تھے، اردو اور فارسی دونوں میں مشق سخن کرتے تھے، اردو میں حضرت امیر مینائی سے اصلاح اور فارسی میں مولانا شبلی سے مشورہ کرتے تھے، فارسی کے مشہور شاعر حضرت خواجہ عزیز سے بھی مولانا شبلی کے ذریعہ سے تعلق رکھتے تھے۔

ان کے اخلاقی فضائل میں وضعداری بڑی نمایاں تھی، جس سے جتنا ملتے تھے، تمام عمر اسی طرح ملتے رہے، جب لکھنؤ آتے تو منشی احتشام علی صاحب کی کوٹھی میں ٹھہرتے تھے اور تمام عمر میں کبھی اس وضع میں فرق نہیں آیا، پھر اس قیام میں جن جن بزرگوں اور دوستوں سے ملنے کا دستور تھا، اسی طرح وہ جا کر ملتے اور اتنی دیر بیٹھتے، لکھنؤ میں فرنگی محل اور وہاں بھی مولانا محمد نعیم صاحب کی نشست گاہ میں ضرور حاضر ہوتے۔

ان کی جوانی تھی کہ ندوہ کا غلغلہ بلند ہوا، یہ وہ مجلس تھی، جس کی روحانی اور علمی صدارت جن دو بزرگوں سے نسبت رکھتی تھی، یعنی مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی اور حضرت مولانا محمد لطف اللہ صاحب دونوں ہی سے ان کو قلبی تعلق تھا اس لئے وہ ندوہ کے ان اصلی ارکان میں تھے جن سے ندوہ کی مجلس عبارت تھی، وہ سب سے پہلے ۱۹۱۷ء میں ندوہ کے اجلاس ناگپور کے صدر ہوئے اور یہیں اسی وقت دولت آصفیہ مرحوم کی صدارت امور مذہبی کی خبر عام ہوئی، جس کے بعد ان کا بارہ تیرہ برس کے قریب حیدرآباد میں قیام رہا اور جامعہ عثمانیہ کی تاسیس اور شعبۂ دینیات کے افتتاح میں ان کی مساعی مشکور ہیں، حیدرآباد کا حال وہاں کے مقیم احباب سنائیں گے۔

حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں بھی وہ دو دفعہ ندوہ کے اجلاس کے صدر ہوئے، پہلی دفعہ انبالہ میں اور یاد آتا ہے کہ دوسری دفعہ لکھنؤ میں مرحوم کو قومی اداروں میں سے علی گڑھ، ندوۃ العلماء اور دارالمصنفین اعظم گڑھ سے خصوصیت کا تعلق تھا، مولانا شبلی مرحوم کے بعد غالباً ۱۹۰۵ء میں وہ انجمن ترقی اردو کے بھی ناظم ہوئے اور دو تین سال کے قریب خدمت کے بعد قرعۂ فال مولوی عبدالحق صاحب کے نام نکلا، ان اداروں کے علاوہ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور کے بزرگوں سے بھی ارتباط رکھتے تھے اور ان درسگاہوں کی بھی امداد فرمایا کرتے تھے۔

عجیب اتفاق ہے کہ نادانستہ ۱۹۲۶ء میں سفر حج میں بھی میرا ان کا ساتھ ہوا، یہ موتمر اسلامی والا موقع تھا، یہاں یہ سخت بیمار پڑ گئے تھے، مگر بڑی ہمت کے ساتھ سارے ارکان ادا کئے، مدینہ منورہ کے قیام کے زمانہ میں ان کا تعارف شیخ ابراہیم حمدی مدیر کتب خانہ شیخ الاسلام سے کرادیا، یہ تعلق چونکہ علمی اور روحانی دونوں تھا، اس لئے بڑا سازگار آیا اور اخیر اخیر وقت تک قائم رہا، حرمین محترمین کی خدمت بھی وہ سالانہ کیا کرتے تھے، اخیر دفعہ جب دو سال ہوئے میں نے اپنے ارادہ حج کی اطلاع ان کو دی، تو لکھا کہ اس دفعہ حرمین شریفین کی خدمت کی رقم آپ ہی کے ذریعہ جائے گی، مگر روانگی کے وقت نہ ان کو یاد رہا اور نہ میں نے یاد دلایا۔

ان کو نادر اور قلمی کتابوں کا بڑا شوق تھا اور اس شوق کی تاریخ خود انہوں نے لکھ کر معارف میں چھپوائی ہے، مولانا شبلی مرحوم کے ذریعہ سے اور ان کی پسند سے کتابیں خریدا کرتے، لکھنؤ میں عبدالحسین اور واجد حسین قلمی کتابوں کے تاجر تھے، لکھنؤ آتے تھے تو ان کے نوادر دیکھتے اور چھانٹ کر لے جاتے، یوں بھی کتابیں ان کے پاس پہنچتی رہتی تھیں، حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں بھی بہت سی کتابیں حاصل کیں، میں جب ۱۹۲۰ء کے آخر میں یورپ سے واپس آیا، تو عزیزوں بزرگوں کے لئے جو تحفے لایا مرحوم کے لئے نستعلیق کے اچھے خطاطوں کی وصلیوں کی عکسی تصاویر کا مجموعہ لاکر پیش کیا۔

پہلے تو اصل وطن علی گڑھ میں بھیکم پور میں تھا، بعد کو بھیکم پور سے کچھ دور ان کے نام سے ان کے والد مغفور نے حبیب گنج کے نام ایک گاؤں آباد کیا تھا، وہیں زنانہ اور مردانہ مکانات، مسجد اور ایک کتب خانہ کی عمارت تیار کی تھی، زمینداری کے شغل کے بعد بھی یہی کتب خانہ ان کی دلچسپی کا مرکز تھا۔ معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد ہاتھ میں ایک بڑی سی لکڑی لے کر باغ میں سیر کو نکل جاتے، اس وقت ان کے دوسرے ہاتھ میں تسبیح ہوتی، لکھنؤ آتے تو صبح کو پیدل منشی احتشام علی کی کوٹھی، واقع خیالی گنج سے مولوی عبدالباری صاحب ندوی کی کوٹھی ہارڈنگ روڈ تک پیدل جاتے، واپسی سواری پر ہوتی، دارالمصنفین آتے تو احاطہ کے اندر کمرہ کے باہر روش پر ٹہلا کرتے۔

ایک دفعہ دارالمصنفین کا جلسۂ انتظامیہ رمضان المبارک میں مقرر کیا، ہم نے عذر کرنا چاہا تو جواب میں لکھا کہ کیا رمضان مسلمانوں کے کام میں مانع ہے، غرض تشریف لائے، اس زمانہ میں وہ چائے کے بجائے اُولٹین پیتے تھے، میں کافی اور مولوی مسعود علی صاحب چائے پیتے تھے، سحری میں یہ تینوں شراب الصالحین لائی جائیں اور ہر ایک کا ایک ایک دور چلتا اور بڑی خوشی سے پیتے اور بعد کی ملاقاتوں میں اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے۔ دارالمصنفین کی مسجد مرحوم ہی کی کوشش سے نواب مزمل اللہ خان مرحوم کی امداد سے مولوی مسعود علی صاحب کی نگرانی اور انجینئرنگ میں بنی، پھر دارالعلوم ندوہ کی مسجد بھی برادر موصوف ہی کی نگرانی اور انجینئرنگ میں بنی، مرحوم دونوں کو دیکھ کر برادر موصوف کے تعمیری ذوق کو بہت پسند فرماتے تھے، چنانچہ جب وہ علی گڑھ میں حبیب منزل بنوانے لگے تو مولوی صاحب موصوف کو بلوا کر ان سے مشورہ کیا۔ انہوں نے جو مشورہ دیا، اس میں سے سامنے کی رو کار عمارت ہے، فرماتے تھے کہ اگر یہ حصہ نہ بنتا، تو یہ عمارت کچھ نہ ہوتی۔

مرحوم کے اخلاق کی دو خصوصیتیں عجیب تھیں، ایک یہ جس شخص سے جس جہت سے ان کا تعلق ہوتا، وہ اس سے اسی جہت سے ملتے اور اسی کے متعلق باتیں کرتے اس کی دوسری جہتوں سے ان کا کوئی تعلق نہ ہوتا، حکیم اجمل خان مرحوم سے گہرے تعلقات تھے، مگر یہ یک جہتی، قدیم قلمی مخطوطات اور قدیم تہذیب و شرافت کے افکار سے تھی، ان دونوں کی ملاقاتوں میں یہی تذکرے رہتے، کہیں بیچ میں سیاست کا نام نہیں آتا، مولانا ابوالکلام سے بھی مولانا شبلی کے واسطہ سے ان کے تعلقات تھے، ان کی ملاقات اور مکاتبت بھی جو چھپ چکی ہے سیاست کے تذکرہ سے خالی ہے، میری زندگی پر مختلف دور گزرے ہیں، جن میں سیاست بھی ہے، مگر کبھی کسی خط میں نہ میں نے اس کے متعلق کچھ لکھا اور نہ کبھی انہوں نے پوچھا۔ ان کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ ان کی مجلس میں کبھی کسی کی برائی یا غیبت نہیں ہوتی، کوئی کرتا بھی تو اڑا دیتے، خطوط میں بھی احتیاط تھی، اگر ناگزیر طور سے کچھ ذکر آتا تو اس طرح اشارہ کنایہ میں کہتے کہ غیر اس کے سمجھنے سے قاصر رہتے۔

مرحوم کو اچھی اور تاریخی یادگاروں کا شوق تھا، بعض بادشاہوں کے فرامین تلواریں یا خنجر ان کے پاس تھے۔ میں جب ۱۹۳۴ء میں کابل کے سفر سے واپس آیا اس کے بعد مرحوم دارالمصنفین آئے، تو قالینوں کا تذکرہ نکلا، میں نے عرض کیا کہ نادر شاہ شاہ کابل نے مجھے ایک قالین عنایت کیا ہے، ان کو دکھایا تو اس کو پسند کیا، ملا صاحب سے جو ان کے رفیق خاص تھے اور ہمیشہ سفر میں ساتھ رہتے تھے، فرمایا ''ملا جی یہ تو پٹھانوں کا مال ہے، ساتھ باندھ لو''۔ چنانچہ وہ قالین ان کے نذر کر دیا کہ شاہاں بشاہاں می دہند، فقیروں کے یہاں اس کا کیا کام، البتہ شاہ کی دی ہوئی تسبیح سبز شاہ مقصود کی فقیر کے پاس ہے۔

مرحوم بزرگوں کے قصے، لطیفے، حالات اور حکایتیں اس قدر ذوق وشوق و لطف سے مجلس میں بیان فرمایا کرتے تھے کہ اس وقت وہ بلبل ہزار داستان معلوم ہوتے تھے، ان کی تقریروں کا بھی یہی رنگ تھا، آواز گو پست تھی، مگر تقریر مسلسل اور تاریخی واقعات کے حوالوں سے پرتاثیر ہوتی تھی، ان کی انشاء پردازی کا بھی ایک خاص رنگ تھا، نہایت ستھرا اور پاکیزہ تکلف سے بری، تصنّع سے خالی اور آورد سے پاک، بزرگوں کے تذکرے ادب سے کرتے تھے، زبان فطرۃً نہایت ادب شناس عنایت ہوئی تھی، لہجہ میں سختی اور آواز میں کرختگی مطلق نہ تھی، گرم سے گرم موقعوں پر بھی وہ حدود سے باہر قدم

نہیں رکھتے تھے۔

بظاہر وہ اخلاق میں بڑے نرم اور مرنج ومرنجان تھے، مگر جب کسی وقت کسی چیز پر اڑ جاتے تو پھر اس سے نہ ٹلتے تھے، چنانچہ حیدرآباد سے علیحدگی کا سبب یہی پیش آیا، اس پر ایک شعر انہوں نے کہا جو مجھے لکھ بھیجا تھا۔

شاہبازِ ہمتم ، ربطے بدست شاہ داشت
دستِ دیگر ترک کردہ در ہوا پرواز کرد

یہ بھی ان کی سیرت کا قابل ذکر واقعہ ہے کہ باوجود ایک رئیس ابن رئیس ہونے کے اور حکام ضلع سے اچھے تعلقات رکھنے کے سرکاری اعزاز و احترام اور خطاب و القاب سے بچتے تھے، ایک دفعہ ان کو شمس العلماء کا خطاب ملنے والا تھا، ان کو خبر ہوئی تو پوری کوشش کی کہ اس خطاب سے ان کو بری رکھا جائے، فرماتے تھے کہ حیدرآباد کا خطاب اس لئے قبول کیا کہ یہ ایک دولت اسلامیہ کی نشانی تھی۔

مرحوم کو ملت اسلامیہ سے بڑی محبت تھی، اس کے اچھے واقعات اور مسرت بخش تذکروں سے خوش ہوتے تھے اور اس کے نفاق واختلاف کی باتوں سے ہمیشہ کنارہ کش رہتے، ندوہ کے باہمی اختلاف کے زمانہ میں باوجود اس کے طرفین دوست تھے، دونوں سے بیگانہ رہے اور جب مولانا شبلی کی وفات کے بعد مصالحت کا زمانہ آیا تو وہ سب سے آگے تھے۔

مرحوم گو سیاست سے سروکار نہیں رکھتے تھے، تاہم ملک کے پچھلے واقعات سے بہت غمگین تھے، عمر کے ساتھ کچھ ملکی اور کچھ خانگی افکار نے بھی ان کے دل و دماغ کو متاثر کیا، مگر ضابط اور متحمل ایسے تھے کہ کبھی اس داستان کا ایک حرف زبان پر نہیں آیا، ان کے قویٰ میں سب سے پہلے ان کے حافظہ نے جواب دیا، اکثر بات بھول جاتے، جب کاروان خیال نکلا، تو اس میں مولانا ابوالکلام کے جواب میں ان کا یہ بیان پڑھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ''ہاں مجھے یاد ہے کہ دو نوجوان ابوالنصر اور ابوالکلام نمایاں ہوئے تھے اسی سلسلہ میں سنا کہ آپ بغداد چلے گئے۔ تفصیلات اب معلوم ہوئیں''۔ میں نے انہیں لکھا کہ یہ صحیح ہے کہ سفر عراق پر (شاید ۱۹۰۶ء میں) دونوں جوان عراق کے سفر کو نکلے تھے جن میں سے ایک ابوالنصر غلام یاسین (مولانا ابوالکلام کے بڑے بھائی) تھے، ابوالکلام نہیں تھے، ان کے رفیق اس سفر میں حافظ عبدالرحمان امرتسری تھے اور اس وقت مولانا ابوالکلام امرتسر میں وکیل کے ایڈیٹر تھے، بیچارے ابوالنصر نے عراق میں انتقال کیا، ہندوستان خبر آئی، تو مولانا ابوالکلام نے وکیل میں اپنے حزن وغم کا اظہار فرمایا، اخیر میں میں نے لکھا کہ آپ کے اسطرح تصدیق کردینے سے افسانہ بھی تاریخ بن جائے گی۔ اس پر مرحوم نے خاموشی اختیار کی اور کچھ جواب نہیں دیا، یہ ان کی خاص عادت تھی کہ جس بات پر گفتگو کرنا نہیں چاہتے اس کے جواب سے اعراض کرتے، اسی سے ان کے اداشناس ان کے مطلب کو سمجھ جاتے۔

مرحوم کو بزرگوں کی یادگاروں سے والہانہ شیفتگی تھی، پٹنہ کے اجلاس ندوہ میں غالباً حاجی شاہ منور علی دربھنگوی بانی مدرسہ امدادیہ دربھنگہ جو حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی کے خلیفہ تھے، ندوہ کے جلسہ میں وہ دستار سر پر باندھ کر آئے جو حضرت حاجی صاحب کا عطیہ اور تبرک تھا، ایک تعلیم یافتہ کی تقریر پر جلسہ میں ایک ایسا پرعظمت جوش، علماء، مشائخ، صلحاء اور عامۂ مسلمین پر طارہ ہوا کہ جو جس کے پاس تھا وہ ندوہ کے نذر کردیا، شاہ منور علی صاحب نے وہی دستار اتار پھینک دی، وہ دستار نیلام ہوکر بڑی قیمت پر فروخت ہوئی۔ وہ کون خوش قسمت تھا، جس نے آگے بڑھ کر اس کی حسب حیثیت قیمت ادا کی اور اس کو اٹھا کر آنکھوں سے لگایا۔ نوجوان حبیب الرحمان خان شروانی! پھر اس کو وہ ہمیشہ اپنے لئے طرۂ سعادت سمجھتے رہے۔ ان کے اخیر دور کی یادگاروں میں استاذ العلماء مولانا لطف اللہ صاحب کی سوانح عمری اور خطیب بغدادی پر حنفی نقطۂ نظر سے تبصرہ ہے، جو معارف میں چھپے ہیں اور الگ بھی شائع ہوئے، انہوں نے مولانا سلیمان اشرف صاحب کی کتاب المبین پر ایک تبصرہ لکھا اور میرے پاس بھیجا، اسی زمانہ میں فقیر کی تصنیف ''عرب و ہند کے تعلقات'' چھپی تھی، جی چاہا کہ مرحوم کے قلم سے اس پر ایک تبصرہ شائع ہوتا تو مصنف کو فخر ومباحات کا ایک موقع ہاتھ آتا، اس موقع پر اپنے مطلب کو میں نے اس طرح ادا کیا، ''المبین پر تبصرہ ملا، یاد آیا کہ حضرۃ الاستاذ کی تصنیفات پر آپ کا تبصرہ ہمیشہ ہوا کرتا، چنانچہ المامون، الغزالی، سوانح مولانا روم اور شعرالعجم وغیرہ پر تبصرے پڑھے، کیا حضرۃ الاستاذ کی متروکہ موروثی سعادتوں میں سے راقم کو بھی اس سنت دیرینہ کی موروثی سعادت کے حصول کا موقع ملے گا''، مرحوم نے بڑی خوشی سے تبصرہ لکھا، جو معارف میں شائع ہوا۔

مرحوم کی پابندی وضع کی ایک خاص یادگار علی گڑھ میں مولانا سلیمان اشرف صاحب کی قیام گاہ میں اخیر وقت کی حاضری تھی، جو بعد مغرب تک جاری رہتی۔ جب وہ علی گڑھ آتے، یہ حاضری بلاناغہ ہر موسم میں اور ہمیشہ رہی۔ اس وقت دلچسپی کا سامان علمی مسائل پر گفتگو رہتی، مولانا سلمان اشرف صاحب کی وفات کے بعد مولانا مفتی عبداللطیف صاحب کی قیام گاہ پر اسی وقت اور اسی حیثیت سے یہ مجلس جاری رہی۔

مرحوم اپنے دور کے خاتم تھے، اب اس جوہر شرافت کا نمونہ کبھی دیکھنے میں نہ آئے گا، اب گلستاں کا رنگ اور ہے، چاردانگ میں ہوائیں اور سمت کی چل رہی ہیں اب ریاست اور ریاست کے ساتھ کمالات وفضائل کا یہ اجتماع گزشتہ تاریخ کا ورق بن کر رہ جائے گا، مگر انشاءاللہ یہ ورق یادگار رہے گا۔

ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

(''س''، دسمبر ۱۹۵۰ء)

پٹیل، سردار

سردار پٹیل

افسوس ہے کہ گذشتہ ۱۵ر دسمبر کو ہماری قومی عمارت کا ایک آہنی ستون گر گیا، اور سردار پٹیل ہم سے جدا ہوگئے، ملک و قوم کی راہ میں ان کی بڑی قربانیاں اور بڑی خدمات ہیں، وہ جنگ آزادی کے نامور ہیرو گاندھی جی کے دست راست اور جدید ہندوستان کے رکن اعظم تھے، گو قومی نقطہ نظر سے ان کے بعض خیالات صحیح نہیں تھے، جس سے ملک کو نقصان پہنچا، لیکن اس غلطی کے احساس اور اس کے برے نتائج دیکھنے کے بعد انہوں نے اس کی تلافی کی بھی پوری کوشش کی، فرقہ پرستی کی بھڑکتی ہوئی آگ کو انہی نے بجھایا، اور نہرو لیاقت پیکٹ کو انہی نے کامیاب بنایا، اگر ان کی تائید حاصل نہ ہوتی، تو ہندوستان اور پاکستان کی اقلیتوں پر دونوں ملکوں کی سرزمین تنگ ہو جاتی، اور آخر میں وہ اقلیتوں کے تحفظ، ملک میں قیامِ امن و پاکستان سے مفاہمت کے مسائل میں بڑی حد تک جواہر لال کے ہم نوا ہوگئے تھے، اور ملک کے ضبط و نظام اور امن و امان کا دارومدار انہی پر تھا، ان کا سب سے نمایاں وصف ان کا کوہ وقار عزم و استقلال تھا، وہ بولتے کم تھے، مگر جو کچھ کہتے یا چاہتے تھے، اس کو پورا کر کے رہتے تھے، ان کا سب سے بڑا کارنامہ ریاستوں کا انضمام ہے، جو انگریزوں سے بھی نہ ہو سکا تھا، انہوں نے تاریخ میں پہلی مرتبہ ہندوستان کو ایک متحدہ ملک بنایا آیندہ ہندوستان میں اس عزم و ارادہ کا انسان مشکل سے پیدا ہوگا، اور اس کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ روشن رہے گا۔

(''م''، جنوری ۱۹۵۱ء)

سیمابؔ اکبر آبادی

جناب سیمابؔ اکبر آبادی

افسوس ہے کہ ہندوستان کے نامور شاعر جناب سیماب اکبر آبادی نے جو کچھ دنوں سے فالج میں مبتلا تھے، ۳۱ر جنوری کو کراچی میں انتقال کیا، وہ داغ کی یادگار صاحبِ طرز اور موجودہ دور کے اساتذہ میں تھے۔

ان کے شاگردوں کا دائرہ بہت وسیع اور ان کا ایک خاص حلقہ تھا، انہوں نے اپنے رسالہ شاعر آگرہ کے ذریعہ اردو ادب و شاعری کی بڑی خدمت انجام دی، اور ہندوستان کے ان حصوں میں بھی جہاں شاعری کا چرچا کم تھا اس کا مذاق پیدا کر دیا، اس لیے ان کی موت تنہا ایک شاعر کی نہیں، بلکہ ایک محسنِ ادب اور خدمت گذار اردو کی موت ہے، اللہ تعالیٰ انکو اپنی رحمت و مغفرت کی داد وتحسین سے نوازے۔

(''م''، فروری ۱۹۵۱ء)

صفؔی

جناب صفؔی

افسوس ہے کہ ہماری پرانی بزمِ شعروسخن کی یادگاریں ایک ایک کر کے اٹھتی جاتی ہیں ابھی چند مہینے ہوئے جناب صفی ہم سے جدا ہوئے تھے کہ گذشتہ مہینہ جناب آرزو نے الوداع کہا، یہ دونوں اپنے فن کے باکمال اساتذہ اور اردو زبان کے بڑے خدمت گذار تھے، صفی نے لکھنو کے قدیم رنگِ تغزل کی اصلاح کے ساتھ قومی و ملی نظموں کا مذاق پیدا کیا جو لکھنو کے شعراء میں بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا، ان کی بعض پرانی نظمیں اتنی مقبول ہوئیں کہ ان کے اشعار اب تک لوگوں کی زبانوں پر ہیں۔

(''م''، مئی ۱۹۵۱ء)

آرزوؔ لکھنوی

آرزوؔ لکھنوی

جناب آرزوؔ جلال لکھنوی کے جانشین اور اردو زبان و ادب کے ماہر و محقق تھے اس پر ان کی نگاہ بڑی وسیع تھی، انہوں نے اردو شاعری میں زبان کی سادگی و سہولت یا موجودہ اصطلاح میں ہندوستانیت کا نیا نمونہ قائم کیا، وہ حتی الامکان عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ اور ترکیبوں سے پرہیز اور خالص ہندوستانی الفاظ استعمال کرتے تھے، جن شعراء نے ان کی تقلید کی کوشش کی وہ کامیاب نہ ہو سکے اور ان کی شاعری یا ہندی کو تاہ بن گئی یا بے رنگ و بے مزہ ہوگئی، آرزو کی یہ خصوصیت تھی کہ انہوں نے زبان کی ہندوستانیت کے ساتھ اردو شاعری کا آب و رنگ اور اس کی دلآویزی قائم رکھی، جو زبان پر ان کی غیر معمولی قدرت کا ثبوت ہے، انہوں نے اپنے کلام کے کئی مجموعے فغانِ آرزو، جہان آرزو، اور سریلی بانسری یادگار چھوڑے ہیں، ان دونوں اساتذہ کے بعد لکھنو پرانی یادگار سے خالی ہوگیا، بلکہ ان پر اس دور ہی کا خاتمہ ہوگیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

(''م''، مئی ۱۹۵۱ء)

حسرتؔ موہانی، فضل الحسن، مولانا

مولانا فضل الحسن حسرتؔ موہانی

شاید جہاں سے حسرتِ دیوانہ چل بسا
ہاں ہاں جب بھی تو چشمِ جنون اشکبار ہے

بالآخر کئی مہینہ کی موت و حیات کی کشمکش کے بعد ہمارے قافلہ آزادی کا پہلا حدی خوان اور میر کاروان بھی کوچ کر گیا اور گلستانِ تغزل کا بلبلِ نغمہ سنج ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا، یعنی گذشتہ ۱۳رمئی کو سید الاحرار مولانا فضل الحسن حسرت موہانی نے اس دارِ

فانی کوالوداع کہا کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ ویبقی وجہ رَبِّکَ ذوالجلال وَالاکرام۔[الرحمٰن:۲۶۔۲۷]

مولانا حسرت کی ذات ستودہ صفات مجموعہ اضداد و کمالات تھی، وہ ملک و وطن کے جانباز مجاہد اور شاعرِ رنگین نوا بھی، انقلابی سوشلسٹ بھی تھے اور صاحبِ وجد وحال صوفی بھی، بوریہ نشینِ فقر ومسکنت بھی اور مسندنشینِ غرو تمکنت بھی انہوں نے اس زمانہ میں انگریزوں کی مخالفت کی صدا بلند کی، جب اسکی پاداش دارورسن تھی، اس زمانہ میں آزادی کا صور پھونکا جب کانگریس بھی اس نام سے گھبراتی تھی اور بڑے بڑے محبِ وطن آزادی کے کھلونوں میں الجھے ہوئے تھے، اوراس زمانہ میں قوم وملک کے لیے قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں جب جیل سیاسی تفریح گاہ نہیں بلکہ حقیقۃً قید محن تھے، انہوں نے اس راہ میں جو قربانیاں کیں اور جتنے مصائب اٹھائے اسکی مثال اس زمانہ کے کسی لیڈر کی زندگی میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے اور موجودہ مدعیانِ آزادی کو تو آزادی کا شعور و احساس بھی نہیں تھا، بلکہ حق یہ ہے کہ گاندھی جی بھی ایک عرصے تک اس راہ میں ان سے بہت پیچھے رہے، حسرت کا یہ دعوی اولیت بالکل صحیح ہے۔

تو نے کی حسرت عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی
اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

وہ اخلاص وصداقت حق گوئی وحق پرستی اور جرات و بے باکی کے جس درجہ پر تھے، اس میں ریا نفاق اور مصلحت اندیشی کا کہیں گذر نہ تھا، اور اپنے خیالات میں اتنے پختہ اور متشدد تھے کہ اس میں ادنیٰ لچک بھی گوارا نہ تھی، ان کی بعض رائیں بھی عام رایوں سے الگ اور نرالی ہوتی تھیں اس لیے وہ موجودہ پرفریب سیاست کے ساتھ نہ چل سکے، اور نہ سیاست فروش لیڈروں کی طرح کوئی دنیاوی جاہ ومنصب حاصل کر سکے، لیکن ان کے کردار وسیرت کا اثر موافقین ومخالفین سب پر تھا، اور ہر دل میں ان کی عزت ووقعت تھی اور وہ بتدا سے کانگریس کے سرگرم رکن اور آزادی کی تحریک میں اتنا آگے تھے کہ کانگریس بھی ان کا ساتھ نہ دے سکی تھی، مگر ادھر چند برسوں سے وہ اس کی فرقہ پرستی سے بددل ہوکر لیگ میں شامل ہوگئے تھے، مگر اس وقت بھی ان کے خیالات کی شدت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا چنانچہ لیگ میں آزادیِ کامل کا رزولیشن زیادہ تر انہی کی کوشش سے پاس ہوا تھا قائداعظم اپنی خودرائی اور نزاکتِ مزاج کے باوجود مولانا کا بڑا احترام اور ان کے اخلاص وصداقت کی بڑی قدر کرتے تھے، ان کا یہ کردار بھی لائقِ ستائش ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کے بعد انہوں نے حصولِ جاہ کے لیے پاکستان کی راہ نہیں لی، بلکہ ہندوستان میں رہ کر مسلمانوں کے درد و دکھ میں برابر کے شریک رہے ان کے خیالات میں بڑی اپج تھی، انہوں نے ایک اسلامی کمیونزم ایجاد کی تھی جس کے بڑے مبلغ تھے، چند سال ہوئے اعظم گڑھ آئے تھے تو دارالمصنفین بھی تشریف لائے اور اسلامی کمیونزم کو سمجھانے کی کوشش کی تھی، اوراس سے متعلق اپنی ایک نظم بھی سنائی تھی، اس سلسلہ میں دو ادبی لطائف یاد رہ گئے ایک یہ کہ سویٹ اسلامی سویت (مساوات) سے اور کامریڈ اخوت سے ماخوذ ہے۔

خارزارِ سیاست کی اس رہ نوردی کے ساتھ وہ اس دور کے سب سے بڑے غزل گو تھے اور آخری دور کے بگڑی ہوئی مذاقِ شاعری کی اصلاح انہی نے کی، اور بے لطف رسمی تغزل کو صحیح معنوں میں دل کی واردات بنادیا، جس میں حقیقی تغزل کی ساری لطافتیں اور رعنائیاں موجود تھیں، اس لحاظ سے وہ اردو غزل کے مصلح ومجدد تھے اور اس میں یکتائی کا یہ دعوی بالکل صحیح تھا۔

حسرت مرے کلام میں مومن کے رنگ ہیں
ملکِ سخن میں مجھ سا کوئی دوسرا نہیں

شاعری کے علاوہ انہوں نے دوسرے ادبی پہلوؤں سے بھی اردو کی بڑی خدمت کی ایک زمانہ میں ان کا رسالہ اردوئے معلّٰی اردو کا سب سے ممتاز رسالہ تھا، اور اردو کی خدمت میں اس کا کوئی حریف نہ تھا مگر اب وہ ایک عرصے سے قریب قریب بند ہوگیا تھا، تاہم چند سال پہلے تک کبھی کبھی اس کا کوئی نمبر نکل آتا تھا، اس میں زیادہ تر ان قدیم اساتذہ کے کلام کا انتخاب ہوتا تھا، جن کے دیوان اب تک نہیں چھپ سکے ہیں، اس طرح انہوں نے سیکڑوں پرانے اساتذہ کے کلام کا معتد بہ حصہ محفوظ کردیا، جو اردو زبان کی بڑی خدمت ہے۔

مولانا کے پاس شعراء کے مطبوعہ وغیرمطبوعہ دواوین اور تذکروں کا نہایت عمدہ ذخیرہ تھا، جو مشکل سے کسی ایک جگہ مل سکتا ہے ان کی گذشتہ آمد کے موقع پر میں نے پوچھا مولانا آپ کے بعد یہ ذخیرہ کیا ہوگا جواب دیا جو اہل ہوگا وہ لے لے گا، میں نے عرض کیا ہم لوگوں سے زیادہ کون اہل ہوگا ہنس کے فرمایا تم ہی لوگ لے لینا، مولانا کے ورثہ کو چاہیے کہ وہ اسی قیمتی ذخیرہ کو ضائع نہ ہونے دیں، مرحوم کی ادبی یادگاروں میں ان کے مطبوعہ دواوین اردوئے معلّٰی کے مضامین، بعض اساتذہ کے مرتب وشائع کردہ دیوان قدیم اساتذہ کے کلام کا انتخاب اور دیوان غالب کی شرح ہے، خیال ہے کہ ان کے علاوہ وہ کچھ غیرمطبوعہ یادگاریں بھی ہوں گی جن کی اشاعت کا انتظام ان کے ورثہ اور دوسرے علم دوست اصحاب کو کرنا چاہئے۔

ذاتی حیثیت سے مولانا اخلاق وشرافت اور سادگی وتواضع کا پیکر تھے، ان کی زندگی بڑی درویشانہ اور مجاہدانہ تھی، سادگی ومساوات کی حد تک وہ عملاً کمیونسٹ اور شان استغنا و بے نیازی اور فقر ودرویشی میں مرد قلندر تھی عقیدۃً خوش عقیدہ اور صوفی مشرب تھے، حضرت مولانا عبدالوہاب فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے، قوالی وسماع سے بڑا ذوق تھا اپنے سلسلہ کے بزرگوں کے عرسوں میں بڑی پابندی سے شریک ہوتے

تھے، انتقال بھی مرشد ہی کے آستانہ فرنگی محل میں اور انہی کے زیر سایہ باغ مولانا انوار میں آسودہ خواب ہوئے اور ان کی یہ پیشن گوئی پوری ہوئی:

گردِ پیر مغان تھا میں یہاں تک حسرتؔ
کہ فنا ہوکے بھی خاکِ درِ میخانہ ہوا

اللہ تعالیٰ اس گردِ پیر مغان کو کوثر و تسنیم کی شرابِ طہور سے نوازے۔

(''م''، جون ۱۹۵۱ء)

حسرت موہانی

(مولانا عبدالماجد دریابادی)

حسرت موہانی بھی آخر اللہ کو پیارے ہوگئے اور یہ ایک سخت دھکا ہے جو اردو ادب اور قومیت اسلامی دونوں کو بیک وقت پہنچا ہے، جو مرحوم اپنے وقت کے ایک بہترین شاعر تھے اور غزل گوئی کے تو کہنا چاہئے کہ بادشاہ ہی تھے، شوخی کیساتھ متانت کا اتنا دلآویز امتزاج کمتر ہی کسی کے حصہ میں آیا ہے اپنے رنگ میں فرد فرید تھے، کلام عاشقانہ تھا، فاسقانہ نہ تھا شوخی تھی بے حیائی نہ تھی، رندی تھی، اوباشی نہ تھی، معاملہ بندی تھی، فحاشی نہ تھی، بے تکلفی تھی، رکاکت نہ تھی، سنجیدگی تھی، خشکی نہ تھی، ترکیبوں کی صناعت، بندشوں کی لطافت، اسلوب کی نزاکت کے لحاظ سے اپنی نظیر آپ، جدت میں اجنبیت نہ تھی۔ ندرت تھی، طرفگی تھی، مومنؔ و نسیمؔ دہلوی کے رنگ کو پہلے اپنالیا، پھر پھیلایا چمکایا، عشق جب جتلایا تو بنتِ عم کے ساتھ شریف پردہ نشین خاتون کے ساتھ آشنائی کا دم، رقیبوں کے غول درغول، بازاری بیسواؤں کے ساتھ کبھی نہ بھرا، کلام پڑھتے تو دل میں سوز و گداز پیدا ہوگا، ولولے بیدار ہوں گے، تمنائیں انگڑائیاں لیں گی، جذبات نفسانی میں ہیجان ایک بار بھی پیدا نہ ہوگا۔

محاروات پر عبور، زبان پر وہ حکمرانی، بلکہ صاحبقرانی کہ باید و شاید شعر جتنا اچھا کہتے تھے اتنا ہی اچھا پرکھتے بھی تھے، سخن گوئی اور شے ہے اور سخن فہمی اور یہاں جو پایہ سخنوری میں تھا، وہی سخن میں! ع یارِ ما آن دارد واین نیز ہم، اردوئے معلیٰ کے پرچوں کر پڑھ پڑھ کر خدا معلوم کتنوں کو خود دعویٰ نقادی ہوگیا، آخر زمانہ میں ادھر کئی سال سیاست شاعری پر غالب آگئی تھی، پھر بھی سالہا سال کی مشاق استادی پر کوئی پانی کیسے پھیر دے!۔

سیاست میں وہ اپنی ذات سے خود ایک انجمن، ایک ادارہ ایک پارٹی تھے، شروع میں اپنے کو منسوب تلک کے اسکول سے کرتے رہے اور اب ایک عرصہ سے اپنے کو کمیونسٹ کہنے لگے تھے، لیکن حقیقۃً وہ مقلد کسی کے بھی نہ تھے، مجتہد اگر نہیں تو منفرد تو ضرور تھے، کانگریس میں جب تک رہے، ساتھیوں ہی سے لڑتے بھڑتے اور آزادی کامل کا علم بلند کیے رہے۔ تحریک خلافت میں رہے تو اسی شیر دلی کے ساتھ اور مسلم لیگ میں جب کام کیا تو حد یہ ہے کہ قائداعظم جناح صاحب تک کی شخصیت سے بھی نہ دبے، مذہبی اتنے کہ کسی میٹنگ، کسی جلسہ میں بھی ہوں ادھر نماز کا وقت آیا اور ادھر وہ اپنی میلی کچیلی ہی شیروانی اتار اور اسی کو جانماز بناکر کمرہ میں، برآمدہ میں، صحن میں، جہاں بھی جگہ ملی، نماز کے لئے کھڑے ہوگئے، حج زندگی میں ایک دو تین نہیں غالباً سولہ کیے۔ مرید سلسلہ قادریہ میں فرنگی محلی کے خاندان رزاقیہ میں تھے، اور خوش عقیدگی میں حد غلو تک پہنچے ہوئے، رودولی یا اور لکھنؤ کے عرس تو شاید ہی کبھی ناغہ ہونے پاتے، اتنی گنجان داڑھی اور مذہب کے ساتھ یہ شیفتگی دنیا کے کسی کمیونسٹ میں پائی گئی ہے۔

سیاسی، ادبی اور سارے پبلک پہلوؤں سے کہیں بڑھ چڑھ کر دلکش پر تاثیر قابل عظمت ستودہ صفات، خود حسرت کی شخصیت اور ذات تھی سادگی بے تکلفی تواضع انکسار کی ایک تصویر تھے، اپنی بڑائی کا احساس تک نہ تھا، انکی کمیونزم بھی درویشی کے مرادف تھی، گھر میں غلہ وغیرہ کا ذخیرہ سال بھر کے لئے کیا معنی مہینہ بھر یا چندروز کے لئے بھی جمع کرنا ناجائز سمجھتے تھے، روز کا روز سودا اپنے ہاتھ سے لاتے تھے، جب دیکھئے دامن میں لیے بازار سے چلے آرہے ہیں نہ کسی سے تکلف نہ کوئی شرم یا جھجھک، راستہ میں بڑے سے بڑے موٹرنشین مل گئے، بے دھڑک ان سے کھڑے باتیں کررہے ہیں، میلی شیروانی، میلی ٹوپی بوسیدہ عینک کے ساتھ راجہ صاحب سلیم پور کے ہاں چلے گئے، فلاں راجہ، فلاں نواب، فلاں گورنر کے ہاں چلے گئے اور جو کچھ کہنا تھا، لگی لپٹی رکھے بغیر کہہ سن آتے، کوئی مہمان آگیا، تو کچھ پروانہیں، رات کی باسی کھچڑی چھینکے پر ٹنگی ہوئی تھی، وہی لیکر خود بھی کھائی، اسکو بھی کھلادی بڑا تکلف و اہتمام کیا، تو جاکر دو پیسے کا دہی لے آئے، ہرحال میں خوش ہرحال میں مست اور مگن اتنے لیڈروں میں انہی کو دیکھا، بے صبری اور ناشکری کا لفظ جیسے ان کے کان میں کبھی پڑا ہی نہ تھا، جو کچھ مل گیا ہنسی خوشی کھالیا اور کچھ نہ ملا تو فاقہ بھی اسی خوش دلی اور بشاشت قلب کے ساتھ کاٹ دیا، نفس مطمئنہ کتابوں میں پڑھا تھا کہ بعض بزرگوں کو حاصل ہوجاتا ہے، آنکھوں سے مثال اسی درویش کی زندگی میں دیکھی۔ (جولائی ۱۹۵۱ء)

واحسرتا!

سید فضل الحسن حسرت موہانی مرحوم کی شدت علالت کی خبریں یہاں کے اخباروں میں کئی ہفتوں سے چھپ رہی تھیں کہ دفعتہً ۱۵/ مئی ۱۹۵۱ء کے ریڈیو میں ان کی وفات کی خبر آئی، حسرت مرحوم ابھی چند ماہ ہوئے کہ اسی سال ۱۳۶۹ھ کے حج سے فارغ ہوکر جدہ سے کراچی آئے تھے، دیکھا کہ ان کا گداز جسم ضعف سے سکڑ گیا ہے،

اسی وقت خیال آیا کہ یہ حضرت بھی جگہ خالی کرانے والے ہی معلوم ہوتے ہیں، کراچی سے واپس جاکر شاید ہی کچھ دن اچھے رہے ہوں کہ علالت کی خبریں آنے لگیں۔

حسرت ضلع اناؤ کے مردم خیز قصبہ موہان میں نیشاپوری سادات کے خاندان میں ۱۲۹۷ھ میں پیدا ہوئے، قرآن پاک اور فارسی کی ابتدائی تعلیم موہان ہی میں حاصل کی، اس کے بعد اردو مڈل اسکول میں داخل ہوئے اور اس امتحان میں تمام صوبہ میں ممتاز رہ کر سرکاری وظیفہ حاصل کیا، اور مزید تعلیم کے لئے فتح پور ہسوہ جاکر گورنمنٹ ہائی اسکول میں داخل ہوئے اور انٹرنس کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کرکے وظیفہ حاصل کیا۔

فتح پور ہنسوہ کی آب و ہوا حسرت کی ادبی و ذہنی و دینی تعلیم کے لئے بہت راست آئی، یہاں مولانا سید ظہور الاسلام صاحب ایک نہایت متقی و پرہیزگار اور باصفات بزرگ تھے، حضرت قطب الوقت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے مرید وخلیفہ تھے، ندوۃ العلماء کے ارکان خاص میں تھے، اس لئے خاکسار کو بار بار ان کی زیارت کا موقع ملتا رہا، بلکہ میرے بچپن میں وہ مولانا محمد علی صاحب مونگیری کے ساتھ خاکسار کے وطن دیسنہ ضلع پٹنہ تشریف لائے تھے، تو پہلے پہل وہیں ان کی زیارت ہوئی تھی، حسرت مرحوم کو انہی پاک مشرب و پاک نہاد اور پاکباز بزرگ کی صحبت حاصل ہوئی، ان کے علاوہ مولانا نور محمد اور مولانا حبیب الدین صاحب جیسے بزرگوں کا فیض بھی نصیب ہوا، بچپن ہی میں وہ قادری سلسلہ میں مولانا شاہ عبدالوہاب صاحب فرنگی محلی پدر بزرگوار مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی یعنی جد بزرگوار مولانا جمال میاں صاحب فرنگی محلی کے مرید ہوچکے تھے اور اسی سلسلہ سے سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے ان کو عقیدت خاص تھی، اور بزرگان فرنگی محل سے بھی ان کو نسبت حاصل تھی، یہی وجہ تھی کہ ہزاروں انقلابات کے باوجود حسرت اپنی مذہبی زندگی اور صوفیانہ مشرب میں ہمیشہ غیر متزلزل رہے۔

فتح پوری میں ان کی شاعری کی زبان بھی کھلی، کچھ مخصوص احباب کی صحبت میں ادبی ذوق پیدا ہوا، اور عمر کے ساتھ یہ ذوق بڑھتا گیا، فتح پور سے انٹرنس پاس کرکے علی گڑھ میں جاکر داخل ہوئے، وہ ذوق وصحبت اور لطف و لطافت کے اس مرکز میں ہاتھوں ہاتھ لئے گئے، سنا ہے کہ چونکہ وہ شرفائے اودھ کے لباس اور وضع میں تھے اور ساتھ ہی اودھ کی پرانی وضع کا بڑا سا پاندان بھی ساتھ تھا، کالج کے دستور کے مطابق بے تکلف دوستوں نے ان کو خالہ جان کا خطاب دیا، مگر خالہ جان نے بھانجوں کی شرارت اور چھیر چھاڑ کی کبھی پروا نہ کی اور اپنے مذاق وطبیعت پر برابر جمے رہے، وہاں شعر وسخن کی ایک نئی مجلس اردوئے معلّٰی کے نام سے قائم کی اور ان کے وجود سے شعر و سخن کے چرچے نے کافی ترقی کی، کالج کے یونین میں بارہا تقریریں کیں اور نظمیں سنائیں اور حاضرین اور نواب محسن الملک سے داد وتحسین حاصل کی۔

مرحوم نے ۱۹۰۳ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کی، اور مذاق زمانہ کے خلاف کسی اعلیٰ ملازمت کے بجائے علم وفن اور شعر وسخن کی خدمت کا تہیہ کیا، اور اردوئے معلّٰی کے نام سے ایک بلند پایہ ادبی رسالہ علی گڑھ سے جاری کیا، اس سے دو تین سال پہلے مخزن لاہور سے نکل چکا تھا، اردوئے معلّٰی نوجوان جدید تعلیم یافتہ گروہ کی ادبی خدمات کا دوسرا قدم تھا، مگر مرحوم کی طبیعت میں جو تضاد تھا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اردوئے معلّٰی کے صحن میں شعر وسخن کے چمنستان کے ساتھ سیاست کا خارستان بھی نظر آیا، چنانچہ اس زمانہ میں جب مسلمان سیاسیات سے جھجکتے تھے، علی گڑھ کا یہ نوجوان بیباک گریجویٹ کانگریس میں شامل ہوگیا اور ۱۹۰۴ء میں بمبئی کے اجلاس کانگریس میں ڈیلیگٹ کی حیثیت سے شریک ہوا اور سورت کانگریس تک یہ برابر شریک رہے۔ سورت کانگریس کے اختلاف کے بعد یہ تلک کی رہبری میں کانگریس سے الگ ہوگئے۔

اردوئے معلّٰی میں شعر وسخن کے پھول اور سیاسیات کے کانٹے ایک ساتھ ناظرین کے سامنے پیش ہوتے رہے، اور لوگ حسب مذاق اس دورنگی سے لطف اندوز ہوتے رہے، اس زمانہ کے اردوئے معلّٰی میں ان کے اور دوسرے اصحاب ذوق کے خوب خوب ادبی مضامین نکلے، اس وقت کی ایک دلچسپ ادبی بحث یاد ہے، اقبال کی شہرت کا آغاز تھا، انھوں نے کسی نظم میں ''ان سے کہا''، ''اور ان کو کہا'' کے موقع استعمال میں غلطی کی تھی، حسرت نے اس پر ان کو ٹوکا، اور ان دونوں محاوروں کے فرق استعمال کو سمجھایا۔

پانچ برس تک اردوئے معلّٰی نکلتا رہا، ۱۹۰۸ء میں اس میں ایک بے نام صاحب قلم کا ایک مضمون مصر کے نامور لیڈر مصطفےٰ کامل کی موت پر شائع ہوا، جس میں مصر میں انگریزوں کی پالیسی پر بے لاگ تنقید تھی، یہ مضمون سرکار کی نظر میں قابل اعتراض ٹھہرا اور یہ علی گڑھ کی سلطنت میں بغاوت کا پہلا جرم تھا، نتیجہ یہ ہوا علی گڑھ کالج کی حرمت کو بچانے کے لئے کالج کے بڑے بڑے ذمہ داروں نے حسرت کے خلاف گواہی دی، یہاں تک کہ نواب وقار الملک نے بھی ایک دو فقروں میں مضمون مذکور کی مذمت ہی کی، پاداش میں حسرت مرحوم کو دو برس کی قید سخت کی سزا ہوئی، ان کا کتب خانہ اور پریس پولیس کے ظلم وستم کے نذر ہوگیا، اس کتب خانہ میں شعراء کے تذکرے اور دواوین کے بڑے نادر نسخے تھے۔

یہاں حسرت کے ایک کیرکٹر کا ذکر کرنا ہے، مضمون حسرت کا نہ تھا، مگر مقدمہ قائم ہونے پر حسرت نے اس کو خود اوڑھ لیا اور باوجود اصرار کے اس کے لکھنے والے کا نام نہیں بتایا، جہاں تک کان میں پڑی ہوئی بات اس وقت یاد آتی ہے، خیال آتا ہے کہ یہ مضمون اعظم گڑھ کے مشہور شاعر وکیل اقبال سہیل کا تھا، جو انہی کی طرح شعر وسخن اور

سیاسی مذاق کا اتحاد رکھتے تھے۔

حسرت مرحوم سے میری ملاقات قید سے چھوٹنے کے بعد ۱۹۱۰ء میں ہوئی، اور وہ اس طرح کہ میں دارالعلوم ندوہ سے فارغ ہوکر ''الندوہ'' کا سب اڈیٹر اور مدرسہ میں مدرس تھا، مدرسہ کے قریب ہی گولہ گنج میں نواب مرشد آباد کے مکان کے ایک کمرہ میں رہتا تھا، یہ وہی مکان ہے جس میں اب اخبار حق کا دفتر ہے، میں اپنی کوٹھری میں تھا کہ ایک صاحب نے آکر اطلاع دی کہ باہر ایک صاحب کھڑے ہوئے تم کو بلاتے ہیں، باہر نکلا تو حسرت تھے، میں نے کہا کہ آپ نے تکلیف کیوں کی، اندر کیوں نہیں چلے آئے، اس زمانہ کی سیاسی حالت کی پستی کا اندازہ کیجئے، حسرت نے جواب دیا کہ چونکہ لوگ مجھ سے ملتے ہوئے گھبراتے ہیں، اس لئے میں نے احتیاط کی راہ سے مطلع کردیا، میں حسرت صاحب کو اپنے کلبہ احزاں میں لایا، اوپر چھت پر جو کمرہ تھا، اس میں بستی اور گورکھپور کے کچھ احباب تھے، جو کرسچین کالج میں پڑھتے تھے، آرام کے خیال سے رات کو سونے کے لئے وہاں ان کے لئے انتظام ہوا، ہاں یہ بتا دینا چاہئے کہ اس وقت سیاست میں سودیشی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا، یہ سردی کا زمانہ تھا، میزبانوں نے ان کے پائتانہ کمبل رکھ دیا تھا، وہ کمبل ولایتی تھا، حسرت نے رات سردی میں اسی طرح کاٹ دی، مگر وہ کمبل نہیں اوڑھا۔

اس کے بعد حسرت صاحب کا جب لکھنو آنا ہوتا، تو ہمارے دارالاقامہ میں آتے اور سیاست پر باتیں کرتے اور تلک مہاراج کے سیاسی خیالات اور سیاسی عزائم کا تذکرہ بڑے والہانہ انداز میں کرتے، اور ہندوستان کی آزادی کی پیشین گوئی جس یقین اور عقیدہ کی پختگی کے ساتھ کرتے، اس پر ہم کو بڑا تعجب آتا، اور سیاسیات کی ہر مشکل آسان نظر آنے لگتی۔

مسلمان ۱۹۰۶ء تک ہندوستان کی سیاست سے بالکل الگ تھلگ تھے، ایک مدراس کے سید محمد کا نام کانگریس میں کبھی کبھی سنائی دیتا تھا، یا بمبئی کے جسٹس حبیب جی کا خیال کبھی کبھی ظاہر ہوتا تھا، مولانا شبلی مرحوم خیال کی حد تک کانگریس کے ساتھ تھے، مگر بہادر نوجوان حسرت پہلا شخص ہے جس نے علی گڑھ کی پالیسی کے برخلاف جہاد کا علم بلند کیا اور اردوئے معلیٰ ادب کے ساتھ ساتھ سیاست کا صحیفہ بھی بنتا گیا، اسی زمانہ میں دو عالموں کے مضامین کانگریس کی حمایت میں اردوئے معلیٰ میں چھپے تھے، جن میں مسلمانوں کو سیاست کی دلیرانہ تعلیم دی گئی ہے، ان میں ایک مضمون تو حیدرآباد دکن کے ملا عبدالقیوم صاحب کا تھا، جو دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن کے بانیوں میں سے ایک تھے اور دوسرا ایک بھوپالی عالم مولوی برکت اللہ صاحب مرحوم کا تھا، جو پہلی جنگ عظیم سے بہت پہلے ہندوستان چھوڑ کر یورپ چلے گئے تھے، اور اخیر وقت تک اسلام کی بین الاقوامی سیاست پر مضامین لکھا کرتے تھے اور ہندوستان کے دوسرے آزادی خواہ ہندوستانی نوجوانوں کی یورپ میں رہبری کرتے تھے، ۱۹۲۶ء تک وہ زندہ تھے اور سوئزرلینڈ میں قیام تھا اور خلافت کے احیاء کے لئے کوشاں تھے، وہیں انتقال بھی کیا، مسئلہ خلافت پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی تھی، جو کئی زبانوں میں ترجمہ ہوئی۔

قید سے چھوٹنے کے بعد حسرت کے دوستوں نے بہت کوشش کی کہ وہ اس سیاست سے باز آجائیں، لیکن انھوں نے اس مخلصانہ نصیحت پر کان نہیں رکھا، دوستوں نے ساتھ چھوڑ دیا، اردوئے معلیٰ کے قدردانوں نے خریداری ترک کردی، لوگوں نے ملنے جلنے تک سے احتراز شروع کردیا، مگر

؎ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

حسرت اپنے عقیدہ میں اور پختہ ہوتے چلے گئے، اور شروع سے جو اصول قائم کیا تھا، اس میں سرمو فرق آنے نہ دیا۔

بوڑھوں میں صرف ایک مولانا شبلی مرحوم تھے، جنھوں نے ابتدا میں ہی حسرت کی تائید کی اور ۱۹۰۴ء میں اردوے معلیٰ کا پہلا سیاسی مضمون پڑھ کر داد دی تھی، اور لکھا تھا:

اینکہ گفتی حکایت سحر است   روز روشن ہنوز درقدر است

حسرت مسلمانوں میں سب سے پہلے شخص ہیں، جنھوں نے سودیشی تحریک کی رہبری کی، حسرت ہمیشہ کے غریب تھے، اور یہ غربت ان معنوں میں ان کی اختیاری تھی کہ کالج کے دوسرے تعلیم یافتوں کی طرح انھوں نے سرکاری نوکری کی راہ اختیار نہیں کی اور اس امارت اور تعیش کی زندگی پر افلاس اور عسرت کی زندگی کو ترجیح دی، انھوں نے چند آنے گز سے زیادہ کپڑا نہیں پہنا اور ولایتی کپڑے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اب انھوں نے سودیشی تحریک میں عملاً حصہ اس طرح لیا کہ سودیشی اسٹور کے نام سے سودیشی کپڑوں کی دوکان قائم کی، اور چاہا کہ ملک میں اس کی شاخیں جابجا قائم کی جائیں، ان کے اس کام میں نواب وقار الملک جو خود بھی اس سادگی پر عامل تھے اور مولانا شبلی مرحوم نے ان کی مدد کی، ان دونوں کی سفارش پر سر فاضل بھائی کریم بھائی سے ملے، اور مولانا کی سفارش سے سر فاضل بھائی سے قرض کپڑا خریدا، اور اسٹور قائم کردیا، ان کی تجارتی سرگرمی کو دیکھ کر مولانا شبلی مرحوم نے ان سے کہا تھا کہ تم آدمی ہو یا جن پہلے شاعر تھے، پھر پالیٹیشن بنے، اور اب بنیئے ہوگئے، ان کی یہ دوکان چل نکلی تھی کہ پے درپے سیاسیات کے انقلابات نے ان کو کبھی بنیا بن کر اطمینان سے بیٹھنے نہیں دیا، اس لئے وہ نفع سے زیادہ خسارہ ہی اٹھاتے رہے۔

اسی زمانہ میں مسلمانوں میں کسی سیاسی تنظیم قائم کرنے کا خیال ایک بوڑھے اور ایک پختہ کار جوان کے ذہن میں آیا، یہ بوڑھے نواب وقار الملک اور پختہ کار جوان مظہر الحق صاحب بیرسٹر پٹنہ تھے، مظہر الحق صاحب نے مجھ سے فرمایا تھا کہ انھیں کی کوٹھی تھی، جس میں سب سے پہلے انھوں نے اور نواب وقار الملک مرحوم نے مل کر مسلم لیگ

کا قالب کھڑا کیا اور شہر ڈھاکہ اس لحاظ سے مبارکباد کے قابل ہے، جہاں خواجہ سرسلیم اللہ صاحب مرحوم کی دعوت پر ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا پہلا اجتماع ہوا، اس کے بعد تاریخ کے ورق جلد جلد اٹھنے لگے، اس وقت ہندوستان کی سیاست میں بنگال اور پونہ سب سے آگے تھے ان کے مقابلہ کے لئے انگریز ہی تھے، جو پس پردہ مسلمان کو سیاست کے اسٹیج پر لائے، مگر لحاظ کے قابل یہ ہے کہ جس راہ کو برادران وطن نے پچیس برس میں طے کیا تھا، مسلمانوں نے اس کو صرف چھ برس میں طے کرلیا، اس کے لئے سازگار حالات بھی پیش آئے جن میں سیاسی جراثیم کو اپنے نشوونما کے لئے مناسب آب و ہوا اور فضا ہاتھ آئی۔

۱۔ سب سے پہلی چیز جس نے مسلمانوں میں سیاسی انقلاب کی لہر دوڑائی، وہ ۱۹۱۰ء میں تقسیم بنگال کی منسوخی تھی، بنگالیوں کی سیاست کا زور توڑنے کے لئے لارڈ کرزن نے یہ مناسب سمجھا کہ بنگال کو مشرقی و مغربی بنگال میں تقسیم کردیا جائے، اس تقسیم سے مشرقی بنگال میں مسلمانوں کو ایسی اکثریت حاصل ہوگئی کہ وہ دفعتہً ہندو بنگالیوں کے سیاسی غلبہ کی دستبرد سے باہر نکل آئے اور اس لئے مسلمانوں نے اس کا بہت خوشی سے خیر مقدم کیا، لیکن ہندو بنگالیوں نے اس کے برخلاف نہایت شدت اور زور وقوت سے تمام ملک میں تحریک اٹھائی، اور علانیہ باغیانہ مضامین لکھے اور باغیانہ تقریریں کی جانے لگیں، بلکہ آربندو گھوش کی پارٹی نے بم کے گولے بھی اڑائے، مدت تک انگریز اس کو طے شدہ مسئلہ کہہ کر اپنی ہمت کا اظہار کرتے رہے بالآخر ان کی طاقت صبر نے جواب دے دیا، اور ۱۹۱۰ء میں بنگال کی تقسیم کو منسوخ کرکے دونوں بنگالوں کو پھر ایک کردیا۔ ان کی اس پالیسی سے جو بنگالی ہندوؤں کو رام کرنے کی خاطر کی گئی تھی، مسلمانوں میں بڑی برہمی پیدا ہوگئی، اور بقول مولانا شبلی مرحوم سب سے پہلا بہادرانہ مضمون جس نے مسلمانوں کی سیاسی کروٹ بدل دی، وہ نواب وقارالملک مرحوم کا باوقار اور سنجیدہ مضمون تھا اور اس کے بعد ۱۹۱۲ء میں مولانا شبلی مرحوم کا وہ انقلاب انگیز سلسلہ مضمون تھا، جو ''مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ'' کے نام سے ''مسلم گزٹ'' لکھنو میں چھپا، ان مضامین نے مسلمانوں کی سیاسی ہوا کا رخ بدل دیا۔

۲۔ ابھی یہ بادل تھمنے بھی نہ پایا تھا کہ یورپ سے ایک نیا سیلاب اٹھا، یعنی ۱۹۰۸ء میں نوجوان ترکوں نے دور ترقی کے نام سے جو انقلاب برپا کیا، اسی وقت اٹلی نے موقع پاکر ۱۹۱۰ء میں ترکی کے برخلاف طرابلس الغرب پر دفعتہً حملہ کردیا، اس واقعہ نے مسلمانان ہند کو اس درجہ مشتعل کردیا کہ ہندوستان کے اِس سرے سے اُس سرے تک آگ سی لگ گئی اور یہ آگ سالہا سال تک قائم رہی۔

۳۔ ابھی سیلاب میں کمی بھی نہیں آنے پائی تھی کہ ۱۹۱۲ء میں بلقانی ریاستوں نے مل کر ترکی کے یورپین علاقوں پر حملہ کردیا، جو جنگ بلقان کے نام سے مشہور ہے، اس نے اور بھی مسلمانوں میں اشتعال پیدا کیا۔

۴۔ ابھی یہ آگ لگی ہی ہوئی تھی کہ ۱۹۱۳ء میں کانپور میں ایک مسجد کے انہدام کا واقعہ پیش آیا، جس نے لگی ہوئی آگ میں تیل کا کام کیا، اور پورے ملک میں اس سے آگ سی لگ گئی۔

۵۔ یہی زمانہ تھا، جس میں آغا خان کی سرپرستی میں مسلم یونیورسٹی کی تحریک ہندوستان میں کھڑی ہوئی اور مسلمان اس کی طرف متوجہ ہوئے لیکن چند ہی روز کے بعد یہ سامان سکینت ایک نئے اضطراب کا پیش خیمہ بن گیا یعنی یہ یونیورسٹی کن اختیارات اور شرائط کے ساتھ لی جائے، اس بحث نے مسلمانوں میں نرم و گرم دو فریق پیدا کردیئے، اور یہی وہ وقت ہے کہ جب مسلمانوں میں احرار نے جنم لیا، جن کے رہبروں اور رہنماؤں میں محمد علی مرحوم، شوکت علی مرحوم، مولانا ابوالکلام، ظفر علی خان اور حسرت موہانی تھے اور یہیں سے حسرت موہانی کو سید الاحرار کہا جانے لگا اور وہ مسلم لیگ جو ابھی چھ برس پہلے بنی تھی، پرجوش نوجوانوں اور مصلحت اندیش بوڑھوں دو حصوں میں منقسم ہوگئی اور یہ تفریق روز بروز بڑھتی گئی۔

مسلم لیگ میں بھی یہ تفریق روز بروز نمایاں ہو رہی تھی، آغا خان کے بعد راجہ محمد علی محمد خان محمود آباد کا زور بڑھ رہا تھا، مسجد کانپور کے ہنگامہ میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی شخصیت سب سے پہلی دفعہ نمایاں ہوئی اور سید علی امام وغیرہ کی کوشش سے اس کا اختتام مصالحت پر ہوا، حسرت آغا خان کی لیگ میں شریک نہیں تھے، مگر جیسے جیسے لیگ میں آزادی بڑھتی گئی وہ اس کے قریب آتے گئے اور اب مسلم لیگ میں داخل تھے۔

مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ آگرہ ۱۹۱۴ء میں جو مسجد کانپور کے ہنگامہ کی مصالحت کے بعد ہی ہوا تھا، حسرت شریک تھے (اور میں بھی اس اجلاس میں شریک تھا) سردیوں کا زمانہ تھا، شب کے جلسہ میں مصلحت پسندوں نے لارڈ ہارڈنگ کے شکریے کا ریزولیشن پیش کیا، یہ وہ موقع تھا جب ان مصلحت پسندوں کے ساتھ بہت سے احراری بھی اس کی تائید میں تھے، ایسے نازک موقع پر صرف دو نوجوان اس کی مخالفت میں تھے، ایک حسرت موہانی اور دوسرے مولوی عبدالودود بریلوی مرحوم۔

اس موقع پر ایک لطیفہ یاد آیا، اس زمانہ میں مسلمانوں کے احساس میں ایسی شدت آگئی تھی کہ ذرا ذرا سی بات سارے ملک میں اشتعال کا باعث ہوجاتی تھی، ۱۹۱۳ء میں مولانا شبلی نعمانی نے دارالعلوم ندوہ کی معتمدی سے مخالف ارکان کی مخالفتوں سے زچ آکر استعفا دے دیا تھا، دارالعلوم کے طلبہ نے اس پر اسٹرائک کی، ایسی پرزور اسٹرائک اس سے پہلے کسی درسگاہ میں نہیں ہوئی تھی، سارے ملک میں ہنگامہ ہو رہا تھا، مولانا ابوالکلام کا الہلال اسی تحریک کا علم بردار تھا، آج کل کے مشہور مصنف مولانا عبدالسلام ندوی نے جو اس زمانہ میں مولانا شبلی مرحوم کے ساتھ بمبئی میں بطور مددگار

تصنیف کے تھے، مولوی مسعود علی صاحب ندوی کے نام جو تعلیم سے فارغ ہوکر ندوہ میں مقیم تھے، ایک خط لکھا تھا جس میں ان کو مشورہ دیا تھا کہ وہ طلبہ میں شورش پیدا کریں اور آخر میں لکھ دیا تھا کہ یہ مولانا کا حکم ہے، یہ خط مخالفوں نے ڈاک سے اڑا لیا، اور طلبہ کی اسٹرائک کے بعد انھوں نے اخبارات میں اس خط کو شائع کرکے یہ ثبوت بہم پہنچایا کہ یہ اسٹرائک مولانا شبلی صاحب کے اشارہ سے ہوئی ہے، مولانا مرحوم نے اس خط سے اپنی برأت اور لاعلمی ظاہر فرمائی، مولانا عبدالسلام نے اخباروں میں یہ لکھا کہ بے شبہ یہ میرا خط ہے اور مولانا کو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، مولانا کے استعفے کی منظوری کی خبر سے مجھے اس درجہ تکلیف ہوئی کہ میرا دماغی توازن قائم نہیں رہا، اور میں نے یہ لکھ دیا اور زور ڈالنے کے لئے اپنے خیال کو مولانا کی طرف منسوب کردیا، اس پر اخباروں میں مولانا عبدالسلام صاحب پر بحث شروع ہوگئی، اس موقع پر سید حسرت موہانی پہلے شخص ہیں، جنھوں نے لکھا کہ مولانا عبدالسلام صاحب نے جو کچھ کیا وہ بہت ٹھیک کیا، ان کو معذرت کے بجائے جرأت کے ساتھ یہ اقرار کرنا چاہئے تھا کہ ندوہ کی اصلاح کے لئے میں اسٹرائک کو آخری علاج سمجھتا تھا، اس لئے جو کچھ میں نے کیا وہ حق کیا۔

بہرحال یہ واقعہ تو لطیفہ کے طور پر درمیان میں آگیا جس سے حسرت کی طبیعت کا رنگ جھلکتا ہے، ذکر مسلم لیگ کا تھا، بمبئی وہ مقام ہے جہاں سب سے پہلے مسلم لیگ اور کانگریس کا ملان ہوا، یہ ۱۹۱۵ء تھا اور یہی وہ سب سے پہلا اسٹیج تھا، جہاں مرحوم محمد علی جینا ؒ (قائداعظم) مسلم لیگ کے صدر استقبالیہ کی حیثیت سے سب سے پہلے ظاہر ہوئے، مظہرالحق مرحوم اس کے صدر اجلاس تھے، کانگریس کا اجلاس بھی یہیں تھا، اس سبب سے مسلم لیگ کے اس اجلاس میں ہندو سیاسی لیڈر بھی دوستانہ شریک اجلاس تھے، ابھی صدارتوں کے خطبے ہی ہوئے تھے کہ بات یاد نہ رہی کہ اسٹیج پر حسرت موہانی مرحوم نمایاں ہوئے اور انھوں نے کسی چیز کی بڑی شدت سے مخالفت کی، بس ایک ہنگامہ جلسہ میں پیدا ہوگیا، چند پٹھان جوش وخروش سے آگے بڑھے اور اسٹیج پر قابض ہوگئے، آخر جلسہ عام ملتوی کرنا پڑا، بعد کو معلوم ہوا کہ انگریز حکام کی تحریک سے یاروں کو خوش کرنے کے لئے بمبئی کے بعض سربرآوردوں نے کرایہ کے پٹھانوں کی مدد سے جلسہ کو درہم برہم کرادیا، غلط فہمی سے لوگ حسرت مرحوم کی نسبت سوئے ظن کرنے لگے، حالانکہ ان سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا، یہ اتفاقی بات تھی کہ ان کی مخالفت کو لوگوں نے ہنگامہ کا موقع بنالیا۔

۱۹۱۴ء والی عالمگیر جنگ روز بروز بڑھتی جارہی تھی، ترکی نے اتحادیوں کے برخلاف جرمنی کا ساتھ دیا تھا، جس سے مسلمانوں کی ہمدردی خواہ مخواہ جرمنی کے ساتھ پیدا ہوگئی تھی، تھوڑے دنوں کے بعد انگریزوں کی سازش سے شریف حسین اور امیر فیصل کی سرکردگی میں ترکی سے بغاوت کی، نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں شریف حسین کے خلاف بھی نفرت پیدا ہوگئی، حضرت مولانا محمود حسن صاحب (شیخ الہند) اور ان کے دوسرے رفقا حجاز میں قید ہوکر مالٹا بھیج دیئے گئے، ہندوستان میں بھی بڑے بڑے احرار لیڈر نظر بند کردیئے گئے، مولانا ابوالکلام رانچی میں اور محمد علی مرحوم اور شوکت علی مرحوم چھندواڑہ میں لیکن ابھی تک حسرت آزاد تھے، اور مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی میں احرار کی سربراہی کررہے تھے، آخر وہ بھی ۱۹۱۶ء میں پہلے للت پور اور پھر میرٹھ میں قید کردیئے گئے، جس سے جنگ کے بعد چھوٹے، اس قید میں جو جو مصیبتیں حسرت نے جھیلیں اور جس طرح ناخوشگوار حالات کا مقابلہ کیا، وہ اخلاق کی پختگی اور عقیدہ کی استواری کی ایک بڑی مثال ہے۔

اب مسلم لیگ اور کانگریس یک جان و دو قالب تھے، ایک ہی جگہ دونوں کے جلسے ہوتے تھے اور ایک کے لیڈر دوسرے کے جلسہ میں خاص طور سے ایک وقت شریک ہوتے تھے، اب خلافت کی تحریک شروع ہوئی، مسلم لیگ کے رہنما جن میں اس وقت لکھنو کے اندر راجہ صاحب محمودآباد اور چودھری خلیق الزمان اور دوسری طرف مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی خدام کعبہ کی صدر کی حیثیت سے جس کے سکریٹری شوکت علی مرحوم تھے، اس کی سربراہی کے لئے اٹھے، راجہ صاحب تو پیچھے رہ گئے اور سرکاری مناصب میں الجھ گئے، چودھری صاحب اور مولانا عبدالباری صاحب باہم نبرد آزما تھے، اور آخر دونوں صاحبوں کی شرکت سے خلافت کا یہ پہلا جلسہ مسلم لیگ کے زیر سایہ منعقد ہوا، اس کے بعد خلافت کی تحریک جیسے جیسے زور پکڑتی گئی، مسلم لیگ اس کے لئے اپنی جگہ خالی کرتی گئی، اب بھی وہ قائم تھی اور اس کے جلسے بھی ہوتے تھے، مگر اس میں کچھ جان نہیں رہی تھی، اب خلافت کانفرنس اور کانگریس کا میل بڑھا اور دونوں کے ایک ساتھ اجلاس ہونے لگے۔

اس موقع پر ایک بات یاد آئی، تحریک خلافت کے آغاز میں امرتسر کے اجلاس کانگریس دسمبر ۱۹۱۹ء سے واپسی کے بعد گاندھی جی کے مشورے سے یہ ضروری سمجھا گیا کہ کام شروع کرنے سے پہلے مسلمان رہنماؤں کا ایک دفد وائسرائے سے دہلی میں ملاقات کرکے اپنے مطالبات پیش کرے، وائسرائے نے ڈیپوٹیشن سے ملنا منظور کیا، اس ڈیپوٹیشن میں نرم وگرم ہر قسم کے لیڈر موجود تھے، حکیم صاحب ڈاکٹر انصاری، محمد علی، شوکت علی وغیرہ سب ہی تھے، خاکسار بھی شریک تھا، اخیر اخیر وقت تک بعض جاہ پسند لوگ اس میں شرکت کے لئے کوشاں تھے اور محرومی سے مایوس نہیں ہوئے تھے لیکن دو مسلمان رہنماؤں کی شان اس میں نرالی رہی، ایک مولانا ابوالکلام آزاد جو مشوروں میں شریک تھے، جلسوں میں شریک تھے، مگر اس ڈپوٹیشن میں شرکت منظور نہیں کی، حکیم صاحب وغیرہ نے ہرچند اصرار کیا مگر ان کا انکار ہر اصرار پر غالب رہا، مگر اس سے زیادہ نرالی شان حسرت موہانی کی رہی، مولانا ابوالکلام والے طریق سے اپنی ذات کی

بڑائی کا اظہار نمایاں ہوتا تھا، مگر حسرت نے یہ کیا کہ ایک طرف تو خاموشی کے ساتھ ڈیپوٹیشن میں شرکت کی، اور وائسرے ایگل لاج میں ڈیپوٹیشن کے ممبروں کے ساتھ موجود تھے لیکن عرض و معروض و جواب کے بعد جب وایسرائے سے ہاتھ ملانے کا اعزازی لمحہ آیا تو میں نے دیکھا کہ حسرت چپکے سے اٹھ کر بے ہاتھ ملائے کترا کر اس طرح نکل گئے کہ کسی نے دیکھا بھی نہیں۔

اس کے بعد ترک موالات کی تحریک اٹھی، ۱۹۲۰ء کے دسمبر میں ناگپور میں کانگریس کا اجلاس تھا، یہی وہ اجلاس ہے جس میں کانگریس نے ترک موالات کی تحریک منظور کی، اس میں حسرت مرحوم اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ موجود تھے۔

یہ بات یوں یاد رہی کہ واپسی میں ہجوم اتنا تھا کہ ریل کا سفر دشوار معلوم ہوتا تھا، حسرت صاحب نے ہمت دلائی کہ تم میرے ساتھ چلو، چنانچہ اسٹیشن پہنچا تو دیکھا کہ تھرڈ کلاس کے ایک ڈبہ میں حسرت مع اپنی بیگم صاحبہ کے بیٹھے ہیں، اور اس میں اتنا ہجوم ہے کہ سر کے سوا کچھ معلوم نہیں ہوتا تھا، کسی طرح سوار ہوا تو دیکھا کہ ایک مرگ چھالے پر حسرت صاحب متمکن ہیں، مٹی کا لوٹا اور مٹی کا برتن ساتھ ہیں، اسی میں کھانا پینا ہے، ہجوم کی کوئی پرواہ نہیں ہے، دوسری طرف پنڈت موتی لال کا سامان فرسٹ کلاس کے ڈبہ میں لگ رہا ہے اور وہ آرام سے اس میں سوار ہو رہے ہیں، اس وقت میری زبان سے یہ فقرہ نکلا کہ سیاسی جھگڑوں کا سفر دو ہی آدمیوں کے لئے موزوں ہے، حسرت جیسے بے نوا یا موتی لال جیسے باسرو سامان کیلئے، اس کے بعد واقعتاً مجھے کانگریس کے کسی اجلاس میں شرکت کا موقع بہت کم ملا۔

اب ۱۹۲۱ء کا سال آیا جب گاندھی جی کانگریس پر چھائے تھے اور ادھر خلافت کے لیڈر محمد علی، شوکت علی، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خان، ڈاکٹر کچلو، ظفر علی خان، تصدق شروانی، ڈاکٹر محمود، مولانا ابوالکلام، حسرت موہانی وغیرہ تھے، ترک موالات کا زور تھا، اخیر دسمبر ۱۹۲۰ء گاندھی جی نے ہندوستان کے سوراج ملنے کی آخری تاریخ مقرر کی تھی، احمد آباد میں کانگریس کا یہ تاریخی جلسہ تھا، محمد علی، شوکت علی، ابوالکلام نظر بند تھے، باقی حضرات شریک تھے، ڈاکٹر انصاری اور سید محمود کے ساتھ اجلاس میں، میں بھی تھا، اجلاس کے پنڈال سے باہر مسلمانوں کی قیام گاہ کے سامنے ایک شامیانے میں مغرب کے بعد خاص مسلمانوں کا جلسہ تھا، حکیم صاحب وغیرہ موجود تھے، گاندھی جی خاص طور سے مسلمانوں سے کچھ کہنے کے لئے آئے ہوئے تھے، اتنے میں دیکھا کہ کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی سے گھبرائے ہوئے بھاگتے ہوئے دو والنٹیر آئے، اور گاندھی جی سے نہایت اضطراب کے ساتھ کہا جلدی چلئے سبجکٹ کمیٹی میں حسرت موہانی صاحب نے ہندوستان کے استقلال (انڈپینڈنس) کی تجویز پیش کردی ہے، اور کسی طرح واپس نہیں لے رہے ہیں، فضا میں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غیبی گولہ آکر پڑا ہے، چنانچہ گاندھی جی وغیرہ بھی گھبرائے ہوئے جلسہ سے اٹھ کر سبجکٹ کمیٹی میں چلے گئے، مگر حسرت ؎

یہ وہ نشہ نہیں ہے جس ترشی اتار دے

حسرت بدستور بات پر جمے رہے، اور نوٹس دیا کہ اس کو کھلے اجلاس میں پیش کریں گے، چنانچہ وہ وقت آیا، جب کھلے اجلاس میں حسرت نے ہندوستان کے استقلال کی تجویز پیش کی، اور آنکھوں نے دیکھا کہ ہزاروں کے مجمع میں ایک آواز بھی اس کی تائید میں نہیں اٹھی، پھر نیرنگ قدرت کا تماشا دیکھئے اس کے آٹھ برس کے بعد لاہور کے اجلاس کانگریس میں ۱۹۲۹ء میں پنڈت جواہر لال نے یہی ریزولیوشن پیش کیا اور کانگریس نے اس کا خیر مقدم کیا، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی خودمختاری کا پہلا اعلان حسرت موہانی کی زبان سے ہوا، اس کے بعد وہ گاندھی جی کی کانگریس سے بھی علیحدہ ہوتے گئے، حسرت مرحوم نے مجھ سے ایک دفعہ کہا تھا کہ گاندھی جی چینی فلسفی کی طرح ہر کلام دو متضاد پہلو رکھتے ہیں، اور بیک وقت دونوں کو حق سمجھتے ہیں۔

کمیونزم اور بالشویزم کے ظہور کے بعد اقتصادی امور میں ان کا میلان اس کی طرف بھی ہوگیا تھا، اور اپنے کو مسلمان کمیونسٹ کہتے تھے، ان کی عقیدت اس باب میں یہاں تک تھی کہ تقسیم سے چند سال پہلے وہ مسلم لیگ کے کسی وفد کے ساتھ اعظم گڑھ آئے تھے، تو دارالمصنفین بھی تشریف لائے، دوران گفتگو ایک تازہ سیاسی نظم سنائی جس کا ایک قافیہ سویت تھا اور وثوق کے ساتھ فرمایا کہ روسی لفظ سوویٹ حقیقت میں عربی لفظ سویت ہے، جس کے معنی برابری کے ہیں۔

کانگریس کے ہٹنے کے بعد ایک اور سیاسی پارٹی مولانا آزاد سبحانی کے ساتھ مل کر قائم کی تھی، مگر وہ چل نہ سکی، کانگریس اور لیگ کے متفقہ الیکشن کے بعد جب مشترکہ لیگ و کانگریس وزارت بنانے کا اصول کانگریس نے تسلیم نہیں کیا، اور مسلم لیگ نے نئے جوش و خروش کے ساتھ اپنی زندگی کا ایک نیا دور شروع کیا اور ایک نئے مقصدِ حیات کی طرح ڈالی تو حسرت موہانی مرحوم نے مسلم لیگ میں پیش از پیش شرکت کی، یہاں تک کہ وہ کانگریس سے بالکل علیحدہ ہوکر خالص لیگی ہوگئے، اور ان کوششوں میں شریک ہوگئے، جو مسلم لیگ پاکستان کے حصول کے لئے کررہی تھی، وہ اس کی مجلس عاملہ کے ارکان خاص میں تھے، لیکن یہاں بھی ان کی شان نرالی تھی، قائداعظم مرحوم کسی اختلاف کو کم برداشت کرسکتے تھے، مگر ایک حسرت موہانی کی ذات تھی جو اپنے خیال میں جس کو حق سمجھتے تھے، اس کے اظہار میں کسی سے مرعوب نہیں ہوئے، بلکہ وہی ہیں جنھوں نے مسلم لیگ میں بھی استقلال اور خودمختاری کا رزولیوشن پیش کیا۔

پاکستان بننے کے بعد انھوں نے ہندوستان ہی میں قیام پسند کیا، اس کی پارلیمنٹ کے ممبر رہے، اور تنہا وہ تھے جو پوری پارلیمنٹ کی مخالفت کے باوجود اپنی رائے کے اظہار میں بے باک تھے، نہ کسی کی تحقیر پر افسوس نہ کسی کی نفریں کا جواب، ایک دھن

تھی، جوان کو اپنی منزل مقصود کی طرف لئے چلی جارہی تھی۔

حسرت خواہ کسی قدر بے ضرر رہے ہوں، انگریزی عہد میں وہ بڑے خطرناک سمجھے جاتے تھے، وہ کہیں جائیں، ایک خفیہ پولیس کا آدمی ان کے ساتھ رہتا تھا، اسٹیشنوں پر ان کی آمد کی اطلاع کردی جاتی تھی، مگر وہ عجیب دلچسپ آدمی تھے، ہمیشہ پولیس اور ریلوے کے آدمیوں کو انھوں نے دھوکہ دیا، وہ کہتے تھے کہ میں ٹکٹ منزل مقصود سے آگے پیچھے کا لے لیتا ہوں اور بیچ میں اتر جاتا ہوں، پولیس حیران ہوتی ہے، کبھی یہ کرتے کہ اپنے بجائے دوسرے کو بھیج کر ٹکٹ منگوا لیتے، اور چلے جاتے پتہ بھی نہ چلتا، پھر یہ ہونے لگا کہ درمیان راہ میں ان کے ٹکٹ کا نمبر چیک ہوتا۔

ایک دفعہ یہ ہوا کہ ٹکٹ چیکر مسافروں کے ٹکٹ دیکھنے لگا، حسرت تاڑ گئے، وہ چکر کاٹ کر دوسری طرف چلے گئے، ٹکٹ چیکر کو جب خوب حیران کر چکے، تو سامنے آکر فرمایا، کہ تم یہ نمبر ڈھونڈ رہے ہو، اس سے زیادہ لطیفہ یہ ہوتا تھا کہ وہ راہ میں کسی سے اپنا ٹکٹ بدل لیتے تھے، حسرت اسٹیشن سے اتر کر چلتے ہوئے، اور دوسرا ناکردہ گناہِ حسرت بنا، پولیس کو احمق بنا رہا ہے۔

ایک دفعہ میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا، خدا جانے کسی جلسہ کی تقریب سے میں اور وہ دونوں دلّی میں تھے، مغرب کے بعد حسرت نے کہا چلو کامریڈ کے دفتر میں کوچۂ چیلاں، راستہ نہ انھیں یاد تھا نہ مجھے فرمایا، چلو ایک رہبر ساتھ ہے اس سے پوچھیں، انھوں نے ایک صاحب کو پکارا کہ بھئی چھپ چھپ کے کیوں چل رہے ہو، ساتھ چلو، ذرا کامریڈ کا دفتر بتاؤ، اب وہ صاحب سامنے آئے، تو میں نے دیکھا کہ کسی عربی مدرسہ کے طالب علم کے لباس میں ایک صاحب ہیں، وہ بے تکلف آگے آگے چلے اور ہم لوگ پیچھے، حسرت نے کہا یہ ہمارے ہمزاد ہیں، یہ یا ان کے بھائی ہمیشہ میرے ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور ایسے مشکل وقتوں میں کام آتے ہیں۔

اب تک جو گفتگو کا سلسلہ چلا آیا، وہ سارا سیاسی تھا، حسرت پکے دیندار تھے، وہ کانگریسی بھی رہے، اور اپنے کو سوشلسٹ بھی کہتے تھے، مگر بچپن سے موت تک وہ سچے اور پکے اور دیندار مسلمان رہے، وہ نہ صرف مسلمان، بلکہ صوفی مسلمان تھے، اور صوفیوں میں بھی وہ صوفی تھے، جن سے بزرگوں کا کوئی مزار، اور کوئی عرس اور کوئی قوالی کی مجلس چھوٹتی نہ تھی، خصوصاً فرنگی محل اور ردولی کی مجلسیں۔ حجاز پر ۱۹۲۴ء میں ابن سعود کے قبضہ کے بعد سے چونکہ وہ وہابیت سے ناراض تھے، اس لئے وہ اس قبضہ سے خفا تھے، لیکن بااین ہمہ انھوں نے حرمین کی زیارت کی توفیق عہد میں پائی، اس حج کے بعد وہ وہابیوں سے خفگی کے باوجود کچھ ایسے اس سرزمین اقدس کے دلدادہ ہوئے کہ چند سال ہوئے متواتر ہر سال حج کو جاتے رہے اور حکومت کے مہمان ہوتے رہے۔

حسرت جیسی متضاد طبیعت کا انسان شاید ہی منصۂ شہود پر آیا ہو، سیاسیات اور قید و بند کے ساتھ شعر و سخن کی چمن بندی اور آبیاری بہت کم جمع ہوسکتی تھی، لیکن حسرت کے مزاج میں دونوں چیزیں جمع تھیں، اور خود حسرت کو بھی اس اجتماع ضدین پر تعجب تھا، جیسا کہ خود ہی کی ایک غزل میں انھوں نے کہا ؎

ہے مشقِ سخن جاری ، چکی کی مشقت بھی
کیا طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

حسرت کو نسیم دہلوی اور تسلیم لکھنوی کے سلسلہ سے شعر و سخن کی سجادگی ملی تھی، غزل کو لکھنو کے تصنع اور غالب کی مشکل گوئی کے کوچہ سے سادگی اور آسان گوئی، اور حقیقت رسی کی منزل تک پھیر کر لانا شاعری میں حسرت کا تجدیدی کارنامہ ہے، حسرت کا مکمل دیوان ابھی تک مکمل نہیں ہوا ہے، متفرق دواوین چھوٹے چھوٹے دیوانوں کی صورت میں اکثر چھپتے رہے اور بیچاری بیگم حسرت جب تک جیتی رہیں، شوہر کی قید کی صورت میں اکثر وہ ان کے دوادین مختلف ترتیبوں سے چھپوایا کرتی تھیں، ضرورت ہے کہ حسرت کا ایک مکمل دیوان صحت و اہتمام کے ساتھ یادگار کے طور پر چھپوایا جائے اور ان کی دوسری سیاسی اور ادبی تحریروں کو جمع کیا جائے، حسرت کی ادبی تصنیفات میں ان کی شرح دیوان غالب بہترین چیز ہے، اسی طرح متروکات اور معانی شعر پر ان کے مسائل اور مقالات یادگاری چیزیں ہیں۔

حسرت کی زندگی کا تذکرہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی وفادار شریف اور بہادر بیگم مرحومہ کے تذکرہ کے بغیر تمام نہیں ہوسکتا، آج سے ۳۵ برس پہلے وہ چہرہ کھول کر نہایت سادہ لیکن پردہ پوش لباس میں باہر آتی تھیں اور کسی کی پروا نہیں کرتی تھیں، شوہر کی ہر قید و بند کے بعد جب ان کا کوئی مونس و مددگار نہیں ہوتا تھا، ہر قسم کی مشکلوں کو بہادری اور استقلال کے ساتھ برداشت کرنے میں شائد ہی کوئی مسلمان عورت ان کے مقابلہ کی نکل سکے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

سید فضل الحسن موہانی کی زندگی کے واقعات پر نظر کر کے ان کی شان حضرت ابوذرؓ صحابی کی نظر آتی ہے، جن کی نسبت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''ابوذر سے زیادہ کسی حق گو پر آفتاب کی کرن نہیں چمکی''

سچ یہ ہے کہ اس عہد پر فریب میں حسرت سے زیادہ کسی حق گو پر آفتاب کی کرن کبھی نہیں چمکی، اسی طرح حضرت ابوذرؓ کے بعد یہ قول نبوی بھی ان پر صادق آتا ہے کہ ''ابوذر کی حق گوئی نے اس کو زندگی میں تنہا چھوڑ دیا، اس کا کوئی ساتھی نہیں رہا'' اور اس لئے اس عہد میں اس مقدس فقرہ کا مورد بھی حسرت کی وفات تھی۔

عَاشَ فریدً اماتَ حمیداً   تنہا جیا اور ستودہ مرد

حسرت کا دماغ خدا جانے کتنے روپوں میں جلوہ گر ہوا، مگر اس کا دل بزرگوں کی عقیدت کی خاک سے بنا تھا، مرتے دم پیر کے آستانہ پر جان دی، اور انہی کی ابدی

خواب گاہ میں آرام کیا، مولانا انوار صاحب کے باغ میں جہاں فرنگی محل کے خدا جانے کتنے خزانے دفن ہیں، حسرت بھی اپنی تمناؤں کے خزانہ کے ساتھ دفن ہوئے۔

حسرت رخصت! تو تنہا آیا تھا، تنہا رہا، تنہا گیا، البتہ تیری نیکی، تیری شرافت، تیرا اخلاص اور حسن عقیدت کے اعمال تیرے ساتھ ہیں، اور وہی تیرے رفیق آخرت ہیں، بارالہا! اس کی حق گوئی کی بے کسی کی شرم رکھ لیجیے اور اس کو اپنی رفاقت سے نواز ہے، وانت الرفیق الاعلیٰ۔ (''س''، دسمبر ۱۹۵۱ء)

---

۱ شاید لوگوں کے لیے یہ بات اجنبی سی معلوم ہوگی، قائداعظم مرحوم کے نام کا آخری جزو اس وقت تک ''جینا'' تھا جس کے معنی گجراتی میں ''ننھے'' کے ہیں، ۱۹۱۶ء میں جب وہ لکھنؤ صدر کی حیثیت سے آئے تو سید جالب مرحوم اڈیٹر ہمدم کی ذہانت نے اس کو جناح بنادیا، جس کے بعد وہ ایسا مشہور ہوا کہ اس نے اصل کی جگہ حاصل کرلی، خود میرا بھی اس زمانہ کا ایک شعر ہے:

ہر مریض قوم کے جینے کی ہے کچھ کچھ امید
ڈاکٹر اس کا اگر مسٹر علی جینا رہا

عسکری، محمد، مرزا

مرزا محمد عسکری

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینہ اردو زبان کی صف میں دو ممتاز جگہیں خالی ہوگئیں، اور مرزا محمد عسکری اور مولوی مہیش پرشاد ہم سے جدا ہوگئے، مرزا صاحب مرحوم قدیم مشرقی تہذیب کا نمونہ، لکھنؤ کی پرانی بزم ادب کی یادگار، اردو زبان و ادب کے صاحب ذوق و نکتہ سنج ادیب اور متعدد کتابوں کے مصنف و مترجم تھے، ان کی سب سے بڑی علمی یادگار بابو سکسینہ کی تاریخ ادبیات اردو کا ترجمہ ہے، اس میں انھوں نے اتنے اضافے کئے ہیں، اور اس کو اس طرح اردو کے قالب میں ڈھالا ہے کہ اس کی حیثیت تصنیف کی ہوگئی ہے، جس طرح جناب صفی اور آرزو پر لکھنؤ کی قدیم بزم شاعری کا خاتمہ ہوگیا، اسی طرح مرزا صاحب کی وفات سے اس دور کی بزم ادب کی آخری یادگار مٹ گئی اب وہ تہذیب ہی ختم ہوگئی، وہ سانچہ ہی بدل گیا جس میں تہذیب و شائستگی اور ذوقِ ادب کے یہ نمونے ڈھلتے تھے، اس لئے آئندہ ان کے پیدا ہونے کی امید نہیں اور ان کی جو جگہ بھی ہوگی، وہ خالی ہی رہے گی۔ (''م''، اکتوبر ۱۹۵۱ء)

پرشاد، مہیش، مولوی

مولوی مہیش پرشاد

مولوی مہیش پرشاد ہندو یونیورسٹی میں عربی و فارسی کے پروفیسر تھے، عربی کی تعلیم انھوں نے مولانا عبداللہ ٹونکی سے حاصل کی تھی، اور ''مولوی'' کا امتحان بھی پاس کیا تھا، اردو زبان و ادب میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے تھے اور اس کے بڑے حامی اور مخلص خدمت گزار تھے، مرزا غالب کے خطوط ان کا خاص موضوع تھا، انھوں نے ان کے نئے خطوط کا پتہ چلایا تھا، اور ان کے چھوٹے چھوٹے رقعوں اور کارڈ اور لفافوں اور ان کے پتوں پر مستقل مضامین لکھے تھے، اور مکاتیب غالب کا ایک جامع اور مکمل مجموعہ جس میں بہت سے ایسے خطوط تھے، جو پرانے مجموعوں میں نہیں پائے جاتے، دو ضخیم جلدوں میں مرتب کیا تھا، اس کی ایک جلد کئی سال ہوئے، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے شائع کی تھی، دوسری جلد کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی تھی کہ خود مرتب کی کتاب زندگی کا ورق الٹ گیا، ضرورت ہے کہ اکیڈمی یا اردو کا کوئی ادارہ مرتب کی یادگار میں اس کو شائع کردے موجودہ فرقہ پرستی اور اردو دشمنی کے زمانہ میں ہندوؤں میں ان کے ایسے خدمت گزار مشکل سے پیدا ہوں گے۔ (''م''، اکتوبر ۱۹۵۱ء)

خان، لیاقت علی

لیاقت علی خان

محرم کا مہینہ ہر سال مسلمانوں کے لئے پیام غم بھی لاتا ہے، اور حیات نو کی بشارت بھی، اس سال ایک نیا کوہ الم اپنے ساتھ لایا، اور اسی مہینہ کی ۱۴ر تاریخ کو کسی شقی نے لیاقت علی خان وزیراعظم پاکستان کی شمع حیات گل کردی ان کی شہادت تنہا پاکستان کا نہیں دنیائے اسلام کا نہایت دردانگیز سانحہ ہے۔ بدبخت قاتل نے ایک شخص کو نہیں مارا، بلکہ ملک و ملت کے ایک مضبوط ستون کو ڈھا کر اس کی پوری عمارت کو کمزور کرنے کی کوشش کی، اور ایک پوری قوم کو ماتم گسار بنادیا۔

لیاقت علی خان کی موت نے پاکستان کو ایک ایسے مدبر اور معمار قوم سے محروم کردیا، جس کا بدل بظاہر مدتوں ملنے کی امید نہیں، وہ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک بڑے مدبر، ہوشمند، یورپ کی سیاست اور بین الاقوامی سیاست کے ماہر اور ٹھنڈے دل و دماغ کے انسان تھے، قائداعظم کی وفات کے بعد انھوں نے جس کامیابی کے ساتھ پاکستان کو چلایا اور چند برسوں کے اندر اس نئی مملکت کو جس درجہ پر پہنچایا وہ ان کا بڑا کارنامہ اور ان کے تدبر اور ہوشمندی کا ایسا نمایاں ثبوت ہے جس کا اعتراف ساری دنیا نے کیا، اس لحاظ سے وہ معمارِ پاکستان تھے، ان کی شہادت نے ان کا درجہ اور بلند کردیا یہ سعادت عظمیٰ ہر شخص کا حصہ نہیں۔

ع ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

انھوں نے اندرونی طور سے پاکستان کو مضبوط و مستحکم بنایا، بیرونی دنیا سے تعلقات پیدا کرکے اس کی خوشی منوائی، دنیائے اسلام سے ٹوٹے ہوئے رشتہ کو جوڑا اور

ان کو ایک سلسلہ میں منسلک کرنے کی کوشش کی ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات میں جب کوئی نازک موڑ آیا، تو اپنے اعتدال، توازن اور سلامت روی سے اس کو خطرہ سے بچایا، گزشتہ فسادات کے موقع پر اگر ان کی ذات درمیان میں نہ ہوتی تو معلوم نہیں دونوں ملکوں کی کشمکش کا انجام کیا ہوتا، مہاجرین کو بھی ان سے تقویت تھی، غرض ان کے کارنامے گوناگوں ہیں اور ان کی جیسی جامعیت کا وزیراعظم مشکل سے پاکستان کو ملے گا، مگر اشخاص کی موت، خواہ کتنی ہی بڑی شخصیت کیوں نہ ہو زندہ قوموں کو کمزور نہیں کرتی، بلکہ ان کے قوائے عمل کو اور زیادہ بیدار کردیتی ہیں شہید کا خون جسم ملت کے لئے روح حیات ہے اس لئے پاکستان اس حادثہ سے سبق لے کر اپنی کمزوریوں کو دور کرکے نئی زندگی حاصل کرسکتا ہے اور معمار پاکستان کے خون سے اس کی عمارت اور زیادہ مستحکم ہوسکتی ہے۔

مرحوم متحدہ ہندوستان کی پیداوار تھے، اور تقسیم سے پہلے انھوں نے ہندوستان کی خدمات بھی انجام دی تھیں، اگرچہ اب ہندوستان اور پاکستان سیاسی حیثیت سے دو ملک ہوگئے ہیں، لیکن وہ ایک ہی جسم کے دو ٹکڑے ہیں، اس لئے جب تک موجودہ نسلیں باقی ہیں، دونوں کی بڑی شخصیتیں ایک دوسرے کی مشترک ملک ہیں، اس لئے ہندوستان بھی پاکستان کے اس دردوالم میں برابر کا شریک ہے اللہ تعالیٰ اس شہیدِ ملت کی تربیت پر اپنی رحمت ومغفرت کے پھول برسائے، اور قوم کے ان نادانوں کو ہدایت دے، جن کو اپنے نفع ونقصان کا بھی امتیاز نہیں، اور وہ اپنے ہاتھوں اپنی قوم کو نقصان پہنچانے میں بھی باک نہیں کرتے۔ (''م''، نومبر ۱۹۵۱ء)

ندوی، اکرام اللہ خان، مولانا

مولانا اکرام اللہ خان ندوی

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ ہندوستان اور پاکستان کے کئی اصحابِ علم وقلم نے وفات پائی، ان میں سب سے ممتاز شخصیت مولانا اکرام اللہ خان ندوی کی تھی، مرحوم دارالعلوم ندوۃ العلماء کے دورِ اول کی پیداوار اور اپنی علمی وتصنیفی قابلیت کے اعتبار سے ممتاز حیثیت کے مالک تھے، ان کا وطن شاہجہان پور تھا، اور تعلیم ندوۃ العلماء میں حاصل کی تھی، انھوں نے مولانا شبلی مرحوم سے باقاعدہ درس تو نہیں لیا تھا، مگر ان کی صحبت کے فیض یافتہ تھے، تعلیم سے فراغت کے بعد کئی سال تک دارالعلوم کے مشہور رسالہ الندوہ کے اڈیٹر رہے، اور کچھ دنوں تک ندوہ کے اہتمام کے فرائض بھی انجام دیئے تھے۔

غالباً ۱۹۲۰ء میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی مرحوم نے اُن کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اسسٹنٹ سکریٹری کی حیثیت سے علی گڑھ بلالیا تھا، جس سے وہ آخر عمر تک وابستہ رہے، مولانا شروانی مرحوم کا قیام امور مذہبی کی صدارت کے سلسلہ میں حیدرآباد میں رہتا تھا، اس لئے کانفرنس کا سارا کام مولانا اکرام اللہ خان کے ہاتھوں میں تھا، جس کو انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے چلایا، کانفرنس گزٹ کے اڈیٹری کے فرائض بھی وہی انجام دیتے رہے، اور کانفرنس کی تجویزیں اور سالانہ اجلاسوں کی رپورٹیں وغیرہ بھی وہی مرتب کرتے تھے، اور ۱۹۲۰ء سے لے کر ۱۹۵۱ء کامل ۳۰ سال تک کانفرنس انہی کی ذات سے عبارت تھی مرحوم کو ندوۃ العلماء سے بھی گہرا تعلق تھا، اور وہ ہر زمانہ میں اسکی خدمت انجام دیتے رہے۔

طبعاً نہایت متین، خاموش، کم آمیز اور دنیاوی جاہ وشہرت سے بے نیاز تھے، اسی لئے علمی دنیا میں وہ شہرت حاصل نہ کرسکے، جس کے وہ حقیقتاً مستحق تھے، مگر مسلمانوں کی خاموش مفید علمی وتعلیمی خدمات انجام دیں، الندوہ اور کانفرنس گزٹ میں انھوں نے سیکڑوں علمی، تعلیمی اور اصلاحی مضامین لکھے، جن کا مجموعہ کئی جلدوں میں آئے گا، اُن کی مستقل قلمی یادگار نواب وقارالملک کی سوانح عمری ''وقار حیات'' ہے، جو تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے، وفات کے وقت ۶۴، ۶۵ سال کی عمر رہی ہوگی، مرحوم کی وفات سے نہ صرف ندوہ کی جماعت بلکہ ہندوستان کے علمی حلقہ میں ایک ممتاز جگہ خالی ہوگئی، اللہ تعالیٰ اس خادم علم کو اپنی رحمت سے سرفراز فرمائے۔ (''م''، فروری ۱۹۵۲ء)

رموزی، ملا

ملا رموزی

دوسرا حادثہ ملا رموزی کی وفات کا ہے، ان کا اصل نام احمد صدیق تھا، مگر ادبی دنیا میں ملا رموزی کے نام سے مشہور تھے، بھوپال وطن تھا، اور مدرسہ الٰہیات کانپور میں تعلیم پائی تھی، مگر حصولِ تعلیم کے بعد خالص ادبی زندگی اختیار کی، وہ اردو میں ایک خاص مزاحیہ طرز کے موجد تھے، جس کا نام انھوں نے گلابی اردو رکھا تھا، اور جو انہی کے ساتھ ختم ہوگیا، ایک زمانہ میں یہ طرز بہت مقبول تھا، مگر ادھر چند برسوں سے اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا، اور مرحوم کے قلم میں وہ تازگی اور جولانی باقی نہیں رہ گئی تھی، وفات کے وقت پچاس سے کچھ اوپر عمر رہی ہوگی جو علمی دنیا کے لئے گویا شباب کی عمر ہے، مگر اتنی ہی عمر میں مرحوم نے شہرت وخمول کے سارے مدارج طے کرلیے تھے، اور بالآخر گذشتہ مہینہ زندگی کا آخری مرحلہ بھی طے ہوگیا، والبقاء للہ وحدہ۔ (''م''، فروری ۱۹۵۲ء)

صدیقی، حیدر زمان، مولانا

مولانا حیدر زمان صدیقی

اسی مہینہ میں پاکستان کے ایک خط سے یہ افسوس ناک اطلاع ملی کہ جنوری کے آخری عشرہ میں مولانا حیدر زمان صدیقی نے وفات پائی، مرحوم سے صرف علمی مراسلت

رہتی تھی، اس لئے ان کے ذاتی حالات کم معلوم ہیں، ایک زمانہ میں اُن کا قیام پٹھان کوٹ میں تھا، مگر ہندوستان کی تقسیم کے بعد سے ہری پور ضلع ہزارہ میں منتقل ہوگئے تھے، مرحوم بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے، اور اپنی علمی و تصنیفی زندگی کے ابتدائی ہی دور میں ایک خاص حلقہ میں اچھی خاصی شہرت حاصل کرلی تھی، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جدید دور کے سیاسی و معاشی مشکلات کا حل اُن کا خاص موضوع تھا، اس موضوع پر وہ معارف اور دوسرے رسالوں میں برابر مضامین لکھتے رہتے تھے، اور اسلامی مسائل کے جدید مفسرین کے برخلاف ان کا قلم بڑی حد تک محتاط واقع ہوا تھا، متفرق مضامین کے علاوہ مستقل تصانیف میں غالباً صرف ایک کتاب اسلام کا نظریہ سیاست اس کی قلمی یادگار ہے، مرحوم کی ذات سے بڑی توقعات وابستہ تھیں، لیکن افسوس موت نے ان کو پوری ہونے کا موقع نہیں دیا، اللہ تعالیٰ اس خادم دین کو اپنی مغفرت سے نوازے۔

("م"، فروری ۱۹۵۲ء)

مشرووالا، شری

شری مشرووالا

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینہ گاندھی جی کے مشہور چیلے شری مشرووالا نے انتقال کیا، وہ ہریجن کے اڈیٹر اور گاندھی جی کے مشن کے سچے حامل و مبلغ تھے اور اس زمانہ میں جب کہ کانگریس اپنے اصولوں سے عملاً بالکل ہٹ گئی ہے اور کانگریسیوں کی اکثریت اقتدار کی ہوس، ذاتی اغراض اور فرقہ پرستی میں مبتلا ہے اور فرقہ پرستوں اور خودغرضوں کی قوت اتنی بڑھ گئی ہے کہ سچے کانگریسی بھی مشکل سے ان کے مقابلہ میں زبان کھولنے کی جرأت کرسکتے ہیں، مشرووالا جی اپنے اصولوں پر قائم تھے اور آخر دم تک نہایت دلیری کے ساتھ کانگریس کی غلط روی پر تنقید اور گاندھی جی کے اصولوں کی تبلیغ و اشاعت کا فرض انجام دیتے رہے انھوں نے ان کی تعلیمات پر متعدد کتابیں لکھی ہیں، اس خودغرضی اور فرقہ پرستی کے دور میں ایسے مخلص اور سچے کانگریسی کا اٹھ جانا ایک ناقابل تلافی نقصان ہے، ان کی موت سے متحدہ قومیت کا ایک بڑا ستون گرگیا، جس کی جگہ مدتوں نہ بھر سکے گی۔ ("م"، اکتوبر ۱۹۵۲ء)

نیرنگ، غلام بھیک، میر

میر غلام بھیک نیرنگ

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینہ ایک پرانی یادگار شخصیت میر غلام نیرنگ کا ستتر (۷۷) سال کی عمر میں انتقال ہوگیا، ان کا ابتدائی تعارف شاعری کے ذریعہ سے ہوا تھا، اور ایک زمانہ میں اقبال کے ساتھ ان کا نام بھی لیا جاتا تھا اور شکوہ و جواب شکوہ کی اشاعت کے زمانہ میں نیرنگ کی بعض نظمیں بھی شائع ہوئی تھیں، جو اس زمانہ میں بہت مقبول ہوئی تھیں مگر وہ بہت جلد یہ کوچہ چھوڑ کر ملک و ملت کی خدمت میں مصروف ہوگئے، ۱۹۲۴ء میں شدھی اور سنگھٹن کے ہنگامہ کے زمانہ میں اس کے مقابلہ کے لئے انجمن تبلیغ الاسلام قائم تھی، جس کا اس زمانہ میں بڑا شہرہ تھا، مگر ادھر عرصہ سے عزلت نشین ہوگئے تھے، اور ان کا نام بہت کم سننے میں آتا تھا اور پاکستان کے قیام کے بعد تو ان کی یاد بھی دلوں سے فراموش ہوچلی تھی کہ پاکستان کے اخبارات سے ان کی وفات کی اطلاع ملی، اللہ تعالیٰ ملک و ملت کے اس دیرینہ خادم کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے۔

("م"، نومبر ۱۹۵۲ء)

سرفراز، عبدالقادر، شیخ

شیخ عبدالقادر سرفراز (پونا)

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینہ فضل و کمال کی ایک ممتاز یادگار اٹھ گئی، یعنی پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز (پونا) نے چوہتر سال کی عمر میں انتقال کیا، مرحوم مشرقی علوم والسنہ کے نامور فاضل تھے، عربی، فارسی اور انگریزی کے علاوہ سنسکرت اور مرہٹی زبان کے بھی ماہر تھے، عبرانی سے بھی واقفیت رکھتے تھے، ان کی پوری زندگی علم و تعلیم کی خدمت میں گزری، ابتدا میں الفنسٹن کالج بمبئی میں استاد مقرر ہوئے تھے، پھر دکن کالج پونا میں تبادلہ ہوگیا، اور یہیں سے ۱۹۳۳ء میں ریٹائر ہوئے، ان کی علمی خدمات کی فہرست طویل ہے، بمبئی یونیورسٹی کے عربی فارسی اور اردو مخطوطات کا محققانہ کیٹیلاگ تیار کیا جو عرصہ ہوا چھپ چکا ہے، تاریخ طبری کی بعض جلدوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا، یہ بھی شائع ہوچکا ہے، تاریخ جہانگشاہی نادری، سبحۃ الابرار جامی اور وقائع نعمت خان عالی کی تصحیح و تہذیب کی اور اس پر محققانہ حواشی لکھے، جن کی اشاعت کی نوبت ابھی تک نہیں آئی، ان کے علاوہ اور بہت سے کام انجام دیئے، جن کی تفصیل آئندہ کسی پرچہ میں پیش کی جائے گی۔

اس علم کے ساتھ نہایت راسخ العقیدہ و باعمل اور پابند مذہب مسلمان تھے، حج بیت اللہ کے شرف سے بھی مشرف ہوئے تھے، طبعاً نہایت متین، سنجیدہ، خاموش اور متواضع و خاکسار تھے، مولانا شبلی مرحوم سے ان کے تعلقات بڑے مخلصانہ تھے، جو ان کے بعد وراثۃً دارالمصنفین کے حصہ میں آئے، دارالمصنفین سے ان کو نہایت گہرا تعلق تھا، اس کی مجلس انتظامیہ کے رکن بھی تھے، عرصہ ہوا ایک مرتبہ پونا سے اعظم گڑھ آنے کی زحمت گوارا کی تھی، اب اس زمانہ میں ایسے اصحاب کمال کا پیدا ہونا مشکل ہے، اللہ تعالیٰ اس سرفرازِ علم کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے۔ ("م"، جنوری ۱۹۵۳ء)

ایک شریف النفس فاضل دوست کی دائمی مفارقت

پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز (پونا)

ناسک (بمبئی) کے ایک خط سے جو مرحوم کے چھوٹے بھائی نے مجھے لکھا تھا یہ معلوم کرکے بڑا تاسف ہوا کہ میرے چالیس برس کے دوست پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز نے پونہ میں اپنے مکان کاشانۂ حق میں ۱۰؍دسمبر ۱۹۵۲ء کو ساڑھے نو بجے انتقال فرمایا، اس کے بعد مرحوم کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر شیخ عبدالحق ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر اردو فارسی (بمبئی) کی اطلاع سے اور بہت سی باتیں معلوم ہوئیں، یہ بھی معلوم ہوا کہ مرحوم کو بڑھاپے اور شیخوخت کے ضعف کے سوا کوئی خاص مرض نہ تھا، بصارت سے معذور ہوچکے تھے، ایک ہفتہ سے ضعف بڑھتا جاتا تھا، ڈاکٹروں کے معائنہ سے قلب اور اعضائے رئیسہ توانا پائے گئے، حواس آخر تک بجا تھے، سوا نو بجے خود آنکھیں بند کرلیں لب ہل رہے تھے، غالباً کلمہ پڑھ رہے تھے، ۱۵ منٹ کے بعد یعنی ساڑھے نو بجے صبح کو اس دنیائے فانی سے سفر اختیار کیا۔

۱۹؍جولائی ۱۸۷۹ء پیدائش کی تاریخ تھی، بہتر (۷۲) برس کی عمر پائی، مرحوم کا خاندان دراصل یوپی کا باشندہ تھا، غدر کے ایام میں بمبئی کی طرف نکل گیا، مرحوم کے والد شیخ سرفراز ڈاکٹر تھے، انہوں نے ناسک کو اپنا وطن بنایا لیکن مرحوم کی عمر کا بڑا حصہ پونہ اور بمبئی میں گزرا ۱۹۰۲ء میں بمبئی یونیورسٹی سے ایم، اے پاس کیا اور غالباً ان کا خاص موضوع فارسی تھا، اس زمانہ میں ایک شریف ایرانی فاضل پروفیسر مرزا حیرت بمبئی یونیورسٹی میں فارسی کے مسندنشین صدر تھے، ان کا غیر معمولی فضل وکمال تمام بمبئی میں مسلم تھا، مرحوم شیخ عبدالقادر کو فارسی کا ذوق انہی کی صحبت سے حاصل ہوا، چنانچہ مرزا حیرتؔ کی انہوں نے مختصر سوانح عمری بھی لکھی ہے اور مجلس میں اکثر ان کے فضائل اور اخلاق اور حالات کا ذکر کیا کرتے تھے۔

ایم، اے ہونے کے بعد وہ فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے، اس زمانہ میں سندھ کا صوبہ بمبئی کے احاطہ سے ملحق تھا، اس لئے ان کا تقرر پہلے سندھ میں ہوا اور اس طرح زبانوں کے شائق کے لئے ایک نئی زبان سندھی کا دروازہ کھل گیا اور وہ اس سے کچھ ہی دنوں میں آشنا ہوگئے، یہاں ان کا قیام مختصر رہا، یہاں سے وہ جلد بمبئی منتقل کردیئے گئے جہاں یکے بادیگرے الفنسٹن کالج بمبئی اور دکن کالج پونہ میں السنۂ شرقیہ کے پروفیسر رہے۔ ۱۹۳۳ء میں ریٹائرڈ ہوکر انہوں نے اپنی بیوی اور تین صاحبزادوں کے ساتھ حج کیا، واپسی کے بعد بدستور اپنے مکان موسوم کاشانۂ حق پونہ میں مستقل سکونت اختیار کی۔

مولانا شبلی مرحوم سے ان کی ملاقات ۱۹۰۸ء میں بمبئی میں ہوئی، اس وقت مولانا شعرالعجم کی تکمیل میں مصروف تھے، دونوں میں تعلقات کی وابستگی کا رستہ یہی فارسی شعر و ادب کا ذوق تھا، وہ فارسی کے یورپین مستشرقین کی تحقیقات سے مولانا کو مطلع کیا کرتے تھے اور بعض مضامین کے ترجمے بھیجا کرتے تھے، مکاتیب شبلی میں مرحوم کے نام مولانا کے جو خطوط ہیں، ان سے ان تعلقات کی پوری حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔

راقم سے مرحوم کی واقفیت کا واسطہ بھی مولانا ہی تھے، ۱۹۱۳ء میں جب وہ الہلال کلکتہ سے قطع تعلق کرکے واپس آیا تو ایک ماہوار سالہ کا خیال دل میں تھا جو الندوہ کا جانشین ہو، مولانا نے اس خیال کو پسند فرمایا اور مجھے لکھنؤ بلالیا، ابھی اس اسکیم پر غور ہی ہورہا تھا کہ ایک نئی صورت پیش آگئی، جس نے زندگی کا رخ بدل دیا۔

اللہ تعالیٰ کا ایک عجیب معاملہ اس بندۂ بے استحقاق کے ساتھ پوری زندگی میں جاری رہا ہے، کوئی خدمت یا کوئی علمی وقومی منصب ہو، میری طلب اور سعی وکوشش کے بغیر مجھے عنایت ہوا، چنانچہ جہاں گیا، بحمداللہ مطلوب بن کر گیا، طالب بن کر نہیں، چنانچہ ایسا ہی اس وقت پیش آیا، انگریزی عہد میں کسی طلب و درخواست کے بغیر کسی سرکاری نوکری پانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا، مگر میرے ساتھ یہ بھی ہوا، میں انہی دنوں لکھنؤ میں مقیم تھا کہ مجھے بمبئی گورنمنٹ کے محکمۂ تعلیم کا سرکاری لفافہ موصول ہوا کہ تم کو دکن کالج پونہ میں السنۂ مشرقیہ کا اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کیا گیا میں سمجھا کہ میرے پتہ پر یہ غلط مراسلہ آگیا ہے، کیونکہ میں نے اس کی درخواست بھی نہیں دی تھی، میں اسی حیص بیص میں تھا کہ اس مراسلہ کو کیا کروں کہ شام کی حاضری میں مولانا سے اس واقعہ کو بیان کیا، فرمایا کہ مراسلہ آگیا اچھا ہوا، میں نے ہی تحریک کی تھی، پروفیسر عبدالقادر صاحب کو شکریہ کا خط لکھو اور پونہ روانہ ہوجاؤ، میں نے کچھ معذرت کرنی چاہی، مگر ان کی خوشی اسی میں پائی اور شیخ صاحب کے پاس پونہ روانہ ہوگیا اور ڈھائی تین سال کے قریب ان کے ساتھ رہا۔ انہوں نے اپنے بنگلہ کے پاس ہی ایک چھوٹی سی بنگلیا میں میرے قیام کا انتظام کیا اور اپنے ہی پاس مہمان رکھا اور اپنے ہی ساتھ مجھے کالج لانے اور لے جانے لگے، اس واقعہ کے ڈیڑھ سال کے بعد مولانا نے نومبر ۱۹۱۴ء میں انتقال فرمایا اور مجھے سب کام چھوڑ کر سیرت کی تکمیل کا اشارہ ہوا، چنانچہ دارالمصنفین کے قیام کے بعد ایک سال کے اندر مجھے پونہ چھوڑنا پڑا اور زندگی نے ایک نئے رخ پر پلٹا کھایا۔

شیخ صاحب کے ساتھ یہ چند سال اس طرح گزرے کہ روز وشب میں ضروری اوقات کے علاوہ ہمیشہ یکجائی رہتی اور تجربہ نے بتایا کہ شیخ صاحب جیسا شریف انسان دنیا نے کم پیدا کیا، وہ ایک مرنجان مرنج طبیعت رکھتے تھے، دوستوں کی ہر ضرورت میں کام آتے تھے، نہایت صاف دل اور بے تکلف تھے، پونہ سے چلے آنے کے بعد بانکی پور کی خدابخش خان لائبریری کے دیکھنے کے بہانہ وہ میرے پاس پٹنہ اور پھر اعظم گڑھ دارالمصنفین آئے اور چند روز یہاں بہت خوشی اور دلچسپی کے ساتھ رہے، وہ بمبئی کے اضلاع کے علاوہ ہندوستان کے کسی دوسرے شہر یا صوبہ میں شاید کبھی گئے ہوں، اس

لئے یوپی کے موسم اور آب وہوا اور اسلامی تمدن وغیرہ کو دیکھ کر انہیں بڑی دلچسپی ہوئی۔

میرے قیام پونہ کی بڑی یادگار ''ارض القرآن'' کی تصنیف ہے، اگرچہ اس کا آغاز کلکتہ میں ہی کیا جاچکا تھا، مگر اس کی تکمیل اسی زمانہ میں ہوئی اور یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اگر شیخ صاحب کی رفاقت نہ ہوتی تو اس کتاب کو کبھی اس طرح نہ لکھ سکتا، پونہ میں ہونے کی وجہ سے جہاں اسرائیلی یہودیوں کی سکونت ہے، مجھے عبرانی سے آشنا ہونے کی فرصت ہاتھ آئی اور شیخ صاحب کے ذریعہ سے بمبئی کے کتب خانوں سے کتابوں اور پرانے علمی رسالوں کے ملنے کے مواقع ہاتھ آئے اور عجب نہیں کہ اسی کام کے لئے مشیت الٰہی نے پونہ کا قیام میرے لئے مقدر کیا تھا۔

شیخ صاحب مرحوم کو زبانوں کے سیکھنے کا عجب ملکہ تھا، وہ مہاراشٹر میں رہنے کے باوجود اردو مادری زبان کی طرح جانتے تھے اور لکھتے اور بولتے تھے، جدید اور قدیم فارسی دونوں پر قدرت حاصل تھی، عربی زبان وہ اس وقت نہیں جانتے تھے اور میرے بلوانے سے ان کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ عربی زبان سیکھیں چنانچہ میرے پہنچنے پر وہ باقاعدہ طالب علموں کی طرح کچھ دنوں عربی صرف ونحو پڑھتے رہے، اس کے بعد بمبئی کے قیام میں عربوں سے عربی بولنے کی مشق کی اور خاصی عربی بولنے اور سمجھنے لگے، مرہٹی زبان مثل ایک برہمن مرہٹہ کے وہ جانتے تھے اور اس بارہ میں خود برہمن مرہٹے اور گورنمنٹ ان کی قابلیت کو تسلیم کرتی تھی اور مرہٹی زبانوں کی کمیٹیوں میں ان کو ممبر بناتی تھی، بمبئی یونیورسٹی میں مرہٹی ٹیکسٹ بک کمیٹی کے ممبر رہے، مہاراشٹر یونیورسٹی کی تحقیقاتی کمیٹی کا ممبر بھی حکومت نے ان کو بنایا، اس کمیٹی کا خیال تھا کہ مہاراشٹر کے مسلمانوں کی زبان مرہٹی ہے، مگر شیخ صاحب نے تاریخی دلائل اور شخصی شہادتوں سے ثابت کردیا کہ ان کی زبان دکھنی اردو ہے اور کمیٹی کی رپورٹ کے ساتھ ایک طویل اختلافی نوٹ لکھا، جس کو حکومت نے رپورٹ کے ساتھ شائع کیا۔

پوری یونیورسٹی میں السنۂ مشرقیہ کے دائرہ میں شیخ صاحب کی حیثیت ممتاز تھی، وہ اس کے نصاب، امتحان اور کمیٹیوں میں ہمیشہ ممبر ہوتے رہے، ۱۹۱۹ء میں وہ بمبئی یونیورسٹی کے فیلو اور ۱۹۲۰ء میں انڈین ایجوکیشنل سروس میں داخل ہوئے، ۱۹۲۴ء میں وہ بمبئی برٹش رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے فیلو اور ۱۹۲۶ء میں بمبئی جی پی یعنی جسٹس آف پیس مقرر ہوئے، اس کے علاوہ تقریباً چودہ مختلف تعلیمی انجمنوں کے صدر یا ممبر تھے، ۱۹۳۱ء میں گورنمنٹ کی ناقدرشناسی سے شمس العلماء کے بجائے خان بہادر بنائے گئے، جس کو انہوں نے اپنے نام کے ساتھ بہت کم استعمال کیا۔

شیخ صاحب مرحوم کا تحقیقاتی مطالعہ بہت وسیع تھا، کتابوں کے شائق تھے۔ اور اچھا خاصہ مختصر سا کتب خانہ ان کے پاس جمع تھا، دن رات مطالعہ اور تحقیقات کے سوا ان کا کوئی دوسرا کام نہ تھا، ان کو شکایت تھی کہ کام کرنے میں نیند آنے لگتی ہے اس کے لئے یہ تدبیر کی کہ میز اونچی کر کے کھڑے ہوکر کام کرنا شروع کیا، گو انہیں لکھنے کی فرصت کم ملتی تھی، بااین ہمہ انہوں نے اپنی کچھ تحریری یادگاریں بھی چھوڑیں، جو زیادہ تر انگریزی اور کچھ اردو میں ہیں، پروفیسر مرزا حیرت کے سوانح، قصائد، قاآنی اور انگریزی میں تاریخ طبری کے کچھ حصے کتابی شکل میں شائع کئے، مطبوعہ کتابوں کی تصحیح اور تحشیہ جیسے غیر دلچسپ کام سے بھی انہیں دلچسپی تھی، چنانچہ اپنے مطالعہ اور کورس کی کتابوں کی یہ خدمت اکثر انجام دیا کرتے تھے، اسی سلسلہ میں فارسی شعراء میں سے انوریؔ، ظہیر فاریابیؔ، قاآنیؔ اور خاقانیؔ کے دواوین اور سبحۃ الابرار جامی کی پوری تصحیح کی اور حاشیے لکھے، وقائع نعمتؔ خان عالی کی نہایت دقت نظر سے تصحیح کی، متن درست کیا، تاریخی واقعات اور ادبی نکات پر نوٹ لکھے، جہاں کشائے نادری اور مثنوی معنوی پر حواشی چڑھائے، پروفیسر براؤن کی مشہور تصنیف تاریخ ادبیات ایران پر ناقدانہ انداز سے حاشیے لکھے، لیکن افسوس ہے کہ ان میں سے کوئی چیز شائع نہیں ہوئی اور یہ سب مسودے ان کے کتب خانہ میں سربستہ راز کی طرح امانت ہیں، شاید ان کے بڑے صاحبزادہ ڈاکٹر عبدالحق ادھر توجہ کریں۔ ان کی جو کتاب شائع ہوئی ہے وہ بمبئی یونیورسٹی کے فارسی، اردو اور عربی مخطوطات کی توضیحی فہرست ہے جو کئی سو صفحوں میں ہے اور جس کو یونیورسٹی نے شائع کیا ہے، یہ فہرست مشرق ومغرب کے اصول تنقید اور طرز تحقیق کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے اور مستشرقین کی تحقیقات پر جابجا تنقیدیں کی گئی ہیں، ایک بسیط مقالہ انگریزی میں فارسی یائے معروف ویائے مجہول پر لکھا، جو بمبئی رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں چھپا اور اس کا خلاصہ ترجمہ معارف میں طبع ہوا۔

شیخ صاحب کو مولانا شبلی مرحوم سے عقیدتمندانہ شیفتگی اور ہم خواجہ تاشوں سے مخلصانہ محبت تھی، جس کو زمانہ کی قدامت اور مکانوں کی مسافت بھی کم نہ کرسکی، جب میرا کراچی آنا ہوا تو ایک خط میں حسب ذیل شعر لکھ کر بھیجا۔

وفا آموختی از مابکار دیگراں کردی
ربودی گوہرے از ما نثارِ دیگراں کردی

افسوس کہ علم وفضیلت اور اخلاق واخلاص کا یہ مجسمہ ہماری نگاہوں سے ہمیشہ کے لئے پوشیدہ ہوگیا، وہ پونہ کے ہندو اور مسلمانوں میں یکساں ہر دلعزیز تھے، اس لئے ان کی وفات پر سب نے سوگ کیا اور ان کے جنازہ کی مشایعت میں سب نے شرکت کی اور لیٹین قبرستان میں اپنی اہلیہ مرحومہ کی قبر کے پہلو میں دفن ہوئے، مگر مرحوم کا اصلی مزار ان کے احباب کے دل ہیں، جس میں ان کی یاد ہمیشہ بسی رہے گی۔

بعد از وفاتِ تربت زمیں مجو
درسینہ ہائے مردمِ عارف مزارِ ما

(''س''، مارچ ۱۹۵۳ء)

کفایت اللہ، مولانا مفتی

مولانا مفتی کفایت اللہ

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ ہماری دینی و ملی عمارت کا ایک بڑا ستون گر گیا، اور ۳۱/دسمبر کی شب کو حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم نے انتقال فرمایا، مفتی صاحب مرحوم اپنے فضل و کمال، دین و تقویٰ اور فہم و فراست کے لحاظ سے طبقۂ علماء میں نہایت ممتاز اور منفرد شخصیت رکھتے تھے، دینی علوم خصوصاً فقہ و فتاویٰ میں ان کا پایہ بہت بلند تھا ان کی پوری زندگی علمِ دین کی خدمت میں گزری اور وہ نصف صدی سے زیادہ درس و افتا کی مسند پر فائز رہے، دہلی کی مشہور دینی درس گاہ مدرسۂ امینیہ کے صدر مدرس بلکہ اس کے جز و کل تھے، اور یہ مدرسہ انہی سے عبارت تھا، اس علم و تقویٰ کے ساتھ وہ ایک مجاہد کا دل اور مدبر کا دماغ رکھتے تھے، خلافت اور ترکِ موالات کی تحریک کے زمانہ سے لے کر ہندوستان کی آزادی تک تمام مذہبی و ملّی اور قومی و سیاسی تحریکوں میں ان کا نمایاں حصہ رہا، ایک زمانہ تک جمعیۃ العلماء کے صدر اور کانگریس کے رکن رکین رہے، اوران دونوں کو ان کی بصیرت اور رہنمائی سے بڑا فائدہ پہنچا۔

مرحوم کا دماغ بڑا نکتہ رس اور سلجھا ہوا تھا، اور ان کی رائے نہایت متین اور صائب ہوتی تھی، پیچیدہ سے پیچیدہ گتھیوں کو اپنی فراست سے سلجھا دیتے تھے، اس لیے مذہبی اور ملکی و سیاسی دونوں جماعتوں میں ان کا بڑا وزن تھا، ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں ان کا خاص حصہ ہے، ملکی سیاست میں وہ اخیر تک کانگریس کے ہم خیال رہے، لیکن جب سے اس پر فرقہ پرستوں کا غلبہ ہوگیا تھا، اوراس میں مسلمانوں کی کوئی حیثیت اور ان کی قربانیوں کی کوئی قدر باقی نہ رہ گئی تھی، عملاً اس سے کنارہ کش ہوگئے تھے، طبعاً نہایت سنجیدہ و متین تھے، اگرچہ مرحوم طبعی عمر کو پہنچ چکے تھے، انتقال کے وقت ۷۹ سال کی عمر تھی، مگر اب طبقۂ علماء میں ایسی جامع الحیثیات شخصیت کا پیدا ہونا مشکل ہے، اس لیے ان کی وفات ہندوستان کے مسلمانوں کا بہت بڑا قومی حادثہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پیکرِ علم و عمل کو اپنی رحمتوں سے نوازے۔ (''م''، فروری ۱۹۵۳ء)

فقیہ الامۃ مولانا کفایت اللہ رحمہ اللہ

ولادت ۱۲۹۲ھ / وفات ۱۳۷۲ھ

عیسوی سال ۱۹۵۲ء کے ختم کو ایک گھنٹہ ۳۵ منٹ باقی تھے، کہ ۳۱/دسمبر ۱۹۵۲ء کو دس بجکر ۲۵ منٹ پر حضرت مفتی مولانا کفایت اللہ صاحب دہلوی نے اپنے گھر واقع کوچہ چیلاں دہلی میں وفات پائی، یہ خبر یکم ۱۹۵۳ء کی صبح کو کراچی پہنچی اور لوگوں کو اس حادثۂ فاجعہ کے علم سے بڑا صدمہ ہوا، مختلف علماء نے اپنے تاثرات اخباروں میں چھپوائے اور جمعیۃ علمائے اسلام کی مجلس عاملہ اور ۳۲ علماء کی دستوری مجلس نے جس میں سارے پاکستان کے منتخب علماء موجود تھے، اس حادثہ پر غم کا اظہار کیا اور دعائے خیر کی۔

مرحوم کے نام سے واقفیت مجھے ۱۹۱۴ء میں ہوئی، جب ندوۃ العلماء کا اصلاحی اجلاس حکیم اجمل خاں صاحبؒ کی طلب پر دہلی میں منعقد ہوا تھا اور ارکان کی باہمی مخالفت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ مولانا شبلی کی تکفیر کا فتویٰ دہلی میں مرتب ہوا، جس پر مفتی صاحب مرحوم کے دستخط تھے، اس کے بعد یہ نام ذہن سے اتر گیا اور یکا یک ۱۹۱۹ء میں جب مسلم لیگ کا استقبالیہ خطبہ ڈاکٹر انصاری نے پڑھا اور اس میں خلافت اور جزیرۃ العرب سے متعلق فقہی اور لغوی بحث پیش کی تو خیال ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کو یہ مواد کس نے پیش کیا، اس سلسلہ میں مفتی صاحب کا نام پھر سنا اور اتفاقِ وقت دیکھئے کہ ایک ہی سال کے بعد ۱۹۲۰ء میں مجلس خلافت کی تحریک کے سلسلہ میں حکیم صاحب مرحوم کے دولت کدہ پر ایک جلسہ تھا، جس میں مفتی صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی، سب سے اول ان کی ظاہری صورت اور متواضع لباس کی بنا پر قیافہ نے ان کے فضل و کمال سے حسن ظن پیدا ہونے نہ دیا، مگر تھوڑی بات چیت سے پتہ چل گیا کہ اس غلاف کے اندر تلوار کیسی ہے، اس کے بعد خلافت اور جمعیۃ العلماء کے اجلاسوں میں بار بار ملاقات اور خلط ملط ان کے علمی، ذہنی اور اخلاقی علوئے شان کی نشاندہی کرتا چلا گیا، پھر تو یہ حال ہوا۔

یزیدک وجھہ حسنا اذا ما زدتہ نظراً

ممدوح کا چہرہ حسن میں اتنا ہی ترقی کرتا چلا جاتا ہے جتنا تم اس کو دیکھتے جاؤ۔

کئی دفعہ مرحوم کے ساتھ یکجائی سفر کا اتفاق ہوا، جس میں سب سے طویل سفر ۱۹۲۶ء میں حجاز کی موتمر اسلامی میں شرکت اور حج کی غرض سے کیا گیا تھا، ایک جہاز سے ہم سب کا جانا اور آنا مکۂ معظّمہ میں قریب قریب قیام اور مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ تک اونٹوں پر ایک ہی قافلہ میں روانگی اور عرفات میں ایک ہی اونٹ پر مسجد نمرہ تک سواری نصیب ہوئی۔

دوسرا موقع یہ آیا کہ مفتی صاحب کے صاحبزادوں کی بات میں نے اعظم گڑھ میں ایک خاندان میں چھیڑی اور مفتی صاحب مع حافظ احمد سعید صاحب اعظم گڑھ میں دارالمصنفین آکر میرے مہمان ہوئے اور چند روز قیام فرمایا، وہ بات پکی نہیں ہوئی، لیکن اس اثناء میں ہماری دوستی پکی ہوگئی، آخری ہمرہی و ہمسفری ۱۹۴۱ء میں دہلی سے بھوپال تک ہوئی، جہاں ہم دونوں ریاست کی دعوت پر اس کے نکاح و طلاق کے ضابطوں پر نظرثانی کرنے کو بلائے گئے تھے اور ساتھ ہی سرکاری مہمان خانہ کے ایک ہی کمرہ میں ٹھہرے تھے۔

وطن اور خاندان: مرحوم کا وطن شاہجہاں پور تھا، مرحوم کا وجود اسلام کے عظیم الشان معاشرتی مساوات کا عملی ثبوت تھا، مولوی حافظ احمد سعید صاحب نے جو ان کے سب سے زیادہ قریب رہنے والے اور ان کے دست راست تھے مجھے بتایا کہ مرحوم کے مورثِ اعلیٰ یمن سے آئے تھے، روایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ یمن سے سوداگروں کا ایک قافلہ بادبانی کشتی میں بیٹھ کر ہندوستان کی جانب روانہ ہوا، لیکن ہندوستان کے ساحل پر پہنچنے سے پہلے وہ ایک طوفان میں پھنس کر تباہ ہوگیا، اس قافلہ میں شیخ جمال نام ایک کم سن لڑکا بھی سوار تھا، وہ کشتی کے ایک تختہ پر بیٹھ کر کنارہ لگ گیا، وہاں بھوپال کا ایک شخص اس کو اپنے ساتھ بھوپال لے آیا اور اس کو اپنی تربیت میں رکھ کر اپنے ہی خاندان کی ایک لڑکی سے اس کی شادی کردی، یہی شیخ جمال مفتی صاحب مرحوم کے مورثِ اعلیٰ تھے، بھوپال سے یہ خاندان شاہجہان پور کو منتقل ہوا، اور محلّہ سن زئی میں سکونت اختیار کی اور گزر بسر کے لئے نائی کا پیشہ اختیار کیا، اور یہ اسلام کی علمی تاریخ کے لئے کوئی نیا واقعہ نہیں، اسلام کی تاریخ میں کتنے علمائے حدیث وفقہ اور مسند نشینانِ فضل وکمال جوتا بنانے والے، کپڑے بننے والے، تیل بیچنے والے، جوتا گانٹھنے والے اور دوسرے معمولی پیشہ کرنے والے بزرگ تھے اور آج تک وہ خصّاف، نساج، حلّاج، دبّاغ، حلوائی، حصیری، حریری کے نام سے پکارے جاتے ہیں اور درس وارشاد کی مسند پر قریش وسادات کے پہلو بہ پہلو بٹھائے جاتے ہیں اور ساری دنیائے اسلام ان کے آگے اپنے احترام کا سر جھکاتی ہے، یہ کوئی نہ کہے کہ یہ اسلام کی گزشتہ روایات کا سماعی واقعہ ہے، مرحوم مفتی صاحب کا وجود اسلام کی معاشرتی مساوات کا آج بھی ناقابل تردید واقعہ ہے، انہوں نے مسلسل بیس برس تک سارے علمائے ہند کے رئیس کی حیثیت سے جمعیۃ العلماء کی صدارت کی اور کسی نے ان کے اس استحقاق سے سرتابی نہیں کی اور وہ بڑے سے بڑا احترام جو ایک انسان دوسرے انسان کو دے سکتا ہے وہ تمام عمر مسلمانوں میں ان کو حاصل رہا اور دنیا نے ان کو مفتی اعظم ہند کہہ کر پکارا۔

مرحوم کے والد ماجد کا نام شیخ عنایت اللہ تھا اور شیخ جمال یمنی تک ان کا سلسلۂ نسب یہ ہے۔

شیخ عنایت اللہ بن فضل اللہ بن خیر اللہ بن عباد اللہ۔

بھوپال کا شہر امیر دوست محمد کی حکومت میں ۱۲۰۰ھ میں آباد ہوا اس سے ظاہر ہوا کہ شیخ جمال یمنی کی بھوپال میں آمد زیادہ سے زیادہ تیرھویں صدی ہجری کے آغاز کا ہوسکتا ہے، جو انیسویں صدی عیسوی کے مطابق ہے۔

تعلیم وتربیت: مرحوم کے والد گو غریب تھے، مگر ہمتِ عالی رکھتے تھے اور بچے کو عالم دین بنانے کی تمنا دل میں رکھتے تھے، پانچ سال کی عمر میں شہر کے محلّہ میں حافظ برکت اللہ صاحب کے مکتب میں داخل ہوئے اور یہیں قرآن مجید ختم کیا، اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم محلّہ درک زئی میں حافظ نسیم اللہ کے مکتب میں ہوئی، اسی زمانہ میں محلّہ خلیل شرقی میں مولوی اعزاز حسن صاحب کا مدرسہ اعزازیہ قائم ہوا تھا، مکتبی تعلیم سے فارغ ہوکر اسی مدرسہ میں داخل کئے گئے، یہاں انہوں نے فارسی کی اعلیٰ اور عربی کی ابتدائی کتابیں، حافظ بدھن خان صاحب سے پڑھیں، یہاں کے اساتذہ میں ایک ولایتی افغان عالم مولانا عبیدالحق خاں صاحب ہے تھے (جو مولانا فضل اللہ خان صاحب شاہجہانپوری کے جن کو بمبئی اور کراچی کے لوگ اچھی طرح جانتے ہیں اور جو بالفعل جمعیۃ الفلاح کراچی کے ناظم ہیں، والد بزرگوار تھے) بچپن ہی سے مفتی صاحب مرحوم کی ذہانت وطباعی آشکار تھی، ان کے استاد ان سے محبت کرتے تھے، مولانا عبیدالحق صاحب نے اپنے ہونہار شاگرد کی طرف بیش از بیش توجہ کی اور شیخ عنایت اللہ صاحب کو مجبور کرکے ۱۳۱۰ھ میں ان کو مرادآباد کی شاہی مسجد کے مدرسہ میں بھجوایا، جہاں انہوں نے وہاں کے مدرسین مولانا عبدالعلی صاحب میرٹھی، مدرس اول سے جو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے شاگرد تھے اور بعد کو مدرسۂ عبدالرب دہلی میں صدر مدرس ہوئے اور مولوی محمد حسن صاحب اور مولوی محمود حسن سہوانی سے کتابیں پڑھیں۔

مفتی صاحب دو سال کے بعد یہاں سے ۱۳۱۲ھ میں مدرسۂ دیوبند چلے گئے اور وہاں کے مدرسین میں مولانا منفعت علی صاحب دیوبندی، مولانا حکیم محمد حسن صاحب و حضرت شیخ الہند کے چھوٹے بھائی مولانا غلام رسول صاحب اور مولانا خلیل احمد صاحب انبیٹھوی سہارنپوری سے اسباق پڑھے اور کتب حدیث کا درس مولانا عبدالعلی صاحب میرٹھی اور حضرت مولانا محمود حسن صاحب سے حاصل کیا۔

صحاح ستہ کے دورہ میں اٹھارہ حضرات شریک تھے، جن میں سے چند کے نام یہ ہیں، مولانا انورشاہ صاحب کشمیریؒ، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی، مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی (حال شیخ الحدیث مدرسۂ عبدالرب دہلی) مولوی محمد امین صاحب ایلولوی بانی مدرسہ امینیہ دہلی، ۱۳۱۵ھ میں ۲۲ برس کی عمر میں دیوبند سے فراغت ہوئی۔

مولانا عبیدالحق صاحب نے شاہجہانپور میں ۱۳۱۴ھ میں ایک مدرسہ عین العلم قائم کیا تھا، مولانا کفایت اللہ صاحب جب فراغت کے بعد وطن واپس آئے، شفیق استاد نے ان کو اسی مدرسہ میں جگہ دی اور تقریباً ۵ سال اس میں کام کرتے رہے، اسی زمانہ میں شاہجہاں پور میں قادیانیت کی تحریک پہنچی، تو اس کے رد میں ۱۳۲۱ھ میں البرہان نام کا ماہانہ رسالہ جاری کیا، مدرسۂ عین العلم میں جن اصحاب نے آپ سے پڑھا ان میں سے حسب ذیل اصحاب کے نام قابل ذکر ہیں: حضرت مولانا اعزاز علی صاحب استاذ الادب والفقہ دیوبند، مولانا مفتی سید مہدی حسن صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند، مولوی اکرام اللہ خانصاحب ندوی ایڈیٹر کانفرنس گزٹ علی گڑھ۔

مدرسۂ امینیہ دہلی کو جس سے مفتی صاحب کو پچاس برس تعلق رہا، ان کے رفیق درس مولوی امین الدین صاحب ایلولوی نے ۱۳۱۵ھ میں قائم کیا تھا، موصوف ایلولہ احاطہ بمبئی کے باشندہ تھے، مگر اپنی علمی و عملی کوششیں دہلی میں خرچ کیں، اس مدرسہ کے سب سے پہلے مدرس حضرت مولانا انور شاہ صاحبؒ کشمیری مقرر ہوئے تھے حضرت شوق نیموی عظیم آبادی کی کتاب آثار السنن جب شائع ہوئی تو مولانا کاشمیری یہیں مدرس تھے، چنانچہ ان کی منظوم تقریظ اس کتاب کے آخر میں شامل ہے، مولانا انور شاہ صاحب کی تشریف بری کے بعد مولوی امین الدین صاحب شاہجہان پور جا کر مفتی کفایت اللہ صاحب کو ۱۳۲۱ھ میں یہاں لے آئے اور مولوی صاحب کی زندگی تک وہ صرف مدرس رہے ۱۳۴۰ھ مطابق ۶ / جون ۱۹۲۰ء میں مولوی صاحب کا انتقال ہوا، تو اہل شوریٰ نے مفتی صاحب کو مہتمم بھی بنادیا، جس کے کام کو وہ آخر تک نباہتے رہے۔

یہ مدرسہ امینیہ پہلے سنہری مسجد میں تھا، یہاں جانے کا مجھے صرف ایک دو دفعہ اتفاق ہوا، آخر میں مفتی صاحب کے اہتمام میں ایک اور مسجد کے پاس مدرسہ کی موجودہ عمارت بنی، اس میں بھی مفتی صاحب کی ملاقات کا جذبہ کئی دفعہ مجھے کھینچ کرلے گیا۔[۲]

(''س''، یادرفتگاں، ص ۴۴۷۔۴۵۲)

---

[۱] افغانستان وطن تھا، حصول تعلیم کے لئے ہندوستان آئے، مولانا مفتی لطف اللہ صاحب علی گڑھی سے تلمذ تھا اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے بیعت کی، ۳۲ برس کی عمر میں ۱۳۲۱ء میں شاہجہاں پور میں وفات پائی، ان کے معاصرین اور رفقاء میں مجاہد شہیر مولانا سیف الرحمان صاحب اور مدرس شہیر مولانا محمد سہول صاحب بھاگلپوری تھی۔ ''س''

[۲] علم و فضل کا ماتم گسار یہیں تک پہنچ پایا تھا کہ خود ان کے رخصت ہونے کا وقت آگیا، علالت شروع ہوگئی، قلم رک گیا، پھر روح نے بھی جسم کا ساتھ چھوڑ دیا، یہ نوحۂ غم ان کی زندگی کا آخری ماتم ثابت ہوئی اس کے بعد تو آہ خود بھی انہی کا ماتم بپا ہوگیا۔ ''عاصم''

(یادِ رفتگان از سید سلیمان ندوی، کراچی: مجلس نشریات اسلام، ۱۹۳۸ء، ص ۴۵۲)

علی، آصف

آصف علی

افسوس ہے کہ اس مہینہ کے شروع میں ہماری قومی و ملی جماعت کی دو ممتاز شخصیتیں ہم سے جدا ہوگئیں یعنی آصف علی مرحوم اور شفیق الرحمٰن مرحوم قدوائی نے انتقال کیا، یہ دونوں پرانے قومی کارکن تھے، ملک و وطن کی انھوں نے بڑی خدمات انجام دیں اور اس کے لئے قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں، ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں ان کا نمایاں حصہ تھا، آصف علی صاحب مرحوم تو پرانے آدمی اور مشہور و ممتاز شخصیت رکھتے تھے، سیاسی زندگی سے پہلے بھی وہ ایک اچھے بیرسٹر تھے، اور سیاست کے میدان میں بھی ان کو نمایاں مقام حاصل تھا، اور ہندوستان کے بڑے لیڈروں میں ان کا شمار تھا، ہندوستان کی آزادی کے بعد وہ مرکزی حکومت کی وزارت، اڑیسہ کی گورنری، امریکہ اور سوئیزرلینڈ کی سفارت جیسے بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز رہے، اور سوئیزرلینڈ میں ہی ان کا انتقال ہوا، علمی حیثیت سے بھی وہ بڑے لائق اور ذہین و ذکی تھے، اردو کے بھی ادیب تھے اور انگریزی و اردو دونوں میں ان کی تصانیف ہیں، انتقال کے وقت ۶۴، ۶۵ سال کی عمر تھی، ان کی موت سے ایک ایسی جگہ خالی ہوگئی جس کا موجودہ حالات میں پر ہونا مشکل ہے۔ (''م''، اپریل ۱۹۵۳ء)

قدوائی، شفیق الرحمٰن

شفیق الرحمٰن قدوائی

شفیق الرحمٰن مرحوم اگر چہ شہرت و ناموری کے عام معیار سے کوئی بڑے آدمی نہ تھے مگر اپنے ایثار و قربانی، اخلاق و کردار، اخلاص و عمل اور خاموش اور بے لوث خدمات کے لحاظ سے بہت سے بڑے بڑے لیڈروں پر فائق تھے، جامعہ ملیہ کے لئے تو انھوں نے اپنی زندگی وقف کردی تھی اور سرد و گرم دور میں بھی اس سے جدا نہ ہوئے، اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جامعہ انہی کی محنت و جانفشانی کی بدولت زندہ رہ گیا، ظاہر و باطن دونوں میں مسلمان اور اپنے اوصاف کی بنا پر ہر جماعت میں مقبول تھے، کانگریس اور حکومت دونوں کے سنجیدہ طبقہ میں ان کا بڑا وقار و وزن اور اخلاقی اثر تھا، مگر وہ اتنے بے لوث تھے کہ کبھی اس اثر سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی، ان کو بنیادی تعلیم کا عملی تجربہ تھا، اس کے وہ ماہر تھے، اس لئے یو این او کی جانب سے اس کام کے لئے انڈونیشیا بھیجے گئے تھے، ابھی وہ وہیں تھے کہ گذشتہ الیکشن میں کانگریس نے ان کو دہلی اسمبلی کے لئے مقرر ہوئے، مگر اس سے بھی ان کا فائدہ اٹھانے کا موقع نہ مل سکا، تھوڑے ہی دنوں کے بعد بیمار پڑگئے، اور چند مہینے بیمار رہ کر ۳ / اپریل کو انتقال کیا، انتقال کے وقت کل ۵۳ سال کی عمر تھی جو سیاست کی دنیا میں عین شباب کی عمر ہے، مسلمانوں میں اب ایسے مخلص اور باعمل آدمی مشکل سے پیدا ہوں گے، اللہ تعالیٰ اس پیکر اخلاص کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے۔ (''م''، اپریل ۱۹۵۳ء)

خیالؔ، ریاض حسن خان، مولوی

مولوی ریاض حسن خان خیالؔ

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ مظفر پور بہار کے مشہور صاحب علم اور علم دوست رئیس مولوی ریاض حسن خان خیال نے اُناسی (۷۹) سال کی عمر میں انتقال کیا، وہ اور اُن کے بڑے بھائی مولوی اعجاز حسن خان مرحوم قدیم مشرقی تہذیب و شرافت اور قدامت و وضعداری کا نمونہ تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو دولت دنیا کے ساتھ علم کی دولت سے بھی

نوازا تھا اُن کا خاندان صوبہ بہار کے تاریخی اور صاحب وجاہت خاندان میں تھا، دونوں بھائی صاحب علم ونظر اور وسعتِ معلومات کے لحاظ سے زندہ کتب خانہ تھے، اعجازحسن خان مرحوم کے مضامین الندوہ اور معارف وغیرہ میں نکلتے رہتے تھے، اس علمی ذوق کی بنا پر اُن کے بہت سے ہم عصر اصحاب علم وکمال سے اُن کے تعلقات تھے، مولانا شبلی مرحوم کے خاص دوستوں میں تھے، مکاتیب شبلی میں ریاض حسن خان کے نام کے بہت سے خطوط ہیں، مولانا مرحوم جب پٹنہ جاتے تو انہی کے مہمان ہوتے تھے، اس سلسلہ میں ایک ادبی لطیفہ قابل ذکر ہے۔

ایک مرتبہ مولانا ان کے مہمان تھے، ریاض حسن خان کی طبیعت کچھ ناساز تھی، وہ دوسرے کمرے میں تھے، مولانا جب اُن کی مزاج پرسی کے لیے پردہ اُٹھا کر کمرہ میں داخل ہوئے تو ریاض حسن خان احتراماً اٹھ کر بیٹھ گئے، مولانا نے فرمایا آپ بیمار ہیں تکلف نہ کیجئے لیٹے رہئے، ریاض حسن خان نے اس کے جواب میں مولانا کا یہ شعر پڑھ دیا۔

باہمہ دعویٰ تمکین نتوان خواست زمن
کہ تو از پردہ بدر آئی و بر جا باشم

یہ برجستہ جواب سُن کر مولانا بہت محظوظ ہوئے اعجازحسن خان مرحوم کا انتقال فروری ۱۹۳۹ء میں ہوا تھا، ۱۴ سال کے بعد چھوٹے بھائی بھی بڑے بھائی سے جا ملے، وہ قدیم تہذیب و شائستگی کا نمونہ اور اس کی یادگار تھے، اس لیے ان کی موت سے اس دور کی پوری تاریخ اور تہذیب دفن ہوگئی، اللہ تعالیٰ اس ریاض علم کو ریاض رضوان سے سرفراز فرمائے۔ (''م''، اگست ۱۹۵۳ء)

ندوی، سید سلیمان، مولانا

آہ سید صاحب!
علم واخلاق کی دنیا اجڑ گئی

رفتی واز رفتنِ تو عالمے تاریک شد
تو مگر شمعی چو رفتی بزم برہم ساختی

آہ گذشتہ مہینہ ۲۲ نومبر کی رات کو کراچی ریڈیو اسٹیشن سے یہ جانکاہ خبر بجلی بن کر گری کہ حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی رحمتہ اللہ علیہ نے ۲۲ اور ۲۳ کی درمیانی شب کو ساڑھے سات بجے اس جہاں فانی کو الوداع کہا، یہ خبر وابستگانِ دامنِ سلیمانی کے لیے ایسی ناگہانی اور ہوش ربا تھی کہ کچھ دیر تک سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ہوگیا، مگر مشیت الٰہی پوری ہوکر رہی اور بالآخر یقین کرنا پڑا کہ اس مسیحا نفس نے بھی جان جان آفرین کے سپرد کردی، جو عمر بھر اپنی زبان وقلم سے مردہ دلوں میں روح حیات پھونکتا رہا، اور امراضِ ملت کا وہ ماہر طبیب اٹھ گیا، جس نے اس کے ناتواں جسم میں نئی طاقت وتوانائی پیدا کی، وہ چشمۂ فیض خشک ہوگیا جس کی آبیاری سے دین وملت کا چمن سیراب تھا وہ شیخ کامل اُٹھ گیا، جس نے دلوں کی دنیا منور کی، وہ شمع خاموش ہوگئی، جو نصف صدی تک علم وفن کی ہر مجلس میں ضیا بار رہی، وہ تاجدار رخصت ہوگیا، جس کا سکہ علم وفن کی پوری اقلیم میں رواں تھا، اسلامی علوم کا وہ امام ومجدد اٹھ گیا، جس نے اُن کو نئی زندگی بخشی، مذہب اسلام کا وہ متکلم اور اسلامی تاریخ وتمدن کا وہ محقق اٹھ گیا، جس نے ان کو اُن کی اصل شکل اور نئے لباس میں جلوہ گر کیا، پیغام محمدی کا وہ شارح وترجمان خاموش ہوگیا، جس نے اپنی بصیرت سے اُس کے اسرار وحکم بے نقاب کئے، اور اس کی ذات جامع الصفات پر علوم کی جامعیت کا خاتمہ ہوگیا۔

لیس من اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

وہ مذہب وسیاست علم وفن، تالیف وتصنیف تعلیم وتدریس تقریر وتحریر انشاء و خطابت وعظ وپندار، شاد وہدایت، ہر مجلس کا صدر نشیں اور اپنے علمی کمالات میں ائمہ سلف کی یادگار تھا، تفسیر وحدیث، فقہ وکلام، مغازی وسیرت، طبقات وتراجم، تاریخ و جغرافیہ، شعر وادب جملہ فنون پر اس کی نظر مجتہدانہ، اور اس کے زبان وقلم کی روانی و حکمرانی یکساں تھی، اور ان میں وسعت ودقت نظر فہم وبصیرت تلاش وتحقیق، اور مہارت فن کی ایسی یادگاریں چھوڑیں جو مدتوں علمی دنیا کی رہنمائی کرتی رہیں گی، اس کے علمی کمالات کا لوہا دنیا سے اسلام کے نامور علماء اور یورپ کے مستشرقین تک مانتے تھے۔

وہ جدت وقدامت کا سنگم، اسلامی علوم کے ساتھ جدید افکار وتصورات نئے رجحانات اور عہد حاضر کی تحریکات سے پوری طرح واقف اور تلاش وتحقیق اور نقد ونظر کے جدید طریقوں کا بھی ماہر تھا، اس دور کا وہ پہلا متکلم ہے، جس نے اسلامی علوم اور مذہبی عقائد وخیالات پر فکر وتدبر، اور ان کی تعبیر وترجمانی کا ایسا حکیمانہ طریقہ اختیار کیا کہ دین و مذہب، نقل و روایت اور سلفیت وقدامت کی روح کو پوری طرح برقرار رکھتے ہوئے ان سے عقل ودرایت اور جدت وروشن خیالی کی نقیض مٹادی، ان کو ان کا معاون ومددگار بنا دیا، اور مذہب اسلام، اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب وثقافت کے معترضین اور نکتہ چینوں کی جہالت کا پردہ چاک کرکے ان کو ایسے حکیمانہ اور دلنشین انداز میں پیش کیا کہ مخالفین ومنکرین بھی ان کی عظمت ماننے پر مجبور ہوگئے، اور علمائے امت نے بھی اس کو تحسین کی نظر سے دیکھا، اور اس طرز فکر اور طریقہ تعبیر کی ایسی شاہراہ قائم کردی کہ آج اس راہ کے سارے راہ رواسی راستہ پر گامزن ہیں۔

اس کی ذات میں روشن ضمیری و روشن دماغی ذوق کے تنوع علوم کی جامعیت عقائد میں رسوخ وپختگی، اعمال میں استقامت، ثقاہت ومتانت، قلب ونظر کی وسعت، مسلک میں اعتدال وتوازن، لوچ اور نرمی، احسن مذاق، اور لطافت مزاج کا ایسا عجیب و غریب واجتماع تھا کہ طبقہ، علماء میں اس کی نظیر مشکل سے ملے گی، اور اس مسلک اعتدال

کا وہ مبلغ بھی تھا، اس لیے مختلف مشرب و مسلک کے مسلمانوں میں وہ مقبول رہا۔

اس کا مزاج و مذاق ابتدا سے دینی تھا، کسی دور میں بھی اس کا قدم جادہ مستقیم سے نہ ہٹا، اور عمر کے ساتھ ساتھ یہ رنگ برابر گہرا ہوتا گیا، اور آخر میں تو سیرۃ النبی کی برکت اور سلوک و تصوف کے فیض سے ہو بہو سلف صالحین کی تصویر، اور سراپا کیف و اثر بن گیا تھا، اس کی صحبت میں بیٹھ کر، اس کی باتیں سن کر اس کی صورت دیکھ کر ایمان میں تازگی پیدا ہوتی تھی، اس کے اعمال و اخلاق خلق عظیم کی عملی تفسیر تھے، وہ فطرۃً پاک دل، پاک طینت، سراپا شرافت و انسانیت، سراپا خلق و مروت، سراپا مہر و محبت اور سراپا جمال تھا، عزیزوں کا معاون و مددگار دوستوں کا ہمدرد و غمگسار اور غریبوں اور بے کسوں کا ہمدم و غمخوار تھا، ضبط و تحمل کا پہاڑ، ایثار و قربانی کا پیکر اور عفو و درگذر کی تصویر تھا، اس کو خدا نے حقیقی بڑائی بخشی تھی، اس لیے مصنوعی اور خود ساختہ بڑائی کے پیچھے کبھی نہیں پڑا، اور دنیاوی جاہ و اقتدار کی ہوس سے ہمیشہ دور اور کبر و نخوت سے نفور رہا۔

اس کی پوری زندگی ایثار و قربانی اور حلم و عفو کا نمونہ تھی، اور یہ وصف حد اعتدال سے بڑھ گیا تھا، اس کا سینہ بے کینہ، اور اس کا دل ایسا شفاف و مجلی آئینہ تھا، جس میں دشمن کے لیے بھی گرد کدورت کی گنجائش نہ تھا، اس نے قدرت و اختیار کے باوجود کبھی دشمنوں سے بھی انتقام نہیں لیا اور بداندیشوں کے ساتھ ہمیشہ بھلائی کی، اور اس کے لیے ہر نقصان گوارا کیا، اور بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہ کیا، اس لیے وہ محبوب القلوب تھا، اور اس کی عزت و محبت دلوں میں جاگزیں تھی، جو عنداللہ اس کے مقبول ہونے کی سب سے بڑی سند ہے، قلم اس کے کمال و جمال کی مصوری سے عاجز و درماندہ ہے، اس کی جو تصویر کھینچی جائے گی، وہ ناقص و ناتمام ہی ہوگی۔

ہر چند مدحت می کنم لیکن ازاں بالاتری

ملک و قوم دین و ملت اور علم و فن کا کوئی رخ اور کوئی پہلو بھی اس کے خدمات سے خالی نہیں ہے اس راہ میں اس کے کارنامے بڑے عظیم الشان اور گوناگوں ہیں، اس لیے اس کی موت درحقیقت ایک حادثہ نہیں مجموعہ حوادث ہے اور اس کا ماتم ایک شخص ایک وصف ایک کمال ایک قوم اور ایک ملک کا ماتم نہیں بلکہ دین و مذہب کا ماتم ہے، ملک و ملت کا ماتم ہے، فضل و کمال کا ماتم ہے علم و فن کا ماتم ہے خلق و شرافت کا ماتم ہے، اور پوری ملت اسلامیہ اس کے غم میں سوگوار ہے کہ آج غزالی و رازی ابن تیمیہ و ابن قیم رومی و سنائی شاہ عبدالحق اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی یادگار دنیا سے اٹھ گئی اور شبلی کی مسند ویران ہوگئی، ایسی ہستیاں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔

سرور رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
برفت از بزم عرفان آن حکیمے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

(”م“، دسمبر ۱۹۵۳ء)

عبدالعزیز آلِ سعود، سلطان

سلطان عبدالعزیز آلِ سعود

گزشتہ سنہ اس لحاظ سے بہت اندوہناک تھا کہ اس کے آخری مہینوں میں دنیائے اسلام کی متعدد بڑی شخصیتوں نے سفر آخرت کیا، ان میں ایک اہم شخصیت سلطان عبدالعزیز آلِ سعود کی تھی، جو اپنے اوصاف و خصوصیات کے لحاظ سے موجودہ تمام مسلمان فرمانرواؤں میں نہایت ممتاز حیثیت رکھتے تھے، ان کی ذات میں علم و دین تدبیر و سیاست اور شجاعت و حوصلہ مندی کا بے مثل اجتماع تھا، انھوں نے اپنے تدبر و شجاعت سے اپنے اسلاف کی کھوئی ہوئی عظمت و شوکت دوبارہ حاصل کرلی، اور حجاز پر قبضہ کرکے نجد کی معمولی ریاست کو ایک طاقتور حکومت بنادیا، ان کو اپنے اسلاف کی طرح، رد بدعات اور احیائے سنت میں بڑا اہتمام تھا، اور اس سلسلہ میں انھوں نے مفید مذہبی اصلاحات کیں، ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے حجاز جیسے علاقوں کو جہاں وحشی بدوؤں کے ہاتھوں انسانی جان و مال کی کوئی قیمت نہ تھی اور ترکی جیسی طاقتور حکومت اپنے زمانہ میں امن قائم نہ کرسکی تھی، امن و امان کا ایسا گہوارہ بنادیا، جس کی نظیر اس زمانہ میں نہیں مل سکتی اور جس کا اعتراف دوست و دشمن سب کو ہے، آج حجاز کے جس ویرانہ میں چاہے، انسان سونا اچھالتا ہوا چلا جائے کوئی شخص آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں کرسکتا، بلکہ راستہ میں گری پڑی ہوئی چیزوں کو بھی کوئی شخص اٹھانے کی جرأت نہیں کرسکتا۔

سلطان خود صاحب علم اور علماء اور علوم و فنون کے بڑے قدردان تھے، انھوں نے نجد و حجاز میں بہت سے مفید علمی و تعلیمی کام انجام دیئے، اگرچہ عام نجدیوں میں طبعاً سختی و درشتی ہوتی ہے اور وہ اپنے عقیدہ کے خلاف دوسروں کے عقائد مشکل سے برداشت کرسکتے ہیں جس کی بناء پر مسلمانوں کے بعض طبقوں کو ان سے تکلیف پہنچی، مگر سلطان اس بارہ میں معتدل اور روادار تھے اور عقائد میں اصول کے علاوہ فروعات میں سختی نہ کرتے تھے، وہ خود حنبلی تھے، مگر اہلسنت کے باقی تینوں مذاہب کی بھی پوری عظمت اور ان کے علماء کی عزت کرتے تھے اور ان کے پیروؤں کے ساتھ فراخ دلی سے پیش آتے تھے اب صحرائے عرب میں ہوا کا رخ دوسری طرف ہے اور اس کے ریگستانوں میں بھی جدید تمدن کے اثرات بڑی تیزی کے ساتھ پھیل رہے ہیں ان حالات میں سلطان کا وجود بہت غنیمت تھا، ان کے بعد اس کے برے اثرات کو روکنے والا کوئی نظر نہیں آتا، اللہ تعالیٰ اس حامی سنت و خادم الحرمین سلطان کو اپنی رحمت و

مغفرت سے سرفراز فرمائے۔ (''م''، جنوری ۱۹۵۴ء)

علی، یوسف، علامہ

علامہ یوسف علی

دوسرا حادثہ علامہ یوسف علی کی وفات کا ہے، وہ جدید تعلیم کی بہترین پیداوار بہت پرانے اور بڑے فاضل آئی سی ایس تھے، انگریزی پر ان کو اہل زبان جیسی قدرت حاصل تھی، وہ متعدد بلند پایہ کتابوں کے مصنف تھے، ان کی ایک کتاب کا ترجمہ ''ہندوستان قرونِ وسطیٰ میں'' کے نام سے اردو میں بھی شائع ہو چکا ہے، یہ ان کے ان لکچروں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد میں دیے تھے، اگرچہ ان کا قالب مغربی تھا، مگر ان کا قلب ہمیشہ مومن اور ان کا قلم ابتداء سے اسلام کی خدمت میں مصروف رہا، ان کا سب سے بڑا علمی و دینی کارنامہ قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ ہے، جو ادبی خوبیوں کے لحاظ سے انگریزی زبان کا شاہکار سمجھا جاتا ہے، اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ مترجم نے ان جدید مفسرین کے برعکس جو محض یورپ کی مرعوبیت میں آیاتِ قرآنی میں خود ساختہ تاویلیں کرتے ہیں، اپنے حواشی میں کوئی ایسی تاویل نہیں کی ہے جو سلف کے عقائد کے خلاف ہو، اس لئے دینی طبقہ میں بھی اس ترجمہ کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا، اللہ تعالیٰ اپنی کتاب عزیز کے اس خادم کو اس کی خدمت کا صلہ عطا فرمائے۔ (''م''، جنوری ۱۹۵۴ء)

ندوی، مسعود عالم، مولانا

مولانا مسعود عالم ندوی

ابھی حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کا غم نہ بھولا تھا کہ ندوہ کے ایک نامور فرزند مولانا مسعود عالم ندوی کا ماتم گسار ہونا پڑا، مرحوم نے چند گھنٹوں کی علالت کے بعد ۱۶/ مارچ کو کراچی میں وفات پائی، وہ ندوہ کے اس دور کی بہترین پیداوار تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں، عربی کے ممتاز ادیب و انشاء پرداز تھے انگریزی سے بقدر ضرورت واقفیت اور اردو کا ستھرا مذاق رکھتے تھے ان کے مضامین مصر و شام کے اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے تھے، اور اہل زبان ادیبوں سے خراج تحسین حاصل کرتے تھے، ابتداء میں ندوہ میں ادب کے مدرس تھے، اسی زبان میں انھوں نے حضرت الاستاذؒ کی نگرانی میں عربی کا ایک رسالہ الضیاء نکالا تھا، جو چند سال نکلنے کے بعد بند ہوگیا، اس کے بعد اورنٹیل پبلک لائبریری پٹنہ میں فہرست نگار ہوگئے اور انگریزی میں عربی کے متفرق مخطوطات کی فہرست کی ایک جلد مرتب کی جو چھپ کر شائع ہوگئی ہے۔

ان میں مسلمانوں کی دینی اصلاح کا جذبہ شروع سے تھا اور وہ وقتاً فوقتاً اصلاحی مضامین لکھتے رہتے تھے اس سلسلے میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی پر معارف میں ایک طویل مضمون لکھا تھا جو بعد میں ترمیم و اضافہ کے بعد کتابی صورت میں شائع ہوا، اسی جذبہ کے ماتحت وہ جماعت اسلامی میں شامل ہوگئے اور پاکستان ہجرت کر گئے تھے اس کے وہ بڑے سرگرم کارکن تھے، ان کی شرکت سے اس تحریک کو بڑا فائدہ پہنچا اس کو مضامین کے ذریعہ اسلامی ملکوں میں روشناس کرایا اس کی تبلیغ و اشاعت کے لیے عراق و شام کا سفر کیا اس کی متعدد اہم کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا ابھی حال میں ہندوستان میں اسلامی دعوت کی تاریخ اور جماعت اسلامی کے اغراض و مقاصد اور اس کے کاموں پر عربی میں ایک کتاب ''نظرۃ اجمالیہ فی تاریخ الدعوۃ اسلامیۃ فی الھند و الباکستان'' لکھی تھی جو مصر میں چھپی ہے، اردو میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کی سوانح عمری اسلام اور اشتراکیت اور عراق و عرب کا سفرنامہ ان کی قلمی یادگار ہیں۔

مرحوم کو حضرت الاستاذؒ اور دارالمصنفین سے بڑا گہرا تعلق تھا، وہ بھی ان کو بہت مانتے تھے اس تعلق کو انھوں نے ان کی وفات کے بعد بھی قائم رکھا اپنی وفات سے چند ہی دنوں پیشتر میری فرمایش پر معارف کے سلیمان نمبر کے لیے ایک مضمون لکھ کر بھیجا تھا جو غالباً ان کا آخری مضمون ہے مگر کیا خبر تھی کہ اس کی اشاعت سے پہلے ہی خود مضمون نگار یادگار بن جائیگا اس مضمون کو بھیجنے کے بعد ہی وہ مصر و شام کے سفر کے ارادہ سے راولپنڈی سے کراچی گئے تھے کہ پیام اجل آگیا اور دیارِ عرب کے مسافر نے سفر آخرت کی راہ لی ابھی کل ۴۴، ۴۵ سال کی عمر تھی جو علمی دنیا کے لیے گویا عنفوان شباب کی عمر ہے ان کی ذات سے بڑی توقعات وابستہ تھیں افسوس موت نے ان سب کا خاتمہ کردیا والبقاء للہ وحدہ اللہ تعالیٰ ان کی دینی خدمات کے طفیل میں ان کو اپنی رحمت و مغفرت کے انعام سے مالا مال اور مسعود عالم کو عالم آخرت کی سعادتوں سے سرفراز کرے۔

(''م''، اپریل ۱۹۵۴ء)

عبدالوالی، قطب الدین، مولانا

مولانا قطب الدین عبدالوالی

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

افسوس ہے کہ گذشتہ ہفتہ فرنگی محل لکھنؤ کی ایک محبوب شخصیت اور عزیز یادگار اٹھ گئی اور ۲۹ شعبان کو مولانا قطب الدین عبدالوالی نے اس دارفانی کو الوداع کہا، وہ مولانا عبدالباری مرحوم کے بھتیجے، داماد اور جانشین تھے، ان کی ذات میں ان کے اسلاف کرام کی بہت سی خوبیاں جمع تھیں تعلیم کی تحصیل و تکمیل مدرسہ نظامیہ میں اور اپنے محترم چچا سے کی تھی، اس کے بعد کچھ دنوں تک مدرسہ نظامیہ میں درس و تعلیم کی خدمت

انجام دی پھر تحریک خلافت کے زمانہ میں جب فرنگی محل مسلمانوں کی قومی وملی جدوجہد کا مرکز بنا، تو قطب میاں بھی اس میں شریک ہوگئے، اور خلافت کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا، وہ اودھ خلافت کمیٹی کے صدر تھے، اسی زمانہ میں انھوں نے جمعیۃ العلماء کے بعض اجلاسوں کی بھی صدارت کی، مولانا عبدالباری مرحوم کی وفات کے بعد انجمن خدام الحرمین کے صدر ہوگئے، اور مسلمانوں کے قومی وملی کاموں میں بھی وقتاً فوقتاً حصہ لیتے رہے، مگر ادھر چند سال سے سیاسی تغیرات اور ملک کے حالات کی وجہ سے سیاست سے کنارہ کش ہوگئے تھے، اور تھوڑے دنوں سے صحت کی خرابی کی بنا پر بالکل خانہ نشینی کی زندگی اختیار کرلی تھی۔

ان کی ذات بہت سی اخلاقی خوبیوں کی حامل تھی، اور قدیم خاندانی روایات تو انہی کے دم سے قائم تھیں اخلاق وشرافت فیاضی ومہمان نوازی قدامت وضعداری خاندانی تعلقات کے لحاظ واحترام وغیرہ میں اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر تھے، اور ان میں مولانا عبدالباری مرحوم کی فقیرانہ شان امارت کے جلوے نظر آتے تھے، خاندانی سجادہ انہی کے دم سے آباد تھا مگر دنیا کی کسی چیز کو ثبات وقرار نہیں اور اس زمانہ میں تو ہر قدیم اور برگزیدہ یادگار قصہ پارینہ بن کر رہ گئی ہے اس لیے فرنگی محل کی دنیا بھی بالکل بدل گئی ہے اور ہر طرف سناٹا نظر آتا ہے، مگر اب بھی اس ویرانہ میں اخلاق وشرافت کی ایک شمع جھلملاتی تھی، ادھر برسوں سے وہاں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا، مگر اس سے پہلے جب کبھی جانا ہوتا تھا تو قطب میاں سے مل کر صدق وصفاء خلق وشرافت اور مہر ومحبت کی تصویر سامنے آجاتی، اور بے اختیار زبان سے نکلتا کہ،

دماغ دل و رینجا گاہ گاہے چاق می گردد
خدا آباد دار و این خرابات محبت را

افسوس کہ یہ خرابہ محبت بھی مٹ گیا۔ ادھر عرصہ سے ان کی صحت خراب تھی، مگر اس حادثہ کا وہم وگمان بھی نہ تھا، اس کی اطلاع دفعۃً ملی ابھی پورے ساٹھ سال کی بھی عمر نہ تھی، ان کی ذات پر خاندان فرنگی محل کی بہت سی روایات کا خاتمہ ہوگیا اللہ تعالیٰ اپنے حبیبؐ کے طفیل میں اپنی رحمت ومغفرت سے سرفراز فرمائے، اب اس مرکز علماء میں صرف مفتی عبدالقادر صاحب اور مولانا صبغۃ اللہ شہید یادگار سلف باقی رہ گئے ہیں، اللہ تعالیٰ ان دونوں کو تادیر صحیح وسلامت رکھے اور جمال میاں سلمہ کو ان کے اسلاف کا صحیح جانشین بنائے۔ (''م''، مئی ۱۹۵۴ء)

قدوائی، رفیع احمد

رفیع احمد قدوائی

رفیع احمد قدوائی مرحوم کی موت ہندوستان کا اتنا بڑا قومی حادثہ ہے کہ اس کی تلافی مدتوں نہ ہوسکے گی، کم از کم مسلمانوں میں ان کا بدل پیدا ہونا دشوار ہے ان کی صحت عرصہ سے خراب تھی، قلب کے دورے پڑتے تھے، ڈاکٹر برابر ان کو آرام کرنے کی تاکید کرتے تھے، مگر انھوں نے کام کے مقابلہ میں کبھی اپنی صحت کی پروا نہ کی اور میدان جنگ میں لڑتے ہوئے سپاہی کی طرح قوم وملک کا کام کرتے کرتے اس راہ میں جان تک دے دی، موت وزندگی کا تماشہ کوئی عجیب چیز نہیں، روزانہ ہوتا رہتا ہے اور بڑے بڑے صاحب وجاہت بھی مرتے رہتے ہیں، مگر ان کی موت کا عام خلق پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اور ایک خاص دائرہ تک محدود رہتا ہے، مگر انسانی بڑائی کے نمونوں کی موت سے ایک دنیا متاثر ہوتی ہے رفیع مرحوم دنیادی وجاہت کے ساتھ اخلاق وسیرت اور انسانیت وشرافت کے لحاظ سے بھی بہت بڑے آدمی تھے اور ان کے فیض سے ایک عالم مستفیض ہوتا تھا، اس لیے ان کی موت دنیائے انسانیت کا حادثہ ہے اور ان کے ساتھ بہت سی خوبیاں دفن ہوگئیں۔

وہ اپنے بہت سے اوصاف اور خصوصیات میں فرد تھے، ان کی پوری زندگی ملک وقوم کی بے لوث خدمت میں گزری اور اس راہ میں بڑی قربانیاں کیں، وہ ہندوستان کے جہاد آزادی کے سرفروش مجاہد، میدان سیاست کے بے نظیر مدبر، قلم مملکت کے بے مثل منتظم تھے، ان کے تدبر کا لوہا مخالفین تک مانتے تھے، اور حکومت کے جو انتظامی کام بڑے بڑوں سے نہ ہوسکے ان کو انھوں نے تنہا کرکے دکھادیا، ان کی زندگی ذاتی اغراض وفوائد کے داغ سے بالکل پاک تھی، اپنے عہدے سے کبھی ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا، ان کے پاس جو کچھ تھا، دوسروں کے لیے وقف تھا، جو ملا دوسروں پر صرف کردیا اور خود ہمیشہ تہی دامن رہے اور عجب نہیں مقروض بھی رہے ہوں جس کی مثال اتنے بڑے عہدہ داروں کی زندگی میں مشکل سے مل سکتی ہے، ان کا سب سے بڑا وصف خدمت خلق، غریبوں کی امداد ودستگیری اور اہل حاجت کی روائی تھا، ان کے دشمن تک ان سے فائدہ اٹھاتے تھے، خدا ہی کو علم ہے کہ ان کی ذات سے کتنے حاجت مندوں کی ضرورتیں پوری ہوتی تھیں، اور اس اخفا کیساتھ کہ کسی کو خبر تک نہ ہونے پاتی تھی، دارالمصنفین کے بھی وہ محسن تھے، اور اس کے اس نازک دور میں انھوں نے خود بھی اس کی مدد کی، اور دوسروں سے امداد دلوائی۔

وہ اتنے اونچے انسان تھے اور ان کا دل اتنا وسیع تھا کہ اس میں دشمنوں تک کے لیے برائی کی گنجایش نہ تھی، اپنے بڑے سے بڑے دشمن کے ساتھ بھی احسان وسلوک کرتے تھے، تعصب وتنگ نظری سے دامن اتنا پاک تھا کہ جن سنگھ اور مہاسبھا جیسی متعصب اور فرقہ پرست جماعتوں تک کو ان کی خالص قوم پروری کا اعتراف تھا، اور اس زمانہ میں وہ ''الفضل ماشھدت بہ الا عداء'' کی تنہا مثال تھے، جس ملک میں گاندھی جی جیسی شخصیت کی موت پر بعض جماعتوں نے خوشی منائی ہو، اس میں رفیع

مرحوم کا جیسا متفقہ ماتم مقبولیت کی آخری سند ہے وہ ہندوستان کا فخر اور مسلمانوں کی آبرو تھے ان کی ذات سے مسلمانوں کا سر اونچا تھا، اب اُن میں ان کی جیسی شخصیت نہیں پیدا ہوسکتی، وہ خدمت خلق کے لیے لہو پیدا ہوئے تھے اور خدمت ہی کرتے کرتے دنیا سے اٹھے، خلق کی خدمت اور غریبوں اور بے نواؤں کی امداد و دستگیری اتنا بڑا کام ہے جو کہ تنہا یہی ایک کام مسلمان کی مغفرت کے لیے کافی ہے اور رفیع مرحوم کے اس عمل خیر کا پلہ اتنا بھاری ہے کہ انشاء اللہ میزان عدل میں بھاری نکلے گا، اور امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے طفیل میں بشری کمزوریوں سے درگذر کر کے ان کو عالم آخرت کی مقبولیت اور سربلندی سے بھی سرفراز فرمائے گا۔ (''م''، نومبر ۱۹۵۴ء)

کول، کشن پرشاد، پنڈت

پنڈت کشن پرشاد کول

پنڈت کشن پرشاد کول کی وفات ایک بڑا ادبی اور تہذیبی سانحہ ہے، وہ اردو کے ممتاز ادیب اس کے شیدائی اور ہماری پرانی تہذیب و شرافت کی ایک اہم یادگار تھے، ان میں خدمت کا جذبہ ابتداء سے تھا، چنانچہ آج سے تقریباً نصف صدی پیشتر اس زمانہ میں جب کہ ہر تعلیم یافتہ نوجوان سرکاری عہدوں کی جانب لپکتا تھا، انھوں نے دنیاوی دولت و وجاہت کے مقابلہ میں ملک وقوم کی خدمت کو ترجیح دی اور سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی کے ممبر ہوگئے، جو اس زمانہ میں سادگی اور قناعت کے ساتھ قومی خدمت کی تربیت گاہ تھی، اور ساری عمر ایک وضع میں گزار دی، وہ لکھنؤ کے پرانے کانگریسی لیڈر بابو گنگا پرشاد ورما کے سیاسی شاگرد اور ان کے شریک کار تھے، ان کے بعد ان کے اخبار ''ہندوستانی'' کو سنبھالا اور کئی سال تک اس کو چلاتے رہے اس کے بعد پنڈت چکبست کے ساتھ مشہور رسالہ ''صبح امید'' نکالا، گنگا پرشاد میموریل لائبریری قائم ہونے کے بعد اس کے آنریری سکریٹری ہوگئے اور آخر عمر تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔

وہ طبعاً سیاسی آدمی نہ تھے، ان کا اصلی ذوق علمی و ادبی تھا، اس لیے ہنگامہ خیز سیاست سے دور رہے اور پوری زندگی علم وادب کی خدمت میں بسر کی، اردو تہذیب اور اردو زبان سے ان کو عشق تھا، اس فرقہ پرستی کے دور میں جبکہ بڑے بڑے اردو نوازوں کے قدم ڈگمگائے گئے، انہوں نے جس جرأت کے ساتھ اردو کی حمایت، اس کا حق منوانے کے لئے علمی جدوجہد اور اردو علاقائی زبان کی تحریک کی رہنمائی کی وہ ان ہی کا حصہ ہے اردو میں ان کے متعدد ناول، افسانے، خطبۂ صدارت اور ادبی وتنقیدی مضامین وغیرہ ان کی یادگار اور ان کی ادبی ولسانی مہارت کا ثبوت ہیں، وہ لکھنؤ کے پرانے کشمیری برہمنوں کی طرح ہماری پرانی تہذیب شائستگی اور شرافت وضعداری کا نمونہ اور بڑے مخلص شریف الطبع اور مرنجان مرنج انسان تھے، ان کی موت سے ہماری پرانی مشترکہ تہذیب کی ایک دلآویز یادگار مٹ گئی جس کے نمونے نئے ہندوستان میں پیدا ہونے کی امید نہیں، اس لیے ان کی موت ایک بڑا تہذیبی حادثہ بھی ہے۔ (''م''، فروری ۱۹۵۵ء)

احمد، سید مقبول، مولوی

مولوی سید مقبول احمد

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینہ اردو زبان کے کہن سال مصنف مولوی سید مقبول احمد صاحب صوفی نے ۸۵ سال کی عمر میں انتقال کیا، اردو کے پرانے مصنفین میں اس وقت وہ سب سے زیادہ معمر تھے، جب تک ان کے قویٰ کام دیتے رہے لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رہا، مگر ادھر کئی سال سے ضعف پیری کی وجہ سے چھوٹ گیا تھا، وہ معارف کے پرانے مضمون نگار تھے جس موضوع پر لکھتے تھے معلومات کا انبار لگا دیتے تھے متفرق مضامین کے علاوہ حیات جلیل، تاریخ الٰہ آباد عرب اور ان کا مستقبل وغیرہ کئی کتابیں ان کی یادگار ہیں، ان کی موت سے ایک پرانی علمی یادگار مٹ گئی، اللہ تعالیٰ مقبول احمد کو آخرت کی مقبولیت سے سرفراز فرمائے۔ (''م''، مارچ ۱۹۵۵ء)

نظامی، حسن، خواجہ

خواجہ حسن نظامی

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ ہندوستان کے نامور بزرگ خواجہ حسن نظامی نے ۷۷ سال کی عمر میں انتقال کیا، ان کی جیسی جامع الحیثیات شخصیتیں مدتوں میں پیدا ہوتیں ہیں، وہ ایک خاندانی اور صاحبِ نسبت صوفی، صاحبِ طرز ادیب، ذہین و ماہر نفسیات داعی، کامیاب تاجر، غرض تنہا ایک دنیا اور دلّی کی تہذیب وشرافت کی یادگار تھے، انہوں نے اپنی محنت اور خداداد ذہانت و قابلیت اور سوجھ بوجھ سے نہایت معمولی حالت سے جس قدر ترقی اور شہرت و ناموری حاصل کی، اس کی مثالیں کم ملتی ہیں ان کا طرز انشاء نہایت سادہ مگر دلنشین اور سہل ممتنع کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے بہت چھوٹی چھوٹی اور حقیر چیزوں پر جیسے مفید، دلچسپ، سبق آموز اور نتیجہ خیز مضامین لکھے وہ ان ہی کا حصہ ہے، ان کے مضامین کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، ان کی تصانیف کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے، موضوع کا اتنا تنوع اور نشیب وفراز مشکل ہی سے اردو کے کسی مصنف کے مضامین اور کتابوں میں مل سکتا ہے، ان کی تصانیف میں غدر دہلی کے افسانوں کا سلسلہ شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے، انہوں نے درجنوں اخبارات اور رسالے نکالے، ایک زمانہ میں ان کے زیر پرستی نکلنے والے رسالوں کی سارے ہندوستان میں دھوم تھی، ان کے بہت سے شاگرد اور تربیت یافتہ اڈیٹر اور صاحبِ قلم بن گئے، اس لیے اردو زبان کی

خدمت کے اعتبار سے وہ اس دور کے اساطینِ اردو میں تھے۔

ان کے ہر کام میں جدت و ذہانت نمایاں تھی، اور ان کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب ان کا یہی وصف تھا، ان کے مریدوں اور عقیدت مندوں کا دائرہ نہایت وسیع تھا، جس میں ہندو، مسلمان، سکھ اور امراء و والیانِ ریاست سب داخل تھے، ایک زمانہ میں انہوں نے شدھی اور سنگھٹن کا بھی مقابلہ کیا، اور ہندو مسلمانوں کو ملانے کا بھی فرض انجام دیا، غرض علم و ادب، مذہب وسیاست، صنعت وتجارت ہر شعبہ میں ان کے کارنامے ہیں، اور ان کی پوری زندگی جدوجہد اور سعی وعمل کا نمونہ اور اس حیثیت سے دوسروں کے لیے قابلِ تقلید تھی، اور وہ اپنے زمانہ کے بڑے کامیاب انسان تھے، باقی بشری کمزوریوں سے کوئی انسان بھی مستثنیٰ نہیں ہے، آج سے دس پندرہ سال پہلے تک سارا ہندوستان ان کی شہرت سے گونجتا تھا، مگر ادھر چند سال سے کچھ حالات کے تغیر اور کچھ ضعف پیری نے خانہ نشین کر دیا تھا اور وہ گمنام سے ہوگئے تھے، ان کی زندگی کا یہ دور دنیاوی شہرت و ناموری کی ناپائیداری کا سبق آموز مرقع ہے۔ والبقاء للہ وحدہ، اللہ تعالیٰ ان کو عالمِ آخرت کی کامیابی اور ناموری سے سرفراز فرمائے۔

(''م''، اگست ۱۹۵۵ء)

جونا گڑھی، احمد میاں اختر، قاضی

احمد میاں اختر جونا گڑھی

ہندوستان اور پاکستان کی علمی دنیا کا یہ بڑا افسوس ناک سانحہ ہے کہ گزشتہ مہینہ مشہور صاحب علم وقلم قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی نے کراچی میں انتقال کیا، وہ اسلامی علوم کے ممتاز فاضل تھے، خصوصاً اسلامی تاریخ پر ان کی نظر نہایت وسیع تھی اور ان کا علمی و تحقیقی مذاق بہت بلند تھا، عربی، انگریزی اور اردو تینوں زبانوں میں یکساں دستگاہ حاصل تھی اور تینوں میں مضامین لکھتے تھے، ان کے مضامین ہندوستان و پاکستان کے تمام سنجیدہ علمی رسالوں میں نکلتے تھے، معارف کے پرانے مضمون نگار تھے، ان کے انگریزی مضامین کا ایک مجموعہ شیخ محمد اشرف تاجر کتب لاہور نے شائع کیا ہے، اقبال پر ان کی ایک کتاب حال ہی میں چھپی ہے، دارالمصنفین سے بھی ان کی ایک کتاب ابن صاعد اندلسی کی طبقات الامم کا ترجمہ عرصہ ہوا شائع ہوچکی ہے، اگر ان کے مضامین جمع کیئے جائیں تو کئی جلدوں میں آئیں گے۔

مرحوم ریاست جونا گڑھ کے جاگیر دار تھے، وہاں کے انقلاب میں لٹ لٹا کر بڑی مصیبتوں سے کراچی پہنچے، کچھ دنوں تک انجمن ترقی اردو سے وابستہ رہے، اس کے بعد سندھ یونیورسٹی میں شعبہ اسلامیات کے صدر ہوگئے تھے، طبعاً نہایت شریف، متواضع اور خاکسار تھے، دارالمصنفین سے ان کا تعلق بڑا پرانا اور مخلصانہ تھا ابھی انھوں نے پاکستان میں دارالمصنفین کی کتابوں کے لئے لائسنس دلانے میں بڑی مدد کی تھی، اب اس زمانہ میں ایسے صاحب کمال کی جگہ کا بھرنا مشکل ہے اللہ تعالیٰ اس شیدائے علم کو اپنی رحمت ومغفرت سے سرفراز فرمائے، انتقال کے وقت ۶۰ سال سے اوپر کی عمر رہی ہوگی۔

(''م''، ستمبر ۱۹۵۵ء)

مدنی، عبدالحق، مولانا

مولانا عبدالحق مدنی

دوسرا حادثہ مولانا عبدالحق صاحب مدنی کی وفات کا ہے، وہ ہندوستان کے ممتاز علماء میں تھے، ان کی پیدائش تعلیم وتربیت اور نشوونما مدینہ طیبہ میں ہوئی تھی، اس لیے مدنی کہلاتے تھے۔ دینی علوم میں مہارت کے علاوہ عربی زبان وادب میں اہل زبان کی جیسی بصیرت حاصل تھی، مرادآباد کی شاہی مسجد کے مشہور مدرسہ میں درس و اہتمام کی خدمت انجام دیتے تھے، اور اب یہ مدرسہ ان ہی کی بدولت چل رہا تھا، اللہ تعالیٰ دینی علوم کے اس خادم کو عالم آخرت کی سربلندی سے سرفراز فرمائے، اب زمانہ کے اثر سے ہماری دینی درسگاہوں کا رنگ بھی بدلتا جاتا ہے، اور نئے علماء میں وہ روح نہیں پیدا ہوتی جو پرانے علماء کا طغرائے امتیاز تھی، اس لیے ان میں جو یادگار مٹ جاتی ہے اس کا بدل نہیں پیدا ہوتا۔

(''م''، ستمبر ۱۹۵۵ء)

کیفی، برجموہن دتاتریہ، پنڈت

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی

ادھر کئی مہینوں سے علم و ادب کے اکابر کی موت کا ایسا سلسلہ قائم ہے کہ کوئی مہینہ ناغہ نہیں جاتا جس میں کسی نہ کسی صاحبِ علم کا ماتم نہ کرنا پڑتا ہو، ان میں سب سے بڑا حادثہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی وفات کا ہے، اگرچہ ان کی عمر نوے سال سے زیادہ ہوچکی تھی، مگر وہ ہماری مشترک تہذیب کی بڑی اہم یادگار تھے، اور انکی موت سے اس کا ایک بڑا ستون گرگیا، ان کی ذات میں اس تہذیب کی تمام خوبیاں اور وضعداریاں جمع تھیں، اردو زبان سے ان کو عشق تھا، اور اس کے وہ بڑے ماہر ومحقق تھے، اور اس کی باریکیوں پر ان کی بڑی گہری نظر تھی، جس پر ان کی نثر ونظم کی تصانیف شاہد ہیں، اس لیے ان کی موت ایک بڑا ادبی وتہذیبی حادثہ ہے۔

وہ نصف صدی سے زیادہ اپنے قلم وزبان سے اردو کی خدمت کرتے رہے، اور سرد وگرم کسی دور میں بھی ان کا قدم پیچھے نہ ہٹا، حتیٰ کہ اس دور میں بھی جبکہ فرقہ پرستی نے اردو کی حمایت کو ایک قومی جرم بنادیا ہے، اور ہندوؤں میں جو لوگ اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں اور دل سے اس کے حامی ہیں، وہ بھی بہت کم اس کے اظہار کی جرأت

کرسکتے ہیں، اردو کی وفاداری پر جو لوگ قائم رہ گئے ہیں، ان میں پنڈت کیفی سب سے نمایاں تھے، وہ برابر اس کے لیے سینہ سپر رہے، اور جب تک ان میں لکھنے پڑھنے اور چلنے پھرنے کی سکت باقی رہی وکالت کرتے رہے، انجمن ترقی اردو ہند کے نائب صدر تھے مگر ادھر چند سال سے ضعف پیری نے بالکل معذور کردیا تھا، ان کی پوری زندگی علمی ادبی مشاغل میں گذری اور اردو زبان اور اس کے شعر و ادب کے متعلق بہت سی تصانیف یادگار چھوڑیں، اخلاق و سیرت میں قدیم شرافت و وضعداری کا نمونہ تھے، اس لیے ان کی موت تنہا علمی و ادبی نہیں بلکہ تہذیبی اور قومی حادثہ بھی ہے جدید ہندوستانی قومیت کی تعمیر جن عناصر سے ہورہی ہے اس میں ایسے نمونوں کی پیدا ہونے کی قطعاً امید نہیں،

یادگارِ زمانہ تھے یہ لوگ
سن رکھو تم ، فسانہ تھے یہ لوگ

(''م''، نومبر ۱۹۵۵ء)

عطا، حلیم، مولانا شاہ

مولانا شاہ حلیم عطا

دوسرا حادثہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث مولانا شاہ حلیم عطا صاحب کی وفات ہے، وہ حضرت شاہ پیر محمد عطا سلونویؒ کی اولاد میں تھے اور موجودہ سجادہ نشین شاہ نعیم عطا صاحب کے چھوٹے بھائی تھے۔ یہ خاندان علم و فضل دونوں کا جامع رہا ہے۔ شاہ حلیم عطا صاحب بڑے وسیع النظر عالم اور اسلامی علوم کا زندہ کتب خانہ تھے۔ خصوصاً حدیث اور اس کے متعلقہ فنون پر ان کی نظر اتنی گہری اور وسیع تھی کہ اس دور کے علماء میں اس کی مثالیں کم ملیں گی۔ حضرت الاستاذؒ فرمایا کرتے تھے کہ شاہ صاحب کے علم کی تھا نہیں ملتی اور اس علم و فضل کے ساتھ ایسے خاکسار اور متواضع، سادہ مزاج اور بھولے بھالے تھے کہ ان کو دیکھ کر کوئی شخص مشکل سے ان کے لکھے پڑھے ہونے کا گمان کرسکتا تھا۔ اپنے سے کمتر علم والوں کی باتیں اس شوق اور توجہ سے سنتے کہ معلوم ہوتا خود استفادہ کررہے ہیں۔ حافظہ حیرت انگیز تھا، کتابوں کے صفحے کے صفحے زبانی یاد تھے مگر ان کمالات کے ساتھ قوت گویائی اور قوتِ تحریر نہ تھی، اس سے بھی زیادہ ان کی تواضع اور استغنا نے ان کو نام و نمود سے بے نیاز کردیا تھا، اس لیے ایک محدود علمی حلقہ کے سوا علمی دنیا بھی ان کے کمالات سے واقف نہ ہوسکی، تقریباً پندرہ سال سے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حدیث نبوی کا درس دیتے تھے اور اسی مبارک شغل میں چند دنوں فالج میں مبتلا رہ کر انتقال کیا۔ انتقال کے وقت ۶۵ سال کی عمر رہی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اس پیکر علم و اخلاق کو اس کے پاک شغل کے طفیل میں عالم آخرت کی سربلندی عطا فرمائے۔

(''م''، نومبر ۱۹۵۵ء)

مولانا شاہ حلیم عطا

(شاہ محمد حسن عطاء)

سید احمد شہید کے رائے بریلی میں کئی تاریخی قصبات ہیں، جائس جس کے بطن سے پدماوت کا شہرہ آفاق مصنف پیدا ہوا، نصیر آباد جس کے آغوش میں اولو العزم سادات پلے، سلون جہاں بیٹھ کر سا لکان حقیقت نے معرفت کا درس دیا، اور ویزکیھم ویعلمھم الکتاب [آل عمران: ۱۶۱] کی سنت سنیہ پر عمل پیرا ہوئے۔ عہد کہن کی مرثیہ خوانی اور درس سلوک کی حکایت بیان کرنے کے لیے ابتک سلون میں ایک پرشکوہ آرام گاہ موجود ہے، جس پر ذیل کی تاریخ ثبت ہے۔

حضرت پیر محمد قطب دیں　　چوں ز دنیا بالِ آگاہ رفت
سال تاریخ شہہ ہر دوسرا　　گفت ہاتفِ عارف باللہ رفت

اس آرام گاہ میں وہ خدا رسیدہ بوریا نشینان مسند بے نیازی محوخواب ہیں، جو کبھی کج کلاہوں کی شوکت سے مرعوب نہ ہوئے اور جن میں سے ہر ایک نے بڑے وقار اور شریعت و طریقت کی جامعیت کے ساتھ زندگی گذاری، شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے جو تیموری دبدبہ کی آخری یادگار تھا، اسی مقبرہ کے ایک ابدی مکین حضرت پیر محمد سلونی کو عطاء ملوکانہ سے سرفراز کرنے کے لیے طلب کیا انھوں نے قلندرانہ جواب دیا۔

فقیر راایں حوصلہ نمی آید۔ دہقانی را در مجلس سلطانی چہ کار کریے دارم چوں گرسنہ می شوم مہمانی میکند و چوں می خسپم پاسبانی میکند، گاہے گاہے کسے از راہی می آید، در کریم باز است و کریم ما بے نیاز، اللہ بس باقی ہوس۔

ان ہی صاحبان قبور میں پیر اشرف، پیر پناہ، پیر عطا اور جانشینان اورنگ زیب کے مخدوم حضرت شاہ کریم عطا سلونی ہیں، جن سے ملنے کے لیے نہ صرف شاہ عالم، صفدر جنگ، شجاع الدولہ بلکہ مجاہد کبیر عارف باللہ حضرت سید احمد رائے بریلوی بھی سلون آئے، ان ہی میں ابوالفضل، ظہیر الدین شاہ پناہ عطا اپنی الگ علمی منزلت رکھتے تھے، احمد شروانی، حضرت شاہ عبد العزیز، مرزا قتیل، اور اس دور کے دوسرے اکابر و مشاہیر سے آپ کے معاصرانہ تعلقات تھے، مشکوٰۃ پر آپ کی تعلیقات آپ کے علمی کمال کی شاہد ہیں اسی سلسلہ کے ایک بزرگ شاہ حسین عطا نے نواب سعادت علی خاں کی اس ترغیب و ترہیب کو کہ اگر وہ تشیع قبول کرلیں تو جائداد میں اضافہ ہوگا ورنہ ضبط ہو جائے گی، حقارت سے ٹھکرادیا، اس سجادہ کی آخری زینت میرے دادا حضرت شاہ مہدی عطا صاحب قدس سرہ تھے، جنھوں نے تصوف پر ایک بے مثل تصنیف لمعۃ الانوار یادگار چھوڑی ہے، آپ فارسی، اردو، ہندی تینوں زبانوں میں بڑے خوش گفتار تھے، اس مقالہ کی شخصیت کو آپ کی فرزندی کا شرف حاصل ہے۔

صدر المحدثین حضرت مولانا حافظ شاہ محمد حلیم عطا صاحب رحمتہ اللہ علیہ ۱۳۱۱ھ میں سلون میں پیدا ہوئے، آپ کی والدہ دیوہ شریف (ضلع بارہ بنکی) کے ایک عالی نسب سادات گھرانے سے تھیں، ابھی عہد شیر خوارگی پر چند ہی ماہ گذرے تھے کہ آپ مادرانہ شفقت سے محروم ہوگئے، پھر زندگی کی ساتویں بہار کا آغاز بھی نہ ہوا تھا کہ آپ یتیم الطرفین ہوگئے، اس جانگداز واقعہ کے بعد خاندان کے اقتدار کی باگ ایسے ہاتھوں میں پہنچ گئی، جنھوں نے اس سجادہ کے تقدس کو خاک میں ملادیا اور چند ہی برسوں کے اندر اس کے زمین و آسمان بالکل بدل گئے۔

افسوس اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

لیکن عین اسی زمانہ میں اس خانقاہ میں ایک ایسی شخصیت پیدا ہوئی جس نے اس کی گرتی ہوئی عمارت کو سنبھال لیا، یہ شخصیت جناب مولانا شاہ حلیم عطا رحمتہ اللہ کی تھی، آپ نے نہایت کم عمری میں درسیات سے فراغت حاصل کرلی تھی، اور ایام شباب میں خاندانی کتب خانہ کی تمام کتابیں آپ کے مطالعہ سے گذر چکی تھیں، اسی زمانہ میں نواب صدیق حسن خان کے استاد حضرت شیخ حسین ابن محسن یمانی سلون میں فروکش ہوئے، ان سے حدیث کی باقاعدہ سند لی، پھر جب میاں نذیر حسین محدث دہلوی کے شاگرد مولانا ابوالحسن دہلوی کئی برس تک سلون میں آکر مقیم ہوئے، تو ان کی نگرانی میں حدیث کا مطالعہ کیا، پھر جب بیس بائیس سال کی عمر سے لکھنؤ جانے کا اتفاق ہونے لگا تو وہاں کے کتب خانوں سے واقفیت حاصل کی اور علامہ شبلی رحمتہ اللہ علیہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، اس ملاقات کا ذکر والد صاحب ہمیشہ بڑے فخر ومباہات سے کرتے تھے۔

اس زمانہ میں مولانا عبدالحئیؒ صاحب سابق ناظم ندوۃ العلماؒ لکھنؤ میں مطب کرتے تھے، جب کبھی والد صاحب کا گذر ادھر سے ہوتا تو وہ بڑی شفقت اور عنایت سے بلا کر بٹھلاتے تھے، ان صحبتوں نے طبیعت میں بڑی جلا پیدا کی، اور تاریخ وحدیث کے نکتہ داں بننے میں بہت مفید ثابت ہوئیں، میرے عہد شیر خوارگی میں علاج کے سلسلہ میں جھوائی ٹولہ لکھنؤ میں کچھ دنوں قیام کرنا پڑا، اس قیام کے زمانہ میں ایک نئی تبدیلی پیدا ہوئی، درس نظامی سے طبیعت ہٹی اور ندوہ کی آمد ورفت کا سلسلہ شروع ہوا، مولانا سید طلحہ حسنی ایم اے، شیخ خلیل عرب اور مولانا کلیم احمد سے تمام زندگی کی مودت کا رشتہ قائم ہوا، اور مولانا یوسف سورتی اور شیخ خلیل عرب کی صحبت میں یمنی مصنفین سے شناسائی حاصل ہوئی، اس سے نگاہ میں بڑی وسعت پیدا ہوئی اور دمشق، قاہرہ، بیروت اور لندن وغیرہ کی مطبوعات منگا کر مطالعہ میں رہنے لگیں، اور اس کا سلسلہ برابر جاری رہا، تاآنکہ آج سے سولہ سترہ سال پہلے مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہ العالی کی ترغیب پر والد صاحب نے ندوہ سے باضابطہ تعلق پیدا کرلیا، تنخواہ کی ابتدا چالیس روپے ماہوار سے ہوئی اگرچہ یہ معاوضہ بہت قلیل تھا، اور سلون میں ان کو تمام آسائشیں میسر تھیں، لیکن محض علم کی خدمت کے ذوق میں اس کو قبول کرلیا اور سولہ سترہ سال کی مدت میں بڑے بڑے انقلابات آئے، بہت سے اساتذہ نے دوسرے اداروں کا رخ کیا، لیکن والد صاحب کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی، اور انھوں نے منصب وجاہ اور دولت دنیا کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا، اور نہ کبھی ندوہ کی مجلس انتظامیہ سے اپنے علم کا بھاؤ طے کیا، جب میں علی گڑھ اور دہلی سے گھر جاتے ہوئے چند گھنٹوں کے لیے ندوہ ٹھہرتا تھا تو ان کی انتہا سے زیادہ سادگی کو دیکھ کر مجھے سخت رنج ہوتا تھا، بعض طالب علموں کو اپنی اولاد پر بھی ترجیح دیتے تھے، کتابوں کے عاشق تھے، لیکن پنجاب کے ایک طالب علم کو طبقات ابن سعد کا پورا سیٹ دے دیا، لکھنے والے ان سے تصنیف وتالیف میں مدد لیتے تھے، لیکن محترمی مولانا محمد اویس ندوی، مولانا ظفر الدین اور مولانا مجیب اللہ ندوی کے علاوہ کم لوگوں نے اس کا اعتراف کیا ہے، علمی تجربہ کا یہ عالم تھا کہ تفسیر، حدیث، رجال، فقہ، تاریخ، وغیرہ جملہ علوم پر ان کی نگاہ یکساں وسیع تھی، دقیق سے دقیق مسائل کو ارتجالاً حل کردیتے تھے، مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہ والد صاحب کے کمالات کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

”طالب علمی کے بے قاعدہ اختتام کے قریب ضلع رائے بریلی کے ایک مردم خیز قصبہ سلون جانے کا اتفاق ہوا اور دو کتب خانے دیکھے، ایک زندہ ومتکلم۔ ایک جامد وخاموش۔ زندہ کتب خانہ مولانا شاہ حلیم عطا صاحب اور جامد کتب خانہ ان کا قیمتی علمی ذخیرہ۔ شاہ صاحب کے واسطے سے حافظ ابن جوزی، حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم، حافظ ابن رجب اور امام عبدالہادی کی کتابیں دیکھیں، پھر وطن واپس جاکر احیاء العلوم مع تخریج عراقی، فضل علم السلف علی الخلف، دفائن الکنوز، تلبیس ابلیس، مختصر منہاج القاصدین وغیرہ منگوائیں۔“

مولانا سید محمد صاحب ندوی شیخ الجامعہ العباسیہ تعزیت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:

”شاہ صاحب کے انتقال سے ایک بڑے عالم، محدث، مورخ اور ایک صوفی درویش کی جگہ خالی ہوگئی، اور دارالعلوم ندوہ ایک متبحر اور ایک بے مثل محدث ومورخ کے فیوض علمیہ سے محروم ہوگیا، میرے ایک مخلص دوست تھے اور انھوں نے میرے ساتھ برادرانہ اور عالمانہ سلوک کیے۔“

مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی صدر شعبہ دینیات جامعہ اسلامیہ لکھتے ہیں:

”شاہ صاحب کی وفات کا سانحہ حد درجہ ملال انگیز ہے، اب ایسا علم وفضل، ذہانت وذکاوت قوت حافظہ کا ہے کو کہیں نظر آنے لگا، مجھ پر خاص طور سے شفقت فرماتے تھے، اللہ تعالیٰ اپنے دامان رحمت میں جگہ عنایت فرمائے، ایسے اشخاص صدیوں میں کہیں پیدا ہوتے ہیں۔“

مولانا مسعود عالم ندویؒ نے ایک بار اپنے ایک دوست کو تحریر فرمایا تھا:

''کانوں نے جب سے سننا شروع کیا ہے اور آنکھوں نے جب سے دیکھنا،
یہ تبحر دیکھا نہ سنا۔''

مولانا حیدرحسن خاں صاحب مہتمم دارالعلوم نے جب ضابطہ کے طور پر ندوہ کی کرسی حدیث کے لیے حضرت سید صاحبؒ سے والد کا تعارف کرایا تو انکے الفاظ بعینہ یہ تھے ''میاں حدیث یہ ہم سے بھی زیادہ جانتے ہیں''۔

والد صاحب کو زندگی کی مصروفیت نے اس کا موقع نہ دیا کہ وہ ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کے علمی مرکزوں کو دیکھ سکتے، ورنہ آج پوری علمی دنیا میں انکا ماتم ہوتا، والد صاحب نے کسی اکیڈمی میں تصنیف و تالیف کا کام نہیں سیکھا، پھر پانچ خورد سال اور دو جوان اولادوں کی موت نے انھیں بالکل مضمحل کردیا تھا، خاندانی تلخیاں علیحدہ تھیں۔ان حالات میں انھوں نے جو علمی خدمات انجام دیں اور جو تصانیف یادگار میں چھوڑیں، دوسرا شخص مشکل ان کو انجام دے سکتا تھا انکی بعض تصانیف کے نام یہ ہیں:

(۱)الکتاب الکریم فی استخراج الدرمن القرآن العظیم (۲)نخبته لسان العرب فی لغات القرآن العجب (۳)المعجم المفهرس (۴)تیسیرا الوصول الی اطراف اصحاب الا صول (۵)فتح المنعم فی اطراف الامام مسلم (۶)الیوا قیت الشمینه فی اطراف عالم المدینه (۷)تعجیل المنفعه فی اطراف الائمته السبعه (۸)اسمأ اصحاب رسول اللّٰہ علیه وسلم و کنا هم عمن روی عنهم الائمته السبعه (۹)دیوان شعر۔

شعر و سخن سے بھی ذوق تھا، مگر طبیعت مشکل پسند تھی، اس لیے اردو کے بجائے عربی شاعری کی جانب توجہ کی، ان کی شاعری میں بقول علامہ سید سلیمان ندویؒ حالؔی کی سادگی پائی جاتی تھی، بحتریؔ، ابن معتز اور ابو الفردوسؔ سے زیادہ متاثر تھے، ذیل کے اشعار سے ان کی عربی شاعری کا اندازہ ہوگا، یہ اشعار انھوں نے اس وقت کہے تھے جب ۵۳ء میں مولانا سید سلیمان ندویؒ پاکستان سے ہندوستان تشریف لائے تھے۔

بشری لکم یا معشر النحلان	بقدوم سید نا ابی سلمان
کنزول غیث بعد طول قنو طها	او نضحة الا رواح فی الا بدان
اعنی به جبل التقی علم الهدیٰ	بحر العلوم خزینة العرفان
والسید العلام فخر زمانه	کنز المعارف منبع الا حسان
قد جائنا نعم المحیٔ فمر حبا	لسحاب رحمته ربنا الرحمن
اهلاًوسهلاًبا لذی یشتاقه	کل امرئ کالماء للظمأن
یارب متعنا بطول بقائه	وادمه فینا دائم الفیضان

اردو اور فارسی سے بعض پرانے علماء کی طرح بے تکلفی نہیں تھی، بلکہ اس کا بھی بہت اچھا ذوق رکھتے تھے، لیکن تمام علوم میں ان کو خاص ذوق احادیث نبوی سے تھا، قرآن مجید کی تفسیر میں میں نے مولانا ابوالحسن علی صاحب کو معیار پایا اور احادیث کی تشریح و تاویل میں والد صاحب کو۔ وفات سے کچھ دنوں پیشتر والد صاحب نے دہلی کا سفر کیا، اس سفر میں انھوں نے میری مملوکہ فارسی کتابوں کو سرسری نگاہ سے دیکھا اور آقای علی اصغر حکمت کی امثال قرآن کو پڑھ کر اس بارے میں امام ابن قیم اور بعض دوسرے علماء کے بے نظیر نظائر بیان کیئے کاش میں نے اس تقریر کو محفوظ کرلیا ہوتا، دوسال ہوئے ان کے شاگرد رشید مولوی عبدالرشید لداخی نے علم کلام سے متعلق اپنے تحقیقی مقالہ کا ذکر کیا اس سلسلہ میں والد صاحب ڈیڑھ دو گھنٹے تک علم کلام، متکلمین اور حکمائے اسلام پر تقریر کرتے رہے، اگر اس کو قلمبند کرلیا جاتا تو علم کلام پر ایک مختصر اور جامع رسالہ تیار ہوجاتا۔

حدیث ان کا خاص فن تھا، اور اس فن کی تمام متداول و غیر متداول کتابیں ان کے کتب خانہ میں موجود تھیں، بلا مبالغہ کئی ہزار حدیثیں مع سند انھیں حفظ تھیں، اور میں نے ان کے ایک معاصر کو کہتے سنا کہ شاہ صاحب کے لیے کم و بیش وہی الفاظ کہے جاسکتے ہیں جو ابن تیمیہ کے کسی قدر شناس نے ان کے لیے استعمال کیے تھے کہ ''حدیث لا یعرف ابن تیمیه فهولیس بحدیث''۔

حافظ قرآن تھے اور چودہ سال کی عمر سے لے کر آخر تک برابر تراویح میں کلام مجید سناتے تھے، اردو اور فارسی کے سیکڑوں اشعار نوک زبان تھے، اردو کی طویل اور مرصع نظمیں کہہ دینا ان کے لیے بہت آسان تھا، حالؔی اور اکبرؔ کو بہت پسند کرتے تھے۔

میرے بڑے بھائی مرحوم کی تعلیم و تربیت انھوں نے بڑی توجہ سے کی تھی، اگر وہ زندہ رہے ہوتے تو علمی و دینی اعتبار سے ہندوستان کے ہونہار اور نامور نوجوانوں میں ہوتے، مگر افسوس کہ عین عنفوان شباب میں ان کا انتقال ہوگیا، اس غم نے والد صاحب پر وہی اثر ڈالا جو فردوسی کے بیٹے کی موت نے اس پر ڈالا تھا، وہ بالکل ٹوٹ گئے اور عمر سے پہلے بوڑھے ہوگئے، طبیعت زندگی سے اچاٹ ہوگئی، لیکن صبر کا یہ عالم تھا کہ جب میں علی گڑھ سے بھائی جان کی موت کے تیسرے دن سلون پہنچا تو وہ نشست گاہ کے سامنے غالباً شذرات الذہب پڑھ رہے تھے اور ان کے چہرے سے کسی قسم کا حزن و ملال ظاہر نہ ہوتا تھا۔سلون اور لکھنؤ میں جن لوگوں کو والد صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کا کردار کس قدر پاک تھا اور وہ کس قدر معصوم اور فرشتہ خصلت انسان تھے، میں نے ان کو کسی شخص سے الجھتے نہیں دیکھا، میرے دادا رحمتہ اللہ علیہ نے ایک پورا علاقہ چھوڑا تھا، ان کی موت کے بعد یہ دولت بے دریغ لٹتی رہی، لیکن والد صاحب میں اسقدر استغنا تھا کہ انھوں نے اس میراث کو جائز طور پر بھی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔

والد صاحب مرحوم یوں بھی خلقۃً کمزور تھے، مسلسل حوادث نے ان کو اور زیادہ

ضعیف اور نڈھال کردیا تھا، وفات سے چند مہینہ بیشتر فالج کا اثر ہوا، ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب، ڈاکٹر عبدالحمید صاحب اور کرنل اندر سنگھ کے علاج سے وہ قریب قریب صحت یاب ہوگئے اور تبدیل آب وہوا کی غرض سے الہ آباد تشریف لے گئے، وہاں بھی علاج ہوتا رہا اور میں دہلی چلا آیا، ایک دن ۷/اکتوبر ۵۵ء مطابق ۲۰/صفر المظفر ۵۷ھ کو جمعہ کے دن دفعتہً وفات کا تار ملا، میں اسی وقت دہلی سے ٹرنکال کیا، اور یہ طے ہوا کہ دائرہ حضرت شاہ علم اللہ تکیہ کلاں رائے بریلی میں تدفین ہو، اور میں ہوائی جہاز کے ذریعہ لکھنؤ پہنچا، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ندوہ کے اساتذہ اور طلبہ کا ایک گروہ الہ آباد روانہ ہو چکا ہے، ادھر ہزار دقتوں کے بعد لاش کو الہ آباد سے بذریعہ پرائیوٹ کار رائے بریلی لایا گیا، میں لکھنؤ سے سیدھا رائے بریلی پہنچا، یہاں پہنچ کر میری رائے بدل گئی اور والد صاحب کو سلون لے جاکر اس کتب خانہ کے سامنے جہاں بیٹھ کر انھوں نے غزالی و رازیؔ اور ابنؔ تیمیہ وابنؔ قیم سے سرگوشیاں کی تھیں، سپرد خاک کیا، اب یوم نشور تک اس دور کا یہ گمنام محدث یوں ہی محوخواب رہے گا، اللہ اس کی تربت پر رحمت و رضوان کے پھول برسائے۔ (مارچ ۱۹۵۶ء)

سہیل، اقبال احمد خان، مولوی

مولوی اقبال احمد خان سہیل

ابھی یہ سطریں زیر تحریر تھیں کہ اعظم گڈھ کی نامور اور صاحبِ کمال شخصیت مولوی، اقبال احمد خان صاحب سہیل نے وفات پائی، وہ علامہ شبلی مرحومؒ کے خاص تلامذہ میں تھے، اپنے زمانہ میں نامور علیگ، عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں کے ماہر تھے، قوتِ حافظہ اور ذہانت و ذکاوت میں بے مثال، اردو کے نکتہ سنج ادیب اور اردو و فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے، قصیدگوئی اور نعت ومنقبت نگاری میں اس زمانہ میں ان کا جواب نہ تھا، ان کا فارسی کلام ایران کے قدیم اساتذہ کے کلام کی ہمسری کرتا تھا، علمی قابلیت کے لحاظ سے غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے، مگر وکالت کے پیشہ نے ان کے جوہروں کو چمکنے نہ دیا، اگر وہ کسی علمی شعبہ میں ہوتے تو ہندوستان کے مشاہیر اہل علم میں ان کا شمار ہوتا، دارالمصنفین سے ان کے تعلقات بڑے گوناگوں اور گہرے تھے۔ اللہ تعالیٰ اس مداح رسول اور منقبت نگار صحابہ کو آخرت کے انعام سے سرفراز فرمائے۔ (''م''، نومبر ۱۹۵۵ء)

جیراج پوری، اسلم، مولانا

مولانا اسلم صاحب جیراج پوری

مولوی اقبال احمد خاں صاحب سہیل کی وفات کا حادثہ ابھی تازہ تھا کہ اعظم گڑھ کی ایک اور نامور شخصیت اٹھ گئی، اور ملک کے مشہور مصنف اور صاحب قلم مولانا اسلم صاحب جیراج پوری نے ۲۸/دسمبر کو انتقال کیا، ان کا وطن اعظم گڑھ کا مشہور گاؤں جیراجپور تھا، ان کے والد مولانا سلامت اللہ صاحب جماعت اہل حدیث کے ممتاز علماء میں تھے، نواب صدیق حسن خان نے بھوپال میں جن علماء کو جمع کیا تھا، ان میں ایک مولانا سلامت اللہ صاحب بھی تھے، وہ بھوپال کے عربی مدارس کے مہتمم تھے، اس لیے مولانا اسلم صاحب کی تعلیم و تربیت وہیں ہوئی، تکمیل تعلیم کے بعد وہ پیسہ اخبار لاہور کے علماء ادارت میں شامل ہوگئے، پھر علی گڑھ کالجڈ اسکول میں عربی کے مدرس ہوئے، کچھ دنوں تک لٹن لائبریری کے شعبہ مشرقیات کے نگراں رہے، اور عربی فارسی کتابوں کی فہرست مرتب کی، مسلم یونیورسٹی قائم ہونے کے بعد شعبہ عربی کے لکچرر ہوگئے، پھر جامعہ ملیہ کے قیام کے بعد یونیورسٹی سے قطع تعلق کرکے جامعہ ملیہ چلے آئے اور تاریخ اسلام کے پروفیسر مقرر ہوئے، اور آخر عمر تک جامعہ سے وابستہ رہے، اور بالآخر اسی کی خاک کا پیوند ہوئے۔

مرحوم صاحب علم ونظر عالم تھے، اگرچہ ان کی تعلیم پرانے اور پھر اہل حدیث کے ماحول میں ہوئی تھی لیکن وہ بڑے روشن خیال اور زمانہ کے حالات ورجحانات سے باخبر تھے، اور کسی سوسائٹی میں اجنبی نہیں معلوم ہوتے تھے، تالیف وتصنیف کا ذوق ابتداء سے تھا، اسلامی تاریخ پر تاریخ الامت، سوانح عمرو بن العاصؓ، تاریخ نجد، حیات حافظ، اور حیات جامی وغیرہ بہت سی کتابیں لکھیں، ان میں تاریخ الامت زیادہ مقبول ہوئی، ان کے مضامین کا ایک مجموعہ نوادرات کے نام سے چند سال ہوئے ادارہ طلوع اسلام کراچی سے شائع ہوا، شعروادب کا بھی ستھرا ذوق رکھتے تھے، اور بڑی شگفتہ اردو لکھتے تھے کبھی کبھی قومی وملی، تاریخی نظمیں بھی لکھتے تھے، ان کا ایک مختصر مجموعہ ''جواہر ملیہ'' کے نام سے شائع ہوچکا ہے، مسلکاً اہل قرآن کی طرف مائل تھے، مگر منکرین حدیث کی طرح غالی نہ تھے، اور سنت متواتر کو مانتے تھے، عملاً دیندار اور طبعاً بڑے سادہ، متواضع اور خلیق تھے، ان کی خوبیوں کے طفیل میں اللہ تعالیٰ ان کی ایک لغزش سے درگزر کرکے اپنی مغفرت سے سرفراز فرمائے۔ (''م''، جنوری ۱۹۵۶ء)

عبدالغفار، قاضی

قاضی عبدالغفار

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ ہماری پرانی علمی وتہذیبی بزم کی ایک اور روشن شمع خاموش ہوگئی، اور قاضی عبدالغفار صاحب نے موت وحیات کی طویل کشمکش کے بعد ۱۷/جنوری کو انتقال کیا، وہ ہماری بزم کہن کی اہم یادگار، حکیم اجمل خاں کے ندیم خاص، مولانا محمد علی کے ہمدم و ہمراز، مولانا ابوالکلام کے ہم نشین، ایک تجربہ کار صحافی اور

صاحبِ طرز ادیب تھے، چمنستانِ ادب اور خارزار صحافت دونوں میں ان کے قلم کی روانی یکساں تھی اور طنز لطیف میں تو آپ اپنی مثال تھے، ہماری زبان میں ان کے ''ہلکے ہلکے اشارے'' طنز و ظرافت کے شرارے اور اردو ادب کے شہ پارے ہوتے تھے۔

وہ پرانے قوم پرست اور وطن پرور تھے، ترک موالات اور خلافت کی تحریکوں میں سرگرمی سے حصہ لیا، اس کے بعد بھی صحافت کے دائرے کے اندر ایک عرصہ تک ملکی سیاست میں حصہ لیتے رہے اور مختلف اوقات میں کلکتہ، دہلی اور حیدرآباد سے مختلف اخبارات جمہود، صباح اور پیام نکالے، ہمدرد میں مولانا محمد علی مرحوم کے دستِ راست تھے، ۱۹۲۲ء میں دوسرے وفد خلافت کے سکریٹری کی حیثیت سے لندن گئے تھے، ان کی کتاب نقش فرنگ اس سفر کا دلآویز مرقع ہے، وہ فطری ادیب تھے، ان کی کوئی تحریر ادب کی چاشنی سے خالی نہ ہوتی تھی، انجمن ترقی اردو کے دوبارہ قیام کے بعد اس کے جنرل سکریٹری ہوگئے تھے، بلکہ پہلی انجمن کے خاتمہ کے بعد دوبارہ ان ہی نے اس کو زندہ کیا تھا، اور اسکے ذریعہ آخر دم تک اردو کے لیے لڑتے رہے، اس صوبہ میں اردو کو جو حقوق بھی ملے ہیں اس میں انجمن کو بڑا دخل ہے۔

قاضی صاحب میں جدت و قدامت کا بڑا لطیف امتزاج تھا، وہ خیالات میں ترقی پسند تھے، لیکن تہذیب و معاشرت میں پرانے مشرقی آداب کے پابند اور قدیم تہذیب و شرافت کا بڑا دلکش نمونہ تھے، ان کی ہر چیز میں ایک خاص قسم کا سلیقہ، شائستگی اور نفاست تھی، جس کا اثر ان کی تحریروں میں بھی تھا، چنانچہ ان کی کوئی تحریر ادبی لطافت سے خالی نہ ہوتی تھی، اسی لیے ادب میں ترقی پسندی کے باوجود وہ ترقی پسند ادیبوں کی بے اعتدالیوں کو پسند نہ کرتے تھے۔

ان کی زندگی کا بڑا حصہ زبان و ادب کی خدمت میں گذرا اور اسی پر ان کا خاتمہ ہوا، ان کی تصانیف نقش فرنگ، حیات اجمل، آثار اجمل الدین افغانی، آثار ابوالکلام آزاد لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں، اور جب تک اردو زبان باقی ہے ان کا نام زندہ رہے گا، قاضی صاحب مرحوم کا بدل ہونا بہت مشکل ہے، اللہ ان کو عالم آخرت کی مقبولیت سے سرفراز فرمائے۔

(''م''، فروری ۱۹۵۶ء)

دیوجی، اچاریہ نریندر

اچارنریندر دیوجی

افسوس ہے کہ اچار نریندر دیوجی کی موت سے ہندوستان ایک بڑی شخصیت سے محروم ہوگیا، وہ اپنے اوصاف کے لحاظ سے ہندوستان کے ممتاز ترین لیڈروں میں تھے، سیاسی خدمات، ایثار و قربانی، علمی قابلیت، بے تعصبی، اور شرافت و وضعداری میں اس دور کے کم لیڈران کا مقابلہ کرسکتے تھے، وہ پنڈت جواہر لال کے پرانے رفیق اور جنگ آزادی کے نامور سپاہی تھے، اس راہ میں پنڈت جی کے دوش بدوش قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں، اردو، انگریزی، ہندی، اور سنسکرت چاروں زبانوں میں ان کو عبور حاصل تھا، اور ان کے بڑے اچھے مقرر تھے، ان کا یہ کمال تھا کہ جب اردو یا ہندی میں تقریر کرتے تھے تو دوسری زبان کا ایک لفظ بھی نہ آنے پاتا تھا، اودھ کی پرانی راجدھانی فیض آباد ان کا وطن تھا، اس لیے اردو ان کی مادری زبان تھی اور وہ بڑی فصیح و بلیغ اردو بولتے تھے، علمی قابلیت اور تعلیمی تجربہ کی بنا پر لکھنؤ اور ہندو یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے، متعدد کتابوں کے مصنف تھے، ان سب سے بڑھ کر ان کی بے تعصبی اور شرافت و وضعداری تھی، ہندوستان میں اس کے جو نمونے رہ گئے ہیں ان میں سے ایک وہ بھی تھے، ایک زمانہ تک کانگریسی رہے پھر اس سے بددل ہوکر سوشلسٹ پارٹی قائم کی، اگر وہ کانگریسی رہتے تو آج مرکزی حکومت کے وزیر ہوتے، مگر انھوں نے اپنے اصول و نظریات کے مقابلہ میں دنیاوی منصب وجاہ کی کوئی پرواہ نہ کی، اب ان کی جیسی شخصیتیں مشکل سے پیدا ہوں گی، اس لیے ان کی موت ایک بڑا قومی حادثہ ہے۔

(''م''، فروری ۱۹۵۶ء)

خان، امیر حسن، نواب

نواب امیر حسن خان

افسوس ہے کہ گذشتہ مارچ میں نواب صدیق حسن خان کے پوتے اور نواب علی حسن خان کے بڑے صاحبزادے نواب امیر حسن خان نے دفعۃً انتقال کیا، اس خاندان میں کئی پشتوں تک علم و دولت کا اجتماع رہا نواب علی حسن خان خود صاحبِ علم، اہل قلم کے قدردان اور لکھنؤ کی اہم شخصیت تھے، اس لئے علامہ شبلی مرحوم سے اُن کے بڑے گہرے تعلقات تھے، اس تعلق اور علم دوستی کی بنا پر ان کو ندوہ اور دارالمصنفین سے خاص تعلق تھا، ندوہ کے وہ ابتداء سے حامی و مددگار اور ایک زمانہ تک اس کے ناظم رہے، دارالمصنفین کے بھی رکن تھے، نواب صاحب کی زندگی تک ان کا دولت کدہ اصحابِ علم وکمال کا مرجع تھا، مگر ان کی وفات کے بعد اس خاندان کی پرانی شان قائم نہ رہ سکی، تاہم نواب امیر حسن خان نے حتی الامکان قدیم روایات اور پرانے تعلقات کو نباہنے کی کوشش کی، مگر زمینداری کے خاتمہ نے اس خاندان کا بالکل خاتمہ کردیا، ایک زمانہ میں بھوپال ہاؤس کی رونق اور چہل پہل قابلِ دید تھی، اور اب وہ تلک الایام نداولھا بین الناس [آل عمران: ۱۴۰] کا مرقع بن گیا ہے، نواب امیر حسن خان کی عمر ساٹھ سال کے قریب رہی ہوگی، اللہ ان کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے۔

(''م''، مئی ۱۹۵۶ء)

گیلانی، مناظر احسن، مولانا

مولانا مناظر احسن گیلانی

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کا حادثہ وفات ابھی فراموش نہ ہوا تھا کہ آسمان علم و ادب کا ایک اور آفتاب غروب ہوگیا اور مولانا مناظر احسن گیلانی نے ۵؍ جون ۱۹۵۶ء کو انتقال کیا، وہ اپنے اوصاف و کمالات میں علمائے سلف کی یادگار اور علوم کی جامعیت، ذہانت و ذکاوت، دین وتقویٰ اور اخلاق و سیرت میں اس دور میں یگانہ تھے، جو اسلامی علوم میں ان کی نگاہ نہایت وسیع اور اس کی ہر شاخ میں ان کے قلم و زبان کی روانی یکساں تھی، اپنی ذہانت و اطباعی سے ایسے ایسے گوشوں سے معلومات و مسائل کا استنباط اور معمولی معمولی باتوں میں ایسے ایسے لطائف و نکات پیدا کرتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی، علم ان کے تابع تھا وہ علم کے تابع نہ تھے ان کی ذہانت کتابوں کے انبار سے بے نیاز تھی، وہ تھوڑے معلومات سے ایسے مطول مضامین اور ضخیم کتابیں لکھ دیتے تھے جس کے لیے دوسرے مصنفین کو بڑے بڑے کتب خانوں کی ضرورت ہوتی ہے، ان کا نکتہ آفریں دماغ اور موّاج قلم جدھر رخ کر دیتا تھا، تحریر کا دریا بہا دیتا تھا، اور اپنے زور میں لعل و جواہر اور خس و خاشاک سب کو بہالے جاتا تھا۔

وہ ایک عرصہ تک جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات کے صدر رہے، اور چوتھائی صدی سے زیادہ، ان کا علمی و تعلیمی فیض جاری رہا، اس زمانہ میں انھوں نے اپنے تلامذہ سے جو علمی و تحقیقی مقالات لکھوائے وہ اسلامی علوم کو جدید رنگ میں پیش کرنے کا ایک نمونہ ہیں، اس کے ذریعہ انھوں نے اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے ایک شاہراہ قائم کردی۔

جامعہ عثمانیہ کے طلبہ میں اسلامی علوم پر تحقیقات اور جدید علوم سے ان کے موازنہ کا جو ذوق پیدا ہوا، اس میں مولانا گیلانی کو بڑا دخل ہے جامعہ عثمانیہ کے تعلق سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور مغربی علوم کے ماہروں سے ان کا بڑا سابقہ رہا اس لیے وہ جدید افکار و خیالات سے پوری طرح آگاہ اور عقائد میں رسوخ و استقامت کے ساتھ بڑے وسیع المشرب اور نئے اور پرانے دونوں طبقوں میں نہایت مقبول اور خاص عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

علم کے ساتھ اسی درجہ کا تقویٰ بھی تھا، علوم ظاہری کے ساتھ باطنی کمالات سے بھی آراستہ تھے، اس حیثیت سے ان کو درویش کامل اور شیخ طریقت کہنا صحیح ہوگا، اس شراب طہور نے ان میں بڑی کیفیت اور مستی پیدا کردی تھی جس کا اثر ان کی تحریروں میں نمایاں تھا، ان کو حضرت شیخ اکبر اور مجدد ہندی دونوں کے رنگ سے یکساں ذوق تھا، مگر رسمی و خانقاہی تصوف اور اس کی بدعات سے ہمیشہ دامن پاک رہا، طبعاً بڑے مرنجان مرنج، خاکسار، متواضع، خوش مزاج، خندہ جبیں اور بذلہ سنج تھے، گفتگو ایسی شگفتہ، دلکش اور لطائف وظرائف سے معمور ہوتی تھی کہ جس محفل میں بیٹھتے تھے شمع محفل معلوم ہوتے تھے، پندار کا ان میں شائبہ تک نہ تھا، اپنے چھوٹوں تک سے اس شفقت اور تواضع سے پیش آتے تھے کہ ان کو شرمندہ ہونا پڑتا تھا۔

طبیعت میں فقہ کا رنگ غالب تھا، ہزار بارہ سو ماہوار تنخواہ پاتے تھے، اس کی نصف پنشن رہی ہوگی، ایک زمانہ میں موٹر بھی تھا، کوٹھی بھی تھی، مگر کبھی ان چیزوں سے دل نہ لگایا، خود ان کی زندگی اتنی سادہ اور درویشانہ تھی کہ ان کی ظاہری حالت سے ان کی حیثیت کا قیاس نہیں کیا جاسکتا تھا، مگر دوسروں کے ساتھ بڑے فیاض اور مخیّر تھے، جو کچھ پیدا کیا سب صرف کردیا اور دولت دنیا سے پاک و صاف اٹھے، انھوں نے دینی و اسلامی علوم و مسائل پر ہزاروں صفحات لکھے اور اپنے بعد بہت بڑا علمی و مذہبی ذخیرہ یادگار چھوڑ گئے، ایسے جامع العلوم قلندر مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو عالم آخرت کی سربلندی سے سرفراز اور ان کے مدارج بلند فرمائے۔

دارالمصنفین سے ان کے تعلقات بڑے گہرے اور گوناگوں تھے، اس لیے ان کی یادگار میں انشاء اللہ معارف کا ایک خاص نمبر نکالنے کا ارادہ ہے، امید ہے کہ ان کے تلامذہ اور احباب اپنے مضامین سے اس نمبر کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں گے۔

(''م''، جولائی ۱۹۵۶ء)

بشیر الدین، مولوی

مولوی بشیر الدین

اسی مہینہ ہماری پرانی بزم کی ایک اہم اور قدیم یادگار مولوی بشیر الدین صاحب نے وفات پائی، وہ اپنے دور کی آخری نشانی تھے، ان کی ابتداء سرسید کی مخالفت سے ہوئی تھی، پھر ان کے حامی، مقلد اور ان کے مشن کے مبلغ بن گئے اور اپنی زندگی مسلمانوں کی تعلیمی خدمت کے لیے وقف کردی، اسلامیہ کالج اٹاوہ ان کا بڑا کارنامہ ہے۔

اخبار البشیر کے ذریعہ بھی انھوں نے بڑی خدمات انجام دیں ایک زمانہ میں وہ نہایت وقیع اخبار تھا اور اس کی آواز بڑی مؤثر تھی، تعلیم کے علاوہ بھی انھوں نے بہت سے تعمیری کام انجام دیئے، ان کی زندگی قومی کارکنوں کے لئے نمونہ تھی، وہ اگرچہ سرسید کی جماعت کے آدمی تھے، لیکن سیاسی خیالات میں آزاد اور قوم پرور تھے اور آخر تک اس مسلک پر قائم رہے۔ اب ایسے مخلص اور عملی انسان مشکل سے پیدا ہوں گے، ایک سو سال سے زیادہ کی عمر پائی، اللہ تعالیٰ اس کہن سال خادم قوم کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے۔

(''م''، جولائی ۱۹۵۶ء)

دہلوی، سید مرتضیٰ علی

سید مرتضیٰ علی دہلوی

اسی مہینہ دارالمصنفین کے ایک پرانے مخلص سید مرتضیٰ علی صاحب دہلوی نے انتقال کیا، وہ کوئی مشہور آدمی نہ تھے، مگر اپنے اوصاف کے لحاظ سے بڑے انسان تھے، دہلی کے ایک قدیم اور اونچے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، نواب علی حسن خاں مرحوم کے داماد تھے، دارالمصنفین کے بڑے ہمدرد ہواخواہ اور اس کی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے، وہ جدید تعلیم یافتہ تھے، ابھی تھوڑے دن ہوئے مرکزی حکومت کے ایک بڑے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے لیکن بڑے دیندار اور اخلاق و شرافت کا مجسم پیکر تھے، جامع مسجد کے قریب ہی مکان تھا، اکثر نمازیں جامع مسجد میں ادا کرتے تھے، بڑے مخیّر خلیق اور مہمان نواز تھے، ان کا گھر مستقل کارواں سرا تھا، بعض بعض مہمان مہینوں بلکہ برسوں مقیم رہتے تھے اور وہ بڑی خندہ پیشانی سے میزبانی کے فرائض انجام دیتے تھے، قومی و ملی اداروں اور اس کے کارکنوں سے خاص تعلق رکھتے تھے، دارالمصنفین سے ان کو بڑا مخلصانہ تعلق تھا، ہر وقت اس کی خدمت کے لیے کمربستہ رہتے تھے، غرض وہ اپنے اخلاق و سیرت میں قدیم تہذیب شرافت کا نمونہ تھے، اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کے طفیل میں ان کی مغفرت فرمائے۔ (''م''، جولائی ۱۹۵۶ء)

غلام محمد

غلام محمد صاحب (گورنر جنرل پاکستان)

افسوس ہے کہ غلام محمد صاحب گورنر جنرل پاکستان نے ایک طویل علالت کے بعد انتقال کیا، وہ نہ صرف اپنے عہدوں بلکہ دل و دماغ کے لحاظ سے بھی اس دور کے نامور لوگوں میں تھے، خصوصاً مالیات کے بڑے ماہر تھے، ایک زمانہ میں حکومت ہند اور ریاست حیدرآباد میں فنانس کے بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز رہے تھے اور ہر جگہ اپنی مہارت فن کا ثبوت دیا، پاکستان کی گورنر جنرلی کے زمانہ میں ان کی سیاسی اور دماغی قابلیتیں نمایاں ہوئیں، چنانچہ انھوں نے بڑے نازک موقعوں پر پاکستان کی حکومت کو اپنی ہوشمندی اور قوت سے خطرات سے بچایا اور اس کے استحکام کی کوشش کی، گو ان کے بعض اقدام آمرانہ تھے، لیکن پاکستان جیسے ڈاواں ڈول سیاست والے ملک کے لیے ایسے ہی مضبوط لیڈر بلکہ ایک اچھے ڈکٹیٹر کی ضرورت ہے، اس کے بغیر اس کو استحکام نہیں ہوسکتا۔

ان کی قابلیتوں کے ساتھ ان کی ذات مختلف حیثیتوں سے بڑی غنیمت تھی، وہ پنجابی تھے لیکن ان کی تعلیم علی گڑھ میں ہوئی تھی، پھر ملازمت کے سلسلہ میں عرصہ تک دلی اور لکھنو میں رہے، اس لیے اس صوبہ کے لوگوں سے ان کے بڑے تعلقات تھے، پنڈت جواہر لال نہرو بھی ان کے دوستوں میں تھے، اس لیے قدرۃً اس کا اثر دونوں ملکوں کی سیاست پر بھی پڑتا تھا، چنانچہ غلام محمد صاحب مرحوم کی گورنر جنرلی کے زمانہ میں دونوں ملک ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے تھے، جس کی توقع نئے اور اجنبی لوگوں سے نہیں ہوسکتی، مذہبی حیثیت سے راسخ العقیدہ بلکہ خوش عقیدہ مسلمان تھے، حج و زیارت سے بھی مشرف ہوئے تھے، حاجی وارث علی قدس سرہ سے ان کو بڑی عقیدت تھی، چنانچہ اپنی گورنر جنرلی کے زمانہ میں وہ ان کے مزار کی زیارت کے لیے دیوہ آئے تھے، ان میں پرانی تہذیب کی بہت سی خوبیاں تھیں، وہ ایک عرصہ سے فالج میں مبتلا تھے، نقل و حرکت سے بالکل معذور ہوگئے تھے، زبان بھی پوری طرح کام نہ دیتی تھی، لیکن دماغ اس حالت میں بھی پورا کام کرتا تھا اور انھوں نے اس معذوری کے زمانہ میں جو کارنامے انجام دیئے، وہ بہت تندرست بھی مشکل سے انجام دے سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ محمدؐ کے اس غلام کو ان کے طفیل میں عالم آخرت کی سربلندی سے بھی سرفراز فرمائے۔

(''م''، ستمبر ۱۹۵۶ء)

لدھیانوی، حبیب الرحمٰن، مولانا

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

یہ سطریں زیر تحریر تھیں کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی کی وفات کی خبر ملی، مرحوم ملک و ملت کے پرانے خدمت گزار، مجلس احرار کے مشہور لیڈر اور جنگ آزادی کے ممتاز مجاہدین میں تھے اور اس راہ میں قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں، کانگریس سے ان کا تعلق بہت قدیم تھا، جو ہر زمانہ میں برابر قائم رہا، ہندوستان کی تقسیم اور اپنے وطن لدھیانہ کی تباہی کے بعد دلی میں متوطن ہوگئے تھے، ان کی عمر کا بڑا حصہ قوم و ملک کی خدمت میں گزرا طبعاً بڑے خاکسار متواضع، فیاض اور مہمان نواز تھے، دارالمصنفین کے لوگوں سے بڑا اخلاص رکھتے تھے، جب مشرقی اضلاع کی جانب آنا ہوتا تھا تو دارالمصنفین ضرور آتے تھے، ان کی صحت عرصہ سے خراب تھی، ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے آنتوں کا آپریشن ہوا تھا، اس سے تو صحت یاب ہوگئے تھے، مگر ۲/ستمبر کو قلب کا دورہ پڑا اور دفعتہً انتقال کرگئے، اللہ تعالیٰ اس پرانے خادم قوم کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے۔ (''م''، ستمبر ۱۹۵۶ء)

ندوی، عبدالسلام، مولانا

آہ مولانا عبدالسلام ندوی

تو نظیری نہ فلک آمد وبودی جو مسیح
باز پس رفتی وکس قدر تو نشناخت دریغ

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کا غم ابھی بھولا نہ تھا، مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کی یاد ابھی بالکل تازہ تھی کہ ایک اور قدیم اور اہم علمی یادگار مٹ گئی اور مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے ۳ اور ۴ اکتوبر کی درمیانی شب کو دفعتہً انتقال کیا، دارالمصنفین کی پرانی بزم علمی کی یہی ایک شمع رہ گئی تھی جس سے اس دور کی یاد قائم تھی، افسوس کہ وہ ابھی گل ہوگئی، مرحوم مولانا شبلی کے شاگرد رشید دارالمصنفین کے پرانے رکن رکین اور اس کے علمی کاموں میں حضرت الاستاذ کے دست راست تھے، ایک زمانہ میں دونوں کا نام ساتھ ساتھ لیا جاتا تھا، وہ دارالمصنفین کے قیام کے ساتھ ہی اس سے وابستہ ہوگئے تھے اور مرکر اس سے جدا ہوئے۔

وہ فطری مصنف و اہل قلم اور ادیب و انشا پرداز تھے، ان کی اس استعداد کا اعتراف مولانا شبلیؒ کو ان کی طالب علمی کے زمانہ سے تھا، اور انھوں نے ان کے ایک کامیاب مصنف بننے کی پیشین گوئی کی تھی، یہ پیشین گوئی پوری ہوئی اور ہندوستان کے نامور مصنفین میں ان کا شمار ہوا، ان کی تصانیف نے دوسروں کو مصنف اور ادیب و انشا پرداز بنادیا اور ملک کا علمی مذاق بنانے میں ان کا بھی حصہ ہے، ان کی قوت اخذ بڑی تیز تھی، سرسری مطالعہ سے کتابوں کا جوہر کھینچ لیتے تھے قلم برداشتہ لکھتے تھے اور اس پر نظر ثانی اور حک و اصلاح کی ضرورت بہت کم پیش آتی تھی، ان کا مسودہ اولیٰ ہی مبیضہ ہوتا تھا، قلم کی یہ پختگی کم مصنفین کو نصیب ہوتی ہے، علامہ شبلی کی زندگی ہی میں، الندوہ کے سب اڈیٹر اور اس کے بعد اڈیٹر ہوگئے تھے، پھر الہلال میں مولانا ابوالکلام کے شریک کار رہے، دارالمصنفین کے قیام کے بعد ۱۹۱۴ء میں یہاں چلے آئے اور آخر عمر تک اس سے وابستہ رہے۔

اپنی بہت سے خصوصیات میں وہ اس زمانہ میں یگانہ تھے، نہایت معصوم اور بے نفس انسان تھے، وہ ایک مشہور مصنف اور نامور اہل قلم تھے، مگر اس حیثیت کا احساس تک ان کو نہ تھا اور علم کے پندرا اور شہرت و نام و نمود کی طلب کا تصور بھی ان کے دماغ میں نہ آتا تھا، پوری زندگی قناعت اور شان استغنا کے ساتھ ایک گوشہ میں گزار دی، تحمل و بربادی کا پیکر تھے، ناگوار سے ناگوار باتیں سن کر پی جاتے تھے اور چہرہ پر شکن تک نہ پڑتی تھی، حقوق العباد سے ان کا دامن اتنا پاک تھا اور معاملات کے اس قدر صاف تھے کہ کسی کا کوئی حق ان کے ذمہ نہ تھا اور ان کے حقوق بہتوں کے ذمہ نکلیں گے وہ اپنی حق تلفی پر بھی چشم پوشی سے کام لیتے تھے، ان کی ذات سے کسی کو ادنی تکلیف بھی کبھی نہیں پہنچی اور وہ **المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده** کا عملی نمونہ تھے، اس قدر سادہ مزاج اور بے تکلف تھے کہ چھوٹے بڑے ادنی و اعلیٰ ہر شخص سے ایک طرح سے ملتے تھے اور ادنی ملازمین تک ان سے بے تکلف تھے، ان کا ظاہر باطن یکساں تھا، نفاق کے نام سے ناآشنا تھے، باتیں ایسی معصوم اور بھولی کرتے تھے کہ ناواقف آدمی ان کو بمشکل پڑھا لکھا تصور کرسکتا تھا، جو لوگ ان کی تصانیف کے ذریعہ ان کو جانتے تھے وہ ان سے ملنے کے بعد ان کے مصنف ہونے کا یقین نہیں کرسکتے تھے، ان کی زندگی **كن في الدنيا كانك غريب او عابر سبيل** کا عملی نمونہ تھی، ناگزیر ضروریات زندگی کے علاوہ تعیش اور نمائش کا کوئی سامان کبھی نہیں رکھا، ان کا پورا اثاثہ اور دارالمصنفین کی ۴۵ سالہ زندگی کا حاصل چند جوڑے کپڑوں، دو بکس ایک ایک پلنگ اور ایک بستر سے زیادہ نہ تھا، یہ وہ اوصاف ہیں جو اس زمانہ میں کسی ممتاز انسان میں مشکل سے مل سکتے ہیں، اس لحاظ سے مرحوم بڑے انسان تھے، مگر افسوس ظاہر پرست دنیا نے، ان کی قدر نہ کی اور اپنے کمالات کے لحاظ سے وہ جس درجہ کے مستحق تھے، وہ حاصل نہ ہوسکا، اگرچہ وہ خود اس سے بہت بلند اور بے نیاز تھے۔

اس بے نفسی، سادگی اور بے تکلفی کی وجہ سے ہر طبقہ میں یکساں مقبول تھے اور خواص سے زیادہ عوام اور غربا، ان سے محبت کرتے تھے، ان کی موت کے بعد ہر زبان پر ان کی خوبیوں کا افسانہ اور ہر دل ان کی یاد میں مغموم تھا اور،

ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

کا منظر نظر آرہا تھا، جو انشاء اللہ عنداللہ ان کی مقبولیت کا ذریعہ ہوگا، کامل ۳۲ سال تک راقم کا ان کا اس طرح ساتھ رہا کہ سفر کے علاوہ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوئے، اس طویل تجربہ میں ہر حیثیت سے ان کو نہایت نیک نفس انسان پایا۔ یوں تو بشری کمزوریوں سے کوئی انسان بھی مستثنی نہیں ہے، اس لیے وہ بھی معصوم عن الخطا نہ تھے، مگر ان کی خطائیں بھی معصوم تھیں۔

انھوں نے نصف صدی تک علم و فن کی خدمت کی اور مختلف علمی، ادبی اور مذہبی موضوعوں پر ہزاروں صفحات لکھے، ان کی مستقل تصانیف کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے، شعر و ادب سے خاص ذوق تھا اور اس پر بڑی گہری اور استادانہ نظر رکھتے تھے، جس پر ان کی تصنیف شعرالہند شاہد ہے، مذہبی تصانیف میں تاریخ اخلاق اسلامی، اسوۂ صحابہؓ، اسوۂ صحابیاتؓ اور سیرت عمرؓ بن عبدالعزیز جیسی کتابیں لکھیں، متعدد مذہبی کتابوں کے ترجمے کیے، جنھوں نے کتنوں کو مسلمان بنادیا، اس حیثیت سے ان کی مذہبی خدمات بھی کم نہیں ہیں، ان کی آخری تصنیف حکمائے اسلام (حصہ دوم) حال ہی میں شائع ہوئی ہے، اس کو لے کر وہ اپنے قدیم رفیق مولانا ابوالکلام صاحب سے ملنے کے لیے دلی جانے والے تھے اور بڑے ذوق و شوق سے اس کی تیاریاں کررہے تھے کہ پیام اجل آگیا اور ایسا دفعتہً جدا ہوئے کہ اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا، ان کی یاد مدتوں فراموش نہ ہوگی اور ان کی ایک ایک ادا یاد آکر دلوں کو تڑپاتی رہے گی۔

اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

بارالٰہا اس نیک نفس انسان کی نیکیوں کے طفیل میں اس کی بشری لغزشوں سے

درگزر فرما، اپنے رحم و کرم سے اپنی رحمت و مغفرت کے دروازے اس کے لیے کھول دے اور جس طرح تو نے دنیا میں اس کو مقبولیت عطا فرمائی تھی، اسی طرح آخرت کی مقبولیت سے بھی سرفراز فرما۔ الھم صبب علیه شأبیب رحمتک و رضوانک یا ارحم الراحمین۔ (''م''، اکتوبر ۱۹۵۶ء)

کیفی چریاکوٹی، محمد مبین، مولوی

مولوی محمد مبین کیفی چریاکوٹی

دوسرا حادثہ مولوی محمد مبین صاحب کیفی چریاکوٹی کی وفات کا ہے، وہ ہندوستان کے قدیم نامور عالم اور مولانا شبلی کے استاد مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی کے لڑکے تھے اور اس دور کے مشہور شاعر اور اہل قلم تھے، انھوں نے عربی کی تعلیم اپنے والد سے پائی تھی مگر شعر و ادب کی جانب رجحان زیادہ تھا، اس لیے اسی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوئے، ایک زمانہ میں انھوں نے العلم کے نام سے ایک رسالہ بھی نکالا تھا، ان کا تعلق مختلف اداروں سے رہا، مگر طبیعت میں استقلال نہ تھا، اس لئے کوئی کام جم کر نہ کرسکے، آج سے دس پندرہ سال قبل ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے ان کا تعلق تھا، اس زمانہ میں انھوں نے جواہر سخن کے نام سے چار ضخیم جلدوں میں اردو شعراء کا مبسوط تذکرہ مرتب کیا جو چھپ کر شائع ہوگیا ہے، اب ان کی سب سے بڑی علمی یادگار یہی ہے اس کے علاوہ متفرق مضامین ہوں گے، کچھ دنوں تک مسلم یونیورسٹی کے کسی شعبہ میں رہے تھے، آج کل اٹاوہ میں تھے کہ وہیں یکم اکتوبر کو انتقال کیا ان کی موت سے چریاکوٹ کے عباسی خاندان کی آخری علمی یادگار مٹ گئی، اللہ تعالیٰ اپنی مغفرت سے سرفراز فرمائے۔

(''م''، اکتوبر ۱۹۵۶ء)

وحشتؔ، رضا علی

وحشت کی رحلت

(مسعود حسن)

کم وبیش چھ سال ہوئے ۱۹۵۰ء کے وسط میں جب حضرت وحشتؔ نے کلکتہ کے فرقہ وارانہ فسادات سے دلبرداشتہ ہوکر ترک وطن کیا تھا، اور زندگی کے آخری دن مشرقی پاکستان میں گذارنے کے لئے رخصت ہوئے تھے، تو کلکتہ میں ان کے عزیزوں، دوستوں، شاگردوں اور عقیدتمندوں کو اس سفر سے سخت صدمہ ہوا تھا، خود حضرت وحشتؔ جب تک ڈھاکہ میں رہے کلکتہ کی یاد انھیں بیقرار کرتی رہی، مگر کسے خبر تھی کہ ڈھاکہ میں صرف چھ سال کے قیام کے بعد ۲۰/ جولائی ۱۹۵۶ء کی شب کو وہ ایک اور سفر کے لئے آمادہ ہوجائیں گے، جو ان کا آخری اور سب سے لمبا سفر ہوگا اور جو آن کے آن میں طے ہوجائے گا۔

ہستی سے عدم تک نفسِ چند کی ہے راہ
دنیا سے گذرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

رضا علی وحشتؔ مرحوم کا تعلق دہلی کے ایک معزز خاندان سے تھا، جس نے ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد دہلی سے منتقل ہوکر بنگال کے مشہور ضلع ہوگلی میں سکونت اختیار کرلی تھی، ان کے والد ماجد حکیم مولوی شمشاد علی شعر و ادب کا اچھا خاصا ذوق رکھتے تھے، اور فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں فکر سخن کیا کرتے تھے، وحشتؔ کی ولادت ۱۸۸۱ء میں کلکتہ میں ہوئی اور یہیں مدرسہ عالیہ کے انگریزی شعبہ میں انھوں نے تعلیم کے مراحل طے کیے، تعلیم سے فارغ ہوکر کلکتہ کے امپیریل ریکارڈ ڈپارٹمنٹ میں چیف مولوی کے فرائض انجام دینے لگے، ۱۹۲۶ء میں جب مسٹر فضل الحق موجودہ گورنر مشرقی پاکستان کی سعی مشکور ہوئی اور اسلامیہ کالج کا قیام عمل میں آیا تو وحشتؔ مرحوم اردو کے لکچرر مقرر ہوئے، یہاں انہوں نے صرف دس سال گذارے مگر اس مختصر مدت میں انہوں نے صوبہ کے انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ میں اردو ادب اور شاعری کا صحیح ذوق پیدا کیا، ۱۹۳۱ء میں انگریزی سرکار نے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرکے ان کو ''خان بہادر'' کا خطاب عطا کیا، ۱۹۳۶ء میں کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے پھر مسٹر فضل الحق ہی کی کوششوں سے جب مسلمان لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے کلکتہ میں برابورن کالج وجود میں آیا تو اردو اور فارسی کی تعلیم کے لیے ان کا دوبارہ تقرر ہوا۔

وحشتؔ مرحوم کی زندگی کا اکثر حصہ مصائب و آلام کی تلخیوں میں گذرا یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کے آسمان پر رنج و غم کے بادل اکثر نظر آتے ہیں، افسوس ہے کہ ان تلخیوں نے ان کی شاعری کو تو فروغ بخشا، مگر خود انھیں ہمیشہ سکون قلب سے محروم رکھا، مالی دقتوں، رفیق زندگی کی دائمی مفارقت، جوان سال بیٹے کی جنوں زدگی اور پھر گمشدگی اور اس نوع کے دوسرے جانگسل صدمات کی تاب لانا وحشتؔ جیسے سخت جان ہی کا کام تھا، اوپر چند سالوں سے پیرانہ سالی کی بنا پر ضعف اور علالت کے پے در پے حملے بھی شروع ہوگئے تھے، خصوصاً مشرقی پاکستان پہنچ کر ان کی صحت تیزی کے ساتھ گرتی گئی، یہاں تک کہ ۱۹۵۴ء کے وسط میں وہ نقل و حرکت سے قطعاً مجبور ہوگئے، چنانچہ اپنے مکتوب مورخہ ۲۳/ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں بڑی حسرت سے تحریر فرماتے ہیں:

''اب تو میں برائے نام زندہ ہوں، دو قدم چلنا بے سہارے مشکل ہوتا ہے، ہاتھ ہے کہ بری طرح لرزاں رہتا ہے، سر ہے کہ مکرر چکراتا ہے:

تو اے کبوتر بامِ حرم چہ می دانی
تپیدن دلِ مرغان رشتہ بر پارا

جب آپ مجھے دیکھیں گے تو اندازہ کرسکیں گے''۔

وحشتؔ کی سیرت، ان کا اخلاق اور ان کی شرافت ان کی شاعری کی طرح زبان زدخاص وعام ہے، وہ فطرۃً سنجیدہ، متین، متواضع اور منکسر المزاج واقع ہوئے تھے، کم آمیزی کی بنا پر احباب کا حلقہ محدود تھا، مگر جس سے ملتے تھے انتہائی خلوص اور محبت سے ملتے تھے، اور ایک مرتبہ جب کسی سے تعلقات قائم ہوجاتے تھے تو انھیں زندگی بھر نباہنے کی کوشش کرتے تھے، قدیم مشرقی تہذیب، شائستگی اور وضعداری کا زندہ نمونہ تھے، طبیعت کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ ٹریم کے علاوہ کسی دوسری سواری پسند نہیں فرماتے تھے، کبھی کسی پر اپنی صلاحیتوں کا رعب نہیں ڈالتے تھے، ہم عصروں اور خصوصاً نوجوانوں سے کوئی غلطی ہوجاتی تو شفقت اور نرمی سے اس کی اصلاح کردیا کرتے تھے، اس وقت بھی جب کہ وہ پورے ہندوستان کے اساتذہ کی صف اول میں ممتاز جگہ پا چکے تھے، بڑی عرق ریزی اور جگر کاوی سے کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے، میرے ایک ہندو دوست نے جو فارسی اور اردو کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے اور کچھ ہی دن ہوئے تقسیم پنجاب کے بعد کلکتہ چلے آئے تھے، ایک مرتبہ کرزن پارک میں ایک معمر شخص کو دیکھا، جو ایک بنچ پر بیٹھا کسی قدر بلند آواز سے چہار مقالۂ نظامی عروضی پڑھ رہا تھا، پارک کی خالص مغربی فضا، اس میں مشرقی وضع قطع کا ایک انسان اور اس کے ہاتھ میں چھٹی صدی ہجری کی ایک فارسی کتاب، میرے دوست کے لیے یہ ایک عجیب سا منظر تھا، انھیں بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بزرگ حضرت وحشتؔ تھے، ان کی اکثر ملاقاتیں شعر وادب کی راہ سے قائم ہوئیں، یہ ادبی رشتے بعض صورتوں میں قرابت سے بھی زیادہ گہرے ہوجایا کرتے تھے، وہ شعر وسخن کی محفلوں سے کبھی نہیں اکتاتے تھے، جب تک کہ کلکتہ میں رہے دلکشا اسٹریٹ اور پھر ویلسلی سکنڈلین میں ان کی نشست گاہ تشنہ کامانِ ادب اور جرعہ کشانِ غزل کا قبلہ حاجات بنی رہی، ہر ہفتہ اتوار کی سہ پہر کو پابندی سے ان کی کوٹھی میں احباب اور شاگردوں کا اجتماع ہوا کرتا تھا جس میں بڑی دلچسپ ادبی بحثیں چھڑتی تھیں اور خوب خوب غزلخوانی ہوا کرتی تھی، افسوس کہ یہ میکدۂ وحشت آج سونا پڑا ہے۔

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

وحشتؔ کے علمی وادبی کمالات کی تفصیل پیش کرنے کا یہ موقع نہیں ہے مگر اس خیال سے کہ ان کے نقوش حیات دھندلے نہ رہ جائیں، اس سلسلے کی چند باتیں مختصراً عرض کرنا چاہتا ہوں، مرحوم فارسی اور اردو کے پختہ کار ادیب اور نقاد تھے، ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا، چنانچہ فارسی اور اردو شعرا کے اکثر دیوان اور تذکرے ان کی نظر سے گذر چکے تھے، ان کی وسعت نظر، علمی شغف، ذوق تحقیق اور بلند ادبی مذاق کا کسی قدر اندازہ ان کے ان بلند پایہ علمی، ادبی اور تنقیدی مقالات سے ہوتا ہے، جو اردوئے معلی، دکن ریویو، نقاد اور مخزن وغیرہ میں شائع ہوا کرتے تھے، ان کی نگاہیں ادب کی گہرائیوں تک جاتی تھیں جہاں اوروں کی رسائی ناممکن ہوتی تھی، چنانچہ مولانا حالیؔ نے اپنی قدیم غزلوں پر وحشتؔ کا ایک مضمون پڑھ کر اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا: ''تم ہی ایک شخص ہو جس نے میری شاعری کو شاعرانہ نقطۂ نظر سے دیکھا ہے، ورنہ میں تو قوم کا ایک مرثیہ گو سمجھا گیا ہوں اور بس''، انھیں انگریزی بولنے اور لکھنے کی بھی بڑی اچھی مہارت تھی، اور ان کے انگریزی مضامین جو زیادہ تر مسلم انسٹیٹیوٹ کے رسالہ میں نکلتے قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، مگر ان کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ جس نے ان کو شہرتِ دوام بخشی، ان کی شاعری ہے۔

قدرت نے شعر وشاعری کی غیر معمولی صلاحیت انھیں اپنے ہاتھوں ودیعت کی تھی، اور بلا شبہ وہ ایک فطری شاعر تھے، اور زمانۂ حال کے شعرا کی عام روش کے خلاف اپنی اس صلاحیت کی اعلیٰ تربیت اور نشوونما کے لیے انھوں نے محنت وکاوش اور جگر کاوی سے بھی دریغ نہیں کیا، چنانچہ خود فرماتے ہیں:

فروغ طبع خدا داد اگرچہ تھا وحشتؔ
ریاض کم نہ کیا ہم نے کسبِ فن کے لیے

۱۵ سال کی عمر سے شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے، مولوی ابوالقاسم شمس مرحوم سے جو فصیح الملک داغؔ دہلوی کے شاگرد اور مولوی عبدالغفور نساخؔ کے بیٹے تھے، تلمذ کا شرف حاصل کیا، ۱۹۱۱ء میں پہلا دیوان جس میں ابتدائی مشق کی غزلیں بھی شامل تھیں، منظر عام پر آیا، اور اس نے مولانا حالیؔ، علامہ شبلیؔ نعمانی، ڈاکٹر اقبالؔ، اکبرؔ الہ آبادی، مولانا عبدالحلیم شرر، نظم طباطبائی، شوقؔ قدوائی، شادؔ عظیم آبادی اور حسرتؔ موہانی جیسے اکابر علم وفن سے خراج تحسین وصول کیا، وحشتؔ قدیم دبستان غزلگوئی کے معتقد اور پیرو تھے، اور اس پر انھیں فخر بھی تھا، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''میں پرانی لکیر کا فقیر اور قدیم طرز سخن کا دلدادہ ہوں''، امیرؔ لکھنوی کا یہ شعر بھی اکثر ان کی زبان پر رہتا تھا۔

گذشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں
مٹا ہوا سا نشانِ سرِ فرار ہوں میں

اردو اور فارسی کے اکثر اساتذہ کا کلام شوق سے پڑھا کرتے تھے، مومنؔ، داغؔ اور حالیؔ کی شاعری سے بڑی حد تک متاثر ہوئے تھے، مگر غالبؔ سے انھیں والہانہ عقیدت تھی، اسی کا نتیجہ تھا کہ اپنی شاعری کے ابتدائی چند سالوں کے سوا عمر بھر غالبؔ کا تتبع کرتے رہے، اور اس طرز خاص میں انھیں جو کامیابی حاصل ہوئی وہ مشکل سے کسی اور کو نصیب ہوئی ہوگی، خیالات کی بلندی اور مضمون آفرینی، جذبات کی تصویر کشی اور تغزل کی رنگینی، زبان وبیان کی شیرینی اور خوشگوار فارسی ترکیبوں کی دل نشینی، یہ ساری خصوصیتیں جو مرزاؔ کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہیں، ان کے کلام میں بھی بڑے سلیقے سے موجود ہیں، مگر ان کے یہاں مرزاؔ کی پیچیدہ گوئی اور مشکل پسندی کے نمونے بہت کم ملتے ہیں، ان کا انفرادی رنگ انکے طرز ادا کی دلکشی اور رعنائی ہے، وہ ہمیشہ شگفتہ بحریں

پسند کرتے تھے، اور اکثر اساتذہ کی غزلوں پر غزلیں کہا کرتے تھے، زندگی کے آخری چند سالوں میں اپنا دوسرا دیوان مرتب کیا، جو ترانہ وحشتؔ کے نام سے ۱۹۵۳ء میں لاہور سے شائع ہوا، یہ ان کی آخری یادگار ہے، اس کے علاوہ شاگردوں کی ایک بہت بڑی جماعت بھی بطور یادگار چھوڑ گئے، جواس وقت ہندوستان و پاکستان کے مختلف حصوں میں اردو شاعری کا چراغ روشن کررہی ہے۔

خداتعالیٰ مرحوم کی تربت پر رحمت کے پھول برسائے، اور ان کی روح کو اپنے سایۂ عاطفت میں جگہ دے۔

اے غائب از نظر کہ شدی ہمنشینِ دل
می بنیمت عیاں و دعا می فرستمت

(نومبر ۱۹۵۶ء)

ظفرعلی خان، مولانا

مولانا ظفرعلی خان

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ ۲۷/نومبر کو مولانا ظفر علی خان نے بھی سفر آخرت کیا، ان کی موت سے ایک اہم تاریخی یادگار مٹ گئی، وہ پرانے نامور علیگ اور مولانا شبلی مرحوم کے شاگرد تھے، نئی نسل ان کی اہمیت اور ان کے کارناموں کا اندازہ کر ہی نہیں سکتی، ایک زمانہ میں پورا ہندوستان ان کی شہرت سے گونجتا تھا، اور سیاست وصحافت، انشاء وخطابت، سخن وری سخن سنجی ہر میدان میں ان کا طوطی بولتا تھا، وہ اپنے زمانہ کے بڑے جری، دلیر، پرجوش اور سرفروش لیڈر، شعلہ بیان خطیب، سحرطراز ادیب اور قادر الکلام ونکتہ سنج شاعر تھے، ان کے قلم اور زبان دونوں میں سیلاب کا جوش وخروش تھا، اپنی تحریر وتقریر سے طوفان بپا کردیتے تھے، ملک وملت کی راہ میں ان کے بڑے کارنامے اور بڑی قربانیاں ہیں، ان کے زمانہ میں کوئی مذہبی وملی اور قومی وسیاسی تحریک ایسی نہ تھی، جس میں ان کا سرگرم حصہ نہ رہتا ہو، وہ اس زمانہ میں انگریزی حکومت سے ٹکرلیتے تھے، جب اس کے جلال و جبروت کا آفتاب نصف النہار پر تھا، اور بڑے بڑے لیڈر اعتدال سے باہر قدم نکالنے کی ہمت نہ کرتے تھے اور اس راہ میں جانی و مالی ہرقسم کی قربانیاں کیں اور برسوں قید وبند کی مصیبتیں جھلیں۔

ان کا اخبار زمیندار اپنے زمانہ کا اردو کا سب سے مشہور اور ممتاز اخبار تھا، ہندوستان خصوصاً مسلمانوں کی بیداری میں اس کا بڑا حصہ ہے، اس نے جس قدر مالی نقصان برداشت کیا ہے، اس کی مثال اردو اخباروں میں نہیں مل سکتی، زمیندار کا ادارہ صحافت کی مستقل تربیت گاہ تھا، پنجاب کے اکثر اخبار نویس اسی ادارہ کے تربیت یافتہ ہیں، قادرالکلامی میں اکبر کے بعد ظفر علی خاں ہی کا درجہ تھا، وہ ایسی ایسی مشکل زمینوں میں ایسے ڈھلے ہوئے شعر کہتے تھے کہ دوسرے شعراء ان زمینوں میں قدم رکھنے کی ہمت نہیں کرسکتے، بدیہہ گو ایسے تھے کہ بات کرتے جاتے تھے اور شعر ڈھل ڈھل کر نکلتے جاتے تھے، ان کے کلام کا بڑا حصہ قومی وملی شاعری اور وقت کے اہم واقعات و حوادث اور ان سے متعلق جذبات وتاثرات پر مشتمل اور رنگارنگ پھولوں کا دلکش گلدستہ ہے، خصوصاً طنزیہ شاعری کے بادشاہ تھے، قادیانیوں، حکومت پرستوں، ہندومہاسبھا، آریا سماج اور شدھی اور سنگھٹن وغیرہ کے متعلق ان کی طنزیہ نظمیں بہت خوب ہیں، ان کے کلام کا مجموعہ عرصہ ہوا نگارستان کے نام سے چھپ چکا ہے۔

وہ جس درجہ کے ادیب وشاعر تھے، اسی درجہ کے مترجم بھی تھے، اپنے زور قلم سے ترجمہ کو اصل سے بڑھا دیتے تھے، ڈاکٹر جان ولیم ڈریپر کی مشہور تصنیف (Conflict between Religion & Science) کا ترجمہ معرکہ مذہب و سائنس کے نام سے کیا۔ لارڈ کرزن کی کتاب ''پرشیا'' کے پہلے حصہ کا ترجمہ ''خیابان فارس'' کے نام سے کیا، مولانا شبلی مرحوم کی الفاروق کی پہلی جلد کا انگریزی میں ترجمہ کیا، جس کو شیخ محمد اشرف تاجر کتب لاہور نے شائع کیا ہے اور چھوٹی چھوٹی متعدد تصانیف اور تراجم ہیں، زمیندار کے علاوہ ایک ہفتہ وار اخبار سیارہ صبح لاہور سے اور دو ماہانہ رسالے فسانہ اور دکن ریویو حیدرآباد سے نکالے تھے۔

وہ طبعاً بڑے پرجوش اور انتہاپسند تھے، اس لیے کبھی کبھی ان کا قدم جادہ اعتدال سے باہر نکل جاتا تھا، اس کا اثر ان کی تحریر، تقریر اور شاعری سب میں نظر آتا تھا، وہ نہایت راسخ العقیدہ مسلمان تھے، ان کا دل دینی اور ملی حمیت سے معمور تھا، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کوئی بات برداشت نہ کرسکتے تھے، ان کی اسلامیت ہی کانگریس سے ان کی علیحدگی کا باعث ہوئی، ایک زمانہ تک وہ کانگریس کے ساتھ رہے اور اس کے لئے بڑی قربانیاں کیں، مگر اس کی فرقہ پرستی اور تنگ نظری دیکھ کر اس سے الگ ہوگئے اور احرار کے نام سے خود مسلمانوں کی قوم پرور جماعت قائم کی، پھر نیلی پوشوں کی تحریک چلائی، آخر میں مسلم لیگ میں شامل ہوگئے تھے اور پنجاب میں اس کی کامیابی میں ان کی کوششوں کو بڑا دخل تھا۔

غرض ان کی زندگی شروع سے آخر تک بڑی ہنگامہ خیز اور سراپا حرکت وعمل رہی، قیام پاکستان کے بعد ضعف پیری کی وجہ سے عزلت نشین ہوگئے تھے اور اب تو عرصہ سے ان کی یاد بھی فراموش ہوچلی تھی، بالآخر اسی گوشۂ خمول میں یہ تابناک شمع جس سے ایک زمانہ میں ہر محفل میں اجالا رہتا تھا، خاموش ہوگئی، والبقاء للّٰہ وحدہ، اللہ تعالیٰ دین وملت کے اس خادم کو اپنے رحمت ومغفرت سے سرفراز فرمائے۔

(''م''، دسمبر ۱۹۵۶ء)

احمد، سلطان، مرزا

مرزا سلطان احمد

افسوس ہے کہ اعظم گڑھ کی ممتاز مقبول شخصیت مرزا سلطان احمد صاحب رٹائرممبر بورڈ آف ریونیو نے طویل علالت کے بعد گزشتہ ۱۷رفروری کو انتقال کیا وہ پرانے علیگ اور اپنے زمانہ کے لائق ترین عہدہ داروں میں تھے، اپنی قابلیت سے ڈپٹی کلکٹری سے کلکٹری اور بورڈ کی ممبری تک ترقی کی اور جہاں رہے اپنی دیانتداری اور شرافت سے مقبول و نیک نام رہے، بڑے عہدہ داروں میں ایسے شریف اور خلیق انسان کم دیکھنے میں آئے ہیں، ان کا خمیر ہی اخلاق و شرافت سے گوندھا گیا تھا، ادنی و اعلیٰ ہر شخص کے ساتھ ان کا اخلاق یکساں تھا، ہر ملنے والے کے ساتھ کوئی نہ کوئی ایسی خصوصیت ضرور برتتے تھے جس سے اس کو یہ محسوس ہوتا کہ وہ اس کے ساتھ خاص تعلق رکھتے ہیں۔

بڑے وضعدار، فیاض اور مہمان نواز تھے جس سے جس قسم کے تعلقات تھے، اس کو عمر بھر نباہا، ملازمت کے زمانہ میں ان کا دسترخوان بڑا وسیع اور گھر مستقل مہمان خانہ تھا، ان کے اعزہ واحباب میں سے کوئی نہ کوئی ان کے یہاں مستقل مقیم رہتا تھا اور جس کو ضرورت ہوتی اس کی نقدی سے بھی مدد کرتے تھے، ہر حاجت مند کی مدد کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے اور اس کے لیے ایسے کام کر گزرتے تھے جس کی ہمت ہر شخص نہیں کرسکتا، وہ بڑے تنخواہ دار تھے لیکن جو کچھ کمایا سب صرف کردیا، اعظم گڑھ میں دو ہی ایسے شخص تھے جنھوں نے بہت پیدا کیا، مگر اپنے بعد کچھ نہیں چھوڑا، ایک مرزا صاحب، دوسرے اقبال سہیل مرحوم ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد حکومت نے ان کے سامنے پبلک سروس کمیشن کی ممبری پیش کی، مگر انھوں نے وطن چھوڑنا پسند نہ کیا اور اعظم گڑھ کی سرزمین ہی میں پیوند خاک ہوئے۔ دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے پرانے رکن اور اس کے خاص ہمدردوں میں تھے اور یہاں کے لوگوں سے ان کے عزیزانہ تعلقات تھے، ان کی موت سے اعظم گڑھ کا شریف ترین انسان اٹھ گیا، جس کا بدل پیدا ہونا مشکل ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کے طفیل میں ان کی مغفرت فرمائے، انتقال کے وقت کل ۶۴ سال کی عمر تھی۔ (''م''۔ مارچ ۱۹۵۷ء)

پھلواروی، محمد قمرالدین، مولانا سید شاہ

مولانا سید شاہ محمد قمرالدین پھلواروی

یہ خبر بھی افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ مولانا سید شاہ محمد قمرالدین صاحب پھلواروی، امیر شریعت صوبہ بہار نے ۳۱/ جنوری کو انتقال فرمایا، مرحوم مولانا سید شاہ بدرالدین صاحب مرحوم، امیر شریعت اول کے صاحبزادے اور علم و عمل میں اپنے اسلاف کرام کے خلف الصدق تھے، اپنے بڑے بھائی مولانا سید شاہ محی الدین صاحب مرحوم امیر شریعت ثانی کے انتقال کے بعد ان کے جانشین ہوئے اور امارت شرعیہ کی روایات اور اس کے مذہبی کاموں کو پوری طرح قائم و برقرار رکھا، ان کی وفات سے خاندان پھلواروی کی ایک اہم یادگار مٹ گئی، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے اور ان کے اخلاف کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشے۔ (''م''، مارچ ۱۹۵۷ء)

خان، آغا، سر

سر آغا خان

سر آغا خان کی وفات سے مسلمانوں کی ایک بڑی شخصیت اُٹھ گئی، وہ ایک اسلامی فرقہ کے امام و مذہبی پیشوا اور لاکھوں انسانوں کا مرکز عقیدت تھے، ان کی شخصیت بین الاقوامی تھی یورپ کے تمام ملکوں میں ان کا بڑا اعزاز تھا اور وہاں کے بڑے بڑے لوگوں سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے، اس زمانہ کا کوئی بڑا سے بڑا اعزاز ایسا نہیں ہے جو ان کو حاصل نہ رہا ہو، ان کی پوری زندگی یورپ کے گہوارہ عیش و نشاط میں گزری، مگر اس میں پڑ کر وہ اپنے فرائض سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔

وہ بڑے مدبر اور بیدار مغز تھے، سیاست پر گہری نظر رکھتے تھے، علم وفن سے بھی ذوق تھا، کئی زبانوں سے واقف تھے، قومی و ملی جذبہ بھی رکھتے تھے اور مسلمانوں کے عمومی معاملات میں کبھی فرقہ کی تفریق نہیں کی، اپنے فرقہ کی فلاح و بہبود کے ساتھ عام مسلمانوں کے معاملات سے بھی دلچسپی اور عملی ہمدردی رکھتے تھے، چنانچہ مسلم یونیورسٹی کے قیام کی کوشش سے لے کر ہندوستان کی آزادی اور پاکستان کے قیام تک مسلمانوں کے بہت سے معاملات میں ان کی امداد و رہنمائی کی جس سے ان کو فائدہ پہنچا، ان کے خودنوشت حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ دینی عقیدہ میں راسخ اور بعض مذہبی معمولات کے پابند تھے، اسلام کی تبلیغ بھی کرتے تھے اور ان کے ہاتھوں پر بہت سے غیر مسلم مشرف باسلام ہوئے، اللہ تعالیٰ ان کے ان نیک اعمال کے صلہ میں ان کی مغفرت فرمائے، مسلمانوں میں اتنی بڑی شخصیت مدتوں میں پیدا ہوگی۔

(''م''، اگست ۱۹۵۷ء)

سبحانی، آزاد، مولانا

مولانا آزاد سبحانی

دوسرا حادثہ مولانا آزاد سبحانی کی وفات کا ہے، نئی پود کو کیا معلوم کہ ایک زمانہ میں مولانا کتنی بڑی شخصیت رکھتے تھے، اگر ان کے دل و دماغ میں توازن اور خیالات و عمل میں استقلال ہوتا تو ہندوستان کے چوٹی کے علماء اور لیڈروں میں ان کا شمار ہوتا، وہ بڑے ذہین اور وسیع النظر عالم معقولات کے ماہر اور سحر بیان خطیب تھے، ان کی تقریر

خطابت اور منطق کا مرقع ہوتی تھی، ایک زمانہ میں مدرسہ الٰہیات کانپور کے روح رواں اور مسجد کانپور کے واقعہ کے ہیرو تھے، ہندوستان کی جنگ آزادی میں بھی ان کا حصہ ہے تحریک ترک موالات میں اور اس کے بعد بھی کچھ دنوں تک گاندھی جی کے رفیق کار اور کانگریس کے سرگرم رکن رہے، مگر ان میں استقلال نہ تھا، کسی مسلک پر زیادہ دنوں تک قائم نہ رہتے تھے اور عجیب عجیب تحریکیں اختراع کرتے تھے، ادھر کئی سال سے اسلامی کمیونزم اور حکومت ربانی کے مبلغ بن گئے تھے اور اس پر ایک کتاب بھی لکھی تھی، مگر کسی تحریک کو عرصہ تک نہ چلا سکے اور سب کا خاتمہ ناکامی پر ہوا، ادھر عرصہ سے سب جماعتوں سے الگ ہوگئے تھے اور ان کی زندگی کا آخری دور گمنامی میں بسر ہوا، مگر اس حال میں بھی جب کہ بڑی شکستہ حالت میں حکومت ربانی کی تبلیغ کرتے پھرتے تھے جب کسی مسئلہ پر گفتگو کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بڑا مفکر اور فلسفی بول رہا ہے، ان کی خاموش موت دنیاوی شہرت کی بے ثباتی کا سبق آموز واقعہ ہے ایک زمانہ میں جس کی خطابت کی سارے ہندوستان میں دھوم تھی، اس کی موت کو اخبارات نے ایک معمولی واقعہ سے زیادہ اہمیت نہ دی اور بہتوں کو اس کی خبر بھی نہ ہونے پائی لیکن اصل شہرت و ناموری عالم آخرت کی ہے، اللہ تعالیٰ اس سے سرفراز فرمائے۔

(''م''، اگست ۱۹۵۷ء)

مدنی، حسین احمد، مولانا

حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی

شیخ الہند حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی وفات ملک و ملت کا اتنا بڑا حادثہ ہے کہ اس پر اظہار غم سے قلم قاصر ہے، یہ تنہا ایک شخص کی موت نہیں بلکہ صحیح معنوں میں موت العالم، موت العالم ہے۔

وما کان قیس هلکه هلک واحد   لکنه بنیان قومه تهدما

علم و عمل، دین و تقویٰ، سلوک و تصوف، ارشاد و ہدایت، جہاد و جانبازی، خلق عظیم و لطف عمیم، کس کس چیز کا ماتم کیا جائے وہ اس دور میں سلف صالحین کا نمونہ اور اسلام کی مجسم تصویر تھے، ان کی ایک ایک ادا سے اسوۂ صحابہ آشکار تھا، دین کے متفرق جلوے اس دور کے اور بھی صلحاء و اخیاء میں ہوں گے، مگر ان کی ذات آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری کی مصداق تھی اور ان پر اس جامعیت کا خاتمہ ہوگیا، وہ سراپا عمل، سراپا جہاد اور ہمارے پرانے کاروان ملت کے آخری مسافر تھے، ان پر اس سلسلۃ الذہب کی خصوصیات ختم ہوگئیں، جس کا آغاز خاندان ولی اللّٰہی سے ہوا تھا، اس نازک دور میں ایسی ہستیوں کا اٹھ جانا ملک و ملت کی بڑی بدنصیبی اور اسلام کی غربت و بے کسی کی نشانی ہے، ایسے نفوس قدسیہ مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس مجاہد جلیل کو عالم آخرت کی سربلندی سے سرفراز فرمائے اور شہداء و صدیقین کا رفیق بنائے۔ (''م''، جنوری ۱۹۵۸ء)

سکسینہ، رام بابو

رام بابو سکسینہ

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینہ اردو زبان کے مشہور محسن اور نامور مصنف رام بابو سکسینہ بھی ہم سے جدا ہوگئے۔ ابھی گزشتہ ہی مہینہ ۹؍ دسمبر کو ان سے ہندوستانی اکیڈمی کے جلسہ میں ملاقات ہوئی تھی، کیا معلوم تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے، ان کو اردو زبان کی خدمت سے عشق تھا اور اس کو انھوں نے زندگی کا مشغلہ بنالیا تھا اور اردو زبان و ادب کی تاریخ پر بڑی قابل قدر کتابیں لکھیں۔ ان میں تاریخ ادب اردو بہت مشہور اور اس موضوع پر پہلی جامع و محققانہ کتاب ہے، اب اردو کے مختلف پہلوؤں پر بہت سی کتابیں لکھی جاچکی ہیں، مگر اس کتاب کی اولیت اپنی جگہ پر قائم ہے، اردو کے یورپین شعراء کا ایک ضخیم اور محققانہ تذکرہ بھی عرصہ ہوا لکھا تھا، ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے قدیم شعراء کا ایک مرقع اور میر کی مثنویاں بخط میر شائع کی تھیں، ان کے علاوہ ان کی اور تصانیف بھی ہیں، جو ابھی شائع نہیں ہوسکی ہیں، اردو کی ایسی خدمت کی مثالیں اس دور میں کم ملیں گی، ابھی ہندوستانی اکیڈمی کے جلسہ میں جہاں پورا ماحول اردو کا مخالف تھا۔ اس کی صریح حمایت میں تنہا ان ہی کی آواز بلند ہوئی تھی، ہندوستان کی موجودہ فضا کو دیکھتے ہوئے ہندوؤں میں آئندہ اردو کے ایسے شیدائی پیدا ہونے کی امید کم ہے۔

یادگار زمانہ تھے یہ لوگ
سن رکھو تم فسانہ تھے یہ لوگ

(''م''، جنوری ۱۹۵۸ء)

آزادؔ، ابوالکلام، مولانا

مولانا ابوالکلام آزادؔ

بالآخر اس مسیحا نفس نے بھی جان جاں آفریں کے سپرد کردی جو نصف صدی تک اپنے انفاس کرم سے مردہ دلوں میں زندگی کی روح پھونکتا رہا، وہ روشن ضمیر اٹھ گیا جو اپنے نور بصیرت سے تاریک دماغوں کو منور کرتا رہا، کاروان ملت کا وہ حدی خواں رخصت ہوگیا جو اپنی ہدایت و رہنمائی سے گم کردہ راہوں کو راہ راست دکھلاتا رہا، وہ شمع فروزاں خاموش ہوگئی جس کی روشنی سے علم معرفت کا ہر گوشہ منور تھا، ابوالکلام کی وفات تنہا ہندوستان کا نہیں بلکہ پوری دنیائے اسلام کا حادثہ ہے اور اس حادثہ پر جتنا ماتم بھی کیا جائے کم ہے۔

آسماں راحق بود گر خوں ببارد بر زمیں

ایسی جلیل القدر اور عہد آفریں شخصیتیں مدتوں میں پیدا ہوتی ہیں، جو افکار و تصورات کی دنیا اور قوموں و ملتوں کی زندگی میں انقلاب پیدا کردیتی اور تاریخ کا نیا دور شروع کرتی ہیں اور ترقی و تعمیر کی ہر راہ میں اپنے نقشِ قدم رہنمائی کے لئے چھوڑ جاتی ہیں، حق یہ ہے کہ مولانا کی وفات پر ان کی زبان سے اقبال کا یہ قطعہ آج پھر دہرایا جائے۔

سرور رفتہ باز آید کہ نہ آید
نسیم از حجاز آید کہ نہ آید
سرآمد روزگار ایں فقیرے
وگر دانائے راز آید کہ نہ آید

ان میں فطری عظمت تھی، وہ فلسفیانہ فکر مجتہدانہ دماغ اور مجاہدانہ جوش عمل رکھتے تھے اور اپنے گوناگوں کمالات کے اعتبار سے تنہا ایک عالم تھے، عالم وفن کے امام و مجتہد بھی تھے اور دانائے رازحکیم مفکر بھی، میدان سیاست کے مدبر بھی تھے اور عرصہ جہاد کے شہسوار بھی، سحر طراز ادیب بھی تھے اور جادو بیان خطیب بھی، ذہانت، فہم وفراست، فکر و تدبر کی گہرائی، دیدہ وری و نکتہ رسی میں ان کا کوئی معاصر ان کا حریف نہ تھا، ان کی ذات پر بہت سے اوصاف و کمالات اور تاریخ کے ایک پورے دور کا خاتمہ ہوگیا، وہ فطرۃً عبقری تھے جس راہ میں بھی انھوں نے قدم رکھا اپنا راستہ سب سے الگ نکالا اور ہر میدان میں اپنا الگ مقام اور امتیازی شان رکھتے تھے جہاں کسی دوسرے کو یاد نہ تھا، اخلاق میں ان کا پایہ اتنا بلند تھا کہ وہ ادنی درجہ کی بات سوچ نہ سکتے تھے، اپنے مخالفوں کے ساتھ بھی احسان وسلوک کرتے تھے جس پر گذشتہ دس سال کی تاریخ گواہ ہے۔

وہ حق وصداقت کی آواز اور عزم و استقلال کا پہاڑ تھے، جو راہ ابتداء میں انھوں نے اختیار کی اس پر آخر عمر تک قائم رہے، اس طویل مدت میں بڑے بڑے انقلابات ہوئے، بڑے بڑے لیڈروں کے پاؤں ڈگمگائے گئے مگر ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی ان کی نگاہ اتنی دور بیں تھی کہ ۱۹۱۲ء میں انھوں نے جو صدا بلند کی تھی وہ بالآخر پورے ملک کی آواز بن گئی، اس راہ میں وہ گاندھی جی کے بھی پیشرو تھے۔

وہ جنگ آزادی کے میر کارواں اور ہندوستان کے معمار اعظم تھے، ان کے کارنامے اتنے گوناگوں ہیں کہ اس کا احاطہ دشوار ہے ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جنگ آزادی کی ابتداء سے لے کر اس وقت تک جتنے نازک مراحل پیش آئے اور جس قدر اندرونی و بیرونی پیچیدہ مشکلات و مسائل پیدا ہوئے ان کے حل کرنے میں مولانا کے تدبر کو بڑا دخل تھا وہ متحدہ قومیت کا نشان اور سیکولرزم کی آبرو تھے، ہندوستان کی تقسیم کے بعد جب پورا ملک فرقہ پرستی کے سیلاب میں نکلا تھا، ان ہی نے حکومت کو اس میں گرنے سے بچایا اور دنیا میں ہندوستان کی سیکولر کی لاج رکھ لی، اگر مولانا کی بصیرت رہنما نہ ہوتی تو معلوم نہیں ہندوستان کس راہ پر پڑ جاتا اور اس کا انجام کیا ہوتا، مولانا کی ذات فرقہ پرستی کے خلاف سپر تھی اور ہر فرقہ کو ان پر اعتماد تھا، چنانچہ آج بلاتفریق مذہب وملت سارے فرقے ان کے غم میں سوگوار ہیں، غرض وہ ہندوستان میں روشنی کا مینار تھے جس سے پورا ملک روشنی حاصل کرتا تھا، اب پنڈت جواہر لال نہرو کے علاوہ کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی جو اس روشنی کو قائم رکھ سکے، مگر ان کی قوتِ بازو بھی مولانا تھے، اس لیے دیکھنا یہ ہے کہ یہ روشنی کہاں تک قائم رہتی ہے۔

ان میں دین و سیاست، مذہب و وطنیت اور جدت و قدامت کا نہایت دلکش امتزاج تھا اور ان پر ان کی نظر بڑی حکیمانہ تھی، انھوں نے ان مختلف عناصر کو ایک دوسرے سے متصادم ہونے کے بجائے ہم آہنگ کردیا اور اسلام میں دین و سیاست کی وحدت کا بھولا ہوا سبق ان ہی نے مسلمانوں کو یاد دلایا، ایک طرف وہ بڑے عالم دین راسخ العقیدہ مسلمان اور اپنی دینی و تہذیبی روایات کے امین و محافظ تھے، دوسری طرف زمانہ کے حالات اور تقاضوں پر بھی ان کی نظر تھی اور نئی قابل قبول چیزوں کے لئے بھی ان کا دل کشادہ اور دامن وسیع تھا، قوم پروری اور وطن پرستی میں نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوؤں کے بھی رہنما تھے۔

ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام کے بعد مسلمانوں میں پسپائی اور کمتری کا جو احساس پیدا ہوگیا اور جدید علوم اور مغربی تہذیب کا جو رعب ان پر چھا گیا تھا، اس کے دور کرنے میں مولانا کا بڑا حصہ ہے، اور اس میں ان کا انداز عذر خواہانہ نہیں بلکہ ناقدانہ اور جارحانہ تھا، مغرب زدہ طبقہ میں سب سے پہلے ان ہی نے دینی و ملی غیرت و حمیت کی روح پھونکی اور یہ ان ہی کا فیض تھا کہ علی گڑھ کالج جیسے جدید تعلیم و مذہب کے مرکز سے محمد علی جیسا مرد مومن اور مجاہد پیدا ہوا اور پرانے خیال کے علماء اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کردیا۔

مولانا کا اصل مقام علم وحکمت کا کنگرہ تھا، سیاست کے میدان میں وہ بقول خود آئے نہیں بلکہ لائے گئے تھے، مگر پھر اس خارزار میں ایسا دامن الجھا کہ علم وفن کا کوچہ قریب قریب چھوٹ گیا، اس سے ملک و وطن کو جتنا فائدہ پہنچا اتنا ہی علم و ادب کا نقصان ہوا، اگر ان کی توجہ علم و ادب کے دائرے تک محدود رہتی تو معلوم نہیں آج اردو کا دامن کیسے کیسے گرانبہا علمی جواہر سے لبریز ہوتا پھر بھی جب کبھی وہ ادھر توجہ کردیتے تھے تو علم و ادب کا کوئی نہ کوئی شاہکار وجود میں آجاتا تھا اور یہ ان کے قلم کا اعجاز تھا کہ وہ چڑیا چڑے کی کہانی بھی لکھ دیتے تھے تو ادب عالیہ کا نمونہ ہوتی تھی۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد مولانا نے پبلک جلسوں میں شرکت بالکل چھوڑ دی تھی، چنانچہ ایک مدت کے بعد وہ دلّی کی اردو کانفرنس میں شریک ہوئے تھے اور تقریر بھی کی تھی، یہ شاید اس لیے کہ اب یہ چراغ بجھنے والا تھا، یہ تقریر اگرچہ مختصر تھی لیکن اس حیثیت سے نہایت اہم تھی کہ اس میں انھوں نے صریح الفاظ میں اردو کی حیثیت اور اس

کا حق واضح کر دیا تھا، اور یہ بھی فرمایا تھا کہ اردو بولنے والوں کا یہ حق ہے کہ وہ اس حق کا مطالبہ کریں اور ملک وحکومت دونوں کو اردو کی اس حیثیت کو ماننا چاہئے، یہ آخری فقرے غالباً کسی اخبار نے نقل نہیں کیے ہیں، آخر میں یہ بھی فرمایا تھا کہ وزیر اعظم کے اس کانفرنس کا افتتاح کرنے کے بعد یقیناً کانفرنس اپنے مقصد میں کامیاب ہوگی، یہ اردو کے جائز حق کے لیے مولانا کی آخری وکالت تھی، جس کی حیثیت گویا وصیت کی ہے، دیکھنا یہ ہے کہ وہ ارباب حکومت جن کی آنکھیں مولانا کے غم میں اشکبار ہیں، ان کی آخری وصیت کا کہاں تک لحاظ رکھتے اور ان کی محبوب زبان کیساتھ کیا سلوک کرتے ہیں، یہ مولانا کے ساتھ ان کے تعلق کا سب سے بڑا امتحان ہے۔

دارالمصنفین کے ساتھ مولانا کو دوہرا تعلق تھا، ایک مولانا شبلی کی یادگار دوسرے ایک علمی ادارے کی حیثیت سے جس پر ان کے وہ مکاتیب شاہد ہیں جو معارف میں شائع ہو چکے ہیں، اس تعلق کو انھوں نے ہمیشہ قائم رکھا، ابھی چند سال ہوئے جب دارالمصنفین سخت مالی مشکلات میں مبتلا ہوگیا تھا اور اس کے چلنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی، مولانا ہی کی امداد و دستگیری سے اس کو دوبارہ زندگی ملی، اس کی امداد واعانت لئے برابر ان کے پیش نظر رہتی تھی، اور جب بھی اس کا کوئی موقع آتا تھا تو دارالمصنفین کو نہ بھولتے تھے، اس وقت بھی یہ مسئلہ ان کے سامنے تھا، ابھی ۱۷ر فروری کو راقم الحروف ان سے ملا تھا حسب معمول بڑی شفقت سے پیش آئے دارالمصنفین کے حالات پوچھتے رہے اور فرمایا کہ ان کی جانب سے دارالمصنفین کی امداد میں کوئی کمی نہ ہوگی کیا معلوم تھا کہ یہ آخری ملاقات اور دارالمصنفین کے لیے ان کے آخری الفاظ ہیں، دارالمصنفین بھی انشاء اللہ اس تعلق کا حق ادا کرنے کی پوری کوشش کرے گا فی الحال مولانا کی یادگار میں معارف کا خاص نمبر نکالنے کا قصد ہے اور آئندہ بھی اس سلسلے میں جو خدمت انجام دے سکتا ہے اس کو انجام دینے کی کوشش کرے گا۔

اللہ تعالیٰ اس ترجمان القرآن، مجاہد جلیل، قوم وملت کے غم خوار اور مسلمانوں کے محسن کو دنیا کی طرح عالم آخرت کی سربلندی سے بھی سرفراز فرمائے۔

(''م''، مارچ ۱۹۵۸ء)

مولانا ابوالکلام آزاد

(پروفیسر رشید احمد صدیقی)

مولانا مرحوم سے خط وکتابت عمر بھر میں دو بار ہوئی۔ ملاقات صرف ایک بار، وہ بھی ان کے آفس میں چندمنٹ کے لیے ڈیوٹی سوسائٹی سے متعلق غالباً ۱۹۴۸ء کے آخر میں! اس طرح میں ان لوگوں میں ہوں جو مرحوم کے بارے میں براہ راست بہت کم واقفیت رکھتے ہیں۔ مرحوم کی نجی، قومی یا علمی زندگی سے اسی حد تک متعارف ہوں جس حد تک کتب رسائل، تقاریر اور مختلف اشخاص کی مدد سے میری جیسی محدود فہم وفکر کا آدمی مولانا جیسی عظیم شخصیت سے ہوسکتا ہے!

بہت سے دوسرے اصحاب کے مانند مولانا سے میری غائبانہ اور بہت گہری عقیدت اس وقت سے ہے جب بلقان اور طرابلس کی جنگ برپا تھی۔ الہلال میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے اور میں اسکول کا طالب علم تھا۔ کیسے اچھے وہ دن تھے جب جینے کی ہر خوشی اپنے دیار اور اپنے عزیزوں اور دوستوں میں نصیب تھی اور اس سے کم خوشی مجاہدوں کے دیار میں جان دینے کی اس دعوت و بشارت میں نہیں ہوتی تھی جو مولانا کی آتش نوائی میں ملتی تھی۔

عمر کا وہ دور کتنا مسعود اور کتنا عجیب تھا جب اچھے اور بڑے کاموں کے لیے جیتے رہنے اور جان دینے دونوں کی یکساں خوشی ہوتی تھی۔ گزرے ہوئے دنوں کی یاد کس کو نہیں عزیز ہوتی، بالخصوص بوڑھوں کو جنھیں صرف ماضی کی جائے پناہ میسر ہوتی ہے، اس لیے یہ کہنا کہ وہ عہد کتنا مسعود اور کتنا عجیب تھا، واقعہ کے اعتبار سے ممکن ہے اتنا صحیح نہ ہو جتنا اپنی یاد کے اعتبار سے میرے لیے حسین وحزیں ہے! بہرحال وہ زمانہ کب کا ختم ہوا اور زمانہ بھی کیا کرے اس کی تقدیر ہی یہ ہے، آج مولانا آزاد بھی اس جہاں سے اٹھ گئے کس کو یاد کرکے کس کا ماتم کروں!

مولانا ان برگزیدہ ہستیوں میں تھے جو اپنے عہد سے بڑی تھیں۔ وہ آفرینندۂ عہد تھے۔ اس لیے ان کی کشمکش ایسے لوگوں سے رہتی جو زائیدہ عہد ہوتے۔ وہ ہماری تاریخ، ہماری تہذیب اور ہمارے علوم کا اعتبار وافتخار تھے۔ اس کا احساس آج ہورہا ہے جب وہ ہم میں نہیں رہے، کیا کیا جائے ایسا احساس بھی ایسے ہی وقت ہوتا ہے۔

سیاسی پلیٹ فارم پر مولانا کے آنے کا وہی زمانہ تھا، جب مسلم یونیورسٹی کی تحریک ملک میں پھیل چکی تھی اور ہز ہائینس آغا خان اور مولانا محمد علی اور شوکت علی بھی ہمارے ایسے ہی ہیرو بنے ہوئے تھے جیسے بلقان اور طرابلس کے جانباز مجاہد، اس سے پہلے مسلم لیگ قائم ہو چکی تھی اور تقسیم بنگال اور اس کی تنسیخ کا عمل اور ردعمل بھی سامنے آچکا تھا۔ برطانوی تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لیے مولانا آزاد نے ہندوستانی قومیت کے متحدہ محاذ کا انتخاب کیا۔ اصولاً وہ علی گڑھ یونیورسٹی کی تحریک اور مسلم لیگ کے پروگرام کی تائید میں نہ تھے۔ وہ ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف نہیں بلکہ دونوں کو انگریزوں کے خلاف صف آراء ہونے کی دعوت دیتے تھے۔ اس عقیدے کی حمایت میں ان پر کیسے کیسے حادثات نہیں گزر گئے، دو چار مہینے یا سال نہیں کم وبیش نصف صدی تک گزرتے رہے۔

قطع نظر اس سے کہ مولانا نے اپنی غیر معمولی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار

لانے کے لیے کس محاذ جنگ کا انتخاب کیا اور اس کا نتیجہ کیا ہوا، مجھے جو چیز سب سے عجیب اور عظیم نظر آئی، وہ ان کا اپنی فراست پر بھروسہ اور اپنے عقیدے کی پختگی تھی۔ کتنی مدت پہلے انھوں نے اسی فراست کی روشنی میں جو راستہ اختیار کیا اور جس منزل کو سامنے رکھا، اس سے تمام عمر سرمو انحراف نہیں کیا۔ اس زمانے میں تذبذب اور تفرقے کی کیسی کیسی نزاع اور نزاکتوں کا سامنا ہوا اور ان کی زد میں آکر کیسے کیسے ساتھیوں نے فکر وعمل میں کیسے کیسے ردوبدل کیے لیکن مولانا نے اپنے اختیار کیے ہوئے راستے سے منہ نہ موڑا۔ سیاست کے صحیفے میں اس طریق عمل کو کبھی کبھی نہیں بھی سراہا گیا ہے لیکن اس کو کیا کہیے کہ بالآخر ان تمام چھوٹے بڑے ساتھیوں اور سرداروں کو جو سیاست کے الیاس وخضر یا قیس وکوہکن سمجھے جاتے تھے، اسی راستہ پر آنا اور اسی کعبۂ مقصود کی طرف پلٹنا پڑا جو مولانا کا بتایا ہوا تھا۔

مولانا کا ایک فقرہ اس وقت یاد آرہا ہے، جو کہیں کہیں یا تو نظر سے گزرا ہے یا سننے میں آیا۔ کچھ اس طرح کی بات کہی ہے کہ ''تم لوگ پانی اور کیچڑ کو دیکھ کر بارش کا یقین کرتے ہو میں اس کو ہوا میں سونگھ کر جان لیتا ہوں''۔ دنیا کے کم لیڈروں کو یہ درجہ نصیب ہوا ہے۔

بلقان اور طرابلس کی جنگوں کا نعرہ مولانا کی زبان اور قلم سے نکل کر پہلی بار ہمارے کانوں میں گونجا اور دل میں اتر گیا۔ ان کی تحریر وتقریر کی بجلیاں اور زلزلے ہندوستان میں وہی کام کررہے تھے، جو مسلمان مجاہدین یورپ اور افریقہ کے میدان کارزار میں اپنے لہو اور تلواروں سے انجام دے رہے تھے، یہاں تک کہ کبھی کبھی ہمارا قصور تاریخ کی کتنی صدیوں اور کھنڈروں کو روندتا کھوندتا اس عہد شرف وسعادت میں پہنچ جاتا جہاں شیدایان اسلام داد شجاعت وشہادت دے رہے تھے۔ اس زمانے میں مولانا یا ان کے اخبار الہلال کے خلاف حکومت جب کوئی تادیبی کاروائی کرتی، اخبار سے ضمانت طلب کی جاتی یا مولانا کو نظربند کردیا جاتا تو ایسا ہی محسوس ہوتا جیسے مسلمانوں کا کوئی جانباز جنرل میدان جنگ میں اسیر ہوگیا یا کام آگیا۔ بلقان اور طرابلس کے محاربے (حق وباطل کی جنگ) جہاں کہیں جب کبھی برپا ہوں گے، مولانا کی تحریریں اور تقریریں دعوت دارورسن دیتی رہیں گی۔

یہ پہلا موقعہ تھا جب مولانا کی تحریروں کے طفیل ہندوستان کے مسلمانوں کے دور دراز بکھرے ہوئے مسلمانوں کی ابتلا وآزمائش میں شریک ہونے کا احساس وافتخار ہوا، گو یہاں اس تلخ حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہمارے دکھ درد میں شریک ہونے کی توفیق باہر کے مسلمانوں کو کبھی نہیں ہوئی، نہ وہاں کے زعما کو نہ عوام کو! اور یہ اس ہندوستانی مسلمان کا کارنامہ ہے جس کی ہندوستانی قومیت کی پختگی سے کٹر سے کٹر ہندو اور جس کے اسلامی تصورات مذہبی معتقدات اور دینی خدمات سے کٹر سے کٹر مسلمان انکار کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ بہ ایں ہمہ ہندوستانی قومیت کی حمایت میں جتنا ظلم وجور اپنے ملک کے مسلمانوں کے ہاتھوں مولانا ابوالکلام نے اٹھایا وہ ہندوستان میں شاید ہی کسی دوسرے مسلمان کے حصہ میں آیا ہو۔

گاندھی جی اور مولانا ابوالکلام کی زندگیوں میں ایک بات کتنی المناک لیکن اتنی ہی عظیم الشان نظر آتی ہے، مسلمانوں کی حمایت اور غم خواری میں اور اس وقت جبکہ مسلمانوں کے جان ومال وآبرو کی کوئی قیمت اور وقعت نہیں رہ گئی تھی، گاندھی جی اپنی ہی قوم کے ایک فرد کی گولی کا نشانہ بنے۔ مجھے اپنی لاعلمی پر ندامت ہوگی لیکن فرطِ افتخار سے سر اونچا ہوجائے گا، اگر کبھی یہ معلوم ہوسکا کہ گاندھی جی کی طرح کسی بڑے مسلمان کو غیر مسلموں کی حمایت میں جان سے ہاتھ دھونا پڑا! ہندوستان کی دو اتنی بڑی ہستیوں کے ساتھ ان کے ہم مذہبوں نے کیا سلوک کیا اس پر کسی اور کو نہیں ہم ہندوستانی مسلمانوں کو ضرور غور کرنا چاہئے۔

تقسیم ملک سے اب تک ہندوستان کی سیاست جن دشواریوں اور نزاکتوں سے گزری اور اب تک گزر رہی ہے اس کو تفصیل سے بیان کرنا نہ تو ضروری معلوم ہوتا ہے نہ میرے بس کی بات ہے لیکن اس دوران میں حکومت ہندوستان کی خارجی اور اندرونی پالیسی پر مولانا کی سیاسی بصیرت، آئینی تدبر، اخلاقی بلندی، علمی فضیلت اور شخصی وقار کس طور پر اثر انداز ہوتا رہا کسی تفصیل کا محتاج نہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ اور نگہداشت کے نہایت درجہ مشکل اور نازک فرائض جس خاموشی، دلسوزی اور قابلیت سے مولانا نے انجام دیئے وہ ان ہی کا حصہ تھا۔ مولانا کی خدمات کی اہمیت اس لیے اور بڑھ جاتی ہے کہ ان کو مسلمانوں کی حمایت اور ان کے گرتے ہوئے حوصلوں کو اونچا کرنے اور رکھنے کے فرائض ایسے حالات اور ایسے زمانے میں انجام دینے پڑے جن سے زیادہ مشکل اور نازک زمانہ مسلمانوں پر اس برصغیر میں شاید پہلے کبھی نہیں گزرا تھا۔

مولانا نے جس طرح جس حد تک جن دشواریوں سے دوچار رہ کر جس کامیابی کے ساتھ ہندوستان کے تباہ حال مسلمانوں کو تسکین دینے اور تقویت پہنچانے کی خدمت انجام دی اس سے بڑی خدمت اس سیکولر جمہوریہ کی ساکھ اندرون وبیرون ملک قائم کرنے میں کوئی اور نہیں انجام دے سکتا تھا۔ ہندوستان کی حکومت مولانا کی اس خدمت کو کبھی فراموش نہ کرسکے گی! کس عظمت اور کیسی عبرت کا یہ مقام تھا کہ یہ فریضہ یکہ وتنہا اس مسلمان کے حصے میں آیا جس سے زیادہ مطعون اور مغضوب تقسیم ملک کی رات سے پہلے مسلمانوں ہی کے نزدیک دوسرا مسلمان نہ تھا۔

ہندوؤں یا حکومت ہند میں یہ غیر معمولی ساکھ مولانا نے محض حسن اتفاق سے نہیں پیدا کرلی تھی، ہندو تو پھر ہمارے ہی آپ جیسے انسان ہیں ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں اور

رہے ہیں جن میں مولانا کسی سے پیچھے نہیں اور بہتوں سے آگے تھے جن کا سابقہ انسانیت سے ناآشنا وحشیوں سے ہوتا تو وہ ان میں بھی اپنی سرداری مسلم کرا لیتے، سفاکی یا چالاکی سے نہیں برگزیدگی اور بہادری سے مولانا کو صبر وصداقت کی کتنی آزمائشوں سے گزرنا پڑا ہوگا تب کہیں جا کر یہ منزلت حاصل ہوئی ہوگی۔ ’بزیرِ شاخِ گل افعی گزیدہ بلبل را‘ کا جیسا ماجرا جو مولانا پر گزرا ہوگا، اس کا احساس ان لوگوں کو کیسے دلاؤں جو نہ اس صورت حال سے آشنا ہیں جن میں مولانا گرفتار تھے نہ اس کرب سے جو شاعر نے اس شعر میں بھر دیا ہے۔

حکومت میں مولانا کو بعض ساتھیوں کے تعصب اور تنگ نظری کا بھی مقابلہ کرنا پڑتا تھا اور کس غیر تمند کو نہیں کرنا پڑتا! یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب نامساعد حالات کا ہجوم تھا۔ ان پر جو گزرتی تھی اور کیا کچھ نہیں گزرتی تھی اس کو وقار اور خاموشی سے سہتے تھے۔ مولانا کو اپنا ہم خیال بنانے میں کبھی تامل نہیں ہوا لیکن اپنا غمگسار بنانا انھوں نے کبھی گوارا نہیں کیا۔ یہ ان کی طبیعت کا بڑا امتیاز خاصہ تھا۔ وہ اپنے عزائم کے سامنے کسی دشواری کو ناقابل تسخیر نہیں سمجھتے تھے۔ دنیوی جاہ منزلت سے بے نیاز تھے۔ کسی سے جھگڑتے نہیں تھے، جھگڑنا اپنے رتبہ سے فروتر سمجھتے تھے لیکن اس کی نوبت آجاتی تو اپنی سطح سے نیچے نہیں اترتے تھے۔ حریف کے مقابلہ میں یہ ان کی پہلی جیت ہوتی تھی۔

علم کی معرفت اور مذہب کے شرف وسعادت نے ایسی بلند نظری اور خود اعتمادی پیدا کردی تھی کہ وہ زندگی کے مصائب ومکروہات اور سیاست کے شوروفتن سے پراگندہ خاطر اور تلخ کام نہیں ہوتے تھے۔ جو شخص ہار جیت دونوں میں اپنا سہارا خود ہو اس کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن ایسے لوگ دنیا میں بہت کم ہوئے ہیں، جو نارمل ہوں اور اپنا سہارا خود ہوں۔

یہاں دو واقعات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، ایک دہلی کی سب سے بڑی مسجد میں پیش آیا، دوسرا ہندوستان کے سب سے بڑے ایوان حکومت میں ۱۹۴۷ء کے اکتوبر میں شمالی ہند کے مسلمان بالعموم اور دہلی کے بالخصوص تقسیم ملک کے تہلکے سے ہراس اور درماندگی کی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ ہندوستان میں کوئی مسلمان لیڈر ایسا نہیں رہ گیا تھا جو ان کو ڈھارس دیتا یا ان کی حمایت میں آگے آتا بلکہ یہ کہنا بھی حقیقت سے بعید نہ ہوگا کہ لیڈر خود سراسیمہ اور درماندہ تھے۔

مولانا دہلی کی جامع مسجد میں تشریف لائے جو مسلمانوں کے جبروت وجلال، شوکت وشادمانی، اقبال واختلال کی کتنی کروٹیں دیکھ چکی تھی۔ مسلمانوں کے خاموش، مایوس اور ملول مجمع کو دیکھا جیسا مجمع آج سے پہلے انہوں نے نہ کسی اور نے ہندوستان میں کبھی دیکھا تھا۔ پھر جیسے بوڑھے سردار کی شریانوں میں خون کے ساتھ عزیمت اور حمیت کے شرارے کوندنے لگے ہوں لیکن اپنے وقار پر قابو رکھتے ہوئے جو اس کا ہمیشہ سے وطیرہ رہا تھا۔ بولنا شروع کیا.......... یہ تقریر اردو کے بیشتر اخبارات میں تمام و کمال چھپ چکی ہے اور پڑھنے والوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس کو اس کے اکثر ٹکڑے زبانی یاد نہ ہوں۔ چاہا تھا کہ ناظرین کی خاطر جہاں تہاں سے اس کے اقتباسات ہی پیش کردوں لیکن اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی کہ کس حصے کو حذف کیا جائے اور کس کو نہیں، اس تقریر پر تبصرہ بجائے خود ایک مضمون بن جاتا، اس لیے بادل ناخواستہ ارادے سے باز رہنا پڑا، جامع مسجد کی اس تاریخی تقریر سے مسلمانوں کے حوصلے بندھے اور خوف ومایوسی کی تاریکی چھٹنے لگی اور ایسا معلوم ہونے لگا جیسے زلزلے کے بعد زمین کی شکست وشکن میں ہمواری اور اس زمین پر بسنے والوں کے پاؤں میں استقامت آگئی ہو۔

کسے معلوم مولانا، ان کی اس تقریر اور اس مجمع کے ہلکے گہرے نقوش جامع مسجد کے سنگ وخشت، سقف ودر، مینار ومحراب، نقش ونگار میں کہیں نامعلوم طریقہ سے پیوست یا مرتسم ہوگئے ہوں، اور خدا ہی جانتا ہے کہ قوم کی تقدیر میں ان کی بازگشت کب اور کس طور پر سنائی دے۔

دوسری تقریر پارلیمنٹ میں پرشوتم داس ٹنڈن کے اس اتہام لگانے پر کرنی پڑی کہ وزارت تعلیمات ہندی سے سردمہری برت رہی ہے، اور اردو کی بے جا پاسداری کرتی ہے، اس اتہام کے پیچھے کھلے چھپے کتنے اور الزامات تھے جن کا اندازہ کرنا ایسا کچھ دشوار نہیں۔ مولانا نے پارلیمنٹ کے آداب اور خود اپنی روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے جس وقار برہم اور صداقت بے باک سے جواب دیا وہ ایک ناقابل فراموش تاریخی واقعہ بن گیا ہے، اس کی روئداد بھی اخباروں میں آچکی ہے جس کو دہرانے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ پوری پارلیمنٹ جس کے اراکین میں سے شاید بہتوں نے مولانا کی یہ تقریر پورے طور پر سمجھی بھی نہ ہو مولانا کے خطاب سے سناٹے میں آگئی، سکوت کا یہ عالم اور سطوت کا یہ سماں ہندوستانی پارلیمنٹ میں اس سے پہلے شاید ہی کبھی دیکھا گیا ہو، اس کے بعد اردو کی حمایت کرنا شیوۂ شرافت وانصاف سمجھا جانے لگا۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے اس تاریخی جلسے میں جو دہلی میں گزشتہ موسم سرما میں ہوا تھا۔ مولانا کی اردو کی حمایت میں آخری تقریر ہوئی۔ اس کے بعد ہی اردو کا سب سے بڑا خطیب اردو کا سب سے شاندار انشا پرداز اور اردو ہی کی کتنی حسین اور عظیم شخصیت ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔ اب دیکھئے اردو کے باب میں:

کسے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ!

رینائسنس (احیائے علوم) اور ریفرمیشن (اصلاح دین) کی دو ایسی زبردست اور عدیم المثال انقلابی تحریکیں یورپ میں برسرکار آئیں جنھوں نے یورپ کو دنیا کی تمام دوسری اقوام سے کمبخت اس درجہ بلند کردیا کہ دوسری قوموں کو صدیوں بعد تک ان

مدارج تک پہنچنا نصیب نہیں ہوا، ان تحریکوں نے جو کچھ کر دکھایا تاریخ عالم کے بڑے بڑے کشور کشاؤں کے حصے میں نہ آیا تھا۔ انسان کی صالح اور صحت مند پوشیدہ قوتوں کو بروئے کار لانے میں مذہب (اعتقاد) اور علوم بڑے زبردست اور پائدار محرکات ثابت ہوئے ہیں۔ اسلام کا ظہور بجائے خود اصلاح ادیان اور احیائے علوم کی براہ راست بشارت تھا۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ رینائسنس اور ریفرمیشن دونوں بڑی حد تک اسلام کا عطیہ ہیں! لیکن مسلمانوں کی عام غفلت اور ان تحریکوں کے غیر معمولی غلبے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان حکومتیں اور مسلمانوں کے عقائد اور اعمال دونوں مغربی افکار اور استعمار کی زد میں آگئے اقبال نے ٹھیک کہا ہے کہ جو قومیں اپنے اعمال کا حساب نہیں لیتی رہتیں، ان کو ایسے ہی برے دن دیکھنے نصیب ہوتے ہیں۔ چنانچہ اب مسلمانوں کو ایک طرف اپنی حکومتوں کو دوسری طرف اپنے افکار و عقائد کو ان قوتوں سے محفوظ رکھنے کی مہم کا سامنا تھا۔ حکومتوں پر کیا گزری یا گزر رہی ہے یہاں خارج از بحث ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ تبدیلی اور اصلاح سب سے دیر میں حکومتیں قبول کرتی ہیں اور ان کا احساس و اظہار سب سے پہلے قوم کے ارباب فکر و نظر کرتے ہیں۔

اسلامی عقائد و افکار کو مغربی اور مروجہ عقائد و افکار کی روشنی میں پرکھنے اور تعبیر کرنے کا فریضہ ہندوستان میں غدر کے بعد جن بزرگوں کے حصہ میں آیا، ان میں بعض یہ ہیں: سرسید، جسٹس امیر علی، شبلی، اقبال، ابوالکلام اور مولانا مودودی۔ ان سب کا مقصد ایک تھا، طریقہ کار و استدلال جدا تھا۔ یہ صورت حال مقامی نہ تھی، عالمگیر تھی۔ مصر اور دیگر بلاد اسلامیہ میں جمال الدین افغانی، مفتی عبدہ، رشید رضا وغیرہ کے سامنے بھی یہی مسائل تھے۔

یہاں اس امر کی طرف بھی اشارہ کر دینا غیر متعلق نہ ہوگا کہ اسی زمانے میں ہندوستان میں بھی ہندو عقائد اور قومیت کے احیاء اور تشکیل نو کی تحریک تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ جس کے اہم مرکز دکن، بنگال اور پنجاب میں تھے۔ یہی نہیں بلکہ بدیسی کمپنیوں کی دیکھا دیکھی ہندو سرمایہ دار بھی صنعتی اور اقتصادی محاذ پر پورے طور سے مستحکم ہو چکے تھے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہندوؤں کی کیا حیثیت بن گئی تھی اور مسلمانوں کی کیا رہ گئی تھی۔

غدر کے بعد ہندوستان کے مسلمان جن دشواریوں میں مبتلا تھے ان میں بعض یہ تھیں: مغلیہ حکومت کا خاتمہ اور انگریزی حکومت کا قیام، انگریزوں کا مسلمانوں سے برہم اور برگشتہ ہونا، مسلمانوں کا ضرورت سے زیادہ کبھی آئین نو سے ڈرنا اور طرز کہن پر اڑنا۔ اسی طرح کبھی طرز کہن سے ڈرنا اور آئین نو پر اڑنا، مذہبی اور تہذیبی احیاء اور سیاسی و صنعتی تنظیم میں ہندوؤں کی پیش قدمی مسلمانوں کی سیاسی کسمپرسی، اقتصادی بدحالی، صنعتی پسماندگی، تعلیمی پستی اور عام مایوسی و درماندگی! سرسید نے ان کا مداوا بہ حیثیت مجموعی علی گڑھ تحریک میں پیش کیا جس کی مرئی اور متعین شکل مدرسۃ العلوم کی تھی جواب مسلم یونیورسٹی ہے۔

مسلمانوں کے نزدیک اور مسلمانوں کے لیے غدر انیسویں صدی کا سب سے المناک انقلابی حادثہ تھا، جس نے ہندوستان میں ان کی کئی سو سالہ سیاسی اور تہذیبی حیثیت کا کلیتہً زیر و زبر کر دیا۔ مسلمانوں میں کسی بڑی سے بڑی شخصیت کے فکر و عمل کے لیے یہ صورت حال ایک بے اماں و بے درماں آزمائش سے کم نہ تھی۔ نظر برآں علی گڑھ تحریک اور مسلم یونیورسٹی کی اس بنیادی اور تاریخی حیثیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ یہ دونوں مسلمانوں کی تقریباً ہمہ جہت آبادکاری و بردمندی کا مشن بھی تھیں اور مشین بھی! اور اپنے گوناگوں مقاصد کے حصول میں جو کبھی کبھی ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتے تھے براہ راست یا بالواسطہ اس حد تک کامیاب ہوئے، جس حد تک ہندوستان کا کوئی اور مسلم ادارہ اب تک کامیاب نہیں ہوا تھا۔

کچھ تعجب نہیں سرسید اور ان کے رفقا نے علی گڑھ تحریک اور مدرسۃ العلوم (مسلم یونیورسٹی) کو کسی نہ کسی حد تک دانستہ یا نادانستہ طور پر رینائسنس اور ریفرمیشن کی روشنی میں آگے بڑھانے کی کوشش کی ہو۔ اس خیال کو اس بنا پر اور تقویت پہنچتی ہے کہ اصلاح دین کی تحریک دہلی میں مدتوں سے برسر کار تھی، جو سرسید کے عہد میں اور زیادہ نمایاں ہوگئی تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کا گھرانا اس تحریک میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز تھا۔ اسی اصلاح دین سے احیائے علوم کے چشمے پھوٹتے تھے۔ پرانے زمانے میں مسلمان ہی نہیں دوسری اقوام میں بھی علوم کا سرچشمہ مذہب تھا۔ ہندوستان میں اس وقت مسلمان جن حالات وحوادث سے دوچار تھے، ان کے پیش نظر علی گڑھ تحریک میں کچھ اور مقاصد بھی شامل کر لیے گئے تھے۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں رینائسنس اور ریفرمیشن کی قیادت کے لیے جس عظیم اور جامع حیثیات شخصیت کی ضرورت تھی وہ صرف سرسید کی تھی۔ انیسویں صدی کے خاتمہ پر سرسید رحلت فرماگئے، بیسویں صدی کے عشرہ اول میں مسلمانوں کی سیاسی اور قومی زندگی نے جو رنگ اور رخ اختیار کیا اس کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا اس کی قیادت اتنی حرکی، محکم، اور ہمہ جہتی نہ تھی کہ وقت کا تقاضا تھا۔ اس وقت ایک نئے سرسید کی ضرورت تھی۔ میرے نزدیک یہ رول مولانا ابوالکلام نے ادا کیا۔

سرسید ہی کی طرح وہ اعلیٰ خاندانی روایات، اسلامی علوم، اسلامی تاریخ، اسلامی عقائد، اسلامی اقدار اور اسلامی تہذیب و اخلاق کے حامل اور مبلغ ہونے کے علاوہ سیاسی بصیرت رکھتے تھے، زندگی اور زمانے کے نئے تقاضوں اور رجحانات کو پہچانتے تھے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت اور طاقت رکھتے تھے۔ مخالفت کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو اس کا مقابلہ شرافت، قابلیت اور پامردی سے کرتے تھے۔ عربی، فارسی اور

اردوشعروادب کا اعلیٰ ذوق اورتحریر وتقریر میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ البتہ ایک بات جو سرسید اور مولانا کو ایک دوسرے سے جدا اور ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ سرسید عامۃ الناس سے بڑا گہرا قریبی اور ہمہ وقت کا تعلق رکھتے تھے، ان میں سے نہ ہوتے ہوئے بھی جیسے ان ہی میں سے ہوں۔ ان کے پاؤں زمین میں بڑی مضبوطی سے گڑے ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے وہ چھوٹے بڑے ہر پیانے پر سوچتے تھے اور اسی کے مطابق کام کرتے تھے۔ سرسید کا کمال اور کارنامہ یہ تھا کہ دور اور دیر کی اسکیموں کو بروئے کار لانے کے علاوہ، موقع آن پڑتا تو وہ فرسٹ ایڈ (حادثے پر فوری چارہ سازی) بھی کرتے۔ سرسید کے اس فرسٹ ایڈ کو ان کے بعد آنے والوں نے خودغرضی یا ناسمجھی کی بنا پر مستقل علاج سمجھ لیا اور کبھی لازمۂ صحت۔

مولانا ابوالکلام عوام کے آدمی نہ تھے۔ کتنے خواص کو بھی ان کے ہاں عوام کے درجے پر اکتفا کرنا پڑتا تھا، شاید انھوں نے اقبال کے عقاب کی طرح چٹانوں کی بلند و ویران تنہائیوں میں اپنی دنیا بنا رکھی تھی۔ یہ بحث آگے بھی آئے گی۔

یہاں علی گڑھ تحریک اور مسلم یونیورسٹی کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کیا گیا ہے، مولانا ان تحریکوں کی تائید میں نہ تھے، یونیورسٹی جن شرائط پر یا جن حالات میں قبول کی گئی، اس کے خلاف مولانا کی لکھنو میں جو تقریر ہوئی اور اس پر جو مضامین انھوں نے سپرد قلم کیے وہ کچھ اور نہیں تو بے مثل خطابت، شدید طنز اور اعلیٰ انشا پردازی کے اعتبار سے اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ لیکن تقسیم ملک کے بعد جب حالات دگرگوں ہوئے تو مسلم یونیورسٹی کو ہرگزند سے محفوظ رکھنے میں مولانا نے جو خدمات انجام دیں، وہ بھی اس ادارے کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کی جائیں گی۔ ان میں سے ایک ذاکر صاحب کو علی گڑھ کی وائس چانسلرشپ قبول کرنے پر آمادہ کرنا بھی تھا۔ حالات و حادثات کی یہ ستم ظریفی بھی دیدنی ہے کہ ذاکر صاحب اور مولانا دونوں علی گڑھ کے خلاف تھے، لیکن وقت آیا تو ان ہی دونوں کو اس کی حمایت و حفاظت کے فرائض ادا کرنے پڑے۔ ''بت خانے'' کی یہ ''کرامت'' کیا کم ہے:

کہ چوں خراب شود خانہ خدا گردد!

ایسے لوگ کم دیکھے گئے ہیں جو اس کم عمری میں اپنے آپ کو دنیا کے راستوں پر نہیں بلکہ دنیا کو اپنے راستے پر چلنے کے لیے تیار کر لیتے ہوں۔ مولانا ابوالکلام ایسے ہی تھے۔ دنیا کے راستے پر چلنے والے دنیا کے اشارے کے محتاج ہوتے ہیں، مردان کار آگاہ، کے بنائے ہوئے راستے پر چلنے کے لئے، خود دنیا ان کے اشارے کی محتاج و منتظر ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ مولانا تمام عمر خود کسی کے مشورے یا مدد کے خواستگار نہیں ہوئے، ان کی مدد اور مشورے کے محتاج و منتظر دوسرے رہے۔ وہ صرف اپنے بنائے ہوئے معیار خوب وزشت کی پابندی کر سکتے تھے۔

مولانا عزلت نشین، دیرآشنا اور کم آمیز تھے۔ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ ہر قوم، ہر ملک اور ہر زمانے کے ''خاصانِ یادگار'' سب سے کنارہ کش ہو کر زندگی کا وہ زمانہ جو ترغیبات نفس کے اعتبار سے غفلت اور غلبے اور ضمیر و دانش کے اعتبار سے نیم رس ہوتا ہے، عبادت و ریاضت میں گزارتے ہیں۔ اس خلوت، عبادت اور ریاضت (اعتکاف) کا مقصد مطالعہ ذات اور محاسبہ نفس سے ہوتا ہے، اس سے ان پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ ان کی زندگی کا کیا مشن ہے اور وہ خلق خدا کی کس خدمت پر مامور (من اللہ) ہونے والے ہیں۔ ان مراحل سے گزرنے کے بعد وہ دعوت حق اور خدمت خلق کے لیے عامۃ الناس میں آتے ہیں۔ یہ تو نہیں بتا سکتا کہ مولانا اپنی زندگی کے کسی خاص عہد میں اس مرحلے و منزل سے گزرے یا نہیں اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اس مطالعے اور مجاہدے میں کسی نہ کسی حد تک مولانا آخر دم تک منہمک رہے۔ اپنے محاسبے کے لیے اپنی کمیں گاہ میں بیٹھنا ایک بات ہے۔ اور بہت بڑی بات ہے اور اپنی بنائی ہوئی جنت یا خانقاہ میں بیٹھنا قطعاً دوسری بات ہے اور بہت معمولی بات ہے۔ اول الذکر حالت وسیلہ ہے ایک بڑے مقصد کا اور موخرالذکر بجائے خود ایک مقصد ہے لیکن ادنیٰ مقصد ہے۔ ایک پناہ لینا ہے، دوسرا بے پناہ بننا ہے، اتنا ہم سب جانتے ہیں کہ مولانا کا مزاج خانقاہی نہ تھا۔ آخرت میں مولانا کے ساتھ جنت کیا سلوک کرے وہ تو مجھے نہیں معلوم، دنیا میں تو مولانا نے جنت کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا۔

مولانا کی رہبری میں پیغمبرانہ طریق دعوت کے بجائے، آمرانہ شان اور کبریائی کی ادا تھی، وہ اتنے پبلک کے نہیں جتنے لیڈروں کے لیڈر تھے۔ مولانا اپنے آپ کو عوام سے زیادہ خواص کی راہ نمائی پر مامور سمجھتے تھے۔

مولانا کا اسلوب تحریر ان کی شخصیت تھی اور ان کی شخصیت ان کا اسلوب دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ صاحب طرز کی ایک نشانی یہ بھی ہے! مولانا نے لکھنے کا انداز، لب و لہجہ اور مواد کلام پاک سے لیا جو ان کے مزاج کے مطابق تھا۔ مولانا پہلے اور آخری شخص ہیں جنھوں نے براہ راست قرآن کو اپنے اسلوب کا سرچشمہ بنایا۔ وہی انداز بیان اور زور کلام اور وعید و تہدید کے تازیانے جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ پہاڑوں کو رعشہ سیماب طاری کر دیتا ہے۔ مولانا کی تحریروں میں وہ نرمی اور نوازش نہ ملے گی جو پیغمبروں کی دعوت میں ملتی ہے، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، مولانا کی حیثیت پیغمبری کے رول سے اتنی سازگار نہ تھی جتنی خدائی کے رول سے، خدا پیغمبروں کی طرح انسانوں میں گھلا ملا نہیں ملتا۔ اس لیے پیغمبروں کی طرح وہ انسانوں میں سے نہیں ہوتا، اس لیے خدا کے خطاب کرنے کا انداز پیغمبر یا انسان کے طرز خطاب سے جداگانہ ہوتا ہے، یہاں پہنچ کر یہ بھید کھلنے لگتا ہے کہ مولانا کی تحریروں میں انانیتی رنگ اور خطابت کا غلبہ کہاں سے آیا۔

صحف سماوی میں جو باتیں بتائی گئی ہیں، انسان نے ہمیشہ ان کو اپنی بہترین احساسات کے مطابق فنون لطیفہ میں تعبیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مذہبی افکار کو شعروادب سے شعروادب کو مذہبی افکار سے سب سے زیادہ تازگی اور توانائی ملی ہے۔ فارسی اور اردو نظم میں رومی اور اقبال نے جس حرارت دینی، علمی تبحر، عصری بصیرت، شاعرانہ حسن کاری اور فنی قدرت سے کلام پاک کو متعارف کیا، اس کی جھلک اگر کہیں ملتی ہے تو ڈانٹے اور ملٹن کی نظموں میں۔ جو عیسوی تصوراتِ مذہب کی رہین منت ہیں۔ ان مشہور عالم شعراء کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے جنت اور جہنم کے اسلامی تصورات سے بھی خوشہ چینی کی ہے۔ کلام پاک کی تعلیمات اور تصورات کو اردو میں اس بصیرت، زیبائی و برنائی کے ساتھ پیش کرنا کہ وہ اللہ کا کلام ہی نہیں بندوں کا عمل صالح بھی معلوم ہو، معمولی ذہن و دماغ کا کام نہیں، اردو میں یہ کارنامہ مولانا آزاد کا ہے۔

عربی زبان کے معیار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دنیا کے دور دراز گوشوں میں آغاز اسلام سے آج تک یکساں بلند ہے جس کا سب سے بڑا سبب کلام پاک کی غیر متبدل زبان و بیان اور اس کے معانی و مطالب کا عالمگیر اثر و نفوذ ہے۔ ان قوموں سے قطع نظر جن کی مادری زبان عربی ہے بے شمار ایسے مسلمان ہیں جن کی مادری زبان کچھ اور ہے لیکن کلام پاک کی تلاوت و ترتیل اور اوراد و وظائف کے التزام مذہبی فرائض بجا لانے اور شعوری یا غیر شعوری طور پر روزانہ کی زندگی میں عربی فقروں کے زبان زد ہوتے رہنے سے عربی ان کی زندگی میں دخیل اور ان کے ذہنوں میں پیوست ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے چھوٹے بڑے بے شمار عربی مدارس ہیں جہاں قدیم زمانے سے آج تک اس کی مکمل تعلیم دی جاتی ہے۔ اب سے پہلے ہندوستان میں مسلمانوں کی علمی، تصنیفی اور ادبی زبان بھی عربی تھی۔ ایک حد تک فارسی کو بھی یہی درجہ حاصل ہے۔

یہاں عربی اور فارسی زبانوں کی خوبیوں پر تفصیل سے گفتگو کرنا مقصود نہیں ہے۔ بتانا صرف اتنا ہے کہ عربی میں کلام پاک کا ہونا عربی زبان کی شہرت اور بقا کی ایسی ضمانت ہے جس کو زوال نہیں اور اس زبان کا صحیح عمل دخل جہاں کہیں جس زبان اور قوم میں ملے گا ان میں حسب استعداد عربی زبان اور عرب قوم کی تازگی اور توانائی بھی ملے گی۔ فارسی اور عربی شعر و ادب پر مولانا کو جو غیر معمولی عبور تھا اور ان کا ذوق جس طرح ان کے ذہن و فکر میں رس بس گیا تھا۔ وہ مولانا کے قلم اور زبان سے اردو میں سہ آتشہ ہوکر نمودار ہوا۔

یہ بات صرف عربی فارسی زبانوں تک محدود نہیں ہے، زبان کے معیار کو بلند اور کارآمد رکھنے میں الہامی اور کلاسکی زبانوں کی اہمیت مسلم ہے، بشرطیکہ اور یہ بہت بڑی شرط ہے کہ ان زبانوں کا اثر اور ان کی افادیت بولنے اور لکھنے والوں کی عملی زندگی میں مسلسل اور مؤثر طریقے پر ملتی ہو، زبان نہ اپنے حسب نسب کے اعتبار سے ترقی کرتی ہے نہ زبان کے بے وقوف دوستوں کے حسب نسب سے۔ وہ ترقی کرتی ہے بولنے اور لکھنے والوں کی ہر طرح کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھنے سے۔

سرسید، شبلی، حالی، نذیر احمد، محمد حسین آزاد سب کے انداز میں لکھنے والے ہمارے یہاں مل جائیں گے لیکن مولانا کا پیرو ایک نہ ملے گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پیرو کا نہ ملنا مولانا کی بڑائی میں کوئی اضافہ ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ مولانا کا اسٹائل ادب اردو کے لیے کچھ زیادہ مفید نہیں یا اس کی فائدہ رسانی کی عمر ختم ہوچکی یا مولانا کی تحریروں میں اسٹائل کا غلبہ اور مواد کی کمی ہے یا مولانا کے مضامین کا ترجمہ کسی ایسی زبان میں، جو عربی فارسی کی جینئس (Genius) سے ناآشنا ہو، کامیاب نہ ہوگا تو میں اس سے ''جدال سعدی'' قسم کی تفریح پر بھی آمادہ نہ ہوں گا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ یہ بے مثل اسلوب جس میں ''عجم کا حسن طبیعت اور عرب کے سوز دروں'' کے ساتھ ''شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی'' بھی ملتا ہے۔ مولانا پر ختم ہوگیا۔ ایک جگہ عرفیؔ نے اپنے انداز خاص سے ماتم کیا ہے کہ تمام شہر و دیار چھان ڈالے لیکن ''نیافتم کہ فروشند بخت در بازار'' نصیبے کی طرح اسٹائل کا بھی یہی حال ہے بالخصوص مولانا کے اسٹائل کا۔

صحافت کو ادب میں جگہ نہیں دی گئی ہے۔ اس کی سرگرمیاں بالعموم روزمرہ کے حالات و حوادث پر رائے زنی تک محدود ہوتی ہیں۔ مسائل حاضرہ پر تبصرہ اور خبریں پڑھ کر ہم دوبارہ اخبار کی طرف التفات نہیں کرتے۔ اخبار کے بارے میں کبھی کبھی ایک کہاوت بھی سننے میں آجاتی ہے یعنی اتنا باسی جتنا کہ گزرے ہوئے دن کا اخبار ہمارے بعض بڑے اچھے شاعر اور نثر نگار صحافت کے نشے یا طلسم میں ایسے اسیر ہوئے کہ آخر تک نکل نہ پائے اور ان کی تحریریں ''صحافتی'' قرار پائیں۔

مولانا کا ابتدائی عہد (جنگ بلقان سے پہلی جنگ عظیم تک) اردو صحافت کا زریں دور تھا۔ گزشتہ پچاس سال میں اردو کے اچھے سے اچھے اخبار اور ان کے مدیر قوم اور ملک سے روشناس ہوئے، جنھوں نے اردو جرنلزم کو بڑی ترقی دی، لیکن سوائے مولانا کے کسی اور کو ایڈیٹر کی حیثیت سے ادب کی صف اول میں جگہ نہ ملی اور صرف الہلال اور البلاغ کے مضامین کو علمی اور ادبی درجہ نصیب ہوا۔

بذات خود میں نہ مولانا کو متداول معنوں میں صحافی سمجھتا ہوں نہ الہلال اور البلاغ کو صرف اخبار۔ مولانا کسی مسئلہ پر نہ سرسری طور سے غور کرتے تھے نہ اظہار خیال۔ بلکہ اس کا التزام رکھتے تھے کہ جو بات کہی جائے وہ مسلمات کی روشنی کی تاب لا سکے، کسی بڑی حقیقت سے رشتہ رکھتی ہو اور علمی و ادبی معیار پر صحیح اترے۔ ادارت کے مصروف پروگرام اور گریز پا لمحات میں اس التزام کا نباہنا تقریباً ناممکن ہے، صرف مولانا

ایسا کرسکتے تھے۔ اردوصحافت کومولانا نے کلاسکس کا درجہ عطا کیا۔ مولانا کی تحریر صحافتی نہیں تصنیفی ہوتی تھی، نظر حکیمانہ، انداز خطیبانہ اور آہنگ ملہمانہ! ان کی تحریروں، تقریروں نیز ان کے سراپا کا جب کبھی خیال آتا ہے تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ازمنہ، قدیمہ میں یونان کے زندہ جاوید رزمیہ نگار مصروف کار ہوں۔ اپنے زمانے اور اپنے دیار میں مولانا یونانی دیوتاؤں سے کم نہ تھے۔

مولانا کے ہاں انشاپردازی کے ایک سے زیادہ اسالیب ملتے ہیں۔ الہلال میں دعوت دار ورسن ہے۔ تذکرے میں دعوت دیدوشنید، غبار خاطر میں دعوت نوش ونشید، تفسیر قرآن کا لب ولہجہ علمی اور عالمانہ ہے۔

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا !

غالبًا الہلال اور تذکرہ ہی کے زمانے میں مولانا نے تفسیر کا کام شروع کردیا تھا۔ کلام پاک کا ترجمہ کرنا آسان نہیں ہے لیکن تفسیر کا کام بدرجہا مشکل اور نازک ہے، اس لیے کہ اس میں عربی زبان وبیان پر عبور ہونے کے علاوہ اقوام عالم کی تاریخ پر نظر، عقیدے کی محکمی اور سیرت کی پختگی و پاکیزگی لازمی شرائط ہیں۔ تفسیر میں مفسر کے نقطہ نظر کا راہ پا جانا جتنا نامناسب ہے، اتنا ہی ناگزیر بھی ہے، تفسیر میں ایسے مقامات اکثر آتے ہیں جہاں تاویل وتعبیر کے ایک سے زیادہ پہلو نکلتے ہیں، چنانچہ الہامی اور مذہبی کتابوں پر معتقدین اور منکرین نے بربنائے اعتقاد یا انتقاد اب تک جتنے متضاد خیالات کا اظہار کیا ہے وہ شاید ہی کسی اور نوعیت کی کتاب کے بارے میں دیکھنے میں آئیں۔

تفسیر لکھنے والوں کا کبھی کبھی مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے نقطہ نظر کی تاویل کلام الٰہی میں پالیں۔ مولانا نے اپنی تفسیر میں (جو شاید تکمیل کو نہ پہنچ سکی) اس کا لحاظ رکھا ہے کہ کلام الٰہی میں اپنے نقطہ نظر کا جواز نکالنے کے بجائے کلام پاک ہی کے نقطہ نظر کو پانے اور پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کام بڑی دیانت اور جرأت کا ہے۔

قلعہ احمد نگر کے ایام اسیری میں مولانا کا غبار خاطر لکھنا ایک دلچسپ مطالعہ ہے۔ غبار خاطر کہنے کو تو مولانا کے خطوط ہیں اور نواب صدر یار جنگ مرحوم کے نام لکھے گئے ہیں لیکن مولانا کے انداز طبیعت کو مدنظر رکھتے ہوئے اکثر ایسا یہ محسوس ہوا جیسا مولانا نے یہ خطوط دراصل اپنے ہی نام لکھے ہوں اس لیے کہ یہ اتنے خطوط نہیں معلوم ہوتے جتنی خود کلامی، مولانا اپنے سوا کسی سے اتنے بے تکلف نہیں ہوسکتے تھے کہ اس کو ایسے خطوط لکھتے، اپنے سے بھی مولانا بڑی مشکل سے بے تکلف ہوتے تھے۔

یہاں پہنچ کر کچھ اس طرح کا احساس ہونے لگتا ہے جیسے کسی نے اپنے عزیز یا دوست سے دانستہ یا نادانستہ تمام عمر بے التفاتی برتی ہو لیکن آخر میں تلافی مافات کا خیال آئے تو اس پر نوازشوں کی بارش کردے۔ مولانا نے سیاست کے خارزار اور قومی زندگی کی بے آب وگیاہ وادی میں تمام عمر اپنے نفس کو ہر لذت سے محروم اور ہر محرومی سے دوچار رکھا لیکن آخر زمانے میں جب اس فروگزاشت کا خیال آتا تو اس پر اپنے اعتماد کا اظہار کرنا شروع کردیا۔ چنانچہ یہ خطوط ایک طور پر نتیجہ ہوسکتے ہیں مولانا کے اپنے نفس سے بدلے ہوئے خوش گوار رویے کا۔

دوسری بات جو مولانا کی انشاپردازی کے بارے میں ان خطوط سے منکشف ہوتی ہے وہ ان کی طبیعت کا انبساط اور شگفتہ، شاداب اور صحت مند انشاء پردازی پر ان کی غیر معمولی قدرت ہے، غبار خاطر میں مولانا کی حسن طبیعت کا وہ اظہار ملتا ہے جو رقعات غالب میں غالب کا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ غبار خاطر سے پہلے مولانا کی انشاپردازی پر ابتدا سے جو خطیبانہ اور ملہمانہ رنگ طاری تھا اس کا فشار اگر بالکل دور نہیں تو بہت کچھ ہلکا ہوگیا تھا۔ غبار خاطر وجود میں نہ آتا تو مولانا کی شخصیت اور انشاپردازی کا ایک بڑا دل آویز پہلو ہماری نظروں سے اوجھل رہتا۔

الہلال اور تذکرہ کے عہد میں مولانا کا جو اسلوب تحریر ملتا ہے وہ اقتضائے زمانہ کے مطابق تھا، اور اپنی خوبی اور خوبصورتی کے باوجود زمانے کے ساتھ ہی ختم ہوگیا لیکن غبار خاطر کا اسلوب اردو میں نامعلوم مدت تک زندہ رہے گا۔ اکثر بے اختیار جی چاہنے لگتا ہے، کاش اس اسلوب کے ساتھ مولانا کچھ دن اور جئے ہوتے۔ پھر ہمارے ادب میں کیسے کیسے نسرین ونسترن اپنی بہار دکھاتے اور خود مولانا کے جذبہ تخیل کی کیسی کیسی کلیاں شگفتہ ہوتیں۔

ملک کی آزادی کی تحریک میں مسلمان اکابر کو اسیری نصیب ہوتی تو بالعموم ان کا ذہن مذہبی کتابوں کے مطالعہ کی طرف مائل ہوتا۔ ان میں سے اکثر اپنے تاثرات بھی قلم بند کرتے۔ آزاد فضا کی حشر زائیوں کے بعد جیل کی ساکن، بے رنگ اور ویران زندگی کے معمولات کا سامنا ہوتو اسیروں کا افکار اور جذبات کی اپنی بنائی ہوئی بے کنار وبوقلموں دنیاؤں میں پناہ لینا فطری ہے، جو ان کو پہلے نصیب نہ ہوتی۔ مسلمانوں ہی پر موقوف نہیں، یہ صورت حال سب پر گزری ہے۔ کسی نے لڑکی کو خطوط لکھے، کسی نے بیوی کو، کسی نے اپنے آپ کو!

قیاس یہ ہے کہ جس زمانے میں مولانا رانچی میں نظر بند تھے، تفسیر کا کام جس کی ابتدا الہلال اور البلاغ کے صفحات سے ہوچکی تھی، بڑی تندہی سے شروع کردیا تھا۔ ان دنوں مولانا کی سرگرمیاں تمام تر سیاسی مذہبی یا مذہبی سیاسی نوعیت کی تھیں، یعنی کبھی کشتی سیاسی ہوتی بادبان مذہبی ہوتے اور کبھی اس کے برعکس جہاں تک خیال ہے، یہ تفسیر ناتمام رہی اور صرف دو جلدیں شائع ہوئیں۔ رانچی سے احمد نگر تک کی مدت اتنی تھی کہ یہ کام مکمل ہوسکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا اور آخری اسیری کا زمانہ مولانا نے کتاب الٰہی کی تفسیر لکھنے کے بجائے ''کتاب دل'' کی تفسیر لکھنے میں صرف کیا۔ ایسا تو نہیں کہ زندگی کے آخری دور میں مولانا ''لازمانی'' اور ''لامکانی'' کے بجائے ''زمینی وزمانی'' ہوگئے

ہوں، اگر ایسا ہے تو یہ تبدیلی بڑی مبارک اور انقلابی تھی۔

جیسا کہ اس سے پہلے ظاہر کر چکا ہوں، تقسیم ملک کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کے وہ تنہا سہارا رہ گئے تھے۔ حکومت کے بڑے اہم منصب پر فائز رہ کر اور بے شمار نزاکتوں میں گھرے ہونے کے باوجود مولانا نے یہ فرض جس خوبی سے انجام دیا وہ بیان سے باہر ہے۔ مولانا کے اٹھ جانے کے بعد کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ منصب ان پر ختم ہوگیا ہو۔

یہاں پہنچ کر یہ بات بھی دل میں آتی ہے کہ حکومت کیسی ہی ہو، آزادی اور تندہی سے قوم کی خدمت کا کام حکومت سے باہر ہی رہ کر زیادہ موثر طور پر انجام دیا جاسکتا ہے کچھ اور نہیں تو اس بناء پر کہ حکومت میں رجعت پسندی اور عامۃ الناس میں ترقی پسندی کی استعداد خلقی ہے۔ اول الذکر کی تقدیر سکونی ہے، مؤخر الذکر کی حرکی۔

قطع نظر اس سے کہ مولانا حکومت سے کس درجہ وابستہ ہوگئے تھے، اس سے باہر نکل سکتے بھی تھے یا نہیں، ان کو نکلنے بھی دیا جاتا یا نہیں یا ان کی صحت اس کی کہاں تک متحمل ہوتی۔ کبھی کبھی یہ بات ذہن میں آتی ہے، کاش وہ حکومت کے محدود اور گلوافشار حلقے سے باہر نکل کر ہندی جمہوریہ کی دستور میں ہندی مسلمانوں کو وہ مشکل لیکن مہتمم بالشان مقام دلاسکتے جو مسلمانوں کا حق بھی ہے اور ذمہ داری بھی۔

جی ایسا کیوں چاہتا ہے، شاید اس لیے کہ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی سردار دور دور ایسا نظر نہیں آتا، جس کے سپرد ہندوستانی مسلمانوں کی حمایت و ہدایت کی ذمہ داری اعتبار و افتخار کے ساتھ کی جاسکے۔

اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی! (دسمبر ۱۹۵۸ء)

<u>عبدالحق، ڈاکٹر</u>

ڈاکٹر عبدالحق

ادھر عرصہ سے کوئی مہینہ خالی نہیں جاتا جب سینہ ملت کو کوئی نہ کوئی تازہ داغ نہ اٹھانا پڑتا ہو۔ ابھی مولانا مدنی اور مولانا ابوالکلام کا غم تازہ تھا کہ افضل العلماء مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے داعی اجل کو لبیک کہا، وہ مدراس کے تھے، اس لیے شمالی ہند کے خواص کے علاوہ عام لوگ کم ان سے واقف تھے، وہ اپنے اوصاف و کمالات کے اعتبار سے بہت بڑی شخصیت رکھتے تھے اور آج مسلمانوں میں جیسے مرد مومن کی ضرورت ہے اس کا نمونہ تھے، ان میں علم و عمل کے سارے کمالات جمع تھے، دینی علوم کے بھی باضابطہ عالم تھے اور علوم جدیدہ کے بھی فاضل تھے، انھوں نے عربی کی تکمیل کے بعد انگریزی پڑھی اور آکسفورڈ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، اس علم و فضل کے ساتھ بڑے دیندار اور عملی انسان تھے، انتظامی قابلیت بھی ان میں اعلیٰ درجہ کی تھی، مدراس کے مسلمانوں کی انھوں نے بڑی خدمت کی، تنہا اپنی کوشش سے مسلمانوں کے کئی ڈگری کالج قائم کیے اور وہ بجا طور پر مدراس کے سرسید کہلاتے تھے، مختلف اوقات میں بڑے بڑے تعلیمی عہدوں پر ممتاز رہے۔

اب سے چند سال پیشتر مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر بھی رہے تھے، اور اپنی قابلیت، دینداری اور حسن انتظام سے یونیورسٹی کی فضا بدل دی تھی، مگر اس سیکولر دور میں پھر مسلم یونیورسٹی جیسے مسلم ادارہ میں اس کی گنجائش کہاں، اس لیے تھوڑے ہی دنوں کے بعد مدراس پبلک سروس کمیشن کے ممبر بنادیئے گئے، اس وقت اس کے چیرمین تھے، مگر ان کی قابلیت اور تعلیمی تجربات کی بناء پر ممبر کی حیثیت سے یونیورسٹی کی مختلف تعلیمی اور انتظامی کمیٹیوں سے برابر ان کا تعلق قائم رہا اور وہ اس سے عملی دلچسپی لیتے رہے، حقیقۃً وہ مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے لائق تھے، وہ صحیح معنوں میں اس کو مسلم بنادیتے، سیکولر نقطہ نظر سے ان میں یہی نقص تھا، افسوس ہے کہ یونیورسٹی کی قسمت میں ان سے فائدہ اٹھانا نہ تھا۔

ان کمالات کے ساتھ ایسی سادگی اور دینداری کی مثالیں کم ملتی ہیں، ان میں ایک مرد مومن کی پوری شان تھی، ظاہری وضع قطع بھی خالص اسلامی تھی، دو مرتبہ حج و زیارت کے شرف سے مشرف ہوئے، اس سال بھی حج کے لیے جانے والے تھے کہ پیام اجل آگیا، عرصہ ہوا ایک مرتبہ دارالمصنفین بھی آئے تھے، ان کی قابلیت اور سادگی کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی، ان سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ افسوس ہے کہ موت نے ان سب کا خاتمہ کردیا، اللہ تعالی اس مرد مومن کو عالم آخرت کے مدارج عالیہ سے سرفراز فرمائے۔ (''م''، اپریل ۱۹۵۸ء)

ڈاکٹر عبدالحق

(پروفیسر رشید احمد صدیقی)

مدراس کے ریلوے اسٹیشن پر ایک اجنبی مسلمان اس فکر میں مضطرب پھر رہا تھا کہ رات بسر کرنے کے لئے کوئی جگہ مل جائے، اسٹیشن کے چھوٹے بڑے اہلکار کسی سبب سے اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے، اتنے ہی میں ایک طرف سے ایک ہندو نوجوان نمودار ہوا، اجنبی کی پریشانی دیکھ کر قریب آیا، وجہ دریافت کی، صورت حال معلوم ہونے پر اسے ایک جگہ اطمینان سے بیٹھ جانے کو کہا اور خود دیر تک آفسوں کا چکر لگاتا رہا، کبھی بابوؤں سے رد و قدح کرتا، کہیں منت سماجت، بالآخر واپس آیا اور مسلمان کو مطلوبہ جگہ پر پہنچادیا، مسلمان نے حیرت سے شکر گزاری کے ساتھ ہندو دوست سے متعارف ہونا چاہا تو بڑے اصرار کے بعد اس نے بتایا، مجھ پر ایک زمانہ بڑے آلام و افلاس کا گزرا

ہے، نہ کوئی سہارا دینے والا تھا نہ دلاسا۔ اس مایوسی اور بے بسی کے عالم میں ڈاکٹر عبدالحق کی خدمت میں پہنچا اور اپنی مصیبت بیان کی، سب کام چھوڑ کر بڑی شفقت سے پیش آئے، امید بندھائی اور روزگار کا ایسا بندوبست کردیا کہ میری زندگی کی کایا پلٹ گئی، میں نے ان کے احسان کو اس طرح محسوس کیا جیسے مجھ پر بڑی اچھی صلاحیتیں ابھر آئی ہوں اور مایوسی و بیزاری سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا مل گیا ہو، پھر میں نے ایک عہد کیا کہ جب تک جیوں گا جس مسلمان کو تکلیف اور تردد میں دیکھوں گا حتی الوسع اس کی مدد کروں گا۔

پچھلے سال کا ذکر ہے میری لڑکی اور داماد ایک طویل سیاحت سے فارغ ہوکر جاپان سے سیلون پہنچے، خط بھیج کر مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ کوئی ایسا انتظام کردوں کہ ایک دو روز مدراس میں قیام کر کے وہاں کی سیر کرلیں، میں نے ڈاکٹر صاحب کو لکھا، سب جانتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کا شمار مدراس کے مصروف ترین لوگوں میں ہوتا تھا، پبلک سروس کمیشن کی ذمہ داریوں کے علاوہ اپنے یا دوسروں کے معلوم نہیں کتنے اور کام اپنے ذمہ لے رکھے تھے، اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ان کی کوٹھی پر چھوٹے بڑے طرح طرح کے لوگ طرح طرح کے کاموں سے صبح سے رات تک برابر آتے جاتے رہتے اور ڈاکٹر صاحب ان سب سے بڑی توجہ اور تلطف سے پیش آتے، جیسے کسی معالج کا مطب ہو جہاں ہر مریض کا علاج مفت کیا جاتا ہو اور مطب صبح سے رات گئے مسلسل کھلا رہتا ہو، یہی نہیں بلکہ علاج کی نوعیت بھی جداگانہ ہو، مثلاً دوا، دعا، گنڈا تعویذ، دان پن، سعی سفارش، رشتہ ناتا، اتنا ہی نہیں بلکہ بیچ بیچ میں آؤٹ ڈور پریکٹس پر بھی نکل جاتے، کسی سے چندہ مانگنے کے لیے، کسی سے سفارش کرنے، کہیں تقریر کرنے، کہیں شادی غمی میں شریک ہونے، کبھی کسی مہمان کو مدراس کی سیر کرانے۔

ڈاکٹر صاحب کسی ضروری کام سے مدراس سے باہر جانے والے تھے، میرا خط ملا تو پروگرام ملتوی کردیا، جہاز کے اڈے پر پہنچے اور دونوں کو اپنے گھر لائے، ڈاکٹر صاحب کے لئے بالکل آسان تھا اور اس میں نزاکت یا قباحت کا کوئی پہلو نہیں نکلتا تھا کہ گھر والوں کو ضروری ہدایات دے کر دورے پر چلے جاتے، جانتا ہوں مہمانوں کی خاطر مدارات میں کسی طرح کی کمی نہ آتی، اس لیے کہ بیگم صاحبہ اور بچوں کی عزت اور محبت کے سلوک سے میں خود ایک بار بہرہ مند ہوچکا تھا، اس وقت کس حسرت سے وہ موقع یاد آتا ہے جب میرے لیے ہر طرح کی سہولت فراہم کرکے ڈاکٹر صاحب نے پہلے پہل مدراس بلایا تھا، میری اس ''زحمت فرمائی'' سے ان کو کتنی مسرت ہوئی تھی، جیسے ''زفرق تا بقدم'' شاداب و شاداں ہوگئے ہوں! اخلاص اور اخلاق برتنے کا ڈاکٹر صاحب کا ٹکنک جداگانہ تھا، وہ اپنے الطاف و کرام کا پورا اندوختہ کامل اعتماد اور افتخار سے پہلے ہی بار ہر اس شخص پر لگادیتے تھے، جس کو اس کی ضرورت ہوتی، ان کے اس طریقہ کار سے جرمنوں کے اس معروف اصولی جنگ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے، جہاں بتایا گیا ہے کہ دشمن کے کمزور پہلو پر حرب و ضرب کی اپنی پوری طاقت یکبارگی مرکوز کردو!

ڈاکٹر صاحب نے اسی پر اکتفا نہ کی، اپنے گھر پر ان کے لیے ایک طرح کی پکنک کا انتظام کیا، میری لڑکی، داماد اور نواسہ نیز اپنے لڑکے لڑکیوں کو پاس بٹھایا، انگیٹھی منگائی، کھانے پکانے کی طرح ڈالی، پکاتے جاتے اور بتاتے جاتے کہ مدراس میں مسلمانوں کے یہ کھانے اور مٹھائیاں نوابوں کے دور حکومت سے مشہور چلی آتی ہیں، یہ چیزیں کھانے کی میز پر دوسری چیزوں کے ساتھ چنی جائیں۔ اصرار سے کھلاتے اور ان کی لذت اور لطافت بیان کرتے، کبھی سبھوں کو ساتھ لے کر مدراس کی سیر کو نکل جاتے، مختلف مقامات کی تاریخی اہمیت بتاتے، اپنے جمع کیے ہوئے طرح طرح کے تاریخی نوادر مسلمانوں کے عہد کی قلمی کتابیں، نقاشی، وصلیاں، مغربی مصوری کے بعض شاہکار دکھاتے اور ان کی صراحت اس لطف سے کرتے جیسے تاریخی حقائق نہیں بلکہ لطیفے بیان کررہے ہوں۔

باوجود ان باتوں کے مجھے نہیں لکھا کہ انھوں نے میری خواہش کس خلوص اور خوبی سے پوری کردی تھی، اپنا کتنا ہرج کیا تھا یا پھر اس طرح کی فرسودہ رسمی معذرت کرتے کہ انھوں نے کیا ہی کیا تھا، گھر میں جو دال دلیا تھا، وہ پیش کردیا، بہت کم قیام کیا، مہمان کو بڑی تکلیف ہوئی امید ہے کہ معاف فرمائیں گے وغیرہ! مدراس میں قیام اور ڈاکٹر صاحب کی مہمان نوازی اور شفقت کی تفصیل مجھے اپنی لڑکی سے معلوم ہوئی جس نے علی گڑھ پہنچتے ہی سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب اور ان کے گھر والوں کی ثنا خوانی شروع کردی جیسے ڈاکٹر صاحب کے نہیں بلکہ اپنے کارنامے کا ذکر کررہی ہو۔

اتفاق یہ کہ ڈاکٹر صاحب کو جلد ہی ایگزیکٹو کونسل کی میٹنگ میں شرکت کے لیے علی گڑھ آنا پڑا، جس دن تشریف لائے اس سے ایک روز پہلے لڑکی داماد علی گڑھ چھوڑ چکے تھے، سنا تو متاسف ہوئے، ان کے متاسف ہونے کا معصوم بزرگانہ متبسم انداز نہیں بھولتا، فرمایا، اس دفعہ علی گڑھ آنے کا شوق یوں اور زیادہ تھا کہ سبھوں سے یہاں ملتا، میں نے کہا کہ سب آپ کی بیگم صاحبہ اور بچوں کی بڑی تعریف کرتے تھے، کہنے لگے ارے یہی تو ان کو بتانے آیا تھا کہ میرے گھر والے ان سب کو کتنا یاد کرتے ہیں۔

عبدالحق صاحب کو ذاکر صاحب یہاں کی پرووائس چانسلری پر بڑے اصرار اور اعتماد سے لائے تھے، میرا خیال ہے کہ کسی اور کے کہنے سے وہ اپنے طرح طرح کے پھیلے ہوئے کاموں کو چھوڑ کر جن سے ان کو بڑا شغف تھا، یہاں آنے پر رضا مند نہ ہوتے اس لیے اور کہ ان کاموں کو سنبھالنے اور ترقی دینے والا اس نواح میں ان کے سوا کوئی اور نہ تھا، آئے تو ذاکر صاحب نے اپنا مہمان بنا کر رکھا، اس زمانے میں یونیورسٹی ایک نازک دور سے گزر رہی تھی، پرانی بساط اٹھ رہی تھی، نیا نظام استوار نہیں ہو پایا تھا،

ذاکر صاحب یہاں کے دروبست پر حاوی نہیں ہو پائے تھے کہ بیمار ہوگئے، طویل علالت کے بعد صحت بحال ہوئی تو امریکہ جانا پڑا عبدالحق صاحب نے وائس چانسلری کا کام سنبھالا۔

اس حصہ ملک اور اس یونیورسٹی میں ڈاکٹر عبدالحق اجنبی نہ تھے تو کچھ زیادہ معروف بھی نہ تھے۔ البتہ خاص حلقوں میں لوگ اتنا جانتے تھے کہ مدراس میں مسلمانوں کے لیے ہر طرح کی تعلیمی سہولت فراہم کرانے میں ڈاکٹر صاحب کا بڑا حصہ ہے، اسلامی علوم و ادب پر اچھی نظر ہے، علوم جدیدہ سے بھی آشنا ہیں اور ہر جماعت میں وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

یہاں آئے تو لوگوں نے دیکھا کہ شکل صورت، وضع قطع، رہن سہن، شرعی مسلمانوں جیسی پرانی چال کی ترکی ٹوپی سر پر، داڑھی، ڈنڈا، اٹنگا پاجامہ، پان کھانا، حقہ پینا، مصافحہ کرنا، جو جہاں بلائے بے تکلف چلے جانا ہر مجلس میں ہر چھوٹے بڑے سے ہنسنا بولنا، کسی نے میلاد پڑھنے کو کہا وہ پڑھ دیا، کسی نے وعظ کہنے پر اصرار کیا وہ کہہ دیا، کسی نے بچہ کی بسم اللہ کرادینے کی درخواست کی وہ پوری کردی، ذاکر صاحب کی خوبصورت خوردسال نواسی (نیلوفر) بہت مانوس ہوگئی تھی، کاموں سے فرصت ہوتی تو اسے کبھی گود میں لیے ہوئے کبھی انگلی پکڑ کر صبح شام لان پر ٹہلتے ہوئے اس کی خاطر تفریح کی باتیں کرتے رہتے، کبھی وہ فرط مسرت سے بے اختیار ہوکر داڑھی پکڑ کر پوری طاقت سے کھینچتی تو اسے خوش کرنے کے لیے کراہتے اور ہنستے، کہتے ارے اب معلوم ہوا تیری ہی ڈر سے تیرے نانا نے داڑھی چھوٹی رکھی ہے کہ تو کھینچ نہ پائے، اچھا رہ جا اب تجھے گود میں نہ لوں گا، پیٹھ پر بٹھاؤں گا، پھر دیکھوں تو میری داڑھی پر کیسے قبضہ کرتی ہے ان کا یہ مشغلہ اور مذاق برابر جاری رہتا چاہے ملنے کے لیے کوئی طالب علم آجاتا یا اسٹاف کا ممبر یا ضلع کا افسر یا شہر یا مضافات کا کوئی رئیس، ملنے والے سے بھی باتیں کرتے جاتے اور بچی کی تفریح بھی بنے رہتے۔

ایک طرف نیلوفر جیسی خوبصورت چنچل ذہین بچی تھی، دوسری طرف ڈاکٹر صاحب کی نورانی شکل اور لطف و مرحمت سے لبریز آزمودہ کار محکم شخصیت میں جب کبھی بچی کو ڈاکٹر صاحب کی گود میں یا ان کی انگلی پکڑے لان پر ٹہلتے دیکھتا تو محسوس کرتا جیسے قدیم، جدید کو زندگی اور زمانے سے روشناس کرا رہا ہو، نیز پرانی اور نئی قدروں کا ایک دوسرے سے کس سطح پر کیا رشتہ ہے، ادھر یہ قصہ تھا، ادھر یہ بات پھیلی کہ ڈاکٹر عبدالحق تو قال اللہ وقال الرسول قسم کے مولوی تھے، علی گڑھ کو کیا جانیں اور ماڈرن یونیورسٹی کے طور طریق کو کیا سمجھیں، کچھ ایسے لوگ جو دنیا کو ہر لعنت سے پاک اور ہر نعمت سے بہرہ یاب کرنے پر اپنے آپ کو مامور اور دوسروں کو صرف فتور عقل و نیت میں مبتلا سمجھتے تھے، ڈاکٹر صاحب سے ملے اور اس طرح گفتگو شروع کی جیسے ان پر علوم جدیدہ کے بصائر و معارف کے وہ دریچے کھول رہے تھے جن تک ڈاکٹر صاحب کی رسائی نہ تھی یا عالمی نظم و نسق کے وہ نکتے واضح کر رہے تھے، جن سے ڈاکٹر صاحب بے بسرہ تھے یہ بھی کافی نہ سمجھ کر کہیں کہیں خیرہ چشمی کی بھی جھلک دکھا دیتے، ڈاکٹر صاحب یہ ساری باتیں بڑے تحمل اور شفقت سے سنتے، کبھی مسکراتے، کبھی داد دیتے، ایک آدھ کلمے ایسے بھی کہہ دیتے جس میں مسلمانوں کی اخلاقی روایات اور وقت کے مطالبات کے علاوہ یونیورسٹی کے تحفظ اور ترقی کے مسائل کی طرف اشارے ہوتے۔

وقتاً فوقتاً اس طرح کے انٹرویو ہوتے رہے اور فضا کچھ اس طرح بدلنے لگی کہ وہ لوگ جو اسلامی روایات کو قصہ ماضی سمجھتے تھے ڈاکٹر صاحب کی ذات میں ان اقدار اور روایات کو ناقابل تسخیر سمجھنے لگے، یہاں تک کہ بعض نے پچھلے طرز عمل پر اظہار پشیمانی کیا اور معافی کے خواستگار ہوئے کچھ دنوں بعد جب ڈاکٹر صاحب یہاں سے تشریف لے جاچکے تھے، یہ فرمائش کی گئی کہ اسٹریچی ہال میں انگریزی میں تقریر فرمائیں موضوع بحث کچھ اس طرح تھا، کیا فقہ اسلامی رومن لا سے ماخوذ ہے، ڈاکٹر صاحب فرمائش پوری کرنے پر آمادہ ہوگئے ایک ایک دن کے وقفے سے غالباً تین لکچر دیئے، اسٹریچی ہال حاضرین سے لبریز ہوتا، بغیر کسی یادداشت کے سہل اور شستہ انگریزی میں بے تکلف تقریر کرتے، کتنی مدلل، پرمغز اور فکر انگیز وہ تقریریں تھیں، جہاں تک مجھے معلوم ہے، قانون کا ڈاکٹر صاحب کا کوئی خصوصی مطالعہ نہ تھا، اس تقریر نے ان کی قابلیت اور شخصیت کا نقش لوگوں کے دلوں پر ہمیشہ کے لیے بٹھادیا، کتنے خوش ہوتے تھے جب کوئی طالب علم کسی علمی ضرورت پر ان سے رہنمائی کا خواستگار ہوتا۔ دقیق سے دقیق مسائل کی تشریح آسان سے آسان طریقوں اور مثالوں سے کرتے کم لوگ ایسے ہوں گے جن کا علم اور اخلاق طلبہ کو اس طرح ''اڑ کر لگتا ہو'' جتنا کہ ڈاکٹر صاحب کا!

ڈاکٹر صاحب کو میں نے علی گڑھ میں بھی کام کرتے دیکھا اور مدراس میں بھی عجیب بات یہ تھی کہ وہ کام بہت زیادہ کرتے تھے لیکن مصروف بالکل نہیں نظر آتے تھے، برخلاف دوسروں کے جو کام بہت کم کرتے ہیں یا بالکل نہیں کرتے لیکن ''مصروف'' ہمہ وقت نظر آتے ہیں۔ وجہ یہ بتاتے ہیں کہ مصروفیت کام سے نہیں ہے، احساس ذمہ داری سے ہے، یہ احساس اپنی ذمہ داری سے متعلق نہ ہو تو دوسرے کی ذمہ داری سے سہی! عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ کوئی شخص کام کرتے کرتے تھک گیا ہو، اور اٹھنا چاہتا ہو، اسی وقت کوئی دوسرا کام یا صاحب غرض آجائے تو وہ قدرۃً جھنجھلا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب پر یہ حالت کبھی طاری نہیں ہوئی، کتنا ہی کام کتنا ہی دیر تک کیوں نہ کر چکے ہوں، کوئی اور کام یا صاحب غرض آجائے تو وہ اس سے اسی تازہ رُوئی سے متوجہ ہوجاتے تھے جیسے وہ اس سے پہلے صرف تفریح کر رہے تھے، کام اب شروع کریں گے۔ یہ بات میں نے بہت کم لوگوں میں پائی، کہا کرتے تھے کہ مجھے نہ کام کھلتا ہے نہ

صاحب غرض! کام کا نہ کھلنا تو سمجھ میں آتا ہے، اس لیے کہ صحت اور سکون میسر ہو تو کام کرنا اور کرتے رہنا زندگی کے نعائم میں سے ہے لیکن بہ ثبات ہوش وحواس جس پر صاحب غرض نہ کھلتا ہو اس کو میں اولیاء اللہ کے طبقے میں جگہ دیتا ہوں، صاحب غرض سے یہاں میری مراد خود غرض سے ہے، اہل حاجت سے نہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں علم اور دین کا چرچا تھا، اس عہد میں علم کا سرچشمہ دین تھا، ہر دین کا مقصد خدا کی اطاعت اور خلق کی خدمت ہے یہ فضا جو ہر قابل کے لیے یوں ہی کیا کم سازگار ہوتی ہے کہ اس پر معاشی تنگ حالی سونے پر سہاگے کا کام کرگئی، ابتدائے زندگی میں تنگ دستی سے بہتر اور سستی تربیت گاہ میں نے آج تک نہ دیکھی، بشرطیکہ تنگ دستی کا یہ زمانہ محنت اور ایمانداری سے کاٹ دینے کی اللہ توفیق دے، اس پر ایک عزیز نے طنزاً فرمایا کہ اللہ کی توفیق ہی درکار ہو تو محنت مزدوری کے بجائے براہ راست دولت اور فراغت ہی کی دعا کیوں نہ مانگی جائے، میں نے کہا کہ بات ٹھیک ہے لیکن اللہ کے لیے عافیت اس میں ہے کہ وہ مجھے محنتی اور ایماندار بنا کر خود کفیل بنادے اور میری طرف سے بے فکر ہوجائے، آپ کو دولت و فراغت براہ راست دے کر وہ اپنی نت نئی مشکلات میں اضافہ کرنا کیسے پسند کرے گا۔

علم اور دین کے مطالبات ڈاکٹر صاحب نے تمام عمر جس پابندی اور خوبصورتی سے پورے کیے وہ مجھے کہیں اور کم نظر آئی، میری تقدیر کو بنانے میں اسلام کو بڑا دخل ہے، اسلام کا جو تصور پیش کیا گیا ہے یا جو میری سمجھ میں آسکا ہے اس سے بڑا تصور انسان کے ذہن و تخیل میں نہیں آسکتا، انسان اور اپنے شایانِ شان اس پیمانے پر صرف خدا سوچ سکتا تھا، بایں ہمہ مجھے کوئی ایسا مسلمان نہ ملا جس کو میں اس اسلام کا نمونہ پاتا جو میرے ذہن میں تھا، اسلام ہی نہیں میں ہر مذہب کا بڑا احترام کرتا ہوں اور اپنے اس عقیدے کو اپنی بڑی جیت سمجھتا ہوں، لیکن مجھے اچھے مذہبی آدمی نہ ملے، بیشتر یہی محسوس ہوا جیسے مذہبی آدمی اپنے کو دوسرے سے علیحدہ اور ممتاز سمجھتا ہو، جیسے اس میں ''برہمنیت'' راہ پاگئی ہو اور وہ اپنے آپ کو مامور من اللہ سمجھتا ہو، لیکن وہ اتنی معمولی سی بات سے بے خبر ہوتا ہے کہ اگر وہ خدا کی طرف سے مامور کیا گیا ہے تو اس کا مامور ہونا، اس کی آزمائش پہلے ہے فضیلت بعد میں، فضیلت برہمن کے حصے میں اور آزمائش شودر کے نصیبے میں آئے، یہ کہیں اور ہوتا ہو تو ہو اسلام میں نہیں ہوتا، مامور من اللہ ہونے کی ذمہ داری لینا یوں بھی کوئی دانشمندی نہیں ہے۔

اس گفتگو کا مقصد یہ بتانا تھا کہ ڈاکٹر عبدالحق کیسے انسان اور کیسے مسلمان تھے، ان کو دیکھ کر میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوتی تھی کہ کاش میں بھی ایسا مسلمان ہوتا اور یہ میں نے اس لیے کہا کہ تمام عمر بے شمار مسلمانوں سے ملنے اور ان کو دور اور قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا، کوئی مسلمان ایسا نہ ملا جس کو دیکھ کر میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ ایسا مسلمان میں بھی ہوتا! اس کے ساتھ اس حقیقت کا بھی یہاں اعتراف کرتا ہوں کہ بہت ممکن ہے میرا سابقہ ایسے مسلمان سے اب تک نہ ہوا ہو، ورنہ ایسے مسلمان بے شمار ہوں ممکن ہے اس کا سبب یہ بھی ہو کہ ڈاکٹر عبدالحق نے بحیثیت انسان اور مسلمان مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کیا ہو دوسرے اس حد تک متاثر نہ ہوئے ہوں، یہ سب صحیح ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ میں ذاتی پسند اور ناپسند کو بہت بڑی حقیقت سمجھتا ہوں۔ انقلابی حقیقت! مجھے تو یہاں تک محسوس ہوا ہے کہ جو لوگ مسلمان نہیں ہیں شاید وہ بھی ڈاکٹر عبدالحق جیسا مسلمان بننا پسند کرتے ہوں! اچھے مسلمان اور اچھے انسان کو میں نے ہمیشہ ایک دوسرے سے اتنا قریب پایا کہ کم سے کم میرے لیے اکثر ان میں امتیاز نہ کرنا دشوار ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے دین کے معاملہ میں کوئی سمجھوتا نہ اپنے آپ سے کیا تھا نہ کسی دوسرے سے جیسا کہ ہم آپ اکثر کرلیا کرتے ہیں یعنی عقائد و اعمال کی ذمہ داریوں سے بقدر ستر فیصدی اپنے آپ کو مستثنیٰ قرار دیے جانے کا رزولیشن باختیار خود پاس کردیتے ہیں، ستر فیصدی غالباً یوں کہ مسلمانوں کو ہر نیکی کا اجر عموماً ستر گنا ہی ملتا ہے! وہ اسلام کے بتائے ہوئے عقائد پر کامل یقین رکھتے تھے اور ظاہر و باطن دونوں اعتبار سے ان پر عامل تھے، بایں ہمہ وہ اتنے خوش مزاج، زود آمیز، مخلص، ہوشمند اور ہمدرد تھے جیسے ہمارا آپ کا کوئی عزیز بے تکلف دوست، وہ کسی حال میں محتسب نہیں معلوم ہوتے تھے بلکہ سر سے پاؤں تک محبّ و مشفق تھے، جیسے ان سے دور یا علیحٰدہ رہنا بدنصیبی اور انکا اعتبار حاصل نہ کرنا محرومی ہو، ان کے مخالفوں کے لیے بڑی مشکل یہ تھی کہ ان کو متعصب قرار دے کر اپنا مطلب نکال سکتے تھے، نہ پرانے خیال اور پرانی چال کا آدمی کہہ کر ان کو نظر انداز کرسکتے تھے، ان کی نظر جتنی علوم دین تاریخ اور سیر پر تھی، اس سے کچھ کم واقفیت دینوی علوم سے نہ تھی، یونیورسٹیوں کے قواعد و قوانین اور سرکاری تعلیمی دفاتر کے آئین وضوابط پر ان کو پورا عبور تھا، ان سے کوئی یہ کہہ کر بازی نہیں لے جاسکتا تھا کہ اس ملک یا کسی دوسرے ملک کا جدید ترین اصول نظام یا نصاب تعلیم یہ یا وہ تھا جس سے وہ آشنا نہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو چھوٹی بڑی ہر طرح کی تعلیم گاہوں کے تمام مدارج اور معلومات سے گہری اور عملی واقفیت تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک جگہ کالج میں تعلیم شروع کرنے کا اپنا بڑا دلچسپ اور عبرت انگیز قصہ لکھا ہے، بیان کرنے میں طوالت ہوگی، اس لیے نظر انداز کرتا ہوں، یہ اسی حادثے کا فیضان ہے کہ انھوں نے دوسروں کے لیے تعلیم کو آسان اور ارزاں بنانے میں تمام عمر اپنی اچھی سے اچھی صلاحیتیں صرف کیں، علوم مشرقیہ سے قطع نظر جہاں تک علوم جدیدہ کو مسلمانوں کے لیے آسان اور ارزاں بنانے کی کوشش اور کامیابی کا تعلق ہے اور اس غرض سے انھوں نے جتنے کالج قائم کیے، وہ ایسا کارنامہ ہے جس میں ڈاکٹر صاحب کا ہمسر ریاست مدراس میں (شاید باہر بھی) نہ پہلے کوئی گزرا ہے نہ

آج موجود ہے ان کے کاموں میں میں نے جتنی برکت دیکھی بہت کم کہیں اور نظر آئی، اچھے کاموں میں وہ تائید غیبی کے قائل تھے، اور اس کی بعض ایسی آپ بیتی سنایا کرتے کہ عقل دنگ رہ جاتی، ہر اچھا اور بڑا آدمی تائید غیبی پر ایمان رکھتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو میں نے کبھی مایوس، مغموم یا متغمی نہیں پایا سوا ایک بار کے جب وہ متفکر نظر آئے تمام دن ان پر یہ کیفیت طاری رہی، دوسرے روز حسب معمول ہشاش بشاش نظر آنے لگے، صورت حال کچھ اس طرح کی پیش آئی تھی کہ اس کو جوں کا توں رہنے دیا جاتا تو اس ادارے کے ایک بنیادی مقصد کو نقصان پہنچتا تھا، دوسری طرف اس کو دور کرنے یا بدلنے کی کوشش میں اس کا خدشہ تھا کہ کہیں دوسرے کی شہرت نہ مجروح ہوجائے فرماتے تھے، دن بھر اس فکر میں غلطاں پیچاں رہا، رات کو کھانے اور نماز عشاء سے فارغ ہوکر اس مسئلے کا حل سوچنے بیٹھا، تمام شب ادھیڑ بن گزر گئی، فجر ہوتے حل سمجھ میں آیا اور اس کا فارمولا مرتب کرسکا، میں نے عرض کی فارمولے میں ایک آدھ جگہ فارمولا کم جرأت زیادہ نظر آتی ہے، فرمایا کہ آپ نے ٹھیک کہا لیکن ہر مؤثر اور کارآمد فارمولے میں دو تہائی سوجھ بوجھ اور ایک تہائی جرأت کا ہونا ضروری ہے حسب ضرورت آپ اس تناسب کو گھٹا بڑھا سکتے ہیں، لیکن یہ چاہیں کہ بغیر جرأت کے کام بن جائے تو یہ ممکن نہیں!

ایک صاحب کا بیان ہے کہ ذاکر صاحب امریکہ سے واپس آرہے تھے، ڈاکٹر صاحب ان کو لینے دہلی گئے ایک صاحب اور ساتھ تھے، جہاز سے اترتے ہی ذاکر صاحب نے علی گڑھ کا حال پوچھا، جو صاحب ساتھ تھے انھوں نے حالات اور واقعات کو مایوسانہ انداز میں بیان کرنا شروع ہی کیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے بات کا رخ بدل دیا اور اپنے مخصوص انداز خوش دلی و خود اعتمادی سے بولے نہیں...... صاحب حالات ایسے نہیں ہیں کہ فکر مند ہوا جائے۔ یہ تو زندگی کے معمولات میں سے ہیں، جہاں اتنے تعلیم یافتہ نوجوان اکٹھا رہتے ہنستے کھاتے پیتے پڑھتے لکھتے کودتے پھاندتے ہوں وہاں اس طرح کے واقعات پیش آتے ہی رہیں گے۔ اور اب تو ذاکر صاحب آگئے ہیں، سارے معاملات یوں بھی روبراہ ہوجائیں گے، یہ کہہ کر ذاکر صاحب کو موٹر میں بٹھایا اور علی گڑھ واپس آگئے اور ذاکر صاحب نے دیکھا کہ صورت حال وہی تھی جو ڈاکٹر صاحب نے بیان کی تھی۔

ڈاکٹر صاحب عربی فارسی کے عالم متبحر اردو شعر و ادب کے شیدائی اور انگریزی اردو کے بڑے اچھے مقرر تھے، ان کی تقریریں دلنشیں بے تکلف اور پر مغز ہوتی تھیں۔ ان کا مطالعہ اتنا وسیع معلومات اتنی متنوع ذہن اس درجہ رسا اور طبیعت ایسی شائستہ اور شگفتہ تھی کہ وہ کسی موضوع پر برجستہ بھی تقریر کرتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے یہ موضوع ان کے مدتوں کے مطالعہ کا نتیجہ تھا، اردو یا انگریزی میں گفتگو یا تقریر کرتے تو لب ولہجہ سے ظاہر ہوتا جیسے انھوں نے تمام عمر مدراس اور اس کے نواح میں نہیں بلکہ دہلی، لکھنؤ یا اس کے آس پاس بسر کی تھی۔

تقریر میں ڈاکٹر صاحب فلسفہ یا سائنس کے اسرار وغوامض کو دخل نہ دیتے، خطابت کے فن سے واقف ہونے کے باوصف اس کے حربوں سے کام نہ لیتے، نہ کسی شخص یا جماعت کا مذاق اڑاتے، نہ کسی کو رلانے ہنسانے کی کوشش کرتے، غرض آرائش گفتار کے لیے جو باتیں درکار ہوتی ہیں ڈاکٹر صاحب ان میں سے کسی کے محتاج نہ تھے، سیدھی سادی بات کہتے لیکن ان کے کہنے کا انداز ایسا تھا اور اعتماد اور اعتبار کی ایسی فضاء پیدا کردیتے تھے کہ بات دلوں کی گہرائی میں اتر جاتی اور خبر نہ ہوتی، ایسا کچھ احساس ہوتا جیسے چونکہ ڈاکٹر صاحب کہہ رہے ہیں اس لیے اس کے صحیح اور معقول ہونے میں شک نہیں کیا جاسکتا۔

میرے نزدیک کسی شخص کا دلی یا لکھنؤ کا ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس کا، اردو کا لب ولہجہ بھی معیاری ہوگا گفتگو میں صحت زبان ہی کافی نہیں ہے لب ولہجہ کا شستہ اور ناشایستہ ہونا بھی ضروری ہے، دلی کے بعض مشہور اشخاص یا گھرانوں سے قطع نظر دلی والوں کا لب ولہجہ بالعموم خشک اور خشن ہوتا ہے، اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ اردو چونکہ ''کھڑی بولی'' پر بنی ہے اس لیے دلی اور اس کے اطراف کے رہنے والوں کا لب ولہجہ بھی کھرا اور کھڑا ہوتا ہے، دوسری طرف جو لوگ کھڑی بولی کے علاقے سے علیحدہ لیکن متجانس پراکرتوں کی سلاست اور شیرینی سے آشنا ہیں وہ اردو کے مناسب حال لب ولہجہ پر زیادہ قدرت رکھتے ہیں، شمالی ہند کی پراکرتوں کے علاوہ چونکہ اودو کا گہرا ربط فارسی زبانوں سے بھی ہے، اس لیے بحیثیت مجموعی اردو لب ولہجہ کے لوازم ایسے ہیں کہ ان سے عہدہ برآ ہونا یوں بھی آسان نہیں ہے، بتوں کی مانند اردو لب ولہجہ کے بھی ایسے کتنے شیوے ہیں جن کو اب تک نام نہیں دیا جاسکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب مدراس کے ہوتے ہوئے صحیح اور فصیح اردو بولتے تھے، یہاں تک کہ تلفظ کی کوئی ''ضرب خفی یا جلی'' ایسی نہ ہوتی جس سے اس کا شبہ ہوسکتا کہ وہ شمالی ہند کے اس خطے سے تعلق نہیں رکھتے تھے جہاں کا اردو کا لب ولہجہ معیاری ہے۔

کسی ماضی کی اہمیت کا مدار محض اس کے ماضی ہونے پر نہیں بلکہ اس پر ہے کہ کس حد تک وہ حال اور مستقبل کی صحیح اور صحت مند رہبری کرسکتا ہے حال و مستقبل کی اہمیت اس بناء پر ہے کہ دونوں ماضی کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں، اس لیے اصولاً یا کلیۃً ماضی سے روگردانی نہیں کرسکتے، ڈاکٹر صاحب کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کے گذشتہ دینی، علمی اور تہذیبی کارناموں کا بڑا احترام تھا، یہ بات کچھ تو ان کے مطالعے اور مشاہدے کا براہ راست تھی، اور کچھ اس خلقی ورثے کا تصرف تھا جو ان کو اپنے خاندان کے اکابر سے ملا تھا، اپنے ان تصورات کی تشکیل میں وہ طرح طرح سے کوشاں

رہتے، چنانچہ ۱۹۴۲ء میں محمڈن کالج کی سلور جوبلی کے موقع پر انھوں نے اسلامی تہذیب وتمدن کی ایک نمائش ترتیب دی تھی، جس میں ایسے تاریخی شواہد اور نوادر اس سلیقے اس پیمانے پر پیش کیے گئے تھے کہ اس سے پہلے کہیں اور دیکھنے میں نہیں آئے تھے۔ اس نمائش کی تفصیلی روئداد معارف کے صفحات میں شائع ہوچکی ہے۔ وہ نمائش تو اب میسر نہیں لیکن چاہتا ضرور ہوں کہ اسلامی تہذیب وتمدن کے طالب علم اس نمائش کی تفصیل کا مطالعہ معارف کے متذکرہ شمارے میں کریں۔

مجھے جو شے یا شخص اچھا نظر آتا ہے جی چاہنے لگتا ہے کہ وہ علی گڑھ کا ہوجائے۔ اس سلسلے میں ایک بار عرض کیا تھا، ڈاکٹر صاحب مدراس کے سب سے اچھے آدمی کو (جہاں تک مجھے علم ہے) علی گڑھ نے پالیا، اب اتنا اور چاہتا ہوں کہ آپ کی یہ نمائش بھی کسی طرح علی گڑھ آجائے، میری دانست میں یونیورسٹی کے ادارہ علوم اسلامیہ کا سے ایک مستقل اور ممتاز جزو ہونا چاہیے۔ رفتہ رفتہ یہ شعبہ اسلامی تہذیب وتمدن کے ایک اعلیٰ درجے کے میوزیم کی حیثیت اختیار کرسکتا ہے بہت خوش ہوئے، فرمایا تجویز نہایت مفید اور مناسب ہے، اس کے لیے تھوڑا بہت سرمایہ فراہم کرنا پڑے گا۔ دوڑ دھوپ درکار ہوگی، شخصی اثرات کو کام میں لانا پڑے گا، ہندوستان سے باہر دوسرے ممالک سے بھی مدد لینی پڑے گی، کچھ دنوں کی مسلسل کوشش کے بعد جو چیز آپ کے ذہن میں ہے وہ عملاً سامنے آسکے گی۔ پھر ڈاکٹر صاحب علی گڑھ سے چلے گئے، اور اب جبکہ وہ اس جہاں ہی میں نہ رہے۔ اس اسکیم کی حیثیت ایک خواب سے زیادہ نہیں رہ گئی ہے!

ڈاکٹر صاحب کے پاس عربی، فارسی اردو کتابوں کا بڑا نادر قلمی اور مطبوعہ ذخیرہ تھا، اس طرح کے نوادر پر ان کی معلومات نہایت وسیع تھیں، میں نے ان صحبتوں میں بھی ان کو دیکھا ہے جہاں مخطوطات کے اچھے اچھے "اصحاب خبر ونظر" موجود ہوتے۔ سب ہی ڈاکٹر صاحب کی وسیع اور تفصیلی معلومات پر متعجب ہوتے، ایک بار کچھ اسی طرح کا تذکرہ تھا، فرمانے لگے تعلیم حاصل کرنے انگلستان گیا تو وہاں دو ہی باتوں کی زیادہ فکر رہتی۔ ایک یہ کہ عربی، فارسی، اردو کے نوادر کہاں کہاں محفوظ ہیں، دوسرے یہ کہ مشہور مستشرقین کون کون تھے اور ان تک رسائی کیونکر ہو۔

فرمانے لگے ہندوستان میں مخطوطات تک پہنچنے میں چند باتوں نے میری رہبری کی، اس طرح کے مخطوطے والیان ریاست یا رؤسا تک کھنچ کر پہنچ جاتے کیونکہ زمانہ حال تک یہی لوگ اصحاب علم و ہنر کے مربی ہوتے یا پھر اس طرح کے نوادر خانقاہوں میں یا سجادہ نشینوں کے ہاں ملتے، اس لیے کہ یہ بزرگان دین خود صاحب علم و فضل ہوتے اور اس طرح کے لوگوں کا ماویٰ و ملجا بھی۔ امور دین کی تلقین بھی اردو ہی میں کرتے تھے، اس لیے ان کے فرمودات بیاضوں میں محفوظ ہوتے، میرے خاندان کے بزرگوں کا تعلق مختلف اور متعدد خانقاہوں اور سجادہ نشینوں سے کسی نہ کسی حیثیت سے رہا ہے، اس لیے اس طرح کے علمی اندوختوں سے مجھے واقفیت رہی ہے، ایک بات اور ہے جس پر لوگ بہت کم توجہ کرتے ہیں، مسلمانوں کے عہد حکومت میں ہندو حکمراں اور رؤسا بھی اس طرح کے مخطوطات کے شائق ہوگئے تھے، چنانچہ بعض بڑے قیمتی اور نایاب قلمی اور مطبوعہ نسخے ان کے کتب خانوں میں آج بھی مل جائیں گے۔ مگر ان کے تلف ہوجانے کا امکان اب بہت بڑھ گیا ہے۔

ایک بار میں نے پوچھا، ڈاکٹر صاحب عربی فارسی سے آپ کا شغف تو سمجھ میں آتا ہے، اس کی سیاحی میں معلوم نہیں کتنی پشتیں گزری ہیں، یہ اردو کا شوق کہاں سے آیا۔ فرمایا مدراس اور اس کے نواح میں اردو کا چرچا قدیم الایام سے رہا ہے۔ یہاں کے مسلمان جب تک اردو میں دستگاہ نہ پیدا کرلیتے تعلیم اور تہذیب میں اپنے کو کامل نہ سمجھتے، اردو میں شاعری کرنا مہذب اور تعلیم یافتہ ہونے کی نشانی سمجھتے ہیں جس طرح مسلمانوں کے بعض قبائل میں یہ دستور ہے کہ جب تک کوئی نوجوان حج کرکے نہ آجائے قبیلے میں شادی کا مستحق نہیں قرار پاتا۔ البتہ اس مرتبے کے شاعر ادھر نہیں ہوئے، جیسے شمالی ہند میں ہوئے، پھر بھی اردو شاعری کی وہاں بڑی وقعت اور قبول عام نصیب رہا ہے، مسلم یونیورسٹی نے اردو کی ایک جامع تاریخ لکھنے کا اہتمام کیا ہے۔ مدراس اور ارکاٹ کے مصنفین اور شعراء اور ان کی تصانیف کے بارے میں میں آپ کو بڑی مفید اور اہم معلومات فراہم کردوں گا، ایک زمانے میں وہاں کی اردو تاریخ لکھنے کا ارادہ ہوا تھا، اس کے لیے کافی مواد بھی دستیاب ہوگیا، لیکن پھر دوسرے کاموں میں ایسا پھنسا کہ ادھر متوجہ نہ ہوسکا۔ میٹریل کے علاوہ بہت سی باتیں ذہن میں محفوظ ہیں، پھر ہنس کر فرمایا اگر پبلک سروس کمیشن مدراس کی مستقل صدارت نہ ملی تو کمیشن سے مستعفی ہوکر اس تاریخ کا کام کروں گا۔

سوچتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب نے علی گڑھ میں کم وبیش چھ ماہ قیام کرکے ہمارے دلوں میں جب اپنے لیے اتنے پاکیزہ اور قابل احترام خیالات وجذبات پیدا کرلیے جو اتنی کم مدت میں علی گڑھ میں آج تک کوئی اور نہ پیدا کرسکا تو ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جن میں رہ کر اور جن کے لیے انھوں نے تمام عمر کام کیا۔ تعلیمی اور عملی ہی نہیں، معلوم نہیں کتنے اور کام! یہ بات اور زیادہ احترام اور اچنبھے کی اس وقت معلوم ہونے لگتی ہے جب ہم یہ بھی جانتے ہوں کہ علی گڑھ کے لوگ کسی سے "راضی وخوشنود" ہونے میں ذرا دیر لگاتے ہیں، بہ نسبت مدراس اور نواح مدراس کے مسلمانوں کے جو زیادہ سیدھے سادے اور بہت جلد عقیدت اور احسان مندی کے جذبات سے متاثر ہوجاتے ہیں، ڈاکٹر صاحب کے یوں دفعتہً وفات پاجانے سے ان پر کیا عالم گذر ہوگا!

کسی آدمی کے بڑے ہونے کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اس کو غریبوں اور بچوں سے کتنی محبت ہے، ڈاکٹر صاحب کو ان دونوں سے بڑا شغف تھا، صاحبزادی کی شادی

کی تو اسی دن اور اسی وقت بستی کی سات غریب لڑکیوں کی بھی شادی کرائی، ہر طرح کی مالی امداد پہنچائی اور ان کی برابر خبر گیری کرتے رہے، ڈاکٹر صاحب یقیناً دولت مند نہ تھے، لیکن اچھے کاموں میں روپیہ صرف کرنے کا بڑا حوصلہ رکھتے تھے، ایک بار کچھ اسی طرح کا ذکر آگیا تو فرمانے لگے، میں بڑا دولت مند ہوں اس لئے کہ میری اپنی دولت کے علاوہ دوستوں اور عزیزوں کی دولت بھی میرے لئے وقف رہتی تھی!

سائنس کانگرس کے سالانہ اجلاس میں ہندوستان کی تقریباً تمام یونیورسٹیوں کے نمائندے شریک ہوتے ہیں، اس کا گزشتہ اجلاس مدراس میں منعقد ہوا تھا، حسب دستور مسلم یونیورسٹی کے نمائندے بھی شریک ہوئے تھے، ڈاکٹر صاحب کی وہاں موجودگی علی گڑھ کے لوگوں کے لیے مزید کشش کا باعث تھی، جن کی خاطر تواضع، آرام وتفریح کو ڈاکٹر صاحب نے اپنی ذمہ داری قرار دے لیا تھا، زیادہ سے زیادہ جتنے اصحاب کی گنجائش ڈاکٹر صاحب کے گھر میں ہوسکتی تھی وہ وہاں ٹھہرے، بقیہ کا انتظام دوسرے تمام شرکاء کے ساتھ کانگریس نے علیحدہ کیا تھا، پبلک سروس کمیشن کی مصرفیات اور دوسرے کاموں سے تھوڑی سی بھی مہلت مل جاتی تو وہ علی گڑھ کے دوسرے نمائندوں کی خیر خیریت لینے نکل جاتے جیسے ان سب کے میزبان مدراس میں وہی تھے، ایک دن علی گڑھ کے تمام لوگ ڈاکٹر صاحب کے ہاں پر مدعو تھے، معلوم ہوا کہ دو چار اصحاب جو دور مقامات پر ٹھہرے ہوئے تھے، غالباً سواری کا انتظام نہ ہونے کے باعث آنہ سکے، ڈاکٹر صاحب بڑے مضطرب ہوئے اور گاڑی لے کر روانہ ہوگئے، سب کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائے، کھانا ختم ہونے کے بعد ان کو ان کی قیام گاہ پر چھوڑ آئے اور طرح طرح سے بار بار معذرت کرتے رہے کہ ان کے ذہن میں یہ بات کیوں نہیں آئی کہ ان مہمانوں کے لیے سواری کا انتظام کرنا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کو علی گڑھ میں جو منزلت اتنی جلدی میسر ہوئی اس کے میرے نزدیک بعض واضح اسباب ہیں، باوجود ہمہ وقت کام میں مصروف رہنے کے وہ چھوٹے بڑے ہر شخص کے لئے اتنے ہی ارزاں اور سہل الحصول تھے جتنی سانس لینے کے لیے ہوا، ہمیشہ محبت اور عزت سے پیش آتے تھے، لوگوں کے دکھ درد کو حتی الامکان دور ورنہ کم کرنے کی کوشش کرتے، ان پر لوگوں کو بھروسہ تھا کہ وہ کسی شخص یا جماعت کی ناواجب پاسداری نہ کریں گے۔ لوگ جانتے تھے کہ قاعدہ قانون سے نہ صرف پورے طور پر واقف تھے بلکہ ان کی پابندی سمجھداری اور ہمدردی سے کرتے تھے کوئی شخص خواہ کتنا ہی مفسد اور متفنی کیوں نہ ہو ڈاکٹر صاحب کو بدنام نہیں کرسکتا تھا، نہ عوام میں نہ خواص میں وہ ہم میں کسی سے علم میں کم نہ تھے، عمل میں سب سے ممتاز تھے، وہ ان علوم کے عالم باعمل تھے، جن سے ہم لوگ بہت کم آشنا ہیں اور جن پر عمل کرنے والا شاید کوئی نہیں، یعنی دین اور اخلاق کا علم! کبھی کبھی کچھ اسی طرح کا بھی احساس ہونے لگتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں ڈاکٹر صاحب کی شخصیت میں علی گڑھ بالکل ایک نئے تجربے یعنی "مرد مومن" سے دوچار ہوا ہو۔ (جولائی ۱۹۵۸ء)

۱؎ آہ، کسے معلوم تھا کہ جس دن یہ صدارت تفویض ہوئی اسی دن ڈاکٹر صاحب کے لبوں پر دفعتاً وہ تبسم نمودار ہوا، جسے اقبال نے "نشان مرد مومن" بتایا ہے، اصغر مرحوم کا یہ شعر آج کتنے دنوں کے بعد یاد آیا ہے۔

زندگی جب مسکرائی ہے قضا کے سامنے
کائناتِ دہر کیا روح الامیں بیہوش تھے

زندگی کی کوئی آزمائش ڈاکٹر صاحب سے ان کی خلقی مسکراہٹ چھین نہ سکی، لیکن ان کی مسکراہٹ نے زندگی سے اس کی ہر آزمائش چھین لی، بعض دوستوں، عزیزوں کی وفات ایسی ہوتی ہے کہ خود اپنا جیتا رہنا بے غیرتی معلوم ہوتا ہے، ڈاکٹر صاحب کی بے رحلت کی خبر سن کی اسی طرح کے بے غیرتی کا احساس ہوا!

اس موقع پر جزع وفزع، صبر وشکر، ایمان و یقین کے کتنے فقرے بے ارادہ یاد آتے ہیں لیکن کسی ایک کو لکھنے کا جی نہیں چاہتا۔ خاکم بدہن! حادثہ اتنا بڑا میں اتنا چھوٹا توازن کیسے قائم رہے خوشی میں کبھی توازن نہیں کھوتا، غم میں قائم نہیں رکھ سکتا، اللہ تعالیٰ معاف فرمائے، وہ تو جانتا ہے اس طرح کا غم مجھ ناتواں کے لیے کیسی بے پناہ آزمائش ہے!

ندوی، ابوظفر، مولانا

مولانا ابوظفر ندوی

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینہ ہماری جماعت کے ایک نامور رکن مولانا ابوظفر صاحب ندوی نے انتقال کیا، ان سے دارالمصنفین کے گونا گوں تعلقات تھے، وہ ندوہ کے مشہور فاضل، نامور، اہل قلم اور حضرت سید صاحبؒ کے حقیقی بھتیجے تھے، دارالمصنفین میں بھی کئی سال تک رہے تھے، ان کی پوری زندگی علم وتعلیم کی خدمت اور تالیف و تصنیف میں گزری وہ مختلف اوقات میں شانتی نکیتن بنگال، جمالیہ کالج مدراس اور دوسری تعلیم گاہوں میں معلم رہے، ادھر عرصہ سے گجرات ورنیکلر سوسائٹی احمد آباد میں ریسرچ اسکالر تھے اور گجرات کی تاریخ اور ادبیات پر تحقیقات کر رہے تھے، ان کا ذوق خالص علمی اور ہندوستان کی تاریخ ان کا خاص موضوع تھا، اس پر انھوں نے کئی کتابیں لکھیں، دو کتابیں تاریخ سندھ اور مختصر تاریخ ہند دارالمصنفین سے شائع ہوچکی ہیں، ایک کتاب گجرات کی تمدنی تاریخ کا مسودہ موجود ہے جو انشاء اللہ آئندہ شائع ہوگی، ایک کتاب تاریخ گجرات ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہورہی ہے ان کے علاوہ سفر نامہ برہما، برہمی بول چال اور بعض دوسری کتابیں ان کی یادگار ہیں، ان مستقل تصانیف کے علاوہ ان کے مضامین معارف اور برہان وغیرہ علمی رسالوں میں وقتاً فوقتاً نکلتے رہتے تھے، مگر ان میں استقلال نہ تھا، اس لیے اپنی علمی قابلیت کے لحاظ سے وہ جس شہرت کے مستحق تھے وہ ان کو حاصل نہ ہوسکی، ان علمی کمالات کے ساتھ بڑے دیندار، نیک

نفس اور سادہ مزاج تھے، جہاں رہتے تھے علمی کاموں کے ساتھ کچھ نہ کچھ دینی اور قومی و ملی کام بھی کرتے رہتے تھے۔ حضرت سید صاحبؒ کے گھرانے میں وہ آخری علمی یادگار تھے، وفات کے وقت ستر سال کے قریب عمر رہی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اس خادم علم و دین کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے۔ (''م''، جولائی ۱۹۵۹ء)

دیسوی، عبدالحکیم، سید

سید عبدالحکیم دیسوی

سیدی صاحب کے متعلقین میں دوسرا حادثہ عبدالحکیم صاحب دیسوی کی وفات کا ہے، وہ رشتہ میں سید صاحبؒ کے چچا ہوتے تھے، مگر دونوں میں حقیقی چچا بھتیجے جیسے تعلقات تھے، دونوں ایک دوسرے کو بہت مانتے تھے، مرحوم سید صاحبؒ کی ہر ترقی اور ہر اعزاز پر بے انتہا مسرور ہوتے تھے، سید صاحبؒ بھی اپنے تمام نجی حالات اور علمی و قومی مشاغل کی اطلاع برابر ان کو دیتے رہتے تھے۔ اس لیے سید صاحبؒ کے مکاتیب کا سب سے بڑا ذخیرہ ان ہی کے پاس تھا۔ دونوں میں ۵-۱۹۰۴ء سے لے کر سید صاحبؒ کی وفات ۱۹۵۴ء یعنی تقریباً نصف صدی تک خط و کتابت رہی، یہ سارے خطوط سید عبدالحکیم صاحب نے محفوظ رکھے اور سید صاحب کی وفات کے بعد دارالمصنفین کے حوالہ کردیئے جو اس کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔

سید عبدالحکیم صاحب کی تعلیم بہت معمولی تھی، لیکن ذوق علمی رکھتے تھے اور کتابوں کے مطالعہ سے انھوں نے اچھی خاصی استعداد بہم پہنچائی تھی، ان کا سب سے بڑا کارنامہ دیسنہ کا اردو کتب خانہ ہے، یہ کتب خانہ اس لحاظ سے ہندوستان میں بے مثل ہے کہ اس میں اردو کی اکثر مطبوعہ کتابیں اور پرانے اخبارات و رسائل کے مکمل فائل موجود ہیں جو دوسرے کتب خانوں میں مشکل سے مل سکتے ہیں، یہ کتب خانہ زیادہ تر سید عبدالحکیم صاحب کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے اس کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا، اردو کے شائقین اور اس کے ریسرچ اسکالر دور دور سے اس کو دیکھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے جاتے ہیں۔ سید صاحبؒ سے تعلق کی بناء پر مرحوم کو دارالمصنفین سے بڑا گہرا تعلق تھا، اگرچہ وہ اس کے کوئی عہدہ دار یا رکن نہ تھے لیکن اس کی ہواخواہی میں سب سے بڑھ کر تھے۔ وفات کے وقت نوے سال کی عمر رہی ہوگی، اللہ تعالیٰ ان کو عالم آخرت کی بخششوں سے نوازے۔ (''م''، جولائی ۱۹۵۸ء)

خان، اسمٰعیل، نواب

نواب اسمٰعیل خاں مرحوم

یہ سطور زیر تحریر تھیں کہ نواب اسمٰعیل خاں مرحوم کی وفات کی خبر ملی، مرحوم ایک بڑے باپ نواب اسحٰق خاں کے لڑکے اور ایک نامور دادا نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے پوتے اور خود بھی بہت سے اوصاف سے متصف، قدیم تہذیب و شرافت کا نمونہ تھے، قومی و ملکی سیاست سے بھی ان کو دلچسپی تھی، چنانچہ خلافت کی تحریک کے زمانہ میں وہ کانگریس کے ساتھ اور ہندوستان کی جنگ آزادی میں عملاً شریک رہے، مگر اس زمانہ میں بھی ان میں بڑی دینی و ملی حمیت تھی، غالباً اسی بناء پر پاکستان کے قیام کی تحریک کے بعد مسلم لیگ میں شامل ہوگئے، وہ اس کے مقتدر رہنما اور فطرۃً نہایت سنجیدہ متین اور باوقار تھے، اس لئے ہر زمانہ میں ان کی روش معتدل رہی اور وہ جس جماعت میں بھی رہے ان کی حیثیت امتیازی رہی اور ان کا خاص وزن و وقار رہا، گو وہ لیگ کے لیڈر تھے، مگر ہندوستان کی تقسیم کے بعد انھوں نے پاکستان کی راہ نہیں لی، بلکہ ہندوستان ہی میں رہ کر یہاں مسلمانوں کے درد دکھ میں شریک رہے، کچھ دنوں تک مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے تھے، ان کی موت سے ہماری قدیم تہذیب و شرافت کی ایک باوقار یادگار مٹ گئی، اللہ تعالیٰ اس خادم ملک و ملت کو اپنی رحمت و مغفرت سے نوازے۔

(''م''، جولائی ۱۹۵۸ء)

نواب محمد اسمٰعیل خاں مرحوم

(پروفیسر رشید احمد صدیقی)

نواب محمد اسمٰعیل خاں، نواب محمد اسحٰق خان کے بیٹے اور نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے پوتے تھے، شیفتہ کو دیکھا نہیں، لیکن ان کی غیر معمولی ذہنی اور اخلاقی خوبیوں کا حال کتابوں میں پڑھا ہے، شیفتہ کی بڑائی میں کیا شک جب حالیؔ اس پر گواہی دیتے ہوں۔

نواب اسحٰق خاں یوپی میں سیشن جج تھے، ان کے ہم عصر نواب محمد علی بھی، دونوں کے بارے میں مشہور تھا کہ انگریزوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، اس زمانے کے انگریزوں کو، انگریز حکام کا کتنا ہی دباؤ کیوں نہ پڑے فیصلے بے لاگ دیتے تھے، مسلمان نوکری پیشہ طبقے میں ان کے نام فخر و مسرت سے لیے جاتے تھے، جیسے یہ ان کے ہیرو ہوں۔

کہنے کو تو کہا جاسکتا ہے کہ دونوں انگریزی سرکار کی ملازمت میں تھے، لیکن انصاف سے دیکھا جائے تو ان کا درجہ ان لوگوں میں بہتوں سے کم نہ تھا، جو اس زمانہ میں لیڈر کہلاتے تھے، بلکہ بعض اعتبار سے ان کی دلیری کا زیادہ قائل ہونا پڑتا ہے، اس لیے کہ حکومت کی ملازمت میں ہوتے ہوئے ایمان و انصاف کے معاملے میں حکومت کے عتاب کی پروا نہیں کرتے تھے، پنشن پاکر دونوں نے ایم اے او کالج کا انتظام سنبھالا اور اسی خدمت کے دوران میں جان جاں آفریں کے سپرد کردی۔

نواب وقار الملک کے بعد نواب محمد اسحٰق خاں آنریری سکریٹری ہوئے، ان کے عہد کے چند واقعات آج تک یاد آتے ہیں، ایک کلیات خسرو کی تدوین اور طباعت، دوسرا نظام آصف جاہ سادس کا علی گڑھ میں دورہ، تیسرے کالج کے یورپین اسٹاف کا متحد ہوکر استعفیٰ دینا اور اس کا منظور کرلیا جانا، نواب صاحب ہی کی سکریٹری شپ کے زمانے میں مسز سروجنی نیڈو علی گڑھ تشریف لائیں اور اسٹریچی ہال میں وہ مشہور تقریر کی اور ان کے خیر مقدم میں مولانا سہیل نے وہ نظم پڑھی جواب تک ہمارے دلوں میں تازہ ہے۔

دہلی کے مشہور داستاں گو میر باقر علی کو فن کا کمال دکھانے کے لیے پہلے پہل علی گڑھ میں نواب صاحب ہی نے دعوت دی تھی، یکی پارک کے صحن میں رات کو محفل سجائی گئی تھی، عزت اور محبت کے الفاظ میں نواب صاحب نے باقر علی کا تعارف کرایا تھا، جس کا آخری فقرہ اب تک یاد ہے، ''میر باقر علی آج داستان سنائیں گے، کل خود داستان بن جائیں گے!'' باقر علی تھے کہ نواب صاحب کے ہر فقرے اور ہر لفظ پر بچھے جارہے تھے اور طلباء کا انداز پذیرائی دیکھ کر جیسے پھولے نہ سماتے تھے۔

داستان شروع کی تو یہ عالم تھا کہ کبھی اس طرح محفل سناٹے میں آجاتی جیسے دور دور کوئی متنفس موجود نہ ہو، اور کبھی تحسین و آفریں کے نعروں کا یہ عالم ہوتا کہ دور دور تک کے لوگ چونک پڑتے، کیسے شریف، شائستہ، صحیح المذاق، زندگی کی صحت مند توانائیوں سے لبریز اور تہذیبی روایات سے آراستہ نوجوان طلبہ کا اجتماع تھا، پھر یکی پارک کی وہ فضا جس میں خود کتنی داستانیں کس کس روپ میں کہاں کہاں خوابیدہ یا بیدار تھیں۔

داستاں گوئی یوں تو ایک معمولی سے بات معلوم ہوتی ہے، لیکن اس رات میر باقر علی کی داستان گوئی کا کمال دیکھ کر یقین آگیا کہ افسانہ طرازی اور افسانہ طراز کیا ہوتے ہیں اور کیا کرسکتے ہیں، ایسے فنکار کو آپ کیا کہیں گے جو ماضی کو مستقبل کے لیے ہمیشہ زندہ رکھ سکے۔

معاف کیجئے گا ماضی کی یاد نے ماضی سے بھی دور کہیں پھینک دیا! ماضی کو میں اپنا کارنامہ نہیں قرار دیتا، یہ بھی نہیں چاہتا کہ آپ قرار دیں، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ اپنے آپ کو کبھی کبھی ماضی کا کارنامہ سمجھنے لگتا ہوں! کہنا یہ تھا کہ نواب اسحٰق خاں ہم لوگوں کو لطف اندوز ہوتے دیکھ کر خود بڑے خوش ہوتے تھے، رہ رہ کر قہقہے لگاتے، بوڑھے داستان گو کی پیٹھ تھپکتے، باقر علی فرط مسرت و افتخار سے کھڑے ہو ہو کر تعظیم بجا لاتے، اور عالم کیف و جذب میں پہنچ کر اس طرح داستان سنانے لگتے جیسے آج کی رات آخری تاریخ تھی، اس کے بعد نہ یہ فن رہے گا، نہ فنکار، نہ اس کے قدرداں!

نواب محمد اسحٰق خاں کے خوش ہونے اور قہقہے لگانے کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا گیا کہ نواب اسمٰعیل خاں بھی اپنی خوشی اور خوشنودی کا اظہار اسی طرح سے کرتے تھے، یہ بات نواب صاحب کے مخلص اور معتبر ہونے کی ایک واضح علامت تھی، ان سے مل کر آپ اس تذبذب میں نہیں مبتلا ہوسکتے تھے کہ انھوں نے آپ کا اعتبار کیا یا نہیں، جو بات ان کے دل میں ہوتی وہی زبان پر آتی، اس سے ہم سب کو اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں نہ صرف سہولت ہوتی بلکہ لطف آتا اور حوصلہ بڑھتا۔

نواب صاحب ہم سب پر بڑے مہربان تھے اور ہم پر بھروسہ کرتے تھے، دلیر اور حوصلہ مند تھے، کوئی نازک موقع آن پڑتا اور بات یونیورسٹی سے باہر پہنچنے والی ہوتی تو وہ ہماری فروگذاشت کو اپنی فروگذاشت بنالیتے اور ہم پر کسی طرح کی آنچ نہ آنے دیتے، ہماری عزت کو اپنی عزت سمجھنے والے تو بہت سے مل جاتے ہیں، گو میرا ساتھ ایسوں سے بھی پڑا ہے جو ہماری عزت کو اپنی توہین سمجھتے تھے، نواب صاحب ذلت کو بھی اپنی ذلت سمجھتے تھے! قبیلے کا سردار ہونے کی ان میں بڑی نشانیاں ملتی تھیں۔

نواب صاحب عرصے تک یونیورسٹی کے ٹریزرر رہ چکے تھے، ملک تقسیم ہوا تو مستقل وائس چانسلر ہوئے، یہ وہ زمانہ تھا جب اطرافِ ملک میں مسلمانوں کی آبرو جان اور مال کی تباہی و تاراجی کا وہ عالم تھا کہ اتنے دن گذر جانے کے بعد آج بھی ان کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، یہ قوم بھی جسے مسلمان کہتے کبھی کبھی شرم آنے لگتی ہے، کیسی کیسی ہولناکیوں سے جانبر ہوچکی ہے، لیکن اب تاریخی کارناموں کے بجائے تاریخی رسوائیوں کی خوگر ہونے لگی ہے، قرآن پاک میں اس موقع کے لیے غالباً کوئی وعید آئی ہے، جو یاد نہیں آتی ورنہ ضرور لکھ دیتا۔

نواب صاحب جس ذہنی اور روحانی کرب میں مبتلا تھے، اس کا اندازہ کرنا ان لوگوں کے لیے مشکل ہے، جو نہ ان کے قریب تھے نہ صورت حال سے براہ راست واقف، ہر وقت اس کا خطرہ رہتا کہ کہیں یونیورسٹی کا وہی حشر نہ ہو جو دوسری مسلمان بستیوں کا ہوچکا تھا، ہر طرف سے وحشت ناک خبریں آرہی تھیں، غارتگروں کا جتھا علی گڑھ کے آس پاس منڈلا رہا تھا، نواب صاحب جس لیگ کے ارکان اعلیٰ میں سے تھے اس کی لائی ہوئی تباہیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور کچھ کر نہیں پاتے تھے، اس پر مستزاد یہ کہ مسلمانوں کی متاع گراں بہا مسلم یونیورسٹی کو بچانے کی ذمہ داری ان کے سر تھی، مقامی حکام سے بروقت امداد کی توقع موہوم تھی، وہ جو انگریزی میں ایک مثل مشہور ہے کہ فلاں شخص غم یا غیرت کا ایسا شکار ہوا کہ پھر تمام عمر نہیں مسکرایا، کم و بیش یہی کیفیت نواب صاحب کی تھی۔

یہاں پہنچ کر قائل ہونا پڑتا ہے کہ آخر کار منصب نہیں بلکہ شخصیت فیصلہ کن ثابت ہوتی ہے، ملک تقسیم ہوا ہے تو کانگریس اور مسلم لیگ کی عداوت انتہا کو پہنچ چکی تھی، لیکن کانگریس کے ہر طبقے میں نواب صاحب کی ساکھ قائم رہی، جس کا ثبوت راج گوپال اچاریہ بالقابہ گورنر جنرل ہند کی وہ تقریر ہے جو انھوں نے مسلم یونیورسٹی کے اسی سال کے کنووکیشن میں کی تھی، اور نواب صاحب کی خدمات اور خوبیوں کا برملا اعتراف کیا تھا،

کانگریس حکومت کے اتنے ذمہ دار اور مقتدر شخص کا مسلم لیگ کے اتنے ممتاز رکن کو اس زمانے میں علی گڑھ آکر سراہنا معمولی بات نہ تھی۔

مسز سروجنی نیڈو یوپی کی گورنر تھیں، علی گڑھ تشریف لائیں، ممدوحہ کے اعزاز میں نواب صاحب نے یونیورسٹی کے کچھ لوگوں کو شب میں اپنے ہاں شعروسخن کی ایک مختصر اور منتخب محفل میں مدعو کرلیا تھا، موصوفہ جہاں موجود ہوں وہاں کی گرمیِ محفل کا کیا کہنا، اس موقع پر اپنے خلوص اور خوش گفتاری سے ایسا کام لیا اور حاضرین میں سے ہر ایک کی فرداً فرداً ایسی دلنوازی کی کہ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے فضا ہی بدل گئی ہو، نواب صاحب کو اپنی اور اپنی حکومت کی طرف سے یونیورسٹی کی حفاظت اور حرمت کا اطمینان دلایا، اس زمانے میں حکومت کا شائد ہی کوئی اتنا بڑا آدمی باستثناء چند علی گڑھ کی تالیف قلب میں اس جرأت اور مرحمت کا نمونہ پیش کرنے کی ہمت کرسکتا تھا۔

سوچتا ہوں مسز نیڈو ۱۶-۱۷ء میں نواب محمد اسحٰق خاں کی آنریری سکریٹری شپ میں ان کی دعوت پر علی گڑھ تشریف لائیں اور اپنی بے مثل خطابت سے بقول سہیل مرحوم،

شکست رنگ ساحری چو زد نوائے شاعری
نمود سحر سامری اگر در خطاب زد!

کا کیسا سماں پیدا کردیا تھا، پھر تیس بتیس سال گذر جاتے ہیں، نواب اسحٰق خاں کے فرزند علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوتے ہیں، ملک میں تقسیم کا تہلکہ مچا ہوا ہے، مسلمان خاک وخون میں ملائے جانے لگتے ہیں، علی گڑھ نرغے میں آجاتا ہے تو وہی مسز نیڈو کسی کے بلائے بغیر علی گڑھ پہنچتی ہیں اور اپنی شرافت اور مرحمت سے نواب صاحب اور ہم سب کو ڈھارس دیتی ہیں اور اس ادارے کو تاراج ہونے سے بچانے میں گرانقدر حصہ لیتی ہیں، آج بھی جبکہ صورت حال بہت کچھ بدل چکی ہے، مسز نیڈو اور اس صوبے میں ان کی گورنری اکثر بے اختیار یاد آتی ہے اور محزوں بنا جاتی ہے، قانون کہتا ہے گورنر کیا کرسکتا ہے، قانون کا یہ کہنا سچ ہے، اس لیے کہ اپنے بارے میں کچھ کہنے والا اس سے زیادہ مستند اور کون ہوسکتا ہے لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ قانون بنانے والوں اور خود قانون کو یہ نہ معلوم ہو کہ شخصیت کیا کرسکتی ہے۔

یادوں کے سلسلے میں باتیں بھی کہاں کہاں پہنچیں! نواب صاحب کو سب سے پہلے غالباً ۱۹۲۰ء میں ان کے دولت کدہ مصطفیٰ کاسل میرٹھ میں دیکھا تھا۔ اس زمانے میں میرٹھ میں ایک پروفیشنل ٹینس ٹورنامنٹ ہوتا تھا، جس میں شرکت کرنے کے لئے کالج سے ٹیم گئی تھی اور نواب صاحب کی مہمان ہوئی تھی، ان ہی دنوں مسعود ٹامی [1] مرحوم میرٹھ میں غالباً نائب تحصیلدار تھے، مسعود ٹامی کو خبر لگ جائے کہ علی گڑھ سے طلبہ آئے ہوئے ہیں تو ملنے کے لیے فرط محبت سے بے قرار ہوجاتے تھے، موٹر لے کر مصطفیٰ کاسل پہنچے اور نواب صاحب سے کہا، نواب صاحب، کلکٹر صاحب سے آج کی چھٹی لے لی ہے، آپ بھی ان لڑکوں کو چھٹی دے دیجئے، سب کو پکنک پر سردھنے کا گرجا دکھانے لے جاؤں گا۔ کھانا ساتھ ہے، لنچ اور سہ پہر کی چائے وہیں ہوگی، شام تک سب کو واپس پہنچا جاؤں گا، نواب صاحب نے فرمایا لے جاؤ، خاطر مدارات خوب کرنا، صرف اپنی عادتیں نہ سکھانا، یہ کہہ کر ایک قہقہہ لگایا، ٹامی مرحوم بھی ہنس پڑے اور بولے نواب صاحب کاش عادت سکھا دینا اتنا ہی آسان ہوتا جتنا آپ کو اندیشہ ہے! پھر دونوں نے قہقہے لگائے اور ہم سب مسعود ٹامی کے قبضے میں چلے گئے۔

اب کیا بتاؤں اور کیونکر بتاؤں کہ مسعود ٹامی ہم سب کو لے کر چلے ہیں تو ان کی سرخوشی کا کیا عالم تھا، جیسے زندگی کی کوئی بہت بڑی آرزو دفعتہً پوری ہوگئی ہو! علی گڑھ اور علی گڑھ کے طلبہ پر مسعود ٹامی کی حد تک فریفتہ میں نے کسی اور کو اب تک نہ پایا، ہر اعتبار سے کتنا حسین مردانہ پیکر سرخ سپید رنگت، بالکل جیسی اس زمانے میں انور پاشا کی روغنی تصویر جابجا آویزاں ملتی تھی، ہر وقت خوش رہنا اور ساتھیوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرنا، کیسا ذہین اور محبت کرنے والا شخص، بار بار علی گڑھ کا ذکر اور ہم پر نوازشہائے پیدا و پنہاں''!

آج کے مصطفیٰ کاسل کو دیکھ کر چالیس برس یا اس سے بھی پہلے کے مصطفیٰ کاسل کا اندازہ لگانا مشکل ہے، کتنی خوبصورت شاندار عمارت، وسیع باغ، کیسے کیسے اور کتنے گھنے تناور درخت جو کبھی کبھی اتنے درخت نہیں معلوم ہوتے تھے، جتنے پرانے زمانے کے سورما اور ان کی داستانہائے رزم و بزم''۔ ایسے دیوپیکر درخت اتنی تعداد میں اس قرینے سے یکجا وسط شہر میں میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھے تھے، عمارت کے وسط میں ایک مختصر سا عجائب خانہ تھا جس میں طرح طرح کے نوادر قرینے سے سجائے گئے تھے ایک چیز اب تک یاد ہے، ہاتھی دانت میں ایک نسوانی پیکر تراشا گیا تھا، جس کی اونچائی غالباً ۸-۱۰ انچ ہوگی، اس وقت اس کو دیکھ کر کچھ اس طرح کا خیال گذرتا تھا کہ عورت میں کشش کی جتنی باتیں فطرت نے ودیعت کی تھیں، یا ابتداء سے آج تک اچھے اور بڑے شعراء نے دریافت کی تھیں، ان کے بعد بھی کچھ باقی رہ گیا تھا، جس کو مجسمہ ساز نے پورا کردیا تھا۔ مدتوں بعد یاد نہیں آتا کسی سلسلے میں ایک دفعہ پھر مصطفیٰ کاسل جانا ہوا، نقشہ ہی بدلا ہوا تھا، عمارت، باغ، درخت سب کھنگی، ویرانی اور افسردگی کی زد میں تھے، سوا نواب صاحب کی شفقت اور شگفتگی کے جو زمانے کی لائی ہوئی کسی زبونی اور ابتری سے متاثر نہ تھی، آج دفعتہً سننے میں آیا کہ نواب صاحب رحلت فرماگئے! مصطفیٰ کاسل ڈھے گیا جس میں کتنی اور کیسی کیسی یادیں دفن ہوگئیں، محبت و مروت کی یادیں، مہمان نوازی اور وضعداری کی یادیں، غیرت وحمیت کی یادیں، شرافت اور شفقت کی یادیں! ایک شخص کے زندہ رہنے سے کتنی اقدار اور روایات کو فروغ تھا، اس کے اٹھ جانے سے کتنی شمعیں بے نور اور محفلیں سونی ہوگئیں!

کہاں ہے آج تو اے آفتاب نیم شبی!

تقسیم ملک سے پہلے کی تقریباً تیس بتیس سال کی قومی سرگرمیوں میں نواب صاحب کی خدمات کا مسلسل اور معتدبہ حصہ رہا ہے، خلافت کی تحریک میں پیش پیش تھے، مسلم لیگ کے اعیان واکابر میں سے تھے، مسلم یونیورسٹی کے ٹریزرر اور وائس چانسلر رہے، کوئی غیر معمولی سیاست داں، ماہر تعلیم، عالم فاضل یا کسی فن میں یگانۂ روزگار نہ تھے، لیکن ایسی شخصیت کے مالک تھے جس کے بغیر یہ تمام سرگرمیاں نامکمل اور ناقابل اعتبار ٹھہرتی ہیں!

مسلم لیگ کے آزمودہ کار اور مقتدر رکن ہونے کے باوجود مسلم لیگ میں اتنے قابل اعتناء نہیں سمجھے گئے، جتنے کہ وہ مستحق تھے، سبب یہ تھا کہ سیاست میں شخص کو نہیں مصلحت کو دیکھتے ہیں، لیگ کی مصلحت اور طریقۂ کار سے بحیثیت مجموعی نواب صاحب کی سیرت وشخصیت ہم آہنگ نہ ہوسکی، نواب صاحب نے اپنے لیے ایک سطح مقرر کرلی تھی، جس سے وہ کسی حال میں نیچے اترنا گوارا نہیں کرسکتے تھے، ان کی زندگی میں اکثر ایسے مواقع آئے جہاں اپنے اس اصول، مزاج یا طریقۂ کار کی خاطر ان کو نقصان اٹھانا پڑا اور حریفوں نے اس سے فائدہ اٹھایا، لیکن نواب صاحب اس طرح کی شکست کو اپنی فتح سمجھتے تھے، اس لیے بددل اور بیزار ہونے کے بجائے ہمیشہ شگفتہ اور شاد ماں رہے، نواب صاحب پارٹی نہیں بناسکتے تھے اور پارٹی بنائے بغیر پبلک لائف کے نشیب وفراز سے عزت اور عافیت سے گزرنا تقریباً ناممکن ہے۔

جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا جاچکا ہے، نواب صاحب مدتوں علی گڑھ سے وابستہ رہے اور بڑے ذمے دار عہدوں پر فائز، اس میں شک نہیں اس زمانے میں (تقسیم ملک سے پہلے) مسلم یونیورسٹی کا کاروبار اتنا پھیلا ہوا نہ تھا، اور نت نئے مسائل کا اتنا سامنا نہ تھا، جتنا آج ہے، پھر بھی انتظامی دشواریاں کچھ کم نہ تھیں، یونیورسٹی کی آمدنی بہت کم تھی، ایک ترقی پذیر معیاری ادارے کے لیے مالی دشواری بہت بڑی مصیبت ہے، اسٹاف کی کمی، سامان کی کمی، عمارات کی کمی، گرانی کے سبب سے ملازموں کی تنخواہوں میں اضافے کی ضرورت، اس قسم کے کتنے اور مسائل تھے، جن کا یونیورسٹی کو سامنا تھا، بایں ہمہ نواب صاحب کی شرافت، بے لوثی اور حسن سلوک کا ایسا اثر تھا کہ کسی دشواری نے پیچیدگی یا ناگواری کی صورت کبھی نہیں اختیار کی، ادنیٰ ملازمین سے لے کر اعلیٰ عہدے داروں تک سبھی تو نواب صاحب پر بھروسا کرتے تھے، اور خود نواب صاحب سب سے عزت اور محبت سے پیش آتے تھے، کسی کے پاس حاجت لے کر جائے تو نفس کو بالعموم غیرت کا احساس ہوتا ہے، لیکن نواب صاحب اس وقار سے ملتے تھے، اور اس دلسوزی سے پرسش احوال کرتے اور مدد پر آمادہ ہوجاتے تھے کہ ذلت کی بجائے آدمی اپنے آپ کو گرامی محسوس کرنے لگتا تھا، نواب صاحب اتنے اچھے تھے کہ کوئی برا شخص بھی اپنے آپ کو آسانی سے اس پر راضی نہیں کرسکتا تھا کہ ان کی برائی پر آمادہ ہوجائے۔

ایک دن نواب صاحب کلکٹر ضلع کے ہاں لنچ پر مدعو تھے، شاید کسی منسٹر کے اعزاز میں یہ تقریب تھی، اس زمانے میں شاید یونیورسٹی کی اپنی کوئی کار نہ تھی، معلوم نہیں کہاں سے ایک خستہ وخوار جیپ آئی، وقت تنگ تھا، نواب صاحب عجلت میں تھے، کوٹھی سے نکلے ہی تھے کہ ایک صاحب آتے ہوئے نظر آئے، موٹر روک دی، معلوم ہوا کہ عارضی ملازم تھے، تنخواہ کے روپے ملنے میں کوئی پیچیدگی پڑ گئی تھی اور آفس والوں نے ان کو چکر میں ڈال رکھا تھا، نواب صاحب نے ان کو گاڑی میں ساتھ بٹھالیا، وکٹوریہ گیٹ پر لائے اور کہا کہ اوپر جاکر متعلقہ کلرک کو بلا لائے، وہ آئے تو وہیں آرڈر لکھ کردیا اور فرمایا کہ ٹریزرر صاحب سے میرا سلام کہنا اور چیک پر دستخط کراکے ان صاحب کے حوالے کردینا، اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا، لنچ سے واپسی پر پھر گیٹ پر آئے اور دریافت کرایا کہ چیک دے دیا گیا یا نہیں، اطمینان ہوگیا تو کوٹھی پر واپس آئے۔

نواب صاحب نے اپنے ٹریزررشپ کے عہد میں یہ اسکیم پیش کی تھی کہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور اعمال کو یونیورسٹی کی حدود میں ذاتی مکان بناکر مستقلاً آباد ہوجانے کے لیے قطعاتِ زمین دیے جائیں اور مناسب سہولتیں فراہم کی جائیں، مقصد یہ تھا کہ ملازمت سے سبکدوش ہونے پر بھی اساتذہ کا بالواسطہ تعلق اس ادارے سے رہ سکے، ان کی ہمہ وقت موجودگی سے طلبہ کو ہر طرح کا فائدہ پہنچے گا، اور یونیورسٹی میں ایسی فضا پیدا ہوجائے گی، جو یہاں کی علمی، تعلیمی اور تہذیبی روایات کو صحت مند اور تازہ کار رکھے گی، ہندوستان کی اقامتی درسگاہوں میں مسلم یونیورسٹی کا یہ اقدام اپنی نظیر آپ تھا، خیال کیا جاتا تھا کہ اس منصوبے کے بروئے کار آنے پر اس درسگاہ کی دیرینہ اقامتی حیثیت کو اور زیادہ فروغ نصیب ہوگا، یونیورسٹی نے اس اسکیم کو منظور کرلیا، چنانچہ مقررہ شرائط پر کافی لوگوں نے بڑے شوق اور حوصلے سے قطعاتِ زمین لیے اور مکان بنوائے، پھر معلوم نہیں کیا صورت پیش آئی کہ کچھ دنوں بعد اس اسکیم کو ختم کردیا گیا، ۱۹۴۷ء کے رستاخیز میں وہ لوگ بھی ادھر ادھر ہوگئے جنھوں نے مکان بنوالیے تھے، چنانچہ اس اسکیم سے جو فوائد مرتب ہونے والے تھے وہ نہ ہوسکے۔

اس زمانے میں اسٹاف کے لوگ یونیورسٹی کے اس اقدام پر بہت خوش ہوئے تھے، اور اس کا عام چرچا تھا کہ نواب صاحب کو ادارے کے اساتذہ اور عمال کا کتنا خیال تھا، ان کے لیے ان کے قلب میں کتنی وسعت تھی، اور جہاں تک یونیورسٹی کی فلاح وبہبود کا تعلق تھا، ان کی نظر کتنی دوررس تھی۔ نواب صاحب بڑے سیر چشم تھے، ان کا دسترخوان بڑا وسیع تھا، اپنے مہمانوں کے ساتھ کھانے پر بیٹھے ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے مہمانوں کی موجودگی، شرف اور شادمانی کی کوئی تقریب تھی، کھانے انواع اقسام کے ہوتے، کھانے والے بھی ہر طرح کے ہوتے، یہ نہیں کہ ہر روز معزز مہمانوں ہی کا مجمع ہوتا، ہر روز تو معزز مہمان کسی کے ہاں نہیں ہوتے، نواب صاحب کے ہاں کا دستور

یہ تھا کہ خود ان کے یا سرکاری جتنے ملازم یا کام کرنے والے ہوتے اور آس پاس ان کے بیوی بچے ہوئے تو وہ سبھی نواب صاحب کے مطبخ سے کھانا کھاتے، یہی نہیں بلکہ کھانے، ناشتے کا وقت ہوا اور کوئی کلرک یا چپراسی پہنچ گیا جو نواب صاحب کے کلرک یا چپراسی کا شناسا ہوا تو وہ بھی کھانے میں شریک ہوگیا، اس طور پر نواب صاحب ہی نہیں ان کے ملازمین اور متوسلین کا دسترخوان بھی کچھ کم وسیع نہ ہوتا! صورت حال کچھ اس طرح کی تھی کہ نواب صاحب کی میزبانی تو ''شرح معین'' تھی، ملازمین اور متوسلین کی حیثیت ''ششمی میزبان'' کی ہوتی۔

یہ وصف ان کا خاندانی تھا، اور جاگیرداری یا سرمایہ داری سے وابستہ نہ تھا، جس نے وفا نہ کی، مہمان نوازی اور وضعداری کے اوصاف نے نواب صاحب کا ساتھ مرتے دم تک دیا، ان اوصاف کا نباہنا ہر شخص کے بس کے بات نہیں، نواب صاحب شروع سے آخر تک مالی دشواریوں میں مبتلا رہے، جوں جوں دن گذرتے گئے، یہ دشواریاں بڑھتی گئیں، آخر میں تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ کسی وقت بھی پانی سر سے اونچا ہوسکتا تھا، لیکن حیرت اس پر ہے کہ نواب صاحب کی کسی بات سے کبھی یہ ظاہر نہیں ہوا کہ ان پر کیا گذر رہی ہے، تنگ حال ہونا اور اس کا اظہار نہ ہونے دینا اتنا ہی مشکل ہے، جتنا اقتدار کو پہنچنا اور آپے میں رہنا۔

نواب صاحب بڑے اونچے درجے کے ارسٹوکریٹ تھے، جس کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ وہ کیسی ہی تکلیف یا پریشانی میں کیوں نہ مبتلا ہو اس کا اظہار اس کی کسی بات سے نہ ہو، ہمارے ہاں ادنی درجے کی بھی ارسٹوکریسی ملتی ہے، لیکن جس بات کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ یونان کے عہد اولین کی ارسٹوکریسی (اشرافیت) ہے جو وہاں کے دیوتاؤں کا درجہ اختیار کر چکی تھی۔

مہمانوں کی تواضع وتکریم، اولاد کی تعلیم وتربیت گھر کی زندگی کو خوبصورتی اور خیر وبرکت سے مالا مال رکھنے میں نواب صاحب کی بیگم صاحبہ کو بڑا دخل تھا، پردہ نشین، باوقار، خدا ترس، خوش مزاج، اور بڑی نفاست پسند بی بی تھیں، یونیورسٹی میں غریب عورتوں کا سہارا تھیں، آج تک یہاں کے نچلے طبقے کے ملازمین، ان کی بیوی بچے بیگم صاحبہ کی دلنوازی اور داد ودہش کا ذکر بڑی محبت اور حسرت سے کرتے ہیں، موقع آئے تو ان میں کسی نہ کسی کو یہ کہتے ضرور سنیں گے کہ کھانے پینے اور عزت وآرام کے مزے تو نواب اسمٰعیل خاں صاحب کی بیگم صاحبہ کے زمانے میں اٹھائے! کہنے کو تو کہا جاتا ہے کہ اولاد کی تقدیر بنانے میں والدین کو بڑا دخل ہوتا ہے، گو اب یہ بھی کہا جانے لگا ہے کہ والدین کی تقدیر بگاڑنے میں اولاد کا دخل کچھ کم نہیں ہوتا، لیکن جہاں تک نواب صاحب کی اولاد کا تعلق ہے، یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ اس وقت ان کی زندگی میں جو ہمہ جہت شہرت اور وقعت نصیب ہے، اس میں نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کے فیض تربیت اور خاندان کی اعلیٰ روایات کا بڑا حصہ ہے۔

نواب صاحب مجھ پر کتنا کرم کرتے تھے اور میرے بچوں اور عزیزوں سے کس محبت اور عزت سے پیش آتے تھے، جی چاہتا ہے اس کا تذکرہ تفصیل سے کروں، اس سے نواب صاحب کی شفقت، حق پسندی اور وضعداری کی کیسی قابل قدر مثالیں سامنے آسکتی ہیں، لیکن کرتا ہوں تو اس کا احساس ہوتا ہے کہ اس میں خودستائی اور خودنمائی کا بھی پہلو نکلتا ہے، جو ممکن ہے کسی اور موقع پر گوارا کرلیتا، یہاں اس کی کسی طرح ہمت نہیں ہوتی اور نہ کروں تو غیرت دامنگیر ہوتی ہے کہ وہ حق نہیں ادا کر رہا ہوں جو نواب صاحب کا مجھ پر ہے۔ نواب صاحب کی فرد اعمال تو خدا کے علم میں ہے، اور نجات اُخروی کا سررشتہ بھی اس کے ہاتھ میں ہے لیکن نواب صاحب کی محبت ومنزلت سے میرا دل جس قدر معمور ہے اس سے امید کرتا ہوں کہ مرحوم کو خدا اپنی بے پایاں بخششوں سے ضرور نوازے گا، میرا کچھ اس طرح کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی کبھی اپنی بخشش کی بشارت اس محبت سے بھی دیتا ہے جو وہ اپنے نیک بندوں کی طرف سے اپنے بعض گنہگار بندوں کے دل میں ڈال دیتا ہے۔ (ستمبر ۱۹۵۸ء)

لے مسعود ٹامی کی بذلہ سنجی، شوخی اور تفریحی شرارتوں کے قصے اس زمانہ میں ہر علی گڑھ والے کی زبان پر تھے، ایک دن یونین کا جلسہ تھا، اچھے اچھے مقرر موجود تھے، مسعود ٹامی بھی کہیں سے آنکلے، حاضرین نے بے اختیار نعرہ لگایا، کہ مسعود ٹامی بھی تقریر کریں، وائس پریسیڈنٹ (اب پریسیڈنٹ) نے کہا کہ مسعود صاحب سب سے آخر میں تقریر فرمائیں گے تاکہ وہ دوسری تمام تقریروں پر تبصرہ فرماسکیں، وقت آنے پر مسعود صاحب ڈائس پر تشریف لائے اور ''ڈمب شو'' شروع کردیا، یعنی ہر مقرر کے سراپا اس کی تقریر اور انداز تقریر کو زبان سے نہیں بلکہ اعضا وجوارح کی حرکات وسکنات سے دکھانا بتانا شروع کیا، جیسے اسکرین پر خاموش تصاویر دکھائی جاتی ہیں، گانے اور ناچنے کے فن کے ماہر آواز اور حرکت سے مختلف کیفیات کا اظہار شائد اس خوبی سے نہ کرپائیں، جیسی مسعود ٹامی نے اس موقع پر تقریر کرنے والوں کی خاموش نقل ہم کو دکھائی تھی، حاضرین کس طرح سے لطف اندوز ہوئے ہوں گے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

زبیری، محمد امین، مولوی

مولوی محمد امین صاحب زبیری

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینہ اردو کے ایک پرانے اہل قلم مولوی محمد امین صاحب زبیری نے کراچی میں انتقال کیا، ان کا وطن مارہرہ تھا، لیکن ان کی عمر کا بڑا حصہ بھوپال میں گزرا وہ ریاست بھوپال کے شعبۂ تاریخ کے مہتمم تھے اور بیگم صاحبہ بھوپال کے تحریری اور تصنیفی کاموں میں بھی مدد دیتے تھے، مولانا شبلی مرحوم سے خاص تعلقات تھے، چنانچہ مکاتیب شبلی میں ان کے نام بہت سے خطوط ہیں، بیگم صاحبہ بھوپال نے سیرۃ النبیؐ کی

تالیف کے لئے دوسو ماہوار کی جو امداد مقرر کی تھی اس میں امین زبیری صاحب کی کوشش کو بھی دخل تھا، پھر مولانا شبلی کی وفات کے بعد انہی کی کوشش سے یہ امداد دارالمصنفین کی جانب منتقل ہوگئی اور ان کے تعلقات دارالمصنفین سے بھی برابر قائم رہے، مگر وہ سرسید ان کی پالیسی اور علی گڑھ تحریک کے بڑے پرجوش حامیوں میں تھے، اس کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہ کرتے تھے، اس لیے حیات شبلی کی اشاعت کے بعد ان کو دارالمصنفین سے شکایت پیدا ہوگئی تھی، مگر پھر وہ خود ہندوستان سے ہجرت کر گئے، ان کی پوری زندگی تالیف وتصنیف میں گزری، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، ڈاکٹر ضیاء الدین اور آغا خان کے حالات میں انھوں نے مستقل کتابیں لکھیں، ان کے علاوہ متعدد تصانیف ان کی یادگار ہیں، انتقال کے وقت نوے سال کی عمر تھی، ان کی موت سے ایک پرانی یادگار مٹ گئی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ (''م''، اکتوبر ۱۹۵۸ء)

بھگوان داس، ڈاکٹر

ڈاکٹر بھگوان داس

اسی مہینہ ہندوستان کی ایک اور نامور شخصیت ڈاکٹر بھگوان داس نے انتقال کیا، وہ اپنے دور کے مشہور صاحب علم وقلم اور درویش صفت صوفی مشرب فلسفی تھے، فلسفہ اور تصوف پر ان کی بڑی گہری نظر تھی، اس پر انگریزی میں ان کی کئی تصانیف ہیں، اسلام سے پوری طرح واقف اور اسلامی تصوف سے خاص ذوق رکھتے تھے، عقیدۂ موحد اور اپنی تہذیب و معاشرت میں پرانی تہذیب و شرافت و وضعداری کا نمونہ تھے، اپنے مسلمان دوستوں کو جب خطوط لکھتے تھے تو اپنا نام عبدالقادر لکھتے تھے اور کہتے تھے کہ بھگوان داس اور عبدالقادر کے معنی ایک ہیں، بمبئی کے گورنر سری پرکاش صاحب کے والد تھے، ان کو شرافت و وضعداری اپنے والد ہی سے ترکہ میں ملی ہے، ڈاکٹر بھگوان داس کی موت سے ہندوستان کی ایک بڑی علمی وتہذیبی یادگار مٹ گئی۔ (''م''، اکتوبر ۱۹۵۸ء)

اصلاحی، اختر احسن، مولانا

مولانا اختر احسن اصلاحی

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینہ مولانا اختر احسن صاحب اصلاحی مہتمم مدرستہ الاصلاح سرائمیر نے انتقال کیا، وہ مولانا حمیدالدین فراہیؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے، ان کو انھوں نے اپنی مخصوص طرز پر کلام مجید پر غور وفکر اور اس کی تفسیر وتاویل کی تعلیم دی تھی اور وہ اس کے اچھے شارح و ترجمان تھے، اور سیاست میں بھی پوری دستگاہ حاصل تھی، دینداری اور زہد میں بھی استاد بزرگ کے شاگرد رشید تھے، انھوں نے پوری زندگی نہایت سادگی اور قناعت کے ساتھ ایک قلیل معاوضہ پر مدرستہ الاصلاح کی خدمت میں گذار دی، اس زمانہ میں غربت وعسرت کے ساتھ علم و دین کی خدمت صرف عربی مدارس کا حصہ ہے وہ طبعاً نیک نفس، خاموش، عزت پسند اور نام ونمود سے بے نیاز تھے، ورنہ ان کے بعض رفقاء کی طرح ان کا شمار بھی مشاہیر میں ہوتا، مدرستہ الاصلاح کی روح رواں اب وہی تھے، وفات کے وقت پچپن سال کے قریب عمر رہی ہوگی، اللہ تعالیٰ علم و دین کے اس خادم کو اپنی رحمت ومغفرت سے سرفراز فرمائے۔ (''م''، نومبر ۱۹۵۸ء)

برنی، محمد الیاس، پروفیسر

پروفیسر محمد الیاس برنی

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینوں میں دنیائے علم وادب کی دو نامور شخصیتیں پروفیسر محمد الیاس برنی اور خلیفہ عبدالحکیم ہم سے جدا ہوگئے، پروفیسر الیاس برنی علی گڑھ کالج کے نامور فرزند تھے، حصول تعلیم کے بعد کالج ہی میں معاشیات کے لکچرار ہوگئے تھے، پھر دارالترجمہ کے رکن کی حیثیت سے حیدرآباد چلے گئے اور کچھ دنوں تک اس کے ناظم بھی رہے، پھر جامعہ عثمانیہ میں معاشیات کے استاد مقرر ہوگئے، اور اسی عہدہ سے سبکدوش ہوئے، تعلیم وتدریس کے ساتھ تالیف وتصنیف کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا، جامعہ عثمانیہ کے لیے معاشیات کی کئی کتابیں لکھیں، اس فن کو اردو میں سب سے پہلے ان ہی نے روشناس کیا تھا، ان کی پہلی تصنیف علم المعیشت ایک زمانہ میں بہت مشہور تھی۔ شعر و ادب کا مذاق بھی رکھتے تھے، معارف ملت، جذبات فطرت اور مناظر قدرت کے نام سے کئی حصوں میں اردو نظموں کا ایک نہایت عمدہ انتخاب مرتب کیا تھا جو بہت مقبول ہوا۔

مذہبی ذوق ابتداء سے تھا جو عمر کے ساتھ بڑھتا گیا اور آخر میں مذہب وتصوف کا بڑا غلبہ ہوگیا تھا اور ان کی ساری قلمی کوششیں اسی کے لیے وقف ہوگئی تھیں، انھوں نے مختلف مذہبی موضوعات پر مفید کتابیں لکھیں، ان کا سفرنامۂ حج، صراط الحمید خاص طور پر مقبول ہوا، قادیانی مذہب کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھی تھی جس میں مرزا غلام احمد قادیانی اور دوسرے قادیانی اکابر کی تحریروں سے اس مذہب کی حقیقت ظاہر کی گئی تھی، یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور ہر ایڈیشن پہلے ایڈیشن سے بڑھ کر تھا، ان کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد دو درجن سے زیادہ ہوگی، اللہ تعالیٰ اس شیدائے علم و دین کو اپنی رحمت ومغفرت سے سرفراز فرمائے۔

(''م''، مارچ ۱۹۵۹ء)

[4] عبدالحکیم، خلیفہ

خلیفہ عبدالحکیم

خلیفہ عبدالحکیم ایک بالغ نظر فلسفی اور ممتاز صاحب علم وقلم تھے، وہ بھی عثمانیہ میں

فلسفہ کے پروفیسر تھے، مذہب پر بھی ان کی نگاہ تھی، اورشعر و ادب کا بھی ستھرا اور پاکیزہ مذاق رکھتے تھے، اقبال کے فلسفہ اور کلام کے بڑے عارف اور اس کے نہایت اچھے شارح و ترجمان تھے، جامعہ عثمانیہ سے ریٹائر ہونے کے بعد لاہور میں اقبال کی یادگار میں ایک ادارہ اقبال اکیڈمی قائم کیا تھا، اور ''اقبال'' کے نام سے ایک بلند پایہ علمی رسالہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں نکالتے تھے، ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے بھی بانیوں میں اور اس کے رکن رکین تھے، اس کا رسالہ ثقافت بھی ان ہی کی ادارت میں نکلتا تھا، ان کا علمی مذاق نہایت بلند تھا، اور ان کی پوری زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزری، انھوں نے فلسفہ، ادب اور مذہب پر نہایت قابل قدر کتابیں لکھیں، ان کی دو کتابیں فکر غالب اور افکار اقبال خاص طور سے اہم ہیں مگر ان کے خیالات میں تجدد کا اثر تھا اس لیے مذہبی تعلیمات کی ترجمانی میں ان سے غلطیاں ہوئیں، لیکن ان کی نیت نیک اور ان کے دل میں مذہب کا درد تھا اور ان کی کتابیں ایک طبقہ کے لیے مفید بھی ہیں، اس حیثیت سے انھوں نے مذہب کی بھی خدمت کی، اللہ تعالیٰ ان کی قلمی لغزشوں سے درگزر ان کی خدمت قبول اور ان کی مغفرت فرمائے، اب ایسے خالص اہل علم مشکل سے پیدا ہوں گے۔ (''م''، مارچ ۱۹۵۹ء)

ملیح آبادی، عبدالرزاق، مولانا

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ ہماری جماعت کے ممتاز رکن اور ندوہ کے نامور فرزند مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی نے وفات پائی، انھوں نے متوسطات تک ندوہ میں تعلیم پائی، اور تکمیل جامعہ ازہر مصر میں کی تھی، علامہ رشید رضا کے خاص شاگردوں میں تھے، ان کا ذوق ابتدا سے سیاسی بلکہ انقلابی تھا، چنانچہ مصر کے قیام کے زمانہ میں قسطنطنیہ جا کر انور پاشا سے ملے، ان کی ملاقات نے سیاست اور آزادی کا نشہ اور تیز کر دیا، پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان واپس آئے، اور کچھ دنوں تک مولانا عبدالباری فرنگی محلی رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ رہے، جن کی ذات اس زمانہ میں مسلمانوں کی سیاست کا مرکز تھی، مگر مولانا عبدالرزاق کے خیالات اس زمانہ کی سیاست سے بہت آگے تھے، اس لئے زیادہ دنوں تک یہ ساتھ نہ رہ سکا۔

حسن اتفاق سے اسی زمانہ میں مولانا ابوالکلام کو ایک علمی و سیاسی رفیق کار کی تلاش تھی، اس کے لئے ان کی نگاہ انتخاب مولانا عبدالرزاق پر پڑی اور ان کو انھوں نے کلکتہ بلا لیا، اس وقت سے وہ مولانا کے دامن سے ایسے وابستہ ہوئے کہ مرتے دم تک ان کا ساتھ نہ چھوڑا، وہ برسوں مولانا ابوالکلام کے سیاسی اور علمی کاموں میں ان کے دست راست رہے، چنانچہ دوسرے دور کے البلاغ اور لے مشہور عربی اخبار الجامعہ کے اڈیٹر مولانا ابوالکلام برائے نام تھے، ان کا پورا کام مولانا عبدالرزاق انجام دیتے رہے، الجامعہ ہندوستان میں عربی کا پہلا معیاری اخبار تھا، جس کی شہرت عرب ملکوں تک تھی، ہندوستان کے مسلمانوں میں عربی ادب و انشاء کا صحیح ذوق پیدا کرنے اور عرب ملکوں سے ان کا رابطہ استوار کرنے میں اس اخبار کا بڑا حصہ ہے، ان علمی و صحافتی مشاغل کے ساتھ سیاسی تحریکوں میں بھی علمی حصہ لیتے رہے، اور اس راہ میں قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں، ہندوستان کی جنگ آزادی کے سلسلہ میں جب مولانا ابوالکلام کی مشغولیتیں زیادہ بڑھ گئیں اور وہ اپنے علمی و صحافتی مشاغل چھوڑنے پر مجبور ہوئے تو مولانا عبدالرزاق صاحب نے مختلف اوقات میں پیغام ہند اور آزاد ہند وغیرہ متعدد اخبار نکالے، آزاد ہند اب تک جاری ہے، بنگال کے مسلمانوں کی بیداری اور ہندوستان کی تحریک آزادی میں الہلال اور البلاغ کے بعد اس اخبار کا نمایاں حصہ ہے۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد مولانا ابوالکلام نے مولانا عبدالرزاق کو دلی بلا لیا اور وہ حکومت ہند کے ثقافتی تعلقات کے شعبہ کے عربی رسالہ ثقافۃ الہند کے اڈیٹر اور آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی کے شعبۂ عربی کے انچارج مقرر ہوئے اور کئی سال تک دونوں کام انجام دیتے رہے، پھر مولانا ابوالکلام کی وفات کے بعد ایسے دل برداشتہ ہوئے کہ ملازمت چھوڑ کر کلکتہ چلے گئے، ان کو ایک مرتبہ حلق میں کینسر کی شکایت ہو چکی تھی مگر علاج سے افاقہ ہو گیا تھا، چند دنوں کے بعد پھر یہ مرض ابھر آیا، اس مرتبہ علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہوا، اور اسی مرض میں گذشتہ مہینہ وفات پائی، وفات کے وقت ۶۴۔ ۶۵ سال کی عمر رہی ہوگی۔

مولانا عبدالرزاق خالص افغانی پٹھان تھے، اس لئے پٹھانوں کی خوبیاں اور خامیاں وہ دونوں ان کے حصہ میں آئی تھیں وہ کہنہ مشق صحافی تھے، ان کی پوری عمر صحافت میں گذری عربی اور اردو دونوں کے ادیب تھے، نہایت فصیح و سلیس عربی اور اردو لکھتے تھے، اخبارات کے علاوہ انھوں نے مختلف اوقات میں اردو کے کئی رسالے نکالے اور ان کے ذریعہ اسلامی تاریخ اور عربی تہذیب و ثقافت سے متعلق خاصہ لٹریچر اردو میں پیدا کر دیا، وہ طبعاً انتہا پسند، انقلابی اور آزاد خیال تھے، اس کا اثر ان کے سیاسی اور مذہبی خیالات میں نمایاں تھا، سیاسی خیالات میں وہ کمیونسٹ تھے، اور مذہب میں غیر مقلد اور ترقی پسند تھے، تقلید جمود اور بدعات کے سخت مخالف تھے، ابتدا میں اسی اثر کے ماتحت انھوں نے ابن تیمیہ اور ابن قیم کے بہت سے رسائل کا اردو میں ترجمہ کیا، مگر بعض اوقات ان کی آزاد خیالی صحیح مذہب کی حدود سے بھی آگے نکل جاتی تھی۔

طبعاً نہایت شریف، مخلص دوست نواز متواضع، بے تکلف، فیاض، سیر چشم، خوش مزاج اور بذلہ سنج انسان تھے، روپیہ پیسہ کی ان کی نگاہ میں کوئی وقعت نہ تھی، انھوں نے جو کچھ پیدا کیا سب صرف کر دیا، حکومت ہند میں ڈیڑھ ہزار ماہوار پاتے تھے، مگر ایک

حبہ نہیں بچتا تھا، ان کی فیاضی سے ان کا ہر ملنے والا مستفیض ہوتا تھا، اور لطف یہ کہ ان کی زندگی نہایت سادہ بلکہ طالب علمانہ تھی، ان کی بے سروسامانی دیکھ کر کوئی شخص یہ یقین ہی نہیں کرسکتا تھا کہ وہ اتنی بڑی تنخواہ پاتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام کے ساتھ برسوں رہے، ان کے ہمدم و ہمراز اور انیس جلوت و خلوت تھے، ان سے زیادہ مولانا سے قریب اور ان کا واقف کار دوسرا شخص نہیں نکل سکتا، مولانا بھی ان کی بڑی قدر اور ان پر بڑا اعتماد کرتے تھے۔

ان کی پوری زندگی قوم و ملت، ملک و وطن اور علم و ادب کی خدمت میں گذری ان کے مضامین کے علاوہ تصانیف کی تعداد دو درجن سے کم نہ ہوگی، دہلی کے قیام کے زمانہ مین عربی اردو کا ایک مبسوط لغت مرتب کر رہے تھے، جس کا ایک حصہ لکھ بھی چکے تھے، اور مولانا ابوالکلام کی ایک سوانحمری بھی لکھی تھی، جس کے متعلق ان کا بیان تھا کہ اس میں ایسے اہم واقعات ہیں جن کا کسی کو بھی علم نہیں، اس لئے یہ کتاب ان کی یا مولانا کی وفات کے بعد شائع ہوگی، یہ سوانح عمری غالباً اس سوانح عمری سے مختلف ہے جو انھوں نے مولانا کی وفات کے بعد مولانا کی روایت سے شائع کی ہے، ان کتابوں کے علاوہ اسلام اور رسول اللہ صلی علیہ وسلم سے متعلق بعض اور تصانیف بھی ان کے پیش نظر تھیں جن میں سے غالباً بعض کتابیں انھوں نے شروع بھی کردی تھیں یقین ہے کہ ان کی غیر مطبوعہ تصانیف کے مسودے ان کے لائق فرزند عزیزی احمد سعید خاں صاحب کے پاس محفوظ ہوں گے، اور وہ ضائع نہ ہونے پائیں گے، مولانا عبدالرزاق نے اپنے قلم سے عرصہ تک مذہب و ملت کی خدمت کی ہے، اللہ تعالیٰ اس کے صلہ اور اپنی رحمت کے طفیل میں ان کی بشری لغزشوں سے درگذر کرکے اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے، **اللھم اغفرلہ وارحمہ رحمۃً واسعۃً۔**

(''م''، جولائی ۱۹۵۹ء)

مصری، عبدالوہاب عزام، ڈاکٹر

ڈاکٹر عبدالوہاب عزام مصری

دوسرا حادثہ دنیائے عرب کی نامور شخصیت ڈاکٹر عبدالوہاب عزام مصری کی وفات کا ہے، وہ عربی دنیا کے اکابر رجال میں تھے، ان میں علم و سیاست دونوں کا جتماع تھا علوم وادب کے فاضل، عربی، فارسی، ترکی، انگریزی، فرنچ وغیرہ متعدد زبانوں کے ماہر تھے، اردو سے بھی واقفیت رکھتے تھے، انہوں نے مصر اور لندن کی یونیورسٹیوں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی، ابتدا میں مدرسہ قضاء شرعی کے استاد مقرر ہوئے تھے، پھر یونیورسٹی میں عربی، فارسی اور ترکی کے پروفیسر، پھر اسی یونیورسٹی میں شعبۂ السنہ مشرقیہ کے صدر مقرر ہوئے، اور آخر میں آرٹس کالج کے پرنسپل ہوگئے تھے، علم کیساتھ سیاست بھی ممتاز تھے، چنانچہ مختلف اوقات میں حکومت مصر کی جانب سے لندن سعودی عرب اور پاکستان کے سفیر مقرر ہوئے، تھوڑے دن ہوئے سعودی حکومت نے ریاض یونیورسٹی کے قیام و تاسیس کے سلسلہ میں ان کی خدمات حاصل کی تھیں، ابھی وہ اس کام کو انجام دے رہے تھے کہ پیام اجل آ گیا، انہوں نے اپنے قلم و دماغ سے علم و فن اور دنیائے عرب کی بڑی قیمتی خدمات انجام دیں اور علمی مضامین کے علاوہ بہت سی محققانہ تصانیف اور تراجم یادگار چھوڑے، عربی دنیا میں ان کی موت سے جو جگہ خالی ہوئی ہے وہ مشکل سے بھر سکے گی، اللہ تعالیٰ علم و ملت کے اس خادم کو اپنے دامن رحمت میں جگہ دے۔

(''م''، جولائی ۱۹۵۹ء)

عبدالقادر، مفتی

مفتی عبدالقادر

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ ۲۴/ اگست کو فرنگی محل کے نامور عالم مفتی عبدالقادر صاحب نے وفات پائی، مرحوم علم و عمل میں اپنے اسلاف کرام کا نمونہ اور طبعاً نہایت خاموش اور عزلت پسند تھے، پوری زندگی خاموشی اور قناعت کے ساتھ درس و تدریس اور علم و افتاد کی خدمت میں گذاری، ان کی موت سے فرنگی محل کی ایک اہم یادگار مٹ گئی، نئی نسل جدید تعلیم یافتہ ہے، اس کو اپنے اسلاف کے علوم اور روایات سے بہت کم علاقہ رہ گیا ہے اس لئے جو ایک دو پرانے بزرگ باقی رہ گئے ہیں ان کے بعد فرنگی محل میں سناٹا نظر آتا ہے۔

اس خاندان میں جتنی طویل مدت تک علم رہا اور اس سے پورے ہندوستان کو جو فیض پہنچا اس کی مثال دوسرے علمی خاندانوں میں کم ملے گی، عموماً دو چار پشتوں سے زیادہ کسی خاندان میں علم نہیں چلتا، مگر فرنگی محل تقریباً تین صدیوں تک دینی علوم اور اس کی تعلیم کا مرکز رہا اور اس مدت میں ملا نظام الدین بانی درس نظامیہ، ملا حیدر، ملا حسن، مولانا بحرالعلوم، مولانا عبدالحیٔ اور مولانا عبدالباری رحمہم اللہ جیسے بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے مگر اب بظاہر اس سلسلۃ الذہب کا خاتمہ نظر آتا ہے۔

مفتی صاحب مرحوم علم و عمل کے ساتھ اخلاق فاضلہ اور اوصاف حمیدہ سے بھی آراستہ نہایت خاموش متواضع، نرم خور، خندہ جبیں، شگفتہ مزاج اور خوش خلق تھے، ملنے والوں پر ان کے علم سے زیادہ ان کے اخلاق کا اثر پڑتا تھا، ان اوصاف کی بنا پر وہ ہر طبقے میں بڑے مقبول تھے۔ راقم نے ان سے مختصر المعانی پڑھی تھی، اس زمانہ میں ان کے اخلاق اور مہر و محبت کا جو نقش دل پر قائم ہوا تھا وہ اب تک باقی ہے، اللہ تعالیٰ اس خادم علم و دین کو اپنی رحمت کاملہ سے سرفراز فرمائے۔

(''م''، ستمبر ۱۹۵۹ء)

ردولوی، محمد علی، چودھری

چودھری محمد علی صاحب ردولوی

افسوس ہے کہ ہماری قدیم تہذیب کی یادگاریں ایک ایک کر کے اٹھتی جاتی ہیں اور پرانی محفل اجڑتی جاتی ہے، ان ہی یادگاروں میں ایک چودھری محمد علی صاحب مرحوم ردولوی بھی تھے، وہ امراؤ شرفائے اودھ کی تہذیب کا نمونہ تھے، ان کی شخصیت بڑی دلکش و دلپذیر تھی، بڑے خوش مذاق، زندہ دل، بذلہ سنج حاضر جواب اور علم مجلسی کے بڑے ماہر تھے، ان کی ہر چیز میں خوبی و لطافت اور زبان و قلم دونوں میں بڑے دلکشی تھی، تحریر میں صاحب طرز ادیب اور خوش گفتاری میں ہزار داستان تھے، جس محفل میں بیٹھتے تھے اپنی خوش بیانی سے چھا جاتے تھے، ان کی تحریر میں سادگی کے ساتھ بڑی تازگی اور بے ساختگی تھی، اس طرز میں وہ منفرد تھے، اہل زبان حضرات میں بھی اس طرز میں لکھنے والا کوئی نہ تھا، مگر ان کی تحریر اور گفتگو دونوں میں اودھ کا پرانا بے فکری کا تفریحی مذاق غالب تھا اس لیے تحریر کا دائرہ ادب و افسانے تک محدود تھا، اور اسی میں ان کا طرز تحریر کھلتا بھی تھا سنجیدہ علمی و ادبی مباحث سے ان کو زیادہ دلچسپی نہ تھی، اگر کبھی بھولے سے اس کوچہ میں نکل آتے تھے تو اس میں بھی تفریحی رنگ پیدا ہو جاتا تھا، یہی حال ان کی گفتگو کا تھا، ان کی سنجیدہ گفتگو بھی لطائف وظرائف سے خالی نہ ہوتی تھی۔

ان کی عمر اسی (۸۰) کے قریب تھی مگر ان کی طبیعت سدا بہار تھی، اسلئے اس زمانہ میں بھی نہ وہ کسی سوسائٹی کے لیے اجنبی ہوئے تھے اور نہ کوئی سوسائٹی ان کے لیے اجنبی تھی، ہر عمر ہر مذاق اور ہر طبقہ کے لوگوں سے ان کے یکساں تعلقات تھے، اور جس مجمع میں بیٹھتے اس میں گھل مل کر اس طرح اس کے مذاق کی باتیں کرتے تھے کہ اسی کے ایک فرد معلوم ہوتے تھے۔ ان کی صحبت زعفران زار ہوتی تھی جس سے ہر مذاق کا آدمی لطف اندوز ہوتا تھا، وہ آج سے نصف صدی پیشتر کے لکھنے والے تھے لیکن ان کی تحریر کی تازگی میں اب بھی فرق نہیں آیا تھا، ان کا مطالعہ وسیع تھا، اسلامیات پر بھی ان کی نظر تھی اور آج کل کے بہت سے پڑھے لکھے لوگوں سے زیادہ معلومات رکھتے تھے اور کسی موضوع پر بھی بند نہ تھے، انگریزی و اردو کا ایک مختصر کتب خانہ بھی ان کے پاس تھا جس مین انگریزی کی بعض اچھی کتابیں تھیں، ان کے ورثہ میں ان کے بعد ان کا کوئی قدردان نہیں ہے، خدا معلوم اس کا انجام کیا ہو۔

وہ مذہباً شیعہ تھے، مگر بڑے معتدل اور شیعہ سنی اتحاد کے بڑے علمبردار تھے، اس سلسلہ میں انھوں نے ''میرا مذہب'' کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی، عرصہ سے محرم کی بدعتوں کو ترک کر دیا تھا، ایک زمانہ میں بڑے آزاد خیال وسیع المشرب اور رنگین مزاج تھے لیکن عمر کے ساتھ ساتھ مذہبی رجحان بڑھتا گیا تھا اور ادھر چند برسوں سے بڑے مذہبی ہوگئے تھے، اور ان کے دل میں بڑا سوز و گداز پیدا ہوگیا تھا، حضرت امام زین العابدینؓ کی دعاؤں کا ایک مجموعہ ان کے ورد میں رہتا تھا اور اپنی گذشتہ زندگی کو یاد کر کے اکثر رویا کرتے تھے اور آنے جانے والوں سے اپنی دعائے مغفرت کی درخواست کرتے تھے، اللہ تعالیٰ کی شان رحمت سے پوری توقع ہے کہ وہ ان کی مغفرت فرمائے گا، جس طرح ان کی زندگی میں شیعہ وسنیوں سے ان کے یکساں تعلقات تھے، اسی طرح ان کی وفات کے بعد بھی ان کی وصیت کے مطابق دونوں نے الگ الگ ان کی نماز جنازہ پڑھائی، چودھری صاحب جس تہذیب کی یادگار تھے، اب وہ تہذیب مٹ چکی ہے، اس لئے ان کی موت سے ایک پورے دور کا خاتمہ ہوگیا اور اب ایسے نمونے پیدا نہ ہوں گے۔

یادگارِ زمانہ تھے یہ لوگ　　سن رکھو تم، فسانہ تھے یہ لوگ

(''م''، اکتوبر ۱۹۵۹ء)

مدراسی، محمد اسمٰعیل، کاکا

کاکا محمد اسمٰعیل مرحوم مدراسی

(مولوی ثناء اللہ)

کاکا اسمٰعیل صاحب مرحوم قوم ملت کی ان شخصیتوں میں تھے، جنھوں نے لاکھوں روپیہ کمایا اور لاکھوں قوم وملت کی راہ میں صرف کیا، ہندوستان کے بہت سے مذہبی وقومی ادارے ان کی فیاضی سے سیراب ہوئے تھے، ایسے محسن قوم کے حالات سے دوسرے ارباب ثروت سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ (''م'')

علاقہ مدراس ضلع نارتھ آرکاٹ کا تاریخی مقام گڑھ آمبور کاکا محمد اسمٰعیل صاحب کا وطن تھا، آپ کے والد کاکا حاجی محمد عمر صاحب ایک دیندار بزرگ، دولتمند تاجر علماء کے عقیدت مند، فیاض اور غریب پرور تھے، دینی اور اصلاحی کاموں میں پیش پیش رہتے تھے، مدراس کی روشن کمپنی جو علم نوازی میں مشہور تھی اور اب بند ہوگئی آپ اس کے ایک رکن تھے، گڑھ آمبور سے متصل اپنے نام کی مناسبت سے عمرآباد نامی ایک گاؤں آباد کیا اور وہیں ایک اعلیٰ دینی درسگاہ و مدرسہ دارالسلام کے نام سے ۱۹۲۴ء میں قائم کی چند ہی سال بعد دسمبر ۱۹۲۷ء میں آپ کا انتقال ہوگیا، آپ کے بعد آپ کے فرزند اکبر کاکا محمد اسمٰعیل صاحب نے جملہ کاروبار کو نہایت خوبی سے سنبھالا، والد مرحوم کی جملہ خوبیوں کے علاوہ آپ میں اور بھی بہت سے کمالات تھے، علمی اور دینی خدمت کے جذبہ سے سرشار تھے، دولت کا بیشتر حصہ ملی وقومی کاموں میں خرچ کرتے تھے، صاحب دل مخلص، موحد اور متبع سنت تھے، متعدد علمی ادارے بذات خود چلا رہے تھے، حسب ذیل ادارے آپ کی یادگار ہیں:

۱۔ جامعہ دارالسلام عمر آباد: یہ ایک اعلیٰ دینی درس گاہ ہے جس طلباء کی تعداد سو سے متجاوز ہے، اس میں رہائش، خوراک اور درسی کتابوں کا انتظام بغیر کسی فیس کے مدرسہ کی طرف سے ہوتا ہے، اساتذہ کی تعداد گیارہ بارہ تک رہتی ہے، درس نظامی میں حذف و ترمیم کرکے اس کا ایک جدید معقول اور جامع نصاب تیار کیا گیا ہے، مولانا سید سلیمان ندوی اس جامعہ کو جنوبی ہند کا ندوہ کہتے تھے۔

۲۔ محمدیہ اسکول: اس میں ہر قوم و مذہب کے بچے انگریزی اور ملکی زبانوں کی تعلیم پاتے ہیں، طلباء کی تعداد تقریباً دوسو اور اساتذہ کی چھ سات ہے۔

۳۔ مدرسۂ نسواں: اس میں صرف مسلمان بچیوں کو دینی اور قومی تعلیم دی جاتی ہے، دو تین استانیاں کام کرتی ہیں۔

۴۔ عمر لائبریری: یہ ایک نہایت شاندار کتب خانہ ہے، جس میں عربی، فارسی، اردو، انگریزی اور ٹمل کی بیش بہا کتابوں کا ذخیرہ ہے، جس میں بلا تفریق ہر خاص و عام استفادہ کرتا ہے، ان کے علاوہ ہر چھوٹے بڑے علمی اور دینی اداروں کی بڑی فیاضی سے امداد فرماتے تھے، دارالمصنفین کے لائف ممبر تھے، مولانا سید سلیمان ندویؒ سے آپ کو اور مولانا مرحوم کو آپ سے بڑی عقیدت و محبت تھی۔

نہایت ہی عالی حوصلہ اور بلند ہمت تھے۔ تقریباً پندرہ سال سے آپ کا تجارتی کاروبار بالکل بند تھا، جو ان اداروں کو چلانے کا سب سے بڑا سہارا تھا، لیکن آپ کی اولالعزمی اور بلند ہمتی نے ان اداروں کو بند ہونے نہ دیا اور کسی نہ کسی طرح چلاتے رہے، آپ کی فیاضی سے ہر قوم و ملت کے آدمی مستفیض ہوتے تھے، نہایت خلیق، متواضع اور ملنسار تھے، یگانہ، بیگانہ، دوست اور دشمن سب آپ کے حسن اخلاق کے مداح تھے، بڑے دانشمند اور مدبر تھے، پیچیدہ سے پیچیدہ معاملات کو بڑی آسانی سے سلجھا دیتے تھے، اطراف کی ہر چھوٹی بڑی مسلم و غیر مسلم آبادی میں آپ کی حیثیت حَکم کی تھی۔ ہر فرقہ کے لوگ اپنے خاندانی اور قومی اختلافات میں آپ ہی کی طرف رجوع کرتے تھے اور آپ کے دانشمندانہ اور عادلانہ فیصلوں پر بے چون و چرا مطمئن ہوجاتے، آپ کی قومی اور ملکی خدمات کے اعتراف میں سرکار انگریزی نے ''خان بہادر'' کے لقب سے نوازا۔

انتقال سے تین سال پیشتر آپ نے جامعہ کے چلانے کے لیے چند قابل اعتماد، مخیرّ اور ہمدرد ملت افراد کی ایک کمیٹی بنادی جو بڑے اخلاص اور توجہ کی دیکھ بھال کررہی ہے اور اس کی ترقی کے لیے فیاضی سے دولت خرچ کررہی ہے۔ چار پانچ سال کے عرصہ میں آپ پر دو تین مرتبہ فالج کا حملہ ہوا، اور بالآخر اسی مرض میں ۱۴ مئی ۱۹۵۹ء جمعہ کی رات دس بجے ستر سال کی عمر میں انتقال کیا۔

آپ نے اپنے پیچھے اپنے چھوٹے بھائی کاکا محمد اسحٰق صاحب ٹرسٹی جامعہ اور تین لڑکوں (کاکا رشید احمد صاحب سکریٹری محمدیہ اسکول و مدرسۂ نسواں کاکا حاجی محمد عمر صاحب جائنٹ سکریٹری جامعہ دارالسلام عمر آباد، کاکا حاجی مولوی سعید احمد سکریٹری عمر لائبریری) اور پانچ لڑکیوں کو چھوڑا ہے۔ **اللھم اغفرلہ وارحمہ۔** (اکتوبر ۱۹۵۹ء)

<u>سالک، عبدالمجید</u>

عبدالمجید صاحب سالک

پنجاب میں مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے بعد ادب و صحافت کے میدان میں سب سے ممتاز اور رنگا رنگ شخصیت عبدالمجید صاحب سالک مرحوم کی تھی، وہ ادیب و شاعر بھی تھے اور صحافی و مزاح نگار بھی، ان کا مذاق بڑا ستھرا اور قلم متوازن تھا، ایک زمانہ میں ان کی ذات لاہور کی ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھی، پنجاب کے بہت سے نوجوان ادیب و صحافی ان ہی کے دامن تربیت کے پروردہ ہیں، طبعاً بڑے باغ و بہار، سخن طراز اور بزم آرا تھے، انھوں نے علم و ادب کے ساتھ ملک و ملت کی بھی خدمت انجام دی، متعدد علمی و ادبی تصانیف ان کی یادگار ہیں، ان میں ''مسلم ثقافت ہندوستان میں'' ان کے حسن مذاق کا نمونہ ہے، ابھی تھوڑے دن ہوئے ''ہم نہیں ہوں گے'' کی ردیف و قافیہ میں ان کی ایک بڑی دلکش نظم نظر سے گذری تھی، کیا معلوم تھا کہ یہ شاعری اتنی جلد واقعہ کی شکل اختیار کرلے گی، علم و ادب کی محفلوں میں مدتوں ان کی یاد آتی رہے گی، اللہ تعالیٰ علم و ادب کے اس خادم کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے۔

(''م''، نومبر ۱۹۵۹ء)

<u>رشیدالدین، حاجی</u>

حاجی رشیدالدین

گذشتہ مہینہ اعظم گڑھ کی ایک پرانی یادگار حاجی رشیدالدین صاحب نے بھی وفات پائی، مرحوم ترجمان القرآن مولانا حمیدالدین فراہیؒ کے سگے اور مولانا شبلی مرحوم کے ماموں زاد بھائی تھے، دارالمصنفین سے ان کا تعلق بہت قدیم اور مخلصانہ تھا، اس کی مجلس انتظامیہ کے رکن بھی تھے، مولانا حمید الدین صاحب مرحوم کے بعد مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کو ان ہی نے سنبھالا تھا، اور عرصہ تک اس کے ناظم رہے، ادھر چند سال سے ضعف پیری کی وجہ سے اس خدمت سے سبکدوش ہوگئے تھے، طبعاً بڑے نیک سیرت، پاک دل اور مرنجاں مرنج تھے، مولانا شبلی کے اعزہ میں سب سے زیادہ سن رسیدہ اب وہی رہ گئے تھے، نوے سال کے قریب عمر تھی، ادھر کئی سال سے بالکل معذور ہوگئے تھے، ہوش و حواس نے بھی جواب دیدیا تھا، صرف رشتۂ حیات باقی تھا، افسوس کہ وہ بھی منقطع ہوگیا، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمتِ کاملہ سے نوازے۔

(''م''، نومبر ۱۹۵۹ء)

کاظمی، سید محمد احمد، مولوی

مولوی سید محمد احمد صاحب کاظمی

ابھی یہ سطریں زیر تحریر تھیں کہ مولوی سید محمد احمد صاحب کاظمی ایڈوکیٹ الہ آباد کے انتقال کی خبر ملی، مرحوم پرانے اور پکے کانگریسی تھے، ہر زمانہ میں اپنے مسلک پر قائم رہے، قوم پروری کے ساتھ دیندار بھی تھے، اور ان کے دل میں مذہب وملت کا بھی درد تھا، اور مسلمانوں کے بعض مفید کام انہوں نے انجام دیئے، پارلیمنٹ کے ممبر بھی رہے تھے، اور مسلمانوں کے نظام قضا کے متعلق ایک بل بھی پیش کیا تھا، لیکن پھر اس کے انجام کا پتہ نہ چلا، ایسے نیشنلسٹ اب مشکل سے ملیں گے، جو ملک و وطن اور مذہب و ملت کے حقوق میں توازن قائم رکھ سکیں، اللہ تعالیٰ مرحوم کی ملی خدمات کو قبول اور ان کی مغفرت فرمائے۔ (''م''، نومبر ۱۹۵۹ء)

سعید، احمد، مولانا

مولانا احمد سعید

افسوس ہے کہ مولانا احمد سعید صاحب صدر جمعیۃ علمائے ہند نے ۴؍ دسمبر کو انتقال فرمایا، مولانا مرحوم ان علمائے دین میں تھے جن کی پوری زندگی ملک وملت کی خدمت میں گزری۔ وہ جنگ آزادی کے نامور مجاہد تھے اور اس راہ میں بارہا قید وبند کی مصیبتیں جھیلیں، مولانا کفایت اللہ صاحب اور مولانا حسین احمد صاحب مرحوم کے بعد اس طبقہ کے علماء میں ایک مولانا احمد سعید ہی کی ذات رہ گئی تھی۔ وہ بھی ہم سے جدا ہوگئے۔

افسوس کز قبیلۂ مجنوں کسے نماند

دینی، ملی اور سیاسی خدمات کے ساتھ مولانا بڑے خوش بیان خطیب تھے، دلی کی ٹکسالی زبان بولتے تھے، باتیں کرتے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے، شرافت اور وضعداری میں بھی دلی کی پرانی تہذیب کا نمونہ تھے، طبعاً بڑے زندہ دل اور خوش مذاق تھے جس محفل میں بیٹھتے تھے اپنی باتوں سے پوری محفل کو مائل کر لیتے تھے۔ عرصہ ہوا ایک سیاسی مقدمہ کے سلسلہ میں ان کو کچھ دنوں اعظم گڑھ میں رہنا پڑا تھا۔ دارالمصنفین میں قیام تھا۔ اعظم گڑھ ہی کی عدالت سے ان کو سزا ہوئی اور یہیں کے جیل میں قید ہوئے، اس لیے مولانا کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اسی زمانہ سے ان کے حسن اخلاق اور پرلطف صحبت کا جو نقش قائم ہوا تھا وہ اب تک باقی ہے۔ مولانا اپنے دور کی آخری یادگار تھے۔ اس لیے ان کی وفات سے ایک دور کا خاتمہ ہوگیا، اللہ تعالیٰ اس خادم دین وملت کو اپنی بے پایاں رحمت ومغفرت سے سرفراز فرمائے۔

(''م''، دسمبر ۱۹۵۹ء)

عبداللطیف، مفتی

مفتی عبداللطیف

افسوس ہے کہ علمائے قدیم کی ایک اہم اور آخری یادگار مفتی عبداللطیف صاحب نے گزشتہ مہینہ انتقال فرمایا، مرحوم استاذ العلماء مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھ کے شاگرد مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ کے مرید اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے دور اول کے اساتذہ میں تھے، حضرت سید صاحب مرحوم نے ابتدائی کتابیں ان ہی سے پڑھی تھیں۔ پھر ندوہ سے اپنے خواجہ تاش مولانا محمد علی مونگیریؒ کے پاس مونگیر چلے گئے اور کچھ دنوں یہاں قیام کے بعد حجاز تشریف لے گئے اور کئی سال تک مدرسۂ صولتیہ مکہ معظّمہ میں درس وتدریس کی خدمت انجام دی، اسی زمانہ میں مصر وشام وعراق وغیرہ کی سیاحت کی، پھر حجاز سے واپس آکر مونگیر میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع کیا، جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد جب ان کے ہم درس مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی اس کے وائس چانسلر مقرر ہوئے تو انھوں نے مفتی صاحب کو اس کے شعبۂ دینیات میں لکچرر مقرر کیا اور آخر میں وہ اس کی صدارت کے عہدہ سے وظیفہ یاب ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ سے سبکدوشی کے بعد شروانی صاحب نے مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات میں ان کا تقرر کرایا۔ مگر چند ہی سال کے بعد ضعف پیری کی وجہ سے اس خدمت سے سبکدوش ہوگئے، اور علی گڑھ میں مستقل قیام فرمایا، مگر درس وتدریس کا سلسلہ آخر عمر تک جاری رہا۔

مفتی صاحب مرحوم ہندوستان کے مشہور اساتذہ میں تھے، دینی علوم پر ان کی نظر بڑی گہری اور وسیع تھی۔ ان کے تلامذہ کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے۔ جن میں مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم جیسے شاگرد بھی تھے۔ تالیف وتصنیف کا بھی مشغلہ رہتا تھا۔ چنانچہ ان کی کئی کتابیں تاریخ القرآن، سیرت امام ابوحنیفہ اور فقہ کے چند رسائل چھپ کر شائع ہو چکے ہیں، ان کی سب سے اہم تصنیف ''جامع ترمذی'' کی شرح ہے، جو مکمل ہو چکی ہے مگر ابھی اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی ہے، مفتی صاحب مرحوم اپنے دور کی آخری یادگار تھے۔ انتقال کے وقت نوے سال سے اوپر عمر تھی۔ اب شاید ہی ان کا کوئی ہمعصر زندہ ہو، اللہ تعالیٰ اس خادم علم ودین کی مغفرت اور ان کے مدارج بلند فرمائے۔

(''م''، جنوری ۱۹۶۰ء)

خان، حمید اللہ، نواب

نواب حمید اللہ خاں

گزشتہ مہینے نواب حمید اللہ خاں مرحوم کے انتقال کی خبر اس وقت ملی جب

شذرات کی کاپی جم چکی تھی، اس لیے معارف اس حادثہ پر اپنے تاثرات کا اظہار نہ کرسکا، نواب صاحب مرحوم اپنے اوصاف وخصوصیات میں دوسرے والیان ریاست سے بہت مختلف تھے، ان میں دین و دنیا کی بہت سی خوبیاں جمع تھی، فہم وفراست اور تدبیر وسیاست میں وہ ہندوستان کے ممتاز مدبروں میں تھے، اور ہر طبقہ میں بڑی، عزت ووقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، مذہبی اعتبار سے عملاً دیندار تھے، والیان ملک میں اس زمانہ میں وہ تنہا حافظ قرآن تھے، حج وزیارت کے شرف سے مشرف ہوئے تھے، ان کی تعلیم وتربیت عام شہزادوں کے برعکس بڑی سادگی سے ہوئی تھی اور انھوں نے بغیر کسی امتیاز کے علی گڑھ کالج میں عام طلبہ کی طرح تعلیم پائی تھی، جس کا اثر بعد میں ان کی زندگی پر رہا چنانچہ ان کے یہاں درباری آداب وتکلفات نہ تھے اور ہر شخص سے عام انسانوں کی طرح ملتے جلتے تھے۔

نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے اثر سے ریاست بھوپال میں اس زمانہ میں بھی مذہب کے بڑے اثرات تھے جس سے دین وملت کو بڑا فائدہ پہنچا مسلمانوں کا کوئی دینی وتعلیمی ادارہ اس ریاست کے فیض سے محروم نہ تھا، یہ وراثت نواب حمید اللہ خاں کے حصہ میں بھی آئی تھی بلکہ ان کی صحیح تعلیم وتربیت نے ان خیالات میں اور زیادہ جلا پیدا کردی تھی، اور انھوں نے اپنے دور حکومت میں بہت سی اصلاحات کیں، وہ ایک عرصہ تک مسلم یونیورسٹی کے چانسلر بھی رہے تھے، دارالمصنفین بھی ریاست بھوپال کے ابرکرم کا ممنون تھا، بلکہ اس کا قیام ہی نواب سلطان جہاں بیگم مرحومہ کی فیاضی سے عمل میں آیا تھا، اس ریاست کے خاتمہ سے ایک بڑے خیر کا خاتمہ ہوگیا، افسوس ہے کہ نواب حمید اللہ خاں کی وفات سے اس کی آخری یادگار بھی مٹ گئی، والبقاء للہ وحدہ۔ ان کی وفات کے جو حالات اخبارات میں آئے ہیں وہ ان کے حسن خاتمہ کی دلیل ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے اعمال حسنہ کے طفیل میں ان کو عالم آخرت کی سربلندی سے بھی سرفراز فرمائے۔ (''م''، مارچ ۱۹۶۰ء)

جگر مرادآبادی

جناب جگر مرادآبادی

افسوس ہے کہ بزم شاعری کی وہ شمع جو ایک عرصہ سے جھلملا رہی تھی، بالآخر خاموش ہوگئی، جناب جگر مرادآبادی نے ۹ر ستمبر کو گونڈہ میں انتقال کیا، وہ صحیح معنوں میں اس دور کے رئیس المتغزلین تھے، غزل مدتوں سے جسم بے جان ہورہی تھی، سب سے پہلے حسرت کی مسیحائی نے اس میں جان ڈالی پھر فانی، اصغر اور جگر نے اس کو سنوارا، یہ چاروں غزل کے ارکان اربعہ تھے، لیکن جگر نے اس کا رنگ ایسا نکھارا کہ ان کا طرز تغزل غزل گوئی کا معیار قرار پایا، انھوں نے تغزل کو اس درجہ تک پہنچادیا ہے کہ مستقبل قریب میں ان کے جیسا غزل گو پیدا ہونے کی امید نہیں، ان کا طرز اس قدر مقبول ہوا کہ نئے شعراء کی پوری نسل اس سے متاثر ہوئی اور نہ صرف تغزل بلکہ جگر کے ترنم، وضع قطع حتی کہ شاعرانہ لاابالی پن کی بھی تقلید کی جانے لگی اردو شاعری کی تاریخ میں کسی شاعر کو اپنی زندگی میں شائد ہی اتنی مقبولیت حاصل ہوئی ہو اور اس کا اتنا ہمہ گیر اثر پڑا ہو۔

اخلاقی حیثیت سے بھی جگر اتنے شریف، وضعدار، بلند نظر اور عالی ظرف انسان تھے کہ اس دور کے شاعروں میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے، اعظم گڑھ اور دارالمصنفین سے ان کا تعلق بہت قدیم تھا، ان کا تعارف یہیں سے ہوا اور ان کی شہرت نے یہیں سے پر پرواز نکالے آج سے پینتیس سال پہلے جب وہ چشمہ کے تاجر کی حیثیت سے اعظم گڑھ آتے تھے اس وقت مرزا احسان احمد صاحب نے ۱۹۱۹ء میں مخزن میں پہلی مرتبہ ان کا تعارف کرایا، پھر ۱۹۲۱ء میں ان کا پہلا دیوان ''داغ جگر'' اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا، یہ مجموعہ معارف پریس میں چھپا تھا، اسی زمانہ سے ان کی غزلیں معارف میں شائع ہونے لگیں، ان کے دوسرے دیوان ''شعلۂ طور'' پر حضرت سید صاحبؒ نے تعارف لکھا اور معارف میں اس پر مفصل تبصرہ لکھا گیا، جگر نے ان تعلقات کا ہمیشہ لحاظ رکھا، اپنی شہرت کے شباب کے زمانہ میں جب اعظم گڑھ آتے تو مرزا احسان احمد صاحب ہی کے یہاں ٹھہرتے اور دارالمصنفین ضرور آتے اور اکثر بغیر فرمائش کے بھی اپنا کلام سناتے اور کہتے یہاں سنانے میں جی لگتا ہے۔

ایک زمانہ تک جگر ایسے رند بلانوش رہے کہ ان کو اپنا ہوش بھی نہیں رہتا تھا، لیکن ان کا دل ہمیشہ مومن رہا اور ہر زمانہ میں وہ راسخ العقیدہ مسلمان رہے، بزرگوں کی صحبت بھی پائی تھی، حضرت شاہ عبدالغنی صاحب بنگلوری سے بیعت تھے، اصغر صاحب کی صحبت سے ان کو زیادہ فائدہ پہنچا، ادھر چند برسوں سے عملاً بھی دیندار ہوگئے تھے، شراب مطلق ترک کردی تھی، فرائض کے پابند تھے، حج وزیارت کے شرف سے بھی مشرف ہوئے۔ چہرہ پر شرعی نورانی داڑھی بھی تھی، اس لئے عملی اعتبار سے بھی ان کی زندگی کا آخری دور بہت اچھا گزرا اور اس پر جمعہ کے مبارک دن صبح صادق کے وقت ان کا خاتمہ ہوا، جو انشاء اللہ ان کے حسن خاتمہ کی دلیل ہے، اللّٰھُم اغفرلہٗ وَارْحَمہٗ۔ (''م''، اکتوبر ۱۹۶۰ء)

عبدالمجید، مولوی

مولوی عبدالمجید صاحب

افسوس ہے کہ گذشتہ ۲۰ر دسمبر کو مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے بڑے بھائی مولوی عبدالمجید صاحب رٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر نے انتقال کیا، مرحوم بڑے دیندار اور بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے، گو دارالمصنفین سے ان کا کوئی قانونی تعلق نہ تھا لیکن اس

کے بڑے مخلص اور پرانے قدر دانوں میں تھے، اس کے کارکنوں سے دوستانہ اور عزیزانہ تعلق رکھتے تھے، مرحوم کو قومی کاموں سے بھی دلچسپی تھی اور مختلف اوقات میں وہ لکھنؤ کے مختلف قومی و تعلیمی اداروں کی اعزازی خدمت انجام دیتے رہے، طبعاً بڑے شریف اور وضعدار تھے، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے۔

(''م''، جنوری ۱۹۶۱ء)

ردولوی، مصطفیٰ احمد، شاہ

شاہ مصطفیٰ احمد ردولوی

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینہ ایک بڑی محترم شخصیت شاہ مصطفیٰ احمد صاحب ردولوی نے انتقال کیا۔ گو ان کو پبلک میں کوئی شہرت حاصل نہیں تھی، لیکن ان کی زندگی مسلمانوں کے لیے نمونہ تھی۔ وہ حضرت مخدوم احمد عبدالحق ردولوی قدس سرہ کی اولاد میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو دین و دنیا دونوں سے نوازا تھا۔ وہ علی گڑھ کالج کے پرانے تعلیم یافتہ تھے۔ اکاؤنٹسی کی تعلیم کے سلسلہ میں ان کا قیام لندن میں بھی رہا تھا، مگر بڑے راسخ العقیدہ اور دیندار مسلمان تھے، تہجد کی نماز تک کبھی ناغہ نہ ہوئی، لندن کے قیام کے زمانہ میں بھی روزے نماز کی پابندی میں فرق نہیں آیا، اس زمانہ میں جب تک ذبیحہ کے متعلق پورا اطمینان نہ ہوجاتا تھا گوشت نہ کھاتے تھے، سبزی اور انڈے پر قناعت کرتے تھے، پہلی جنگ عظیم چھڑنے کے بعد ایمڈن جہاز سے واپس آرہے تھے جس کو جرمنی نے تارپیڈو کردیا تھا، اس کے جو مسافر بچ گئے تھے، ان میں ایک شاہ صاحب بھی تھے، انھوں نے کل سامان چھوڑ کر صرف کلام مجید ساتھ لے لیا تھا۔

انھوں نے معمولی حیثیت سے ترقی کی اور بڑی دولت پیدا کی اور اسی فیاضی سے اس کو مذہبی و ملی کاموں اور غرباء و مساکین پر صرف کیا، ان کے در سے کوئی مستحق واپس نہ جاتا تھا، اہم کاموں کے لئے بڑی رقمیں دے دیتے تھے، خواجہ کمال الدین مرحوم کو کلام مجید کے جرمن ترجمے کے لیے دس ہزار روپے دیئے تھے، تحریک خلافت کے زمانہ میں خلافت کمیٹی اور اس کے لیڈروں کی بھی مدد کرتے رہتے تھے، اس زمانہ میں ترکوں کی مدد کے لیے ہندوستان میں جو انگورہ لیجن قائم ہوا تھا، اس کے پرجوش رکن تھے، مسلم یونیورسٹی سے پرانا تعلق تھا، کئی سال تک مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر رہے تھے۔ اس کے علاوہ اور ہر قسم کے دنیاوی اعزاز سے انھوں نے ہمیشہ دامن بچایا، بہت سے غریب گھرانے ان کی ذات سے پرورش پاتے تھے مگر خود ان کی زندگی بڑی سادہ اور دوسروں کے لیے نمونہ تھی، آج کل کے پیرزادوں میں ایسی مثالیں مشکل سے ملیں گی، اللہ تعالیٰ ان کو عالم آخری کی سربلندی سے بھی سرفراز فرمائے۔

(''م''، فروری ۱۹۶۱ء)

عبدالعلی، سید، ڈاکٹر

ڈاکٹر سید عبدالعلی

افسوس ہے کہ آج قلم کو ایک ایسی برگزیدہ شخصیت کا ماتم کرنا پڑ رہا ہے جو تنہا ایک شخص کا نہیں بلکہ علم و عمل کا ماتم ہے، دین و تقویٰ کا ماتم ہے، اخلاق و شرافت کا ماتم ہے، اس شخصیت کو دنیا ڈاکٹر سید عبدالعلی ناظمِ ندوۃ العلماء کے نام سے جانتی ہے، وہ تنہا ڈاکٹر یا ندوۃ العلماء کے ناظم نہ تھے، بلکہ اس زمانہ میں اپنے اوصاف، خصوصیات اور دینی و اخلاقی کمالات میں یگانہ تھے، ان کا نسبی تعلق مشہور عارف باللہ حضرت سید شاہ علم اللہ رحمۃ اللہ علیہ رائے بریلوی کے خاندان سے تھا جس میں علم و عمل، دین و تقویٰ، فقر و تصوف اور ارشاد و ہدایت کی روایات صدیوں سے چلی آرہی تھیں، حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اسی دودمانِ عالی کے گوہر شب چراغ تھے۔

خاندان کی یہ ساری روایات ڈاکٹر صاحب مرحوم کے حصہ میں آئی تھیں، ان کے والد بزرگوار مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانہ کے مشہور عالم، نامور طبیب، اہل قلم فاضل اور صاحب زہد و تقویٰ بزرگ تھے، ڈاکٹر عبدالعلی صاحب ان کے خلف الصدق تھے، ان کی ذات قدیم و جدید تعلیم کا سنگم تھی، انھوں نے پہلے عربی اور طب کی تحصیل کی، اس کے بعد انگریزی پڑھی اور ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی، یہ وہ زمانہ تھا جب ڈاکٹروں کی زندگی مغرب زدگی اور انگریزی طرز معاشرت کا نمونہ ہوتی تھی، مگر ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کی فطرت ایسی صالح و سلیم تھی اور ان کی رگوں میں ایسے بزرگوں کا خون تھا کہ جدید تعلیم کے مادی اثرات سے ان کا دامن بالکل پاک رہا، حتیٰ کہ ان کی ظاہری وضع قطع بھی خالص اسلامی رہی ناواقف لوگ ان کو دیکھ کر گمان نہیں کرسکتے تھے کہ ان کو جدید تعلیم یا ڈاکٹری کے پیشے سے کوئی تعلق ہے ان کے مریض ان کی ڈاکٹری سے زیادہ ان کی بزرگی کے قائل تھے۔

ان کے باطنی محاسن کا پلہ ظاہری محاسن سے بھی بھاری تھا، وہ لکھنؤ کے بڑے مشہور و مقبول ڈاکٹر تھے، مگر دولت دنیا کی ان کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں تھی اور انہوں نے حصول دولت کی کبھی فکر نہیں کی اور جو کچھ بھی کمایا سب مستحقین پر خرچ کردیا، اگر وہ چاہتے تو شہری زندگی اور جدید طرز معاشرت کے سارے لوازم آسانی سے مہیا کرسکتے تھے، مگر انہوں نے اس کی جانب کبھی توجہ نہیں کی، ان کی زندگی بڑی سادہ تھی، حتیٰ کہ لکھنؤ میں رہ کر مکان نہیں بنوایا اور سواری تک نہیں رکھی اور پوری زندگی پرانے طرز کے کرایہ کے مکان میں گذار دی، وہ صحیح معنوں میں زاہد اور مرد مومن تھے، ان کی فطرت اسقدر معصوم اور پاکیزہ تھی کہ اس کا نور ان کے چہرے پر جھلکتا تھا، اور دیکھنے والے کو ان کے چہرے سے ان کی پاکیزگی کا یقین ہوجاتا تھا، ان کو دنیاوی فہم و فراست سے

بھی وافر حصہ ملا تھا، انھوں نے ندوے کو جن نازک حالات سے نکال کر جس بام عروج پر پہنچایا وہ ان کے تدبر اور ہوشمندی کا ثبوت ہے۔

ان کی دینی تعلیم و تربیت کا سب سے بڑا اور مثالی نمونہ مولانا سید ابوالحسن علی سلمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، ان کی تربیت تمام تر انہی کے دامن شفقت میں ہوئی، اس لئے ان کے محاسن و کمالات میں ان کی ذاتی صلاحیت اور فطری سعادت کے علاوہ ان کے برادر بزرگ کی تربیت کو بھی بڑا دخل ہے ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنے اکلوتے لڑکے اور اپنی لڑکیوں کو بھی خالص دینی تعلیم دی جس کا اس زمانہ میں کوئی ڈاکٹر تصور بھی نہیں کرسکتا، مرحوم کو دینی کاموں سے بڑا شغف تھا، قومی و ملی کاموں میں بھی عملی مگر خاموش حصہ لیتے تھے، دارالعلوم ندوۃ کے تو روح رواں تھے، اور آخر دم تک اس کی خدمت کرتے رہے، یہ انہی دونوں بھائیوں کے اخلاص اور حسن نیت کا نتیجہ ہے کہ دارالعلوم نے ان کی نظامت اور معتمدی کے زمانہ میں جس قدر ترقی اور جو شہرت و مقبولیت حاصل کی وہ اس کی تاریخ کے کسی دور میں حاصل نہیں ہوئی تھی، غرض ڈاکٹر صاحب کی ذات ہر حیثیت سے ایمان و عمل کا ایک مثالی نمونہ تھی، اللہ تعالیٰ اس مرد مومن کی مغفرت اور مدارج عالیہ عطا فرمائے۔ اللھم اغفرلہ و ارحمہ و صبب علیہ شأبیب رحمتک و رضوانک یا ارحم الراحمین۔

(''م''، مئی ۱۹۶۱ء)

امجد حیدرآبادی، احمد حسین، سید

سید احمد حسین امجد حیدرآبادی

افسوس ہے کہ حکیم الشعراء سید احمد حسین امجد حیدرآبادی نے بھی اس جہاں فانی کو الوداع کہا، ان کی وفات محض دنیائے شاعری کا نہیں بلکہ دنیائے دل کا حادثہ ہے، وہ تنہا شاعر ہی نہیں اس سے زیادہ حکیم و عارف اور صاحب دل صوفی تھے، اردو کے نامور شاعروں سے آج بھی ہندوستان خالی نہیں، مگر امجد اپنے رنگ میں یگانہ تھے، ان کے کلام میں طور کی تجلی اور وادی یمن کے شراروں کا عکس ہے، خصوصاً رباعی گوئی میں اس زمانہ میں ان کا جواب نہ تھا، ان کی رباعیات حکمت و بصیرت کا دفتر ہیں، وہ صحیح معنوں میں اس دور کے سرمد اور ابوسعید ابوالخیر تھے، ان کی ذات بظاہر عارفانہ شاعری کا خاتمہ نظر آتا ہے۔

انھوں نے فطرۃً بھی حکیمانہ نظر اور درد آشنا دل پایا تھا، اور ان کو حوادث بھی ایسے پیش آئے جنھوں نے ان کو سراپا سوز اور حقیقت نگر بنا دیا، وہ نثر بھی سادہ سلیس، بے تکلف، اور مؤثر و دلنشین لکھتے تھے، چھوٹے چھوٹے سادہ بلیغ فقروں میں بڑی حکیمانہ اور سبق آموز باتیں کہہ جاتے تھے، ان کی نظم و نثر کی تصانیف کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہوگی، دارالمصنفین سے ان کے دیرینہ تعلقات تھے، حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کے اور ان کے کلام کے بڑے قدر دان تھے، حکیم الشعراء کا لقب ان کو انہی نے دیا تھا، ایک مرتبہ امجد مرحوم دارالمصنفین بھی آئے تھے، ان کی سادہ مگر پر تاثیر شخصیت اب تک نگاہ میں ہے ایک زمانہ میں ان کا کلام معارف میں بکثرت چھپتا تھا، مگر ادھر عرصہ سے ان چیزوں سے اس قدر مستغنی اور بے نیاز ہوگئے تھے کہ اپنا کلام رسالوں میں بھیجنا چھوڑ دیا تھا، افسوس ہے کہ شاخِ طوبیٰ کا یہ بلبلِ خوشنوا ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا، اللھم اغفرلہٗ وَارْحمہٗ۔ (''م''، جون ۱۹۶۱ء)

علی، سید نواب، پروفیسر

پروفیسر سید نواب علی

ہماری پرانی علمی شخصیتیں ایک ایک کرکے اٹھتی جاتی ہیں، اور ان کا بدل نظر نہیں آتا، جون کی آخری تاریخوں میں مشہور اہل قلم اور نامور فاضل پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم اے نے انتقال کیا، ان کا اصل وطن نیوتنی ضلع اوناؤ تھا، لیکن ملازمت کے سلسلے میں ان کا قیام زیادہ تر گجرات میں رہا، وہاں وہ مختلف بڑے بڑے تعلیمی عہدوں پر ممتاز رہے، سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد ریاست جونا گڑھ کے وزیر تعلیم ہوگئے تھے، اس سے سبکدوش ہونے کے بعد وطن لوٹ آئے تھے، پھر قیام پاکستان کے بعد کراچی چلے گئے اور وہیں گذشتہ ۳۰/جون کو وفات پائی۔

مرحوم، حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہمعصر تھے، ان کی طالب علمی کا زمانہ لکھنؤ میں گزرا تھا، اس زمانہ میں وہ مولانا شبلی کی صحبت سے مستفید ہوئے، اس لیے دارالمصنفین اور اس کے کارکنوں سے ان کے تعلقات بہت قدیم تھے، اور وہ اس کے ابتدائی ارکان میں تھے، جدید علوم کے ساتھ عربی سے بھی واقف تھے اور اسلامی علوم پر بھی ان کی نظر تھی، ان کا علمی ذوق بہت بلند تھا۔ وہ متعدد بلند پایہ کتابوں کے مصنف تھے، اور اپنی تصانیف کے ذریعہ انھوں نے دین کی بڑی خدمت انجام دی، ان کی تصانیف کی تعداد ایک درجن کے قریب ہوگی ان میں ''سیرۃ الرسول'' اور ''تاریخ صحف سماوی'' اور ''معارج الدین'' زیادہ اہم ہیں، اب ایسے محقق فاضل مسلمانوں میں مشکل سے پیدا ہوں گے۔ (''م''، اگست ۱۹۶۱ء)

خان، ظفر حسین، خان بہادر

خان بہادر ظفر حسین خاں

دوسرا حادثہ بہادر ظفر حسین خاں کی وفات کا ہے، وہ بھی اس علمی بزم کی یادگار تھے، اس لیے ان کے تعلقات بھی دارالمصنفین سے دیرینہ تھے، وہ انسپکٹر آف اسکولس

کے عہدہ پر ممتاز تھے، اس سے ریٹائر ہونے کے بعد کچھ دنوں تک شیعہ کالج کے پرنسپل رہے، ادھر عرصہ سے عزلت نشینی کی زندگی بسر کر رہے تھے، مگر تالیف وتصنیف کا سلسلہ آخر تک جاری رہا، ان کا خاص موضوع فلسفہ تھا اور اس کی تاریخ پر ان کی نظر بہت وسیع تھی، اس موضوع پر ان کی کئی تصانیف ہیں، ان کی ایک تصنیف مقالہ روسو عرصہ ہوا اور دوسری مال و مشیت ابھی چند سال ہوئے دارالمصنفین سے شائع ہوئی تھی، آخرالذکر کتاب پر ان کو ساہتیہ اکیڈمی سے پانچ ہزار انعام ملا تھا، انجمن ترقی اردو ہند سے بھی ان کی بعض فلسفیانہ تصانیف شائع ہوئیں، اللہ تعالیٰ دونوں خدام علم کو مغفرت فرمائے۔

(”م“، اگست ۱۹۶۱ء)

عبدالحق، مولوی، بابائے اردو

بابائے اردو مولوی عبدالحق

بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کی وفات دنیائے اردو کا سب سے بڑا حادثہ ہے، علمی و ادبی حیثیت سے اردو کے خدمت گذاروں کی کمی نہیں ہے، لیکن جس نے ہر پہلو سے اس کی خدمت کی اور اس کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کردی اور اس کی راہ میں اپنا تن من دھن سب نثار کردیا، وہ تنہا مولوی عبدالحق کی ذات تھی، مولوی صاحب مرحوم سے پہلے اردو کی خدمت کا دائرہ محض اردو کی انفرادی علمی و ادبی تصانیف تک محدود تھا، اجتماعی کوشش اور تاریخی لسانی اور سیاسی حیثیت سے اس کی خدمت کی صرف بنیاد پڑی تھی، مولوی صاحب نے اس کا عظیم الشان قصر تعمیر کردیا، اور اردو کی خدمت کی ایک عام لگن پیدا کردی، ان کی خدمات اردو کی تاریخ میں ناقابل فراموش ہیں، اور جب تک اردو زبان باقی ہے ان کا نام بھی زندہ و پائندہ رہے گا۔

ان سے پہلے انجمن ترقی اردو کا کوئی وجود نہ تھا، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک شعبہ اردو کی خدمات بھی تھا، وہ بھی برائے نام اس کی کوئی عملی حیثیت نہ تھی، ۱۹۱۲ء میں جب مولوی صاحب اس شعبہ کے سکریٹری مقرر ہوئے تو اس ”نام“ کو اپنے ساتھ اورنگ آباد لے گئے اور اپنی ان تھک کوششوں سے چند دنوں میں اس کو ایک آل انڈیا ادارہ انجمن ترقی اردو بنا دیا، اس نے اردو زبان کی جو گوناگوں خدمات انجام دیں ہیں، ان سے ہر صاحب علم واقف ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر انجمن ترقی اردو نہ ہوتی تو اردو کو علمی زبان بننے میں بڑی دیر لگتی۔

مولوی صاحب کو اردو سے والہانہ عشق تھا، انہوں نے اس کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا، ان کو سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، اسی کی دھن رہتی تھی، اور ان کو اردو کی خدمت کے جو موقع بھی ملے ان سے انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا، اردو کی پہلی یونیورسٹی مرحوم جامعہ عثمانیہ کی تشکیل میں بھی ان کا ہاتھ تھا، پھر اس کے شعبۂ تالیف و تراجم کے سکریٹری اور آخر میں جامعہ عثمانیہ کے شعبہ اردو کے صدر مقرر ہوئے اور ان سب میں انہوں نے اردو کی خدمت اور ترقی کی نئی نئی راہیں پیدا کیں، جامعہ عثمانیہ سے ریٹائر ہونے کے کچھ دنوں بعد انجمن ترقی اردو کو دہلی لے آئے یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کی آئندہ مشترک زبان کی بحث چھڑ چکی تھی، مولوی صاحب اردو کے لیے سینہ سپر ہوگئے، اور بالآخر ہندوستانی زبان پر سمجھوتا ہوا، جو عبدالحق راجندر پیکٹ کے نام سے موسوم ہے، اور جس کو ہندوستان کی آزادی کے بعد طاقِ نسیاں کے حوالہ کردیا گیا۔

ہندوستان کی تقسیم کے بعد مولوی صاحب کو ان کے حوصلہ کے مطابق ہندوستان میں اردو کی خدمت کا میدان تنگ نظر آیا، اس لئے پاکستان چلے گئے، اور وہاں نئے سرے سے انجمن ترقی اردو کا ٹھاٹھ قائم کیا، اور اسی شان سے رسالہ اردو نکالا، گو دستوری حیثیت سے پاکستان کی زبان اردو ہے، لیکن وہاں بھی بڑے پیچیدہ لسانی مسائل ہیں، اس لئے پاکستان میں بھی ان کو اردو کے لئے جنگ کرنا پڑی، اور آخر تک لڑتے رہے، اردو کے مسئلہ میں پاکستان میں جو کامیابی بھی ہوئی، اس میں دوسرے حامیانِ اردو کی تائید وحمایت کے ساتھ مولوی صاحب کی کوششوں کو بھی بڑا دخل ہے، ان کے پیش نظر ایک اردو یونیورسٹی کا قیام بھی تھا، اس میں تو وہ اپنی زندگی میں کامیاب نہ ہوسکے، لیکن ایک اردو کالج قائم کردیا، جو ان کی آخری آرام گاہ بنا۔

خالص علمی و ادبی حیثیت سے بھی ان کی خدمات بڑی گرانقدر رہیں، اردو کی تاریخ کی طرف سب سے پہلے انہی نے توجہ کی اور اس کی کڑیاں فراہم کیں، دکنی نوادر کا سراغ لگایا اور ان کی اہمیت واضح کی، اردو شعرا کے دواوین اور قدیم تذکروں کو تصحیح تحشیہ اور مبسوط مقدمات کے ساتھ شائع کیا، بہت سی کتابوں پر مقدمے لکھے جو افادی پہلو سے مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ صاحب طرز ادیب تھے، ان کی تحریر سادگی و سلاست میں سہل ممتنع کی حیثیت رکھتی ہے، اور سادگی کے باوجود خوشگوار ادبی چاشنی سے خالی نہیں ہوتی، ان کے ادبی مضامین، تحریر کی سادگی و پرکاری کا نمونہ ہیں، غرض انھوں نے اردو کی خدمت کا کوئی پہلو اور کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، اب اردو کے ایسے باعمل فدائی نہ پیدا ہوں گے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

(”م“، ستمبر ۱۹۶۱ء)

بخاری، سید عطاء اللہ شاہ، مولانا

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری

دوسرا حادثہ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات حسرت آیات کا ہے، مولانا مرحوم جنگ آزادی کے ممتاز مجاہد اور احرار کے نامور لیڈر تھے، تحریک خلافت کے زمانہ سے لے کر ہندوستان کی آزادی تک ملک و ملت کے ہر معرکہ میں ان کے کارنامے

نمایاں ہیں، اس راہ میں انہوں نے برسوں قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں وہ ایک سحر بیان خطیب تھے، اپنی کی تقریر سے سامعین کو ایسا مسحور کر دیتے تھے کہ جدھر چاہتے ان کی باگ موڑ دیتے، وہ گھنٹوں تقریر کرتے تھے، اور سامعین ہمہ تن گوش بنے رہتے تھے، دین وتقویٰ میں بھی ان کا پایہ بلند تھا، ان کی زندگی درویشانہ تھی، ہندوستان کی تقسیم کے بعد اپنے وطن امرتسر سے اجڑ کر ملتان چلے گئے، اور بالآخر اسی کی خاک کا پیوند ہوئے، اس کا افسوس ہے کہ آزادی کے بعد اس مردمجاہد کی خدمات اور ایثار وقربانی کی کوئی قدر نہ ہوئی، اوراس کی زندگی کا آخری دور عسرت وگمنامی میں بسر ہوا، مگر انہوں نے قلندرانہ شان کے ساتھ اس کو گذار دیا، اللہ عالمِ آخرت میں اس مردمجاہد کو اپنے انعامات سے سرفراز فرمائے۔ (''م''، ستمبر ۱۹۶۱ء)

حفیظ سید، ڈاکٹر

ڈاکٹر حفیظ سید مرحوم

افسوس ہے کہ ہماری علمی بزم کی ایک پرانی یادگار ڈاکٹر حفیظ سید مرحوم نے گزشتہ مہینہ انتقال کیا ان کی پوری زندگی تعلیمی اور علمی مشاغل میں گزری اور آخر میں الٰہ آباد یونیورسٹی کی اردو کی پروفیسری سے ریٹائرڈ ہوئے تھے، وہ مشہور صاحب قلم تھے اردو، انگریزی دونوں زبانوں میں سیکڑوں مضامین، ان کی یادگار ہیں مستقل کتابوں میں مشہور دکنی شاعر قاضی محمود بحری کا کلیات تصحیح وترتیب کے جملہ لوازم کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا تھا، ان کو تصوف اور روحانیات سے خاص دلچسپی تھی، اس ذوق میں انھوں نے مختلف مذاہب کے روحانی مرکزوں اور ان کی روحانی شخصیتوں سے بھی استفادہ کیا تھا مگر آخر میں اپنے اصلی مرکز کی طرف لوٹ آئے تھے اور اسی پر ان کا خاتمہ ہوا، مرحوم علامہ شبلی کے صحبت یافتہ اور ارکان دارالمصنفین کے پرانے رفقاء میں تھے، اس لیے دارالمصنفین سے ان کو دیرینہ مخلصانہ تعلق تھا، اس کی مجلس عاملہ اور مجلس انتظامیہ کے رکن بھی تھے، ادھر کئی سال سے فالج میں مبتلا تھے، گذشتہ مہینہ آنکھ کھلوانے کے لیے سیتاپور گئے تھے، وہیں دفعتہً انتقال کیا اور الٰہ آباد میں تجہیز وتکفین ہوئی۔ اللھم اغفرلہٗ وَ ارْحمہٗ۔ (''م''، جنوری ۱۹۶۲ء)

قریشی، شعیب

شعیب قریشی

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینہ متحدہ ہندوستان کی ایک اہم شخصیت شعیب قریشی صاحب نے کراچی میں انتقال کیا وہ ہندوستان کے ممتاز رہنماؤں میں تھے، ان کی عمر کا بڑا حصہ ملک وملت کی خدمت میں گزرا ان کی قومی زندگی کا آغاز مشہور انگریزی اخبار ''نیو ایرا'' کی مضمون نگاری سے ہوا تھا، جس کے وہ بعد میں ایڈیٹر بھی ہو گئے تھے، پھر ۱۹۱۴ء میں جنگ بلقان کے زمانہ میں مشہور انصاری مشن کے ساتھ ٹرکی گئے، ۱۹۲۰ء میں جب وفد خلافت لندن گیا تھا تو وہ وہاں زیر تعلیم تھے، اس لیے وفد کی کاروایوں میں عملی حصہ لیا، اسی زمانہ میں خلافت اور کانگریس کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ لندن کی واپسی کے بعد ان میں سرگرمی سے حصہ لیا، ایک عرصہ تک خلافت کمیٹی کے سکریٹری بھی رہے، اور کچھ دونوں گاندھی جی کی غیر حاضری میں ان کے اخبار ''ینگ انڈیا'' کے بھی ایڈیٹر رہے، حجاز پر سلطان عبدالعزیز آل سعود کے قبضہ کے بعد وہاں کے حالات کی تحقیقات اور اس کے آئندہ نظام حکومت کے بارے میں مشورہ دینے کے لیئے خلافت کمیٹی کی جانب سے جو وفد گیا تھا اس کے ایک رکن شعیب قریشی بھی تھے، پھر نہرو کمیٹی میں مسلمانوں کی نمائندگی کی، مگر اس کی رپورٹ سے انھوں نے اختلافات کیا اور سیاسی زندگی سے کنارہ کش ہوکر ریاست بھوپال میں وزیر تعلیم ہوگئے، اپنے دورِ وزارت میں انھوں نے بہت سے مفید تعلیمی اور مذہبی کام انجام دیئے، ریاست بھوپال کے خاتمہ کے بعد پاکستان چلے گئے، اور مختلف اوقات میں مرکزی حکومت کی وزارت اور سفارت کے عہدوں پر ممتاز رہے، علمی قابلیت اور سیاسی بصیرت کے ساتھ اخلاقی حیثیت سے بھی بہت بلند اور پختہ کیرکٹر کے انسان تھے، ادھر چند سال سے انکا ذکر سننے میں نہیں آتا تھا، ایک دن دفعتہً ان کے انتقال کی خبر سنی، ان کی ذات سے ملک وملت کو بڑے فوائد پہنچے، اللہ تعالیٰ اس خادم قوم کو اپنی رحمت ومغفرت سے سرفراز فرمائے۔

(''م''، مارچ ۱۹۶۲ء)

عبدالشکور، مولانا

مولانا عبدالشکور

ہمارے پرانے نامور علماء ایک ایک کرکے، اٹھتے جاتے ہیں، افسوس ہے کہ ان کی آخری یادگار مولانا عبدالشکور صاحب نے بھی سفر آخرت اختیار کیا، مولانا کی ذات جامع کمالات اور اس دور میں سلف صالحین کا نمونہ تھی، علم وعمل اور دین وتقویٰ میں ان کا درجہ بہت بلند تھا، تعلیم وتدریس، تالیف وتصنیف، وعظ وتبلیغ، ارشاد وہدایت ہر راہ میں ان کے نمایاں کارنامے ہیں، تقریباً نصف صدی تک ان کا فیض جاری رہا، اور ان کے ذریعہ بہتوں کو ہدایت حاصل ہوئی، ایک زمانہ میں پورے ہندوستان میں ان کے کارناموں کی شہرت تھی، مگر ادھر پچیس تیس سال سے انھوں نے خاموشی اور گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کر لی تھی، اور موتوا قبل ان تموتوا کی عملی تفسیر بن گئے تھے، اب ایسے ربانی علماء کا پیدا ہونا مشکل ہے، اللہ تعالیٰ ان کے خدمات کو قبول اور ان کے مدارج بلند فرمائے۔ (''م''، جنوری ۱۹۶۲ء)

حفظ الرحمٰن، مولانا، مجاہد ملت

مجاہد ملّت مولانا حفظ الرحمٰن

(جمعیۃ علمائے ہند کی آخری شمع بجھ گئی)

جس حادثہ کا دھڑکا عرصہ سے لگا ہوا تھا، بالآخر وہ پیش آہی گیا، اور مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ۲/اگست ۱۹۶۲ء کو صبح صادق کے وقت اپنے رب کے حضور میں حاضر ہوگئے، موت کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں، ہر وقت اس کا بازار گرم ہے، روزانہ ہزاروں لاکھوں انسان مرتے رہتے ہیں، مگر کسی کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا، لیکن بعض موتیں وہ ہوتی ہیں جن سے ایک قوم اور ایک ملت کی پوری عمارت متزلزل ہوجاتی ہے، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی وفات بھی انہی میں سے ہے:

فما كان قيس هلكه هلك واحد ولكنه بنيان قوم تهدما

ان کی موت سے ہماری قومی و ملی عمارت کا بہت بڑا ستون گر گیا، مولانا کی پوری زندگی اور زندگی کا ہر لمحہ ملک و ملت کی خدمت میں گذرا حتیٰ کہ مرض الموت میں بھی اس سے غافل نہ رہے اور اپنی ان تھک محنت سے اس راہ میں جان تک دیدی، اس لیے اگر زندگی میں وہ مجاہد ملت تھے تو موت کے بعد شہید ملت ہیں۔

ان کی پوری زندگی ایک سعی پیہم اور جہد مسلسل تھی، جس سے ان کو ہندوستان کی آزادی کے بعد بھی نجات نہیں ملی، آزادی نے جنگ آزادی سے بھی زیادہ مشکل اور پیچیدہ مسائل پیدا کردیے تھے، ایک طرف فرقہ پروری کا سیلاب تھا جو آزادی کے اصل مقصد ہی کو خس وخاشاک کی طرح بہائے لیے جارہا تھا، دوسری طرف مسلمانوں کے سنگین مسائل تھے، تیسری جانب ملکی و وطنی مصالح اور صحیح جمہوری اور سیکولر بنیادوں پر آزاد ہندوستان کی تعمیر تھی، اس بحرانی دور میں ان سب سے عہدہ برآ ہونا آسان نہ تھا، فرقہ پروری نے بڑے بڑے قوم پروروں کے قدم اکھاڑ دیے تھے، مگر اس وقت بھی مولانا صحیح قومی اصولوں پر قائم رہے، اور ان سارے فرائض کو اس خوش اسلوبی سے ادا کرتے رہے کہ ان کا کوئی مخالف بھی حرف گیری نہیں کرسکتا۔

مسلمانوں کی اس بیکسی کے دور میں مولانا کی ذات بہت بڑا سہارا تھی، اور اس راہ میں ان کے کارنامے بے نظیر ہیں، ان کے بعد کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی جو مسلمانوں کی مظلومیت اور حق تلفی پر اس جرأت و بے باکی کے ساتھ آواز بلند کرسکے اور وہ موثر بھی ہو، یوں تو زبانی شور وغوغا کرنے والے بہت ہیں لیکن اس کی حیثیت صدبصحرا سے زیادہ نہیں ہے، مولانا ہندوستان کی جنگ آزادی کے ممتاز سپہ سالاروں میں تھے، انھوں نے چوٹی کے لیڈروں کے دوش بدوش کام کیا تھا، ان کا دامن فرقہ پرستی کے داغ سے بالکل پاک تھا، ان کی پشت پر خدمات اور قربانیوں کی ایک پوری تاریخ تھی، اس لیے ان کی آواز میں قوت بھی تھی، اور ایک حد تک اثر بھی تھا، ان کے بعد کوئی ایسی شخصیت باقی نہیں ہے، ہر طرف سناٹا نظر آتا ہے۔

افسوس کز قبیلۂ مجنوں کسے نماند

اس لیے ان کی موت ملک وملّت خصوصاً مسلمانوں کا ایسا نقصان عظیم ہے جس کی تلافی نہیں ہوسکتی، اللہ تعالیٰ اس مجاہد ملت کی خدمات کو قبول اور عالمِ آخرت کی سر بلندیوں سے سرفراز فرمائے۔ اللھم صبب علیه شأبیب رحمتک و رضوانک۔

("م"، اگست ۱۹۶۲ء)

رائے پوری، عبدالقادر، مولانا

عبدالقادر رائے پوری

اس دور میں ہندوستان کے مسلمانوں کو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلہ سے جو دینی و روحانی فیوض حاصل ہوئے، اس کی مثال دوسرے سلاسل میں مشکل سے مل سکتی ہے، اسی اعتبار سے یہ پورا سلسلہ۔

ایں سلسلہ از طلاے ناب ست ایں خانہ تمام آفتاب است

کا مصداق ہے، اس سلسلہ میں آسمان علم ومعرفت کے ایسے ایسے مہر و ماہ پیدا ہوئے جن کی روشنی سے سارا ہندوستان منور ہے اور آج اس ظلمت کدہ میں علم وعرفان کی جو روشنی بھی نظر آتی ہے وہ سب ان ہی نفوس قدسیہ کا پرتو ہے، اسی نورانی محفل کی ایک شمع فروزاں حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ تھے، وہ اس دور کے شیخ کامل اور قطب وقت تھے، ان کی ذات سے ایک مخلوق ہدایت یاب ہوئی، گمراہوں کو راہ راست ملی، ناقص کامل اور کامل صاحب احوال و مقامات ہوگئے۔ افسوس ہے کہ یہ شمع ہدایت گزشتہ مہینہ گل ہوگئی، گو الحمدللہ اب اس سلسلہ میں بعض بڑی شخصیتیں موجود ہیں، لیکن "ہر گلے رارنگ وبوئے دیگرے است"۔ حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ اپنے رنگ میں منفرد تھے، ان کے ساتھ ان کی خصوصیات ختم ہوگئیں، وہ بات کوہکن کی گئی کوہکن کے ساتھ۔ اس لیے ان بزرگوں میں سے جو بھی اٹھتا ہے وہ اپنی جگہ ہمیشہ کے لیے خالی چھوڑ جاتا ہے، والبقاء للہ وحدہ، اللہ تعالیٰ عالم آخرت میں حضرت شیخ کے درجات مراتب بلند فرمائے۔ ("م"، ستمبر ۱۹۶۲ء)

انصاری، عبدالغنی، مولوی

عبدالغنی صاحب انصاری

دارالمصنفین کے لیے دوسرا حادثہ مولوی عبدالغنی صاحب انصاری ریٹائرڈ کمشنر انکم ٹیکس کی وفات کا ہے، مرحوم علامہ شبلی کے عزیز دارالمصنفین کے پرانے ہمدرد ہوا خواہ

اور اس کی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے، ان کی ذات میں جدید و قدیم دونوں کی خوبیاں جمع تھیں، جدید تعلیم کے ساتھ پرانی وضعداری اور تہذیب و شرافت کا نمونہ تھے۔ اپنے دور کے قابل ترین افسروں میں ان کا شمار تھا، اپنی قابلیت حسن اخلاق اور سیرت و کردار کی پختگی کی وجہ سے حکومت اور پبلک دونوں میں مقبول و ممدوح تھے، ریٹائر ہونے کے بعد قومی کاموں میں بھی دلچسپی لیتے تھے، ادھر عرصہ سے ان کی صحت خراب تھی، گذشتہ مہینہ کراچی میں انتقال کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ (''م''، ستمبر ۱۹۶۲ء)

قادری، سید محی الدین زور، ڈاکٹر

ڈاکٹر سید محی الدین زور قادری

اردو زبان کے مشہور خدمت گذار اور نامور صاحبِ قلم ڈاکٹر سید محی الدین زور قادری کی وفات دنیائے اردو کا بڑا سانحہ ہے، انھوں نے علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے اردو زبان و ادب کی بڑی خدمت کی، وہ دکن کے مولوی عبدالحق اور دکنیات کے خصوصیت کے ساتھ بڑے ماہر تھے، قدیم دکھنی اردو کی بہت سی نادر کتابیں انھوں نے شائع کیں، ان کا سب سے بڑا کارنامہ ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد ہے، اس ادارہ نے اردو زبان و ادب کی جو گوناگوں خدمات انجام دیں، اس کی مثال اردو کے اس کی عمر کے اداروں میں نہیں مل سکتی، اس کی...... حیثیت دکن میں وہی ہے، جو شمالی ہند میں انجمن ترقی اردو ہند کی ہے اور آج اندھراپردیش میں اردو کا وجود اور اس کا وقار اسی ادارے کے دم سے قائم ہے، ڈاکٹر زور کی مستقل تصانیف اور ان کی مرتب اور شائع کردہ کتابوں کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہوگی، وہ حیدرآباد کے ایک خانوادۂ مشائخ سے تعلق رکھتے تھے، اسی نسبت سے اپنے نام کے ساتھ قادری لکھتے تھے، اور اس سلسلہ کو انھوں نے قائم بھی رکھا تھا، چنانچہ ان کے بڑے صاحبزادے ان کی خاندانی خانقاہ کے سجادہ نشین ہیں، مگر ان کی علمی و ادبی شہرت نے ان کی اس حیثیت کو اتنا چھپا دیا تھا کہ اس کا علم بھی بہتوں کو نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

(''م''، اکتوبر ۱۹۶۲ء)

انصاری، سعید، مولانا

مولانا سعید انصاری

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینے ہمارے قدیم اور سابق رفیق مولانا سعید انصاری نے لاہور میں انتقال کیا، وہ دارالمصنفین کے دور اول کے رفقاء میں تھے، ان میں تالیف و تصنیف کا بہت اچھا سلیقہ تھا، اور وہ اردو زبان و ادب کا بڑا ستھرا مذاق رکھتے تھے، لیکن مزاج میں استقلال اور اعتدال و توازن نہ تھا، اس لئے کسی ایک مقام پر جم کر نہ رہ سکے، پہلی مرتبہ دارالمصنفین میں ان کا قیام سات آٹھ سال تک رہا، اس مدت میں انھوں نے سیر انصار اور سیر الصحابیات لکھی، اور امام ابومسلم اصفہانی معتزلی کی تفسیر ''جامع التاویل لمحکم التنزیل'' جو اب دنیا سے ناپید ہوچکی ہے، اس کے اقتباسات امام رازی کی تفسیر کبیر سے جمع کرکے اس کو کتابی شکل میں مرتب کیا، جو اسی زمانہ میں دارالمصنفین سے شائع ہوگئی تھی، پھر دارالمصنفین چھوڑ کر صوفی پنڈی بہاء الدین کے یہاں چلے گئے اور اس کے لئے سیر الصحابہ کے نام سے شیخینؓ کے حالات ایک جلد میں لکھے، اس کے بعد مختلف اسکولوں میں ٹیچر رہے، مگر ان میں مستقل قیام نہ رہ سکا اس لئے حضرت سید صاحبؒ نے ان کو پھر دارالمصنفین بلالیا، اس مرتبہ ان کا قیام تین چار سال رہا، مگر متفرق مضامین کے علاوہ اس دور کی اور کوئی یادگار نہیں ہے، یہاں سے دوبارہ الگ ہونے کے بعد مختلف رسالوں کے اڈیٹر رہے، پھر سید صاحب نے ان کو ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے سہ ماہی اردو رسالہ کا اڈیٹر مقرر کروایا، چند برسوں کے بعد اس سے بھی الگ ہوگئے، اور پاکستان قائم ہونے کے بعد لاہور چلے گئے، حضرت سید صاحبؒ نے ان کو لاہور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو انسائیکلوپیڈیا میں رکھا دیا، اسی خدمت پر تھے کہ دفعتہً ان کے انتقال کی خبر ملی، شاعر بھی تھے، نشتر تخلص تھا، اردو اور فارسی دونوں میں دادِ سخن دیتے تھے، اردو کلام کا انتخاب جمالیاتی شاعری کے نام سے الہ آباد کے قیام کے زمانہ میں اور فارسی غزلوں کا مجموعہ چند سال ہوئے لاہور سے شائع کیا تھا، اپنے مکاتیب کا مجموعہ بھی مرتب کیا تھا، مگر اس کی اشاعت کی نوبت نہ آسکی تھی کہ وقت آخر ہوگیا، ان کی شخصیت ان کے احباب کے لئے بڑی دلکش و دلآویز تھی اور ان کے بعض اوصاف بڑے معصومانہ تھے، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے۔ (''م''، نومبر ۱۹۶۲ء)

خواجہ، عبدالمجید

عبدالمجید خواجہ

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینے دوسری دسمبر کو ہماری پرانی قومی بزم کی ایک یادگار عبدالمجید خواجہ نے انتقال کیا، خواجہ صاحب مرحوم کی شخصیت بڑی جامع تھی، ان کی ذات میں دین و سیاست، قومیت وطنیت اور اسلامی غیرت وحمیت کا بڑا متناسب اجتماع تھا، ان کی پوری زندگی ملک و ملت کی خدمت میں گذری، طرابلس اور بلقان کی جنگ سے لے کر ہندوستان کی آزادی تک ہر قومی و ملی تحریک میں ان کا نمایاں حصہ رہا، اس دور کے لیڈروں میں ان کا ممتاز مقام تھا، ایک طرف وہ پکے قوم پرور اور وطن دوست تھے، مسلمان فرقہ پروروں کا ہمیشہ مقابلہ کرتے رہے، دوسری طرف راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور ان کا دل اسلامی غیرت وحمیت سے معمور تھا، اس لئے ہندوستان کی آزادی کے بعد کے حالات سے بہت بددل تھے، اور اس سلسلہ میں نئے ارباب سیاست اور ارکان

حکومت سے بہت صاف اور کھری باتیں کہتے تھے، پنڈت جواہر لال تک ان کا لحاظ کرتے تھے، مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ سے بہت قدیم اور گہرا تعلق تھا، جامعہ کے تو معماروں میں تھے، آخر وقت تک اس کے چانسلر رہے۔ مسلم یونیورسٹی کے بھی رکن رکین تھے، آزادی کے بعد یونیورسٹی میں جو غیر اسلامی رجحانات پیدا ہوگئے ہیں ان کی اصلاح کے لئے برابر کوشش کرتے رہے۔

خواجہ صاحب علی گڑھ کے اس دور کی پیداوار تھے جب انگریزیت اور تجدد اس کا طغرائے امتیاز تھا۔ بیرسٹری کی تعلیم کے سلسلہ میں ان کا قیام عرصہ تک لندن میں رہا، لیکن ان کا مزاج ابتدا سے مذہبی تھا، اس لئے وہ ہر دور میں عملاً مسلمان اور پابند مذہب رہے، اور عمر کے ساتھ ساتھ ان کی مذہبیت بڑھتی گئی تھی، ان کا مذہبی مطالعہ وسیع تھا، مذہبی گفتگو میں آیات و احادیث ان کے نوک زبان رہتی تھیں، علمی اور ادبی مذاق بھی ستھرا رکھتے تھے، طبعاً بڑے خلیق اور شگفتہ مزاج تھے، پرانے بزرگوں کی تمام وضعداریاں ان میں جمع تھیں، وہ موروثی طور پر صاحب ثروت تھے، اس لئے بیرسٹری عرصہ سے ترک کردی تھی اور زیادہ وقت قومی کاموں میں صرف کرتے تھے، ادھر چند برسوں سے ضعف پیری اور امراض کی وجہ سے بالکل عزلت نشین ہوگئے تھے، مولانا محمد علیؒ وشوکت علی کے ہم قافلہ مسافروں میں صرف دو بزرگ رہ گئے تھے، خواجہ صاحب مرحوم اور ڈاکٹر سید محمود صاحب، خواجہ صاحب نے جنت کی راہ لی، ڈاکٹر صاحب کا حال یہ ہے کہ ''اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے''، لیکن ان کا وجود بہت غنیمت ہے اللہ تعالیٰ ان کا سایہ عرصہ تک قائم رکھے اور خواجہ صاحب مرحوم کو اپنی رحمت و مغفرت اور عالم آخرت کی خواجگی سے سرفراز فرمائے۔ (''م''، جنوری ۱۹۶۳ء)

<u>پرشاد، راجندر، ڈاکٹر</u>

ڈاکٹر راجندر پرشاد

سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر راجندر پرشاد کی موت ہندوستان کا ایک بڑا قومی حادثہ ہے، وہ اپنے قومی وملکی خدمات کے لحاظ سے صف اول کے لیڈروں میں تھے، ہندوستان کی جنگ آزادی میں ان کے بڑے کارنامے ہیں، چمپارن کی مشہور ستیہ گرہ کے گویا ہیرو تھے، وہ گاندھی جی کے خاص تربیت یافتہ اور ان کے معتمد علیہ تھے، ان میں ان کی بہت سی اخلاقی خوبیاں موجود تھیں، جو آخر تک قائم رہیں، ہندوستان کی آزادی کے بعد کانگریس کے بہت سے لیڈروں کے خیالات اور کردار میں تبدیلی ہوگئی ہے، ان سے ان کا دامن محفوظ تھا، وہ کانگریس کے پرانے اصولوں پر برابر قائم رہے، اور اپنے جلیل القدر عہدے کی ذمہ داریوں کو بھی بڑی خوبی کے ساتھ نباہا، طبعاً بڑے شریف اور منرنجان مرنج تھے اور قومی وملکی معاملات میں ان کا دل بہت وسیع تھا، اس لیے کسی طبقہ کو بھی ان سے کوئی شکایت نہیں پیدا ہوئی، وہ پرانے کایستھ تھے اس لیے اردو اور فارسی تہذیب سے بہت اچھی واقفیت رکھتے تھے، اور بہت شستہ اردو بولتے اور لکھتے تھے، اور ان میں قدیم مشترک تہذیب کی بہت سی خوبیاں موجود تھیں، اس لیے ان کی موت مختلف حیثیتوں سے بڑا قومی سانحہ ہے۔ اور ان کا نام ہندوستان کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ (''م''، مارچ ۱۹۶۳ء)

<u>شفیع، محمد، مولوی</u>

مولوی محمد شفیع

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ پاکستان کے نامور فاضل مولوی محمد شفیع صاحب سابق پرنسپل اورینٹل کالج لاہور نے انتقال کیا، ان کی وفات علمی دنیا کا بڑا حادثہ ہے، وہ ہندو پاک کے نامور فضلاء و محققین میں تھے، انگریزی کے ساتھ عربی و فارسی کے بھی ماہر تھے، ان کا علمی پایہ بہت بلند تھا، ان کے علمی و تحقیقی کارنامے بڑے متنوع ہیں، بہت سے فاضلانہ علمی مقالات کے علاوہ انھوں نے عربی و فارسی کی متعدد اہم اور نادر کتابوں کو تصحیح و تحشیہ کے ساتھ مرتب کرکے شائع کیا، اپنی پرنسپلی کے زمانہ میں علمی حیثیت سے اورینٹل کالج میگزین کا معیار بہت بلند اور اپنے تلامذہ میں سنجیدہ علمی تلاش و تحقیق کا ایک عام ذوق پیدا کردیا تھا، چنانچہ لاہور کے موجودہ فضلاء اور محققین میں بیشتر انہی کے تربیت یافتہ ہیں، ادھر چند سال سے لاہور یونیورسٹی اردو انسائیکلوپیڈیا کی تالیف و اشاعت کا کام ان کی نگرانی میں شروع ہوا تھا، اور اس کے بعض اجزا شائع بھی ہوئے لیکن ابھی یہ کام ابتدائی منزل میں ہے، اس قحط الرجال کے زمانہ میں علمی ذوق وطلب میں ان کی ذات علمائے سلف کا نمونہ تھی اللہ تعالیٰ اس شیدائے علم کو رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے۔ (''م''، اپریل ۱۹۶۳ء)

<u>احسن، سید ہادی، ڈاکٹر</u>

ڈاکٹر سید ہادی احسن

افسوس ہے کہ گزشتہ آخر مئی میں ڈاکٹر سید ہادی حسن صاحب سابق صدر شعبہ فارسی مسلم یونیورسٹی نے انتقال کیا، مرحوم یونیورسٹی کے لائق اور ممتاز اساتذہ میں تھے۔ قدیم و جدید فارسی زبان و ادب پر ان کو اسناد اور عبور حاصل تھا، ان کی فارسی دانی کا لوہا اہل زبان تک مانتے تھے، نہایت شستہ و رفتہ فارسی میں برجستہ تقریر کرتے تھے اور اپنی ساحرانہ خطابت سے سماں باندھ دیتے تھے اور اس حیثیت سے وہ یونیورسٹی کی آبرو تھے، یونیورسٹی سے ان کو والہانہ تعلق تھا، اس کے عملی کاموں میں سرگرمی سے حصہ لیتے تھے اور ان کی ذات سے یونیورسٹی کو بڑے فوائد پہنچے۔ میڈیکل کالج کے چندہ کی فراہمی میں

ڈاکٹر ضیاءالدین مرحوم کے بعد ان کی کوششوں کو سب سے زیادہ دخل تھا، ان کی شخصیت بڑی دلآویز تھی، فارسی شعروادب اور شعراء کے تذکرے اور تراجم پر انگریزی میں متعدد تصانیف ان کی یادگار ہیں۔ اس زمانے کے فارسی کے اساتذہ میں ان کی جیسی قابلیت کی مثالیں کم ملیں گی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ (''م''، جولائی ۱۹۶۳ء)

پھولپوری، عبدالغنی، مولانا

مولانا عبدالغنی پھولپوریؒ

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینہ مولانا عبدالغنی پھولپوریؒ نے کراچی میں انتقال فرمایا۔ مولانا مرحوم حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے اجل خلفاء میں تھے اور اس صوبے کے مشرقی اضلاع خصوصاً اعظم گڑھ میں ان کا علمی اور حانی فیض نصف صدی سے زیادہ جاری رہا، انھوں نے مرشد کی تعلیمات اور ملفوظات و مواعظ کو ایسا جذب کیا تھا کہ ان کی تحریر اور گفتگو میں اس کا عکس نظر آتا تھا، ان میں جذب وسلوک دونوں کی شانیں تھیں، اہتمام شریعت اور مریدین متوسلین کی تعلیم وتربیت میں سالک تھے اور اپنی نجی زندگی میں مجذوب، ان میں عجیب سادگی اور وارستگی تھی۔ ضروریات زندگی میں سے کسی چیز میں بھی اہتمام نہ تھا۔ وہ صحیح معنوں میں زاہد تھے۔ ان کی سادگی بلکہ بے سامانی کو دیکھ کر ان کے ایک خواجہ تاش بزرگ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ ان کے یہاں نئی کیا پرانی روشنی کا بھی گزر نہیں ہے۔

مولانا نے عربی کے دو مدرسے قائم کیے تھے، ایک سرائمیر میں، دوسرا پھولپور میں، پھولپور کے مدرسے کی حیثیت اب مکتب کی رہ گئی ہے، مولانا کی تعلیم وتربیت عملی تھی، اس لیے تالیف وتصنیف کی طرف ان کی توجہ نہ تھی، آخر عمر میں چند رسالے اور ایک ضخیم کتاب معیت الٰہیہ کے نام سے لکھی تھی جو سالکین راہ طریقت کے لیے بہت مفید ہے، حضرت مولانا اشرف علیؒ صاحب سے حضرت سید صاحبؒ کی ارادت کے بعد مولانا مرحوم کو دارالمصنفین کے لوگوں سے خاص تعلق ہوگیا تھا اور وہ یہاں اکثر تشریف لایا کرتے تھے، دو تین سال ہوئے پاکستان چلے گئے تھے، چند مہینے ہوئے کہ فالج کا حملہ ہوا، اس کے اثر سے ۱۱راگست کو کراچی میں انتقال فرمایا۔ نوے سال کے قریب عمر تھی۔

اللہ تعالیٰ عالم آخرت میں ان کے مدارج بلند فرمائے۔ ان بزرگوں میں سے جو بھی اٹھتا ہے، اس کی جگہ ہمیشہ کے لیے خالی رہ جاتی ہے۔ مولانا پھولپوری کے انتقال کے بعد نواح میں صرف مولانا وصی اللہ صاحب کی ایک ذات رہ گئی ہے، جس سے ارشاد وہدایت کا چراغ روشن ہے، اللہ تعالیٰ ان کا سایہ عرصہ دراز تک قائم رکھے۔

(''م''، ستمبر ۱۹۶۳ء)

حسن، صدیق، سید

سید صدیق حسن

گزشتہ مہینہ سید صدیق حسن صاحب مرحوم کا حادثہ وفات ایسے وقت پیش آیا جب معارف چھپ چکا تھا، اس لیے تعزیت کا فرض ادا نہ ہوسکا، یہ اتفاق ہے کہ ان کی وفات سے صرف تین چار دن پیشتر ندوہ کی مجلس انتظامیہ کے جلسہ میں ان سے ملاقات ہوئی تھی، پھر دوسرے دن وہ ملنے کے لئے آئے، اس وقت یہ گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے، اعظم گڑھ واپس آنے کے دوسرے دن معلوم ہوا کہ مرحوم نے عالم غربت میں جنت کی راہ لی، اس سے اور بھی دل متاثر ہوا، مرحوم اپنے اوصاف وخصوصیات میں مومن کامل، اخلاص وللّٰہیت، حسن خلق، سادگی وتواضع، خدمت خلق، اہل حاجت کی امداد ودستگیری کا نمونہ اور غریبوں اور بے نواؤں کا ملجا وماویٰ تھے، ان کی فیض رسانی عام تھی، کسی طبقہ اور فرقہ کی تخصیص نہ تھی، ہر حاجت مند کے لئے ان کا دروازہ کھلا ہوا تھا، عقیدۃً اور عملاً پکے مسلمان تھے، ان کے یہاں ہر ہفتہ قرآن مجید کا درس ہوتا تھا، جس میں بہت سے مسلمان حکام شریک ہوتے تھے، ان میں انھوں نے ایک مذہبی ذوق پیدا کردیا تھا، دینی واسلامی اداروں سے ان کو بڑی دلچسپی تھی، ندوے کے رکن رکین اور بڑے معاون ومددگار تھے، دارالمصنفین سے بھی ان کو مخلصانہ تعلق تھا، اس کی مجلس انتظامیہ کے رکن بھی تھے، ان کا مذہبی اور اسلامی تاریخ کا مطالعہ بھی وسیع تھا، انھوں نے جمع وتدوین قرآن پر ایک طویل مقالہ لکھا تھا، جو معارف کے اس نمبر میں چھپ رہا ہے، اس سے ان کے علمی ودینی ذوق اور اس میں دقت نظر کا اندازہ ہوگا، شعروادب کا بھی ستھرا ذوق رکھتے تھے، رسمی غزل سرائی کے علاوہ بڑی ایمان افروز قومی وملی نظمیں کہتے تھے۔

وہ بڑے لائق، تجربہ کار اور ایماندار سویلین تھے، اس لئے حکومت میں بھی ان کا اثر ووقار تھا، اس اثر سے حاجتمندوں کا بڑا کام نکلتا تھا، آج کل کے مسلمان افسر مسلمانوں کے نام سے گھبراتے ہیں، لیکن مرحوم اسی جرأت وہمت کے ساتھ مسلمانوں کا کام بھی انجام دیتے تھے، وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے عوامی آدمی تھے، اور ان سے آئندہ قومی وملی کاموں کی بڑی امیدیں تھیں، افسوس کہ موت نے ان سب کا خاتمہ کردیا، اس لیے ان کی موت ایک بڑا قومی حادثہ ہے، اور ملک ایک نہایت لائق افسر اور ایک شرافت مجسم انسان سے محروم ہوگیا، وہ ہر طبقہ میں مقبول ومحبوب تھے، اور مخلوق میں مقبولیت عنداللہ بھی مقبولیت کی دلیل ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو آخرت میں صدیقین کا درجہ عطا فرمائے۔

(''م''، اکتوبر ۱۹۶۳ء)

کینیڈی، مسٹر

مسٹر کینیڈی

امریکہ کے پریسڈنٹ مسٹر کنیڈی کا قتل بہت بڑا بین الاقوامی حادثہ ہے، جس کا اثر پوری دنیا کی سیاست پر پڑیگا، وہ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے، ابھی ان کی عمر ۴۶ سال کی تھی، اور ان کی مدت صدارت بھی ڈھائی سال سے زیادہ نہ تھی، اس عمر اور اس مدت میں بین الاقوامی معاملات میں انہوں نے جس تدبر اور ہوشمندی کا ثبوت دیا وہ ان کی سیاسی بصیرت اور عالی دماغی کی بین شہادت ہے، وہ مختلف رنگ و نسل کی قوموں کے درمیان مساوات، دوستانہ تعلقات اور امن کے بڑے علم بردار تھے، اور اس راہ میں ان کے بڑے کارنامے ہیں، وہ نسلی تفریق و امتیاز کے سخت خلاف تھے اور اس میں انہوں نے اپنی قوم کی بھی مخالفت کی پرواہ نہیں کی اور نیگرو اور یورپین نژاد امریکنوں کے درمیان حقوق کے مساوات کی کوشش کے جرم میں قتل کیے گئے، اس لیے ان کا قتل درحقیقت انسانیت کی راہ کی قربانی ہے، مذہبی حیثیت سے بھی وہ قابل قدر تھے، وہ راسخ العقیدہ کیتھلک تھے، پروٹسٹنٹ میں تو برائے نام مذہب رہ گیا ہے، گو رومن کیتھلک کی بعض رسمیں مشرکانہ ہیں لیکن یورپ و امریکہ کی خدا بیزار اور مادہ پرست سرزمین میں مذہب انہی کے دم سے زندہ ہے۔ (''م''، دسمبر ۱۹۶۳ء)

نامی، محفوظ الرحمٰن، مولانا

مولانا محفوظ الرحمٰن نامی

افسوس ہے کہ ایک طویل علالت کے بعد گذشتہ مہینہ مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب نامی نے وفات پائی مرحوم ایک ممتاز عالم دین، خوش بیان واعظ اور عملی انسان تھے، انھوں نے مسلمانوں کی بڑی مفید علمی تعلیمی اور ملی خدمات انجام دیں، وہ سیاسی خیالات میں قوم پرور تھے، اور ان کا اتنا اثر تھا کہ لیگ اور کانگریس کے اختلاف کے شباب کے زمانہ میں اسمبلی کے انتخاب میں مسلم پارلیمنٹری بورڈ کے ٹکٹ پر لیگ کے امیدوار کے مقابلہ میں کامیاب اور شعبۂ تعلیم میں پارلیمنٹری سکریٹری مقرر ہوئے، لیکن وہ ایک دیندار اور باحمیت مسلمان تھے، اس لیے زیادہ دنوں تک حکومت کے ساتھ نہ چل سکے اور ایک مذہبی معاملہ میں ان کو اس عہدے سے الگ ہونا پڑا، درس و تدریس سے بھی ان کو ذوق تھا، نور العلوم کے نام سے انھوں نے بہرائچ میں عربی کا ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا، نئے نظام تعلیم میں ان کو مسلمان بچوں کی تعلیمی مشکلات کا ذاتی تجربہ ہو چکا تھا، اس لیے پارلیمنٹری سکریٹری کے عہدہ سے الگ ہونے کے بعد وہ ہمہ تن مسلمان بچوں کی مذہبی تعلیم کی جدوجہد میں لگ گئے، اور درس قرآن کا ایک سلسلہ مرتب کیا جس سے بہ یک وقت ابتدائی عربی، ترجمہ قرآن اور اردو زبان تینوں کی تعلیم ہو جاتی تھی، یہ سلسلہ بہت مقبول ہوا، اور مولانا نے اس کی تبلیغ و اشاعت کے لیے ہندوستان بھر کا دورہ کیا اس غیر معمولی محنت سے ان کی صحت خراب ہوگئی اور ان پر فالج کا حملہ ہوگیا، اور سات آٹھ سال صاحب فراش رہنے کے بعد ۲۰؍ نومبر کو انتقال کیا، اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول اور ان کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے۔ (''م''، دسمبر ۱۹۶۳ء)

علوی، ظہیر الدین، سید

سید ظہیر الدین علوی

سید ظہیر الدین علوی مرحوم رجسٹرار جامعہ اردو علی گڑھ کی وفات دنیائے اردو کا افسوس ناک سانحہ ہے، جامعہ اردو ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے، اس کے ذریعہ اردو کی تعلیم کی جس قدر اشاعت ہوئی، اس کی مثال کوئی ادارہ پیش نہیں کرسکتا، جامعہ اردو کے امتحان دینے والوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہوگئی ہے، اس کی سند کو ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں نے تسلیم کرلیا ہے، اس کا فائدہ یہ ہوا کہ سیکڑوں آدمیوں نے جامعہ اردو کے امتحانات کے ذریعہ محض انگریزی زبان و ادب کا امتحان دے کر انگریزی کی پوری تعلیم حاصل کرلی، اس سے لڑکیوں کی تعلیم میں خصوصیت کے ساتھ بڑی سہولت پیدا ہوگئی ہے، اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، ان کے بعد جامعہ کی رجسٹراری کے لیے مولوی نور الرحمٰن صاحب کا انتخاب عمل میں آیا ہے، جو اپنی قابلیت اور تجربہ کے لحاظ سے اس جگہ کے لیے موزوں ترین شخص ہیں اور ہم کو یقین ہے کہ وہ اپنے پیشرو کے صحیح جانشین اور ان کا نعم البدل ثابت ہوں گے۔ (''م''، فروری ۱۹۶۴ء)

نہرو، جواہر لال، پنڈت

آہ جواہر لال

ہندوستان کی عظمت کا آفتاب غروب ہوگیا

جس نازک وقت کا خطرہ کروڑوں دلوں کو مضطرب کیے رہتا تھا بالآخر پیش آکر رہا اور جو آواز تقریباً نصف صدی تک ہندوستان کے در و دیوار میں گونجتی رہی ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی وہ حیات آفریں جس نے ہندوستان کی مردہ رگوں میں زندگی کی روح پھونکی، خود موت کے آغوش میں سوگیا۔ وہ آفتاب جس کی ضیاباریوں نے نہ صرف ہندوستان کو منور کیا بلکہ دوسرے ملکوں تک اس کی روشنی پھیلی، ۲۷؍ مئی کو عین دوپہر کے وقت ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا۔ پنڈت جواہر لال کی موت ایسا حادثہ نہیں جس کو زمانہ کی گردش بھلا سکے، ان کا جسم گو خاک میں مل چکا ہے لیکن ان کی روح ہندوستان میں ہمیشہ زندہ رہے گی اور اس کے ذرے ذرے پر ان کا نام ثبت رہے گا۔

وہ آزاد ہندوستان ہی کے بانی اور اس کے معمار نہ تھے، بلکہ پورے ایشیا کی

آبرو اور دنیا کی عظیم شخصیتوں میں تھے، ہندوستان نے اب تک جتنی بڑی شخصیتیں پیدا کیں ان میں بعض قدیم مذہبی پیشواؤں کو چھوڑ کر پنڈت جواہر لال کا درجہ سب میں بلند تھا، انھوں نے نصف صدی تک ہندوستان کی مسلسل اور ان تھک خدمت کی، وہ جنگ آزادی کے سپہ سالار بھی تھے، آزاد ہندوستان کے معمار بھی اور اس کے محبوب لیڈر بھی، اس لیے انھوں نے دلوں پر حکمرانی کی اور کل سترہ سال میں جو قوموں اور ملکوں کی عمر کے لحاظ سے نہایت قلیل مدت ہے، ہندوستان کا درجہ ساری دنیا میں بلند کردیا۔

پنڈت جواہر لال کی جیسی تاریخ ساز شخصیتیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں اور اپنا نام صفحہ عالم پر ہمیشہ کے لیے ثبت کرجاتی ہیں، ان میں جتنے اوصاف جمع تھے مشکل ہی سے کسی ایک انسان میں ان کا اجتماع ہوتا ہے، وہ اس دور کے بہت بڑے مدبر اور مفکر تھے، ان کی شخصیت اتنی عظیم تھی کہ جو آواز ان کے منہ سے نکلتی تھی، ساری دنیا میں گونج جاتی تھی، وہ ایشیا کا مرکز ثقل تھے اس لیے دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں ان کی دوستی کے لیے مسابقت کرتی تھیں، ان میں اتنی عظمت وکشش تھی کہ بڑی سے بڑی شخصیت کو متاثر اور مخالفین کو مسحور کرلیتی تھی، وہ اس ایٹمی دور میں امن و آزادی کے بڑے علمبردار تھے، محکوم قوموں کی آزادی کی حمایت میں ان کا قدم سب سے آگے تھا، ان کی آواز نے ایشیا کی آزادی پر بڑا اثر ڈالا، اس اعتبار سے وہ پورے ایشیا کے لیڈر تھے۔

اتنی طویل مدت تک پوری مقبولیت کے ساتھ حکومت اور ملک وقوم کی خدمت کی مثال دنیا کے موجودہ لیڈروں میں نہیں مل سکتی، انھوں نے قانون کی قوت سے نہیں بلکہ اپنی مقبولیت سے دلوں پر حکمرانی کی ان کے خیالات بہت بلند اور دل بڑا وسیع تھا، اس کا دروازہ بلا امتیاز رنگ ونسل اور مذہب وملت ہر شخص کے لیے کھلا ہوا تھا، وہ پرانی مشرقی تہذیب کی یادگار تھے، ان میں اس کی تمام شرافتیں اور وضعداریاں جمع تھیں، اپنے پرانے دوستوں اور ادنیٰ ادنیٰ درجہ کے ملنے والوں کے ساتھ تعلقات کو جس طرح نباہا اس کی مثال اس درجہ کے آدمیوں میں کم ملے گی، غرض جس پہلو پر بھی نظر ڈالی جائے۔ جواہر لال ہندوستان کے ایک انمول جوہر تھے اور ان کی وفات تنہا ہندوستان کا نہیں، بلکہ عالم انسانیت کا حادثہ ہے، اور ان کی ذات پر تاریخ کا ایک دور ختم ہوگیا، آئندہ ہندوستان میں اتنی بڑی اور ایسی جامع اوصاف شخصیت کے پیدا ہونے کی امید نہیں۔

دارالمصنفین کے لیے پنڈت جی کی وفات قومی نہیں بلکہ ذاتی حادثہ بھی ہے، دارالمصنفین سے ان کے اور پنڈت موتی لال کے تعلقات بہت قدیم تھے، خلافت اور نان کوآپریشن (Non-cooperation) تحریک کے زمانہ میں اور اس کے بعد ایک عرصہ تک دارالمصنفین قومی وسیاسی تحریکوں کا ایک بڑا مرکز رہا، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی اس زمانہ کے ممتاز لیڈروں میں تھے، سید صاحب تو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے رکن بھی تھے، اس لیے اس زمانہ کے بڑے لیڈروں میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو دارالمصنفین نہ آیا ہو، پنڈت موتی لال اور پنڈت جواہر لال جب اعظم گڑھ کے دورے پر آتے تھے تو دارالمصنفین ہی میں قیام کرتے تھے، پنڈت جواہر لال نہرو کی آخری آمد ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں ہوئی تھی، وزارت کے زمانہ میں اس کی کوئی تقریب نہ پیدا ہوسکی خیال تھا کہ دارالمصنفین کی پچاس سالہ جوبلی میں ان کو شرکت کی دعوت دی جائے گی، لیکن افسوس،

آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند

پنڈت جی نے ان تعلقات کو آخر عمر تک نباہا، وہ دارالمصنفین کے لائف ممبر بھی تھے، ان کی ممبری کا یہ سبق آموز واقعہ قابل ذکر ہے کہ لائف ممبری کی فیس ایک ہزار روپے ہے۔ مولانا مسعود علی صاحب نے جب ان کو ممبر بنایا تو انھوں نے اس کی پہلی قسط ڈھائی سو روپے کی دی، مولانا مسعود علی صاحب نے ان سے کہا کہ آپ ہندوستان کے وزیر اعظم ہوکر ایک ہزار یکمشت نہیں دے سکتے، انھوں نے کہا کہ مجھ کو جو تنخواہ ملتی ہے اس میں سب کٹ کٹا کر دو ہزار ماہوار کے قریب میرے ہاتھ میں آتا ہے، اس میں ایک ہزار یکمشت دینے کی گنجائش کہاں، یہ واقعہ ان کی عظمت کا کتنا بڑا ثبوت اور ہمارے بہت سے وزراء کے لیے کس قدر سبق آموز ہے، ہندوستان کی تقسیم کے بعد جب دارالمصنفین مالی مشکلات میں مبتلا ہوا تو مولانا ابوالکلام نے پنڈت جی کی تائید بلکہ تحریک سے وزارت تعلیم کی جانب سے ساٹھ ہزار روپے کی امداد دی، اس وقت مولانا ابوالکلام سالانہ امداد دینے کے لیے بھی تیار تھے، لیکن دارالمصنفین کے کارکنوں نے اس کو منظور نہیں کیا، اس لیے پنڈت جی دارالمصنفین کے محسن بھی تھے اور ان کی وفات سے اس کا ایک بڑا قدردان اُٹھ گیا، ان کے جانشینوں میں یہ وضعداری کہاں، ان کے بعد کی نسل بلکہ ان کے بہت سے معاصر تو دارالمصنفین کو شاید جانتے بھی نہ ہوں گے۔ پنڈت جواہر لال کی وفات پر ان کے دارالمصنفین میں قیام کے زمانہ کا پورا نقشہ نگاہوں کے سامنے آگیا اور ان کے اور پنڈت موتی لال نہرو کے بہت سے دلچسپ واقعات اور لطائف یاد آگئے، جو کسی موقع پر پیش کیے جائیں گے۔

(''م''، جون ۱۹۶۴ء)

قادری، حامد حسن، پروفیسر

پروفیسر حامد حسن قادری

افسوس ہے کہ ادھر چند مہینوں کے اندر دنیائے علم و ادب کی کئی نامور ہستیوں، پروفیسر حامد حسن صاحب قادری، سید ہاشمی صاحب فرید آبادی اور مولانا صلاح الدین احمد نے انتقال کیا، پروفیسر حامد حسن صاحب قادری ہماری پرانی علمی بزم کی یادگار تھے، اردو اور فارسی زبان وادب اور اس کی تاریخ پر ان کی نظر بڑی گہری اور وسیع تھی، تاریخ

داستان اردو ان کی وسعت نظر کی شاہد ہے، وہ عرصہ تک سینٹ جانس کالج آگرہ میں اردو اور فارسی کے استاد رہے، ریٹائر ہونے کے بعد کراچی چلے گئے تھے، اور وہیں وفات پائی، ان کی وفات سے ایک پرانی علمی وتہذیبی یادگار مٹ گئی۔

("م"، اگست ۱۹۶۴ء)

فرید آبادی، ہاشمی، سید

سید ہاشمی فرید آبادی

سید ہاشمی فرید آبادی اردو کے نامور مصنف اور اردو زبان کے پرانے خدمت گذار تھے، برسوں بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کے کاموں میں ان کے دست راست رہے، غالباً کچھ دنوں دارالترجمہ حیدرآباد سے بھی ان کا تعلق رہا تھا، انھوں نے جامعہ عثمانیہ کے لیے ہندوستان کی تاریخ پر کئی کتابیں تالیف و ترجمہ کیں، عین قیام پاکستان کے بعد وہ بھی مولوی عبدالحق صاحب کے ساتھ کراچی چلے گئے تھے، انھوں نے لاہور کے قدیم عمال و حکام، علماء و مشائخ اور شعراء ومصنفین کے حال میں ایک کتاب مآثر لاہور کے نام سے لکھی تھی۔ ("م"، اگست ۱۹۶۴ء)

احمد، صلاح الدین، مولانا

مولانا صلاح الدین احمد صاحب

مولانا صلاح الدین احمد صاحب اردو کے صاحب طرز ادیب بلکہ ادیب گر تھے، ان کے فیضِ تربیت سے بہت سے نوجوانوں میں اردو زبان و ادب کا صحیح مذاق پیدا ہوا، ان کی پوری زندگی علم و ادب کی خدمت میں گذری، وہ بجائے خود ایک "ادبی دنیا" تھے، ان کا نام اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا، اللہ تعالیٰ ان تینوں اصحاب کمال کی مغفرت فرمائے۔

("م"، اگست ۱۹۶۴ء)

فرنگی محلی، صبغۃ اللہ شہید، مولانا

مولانا صبغۃ اللہ صاحب شہید فرنگی محلی

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینے ۲۴؍ دسمبر کو مولانا صبغۃ اللہ صاحب شہید فرنگی محلی نے انتقال فرمایا مرحوم ایک نامور عالم، لائق مدرس، خوش بیان خطیب، شگفتہ نگار ادیب اور خوش فکر شاعر تھے، ان کی سیرت کی تقریریں خصوصیت کے ساتھ بڑی موثر اور دل آویز ہوتی تھیں، عرصہ تک مدرسہ نظامیہ میں درس وتعلیم کی خدمت انجام دی، ایک زمانہ میں النظامیہ کے نام سے ایک رسالہ بھی نکالا تھا، انجمن خدام کعبہ کے عہدہ دار اور اس کے اخبار خادم الحرمین کے اڈیٹر رہے، خلافت اور ترک موالات کی تحریکوں میں بھی سرگرمی سے حصہ لیا تھا پھر لیگ میں شامل ہوگئے تھے، آداب و اخلاق میں قدیم تہذیب و شائستگی کا نمونہ، بڑے وضعدار خوش مذاق، بذلہ سنج اور علم مجلسی کے ماہر تھے صنع جگت سے بھی ذوق رکھتے تھے، غرض ان کی ذات میں بڑی جامعیت تھی، ان کی وفات سے بہت سی خصوصیات کا خاتمہ ہوگیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ ("م"، جنوری ۱۹۶۵ء)

چرچل، مسٹر

مسٹر چرچل

بالآخر مسٹر چرچل کو بھی پیام اجل آگیا، وہ اس صدی کی عظیم ترین شخصیتوں میں تھے، ان میں اتنے کمالات جمع تھے کہ مشکل ہی سے ایک انسان میں جمع ہوتے ہیں، وہ صحیح معنوں میں صاحب السیف والقلم بلکہ کچھ اس سے بھی زیادہ تھے، ایوان سیاست میں بے نظیر و مدبر، عرصۂ رزم میں جنگ آزما سپہ سالار میدان علم و ادب میں سحر طراز ادیب وخطیب، وہ اپنی قوم کے بہت بڑے محسن تھے، انھوں نے جتنی طویل مدت تک اپنے ملک وقوم کی خدمت کی اس کا موقع کم لیڈروں کو ملتا ہے، انھوں نے نوے سال کی عمر پائی اور ستر سال تک مسلسل کسی نہ کسی حیثیت سے خدمت کرتے رہے، وہ برطانوی قوم کے ناخدا تھے، انھوں نے ایسے نازک موقعوں پر اس کو ڈوبنے سے بچایا جب اس کی امید بہت کم رہ گئی تھی، گو وہ قدامت پرست طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جس کا نقطۂ نظر برطانوی شہنشاہیت کی توسیع واستحکام اور دنیا میں اس کی بالادستی تھا لیکن وہ اتنے بڑے آدمی تھے اور انھوں نے اپنی قوم کی اتنی گوناگوں خدمات انجام دیں کہ ان کی ذات دنیا کے لیڈروں کے لئے نمونہ ہے جس سے ان کو سبق حاصل کرنا چاہیے۔

("م"، فروری ۱۹۶۵ء)

صدیقی، حمید

حمید صدیقی

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینے زائر حرم حمید صدیقی نے وفات پائی، وہ اس دور کے بہترین نعت گو تھے ان کی نعتیں محض شاعرانہ صناعی نہیں بلکہ سچے جذبات اور دلی کیفیات کی ترجمان ہیں، وہ جیسی پاکیزہ نعتیں کہتے ویسے ہی ترنم سے پڑھتے بھی تھے، ان کی نعتیں صاحب نعتؐ کی بارگاہ میں اتنی مقبول تھیں کہ ان کو دس بارہ مرتبہ آستان نبوی کی حاضری سعادت حاصل ہوئی طبعاً بھی بڑے مہذب اور شریف تھے، ادھر عرصہ سے ان کی صحت خراب رہتی ایک دن معلوم ہوا کہ ریاض نبوی کا زمزمہ سنج باغ رضوان میں پہنچ گیا، اللہ تعالیٰ مدحِ نبویؐ کے طفیل میں ان کی مغفرت فرمائے۔

("م"، مارچ ۱۹۶۵ء)

یوسف، محمد، مولانا

مولانا محمد یوسف

شیخ التبلیغ مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پوری ملت اسلامیہ کا حادثہ ہے، اس وقت ہندوستان کی تمام جماعتوں میں تبلیغی جماعت اپنے اثرات و نتائج کے لحاظ سے سب سے زیادہ مفید کام انجام دے رہی ہے، اس نے لاکھوں نامسلمانوں اور منکروں کو مسلمان اور مسلمانوں کو مومن کامل اور اسلام کا مبلغ بنادیا، اس کے قافلے ساری دنیا میں رواں دواں ہیں، جس کی مثال قرونِ اولیٰ کے بعد نہیں ملتی، اور یہ سب نتیجہ ہے ایک صاحب عزیمت مردمومن مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاص وللہیت اور دینی تڑپ کا، ان کے بعد ان کے خلف الصدق مولانا محمد یوسف نے اس بار امانت کو سنبھالا، اور اس لگن سے اس کو چلایا کہ اس کا دائرہ ایشیا سے نکل کر افریقہ اور یورپ تک پھیل گیا، لیکن مشیت ایزدی کو کچھ اور منظور تھا، مولانا مرحوم تبلیغ کے سلسلہ میں لاہور تشریف لے گئے تھے کہ وقت موعود آ گیا، وہیں قلب کا دورہ پڑا اور مبلغ اسلام اپنے رب کے حضور حاضر ہوگیا، اللہ تعالیٰ ان کی دینی خدمات کو قبول اور ان کے مدارج بلند فرمائے، اللھم صب علیہ شابیب رحمتک و رضوانک یہ حادثہ اتنا سخت ہے کہ بظاہر اس کی تلافی کی امید نظر نہیں آتی لیکن اگر اللہ تعالیٰ کو اپنے دین کی تبلیغ اور اپنے محبوب کی امت کی اصلاح کا کام لینا منظور ہے تو اس کا کوئی نہ کوئی انتظام فرمادے گا۔

تبلیغی جماعت کی کامیابی کا راز اس کا اخلاص وللہیت ہے، وہ ہر قسم کے جماعتی تعصب اور گروہ بندی سے پاک، اختلافی مسائل سے الگ اور قیادت و اقتدار کی ہوس سے بلند ہے، اسی لیے اس میں ہر عقیدہ و خیال کے مسلمان شریک ہیں، اس کے مبلغ اپنا بار کسی پر نہیں ڈالتے، اپنے صرف سے خدا کی راہ میں نکلتے ہیں، کسی کی دعوت تک قبول نہیں کرتے مسجدوں میں ٹھہر کر مسلمانوں کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام سناتے ہیں اور ان پر عمل اور استقامت کی دعوت دیتے ہیں، ان کا دعوتی نظام ایسا موثر ہے کہ جس شخص کو بھی اس کے اجتماعات میں شرکت کا موقع مل جائے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ (''م''، اپریل ۱۹۶۵ء)

علوی، بدرالدین، مولانا

مولانا بدرالدین علوی

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینے مولانا بدرالدین صاحب علوی سابق استاد عربی مسلم یونیورسٹی نے وفات پائی مرحوم استاد العلماء مولانا لطف اللہ صاحب علی گڑھی کے تلمیذ رشید اور مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم کے ہمدرس تھے، ان کی پوری زندگی درس و تدریس اور علم و ادب کی خدمت میں گذری مسلم یونیورسٹی سے ریٹائر ہونے کے بعد گھر پر عربی کے شائقین کو درس دیتے تھے، انھوں نے عرصہ ہوا المختار بن شعر بشار بن برد پر اور اس کی شرح لابی الطاہر اسمٰعیل بن احمد التجیبی بڑے اہتمام سے تصحیح و تحشیہ کے ساتھ شائع کیا اللہ تعالیٰ اس شیدائے علم کی مغفرت فرمائے۔

(''م''، مارچ ۱۹۶۵ء)

سیف الدین، طاہر، ملا

ملا طاہر سیف الدین

گذشتہ دو مہینوں میں مسلمانوں کے دو بڑے قومی حادثے ہوئے، ۵/نومبر کو داؤدی بوہرون کے امام ملا طاہر سیف الدین نے انتقال کیا، ان کی ذات جامع صفات تھی، بڑے ذی علم، دیندار، فیاض و مخیّر اور وسیع القلب تھے، دینی علوم پر ان کی نگاہ بہت وسیع تھی، اس لحاظ سے وہ ہندوستان کے ممتاز علماء میں تھے، صاحبِ قلم بھی تھے، عربی میں ان کی کئی تصانیف ہیں، انھوں نے اپنے دور میں نہ صرف اپنے فرقہ کی بڑی تعلیمی و اقتصادی خدمت کی بلکہ دوسرے اسلامی فرقوں کے ساتھ بھی ان کا سلوک روادارانہ و فیاضانہ تھا، اور ان کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کی، مسلم یونیورسٹی کے تو چانسلر ہی تھے، اس کو وقتاً فوقتاً بڑی بڑی رقمیں دیتے رہتے تھے، دارالمصنفین کی جوبلی کے موقع پر اس کو بارہ ہزار کا عطیہ دیا، اس لیے ہر فرقہ کے مسلمانوں میں عزت و وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کے حسنات کے طفیل میں ان کی مغفرت فرمائے، دارالمصنفین اس حادثہ میں ان کے لائق جانشین ملا برہان الدین کا شریک غم ہے اور دعا ہے کہ خدا ان کو ان کے باعظمت والد کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (''م''، دسمبر ۱۹۶۵ء)

میرٹھی، بدرعالم، مولانا

مولانا بدرعالم میرٹھی

دوسرا حادثہ مولانا بدرعالم صاحب میرٹھی کی وفات کا ہے، مرحوم مولانا سید محمد انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ کے شاگرد رشید اور ہندوستان کے ممتاز عالم تھے، ان کی پوری زندگی دینی علوم خصوصاً حدیث نبوی کی خدمت، اس کی تعلیم و تدریس اور اس سے متعلق تالیف و تصنیف میں گزری، مختلف اوقات میں دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ ڈابھیل کے مدرس رہے، کچھ دنوں تک ندوۃ المصنفین سے بھی تعلق رہا، پھر ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے، وہاں بھی درس و افاضہ کا سلسلہ جاری رہا، چند برسوں کے بعد دیار حبیب کی کشش مدینہ طیبہ کھینچ لے گئی اور دس بارہ سال تک جوار رسول میں حدیث رسول کی

خدمت انجام دیتے رہے، بالآخر اس آستانہ پر گزشتہ اکتوبر میں جان دی، سلوک و تصوف کا بھی وافر حصہ ملا تھا، ان کے دو بڑے علمی و دینی کارنامے ہیں، مولانا انور شاہؒ کے درس بخاری کی تقریروں کی جمع و تدوین جو فیض الباری کے نام سے مصر سے چھپ کر شائع ہوچکی ہے۔ اردو میں ترجمان السنۃ کی ضخیم جلدیں جو ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی ہیں، ان کی وفات سے ایک بڑی علمی و دینی شخصیت اٹھ گئی، اللہ تعالیٰ صاحب حدیث صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں حدیث و سنت کے اس خدمت گزار کی مغفرت فرمائے۔ (''م''، دسمبر ۱۹۶۵ء)

شاستری، لال بہادر، شری

لال بہادر شاستری

پنڈت جواہر لال نہرو کا غم ابھی فراموش نہ ہوا تھا کہ ملک نے ایک اور لعل بے بہا کھودیا، شری لال بہادر شاستری کی موت ہندوستان کا عظیم ترین حادثہ ہے۔ ان کی موت سے ہندوستان ایک ایسے فرزند سے محروم ہوگیا جس کی تلافی مدتوں نہ ہوسکے گی، انھوں نے ملک وقوم کی خاطر غریب الوطنی میں جان دی اور مرنے سے پہلے ایک ایسا کارنامہ انجام دے گئے جو ہند و پاک کی تاریخ میں یادگار رہے گا، مگر افسوس کہ اس کے خوشگوار نتائج اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکے، پنڈت جواہر لال نہرو کی زندگی ہی میں یہ سوال پیدا ہوگیا تھا کہ ان کے بعد کوئی ایسی شخصیت نظر نہیں آتی جو وزارت عظمیٰ کے بارگراں کو سنبھال سکے، لیکن شاستری جی نے اٹھارہ مہینہ کی مختصر مدت میں یہ ثابت کردیا کہ وہ پنڈت جی کے صحیح جانشین تھے۔ اس قلیل مدت میں بڑے پیچیدہ اور نازک معاملات پیش آئے، لیکن شاستری جی نے اپنے فہم و تدبر اور ہمت و پامردی سے ان کا پورا مقابلہ کیا، معاہدہ تاشقند تو ان کے اور جنرل ایوب کے تدبر کا شاہکار ہے، گو اس سے سب مختلف فیہ مسائل حل نہیں ہوگئے، لیکن ہندوستان اور پاکستان کی ہلاکت خیز جنگ کا خاتمہ ہوگیا، اور صلح و مسالمت کی ایسی فضا پیدا ہوگئی ہے کہ اگر فریقین نے ہوشمندی سے کام لیا تو ہندوستان و پاکستان کے درمیان مصالحت اور دوستی کا خوشگوار دور شروع ہوسکتا ہے۔

شاستری جی بڑے ٹھنڈے دل و دماغ کے اور طبعاً نرم مزاج، صلح جو اور امن پسند انسان تھے، لیکن سختی کے موقع پر سخت اور ہمت و استقلال کا پیکر بن جاتے تھے، انھوں نے اپنی سلامت روی اور ہوشمندی سے ملک کو بڑے نازک حالات سے نکالا، افسوس ہے کہ اس کو ان کی صلاحیتوں سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا موقع نہ مل سکا، لیکن یہ ملک کی خوش قسمتی ہے کہ شاستری جی کی جانشینی ایک ایسی شخصیت کے حصہ میں آئی ہے جو اپنے نامور باپ کے بہت سے اوصاف و خصوصیات کی حامل ہے، اس لئے یقین ہے کہ ملک پنڈت جواہر لال نہرو کی قائم کی ہوئی راہ پر گامزن رہے۔

(''م''، فروری ۱۹۶۶ء)

محرومؔ، تلوک چند

تلوک چند محرومؔ

مشہور استاد سخن تلوک چند مرحوم کی وفات ادبی دنیا کا افسوس ناک سانحہ ہے، وہ ہماری پرانی بزم ادب کی یادگار تھے، اردو شاعری کے اساتذہ میں ان کا نہایت ممتاز مقام تھا، فن شاعری پر ان کی نظر بڑی گہری اور وسیع تھی، اور ان کا کلام جدت وقدامت کے صالح عناصر کا سنگم تھا، ان کو ہر صنف شاعری پر یکساں قدرت حاصل تھی، ان میں پرانی تہذیب کی بہت سی خوبیاں اور وضع داریاں جمع تھیں، ان کا دل دوسرے مذاہب اور اس کے بزرگوں کے لئے بھی وسیع تھا، بارگاہ نبویؐ میں بھی ہدیۂ عقیدت پیش کرتے تھے، قوم و ملک نے بھی ان کے کمالات کی پوری قدر دانی کی اور ان کو ہر طرح کے اعزاز واکرام سے نوازا، ان کی پوری زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزری، اپنے بعد متعدد ادبی یادگاریں چھوڑ گئے، ان کی مادی یادگار مشہور شاعر جگن ناتھ آزاد ہیں، جنھوں نے اپنے محترم والد کی بہت سی خوبیاں حصہ میں پائی ہیں۔ (''م''، فروری ۱۹۶۶ء)

کاکوروی، احترام علی، منشی

منشی احترام علی کاکوروی صاحب

افسوس ہے کہ منشی احترام علی صاحب کاکوروی نے ایک طویل علالت کے بعد انتقال کیا، وہ ایک نامور باپ منشی احتشام علی صاحب مرحوم رئیس کاکوروی کے فرزند اور خود بھی بڑی خوبیوں کے انسان تھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ان کو موروثی تعلق تھا، وہ اس کے معتمد مال تھے، ایک زمانہ میں لکھنؤ کے مقامی قومی کاموں میں بھی حصہ لیتے تھے، لیکن ادھر کچھ دنوں سے خانہ نشینی کی زندگی اختیار کرلی تھی لکھنؤ کا مسلم یونیورسٹی کنونشن ان ہی کی کوشش کا نتیجہ تھا، وہ پشتینی رئیس تھے، لیکن طبعاً نہایت متواضع، خلیق اور شرفائے اودھ کی تہذیب وشرافت کا نمونہ تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

(''م''، فروری ۱۹۶۶ء)

نیاز فتح پوری

نیاز فتح پوری

گزشتہ مہینہ نیاز فتح پوری کی وفات اکیاسی (۸۱) سال کی عمر میں کراچی میں ہوگئی، معارف کو ان کی پچھلی زندگی میں ان کے بعض دلآزار مذہبی مضامین سے بڑا اختلاف رہا، لیکن انھوں نے اظہار انابت کرکے آخر میں مذہبی دلآزادی چھوڑ دی تھی،

ان کے علمی ذوق میں بڑی رنگارنگی تھی، رسالہ نگار کے اڈیٹر ہونے کے ساتھ، مذہب تاریخ، سوانح، ناول نگاری، افسانہ نویسی اور شعر وادب پر بھی طبع آزمائی کرتے رہے اپنے بعض مذہبی مضامین کی وجہ سے تو مطعون ہوئے، اچھے مورخ اور اچھے سوانح نگار بھی نہ ہوسکے، لیکن ان کا نام اچھے ناول نگار عمدہ افسانہ نویس اور شعر وادب کے بلند پایہ نقاد کی حیثیت سے اردو زبان کی تاریخ میں خصوصیت کے ساتھ برابر لیا جائے گا، وہ اپنے رسالہ نگار کے ذریعہ جو علمی وادبی خدمت انجام دیتے رہے وہ بھی ان کے اہم کارناموں میں شمار ہوگا، دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی کمزوریوں کو اپنے دامن عفو میں جگہ دیں اور ان کو اپنی رحمت ومغفرت سے سرفراز فرمائیں، آمین۔

(''ص۔ع''، جون ۱۹۶۶ء)

یار جنگ، ناظر، نواب

نواب ناظر یار جنگ

نواب ناظر یار جنگ مرحوم ہماری پرانی بزم کی یادگار تھے، اس کی ساری خوبیاں ان میں جمع تھیں، وہ ایک بڑے باپ مولوی نظام الدین حسن مرحوم کے فرزند، خود حیدرآباد ہائیکورٹ کے جج اور اپنے اوصاف کے اعتبار سے بڑے آدمی تھے، وہ علی گڑھ کالج کے ابتدائی دور کے اولڈ بوائے تھے، اب شائد ہی ان کا کوئی معاصر زندہ ہو اور آخر تک ان کو اس سے وابستگی رہی، مدتوں مسلم یونیورسٹی کورٹ اور ایگزیکیٹو کونسل کے ممبر اور اس کے کاموں میں عملی حصہ لیتے رہے، ججی کے عہدے سے عرصہ ہوا ریٹائر ہوچکے تھے اور اپنا وقت حیدرآباد کے قومی وملی کاموں میں صرف کرتے تھے، دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے پرانے رکن اور اس کے ہمدرد وہواخواہ تھے، ان سب سے بڑھ کر وہ عملاً مردمومن تھے، ان کی موت سے ایک پرانی یادگار مٹ گئی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ (''م''، ستمبر ۱۹۶۶ء)

قطب، سید

سید قطب

اخوان المسلمین کے مشہور رہنما سید قطب اور ان کے تین ساتھیوں کو ناصر کے خلاف سازش کے جرم میں پھانسی دے دی گئی اور دوسرے لیڈروں کو مختلف المیعاد قید کی سزائیں دی گئیں ہیں جن میں بعض عورتیں بھی ہیں، یہ کوئی خلاف توقع خبر نہیں، ناصر مختلف حیلوں سے اخوان کو ختم کردینے پر تل گئے ہیں، حجاز میں ان پر ناصر کے وحشیانہ مظالم کے جو واقعات معلوم ہوئے تھے، ان کو سن کر الجزائر کے مسلمانوں پر فرانس کے مظالم کی یاد تازہ ہوگئی تھی، یہ وہ دینی شخصیتیں تھیں، جن کے بارے میں کسی سازش کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا لیکن اعلاء کلمۃ اللہ کی تاریخ نیا واقعہ نہیں ہے، بہت سے اصحاب دعوت وعزیمت کو اس راہ سے گزرنا پڑا ہے، گویہ واقعہ ساری دنیائے اسلام کے لیے المناک ہے، لیکن سید قطب اور ان کے رفقا، شہید فی سبیل اللہ کے درجہ عالی پر سرفراز ہوئے اور دعوت وعزیمت کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ کے لیے روشن ہوگیا، اللہ تعالیٰ ان شہدائے حق پر اپنی رحمت کے پھول برسائے۔ (''م''، ستمبر ۱۹۶۶ء)

حسن، مجید، مولوی

مولوی مجید حسن

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینے مدینہ اخبار کے بانی مولوی مجید حسن صاحب مرحوم نے وفات پائی، وہ اردو صحافت کے سب سے پرانے رکن تھے، موجودہ اردو اخبارات میں مدینہ سے پرانا اخبار کوئی نہیں، اب تو بہت سے روزنامے نکلتے ہیں، اس لیے سہ روزہ اخبار کی کوئی قدر نہیں رہ گئی، ایک زمانہ میں مدینہ دیہات دیہات میں پھیل ہوا تھا اور بہت سے ہونہار اہل قلم نے اس کی بدولت شہرت حاصل کی، مدینہ شروع سے قوم پرور رہا اور اس نے ملک وملت دونوں کی یکساں خدمت انجام دی، مدینہ سے متعدد اہم مذہبی کتابیں شائع ہوئیں، اللہ تعالیٰ اس کے بانی کی مغفرت فرمائے۔

(''م''، دسمبر ۱۹۶۶ء)

تنہا، محمد یحییٰ، مولوی

مولوی محمد یحییٰ تنہا

افسوس ہے کہ گزشتہ رمضان میں مولوی محمد یحییٰ تنہا مرحوم نے کراچی میں انتقال کیا، مرحوم اردو زبان کے مشہور اہل قلم، اس کے پرانے خدمت گزار اور متعدد کتابوں کے مصنف ومترجم تھے، ان کی سب سے مشہور ومفید کتاب سیر المصنفین اور مراۃ الشعراء ہے، دونوں دو جلدوں میں ہیں، سیر المصنفین میں شروع سے لے کر موجودہ دور تک کے مصنفین کے حالات اور ان کی تصانیف پر تبصرہ ہے، اس میں اردو کی پوری تاریخ آگئی ہے، مراۃ الشعراء اردو کے شعراء کا تذکرہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

(''م''، فروری ۱۹۶۷ء)

خان، میر عثمان علی، نواب

نواب میر عثمان علی خان

افسوس ہے کہ آصف جاہی خاندان کے آخری فرمانروا نظام الملک آصفجاہ نواب میر عثمان علی خاں نے ۲۴؍ فروری کو جان جاں آفریں کے سپرد کری، وہ محض ایک والی ملک نہیں بلکہ اپنے اوصاف اور کارناموں کے لحاظ سے پوری تاریخ اور ایک عہد تھے،

آصف جاہی حکومت اپنی تہذیب و روایات اور آئین و آداب میں تیموری حکومت کی جانشین تھی، اور میر عثمان علی خاں اس کی آخری یادگار تھے، انھوں نے اپنے دور میں جو گوناگوں کارنامے انجام دیے اس کی مثال ہندوستان کے کسی والی ریاست میں نہیں مل سکتی ہندوستان کا کوئی قومی و ملی ادارہ ان کی فیاضی سے محروم نہ تھا اور ان کا ابر کرم بلاتفریق مذہب وملت سب پر یکساں برستا تھا، ان کی ذات سے سیکڑوں حاجت مند خاندانوں اور ہزاروں غرباء پرورش پاتے تھے، ان کی علم نوازی نے ہندوستان کے ہر فن کے اہل کمال کو حیدرآباد میں جمع کرکے بغداد و قرطبہ کی یاد تازہ کردی تھی، ان کا سب سے بڑا کارنامہ عثمانیہ یونیورسٹی ہے، جس میں جملہ جدید علوم کی تعلیم اردو زبان میں ہوتی تھی اور اس کے تعلیم یافتہ استعداد و قابلیت میں ہندوستان کی کسی یونیورسٹی کے طلبہ سے کم نہ تھے، یہ یونیورسٹی پورے ایشیا کے لیے قابل فخر تھی، مگر افسوس اندھے تعصب نے اس کو ختم کردیا اور اس کا بیش قیمت علمی ذخیرہ ردی بن کر رہ گیا جو پوری علمی دنیا کا سانحہ ہے۔

دولت کے لحاظ سے میر عثمان علی خاں دنیا کے امیر ترین آدمیوں میں تھے، حکومتوں اور بڑے بڑے بینکوں کو چھوڑ کر نقد سونے کی شکل میں اتنی دولت شاید ہی کسی فرد واحد کے پاس نکل سکے، اس ثروت کے ساتھ ان کی زندگی اتنی سادہ تھی کہ اس کا قیاس کرنا مشکل ہے، ان سے بعض غلطیاں بھی ہوئیں جو ان کے غلط اندیش مشیروں کا نتیجہ تھیں، جس سے ریاست حیدرآباد اور یہاں کے مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اور خود نظام کی زندگی کا آخری زمانہ بڑی بیچارگی میں گذرا، ورنہ ریاست حیدرآباد کا اس افسوسناک شکل میں خاتمہ نہ ہوتا، مگر غلطیوں سے کون انسان خالی ہے، اللہ تعالیٰ ان کو معاف اور ان کے اعمال خیر کے صلہ میں ان کی مغفرت فرمائے، ان کی موت سے ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا۔ والبقاء للہ وحدہ۔ (''م''، مارچ ۱۹۶۷ء)

اثرلکھنوی، جعفرعلی خاں، نواب

نواب جعفرعلی خاں اثرلکھنوی

افسوس ہے کہ ۶ جون کو نواب جعفرعلی خاں اثرلکھنوی نے انتقال کیا، وہ اس دور کے استاد فن شاعر اور اردو زبان و ادب کے نامور محقق تھے، اس کے جملہ متعلقات پر ان کی نظر بڑی گہری اور محققانہ تھی، اور اس میں ان کا قول سند کی حیثیت رکھتا تھا، ان کی ذات لکھنؤ کی تہذیب و شائستگی اور قدیم شرافت و وضعداری کا نمونہ تھی، ان کی زندگی کا بڑا حصہ سرکاری ملازمت میں گذرا، کلکٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے لیکن تصنیف و تالیف و تلاش و تحقیق کا مشغلہ ہمیشہ جاری رہا اور انھوں نے اردو زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں پر محققانہ مضامین اور مستقل کتابیں لکھیں، ان کا سب سے بڑا کارنامہ فرہنگ اثر ہے جس کی پہلی جلد شائع ہوچکی ہے، ان کی وفات سے اردو زبان کا ایک بڑا محقق اٹھ گیا، اور قدیم تہذیب کی ایک اہم یادگار مٹ گئی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ (''م''، جون ۱۹۶۷ء)

ندوی، مسعود علی، مولانا

مسعود علی ندوی

کاروان شبلی کا آخری مسافر

دارالمصنفین کے تین معمار تھے، حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا عبدالسلام صاحب ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی اول الذکر دونوں بزرگ بہت پہلے اس دنیا سے اٹھ چکے تھے، اس قافلہ کے آخری مسافر مولانا مسعود علی صاحب ندوی نے بھی ۲۷؍ اگست کو جنت کی راہ لی، ان تینوں نے مل کر دارالمصنفین کو پروان چڑھایا تھا، حضرت سید صاحب اور مولانا عبدالسلام صاحب نے علمی حیثیت سے دارالمصنفین کا نام اونچا کیا، اور اس کی شہرت کو عالمگیر بنایا اور مولانا مسعود علی صاحب نے انتظامی حیثیت سے اس کو ترقی دی اور اس کا مقامی وقار قائم کیا۔

مرحوم سراپا قوت و عمل تھے، انھوں نے اپنے دور میں بڑے بڑے عملی کام کئے اور مولانا شبلی سے نسبت رکھنے والے اداروں کو فائدہ پہنچایا، دارالمصنفین کی تمام عمارتیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء کی عالیشان مسجد، شبلی کالج کا وسیع کانوکیشن ہال انھی کے ذوق تعمیر کی یادگار ہیں، جب تک یہ عمارتیں قائم ہیں، ان کا نام زندہ رہے گا، ایک زمانہ میں سیاسی اور قومی کاموں میں بھی سرگرمی سے حصہ لیا، خلافت اور ترک موالات کی تحریک کے زمانہ میں سید صاحب کی شخصیت اور مولانا مسعود علی صاحب کی عملی جدوجہد نے دارالمصنفین کو سیاسی کاموں کا مرکز بنادیا تھا، اس زمانہ کا کوئی بڑا لیڈر ایسا نہیں ہے جس نے دارالمصنفین کا طواف نہ کیا ہو، ان سب سے مولانا کے دوستانہ تعلقات تھے، پورے ضلع میں ان کا طوطی بولتا تھا، یہاں کے سارے کاموں کے روح رواں وہی تھے، ان کے بغیر کسی تحریک میں جان نہیں پڑتی تھی، اب تو زمانہ بہت آگے بڑھ گیا ہے، ایک زمانہ میں وہ اعظم گڑھ میں تہذیب کے بھی معلم سمجھے جاتے تھے، انھوں نے یہاں کا تہذیبی معیار بلند کردیا تھا، غرض ایک عرصہ تک وہ اعظم گڑھ کی پوری زندگی پر چھائے رہے، ان کے یہاں ہر وقت ایک دربار لگا رہتا تھا۔

ان میں فطری دبدبہ تھا، عملی کاموں میں ان کی انتظامی قابلیت سے زیادہ ان کا دبدبہ کام دیتا تھا، بڑے خوش سلیقہ، خوش مذاق اور خوش گفتار تھے، جس محفل میں بیٹھتے تھے اپنی باتوں سے چھا جاتے تھے، رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ بڑی سے بڑی شخصیت سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے اور نہ دب کر ملے، ادھر دس بارہ سال سے ان کی علالت کا سلسلہ

چل رہا تھا اور وہ دارالمصنفین کے کاموں سے بھی معذور ہوگئے تھے، کئی سال سے بالکل صاحب فراش تھے، آخری چند مہینوں میں ہوش و حواس نے بھی جواب دے دیا تھا اور وہ زندگی کا محض سایہ رہ گئے تھے لیکن یہ سایہ بھی بہت غنیمت تھا، افسوس ہے کہ وہ بھی ختم ہوگیا اور وہ دارالمصنفین کے عہدگل کی آخری یادگار بھی مٹ گئی، والبقاء للہ وحدہ، اللہ تعالیٰ ان کے اعمال حسنہ کے صلہ میں ان کی مغفرت فرمائے۔ (''م''، ستمبر ۱۹۶۷ء)

وصی اللہ، شاہ، مولانا

مولانا شاہ وصی اللہ رحمۃ اللہ

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ رحمۃ اللہ کی وفات سے رشد و ہدایت کا ایک روشن چراغ گل ہوگیا، وہ اس دور کے بڑے شیخ طریقت اور سالکین کی اصلاح و تربیت میں اپنے مرشد حضرت مولانا تھانویؒ کا مثنی تھے، ان کی وفات کے بعد ان کی ذات طالبین کا مرجع بن گئی تھی، ان سے ایک مخلوق فیضیاب ہوئی، ان کی اصلاح و تربیت سے ہزاروں بگڑی ہوئی زندگیاں سنور گئیں، گم کردہ راہوں کو راہ راست اور تاریک دلوں کو ایمان کی روشنی ملی ادھر چند برسوں سے جب مولانا نے اپنے وطن فتح پور تال نرجا کا گوشۂ عافیت چھوڑ کر الہ آباد کا قیام اختیار فرمایا، آپ کا فیض پورے ہندوستان میں پھیل گیا تھا، جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا مرجوعہ خاص طور سے بہت بڑھ گیا تھا اور اس کی خصوصیت سے زیادہ فائدہ پہنچا۔

حضرت مولانا خلقۃً نحیف و ناتواں تھے، عمر کے تقاضے اور فالج کے اثر نے اور کمزور کر دیا تھا، اس کے باوجود آپ کے معمولات اور فیض رسانی میں فرق نہ آیا تھا، اسی حالت میں گزشتہ شعبان میں حج کا قصد فرمایا، مگر وقت موعود آچکا تھا، جہاز کی روانگی کے کل دو دن بعد ۲۵ نومبر کی شب کو تہجد کی نماز سے فراغت کے بعد اور فجر کی نماز سے پہلے روح مبارک عالم قدس میں پہنچ گئی، جہاز کے قاعدہ کے مطابق ہر متوفی کی لاش تجہیز و تکفین کے بعد سمندر کی موجوں کے حوالے کر دی جاتی ہے، مگر جس دربار سے طلبی ہوئی تھی، اسی نے اس کا انتظام بھی کر دیا کہ لاش کو جدہ لے جانے کی اجازت مل گئی، اور یقین ہے کہ اس وقت تک جسدِ خاکی کو جنت البقیع کی مقدس سرزمین میں سپرد خاک کر دیا گیا ہوگا۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا،

حضرت مولانا کی وفات سے رشد و ہدایت کی ایک بڑی مسند خالی ہوگئی، اللہ تعالیٰ ان کے مدارج بلند فرمائے، آپ کے متوسلین ''معرفتِ حق'' کے نام سے ایک پرچہ نکالتے ہیں، حضرت مولانا کی اصلاحی تقریریں ملفوظات اور اصلاح و تربیت کے متعلق سوالات و جوابات شائع ہوتے ہیں، یہ ملفوظات اصلاح و تربیت کے نصاب کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ حضرت مولانا تھانویؒ کے مواعظ و ملفوظات کی طرح ان کو بھی کتابی شکل میں شائع کیا جائے تا کہ ان کا افادہ مستقل قائم رہے۔ (''م''، دسمبر ۱۹۶۷ء)

بلیاوی، محمد ابراہیم، مولانا

مولانا محمد ابراہیم بلیاوی

ابھی مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کا غم تازہ تھا کہ ایک اور بزرگ ہستی کا سایہ اٹھ گیا، رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی صدر مدرس دارالعلوم دیوبند نے وفات پائی مرحوم اس دور کے نامور عالم دین اور صاحب تقویٰ بزرگ تھے تقریباً نصف صدی تک دینی علوم کے درس کی خدمت انجام دی اور ان کے چشمۂ فیض سے ہزاروں تشنگان علم سیراب ہوئے، ان کی وفات سے علم و عمل، درس و تدریس اور تدین و تقویٰ کی ایک بڑی یادگار مٹ گئی اللہ تعالیٰ ان کے مدارج بلند فرمائے۔ (''م''، جنوری ۱۹۶۸ء)

ابراہیم، محمد، حافظ

حافظ محمد ابراہیم

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینے حافظ محمد ابراہیم صاحب نے وفات پائی، مرحوم پرانے قوم پرور اور اس دور کے کانگریسی تھے جس کی یادگاریں اب بہت کم پائی ہیں، اپنے حسن اخلاق اور خدمت کی بنا پر اپنے حلقہ میں بڑے مقبول اور اپنا ذاتی اثر رکھتے تھے، انھوں نے لیگ اور کانگریس کے بڑے معرکے کے الیکشن میں لیگی امیدوار کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کی اور کانگریس کا وقار قائم کیا اتر پردیش اور مرکزی حکومت میں وزیر رہے، آخر میں کچھ دنوں تک گورنری بھی کی، اگرچہ وہ بڑے وفادار کانگریسی تھے، لیکن آخر میں ان کو خود اپنی جماعت سے دھوکا اٹھانا پڑا اور ان کی زندگی کا آخری دور پریشانی میں گذرا۔

مرحوم بڑے مرنجان مرنج تھے، مسلمانوں کے معاملات میں بھی ان کی روش یہی تھی، انھوں نے نہ ان کو فائدہ پہنچایا نہ نقصان، ان معاملات میں وہ خاموشی سے کام لیتے تھے، بڑے خوش اخلاق تھے، ہر شخص کو اپنی باتوں سے خوش کرنے کی کوشش کرتے تھے، جب دارالمصنفین کے لوگوں سے ملاقات ہوتی تو بڑی خصوصیت ظاہر کرتے، ایک مرتبہ یہاں تک آمادگی ظاہر کی کہ وہ خود دارالمصنفین آکر اس کی مالی حالت مضبوط کرنے کی کوشش کریں گے مگر اس کی نوبت نہ آسکی، اب قوم پرور مسلمانوں میں ایسے لوگ نہ ملیں گے، ان کی وفات سے ایک پرانی یادگار مٹ گئی اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ (''م''، فروری ۱۹۶۸ء)

دیسنوی، سعید الحق

سعید الحق دیسنوی

حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک لائق عزیز سعید الحق دیسنوی پاکستان ریڈیو میں ایک بڑے عہدہ پر ممتاز تھے، ان کو حضرت سید صاحب سے قلبی لگاؤ تھا، انھوں نے ان پر انگریزی اخبارات و رسائل میں کئی مضمون لکھے، ان کی مشہور تصنیف خطبات مدراس کا انگریزی میں ترجمہ کیا، جو شائع ہو چکا ہے، ان کی دوسری تصنیف عرب و ہند کے تعلقات کا بھی ترجمہ کیا جو بالاقساط اسلامک کلچر حیدرآباد میں شائع ہوا، مشرقی پاکستان کی سلیمان اکیڈمی کے بھی بانیوں میں تھے، افسوس ہے کہ گزشتہ مہینہ ان کا انتقال ہوگیا اور ان کی ذہانت اور صلاحیت سے جو امیدیں تھیں وہ پوری نہ ہوسکیں، ان کی کل عمر اٹھاون سال تھی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ (''م''، اپریل ۱۹۶۸ء)

ندوی، نجیب اشرف، سید

سید نجیب اشرف ندوی

افسوس ہے کہ دارالمصنفین کی پرانی بزم کے ایک ممتاز رکن اور ندوہ کے نامور فرزند سید نجیب اشرف صاحب ندوی نے ۴؍ستمبر کو بمبئی میں انتقال کیا، مرحوم دارالمصنفین کے ابتدائی دور کے رفقاء میں تھے، سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہم وطن اور قریبی عزیز تھے، ان کی ندوہ کی مدرسی کے زمانہ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے، مگر ابتدائی تعلیم کے بعد ہی انگریزی کی طرف چلے گئے، پھر خلافت اور نان کواپریشن کی تحریک کے زمانہ میں تعلیم ترک کر کے ۱۹ یا ۲۰ء میں دارالمصنفین آگئے اور ان تحریکوں میں سرگرم حصہ لیا، ان کے خاتمہ کے بعد کلکتہ میں تعلیم کی تکمیل کی اور فارسی میں ایم۔اے کیا، وہ بڑے ذہین اور ہونہار تھے، ان کی اٹھان بہت اچھی تھی، چنانچہ کلکتہ کے قیام کے زمانہ میں سرجدو ناتھ سرکار کی زیرنگرانی اورنگزیب کے رقعات جمع اور مرتب کیے اور اس پر ایک مبسوط اور ضخیم مقدمہ لکھا، جو مقدمہ رقعات عالمگیر کے نام سے ایک مستقل جلد میں شائع ہوا، اس میں فن انشاء اور شاہانہ احکام و مراسلات کی تاریخ اور عالمگیر کی انشاء کی خصوصیات وغیرہ پر روشنی اور اس کی شہزادگی سے لے کر برادرانہ جنگ کے زمانہ تک کے واقعات و سوانح پر ان مکاتیب کی روشنی میں تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے، اس لیے یہ مقدمہ اس دور کی اورنگزیب کی مستندترین تاریخ ہے، اس کے بعد اصل کتاب رقعات کا پہلا حصہ رقعات عالمگیر جلد اول کے نام سے شائع ہوا جو اورنگزیب کی شاہزادگی کے زمانہ سے لے کر برادرانہ جنگ کے زمانہ تک کے خطوط پر مشتمل ہے باقی جلدوں کا مواد بھی اکٹھا کرلیا تھا، جس کی ترتیب کا موقع تعلیمی زندگی اختیار کرلینے کی وجہ سے نہ مل سکا، دارالمصنفین کے قیام کے زمانہ میں معارف کی سب اڈیٹری کے فرائض بھی انجام دئے، اس دور کے بہت سے مضامین ان کی یادگار ہیں۔

۱۹۳۰ء میں احمد آباد کے کسی کالج میں فارسی کے لکچرر مقرر ہوگئے، پھر دو ہی تین سال کے بعد اندھیری بمبئی کے اسمٰعیل کالج میں چلے گئے، اس سے ریٹائر ہونے کے بعد اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ انجمن اسلام کے ڈائرکٹر مقرر ہوگئے۔ جہاں اردو کے ریسرچ اسکالروں کی رہنمائی کرتے تھے اور اس کے رسالے نوائے ادب کے اڈیٹر بھی تھے، اور کبھی کبھی اس کے لیے مضامین بھی لکھتے تھے اسمٰعیل کالج سے ریٹائر ہونے کے بعد اندھیری میں ایک پرفضا مقام پر ایک چھوٹا سا خوبصورت بنگلہ بنوالیا تھا، اور بمبئی میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی، انھوں نے یہاں ایک علمی حلقہ بھی پیدا کرلیا تھا لیکن بعد میں بجھ سے گئے تھے، ادھر کئی سال سے ان کی صحت خراب رہتی تھی اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا کام عملاً ان کے لائق شاگرد اور جانشین عبدالرزاق صاحب قریشی انجام دیتے تھے بعض خانگی حوادث نے ان کی صحت اور گرادی تھی، اسی میں انتقال کیا، مرحوم بڑے ذہین و طباع تھے، ان کا مطالعہ نہایت وسیع تھا، مگر افسوس ہے کہ تعلیمی لائن میں آنے کے بعد تصنیفی شغل قائم نہ رکھ سکے، ورنہ ان کا شمار ہندوستان کے چوٹی کے مصنفین میں ہوتا، جس پر ان کی کتاب مقدمہ رقعات عالمگیر شاہد ہے، جو ان کی نوجوانی کی تصنیف ہے طبعاً بڑے مرنجا مرنج اور شگفتہ مزاج تھے، مزاج میں ایک معصوم لڑکپن تھا، جو آخر عمر تک قائم رہا، جب ان سے ملاقات ہوتی تھی تو ان کی باتوں سے پرانی صحبتیں یاد آجاتی تھیں، آخری مرتبہ سفر حج کے موقع پر ۶۶ء میں ملاقات ہوئی تھی، کیا معلوم تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے، عمر میں مجھ سے چند سال بڑے تھے، دارالمصنفین سے ان کے گوناگوں تعلقات تھے، اس لیے ان کی موت ہم سب، خاص طور سے ان کے لڑکوں اور ان کے لائق بھانجے شہاب الدین دیسنوی پرنسپل صابو صدیق ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کے لیے بڑا سانحہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت اور جملہ متعلقین کو صبر و سکون عطا فرمائے۔

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

(''م''، ستمبر ۱۹۶۸ء)

جعفری، رئیس احمد

رئیس احمد جعفری

سید نجیب اشرف صاحب مرحوم کی موت کا زخم ابھی تازہ تھا کہ ندوے کے ایک اور نامور فرزند رئیس احمد جعفری نے بھی داغ مفارقت دیا، اکتوبر کی آخری تاریخوں میں پاکستان میں ان کا انتقال ہوا، جوار لکھنؤ کا قصبہ خیرآباد ان کا وطن تھا، مشہور شاعر، ریاض خیرآبادی کے نواسے تھے، راقم جب ندوہ میں آخری درجوں میں تھا، مرحوم ابتدائی درجوں میں تھے، عربی کی تعلیم کے بعد جامعہ ملیہ میں انگریزی کی تعلیم حاصل کی، پھر

خلافت اخبار بمبئی کے اڈیٹوریل اسٹاف میں ملازم ہوگئے، بعد میں اس کے اڈیٹر بھی ہوگئے تھے، قیام پاکستان کے بعد لاہور چلے گئے۔

مرحوم میں تالیف و تصنیف کا ذوق فطری تھا، طالب علمی کے زمانے میں بھی خامہ فرسائی کیا کرتے تھے، ان کے قلم میں بڑا زور تھا، جس پر ان کی پہلی تصنیف سیرت محمد علی شاہد ہے، اس وقت ان کی عمر پچیس چھبیس سال سے زیادہ نہ رہی ہوگی، بڑے زودنویس تھے، ان کا قلم ہمیشہ رواں دواں رہتا تھا، بڑی بڑی ضخیم کتابیں چند دن میں لکھ ڈالتے تھے، ادب و افسانے سے لے کر تاریخ و مذہبیات تک میں ان کے قلم کی جولانی یکساں تھی، ہر صنف میں ان کی تصانیف موجود ہیں، اس دور کے مصنفین میں کثرت تصانیف کے لحاظ سے ان کا نام سرفہرست ہوگا، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کے قیام کے بعد اس سے متعلق ہوگئے تھے، اور اس کے لیے کئی کتابیں لکھیں، اس کے رسالہ ثقافت اسلامیہ حال المعارف میں ان کے مضامین نکلتے رہتے تھے، اس کے تازہ اکتوبر نمبر میں بھی ان کا ایک مضمون ''عالم اسلام سے مسلمانان برعظیم کی وابستگی'' شائع ہوا ہے، کیا خبر تھی کہ یہ ان کا آخری مضمون ہے۔ (''م''، نومبر ۱۹۶۸ء)

حمید الدین، مولانا

مولانا حمید الدین

گزشتہ مہینہ مولانا حمید الدین صاحب محدث اور ان کے ایک کمسن نواسے مولانا اسعد مدنی کے صاحبزادے نے کار کے حادثہ میں وفات پائی، مرحوم مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے قریبی عزیز تھے، ان کی پوری زندگی دینی علوم خصوصاً حدیث نبوی کی خدمت میں گزری، ابتداء میں دارالعلوم دیوبند میں مدرس تھے، کچھ دنوں تک دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بھی حدیث کا درس دیا، ادھر عرصہ سے مدرسہ عالیہ کلکتہ میں شیخ الحدیث تھے، علم کے ساتھ عمل اور اصلاح و تقویٰ کے زیور سے بھی آراستہ اور طبعاً خاموش، متین اور مرنجان مرنج انسان تھے، یہ المناک حادثہ بجائے خود ایک طرح کی شہادت ہے۔ اللہ تعالیٰ، حدیث نبوی کے اس خادم کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے، دارالمصنفین اس حادثہ میں مولانا اسعد مدنی کا شریک غم ہے۔ (''م''، دسمبر ۱۹۶۸ء)

عثمانی، لقاء اللہ، مولانا

مولانا لقاء اللہ عثمانی

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینہ مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی نے وفات پائی، مرحوم تحریک خلافت کے دور کی یادگار تھے، ایک زمانہ میں قومی و ملی تحریکوں میں ان کا نمایاں حصہ رہا، ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ۴۷ء کے خونیں ہنگامے میں جب پانی پت مسلمانوں سے خالی ہوگیا تھا، اس کی مسجدیں ویران اور خانقاہیں سونی ہوگئی تھیں، ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی اور انھوں نے اپنے جدامجد حضرت جلال الدین کبیر الاولیاءؒ کا آستانہ نہ چھوڑا، ان کے اس استقلال سے مسلمانوں کے اکھڑے ہوئے قدم دوبارہ جم گئے اور ان کی دینداری اور حسن اخلاق سے وہ شرنارتھی جو مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے ان کے عقیدت مند بن گئے اور آج پانی پت میں جو مسلمان نظر آتے ہیں، وہ سب ان کے استقلال اور قوت ایمانی کا نتیجہ ہے، اللہ تعالیٰ اس مرد مجاہد کے مراتب بلند فرمائے۔ (''م''، جنوری ۱۹۶۹ء)

خان، شوکت، نواب

نواب شوکت خاں

دوسرا حادثہ باغپت کے نوجوان رئیس نواب شوکت خاں کی وفات ہے ان کو اللہ تعالیٰ نے امتیازی وجاہت کے ساتھ دینداری کی دولت سے بھی نوازا تھا، چنانچہ حاجی اور حافظ بھی تھے جس کی مثال جدید تعلیم یافتہ نوجوان رئیسوں میں مشکل سے ملے گی، اسمبلی کے ممبر بھی رہ چکے تھے، سٹی سنٹرل وقف بورڈ کے صدر تھے، اس تعلق سے کئی سال ان سے سابقہ رہا، طبعاً نہایت شریف اور مہذب و متین تھے، عمر چالیس بیالیس سال سے زیادہ نہ تھی، اللہ تعالیٰ اس نوجوان اور دیندار رئیس کی مغفرت فرمائے۔

(''م''، فروری ۱۹۶۹ء)

خان، ذاکر حسین، ڈاکٹر

آہ ذاکر صاحب!

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی ناگہانی وفات ہندوستان کا بہت بڑا قومی حادثہ ہے، وہ اسکا گوہر بے بہا تھے، ان کی موت سے وہ ایسی دولت سے محروم ہوگیا جس کی تلافی نہیں ہوسکتی، کم سے کم مسلمانوں میں ان کا بدل پیدا ہونا بہت دشوار ہے اور اب وہ اس نقصان کو محسوس کریں گے، وہ اپنے علمی کمالات، فہم و فراست، قومی و تعلیمی خدمات، ایثار و قربانی اور اخلاق و سیرت کے لحاظ سے بہت بڑے انسان تھے، انھوں نے سیاست کے میدان میں کبھی قدم نہیں رکھا، لیکن اپنی بصیرت سے بڑی بڑی سیاسی گتھیوں کو آسانی سے سلجھا دیتے تھے، پنڈت جواہر لال نہرو کے بعد بین الاقوامی دنیا میں ہندستان کا وقار اُن ہی نے قائم رکھا۔

ان میں ابتدا سے غیر معمولی صلاحیتیں تھیں، ان کا آغاز ہی ان کے روشن مستقبل کا پتہ دیتا تھا طالب علمی ہی کے زمانہ سے ان کا قومی خدمت کا ولولہ اور ایثار و قربانی کا جذبہ تعلیم یافتہ نوجوانوں اور قومی کارکنوں کے لیے نمونہ تھا، اس زمانہ اور اس عمر میں

جب ہونہار نوجوانوں کا منتہائے نظر اور ترقی کی سب سے بڑی معراج سرکاری عہدے اور تعیش کی زندگی تھی، انھوں نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا، اور ان کے مقابلہ میں قومی خدمت اور غربت کی زندگی کو ترجیح دی اور اس راہ میں عمر کا بہترین حصہ صرف کر دیا، ان کا زندہ کارنامہ ہندوستان کی پہلی آزاد قومی درسگاہ جامعہ ملیہ ہے، گو اس کے بانی حضرت شیخ الہند حکیم اجمل خاں اور مولانا محمد علی وغیرہ تھے۔ لیکن اس کے اصلی معمار وہی تھے، اور ان ہی نے جامعہ کو جامعہ بنایا اور اپنی زندگی میں اپنے لگائے ہوئے پودے کو ایک تناور درخت بنا گئے، اور آج وہ باقاعدہ یونیورسٹی ہے، مشہور واردھا اسکیم ان ہی نے مرتب کی ہندوستان کی تقسیم کے بعد جب مسلم یونیورسٹی کا وجود خطرہ میں پڑ گیا تھا، تو پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام کی مدد سے اس کو بچایا، گو اس کی خصوصیات باقی نہ رہ سکیں، لیکن بگڑی ہوئی شکل میں اس کا وجود قائم رہ گیا اور کئی سال ڈاکٹر صاحب اس کے وائس چانسلر رہے، اور بعض حیثیتوں سے اس کو ترقی دی، اس کے علاوہ اور بہت سے مفید علمی کام کیے، وہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر جامعہ کی پرنسپلی سے مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری، گورنری، جمہوریۂ ہند کی نائب صدارت اور آخر میں صدارت کے جلیل القدر منصب تک پہنچے جو ایک ہندوستانی کے لیے سب سے بڑا عہدہ اور سب سے بڑا اعزاز ہے، اور وہ اس عہدہ کی زینت رہے۔

دارالمصنفین سے ان کا تعلق بہت پرانا تھا، حضرت سید صاحبؒ ان کے بزرگ اور جامعہ کے سرپرستوں میں تھے، اور ایک زمانہ میں وہاں جا کر ایک ایک ہفتہ قیام اور اس کے اساتذہ اور طلبہ کی علمی و تعلیمی رہنمائی فرماتے تھے، ڈاکٹر صاحب بھی اس زمانہ میں ایک دو مرتبہ جامعہ کے چندے کے لیے اعظم گڈھ آئے، اس میں مولانا مسعود علی صاحب مرحوم ان کے معاون ہوتے تھے، اس لیے دارالمصنفین سے ان کا تعلق ہر دور میں قائم رہا، اس کے کارکنوں سے مخلصانہ تعلق رکھتے تھے، اسی تعلق کی بنا پر دارالمصنفین کی گولڈن جوبلی کی صدارت قبول فرمائی اور حکومت ہند سے پچاس ۵۰ ہزار کی رقم دلوائی، اور ضرورت کے وقت اس کی ہر ممکن مدد کے لیے تیار رہتے تھے، ان سے آخری ملاقات غالبؔ کے صدسالہ یادگاری جشن میں ایوان صدارت کے ایٹ ہوم میں ہوئی تھی، کیا معلوم تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے اس لیے دارالمصنفین کے لیے ان کی وفات قومی کے ساتھ ذاتی حادثہ بھی ہے، دارالمصنفین کی جانب سے سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے تجہیز و تدفین میں شرکت کی۔

طبعاً نہایت شریف اور جدید تعلیم کے ساتھ قدیم مشرقی تہذیب و شرافت کا نمونہ تھے ان کی وضعداری ہر دور میں یکساں قائم رہی بلکہ عہدہ میں ترقی کے ساتھ اور بڑھتی گئی، جو ان کی بڑائی کی سب سے بڑی دلیل ہے، وہ ایک سچے قوم پرور محبّ وطن اور عقیدہ و عمل میں پکے مسلمان تھے، ایک معتبر روایت یہ بھی ملی ہے کہ انھوں نے کلام مجید حفظ کرنا شروع کیا تھا، لیکن ان کا دل بڑا وسیع تھا، اور اس میں سارے انسانوں کی بھلائی کا جذبہ تھا، انھوں نے زندگی کی بہت سی راہوں میں قابلِ تقلید نقشِ قدم چھوڑے ہیں، ان کی جیسی جامعیت کی مثال مشکل سے ملے گی،

؎ اے تو مجموعہ خوبی بچہ نامت خوانم

لیکن بشری کمزوریوں سے کوئی انسان خالی نہیں، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ تیرا ایک عاجز بندہ تیرے حضور میں حاضر ہے، اپنی بندہ نوازی کے طفیل میں اس کی لغزشوں اور خطاؤں سے درگذر، اس کے نیک اعمال کے صلہ میں اس کی مغفرت اور دنیا میں کامیابی کی طرح آخرت کی کامیابی سے بھی سرفراز فرما۔

اللھم اغفر لہ و ارحمہ رحمۃ و اسعہ

("م"، مئی ۱۹۶۹ء)

ذاکر صاحب

ذاکر صاحب کو جن کو مرحوم لکھتے وقت قلم تھرتھرا رہا ہے، میں نے آج سے ۴۳ سال پہلے ۱۹۲۷ء میں مظفر پور میں پہلی دفعہ دیکھا تھا، اُس وقت میں انٹرمیڈیٹ میں تعلیم پا رہا تھا، وہ حکیم اجمل خاں مرحوم کے ساتھ ایک وفد میں جامعہ ملیہ کا چندہ جمع کرنے کے لیے وہاں تشریف لائے تھے، اسی زمانہ میں وہاں ایک دینی اجتماع تھا جس میں مولانا نثار احمد مرحوم (مولانا محمد علی مرحوم کے کراچی جیل کے ساتھی) حافظ احمد سعید دہلوی مرحوم وغیرہ کے مواعظ ہو رہے تھے، رات کی ایک نشست میں جامعہ ملیہ کا وفد اس اجتماع میں بھی شریک ہوا، حکیم اجمل خاں مرحوم کی ایک تقریر جامعہ ملیہ کی اہمیت پر ہوئی جس میں انھوں نے ذاکر صاحب کا ذکر خاص طور پر کیا کہ وہ برلن سے تعلیم پا کر آئے ہیں لیکن بڑی ملازمت تلاش کرنے کے بجائے ایثار خدمت کے جذبے میں جامعہ ملیہ سے منسلک ہوگئے ہیں، ان کی تقریر ختم ہوئی تو پنڈال پر ذاکر صاحب کو لا کر کھڑا کیا گیا، ان کے چہرہ پر اس وقت سیاہ داڑھی تھی چہرہ کا رنگ بہت گورا تھا، سیاہ داڑھی میں چہرہ ایسا دمکتا اور چمکتا نظر آیا، جیسے رات کی تاریکی میں برق چمکتی دکھائی دے، انھوں نے کوئی تقریر نہیں کی، ان کے لبوں پر تبسم تھا، متین بلکہ شرگیں نظریں نیچی تھیں، مشکل سے ایک منٹ کھڑے رہے ہوں گے کہ پھر اپنی جگہ پر چپ چاپ بیٹھ گئے، میرے کچھ ساتھیوں نے ان کو دیکھ کر کہا کہ کیا یہ سحر آگیں ادائیں اور شرگیں آنکھیں جامعہ ملیہ جیسے ادارہ کے لیے مفید ہو سکیں گی؟

اس وقت سے میری نظروں میں ذاکر صاحب برابر گھومتے رہے، اسی زمانہ میں میرے کچھ اعزہ اور ساتھی جامعہ ملیہ میں تعلیم پا رہے تھے، ان کی زبانی جامعہ ملیہ کا ذکر سنتا، جس میں وہ زیادہ تر ذاکر صاحب کی بھلمنساہت اور شرافت طبع کے روزمرہ کے

واقعات سناتے، اس سے اندازہ ہوتا کہ وہ بچوں سے بڑی محبت سے پیش آتے ہیں زمانہ گذرتا گیا، میں بی۔اے پاس ہوا۔ ایم۔اے کی تعلیم بھی ختم کی لیکن ان کو کہیں پھر نہیں دیکھا، اخباروں میں ان کا کوئی ذکر آجاتا تو اس کو ضرور پڑھتا، حضرت مولانا سلیمان ندویؒ وطن تشریف لاتے تو اپنی مجلسوں میں جب کبھی ان پر گفتگو کرتے تو اس کو بڑی توجہ سے سنتا، ان کو ذاکر صاحب سے بڑا لگاؤ رہا، ان کی صلاحیت، قابلیت، جذبہ، ایثار، سادگی، قناعت، استغنا کا ذکر دیر تک کرتے رہتے اور فرماتے کہ مسلمانوں کو ان ہی جیسے ایثار پسند اور خدمت گزار افراد کی ضرورت ہے۔

میری پوری طالب علمی کے زمانہ میں ذاکر صاحب کی شہرت میں چار چاند لگ گئے ہیں پٹنہ یونیورسٹی میں ایم۔اے کی تعلیم پاکر علی گڑھ ٹریننگ کالج میں داخل ہوگیا، یہاں کی ڈگری پانے کے بعد میری خواہش ہوئی کہ میں کچھ دنوں ذاکر صاحب کی صحبت میں جامعہ ملیہ جاکر رہوں، میں نے اس کا ذکر اپنے محترم استاد جناب غلام الدین صاحب سے کیا، جو اس وقت مسلم یونیورسٹی ٹریننگ کالج کے پرنسپل تھے، انھوں نے میری خواہش کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کو ایک خط لکھا جس میں انھوں نے ان کی ذات سے میری گرویدگی اور شیفتگی کا ذکر خاص طور پر کیا، میں یہ خط لیکر ان کے پاس پہنچا، جب ان کو معلوم ہوا کہ میں حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کا عزیز بھی ہوں تو پھر مجھ سے اس طرح ملے جیسے میں ان ہی کا عزیز خاص ہوں، یہ ۱۹۳۴ء کا سال تھا، ان کی باتوں میں مجھ کو نرمی، محبت، اخلاص، ہمدردی کی رنگارنگی کی قوس وقزح نظر آئی، میں ان کی صحبت میں پہنچنے کو تو پہنچ گیا تھا، مگر میں جامعہ ملیہ میں داخلہ نہیں لے سکتا تھا، کیونکہ میری تعلیم کے سارے مدارج ختم ہوچکے تھے، میں وہاں ملازمت بھی نہیں چاہتا تھا، لیکن مجھ کو مشغول بھی رہنا تھا، مشکل یہ تھی کہ ذاکر صاحب کا موضوع معاشیات تھا جس سے مجھ کو کوئی مناسبت نہ تھی مجھ کو دلچسپی تاریخ اور خصوصاً ہندوستان کے مسلمانوں کے عہد کی تاریخ سے تھی، جو پروفیسر محمد مجیب صاحب کا موضوع تھا، اس لیے ذاکر صاحب نے مجھ کو ان ہی کے ساتھ کام کرنے کو کہا۔

جامعہ ملیہ اس زمانہ میں قرول باغ، دہلی میں کرایہ کے مکانات میں تھی، تمام اساتذہ کی زندگی بڑی عسرت اور تنگی میں گذرتی تھی، ان کو اپنی اس عسرت اور تنگی پر بڑا ناز تھا، ایثار پسند اساتذہ کا بڑا اچھا اجتماع ہوگیا تھا، ان ہی میں ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، محمد علی بی۔اے (آکسن) (مولانا محمد علی نہیں)، مولانا اسلم جیراجپوری مصنف تاریخ الامت، مولانا عبدالحئی مفسر قرآن، مس فلپس بورن، مولانا شرف الدین ٹونکی اور جناب عبدالغفار مدھولی وغیرہ تھے۔

اس زمانہ میں معاشیات کے ایک استاد محمد عاقل صاحب بھی تھے، انھوں نے ایک مکان کرایہ پر لے رکھا تھا، ان کے ساتھ حسین حسان ندوی صاحب اڈیٹر پیام تعلیم بھی رہتے تھے، ذاکر صاحب نے ان ہی دونوں حضرات کے ساتھ مجھ کو بھی رہنے کے لیے جگہ دی، اسی کے قریب ذاکر صاحب کا بھی مکان تھا، ان کی تنخواہ اس وقت ۷۵ روپے ماہانہ تھی، جو اکثر کئی مہینوں تک نہیں ملتی تھی، اس میں سے تیس روپے تو اپنے مکان کا کرایہ دیتے تھے، بقیہ ۴۵ روپے میں اپنے سارے اخراجات پورے کرتے تھے، ان کے مکان کے باہری کمرہ میں صرف تین چار مونڈھے تھے، جن کے نیچے کوئی فرش بھی نہ تھا، ان ہی مونڈھوں پر بیٹھ کر وہ اپنے ملنے والوں سے باتیں کرتے، ان کے یہاں اس زمانہ میں بھی ہر قسم کے لوگ آتے رہتے، رہنمایان قوم بھی، عہدیداران حکومت بھی، علمائے اسلام بھی، شعرا بھی مصنفین بھی مبلغین مذہب بھی، ملحدین بھی، ان کا دروازہ سب کے لیے کھلا رہتا، جو بھی آتا ان سے مل کر ان کی قناعت پسندانہ زندگی کا راگ الاپتا جاتا۔

اس زمانہ میں ان کے بھتیجے امتیاز حسین خاں مرحوم جامعہ سے بی۔اے کرکے باہر اعلیٰ تعلیم کے لیے جانے کی فکر میں تھے، وہ پاسپورٹ کا انتظار کررہے تھے، میری ان سے ملاقات ہوئی تو وہ مجھ سے بے تکلف ہوگئے، وہ اپنے خاندان والوں ہی کی طرح شکیل، مخلص، خلیق اور ملنسار تھے، ذاکر صاحب ہی کے ساتھ رہتے تھے جب کبھی ان کو موقع مل جاتا میرے کمرہ میں چلے آتے اور دیر تک بیٹھے رہتے ان کے ساتھ کبھی ذاکر صاحب کی بڑی لڑکی سعیدہ بھی آجاتیں، جو اس وقت چار پانچ برس کی محض ایک بچی تھیں، امتیاز مرحوم اپنے محبوب چچا کی گھریلو زندگی کی سادگی کا کبھی کبھی ذکر کرتے تو ہنس کر کہتے کہ سعیدہ کو شکایت ہے کہ ان کے گھر میں ڈرائنگ روم نہیں، فرش نہیں، قالین نہیں، اور کہتی ہیں کہ حیدرآباد میں چچا جان یعنی ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب کے ہاں بڑا اچھا ڈرائنگ روم ہے، بہت اچھے اچھے قالین ہیں، امتیاز مرحوم ہی سے معلوم ہوا کہ اس زمانہ میں ایسا بھی ہوتا کہ ذاکر صاحب کے یہاں رات کو جو روٹیاں بچ جاتیں، صبح کو گھر والے ان ہی کا ناشتہ کرکے اکتفا کرلیتے، اس سے ذاکر صاحب کی عزت میرے دل میں اور بڑھ گئی، وہ چاہتے تو ان کو بڑی سے بڑی ملازمت مل سکتی تھی، لیکن ان کو جامعہ کی عسرت بھری زندگی ہی میں عشرت حاصل تھی، اور اسی عسرت بھری عشرت میں ان کی شہرت اور عزت بڑھتی گئی، جامعہ کے لوگ خواہ اساتذہ ہوں یا طلبہ دونوں ان کو دیکھتے تو محسوس کرتے کہ وہ ایثار، اخلاق، محبت، شرافت، بے نفسی مستقل، مزاجی اور اخلاص کے قطب مینار کو دیکھ رہے ہیں۔

شیخ الجامعہ کی حیثیت سے ان کا دفتر بھی بڑا سادہ تھا، کمرہ میں فرش بچھا رکھا تھا، میز، کرسیاں نہ تھیں۔ فرش ہی پر بیٹھتے، ایک صندوق نما ڈسک پر جھک کر جامعہ کے کاغذات دیکھتے یا کچھ لکھتے رہتے، جو کوئی آتا اسی فرش پر بیٹھ کر ان سے باتیں بھی کرتا، انھوں نے جامعہ ملیہ کے اندر بالکل مشرقی اور اسلامی طرز کی زندگی برقرار رکھنے کی کوشش

کی تھی، طلبہ فرش پر بیٹھ کر کھانا کھاتے، البتہ کھانا تخت پر رکھا جاتا، یہ ایرانیوں کے کھانے کا طریقہ ہے،اس زمانہ میں تمام طلبہ کے سروں پر ٹوپیاں ضرور ہوتیں۔ ذاکر صاحب کسی موقع پر ننگے سر دکھائی نہیں دیتے اسی لیے اپنے طلبہ کو بھی ننگے سر دیکھنا نہیں چاہتے تھے پانچوں وقت نماز کی بڑی پابندی کراتے، ہر ہوسٹل میں ایک بڑا کمرہ نماز باجماعت کے لیے ہوتا، جو پانچوں وقت بھر جاتا، جامعہ ملیہ چھوٹے بچوں کی تربیت کے معاملہ میں پورے ہندوستان میں مشہور ہوگئی تھی، اس لیے ہندوستان کے ہر گوشہ سے بچے آکر وہاں جمع ہوگئے تھے،ان کی نگرانی اس زمانہ میں ایک یہودی جرمن خاتون مس فلپسبورن کرتی تھیں، ذاکر صاحب کی ہدایت کے مطابق تمام بچے ان کو آپا جان کہا کرتے تھے،ہٹلر نے جرمنی سے یہودیوں کو جلا وطن کیا تو وہ ہندوستان آگئی تھیں، یہاں ذاکر صاحب نے ان کو اپنے سایہ عاطفت میں لے لیا، رفتہ رفتہ جامعہ ملیہ کے لیے بہت مفید ثابت ہوتی گئیں، سب سے بہت ہی اخلاق سے پیش آتیں، ایک روز میں بھی بچوں کے مکتب کے سامنے کھڑا ہوکر ان سے باتیں کررہا تھا، کہ یکا یک میں نے دیکھا کہ ایک بظاہر گنوارلڑکا ایک صاف ستھرے لڑکے کو ایک درجہ سے دھکا دیتے ہوئے باہر نکل آیا اور اس کو پٹک کر اس کے سینے پر سوار ہوگیا، مجھ سے دیکھا نہ گیا میں نے گنوارلڑکے کو دھکیل کر صاف ستھرے لڑکے کو اس کی مار سے بچا لیا، میں نے آزدہ ہوکر مس فلپسبورن سے کہا کہ:

"Why do you allow such street unchins to came to classes"

یہ سن کر فلپسبورن برہم ہوگئیں اور ان کے چہرہ کا رنگ سرخ ہوگیا، مجھ سے مخاطب ہوکر بولیں:

"Don't say like that, We shall try to acclamatise him in our environment".

اس غیر ملکی عورت کی زبان سے یہ سن کر مجھ کو بڑی ندامت ہوئی، میں ان سے معذرت خواہ ہوا، اسی سلسلہ میں انھوں نے کہا کہ میں ہندوستان میں آکر ہندوستانی بچوں سے بہت متاثر ہوئی ہوں، ان کو جرمنی کے بچوں سے سیکڑوں گنا زیادہ ذہین پایا، اگر ان کی صحیح تربیت ہوتی رہے تو وہ یورپ کے بچوں سے زیادہ بہتر ثابت ہوسکتے ہیں، یہ سن کر میں خوش ہوا، لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی کہا کہ جامعہ ملیہ کی تربیت سے تو وہ بہت جلد راہ راست پر آجاتے ہیں لیکن جب وہ چھٹیوں میں گھر جاتے ہیں تو پھر پہلے ہی جیسے کورے ہوکر لوٹتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے گھر کا ماحول بہت ہی مختلف ہوتا ہے۔

جامعہ ملیہ میں ذاکر صاحب کی کوشش یہی رہی کہ ہندوستانی بچے جو جرمنی کے بچوں سے سینکڑوں گنا زیادہ ذہین ہوتے ہیں، صحیح تربیت پاتے رہیں۔ اور ان کے لیے ملک کی نئی آب و ہوا ساز گار ہوتی رہے، ان کی یہ کوشش اس زمانہ میں کامیاب رہی، وہاں کے بچے دور سے پہچان لیے جاتے کہ یہ جامعہ کے ہیں۔

ذاکر صاحب کی وضعداری یہ بھی تھی کہ وہ طلبہ کے ہوسٹلوں اور اساتذہ کے گھروں میں جاکر ان سے بے تکلفانہ گفتگو کرتے میرے کمرہ میں بھی کئی بار آئے، ایک بار میں سی آف اینڈ ریوز کی تصنیف منشی ذکاء اللہ کا مطالعہ کررہا تھا، وہ تشریف لائے تو یہی کتاب موضوع بن گئی، میں نے عرض کیا کہ کیا مناسب ہوگا اگر میں اس کتاب کا ترجمہ اردو میں کردوں، جواب میں فرمایا، پہلے ترجمہ کے ناشر کو ٹھیک کرلیجئے پھر ترجمہ شروع کیجئے، ورنہ ترجمہ کے بعد کوئی ناشر نہیں ملا تو محنت رائگاں جائے گی، پھر بزرگانہ شفقت سے کہا کہ کچھ لوگ پڑھے ہوتے ہیں، کچھ صرف لکھے ہوتے ہیں اور کم لوگ پڑھے لکھے ہوتے ہیں، آپ پڑھے لکھے ہونے کی کوشش کیجئے، پڑھیے زیادہ لکھیے کم، پڑھنا لکھنا چھپنے کے لیے نہ ہو، چھپنے کے بعد غلط راستے پر پڑ جانے کا امکان زیادہ بڑھ جاتا ہے، جو چھپتے ہیں وہ لکھتے تو زیادہ ہیں لیکن پڑھتے کم ہیں، یہ بات دل میں اب تک بیٹھی ہے، ذاکر صاحب اپنی گفتگو میں تم کہہ کر بہت کم لوگوں سے مخاطب ہوتے زیادہ تر آپ ہی ان کی زبان سے نکلتا، ایک اور موقع پر اکبر پر گفتگو آگئی، میری زبان سے اس کے متعلق کچھ سخت باتیں نکل گئیں جن کو ذاکر صاحب نے ہنس کر سنا، پھر فرمایا کہ اکبر کو برا کہنا تو آسان ہے لیکن اس کو سمجھنا مشکل ہے، ہندوستان کی تاریخ میں اس کی ذات رواداری سیرچشمی اور فراخدلی کا بہت بڑا تجربہ ہے، اس کا مطالعہ اسی تجربہ کی روشنی میں کرنا چاہیے، اس سے غلطیاں اور بے اعتدالیاں ضرور ہوئیں لیکن اس کا یہ تجربہ سیاسی نفسیاتی اور عمرانی تجزیہ کا مستحق ہے یہ اور بات ہے کہ وہ اپنے تجربہ میں ناکام رہا۔

جامعہ کے قیام کے زمانہ میں ایک بار مجھ پر ملیریا کا سخت حملہ ہوا، اور اپنے کمرہ میں پڑا تھا کہ ایک کمبلی اوڑھے فقیر میرے کمرہ میں داخل ہوگیا اور مجذوبانہ باتیں شروع کردیں جن سے میں مرعوب ہوگیا میں نے اس کو ٹالنے کی خاطر دو پیسے دیے، لیکن اس نے فضا میں ان دو پیسوں کو کچھ اس طرح اچھالا کہ میری نظروں سے غائب ہوگئے، اور وہ بولا ''میں تمہارے پاس بھیک مانگنے نہیں آیا ہوں'' میں گھبرا گیا اور مودب ہوکر دو روپے نذرانے کے طور پر پیش کیے، لیکن اس نے ان دو روپیوں کو بھی فضا میں غائب کردیا اور چیخا ''میں تمہارے ان دو روپیوں کے لیے نہیں آیا ہوں'' میں اور بھی پریشان ہوا، میرے بکس میں ایک دس روپے اور پانچ پانچ روپے کے دو نوٹ تھے میں نے کچھ اور نذرانہ پیش کرنا چاہا، سوچنے لگا کہ پانچ کا نوٹ دوں یا دس کا، پھر پانچ کا نوٹ لے کر اس کو مودبانہ پیش کیا، وہ بولا ''تو اس کشمکش میں تھا کہ پانچ کا دوں یا دس کا، ایسی کشمکش کا نذرانہ لے کر میں کیا کروں گا'' اور پھر اس نے فضا میں پانچ روپے کا نوٹ اس طرح اچھالا کہ میری نظر سے غائب ہوگیا، میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے

لگے تو میں نے دس روپئے کا نوٹ بھی اس کے حوالے کردیا، جس کو اس نے ہنس کر لے لیا، وہ بیڑی پی رہا تھا، اس کی راکھ میرے منہ میں یہ کہہ کر ڈال دی کہ یہ برکت کی راکھ ہے، یہ راکھ شکر کی ایسی میٹھی تھی پھر وہ اٹھا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ ''جس ڈبہ سے تو نے روپئے نکال کر دیے ہیں وہ تجھ کو کل صبح روپیوں سے بھرا ملے گا''۔ کہہ کر غائب ہوگیا، صبح کو میرا ڈبہ بھرنے کے بجائے بالکل خالی تھا، میرے اس طرح لٹ جانے کی خبر جامعہ میں پھیلی تو سب ہنسے میں بیمار تھا ہی، ذاکر صاحب میری عیادت کے لیے آئے، تو میرے لٹ جانے پر یہ کہہ کر ماتم پرسی کی، حضرت! یہ دہلی ہے، جہاں درویش ضرور رہا کرتے ہیں، لیکن یہاں درویش نما بدمعاش بھی ہیں، پھر فرمایا کہ آپ کا یہ نقصان رائگاں نہ جائے گا، اس کے پیچھے ایسے فوائد ہیں جن سے آپ کو سنبھل کر زندگی بسر کرنے میں مدد ملے گی، ان کی یہ نصیحت بڑی کارگر ہوئی۔

اس زمانہ میں جامعہ کے اساتذہ میں مولانا شرف الدین ٹونکی بھی تھے، جو ذاکر صاحب کے استاد بھی رہ چکے تھے، ذاکر صاحب ان کا بڑا احترام کرتے، ان کے سامنے مودب بیٹھتے، بلند آواز میں گفتگو نہ کرتے، مولانا شرف الدین ٹونکی کے مزاج میں بڑا اکھڑاپن تھا، جو بات ان کی زبان پر آتی وہ کہے بغیر نہ رہتے، حق اور صداقت کا اعلان کرنے میں بہت بے باک تھے، کسی سے ان کی نہ بنتی لیکن ذاکر صاحب کی وجہ سے اور لوگ بھی ان کے احترام میں فرق نہ آنے دیتے، ایک بار بچوں کی طرف سے سالانہ عید میلادالنبی کی دلچسپ تقریب تھی، اس کی صدارت مولانا ہی کرنے والے تھے، جامعہ کے اساتذہ کے علاوہ بیرونی مہمانوں میں جناب ڈاکٹر لودی کریم حیدر بھی آئے ہوئے تھے، جو مسلم یونیورسٹی میں معاشیات کے پروفیسر تھے، لیکن اسی وقت وہ مرکزی پبلک سروس کمیشن کے رکن تھے، وہ ذاکر صاحب کے یہاں برابر آتے جاتے رہتے ان کی بیوی جرمن تھیں، لیکن اسلام قبول کرلیا تھا، وہ صاحب قسم کے آدمی ہونے کے باوجود اسلامی جذبات رکھتے تھے، اس لیے اپنی بیگم کے ساتھ مذہبی جلسہ میں شریک ہوا کرتے تھے، وہ اپنی بیگم اور لڑکی کے ساتھ بچوں کی عیدالنبی کی تقریب میں آئے تو مس فلپسبورن نے ان کی پیشوائی کی، یہ تینوں خواتین جلسہ گاہ کے کنارے کرسیوں پر بیٹھیں، ان کا لباس یوروپی تھا، مولانا شرف الدین ٹونکی ان میموں کو دیکھ کر بگڑ گئے اور غصہ میں ذاکر صاحب سے کہا کہ میں ایسی تقریب کی صدارت نہیں کرتا جہاں نیم برہنہ عورتیں موجود ہوں، یہ سن کر ذاکر صاحب بہت پریشان ہوئے لیکن وہ اپنی معزز خواتین مہمان سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے، ان کی پریشانی کو مولانا اسلم جیراجپوری نے دور کیا، پہلے تو انھوں نے مولانا شرف الدین ٹونکی سے کہا ''مولانا، اگر آپ نیم برہنہ عورتوں کی موجودگی میں صدارت کرنا پسند نہیں فرماتے تو آپ اجازت دیں تو کسی اور کو صدر منتخب کرلیا جائے، مولانا ٹونکی نے صدارت چھوڑنا پسند نہیں کیا، ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مولانا اسلم جیراجپوری نے کہا کہ اگر آپ صدارت کی جگہ پر اس طرح بیٹھیں کہ آپ کی نظریں ان نیم برہنہ نامحرم عورتوں پر نہ پڑیں تو میرا خیال ہے کہ شرعی قباحت دور ہوجائے گی۔ مولانا اشرف الدین ٹونکی نے فرمایا کہ یہ مشورہ صحیح ہے، اور پھر وہ صدارت کے لیے آگے بڑھ گئے، میں دوسرے دن مولانا اسلم جیراجپوری کے گھر پر حاضر ہوا تو اس واقعہ کا بھی ذکر آگیا، مولانا نے فرمایا کہ مولانا شرف الدین ٹونکی کی وجہ سے کبھی کبھی ایسی چپقلش پیدا ہوتی رہتی ہے کہنے لگے کہ ایک بار بیگم صاحبہ بھوپال تشریف لائیں، وہ برقعہ میں تھیں، اساتذہ ایک صف میں ان کی پیشوائی کے لیے کھڑے تھے، بیگم صاحبہ تشریف لائیں تو ذاکر صاحب نے سب سے تعارف کرانا شروع کیا، تعارف کے بعد بیگم صاحبہ ہاتھ بھی ملاتیں، انھوں نے جب مولانا شرف الدین ٹونکی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ دوٹوک بولے میں نامحرم عورتوں سے ہاتھ نہیں ملاتا، اور یہ کہہ کر اپنا ہاتھ پیچھے کرلیا، بیگم صاحبہ کا ہاتھ بڑھا ہوا تھا میں نے ان سے یہ کہہ کر ہاتھ ملالیا کہ میں بھی عالم ہوں، لیکن میں نامحرم عورتوں سے ہاتھ ملالیتا ہوں، یہ سن کر بیگم صاحبہ ہنسنے لگیں، ذاکر صاحب بھی اس طرح محجوب نہ ہوئے۔

اسی زمانہ میں دہلی میں آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس ہونے والی تھی، اس کے صدر جے پور ریاست کے وزیر تعلیم ہوئے، اس کے مستقل سکریٹری پرنسپل سیشادری تھے، جو اس وقت غالباً اجمیر پرنس کالج میں تھے، مجلس استقبالیہ کا کوئی صدر نہ ہوا تھا، اس کے انتخاب کی تاریخ کا اعلان ہوا، تو جامعہ والوں کی خواہش ہوئی کہ اس کے صدر ذاکر صاحب ہوں مجلس استقبالیہ کی رکنیت کی فیس ایک روپیہ تھی، ہم تمام لوگ اس کے رکن بن گئے، انتخاب کے مقابلہ میں ذاکر صاحب بھاری اکثریت سے صدر منتخب کرلیے گئے۔ انھوں نے اجلاس میں اپنا خطبہ پڑھا تو ہر طرف اسی کی دھوم تھی، جے پور کے وزیر تعلیم کا خطبہ بہت پھیکا پڑ گیا، دہلی کے اخباروں میں ذاکر صاحب کا خطبہ بڑے آب و تاب سے شائع ہوا اور اس پر ہندوستان ٹائمز اور دوسرے اخباروں نے اداریے بھی لکھے۔

جامعہ میں میرے قیام کے دوران خالدہ ادیب خانم بھی وہاں اپنے توسیعی خطبات دینے آئیں، ان کے ٹھہرانے کا انتظام ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے گھر پر کیا گیا، پروفیسر محمد مجیب ان کے یہاں ان کے خطابات پر نظر ثانی کرنے کے لیے برابر جاتے، میں بھی ایک بار ان کے ساتھ گیا اور خالدہ ادیب خانم کے ساتھ دن کا لنچ بھی کھانے کا اتفاق ہوا، بڑی باوقار اور متین خاتون تھیں، انگریزی بہت بے تکلف بولتی تھیں اور جو بات کہتیں اس میں وزن اور وقار ہوتا، ان کا پہلا توسیعی لکچر جامعہ ملیہ میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی صدارت میں ہوا، سامعین میں بہت سے مشاہیر تھے، جن میں راجہ گوپال اچاریہ، بھولا بھائی ڈیسائی، گووند بلبھ پنت، سروجنی نائیڈو، سیتا مورتی، لودی کریم حیدر کے نام اس وقت یاد آرہے ہیں۔ ذاکر صاحب ان سب کی پیشوائی میں مشغول تھے،

ان مشاہیر سے ان کے ملنے اور باتیں کرنے کا کچھ ایسا انداز ہوتا کہ وہی ان سب پر بھاری نظر آتے ہیں اور شاید اس وقت بھی فضا میں یہ آواز گونج رہی تھی کہ کہ آگے چل کر ہندوستان کا یہ شاہین ان سب سے سبقت لے جانے والا ہے۔

اس زمانہ کا ایک وقعہ برابر یاد آتا رہا سینٹ اسٹیفن کالج میں دہلی یونیورسٹی کی طرف سے معاشیات تو سیعی لکچرز پنجاب یونیورسٹی کے ایک ممتاز پروفیسر دے رہے تھے، پروفیسر مجیب اس میں شرکت کے لیے ایک تانگہ پر جارہے تھے، تو میں بھی ان کے ساتھ ہوگیا، قرول باغ سے سینٹ اسٹیفن کالج تک پورے تانگہ کا کرایہ اس وقت صرف چھ آنے پیسے تھے، پروفیسر مجیب جامعہ میں نسبتاً خوشحال زندگی بسر کرتے تھے، ان کے والد جناب محمد نسیم صاحب لکھنؤ کے بہت ہی مشہور وکیل تھے، وہ ان کی مالی امداد کرتے رہتے، اس لیے ان کو روپے پیسے کی تنگی نہ تھی، پروفیسر مجیب کے ساتھ میں بھی کالج پہنچ کر لکچرز سننے میں مشغول تھا کہ ذاکر صاحب تقریباً ایک گھنٹہ کے بعد وہاں پہنچے اور پیچھے بیٹھ کر لکچر سننے لگے، جب لکچر ختم ہوا تو وہ لوگوں سے ملنے ملانے لگے، پھر مجیب صاحب کو مخاطب کرکے کہا کہ مجھ کو بھی اپنے ساتھ تانگہ پر لیتے چلیں، سب سے مل کر ہم تینوں رخصت ہوئے، تو ایک تانگہ چھ آنے میں طے ہوا، ذاکر صاحب نے آگے بیٹھنا پسند کیا، مجیب صاحب میرے ساتھ پیچھے بیٹھے، ذاکر صاحب بولے کہ میں دیر کر کے لکچر میں پہنچا، اس لیے کہ میرے پاس اتنے دام نہ تھے کہ میں تانگہ کا کرایہ دیتا، ایک صاحب موٹر پر گذر رہے تھے تو میں ان ہی کے ساتھ بیٹھ کر یہاں چلا آیا، واپسی کے بھی دام نہ تھے، اس لیے آپ کو روکے رکھا، یہ سن کر مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوگئی کہ خدمت وایثار کا یہ پیکر کیسی تنگی کی زندگی بسر کرنے میں لگا ہوا ہے اور پھر کیا معلوم تھا کہ دہلی کی ان ہی سڑکوں پر اس مردفقیر کو وہ اعزاز حاصل ہوگا جو کسی ہندوستانی کے لیے سب سے بڑا اعزاز ہوسکتا ہے۔

ذاکر صاحب کا معمول تھا کہ وہ صبح کو قرول باغ کی پہاڑی پر جاکر ہوا خوری کرتے، ان کے ساتھ پروفیسر عاقل بھی ہوتے ایک دو بار میں بھی ساتھ رہا، اسی پہاڑی کے نیچے جھاڑیاں تھیں، جن میں وائسرائے اور ویسرائین کی شہسواری کے لیے راستے بنے ہوئے تھے، وائسریگل لاج سے دونوں یہاں آکر ہوا خوری کرتے، ذاکر صاحب کا کبھی ان سے آمنا سامنا بھی ہوجاتا، ان کو کیا خبر تھی کہ ہوا خوری کرنے والا یہ پیدل ان ہی کی طرح شاہ بن کر وہاں متمکن ہوگا جہاں اس وقت ہندوستان کا کوئی پرندہ پر نہیں مارسکتا تھا۔

میں چھ مہینے جامعہ میں رہ کر حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ کی طلبی پر دارالمصنفین جنوری ۱۹۳۵ء میں آگیا، اُس وقت سے اب تک اس کا ادنی خدمت گذار بنا ہوا ہوں جب میں جامعہ ملیہ سے دارالمصنفین کے لیے چلا تو ذاکر صاحب کی طبیعت کی شرافت، اخلاق کی پاکیزگی اور بے سروسامان میں مفید کام انجام دینے کی ہمت و پامردی کے بار سے دبا ہوا روانہ ہوا، ان کے اخلاص، جذبۂ ایثار، ان کی فطری، ملنساری، نرمی اور ملائمت کو نہ صرف جامعہ ملیہ کا بلکہ ملک وملت کا راس المال سمجھنے پر مجبور تھا۔ دارالمصنفین کی صحبتوں میں ان کا ذکر برابر رہتا، میرے دارالمصنفین آنے کے فوراً ہی بعد سید صاحب خالدہ ادیب خانم کی ایک لکچر کی صدارت کے لیے جامعہ ملیہ تشریف لے گئے، جہاں اکثر و بیشتر ذاکر صاحب کے ساتھ قیام کرتے، واپسی کے بعد ذاکر صاحب کے گوناگوں اوصاف کا ذکر بڑے لطف ولذت سے کرتے، ذاکر صاحب کو بھی دارالمصنفین سے بڑا گہرا لگاؤ رہا، جب جامعہ قرول باغ کی عمارتوں میں کٹھن منزلوں سے گذر رہی تھی تو وہ اُس وقت دارالمصنفین کی ترقی اور سرگرمیوں کو جامعہ کے لوگوں کے سامنے ایک اچھی عملی مثال کی طرح پیش کرتے، میرے دارالمصنفین آنے سے پہلے ذاکر صاحب جامعہ ملیہ کے چندے وصول کرنے کے لیے دوبار اعظم گڈھ آئے اور دارالمصنفین ہی میں قیام کیا، مولانا مسعود علی ندوی مرحوم کو چندے وصول کرنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی، انھوں نے بڑی بڑی رقمیں ذاکر صاحب کو دلوائیں، جن کا اعتراف ذاکر صاحب آخر آخر وقت تک کرتے رہے، وہ دارالمصنفین میں آکر بہت بے تکلف ہوجاتے، کھری چارپائی پر لیٹتے اور ایسے مل جل کر رہتے جیسے یہیں کے ایک فرد ہیں مولانا مسعود علی صاحب ندوی دہلی جاتے تو ذاکر صاحب ان کو اپنے یہاں مہمان رکھتے، وہ ذاکر صاحب کی بیگم صاحبہ کو پٹھانی کہتے، ان کا بیان ہے کہ کھانے کے وقت ذاکر صاحب اپنی نامشغولیتوں کی بناپر گھر پر نہ ہوتے تو پٹھانی پردے کی آڑ میں سے سینی پر کھانا رکھ کر بڑھا دیتیں وہ کھاتے، اللہ کا شکر ادا کرتے اور پھر سینی خود ہی بڑھا دیتے، ذاکر صاحب کی بیگم صاحبہ شروع ہی سے گھریلو خاتون بن کر چراغ خانہ بنی رہیں، انھوں نے اپنی یہ وضعداری ذاکر صاحب کے انتہائی عروج کے زمانہ میں بھی قائم رکھی۔

۱۹۳۶ء میں کابل کے مشہور شاعر سرور خاں گویا ہندوستان کی سیاحت کے لیے آئے، وہ دہلی علی گڑھ اور لکھنؤ کے مشاہیر سے ملتے ہوئے دارالمصنفین اعظم گڑھ آئے، اثنائے گفتگو میں انھوں نے کہا ''میں نے ہندوستان میں حسین ترین آدمی ڈاکٹر ذاکر حسین کو پایا''، ہم لوگوں نے بھی اس کی تائید کی۔

میں نے دارالمصنفین کے گوشۂ عافیت میں ذاکر صاحب کی خوبیوں کی یادوں کا چراغ اپنے دل میں روشن رکھا، گو اس کا بھی احساس رہا کہ ذاکر صاحب کے میرے جیسے عقیدت مند ہزاروں ہوں گے اس لیے جامعہ سے آنے کے بعد وہ مجھے بھول چکے ہوں گے، ۱۹۳۵ء کے بعد معلوم نہیں کتنے سیاسی انقلاب آئے، ۱۹۳۵ء ایکٹ، ہندوستان چھوڑو ہنگامے، پاکستان تحریک، اسٹفورڈ کرپس تجاویز ہندو مسلمان فسادات،

کانگریس لیگ کے جھگڑے سے ہندوستان کا ڈھانچہ بدل رہا تھا، ان تمام ہنگاموں میں ۱۹۴۷ء تک ذاکر صاحب کی مقبولیت اور محبوبیت میں کوئی فرق نہیں آیا، بلکہ ان میں اضافہ ہی ہوتا گیا، ہندو اور مسلمان دونوں ان پر اعتماد کرتے اور ان کے اخلاق و کردار کو نمونہ سمجھتے رہے، ۱۹۴۷ء کے سیاسی انقلاب میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھی متاثر ہوئی تقسیم ہند کے بعد سے ہندوؤں کا اعتماد ہندوستان کے مسلمانوں پر سے جاتا رہا، کیونکہ پاکستان کے حق میں ووٹ دینے میں وہی آگے تھے۔ اس بے اعتمادی کے طوفان میں مسلم یونیورسٹی کی کشتی بھی منجدھارے میں پڑ گئی، اس وقت ارباب بصیرت کی نظر ذاکر صاحب کی طرف اٹھی، کہ وہی اب اس کشتی کے کھویا صحیح معنوں میں ہوسکتے ہیں حکومت کو بھی ان پر اعتماد تھا، اس لیے وہ ۱۹۴۸ء میں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنادیے گئے، مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کرنا اور خاردار بستر پر لیٹنا دونوں برابر ہیں، وائس چانسلری کے زمانہ میں پہلی دفعہ ذاکر صاحب پر تنقیدیں سننے میں آئیں، ان میں عقلیت پسندی بھی تھی اور مذہبیت بھی، وہ اپنے خاندان اور گھر کے ماحول کی وجہ سے ایک اچھے قسم کے مسلمان تھے لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد کے ہندوستان میں جب ان پر ذمہ داریاں عائد کی گئیں تو وہ اچھے قسم کے مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ حقیقت پسند مسلمان بھی ہونا چاہتے تھے، وہ بھی ہندوستان کے عام مسلمانوں کی طرح اس ذہنی الجھن میں مبتلا ہوگئے کہ مسلمانانِ ہند کا مقام ہندوستان میں ہو تو کیا ہو، ملک کے بدلے ہوئے حالات میں ان کو ایک علیحدہ قوم تسلیم نہیں کیا جاسکتا تھا، اور نہ ان میں اتنی قوت و صلاحیت باقی رہ گئی تھی کہ وہ حکومت سے ٹکر لے کر اپنی جداگانہ قومیت کو تسلیم کراسکتے تھے، وہ نہ خود مختار ہوسکتے تھے اور نہ ذہنی طور پر کسی کے زیر اقتدار ہوکر محض خاموش اور غیر متحرک شہری بننا پسند کرتے تھے، ذاکر صاحب ان الجھنوں میں جس نتیجہ پر پہنچے تھے اس کا اظہار انھوں نے اس تقریر میں کیا جو ۱۹۵۶ء میں سعودی عرب میں جاکر کی، انھوں نے فرمایا:

''اسلام کی جو حیثیت عالمی زندگی میں ہونی چاہیے مسلمانوں کی وہی ہندوستانی زندگی میں ہو، جس طرح دنیا میں مسلمانوں کو اپنے مختلف اعمال و اعتقاد رکھنے والوں کے ساتھ زندگی گذارنی ہے اور اپنی مثال اپنے افکار کی بلندی، اپنے کردار کی خوبی سے ایک صالح اور صحت مندانہ زندگی کا نمونہ دوسروں کے سامنے پیش کرنا ہے، اسی طرح مسلمانان ہند پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ مشترک اور مختلف العناصر ہندی قوم میں حیات طیبہ اسلامیہ کا ایسا نمونہ پیش کریں جس سے ان کے ہم وطنوں کے دل میں ان کے لیے جگہ پیدا ہو، زندگی کی وہ اعلیٰ قدریں جن کے یہ حامل ہوں عام ہندی زندگی کو متاثر کریں اور ہم جو رحمتہ للعالمین کے نام لیوا ہیں، اپنے وطن اور اہل وطن کے لیے مثال اور رحمت کا کام دیں''۔

یہ کوہ سینا کا کوئی وعظ نہیں، بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے صحیح لائحہ عمل ہے، اور اسی نصب العین پر عمل کرنے میں ان کی اجتماعی زندگی کی نجات ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہم ہندوستانی مسلمان زندگی کے ایسے دور سے گذر رہے ہیں جس میں نہ افکار کی بلندی، نہ کردار کی خوبی، نہ حیات طیبہ اسلامیہ کی اعلیٰ قدریں ہیں، ان پر صرف یہ خوف غالب ہے کہ کہیں ہندوستانی قومیت کے سیلاب میں ان کا وجود بالکل مٹ نہ جائے یہ خوف بیجا بھی نہیں تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کی حکومت کا تو نہیں لیکن یہاں کے اکثریتی فرقہ کے جذبات یہ ہیں کہ مسلمانوں کو جو کچھ لینا تھا وہ پاکستان کی شکل میں لے چکے ہیں، ہندوستان میں اب وہ کسی سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی رعایت کے مستحق نہیں، ان جذبات کا اظہار جن مختلف صورتوں میں ہوتا رہتا ہے، اس سے مسلمان حکومت کی یقین دہانی کے باوجود اپنے کو ایک آزاد جمہوریہ کا آزاد شہری تصور کرنے کے بجائے ایک مجبور اور بے بس اقلیت سمجھتے ہیں، اور ملک میں آئے دن کے بلوؤں میں ان کا خون جو پانی کی طرح بہتا رہتا ہے، اس سے ان کا خوف بڑھتا جاتا ہے کہ ان کا تہذیبی وجود کہیں بالکل ختم نہ ہوجائے ذاکر صاحب کو مسلمانوں کے اس خوف کا احساس رہا، وہ بہار کے گورنر اور حکومت ہند کے نائب صدر ہونے سے پہلے کاشی ودیا پیٹھ میں مدعو کیے گئے تو وہاں انھوں نے اپنے خطبہ میں کہا کہ:

''کیا ہندوستان کا قومی نظام تعلیم مسلمانوں کو اس بات کا موقع دے گا یا نہیں کہ وہ اپنی تمدنی زندگی کو اپنی تعلیم کا ذریعہ بنائیں، آپ جانتے ہیں کہ یہ مسئلہ ہماری قومی زندگی کے لیے کتنا اہم ہے، ممکن ہے کہ بعض نیک نیت اور انتہا پسند قوم پرست متحدہ ہندوستانی قومیت کی ایسی تصویر اپنے ذہن میں رکھتے ہوں جس میں مسلمانوں کو یہ حق دینا قوم کی قوت اور قوم کی ترقی کے لیے مضر ہو، مگر ہمارے ماہرین تعلیم اگر نیک نیتی سے ہندوستان کی تعلیم کا نظام بنائیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ مسلمانوں کی اس خواہش کو خوشی سے قبول کرلیں گے کہ وہ اپنی تعلیم کی بنیاد اپنے تمدن پر رکھیں کہ صحیح تعلیم اور صحیح سیاست دونوں کا یہی تقاضا ہے آپ مجھے معاف فرمائیں گے اگر اس معزز مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کروں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ ہندوستانی قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے، اس میں جہاں شخصی خودغرضیاں تنگ نظری اور آپس کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قائم کرسکنے کو دخل ہے، وہاں اس شدید شبہ کا بھی بڑا حصہ ہے کہ قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں، اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں سچے ہندوستانی کی حیثیت سے

بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان قیمت ادا کرنے پر تیار نہیں، اس لیے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا سو ہوگا ہی، خود ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہنچ جائے گا''۔

گرچہ مثلِ غنچہ دل گیریم!
گلستان میر دا گر میریم!

یہی وجہ ہے کہ سچے مسلمان ہندوستانی اپنی مذہبی روایات اپنی تاریخ، اپنی تمدنی خدمات اور اپنے تمدن سے توقعات کی وجہ سے اپنے ملّی وجود کو اپنے لیے ہی بے بہا نہیں سمجھتے بلکہ ہندوستانی قومیت کے لیے بھی نہایت بیش قیمت جانتے ہیں، اور اس کے مٹائے جانے یا کمزور کیے جانے کو اپنے ہی ساتھ ظلم نہیں بلکہ ہندوستانی قوم کے ساتھ بھی سخت خیانت سمجھتے ہیں، ہندوستانی مسلمانوں کو اپنا دیش کسی اور سے کم عزیز نہیں ہے، وہ ہندوستانی قوم کا جز ہونے پر فخر کرتے ہیں مگر وہ ایسا جز بننا کبھی گوارہ نہ کریں گے جس میں ان کی اپنی حیثیت بالکل مٹ چکی ہو''۔ (یادوں کی دنیا، ص: ۲۱۱-۲۱۰)

لیکن اسی کے ساتھ وہ مسلمانوں کو یہ بھی تلقین کرتے رہے کہ قومیت اور اسلامیت ایک دوسرے کی ضد اور نقیض نہیں، بلکہ ان کو ایک دوسرے سے تقویت حاصل ہونی چاہیے، جامعہ ملیہ میں ان کی ساری سرگرمیوں کا محور یہی رہا کہ وہ مسلمانوں کی آئندہ زندگی کا ایک ایسا نقشہ تیار کریں جس کا مرکز مذہب اسلام ہو اور اس میں ہندوستان کی قومی تہذیب کا وہ رنگ بھرا جائے جو عام انسانی تہذیب کے رنگ میں کھپ جائے۔ وہ اس کا اظہار برابر کرتے رہے کہ مذہب کی سچی تعلیم ہندوستانی مسلمانوں کو وطن کی محبت اور قومی اتحاد کا سبق دے گی، اور ہندوستان کی ترقی میں حصہ لینے پر آمادہ کرے گی، اور آزاد ہندوستان اور ملکوں کے ساتھ مل کر دنیا کی زندگی میں شرکت اور امن و تہذیب کی مفید خدمت کرے گا۔ وہ سمجھتے رہے کہ تنگ نظری اور تعصب کے اس دور میں یہ تصور محض خواب و خیال ہے لیکن وہ ہمت، اخلاص، محنت اور استقلال سے اس خواب کو حقیقت کا جامہ پہنانا چاہتے تھے۔

گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو کی طرح ان کی بھی خواہش رہی کہ آزاد ہندوستان میں باہمی دل آزاری اور بیزاری کے بجائے باہمی رواداری اور یگانگت ہو، اسلامیت اور قومیت کا حسین امتزاج ہو، اسی امتزاج کی خاطر ان سے بعض ایسی باتیں عمل میں آجاتی تھیں جن سے ان پر بڑی نکتہ چینیاں ہونے لگتی تھیں، وہ جو رواداری چاہتے تھے، اس کے لیے ہندوستان کا مزاج ابھی نہیں بنا تھا، وہ خاندانی طور پر اچھے قسم کے مسلمان تھے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ الجامعہ رہ چکے تھے، اس لیے مسلمان ان میں اسلامیت چاہتے تھے، جب وہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہونے لگے تو حکومت اور اکثریتی فرقہ دونوں ان عہدوں کا معاوضہ ان کی بے داغ قومیت کی شکل میں چاہتے تھے اور وہ بھی قومیت ایسی ہو جس کا معیار انھوں نے خود قائم کیا ہے، ذاکر صاحب کو اپنے عہدوں کا معاوضہ ادا کرنا پڑا لیکن میرا اپنا خیال ہے کہ اس کے ادا کرنے میں ان کو گھٹن محسوس ہوتی رہی کیونکہ ان کے سامنے ہندوستانی قومیت کا جو تخیل تھا، وہ تقسیم ہند کے بعد باقی نہ رہا، مسلمان ان کو مسلمان دیکھنا چاہتے تھے، ہندو ان کو ہندوستانی حکومت کا ایک وفادار عہدیدار کے علاوہ کچھ اور دیکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ کوئی ان کے حسن امتزاج کو پسندیدہ نگاہ سے دیکھنے کو تیار نہ تھا وہ سچے مسلمان اور پکے ہندوستانی بننے کا عزم رکھتے تھے، اس عزم کو اپنے اخلاص اور نیت کی پاکیزگی سے عمل میں لاکر ایک مثالی نمونہ پیش کرنے کی کوشش کرتے رہے، لیکن یہ راہ ہندوستان کی موجودہ فضا میں بڑی خاردار تھی، انھوں نے اسلامیت اور ہندوستانی قومیت کے حسن امتزاج کا جو خواب دیکھا تھا، ان کے اخلاص، محنت اور استقلال کے باوجود حقیقت میں تبدیل نہ ہوسکا، جامعہ کی زندگی میں وہ بے داغ ہیرو بن کر رہے، لیکن اپنے بڑے سے بڑے عہدوں کے زمانے میں رہین ستم ہائے روزگار بن گئے، معلوم نہیں ان کو اپنے آخری زمانے میں کونسی زندگی قابل ترجیح نظر آتی تھی، جامعہ ملیہ کی عسرت بھری زندگی یا راشٹر پتی بھون کی عشرت بھری فضا۔

لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے بڑے سے بڑے عہدوں کے باوجود ہر زمانہ میں ذاکر صاحب ہی رہے، مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو کچھ عرصہ کے بعد ان پر نکتہ چینی ہونے لگی کہ وہ جامعہ ملیہ کے شیخ الجامعہ نہیں رہے، بلکہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوگئے، ان پر ہندو نوازی کا بھی الزام آیا، ان پر یہ بھی اعتراض ہوا کہ طالبات کی بے پردگی اور آزادی ان ہی کے دور سے شروع ہوئی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلم یونیورسٹی پاکستان تحریک کا بڑا مرکز بنی ہوئی تھی، قائداعظم محمد علی جناح اس کو اپنا Arsenal کہتے تھے، علی گڑھ کے اس رول کو حکومت اور اس کے ہم نوا فراموش کرنے کے لیے تیار نہ تھے، سیکولرزم کی آڑ میں اس کی اصلی حیثیت کو ختم کرنے کا بیڑا اٹھایا تو اس وقت اس کو ذاکر صاحب اور صرف ذاکر صاحب ہی بچا سکتے تھے۔

انھوں نے حکومت کی تھوڑی سی مزاج داری کرکے علی گڑھ کو مجموعی حیثیت سے بچالیا، حکومت کی یہ مزاجداری کچھ لوگوں کو پسند نہ آئی، لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا، ذاکر صاحب کا یہ کارنامہ ہے کہ اس دار و گیر کے زمانے میں یونیورسٹی کے سالانہ بجٹ کو پندرہ لاکھ سے پچاس لاکھ تک پہنچا دیا، وہاں انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز اور ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی تاریخ پر تحقیق کا شعبہ اور ادب اردو کی تاریخ مرتب کرنے کی اسکیم ان ہی کی قائم کی ہوئی ہے، تار کے بنگلے کے پاس اس وقت ایک بہت ہی خوبصورت مسجد ہے، یہ ان ہی کی بنوائی ہوئی ہے، انھوں نے اس کا نقشہ ایک جرمن

انجینئر کو بلا کر تیار کرایا، پھر خود کھڑے ہوکر اس کی تعمیر کی نگرانی کرتے تھے، یہ جب بن گئی تو اکثر اس میں آکر نماز باجماعت ادا کرتے تھے، یہاں ان کی خوش مذاقی کا اظہار چمن بندی اور طراحی میں بھی ہوا، میں یونیورسٹی کا طالب علم تھا، تو سوئمنگ باتھ کے پاس جو ایک لان ہے وہیں کچھ پھول نظر آتے تھے، اور ہر جگہ زمین اوسر پڑی تھی، ذاکر صاحب نے اپنی وائس چانسلری کے زمانہ میں یونیورسٹی کے احاطہ کو چمن زار بنادیا، وہ گلاب اور بوگن ولیا کے عاشق زار تھے، یونیورسٹی میں گلابوں کے جابجا چمن لگائے، جن میں نارنجی، ارغوانی، سیاہ، سبز اور فاختئی رنگ کے بھی گلاب دیکھنے میں آئے، ایس۔ ایس۔ ہال کے باہر کے کمروں کی دیواروں کو بوگن ولیا کی باڑھ سے لاد دیا، اور جب ان کے پھول کھلتے ہیں یونیورسٹی لالہ زار بن جاتی ہے، ذاکر صاحب کے بوگن ولیا کے اس شغف کو دیکھ کر یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر جناب حبیب الرحمٰن صاحب (سابق پرنسپل ٹریننگ کالج) نے اس کی ایک قسم تیار کی جس کا نام ذاکریانا رکھا، اس میں گلابی اور نارنجی رنگوں کی حسین اور لطیف آمیزش تھی، ذاکر صاحب یونیورسٹی کو بھی اسلامیت کے گلابی اور ہندوستانیت کے نارنجی رنگوں کی حسین اور لطیف آمیزش کا ایک بوگن ولیا بنانا چاہتے تھے، لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد مسموم فضا اس کے لیے سازگار نہ ہوسکی، اکثریت و اقلیت کے فکر ونظر کے تصادم سے وہ اپنے خواب کو حقیقت کا جامہ یہاں بھی نہ پہنا سکے، اور ان کی بہت سی تمنائیں اور آرزوئیں پروان چڑھنے سے پہلے ہی ان کی وائس چانسلری کی مدت ختم ہوگئی مگر وہ اور ان کے ساتھ بہت سے لوگ خوش تھے کہ یونیورسٹی انقلاب کی زد سے محفوظ رہ گئی، گو کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو ان کی بہت سی اصلاحات سے ناخوش بھی تھے۔

یونیورسٹی کی وائس چانسلری کے زمانہ میں ان سے میری ملاقات نہیں ہوئی، لیکن اس زمانہ میں دارالمصنفین کے لوگوں میں سے کوئی بھی علی گڑھ جاتا تو وہ اپنے دیرینہ اخلاق سے پیش آتے، ایک بار مولانا مسعود علی ندوی مرحوم اور شاہ معین الدین صاحب ندوی دونوں ساتھ وہاں پہنچے، تو ذاکر صاحب نے ان کی ایک پرتکلف دعوت کی، شاہ معین الدین صاحب انجمن ترقی اردو کے رکن ہونے کی حیثیت سے علی گڑھ برابر جاتے رہتے، ذاکر صاحب ان کو جلسہ گاہ میں لانے کے لیے اپنی موٹر بھیجتے اور ان کی قیام گاہ پر آکر دیر تک پرلطف باتیں بھی کرتے رہتے۔

۱۹۵۹ء میں جب وہ بہار کے گورنر تھے، تو میں پٹنہ جاکر گورنر ہاؤس میں ان سے ملا، اتنے طویل وقفہ کے بعد کی ملاقات کے بعد خیال تھا کہ وہ مجھے بھول چکے ہوں گے لیکن میرا تعلق دارالمصنفین سے بھی ہو چکا تھا، اس لیے ان سے ملا، تو ان میں جامعہ ملیہ ہی کے زمانہ کی خاکساری ملنساری، محبت اور شفقت پائی اور جب انھوں نے گفتگو شروع کی تو معلوم ہوتا تھا کہ قرول باغ کے مکان ہی میں بیٹھ کر باتیں کررہے ہیں، دارالمصنفین کے تمام لوگوں کی خیریت پوچھی، اس کی علمی سرگرمیوں کی تعریف کی، سید صاحبؒ کا وصال کراچی میں ہو چکا تھا، ان کا ذکر دیر تک کرتے رہے، اور جب ان سے رخصت ہونے لگا تو گلے سے اس طرح لگایا جیسے اپنے کسی عزیز خاص کو رخصت کررہے ہیں۔

اس کے کچھ دنوں کے بعد انھوں نے حضرت سید صاحبؒ کے وطن دیسنہ کو دیکھنے کا پروگرام بنایا، جہاں ان کا بہت ہی مخلصانہ خیر مقدم کیا گیا، میں بھی اس موقع پر وہاں پہنچ گیا، جلسہ گاہ میں سپاسنامہ پڑھے جانے سے پہلے چار پانچ برس کے ایک ہریجن بچے نے ان کو ہار پہنانا چاہا، اس کے ہاتھ ان کے گلے تک نہیں پہنچے تو انھوں نے اپنے اعلیٰ مرتبہ کا خیال کیے بغیر اس کو اپنی گود میں اٹھا لیا اور گردن جھکا کر ہار پہن لیا، اس امتیاز پر اس ہریجن بچہ کا خاندان ابھی تک فخر کرتا ہے، سپاسنامہ کے جواب میں انھوں نے سید صاحبؒ کا ذکر دیر تک کیا، اور آبدیدہ ہوکر کہا کہ جن چند بزرگوں نے ان کی ز ندگی کا رخ موڑا ہے اُن میں ایک سید صاحب بھی ہیں، اس گاؤں میں اردو کا ایک بڑا اچھا کتب خانہ تھا، تقریباً دس بارہ ہزار کتابیں رہی ہوں گی، ذاکر صاحب کو یہ کتب خانہ بہت پسند آیا، میں نے اس میں خود گاؤں کے چند مشہور مصنفوں مثلاً سید سلیمان ندوی، مولانا سید ابوظفر ندوی اور سید نجیب اشرف ندوی وغیرہ کی تصانیف ان کو دکھائیں، تو فرمایا کہ جس گاؤں میں اتنے مشہور مصنف ہوئے ہیں اُن پر ہندوستان کو فخر ہونا چاہیے، جلسہ کی تقریب ختم ہوئی تو انھوں نے حضرت سید صاحب کا مکان دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، میں نے عرض کیا کہ وہاں جانے میں کچھ ایسی گندی گلیاں ملیں گی جہاں پر سے آپ کا گذرنا مناسب نہیں، فوراً جواب دیا کہ میں ہر زمانہ میں گورنر نہیں رہا ہوں، ایسی ہی گلیوں میں کھیلا کودا اور پلا ہوں، اور پھر میں نے ان گلیوں میں ان کی رہبری کی۔

۱۹۴۷ء کے بعد یہ شاداب گاؤں ویران ہوتا چلا گیا، اس کے بیشتر باشندے پاکستان چلے گئے، کتب خانہ کا قیمتی ذخیرہ گاؤں ہی میں رہ گیا برابر ڈر لگا رہا کہ کہیں بلوے فساد میں یہ ضائع نہ ہوجائے، گاؤں کے سنجیدہ لوگ چاہتے تھے کہ اس کو پٹنہ منتقل کرکے خدا بخش خاں کی لائبریری کا ایک جز بنادیا جائے لیکن وہاں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اس کے ذریعہ گاؤں کی سیاست کا کھیل کھیلا کرتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ یہ کہیں منتقل نہ ہونے پائے، اسی کشمکش میں مولوی سید عبدالحفیظ ندوی صاحب ناظم کتب خانہ اور جناب سید عبدالقیوم صاحب نائب ناظم نے چپکے سے ایک خط ذاکر صاحب کو لکھ دیا کہ آپ اس کو خدا بخش خاں لائبریری میں منتقل کرادیں، ذاکر صاحب کی اندرونی خواہش پوری ہوتی نظر آئی، انھوں نے فوراً پٹنہ ڈویژن کے کمشنر کو ایک خط لکھا جس کو پاتے ہی کمشنر ضلع کے کلکٹر اور دوسرے حکام دیسنہ پہنچ گئے، برسات کا زمانہ تھا، وہاں تک ٹرک جا نہیں سکتے تھے، لیکن انھوں نے سولہ ۱۶ بیل گاڑیوں پر کتابیں لدوائیں، اور پھر تھوڑی دور جاکر ٹرک پر رکھ کر پٹنہ لے اڑے، گاؤں کی دوسری پارٹی دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی، یہ

کتب خانہ اب دیسنہ بلاک کے نام سے خدابخش خاں لائبریری کا ایک حصہ ہے۔

مجھ کو اس کی خبر ملی تو خوش تھا کہ ایک قیمتی ذخیرہ ایک اچھی جگہ محفوظ ہو گیا لیکن ہم لوگوں نے جس ذوق وشوق سے اس ذخیرہ کو جمع کیا تھا، اس کا خیال آیا تو محسوس ہوا کہ اس گاؤں کی اب روح نکل گئی اور اب یہ صرف بے روح کا ایک ڈھانچہ رہ گیا ہے میں نے ذاکر صاحب کو اپنے ملے جلے تاثرات کا اظہار کیا اور یہ شعر بھی لکھ بھیجا:

نشیمن پھونکنے والے ہماری زندگی یہ ہے
کبھی روئے کبھی سجدے کیے خاک نشیمن پر

ذاکر صاحب نے جو جواب لکھا اس میں گاؤں کی دوسری پارٹی کے ایک فرد کا خط بھی منسلک کردیا جو بڑی بدتمیزی سے لکھا گیا تھا، کوئی دوسرا گورنر ہوتا تو اس کو پڑھ کر معلوم نہیں غصہ میں کیا کیا کارروائیاں کرنے پر آمادہ ہوجاتا لیکن ذاکر صاحب کو شاید کبھی غصہ نہیں آیا، ان کے مخالفین اور ناقدین ان سے اشتعال انگیز باتیں بھی کرتے تو وہ ہنس کر ٹال دیتے، ان کی پوری زندگی پُرشور رہی لیکن وہ کبھی کسی سے نہیں الجھے، کسی کو کوئی سخت خط نہیں لکھا، کسی سے ترشی سے نہیں بولے، اخباروں میں متنازع فیہ بیانات شائع نہیں کیے، ان پر غلط اعتراضات ہوئے تو اس کی تردید بھی نہیں کی، ان کے بدباطن ناقد ان سے ملتے تو وہ پہلے سے بھی زیادہ لطف وکرم سے پیش آتے، اس لیے مشہور تھا کہ وہ اپنے دوستوں سے زیادہ اپنے خبیث مخالفوں کے ساتھ اچھے برتاؤ کرتے ہیں، کچھ بڑے بلکہ بہت بڑے لوگ ایسے بھی گذرے ہیں جو خبیثوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر کے ان کی خباثت میں اضافہ کردینے ہی میں اصلی انتقام سمجھتے ہیں، ذاکر صاحب کے یہاں انتقام لینے کا تو کبھی کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوا ہے، لیکن وہ اپنے خبیث مخالفوں کو ہر قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا رکھنے ہی میں، اپنی فتح سمجھتے، میرے ہموطن نے ان کو جو بدتمیزانہ خط لکھا اس سے مجھ کو بڑی ندامت ہوئی، لیکن ذاکر صاحب نے اپنی طبیعت کی بلندی سے عفو ودرگذر سے کام لیا۔

اس کے تھوڑے دنوں کے بعد ہی دہلی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی یادگار میں نئی دہلی میں جو آزاد بھون تعمیر ہوا تھا، اس کا افتتاح راجندر پرشاد نے کیا، میں بھی اس میں انڈین کانسل آف کلچرل ریلیشنز کے ممبر کی حیثیت سے شریک تھا، اسی زمانہ میں دہلی میں گورنر کانفرنس ہورہی تھی، اس تقریب میں وہ سب بھی مدعو تھے، جو ایک جگہ بٹھائے گئے، ان کے بیچ میں ذاکر صاحب بیٹھے نظر آئے، مجھ کو بہت ہی بھلے معلوم ہوئے سب میں ہی سب سے زیادہ شکیل، وجیہہ، پرشکوہ اور باوقار نظر آئے، اور ان کے ساتھ جب وہ کھڑے ہوئے تو ایسا معلوم ہوا کہ یونانی سنگ تراشی کے آرٹ کا بہترین نمونہ نگاہوں کے سامنے ہے، جلسہ ختم ہوا تو وہ سب سے ایسے بے تکلفانہ انداز میں ملنے لگے جیسے وہ گورنر نہیں ہیں، مجھ پر نظر پڑی تو میری طرف بھی بڑھے اور بڑی شفقت سے فرمایا، کہئے کتب خانہ کے ہجر کا غم باقی ہے یا جاتا رہا اور گاؤں والے کا کیا خیال ہے پھر اس بدتمیزانہ خط کا بھی ذکر کیا، میں نے ان سے اپنی ندامت اور معذرت کا اظہار کیا اور عرض کیا کہ ہم تمام لوگ آپ کے ممنون ہیں کہ آپ نے ایک قیمتی ذخیرہ کو محفوظ کردیا، ایسا نہ ہوتا تو یہ علمی دولت ضائع ہوجاتی۔ (جون ۱۹۶۹ء)

(۲)

گورنری کے عہدہ سے سبکدوش ہوئے تو وہ ۱۹۶۲ء میں جمہوریہ ہند کے نائب صدر منتخب کرلیے گئے، ان کے اس اعزاز پر ہم دارالمصنفین والوں کو بڑی خوشی ہوئی، ان کی نائب صدارت کے زمانہ میں مجھ کو بارہا ملنے کا اتفاق ہوا، ہر موقع پر ان کی ملنساری، وضعداری، خاکساری اور محبت کو پہلے سے زیادہ پایا، وہ دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے رکن ۱۹۴۷ء سے تھے، اس حیثیت سے بھی دارالمصنفین کے تمام لوگوں سے محبت کرتے اور اس کے کاموں سے دلچسپی رکھتے، حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی رحلت کے بعد خود ہم لوگ مشکوک تھے کہ معلوم نہیں اس کا علمی وتحقیقی معیار باقی رہ بھی سکے گا کہ نہیں، ڈاکٹر صاحب سے جب ملتا، اور دارالمصنفین کا ذکر آتا تو اس کے معیار کے برقرار رہنے کی تعریف کر کے حوصلہ افزائی فرماتے، ایک بار میں نے ان کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا، جس کے شروع میں میرے قلم سے یہ نکل گیا تھا کہ ”امید ہے آپ مجھ کو بھولے نہ ہوں گے“۔ اس کا جواب اپنے ایک سرفراز نامہ مورخہ ۳/اگست ۱۹۶۳ء میں دیا، تو تحریر فرمایا کہ ”یہ بدگمانی آپ کو کیوں ہے کہ میں آپ کو بھول گیا ہوں، حافظہ تو میرا کچھ اچھا نہیں رہا ہے، لیکن آپ کو بھلانا تو میرے حافظہ کے لیے بھی مشکل ہے“۔ ان فقروں میں خود بلند مرتبہ کاتب کی شرافت طبع کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

دارالمصنفین میں تاریخ ہند پر جو کام ہورہا تھا، اس کی پندرہ جلدیں ان کی خدمت میں مذکورہ بالا خط کے ساتھ بھیجی تھیں، ان کے متعلق لکھا ”تاریخ ہند سے متعلق دارالمصنفین کی مطبوعات کا پورا سیٹ مجھے مل گیا ہے، کن لفظوں میں آپ کے اس کرم کا شکریہ ادا کروں، بعض کتابیں تو پہلے نظر سے گزر چکی ہیں، لیکن اس پورے سیٹ سے کام کی وسعت اور نوعیت کا وہ اندازہ ہوتا ہے جو مجھے پہلے نہ تھا، آپ نے ایک بڑا کام اٹھایا ہے، دعا ہے کہ آپ کے ہی ہاتھوں تکمیل کو پہنچے، آپ کی یکسوئی، مستعدی اور خلوص سے یقین ہے کہ اس دعا کو قبولیت نصیب ہوجائے گی“۔

اسی سال میں نے تاریخ ہند کی دو نئی جلدیں اور ان کی خدمت میں بھیجیں تو اپنے ایک مکتوب مورخہ ۸/دسمبر ۱۹۶۳ء میں تحریر فرمایا ”مطبوعات دارالمصنفین کی دو جلدیں ”ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی جلوے“ اور ”ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے تمدنی کارنامے“ مجھے ملیں، جستہ جستہ دیکھ رہا ہوں، بہت خوب کام ہے، اس عہد کی تمدنی تاریخ پر بہت اچھی اور تفصیلی معلومات کا ذخیرہ ہے، یہ دونوں کتابیں

آپ جس مستعدی اور یکسوئی سے اپنے استاد مرحوم کے تفویض کردہ کام کی تکمیل کر رہے ہیں، اس پر بے ساختہ دل سے صدائے آفریں نکلتی ہے، مبارک ہو''۔

ذاکر صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ کام کرنے والوں کو اپنی پیاری پیاری باتوں سے ان کی دبی ہوئی صلاحیتوں کو ابھارتے، بلکہ اکسا کر ان کو اور بھی زیادہ مستعدی سے کام کرنے کی ہمت دلاتے، یہ تحریریں ان کی ان ہی خوبیوں کے نمونے ہیں، وہ اپنے خطوط میں مجھ کو محبی، محبّ گرامی، محبّ گرامی سید صباح الدین عبدالرحمٰن زاد لطفہ سے مخاطب کرتے، میں نے ان کو توجہ دلائی کہ میری حیثیت تو آپ کے ایک ادنی شاگرد کی ہے، محبی پڑھ کر شرمندہ ہوتا ہوں، تو اس کے جواب میں دو تین خطوط میں مکرم بندہ سے مخاطب فرمایا، اس سے اور بھی ندامت ہوئی، اور پھر محبی لکھنے لگے، یہ ان کی بلندی اخلاق اور خاکساری کی دلیل تھی، میں جب جب دہلی جاتا تو اعظم گڑھ سے روانہ ہوتے وقت خوش رہتا کہ دہلی میں ان سے مل کر ان کے لطف و کرم سے سیراب ہونے کا موقع ملے گا، اور ان ہی کی محبت بھری باتوں کی سوغات اعظم گڑھ لاتا۔

ایک بار جناب شاہ معین الدین صاحب ندوی بھی ہمسفر ہوئے، ہم دونوں ذاکر صاحب سے ملے، تو دیر تک بڑی بے تکلف مجلس رہی، ہم دونوں رخصت ہونے لگے تو ذاکر صاحب اپنی برساتی تک پہنچانے آئے، رات کا وقت تھا، شاہ صاحب نے رخصتی مصافحہ کیا تو ذاکر صاحب کچھ دیر تک روبرو کھڑے ہو کر ان کا ہاتھ پکڑے رہے، اوپر دونوں کے چہروں پر ایک بہت تیز بجلی کا بلب جل رہا تھا، ذاکر صاحب، شاہ صاحب کے وجیہہ چہرے کو دیکھ کر بولے ماشاء اللہ چہرہ پر نور برس رہا ہے، شاہ صاحب نے برجستہ جواب دیا ''جی نہیں، یہ جمال ہمنشیں کا عکس ہے''، ذاکر صاحب بے ساختہ ہنس پڑے، میں نے فوراً ہی کہا ''اگر اجازت ہو تو عرض کروں کہ کابل کے مشہور شاعر سرور خاں گویا ۱۹۳۶ء میں ہندوستان آئے تھے، وہ آپ سے بھی جامعہ ملیہ میں ملے تھے، پھر دہلی سے لکھنؤ ہوتے ہوئے اعظم گڑھ بھی پہنچے تھے، انھوں نے ایک گفتگو کے سلسلہ میں حضرت سید صاحب (یعنی مولانا سید سلیمان ندویؒ) سے کہا کہ ''میں نے ہندوستان میں حسین ترین آدمی ڈاکٹر ذاکر حسین کو پایا''۔ یہ سن کر ذاکر صاحب نے فرمایا ''اخاہ! آپ نے یہ بات بہت دیر میں بتائی اگر پہلے بتائی ہوتی تو میں اس کو سند کے طور پر استعمال کرتا رہتا''۔

اس پر لطف ملاقات کے بعد ہم دونوں ذاکر صاحب کی کوٹھی سے براہ راست ایک دعوت میں پہنچے جہاں ہم لوگوں کی خاطر کچھ اور معززین بھی بلا لیے گئے تھے، ان میں کچھ سرکاری عہدیدار اور کچھ اخبار کے اڈیٹر بھی تھے، میری شامت آئی تو اثنائے گفتگو میں ذاکر صاحب کے یہاں جو دلچسپ باتیں ہوئی تھیں، ان کو دہرادیا، سامعین سن کر خاموش ہوگئے، انھوں نے ان باتوں سے نہ لطف لیا اور نہ ان پر تبصرہ کیا، بلکہ محض سن لیا، پندرہ منٹ کے وقفہ کے بعد ان لوگوں نے خود ذاکر صاحب کو موضوع بنایا، جن کو سن کر ہم دونوں کو اندازہ ہوا کہ یہ سب ان کے ناقدین میں سے ہیں، پھر ان کے منہ میں جو کچھ آیا سب کہہ گئے، ''وہ ہندو نواز ہیں، ہندوؤں کو صرف خوش رکھنا چاہتے ہیں، بلوے فساد ہوتے رہتے ہیں مگر مسلمانوں کی حمایت میں کچھ نہیں کہتے'' وغیرہ مجھ کو افسوس ہوا کہ میں نے اس مجمع میں ذاکر صاحب کا نام ہی کیوں آنے دیا۔

جنوری ۱۹۶۴ء میں انٹرنیشنل اورینٹل کانفرنس کا ۲۶ واں اجلاس دہلی میں منعقد ہوا، مجھ کو بھی ایک مقالہ اس کے اسلامک اسٹڈیز سیکشن میں پڑھنا تھا، دنیا بھر کے مستشرقین کا بڑا اچھا اجتماع تھا، میں نے دہلی جانے سے پہلے حسب معمول ذاکر صاحب کو ایک خط لکھ کر ان سے ملاقات کا وقت مانگا، اورینٹل کانفرنس کے شرکاء راشٹرپتی بھون میں صدر جمہوریہ ہند جناب رادھا کرشنن کی طرف سے ایٹ ہوم میں مدعو تھے، میں نے بھی اس میں شرکت کی، لیکن رادھا کرشنن اپنی علالت کی وجہ سے وہاں نہ پہنچ سکے، ان کی نیابت ذاکر صاحب نے کی، چائے کے بعد وہ سب سے بے تکلف ملے، مجھ سے بھی ملاقات ہوئی تو فرمایا ''گھر پر آکر ضرور ملیے، جب رخصت ہونے لگے تو ایک اونچے تخت پر کھڑے ہوگئے، دونوں ہاتھ جوڑ کر رخصتانہ سلام کیا، اس وقت میرے پاس ایک کٹر اہل علم نیشنلسٹ مسلمان کھڑے تھے، جو آگے چل کر راجیہ سبھا کے رکن بھی ہوئے، انھوں نے ذاکر صاحب کو اس طرح ڈنڈوت کرتے دیکھا تو بولے ''بہار سے تم لوگوں نے ذاکر صاحب کو یہی سوغات دی ہے، پہلے تو اس طرح سلام نہیں کرتے تھے، مولانا ابوالکلام آزاد نے تو کبھی بھی اس طرح سلام نہیں کیا، یہ محض ہندوؤں کو خوش کر رہا ہے''۔ میں اس وقت یہ سننے کو تیار نہ تھا، دل میں ایک چوٹ لگی، مگر ہنس کر ان کو تو یہ جواب دیا: غمزۂ خاص بہر گبر و مسلمان دارد

اور میں زبان حال سے کہہ رہا تھا: ذاکر کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

اور جب راشٹرپتی بھون سے رخصت ہو رہا تھا، تو ذہن پر یہ خیال چھایا ہوا تھا کہ لوگ اپنی محبت میں ان کو جامعہ ملیہ ہی کا مرد مومن ہر حال میں دیکھنا چاہتے ہیں، کاش ان سے کوئی بات ایسی سرزد نہ ہوتی کہ جس سے ان کی محبوبیت اور عظمت میں فرق آتا، میں پھر ان کی کوٹھی پر جا کر ملا، ان سے عرض کیا کہ اسی سال دارالمصنفین کی طلائی جوبلی منانے کا خیال ہے، آپ سے بڑھ کر اس جشن کے افتتاح کے لیے کوئی اور آدمی موزوں نہیں ہے، انھوں نے بڑی خوشی سے میری دعوت قبول فرمائی، ان سے یہی توقع تھی، کیونکہ ان کو دارالمصنفین سے بڑا لگاؤ رہا، پھر اس کو کامیاب بنانے کے لیے مختلف قسم کے مشورے دیر تک دیتے رہے، میں ان سے ایک بار پھر شاداں و فرحاں ہو کر رخصت ہوا۔

اکتوبر ۱۹۶۴ء میں صاحب شاہ معین الدین احمد ندوی اور میں دونوں بمبئی گئے

ہوئے تھے، وہاں سے سیدھے دہلی پہنچے کہ ذاکر صاحب سے گفتگو کر کے جشن کی تاریخ مقرر کرلی جائے، وہ حسب معمول بہت ہی محبت سے ملے اور تاریخ ۲۰/۲۱/ فروری ۱۹۶۵ء مقرر کی، اسی اثناء میں آزاد بھون کے ایک ڈنر میں جناب عبدالکریم چھاگلا سے میری ملاقات ہوئی جو اس زمانہ میں وزیر تعلیم تھے، میں نے ان کو شبلی اکیڈمی کی جوبلی میں مدعو کیا، وہ مولانا شبلی اور شبلی اکیڈمی سے بالکل واقف نہ تھے، انگریزی میں پوچھنے لگے، مولانا شبلی کون تھے اور کیا یہ اکیڈمی آرٹ کی اکیڈمی ہے؟ میں نے اس کا ذکر ذاکر صاحب سے کیا تو ہنس کر فرمایا کہ کہہ دیا ہوتا کہ یہ رقص وسرود کی اکیڈمی ہے، چلتے وقت تین ہزار کی رقم بھی دارالمصنفین کو عطیہ کے طور پر دی، اس موقع پر اپنے پھولوں کا چمن بہت شوق سے دکھایا، جس میں گلابوں اور بوگن ولیا کی بڑی بہار تھی، ان کے چمن میں گلابوں کی چار سو قسمیں تھیں جو انھوں نے نہ صرف ہندوستان کے مختلف گوشوں بلکہ انگلستان، فرانس اور جرمنی سے بھی منگوائی تھیں، ان کے اس ذوق کو دیکھ کر گلاب کے ماہرین بھی ان کے پاس تحفے بھیجا کرتے تھے، صوبہ بہار میں دیو گھر میں گلابوں کی بہت سی قسمیں تیار ہوتی ہیں، وہاں اس کے ماہر نگراں مسٹر بھٹا چارجی تھے، وہ ذاکر صاحب سے بہار کی گورنری کے زمانے میں ملے، تو ان کے اس شوق کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے گلاب کی ایک قسم کا نام ذاکر حسین ہی رکھ دیا، جو اب اسی نام سے مشہور ہے، ذاکر صاحب نے اپنی کوٹھی میں ہم لوگوں کو ایک ایسا بوگن ولیا بھی دکھایا جس میں کئی رنگ کے پھول تھے، میں نے ان سے دریافت کیا کہ یہ کیسے ممکن ہوسکا تو انھوں نے فرمایا کہ آپ اس کی تحقیق نہ کیجیے، آپ اپنی علمی و تاریخی تحقیقات ہی میں رنگ برنگ کے پھول پیدا کرنے میں لگے رہیں۔

دارالمصنفین واپس آکر طلائی جوبلی کے جشن کی تیاری شروع کردی، جناب شاہ معین الدین اور میرے دونوں کے دل دھڑکتے رہے کہ اس دور افتادہ مقام میں مدعوئیں آنا مشکل ہے، اس لیے جشن کامیاب نہ ہوسکے گا، میری صحت اچھی نہیں رہتی ہے، لیکن میں نے جشن کو کامیاب بنانے میں جان کی بازی لگادی، یہاں اس شہر میں کوئی اچھا ہوٹل نہیں ہے، جہاں معزز بیرونی مہمانوں کے ٹھہرنے کا انتظام کیا جاسکتا تھا، نائب صدر جمہوریہ کے لیے بھی کوئی موزوں جگہ نہ تھی، لیکن کافی خرچ کر کے بہترے بہت خیمہ و خرگاہ شبلی کالج کے میدان میں نصب کئے گئے، پنڈال بھی خوبصورت تیار کیا گیا، ایک روز پہلے دارالمصنفین کو آراستہ و پیراستہ کر کے دلہن بنادیا گیا، جو طرح طرح کی روشنی سے جگمگانے لگا، پھر بھی ڈر تھا کہ مدعوئین نہ پہنچے تو خفت اور مالی زیر باری دونوں ہوگی، لیکن ذاکر صاحب کا اقبال روز افزوں عروج پر تھا، اس لیے ان کی آمد میں دارالمصنفین پر بھی اقبال طاری ہوا، بیگم صاحبہ بھوپال کا تار پہنچا کہ وہ بھی تشریف لائیں گی، اتر پردیش کی چیف منسٹر مسز سچیتا کرپلانی کا ٹیلیفون آیا کہ وہ بھی آرہی ہیں، جناب ہمایوں کبیر وزیر حکومت ہند، سفیر شام، سفیر سعودی عرب الشیخ احمد الشبیلی، جناب افضل اقبال صاحب ڈپٹی ہائی کمشنر پاکستان کی طرف سے بھی اطلاع ملی کہ وہ بھی شرکت کریں گے، پھر جناب علی ظہیر صاحب وزیر قانون وانصاف حکومت اتر پردیش، جناب مظفر حسن وزیر حکومت اتر پردیش، پروفیسر محمد مجیب وائس چانسلر جامعہ ملیہ، ڈاکٹر عابد حسین دہلی، کرنل بشیر حسین زیدی سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، مولانا طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند، ڈاکٹر یوسف حسین پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی ناظم شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی، پروفیسر خلیق احمد نظامی مسلم یونیورسٹی، مولانا ابواللیث امیر جماعت اسلامی، مفتی عتیق الرحمٰن دہلی، مولانا اسعد میاں ناظم جمعیۃ العلمائے ہند، مولانا منت اللہ امیر شریعت بہار، مولانا شاہ عون احمد صاحب خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف، مولانا قاضی محمد سجاد صاحب صدر مدرس مدرسہ فتح پوری دہلی، جناب مالک رام دہلی، جناب حیات اللہ انصاری صاحب اڈیٹر قومی آواز لکھنو، جناب رضا انصاری صاحب فرنگی محل لکھنو، پروفیسر حسن عسکری صاحب پٹنہ یونیورسٹی، مولانا عرشی صاحب رامپوری، ڈاکٹر امیر حسین عابدی صاحب دہلی یونیورسٹی، جگن ناتھ آزاد دہلی، پروفیسر رام کمار چوبے بنارس، ضیاء الحسن فاروقی صاحب دہلی، جناب روش صدیقی صاحب، جناب عدیل عباسی صاحب بستی، جناب نیاز احمد صدیقی سابق پرنسپل محمد حسین انٹر کالج جونپور، محمد یٰسین خان صاحب جونپور، پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی بمبئی، مولوی ریاست علی ندوی پٹنہ، پروفیسر عبدالقوی دیسنوی بھوپال، وغیرہ شریک ہوکر رونق مجلس ہوئے، دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے بیرونی اراکین میں ڈاکٹر سید محمود، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، سید شہاب الدین دیسنوی بمبئی، ظہور الحسن صاحب آئی اے ایس سابق سکریٹری یوپی حکومت، مولانا اویس نگرامی ندوی اور جناب سعید انصاری جامعہ ملیہ دہلی بھی آگئے تھے، ۲۱/ فروری کو دارالمصنفین اس کے کارکنوں کی آرزوؤں کی جنت بن گئی، اس میں معزز مہمان فرشتوں کی طرح چلتے پھرتے نظر آئے، جب ذاکر صاحب دارالمصنفین کے احاطہ میں داخل ہوئے تو ایسا معلوم ہوا کہ خداوند تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کو ساتھ لے کر جلوہ افروز ہوئے ہیں، ان کا شاندار استقبال کیا گیا، شبلی کالج کے ان سی سی نے گارڈ آف آنر دیا، دارالمصنفین کے احاطہ میں سب ان کے لیے فرش راہ ہوگئے، میں اس منظر کو دیکھ کر بے قابو ہوگیا اور اس تقریب کی شوکت سے میری آنکھوں سے مسرت کے آنسو بہنے لگے، ذاکر صاحب نے تھپکی دی اور بولے ''آپ نے تو ایک شہر آباد کردیا ہے، اتنی تیاری کی ضرورت نہیں تھی، جوبلی منانے کا مقصد روپے کمانا بھی ہوتا ہے، کہیں مالی خسارہ نہ ہو''، پھر حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا ''خسارہ میں نہیں رہیئے گا، کچھ تحفے لایا ہوں'' میں نے عرض کیا کہ ''آپ کا آجانا ہی

سب سے بڑی دولت ہے''، بولے ''میری فکر نہ کیجیے، میں دارالمصنفین کو اپنا گھر سمجھ کر آیا ہوں، مسز سچتا کرپلانی اور بیگم صاحبہ بھوپال کی ہر ممکن خاطر تواضع کیجیے''۔

لنچ کے بعد ذاکر صاحب نے تھوڑی دیر تک آرام کیا، پھر تین بجے سہ پہر کو جشن کا جلسہ ڈاکٹر سید محمود صاحب کی صدارت میں شروع ہوا، ذاکر صاحب جب ڈائس پر آکر بیٹھے تو مجھ کو وہ بہت ہی دل آویز اور پرشکوہ معلوم ہوئے، خیال ہوا کہ یونان میں افلاطون شاید اسی طرح لوگوں کی نگاہوں میں دکھائی دیتا ہو، جناب شاہ معین الدین صاحب نے جب ان کی خدمت میں سپاسنامہ پڑھا تو پڑھتے وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اپنے دل وجگر کے ٹکڑے بھی ان کی نذر کر رہے ہیں، انھوں نے سپاسنامہ کی ابتدا اس طرح کی:

جناب والا!

''آپ نے نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ کے بڑے بڑے تعلیمی وعلمی ادارے دیکھے ہیں، خود ان کے مہمان ہوئے ہیں اور ان کے فضلاء کو اپنا مہمان بنایا ہے، بڑے بڑے سلاطین اور حکومتوں کو آپ کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا ہے، آپ کی آنکھوں نے شاہانہ استقبال و میزبانی کے پرشکوہ مظاہر دیکھے ہیں، ان میں سے کوئی چیز بھی ہم بوریا نشینوں کے پاس نہیں ہے، لیکن آپ کی بڑائی ان ظواہر سے بے نیاز ہے، اور آپ کا دل بھی ان سے سیر ہے، ہمارے پاس صرف اخلاص کا ہدیہ، سادگی کی پونجی ہے جس کے آپ خود بڑے قدرشناس ہیں، اس لیے ہم کو یقین ہے کہ ہمارا ہدیہ اخلاص آپ کی نگاہ میں شان وشکوہ کے مظاہرے سے زیادہ قابل قبول ہوگا، ہمارے لیے آپ کی حیثیت تنہا ہندوستان کے وائس پریسیڈنٹ ہی کی نہیں، بلکہ ایک مفکر، ایک ماہر تعلیم اور معمار قوم کی بھی ہے، آپ نے اس زمانہ میں نوجوانوں کو ملک وملت کے لیے ایثار وقربانی کا عملی سبق دیا، جب ان کا منتہائے نظر سرکاری عہدے اور دنیاوی دولت ووجاہت تھی، آپ نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، اور فقر و درویشی کی زندگی بسر کر کے قومی تعلیم کا ایک عظیم الشان ادارہ قائم کر دیا جس نے انگریزوں کی غلامی کے دور میں ملک کے نوجوانوں کو درد دیا اور ان کو قوم وملت کی راہ پر لگا دیا، آپ نے مسلمانوں کے سب سے بڑے تعلیمی ادارے مسلم یونیورسٹی کو بڑے نازک دور میں تباہی سے بچا کر دوبارہ زندگی بخشی، اب آپ کی ذاتی عظمت دنیاوی اعزاز سے بے نیاز ہے، آپ کے جمال وکمال کو ظاہری زینت وآرائش کی ضرورت نہیں ہے،

ع ۔ بہ آب ورنگ وخال وخط چہ حاجت روئے زیبارا

لیکن اللہ تعالیٰ ایثار وقربانی کا صلہ ضرور دیتا ہے، اس لیے اب آپ کو ان دنیاوی انعامات سے بھی نوازا جن کی ایک بڑے سے بڑا ہندوستانی تمنا کر سکتا ہے، اگرچہ جوہر تلوار کے لیے طلائی قبضہ کی ضرورت نہیں لیکن طلائی قبضہ اس پر زیب دیتا ہے، اسی طرح آپ کی عظمت پر آپ کے جلیل القدر عہدے کا طرہ بھی زیب دیتا ہے''۔

''دارالمصنفین سے جناب کے جو گوناگوں تعلقات ہیں، ان کے اظہار کی ضرورت نہیں، ہم دونوں ایک ہی منزل کے مسافر تھے، گو راہیں جدا جدا تھیں، اس وحدت مذاق نے جو رشتہ ہمارے درمیان پیدا کر دیا تھا، وہ بحمداللہ ہر زمانہ میں قائم رہا، دارالمصنفین کی مجلس منتظمہ کو آج بھی آپ کی کیفیت کا شرف حاصل ہے، اس رشتہ کی کشش تھی جو آپ کو اعظم گڑھ کھینچ لائی، ورنہ اس ویرانہ میں ہندوستان کے نائب صدر جمہوریہ کا دورہ کون تصور کر سکتا تھا،

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں''

یہ سپاسنامہ رسمی طور پر نہیں بلکہ بہت ہی عقیدت و اخلاص سے پیش کیا گیا تھا، اس لیے ذاکر صاحب نے لطف ولذت کے ساتھ سنا اور خود بھی بہت محبت و اخلاص سے اپنا خطبہ پڑھ کر سنایا۔ جس میں انھوں نے فرمایا:

جناب صدر، بزرگو اور دوستو!

''زبان اور اس کا ذخیرہ الفاظ یوں بھی قلب انسانی کی صحیح اور مکمل ترجمانی سے قاصر تھا، اور پھر زبان کے سرمایہ داروں نے اپنا سارا خزانہ سطحی جذبات کی نمود ونمائش میں اس بے دردی سے لٹا دیا کہ گہرے محسوسات کے لیے اچھوتے الفاظ باقی نہیں رہے، مجبوراً ہمیں گہرے اور نازک سے نازک واردات قلب کو بیان کرنے کے لیے ان ہی گھسے پٹے الفاظ سے کام لینا پڑتا ہے، جن میں اب بظاہر نہ آب ورنگ رہا ہے نہ معنویت، اس لیے اگر میں یہ کہوں کہ دارالمصنفین کے جشن طلائی میں شرکت کرنا میرے لیے فخر و مسرت کا باعث ہے، تو آپ قول کی فرسودگی اور بے رنگی پر نہ جائیے، بلکہ اس کی تہ میں قائل کے جوش وخلوص کی تازگی وتب وتاب کو دیکھئے، اور محسوس کیجیے، جی ہاں، مجھے آج فخر ہے اس پر کہ پچھلی نصف صدی میں ہمارے ملک میں سیاست کی تند وتیز آندھیوں کے درمیان میں تحقیق وتخلیق کے چراغ جلتے رہے، اور علم وادب کی جوت جگاتے رہے اور مسرت ہے اس کی کہ ان میں سے ایک سراج منیر دارالمصنفین اعظم گڑھ ہے جس کے ساتھ مجھے کئی رشتوں سے وابستہ ہونے کا شرف حاصل ہے، اس لیے کہ یہ

یادگار ہے، میرے محترم بزرگ مولانا شبلی نعمانی اور ان کے شاگردوں رشید مولانا سید سلیمان ندوی اور مولوی عبدالسلام ندوی کی، اور کارنامہ ہے میرے محترم اور شفیق بھائی مولوی مسعود علی ندوی اور عزیز دوست شاہ معین الدین احمد ندوی اور مولوی سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور ان کے رفقائے کار کا، اور اس لیے کہ اس سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا جس کی خدمت میں میں نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ گزارا ہے، ہم خیالی اور ہم مشربی کا تعلق رہا ہے، ان ذاتی تعلقات سے قطع نظر ایک مسلمان اور ہندوستانی کی حیثیت سے مجھے یہ ادارہ جو قوم کی بیش بہا دولت ہے، دل سے عزیز ہے، اور اس کے جشن میں شرکت کر کے سچی خوشی محسوس ہوتی ہے''۔

ذاکر صاحب بڑے اچھے خطیب بھی تھے، ان کا شمار ملک کے بہترین خطیبوں میں ہوتا ہے، اپنی خطابت میں فوج درفوج الفاظ یا جملوں کا سہارا نہیں لیتے، بلکہ جو کچھ کہتے ایسے سادہ، مخلصانہ مگر دل آویز انداز میں کہتے کہ معلوم ہوتا کہ اس سے بہتر طریقہ پر وہ چیز ادا نہیں کی جاسکتی ہے، ان کی تحریروں میں بھی اسی سادگی کی دل آویزی ہوتی، لیکن وہ اپنی اثر پذیری کی وجہ سے ایک خاص اسلوب بن جاتا، جو انشا پردازی کے ٹکڑے بھی بن جاتے، ان کا مذکورہ بالا خط ان کی اسی سادہ خطابت اور انشاء پردازی کا ایک نمونہ ہے، وہ دارالمصنفین کے جشن جوبلی میں اپنی شرکت کی خوشی کا اظہار کر چکے تو نہ صرف اپنے سامعین بلکہ پورے ہندوستان کو دارالمصنفین کی طرف ہمدردانہ توجہ کرنے کی ضرورت پر زور یہ کہہ کر دیا:

''آج اس مبارک موقع پر جب دارالمصنفین اعظم گڑھ اپنی زندگی کی پہلی نصف صدی پوری کر کے نصف دوم میں قدم رکھ رہا ہے، سب علم دوست اور محبّ وطن ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کا فرض ہے اور ہم آپ جو ملک کے مختلف حصوں سے آکر یہاں جمع ہوئے ہیں، اسے ساری قوم کی طرف سے فرض کفایہ کے طور پر ادا کر رہے ہیں کہ دارالمصنفین اور اس کے موسس روحانی مولانا شبلی نعمانی کی گرانقدر علمی اور ادبی خدمات کا جس سے انھوں نے بلاواسطہ ہندوستان کے اور بالواسطہ ساری دنیا کے تہذیبی سرمایہ میں قابل قدر اضافہ کیا اور ان کی ان ملی خدمات کا جن سے انھوں نے حب وطن، آزادی اور قومی یکجہتی کی تحریکوں کو سہارا دیا، کم سے کم ایک سرسری جائزہ لیں، ان کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کریں اور سوچیں کہ اس چشمہ فیض کو جاری رکھنے اور اس کے دامن کو وسیع کرنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہئے''۔

اس کے بعد انھوں نے دارالمصنفین کے کارناموں پر مختصر لیکن پرمغز طریقہ پر مداحانہ تبصرہ کیا:

''علامہ شبلی اور دارالمصنفین کا علمی اور ادبی عطیہ زیادہ تر اسلامی تاریخ و سیر، تاریخ ہند اور تاریخ و تنقید اور ادب کے میدانوں سے تعلق رکھتا ہے، اور اس کی خصوصیات میں نفس مضمون کی معروضیت لہجے کے اعتدال، زبان و بیان کی سلاست کے علاوہ اور ان سے بھی زیادہ نمایاں قلب و نظر کی وسعت ہے، اس مکتب فکر کے مصنفوں نے جہاں کہیں اسلامی تہذیب کے تعلقات یونانی، ایرانی، ہندی تہذیب سے دکھائے ہیں وہاں فصل کے بجائے وصل کے پہلو کو ابھارا ہے، اور ''قصہ اسکندر دارا'' سنانے پر ''حکایت مہر و وفا بیان'' کرنے کو ترجیح دی ہے''۔

اس خطبہ کے لکھنے تک ہندوستان کے قرون وسطی پر دارالمصنفین سے سولہ جلدیں نکل چکی تھیں جو ذاکر صاحب کی نظروں سے گذری تھیں، ان پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

''ہندوستان میں تاریخ نگاری کے اس تاریک دور میں جب ہمارے اکثر مورخ اپنے مجازی استاد ازل کے کہے ہوئے کو طوطی صفت دہرادیا کرتے تھے اور قرون وسطٰی کے ہندوستان کو ایک بحر طوفان خیز بنا کر پیش کرتے تھے، جس میں اسلامی تہذیب اور ہندو تہذیب کے دھارے ایک دوسرے سے الجھتے اور ٹکراتے رہتے تھے، دارالمصنفین کے مورخوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ ان دونوں کا ملنا تصادم نہیں بلکہ امتزاج سنگھرش نہیں بلکہ سنگم تھا، اور کیوں نہ ہو عالمی تاریخ کی تہ کو پہنچئے تو ہر تہذیب ایک عظیم الشان منصوبہ کی تکمیل میں اپنا اپنا حصہ پورا کرتی دکھائی دیتی ہے''۔

ذاکر صاحب کا خاص موضوع تو معاشیات تھا، لیکن مختلف علوم وفنون کا مطالعہ بھی برابر کرتے رہے، جس سے ان کی فکر و نظر میں ہمہ گیریت تھی، اس لیے وہ ہر موضوع پر گہری نظر ڈال کر اس میں خاص آب و تاب پیدا کر دیتے تھے، چنانچہ اپنے اس خطبہ میں بھی یہ کہہ کر فاضلانہ اور مفکرانہ رنگ پیدا کر دیا:

''لین دین، تاثیر و تاثر کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے، جو ایک صالح انسانیت کی تعمیر کے لیے برابر جاری ہے، علوم وفنون کا خزانہ ہندوستان سے بغداد پہنچا، وہاں عربوں نے اس پر اپنی زبان اور تہذیب کا رنگ چڑھایا، چند صدیوں بعد یہی علوم وفنون ترکوں کے ذریعہ پھر ہندوستان واپس آئے اور اس ملک کی تہذیبی زندگی کو مالا مال کیا، اور ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ ایک وسیع تر تاریخ کا جز بن گئی، اس کا احساس وضاحت کے ساتھ امیر خسرو کے یہاں خصوصاً ان کی مثنوی نہ سپہر میں ملتا ہے صرف یہی نہیں کہ حضرت امیر خسرو نے ہندوستانی اشیاء سے متعلق اپنی گہری پسند کا اظہار فرمایا ہے بلکہ ایسا

محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ سارے ہندوستانی تاریخی ورثے کو اپنا ورثہ سمجھتے ہیں، اس پرانے عہد کی تمام زندگی میں یہ احساس موجود تھا، خسرو نے شاعر کی حیثیت سے اس احساس کو آب و تاب کے ساتھ پیش کرکے جماعتی زندگی اور احساس کی سچی ترجمانی کا حق ادا کیا ہے''۔

ذاکر صاحب اپنی قابلیت اور ذہانت سے اپنی تحریروں کو موم کے سانچے کی طرح اپنی خواہش کے مطابق موڑ کر ان میں پیچ وخم پیدا کردیتے تھے، جس میں بڑی نکتہ رسی بھی ہوتی اور گہری بصیرت بھی، امیر خسرو کے احساس وطنیت کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

''اسلام کا نقطۂ نظر چونکہ عالمی نقطۂ نظر ہے، اس کا خطاب چونکہ ساری نوعِ انسانی سے ہے، اس لیے اس کی تعلیمات سے متاثر مورخوں سے امید کی جاسکتی ہے کہ تاریخ نگاری کو تنگ تعصّبات کے بھلانے کا ذریعہ نہ بتائیں گے بلکہ انسان کو اس تقدیر سے آگاہ کرنے میں مدد دیں گے، شاید امام شافعی کا قول ہے کہ اگر صرف سورہ ''العصر'' نازل کردی جاتی تو بندوں کو ہدایت کے لیے کافی تھا، اس قول میں بڑی بصیرت پوشیدہ دکھائی دیتی ہے، اس لیے کہ اس مختصر سی سورت کے چند بولوں میں تاریخ عالم کی نہایت بلیغ توجیہہ وتعبیر موجود ہے، ذکر وہی عموم کے ساتھ انسان کا ہے اور زمانہ کی قسم سے منشا یہ ظاہر کرنا معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ انسان کے لیے جبری لزوم کی زنجیریں نہیں بناتا بلکہ عمل کے لیے شمارا مکانوں دروازہ کھول دیتا ہے، یہ تاریخ کی اخلاقی توجیہہ ہے، اس سے تاریخ انسانی اعمال کے نتائج سے عبارت ہوجاتی ہے، جو انسانی یقین اور ارادہ سے ظہور میں آتے ہیں، اور کیسا بلیغ اشارہ ہے کہ اگر فوری طور پر نیک عمل کرنے والی جماعت گھاٹے میں نظر آئے تو صبر کے ساتھ انتظار کرے، زمانہ اس گھاٹے اور نامرادی کو کامیابی میں بدل دے گا، بے یقینی اور بے عملی کے لیے تو گھاٹا ہی گھاٹا ہے''۔

ذاکر صاحب نے سورہ العصر کی دل آویز تشریح کرکے جس پوشیدہ مذہبی، تاریخ اور انسانی بصیرت کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ نہ صرف ہندوستان کے مورخوں بلکہ انسانی معرفت کے اقدار کے قدردانوں کے لیے ایک مستقل پیام ہے۔

ذاکر صاحب نے اپنے خطبہ کا رخ موڑ کر پھر دارالمصنفین کی گوناگوں خدمات کا ذکر چھیڑ دیا اور فرمایا:

''دارالمصنفین نے تاریخی تحقیق پر خاص توجہ کرکے اسلامی اور ہندوستانی تہذیبی زندگی اور ان کی معرفت انسانی اقدار کی بڑی خدمت انجام دی ہے، ملکی سیاست کے میدان سے دارالمصنفین کو بہ حیثیت ایک علمی اور ادبی ادارے کے کوئی تعلق نہیں رہا، لیکن شخصی حیثیت سے اس کے مراد و مرشد مولانا شبلی سچے اور پکے قوم پرور مسلمان تھے، اور اس کے کارساز کارپرداز مولوی مسعود علی ندوی بھی ان ہی کے نقش قدم پر چلتے رہے اور دونوں نے اتحاد اور آزادی کا ساتھ دیا، اور تفریق اور غلامی کے رجحانات کی شدید مخالفت کی، اس لیے دارالمصنفین کے گوشہ نشین کارکنوں میں قومی آزادی اور قومی یکجہتی کے جذبات روح رواں کی طرح سما گئے، اور ان کی تائید، ہمدردی، اتحاد و آزادی کے سب علمبرداروں خصوصاً قوم پرور مسلمانوں کے لیے قوت اور فیضان کے سرچشمے کا کام دیتی رہی''۔

اور پھر بڑی دل سوزی سے اپنی اور ملک کی طرف سے دارالمصنفین کے لیے دعائیں کرتے ہوئے ان سطروں میں خراج تحسین پیش کیا، جس میں دارالمصنفین کو ایک سربلند سایہ دار بردمند درخت اور شجر طیبہ کہا:

''اگر میں یہ سمجھوں تو بے جا نہ ہوگا کہ علم و ادب کے قدرشناس اور ملک وقوم کے خیرخواہ وہ بھی جو آج یہاں موجود اور اس مجلس میں شریک ہیں اور وہ بھی جو اپنی مجبوریوں کی بنا پر شرکت سے محروم رہے، میری طرح یہ احساس رکھتے ہیں کہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کا ہندوستان کی تہذیب و تاریخ تدوین اور آزادی و یکجہتی کی تحریک میں قابل قدر اور قابل ذکر حصہ ہے، اور میرے ہم زبان ہوکر اس کے گذشتہ اور موجودہ اراکین کا ان کی بیش بہا خدمات کے لیے پرجوش شکریہ ادا کرتے ہیں، اور انھیں پرخلوص مبارکباد دیتے ہیں کہ وہ پودا جو انھوں نے اب سے پچاس برس پہلے لگا کر اسے اپنے خون سے سینچا تھا۔ آج ایک سربلند اور بردمند درخت بن گیا ہے، اور خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اس شجر طیبہ کی جڑیں اور زیادہ مضبوط ہوں اور اس کی شاخیں اور پھلیں، اس کے پھولوں کی شادابی اور نکہت اور اس کے پھولوں کے رس اور لذت میں اور اضافہ ہو''۔

ذاکر صاحب کو یہ معلوم تھا کہ اس سایہ دار بردمند درخت اور شجر طیبہ کے سینچنے میں اس کے باغبان کٹھن منزلوں سے اب تک گزر رہے ہیں اور وہ ابھی تک اسی قناعت و توکل کی زندگی بسر کر رہے ہیں جو خود انھوں نے جامعہ ملیہ میں گزاری تھی، اسی لیے اس کی طرف بہت ہی حسین پیرایۂ بیان میں قوم و ملک کی توجہ دلائی:

''مگر دارالمصنفین کے قدردانوں، معترفوں اور شکرگزاروں کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا بہت ضروری ہے کہ قدردانی، تعریف اور شکرگزاری اپنی جگہ بہت اچھی چیزیں ہیں لیکن ان سے نہ انجن کی بھٹی گرم ہوتی ہے، نہ بھاپ بنتی ہے، نہ گاڑی چلتی ہے، اس عالم مادی میں ذہنی اور روحانی کاموں کے لیے بھی مادی وسائل کی ضرورت ہوتی ہے، اگر ہم آپ واقعی دارالمصنفین

کے قیام کو علم وادب اور ملک وقوم کے لیے مفید اور اہم سمجھتے ہیں تو ہمارا فرض ہے اور یہ فرض کفایہ نہیں بلکہ فرض ذاتی ہے کہ قدمے اور سخنے سے آگے بڑھ کر دامے درمے اس کی مدد دل کھول کر کریں، مجھے امید ہے کہ ارباب علم و دانش زیادہ سے زیادہ تعداد میں اس کی مطبوعات کے مستقل خریدار بنیں گے اور ارباب حکومت و اقتدار کو اس پر آمادہ کریں گے، مگر انھیں مدرسوں کے کتب خانوں اور عام کتب خانوں کے لیے خریدیں، یہ کوئی احسان نہیں ہوگا بلکہ ایک اچھا، سودا جس میں چاندی کے چند ٹکوں بلکہ کاغذ کے چند پرزوں کے بدلے علم وحکمت کی دولت ہاتھ آتی ہے، جو بے بہا اور لازوال ہے''۔

ذاکر صاحب نے دارالمصنفین کے حقوق کی وکالت کرنے کے بعد مخلص بزرگ، ایک وطن پرست، ایک سیاسی رہنما کی حیثیت سے اسی ادارہ کو اس کے فرائض سے بھی آگاہ کیا، ناظرین کو حسب ذیل اقتباسات میں فلسفیانہ فکر، مورخانہ نظر، ثقافتی بصیرت اور ایک مخلص رہنما کے دل کی دھڑکن کے ساتھ ادب و انشاء کی چاشنی اور لذت بھی محسوس ہوگی۔

''آخر میں چند الفاظ دارالمصنفین کے اراکین اور رفیقوں سے کہنا چاہتا ہوں، جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے آپ کی تصنیف و تالیف کا ایک خاص میدان ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی تاریخ اور اس کی ایک امتیازی خصوصیت قلب و نظر کی وسعت ہے، یعنی مختلف تہذیبوں اور معاشروں کی مثبت اور معروف اقدار کا اعتراف کرنا، ان کے اختلاف میں اشتراک اور اتحاد کے نقطے تلاش کر کے انھیں نمایاں کرنا آپ کی یہ خصوصیت ہمارے دور محکومی میں جب تاریخ سیاسی مصلحتوں کے ماتحت مسخ کی جارہی تھی بہت کام آئی لیکن آپ یہ نہ سمجھیے کہ اس دور آزادی میں تاریخ کو تفریقی سیاست کا آلہ کار بنانا ختم ہوچکا ہے، آج یہی رجحان باقی ہے اور خاصا قوی ہے، آج بھی دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہندو مسلم تہذیبوں میں کبھی میل نہیں ہوا، ہمیشہ ٹکر ہوتی رہی اور آئندہ بھی ہوتی رہے گی، جب تک ایک تہذیب دوسری تہذیب میں جذب نہ ہوجائے، اس لیے آپ کو اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہئے کہ آپ کی سعی ابھی ناتمام، آپ کا کام ابھی ادھورا ہے، آپ کو اور زیادہ محنت، ہمت اور استقلال کے ساتھ یہ جدوجہد کرنی ہے کہ تاریخ نگاری کو اس کجروی سے محفوظ رکھنے کی اور یہ واضح کرنے کی کہ گو قرون وسطیٰ میں ہندو مسلم تہذیبوں کے اپنے اپنے دائرے تھے، لیکن ان میں ایک مشترک قطعہ بھی تھا، جو اس عہد میں قومی تہذیب کی حیثیت رکھتا تھا، یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے آپ زبردستی تاویل سے کام لیں، یہ نہ تو دیانتدار مورخوں کی حیثیت سے آپ کے لیے جائز ہے اور نہ آپ کو اس کی ضرورت ہے، آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ اس کے ثبوت تاریخ کے صفحوں پر بکھرے ہوئے ہیں، صرف انھیں جمع کرنے اور ترتیب دینے کی ضرورت ہے، میرا یہ پختہ خیال ہے جسے تاریخی نظر رکھنے کی جرأت نہیں کہہ سکتا، لیکن ذہنی عقیدہ کہہ سکتا ہوں کہ صرف ہندوستان میں ہندو مسلم تہذیبوں ہی میں نہیں بلکہ دنیا میں کہیں بھی دو تہذیبوں میں ٹکراؤ نہیں ہوا، تہذیبیں ٹکرایا نہیں کرتیں، بلکہ وحشتیں ٹکرایا کرتی ہیں، انسان کا وجود اس دنیا میں اربوں سال سے ہے، اس میں سے تہذیب کے چند ہزار سال نکال دیجئے تو باقی سارا زمانہ وحشت کا زمانہ تھا، اس لیے آج ان افراد اور قوموں میں جنھیں ہم تہذیب کہتے ہیں، تہذیب کی ایک ہلکی سی پرت کے نیچے نہ جانیں کتنی پرتیں وحشت کی دبی ہوئی ہیں جو موقع ملنے پر ابھر آتی ہیں دو قوموں کی تہذیبیں جب تک اپنی اپنی وحشتوں کو دبائے ہوئے ہیں، آپس میں لڑائی نہیں، بلکہ گلے ملتی ہیں، اور تہذیبی قدروں کا لین دین کرتی ہیں، مگر جب ان کی وحشتیں ان کی تہذیبوں پر غالب آجاتی ہیں تو ایک تہذیب دوسری تہذیب سے بھڑ جاتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کو نوچنے، کاٹنے اور بھنبھوڑنے لگتی ہیں''۔

ان کے خطبہ کے آخری ٹکڑے میں بڑی مخلصانہ اور ہمدردانہ اپیل تھی، جو نہ صرف دارالمصنفین کے لیے بلکہ پورے ہندوستان کے اہل علم کے لیے ہے:

آپ سے میری یہ التجا ہے کہ وحشتوں کی روداد دوسروں کے لیے چھوڑ دیجئے، آپ تہذیبوں کی کہانی لکھئے اور نئے ہندوستان کے ماضی کی روشنی میں حال کا یہ اہم ترین مسئلہ حل کرنے میں مدد دیجئے کہ کس طرح مختلف تہذیبوں کے الگ الگ رنگ و آہنگ کو ضروری حد تک قائم رکھتے ہوئے ان میں وہ ہم رنگی و ہم آہنگی پیدا کرے جو ایک متحد اور مضبوط قوم بنانے کے لیے درکار ہے اور اپنے محبوب وطن کو ایسی مہذب انسانی برادری کا گھر بنانے میں ہاتھ بٹائیے، جس کے صدر دروازہ پر حالی کی یہ رباعی رقم ہو:

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں — شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
دنیا کو جو کہتے ہیں جہنم ہے یہ — وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

ان چند لفظوں کے بعد جنھیں کسی مہمان خصوصی کا رسمی خطبہ نہیں بلکہ ایک محبّ مخلص کے دل کی آواز سمجھیے، میں دارالمصنفین اعظم گڑھ کے جشن طلائی کا افتتاح کرتا ہوں''۔

یہ خطبہ بار بار تالیوں کی گونج سے سراہا گیا، اور جب یہ ختم ہوا تو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے فرمایا کہ یہ تمام خطبات کا تاج محل ہے، اس کا یہ فقرہ ہر شخص کی زبان پر تھا:

''تہذیبیں ٹکرایا نہیں کرتیں ہیں، وحشتیں ٹکرایا کرتی ہیں''۔

ذاکر صاحب نے اس افتتاحیہ اجلاس میں دارالمصنفین کے لیے اپنی حکومت کی طرف سے پچاس ہزار کے عطیہ کا اعلان کیا، اس کے ساتھ ان کے عزیز دوست کرنل بشیر حسین زیدی نے سیدنا سیف الدین طاہر کی طرف سے بارہ ہزار جناب مصطفےٰ رشید شروانی کی طرف سے تین ہزار اور حکیم عبدالحمید صاحب مالک ہمدرد دواخانہ دہلی کی جانب سے ایک ہزار کے چیک پیش کئے جو ذاکر صاحب کی خواہش ہی پر حاصل کئے گئے تھے، پھر ان ہی کی موجودگی میں مسز سچتا کرپلانی نے حکومت اتر پردیش کی طرف سے دس ہزار کی گرانٹ کا اعلان کیا، بیگم صاحبہ بھوپال نے بھی دس ہزار روپے کا عطیہ دیا، سعودی عرب کے سفیر محترم نے رابطہ اسلامیہ کی طرف سے پانچ ہزار کی رقم کا اعلان کیا، دس ہزار کی گرانٹ حکومت کشمیر کی طرف سے بھی ملی، اس سے پہلے طلائی جوبلی کے سلسلہ میں بھوپال میں مولانا عمران خان صاحب ندوی نے ایک ایک ہزار کے بارہ لائف ممبر بنائے تھے، جناب سیٹھ عبدالعزیز انصاری اور سید شہاب الدین دیسنوی صاحب نے اپنی مساعی جمیلہ سے بمبئی میں ایک ایک کے چالیس ممبر بنا کر اس ادارہ کو غیر معمولی امداد پہنچائی، اسی موقع پر پاکستان کی طرف سے پچیس ہزار کی کتابوں کی خریداری کا اعلان ہوا، دو ہزار روپے کویت سے جناب ڈاکٹر عبداللطیف نے اس جشن کے لیے بھیجے، پھر ڈاکٹر حمیداللہ نے فرانس سے ایک ہزار روپے کا عطیہ بھیجا، اس طرح ذاکر صاحب کے قدموں کی برکت سے دارالمصنفین کو تقریباً ایک لاکھ اکاسی ہزار (۱۸۱۰۰۰) کی امداد پہنچ گئی۔

جوبلی کے افتتاحیہ اجلاس کے بعد مسز سچتا کرپلانی کو اس راقم نے ایک سپاسنامہ پیش کیا، جس میں ذاکر صاحب بھی سامعین کی حیثیت سے شریک رہے، پھر شبلی منزل کے لان پر ایٹ ہوم ہوا، ذاکر صاحب، مسز سچتا کرپلانی، بیگم صاحبہ بھوپال، سفرا اور وزرا کو دیکھنے کے لیے اتنا ہجوم ہوگیا تھا کہ ان کو قابو میں رکھنا مشکل تھا، لیکن ضلع کے کلکٹر شری ماڈول اور ایس، پی شری بھلا نے بڑی خوش اسلوبی سے مجمع کو قابو میں رکھا، ذاکر صاحب ان تقریبوں میں سب سے بہت ہی بے تکلفی سے ملے، کہیں سے ظاہر ہونے نہیں دیا کہ وہ نائب صدر ہیں، اعظم گڑھ کے ان لوگوں سے بھی ملے جنھوں نے تقریباً چالیس برس پہلے جامعہ ملیہ کو ان کے یہاں آنے پر چندہ دیا تھا، ایٹ ہوم کے بعد وہ اپنے خیمہ میں چلے گئے، لیکن مغرب کی اذان ہوئی تو شبلی منزل کی مسجد میں نماز باجماعت ادا کرنے کو آئے، وہ وہاں اس وقت پہنچے جب مسجد بھر چکی تھی، ان کو تقریباً نعلین کے پاس جگہ ملی اور اس جشن کا محمود ایاز کے ساتھ کھڑے ہوکر نماز ادا کر رہا تھا۔

رات کو ایک سمپوزیم تھا، جس میں سعودی عرب کے سفیر، مولانا طیب مہتمم دیوبند، ڈاکٹر یوسف حسین پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی صدر شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی، افضل اقبال ڈپٹی ہائی کمشنر پاکستان کی تقریریں تھیں، ان تقریروں میں رات کافی گزرتی جارہی تھی، ذاکر صاحب کے آرام کی خاطر میں بار بار ان سے کہتا تھا کہ وہ اٹھ کر تشریف لے جائیں، لیکن وہ فرماتے کہ میں ان تقریروں سے لطف اندوز ہورہا ہوں، اور وہ آخری بیٹھے رہے، بہت رات گئے اپنے خیمہ میں سونے گئے، رات کے تین بجے ہوں گے کہ سخت آندھی آئی، میری آنکھ کھلی تو خیال آیا کہ ذاکر صاحب کا خیمہ گر گیا ہوگا، ایک صاحب دوڑے آئے اور بولے ذاکر صاحب کا خیمہ گر گیا، اور وہ غسل خانہ میں پناہ لیے ہوئے ہیں، میں بے حد مضطرب ہوا کہ ساری محنت ضائع گئی، دوڑ کر خیمہ کے پاس پہنچا، اس کا ایک ستون تو ضرور جھک گیا تھا، لیکن خیمہ محفوظ تھا، اندر سے ذاکر صاحب کی کوئی آواز نہیں آئی، تو میں نے اندر جانا پسند نہیں کیا، صبح ہوئی تو مضطربانہ طور پر ان کی خیریت دریافت کرنے کے لیے حاضر ہوا، بولے کہ مجھ کو آندھی کی تو خبر بھی نہیں ہوئی اور میں بالکل غافل سویا، یہ محض ان کے اقبال کی کرامت تھی۔

صبح کو بیگم صاحبہ بھوپال کی خدمت میں جناب شاہ معین الدین صاحب نے ایک سپاسنامہ پیش کیا، ذاکر صاحب نے اس میں بھی شرکت فرمائی، اس کے بعد ایک ادبی نشست تھی، جس میں مولانا عبدالماجد دریابادی، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر سید عابد حسین، ضیاء الحسن فاروقی پروفیسر جامعہ ملیہ کالج نے اپنے اپنے مقالے پڑھے مولانا عبدالماجد دریابادی کا مقالہ مولانا شبلی پر تھا، جس کو نہ صرف عام حاضرین بلکہ خود ذاکر صاحب نے بہت پسند کیا، اور مولانا عبدالماجد دریابادی کو اس کی داد دی، ان کی روانگی اسی دن کے سہ پہر کو تھی، اس لئے میں اس نشست کے آخر میں شکریہ ادا کرنے کے لیے کھڑا ہوا، اس جشن کی کامیابی پر اتنا خوش تھا کہ میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور ان ہی آنسوؤں کی لڑیوں میں مشکل سے یہ کہہ پایا کہ میری زندگی کی تمنائیں یہ تھیں کہ مصنف بنوں، مولانا سید سلیمان ندوی کا شاگرد بن کر دارالمصنفین کا ادنیٰ خدمت گزار بنا رہوں اور دارالمصنفین کی طلائی جوبلی کا جشن اپنے محترم بزرگ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی صدارت میں انجام دوں، یہ ساری تمنائیں پوری ہوگئیں، اگر ذاکر صاحب اپنے ہوائی اڈے پر پہنچ کر میری وفات کی خبر سنیں تو وہ میرے لیے کوئی غم نہ کریں۔

ذاکر صاحب کے جانے کے بعد رات کو ایک مشاعرہ بھی آنند نرائن ملا کی صدارت میں ہوا، جس میں روش صدیقی، جگن ناتھ آزاد، حبیب احمد صدیقی، عارف عباسی اور کوثر فاروقی وغیرہ جیسے منتخب شعراء شریک ہوئے، دوسرے دن صبح کو تمام مہمان رخصت ہوگئے، اس جشن میں کچھ مہمانوں کو ضرور تکلیف ہوئی ہوگی، لیکن جتنے آئے وہ سب دارالمصنفین کے مخلص اور قدرداں تھے، اس لیے کسی نے کوئی شکایت نہیں کی، شاہ معین الدین صاحب اور ہم دونوں بے انتہا خوش تھے کہ اللہ تعالیٰ نے بڑی آبرو رکھ لی، اس جشن کو ہر طرح کامیاب کیا، یہ ذاکر صاحب کے محبت و اخلاص کا بھی نتیجہ تھا جو ان

کو دارالمصنفین سے ہر زمانہ میں رہا، جشن کے دوسرے دن کے لنچ میں ایک بیرونی مہمان نے ذاکر صاحب کی موجودگی میں کہا کہ یہ جوبلی جامعہ ملیہ کی سلور جوبلی ہی کے مقابلہ کی ہے، کرنل بشیر حسین زیدی نے سن کر فرمایا، جی نہیں، اس سے بہت بڑھی ہوئی، جامعہ کی سلور جوبلی جب ہوئی تھی تو میں رامپور کا وزیر اعلیٰ تھا، میں نے ریاست کا سارا سامان وہاں بھجوا دیا تھا، حتی کہ وہاں کے بہشتی اور بھنگی بھی گئے تھے، لیکن دارالمصنفین کے قناعت پسند بوریا نشینوں کی طرف سے جوبلی کی اس آرائش و زیبائش کو دیکھ کر میں خود متحیر ہوں، وہ ہر طرح کی تعریف کے مستحق ہیں۔

ذاکر صاحب گلابوں کے بڑے عاشق زار تھے، اس لیے جوبلی کے جشن کے موقع پر گلابوں کے پھولوں کی بھی ایک نمائش کا انتظام کیا گیا تھا، یہ اہتمام محبی خلیل الرب صاحب (انسپکٹر آف اسکولز) نے کیا، ذاکر صاحب نے ان میں سے بعض گلابوں کو بہت پسند کیا اور اپنے چمن کے لیے ان کے پودے مانگے جو اکتوبر ۱۹۶۵ء ہی میں تیار ہو گئے، میں نے یہ پودے ان کے پاس بھیجے تو ایک مکتوب مورخہ ۳۰/اکتوبر ۱۹۶۵ء میں تحریر فرمایا: ''نوازش نامہ ملا، یاد فرمائی کا شکریہ، گلاب کے ۱۳ پودے بھی پہنچے، کس طرح شکریہ ادا کروں، کسی اور تحفہ سے جی اتنا خوش نہیں ہوتا، جتنا اس سے ہوا، خلیل الرب صاحب کا بھی میری طرف سے شکریہ ادا کر دیجئے''۔

ان کو گلابوں سے جو عشق رہا تو غیر شعوری طور پر وہ گلاب کی دل آویزی، رعنائی اور خوشبو زندگی کے ہر پہلو میں چاہتے تھے، اور وہ جہاں کہیں پا جاتے اس سے ایسے ہی خوش ہوتے جیسے اپنے چمن میں گلاب کی رنگینی اور خوبصورتی کو دیکھ کر ہوتے۔

جوبلی کے جشن کے منانے کے چھ مہینے کے بعد یعنی ستمبر ۱۹۶۵ء میں ہندوستان و پاکستان کی جنگ چھڑ گئی، اس وقت سے اب تک ہندو پاکستان کا تجارتی لین دین بند ہے، اس لیے دارالمصنفین کی کتابوں کی تجارت کا توازن بالکل بگڑ گیا ہے، پاکستان کے بعض خود غرض ناشروں نے تجارتی لین دین بند ہونے کی وجہ سے اس کی بہت سی کتابیں چھاپ لی ہیں، جس سے اس پر مزید مالی ضرب کاری لگ رہی ہے، اگر اس کی جوبلی نہ ہوئی ہوتی اور ذاکر صاحب کے حسنِ وساطت سے اس کو عطیات نہ ملے ہوتے تو اس وقت تک معلوم نہیں یہ کن کن پریشانیوں میں مبتلا ہو گیا ہوتا، اس لحاظ سے بھی ذاکر صاحب اس کے بڑے محسن ہیں، ان سے جب جب ملاقات ہوئی تو اس کے مالی استحکام کی تدبیریں بتاتے رہتے، ان کا سہارا لے کر حکومت ہند سے اس کے لیے مستقل سالانہ امداد حاصل کرنا ممکن تھا، مولانا ابوالکلام آزاد کی خواہش تھی کہ یہ سالانہ گرانٹ منظور کر لے، کیونکہ انگریزوں کی طرح اب غیر ملکی حکومت نہیں ہے بلکہ قومی حکومت ہے، لیکن خواہش کے باوجود سالانہ امداد لینا منظور نہیں کیا گیا، کیونکہ اس کے بعد ادارہ کے علمی مزاج کے بدل جانے کا خطرہ رہا۔

فروری ۱۹۶۶ء میں ذاکر صاحب کے بھتیجے امتیاز حسین کا اچانک حیدر آباد میں انتقال ہو گیا، پہلے ذکر آ چکا ہے کہ جامعہ ملیہ کے قیام کے زمانہ میں میری ان سے گہری ملاقات ہو گئی تھی، ان کی وفات سے مجھ کو بھی صدمہ ہوا، اور میں نے ایک تعزیتی خط ذاکر صاحب کو لکھا، جس کا جواب انھوں نے ۳/ مارچ ۱۹۶۶ء کو بہت ہی غمناک انداز میں اسی طرح دیا جس طرح ایک سچے اور خدا ترس مسلمان کو دینا چاہئے:

> ''آپ کا تعزیت نامہ ملا، آپ کی ہمدردی کا دل سے شکر گزار ہوں، خدا کی مرضی یوں ہی تھی، اس پر صابر و شاکر ہونا چاہئے، یوں صدمہ میرے لیے سخت ہے، اس لیے کہ اپنے بڑے بھائی کے انتقال کے بعد مرحوم کی پرورش میرے ہی ذمہ تھی، اور وہ مجھے بیٹے سے زیادہ عزیز تھے، لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا، راضی برضا ہوں''۔

ذاکر صاحب مئی ۱۹۶۷ء میں جمہوریہ ہند کے صدر منتخب ہوئے تو دارالمصنفین میں بھی مسرت کی لہر دوڑ گئی، ایسا معلوم ہوا کہ کوئی ہم لوگوں ہی میں صدر بنا ہے، اور ان کو اپنوں میں شمار کرنا صحیح تھا، کیونکہ وہ نہ صرف دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے بہت ہی قدیم رکن تھے، بلکہ ہم لوگوں سے بزرگانہ تعلقات بھی رکھتے تھے، میں نے دارالمصنفین کی طرف سے مبارکباد کے خط اور تار بھیجے اور اس کے بعد دارالمصنفین کی تین نئی کتابیں بھی بھیجیں، اس کا جواب اپنے ایک عنایت نامہ مورخہ ۷/ جون ۱۹۶۷ء میں یہ دیا:

محبّ مکرم! السلام علیکم

> نوازش نامہ ملا، یاد فرمائی اور دعاؤں کا شکریہ، دارالمصنفین کے اراکین اور ملازمین کا بھی ان کی دعاؤں کے لیے شکریہ ادا کرتا ہوں، خدا آپ سب کو خوش اور اچھا رکھے۔
>
> آپ نے ازراہ نوازش جو تین کتابیں مجھے بھیجی ہیں وہ مجھے مل گئی ہیں، ان تصانیف کو میں دارالمصنفین کے بیش بہا تحائف ہی سمجھتا ہوں، ان کتابوں کے لیے بھی شکریہ قبول فرمائیں، خدا کرے مزاج بخیر ہو۔ والسلام

میں نے اپنی طرف سے بھی ایک ذاتی خط لکھا تھا، اس کا جواب اپنے مکتوب مورخہ ۲۱/ جون ۶۷ء میں اس طرح دیا،

محبی صباح الدین صاحب۔ السلام علیکم

> ''آپ کا نوازش نامہ مورخہ ۱۰/ مئی ملا، یاد فرمائی کا شکریہ، میرے صدر منتخب ہونے پر آپ نے جس خلوص اور محبت کا اظہار فرمایا ہے، اس کے لیے دل سے شکر گزار ہوں، دعا فرمائیں کہ میں اپنے اس منصب کے فرائض کو پوری طرح انجام دے سکوں، اس سلسلہ میں مبارکباد کو خطوط اور تار اس کثرت سے آئے کہ ان سب کا جواب دینا جلد ممکن نہ ہو سکا، اس تاخیر کو معاف

فرمائیے گا، شاہ معین الدین صاحب کو میرا اسلام مسنون پہنچا دیں''۔

میں اگست ۱۹۶۷ء میں ایک خاص کام کے لیے دہلی پہنچا، میری لڑکی عشرت افروز بھی ساتھ تھی، میں نے ذاکر صاحب سے وقت مانگا، تو مجھ کو لڑکی کے ساتھ ملنے کو بلایا، جب میں راشٹر پتی بھون پہنچا تو ملاقات کے کمرہ کے دروازہ تک لینے کو آئے، اپنی شرافت طبع اور پاکیزگی اخلاق سے میری لڑکی سے اس طرح ملے جیسے اپنی خاص عزیزہ سے مل رہے ہیں، اس کو اپنی گفتگو میں برابر بیٹی کہہ کر مخاطب فرمایا، چائے آئی تو اس سے مٹھائی اور پسٹری کھانے کے لیے اصرار کیا، ان میں راشٹر پتی بھون کی فضا کی تمکنت اور وقار کے بجائے جامعہ ملیہ ہی کا عجز اور انکسار تھا، وہ کھدر کی شیروانی اور اسی کپڑے کی ٹوپی پہنے ہوئے تھے، بعض لوگ کپڑے پہن کر خوبصورت اور بارونق معلوم ہوتے ہیں، لیکن ذاکر صاحب کے جسم پر خود لباس خوبصورت اور بارونق بن جاتا، اعلیٰ قسم کے مغربی وضع کے ڈرائنگ روم میں ان کا مشرقی مزاج چھایا ہوا تھا، وہ خود ہی ڈرائنگ روم کی زینت بنے ہوئے تھے، ان سے باتیں کرنے میں راشٹر پتی بھون کے ماحول کو ان کے قدیم رنگ کی حسین وضعداری سے دبا پایا، صدر کی حیثیت سے ان سے یہ میری پہلی اور آخری ملاقات تھی، میں نے کئی بار جلد اٹھنے کی کوشش کی، لیکن اصرار سے روکے رکھا، دارالمصنفین کی مالی حالت پوچھی، وہ جانتے تھے کہ میری صحت اچھی نہیں رہتی ہے، اس لیے صحت کو برقرار رکھنے کی نصیحت فرمائی، پھر کہا کہ شاہ معین الدین صاحب اور آپ دونوں نے مل کر دارالمصنفین کے معیار اور حیثیت کو برقرار رکھا ہے، لیکن آپ دونوں اپنے پیچھے کوئی جماعت نہیں چھوڑ رہے ہیں، میں نے عرض کیا، اب پہلے کی طرح ایثار پسند اور خدمت گزار نوجوان نہیں ملتے، فرمایا کہ ہندوستان سے ایثار اور خدمت کا جذبہ ختم ہو چکا ہے، پہلے ایثار و خدمت بڑا وصف سمجھا جاتا تھا، لیکن وہ دور جاتا رہا، اس لیے ایثار پسند نوجوانوں کی تلاش فضول ہے، ان کو وہی تنخواہیں دے کر رکھئے جو ہر جگہ ملتی ہیں، اور پھر ہنستے ہوئے فرمایا کہ ادارہ چلانے میں یہ ضرور ہے کہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلائے جائیں، لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ پاؤں دیکھ کر چادر بنائی جائے، آپ لوگوں کو اب ایسی ہی چادر بنانی ہے، اسی سلسلہ میں فرمایا کہ اس زمانہ میں صرف جماعت اسلامی والے ہی ایثار اور قربانی سے کام لے رہے ہیں، میں نے ان کی مطبوعات میں سے محسن انسانیت پڑھی ہے، یہ مجھ کو بہت پسند آئی، جب میں ان سے رخصت ہونے لگا تو عرض کیا، آپ کی بدولت راشٹر پتی بھون کے اندر تک پہنچ گیا، اس کا جواب بڑی محبت سے یہ دیا، مگر آپ لوگوں کی دعاؤں کی بدولت میں بھی راشٹر پتی بھون میں پہنچ گیا۔

وہاں سے آنے کے بعد ایک مرض میں مبتلا ہو گیا، جس کے اعظم گڑھ اور پٹنہ میں دو آپریشن ہوئے، میں شفا پا کر پٹنہ سے اعظم گڑھ آیا تو کسی سلسلہ میں ان کو خط لکھا تو اپنی علالت کا بھی ذکر کر دیا، اس کے جواب میں اپنے ایک مکتوب مورخہ ۴/ جنوری ۱۹۶۱ء میں تحریر فرمایا کہ ''مجھ کو آپ نے اپنی علالت کی خبر نہیں دی، میں آپ کے لیے کم از کم دعائیں تو کر سکتا تھا، خدا کرے آپ عرصۂ دراز تک توانا و تندرست رہ کر دارالمصنفین کی مفید خدمات انجام دیتے رہیں، آمین''۔

مارچ ۱۹۶۸ء میں دہلی گیا تو کچھ ایسی عجلت میں تھا کہ ان کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا، اور ان سے ملے بغیر اعظم گڑھ واپس چلا آیا، تو ایسا معلوم ہوا کہ دہلی گیا ہی نہ تھا، یہاں آنے کے بعد دارالمصنفین کی پانچ مطبوعات کی جلدیں ان کی خدمت میں ارسال کیں اور دہلی جانے اور خدمت میں حاضر نہ ہونے کا افسوس بھی ظاہر کیا تو اس کا جواب ایک مکتوب مورخہ ۲۵/ اپریل ۶۸ء میں اس طرح دیا:

محبی صباح الدین صاحب! السلام علیکم

> نوازش نامہ مورخہ ۱۸/ اپریل بھی ملا اور دارالمصنفین کی پانچ مطبوعات بھی جو آپ نے ازراہ ذاکر نوازی بھیجی ہیں، بڑی خوشی ہوئی کہ اشاعت کتب کا کام قابل اطمینان طور پر بڑھ رہا ہے، انشاءاللہ آئندہ سال بھی ۵، ۶ کتابیں نکل جائیں گی، آپ لوگوں کی محنت اور آپ کا انہماک قابل رشک ہے۔
>
> یہ آپ مجھ سے ملنے کیوں نہیں آئے؟ کہیں میرے دفتر سے تو وقت دینے میں کوتاہی نہیں ہوئی یا اس کوتاہی کے خیالی اندیشہ سے آپ نے وقت ہی نہیں چاہا، آپ دہلی آئیں اور ملاقات نہ ہو، یہ تو اچھا نہیں لگتا، سب ساتھیوں کو میرا سلام پہنچا دیجئے۔ والسلام۔ مخلص ذاکر حسین۔

اس مکتوب کے بعض فقروں میں دل نوازی کی کیسی شمیم انگیزی ہے، جس سے معلوم نہیں میری طرح کتنے مکتوب الیہ معطر ہوتے رہے۔

مئی ۱۹۶۸ء میں راشٹر پتی بھون میں نذر ذاکر کے نام سے دو جلدیں پیش کی گئیں، اس میں میرا بھی ایک مقالہ تھا، خلاف توقع ذاکر صاحب کا ایک مکتوب مورخہ ۲۲/ مارچ ۱۹۶۹ء ملا، میرا خیال ہے کہ یہ ایک مشترکہ مکتوب ہے جو انھوں نے نذر ذاکر کے ہر مقالہ نگار کو لکھا تھا، یہ دلچسپ ہے اور میرے نام ان کا آخری مکتوب ہے، اس لیے ذیل میں درج ہے:

مکرم بندہ! تسلیم

> یہ شکریہ کا ناچیز ہدیہ آپ کی خدمت میں بہت دیر سے پہنچ رہا ہے، جس کے لیے دل سے معذرت خواہ ہوں، آپ نے ازراہ ذاکر نوازی ''نذر ذاکر'' میں اپنا گراں قدر مضمون شامل فرما کر جو کرم فرمایا تھا اس کا دلی شکریہ تقریباً ایک سال بعد پیش خدمت کر رہا ہوں، یہ کتاب سال بھر سے پہلے میری سالگرہ کی تقریب میں دوستوں نے مجھے عنایت فرمائی تھی، عمر بھر اپنی سالگرہ نہیں منائی

تھی لیکن اب دوستوں نے ایک صحیح یا غلط تاریخ کا تعین فرما کر اس کا سلسلہ شروع کر دیا ہے، کتاب جب ملی تو اسے پڑھنا شروع کیا، ایک دوست میری میز سے وہ نسخہ اٹھالے گئے اور حسب معمول واپس کرنا بھول گئے اور میں بھول گیا کہ وہ کون دوست میری میز سے وہ نسخہ اٹھالے گئے، اس لیے انگریزی میں مضامین دینے والے دوستوں کا شکریہ تو پہلے ادا کر چکا اور اردو کا ایک دوسرا نسخہ جب مالک رام صاحب نے عطا فرمایا تو یہ معذرت نامہ لکھنے کا موقع نکلا، میں اس تاخیر کی معذرت چاہتا ہوں، اور دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں''۔

دارالمصنفین کی طرف سے انڈین کانسل آف کلچرل ریلیشنز کے رکن کی حیثیت سے اس کے سالانہ جلسہ میں دہلی بارہ برس سے جایا کرتا ہوں، اس سال اس کا جلسہ ۳؍ مئی ۱۹۶۹ء کو طے پایا، میں نے حسب معمول اس میں شرکت کا ارادہ کیا تو خیال ہوا کہ اس مرتبہ ذاکر صاحب کی خدمت میں ضرور حاضر ہوں گا، ۲۱؍ اپریل ۶۹ء کے ایک خط میں ان سے ملنے کی تاریخ طلب کا طلبگار ہوا، وہ ان ہی دنوں آسام کے دورہ پر جانے والے تھے، اس لیے اس خط میں یہ بھی لکھ دیا کہ ٹیلیفون سے دریافت کرلوں گا کہ کون سی تاریخ اور وقت میں حاضر خدمت ہونا ہے، ۲۰؍ مئی کو دہلی پہنچا اور محبی پروفیسر ڈاکٹر امیر حسن عابدی صدر شعبہ فارسی دہلی یونیورسٹی کے یہاں ٹھہرا، ۳؍ مئی کو دس بجے خانہ ایران میں ایران کے کلچرل کونسلر جناب ہاشم کردوش سے ایک ملاقات طے تھی، ان سے ملنے کے بعد تقریباً پونے گیارہ بجے وہیں سے راشٹرپتی بھون ٹیلیفون کیا کہ مجھ کو کس روز اور کس وقت طلب کیا گیا ہے، سکریٹری نے بتایا کہ میرا خط فائل میں رکھا ہوا ہے، اب وہ راشٹرپتی سے پوچھ کر مجھ کو تھوڑی دیر میں تاریخ اور وقت بتادیں گے، میں نے ان سے کہا کہ وہ وقت اور تاریخ دریافت کرلیں میں چار بجے ٹیلیفون سے دریافت کرلوں گا، اس کے بعد میں اپنی قیام گاہ پر چلا آیا۔

انڈین کانسل آف کلچرل ریلیشنز کے جلسہ کے لیے آزاد بھون روانہ ہو رہا تھا کہ محبی ڈاکٹر امیر حسین عابدی نے اچانک یہ خبر سنائی کہ حرکت قلب کے بند ہوجانے سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا انتقال ہوگیا، ایسا معلوم ہوا کہ مجھ پر بجلی گر پڑی دل و دماغ پر تاریکی چھاگئی، کسی طرح آزاد بھون پہنچ گیا، جہاں اور بھی نمائندے آئے ہوئے تھے، سب ہی سوگوار تھے، جلسہ جناب صدر بی، ان کھوسلا اور جناب ہردے ناتھ کنزرو کی تعزیتی تقریروں کے بعد ملتوی کر دیا گیا، دونوں نے ان کو سیکولرزم کا اعلیٰ نمائندہ بتایا، حیدرآباد سے اس جلسہ کے لیے ڈاکٹر عبدالمعید خان صدر شعبہ عربی عثمانیہ یونیورسٹی بھی آئے تھے، ان کو بھی ذاکر صاحب سے بڑا گہرا لگاؤ تھا، ہم دونوں ساڑھے پانچ بجے تک راشٹرپتی بھون پہنچ گئے، کسی نے خبر دی تھی کہ میت پانچ بجے اس کے دربار ہال میں لاکر رکھ دی جائے گی، وہاں پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ سات بجے رکھی جائے گی، اندر باہر بڑا ہجوم تھا، وزراء اور سفراء اور معززین تعزیت کے لیے برابر آرہے تھے، پھر اتنی بھیڑ ہوئی کہ ڈاکٹر عبدالمعید خان نے کہا کہ اب میت کو دیکھنا ممکن نہ ہوسکے گا، اس لیے ہم دونوں آخری دیدار سے محروم ہوکر واپس ہوگئے۔

۴؍ مئی ۱۹۶۹ء کو میں جماعت اسلامی کے دفتر پہنچا، تو مولانا ابواللیث امیر جماعت اسلامی کو بھی سوگوار پایا، وہ ذاکر صاحب کی بعض خوبیوں کے بڑے معترف تھے، وہاں سے راشٹرپتی بھون عبدالعظیم صاحب ٹونکی کے ساتھ چلا گیا، میت کی زیارت کرنے والوں کا بڑا ہجوم تھا، تقریباً ایک میل کی قطار لگی ہوئی تھی، بڑی مشکل سے دربار ہال پہنچا، میت گلاب کے پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی، دیکھ کر آنکھیں غمناک ہوگئیں کہ ہندوستان کا گل سرسبد، سیکولرازم کا گل لالہ، راشٹرپتی بھون کا پیر رعنا نہیں بلکہ مغل گارڈن کا گل رعنا آج ٹوکریوں پھولوں کے نیچے بے جان پڑا ہے، چہرا کھلا تھا، اس کی طرف نظر اٹھی، لیکن جھک گئی، جس شکیل اور وجیہہ چہرہ پر شروع میں مقصد حیات کی بلندی، قلندری کا بانکپن، محبت کی قوس وقزح، اخلاص کی شفق، علم کی گہرائی اور آخر میں شاہانہ ماحول میں پر ازعظمت انکسار دیکھا تھا، اس کو بے حس وحرکت دیکھا نہیں گیا، انھوں نے اپنی زندگی کا آغاز کانٹوں کے سیج پر لیٹ کر کیا تھا، دنیا ان کو پھولوں کے سیج پر سلا کر ہمیشہ کے لیے رخصت کر رہی تھی، میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے، لیکن اس وقت رونے والوں کی کمی نہ تھی، جو میرے آنسوؤں کی کوئی قیمت ہوتی، میت کے پاس قرآن خوانی ہو رہی تھی، میں بھی شریک ہوگیا، عصر کا وقت آیا تو ہال میں اذان دی گئی، نماز باجماعت ادا کی گئی، اس دربار ہال میں کبھی تکبیر کی آواز بلند نہیں ہوئی ہوگی، کلام پاک بھی نہ پڑھا گیا ہوگا، نماز کی برکت سے بھی متبرک نہ ہوا ہوگا، لیکن ذاکر صاحب کی بدولت یہ ہال کئی روز تک کلام الٰہی سے گونجتا رہا، ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں نے بھی اپنے اپنے مذہبی گیت گائے، لاش کی نگرانی ذاکر صاحب کے بڑے داماد خورشید احمد صاحب کر رہے تھے، بے انتہا مغموم تھے، میں نے ان سے اظہار تعزیت کرنا چاہا، لیکن میری تعزیت کی کیا قدر ہوسکتی تھی، جب دنیا کے مشاہیر کے تعزیتی پیام ان کے پاس پہنچ رہے تھے، پھر بھی بے اختیار ہوکر ان کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا، مشکل سے ایک دو جملے کہہ پایا، وہاں سے لوٹا تو جماعت اسلامی کے اخبار دعوت کے اڈیٹوریل پر نظر پڑی جس کے کچھ ٹکڑے یہ تھے:

''ڈاکٹر صاحب کے افکار سے بہت سے لوگوں کو اختلاف رہا ہوگا، یہ کوئی معیوب بات بھی نہیں، لیکن ان کی مرنجاں مرنج طبیعت ان کی ملنساری اور تواضع، ان کا علمی وقار اور تہذیبی انکسار، تعمیری کاموں سے ان کی لگن، جس چیز کو صحیح سمجھا اس کے لیے ایثار اور قربانی کی راہ اپنالی مرحوم کی یہ خوبیاں تھیں

جنھیں ان کے بعد بھی یاد رکھا جائے گا...... ابھی آپ ناگالینڈ اور آسام پر گئے ہوئے تھے، اس موقع پر گوہاٹی میں اپنے ایک شاگرد حسنین سید سے ملاقات کے موقع پر جو بات چیت کی وہ آپ کی دین پسندی کے رجحان کی شاہد ہے، حسنین سید صاحب نے ملاقات کے موقع پر آپ سے شکایۃً کہا کہ آج جمعہ کا دن ہے، یہ صحیح ہے کہ مسافر پر جمعہ واجب نہیں ہے، پھر بھی مسجد میں نماز جمعہ کی ادائیگی کا پروگرام آپ بنالیتے تو لوگوں کو بھی قریب سے دیکھنے کا موقع مل جاتا، آپ نے شاگرد کی شکایت سن کو جواب دیا، ''افسوس کیا بتاؤں میرے دونوں گھٹنوں میں تکلیف رہتی ہے، التحیات و درود پڑھنے کے لیے جس طرح بیٹھا جاتا ہے، میں نہیں بیٹھ سکتا، اپنی قیام گاہ پر چوکی پر بیٹھ کر پاؤں لٹکا کر نماز پڑھ لیتا ہوں، مسجد میں یہ صورت نہیں ہوسکتی، سال میں عیدین کے موقع پر جب عیدگاہ میں نماز پڑھنے جاتا ہوں تو بڑی تکلیف سے نماز ادا کرتا ہوں''۔ (روزنامہ دعوت، مورخہ ۴؍مئی ۱۹۶۹ء)

ذاکر صاحب کے بہار کی گورنری کے زمانہ کے ایک سکریٹری کا بھی ایک تعزیتی بیان شائع ہوا کہ وہ جب تک وہاں گورنر کے عہدہ پر فائز رہے، پانچوں وقت کی نماز پابندی سے ادا کرنے کے عادی رہے۔

ان کی وفات پر بے شمار بیانات نکلے، تمام اخباروں نے اڈیٹوریل لکھے، مضامین شائع کیے، بڑے بڑے جلسے ہوئے، مؤثر اور دل گداز تقریریں ہوئیں، لیکن اوپر صرف ایک اداریہ اور ایک بیان کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ دنیا میں تو ان کو ہر قسم کا اعزاز ملا، سفر آخرت کے لیے بھی ان کو زادراہ چاہئے تھا، جس سے وہ غالبًا خالی نہیں گئے۔

۵؍مئی کو پانچ بجے سہ پہر کو راشٹرپتی بھون میں جنازہ کی نماز کا اعلان ہوا، بڑا ہجوم تھا، فوجوں کا زبردست پہرہ تھا، میں بھی مولانا ابواللیث امیر جماعت اسلامی اور ان کے ہمراہیوں کے ساتھ بڑی مشکل سے راشٹرپتی بھون پہنچا جس کا میدان سواروں، فوجیوں اور دنیا کے مختلف ملکوں کے نمائندوں اور حکومت اور حکومت کے وزیروں اور عہدیداروں سے بھرا پڑا تھا، اس سرکاری تقریب میں کلمہ طیبہ کی آواز بھی فضا میں گونج رہی تھی، دربار ہال سے جنازہ باہر آیا، سرکاری قاعدہ کے مطابق اکیس توپوں کی گونج میں سواروں نے سلامی دی، جنازہ کی نماز دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا فخرالدین صاحب نے پڑھائی، اور جب جنازہ سرکاری اعزاز کے ساتھ بحری، بری اور ہوائی فوج کے جلو میں روانہ ہوا تو فضا یہ کہہ رہی تھی کہ یہ صرف صدر جمہوریہ ہند کا جنازہ نہیں بلکہ صحیح معنوں میں انسانی قدروں کی معرفت حاصل کرنے والے مشرق مغرب کی خوبیوں کو اپنے میں سمونے والے، اسلامیت اور قومیت کے حسین امتزاج کا خواب دیکھنے والے، ہندو مسلم کا اتحاد دل سے چاہنے والے، رواداری، فراخدلی اور یکجہتی کے لیے قلب و جگر میں تڑپ رکھنے والے، شرافت، اخلاق کو اپنی وضعداری اور شائستگی سے جلا دینے والے، للہیت، محبت اور اخلاص میں نکھار پیدا کرنے والے کا بھی جنازہ ہے۔

۷؍مئی ۱۹۶۹ء کی شام کو مولانا ابواللیث صاحب امیر جماعت اسلامی کے ساتھ جامعہ نگر جا کر ان کے مرقد پر حاضری دی، وہاں جامعہ ملیہ کے بہت سے لوگ موجود تھے، ان میں سب سے زیادہ مغموم ڈاکٹر عابد حسین صاحب تھے، جو ذاکر صاحب کے بہت ہی قدیم دوست اور ساتھی ہیں، انھوں نے جامعہ ملیہ کے پرانے دور کی تنگی اور عسرت کے کچھ واقعات سنائے اور جب میں قبر کے پاس کھڑا ہوکر فاتحہ پڑھنے لگا تو دل کہہ رہا تھا کہ وہ جب تک زندہ رہے ان میں در شاہوار کی آب و تاب رہی، بلکہ وہ کوہ نور بن کر چمکے، وہ تہذیب و ثقافت کے ایک شاندار باب بھی تھے، بہت سی حسین اداؤں کے ایک گلدستہ بھی، زندگی کی رعنائیوں کے ایک چمن بھی، لیکن آہ! اب مٹی کے تودوں کے نیچے ابدی نیند سورہے ہیں، ان کی زندگی کی الف لیلیٰ تو ختم ہوگئی لیکن وہ اپنے پیچھے اپنی یادوں کی ایک انجمن چھوڑ گئے ہیں، جس میں معلوم نہیں، ان کی کتنی نیکیوں اور خوبیوں کی شمع برابر فروزاں رہے گی، انھوں نے اپنی زندگی میں جامعہ ملیہ میں اسلامی اور قومی قدروں کے نور کے جوت جگائے تھے، امید ہے کہ ان کی زندگی کے بعد بھی ان کا مرقد جامعہ ملیہ کے لیے روشنی کا مینارہ بنا رہے گا، اسی کے پاس ان کے ایک اور پرانے ساتھی ارشاد حسین صاحب سابق رجسٹرار جامعہ ملیہ نے بتایا کہ انھوں نے آخر زمانہ میں کلام پاک بھی حفظ کرنا شروع کردیا تھا، یہ سن کر خوشی ہوئی کہ ان کے سفر آخرت کے زادراہ کا بھی شائد پورا انتظام ہے۔

۸؍مئی کی صبح کو جناب سید حسین صاحب ایم، اے علیگ کے ساتھ ذاکر صاحب کے بھائی ڈاکٹر یوسف حسین صاحب سے ملا، جو اپنے چھوٹے بھائی ڈاکٹر محمود حسین کی تیمارداری کے لیے ولنگڈن اسپتال میں تھے، موخرالذکر کراچی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، اپنے محبوب بھائی اور فخر خاندان کے جنازہ میں شرکت کے لیے دہلی آئے تو میت دیکھ کر ایسے بے قرار ہوئے کہ ان پر قلب کا شدید دورہ پڑا کہ جان کے لالے پڑ گئے، یہ تحریر لکھتے وقت خدا کے فضل و کرم سے بہتر ہیں، ڈاکٹر یوسف حسین کے دل میں اپنے مرحوم بھائی کی جو عزت و محبت تھی، اس کا اندازہ ان کی حسب ذیل تحریروں سے ہوگا جو ذاکر صاحب کی زندگی ہی میں ان کی دلچسپ تصنیف ''یادوں کی دنیا'' میں لکھی گئیں:

> جس کسی نے انھیں راتوں کو کلام پاک کی تلاوت کرتے سنا یا دیکھا ہے وہ ان کے خشوع و خضوع سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، وہ اپنی دینداری کو چھپاتے ہیں، اپنے قریب ترین عزیز سے بھی، نہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ کوئی انھیں عبادت کرتے ہوئے دیکھے، میں سمجھتا ہوں یہ ان کے اخلاص و عقیدت اور بے تصنع زندگی کا اقتضا ہے،...... ذاکر میاں کی نجی زندگی ہمیشہ آئینہ کی

طرح پاک صاف رہی ہے، اس میں ہر بات ظاہر ہے، کوئی چیز ڈھکی چھپی نہیں، جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں، ان کی سیرت کے اوصاف پبلک زندگی اور نجی زندگی دونوں ہی میں یکساں ہیں، وہی سادگی، وہی بے ساختگی، وہی نمائش سے گریز، وہی ملنساری، وہی محبت کا نبھاؤ، وہی وضعداری اپنوں سے بھی اور پرایوں سے بھی، وہ ایک شفیق باپ، ایک دردمند بھائی، ایک مخلص دوست ہیں، ہر حالت میں آدمی ان پر بھروسہ کرسکتا ہے،...... انھوں نے جس طرح فقر میں شاہی کی، بلندنگاہی نہیں چھوڑی، اسی طرح شاہی میں فقر کے آداب کا احترام کرتے ہیں، جہاں بھی رہے مقبول اور محبوب رہے، جو ان سے ایک مرتبہ مل گیا، ان کی دلنواز شخصیت سے مسحور ہوگیا،...... بلاشبہ ذاکر میاں فخر خاندان تو ہیں ہی، لیکن اس سے بڑھ کر بھی بہت کچھ ہیں، ان کی شخصیت کی حدود خاندان کے باہر بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں، ان کی روح کی روشنی سے بہت سارے دل اور بہت سی محفلیں منور ہیں، اگر انھیں فخر قوم کہا جائے تو یہ زیادہ موزوں اور مناسب ہوگا، وہ اپنی ذات سے انجمن ہیں، اور بہت سی انجمنیں ان کی ذات سے فیضان حاصل کررہی ہیں، ہمیں اس بات پر بجاطور پرفخر ہے کہ یہ چراغ جس سے بہت سی انجمنیں روشن ہیں، ہمارے گھر کا چراغ ہے، بقول شاعر:

یک چراغیست دریں خانہ کہ پرتو آں
ہر کجامی نگری انجمنے ساختہ داند''۔

۹رمئی کو دارالمصنفین واپس آیا تو جناب شاہ معین الدین احمد ندوی کے ساتھ یہاں کے ہرفرد کو سوگوار اور مغموم پایا، اس لیے کہ وہ اس کی مجلس انتظامیہ کے نہ صرف بہت ہی قدیم رکن تھے، بلکہ اس کے بہت بڑے محسن بھی تھے، یہ تحریر ختم کرتے وقت دل سے دعائیں نکل رہی ہیں کہ بار الہا! ان کو اپنی آغوش رحمت میں لینا، تیری بنائی ہوئی دنیا میں عاجز بندوں ہی سے نہیں بلکہ بڑے بڑے حکمرانوں، رہنماؤں اور مصلحوں سے بھی خطائیں ہوتی رہی ہیں، لیکن تیری ستاری اور غفاری میں کمی نہیں ہوتی، تجھ کو بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتیں پسند ہوجاتی ہیں، ان ہی سے تیری رحیمی اور کریمی حرکت میں آجاتی ہیں، حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی روایت ہے کہ بزرگوں نے سلطان محمود غزنوی کو اس کی وفات کے بعد خواب میں دیکھا، پوچھا اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا، جواب دیا ایک رات میں کسی قصبہ میں مہمان تھا، جس مکان میں ٹھہرا تھا وہاں طاق میں قرآن شریف کا ایک ورق رکھا ہوا تھا، میں نے خیال کیا، یہاں ورق مصحف رکھا ہوا ہے، سونا نہ چاہئے، پھر دل میں خیال آیا کہ ورق مصحف کو کہیں اور رکھوادوں، اور خود یہاں آرام کروں، پھر سوچا کہ بڑی بے ادبی ہوگی، اگر اپنے آرام کی خاطر ورق مقدس کی جگہ تبدیل کروں، اس ورق کو دوسری جگہ نہ بھیجا، تمام رات جاگتا رہا، میں نے کلام پاک کے ساتھ جو ادب کیا، اسی کے بدلے حق تعالیٰ نے مجھ کو بخش دیا۔ (دلیل العارفین، مجلس پنجم)۔ ہندوستان کے غلام خاندان کا حکمران شمس الدین ایلتتمش بڑا دیندار بادشاہ گذرا ہے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی روایت ہے کہ لوگوں نے اس کی وفات کے بعد اس کو خواب میں دیکھا اور اس سے پوچھا کہ خداوند تعالیٰ نے تمھارے ساتھ کیا کیا، تو اس نے جواب دیا کہ میری بخشایش اس حوض کی بدولت ہوئی جو میں نے دہلی میں لوگوں کو شیریں پانی فراہم کرنے کے لیے کھدوایا (فوائد الفواد، ص۱۱۹)۔ بارالہا! ذاکر صاحب سے ضرور بشری لغزشیں ہوئیں، ممکن ہے کہ ان سے تیرے احکام کی خلاف ورزی بھی ہوئی ہو، لیکن تیرے بندوں کی نگاہوں میں ان میں بہت سی نیکیاں، خوبیاں اور اچھائیاں تھیں، اے بندوں کی خطاؤں اور لغزشوں کو درگزر کرنے والے آقا! تو بڑا ہی غفورالرحیم ہے، دعا ہے کہ ان کی بھی کوئی ادا، کوئی بات تیری بارگاہ میں قبول ہوگئی ہو اور وہ تیری رحمتوں کی کوثر، برکتوں کی تسنیم اور شان کریمی کی سلسبیل سے سیراب ہورہے ہوں۔ آمین ثم آمین۔

(''ص۔ع''، جولائی ۱۹۶۹ء)

کبیر، ہمایوں

ہمایوں کبیر

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ ہمایوں کبیر صاحب نے انتقال کیا، وہ اس دور کے لائق ترین مسلمانوں میں تھے اور اپنے ذوق کے اعتبار سے علمی و تعلیمی لائن کے آدمی تھے لیکن انھوں نے سیاست کا پُر خار راستہ اختیار کیا، اس لیے اس میں کامیاب نہ ہوسکے، علمی و تعلیمی لائن میں وہ زیادہ مفید کام انجام دے سکتے تھے، ان میں بعض خامیوں کے باوجود اسلامی حمیت پوری طرح موجود تھی جس کا اظہار ان کی تقریروں میں ہوتا رہتا تھا، وہ مولانا ابوالکلام کے شعبۂ میں رہ چکے تھے، اس لیے دارالمصنفین سے بھی واقف اور اس کے بڑے قدردان تھے، چنانچہ انھوں نے مولانا کے بعد بھی دارالمصنفین کے کاموں میں بڑی مدد پہنچائی، اب جو اور جیسا مسلمان بھی اٹھتا ہے، اس کا بدل نہیں مل سکتا، اس لیے ان کی جگہ بھی خالی رہے گی، اللہ تعالیٰ ان کی خامیوں اور خطاؤں سے درگذر کرکے ان کی مغفرت فرمائے۔ (''م''، ستمبر ۱۹۶۹ء)

خان، محمد اجمل

محمد اجمل خان صاحب

افسوس ہے کہ محمد اجمل خان صاحب ممبر پارلیمنٹ نے طویل علالت کے بعد

انتقال کیا، مرحوم پرانے کانگریسی تھے، ان کا وطن الہ آباد تھا، انہوں نے پنڈت جواہر لال کے ساتھ قید و بند کی مصیبتیں جھیلی تھیں، آزادی کے بعد عرصہ تک مولانا ابوالکلام کے سکریٹری رہے، اس زمانہ میں کئی مرتبہ ان سے ملاقات کا اتفاق ہوا، سیاسی ذوق کے ساتھ صاحبِ علم و قلم بھی تھے، عربی سے پوری طرح واقف تھے، ان کا خاص موضوع کلام مجید کی نزولی ترتیب تھا، اسی نقطۂ نظر سے انہوں نے سیرت قرآنی کے نام سے آنحضرت ﷺ کی ایک سیرت لکھی تھی، ادب و انشاء کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے تھے، غبار خاطر پر انہوں نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ مولانا ابوالکلام کے رنگ میں اتنا ڈوبا ہوا ہے کہ یہ امتیاز کرنا مشکل ہے کہ ان کے قلم کا ہے یا خود مولانا ابوالکلام کے قلم کا، وہ اپنے بعض خیالات میں منفرد تھے، لیکن اسلامی حمیت ان میں پوری طرح موجود تھی، بلکہ حالات نے ان کو اور بڑھا دیا تھا، اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں سے درگذر اور ان کی مغفرت فرمائے۔ (''م''، نومبر ۱۹۶۹ء)

فرنگی محلی، محمد قائم، مفتی

مفتی محمد قائم فرنگی محلی

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ مفتی محمد قائم صاحب فرنگی محلی نے انتقال فرمایا، مرحوم درس و تدریس اور فقہ و فتاویٰ میں خانوادہ فرنگی محل کی آخری یادگار تھے، ایک مدت تک مدرسہ حنفیہ جونپور کے صدر مدرس رہے، مگر ادھر عرصہ سے کبرسنی کے باعث خانہ نشین ہوگئے تھے، چند برسوں سے بالکل معذور ہوگئے تھے، مگر اس حالت میں بھی افتا کا کام جاری تھا، اور مولانا محمد رضا فرنگی محلی ان کی نگرانی میں اس کو انجام دیتے تھے، فقہ کے علاوہ حدیث و رجال پر بھی ان کی وسیع نظر تھی، جس پر ان کی تصنیف معیار الحدیث شاہد ہے، اخلاق و وضعداری میں پرانے بزرگوں کا نمونہ تھے، ان کی وفات سے فرنگی محل کی علم و فضل کی آخری یادگار مٹ گئی۔ والبقاء للہ وحدہ۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ (''م''، جنوری ۱۹۷۰ء)

اسحٰق، محمد، ڈاکٹر

ڈاکٹر اسحٰق مرحوم

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو نام و نمود کے لیے سرگرداں رہتے ہیں، لیکن یہ ان سے گریزاں رہتی ہے، کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس کے خواہاں تو نہیں ہوتے لیکن یہ ان کے پیچھے لگی رہتی ہے اور وہ نہ صرف اپنے معاصروں اور ہم چشموں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں بلکہ اپنی وفات کے بعد بھی محبت سے یاد کیے جاتے ہیں، ڈاکٹر محمد اسحٰق (جن کو مرحوم لکھتے وقت دلی رنج ہوتا ہے) ایسے ہی لوگوں میں تھے۔

وہ ۱۲؍ستمبر ۱۹۶۹ء کو کلکتہ میں حرکت قلب کے بند ہوجانے سے اللہ کو پیارے ہوئے، ان کا کوئی سوانح نگار ان کے سوانح حیات لکھنے بیٹھے تو ان کی روداد زندگی کو طویل اور ضخیم تو نہیں بنا سکتا لیکن ان کے کارنامے کچھ ایسے ہیں جن کو قلمبند کرنے میں ان کی روداد حیات اگر طویل نہیں ہوسکتی ہے تو دلنشین ضرور ہوجائے گی۔

وہ کلکتہ میں ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے، وہاں کے مدرسہ عالیہ اور ہیر اسکول میں تعلیم پائی، پھر اسکاٹش چرچ کالج سے ۱۹۲۱ء میں بی ایس سی کیا، سائنس کی تعلیم پانے کے بعد ایم، اے میں عربی لے لی، ۱۹۲۳ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے اس مضمون میں فرسٹ کلاس پایا، ۱۹۲۴ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی میں عربی اور اسلامیات کے لکچرار مقرر ہوئے، ۱۹۲۶ء میں کلکتہ اسلامیہ کالج میں عربی و فارسی دونوں مضامین کے لکچرار ہوکر اپنے مولد واپس آگئے، ۱۹۲۷ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے لکچرار ہوگئے، جہاں ۳۳ سال کی خدمت کے بعد اسی یونیورسٹی سے عربی اور فارسی کے ریڈر اور صدر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ان کے علمی ذوق کے تنوع کا اندازہ اس سے ہوگا کہ سائنس کی تعلیم پانے کے باوجود عربی اور فارسی کا ذوق بہت اچھا رکھتے تھے، عربی میں ایم، اے کی ڈگری حاصل کی لیکن فارسی پڑھاتے رہے، اس زبان کی جو خدمت انجام دی ہے، وہ ان کی زندگی کا نمایاں کارنامہ ہے، وہ اپنی ملازمت کے زمانہ میں ۱۹۳۸ء میں لندن گئے وہاں پروفیسر ولڈ امیر منورسکی کی نگرانی میں اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں کام کرتے رہے اور جدید فارسی شاعری پر ایک مقالہ لکھ کر پی، ایچ، ڈی کی ڈگری پائی، پھر سوئزرلینڈ، فرانس اور اٹلی کی بھی سیاحت کی، ہندوستان واپس آئے تو ایرانی زبان و ادب پر ان کی واقفیت کی شہرت بڑھتی گئی، مشہور مستشرقین رینالڈ نکلسن اور ال، لوک ہارٹ سے ان کے تعلقات پیدا ہوئے، اسی شہرت کی بنا پر فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے جشن کے موقع پر ایران کی حکومت نے ان کو مدعو کیا، وہ طہران اور طوس گئے تو بغداد، بصرہ، کربلا اور نجف کی بھی سیاحت کی۔

فارسی زبان و ادب سے ان کو فطری دلچسپی تھی، اس لیے ایران کے قیام کے زمانہ میں وہاں کے معاصر شعرا سے متاثر ہوکر ایک کتاب ''سخنوران ایران درعصر حاضر'' دو جلدوں میں قلمبند کی، جو ۱۳۵۱ھ اور ۱۳۵۵ھ میں شائع ہوئیں، یہ علمی حلقہ میں بہت پسند کی گئیں، جو مقبول اور کئی لحاظ سے مفید بھی ثابت ہوئیں، ان دونوں جلدوں کو ایران کی جدید فارسی شاعری کا خزینہ ازریں سمجھنا چاہئے، ہندوستان کا ادبی حلقہ تو ایران کے قدیم شعراء سے اچھی طرح واقف تھا، لیکن وہاں کے جدید شعراء سے بیگانہ ہوگیا تھا، اس کتاب کے ذریعہ وہ ہندوستان میں روشناس ہوئے، جس سے ہندوستان و ایران کے پرانے ثقافتی تعلقات کی تجدید بھی ہوئی، ہندوستان کے مغل حکمرانوں کے زمانے میں تو ہندوستان و ایران فارسی زبان کے شعراء کے لیے ایک ہی مکان کے دو صحن تھے، لیکن برطانوی حکومت میں لندن تو ہندوستان سے قریب ہوگیا، مگر ایران دور

ہوگیا۔ ڈاکٹر اسحٰق کی اس کتاب کی اشاعت کے بعد ہندوستان سے ایران کی دوری بہت حد تک کم ہوگئی اور ہندوستان کے ادبی حلقہ میں ایران کے جدید شعراء سے دلچسپی پیدا ہونے لگی۔

ان دونوں جلدوں میں تقریباً ۸۳ شعرا کا تذکرہ ہے، شروع میں ان کے مختصر حالات ہیں، پھر ان کے کلام پر تبصرہ اور ان کے نمونے ہیں، ڈاکٹر اسحٰق نے یہ دونوں جلدیں جدید فارسی میں لکھی ہیں، ایران کے دانشور سبک ہندی کو پسند نہیں کرتے، اسی لیے وہ ہندوستان کی فارسی نثر و شاعری کی تعریف کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں لیکن ڈاکٹر اسحٰق نے اپنی دلنشین تحریروں کے ذریعہ سے ان کو اپنی طرف مائل کیا، اور ان سے خراج تحسین بھی حاصل کیا، ایران کے آقای سید محمد علی جمال زادہ نے اس کتاب کی ابتدا میں تقریظ وتشکر کے عنوان سے ایک تحریر لکھی ہے، اس کے شروع میں وہ لکھتے ہیں:

''جمع اور ندہ کتاب مستطاب، سخنوران ایران اور عصر حاضر''
آقای محمد اسحٰق از فضلائے ہندوستان ومعلم در دارالعلوم کلکتہ
بسابقہ علاقمندی بایران و ادبیات فارسی چندی قبل بایران آمدہ و
مدت مدیدی دراطراف و اکناف مملکت ماسیر و سیاحت نمودہ
درضمن نیز ہرکجا اتفاق یاری کردہ بابزرگان نظم ونثر ایران آشنائی و
نشست و برخاست نمودہ و بدین وسیلہ گلچیں گلچیں ہماںطور کہ خود
ایشان درمقدمہ کتاب باعباراتی شیریں ومضامینی دلنشین اشارہ
فرمودہ انداز گلستان مرزوبوم فردوسی و سعدی و حافظ ہموطنان
خویش ومشتاقان علم و ادب راہ امنے پراز گل و ریحان ومعنی و
عرفان از ایران ارمغان آوردہ اند برما ایرانیان فرض است کہ از
علوہمت ایشان و دل بستگی کہ بادبیات ماداند سپاسگذاری نمودہ و
مسلست نمائیم کہ توفیقات یزوالی شامل حال ایشان باشد''۔

اور پھر ڈاکٹر اسحٰق نے جس محنت اور سلیقہ سے اس کتاب کی ترتیب دی ہے، اس کی تعریف کرتے ہوئے سید محمد علی جمال زادہ رقمطراز ہیں:

''بندہ نگارندہ بااجازہ ضمنی از جانب کلیہ ہموطنان وادبا وفضلای ایران واشخاص بیگانہ کہ باادبیات فارسی تعلق خاطر ودل بستگی دارندو واج آنراخواستار مشوق می باشند از مولف محترم صمیمانہ تشکر نمودہ وبرہمت عالی ایشان آفریں می خوانم''۔

اس کتاب کی اشاعت پر آقای میرزا محمد علی خان فروغی ذکاء الملک (رئیس الوزرای سابق ایران) نے ایک مکتوب میں ڈاکٹر اسحٰق کو یہ لکھ کر مبارک باد دی:

''از دریافت کتاب سخنوران ایران اورعصر حاضر بسیاء خوشنود شدم وبرمراتب اخلاصم نسبت بآں دوست دانشمند بسی افزود''۔

خود حکومت ایران نے ڈاکٹر اسحٰق کی اس ادبی خدمت کو نشان علم کا تمغہ عطا کر کے سراہا، جو ایک ہندوستانی کے لیے بڑا امتیاز ہے۔

ڈاکٹر اسحٰق نے اپنے مقدمہ میں ایران کی جدید شاعری کا تجزیہ بھی کیا ہے، ان کا بیان ہے کہ ایران کے جدید دور میں کچھ ایسے شعرا ضرور ہیں جو پرانے اساتذہ کی تقلید میں غزلیں، قصیدے اور مراثی لکھتے ہیں لیکن اس جدید دور میں ایسے شعرا بھی ہیں، جو روایتی شاعری سے بغاوت کر کے زیادہ تر ایسی نظمیں لکھتے ہیں جن میں وطن کی محبت کا تو اظہار ہوتا ہے لیکن پرانی چیزوں پر استہزاء بھی ہوتا ہے، وہ مذہبی موضوعات پر نظمیں نہیں لکھتے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مذہب سے بیگانہ ہوتے جارہے ہیں، وہ زیادہ تر سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی مسائل کو اپنی شاعری کے موضوعات بناتے ہیں، گو اپنے انداز بیان کو سلیس اور عام فہم بھی بناتے ہیں لیکن اس ادبی انقلاب سے ڈاکٹر اسحاق خوش نہ تھے، چنانچہ اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں:

''ایں انقلاب ادبی معایبی نیز در برداشت کہ شاید اگر
بدقت سخیدہ شوباید گفت ادبیات ایران دریں معاملہ چنداں
سودنبردہ است''۔

ڈاکٹر اسحٰق کو اس بات سے بھی دکھ ہوا کہ اہل ایران اپنی شاعری اور روزمرہ کی گفتگو میں فرانسیسی اور دوسری یورپین زبانوں کے الفاظ بہت استعمال کرنے لگے ہیں، اس دکھ کا اظہار وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''نمنی توانستم تصور کنم کہ ادبای ایران بدست خویش
تیشہ برویشہ زبان خودی زنند ودرفنا واضمحلال ایں زبان
شیریں ادبی می کوشند''۔

لیکن ان نکتہ چینیوں کے ساتھ انھوں نے جدید شعرا کے کمالات پر دل کھول کر داد بھی دی ہے یہاں پر ان کی داد کے کچھ نمونے اس لیے بھی ہم پیش کرتے ہیں تاکہ فارسی میں ان کے طرز تحریر کا بھی اندازہ ہوجائے،

ادیب نیشاپوری (پیدائش، ۱۲۸۱ھ) در شاعری بدواً پیرو قاآنی بود، وبعداً شیوۂ ترکستانی راتعتیب نمودہ ودرعین حال خود دارامی سبک مخصوصی است وحقیقتاً درحقیقت در شاعری کمتر کسی بپایہ ادی رسد انتخاب الفاظ وانسجام ترکیبات و اظہار معانی دقیقہ وعواطف دردنی از مرآیای اشعار اوست''۔

ایرج میرزا (المتوفی ۱۳۴۳ھ) اشعار ایرج مرزا تقریباً می تواں بہترین نمونہ ادبیات جدید ایران شمرد زیر اعلادہ برانکبہ و دلچسپ و شامل مضامین بدیع وشیواست داری استحکام ومتانت کلام قدامت نہ چوں پیردان متقدمین نکتہ چیں کلمات عرب است ونہ چوں متجددین دشمن علم وادب است''۔

بدیع الزماں خراسانی (پیدائش، ۱۳۱۸ھ) درخطابہ ونطق نیز مقام مہمی راحائیز است اشعار اوبسبک ترکستانی ودارای مضامین دل نشین می باشد''۔

پروین اعتصامی (پیدائش، ۱۳۲۸ھ) افکار ایں گوینده متجد وفصائح واندوز است کہ بوسیلہ افسانہ ہائے دلکش وشیریں بیان شده، وجنس راجع باجتماعیات وطن قطعات بسیاری بطرز جدید وقدیم ساختہ است،غزل کمتراز دیدہ شدہ''۔

محمود خاں افشاز (پیدائش،۱۳۱۳ھ) اشعارش بسبک قدما امابہ مضامین جدید ووضعی بسیاء مطبوع وشیریں می باشد''۔

روحانی۔ فکاہیات بسبکی خاص واسلوبی سادہ کہ ہم مطبوع طبع عامہ است وہم ورنزد ارباب ادب مطلوب ودل پسند''۔

میرزا حسین خاں عطا (پیدائش،۱۲۹۳ھ) عطامنشی زبردست شاعر وتوانائی می باشد در شاعری بیشتر پیر دسبک شعرای عراق است ودرشعر مضامین دقیق وکلمات رقیق بسیاء دارد دردی ہم رفتہ شاعر بسیار حساس در قیق القلبی باشد وطبع اوبعرفان بہتر مائل است''۔

ملک الشعراء بہار (پیدائش،۱۳۰۴ھ) بہار بدوں اختلاف امروز از بزرگ ترین شعراء نوسیدگان محسوب......راہ عراق رانہ پیمودہ، است، چہ درفن نظم ونثر شیوا بنایت مہارت رادر درمبدع ومبتکر وپیشرو ادبیات جدید ایران است۔

ڈاکٹر اسحٰق ان ایرانی شعراء کی تعریف کرتے وقت سبک ہندی سے مجبوب یا شرمندہ ہوتے ہوئے نظر نہیں آتے، بلکہ انھوں نے اپنی کتاب کی ابتدا ادیب پیشاوری (پیدائش درمیان سال ۱۲۵۰ھ، ۱۲۶۰ھ) کے تذکرہ سے کی ہے، اس ہندی الاصل شاعر نے ایران والوں سے اپنا لوہا منوالیا تھا۔ چنانچہ مرزا محمد قزوینی نے اپنی کتاب بست مقالہ میں ان کو بقیۃ الفضلاء خاتمۃ الادباء اور نابغہ عصر کہا ہے، ان کا ذکر ڈاکٹر اسحٰق نے بھی بہت فخر سے کیا ہے، پھر وہ حیدر علی کمالی اصفہانی (پیدائش، ۱۲۸۸ھ) کے ذکر میں لکھتے ہیں:

اشعار کمالی باآنکہ دارای سبک اشعار شعرای فارس وعراق
است معہذانہ حیث لطافت ودقت فکر بابہترین اشعار سبک
ہندی برابری وارد''۔

اس کے یہ معنی ہیں کہ سبک ہندی میں جو لطافت اور دقت فکر ہوتی ہے، ڈاکٹر اسحٰق اس کے نہ صرف قائل تھے، بلکہ سبک ایرانی اور سبک عراقی میں شاید نہ پاتے تھے لیکن سبک ہندی سے تعلق خاطر رکھنے کے باوجود وہ سبک ایرانی کے بھی معترف رہے، ان کی اس رہ داری کی وجہ سے ایران کے ممتاز شاعر اور ادیب مثلاً ملک الشعراء تقی بہار پروفیسر پورداؤد، ڈاکٹر لطف علی صورت گر اور ڈاکٹر علی اصغر حکمت، سید محمد علی جمال زادہ اور میرزا محمد علی فروغی ان کے دوست اور قدرداں رہے، موجودہ شہنشاہ ایران اعلیٰ حضرت محمد رضا پہلوی آریامہر بھی ان کی عزت کرتے تھے، اسی لیے ایران میں دو مرتبہ ان کے حضور میں باریاب ہوئے۔

فارسی شاعری سے ڈاکٹر اسحٰق کے شغف کا اظہار انگریزی میں ان کی کتاب ایران کی چار مشہور خواتین شاعر سے بھی ہوتا ہے، اس میں انھوں نے قزدر کی رابعہ، گنجہ کی مہستی، قرۃ العین اور پروین اعتصامی کی شاعری پر فاضلانہ تبصرہ کیا ہے، مہستی کا وہی زمانہ تھا جو رودکی (المتوفی، ۳۲۹ھ) کا تھا، وہ ایک غلام سے عشق کرنے کے سلسلہ میں موت کے گھاٹ اتاری گئی، مگر اس کا ذکر تذکروں میں احترام سے کیا جاتا ہے، حتیٰ کہ ملا جامی نے اس کا ذکر فضحاالانش میں کیا ہے (ص ۶۵،۵۶۴ لکھنؤ اڈیشن) ڈاکٹر اسحٰق نے اس کی بہت سی رباعیاں اپنی کتاب میں جمع کردی ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ اس کے عشقیہ اشعار واردات قلبی کی عکاسی کرتے ہیں اور بعض رباعیوں میں قدرتی مناظر کی بڑی اچھی مرقع آرائی ہے، جن میں دل آویز انداز بیان کے ساتھ روانی بھی ہے اور تشبیہات اور تلمیحات کی برجستگی بھی، مہستی کا زمانہ کا صحیح تعین ڈاکٹر اسحٰق نہیں کرسکے ہیں، انھوں نے دو مختلف روایتیں بیان کی ہیں، ایک سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ سلطان سنجر (۵۵۲، ۵۱۱ء۔ ۱۱۵۷، ۱۱۱۷ھ) کے دربار کی شاعرہ تھی اور دوسری روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں تھی، ڈاکٹر اسحٰق نے اس کی بہت زیادہ رباعیاں جمع کردی ہیں، اس کے عشقیہ اشعار کو وہ غیر سنجیدہ قرار دیتے ہیں لیکن اس کے خمریات کے بارہ میں لکھتے ہیں کہ وہ خیام کی یاد تازہ کرتے ہیں، ڈاکٹر اسحٰق یہ بھی لکھتے ہیں کہ وہ فی البدیہہ اشعار کہتی اور حاضر جوابی میں بہت مہارت رکھتی تھی، ڈاکٹر صاحب نے بانی مذہب کی مشہور مبلغہ قرۃ العین (پیدائش، ۳۱-۱۲۳۰ھ۔ ۱۵-۱۸۱۴ء) کے اشعار بھی جمع کیے ہیں، گو وہ خود ان کو اس کے اشعار سمجھنے میں شامل ہیں لیکن ان کو پیش کرتے وقت انھوں نے کچھ ایسا انداز بیان اختیار کیا ہے کہ ناظرین مشکوک تو ضرور ہوجاتے ہیں، مگر ان اشعار کو رد کرنے میں ہچکچاہٹ بھی محسوس کرتے ہیں، ڈاکٹر اسحٰق نے پروین اعتصامی کے کلام پر تبصرہ نسبتاً زیادہ تفصیل کے ساتھ کیا ہے، اس لائق شاعرہ نے زندگی کم پائی ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئی اور ۱۹۴۰ء میں وفات پاگئی لیکن اس نے اپنی زندگی کی اس مختصر مدت میں پانچ ہزار اشعار کہے۔ ڈاکٹر اسحٰق نے اپنی پہلی کتاب سخنوران ایران اور عصر جدید میں اس کا ذکر مختصر طریقہ پر کیا تھا لیکن اپنی انگریزی تصنیف میں اس کی وفات پر دلگیر ہوکر اس کی شاعری کا گہرا مطالعہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ وہ تجدد پسند شاعرہ ضرور رہی لیکن اس کے کلام میں وہ عشقیہ اور رومانی جذبات نہیں جن سے فارسی شاعری پر ہے، عورت ہونے کے باوجود اس نے اپنے کلام میں طبقہ نسواں کی فلاح و بہبود میں کچھ بھی نہیں کیا، اس نے زیادہ تر مناظرہ کے رنگ میں نظمیں کہی ہیں جو بعض تو بہت اچھی ہے لیکن زیادہ تر وہ طویل اور خشک ہیں، البتہ کہیں کہیں سوال و جواب دلچسپ اور

دلآویز ہیں، اس کی اخلاقی نظمیں موثر ہیں، جن کو قصوں سے دلچسپ بھی بنادیا ہے، اس نے ان نظموں میں رحم دلی اور طبیعت کی صفائی اور پاکیزگی پر زیادہ زور دیا ہے، وہ مزدوروں کی بھی حامی رہی، ان کی حمایت میں رنج بر کے عنوان سے ایک پرزور نظم لکھی جس کا مطلع یہ ہے:

تا بکے جان کندن اندر آفتاب اے رنجبر رنجتن از بہر نان از چہرہ آب اے رنجبر

ان چاروں خواتین پر ڈاکٹر اسحٰق کا قلم چلا تو ان کو فارسی کی اور دوسری خواتین شاعرہ بھی یاد آگئیں، انھوں نے اسی کتاب کے ایک ضمیمہ میں ایران اور ہندوستان کی تقریباً سو شاعرہ کا ذکر کرکے ان کے کلام کے نمونے دیئے ہیں، اس کا مطالعہ ایسے ناظرین کے لئے مفید ہوگا جو سرسری طور پر ایسی باکمال خواتین کے متعلق کچھ جاننا چاہتے ہیں، لیکن اس ضمیمہ کی روشنی میں ان خواتین پر پوری ایک کتاب تیار ہوسکتی ہے، اس لحاظ سے ڈاکٹر اسحٰق کی یہ محنت بڑی کارگر ثابت ہوگی۔

انھوں نے ۱۹۶۳ء میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے لیے امین احمد رازی کی ہسنت اقلیم (ج ۳) کو ایڈٹ کیا، جس میں ہندوستان، ایران اور دوسرے ممالک کے ۲۹۷ فارسی شعراء کا ذکر ہے، ایشیاٹک سوسائٹی کے لئے روحتہ الجنات فی اوصاف مدینۃ الہرات کو بھی ایڈٹ کیا اور اس کے عربی مخطوطات کی فہرست بھی تیار کی، اپنی آخری زندگی میں علی قلی داغستانی کی ریاض الشعراء کو بھی ایڈٹ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، اور غزنوی عہد کے فارسی شعراء پر ایک کتاب بھی لکھ رہے تھے لیکن ان کی زندگی نے وفا نہ کی اس لیے یہ دونوں کام پورے نہ ہوسکے۔

ان علمی سرگرمیوں کے ساتھ انھوں نے ۱۹۴۴ء میں کلکتہ میں ایران سوسائٹی قائم کی، جو ان کی زندگی کا اصلی راس المال ہے، اس کی جو تاریخ ہے وہ گویا ان کی تاریخ زندگی ہے، اس کے ذریعہ سے گذشتہ پچیس سال کے اندر جو علمی و ادبی کام ہوا ہے وہ دراصل ان ہی کے زریں کارنامے ہیں۔ یہ سوسائٹی ہندوستان کے علمی حلقہ کے لیے ایک ایسی مثال ہے کہ علم و فن کا ایک خدمت گذار اپنے اخلاص و محنت سے بے سروسامانی کی حالت میں بھی علمی سرگرمیوں اور تحقیق کاوشوں کا ایک ایسا مرکز قائم کرسکتا ہے جو نہ صرف اس ملک بلکہ اس سے باہر کے ارباب علم کے لیے بھی توجہ کا مرکز بن سکتا ہے، ڈاکٹر اسحٰق نے جب اس کی بناڈالی تو ان کے پاس جذبہ و اخلاص کے سوا کوئی اور سرمایہ نہ تھا لیکن اب اس کے پاس ایک ایسی عمارت ہے جو کئی لاکھ کی ہے، اس کا اپنا کتب خانہ بھی ہے، اس کی علمی سرگرمیوں سے ملک کے ثقافتی سرمایہ میں بڑا قیمتی اضافہ ہوتا جارہا ہے، گذشتہ پچیس برس میں اس کی طرف سے جو کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں:

(۱) البیرونی یادگار جلد۔ یہ کتاب ۱۹۵۲ء میں البیرونی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر شائع ہوئی، اس میں امریکہ، یورپ، ایران اور ہندوستان کے اہل قلم کے گرانقدر مضامین ہیں، ۳۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ (۲) ہندوستانی جغرافیہ سے متعلق البیرونی کی معلومات از ڈاکٹر بی، سی، لا۔ (۳) البیرونی۔ سوانح حیات از ریونڈ فارد دی۔ کورتے۔ (۴) البیرونی اور پنڈت از ایضاً۔ (۵) ایران کی چار مشہور خواتین شاعرہ از ڈاکٹر محمد اسحٰق۔ (۶) فرد۔ بہار کا ایک گمنام فارسی شاعر از پروفیسر مسعود الحسن۔ (۷) بوعلی سینا، یادگار جلد ۱۹۵۶ء میں بوعلی سینا کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر شائع کی گئی، اس میں بھی مختلف ممالک کے اہل قلم کے مضامین ہیں، ۳۲۴ صفحے پر مشتمل ہے۔ (۸) کشمیر سلاطین کے عہد میں۔ از پروفیسر محبّ الحسن۔ (۹) دیوان کاہی از ڈاکٹر ہادی حسن۔ (۱۰) فارسی ادب کی ایک ایک جھلک، از ڈاکٹر علی اصغر حکمت۔ (۱۱) نقش پارسی، براحجاہند، از ڈاکٹر علی اصغر حکمت۔ (۱۲) الادویۃ القلبیہ مصنفہ بوعلی سینا مترجمہ حکیم عبداللطیف۔ (۱۳) ہدیۃ السلطانیہ مصنفہ قاضی محمد یوسف بلگرامی، مرتبہ مولانا فضل الرحمٰن باقی۔ یہ ساری کتابیں ڈاکٹر اسحٰق مرحوم کی مساعی جمیلہ میں شائع ہوئیں، ایران سوسائٹی کی طرف سے ملا صدر خمیرازی کی چار سو سالہ برسی کا جشن منایا گیا اور پروفیسر ایڈورڈ براؤن کی بھی صد سالہ سالگرہ منائی گئی، ان دونوں مشاہیر پر قابل قدر لٹریچر شائع کیا گیا۔

اس سوسائٹی کی طرف سے انگریزی میں ایک سہ ماہی رسالہ انڈوایرانیکا بھی نکلا کرتا ہے جس کی اب تک ۲۴ جلدیں نکل چکی ہیں، ان جلدوں کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ ان کے ذریعہ سے ہندوستان اور ایران کے تعلقات کو کس قدر خوشگوار کرنے کی کوشش کی گئی ہے، پھر اس میں ہندوستان کے فارسی لٹریچر پر اتنے مفید اور گرانقدر مضامین نکلے ہیں کہ ان سے نہ صرف علمی سرمایہ میں اضافہ ہوا ہے بلکہ سب ہندی کی طرف اہل ایران کی بھی نظر اٹھنے لگی ہیں، اگر اس میں اسی طرح کے مضامین شائع ہوتے ہیں تو سبک ہندی کے خلاف سبک ایرانی کے حامیوں کے تعصب میں بڑی کمی ہوجائے گی، اور خود ہندوستان والے اس علمی و ادبی ورثہ پر فخر کرنے لگیں گے، جس کے بعد ان کو ڈاکٹر اسحٰق مرحوم کے کارناموں کا یہ دل سے شکر گزار ہونا پڑے گا، کیونکہ انڈوایرانیکا ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر اسحٰق نے ایران سوسائٹی اور رسالہ انڈوایرانیکا کو اپنا قلب وجگر بنا رکھا تھا، ان ہی کے لیے وہ زندہ رہے اور مرے، جب اس سوسائٹی کے پچیس سال ہوئے تو اس کی سلور جوبلی اعلیٰ پیمانہ پر منانے کی فکر میں تھے اور انڈوایرانیکا ایک سلور جوبلی نمبر ترتیب دے رہے تھے، مگر یکایک وہ جنت کو سدھادے، ان کی یہ آرزو میں ان کی زندگی میں پوری نہ ہوئیں، وہ سوسائٹی کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لیے تیار رہتے، اس جذبہ اخلاص کو دیکھ کر اہل ثروت ان کی خاطر سوسائٹی کو بڑے سے بڑا

سرمایہ دیتے ہیں پس و پیش نہ کرتے۔ سوسائٹی کی موجودہ عمارت کو خریدنے کے لیے ان کے پاس کچھ بھی سرمایہ نہ تھا، لیکن اس کے صدر جناب ام، راے، راے کا شانی نے ان کو تین لاکھ روپے کا قرض کسی شرط کے بغیر دے دیا، جس سے یہ عمارت خرید لی گئی، مولانا ابوالکلام آزاد اور پورفیسر ہمایوں کبیر نے اپنی وزارت کے زمانہ میں سوسائٹی کو حکومت ہند کی طرف سے سالانہ امداد دلاتے رہے، ان کے بعد یہ امداد بند ہوگئی تو ڈاکٹر اسحٰق مرحوم کی جبیں پر شکن نہ آئی، مغربی بنگال کی حکومت کلکتہ کارپوریشن اور کبھی کبھی حکومت ایران سے جو تھوڑی بہت مالی مدد مل جاتی اسی سے سوسائٹی کا کام حسب دستور جاری رکھا، ان کی بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کام کرنا جانتے تھے، اس لیے کام لینا بھی جانتے تھے، انڈوایرانیکا کے لیے اہل قلم کے مضامین ایسے شفقت آمیز خطوط لکھ کر طلب کرتے کہ پھر مضمون لکھ کر بھیجنے کے سوا کوئی اور چارہ نہ ہوتا، ان ہی کی محبت بھرے خطوط کی وجہ سے میں نے بھی اس رسالہ مضامین میں لکھنے شروع کیے اور برابر لکھتا رہا، وہ مجھ کو بہت ہی اخلاص اور شفقت سے خطوط لکھتے، اگر میرے جواب جانے میں دیر ہوتی تو تردد اور پریشانی کا اظہار کرتے، جب وہ کلکتہ یونیورسٹی سے ریٹائر ہوئے تو مجھ کو اپنی محبت میں کلکتہ یونیورسٹی کے اسٹاف میں دیکھنا چاہتے تھے، تاکہ میری قربت ان سے اور بھی زیادہ ہوجائے، اس کے لیے مجھ کو ایک پرزور خطوط لکھا، مگر دارالمصنفین کے کاموں سے میری دلچسپی ایسی زیادہ ہوگئی ہے کہ میں نے ان خط کے جواب میں لکھ بھیجا:

چسکا لگا ہے جام کا شغل ہے صبح شام کا　　اب میں تمھارے کام کا ہم نفسو نہیں رہا

یہ جواب پاکر آزدہ خاطر ہونے کے بجائے میرے لیے بہت دعائیں کیں، میں اکتوبر ۶۹ء میں ڈھاکا جانے والا تھا، ان کا اصرار تھا کہ جب میں کلکتہ آؤں تو ان کے ساتھ قیام کروں، چنانچہ ستمبر کے شروع میں ان کو لکھا کہ ڈھاکہ جاتے وقت ان کے ساتھ قیام کرنے کی سعادت حاصل کرنے کا ارادہ ہے۔ اس کے جواب میں ان کی اہلیہ کی طرف سے ایک مکتوب ملا تو دل پکڑ کر گیا، ۱۲؍ستمبر کو وہ وہاں پہنچ گئے جہاں آخر میں سب کو جانا ہے، ان کی رحلت کی خبر پاکر ایسا معلوم ہوا کہ اپنے خاندان کا ایک شفیق بزرگ کھو بیٹھا ہوں۔

وہ یاد آئیں گے اور اکثر یاد آئیں گے۔ انھوں نے تو سب کو بھلا دیا، مگر ان کو دل سے بھلائے گا کون؟ ان کی بے لوث علمی خدمت ان کے نام کو زندہ رکھے گی، ان کے کام کرنے کا طریقہ اور سلیقہ ان کے معاصروں کے لیے چراغ راہ ہے، ان کے رفقائے کار محض اس اخلاص و محبت کی خاطر جس کے وہ اعلیٰ نمونہ تھے، ان کے چھوڑے ہوئے کاموں کو اور آگے بڑھائیں گے اور جب وہ ان کو یاد کریں گے تو زبان حال سے کہہ رہی ہوں گے کہ آہ! تو اس دنیا میں نہیں رہا، لیکن اخلاص سے بھری ہوئی تیری علمی سرگرمیوں، تیری نیکیوں اور تیری خوبیوں کی شمع تیرے جاننے والوں کے دلوں میں روشن رہے گی، تیری تربت پر اللہ تعالیٰ کی برکتوں اور رحمتوں کی بارش ہوتی رہے اور تجھے کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا ہو، آمین ثم آمین۔

ان سطروں کے چھپنے کے وقت ڈاکٹر اسحٰق مرحوم کے بے لوث رفقائے کار جناب خواجہ محمد یوسف ایڈوکیٹ نائب صدر ایران سوسائٹی اور جناب ام عبدالمجید صاحب ایکٹنگ جنرل سکریٹری کی کوششوں سے اس سوسائٹی کی سلور جوبلی دھوم دھام سے منائی جارہی ہوگی۔ ڈاکٹر اسحٰق مرحوم کی روح خوش ہورہی ہوگی کہ جو آرزو ان کی زندگی میں پوری ہونے سے رہ گئی تھی، وہ ان کے بعد ان کے دست راست رفقائے کار کے ذریعہ پوری ہوگئی، اب دونوں علم دوست اور مخلص حضرات سے امید کامل ہے کہ مرحوم کے چھوٹے ہوئے کاموں کو اسی لگن اور دھن کے ساتھ انجام دیتے رہیں گے، جس طرح کہ خود مرحوم دیتے رہے۔　　(''ص۔ع''، مارچ ۱۹۷۰ء)

بھوپالی، محمد یعقوب مجددی، مولانا

مولانا یعقوب مجددی بھوپالی

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مجددی بھوپالی نے انتقال فرمایا، موصوف کو حضرت مجدد الف ثانیؒ سے نسبی اور خاندانی تعلق بھی تھا، وہ اس دور کے عارف کامل اور نامور شیخ تھے، ان کی خانقاہ ارشاد و ہدایت کا مرکز تھی اور اس سے بڑا فیض پہنچا، راقم کو بھی ان کی خدمت میں حاضری اور کئی مجلسوں میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی معلوم ہوتا تھا علم و عرفان کا چشمہ ابل رہا ہے اور دلوں کی کھیتیاں سیراب ہورہی ہیں، میری حاضری کے وقت حضرت کی عمر اسّی (۸۰) سال کے قریب رہی ہوگی، خلقۃً بھی نحیف تھے، لیکن روحانی قوت کا یہ حال تھا کہ گھنٹوں پورے جوش کے ساتھ تقریر و ملفوظات کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور یہ روزانہ کا معمول تھا، آپ کے ملفوظات و مواعظ علم و عرفان کا گنجینہ ہیں، جہاں تک معلوم ہے ان کو قلم بند کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا، مولانا علی میاں نے کچھ مجلسوں کے ملفوظات قلم بند کئے تھے، جو الفرقان میں شائع ہوچکے ہیں، اگر تمام ملفوظات و مواعظ قلم بند ہوکر شائع ہوگئے ہوتے تو علم و عرفان کا یہ گنجینہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوجاتا، ان کی وفات سے ارشاد و ہدایت کی ایک نورانی شمع گل ہوگئی، اللہ تعالیٰ ان کے مدارج بلند فرمائے۔ (''م''، جون ۱۹۷۰ء)

محسن الحکیم، سید

سید محسن الحکیم

یہ سطریں زیر تحریر تھیں کہ عراق کے مجتہد اعظم آقائے سید محسن الحکیم کی وفات کی خبر ملی، وہ شیعوں کے سب سے بڑے مذہبی پیشوا اور اعلم کے منصب جلیل پر فائز تھے،

مذہبی امور میں ان کا فیصلہ حرف آخر کا حکم رکھتا تھا، جس کے سامنے پوری شیعی دنیا سرِتسلیم خم کرتی تھی، علمی حیثیت سے وہ دنیائے اسلام کے نامور علماء میں تھے اور سنیوں میں بھی عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، انھوں نے اپنے فرقہ کی بڑی مفید علمی و دینی خدمات انجام دی ہیں، اسی کے ساتھ وہ اتحاد اسلامی کے بھی قائل تھے اور شیعہ سنی اختلاف کو ناپسند کرتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے۔

سنیوں کے یہاں اس قسم کا کوئی منصب نہیں ہے، جس کو پوری سنی دنیا ماننے پر مجبور ہو، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں ہر شخص مجتہد ہے اور جن کو نہ صرف دینی علوم سے کوئی واقفیت نہیں بلکہ مذہب سے بھی عملاً کوئی علاقہ نہیں، ان کو بھی اجتہاد کا دعویٰ ہے، چنانچہ آج کل ایسے بہت سے مجتہد اور مفسر قرآن ملیں گے جو عربی کی ابجد سے بھی واقف نہیں، ان کا کام یہ ہے کہ جو نیا قالب نظر آئے اسلام کو اس میں ڈھالنے کی کوشش کریں، ان کے اجتہاد کے عجیب و غریب نمونے آئے دن نظر آتے رہتے ہیں، اور اس تخریب کا نام انھوں نے اسلامی خدمت رکھا ہے، شیعوں کے نظام میں اگرچہ تنگی ہے، لیکن مذہبی ضبط و نظام کے نقطۂ نظر سے بہت مفید ہے۔ (''م''، جون ۱۹۷۰ء)

عبدالناصر، جمال

جمال عبدالناصر

جمال عبدالناصر کی موت دنیائے عرب کا بہت بڑا حادثہ ہے، مدتوں کے بعد عربوں میں اتنا بڑا لیڈر پیدا ہوا تھا، ان کی پوری زندگی قوم و وطن کی راہ میں ایک جہد مسلسل تھی، اس راہ میں جان تک دے دی، انھوں نے عربوں میں آزادی کی روح پھونکی، مصر کی شخصی بادشاہت سے نجات دلائی، سامراجی طاقتوں سے ٹکر لی، برطانوی اثر و اقتدار سے سرزمین مصر کو آزاد کرایا، نہر سویز کے قومیا نے کے انتقام میں فرانس، برطانیہ اور اسرائیل کے متحدہ حملہ کو ذلت آمیز شکست دی، اسوان بند تعمیر کرایا، ان کے علاوہ اور بہت سے تعمیری کام کئے، ان کارناموں نے ان کو دنیا کے بڑے لیڈروں کی صف میں کھڑا کر دیا تھا، وہ اپنی قوم میں اس قدر مقبول و محبوب تھے کہ اگر ان کی جگہ کوئی دوسرا لیڈر ہوتا تو ۶۷ء کو شکست کے بعد اس کا زوال یقین تھا، لیکن اس کے بعد بھی ان کی مقبولیت میں فرق نہ آیا، ان سے بعض سیاسی اور مذہبی غلطیاں بھی ہوئیں، جن سے عرب اتحاد اور خود ان کے ملک اور ان کی شہرت کو نقصان پہنچا لیکن ان کی مذہبی غلطیاں مذہب کی مخالفت یا اس سے آزادی کے بجائے اس دور کی لادینی سیاست کا نتیجہ تھیں جس سے کوئی اسلامی ملک بھی محفوظ نہیں، خصوصاً جن کی سیاست میں غیر مسلم بھی دخیل ہیں، مگر ان غلطیوں کے مقابلہ میں ان کے کارنامے زیادہ ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے اچھے اعمال کے طفیل میں ان کی مغفرت اور ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے، ان کی زیر تعمیر مسجد میں ان کی تدفین بھی ان کے حسن خاتمہ کے لئے فال نیک ہے، ان کی موت سے عرب دنیا ایک ایسے لیڈر سے محروم ہوگئی، جس کی تلافی مدتوں نہ ہو سکے گی۔

اس وقت چند ملکوں کو چھوڑ کر انڈونیشیا سے لے کر افریقہ تک پوری اسلامی دنیا آپس کے اختلاف و انتشار کا شکار ہے آئے دن انقلابات ہوتے رہتے ہیں، اور سب سے زیادہ عرب ممالک اس میں مبتلا ہیں، جو اتحاد اسلامی اور کروڑوں عرب ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے، یہ صحیح ہے کہ یہودیوں کی پشت پر امریکہ کی قوت ہے لیکن وہ کب تک ان کی پشت پناہی کر سکتا ہے، اگر عرب حکومتوں میں اتحاد ہوتا تو یہودیوں کو فلسطین میں پناہ نہ ملتی مگر اس سے بھی ان کو سبق حاصل نہیں ہوتا، ان کے اختلافات کا سب سے عبرت انگیز نمونہ اہل اردن اور فدائیوں کی برادرکشی ہے جس کا سلسلہ مصالحت کے بعد بھی ختم نہیں ہوا ہے، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا، عربوں میں صرف ناصر کی شخصیت ایسی تھی جو اس قسم کی گتھیوں کو سلجھا سکتی تھی، ان کے بعد کوئی شخصیت نظر نہیں آتی، اس لئے ان کی موت کا اثر پورے مشرق وسطیٰ کی سیاست پر پڑے گا، معلوم نہیں وہ آئندہ کیا رخ اختیار کرتی ہے، اللہ تعالیٰ مغربی حکومتوں کی ریشہ دوانیوں سے ان کو محفوظ رکھے۔ (''م''، اکتوبر ۱۹۷۰ء)

روشن صدیقی

روشن صدیقی

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینہ روشن صدیقی نے دفعتہً انتقال کیا، مرحوم اپنے اوصاف اور خصوصیات میں منفرد تھے، جس کی مثال اس دور کے شعراء میں کم ملے گی، وہ جس درجہ کے شاعر تھے، اسی درجہ کے انسان بھی تھے، ان کی موت سے ایک باکمال شاعر ہی نہیں بلکہ اخلاق و شرافت کا ایک پیکر اٹھ گیا، ان میں مشرق تہذیب کی ساری خوبیاں اور وضعداریاں جمع تھیں، شاعری میں ان کا پایہ بہت بلند تھا، وہ صاحب طرز شاعر تھے، سیکڑوں شعراء میں ان کا کلام ممتاز نظر آتا تھا، وہ ان شعراء میں تھے جن سے شاعری کا بھرم و وقار قائم تھا، ان کو نظم اور غزل دونوں میں یکساں قدرت حاصل تھی، ان کی نظموں میں تغزل کی لطافت و رنگینی اور غزلوں میں تغزل کے کیف و سرور کے ساتھ نظم کا شکوہ و تجمل ہوتا تھا، ان کی فارسی استعداد بہت اچھی تھی، اور اس کا سارا حسن ان کے کلام میں جلوہ گر تھا، ظاہری حسن کے ساتھ معنوی حیثیت سے اس میں بڑی بلندی اور پاکیزگی تھی، اور وہ ان من الشعر الحکمۃ وانّ من البیان السحر کا مصداق تھا، مذہب میں راسخ العقیدہ اور عملاً پابند مذہب مردمومن تھے، اس سے ان کو دنیاوی نقصان بھی اٹھانا پڑا، مگر اس کی انھوں نے مطلق پروا نہ کی، ان کی شخصیت بڑی دلآویز تھی، چھوٹا سا قد ہنستا ہوا شگفتہ و شاداب چہرہ اس پر اخلاص و محبت کی موجیں دل کو کھینچ لیتی تھیں، دارالمصنفین کے

کارکنوں سے ان کو بڑا مخلصانہ تعلق تھا، جب اعظم گڑھ کے نواح میں آنا ہوتا تو ملنے کے لئے ضرور آتے تھے، ادھر ڈیڑھ دو سال سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، ایک دن دفعتہً ریڈیو نے ان کی مرگ ناگہانی کی خبر سنائی، اس کو سن کر سکتہ سا ہوگیا، مگر موت تو اپنے وقت ہی پر آتی ہے، اذا جاء اجلھم لایستاخرون ساعۃً و لایستقدمون۔[یونس:۴۹] اللہ تعالیٰ اس مردمومن شاعر کو اپنے خاص لطف وکرم سے سرفراز فرمائے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہٗ۔ (''م''، فروری ۱۹۷۱ء)

سروری، عبدالقادر، پروفیسر

پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم صدر شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی نے دفعتہً انتقال کیا، اس سے پہلے وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں تھے، ان کا وطن بھی حیدرآباد تھا، پروفیسر زور مرحوم کے انتقال کے بعد ان کی جگہ کشمیر یونیورسٹی میں آگئے تھے، مرحوم اردو زبان کے بڑے مخلص خدمت گذار تھے، اگرچہ وہ شعبہ اردو کے صدر اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے، لیکن ان میں طالب علمانہ شوق اور طلب تھی، انجمن ترقی اردو کے جلسوں میں بارہا ان سے ملاقات ہوئی، بڑے متواضع اور خاکسار تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ (''م''، اپریل ۱۹۷۱ء)

لکھنوی، شمس الدین، حکیم حافظ خواجہ

حکیم حافظ خواجہ شمس الدین لکھنوی

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ دو ممتاز اہل علم نے وفات پائی، حکیم حافظ خواجہ شمس الدین لکھنوی اور سید اختر علی صاحب تلہری، حکیم صاحب تنہا حاذق طبیب ہی نہیں تھے، بلکہ عربی زبان اور اسلامی علوم کے فاضل بھی تھے اور شعر و ادب کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے تھے طب یونانی کے تو ماہر ہی تھے، اور اب لکھنؤ میں اس کی عظمت انہی کے دم سے قائم تھی، طب کی کتابوں کا درس بھی دیتے تھے جن کے پڑھانے والے اب کم رہ گئے ہیں، آداب و اخلاق میں لکھنؤ کی پرانی تہذیب اور وضعداری کا نمونہ تھے، لکھنؤ کے متعدد قومی ملی اداروں کے رکن تھے اور ان کے کاموں میں بڑی دلچسپی سے حصہ لیتے تھے، ندوہ سے خاص تعلق تھا، اور اس کی مجلس منتظمہ کے جلسوں میں بڑی پابندی سے شریک ہوتے تھے، مولانا عبدالباریؒ فرنگی محل کے شاگرد بھی تھے اور مرید بھی، اس تعلق سے ان سے بہت پرانی شناسائی تھی آخر میں تصوف کی طرف زیادہ رجحان ہوگیا تھا، اب طب یونانی کے ماہر اٹھتے جارہے ہیں، طبی درسگاہوں سے طبیب کے بجائے ''ڈاکٹر'' پیدا ہونے لگے ہیں اور خالص فن طب ختم ہوتا جاتا ہے، مرحوم لکھنؤ میں اس کی آخری یادگار تھے، ان کی موت سے فن طب اور پرانی تہذیب و شرافت کی ایک بڑی یادگار مٹ گئی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ (''م''، مئی ۱۹۷۱ء)

تلہری، اختر علی، سید

سید اختر علی صاحب تلہری

سید اختر علی صاحب فن شاعر اور نکتہ سنج ادیب تھے، اردو اور فارسی زبان و ادب پر استادانہ نظر تھی، عربی اور انگریزی سے بھی واقف تھے، ساری عمر درس و تدریس اور تالیف و تصنیف میں گذری، ان کے تلامذہ کا دائرہ بہت وسیع ہے ان کی تربیت نے بہت سے شاعر و ادیب پیدا کردیے، ان کا کلام اور مضامین رسالوں میں نکلتے رہتے تھے، معارف میں بھی ان کی غزلیں شائع ہوتی تھیں، عرصہ ہوا معارف میں ہندوستان کے عربی شعرا پر ایک مبسوط مضمون شائع ہوا تھا، اتفاق سے اس میں کسی شیعہ شاعر کا ذکر نہ تھا، تلہری صاحب نے مجھ کو شکایت کا خط لکھا میں نے جواب دیا کہ اس میں میرا قصور نہیں ہے مضمون جس شکل میں آیا تھا میں نے شائع کردیا، اگر آپ شیعہ شعرا پر لکھ بھیجیں تو اس کو بھی شائع کردیا جائے گا، چنانچہ یہ مضمون انھوں نے لکھ کر بھیجا اور وہ شائع ہوا، مضامین کے علاوہ مستقل علمی و ادبی تصانیف بھی ان کی یادگار ہیں، آج کل شاعروں اور ادیبوں کی کمی نہیں، ان کی تعداد روز افزوں ہے اس سے نظم و نثر دونوں کا دامن بہت وسیع ہوگیا ہے لیکن فنی مہارت اور علمی و ادبی بصیرت مفقود ہوتی جاتی ہے۔ تلہری مرحوم کی وفات سے ایک صاحبِ علم و ادب اور صاحبِ فن شاعر اٹھ گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ (''م''، مئی ۱۹۷۱ء)

پرکاش جی، سری

سری پرکاش جی

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ ہندوستان کی دو نامور شخصیتوں سری پرکاش جی اور پروفیسر محمد حبیب نے وفات پائی، سری پرکاش کی شخصیت مختلف حیثیتوں سے بڑی اہم تھی، وہ ہندوستان کے مشہور فلسفی صوفی ڈاکٹر بھگوان داس کے فرزند اور پنڈت جواہر لال نہرو کے پرانے معتمد علیہ رفیق تھے، انگلستان کی تعلیم کے زمانہ سے لے کر ہندوستان کی جنگ آزادی اور اس کے بعد تک ہر مرحلہ میں دونوں کا ساتھ رہا، آزادی کے بعد سری پرکاش حکومت کے ذمہ دار عہدوں پر رہے اور بڑی خوبی سے اپنے فرائض انجام دیئے اور اپنے اخلاص اور سلامت روی کی بنا پر پاکستان میں بھی ہائی کمشنری کے زمانہ میں مقبول رہے اور دونوں ملکوں کو قریب لانے کی کوشش کی، وہ ہماری پرانی مشترک تہذیب کی یادگار اور ہندو مسلم اتحاد کے بہت بڑے علمبردار تھے اور آخر تک اس پر قائم رہے، ان

کا سب سے بڑا وصف ان کی بے تعصبی، فراخدلی اور اخلاقی بلندی تھی، وہ سیاست میں بھی صداقت و اخلاص پر عامل تھے، جو آجکل کے سیاسی لیڈروں میں کمیاب ہے اس لیے آزادی کے بعد کے حالات سے بہت بددل تھے، عرصے سے خانہ نشینی اختیار کرلی تھی، لیکن کبھی کبھی اپنے خیالات اخبار کے ذریعہ ظاہر کرتے رہتے تھے، ایک دو مرتبہ پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ دارالمصنفین بھی آئے تھے، اور یہاں کے بزرگوں سے ان کے تعلقات تھے، وہ جس تہذیب کی پیداوار تھے اس کا دور اب ختم ہوگیا، سری پرکاش اس کی آخری یادگار تھے، اب ایسے نمونے نہ پیدا ہوں گے۔ (''م''، جولائی ۱۹۷۱ء)

<u>حبیب، محمد، پروفیسر</u>

پروفیسر محمد حبیب

پروفیسر محمد حبیب ہندوستان کی قرون وسطٰی کی تاریخ کے نامور مورخ تھے، اس کے ماہر جانے جاتے تھے، پوری عمر مسلم یونیورسٹی سے وابستہ رہے، اور شعبہ تاریخ کی صدارت سے ریٹائر ہوئے، وہ صحیح معنوں میں طالب علم تھے، ان کی پوری زندگی تعلیم و تدریس اور تالیف و تصنیف میں گذری، اس کا ان کو ایسا چسکا تھا کہ ریٹائر ہونے کے بعد بھی مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کی علمی و تعلیمی رہنمائی کرتے رہتے تھے، انہوں نے اسلامی ہند کی تاریخ پر سیکڑوں مضامین لکھے، لیکن اس کے بعض پہلوؤں کے متعلق ان کے خیالات دوسرے مسلمان مورخین سے مختلف تھے، اور اس میں اعتدال و توازن نہ تھا، جس کا نمونہ ان کی کتاب محمود غزنوی اور ڈاکٹر اطہر عباس رضوی کی کتاب کا مقدمہ ہے جس میں انہوں نے مصنف کو البیرونی، بوعلی سینا، خواجہ نظام الدین اولیاء اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا ہم پایہ بنادیا ہے، لیکن اس سے ان کے علمی کمال میں فرق نہیں آتا، وہ علمی سیاست کے آدمی نہیں تھے، لیکن خیالات کے لحاظ سے پکے نیشنلسٹ سمجھے جاتے تھے، ان کی موت سے ایک نامور مسلمان مورخ اٹھ گیا، اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں سے درگذر کرے، اور ان کی مغفرت فرمائے۔ (''م''، جولائی ۱۹۷۱ء)

<u>ندوی، سید محمد ہاشم، مولانا</u>

مولانا سید محمد ہاشم ندوی

ہمارے لیے تیسرا حادثہ مولانا سید محمد ہاشم ندوی کی وفات کا ہے، وہ ندوہ کے لائق فرزند تھے، جس سال راقم ندوہ میں داخل ہوا ہے، اسی سال وہ فارغ ہوئے تھے اور حضرت سید صاحب کی سفارش سے اسی زمانہ میں دائرۃ المعارف حیدرآباد میں ملازم ہوگئے تھے، جس سے ریٹائر ہونے تک وابستہ رہے، وہ اس کے اہم رکن تھے، بہت سے کتابیں ان کے اہتمام میں شائع ہوئیں، بعض کی انہوں نے تصحیح بھی کی اور بعض پر مقدمے لکھے، انہوں نے ایک مفید علمی خدمت یہ انجام دی کہ دنیا کے مختلف کتب خانوں میں عربی کی جو اہم اور نادر و نایاب کتابیں ہیں ان کی فن وار فہرست ''تذکرۃ النوادر'' کے نام سے مرتب کی جو دائرۃ المعارف سے شائع ہوگئی ہے، ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد حیدرآباد ہی میں متوطن ہوگئے تھے، ان کی صحت عرصہ سے خراب تھی، گذشتہ مہینہ حیدرآباد کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ ان کا انتقال ہوگیا، ستر سے کچھ اوپر عمر رہی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اس خادم علم کی اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے۔

(''م''، جولائی ۱۹۷۱ء)

<u>خیر بہوروی</u>

خیر بہوروی

افسوس ہے کہ گذشتہ دو مہینوں کے اندر اردو کے پرانے خدمت گذار خیر بہوروی اور نامور شاعر تسکین قریشی مرحوم کا انتقال کیا، خیر صاحب کی زندگی کا بڑا حصہ اردو کی خدمت میں گذرا، وہ برسوں انجمن ترقی اردو ہند سے وابستہ رہے، مولوی عبدالحق صاحب اور قاضی عبدالغفار صاحب مرحوم کے زمانہ میں ان کی حیثیت اسسٹنٹ سکریٹری کی تھی، وہ محض انجمن کے تنخواہ دار ملازم نہ تھے، بلکہ ان میں اردو کی خدمت کی لگن تھی، جس سے انجمن کے کاموں کو بڑا فائدہ پہنچا، ان کی کوشش سے بعض مقامات پر اردو کانفرنسیں بھی ہوئیں، صاحبِ قلم بھی تھے، اور کبھی کبھی ادبی مضامین لکھتے تھے، انجمن سے الگ ہونے کے بعد لکھنؤ میں میر اکیڈمی اور غالب اکیڈمی قائم کیں، جن سے حدیث میر اور مرقع غالب شائع کیں، باہر کے جو ادیب لکھنؤ آتے تھے، ان کو اکیڈمی میں مدعو کرتے تھے، اور بڑے شوق سے اس کے کاموں کو دکھلاتے تھے، ان کو جس پہلو سے بھی اردو کی خدمت کا موقع ملتا تھا، اس سے فائدہ اٹھاتے، اور انہوں نے اپنی بساط سے زیادہ اردو کی خدمت انجام دی، طبعاً بھی خلیق و شریف تھے، اللہ تعالیٰ اس شیدائے اردو کی مغفرت فرمائے۔ (''م''، اگست ۱۹۷۱ء)

<u>تسکین قریشی</u>

تسکین قریشی

تسکین قریشی غزل گو شعراء میں نہایت ممتاز اور تغزل میں جگر کے صحیح جانشین تھے، وہ ملازم پیشہ تھے، اس لیے پیشہ ور شعراء کی کمزوریوں سے ان کا دامن پاک تھا، اور اپنی اخلاقی بلندی کے اعتبار سے شعراء کی آبرو تھے، طبعاً خاموش، عزلت پسند اور شہرت طلبی سے دور تھے، مشاعروں میں بھی بہت کم شریک ہوتے تھے، اور اخبارات و رسالوں میں بھی اپنا کلام اشاعت کے لیے کم بھیجتے تھے، اس لیے ایک عرصے تک ان کو وہ شہرت

حاصل نہ ہوسکی جس کے وہ مستحق تھے، لیکن آخر میں ان کے کلام کی نکہت صاحب ذوق طبقہ میں پوری طرح پھیل گئی تھی، راقم کو ان کے کلام کا اندازہ ان کے دوسرے مجموعۂ کلام ''گلگونہ'' کی اشاعت کے بعد ہوا، ان کی شاعری خیالات کی لطافت و پاکیزگی اور زبان کی نفاست و سلاست کا نمونہ ہے، نعتیں بھی بڑی پرکیف کہتے تھے، ان سے ملاقات کی نوبت کبھی نہیں آئی، مگر کبھی کبھی وہ اپنا کلام معارف میں اشاعت کے لیے بھیجتے تھے، اس سلسلہ میں ان سے خط وکتابت رہتی تھی، اور ان سے ایسے تعلقات ہوگئے تھے کہ انہوں نے اپنے آخری مجموعۂ کلام سرمایۂ تسکین کا مقدمہ راقم سے باصرار لکھوایا، وہ راسخ العقیدہ اور پابند مذہب مردمومن تھے، ان کی موت سے ایک نامور اور شائستہ غزل گوشاعر اٹھ گیا، اللہ تعالیٰ اس صاحبِ دل شاعر کی مغفرت فرمائے۔

(''م''، اگست ۱۹۷۱ء)

بلیاوی، عبدالحفیظ، مولانا

مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی

افسوس ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذ مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی نے وفات پائی وہ ادب کے استاد تھے، عربی زبان ولغت پر ان کی نظر بڑی گہری وسیع تھی، انہوں نے لغت کی کئی کتابیں لکھیں، ان میں مصباح اللغات اور اردو عربی ڈکشنری چھپ گئی ہیں بعض مسودے کی شکل میں ہیں، دینی علوم میں بھی پوری دستگاہ رکھتے تھے، ان کی پوری زندگی عربی زبان کی تلاش وتحقیق میں گذری، ان کی وفات سے عربی زبان کا ایک بڑا ماہر اٹھ گیا، اللہ تعالیٰ اس شیدائے علم کی مغفرت فرمائے۔

(''م''، ستمبر ۱۹۷۱ء)

محمود، سید، ڈاکٹر

ڈاکٹر سید محمود

افسوس ہے کہ ملک وملت کی وہ شمع جو ایک عرصہ سے جھلملا رہی تھی، ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی اور ڈاکٹر سید محمود صاحب نے ۲۸؍ستمبر کی صبح کو اس جہاں فانی کو الوداع کہا، ڈاکٹر صاحب جیسی جامع اوصاف شخصیتیں کم پیدا ہوتی ہیں، ان میں مذہب و سیاست، علم وفن اور تہذیب وشرافت کا نہایت متناسب اجتماع تھا، شرافت اور وضعداری کا تو مجسم پیکر تھے، آخر کے چند برسوں کو چھوڑ کر جب وہ بالکل معذور ہوگئے تھے، ان کی پوری زندگی ملک و وطن اور قوم وملت کی خدمت میں گزری، وہ ابتدا سے کانگریسی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے پرانے رفیق تھے، ان دونوں کے تعلقات اتنے عزیزانہ تھے کہ ڈاکٹر صاحب پنڈت جی کے گھر کے ایک فرد سمجھے جاتے تھے، جنگ آزادی میں ان کے دوش بدوش حصہ لیا، اور ان کے ساتھ قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں، آزادی کے بعد صوبہ بہار کے راجیہ سبھا کے ممبر تھے، پھر مرکزی حکومت میں وزیرمملکت برائے امور خارجہ ہوئے، چند سال پہلے تک راجیہ سبھا کے ممبر تھے پھر اپنی معذوریوں کی وجہ سے اس سے بھی الگ ہوگئے تھے ان کا آخری کارنامہ مجلس مشاورت کا قیام ہے، اس کو انھوں نے ہندومسلم اتحاد، ان دونوں کے درمیان غلط فہمیوں کے ازالہ اور ملک وملت کی مشترک خدمت کے لیے قائم کیا تھا، اور ابتدا میں بڑی سرگرمی سے اس کے کاموں میں حصہ لیا، اورضعف پیری کے باوجود ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کیا جس کا ملک کی فضا پر بہت اچھا اثر پڑا، لیکن پھر مجلس مشاورت کی پالیسی میں بعض ارکان سے اختلاف کی بنا پر اس سے الگ ہوگئے، وہ چند دنوں سے شیعہ سنی اتحاد کی کوشش میں تھے۔

وہ اگرچہ ابتدا سے کانگریسی اور اس کے نہایت ممتاز رہنما تھے، اور آخر تک اس پر قائم رہے، لیکن اس سے ان کے مذہبی وملی جذبہ میں فرق نہیں آیا تھا، ان کے دل میں مذہب وملت کے لیے بھی وہی تڑپ تھی جو ہندوستان کی آزادی کے لیے تھی، مگر ان کی رائے میں مسلمانوں کے مسائل کا حل اکثریت سے مل کر اور ان کی مدد ہی سے ہوسکتا تھا، مجلس مشاورت کے قیام کا مقصد بھی یہی تھا، جو پورا نہ ہوسکا، وہ عملاً پابند مذہب تھے، ان کو مولانا آسی سکندر پوری سے عقیدت تھی، بلکہ شاید ان سے بیعت بھی تھے، اس لیے ابتدا سے ان پر مذہب کا اثر اور تصوف کا ذوق تھا، اور آخر میں یہ رنگ اور گہرا ہوگیا تھا، مولانا آسی کا عارفانہ کلام بڑے تاثر سے پڑھا کرتے تھے، بزرگوں سے عقیدت رکھتے اور ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔

اس مختصر تحریر میں ان کے اوصاف وکمالات اور سیاسی وقومی خدمات کی تفصیل کی گنجایش نہیں، اس پر بہت سے لکھنے والے لکھیں گے، معارف میں بھی انشاء اللہ مستقل مضمون لکھا جائے گا، اس وقت دارالمصنفین سے ان کا تعلق دکھانا مقصود ہے، ان کے اور سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے گہرے دوستانہ تعلقات تھے، وہ علمی ذوق بھی رکھتے تھے اس لیے دارالمصنفین سے بھی ان کو بڑا لگاؤ تھا، وہ اس کی مجلس انتظامیہ کے پرانے رکن تھے، پھر اس کے صدر ہوگئے تھے، اور پابندی سے اس کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے، سوگھر پور ضلع اعظم گڑھ میں ان کی قرابت اور جائداد تھی، اس سلسلہ میں بھی ان کا اعظم گڑھ آنا ہوتا رہتا تھا اور قیام دارالمصنفین میں رہتا تھا، جب تک رہتے بڑی پُرلطف صحبت رہتی، سیاسی، علمی، مذہبی ہر قسم کے مسائل پر گفتگو ہوتی، ان میں ان کے بعض تفردات بھی تھے، ان کا حافظہ بڑا قوی تھا، ان کا دماغ پرانی یادوں کا خزانہ تھا، اس سے ہم لوگوں کے معلومات میں بھی اضافہ ہوتا تھا، سید صاحب اور مولانا مسعودعلی صاحب کے بعد ان کی حیثیت دارالمصنفین کے بزرگ خاندان کی ہوگئی تھی، اور وہ ہم لوگوں سے اپنے عزیزوں ہی کی طرح محبت کرتے تھے۔

ان کی ذات سے دارالمصنفین کو بڑے فوائد پہنچے، انھوں نے اپنے اثر سے ایک مرتبہ دس ہزار اور دوسری مرتبہ پچاس ہزار سعودی عرب سے دلوائے، وہ کہا کرتے تھے کہ میں چاہتا ہوں کہ دارالمصنفین مالی حیثیت سے اس قدر مضبوط ہوجائے کہ پھر اس کو کسی کی امداد کی احتیاج باقی نہ رہے، اس کے لیے انھوں نے کویت جانے کا پروگرام بنایا تھا ہم لوگوں نے عرض کیا کہ اس عمر میں آپ سے اتنا لمبا سفر کیسے ہوسکے گا، فرمایا تبدیلی آب و ہوا سے میری صحت زیادہ ٹھیک رہتی ہے، اور زیادہ تر وتازہ رہتا ہوں، ان کا یہ بھی ارادہ تھا کہ دارالمصنفین میں قیام کرکے اپنے پیش نظر علمی کاموں کو پورا کریں گے، دارالمصنفین کے متعلق اور بھی منصوبے تھے، مگر یہ سارے منصوبے دل ہی میں رہ گئے، اور ان کا وقت آخر ہوگیا، وہ پرانی یادگاروں میں تھے، اس لیے کانگریس اور مرکزی حکومت کے ارکان دونوں ان کا احترام کرتے اور ان کی باتوں کا بڑا لحاظ کرتے تھے، مسز اندرا گاندھی خاص طور سے ان کو اپنا بزرگ سمجھتی تھیں، اس اثر سے انھوں نے دارالمصنفین کو بڑا فائدہ پہنچایا، افسوس کہ یہ سہارا ختم ہوگیا لیکن اصلی اور حقیقی سہارا تو ایک ہی ہے۔ وعلیہ التکلان۔

اس ضعف پیری میں بھی جب کہ ان کے قویٰ جواب دے چکے تھے، ان کا دماغ پورا کام کرتا تھا، اور ان کی ہمت، حوصلے اور قوت عمل کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی، مگر ان کے سارے ہم نوا و ہم صفیر اٹھ چکے تھے اور وہ اس انجمن میں اپنے کو تنہا محسوس کرتے تھے، ہندوستان کے حالات سے بھی بہت شکست خاطر تھے اور حسرت و افسوس کے ساتھ ان کا ذکر کیا کرتے تھے، ادھر کئی مہینوں سے ان کی حالت خراب تھی، جولائی میں تو زندگی سے بالکل مایوسی ہوگئی تھی، ان کی حالت سن کر راقم اور صباح الدین صاحب ان کو دیکھنے کے لیے دلی گئے تھے، مگر ہمارے دوران قیام میں برابر بے ہوش رہے، اور ہوش میں ان سے ملاقات نہ ہوسکی، مگر اس کے بعد پھر حالت سنبھل گئی تھی، لوگوں کو پہچاننے اور باتیں کرنے لگے تھے۔

شروع اکتوبر میں بعض ضرورتوں سے پھر ہم دونوں کا دلی سفر ہونے والا تھا، خیال تھا کہ اس مرتبہ ہوش میں ملاقات ہوگی کہ ۲۸؍ستمبر کی صبح کو دلّی ریڈیو اسٹیشن نے ان کی وفات کی غمناک خبر سنائی اور یہ آرزو دل ہی میں رہ گئی، البتہ ان کے مزار پر حاضری ہوگئی، ان کی وفات دارالمصنفین کے لیے تنہا قومی نہیں بلکہ ذاتی حادثہ بھی ہے، اللہ تعالیٰ ملک و وطن کے اس خادم اور قوم و ملت کے اس غم خوار کی مغفرت اور عالم آخرت میں مقام محمود عطا فرمائے۔ والبقاء للہ وحدہ۔ (''م''، اکتوبر ۱۹۷۱ء)

ڈاکٹر سید محمود

جناب ڈاکٹر سید محمود......کو......مرحوم...... لکھتے وقت قلم تھرا رہا ہے، ہاتھ کانپ رہا ہے، دل رو رہا ہے، ان کی وفات غیر متوقع نہیں ہوئی، انھوں نے کافی عمر پائی، ریڈیو اور اخباروں میں تو ان کی عمر ۸۲ سال بتائی گئی ہے، مگر وہ غالباً اس سے بھی زیادہ عمر کے تھے، لمبی عمر پائی، مگر وہ خود بھی دنیا چھوڑنے کو تیار نہ تھے، اور نہ ہم لوگ ان سے اتنا جلد جدا ہونا چاہتے تھے، وہ مئی کے آخر میں اپنے ڈرائنگ روم میں اپنی پوتی سے پیار محبت کی باتیں کررہے تھے، کہ اٹھے اٹھنے میں پوتی سے ٹکرا کر قالین پر گر پڑے تو ان کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ گئی، اسپتال لے جائے گئے، لیکن یہی موت کا بہانہ بن گیا، ٹوٹی ہوئی ہڈی علاج سے تو درست ہوگئی۔ مگر اور دوسرے امراض پیدا ہوتے گئے، پیشاب بند ہوگیا، آپریشن ہوا، ربر کی نلکی سے پیشاب جاری کیا گیا، بے ہوش رہنے لگے، نلکی کے ذریعہ غذا پہنچائی جانے لگی، ہوش آجاتا، تو پہلے کی طرح باتیں کرنے لگتے، صحت کی امید بندھنے لگتی، ان کے تمام اعزہ واقربا، ان کی عیادت کو جمع ہوگئے، ان کی ایک صاحبزادی پاکستان میں ہیں، وہ آگئیں، ان کے ایک صاحبزادے سید احمد جرمنی میں ہیں، وہ بھی آگئے، وہ دارالمصنفین کے بہت بڑے سرپرست اور مربی رہے، گزشتہ ۵۰ سال سے ان کے تعلقات اس ادارہ سے تھے، اس لئے میں اور شاہ صاحب دونوں ۲۱؍جولائی کو ان کی عیادت کے لئے دہلی پہنچے، وہاں تین روز قیام رہا، لیکن وہ ہوش میں نہیں آئے، ان سے کوئی بات نہ ہوسکی اور نہ ان کو معلوم ہوسکا کہ ہم لوگ ان کی محبت و شفقت کا حق ادا کرنے آئے ہیں، تین روز کے بعد ہم لوگ بڑی افسردگی کے ساتھ ان کے اعزہ سے رخصت ہوکر واپس ہوگئے، خطوط کے ذریعہ ان کی حالت معلوم ہوتی رہی، کبھی امید زیست ہوجاتی، لیکن ۲۸؍ستمبر کی صبح کے ریڈیو سے یکا یک خبر ملی، کہ وہ اللہ کو پیارے ہوگئے، آنکھیں اشک بار ہوئیں، دل رویا رواں رواں رویا، رونے کے اسباب تھے، ادھر گزشتہ دس بارہ سال سے انھوں نے دارالمصنفین کو اپنی توجہ اور محبت کا خاص مرکز بنایا تھا، اور بیڑا اٹھایا تھا کہ وہ اپنی وفات سے پہلے دارالمصنفین کے سرمایہ محفوظ کے لئے کئی لاکھ روپے اپنی مساعی جمیلہ سے جمع کرکے رہیں گے، اسی کوشش کے سلسلہ میں سعودی عرب کے سفیر کے ذریعہ سے پچاس ہزار روپے دارالمصنفین کو دلوائے، پھر اسی اکتوبر میں مجھ کو اپنے ساتھ لے کر کویت تشریف لے جانے والے تھے، اس سفر کے لئے تیاری بھی شروع کردی تھی، لیکن خداوند تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ وہ دنیاوی سفر کرنے کے بجائے سفر آخرت کریں، انھوں نے یہ بھی خواہش ظاہر کی تھی کہ اب وہ دہلی چھوڑ کر دارالمصنفین چلے آئیں گے، جہاں رہ کر وہ اپنے علمی کاموں کی تکمیل کریں گے لیکن یہ ارمان ان کے دل ہی دل میں رہ گیا اور وہ سپرد خاک ہوگئے، ان کی وفات سے دارالمصنفین والوں کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کا ایک بڑا سہارا ہی نہیں اٹھ گیا، بلکہ بے سہارا ہوگیا۔ جنازے میں ہم لوگوں کی شرکت ممکن نہ تھی، ریڈیو سے خبر ملی کہ شاہ ولی اللہؒ کے خاندان کے قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے، جنازے میں کافی لوگ تھے،

وزراء بھی سفراء بھی، صدر جمہوریۂ ہند کی بھی نمائندگی تھی، وزیراعظم اندرا گاندھی روس میں تھیں، لیکن وہیں سے ان کا پیام تعزیت شائع ہوا، وہ سیاست سے کنارہ کش ہو چکے تھے، آنکھوں کی بینائی بھی کم ہوگئی تھی، بہت اونچا سنتے تھے، فیل پا کی وجہ سے زیادہ دور تک پیدل نہیں چل سکتے تھے، لیکن سفر اور کام کرنے میں جوانوں کو مات کرتے، سفر میں گرمی، سردی، دن اور رات کا مطلق خیال نہ کرتے، ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ کا سفر بے تکلف کر لیتے، مسز اندرا گاندھی سے اپنی بیٹی ہی کی طرح محبت کرتے، گزشتہ انتخاب میں ان کی خاطر اپنی آخری علالت سے گویا تین مہینے پہلے یو۔پی اور بہار کا سفر ایک طوفانی پروگرام کے ساتھ کیا، دہلی سے لکھنؤ، رائے بریلی، فیض آباد، جونپور، غازی پور، پٹنہ، مظفر پور، چھپرہ کا دورہ چند روز میں ختم کرلیا، ان کے ساتھی تو تھک کر ان کو چھوڑتے گئے، لیکن وہ تازہ دم دہلی واپس ہوئے، پھر فوراً اپنے نجی کاموں کے لئے دیوریا، غازی پور، اعظم گڑھ اور جونپور آئے، یہاں سے واپس ہوئے، تو جیسا کہ ذکر آیا ڈرائنگ روم میں اتفاقاً گر پڑے، اور گرے تو پھر نہ اٹھے، وہ تقریباً پانچ مہینے ولنگڈن اسپتال میں رہے، اتنی طویل علالت میں لوگوں نے ان کو نظر انداز نہیں کیا، ان کی عیادت کے لئے صدر وی۔ وی۔ گری۔ وزیراعظم اندرا گاندھی، اور شہر کے اکابر، علماء، اور صلحاء برابر آتے رہے، سعودی عرب کے سفیر ان کی عیادت کے لئے آئے، تو ان کے اعزہ سے فرمایا کہ دنیا میں اگر کوئی بیش قیمت دوا ایسی ملتی ہو جس سے ان کی صحت ہو جائے، تو وہ منگوالی جائے، اس کے اخراجات وہ برداشت کرلیں گے، لیکن کارکنان قضا و قدر کی طرف سے پیام اجل چل چکا تھا، اس لئے کوئی تدبیر کارگر نہ ہوسکی، اور وہ اپنے عزیزوں اور عقیدت مندوں کو اپنا غم منانے اور اپنی خوبیاں یاد کرنے لئے چھوڑ گئے۔

اس مضمون میں ان کی سوانح عمری یا ان کے سیاسی حالات لکھنے کا ارادہ نہیں ہے، وہ مجھ سے برابر کہتے رہے کہ جب وہ دہلی چھوڑ کر دارالمصنفین میں قیام کریں گے تو مجھ کو اپنی سوانح عمری اوٹو بیاگرافی کے انداز میں ڈکٹیٹ کرادیں گے، لیکن یہ نہ ہوسکا، جس کا افسوس ہے، ان کے ذاتی تجربات، مشاہدات اور خیالات قلم بند ہو جاتے، تو ان کے دور کی سیاسی اور ملی زندگی کی بہت ہی قیمتی دستاویز ہو جاتی، راقم زیادہ تر اس مضمون میں اپنے تاثرات کا اظہار کرے گا، گزشتہ بارہ تیرہ سال سے وہ مجھ سے بڑی محبت کرنے لگے تھے، دارالمصنفین آتے تو بارہ ایک بجے رات تک اپنے پاس بٹھائے رکھتے، اور ہر قسم کی باتیں کرتے رہتے، کبھی اپنے خاندانی حالات کا ذکر کرتے، کبھی اپنی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے، کبھی اپنے معاصروں کا ذکر چھیڑ دیتے، کبھی ہندوستان کے گزشتہ سیاسی واقعات پر تبصرہ کرنے لگتے، کبھی اپنی خاص خاص تحریروں کے حوالے دیتے، کبھی جن جن تحریروں میں ان کا ذکر آیا ہے، ان کی نشاندہی کرتے، ان ہی تمام باتوں کی روشنی میں یہ سطریں لکھی جارہی ہیں۔

ان کی ولادت غازی پور کے ایک مردم خیز گاؤں سید پور بھتری میں ہوئی، ان کے خاندان میں دولت کے ساتھ علم اور مذہب بھی برابر رہا، مشائخ بھی گزرے، اکبر بہار اور بنگال کی فتح کے لئے آگرہ سے چلا تو سید پور بھتری سے گزرا، اس وقت اس خاندان میں دو مشہور بزرگ بندگی شاہ جمال اور بندگی محمود تھے، اکبر نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، تو انھوں نے ملنے سے انکار کیا، مگر چند عدد بیریں بھیج دیں، اکبر اس تحفہ کو فال نیک سمجھا، وہ واپسی میں پھر سید پور بھتری سے گزرا، تو اس خاندان کے لئے ایک جائداد وقف کی، جو رفتہ رفتہ بڑھتی گئی، ڈاکٹر صاحب کے دادا جناب قاضی فرزند علی نے اپنی وفات کے وقت ڈھائی لاکھ سالانہ آمدنی کی جائداد چھوڑی تھی، وہ رئیس ہونے کے ساتھ بڑے مذہبی بھی تھے، مکہ معظمہ حج کے لئے گئے تو وہاں سے حضرت علیؓ کے پیراہن، کھڑاؤں اور رسول اللہ ﷺ کا موئے مبارک اور ہرن کی سینگ پر خط کوفی میں لکھا ہوا کلام پاک کا ایک نسخہ ساتھ لائے، ان تبرکات کی نمائش گاؤں میں برابر ہوتی رہی، مولانا وارث علی شاہ ڈاکٹر صاحب کے بڑے بھائی کے استاد تھے، ایک بار وہ اس گاؤں میں آئے، تو ان تبرکات کو دیکھا تو ان پر جذب کا عالم طاری ہوگیا، ایک چیخ مار کر بولے واللہ یہی چیز ہے، یہی چیز ہے، حفاظت کرو، حفاظت کرو، اسی کے بعد انھوں نے بیعت و ارادت کا سلسلہ شروع کیا، ڈاکٹر صاحب کے دادا حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کی تحریک سے بھی متاثر تھے، انھوں نے اپنے ایک لڑکے یعنی ڈاکٹر صاحب کے بڑے چچا کو جہاد کے لئے حضرت احمد شہیدؒ کے سپرد کردیا، ایک موقع پر انھوں نے ان کی خدمت میں ایک لاکھ کی رقم بھی پیش کی، حضرت سید احمد شہیدؒ کو بھی ان سے بڑی محبت تھی، جب وہ حج سے واپس ہوئے، تو غازی پور کے ایک گاؤں میں پہنچے، یہاں پہنچتے ہی فرمایا، ''بوئے دوست می آید، بوئے دوست می آید'' یہ کہہ کر یوسف پور کی طرف پا پیادہ چل کھڑے ہوئے، جہاں اس وقت ڈاکٹر صاحب کے دادا علیل تھے اسی علالت کے باوجود انھوں نے حضرت سید احمد شہیدؒ کا خیر مقدم بڑے جوش و خروش سے کیا، ان کو غازی پور لے گئے، ان کے پورے قافلے کی خاطر و مدارت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، بہت سے تحائف ساتھ کئے، اس سے متاثر ہوکر سید صاحب نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا، تم نے میرے دوست کو دیکھا۔

ڈاکٹر صاحب کے والد ماجد ملا سید محمد عمر صاحب نے خالص دینی تعلیم پائی تھی، اس لئے ان کے نام کا جز ملا ہوگیا تھا، وہ مولانا عبدالعلیم آسی غازی پوری کے تلامذہ میں تھے، راہ سلوک پر بھی گامزن ہوئے، اور حضرت قطب الہند شاہ غلام معین الدین عرف شاہ امید علی سجادہ نشین خانقاہ رشیدیہ جونپور سے بیعت کی، ڈاکٹر صاحب کو اپنے والد بزرگوار سے مذہبی حمیت اور ایمانی غیرت وراثت میں ملی صوم وصلوٰۃ کے پابند رہے، آخر زمانہ میں تو اوراد وظائف کا بھی شغل رکھنے لگے تھے، فیل پا کی وجہ سے ان کو

اٹھنے بیٹھنے میں تکلیف ہوتی تھی، مگر چوکڑی مار کر بیٹھے بیٹھے نمازیں پڑھتے، سجدے کرنے میں ان کے پاؤں میں تکلیف ہوتی تھی، تکلیف گوارا کرلیتے، دارالمصنفین آتے، یا میں خود ان کے یہاں کبھی مہمان ہوتا، تو رات کو بھی اٹھ کر ان کو نمازیں پڑھتے دیکھتا، ان کے پاس دعاؤں کا ایک مجموعہ تھا، جس میں قرآنی آیتیں تھیں، ان کو وہ روزانہ پڑھا کرتے، کچھ تو ان کو زبانی یاد تھیں، اور کچھ دیکھ کر پڑھتے، ایک روز فرمانے لگے، کہ ان دعاؤں کو پڑھتے وقت خیال آیا کہ معلوم نہیں صحیح بھی پڑھتا ہوں یا نہیں، بارگاہ ایزدی تک پہنچتی بھی ہیں یا نہیں، ایک رات یاس وحسرت کے انہی جذبات کے ساتھ سوگیا، تو خواب میں دیکھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں کھڑا ہوں، اور آپؐ فرما رہے ہیں کہ جو دعائیں پڑھتے ہو، ان کو جاری رکھو، ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آنکھیں کھلیں تو اپنے کو پسینے میں شرابور پایا، انھوں نے کئی اور مرتبہ رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا، وہ ملک میں شیعہ سنی کے فسادات سے بہت آزردہ خاطر رہتے، اسی آزردگی میں ایک رات جو آنکھ لگی تو دیکھا کہ ایک مختصر مجمع ہے، فرش وفروش لگے ہوئے ہیں، حضور سرور عالمؐ تشریف فرما ہیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی تشریف رکھتے ہیں، مجمع سے دو آدمی اٹھے، انھوں نے حضور ﷺ کو مخاطب کرکے حضرت علیؓ کی کچھ شکایت کرنے کی کوشش کی، لیکن حضورؐ کے اشارہ سے حضرت سید فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا وہاں لائی گئیں، وہ ایک سفید چادر میں ملبوس تھیں، حضرت سیدہؓ کا ہاتھ حضرت علیؓ کے ہاتھ میں دیا گیا، دونوں کا نکاح پڑھایا گیا، لیکن یکایک دیکھنے میں آیا کہ لکڑی کا ایک بڑا سا بکس حضورؐ کی پشت پر رکھا ہوا تھا، اس میں کسی نے آگ لگادی، اس میں سے چھوٹی چھوٹی پتلیاں نکل کر ناچنے اور آپس میں لڑنے لگیں، یہ حضورؐ کو سخت ناگوار ہوا، وہاں سے آپ اٹھ کر دور جاکر تشریف فرما ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس خواب کا ذکر کرکے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دکھانا تھا کہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ سے آپ کا کیا تعلق ہے، پتلیوں کے جھگڑنے سے مراد شیعہ سنیوں کے باہمی جھگڑے ہیں، اور آپ کا وہاں سے اٹھ جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ مسلمانوں کے جھگڑے سے اسلام کو تضحیک وتذلیل ہورہی ہے اس سے آپ کو سخت تکلیف ہورہی ہے، اور آپ ناراض ہیں، اس خواب کا ذکر انھوں نے اس پمفلٹ میں بھی کیا ہے، جو انھوں نے شیعہ سنی کے اتحاد کے سلسلہ میں سنی مسلمانوں سے ایک دردمندانہ اپیل کے عنوان سے ہندوستان کے مشاہیر کے دستخطوں کے ساتھ شائع کرایا تھا، لیکن اس میں اپنا نام ظاہر کرنا پسند نہیں کیا۔

ان کو اپنی مذہبیت کی بناء پر کلام پاک سے بڑا شغف رہا، جب تک ان کی بینائی کام کرتی رہی، اس کی تلاوت بھی کرتے رہے، اس کی تفسیر بھی پڑھتے، اس کے پڑھنے اور سمجھنے سے متعلق ان کے جو خیالات تھے، اس کا اظہار دارالمصنفین کی مجلسوں میں برابر کرتے رہتے، کہتے کہ مسلمانوں نے قرآن پاک کو جزدان میں لپیٹ کر رکھ دیا ہے، وہ اسلام کو قرآن پاک کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ اپنے ماضی قریب کی روایات ہی کو اسلام سمجھتے ہیں، قرآن پاک کا تخاطب ساری انسانیت سے ہے لیکن ہم نے غیر حکیمانہ طور پر اس کو صرف مسلمانوں ہی کے لئے مخصوص سمجھ رکھا ہے، اس لئے ہمارے علماء نے اللہ تعالیٰ کو رب المسلمین بنادیا ہے، وہ رب العالمین بنا کر پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں فیض آباد کے رسالہ دوام کے ایک انٹرویو میں یہ کہا کہ افسوس ہے کہ ہندوستان میں شیخ عبدہ اور شکیب ارسلان جیسی شخصیتیں نہیں پیدا ہوئیں، جو قرآن پاک کی آیات کی روشن تعبیر کرتیں اور اس دور کے مسائل کی گرہیں کھولتیں، قرآن مجید کی آخری تفسیر وتشریح کبھی نہیں ہوسکتی، یہ بڑا معنی خیز، جامع العلوم اور عظیم المرتبت کلام ہے، ہر دور میں یہ سائنٹفک حقائق سے ہم آہنگ رہا ہے، ہر دور کے محقق اور سائنس دان نے اس کے اندر وہ صداقتیں دیکھی ہیں جو کائنات میں بکھری ہوئی ہیں، ضرورت ہے کہ ہم اس کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کی صلاحیت پیدا کریں، اپنی وفات سے چار مہینے پہلے اپنے ایک مضمون میں یہ تحریر فرمایا:

''کلام پاک کو اس سائنٹفک دور میں سائنٹفک طور پر سمجھنے کی ضرورت ہے، ایک یوروپین سائنسدان نے لکھا ہے کہ قرآن کو سمجھنے کے لئے صرف عربی کا جاننا کافی نہیں، سائنس کے علوم کو بھی جاننا لازمی ہے، موجودہ دور کے سائنس دانوں نے یہ اعلان کیا ہے کہ اوپر کے سیاروں تک پہنچنے میں دور حاضرہ کی بجلی کام نہیں دے سکتی، اس لئے وہ اور طاقت ور بجلی کے انکشاف میں لگے ہوئے ہیں، اگر ہمارے رسول ﷺ کو معراج جسمانی تسلیم کرلی جائے تو کیا عجب ہے کہ ان کا براق دراصل وہی برق ہو جس کے انکشاف کی کوشش آج کل کے سائنسدان کر رہے ہیں، اسی طرح کے اور بہت سے قرآنی اشارے ہیں، جو سائنس کے نہ جاننے کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آتے، قرآن کے الفاظ **سخر الشمس و القمر** [الرعد:۲] کی تائید سائنس کے موجودہ انکشافات سے ہورہی ہے، اسی لیے قرآن پاک کو سمجھنے کے لیے سائنس کے علوم کی واقفیت ناگزیز ہوگئی ہے، یاد آتا ہے کہ سرشاہ سلیمان نے اپنی سائنسی تحقیقات کے سلسلہ میں کہا تھا کہ سائنس کے انکشافات جتنے زیادہ ہوتے جائیں گے، اتنا ہی ذات باری کا یقین بڑھتا جائے گا۔ اب تک خدا کے وجود کے متعلق شکوک اس لئے ہیں کہ سائنس کی تحقیقات مکمل نہیں ہوسکی ہیں،......قرآن پاک میں ذوالقرنین کے متعلق جیسی باتیں لکھی ہوئی ہیں، وہ موجودہ تحقیقات سے صحیح ثابت ہورہی ہیں، قرآن پاک کا یہ دعویٰ کہ اس کی تعلیم ہر زمانہ کے لئے ہے، مزید تحقیقات سے اور بھی مستحکم

ہوجائے گا''۔

ان کو اس کی بھی لگن رہی کہ قرآن پاک کی تعلیمات زیادہ سے زیادہ عام کی جائیں۔ حیدرآباد کے ڈاکٹر عبداللطیف نے جب مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا، اور ایک سوسائٹی کی تشکیل کرکے قرآنی تعلیمات کو انگریزی زبان کے ذریعہ سے زیادہ سے زیادہ ترویج دینے کی اسکیم بنائی تو ڈاکٹر صاحب نے اپنی کوششوں سے ان کے لئے ایک گرانقدر رقم فراہم کرائی۔

ان کو اپنے خاندانی اثرات کی وجہ سے صوفیائے کرام سے بھی بڑی عقیدت رہی، کہا کرتے کہ مجھ کو بچپن میں حضرات قطب الہند غلام معین الدین (عرف شاہ امید علی) کی گود میں کھیلنے کا فخر حاصل ہوا، جونپور جاتے تو ان کی خانقاہ میں ضرور حاضری دیتے، اس کی مالی امداد بھی کیا کرتے، ان کی خواہش یہی رہی کہ وہ اپنی وفات کے بعد جونپور ہی میں سپرد خاک ہوں، اس سلسلہ کے بزرگوں کے قبرستان میں اپنی جگہ بھی متعین کردی تھی، مگر مشیت ایزدی کچھ اور تھی، ایک بار میں ان کے ساتھ جونپور میں تھا، تو اس قبرستان میں ان کے ساتھ گیا، یہیں ان کے والد بزرگوار اور والدہ بھی مدفون ہیں، اپنے والدین کی قبروں کے علاوہ اور دوسرے بزرگوں کے مزاروں پر علیحدہ علیحدہ جاکر نہایت عقیدت اور احترام سے فاتحہ پڑھتے رہے، دارالمصنفین آتے تو صوفیائے کرام کے واقعات شوق سے سنتے، اور خود بھی بیان کرتے، ایک روز میری کتاب بزم صوفیہ سے حضرت نصیرالدین چراغ دہلویؒ کے حالات شروع سے آخر تک پڑھوا کر سنے اور جب میں نے ختم کرکے ان کے چہرے کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

ان کو اپنے والد بزرگوار کے استاد شاہ عبدالعلیم آسی سے بھی بڑی عقیدت رہی، کہتے تھے، ان سے بیعت تو نہیں ہوا لیکن ان کا صحبت یافتہ ہوں، مگر اپنی بعض تحریروں میں ان کے نام کے ساتھ پیر و مرشد بھی لکھا ہے، ان کے کلام کے مجموعہ کو سفر میں برابر ساتھ رکھتے، اس مجموعہ کے بہت سے اشعار ان کو زبانی یاد تھے، جو سنایا کرتے، پھر بھی تشفی نہ ہوتی، تو مجموعہ سے اشعار پڑھوا کر سنتے، دارالمصنفین کے قیام کے زمانے میں ایک رات اپنی اٹیچی سے کلام آسی نکال کر مجھ کو دیا، اور کہا کہ اس کو پڑھ کر سناؤ۔ میں نے یہ مجموعہ کھولا، تو یہ غزل پڑھنے لگا۔

کبھی میری بھی تجھے چاہ تھی، ترے دل میں میری بھی راہ تھی
کبھی اس طرف بھی نگاہ تھی کہ یہ سب خیال ہے خواب ہے
دل مبتلا ہے ترا ہی گھر اسے رہنے دے کہ خراب کر
کوئی میری طرح تجھے مگر نہ کہے کہ خانہ خراب ہے
یونہیں اپنے کوچہ میں رہنے دے نہ عبث اٹھا کے ستا مجھے
جو اٹھے تو درد جگر اٹھے، کہیں مجھ میں اٹھنے کی تاب ہے
اگر آنکھ کھولو تو کچھ نہیں اثر وجود بجز فنا،
ہے سوا وہستی بے بقا کہ بیاض چشم حباب ہے

ہر شعر پر وجد کرتے کبھی تکیہ کے سہارے لیٹ جاتے، کبھی اٹھ بیٹھتے، ہر شعر کو سمجھاتے بھی جاتے، کہتے کہ اشعار میں تغزل، موسیقی، جذبہ سب کچھ ہے، پھر کہا کہ اسی قافیہ اور ردیف میں کیف عشق کے عنوان سے بھی ان کے اشعار ہیں، وہ بھی پڑھو،

نہ کبھی کے بادہ پرست ہم نہ ہمیں یہ کیفِ شراب ہے
لب یار چومے تھے خواب میں وہی جوش مستی خواب ہے
وہی پیشِ چشم ہیں ہر نظر مگر اب بھی شوقِ نقاب ہے
وہی میری ہر رگ و پے میں ہیں مگر اب بھی مجھ سے حجاب ہے
انھیں کبر حسن کی نخوتیں مجھے فیض عشق کی حیرتیں
نہ کلام ہے نہ پیام ہے نہ سوال ہے نہ جواب ہے

ان کو مولانا آسی کے مجموعہ کلام کے تمام عنوانات یاد تھے، کبھی کبھی اس کے صفحے بھی بتادیتے، کہتے کہ مولانا آسی کے بہت سے اشعار میں کسی نہ کسی آیت قرآنی یا حدیث کی طرف اشارہ ہے، پھر وحدت الوجود پر ان کے اشعار سناتے رہتے، اس شعر کو باربار پڑھتے،

بجز تمھارے کسی کا وجود ہو یہ محال مگر تمھیں نظر آتے ہو ماسوا ہوکر

مولانا آسی کے یہ اشعار بھی انہی کی زبان سے سنے:

بلندی اس کی اسی کی پستی ہر ایک شے میں اسی کی ہستی
عروج اسی کا رسول ہوکر، نزول اسی کا کتاب ہوکر

ان کی ابتدائی تعلیم جونپور میں ہوئی، پھر اپنے بہنوئی محمد عمر صاحب کے ساتھ بنارس چلے گئے، یہاں مولوی محمد عمر صاحب نے ان کے والد کی مرضی کے خلاف انگریزی تعلیم دلانی شروع کی، یہیں کے قیام کے زمانہ میں ان کو مولانا شبلی کی تصانیف سے دلچسپی ہوئی، پھر یہ دلچسپی عقیدت میں ایسی تبدیل ہوگئی کہ ان کے شاگردوں سے بھی گہرے تعلقات پیدا کیے، اور پھر دارالمصنفین سے وابستہ ہوئے تو اس سے ہر طرح کی محبت کا اظہار کرتے رہے، وہ مولانا شبلی کو بہت بڑا عالم، ادیب، مورخ، شاعر سمجھتے تھے، ان کی بصیرت، فکر اور نظر کے بہت قائل تھے، سیرۃ النبی اور الفاروق کی بہت تعریف کرتے، البتہ مضامین عالمگیر کی بعض باتوں سے اختلاف کرتے، کہتے کہ یہ بہت ہی اچھی کتاب ہے اورنگزیب کے خلاف جو زہر پھیلایا گیا ہے، اس کا یہ تریاق ہے، مگر مولانا نے اورنگزیب کو سراہنے میں کہیں کہیں شاہ جہاں اور جہانگیر وغیرہ کو جو مجروح کیا، وہ نہ کرتے، تو اچھا تھا،

مولانا شبلی کو بھی ان سے لگاؤ رہا، دونوں میں برابر خط وکتابت رہی، مولانا شبلی

ان سے علمی خط وکتابت بھی کرتے، اپنے خط میں ان کو محبّی لکھتے، اور جب آخر میں مجلس تالیف سیرت قائم کی تو ان کا نام بھی اس میں رکھنا چاہا، مولانا شبلی کا ایک خط ان کے نام سے یہ ہے،

مجی! سلام شوق!

''آپ سے تو میں نے امیدوں کا بڑا سلسلہ قائم کیا تھا، جو بیچ میں ذرا منقطع ہوگیا تھا، یہ سچ ہے کہ جرمن پر نظر ڈالنی چاہئے، لیکن نظر کہاں سے آئے میں بالکل تیار ہوں، آپ جب بانکی پور جائیں تو مجھ کو لکھیں، میں دو ایک مہینہ کے بعد ضرور آجاؤں گا۔

مرگولوس، نولدکی وغیرہ سے بہت کچھ نقل آتا ہے، لیکن وہ سب مضحکہ انگیز ہوتے ہیں، آج جو مقام زیر قلم تھا، وہ یہ کہ نولدکی نے آنحضرتؐ کا ذلیل النسب ہونا [معاذ اللہ] ثابت کیا ہے، دلائل سخت حیرت انگیز ہیں، قرآن مجید میں ایک آیت ہے:

وقالو لولا نزل هٰذا القرآن علیٰ رجل من القریتین عظیم. [الزخرف: ۳۱]

یعنی کفار کہتے ہیں کہ قرآن دوشہروں میں کسی رئیس پر کیوں نہ اترا۔

عظیم کا لفظ رئیس اور صاحب دولت و اقتدار کے لئے آتا ہے، اس کے صرف یہ معنی ہیں کہ آنحضرت ﷺ کو دولت اور ریاست حاصل نہ تھی، اس سے بدنسبی کہاں ثابت ہوتی ہے، یہ نولدیک کا استدلال ہے۔

میں نے بعض فرنچ کتابیں پڑھی ہیں، رینان کا ایک رسالہ سبقاً پڑھا ہے، عجیب حماقتانہ باتیں پاتا ہوں، رینان نے ثابت کیا ہے کہ علم اور اسلام جمع نہیں ہوسکتے، پورا رسالہ اسی بحث پر ہے۔

ذالک مُبلغھمُ مِنَ العلم .... مجھ کو تو اس حمام میں سب ننگے نظر آتے ہیں۔

آپ کا خط جی چاہتا ہے الہلال وغیرہ میں شائع کردوں، کل یا جزاً یہ میں چاہتا ہوں کہ مجلس تالیف سیرت میں آپ کا نام شامل کروں''۔

شبلی۔لکھنؤ، ۱۵/ اکتوبر ۱۹۱۲ء

۱۸۹۹ء میں وہ مزید تعلیم کے لئے اٹاوہ بھیجے گئے، جہاں مولوی بشیرالدین صاحب نے اپنا مشہور اسکول کھول رکھا تھا، انھوں نے کئی بار اثنائے گفتگو میں بیان کیا کہ جب انھوں نے پہلی دفعہ مولوی بشیرالدین کو دیکھا تو ان کو مسلمانوں کا اتنا بڑا محسن سمجھنے کے بجائے اسکول کا کوئی ادنیٰ ملازم سمجھا، وہ اپنے لباس اور وضع قطع سے بے نیاز رہتے، خود سادہ رہ کر مسلمان طلبہ کو سادگی اور کفایت شعاری کی تلقین کرتے رہے، ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ جب وہ پہلی دفعہ ان سے ملے تو وہ دوڑ کر ایک ٹوکری میں چنے لائے، اور کہا کہ یہ ناشتہ سمجھیں کرنا ہوگا، وہ اٹاوہ میں دو تین مہینے سے زیادہ نہ رہے، وہاں سے علی گڑھ چلے گئے، مگر مولوی بشیرالدین سے بہت متاثر رہے، کہتے کہ ان کے اخبار البشیر کی حیثیت اس زمانہ میں ٹائمس آف لندن کی تھی، وہ انگریزوں اور خصوصاً یو۔پی کے گورنر کے خلاف برابر مضامین لکھا کرتے، ان کے اخبار میں کوئی اور صاحب ہندوؤں کے خلاف بھی مضامین لکھتے تھے، ڈاکٹر صاحب کو اپنی اس کم سنی میں بھی ان مضامین سے دکھ ہوا تھا، مولوی بشیرالدین کے یہاں روزانہ شام کو ''جہل مرکب'' کے نام سے ایک اجتماع ہوا کرتا تھا، جس میں ہر قسم کے مسائل پر گفتگو ہوتی تھی، ڈاکٹر صاحب بھی اس اجتماع میں شریک ہونے لگے، انھوں نے اس میں ان مضامین پر سخت نکتہ چینی کی، ان کا خیال تھا کہ قومی تحریک کے لئے ایسے مضامین مضر ہوں گے، اس ملک میں رہ کر ہندوؤں کو اپنے سے دور کرنے کے بجائے ان کو اپنے سے قریب تر کرنا ضروری ہے، اگر ہندوؤں کو مسلمانوں کی طرف سے شکوک ہیں، تو ان کو دور کرکے ان کو اپنی طرف مائل کرتے رہنا چاہئے، ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ انھوں نے اس سلسلہ میں اور بھی دلائل پیش کئے، ان سے مولوی بشیرالدین صاحب خوش ہوئے، اور وہ روزانہ اپنے ساتھ ان کو ٹہلنے کے لئے لے جاتے، ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر جو کچھ کہا تھا وہی ان کے ذہن کا خمیر بنا رہا،

وہ ۱۹۰۰ء میں مزید تعلیم کے لئے علی گڑھ گئے جہاں ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۷ء تک رہے، اس مادرِ درسگاہ کی محبت ان کے دل میں ایسی سرایت کئے ہوئی تھی کہ آخر وقت تک اس کے خلاف کوئی بات سننا پسند نہ کرتے، سرسید سے تو ان کو ملنے کا اتفاق نہیں ہوا، لیکن وہ ان کو مسلمانوں کا بہت بڑا محسن سمجھتے، ان کے متعلق ان کے جو خیالات رہیں، وہ ان کی اس تحریر کے ٹکڑے سے ظاہر ہوں گے جو انھوں نے اپنی وفات سے پانچ مہینے پہلی لکھی، وہ کہتے ہیں:

''سرسید سند یافتہ عالم تو نہ تھے، لیکن ان کے جو کارنامے ہیں، ان کی وجہ سے کینٹول اسمتھ نے ان کو حضرت مجدد الف ثانیؒ کی صف میں لا کھڑا کیا ہے، شبلی، حالی، نذیر احمد اور آزاد کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں سے مسلمانوں کو نشاۃ الثانیہ عطا کی، لیکن اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اردو کے یہ عناصر اربعہ سرسید کے خیالات وتحریکات سے متاثر نہیں ہوئے، شبلی کا سلسلہ ناموران اسلام سرسید کی صحبت کی وجہ سے شروع ہوا، ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں اور لکچروں میں سرسید کے خیالات کی پوری عکاسی ہے اور آج یہ بحث جاری ہے کہ ان کے ناول ابن الوقت کا ہیرو دراصل سرسید ہی کا کیریکٹر ہے، ابن الوقت انگریزوں کے تمدن میں ضرور رنگ گیا

ہے، لیکن اس کی خودداری اور غیرت کی جو تصویر کشی کی گئی جو وہ ضرور قابل قدر ہے، حالی نے گل گشتِ رندانہ اور نغمۂ مستانہ الاپنے کے بعد جب سرسید کو اپنا رہبر تسلیم کرلیا، تو پھر ان کا ملی درد، مذہبی جوش اور ایمانی ولولہ مسدس حالی کی شکل میں ظاہر ہوا، اور یہ وہ کتاب ہے، جس نے مسلمانوں میں غیر معمولی معاشرتی، تعلیمی، دینی اور مذہبی انقلاب پیدا کیا، اس کے مفید اثرات اس وقت تک باقی رہیں گے، جب تک مسلمان ہندوستان میں اردو پڑھتے رہیں گے یہ مسدس دراصل سرسید ہی کے جذبات کی صحیح تصویر ہے اور یہ ان ہی کا کارنامہ ہے، ہندوستان کی گزشتہ تین صدیوں کے اندر مسدس حالی جیسی کوئی اور کتاب گزشتہ تین صدیوں کے اندر...... نہیں لکھی گئی، جس سے مسلمان اتنا زیادہ متاثر ہوئے ہوں، اور انھیں ہر شعبۂ زندگی میں اتنے فوائد پہنچے ہوں، خود مولانا ابوالکلام آزاد سرسید کے کارناموں سے متاثر رہے، یہ اور بات ہے کہ ان کے سیاسی خیالات سے متفق نہ تھے، میں تو اقبال کو بھی سرسید ہی کی تحریکات کا علم بردار سمجھتا ہوں، سرسید کے مذہبی خیالات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انھوں نے اس سائنٹفک اور ایٹمک (Atomic) دور سے پہلے کلام پاک کو سائنٹفک طریقہ سے سمجھنے کی کوشش کی بنیاد ڈالی، لیکن ان پر کفر کے اتنے فتوے صادر ہوئے کہ اپنے کالج کے مفاد کی خاطر اس کوشش کو بہت زیادہ بار آور نہ کرسکے، وہ کافر تو ضرور بنائے گئے، لیکن انہی کے یہ اشعار بھی ہیں،

خدا وارم دلِ بریاں زعشقِ مصطفیٰؐ دارم
ندا روہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم
زجبریل امیں قرآن بہ پیغامے نمی خواھم
ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ من دارم

اپنے سینے میں اسلام کی آتش فروزاں رکھنے والا ہی یہ اشعار کہہ سکتا ہے''۔

ان کی وطنی محبت کا جذبہ علی گڑھ میں اتنا ابھرا کہ وہ وہاں قوم کے نام سے یاد کئے جانے لگے، اپنی ایک تحریر میں اپنے زمانہ کے کالج کے ساتھیوں کو یاد کرکے لکھتے ہیں:

''مہندر پرتاب، تصدق احمد، حیات، جواہر لال (جواہر لال نہرو نہیں) مجید، احمد، شیو پرشاد، باقی، محسن، شمشاد، مسعود، یہ سب طلبہ علی گڑھ کے مشہور کالج میں انٹرنس میں تعلیم پاتے تھے، یہ ہندوستان کے مختلف صوبوں کے رہنے والے تھے، لیکن ایک دوسرے کے ہمدرد، غمخوار اور آپس میں سب دوست تھے، روزانہ شام کو مارسین کورٹ (جہاں ان میں سے اکثر رہتے تھے) کے کمرہ نمبر ۴ میں جمع ہوتے تھے، اور دیر تک ہنستے بولتے اور آپس میں گپ شپ کرتے رہتے، مہندر پرتاب، جواہر، شیو پرشاد ایک علیحدہ بنگلہ میں رہتے تھے، جو بورڈنگ ہاؤس میں خاص کر ہندو طلبہ کے لئے متعین کردیا گیا تھا، شام کو یہ سب دوست مل کر کبھی کبھی پرانے قلعہ کی طرف سیر و تفریح کے لئے چلے جاتے، اونچے درجے کے طلبہ میں بھی مثلاً عبدالرحمٰن (بجنوری)، عزیز الرحمٰن، اور بدرالدین ان کے کچھ دوست تھے، عبدالرحمٰن ایم۔اے میں پڑھتے تھے، اور عزیز الرحمٰن اور بدرالدین ایف۔اے میں کبھی کبھی یہ دونوں بھی اپنے دیگر دوستوں کے ساتھ مل کر مختلف مضامین پر گفتگو کیا کرتے تھے، مہندر پرتاب اپنے درجہ میں محنتی لڑکوں میں شمار ہوتے تھے، لیکن ان کو تاریخ نہیں یاد ہوتی تھی، اور نہ دل اپنا اس مضمون میں لگاتے تھے، جواہر اور احمد کو اپنے درجہ میں تاریخ سب سے اچھی یاد تھی، حیات اور شیو پرشاد کو ہندو اور مسلمانوں کے زمانہ کی تاریخ سے دلچسپی نہ تھی، لیکن انگریزوں کے زمانہ کی تاریخ کو وہ شوق سے یاد کرتے تھے، تمام وایسراؤں کے شاندار نام ان دونوں کو ازبر یاد تھے، ہمارے میر ولایت حسین صاحب جن کا انتقال ۱۸/ جولائی ۱۹۴۹ء کو ہوگیا، تاریخ کے استاد تھے، ہر چند کوشش کرتے کہ مہندر پرتاب کو کسی طرح تاریخ یاد ہوجائے، تاکہ وہ امتحان میں کامیاب ہوجائیں، لیکن ان کی ساری کوششیں رائگاں جاتیں''۔

مہندر پرتاب سے مراد راجہ مہندر پرتاب ہیں، جو ابھی تک زندہ ہیں، اور انقلابی ہونے کی وجہ سے انگریزوں کی حکومت کے زمانے میں بہت دنوں تک جلاوطن رہے، تصدق سے مراد تصدق احمد شروانی ہیں، جو اپنے زمانہ کے مشہور کانگریسی لیڈر اور یو۔پی میں وزیر بھی رہے، عبدالرحمٰن سے مراد ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ہیں، جو غالب پر اپنے ایک مضمون کی وجہ سے اردو ادب میں ایک مستقل جگہ بنا گئے ہیں، مجید سے مراد عبدالمجید خواجہ ہیں، جو بیرسٹر ہوکر کانگریسی لیڈر اور جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر بھی ہوئے، حیات بعد میں لارڈ حیات کے نام سے مشہور ہوئے، وہ نواب بھوپال کے پرائیوٹ سکریٹری بنے، عزیز الرحمٰن جمعیۃ العلماء کے مشہور نامور مولانا حفظ الرحمٰن کے بڑے بھائی تھے، بدرالدین اناؤ کے رہنے والے تھے، کمیونسٹ خیالات رکھتے تھے، انھوں نے چھ جلدوں میں ''میرا پہلا گناہ'' کے نام سے ایک کتاب لکھی، ان کا بعد میں قتل ہوگیا۔

ان کے ہم جماعت سرسید کے پوتے سر راس مسعود اور قاضی تلمذ حسین مصنف مراۃ المثنوی بھی تھے، سرراس مسعود کو سیاست سے کوئی غیر معمولی دلچسپی نہیں رہی، اس کے باوجود دونوں کے تعلقات برابر خوشگوار رہے، البتہ قاضی تلمذ حسین ان کی سیاسی سرگرمیوں کے ناقد رہے، ان کے خلاف کچھ مضامین بھی لکھے۔

علی گڑھ میں رفتہ رفتہ ان کے ساتھیوں کا ایک ایسا گروپ بن گیا، جو ہندوستان

میں برطانوی حکومت کے خلاف رہا، اس گروپ نے طلبہ پر انگریزوں کی جو مرعوبیت چھائی ہوئی تھی، اس کو وطنی محبت کے جذبے میں دور کرکے ہندو مسلمان کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے کی کوشش کی، ان کے ہم خیال طلبہ نے ایک خفیہ سوسائٹی اخوان الصفاء کے نام سے قائم کی، اس میں جو بحث مباحثے ہوتے، اس کا اندازہ ان کی کتاب ''آج سے قبل کا ہندوستان'' سے ہوگا، اس میں انھوں نے اپنے زمانہ کے علی گڑھ کے طلبہ کی گفتگوؤں کے حوالے سے ان کی ذہنیت کو بھی پیش کیا ہے، اس کتاب کا ذکر آگے آئے گا۔

اس زمانہ میں ایم۔ او۔ کالج میں انگریز اساتذہ میں مارلین، کارنا اور براؤن تھے، ان کے خلاف طلبہ میں بے چینی پیدا ہوئی، تو انھوں نے اور مطالبات کے ساتھ یہ بھی مطالبہ کیا کہ بورڈنگ ہاؤس اور ڈرائنگ ہال انگریز اساتذہ کے سپرد نہ کئے جائیں، اور اگر وہ اساتذہ کی حیثیت سے نااہل ثابت ہوں تو رورعایت کے بغیر برطرف کردیئے جائیں، یہ بے چینی ۱۹۰۷ء میں ایک اسٹرائک میں منتقل ہوگئی، ڈاکٹر سید محمود نے اس میں نمایاں حصہ لیا، وہ اور طلبہ کے ساتھ کالج سے نکالے گئے، مگر اس سے اسٹرائک کرنے والوں کی اور بھی زیادہ بے چینی بڑھی، حکیم اجمل خاں بیچ میں پڑے، اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب چند طلبہ کے ساتھ ادب کے مشہور مصنف ڈپٹی نذیر احمد سے بھی جاکر ملے، ڈپٹی نذیر احمد اپنے خاص انداز میں گفتگو کرنے کے عادی تھے، انھوں نے طلبہ سے ہمدردی کا اظہار تو ضرور کیا، مگر اور باتوں کے ساتھ یہ دلچسپ باتیں بھی کہیں:

''تم جانتے نہیں انگریز کتے کی ذات ہے، جہاں ایک کتے نے پیشاب کیا، پیشاب لگے یا نہیں، ہر کتا وہاں آکر ضرور پیشاب کرے گا''۔

''بدمعاشو سودیشی سوجھی ہے، سودیشی سوت کہاں سے آئے گا، کیا تمھاری خالائیں سوت کاتیں گی، انگریز کا مقابلہ کرنے چلے ہو''۔

اسٹرائک ختم ہوئی تو ڈاکٹر صاحب پھر کالج میں داخل کرلئے گئے، اور اس کے یونین پر انہی کا قبضہ رہا، جس سے انگریز اساتذہ ان سے بدظن رہے،

وہ اپنے کالج کے ساتھیوں میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، تصدق احمد شروانی اور خواجہ عبدالمجید سے زیادہ متاثر تھے، کئی بار مجھ سے کہا کہ ''فرصت ہوگی تو دارالمصنفین میں آکر ان دوستوں پر ایک مستقل کتاب لکھواؤں گا، میں بولتا جاؤں گا تم لکھتے جانا'' ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی علمی اور ادبی صلاحیت کے بہت معترف رہے، اپنے ایک مضمون میں ان کے متعلق لکھتے ہیں:

''اس نئے دور میں مغربی تعلیم نے ہندوستان میں ایک ایسا نوجوان پیدا کیا تھا، جس نے مرزا غالب کی عظمت حقیقی معنوں میں پہچان لی تھی، اور جو کلام غالب کو ایسے حسنِ معانی کے ساتھ ملک کے سامنے پیش کرنے والا تھا، جس سے فلسفی، صوفی، شاعر اور سائنس داں سب ہی متحیر رہ جاتے، آہ! عبدالرحمٰن! عمر نے تیرے ساتھ وفا نہ کی، تو ملک وقوم کی عظیم الشان خدمت انجام نہ دے سکا''۔

میرا خیال ہے کہ ان ہی کی صحبت میں ڈاکٹر صاحب کو غالب سے دلچسپی پیدا ہوئی، ان کو غالب کے بکثرت شعار یاد تھے، اور اپنے بڑھاپے میں بھی ان کا کلام سناتے تو سناتے ہی چلے جاتے، ۱۹۲۰ء میں غالب پر انھوں نے ایک مضمون لکھ کر ان کے اشعار سے سیاسی نتائج نکالے جس سے ایک خاص قسم کی دلچسپی پیدا ہوگئی، اس کا ذکر آگے آئے گا، تصدق احمد شروانی کے صاحبزادے جناب مصطفےٰ رشید شیروانی ہیں جو الٰہ آباد میں جیپ کمپنی کے مالک ہیں، ان سے ڈاکٹر صاحب کے بہت ہی عزیزانہ تعلقات رہے، خواجہ عبدالمجید صاحب کے گھر والوں سے بھی آخر وقت تک ان کا گہرا لگاؤ رہا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو ان سے پہلے ڈاکٹر صاحب کا نام بھی وائس چانسلری کے لئے اخباروں میں آیا، اسی زمانہ میں جب وہ علی گڑھ گئے، تو طلبہ ان کو ایک بہت ہی شاندار جلوس میں اسٹیشن سے یونیورسٹی لے گئے، انھوں نے اس موقع پر علی گڑھ سے اپنی محبت کا پورا اظہار کیا لیکن وائس چانسلری کا عہدہ قبول کرنے سے انکار کیا۔

وہ علی گڑھ کے کسی اولڈ بوائے کی تعریف سنتے تو ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہوجاتی، ایک بار دارالمصنفین میں ان کا قیام تھا، رات زیادہ گزر چکی تھی، میں ان کے پاس بیٹھا باتیں کررہا تھا، اثنائے گفتگو میں منشی ذکاء اللہ کے لائق فرزند جناب عنایت اللہ صاحب بی۔ اے علیگ (سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد) کا ذکر آگیا، میں ان کے ساتھ دہرہ دون میں کچھ دنوں میں رہ چکا تھا، ان کی شرافت، اخلاق، وضعداری، لیسنت، مروت اور محبت کے کچھ واقعات سنائے، تو وہ سن کر بہت ہی خوش اور شگفتہ ہوگئے، جھومتے اور کہتے ان کے کچھ اور واقعات سناؤ، بستر سے اٹھ کر بیٹھ جاتے اور کہتے کہ ان واقعات کو سنا کر تم نے میری آج کی رات کیسی خوشگوار بنادی ہے، پھر یکایک دیکھا کہ ان کے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھ گئے، اور وہ کچھ پڑھ رہے ہیں، جب پڑھ چکے تو کہا میں عنایت اللہ صاحب پر فاتحہ پڑھ رہا تھا، اور اللہ تعالیٰ سے ان کی مغفرت کے لئے دعائیں مانگی ہیں۔

ان کی وفات کے بعد ان پر اخباروں میں اب تک مضامین آرہے ہیں، ۹/ اکتوبر ۱۹۷۱ء کے مدینہ بجنور میں ان پر ایک مضمون ''ڈاکٹر سید محمود کی کچھ یادیں'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے، اس میں ہے:

''مسلم یونیورسٹی سے انھیں عشق تھا، اور ہر وقت وہ اس غم میں گھلا کرتے تھے کہ یہ تعلیم گاہ کسی طرح سرکاری دست برد سے بچے، جس زمانے میں مسٹر چھاگلا وزیر تعلیم تھے، انھوں نے لوک سبھا میں علی گڑھ یونیورسٹی پر ایک

انتہائی زہریلی تقریر کی، جس میں انھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ ترقی پسندانہ اور سیکولر جذبات رکھتے ہیں، اس لئے مسلمان امن کے مخالف ہیں، ڈاکٹر سید محمود راجیہ سبھا کے ممبر تھے، لیکن اس تقریر کو سننے کے لئے وہ لوک سبھا کی گیلری میں بیٹھے تھے، چھاگلا صاحب کی تقریر سن کر وہ گیلری میں زور زور سے غصے میں اپنا بید فرش پر مارتے تھے، اور کہتے جاتے تھے کہ جھوٹ ہے، بدمعاشی ہے، شرارت ہے، یہ بات لوک سبھا کے آداب کے خلاف تھی، لیکن کسی کو ان سے کچھ کہنے کی جرات نہ ہوئی''۔

۱۹۰۷ء کے بعد وہ مزید تعلیم کے لئے یورپ گئے، انگلستان میں ان کا قیام تین سال تک رہا، کیمبرج سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی، پھر جرمنی گئے، وہاں ان کو تاریخ میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری ملی، عام طور سے مشہور رہا کہ انھوں نے مولانا شبلی کی کتاب مضامین عالمگیر کا جرمن زبان میں ترجمہ کرکے پی۔ایچ۔ڈی ڈگری حاصل کرلی تھی، مگر یہ شہرت ان کے حریفوں نے دی، ورنہ مجھ سے خود انھوں نے بیان کیا کہ انھوں نے ''مغلوں کے سیاسی نظام سلطنت'' پر مقالہ لکھا تھا۔

وہ انگلستان اپنی وطنیت کے جذبہ میں سرشار ہوکر انگریزوں کے خلاف ایک زہریلا ذہن لے کر گئے تھے، مگر وہاں کے قیام میں انگریزوں کی شرافت و اخلاق سے بہت زیادہ متاثر ہوئے، اور یہ اثر ان کی زندگی کے آخری وقت تک رہا۔ مگر انھوں نے اپنے ذہن کو دو حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا، سیاسی طور پر انگریزوں کے مخالف رہے، لیکن اس سے ہٹ کر وہ انگریزوں کو ہر طرح پسند کرتے تھے، ان کی قومی اور معاشرتی خوبیوں کے معترف رہے۔

انگلستان میں اپنے دو انگریز استاد پروفیسر ایڈورڈ براؤن، اور ولفرڈ بلنٹ سے زیادہ متاثر ہوئے، پروفیسر براؤن کو ایرانی ادب اور تہذیب سے بڑا شغف رہا، انھوں نے اپنی تصانیف:

(A history of Persian literature, The press and poetry of Modern Persia, The wit and humour of the Persians).

کی وجہ سے علمی دنیا میں ہمیشہ کے لئے ایک مستقل جگہ بنالی ہے، وہ ایرانی تہذیب کی دلدادگی میں کبھی کبھی ایرانی لباس پہنے اور ایرانی حقہ بھی پیتے دکھائی دیتے، مسٹر بلنٹ نہ صرف اہل علم بلکہ سیاسیات اور خصوصاً مسلم ممالک کی سیاسیات کے ماہر سمجھے جاتے تھے، وہ اپنی تصانیف:

The secret history of the English occupation of Egypt. اور Indie under Ripon 'Future of Islam'.

کے لئے ہندوستان اور اسلامی ممالک میں بہت مشہور رہے، ان کی شادی انگریزی زبان کے مشہور شاعر لارڈ بائرن کی نواسی سے ہوئی تھی، ہندوستان کے وایسرائے لارڈ لٹن کے سمدھی بھی تھے، ایک انگریزی رسالہ بھی نکالا کرتے، کلام پاک برابر مطالعہ میں رکھتے، کہتے کہ اسلام قبول کرنے کا دل چاہتا ہے، مگر مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں کو دیکھ کر مسلمان ہونے سے باز آجاتا ہوں، عربی پاشا کو جب پھانسی کی سزا دی گئی تو ان ہی کی کوشش سے وہ پھانسی کے تختے سے اترے، ان کو سیلون جلاوطن کردیا گیا تو مسٹر بلنٹ وہاں جاکر ان سے ملے۔ مگر ان کو وہاں مصریوں کو آپس میں لڑتے دیکھ کر بڑا دکھ ہوا، انھوں نے پانچ سال عرب میں بدوؤں کے ساتھ بھی گزارے تھے، عربی گھوڑوں کو پسند کرتے تھے۔ ان کی برائی سننا پسند نہیں کرتے۔

ایک بار ڈاکٹر صاحب کے ایک دوست نے ان کے سامنے کہہ دیا کہ انگریزی گھوڑے زیادہ تیز ہوتے ہیں تو انھوں نے برجستہ کہا کہ مگر عربی گھوڑے زیادہ شریف ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب مسٹر بلنٹ کی خوبیوں کا ذکر برابر کرتے رہتے، انھوں نے اس کا بار بار اعادہ کیا کہ مسٹر بلنٹ ہی نے سیاسیات میں ایمانداری کے اصول پر استوار رہنے کا نکتہ ذہن نشین کرایا، ان کی یہ تلقین کچھ ایسی موثر رہی کہ وہ سیاسیات میں ایمانداری کا ثبوت آخر آخر وقت تک دیتے رہے جس سے اور دوسرے رہنماؤں کی طرح وہ زیادہ کامیاب سیاست داں نہ ہوسکے، کہتے کہ کسی انگریز ہی نے کہا ہے کہ:

"Cosistency in politics is the virtue of an ass"

مگر وہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں خوش تھے، کہ سیاسی دیانت داری اور وضعداری کا دامن ان کے ہاتھ سے کسی حال میں نہیں چھوٹا، گو لوگوں کو ان سے بہت کچھ اختلافات ہوتا رہا۔ ان کا بیان ہے کہ مسٹر بلنٹ ان سے برابر کہتے رہتے کہ:

''ہندوستان کی قومی تحریکوں میں مسلمان برابر شریک ہوتے رہیں، ورنہ ان کی حیثیت باعزت نہیں رہ سکے گی''۔

یہ نصیحت ان کے ذہن پر برابر چھائی رہی۔ (نومبر ۱۹۷۱ء)

(۲)

انگلستان کے قیام میں ڈاکٹر صاحب کے وطنی اور ملی دونوں جذبات بیدار ہوتے رہے، ۱۹۰۹ء میں ایران کی تقسیم کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تھا، انگریزوں نے وہاں بلو جیکٹ فوج اتار دی، مسٹر بلنٹ اور پروفیسر براؤن دونوں نے اس جھگڑے سے پوری دلچسپی لی، ڈاکٹر صاحب دونوں کی صحبت میں برابر رہا کرتے تھے، اس لیے وہ انہی کے ذریعہ سے ایران کے مشہور رہنماؤں میں مرزا یحییٰ اور آقا تقی وغیرہ سے ملتے رہے، پھر ایرانیوں کی حمایت میں ایک جلسہ کرایا، پروفیسر براؤن نے اس جلسہ میں منظور کرانے کے لیے ایک تجویز مرتب کی جس کو ڈاکٹر صاحب نے لے جاکر مسٹر بلنٹ کو دکھایا، انھوں نے دیکھ کر کہا یہ تجویز بے جان ہے، انگریزوں کی سخت مذمت کرو، ان کو گالیاں

دو، تب ہی ان پر اثر ہوتا ہے، پھر انھوں نے خود ہی ایک بہت سخت تجویز مرتب کی، جلسہ میں جب یہ تجویز ڈاکٹر صاحب نے پیش کی تو پاس نہ ہوسکی لیکن ایک دوسری تجویز میں سلطان ترکی اور امیر افغانستان سے ایران کے مسئلہ میں مداخلت کرنے کی استدعا کی گئی، اس تجویز سے بھی انگلستان کے سیاسی حلقہ میں ایک ہلچل مچ گئی۔

۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر حملہ کیا تو ڈاکٹر صاحب کی اسلامی حمیت بھڑک اٹھی اور انھوں نے ترکوں کی ہمدردی میں ایک جلسہ کرایا، جس میں انکی دعوت پر مسٹر بلنٹ اور پروفیسر براؤن بھی شریک ہوئے اس میں مسٹر بلنٹ نے انگریزوں کے خلاف اپنی سخت تقریر میں کہا کہ یہ بڑے سازشی ہیں، اٹلی کے ساتھ سازش میں شریک ہیں، اگر یہ چاہیں تو طرابلس سے اٹلی کی فوجیں واپس جاسکتی ہیں، جنگ بلقان کے موقع پر بھی ڈاکٹر صاحب کی اسلامی غیرت ابھری اس سلسلہ میں مسٹر بلنٹ نے ان کو ایک طویل خط لکھا جس کو انھوں نے مولانا محمد علی کے مشہور انگریزی ہفتہ وار اخبار کامریڈ میں شائع کردیا۔ وہ اپنے استاد کا بہت احترام کرتے، مگر بلقان کی جنگ کے سلسلہ میں ان کی رائے سے اختلاف کیا۔ اسی طرح مسٹر بلنٹ کا خیال تھا، کہ اگر خلافت ترکی کے بجائے عربوں کے کسی ملک میں منتقل ہوجاتی تو زیادہ مفید ہوتی مگر ڈاکٹر صاحب اپنے استاد کے اس خیال کو سیاسی مصلحتوں پر مبنی سمجھتے۔

ڈاکٹر صاحب نے رسالہ دوام کے ایک انٹرویو میں بیان کیا کہ مسٹر بلنٹ ہندوستان کی سیاحت کے لیے بھی آئے تھے، وہ علی گڑھ پہنچے تو سرسید ان کی دعوت کی، جس میں ایک انگریز کلکٹر اور ایک جج کو اپنے دونوں طرف بٹھایا۔ مسٹر بلنٹ کو یہ انگریز نوازی ناگوار گزری، اور اپنی ڈائری میں ان انگریزوں کا ذکر ٹامی کی حیثیت سے کر کے سرسید کے متعلق لکھا کہ یہ غیر مخلص شخص (Insincere fellow) ہے، ڈاکٹر صاحب سرسید کے متعلق یہ رائے پسند نہیں کرسکتے تھے اس لیے وہ خوش تھے کہ مسٹر بلنٹ نے آخر میں یہ رائے بدل دی تھی۔ اور وہ سرسید کو مخلص سمجھنے لگے تھے، اس رائے کی تبدیلی میں یقیناً ڈاکٹر صاحب کا بھی حصہ رہا ہوگا۔ مسٹر بلنٹ اور پروفیسر براؤن کے بہت سے خطوط ڈاکٹر صاحب کے پاس آخر وقت تک محفوظ رہے، انھوں نے ان کو اپنے اس مجموعہ میں شامل کیا ہے، جو انھوں نے ''مشاہیر کے خطوط ان کے نام'' کے عنوان سے مرتب کیا تھا۔ افسوس ہے کہ یہ اب تک شائع نہیں ہوسکا ہے۔ اس سے ان کی سیاسی سرگرمیوں اور دوسری قسم کی دلچسپیوں کی اور زیادہ تفصیلات معلوم ہوتیں۔

ڈاکٹر صاحب کے قیام انگلستان ہی کے زمانہ میں رائٹ آنریبل جسٹس امیر علی نے لندن میں مسلم لیگ قائم کی تو ان کو اس کا جوائنٹ سکریٹری بنایا۔ اس کے ایک جلسہ میں سر علی امام نے مشترکہ انتخاب کی تحریک پیش کی تو انھوں نے اس کی تائید کی، اور پھر اس کے لیے مختلف جلسے بھی کرائے، یہ بات جسٹس امیر علی اور سر آغا خاں کو پسند نہ آئی، ان سے ڈاکٹر صاحب کا اختلاف بڑھا تو وہ مسلم لیگ سے مستعفی ہوگئے۔ وہ اپنی نجی گفتگو میں کہتے کہ مجھ کو اس وقت جداگانہ اور مشترکہ انتخاب کی بحث بالکل فضول معلوم ہوتی، وہ ہر دام پر انگریزوں کی غلامی کا طوق ہندوستانیوں کی گردن سے اتار کر پھینک دینا چاہتے تھے، اس لیے وہ کوئی ایسا جھگڑا پسند نہیں کرتے جس سے ہندوستان کی آزادی میں رکاوٹ پیدا ہونے کا اندیشہ ہوجاتا۔ وہ ہندوستان سے انگریزوں کو جلد سے جلد اس لئے بھی رخصت ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے کہ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان سے انگریزوں کے اقتدار ختم ہونے کے ساتھ ہی اسلامی ممالک میں بھی ان کا تسلط خود بخود ختم ہوجائے گا وہ اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں:

''طالب علمی ہی کے زمانے میں اسلامی جذبے کے ماتحت ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں شریک ہوا اور اپنے دوستوں تصدق احمد خاں شروانی اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے ساتھ اس میدان میں اترا، اس وقت تمام اسلامی ممالک انگریزوں کے مظالم سے تباہ ہورہے تھے، میرا عقیدہ تھا کہ جب تک انگریز ہندوستان پر مسلط رہیں گے اسلامی ممالک ان کے مظالم سے نجات نہیں پاسکتے، یہی اسلامی جذبہ طالب علمی کے زمانے میں چھایا رہا، جو خلافت کی مذہبی تحریک کے زمانے میں انتہا کو پہنچ گیا، جس سے مجھ کو ہر طرح کے مالی و جانی نقصانات اٹھانے پڑے''۔

وہ انگریزوں کی مخالفت ضرور کرتے رہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ وہ انگریزوں کے حوالے اپنی گفتگو میں برابر دیتے۔ دونوں کے نام مجھ کو اس وقت یاد نہیں آرہے ہیں، مگر انھوں نے اُن کا ذکر اپنے اس مقدمہ میں کیا ہے جو انھوں نے مشاہیر کے خطوط کے اس مجموعہ کے لیے لکھا تھا، جو ان کے نام سے ہیں، ایک انگریز نے جو برسوں ہندوستان میں رہ چکا تھا، ان سے ۱۹۱۱ء میں کہا کہ آپ ہندوستان کی آزادی چاہتے ہیں مگر یاد رکھئے کہ جب انگریز ہندوستان چھوڑیں گے، تو ہندوستان مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہوجائے گا، ڈاکٹر صاحب اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس انگریز کی پیشین گوئی کا ذکر برابر کرتے، اور کہتے کہ سیلون، برما، پاکستان اور اب بھوٹان بھی آخر واقعی علیحدہ ہو کر رہے، اپنے ایک دوسرے انگریز کی یہ بات بھی دہراتے کہ اس نے ان سے کہا کہ ہم لوگ جب ہندوستان چھوڑیں گے تو سارے ہندوستانی زبان کے مسئلہ پر کٹ مریں گے۔ ہندوستان میں جو لسانی جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، ان پر ڈاکٹر صاحب تاسف کا اظہار کرتے ہوئے اس انگریز کی انجام بینی کی داد دیتے۔

کیمرج کی تعلیم کے زمانے ہی میں ڈاکٹر صاحب اور پنڈت جواہرلال نہرو سے تعلقات پیدا ہوئے۔ جو آخر وقت تک استوار رہے، پنڈت جواہرلال نہرو نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے:

''میرے کیمبرج کے ساتھیوں میں کئی آدمی تھے جنھوں نے آگے چل کر ہندوستان میں کانگریس کے کاموں میں نمایاں حصہ لیا۔ ج۔م۔سین۔ گپتا، میرے کیمبرج پہنچنے کے تھوڑے دن بعد وہاں سے رخصت ہوگئے۔ سیف الدین کچلو، سید محمود اور تصدق احمد شروانی کم و بیش میرے ہم عصر تھے، شاہ محمد سلیمان بھی جواب الہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہیں، میرے زمانہ میں پڑھتے تھے۔ میرے اور ہم عصر سول سروس کے رکن یا وزیر بن کر پھلے پھولے''۔

انگلستان کے قیام کے زمانے میں ان کو ۱۹۰۹ء میں گاندھی جی سے ملنے کا اتفاق ہوا، وہ وہاں افریقہ سے آئے ہوئے تھے، ان کی ملاقات کچھ ایسی نیک اور مبارک ثابت ہوئی کہ آئندہ دونوں ایک دوسرے کے گرویدہ ہوتے گئے۔

وہ ۱۹۱۳ء میں ہندوستان واپس آئے، اس وقت پٹنہ میں سر علی امام کا طوطی بولتا تھا، ان کا شمار ہندوستان کے ممتاز بیرسٹروں میں تھا وہ ویسرائے لارڈ ہارڈنگ کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر بھی رہ چکے تھے، سیاسی خیالات میں قوم پرورانہ رجحانات رکھتے تھے، ان ہی کی خواہش پر ڈاکٹر صاحب نے پٹنہ ہی میں بیرسٹری شروع کی، اور نمایاں کامیابی حاصل کرنے لگے، مگر ہندوستان کی آزادی کی جو شمع ان کے دل میں روشن ہوئی تھی، وہ جلتی رہی، اسی لیے سیاسیات میں بھی حصہ لیتے رہے، اس زمانہ میں مسٹر مظہر الحق بھی جو بعد میں اپنی داڑھی اور مذہب کی وجہ سے، مولانا مظہر الحق کہلانے لگے تھے، ہندوستان کے چوٹی کے بیرسٹروں میں تھے، ان کی نظر ڈاکٹر صاحب کی طرف اٹھی، اور اپنی صاحبزادی سے ان کی شادی ۱۹۱۵ء میں کردی، مسٹر مظہر الحق کانگریس کی تحریکوں میں نمایاں حصہ لیتے تھے۔ ان کی صحبت میں بھی ڈاکٹر صاحب کی وطنیت کی کیمیا کو ضرور آنچ ملی۔ چنانچہ وہ ۱۹۱۵ء میں آل انڈیا کانگرس کے ممبر بنے، اور اس وقت سے زندگی کے آخری لمحہ تک مخلص کھدر پوش کانگریسی رہے۔

ان کو شعر و شاعری، اور تاریخ کا بڑا اچھا ذوق رہا، مگر ان پر سیاست کچھ ایسی حاوی رہی کہ وہ ادبی اور تاریخی کتابوں کا مطالعہ کرتے، تو ان میں بھی اپنے ملّی اور وطنی جذبات کی تشنگی بجھانے کی کوشش کرتے، مثلاً ان کو غالبؔ کے کلام سے بڑی دلچسپی رہی، انھوں نے غالبؔ پر ایک مقالہ ۱۹۱۹ء میں لکھا، اس میں انھوں نے غالبؔ کی شیریں بیانی، فصاحت، بلاغت، بلندی خیال، ذکاوت، تعمق خیال، وسعت نظر، عالمگیر ہمدردی، غم خواری، انسان اور اس کے فضائل سے گہری واقفیت مشکل گوئی کے ساتھ طرز ادا کی سادگی، تشبیہوں کی جدت، استعاروں کی طرفگی، بلند پروازی کے ساتھ شوخی وغیرہ کی تعریف کرتے، اور ان کی مثالیں دیتے ہوئے، اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ان کا کلام ہر زمانہ میں انسان کے دلی جذبات و خیالات کی تفسیر کر کے لوگوں کو خوش کرتا رہے گا، ان کا کلام شیلی کی پرواز، کیٹس کی فصاحت، گوئٹے کی عمیق النظری، شلر کی بلند خیالی ٹامسن کے تخیل، مومن کے درد، سودا کی ظرافت اور میر کی سادگی کا مجموعہ ہے، یہ تعریف غالبؔ اپنے کانوں سے سنتے تو اپنی ناقدری کی شکایت نہ کرتے، مگر اسی کے ساتھ اس مقالہ میں ڈاکٹر صاحب یہ بھی لکھ گئے کہ غالب کی غزلوں کے اشعار میں ان کے زمانہ کے خونچکاں سیاسی واقعات کی عکاسی نظر آتی ہے مثلاً ۱۸۵۷ء سے پہلے ہندوستانیوں کی زندگی کا خاتمہ ایک قوم کی حیثیت سے ہو چکا تھا، سیاست دانوں کی طرح غالب نے بھی اپنے گہرے احساس سے اس کو محسوس کیا اور پردرد پیرایہ میں اس کا اظہار یہ کہہ کر کیا:

کیوں گردش مدام سے گھبرانہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے
لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

اسی بات کو دوسرے انداز میں اس طرح کہتے ہیں:

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہوئے،

۱۸۵۷ء میں دہلی تباہ ہوئی، بندگان خدا بے خانماں ہوئے، شرفاء کے مکان ویران اور برباد کردیئے گئے، پورا شہر صحرا ہوگیا تو غالبؔ اس کی تصویر اس طرح پیش کرتے ہیں:

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے، ان کو دیکھ کر غالبؔ نے کہا:

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں ایسی لگی کہ جو تھا جل گیا

پھر انگریزوں نے ہندوستان کی تہذیب کو جس طرح مٹایا اس کا اثر غالب کے دل پر بھی ہوا، انھوں نے پوشیدہ طور پر اس کا دردناک مرثیہ لکھا، جو حقیقۃً دل کو ہلا دینے والا ہے، اور یہ ہندوستان کی مٹی ہوئی عظمت کو یاد دلا کر خون کے آنسو دلواتا ہے، اس کی مثال اس قطعہ کے اشعار میں پیش کی، جو حسب ذیل شعر سے شروع ہوتا ہے:

ظلمت کدہ میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

ملک کی کھوئی ہوئی آزادی پر ان کے آنسو کبھی نہیں تھمے، اسی لئے فرماتے ہیں:

یاد نہیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہوگئیں

جوئے شیر انکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں

اسی قسم کے اور بہت سے خیالات کا اظہار کرکے آخر میں لکھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو ہندو مسلمان کے اتحاد کی تلقین اس طرح کرتے ہیں:

زنار باندھ سبحۂ صددانہ توڑ ڈال
رہ بر چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ڈاکٹر صاحب کا یہ مضمون نظامی بدایونی کی شرح کلام غالبؔ کے پانچویں اڈیشن میں بھی شامل ہے، اس پر راسؔ مسعود، یگانہ چنگیزی، ڈاکٹر سید عبدللطیف، شیخ اکرام وغیرہ، نے بڑی سخت تنقیدیں کیں، اور پھر یہ بھی ثابت کیا گیا کہ ڈاکٹر صاحب نے جن اشعار کو غدر کی تباہی وغیرہ سے منسوب کیا ہے وہ غدر سے بہت پہلے لکھے جاچکے تھے، ڈاکٹر صاحب کو جب اشعار کے کہنے کا زمانہ معلوم ہوا تو پھر انھوں نے اپنے خیالات سے رجوع کرلیا۔ مگر وہ غالبؔ کی وطن پرستی کے آخر وقت تک معترف رہے، میں نے اپنی زیرتالیف کتاب ''غالبؔ مدح وقدح کی روشنی میں'' ڈاکٹر صاحب کے اس مضمون پر مفصل تبصرہ کیا ہے اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ انھوں نے جو اشعار غالبؔ کی وطنیت کے ثبوت میں پیش کیے ہیں، وہ تو یقیناً وطنی جذبے میں نہیں لکھے گئے لیکن ان کے مجموعہ کلام میں بنارس، پٹنہ کلکتہ کی جو مداحی ہے، یا ان کے خطوط میں دہلی سے جو محبت اور لگاؤ کا اظہار ہے، یا ان کے مکتوبات اور دستنبو میں دہلی کی تباہی اور بربادی کی جو خونچکاں تفصیلات ہیں، یا پھر ان کو اپنے ہندو شاگردوں اور دوستوں سے جو شیفتگی رہی، اور موقع بموقع جو اپنی رواداری اور بے تعصبی کا ثبوت دیتے رہے، اس سے اس زمانہ کے معیار کے مطابق ان کی وطنیت، جذباتی ہم آہنگی اور باہمی، اتحاد کا اظہار ضرور ہوتا ہے، ڈاکٹر صاحب نے میری کتاب کا یہ حصہ اصرار کرکے مجھ سے سنا اور سن کر فرمایا کہ جس طرف میری نظر پہلے نہیں گئی تھی، تم نے منتقل کرادی، میرے مضمون میں میرے دلائل صحیح نہ ہوں لیکن میں مطمئن ہوں کہ میں جس نتیجہ پر پہنچا تھا، وہ صحیح تھا، خوش ہوں کہ میرے مضمون ہی کی بدولت غالبؔ کے پرستار غالبؔ کے کلام اور تصانیف کو میری نگاہ سے بھی مطالعہ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

ان کا ادبی اور علمی ذوق ان کے سیاسی ذوق کی وجہ سے دبتا چلا گیا ۲۱-۱۹۲۰ء میں خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں دونوں ساتھ چل نکلیں تو انھوں نے ۱۹۲۱ء میں اپنی پریکٹس چھوڑ دی، اسی سال مرکزی خلافت کمیٹی کے جنرل سکریٹری بنائے گئے، مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کے ساتھ بمبئی میں رہنے لگے، مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان کی وفات پر جو پراثر مضمون لکھا ہے، اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

''آل انڈیا خلافت کمیٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے کام بڑے جوش وخروش، اخلاص و کامل دیانت کے ساتھ کیا، جب ۱۹۲۱ء میں علی برادران قید ہوگئے تو ان کی والدہ بی بی اماں مرحومہ کے دوروں کا انتظام کرایا، ان ہی دنوں انھوں نے ایک انگریزی کتاب ''خلافت اینڈ انگلینڈ'' لکھی، اور بھی بہت کچھ لکھا لکھایا، اسٹیٹسمین، اس وقت طاقتور اخبار تھا، وہ خلافت کی دیانت وامانت پر زور شور سے حملہ آور ہوا، دفاع میں سید محمود بھی میدان میں اترے دلائل واعداد کی توپوں سے اس مورچہ کو سر کرلیا۔

خلافت کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے ان کی سرگرمیوں کا کچھ انداز مولانا ابوالکلام آزاد کے حسب ذیل خط سے بھی ہوگا۔

"۴۶، رپن لین، کلکتہ

حبی فی اللہ، السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ، تار اور پھر خط پہنچا، آپ کا خط رمضان سے چند یوم پیشتر آیا تھا اور میں نے بروقت جواب دیدیا تھا، منتظر تھا کہ اس کا جواب آپ کی جانب سے موصول ہو تو بعض امور موعودہ کی نسبت لکھوں، بہرحال اب آپ کا منتظر ہوں اور احتیاطاً خط کا جواب بھی روانہ کررہا ہوں بہار کے لیے میری جانب سے کبھی کوتاہی نہ ہوگی، بشرطیکہ کم سے کم آپ پوری طرح مستعد ہیں، گاندھی جی سے بعض ضروری امور طے کرنے ہیں، اس لیے غالباً میں عید کی شام ہی کو بمبئی کے لیے روانہ ہوجاؤں اور پھر واپسی میں بانکی پور ٹھہروں، آپ بہار کے لیے ایک منظّم اور طے شدہ پروگرام تیار کررکھیں، اور میرے لیے ایک ایک دن صرف ان جگہوں میں ٹھہرائیں، جہاں واقعی اور ناگزیر ضرورت ہو کیونکہ علاوہ بمبئی اور مرکزی خلافت کی ضروریات اور باہر کے عاجز کن تقاضوں کے خود بنگال کا تمام کام ویسا ہی دھرا ہے، اور شوال میں اس کے لیے کافی وقت نکالنا نہایت ضروری ہے، ۱۴ جون سے ۲۵ تک بنگال کے لیے قرار دے چکا تھا، اور بعض مقامات کو مطلع بھی کرچکا تھا، لیکن آپ کے خط کی وجہ سے بہار کو ترجیح دی، اور بنگال کی تاریخیں پیچھے ڈالدیں، پس اس کا لحاظ رہے کہ کم سے کم وقت وہاں صرف ہو، اور صرف ناگزیر اور واقعی ضروری مقامات سردست منتخب کرلیے جائیں، پھر جولائی میں انشاء اللہ یہ مقامات کا بھی دورہ ہورہے گا۔

امید ہے کہ آپ کی آمادگیاں جس کا میرٹھ میں تذکرہ ہوا تھا، قائم ہوں گی بلکہ مزید محکم واستوار۔ میں نے طے کرلیا ہے کہ کچھ دنوں معیت رہے، اور آپ کی خواہش کے مطابق سفر وحضر میں یکجائی ہو، علی الخصوص سفر میں خدا نے چاہا تو موجب نتائج وثمرات ہوگا۔

امید ہے کہ مسٹر مظہرالحق (جن کو اب بقاعدہ عام مولانا مظہرالحق کہنا چاہئے اگرچہ وہ اس سے خوش نہ ہوں گے) بدستور مشغول ومنہمک ہوں گے

اب ان سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کے ایثار واخلاص کو مزید قبولیت وثمرات عطا فرمائے۔ (فقیر ابوالکلام احمد کان اللہ لہ)

۱۹۲۲ء میں جب خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں بڑے شد و مد کیساتھ بڑھیں تو ہزاروں محبان وطن کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کو بکسر شاہ آباد (بہار) کے برطانوی جیل خانہ کی تنگ و تاریک کوٹھری میں بند ہونا پڑا، اس وقت ہندو مسلمان کے اتحاد کا بڑا ہی شاندار منظر دیکھنے میں آتا تھا، گاندھی جی، موتی لال نہرو، سی۔آر۔داس، جواہر لال نہرو، مولانا شوکت علی، محمد علی، ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خان وغیرہ شمعِ اتحاد کے پروانے بنے ہوئے تھے ہر شخص اپنے اپنے نقطۂ نظر سے ہندو مسلمان کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا، ڈاکٹر صاحب کا بھی یہ جذبہ اپنی انتہا تک پہنچ گیا تھا، بکسر جیل ہی میں انھوں نے ایک تحریر لکھنی شروع کی، جو پہلے تو روزنامہ خلافت بمبئی میں کئی مہینوں تک باقساط شائع ہوتی رہی، پھر نظامی بک ایجنسی بدایوں سے ۱۹۵۰ء میں کتابی شکل میں ''آج سے قبل کا ہندوستان'' کے نام سے شائع ہوئی۔

اس کتاب میں جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے علی گڑھ کے ہندو مسلمان طلبہ کی مجلسی گفتگوؤں کے ذریعہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں ذہنی موانست اور باہمی یگانگت پیدا کرنے کی خاطر ان کی گذشتہ تاریخ کی کچھ تفصیلات بیان کی گئی ہیں، یہ بظاہر کوئی تحقیقی کتاب نہیں لیکن اس میں جو معلومات فراہم کئے گئے ہیں وہ تاریخ ہند کے محققوں کے لیے سبق آموز اور مشعل راہ بھی ہیں۔ سارے تاریخی واقعات عبدالرحمٰن (بجنوری) کے ذریعہ سے بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ عبدالرحمٰن دراصل خود ڈاکٹر صاحب ہیں، جو کچھ کہنا چاہتے تھے۔ عبدالرحمٰن کی زبانی کہہ گئے ہیں، اپنا نام کہیں آنے نہیں دیا ہے۔ جو ان کی کسر نفسی کی دلیل ہے، ان کا آخر آخر وقت تک خیال رہا کہ ہندو مسلمانوں میں اختلاف، پھوٹ، اور کدورت کی ایک بڑی وجہ یہ رہی کہ وہ اپنے تعلیمی اداروں میں ہندوستان کی تاریخ کیا پڑھتے ہیں بلکہ اس کے ذریعہ بس ملے دودھ پیتے رہتے ہیں، ان ہی کو پی کر جوان ہوتے ہیں، اپنی اس کتاب میں اسی بس کو دور کرنے کی کوشش کی۔

انھوں نے مسلمانوں کو یہ سمجھایا کہ اگر وہ ہندوؤں کے مذہب، ان کے مقدس رشتوں اور بزرگوں کے طریق علم وعمل کا مطالعہ کریں، تو ان کو معلوم ہوگا کہ ہندوؤں کے یہاں بھی خدا پرستی کی پوری شان اور توحید کی سچی تصویر نظر آئے گی، ہندو بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ خدا ایک ہے، اس کی ابتداء اور انتہا نہیں، ہر جگہ موجود ہے، پاک ہے، اپنی مرضی سے جو چاہتا ہے، کرتا ہے، قادر مطلق ہے، دانائے کل ہے، زندگی بخشتا ہے، حکومت کرتا ہے، سب کی حفاظت کرتا ہے، اپنی بادشاہی میں نرالا ہے، وغیرہ وغیرہ، وہ اس کے ضرور قائل ہیں، کہ خدا انسان کی صورت میں جنم لیتا ہے، اسی کو اوتار کہتے ہیں، مگر وہ اوتار کو خدا نہیں تسلیم کرتے، وہ بت کو ضرور سامنے رکھتے ہیں لیکن وہ دراصل اس کی پرستش نہیں کرتے۔ بلکہ اس کو اپنی دلجمعی کا وسیلہ سمجھتے ہیں تا کہ ان کا دل دوسری طرف منتشر نہ ہو۔ وہ اپنی مدد خدا ہی سے ڈھونڈھتے ہیں، اور اس کی پاکی کو سب سے برتر سمجھتے ہیں، ان کی مقدس کتاب رگ وید کا بڑا حصہ عبادت اور خدا کی تعریف سے بھرا ہوا ہے، ان کی اور مذہبی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دلوں میں خدا کا خوف اور نیکی کرنے کا ذوق رہا، ان میں بھی سخاوت، مروت، شجاعت اور شرافت، نیکی، نیک خیالی، ہمدردی، رواداری، سرچشمی، وضعداری، اور سعادت مندی کی تعلیمات ہیں، ان کی تہذیب، تمدن، علم، شاعری، فلسفہ، اخلاقیات، ریاضیات، نجوم، منطق، موسیقی، فن تعمیرات، زراعت، پارچہ بافی، رنگ سازی وغیرہ کی بھی ترقی ہوتی رہی، ڈاکٹر صاحب نے مسلمانوں کو ان ساری باتوں کے روادارانہ طور پر مطالعہ کرنے کی تلقین کی۔

پھر انھوں نے ہندوؤں کو یہ سمجھایا کہ وہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کو اتنا برا نہ تصور کریں جیسا کہ وہ کرتے ہیں، پھر ہر مسلمان حکمراں کی کچھ نہ کچھ خوبیاں بتائیں، مثلاً انھوں نے بتایا کہ محمد بن قاسم اتنا روادار تھا کہ جب وہ سوا تین برس حکومت کر کے خلیفہ کے حکم سے واپس بلایا گیا تو تمام ہندو اس کے لیے زار زار روتے تھے، کیمبرج میں اس کا بت بنا کر ایک عرصہ تک پوجتے رہے، محمود غزنوی نے اپنی ساری عمر میں کسی ایک ہندو کو بھی بزور مسلمان نہیں بنایا، راجہ تلک اس کا میر منشی اور پھر سپہ سالار مقرر ہوا، اس کو دربار کے تمام امراء پر فوقیت حاصل تھی، ایک دوسرا ہندو شیوندرائے نامی بھی اس کی فوج کا سپہ سالار تھا، ناتھو نامی ایک اور ہندو محمود کی فوج میں ایک بڑے عہدے پر مامور تھا، ایک اور فوجی کمانڈر بجے رائے نامی تو محمود کا خاص دوست سمجھا جاتا تھا، اس کا دربار شاہی میں بڑا رتبہ تھا، محمود گجرات، پنجاب، قنوج میں پھرتا رہا، لیکن وہاں کے مندر نہیں ڈھائے، عربوں کے زمانہ میں ملتان کے ایک مندر کو گرا کر اس جگہ مسجد بنائی گئی تھی، اس نے ملتان فتح کیا تو اس مسجد کو نماز کے لیے بند کر دیا کہ وہ غصب سے حاصل ہوئی تھی، اس نے سومنات کا مندر ضرور گرایا، لیکن اس نے متھرا کے مندروں کو صرف اس لیے چھوڑ دیا کہ وہ نہایت خوبصورت بنے ہوئے تھے، شہاب الدین غوری بڑا خدا ترس حکمران تھا، اس کو اپنی رعایا کی بہبود کا بہت خیال رہا، التتمش کی عدل پروری کی شہرت دور دور تک تھی، رضیہ میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو کسی اچھے سے اچھے حکمراں میں ہوسکتی ہیں، نصیرالدین محمود دنیا کی تاریخ میں بڑا عادل، نیک نفس اور خدا ترس بادشاہ سمجھے جانے کا مستحق ہے، بلبن کی حکومت انصاف وعدل کے لیے ہمیشہ ہندوستان میں یاد کی جائے گی، جلال الدین خلجی کی نیک چلنی، رحم دلی اور دشمنوں کے ساتھ شریفانہ سلوک کے سب ہی مداح تھے۔ علاء الدین خلجی کے زمانے میں غلے کی ایسی ارزانی تھی کہ پھر کبھی ہندوستان کو ایسی نصیب نہ ہوئی، اس کے عہد میں ایک شخص بنگالہ سے کابل اور مالابار سے کشمیر تک بلا خوف وخطر قیمتی سامان کے ساتھ سفر کرتا تھا، اس نے ملک

کے دفاع کا ایسا اچھا انتظام کیا کہ مغل برابر پسپا ہوکر واپس جاتے رہے، محمد تغلق نے تمام ملک میں شفا خانے بنوائے، صرف دہلی میں ستر شفاخانے تھے، بارہ سو اطبا ملازم تھے، غرباء و مساکین کے لیے خیرات خانے تھے، جن میں غریب ہندو مسلمان کو خیرات بٹتی تھی، ملک میں تعلیم کا خاص انتظام تھا، صرف صوبہ دہلی میں ایک ہزار کالج تھے، فیروز شاہ تغلق نے بڑے بڑے شہر آباد کئے، نہریں جاری کیں، بے شمار میووں کے باغات لگائے گئے، صرف شہر دہلی میں بارہ سو باغات تھے، رعایا خوشحال رہی، ان کے پاس دولت، مال، زیور، سونا اور چاندی کی کثرت رہی، خضر خاں اپنے امراء اور رعایا میں ہر دلعزیز رہا، سیدوں کے زمانہ میں ہندوؤں کو سلطنت کے امور میں بڑا دخل تھا، سدانند اور سدا پال دربار کے بڑے معزز امراء تھے، وہ امروہہ، بیانہ خرنول اور گہرام کے گورنر مقرر ہوئے، سکندر لودی جفاکش رحم دل، منکسر، نیک طینت اور نیک طبع بادشاہ تھا، مغلوں کی حکومت کی تعریف تو غیر بھی کرتے ہیں، ان کے دور حکومت میں ہندوستان عروس البلاد بن گیا تھا، اس دور میں شیر شاہ کے ساتھ بابر ہمایوں، اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے کارناموں سے کوئی انکار نہیں کرسکتا، اورنگزیب ہندوؤں میں ضرور بدنام ہے لیکن اگر وہ چند الزامات سے اپنے کو بری رکھتا، اور اس کی طبیعت دو ایک برائیوں سے صاف ہوتی، تو شاید وہ دنیا کے چند مشہور بادشاہوں کے ساتھ شمار کیا جاتا، شجاعت، ہمت، اولوالعزمی، استقلال، محنت، تہذیب، علم، بردباری، عقل و فراست میں اورنگزیب اپنا نظیر نہیں رکھتا تھا، اس پر مندروں کے منہدم کرنے کا الزام رکھا جاتا ہے، مگر اورنگزیب ایک موقع پر بنارس کے گورنر کو لکھتا ہے کہ ''میں نے سنا ہے کہ بعض لوگ بنارس کے برہمنوں اور ہندوؤں کو ان زمینوں پر جو ہندوؤں کی ہیں، اور قدیم زمانے سے انہی کے قبضہ میں ہیں، بت خانے بنانے سے روکتے ہیں، اس وجہ سے وہاں کے ہندو پریشان اور متردد ہیں، تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ ان کو بت خانہ اپنی زمین پر بنانے سے کوئی شخص نہ روکنے پائے، اور نہ ان کی عبادت میں کوئی مزاحم ہو، تاکید جانو''۔

پھر اسی اورنگ زیب نے ہندو مندروں کے لیے جاگیریں دیں، پجاریوں کے لیے وظیفے مقرر کئے، بہت سے مندروں کے پجاریوں کے پاس امداد کے سلسلہ میں اس کے شاہی فرامین موجود ہیں مغلوں کے آخر زمانے میں ہندو امراء دربار پر چھائے رہے، رتن چند اور راجہ اجیت سنگھ تو سید عبداللہ اور سید حسین کے ساتھ سلطنت کے کاموں میں برابر کے شریک دار تھے۔ رتن چند کے اختیارات تو اتنے وسیع تھے کہ ساری سلطنت میں قاضیوں کی موقوفی اور بحالی اسی کے ہاتھ میں تھی، محمد شاہ کے عہد میں چھبیلا رام احمد آباد کا گورنر، رائے بسنت رام آگرہ کا گورنر اور راجہ خوشحال رائے اس کا سکریٹری تھا، اودھ میں نواب شجاع الدولہ کی سلطنت کا دراصل مالک راجہ بینی بہادر تھا، نواب صفدر جنگ کے وقت میں فوج کا کمانڈر انچیف مہاراجہ نول رائے تھا، آصف الدولہ کے زمانہ میں راجہ سورت سنگھ بریلی کا گورنر تھا، اور خوشحال رائے بخشی الممالک، پھر بعد میں وہ الہ آباد کا گورنر ہوا بنگال میں راجہ موہن لال سراج الدولہ کا دیوان اور اس کی سلطنت کا مختار کل تھا، اسی کے زمانہ میں راجہ رام نرائن بہار کا گورنر رہا، الخ الخ''۔

ڈاکٹر صاحب کی کتاب سے مثالیں گو بہت زیادہ پیش کردی گئی ہیں لیکن ان کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے وطنی جذبے کی بناء پر اگر ہندوؤں کے مذہب اور تاریخ کو برا کہنے کے روادار نہ تھے، تو پھر اپنے ملی جذبات کی بنا پر نہ صرف اسلام، بلکہ مسلمان حکمرانوں کے بارے میں بھی ان کی برائیاں سننا پسند نہ کرتے تھے، بلکہ ان کو اچھا سمجھنے کی تلقین کرتے۔ ان ہی وطنی اور ملی جذبات کی ملی جلی شکل کا نام ڈاکٹر سید محمود تھا، اگر ان پر کبھی ضرورت سے زیادہ وطنی جذبہ غالب ہوجاتا، تو کبھی ملی جذبات سے بھی وہ مغلوب ہوجاتے، ان کے ان دونوں مشترک جذبات کی قدر کرنے والے زیادہ نہ تھے، مگر جنھوں نے قدر کی ان کی نظروں میں وہ باوقار ہے۔

وہ ۱۹۲۳ء میں پنڈت موتی لال نہرو کے ساتھ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری مقرر ہوئے، اس کے بعد وہ نہرو خاندان سے ایسے وابستہ ہوتے گئے، کہ وہ اس خاندان کے رکن معلوم ہونے لگے، کانگریس کی سیاسی سرگرمیوں میں ان کا برابر کا حصہ رہا، مگر ۱۹۲۳ء کے بعد ہندو مسلم یگانگت کا وہ خوشگوار منظر دیکھنے میں نہیں آیا، جو ۲۱-۱۹۲۰ء کے عدم تعاون اور خلافت کی تحریکوں کے زمانہ میں آیا تھا، دو تین سال کے اندر ہی ہندو مسلمان کے تعلقات بگڑنے لگے، کشیدگی بڑھی، فرقہ وارانہ فسادات ہونے لگے، عدم تعاون اور خلافت دونوں کی تحریکیں بے جان سی ہوتی چلی گئیں، ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۲۵ء میں پھر اپنی پریکٹس کی طرف توجہ کرنی چاہی، مگر ان پر گاندھی جی، موتی لال نہرو، اور جواہر لال نہرو کا ایسا دباؤ پڑا کہ سیاسی کاموں سے الگ نہ رہ سکے، ۱۹۲۶ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری کا عہدہ ان کو دیا گیا لیکن انھوں نے انکار کیا۔

میں نے ان کو پہلی دفعہ مظفر پور (صوبہ بہار) میں ۱۹۲۶ء میں دیکھا تھا، وہاں مولانا شوکت علی تشریف لانے والے تھے، ریلوے اسٹیشن پر بہت سے مسلمان ان کے استقبال کے لیے پہنچے، میں بھی ان کے ساتھ تھا، جاڑے کا موسم تھا، گاڑی صبح کے وقت پہنچی تھی، اللہ اکبر کے نعروں کے ساتھ فرسٹ کلاس کا دروازہ کھولا گیا، مولانا شوکت علی ڈبے کے پھاٹک پر نمودار ہوئے، تھوڑی دیر میں ڈاکٹر سید محمود بھی دکھائی دیئے، اس زمانہ میں کانگریس سے مسلمانوں کی بدگمانی شروع ہوگئی تھی، اس لیئے ڈاکٹر صاحب سے مسلمانوں نے کوئی خاص گرم جوشی نہیں دکھائی، ایک صاحب میری بغل میں کھڑے تھے، انھوں نے کہا کہ یہ ہندوؤں کے خاص آدمی ہوگئے ہیں، میں خاموش رہا، ڈاکٹر صاحب کی صحبت میں رہنے کے بعد یہ وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ خریدے نہیں جاسکتے تھے، وہ اپنے وطنی جذبے میں جو کچھ کرتے رہے، اس میں ان کا صرف اخلاص

تھا، یہ اور بات ہے کہ ان کے مخلصانہ جذبات کو مسلمان مشکوک نگاہوں سے دیکھتے رہے دیکھنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ ڈاکٹر صاحب کے وطنی جذبات کو تو ہندو پریس میں خوب اچھالا جاتا، لیکن وہ مسلمانوں کی ہمدردی میں جو کچھ کہتے یا کرتے، وہ پریس میں بلیک آوٹ ہوتا رہتا، ڈاکٹر صاحب کی طرح دوسرے کانگریس اور نیشنلسٹ مسلمانوں کی سیاسی زندگی کا بھی یہی المیہ رہا، ان کی زندگی کا ایک ہی رخ پریس میں آیا دوسرے رخ پر پردہ پڑا رہا، اس سے ملک کو بھی نقصان پہنچا، مسلمان کانگریسی رہنما مسلمانوں کے لیے جو ہمدردانہ جذبات رکھتے تھے، وہ بھی پریس میں آتے رہتے، تو ان کی قیادت بھی ضرور موثر اور مفید ہوتی رہتی، ڈاکٹر صاحب ہی کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ اس زمانہ میں انھوں نے مسلمانوں کی ہمدردی میں بہت کچھ کیا۔

مثلاً ملابار میں موپلاؤں پر بڑے مظالم ڈھائے گئے، اُن کو ٹرین کے ڈبوں میں جانوروں کی طرح بھر بھر کر جلاوطن کیا گیا، ان کے گھر بار برباد کردیے گئے ان کو اپنی املاک سے محروم کر دیا گیا، ان مظالم کی تحقیقات کے لیے پہلی آواز ڈاکٹر صاحب ہی نے اٹھائی، پھر سرحد کے پٹھانوں کے ساتھ بھی جو مظالم ہوئے، اُن کی تحقیقات کی تحریک بھی ان ہی کی کوشش سے ہوئی، لیکن یہ سب کچھ پریس میں نہیں آیا، اور عام مسلمان یہی سمجھتے رہے کہ ڈاکٹر صاحب وہی سب کچھ کرتے ہیں جو کانگریس کرنے کو کہتی ہے۔

۱۹۲۹ء میں ڈاکٹر صاحب آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری بنائے گئے۔ اس فرض کو وہ ۱۹۳۰ء تک انجام دیتے رہے، اس دور کی کانگریس کی تاریخ میں اُن کا نام نمایاں طور پر لکھے جانے کا مستحق ہے اُن کی اس زمانہ کی پوری سرگرمیوں کا احاطہ کرنا اس مقالہ کا مقصد نہیں۔

۱۹۳۰ء میں وہ سول نافرمانی کی تحریک کے سلسلہ میں پھر جیل گئے، اُن کے جیل جانے سے پہلے آل انڈیا کانگریس کمیٹی غیر قانونی قرار دے دی گئی۔ تو انھوں نے خفیہ مسنجر سسٹم کا طریقہ اختیار کیا، جس سے کانگریس کے کاموں میں بڑی مدد ملی، پھر انہی کی مساعی جمیلہ سے ہندوستان کی کپڑوں کے ملوں پر کانگریس کا اقتدار حاصل ہوا۔

کانگریس میں مسلمانوں کی آواز کو موثر بنانے کے لیے ۱۹۳۰ء میں مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے قیام کو عمل میں لائے۔ پھر ۱۹۳۴ء میں ہندو مسلمان کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے کے لیے ایک اتحاد کانفرنس کی تجویز پیش کی، جو الہ آباد میں بلائی، اس میں ہندوؤں کے تمام سربرآوردہ رہنما شریک ہوئے، ڈاکٹر صاحب اس کانفرنس کے نتیجہ سے خوش تھے، کہ اس میں مسلمانوں کے تحفظات اور مطالبات کے تمام بنیادی اصول مان لیے گئے تھے، جو بعد میں برطانوی حکومت کے ۱۹۳۵ء کے کمیونل اوارڈ کی شکل میں نمودار ہوئے۔ ان کی سیاسی سلامت روی اور دیانت داری کا ایک بڑا ثبوت یہ بھی ہے کہ مولانا محمد علی کبھی اُن سے بدظن نہیں ہوئے، مولانا محمد علی کو کانگریس سے اختلاف ہوا تو وہ اس سے دور ہوتے چلے گئے، ڈاکٹر صاحب برابر کانگریس سے وابستہ رہے، اس کے باوجود مولانا محمد علی کو ان کی ذات پر پورا اعتماد رہا، ان کو آخر وقت تک عزیز رکھا، ان کو خط لکھتے تو ''پیارے محمود'' سے مخاطب کرتے، اور کھل کر اپنے دل کی باتیں لکھتے، ۴؍ مئی ۱۹۲۹ء یعنی اپنی وفات سے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے ڈاکٹر صاحب کو ایک مکتوب لکھا اس کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں:

> ''پیارے بھائی بظاہر یہ دو سال ہمارے Character کے امتحان کا زمانہ ہے، سب کا پریکھا ہو رہا ہے، ہم لوگ دشمنان ملک اور ہزنان ملت ہیں، آج..... زرطلب ملک پرور ملت دوست ہے.....جن کو ساری عمر ہم نے گالیاں دیں اور کوسا یہ، ہم کو اپنا آلہ کار بنانا چاہتے ہیں، سو جس طرح ہم مالوی اور منجے کے یا نہرو اور چتامنی کے آلہ کار نہیں بن سکتے، اسی طرح شفیع اور عبدالرحیم کے بھی آلہ کار نہیں بن سکتے۔
>
> اس وقت سوائے اس کے چارۂ کار ہی کیا ہے، کہ دوا سے تھک دعا کے لیے ہاتھ اٹھائیں اور مسلمانوں اور ہندوستان والوں کو خدا کے سپرد کردیں اور اس وقت کا انتظار کریں جب کہ یہ اپنے نئے رہنماؤں کی ہدایت کا مزا چکھ کر پھر ہمارے پاس آئیں گے اور التجا کریں گے، چلو ہمیں انگریزوں اور ان کے ہندو اور مسلمان غلاموں سے نجات دلا دو، خدا وہ وقت جلد لائے یا ہم کو جلد اس دنیا سے اٹھالے، آمین، بہن اور بچیوں کو پیار، تمہارا بھائی محمد علی''۔

مولانا عبدالماجد دریابادی مولانا محمد علی کے بڑے پرستاروں میں ہیں ان سے گہرے ذاتی تعلقات بھی رہے، ڈاکٹر صاحب سے بھی ان کے مراسم تھے، اُن کے اور علی برادران کے تعلقات پر بڑا اچھا تبصرہ کیا ہے:

> ''سید محمود بڑی خوبیوں کے مالک تھے، خصوصاً مشرقی قسم کی اخلاقی خوبیوں کے دردمندی، انکساری، مہمان نوازی، اور سب سے بڑھ کر مروت کے، شروع میں علی برادران سے خوب نبھ گئی، لیکن آگے چل کر کہنا چاہیے، ۲۹-۱۹۲۸ء میں جب گاندھی جی اور علی برادران میں اختلاف ہوا، تو بے چارے کی پوزیشن عجب نازک سی ہوگئی، اُدھر گاندھی جی کا اعتماد انھیں پورا حاصل تھا، ادھر یہ بھی گوارانہ تھا کہ بات علی برادران کی ضائع ہو، چھوٹی کمیٹیوں میں ووٹ دیتے وقت عجیب کشمکش میں پڑ جاتے اور کوشش اپنی والی یہی کرتے کہ مروت کی عدالت سے ڈگری کسی کے خلاف بھی نہ صادر ہونے پائے، بے تکلف دوستوں پر یہ راز کھل گیا تھا، وہ شرافت کے اس منظر سے لطف لیتے''۔

ڈاکٹر صاحب کے سامنے مولانا محمد علی صاحب کا تذکرہ آجاتا تو وہ بھی ان کا ذکر بڑی محبت اور عزت سے کرتے۔ اور مولانا مناظر احسن گیلانی کا جو مرثیہ مولانا محمد

علی پر ہے اس کا یہ مصرع پڑھ کر اُن کو یاد کرتے:

عجب مستے عجب دیوانہ بودے

۱۹۳۵ء کی اصلاحات کے بعد جب کانگریس نے مرکزی اور صوبائی قانون ساز مجلسوں کے انتخاب میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا، تو ڈاکٹر صاحب بھی ترہت (صوبہ بہار) کے دو حلقوں سے کھڑے ہوئے، اور کامیاب رہے، ان کو اپنے انتخابی حلقہ میں ایسی مقبولیت رہی کہ مسلم لیگ بھی اپنے انتہائی عروج کے زمانہ میں ان کو شکست نہ دے سکی، جداگانہ اور مخلوط انتخاب دونوں میں وہ ۱۹۶۵ء تک وہاں سے برابر منتخب ہوتے رہے۔

۱۹۳۷ء کے انتخاب کے بعد جب بہار میں وزارت بنی تو وہ بھی اس کے ایک رکن تھے۔ ان کے عقیدت مندوں کا تو خیال تھا کہ وہ اپنی خدمات اور آل انڈیا حیثیت کی بنا پر بہار کے وزیر اعلیٰ بنائے جائیں گے، لیکن ان کی جگہ پر سری کرشن سنہا اس عہدہ جلیلہ پر فائز کئے گئے، اس ناانصافی پر ڈاکٹر صاحب کو اندرونی شکایت تو ضرور پیدا ہوئی ہوگی لیکن ان کی طبیعت میں جارحیت، جھگڑا، فساد، بالکل نہیں تھا وہ مکدّر ضرور ہوتے۔ لیکن اپنے تکدّر کا بوجھ خود برداشت کر لیتے، انھوں نے اپنی خانگی زندگی میں بھی غصے اور اشتعال کا اظہار شاید ہی کیا ہو گھر میں کسی سے ان کو رنج پہنچتا، تو تھوڑی دیر کے لیے خاموش رہ کر پھر خوش ہو جاتے، انھوں نے سری کرشن سہنا کے ساتھ پورا تعاون کیا، اور ان کو اپنا بھائی ہی سمجھتے رہے، اور جب ان سے اس ناانصافی کا ذکر کیا جاتا تو وہ کہتے کہ وہ خود اس عہدہ سے سری کرشن کے حق میں دست بردار ہو گئے تھے، اس طرح نکتہ چینوں کا منھ بند کر دیتے۔ (''ص۔ع''، دسمبر ۱۹۷۱ء)

کاظمی، اسداللہ، سید

سید اسداللہ صاحب کاظمی

افسوس ہے کہ مشہور ماہر تعلیم سید اسداللہ صاحب کاظمی نے کراچی میں انتقال کیا وہ مسلم یونیورسٹی کے نامور فرزند تھے حصول تعلیم کے بعد کچھ دنوں یونیورسٹی ہی میں انگریزی کے استاد رہے، پھر صوبہ متحدہ کے محکمہ تعلیمات سے وابستہ ہوگئے، اور ڈپٹی ڈائرکٹر کے عہدہ تک پہنچے، اسی زمانہ میں ریاست کشمیر کے ڈائرکٹر تعلیمات ہوگئے ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد یونیسکو کی طرف سے کئی سال تک حکومت بغداد کے مشیر تعلیم رہے اس طرح ان کی پوری عمر تعلیمی تجربات میں گذری مسلمانوں میں وہ ماہر تعلیم مانے جاتے تھے، ان کو مسلمانوں کے تعلیمی مسائل سے بڑی دلچسپی تھی، اور اُن کی تعلیمی تنظیموں کو اپنے تجربات اور مفید مشوروں سے فائدہ پہنچاتے تھے، علمی وادب کا بلند اور (ستھرا مذاق رکھتے تھے) مذہبی مطالعہ بھی وسیع تھا، راسخ العقیدہ پابند مذہب مسلمان تھے، کلام مجید کے مطالعہ کا خاص ذوق تھا، بغداد کے قیام کے زمانہ میں کچھ عربی بھی سیکھ لی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو دین و دنیا دونوں سے نوازا تھا، عالم آخرت کی نعمتوں سے بھی سرفراز فرمائے۔ (''م''، نومبر ۱۹۷۱ء)

اقفر موہانی

اقفر موہانی

دوسرا حادثہ اُردو کے بزرگ شاعر اقفر موہانی کی وفات کا ہے، اپنے معاصرین میں وہ تنہا رہ گئے تھے، ان کی عمر کا اب کوئی شاعر زندہ نہیں ہے، وفات کے وقت ۸۸ سال کی عمر تھی، وہ استادفن تھے بڑے اساتذہ کی طرح زبان کی باریکیوں پر اُن کی نظر بڑی گہری تھی، اور شاعری میں اس کا بڑا اہتمام رکھتے تھے، ان کے دامن تربیت میں بہت سے شعرا پلے، ان کے تلامذہ کا دائرہ وسیع تھا، صاحب قلم بھی تھے اسی زمانہ میں ایک رسالہ جام جہاں نما کے نام سے نکالتے تھے مگر عرصہ سے لکھنا چھوٹ گیا تھا، مگر مشق سخن برابر جاری تھی کبھی کبھی معارف میں بھی اپنا کلام بھیجتے تھے، حاجی وارث علی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے ان کی یادگار میں ہر سال بڑے اہتمام سے مشاعرہ کرتے تھے، ان کی موت سے ایک استادفن شاعر اٹھ گیا، رمضان المبارک میں موت یوں بھی ذریعہ مغفرت ہے، اللہ تعالیٰ اپنی مزید رحمتوں سے نوازے۔ (''م''، نومبر ۱۹۷۱ء)

عارف عباسی

عارف عباسی

عارف عباسی بھی اللہ کو پیارے ہوگئے، وہ اس دور کے ممتاز غزل گو اور جگر کے طرز کے کامیاب مقلد تھے، انھوں نے اپنی ظاہری وضع وقطع بھی انہی کی جیسی بنالی تھی، ان کا مکان اعظم گڑھ سے متصل ضلع ملبا میں تھا اس لئے اعظم گڑھ میں اُن کے پرانے تعلقات تھے اور یہاں برابر اُن کی آمدورفت رہتی تھی پہلے جب اعظم گڑھ آنا ہوتا تھا تو دارالمصنفین ضرور آتے تھے، اور اپنے تازہ کلام سے محظوظ کرتے تھے، مگر ادھر کچھ دنوں سے اس وضعداری میں فرق آ گیا تھا، عرصہ تک اُن کی غزلیں معارف میں چھپتی رہیں، اُن کے تغزل میں بڑی لطافت و پاکیزگی تھی ابتدا میں راجہ صاحب نانپارہ کے لڑکوں کے اتالیق رہے تھے، اس لئے درباری آداب اور علم مجلس کے بڑے ماہر تھے، اُن کی عمر ساٹھ باسٹھ سال کی رہی ہوگی، ادھر کچھ دنوں سے کچھ قلبی شکایت ہوگئی تھی، اسی نے مرض الموت کی شکل اختیار کرلی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ (''م''، نومبر ۱۹۷۱ء)

عبداللطیف، سید، ڈاکٹر

ڈاکٹر سید عبداللطیف

ہماری بزم علمی کی پرانی یادگاریں روز بروز اٹھتی جاتی ہیں اور ہر مہینہ کسی نہ کسی کا

ماتم کرنا پڑتا ہے، گذشتہ مہینہ دو نامور اہل علم نے وفات پائی، ہندوستان میں ڈاکٹر سید عبداللطیف نے اور پاکستان میں غلام رسول مہر نے، ڈاکٹر صاحب اس دور کے نامور فاضل اور انگریزی کے مشہور اہل قلم تھے، ان کی پوری زندگی علمی و تعلیمی مشاغل میں گذری، وہ جامعہ عثمانیہ میں انگریزی یا فلسفہ کے پروفیسر تھے، اس سے ریٹائر ہونے کے بعد ان کا سارا وقت تالیف و تصنیف میں گزرتا تھا، وہ راسخ العقیدہ مسلمان تھے، ان کے دل میں مذہب و ملت کا درد تھا، اسلامیات پر بھی ان کی نظر وسیع تھی، کلام مجید سے خاص شغف تھا، ان کی بیشتر تصانیف اور مضامین کلام مجید اور اسلامی تعلیمات اور تہذیب و ثقافت کے کسی نہ کسی پہلو پر ہیں، انھوں نے کلام مجید اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمان القرآن کا انگریزی ترجمہ کیا، یہ دونوں شائع ہو چکے ہیں، انگریزی تصانیف میں The Mind Al-Quran Builds زیادہ مشہور ہے، اس کا اردو ترجمہ چھپ چکا ہے، ایک کتاب اردو میں ''اساس تہذیب'' کے نام سے لکھی اس میں کلام مجید اور احادیث نبوی سے عالمگیر انسانی تہذیب کے عناصر دکھائے گئے ہیں، اردو شعر و ادب سے بھی ذوق تھا، انھوں نے غالب پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی، اس میں ان کی زندگی کے وہ پہلو بھی دکھائے گئے ہیں، جن سے ان کے سوانح نگار اغماض برتتے ہیں، ان مستقل تصانیف کے علاوہ انھوں نے مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب و ثقافت پر بکثرت مضامین لکھے، ان کا آخری کارنامہ یہ ہے کہ اپنی وفات سے پہلے انھوں نے قرآنی ٹرسٹ کے نام سے ایک ٹرسٹ قائم کیا اور اس کو اپنی تمام تصانیف کا حق اشاعت اور بیس ۲۰ ہزار روپے نقد دیئے، ایسے اہل علم مسلمانوں میں اب مشکل سے ملیں گے، اللہ تعالیٰ علم دین کے اس خادم کو اپنی بے پایاں رحمتوں سے سرفراز فرمائے۔

(''م''، دسمبر ۱۹۷۱ء)

مہرؔ، غلام رسول

غلام رسول مہرؔ

غلام رسول مہر صاحب کی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا، وہ ایک زمانہ تک اخبار زمیندار کے عملہ ادارت میں رہے، پھر مولانا ظفر علی خاں سے اختلاف کی بنا پر عبدالمجید سالک سے مل کر انقلاب کے نام سے اپنا مستقل اخبار نکالا، جو اپنے دور کا مشہور اخبار تھا، اس میں اور زمیندار میں نوک جھونک چلتی رہتی تھی، انقلاب کے فکاہات جو سالک صاحب کے قلم سے ہوتے تھے، خاص چیز تھے، اس کو لوگ بڑے ذوق سے پڑھتے تھے، مہر صاحب تنہا صحافی ہی نہیں تھے، ان کا علمی و تحقیقی ذوق بھی بلند تھا، انھوں نے حضرت سید احمد شہید بریلوی اور غالب پر بڑی مبسوط اور محققانہ کتابیں لکھیں، ان کے علاوہ بھی بعض چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں، دارالمصنفین سے ان کو خاص تعلق تھا، ان سے کبھی کبھی خط و کتابت ہوتی تھی، ان کی موت سے ایک نامور اہل قلم اٹھ گیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

(''م''، دسمبر ۱۹۷۱ء)

غلام السیدین، خواجہ

خواجہ غلام السیدین

افسوس ہے کہ خواجہ غلام السیدین بھی دنیا سے رخصت ہوگئے، ان کی موت علمی دنیا کا اندوہناک حادثہ ہے، وہ علی گڑھ کی بہترین پیداوار اور اس کا مثالی نمونہ تھے، اللہ تعالیٰ نے ان میں علم و فضل، فکر و نظر، تقریر و تحریر، تالیف و تصنیف بہت سے کمالات جمع کر دیئے تھے، اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ان کو بڑی قدرت تھی، تعلیم کے ماہر خصوصی تھے، ان کے خیالات میں گہرائی کے ساتھ بڑا اعتدال و توازن تھا اور وہ مغربی تعلیم اور مشرقی تہذیب کا سنگم تھے، وہ نئے دور کی پیداوار تھے اور جدید علوم و افکار میں مہارت کے ساتھ راسخ العقیدہ مسلمان بھی تھے، ان کے دل میں اپنے مذہب و ملت کا درد تھا، اگرچہ بعض مسائل میں وہ جدید خیالات سے متاثر تھے، لیکن اسلام کی ترجمانی کا پورا حق ادا کرتے تھے، انھوں نے قلم و زبان دونوں سے مذہب و ملت کی خدمت انجام دی، ان کو ہندوستان اور اس کے باہر بڑے بڑے علمی اعزاز حاصل ہوئے اور مختلف علمی، تعلیمی، مذہبی اور ادبی موضوعات پر انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں تصنیفی یادگار چھوڑیں، ان کی تصانیف بڑی فکر انگیز ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت اور دنیا کی طرح آخرت کی سربلندی سے بھی سرفراز فرمائے، یوں تو آئے دن موتیں ہوتی رہتی ہیں، مگر جب کوئی معاصر اور ہم عمر اٹھتا ہے تو اپنا وقت بھی قریب نظر آتا ہے۔

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

(''م''، جنوری ۱۹۷۲ء)

کاندھلوی، احتشام الحسن، مولانا

مولانا احتشام الحسن کاندھلوی

مذہبی حلقہ کے لیے مولانا احتشام الحسن کاندھلوی کی وفات بھی بڑا حادثہ ہے، وہ اس دور کے صاحب تدین و تقویٰ عالم تھے، شیخ التبلیغ مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے مجاز اور تبلیغی کاموں میں ان کے دست راست تھے، انھوں نے تبلیغ کو زندگی کا مقصد بنالیا تھا، ہر وقت اسی کی دھن رہتی تھی۔ انھوں نے بہت سے تبلیغی رسائل بھی لکھے، ان کی صحت عرصہ سے خراب تھی، اس کے علاوہ مختلف قسم کی مشکلات میں مبتلا رہے، لیکن کوئی معذوری تبلیغی کام میں حائل نہ ہوسکی اور مرض الموت تک اس کام کو انجام دیتے رہے، اللہ تعالیٰ ان کے مدارج بلند فرمائے۔

(''م''، جنوری ۱۹۷۲ء)

ظہور الحسن، شیخ

شیخ ظہور الحسن

افسوس ہے کہ شیخ ظہور الحسن صاحب سابق ریوینیو سکریٹری حکومت اتر پردیش نے کراچی میں انتقال کیا، وہ اپنے محکمہ کے ماہر اور اس صوبے کے لائق ترین عہدہ داروں میں تھے، حکومت میں ان کا بڑا وقار تھا، عملاً بڑے مذہبی اور دیندار تھے، مذہبی مطالعہ وسیع تھا، دینی کاموں سے بڑی دلچسپی تھی، ترک وطن سے پہلے دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے، کئی سال ہوئے ریٹائرڈ ہو چکے تھے، ان کے لڑکے پاکستان میں بڑے عہدوں پر تھے، لیکن وہ خود ہندوستان ہی میں مقیم رہے، ۱۹۶۵ء کی جنگ سے کچھ پہلے لڑکوں سے ملنے کراچی گئے تھے، اسی دوران میں جنگ چھڑ گئی، اس لیے لڑکوں کے اصرار سے وہاں مستقل قیام اختیار کرلیا، اور وہیں قلبی دورے میں وفات پائی، مسلمان عہدہ داروں میں ایسے لائق اور دیندار کم ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس مردمومن کی مغفرت فرمائے۔ (''م''، جنوری ۱۹۷۲ء)

کنزرو، رام ناتھ، پنڈت

پنڈت رام ناتھ کنزرو

دوسرا حادثہ پنڈت رام ناتھ کنزرو کی وفات کا ہے، وہ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو صدر سرونٹل آف انڈیا سوسائٹی و انجمن ترقی اردو ہند کے بڑے بھائی، پرانے کشمیری پنڈتوں کی طرح ہماری پرانی مشترک تہذیب کا نمونہ اور اردو زبان کے بڑے شیدائی تھے، جامعہ اردو علی گڑھ کے امیر بھی تھے، ان کی وفات سے اردو کا ایک بڑا حامی و مددگار اٹھ گیا، اور قدیم تہذیب و شرافت کی ایک یادگار مٹ گئی اب اس دور انقلاب میں ایسے نمونے نہ پیدا ہوں گے۔ (''م''، فروری ۱۹۷۲)

اعظمی، یحییٰ

یحییٰ صاحب اعظمی

ناظرین کو یہ معلوم کر کے افسوس ہوگا کہ دفتر دارالمصنفین کے منصرم یحییٰ صاحب اعظمی نے چند دنوں کی علالت کے بعد ۲۲؍فروری کو انتقال کیا، وہ عمر بھر دارالمصنفین سے وابستہ رہے اور مرکر اس سے جدا ہوئے، مرحوم بڑے متدین اور دفتری کاموں میں تجربہ کار تھے، ہزاروں روپے کا کاروبار ان کے ہاتھ میں تھا اور کبھی ایک حبہ کا فرق نہیں نکلتا تھا، ایسے قابل اعتماد آدمی مشکل سے ملیں گے، طبیعت میں حد سے زیادہ نظافت و نفاست تھی، بڑی صاف ستھری زندگی بسر کرتے تھے، ان کا دفتری کام بھی بڑا صاف ستھرا تھا، خشک دفتری کاموں کے ساتھ خوشگو شاعر بھی تھے، ان کے کلام کے دو مجموعے ''نوائے حیات'' اور ''نوائے عصر'' شائع ہو چکے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

(''م''، مارچ ۱۹۷۲ء)

احمد، سید فخر الدین، مولانا

مولانا سید فخر الدین احمد

شیخ الحدیث مولانا سید فخر الدین احمد صاحب کی وفات دینی و علمی دنیا کا بڑا حادثہ ہے، مرحوم ہندوستان کے نامور عالم دین دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور جمعیۃ علماء ہند کے صدر تھے، ان کی پوری زندگی دینی علوم کی خدمت میں گذری، تقریباً نصف صدی تک مدرسہ مسجد شاہی مرادآباد اور دارالعلوم دیوبند میں ان کا فیض جاری رہا، جس سے سیکڑوں تشنگان علم سیراب ہوئے، مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کے بعد دارالعلوم کے شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے، درس و تدریس کے ساتھ ملک و ملت کے بھی مجاہد بھی تھے، خلافت اور ہندوستان کی آزادی کی تحریکوں میں نمایاں حصہ لیا اور قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں، تدین و تقویٰ میں سلف صالحین کا نمونہ تھے، اللہ تعالیٰ ان کے مدارج بلند فرمائے۔ (''م''، اپریل ۱۹۷۲ء)

اسماعیل، محمد، شیخ

شیخ محمد اسماعیل

دوسرا حادثہ شیخ محمد اسماعیل صاحب صدر مسلم لیگ کی وفات کا ہے، وہ ملک و ملت کے پرانے خدمت گزار تھے، ایک زمانہ میں کانگریسی تھے، پھر مسلم لیگ میں شامل ہوگئے تھے، جنوبی ہند کی سیاست میں ان کو نمایاں مقام حاصل تھا، یہ انہی کی شخصیت تھی کہ ملک کی تقسیم کے بعد جب ہندوستان میں لیگ کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی جنوبی ہند میں اس کو دوبارہ زندہ کیا، پھر ملک کے مختلف حصوں میں اسکو پھیلا دیا، مگر اسکو فرقہ پروری سے اتنا دور رکھا اور ملکی حالات سے اتنا ہم آہنگ کردیا کہ اسکے مخالفین کو بھی گرفت کا موقع نہ مل سکا اور کانگریسی حکومتوں تک کو اس سے معاملت کرنا پڑی، اب ملت کے ایسے بڑی غم گسار مشکل سے پیدا ہوں گے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

(''م''، اپریل ۱۹۷۲ء)

صدیقی، عبدالستار، ڈاکٹر

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی

افسوس ہے کہ ہماری علمی بزم کی ایک اہم یادگار ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے گزشتہ مہینے انتقال کیا، وہ اس دور کے مشہور فاضل اور نامور محقق تھے، ان کا موضوع عربی لسانیات تھا، اس کے متعلقات علم الاشتقاق، رسم الخط حروف واصوات وغیرہ پر ان کی نظر

بڑی دقیق تھی اور اپنی تحریروں میں اس کا بڑا اہتمام رکھتے تھے، ان کی پوری زندگی علمی و تعلیمی خدمات میں گزری، مگر لکھتے کم تھے، انھوں نے غالباً متفرق مضامین کے علاوہ کوئی مستقل تصنیف یادگار نہیں چھوڑی، مگر ان کے یہ مضامین ان کی محققانہ نظر کا ثبوت ہیں، عرصہ ہوا الہ آباد ہونیورسٹی کے شعبۂ عربی و فارسی کی صدارت سے ریٹائر ہوئے تھے اور الہ آبادی ہی میں سکونت اختیار کرلی تھی، ایک زمانہ میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے رکن رکین تھے، یونیورسٹیوں اور دوسری علمی مجالس میں ان کا بڑا وقار تھا، دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے بھی رکن تھے، ان کا رہن سہن تو جدید تھا، لیکن شرافت و وضعداری اور شفقت و محبت میں مشرق تہذیب کا نمونہ تھے، ادھر کئی سال سے بالکل معذور ہوگئے تھے، آخر میں ہوش وحواس نے بھی جواب دے دیا تھا، اسی حالت میں گزشتہ جولائی میں انتقال کیا، انتقال کے وقت ۸۷ سال کی عمر تھی، مسلمانوں میں ایسے محقق اب مشکل سے پیدا ہوں گے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ (''م''، اگست ۱۹۷۲ء)

حسین، سید احتشام، پروفیسر

پروفیسر سید احتشام حسین

پروفیسر سید احتشام حسین صدر شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کی ناگہانی وفات علمی و ادبی دنیا کا بڑا سانحہ ہے، مرحوم اس دور کے چوٹی کے ادیبوں اور نقادوں میں تھے، ترقی پسند ادب کے تو معلم و رہنما تھے، اس دور کے نوجوان ادیبوں کی پوری نسل ان سے متاثر ہوئی، جدید ادب کے ساتھ قدیم ادبیات پر بھی ان کی نظر بڑی گہری، اور مبصرانہ تھی، اور وہ اس کی اچھی روایات کے بھی قدرشناس تھے، لسانیات سے بھی واقف تھے، انھوں نے سیکڑوں ادبی وتنقیدی مضامین اور بعض مستقل کتابیں لکھیں، اگرچہ وہ ترقی پسندوں کے امام تھے لیکن ان کے خیالات میں بڑا اعتدال وتوازن اور زبان وقلم دونوں میں بڑی شایستگی تھی، اس لئے جدید کے ساتھ قدیم طبقہ میں بھی ان کی بڑی قدر تھی، وہ ابتداء میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے لکچر مقرر ہوئے اور تقریباً ۱۵- ۱۶ سال اس عہدہ پر رہے، پھر الہ آباد یونیورسٹی اردو کے صدر ہوگئے تھے، اردو کی تمام اہم مجالس کے ممتاز رکن تھے، کوئی اہم ادبی اجتماع ان کے بغیر کامیاب نہ سمجھا جاتا تھا، انھوں نے مختلف حیثیتوں سے اردو کی بڑی قیمتی خدمات انجام دیں اور ہر محاذ پر اردو کے مخالفین کا مقابلہ کیا۔

ان علمی کمالات کے ساتھ وہ طبعاً بڑے متین، سنجیدہ، شریف اور وضعدار تھے، ان کے علم سے زیادہ ان کے اخلاق وشرافت کا اثر پڑتا تھا، دارالمصنفین سے ان کو دہرا تعلق تھا، ایک علمی و ادبی دوسرا وطنی، ماہل ضلع اعظم گڑھ ان کا وطن تھا، ہائی اسکول تک ان کی تعلیم بھی اعظم گڑھ میں ہوئی تھی، اسی زمانہ سے ان کو دارالمصنفین سے تعلق تھا، جو ہر زمانہ میں یکساں قائم رہا، جب تک وہ لکھنؤ میں رہے، اکثر ان سے ملاقات ہوتی رہتی تھی، الہ آباد جانے کے بعد کسی ہندوستانی اکیڈمی کے جلسہ میں اور کبھی اردو کی دوسری مجالس میں ملاقات ہوجاتی تھی، جب ملاقات ہوتی تو اپنی طالب علمی کے زمانہ کے دارالمصنفین کے تمام لوگوں کو فرداً فرداً پوچھتے، اپنے اعظم گڑھ کے شاگردوں کو دارالمصنفین سے استفادہ کی برابر تاکید کرتے رہتے، اور ہر مرتبہ آنے کا وعدہ کرتے جس کے پورے ہونے کی نوبت نہ آئی، ان کی موت سے اردو کا بہت بڑا ستون گرگیا، اور تہذیب وشرافت کا ایک نمونہ اٹھ گیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

(''م''، دسمبر ۱۹۷۲ء)

احمد، احسان، مرزا

مرزا احسان احمد

افسوس ہے کہ ہمارے شہر کے مشہور وکیل اور نامور شاعر مرزا احسان احمد صاحب کا گزشتہ مہینہ انتقال ہوگیا، ان کی صحت عرصہ سے خراب تھی، ادھر کچھ دنوں سے صاحب فراش ہوگئے تھے، ۲۳ر دسمبر کو وفات پائی، وفات کے وقت ۷۷ سال کی عمر تھی، مرحوم شاعری کے ساتھ اردو کے ادیب و نقاد بھی تھے، ان کا ادبی ذوق بڑا بلند اور پاکیزہ تھا، ان کے کلام اور ادبی مضامین کا مجموعہ شائع ہوچکا ہے، ایک زمانہ میں ان کے اور اقبال احمد خاں صاحب سہیل مرحوم کے دم سے اعظم گڑھ میں شعر وشاعری کا بڑا چرچا تھا، مگر مرحوم جب چشمہ کے ایجنٹ اور بعد میں شاعری کی حیثیت سے اعظم گڑھ آتے تھے تو مرزا صاحب ہی کے یہاں ٹھہرتے تھے، اور شعر وشاعری کی محفل گرم ہوتی تھی، اس میں مولانا عبدالسلام مرحوم پابندی سے اور کبھی کبھی سید صاحبؒ بھی شریک ہوتے تھے، جگر صاحب کے کلام کا پہلا مجموعہ داغ جگر اعظم گڑھ ہی سے شائع ہوا، اس پر مرزا احسان احمد صاحب کا مبسوط مقدمہ ہے اسی سے جگر صاحب کی شہرت کا آغاز ہوا، مرزا صاحب کے گھر میں دارالمصنفین کے تعلقات بڑے گہرے تھے، ان کے بڑے بھائی مرزا سلطان احمد صاحب مرحوم دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے ہمیشہ رکن رہے، ان کے بعد مرزا صاحب منتخب ہوئے، اور اپنی وفات تک رہے، ان کی زندگی بڑی سادہ اور درویشانہ تھی، استطاعت کے باوجود تکلفات سے ہمیشہ بری رہے، طبیعت میں بڑا استغنا تھا ان کا پیشہ ضرور وکالت تھا مگر اس کی طرف ان کا طبعی رجحان نہ تھا، بس بقدر ضرورت ہی وکالت کرتے تھے، اور ادھر دس بارہ سال سے بالکل چھوڑ دی تھی، طبیعت بڑی مرنجان مرنج تھی، کسی کے معاملات اور مقامی سیاست سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا، اپنے حال میں مست رہتے تھے، صاحب خیر بھی تھے، کارخیر میں بڑی فیاضی سے صرف کرتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ (''م''، جنوری ۱۹۷۳ء)

حریری، عبدالمجید، مولانا

مولانا عبدالمجید حریری مرحوم

دوسرا علمی حادثہ مولانا عبدالمجید حریری مرحوم کی وفات کا ہے، انھوں نے بھی گزشتہ مہینہ وفات پائی، مرحوم مدنپورہ بنارس کے ایک ممتاز انصاری خاندان سے تھے، عربی اور انگریزی دونوں زبانوں کے فاضل تھے، عربی کی تکمیل کے بعد انگریزی کی تعلیم علی گڑھ کالج میں حاصل کی تھی، اور اپنے دور کے ممتاز طلبہ میں تھے، یہیں سے خلافت اور نان کو اپریشن کی تحریک میں شریک ہوئے اور ایک زمانہ تک جنگ آزادی میں سرگرمی سے حصہ لیتے رہے، اس دور کے تمام بڑے بڑے لیڈروں سے ان کے تعلقات تھے، ہندوستان کی آزادی کے بعد حکومت ہند نے ان کو سعودی عرب میں قونصل جنرل مقرر کیا، کئی سال تک اس عہدہ پر رہے، اس سے سبکدوش ہونے کے بعد کچھ دنوں تک سعودی عرب کے پایۂ تخت ریاض میں قیام رہا، مرحوم ہندوستان کے ممتاز صاحب علم تھے، عربی زبان پر ان کو اہل زبان کی جیسی قدرت حاصل تھی، مقرر بھی اچھے تھے، لیکن افسوس ان کے سیاسی ذوق نے ان کے علمی جوہروں کو چمکنے نہ دیا، ایک عرصہ سے اس کا دائرہ بھی مقامی سیاست تک محدود ہوگیا تھا، اس لئے وہ جس علمی شہرت کے مستحق تھے وہ ان کو حاصل نہ ہوسکی اور اب عرصہ سے خانہ نشینی اختیار کرلی تھی، وہ مسلکاً اہل حدیث تھے، لیکن ہر مسلک کے علماء اور اہل علم سے ان کے تعلقات تھے، دارالمصنفین کے بزرگوں سے بھی ان کے پرانے روابط تھے، اس سلسلہ میں کئی مرتبہ ان کا یہاں آنا ہوا گزشتہ سال ایک تقریب سے بنارس جانا ہوا تو ملاقات کے لئے ان کی خدمت میں بھی حاضر ہوا تھا، بہت ضعیف ہوچکے تھے دماغ بھی پوری طرح کام نہ دیتا تھا، تعارف کے بعد پہچانا اور بڑی شفقت ومحبت سے پیش آئے اس وقت اندازہ ہوگیا تھا کہ اب یہ چراغ زیادہ دنوں جلنے والا نہیں، ایک زمانہ میں علمی اور سیاسی حلقوں میں ان کی خاصی شہرت تھی، مگر اس دور کے لوگ تو ان کے نام سے بھی واقف نہ ہوں گے۔ والبقاء للہ وحدہ، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ (''م''، جنوری ۱۹۷۳ء)

تھنگل، عبدالرحمٰن بافقیہ، سید

سید عبدالرحمٰن بافقیہ تھنگل

آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر سید عبدالرحمٰن بافقیہ تھنگل مرحوم کی وفات قومی و ملی حادثہ ہے، اور ان کی موت اس لحاظ سے ہر مسلمان کے لیے قابل رشک ہے کہ حج سے فراغت کے بعد وہ سعودی عربیہ کے دارالحکومت ریاض گئے تھے، وہیں ایک مختصر علالت کے بعد انتقال کیا، حرم محترم میں نماز جنازہ پڑھی گئی اور مکہ معظمہ کی سرزمین میں سپرد خاک کیے گئے، اس طرح گناہوں سے پاک وصاف ہوکر لبیک کہتے ہوئے اپنے رب کے حضور میں حاضر ہوگئے۔

خوش حال آنکہ دید ترا و سپرد جان
آگہ نشد کہ ہجر کدام و وصال چیست

تھنگل مرحوم اگرچہ مسلم لیگ کے صدر تھے لیکن ملکی قومی خدمات میں بھی ان کا قدم پیچھے نہ تھا، اس لیے بلاتفریق مذہب وملت سب ان کو مانتے تھے، اور ان کی موت پر جنوبی ہند کے ہندو مسلمان دونوں نے یکساں ماتم اور ان کی موت کو قومی نقصان تصور کیا، ارض مقدس میں ان کی موت خود مغفرت کا ذریعہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کے مدارج بلند فرمائے۔ (''م''، فروری ۱۹۷۳ء)

فرقتؔ کاکوروی، غلام احمد

غلام احمد فرقتؔ کاکوروی

دوسرا حادثہ غلام احمد فرقت کاکوروی مرحوم کی دردناک موت کا ہے، انھوں نے عالم مسافرت میں بڑی بیکسی میں جان دی، بہار کے کسی مشاعرے سے واپس آرہے تھے کہ راستہ میں دفعتاً انتقال ہوگیا، مغل سرائے اسٹیشن پر ٹرین میں لاش ملی، ڈائری سے مرحوم کے نام کا پتہ چلا، پولیس نے ضروری کارروائی کے بعد لاش بنارس کی ایک اسلامی انجمن کے حوالہ کردی جس نے اس مشہور ادیب کو لاوارثی میں دفن کیا، اس دردناک حادثہ پر جتنا بھی رنج والم کا اظہار کیا جائے کم ہے۔

فرقت مرحوم فطری ظریف اور طنز وظرافت میں شوکت تھانوی کا مثنٰی تھے، مگر ان کی ظرافت محض ہنسنے ہنسانے کا سامان نہ تھی، بلکہ اکبر کی شاعری کی طرح اصلاحی تھی، اور اس سے انھوں نے بڑے مفید کام لیے، اور اس دور کے ادبی اور سماجی فتنوں کا اپنے رنگ میں بھرپور مقابلہ کیا، اس لحاظ سے وہ ادیب ملت تھے، ان کے قلم میں اتنی طاقت تھی اور انداز بیان اتنا دلکش اور موثر تھا کہ ان کے حریف بھی ان کا لوہا مانتے تھے، وہ ان کے طنز پر تڑپ اٹھتے تھے، مگر اس سے لطف لینے پر بھی مجبور تھے، ان کو لکھنؤ کی ٹکسالی زبان پر بھی قدرت تھی، اور لکھنؤ کی پرانی سوسائٹی کی مصوری میں بھی کمال حاصل تھا، اللہ تعالیٰ ان کی مسافرت کی موت اور اصلاحی خدمات کے صلہ میں ان کی مغفرت فرمائے۔
(''م''، فروری ۱۹۷۳ء)

خلیق الزماں، چودھری

چودھری خلیق الزماں

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینہ چودھری خلیق الزماں مرحوم کا کراچی میں انتقال ہوگیا، مرحوم ان لوگوں میں تھے جن کی پوری زندگی سیاسی اور قومی کاموں میں گزری، سیاست

کا چسکا ان کو طالب علمی ہی کے زمانہ سے تھا، چنانچہ جنگ بلقان کے زمانہ میں ہندوستان سے جوطبی وفد ڈاکٹر انصاری مرحوم کی قیادت میں ٹرکی گیا اس میں جو نوجوان شامل ہوئے تھے ان میں ایک چودھری صاحب بھی تھے، کئی مرتبہ لکھنو میونسپلٹی کے چیرمین ہوئے ان کی چیرمینی کا دور ایک یادگار دور تھا، اسی زمانہ میں خلافت اور ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی، اس میں اس سرگرمی سے حصہ لیا کہ صوبے کے لیڈروں میں ان کا شمار ہونے لگا، ایک مدت تک کانگریس میں رہے، پنڈت موتی لال کے معتمد علیہ اور جواہر لال کے خاص رفقاء میں تھے، کانگریس میں بھی نمایاں مقام حاصل کیا، چنانچہ ۱۹۲۹ء میں جب کانگریس کے لیڈروں کی گرفتاری کا سلسلہ شروع ہوا تو آخر میں ان کو کانگریس کا ڈکٹیٹر مقرر کیا گیا تھا۔

پھر مسلم لیگ میں شامل ہوگئے اور پاکستان کی تحریک میں چند دنوں میں آل انڈیا لیڈر کی حیثیت حاصل کرلی چنانچہ پاکستان کے بانیوں میں ان کا شمار ہوتا ہے، قیام پاکستان کے بعد کراچی چلے گئے، یہاں بھی ان کو بڑے بڑے عہدے حاصل ہوئے مختلف اوقات میں مسلم لیگ کے صدر مشرقی پاکستان کے گورنر اور انڈونیشیا کے سفیر مقرر ہوئے مگر مسٹر جناح ان سے خوش نہ تھے اس لئے وہ پاکستان کی سیاست پر اثر انداز نہ ہوسکے اور آخر میں گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کرلی تھی اور اسی پر ان کا خاتمہ ہوا، چودھری صاحب کی زندگی قلندرانہ تھی، وہ وکیل تھے، ان کے ماموں اور خسر مولوی محمد نسیم صاحب لکھنو کے چوٹی کے وکیل اور ان کے صاحبزادے محمد وسیم صاحب نامور بیرسٹر تھے، لیکن چودھری صاحب کو سیاست کا ایسا چسکا تھا کہ ان کا سارا وقت اسی میں گزرتا تھا، اس لئے وکالت کی طرف توجہ کرنے کا موق کم ملتا تھا، ان کی وکالت برائے نام تھی، اس سلسلہ میں ایک واقعہ یاد آ گیا، ایک مرتبہ وہ مسلم لیگ کے دورے کے سلسلہ میں اعظم گڑھ آئے تھے۔ ایک گفتگو میں سید صاحب مرحوم سے کہنے لگے کہ مولانا میرے ساتھیوں نے وکالت سے لاکھوں پیدا کئے اور میں گھر تک نہ بنوا سکا، ابھی چند سال ہوئے انھوں نے شاہراہ پاکستان کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں قیام پاکستان کی سرگزشت تحریر کی ان کی موت سے ایک اہم یادگار مٹ گئی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

("م"، جون ۱۹۷۳ء)

رحمانی، عبدالصمد، مولانا

مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی

دوسرا حادثہ مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی نائب امیر شریعت صوبہ بہار واڑیسہ کا ہے وہ بھی پرانی یادگار، اس دور کے نامور عالم اور ملک وملت کے پرانے خدمت گزار تھے، ملکی وملی تحریکات میں ان کا نمایاں حصہ رہا، خلافت اور ترک موالات کی تحریک اور ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں مولانا سجاد بہاری مرحوم کے رفیق کار تھے، ان کی وفات سے ایک قدیم یادگار اٹھ گئی، اللہ تعالیٰ ان کے مدارج بلند فرمائے۔

("م"، جون ۱۹۷۳ء)

بدایونی، ضیاء الدین احمد، مولانا

مولانا ضیاء الدین احمد بدایونی

افسوس ہے کہ گذشتہ جولائی میں ایک ممتاز علمی شخصیت مولانا ضیاء احمد بدایونی سابق صدر شعبہ فارسی مسلم یونیورسٹی نے وفات پائی، مرحوم فارسی زبان کے فاضل اور مسلم الثبوت استاد تھے، انہوں نے فارسی کی درسیات پرانے طرز پر پڑھی تھیں اور عربی سے بھی واقف تھے، اس لیے فارسی زبان وادب پر ان کی نظر ماہرانہ تھی، ان کا ذوق بڑا متنوع تھا، مذہبیات اور تاریخ اسلام سے بھی ان کو دلچسپی تھی، اور ان سب پر ان کے مضامین اور تصانیف موجود ہیں، ان میں سب سے اہم دیوان مومن کی شرح اور اس کا فاضلانہ مقدمہ ہے اور یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جس طرح سب سے پہلے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے کلامِ غالب کی اہمیت نمایاں کی تھی، اسی طرح مولانا ضیاء احمد نے مومن کے کلام کی اہمیت واضح کی، وہ عملاً نہ صرف دیندار بلکہ خوش عقیدہ مسلمان تھے، جس کا اثر ان کی تمام مذہبی تحریروں میں ہے، اس زمانہ میں جب کہ فارسی کا ذوق گھٹتا جا رہا ہے مرحوم کی جگہ مشکل سے پُر ہوسکے گی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ ("م"، ستمبر ۱۹۷۳ء)

خان، عبدالمعید، ڈاکٹر

ڈاکٹر عبدالمعید خان

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے شعبہ عربی کے صدر ڈاکٹر عبدالمعید خاں کی وفات علمی حلقہ کے لیے ایک سانحہ ہے، انھوں نے قاہرہ اور کیمبرج میں تعلیم پاکر ساری عمر جامعہ عثمانیہ کی خدمت میں گذاری، کچھ دنوں آکسفورڈ یونیورسٹی میں بھی عربی کے پروفیسر رہے، حیدرآباد کے مشہور انگریزی رسالہ اسلامک کلچر کی ادارت کے فرائض آخر وقت تک بڑی خوبی سے انجام دیئے مارماڈیوک پکتھال نے اس کا جو معیار قائم کیا تھا، اس کو انھوں نے قائم رکھا، دائرۃ المعارف حیدرآباد کی علمی سرگرمیوں میں بھی ان کا بڑا حصہ رہا، ان کی رہنمائی میں یہاں سے بہت سی مفید کتابیں شائع ہوئیں، مولانا ابوالکلام آزاد ان کی علمی صلاحیتوں کے معترف تھے، وہ حکومت کی علمی کمیٹیوں میں نامزد ہوتے رہے، جہاں وہ عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، امید ہے کہ جامعہ عثمانیہ ان کو ایک نامور فرزند کی حیثیت سے برابر یاد رکھے گی۔

("ص ـ ع"، نومبر ۱۹۷۳ء)

تاراچند، ڈاکٹر

ڈاکٹر تاراچند

گذشتہ اکتوبر میں ڈاکٹر تاراچند کے انتقال پر ملال سے بھی ہندوستان میں ایک بڑا علمی خلاء پیدا ہوگیا، وہ الہ آباد کے کایستھ پاٹ شالہ کی مدرسی اور پرنسپلی کے بعد الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہوئے، پھر حکومت ہند کے تعلیمی مشیر بنے، ایران میں ہندوستان کی طرف سے سفیر بنا کر بھیجے گئے، وہاں سے واپسی پر پارلیمنٹ کے رکن نامزد کئے گئے لیکن ان کی اصلی شہرت اور مقبولیت ایک بلند پایہ مورخ کی حیثیت سے ہوئی، انھوں نے ''انفلوانس آف اسلام ان انڈین کلچر'' پر ایک مقالہ لکھ کر آکسفورڈ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، یہ ان کی ابتدائی تحقیقی کوشش تھی، لیکن اس سے بہتر کتاب اس موضوع پر اب تک نہیں نکلی، آخر میں وہ ہسٹری آف دی فریڈم مومنٹ کے بورڈ کے اڈیٹر تھے، ان کی ادارت میں یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام پاتا رہا، ان کی تحقیقی تحریروں میں دیدہ دری کے ساتھ بڑی فراخدلی بھی ہوتی، وہ ہندی اردو کی حسین آمیزش یعنی ہندوستانی زبان کے بھی بڑے موئد تھے، اس کے کچھ اچھے نمونے بھی لکھ کر پیش کرتے رہے، ان کی نیک نامی اور مورخانہ بصیرت کی وجہ سے ان کی خوشگوار یادوں کا چراغ علمی حلقہ میں برابر روشن رہے گا۔ (''ص، ع''، نومبر ۱۹۷۳ء)

مچھلی شہری، سلام

سلام مچھلی شہری

افسوس ہے کہ سلام مچھلی شہری بھی چل بسے، وہ ممتاز ترقی پسند شاعر تھے، اعظم گڑھ اور دارالمصنفین سے ان کے تعلقات بہت پرانے تھے، جس کا انھوں نے ہمیشہ لحاظ رکھا، کئی مہینے ہوئے خبر ملی تھی کہ انھوں نے شراب سے توبہ کرلی ہے، اس خبر سے قدرۃً خوشی ہوئی، اتفاق سے اسی زمانہ میں انھوں نے جدید طرز میں ایک نعت کہہ کر معارف میں اشاعت کے لیے بھیجی، میں نے ان کو توبہ پر مبارک باد دی اور لکھا کہ نعت کے لیے پرانا طرز ہی مناسب ہے، انھوں نے جواب میں لکھا کہ انھوں نے شراب سے توبہ کرلی ہے اور دعا فرمایئے کہ خدا استقامت عطا فرمائے اور اپنے موروثی مذہبی اثرات کا بھی حوالہ دیا، اور دوسری نعت کہہ کر بھیجنے کا وعدہ کیا، مگر ابھی اس کے ایفا کی نوبت نہ آئی تھی کہ ان کا وقت پورا ہوگیا، شراب نے ہمارے بہت سے ہونہار شعراء کو تباہ کیا ہے، شکر ہے کہ سلام اس سے تائب ہوگئے تھے، جو ان کی عاقبت کے لیے فال نیک ہے، اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول اور ان کی مغفرت فرمائے۔

(''م''، دسمبر ۱۹۷۳ء)

ندوی، شبلی، مولانا

مولانا شبلی ندوی

اسی مہینہ مولانا شبلی ندوی کی وفات تقریباً نوے سال کی عمر میں لکھنؤ میں ہوگئی، وہ اپنی زندگی میں سب سے پرانے ندوی کی حیثیت سے عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، شروع ہی سے بڑے خاکسار متواضع اور ایثار پسند رہے، علامہ شبلی نعمانی کے محبوب اور معتمد شاگردوں میں تھے، ان کو متکلم شبلی کہا کرتے تھے۔ اپنے بستر مرگ پر ان کو نصیحت کی تھی کہ جہاں رہو میری طرز تعلیم کو پھیلاتے رہو، ان ہی کی خواہش سے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں مدرس ہوئے، اس کی خدمت میں پوری زندگی گذار دی، وہاں کے اختلافات کی وجہ سے کچھ دنوں اس سے علیحدہ رہے، لیکن پھر وہاں آگئے تھے، ان کی تمنا تھی کہ اس احاطہ میں دم توڑ دیں، لیکن آخری زندگی میں بعض اسباب سے ان کو پھر سے الگ ہونا پڑا، ان کی مٹی ان کو لکھنؤ لے گئی، کلام ومعقولات کے بڑے لائق و فاضل مدرسہ تھے، دارالمصنفین سے بھی ان کو بڑی محبت رہی، بڑے خوش نصیب باپ تھے، ان کی اولاد ہندوبیرون ہند میں اچھے اچھے عہدوں پر مامور رہی مگر وہ اپنی اصلی اولاد مدرسۃ الاصلاح ہی کو سمجھتے رہے، اپنے لڑکوں کے گھروں کی راحت وآسائش کو یہاں کی قانع اور سادہ زندگی پر قربان کرتے رہے، اللہ تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا کریں، آمین۔ (''ص، ع''، جنوری ۱۹۷۴ء)

فریدی، ڈاکٹر

آہ ڈاکٹر فریدی

جس حادثہ کا دھڑکا عرصہ سے لگا ہوا تھا وہ بالآخر پیش آکر رہا اور جس کے ہاتھوں سے اللہ تعالیٰ نے ہزاروں مایوس مریضوں کو شفا بخشی تھی۔ اس نے بھی گزشتہ ۱۹؍مئی کو جان جاں آفریں کے سپرد کردی، مرحوم فریدی کے کن کن اوصاف کو یاد کیا جائے۔

اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

وہ ایک حاذق طبیب، بے غرض مخلص اور جری لیڈر اور سراپا انسانیت اور شرافت تھے، قومی وملی مفاد کے مقابلہ میں کسی طاقت کو خاطر میں نہ لاتے تھے، اس کے لئے آخر وقت تک حکومت سے جنگ کرتے رہے، اور اپنی دولت، صحت اور زندگی کسی چیز کی بھی پروا نہ کی اور ایک بہادر سپاہی کی طرح اس راہ میں جان تک دے دی، انھوں نے قوم و ملت کے لئے جو قربانیاں کیں اس دور کے مسلمانوں میں مشکل سے اس کی مثال مل سکتی ہے، ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں سے خوف و ہراس اور احساس کمتری دور کرکے ان میں جرات و ہمت پیدا کی، ان کا دامن فرقہ پروری سے بالکل پاک تھا، انھوں نے اقلیتوں اور پسماندہ طبقوں کے مفاد کے لئے مختلف سیکولر

پارٹیوں سے مل کر اس کا عملی نمونہ پیش کیا، اگرچہ وہ مسلم مجلس کے بانی اور اس کے صدر تھے، لیکن کانگریسیوں سے بھی ان کے تعلقات تھے، اور وہ بھی ان کی عزت کرتے تھے، ان کی موت پر مختلف طبقوں کے اکابر اور جن کو ان کی سیاست سے اختلاف تھا، انھوں نے بھی جو تاثرات ظاہر کئے ہیں وہ ان کی مقبولیت کے شاہد ہیں۔

اس دور میں وہ تنہا شخص تھے، جس نے سیاست سے کسی قسم کا ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اپنا کھویا، اگر وہ چاہتے تو حکومت کا بڑے سے بڑا عہدہ حاصل کر سکتے تھے، لیکن اس کی طرف انھوں نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، ان کے پیشہ کی آمدنی بڑے بڑے وزراء کی تنخواہ سے کئی گنا زیادہ تھی، اس کو انھوں نے بڑی فیاضی سے قوم وملت کی راہ میں صرف کیا اور اپنی سیاسی مشغولیتوں کی وجہ سے ہزاروں روپیہ کا نقصان اٹھایا، ان کی زندگی شاہانہ تھی، مگر قوم کی خاطر انھوں نے اپنے کو سادہ اور سخت زندگی کا عادی بنالیا تھا، جس نے ان کی صحت کو نقصان پہنچایا۔

مریضوں کو ان کی صداقت پر اتنا عقیدہ تھا کہ ان کے پاس پہنچ کر ان کو اپنی صحت کا یقین ہوجاتا تھا، آدھا مرض تو وہ اپنی باتوں سے دور کردیتے تھے، وہ جس پایہ کے ڈاکٹر تھے اگر وہ چاہتے تو ان کی آمدنی دونی ہوسکتی تھی لیکن صبح سے دوپہر تک وہ مریضوں کو مفت دیکھتے تھے، اور بہت سے غریبوں کو دوا بھی اپنے پاس سے مفت دیتے تھے، ان کی شخصیت میں بڑی کشش تھی، ان کی سروقامتی، ہنستا ہوا شگفتہ وشاداب چہرہ، ان کی جامعہ زیبی، ان کا حسن اخلاق ہر چیز دامن دل کھینچتی تھی، وہ عملاً دیندار اور راسخ العقیدہ بلکہ خوش عقیدہ مردمومن تھے، اس سلسلہ میں ایک واقعہ یاد آگیا، ایک مرتبہ وہ علی میاں سے ملنے کے لئے ندوہ آئے، اتفاق سے میں بھی موجود تھا، کسی سلسلہ میں داڑھی کا ذکر آگیا، ڈاکٹر صاحب کلین شیو تھے، میں نے اس کی سند جواز میں یہ واقعہ سنایا کہ مولانا حمیدالدین فراہیؒ، ایک زمانہ میں داڑھی منڈوں سے مصافحہ نہ کرتے تھے، مگر جب حج سے واپس آئے تو مصافحہ کرنے لگے، لوگوں نے پوچھا حضرت اس تبدیلی کا کیا سبب ہے، فرمایا حج میں ایسے داڑھی منڈے ترکوں سے ملاقات ہوئی جن کے جسم پر جہاد کے کئی کئی زخم تھے، جو ایمان کی سب سے بڑی کسوٹی ہے، اس وقت مجھے خیال آیا کہ ایمان داڑھی پر موقوف نہیں ہے، یہ واقعہ سناکر میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ آپ بھی ان ہی مجاہدین میں ہیں، اس پر انھوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور جھک کر سلام کیا۔

ان سے آخری ملاقات گزشتہ الیکشن میں اعظم گڑھ کے دورے کے موقع پر اور اس سے چند مہینے پیشتر لکھنؤ میں ہوئی تھی، اس وقت ان کی صحت گرچکی تھی، دو چار قدم چلنے میں سانس پھولنے لگتی تھی، میں نے ان سے کہا ''ڈاکٹر صاحب اگر آپ کو قوم و ملت کی خدمت کرنا ہے تو اپنی صحت پر رحم کیجئے''۔ زیادہ دوڑ دھوپ نہ کیا کیجئے، جواب دیا اب میری زندگی کا کوئی اعتبار نہیں معلوم نہیں کب وقت آجائے اس لیے چاہتا ہوں کہ جو مہلت بھی ہے اس میں جتنا کام بھی ہوسکے کرلیا جائے، آج ان کا یہ جواب بے اختیار یاد آرہا ہے، اس میں کتنی بلندی اور بڑائی ہے۔

دارالمصنفین سے ان کا تعلق بڑا مخلصانہ تھا، وہ اس کے محسن اور اس کی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے، اس لئے ان کی موت دارالمصنفین کا ذاتی حادثہ اور قحط الرجال کے اس دور میں بہت بڑا قومی حادثہ ہے، جس کی تلافی مدتوں نہ ہوسکے گی، ان کے غم میں ہزاروں آنکھیں اشکبار اور ہزاروں زبانیں دعائے مغفرت میں مصروف ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو قبول فرمائے اور مرحوم کے نیک اعمال کے صلہ اور اپنے حبیب پاک کے طفیل میں ان کو دنیا کی طرح آخرت کی سرخروئی اور سربلندی عطا فرمائے، **اللھم اغفرلہ وارحمہ رحمۃ واسعۃ**۔ ڈاکٹر صاحب اس دنیا سے اٹھ گئے، مگر ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما

(''م''، جون ۱۹۷۴ء)

امین الحسینی، مفتی

مفتی امین الحسینی

افسوس ہے کہ گزشتہ مئی میں مجاہد جلیل مفتی امین الحسینی نے انتقال کیا، ان کی پوری زندگی جہاد مسلسل کی ایک داستان ہے، اسرائیل کے قیام کے بعد سے برابر اس کے خلاف جدوجہد میں لگے رہے، فلسطین کا مسئلہ اگرچہ ابتداء سے مسلمانوں کا مذہبی مسئلہ تھا اور انھوں نے اسی وقت سے اس کے خلاف احتجاج شروع کردیا تھا، لیکن جب تک اسرائیل نے پروبال نہ نکالے تھے اس کے عواقب ونتائج پر ان کی پوری نظر نہ تھی، مفتی صاحب کی دوربین نگاہ نے اس کو محسوس کرلیا تھا اور انھوں نے پوری دنیائے اسلام کا سفر کرکے مسلمانوں کو اس کے خطرات سے آگاہ اور اس کے مقابلے پر آمادہ کیا، اس سلسلہ میں وہ ہندوستان بھی آئے تھے، اس لئے اس مسئلہ میں جان ان ہی نے ڈالی تھی اور اس راہ میں قید وبند جلاوطنی ہر قسم کی مصیبتیں جھیلیں اور اسی جہاد پر ان کا خاتمہ ہوا۔ ایسی عظیم شخصیتیں مدتوں میں پیدا ہوتی ہیں اس لئے ان کی موت تنہا عربوں کا نہیں بلکہ پوری دنیائے اسلام کا حادثہ ہے، اللہ تعالیٰ اس مجاہد جلیل کے مدارج بلند فرمائے۔

(''م''، اگست ۱۹۷۴ء)

یٰسین، انس، شیخ

شیخ انس یٰسین

دوسرا حادثہ سعودی عرب کے سابق ہندوستانی سفیر شیخ انس یٰسین کی وفات کا

ہے، ابھی وہ جوان تھے، لیکن تدبر و معاملہ فہمی میں تجربہ کار بوڑھوں سے کم نہ تھے، وہ مختلف اوقات میں مختلف ملکوں کی سفارت پر رہے، آج کل ٹرکی میں سفیر تھے، وہیں کار کے حادثہ میں وفات پائی، ان میں اپنے مذہب و ملت کا بڑا درد تھا، ہندوستان کے اسلامی اداروں سے ان کو خاص دلچسپی تھی، اپنی سفارت کے زمانہ میں متعدد اداروں کو دیکھا اور ان کی مدد بھی کی، دارالمصنفین کے بھی محسن تھے، یہاں آنے کا وعدہ بھی کیا تھا، مگر ایسے موقع پیش آتے رہے کہ آنا نہ ہوسکا، دو سال ہوئے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مدرسہ ثانویہ کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے لکھنؤ آئے تھے تو ان سے ملاقات ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ ("م"، اگست ۱۹۷۴ء)

ندوی، حسین حسان، مولوی

مولوی حسین حسان ندوی

راقم کے لیے تیسرا حادثہ طالب علمی کے زمانہ کے رفیق مولوی حسین حسان صاحب ندوی اڈیٹر پیام تعلیم کی وفات کا ہے، مرحوم درجہ میں مجھ سے دو تین سال نیچے اور غالباً عمر میں بھی اسی قدر چھوٹے تھے، لیکن ہم دونوں عرصہ تک ایک ہی کمرے میں رہے تھے، اس لئے ان سے دوستانہ تعلقات تھے جو آخر تک قائم رہے، اسی زمانہ سے ان میں مضمون نگاری کا ذوق تھا، چنانچہ عشاق عرب کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا تھا۔ جو زمانہ کانپور کے کئی نمبروں میں چھپا تھا، ندوہ سے فراغت کے بعد جامعہ ملیہ چلے گئے اور وہاں تعلیم کے ساتھ مختلف اوقات میں جامعہ کے مختلف شعبوں سے ان کا تعلق رہا، بچوں کا ادب لکھنے میں ان کو خاص ملکہ تھا اس کے وہ صاحب طرز ادیب تھے، برسوں بچوں کے رسالہ پیام تعلیم کے اڈیٹر رہے اور اس کو ان کا بڑا مقبول رسالہ بنادیا، پیام تعلیم کے مضامین کے علاوہ انھوں نے بچوں کے ذوق کی بہت سی کتابیں لکھیں اور بچکانہ ادب کا بڑا ذخیرہ فراہم کردیا، ان سے تعلقات کا سلسلہ برابر قائم رہا، کبھی کبھی ملاقات بھی ہوجاتی تھی، گزشتہ دسمبر میں دلی میں ملاقات ہوئی تھی، کیا معلوم تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ ("م"، اگست ۱۹۷۴ء)

ندوی، معین الدین، شاہ

آہ شاہ صاحب!

جناب شاہ معین الدین احمد ندوی ناظم دارالمصنفین اور اڈیٹر معارف جو شاہ صاحب کے نام سے یہاں یاد کئے جاتے اب اپنے پاک دل، پاک ذات اور پاک صفات کے ساتھ آغوش رحمت الٰہی میں ہیں۔ ۱۳؍ دسمبر ۱۹۷۴ء کو جمعہ کے روز اپنے تمام روزمرہ کے معمولات میں مشغول رہے، دس بجے دن کو بال بنوایا، غسل کیا، کھانا کھایا، جمعہ کی نماز پڑھی، ڈھائی بجے تک عاجز راقم سے ملاقات رہی، اخبار پڑھتے پڑھتے سوگئے، گہری نیند سوئے، چار بجے اٹھے، اپنے ایک دیرینہ ہم جلیس مولوی عزیز الرحمٰن صاحب کے ساتھ بیٹھے باتیں کرنے لگے، عصر کی نماز کے لئے وضو کا پانی منگوایا، کرسی سے اٹھ کر وضو کے لئے اٹھنا چاہتے تھے کہ زمین پر گر گئے، خیال ہوا کہ بے ہوش ہوگئے ہیں، ان کے دوست ڈاکٹر عبدالحفیظ انصاری بلائے گئے تو انھوں نے اعلان کیا کہ وہ اللہ کو پیارے ہوئے، وہ نہ بیمار پڑے نہ سکرات کی تکلیف ہوئی، نہ کسی کو کچھ خدمت کرنے کا موقع دیا، ایسا معلوم ہو (کہ زمین پر سے یکا یک اٹھا لئے گئے اور دارالمصنفین کے در و دیوار کو اداس نہیں، بلکہ روتا چھوڑ گئے، ان کی وصیت کے مطابق ان کی میت، ان کے وطن ردولی دارالمصنفین کے کارکنوں اور ان کے قدر دانوں کے جلو میں لے جائی گئی، جہاں وہ چودھری خلیل احمد کی مسجد کے احاطہ میں سپرد خاک کئے گئے۔ **اللھم اغفر له و الرحمة و ادخله الجنة۔**

ان کی رحلت دارالمصنفین کے لئے حقیقی معنوں میں جانکاہ حادثہ ہے، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی نے دارالمصنفین کو چھوڑا تو مولانا مسعود علی ندوی کا انتظامی سلیقہ، مولانا عبدالسلام ندوی کی علمی شہرت اور اس ادارہ سے خود جناب شاہ صاحب کی شیفتگی بروئے کار رہی، عاجز راقم کو بھی اس کی خدمت میں گیارہ سال گزر چکے تھے، استاذی المحترم جناب سید صاحب خوش تھے کہ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی زندگی کے بعد کے دارالمصنفین کا نقشہ دیکھ لیا، ان کے بعد اس علمی تاج محل پر چودھویں چاند کی چاندنی تو نہیں چھٹکی، مگر یہ برقرار رہا، ۱۹۵۶ء میں مولانا عبدالسلام ندوی داغ مفارقت دے گئے، تو ایک بڑا خلا پیدا ہوا جو پُر تو نہ ہوسکا، لیکن دارالمصنفین کی علمی سرگرمیاں بدستور باقی رہیں، ۱۹۵۴ء میں مولانا مسعود علی ندوی کی صحت خراب ہوئی تو ۱۹۶۷ء تک ان کی علالت کا سلسلہ جاری رہا، اپنے انتظامی امور کا بار اس راقم کے دوش ناتواں پر ڈالا، وہ بھی خوش رہے کہ انھوں نے بھی اپنی زندگی کے بعد کا نقشہ، دارالمصنفین دیکھ لیا، مگر شاہ صاحب کی وفات سے دارالمصنفین ایک زبردست آزمائش میں مبتلا ہے، وہ دارالمصنفین کی دونسلوں کی جلا کے تر شے ہوئے ہیرے بن گئے تھے، اور اس کی انگوٹھی میں نگینے کی طرح جڑے ہوئے تھے اب یہ نگینہ نکل گیا، تو انگوٹھی بے رونق ہورہی ہے، ان کی جگہ کو پر کرنے والا اب کوئی نہیں، دارالمصنفین اپنی زبان حال سے یہ کہہ رہا ہے، موت العالم موت العالم۔

وہ پچاس سال پہلے ۱۹۲۴ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فارغ ہوکر دارالمصنفین آئے، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کو قلم پکڑنا سکھایا، پھر تو یہ مضمون نگار بنے، شعر، ادب کے ادا شناس بھی، صحابہ کرامؓ کے سوانح نگار بھی، مورخ اسلام بھی، دین رحمت کے شارح بھی، معارف کے اڈیٹر بھی اور جو کرسی علامہ شبلیؒ نے حضرت سید

صاحب کو عطا کی تھی، اس پر ناظم دارالمصنفین کی حیثیت سے بٹھائے گئے تو شبلی و سلیمان کی علمی روح و روایت کو برقرار رکھنے میں اپنی ساری علمی و ادبی صلاحیتیں صرف کیں۔

حضرت سید صاحب ان کے ادب و انشا کے معترف رہے، انھوں نے دارالمصنفین کے سلسلۂ صحابہؓ کی تین جلدیں لکھیں جو اچھی زبان کی وجہ سے بہت پڑھی گئیں، وہ اردو شعر و ادب کے کسی پہلو پر کچھ لکھ دیتے تو یہ اس صنف کا قابل قدر اضافہ جاتا، ان کے مضامین ''اردو شاعری میں ہندو کلچر اور ہندوستان کے طبعی و جغرافی اثرات'' اور ''اردو زبان کی لسانی، علمی اور تمدنی حیثیت'' سے بڑی ادبی و تحقیقی رہنمائی ہوئی، جگرؔ، اصغرؔ، حسرتؔ، اور اقبالؔ پر جو ناقدانہ مضامین لکھے، وہ ادبی حلقے میں بہت پسند کئے گئے، ان کے ادبی مقالات کے مجموعہ نقوش ادب کو اردو کے تنقیدی ادب میں اہم جگہ حاصل رہے گی، تاریخ اسلام پہلے بھی بہت لکھی گئی، مگر ان کی چار جلدیں اپنے موثر اور دل نشین انداز کی وجہ سے اس برصغیر میں بہت مقبول ہوئیں، یہ یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہیں، دارالمصنفین کی مطبوعات میں سیرۃ النبیؐ کے بعد ان ہی کی مانگ بہت زیادہ ہے، اسلام اور عربی تمدن ایک عربی کتاب سے ترجمہ ہے، مگر محض ان کے اسلوب کی وجہ سے اصل سے کم نہیں، دین رحمت میں اسلام کی رواداری اور فراخدلی کو کچھ ایسے دلکش پیرایہ میں پیش کیا کہ اس کے ہندی ترجمے کی اجازت کئی جگہ سے مانگی گئی، آخر میں انھوں نے حیات سلیمان کی تکمیل برسوں کی محنت کے بعد کی، اس کی اشاعت پر ہر طرف سے داد و تحسین ملی، اور حیات شبلی ہی کے پایہ کی تصنیف قرار دی گئی، معارف میں ان کے کچھ مضامین ابھی چند مہینے پہلے مسائل حاضرہ پر شائع ہوئے، جو اس قدر پسند کئے گئے کہ ان کے ترجمے عربی زبان میں بھی کئے گئے۔

شبلی کا ایجاز، سلیمان کا وقار، پھر ان کی انفرادی سلاست، روانی، شگفتگی اور پختگی ان کے اسلوب کا امتیازی رنگ ہو گیا تھا، وہ اپنی تحریروں کی بے ساختگی میں عالمانہ رنگ اور عالمانہ رنگ میں وزن اور وزن میں نکھار پیدا کرتے رہے، اپنی تصنیف و تالیف میں دبستان شبلی کے انداز بیان اور مسلک کا پورا لحاظ رکھتے، اس کی نگرانی رفقائے دارالمصنفین کی تحریروں پر بھی رکھتے، مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کو بھی ان کی ادبی خوش مذاقی اور تصنیفی خوش سلیقگی پر بڑا بھروسہ تھا، مولانا کی مشہور اور مقبول کتاب اقبال کامل کو جامع اور دلنشین بنانے میں ان کا بڑا حصہ رہا، میری تحریروں میں بڑی بے تکلفی سے ترمیم کر دیتے، جس کو غور سے پڑھ کر میں خوش ہو جاتا، ان کو اپنی تحریر کو دکھانے میں لذت ملتی، اگر پسند کر لیتے تو اسی کو اپنی محنت کا اصلی صلہ سمجھتا، پھر فکر نہ ہوتی، کہ کوئی اور کیا رائے رکھے گا۔

معارف کے معیار کو برقرار رکھنے میں اپنی دوسری تصنیفی سرگرمیاں قربان کیں اور اس کے ہر مضمون کی نوک پلک کو شروع سے آخر تک درست کرتے، بعض اوقات پورے مضمون کو از سر نو لکھ دیتے، حک و اصلاح اور حشو و زائد کو دور کرنے میں، ان کو بڑی مہارت تھی، معارف میں ان کے شذرات شوق سے پڑھے جاتے، حضرت سید صاحب نے ان کو پڑھ کر داد دی کہ اب ''س'' اور ''م'' میں کوئی فرق نہیں رہا، ملک کے اخبارات و رسائل میں برابر نقل ہوتے رہتے، کبھی ان کے لکھنے میں ان کا لب و لہجہ تیز و تند ہو جاتا، مگر ان کے شگفتہ انداز بیان کی وجہ سے تلخی پیدا نہیں ہونے پاتی، بلکہ ان کی سخت رائے مخلصانہ اور تعمیری سمجھی جاتی، اہم شذرات کے چھپنے سے پہلے مجھ کو بھی دیکھنے کا اتفاق ہوتا، اس کے تیز لب و لہجہ سے اختلاف کرتا تو وہ اپنی شرافت، اخلاق سے اس میں ترمیم کر دیتے، مگر خفا ہو کر کہتے کہ میری مصلحت اندیشی سے ان کا قلم رکتا ہے اور کبھی ترمیم کرنے پر یہ کہہ کر راضی نہ ہوتے کہ بعض اوقات تیز اور بے لاگ تحریر بھی مفید پڑ جاتی ہے اور ضرور مفید پڑتی رہی۔

آٹھویں صدی ہجری میں صابریہ چشتیہ سلسلہ میں شیخ احمد عبدالحقؒ بہت ہی برگزیدہ بزرگ گزرے ہیں، ردولی ضلع بارہ بنکی میں ان کا مزار اقدس اب بھی مرجع عوام و خواص ہے، شاہ صاحب ان ہی کے خاندان سے تھے۔ شکل وجیہہ، چہرہ باوقار، اور داڑھی منور پائی تھی، پروفیسر خلیق احمد نظامی نے علی گڑھ میں ان کو پہلی دفعہ دیکھا تو بے ساختہ بول اٹھے کہ میں مولانا سید سلیمان ندوی کو تو نہیں دیکھ رہا ہوں، وہ جس مجلس میں شریک ہوتے محبت و عزت کی نظروں سے دیکھے جاتے، بڑی پاکیزہ زندگی بسر کی، مگر اپنی پاکیزگی میں خشکی نہیں آنے دی طبیعت کی شگفتگی برابر باقی رکھی، جب ۳۵ سال کے رہے ہوں گے، تو دوسری بیوی سے بھی دائمی جدائی ہو گئی، ۷۲ سال کی عمر پائی، مگر بقیہ زندگی تجرد میں گزار دی، دارالمصنفین ہی کو عروس بنا کر اس سے ہمکنار رہے، معاملات کی صفائی کا بڑا خیال رکھتے، کسی کا حق اپنے ذمہ باقی نہیں رہنے دیتے، نجی زندگی میں تکلیف اٹھا کر ضرورت مندوں کی مالی امداد کرتے رہتے، دارالمصنفین کے ایک برآمدہ اور دو کمرے کی چھوٹی سی عمارت میں پوری زندگی بسر کر دی، کہتے کہ اس میں جو راحت ملتی ہے وہ اپنے گھر میں بھی محسوس نہیں ہوتی، نماز باجماعت کی پابندی کا بڑا اہتمام کرتے، تہجد گزار بھی تھے، مناجات مقبول اور کلام پاک کی تلاوت روزانہ کرتے، موت سے سینہ سپر ہونے کے لئے ہمیشہ تیار رہے، حج کا شرف دو بار حاصل کیا، آخری بار گزشتہ سال حجاز کے شاہ فیصل کی طرف سے زیارت خانۂ کعبہ کے لئے مدعو کئے گئے، مرکزی حکومت ہند نے ان کے علم و فضل کا اعتراف عربی میں سند اور خلعت عطا کر کے کیا، اس سلسلہ میں ان کو تین ہزار سالانہ وظیفہ بھی ملتا تھا، مگر تین سال سے زیادہ نہ پاسکے ساری عمر دارالمصنفین سے جو قلیل تنخواہ ملتی اسی پر قانع رہ کر بسر کی، مدرسہ عالیہ کلکتہ اور جامعہ ملیہ دہلی سے ان کو خاطر خواہ تنخواہ پر مدعو کیا گیا، لیکن دارالمصنفین کی خدمت ہی کو اپنی زندگی کا اصل مقصد قرار دیا، سفر کرنے سے بہت

گھبراتے، ملک کے مختلف حصوں سے صدارت اور بالمعاوضہ مقالہ خوانی کی دعوت آتی رہی، مگر ان کو قبول کرنے سے انکار کرتے رہے، آخر عمر میں مولانا زکریا سہارنپوری سے بیعت ہوگئے تھے، تو اورادو وظائف میں بھی مشغول رہنے لگے تھے، گزشتہ نومبر میں ان کی خدمت میں سہارنپور حاضر ہوئے تھے، وہاں سے واپسی پر اپنے وطن ردولی میں انفلوانزا میں مبتلا ہوگئے تھے، صحت یاب ہوکر دارالمصنفین واپس آئے تو چھٹے روز اپنے قدردانوں کو روتا چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوگئے، موت ان کے پاس ضرور آئی مگر دبے پاؤں آئی، منھ چھپائے ہوئے آئی اور ان کے بربطِ ہستی کے سرور سے محض ہم آغوش ہونے آئی۔

راقم دارالمصنفین ان کے یہاں آنے کے گیارہ سال بعد آیا، مگر ہم دونوں چالیس سال تک لازم ملزوم، ایک جان دو قالب بلکہ عرض و جوہر بن کر رہے، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا کہ کون ملازم ہے، کون ملزوم، کون جان ہے اور کون قالب، امیر خسرو کا ایک بہت ہی مشہور شعر ہے، جس میں انھوں نے من وتو اور جان تن کی تفریق مٹا کر من دیگرم تو دیگری کا، سوال ہی ختم کردیا ہے، ہم دونوں دارالمصنفین کی زندگی میں اسی طرح رہے، انھوں نے اپنے کو میرے لئے اور میں نے اپنے کو ان کے لئے مٹایا، ان کے غصے پر مجھ کو پیار آتا اور میرے پیار پر ان کو غصہ آتا، ان کو کبھی زیادہ جھلاہٹ آجاتی تو تھوڑی دیر کے بعد ہی معذرت کرتے جس میں اظہار ندامت کے بجائے غیر معمولی محبت ہوتی، اس کو میں اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ سمجھتا رہا، وہ دارالمصنفین کے ناظم ضرور تھے، مگر نظامت کے سارے فرائض میرے ذمہ کررکھا تھا، وہ خوش رہتے کہ میرے کام میں کوئی دخل نہیں دیتے، مگر میری خوشی اس کوشش میں رہتی کہ کوئی کام ان کے مزاج کے خلاف نہ ہو، ان کی حوصلہ افزائی ہوتی اور میری عملی سرگرمی وہ کوک دے دیتے تو میں گھڑی کے پرزوں کی طرح متحرک رہتا، وہ دارالمصنفین سے کچھ دنوں کے لئے باہر چلے جاتے تو مجھ کو محسوس ہوتا کہ وہ میری ساری علمی قوت اپنے ساتھ سمیٹ کر لیتے گئے ہیں، وہ گھر جاتے تو میرے لئے بے قرار رہتے، ان کی چہیتی لڑکی ان سے کہتی کہ وہ اپنے ساتھ اپنی روح کو بھی کیوں نہیں لاتے، مجلس انتظامیہ کے بعض ارکان کہتے کہ ہم دونوں مل کر ایک آدمی بنتے ہیں، دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوکر بے جان ہوجاتے ہیں، چالیس برس تک ہم دونوں کی یہی مثالی زندگی رہی، وہ اس دنیا سے خوش گئے ہوں گے کہ مجھ سے ان کو شکایت نہیں ہوئی، اور مجھ کو فخر ہے کہ میری ذات سے ان کو آخر وقت تک کوئی تکلیف نہیں پہنچی، مگر اب ان کے بعد اپنی بقیہ زندگی میں اپنی زبان حال سے کہتا رہوں گا۔

نہ دماغ ہے، نہ فراغ ہے، نہ شکیب ہے، نہ قرار ہے

وہ میرے لئے سب کچھ تھے، افسراعلیٰ، محترم بزرگ، عزیز بھائی، مشیر، رفیق کار ہمدم رمساز، دوست اور کیا نہیں، اب وہ نہیں رہے، تو میں اپنے کو کچھ بھی نہیں پاتا،

فریاد کہ غم دارم و غم خوار ندارم

اقبال کا خیال تھا کہ سوگواری کی ظلمات میں مرنے والوں کی یادوں کی، جبین اسی طرح چمکتی رہتی ہے، جس طرح اندھیری رات میں تارے چمکتے رہتے ہیں، معلوم نہیں کب تک میری آنکھیں دیکھتی رہیں گی کہ وہ آرہے ہیں، جارہے ہیں، خدا جانے کب تک میرے کان سنتے رہیں گے کہ وہ پکار رہے ہیں الجھ رہے ہیں، الجھ کر میری باتوں کو مان رہے ہیں، ان کی وجہ سے میرے لئے دارالمصنفین کی ہر صبح حسین اور ہر شام رنگین تھی، مگر اب ان کے بعد اس کی خاموش فضا بڑی غمگین اور اس کی سونی رات کی تاریکی، انتہائی اندوہ گیں ہوگئی ہے، اس کے احاطہ میں شام آتی ہے تو میرا دل مفلس کا چراغ بن کر بجھا بجھا سا رہتا ہے، استاذ المحترم حضرت سید صاحب نے لکھنا پڑھنا تو سکھایا تھا، ماتم کرنا نہ سکھا سکے تھے، کیسے لکھوں کہ آہ! بزم شبلی کی قندیل کی آخری شمع بجھ گئی، سلیمان کی امانت کا بار اٹھانے والا آسمان پر اٹھایا گیا، دارالمصنفین کی شاندار روکو سینے سے لگائے رکھنے والا سپرد خاک کردیا گیا، اور اپنے ایک ہمراز، ہم مشرب اور ہم پیالہ کی تنہائی اور بے چارگی پر دارالمصنفین کے پھول پتے، شجر اور حجر رونے کے لئے چھوڑ گئے، حالی نے اپنے استاد غالب کی وفات کے بعد بزم سلطانی تخت خاقانی، راح ریحانی، عقل رمانی، اور حسن کنعانی کو فانی پاکر ہستی کو محض سراب اور طلسم خیال پایا تھا، اب سے پہلے حالی کے ان جذبات کو محض شاعرانہ تخیل سمجھتا تھا، مگر اب محسوس ہوتا ہے کہ یہ کیفیات حقیقت بھی بن جاتی ہیں، کاش میں تھوڑی دیر کے لئے بھی متمم بن نویرہ بن جاتا تو جس طرح وہ اپنے بھائی کی موت پر مرثیہ لکھ کر خود رویا، اور گلی گلی گھوم کر دوسروں کو رلایا، اسی طرح میں بھی پر درد نوحہ لکھ کر آتا اور لوگوں کو رلاتا۔

خوں شد دلِ خسرو زنگہداشتن راز چوں ہیچ کسے محرم اسرار ندارم

دارالمصنفین کے مستقبل کی شب تاریک اور بیم موج و گرداب سے گھبرا اٹھا تو اضطرابی کیفیت میں دو تین روز لکھنؤ جاکر مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ رہا، صحبت اولیاء اللہ میں جو تاثیر ہوتی ہے وہ ان کی مجلس میں پائی، ان کی حوصلہ افزائی سے بڑا سہارا ملا ان کے ساتھ مولانا عبدالماجد دریا بادی اور مولانا حافظ عمران خاں ندوی نے دارالمصنفین کی دیرینہ روایات کو برقرار رکھنے کے سلسلہ میں باہمی مشورے کئے وہاں سے ردولی آیا، مرحوم کی لڑکی اور ان کے اعزہ کو دیکھ کر پھر غم امنڈ پڑا، ان کی قبر دیکھی نہ جاسکی، حضرت شیخ عبدالحق کی لحد مبارک پر حاضری دی، فاتحہ پڑھتے وقت سکون قلب کی دعا مانگی، اس وقت وہاں کے سجادہ نشین جناب شاہ آفاق احمد صاحب سے ملاقات ہوئی، جنھوں نے مجھ کو دیکھتے ہی کہا:

اک عمر کا ساتھی چھوٹا ہے صبر آتے آتے آئیگا

یہ سن کر پھر غم تازہ ہوگیا، مگر انھوں نے یہ شعر بھی سنایا:

بہ گیتی گر کسے پایندہ بودے — ابوالقاسم محمدؐ زندہ بودے

اس مشہور شعر سے سوزشِ دل پر تسکین کے کچھ چھینٹے پڑے۔

انھوں نے علامہ شبلی اور سید صاحبؒ سے زیادہ عمر پائی، مگر اس وقت دارالمصنفین کو ان کی سربراہی اور رہنمائی کی شدید ضرورت اتنی ہی تھی جتنی کہ ایک محاذ پر ایک جوان سپہ سالار کی ہوتی ہے، اس لئے ان کی اچانک رحلت جوانمرگی سے کم المناک نہیں، دارالمصنفین اپنے سوزسینہ کے داغ سے بے چین اور درد وغم سے فگار ہوکر فلک سے کہہ رہا ہے کہ کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتے کوئی دن اور مگر مصلحت خداوندی اور مشیت ایزدی کا دامن تھام کر اسی کی بارگاہ میں اب صرف یہی دعا کرنا ہے کہ وہ اپنی خدا ترسی، دینداری، نیک نفسی، فرض شناسی اور اوصاف کی پاکیزگی کی بدولت کوثر کی موجوں اور تسلیم کی لہروں سے سیراب ہوں، آمین ثم آمین، الوداع اے شبلی کے علمی لشکر کے آخری رجز خواں! الوداع اے سلیمان کے کارناموں کے حدی خواں! الوداع اے جان جانان دارالمصنفین! سلام! شبلی کی روح کی طرف سے سلام! سلیمان کی سند علم کی طرف سے سلام! کارکنان دارالمصنفین کی طرف سے سلام! اور ہاں ایک مہجور مغموم، محزوں، خستہ دل اور شکستہ خاطر رفیق کار کی طرف سے بھی سلام! ہزاروں سلام، لاکھوں سلام۔

(''ص ۔ ع''، جنوری ۱۹۷۵ء)

حسین، اعجاز، ڈاکٹر / مسیح الزماں، ڈاکٹر

ڈاکٹر اعجاز حسین رڈاکٹر مسیح الزماں

گزشتہ مہینہ میں ڈاکٹر اعجاز حسین سابق صدر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی کا انتقال حرکت قلب بند ہوجانے سے مظفر پور میں ہوگیا، جہاں وہ ممتحن بن کر گئے ہوئے تھے، ان کی میت الہ آباد لائی گئی، اپنی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رکھا تھا، اہم اور مفید کتابوں کے مصنف تھے، جن میں مختصر تاریخ ادب اردو اور نئے ادبی رجحانات وغیرہ زیادہ مقبول ہوئیں، اپنے شاگردوں میں بہت مقبول رہے، ان کی وفات سے اردو ادب ایک بہت ہی لائق مصنف اور خدمت گزار سے محروم ہوگیا، ان سے کچھ ہی روز پہلے ڈاکٹر مسیح الزماں ریڈیو شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی کی بھی وفات اچانک ہوگئی، اردو کی مرثیہ نگاری ان کا خاص موضوع تھا، ان کی عمر وفا کرتی تو اس صنف میں ان کا ادبی کارنامہ بڑا قابل قدر ہوتا، وہ پروفیسر مسعود حسن رضوی سابق صدر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے داماد تھے، جن کے لئے اس کبرسنی میں یہ سانحہ بڑا ہی جانکاہ ہوگا۔

دعا ہے کہ خدا اردو ادب کے ان دونوں خدمت گزاروں کو غریق رحمت کرے، آمین ثم آمین۔

(''ص ۔ ع''، مارچ ۱۹۷۵ء)

عثمانی، ظفر احمد، مولانا

مولانا ظفر احمد عثمانی

۸/ دسمبر ۱۹۷۴ء کو نامور عالم مولانا ظفر احمد عثمانی تھانوی نے ۸۵ سال کی عمر میں وفات پائی وہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حقیقی بھانجے اور ہم زلف تھے، ان کی ولادت ۱۳۱۰ھ میں دیوبند میں ہوئی، ان کے والد شیخ لطیف احمد عثمانی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے عزیز تھے، ان کی ابتدائی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں ہوئی، پھر حکیم الامت نے ان کو تھانہ بھون بلالیا، یہاں فارسی کی تکمیل اور عربی کی کچھ کتابیں پڑھیں، مولانا تھانوی سے بھی مثنوی مولانا روم اور عربی کے چند اسباق پڑھے، یہاں سے مولانا نے ان کو مدرسہ جامع العلوم کانپور بھیج دیا، پھر مظاہر العلوم سہارنپور جاکر تعلیم مکمل کی، ۱۳۳۸ھ میں یہیں مدرس مقرر ہوئے، وہ تھانہ بھون میں درس وافتا کی خدمت پر بھی مامور رہے۔ ۱۳۴۹ھ سے رنگون گئے، جہاں درس وتدریس کے علاوہ وعظ وارشاد کا بھی مشغلہ جاری رکھا، مولانا ۱۳۵۸ھ میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے استاذ دینیات مقرر ہوئے، یہاں ایک مدرسہ اشرف العلوم قائم کیا، اس میں بلامعاوضہ درس دیتے تھے، ۱۹۵۴ء میں دارالعلوم ٹنڈوالہ یار (سندھ) میں شیخ الحدیث ہوئے اور آخر تک اسی سے تعلق رہا۔

درس وتدریس کے علاوہ تصنیف وتالیف کا بھی سلسلہ جاری رکھا، اردو عربی میں بہت سی کتابیں لکھیں، حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ سے گہرے تعلقات تھے، معارف میں بھی ان کے عالمانہ مضامین شائع ہوتے رہے، حکیم الامت کے اکثر مواعظ قلمبند کئے، ان کی تفسیر بیان القرآن کا خلاصہ کیا، ان کا سب سے اہم کارنامہ بیس جلدوں میں علاء السنن کی ترتیب وتالیف ہے، اس میں حنفی مذہب کی موید حدیثوں کو بالاستیعاب جمع کرکے اس غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا ہے کہ حنفی مسلک کی تائید میں احادیث بہت کم ہیں، حواشی میں محدثین اور علمائے فن کی تحقیقات درج ہیں، اس کا مقدمہ مستقل کتاب کی صورت میں علیحدہ ایک جلد میں شائع ہوا ہے، یہ جلدیں حضرت تھانویؒ کی نگرانی میں دیدہ ریزی، وسعت نظر اور تحقیق وتنقید سے مرتب کی گئی ہیں، حنفیہ نے جو مسائل قرآن سے مستنبط کئے ہیں ان کو احکام القرآن کے نام سے جمع کرنا شروع کیا تھا، شعبہ تاریخ ادبیات پنجاب یونیورسٹی لاہور کی فرمائش پر خودنوشت حالات نور النظر فی آثار الظفر کے نام سے لکھے، شعر وسخن کا بھی اچھا ذوق رکھتے تھے، اردو عربی دونوں میں دادسخن دیتے رہے۔

وہ علوم ظاہر کی طرح علوم باطن سے بھی مالا مال تھے، حضرت مولانا تھانویؒ سے رشتہ وقرابت ہی کا نہیں بلکہ دینی وروحانی تعلق بھی تھا ان کی نماز جنازہ بھی پڑھائی تھی،

کئی بار حج و زیارت کعبہ کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔

مزاج میں تشدد و انتہا پسندی کے بجائے حق پسندی تھی، ہر طبقہ و مسلک کے لوگوں کے لئے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے، جائز اور حق بات کہنے میں جماعتی عصبیت مانع نہ ہوتی تھی، اس کا ثبوت ان کی معرکۃ الآرا تصنیف اعلاء السنن ہے، ان کے بقول اس میں تقلید جامد کے بجائے تحقیق فی التقلید سے کام لیا گیا ہے، جس مسئلہ میں حنفیہ کی دلیل کمزور تھی، وہاں صاف طور سے ضعف دلیل کا اعتراف کیا گیا ہے اور دوسرے مذاہب کی قوت کو تسلیم کیا گیا ہے۔

ان میں علم و سیاست دونوں کا اجتماع تھا، علمی و دینی خدمات کے ساتھ ساتھ سیاسی سرگرمیوں میں بھی نمایاں حصہ لیتے تھے، تحریک پاکستان کے بڑے حامی تھے اور اس کے لئے ملک کے مختلف مقامات کا دورہ بھی کیا، تحریک کے شباب کے زمانہ میں اعظم گڑھ بھی تشریف لائے تھے، یہاں ان کا بہت بڑا جلوس نکالا گیا تھا، جس کی یاد یہاں کے لوگوں میں اب تک باقی ہے، مولانا علم و عمل اور اخلاق و عادات میں علمائے سلف کا نمونہ تھے، ایسے صاحب کمال اور بلند پایہ علماء مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ قوم و ملت اور علم و دین کے اس خادم کے درجات بلند کرے اور اپنے دامن رحمت میں جگہ دے۔ (''ض''، مارچ ۱۹۷۵ء)

اسحاق، محمد، حکیم

حکیم محمد اسحاق مرحوم

اعظم گڑھ کے مشہور طبیب حاجی حافظ محمد اسحٰق گزشتہ مہینہ اللہ کو پیارے ہوئے، ان کی عمر پچاسی سال سے زیادہ تھی، دہلی کے طبیہ کالج میں طب کی تعلیم پائی، حکیم محمد اجمل خاں کے شاگرد تھے، ان کے مطب میں ان کے نسخے لکھا کرتے تھے، دہلی سے آکر اعظم گڑھ میں طبابت شروع کی، اپنے فن میں بڑی مہارت حاصل کرلی تھی، مریضوں کا علاج دلسوزی سے کرتے، علاج اور نسخہ نویسی میں فن کی روایت اور وقار کا پورا لحاظ رکھتے، کسی مریض کو یہ شکایت نہیں ہوئی کہ ان کی تشخیص غلط تھی، یا ان کا نسخہ صحیح نہیں تھا، شہر کے ہندو مسلمان کے ہر طبقہ میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے، شروع سے عمر کے آخر لمحہ تک کانگریسی رہے، ہر زمانہ میں کھدر پہننے کا اہتمام رکھا، ترک موالات، خلافت اور جمعیت العلماء کی تحریکوں میں نمایاں حصہ لیتے رہے، مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بیعت بھی ہوگئے تھے، دارالمصنفین سے بڑا قلبی لگاؤ رکھا، شروع میں یہاں ہفتہ میں تین روز آتے، ان کی طبی مشغولیت بڑھی تو ہفتہ میں دو روز آنے لگے، آخر میں اپنی کبرسنی کے باوجود ہفتہ میں ایک روز ضرور آتے، ان کا یہ معمول ساٹھ سال تک رہا، دارالمصنفین کی مسجد میں برسوں تراویح پڑھائی، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود علی ندوی اور شاہ معین الدین احمد ندوی کو ان کے طریقہ علاج پر کامل اعتماد رہا، بولتے کم تھے، مگر ان کی زبان سے جو کچھ نکلتا، اس میں وزن، وقار اور اخلاص ہوتا، ان کی وفات سے شہر ایک ممتاز طبیب اور دارالمصنفین ایک بہت ہی مخلص، وضعدار اور کریم النفس قدرداں سے محروم ہوگیا، اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا کرے، آمین۔ (''ص۔ع''، مارچ ۱۹۷۵ء)

فیصل، شاہ

شاہ فیصل

۲۴/ مارچ ۱۹۷۵ء کو سعودی عرب کے شاہ فیصل شہید کردیئے گئے، اس حادثہ جانکاہ سے اسلامی ممالک میں اندوہ و غم کا ایک بادل امنڈ پڑا کہ آہ! اسلام کا پاسبان، اسلامی حمیت و غیرت کا نگہبان، اسلامی موانست و یگانگت کا حدی خوان نہیں رہا، اسلامی زندگی کی قوت پنہاں کو آشکار، مسلمانوں کے سینوں میں عزائم کو بیدار اور ان کی نگاہوں کو تلوار کرنے والا جاتا رہا۔

مدتوں کے بعد بڑی مشکل سے اسلامی دنیا میں ایک دیدہ ور پیدا ہوا، جس کے مقاصد جلیل تھے، جس کی ادائیں دلفریب اور نگاہیں دلنواز تھیں، اسلام کے اس بطل حریت نے صرف گیارہ سال حکومت کی، مگر اس کے سارے کارنامے اسلامی تاریخ کے زریں باب بن کر رہیں گے، سعودی عرب کو دنیا کے متمول ترین ملکوں کی صف میں لا کھڑا کیا، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کو سج دھج کر فردوس نگاہ بنادیا، پٹرول کو جنگی اسلحہ سے زیادہ مہلک تسلیم کراکے دنیا کی اہم طاقتوں کو بھی اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کیا، حاتم طائی کی افسانوی سخاوت کی شہرت کو بلند کرکے عربوں کو اپنے مالی امداد سے سربلند اور سرخرو کیا، بچھڑے ہوئے مسلمان ملکوں کی دست گیری کرکے ان کو آگے بڑھنے کا حوصلہ دلایا، اسلامی بینک، اسلامی سکریٹریٹ، اسلامی خبر ایجنسی اور اسلامی سربراہ کانفرنس کی روح رواں بن کر یہ خاموش پیام دیا کہ توحید کی امانت سینے میں رکھنے والے اخوت کا بیان اور محبت کی زبان بن کر دہر کو اسم محمد سے اجالا کردیں، اور جب کتاب ملت بیضا کی شیرازہ بندی سے پھر سے ہو رہی تھی تو آیات الٰہی کے اس نگہبان کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی مصلحت سے اپنے پاس بلالیا، جہاں رخ در رخ محمدی سے کہہ رہا ہوگا:

؎ اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے (''ص۔ع''، اپریل ۱۹۷۵ء)

کرشنن، رادھا، ڈاکٹر

ڈاکٹر رادھا کرشنن

ڈاکٹر رادھا کرشنن گزشتہ ماہ اس دار فانی کو چھوڑ گئے، علم وفن کے فروغ دینے

میں ان کا نام رابندرناتھ ٹیگور، جسے۔ سی۔ بوس۔، اور سی۔ وی۔ رمن جیسی قدآور شخصیتوں کے ساتھ لیا جائے گا ان کی وفات سے اس ملک میں بیسویں صدی کا ایک زریں علمی عہد ختم ہوگیا۔

وہ ہندو ادب کے بہت بڑے شارح تھے، فلسفہ میں بھی ان کا علم بہت گہرا تھا، اس لئے ہندو مذاہب کے عقائد وتفکرات میں فلسفیانہ موشگافی کرتے رہے، وہ گسان جیمس وارڈ، ولیم جیمس اور برٹنڈ رسل کے فلسفے سے متاثر تھے،تو خودان کی علمی گہرائی اور فلسفیانہ ژرف نگاہی کا اعتراف طامسن من اور ایچ جی۔ ویلس جیسے مشاہیر نے کیا، کلکتہ، میسور اور مدارس کی یونیورسٹیوں میں استاد رہنے کے بعد آکسفورڈ یونیورسٹی کے بھی پروفیسر رہے، اندھرا اور بنارس یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر بھی بنائے گئے، بیرونی ممالک نے بھی مختلف قسم کے اعزاز اور انعامات سے نوازا جس سے ہندوستان کی عظمت وفضیلت میں بھی اضافہ ہوا، ان کی متعدد تصانیف میں ایک کتاب ''مذہب کی حکومت جدید فلسفہ'' پر ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ جدید فلسفہ خود مذاہب سے متاثر ہے، وہ بڑے خوش بیان اور باوقار مقرر بھی تھے بولتے تو معلوم ہوتا کہ فضا میں سیم وزر کی آواز کھنک رہی ہے اسی کے ساتھ سامعین محسوس کرتے کہ ان سے اخلاق اور روحانیت کا پیام مل رہا ہے۔

پنڈت جواہر لال نہروان کی قابلیت اور اعلیٰ سیرت سے متاثر تھے، اس لئے ان کو علم کی سند سے اٹھا کر سیاست کی مسند اعلیٰ پر بٹھایا، وہ پہلے نائب صدر جمہوریہ ہند پھر صدر بنائے گئے، جس سے خودان دونوں عہدوں میں وزن اور وقار پیدا ہوگیا، افلاطون فلسفی حکمران کو پسند کرتا تھا، ڈاکٹر رادھا کرشنن افلاطون کے سیاسی خواب کی تعبیر تھے، بلند پایہ فلسفی، مخلص محبّ وطن اور مدبر ہونے کے ساتھ مذہب کو اپنی زندگی کی بیساکھی بنانے میں شرمندگی محسوس نہیں کی، ظاہری وضع قطع ہی سے مذہبی معلوم ہوئے، قشقہ بھی لگاتے، تقریروں میں بلاتکلف وید کے اشلوکوں کے حوالے بھی دیتے تھے، ان کی زندگی یہ پیام چھوڑ گئی ہے کہ مذہب سیاست میں مشکلیں پیدا نہیں کرتا، بلکہ اس سے سیاست میں روحانیت اور حقانیت پیدا ہوجاتی ہے، البتہ مذہب میں سیاست لائی جاتی ہے تو مذاہب اور سیاست دونوں میں ریاکاری اور عیاری آجاتی ہے۔

مذہب کے منکرین اسی کو ہر قسم کے جنگ و جدل کا سبب قرار دیتے ہیں مگر سیاست سے مذہب کو الگ کرنے کے بعد سیاست کے دیو بے زنجیر کی بدولت ہیروشما، برلن، ہنگری، چین، بنگلہ دیش، ویٹ نام اور کمبوڈیا میں کیا کچھ دیکھنے میں نہیں آیا، سیاسی سامریوں ہی کے لئے تو طرح طرح کے اسلحہ کی ایجاد ہورہی ہے، جن کے استعمال سے چنگیز اور ہلاکو کی ساری وحشت اور بربریت ماند پڑگئی ہے مگر ان میں، ع ایک مجرم نہیں مذہب کی طرف داری کا، سیاست کی جادوگری میں اخلاق کی بلندی کے بجائے چال بازیوں اور فریب کاریوں کے ایسے نمونے ملتے ہیں کہ:

فرزیں سے بھی پوشیدہ ہے شاطر کا ارادہ

میکاولی کی مکارانہ سیاست سے یورپ پہلے تو چیخ اٹھا تھا، مگر یورپ ہی میں نہیں بلکہ ہر جگہ کی سیاست کی، موڑ پر میکاولی دکھائی دیتے ہیں، کیا انسانیت کی نجات ان میکاولیوں ہی سے ہے؟۔

انفرادی یا قومی زندگی اعلیٰ اخلاق کے بغیر راکھ کا ڈھیر ہے آلات، بخارات، امریکی اور روسی مدنیت کے فتوحات سے انسان چاند اور مریخ تک پہنچ سکتا ہے مگر ان سے اعلیٰ اخلاق کی تعمیر اور ترویج نہیں ہوسکتی، اس کی تعمیر ملک یا ضمیر یا عقل کے قانون سے بھی نہیں ہوسکتی، ملک کا قانون انسان کو اس کے نفس کی برائیوں پر ملامت کرنا نہیں سکھا سکتا، ضمیر یا عقل کے قانون سے فہم و ادراک کی انارکی کا اندیشہ لاحق رہتا ہے، کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ ایک جو کچھ اپنی عقل یا ضمیر کے مطابق کرے اور دوسرا بھی وہی کرے جب تک یا احساس نہ کہ کوئی قوت پنہاں یا مواخذہ اور باز پرس کرنے والی ہستی ضمیر یا عقل کے ہر گوشہ کو ہر طرف سے جھانک رہی ہے، یا دل کی تہ کے ہزار پردوں کو بھی دیکھ رہی ہے، وجدان، ضمیر کی آواز، اور حاسہ کے تقاضے کا نام لے کر کچھ نہیں کیا جاسکتا ہے، جس کے بعد حسن و قبح خیر وشر اور نیک و بد کا معیار قائم کرکے اس میں یکسانیت پیدا کرنا آسان نہیں، مثلاً اگر کمیونزم کے حامی کو انسانی عقل کے مطابق قرار دے سکتے ہیں، تو ہپی ازم کے موئد اس کو خارج از عقل وحاسہ سمجھنے کے لئے تیار نہیں،

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے　　　جو عقل کا غلام جو وہ دل نہ کر قبول

اسی لئے اخلاق کا اصلی ماخذ خدا کا قانون قرار دیا گیا ہے:

ہے وہ قوت کہ حریف اس کی نہیں عقل حکیم

خدا کے قانون ہی کا نام مذہب ہے، اور بہترین مذہب وہ ہے جس کا اخلاقی دباؤ اپنے ماننے والوں پر اتنا ہو کہ وہ ان کے قدم کو اخلاق کی صراط مستقیم سے بھکنے نہ دے، اسی لئے اخلاق کی موثر تعلیم سیاستدانوں کے بجائے ان مذہبی پیشواؤں اور روحانی ہادیوں کے یہاں ملتی ہے جن کے اخلاق حسنہ کو ان کے ایمان کی پہچان قرار دی گئی ہے، اور جن کی زبان پر نہیں، بلکہ دلوں کی گہرائیوں میں یہ خیال چھایا رہتا ہے کہ قیامت کی ترازو میں حسن خلق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہیں ہوگی، اور وہی قوم کی مدنیت کی روح میں عفت اور اخلاق میں طہارت پیدا کرکے اس کو تباہی اور بربادی سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔

مہاتما گاندھی کی وفات ہوئی تو دارالمصنفین کے ایک رکن رکین مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم بے ساختہ کہہ اٹھے تھے کہ آہ! اب ان کے ساتھ ہندوستان کی پالی ٹکس سے آتھیکس بھی جاتا رہا، کیا ان کا یہ کہنا صحیح نہیں تھا؟ بھکرننگل اور دامودر دہلی کے بند سے ہمارے ملک میں بڑی مادی ترقی ہوئی، کاش یہاں کے لوگوں کے اخلاق بھکرننگل اور

دامودر دہلی کے بند کی تعمیر ہوتی رہتی تو آج یہ ملک اس بحران میں مبتلا نہ ہوتا، جس سے حکومت کے مخالفین فائدے اٹھا کر اس کے خلاف تحریکیں چلا رہے ہیں، مگر ان مخالفوں کو بھی ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے کہ وہ پالی ٹکس میں آ تھیکس لا رہے ہیں، محض اقتدار کا ایک ہنگامہ ہے جس میں دراصل،

نہ زندگی نہ محبت، نہ معرفت نہ نگاہ۔

(''ص۔ع''، مئی ۱۹۷۵ء)

افغانی، ابوالوفاء، مولانا

مولانا ابوالوفاء افغانی

معارف کے قارئین مولانا ابوالوفاء افغانی کے نام سے اور کام سے بخوبی واقف ہیں ان کی پیدائش افغانستان میں ہوئی، لیکن تعلیمی مراحل ہندوستان میں طے ہوئے اور یہاں کے باکمال اساتذہ سے استفادہ کیا، زندگی کا بڑا حصہ حیدر آباد میں گزرا، عرصہ تک مدرسہ نظامیہ میں مدرس رہے، فقہ حنفی سے خاص مناسبت تھی اور امام ابوحنیفہ ان کے تلامذہ اور ائمہ احناف سے بے حد عقیدت تھی، لجنۃ احیاء المعارف العثمانیہ ان کی اس عقیدت کی گواہ ہے، انھوں نے قاضی ابو یوسف امام محمد اور شمس الائمہ سرخسی کی کتابیں ڈھونڈ کر جمع کیں، بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ مختلف نسخوں کا مقابلہ کیا، جان کاہی کے ساتھ ان کی تصحیح کی، حواشی لکھے، انڈکس بنائے اور حسن وخوبی کے ساتھ طباعت کا انتظام کیا، وہ پرانے مدرسوں کے پڑھے ہوئے تھے، لیکن نئے محققین بھی ان کا لوہا مانتے تھے، افسوس ہے کہ گزشتہ ماہ علم وتحقیق کی یہ شمع خاموش ہوگئی، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمتوں سے سرفراز فرمائے اور ان کے بیش بہا کاموں کے جاری رکھنے کا انتظام فرمائے۔

(''ع۔ق''، ستمبر ۱۹۷۵ء)

فاخری، محمد، مولانا

مولانا محمد شاہد فاخری

افسوس ہے کہ گزشتہ ماہ مولانا محمد شاہد فاخری نے وفات پائی، وہ الہ آباد کے مشہور مذہبی خانوادہ دائرہ شاہ اجمل سے تعلق رکھتے تھے، مذہبی کاموں کے ساتھ ان کو ملک کے سماجی اور سیاسی مسائل سے بھی دلچسپی تھی، وہ جمعیۃ علمائے ہند کے نائب صدر تھے، انھوں نے آزادی کی جدوجہد میں نمایاں حصہ لیا تھا اور قید وبند میں بھی مبتلا ہوئے تھے، آزادی کے بعد بھی وہ ملک وملت کی خدمت میں لگے رہے اور اس راہ میں مشکلات و مصائب برداشت کرتے رہے، وہ دارالمصنفین کے کاموں کے بڑے قدرداں اور مداح تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور انھیں اپنی رحمتوں سے سرفراز فرمائے۔

(''ع۔ق''، اکتوبر ۱۹۷۵ء)

محمد میاں، مولانا

مولانا محمد میاں

مولانا محمد میاں سے قارئین معارف بخوبی واقف ہیں، ان کی علمی و عملی خدمات محتاج تعارف نہیں، وہ در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق کے قائل تھے، انھوں نے علمی شغف اور قومی خدمت کو اپنی زندگی میں سمو رکھا تھا، مطالعہ وتحقیق اور تصنیف و تالیف کے لئے سکون قلب اور فراغ خاطر ضروری سمجھا جاتا ہے لیکن محمد میاں نے سیاست کے پرشور ہنگاموں اور قید وبند کی پریشانیوں میں یہ منزل طے کی ہے، انھوں نے نہ کبھی دار ورسن کا خوف کیا نہ آبلہ پائی کا گلہ وہ مطالعہ میں مصروف ہوتے یا درس و تدریس میں منہمک یا خاندانی مشاغل میں مشغول، جیسے ہی جنگ آزادی کا بگل بجتا میدان میں نکل آتے، اور اس راہ کی ہر پریشانی خندہ پیشانی سے برداشت کرتے، وہ زندگی بھر اس روش پر چلتے رہے، سیاست کے ساتھ تقویٰ پر عمل بہت مشکل ہے، مگر انھوں نے سیاسی زندگی کو پاکیزگی سے کبھی جدا نہیں ہونے دیا، ان کی خدمت بے لوث اور ان کی سیرت بے داغ تھی، جماعتی زندگی میں کشمکش عام ہے، ہر شخص سیادت کا طالب ہوتا ہے لیکن ان کا ذہن اس عیب سے پاک تھا، انھوں نے اپنے مفاد پر جماعت کے مفاد کو ہمیشہ مقدم رکھا اور اس راہ ایثار میں ہر پریشانی کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتے رہے، افسوس ہے کہ علم وعمل اور ایثار وخدمت کا یہ مجسمہ دنیا سے رخصت ہوگیا، اللہ تعالیٰ انھیں اپنی رحمت سے سرفراز فرمائے، اور دوسروں کو ان کی پاکیزہ اور پرخلوص زندگی کو نمونہ عمل بنانے کی توفیق عطا فرمائے۔

(''ع۔ق''، نومبر ۱۹۷۵ء)

شورش کاشمیری

شورش کاشمیری

شورش کاشمیری کی وفات بھی بڑا سانحہ ہے، ان کی نشوونما آزادیٔ ہند کی جدوجہد کے دوران ہوئی، انھوں نے آزادیٔ وطن کے علم برداروں کے ساتھ زندگی کا بڑا حصہ گزارا، مولانا آزاد، عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ظفر علی خان سے انھیں گہرا تعلق تھا، ملک کی تقسیم سے پہلے ان کا قیام لاہور میں تھا، آزادی کے بعد وہ وہیں رہ گئے، لیکن انھیں وہاں کبھی اطمینان نصیب نہیں ہوا، ان کی زندگی کا بڑا حصہ جیلوں میں بسر ہوا، کبھی کبھی دار ورسن کا خطرہ بھی ہوا مگر ان کے پائے ثبات کو کبھی لغزش نہیں ہوئی وہ بڑے قادر الکلام شاعر اور پرزور خطیب تھے، ان کا زور بیان اور حسن کلام مولانا ظفر علی

خاں کی یاد دلاتا تھا، اعلان حق میں بڑی جری تھے اور اس راہ میں شدائد و مصائب سے کبھی ہراساں نہیں ہوئے، زندگی بھر تکلیفیں برداشت کرتے رہے، مگر کبھی باطل سے سمجھوتہ نہیں کیا، وہ دارالمصنفین کے بڑے ہمدرد اور بہی خواہ تھے اور اس کی خدمت و اعانت کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کو اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے اور ان کی حق گوئی کا پورا صلہ عطا فرمائے۔ (''ع۔ق''، نومبر ۱۹۷۵ء)

حسن، سید مسعود، پروفیسر

پروفیسر سید مسعود حسن

ابھی یہ سطور تمام نہیں ہوئی تھیں کہ پروفیسر سید مسعود حسن کی وفات کی اطلاع ملی، افسوس ہے کہ اردو کے پرانے خدمت گزار اٹھتے جارہے ہیں اور کوئی ان کی جگہ لینے والا نظر نہیں آتا ہے، مسعود صاحب نے درس و تدریس اور تصنیف و تالیف دونوں میدانوں میں بڑا قابل قدر کام کیا ہے، وہ صاحب زبان تھے اور صاحب قلم بھی، وہ بات کرتے تو ادب کے پھول جھڑتے، درس دیتے تو طلبہ ان کے علم سے مرعوب اور حسن بیان سے مسحور ہوجاتے اور قلم ہاتھ میں لیتے، تو تحقیق کے موتیوں سے کاغذ کا دامن بھر دیتے وہ سرسری مضمون نویسی کے عادی نہ تھے، لکھنے سے پہلے موضوع کے تمام پہلوؤں پر غور کرتے، سارا مواد جمع کرتے اور پوری چھان بین کے بعد قلم ہاتھ میں لیتے اور پھر تحقیق کا شاہکار پیش کرتے، ممکن ہے ان کے نتائج تحقیق سے کسی کو اختلاف ہومگر ان کی وسعتِ علم دقتِ نظر اور تلاش و تفکر سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا، وفور علم کے ساتھ وہ بڑے خلیق، وضع دار اور بامروت تھے، ہر مذہب و ملت کے لوگوں سے ان کے تعلقات تھے، یہی وجہ تھی کہ سب ان کے غم میں اشکبار تھے، وہ شیعہ تھے، مگر سنیوں میں بھی اتنے مقبول تھے کہ فرنگی محل کے نامور عالم مولانا ہاشم کی امامت میں سنیوں نے بھی جنازہ کی نماز پڑھی، اللہ ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے اور ان کے عزیزوں اور شاگردوں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (''ع۔ق''، دسمبر ۱۹۷۵ء)

ولی الدین، میر، ڈاکٹر

ڈاکٹر میر ولی الدین

افسوس ہے کہ یکم دسمبر ۱۹۷۵ء کو نامور فلسفی وصوفی اور مشہور مصنف و معلم ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب نے اپنے وطن حیدرآباد میں انتقال کیا، وہ اسی (۸۰) کے پیٹے میں تھے، ایک سال سے ان کی علالت کا سلسلہ جاری تھا، مرحوم کی تعلیم جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں ہوئی، یہاں سے فلسفہ میں ایم۔اے کرنے کے بعد لندن تشریف لے گئے، بیرسٹری کی تعلیم کے ساتھ کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفہ کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی، ۱۹۳۳ء میں جامعہ عثمانیہ میں فلسفہ کے استاذ مقرر ہوئے اور پھر اسی شعبہ کے صدر ہوکر ۱۹۶۰ء میں ریٹائر ہوئے اور کئی سال سے خانہ نشین ہوگئے تھے، تاہم تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے اردو اور انگریزی میں بہت سی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، انگریزی اور عربی کی بعض کتابوں کے ترجمے بھی کئے ان کو دارالمصنفین سے بھی بڑا تعلق تھا، ایک زمانہ میں ان کے مضامین معارف میں برابر شائع ہوتے رہے، ان کی پہلی کتاب ''فلسفہ کی پہلی کتاب'' یہیں سے چھپی تھی۔ یہ ریپوپارٹ کی پرائمر آف فلاسفی کا اردو ترجمہ ہے جس کو انھوں نے جامعہ عثمانیہ کے سلسلہ نصاب تعلیم کے لئے تیار کیا تھا، ''رسالہ اخلاقیات'' کے نام سے بھی ایک کتاب میٹرک کے نصاب کے لئے لکھی تھی، ''مراقبات'' ان کی اہم کتاب ہے، یہ بظاہر تو حزب و اوراد کی کتاب معلوم ہوتی ہے مگر نفسیات کے اس مسلمہ اصول کے مطابق کہ انسان پر جس قسم کے خیالات کا غلبہ ہوتا ہے، اسی قسم کے اثرات اس کے خارجی اور باطنی وجود میں بھی لازماً ظاہر ہوتے ہیں، انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ دینی تعلیمات اور ایمانیات وعقائد پر پختہ یقین و ایمان نہ صرف مذہبی عقیدت کے لحاظ سے بلکہ نفسیاتی اصول سے بھی انسان کی اخروی فلاح اور دنیاوی و مادی کامرانیوں کا ضامن ہے، گو بعض صوفیہ نے بھی اس نکتہ کی جانب اشارہ کیا ہے، مگر جدید نفسیات کی روشنی میں سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب ہی نے اس حقیقت کو شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا اصل موضوع فلسفہ تھا، مگر حقیقتاً وہ ایک مردمومن اور عارف باللہ تھے، اس لئے وہ فلسفہ کے برے اثرات و نتائج سے ہمیشہ محفوظ رہے، ان کی فلسفیانہ تحریریں بھی ایمان کی لذت و لطافت سے معمور ہوتی ہیں اور خالص فلسفہ کی کتابوں میں بھی پہلے قرآنی فلسفہ بیان کرتے ہیں، کیونکہ قلب حکمت ایمانی سے منور ہونے کے بعد عقل خودبین کا غلام نہیں بن سکتا، تصوف اور قرآنیات پر ان کی کتابیں بڑی پرمغز ہیں جیسے قرآن اور تصوف، قرآن اور تعمیر سیرت، علاج خوف وحزن اور انگریزی میں 'Love of Lord' وغیرہ ان میں اسلامی تصوف و احسان کی وضاحت کرکے تصوف اور صوفیہ پر اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے اور اس کی تائید میں قرآن و حدیث سے سندیں اور اکابر صوفیہ کے اقوال بھی پیش کئے گئے ہیں، ڈاکٹر صاحب کی ذات قدیم و جدید کا سنگم تھی، وہ جدید علوم وفلسفہ سے پوری طرح باخبر تھے، اس لئے ان کی کتابوں میں علمی و کلامی بحث و استدلال بھی ہوتا ہے اور وہ عام صوفیانہ کتابوں کی طرح ضعیف روایتوں اور حکایتوں سے بڑی حد تک خالی ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے انداز بیان کی شگفتگی و دلکشی نے فلسفہ کے خشک اور دقیق موضوع میں شعروادب جیسی لطافت و دلآویزی پیدا کردی ہے تصوف میں ذوقی اور

وجدانی باتیں ہوتیں ہیں اور کیفیات و ذوقیات کو تعقلات کی زبان میں ادا کرنا بہت مشکل ہوتا ہے مگر ان مباحث کو بھی وہ اس قدر سلجھے انداز میں بیان کرتے ہیں کہ عام قاری کو ان کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر صاحب صوم وصلوۃ کے نہایت پابند اور تہجد گزار تھے، تہجد کے بعد فجر تک اورادو وظائف میں مشغول رہتے، حضرت مولانا محمد حسین صاحبؒ حیدرآبادی سے بیعت و ارادت کا تعلق تھا، ان کے نام اپنی اکثر کتابیں بڑی عقیدت سے معنون کی ہیں، ڈاکٹر صاحب کی صحبت سے بھی بہت سے لوگوں کو فیض پہنچا، زندگی کے ہر دور میں ان کی پختہ دینداری قائم رہی، لندن کے مناظر بھی ان کی نگاہوں کو خیرہ نہ کرسکے، ان کا دماغ فلسفہ جدیدہ سے روشن تھا مگر دل ہمیشہ ایمان سے منور رہا، اب ایسے لوگ بہت کم ہوں گے جو حکیمانہ دماغ و فلسفیانہ ژرف نگاہی کے ساتھ دل آگاہ اور چشم بینا بھی رکھتے ہوں، اللہ تعالیٰ اپنے اس دیندار بندے اور علم کے خادم کو اپنی رحمت کاملہ سے نوازے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

(''ض''، جنوری ۱۹۷۶ء)

<u>ندوی، عبدالباری، مولانا</u>

مولانا عبدالباری ندوی

یہ شذرات لکھے جاچکے تھے کہ مولانا عبدالباری ندوی اور جناب مرزا مرتضیٰ بیگ وکیل اعظم گڑھ کے انتقال پر ملال کی خبریں ملیں، مولانا عبدالباری ندوی دارالعلوم ندوہ کے مایۂ ناز فرزند اور قدیم ترین یادگار تھے، بڑے نامور مصنف، فلسفی اور مترجم ہونے کے علاوہ دینداری کے بھی اعلیٰ نمونہ بن کر رہے۔ (''ص۔ع''، فروری ۱۹۷۶ء)

مولانا عبدالباری ندوی

(محمد نعیم صدیقی ندوی)

تلامذہ شبلی کی بزم دوشیں کا ایک اور چراغ جو مدت سے ٹمٹما رہا تھا گزشتہ دنوں چمنستان روزگار کی نوے بہاریں دیکھ کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا مولانا عبدالباری ندوی نے ۹۰ سال کی عمر میں اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کردی، دارالعلوم ندوہ نے اپنے دور اول میں جتنے نامور اور باکمال فرزند اور علم و دین کے مخلص خادم پیدا کئے ان میں مرحوم کو بہت نمایاں حیثیت حاصل تھی، مبدا فیاض نے ان میں علم وعمل کی بہت سی خوبیاں جمع کردی تھیں۔

امیٹھی ضلع لکھنؤ ان کا آبائی وطن تھا یہ کچھ اہل خاندان ستر کھ میں بھی آباد ہوگئے تھے، ان کے والد کے بڑے بھائی حکیم امجد علی صاحب اس جوار کے مشہور طبیب تھے، ان کے اثر سے مولانا کے والد حکیم عبدالخالق صاحب گدیہ ضلع بارہ بنکی میں طبیب مقرر ہوگئے وہیں ۱۸۸۹ء میں مولانا پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مولانا محمد ادریس نگرامی سے حاصل کی، پھر ۱۹۰۲ء میں ندوہ میں داخل ہوئے، علامہ سید سلیمان ندوی اس سے ایک سال قبل ندوہ آچکے تھے، جلد ہی دونوں کے درمیان دوستی ہوگئی، بساط شبلی کی حاشیہ نشینی نے اس دوستی میں اور پختگی پیدا کی اور زندگی بھر مخلصانہ روابط قائم رہے۔

علامہ شبلی کی قدر شناس نگاہ ابتدا ہی میں اس جوہر قابل پر پڑی اور انھوں نے ان کی تعلیم وتربیت پر خاص توجہ کی جس پر ان کے وہ خطوط شاہد ہیں جو مرحوم کے نام مکاتیب شبلی کی دوسری جلد میں شامل ہیں، ان میں شفقت و محبت بھی ہے اور علمی مشورے بھی، مرحوم کی ذہنی ترقیات پر اظہار مسرت بھی ہے اور ان سے بلند توقعات کی وابستگی بھی، ندوہ سے فراغت کے بعد کچھ عرصہ تک انگریزی زبان اور فلسفۂ جدید کی تحصیل میں مصروف رہے، اور ایسی صلاحیت پیدا کرلی کہ صاحب نظر فلسفی سمجھے جانے لگے، دارالمصنفین قائم ہوا تو کچھ عرصہ یہاں رفیق کی حیثیت سے قیام کیا، پھر دکن کالج پونہ میں عربی و فارسی کے استاد مقرر ہوئے اس کے بعد حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ کے شعبہ فلسفہ میں ان کا تقرر ہوا اور بہت عرصہ تک فلسفہ کا درس دیتے رہے، آخر میں کئی برس شعبہ دینیات کی خدمت بھی خوش اسلوبی سے انجام دی۔

مرحوم کی شخصیت قدیم و جدید کا سنگم تھی نئے اور پرانے تعلیم یافتہ دونوں کا احترام کرتے تھے، فلسفہ اور علم کلام میں ان کی قابلیت مسلم تھی، ان فنون کے وہ نکتہ سنج ناقد بھی تھے، اور دیدہ ور عالم بھی مرحوم کا قابل ذکر وصف یہ ہے کہ انھوں نے عام روش کے برخلاف فلسفہ کو الحاد و تشکیک کی تبلیغ کا آلۂ کار بنانے کے بجائے اس سے اسلام کے دفاع اور مستشرقین کے رد کا کام لیا، بقول مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، فلسفہ مولانا عبدالباری کے ہاتھ پر کلمہ پڑھ کر ایمان لے آیا ہے۔

وہ ایک مشاق استاد کے ساتھ اردو کے ایک بلند پایہ اہل قلم بھی تھے، انھوں نے ادب و انشا اور تصنیف و تالیف کا سلیقہ علامہ شبلی سے سیکھا تھا، پھر اپنی فطری ذہانت اور طباعی سے اس میدان میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے، ایک زمانہ میں ''عباری'' کے مخفف نام سے ان کے فلسفیانہ مضامین معارف میں شائع ہوتے تھے اور صاحبان علم و ذوق سے داد حاصل کرتے تھے، ان کی اس صلاحیت کی بناء پر استاذ الاساتذہ علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی کی تیسری جلد میں جو معجزات پر مشتمل ہے، مرحوم سے ''معجزات اور فلسفۂ جدیدہ'' کے موضوع پر ایک باب لکھوا کر شامل کیا، جو نہ صرف جدید علم کلام کا بہترین نمونہ ہے، بلکہ زبان و بیان وطرز استدلال کے اعتبار سے بھی بہت اہمیت کا حامل ہے، دارالمصنفین سے ان کو اس کی تاسیس کے وقت ہی سے بڑا قلبی تعلق

تھا، وہ سالہا سال اس کی مجلس انتظامیہ کے رکن رہے، یہاں سے ان کی کئی کتابیں شائع ہوئیں، جن سے اردو کے ذخیرہ میں قابل قدر اضافہ ہوا۔

فلسفہ کے ساتھ غیر معمولی شغف کے باوجود ان کے اندر شک و ارتیاب کی کیفیت کبھی نہیں پیدا ہوئی، البتہ منقولات کو اس طرح پیش کرتے تھے کہ عقلیت پسند بھی اس سے مطمئن ہوجائیں، بقول خود "نقل کی کوئی بات عقل کی کسوٹی پر پوری اترے بغیر مان لینا بڑی بے عقلی جانتا تھا"۔ لیکن آگے چل کر ان کے اندر ایک باطنی انقلاب رونما ہوا، چنانچہ مولانا حسین احمد مدنی سے بیعت کرلی مرشد سے استفادہ کے علاوہ مولانا تھانوی سے بھی تربیت کا تعلق رکھا، بالآخر راہ سلوک میں اتنا کمال حاصل کیا کہ خلافت کے مستحق قرار پائے، آخر میں روحانیت کا رنگ اتنا گہرا ہوگیا تھا کہ لکھنؤ میں اپنی کوٹھی کے ایک کمرہ میں گوشہ نشین ہوگئے اور موتوا قبل ان تموتوا کی عملی تفسیر بن گئے، انھوں نے مولانا تھانوی کے افکار و خیالات کو سلسلہ تجدید دین کے نام سے کئی جلدوں میں بڑے سلیقہ کے ساتھ مرتب کرکے شائع کیا ہے، اس سلسلہ کی کتابوں میں جامع المجددین خصوصیت کے ساتھ لائق مطالعہ ہے،

مرحوم کی تصنیفات کی فہرست مع سنین اشاعت حسب ذیل ہے:

مبادی علم انسانی (۱۹۱۸ء)، مذہب وعقلیات (۱۹۱۹ء)، برکلے (۱۹۱۹ء)، علم اخلاق (۱۹۲۳ء)، حدیقہ نفسیات (۱۹۲۸ء)، مقدمہ مابعد الطبیعات (۱۹۳۱ء)، اخلاقیات (۱۹۳۲ء)، طریق اور تفکرات (۱۹۳۲ء)، فلسفۂ نتائجیت (۱۹۳۷ء)، فہم انسانی (۱۹۳۸ء)، علمی نباتیات (۱۹۳۸ء)، تجدید تصوف وسلوک (۱۹۴۹ء)، جامع المجددین (۱۹۵۰ء)، تجدید تعلیم وتبلیغ (۱۹۵۱ء)، تجدید معاشیات (۱۹۵۵ء)، تفسیر نظام صلاح وفلاح (۱۹۶۴ء)۔

آخر زمانے میں مرحوم نے مذہب وسائنس کے نام سے ایک اہم کتاب لکھی تھی، مشہور ریاضی داں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے اس پر مقدمہ لکھا ہے، جس میں مولانا مرحوم کی بصیرت اور ژرف نگاہی کی داد دی ہے۔

مرحوم کی طبیعت میں حق پسندی بے حد تھی، جس بات کو صحیح سمجھ لیتے اس کو بے جھجک کہتے اور بلاخوف لومۃ لائم عمل کرتے، اس راہ میں کسی دوستی اور عزیزداری کی پروانہ کرتے، راقم الحروف کو اپنی ندوہ کی طالب علمی کے دور میں مرحوم کی خدمت میں بارہا حاضری کی سعادت نصیب ہوئی ہے میرے ساتھ ان کا برتاؤ ہمیشہ شفقت ومحبت کا رہا، لیکن اس کے باوجود رفتار وگفتار اور وضع ولباس میں اگر کوئی کوتاہی محسوس کرتے تو سختی کے ساتھ تنبیہ بھی کرتے، گفتگو میں علم کا وقار اور دین کا اخلاص نمایاں ہوتا اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کو اعلیٰ علیین میں مقام بلند عطا فرمائے۔ (مارچ ۱۹۷۶ء)

بیگ، مرتضی، مرزا

مرزا مرتضیٰ بیگ

جناب مرزا مرتضی بیگ اعظم گڑھ کے بہت ہی لائق، ممتاز اور وضعدار وکیل تھے، دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے اہم رکن بھی ایک عرصہ تک رہے، ان کی وفات کراچی میں ہوئی، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو اپنی رحمتوں اور برکتوں سے سرفراز رکھے، آمین۔

("ص۔ع"، فروری ۱۹۷۶ء)

احمد، نعیم، ڈاکٹر

پروفیسر ڈاکٹر نعیم احمد

افسوس ہے کہ گذشتہ ماہ پروفیسر ڈاکٹر نعیم احمد، صدر شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی انتقال کرگئے، وہ بڑے خلیق، ملنسار اور مرنجاں مرنج شخص تھے۔ ابھی وسط نومبر میں انھوں نے اپنے شعبہ میں توسیعی خطبہ دینے کے لیے مجھے مدعو کیا تھا مگر میں نے اپنی مشغولیت کی بنا پر اس وقت معذرت کرلی تھی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

("ص۔ع"، فروری ۱۹۷۶ء)

عبدالعلیم، ڈاکٹر

ڈاکٹر عبدالعلیم

ڈاکٹر عبدالعلیم سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور صدر اردو بورڈ دہلی کی اچانک وفات سے پورے علمی حلقہ کو دکھ ہے، ان کے خیالات کچھ بھی رہے ہوں، لیکن وہ اپنی شرافت طبع اور مرنجان مرنج رویے کی وجہ سے ہر حلقہ میں پسند کئے جاتے تھے، جہاں رہے ان کا وزن اور وقار رہا، دارالمصنفین سے ان کے تعلقات برابر خوشگوار رہے، مسلم یونیورسٹی کے عربی اور اسلامیات کے شعبوں کو ترقی دینے میں بھی ان کی خدمات برابر یاد کی جائیں گی، وہ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بہت ہی نازک دور میں بنائے گئے، ان پر نظر انتخاب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کی پڑی تھی، جو ان کو بہت محبوب رکھتے تھے، انھوں نے جامعہ ملیہ میں تعلیم پائی، ان کی وفات سے جامعہ ایک لائق فرزند علمی حلقہ ایک شریف اہل علم اور ملک ایک بہت ہی باوقار محبّ وطن سے محروم ہوگیا، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے، آمین۔ ("ص۔ع"، مارچ ۱۹۷۶ء)

صدیقی، محمد زبیر، ڈاکٹر

ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی

علمی اور اسلامی حلقے ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی سے خوب واقف ہیں، ان کا عربی

زبان اور اسلامی علوم کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان کے مقالات اور کتابیں اہلِ علم کے حلقہ میں قدر کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں، تدوین حدیث پر ان کی کتاب السیر الحثیث بڑی محققانہ سمجھی جاتی ہے، تصنیف و تالیف کے ساتھ ان کی زندگی کا بڑا حصہ تعلیم و تدریس میں گزرا، پہلے کئی برس لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی سے وابستہ رہے، پھر کلکتہ چلے گئے، اور تقریباً ۳۳ سال تک اسلامی تاریخ وتہذیب اور عربی و فارسی زبانوں کی تدریس وتحقیق میں مصروف رہے، عرصہ تک مدرسۂ عالیہ کے صدر، ایشیاٹک سوسائٹی کے نائب صدر اور ملک کی بہت سی یونیورسٹیوں اور علمی اداروں کے رکن بھی رہے، افسوس کے ۱۸/ مارچ کوعلم کا یہ چراغ گل ہوگیا، اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمتوں اورنوازشوں سے سرفراز فرمائے، اور ان کے عزیزوں، دوستوں اور شاگردوں کوصبر عطا فرمائے، اور ان کی راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (''ع۔ق''، اپریل ۱۹۷۶ء)

ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی

(پروفیسر مسعود حسن)

ایتھا النفس اجملی جزعا اِن ماتخذرین قد وقعا

اوس بن حجر کا یہ شعر سیکڑوں بار پڑھا ہوگا، لیکن استاذ محترم ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی کی وفات ہوئی تو معلوم ہوتا تھا کہ شاعر نے اسی موقع کے لئے کہا ہے۔

ڈاکٹر صاحب ایک متبحر عالم قرآن و حدیث کے بالغ نظر نکتہ شناس وسیع النظر محقق، تجربہ کار ماہر تعلیم، بے مثل، استاد اور بلند مرتبت اور پروقار شخصیت کے انسان تھے۔

مرحوم بیماری اور کبرسنی کی وجہ سے بے حد کمزور ہوگئے تھے، اور کئی سال سے خانہ نشین تھے، گزشتہ سال اپریل میں ان کی حالت ایسی تشویش ناک ہوگئی تھی کہ نرسنگ ہوم میں داخل کرنا پڑا، مگر اللہ نے دو ہفتے میں صحت یاب کردیا، اسی سال مارچ کے پہلے ہفتے میں گردے میں مہلک خرابی پیدا ہوئی۔ پانچ چھ دن بیہوش رہے، اور آخر ۱۸/ مارچ ۱۹۷۶ء یوم پنج شنبہ کی سہ پہر کو ساڑھے ۳ بجے ان کی شمع حیات ہمیشہ کے لیے گل ہوگئی، وفات کے وقت ان کی عمر تقریباً نوے سال تھی، اسی دن شب کو ساڑھے ۱۰ بجے جنازہ ان کی کوٹھی کے سامنے پارک سرکس میدان میں لایا گیا، عزیزوں، دوستوں، عقیدت مندوں اور شاگردوں کی کثیر تعداد ساتھ تھی نماز جنازہ کے بعد ان کا جسد خاکی قبرستان لے جایا گیا، اور تقریباً بارہ بجے مخلصوں کی دعائے نیم شبی کے درمیان سپرد خاک کردیا گیا۔

اے تیرہ خاک خاطر مہماں نگاہ دار کیں نور چشم ماست کہ در بر گرفتہ ای

اللہ ان کی تربت پر رحمت کے پھول برسائے، اور دنیا کی طرح عقبیٰ بھی انہیں اونچا مقام عطا فرمائے، ڈاکٹر صاحب اب ہمارے درمیان موجود نہیں۔ مگر ان کے عظیم الشان کارنامے ہمیشہ نظروں کے سامنے رہیں گے، اوران کی محبت و احترام سے ہمارے دل ہمیشہ لبریز رہیں گے۔

جمالک فی عینی وحبک فی قلبی

وذکرک فی فمی فاین تغیب

ڈاکٹر صدیقی صاحب صوبۂ بہار کے ایک معزز علمی اور مذہبی خانوادے کے چشم و چراغ تھے، آباؤ اجداد کا قدیم مسکن ایک چھوٹا گاؤں کمہار تھا، جو پٹنہ (بانکی پور) کے جنوب میں کئی میل کے فاصلے پر واقع ہے، خاندان کے بعض بزرگ پٹنہ سٹی کے ایک محلّہ منگل تالاب میں منتقل ہوگئے تھے، اوریہیں ان کی ولادت ہوئی، پدر بزرگوار، حافظ حکیم مولوی محمد اسحٰق صاحبؒ شہر کے مشہور طبیب اور مقدس بزرگ تھے، ان کا مزار اب تک مرجع خاص و عام ہے، ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی تعلیم والد ماجد کی نگرانی میں ہوئی، پھر درسیات کا اچھا خاصہ حصہ بخشی محلّہ پٹنہ کے مدرسۂ حنفیہ میں پورا ہوا، جسے قاضی عبدالودود صاحب کے والد ماجد قاضی عبدالوحید مرحوم نے قائم کیا تھا اور وہی اس کے اخراجات کے کفیل تھے، عرصہ ہوا یہ مدرسہ ختم ہوگیا ہے، یہاں انھوں نے طب یونانی کی تعلیم بھی حاصل کی، یہاں کے اساتذہ میں مولانا عبداللہ صاحب پنجابی، مولانا حکیم عبدالعزیز صاحب منطقی سہارنپوری اور مولانا حکیم محمد نجم الدین صاحب دانا پوری خاص طور سے قابل ذکر ہیں، ان ہی دنوں مولانا عبدالعزیز صاحب کا تقرر مدرسۂ عالیہ رام پور میں ہوگیا، اور ڈاکٹر صاحب اسلامیات، اور طب کی تکمیل کے لئے ان کے ساتھ رام پور بھیج دیئے گئے، یہاں دوسرے صاحب نظر اساتذہ کے ساتھ انھیں مولانا فضل حق رامپوری سے استفادہ کا بھی موقع ملا اس مدرسہ سے فراغت کے بعد وہ لاہور کے اورینٹل کالج میں داخل ہوئے، جو ان دنوں مشرقی علوم کا بڑا اہم مرکز تھا، اور جہاں پروفیسر محمد شفیع اور پروفیسر اقبال جیسے فضلائے روزگار موجود تھے، ۱۹۱۲ء میں انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان درجۂ اول میں پاس کیا، اور وطن واپس آگئے، ۱۹۱۴ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے میٹریکولیشن کے امتحان میں بھی اول درجہ میں کامیاب ہوئے، پھر بہار نیشنل کالج سے آئی۔اے اور بی۔اے کے امتحانات اور پٹنہ یونیورسٹی سے بی۔ایل اور ایم۔اے (فارسی) کے امتحانات امتیاز وتخصص کے ساتھ پاس کئے ایم۔اے کے امتحان میں ایسی شاندار کامیابی حاصل کی کہ حکومت بہار و اڑیسہ نے یورپ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ان کو ایک گرانقدر وظیفہ عطا کیا، انگریزی کی تکمیل کے بعد انھوں نے پٹنہ میں ایک سال وکالت کی۔ ان کے بچپن کے ایک رفیق کا، جن کا ذکر بعد میں آئے گا بیان ہے کہ کچھ دنوں انھوں نے اپنے والد مرحوم کی رہنمائی میں طبابت بھی کی، طب کی باقاعدہ تعلیم وہ پہلے ہی حاصل کرچکے تھے، علاج و معالجہ اور تشخیص امراض کی مشق، اور ایک کامل فن کی تربیت نے ان کے اندر تمام

صلاحیتیں پیدا کردیں جن کی بناء پر آگے چل کر طب ان کی تحقیقات علمی کا ایک خاص موضوع بن گیا۔

۱۹۲۶ء میں وہ ولایت تشریف لے گئے اور ان کی علمی مشغولیتوں اور تحقیقی کاوشوں کا سب سے اہم دور شروع ہوا، وہاں ان کا داخلہ کیمبرج یونیورسٹی کے کنگز کالج میں ہوا، انھوں نے یورپ کے مشہور مستشرق پروفیسر ایڈورڈ جی۔ براؤن کی نگرانی میں عربی زبان میں ''طبی ادب کا ارتقاء'' کے ارتقاء کے موضوع پر ایک محققانہ مقالہ لکھا جس پر یونیورسٹی نے ان کو پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری عطا کی، اس دوران میں پروفیسر براؤن کی تحریک اور اصرار پر عربی زبان کی ایک قدیم ترین اور اہم کتاب فردوس الحکمۃ بھی ایڈٹ کی اور اس پر عربی میں فاصلانہ مقدمہ لکھا یہ کتاب ۱۹۲۸ء میں ان کے ہندوستان آنے کے بعد شائع ہوئی، اور اس نے ان کو علمی دنیا میں ایک فاضل محقق کی حیثیت سے روشناس کیا۔

ابھی وہ ولایت ہی میں تشریف رکھتے تھے کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی وعلوم مشرقی کے پروفیسر اور صدر کی جگہ کے لئے ایک لائق استاد کی تلاش ہوئی، اور پروفیسر براؤن سے اس سلسلہ میں مشورہ کیا گیا۔ انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو نامزد کیا اور ڈاکٹر صاحب نے ہندوستان واپس آکر ۱۹۲۶ء میں اس عہدے کا چارج لیا، لکھنؤ یونیورسٹی میں ابھی دو سال بھی اپنے فرائض انجام نہیں دے سکے تھے کہ کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی و فارسی کے صدر کی جگہ ان کا تقرر ہوگیا، ڈاکٹر صاحب کی علمی اور تعلیمی زندگی کا سب سے بڑا اور اہم حصہ اسی یونیورسٹی میں گزرا ہے، یہاں رہ کر پورے ۳۳ سال تک (۱۹۲۹ء تا ۱۹۶۲ء) وہ نہ صرف یونیورسٹی بلکہ پورے صوبہ میں عربی، فارسی، اردو اور اسلامیات کی تعلیم کے اہم مسائل طے کرنے میں پیش پیش رہے، اسی زمانہ میں ان کی متعدد تصنیفات حلیۂ طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئیں، انھوں نے بے شمار علمی مقالے لکھے، ہندوستان اور بیرون ہند کی بہت سی علمی اور تعلیمی کانفرنسوں میں شرکت فرمائی، اور خطبات پڑھے، ان کے تبحر علمی کی بناء پر اسلامک کلچر اور شعبۂ عربی و فارسی کا اعتبار سارے ملک میں قائم ہوا، جب ۱۹۴۰ء میں سر عزیز الحق وائس چانسلر کلکتہ یونیورسٹی کی کوششوں سے یونیورسٹی میں اسلامی تاریخ و ثقافت کا نیا شعبہ قائم ہوا، تو اس کی صدارت بھی ڈاکٹر صاحب کو تفویض کی گئی، اور کئی سال تک وہ اس کے بھی صدر رہے، اس کے علاوہ وہ یونیورسٹی کی ملازمت کے زمانے میں سینٹ اور سنڈیکیٹ کے ممتاز ممبر بھی رہے، اور یونیورسٹی کے تمام کاموں میں نمایاں حصہ لیتے رہے، وہ یونیورسٹی میں ہمیشہ ہر حلقہ میں نہایت عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ بنگال کے علاوہ پورے ہندوستان کے علمی اور تعلیمی حلقے آپ کے فضل و کمال کے معترف تھے۔ حکومت ہند نے عربی، فارسی اور سنسکرت کے علماء کے اعزاز کے سلسلے میں جو اسکیم تیار کی، اس کے ماتحت عربی کا پہلا اعزاز ۱۹۵۰ء میں آپ کو ملا۔ یہ ایک سند علمی، ایک خلعت اور تاحیات وظیفہ پر مشتمل تھا، ۱۹۷۲ء میں آپ حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنے بعد ہندوستان اور ہندوستان کے باہر بے شمار شاگردوں، دوستوں، عقیدت مندوں اور عزیزوں کو سوگوار اور اشکبار چھوڑا اعزہ میں محترمہ بیگم صدیقی صاحبہ، تین صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں خاص طور پر ہمدردی کے مستحق ہیں، بیگم صاحبہ بہار شریف کے ایک ممتاز خاندان سے تعلق رکھتی ہیں، میں نے ڈاکٹر صاحب کو اکثر ان کے حسن انتظام اور ان کی خوش سلیقگی کے باب میں رطب اللسان پایا۔ بڑے صاحبزادے ڈاکٹر محمد خالد صدیقی کلکتہ کے مشہور اور کامیاب ماہر امراض قلب ہیں، منجھلے محمد شاہد صدیقی اور چھوٹے محمد کامل صدیقی امریکہ میں اعلیٰ تعلیم پارہے ہیں، دو صاحبزادیاں بڑی اور منجھلی شادی شدہ ہیں، سب سے چھوٹی جو ڈاکٹر صاحب کو اپنی اولاد میں بہت عزیز تھی، زیر تعلیم ہے۔

ڈاکٹر صاحب جہاں بھی رہے پوری یکسوئی اور جگر سوزی کے ساتھ علمی تحقیقی اور تعلیمی کام انجام دیتے رہے، وہ ملکی اور غیر ملکی علمی کانفرنس میں شریک ہوتے اور سارے ہندوستان کے علمی اداروں اور یونیورسٹیوں کے انتظامی اور تعلیمی امور میں مشورے دیتے جب تک ان کی صحت نے ساتھ دیا، ان خدمات کا سلسلہ جاری رہا، ان کے علمی انہماک کا یہ عالم تھا کہ ضعف بصارت کی وجہ سے جب لکھنے پڑھنے میں کافی دقت ہونے لگی، تب بھی ان کی علمی مشغولیت میں کوئی فرق نہیں آیا کسی شاگرد کو پکڑ لیتے اس سے کتابیں پڑھواتے، اس کو املا کراتے، اسے اپنی کار میں لائبریری لے جاتے، اور وہاں اس سے مدد لیتے، آخری زمانے کا واقعہ ہے، ایک دن راقم ان سے ملنے کے لئے گیا، اس وقت انھیں تنفس کی سخت تکلیف تھی، میں نے عرض کیا کہ بے کاری میں آپ کو بہت بے لطفی محسوس ہوتی ہوگی، انھوں نے فرمایا میں تو کام کرتا رہتا ہوں، پھر سامنے کی الماری پر ایک جرمن یا فرانسیسی کتاب کی دو ضخیم جلدوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے ''میں ان دونوں جلدوں کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہتا ہوں''، میں نے عرض کیا کہ اس میں تو بہت وقت لگ جائے گا۔ انھوں نے فرمایا ''اس میں صرف دو مہینے''۔ پیرانہ سالی کے باوجود ان کی یہ جوان ہمتی دیکھ کر مجھے اپنے آپ پر شرم آنے لگی۔

استاد مرحوم کی چند اہم تصنیفات وتالیفات کی فہرست درج ذیل ہیں:

(۱) فردوس الحکمۃ (فی الطب) یہ ابوالحسن علی بن سہل بن الطبری کی ایک اہم تصنیف ہے۔ جو ۸۵۰ھ میں لکھی گئی تھی یہ عربی میں طب کی قدیم ترین کتاب ہے، جس میں اس دور تک کے سارے طبی معلومات جمع کردیئے گئے ہیں اس کتاب کی طرف سب سے پہلے پروفیسر براؤن نے توجہ کی جو تاریخ، ادبیات، فارسی کے مصنف ہونے کے علاوہ عربی زبان میں طبی معلومات کے موضوع پر ایک ماہر مستشرق کی حیثیت

سے بڑی شہرت کے مالک ہیں، پروفیسر موصوف نے اس کتاب کا ایک حصہ ایڈٹ بھی کرلیا تھا، مگر بعض مجبوریوں کی بناء پر اس کام کو جاری نہ رکھ سکے۔

جب ڈاکٹر صاحب کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوئے تو انھوں نے یہ اہم کام ان کے سپرد کیا، یہ کام بڑا مشکل اور بے حد محنت طلب تھا کوئی اور ہوتا تو گھبرا جاتا، مگر ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کو نہ صرف ایڈٹ کیا اور اس پر فاضلانہ مقدمہ لکھا، بلکہ ایک ہندوستانی مخطوطے کی مدد سے اس کے نامکمل حصے کو مکمل بھی کیا یہ کتاب برلن سے گب میموریل ٹرسٹ کے زیر اہتمام ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی۔

(۲) **السیر الحثیث فی تاریخ تدوین الحدیث** ۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا وہ عربی مقالہ ہے، جوانھوں نے تاریخ علم الحدیث پر دائرۃ المعارف حیدرآباد کے ایک جلسہ میں ۱۹۳۹ء میں پڑھا تھا، اور جو بعد میں مطبع دائرۃ المعارف سے ۱۳۵۸ھ میں شائع ہوا تھا۔ اس مقالے میں فن حدیث کی تاریخ اور حدیث نبوی کے اہم مسائل سے بحث کی گئی ہے۔

(۳) **تاریخ نامۂ ھراۃ** ۔ یہ ہرات کی تاریخ ہے جسے فاضل مورخ سیف بن محمد بن یعقوب الہروی نے ملک غیاث الدین کرت کی فرمائش پر لکھا، یہ چنگیز خان کے حملۂ ہرات سے لے کر غیاث الدین کرت کے عہد تک کی ایک مستند تاریخ ہے، اس کا واحد مخطوطہ امپیریل لائبریری (موجودہ نیشنل لائبریری) کے بوہار سیکشن میں محفوظ تھا، لائبریری کے سابق ناظم خان بہادر خلیفہ محمد اسد اللہ مرحوم کی تحریک پر ڈاکٹر صدیقی صاحب نے بڑی محنت اور عرق ریزی کے بعد اس کو ۱۹۴۴ء میں ایڈٹ کیا اور اس پر انگریزی میں ایک بسیط اور پر از معلومات مقدمہ لکھا۔

(۴) اسٹڈیز ان عربک اینڈ پرشین میڈیکل لٹریچر (Studies in Arabic and Persian Medical Literature) یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کی ایک اہم تصنیف ہے، اس میں انھوں نے عربی اور فارسی زبانوں میں آغاز اسلام سے ابتدائے عہد بنی عباس تک طبی سرمایہ کا جائزہ لیا ہے، اور مختلف اہم طبی مسائل پر عالمانہ بحث کی ہے۔ ڈاکٹر بی۔سی رائے سابق وزیر اعلیٰ مغربی بنگال نے اس پر پیش لفظ لکھا ہے یہ کتاب کلکتہ یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔

(۵) حدیث لٹریچر۔ (Hadith Literature) طب کی طرح فن حدیث سے بھی ڈاکٹر صاحب کو گہری دلچسپی رہی ہے، چنانچہ انھوں نے اسی موضوع پر مختلف تحقیقی مضامین اردو اور انگریزی میں شائع کئے، سالہا سال کی اس محنت کے نتائج ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں محفوظ کردیئے ہیں، یہ انگریزی زبان میں فن حدیث کی سب سے پہلی مستند اور جامع کتاب کہی جاسکتی ہے، یہ کتاب بھی کلکتہ یونیورسٹی کے اہتمام سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی۔

(۶) دی سوشل پوزیشن آف وومین تھرو دی ایجیز (The Social Position of Women Through The Ages) یہ دراصل ڈاکٹر صاحب کے وہ تین انگریزی خطبات ہیں جو انھوں نے سر عبداللہ میموریل لکچرر کی حیثیت سے ۲۹؍ستمبر اور پہلی اور تیسری اکتوبر ۱۹۶۴ء کو کلکتہ یونیورسٹی میں دیئے تھے، پہلے خطبے میں عورت کی حیثیت زمانۂ قدیم میں، دوسرے خطبے میں اس کی حیثیت زمانۂ وسطیٰ کے مغربی معاشرے میں اور تیسرے خطبے میں ''عورت کی حیثیت اسلام میں'' پر مفصل بحث کی گئی ہے، یہ خطبات بھی کلکتہ یونیورسٹی کی طرف سے ۱۹۷۱ء میں شائع ہوگئے ہیں۔

اپنی پچاس سالہ علمی زندگی میں ڈاکٹر صاحب نے ہندوستان کے مختلف علمی رسائل و مجلّات مثلاً معارف، اسلامک کلچر، کلکتہ ریویو اور اسلام اور عصر جدید میں بے شمار علمی و تحقیقی مضامین لکھے جن سے ڈاکٹر صاحب کے علم کی گہرائی، تنوع اور مطالعہ کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اسلامیات کے متعلق ہندوستان کا شاید ہی کوئی ادارہ ہوگا جس سے ان کا گہرا تعلق نہ ہو، ندوۃ العلماء لکھنؤ، دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ندوۃ انجمن لائبریری پٹنہ، رام پور اسٹیٹ لائبریری سالار جنگ میوزیم، آصفیہ لائبریری حیدرآباد اور ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں وہ ہمیشہ سرگرم عمل نظر آئے، ہندوستان کی ان تمام یونیورسٹیوں سے جہاں عربی، فارسی اور اسلامیات کی تعلیم کا انتظام ہے، وہ ہمیشہ منسلک رہے، اور یہاں ان کے مشورے بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، ملک کے بہت سے اسلامی مدارس کے علمی اور انتظامی امور میں ڈاکٹر صاحب کے مشوروں کو بڑا دخل تھا، مدرسۂ شمس الہدیٰ پٹنہ اور مدرسۂ عالیہ کلکتہ کے نصاب تعلیم کی تشکیل میں انھوں نے بڑا حصہ لیا، مدرسۂ عالیہ کلکتہ سے تو تقسیم بنگال سے پہلے اور اس کے بعد برابر ان کا تعلق رہا، وہ اس کی گورننگ باڈی کے چیرمین اور مدرسہ بورڈ کے ممتاز رکن تھے، مشرقی علوم سے متعلق ہندوستان اور بیرون ہند کی کانفرنسوں میں وہ بالعموم شریک ہوتے تھے، بین الاقوامی اورینٹل کانگریس کے کئی جلسوں میں جو ایشیا اور یورپ کے مختلف ممالک میں منعقد ہوئے، انھوں نے شرکت فرمائی اور تحقیقی مقالے پڑھے، وہ ڈھاکہ کی اس آل پاکستان ہسٹوریکل کانفرنس میں بھی تشریف رکھتے تھے جس میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے خطبہ کے خلاف اردو دشمن عناصر نے بڑا نازیبا مظاہرہ کیا تھا، ڈاکٹر صاحب کو اس ناشائستہ حرکت سے بڑا قلق ہوا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کے اساتذہ کرام میں مولانا عبداللہ صاحب پنجابی، مولانا حکیم عبدالعزیز صاحب منطقی سہارنپوری، مولانا حکیم محمد نجم الدین صاحب داناپوری، مولانا فضل حق صاحب رامپوری، ڈاکٹر عظیم الدین (پٹنہ) پروفیسر محمد شفیع (لاہور) پروفیسر محمد اقبال (لاہور) پروفیسر اے۔ اے بیوان اور پروفیسر ایڈورڈ جی۔ براؤن کے نام ذہن میں محفوظ ہیں، جن اکابر وقت سے ان کو عقیدت تھی، یا جن کا نام وہ احترام کے ساتھ لیا

کرتے تھے، ان میں سر فخرالدین وزیر تعلیم بہار و اڑیسہ، سر عبداللہ سہروردی، سر حسان سہروردی، سر عزیزالحق، ڈاکٹر رادھا کرشنن، رینالڈ اے نکلسن، علامہ سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر ہربندر کمار مکھرجی اور ڈاکٹر پروفیسر بی۔ سی رائے خاص طور پر قابل ذکر ہیں، علامہ سید سلیمان ندویؒ کے علم و فضل اور اخلاق و کمالات کے بڑے قدردان تھے، اپنی عقیدت و نیازمندی کا اظہار اپنے اس مقالہ میں کیا ہے، جو معارف سلیمان نمبر میں شائع ہوا ہے، ہم عصروں اور ہم چشموں میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (الٰہ آباد) ڈاکٹر شیا ما پرشاد مکھرجی، پروفیسر ہمایوں کبیر ڈاکٹر سونیتی کمار چڑجی (نیشنل پروفیسر) ڈاکٹر نظام الدین، پروفیسر ہارون خان شروانی، مسٹر اے۔ اے فیضی، ڈاکٹر عابد حسین، ڈاکٹر عبدالعلیم سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، پروفیسر محمد محفوظ الحق سابق صدر شعبۂ عربی فارسی و اردو پریسیڈنسی کالج (کلکتہ)، ڈاکٹر عندلیب شادانی (ڈھاکہ)، ڈاکٹر محمد اسحٰق (کلکتہ)، مولانا عبدالعزیز میمن، مولانا فضل الرحمٰن باقی (غازیپور)، حکیم نورالحسن (پٹنہ)، حکیم مظہر امام صاحب رئیس پٹنہ اور قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹرایٹ لا (پٹنہ) سے، وہ بڑے گہرے دوستانہ روابط اور بے تکلفانہ مراسم رکھتے تھے، مؤخرالذکر دو بزرگ ان کے بچپن کے رفیق ہیں، اور خدا کا شکر ہے کہ دونوں بقید حیات ہیں۔ مظہر امام صاحب مدرسۂ حنفیہ میں ان کے ہم سبق تھے، اور ڈاکٹر صاحب جب پٹنہ جاتے ان سے ضرور ملاقات کرتے تھے، قاضی صاحب سے جو خلوص تھا، اس کا اندازہ ان الفاظ سے ہوتا ہے جو ڈاکٹر صاحب نے سر عبداللہ میموریل لکچر کے آغاز میں ان کی طرف خطبہ کا انتساب کرتے ہوئے لکھے ہیں، اور جس میں انھوں نے حافظ شیرازؒ کا یہ شعر بھی نقل کیا ہے:

محبک راحتی فی کل حین
وذکرک مونسی فی کل حال

ڈاکٹر صاحب مرحوم کے شاگردوں کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ یہاں اس کی مختصر سے مختصر فہرست بھی پیش نہیں کی جاسکتی ہے، اپنی چہل سالہ تدریسی زندگی میں انھوں نے اپنی نظر کیمیا اثر سے نہ معلوم کتنے مس خام کو کندن بنادیا، ان کے علم کی تابانی سے بہت سے ذرے آفتاب بن گئے، اور ان کی نگاہ جوہر شناس نے کتنے ہی موتیوں کو در شہوار بنادیا۔ یہ سطریں لکھتے وقت جن ارشد تلامذہ کے نام حافظہ کے افق پر ابھر رہے ہیں، صرف ان کی فہرست پیش خدمت ہے۔

مولانا حافظ عبدالحفیظ سابق پرنسپل مدرسۂ عالیہ ڈھاکہ، مولانا حافظ عبدالحیٔ سابق پرنسپل مدرسۂ چاٹگام، مولانا محمد اکبر ندوی ریڈر شعبۂ عربی و فارسی کلکتہ یونیورسٹی ڈاکٹر امام الدین صدر شعبۂ اسلامی تاریخ و ثقافت ڈھاکہ یونیورسٹی، پروفیسر محمد اسمٰعیل مولانا آزاد کالج کلکتہ، ڈاکٹر محمد صابر خان ممبر پبلک سروس کمیشن مغربی بنگال، خواجہ محمد یوسف ایڈوکیٹ ہائی کورٹ، سید ابوبکر حسنی (نہرو یونیورسٹی دہلی)، ڈاکٹر عطا کریم برق صدر شعبہ فارسی و عربی کلکتہ یونیورسٹی، مسٹر محمد عبدالمجید جنرل سکریٹری ایران سوسائٹی (کلکتہ) لکھنؤ یونیورسٹی سے وابستگی کے زمانہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بھی ڈاکٹر صاحب سے استفادہ کیا ہے۔ [1]

کلکتے میں جن بے شمار لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، ان میں ہیچمداں راقم السطور بھی داخل ہے، گوش آشنا تو شمس الہدیٰ پٹنہ کی طالب علمی کے زمانہ (۳۵-۱۹۳۲ء) سے تھا، ۱۹۳۷ء میں جب کہ پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں داخل ہوا، مختلف مجلسوں میں ڈاکٹر صاحب کو دور سے دیکھنے اور تقریریں سننے کا موقع ملا۔ اس وقت تک میں مغربی وضع و قطع کے لوگوں کے منہ سے قرآن و حدیث کی باتیں سننے کا عادی نہیں ہوا تھا، مدرسہ کی تعلیم کی کچھ خشونت ابھی باقی تھی، اس لیے شروع شروع میں ایسے موقعوں پر مدرسی عصبیت کی بناء پر دل میں انقباض پیدا ہوتا تھا، مگر شکر ہے کہ تشکیک کی یہ منزل بہت جلد طے ہوگئی، ۱۹۴۱ء کے وسط میں کلکتہ یونیورسٹی میں طالب علم کی حیثیت سے پہنچا تو ڈاکٹر صاحب کے حلقۂ درس میں شریک ہونے کی سعادت حاصل ہوئی، براہ راست استفادہ کا موقع ملا، ان دنوں وہ ایم۔ اے (عربی) میں ابن قدامہ کی نقدالشعر اور تاریخ اسلام کا درس دیا کرتے تھے، ان کی عربی دانی، تاریخ ادبیات عرب سے گہری واقفیت اور وسعت مطالعہ نے میرے دل پر سکہ جمانا شروع کیا، رفتہ رفتہ میں ان کا گرویدہ ہوگیا، ایم۔ اے کے بعد جب ان کی نگرانی میں علمی تلاش و تحقیق کا کام شروع کرنے کا شرف حاصل ہوا تو اور قربت بڑھی۔ اب میں ان کے دولت کدے پر بھی حاضر ہونے لگا۔ انھوں نے ابن حزم اندلسی کی جمھرۃ الانساب کے متن کی تہذیب و تصحیح اور ابن حزم کے حالات زندگی کی ترتیب کا کام میرے سپرد کیا، اس وقت تک جمھرۃ الانساب کے صرف دو قلمی نسخے موجود تھے، ایک کتب خانہ خدابخش پٹنہ میں اور دوسرا رامپور لائبریری میں، [2] میں نے اپنی بساط علم کے مطابق بڑی محنت کی اور دو سال تک اس کام میں لگا رہا، مگر چونکہ استاد محترم کی علمی تحقیق کا معیار بہت بلند تھا، اور وہ اپنے شاگردوں سے بھی یہی توقع رکھتے تھے، اس لیے میرے کام سے کچھ زیادہ مطمئن نہیں تھے، مگر جب میں نے چپکے چپکے ابن حزم اور اس کی جمھرۃ الانساب پر انگریزی میں ایک مقالہ لکھا اور وہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے جرنل میں شائع ہوگیا تو وہ مجھ سے بہت خوش ہوئے، علمی کاموں میں ان کی سخت گیری کا ایک واقعہ جو اسی زمانہ میں میرے ساتھ پیش آیا مجھے یاد ہے، میں امپیریل لائبریری (موجودہ نیشنل لائبریری) کے بوہار سیکشن کے دارالمطالعہ میں بیٹھا ہوا حسب معمول اپنے کام میں مشغول تھا، میری میز پر بہت سی کتابیں بے ترتیبی سے پڑی ہوئی تھیں، اس وقت میں اتفاق سے شعرالعجم میں کچھ دیکھ رہا تھا، اچانک استاد محترم میرے قریب آئے اور یہ کہتے

ہوئے کہ ’’ابھی آپ شعرالعجم ہی میں ہیں‘‘ گزر گئے، ان کا یہ جملہ مجھ پر بجلی کی طرح گرا۔ اس وقت وہاں کچھ اور لوگ بھی موجود تھے، اس لیے شرم اور ندامت سے عرق عرق ہوگیا، مگر اس جملہ نے میرے سمندشوق پر تازیانہ کا کام کیا، اور میں اپنی علمی جدوجہد میں پہلے سے زیادہ سرگرم ہوگیا۔ پھر وہ دن آیا جب استاد محترم نے مجھے ایک سرکاری کالج کی پروفیسری کے لئے منتخب کیا۔ چند ہی برسوں کے بعد انھوں نے اپنی کوششوں سے میرا رشتہ کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی و فارسی سے بھی قائم کردیا، اور میں وہاں بھی درس دینے لگا۔

۱۹۵۹ء کا ذکر ہے، مولانا سعید احمد اکبرآبادی پرنسپل مدرسۂ عالیہ کلکتہ مدرسہ سے شدرحال کا مصمم ارادہ کرچکے تھے، ان کی جگہ کا اعلان ہوا تو مدرسہ کے رموز و اسرار سے ناواقفیت کی بنا پر میں نے درخواست دینی چاہی، میں نے استاذ مرحوم سے اس سلسلہ میں مشورہ کرنا چاہا، مگر انھوں نے انکار کردیا، اس وقت ان کی اس بے التفاتی سے میرے دل کو تھوڑی سی تکلیف پہنچی تھی، مگر بعد کے واقعات نے بتایا کہ ان کا طرزعمل درست تھا، بہرحال میں نے درخواست دے دی اور میرا انتخاب بھی ہوگیا۔ انتخابی کمیٹی میں دوسرے ماہرین کے ساتھ استاذ مرحوم بھی تھے، پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہوئے، ابھی ایک ہی سال گزرا تھا کہ میں وہاں کی فضا سے بددل ہوکر مولانا اکبرآبادی کی طرح رخت سفر باندھنے پر مجبور ہوگیا، استاذ محترم مدرسے سے میری علیحدگی کے مخالف تھے ان کے اور بعض دیگر بزرگوں کے اصرار سے میں نے وہاں تقریباً چار سال گزارے، اس پوری مدت میں میرے خلاف شدید ہنگامے ہوتے رہے، حضرت الاستاذ ہمیشہ ہر آڑے وقت میں میری دستگیری فرماتے اور مفید مشورے دیتے مدرسے کے علاوہ پرنسپل کوارٹر میں پابندی سے تشریف لاتے، اور گھنٹوں مدرسہ کے پیچیدہ معاملات پر گفتگو کرتے، یہاں تک کہ میری حمایت میں وہ اہل مدرسہ کے سب وشتم کا نشانہ بھی بنے۔

۱۹۶۴ء کے اوئل میں خدا خدا کرکے مدرسہ سے رخصت ہوکر مولانا آزاد کالج میں واپس آیا تو کھویا ہوا سکون مجھے واپس ملا۔ اور ان علمی و ادبی منصوبوں کی طرف پھر توجہ کا موقع ملا، جن کا شیرازہ گزشتہ پانچ سال کے عرصہ میں بکھر گیا تھا، ع

دگر از سر گرفتم قصۂ زلف پریشاں را

حضرت الاستاذ کی ہم نشینی، ان کی ہمرکابی اور ان سے علمی استفادہ کے زیادہ مواقع نصیب ہوئے، اب وہ بھی یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش اور سینٹ اور سنڈیکیٹ کی کارروائیوں کے چکر سے سبک بار ہوچکے تھے، اس لئے اکثر باریابی کا موقع میسر آتا، پھر جب ان کی صحت خراب رہنے لگی، تو اکثر مزاج پرسی کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ وہ ہمیشہ اپنے مرض کی تفصیلات بیان کرنے سے اغماض کرتے اور اپنی دلچسپی کی خبریں پوچھتے، آخری دوتین برسوں میں عام صحت کے ساتھ حافظہ بھی کمزور ہوگیا تھا، آخری ملاقات اور گفتگو ۱۳؍جنوری ۱۹۷۶ء کی صبح کو ہوئی، وہ اندر کے برآمدے میں دھوپ میں بیٹھے ہوئے تھے، میری آمد کی اطلاع پاکر ملاقات کے کمرہ میں داخل ہوئے تو میں نے ان کو سہارا دینا چاہا مگر انھوں نے منع فرمایا میں نے مزاج پرسی کے بعد ان کے بچپن کے رفیق حکیم مظہر امام صاحب کا ایک پیغام سنایا اور عرض کیا کہ پٹنہ جارہا ہوں، اگر آپ انھیں کچھ کہنا یا لکھنا چاہیں تو میں خدمت انجام دے سکتا ہوں، میں نے جب پہلی مرتبہ حکیم صاحب کا نام لیا تو فرمایا ہاں حکیم مظہر امام میرے بچپن کے ساتھی ہیں، پھر دوتین منٹ بعد ان کا ذکر آیا تو فرمانے لگے، کون مظہر امام؟ کہاں کے رہنے والے، فروری کے مہینے میں میں ان کی خدمت میں حاضر نہ ہوسکا۔ مارچ کے مہینہ میں ان کی آخری علالت کی اطلاع مجھے بہت دیر سے ملی۔ ۱۷؍مارچ کی شب کو حاضر ہوا تو انھیں بستر مرگ پر بے ہوش دیکھا۔ ان کی تکلیف مجھ سے نہیں دیکھی گئی، دل ہی دل میں انھیں الوداع کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔ دوسرے دن مغرب سے کچھ پہلے جناب احمد سعید ملیح آبادی صاحب اور جناب خواجہ محمد یوسف صاحب میرے غربت کدے پر یہ غمناک خبر دینے کے لئے تشریف لائے کہ استاذ مرحوم رفیق اعلیٰ سے جاملے۔

افسوس! صد افسوس!! یہ ابر کرم، علم و دانش، اخلاق و مذہب، فلسفۂ وحکمت اور حقایق و معارف کے موتی بکھیرتا ہوا، سر سے گزر گیا، اور میں کم نصیب پوری طرح اس سے فیض یاب نہ ہوسکا۔

ابر رحمت دامن از گلزارِ من برچید و رفت
اندکے ہر غنچہ ہائے آرزو بارید رفت

(مئی ۱۹۷۶ء)

۱؎ گذشتہ صفحات میں بہت سے بزرگوں اور رفیقوں کے نام آئے ہیں ان میں سے کتنے اس دنیائے فانی سے رخصت ہوچکے ہیں جن کے متعلق مجھے معلوم نہیں ہے کہ وہ بقید حیات ہیں یا اللہ کو پیارے ہوگئے۔ مرحومین کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہوں احباب اور رفقاء میں کوئی قابل ذکر نام اگر درج ہونے سے رہ گیا ہو تو وہ معاف فرمائیں کہ یہ عمداً نہیں بلکہ سہواً ہے۔

۲؎ عرصہ ہوا یہ کتاب مصر سے شائع ہوگئی ہے۔

شہاب، مہر محمد خاں، میاں

میاں مہر محمد خاں شہاب

میاں مہر محمد خاں شہاب کی وفات بھی اہل علم کے حلقہ میں رنج و افسوس کے ساتھ سنی جائے گی، وہ مالیر کوٹلہ کے رہنے والے تھے، لیکن پچاس سال سے بمبئی میں

قیام تھا، اردو، فارسی، عربی اور انگریزی سے خوب واقف تھے، ہندی بھی جانتے تھے، اور مرہٹی سے بھی ایک حد تک مانوس تھے، ان کی زندگی علمی کمال کے ساتھ حسن اخلاق سے بھی آراستہ تھی، وقت کے التزام اور معمولات کی پابندی میں بے نظیر تھے، وہ بڑے منکسر المزاج تھے، لیکن کبھی خودداری پر آنچ نہیں آنے دیتے تھے، وہ خوردوں کے ساتھ بڑی محبت وشفقت کے ساتھ ملتے تھے، مگر اس کے باوجود خوردوں کے دل ان کی عظمت کے احساس سے لبریز رہتے تھے، زندگی بھر دوسروں کے ساتھ سلوک کرتے رہے، مگر چارگز کفن کے لئے بھی کسی کا احسان گوارا نہیں کیا، دارالمصنفین کے بڑے قدرداں تھے، اور اس کے کارکنوں سے بڑی محبت سے پیش آتے تھے، اللہ ان کی روح کو اپنی رحمت ومغفرت سے شاد فرمائے، اور ان کی صاحبزادی، دونوں صاحبزادے، عزیزوں اور دوستوں کو صبر عطا فرمائے، اور ان کی پاکیزہ زندگی کی تقلید کی توفیق نصیب فرمائے۔

(''ع۔ق''، اپریل ۱۹۷۶ء)

بھاگلپوری، فخر عالم، شاہ

شاہ فخر عالم بھاگلپوری

دینی اور علمی حلقوں میں شاہ فخر عالم بھاگلپوری کی وفات کی خبر بڑے رنج و افسوس کے ساتھ سنی جائے گی، ان کے نامور بزرگ سید ظہیرالدین ۱۲۷۹ھ میں دہلی آئے اور حضرت نظام الدین اولیاء کے حلقۂ ادارت میں داخل ہوئے، انھوں نے حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے پوتے مخدوم رکن الدین رکن عالمؒ سے بھی اکتساب فیض کیا، اس طرح اس خاندان میں چشتی اور سہروردی دونوں نسبتیں جمع ہوگئیں، بعد کو یہ خاندان دہلی سے بہار آگیا، اور حضرت سید علی محمد (ڈمڑیا بابا) نے بھاگلپور میں قیام فرمایا، اس وقت سے یہ لوگ یہیں آباد ہیں، اور ان کی خانقاہ ڈمریا بابا ان کے نام سے موسوم ہے، شاہ فخر عالم مرحوم اسی خانقاہ کے سجادہ نشین تھے، وہ دینی مشاغل کے ساتھ علمی مذاق بھی رکھتے تھے، ان کا کتب خانہ ان کے علمی ذوق کا شاہد ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کو اپنی عنایتوں اور رحمتوں سے شاد کام کرے، اور ان کے جانشین سید شاہ شرف عالم ندوی کو اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(''ع۔ق''، جون ۱۹۷۶ء)

صدیقی، محمد یوسف

جناب محمد یوسف صاحب صدیقی

جناب محمد یوسف صدیقی کی وفات بھی باعث رنج و ملال ہے، وہ ایم اے او کالج علی گڑھ میں ڈاکٹر حسین مرحوم کے کلاس فیلو تھے، تحریک ترک موالات کے اثر سے ۱۹۲۰ء میں وہ جامعہ آئے، کچھ عرصہ کے بعد معاشی مسائل میں لگ گئے، لیکن تحریک خلافت اور ترک موالات کا اثر ان کے دل سے کبھی نہیں گیا اسی اثر کے ماتحت وہ جماعت اسلامی میں شامل ہوئے اور قومی و ملی تحریکوں سے دلچسپی لیتے رہے، جامعہ کی محبت بھی برابر ان کے دل میں جاگزیں رہی اور اس کے اہم جلسوں اور تقریبوں میں حتی الامکان شریک ہوتے رہے، ان کی دینداری، خلوص اور وضع داری ہمیشہ یاد رہے گی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے پس ماندگان کو حق پسندی اور نیک روی کی توفیق نصیب فرمائے۔ (''ع۔ق''، جون ۱۹۷۶ء)

عبدالعزیز، مولانا حافظ

مولانا حافظ عبدالعزیز

یہ سطور ابھی زیر تحریر ہی تھیں کہ جامعہ اشرفیہ مبارکپور کے سربراہ اعلیٰ مولانا حافظ عبدالعزیز کی وفات کی اطلاع ملی ان کی عمر اسی سال سے متجاوز تھی، مگر ابھی خیال نہ تھا کہ وقت موعود اتنا قریب آچکا ہے، وہ بریلوی مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے، مگر مزاج میں اتنا اعتدال تھا کہ دوسرے حلقہ کے لوگوں سے بھی خندہ پیشانی اور فراخ دلی سے ملتے تھے، علمی مشاغل کے ساتھ عبادت وریاضت سے بھی خاص شغف تھا، راقم الحروف نے ۱۹۶۸ء کے موسم حج میں ہندوستانی سفارت خانہ کی ایک تقریب میں پہلی بار انھیں دیکھا تھا، اور ان کی سادگی، احتیاط، اور زاہدانہ زندگی سے متاثر ہوا تھا، اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ رحمت ومغفرت فرمائے، اور ان کے اہل وعیال اور عقیدت مندوں کو صبر جمیل اور دین وملت کی پرخلوص خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ (''ع۔ق''، جون ۱۹۷۶ء)

فارقلیط، محمد عثمان، مولانا

مولانا محمد عثمان فارقلیط

مولانا محمد عثمان فارقلیط سے معارف کے ناظرین بخوبی واقف ہیں، وہ پلکھنہ ضلع میرٹھ کے رہنے والے تھے، لیکن ان کی زندگی کا بڑا حصہ دہلی میں بسر ہوا، وہیں مدرسہ علی جان میں انھوں نے اپنی تعلیم مکمل کی، وہ مذہباً اہل حدیث تھے، مگر مزاج میں بڑا اعتدال تھا، حنفیوں کے ساتھ بڑا خلاملا تھا، اپنے اصول میں پختہ تھے، مگر تحزب اور گروہ بندی سے کوسوں دور تھے، دوسروں سے ایسی محبت اور یگانگت کے ساتھ پیش آتے کہ کسی کو غیریت کا احساس نہ ہوتا، وہ جماعتی عصبیت کے بجائے اسلام کی وسعت اور ہمہ گیری کو پیش نظر رکھتے تھے، تعلیم کے زمانہ ہی سے مناظرہ سے دلچسپی تھی، فراغت کے بعد کچھ عرصہ تک یہی مشغلہ رہا، اس سلسلہ میں دہلی کے علاوہ مدراس، کلکتہ اور ملایا تک

کے سفر کئے، ۱۹۲۹ء میں الجمعیۃ (سہ روزہ) کے سب اڈیٹر مقرر ہوئے، بلال احمد زبیری صاحب کے بعد ادارت کی پوری ذمہ داری ان کے سر پر آگئی، درمیان میں ''مدینہ'' میں بھی کچھ عرصہ کام کیا، تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لینے کی وجہ سے الجمعیۃ بند ہوگیا تو لاہور چلے گئے اور ۱۹۴۷ء تک ''زمزم'' کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد دہلی واپس آگئے اور اسی سال دسمبر میں روزنامہ الجمعیۃ کا اجرا ہوا تو وہ اس کے اڈیٹر مقرر ہوئے، ان کے مضامین قوت استدلال دلنشین طرز تحریر اور موثر انداز بیان کی وجہ سے بہت پسند کئے جاتے تھے، ۲۶ سال تک وہ برابر الجمعیۃ سے وابستہ رہے، ۱۹۷۳ء میں جب صحت نے بالکل جواب دے دیا اور ضعف حد سے زیادہ ہوگیا تو مجبوراً اس خدمت سے سبکدوش ہوئے، لیکن جمعیۃ علمائے ہند سے ان کا دلی تعلق برابر قائم رہا اور جمعیۃ بھی ان کی خدمت رہی، الجمعیۃ کے علاوہ دوسرے اخبارات و رسائل میں بھی کبھی کبھی لکھا کرتے تھے، لوگ ان کی جرات و بے باکی اور صداقت وحق گوئی کی بڑی قدر کرتے تھے، گزشتہ سال اردو اڈیٹر کانفرنس لکھنو میں منعقد ہوئی تو اس کی صدارت کے لئے ان کا انتخاب کیا گیا، ان کا خطبہ صداقت بہت پسند کیا گیا افسوس ہے کہ گزشتہ ماہ قوم وملت کا یہ خدمت گزار دنیا سے رخصت ہوگیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے عزیزوں، دوستوں اور قدردانوں کو صبر کی توفیق اور ان کے نقش قدم کو دلیل راہ بنانے کی ہمت عطا فرمائے۔ (''ع۔ق''، جولائی ۱۹۷۶ء)

شاہجہانپوری، سید محمد مہدی حسن، مفتی

مفتی سید محمد مہدی حسن شاہجہانپوری

(محمد نعیم صدیقی ندوی)

افسوس ہے کہ گزشتہ اپریل کی ۲۹؍تاریخ کو علم وعمل اور فضل وکمال کی ایک اور شمع فروزاں گل ہوگئی، مولانا مفتی سید محمد مہدی حسن شاہجہانپوری نے ۹۶ سال کی عمر میں بعارضہ فالج داعی اجل کو لبیک کہا مرحوم اس عہد میں اگلی صحبتوں کی چند بقیۃ السلف یادگاروں میں سے تھے، وہ اتباع سنت، تبحر علم، وسعت نظر، طہارت وتقویٰ زہد و ورع اور کتاب وسنت کی تفسیر وتعبیر میں یگانہ عہد تھے، دارالعلوم دیوبند کی مسند درس و افتا ان کے فیضان کمال سے ایک عرصہ تک بارونق رہی ہے اور سیکڑوں تشنگان علم ان کے منبع فیض سے سیراب ہوئے، وہ بلاشبہ معلومات کے دریا، حافظہ کے بادشاہ اور وسعت علم کی ایک نادر مثال تھے، ہر مجلس ومحفل میں یکساں ان کی قدر ومنزلت تھی، حدیث کے ساتھ فقہ کے جزئیات پر ان کی وسعت نظر مسلم خیال کی جاتی تھی۔

مفتی مہدی حسن مرحوم ۱۳۰۰ھ میں شاہجہاں پور کے ایک محلہ ملاخیل میں پیدا ہوئے، عربی وفارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد سید کاظم حسن اور بڑے بھائی سے حاصل کی بارہ سال کی عمر میں حفظ قرآن کی دولت سے مالامال ہوگئے، پھر وطن ہی کے مدرسہ عین العلم میں شیخ عبدالحق (خلیفہ مجاز مولانا رشید احمد گنگوہی) اور مفتی کفایت اللہ دہلوی جیسے اکابر اساتذہ فن سے صرف ونحو اور فقہ کی تحصیل کی، پھر جب مفتی کفایت اللہ صاحب مدرسہ امینیہ دہلی چلے گئے تو مرحوم کے والد نے ان کو بھی وہیں بھیج دیا، جہاں انھوں نے ملک کے منتخب اصحاب کمال کے سامنے زانوئے تلمذتہ کرکے فقہ، ادب، منطق، فلسفہ، اصول فقہ اور حدیث وغیرہ علوم میں دسترس اور کمال بہم پہنچایا، ۱۳۲۶ھ میں کتب درسیات سے فراغت پائی اور مدرسہ امینیہ ہی میں تدریسی خدمت انجام دینے لگے، جامع ترمذی اور صحیح بخاری کا درس شیخ الہند مولانا محمود حسن سے بھی لیا، پھر مدرسہ اشرفیہ راندیر (سورت) میں صدر مدرس مقرر ہوئے اور وہاں سات سال تک حدیث کی امہات کتب کے علاوہ معقولات کا درس دیا، اس کے بعد راندیر ہی کے مدرسہ محمدیہ میں چار سال تک شیخ الحدیث کے منصب پر مامور ہوکر صحاح ستہ کی تدریس اور کامل تیس سال تک افتا کی خدمت انجام دی، یہاں تک کہ ۱۳۶۰ھ میں ارباب دارالعلوم دیوبند کی نظر انتخاب ان پر پڑی اور وہ وہاں تادم واپسیں صدر المفتیین کے اعلیٰ منصب پر فائز رہے، اس طرح تقریباً چالیس سال تک انھوں نے ایک جید مفتی کی حیثیت سے بے شمار لوگوں کو مستفیض کیا، وہ فتاویٰ کے جوابات مختصر لیکن ماقل ودل دیتے تھے۔

مرحوم پانچ مرتبہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے تھے اور انھوں نے حرمین میں علوم عقلیہ ونقلیہ کے ماہر شیوخ سے استفادہ کرکے سند وخرقہ اجازہ حاصل کیا تھا، یہ اسی طویل ریاض اور محنت کا نتیجہ تھا کہ مرحوم کا پایۂ فقہ وحدیث اور رجال وانساب میں اتنا اونچا تھا کہ اس عہد میں اس کی نظیر بہت مشکل ہے، ایک مشاق مدرس اور ماہر مفتی ہونے کے ساتھ تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی امتیاز حاصل تھا، چنانچہ انھوں نے عربی اور اردو دونوں زبانوں میں بکثرت کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، جن میں اللآلی المصنوعہ فی الروایات المجموعة شرح کتاب الآثار (۳ جلد) کتاب الحجة علیٰ اهل المدینة (۳ جلد) الدر الثمین، رجال کتاب الآثار، الاهتداء فی ردالبدعة شرح بلاغات محمد فی کتاب الآثار خصوصیت کے ساتھ مفتی صاحب کے تبحر علمی، وسعت نظر، دقیقہ رسی اور بلند ذوق تحقیق وتفحص کی آئینہ دار ہیں، ان کتابوں کے مطالعہ سے پورا اندازہ ہوتا ہے کہ مرحوم کا علم کتنا حاضر ومتحضر اور جزئیات فقہ وحدیث واسماء الرجال پر ان کو کیسا عبور کامل حاصل تھا، کتاب الحجة علیٰ اهل المدینة کی تصحیح وتعلیق کی خدمت انھوں نے کامل بیس سال تک نہایت جانکاہی اور عرق ریزی کے ساتھ مشغول رہ کر انجام دی تھی اور غالباً اسی باعث بقول مولانا ابوالوفا افغانی، یہ ایک بہترین تخلیق بن گئی ہے۔

فضل وکمال کے ساتھ مرحوم کی شخصیت گوناگوں محاسن اخلاق کی حامل تھی، علم

اور عمل بہت کم یکجا ہوتے ہیں، لیکن مفتی صاحب کی ذات ان دونوں کی جامع تھی، وہ نہایت نیک طینت متواضع ملنسار سادہ مزاج، کشادہ دست خندہ جبیں کریم النفس، مہمان نواز رائے کے مضبوط اور کام کے دھنی تھے، تقویٰ اور دینداری ان کے چہرہ کمال کے نمایاں خط وخال تھی، وہ بایں ہمہ وقار علم بذلہ سنج بھی تھے، اردو شعر وسخن کا بڑا نکھرا ذوق رکھتے تھے، ان کے عربی اسلوب نگارش میں بہت سادگی، دلکشی اور رعنائی ملتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ ایسے نادرِ عہد صاحبِ کمال صدیوں کی گردش میں پیدا ہوتے ہیں، اللہ جل شانہ اس مجموعہ کمالات واخلاق کی مرقد کو پرنور فرمائے اور اس پر اپنا ابر رحمت برسائے۔

(جولائی ۱۹۷۶ء)

زکی، احمد

احمد زکی

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کا دور ایک عالمگیر بیداری تجدید اور ذہنی علمی تہذیب وتثقیف کا دور ہے، تقریباً ہر زندہ قوم وزبان پر بدلے ہوئے حالات کا اثر پڑا اور کچھ ایسی شخصیتیں سامنے آگئیں جو نئے رجحانات اور جدید تقاضوں سے باخبر بھی تھیں اور ان کی اہمیت وضرورت کی معترف بھی، عالم عرب جو عرصہ سے سیاسی خلفشار اور معاشرتی اضطراب و بےچینی سے دوچار تھا، دوسروں کی بہ نسبت ان حالات سے جلد متاثر ہوا، عربی ادب جو زمانہ سے جمود وتعطل کا شکار تھا، اس دور میں اس نے کئی ایسے نامور ادیبوں کو جنم دیا جنھوں نے نہ صرف یہ کہ عربی ادب کو نئی روح، اس کے قالب کو نئی جان اور اس کے چہرے کو نئی رونق بخشی، بلکہ ان کی بالغ نظری، جدت طرازی اور دوربینی نے دوسروں کی توجہ بھی اپنی جانب مبذول کرلی اور ان کے خیالات کی بازگشت دور دور سنائی دینے لگی، شیخ محمد عبدہ، علامہ رشید رضا، امیر شکیب ارسلان، مصطفیٰ لطفی منفلوطی، مصطفیٰ صادق الرافعی معروف الرضافی خلیل مظران، کرد علی، عباس محمود عقاد، احمد امین، حسن زیات جیسے نامور مفکروں اور ادیبوں سے یہ عہدِ جدید مالا مال ہوگیا، ان میں سے ہر شخص زبان اور فکر ونظر، ادب وانداز اور گہرائی و گیرائی کے لحاظ سے منفرد وممتاز حیثیت کا حامل ہے۔ انہی ناموروں کی صف میں احمد زکی کا بھی شمار ہوتا ہے، جن کا ابھی گزشتہ سال انتقال ہوا ہے، اور جنھوں نے اپنے سائنس آمیز مقالات وتصانیف کی وجہ سے عربی ادب میں ایسا مرتبہ حاصل کرلیا ہے جو محترم بھی ہے اور باوقار بھی۔

اصلاً وہ سائنس کے عالم تھے، ان کی تعلیم کا بیشتر حصہ سائنسی علوم کی تحصیل میں صرف ہوا، ۱۹۱۹ء میں انھوں نے لندن یونیورسٹی سے سائنس میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی اور پھر چند ہی برسوں کے بعد فلسفہ میں بھی لیورپول یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کرلیا، اس طرح وہ سائنس وفلسفہ دونوں میں اعزازی نمبروں کے ساتھ سندیں لے کر اپنے وطن مصر واپس آئے اور پھر طویل عرصہ تک درس وتدریس کی زندگی میں لکچرر سے لے کر پروفیسر ڈین اور پرنسپل تک کے عہدوں پر کام کرتے رہے، اس اثنا میں وہ مصر کے اعلیٰ سائنسی اداروں کے مشیر شریک اور سربراہ کی حیثیت سے بھی اپنے فرائض انجام دیتے رہے ۱۹۵۴ء میں سرکاری عہدوں سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ مکمل طور سے سائنسی وعلمی بحث وتحقیق میں لگ گئے، اس طرح انھوں نے سائنس اور ادب کے بہترین امتزاج کی ایک مثال قائم کردی، مشہور عربی محقق ڈاکٹر عدنان خطیب نے لکھا ہے، احمد زکی ایسے اچھے سائنسدان تھے، جنھوں نے لوگوں کو سائنس کے احترام پر مجبور کردیا، ایسے صاحب فکر تھے جو قارئین کو اپنے نقطۂ نظر سے متاثر کردیتے، ادیب اس درجہ کے تھے کہ اپنا ایک اسلوب رکھتے تھے، اس کے ساتھ کمال یہ تھا کہ اپنے علم وفکر کو صحیح، سلیس اور عام فہم زبان میں پیش کرنے کی بےمثل قدرت رکھتے تھے، احمد زکی کے طرز تحریر کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ دقیق وپیچیدہ سائنسی مسائل اور مشکل ترین معانی ومطالب کو ایسے صاف اور سلجھے ہوئے انداز میں پیش کرتے ہیں کہ سمجھنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوتی ان کے یہاں علم کے وزن کے ساتھ ادب کی چاشنی بھی ہوتی ہے، "حصہ المکروب" اور "قصہ الکیمیا" ان کی ایسی ہی کتابیں ہیں جن میں قاری تجسس اور کھوج کی بھول بھلیوں میں بڑے اطمینان کے ساتھ ان کے ساتھ چلتا ہوا منزل تک جا پہنچتا ہے، "مع الله فی السماء"، "مع الله فی الارض"، "وحدة الله تترأی فی وحدة خلقه" اور "قدرة الله تترائی فی بدیع صنعه" جیسے سلسلۂ مضامین ان کی وقت نظری کثرت مطالعہ اور وسیع ثقافتی ذہن کے آئینہ دار ہیں، پیچیدہ ترین موضوع کو آسان الفاظ اور واضح ترکیبوں سے سلجھا دینے کا نمونہ دیکھنا ہوا تو ان کی زندہ جاوید کتاب "فی سبیل موسوعة علمیه" کا مطالعہ کیجئے۔

انھوں نے مصر کے اعلیٰ علمی ادارہ لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر کے ایک ممتاز رکن کی حیثیت سے کئی کتابوں کو عربی قالب عطا کیا، مختلف اعلیٰ علمی مباحثوں میں شریک ہوئے، اور ملک کے چوٹی کے مجلوں میں بلند پایہ مضامین لکھے، ان کی چند کتابوں کے نام یہ ہیں، ۱۔سلطة علمیه، ۲۔بین السموع القرأة، ۳۔مارجرت او غادة الکیمیا، ۴۔قصه المکروب، ۵۔قصه الکیمیا، ۶۔جان دارک، ۷۔مواقف حاسمه فی تاریخ العلم، ۸۔مع الله فی السماء، ۹۔فی سبیل موسوعة علمیه، ۱۰۔مع الله فی الارض، وہ صاحب طرز ادیب تو تھے ہی اسی کے ساتھ نئے الفاظ جدید اصطلاحات اور انوکھی ترکیبیں بھی بےتکلف استعمال کرتے تھے اور اس بارے میں کسی کی مخالفت کی پرواہ نہ کرتے تھے، "العلم ورای السواد بین الناس"، جو جیمز کونائٹ کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے اس کے مقدمہ میں انھوں نے اپنے

مسلک کی وضاحت بڑی جرأت کے ساتھ کی ہے، وہ لکھتے ہیں ''رہی بات ترجمہ کی تو میں نے اس میں آزادی و آزاد روی کا مسلک اختیار کیا ہے، اور نفع وافادہ کو ترجیح دی ہے، ایسی کتاب کے لئے جو سائنسی مضامین پر مشتمل ہو، الفاظ کی نئی ساخت اور جدت و اختراع ضروری ہے، چنانچہ میں بھی اس بدعت کا مرتکب ہوا ہوں''، ہاں انگریزی سے مانوس و واقف قارئین کے لئے قوسین میں اصل انگریزی الفاظ بھی لکھ دیتے ہیں، یہ کتابیں صرف اپنی جدت اسلوب کے لحاظ سے ہی ممتاز نہیں بلکہ احمد زکی کی تعلیمات اور ان کے گہرے علم سے لبریز حاشیوں کی وجہ سے بڑی قیمتی اور بلند پایہ ہوگئی ہیں، یہ حاشیے فروعی مسائل سے متعلق ہوتے ہیں، مگر مولف کے مسلک اور اس کی ماخذ وقبول کے اصول کو بھی نمایاں کردیتے ہیں، عنوانوں کے انتخاب میں بھی ان کا ایک خاص ذوق ہے، ''**مواقف حاسمه فی تاریخ العلم**'' اسی ذوق کا آئینہ دار ہے۔

وہ ۱۹۴۷ء میں عالم عرب کی ممتاز ترین علمی اکیڈمی المجمع العلمی دمشق کے ممبر منتخب ہوئے اسی اکیڈمی کے ایک اجلاس میں جو ان کے اعزاز میں منعقد ہوا تھا، مشہور ادیب احمد امین نے کہا تھا ''احمد ایک نامور ماہر کیمیا اور ایک بلند پایہ ادیب ہیں، انھوں نے سائنس اور ادب کو باہم شیر وشکر کردیا ہے، حق یہ ہے کہ وہ سائنسدانوں میں ادیب اور ادیبوں میں سائنسدان ہیں، کبھی لیباریٹری میں نلکیوں اور محلولوں میں سرکھپا رہے ہیں اور کبھی اپنے کتب خانہ میں الفاظ کی تحلیل و تجزیہ میں مشغول کسی اصطلاح کو عربی رنگ دیتے اور اپنے نتیجہ تحقیق کو ادبی جامہ پہناتے نظر آتے ہیں' قدیم سے اختلاف کے باوجود وہ افراط وتفریط کا شکار کبھی نہ ہوئے، بلکہ ان کے اور کارناموں کے ساتھ یہ کارنامہ بھی یاد رکھا جائے گا، کہ نشر واشاعت کے ذرائع میں انھوں نے سختی کے ساتھ عربی قواعد اور صحیح عربی اسلوب کے اختیار پر زور دیا، خبروں کی نشریات میں خاص طور سے انھوں نے غیر فصیح الفاظ کے استعمال پر روک لگوائی۔

احمد زکی عربی صحافت سے تقریباً ہمیشہ وابستہ رہے، ایک زمانہ میں وہ ''الرسالہ'' اور ''الثقافہ'' جیسے بلند ادبی رسالوں کی مجلس ادارت میں شریک اور ''الہلال'' کے اڈیٹر رہے۔ لیکن صحیح معنوں میں ان کے سائنس آمیز ادبی شہ پاروں وشہ کاروں کو پیش کرنے کا فخر عالم عربی کے مشہور رسالہ ''العربی'' کو حاصل ہوا یہ رسالہ جو آج ۴ لاکھ سے بھی زیادہ تعداد میں ہر ماہ شائع ہوکر تمام عالم عرب میں پھیل جاتا ہے، احمد زکی کی ادارتی صلاحیتوں اور ان کی اعلیٰ قابلیتوں کا حسین ترین نمونہ ہے، کویت کا ملک جب نیا نیا قائم ہوا، تو اس کی حکومت نے ایک ایسے رسالہ کی اجراء کی تحریک کی جو باوجود اختلاف بلاد عربیہ کے ہر حلقہ میں قبولیت حاصل کرسکے اور جس کا واحد مشن عربی زبان کی تحسین و تزیین اور ترویج و اشاعت ہو، ایک ایسا رسالہ جو قدیم اقدار کے ساتھ جدید علوم و نظریات کا بھی حامل ہو، اعلیٰ مقاصد کے حامل، اس رسالہ کے لئے کسی ایسی ہی شخصیت کی ضرورت تھی، اور ظاہر ہے، احمد زکی سے بڑھ کر اس وقت کون سی ایسی شخصیت تھی، چنانچہ حکومت کویت کی نظر انتخاب ان پر پڑی اور پھر ''العربی'' اور احمد زکی ایسا ایک جان دو قالب ہوگئے ایک کے بغیر دوسرے کا تصور مشکل تھا، احمد زکی نے دسمبر ۱۹۵۸ء میں العربی کے پہلے اداریہ جس نے بعد میں ''عزیزی القاری'' کے عنوان سے ایک روایتی شکل اختیار کرلی لکھا تھا ''ہم نے اس رسالہ کا نام العربی رکھا ہے، وطن عزیز کے ہر شخص کے ذہنی افق پر ابھرتے ہوئے نئے معانی ومطالب اور قلب کی گہرائی میں جنم لیتی ہوئی آرزوں اور تمناؤں کو واقعی اور حقیقی انداز میں پیش کرنے کے لئے اس سے مختصر اور مکمل لفظ اور کون ہوسکتا ہے''، انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ العربی خالص عربی فکر کا ترجمان ہے، وہ وسیع معنی میں جہل کے برعکس علم کا مرادف ہے، وہ مرض کے خلاف صحت کا رفیق ہے، وہ فقر کا دشمن اور ثروت وغنا کا دوست ہے، وہ ایسے پرخلوص عمل کا داعی ہے جس میں اعلیٰ تعلیم، وسیع ثقافت اور سچی لگن کی روح کارفرما ہو، تب ہی یہ عمل ایک خوش حال و باوقار زندگی عطا کرسکے گا، عمل انسانی معاشرہ کا حق ہے، جسے وہ اپنے ہر فرد سے طلب کرتا ہے، تعطل و بے عملی قانون فطرت ہی کے نہیں قانون حیات کے بھی خلاف ہے، عربی دنیا کے مخصوص حالات کے پیش نظر العربی نے اپنے صفحات کو سیاست وعقائد کے مباحث سے پاک رکھا، لیکن احمد زکی استعماری اور استبدادی قوتوں کی ریشہ دانیوں سے ہمیشہ اپنے قارئین کو باخبر رکھنے کی کوشش کرتے رہے، عربوں کی شکست کے عوامل کا وہ تجزیاتی مطالعہ کرتے، اور اظہار رائے میں کبھی کسی ملامت یا خوف کا خیال نہ کرتے۔

العربی بدستور اپنے انداز پر قائم اور اپنی راہ پر گامزن رہا، ۲۰۴ شماروں کے بعد نومبر ۱۹۷۵ء کا شمارہ وہ آخری شمارہ تھا، جس میں احمد زکی نے اپنا آخری مقالہ سپرد تحریر کیا اور جس کا عنوان عربوں کی سیاسی صورت حال کے پیش نظر بڑا ہی معنی خیز تھا، عنوان تھا، لوگ کہتے ہیں رحم والفت دوستی اور محبت تو پرانی باتیں ہوچکیں، اب مصلحت سب پر مقدم ہے، کیسی زبوں خیالی ہے''، العربی کے دوسو چار رسالوں میں ہر جگہ احمد زکی اپنے وجود کا احساس دلاتے رہے، ''عزیزی القاری'' کے علاوہ نہ جانے کتنی نازک بحثوں اہم معاملوں اور زندہ عنوانوں پر انھوں نے اظہار خیال کیا، ان کے انتقال سے عربی زبان اپنے ایک بہت بڑے خادم سے محروم ہوگئی، جو ہر وقت اس کے لئے سینہ سپر رہا کرتا، اور ایک خوبصورت جدید انداز میں عربی کے حسن کو نکھارنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ [1]

(''ع۔ص''، اگست ۱۹۷۶ء)

---

[1] مضمون بالا کے واقعات وسنین ڈاکٹر عدنان خطیب کے ایک مضمون سے ماخوذ ہیں، جو **المجمع العلمی العربی** دمشق کے تازہ شمارے میں شائع ہوا ہے۔

ندوی، محمد اویس نگرامی، مولانا

مولانا محمد اویس ندوی نگرامی

دارالمصنفین اور معارف کے حلقہ میں مولانا محمد اویس ندوی نگرامی کا نام محتاج تعارف نہیں ہے، وہ معارف کی مجلس ادارت کے رکن اور دارالمصنفین کی مینیجنگ کمیٹی کے ممبر تھے، رفیق کی حیثیت سے بھی کئی سال تک یہاں رہ چکے اور تصنیف و تالیف کے علاوہ سیرۃ النبی کی نظر ثانی میں بھی انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کا ہاتھ بٹایا تھا، سید صاحب کی جوہر شناس نگاہ نے طالب علمی کے زمانہ ہی میں ان کی صلاحیت کا اندازہ کرلیا تھا، تعلیم سے فراغت کے کچھ ہی عرصہ بعد ان کو دارالمصنفین لے آئے، تصنیف و تالیف کے علاوہ وہ ان کی درسی لیاقت کے بھی معترف تھے، قرآن مجید کے مطالعہ کا شوق انہیں شروع ہی سے تھا، سید صاحب کی صحبت میں یہ ذوق اور بڑھا، یوں تو سبھی اہم تفسیریں نظر سے گزریں تھی، لیکن ابن جریر اور ابن کثیر سے زیادہ دلچسپی تھی علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کے تو عاشق تھے، ان کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کیا کرتے تھے، اس گرویدگی کا اثر تھا کہ مختلف کتابوں سے ان کے تفسیری بیانات چن کر ایک ضخیم کتاب تیار کردی، ان کی یہ کوشش ہندوستان ہی میں نہیں، بلکہ پوری دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی، اب تک کئی اڈیشن شائع کرچکے ہیں۔

علمی انہماک کے ساتھ تزکیۂ نفس اور اصلاح باطن کا بھی بڑا خیال تھا، ان کا خاندان شریعت و طریقت کی جامعیت میں ممتاز تھا، ان کے پردادا مولانا عبدالعلی حضرت شاہ علم اللہ رائے بریلوی کے سلسلہ سے وابستہ تھے، دادا مولانا محمد ادریس بھی ایک بڑے عالم اور شیخ طریقت تھے، وہ مولانا عبدالحئی فرنگی محلی مولانا عبدالحق حقانی اور قاری عبدالرحمن پانی پتی کے شاگرد اور مولانا فضل رحمن گنج مرادآبادی کے خلیفہ تھے، والد ماجد مولانا محمد انیس بھی پوری زندگی ارشاد و ہدایت میں مصروف رہے، اس خاندان کی بدولت اودھ کے بہت سے علاقوں میں کتاب و سنت کی روشنی پہنچی، دیہات کی بہت سی برادریاں جو شرک و بدعت اور غیر شرعی رسوم میں مبتلاتھیں، ان کے ذریعہ راہ راست پر آئیں، مولانا محمد اویس کو تعلیمی و تصنیفی مشاغل کی وجہ سے دیہاتی حلقوں میں دورہ کا زیادہ موقع نہیں ملتا تھا، لیکن بایں ہمہ بزرگوں کی یہ روایت منقطع نہیں ہونے پائی۔

دارالمصنفین کے زمانۂ قیام میں ندوہ کو ان کی ضرورت محسوس ہوئی، مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم ندوہ کے بھی معتمد تھے، چنانچہ ان کے مشورے سے وہ وہاں چلے گئے، اور قرآن مجید کی تعلیم ان کے سپرد ہوئی، خداداد مناسبت کے علاوہ سید صاحب کی رہنمائی میں وہ اس موضوع پر کافی تیاری کرچکے تھے، اس لئے ان کا درس بہت مقبول ہوا، طلبہ کے علاوہ لکھنؤ کے تعلیم یافتہ اصحاب نے بھی استفادہ کی خواہش کی، اور سید صدیق حسن صاحب مرحوم کے دولت کدہ پر درس ہونے لگا، یہ سلسلہ جب تک بیماری نے مجبور نہیں کردیا، برابر جاری رہا، ان کو قلبی تکلیف کئی سال سے تھی، لیکن شروع میں اس کا احساس نہیں ہوا لیکن جب تکلیف بڑھی تو علاج شروع ہوا، اور اس میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی، لیکن تقدیر کے سامنے کوئی تدبیر نہ چل سکی، بالآخر وقت موعود آپہنچا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کے مراتب بلند فرمائے، اور پس ماندگان کو توفیق عطا فرمائے کہ ان کے نقش قدم کو دلیل راہ بنائیں۔

(''ع۔ق''، ستمبر ۱۹۷۶ء)

مولانا محمد اویس ندوی نگرامی

اہل علم و اصحاب نظر ابھی مولانا عبدالباری ندوی مرحوم کے ماتم سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ مولانا محمد اویس ندوی نگرامی بھی اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔

مولانا مرحوم کا خاندان نگرام ضلع لکھنؤ میں صدیوں سے آباد اور اپنی علمی و دینی خدمات کے لحاظ سے قرب و جوار میں ممتاز تھا، مولانا مرحوم کے پردادا مولانا حفیظ عبدالعلی نگرامی ایک نامور عالم تھے، مشہور نقش بندی بزرگ قاضی عبدالکریم نگرامی سے بیعت اور صاحب اجازت تھے، یہ قاضی عبدالکریم اپنے ہم نام قاضی عبدالکریم جو راسی کے خلیفہ تھے، جو حضرت شاہ علم اللہ رائے بریلوی کے صاحبزادہ سید محمد کے مرید اور سید محمد عدل کے تربیت یافتہ تھے، اس کے علاوہ مولانا عبدالعلی کو حضرت سید احمد شہیدؒ کے بھانجے خواجہ احمد نصیر آبادیؒ سے بھی اجازت حاصل تھی، ان بزرگوں کے اثر نے ان کے اندر توحید کا جوش اور سنت کا غیر معمولی ولولہ پیدا کردیا تھا، وہ گاؤں گاؤں پھر کر دین حق کی منادی کرتے تھے، اس زمانہ میں شرک و بدعات اور غیر شرعی رسوم کا جال ہر جگہ پھیلا ہوا تھا، مولانا عبدالعلی کے مواعظ اور دلنشین انداز بیان سے بکثرت لوگ تائب ہوئے اور شیخ سدو کے بکروں اور ٹھیلے کی مرغیوں کو چھوڑ کر اور میلے ٹھیلوں کو ترک کرکے اللہ اور رسول کی فرمانبرداری میں لگ گئے۔

حافظ عبدالعلی کے بیٹے اور مولانا مرحوم کے دادا مولانا محمد ادریس صاحب بھی اپنے علم و فضل اور صلاح و تقویٰ میں بہت ممتاز تھے، اپنے والد کے علاوہ انھوں نے مولانا عبدالحئی فرنگی محلی، مولانا عبدالرحمن پانی پتی، شیخ عبدالحق صاحبِ تفسیر حقانی سے بھی اکتساب علم کیا، علوم باطنی میں توجہ شیخ وقت مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی کی پائی، ان سے خلافت عطا ہوئی، اور اس طرح علوم ظاہری و باطنی میں بڑا مقام پیدا کیا، مولانا مرحوم کے والد مولانا محمد انیس نگرامی بھی ایک صاحب علم تھے اور اودھ کے قصبات و دیہات میں ان کے تبلغی واصلاحی دورے ہوتے رہتے تھے۔

اس طرح مولانا مرحوم کو ظاہری و باطنی علوم وراثت میں ملے اور قال اللہ وقال

الرسول کی صدائیں ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی ان کے کانوں میں پڑیں، آگے چل کر انھوں نے اس بیش قیمت ورثہ میں بیش بہا اضافہ کیا اور بزرگوں کے نام اور کام کو دور دور تک پھیلا دیا۔

ابتدائی تعلیم گھر ہی پر اپنے بزرگوں کے زیر سایہ حاصل کی، پھر اعلیٰ تعلیم کی غرض سے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے ۱۹۳۲ء میں تعلیم مکمل کی، بیعت اپنے والد سے ہوچکے تھے، لیکن بعد میں مولانا حسین احمد مدنی سے بھی اجازت حاصل کی اور ان کی مجلس درس سے مستفید بھی ہوئے، مولانا مدنی کے اثر سے ان کے سیاسی شعور میں بھی پختگی آئی اور جرأت وحق گوئی کی عادت پڑی، ذہنی تثقیف وتہذیب کے لئے خود دارالعلوم کی فضا اور ماحول ہی کیا کم تھا، مزید یہ کہ استفادہ کا موقع مولانا سید سلیمان ندوی جیسے یگانہ روزگار سے ملا جن کی نگاہ ہی میں مس خام کو کندن بنادینے کی صلاحیت تھی، ان کی نگاہ جوہر شناس پہلی نظر میں ذہانت وصلاحیت کو بھانپ لیتی تھی چنانچہ سید صاحب نے ان کو اپنی خاص تربیت میں لے لیا اور دارالمصنفین بلالیا، یہیں سے مولانا مرحوم کی علمی و دینی شہرت کا آغاز ہوا، معارف میں ان کے مقالات ومضامین اہل علم کی توجہ کا مرکز بنے، طبیعت کا میلان قرآنی علوم کی جانب شروع ہی سے تھا، چنانچہ اکثر مقالات قرآن مجید اور اس کی تعلیمات سے متعلق تھے، تراجم قرآن، زندیق کی حقیقت، حافظ جلال الدین سیوطی، کلمۃ اللہ، ابن جریر طبری، مستشرق نولدیکی اور قرآن، امام ابوالحسن اشعری، کچھ تفسیر زاری کے متعلق، حجر اسود وغیرہ مضامین ان کے اس ذوق و شوق کے شاہد عادل ہیں، سید صاحب کی تربیت ونگرانی میں انھوں نے اس فن میں نمایاں ترقی اور بڑی دسترس حاصل کرلی، تفسیر ابن القیم ان کی تلاش ومحنت کا ایسا شاہکار ہے جس نے دینی وعلمی حلقوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی، عرب سے اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے، سات سال تک دارالمصنفین میں تصنیف وتالیف کی مشق و مہارت کے بعد مولانا مرحوم نے ندوہ کی ضرورت کے پیش نظر سید صاحب کی مرضی و مشورہ سے دارلعلوم ندوۃ العلماء میں شیخ التفسیر کی ذمہ داری قبول کی اور پھر وہیں کے ہوکر رہ گئے، ندوہ کی ملازمت کے زمانہ میں بعض یونیورسٹیوں سے بیش قرار معاوضہ کی پیشکش ہوئی، مگر وہ ندوہ چھوڑ کر کہیں جانے کے لئے تیار نہ ہوئے، سینکڑوں طلبہ نے ان سے کسب فیض کیا، درس قرآن میں شرکت، طلبہ کی آرزو اور وجہ سعادت بن گئی، قرآن کی سی معجزانہ کتاب، بلاغت وفصاحت کا بلند ترین معیار اور پھر مولانا مرحوم کا والہانہ انداز گفتار مفسرین کے اقوال و افکار، صوفیہ کے رموز و اسرار درمیان میں سید صاحب کے ذکر کی تکرار، درس قرآن کو گل افشانی گفتار کا عجیب نمونہ بنادیتے، سورہ فاتحہ کی تفسیر میں بالخصوص کئی کئی روز تقریر جاری رہتی، تفسیر ماجدی کا ذکر تحسین کے ساتھ اکثر کیا کرتے، طلبہ کو اس کے مطالعہ کا مشورہ بھی دیتے، تفسیر میں صرف ونحو کی بحثیں بھی ہوتیں، فصاحت اور بلاغت کے مسائل بھی چھڑتے، عقائد وکلام کے مباحث بھی ہوتے، مگر ان چیزوں میں الجھ کر نہ رہ جاتے بلکہ قرآن کی دعوت اور اس کے مقاصد ہر موقع پر پیش نظر رکھتے، مفسرین کے حوالے دیتے، ان کے اقوال تائید میں نقل کرتے اور طلبہ کے لئے کسی گوشہ کو تشنہ نہ چھوڑتے، دوران درس آپ بیتی اور جگ بیتی کے پر لطف واقعات سنا کر خود محظوظ ہوتے، طلبہ کو بھی اس حظ میں شریک کرتے، سید صاحب کے ذکر کے وقت ان پر بے خودی وسرمستی کی عجیب کیفیت طاری ہوتی، مزے لے لے کر ان کے واقعات بیان کرتے، آج بھی کانوں میں ان کی یہ صدا گونج رہی ہے کہ ''ہمارے سید صاحب یہ فرمایا کرتے تھے''۔

وسیع النظر وسیع القلب تو تھے ہی وسیع المشرب بھی تھے، تقلید نہ جامد خود کیا کرتے دوسروں سے بھی اس کی توقع نہ رکھتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ اس وسیع المشربی میں بڑا حصہ تعلیمات قرآن ہی کی دین تھا، ندوہ کے مقاصد سے انھیں صرف قول ہی کی حد تک اتفاق نہ تھا بلکہ عملی زندگی میں بھی وہ ندوہ کے مقاصد کی سچی تصویر تھے، ندوہ کا ماحول اور سید صاحب کی توجہ نے ان کی فکر کو جلابخشی تھی، ذہن میں ایسی درخشانی، عمل میں ایسی تابانی اور مزاج میں ایسی شگفتگی تھی کہ کیا دوست احباب، کیا تلامذہ وعقیدت مند، سب کے سب ان سے کسب نو کرتے، حق یہ ہے کہ ان کی ذات ندوہ کی اساس پر بڑی خوبصورت اور بڑی دلکش عمارت تھی، جس میں قدیم علم وتمدن اور عہد جدید کی بیداری و تازگی دونوں شامل تھیں، اور یہی وہ حسن توازن تھا جس نے ان کی شخصیت کو جدید وقدیم کا مرجع بنادیا تھا، پرانے دین دار بھی ان سے خوش تھے اور جدید تعلیم یافتہ اصحاب بھی ان کے گرویدہ تھے، ندوہ کا مقصد بھی یہی تھا اور ندوہ کے اس عظیم فرزند کا مشن بھی یہی، کتنے ذہن تھے جو بہک سکتے تھے مگر مولانا مرحوم کے درس قرآن نے ان کو ایمان ویقین کی ایسی مستحکم چٹان بنادیا تھا جن کو کفر والحاد کی تیز وتند آندھیاں بھی جنبش نہ دے سکیں۔

مولانا مرحوم کی تقریر وتحریر میں نمایاں چیز شگفتگی تھی، تفسیر تو خیر لیکن کلامی مسائل میں زبان شستہ وشگفتہ رہے یہ ذرا مشکل ہے لیکن شاید اودھ کے قصباتی اور ندوہ کے ادبی رنگ کی برکت تھی کہ ایسے مواقع پر بھی زبان بڑی دلکش اور مؤثر ہوتی۔ تقریریں عموماً کم کرتے لیکن جب کرتے تو دلوں پر گہرا اثر چھوڑتے، ندوہ کی مسجد کے توسیعی مرحلہ پر انھوں نے جو تقریر کی تھی وہ اب تک ذہن پر نقش ہے، اسی طرح تعزیتی جلسوں اور طلبائے ندوہ کی انجمن الاصلاح کی محفلوں میں ان کی تقریریں سننے کے لائق ہوا کرتی تھیں۔

بڑے خوش وضع خوش لباس اور خوش گفتار تھے، ہم طلبہ میں یہ بات مشہور تھی کہ مولانا باہمہ ہوں یا بے ہمہ، پان کی نفیس ڈبیا، خوبصورت منقش چھڑی اور لازوال تبسم کبھی ان سے جدا نہیں ہوتے، طلبہ انھیں دارالعلوم کی آبرو اور ماضی کی عظمت کا امین سمجھتے تھے

اور اس احساس میں وہ غلط بھی نہ تھے۔

ندوہ سے ان کے عشق کا حال یہ تھا کہ جشن کے موقع پر ان کی علالت تشویش ناک ہو چلی تھی، مرض کی شدت نے ضعف و نقاہت میں بھی تیزی پیدا کر دی تھی، اس کے باوجود ان سے رہا نہ گیا اور معالجوں کی ممانعت کے باوجود ایک کار میں بیٹھ کر انھوں نے دارالعلوم کے پورے کیمپس کا دورہ کیا، پنڈال اور اسٹیج دیکھا، عمارتوں اور پارکوں پر نظر ڈالی، درو دیوار بلکہ ایک ایک اینٹ کو غور سے دیکھا، درو دیوار پر سبزہ اگ رہا تھا، اس جوشش فصل بہاری میں انھیں غالب کی طرح اپنے بیابانی ہونے کا تکلیف دہ احساس ہو رہا تھا۔ یہ دورہ دارالعلوم کا شائد آخری دورہ تھا، زبان قال سے نہ سہی زبان حال سے وہ چمن والوں کو خوش رہنے اور اپنے آخری سفر پر چلنے کی بات کہہ گئے تھے، ممکن ہے آنسو پلکوں تک آئے ہوں، لیکن مانوس تبسم اب بھی ان کے ساتھ تھا، یہ تبسم مجھے اس وقت بھی ان سے جدا نہ دکھائی دیا جب میں آخری بار ان کی عیادت کی غرض سے لکھنؤ میڈیکل کالج پہنچا تھا، بھاری بھرکم جسم نحیف و نزار ہو چکا تھا، دل کے مرض نے حالت اس حد تک پہنچا دی تھی، بے اختیار یہ شعر زبان پر آ گیا:

دیدنی ہے شکستگی دل کی کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

مگر اس کے باوجود دیر تک نصیحتیں کرتے رہے، جب معلوم ہوا کہ میں دارالمصنفین جا رہا ہوں تو بہت خوش ہوئے، دعائیں دیں اور پھر خاموش ہو گئے، شاید عہد رفتہ کی کچھ کہانیاں یاد آ گئی ہوں۔

مولانا مرحوم کی تصانیف کی فہرست زیادہ طویل نہیں، درس و تدریس کی زندگی اس کا موقع بھی کہاں دیتی تھی لیکن اس کے باوجود تفسیر ابن القیم ہی ان کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے، فکر و خیال کی ہم آہنگی نے انھیں شاہ ولی اللہ دہلوی کا بڑا معتقد بنا دیا تھا، چنانچہ علم کلام میں شاہ صاحب کے رسالہ **العقیدہ الحسنہ** کی شرح لکھی جو **العقیدۃ السنیہ** کے نام سے طبع ہوئی، یہ رسالہ نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم عربی کے مدارس میں داخل نصاب ہوا، اس کے علاوہ تعلیم القرآن، رسالہ اصول حدیث، قرآن کا مطالعہ کیسے اور بلا کشان اسلام جیسی تصانیف یادگار چھوڑیں، ضرورت اس کی ہے کہ مولانا کے مضامین کا مجموعہ شائع ہو، سید صاحب کے حوالوں اور حواشی کا ایک قابل تفسیری سرمایہ ان کے پاس محفوظ تھا، اس کی اشاعت بھی قرآنی علوم میں قیمتی اضافہ ہوگی۔

زندگی ان کی قابل رشک رہی پھر موت کیوں نہ قابل رشک ہوتی، جمعہ کا دن ملا شعبان و رمضان کے سے مبارک مہینوں کے عین اتصال کے موقعہ پر برکتوں کے سایہ میں وہ اپنے رب سے جا ملے دیکھا تو نہیں لیکن یہ یقین ضرور ہے کہ اپنے خدا سے ملتے وقت بھی وہی لازوال تبسم ساتھ رہا ہوگا، جو خدا کے بندوں کے لئے دل کا آئینہ بنا ہوا تھا،

نشان مرد مومن باتو گویم
چو مرگ آید تبسم برلب اوست

(''ع۔ص''، ستمبر ۱۹۷۶ء)

<u>شفیع، محمد، مولانا مفتی</u>

مولانا مفتی شفیع صاحب

۶؍ اکتوبر کو ریڈیو پاکستان سے یہ اندوہناک خبر معلوم ہوئی کہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال فرما گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ان کی طبیعت عرصہ سے خراب تھی، اس پیرانہ سالی میں جواں سال فرزند کی وفات کا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا، کئی بار دل کا دورہ پڑ چکا تھا، بالآخر اس بیماری دل نے کام تمام کر دیا۔

وہ دیوبند کے عثمانی خانوادہ کے چشم و چراغ تھے، اور یہیں ۱۳۱۴ھ میں پیدا ہوئے تھے، ان کے والد مولانا محمد یٰسین صاحب دارالعلوم دیوبند میں مدرس تھے، مفتی صاحب نے ان سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۳۳۰ھ میں دارالعلوم کے عربی درجہ میں داخلہ لیا، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا محمد ابراہیم بلیاوی اور مولانا اعزاز علی وغیرہ اکابر علماء سے درسیات کی تکمیل کی، مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم اور مولانا شاہ وصی اللہ کے ہم سبق تھے، ۱۳۳۶ء میں درس نظامی سے فراغت کے بعد دارالعلوم میں درس و تدریس کی خدمت پر مامور ہوئے، اس عرصہ میں دارالافتاء کے سربراہ مولانا مفتی عزیز الرحمٰن کے زیر نگرانی فتویٰ نویسی کا کام بھی انجام دیتے رہے، ان کے انتقال کے بعد ۱۳۵۰ھ میں یہ شعبہ خود ان کے سپرد کیا گیا اور بارہ سال تک اس خدمت کو خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے، دارالعلوم دیوبند کی فتویٰ نویسی کی تاریخ میں یہ دونوں بزرگ اپنے علم و فضل اور فقہی و دینی بصیرت کی وجہ سے برابر یاد کیے جائیں گے، ملک کی تقسیم کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کی دعوت پر پاکستان کے اسلامی دستور کا خاکہ تیار کرنے کے لئے مئی ۴۸ء میں کراچی تشریف لے گئے، پھر وہیں مستقل طور پر رہ گئے، دارالعلوم دیوبند کے طرز پر دارالعلوم کراچی کے نام سے ایک بڑے عربی مدرسہ کی داغ بیل ڈالی، جس کے وہی مہتمم ہوئے ۶۷ء میں ان کے خلف الرشید مولوی محمد تقی عثمانی نے ان کی سرپرستی میں البلاغ کے نام سے ایک علمی، دینی اور اصلاحی ماہنامہ جاری کیا جو دارالعلوم کراچی کا ترجمان ہے، اس کے ہر نمبر میں مفتی صاحب کے مفید مضامین بھی شائع ہوتے رہتے تھے۔

تفسیر، حدیث اور متداول علوم میں مفتی صاحب کی استعداد پختہ تھی، مگر فقہ

وافتاء کی طرف میلان زیادہ رہا، حنفی فقہ پر ایسی گہری نظر رکھنے والے اب بہت کم لوگ ہوں گے۔

ان کو تصنیف و تالیف کا فطری ذوق تھا، ان کی تحریریں بڑی سلیس، عام فہم سنجیدہ، پرمغز اور جامع ہوتی ہیں، دارالعلوم دیوبند میں درس وافتا کی مشغولیت کی باوجود متعدد علمی، دینی، فقہی، اور اصلاحی رسائل تصنیف کئے، ردِ قادیانیت پر کئی کتابیں لکھیں اسی زمانہ کی یادگار وہ ضخیم رسالہ ہے جو ختم نبوت کے عنوان سے چار حصوں میں شائع ہوا تھا، اس کے تین حصوں میں قرآن، حدیث اور صحابہ و تابعین کے اقوال و آثار کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں ہوسکتا، اور آخری حصہ میں قادیانیوں کے دلائل کی محققانہ تردید کی گئی ہے، اس زمانہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے دارالعلوم دیوبند کے ہزاروں فتووں کا مجموعہ آٹھ جلدوں میں مرتب کرکے افادہ عام کے لئے شائع کیا ہر جلد دو حصوں پر مشتمل تھی پہلے میں عزیز الفتاوی کے نام سے مولانا مفتی عزیز الرحمٰن کے اور دوسرے میں امداد الفتادی کے نام سے خود ان کے فتوے درج ہیں، یہی فتوے بعد میں مزید حک و اصلاح ونظرثانی کے بعد نئی ترتیب وتبویب کے ساتھ جواہر الفقہ کے نام سے دو جلدوں میں مکتبہ و دارالعلوم کراچی سے شائع ہوئے، پہلی جلد مفتی عزیز الرحمٰن صاحب، اور دوسری ان کے فتووں کا مجموعہ ہے، مفتی صاحب نے اکثر جدید مسائل کا تشفی بخش جواب دیا ہے، اس طرح کے فتووں کا ایک علیحدہ مجموعہ **البدائع المفیده فی الصنائع الجدیده** کے نام سے چھپا تھا، اس میں سائنس کی موجودہ ترقیات نے جو نئے نئے آلات جیسے ریڈیو، سنیما، تار، ٹیلیفون، وائرلیس، فوٹوگرافی اور مسائل مثلاً روزہ میں انجکشن وغیرہ پیدا کردیئے ہیں، ان سے متعلق سوالات کے مفصل جوابات دیئے ہیں، کراچی کے قیام کے زمانہ میں بھی بعض علمی وفقہی مسائل پر ان کے مفید مضامین شائع ہوئے، ان میں اسلامی ذبیحہ، قربانی، رویت ہلال، سود اور اسلام کا نظام تقسیم دولت وغیرہ خصوصیت سے بڑے اہم ہیں، جن میں بعض علیحدہ رسالوں کی صورت میں چھپ کر بہت مقبول ہوئے۔

ان کی سب سے اہم کتاب تفسیر معارف القرآن ہے، جو کئی جلدوں میں چھپی ہے اور رسالہ البلاغ میں بھی قسط وار چھپتی رہتی ہے اور ہفتہ وار درس کی صورت میں ریڈیو پاکستان سے بھی نشر کی جاتی ہے، مفتی صاحب کی ایک اور قابل ذکر کتاب ''اسلام کا نظام آراضی'' ہے، اس کے پہلے حصہ میں زمین کی مختلف قسموں اور ہندو پاک کی زمینوں کے مفصل شرعی احکام بیان کئے گئے ہیں اور دوسرے حصہ میں آراضی ہند کی شرعی وفقہی حیثیت کو متعین کرنے کے لئے اسلامی فتوحات کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔

عربی میں بھی کئی رسالے لکھے اور بعض عربی رسالوں کا اردو ترجمہ بھی کیا، علامہ سیوطی کے ایک عربی رسالہ ''**الاجر الجزل فی الغزل**'' کا اردو ترجمہ کیا، اس میں چرخہ کاتنے کی فضیلت سے متعلق حدیثیں جمع کی گئی ہیں، یہ رسالہ ترک موالات کے زمانہ میں جب گاندھی جی نے چرخہ چلانے کی مہم پورے ملک میں چلائی تھی بہت مقبول ہوا، شعر و سخن کا ذوق بھی تھا، عربی میں بعض اچھے نعتیہ قصائد کہے ہیں۔

علمی کمالات کے ساتھ وہ حسن اخلاق اور زہد و تقویٰ میں بھی ممتاز تھے، ان کے ہم جماعت مولانا وصی اللہ صاحب طالب علمی کے زمانہ ہی سے تھانہ بھون آنے جانے لگے تھے، تعلیم مکمل کرنے کے بعد تو وہ اسی استاذ کے ہوکر رہے، مفتی صاحب ان کے دس سال بعد ۱۳۴۶ھ میں جب پہلی دفعہ اصلاح باطن کے لئے مولانا تھانویؒ کی خدمت میں تشریف لے گئے تو مولانا وصی اللہ، مولانا کے خلیفہ مجاز ہوچکے تھے، ایک روز انھوں نے مولانا وصی اللہ کا ذکر بڑی تحسین کے ساتھ کرتے ہوئے ان سے دریافت کیا کہ ''کیا آپ کو جانتے ہیں'' مفتی صاحب نے بے ساختہ یہ شعر پڑھا:

ماہ مجنوں ہم سبق بدیم در دیوان عشق
او بصحرا رفت و ما در کو چہار سوا شدیم

مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں ارشاد فرمایا ''ہاں یہاں یہی دستور ہے، کسی کو صحرا دیا جاتا اور کسی کو سہرا دیا جاتا ہے، ہر ایک کو جو کچھ ملا ہو، اس پر راضی ہونا چاہئے''۔

اس کے بعد وہ برابر مرشد کی خدمت میں استفادہ کے لئے حاضر ہوتے رہے، بالآخر خلافت سے سرفراز ہوئے، ان کے والد مولانا محمد یسین صاحب، مولانا تھانویؒ کے ہم درس تھے، بیعت و ارادت کے تعلق سے محبت و شفقت میں اور بھی اضافہ ہوگیا، مفتی صاحب کو اپنے شیخ سے بے حد عقیدت تھی، اپنی تحریروں میں ان کا بڑے احترام سے ذکر کرتے ہیں، ان کی کئی کتابوں کے ضمیمے اور شرحیں لکھیں اور فتووں کے مجموعہ امداد الفتاویٰ کو از سر نو مدون کیا اور اس کے بعض صبہم مسائل کی تشریح کی، ان کے حکم سے احکام القرآن کے نام سے عربی میں ایک کتاب لکھ رہے تھے، پتہ نہیں مکمل ہو پائی یا نامکمل رہ گئی، مفتی صاحب کی اکثر کتابوں کے نام مولانا تھانویؒ ہی کے تجویر کردہ ہیں اور ان میں ان کے تحسین آمیز کلمات بھی درج ہیں، مفتی صاحب کی تحریروں میں اپنے مرشد کے اسلوب کا پرتو اور اسی طرز کی حکیمانہ تشریح و تعبیر نظر آتی ہے، مفتی صاحب نے ان کو اصلاح اعمال اور تصفیۂ باطن کے لئے جو خطوط لکھے تھے، وہ مع جواب آج کل البلاغ میں شائع ہورہے ہیں، ان سے بھی مرشد و مسترشد کے تعلق کا اندازہ ہوتا ہے۔

مفتی صاحب حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے خواجہ تاش تھے، اس لئے دونوں بزرگوں میں بہت اچھے روابط تھے، اور ایک دوسرے کے علم و کمال کے معترف تھے، سید صاحب کے جانشین مولانا شاہ معین الدین احمد مرحوم بھی اکثر مفتی صاحب کے مضامین اور کتابوں کا اچھے انداز میں ذکر فرماتے تھے۔

مفتی صاحب اسلام کی حمایت اور فسق و فجور کے خلاف ہمیشہ سرگرم عمل رہے،

انھوں نے اسلام، اسلامی تعلیمات اور داعی اسلام کے متعلق مخالفین کے اعتراضات کا جواب بھی دیا ہے اور مسلمانوں کے گمراہ فرقوں کے باطل خیالات کی پرزور تردید بھی کی ہے، پاکستان کے حکمران اور تجدد پسند طبقہ نے جب اسلام کے بعض قوانین اور عائلی نظام میں رد و بدل کرنا چاہا تو اس کے مقابلہ میں وہ بہت پیش پیش تھے، اور وہاں اسلامی قانون کے نفاذ کے لئے بھی جدوجہد کرتے رہے۔

مفتی صاحب اپنے اکابر کی طرح ہمیشہ دیوبند کے طرز فکر سے پورے طور پر وابستہ اور حنفی مذہب پر شدت سے قائم رہے، مگر طبیعت میں اعتدال اور میانہ روی تھی، اس لئے فروعی مسائل میں رواداری برتتے تھے، جماعت اسلامی اور جماعت اہل حدیث کے بارے میں ان کا اور ان کے حلقہ کا جو بھی خیال رہا ہو، مگر اسلامی قانون کے نفاذ اور مشترکہ دینی مسائل اور ملی اتحاد کی خاطر ان جماعتوں کے رہنماؤں کے ساتھ تبادلہ خیال اور اشتراک عمل میں انھوں نے کبھی دریغ نہیں کیا، اپنے ایک رسالہ ''وحدت امت'' میں بڑے اخلاص اور دلسوزی کے ساتھ اتحاد کی اہمیت اور تفرق و انتشار کے نقصانات واضح کئے ہیں اور فقہی مسائل میں غلو، اختلافات اور معرکہ آرائی کی سخت مذمت کی ہے، وہ فروعی اختلافات کو حق و باطل کا معیار قرار دینے کے بجائے اولیٰ وغیر اولیٰ پر محمول کرتے تھے، اس رسالہ میں انھوں نے اپنے استاذ مولانا انور شاہ کشمیری کا یہ دلچسپ قول نقل کیا ہے کہ ''میاں ہم نے تو افضل و مفضول کی بحث میں اپنی ساری عمر ضائع کردی''۔

مفتی صاحب اپنے علم، تفقہ، تقویٰ، طہارت اور اعتدال و سلامت روی کی بناء پر برصغیر کے علمی و دینی حلقوں میں بہت مقبول تھے، اور ان کی علمی و فقہی رایوں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، افسوس ہے کہ ہماری پرانی علمی یادگاریں ایک ایک کر کے ختم ہوتی جارہی ہیں، اور ان کا کوئی بدل نظر نہیں آتا۔

ان کے صاحبزادہ مولوی محمد تقی عثمانی مدیر البلاغ دارالعلوم کراچی کے استاد اور لائق اہل قلم ہیں، ان سے بڑی توقعات وابستہ ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو اور دوسرے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور علم دین کے اس خادم کو اپنی رحمت کاملہ سے نوازے، آمین۔ (''ض''، نومبر ۱۹۷۶ء)

مرزا، وحید، ڈاکٹر

آہ! ڈاکٹر وحید مرزا

گزشتہ ماہ ریڈیو سے خبر ملی کہ اس برصغیر کے ایک بہت ہی لائق اور ممتاز اہل علم ڈاکٹر وحید مرزا کی وفات لاہور میں ہوگئی، اس خبر سے بڑا دکھ ہوا، ان سے میری ملاقات زیادہ نہیں رہی، اب سے ۳۵ سال پہلے ۱۹۴۱ء میں دہرہ دون میں تو ان سے برابر ملنے کا موقع ملا، اس کے بعد پھر کہیں ان سے نہیں ملا، مگر وہ اس وقت سے برابر دل و دماغ پر چھائے رہے ہیں ۱۹۴۱ء میں ایک طویل علالت کے بعد دہرہ دون جاکر تقریباً تین مہینے رہا، سرسید احمد خان ہم عصر اور دوست منشی ذکا اللہ مرحوم کے نامور فرزند جناب عنایت اللہ صاحب نے اپنی کوٹھی کے دو کمرے میرے قیام کے لئے دے دیئے تھے، اسی زمانہ میں لکھنؤ سے ڈاکٹر وحید مرزا دہرہ دون آکر اپنے خسر جناب رضاء اللہ کے یہاں مقیم تھے، جو جناب عنایت اللہ صاحب کے چھوٹے بھائی تھے، انجینئر کے عہدہ سے ریٹائر ہوکر دہرہ دون میں ایک بنگلہ بنایا تھا، دونوں بزرگوں کا وطن دہلی تھا، مگر عنایت اللہ صاحب نے دہرہ دون ہی میں ڈالن والا کے یسی روڈ پر منتقل سکونت اختیار کرلی تھی، ان ہی کے بنگلہ کی پشت پر رضا اللہ صاحب کا بنگلہ تھا، ڈاکٹر وحید مرزا ان دنوں لکھنؤ یونیورسٹی میں استاذ تھے، وہ دہرہ دون آئے تو عنایت اللہ صاحب کو سلام کرنے آئے، وہیں ان سے میرا تعارف ہوا، قد لمبا اور جسم دبلا پتلا تھا، دونوں گال پچکے ہوئے تھے، کیونکہ منہ کے تمام دانت نکلوا دیئے تھے، پتلون اور قمیص پہنے ہوئے تھے، بڑے متین اور سنجیدہ نظر آئے، خاموش بیٹھے رہے، عنایت اللہ صاحب کی باتوں کا جواب بہت ہی مختصر طریقے پر دے کر خاموش ہوجاتے، جب وہ اٹھ کر چلے گئے تو عنایت اللہ صاحب نے مجھ سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ بڑی قابلیت رکھتے ہیں، امیر خسرو پر بہت عمدہ کتاب لکھی ہے، اس زمانہ میں خود عنایت اللہ صاحب کی لیاقت کی بڑی شہرت تھی، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے دارالترجمہ کے ناظم کے عہدہ سے ریٹائر ہوکر بھی علمی کاموں میں لگے ہوئے تھے، ان کی جغرافیہ اندلس سے استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ بہت متاثر تھے، پھر بہت سی کتابوں کے ترجمے کرڈالے تھے، جن میں تائیس، سلامبو، تیمور اور چنگیز خان زیادہ مقبول ہوئیں، ہوورتھ کی ہسٹری آف دی منگولس کی ضخیم جلدوں کے بھی ترجمے کرلیے تھے، ڈاکٹر وحید مرزا کی قابلیت سے ان کا متاثر ہونا کوئی معمولی بات نہ تھی، میں نے اس زمانہ میں حضرت سید صاحب کے بہت سے مضامین کے ترجمے انگریزی میں کیے تھے، دو چار ملاقاتوں کے بعد ڈاکٹر صاحب سے ان ترجموں کی انگریزی دیکھنے کو عرض کی تو بڑی خوشی سے میرا مسودہ مجھ سے مانگا، اپنے پورے قیام میں اس کو دیکھتے رہے، انھوں نے جو اصلاح و ترمیم کی اس سے میں بھی ان کی قابلیت سے متاثر ہوا، ان کو عربی، فارسی، انگریزی اور اردو پر بڑی قدرت حاصل رہی، مگر بے تکلف صحبتوں میں بھی کبھی اپنے کمالات کا اظہار کرنا پسند نہ کرتے، ہم لوگ باتیں کرتے رہتے وہ صرف سننے ہی پر اکتفا کرتے، کچھ دنوں پہلے ان کی بیوی یعنی رضاء اللہ صاحب کی صاحبزادی کا انتقال ہوگیا تھا، اس سے ملول اور مغموم رہتے، ان کا لڑکا طاہر مرزا شاید تین چار برس کا رہا ہوگا، اس سے دل بہلاتے رہتے، اس کی ہر طرح کی ناز برداری کرنے ہی میں ان کو لذت ملتی، وہ ان کو چھیڑتا، تنگ کرتا، ان کا

ہاتھ پکڑ کر برآمدہ سے کمرہ اور کمرہ سے باہر لے جاتا، وہ اس کے حکم کی تعمیل کرتے رہتے تھے، جتنے دنوں ان کا ساتھ رہا یہی تماشہ دیکھنے میں آیا، اس سے ان کی شرافت نفس کا گہرا نقش دل میں برابر قائم رہا، پھر ان سے ملاقات نہیں ہوئی، مگر آنکھوں کے سامنے وہی وحید مرزا رہے جن کو طاہر مرزا ہر طرح چھیڑا کرتے تھے۔

دارالمصنفین واپس آکر امیر خسرو پر ان کی کتاب منگوائی، اس کے پڑھنے میں جو لذت ۱۹۴۲ء میں ملی وہی ۱۹۷۶ء میں بھی پاتا ہوں، اپنی علمی و ادبی زندگی میں مجھ کو امیر خسرو سے لگاؤ نہیں بلکہ عشق ہوگیا ہے، جن کو سب سے پہلے علامہ شبلی کے ذریعہ سمجھا مگر اس ذوق کی شراب کو دوآتشہ ڈاکٹر وحید مرزا کی کتاب نے بنایا، علامہ شبلی نے امیر خسرو سے متعلق اپنی شعرالعجم میں جو کچھ لکھا ہے، اس کے ایجاز کا اطناب ڈاکٹر صاحب کی تصنیف ہے، اگر علامہ شبلی بقید حیات ہوتے تو اس اطناب کی داد دل کھول کر دیتے، اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ امیر خسرو پر جو کچھ لکھا گیا تھا، وہ اس میں ہے، جو کچھ نہیں لکھا گیا ہے وہ بھی اس میں ہے، اور جو کچھ آگے چل کر لکھا جائے گا وہ بھی اس میں ہے ۱۹۷۵ء میں ہندوستان اور پاکستان میں امیر خسرو کا سات سوسالہ جشن بہت دھوم دھام سے منایا گیا، ان تقریبات میں بہت سے مقالات پڑھے گئے، ہر طرف سے رسائل کے امیر خسرو پر نمبر نکالے گئے، ظروف بدلے ہوئے تھے، مگر مظروف وہی تھا، جو ڈاکٹر وحید مرزا اپنے ظرف میں پیش کر چکے تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب ''لائف اینڈ ورکس آف امیر خسروؔ'' کے بعد امیر خسرو کی مثنوی ''نہ سپہر'' کو ایڈٹ کرکے شائع کیا، اس سے پہلے امیر خسرو کی قران السعدین اور ان کی خمسہ شائع ہوچکی تھیں، نہ سپہر کو ہاتھ لگاتے ہوئے شائد اہل نظر بھی گھبراتے تھے، مگر ڈاکٹر صاحب نے اس پر انگریزی میں ایک بہت ہی فاضلانہ مقدمہ لکھ کر اس کو شائع کیا تو ایک بار پھر ان کی اعلیٰ قابلیت کی دھوم ہوئی، انھوں نے مثنوی نہ سپہر کو جس طرح سمجھایا ہے اس سے بہتر کوئی اور نہ سمجھا سکے گا، آئندہ جو بھی اس مثنوی پر کچھ لکھے گا، اس سے استفادہ کئے بغیر نہ رہ سکے گا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں اس لئے بھیجے گئے تھے کہ امیر خسرو کو سمجھیں اور دوسروں کو سمجھائیں، ان کی طبیعت کی بلندی اور بے نیازی کا اثر اس حیثیت سے بھی پڑا کہ ۱۹۷۵ء میں جب پاکستان میں امیر خسرو پر نیشنل اور انٹرنیشنل سیمینار ہوئے تو میں اس زمانہ میں پاکستان ہی میں تھا، ان علمی مجلسوں میں ہر قسم کے اسکالر امیر خسرو پر کچھ نہ کچھ لکھ کر داد و تحسین کا خراج وصول کرنا چاہتے تھے، مگر ڈاکٹر وحید مرزا کہیں نظر نہیں آئے، حالانکہ ان ہی کا طوطی ہر جگہ بول رہا تھا، وہ ان تقریبوں کے ہنگاموں سے دور اپنے گوشہ عافیت میں بیٹھے اپنی دنیا آپ آباد کر رہے تھے۔

مئی ۱۹۳۵ء کے اورینٹل کالج میگزین میں مظہر کڑہ مانکپوری پر ایک بحث چھڑ گئی تھی، اس میں محمود شرانی، مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کے ساتھ ڈاکٹر وحید مرزا نے بھی حصہ لیا تھا، ان کا مضمون بڑے شوق سے علمی حلقہ میں پڑھا گیا تھا، ۱۹۶۰ء میں دارالمصنفین سے ''ہندوستان عربوں کی نظر'' میں نکلی تھی، تو اس کی پہلی جلد پر ڈاکٹر صاحب نے حیدرآباد کے اسلامک کلچر میں ایک طویل ریویو لکھا تھا، اس میں ترجموں کے تسامحات کی نشاندہی فاضلانہ انداز میں کی تھی جن کو دارالمصنفین میں تسلیم کیا گیا۔

وہ جب تک لکھنؤ یونیورسٹی میں رہے، اساتذہ اور طلبہ دونوں نہ صرف ان کی عزت بلکہ ان سے محبت کرتے یہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد لاہور کے پروفیسر محمد شفیع نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی ترتیب و تدوین کے سلسلہ میں اپنے یہاں مدعو کیا، جہاں وہ آخر وقت تک رہے۔

ان کے اعزہ زیادہ تر دہلی میں رہتے تھے، مگر انھوں نے لاہور میں رہ کر پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے کیا، اور وہیں سے پی۔ایچ۔ڈی کرنے لندن گئے، ان کو لاہور سے خاص مناسبت تھی، اس لئے اللہ تبارک و تعالیٰ کو بھی منظور تھا کہ وہ وہیں سپرد خاک ہوں۔

وہ اب آغوش رحمت الٰہی میں ہیں، مگر اپنے پیچھے ایک بہت ہی اچھے محقق، بہت اچھے اہل علم اور بہت ہی شریف انسان کی یاد چھوڑ گئے، امیر خسرو پر ان کی کتابیں تو شائع ہوکر مقبول ہوچکی ہیں، ضرورت اس کی ہے کہ ان کی ایک اچھی سوانح عمری لکھ کر ان کی علمی سرگرمیوں کا سیر حاصل جائزہ لیا جائے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں اور خوبیوں کی بدولت ان کو کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا کریں، آمین ثم آمین۔ (''ص۔ع''، نومبر ۱۹۷۶ء)

ندوی، سید ریاست علی، مولانا

آہ! مولانا سید ریاست علی ندوی

گزشتہ مہینہ پٹنہ کے اخبار صدائے عام میں دارالمصنفین کے ایک پرانے لائق خدمت گزار مولانا سید ریاست علی ندوی کی وفات کی خبر بڑے دکھ، اور درد کے ساتھ پڑھی، اسی وقت ان کی اہلیہ کے نام ایک تعزیتی تار بھیجا، پھر ان کے صاحبزادے سید ارشد علی کا یہ خط موصول ہوا:

آبگیلہ، ڈاکخانہ بنیادگنج، گیا۔

۱۹، دسمبر ۱۹۷۶ء

محترم چچا جان! السلام علیکم

بہت ہی افسوس کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ والد محترم جناب مولانا سید ریاست علی ندوی صاحب ۱۴/نومبر ۱۹۷۶ء کو بروز اتوار بوقت سوا نو بجے

دن رحلت فرما گئے، موت حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے ہوئی، پہلا دورہ ۱۳؍نومبر کو ۹ بجے دن کو ہوا، شہر کے مشہور ڈاکٹروں نے دیکھا، طبیعت سنبھل گئی، ہم لوگ کافی پر امید ہوگئے، احتیاط کی خاطر گیارہ بجے رات کو مقامی اسپتال میں داخل کردیا گیا، کبھی کبھی طبیعت کچھ بگڑ جاتی تھی، لیکن برابر ہوش میں رہے، اپنی وفات سے ایک منٹ پہلے ہنستے بولتے رہے، ہم لوگوں کے گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ ہم لوگوں کو اس قدر جلد داغ مفارقت دے جائیں گے۔

ان کو اپنی غیر مطبوعہ کتابوں کی کافی فکر تھی، وہ اعظم گڑھ جانے کا ارادہ بار بار کرتے رہے، وہ دسمبر میں اعظم گڑھ ضرور پہنچتے، وہ اپنی چند کتابیں دارالمصنفین کو دینا چاہتے تھے۔ یہ بات اطلاعاً لکھ رہا ہوں، امید کہ جناب عالی مع الخیر ہوں گے''۔

اس خط کو پڑھ کر آبدیدہ ہوا اور چالیس سال پہلے کے دارالمصنفین کی صحبتیں یاد آ گئیں، میں یہاں ۱۹۳۵ء میں آیا، یہ اس کی شہرت کے شباب کا زمانہ تھا، اس وقت اس علمی کارواں کے سالار اور حدی خواں استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلمان ندویؒ تھے، جن کے علم کا اعتراف علامہ اقبالؒ نے جوئے شیر اسلامیہ کا فرہاد کہہ کر کیا تھا، اس وقت ان کی علمی بصیرت اور تحقیقی ژرف نگاہی سے پورا ہندوستان گونج رہا تھا، ہندوستان کے ہر گوشہ سے ان سے استفادہ کے لئے ارباب علم پہنچتے رہتے تھے، دارالمصنفین کے اندر مولانا عبدالسلام ندویؒ اپنے گزشتہ عافیت میں بیٹھ کر علم و ادب کے موتی بکھیرنے میں مشغول تھے، اس بیت الحکمت سے مولانا ابوظفر ندوی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا سید ریاست علی ندوی، جناب محمد عزیر صاحب ایم۔اے، ایل۔ایل۔بی، اور ہاں مدراس سے آ کر مولوی حافظ محمد یوسف کوکنی عمری وابستہ تھے، مولوی مسعود علی ندوی اہل علم نہ ہونے کے باوجود اس علمی مجلس کے رکن رکین بنے رہے، وہ اپنی دلچسپ باتوں اور بذلہ سنجیوں سے اس پر چھائے رہتے، میں یہاں پہنچا تو مجھ کو یہاں کا ہر ہر گوشۂ بساط دامانِ باغبان اور کفِ گل فروش نظر آیا۔

مگر یہی بزم جنت نگاہ اور فردوس گوش بنی ہوئی تھی، سرور و سوز، جوش و خروش سے خالی ہوتی گئی، پہلے تو استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کی جدائی سے ان کے صریر خامہ کے نوائے سروش سے محروم ہوگئی، ان کے بعد مولانا عبدالسلام ندوی کے قلم کا خرام ناز اور نظارۂ جمال آنکھوں سے اوجھل ہوا، مولانا ابوظفر ندوی بھی دارالمصنفین سے جا کر اللہ کو پیارے ہوئے، پھر مولوی مسعود علی ندوی کی شیریں بیانی اور خوش گفتاری چھن گئی، جناب مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی دارالمصنفین کے وقار اور آبرو کے ضامن بنے ہوئے اس کی مسند پر متمکن تھے کہ یکا یک اس کے ذرہ ذرہ کو سینہ کوبی کرنے کے لیے چھوڑ گئے، ڈاکٹر محمد عزیر ۱۹۴۰ء ہی میں دارالمصنفین چھوڑ کر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ چلے گئے تھے، مگر بفضل اللہ تعالیٰ وہ بقید حیات ہیں اور کراچی میں عاقبت سنوارنے میں لگے ہوئے ہیں، جناب مولوی حافظ محمد یوسف صاحب بھی پانچ سال یہاں رہ کر مدراس واپس ہوگئے، جہاں وہ مدراس یونیورسٹی میں عربی و فارسی اور اردو کے شعبوں کے صدر ہوئے۔

مولانا سید ریاست علی ندوی بھی ۱۹۵۰ء میں یہاں سے مستقل طور پر چلے گئے، مگر یہاں سے جانے سے پہلے دارالمصنفین کے بزم دوشین کی ایک روشن شمع وہ بھی تھے، مگر آہ وہ بھی اب خموش ہے،

وہ ۱۹۲۴ء میں جناب شاہ معین الدین احمد ندوی کے ساتھ ندوہ کی تعلیم ختم کر کے حضرت سید صاحب کی خواہش پر یہاں آئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں سید صاحب کو اپنی علمی ریاضت و محنت سے متاثر کیا، ۱۹۲۶ء میں ان کو اپنی نگرانی میں معارف کے مضامین کی ترتیب کا کام سپرد کیا، جس میں وہ اچھے اچھے مضامین کی تلخیص کرتے اور مطبوعات جدیدہ پر ریویو بھی لکھتے رہے، ۱۹۲۶ء سے ۱۹۵۰ء تک معارف میں ان کے اہم مضامین حسب ذیل عنوانات سے شائع ہوئے۔

عربوں کا علمِ طب شام میں (جون ۱۹۲۶ء)، فقہ اسلامی کے مذاہب اربعہ (جولائی تا ستمبر ۱۹۲۶ء)، ترکی ادبیات پر ایک اجمالی نظر (جون ۱۹۲۷ء)، امام غزالی اور حکمائے یورپ (اگست ۱۹۲۸ء)، ابن رشیق صقلیہ میں (اپریل، اگست، ستمبر ۱۹۲۹ء)، خان اعظم تاتار خان (فروری ۱۹۳۲ء)، کیا عالمگیر کے عہد میں تاریخ نویسی قانوناً جرم تھی (مئی ۱۹۳۲ء)، ترجمان القرآن اور نجات و سعادت کی راہ (مارچ ۱۹۳۳ء)، اغلبیوں کا عدالتی نظام (دسمبر ۱۹۳۳ء)، سندھ کے اسلامی حملوں کے قیدی (مئی ۱۹۳۵ء)، سسلی میں مسلمانوں کا تمدن (ادارہ معارف اسلامیہ لاہور میں پڑھا گیا، ستمبر تا دسمبر ۱۹۳۵ء و جنوری ۱۹۳۶ء)، صفی ہندی (مارچ ۱۹۴۳ء)، عالمگیر کے عہد میں مندروں کا انہدام (ستمبر ۱۹۴۳ء)، کتاب العشر والزکوۃ (اگست، ستمبر ۱۹۴۴ء)، عہد اسلامی کا ہندوستان (مئی، جون، جولائی ۱۹۴۹ء)۔

معارف میں باب الاستفسار قائم کیا گیا تو اس میں بیرونی سوالات کے جوابات بہت ہی محنت سے لکھتے جو بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے۔

دارالمصنفین کے قیام میں ان کا اہم کارنامہ دو جلدوں میں تاریخ صقلیہ کی ترتیب و تدوین ہے، اس جزیرہ میں مسلمانوں کی حکومت کے کارناموں کو بالکل بھلا دیا گیا تھا، یہاں ان کی ڈھائی سو سال کی حکمرانی رہی، اس مدت میں انھوں نے اس کو جس طرح سنوارا، وہ مسلمانوں کی تاریخ کا بڑا شاندار کارنامہ ہے، اس کی پہلی جلد بقول مصنف مرحوم رزمگاہ ہے، جس میں یہاں کے سیاسی حالات اور مسلسل معرکہ

آرائیاں دکھائی گئی ہیں، اور دوسری جلد بزمگاہ ہے جس میں صقلیہ کے اسلامی تمدن کے مناظر دکھائے گئے ہیں، اس طرح یہ دونوں جلدیں ایک ایسی تمدن آفریں قوم کی سرگزشت ہے جس کی تمدنی ترقیاں یورپ کی جدید ترقیوں کی بنیادوں میں سے ایک بنیاد ہے، مرحوم نے ان دونوں جلدوں کو جس محنت و ریاضت سے لکھا ہے، وہ دارالمصنفین کی علمی تاریخ کا ایک بڑا کارنامہ شمار کرنے کے لائق ہے، اس کو جن چند کتابوں پر ناز ہے، ان میں یہ دو جلدیں بھی شامل ہیں۔

ان کی ایک کتاب تاریخ اندلس جلد اول بھی ہے، یہ بھی دارالمصنفین کی مقبول کتابوں میں ہے اور یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے، انھوں نے معارف میں اسلامی نظام تعلیم کے عنوان سے ایک سلسلہ مضمون بھی لکھنا شروع کیا تھا، جو بعد میں کتاب کی صورت میں شائع ہوکر مقبول ہوئی، اردو میں اس موضوع پر اس سے بہتر شائد کوئی اور کتاب نہیں، معارف میں ان کے جو مضامین ہندوستان پر نکلتے رہے، ان کا ایک مجموعہ ''عہد اسلامی کا ہندوستان'' کے نام سے شائع کیا۔

دارالمصنفین میں تقریباً ۱۴ سال رہنے کے بعد وہ مدرسہ شمس الہدیٰ کے پرنسپل کے عہدہ کے خواستگار ہوئے، وہاں ان کا انتخاب نہیں ہوسکا تو ان کو دارالمصنفین واپس آنے میں تامل ہوا، اس لئے وہ اپنے وطن گیا جاکر رسالہ ندیم کے مالک ہوگئے، ان کو خیال ہوا کہ وہ معارف کے اپنے ادارتی تجربے سے اس کے معیار کو اونچا کرکے معارف بنادیں گے۔ لیکن اس میں ان کو مایوسی ہوئی، ندیم کا ایک بہار نمبر تو اچھا نکالا، مگر اس کے بعد مالی پریشانیوں میں مبتلا ہوگئے تو پھر دارالمصنفین واپس آگئے، یہ زمانہ ہندوستان کی سیاست میں بہت ہی پُرآشوب تھا، کانگریس اور مسلم لیگ کی کشمکش سے ہندوستان کی سیاست بہت ہی مکدر ہورہی تھی، سید صاحب دارالمصنفین کو اس سیاسی الجھاؤ سے محروم رکھنا چاہتے تھے، مگر ریاست علی صاحب کھل کر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے، جو سید صاحب کو پسند نہ آیا، ۱۹۵۰ء میں وہ دارالمصنفین کو چھوڑ کر شمس الہدیٰ کے پرنسپل ہوگئے تو وہاں نہ خود مطمئن رہ سکے، نہ وہاں طلبہ اور اساتذہ کو خوش رکھ سکے، اس لئے بہار عربک پرشین ریسرچ انسٹیٹیوٹ منتقل ہوگئے، جہاں سے ریٹائر ہوئے تو ان کو یونیورسٹی گرانٹ کمیشن سے کچھ تحقیقی کام کے لئے وظیفہ بھی ملا، مگر شائد مکمل نہ کرسکے، ان کا وطن آبکیلہ ضلع گیا تھا، وہیں زندگی کے آخری ایام گزار رہے تھے، سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے باوجود سیاست ان کے لئے سازگار نہیں ہوئی، وفات سے کچھ دنوں پہلے ان کو موتیا بند ہوگیا تھا، اس لئے لکھنے پڑھنے سے مجبور ہوگئے، آپریشن کے بعد روشنی آگئی تھی، میرا اصرار تھا کہ وہ دارالمصنفین آکر تاریخ اندلس کی دوسری جلد مکمل کردیں، اس کے لئے وہ رضامند بھی ہوگئے تھے، ان کی آمد کا انتظار تھا، کہ یکایک ان کی رحلت کی خبر ملی، جس سے بڑا دکھ پہنچا، وفات کے وقت ان کی عمر غالباً ۷۴ سال تھی۔

ان کی اصل جگہ دارالمصنفین تھی، وہ ایک پرنسپل، ایک استاد اور ایک سیاست داں کی حیثیت سے تو بھلا دیئے جائیں گے لیکن ایک اچھے مصنف کی حیثیت سے برابر یاد کئے جائیں گے، اگر ان کی ساری عمر دارالمصنفین ہی میں گزرتی تو اپنے پیچھے مفید اور بلند پایہ تصانیف چھوڑ جاتے، انھوں نے پٹنہ میں ادارۃ المصنفین قائم کرنا چاہا لیکن ناکام رہے، وہ خود کہتے کہ دارالمصنفین چھوٹا تو علم کا لبادہ بھی خود بخود اتر گیا، دارالمصنفین کی تاریخ کا یہ پہلو عجیب ہے کہ یہاں رہ کر اچھے سے اچھے مصنف تیار ہوئے، لیکن یہاں سے جانے کے بعد وہ علم وفن کے لئے کھوگئے، مرحوم دارالمصنفین چھوڑ رہے تھے تو سید صاحب کو دکھ تھا کہ ایک لائق، محنتی اور قابل قدر مصنف ان سے جدا ہورہا ہے، اس تحریر کے لکھتے وقت یہ خیال آرہا ہے کہ وہ یہاں آخر وقت تک رہتے تو دارالمصنفین کے علمی آسمان کے ایک اہم سیارہ اور ملک کے ایک قیمتی علمی سرمایہ بن کر رہتے۔

دعا ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ ان کو اپنی آغوش مغفرت میں لے کر ہر قسم کی رحمتوں اور برکتوں سے سرفراز فرمائیں۔ آمین! (''ص۔ ع''، دسمبر ۱۹۷۶ء)

دریابادی، عبدالماجد، مولانا

آہ! مولانا عبدالماجد دریابادی

معارف کے زیر نظر شمارہ کی کتابت ہوچکی تھی کہ فخر روزگار، یگانہ وقت، مجاہد العلم، رئیس القلم اور دارالمصنفین کی مجلس ارکان کے صدر نشین مولانا عبدالماجد دریاباری کی رحلت کی اچانک خبر ریڈیو سے سنی تو ع عجب اک سانحہ ہوگیا ہے۔

ان کی زندگی کی شاندار کتاب ختم ہوگئی، جس کا ہر ورق اپنی گوناگوں خوبیوں سے مزین رہا، یہ عاجز راقم گزشتہ ۴۲ سال سے ایک ادنی خورد کی حیثیت سے ان کی بزرگانہ شفقت اور علمی جلالت کے سامنے سر تسلیم خم کرتا رہا، اس مدت میں ان کی زندگی کی جو سرگرمیاں رہیں وہ متحرک تصویروں کی طرح نظروں کے سامنے گھومنے لگیں۔

گل و آئینہ کیا ، خورشید و مہ کیا
جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رو تھا

کیننگ کالج لکھنؤ سے بی، اے کرنے کے بعد ان کی زندگی کا آغاز الحاد و بے دینی کی وادی کی سیر سے ہوا، مگر یہیں ان کی نظر شعلۂ طور بن کر چمکی، جس کے بعد وہ توحید اور رسالت کے ایسے داعی اور مبلغ بنے کہ سند یافتہ عالم نہ ہونے کے باوجود باوقار عالم تسلیم کیے گئے، اچھے اچھے علماء ان کے سامنے جھکے، کبھی علماء کی مجلس کے سرخیل بھی منتخب ہوئے اور ان کا خاتمہ بالخیر کلام پاک کے مفسر اور شارح کی حیثیت سے ہوا، انھوں نے اردو اور انگریزی میں جو تفسیر لکھی ہے اس میں اسرائیلیات کی فتنہ سامانیاں اور

توریت وانجیل کی تحریفات کی شرانگیزیوں کی راز کشائی میں جو دیدہ وری اورنکتہ وری دکھائی ہے اس سے کلام پاک کے مفسروں میں ان کا مقام ہمیشہ نمایاں رہے گا، ان کی یہ تفسیر گنجینہ معارف وتحقیق بھی سمجھی جاتی رہے گی۔

وہ کچھ دنوں تک فلسفی بھی رہے، ان کی ''فلسفہ جذبات'' اور''فلسفہ اجتماع'' ان کی ابتدائی دور کی تصانیف ہیں جن کے بعد ان کی ''مبادی فلسفہ'' کی دو جلدیں ''فلسفہ اوراس کی تعلیم''، ''ہم اور آپ بھی نکلیں''، ان کے فلسفیانہ مضامین کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا اور جب اردو کا خالی دامن ان کے فلسفیانہ خیالات سے پر ہورہا تھا تو انھوں نے فلسفہ کے چناں وچنیں سے منہ موڑ کر اقبال ہی کی طرح پیرروم کو اپنا معنوی مرشد قرار دیا، اسلامی تصوف اور فیہ مافیہ لکھ کر راہ سلوک کے ایک پر جوش سالک بن گئے، مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بیعت بھی ہوئے، مگر حکیم الامت لکھ کر مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تعلیمات کے اسرار ورموز کے شارح بنے جس کے بعد

؎ جس طرف کے لے چلا رہبر چلے

وہ بڑے اچھے مترجم بھی تھے، انگریزی سے اردو میں برکلے کے مکالمات، لیسکی کی تاریخ اخلاق یورپ بکل کی تاریخ تمدن، سیوپال کے پیام امن کے ترجمے کیے ان کے ترجمے میں اصل کتاب ہی کی لذت اور کیفیت محسوس ہوتی ہے، ان کتابوں سے یورپ کے تہذیب وتمدن سے واقف ہوئے تو ان سے متاثر ہونے کے بجائے ان کو یا جوجی تمدن اور دجالی فتنہ قرار دیا، وہاں کی فحاشی، عریانی، رندی اور بے راہ روی پر اپنی مختلف تحریروں سے ایسی کاری ضربیں لگاتے رہے کہ جن لوگوں نے ہندوستان کو یورپ کی تمدنی فریب کاریوں سے بچایا ہے ان میں ان کا نام بھی نمایاں طور پر لیا جائے گا۔

وہ اردو تنقید نگاری کے ایک خاص رنگ کے امام بھی رہے، اردو شعر وادب کی رمزشناسی میں ان سے شاید ہی کوئی سبقت لے جاسکا، لکھنوی تہذیب کے ساتھ لکھنو کی شاعری اور اس کے نثری اسلوب کے بڑے دلدادہ تھے، زہر عشق، مرزا رسوا اور گل بکاؤلی پر ان کے تبصرے ان کے نقادانہ دقت نظر کے شاہکار ہیں، غالب کو ایک فلسفی کے بجائے ہر بات کو حکیمانہ انداز میں کہنے والا شاعر مرزا شوق کو ایک بدنام شاعر حالی کو ایک واعظ شاعر، اکبرآبادی کی شوخی اور دل لگی کو ایک نیا آئین اکبری، شکوہ والے اقبال کو صاحب حال اور سالک اور جواب شکوہ کے اقبال کو صاحبِ مقام اور عارف کہکر نقادوں کے ذہن کے لیے نئے دریچے کھول دیئے۔

وہ اپنے زمانہ میں اردو کی انشاء پردازی کے بھی امام رہے، وہ اپنے طرز کے موجد اور خاتم تھے، شبلیؒ، مہدی افادی اور سید سلیمانؒ کے انداز بیان کے بڑے پرستار اور قدردان تھے، مگر اپنے طرز نگارش میں کسی کی تقلید پسند نہیں کی، بالکل منفرد اور غیر مقلد رہے، ان کی تحریروں میں جہاں تندی صہبا موج خرام یار، نکہتِ بادِ بہاری اور فکری لالہ کاری ملے گی وہاں کج روحریفوں کے مقابلہ میں سانپ کی پھنکار، بچھو کا ڈنک اور خنجر کا وار بھی ہے، وہ اپنے مخالفوں کے خلاف اپنے قلم سے صف شکن یلغار اور مردافگن یورش کرکے اپنی انشا پردازی کا جوہر دکھاتے، اپنے عزیز دوستوں اور محبوب معاصروں کی موت پر ماتم کرتے تو اس میں دلسوزی، عقیدت مندی اور وفا کیشی کے ساتھ ان کے قلم کی رعنائی، شگفتگی اور رنگینی کی پوری بہار آفریں قوس قزح نظر آتی، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا عبدالماجد بدایونی، بہادر یار جنگ اور سید سلیمان ندوی اور حکیم عبدالمجید لکھنوی پر ان کی ماتمی تحریروں میں ان کے زور بیان کے ساتھ اثر، تاثیر اخلاص محبت اور درد کے جھلملاتے جواہر ریزے نظر آتے ہیں، ان کے مضامین کے مجموعے انشائے ماجدی میں جمع کردیئے گئے ہیں جو ہر زمانہ میں بلاغت کی سحرکاری، فصاحت کی تازگی اور سلاست کی پرکاری کے لحاظ سے اردو ادب کے شہ پارے بنے رہیں گے، یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ لکھنو کی زبان کا بانکپن اور رسیلا پن دکھانے والا سفر حجاز اور تفسیر کی زبان لکھنے میں کس قدر باوقار، باوزن اور متین ہوگیا ہے۔

انھوں نے سچ اور صدق نکال کر اپنے کو شیر دل بلکہ کفن بردوش صحافی بھی ثابت کیا، حکومت کا دبدبہ قانون کا شکنجہ، انقلاب کا کوئی بھچولہ ان کے قلم کی آزادی کو نہ روک سکا، مسلمانوں کے غمخوار، غمگسار اور دمساز بن کر ان کے سیاسی المناک حوادث پر خون کے آنسو روئے، ان کی سیاسی کامیابی اور فتح پر اپنی مسرت وشادمانی کا اظہار دل کھول کرکیا، خواہ ان کی یہ تحریریں حکومت کی پالیسی کے خلاف ہی کیوں نہ ہوتیں، سچ اور صدق جدید میں سچی باتیں لکھ کر ایمان، ایقان اور عرفان کے موتی بکھیرتے رہے، اس انداز کی تحریر اب مدت مدید تک کوئی اور نہ لکھ سکے گا، اسی کے ساتھ اسلامی طرز فکر کی راہ چھوڑنے والوں کے خلاف خم ٹھونک کر میدان میں اترتے، کردار کو نیلام کی بولی پر بھینٹ چڑھانے والوں کے نہاں خانے میں پہنچ کر شب خوں مارتے، اپنی تحریروں کی ناوک فگنی سے تجدد پسندوں کے کلیجوں کو چھلنی کرتے رہے، ان کے اخبار کا ایک شعر ایک جلی سرخی، ایک زہریلا فقرہ ان کے حریفوں کے پورے مضمون پر بھاری ہوتا۔

ان کے چھوٹے سائز کا ہفتہ وار اخبار سچ یا صدق جدید کل آٹھ صفحے پر مشتمل ہوتا، اس کو شروع سے آخر تک خود ہی لکھتے جو ان کے قلم کی صاعقہ پاشی کی دلیل ہوتی، اس میں کبھی تو واعظ، کبھی فقیہ، کبھی مرد مومن، کبھی مفسر قرآن، کبھی متکلم اسلام، کبھی نقاد، کبھی سیاسی مبصر اور ہاں کبھی قلم کے افراسیاب، کبھی اسلوب کے جمشید اور کبھی زور بیان کے رستم بن جاتے اور اپنی آخر عمر میں خوش ہوں گے کہ علم، ادب اور فن کا ایک انبار نہیں بلکہ گل وگلزار لگا کر زندگی ختم کررہے ہیں۔

وہ خلافت تحریک میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مولانا محمد علی کے اصرار سے شریک ہوئے، مگر کبھی سیاسی رہنما ہونے کے دعوے دار نہیں ہوئے، البتہ علی برادران کی

طرح جوکھدر کا کرتہ اور پائجامہ اور جبہ پہنا تو آخر عمر تک پہنتے رہے، مولانا محمد علی کے نام پر جان چھڑکتے رہے، ان کی یاد میں محمد علی کی ڈائری کے نام سے جو دو جلدیں لکھی ہیں ان میں ان کے نہ صرف دل و جگر کے ٹکڑے بلکہ انشا پردازانہ کمالات کے سارے جلوے نظر آتے ہیں، مولانا محمد علی پر ان دونوں جلدوں سے بہتر اب تک کوئی اور کتاب نہیں لکھی گئی۔

دارالمصنفین کی اکسٹھ سالہ زندگی کے ہر نشیب و فراز میں اس کے ہمدم اور ہمراز بنے رہے، شروع میں اس کی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے، پھر اس کی مجلس ارکان کے صدر بھی ہوگئے، اس کا شائد ہی کوئی ایسا جلسہ ہوا ہو جس میں ان کی شرکت نہ ہوئی ہو، آخری بار گزشتہ نومبر میں ان کی علالت کے زمانہ میں ملنے گیا تو رخصت کرتے وقت فرمایا کہ، خدا کرے دارالمصنفین کے آئندہ جلسہ میں پھر حاضری کا موقع مل جائے، وہ یہاں تشریف لاتے تو تمام لوگ ان کے سامنے مودب بیٹھتے، سید صاحب سے وہ عمر میں بہت چھوٹے تھے، مگر وہ ان کا بڑا احترام کرتے، ان کو کوئی خط لکھتے تو اس احترام کو برقرار رکھتے، خود وہ سید صاحب کی بڑی عزت بلکہ ان سے بڑی محبت کرتے، جب کبھی ان پر کوئی مضمون لکھا، ان کا قلم بہت ہی رواں اور شگفتہ ہوگیا، مولوی مسعود علی ندوی سے ان کی بڑی بے تکلفی رہتی، وہ طبعاً بہت ہی متین سنجیدہ اور خاموش تھے کسی مجلس میں مشکل سے کچھ بولتے، مگر مولوی مسعود علی ندوی سے باتیں کرتے تو عندلیب شیوا بیان بن جاتے، صدق میں ان سے کسی سے قلمی جنگ شروع ہوجاتی تو سید صاحب فرماتے کہ ان کے گوریلا جنگ کے خلاف کسی کا کامیاب ہونا آسان نہیں، سید صاحب کے بعد وہ دارالمصنفین کے علمی محتسب بھی بن گئے تھے، معارف اور یہاں کی نئی تصانیف ان کی خدمت میں ضرور بھیجی جاتیں، زبان اور انداز بیان میں کوئی فروگذاشت ہوجاتی تو اس کی طرف توجہ ضرور دلاتے اور جو چیز پسند آجاتی اس کی تعریف دل کھول کر کرتے، افسوس دارالمصنفین اپنے ایک بڑے علمی محتسب سے محروم ہوگیا۔

ان تمام اوصاف کے ساتھ ان کا ایک بہت بڑا صف یہ بھی تھا کہ انھوں نے بڑی جرأت کے ساتھ اسلامی جمعیت کی دیدبانی، اسلامی شعار کی پاسبانی اور ملی غیرت کی رجز خوانی کی، ان کی تفسیر کے ساتھ ان کا وہ سوز نہاں اور درد پنہاں جو ان کے دل میں اسلام کے لئے رہا، ان کا توشۂ آخرت بنے گا، ان ہی کی بدولت جنت کے رضوان نے ان کا خیر مقدم کیا ہوگا اور حوریں پیشوائی میں شراب طہور کا مینا و ساغر لے کر بڑھی ہوں گی، ان سطروں کے لکھتے وقت اخبار سے معلوم ہوا کہ ان کے جنازہ کی نماز ندوۃ العلماء کے احاطہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے پڑھائی جس میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ شریک ہوئے، مولانا علی میاں سے تو وہ محبت نہیں بلکہ عشق کرتے، ندوہ سے بھی ان کو غیر معمولی لگاؤ رہا، ندوہ میں مولانا علی میاں نے ان کے جنازہ کی نماز پڑھا کر اپنا فرض اور قرض دونوں ادا کیا، یہ راقم بخار میں مبتلا تھا، اس لئے تعزیت میں نہیں پہنچ سکا لیکن جنازہ کی شرکت کے لئے ایک سہ رکنی وفد دارالمصنفین کی طرف سے بھی گیا، دل کے تقاضے سے مجبور ہوکر یہ سطریں بستر علالت ہی پر سے قلمبند کی جارہی ہیں۔

ع اے نالہ! نشانِ جگر سوختہ کہاں ہے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے، مگر مولانا سپرد خاک ہوئے تو ان کے سینہ میں علم کی جو ہمہ گیری، قلم کی جو صاحبقرانی تحریر کی جو برق روشنی، علم و عرفان کی جو فرمانروائی اور اسلام کی عزت و ناموس کی خاطر جو قلمی سرفروشی اور جانبازی تھی، وہ بھی ان کے ساتھ خاک ہوگئی، عالم بقا کے مسافر! تجھ پر رحمت، تیری روح پر رحمت، اسلامی روایت کی تیری حدی خوانی پر رحمت، تیرے قلم کی اس کوہ کنی پر رحمت جس سے جوئے شیر اسلامیہ بہتی نظر آتی، الوداع، السلام، تو جاچکا، مگر تو زبان حال سے کہتا گیا:

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں
ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

(''ص۔ع''، جنوری ۱۹۷۷ء)

یاور جنگ بہادر، علی، نواب

نواب علی یاور جنگ بہادر

گزشتہ ماہ دسمبر میں نواب علی یاور جنگ بہادر گورنر بمبئی کا انتقال ہوگیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد حکومت ہند کی طرف سے ان کو بڑے بڑے عہدے ملتے رہے، وہ امریکہ میں ہندوستان کی طرف سے سفیر بنا کر بھیجے گئے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر بنائے گئے، بمبئی کی گورنری کے عہدے پر مامور ہوئے اور اسی ریاست کے گورنر کی حیثیت ہی سے عالم بقا کو سدھارے، اور معلوم نہیں کتنے دوسرے اعزاز ان کو حاصل ہوتے رہے، حکومت ہند کے معتمد ترین حکام میں ان کا شمار ہوتا رہا۔

میں نے ان کو کسی بڑے عہدیدار کی حیثیت سے نہ جانا اور نہ پہچانا، بلکہ ان سے نواب عمادالملک کے نواسے کی حیثیت سے ملتا رہا، نواب عمادالملک دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے پہلے صدر تھے، جن کا احسان دارالمصنفین پر بہت بڑا تھا، ان ہی کی مساعی جمیلہ سے علامہ شبلیؒ کی وفات کے بعد ان کا ماہانہ وظیفہ دارالمصنفین کے نام منتقل ہوا، جس سے اس کی تاسیس میں بڑی مدد ملی، وہ دارالمصنفین کے بڑے قدرداں اور سرپرست رہے، جب ان کی وفات ۳/ جون ۱۹۲۶ء کو ہوئی تو استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ نے معارف کے شذرات میں اپنی غیر معمولی سوگواری کا اظہار کیا، جس میں ان کے اور بہت سے فضائل اور محاسن کے ساتھ مولانا شبلی، دارالمصنفین اور خود ان سے جو تعلقات رہے، اس کا ذکر بہت ہی خوش عقیدگی سے کیا، جس کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں:

''آخر عمر میں مولانا شبلی مرحوم کی تحریک سے انھوں نے قرآن مجید کا انگریزی میں ترجمہ شروع کیا تھا جو سولہ پاروں تک ضعف بصارت و علالت کی وجہ سے رک گیا، اس ترجمہ میں بالکل بائبل کی زبان اختیار کی ہے''۔

''مولانا شبلی مرحوم سے ان کا تعلق سرسید کے زمانہ سے اور ان ہی کے واسطہ سے ہوا تھا، چنانچہ مرحوم ان کی بڑی قدر فرماتے تھے''۔

''الفاروق کی تالیف میں ان کی حوصلہ افزائی کو بھی دخل ہے، جامعہ عثمانیہ کا پہلا نام حیدرآباد کی مشرقی یونیورسٹی پڑا تھا، اس کے نصاب اور خاکہ کی تیاری کے لیے مولانا شبلیؒ مرحوم کا انتخاب ان ہی کے اشارہ سے ہوا تھا اور ۱۹۱۴ء میں مولانا شبلی مرحوم کی ماہانہ تنخواہ میں دوسو کا اضافہ نواب صاحب ہی کی تحریک سے اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خان نے منظور فرمایا''۔

مولانا شبلی مرحوم سے اس تعلق اور دارالعلوم ندوہ کی تعلیم میں مشرقی و مغربی علوم و فنون کی جامعیت کی بنا پر اس سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے، چنانچہ ۱۹۰۸ء میں انھوں نے ندوہ کو اپنا قیمتی کتب خانہ عطا فرمایا اور ہر موقع پر طلبائے ندوہ کی سرپرستی و قدردانی کرتے رہے۔ مولانا شبلی کی نسبت اور ایک علمی مرکز ہونے کی حیثیت سے انھوں نے دارالمصنفین کے ساتھ ابتدا ہی سے اپنا شغف ظاہر فرمایا اور جس کو آخر زندگی تک قائم رکھا، چنانچہ جب دارالمصنفین قائم ہوا تو ان ہی کی سفارش سے مولانا شبلی مرحوم کی تین سو ماہوار رقم سرکار آصفیہ نے دارالمصنفین کے نام منتقل کردی، اس کے ساتھ خاص اپنی جیب سے انھوں نے اس کے لیے سالانہ سو روپے کی رقم مقرر فرمائی اور مجھے لکھا کہ دارالمصنفین پہلا انسٹیٹیوشن ہے جس کے لئے میں یہ مستقل رقم مقرر کرتا ہوں، لیکن یہ رقم ان کے حوصلہ کے مطابق نہ تھی، اس لیے اس پر ہمیشہ تاسف و ندامت کا اظہار کرتے رہے، وہ دارالمصنفین کی مجلس منتظمہ کے پہلے صدر نشین تھے اور آخر تک اس تعلق کو قائم رکھا، معارف کا بالاستیعاب مطالعہ فرماتے اور جو مضمون پسند آتا اس پر خوشی ظاہر کرتے، اس کے لکھنے والے کے حالات دریافت فرماتے، مولانا عبدالباری ندوی سے ان کا تعارف اسی طرح ہوا، دارالمصنفین کی تصنیفات جب ان کی خدمت میں بھیجی جاتی تھیں تو ان کو لازمی طور پر پڑھتے تھے اور اگر ضعف و علالت کی وجہ سے خود نہیں پڑھ سکتے تھے تو دوسروں سے پڑھوا کر سنتے تھے، ان تصنیفات کے پہنچنے پر مجھے جو خط لکھتے، اس میں ان کی داد دیتے تھے اور اپنی مسرت کا اظہار کرتے تھے۔

خود سید صاحب اپنے متعلق فرماتے ہیں کہ:

''آخر عمر تک نواب صاحب کے علمی تعلقات کا سلسلہ برابر جاری رہا، خصوصاً حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کی وفات کے بعد جو نومبر ۱۹۱۴ء میں ہوئی، ان کی شفقت بزرگانہ سے یہ تعلقات برابر بڑھتے رہے، خط و کتابت کا آغاز اس طرح ہوا کہ استاذ مرحوم کی وفات پر جو اردو مرثیہ میں نے لکھا تھا وہ ان کے پاس بھیجا، جواب میں ایک ایسا نکتہ حوالہ قلم فرمایا جو ہمیشہ میرے لیے رہنما ثابت ہوا۔ فرمایا، عرض ہنر اس وقت تک نہیں کرنا چاہئے جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ اس ہنر میں میرا کوئی حریف نہ ہو سکے گا۔ حیدرآباد جب جانا ہوا تو شفقت سے ملتے، دیر تک باتیں کرتے رہتے تھے، اسلامی علوم و فنون، تمدن و تاریخ کا موضوع ہوتا، ہمیشہ اپنے مکتوبات سے ممنون فرماتے''۔

نواب علی یاور جنگ کے لیے میرے دل میں نرم گوشہ محض اس لیے رہا کہ وہ علامہ شبلیؒ اور سید صاحبؒ کے بہت بڑے قدردان اور دارالمصنفین کے بہت بڑے مربی کے نواسے تھے۔

وہ جب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے، تو ان کا ایک خط دارالمصنفین آیا کہ بزم صوفیہ ان کے نام سے وی، پی بھیجی جائے، مجھ کو تعجب ہوا کہ ان کو تصوف سے کیسے ذوق پیدا ہوگیا، میری پہلی ملاقات دہلی میں ان سے انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز کے ایک جلسہ میں ہوئی، میں اس کونسل میں دارالمصنفین کی نمائندگی بارہ سال تک کرتا رہا، جب نواب علی یاور جنگ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوئے تو اس کونسل کے وہ بھی رکن ہوئے، وہ پہلی دفعہ اس کے جلسہ میں شریک ہوئے تو جب ان کو معلوم ہوا کہ میں دارالمصنفین سے آیا ہوں تو جلسہ کے بعد اور تمام معزز اراکین کو نظر انداز کر کے میری طرف بڑھے، دارالمصنفین سے متعلق پوری تفصیلات حاصل کرتے رہے، کہنے لگے کہ دارالمصنفین سے بڑی دلچسپی رہی ہے، اس لیے کہ جب علامہ شبلی میرے نانا عمادالملک سے ملنے آتے تو وہ مجھ کو اپنی گود میں بٹھا لیتے، وہ دونوں کی علمی گفتگو سمجھ تو نہیں سکتے لیکن غیر شعوری طور پر ان کی باتوں کا نقش ان کے ذہن پر رہا، پھر کہنے لگے کہ وہ اب بھی فخر محسوس کرتے ہیں کہ وہ علامہ شبلی کی گود میں بیٹھے، بلکہ وہ اپنے کو ان کی گود کا پروردہ سمجھتے ہیں، وہ علامہ شبلی کی تصانیف، ان کے اسلوب، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ان کی جانشینی کا جو حق ادا کیا ہے اور پھر ان سے جو ملاقاتیں ہوتی رہیں اس پر اتنی دیر تک گفتگو کرتے رہے کہ چائے کی ایک نشست ختم ہوگئی اور ہم دونوں وہاں نہیں پہنچ سکے۔

اسی کے دوسرے سال میں کسی کام سے دہلی گیا تو ایک روز اپنے بہت ہی معزز کرم فرما اور دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے اہم رکن کرنل بشیر حسین زیدی کے ساتھ ان کی موٹر گاڑی پر کہیں جانا ہوا، انھوں نے راستہ میں کہا کہ وہ ذرا انٹرنیشنل کلب بھی تھوڑی دیر ٹھہریں گے، وہاں پہنچ کر وہ کلب کی عمارت میں چلے گئے۔ میں موٹر ہی میں بیٹھا رہا وہ باہر آئے تو ان کے ساتھ نواب علی یاور جنگ بہادر بھی تھے، زیدی صاحب نے فرمایا کہ میں موٹر میں بیٹھا ہوں تو وہ مجھ سے ملنے چلے آئے ہیں، پھر تو ایک خوشگوار

شام گزری، جس میں نواب عمادالملک، علامہ شبلی اور سید صاحب پر دیر تک گفتگو رہی، سید صاحب سے حیدرآباد میں جوان کی ملاقاتیں ہوتی رہیں ان کا ذکر بھی کرتے رہے، پھر فرمایا کہ جب وہ امریکہ میں سفیر تھے تو تذکرہ سلیمان مولفہ غلام محمد کا اشتہار دیکھا، کراچی سے خاص طور پر یہ کتاب منگوائی اور جب یہ کتاب پڑھی تو اس میں مولانا سید سلیمان ندوی نظر نہیں آئے، میں نے اس پر ان سے عرض کیا کہ یہ کتاب آپ کے لیے نہیں لکھی گئی، پھر کہنے لگے کہ وہ سید صاحب کو ایک مصنف، ایک محقق، ایک مورخ اور ایک ادیب کی حیثیت سے جاننا چاہتے تھے، میں نے اثنائے گفتگو میں عرض کیا کہ آپ کے نانا نواب عمادالملک سید صاحب کے ذہن پر برابر چھائے رہے، ان کی زبانی میں نے سنا کہ جب علامہ شبلی کی رحلت ہوئی تو انھوں نے بہت دکھ اور درد کے ساتھ ان کا نوحہ لکھا جو اخباروں میں چھپا تو ہر طرف سے اس کی تعریف ہوئی، عزیز لکھنوی نے بھی اس کو پسند کیا، مگر نواب عمادالملک کو شاید پسند نہ آیا، اس لیے انھوں نے سید صاحب کو لکھ بھیجا کہ وہ بازار میں اپنی کسی چیز کو اس وقت تک پیش نہ کریں جب تک کہ ان کو یقین کامل نہ ہو کہ بازار میں اس سے بہتر چیز کوئی اور پیش نہیں کرسکتا، میں نے کہا کہ سید صاحب نے یہ بیان کرکے فرمایا کہ نواب صاحب کی یہ نصیحت ذہن پر برابر چھائی رہی اور اپنی تحریر اور تصنیف کی طباعت و اشاعت سے پہلے نواب صاحب برابر ذہن کے سامنے کھڑے رہتے، نواب علی یاور جنگ نے اپنے نانا کی یہ نصیحت سنی تو بہت محظوظ ہوئے اور بولے کہ دارالمصنفین کو یہ نصیحت ہمیشہ پیشِ نظر رکھنی چاہئے، میں نے عرض کیا ”حتی الوسع یہ پیشِ نظر ہے“۔

ان سے میری دو ملاقاتیں آئی گئی ہوگئیں، دسمبر ۱۹۷۴ء میں شاہ صاحب کی وفات ہوئی تو ان کا یہ مکتوب میرے نام پہنچا:

راج بھون، ۶/جنوری ۱۹۷۵ء

مکرمی!

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے انتقال کی خبر مجھ کو شاق گزری، خدا ان کو اپنے جوار رحمت میں لے، میری ان سے ملاقات تو نہیں ہوئی البتہ اپنے نانا کے توسط سے مجھے مولانا سید سلیمان ندوی سے نیاز حاصل تھا، بچپن میں تو مولانا شبلی مرحوم کو بھی اپنے نانا کے پاس آتے جاتے دیکھا تھا اور کبھی کبھار ان کی گود میں بیٹھنے کی عزت بھی حاصل ہوئی۔ (علی یاور جنگ)

اس کے بعد امیر خسرو کا سات سوسالہ جشن منایا جانے لگا، تو اس کے وہ روح رواں بن گئے، میرے نام سے بھی ان کے دستخط سے ایک گشتی مراسلہ پہنچا، امیر خسرو سے مجھ کو عشق رہا ہے، اس لیے میں نے ان پر انگریزی میں ایک مضمون لکھ کر ان کی خدمت میں بھیج دیا، فروری ۱۹۷۵ء میں دہلی میں امیر خسرو پر انٹرنیشنل سیمینار کی تاریخیں مقرر ہوئیں تو ان ہی کے دستخط سے میرے نام سے بھی شرکت کے لیے ایک دعوت نامہ پہنچا، میں ان ہی دنوں دارالمصنفین کے کام سے پاکستان جانے والا تھا، اس لیے میں نے اس دعوت نامہ کی رسید نہیں بھیجی، جب سمینار کا وقت قریب آیا تو ایک روز نواب علی یاور جنگ صاحب کا ایک لمبا تار میرے نام پہنچا کہ میری شرکت ضروری ہے۔

اس تار پر اس میں شرکت کے لیے آمادہ ہوگیا، وہاں پہنچا تو نواب علی یاور جنگ اس طرح ملے جیسے میری اور ان کی ملاقاتیں برابر ہوتی رہی ہیں، ملتے ہی کہا کہ حیات سلیمان چھپ گئی ہے، مجھ کو اس کے پڑھنے کا بہت اشتیاق ہے، میں نے عرض کیا کہ یہ آپ کی خدمت میں پہنچ جائے گی۔

سیمینار میں انگلستان، روس، شام، ترکی، مصر، عراق اور بنگلہ دیش کے بھی نمائندے آئے ہوئے تھے، ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے عربی اور فارسی کے اساتذہ بھی موجود تھے، بڑا اچھا اجتماع تھا، صدر جمہوریہ ہند نے اس کا افتتاح کیا، اس کے بعد ایک علیحدہ کمرہ میں سیمینار شروع ہوا، تو یہ بھر گیا، جگہ کی تنگی محسوس ہونے لگی، شام کے نمائندے کی صدارت میں کارروائی شروع ہوئی، مگر اس میں نواب علی یاور جنگ بہادر ہی پورے طور پر چھائے رہے، انھوں نے جب یہ کہا کہ عمادالملک کے نواسے کی تقریب میں عمادالملک کا نواسہ موجود ہے، تو بہت پسند کیا گیا۔

انھوں نے کمرے کو ضرورت سے زیادہ لوگوں سے بھرا ہوا دیکھا تو فوراً جھلاہٹ کے لہجہ میں مجمع کو مخاطب کرکے کہا ”جن کے پاس دعوت نامے نہیں ہیں وہ باہر نکل جائیں“۔ اس سے مجمع میں کھلبلی سی مچ گئی، نواب صاحب نے ایک صاحب کو مخاطب کرکے کہا کہ ”وہ کیسے آگئے ہیں، باہر چلے جائیں“، اس سے اور بھی تکدر بڑھا، مگر پھر فضا خوشگوار ہوگئی، جلسہ ختم ہوا تو نواب صاحب کے لب و لہجہ پر تنقیدیں ہو رہی تھیں، مگر پوری تقریبات نواب صاحب کی وجہ سے بہت ہی خوش اسلوبی سے انجام پائیں، انھوں نے ہر مقرر اور مقالہ نگار پر اچھے اچھے تبصرے کیے، اسی لیے میں نے معارف کے شذرات میں جب اس سیمینار کا ذکر کیا تو نواب صاحب کی ابتدائی ڈانٹ پھٹکار کو زیادہ نمایاں نہیں کیا، جس سے بعض دوست میرے شاکی بھی ہوئے۔

اس سمینار میں امیر خسرو کے کچھ مخالفین اور ناقدین بھی جمع ہوگئے تھے، جنھوں نے ان پر یہ کہہ کر اعتراضات کیے کہ وہ صوفی کسی معنے میں نہ تھے، خواجہ نظام الدینؒ اولیاء سے ان کی ارادت نہ تھی، وہ ایک چالاک آدمی تھے، اس لیے دربار سے، ہر حکمران سے تعلقات رکھتے رہے وہ موسیقی کے ماہر نہ تھے، ان کی ہندو دشمنی سے متعلق بھی کچھ باتیں بیان کی گئیں، وغیرہ وغیرہ۔ سیمینار میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی درگاہ کے جناب پیر ضامن علی اور جناب حسن ثانی بھی تھے، وہ دونوں یہ سب کچھ سن کر دم بخود تھے، مگر خاموش تھے، میرے لیے بھی یہ اعتراضات ناخوشگوار بلکہ ناقابل

برداشت تھے، بے چین ہوکر میں نے ہر ایک سے ٹکر لی اور امیر خسرو سے متعلق میرا جو کچھ مطالعہ تھا اس کو بروئے کار لانے کی کوشش کی، یہاں تک کہ نواب صاحب نے مجھ کو مخاطب کرکے کہا کہ میں نے بہت کافی وقت لیا، کچھ اور لوگوں کو بھی بولنے کا موقع دوں، میں نے ان سے عرض کیا کہ میں اس لیے برابر بول رہا ہوں کہ عمادالملک کے نواسے امیر خسرو نے سات سو برس میں جو کچھ حاصل کیا ہے، وہ عمادالملک کے نواسے کی موجودگی میں اس دوروز کے سیمینار میں ان سے چھین نہ لیا جائے، یہ سن کر مجمع کے ساتھ وہ بھی ہنسنے لگے، چائے کا وقفہ ہوا، تو وہ میرے پاس آئے اور بولے کہ میں دارالمصنفین کی نمائندگی کا پورا حق ادا کررہا ہوں اسی وقت ایک روسی نمائندہ بھی میرے پاس پہنچ گئے اور مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں سے آیا ہوں۔ نواب صاحب نے شبلی اکیڈمی کا نام بتایا، تو روسی نمائندے نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ اس اکیڈمی کی نمائندگی پورے طور پر ہورہی ہے، میرے کچھ علمی دوستوں نے بھی کہا کہ میرا آنا اچھا ہوا ورنہ معلوم نہیں اس سیمینار میں امیر خسرو کہاں لے جاکر پٹک دیے جاتے، سیمینار کے دوسرے دن راشٹرپتی بھون میں صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے ایٹ ہوم تھا، میں بھی ڈاکٹر یوسف حسین صاحب کے ساتھ وہاں پہنچا، صدر جمہوریہ سے بڑھ بڑھ کر سبھی مل رہے تھے، وہ دارالمصنفین کے بڑے محسن، ہمدرد اور سرپرست رہے ہیں، اس کی رکنیت بھی قبول فرما کر اس کی عزت بڑھائی ہے، میں بھی ان کی خدمت میں پہنچ کر شرف ملاقات حاصل کرنا چاہتا تھا، مگر اس بھیڑ بھاڑ میں پہنچنے کی ہمت نہیں ہورہی تھی، دور سے نواب علی یاور جنگ صاحب کی نظر میرے اوپر پڑی، وہ میرے پاس آئے اور مجھ کو اپنے ساتھ صدر صاحب کے سامنے لاکھڑا کردیا اور پھر میں نے سمینار میں جو حصہ لیا اس کا ذکر کرنے کے ساتھ میری تصانیف کے لیے ایسے ایسے کلمات خیر کہے جن کا میں اپنے کو مستحق نہیں پارہا تھا، میں دونوں بزرگوں کے سامنے شرمندہ ہورہا تھا، میں ان سے رخصت ہوا تو عرض کیا کہ میں دہلی سے بمبئی پی، ایچ۔ ڈی کے ایک مقالہ کا ممتحن بن کر جارہا ہوں، وہ بولے، میں بمبئی میں ان سے ضرور ملوں، بمبئی میں کچھ ایسا مشغول رہا کہ ان سے وقت مقرر کرنے کا موقع نہ ملا، جب چلنے لگا تو ان کے سکریٹری سے ان کی مشغولیتوں کا پروگرام معلوم ہوا تو میں ان سے ملے بغیر بمبئی سے اعظم گڑھ کے لیے روانہ ہوا۔

اعظم گڑھ آکر حیات سلیمان کے ساتھ کچھ اور کتابیں ان کی خدمت میں بھیج دیں، پھر پاکستان چلا گیا، جہاں دارالمصنفین کے کام کے سلسلہ میں سات مہینے قیام کرنا پڑا، اس اثناء میں نواب صاحب کے دو عنایت نامے موصول ہوئے جو یہ تھے۔

راج بھون، مورخہ ۱۵/ مارچ ۱۹۷۶ء

مکرمی!

چاروں کتابیں جن میں سے سچی کہانیوں کے دو حصے ہیں، وصول ہوئیں، جن کا ازحد شکریہ، مطالعہ بزم صوفیہ کی طبع ثانی سے شروع کیا ہے، جس کا بہت انتظار تھا، مولانا سید سلیمان ندوی صاحب مرحوم سے مجھے بڑا انس تھا اور ان کی حیات کو بھی بڑے شوق سے پڑھوں گا، مجھے علم ہے اور افسوس بھی کہ آپ بمبئی تشریف فرما تھے اور مجھ سے ملنا چاہتے تھے، مگر اتنے دن دہلی میں رہنے کے بعد واپسی پر کام کا انبار جمع ہوگیا تھا، اس کے علاوہ پے درپے کمیٹیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا، اس لیے آپ سے معافی چاہتا ہوں اور امید ہے کہ آپ مجھے بخش دیں گے، جی چاہتا ہے کہ اب اعظم گڑھ ہی میں ملاقات ہو، دارالمصنفین سے نانا مرحوم کو بھی دیرینہ علمی تعلق رہا، اس کے کتب خانہ کو بھی خاص طور سے دیکھنا چاہتا ہوں، یہ کب ہوسکے گا، خدا ہی جانتا ہے، مگر میں اس کے لیے برابر دعا کررہا ہوں۔ (فقط علی یاور جنگ)

راج بھون بمبئی، مورخہ ۱۱/ مئی ۱۹۷۶ء

مکرمی!

ابھی سوچ میں لگا ہوں کہ کب آپ کی خدمت میں حاضر ہوں اور دارالمصنفین کا کتب خانہ دیکھوں جس میں جی لگا ہوا ہے، اس سلسلہ میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کی سوانح عمری کا مطالعہ ختم ہوگیا، کتاب مجھے بے حد پسند آئی اور مولانا بہت یاد آئے، چندروز ہوئے حیدرآباد جانے کا موقع آیا تو اس مکان کو بھی دیکھا جہاں عمادالملک بہادر اپنی عمر کے آخری حصہ میں رہا کرتے تھے، اور جہاں مجھے پہلی بار مولانا سید سلیمان ندوی سے شرف ملاقات حاصل ہوا، اس وقت اس مکان میں آل انڈیا ریڈیو بسا ہوا ہے، ان کا سابقہ مکان بلگرامی ہوز (House) بھی مکرر دیکھا جو انھوں نے میری والدہ کو دے دیا تھا اور جس میں میں پیدا ہوا، میں نے خاص طور سے وہاں اس کمرے کا بھی معائنہ کیا جس میں وہ مولانا شبلی مرحوم سے ملاقات کیا کرتے تھے، اس طرح آپ کی بھیجی ہوئی کتاب کیا پڑھی کہ سارا پچھلا زمانہ یاد آگیا۔

معارف کی اس اشاعت کا شکریہ جس کے شذرات میں سیمینار کا ذکر خیر کیا گیا ہے، جو آپ ہی کے قلم مبارک سے لکھا گیا ہے، اگر اس اشاعت کی تین یا چار کاپیاں اور مجھے مل سکیں تو ضرور بھیج دیجئے میں ممنون ہوں گا، سیمینار میں آپ کی عالمانہ تقریریں مجھے ہمیشہ یاد رہیں گی، جنھوں نے بالخصوص تصوف کے موضوع پر مباحث کو اتنے بلند پایہ رکھا۔

فقط علی یاور جنگ

محبی مولانا عبدالسلام ندوی میری عدم موجودگی میں دارالمصنفین کی ڈاک کے جوابات دیتے رہے تھے، نواب صاحب کے خطوط کے بھی جوابات دیئے، مگر شائد ان کے سامنے پیش نہیں کئے گئے، میں پاکستان سے واپس آیا تو اپنی ڈاک میں یہ دوخطوط بھی پڑھے، ان کا جواب دیا، مگر جواب دینے میں عجلت نہیں کی، خیال ہوا کہ ان کے جوابات تو جاچکے ہیں، میں نے ان کو جو خط لکھا اس میں کوئی جواب طلب بات نہ تھی، اس لیے ان کے جواب کا انتظار نہ تھا، ایک رات یکایک ان کی وفات کی خبر ریڈیو سے ملی، تو بڑا دکھ ہوا، ان کی علالت کی خبر نہ ملی تھی، اس لیے ان کی المناک وفات کی خبر سننے کے لیے تیار نہ تھا، ان کی ملاقاتیں اور ان کی باتیں یاد آتی رہیں، سرکاری حلقوں میں ان کی اہمیت کا اندازہ تو پہلے ہی سے تھا، ان کی موت پر صدر جمہوریہ ہند اور وزیراعظم مسز اندرا گاندھی کے جو تعزیتی پیغامات شائع ہوئے اس سے ان کی سرکاری حیثیت کی اہمیت کے اندازہ میں اور بھی اضافہ ہوا۔

ان کی وفات کے چار روز کے بعد ان کا یہ مکتوب ملا:

راج بھون بمبئی، مورخہ ۷/دسمبر ۱۹۷۶ء

مکرمی!

آپ کے خطوط مورخہ ۹/نومبر کا شدید انتظار تھا، اور اب معلوم ہوا کہ کیوں میرے دو پچھلے خطوں کے جواب نہیں آئے۔ اس بیچ میں قلب کے عارضہ سے میں بیمار پڑ گیا تھا اور آپریشن کروانا پڑا، اب خدا کے فضل سے رفتہ رفتہ روبصحت ہوتا جارہا ہوں، اس وقت دہلی جانے کا ارادہ نہیں ہے، مگر جب بھی ہوا تو وہاں سے اعظم گڑھ ضرور آؤں گا اور آپ سے ملاقات کا شرف حاصل کروں گا، جس کے لیے جی تڑپ رہا ہے، رسالہ معارف کے اس خاص شمارے کی دو تین کاپیاں جن کی مجھے ضرورت تھی اور جن میں شذرات کے تحت سیمینار کے بارے میں بڑا قدردانہ مضمون شائع ہوا تھا، ان کو بھیجنا نہ بھولئے، انتظار رہے گا، کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ وہ سیمینار کے رکارڈ میں رہیں۔ فقط، علی یاور جنگ

اس خط کو پڑھ کر ان کی وفات کی سوگواری میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہوئی کہ علامہ شبلی، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی اور دارالمصنفین کا ایک بڑا قدردان جاتا رہا، اس حیثیت سے وہ یاد آتے رہے اور اکثر یاد آتے رہیں گے۔

ان کی زندگی میں ان کے ناقدین بھی رہے، بعض حلقوں میں ان کی مخالفت بھی ہوتی رہی جس کی ناشگوار انتہا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کورٹ کے جلسہ میں پہنچ گئی تھی، مگر انھوں نے اپنے لیے جو دنیا بنائی تھی، اس میں وہ کامیاب رہے اور کامیاب اس دنیا سے رخصت ہوئے، ان میں کمزوریاں بھی رہی ہوں گی، مگر ان میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں، اللہ تبارک تعالیٰ ان کی عاقبت کو بھی بخیر کرے، آمین!

(''ص۔ع''، جنوری ۱۹۷۷ء)

صدیقی، رشید احمد

آہ! رشید احمد صدیقی

ابھی مولانا عبدالماجد دریابادی کی وفات کا غم تازہ ہی تھا کہ اردو زبان کے ایک اور صاحب کمال صاحب طرز اور صاحب فن ادیب اور انشاء پرداز یعنی یگانہ روزگار، فخر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ در مایۂ ناز فرزند شیراز ہند جناب رشید احمد صدیقی کی رحلت کی خبر ملی۔

دل سے لپٹ لپٹ کر غم بار بار رویا

وہ مڑیا ہو ضلع جونپور کے رہنے والے تھے، علی گڑھ میں چھ سال تعلیم پائی، یہاں کے شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے تو یہیں کے ہوکر رہ گئے، اس کی روایات کے رازداں، اس کی حمیت کے دیدباں، اس کی عزت کے نگہبان اور اس کی آبرو کے پاسبان بن کر ساری زندگی گزاری، وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ایک اہل دل مسلمان نقاش اور مصور کا شاہکار سمجھتے رہے، سیاحوں کو جو دل آویزی اور رعنائی اجنٹا اور ایلورا میں نظر آتی ہے، وہی ان کو گھر بیٹھے مسلم یونیورسٹی میں نظر آتی رہی، شاہجہاں مثمن برج میں بیٹھ کر تاج محل دیکھا کرتا، پھر اسی برج میں اس نے ایک چھوٹا سا شیشہ نصب کرا رکھا تھا، جس میں تاج محل کا پورا عکس پڑتا رہتا، رشید صاحب کے لئے علی گڑھ میں ان کا مکان ان کا مثمن برج تھا، جس کے اندورونی حصہ میں ایک خوبصورت لہلہاتا سبزہ زار تھا، اس کے بیرونی حصہ میں طرح طرح کے گلاب کے پودے لگے رہتے تھے، یہیں سے اپنے شیشہ دل میں اپنے ذہن کے تاج محل یعنی مسلم یونیورسٹی کو دیکھ کر خوش ہوتے رہتے، اب اسی تاج محل کے اندر مدفون ہیں، جس کی سرزمین نے ان کے جسد خاکی کو نہیں بلکہ مسلم یونیورسٹی کے نشاط روح، سوز سینہ اور دل بےقرار کو بڑے شوق سے اپنی آغوش میں لے لیا ہوگا، وہ جاچکے مگر اپنی کتاب ''آشفتہ بیانی میری'' میں علی گڑھ کے لئے یہ پیام چھوڑ گئے ہیں کہ زمانہ بدلتا رہتا ہے بدلتے رہنا اس کی تقدیر ہے، علی گڑھ اس تقدیر سے باہر نہیں ہے، اس لئے وہ بنتا بگڑتا رہے گا، لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ہر تبدیلی کی زیادہ سے زیادہ اچھائیوں اور کم سے کم برائیوں کو قبول کرے گا۔

وہ ادبی دنیا میں ایک مزاح نگار کی حیثیت سے داخل ہوئے ''طنزیات و مضحکات'' لکھ کر اس فن کو سیکھنے اور سکھانے کی کوشش کی، پھر ''خنداں'' اور ''مضامین رشید'' لکھ کر سنجیدہ ظرافت اور ظریفانہ سنجیدگی دونوں کو ایک مستقل آرٹ بنادیا، شیخ نیازی لکھ کر بچوں کو بھی کشت زعفران کے کنارے لاکر کھڑا کردیا، ان کے مضامین

''دھوبی'' اور ''حاجی صاحب'' کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے قلم سے آب و گیاہ سے خالی زمین کو لالہ زار اور بے مزہ زندگی کو مزیدار بنا سکتے تھے، شروع میں ان کا نام فرحت اللہ بیگ، شوکت تھانوی اور پطرس بخاری کے ساتھ لیا جاتا تھا، مگر رفتہ رفتہ ان کی صف سے نکل کر اپنے لئے نئی راہ نکالی، وہ قہقہوں کے بجائے صرف موج تبسم کے قائل تھے، وہ صرف گدگدانے، گدگدا کر ہنسنے پر مجبور نہیں کرتے، دکھتی ہوئی رگ کو ضرور پکڑ لیتے، مگر اس کو مسل دینے سے گریز کر جاتے، ان کے یہاں نیش عقرب ہوتا اور نہ نوک سوزن ہوتی، ان کی بذلہ سنجی پر ان کے ذوق کی عفت مآبی چھائی رہتی، جو حجاب شکن اور نہ نقاب پوش ہوتی مگر ہر حال میں محمل نشیں ہوتی، وہ شاعر نہ تھے، مگر اپنی مزاحیہ نثر سے شاعری کا کام لیتے رہتے، آخر میں تو اس میں غالب کی شوخی، داغ کا تیکھا پن، اکبر الہ آبادی کا اخلاقِ درس، جگر کی دردمندی اور فانی کے غم کی معرفت پیدا ہوگئی تھی۔

ان کی علمی و ادبی تحریروں میں بڑی آب و تاب ہوتی، ان کی وجہ سے دہلی اور لکھنؤ اسکول کی طرح اردو زبان کا ایک علی گڑھ اسکول بھی بن گیا ہے، وہ جب کوئی تحریر لکھتے اس میں اردو کے ساتھ علی گڑھ یا علی گڑھ کی کسی شخصیت کا ذکر ضرور لے آتے، ان کو خود اعتراف ہے کہ ان میں انداز گل افشانی گفتار علی گڑھ ہی کے پیمانہ وصہبا سے آیا، ان کی تحریروں میں مشرقیت کے احترام کے ساتھ مغربیت کا پاس خاطر بھی ہوتا، جن میں خوش طبعی، شایستگی اور خیر اندیشی کے آبدار موتی بھی جھلملاتے رہتے، اپنے محبوب معاصروں اور خصوصاً علی گڑھ کے کسی نامور فرزند کی وفات پر کوئی ماتمی تحریر لکھتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ لکھ نہیں رہے ہیں بلکہ اس کی تربت پر پھولوں کی چادر چڑھا رہے ہیں، مولانا محمد علی پر ان کا نوحہ ان کے قلم اور خود اردو ادب کی انشا پردازی کی بہترین مثال ہے۔ وہ ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ بولتے تو معلوم ہوتا کہ بوالہول کی آواز اہرام مصر سے ٹکرا رہی ہے، لکھتے تو معلوم ہوتا کہ کرپ کے کارخانے میں توپیں ڈھلنے والی ہیں، یا پھر شاہ جہاں کے ذہن میں تاج محل کا نقشہ مرتب ہورہا ہے۔......محمد علی کو بدتوفیقوں اور بدمذاقوں سے سابقہ پڑا، ایسے بدتوفیق اور بدمذاق بھوکے تھے، بوالہوس اور کثیر کینہ پرور بھی، محمد علی نے ان سب سے انتقام بھی لیا، لیکن اپنی زندگی میں نہیں بلکہ اپنی موت سے......''ایسا حسین کہاں جس کو خود یزید تلاش ہو'' آج کون ہے جو ایسے ڈھلے، ترشے اور کندن کی طرح چمکتے ہوئے جملے لکھ سکتا ہے، ان کی گنج ہائے گرانمایہ اردو ادب کا بیش بہا سرمایہ بنی رہے گی۔

وہ اپنے زندہ معاصروں میں سے کسی پر کچھ لکھتے تو اس میں بھی خاص رنگ و بو پیدا کر دیتے، ان کی کتاب ''ہمارے ذاکر صاحب''، ڈاکٹر ذاکر حسین ہی کی زندگی میں شائع ہوئی، ڈاکٹر صاحب نے راشٹرپتی بن کر جب کبھی اس کو راشٹرپتی بھون میں پڑھا ہوگا تو ان کو یہ فیصلہ کرنا شائد مشکل ہوا ہوگا کہ راشٹرپتی کے مغل گارڈن کے سبزہ زاروں اور پھولوں میں زیادہ لہلہاہٹ اور شادابی ہے یا رشید صاحب کی اس کتاب میں ان کی تحریروں کو پڑھتے وقت کبھی ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہم گوری چنبیلی کی روش کے بیچ کھڑے ہو کر بکھری ہوئی تجلی اور چھٹکی ہوئی چاندنی سے محظوظ ہو رہے ہیں، ان ہی کے انداز میں یہ کہتے میں تامل نہیں کہ وہ اپنی تحریروں کی جنت میں ہمیشہ زندہ و قائم رہیں گے۔

انھوں نے اردو تنقید نگاری کے فن کی بھی امامت کی، جس میں ان کا رنگ بالکل ہی منفردانہ اور غیر مقلدانہ رہا، وہ جب یہ لکھتے ہیں کہ ''غزل بدنام ہونے کے باوجود اردو شاعری کی آبرو ہے''، ''غالب نے اردو شاعری کو وزن اور وقعت دینے کے علاوہ ایک نسب اور ایک روایت بھی دی''، بعض احباب کہتے رہتے ہیں کہ ''غالب ایک زوال آمادہ تمدن، جاگیردارانہ نظام یا روایتی شاعری کے چراغ رہگذار باد تھے، تو یہ الزامات ہیں، اصولی تنقید نہیں، آئین نہیں، آرڈیننس ہے''، ''جدید اردو میں ان تمام صالح و دلکش اور وقتی عناصر کی جلوہ گری ملتی ہے جن سے خود علی گڑھ عبارت ہے''، ''اقبال کے کلام کا مطالعہ کیجئے، حاتم طائی کے کوہ ندا کی مانند وہ اپنی پہلی آواز پر آپ کو کشاں کشاں اپنے قدموں میں لا ڈالیں گے''۔''اقبال کبھی حکیم پہلے اور شاعر بعد میں اور کبھی اس کے خلاف لیکن بالآخر دونوں''۔ تو ان جملوں میں نہ صرف نیا پن ہے بلکہ نظر و فکر کی گہرائی بھی ہے، انھوں نے غالب، اقبال، اکبر الہ آبادی، اصغر اور فانی پر جو کچھ لکھ دیا ہے اس میں آئندہ نسلوں کے لئے بھی کہنگی محسوس نہیں ہوگی، اس سے ہر زمانہ میں روشنی ملے گی اور ذہن میں جلا پیدا ہوتی رہے گی، جس سے ان کے ادبی شعور کی پختگی کا اظہار ہوتا رہے گا۔

ان کو دارالمصنفین سے بڑا گہرا لگاؤ تھا، وہ علامہ شبلی کی تحریروں کی رعنائی، برنائی، جمالیات کی زمر شناسی، ان کے تخیل کی رنگینی اور جذبے میں حرارت اور تلملاہٹ کے بے حد قائل تھے، استاذ محترم مولانا سید سلیمان ندویؒ علی گڑھ تشریف لے جاتے تو وہ ان کی میزبانی بڑی محبت اور احترام سے کرتے، ان کی وفات پر معارف کے سلمان نمبر کے لئے گنج گرانمایہ کے عنوان سے جو مضمون لکھا وہ ان کے بہترین مضامین میں شمار ہوتا رہے گا، اس میں ان کے علمی تبحر، تحقیقی ذہانت، ذہنی تنقیحات، ادبی بصیرت، مورخانہ ژرف نگاہی، طالب علمانہ شغف، علوم پر محرمانہ نظر، مذہب کے معاملات میں شریفانہ، دانشمندانہ اور عالمانہ رویہ، تقریر کی اثر آفرینی اور صلح جوئی کے ساتھ ساتھ ان کی وضع قطع میں نفاست پسندی اور رکھ رکھاؤ کی مدح بڑی فراخدلی سے کی ہے، ان کی اس رائے پر کہ وہ بحیثیت طالب علم علامہ شبلی سے متاثر ہوئے اور بحیثیت معلم سید صاحب سے، ان کے مرتبہ شناسی میں مدد ملے گی، اور یہ غور و فکر کی بھی دعوت دیتی ہے، وہ مولانا عبدالسلام ندوی کی تصانیف کی منطقیانہ ترتیب کے معترف

تھے، کہتے کہ پیچیدہ مسائل کو سلجھا کر لکھنے میں ان کی ہمسری کوئی نہیں کرسکتا ہے، ان کی اقبال کامل کے متعلق بار بار کہا کہ یونیورسٹیوں میں اقبال اسی کتاب کے ذریعہ سے سمجھے گئے، وہ جناب شاہ معین الدین ندوی مرحوم کے ادبی ذوق کے بھی مداح تھے، معارف کے سلیمان نمبر کے لئے انھوں نے اپنا مضمون ان کے پاس یہ لکھ کر بھیجا کہ وہ جس طرح چاہیں اس میں کتر بیونت کرسکتے ہیں، ان کی ترمیم و اصلاح سے ان کو پورا اتفاق ہوگا، یہ ان کی کسر نفسی کا بھی ثبوت تھا، یہ راقم علی گڑھ جب بھی گیا ان کی خدمت میں حاضر ہوکر ان سے کچھ نہ کچھ سیکھ کر اٹھا، جب اپنی کتاب ''غالب مدح و قدح کی روشنی میں'' لکھ رہا تھا تو ان کو یہ کچھ ایسی پسند آگئی کہ اس کو جلد از جلد طبع اور شائع کرنے کی فرمائش کرتے رہے، اس کا اعتراف ہے کہ ان ہی کی حوصلہ افزائی سے یہ دو جلدوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔

ان کے فرشتہ صفت چھوٹے بھائی جناب نیاز احمد صدیقی شبلی کالج میں انگریزی کے لکچرر تھے، جن کا قیام عرصۂ دراز تک شبلی منزل کے احاطہ ہی میں رہا، اس لئے وہ جب کبھی اعظم گڑھ آئے تو یہیں قیام کرتے، وہ مولانا مسعود علی ندوی کی خوش سلیقگی اور خوش انتظامی، یہاں کی خاطر مدارات، مہمان نوازی، رفقاء کے میل محبت اور کام کرنے کے شغف سے متاثر ہوتے، انھوں نے اپنے ایک مضمون میں جہاں یہ تحریر فرمایا کہ بہت سے دانایان سیاست، ارباب فضیلت اور شیدائیان شعر و ادب اس سے نسبت رکھنا اپنے لیے ایک امتیاز سمجھتے تھے، وہاں یہ بھی لکھا کہ اعظم گڑھ کا یہ مختصر سا خطہ جو کسی طرح ایک اوسط درجہ کے باغ کے رقبہ سے زیادہ نہیں ہے، شمالی ہند کی روایتی تہذیب و دانش و بینش کی نہ صرف نمایندگی کرتا رہا بلکہ اس میں خاطر خواہ اضافہ بھی کرتا رہا ''......یہ خاکسار جب جب ملا شبلی منزل کی اس روایتی تہذیب کو برقرار رکھنے کی بھی ضرور نصیحت کی، وہ معارف کے شذرات کو بہت شوق اور پابندی سے پڑھا کرتے تھے، حضرت سید صاحبؒ نے اس کے لکھنے میں جو معیار قائم کیا تھا اس کو قائم رکھنے کی تلقین اپنی ملاقاتوں میں برابر کرتے رہتے، ان سطروں کے لکھتے وقت ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ ان کی وفات سے دارالمصنفین اپنے ایک بہت ہی دلنواز اور شفیق بزرگ اور قدرداں سے محروم ہوگیا''۔

ان کی رحلت کے بعد علی گڑھ کے چمن کی نرگس خدا جانے اپنی بے نوری پر کتنے دنوں تک روتی رہے گی، علی گڑھ والے جب ان کو یاد کریں گے، ان کے دل سے یہ آواز نکلے گی:

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

وہ اردو زبان کے حبیب تھے، مگر وہ خود اس کے محبوب بن گئے، وہ اردو ادب کے عاشق زار تھے مگر اردو ادب نے خود ان کو اپنا معشوق بنالیا، انھوں نے اپنے محبوب ذاکر صاحب کے لیے جو کچھ کہا تھا وہی ان کیلئے اردو ادب اپنی زبان حال سے کہتا رہے گا:

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

علی گڑھ کے لئے ان کے سینہ میں ایک سوز سلگتا رہا، یہ سوز سینہ ہندوستان کے مسلمانوں کے افتخار، وقار اور سربلندی کے لئے تھا، یہی ان کا توشۂ آخرت بنے گا جو ممکن ہے کہ جنت کی حوروں کے گیسوؤں کا شمامہ بن جائے۔ آمین، انھوں نے کسی موقع پر لکھا تھا کہ مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا، غالبؔ، اردو اور تاج محل۔ اگر اس راقم سے پوچھا جائے کہ ایم۔اے۔او کالج نے ہم کو کیا دیا تو میں یہ کہوں گا، خوبصورت یونی فارم، مسلم یونیورسٹی اور رشید احمد صدیقی۔ (''ص۔ع''، فروری ۱۹۷۷ء)

فروری ۱۹۷۷ء

آہ! جناب فخر الدین علی احمد صاحب صدر جمہوریہ ہند

معارف کے اس شمارہ کی طباعت ہوچکی تھی کہ یکایک ریڈیو سے صدر جمہوریہ ہند کی المناک رحلت کی خبر ملی، ملک اس قدر جلد ان کی دائمی جدائی کے لیے تیار نہ تھا، فلک کا کیا بگڑتا جو نہ وہ مرتے کوئی دن اور، پہلے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم اور اب جناب فخر الدین علی احمد کی وفات راشٹر پتی بھون ہی میں ہوئی، دونوں کی صدارت کے ساتھ،

پیچھے پیچھے وہ دبے پاؤں قضا بھی آئی

وہ جاچکے، جب ان کی سوانح عمری لکھی جائے گی تو وہ ایک پرجوش مجاہد آزادی، قابل فخر محبّ وطن، کامیاب بیرسٹر، آسام کے معزز ایڈوکیٹ جنرل، اسی ریاست کی حکومت کے قابل اعتماد وزیر خزانہ، پھر ملک کی لوک سبھا کے ہر دلعزیز ممبر، اقوام متحدہ کے ہندوستانی وفد کے بڑے لائق رکن، مرکزی حکومت کے مختلف محکموں کے بہت ہی کارگزار وزیر سیکولرزم کے بہترین نمائندہ، قومی یکجہتی کے زریں نشان اور آخر میں جمہوریہ ہند کے محبوب صدر کی حیثیت سے برابر یاد کئے جائیں گے، ہندوستان کی خارزار سیاست میں داخل ہوکر کسی مسلمان رہنما کا کامیاب ہونا آسان نہیں، کچھ مسلمان قائد ایسے ہوئے جو مسلمانوں میں تو مقبول تھے لیکن ہندوؤں میں اچھی نظروں سے نہیں دیکھے گئے اور کچھ مسلمان لیڈر ایسے بھی گذرے جو ہندوؤں میں تو محبوب لیکن مسلمانوں میں غیر محبوب رہے، جناب فخر الدین علی احمد صاحب کا نمایاں وصف یہ تھا کہ وہ دونوں حلقوں میں عزت کی نگاہوں سے دیکھے گئے، ان کے کسی اخباری بیان کسی عمل کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی ہے، جس سے ہندو خوش اور مسلمان ناخوش یا مسلمان خوش اور ہندو ناخوش ہوئے۔

ان کی علم نوازی کی یادوں کی بھی مشعل روشن رہے گی، ۱۹۶۹ء میں غالب کی صدسالہ برسی پورے ملک میں ان ہی کی خواہش پر بڑے اہتمام سے منائی گئی، ایوان غالب اور غالب انسٹی ٹیوٹ ان کی یاد کو ہمیشہ تازہ رکھیں گے، ۱۹۷۵ء میں امیر خسرو کا سات سوسالہ بین الاقوامی جشن ان ہی کی سرپرستی میں بڑی کامیابی سے منایا گیا، ملک کے بعض حلقوں میں اردو زبان سے جو بیزاری تھی ان کو رفع کرنے میں ان کی مؤثر شخصیت بہت کارآمد ثابت ہوئی، مختلف ریاستوں میں جو علیحدہ اکیڈمی قائم ہوئی ہیں اس میں ان کی ہدایت کو بڑا دخل رہا، انھوں نے اردو کی حمایت میں بھی ایسی مؤثر تقریر کی جس سے ایک ریاست کا غفلت شعار ضمیر بیدار ہوا، اردو کو ملک کے تہذیبی ورثہ میں واپس لانے میں ان کی کوشش برابر جاری رہی۔

وہ دارالمصنفین کے بھی بڑے مربی رہے، ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم ہماری مجلس انتظامیہ کے بڑے قدیمی رکن تھے، ان کی وفات کے بعد جب جناب فخرالدین علی احمد صاحب سے ان کی جگہ پر یہاں کی رکنیت قبول کرنے کی درخواست کی گئی تو انھوں نے اپنے حسب ذیل گرامی نامہ میں یہ تحریر فرمایا، اس وقت وہ محکمۂ زراعت اور غذا کے وزیر تھے۔

نئی دہلی، ۲۲ر ستمبر ۱۹۶۹ء

مکرمی: تسلیم۔ آپ کا گرامی نامہ ملا، آپ نے شبلی اکیڈمی کی مجلس انتظامیہ کا رکن بننے کی جو پیشکش کی ہے، وہ بڑی عزت افزا ہے، دارالمصنفین کی خدمات کے ملک اور ملت لئے بہت مفید رہی ہیں، میں اسے فخر کی بات سمجھوں گا کہ اس سے میرا رشتہ اور قریب تر ہوجائے، امید کہ مزاج گرامی مع الخیر ہوگا۔ نیازمند: فخرالدین علی احمد

دارالمصنفین جب مالی پریشانیوں سے گذر رہا تھا تو انھوں نے اچ۔ای۔اچ نظام چیری ٹیبل ٹرسٹ حیدرآباد کے صدر شہزادہ مفخم جاہ کو حسب ذیل مکتوب انگریزی میں تحریر فرمایا:

نئی دہلی، ۲۹ر مارچ ۱۹۷۱ء

مائی ڈیر پرنس مفخم جاہ! آپ کو معلوم ہے کہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ یو۔پی اپنی علمی اور تحقیقی سرگرمیوں میں تقریباً پچپن سال سے مشغول ہے، اس نے ایسی شہرت حاصل کرلی ہے کہ دوسرا کوئی بھی علمی ادارہ اس سے رشک کرسکتا ہے، اس کو ہندوستان کے ایک نامور فرزند مولانا شبلی نے قائم کیا جن سے اردو میں تاریخی تحریروں کی تحقیقات کی بنا پڑی اور اردو کے تنقیدی سرمایہ میں بڑا گرانقدر اضافہ ہوا، ان کی سیرۃ النبیؐ علم وفضل کا شاہکار ہے۔ اس اکیڈمی کو ہزہائینس نظام حیدرآباد کی طرف سے ہندوستان کی آزادی سے پہلے امداد ملتی رہی، بدقسمتی سے گزشتہ چند برسوں کے اندر اکیڈمی بعض مختلف اسباب کی بناء پر مالی پریشانیوں میں مبتلا ہے، یہ بڑی المناک ہوگی اگر یہ ادارہ بند ہوجائے یا اس کو اپنی علمی سرگرمیوں کو بڑی حد تک کم کرنا پڑے، اس کو ہزاگزالٹڈ ہائینس نظام ٹرسٹ کی طرف سے پانچ سو روپے ماہوار کی امداد ملی ہے، اس سے جو اہم علمی کارنامے انجام پائے ہیں اور اس کے مالی ذرائع کی جو کمی ہے اس لحاظ سے یہ امداد بہت زیادہ نہیں، گو جو کچھ ملا ہے اس کا خیرمقدم کرنا بھی مناسب ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس ادارہ کے لوگ بہت شکرگزار ہوں گے اگر ان کے لیے کوئی مستقل آمدنی کی صورت نکل آئے ہیں، آپ کا ذاتی طور سے شکرگزار ہوں گا اگر ان کو آپ یکمشت ایسی رقم دے دیں جس سے اس کو پندرہ سو روپے ماہانہ کی آمدنی مستقل طور پر ہوجائے۔ بہترین خواہشوں کے ساتھ۔ آپ کا مخلص فخرالدین علی احمد

ان کے اس مکتوب کے بعد بعد دارالمصنفین کو یکمشت بڑی رقم تو نہیں ملی لیکن ایک ہزار ماہانہ کی امداد گذشتہ سال تک ملتی رہی جس کے لیے دارالمصنفین ان کا بے حد ممنون ہوا۔

یہ راقم ان کی خدمت میں بارہا حاضر ہوا، ہر حاضری میں ان کی شرافت واخلاق سے متاثر ہوکر اٹھا، جب ہندوستان و پاکستان کی آمدورفت کا سلسلہ بند تھا تو میں اپنی لڑکی کی شادی کے لئے کراچی جانا چاہتا تھا، تاخیر سے میری پریشانی بڑھ رہی تھی، میں نے جناب فخرالدین علی احمد صاحب کو ایک خط میں اپنی پریشانی کا اظہار کیا، انھوں نے ازراہ نوازش اپنے جواب میں یہ تحریر فرمایا کہ میں باضابطہ حکومت کو درخواست دوں، اگر اجازت ملنے میں کوئی دشواری ہو تو میں ان کو مطلع کروں، اس خط کے لکھنے کے بعد ہی وہ صدر جمہوریۂ ہند ہوگئے، یہ خط میں نے ضلع کے سرکاری حکام اور اترپردیش کے اس وقت کے وزیراعلیٰ شری ہیمہ وتی نندن بہوگنا کو دکھایا تو پھر ضروری کاروائیوں میں بڑی آسانی پیدا ہوگئی، پھر بھی اس میں کافی تاخیر ہوگئی، میں نے ایک دوسرے خط میں اپنی پریشانی کا اظہار جناب فخرالدین علی احمد سے کیا، میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب یہ معلوم ہوا کہ انھوں نے وزارت خارجہ کو ٹیلیفون کرایا کہ لکھنؤ کے علاقائی پاسپورٹ آفس کو ہدایت دی جائے کہ میرے لیے جلد پاسپورٹ بنادیا جائے، وزارت خارجہ سے لکھنؤ ٹرنک کال آیا، جس کے بعد پاسپورٹ لے کر میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ پاکستان وانہ ہوگیا، ان کا یہ احسان میرے اور میرے خاندان کے دل ودماغ پر برابر منقوش رہے گا۔

عابدہ احمد بیگم صاحب اب تک مسز اندرا گاندھی کے بعد ہندوستان کی معزز ترین خاتون سمجھی جاتی تھیں، وہ اپنے بلند اقبال شوہر کے مہر ومحبت کے عطر میں بسی

ہوئی زندگی بسر کر رہی تھیں اور اپنے کو ہندوستان کی بہت ہی خوش قسمت خاتون سمجھتی ہوں گی، جب یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں تو ان کے شوہر کی میت گلاب کے پھولوں کے انبار کے نیچے لوگوں کے آخری دیدار کے لیے رکھی ہوئی ہے۔ دہلی کے عقیدت مند شہری اس کو دیکھ کر ان کی زندگی کی کامیابی، ان کے مرتبے کی بلندی، ان کی بھلمنساہت کی خوبی اور ان کی مرنجان مرنج سیاسی حکمت عملی کو یاد کر کے ان کو آخری خراج تحسین پیش کر رہے ہوں گے، اس کے بعد جنازہ پورے شاہانہ انداز میں اٹھے گا، ماتمی بگل کے بعد توپوں کی سلامی دی جائے گی، میت کی فوجی گاڑی پھولوں سے لدی ہوئی ہوگی، اس کے آگے خوش لباس سواروں کا دستہ ہوگا، اس کے پیچھے مغموم وزیراعظم مسز اندرا گاندھی، قائم مقام صدر، وزراء، سفرا، بیرونی ممالک کے ممتاز نمائندوں کی سواریاں ہوں گی، بحری، بری اور ہوائی فوج کے ہزاروں لشکریوں کا جلو ہوگا، یہ ماتمی جلوس شان و شوکت کے ساتھ نئی دہلی کی سڑکوں سے گزرے گا، بیشمار شہری اپنے مرحوم صدر کو الوداعی سلام کہہ رہے ہوں گے، ان کے لیے دعائے مغفرت بھی کرتے جاتے ہوں گے، مگر ان کی سوگوار اور غمزدہ بیوہ اس شاندار جنازہ کو دیکھ کر اپنی زبان حال سے کہہ رہی ہوں گی،

مفہوم کائنات تمھارے سوا نہیں
تم چھپ گئے نظر سے تو سارا جہاں نہ تھا

مسز اندرا گاندھی ان کے غم میں برابر شریک ہوں گی، کیونکہ ان کو اپنی سیاسی زندگی میں کوئی اور راشٹر پتی ایسا معتمد علیہ شاید ہی ملے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دونوں کو صبر جمیل اور مرحوم صدر جمہوریہ کو ان کی نیکیوں اور خوبیوں کی بدولت کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا فرمائیں۔ آمین

رفتید ولے نہ از دلِ ما

(''ص۔ع''، فروری ۱۹۷۷ء)

ندوی، عزالدین پھلواروی، شاہ

شاہ عزالدین پھلواروی ندوی

شاہ عزالدین پھلواروی علمی اور دینی حلقوں کے لئے محتاج تعارف نہیں، اپنے مواعظ اور تصانیف کی وجہ سے خاصے معروف ہیں، ابھی چند ہی مہینہ کی تو بات ہے جب انھیں عربی زبان اور اسلامی علوم میں مہارت کی بناء پر حکومت ہند نے اعزاز عطا کیا تھا، اور معارف نے اس سلسلہ میں انھیں مبارکباد دی تھی، کسے معلوم تھا کہ وہ اتنی جلد اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔

ادھر کچھ عرصہ سے ان کی صحت مضمحل رہنے لگی تھی، اس لئے انھوں نے سفر ترک کر دیئے تھے، لیکن پورنیہ کے کچھ لوگ ان کے بے حد معتقد تھے، ان کی آرزو تھی کہ وہ اپنی تشریف آوری سے انھیں عزت بخشیں اور انھیں اپنے مواعظ سے مستفید فرمائیں، شاہ صاحب نے ناسازی مزاج کا عذر کیا، مگر جب معتقدین کا اصرار جاری رہا تو آمادہ ہو گئے تاکہ ان کے دلوں کو ٹھیس نہ پہنچے، مومن کے دل کو خوش کرنا بڑے ثواب کا باعث ہے، انھیں اس سلسلہ میں آقائے دو جہاں ﷺ کی ہدایات یاد تھیں، اس لئے اپنی تکلیف کو نظر انداز کر کے آمادہ سفر ہو گئے، راستہ بخیر گزرا، پورنیہ پہونچ کر بھی ایک آدھ دن طبیعت ٹھیک رہی لیکن پھر ضعف کے ساتھ درد سینہ کی شکایت محسوس ہوتی، جو برابر بڑھتی رہی، جب مقامی دوا دارو سے طبیعت قابو میں نہ آئی، تو لوگ کسی بڑے ڈاکٹر کو بلانے کے لئے شہر گئے، مگر ساری تگ و دو بے کار ثابت ہوئی اور بالآخر وطن سے دور عزیزوں سے مہجوری کے عالم میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی، نعش پھلواری لائی گئی اور خاندانی قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے، وہ مجھ سے عمر میں چند سال بڑے تھے، تعلیم میں بھی دو تین درجے آگے تھے، لیکن طلبائے ندوہ کی انجمن الاصلاح میں میرا ان کا عرصہ تک ساتھ رہا اور ایک سال ان کے دور نظامت میں ان کی نیابت کا موقع بھی ملا، اس طرح عمر اور درجہ کے فرق کے باوجود اکثر نشست و برخاست اور تبادلۂ خیالات میں ساتھ رہتا، وہ مزاج کے نرم تھے، اور انھیں دوستوں کے ساتھ نباہ کرنے کا اچھا سلیقہ تھا، زود حس بہت تھے، اس لئے بعض اوقات معمولی بات بھی گرانی طبع کا باعث ہو جاتی، مگر حتی الامکان ظاہری برتاؤ میں فرق نہ آنے دیتے، مزاج میں رواداری اور دوست نوازی بہت تھی، طالب علمی کے بعد جب انھیں تعلیم و تدریس کی خدمت سپرد ہوئی تو اس زمانہ میں کئی برس میرا ان کا ساتھ رہا، مجھے یاد نہیں آتا کہ کبھی شکر رنجی کی نوبت آئی ہو، میرے ان کے خیالات میں خاصہ فرق تھا، بسا اوقات اختلافی مسائل زیر بحث بھی آجاتے، لیکن یاد نہیں پڑتا کہ کبھی تکدر یا ملال خاطر کی نوبت آئی ہو۔

وہ پھلواری کے اس مشہور دینی خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے جس کا سلسلہ مخدوم شاہ مجیب اللہ سے ملتا ہے، آخری زمانہ میں اس سلسلہ کے دو نامور بزرگ حضرت شاہ بدرالدین اور مولانا شاہ سلیمان بہت مشہور ہوئے ہیں، شاہ بدرالدین بہار کے پہلے امیر شریعت تھے، جن کے اثر سے امارت شرعیہ کو استحکام حاصل ہوا، شاہ سلیمان اپنی جادو بیانی کے لئے سارے ملک میں مشہور تھے، ان کے مواعظ عوام و خواص دونوں میں مقبول تھے، شاہ عزالدین ان دونوں سلسلوں سے تعلق رکھتے تھے، وہ شاہ سلیمان کے نواسے اور شاہ بدرالدین کے صاحبزادے شاہ محی الدین امیر شریعت مرحوم کے داماد تھے، ان دونوں بزرگوں سے انھوں نے اکتساب فیض کیا، اور دونوں سے اجازت حاصل کی، سلسلہ کے اذکار و اشغال سے عملی واقفیت کے علاوہ تصوف میں ان کی علمی نظر بھی بہت گہری تھی، وہ اس کی تاریخ، اکابر صوفیہ کے حالات، اصحاب سلاسل کے واقعات اور ان کے معمولات و مختارات سے بخوبی آگاہ تھے، ان مسائل پر جب ان

سے گفتگو ہوئی تو انھیں بہت باخبر پایا۔

یوں تو سب ہی سلسلوں سے ان کا تعلق تھا، مگر نسبت قادریہ کا غلبہ تھا، خاندانی اعراس و مراسم میں شریک ہوتے تھے، اس بارے میں ان کا ایک خاص ذوق تھا، لیکن سکر پر ہمیشہ غالب رہا، محفل سماع میں شرکت اور وجد و حال کی کیفیت کے باوجود صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔

میں کبھی کبھی ان کے اس وجد و حال پر کچھ کہتا تو مسکرا کر کہتے:

ع ''ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں''۔

انھیں طالب علمی ہی کے زمانہ سے عربی ادب کا خاص ذوق تھا، اور بے تکلفی سے عربی بولتے اور لکھتے تھے، ان کے عربی مضامین شائع بھی ہوتے تھے، یاد آتا ہے کہ ۲۵ء یا ۲۶ء میں ان کا ایک تحقیقی مضمون مصر کے مشہور رسالہ ''الزہراء'' میں شائع ہوا تھا، ندوہ میں عربی ادب کی اہم کتابیں پڑھاتے تھے، لیکن اس کے ساتھ دینی علوم سے بھی تعلق تھا، اور حدیث و تفسیر کے کچھ اسباق بھی پڑھاتے تھے، اسی ذوق نے ان سے حدیث کی تاریخ اور حیات امام احمد بن حنبلؒ لکھوائی، کچھ اور کتابیں بھی انھوں نے لکھیں، جن میں سے بعض چھپ گئی ہیں، اور بعض کے مسودے ان کے ہاں موجود ہوں گے، ندوہ میں کئی برس تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد پھر وہ مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے استاد مقرر ہوئے، اس کے علاوہ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں تحقیقی کام بھی کیا، ندوہ سے جانے کے بعد کئی بار لکھنو، دہلی اور اعظم گڑھ میں ان سے ملاقات ہوئی، جب ملتے تو طالب علمی اور ندوہ کی مدرسی کے زمانہ کی بے تکلف صحبتیں یاد آجاتیں، کبھی کبھار پر خلوص خط بھی لکھتے، گزشتہ سال جب حکومت ہند کے ایوارڈ پر میں نے انھیں مبارکباد کا خط بھیجا اور پھر معارف میں ایک نوٹ لکھا تو خوش ہوئے، لکھا تھا کہ اعظم گڑھ آنے کا ارادہ ہے لیکن اجل نے اس کا موقع نہ دیا، اللہ سے دعا ہے کہ وہ ان کے اعمال صالحہ کو قبول فرمائے اور اپنی رحمت سے انھیں شاد فرمائے، خدا ان کی اہلیہ، صاحبزادیوں اور اعزہ و احباب کو صبر عطا فرمائے اور توفیق دے کہ وہ ان کے نیک کام کو نہ صرف باقی رکھیں بلکہ انھیں اور چار چاند لگائیں۔ (''ع۔ق''، جون ۱۹۷۷ء)

فرنگی محلی، محمد عتیق، مولانا مفتی

مولانا مفتی محمد عتیق فرنگی محلی

مولانا مفتی محمد عتیق کا سانحہ وفات بھی مذہبی اور علمی حلقوں کے لئے باعث رنج و افسوس ہے، ہر چند کہ وہ عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے، اور عرصہ سے بیمار رہتے تھے لیکن اس قحط الرجال کے زمانہ میں ان کا دم بساغنیمت تھا، وہ فرنگی محل کے اس خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے، جس نے کئی سو برس سے تعلیم و تدریس، تصنیف و تالیف اور ارشاد و ہدایت کی شمع روشن رکھی ہے، اس خاندان کے فیوض و برکات سے ہندوستان ہی نہیں بلکہ دوسرے ممالک بھی مستفید ہوتے رہے ہیں۔

ملا نظام الدین کا مجوزہ نصاب تعلیم ایسا مقبول ہوا کہ سینکڑوں برس سے عربی مدارس میں رائج ہے، اور درس نظامی کی تکمیل دستار فضیلت کے حصول کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہے، اس دو ڈھائی سو برس میں ساری دنیا میں انقلاب برپا ہوگیا، اور تعلیمی نصاب میں غیر معمولی ردوبدل ہوا، لیکن ہندوستان میں عربی مدارس کی بڑی تعداد اب بھی درس نظامی پر جمی ہوئی ہے، یہ ملا نظام الدین اور ان کے جانشینوں کے خلوص اور کمال علم و عمل کا اثر ہے کہ عوام و خواص سب اس خاندان کی حلقہ بگوشی کو باعث فخر سمجھتے رہے، مل بحرالعلوم نے جب جنوبی ہند کا رخ کیا تو نواب ارکاٹ استقبال کے لئے آگے بڑھے اور ان کی پالکی کو کاندھا دیا۔

مولانا محمد عتیق صاحب اسی خاندان عالی کے ایک ممتاز فرد تھے، اس خاندان میں علم و عمل کا ایسا اجتماع رہا کہ فرنگی محل دارالعلوم کہلایا، ملا نظام الدین علمی کمال کے ساتھ شاہ عبدالرزاق بانسوی سے ارادت رکھتے تھے، اس طرح اس خاندان میں علم و معرفت، معقول و منقول اور فقر و درویشی کا ہمیشہ اجتماع رہا۔ مغربی علوم و فنون کی چمک دمک سے سبھی متاثر ہوئے، زمانہ کے حالات اور معاشی ضروریات نے بہتوں کو جدید یونیورسٹیوں میں پہنچا دیا، فرنگی محل بھی اس سے محفوظ نہیں رہا، اور یہاں کے بھی بہت سے افراد کالجوں اور یونیورسٹیوں کی زینت بن گئے، لیکن اب بھی پرانے بزرگوں کے کچھ نام لیوا موجود ہیں، ان ثابت قدم اصحاب میں مولانا محمد عتیق صاحب خاص طور سے قابل ذکر ہیں، انھوں نے بزرگوں کے نام کو حرز جاں بنائے رکھا، ان کے نقش قدم کو دلیل راہ سمجھتے رہے اور باد مخالف کے تیز جھونکوں میں تعلیم و ارشاد کی شمع کو روشن رکھنے کی کوشش کی جو بزرگوں نے جلائی تھی، اور اللہ کا نام لے کر ساری زندگی اسی راہ میں بسر کردی، وہ پرانے بزرگوں کی آخری نشانی تھے، ان کو دیکھ کر اور ان سے مل کر فرنگی محل کی پرانی محفلیں یاد آجاتی تھیں، اگرچہ پیرانی سالی کی بناء پر عرصہ سے گوشہ نشین تھے، مگر پھر بھی ان کے ساتھ لوگوں کی محبت و عقیدت کا یہ عالم تھا کہ شرعی معاملات میں سارے اودھ کو ان کے فتویٰ کا انتظار رہتا تھا، اور جب تک ان کی طرف سے اعلان نہ ہوجاتا لوگوں کو اطمینان نہ ہوتا، اسی اعتماد و اعتقاد کا اثر تھا کہ جب ان کی وفات کا اعلان ہوا تو لکھنؤ میں دوکانیں بند ہوگئیں، اور لوگ اپنا کاروبار چھوڑ کر نماز جنازہ میں شرکت کے لئے دوڑ پڑے، مستند اخبار نویسوں کا اندازہ ہے کہ جنازہ کے ساتھ تقریباً دو لاکھ اشخاص تھے۔

حکومت نے بھی ان کے اسی ہمہ گیر اثر کا اعتراف کیا اور گورنر کی طرف سے تربت پر پھول چڑھائے گئے، لکھنؤ سے باہر کے علمی اور دینی حلقوں نے تعزیتی جلسے

کئے اور قرآن خوانی کے ذریعہ ان کی روح کو ثواب پہنچایا، اللہ تعالیٰ مرحوم کی علمی و دینی خدمات قبول فرمائے، انھیں اپنے سایہ رحمت میں جگہ دے، ان کے مراتب بلند فرمائے، ان کے صاحبزدگان اور متعلقین کو صبر عطا فرمائے اور ان کے اعمال جلیلہ کو نصب العین بنانے کی توفیق نصیب فرمائے۔ (''ع۔ق''، جون ۱۹۷۷ء)

اورینوی، اختر، پروفیسر

آہ! پروفیسر اختر اورینوی

گزشتہ اپریل میں بہار کے پروفیسر ڈاکٹر اختر اورینوی کی وفات کی خبر بہت دکھ اورغم کے ساتھ سنی ہم دونوں ہم درس اور ہم جماعت تو نہیں رہے، لیکن ہماری طالب علمی کا زمانہ ایک ہی تھا، وہ شروع میں سائنس کے طالب علم تھے، آئی ایس سی کر کے پٹنہ میڈیکل کالج میں داخل ہوئے، مگر وہاں ان کی صحت خراب ہوئی تو اٹکی اور رانچی کے سینی ٹوریم میں رہ کر صحت یاب ہوئے، میڈیکل کالج چھوڑ کر پٹنہ کالج میں آرٹس کی تعلیم حاصل کرنے لگے، ہم دونوں ۳۶ء میں ایم۔اے اردو کے امتحان میں ساتھ شریک تھے، اس کے نتیجہ میں ان کا نام سرفہرست تھا، میرا نام ان کے بعد تھا، وہ ایم۔اے کرنے کے بعد پٹنہ کالج میں اردو کے لکچرار ہوئے، اس زمانہ میں ڈاکٹر سید محمود مرحوم بہار کے وزیر تعلیم تھے۔ وہ کالج میں اردو کے ایک لائق استاد کے تقرر کے خواہش مند تھے، اس لئے انھوں نے امیدواروں کا انٹرویو خود لیا، درجہ میں باضابطہ سبق پڑھانے کو بھی کہا اختر اورینوی صاحب ان کے معیار پر پورے اترے، وہ ایک استاد کی حیثیت سے طلبہ میں بہت مقبول رہے، جو نہ صرف ان کی صلاحیت اور قابلیت بلکہ ان کے ذاتی اوصاف کی بھی قدر کرتے، آخر میں وہ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر اور پروفیسر ہوگئے تھے، انھوں نے اردو زبان وادب کے ارتقاء پر ایک مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کی، بہار کے جن شاعروں، مصنفوں اور نقادوں پر اس وقت تک سیر حاصل بحث نہیں ہوئی ہے، اس کی تلافی ان کے مقالہ سے ہوگئی اور وہ بھی ایک اچھے مصنف کی صف میں داخل ہوگئے، اس کے بعد سے جب ان کا کوئی مقالہ کہیں شائع ہوتا، تو اردو کے ادبی حلقہ میں شوق سے پڑھا جاتا، انھوں نے اپنے مقالات کے مجموعے تنقید جدید، قدر ونظر اور تحقیق وتنقید کے نام سے شائع کئے، اس طرح اردو کے اچھے نقاد بھی شمار کئے جانے لگے۔

وہ ایک اچھے افسانہ نگار بھی تھے، ان کی بیوی شکیلہ اختر نے بھی ان کے ساتھ افسانے لکھنے شروع کئے، دونوں نے رومانی دنیا کے دلوں کی دھڑکنوں کی اچھی طرح عکاسی کی، انھوں نے کچھ ڈرامے اور ناولٹ بھی لکھے، وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے، ان کی بعض نظمیں مثلاً جگنو، ایک مجاہد فلسطین کے افکار، ارمغان شباب اور نغمے مقبول ہیں۔

بہار میں اس وقت ایک اچھا علمی و ادبی ماحول پیدا ہوگیا ہے، جمیل مظہری صاحب شاعر کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے، جناب قاضی عبدالودود صاحب نے دینی علمی تحقیق و تدقیق سے بڑی ناموری حاصل کی، پروفیسر کلیم الدین احمد نے اپنی تحریروں سے اردو کی ادبی دنیا میں بڑی ہل چل پیدا کردی ہے، پروفیسر حسن عسکری نے تاریخ دانی میں اپنا لوہا منوالیا ہے، پروفیسر سید حسن نے اپنی سنجیدہ مقالہ نگاری سے علمی حلقہ کو اپنی طرف مائل کرلیا ہے، پروفیسر عطا کاکوی اپنے ذوق شعر و ادب کی وجہ سے مقبول ہیں، کلیم عاجز صاحب کی شاعری بھی مقبول ہورہی ہے، اسی بزم کے ایک ممتاز رکن پروفیسر اختر اورینوی بھی تھے، پٹنہ میں رہ کر ہندوستان کے ممتاز شاعروں اور ادیبوں کو اپنی طرف کھینچتے رہے، جعفر علی خاں، اثر جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری، حفیظ جالندھری اور ڈاکٹر عبادت بریلوی وغیرہ ان کے مہمان رہے، طبیعت میں سادگی تھی، ان کو اپنے مہمانوں کو مٹی کے برتنوں میں زمین پر چٹائی بچھا کر کھانا کھلانے میں کوئی عذر نہ ہوتا، مگر ان کی بیوی مہمانوں کی خاطر تواضع پوری شان سے کرنا پسند کرتیں، اختر صاحب ان سے یہ کہہ کر اختلاف کرتے، ''میں کوئی نواب کا ناتی تھوڑے ہی ہوں جو اپنی شان دکھاؤں، بس میں جیسا ہوں ویسا ہی رہوں گا''۔

ان کی زندگی کے کچھ واقعات یاد رکھنے کے لائق ہیں، ایک غریب لڑکی کی تجہیز و تکفین کا سامان نہ تھا، تو انھوں نے اپنی بیوی کے سونے کے کڑے بیچ کر یہ سامان کردیا، اسی طرح ان کے ایک عزیز دوست کو اپنے والد کے لئے مقدمے کی فیس جمع کرنے کو کچھ روپے کی ضرورت تھی، اس کا ذکر ان سے اس وقت آیا، جب ان کی جیب خالی تھی، ان کو اپنے امتحانات میں سونے کے جتنے مڈل ملے تھے، ان کو اونے پونے فروخت کرکے روپے اپنے دوست کے حوالے کردیئے۔

وہ وہاں جاچکے جہاں سب کو جانا ہے، مگر بہار کے علمی وادبی حلقہ میں ایک قابل قدر مصنف، نقاد، شاعر، افسانہ نگار اور ایک اچھے انسان کی حیثیت سے برابر یاد کئے جائیں گے۔

وہ بہار کے ضلع مونگیر کے ایک گاؤں اورین کے رہنے والے تھے، ان کا خوشحال خاندان جاجنیری زیدی سادات سے تھا جو مرزا غلام احمد کا پیرو ہوگیا، اس حیثیت سے وہ احمدی تھے، اپنے مسلک کی تبلیغ بڑی سرگرمی سے کرتے رہتے، پاکستان میں احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا تو ان کے قریبی دوستوں کا بیان ہے کہ ان کو بڑا دکھ ہوا، ان کی افسانہ نگار بیوی نے ان کی زندگی میں لکھا تھا کہ وہ عائلی زندگی سے کوسوں دور رہتے، سمجھ میں نہ آنے اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں الجھنے والے شوہر ہیں، مگر اسی کے ساتھ اس کا بھی اعتراف کیا تھا کہ ''جب ان کے ساتھ گھر کے سارے لوگ ایک ہی ساتھ کھانا کھایا کرتے، تو ایسی مزیدار باتوں کا سلسلہ چلتا کہ گیارہ بارہ بجے تک محفل جمی

رہتی، جو ٹھے ہاتھ سوکھ کر جھڑ جاتے، پھر بھی کسی کا جی پلنگ پر جانے کو نہیں چاہتا''۔ان کے احباب بھی ان کی گفتگو کی بذلہ سنجی، زندہ دلی، اور خوش مذاقی کے قائل تھے، ان کی صحت ہمیشہ خراب رہی، آخر میں ان کی قوت گویائی بھی ختم ہوگئی تھی، ان کی بیوی کو ان کی ضد اور چڑچڑاہٹ سے شکایت رہی، مگر انھوں نے ان کے ساتھ جس وفاداری سے زندگی بسر کی، وہ ایک افسانہ کا موضوع بن سکتا ہے، ان کے کوئی اولاد نہ تھی، مگر وہ اپنی سوگوار بیوی کے دل و دماغ پر اپنی یادیں اس طرح چھوڑ گئے ہیں کہ:

؎ مخملیں سبزے پہ جیسے برگ گل کی ہو پھوار

(''ص۔ع''، جون ۱۹۷۷ء)

چٹرجی، سینتی کمار، پروفیسر

پروفیسر سینتی کمار چٹرجی

گزشتہ مئی میں ملک کے مشہور ماہر لسانیات پروفیسر سینتی کمار چٹرجی کی وفات سے ایک عظیم علمی سانحہ ہوا، بنگال میں رابندرناتھ ٹیگور کے بعد ان ہی کی علمی شخصیت اُبھری، انھوں نے رابندرناتھ ٹیگور کے ساتھ رہ کر نہ صرف تربیت پائی، بلکہ ان کی شانتی نکیتن یونیورسٹی کی تاسیس میں ان کا بھی حصہ تھا، بنگال کے اس فلسفی شاعر نے ان کی جوانی ہی میں ان کی قدر کرنی شروع کردی تھی اور اپنی ایک کتاب ان کے نام سے معنون بھی کیا اور ان کو بھاشا اچاریہ کا خطاب دیا، جس کے معنی زبانوں کا پیشوا ہے، اس خطاب کے وہ مستحق تھے، وہ بنگال، سنسکرت، ہندی، پراکرت، فارسی، انگریزی، فرانسیسی، آئرش، گوتھک اور خدا جانے کتنی زبانیں جانتے تھے۔

کلکتہ اور لندن سے ڈگریاں حاصل کرکے یونیورسٹی میں ایک استاد کی حیثیت سے مقرر ہوئے، یہاں رہ کر انھوں نے جو شاندار کارنامے انجام دیئے، ان پر یونیورسٹی ہمیشہ ناز کرتی رہے گی، ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کوئی علمی اعزاز ایسا نہ تھا جس سے وہ سرفراز نہیں کئے گئے، رابندر ناتھ ٹیگور کے ساتھ ملایا، سماترا، جاوا، بالی اور تھائی لینڈ گئے، تو وہاں ہندوستانی آرٹ اور کلچر پر ان کے لکچر بہت مقبول ہوئے، جس کے بعد علم و زبان کی تمام بین الاقوامی کانفرنسوں میں مدعو ہونے لگے، اسی سلسلہ میں بلجیم اور کوپن ہیگن کا سفر کیا، یونسکو کے علمی اجتماعات میں شرکت کے لئے کئی بار پیرس بلائے گئے، بیروت میں عربی و فارسی کی علمی و لسانی کانفرنس ہوئی تو وہاں خاص طور پر مدعو ہوئے، کلکتہ یونیورسٹی کی طرف سے اٹلی، برطانیہ، ہالینڈ اور ترکی کے تعلیمی حالات کا مطالعہ کرنے کے لئے بھیجے گئے، پن سلونیا یونیورسٹی کے وزیٹنگ پروفیسر بھی مقرر ہوئے، امریکہ کے قیام میں کولومبیا اور ییل کی یونیورسٹیوں کی علمی مجلسوں میں لکچر دیئے، راک فیلر فاونڈیشن کی طرف سے میکسیکو کے مختلف شہروں میں خاص خاص موضوعات پر لکچر دینے کے لئے بھیجے گئے، پیکنگ یونیورسٹی اور چینی حکومت کی دعوت پر چین بھی گئے، روس کی سوویٹ اکیڈمی آف سائنس نے ان کو روس مدعو کیا، جہاں کے مختلف شہروں میں ان کے لکچر ہوئے، یونسکو کی طرف سے می چیگن یونیورسٹی میں بھی لکچر دیئے، پھر منگولیا جاکر وہاں اپنی علمی عظمت کا سکہ جمایا، کینبرا میں دولت مشترکہ کی پارلیمینٹری کانفرنس ہوئی تو اس میں ہندوستان کی نمائندگی کی، جاپان بھی گئے، جہاں ٹوکیو یونیورسٹی میں لکچر دیئے، وہاں سے فلپائن گئے، جہاں منیلا یونیوسٹی کو مخاطب کیا، وہ لیتھونیا اور لیٹ ویا بھی مدعو ہوئے، ہندوستان کی طرف سے افریقہ اور یورپ کی مختلف یونیورسٹیوں میں ہندوستان کی تاریخ اور کلچر پر لکچر دیے کے لئے بھیجے گئے، حکومت ہند کی وزارت تعلیم کے ماتحت محکمہ انڈین کانسل آف کلچرل ریلیشنز کی طرف سے گھانا، نائجیریا اور لائبیریا کی یونیورسٹیوں میں لکچر دینے کے لئے مامور ہوئے، قاہرہ، ادیس بابا، طہران، بخارسٹ اور روم جاکر بھی لکچر دیئے، فرانس کی دو یونیورسٹیوں کی صد سالہ سالگرہ منائی گئی تو وہاں بھی بلائے گئے، آرمینیا اور ہندوستان کے ثقافتی تعلقات پر مواد جمع کرنے کے لئے آرمینیا بھی بھیجے گئے، زیکوسلوکیا کی ایک یونیورسٹی کے چھ سالہ سالگرہ کے جشن کے موقع پر مدعو ہوئے تو وہاں ان کی قابلیت کا اعتراف ایک طلائی تمغہ دے کر کیا گیا، روم کی یونیورسٹی نے ان کو ڈی لٹ کی ڈگری بھی دی، دنیا میں لسانیات کی جو بھی کانفرنس یا مجلس کہیں ہوئی، چاہے یہ پولینڈ یا ہوائی یا نیویارک یا پیرس یا ناروے یا سری لنکا میں ہوئی اس میں وہ ضرور بلائے جاتے، وہاں وہ پہنچ کر بڑا اچھا اثر پیدا کرتے، جس سے ہندوستان کے علمی وقار میں اضافہ ہوتا رہتا۔

اس بین الاقوامی علمی سفیر وضمیر کی قدر ملک کے اندر بھی ان کے رتبہ کے مطابق ہوتی رہی، برما بنگالی لٹریری کانفرنس وغیرہ کے اجلاسوں کی صدارت کی، ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند کے بعد دہلی کی ساہتیہ اکیڈمی کے صدر ہوئے، انڈین کانسل آف کلچرل ریلیشنز نئی دہلی کے بہت ہی اہم اور ممتاز رکن رہے، کلکتہ یونیورسٹی کی طرف سے ان کو ہرقسم کا اعزاز ملا، کلکتہ کی ایران سوسائٹی کے مستقل اعزازی رکن تھے اور اس کی ساری علمی سرگرمیوں سے برابر دلچسپی لیتے رہتے، بنگال لیجیسلیٹو کانسل کے پہلے رکن اور پھر اس کے صدر بھی ہوئے، ان غیر معمولی ملکی اور غیر ملکی علمی سرگرمیوں کے باوجود تصنیف و تالیف کے مشاغل بھی برابر جاری رکھے، بکثرت مضامین لکھنے کے ساتھ، حسب ذیل کتابوں کے مصنف بھی ہوئے، (۱) اوریجن اینڈ ڈیولپمنٹ آف بنگالی لینگویج۔ (۲) انڈیا اینڈ ایتھوپیا۔ (۳) ورلڈ لٹریچر اینڈ ٹیگور۔ (۴) ایرانیسزم م۔ (۵) جے دیو۔ (۶) انڈیا اے پولی گلوٹ نیشن۔ (۷) اے شورٹ اینڈ اریا ہندو ویڈنگ اینڈ اینی شی ایشن ری چوئلز۔ (۸) بنگلہ بھاشا پرسنگے وغیرہ۔ حکومت ہند نے ان کو پدم بھو اور پدم دی بھوشن کے خطابات دے کر ان کی علمی خدمات کو سراہا۔

ان کی ہر قسم کی قدردانیوں کے باوجود ان کی بعض تحریریں متنازعہ فیہ بن گئی تھیں، ان پر نکتہ چینی ہوئی کہ انھوں نے رامائن کے قصے کو ہومر سے مستعار بتایا ہے، ان کی طرف سے یہ جواب تھا کہ انھوں نے رامائن کو تو نہیں لیکن ان کے نزدیک دس سروں والے راکشس کا وجود یونانی تخییل کی صدائے بازگشت ہے، کیونکہ ہندوؤں کے قدیم ترین خرافاتی ادب میں ایسے راکشس کا ذکر نہیں ملتا، انھوں نے بعض بہت ہی پرانے شواہد سے اس پر بحث کی ہے کہ رام اور سیتا، بھائی بہن تھے، یا ازدواجی رشتے میں منسلک تھے، اس سے بھی ایک علمی سنسنی پھیلی۔

ان سے میری ذاتی ملاقاتیں بھی رہیں، وہ انڈین کانسل آف کلچرل ریلیشنز نئی دہلی کے سالانہ جلسوں میں برابر شریک ہوتے رہے، میں نے بھی اس میں دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کی نمائندگی بارہ برس تک کی، اس کے جلسوں میں ان کی اہم تقریریں ہوتیں، جو شوق سے سنی جاتیں، جلسہ ختم ہوتا تو اراکین ان کو گھیر لیتے، میں بھی ان سے ملتا رہتا، وہ دارالمصنفین کی علمی سرگرمیوں سے اچھی طرح واقف تھے، اس لئے مجھ سے بڑی خندہ پیشانی سے ملتے، کلکتہ کی ایران سوسائٹی کی طرف سے البیرونی پر ایک اہم یادگار جلد شائع ہوئی تھی، اس میں ان کا ایک مضمون ''البیرونی اینڈ سنسکرت'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا، میں نے اس سے اپنی تصانیف اور مضامین میں بڑا استفادہ کیا تھا، ان سے اس مضمون پر دیر تک باتیں ہوئیں، میں نے کانسل کے ایک اجلاس میں اپنی ایک تقریر میں دارالمصنفین کی مطبوعات میں سے ''ہندوستان عربوں کی نظر میں'' کا ذکر کیا، تو ڈاکٹر سینتی کمار چٹرجی نے اس کتاب سے بڑی دلچسپی لی اور اس کی جلدوں کی وی، پی بھیجنے کو کہا، اعظم گڑھ آکر میں نے اس کی ایک جلد ان کی خدمت میں ہدیۃً بھیج دی، جب یہ ان کے پاس پہنچی تو انھوں نے مجھ کو انگریزی میں یہ خط لکھا جس کا ترجمہ یہ ہے،

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب!

آپ کا خط مورخہ ۲۶؍ نومبر ۱۹۶۰ء کو موصول ہوا، اس کے لئے میں آپ کا شکرگزار ہوں، اس خط کے ساتھ میرے لئے ''ہندوستان عربوں کی نظر میں'' ایک بہت ہی دل پذیر تحفہ ہے۔

آپ لوگوں کا یہ خیال ہی خوب رہا کہ ایک جلد میں اسلام کے ان تیرہ مصنفوں کی تحریروں کے اقتباسات جمع کردیں، جنھوں نے عربی زبان میں ہندوستان سے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے، اس کتاب میں عربی عبارتوں کے ساتھ جو ان کے اردو ترجے ہوگئے ہیں، اس سے غیر معمولی سہولت پیدا ہوگئی ہے، عرب مورخوں اور جغرافیہ دانوں کی تحریر میں بعض ملکوں کے قدیم عہد اور ازمنہ وسطیٰ کے حالات معلوم کرنے کے لئے بہت ہی قیمتی ماخذ ہیں، یہ ملک خواہ ایشیا یا یورپ یا افریقہ ہی کے کیوں نہ ہوں، مغربی افریقہ کے چار یا پانچ سو بلکہ ایک ہزار برس پہلے کے حالات جاننے کے لئے تو ان عرب مورخوں اور جغرافیہ دانوں کی تحریریں ہی واحد ماخذ بنی ہوئی ہیں، شبلی اکیڈمی نے یہ کتاب (ہندوستان عربوں کی نظر میں) شائع کر کے ہندوستان سے متعلق معلومات فراہم کرنے میں ایک بہت بڑی خدمت انجام دی ہے، یہ کتاب تو ایسی ہے کہ ریسرچ کرنے والوں کو اپنی الماری میں رکھنی چاہئے، جو پڑھا لکھا آدمی ہندوستان کے ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ اور کلچر سے دلچسپی رکھتا ہے، اس کے پاس بھی یہ کتاب ہونی چاہئے۔

والسلام

آپ کا مخلص، سینتی کمار چٹرجی

وہ اس دارفانی سے رخصت ہوگئے، ایک دن سب ہی کو یہاں سے کوچ کرنا ہے، وہ مگر ان لوگوں میں ہیں، جو اپنے پیچھے اپنا شاندار نام اور کام چھوڑ جاتے ہیں، ہندوستان کی جب کبھی علمی تاریخ لکھی جائے گی، تو ان کی علمی سرگرمیوں کا ذکر نمایاں طور پر ہوگا، بنگال کی جس پکچر گیلری میں بکتم چندر، جے۔ سی، بوس اور رابندر ناتھ ٹیگور کی تصویریں ہوں گی، وہاں پروفیسر سینتی کمار چٹرجی کا بھی ہونا ضروری ہے۔

(''ص ۔ ع''، جولائی ۱۹۷۷ء)

کیرانوی، محمد سلیم، مولانا

مولانا محمد سلیم کیرانوی مرحوم

مولانا محمد سلیم صاحب سے میری پہلی ملاقات بارشاید قرول باغ دہلی میں ہوئی، اس زمانہ میں انھوں نے وہاں مدرسہ صولتیہ کے تعارف اور اس کی امداد و اعانت کی غرض سے دفتر قائم کیا تھا اور ایک ماہوار رسالہ نکالتے تھے، جامعہ ملیہ بھی اس زمانہ میں قرول باغ ہی میں تھی، اس کی وجہ سے میرا وہاں آنا جانا ہوتا رہتا تھا، خیال آتا ہے کہ دو ایک بار لکھنؤ میں بھی ڈاکٹر عبدالعلی صاحب مرحوم ناظم ندوۃ العلماء کے یہاں انھیں دیکھا تھا، یہ ملاقاتیں سرسری تھیں، گفتگو بھی زیادہ تر رسمی ہوئی، مگر مولانا رحمۃ اللہ کیرانوی سے نسبت اور مدرسہ صولتیہ کے تعلق کی بنا پر دل میں انکی غیر معمولی عزت تھی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ الرحمۃ کا مسلمانان ہند پر بڑا احسان ہے، ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط کے بعد سارا ملک عیسائیت کے نرغے میں آگیا تھا، مشنری اس زور توروقوت کے ساتھ میدان میں نکل آئے تھے کہ خیال ہوتا تھا کہ کچھ ہی عرصہ میں پورا ملک عیسائی ہوجائے گا، مسلمان خاص طور سے زد میں تھے، اس زمانہ میں انگریزوں کا جو رعب اور دبدبہ تھا اس کے سامنے بڑے بڑوں کے پتے پانی ہوتے تھے، ایسی دہشت انگیز فضا میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ الرحمۃ نے جان پر کھیل کر مقابلہ کی ہمت کی،

اس زمانہ میں پادری فنڈر کا بڑا غلغلہ تھا، وہ بڑا زور آور مناظر سمجھا جاتا تھا، حکومت کی پشت پناہی نے اسے بہت بیباک بنادیا تھا، مولانا رحمۃ اللہ نے اسے دعوت مبارزت دی، بالآخر ۱۲۷۰ھ میں آگرہ میں بہت بڑے پیمانہ پر مجلس مناظرہ منعقد ہوئی، اس موقع پر مولانا کے ساتھ ڈاکٹر محمد وزیر بھی تھے تاکہ حسب ضرورت انگریزی میں مولانا کی ترجمانی کرسکیں۔

مولانا نے بائبل کی تحریف اور نسخ پر ایسی مدلل اور موثر تقریر کی کہ پادری فنڈر لاجواب ہوگیا اس شکست نے مشنریوں کے حوصلے پست کردیئے اور نصرانیت کے بڑھتے قدم رک گئے لیکن انگریزی حکومت کے لئے یہ بات ناقابل برداشت تھی، آج آزادی کے دور میں ہم اس زمانہ کے انگریزی رعب وداب کا اندازہ نہیں کرسکتے ہیں، پادری فنڈر کی شکست تو بہت بڑی بات تھی، اس سے بہت چھوٹی باتوں پر دارورسن کی نوبت آجاتی تھی، مولانا رحمۃ اللہ کو لوگوں نے اس صورت حال سے باخبر کیا، اور مشورہ دیا کہ ہندوستان سے باہر نکل جائیں، انھوں نے حجاز کا رخ کیا اور مکہ معظّمہ میں سکونت اختیار کرلی، وہیں اپنی مایہ ناز کتاب ''اظہار الحق'' تصنیف کی جو مسیحی عقائد وخیالات کی تردید میں اب تک لاجواب سمجھی جاتی ہے۔

پادری فنڈر ساری دنیا میں مشہور تھا، اس کی شکست سارے مسلم ممالک میں بڑی مسرت کے ساتھ سنی گئی اور مولانا رحمۃ اللہ کا نام بڑی عزت کے ساتھ لیا جانے لگا، یہ سلطان عبدالحمید کا زمانہ تھا، انھوں نے مولانا کو قسطنطنیہ بلایا، بڑا اعزاز واکرام کیا اور خواہش کی کہ آستانۂ خلافت کے قریب قیام کریں، مگر مولانا نے ہجرت کے ثواب کو ضائع کرنا پسند نہ کیا اور سلطان سے اجازت لے کر مکہ معظّمہ واپس آگئے، اس کے بعد بھی کئی بار طلب کئے گئے اور اسی خواہش کا اظہار کیا گیا مگر مولانا نے معذرت کردی اور ساری زندگی بیت اللہ کے جوار میں گذار دی، مکہ معظّمہ میں انھوں نے ۱۲۹۰ھ میں مدرسہ صولتیہ کے نام سے ایک مدرسہ بھی قائم کیا جس کی خدمات آج تک جاری ہیں۔

۱۳۰۸ھ میں مولانا نے وفات پائی، ان کے بعد ان کے بھتیجے مولانا محمد سعید نے مدرسہ صولتیہ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا، جب ان کا بھی انتقال ہوگیا تو یہ خدمت ان کے صاحبزادہ مولانا محمد سلیم کے سپرد ہوئی، انھوں نے اپنی ساری زندگی اس کام میں لگادی، اس اثنا میں حجاز میں بڑے انقلاب آئے، پہلی جنگ عظیم کے بعد خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہوگیا اور ترکی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے، شریف حسین نے انگریزوں کی شہ پر ترکوں کے خلاف بغاوت کی اور حجاز میں اپنی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی لیکن اس غداری کا انجام اچھا نہیں ہوا، ساری دنیائے اسلام نے اس حرکت پر بیزاری کا اظہار کیا، چند ہی برس میں والیٔ نجد شاہ عبدالعزیز ابن سعود نے اسے شکست دے کر حجاز سے نکال باہر کیا اور اپنی حکومت قائم کی۔

یہ سارے انقلابات مولانا محمد سلیم کے سامنے ہوئے وہ تفصیل سے اس دور کے حالات سناتے تھے، کہتے تھے کہ حرمین شریفین کے ساتھ ترکوں کو والہانہ عقیدت تھی، وہ دل سے اپنے کو خادم الحرمین سمجھتے تھے، جنگ عظیم کے زمانہ میں حرم شریف کے اندر کھڑے ہوکر شریف حسین نے انور پاشا کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا تھا لیکن اس اقرار کے باوجود انور پاشا کے رخصت ہوتے ہی بغاوت کردی اور برطانوی حکومت کی مدد سے ترک سپاہیوں کو گولی کا نشانہ بنایا، شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور ان کے رفقاء کی گرفتاری کا حال بھی سناتے تھے سعودی حکومت کے آغاز سے اس وقت تک کے حالات سے بھی خوب واقف تھے اور بہت سے ایسے واقعات ان کے حافظہ میں محفوظ تھے جو تاریخ کی کتابوں میں نظر نہیں آتے۔

۱۹۶۷ء میں جب جامعہ کے بعض احباب (ارشادالحق مرحوم، عبدالرزاق صاحب اور سعید انصاری صاحب) کے ساتھ حج کا ارادہ ہوا تو قیام کے لیے مدرسہ صولتیہ کا خیال آیا مولانا محمد سلیم صاحب کو اس ارادہ کی اطلاع دی اور جہاز کا نام اور تاریخ بھی لکھ دی، جب ہم لوگ جدہ پہنچے تو مولانا کے فرستادہ قاری عبدالروف مدینۃ الحجاج میں خوش آمدید کہنے کے لیے موجود تھے، دوسرے دن مکہ معظّمہ میں مولانا سے ملاقات ہوئی تو بڑے تپاک سے ملے اور فرمایا، پوچھنے کی کیا بات تھی، صولتیہ تو مولویوں کا گھر ہے، ان کی کریم النفسی کرایہ کے ذکر سے گریز کرتی تھی، لیکن ہم لوگوں نے مدرسہ کا نقصان گوارا نہ کیا اور کرایہ ادا کردیا، تقریباً ڈھائی ماہ مکہ معظّمہ میں قیام رہا، ان کے سایہ میں یہ دن بڑے آرام سے گذرے، ان کی مجلس بڑی باغ و بہار ہوتی تھی، بات کرتے تو منہ سے پھول جھڑتے، سیکڑوں لطائف وظرائف نوک زبان تھے، قصص و امثال کی تو کوئی حد نہ تھی، بات میں بات نکلتی اور قصہ پر قصہ چھڑتا اور سامعین ایسے محو ہوتے کہ گھنٹوں گزر جاتے اور اٹھنے کا جی نہ چاہتا، ان کی معلومات وملفوظات اگر قلمبند ہوگئے ہوتے تو بڑے دلچسپ اور مفید ہوتے، گزشتہ ۶۰ ساٹھ برس کی تاریخ پر ان کی نظر بہت گہری تھی، شاید ہی کوئی دوسرا شخص واقعات اور ان کے علل واسباب سے اس قدر واقف ہو، میں نے کہا کہ یہ حالات قید تحریر میں آجاتے تو آئندہ مورخ کے لیے بڑے کارآمد ہوتے، کہنے لگے کہ عرصہ ہوا کچھ واقعات لکھے تھے لیکن پتہ نہیں اب کہاں ہیں، ان کے صاحبزادہ مولوی محمد شمیم کو بھی ایک بار توجہ دلائی تھی، خدا کرے وہ کاغذات مل جائیں اور شمیم صاحب انھیں مرتب کرکے شائع کردیں۔

حجاج کی خدمت کا بہت شوق تھا، ان کی راحت رسانی کی پوری تدبیر کرتے تھے۔ ۱۹۷۴ء میں شاہ معین الدین احمد صاحب مرحوم کے ساتھ دوبارہ حج و زیارت کی سعادت حاصل ہوئی تو مولانا کی خدمت میں بھی حاضری کا موقع ملا، شاہ صاحب حضرت شاہ احمد عبدالحق رودولی کی اولاد میں تھے جو مخدوم جلال الدین پانی پتی کے خلیفہ

تھے اور مولانا محمد سلیم صاحب حضرت جلال الدین پانی پتی کی نسل سے تھے، اس رشتہ سے دونوں کو ایک دوسرے سے بہت تعلق تھا، بڑی یگانگت سے ملے اور دیر تک بزرگوں کا تذکرہ ہوتا رہا، عمر کافی ہوچکی تھی مگر نشاط طبع میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، لطف بیان اور حلاوت لسان کا وہی عالم تھا، بلبل ہزار داستان کی طرح بولتے اور چہکتے گلفشانی گفتار دیدنی ہوتی، ثقاہت میں لطافت اور سنجیدگی میں مزاح کی ایسی آمیزش کم دیکھنے میں آئی ہے، اس وقت کسے معلوم تھا کہ یہ زبان گہر بار جلد خاموش ہونے والی ہے، سال ہی بھر میں شاہ معین الدین احمد اللہ کو پیارے ہوگئے اور ان کے دو برس بعد مولانا محمد سلیم نے بھی سفر آخرت اختیار کیا، اللہ انھیں اپنے سایۂ رحمت میں جگہ عنایت فرمائے۔

مولوی محمد شمیم نے ان کی زندگی ہی میں تمام کاموں کو سنبھال لیا تھا، اللہ انھیں توفیق عطا فرمائے کہ اپنے نامور باپ کی روایات کو قائم رکھیں، ہندوستانی حجاج روز افزوں گرانی سے بے حد پریشان ہیں، متوسط طبقہ کی استطاعت روز بروز ختم ہوتی جارہی ہے، اس وقت انھیں سہارے کی ضرورت ہے، کسی زمانہ میں حرمین شریفین میں متعدد رباطیں موجود تھیں، مگر اب وہ یا تو ختم ہوگئی ہیں یا خاتمہ کے قریب ہیں، شمیم صاحب اگر حاجیوں کے لیے سستی قیام گاہوں کا انتظام کرسکیں تو ثواب دارین کے مستحق ہوں گے، اس سلسلہ میں سعودی حکومت اور ہندوستانی گورنمنٹ دونوں کی طرف سے کافی مدد مل سکتی ہے۔ مدرسہ صولتیہ کو اپنے زمانہ قیام ہی سے بڑی اہمیت حاصل ہوگئی تھی، مولانا رحمۃ اللہ اور ان کے رفقاء کی جدوجہد نے اسے عالم اسلام کا مشہور مدرسہ بنا دیا تھا، اس کے فیض یافتگان بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور اعلیٰ مناصب پر سرفراز رہتے تھے، ساری دنیا میں اب حالات پہلے سے بہت کچھ بدل گئے ہیں، اس انقلاب سے سعودی عرب بھی متاثر ہوا ہے، تعلیم و تربیت کے میدان میں بہت اصلاحات ہوئی ہیں اور ان کا سلسلہ اب بھی جاری ہے، ان تغیرات کی روشنی میں مدرسہ کو بھی مناسب اصلاحات کرنی ہوں گی۔

مدرسہ صولتیہ میں ایک زمانہ میں ہندوستانی طلبہ کافی جایا کرتے تھے اور تعلیم و تربیت حاصل کرکے ہندوستان کے مدارس میں تدریس کی خدمت انجام دیتے تھے، اس بارہ میں خصوصی توجہ کی ضرورت ہے، اس کام کے لیے ہندوستان کے اہل خیر سے کافی وظائف مل سکتے ہیں۔ اس طرح اہل ہند اس درسگاہ سے زیادہ سے زیادہ فیض یاب ہوسکیں گے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ اور مولانا محمد سلیم مرحوم کے مقاصد پایۂ تکمیل کو پہنچ سکیں گے، خدا کرے مولوی محمد شمیم کے ہاتھوں مدرسہ صولتیہ کے ایک شاندار دور کا آغاز ہو۔ ("ع، ق"۔ اگست ۱۹۷۷ء)

استدراک: گزشتہ ماہ کے معارف میں وفیات کے تحت مولانا محمد سلیم مرحوم کے مختصر حالات شائع ہوئے ہیں، اس میں ایک جگہ ان کے "بھتیجے کے بعد" کے لڑکے کا اندراج رہ گیا ہے، اسے درج کرلیا جائے، مولانا محمد سعید مولانا رحمۃ اللہ کے بھتیجے نہیں تھے، بلکہ ان کے بھتیجے محمد صدیق صاحب کے لڑکے تھے۔

اسی طرح جہاں پادری فنڈر سے مناظرہ کا ذکر ہے، اس جگہ کی عبارت سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ مولانا اس کے بعد ہی مکہ معظمہ چلے گئے تھے، یہ صحیح ہے کہ ردمسیحیت کی وجہ سے مولانا انگریزوں کی نظر میں کھٹکتے تھے، پادری فنڈر کی شکست کے بعد ان کی ناراضی بہت بڑھ گئی تھی، مگر اس کے باوجود مولانا نے ہندوستان نہیں چھوڑا اور بدستور اپنے کام میں لگے رہے، آگرہ کا یہ مناظرہ ۱۸۵۴ء میں ہوا تھا، اس کے تین برس بعد ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی شروع ہوئی، مولانا رحمۃ اللہ نے بھی اس میں حصہ لیا، جب انقلاب کی یہ کوشش ناکام ہوئی اور ہندوستان پر پھر انگریزوں کا تسلط قائم ہوگیا، تو مولانا بھی باغی قرار پائے اور ان کی گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا گیا، کچھ دن احباب و معتقدین نے پوشیدہ رکھا، لیکن جب یہ تدبیر ناکام ہوتی نظر آئی اور یہ محسوس ہوا کہ مولانا کے ساتھ سیکڑوں اور بندگان خدا بھی انگریزوں کے غضب کا شکار ہوجائیں گے، تو مخلص دوستوں نے ہجرت کا مشورہ دیا۔

مولانا جب مکہ معظمہ پہونچے تھے تو سلطان عبدالمجید کا زمانہ تھا، ان کے بعد سلطان عبدالعزیز اور سلطان عبدالحمید ثانی خلیفہ ہوئے، قسطنطنیہ کا پہلا سفر ۱۲۸۰ھ میں سلطان عبدالعزیز کے عہد میں ہوا، دوسرا سفر ۱۳۰۱ھ میں اور تیسرا سفر ۱۳۰۴ھ میں سلطان عبدالحمید ثانی کے دورحکومت میں ہوا۔ ("ع۔ق"، ستمبر ۱۹۷۷ء)

قریشی، عبدالرزاق

عبدالرزاق قریشی

دارالمصنفین میں یہ خبر بڑے دکھ اور رنج سے سنی گئی کہ جناب عبدالرزاق قریشی اللہ کو پیارے ہوئے، ان کی وفات سے نہ صرف اردو زبان و ادب ایک لائق خدمت گزار، بلکہ دارالمصنفین ایک بہت ہی مخلص پرستار سے محروم ہوگیا ہے، ان کے اعزہ نے ان کی وفات کی خبر بڑی تاخیر سے بھیجی۔ معارف کی آیندہ اشاعت میں ان پر ایک تفصیلی مضمون شائع ہوگا، اس وقت تو ان کی مغفرت کے لیے دل سے دعا نکل رہی ہے۔

("ص۔ع"، ستمبر ۱۹۷۷ء)

عبدالرزاق قریشی مرحوم

(سید شہاب الدین دسنوی)

ضلع اعظم گڈھ کی ایک چھوٹی سی بستی بسہہ میں ۳۰/ جولائی ۷۷ء کو عبدالرزاق

قریشی پر ۹ بجے دن کو دورہ پڑا، دو تین قے ہوئی، ۱۲ بجکر دس منٹ پر ''یا اللہ'' کہہ کر آنکھیں بن کرلیں اور پانچ منٹ بعد یہ خاموش، متین اور سنجیدہ، سادہ مزاج اسکالر اور ادیب اپنے مالک حقیقی سے جاملا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

عبدالرزاق قریشی کم عمری میں بمبئی چلے گئے تھے، جہاں میری اور ان کی رفاقت ۴۱ سال تک قائم رہی، ان کا خاندانی ماحول کچھ ایسا حوصلہ افزا نہ تھا، کہ وہ کسی اسکول یا مدرسے کی تعلیم مکمل کرسکتے، اس کے باوجود وہ بمبئی آئے تو اپنے ساتھ پڑھنے لکھنے کا شوق بھی لیتے آئے تشنگی علم انھیں مختلف چشموں تک لے گئی، مگر آخر میں میکدہ شبلی کے اس بادہ خور کو جس ساقی کی تلاش تھی، وہ ۱۹۳۲ء میں پروفیسر نجیب اشرف ندوی مرحوم کی صورت میں نظر آگیا، جو دارالمصنفین چھوڑنے کے بعد پہلے گورنمنٹ کالج احمد آباد، پھر وہاں سے بمبئی کے ایک سرکاری کالج میں اردو کے پروفیسر ہوکر آگئے تھے، اعظم گڑھ کے ہونے کے ناتے اور دبستان شبلی کے خوشہ چیں کی حیثیت سے قریشی صاحب نے ندوی صاحب سے اپنا تعارف کرایا، طالب و مطلوب کی یہ ملاقات استاد اور شاگرد، بزرگ اور عزیز، دوست اور رفیق کی حیثیتوں میں تبدیل ہوکر زمانے کے بدلتے ہوئے لیل و نہار کے باوجود پوری وضعداری کے ساتھ ۱۹۳۲ء سے پروفیسر نجیب اشرف ندوی صاحب مرحوم کی زندگی کے آخری لمحوں تک برقرار رہی۔

عبدالرزاق قریشی نے ابتدا میں تفریحاً بمبئی کی اردو صحافت کی دنیا میں بھی دشت نوردی کی، پھر ایک مشن اسکول میں، اس کے بعد پارسی اسکول میں ٹیچر ہوکر پڑھاتے رہے، کچھ عرصہ ایک گجراتی اسکول میں بھی پڑھایا، پھر انجمن اسلام ہائی اسکول (بمبئی) میں بھی اردو اور فارسی کے مدرس ہوئے، جہاں انھوں نے طلبہ کو صرف اعلی نمبر ہی کے لیے نہیں تیار کیا، بلکہ ان میں سے بیشتر طالب علموں میں زبان کا ستھرا ذوق بھی پیدا کیا، جتنے شوق سے وہ لڑکوں کو پڑھاتے تھے، اتنی ہی دلچسپی کے ساتھ وہ ان کے ذاتی مسائل کے حل کرنے میں بھی لگے رہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے شاگرد ان کا نام بڑے احترام و عقیدت سے لیتے رہے، درس و تدریس کے علاوہ طلبہ میں تحریر و تقریر کا شوق پیدا کرتے، اور مختلف سرگرمیوں کے ذریعے ان کی تنظیمی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا کام بھی وہ بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیتے تھے، مگر جیسے جیسے ان کا علمی معیار بلند ہوتا گیا، انھیں ہائی اسکول کا تدریسی میدان اپنے لئے تنگ نظر آنے لگا۔ ۱۹۴۷ء میں انجمن اسلام کے تحت ایک اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا ۱۹۵۵ء سے پروفیسر نجیب اشرف ندوی (کالج سے ریٹائر ہوکر) اس ادارے کے پورے وقت کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے، اس درمیان میں انسٹی ٹیوٹ سے عبدالرزاق قریشی کا تعلق گہرا ہوتا گیا اور وہ محسوس کرنے لگے کہ ان کا میدان عمل انسٹی ٹیوٹ ہی ہوسکتا ہے مگر دوسری طرف اسکول کے ہیڈ ماسٹر خلیفہ ضیاء الدین صاحب ان کے ایسے قدر شناس تھے کہ ان کو اسکول سے جدا کرنا گوارا نہ تھا، جب معاملہ میرے سپرد ہوا تو ایک روز میں نے خلیفہ صاحب سے کہا: ''دیکھئے قریشی صاحب سے ہم اور آپ دونوں خصوصی تعلقات رکھتے ہیں مگر ان کا ایک اہم کام آج تک نہ کرپائے یعنی ان کی شادی نہ کراسکے، اس طرح تو وہ دنیا سے لاولد ہی رخصت ہوجائیں گے، اب میں ان کی شادی کی تجویز لے کر آیا ہوں وہ حیرت سے میرا منھ تکتے رہے، پھر بولے: ''تمہید چھوڑئے، تجویز بیان کیجئے''۔ میں نے کہا: ''عبدالرزاق قریشی کا رشتہ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے منسلک کردیا جائے، جہاں سے ان کی تصنیفات معنوی اولاد کی صورت میں ظہور میں آسکیں، ایک لمحہ کے توقف کے بعد وہ متبسم ہوئے اور بولے: ''رشتہ منظور'' اور ۱۹۶۲ء سے عبدالرزاق قریشی نے انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو اپنا شریک حیات بنالیا، اور آخری دم تک اس رشتے کو اس طرح نبھایا کہ انتہائی معذوری کے سوا ایک دن ایسا نہیں گذرا جب کہ وہ بمبئی میں موجود ہوں اور یہاں حاضر نہ رہے ہوں، وہ یہاں اسکول ہی کی تنخواہ پر آئے لیکن شادمانی اور انبساط کا یہ عالم تھا کہ جیسے انھیں یونیورسٹی پروفیسر کا گریڈ مل گیا ہو جب تک رہے اسی نشہ میں سرشار رہے۔

ایک بار وہ چھٹی لے کر وطن گئے اور وہاں علالت کی وجہ سے قیام میعاد سے زیادہ طویل ہوگیا، وہ تنخواہ پیشگی لے گئے تھے، واپس ہوئے تو خود ہی حساب لگا کر معلوم کیا کہ جتنی چھٹی ان کی جمع تھی اس سے دو چار دن زائد ہوگئے تھے، اکاؤنٹ آفس نے کوئی پرسش نہیں کی، کسی نے یہ بھی مشورہ دیا کہ چند دن اگلی چھٹی میں منہا کردئے جائیں مگر انھیں اطمینان نہیں ہوا، میں انجمن اسلام کا جنرل سکریڑی تھا، انسٹیٹیوٹ کے انتظامی امور سے بھی میرا تعلق تھا، انھوں نے مجھے صورت حال سمجھائی اور زائد دنوں کی تنخواہ واپس کرنے پر اصرار کیا، بڑی مشکل سے میں انھیں اس پر راضی کرسکا کہ وہ ان کو نصف تنخواہ کی چھٹی میں منہا کرادیں جو ان کے حساب میں جمع تھی۔

استغناء کی ایک شان یہ بھی تھی کہ نوائے ادب اور تحقیق و تالیف کے سلسلہ میں انھیں مختلف ادیبوں اور اسکالروں سے کافی خط و کتابت کرنی پڑتی تھی، ایک روز میں نے انھیں ڈاکخانے کے عام قسم کے کارڈ اور ان لینڈ کاغذ پر خطوط لکھتے دیکھا تو کہا: ''آپ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی اسٹیشنری اور ٹکٹ کیوں نہیں استعمال کرتے؟'' ہنس کر فرمانے لگے: ''بھائی! میں اپنی طرف سے انسٹی ٹیوٹ کی یہی چھوٹی سی خدمت تو کرتا ہوں''۔

اکتساب علم میں عبدالرزاق قریشی نے جتنی محنت، شوق اور تلاش سے کام لیا وہ اپنی جگہ خود ایک مثال ہے، وہ ہر اتوار کو نجیب اشرف ندوی صاحب مرحوم کے بنگلہ جوگیشوری پہنچ جاتے، ان کے ذاتی کتب خانہ میں اردو، فارسی اور انگریزی کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا، یہ کتابیں اور ندوی صاحب کی ہدایتیں ہر اتوار کو قریشی صاحب کو

وہاں کھینچ لے جاتیں، اس معمول پر وہ اس پابندی سے عمل کرتے کہ بمبئی کی بے تحاشہ بارش اور تیز وتند ہوائیں بھی انھیں اس گیارہ میل کے سفر سے کبھی باز نہ رکھ سکیں، صبح سے شام تک وہ مطالعے میں غرق رہتے، یہ سلسلہ سالہا سال تک جاری رہا، اور اس وقت ختم ہوا جب ان کی صحت بہت خراب ہوگئی اور وہ اتنی لمبی مسافت طے کرنے کے لائق نہیں رہے۔

وہ اپنا ہر کام بڑی لگن کے ساتھ کرتے اور علمی کاموں میں خوب سے خوب تر کے قائل تھے، ان کی سیدھی سادہ زندگی دیکھ کر یہ اندازہ لگانا دشوار ہوتا کہ وہ اپنے مسودے اتنے سلیقے، احتیاط اور اتنی نفاست کے ساتھ تیار کرتے ہوں گے، ان کا خط بڑا پاکیزہ اور پختہ تھا: تحقیقی کاموں میں وہ دوسرے درجہ کی چیز گوارا نہیں کر سکتے تھے، انھوں نے کسی کالج یا یونیورسٹی میں تعلیم نہیں پائی لیکن مغربی طریقہ تحقیق کا نہایت گہرا مطالعہ کرکے اس پر عمل پیرا تھے، ان کی مختصر سی کتاب ''مبادیات تحقیق'' ریسرچ کرنے والوں کے لیے نہایت مفید ہدایت نامہ ہے اور اردو زبان میں اپنے طرز کی شاید پہلی کتاب۔

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں عبدالرزاق قریشی ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے شریک ہوئے، اپنے خاص موضوعات پر تحقیق کرنے علاوہ ادارے کے سہ ماہی رسالے ''نوائے ادب'' کی ادارت بھی سنبھالی اور رسالے کو جس بلند معیار اور وقار کے ساتھ ایڈٹ کیا، اس نے ساری اردو دنیا سے خراج تحسین حاصل کی، جب ان کی وفات کی خبر ملی تو مجھے اور باتوں کے ساتھ نوائے ادب کی یاد آئی اور بے اختیار غالب کا شعر زبان پر آگیا ؎

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

عبدالرزاق قریشی نے بڑی تعداد میں ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین لکھے، تعلیم بالغان کے سلسلہ میں بمبئی کی مشہور سوشل ورکر مسز کلثوم سایانی نے ۱۹۴۰ء میں ایک پندرہ روزہ اخبار ''رہبر'' نکالا تو کئی مہینوں تک اس کے سارے مضامین عبدالرزاق قریشی اور راقم الحروف نے مل کر لکھے، ان مضامین میں بڑی عمر کے لوگوں کی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے سہل نگاری کا لحاظ بہت ضروری تھا، اخبار، زبان اور مضامین دونوں حیثیتوں سے اس قدر مقبول ہوا کہ تھوڑے دنوں میں بیک وقت یہی اخبار اردو (ٹائپ)، دیوناگری اور گجراتی تینوں رسم خط میں چھپنے لگا، اس کوشش کو ملک کے مشہور سربراہوں نے بہت سراہا۔

قریشی صاحب کے سترہ ۱۷ شائع شدہ مضامین کا مجموعہ ''تاثرات'' کے عنوان سے ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا جس میں بعض کتابوں اور شخصیتوں کے متعلق ان کے تاثرات ہیں، مضامین میں ان کی انشا پردازی شبلی اسکول سے وابستگی ظاہر کرتی ہے اور کتاب کا معارف پریس میں طبع کرانا ان کی دارالمصنفین کے دلدادہ ہونے کی دلیل ہے۔

مہاراشٹر کی ریاست میں (جو پہلے ریاست بمبئی کہلاتی تھی) اردو کی تعلیم میں خاصی سہولتیں فراہم تھیں، پھر بھی بعض چیزیں خود اردو والوں کے کرنے کی تھیں، جب تک حکومت نے درسی کتابیں قومیانے کا فیصلہ نہیں کیا تھا، ایسی کتابوں کی تالیف و اشاعت کا مسئلہ اردو والوں کے لئے منفعت بخش نہ ہونے کی وجہ سے قابل توجہ نہ سمجھا جاتا تھا، اوپر کی جماعتوں کی زبان دانی کی مناسب کتابیں مفقود تھیں، انجمن اسلام نے صورت حال کا جائزہ لے کر تالیف کا کام عبدالرزاق قریشی کے سپرد کیا، اور ان کی مرتب کی ہوئی ریڈریں ''نگار اردو'' کئی سال تک داخل نصاب رہیں اور اس طرح ہزاروں اردو داں طلبہ کی اہم ضرورت پوری ہوتی رہی۔

مئی ۱۹۵۶ء میں حیدرآباد اردو کانفرنس کی ایک نشست میں ''اردو تحریک آزادی'' موضوع بحث تھا، اسی نشست میں یہ خیال پیش ہوا کہ اگلے سال جب پہلی جنگ آزادی کی صد سالہ سالگرہ منائی جائے تو اردو کی ایسی تحریروں اور نظموں کا جن سے ملک کی آزادی کی تحریکوں کو بڑی تقویت پہنچی، ایک انتخاب انجمن ترقی اردو (ہند) کی طرف سے شائع ہو، انجمن اسلام کے صدر سیف طیب جی بھی وہاں موجود تھے، انھوں نے انجمن اسلام کی جانب سے انتخاب کے شائع کرنے کے اخراجات کی ذمہ داری قبول کرلی، مگر بعض اسباب کی بنا پر انجمن ترقی اردو اس انتخاب کی ذمہ داری لینے پر رضامند نہ ہوئی اور انجمن اسلام نے یہ کام عبدالرزاق قریشی کے سپرد کردیا جو اس وقت تک انجمن کے لائف ممبر بن چکے تھے، اگلے سال مئی میں چار سو صفحات کا یہ انتخاب قریشی صاحب کے مقدمہ کے ساتھ ''نوائے آزادی'' کے نام سے ٹائپ میں چھپ کر شائع ہوا تو لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں، اس کا پہلا نسخہ انجمن کے صدر نے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کی خدمت میں پیش کیا، یوں تو اس موقع پر جنگ آزادی اور تحریک آزادی کی تاریخیں ہندوستان کی ہر زبان میں لکھی گئیں لیکن اردو کے سوا کسی زبان کو یہ فخر نصیب نہیں ہوا کہ وہ کوئی ایسا مجموعہ (نثر و نظم کا) پیش کرتی جس سے ثابت ہوتا کہ وہ اس ملک کی تحریک آزادی میں معاون ہوئی ہو، یہ کتاب انجمن کے شعبہ اشاعت (ادبی پبلشرز) کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں سب سے پہلے قریشی صاحب نے مرزا مظہر جان جاناں اور ان کے اردو کلام کو تحقیق کا موضوع بنایا، جب یہ کتاب کی صورت میں ان کے عالمانہ مقدمہ کے ساتھ شائع ہوئی تو اردو کے ایک بڑے بلند پایہ محقق اور نقاد نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ یہ کتاب ہندوستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کے تھیس کی حیثیت سے پیش کردی جاتی تو پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری مل جاتی۔

انسٹی ٹیوٹ کے تحقیقی پروگرام کے تحت انھوں نے بڑی قابلیت کے ساتھ

"دیوان عزلت" اور "بارہ ماسہ" دو نایاب قلمی نسخے ایڈٹ کر کے شائع کروائے، پھر "اردو کا تمدنی سرمایہ" کے عنوان سے نوائے ادب میں ان کے کئی مضامین شائع ہوئے، موخرالذکر کام میں ان کی دلچسپی اتنی بڑھی اور اتنا مواد جمع کیا کہ ایک مستقل تصنیف کا مسودہ تیار ہوگیا جو اب دارالمصنفین کے اشاعتی پروگرام میں شامل ہے۔

"مبادیات تحقیق" کا ذکر اوپر آچکا ہے، قریشی صاحب کا تعلق اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے قائم ہوا تو پوسٹ گریجویٹ کلاس کے طلبہ اور تحقیق کا کام کرنے والوں کی خاصی تعداد ان کے اردگرد منڈلانے لگی، وہ لوگ ان سے مشورے کرتے، مقالے دکھاتے، مشکل مقامات کے حل طلب کرتے، عبدالرزاق قریشی منرنجاں مرنج طبیعت کے آدمی، بڑی خوش دلی کے ساتھ ان کی مدد کے لیے ہر وقت تیار رہتے، اسی سلسلہ میں انھوں نے محسوس کیا کہ بیشتر طلبہ تحقیق کے ابتدائی اصول اور طریقہ کار سے بے خبر ہوتے ہیں، کالج اور یونیورسٹی والے اس مفروضے کے تحت کہ طلبہ یہ باتیں خود ہی معلوم کرلیں گے، انھیں اس فن کی معلومات دینا غیر ضروری سمجھتے ہیں، چنانچہ اکثر مقالے اس طرح لکھے اور پیش کئے جاتے ہیں کہ جن کو پڑھنے میں الجھن ہوتی ہے، قریشی صاحب نے مبادیات تحقیق میں وہ اصول بتائے ہیں جن سے مقالہ کی تیاری میں باضابطگی پیدا ہوتی ہے۔

کردار کے اعتبار سے عبدلرزاق قریشی بڑے بلند مرتبے کے انسان تھے، وضعداری پسند کرتے اور اسے نباہنا بھی خوب جانتے تھے، ان کے عزیز اور رشتہ دار وطن سے علاج کے لیے بمبئی آتے تو یہ ان کے مشیر اور مددگار ہوتے مرض کے لحاظ سے کسی ماہر طبیب کا انتخاب، اس سے وقت طے کرنا، پھر بیمار کو وہاں تک لے جانا، ضرورت ہوتی تو اسپتال یا نرسنگ ہوم میں داخل کرانا اور اس وقت تک اس کا حال چال دریافت کرتے رہنا جب تک کہ اس کا قیام بمبئی میں رہتا ہے، یہ سب ان کی زندگی کے معمول میں داخل تھا، یہی سلوک وہ اکثر ان طالب علموں کے ساتھ بھی کرتے جن کے بارے میں انھیں شبہہ ہوجاتا کہ وہ بغیر والی یا مددگار کے ہیں۔

عبدالرزاق قریشی راسخ العقیدہ تو ضرور تھے مگر مذہبی فرائض کی ادائیگی میں ان سے شروع میں کوتاہی ہوتی رہی، میں جب بھی ان سے کہتا: "حضرت! آپ پر صوم و صلوٰۃ کا حکم کب نازل ہوگا؟" تو وہ بڑے معصوم انداز میں مسکرا دیتے اور بس! پھر ایک وقت وہ آیا جب وہ عبادت کی طرف رجوع ہوئے اور اس جوش وخشوع کے ساتھ عبادت میں مشغول دکھائی دینے لگے، کہ ان کے وہ احباب بھی جو پہلے سے پابند صوم و صلوٰۃ تھے ان کی عبادت پر رشک کرنے لگے، ان کے قلب کی اس تبدیلی کا راز افشا کرنا شاید اخلاقی جرم ہو، پھر بھی ان کی روح سے معذرت کرتے ہوئے بیان کردینے کو جی چاہتا ہے، خود ان کا کہنا تھا کہ ایک روز وہ اپنے کمرے میں تنہا سو رہے تھے، فجر ہونے والی تھی، اب دھندلکا تھا کہ انھیں محسوس ہوا کہ اذان کی آواز آرہی ہے، اس سے پہلے ایسی آواز کبھی سنائی نہ دی تھی، ان کی آنکھ کھل گئی مگر وہ پلنگ پر لیٹے رہے، دوسرے دن پھر یہی ہوا، اس مرتبہ اذان کی آواز اور قریب سے آتی ہوئی محسوس ہوئی، پھر آنکھ کھلی اور یہ لیٹے رہے تیسرے دن اور چوتھے دن بھی یہی بات ہوئی، ہر روز آواز قریب تر ہوتی گئی، پھر ایک صبح ایسی آئی جب کہ انھیں لگا جیسے اذان ان کے کانوں میں دی جارہی ہو اور یہ گھبرا کر اٹھ بیٹھے، کچھ دیر تک غور کرتے رہے، پھر اٹھے، وضو کیا اور فجر کی نماز ادا کرنے بیٹھ گئے، اس دن سے ان کی نماز شروع ہوئی جس کی پابندی آخری دم تک قائم رہی، اس سال وہ فریضہ حج ادا کرنے کا عزم کرچکے تھے مگر وقت آگیا اور وہ سوئے عدم سفر پر چلے گئے۔

اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے ریٹائر ہوکر ان کی سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ دارالمصنفین میں رفیق بن کر کام کریں، اس کی پوری تیاری انھوں نے کرلی تھی، ذاتی کتب خانے کی اکثر کتابیں انھوں نے وہاں بھجوادی تھیں اور ارباب دارالمصنفین بڑے شوق کے ساتھ ان کے چشم براہ تھے، مگر

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

عبدالرزاق قریشی کی پوری زندگی پر نظر ڈالتے ہوئے ان کی زبان سے میر کا یہ شعر کتنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

برسوں لگی رہی ہیں جب مہر و مہ سے آنکھیں
تب کوئی ہم سا صاحب، صاحب نظر بنے ہے

اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، آمین۔ (اکتوبر ۱۹۷۷ء)

بنوری، محمد یوسف، مولانا

مولانا محمد یوسف بنوری

۱۹۲۷ء کا زمانہ تھا، میں اس وقت ندوہ میں پڑھتا تھا، درس کے دوران اور بحث وتحقیق کے سلسلہ میں مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ کا تذکرہ ہوتا تھا، ہمارے استاد مولانا حیدر حسن خاں صاحب شاہ صاحب سے بخوبی واقف تھے، اُن کی مجلس میں شاہ صاحب مرحوم کی وسعت علم، بے نظیر حافظہ، ندرتِ فکر، اور دقت نظر کا ذکر آتا تھا، شاہ صاحب کے بعض شاگرد بھی کبھی کبھی آجاتے اور اپنے استاد کے علم و کمال کا والہانہ ذکر کرتے، گرمیوں کی چھٹی میں مولانا سید طلحہ پروفیسر اورینٹل کالج لاہور لکھنؤ آتے، مولانا حیدر حسن خاں صاحب مرحوم اُن کے شفیق استاد تھے، ٹونک اُن کا وطن تھا، اس طرح تلمذ کے ساتھ وطن کی مشارکت بھی اُن کو ندوہ لاتی، اور بعض اوقات کئی کئی دن مولانا حیدر حسن خاں کے ہاں ان کا قیام رہتا، مولانا طلحہ کی عقیدت اور مولانا حیدر حسن خاں کی شفقت قابل دید ہوتی۔

مولانا سید طلحہ صاحب نے مولانا انور شاہ صاحبؒ کو قریب سے دیکھا تھا، اور ان کے حلقہ درس میں کئی بار بیٹھے تھے، اُن کی مخصوص صحبتوں میں بھی شریک ہوئے تھے، علوم اسلامیہ پر خود اُن کی اچھی نظر تھی، خصوصاً تفسیر حدیث، اور رجال کا بہت اچھا مطالعہ تھا، حافظہ بھی غضب کا پایا تھا، لیکن بایں ہمہ وہ شاہ صاحب سے بہت زیادہ متاثر تھے، اور ان کی وسعت نظر، حفظ و اتقان، مہارت علوم، اور مجتہدانہ صلاحیت کے بیحد معترف تھے، ان کا تذکرہ بڑے کیف و وجد کے ساتھ کرتے، کہا کرتے تھے، کہ اگر میں نے مولانا انور شاہ صاحب کو نہ دیکھا ہوتا، اور اُن کے حافظے کا ذاتی تجربہ نہ ہوتا، تو مجھے ان روایتوں کو تسلیم کرنے میں تامل ہوتا جو کتابوں میں سلف کے حافظے کے بارے میں درج ہیں، لیکن شاہ صاحب کو دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا کہ جس امت کے پچھلوں کا یہ حال ہے، اس کے اگلوں کی کیا کیفیت ہوگی۔

یہ باتیں سن کر مجھے اور میرے ساتھیوں کو بھی شاہ صاحبؒ سے بڑی عقیدت پیدا ہوگئی، دیکھنے کا اتفاق تو اس کے کئی برس بعد ہوا لیکن دل پر اُن کی عظمت کا نقش اسی وقت سے قائم ہوگیا تھا، شاہ صاحب کے شاگردوں کے نام بھی کبھی کبھی کان میں پڑتے تھے، مولانا حفظ الرحمٰن، مفتی عتیق الرحمٰن، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا محمد یوسف بنوری اور مولانا احمد رضا کے نام بار بار سننے میں آئے، پھر جب مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مرحوم کے زمانہ اہتمام میں دارالعلوم دیوبند میں عظیم الشان اسٹرائک ہوئی، اور مولانا انور شاہ صاحب، مفتی عزیز الرحمٰن، مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ متعدد بزرگوں نے استعفا دے کر دارالعلوم سے علیحدگی اختیار کی تو عرصہ تک اخبارات میں ان واقعات کا چرچا رہا، بعض اخبارات تو محض انہیں مسائل پر بحث کے لیے نکالے گئے تھے، یہ اسٹرائک بڑی خطرناک تھی، اور ڈر تھا کہ کہیں بزرگوں کی نصف صدی کی کمائی خاک میں نہ مل جائے، لیکن اللہ نے اس کے نقصان سے بڑی حد تک محفوظ رکھا، ایک طرف مولانا حسین احمد مدنیؒ نے دارالعلوم میں صدر مدرس اور شیخ الحدیث کے منصب کو سنبھال لیا، اور دوسری طرف بعض اہل خیر نے ڈابھیل (گجرات) میں شاہ صاحب ان کے رفقاء اور شاگردوں کو بلا کر ایک نئے علمی مرکز کی بنیاد رکھ دی، اساتذہ کی علمی شہرت، کارکنوں کی دل سوزی، اور معاونین کی دریا دلی نے سارے ملک میں اس درسگاہ کا ایسا سکہ جما دیا، کہ تشنگان علم دور دور سے کھنچ کر اس چشمہ صافی کے گرد جمع ہوگئے، اور ڈابھیل کے گلی کوچوں میں قال اللہ اور قال الرسول کے ترانے گونجنے لگے، شاہ صاحب کی صحت پہلے ہی اچھی نہ تھی، ڈابھیل کی مرطوب آب و ہوا اور مضر ثابت ہوئی لیکن اس کے باوجود وہ اپنے کام میں لگے رہے، اور جب تک صحت کی خرابی نے بالکل مجبور نہیں کر دیا، وہ یہاں سے نہیں ہٹے، ان کا قیام اگرچہ زیادہ عرصہ نہیں رہ سکا، مگر اس کے باوجود ڈابھیل دیوبند کا ثنی سمجھا جانے لگا، شاہ صاحب کے بعد ان کے مشن کو ان کے شاگردوں نے نہ صرف جاری رکھا، بلکہ اس میں چار چاند لگا دیئے، ان اصحاب میں مولانا محمد یوسف بنوری خاص طور سے قابل ذکر ہیں، انھوں نے درس و تدریس کے علاوہ ڈابھیل میں نشر و اشاعت کی غرض سے ایک علمی مجلس بھی قائم کی، جس کی طرف سے بہت سی بیش قیمت کتابیں شائع ہوئیں، شاہ صاحب کی سوانح عمری کے علاوہ ان کے افادات درس بھی کئی ضخیم جلدوں میں مرتب کر کے شائع کئے گئے ان میں بخاری کی شرح فیض الباری خاص طور سے قابل ذکر ہے، قدماء کی کتابوں میں ہدایہ کی تخریج نصب الرایہ کی بڑی اہمیت ہے، لیکن پہلے یہ بہت ہی معمولی کاغذ پر چھپی تھی، اور اس کے نسخے بھی بہت کمیاب تھے، مولانا بنوری کا حدیث و فقہ کے طلبہ پر بڑا احسان ہے کہ انھوں نے مصری ٹائپ میں بہت اچھے کاغذ پر اس کتاب کی طباعت کا انتظام کیا، اور اس کے ساتھ بڑے عالمانہ حواشی تحریر کئے، جن کی وجہ سے اس کتاب کا افادہ بہت بڑھ گیا حضرت شاہ ولی اللہ کی بعض نایاب کتابیں بھی ان کی توجہ سے شائع ہوئیں، ملک کی تقسیم کے بعد انھیں بھی پاکستان جانا پڑا، لیکن ان کی علمی اور تعلیمی سرگرمیاں وہاں بھی جاری رہیں، بلکہ ہندوستان سے بھی زیادہ وہاں انھوں نے علمِ دین کی خدمت کی، کراچی میں ایک درس گاہ کی بنیاد ڈالی جس نے ان کی زندگی ہی میں بڑی مرکزیت حاصل کر لی، اس درسگاہ کے ساتھ ایک ماہنامہ ''بینات'' بھی جاری کیا، جو اپنے وقیع علمی و دینی مضامین کی وجہ سے بہت ممتاز ہے، ہندوستان کی طرح پاکستان میں بھی عربی مدارس کے درمیان کوئی رشتہ ارتباط نہیں تھا، وہاں کے سرکاری حلقوں نے اس انتشار سے فائدہ اٹھانا چاہا، اور ان مدارس کو سرکاری سرپرستی میں لے کر مشرقی امتحانات کا مرکز بنا دینے کی کوشش کی لیکن مولانا محمد یوسف بنوری مرحوم نے بڑی ہمت سے اس صورت حال کا مقابلہ کیا، اور آزاد عربی مدارس کا ایک وفاق بنا دیا، جو بہت مفید ثابت ہوا، جو حضرات عربی مدارس سے تعلق رکھتے ہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ کام کتنا مشکل تھا، اس کامیابی سے ایک طرف ان کے اثر و رسوخ کا اندازہ ہوتا ہے، اور دوسری طرف یہ پتہ چلتا ہے کہ انھیں دینی اور علمی حلقوں میں کتنا اعتماد حاصل تھا، ان اہم کاموں کے علاوہ انھوں نے وہاں لامذہبیت اور بدعقیدگی کو بھی روکنے کی کامیاب کوشش کی، اس سلسلہ میں بعض اوقات انھیں حکومت سے بھی ٹکر لینی پڑی لیکن انھوں نے اس کی کوئی پروا نہیں کی، اُن کی اس ہمت اور استقامت کو دیکھ کر بعض دوستوں نے بے ساختہ کہا کہ یہ کسی بنوری ہی کا دل و گردہ تھا، ورنہ جنرل ایوب کے فوجی اقتدار کے زمانہ میں ایسی جرأت کی توقع کسی سے مشکل ہی سے کی جاسکتی تھی، وہ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کے نامور خلیفہ شیخ آدم بنوری کی اولاد میں تھے، اور اُن کے اندر دینی حمیت تجدیدی روح اور استقامت و ثبات قدمی انھیں کی وراثت کی بنا پر آئی تھی، جو شاہجہاں کے شان و شکوہ اور اس کے صاحب اثر وزیر سعد اللہ خاں کے جاہ و جلال کو خاطر میں

نہیں لایا، اس کا نام لیوا ایوبی حکومت کی کیا پرواہ کرتا، ان کی ہمت و استقامت نے بہت سے ڈگمگائے ہوئے قدموں کو سہارا دیا، الحادو بے دینی کے اڈے ٹوٹ گئے، اور ملحدین کو راہ فرار اختیار کرنی پڑی، مسلم ممالک میں بھی ان کا بڑا اثر تھا، اور اکثر اسلامی اور دینی کانفرنسوں میں انھیں شرکت کی دعوت دی جاتی تھی، اور ان کے علم و تجربہ سے فائدہ اٹھایا جاتا تھا، میرا ان سے ملنا جلنا زیادہ نہیں ہوتا تھا، مگر جب مل جاتے تو بڑی محبت سے پیش آتے ۱۹۶۷ء کے موسم حج میں ان کے والد صاحب بھی ساتھ تھے، مجھے ان سے خاص اہتمام سے ملایا، اور میرا تعارف بڑی تعریف و توصیف کے ساتھ ان سے کرایا، جب بھی ملاقات ہوتی، بڑی خوش دلی اور بشاشت کے ساتھ ملتے، آخری بار ۱۹۷۴ء میں مکہ معظّمہ میں ملاقات ہوئی، اس وقت کمزور بہت تھے، پیدل چلنا دشوار تھا، اس لیے سعی گاڑی پر کررہے تھے، آخری ملاقات وہیں مسعٰی میں ہوئی، پھر اس کے بعد ملنے کا موقع نہیں ملا کئی مہینہ سے ان کی بیماری، اور کمزوری کی خبریں آرہی تھیں، بالآخر وقت موعود آپہنچا، اور ۱۸/ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو جان جان آفریں کے سپرد کردی، اللہ انھیں اپنے سائیہ رحمت میں جگہ دے، ان کے مراتب بلند فرمائے، اور ان کے جانشینوں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

انھوں نے علم دین کی خدمت کے لیے جو ادارے قائم کئے تھے، امید ہے کہ وہ برابر ترقی کرتے رہیں گے، اور ان کے دائرہ کار میں مزید توسیع ہوتی رہے گی، تصانیف کے جو مسودے مکمل ہوچکے ہیں، ان کی طباعت کا انتظام جلد ہونا چاہئے، اور جو ابھی نامکمل ہیں، ان کی تکمیل کا بندوبست کرنا چاہئے، اس بارے میں جامع ترمذی کی شرح خاص طور سے قابل ذکر ہے، امید ہے کہ ان کے لائق جانشین اس کی تکمیل اور اشاعت کی خاص فکر کریں گے۔ (”ع۔ق“، نومبر ۱۹۷۷ء)

استدراک: معارف کے ایک نمبر میں مولانا یوسف بنوری کے متعلق آپ کا مضمون پڑھ کر خوشی ہوئی، دیوبند کے قدیم حالات پر آپ کی نظر ہے، اور آپ نے بڑی وسعت قلبی کے ساتھ ان کا ذکر فرمایا ہے، اس مضمون میں ایک ذرا سا تسامح رہ گیا ہے، ڈابھیل میں مجلس علمی مولانا یوسف بنوری نے نہیں بلکہ خود حضرت مولانا سید انور شاہ صاحبؒ نے قائم فرمائی تھی، اور اپنے اس وقت کے نوجوان شاگردوں مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا محمد یحییٰ تھانوی وغیرہ کو تصنیف و تالیف کے کام پر لگایا تھا، مولانا محمد یوسف بنوری ڈابھیل میں دورۂ حدیث پڑھ کر اپنے وطن واپس جاچکے تھے، ڈابھیل میں بہ سلسلہ تدریس و تصنیف اباجیؒ کے انتقال کے بعد پہنچے اور پھر انھوں نے مجلس علمی کی بڑی خدمت کی ہے، عجیب بات یہ ہے کہ بنوری صاحب کو اباجیؒ سے قریب رہنے کا موقع بہت کم ملا، اس کی ابتدا یہ ہے کہ ۱۸ برس کی عمر میں وہ مشکوٰۃ وجلالین کے طالب علم کی حیثیت سے دیوبند آئے، ان کے والد مولانا محمد زکریا صاحب اور ماموں مولانا فضل صمدانی سے اباجیؒ کے تعلقات تھے، مگر بنوری صاحب نے بغیر کسی تعارف کے اپنا ایک عربی قصیدہ اباجیؒ کے سامنے پیش کیا، جسے ملاحظہ فرما کر اباجیؒ نے فرمایا کہ اس میں کسی اصلاح کی ضرورت نہیں، بنوری صاحب بہت تھوڑی مدت میں اباجیؒ سے قریب ہوگئے، علاوہ عام درس کے کئی کتابیں صرف ان کو اباجیؒ نے پڑھائیں، لیکن اباجی سے ان کی معیت و صحبت کی مدت بہت کم ہے، مگر اس بہت کم مدت میں انھوں نے اباجی کو خوب سمجھا، اور ان کے علوم کی بڑی خدمت کی، آپ نے مولانا سید محمد طلحہ کا بھی ذکر کیا ہے، میں نے بچپن میں مولانا طلحہ صاحب کو اباجیؒ کی مجلسوں میں لاہور اور دیوبند میں دیکھا ہے۔

آپ نے یہ خبر کسی اخبار میں پڑھی ہوگی کہ حکومت جموں وکشمیر نے ابھی اکتوبر میں اباجیؒ کی یاد میں ایک سیمینار کشمیر میں بلایا تھا جس میں ان کے خاص خاص شاگرد جمع ہوئے تھے، یہ سیمینار بہت کامیاب رہا اور اس میں شیخ عبداللہ صاحب نے کشمیر میں اباجیؒ کی یاد میں ایک علمی ادارہ قائم کرنے کی تجویز منظور کی، عزیز مکرم مولانا محمد فاروق، میر واعظ کشمیری، مولانا مسعودی، مولانا محمد طیب صاحب، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا سعید احمد صاحب اس تجویز کے محرک تھے۔

معارف کو اپنے صفحات پر اس تجویز کی تائید کرنی چاہیے اور اس کے قیام پر زور دینا چاہیے، کشمیر میں علمی دینی کام کرنے کا بڑا میدان ہے، اب شیخ صاحب بھی متوجہ ہیں، ایسا علمی، دینی اور تصنیفی ادارہ قائم ہوگیا تو بڑا کام ہوگا۔

(مولانا محمد ازہر شاہ قیصر، اپریل ۱۹۷۸ء)

ظفر الہدیٰ، ڈاکٹر

آہ! ڈاکٹر ظفر الہدیٰ

ڈاکٹر ظفر الہدیٰ ایم، اے۔ پی، ایچ۔ ڈی، علامہ شبلیؒ کی بڑی پوتی کے شوہر تھے، ان کا آبائی وطن تو اعظم گڑھ ضلع ہی میں تھا، مگر ان کے گھر کے لوگ دربھنگہ (بہار) منتقل ہوگئے تھے، اس لئے پٹنہ یونیورسٹی میں اپنی انگریزی تعلیم کی تکمیل کی، وہاں سے فارسی اور اردو میں ایم، اے کرنے کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی میں لکچرار ہوگئے، وہیں سے پنشن پاکر ڈھاکہ میں مقیم تھے کہ ۷/ مارچ ۱۹۷۸ء کو اللہ کو پیارے ہوئے، ان کی وفات علامہ شبلیؒ کے خاندان کا ایک المناک سانحہ ہے، وہ اپنے شاگردوں اور یونیورسٹی کے رفقائے کار میں اپنے اخلاق، اخلاص، محبت اور میٹھی زبان کی وجہ سے بہت مقبول تھے، اسی لئے جب بنگلہ دیش میں خونیں انقلاب آیا تو وہاں کی سفاکانہ اور بیرحمانہ

خونریزی میں ہر طرح محفوظ رہے، ان کے اور رفقائے کار تو کراچی منتقل ہوگئے، لیکن انھوں نے ڈھاکہ ہی میں رہنا پسند کیا، بنگالیوں نے غیر بنگالیوں کے ساتھ جو بے رحمانہ سلوک کیا تھا، اس کی وجہ سے بنگلہ دیش کے لوگوں کے خلاف ہندوستان کے مسلمانوں میں بڑا سخت ردعمل تھا، اس کو ڈاکٹر ظفر الہدیٰ اپنے خطوط میں یہ لکھ کر دور کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ آخیر یہ لوگ بھی مسلمان ہیں، وہاں کے مسلمانوں کے لئے اسلام کا صالح لٹریچر پیش کرنے کی خاطر شبلی اکیڈمی بھی قائم کی، دارالمصنفین کی مطبوعات کو بنگلہ زبان میں ترجمہ کرانے کی علمی مہم شروع کی، ان کا کام کچھ چل نکلا تھا کہ وہ وہاں پہنچ گئے، جہاں ایک روز سب کو جانا ہے۔

ان کو دارالمصنفین اور اس کے وسیلہ سے میری حقیر ذات سے بڑی محبت رہی ہے، جب کبھی ڈھاکہ گیا تو وہ مجھ سے سگے بھائی کی طرح ملے اور خاطر تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے اعظم گڑھ آتے تو ان کا زیادہ تر وقت دارالمصنفین ہی میں گزرتا، یہیں قیام کرکے انھوں نے اپنے پی، ایچ، ڈی کا مقالہ لکھا، جس کا عنوان یہ تھا، ہندوستان میں ۱۴۵۱ء سے ۱۵۲۰ء تک کے عہد میں فارسی زبان و ادب کا فروغ۔ ان کے اس مقالہ کے کچھ حصے کراچی کی پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے سہ ماہی انگریزی جرنل اور معارف میں چھپے اور اس کی داد ان کو اہل نظر سے ملی، ان کے پورے مقالہ کا اردو ترجمہ ان کے ایک شاگر سلطان احمد صاحب نے کیا ہے، امید کہ یہ ترجمہ دارالمصنفین سے شائع ہوگا، ان کی اہلیہ ڈھاکہ یونیورسٹی سے ایم۔ بی، بی، ایس کی ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرکے وہیں پریکٹس کرتی ہیں، ان کی اولاد میں صرف ایک لڑکی ہے، وہ اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے، لیکن اپنی شرافت، اغلاق، بھلمنساہت، دوست نوازی، اعزہ پروری اور دوسری خوبیوں کی وجہ سے ایک عرصہ دراز تک اپنے عزیزوں اور دوستوں کے حلقے میں یاد کئے جائیں گے، دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو ان کی نیکیوں کی بدولت کروٹ کروٹ جنت نعیم اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائیں، آمین، ثم آمین۔ (''ص۔ ع''، اپریل ۱۹۷۸ء)

صدیقی، اعجاز

اعجاز صدیقی مرحوم

(سید شہاب الدین دسنوی)

مولانا سیماب اکبر آبادی کے فرزند اور رسالہ ''شاعر'' کے مدیر، اعجاز صدیقی پر ۹؍فروری ۱۹۷۸ء کو دل کا دورہ پڑا اور وہ اسی روز اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

ایک عرصہ سے مختلف امراض کی وجہ سے اعجاز صاحب کی صحت خراب ہو چکی تھی، کئی بار اسپتال میں داخل کئے گئے، اچھے اچھے ڈاکٹروں نے بڑی توجہ اور شفقت سے علاج کیا، مگر بقول شاعر:

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا، اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

اعجاز صدیقی فروری ۱۹۵۱ء میں اپنے وطن آگرہ سے بمبئی آئے اور یہیں انھوں نے مستقل سکونت اختیار کرلی، ان کا رسالہ ''شاعر'' (ماہنامہ) جو پہلے آگرے سے نکلتا تھا، اسی سال سے بمبئی سے شائع ہونے لگا، وہ اس کے معیار کو بلند رکھنے میں انتھک، کوشش کرتے تھے، اردو سے پرخلوص محبت اور اپنے قارئین کو صاف ستھرا ادب پیش کرنے کی کوشش، ان کی زندگی کے دو ایسے نمایاں پہلو تھے کہ جن کی وجہ سے اردو کے اچھے اور اہم لکھنے والوں اور شعراء کا انھیں غیر معمولی تعاون حاصل ہوتا رہا، جس کے سہارے وہ ''شاعر'' کے بڑے ضخیم خصوصی نمبر نکال سکے، ان میں کرشن چند نمبر، ناولٹ نمبر، افسانہ اور ڈرامہ نمبر اور آخری میں ہم عصر اردو ادب نمبر ہماری زبان و ادب میں قابل قدر اضافہ ہیں، حقیقت یہ ہے کہ مسلسل علالت گرتی ہوئی صحت اور محدود مسائل کے ساتھ ایسے ضخیم اور اچھے نمبر شائع کرنا، بڑی جرأت کا کام تھا، بلاشبہ اعجاز صاحب غیر معمولی قوت ارادی کے حامل تھے۔

اعجاز صدیقی، ذاتی طور پر مشرقی تہذیب اور قدروں کے علمبردار اور رکھ رکھاؤ کے آدمی تھے، انھوں نے لوگوں کے ساتھ اپنے تعلقات اور دوستانہ رسم سالہا سال تک آخری دم تک بڑی خوبی کے ساتھ نبھائے، بمبئی، فلمی دنیا کا مرکز مانا جاتا ہے، جہاں پہنچ کر اچھے اچھے ادیبوں اور مشاعروں (یا جدید اصطلاح میں قلمکاروں) کا ادبی پرہیز ٹوٹ جاتا ہے، مگر اعجاز صاحب نے سب سے تعلقات رکھتے ہوئے بھی، اپنے قلم کی سلامت روی کو قائم رکھا۔

اردو تحریک اور اس سے متعلقہ مسائل، اعجاز صاحب کے دماغ پر ہر لمحہ اس طرح چھائے رہتے تھے کہ ان سے کسی اور موضوع پر گفتگو کم ہوتی تھی، انھوں نے ''جرعات'' کے تحت ''شاعر'' میں ان مسائل پر اچھے اداریے لکھے ہیں جن میں فکر کی گہرائی اور خلوص کا جذبہ دونوں جھلکتے ہیں، وہ غزل کے شاعر تھے، مشاعروں میں اس وقت مقبول رہے، جب ترنم سے پڑھتے تھے اور اس وقت بھی داد سخن حاصل کرتے رہے، جب ترنم سے پڑھنا چھوڑ دیا تھا، انھوں نے کئی قومی نظمیں لکھیں مثلاً خوابوں کا مسیحا، ہماری جنگ آزادی، ہم امن چاہتے ہیں، وغیرہ ان میں سے بعض پر ادبی اداروں کی طرف سے انعامات بھی ملے۔

اعجاز صدیقی کی وفات سے اردو کی صف سے ایک مخلص، سچا اور جانباز سپاہی اٹھ گیا، اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ (اپریل ۱۹۷۸ء)

کنزرو، ہردے ناتھ، پنڈت

پنڈت ہردے ناتھ کنزرو

یہ سطریں لکھی جارہی تھیں کہ پنڈت ہردے ناتھ کنزرو کی وفات کی خبر ملی، انھوں نے بڑی لمبی عمر پائی، نوے سال کے تھے، وہ ایک جلیل القدر، مرنجان مرنج، بامروت، وضعدار شخصیت، پارلیمانی دستور کے بڑے ماہر ہندو مسلمان کی ملی جلی تہذیب کے عمدہ نمونہ اور اردو زبان کے بڑے محسن کی حیثیت سے برابر یاد کئے جائیں گے، وہ اپنی ترشی ہوئی بھلمنساہت کی وجہ سے ہندوستان کی سیاست کی جذباتی ہم آہنگی کے قابل تقلید نمونہ بن سکتے ہیں، بشرطیکہ موجودہ قومی دھارے کے بنانے والے ان کو ایسا ہی سمجھیں۔ (''ص۔ع''، اپریل ۱۹۷۸ء)

ماہرالقادری

آہ ماہرالقادری

جناب ماہرالقادری کی وفات کی خبر سے بہت ہی دل گیر اور دل فگار ہو کر جب یہ تحریر لکھنے بیٹھا ہوں تو کراچی کی ساری علمی و ادبی مجلسیں یاد آرہی ہیں۔

کراچی بار ہا جانے کا اتفاق ہوا، وہاں کی ممتاز شخصیتوں کی یادوں کی قندیلیں روشن کرتا رہتا ہوں، ان میں بہت سے اللہ کو پیارے بھی ہوگئے، اختر جونا گڑھی مرحوم یاد آتے ہیں، ان کی کتاب ''طبقات الامم'' دارالمصنفین سے شائع ہوئی تھی، معارف میں مولانا شبلیؒ پر اچھے مضامین لکھے، وہ بزرگ محترم مولانا سید ابوظفر ندوی مرحوم کے ساتھ جونا گڑھ سے شہاب رسالہ بھی نکالا کرتے تھے، دارالمصنفین کے بڑے قدردان رہے، وہ جس محبت سے کراچی میں ملے اس کی یاد برابر باقی رہے گی، ان ہی کے یہاں کھانے پر حفیظ ہوشیار پوری مرحوم سے ملا تھا، ان کے پرکیف نغمہ شعری سے بھی محظوظ ہوا تھا، ان کی محبت بھری باتوں میں بڑی کیفیت تھی، ممتاز حسن مرحوم (ریٹائرڈ سکریٹری محکمہ فنانس حکومت پاکستان) یاد آتے ہیں تو ان کی علم نوازی، کرم گستری اور دوست پروری کے معطر اور نکہت بیز پھولوں کے بار سے دبتا چلا جاتا ہوں، ایک رات جناب جمیل عالی کے دسترخوان پر میں جناب ممتاز حسن مرحوم، ابن انشاء مرحوم اور یادش بخیر پیر حسام الدین راشدی کے ساتھ شریک ہوا، رات کو ایک بجے تک علمی و ادبی باتیں ہوتی ہیں، وہ رات بھی کیسی حسین اور بہار آفریں تھی، ممتاز حسن مرحوم ایک تناور سایہ دار علمی برگد تھے، اسی کے چھاؤں کے نیچے کراچی کے ارباب علم جمع ہوتے اور ان کے سایہ عاطفت میں اپنے علمی و ادبی ذوق کو پھلتے پھولتے محسوس کرتے، جناب ابن انشاء مجلسوں میں ملتے اور خاموش بنے رہتے، مگر اخبار کے کالم میں شب برات کی پھلجڑی اور پٹاخے بن جاتے ان کی موت پر پاکستان کے اخباروں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر جو ماتم ہوا ہے وہ قابل رشک ہے، جمیل الدین عالی صاحب ابھی بقید حیات ہیں خدا کرے ابھی بہت دنوں زندہ رہیں، اخبار کے کالم اور ٹیلی ویژن کے تو وہ ہیرو سمجھے جاتے ہیں، جناب پیر حسام الدین راشدی تو کراچی کے نہ صرف پرنس اسکالر ہیں، بلکہ وہاں کے علمی معشوقوں کے معشوق ہیں، ان کی کوٹھی تو میرے لیے ایک علمی زیارت بن گئی ہے، ان کے نوشت و خواند کے کمرے میں پہنچ جاتا ہوں تو وہاں علم و فن کی کرنیں میرے ذہن کو گرماتی رہتی ہیں، وہ اپنے یہاں کراچی کے اہل علم کو برابر مدعو کر کے ان سے ملاقاتیں کراتے رہتے ہیں، ان ہی کے یہاں پہلی دفعہ فلسفہ اور فلسفہ اقبالیات کے بہت بڑے ماہر جناب بشیر احمد ڈار صاحب سے ملا، ان کے عجز، انکسار اور استغناء سے ان کا علم و فن دب کر رہ گیا ہے، اقبال پر ان کا جب کوئی مضمون پڑھتا ہوں تو نظر و فکر میں کندن سی چمک پیدا ہوجاتی ہے، راشدی صاحب ہی کے دولت کدہ پر پروفیسر شیخ عبدالرشید سے بارہا ملا، بوڑھے ہیں مگر علمی باتوں میں جوان رعنا نظر آتے ہیں، تاریخ کے ہر پہلو پر ناقدانہ نظر رکھتے ہیں، راشدی صاحب ہی کے یہاں ڈاکٹر ریاض الاسلام صدر شعبہ تاریخ کراچی یونیورسٹی سے کئی بار ملا خاموش، متین اور سنجیدہ ہیں، مگر کام کرنے کی لگن کی وجہ سے کسی نہ کسی علمی کام میں لگے رہتے ہیں اور اب تک بہت سی کتابوں کے مصنف ہو چکے ہیں، کراچی یونیورسٹی کے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کو اردو کے ایک مصنف اور نقاد کی حیثیت سے تو جانتا تھا، مگر جب ان کی کتاب اقبال اور مسلک تصوف پڑھی تو ان کو علم معرفت کا اداشناس بھی سمجھنے پر مجبور ہوا اور جب ان کی یہ کتاب ختم کی تو محسوس ہوا کہ بہت دنوں کے بعد ایک اچھی کتاب پڑھنے کو ملی، یہ کتاب جناب ڈاکٹر معزالدین ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی کے ذریعہ سے ملی جس کے لئے ان کا شکر گزار ہوں، ڈاکٹر معزالدین صاحب کراچی میں تھے، تو اس طرح ملے جیسے کوئی شفیق چھوٹا بھائی ملتا ہو، ان کی بھلمنساہت میں بڑی دل آویزی ہے، جناب شریف المجاہد جرنلزم کے فن کے استاد ہیں ان کا مضمون جہاں کہیں دیکھتا ہوں ضرور پڑھتا ہوں۔

جناب مشفق خواجہ۔ تو اردو ادب کے حبیب بن کر اب اس کے محبوب بن گئے ہیں، ہر مجلس میں ان کی شان محبوبیت قائم رہتی ہے، وہ میری دل نوازی جس طرح کرتے ہیں، اس کی روداد کم دل آویز نہیں۔

کراچی کے علمی حلقہ میں جناب حکیم سعید دہلوی سے بھی بار ہا ملنے کا اتفاق ہوا، خوشرو، خوش جامہ زیبی اور مہمان نوازی کے پیکر ہیں، ان کی علم نوازی میں وہی شان پائی جاتی ہے، جو تیموری دربار کے امراء کے یہاں ہوا کرتی تھی، معلوم نہیں کیسی کیسی علمی مجلسیں منعقد کیا کرتے ہیں اور کس کس طرح سے ارباب علم کو اپنی فیاضیوں سے سیراب کرتے رہتے ہیں۔

کراچی کی علمی مجلسوں میں مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی تو بلبل ہزار داستان

ہیں، کہیں بیٹھ جائیں تو وہی چھائے رہتے ہیں، حدیث، فقہ، تصوف، تاریخ اسلام یہود و انصاری کے صحائف، افریقہ کے جنگلی قبائل، تبلیغ اسلام روڈیشیا کے آئین اسمتھ، انگریز مورخ ٹوائن بی، ہپی، مہاتما گاندھی، محمد علی جناح، پاکستان تحریک، شدھی، سنگھٹن، شعروادب، امیر مینائی جوش ملیح آبادی، سراج لکھنوی، قدیر لکھنوی، غزل، دوہے، مگھی گیت اور برہے پر ایک سانس میں گفتگو کرکے سامعین کو ساکت و صامت بنادیتے ہیں، وہ اپنی معلومات کے لحاظ سے انسائیکلوپیڈیا ہیں، مولانا ناظم ندوی سابق شیخ الجامعہ مدرسہ بھاولپور کو عربی شعر و ادب میں بڑا عبور ہے، عربی کے اشعار برجستہ سناتے ہیں اور خود بھی کہتے ہیں، عربی میں ان کی گہری نظر کا معترف کراچی کا پورا علمی حلقہ ہے، مہمان نوازی اور دوستوں کی دلجوئی کا پورا حق ادا کرتے ہیں، مولانا حسن مثنیٰ ندوی پاکستان کے موتمر اسلامی کے صدر ہیں، بہت اچھے مقرر ہیں، اپنے اردگرد دوستوں اور نوجوانوں کو ساتھ رکھنے کا خاص ملکہ رکھتے ہیں، نوجوانوں میں کام کرنے کا جذبہ پیدا کرنے کا بھی سلیقہ رکھتے ہیں، قہرنیم روز کے اڈیٹر ہیں، اپنے قہقہوں اور چہچہوں سے مجلس کو گرم رکھتے ہیں، ان کے ہمدم اور دمساز ظفیر الحسن صاحب ہیں جو بیدل لائبریری کے جنرل سکریٹری ہیں، ان میں علمی سرگرمیوں کو جاری رکھنے اور رکھانے کی بڑی لگن ہے، کسی نہ کسی مفید کام میں لگے رہتے ہیں، ڈاکٹر مطیع الاسلام صدر شعبہ فارسی کراچی یونیورسٹی، حضرت شرف الدین یحییٰ منیری کی تصانیف پر بڑی اچھی نظر رکھتے ہیں، مجھ سے بزم صوفیہ کے مصنف کی حیثیت سے جس اخلاص سے ملتے ہیں، اس کے لئے ان کا شکرگزار ہوں، جناب شفیق بریلوی نے ارمغان نعت مرتب کرکے کراچی کے علمی حلقہ میں بڑی مقبولیت حاصل کرلی ہے، بڑے متحرک اور فعال قسم کے اہل علم ہیں، بزمی انصاری صاحب سے ملنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کے جسم کے کسی حصہ کو چھو لیجئے تو علم ہی کی آواز بلند ہوگی، انگریزی میں انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مستقل مقالہ نگار ہیں، اس کے بورڈ آف ڈائریکٹر کے بھی شاید رکن ہیں، شاہجہانی دور کے علامہ سعداللہ خاں پر ایک کتاب بڑی محنت اور عراق ریزی سے لکھی ہے، پروفیسر ایوب قادری تو ان گنت کتابوں کے مصنف ہوچکے ہیں، عہد مغلیہ کے دور کی فارسی کتابوں کا اردو ترجمہ کرنے میں غیر معمولی ملکہ حاصل کرلیا ہے، کراچی یونیورسٹی میں اس کے وائس چانسلر جناب احسان رشید صاحب سے ملا تو ان کی قدر آور شخصیت اور تواضع سے متاثر ہوا، وہیں شعبہ اردو کے پروفیسر ابوالخیر کشفی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے جس طرح پذیرائی کی اس سے ان کا ممنون ہوا۔

ڈاکٹر معین الحق جنرل سکریٹری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی مورخانہ بصیرت کی وجہ سے ان کی ذات خود ایک علمی انجمن بنی ہوئی ہے، ان کی ملاقات درس و تدریس کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

جناب خالد اسحٰق کراچی کے بہت ہی مقبول اور مشغول ایڈوکیٹ ہیں، ایک روز انھوں نے اپنے یہاں برادرم ڈاکٹر سلمان ندوی کے ساتھ کھانے پر مدعو کیا تو ان کا کتب خانہ دیکھ کر خوش ہوا، ان کا علمی ذوق پورے شہر میں مشہور ہے، بڑے دیدہ ور سیاست داں اور ایڈوکیٹ سمجھے جاتے ہیں، بڑی شستہ رفتہ گفتگو کرتے ہیں، اردو پنجابی، سندھی اور انگریزی ایک ساتھ بولتے ہیں، دنیا کے تمام مسلمانوں کے لئے درد رکھتے ہیں، ان ہی کے یہاں جناب صلاح الدین اڈیٹر جسارت سے ملاقات ہوئی، انھوں نے بنیادی حقوق کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، جس کی دھوم پورے پاکستان میں ہے، ان کی اس کتاب کی رونمائی کے موقع پر انگریزی زبان کے لائق مصنف جناب جمیل احمد صاحب سے ملاقات ہوئی جنھوں نے Hundred Great Muslims of the World لکھی ہے، یہ پورے پاکستان بلکہ بیرون پاکستان میں بہت ہی شوق سے پڑھی جارہی ہے، اس کا ایک نسخہ مجھ کو بھی عنایت کیا، بہت ہی خاموش قسم کے اہل قلم معلوم ہوئے۔

ماہرالقادری مرحوم کی ماتمی تحریر کے سلسلہ میں یہ ساری باتیں بظاہر بے جوڑ معلوم ہوں گی، لیکن اس لمبی تمہید کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ کراچی کے علمی حلقہ کی بہت سی ممتاز شخصیتوں سے ملنے کا اتفاق ہوا، مگر ان میں سب سے رعنا، دل آویز اور باغ و بہار شخصیت مولانا ماہرالقادری کو پایا، جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے، دن ہے تو مجلس کے گل سرسبد بن گئے، رات ہے تو شمع محفل نظر آئے۔

ان سے غائبانہ تعارف ۱۹۳۵ء سے بھی پہلے کا تھا، انھوں نے اپنی ایک غزل ایک بار معارف میں چھپنے کے لیے بھیجی، جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کا ذوق شعری بہت عمدہ تھا، اس میں انھوں نے کچھ اصلاح دے دی، ماہرالقادری صاحب نے اس کو پسند نہیں کیا، احتجاجاً ایک خط حضرت مولانا سید سلیمانؒ ندوی کو لکھا، اس کا جواب سید صاحبؒ نے بہت ہی نرم اور ٹھنڈے انداز میں دیا جس سے وہ بہت متاثر ہوئے اس کا ذکر کراچی کی علمی مجلس میں برابر کرتے، جب میں ۱۹۷۵ء میں پاکستان گیا تو مولانا ظفر احمد انصاری صاحب سے بزرگانہ عزیزانہ مراسم پیدا ہوئے انھوں نے مجھ کو اپنے یہاں مدعو کیا تو جناب ماہرالقادری کو مجھ سے ملنے کے لیے خاص طور پر بلایا، وہ ان کو اس قدر پسند کرتے کہ اپنے یہاں چھوٹی بڑی جو بھی دعوت کرتے تو ان کو ضرور بلاتے، خود ماہرالقادری صاحب ان کے بڑے دلدادہ تھے، یہ دلدادگی بلاوجہ بھی نہ تھی، مولانا ظفر احمد انصاری کراچی میں اپنے قدردانوں، دوستوں اور مخلصوں کے پیرمغان ہیں، وہ سند یافتہ عالم تو نہیں ہیں، بلکہ الہ آباد یونیورسٹی سے ایم، اے کیا اور یونیورسٹی میں اول آئے، ال، ال۔ بی کے امتحان میں بھی امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی، شعروادب کا بھی ذوق رکھتے ہیں، ان کی ایک قومی نظم کی بھی شہرت ہوئی تھی، مگر وہ

پاکستان کی تحریک میں شریک ہوئے تو پھر سیاست ہی کے ہوکر رہ گئے، مسلم لیگ کی کمیٹی آف ایکشن اور آل انڈیا مسلم لیگ سنٹرل پارلیمنٹ بورڈ کے سکریٹری پھر آل انڈیا مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سکریٹری بھی رہے، جناب لیاقت علی خان مرحوم کے ساتھ بھی کام کیا، ان ہی کی مساعی جمیلہ سے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ مسلم لیگ میں شامل ہوئے، پاکستان کی دستور سازی کے سلسلہ میں جو تعلیمات اسلامی کا بورڈ بنا، اس کے بھی سکریٹری رہے اور جب استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ پاکستان پہنچے تو ان کے ساتھ بھی کام کیا، قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے میں ان کا نمایاں ترین حصہ رہا جب میں ان سے ملا تو وہ پاکستان کی نیشنل اسمبلی کے بڑے بااثر آزاد رکن تھے، حکومت اور حزب مخالف دونوں کی رائے کی قدر کرتے، وہ اپنی نرم شیریں، سبک، متوازن اور متین باتوں سے اپنے ملنے والوں کے دلوں کی تسخیر کرتے ہیں شہرت یا کوئی ذاتی فائدہ نہیں چاہتے، گمنام رہ کر پاکستان کے تعمیری کاموں میں لگے رہتے ہیں، اس لیے پاکستان کے گمنام معمار کہلاتے ہیں، عربی کا ایک مدرسہ بھی ان کی نگرانی میں چل رہا ہے پاکستان کے سربراہ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق ان کی بے لوثی، بے غرضی، رائے کی اصابت کے معترف ہیں، ان کی ذات گرامی میں کچھ ایسی ہی مقناطیسیت ہے، دارالمصنفین کی مطبوعات کے حق طباعت و اشاعت کا جو معاہدہ نیشنل بک فاؤنڈیشن کراچی سے ہوا اس سلسلہ میں ہر قسم کی مدد پہنچائی ان کے یہاں ادیب، شاعر، عالم، وکیل، سیاست داں سب ہی جمع ہوتے ہیں، جناب ماہر القادری تو ان کے قلب کی دھڑکن بن کر رہے، ان کے یہاں ماہر صاحب سے جو ملاقات ہوئی، تو یہ مشفقانہ راہ و رسم میں تبدیل ہوگئی، پھر خدا جانے کتنی ملاقاتیں ہوتی رہیں، وہ میری قیام گاہ پر آتے اور میں ان کے گھر پر حاضر ہوتا، دعوتوں اور جلسوں میں ان کا ساتھ رہتا، علامہ محمد اقبال کی صدسالہ سالگرہ کے موقع پر انٹرکونٹی نینٹل ہوٹل لاہور میں ٹھہرا ہوا تھا، ان دنوں وہ لاہور ہی میں تھے، کافی رات گزر چکی تھی تو وہاں ملنے آئے اور دیر تک اپنی باتوں سے محظوظ کرتے رہے۔

ان کی شیوہ بیانی ان کی خاص چیز تھی، اس وقت ان کی طلاقت لسانی زیادہ بروئے کار آتی وہ جب وہ اختلافی مسائل پر گفتگو کرتے، تصوف، وحدت الوجود، بدعت، تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی، بریلوی علماء، زبان، ادب، تذکیر و تانیث ان کا خاص موضوع ہوتا، تصوف کے مخالف اور وحدت الوجود کے منکر تھے، ان دونوں مسائل پر گفتگو کرتے وقت پسینہ میں شرابور ہوجاتے ان کو چھیڑنے کے لیے ان کے دلائل کا رد کیا جاتا تو پھر ان کی قوت گویائی میں اور بھی اضافہ ہوجاتا، کلام پاک اور حدیث کا سہارا لے کر اپنے معترض کو قائل کرنے کی کوشش کرتے، کلام پاک کی آیتیں پڑھتے اور حدیث کے حوالے دیتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ ہم کو کوئی مستند عالم مخاطب کررہا ہے، حالانکہ انھوں نے فارسی اور عربی کی تعلیم گھر ہی پر پائی تھی، انگریزی تعلیم شائد میٹرک ہی تک حاصل کی تھی، مگر بحث کرتے وقت اپنی مذہبی اور علمی معلومات میں جید عالموں اور انگریزی دانوں سے کسی حال میں دبتے نظر نہیں آتے، ان کو معلوم تھا کہ یہ راقم بزم صوفیہ کا مصنف ہے، تصوف اور وحدت الوجود کے خلاف بولتے وقت میرا ہاتھ پکڑ لیتے اور میری دل جوئی کی خاطر کہتے کہ میں تزکیہ نفس اور تصفیہ باطن کا مخالف نہیں ہوں، مگر تصوف میں جو غیر اسلامی اور اباحتی رنگ پیدا ہوگیا ہے، اس کا مخالف ہوں وہ میری کسی بات سے قائل ہونا پسند نہیں کرتے، جب بحث کرنے میں ان کو پسینہ آنے لگتا تو موضوع کا رخ بدل دینے کی کوشش کی جاتی، ایسے ہی ایک موقع پر جب ان کی بحث میں بہت تیزی آرہی تھی تو ایک صاحب بول اٹھے کہ مولانا شبلیؒ شان نزول کو مذکر لکھتے ہیں، شان تو مونث ہے، شان نزول بھی مونث ہونا چاہئے، پھر ان کا رنگ ہی بدل گیا، بولے کہ مولانا شبلیؒ نے شان نزول کو مذکر لکھا ہے تو یہی صحیح ہے، ان کے یہاں زبان کی کوئی غلطی نہیں مل سکتی، وہ مولانا شبلیؒ کے بڑے عقیدت مند تھے، بارہا ان کی زبان سے سنا کہ مولانا شبلیؒ ایک طرف اور ساری علمی و ادبی امت دوسری طرف ہو تو بھی ان کا پلا بھاری ہوگا، ان کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا، ماہر صاحب اردو زبان کے محاوروں، تذکیر تانیث اور واحد و جمع پر بڑی اچھی نظر رکھتے، کہتے کہ درد اگر جمع کے ساتھ استعمال ہو تو معنی بدل جاتے ہیں، درد اٹھ رہے ہیں سے مراد دردزہ ہوتا ہے، ستو کے ساتھ پینا ہمیشہ جمع کے ساتھ استعمال ہونا چاہئے ستو پیئے صحیح ہے، ستو پیا بولنا غلط ہے، کہنے لگے کہ جوش ملیح آبادی نے ایک جگہ رنگینی پھٹ پڑی کا محاورہ استعمال کیا ہے، شباب اور جوانی کے لئے پھٹ پڑنا استعمال ہوتا ہے، رنگینی پھٹ پڑنا غلط ہے کہتے کہ ہر زبان کا مرکز ہوا کرتا ہے، حجاز عربی اور ایران فارسی کا مرکز ہے، تو اردو کا مرکز لکھنؤ اور دہلی کو تسلیم کرنا پڑے گا، وہیں کے روزمرے اور محاورے مستند سمجھے جائیں گے اسی کے ساتھ اقبال کے بہت معترف تھے، کہتے کہ میرؔ کی شاعری آہ ہے، سوداؔ کی واہ ہے، تو اقبالؔ کی شمع راہ ہے، رومی نے مسلمان کو ولی اللہ بنانے کی کوشش کی تو اقبال نے کافر کو مسلمان بنایا، اقبال کی وفات پر انھوں نے ایک غمناک نظم بھی لکھی تھی جس کے چند اشعار یہ ہیں:

ساز میں سوز نہ تھا تیری نوا سے پہلے   کاروان خواب میں تھا بانگ درا سے پہلے
بال جبریل کے سایہ میں ہوا گرم خرام   اللہ اللہ ترا قافلہ نطق و کلام
نگہ و فکر پہ اسرار خودی فاش کئے   صرف مشرق نہیں مغرب کو بھی پیغام دیئے
موج کوثر ترے اشعار کہیں ضرب کلیم   تو کبھی شعلہ رقصاں، کبھی رفتار نسیم
شکوہ اللہ تعالیٰ سے بصد ناز کیا   ایک نئی طرز نئے باب کا آغاز کیا
کہیں ایمان ابراہیم کہیں عزم حسینؓ   ترے شعروں میں کہیں معرکہ بدر وحنین
ترا سرمایہ دانش تھا فقط عشق رسول   اس لئے ہے تری ایک ایک مجھے بات قبول

محفل رومی و عطار تھی مدت سے خموش   ترے نغموں نے بنایا اسے ہنگامہ جوش
علم و حکمت کے مسائل کو دیا شعر کا رنگ   کس نزاکت سے ہم آغوش کئے شیشہ و سنگ
فکر افسردہ کو پرواز عطا کی تو نے   لب خاموش کو آواز عطا کی تو نے

اس جامع نظم میں اقبال کی پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے، مگر جب ان سے کہا جاتا کہ رومی اور اقبال دونوں تصوف اور وحدت الوجود کے قائل تھے، تو پھر ان کی بحث میں تیزی آجاتی، لیکن ان کی بڑی خوبی یہ تھی کہ تلخ بحث کرنے میں کتنے ہی منہمک ہوجاتے، رخ بدل جاتا تو یکا یک وہ بذلہ سنج، لطیفہ گو اور قہقہوں اور چہچہوں کے مالک بلاشرکت غیرے ہوجاتے، اس برصغیر کا کوئی سیاسی، علمی، ادبی اور معاشرتی لطیفہ ایسا نہ تھا، جو ان کے ذہن کے خزینہ میں محفوظ نہ تھا، اگر کوئی کسی اچھے لطیفہ کو صحیح طور پر بیان نہ کرتا تو وہ بدحظ ہوکر اس کی اصلاح کرتے، اپنے لطیفوں اور چٹکلوں سے مجلس کو زعفران بنائے رکھتے، کہتے کہ وہ نیند کے بادشاہ ہیں، نیند ہر وقت میری آنکھوں میں دھری رہتی ہے ریل کے مسافروں کے ہجوم میں بیٹھے بیٹھے سویا ہوں اس طرح کہ دہلی سے ریل چلتے ہی آنکھ لگی اور امرتسر پہنچ کر آنکھ کھلی۔ دنیا میں صرف ایک ہی شخص نیند میں ان سے بازی لے گیا، ایک بحری جہاز ڈوبنے لگا تو ایک شخص اس کے عرشہ سے سمندر میں گر گیا مگر سمندر کے پانی پر گرنے سے پہلے کچھ لمحات کے لئے وہ سوگیا، ان کی تفریحی باتوں کے درمیان ان سے ان کی غزلیں سننے اور سنانے کی فرمائش ہوتی تو پھر ان کی نعت، نظم، غزل اور گیت کے نغمے فضا میں اس طرح گونجنے لگتے کہ معلوم ہوتا کہ وہ پئے ہوئے ہیں اور پلا رہے ہیں، وقت گزرتا جاتا، ان کی زمزمہ سنجی اور گلفشانی جاری رہتی، وہ رخصت ہوتے تو جی چاہتا کہ وہ دوسرے دن پھر ملیں، خود مجھ سے اور میں ان سے ملنے کے لئے بے قرار رہتا، کبھی چائے اور کبھی کھانے پر بلاتے، بریانی اور گاجر کے حلوے بہت شوق سے کھاتے اور دوستوں کو کھانے کے لئے اصرار کرتے، کراچی میں ابھی گزشتہ فروری ہی میں اپنی قیام گاہ پر مولانا ظفر احمد انصاری، پیر حسام الدین راشدی، مولانا جمال میاں فرنگی محلی، بزمی انصاری، مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی، مولانا ناظم ندوی کاظم، ایم، اے شفیق بریلوی، ڈاکٹر آفتاب صدیقی، محمود الرحمٰن آہنگ کے ایڈیٹر صبیح محسن اور جنگ کے نامہ نگار اقبال احمد صدیقی، ظفیر الحسن، ڈاکٹر محمد نعیم اور ڈاکٹر محمد طیب وغیرہ کو اپنے یہاں شام کی چائے پر مدعو کیا، ماہرالقادری کی وجہ سے تو صبح صبح بنارس اور شام شامِ اودھ بن جاتی، وہ کیوں نہ ہوتے، مجلس کو مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی اور جناب ماہرالقادری دونوں نے مل کر لوٹا، یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ دونوں میں کس کی شیوہ بنائی زیادہ کام کررہی ہے، مگر جب حضرت ماہرالقادری اپنی نظمیں سنانے لگے تو پھر سب ہی لوگ دم بخود تھے، جنگ کے نامہ نگار نے کہا کہ یہ مجلس کراچی کی یادگار مجلس میں شمار کی جائے گی۔

دارالمصنفین کا معاملہ کراچی کے نیشنل بک فاؤنڈیشن سے ہورہا تھا، تو انھوں نے ہر طرح کی اخلاقی مدد پہنچائی تھی، جس کے لئے ان کا شکرگزار رہا، کراچی سے اعظم گڑھ آتے وقت گزشتہ فروری میں ان سے رخصت ہوا، تو انھوں نے بھینچ بھینچ کر پیار کیا، کیا معلوم تھا کہ پھر کبھی ملاقات نہ ہوگی، ۱۰/مئی کی رات کو پاکستان کی خبروں میں یکا یک سنا کہ پاکستان کے مشہور ادیب، نقاد اور شاعر وفات پاگئے، ان کی تدفین مکہ معظمہ کی جنت المعلیٰ میں ہوگی، یہ خبر سننے کے لئے تیار نہ تھا، غایت اضطراب میں رات کے زیادہ حصہ میں کروٹیں لیتا رہا ان کا ہشاش بشاش چہرہ ان کی سرگیں آنکھیں، ان کی دلآویز باتیں، ان کے لطیفے چٹکلے غزل اور نظم سنانے میں ان کی مترنم آواز کانوں میں گونجتی رہی، خیال آیا کہ مولانا شبلیؒ، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ، دارالمصنفین اور خود اس عاجز راقم کا ایک بڑا قدرداں جاتا رہا، استاذی المحترم نے کراچی پہنچ کر اسلامی ملکوں کے علماء کا ایک اختفال منعقد کیا تھا، اس کے انعقاد میں وہ بھی شریک تھے، اس موقع پر انھوں نے ایک نظم بھی کہی تھی، جس کے کچھ اشعار یہ ہیں،

یہ حقیقت آپ کو اچھی طرح معلوم ہے   آج دین حق جہاں میں ہر جگہ مظلوم ہے
دین سے بیزار دولت مند بھی نادار بھی   نفس کی خواہش کے بندے شیخ بھی مے خوار بھی
قوم کی وہ بیٹیاں جن کو کہ بننا تھا بتول   مدرسوں میں سیکھتی ہیں ناچ گانے کے اصول
مال و زر جاہ و تعیش منزل مقصود ہے   آدمی کا اس جہاں میں آدمی معبود ہے
زندگی نان و شکم کے ماسوا کچھ نہیں   دل میں سب کا خوف ہے خوف خدا کچھ بھی نہیں
ہر طرف باطل کے پھندے ہر طرف بازیگری   روس کا فتنہ بھی ہے اور لعنت افرنگ بھی
اپنی منزل سے ہیں اب تک ناشناس و بے خبر   مطمئن ہیں آج تک ہم کفر کے دستور پر

پھر اسی اختفال میں مصر، شام، عراق، الجزائر، افغانستان، برما اور انڈونیشیا کے علمائے کرام کو للکار کر کہا تھا کہ:

روک دو طاغوت کے طوفان کو بڑھ کر روک دو

ان کی اس نظم کی تعریف سید صاحب نے بھی کی تھی، وہ معارف کے قدرداں ہونے کی حیثیت سے اس کو پابندی سے پڑھتے، میرے قیام کراچی میں معارف جب ان کے پاس پہنچتا، ملتے کے ساتھ ہی اس کے مضامین کے معیار کی تعریف کرنے لگتے کہتے کہ اس کا معیار اس کے ابتدائی دور سے اب بہت اونچا ہوتا جارہا ہے، میرا جب کسی سے تعارف کراتے تو میری تمام تصانیف کا نام شمار کرنے لگتے، گزشتہ فروری میں اعظم گڑھ پہنچا تو ایک نعت معارف میں چھپنے کے لئے بھیجی جو معارف سے ان کے لگاؤ کا ثبوت تھا۔

ان کے کوئی اولا نہ تھی، غالبًا اب سے چھ سات برس پہلے ان کی اہلیہ کی وفات ہوگئی تھی، اپنے چھوٹے بھائی مسرور حسین کے بچوں کو اپنی اولاد سمجھتے رہے، ناظم آباد میں

ایک اچھی کوٹھی خرید لی تھی، جس کی اب لاکھوں روپے کی قیمت لگائی جاسکتی ہے، ان کی سجی سجائی کوٹھی سے ان کی خوش مذاقی اور خوش سلیقگی ظاہر ہوتی تھی، یہاں اپنے دوستوں کو برابر چائے اور کھانے پر بلایا کرتے، ان کے مدعوئین اختلافی مسائل چھیڑ کر ان کے خیالات سن کر محظوظ ہوتے، انھوں نے کراچی پہنچ کر ۱۹۴۸ء میں رسالہ فاران نکالا، اس کی اشاعت تو بہت زیادہ نہ تھی، لیکن یہ اپنے مضامین کی سنجیدگی اور علمیت کی وجہ سے قدر کی نظر سے دیکھا جاتا، اس رسالہ کی وجہ سے ان کی عزت و وقعت میں اضافہ ہوتا رہا، ان کے قدر دان ان کے رسالہ میں کافی اشتہارات دیتے جس سے ان کو کبھی مالی پریشانی اٹھانی نہیں پڑی وہ مشاعروں اور علمی و ادبی مجلسوں میں ہر جگہ مدعو ہوتے، جس مشاعرہ میں وہ نہ ہوتے، وہ سونا رہتا، گزشتہ مہینہ جدہ ایک مشاعرہ میں گئے، جس میں حفیظ جالندھری بھی مدعو تھے، مشاعرہ سے پہلے مکہ معظمہ عمرہ کے لئے گئے، وہاں سے آئے تو مشاعرہ میں شرکت کی، ڈھائی بجے رات کو اپنا کلام سنایا اور اس کے فوراً ہی بعد اپنے خالق حقیقی سے جاملے، ان کی میت مکہ مکرمہ لے جائی گئی، جہاں بیت اللہ میں نماز جمعہ کے بعد نماز جنازہ ادا کی گئی اور اسی سرزمین میں سپرد خاک کردیئے گئے، بڑے خوش قسمت تھے، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی محبت ان کی گھٹی میں پلائی گئی تھی، وہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں،

''خدا شاہد اور میری آشفتہ مزاجیاں اس کی گواہ ہیں کہ زندگی ہر طرح کے مرحلوں سے گزری، مگر کسی عالم میں بھی وہ مکہ اور مدینہ کی یاد سے خالی نہیں رہی'' اسی یاد کی بدولت اپنی آرزؤں کی جنت میں آخری آرام گاہ پائی۔

ان کی زندگی کے مرحلے کی مختصر داستان یہ ہے: وہ کبیر کلاں ضلع بلند شہر یو۔پی میں ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے، ان کے والد نے ان کا نام منظور حسین رکھا، مگر وہ اپنے تخلص ہی کی وجہ سے مشہور ہوئے، ۱۹۲۶ء میں مسلم یونیورسٹی سے میٹرک پاس ہوئے، ۱۹۲۸ء میں حیدرآباد گئے وہاں چودہ پندرہ برس رہ کر مختلف اوقات میں باب حکومت نظامت پٹنہ فوج، صدر محاسبی، ہائی کورٹ، دیوانی اور نظام فوجداری میں ملازم رہے، شائد وہیں مولانا عبدالقدیر بدایونی سے بیعت ہوئے، مگر معلوم نہیں پھر کیوں تصوف سے بیزار ہوگئے، وہ حیدرآباد سے نجف اشرف، کربلا، بصرہ اور مداین کے سفر پر گئے، یہاں ان کو اپنے ادبی ذوق کی وجہ سے مہاراجہ سرکشن پرشاد، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولوی عنایت اللہ، جوش ملیح آبادی، ہوش بلگرامی، نظم طباطبائی، ہادی رسوا، مسعود علی محوی، فانی بدایونی، نواب بہادر جنگ، نواب محمد خان اور نواب نثار جنگ کی مجلسیں بھی ملتی رہیں۔

حیدرآباد میں وہ اپنی نعتیہ نظم ظہور قدسی کی وجہ سے مقبول ہوئے، ان کو مولانا شبلیؒ سے بڑی عقیدت تھی، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت پر جو نظم کہی اس کا عنوان بھی یہی رکھا جو مولانا شبلی نے اپنی سیرۃ النبی میں رکھا تھا، بڑی لمبی نظم ہے، اس میں نوے اشعار ہوں گے، پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے جذبات رسول اللہ ﷺ کے خیر مقدم کے ترانے گنگنانے میں بے قابو ہو رہے ہیں، اس کے احساسات کی مے عشرت چھلک رہی ہے، شادمانی کے پھولوں سے وہ لدا ہوا ہے، اس کی عقیدت کے موتی جھلملا رہے ہیں اس کے ہر شعر میں گل و لالہ کی رعنائی ہے، وہ نعت نہیں لکھ رہا ہے، بلکہ خوشی کا گیت گا رہا ہے، ولادت کا ذکر آتا ہے تو جوش طرب میں کہتے ہیں، شہ ہر دوسرا محمد مصطفےٰ غمگسار بے کساں، شفیع عاصیاں، نبی آخری، جہاں کی روشنی، مظہر شان احد، فاتح بدر و احد، ہادی دین مبین رحمۃ للعالمین، شہ کون و مکان، وجہ تخلیق جہاں، رہبروں کے پیشوا، شمع بزم انبیاء، دست گیر بے نوا، دردمندوں کی دوا، مخبر صادق لقب، سید والانسب، چشمہ صدق وصفا، مہبط وحی خدا، عرش کے مسند نشیں، بزم خلوت کے مکین، خاتم پیغمبران، امیر کارواں، زندگی کے مدعا، محبوب خدا، پیکر صبر و رضا، جد شاہ کربلا، قبلہ ارباب دین، صادق الوعد وامیں، دافع رنج والم، صاحب جود و کرم، رسول محتشم نبی محترم تشریف لائے، پھر سلام بھیجتے میں ان کے عقیدت مندانہ جذبات کا سیلاب روکے نہیں رکتا، ہمارے رسول نے بیکسوں کی جو دستگیری کی بادشاہی میں جو فقیری کی، اسرار محبت کو جس طرح سمجھا یا زخم کھا کر دشمنوں پر جو پھول برسائے اپنے خون کے پیاسوں کو جو قبائیں دیں، گالیاں سن کر جو دعائیں دیں، سچائی کی خاطر جو تکلیف اٹھائی بھوکے رہ کر جس طرح اوروں کو کھلایا، جس کی سادگی میں درس بصیرت ہے، جس کی ذات فخر آدمیت ہے، پھر اسی انداز میں مکین گنبد خضری، شب معراج کے دولھا، شمع سبستان ازل، ابد کی بزم کے کنول، بہار گلشن عالم اور فخر مبین آدم پر درود بھی بھیجے ہیں، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس نعت کے لکھنے میں شاعر کے اندر عقیدت کے جذبات کارفرما تھے، یہ نعت ایسی مقبول ہوئی کہ اس کو ایک علیحدہ رسالہ میں شائع کیا گیا جس میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی صدر شعبہ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کا تعارف ہے، اس میں وہ رقمطراز ہیں:

''اس سلام میں ماہر نے حتی الوسع پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس قسم کے صفات منسوب کرنے سے احتراز کیا ہے، جن میں شان نبوت سے کوئی مناسبت نہیں ہے، لیکن عام شعرا جس کے انتساب میں بے باک ہیں، یہ تو ان کا سلبی کارنامہ ہے، اس کے بعد انھوں نے سیرت طیبہ کی مستند کتابوں اور احادیث کے مفید ذخیروں سے ان سچے واقعات کا انتخاب کیا ہے، جس کی توثیق و تصدیق پر محدثین اور علماء سیر کی مہریں ثبت ہوچکی ہیں، پھر انہیں واقعات صادقہ کو اپنے خاص بلیغ اور اچھوتے انداز میں نظم کا لباس پہنایا ہے''۔

وہ پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

''ان کی شعریت کے متعلق اسی قدر عرض کرسکتا ہوں کہ وہ پڑھتے جاتے اور بے اختیار میرے دل سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ بہہ کر آنکھوں کی راہ سے نکل رہا تھا، اگر شعر کی بلندی پستی کا معیار اس کی تاثیری کیفیت ہے، تو کم از کم اس معیار پر میرے خیال میں ان کی یہ نظم بلند مقام کی مستحق ہے''۔

اخیر میں وہ لکھتے ہیں:

''مجھے امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ ماہر القادری کے اس اسلام کے بعد میلادی مجالس سلاموں کی تاثیر و افادیت میں ایک بڑا انقلاب پیدا ہوگا، مسلمانوں کو چاہئے کہ آئندہ اسی سلام کو میلاد کی مجلسوں میں پڑھنے اور پڑھانے کا دستور جاری کریں اور وہ دن کچھ دور نہیں کہ ماہر کا یہ سلام پشاور سے برما تک اور کاٹھ منڈو سے، راس کماری تک کے علاقوں کو فتح کرے گا''۔

مولانا مناظر احسن گیلانی جیسے اہل دل دیوبندی عالم کی یہ ستائش جناب ماہر القادری کی نعت کے لیے حرف آخر ہے اور یہ سلام واقعی بہت مقبول ہوا، اور خدا جانے کتنی مجلسوں میں پڑھا گیا، خود ماہر القادری صاحب کی زبان سے کتنی بار سنا گیا ان کے پڑھنے کا انداز بھی ایسا تھا کہ وہ پڑھتے تو سننے والے کے دل سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ کر آنکھوں کی راہ سے نکلنا ناگزیر تھا، جناب ماہر القادری نے اپنے اس سلام کو اس نعتیہ کلام کے مجموعہ کے ساتھ بھی شائع کیا، جس کا نام انھوں نے ذکر جمیل رکھا ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں:

''خدائے پاک کے ناموں کی قسم، رسول پاک کے مقدس نام کی لذت کبھی کم نہیں ہوئی، جتنی بار بھی محمد کہئے اک نیا کیف اور ایک نئی لذت محسوس ہوتی ہے، محمد رسول اللہ سن کر یا کہہ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی لجکلا ہیان بھی مجھے اپنی طرف نہیں کھینچ سکتیں، اللہ کے نام کے بعد اسی نام پر خاتمہ چاہتا ہوں''۔

اسی میں وہ یہ تحریر کرتے ہیں کہ:

''میں نے اپنے آقا و مولا کی مدح لکھ کر کفارہ معاصی کی کوشش کی ہے، اللہ کی رحمت اور نبی کی شفاعت سے کیا بعید ہے کہ یہی کارنیک وسیلۂ بخشش اور ذریعہ نجات بن جائے، قیامت کے دن ایک ہاتھ میں فرد عمل اور دوسرے ہاتھ میں ذکر جمیل ہوگی، ذکر جمیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے مختلف طریقوں سے جو محبت و عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے، عجب کیا کہ اس نعت گو کا یہی وسیلۂ بخشش ہوجائے، اس میں ایک نعت صلی اللہ علیہ وسلم کے عنوان سے ہے، جو اسی انداز میں کہی گئی جس میں اعظم گڑھ کے جناب اقبال سہیل کی نعت موج کوثر بہت مقبول ہوئی، وہ مجھ سے برابر کہتے رہے کہ اقبال سہیل کے بہت قائل اور معترف ہیں، اس مجموعہ کے اور دوسرے کچھ عنوانات یہ ہیں انسان گرے پیداش، اسیران بدر، حریت کا مبلغ اعظم، جشن ولادت دربار اقدس میں، پیغمبر انسانیت، جانوروں سے حسن سلوک، شاہ حسین کے دربار میں حضرت جعفرؓ کی تقریر، ساقی نامہ اور معراج کی رات وغیرہ''۔

ان کی آخری تمنا یہ تھی کہ ذکر جمیل کا کچھ حصہ دربار اقدس میں حاضر ہوکر اپنی زبان سے عرض کریں اور اس کے بعد اسی جان حیات کے سامنے دم نکل جائے، جس کے قدموں پر جان نچھاور کرنے کے لیے دی گئی تھی، ان کی یہ تمنا بڑی حد تک پوری ہوئی، وہ ۱۹۵۴ء میں حج کے لیے گئے، ظاہر ہے کہ روضہ نبوی کے سامنے پہنچ کر ان کی کیا قلبی کیفیات ہوں گی، ذکر جمیل کے کن کن اشعار کو نہ دہرایا ہوگا اور اس وقت تو اپنی جان وہاں نچھاور نہیں کی لیکن ۱۹۷۸ء میں اپنے رسول کے مولد و منشاء میں سپرد خاک ہوکر اپنی آخری تمنا پوری کی۔

وہ ۱۹۵۴ء میں حج کے لئے گئے تو واپسی پر کاروان حجاز کے نام سے اپنا سفرنامہ شائع کیا، جس میں ان کی پوری تصویر نظروں کے سامنے گھومتی نظر آتی ہے، وہ اس میں لکھتے نہیں دکھائی دیتے، بلکہ جن لوگوں کو ان کی صحبت میں ان کی باتیں سننے کا اتفاق ہوا ہے، ان کو اس کے پڑھنے میں محسوس ہوگا کہ وہ بول رہے ہیں، اور لوگ ان کو سن رہے ہیں، انھوں نے پورا سفرنامہ بہت ہی والہانہ انداز میں لکھا ہے، جب وہ حرم شریف پہنچے تو فجر کی نماز کے لیے اذان ہوئی، ان کو اس میں بڑی دلکشی محسوس ہوئی، صبح کا سہانا وقت تھا، بوقبیس کی چوٹیوں پر سپیدہ سحر کے آثار کا آغاز ہو رہا تھا، حرم کے در و دیوار میں ان کو بجلیاں نظر آئیں، بیت اللہ کی جلالتِ شان اور دیواروں پر سیاہ غلاف کے سکوت کا باوقار منظر ان کے لئے جنت نگاہ بن گیا، اسی وقت بہت سے اشعار قلمبند کئے، جن میں سے کچھ یہ ہیں:

حرم میں اذان سحر اللہ اللہ کہ ہیں وجد میں بام و در اللہ اللہ
یہ میز اب رحمت وہ رکن یمانی مقامات اہل خبر اللہ اللہ
دھڑکتے ہوئے دل کا لے کر سہارا مناجات باچشم تر اللہ اللہ
تجلی میں دھوئے ہوئے سنگریزے یہاں کے نجوم و قمر اللہ اللہ
مقام ابراہیم پر یہ نمازیں یہ ہر سجدہ معراج سر اللہ اللہ
جلال الٰہی کی تابندگی میں جھلکتے ہوئے بام و در اللہ اللہ
وہ کعبہ جسے دیکھ لینا عبادت مسلسل ہے پیش نظر اللہ اللہ

حج کے بعد جب وہ مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوئے تو اس وقت بھی انھوں نے فی البدیہہ کچھ اشعار کہے جن میں سے کچھ یہ ہیں:

بعد مکہ کے مدینہ کا سفر کیا کہنا پاک دل، پاک نفس، پاک نظر کیا کہنا

جیسے جنت کے دریچوں سے جھلکتی ہو بہار پہلی منزل ہی کے انوار سحر کیا کہنا
تپش شوق بھی ہے گرمی موسم بھی ہے اور پھر اس پہ مرا سوز جگر کیا کہنا
خشک آنکھوں کو مبارک ہو یہ طغیانی شوق ہی رواں اشک بہ انداز دگر کیا کہنا

مدینہ منورہ پہنچ کر جب مسجد نبوی میں پہنچتے تو لکھتے ہیں:

یہ سروقامت ستون، یہ مصفا جھاڑ فانوس، یہ نظرافروز نقش و نگار ایک ایک چیز آنکھوں میں کھبی جارہی ہے، اس ظاہری چمک دمک سے بڑھ کر جمال و رحمت کی فراوانی! جیسے مسجد نبوی کے در و دیوار سے رحمت کی خنک شعاعیں نکل رہی ہیں،

داماں نگہ تنگ گل حسن تو بسیار گل چیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

کی معنویت آج سمجھ میں آئی، تجلیوں کا وہ ہجوم کہ آنکھیں جلوے سمیٹے سمیٹے تھکی جاری ہیں، یہاں کے انوار کا کیا پوچھنا، یہ آفتاب جہاں تاب بے چارہ اس جلوہ گاہ کے ذروں کا ادنی غلام ہے دائیں بائیں اوپر نیچے، ادھر ادھر روشنی ہی روشنی اور نور ہی نور، مگر لطف یہ کہ آنکھیں خیرہ نہیں ہوتیں، یہ آنکھوں کا نہیں خود یہاں کی تجلیوں کا کمال ہے۔

انھوں نے مسجد نبوی کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق اعظمؓ، باب جبریل، بیت فاطمہؓ، صفہ، مسجد قبا اور میدان احد کا بھی والہانہ انداز میں ذکر کیا، سیدنا حمزہؓ کے مزار، جنت البقیع، سیدہ فاطمہؓ، حضرت امام حسنؓ، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت امام محمد باقرؒ اور حضرت امام جعفر صادقؒ، حضرت عثمان بن عفانؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور مشہور محدث امام مالکؒ کے مزارات کی زیارت میں ان پر جو کیفیات طاری ہوئیں، ان کو بہت ہی موثر انداز میں بیان کیا ہے، لکھتے ہیں کہ ایک ایک مزار پر دل کھنچا اور موت بھی یاد آئی، وہ قبر پرستی کے تو قائل نہیں تھے، مگر قمطراز ہیں کہ جنت المعلا کو دیکھ کر بڑا دکھ ہوا، اس میں صحابہ کرام، تابعین عظام اور اکابر اولیاء آسودہ ہیں، حضرت سیدہ خدیجہ الکبری رضی اللہ عنہا کی قبر کو چھوڑ کر ہر طرف جھاڑ جھنکار، اونٹوں اور دنبوں کی مینگنیاں اور گندگی نظر آتی ہے، یہ تو ان نفوس قدسیہ کی قبریں ہیں جو ہم سب کے مخدوم اور محسن ہیں، عام مسلمانوں کی قبروں کے ساتھ بھی یہ سلوک جائز نہیں میرے دوشعر ان ہی تاثرات کی یادگار ہیں:

فغان کردن کہ شکایۂ ہنسوں کہ اشک بہاؤں کھڑا ہوا ہوں میں ٹوٹے ہوئے مزاروں پر
تجلیاں تو چھپانے سے چھپ نہیں سکتیں ہزار خاک اڑائے کوئی ستاروں پر

جب وہ تصوف اور قبر پرستی کے خلاف اپنے دوستوں سے بحث کرتے تو ان کے ان اشعار کا حوالہ دیا جاتا، وہ تھوڑی دیر کے لئے جزبز تو ضرور ہوجاتے مگر پھر اپنی طلاقت لسانی سے اپنے معترضین کو خاموش کردیتے، مگر اس سفرنامہ میں انھوں نے یہ لکھ کر اپنی فراخدلی کا بھی ثبوت دیا ہے کہ مدینہ منورہ ہی میں ترجمان السنۃ کے مصنف مولانا بدر عالم میرٹھی سے ملاقات ہوئی، ان کے بعض حکمت آمیز نکتوں نے میرے دل کی کتنی گرہیں کھول دیں، ان کے بعض ارشادات پر میں گفتگو کرسکتا تھا، مگر میں نے بات کو طول دینا پسند نہیں کیا، رشتہ تصوف میں کچھ ایسے پیچ بھی پڑے ہوئے ہیں، جن کو سلجھانا دشوار ہے، انھوں نے بار بار کہا کہ اہل تصوف، فقہا اور مفسرین پر کوئی نیک نیتی کے ساتھ ذرا سی بھی تنقید کرتا ہے تو اس دور افکار و الحاد میں متشککین اور منکرین کو شہ مل جاتی ہے اور انکار و تشکیک کے لئے مسالہ ہاتھ آجاتا ہے، یہ لکھنے کو تو لکھ گئے، لیکن اپنی نجی صحبت میں تصوف کے متعلق ان کے وہی خیالات رہے جن کا اظہار اپنی نجی صحبتوں میں کرتے رہے۔

ان کا سفرنامہ کاروان حجاز ان کے تمام ذہنی خیالات کا کشکول ہے، اس میں تبلیغی جماعت، تحریک پاکستان، قبر پرستی، تصوف، شاہ ابن سعود، شریف حسین، ترکوں کی حکومت اور دوسرے مسائل پر اپنی رائے کا اظہار کھل کر کیا ہے، ان کی طبیعت میں بڑی صاف گوئی تھی، ظاہر اور باطن یکساں تھا، اس لئے ان کے دل میں جو بات ہوتی وہ ان کی زبان اور تحریر میں برملا آجاتی، مگر اس کا لحاظ ضرور رکھتے کہ خیر کے بجائے شر نہ ابھرنے پائے، اس لحاظ سے وہ محتاط تھے۔

۱۹۵۵ء میں ان کے کلام کا مجموعہ فردوس کے نام سے مکتبۂ چراغ راہ بیرون لوہاری دروازہ لاہور سے شائع ہوا، اس کے کچھ عنوانات یہ ہیں، لا الہ الا اللہ، صبح سعادت، طیبہ کی زیارت ہوتی ہے، منقبت، سلام، سوئے مدینہ، نغمۂ حرم حجاز سے رخصت ہوتے ہوئے، نوائے جبریل، خلافت الٰہی، مغربی تہذیب، مسلمان عورت سے سجدہ وتکبیر، اشتراکیت وغیرہ ان کے کچھ برق پارے اور کچھ غزلیں بھی اس میں ہیں، ان کی شاعری پر تبصرہ مختصر طریقہ پر یہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کے سامنے ایک مقصد تھا ان کا مقصد ان کی شاعری پر چھایا ہوا ہے، ان کے نقاد کہہ سکتے ہیں کہ ان کے مقصد نے ان کے فن شاعری کو دبا رکھا ہے، وہ اپنے مقصد کی ترویج اپنے زور کلام کے ذریعہ جس طرح کرتے رہے، اس سے ان کی مخالفت بھی ہوتی رہی، لیکن وہ دب کر اپنی شاعری میں اپنے خیالات کا اظہار کرنا پسند نہیں کرتے، ان کے خیالات سے چاہئے کوئی کتنا ہی اختلاف کرے لیکن وہ آخر وقت تک ایک جواں ہمت اور جواں حوصلہ شاعر رہے، بہ بانگ دہل کہا:

میں کسی خوف سے خاموش نہیں رہ سکتا ظلمت شام کو میں صبح نہیں کہہ سکتا

وہ مولانا ابوالاعلی مودودی کے بڑے معتقد تھے، اور ان کے جو خیالات تھے، وہی اپنی شاعری میں پیش کرتے رہے، وہ اسلام پسند شاعر کہلانے میں فخر محسوس کرتے رہے، رہی ان کی غزل گوئی تو بڑے جوش کے ساتھ کہتے ہیں:

اب وقت ہے کہ شعروادب کی زبان سے مفہوم لاالہ بتاتے ہوئے چلو

اور اپنے اس جذبہ پر ان کو پورا اعتماد رہا، اس لئے کہتے ہیں:

مرا ہر شعر ماؔہر شارح آیات قدرت ہے،   وہاں جذب ویقین کی ترجمانی ہے جہاں میں ہوں

وہ اپنی قادر الکلامی سے اس میں غزل کی وہ ساری خوبیاں پیدا کر سکتے تھے، جو غزل کے اجزائے ترکیبی کے لیے ضروری ہیں، ان میں وہ نغمہ، ترنم، موسیقیت، ایمائیت، جذباتیت اور کیفیت پیدا کر کے نرالی شان پیدا کرتے رہے، ان کی اس غزل کو پڑھ کر کون ہے جس میں کیف وسرور نہیں پیدا ہوسکتا ہے:

جب غم کی لطافت بڑھتی ہے ، جب درد گوارا ہوتا ہے
اشکوں میں تبسم ڈھلتا ہے ، فریاد میں نغمہ ہوتا ہے
فرقت کی بھیانک راتوں میں کیسا طرفہ تماشا ہوتا ہے
شمعیں بھی فروزاں رہتی ہیں اور گھر میں اندھیرا ہوتا ہے
بیمار کی حالت کیا کہیے درد آخری حد میں آپہنچا
پرستش کا زمانہ بیت گیا تسکین سے اب کیا ہوتا ہے
سورج کی شعاعیں افسردہ ، آنکھیں پرنم ، دل پژ مردہ
اک جب بھی سویرا ہوتا تھا اک اب بھی سویرا ہوتا ہے
وہ یاد سلامت ہے جب تک دنیا کے غموں کی کیا پروا
کانٹوں میں بھی رہ کر اے ہمدم! پھولوں میں بسیرا ہوتا ہے
سمجھو تو خموشی سب کچھ ہے ، دیکھو تو خموشی کچھ بھی نہیں
آواز بھی ہے ، الفاظ بھی ہیں مفہوم بھی پیدا ہوتا ہے
ماؔہر مرے شعروں کے خاکے اس طرح مرتب ہوتے ہیں
کچھ دل بھی تقاضا کرتا ہے ، کچھ ان کا اشارا ہوتا ہے

انھوں نے کچھ افسانے اور ناول بھی لکھے ہیں، جن کے نام یہ ہیں، انگڑائی، طلسم حیات، حسن وشباب، نگینے، جب میں جوان تھی، کردار اور کانجی ہاؤس وغیرہ اسلام کے موضوع پر ان کے چھوٹے چھوٹے رسالے آخری رسول، خدا اور کائنات، دریتیم اور نقش توحید بھی شائع ہوئے، ان کے روزنامچے اور خطوط بھی طبع کئے گئے ہیں۔

ان کے اشعار کے اور دوسرے مجموعوں کے نام نغمات ماؔہر، جذبات ماؔہر اور محسوسات ماؔہر ہیں اور بھی کچھ چھپنے کو باقی رہ گئے ہوں گے، ان تمام مجموعوں کو سامنے رکھ کر آئندہ ان کے شاعرانہ کمالات پر مقالے لکھے جائیں گے وہ ''فاران'' جس انداز میں نکالتے رہے وہ خود ایک بڑا کارنامہ ہے، ہندو پاکستان دونوں جگہوں کے ارباب قلم کو ڈر لگا رہتا کہ کہیں فاران کے مدیر کی نظر ان کی تحریروں پر پڑ گئی تو وہ زبان، طرز ادا، طرز فکر کی ساری خامیوں کے بخیے ادھیڑ کر رکھ دیں گے، اس طرح وہ فاران کے ذریعہ سے علم وادب کے بڑے محتسب بھی بنے رہے، فاران میں ''نقش اول'' کے عنوان سے جو کچھ لکھتے، وہ اس برصغیر میں شوق سے پڑھا جاتا، ان کے مجموعے بھی اگر شائع ہوں گے تو آئندہ ان سے بڑی علمی بصیرت حاصل ہوگی، انھوں نے فاران میں جو مضامین لکھے ہیں، ان کو بھی کتابی صورت میں شائع کرنے کی ضرورت ہے، ان سے علم وادب میں گراں قدر اضافہ ہوگا، فاران کا جو سیرت نمبر ان کی ادارت میں نکلا تھا وہ بھی کتاب کی صورت میں شائع ہوجائے تو یہ بھی ایک بلند علمی کام ہوگا، انھوں نے اس کے نقش اول میں لکھا تھا:

''دنیا اگر فوز وفلاح اور سکون واطمینان چاہتی ہے، تو اسے چاہئے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس تعلیمات کے مطابق اپنے کو بدلے چاہے اس تبدیلی میں معاشرے کی ایک ایک اینٹ کو کیوں نہ اکھیڑنا پڑے، مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ تمدن وتہذیب اور معاشرے کی غلط کاریوں سے...... رسول اللہ ﷺ کے حکم میں ایک شوشہ کی بھی تبدیلی گوارا کر لی جائے، زندگی اور ترقی نام ہی اسوہ حسنہ کی اتباع کا ہے، جہاں یہ اتباع نہیں وہاں رجعت ہے، زوال ہے، اور موت ہے''۔

ان کا یہ پیغام دنیا کے تمام گوشوں تک تو نہ پہنچ سکے گا، مگر پاکستان تو ان کے اس پیغام کو کم از کم سن کر اس پر غور کر سکتا ہے۔

ان کو سیر وسیاحت کا بھی بڑا شوق تھا، ۱۹۶۹ء میں جنوبی اور مشرقی افریقہ کی دعوت پر وہاں کے مشاعرے میں شرکت کی تو روم، اسپین اور انگلستان کے مختلف شہروں کی سیاحت کرتے ہوئے کراچی واپس آئے، لندن تو مشاعرہ میں غالباً کئی بار گئے۔

وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں، خدا جانے ان کے بھائی مسرور حسین پر کیا گزری ہوگی، معلوم نہیں پاکستان کے علم وادب کے حلقوں میں ان کے بغیر جو بے رونقی آگئی ہے، وہ پھر کب واپس آئے گی، ان کے احباب ان کی بذلہ سنجیوں سے محروم ہوکر جو سوگوار ہوئے ہوں گے ان کی سوگواری کب ختم ہوگی، مولانا ظفر احمد انصاری ان سے مل کر اپنے بڑھاپے میں جوانوں کی جو رعنائی محسوس کرتے تھے، وہ ان کو اس بقیہ زندگی میں شاید ہی محسوس ہو، ان کی وفات پر مولانا ابوالاعلیٰؒ مودودی کی نمناک آنکھیں معلوم نہیں کتنے دنوں کے بعد خشک رہی ہوں گی، وہ اپنی نیکیوں عشق رسول کی تابناکیوں، اسلام کے نام پر دل کی اپنی دھڑکنوں کی بدولت کوثر وتسنیم کے کنارے ضرور کھڑے ہوں گے، مگر اپنے تمام ملنے والوں کو اپنا یہ پیام چھوڑ گئے ہیں:

ماؔہر میں محبت کے صحیفوں میں ملوں گا
ڈھونڈیں جو کبھی تجھکو میرے ڈھونڈنے والے

(''ص۔ع''، جون ۱۹۷۸ء)

اعظمی، خلیل الرحمٰن، ڈاکٹر

یادِ خلیل

مرزا غالب مرحوم نے عارف کی موت پر کہا تھا:

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم کی خبر وفات سن بے ساختہ یہ شعر زبان پر آ گیا، ابھی شاید وہ پچاس کے ہوں، بھلا یہ مرنے کے دن تھے، لیکن تقدیر کے راز کون سمجھ سکتا ہے، انّ اجل اللہ اذا جاء لا یوخّر[نوح: ۴]۔

وہ بہت ہونہار، لائق اور ذی استعداد تھے، اپنی صلاحیت سے انھوں نے اس کم سنی ہی میں اردو کے مشہور نقادوں، ممتاز ادیبوں اور اہم شاعروں کی صف میں اپنی جگہ بنالی تھی، ان کا نام ادبی حلقوں میں عزت سے لیا جاتا تھا اور ان کے خیالات کا وزن محسوس کیا جاتا تھا۔

وہ اعظم گڑھ کے مردم خیز خطہ سے تعلق رکھتے تھے، سرائے میر کے قریب ایک گاؤں سیدھا سلطان پور کے رہنے والے تھے، ان کے والد محترم مولانا محمد شفیع صاحب مرحوم بڑے نیک نفس اور مقدس بزرگ تھے، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کا قیام انھیں کی جدوجہد کا نتیجہ ہے، جس کے نظم ونسق کی ذمہ داری ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہی نے بعد میں علامہ شبلی مرحوم کے ایماء سے قبول کرکے اس کو بڑی شہرت وترقی دی تھی، مولانا محمد شفیع مرحوم کے پانچ صاحبزادوں میں خلیل صاحب سب سے چھوٹے مگر اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے سب میں ممتاز تھے، انھوں نے شبلی نیشنل اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا، تعلیم مکمل کر چکے تو وہیں شعبۂ اردو میں لکچرر ہوگئے، بعد میں ترقی کرکے ریڈر ہوئے، وہ اپنے استادوں میں پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کی عقیدت کا دم بھرتے تھے، وہ ان کے ادب وانشا کے بڑے مداح اور ان سے تلمذ اپنے لئے مایۂ فخر خیال کرتے تھے، رشید صاحب کی طرح ان کو بھی اردو اور علی گڑھ سے عشق تھا، سرسید نگر میں ایک خوبصورت اور کشادہ مکان تعمیر کرایا تو اس کا نام ''اردو باغ'' رکھا، علی گڑھ سے اس قدر مانوس ہوگئے تھے کہ وہاں سے بہت کم باہر نکلتے، اپنے وطن بھی کئی کئی برس کے بعد آتے اور چار چھ روز سے زیادہ قیام نہ کرتے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کا تعلق ایک علمی ودینی گھرانے سے تھا، ان کے والد بزرگوار متورع عالم تھے، چاروں بڑے بھائی بھی دینی تعلیم حاصل کرکے علم ودین کی خدمت میں مشغول رہے، افسوس ہے کہ اب مولانا حبیب الرحمٰن اور پرواز اصلاحی کے سوا سب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، خلیل صاحب کی نشوونما اسی علمی ودینی ماحول میں ہوئی تھی، وہ علی گڑھ گئے تو ان کے خیالات میں ترقی پسندی آئی اور دین کی طرف میلان میں کمی ہوگئی، مگر الحمدللہ چند برس قبل ان میں پھر تبدیلی آئی، وہ صوم صلوٰۃ کے پابند ہوگئے تھے اور دین ومذہب سے تعلق بڑھ گیا تھا، انھوں نے ایک مردمومن کی طرح خندہ پیشانی کے ساتھ موت کا خیر مقدم کیا، اپنی آخری کتاب ''مضامین نو'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''گذشتہ ایک سال سے موت وحیات کی جس کشمکش سے گذر رہا ہوں، اس نے زندگی کی بے ثباتی اور ناپائداری کے نقش کو گہرا کردیا ہے، یوں تو میں اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں، مگر اس کے بلاوے اور پکار پر لبیک کہنے کو اپنے لئے باعث برکت سمجھتا ہوں، اس ''جہانِ گندم وجو'' میں ہمیشہ کے لئے رہنے، یہاں بستی بسانے اور چھاؤنی چھانے کی تمنا نہ پہلے تھی، اور نہ اب ہے''۔

کتب بینی اور مطالعہ کا شوق بچپن سے تھا، رات رات بھر جاگ کر کتابیں پڑھتے تھے، اسی میں ان کی صحت خراب ہوگئی، جب شبلی اسکول میں زیر تعلیم تھے تو پابندی سے دارالمصنفین کے کتب خانہ میں آکر اخبار، رسالے اور کتابیں پڑھا کرتے تھے، اسی تعلق کی بنا پر اعظم گڑھ آتے تو دارالمصنفین بھی ضرور آتے اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب دیر تک علی گڑھ، دارالمصنفین اور اردو وغیرہ کے مسائل پر باتیں کرتے، یہاں کے پرانے کارکن مولوی عبدالباری صاحب سے زیادہ مانوس تھے، ان کے پاس اسی طرح بیٹھتے جس طرح طالب علمی کے زمانے میں بیٹھا کرتے، اپنی آخری کتاب ''مضامین نو'' انھیں کے نام معنون بھی کی ہے۔

ان کا حافظہ بہت اچھا تھا، جو کچھ پڑھتے سب ذہن نشین ہوجاتا، اردو ادبیات پر ان کی نظر بہت وسیع تھی، اردو کی ترقی پسند تحریک کا بڑی گہرائی اور وقتِ نظر سے مطالعہ کیا تھا۔

گفتگو دلچسپ اور معلومات افزا کرتے، یوں تو شعروادب کے سبھی شعبوں سے دلچسپی تھی مگر تنقید ان کا خاص موضوع تھا، وہ ادبی وتنقیدی مسائل میں اپنا خاص نقطۂ نظر رکھتے جس کو بہت مربوط اور مدلل انداز میں پیش کرتے تھے، چاہے کسی کو ان کے خیالات سے اتفاق نہ ہو مگر وہ ان کی قوت استدلال، جوش بیان، دلنشیں انداز، منطقیانہ ترتیب اور خود اعتمادی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، ان کی گفتگو اور ان کی تحریر میں جانبداری ومصلحت کو دخل نہ ہوتا، وہ خود ترقی پسند ادیب تھے، مگر اس ادب کی خوبیوں اور خامیوں دونوں پر ان کی نظر تھی، اس کے انتہا پسندوں کی طرح ''عوامی ادب'' کی دھن میں اردو زبان کی پرانی روایات کو نظر انداز نہ کرتے، بعض نامور ترقی پسند ادیبوں کی تحریروں پر بھی بے لاگ تنقید کرتے، اظہار رائے میں نہ کوئی رو رعایت

کرتے اور نہ کسی کی خوشی یا ناخوشی کی پرواہ کرتے، مولانا شبلی مرحوم کی عظمت کے معترف تھے مگر ان کے بعض ادبی وتنقیدی خیالات کے ناقد تھے اور مولانا کے عقیدت مندوں کے سامنے بھی ان کے متعلق بے جھجک اظہار خیال کرتے، اپنے ایک مضمون میں مولانا کے تنقیدی مسلک کی وضاحت کرکے اس پر کچھ ردوکد کی ہے، مگر آخر میں یہ اعتراف بھی کیا ہے:

''شعرالعجم اس اعتبار سے قابل قدر ہے کہ اس نے اپنے دامن میں فارسی شاعری کے بہترین جواہر پاروں کو سمیٹ لیا ہے، شبلی نے ان کی تشریح وترجمانی ایسے موثر انداز میں کی ہے کہ عجم کا حسن طبیعت ہم پر ایک لازوال نقش چھوڑ جاتا ہے، شبلی کی تنقیدی نگارشات نے کئی نسلوں کے مذاق سخن کی تربیت کی ہے، موجودہ دور میں بھی کافی دور تک ہماری رہنمائی کرسکتے ہیں''۔

ایک مرتبہ کہنے لگے کہ مولانا شبلی نے میرانیس کی حمایت کے جوش میں ان کے کھاتے میں مرزا دبیر کے اچھے اشعار بھی ڈال دئے ہیں، جیسے:

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے

میں نے کہا آپ خود جوش بیان میں خلاف واقعہ بات کہہ رہے ہیں، مولانا شبلی نے بھی اس شعر کو مرزا صاحب ہی کا بتایا ہے، کہنے لگے نہیں! جب میں نے ان کو موازنۂ انیس ودبیر دکھایا، تب جاکر چپ ہوئے، مگر ان کے قلم میں میانہ روی اور تحریر میں اعتدال تھا، اس لئے اختلاف کے باوجود شایستگی اور متانت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے نہ پاتا۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کی زندگی سادہ تھی، وہ تکلف، بناوٹ، نمائش اور ظاہرداری کو پسند نہ کرتے تھے، جوان کے دل میں ہوتا وہی زبان پر بھی، وہ اپنی کسی ادا سے رعونت یا اپنی عظمت کا احساس نہ ہونے دیتے، اعظم گڑھ آتے تو اپنے ایک ایک ساتھی اور دوست کو تلاش کرکے اس سے نہایت بے تکلفی سے ملتے، اپنے بزرگوں اور استاذوں سے عقیدت واحترام کا برتاؤ کرتے اور تواضع وانکسار سے پیش آتے، ان کی جو حیثیت تھی اس کی بنا پر جہاں جاتے اونچے سے اونچے درجہ کے لوگ ان کا خیرمقدم کرنے کے لئے تیار رہتے، مگر وہ اپنے دوستوں کے ساتھ رہنا پسند کرتے، اعظم گڑھ آتے تو میجر علی حماد عباسی صدر شعبۂ انگریزی شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج کے یہاں ہمیشہ قیام کرتے، جو ان کے کلاس فیلو، بے تکلف رفیق اور گہرے دوست تھے، اس سال فروری میں راقم بمبئی گیا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی آئے ہیں، ان سے ملنے کے خیال سے ان کے بڑے بھائی جناب پرواز اصلاحی کے پاس گیا اور ان کی قیام گاہ کے بارہ میں دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ اپنے اسکول کے ساتھی حاجی نیاز اعظمی کے یہاں مقیم تھے مگر اب چلے گئے ہیں۔

خلیل اعظمی نے کم عمر پائی، لیکن جو عمر پائی وہ اردو کی خدمت میں گذاردی، درس وتدریس ان کا اصلی مشغلہ تھا اور وہ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے اچھے اور کامیاب استاد تھے، تصنیف وتالیف سے مدت العمر سروکار رکھا، ان کے قلم نے نظم ونثر دونوں میں گلکاری کی ہے، کلام کے دو (۲) مجموعے ''کاغذی پیرہن'' اور ''نیا عہد نامہ'' چھپے ہیں، ان سے شاعری میں ان کی جدت طبع اور منفرد انداز کا پتہ چلتا ہے، لیکن ادیب و نقاد کی حیثیت سے ان کی زیادہ شہرت ہوئی ''مقدمہ کلام آتش'' ان کی طالب علمی کے زمانہ کی تحریر ہے، مگر اسی کی بدولت وہ اردو کے مشہور ادیبوں اور نقادوں میں شمار کئے جانے لگے، ''نوائے ظفر'' بھی اسی طرح کی کتاب ہے ''فکروفن''، ''زاویۂ نگاہ'' اور ''مضامین نو'' ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ہیں، جدید نظموں کا ایک انتخاب ''نئی نظم کا سفر'' کے عنوان سے کیا تھا، ان کی زیادہ اہم کتاب ''اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' ہے، جو ترقی پسند ادب کی تاریخ پر پہلی باقاعدہ کتاب ہے، یہ دراصل ان کے ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے، اس کے تین حصوں میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک کی تاریخ، ان کی خدمات ادب کا جائزہ اور ان کے خیالات پر تنقید وتبصرہ کیا گیا ہے، مصنف نے یہ کتاب محنت وجستجو اور سلیقہ سے لکھی ہے، اس کی ترتیب و پیرایۂ بیان بھی عمدہ ہے، اعتدال وغیرجانبداری کی وجہ سے اس کو سنجیدہ ارباب ذوق نے پسند کیا ہے، مقالہ کے نگراں اور ممتحن جناب مجنون گورکھپوری اور پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنی اپنی رپورٹ میں اس کی بہت تحسین کی تھی، جب یہ شائع ہوکر دارالمصنفین آئی تو سب سے پہلے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے اس کو شوق اور دلچسپی سے پڑھا اور کئی نشستوں میں اس کی تعریف کرتے رہے اور مجھ سے فرمایا کہ میں خود اس پر ریویو کروں گا، ان کے تبصرے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''مصنف نے بڑی محنت اور تلاش وتحقیق سے یہ کتاب لکھی ہے، اس کے لئے ترقی پسند ادب کا پورا دفتر کھنگالا ہے اور بڑے اعتدال وتوازن اور حسن مذاق سے اس کا تنقیدی جائزہ لیا ہے، اس سے اس کی پوری سرگذشت اور اس کا ہر رخ سامنے آجاتا ہے، مصنف ایک مشاق اہل قلم اور دیدہ ور نقاد ہیں، یہ خصوصیت اس کتاب میں بھی نمایاں ہے اس سے اردو کے ادبی ذخیرے میں ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہوا''۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کے ابھی متعدد مضامین کتابی صورت میں چھپنے سے رہ گئے ہوں گے، انجمن ترقی اردو کو ان کا ایک مجموعہ شائع کرنا چاہئے، چند برس پہلے انھوں نے انجمن کے ہفتہ وار اخبار ''ہماری زبان'' میں ''میرا صفحہ'' کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا تھا جسے اس وقت بہت پسند کیا گیا تھا، اس کا مجموعہ بھی شائع کرنے

کی ضرورت ہے۔

ان کی اٹھان بہت شاندار تھی، آئندہ ان سے بڑی توقعات وابستہ تھیں مگر ع

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود بلڈ کینسر کے موذی مرض نے ایک سال سے موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا کر رکھا تھا، بالآخر یکم جون ۷۸ء کو پیام اجل آ گیا، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔

(''ض''، جولائی ۱۹۷۸ء)

ندوی، عبدالحمید، مولوی

مولوی عبدالحمید ندوی

یہ سطور ابھی پریس نہیں گئی تھیں کہ مولوی عبدالحمید ندوی کے انتقال کی خبر ملی، وہ بارہ بنکی کے ایک گاؤں جیسکھ پور کے رہنے والے تھے، بڑے مخلص، حق پسند اور بہی خواہ خلق تھے، ۱۹۱۹ء میں ندوہ میں داخل ہوئے، تحریک خلافت شباب پر تھی، حمید صاحب بھی اس سے متاثر ہوئے، اس کی وجہ سے سادگی طبیعت ثانیہ بن گئی، مولانا عبدالرحمٰن نگرامی کی صحبت نے ان کے اندر ندوہ کی محبت اور خاموش خدمت کا جذبہ پیدا کیا، تعلیم سے فراغت کے بعد قیام زیادہ تر وطن ہی میں رہا، لیکن ندوہ برابر آتے جاتے رہتے تھے، دوستوں کے اصرار کئی برس تک بھٹکل میں تعلیمی خدمت انجام دی، ان کے مخلص شاگردوں نے اس کام کو آگے بڑھایا اور ایک بڑا تعلیمی مرکز قائم ہو گیا، عرصہ سے دل کے مریض تھے، رمضان میں ندوہ آئے، مولانا ابوالحسن علی سے ملنے رائے بریلی جانے کا ارادہ تھا، دفعتہً دل کا دورہ پڑا اور تھوڑی دیر میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے صاحبزادہ مولوی عبدالرشید ندوی اور دوسرے متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (''ع۔ق''، ستمبر ۱۹۷۸ء)

حسین، سید عابد، ڈاکٹر

ڈاکٹر سید عابد حسین

یہ سطریں لکھی جا رہی تھیں کہ ڈاکٹر عابد حسین کے انتقال پر ملال کی خبر ملی، وہ جامعہ ملیہ کے جان نثار ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے رفیق قلبی، ایک بہت بڑے محبِّ وطن، ایک قبل قدر فلسفی، اردو زبان کے مایہ ناز ادیب، ایک ماہر مترجم، ایک بلند پایہ مصنف، ایک محتاط اہل قلم، اسلام اور عصر جدید، پھر انگریزی رسالہ موڈرن اسلام کے صاحب دل اڈیٹر اور انسانی اخلاق کے بعض دلآویز اوصاف کے حامل کی حیثیت سے اپنے ہم وطنوں، معاصروں اور قدردانوں میں برابر یاد کئے جائیں گے دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا فرمائیں۔ (''ص۔ع''، دسمبر ۱۹۷۸ء)

ڈاکٹر سید عابد حسین

ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم کی وفات کو کم و بیش ایک مہینہ ہو چکا ہے، مگر اب تک دل ان کی جدائی پر تیار نہیں ہے، ان کا مسکراتا ہوا چہرہ ہر وقت نگاہ کے سامنے رہتا ہے، ان کی شفقت و محبت اور عنایت و کرم فرمائی رہ رہ کر یاد آتی ہے، اور ان کی دل آویز گفتگو کی آواز کانوں میں گونجتی رہتی ہے، وہ میرے استاد بھی تھے، اور محسن و مربی بھی تقریباً ۴۸ برس یہ روابط اس طرح قائم رہے کہ نہ میری عقیدت میں کوئی فرق آیا نہ ان کی شفقت میں کوئی کمی محسوس ہوئی، ان کے نام سے واقفیت تو ندوہ کی طالب علمی ہی کے زمانہ میں ہو گئی تھی، رسالہ جامعہ میں ان کے مضامین بھی پڑھے تھے، اور ان کی کتاب تاریخ فلسفہ اسلام بھی اسی زمانہ میں نظر سے گزری تھی، یہ اگرچہ طبع زاد نہیں تھی، بلکہ مشہور مستشرق دی بوئر کی کتاب کا ترجمہ تھی مگر ڈاکٹر صاحب نے اس خوش اسلوبی کے ساتھ اسے اردو میں منتقل کیا تھا کہ ترجمہ کا احساس نہیں ہوتا تھا، بلکہ اصل کا گمان ہوتا ہے۔

یہ شاید ان کا پہلا ترجمہ تھا، اہل نظر کو اسی سے ان کی صلاحیت کا انداز ہو گیا، آگے چل کر اس صلاحیت میں اور اضافہ ہوا، اور سارے ملک میں ان کی شہرت ہو گئی گاندھی جی کی خود نوشت سوانح عمری کے ترجمے کی مختلف لوگوں نے کوشش کی روزنامہ ہمدرد میں بھی ''میرے تجربات زندگی کے'' عنوان سے مدتوں اس کے ابواب شایع ہوتے رہے، مگر جب مکتبہ جامعہ نے ''تلاش حق'' کے نام سے عابد صاحب کا ترجمہ شائع کیا تو لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں، اسی طرح پنڈت جواہرلال نہرو کی خود نوشت سوانح عمری کا ترجمہ ''میری کہانی'' کے نام سے شائع ہوا تو ہر طرف سے شور تحسین بلند ہوا، اس کے بعد انھوں نے متعدد کتابوں کے ترجمے کئے، اور پورے ملک میں ایک لائق مترجم کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ وہ محض مترجم نہ تھے، بلکہ انھوں نے بہت سی کتابیں خود بھی لکھی ہیں، ان کی تحریر میں زبان کی صحت و شستگی، روانی و برجستگی، اور لطافت و حلاوت کے ساتھ زور بیان اور قوت استدلال بھی بہت ہے، وہ معلم بھی رہے ہیں، اس لیے ان کے اندر تفہیم کی غیر معمولی صلاحیت ہے، وہ اپنی بات کو دل میں اتارنے اور ذہن نشین کرنے کا ڈھنگ خوب جانتے ہیں زبان پر ایسی قدرت ہے کہ مشکل سے مشکل مسائل کو عام فہم بنا دیتے ہیں، مگر عامیانہ انداز کو پاس نہیں آنے دیتے، ان کی سلاست رکاکت سے پاک ہوتی ہے، اور لطف بیان کہیں سے کلام کے وزن اور وقار کو گرنے نہیں دیتا بلکہ اس کی دل آویزی میں اضافہ کر دیتا ہے۔

قنوج کے قریب داعی پور شرفا کی ایک پرانی بستی ہے۔ عابد صاحب وہیں کے رہنے والے تھے، اور سادات کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے اردو اور فارسی کی تعلیم کے بعد وہ انگریزی کی طرف متوجہ ہوئے اور میور سنٹرل کالج الہ آباد سے بی۔

اے کی ڈگری حاصل کی، اس زمانہ میں علی گڑھ کے ایم۔اے۔او کالج کی مسلمانوں میں بڑی شہرت تھی، ڈاکٹر صاحب نے بھی وہاں ایم۔اے میں داخلہ لیا لیکن زیادہ دنوں یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا، اور یورپ جانے کا موقع مل گیا، پہلی جنگ عظیم کو ختم ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا، سیاسی اعتبار سے جرمنی تباہ ہوگیا تھا، مگر اس کی یونیورسٹیوں کا علمی اثر اب بھی باقی تھا، برلن میں ڈاکٹر ایڈورڈ اشپرانگر فلسفہ کے نامور استاد تھے، ڈاکٹر صاحب ان سے وابستہ ہوگئے، اور کئی برس تک ان کی خدمت میں رہ کر پی۔ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی۔

ڈاکٹر صاحب عملی سیاست سے تعلق نہیں رکھتے تھے، لیکن طبیعت آزادی پسند تھی، ان کی طالب علمی کا زمانہ تحریک خلافت اور کانگریس کے شباب کا زمانہ تھا، بچہ بچہ آزادی کے نشہ میں سرشار تھا، ہندو مسلمان، پارسی، سکھ سبھی آزادی کی جدوجہد میں شریک تھے، جوش و ولولہ اور قربانی و فداکاری کی عجیب فضا تھی، ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی انگریزی پالیسی سب پر آشکار ہوچکی تھی، اور فرقہ وارانہ اتحاد کے روح پرور نظارے ہر طرف نظر آرہے تھے، اس فضا میں ڈاکٹر صاحب جیسا حساس اور آزادی پسند نوجوان کس طرح بے تعلق رہ سکتا تھا، اس وقت جو نقوش ان کے دل پر ثبت ہوگئے وہ ساری زندگی باقی رہے، جب وہ علی گڑھ آئے تو وہاں خلافت اور کانگریس کے رہنماؤں کا اثر بہت بڑھ گیا تھا کالج کے احتیاط پسند عناصر نوجوانوں کو آزادی کی اس جدوجہد میں شرکت سے باز نہ رکھ سکے اور مولانا محمد علی کی سرکردگی میں ایم۔اے۔او کالج کے بہت سے طالب علموں، استادوں اور طلباء قدیم نے نیشنل مسلم یونیورسٹی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کی علی گڑھ ہی میں بنیاد رکھ دی۔

علی گڑھ میں عابد صاحب کا قیام زیادہ نہیں رہا، لیکن اس کے باوجود وہ وہاں کے ممتاز طلبہ اور اساتذہ سے واقف ہوگئے تھے، ڈاکٹر ذاکر حسین کو پہلی بار انھوں نے علی گڑھ ہی میں دیکھا تھا، اور ان کی ذہانت، طلاقت لسانی، حاضر جوابی، شرافت نفس، خدا پرستی اور انسانیت نوازی سے بے حد متاثر ہوئے، خود ان کا بیان ہے کہ انگریزی ادب میں ایم۔اے کرنے کے لیے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں داخل ہوا تو سارا کالج ذاکر حسین کی شہرت سے گونج رہا تھا، دو چار ملاقاتوں میں اچھی طرح اندازہ ہوگیا کہ میں نے ان کی غیر معمولی ذہنی اور اخلاقی صفات اور دلکش شخصیت کے بارے میں جو افسانوی روایتیں سنی تھی وہ بڑی حد تک صحیح تھیں، مجھے ان کی ذہانت میں ایک طرف ادراک وجدان کا اور دوسری طرف تفکر و تخیل کا ایک ایسا مرکب نظر آیا جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، آپ ان سے گفتگو کریں تو وہ چشم زدن میں بات کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے، ان کی قوت فیصلہ بجلی کی طرح کوند کر صحیح حل کے مرکزی نقطہ کو واضح کردیتی تھی، ان کی تقریر پہلے سیدھی دل میں اتر جاتی تھی اور پھر استدلال کے ذریعہ دماغ کو قائل کرتی تھی، ان کی شخصیت میں بڑی دلکشی تھی، بحث و مباحثہ میں ان کے چبھتے ہوئے طنز و مزاح اور بے پناہ قوت مناظرہ کے سامنے ٹھہرنا مشکل ہوجاتا تھا، سرسری نظر سے دیکھنے والے کو ایسا لگتا کہ وہ ایک خوش باش، لاابالی مزاج رکھتے ہیں، مگر ان کے سینہ میں ایک پُرخلوص، پُرسوز اور پُرجوش دل تھا، اور اس دل میں محکم ایمان، اٹل ارادہ اور اتھاہ ہمت و حوصلہ تھا، اپنے ذہن کو مغربی علم و عقل کی روشنی سے منور کرنے کے باوجود انھوں نے اپنے دل میں نور ایمان کی شمع کو بجھنے نہیں دیا''۔

کچھ عرصہ کے بعد ذاکر صاحب بھی برلن پہنچ گئے، اور پروفیسر زومبارٹ کی رہنمائی میں معاشیات کی تکمیل کرنے لگے، ذاکر صاحب معاشیات کے علاوہ فلسفہ تعلیم سے بھی بڑی دلچسپی رکھتے تھے، اور اس سلسلہ میں عابد صاحب کے استاد ڈاکٹر اشپرانگر سے خاص طور سے استفادہ کرتے تھے، نیز جرمنی کے نت نئے تعلیمی تجربوں سے بھی واقفیت حاصل کرتے رہتے تھے، یہ علم و تجربہ ان کے لیے جامعہ کے چلانے میں بہت مفید ثابت ہوا۔ برلن کے اس قیام میں عابد صاحب کا تعلق ان سے اور بڑھا۔ جس کی وجہ سے انھیں ان کے ساتھ جامعہ میں کام کرنے کا شوق پیدا ہوا۔

اس زمانہ میں پروفیسر محمد مجیب صاحب بھی آکسفورڈ یونیورسٹی سے بی۔اے آنرز کی سند حاصل کرنے کے بعد پریس کے کاموں کو سیکھنے اور فن طباعت میں مہارت حاصل کرنے کی غرض سے برلن آگئے، اس طرح خدا نے جامعہ کے ان خدمت گزاروں کو یکجا کردیا، جن کی قسمت میں آئندہ تعلیم ملی کے اس سفینہ کی ناخدائی تھی، جو گرداب حوادث میں گھرا تھا، اور باد مخالف کے تیز و تند جھونکے اسے تہ و بالا کرنے پر تلے ہوئے تھے، عابد صاحب اور مجیب صاحب کو پہلے جامعہ سے کوئی خاص تعلق نہ تھا، مگر ذاکر صاحب کی ذات ایسی پرکشش تھی، اور ان کے اندر دلداری و دلنوازی کی ایسی ادائیں تھیں، جن کی بنا پر مشکل ہی سے کوئی شخص ان سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا تھا، پھر یہ لوگ تو وفور علم کے ساتھ ذہن ثاقب اور عقل حق شناس کے ساتھ دل دردمند بھی رکھتے تھے، اور ان کے اندر خدمت ملی کا جذبہ اور قوم کے بخت خفتہ کو بیدار کرنے کا حوصلہ تھا، بھلا یہ ذاکر صاحب سے متاثر کیوں نہ ہوتے، انھوں نے بھی جامعہ کے خدمت گزاروں میں شامل ہونے کا عزم کرلیا۔ ذاکر صاحب نے ان کے سامنے جامعہ کی غربت و فلاکت کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہاں پھولوں کی سیج نہیں بلکہ صحرائے پرخار سے دوچار ہونا پڑے گا۔ لیکن اس سے ان بلاکشانِ شوق کے ارادہ میں کوئی ضعف نہیں آیا، اور ہر قسم کے سود و زیاں سے بے نیاز ہوکر ذاکر صاحب کی پرخلوص رفاقت میں ساری زندگی گزار دینے کا ارادہ کرلیا۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں حکیم اجمل خان جرمنی آئے، وہ ایک حاذق طبیب اور ممتاز قومی رہنما ہونے کے علاوہ جامعہ کے امیر (چانسلر) بھی تھے، ذاکر صاحب جامعہ

کے تعلق کی بنا پر ان سے واقف تھے، لیکن مجیب صاحب اور عابد صاحب کی یہ پہلی ملاقات تھی، اس وقت ہندوستان میں آزادی کی تحریک کمزور ہوگئی تھی، اور خلافت و کانگریس دونوں حلقوں میں بڑی افسردگی تھی، قوم پھر پیچھے کی طرف مڑنے لگی تھی، اور طلبہ آزاد تعلیم گاہوں کے بجائے سرکاری اسکولوں اور کالجوں کی جانب رخ کررہے تھے، ان حالات میں جامعہ کا علی گڑھ میں چلنا دشوار تھا، پرجوش کارکن ایک ایک کرکے رخصت ہورہے تھے، اساتذہ بھی اس ملی درسگاہ کو چھوڑ کر سرکاری اداروں کی طرف جارہے تھے، اس فضا میں حکیم صاحب کو یہ نوجوان بہت غنیمت معلوم ہوئے، انھوں نے ان کے اندر جامعہ میں آنے کا شوق اور اس کے ذریعہ ملک وملت کی خدمت کا جذبہ پیدا کیا، ذاکر صاحب کی کشش انگیز شخصیت نے پہلے ہی ان لوگوں کو متاثر کررکھا تھا، حکیم صاحب کی ملاقات اور گفتگو نے اس جذبہ کو اور بڑھا دیا، عابد صاحب نے حکیم صاحب کی اس ملاقات کا اپنے ایک مضمون میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

حکیم صاحب ہندوستان واپس آئے تو جامعہ کا حال بیحد ابتر نظر آیا۔ طلبہ بے چین اساتذہ پریشان، کارکن بددل، امناد (ٹرسٹی) مستقبل سے مایوس اور رہنمایانِ قوم دل برداشتہ تھے، بظاہر اس ادارہ کا دم واپسین بہت قریب محسوس ہوتا تھا، ان حالات میں گاندھی جی کی مدد سے حکیم صاحب جامعہ کو علی گڑھ سے دہلی لائے اور قرول باغ میں طبیہ کالج کے قریب کرایہ کے مکانوں میں اس اجڑی ہوئی تعلیمی بستی کو پھر سے بسانے کا انتظام کیا، چند مہینوں کے بعد عابد صاحب اور مجیب صاحب ذاکر صاحب کی رفاقت میں دہلی پہنچ گئے، ان لوگوں کے آجانے سے جامعہ کی ڈوبتی ہوئی کشتی پھر ابھر آئی یہ تینوں نوعمر تھے، جامعہ کے مقاصد بہت عظیم تھے، مگر حالات بے حد ناساز گار تھے، کسی کو مشکل سے یقین آتا تھا کہ یہ ناتجربہ کار نو وارد اس ادارہ کو حیات نو بخشیں گے، مگر اپنے وسیع علم، مخلصانہ خدمت اور مسلسل محنت کی بدولت بہت ہی جلد یہ لوگ سب کی توجہ کا مرکز بن گئے، جامعہ کے بچے کھچے اساتذہ، طلبہ اور کارکنوں میں ایک نئی امنگ پیدا ہوئی، اور تعلیم وتربیت کا کام بڑے جوش اور ہوشمندی کے ساتھ شروع ہوگیا، ذاکر صاحب اس مختصر گروہ کے قافلہ سالار اور عابد صاحب اور مجیب صاحب ان کے یمین و یسار تھے۔

ان لوگوں کے دلوں میں جامعہ کا بہت ہی بلند تصور تھا، اور اس کے ذریعہ وہ ملک وملت کو ایسے رخ پر لے جانا چاہتے تھے، جو امن وسکون، اعتبار واعتماد، خلوص و محبت، اور ہمدردی وبہی خواہی کی شاہراہ تک پہنچائے، بقائے باہم کے اصول کو اس ملک میں رواج عام حاصل ہو، اور رنگ برنگ پھولوں کے گلدستہ سے قوم کی شان دوبالا ہوسکے، اس کام میں عابد صاحب اور مجیب صاحب سرگرمی کے ساتھ ذاکر صاحب کا ہاتھ بٹاتے تھے، ان حضرات کی بہت سی تحریریں آج بھی موجود ہیں جن سے ان کے خیالات اور جدوجہد کا پتہ چلتا ہے، عابد صاحب کی زبان میں کسی قدر لکنت تھی، اس لیے ان کو بولنے میں دقت ہوتی تھی، لیکن اس لکنت کے باوجود وہ درس بھی دیتے تھے، اور تقریر بھی کرتے تھے، مگر اس لکنت کی تلافی اللہ نے اس طرح کی تھی کہ انھیں بہت سلجھا ہوا دماغ، فکر عمیق اور قلم سیال عطا کیا تھا، ان کے قلم کی روانی نے جامعہ کی بڑی خدمت کی ''مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ ملیہ'' کے نام سے انھوں نے ایک کتاب لکھی تھی جو کہنے کو تو جامعہ کے مقاصد، طریق کار اور نصاب و نظام تعلیم کا ایک خاکہ ہے، لیکن اس کے اندر تعلیمِ ملّی کا جو منصوبہ پیش کیا گیا ہے، وہ ہمیشہ اس میدان میں کام کرنے والوں کی رہبری کرتا رہے گا۔

یہ پہلے لکھ چکا ہوں کہ جامعہ سے واقفیت ندوہ کی طالب علمی ہی کے زمانہ میں ہوچکی تھی اپنے شفیق استاد مولانا عبدالرحمٰن نگرامی مرحوم کی زبان سے بارہا اس کا ذکر سنا تھا شیخ الہند کا خطبہ تاسیس اور سرپی، سی، رے کا خطبہ تقسیم اسناد بھی نظر سے گزر چکا تھا، جامعہ کے بعض طلبہ سے ملاقات بھی ہوچکی تھی، اور کچھ ہمارے ندوہ کے فاضل بھی وہاں پہنچ چکے تھے، ان سب ذرائع سے جامعہ کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوگئی تھیں، اور ذاکر صاحب کے ساتھ عابد صاحب کا نام اس طرح ذہن نشین ہوگیا تھا کہ دونوں توام بھائی معلوم ہوتے تھے، مئی ۱۹۳۰ء میں ایک معمولی سی بات پر ندوہ میں بڑی اسٹرائک ہوگئی اور تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا، اس موقع پر انگریزی زبان اور جدید علوم کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جامعہ جانے کا خیال ہوا، ذاکر صاحب اس زمانہ میں شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) تھے، ان کو صورت حال لکھی اور درخواست کی کہ اگر ہمیں اپنے زیر سایہ جگہ دے سکیں تو حاضر ہوں، اس درخواست کی قبولیت کا بہت کم یقین تھا، مگر ڈاکٹر ذاکر صاحب کے دل میں خدا نے کچھ ایسی ہمدردی پیدا کی کہ منظور ہوگئی، اور چند دن میں ہم جامعہ پہنچ گئے، اس سفر میں میرے عزیز دوست رئیس احمد جعفری مرحوم اور عبدالمجیب سہالوی ساتھ تھے، بعد میں محمد ابراہیم عمادی، رشید اختر، اور خلیل شرف الدین بھی ندویوں کے اس قافلہ سے آملے اور ماضی کے واقعات کو نظر انداز کرکے مستقبل کی تیاری میں لگ گئے۔

اس وقت عابد صاحب اورنگ آباد میں تھے، اور ڈاکٹر عبدالحق کے ساتھ انگریزی اردو ڈکشنری مرتب کررہے تھے، مجیب صاحب بھی تصنیف وتالیف کے سلسلہ میں وہیں مقیم تھے، شاید روسی ادب کی تاریخ لکھ رہے تھے، لیکن ہمارے داخلہ کے چند ہی ماہ بعد تحریک آزادی کو پھر فروغ ہوا، اور قید وبند کا سلسلہ شروع ہوگیا، جامعہ، آزادی پسندوں کا مرکز تھا، آزادی کی اس جدوجہد کا اس پر اثر ناگزیر تھا، چنانچہ کئی ممتاز اساتذہ اور طلبہ تعلیم گاہ سے نکل کر سیاست کے میدان میں پہنچ گئے، اور وہاں سے جیل بھیج دئے گئے، حکومت کی دار وگیر سے جامعہ کو بچانے کا کام تو ذاکر صاحب اور ان کے مشیر و معاون کسی نہ کسی طرح کررہے تھے، لیکن اساتذہ کی کمی کا کیا علاج تھا، جامعہ جیسی

حکومت کی معتوب اور تہی مایہ درسگاہ میں آکر کون اپنے کو مصائب میں مبتلا کرتا، بالآخر عابد صاحب اور مجیب صاحب کو اورنگ آباد سے بلانا پڑا، ایک روز ہم لوگ ریاضی کے استاد حاجی برکت علی صاحب کے درجہ میں پڑھ رہے تھے، اچانک دو اجنبی ان سے ملنے آگئے، معلوم ہوا کہ یہ ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب ہیں، عابد صاحب کے چہرہ پر خاصی بڑی داڑھی تھی، جو بعد کو برقرار نہیں رہی، مگر ان کے دل میں اس کی جڑیں باقی رہیں، اور زندگی کے آخری دور میں پھر چہرہ پر اسی طرح نمودار ہوگئی، یہ ان کے مذہبی جذبات کا اثر تھا، وہ زندگی کے کسی دور میں مذہب سے غافل نہیں رہے، ایمان ان کے دل و دماغ دونوں میں پیوست تھا، وہ وجدانی طور پر بھی مسلمان تھے، اور علم و استدلال کے ذریعہ بھی انھیں اسلام کی صداقت کا یقین تھا، اور اس کی اشاعت و ترقی کے لیے کوشاں رہتے تھے۔

اس زمانہ کی انگریزی حکومت جامعہ کی مخالف تھی، اس کی سند ہندوستان میں کہیں تسلیم نہیں کی جاتی تھی، ان حالات میں طلبہ کی قلت لازمی تھی، ایسی صورت میں فلسفہ کی تعلیم کا کیسے انتظام ہوتا، عابد صاحب اس زمانہ میں کالج کے طلبہ کو اردو پڑھاتے تھے، اس کے علاوہ رسالہ جامعہ کی ادارت اور اردو اکیڈمی کی نظامت بھی ان کے سپرد تھی، جامعہ کے طلبہ میں اردو کا جو ذوق پیدا ہوا وہ بہت کچھ عابد صاحب کا رہین منت ہے، اردو اکیڈمی کے ذریعہ انھوں نے بیش بہا خدمات انجام دیں انکے اہتمام میں بڑے معرکے کے مشاعرے ہوئے، اور اعلیٰ درجہ کے مضامین پڑھے گیے، ایسی محفلیں اب کاہے کو دیکھنے کو ملیں گی، ان مشاعروں میں جگر مرادآبادی، حفیظ جالندھری، اصغر گونڈوی، حسرت موہانی، ثاقب لکھنوی، ظریف لکھنوی، سعید بریلوی، ساحل دہلوی، منور لکھنوی، برق دہلوی اکابر شعراء شریک ہوتے اور اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ کرتے، یہ مشاعرے بڑے باوقار اور پرسکون ہوتے تھے، مضمون خوانی کی مجلسیں بھی بڑی شاندار ہوتی تھیں، مولانا سید سلیمان ندوی، خواجہ غلام الثقلین، مولانا اسلم جیراج پوری، پروفیسر حبیب الرحمٰن، مولانا عبدالرؤف دانا پوری، خالدہ ادیب خانم، حسین رؤف بے، ڈاکٹر بہجت وہبی کس کس کو یاد کیجئے جامعہ کے ہال میں کیسے کیسے اصحاب علم رونق افروز ہوچکے ہیں، غیر ملکی مقالہ نگاروں کے ترجمے اکثر ڈاکٹر عابد صاحب کیا کرتے تھے، خالدہ خانم کے مقالات کا مجموعہ ''ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش'' ان ہی کے قلم سے کتابی شکل میں اردو میں منتقل ہوا، اور آج تک اس باب میں تاریخ کا ایک مستند ماخذ سمجھا جاتا ہے، ان جلسوں کی صدارت بھی بڑے نامور اصحاب نے کی ڈاکٹر اقبال، مسز سروجنی نائیڈو، ڈاکٹر انصاری، مولانا سید سلیمان جیسے صاحبانِ علم کے خطابات صدارت نے ان مجالس کی رونق دوبالا کردی۔

کتابوں کی نشر و اشاعت کا کام مکتبہ جامعہ کرتا تھا، ان کی ظاہری آرائش و زیبائش کا اہتمام مکتبہ کے منیجر حامد علی خان صاحب کرتے تھے لیکن کتابوں کا معنوی وزن عابد صاحب کی توجہ کا رہین منت ہوتا تھا۔

عابد صاحب بہترین مشیر تھے، ان کی سوجھ بوجھ سے جامعہ کو بہت فائدہ پہنچا، غور و فکر کی صلاحیت ان کے اندر ہمیشہ بیدار رہی، بارہا نازک حالات میں ان کے مشورہ سے پیچیدہ مسائل حسن و خوبی کے ساتھ حل ہوگئے، مجھے اس کا ذاتی تجربہ ہے، ۱۹۵۱ء میں میں اُن کی طلب پر جامعہ آیا، اُس وقت وہ کالج کے پرنسپل تھے، چند سال براہ راست اُن کی ماتحتی میں کام کرنے کا موقع ملا، اس اثناء میں اور اس کے بعد بھی اُن کو بہت قریب سے دیکھنے اور ان کے طریقہ کار کو سمجھنے کا موقع ملا، اس زمانہ کی مشکلات کو آج سمجھنا دشوار ہے، تقسیم ملک سے فضا میں جو تلخی پیدا ہوگئی تھی، اس کا اثر ہنوز باقی تھا، طلبہ کی تعداد قلیل، اساتذہ کم، مالی وسائل محدود اور عمارتیں برائے نام تھیں، ہندوستان کی یونیورسٹیاں عموماً جامعہ کی سندیں تسلیم نہیں کرتی تھیں تعلیم کا دائرہ بہت تنگ تھا، چند ہی مضامین کی تعلیم کا انتظام تھا، ان سب پریشانیوں پر مستزاد یہ کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو کے اصرار پر ذاکر صاحب مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوگئے تھے، ان کا قیام علی گڑھ میں رہتا تھا، اور جامعہ ان کی باضابطہ رہنمائی سے محروم ہوگئی تھی، ان حالات میں جامعہ کو برقرار رکھنا ہی مشکل تھا، چہ جائیکہ اس کو ترقی دی جائے، لیکن مجیب صاحب اور عابد صاحب نے بڑی ہمت کے ساتھ ان مشکلات کا مقابلہ کیا، ذاکر صاحب کے خالی عہدہ کو مجیب صاحب نے سنبھالا، اور اعلیٰ تعلیم کی سربراہی عابد حسین صاحب نے اپنے ذمہ لی، ان دونوں کی تندہی اور شبانہ روز کی جانفشانی نے بند راہیں کھول دیں، اور رفتہ رفتہ جامعہ ترقی کی منزلیں طے کرنے لگی، حکومت کی امداد میں اضافہ ہوا، جامعہ کو ایک حد تک یونیورسٹی کا درجہ ملا، نئے مضامین داخل نصاب ہوئے، آرٹس اور سائنس کے متعدد شعبے کھلے، متعدد عمارتیں بنیں، ملک کی یونیورسٹیوں میں اس کی سندیں تسلیم ہوئیں اور حکومت نے اس کے مصارف کی پوری ذمہ داری اپنے سرلی، ڈاکٹر صاحب کے بعد مجیب صاحب جامعہ کے سربراہ تھے انھوں نے جامعہ کی خاطر بے حد مشقت برداشت کی، مگر اس ساری جدوجہد میں عابد صاحب ان کے مشیر خاص اور معین کار تھے وہ مسائل و حالات پر غور کرتے منصوبے بناتے، وسائل تلاش کرتے اور اشخاص کو ہموار کرتے، اس طرح مجوزہ اسکیم کو کامیابی کی منزل تک پہنچاتے انہیں آدمیوں سے کام لینے کا بڑا سلیقہ تھا جامعہ کی ترقی کے لیے انھوں نے معلوم نہیں کیا کیا جتن کیے اور کس کس طرح مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کی، سطح کے اوپر سبھی کو نظر آتا ہے لیکن اس کے نیچے کا حال کم ہی لوگوں کو معلوم ہوتا ہے۔

جامعہ کے علاوہ ملک و ملت کی خدمت سے بھی وہ کبھی غافل نہیں ہوئے اور زبان و قلم کے ذریعہ اصلاح حال کی تدبیر کرتے رہے تقسیم سے پہلے رسالہ جامعہ اور

اپنی تصانیف وتراجم کے ذریعہ انھوں نے باشندگانِ ملک اور ابنائے ملت کے ذہن کی تعمیر اور خیالات کی اصلاح کے لیے بڑا کام کیا، اور جب ۴۷ء میں فرقہ وارانہ کشیدگی حد سے بڑھ گئی اور جان و مال اور عزت وآبرو کی حفاظت دشوار ہوگئی اس وقت انھوں نے ''نئی روشنی'' کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار نکالا اور اس کے ذریعہ گم کردہ راہ انسانوں کی رہبری کی، انھوں نے ان کے سامنے منزل کی نشاندہی کی اور وہاں تک پہنچنے کے لیے سیدھی راہ دکھائی انھوں نے جزئیات وفروعات میں الجھنے کے بجائے اصول کی طرف توجہ دلائی اور شرافت و نیک نفسی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی تلقین کی، افسوس ہے کہ یہ اخبار زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا، لیکن اپنی مختصر مدت حیات میں بیش بہا خدمت انجام دی، معلوم نہیں اس کے مضامین کے ذریعے کتنے مایوس دلوں کو امید کی شعاع نظر آئی، کتنے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کو استقامت نصیب ہوئی، اور کتنے پریشان حالوں کو سکون حاصل ہوا۔

۱۹۶۹ء مین انھوں نے عصر حاضر کے چیلنج کا جواب دینے کے لیے اردو میں ''اسلام اور عصر جدید'' اور انگریزی میں ''اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج'' نامی دوسہ ماہی رسالے نکالے وہ چاہتے تھے کہ مسلمان زمانہ کے تقاضوں کو سمجھیں اور اسلام کی صحیح تعلیمات کی روشنی میں ان مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کریں جن میں آج سارا عالم مبتلا ہے ان کا خیال تھا کہ مسلمان خدا کے عالمگیر پیغام کے حامل ہیں ان کا فرض ہے کہ ایک طرف مغربی تہذیب کا مطالعہ کرکے اس کے امراض کا پتہ چلائیں دوسری طرف اسلامی تعلیمات کا گہرا مطالعہ کرکے ان امراض کی روک تھام اور علاج کی تدبیریں بتائیں اس رسالہ کے موضوعات بحث ان کے الفاظ میں حسب ذیل تھے:

۱۔عصر حاضر کی مغربی تہذیب کے مختلف پہلوؤں کا تنقیدی مطالعہ اور ان عناصر کی نشاندہی جو اسلام کی روحانی اور اخلاقی تعلیم سے ہم آہنگ ہیں اور مسلمانوں کی جائز ذہنی اور مادی ترقی میں مدد دے سکتے ہیں خصوصاً سائنس کے دائرہ فکر کا اور سائنسی انداز نظر کی تشریح اور سائنس کی رفتار ترقی کا جائزہ۔

۲۔اسلامی تعلیم اور اسلامی تہذیب کے ان پہلوؤں پر بحث جو مسلمانوں کے ہندوستان کے، اور دنیا کے اہم ترین مسائل حاضرہ کے حل کرنے میں مدد دے سکتے ہیں۔

۳۔مسلمانوں کے ان کارناموں کا ذکر جنھوں نے انسانیت کے علمی وتہذیبی سرمایہ میں اضافہ کیا۔

۴۔ان مسائل پر بحث کہ اسلام اور دنیا کے دوسرے بڑے مذاہب کس طرح اور کس حد تک مل کر روحانی اور اخلاقی اقدار کے مقابلہ میں تشکیک اور انکار کے اس طوفان کا مقابلہ کرسکتے ہیں، جو دنیا میں اٹھتا ہوا نظر آرہا ہے۔

۵۔اسلامی معاشروں میں تجدد کی تحریکوں کا تنقیدی مطالعہ۔

۶۔اسلامی معاشروں کی علمی تعلیمی اور تہذیبی رفتار ترقی کا جائزہ۔

۷۔اسلام سے متعلق مطبوعات پر تبصرہ۔

ڈاکٹر صاحب نے ان مقاصد کی تکمیل کے لیے ''اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی'' قائم کی تھی، یہ رسالے اسی سوسائٹی کی طرف سے نکلتے تھے، کتابوں کا ایک سلسلہ بھی پیش نظر تھا، ان میں سے بعض تیار ہوچکی ہیں اور بعض تیار ہورہی ہیں، ڈاکٹر صاحب کے اندر جب تک سکت رہی وہ سوسائٹی کی آمدنی بڑھانے کی کوشش کرتے رہے، اس کے لیے خط وکتابت کے علاوہ انھوں نے طویل دورے کیے، ان کوششوں سے چند ہی برس میں سوسائٹی نے بڑی ممتاز حیثیت حاصل کرلی، کئی بین الاقوامی سیمینار منعقد ہوئے، جن میں ہندوستان کے علاوہ یورپ، امریکہ اور افریقہ کے نامور اہل قلم نے شرکت کی، اگر وہ تندرست رہتے، تو سوسائٹی کی بنیاد مستحکم ہوجاتی، لیکن ان کی صحت جو کبھی اچھی نہ تھی، مسلسل افکار اور کثرت کار کی وجہ سے گرتی گئی پیرانہ سالی میں مدافعت کی قوت کمزور ہوگئی تو امراض کا ہجوم ہوا، دو تین سال سے ان کی حالت خراب ہوتی جارہی تھی لیکن جہاں تک ہوسکتا اپنے کو سنبھالتے اور شدید علالت کے باوجود کام کرتے رہتے، مگر ادھر تین چار ماہ سے بالکل بستر سے لگ گئے تھے، ۶/نومبر کو انجمن جامعہ کے سلسلہ میں دہلی گیا تو ان کے یہاں بھی حاضر ہوا اس وقت غنودگی طاری تھی کچھ دیر بستر کے پاس کھڑا انھیں دیکھتا رہا، اُن کی یہ حالت دیکھ کر بہت رنج ہوا بیگم صاحبہ بھی بہت متاثر تھیں، اور صبر وضبط کے باوجود اُن کے چہرے پر رنج و ملال کے گہرے آثار نمایاں تھے، کیوں نہ ہوکے، ۴۵، ۴۶ برس کی رفاقت ختم ہوتی نظر آرہی تھی، جس کے ساتھ محبت وشفتگی، ہمدردی وغمگساری، خلوص ووفا اور دلداری ودلنوازی کی کتنی یادیں وابستہ تھیں، دہلی سے واپسی کے بعد خط لکھ کر برابر حالات معلوم کرتا رہا، ۱۳/دسمبر ۷۸ء کو اچانک ایک بجے دن کو ریڈیو سے ان کی وفات کا اعلان ہوا ہر چند کہ یہ خبر خلاف توقع نہ تھی، مگر پھر بھی دل بے قرار اور آنکھیں اشکبار ہوگئیں، اللہ اپنی رحمت سے نوازے اور بیگم صاحبہ اور دوسرے عزیز واحباب کو صبر کی توفیق نصیب فرمائے اور اُن کی مثالِ نیک کو دلیل راہ بنانے کی ہمت عطا فرمائے۔ (''ع۔ق''، جنوری ۱۹۷۹ء)

میمن، عبدالعزیز، مولانا

مولانا عبدالعزیز میمنی راجکوٹی

عربی زبان وادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مولانا عبدالعزیز میمنی کی وفات بڑی افسوس ناک ہے، انھوں نے خاصی طویل عمر پائی، انتقال کے وقت ۹۶ برس کے تھے، لیکن عربی علم وادب اور تاریخ وتحقیق کے میدان میں ان کا جو مرتبہ تھا، اس کی بناء پر درازی عمر کے باوجود ان کا انتقال بہت محسوس ہوگا، اور عرصہ دراز تک انھیں یاد کیا

جاتا رہے گا۔

وہ ۱۸۸۹ء میں راجکوٹ (کاٹھیاواڑ) میں پیدا ہوئے، عنفوان شباب میں تحصیل علم کے لئے دہلی کا سفر کیا، اور وہاں ایک عرصہ تک تحصیل علم میں مشغول رہے، انھوں نے باقاعدہ کسی درس گاہ سے سند فراغ نہ لی تھی، لیکن اہل کمال کی خدمت میں رہ کر عربی ادب میں کمال پیدا کیا، شیخ طیب عرب سے مدتوں اکتساب فیض کیا، ڈپٹی نذیر احمد سے بھی کافی استفادہ کیا، مطالعہ کتب کا خاص اہتمام تھا، اس طرح کامل دستگاہ حاصل کرلی اور اقران و اماثل میں ممتاز سمجھے جانے لگے، تلاش معاش کے لئے پہلے اسلامیہ کالج پشاور پہنچے، وہاں عربی کے استاد کی حیثیت سے کچھ عرصہ تک درس و تدریس کی ملازمت انجام دی، اپریل ۱۹۲۱ء میں اورینٹل کالج لاہور میں اڈیشنل مولوی کی حیثیت سے ایک سو روپیہ ماہوار تنخواہ پر تقرر ہوا، یہاں کی علمی و ادبی فضا نے ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کیا، چنانچہ درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تحقیق کا ذوق پروان چڑھا، چار سال بعد آخر ۱۹۲۵ء میں یہاں سے علی گڑھ چلے آئے، پہلے شعبۂ عربی میں استاد ہوئے، پھر صدر شعبہ ہوگئے، ۱۹۴۹ء میں یہاں سے ریٹائر ہوکر کراچی چلے گئے، وہاں کراچی یونیورسٹی کے قیام پر شعبۂ عربی کے صدر منتخب ہوئے، یہاں سے سبکدوشی کے بعد اکتوبر ۱۹۵۴ء میں مرکزی ادارۂ تحقیقات اسلامی کے پہلے اعزازی ڈائرکٹر مقرر ہوئے، یہاں مولانا کے فرائض میں ایک اعلیٰ درجہ کے کتب خانہ کا انتظام تھا، اس غرض سے پاکستان کی وزارت تعلیمات نے ان کے لئے مختلف ممالک کے سفر کا انتظام کیا، تاکہ نادر و نایاب کتابیں فراہم ہوسکیں، مولانا نے اس علمی سفر میں مصر، شام، تونس، الجزائر، سعودی عرب، عراق، ترکی اور ہندوستان کا دورہ کیا، ان کی نظر انتخاب نے اس ادارہ کے کتب خانہ کو قیمتی کتابوں سے مالا مال کردیا۔

مولانا کا اوڑھنا، بچھونا عربی زبان و ادب کی خدمت تھا، اس سلسلہ میں انھوں نے ایسے نقوش جاوداں ثبت کئے ہیں، جو عرصہ تک ان کی یاد دلاتے رہیں گے، ان کا پہلا علمی و تحقیقی کارنامہ ''ابو العلاء وما الیہ'' ہے، اس کتاب میں انھوں نے ادبائے مشرق و مغرب کے افکار و خیالات کا جائزہ لیا، اس کی اشاعت کی بعد ادبائے عرب اور مستشرقین یورپ نے ان کی دیدہ وری، شان تحقیق اور وسعت نظر کی دل کھول کی داد دی، علامہ سید سلیمان ندوی ان کے علمی و تحقیقی کاموں کے بڑے قدر شناس تھے، انھوں نے اس تحقیقی شاہکار کو دارالمصنفین کے سلسلہ تصنیفات میں شامل کیا، اور ۱۳۴۴ھ میں بڑے اہتمام کے ساتھ اسے قاہرہ میں طبع کرایا۔ اس کے شروع میں میمن صاحب نے دارالمصنفین کی خدمات، سید صاحبؒ کے علمی شغف اور علامہ شبلی کا ذکر خیر کیا ہے اور اس کتاب کو دارالمصنفین کے سلسلۃ الذہب میں شامل کئے جانے پر تشکر و امتنان کا اظہار کیا ہے، اس سے عالم اسلام میں دارالمصنفین کی خدمات کا بھی تعارف ہوا، اس کتاب کی اشاعت پر سید صاحب بہت خوش ہوئے اور قارئین معارف کو اس علمی تحفہ کی خبر شذرات میں اس طرح دی:

> ''دارالمصنفین کی طرف سے ایک نئی عربی کتاب ابوالعلاء معری پر جو عربی زبان کا خیام ہے، مصر کے مطبعۂ سلفیہ سے چھپوا کر منگوائی گئی ہے، یہ ہندوستان کے مشہور فاضل و ادیب مولانا عبدالعزیز صاحب میمن استاذ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی تصنیف ہے، اب تک بلادِ عربیہ میں اس شاعر پر جو کچھ لکھا گیا تھا، اس سے بہت زیادہ بڑھ کر اور ان سے زیادہ صحت اور استیعاب کے ساتھ اس کتاب میں معلومات فراہم کی گئی ہیں، لوگوں کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ وسعت معلومات ایک طرف ایک ہندی نژاد کے عربی قلم نے خود اہل زبان سے خراج تحسین وصول کیا ہے''۔ (معارف جنوری ۲۸ء)

سید صاحب ان کے علمی و تحقیقی کام کے بڑے قدرداں تھے، ان سے مضامین طلب کرتے، سید صاحب کی فرمائش پر انھوں نے معارف میں متعدد مضامین لکھے، جنھوں نے اہل علم سے خراج تحسین حاصل کیا، پہلا مضمون جولائی ۱۹۲۴ء میں کتب خانہ جامع القرویین فاس کے بارے میں شائع ہوا، اس کے بعد اسی سال ابن رشیق اور المعز بین بادیس پر ایک مضمون نکلا، جس کے شروع میں سید صاحب کا ایک نوٹ بھی تھا:

> ''مولانا نہ صرف عربی زبان و ادب پر کامل عبور رکھتے ہیں بلکہ علم کا خالص مثالیں ملک کے سامنے آچکی ہیں، ذیل کا مضمون تلاش کامل مطالعہ عمیق اور سخت کاوش و محنت کا نتیجہ ہے''۔ (معارف ۲۴ء)

اس کے بعد ۲۵ء میں ''ابوالعلاء اور معارضہ قرآن''، ''ابوتمام کی نقائض جریر و اخطل کا ایک واحد نسخہ'' کے عنوان سے دو اور مضامین شائع ہوئے، ابوالعلاء معری اور گاندھی جی کا چرخہ ایک مضمون لکھا..... تو سید صاحب نے تحریر فرمایا کہ:

> ''ہمارے دوست مولانا عبدالعزیز کو آج کل ایسی ہی دھن ہے جیسی گاندھی جی کو چرخہ کی، چنانچہ ابوالعلاء معری کا چرخہ آج وہ نکال کر لائے ہیں''۔

سید صاحب نے ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم کی حیثیت سے ندوہ میں توسیعی خطبات کا سلسلہ شروع کرنے کا عزم کیا تو اس سلسلہ میں سب سے پہلے مولانا عبدالعزیز میمن نے جون ۲۵ء میں طلبائے ندوہ کے سامنے ایک خطبہ دیا جو سید صاحب کے ایک طویل نوٹ کے ساتھ ''خطبۂ علمی ابوالعلاء معری کے متعلق مستشرقین یورپ کی غلطیاں'' کے عنوان سے ستمبر، اکتوبر، نومبر ۲۵ء میں معارف میں شائع ہوا۔

ان کے علاوہ قابل ذکر مضامین میں ''علامہ ابن الجوزی کے افکار یا ان کا روزنامچہ'' مئی ۲۸ء میں ''ابن رشیق صقلیہ میں'' جولائی ۲۹ء میں شائع ہوا۔

میمن صاحب کا دوسرا اہم علمی کارنامہ امالی کی شرح سمط اللآلی کو ایڈٹ کرنا

ہے، یہ دوجلدوں میں قاہرہ سے شائع ہوئی، ایک جلد فہرست کی اس کے علاوہ تھی، جس میں اماکن وامصار اعلام واشخاص کوحروف تہجی کے اعتبار سے تحریر کیا ہے، یہ فہرست بھی تلاش وتحقیق کرنے والوں کے لئے بڑی کارآمد ہے۔

ابوعلی القالی (متوفی ۳۵۶ھ) کی الامالی عربی ادب کی امہات کتب میں شمار ہوتی ہے، مورخ ابن خلدون کا مقولہ ہے، ''جسے ادب عربی حاصل کرنا ہوا، اسے اس فن کی ان چار اصل الاصول کتابوں کو یادکھنا چاہئے: ا۔البیان و التبیین للجاحظ، ۲۔الکامل للمبرد، ۳۔الامالی لابی علی القالی، ۴۔ادب الکاتب لابن قتیبۃ''۔

ابوعبید البکری (متوفی ۴۸۷ھ) نے امالی کی ایک بلند پایہ شرح اللآلی کے نام سے لکھی، مولانا میمنی نے سات سال کی تلاش وتحقیق کے بعد اسے مرتب کیا، سمط اللآلی کے نام سے اس پر بڑا بیش قیمت حاشیہ لکھا،.....۱۹۳۶ء میں یہ کتاب مصر سے شائع ہوئی تو میمنی صاحب کا نام ساری دنیا میں پھیل گیا۔

مولانا محمد عبداللہ سورتی نے معارف ۳۸ء میں تین قسطوں میں اس پر تبصرہ کیا، اور غلطیوں کی نشان دہی کی میمنی صاحب نے برہان ۳۸ء و ۳۹ء کے سات شماروں میں اس کا پرزور جواب لکھا، افسوس ہے کہ اس جواب میں شدت جذبات کی بناء پر علمی مباحث کے ساتھ نامناسب الفاظ میں سورتی صاحب کی ذات کو بھی ہدف طنز وتعریض بنایا ہے۔

الندوہ کے دور جدید میں ''میری محسن کتابیں'' ایک مفید سلسلہ شروع کیا گیا تھا، جس میں مشاہیر اہل علم نے اپنے تجربات کا نچوڑ پیش کیا تھا اس میں مولانا میمن نے بھی اپنی محسن کتابوں کا ایک جائزہ پیش کیا ہے، جو اس کے مجموعہ ''مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں'' مرتبہ مولانا محمد عمران خان ندوی میں دیکھا جاسکتا ہے۔

مولانا کو جاہلی اور اسلامی شعراء کے ہزاروں بلکہ شائد لاکھوں اشعار از بر تھے، قدیم ادب پر بھی ان کی نظر بہت عمیق تھی، الفاظ کی تحقیق میں ان کو خاصا درک تھا، انساب بھی ان کا خاص موضوع رہا ہے، ہندوستان میں جب تک آپ کا قیام رہا علی گڑھ سے تعلق کے ساتھ ہندوستان کے عربی مراکز اور اسلامی اداروں سے بھی گہرا ربط رہا اور مختلف علمی و ادبی انجمنوں کے رکن رہے، عالم اسلام میں اپنی خدمات کی بناء پر انھیں بڑی شہرت حاصل تھی، ۲۸ء سے دمشق کی مشہور علمی اکیڈمی "المجمع العلمی" کے رکن منتخب ہوئے، اس کے ترجمان "المجلہ العربی" میں آپ کے بہت سے مضامین شائع ہوئے، عربی کے سب سے اہم لغت لسان العرب کی اشاعت کے لئے جو کمیٹی بنائی گئی تھی اس میں بھی میمن صاحب کا نام شامل تھا، ان کی ان وسیع خدمات کے صلہ میں جامعہ ازہر کی طرف سے انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی سند دی گئی۔

آپ کی دو مندکرہ بالا کتابوں کے علاوہ دوسری قابل ذکر علمی و ادبی کتابیں حسب ذیل ہیں:

ا۔ابن رشیق	۲۔نسب عدنان وقحطان
۳۔نظرۃ علمی دیوان نعمان بن بشیر الانصاری	
۴۔مااتفق لفظہ واختلف معناہ	۵۔النتف
۶۔الطرائف الادبیۃ	۷۔اکلید الخزانۃ
۸۔عرام بن الاضبع السلمی الاعرابی کی، اسماء حیال تھامہ	
۹۔زیادات المتنبی	۱۰۔ثلاث رسائل
۱۱۔المداخل	۱۲۔فرائد القصائد
۱۳۔دیوان الشنفرسی	۱۴۔دیوان ابراھیم الصولی
۱۵۔دیوان حمید بن ثور	۱۶۔الفاضل للمبرد
۱۷۔حواشی اللسان	۱۸۔اغلاط معجم الادباء یاقوت
۱۹۔خلاصہ السیر	۲۰۔ابواب مختارہ
۲۱۔الفائت	۲۲۔اختیار الجرجانی
۲۳۔دیوان صحیم العبد	۲۴۔دیوان کعب
۲۵۔المقصور للفراء	۲۶۔التنبیھات

وغیرہ وغیرہ۔ (''م،ن،ن''۔دسمبر ۱۹۷۸ء)

مولانا عبدالعزیز میمن: چند یادیں

(شیخ نذیر حسین)

مولانا عبدالعزیز میمن نے نوے (۹۰) برس کی عمر میں ۲۷/اکتوبر ۱۹۷۸ء کو کراچی میں انتقال کیا۔ وہ عہد حاضر میں عربی زبان کے مشہور ادیب، محقق، عالم اور انشا پرداز تھے، اور اپنی عربی تصانیف کی بدولت ہندو پاکستان سے زیادہ عرب ممالک کے علمی حلقوں میں معروف اور روشناس تھے، مولانا میمن صاحب کا وطن مالوف راج کوٹ (کاٹھیاواڑ) تھا، جہاں وہ ۱۸۸۸ء میں ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے آبائی پیشہ زمینداری تھا، بچپن ہی میں وہ حصول علم کے لیے دہلی چلے آئے، ان دنوں دہلی علوم اسلامیہ کا سب سے بڑا مرکز تھا، شہر میں باکمال علما کے درس و تدریس کے حلقے جگہ جگہ قائم تھے، میمن صاحب نے مولانا محمد بشیر سہسوانی سے جو نواب صدیق حسن کے زمانہ عروج میں بھوپال میں قاضی رہ چکے تھے، درسیات کی تحصیل کی، ادب کی تعلیم کے لیے وہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوئے جو عربی علم و ادب کے مسلم الثبوت استاد تھے، انھوں نے حماسہ، متنبی، مقامات اور سقط الزند ڈپٹی صاحب سے پڑھی میمن

صاحب بیان کرتے تھے کہ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم ترجمہ اس قدر خوبصورت کرتے تھے کہ تعریف نہیں ہوسکتی، امیر حبیب اللہ خاں والی افغانستان ایک دفعہ دہلی تشریف لائے تو ڈپٹی صاحب امیر حبیب اللہ خاں سے ملنے گئے، اتفاق سے عید کا دن تھا، ڈپٹی صاحب نے متنبّی کا عید اور وجہ حبیب والا شعر پڑھا، عید کے دن اور امیر صاحب کے نام سے مناسبت نے عجیب لطف پیدا کردیا، اور امیر صاحب بہت محظوظ ہوئے، اس زمانے میں معقولات کا بڑا شہرہ تھا، قدیم فلسفہ اور منطق کی کتابیں پڑھے بغیر کوئی شخص صحیح معنوں میں عالم کہلانے کا مستحق نہیں سمجھا جاتا تھا، ان علوم کا سب سے بڑا مرکز مدرسہ عالیہ رام پور تھا، علامہ محمد طیب مکی صدر مدرس تھے، جو بلند پایہ ادیب تھے، ان کی علمی شہرت کی وجہ سے نہ صرف ہندوستان بلکہ افغانستان اور ترکستان تک کے طلبہ رام پور کھنچے چلے آتے تھے، میمن صاحب نے رام پور جاکر علامہ طیب صاحب سے استفادہ کیا اور فراغت کے بعد دہلی چلے آئے، جہاں رہ کر پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات منشی فاضل اور مولوی فاضل ۱۹۰۸ء اور ۱۹۰۹ء میں پرائیوٹ طور پر پاس کئے اور یونیورسٹی میں اول آئے۔

اس وقت شہر دہلی مجمع الکمال بنا ہوا تھا، بڑے بڑے علماء، ادباء اور صلحاً وہاں موجود تھے، لیکن مولانا میمن افسوس سے ذکر کیا کرتے تھے، کہ دہلی احناف اور اہل حدیث علماء کے فقہی اختلافات کا اکھاڑہ بنی ہوئی تھی، فریقین میں مناظرے ہوا کرتے تھے اور یہ مناظرے بسا اوقات مجادلے اور مقاتلے بن جایا کرتے تھے، وہ بیان کرتے تھے کہ مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو انتقال کیے ہوئے تقریباً نصف زمانہ گذر چکا تھا، لیکن لوگوں کے دلوں میں بہادر شاہ کی یاد تازہ تھی، اس کی یہ غزل:

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ ۔۔۔ نہیں دل کو میرے قرار ہے

بچے بچے کی زبان پر تھی۔ دہلی کا خونی دروازہ، جہاں شہزادوں کو سولی دی گئی تھی، زیارت گاہ عوام وخواص تھا، ارزانی کا یہ عالم تھا کہ مصر کی چھپی ہوء صحیح بخاری ڈھائی تین روپے میں مل جاتی تھی۔

اس اثنا میں ان کو مشن کالج پشاور میں عربی وفارسی کے لکچرار کی جگہ مل گئی اور وہ پشاور چلے آئے، اس زمانے میں انھوں نے لاہور کے مشہور ادبی رسالہ مخزن میں عربی نصاب تعلیم کی اصلاح پر کئی مضامین لکھے، جن میں کافیہ اور شرح ملا جامی کے بجائے ابن ہشام کی کتابوں (شرح قطر الندیٰ اور شرح شذور الذہب) اور الفیہ کی شروح کو اختیار کرنے اور منطق وفلسفہ میں زیادہ انہماک کے بجائے علم حدیث کے اشتغال اور مزاولت پر زور دیا گیا تھا۔

اپریل ۱۹۲۱ء میں وہ مولوی محمد شفیع کی قدردانی سے اورینٹل کالج لاہور میں ایڈیشنل مولوی کی حیثیت سے تشریف لے آئے، یہ زمانہ اورینٹل کالج کے شباب کا تھا، شعبہ عربی میں مولوی محمد شفیع کے علاوہ مولوی نجم الدین اور مولانا سید محمد طلحہ (سید ابوالحسن علی ندوی کے پھوپھا) بھی تھے، جب کہ شعبہ فارسی میں ڈاکٹر محمد اقبال (ڈاکٹر داؤد رہبر کے والد) اور سید وجاہت حسین بلگرامی (رام پوری) تدریسی خدمات انجام دیتے تھے، ان اساتذہ کے علم وفضل اور تدریسی مہارت کی شہرت سن کر یو۔ پی، بہار، ریاست ہائے راجپوتانہ بلکہ حیدرآباد (دکن) تک سے بھی طلبہ لاہور کھنچے چلے آتے تھے، مولانا میمن کالج میں تدریس کے علاوہ اورینٹل کالج کے ہوسٹل کے بھی نگراں تھے، اس دور کے شاگردوں میں مولوی امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ مرحوم اور ڈاکٹر سید عبداللہ قابل ذکر ہیں، سید صاحب بیان کرتے ہیں کہ مولانا میمن سبعہ معلقہ اس مہارت اور عمدگی سے پڑھاتے تھے کہ تعریف نہیں ہوسکتی، لاہور کے زمانہ قیام میں انھوں نے مولوی محمد شفیع مرحوم کی ترغیب اور تشویق سے خزانۃ الادب (عبدالقادر بغدادی) کا انڈکس کلید الخزانہ کے نام سے شائع کیا، مشہور عرب شاعر ابوالعلاء المعری کے حالات اور فلسفہ شاعری میں ابوالعلاء المعری وما الیہ کے نام سے ایک جامع کتاب لکھی جو دارالمصنفین کی طرف سے قاہرہ سے چھپ کر شائع ہوئی، اس کے علاوہ انھوں نے ابن رشیق کے اشعار کا مجموعہ مختلف ادبی کتابوں کو کھنگال کر شائع کرایا۔ اورینٹل کالج میگزین کا اجرا ہوا تو مولوی محمد شفیع صاحب نے میمن صاحب کو بھی اردو میں لکھنے کی ترغیب دی اور ان کی ہر طرح سے علمی رہنمائی کی، حیرت ہے کہ میمن صاحب نے شفیع صاحب کے احسانات کا کبھی بھی اعتراف نہیں کیا۔ اس زمانے میں وہ معارف میں بھی لکھتے رہے۔

۱۹۲۵ء میں مسلم یونیورسٹی میں عربی کے ریڈر کی اسامی خالی ہوئی تو وہ غالبًا علامہ اقبال مرحوم ومغفور کی سعی وسفارش سے علی گڑھ چلے گئے میمن صاحب کے تقرر پر مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے معارف کے شذرات میں اظہار مسرت کیا تھا، میمن صاحب ۱۹۵۰ء میں صدر شعبہ عربی کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے، ان کی آمد سے قبل عربی شعبہ کا صدر جرمن یا برطانوی مستشرق ہوا کرتا تھا، جس کی وجہ سے یہ شعبہ خاطر خواہ ترقی نہیں کرسکا تھا۔

معیار تعلیم کی پستی کا یہ عالم تھا کہ ایم۔ اے (عربی) کے کورس میں بائبل کا عربی ترجمہ شامل تھا، میمن صاحب نے نصاب تعلیم کی اصلاح کی، عربی ادب کی امہات کتب، مثلاً الکامل (المبرد) اور کتاب العمدہ (ابن شیق) نصاب میں داخل کیں، شعبہ عربی کا وقار ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں قائم کیا اور طلبہ میں صحیح علمی ذوق اور ملکہ تحقیق پیدا کیا۔ ان کے درس وتدریس سے بہت سے مستعد طلبہ نے فائدہ اٹھایا۔

ان میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ (حیدرآباد سندھ اب اسلام آباد) ڈاکٹر محمد یوسف مرحوم (کراچی یونیورسٹی)، ڈاکٹر مختار الدین آرزو (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) اور ڈاکٹر خورشید احمد فارق (دہلی یونیورسٹی) قابل ذکر ہیں، افسوس ہے کہ ڈاکٹر محمد یوسف جن کو میمن صاحب بھی بہت مانتے تھے، ٹریفک کے حادثے میں گذشتہ ستمبر میں لندن میں

انتقال کرگئے۔

علی گڑھ کے قیام کے دوران میں ان کا قابل ذکر کارنامہ امالی القالی کی شرح کی اشاعت ہے، اس کی شرح ایک اندلسی عالم ابوعبید البکری نے اللآلی کے نام سے پانچویں صدی ہجری میں لکھی تھی جو نایاب تھی۔ میمن صاحب نے اس کے متعدد نسخے بہم پہنچائے، ان کے مقابلے اور تصحیح سے ایک صحیح نسخہ مرتب کیا، اس پر حواشی لکھے، شارح کی غلطیوں اور فروگذاشتوں کی نشاندہی کی اور ۱۹۳۵ء میں خود قاہرہ جا کر اس کو سمط اللآلی کے نام سے شائع کرایا علمی حلقوں میں اس کتاب کی خوب پذیرائی ہوئی۔ جو آئندہ چل کر عالم عرب میں ان کی شہرت اور تعارف کا ذریعہ بنی۔ امام عبدالقاہر الجرجانی نے ابوتمام بحتری و متنبّی کے دواوین کا انتخاب الطرائف الادبیہ کے نام سے کیا تھا۔ یہ بھی اسی زمانے میں میمن صاحب کے حواشی اور ضروری تشریحات کے ساتھ شائع ہوا۔ الفتح کے فاضل مدیر محبّ الدین الخطیب کی فرمائش پر خزانۃ الادب (عبدالقادر بغدادی) کی جدید اشاعت میں حصہ کیا۔ اس کی صرف چار جلدیں شائع ہوسکیں، یہ کتاب دیکھنے کو تو شیخ رضی کی شرح کافیہ کے شواہد کی شرح ہے، لیکن حقیقت میں عربی ادب کا خزانہ ہے، جس سے کوئی ادیب مستغنی نہیں ہوسکتا۔ اب اس کو مصر کے مشہور محقق عالم استاد عبدالسلام محمد ہارون جدید تحقیق، تصحیح اور تحشیہ کے جملہ لوازم کے ساتھ شائع کررہے ہیں، اور اس کی چھ سات جلدیں شائع ہوچکی ہیں۔

میمن صاحب نے مصری حکومت کے اصرار پر لسان العرب کی بھی تصحیح کی، لیکن اس کی صرف دو جلدیں شائع ہوسکیں، افسوس ہے کہ خطیب صاحب کی بے وقت موت کی وجہ سے یہ عظیم الشان کارنامہ ادھورا رہ گیا، ۱۹۵۰ء میں وہ کراچی یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے صدر بن کر پاکستان چلے آئے، اس دور کا علمی کارنامہ دیوان حمید بن ثور الہلالی اور الفاضل (المبرد) کی اشاعت ہے۔

دسمبر ۵۷ء میں راقم کو ان کی زیارت اور ملاقات کا پہلی دفعہ شرف حاصل ہوا، اسلامی کلوکیم (مذاکرہ) لاہور میں بہت سے مستشرقین اور عرب ممالک کے متعدد فضلا مدعو تھے، جن میں نمایاں شخصیت شام کے مشہور سلفی عالم شیخ محمد بہجت بیطار کی تھی، اس سے قبل میں ان کے علمی مقالات اور نئی کتابوں پر متوازن تبصرے مجمع العلمی العربی (دمشق) کے سہ ماہی مجلّہ میں پڑھ چکا تھا اور ان سے غائبانہ عقیدت رکھتا تھا، چنانچہ میں استاد محترم شیخ محمد العربی المراکشی کی معیت میں فلیٹی ہوٹل پہنچا، جہاں عرب مندوبین مقیم تھے۔ معلوم ہوا کہ شیخ محمد بہجت بیطار مولانا محمد ادریس کاندہلوی شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ کے ہاں چلے گئے ہیں۔ ان کی تلاش میں ایک اور صاحب بھی سرگرداں تھے، لمبا قد، چھریرا بدن، خشخشی داڑھی اور اچکن اور پاجامے میں ملبوس، مراکشی صاحب نے بتلایا کہ یہی مولانا عبدالعزیز میمن ہیں۔ ہم سب مل کر مولانا محمد ادریس کاندہلوی کے فضیلت کدے پر پہنچے جہاں بیطار صاحب بلبل ہزار داستان بنے شیعوں کے متعلق لطائف وظرائف بیان کررہے تھے، اور انھوں نے ساری محفل کو کشت زعفران بنا رکھا تھا۔ ان کے ساتھ شام کے مشہور عالم استاد محمد المبارک بھی تھے، میمن صاحب کی آمد پر علمی مسائل چھڑ گئے جس میں میرے اندازے میں میمن صاحب کا پلہ بھاری رہا۔ وہاں سے یونیورسٹی آتے ہوئے راستے میں پنجاب یونیورسٹی کی چھوٹی سی مسجد پڑی، جس کی پیشانی پر یہ شعر کندہ تھا۔

چراغ و مسجد و محراب و منبر
ابوبکرؓ و عمرؓ عثمانؓ و حیدرؓ

شیخ بہجت بیطار نے اس شعر کا مطلب دریافت کیا۔ راقم نے اس کا مطلب اردو میں جناب محمد العربی المراکشی سے بیان کیا اور انھوں نے اس کا مفہوم عربی میں شیخ صاحب کو سمجھایا بیس اکیس برس گذرنے کے باوجود اس محفل کی یاد شرکاء کے دلوں میں ابھی تک تازہ ہے، ۱۹۶۰ء سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ و ادارہ تحقیقات اسلامی قائم ہوئی تو میمن صاحب اس سے متعلق ہوگئے۔ اس وقت سب سے مشکل کام کتب خانہ کی فراہمی تھی۔ اس کے لیے انھوں نے عراق، شام، ترکی اور تونس وغیرہ کا سفر کیا اور ضروری کتابیں خرید لائے۔ اب ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد کا کتب خانہ مطبوعات کے لحاظ سے کسی بڑے سے بڑے کتب خانے سے کم نہیں۔ ۱۹۶۴ء میں وہ پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کی قدردانی اور معارف پروری کی بدولت عربی زبان کے صدر شعبہ بن کر اورینٹل کالج میں تشریف لے آئے اور لاہور میں دو سال مقیم رہے، افسوس ہے کہ اس دفعہ ان سے خاطرخواہ استفادہ نہ ہوسکا۔ اب وہ پیرانہ سالی کی وجہ سے درس و تدریس کے بجائے علمی و تحقیقی کاموں میں رہنمائی کے لیے زیادہ سودمند ہوسکتے تھے۔

ان کا معمول تھا کہ وہ ہر اتوار کو مولانا عبیدالحق خاں ندوی کے مکتبۃ العلمیہ میں آجاتے تھے، عربی زبان و ادب سے مشغف رکھنے والے اصحاب بھی ان سے ملنے وہیں چلے آتے تھے۔ راقم السطور بھی بالالتزام ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا۔ یہ پرلطف نشست دو ڈھائی گھنٹے جاری رہتی تھی اور علمائے سلف، ان کی نادر تصانیف، نواب صدیق حسن خان کی علمی خدمات اور ہندوستانی محدثین کے کارناموں کے ذکر سے معمور رہتی تھی۔ ان کی گفتگو کا دل پسند موضوع نادر علمی کتابیں تھیں جن کی تلاش اور جستجو میں انھوں نے دمشق، قاہرہ، قسطنطنیہ اور رباط کے کتب خانے چھان مارے تھے قسطنطنیہ کے علمی خزائن، عجائب گھر اور سلاطین آل عثمان تک کے تاریخی آثار، وہ دلکش موضوع تھا جس پر وہ حاضرین مجلس کو گھنٹوں اپنی پرلطف گفتگو سے لطف اندوز کرتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے سلطان ٹیپو کی سفارت کا حال سنایا جو سلطان نے خلیفۃ المسلمین کی

خدمت میں مدد واعانت کے لیے قسطنطنیہ بھیجی تھی۔اس سفارت کو زیادہ پذیرائی حاصل نہ ہوسکی اوراس کے ارکان قسطنطنیہ ہی میں مرکھپ گئے۔میمن صاحب بتلاتے تھے کہ ان کا قبرستان آج بھی وہاں موجود ہے۔اس مجلس میں وہ کبھی دل لگی اور تفنن ومزاح کی باتیں بھی کیا کرتے تھے۔ عالم عرب کے بیشتر فضلاء سے ان کے گہرے اور ذاتی تعلقات تھے اور وہ ان کا ذکر کرتے رہتے تھے۔عربوں میں وہ شامیوں کی مہمان نوازی، نرم خوئی اور خوش اخلاقی کے بڑے معترف تھے۔ اسی طرح وہ اہل تونس کی تہذیب وشائستگی کے بڑے مداح تھے اور بتلاتے تھے کہ بیشتر تونسی، ان مہاجروں کی اولاد ہیں جو اندلس کو خیر باد کہہ کر شمالی افریقہ میں پناہ گزیں ہوگئے تھے۔وہ جامعہ زیتونہ کے شیخ الجامعہ طاہر بن عاشور کی بھی تعریف کیا کرتے تھے۔جو بڑھاپے میں بھی نواب صدیق حسن کی طرح خوبصورت اور دیدہ زیب دکھائی دیتے تھے۔شیخ طاہر بن عاشور نے قرآن مجید کی تفسیر **التحریر و التنویر فی التفسیر** کے نام سے لکھی ہے اوراس میں اعجاز القرآن سے خاص طور پر اعتناء کیا ہے، وہ مصر جدید کی فرعون پرستی سے سخت متنفر تھے۔عرب قوم پرستی جس کا مقصد عربوں کو غیر عرب مسلمانوں سے دور رکھنا ہے، خود عربوں کے حق میں مضر سمجھتے تھے۔ برخلاف اس کے وہ ترکوں کی علمی سرپرستی کے لیے بے حد مداح تھے جن کی علمی سرپرستی کی بدولت اسلاف کے علمی خزانے تباہ ہونے سے بچ گئے۔اسلامی ممالک کی دینی اوراسلامی تحریکوں پر بھی ان کی نظر اچھی تھی۔

لاہور سے سبکدوش ہوکر وہ کراچی چلے گئے اور وہاں خاموش زندگی گذارنے لگے۔اس کے بعد بھی وہ ایک دو بار لاہور تشریف لائے اور ان سے نیاز حاصل ہوتا رہا۔اس زمانے میں انھوں نے ابوتمام کا دیوان **الحماسة الصغری** اور علی بن حمزہ بصری کی **التنبیهات علی اغالیط الرواۃ** شائع کیں۔مجلّہ **مجمع اللغته العربی** (سابق مجلّہ مجمع العلمی العربی) دمشق میں انھوں نے معجم الادباء (یاقوت) پرنقد وتبصرہ لکھا جو کئی قسطوں میں شائع ہوتا رہا۔وہ امام رضی الدین صاغانی کی **العباب الزاخر** کی اشاعت کی بڑی آرزو رکھتے تھے، چنانچہ اسی رسالہ میں انھوں نے اس کا مقدمہ بھی شائع کیا تھا۔کراچی میں جناب ممتاز حسن مرحوم (سابق معتمد مالیات حکومت پاکستان) اور پیر حسام الدین راشدی ان کے بڑے مداح اور عقیدت مند تھے۔علمی حلقوں میں ان کی بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور باہمی طنز وتضحیک مشہور تھی۔ممتاز حسن مرحوم کی تحریک سے انھوں نے اردو بورڈ کے زیر اہتمام عربی لغت اوراس کی خصوصیات پر کئی خطبات دیے تھے جو اردو بورڈ کے سہ ماہی مجلّے میں کئی قسطوں میں شائع ہوئے تھے۔اب ضرورت ہے کہ پیر حسام الدین راشدی ان خطبوں کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا اہتمام فرمائیں۔میمن صاحب چند برس سے تنہائی اور کسمپرسی کی زندگی بسر کررہے تھے، تین چار برس ہوئے کہ ان کی اہلیہ کا انتقال ہوچکا تھا،اورلڑکے ملازمت کے سلسلہ میں کہیں باہر مقیم تھے۔صرف ایک پوتا ان کی خبر گیری کیا کرتا تھا۔آخر عمر میں نہایت لاغراور کمزور ہوگئے تھے۔

آخر تک حافظہ برابر اپنا کام کرتا رہا اور کتابیں ان کی مونس وہمدم رہیں۔انھوں نے نوے ۹۰ برس کی عمر میں، جو طویل تعلیمی اور علمی خدمات سے معمور تھی، ۲۷/اکتوبر ۱۹۷۸ء کو انتقال کیا۔

علم وفضل: مولانا عبدالعزیز میمن یادداشت میں علمائے سلف کا نمونہ تھے۔سیکڑوں عربی قصائد اور ہزاروں اشعار نوک زبان تھے۔ کتب درسیہ میں دیوان المتنبی اور دیوان الحماسہ تقریباً مکمل حفظ تھے۔مفضلیات، لکامل (المبرد) اور کتاب البیان والتبیین (جاحظ) کے بیشتر حصے ازبر تھے۔ وہ عرب ممالک میں ابوالعلاء المعری پر اتھارٹی (سند) سمجھے جاتے تھے۔نادر علمی کتابوں کی اشاعت اور انتخاب میں ان سے مشورہ ناگزیر تھا۔وہ مجمع اللغتہ دمشق اور قاہرہ کے بھی رکن تھے۔میمن صاحب مسلکاً اہل حدیث تھے، لیکن ذہنی جمود نام کو بھی نہ تھا۔سیروسیاحت اور مختلف الخیال اصحاب فکر کی میل ملاقات نے ان کو وسیع النظر بنا دیا تھا۔وہ امام شافعیؒ کے بے حد عقیدت منداور مداح تھے اور اصول فقہ میں ان کے ''الرسالہ'' کی عربیت کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے۔فقہا میں ابن حزم اور ابن عبدالبر کی جامعیت اور بغدادی کی ادبیت کے بڑے قائل تھے، کہا کرتے تھے کہ جتنے علمی وادبی ماخذ ومصادر عبدالقادر بغدادی (مصنف خزانۃ الادب) کی دسترس میں تھے، وہ آج تک کسی عالم یا ادیب کو حاصل نہیں ہوسکے۔مستشرقین میں وہ مسٹر سالم کرینکو (Krenkow) جو ان کے ساتھ علی گڑھ میں کام کرچکے تھے، تبحر علمی، وسعت معلومات اور ژرف نگاہی کے ثناخوان تھے۔

اصلاحی خیالات: مولانا میمن درس نظامی کے نصاب تعلیم میں اصلاح وترمیم کی ضرورت شدت سے محسوس کرتے تھے، نحو میں کافیہ اور شرح ملا جامی جیسی کتابوں کے بجائے الفیہ کی بعض شروح اور ابن ہشام کی کتابیں پسند کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے لیے امام نووی کی ریاض الصالحین کی سفارش کرتے تھے، جس میں نور نبوت کے علاوہ ادبی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔اس کے علاوہ وہ سنن ابی داؤد کی کتاب الادعیہ اور ترمذی کی کتاب الزہد والرقاق کے مطالعہ کی بھی تاکید کیا کرتے تھے۔تفسیر میں جلالین کے بجائے جامع البیان کی افادیت کے قائل تھے۔ابن خلدون نے جن کتابوں کو اصولِ فن ادب قرار دیا ہے، ان کے متعلق انھوں نے الندوہ (دور جدید) میں میری محسن کتابوں کے عنوان کے تحت بڑا دلچسپ تبصرہ لکھا تھا۔ان کی یہ رائے تھی کہ الکامل (المبرد) ایک مبتدی کے لیے زیادہ مفید ہے۔ادب الکاتب کو اقتضاب کے ساتھ پڑھا جائے تو انسان کو ایک محقق لغوی بنا سکتی ہے، کتاب البیان والتبیین (جاحظ) میں فصیح نظم ونثر کے نمونے ان چاروں سے زیادہ ہیں، اور نوادر لغت وشعر امالی القالی میں سب سے زیادہ ہیں۔ان

کے نزدیک حماسات میں ابوتمام کا دیوان الحماسہ سب سے عمدہ اور بہتر ہے اور نقد الشعر کے لیے ابن رشیق کی کتاب العمدہ بہترین کتاب ہے۔ کہا کرتے تھے کہ الغریب المصنف (ابن سلام) اور اصلاح المنطق (ابن السکیت) وہ کتابیں ہیں، جن کا یاد ہونا ایک ادیب کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اول الذکر شاید ابھی تک شائع نہیں ہوسکی جب کہ موخر الذکر کتاب استاد عبدالسلام محمد ہارون کی علمی کاوش سے بڑی آب و تاب سے شائع ہوچکی ہے۔

اس علم و فضل کے باوجود تمکنت نام کو نہ تھی، طرزِ معاشرت سادہ اور درویشانہ تھی، وہ سودا سلف خود بازار سے خرید کر لاتے تھے۔ حقہ کے شوقین تھے۔ شاگرد تمبا کو اور چلمیں دور دور سے لاکر دیتے تھے۔ طالب علموں کے استفسارات کا خندہ پیشانی سے جواب دیتے تھے، لیکن زیادہ سوالوں سے گھبراتے تھے۔ لاہور اور کراچی کے بعض احباب ان کی تنک مزاجی اور زودرنجی کے افسانے سناتے ہیں، لیکن ان کی حیثیت سنی سنائی باتوں سے زیادہ نہیں انھوں نے عربی خواں طلبہ کے وظائف کے لیے لاکھوں روپوں کے عطیات کراچی اور پنجاب کی یونیورسٹیوں کو دیئے۔ شاید دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو بھی ان کی فیاضی سے محروم نہ رہا۔

انھوں نے اپنا قیمتی کتب خانہ حیدرآباد یونیورسٹی کو دے دیا۔ جب حدیث کی مشہور کتاب مصنف عبدالرزاق شائع ہوئی تو پچاس ۵۰ ہزار روپے خرچ کرکے اس کے بہت سے نسخے خریدے اور عربی مدارس اور یونیورسٹیوں میں مفت تقسیم کیئے۔ راقم السطور پر ان کا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے ادب سے ہٹا کر علم حدیث کی طرف متوجہ کیا، اس کی اہمیت اور افادیت واضح کی اور ہندوستانی محدثین کی عظمت اور ان کے علمی کارناموں سے متعارف کرایا۔ لاہور سے روانہ ہوتے وقت انھوں نے مجھے عربی کا ایک شعر لکھ کر دیا تھا اور میں اسی شعر پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

مازال تکتب فی الحدیث مجتہدا

حتی وجدناک فی الحدیث مکتوبا

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب پاک ﷺ کی زبان کی خدمت کے صدقے میں ان کے درجات بلند کرے اور ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین!!

(جنوری ۱۹۷۹ء)

خان، یوسف حسین، ڈاکٹر

ڈاکٹر یوسف حسین مرحوم

معارف کا زیادہ تر حصہ لکھا جاچکا تھا کہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے انتقال پر ملال کی خبر ملی، وہ ہماری مجلسِ انتظامیہ کے بہت پرانے رکن تھے، ان کی وفات سے یہ ملک ایک شریف ترین انسان، ایک خلیق بزرگ، ایک اچھے دوست اور ایک بہت ہی نامور مصنف سے محروم ہوگیا، اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا کریں۔ (''ص۔ع''، مارچ ۱۹۷۹ء)

ڈاکٹر یوسف حسین مرحوم

گذشتہ ۲۱/ فروری کی رات کو ریڈیو میں خبر سنی کہ ڈاکٹر یوسف حسین اللہ کو پیارے ہوئے یہ خبر سن کر ایسا معلوم ہوا کہ کوئی شفیق بزرگ دائمی مفارقت دے گیا، رات بڑے کرب سے گذری۔

ان سے میرا پہلا تعارف ۱۹۳۴ء میں ہوا میں کچھ دنوں جامعہ ملیہ میں بھی رہا، قرول باغ کے جس مکان میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم جامعہ ملیہ کے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے سکونت پذیر تھے، اسی کے پاس میں ایک مکان میں مقیم تھا، ان دنوں ڈاکٹر یوسف حسین جامعہ عثمانیہ میں تاریخ کے استاد تھے، عید منانے اپنے محبوب بھائی ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے پاس آگئے تھے، ان کو پہلی دفعہ دیکھا تو سفید شیروانی میں ملبوس تھے، بہت ہی شکیل اور رعنا جوان نظر آئے، اسی زمانہ میں ان کے بھتیجے امتیاز حسین مرحوم یعنی ان کے سب سے بڑے بھائی کے لڑکے جامعہ ملیہ سے بی۔اے کی تعلیم سے فارغ ہوئے تھے اور مزید تعلیم کے لیے یورپ جانے کی فکر میں تھے، وہ خالی اوقات میں میرے پاس آجاتے، ان سے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے گھر کی عورتیں ڈاکٹر یوسف حسین صاحب کو خوش قسمت اور مالدار سمجھتی ہیں، کیونکہ ان کے یہاں اچھے سوفہ سٹ اور دوسرے فرنیچرس جو اس زمانہ میں ہیں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے یہاں نہ تھے۔

ڈاکٹر یوسف حسین کے ساتھ عید کی نماز پڑھنے عیدگاہ گیا اور ان کی وجاہت سے مرعوب ہوکر گھر واپس آیا ان ہی دنوں ڈاکٹر یوسف حسین نے گارسان دتاسی کے خطبات کے کچھ حصے کا اردو ترجمہ کیا تھا، جو رسالہ اردو حیدرآباد دکن میں شائع ہو رہا تھا یہ ڈاکٹر عبدالحق کی ادارت میں نکل رہا تھا، اس میں کسی کی تحریر کا شائع ہونا اس کی علمی قابلیت کی بڑی سند تھی، ڈاکٹر صاحب جامعہ ملیہ سے بی۔اے کرکے فرانس گئے اور پیرس یونیورسٹی سے ڈی۔لٹ کی ڈگری حاصل کی وہاں کے قیام کے زمانہ میں انہوں نے فرانسیسی زبان بڑی محنت سے سیکھی اور اس میں مہارت حاصل کی ہندوستان آکر ڈاکٹر عبدالحق کی فرمائش پر انہوں نے خطبات گارسان دتاسی کا ترجمہ شروع کیا تو اس کے پندرہ خطبات کے ترجمے کیے جب یہ کتاب ۱۹۳۵ء میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہوئی تو ڈاکٹر عبدالحق ان کے بہت شکر گذار ہوئے اس وقت وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ کے ریڈر ہوچکے تھے، انہوں نے فرانسیسی ادب کے نام سے

ایک کتاب بھی لکھی۔

مجھ کو دارالمصنفین آئے ہوئے کچھ دن ہوئے تھے کہ ان کی انگریزی کتاب نظام الملک جاہ معارف میں ریویو کے لیے ۱۹۳۶ء میں آئی اس کو بہت شوق سے پڑھا اور انگریزی زبان میں ان کی تحریری قدرت کا قائل ہوا اس کتاب میں انہوں نے نظام الملک آصف جاہ کی سیرت نگاری جس طرح کی ہے وہ نظام حیدرآباد کے خاندان سے ان کی محبت کا ثبوت ہے حیدرآباد میں ان کی زندگی کے بہت اچھے دن گذرے اور اس کی یادوں کی قندیلیں برابر روشن کرتے رہے۔

''نظام الملک دوسرے مذاہب کے لیے بڑے رواداد تھے، لیکن اپنے اسلامی عقائد میں بھی پختہ تھے، ان کی یہ پختگی بچپن ہی سے تھی، وہ زحمت گوارا کر کے تمام مذہبی مراسم اور عقائد کو بڑے اہتمام سے بروئے کار لائے وہ اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں قرآن اور سنت کے احکام کی پابندی کرتے، لیکن وہ غالی قسم کے متعصب مسلمان نہ تھے، وہ دوسروں کے مذاہب کا احترام کرتے، غیر مسلموں کو اہم اور اعلیٰ عہدوں پر مامور کرتے، یہی روش ان کے جانشینوں نے اختیار کی، ان کے مزاج کی بے پناہ اچھائیوں اور انسانیت نوازی کی وہ تمام لوگ قدر کرتے جن کا واسطہ ان سے پڑتا، وہ ان کی مدح کرنے کے ساتھ ان سے محبت کرتے، اس زمانہ میں جب کہ ہندوستان کے اور دوسرے حکمرانوں اور قائدوں کی سیرت کی سطح بہت ہی نیچی ہوگئی تھی، تو اس برے زمانہ میں نظام الملک کا اچھا کردار نمایاں ہو کر ابھرا''۔ (ص: ۲۰۴)

ان کی اہم تصنیف روح اقبال ۱۹۴۱ء میں شائع ہوئی تو اس سے ہندو پاک کے تمام ارباب ذوق ان کی ادبی بالغ نظری سے متاثر ہوئے، چٹان کے ایڈیٹر شورش کاشمیری مرحوم نے اس کی اشاعت پر لکھا کہ اس سے بہتر کتاب تو پاکستان میں بھی نہیں لکھی گئی ان کو اقبال سے عشق تھا، اسی لیے اس کے لکھنے میں ان کے ہر صفحہ پر سرشارانہ کیفیت دکھائی دیتی ہے، شروع میں جب یہ کتاب شائع ہوئی تو اس کو پڑھ کر اس کے ناظرین شاید یہ کہہ اٹھے ہوں گے کہ اس کی ہر سطر پر ایک کرشمہ حسن ہے جس کی طرف دامن دل کھنچ کر رہ جاتا ہے، انہوں نے اس کی ابتدا ہی ایسے انداز میں کی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ لکھتے وقت ان پر اقبال کی محبت اور عقیدت کا نشہ چھایا ہوا ہے۔

''اقبال کی طبیعت ایسی ہمہ گیر اور ہمہ جو تھی اور اس کی شخصیت میں ایسے مختلف عناصر جمع ہو گئے تھے جو عام طور پر کسی ایک شخص کی زندگی میں شاذ و نادر ہی ملتے ہیں، اس کے ذہن اور اس کی زندگی میں بلا کی وسعت تھی، اس کے جمال پرست اور عشق پروروں نے اپنے تخیل کی گل کاریوں سے اپنی ایک الگ دنیا آباد کر لی تھی، اس دنیا کی خیالی تصویر میں اس نے اپنے جذبات کے موئے قلم سے ایسی رنگارنگی اور تنوع پیدا کیا کہ انسانی نظر جب اس تصویر پر پڑتی ہے تو پھر ہٹنے کا نام نہیں لیتی، اقبال کا آرٹ دلوں کو لبھانے کے طلسم میں پوشیدہ ہے، اقبال کے جسم خاکی میں ایک مصلح حیات کی عرفان جو صداقت پسند اور نظم آفرین روح تھی، جو جذبہ دینی کے تحت انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ضبط و نظم قائم کرنا چاہتی تھی، وہ شاعر بھی تھا، اور حکیم نکتہ داں بھی اس کے ہاں درد و سوز بھی ہے اور رندی و مستی بھی، نصیحتیں بھی ہیں، اور دین و تمدن کی تعلیم بھی، عقل و عشق کی ابدی کش مکش کا بیان بھی ہے اور حسن کی کرشمہ سازیوں کی نقاشی بھی''۔

یہ اور نقادوں کی طرح محض عبارت آرائی نہیں، یہ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اقبال کے آرٹ، شاعرانہ مسلک، تخیلی پیکر، محساکات، خودی، مقاصد آفرینی، انسانی فضیلت، تاریخی استقراء، انسان کامل، حیات اجتماعی، فرد، جماعت، مملکت، تمدن، نظام معیشت، تقدیر، جبر و اختیار، عشق اور موت کے تخیلات کے گہرے مطالعہ کے بعد لکھا ہے، اور جس انداز میں انہوں نے اقبال کے ان تفکرات کو سمجھ کر سمجھایا وہ اقبال شناسی میں عرصہ دراز تک مدد دیتا رہے گا، اقبال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اور آیندہ اس سے بھی زیادہ لکھا جائے گا، لیکن ڈاکٹر یوسف حسین کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اقبال کو پہلی دفعہ جس طرح سمجھانے کی کوشش کی، اسی کی آواز بازگشت بعد میں سنائی دی غالب کو سمجھانے میں اولیت کا جو درجہ حالی کی یادگار غالب کو ہے وہی اقبال کو سمجھانے میں روح اقبال کا ہے۔

روح اقبال کے بعد ان کی مشہور کتاب اردو غزل منظرِ عام پر ۱۹۵۲ء میں آئی تو اس سے لوگ اردو شعر و شاعری میں ان کی گہری بصیرت سے متاثر ہوئے اور یہ پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اردو ادب کے حلقہ میں اردو غزل کو سمجھنے میں اس کتاب سے بڑی مدد ملی انہوں نے اردو غزل کو چار سو صفحے سے زیادہ میں سمجھایا ہے اور جس دیدہ وری اور عرق ریزی سے اس کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے وہ ان نقادوں کے لیے ایک درس ہے جو چھوٹے چھوٹے مقالات لکھ کر اردو کے نقادوں کی صف اول میں جگہ پانے میں کوشاں رہتے ہیں، وہ غزل کے متعلق لکھتے ہیں:

''شعر کو قدر کا خادم ہونا چاہیے نہ کہ اس کو مٹانے والا غزل گو شاعر جب زندگی کا ذکر کرے گا تو لازمی طور پر اس کے لامحدود امکانوں کی طرف اس کی نظر جائیگی، وہ کبھی اپنی خواہشوں کا رنگ ان پر چڑھائے گا ورکبھی ان کے اثر سے اپنی آرزوؤں کی صورت گری کرے گا وہ حسن آفرینی بھی کرے گا اور قدر آفرینی بھی، لیکن یہ کام وہ تجرید اور منطقی مقدمات سے نہیں انجام دے سکتا جن کا لازمی نتیجہ کلام میں بے لطف یکسانیت اور سپاٹ پن ہوگا شاعری کی فکر تخیلی اور وجدانی ہونی چاہیے جس میں اندرونی جذبے کا رس رچا ہوا ہو بغیر اس کے کلام

میں تاثیر اور دل کشی نہیں پیدا ہوسکتی، شعر کی خوبی کا معیار نہ اسلوب میں پنہاں ہے اور نہ موضوع میں بلکہ شعریت میں جو دونوں سے بالاتر ہے ہم یہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ شعریت تخیلی فکر اور جذبے کی ہم آمیزی کے بغیر نہیں پیدا ہوسکتی اور یہی دونوں اجزاء غزل کی جان ہیں، انہیں سے حسن ادا کی جلوہ گری ہوتی ہے، جو ادب کی بنیادی قدر ہے''۔(اردو غزل، ص۴۰۳۔۴۰۴)

ڈاکٹر صاحب غزل کو سمجھنے کے لیے گویا یہ پیام چھوڑ گئے ہیں اور جس صاف ستھری اور نکھری ہوئی اردو میں یہ تحریر قلمبند ہوئی ہے اسی کی شان پوری ''اردو غزل'' میں جلوہ گر ہے، جس کا انشا پردازانہ انداز ارباب ذوق کے ادبی کام و دہن کے لطف و لذت کا باعث بنا رہے گا۔

ڈاکٹر صاحب حسرت موہانی کی غزل گوئی سے اس قدر متاثر تھے کہ انہوں نے اپنی یہ کتاب ان ہی کے نام سے معنون کی، ان کی ایک مستقل کتاب ''حسرت کی شاعری'' کے نام سے بھی شائع ہوئی، جس میں ڈاکٹر صاحب نے ان کو اپنا خراج عقیدت ناقدانہ انداز میں پیش کیا ہے، حسرت کی غزلوں کے استفہامی اشعار اور پھر جمع کے استعمال سے وہ اپنے کلام میں جو تاثیر اور حسن پیدا کرتے ہیں وہ ڈاکٹر صاحب کو خاص طور پر پسند تھا۔

وہ اردو میں لکھنے کے ساتھ انگریزی میں بھی برابر کچھ لکھتے رہے، اسلامک کلچر حیدرآباد میں ان کے جو مضامین نکلے وہ ۱۹۵۷ء میں کتاب کی صورت میں Glimpses of medieval Indian culture کے نام سے شائع ہوئی جس کے اندر علیحدہ علیحدہ ابواب میں یہ عنوانات ہیں، اسلام اور بھکتی کا عقیدہ، ہندوستان میں تصوف، تعلیمی نظام، اردو زبان کا ارتقاء، معاشرتی اور اقتصادی حالات، ہندوستان کے عہد وسطیٰ میں ان موضوعات سے جس کو بھی دلچسپی ہے وہ ان کو پڑھ کر ان سے استفادہ کرنے پر مجبور ہے۔

وہ جامعہ عثمانیہ سے پنشن پاکر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اس کے پرو وائس چانسلر سات سال تک رہے تو ان سے علی گڑھ میں برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں، میری کچھ تصانیف بھی اس وقت تک شائع ہوچکی تھیں، میں ان سے ملنے جاتا تو میری تصانیف کو اپنی الماری میں دکھاتے اور اس وقت گھر میں جو میٹھی چیز ہوتی اس سے تواضع کرتے ان کو رساول بہت مرغوب تھی، گھر میں موجود ہوتی تو اصرار کرکے کھلاتے۔

وہ دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے رکن بھی نامزد ہوئے تو ان سے تعلقات اور بھی قریب تر ہوگئے، ۱۹۶۵ء میں دارالمصنفین کی طلائی جوبلی ہوئی تو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے ساتھ وہ بھی دارالمصنفین تشریف لائے اسی کے بعد انہوں نے اپنی کتاب ''یادوں کی دنیا'' لکھی تھی جو مجھ کو اور جناب شاہ معین الدین کو اس قدر پسند آئی کہ دارالمصنفین کے سلسلہ کتب میں تو نہیں لیکن اس کی طباعت معارف میں کرائی ان کی یہ کتاب بھی بہت مقبول ہوئی، یہ گویا ان کی خودنوشتہ سوانح عمری کی شکل میں ان کے بیتے ہوئے زمانے کی یادیں ہیں ان کی قوت ارادی نے ان کے حافظہ کے دروازے کو کھٹکھٹایا تو یہ سب کے سب لبیک کہتے ہوئے حاضر ہوئے جس میں جذبہ کی رنگ آمیزی اور خیالی پیکروں کی تحلیل کے ساتھ ان کے آباء و اجداد و خاندان، ڈاکٹر ذاکر حسین، جامعہ ملیہ دیارِ فرنگ، دیار تلنگ، علی گڑھ، اور بہت سی علمی ادبی اور سیاسی شخصیتوں کا بہت ہی دلچسپ مرقع ہے دو سات سال تک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پرو وائس چانسلر رہ چکے تھے، اس لیے یونیورسٹی کے لیے دل میں بڑا درد اور نرم گوشہ رکھتے تھے، اس کتاب میں مسلم یونیورسٹی کے اسلامی کردار کے رہنے اور نہ رہنے کے مسئلہ پر بڑی دلسوزی سے لکھتے ہیں:

''جو لوگ اسلامی کردار کے مفہوم سے ناآشنا ہیں یا جن کی نگاہ میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے وہ اسے قومی وحدت کے تصور کے منافی سمجھتے ہیں، اسلامی کردار سے مراد یہ ہے کہ مسلمان طلبہ میں دینی احساس، اسلامی شعائر کا احترام، قومیت کے جذبہ کے ساتھ ساتھ بیدار ہو، یونیورسٹی کے تمام شعبوں میں خواہ تعلیمی ہوں یا انتظامی، مسلمانوں کی نمایاں اکثریت رہے، حکومت کے نامزد ارکان کی تعداد کم سے کم رکھی جائے، غیر مسلم ارکان ایسے منتخب اور نامزد کیے جائیں جو مسلمانوں کی تہذیب اور روایات سے واقف ہوں اور یونیورسٹی کے سچے ہمدرد ہوں، یہ باتیں نہ رجعت پسندی ہیں اور نہ فرقہ واریت اور نہ قومی وحدت اور سیکولرزم کے خلاف بلکہ اقلیتوں کا تسلیم شدہ دستوری حق ہے، جس کو حکومت سلب نہیں کرسکتی، سوائے ایسی صورت کے کہ وہ انصافی پر اتر آئے''۔(ص:۴۵۹،۶۰)

ڈاکٹر صاحب نے یہ لکھ کر ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کی صحیح ترجمانی کی ہے، اور وہ مسلم یونیورسٹی کیا مسلمانوں کی دینی حمیت اور ملی غیرت کے ترجمان اپنی ادبی تحریروں میں بھی بنے رہے، میں پاکستان گیا ہوا تھا تو اس کتاب کا ذکر خیر وہاں کے علمی حلقہ میں برابر آیا اس کتاب کی اشاعت کے بعد اردو غزل کا حقِ طباعت دارالمصنفین کو دیا جو یہاں سے شائع ہوکر فروخت ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر یوسف صاحب کو اقبال کے ساتھ غالب سے بھی عشق تھا، انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ وہ یورپ تعلیم کے لیے گئے تو اپنے ساتھ صرف تین کتابیں لے گئے، کلام مجید، کلام اقبال کا مجموعہ اور دیوانِ غالب، اسی لیے انہوں نے ۱۹۶۸ء میں غالب اور آہنگ غالب لکھی، اردو غزل میں غالب پر جو باتیں اختصار سے لکھی تھیں، اسی کو پھیلا کر اس کتاب میں لکھیں جو ۳۰۴ صفحے پر مشتمل ہے، غالب پر انہوں نے جو کچھ لکھا ہے

اس پر میں نے اپنی کتاب غالب مدح وقدح کی روشنی میں بڑا المبا تبصرہ کیا ہے اور خوش تھا کہ ڈاکٹر صاحب اس کو پڑھ کر ضرور محظوظ ہوں گے، مگر افسوس یہ کتاب اب شائع ہوئی جب ان کی رحلت ہوچکی ہے یہ حصہ ان کی نظر سے نہیں گذرا تو کتاب کی طباعت سے زیادہ خوشی نہیں ہوئی۔

غالب کی صد سالہ برسی منائی گئی تھی، اس موقع پر جتنے مقالات لکھے اور پڑھے گئے، وہ ان ہی کی نگرانی میں بین الاقوامی غالب سیمینار کے نام سے شائع ہوئے۔

اس اثنا میں جب دہلی جاتا تو ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا، اور وہ اپنے یہاں کھانا کھلائے بغیر رخصت نہ ہونے دیتے۔

۱۹۷۶ء میں امیر خسرو کا سات سو سالہ جشن حکومت ہند کی طرف سے منایا گیا تو اس میں مجھ کو بھی شرکت کی دعوت تھی، اس کے مختلف اجلاس میں ڈاکٹر صاحب خاص طور پر مجھ کو بلا کر اپنے پاس بٹھاتے، جناب علی یاور جنگ گورنر بمبئی کی نگرانی میں اس جشن کی ساری کارروائیاں انجام پارہی تھیں، اس موقع پر امیر خسرو سے متعلق بہت کچھ ناروا باتیں کہی جارہی تھیں، مجھ کو خسرو سے عشق ہے، ہر ناروا بات کا جواب دیتا رہا، اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب مرحوم نے میری بڑی ہمت افزائی کی، جب امیر خسرو سے متعلق کوئی ناخوشگوار بات کہی جاتا تو وہ مجھ سے چپکے سے کہتے ''اٹھو اور جواب دو'' میرا جواب سن کر میری پیٹھ پر تھپکی دیتے۔

اسی موقع پر راشٹر پتی بھون میں حکومت ہند کی طرف سے ایٹ ہوم تھا ڈاکٹر صاحب اصرار کرکے مجھ کو اپنے ساتھ وہاں لے گئے ان دنوں دارالمصنفین کا کچھ مسئلہ ایسا تھا، جس کے متعلق ایک مسلمان وزیر حکومت ہند سے گفتگو کرنے والا تھا، مگر ڈاکٹر صاحب رکن مجلس انتظامیہ دارالمصنفین کی حیثیت سے پسند نہیں کرتے تھے، کہ ان سے گفتگو کی جائے، اتفاق سے وزیر صاحب بھی ایٹ ہوم میں تشریف لائے تو میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کیا حرج ہے، اگر ان سے اس مسئلہ پر رسمی گفتگو ہی کرلی جائے یہ سنا تو میرا ہاتھ پکڑ کر بولے نہ جاؤ ان سے فائدہ کے بجائے نقصان ہی پہنچ جائے گا پھر ان کے پاس جانے سے روک لیا۔

۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی کتاب ''حافظ اور اقبال'' شائع ہوئی جس کے نام ہی سے ارباب ذوق چونکے، کیونکہ ڈاکٹر صاحب کی اسرار خودی کا پہلا اڈیشن نکلا تو اس میں حافظ شیرازی کے متعلق لکھا تھا۔

ہوشیار از حافظ صہبا گسار ‏ جامش از زہر اجل سرمایہ دار
گوسفند است ونوا آموخت است ‏ عشوہ و ناز و ادا آموخت است
بگذر از جامش کہ در مینائے خویش ‏ چوں مریدانِ حسن دار وحشیش
بے نیاز از محفل حافظ گذر ‏ الحذر از گو سفنداں الحذر

اسرار خودی شائع ہوئی تو حافظ سے متعلق اشعار کی بڑی مخالفت ہوئی جس سے متاثر ہو کر ڈاکٹر صاحب نے اسرار خودی کے دوسرے اڈیشن میں ان اشعار کو نکال دیا عام طور سے یہی خیال ہے کہ اقبال حافظ کو پسند نہیں کرتے تھے، لیکن ڈاکٹر یوسف حسین نے اپنی یہ کتاب لکھ کر اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ حافظ پر کڑی تنقید کرنے کے باوجود اقبال اس کے حسن ادا اور لطافت بیان کا قائل تھا اور شعوری طور پر کوشش کرتا تھا کہ اپنی فارسی غزلوں میں اس کا رنگ آہنگ پیدا کرے اور اس کے رموز و علائم کو برتے، اس نے حافظ کے استعاروں اور کنایوں کو اپنے فکر وفن میں رنگینی پیدا کرنے کے لیے سمونے کی پوری کوشش کی اور میرا خیال ہے کہ وہ بڑی حد تک اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا۔ (ص:۱۲،۱۱)

دونوں کے کچھ اختلافات بھی دکھائے ہیں مثلاً حافظ انسان کو مجبور محض سمجھتے ہیں، اس کے برخلاف اقبال کی اجتماعی مقصدیت کا تقاضا ہے کہ وہ انسان کو مجبور نہ مانے، حافظ کے اشعار میں خودی کا مروجہ تصور کارفرما ہے، اقبال اپنے تصور میں منفرد ہیں، اسی قسم کے اور اختلافات دکھا کر ڈاکٹر صاحب آخر میں لکھتے ہیں کہ میں پھر اپنے اس خیال کو دہراتا ہوں کہ فارسی زبان کا کوئی شاعر طرز واسلوب اور پیرایہ بیان میں حافظ سے اتنا قریب نہیں جتنا کہ اقبال ہے، اس کے ماسوائے دوسرا کوئی شاعر حافظ کا تتبع نہ کرسکا، اقبال کو اس ضمن میں اولیت کا شرف حاصل ہے، میں اسے حافظ کے روحانی فیض اور خود اس کو اپنی ریاضت کا ثمرہ خیال کرتا ہوں۔ (ص:۴۱۲)

یہ دعویٰ ایسا ہے جو متفق علیہ نہیں کہا جاسکتا، روح اقبال میں ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ لکھا اس سے کسی کو اختلاف نہیں رہا، لیکن اس کتاب میں بہت سی مختلف فیہ باتیں آگئی ہیں، جن کی توضیح آئندہ ہی کی بحث وتمحیص سے ہوسکے گی، لیکن افسوس اس بحث میں ڈاکٹر صاحب کا کوئی حصہ نہ ہوگا، مگر وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے وہ کہہ گئے ہیں، ہمارے نقاد اور ادیب اس کو پڑھتے اور اپنی رائے کا اظہار کرتے رہیں گے۔

۱۹۷۷ء میں اقبال کا جشن منایا گیا تو دہلی کے بین الاقوامی سیمینار میں میری بھی شرکت ہوئی، ڈاکٹر صاحب کو اس جشن کا اصلی روح رواں ہونا چاہیے تھا، مگر وہ اس جشن کے منتظمین سے کچھ شاکی نظر آئے، اسی موقع پر غالب اکیڈمی میں ان کے دو لکچر ہوئے ایک کا عنوان تھا ''غالب اور اقبال'' اور دوسرے کا عنوان تھا، ''حافظ اور اقبال'' ایک کی صدارت جرمنی کی مشہور مستشرق خاتون اینی شمیل نے کی جب ڈاکٹر صاحب کا لکچر ختم ہوا، تو اینی شمیل نے بہت پرزور تقریر میں ان کے لکچر کی تعریف کی، اتفاق سے اس کے بعد وگیان بھون میں ایک ہی میز پر مجھ کو اینی شمیل کے ساتھ بیٹھنے کا موقع ملا، گفتگو شروع ہوئی تو وہ بولیں کہ ڈاکٹر صاحب کچھ اس لب ولہجہ میں اپنا مقالہ پڑھ رہے تھے کہ وہ ایک لفظ بھی سمجھ نہ سکیں، ان کی یہ گفتگو سن کر مجھ کو ہنسی آگئی، ڈاکٹر صاحب سے

یہ گفتگو دہرائی تو وہ بھی ہنس کر کہنے لگے کہ ان لوگوں میں ایسے ہی تصنع ہوا کرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنا مقالہ ''حافظ اور اقبال'' جناب آنند نرائن ملا کی صدارت میں پڑھا تھا، جب ان کا مقالہ ختم ہوا تو آنند نرائن صاحب نے اپنے مختصر تبصرہ میں کہا کہ ''حافظ اور اقبال'' میں کوئی مماثلت نہیں اس مختصر رائے سے حاضرین پر سناٹا چھا گیا، ڈاکٹر صاحب بھی سن کر خاموش رہے یہ موضوع کچھ ایسا ہی متنازعہ فیہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی کتابیں پاکستان کے ناشر چھاپ کر فائدے اٹھا رہے تھے، ان کی خواہش تھی کہ اقبال اکیڈمی لاہور اس کا حق طباعت ان سے خرید لے، ڈاکٹر معزالدین ڈائرکٹر اقبال اکیڈمی اقبال کے جشن میں دہلی آئے ہوئے تھے، میں نے ان سے گفتگو کی انہوں نے وعدہ کیا کہ ''روح اقبال'' اور ''حافظ اور اقبال'' کو اپنی کمیٹی کے سامنے پیش کر کے ان کے حق طباعت کا معاوضہ ڈاکٹر صاحب کو دلائیں گے، مگر یہ اب تک انجام نہیں پا سکا ہے۔

اپریل ۱۹۷۸ء میں انجمن ترقی اردو کی مجلس انتظامیہ میں میری دوبارہ رکنیت کا انتخاب تھا، تو ڈاکٹر صاحب نے محض اپنی محبت میں مجھ کو زیادہ سے زیادہ ووٹ دلائے، ان کی اس محبت کی قدر میرے دل میں برابر باقی رہے گی، مئی ۱۹۷۸ء میں اس کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ دہلی میں تھا، وہاں پہنچا تو وہ اپنی وضع داری میں اپنے گھر لے گئے، کھانا کھلایا، دیر تک باتیں ہوتی رہیں، انہوں نے اپنے گھر کے ایک وسیع کمرہ میں اپنے ذوق کی بہت سی کتابیں کئی الماریوں میں جمع کر رکھی تھیں، میں نے ان کا جائزہ لینا شروع کیا تو مجھ کو ان میں سے کئی کتابیں پسند آئی جن میں مصر کا ایک بہت ہی خوش خط مطبوعہ کلام پاک تھا، ایک لمبی تقطیع کا بھی کلام پاک تھا، جو ایران میں بہت ہی عمدہ کتابت کے ساتھ طبع ہوا اس کو میں دیکھ رہا تھا تو ڈاکٹر صاحب مرحوم بولے کے شہنشاہ ایران نے اس کے کچھ نسخے ہندوستان بھیجے تھے ان میں سے ایک ان کو بھی نذر کیا گیا تھا، تاریخ وادب کی کچھ اور کتابیں تھیں جو مجھ کو پسند آئیں میں نے ان سے عرض کیا کہ ان میں سے آپ کچھ دارالمصنفین کو فروخت کر دیں، فوراً بولے جو کتابیں پسند آئیں لے جاؤ میری طرف سے دارالمصنفین کو نذر ہیں، میں نے عرض کیا کہ آپ قیمت نہ لیں گے تو میں ان کو دارالمصنفین کے لیے لے جانا پسند نہ کرونگا، پھر اصرار سے کلام پاک کے یہ دونوں نسخے اور کچھ کتابیں میرے ساتھ کردیں، کلام پاک کے یہ دونوں نسخے یہاں کے کتب خانے کی زینت میں اضافہ کر رہے ہیں، میں نے یہاں سے بھی خط لکھ کر ان کی قیمت قبول کرنے کے لیے عرض کیا مگر انہوں نے لکھا کہ اس اصرار سے ان کو تکلیف ہو رہی ہے یہ بھی مجھ کو معلوم ہوا کہ بہت سے کتابیں انہوں نے جامعہ ملیہ کے کتب خانہ کو دیدی تھیں، انہوں نے ان کتابوں کے ساتھ اپنی دو انگریزی تصانیف Selected Documents- From The Aligarh Archives اور Two studies in early Mughal history) بھی دیں اول الذکر کتاب میں زیادہ تر سرسید احمد کے انگریزی اور اردو میں خطوط ہیں، ان ہی کے ساتھ وہ خطوط بھی ہیں جو انگریزوں یا اور دوسرے معاصروں نے ان کو لکھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ لکھنے میں اس کتاب سے استفادہ کرنا ناگزیر ہے، یہ ۱۹۶۷ء میں ایشیا پبلشنگ ہاؤس سے شائع ہوئی، دوسری کتاب ظہیرالدین محمد بابر پر دو لکچر ہیں، بابر ہندوستان کے عہد وسطی کا بہت ہی دل آویز اور رعنا حکمراں گذرا ہے، ڈاکٹر صاحب مرحوم کے قلم سے اس کی شخصیت اور بھی زیادہ نکھر گئی ہے۔

اسی ملاقات میں انہوں نے بتایا کہ انہوں نے غالب کی منتخب غزلوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے، جو چھپ رہا ہے، اس کے کچھ پروف بھی دکھائے اور کہا کہ بعض انگریزوں نے اس ترجمہ کو بہت پسند کیا ہے، خدا کرے ان کا یہ ترجمہ مقبول ہو، ان کی ایک کتاب ''کاروان فکر'' کے نام سے بھی شائع ہوئی جس میں اخلاقی قدریں، علم اور زندگی، تاریخ میں جبر واختیار کی چھاؤں، اور ادبی قدریں کے عنوانات ہیں، میرا خیال ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اور اس حصہ کے شب و روز کے زیادہ تر لمحات صرف لکھنے پڑھنے میں گذارے، نظام الدین ویسٹ کے مکان میں ایک چھوٹا سے کمرہ اپنے رہنے کے لیے انتخاب کر رکھا تھا، اسی میں علم و ادب کے سارے جلوے ان کی نظروں کے سامنے سمٹ کر آتے رہے، جن کو وہ اپنے قلم کی رعنائی سے کاغذ کے صفحات پر منتقل کرتے رہے، وہ کچھ دنوں شملہ میں انڈین انسٹیٹیوٹ آف ایڈوانسڈ اسٹڈی میں رہے، پھر دہلی چلے آئے یہیں آخر وقت تک رہے یہاں رہ کر علم وادب کا مینا کا رجام پی کر سرشار اور مخمور رہے۔

ان کی اردو غزل اور یادوں کی دنیا دارالمصنفین کے دارالاشاعت کی ایجنسی میں ہیں گذشتہ جنوری میں ان کی رائلٹی کی رقم بھیجی جس کے شکریہ کا خط آیا۔ یہی ان کا آخری خط میرے نام تھا، یہاں سے ان کی کتابوں کی رائلٹی بھیجی جاتی تو اس کو وصول کرتے وقت ایسا محسوس کراتے کہ گویا دارالمصنفین کی طرف سے ان کو رقم مل رہی ہے، اس کو وہ اپنا حق نہیں سمجھتے۔ یہ ان کی شرافت اخلاقی تھی، ان کی وضع داری، ان کے رکھ رکھاؤ کا طریقہ، ان کا استغناء اور شہرت سے بے نیازی کچھ ایسی تھی کہ اس کی مثالیں بہت کم لوگوں میں ملیں گی، دہلی میں رہتے تھے، ہر قسم کے خاندانی ذرائع تھے، چاہتے تو اپنے لیے حکومت ہی سے بہت کچھ حاصل کر لیتے خصوصاً جب وہاں اس کی دوڑ لگی ہوئی ہے کچھ ایسے مصنف بھی ہیں، جو ایک کتاب لکھتے ہیں، اس کی رسم اجرا یا رونمائی کراتے ہیں، اور ہر قسم کے فوائد اٹھانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں، مگر ڈاکٹر صاحب نے اپنے علم کے وقار کو کسی موقع پر جھکنے نہیں دیا، وقار خود ان کے سامنے آکر جھکا، ان کو پانچ ہزار کا ایوارڈ بھی ملا، مگر ان کے بیش بہا علم کی قیمت لگائی نہیں جاسکتی، ان کو پدم دی بھوشن کا

اعزاز بھی ملا، مگر خود اس اعزاز کو ان سے عزت حاصل ہوئی۔

ان کی وفات پر خیال تھا کہ علمی حلقہ میں بڑا ماتم ہوگا آج کل خاص خاص حلقے ایسے بنے ہوئے ہیں جہاں کی نرگس ہزاروں سال رونے کے بجائے صرف ایک دو سال روکر اپنے چمن کے دیدہ ور کو دیکھ لیتی ہے، ایسے حلقہ کی نرگس اپنی بے نوری کی وجہ سے ڈاکٹر یوسف حسین کی دیدہ وری کو صحیح طور پر دیکھ نہیں سکی، اس لیے ان کا یہاں ماتم نہ ہوا تو تعجب کرنے کی بات نہیں، مگر جو اپنی نظروں میں نور رکھتے ہیں، وہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے علم کی بصارت، بصیرت، ان کی رائے کی اصابت، پھر ان کی ادبی ذوق کی پاکیزگی، قلم کی رعنائی، تنقید نگاری کی دل آویزی اور گہرائی کو یاد کریں گے، اور اکثر یاد کر کے اپنے ذوق ادب اور علم وتحقیق میں نفاست، نظافت اور لطافت پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔

ڈاکٹر صاحب اب آپ وہاں ہیں جہاں اسلامی درد، مذہبی اضطراب، اور ملی غیرت وحمیت کی بڑی قدر ہوتی ہے، آپ کو اللہ تعالیٰ نے ان محاسن کا بہت بڑا حصہ عطا کیا تھا، اس لیے شفیع المذنبین ﷺ کے صدقے میں آپ رب العالمین کی رحمتوں اور برکتوں سے ضرور سرفراز کئے جائیں گے، آمین ثم آمین۔ (”ص۔ع“، اپریل ۱۹۷۹ء)

ڈار، بشیر احمد

بشیر احمد ڈار

پاکستان کے مشہور اہل علم اور صاحب قلم جناب بشیر احمد ڈار کی وفات کی خبر دیر میں ملی اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو غریق رحمت فرمائیں، وہ اقبالیات کے بڑے اداشناس اور ماہر تھے، اپنے علمی کمالات کے ساتھ اپنی شرافتِ اخلاق، انکسار اور وضعداری کی وجہ سے اپنے دوستوں اور ملنے والوں میں بہت مقبول تھے۔ (”ص۔ع“، جون ۱۹۷۹ء)

بشیر احمد ڈار

۲۹/ مارچ ۱۹۷۹ء کو پاکستان کے ممتاز، لایق اور مشہور اہل قلم جناب بشیر احمد ڈار اللہ کو پیارے ہوئے، ان کی وفات کی خبر دیر سے ملی، دکھ ہوا، کہ پاکستان ایک بہت اچھے مصنف، بہت اچھے فلسفی اور بہت اچھے انسان سے محروم ہوگیا۔

۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۸ء تک پاکستان بار بار جانے کا اتفاق ہوا تو جناب بشیر احمد ڈار سے کراچی، اسلام آباد اور لاہور میں برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں، پہلی بار جناب سید حسام الدین راشدی کے دولت کدہ پر ملا، جو کراچی کے ارباب علم و دانش کا صنم خانہ بنا ہوا ہے، معارف کے صفحات پر جناب سید حسام الدین راشدی کا ذکر خیر اکثر آیا ہے، میری نظر میں وہ پاکستان کے پرنس اسکالر ہیں، ان گنت کتابوں کے مایہ ناز مصنف ہیں، اللہ تعالیٰ نے دولت بھی دی ہے، اس لیے علم دوست اور علم نواز بن کر اپنی مرصع کوٹھی پر علمی محفلیں بھی سجاتے رہتے ہیں، جن میں شریک ہوکر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جہانگیر کے دور میں سندھ میں غازی خاں ترخان کے یہاں بھی ایسی ہی پر کیف مجلسیں ہوا کرتی ہوں گی، ان محفلوں میں جناب بشیر احمد ڈار کا ہونا لازمی تھا۔ جو کراچی میں راشدی صاحب کی زندگی کے جزو لاینفک بنے رہے، شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا جب دونوں کی ملاقاتیں نہ ہوتیں، دونوں کی ملاقاتوں میں پروفیسر شیخ عبدالرشید بھی (سابق استاد تاریخ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) ضرور شریک ہوتے، پھر یہ تینوں حضرات علم وفن کے تھری مسکیٹیرز بن جاتے، کئی بار مجھ کو بھی ان کی دلچسپ صحبت سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا، راشدی صاحب کی ہر بات کا برجستہ جواب دینے کے لیے پروفیسر شیخ عبدالرشید تیار رہتے، دونوں کی علمی پھلجھڑیوں اور پٹاخوں سے جناب بشیر احمد ڈار محظوظ تو ہوتے، مگر زیادہ تر خاموش ہی رہتے، ان دونوں کی باتوں کی داد صرف اپنی خوشگوار ہنسی کی پریم بتیسی کھول کر دیتے، اور جب بولتے تو سونا پگھلاتے ہی نظر آتے، اہل علم کی کچھ قسمیں ایسی ہیں جن کے اندر علم وفن کا خزانہ بھرا رہتا ہے، مگر ان کو دبا کر رکھنے ہی میں اپنی بلندی تصور کرتے ہیں، بشیر احمد ڈار صاحب کے ساغر میں علم وفن کی مے بھری رہتی، مگر اس کو ہر جگہ چھلکتے ہوئے دیکھنا پسند نہ کرتے، وہ دوسروں کی گفتگو دل سے لطف لیتے، مگر خود شناسی سے بے نیاز ہوکر اپنی علمی خودی کی بے خودی سے دب کر خاموش بیٹھے ہی رہنا پسند کرتے۔

وہ نسلاً کشمیری تھے، مگر ان کا خاندان لاہور میں آباد ہوگیا تھا، یہیں وہ ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے، پہلی دفعہ ان سے ملاقات ہوئی تو چھڑی ٹیک کر کچھ لنگ کھاتے ہوئے چلتے دیکھا، معلوم ہوا کہ بچپن میں اپنے مکان کی چھت پر پتنگ اڑا رہے تھے، اس پر سے گرے تو ایک ٹانگ اس طرح مجروح ہوئی کہ اس کو قطع ہی کر دینا پڑا۔ گھر کے لوگ ان کی زندگی کے اچھے مستقبل سے زیادہ پرامید نہیں تھے، مگر انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے فلسفہ میں ایم۔اے کیا، پھر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں آکر بی۔ٹی۔ کی ڈگری حاصل کی، لاہور کی انجمن حمایت اسلام کے اسکولوں میں ملازمت کر کے ایک شفیق اور لایق استاد کی حیثیت سے مشہور ہوئے، یہاں کے قیام میں ان کو اقبالیات سے بڑی دلچسپی ہوئی، ۱۹۴۴ء میں ان کی کتاب انگریزی میں ”اے اسٹڈی ان اقبالس فلاسفی“ کے نام سے شایع ہوئی، اس میں ان کا یہ مطمح نظر تھا کہ اسلام ہندوستان میں آیا تو یہاں اس کی اخلاقی اور معاشرتی تعلیمات اصلی طور پر عمل میں نہیں آئیں، کچھ مصلحوں اور صوفیوں نے وحدت الوجود کے ذریعہ سے ہندو مذہب اور اسلام کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے کی کوشش کی، اکبر نے دین الٰہی قائم کر کے مذہب کو حکومت کی سرپرستی میں لیا، تو یہ پہلی اور آخری سعی ہوکر رہ گئی، داراشکوہ کی وجہ سے اس ملک کی ایک بڑی

آبادی اخلاقی اور ذہنی فالج میں خطرناک حد تک مبتلا ہونے والی تھی، مگر اس کے خاتمہ سے اس قسم کی تحریک ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی، ایسی تحریکوں کے خلاف حضرت مجدد الف ثانیؒ اور شاہ ولی اللہؒ دہلوی نے اپنی تحریکیں چلائیں ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی گرتی ہوئی حالت کو دور کرنے کی کوشش برابر جاری رہی، اس بار کو اقبال نے بھی اپنے کاندھوں پر اٹھایا جو موجودہ دور کی مادی ترقی سے بددل تھے، ان کو خیال ہوا کہ اگر قرآن مجید کی تعلیمات پر صحیح طور سے عمل کیا جائے، تو نہ صرف اسلام بلکہ دنیا کو حیات نو مل جائے گی، اور جب یہی بات ان کی جادو بھری شاعری کے ذریعہ سے مسلمانوں کے کانوں تک پہنچی تو ان کو احساس ہوا کہ زندگی کے تخیلات کو اسلامی اصولوں کی روشنی میں از سر نو ترتیب دیا جاسکتا ہے، ۱۹۴۴ء سے پہلے بھی یہ باتیں کہی گئی تھیں، مگر بشیر احمد ڈار صاحب نے ان کو کچھ ایسے طاقتور اور موثر انداز میں اپنی اس کتاب میں پیش کیا کہ وہ ممتاز ارباب علم کی نظر ان کی طرف اٹھی، انھوں نے اس کو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے نام سے معنون کیا جس سے ظاہر ہے کہ وہ ان سے بھی متاثر تھے۔

اس کتاب کی اشاعت کے بعد وہ مجلّہ اقبال کے نائب مدیر بنالئے گئے، جس کے مدیر اس وقت اس برصغیر کے مشہور فلسفی ایم۔ایم۔شریف صاحب تھے، پھر وہ اقبال اکیڈمی کے ڈائرکٹر کے عہدہ پر مامور ہوئے، جو ان کی علمی قابلیت کا بہت بڑا اعتراف تھا، وہ اس عہدہ پر غالبًا ۱۹۷۱ء تک رہے، وہ پاکستان کے فلاسفیکل جرنل کے مینیجنگ اڈیٹر بھی آخر وقت تک تھے، ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور کے ترجمان ثقافت کے ادارۂ تحریر کے بھی رکن رہے۔

۱۹۷۵ء میں کراچی میں ان سے ملنے ان کے گھر گیا تو انھوں نے اپنی دو کتابیں ''اقبال اینڈ پوسٹ کانٹین دولنٹرزم'' اور ''ریلیجیس تھاٹ آف سید احمد خاں'' نذر کیں، جن کو بار بار پڑھنے کا اتفاق ہوا، اول الذکر کتاب بزم اقبال کی طرف سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی، پانچ سو چھیالیس صفحے پر مشتمل ہے، اس کی انگریزی تحریر میں جو روانی سنجیدگی اور وقار ہے، اس کو پڑھ کر یہ اثر ہوتا ہے، یہ لاہور کے کسی کالج کے فارغ التحصیل کے بجائے انگلستان کی کسی بلند پایہ یونیورسٹی کی اعلیٰ ڈگریوں کے پانے والے نے لکھی ہے، اس کے لائق مصنف نے کانٹ کے فلسفہ استدلال اور قوت ارادی، نٹشے کی فکر خود آگاہی شوپنہار کے تخیل فکر، اور قلبی معلومات، ملٹن کے نظریہ شیطنت، برگسان کے تخیل عشق، گیٹے کی روشن خیالی، جیمس وارڈ کے فلسفہ پر سائنٹفک اثرات، عقلیت اور میکانزم کے خلاف میک ڈوگل کے خیالات، ولیم جیمس کے نظریہ عملیت اور اس کے چارٹزم، برونگ کی نیچر نوازی اور برنارڈ شا کی قوت ارادی پر جس طرح بحث کی ہے، اس پر ایک انگریز فلسفی کو بھی رشک آسکتا ہے، یورپ کے ان فلسفیوں کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اقبال کے سامنے ان مغربی مفکروں کے خیالات ضرور رہے، مگر ان کے ان ہی افکار کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوئے جو قرآن مجید اور گذشتہ اسلامی مفکرین کی تعلیمات کے مطابق تھے۔

جناب بشیر احمد ڈار اس کو تسلیم نہیں کرتے کہ اقبال کی فکری اور نظری تنظیم ملے جلے اجزا سے بنی جن کے کچھ حصے کبھی ایک اور کبھی دوسرے مغربی مفکرین سے مستعار لے گئے، ان کی فلسفیانہ موشگافیاں بظاہر مغربی مفکرین کی معلوم ہوتی ہیں، لیکن یہ دراصل وہی ہیں جو اسلام کے بنیادی عقاید پر مبنی مسلمان مفکروں کے یہاں بھی گذشتہ دور میں پائی گئی ہیں، اقبال کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے موجودہ دور کے علم وفضل کی ترقی سے فائدہ اٹھا کر ان کو جدید منطقیانہ رنگ اور سریع الفہم انداز میں ترتیب دیدیا ہے، بشیر احمد ڈار صاحب نے اپنی اس کتاب میں یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا ذہن جب قدامت پسندی اور ترقی پسندی کے جھولے میں جھول رہا تھا، تو اقبال نے ان دونوں کے اچھے پہلوؤں کو ملا کر اپنے افکار کے عناصر مرتب کئے، جن کا سرچشمہ سراسر قرآن مجید ہی رہا، جس طرح ابن تیمیہ نے قرآن پاک کی تعلیمات سے اسلام کو ایک نئی زندگی عطا کی، اس طرح اقبال کا یہ پیام ہے،

چون کہن گردو جہانے در بوش
ملی دہد قراتے جہانے دیگرش

بشیر احمد ڈار صاحب نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اس کی تائید ان لوگوں سے بھی ہوگی، جو اقبال کا گہرا مطالعہ کریں گے، ڈار صاحب نے جس فلسفیانہ اور فاضلانہ انداز میں اس کی وضاحت کی ہے، اس سے لوگ آئندہ بھی برابر مستفید ہوتے رہیں گے، خود انھوں نے قرآن مجید کی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے انگریزی میں قرآنی اخلاقیات کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی، وہ اس کے بھی قائل تھے، کہ اقبال کا نظریۂ ارتقاء قرآن مجید کی تعلیمات ہی پر مبنی ہے، گو انھوں نے ابن مسکویہ، مولانا رومی اور شاہ ولی اللہ کے افکار سے بھی مدد لی ہے، ان کا یہ تصور ڈارون اور برگسان کے نظریے سے بالکل مختلف ہے، انھوں نے اس خیال پر پورا زور اپنے خطبہ صدارت میں دیا، جو انھوں نے اپریل ۱۹۷۸ء میں پاکستان فلاسفیکل کانگریس کے اجلاس میں پڑھا۔

ان کو اقبالیات سے کچھ ایسا لگاؤ تھا کہ انھوں نے اقبال کی مثنوی گلشن راز جدید بندگی نامہ، پس چہ باید کرد اے اقوام شرق اور قوم کے نوجوانوں کو پیغام کے انگریزی ترجمے بھی کئے، اور ان میں سے بعض پر حواشی بھی لکھے، اقبال کے انگریزی اور اردو خطوط کے مجموعے بھی مرتب کئے۔

اقبالیات کے چمن میں نرگس اپنی بے نوری پر نہیں روئے گی، جہاں اس میں اور دیدہ ور پیدا ہوئے، وہاں بشیر احمد ڈار صاحب نے اپنی دیدہ وری سے اقبال کا جو اصلی اور حقیقی مقام متعین کیا ہے، وہ اقبالیات کی تاریخ میں برابر یاد کیا جائے گا۔

ان کی تصنیف ''ریلیجیس تھاٹ آف سید احمد خان'' پر یہ راقم جنوری ۱۹۷۶ء کے معارف میں اپنے خیالات کا اظہار کرچکا ہے یہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس کے ذریعہ سے انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستانی مسلمان اپنے حکمران انگریزوں اور اپنے ہم وطن ہندوؤں کے ساتھ رہ کر جس ذہنی، تمدنی اور مذہبی آزمائش میں مبتلا ہوئے، اس کا اس میں اچھا تجزیہ ہے، عیسائی مبلغین اسلام پر طرح طرح سے حملے کررہے تھے، جن سے مسلمانوں میں احساس کمتری پیدا ہورہا تھا، پھر ہندوؤں نے انگریزی تعلیم پاکر بدلے ہوئے حالات میں ہر قسم کے اقتصادی فوائد حاصل کرکے اپنے مذہب میں بھی اصلاحات شروع کردی تھیں، مسلمانوں کو دونوں سے مقابلہ کرنا تھا، اسی کے ساتھ وہ ذہنی طور پر اپنے سے بھی برسر پیکار تھے، وہ ماڈرنزم سے بھی متاثر ہورہے تھے، مگر اپنی مذہبی روایات سے کنارہ کش بھی ہونا نہیں چاہتے تھے، وہ اپنے مذہب کی فرمانروائی کے خواہاں بھی تھے، اسی کے ساتھ ان کو سائنس، فلسفہ اور عقلیاتی علوم سے اپنے مذہبی عقائد کی تطبیق کی جستجو بھی تھی، وہ اپنے قدیم خیالات کے علماء کو نظر انداز کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے، لیکن ان کی ہر بات کو تسلیم کرکے اپنے تمام مسائل کا حل بھی نہیں پاتے تھے، وہ تجدد پسند مصلحین کے مغربی افکار کی باتوں کو بھی شوق سے سنتے، مگر غیر شعوری طور پر ڈرتے بھی رہتے کہ کہیں ان کی باتوں کو قبول کرکے اپنی مذہبی روایات سے دور نہ ہوجائیں، اس ذہنی آویزش کی فضا میں سید احمد خاں کی تحریک چلی تو ایک بڑا طبقہ ان کی طرف جھک گیا، جن کے خیالات میں اس کو بہت کچھ ذہنی سکون ملا، سید احمد خان نے اسلامی تعلیمات کی جو جرات مندانہ تعبیرات کیں، ان کا جائزہ بشیر احمد ڈار صاحب نے اپنی اس کتاب میں لیا ہے، وہ ان سے متاثر ہوکر لکھتے ہیں کہ اب جب مغربی تمدن کی وجہ سے مادی رجحانات پیدا ہورہے ہیں، ان کا مقابلہ کرنے کے لیے سید احمد خان نے جو اسلام پیش تھا، اس کو سمجھ کر ایک موثر ذریعہ بنانے کی ضرورت ہے، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن کے نام سے جو تفسیر لکھی ہے، اس میں وہی سب کچھ ہے، جو سید احمد خاں نے پیش کیا تھا، بلکہ اقبال اپنے فلسفیانہ خیالات کے باوجود قرآن مجید کے بعض نکات کے ادراک میں سید احمد خان سے آگے نہیں جاسکے ہیں۔

ڈار صاحب اپنی اس کتاب میں دراصل جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں کے اس کرب اور اضطراب کے ترجمان بن گئے ہیں، جو ماڈرنزم تو چاہتے ہیں، مگر اپنے مذہبی عقائد سے ہٹ کر ماڈرنزم میں اپنی ذہنی پریشانوں کا حل نہیں پاتے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ وہ اپنے مذہبی عقائد کے ساتھ ماڈرنزم کا ساتھ کس طرح دیں، کیا ہر جگہ اور ہر زمانہ میں سید احمد خاں پیدا ہونے کی ضرورت ہے، مگر ایسے سید احمد خاں کی بھی ضرورت نہیں جن کے خلاف قدیم خیالات کے علماء کی جماعت کھڑی ہوجائے، پھر ایسے علماء اگر واقعی اسلام کے نگہبان اور پشتیبان ہیں تو ان کو ایسے سید احمد خاں کو گوارا کرلینے میں تامل نہ ہونا چاہئے، جو اپنے خالص اسلامی جذبہ سے اسلام کو ماڈرنزم اور ماڈرنزم کو اسلام سے ہم آہنگ کردے، اسلام ایک دائمی اور عالمگیر مذہب ہے، ہر زمانہ، ہر ماحول اور ہر ملک کے لیے ہے، بشرطیکہ اس کو صحیح طور پر سمجھ کر متکلمانہ اور مخلصانہ انداز میں پیش کیا جائے۔

بشیر احمد ڈار صاحب متکلم اسلام تو نہیں تھے، مگر فلسفیانہ انداز میں اسلام کا درد رکھتے تھے، انھوں نے اسی درد کا اظہار کچھ کرب اور بے چینی کے ساتھ کیا ہے، سید احمد خاں کے خیالات میں ان کا پناہ لینا اگر صحیح نہیں تھا تو پھر ان کے ہم خیال اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو مطمئن کون کرسکتا ہے؟ ان کی ذمہ داری تو ان پر آتی ہے، جو اپنے کو صحیح معنوں میں اسلام کا نگران اور محافظ سمجھتے ہیں، ڈار صاحب اپنی اس کتاب سے بھی ان پر یہ ذمہ داری عائد کرگئے ہیں۔

جناب بشیر احمد ڈار کا زیادہ وقت لکھنے پڑھنے میں گذرتا۔ اقبالیات کے علاوہ تاریخ تصوف قبل از اسلام، حکمائے قدیم کا فلسفہ اخلاق اور پاکستان کیوں؟ وغیرہ اپنی علمی یادگاریں چھوڑ گئے ہیں، آخر میں تصوف کی فارسی کتاب ثمرات القدس بھی ترتیب دے رہے تھے، پھر رسالوں اور کانفرنسوں، انسائیکلوپیڈیا آف فلاسفی اور ورلڈ آف فلاسفی کے لیے برابر مضامین لکھتے رہے۔

ان کی خودشکن بھلمنساہٹ کا ایک واقعہ برابر یاد آتا ہے، دسمبر ۱۹۷۷ء میں لاہور میں علامہ اقبال کے صد سالہ جشن کے موقع پر ہم لوگ انٹرکونٹی ننٹل ہوٹل میں ایک ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے، وہیں جناب سید حسام الدین راشدی پر قلب کا حملہ ہوا وہ اسپتال منتقل کردیے گئے، دوسرے دن میں ان کی عیادت کے لیے اسپتال جانا چاہتا تھا، جناب بشیر احمد ڈار اپنی محبت میں میری رہبری کے لیے تیار ہوگئے، جشن کے مہمانوں کو لاہور کے تاریخی مقامات کی سیر کرانے کے لیے مخصوص بسیں اور موٹریں چلیں، ہم دونوں بھی روانہ ہوئے، طے ہوا کہ لاہور کے شاہی قلعہ سے ہم دونوں اسپتال چلے جائیں گے، وہاں پہنچے تو اسپتال جانے کے لیے کوئی ٹیکسی نہیں ملی، جشن کی موٹروں کے انچارج ڈار صاحب کے ایک شاگرد رشید تھے ڈار صاحب ان کو کہتے کیا بلکہ حکم دیتے تو وہ بہت شوق سے ہم دونوں کو اسپتال پہنچا دیتے مگر انھوں نے کہا کہ اتنی سی بات کے لیے احسان کیوں لیا جائے، اور وہ تانگے پر چلنے کو تیار ہوئے، ان کے شاگرد رشید نے ہم دونوں کو تانگے پر بیٹھتے دیکھا تو وہ ایک اچھی موٹر لے کر پہنچ گئے کہ یہ حاضر ہے، جب تک چاہیں، اس کو استعمال میں رکھیں، معلوم نہیں ڈار صاحب کی ایسی بے نیازی کی مثالیں، ان کی زندگی میں کتنی ملیں گی۔

وہ اپنی تصانیف کو تو علمی دنیا میں چھوڑ گئے مگر وہ سفر آخرت کے لیے بھی زاد راہ لے گئے ہیں، اجتہاد کے ذریعہ سے وہ اسلام کی سربلندی اور اعتدال پسندی کے خواہاں تھے، وہ قرآن مجید کی اخلاقی تعلیمات کی بھی ترویج چاہتے تھے، اس سلسلہ میں انھوں

نے اپنی نیکی اور بھلمنساہت کے ساتھ جو تحریریں لکھیں کیا عجب کہ خداوند قدوس کی بارگاہ میں مغفرت کا باعث بن جائیں، آمین۔ (''ص۔ع''، جولائی ۱۹۷۹ء)

رحمانی، فضل اللہ، مولانا

مولانا فضل اللہ مرحوم

معارف ابھی زیر ترتیب ہی تھا کہ مولانا فضل اللہ صاحب رحمانی کے انتقال کی اطلاع ملی، مرحوم اپنے علم و فضل تقویٰ و طہارت، اور شرافت و حسن اخلاق میں سلف صالحین کا نمونہ تھے، راقم الحروف کو ان کی خدمت ایک عرصہ سے نیاز حاصل تھا، جب علی گڑھ جانا ہوتا تو ان کے یہاں ضرور حاضری دیتا، اور وہ بھی پیرانہ سالی اور ضعف جسمانی کے باوجود بازدید کے لیے تشریف لاتے اور دیر تک دینی و علمی گفتگو فرماتے میرا قیام سرسید نگر میں اپنے لڑکے ڈاکٹر محمد سالم قدوائی کے مکان بیت الفرح میں ہوتا ہے اور مولانا امیر نشان میں اپنی صاحبزادی رونق بیگم کے یہاں رہتے تھے، امیر نشان سے سرسید نگر کا فاصلہ اچھا خاصا ہے، میں نے کئی بار عرض بھی کیا کہ آپ اتنی تکلیف گوارا نہ کیا کریں، میں جب تک علی گڑھ میں رہوں گا خود ہی حاضر ہوتا رہوں گا مگر انھوں نے اخلاق کریمانہ کی بنا پر میری اس درخواست کو کبھی قبول نہیں کیا، ایسی خورد نوازی کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، میں ان سے عمر میں بھی بہت چھوٹا تھا، اور علم و فضل میں تو ان سے کوئی نسبت ہی نہ تھی، میں ذرہ بے مقدار اور وہ آفتاب علم و کمال، یہ محض ان کی بزرگانہ شفقت تھی، اور اس تعلق خاطر کا اظہار تھا، جو انھیں ندوہ کے خادموں کے ساتھ تھا، دو ندوۃ العلماء کے بانی اور ناظم اول مولانا محمد علی مونگیری کے پوتے تھے، والد کا نام مولانا احمد علی تھا، وہ علم و فضل، صلاح و تقویٰ، محاسنِ اخلاق اور عقل و ذہانت میں بہت ممتاز تھے، ان کی نوعمری کے زمانہ میں ایک طرف مستشریوں کا بڑا زور تھا جو آئے دن اسلام کے خلاف کتابیں لکھتے رہتے تھے، دوسری طرف مستشرقین علم و تحقیق کے نام پر اسلامی شریعت، سیرۃ نبوی اور تاریخ اسلام کو داغدار کر رہے تھے، اس وقت انگریزوں کے جلال و جبروت، اور دبدبہ و سطوت کا یہ عالم تھا، کہ ان ہرزہ سرائیوں کے خلاف زبان کھولنا اپنے آپ کو آفات و مصائب میں مبتلا کرنا تھا، لیکن اللہ کے کچھ بندے اپنی عزت و ناموس کو خطرہ میں ڈال کر میدان میں نکل آئے، ان سرفروشوں میں مولانا محمد علی سرفہرست تھے، انھوں نے تحفہ محمدیہ کے نام سے ایک ماہنامہ نکالا، متعدد کتابیں لکھیں اور ابناء ملت کو دفاع اسلام کے لیے تیار کیا۔

اس فضا نے مولانا احمد علی کے اندر غیرت ایمانی اور رحمت دینی کا غیر معمولی جذبہ پیدا کردیا وہ باپ کے دوش بدوش اس مہم میں لگ گئے، تذکرہ نگار نے ان کے جوش و ولولہ، صلاحیت کار اور اصابت رائے کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔

جب ۱۳۱۱ھ میں مولانا محمد علی نے اپنے کام کو آگے بڑھانے کے لیے ندوۃ العلماء کی داغ بیل ڈالی تو مولانا احمد علی بھی عزم و قوت کے ساتھ اس میں شریک ہوگئے، ان کی فہم و فراست لیاقت و صلاحیت اور محنت و کارگذاری کی بنا پر ان سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں، حکیم عبدالحی صاحب اس زمانہ میں مددگار ناظم تھے، اور مولانا احمد علی ان کے داست راست تھے دونوں کے درمیان فکر و خیال کا ایسا اتحاد تھا کہ ایک جان دو قالب سمجھے جاتے تھے، مولانا محمد علی نے حکیم صاحب کے نام جو خطوط لکھے ہیں ان میں بڑے حسن ظن کا اظہار کیا ہے، ان کا خیال تھا کہ یہ دونوں مل کر ندوہ کو جلد بام عروج تک پہنچا دیں گے، لیکن افسوس کہ ان کا ۱۳۲۸ھ میں عین عنفوان شباب کے عالم میں انتقال ہوگیا۔

جس وقت مولانا احمد علی کا انتقال ہوا، اس وقت مولانا فضل اللہ بہت چھوٹے تھے، دادا نے انھیں اپنی آغوش تربیت میں لے لیا، اور بڑی توجہ کے ساتھ ان کی تعلیم و تربیت میں کوشش کی اللہ نے ذہن ثاقب، طبع ارجمند اور مزاج خیر پسند عطا فرمایا تھا، مولانا محمد علی جیسے شیخ وقت کی صحبت نے ان کی ظاہری اور باطنی قوتوں کو بیدار کردیا تھا جلد ہی علم و سلوک کے مدارج عالیہ تک پہنچ گئے، وہ مولانا محمد علی کی شفقت اور حسن توجہ کا ذکر ہمیشہ بڑی محبت و عقیدت کے ساتھ کیا کرتے تھے، کبھی کبھی راہ سلوک کے واردات بھی بیان کرتے تھے، زندگی بھر درس و تدریس، تصنیف و تالیف کے ساتھ، اذکار و اشغال کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

علوم اسلامیہ میں کتاب و سنت سے خاص تعلق تھا، قرآن مجید بڑی توجہ کے ساتھ پڑھتے تھے، اس کے رموز و اسرار اور نکات و اشارات پر ان کی گہری نظر تھی، قرآن مجید کی توضیح و تفسیر میں خاص طور سے احادیث پیش نظر رہتی تھیں، کتب حدیث میں سے یوں تو صحاح کی سبھی کتابیں مطالعہ میں رہتی تھیں، لیکن امام ابخاری کی جامع صحیح سے خاص شغف تھا، عرصہ دراز تک پابندی کے ساتھ اس کا ایک پارہ روز پڑھتے تھے۔

ادب المفرد امام بخاری کی بڑی اہم کتاب ہے، اس میں اسلامی اخلاق و آداب کا تفصیل سے ذکر ہے، اس کتاب کی کوئی شرح نہ تھی جس سے اس کی مشکلات حل کی جاسکتیں، مولانا فضل اللہ نے کئی سال کی محنت و عرق ریزی کے بعد فضل اللہ الصمد کے نام سے دو ضخیم جلدوں میں اس کی شرح لکھی، اس کی وجہ سے ان کا نام ساری دنیا میں پھیل گیا، حدیث کے اساتذہ اور علماء نے اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اور اس کی بڑی ثنا وصفت بیان کی، بیرون ہند کے اہل قلم نے بھی اس خدمت پر بڑی ممنونیت کا اظہار کیا۔

ان کے استاد اور خسر مفتی عبداللطیف رحمانی نے جامع ترمذی کی بارہ جلدوں میں بڑی اچھی شرح لکھی ہے، اس کام میں مولانا فضل اللہ ان کے دست راست تھے ان کے بعد انھوں نے پھر نظر ثانی کی اور بیش قیمت مفید حواشی کا اضافہ کیا، اگر یہ کتاب

شائع ہوجائے تو حدیث شریف کے اساتذہ اور طلبہ کو بہت فائدہ پہنچے، مرحوم اہل علم اور اہل ثروت دونوں کو اس جانب توجہ دلاتے تھے، ان کے ایما پر معارف نے بھی ایک نوٹ لکھ کر اصحاب خیر کو اس جانب متوجہ کیا، مگر کتاب اتنی بڑی ہے اور اس کی اشاعت میں اتنا کثیر سرمایہ لگانا پڑے گا کہ کوئی ناشر تیار نہ ہوا، شرح ادب المفرد کی اشاعت میں بھی یہی دشواری تھی، مگر اللہ نے حجاز کے مشہور اہل خیر یوسف زینل علی رضا کو توفیق عطا فرمائی اور انھوں نے حدیث نبوی کے اس ذخیرہ کو بہ حرفِ کثیر شائع کر کے حسن قبول اور اجر جزیل حاصل کیا۔

اگر اسی طرح جامع ترمذی کی شرح بھی کوئی اللہ کا بندہ شائع کر دیتا تو بڑا اجر حاصل کرتا مرحوم کے چچا مولانا منت اللہ رحمانی [۱] امیر شریعت صوبہ بہار اگر جامعہ رحمانیہ کی طرف سے اس کی اشاعت کا بیڑا اٹھالیں تو یہ مشکل آسان ہوسکتی ہے۔

مولانا کی عمر کا کافی حصہ حیدر آباد میں گذرا اور عثمانیہ یونیورسٹی میں عرصہ دراز تک علوم اسلامیہ کی تعلیم و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، وہاں سے سبکدوشی کے بعد علی گڑھ میں قیام کیا، اور وہیں وفات پائی، تادم مرگ علم و دین کی خدمت میں لگے رہے، اور زبان و قلم سے تلقین و ارشاد کرتے رہے، اللہ تعالیٰ ان کی خدمات قبول فرمائے اور انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ان کی لائق صاحبزادیوں اور دوسرے عزیزوں کو ان کے نام نیک کو بلند رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(''ع۔ق''، جون ۱۹۷۹ء)

---

[۱] مولانا منت اللہ عمر میں مولا فضل اللہ سے بہت چھوٹے ہیں، مولانا کہتے تھے کہ میں نے انھیں گود میں کھلایا ہے، مگر حقیقی چچا ہیں دوسرے چچا مولانا نوراللہ ناظم جمعیۃ علماء بہار بھی حیات ہیں، وہ بھی عمر میں چھوٹے ہیں، مولانا فضل اللہ کے والد مولانا احمد علی مولانا محمد مونگیریؒ کے سب سے بڑے لڑکے تھے، جو ان کی پہلی حرم سے تھے۔

الحسنی، محمد، مولوی

مولوی محمد الحسنی

جون کا معارف طباعت کے آخری مرحلہ میں تھا کہ اچانک اطلاع ملی کہ ندوۃ العلماء کے نقیب رسالہ البعث الاسلامی کے مدیر مولوی محمد الحسنی کا انتقال ہوگیا، یہ خبر اتنی خلاف توقع تھی کہ بڑی دیر تک یقین نہیں آیا، ان کی عمر زیادہ نہیں تھی، چالیس سے تین ہی چار سال آگے بڑھے ہوں گے، صحت بھی اچھی تھی، کبھی کسی طویل یا شدید بیماری میں مبتلا نہیں ہوئے تھے، جب ملاقات ہوتی، ہشاش بشاش نظر آئے۔

یہ سچ ہے کہ جو آیا ہے، اسے ایک دن جانا ضرور ہے، **کل نفس ذائقتہ الموت**[العنکبوت:۵۷] لیکن کسے معلوم تھا کہ ان کا وقت موعود اتنا قریب ہے، ہم لوگوں کے سامنے تو بچے تھے، ان کی پیدائش کل کی بات معلوم ہوتی ہے، ہم کس طرح خیال کرتے تھے کہ وہ ہم سے پہلے رخصت سفر باندھ لیں گے۔ لیکن ان کے دوستوں اور ہم سنوں کو بھی اس تیز روی کا گمان نہیں تھا، ان کی جسمانی ساخت اور صحت کی رفتار دیکھ کر سبھی عمر طویل کی پیشگوئی کرتے تھے، لیکن ظاہر بینوں کے یہ سارے اندازے غلط ثابت ہوئے اور اللہ کی مشیت پوری ہو کر رہی، تقدیر کے سامنے تدبیر نے سپر ڈال دی، اور انسان کی مجبوری دبے بسی ہی نہیں خام خیالی اور غلط اندیشی بھی نمایاں ہوگئی۔

مصلحت ایزدی تھی کہ وہ چھوٹی عمر ہی میں اس دنیا سے کوچ کر جائیں تقدیر الٰہی کے رازہائے سربستہ کی نقاب کشائی انسان کے بس میں نہیں ہے، اس کا علم ناقص اس کی نظر کوتاہ اور اس کا علم محدود ہے، ان حالات میں وہ حکمت الٰہی کا احاطہ کس طرح کرسکتا ہے، عالم غیب ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے، ہم ظاہر بیں باطن کے حقائق سے ناواقف ہیں، البتہ اللہ کی مصلحت پر ہمارا ایمان ہے، اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ اس کا کوئی فعل مصلحت سے خالی نہیں ہے، یہ ہماری کم نگاہی ہے کہ موت کو زندگی کا خاتمہ سمجھتے ہیں، اس سے تو حیات نو کا آغاز ہوتا ہے، دنیا **مطیتہ آلاخرہ** ہے، انسان اس جہاں فانی سے گزر کر عالم جاودانی میں قدم رکھتا ہے، جہاں اسے مادہ کے جامہ تنگ کو اتار کر خلعت لامحدود عطا ہوتی ہے، اور فنا کے گھاٹ سے اتر کر بقائے دوام نصیب ہوتا ہے، اسے انحطاط و زوال کے خوف سے نجات ملتی ہے، اور عروج مسلسل اور ارتقائے پیہم کی مسرت سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔

محمد میاں اب ہمیں نظر نہیں آتے ہیں، لیکن یہ ہماری نظر کی کوتاہی اور نگاہ کی نارسی ہے، اگر مادیت کا حجاب حائل نہ ہوتا تو ہم دیکھتے کہ وہ **لاخوف علیھم ولاھم یحزنون**[یونس:٦٢] [۱] کے عالم میں پہنچ کر **فرحین بما آتا ھم اللہ من فضلہ**[آل عمران:۱۷۰] [۲] کے زمرہ میں شامل ہوگئے ہیں، وہاں **نزلا من غفور رحیم**[فصّلت:۳۲] [۳] کے مزے لے رہے ہیں، اور پس ماندگان کو خوف وحزن سے نجات کی بشارت سنا رہے ہیں، **ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم**[الجمعۃ:۴] اللہ کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہے، وہ جسے جو چاہے دے، وہ سمیع و بصیر علیم و خبیر ہے، وہ دلوں کی آواز سنتا اور نیتوں کے خلوص کو دیکھتا ہے، وہ ماضی سے آگاہ، حال سے باخبر اور مستقبل سے واقف ہے، اس کے یہاں مزدور پابند وقت نہیں، بلکہ مزدور کے حسن عمل اور صلاحیت کار پر موقوف ہے، کسی کو سارے دن کی جانکاہی کے بعد چند پیسے ملتے ہیں، اور کسی کو صرف چند منٹ کی کارگذاری پر اشرفیاں عطا ہوتی ہیں، قلت و کثرت کا فیصلہ مالک کی نظر پر منحصر ہے، اس کو کسی کا کام پسند آجائے تو تھیلیوں کے منہ کھول دیتا ہے۔

محمد میاں نے عمر بہت کم پائی اس زندگی کی چوالیس (۴۴) بہاریں بھی پورے

طور پر دیکھ نہ پائے کہ مادی آنکھیں بند ہوگئیں، اور روح فنا کے مرحلہ سے گزر کر بقا کی منزل میں پہنچ گئی، وہ ڈاکٹر عبدالعلی مرحوم کی آخری اولاد تھے، پانچ بیٹیوں کے بعد اللہ نے انھیں یہ بیٹا عطا کیا تھا، سارے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، ڈاکٹر صاحب بھی مسرور ہوئے، انھوں نے اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کیا، اور طے کرلیا کہ اس عطیہ ربانی کو اسی کی راہ میں لگائیں گے۔ لوگ سمجھتے تھے کہ وہ اپنی طرح دینی و دنیاوی تعلیم دلا کر اس بچے کو ڈاکٹر بنائیں گے، لیکن ڈاکٹر صاحب کے سوچنے کا انداز دوسرا تھا، وہ اللہ کے دین اور اس کے بندوں کی خدمت کے قائل ضرور تھے، مگر موقع و محل اور حالات و ضروریات کے پیش نظر وہ خدمت کی نوعیت اور دائرہ کار کا تعین کرتے تھے محض مادی نفع تو کبھی ان کا مطمع نظر نہیں رہا، وہ خالص دنیاوی کاموں میں بھی روحانی قدروں کو پیش نظر رکھتے تھے، اور رضائے الٰہی کی طلب سے کبھی غافل نہ ہوتے تھے، مگر اس بارے میں بھی وہ ادنیٰ و اعلیٰ پر نظر رکھتے تھے، انھوں نے محمد میاں کی تعلیم و تربیت میں بھی یہ نقطہ نظر پیش نظر رکھا، وہ نصاب و نظام تعلیم کے بارے میں تقلید کے بجائے اجتہاد کے قائل تھے، اور خوب سے خوب تر کی فکر میں رہتے تھے، پہلا تجربہ انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی (علی میاں) پر کیا، پھر اسی روشنی میں محمد میاں کے لیے بھی نصاب وطرز تعلیم کا ایک موثر اور تیز رفتار لائحہ عمل مرتب کیا، مجھے یاد ہے کہ تجربہ کار مدرسین اس پر سخت تنقید کرتے تھے، اور وثوق کے ساتھ اس کی ناکامی کی پیشن گوئی کرتے تھے، مگر ڈاکٹر صاحب اپنی رائے پر جمے رہے، بالآخر ان کی رائے صحیح ثابت ہوئی، اور محمد میاں قواعد وضوابط کی پُر پیچ راہوں سے گزرے بغیر ادب و انشاء کی ایسی بلند منزل تک پہنچ گئے، جس پر لوگ رشک کرتے تھے، ان کی تحریریں فصاحت و بلاغت، زور کلام، قوت استدلال اور انداز بیان کا بہترین نمونہ ہوتی تھیں، ان کے مضامین عرب ملکوں میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے اور دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے، وہ مقرر نہ تھے، مگر جب کبھی مجمع کے سامنے کوئی مضمون پڑھتے تو سامعین ہمہ تن گوش ہوجاتے۔

اللہ نے ان کے دل کو اسلام کی محبت اور ملت کے درد سے سرشار کردیا تھا، باپ کی تربیت اور صاحبان علم و بصیرت کے فیضان نظر نے اس نشہ کو دوآتشہ بلکہ سہ آتشہ بنا دیا تھا، ابھی شعور کی آنکھیں ٹھیک سے کھلنے بھی نہیں پائی تھیں کہ وہ اسلام کی خدمت اور ملت کی تنظیم کے خواب دیکھنے لگے، اس غرض سے ایک سوسائٹی کی تشکیل کی اور اسلام کی بین الاقوامی زبان عربی میں ایک اعلیٰ درجہ کے رسالہ کے اجرا کا منصوبہ بنایا، ان کے حسن نیت نے اس خیال کو مقبولیت عطا فرمائی اور البعث الاسلامی کے نام سے ایک وقیع رسالہ جاری ہوگیا، اور ملل اسلامیہ کے درمیان ربط ونظم کی طرح پڑ گئی جس نے آگے چل کر ایک موثر اور مضبوط نظام کی شکل اختیار کی، ندوۃ الشباب العالمیۃ اور رابطۃ العالم الاسلامی دونوں ان کے خواب کی تعبیر ہیں، ان کے قلم کا اثر روز بروز بڑھ رہا تھا، اور مصر و شام، نجد وحجاز اور دوسرے عرب ممالک میں ان کے مضامین بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے، ان کا ایک مجموعہ کتابی شکل میں شائع ہوچکا ہے، مزید کتابیں زیر ترتیب تھیں۔ لیکن،

؎ آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند

عربی کے کے ساتھ وہ اردو کے بھی بہت اچھے انشا پرداز تھے، اس کم عمری میں انھوں نے کہن سال مصنفین سے خراج تحسین وصول کیا، مولانا محمد علی مونگیری کی ضخیم سوانح عمری کے علاوہ تصانیف وتراجم کا ایک سلسلہ یادگار ہے، مشہور صاحب علم جرمن مسلمان لیوپولڈ اسد کی کتاب ''روڈ ٹو مکہ'' کا ترجمہ ''طوفان سے ساحل تک'' کے نام سے ایسا رواں اور شستہ کیا کہ اہل زبان عش عش کرنے لگے، مولانا ابوالحسن علی کی تحریروں کے بڑے باکمال مترجم تھے، ان کی بہت سی کتابوں اور رسالوں کو عربی سے اردو اور اردو سے عربی میں منتقل کیا ہے، اور ابھی چند ماہ ہوئے ان کی ضخیم سیرت نبوی کا ترجمہ اس خوبی کے ساتھ اردو میں کیا کہ اصل کا گمان ہوتا ہے، علی میاں ان کی ترجمہ نگاری کے بڑے مداح تھے، اور کہا کرتے تھے کہ محمد میاں نقل کو اصل بنا دیتے ہیں۔

علم و ادب میں اس کمال کے ساتھ وہ تہذیب و شائستگی اور شرافت و متانت کا بھی بہترین نمونہ تھے، خوردوں کے ساتھ شفقت و محبت سے پیش آتے، دوستوں کی دلداری و دلنوازی کی کوشش کرتے، بزرگوں کی تعظیم و توقیر کا ہمہ وقت خیال رکھتے اور ہم نشینوں کی خوشنودی کی فکر کرتے، اجنبی آدمی سے بھی ملاقات ہوتی تو مسکراتے ہوئے ملتے ان کے چہرہ کی بشاشت اور خندہ جبینی ان کی لطافت طبع اور پاکیزگی قلب کی ترجمان تھی ان کی کس کس بات کو یاد کیا جائے۔

؎ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا این جا است

جی چاہتا تھا کہ ابھی کچھ دن اور زندہ رہتے، اپنے بچوں کی بہار دیکھتے، گھر والے ان کو دیکھ کر خوش ہوتے، عزیز ان کے حسن سلوک سے مستفید اور دوست انکی شگفتہ مزاجی اور بذلہ سنجی سے محظوظ ہوتے، اور ان کے دل ان کی باغ و بہار طبیعت سے باغ باغ ہوتے، ملک وملت کی خدمت کے نئے نئے میدان تلاش کرتے، ان کا اشہب قلم نئی وادیوں میں قدم رکھتا، اس کی جولانیاں نئے معرکے سر کرتیں، اور وہ اپنی سحر آفرین تحریروں سے دلوں کو مسخر کرتے لیکن،

؎ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مشیت ایزدی کے سامنے کسے مجال دم زدن ہے بندگی تسلیم و رضا کی طالب ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ (''ع ۔ ق''، جولائی ۱۹۷۹ء)

---

۱ ان کو خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔

۲ اللہ سے انھیں جو عطا کیا اس پر وہ خوش ہیں۔
۳ غفور رحیم کی طرف سے مہمانی۔

جلیس، محمد اسحٰق

ایک اور سانحہ
محمد اسحٰق جلیس مرحوم

ابھی یہ سطور زیر تحریر ہی تھیں کہ مولوی محمد اسحٰق جلیس ندوی کے انتقال کی اطلاع ملی وہ ندوہ کے کتب خانہ کے نائب مہتمم، رسالہ تعمیر حیات کے ایڈیٹر اور تحریک پیام انسانیت کے سرگرم سکریٹری تھے، مولانا ابوالحسن علی ندوی ان کے بڑے قدر شناس تھے، اور ان سے بڑی توقعات رکھتے تھے، افسوس کہ عمر نے وفا نہ کی اور عین شباب کے عالم میں اس جہاں فانی سے رخصت ہوگئے، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت سے نوازے، پس ماندگان کو صبر عطا فرمائے اور ندوہ کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ (''ع،ق''، جولائی ۱۹۷۹ء)

قدوائی، عبدالسلام، مولانا

آہ مولانا عبدالسلام قدوائی!

آنکھیں اشکبار ہیں، دل اندوہ وغم کا جوئبار ہے، جب یہ قلم فگار ہوکر لکھ رہا ہے کہ مولانا عبدالسلام قدوائی جو دارالمصنفین کی علمی اور نجی مجلسوں کی رونق، عزت اور آبرو تھے، ہم سب کو چھوڑ کر یکا یک آغوش رحمت الٰہی میں چلے گئے۔

وہ ۱۹۷۵ء میں دارالمصنفین اس وقت آئے جب جناب شاہ معین الدین احمد ندوی سابق ناظم دارالمصنفین کی رحلت سے یہاں کا پتہ پتہ، بوٹا بوٹا سوگوار اور بے رونق ہورہا تھا، وہ یہاں آئے تو اپنے جلو میں علامہ شبلیؒ کی بے پناہ عظمت، اپنے استاد مولانا سید سلیمان ندویؒ کی غیر معمولی عقیدت، جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی شخصیت سے اپنی مخلصانہ محبت اور خود اپنی ذات کی لینت، مروت اور ملاطفت کا لشکر ساتھ لائے اور اس راقم سے ایسے گھل مل گئے کہ ہم دونوں کے درمیان شیر وشہد کی کوثر بہتی نظر آنے لگی، ان کی آمد سے دارالمصنفین کی سرگرمیوں میں شادابی، اس کی امیدوں کے پھولوں میں رعنائی اور اس کی تمناؤں کے مرغزاروں میں دل فریبی پیدا ہونے لگی، مگر معلوم نہیں مصلحتِ خداوندی کیا تھی کہ دارالمصنفین کے رفقاء ان کی علمی بصیرت اور بزرگانہ الفت سے ہر طرح کا استفادہ کررہے تھے کہ وہ اچانک دائمی طور پر ان سے جدا ہوگئے، وہ ۲۷/ رمضان المبارک کو تراویح پڑھ کر اور تہجد اور فجر کی نماز ادا کرکے چار بجے صبح اعظم گڑھ سے اپنے وطن تھلنڈی ضلع رائے بریلی عید منانے روانہ ہوئے، وہاں پہنچنے کے دوسرے روز سحری کے وقت اٹھے، یکا یک بیہوش ہوئے اور جمعہ کے روز گیارہ بجے دن کو اللہ کو پیارے ہوگئے، دوسرے دن عید کی نماز کے بعد ان کی طالب علمی کے محبوب اور شفیق ترین ساتھی اور اسلامی ممالک کے فاضل اجل مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ان کے سات سوگوار بیٹوں اور ہزروں آدمیوں کے ساتھ ان کے جنازہ کی نماز پڑھائی، اور وہیں گوناگوں خوبیوں کا یہ مجسمہ سپرد خاک کردیا گیا۔

ان کا سنہ پیدائش ۱۹۰۶ء تھا، ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تحصیل علوم کے بعد مزید تعلیم کے لئے جامعہ ملیہ دہلی گئے، وہاں سے بمبئی کے اس زمانہ کے مشہور اخبار خلافت کی مجلس ادارت میں شریک ہوگئے، پھر ۱۹۳۴ء میں ندوہ میں مدرس کی حیثیت سے بلالئے گئے، لکھنؤ میں ادارۂ تعلیمات اسلام قائم کیا، جہاں تعلیم یافتہ حضرات کو کلام مجید کا درس دیتے اور آسان ریڈروں کے ذریعہ سے عربی سکھاتے، یہاں سے ایک جریدہ ''تعمیر'' بھی مولانا ابوالحسن ندوی کے ساتھ شائع کرتے رہے پھر جامعہ ملیہ میں دینیات کے استاد مقرر ہوئے، جہاں اکیس سال تک اس درس گاہ کے لوگوں کے دلوں کی تسخیر کرتے رہے، وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد ندوہ کے اعزازی معتمد تعلیم بنائے گئے، پھر جناب شاہ معین الدین احمد ندوی کے بعد مولانا ابوالحسن علی کی خواہش پر دارالمصنفین کی کشتی کے دیدبان بن کر آئے۔

ان تینوں اداروں سے ان کو عشق رہا، ندوہ ان کی لیلیٰ تھی، جامعہ ملیہ ان کی عذرا تھی، دارالمصنفین ان کے لئے شیریں بنی ہوئی تھی، یہاں فرہاد بن کر اس کے لئے جوے شیر نکالنے کی فکر میں تھے کہ اسی فکر کا تیشہ لئے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی۔

ان کی شخصیت ایک عطر مجموعہ تھی، وہ ایک بہت اچھے انسان، بہت اچھے دوست بہت اچھے شاگرد، بہت اچھے استاد، بہت اچھے شوہر، بہت اچھے باپ اور بہت اچھے عالم تھے، ان کا دل چیر کر دیکھا جاتا تو ان کے سویداے دل کے اندر حسین اور شامہ نواز گلاب کی پنکھڑیاں رکھی ہوئی دکھائی دیتیں، وہ بولتے تو معلوم ہوتا کہ مصری کی ڈلی چبارہے ہیں، اور اپنے مخاطب کا من موہ رہے ہیں، جس کے ساتھ رہے، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا کہ وہ حبیب ہیں کہ محبوب، ندوہ میں ان کے ہم درس رئیس احمد جعفری مرحوم تھے، جو اردو کی بے شمار تصانیف کے مشہور مصنف ہوئے، ان سے بچھڑے ہوئے خدا جانے کتنی مدت گزر چکی تھی، مگر شائد ہی کوئی روز ایسا گزرتا، جب وہ ان کی یادوں کی برات نہ سجاتے، مولانا ناظم ندوی بھی ان کے ہم درس تھے، اب وہ کراچی میں ہیں، ان کا ذکر آتا تو کہتے کہ ان سے ایک بار ملاقات ہوجاتی تو پھر دنیا سے جانے کا افسوس نہ ہوتا، ندوہ کی طالب علمی کے زمانہ میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کا بھی ان کا ساتھ رہا، ان کی ہر دل عزیزی کے جلووں، ان کی محبوبانہ اداؤں اور ان کی علمی دلربائیوں کا تو وظیفہ پڑھتے رہتے۔

ان کے تین محبوب استاد تھے، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا حیدر حسن خاںؒ اور

مولانا شبلی جیراجپوری مرحوم، ان تینوں کا ذکر خیر اس طرح کرتے، جیسے ابھی ابھی ان سے مل کر آئے ہیں، سید صاحبؒ کی گھریلو زندگی کے کچھ واقعات ایسے سناتے کہ ان کی خبر مجھ کو بھی نہ تھی، حالانکہ مجھ کو ان کے گھر کے اندر بھی ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، وہ سید صاحبؒ کی علمی جلالت کے بے حد قائل تھے، کہتے کہ ان کے ایسا روشن دماغ اور دیدہ ور عالم عرصہ دراز تک پیدا نہ ہوسکے گا، وہ مولانا حیدر حسن خاںؒ سے گرویدہ ہوکر ان سے بیعت بھی ہوگئے تھے، ان کی آن بان اور تدریسی شان کا ذکر مزے لے لے کرتے، معارف میں ان پر جو مضمون لکھا تو لکھتے وقت اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دینے کی فکر میں رہے، انھوں نے مولانا شبلی جیراجپوری پر بھی معارف میں ایک مضمون لکھا تو ان کے پاس خطوط آئے کہ مولانا مرحوم کی اصلی عظمت اس مضمون سے معلوم ہوئی۔

کلام مجید کا درس دینے اور عربی زبان سکھانے میں ان کو خاص لذت ملتی، تاریخی لطیفوں، علمی چٹکلوں اور ادبی بذلہ سنجیوں کے ساتھ کلام پاک کے رموز ونکات مزے لے لے کر بیان کرتے، چالیس روز میں عربی سکھا دیتے، ان کے عربی کے قاعدے ہندوستان اور پاکستان میں بہت مقبول ہیں، بچوں کی ذہنی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھے، دارالمصنفین سے بچوں کے لئے ان کی دو کتابیں ہماری بادشاہی اور ہندوستان کی کہانی شائع ہوئیں، تو ہزاروں کی تعداد میں چھپ کر فروخت ہوتی رہتی ہیں، وہ جہاں بھی رہتے، اپنے شاگردوں کو بہت عزیز رکھتے، ان کی خاطر ارباب حل و عقد سے بھی اختلاف کرتے، چاہے وہ ان کے عزیز دوست ہی کیوں نہ ہوتے۔

وہ ایک شفیق شخص بھی تھے، ان کی دوستوں کی بیویوں کو رشک ہوتا کہ ان کے شوہر بھی ان ہی کی طرح ہوتے، ان کے بچے ان کی شفقت و محبت کی ٹھنڈی اور گھنی چھاؤں میں جس طرح پلے، کم بچے اپنے باپ کے زیر سایہ اس طرح پلے ہوں گے، ان کے یہاں دھتکار اور پھٹکار کی کوئی گنجائش نہ ہوتی، ان کے پیارا اور چمکار سے ان کے گھر کی فضا خوشگوار بنی رہتی۔

ان کی خطابت کی بھی عجیب دلربایانہ شان تھی، جمعہ کے روز منبر پر کھڑے ہوکر خطبہ دیتے تو معلوم ہوتا کہ، ع

بلبل چہک رہا ہے ریاض رسول میں

وہ چٹکلے اور گھریلو قصے بیان کرکے ان کو کلام پاک کی آیات، حدیث کی روایات اور اسلامی تاریخ کے واقعات سے اس طرح جوڑ دیتے کہ ان سے نہ صرف ان کی بالغ نظری اور روشن ضمیری کی فضا پیدا ہوجاتی بلکہ سامعین بھی اپنی روح میں ایک طرح کی بالیدگی اور ذہن میں ایک قسم کی بیداری محسوس کرتے، دارالمصنفین ان کے خطبے کی وجہ سے بھی بیت الحکمت اور مذہبی تربیت گاہ بن گیا تھا۔

ان کا علمی مطالعہ بھی بہت وسیع تھا، جو کچھ پڑھا تھا، مستحضر رہا، کلام پاک، تفسیر حدیث، رجال، علم کلام، تصوف، تاریخ، ادب، سیاست، حتی کہ ناول نگاری اور افسانہ نویسی پر جب کبھی گفتگو آجاتی تو کچھ نہ کچھ ایسے نکتے بیان کرجاتے کہ یکا یک ذہن کے دریچے کھل جاتے، یہ اعتراف کرنے میں تامل نہیں کہ راقم نے ان کے بعض ایک دو جملوں پر معارف کے لئے لمبی لمبی تحریریں لکھیں، وہ علمی مشورے کچھ ایسے میٹھے اور پیارے انداز میں دیتے کہ موضوع کی بہت سی گتھیاں سلجھ جاتیں، وہ علمی کاوشوں کے لئے جس طرح اکساتے، خفتہ علمی جذبات کو جس طرح بیدار کرتے، پھر ان میں جس طرح جوت جگا دیتے، وہ نہ صرف میرے بلکہ دارالمصنفین کے لئے بڑی دولت رہی، وہ ان لوگوں میں سے تھے جن سے علمی بصیرت کا درس لیا جاسکتا تھا، بشرطیکہ کسی میں یہ درس لینے کی صلاحیت ہو۔

وہ مسلمان اور عصری تقاضے، سورہ بقرہ کی تفسیر، ہماری بادشاہی، ہندوستان کی کہانی، عربی کے دس سبق، قرآن مجید کی پہلی کتاب، (پارہ الم) اور قرآن مجید کی دوسری کتاب (سیقول) وغیرہ کے مصنف تھے، مگر میرے لئے وہ بہت سی اور یادیں بھی چھوڑ گئے ہیں، ان کا وہ درد بھی یاد آئے گا، جو وہ دارالمصنفین کے لئے اپنے پاک اور بلور کی طرح جھلکتے ہوئے دل میں رکھتے تھے، وہ لمحات بھی یاد آئیں گے، جب ہم دونوں دارالمصنفین کے سبزہ زار پر بیٹھ کر اس کے مستقبل کو سوچتے، وہ سامنے کھلے ہوئے گلاب کو دیکھ کر کہہ اٹھتے کہ اس ادارہ کی علمی روایات میں گلاب ہی کی شادابی اور رنگینی رہی ہے، کیا وہ آئندہ بھی باقی رہے گی، پھر مایوسانہ لہجے میں کہتے کہ دارالمصنفین کے اسلاف نے خدمت اور اشیاء کے جو نمونے پیش کئے ہیں، وہ اب نہیں ملیں گے، یہ پیسے کے پیچھے دوڑ لگانے کا دور ہے، مگر وہ اس مایوسی کو دور بھی کرنے کی کوشش کرتے، کبھی چاندنی راتوں میں ہم دونوں دارالمصنفین کے صحن میں بیٹھے باتیں کرتے رہتے، تو وہ بشارت دیتے کہ ہم لوگوں کو پرامید رہنا چاہئے، اس علمی مرکز پر اللہ تعالی کی رحمتوں اور برکتوں کی چاندنی انشاءاللہ برابر چھٹکی رہے گی۔

وہ حوصلہ افزائی کرنا خوب جانتے تھے، جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی وفات سے میرا سینہ اندوہ وغم کا آتشدان بنا ہوا تھا، مگر انھوں نے اپنی مدبھری باتوں سے اس کو امیدوں کا گلزار بنا دیا تھا، کیا معلوم تھا کہ اس قدر جلد پھر یہ سوزغم کا تنور بن جائے گا، یہ اب ایک گنج شہیداں بن چکا ہے، اس میں استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، اور اب مولانا عبدالسلام قدوائی مدفون ہیں، میری حیثیت اب ایک مجاور کی ہے جو اپنے سینے کے قبرستان میں ان کی یادوں کا لوبان جلانے کے لئے رہ گیا ہے۔

چوالیس سال پہلے دارالمصنفین آیا تو اس کو استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کی وجہ سے علم کا عشرت کدہ سمجھنے میں لذت محسوس کی، پھر مولانا شاہ معین الدین

احمد ندویؒ کے زمانہ میں بھی اس کو اپنے لئے علم کا گلکدہ سمجھتا رہا، مولانا عبدالسلام قدوائی کی رفاقت سے بھی یہ میرے لئے علم کا خم کدہ بنتا جارہا تھا، مگر اب زندگی کی اس منزل میں ہوں کہ کہیں مجھ کو خود یہ نہ کہنا پڑے،

ع ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم کی نیکیاں اور خوبیاں ان کے سفر آخرت کے لئے زادِ راہ ہیں، دعا ہے کہ ان ہی کی بدولت مغفرت کی کوثر و تسنیم سے ضرور سیراب ہوں، آمین، ثم آمین، ان کی سیرت کی رعنائیوں، ان کے کردار کی دل آویزیوں اور ان کی گوناگوں خوبیوں کو سلام اور لاکھوں سلام بھیجتا ہوں تو اس وقت دارالمصنفین کی ہر سمت سے یہ صدا سنائی دیتی رہے،

ع گلے برفت نیاید بہ صد بہارا دگر!

(''ص، ع''، جولائی ۱۹۷۹ء)

مودودی، ابوالاعلیٰ، مولانا

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

۲۲رستمبر ۱۹۷۹ء کو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی وفات سے یہ برصغیر ہی نہیں بلکہ پوری اسلامی دنیا بھی ایک ممتاز متکلم، ایک مضطرب مفکر، ایک دیدہ ور مفسر، ایک بے چین شارح دین، ایک قابل قدر ترجمان شریعت اور ایک بلند پایہ مصنف سے محروم ہوگئی۔

انھوں نے ۷۷ برس کی عمر پائی، ان گنت کتابوں کے مصنف ہوئے شروع میں ان کی تحریریں نکلیں تو جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو محسوس ہونے لگا کہ ان میں وہ ساری باتیں ہیں جن کی تلاش ان کے ذہن کو ہے، جب وہ مغربی افکار کے ابلیس کی تلبیس سے دب کر اپنے تذبذب اور تشکیک کی بناء پر اسلام کو جامد اور غیر متحرک پارہا تھا تو اس کو مولانا مودودی کی تحریروں کے ذریعہ سے یہ احساس ہوا کہ کوئی اس کے تاریک اور منجمد ذہن پر ہلہ بول کر اس کو جھنجھوڑ رہا ہے، مولانا مودودی کی تحریروں میں شگفتگی بھی ہوتی، دلنشینی بھی، حرارت ایمانی کی گرمی بھی، نظر و فکر کی گرم جوشی بھی، منطقی دلائل کے یقین کی پختگی بھی، عالمانہ انداز میں کلام پاک اور حدیث کی جاندار تعبیر بھی، اسلام کے ناقدوں اور خصوصاً فرنگی معترضوں کے خلاف جارحانہ حملے بھی اور یورپی طرز فکر کی جرأت مندانہ تحدی بھی، اس لئے وہ شوق سے پڑھی گئیں، ان کا علم ایک بحر خار تھا، جس سے انھوں نے بقول استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی، ''یورپ کے ملحدانہ افکار'' کے خلاف ایک بند باندھنے کی کوشش کی اس میں ان کے قلم کی بے مثال قوت ان کا پورا ساتھ دیتی رہی۔

رفتہ رفتہ وہ ایک خاص مکتب فکر اور تحریک کے بانی قرار پائے جس سے صالح قیادت کے ذریعہ وہ مسلمانوں کی معاشرتی اور سیاسی زندگی میں طاقتور دینی روح دینی اخلاص اور دینی قدریں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ یہ تحریک اس برصغیر میں جماعت اسلامی کی تنظیموں سے مسلمانوں کے ایک اچھے خاصے طبقہ پر اثر انداز ہوئی۔

ان کی مقبولیت بڑھی تو بعض حلقوں میں ان سے اختلاف بھی پیدا ہوتا گیا، انھوں نے تصور دین کے سلسلہ میں الٰہ، رب، دین اور عبادت کے قرآنی کلمات اور اسلامی اصطلاحات کی جو تشریح کی یا تصوف کو تعطل اور بطالت کا جو دوسرا نام قرار دیا، یا نسلی اور اصلی مسلمان کی جو تفریق بتائی حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے متعلق جس رائے کا اظہار کیا یا اور دوسرے صحابہ کرام کی شان میں جو الفاظ استعمال کئے یا امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں جو یہ لکھا کہ ان کی فقہ میں بکثرت ایسے مسائل ہیں جو مرسل، معضل اور منقطع حدیثوں پر مبنی ہیں، یا معیار حق کی جو تصریح کی الخ الخ تو ان کے اور ان کے حامیوں کے کلامی افکار و نظریات پر بہت ہی تلخ بحث چھڑ گئی۔

حکومت الٰہیہ کے تخیل کے ساتھ مولانائے مرحوم نے پاکستان کی عملی سیاست میں حصہ لیا تو ان کو دار کے تختہ تک پہنچانے کی کوشش کی گئی، خود ہندوستان کے اندر ان کے حامیوں سے حکومت کچھ ایسی مشکوک ہوتی چلی گئی کہ بات بات پر ان کو جیل جاکر ابتلا و آزمائش سے دوچار ہونا پڑا، مگر مولانائے مرحوم نے اپنے یقین محکم، عمل پیہم اور عزم راسخ کا وہی ثبوت دیا جو اسلام کے بڑے بڑے مصلحین نے دیا ہے، انھوں نے معتقدوں میں بھی استقامت کی ایسی روح پھونکی کہ وہ بھی ہر امتحان میں پورے اترے۔

ہر نئی دعوت کے داعی اور اس کے حامیوں کو ہر طرح کی صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اسلام کی تاریخ دعوت و عزیمت کے صبر آزما مرحلوں سے ہمارے مصلحین اور مجاہدین درس لیتے رہے ہیں، یہ صحیح ہے کہ اسلامی تحریک شائد ہی کوئی ایسی ہو جس کی مخالفت کسی نہ کسی طرح نہ کی گئی ہو، مگر یہ بھی صحیح ہے کہ ایسی ہر تحریک میں کچھ نہ کچھ نظری، فکری اور عملی خامیاں اور کمزوریاں بھی ضروری ہیں، جن سے مخالفت کا موقع ملتا رہا جن اسباب کی بناء پر ان کی مخالفت ہوئی ان کا گہرا تجزیہ کرنے کے بعد بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے، آخر ہم گزشتہ چودہ سو سال کی تاریخ کے اپنے عروج و زوال دونوں کے عواقب سے کب بصیرت اور عبرت حاصل کریں گے، موجودہ دور کے مسلمانوں کو بھی اپنے معاشرہ میں مذہبی، معاشرتی اور سیاسی انحطاط و ادبار کا سامنا ہے، وہ بے چینی سے متوقع ہیں کہ اس کو دور کرنے کے لئے ان کے مفکرین نہیں اسلامی نظر و فکر سے کچھ ایسی قابل عمل چیزیں پیش کریں جو متنازعہ ہونے کے بجائے متفق علیہ ہوں، یا کم از کم اس حد تک قابل قبول ہوں کہ ان کے خلاف کفر و ضلالت کا فتوی صادر نہ کیا جائے، کیا یہ ممکن نہیں؟ اگر ناممکن ہے تو سارے مسلمان اپنے خیالات کی ریت میں اپنے ذہن کو یہ سوچ کر چھپالیں کہ انسانی تاریخ میں آج تک کوئی ایسی تحریک نہیں چلی جس کی مخالفت نہ ہوئی ہو، مگر یہ اسلامی طرز فکر نہیں، ہر اسلامی تحریک کے دردمند اور مخلص محرک

کو یہ سوچنا ضروری ہے کہ اس سے مسلمانوں کی یکجہتی اور یگانگت میں خلل پڑنے کا ذرا بھی احتمال ہوتو وہ اس تحریک کی خامیوں کو یا تو دور کرے یا اس سے دست بردار ہوجائے، ایک اسلامی قائد کی شان یہ ہے کہ اس کی کسی بات سے کسی مسلمان کے تلوے میں چبھن محسوس ہوتو وہ اس کی چبھن کو تلوے کی جگہ اپنے دل میں محسوس کرے۔

اس قسم کی بحث ہوتی رہے گی مگر اب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی وہاں ہیں جہاں ان سے پہلے اسلام کے بڑے بڑے مفکرین جاچکے ہیں، وہ اپنے پیچھے اپنی نظر وفکر کا ایک خزانہ چھوڑ گئے، مگر اپنے ساتھ اسلام کی وہ شیریں دیوانگی لے گئے ہیں، جس میں وہ زندگی بھر مبتلا رہے، ان کی تحریروں میں کہیں کہیں اسلام کی جو پسی ہوئی بجلیاں اور بکھری ہوئی تجلیاں ہیں وہ ان کے آخری سفر کی زاد راہ ہیں، وہ مضطرب اور بے قرار گھڑیاں جو انھوں نے اپنے مطمع نظر سے احیائے دین کی خاطر اپنی زندگی میں گزاریں، کیا عجب کہ عالم بالا میں رحمت الٰہی کے موتیوں کی لڑیاں بن جائیں، ان کا جنازہ دھوم سے اٹھا، بے شمار لوگوں نے ان کے جنازہ کی نماز پڑھی، علماء، صلحاء، اتقیاء اور اصفیاء نے ان کا ماتم کیا، دعا ہے کہ بارگاہ الٰہی میں بھی ان کو یہی حسن قبول عطا ہوا، آمین ثمہ آمین، اللھم اغفرله وارحمه۔ (''ص۔ ع''، اکتوبر ۱۹۷۹ء)

قدسی، اسدالرحمٰن، شاہ

شاہ اسدالرحمٰن قدسیؒ

(محمودالرحمٰن)

بہت سے انسان موت کے بعد فراموش کردیئے جاتے ہیں، لیکن بعض اس مرتبے کے ہوتے ہیں کہ ان کی یاد لمحے بھر کو بھی دل سے محو نہیں ہوتی، اور زندگی کے ہر موڑ پر ان کی کمی شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔

ایسی ہی عالی مرتبت ہستیوں میں حضرت شاہ اسدالرحمٰن قدسی علیہ الرحمۃ بھی تھے، طریقت ہوکہ شریعت، قلندری ہوکہ درویشی، علم ہوکہ عرفان، ادب ہوکہ آگہی، فلسفہ ہوکہ حکمت، تفکر ہوکہ تصوف، ہرصنف میں انھیں مقام اولیت حاصل تھا۔

برصغیر پاک و ہند کے تمام اکابر آپ کی فکر ونظر، علم و دانش، تبحر علمی، قلندرانہ شان، حسن اخلاق، شفقت ومحبت اور روحانی مقام و مرتبے کے معترف رہے ہیں، ہر مکتبۂ خیال کے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر سکون و اطمینان کی دولت سے مستفید ہوتے رہے ہیں، ہرفکر وتشویش ان کی صحبت میں کالعدم ہوجایا کرتی تھی، اور ہر عقدۂ لاینحل اس پیر کامل کی مجلس میں حل ہوجایا کرتا تھا اور سائل آستانہ قدسی سے شاد کام وبامراد لوٹتا تھا۔

آپ کا اسم گرامی ناصر الدین محمد اسدالرحمٰن قدسی تھا۔ آپ کے جدامجد شیخ الاسلام شاہ ابوالمکارم، جن کا سلسلۂ نسب حضرت امام جعفرؒ صادق سے ملتا ہے، سبزوار کے رہنے والے تھے، وہاں سے ہجرت کرکے ہندوستان تشریف لائے اور قطب الاقطاب حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کے خاندان میں متاہل ہوئے، آگے چل کر اس خاندان میں ایک بہت مشہور بزرگ حضرت شاہ نجف علی گزرے ہیں، جو حضرت رفیع الدین محدث دہلویؒ کے شاگرد وخلیفہ تھے، موصوف کی اہلیہ محترمہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی حقیقی بہن تھیں، جن سے حضرت شاہ حبیب الرحمٰن پیدا ہوئے۔

آپ کی والدہ محترمہ علامہ محمد اسحٰق کی دختر تھیں۔ ان کی زبان فارسی تھی، اردو اور پشتو بھی بولتی تھیں۔ اپنے والد سے عربی پڑھی تھی، اور حافظ کلام اللہ تھیں۔

آپ کی ولادت ۱۲/رجب ۱۳۰۹ھ بروز شنبہ بوقت صبح صادق ہوئی۔ جب آپ چار سال کے ہوئے تو والدہ محترمہ نے قرآن مجید پڑھانا شروع کیا، آپ نے جس دن قرآن مجید ختم کیا، والدہ صاحبہ نے خواب میں دیکھا کہ حضرت نبی کریم ﷺ کے سامنے رحل پر قرآن کھولے ہوئے اول سے آخر تک پورا قرآن شریف سنایا اور سرکارؐ نے ایک بڑا تھیلا جس میں اخروٹ کے برابر کوئی شے بھری ہوئی تھی، عنایت فرمایا۔

چھٹے برس کتابی تعلیم اور اس کے ساتھ روحانی تربیت والد بزرگوار کی زیرنگرانی مسلسل سات برس تک ہوتی رہی۔ قرآن پاک، تفسیر، حدیث اور فقہ کی تعلیم سے فراغت کے بعد والد نے آپ کو لاہور بھیج دیا۔ جہاں آپ نے پانچ سال تک مقیم ہوکر مختلف علوم وفنون میں دستگاہ حاصل کی۔

اٹھارہ برس کی عمر میں درس وتعلیم سے فراغت حاصل کرکے بھوپال واپس آئے، اور روحانی مشاغل کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس دوران والد بزرگوار حضرت شاہ حبیب الرحمٰن نے جو حضرت کے مرشد طریقت بھی تھے، رحلت فرمائی۔ رخصت سے دو ہفتے پہلے بعد نماز مغرب حضرت قدسیؒ کو تسبیح، مصلے کلاہ اور اوراد وظائف کا قلمی مجموعہ حوالہ کرکے ارشاد فرمایا کہ ''مجھے ہدایت ہوئی ہے کہ تم کو اپنا جانشین مقرر کروں۔ میری وفات کے بعد بارہ برس تک مجاہدات میں مشغول رہنا۔ کتاب وسنت کے بغیر کوئی عمل اختیار نہ کرنا''۔

آپ نے اپنے والد ماجد کے حکم پر پوری طرح عمل کیا اور کامل بارہ سال تک سخت مجاہدے میں مصروف رہے، دن بھر روزہ رکھتے، شام کو کچھ خرمے اور چائے سے افطار کرتے۔ بقیہ سارا وقت عبادت و ریاضت میں گزرتا بھوپال کی جس ویران مسجد میں تنہا تین سال کا عرصہ گزرا۔ وہاں ایک پرانا بوریا، جس کے سرہانے دو اینٹیں رکھی ہوئی تھیں، ایک کمبل، ایک پانی کا گھڑا اور ایک مٹی کا لوٹا تھا، صاحب ولایت کا بس یہی اثاثہ تھا۔ اس تمام عرصے میں شب بیداری آپ کا معمول خاص رہا۔

بارہ سالہ مجاہدہ ختم ہونے پر مولانا اشرف علی تھانویؒ نے آپ کو ''ولی الاشرف''

کا لقب عنایت فرمایا۔ حضرت شاہ محمد سلیمان پھلواروی نے ''حبیب الاولیاً'' کے خطاب سے نوازا۔

حضرت قدسی نے ۱۳۵۷ھ میں سفر حج اختیار کیا اور مدینہ منورہ میں سرکار عالم کے روضے پر حاضری دی۔ وہیں آپ حضرت سید حمزہ رفاعیؒ کی زیارت سے مشرف ہوئے تو حضرت اقدس نے جو سالہا سال سے خلوت نشیں تھے۔ اپنا تجدید شدہ طریقہ تفویض فرما کر خلعت خلافت سے سرفراز فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ ''تمھاری امانت میرے پاس محفوظ تھی، اور عرصہ دراز سے میں تمھارا منتظر تھا۔ الحمدللہ کہ اس بار امانت سے جلد دی ہوا، یہ چیز دربار نبویؐ سے روحانی طور پر عطا ہوئی، خواجہ حسن نظامی نے اس خبر کو اپنے اخبار ''منادی'' مورخہ یکم فروری ۱۹۴۰ء میں شائع کیا تھا۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو حضرت قدسیؒ سے خصوصی عقیدت تھی، اپنی پیرانہ سالی کے زمانے میں حضرت مرحوم کو خط لکھا کہ:

''میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ کچھ سکت ہوتی تو حاضر آستانہ ہو کر خدمت کرتا، کیا ہی اچھا ہو کہ آپ یہاں رونق افروز ہو کر باعث خیر و برکت ہوں''۔

مولانا کی اس درخواست پر ہمارے مرشد گرامی تھانہ بھون تشریف لے گئے، معزز میزبان نے مقتدر مہمان کو ٹھہرانے کے لئے بستی سے باہر خیمہ گاہ کا بندوبست فرمایا۔ اس میزبانی سے کچھ عرصہ قبل مولانا موصوف کو خواب میں اس جگہ ایک بارونق منظر کا مشاہدہ ہوا تھا، عجب اتفاق، حضرت قبلہ کو یہ جگہ پسند آئی اور ایک فرودگاہ تعمیر کرائی، جس کو مولانا تھانویؒ نے ''آستانہ قدسی'' کے نام سے موسوم فرمایا اور مندرجہ ذیل تاریخی قطعہ لکھا اور اسے ایک سنگ مرمر کی لوح پر کندہ کرا کر آستانے کی دیوار میں نصب کرا دیا۔

قطعہ

کرد قدسی نزول چوں ایں جا جستم ازدل سن ظہور سرور
گفت دل آستانہ قدسی ہم بیفزا برد تجلّی طور
کتبہ فقیر اشرف علی تھانوی

مولانا ممدوح نے اس دوران یہ وصیت کی تھی کہ جس جگہ حضرت قدسی کا پلنگ بچھا ہے، مجھے وہیں پر دفن کیا جائے۔ چنانچہ ان کی وصیت کے مطابق ایسا ہی کیا گیا۔

علامہ اقبال کو حضرت قدسی سے خاص عقیدت تھی۔ اس کی نمایاں وجہ یہ تھی کہ اقبال کے مرشد حضرت گل حسن شاہ قلندرؒ کو حضرت سے خاص تعلق تھا، نیز ان کے خلیفہ حضرت فضل شاہ قلندر کشمیری آستانہ قدسی پر اکثر حاضری دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ علامہ اقبال حضرت مرحوم سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، آپ ہی کی تحریک پر علامہ نے ''جواب شکوہ'' جیسی شہرہ آفاق نظم لکھی تھی، علامہ اقبال نے قیام بھوپال کے زمانہ میں آستانے پر حاضری دی، اور وہاں کے روح پرور ماحول سے متاثر ہو کر یہ قطعہ لکھا تھا:

چشمہ فیض تشنہ لب کے لیے مرکز رشد بہر اہلِ صفا
کوئی سمجھے تو ہے مقامِ قدس آستانہ جناب قدسی کا

قیام پاکستان کے بعد آپ ہجرت کر کے پہلے کوئٹہ آئے۔ پھر سندھ کے مقام تھانہ بھولا خاں میں سکونت اختیار کی پھر وہاں کوٹری تشریف لے آئے یہاں کئی سال قیام کرنے کے بعد بھاول پور تشریف لے گئے، پھر وہاں سے نقل مکان کر کے چکوال آئے، اور کچھ عرصہ بعد بھون میں ایک وسیع و عریض رقبہ میں آستانہ قدسی کی تعمیر عمل میں آئی اور پھر آپ نے وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

افسوس، صد افسوس! اس گراں مایہ ہستی نے ۸۸ سال کی عمر میں آستانہ قدسی بھون میں ۲۴؍ نومبر ۱۹۷۸ء کی شام کو وفات پائی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون، دوسرے دن جمعہ کو بعد نماز عصر اپنی وصیت کے مطابق آستانہ قدسی میں مدفون ہوئے۔ مجھ جیسے روسیاہ کی زبان اس لائق نہیں کہ ایسی مقتدر شخصیت کے لئے دعائے مغفرت کرے۔

(دسمبر ۱۹۷۹ء)

عباسی، محمد عدیل، قاضی

قاضی محمد عدیل عباسی

جناب قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم کی رحلت کی خبر دارالمصنفین میں بہت ہی رنج و الم کے ساتھ سنی گئی، مرحوم قوم و ملت دونوں کے لیے بہت ہی مخلصانہ جذبات رکھتے تھے، وہ ایک اچھے خدمت گزار ملت کے ساتھ ہی بڑے سچے محبِ وطن بھی تھے، انھوں نے اپنی علمی سرگرمیوں سے یہ عملی نمونہ پیش کیا کہ ایک سچا مسلمان ہی سچا محبِ وطن ہو سکتا ہے۔ قاضی صاحب نے اردو، علی گڑھ اور مسلمانوں کی دینی تعلیم کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں وہ مدتِ مدید تک یاد رہیں گی۔ (''ص۔ع''، جون ۱۹۸۰ء)

قاضی محمد عدیل عباسی

جناب قاضی محمد عدیل عباسی کے انتقال کو کئی مہینے ہو گئے، دارالمصنفین سے ان کو جو اخلاص و تعلق تھا، اس کا تقاضا تھا کہ ان کے ذکر سے معارف خالی نہ رہے، اس لئے تاخیر کے باوجود اس تحریر کی اشاعت نامناسب نہ ہوگی۔

قاضی محمد عدیل صاحب کا تعلق ضلع بستی کے ایک کھاتے پیتے زمیندار گھرانے سے تھا مگر ابتداء ہی سے ان کا رجحان قوم پروری اور حب الوطنی کی تحریک کی جانب ہو گیا تھا، اس لئے کالج کی تعلیم چھوڑ کر وہ عملی سیاست میں داخل ہو گئے، ان کو اس

میدان میں پنڈت جواہر لال نہرو، رفیع احمد قدوائی، مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا حفظ الرحمان وغیرہ کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا، خلافت، ترک موالات اور ہندوستان چھوڑ دو، تحریکوں میں سرگرم حصہ لینے کی بنا پر وہ کئی بار جیل گئے۔

قاضی صاحب کی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا ان کو اس کا ذوق کان پور میں مولانا حسرت موہانی مرحوم کی صحبت میں پیدا ہوا، پھر وہ مشہور قوم پرور اخبار مدینہ بجنور اور زمیندار لاہور سے وابستہ ہوئے، زمیندار اس زمانہ کا سب سے مقبول روزنامہ تھا اور مولانا ظفر علی خاں مرحوم کی ادارت میں شائع ہوتا تھا، قاضی صاحب کے قلم سے اس میں ایسے مضامین نکلے جن پر وہ برطانوی حکومت کے زیر عتاب آگئے اور ایک سال تک لاہور سنٹرل جیل میں قید رہے۔

اس کے بعد وہ اپنی ادھوری تعلیم مکمل کرنے کے لئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہوئے، ایم۔ اے اور ال۔ ال۔ بی کی ڈگری لی۔ ۱۹۲۶ء سے بستی میں وکالت شروع کی، اس پیشہ میں بہت نیک نام اور کامیاب تھے، وکالت کے ساتھ ان کو پبلک کے کاموں سے بھی دلچسپی رہی کئی برس تک بستی میونسپل بورڈ کے چیرمین رہے۔ ۱۹۳۷ء میں پہلی دفعہ صوبائی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے، اور ۱۹۵۷ء تک برابر ممبر منتخب ہوتے رہے، اس کے بعد اس کوچہ کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا۔

اردو سے ان کو عشق تھا، اس کے لئے وہ عمر بھر جہاد کرتے رہے، آزادی کے بعد جب قومی حکومت نے اس کے ساتھ معاندانہ اور غیر منصفانہ رویہ اختیار کیا تو وہ اسمبلی کے اندر اور باہر اس کے لئے آئینی و دستوری لڑائی لڑتے رہے، کانگریس میں رہ کر بھی وہ اس کے تنگ نظر، متعصب اور فرقہ پرست عناصر سے نبرد آزما رہتے اور بڑی جرأت و بیباکی کے ساتھ کانگریس کی اردو دشمن پالیسی کی مخالفت کرتے، وہ اردو کی دستخطی مہم میں بھی پیش پیش رہے اور اس وفد میں شریک ہوئے جس نے صدر جمہوریہ ہند بابو راجندر پرشاد کو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کی قیادت میں اکیس لاکھ افراد کے دستخطوں سے میمورنڈم پیش کیا تھا، اردو کا حق منوانے اور اس کو علاقائی زبان تسلیم کرانے کے لئے ان کی جدوجہد آخر دم تک جاری رہی، اس سلسلہ میں انہوں نے بے شمار مضامین لکھے جن سے اردو تحریک کو بڑی قوت ملی، تیس برس تک وہ انجمن ترقی اردو کی مجلس عام کے بڑے سرگرم اور فعال رکن رہے۔

دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کی تشکیل و تاسیس قاضی صاحب کا بڑا اہم کارنامہ ہے۔ اس کی بدولت اس صوبہ کے گاؤں گاؤں میں مکاتب قائم ہوگئے ان مکاتب کے ذریعہ مسلمانوں کی نئی نسل کے دین و ایمان کی سلامتی، اسلامی تہذیب و روایات سے اس کی وابستگی اور اس کے ذہنی ارتداد سے محفوظ رہنے کا سامان فراہم ہوا، انھوں نے مکاتب چلانے کے لئے چٹکی فنڈ اور کھلیانی جیسی اسکیمیں چلائیں اور سب سے پہلے اس کا تجربہ اپنے ضلع بستی میں کیا اور جب اس میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی تو انہوں نے پورے صوبہ میں اس نظام کو بروئے کار لانے کے لئے بستی میں دسمبر ۵۹ء میں ایک دینی تعلیمی کانفرنس کی، جس میں تمام مختلف الخیال اشخاص اور جماعتیں شریک ہوئیں، بعد میں جمعیۃ علمائے ہند نے اس سے علیحدگی اختیار کرلی، لیکن اب بھی اس میں مسلمانوں کی اور دوسری جماعتیں اور مختلف مکاتب فکر کے افراد شامل ہیں اور الحمداللہ اس وقت پورے صوبہ میں یہ تحریک کامیابی سے چل رہی ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی سب سے قیمتی متاع اور بیش بہا سرمایہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے، قاضی صاحب کو اس سے بڑا تعلق تھا، وہ یہیں کے تعلیم یافتہ تھے اور برسوں اس کی کورٹ کے ممبر بھی رہے تھے، اس کا اقلیتی کردار سلب کیا گیا تو قاضی صاحب کا خواب و خور حرام ہوگیا، اقلیتی کردار کو بحال کرنے کی جدوجہد شروع ہوئی تو وہ اس کے ہراول دستہ میں شامل ہوگئے اور اس کے متعلق بکثرت مضامین لکھے جن کا وزن پوری طرح محسوس کیا گیا۔

تصنیف و تالیف قاضی صاحب کا اصلی مشغلہ نہ تھا، لیکن وہ اچھے اہل قلم، ممتاز ادیب و انشا پرداز تھے، قلم برداشتہ لکھنے پر بھی قادر تھے، مضامین کے علاوہ حال ہی میں ان کی دو کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ (۱) اقبال فلسفہ حیات و شاعری۔ (۲) تحریک خلافت دونوں کتابیں اہم ہیں مگر موخر الذکر بعض حیثیتوں سے متنازعہ فیہ ہوگئی ہے، ۶۸ء میں خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے گئے تو اس کا سفرنامہ بڑے والہانہ انداز میں لکھا جو کتابی صورت میں چھپا اور پر از معلومات ہونے کی وجہ سے بہت پسند کیا گیا۔

وہ بہت اچھے مقرر اور خطیب بھی تھے، ان کی تقریریں مربوط، مدلل، مؤثر اور قانونی ہوتی تھیں، دینی تعلیمی کونسل کے جلسوں میں ان کی تقریریں سننے کے لئے لوگ بہت شوق سے جمع ہوجاتے، ایک دفعہ اعظم گڑھ کی ضلعی کانفرنس میں انہوں نے دینی تعلیم کی ضرورت و اہمیت کی وضاحت ایسے دل نشین انداز میں کی کہ اب تک اس کا چرچا ہوتا رہتا ہے۔

وہ دھن اور ارادہ کے پکے اور عملی آدمی تھے۔ وہ جس کام میں لگ جاتے اس میں تن، من، دھن سب کی بازی لگا دیتے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اردو اور دینی تعلیمی تحریک کے روح رواں تھے، ان کی سرگرمی اور قوت عمل نے ان تحریکوں میں بڑی حرکت و توانائی پیدا کردی تھی، وہ بہت بے لاگ اور کھرے بھی تھے، حق کے معاملے میں کسی قسم کی رورعایت نہ کرتے، جس بات کو غلط سمجھتے اس کی برملا تردید کرتے۔

وہ بڑے قوم پرور تھے، ہندو فرقہ واریت کی طرح مسلم فرقہ واریت سے بھی نبرد آزما رہتے تھے، لیکن ان کا دل دینی حمیت، ایمانی غیرت اور ملی درد سے معمور تھا، نیشنلسٹ مسلمانوں کے طبقہ میں دین و ملت کا ایسا درد رکھنے والے بہت کم لوگ ہوں

گے، انھوں نے قوم پروری کو ایمانی و ملی غیرت پر کبھی غالب نہ آنے دیا، انہوں نے ثابت کردیا کہ ایک سچا مسلمان ہی محبّ وطن ہوسکتا ہے، ان کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑی عقیدت ومحبت تھی، ۱۹۶۵ء میں دارالمصنفین کی طلائی جوبلی کے ایک جلسہ میں پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر جناب افضل اقبال نے انگریزی میں تقریر کی جو عام طور پر پسند کی گئی مگر قاضی صاحب کو اس سے اس بنا پر سخت تکدر ہوا کہ فاضل مقرر نے آنحضرت ﷺ کا اسم مبارک جس عقیدت اور احترام سے لینا چاہئے تھا نہیں لیا۔ اس کی شکایت انہوں نے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ناظم دارالمصنفین سے بھی کی اور اس کے خلاف قومی آواز لکھنؤ میں مراسلہ بھی لکھا۔

انھوں نے کبھی اپنی خدمت کا کوئی صلہ اور معاوضہ نہیں حاصل کیا، بلکہ ہمیشہ ٹھوس اور خاموش خدمت کو نام ونمود پر ترجیح دیا، ان کی موت سے اس دور کا خاتمہ ہوگیا، جس میں سیاست داں ملک، قوم اور ملت کی خدمت محض خدمت و ایثار کے جذبہ سے انجام دیتے تھے اور اس میں کسی ذاتی مفاد اور غرض کو دخل نہ ہوتا تھا، اللہ تعالیٰ قوم و ملت کے اس خدمت گزار کے ساتھ رحمت ومغفرت کا معاملہ کرے۔ آمین!!

(''ض''، جولائی ۱۹۸۰ء)

ردولوی، آفاق احمد، شاہ

حضرت شاہ آفاق احمد ردولویؒ

درگاہ شریف، ردولی۔

محترمی! تسلیمات

خدا کرے آپ کا مزاج اچھا ہو، اس سے پہلے بھی میں دو خط آپ کو تحریر کرچکا ہوں مگر جواب سے محروم ہوں۔ خدا معلوم وہ خطوط آپ تک پہنچے بھی یا نہیں، میرے حقیقی ماموں حضرت شاہ آفاق احمد سجادہ نشین درگاہ شیخ العالم ردولی شریف کا ۲۵/جولائی ۸۰ء کو اچانک میڈیکل کالج لکھنؤ میں قلبی دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا، ان کو پہلا دورہ ردولی شریف میں پڑا تھا اس کے بعد تین دورے میڈیکل کالج لکھنؤ میں پڑے، ڈاکٹروں نے پیس میکر لگانے کو کہا وہ بھی لگادیا گیا۔ مگر موت کے آگے اور خداوند عالم کی مرضی کے آگے کوئی اختیار نہیں چلتا، چونکہ اکثر بیشتر وہ آپ کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے اسی لئے ان کی بیماری کی اطلاع بھی ۳۰/جون کو آپ کو اور وسیم الحسن صاحب کو بھی دے دی تھی، اس کے بعد ۲۸/جولائی کو انتقال کی بھی خبر تحریر کردی تھی، اسی سال عرس شریف کی ۱۴/تاریخ کی شب کی محفل میں اپنے بڑے صاحبزادے تمیم میاں صاحب مرحوم جن کا بھی اچانک بقرعید میں انتقال ہوا تھا ان کے بڑے صاحبزادے نیر میاں کی دستار بندی اپنے ہاتھوں کردی تھی اور خرقہ شریف بھی انہیں کو پہنا دیا تھا، چونکہ نیر میاں ابھی طالب علم ہیں اور بی۔کام کررہے ہیں، اس لئے ماموں صاحب مرحوم نے اپنے چھوٹے صاحبزادے حسین میاں کو نیر میاں کا ولی اور سرپرست مقرر کردیا ہے، جو نیر میاں کی جگہ پر سجادگی کے فرائض انجام دے رہے ہیں، مگر ابھی دونوں صاحبزادگان بچے ہیں آپ حضرات ہی ان کے سرپرست اور بزرگ ہیں، اس کم عمری میں ان کے اوپر اتنی بڑی ذمہ داری آپڑی ہے، لہٰذا آپ حضرات کی شفقت دیرینہ ہی ان کی تسلی کا باعث ہوگی، چہلم کی فاتحہ ۴/ستمبر کو ہوگی جس کی اطلاع روانہ کروں گا، مجھے امید ہے آپ حضرات اپنے قیمتی وقت میں سے تھوڑا سا وقت نکال کر اور یہاں تشریف لاکر شکریہ کا موقع دیں گے جس سے ہماری تسلی بھی ہوگی۔

آپ حضرات ماموں صاحب کے لئے دعائے مغفرت فرمائیں۔ سوگوار

شاہ اخلاق احمد صابری درگاہ شریف رودولی

افسوس ہے کہ ڈاک کی خرابی کی وجہ سے شاہ اخلاق احمد صاحب صابری کے خطوط یہاں نہیں پہنچ سکے، اخبار میں اس سانحہ کی خبر پڑھی تھی، ایک تعزیتی خط جناب چودھری محمد اویس رئیس رودولی کو لکھا، لیکن وہ بھی بہت دیر سے وہاں پہنچا، جناب شاہ آفاق احمدؒ صاحب سے بڑا ذاتی اور گہرا تعلق رہا، ان سے نیاز جناب شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی مرحوم کے حسن وساطت سے ہوا جو خود اس خانقاہ کے اولین بزرگ اور سلسلہ چشتیہ صابریہ کے فخر سلسلہ حضرت شاہ احمد عبدالحق رودولوی کے خاندان کے چشم و چراغ تھے اودھ میں اس خانقاہ سے بڑے فیوض و برکات پہنچے، خدا جانے کتنے رہروانِ سلوک اور تشنگان معرفت نے یہاں آکر اپنی پیاس بجھائی اور انوار وتجلیات سے فیض یاب ہوئے۔

اسی خانقاہ کی آبرو شاہ آفاق احمد صاحبؒ تھے۔ جن کو مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ پانی ہوتا ہے، ایک بار دارالمصنفین بھی تشریف لائے تھے۔ گفتگو کرتے تو معلوم ہوتا کہ کوئی عندلیب چہچہا رہا ہے، ان کی شیوہ بیانی اور شیریں کلامی سے مجلس کے حاضرین بے حد محظوظ ہوئے اور جب کبھی رودولی جانے کا اتفاق ہوا اور ان کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا تو ایسا معلوم ہوتا کہ اپنا کوئی محبوب اور شفیق عزیز گلے لگا رہا ہے۔ پیشانی پر بوسے دے رہا ہے اور دل کی ساری کیفیتوں کو اپنے سینہ سے میرے سینہ میں منتقل کررہا ہے۔ خاطر تواضع کی کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے، کھانے پر بلاتے، کھانے کا وقت نہ ہوتا تو پرتکلف چائے پر مدعو کرتے، اس کا بھی موقع نہ ہوتا تو رودولی کی مشہور مٹھائیاں ساتھ کردیتے۔

ان کے یہاں طعام سے زیادہ ان کے کلام میں لذت محسوس ہوتی، ایسی اچھی گفتگو کرنے والا شاید ہی اس صوبہ میں کوئی ہو، تصوف وسلوک پر گفتگو کرتے تو اس کو فارسی اور اردو کے اشعار سے اس طرح مزین کردیتے کہ جو گتھیاں تصوف کے نکات سے حل ہوتی نظر نہ آتیں، وہ ان کے برجستہ اشعار کے پڑھ دینے سے حل ہوجاتیں،

فارسی اور اردو کے اشعار ان کی نوک زبان پر ہوتے اور وہ سب کے سب اعلیٰ درجہ کے معیاری ہوتے، جلال لکھنوی کے بے حد قائل تھے، اور اگر یہ کہا جائے کہ ان کا پورا کلام ان کو حفظ تھا تو مبالغہ نہ ہوگا۔ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے جلالؔ لکھنوی پر ایک مضمون لکھا تھا۔ میں نے ان سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے خاص طور پر معارف کا پرچہ منگوا کر پڑھا پڑھ کر مجھ سے خط لکھا کہ ''مضمون تو اچھا ہے مگر جلال کی شاعری کے بہت سے رموز و نکات اس میں نہ آسکے ہیں''۔

رودولی کے عرس کے موقع پر جو محفل سماع ہوتی ہے، اس کے متعلق جناب شاہ معین الدین احمد ندوی صاحب مرحوم فرماتے کہ ایسی آراستہ پیراستہ، مہذب اور متین محفل کہیں نہیں دیکھی جاتی اور اس میں جو نعتیں غزلیں اور نظمیں پڑھی جاتی ہیں وہ بہت ہی اعلیٰ معیار کی ہوتی ہیں، اس روایت کو جناب شاہ آفاق احمد مرحوم نے نہ صرف باقی رکھا بلکہ اونچا کرنے کی کوشش کی۔

جناب شاہ معین الدین شاہ آفاق احمد صاحب سے سن میں بڑے تھے اس لیے ان سے بزرگانہ طور پر پیش آتے اور مجھ سے کئی بار کہا کہ آفاق کا دل چیر کر کے دیکھا جائے تو اس میں گلاب کی پنکھڑیوں کی نکہت بیزی اور عطر فشانی محسوس ہوگی اور سچ تو یہ ہے کہ وہ اس وقت اپنی خانقاہ کی آبرو بنے ہوئے تھے، بلکہ رودولی کو ان کی ذات مبارک کی وجہ سے افتخار و وقار حاصل تھا، ردولی کا شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہو جس کو ان کی زبان سے کوئی تکلیف پہنچی ہو۔ سجادہ نشینی کے فرائض ادا کرنے کے ساتھ ساتھ ہر شخص کے کچھ نہ کچھ کام آتے، دلجوئی اور دلنوازی تو ان کے خمیر میں داخل تھی، انھوں نے بڑی باغ و بہار طبیعت پائی تھی، اس میں تو ان کی روحانی مسرتوں کا چمنستان آباد ہونا چاہئے تھا، مگر ان کی زندگی میں دو المناک حادثے پیش آئے ایک تو ان کے عزیز ترین بھائی اور دوسرے ان کے فرزند اکبر کی المناک موت، جن کا غیر معمولی اثر ان پر پڑا تھا ان کے صاحبزادے کی وفات کی خبر سن کر رودولی گیا تھا، مگر دیر کر کے پہنچا تھا۔ وہ کہیں باہر تشریف لے گئے تھے۔ اس لئے ان سے نیاز نہ حاصل ہو سکا تھا۔ جس کا قلق اب زندگی بھر رہے گا۔

جناب شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی کی وفات سے میں بے حد متاثر تھا، ان کی قبر پر فاتحہ پڑھنے رودولی گیا، جناب شاہ آفاقؒ کے آستانہ پر بھی پہنچا، گلے سے لپٹ کر پہلے تو یہ مصرعہ پڑھا،

ع اک عمر کا ساتھی چھوٹا ہے، صبر آتے آتے آئے گا

پھر دوسرا شعر یہ پڑھا:

یہ گیتی گر کسے پایندہ بودے ابوالقاسم محمدؐ زندہ بودے

ان کے پڑھنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ ایسا معلوم ہوا کہ اس سے بڑھ کر کوئی اور تسکین نہیں دے سکتا، وہ وہاں جا چکے ہیں، جہاں سب کو جانا ہے لیکن رودولی کے درو دیوار ان کو کبھی نہ بھولیں گے اور رودولی ہی کے لوگ نہیں بلکہ ان کے ملنے والوں کا جو وسیع حلقہ تھا ان میں سے ہر ایک ان کو یاد کر کے بے اختیار کہے گا:

ع جب نام تیرا لیجئے تب اشک بھر آوے

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں، ان کی خوبیوں کی وجہ سے ان کو اپنی رحمت کے کوثر اور مغفرت کی تسنیم سے سیراب کرے، آمین! (''ص۔ع''، ستمبر ۱۹۸۰ء)

ندوی، محمد اکبر، مولانا

مولانا محمد اکبر ندوی

(پروفیسر مسعود حسن)

یہ خبر انتہائی افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ مولانا محمد اکبر ندوی سابق ریڈر شعبہ عربی و فارسی کلکتہ یونیورسٹی ۱۵/رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ کو صبح کے وقت ۹:۳۰ بجے اس دار فانی سے عالم جاودانی کو سدھارے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی وفات سے مغربی بنگال میں عربی زبان کے ایک ممتاز ادیب ایک مستند عالم دین اور استادوں کے استاد کی جگہ خالی ہوگئی۔ راقم الحروف کے لیے ذاتی طور پر یہ حادثہ ایک بہت بڑا سانحہ ہے کیونکہ ان کی موت کے بعد اس کے اساتذہ میں اب کوئی زندہ نہیں رہا۔ اس کے مدرسہ، اسکول کالج اور یونیورسٹی کے استاد سب کے سب اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اس کی علمی رہنمائی کے لئے ایک آخری شمع رہ گئی تھی، موت نے اسے بھی چھین لیا۔

مولانا محمد اکبر ندوی کا وطن مالوف ناگپور تھا۔ مگر عرصہ سے ترک وطن کر کے کلکتے میں مقیم تھے۔ ان کی اعلیٰ تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہوئی تھی، وہ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے ہم جماعت تھے، طالب علمی کے زمانے میں ان کی عربی خطابت اور عربی انشاء ندوہ میں مشہور تھی۔ فرماتے تھے کہ طلبہ کے ایک جلسے میں ان کی ایک عربی تقریر علامہ سید سلیمان ندویؒ کو اس قدر پسند آئی کہ انھوں نے جیب خاص سے انعام مرحمت فرمایا۔ عربی انشاء پردازی میں مسعود عالم صاحب سے ٹکر ہوتی تھی، ندوہ سے فراغت پا کر کلکتہ آگئے، اور اسلامیہ کالج سے بی۔اے کیا۔ پھر کلکتہ یونیورسٹی سے عربی اور فارسی دونوں میں ایم اے کی ڈگری لی، اور ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی مرحوم کے ارشد تلامذہ میں شمار ہونے لگے۔

مشرقی بنگال کے ایک بڑے کالج میں ایک بڑی اونچی جگہ ملی اور بڑی خوشامدیں ہوئیں، مگر اپنے استاد ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی مرحوم کے حکم کی تعمیل کی، اس عہدہ کو قبول نہیں کیا، اور کلکتہ یونیورسٹی میں لکچرر کی جگہ پر قانع رہے۔

راقم کو ان کی شاگردی کا شرف کلکتہ یونیورسٹی میں ۱۹۴۱ء میں ایم۔اے میں

حاصل ہو۔ یہ مولانا کی زندگی کا سنہرا دور تھا۔ بلند و بالا قد و قامت، قابل رشک جسمانی صحت، بڑے سلیقے سے سلی ہوئی شیروانی، سر پر مخمل کی رامپوری ٹوپی، کلاس میں اس سج دھج کا بڑا اچھا اثر پڑتا تھا۔ میں نے المرزبانی (متوفی ۳۸۴ھ) کی الموشح ان سے سبقاً سبقاً پڑھی، وہ باتوں ہی باتوں میں بہت سی ادبی نکتے بیان کردیتے تھے۔ یہ زمانہ کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ عربی و فارسی کا عہد زریں تھا۔ ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی صدر شعبہ تھے، ڈاکٹر محمد اسحٰق، پروفیسر محمد محفوظ الحق اور مولانا فضل الرحمٰن باقی جیسے دانشور اور فضلائے روزگار درس دیا کرتے تھے۔ خدا تعالیٰ ان مرحوموں کی تربت پر اپنی رحمت کے پھول برسائے، اکبر صاحب نے ان بزرگوں کے ساتھ کام کیا، اور کم و بیش ۴۰ سال تک پہلے لکچرر اور پھر ریڈر کی حیثیت سے درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں شاگردوں کی ایک بڑی تعداد بطور یادگار چھوڑ گئے، اس وقت کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ عربی و فارسی میں بشمول صدر شعبہ جناب ڈاکٹر عطا کریم صاحب برق سبھی ان کے حلقہ شاگردی میں داخل ہیں۔ ایک کلکتہ یونیورسٹی پر کیا منحصر ہے، مغربی بنگال کی تمام درسگاہوں میں جہاں عربی اور فارسی کی تعلیم کا انتظام ہے ان کے شاگرد تعلیم و تدریس کی مسندوں کی زینت ہیں۔

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

افسوس ہے کہ ابھی چند سال ہی گزرے تھے کہ اکبر صاحب کو چند حادثوں اور ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا جن سے ان کی زندگی میں ایک بڑا انقلاب آگیا، نہ وہ پہلی سی شگفتگی رہی۔ نہ وہ پہلی سی رعنائی۔ انھیں اچھا کھانے اور اچھا پہننے کا بے حد شوق تھا، حتی کہ اس شوق کی تکمیل کے لئے اپنی آمدنی کی بھی پروانہیں کرتے تھے، پہننے کا شوق ختم ہوا۔ اب وہ الفقر فخری کی جیتی جاگتی تصویر بن گئے تھے، زیادہ تر وقت تسبیح و تہلیل اور وظائف میں گزارتے تھے۔ قرآن مجید کی تلاوت وہ بڑی پابندی سے کرتے تھے، چنانچہ جس صبح کو پیغام اجل آپہنچا اس صبح کو بھی معمول کے مطابق فجر کی نماز کے بعد تلاوت قرآن سے فارغ ہو چکے تھے۔ اخیر زندگی میں خاص طور پر استغفار، توکل علی اللہ، مالی منفعت سے بے پروائی اور نام و نمود سے بے نیازی ان کا طرۂ امتیاز بن گیا تھا۔ جن سے احباب اور رفقائے کار کے حلقوں میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ وہ یونیورسٹی کے پروفیسر روم میں داخل ہوتے تو ''شہنشاہ اکبر'' اور ''اکبر دی گریٹ'' کی صداؤں کے ساتھ ان کا خیر مقدم ہوتا اور ان کے لئے کوئی ممتاز جگہ خالی کی جاتی۔

استاذ مرحوم سے میری آخری ملاقات جولائی کے دوسرے ہفتہ میں ہوئی تھی، کئی دن پہلے ان کی اہلیہ محترمہ کا انتقال طویل علالت کے بعد ہوگیا تھا۔ میں ان کے اور اپنے شاگرد مولوی محمد شہید اللہ لکچرر شعبہ عربی و فارسی کلکتہ یونیورسٹی کو ساتھ لے کر تعزیت کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ ہم دونوں سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ ان کے چہرے پر ایک پراسرار طمانیت تھی۔ ہم دونوں نے محسوس کیا کہ اس بظاہر ساکن سطح کے اندر غم والم اور فکر و اضطراب کا ایک پرشور سمندر متلاطم ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ وقت کیسے گزرتا ہے؟ تو فرمایا: اب تو فرصت ہی فرصت ہے۔ پہلے تیمارداری میں وقت گزر جاتا تھا۔ اس وفا پرست شوہر کی وفاشعاری دیکھئے کہ پندرہ دن کے اندر ہی رفیق حیات سے جاملے۔

خداوندا اپنے اس پیارے بندے کی آخری آرام گاہ کو اپنے ابر رحمت سے سیراب کر، اور اسے جنت میں بزرگوں کا مقام عطا کر۔

سقیٰ مثواک غاد فی الغوادی
نظیر نوال کفک فی النوال

(ستمبر ۱۹۸۰ء)

صدیقی، ظفر احمد

ظفر احمد صدیقی مرحوم

(ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی)

۴/اکتوبر ۱۹۸۰ء کو جناب ظفر احمد صدیقی وکیل، سکریٹری دینی تعلیم کونسل کا انتقال اپنے آبائی وطن راما بھاری تحصیل بسواں ضلع سیتاپور میں ۷:۳۰ بجے صبح کو طویل علالت کے بعد ہوگیا، دفتر دینی تعلیمی کونسل لکھنو میں وہ حضرت مولانا علی میاں صاحب کے ایماء پر ۵۹ء سے مقیم تھے، یہ ایک طرح سے ان کا وطن ثانی بن گیا تھا، اپنی وفات سے ۴۸ گھنٹے پہلے اس حال میں رخصت ہوئے تھے کہ انہیں ہوش نہیں تھا، بلڈ یوریا کی وجہ سے ایک ہفتہ سے غفلت تھی، احباب اور رفقاء نے اسی وقت یہ سمجھ لیا تھا کہ برسوں کا یہ تھکا ہوا مسافر اور ساتھی اب لکھنؤ واپس نہیں آئے گا، سیتاپور سے فون پر اطلاع ملی، وہ سب سے جدا ہوکر اللہ کو پیارے ہوگئے، ان کی اہلیہ کا انتقال سال بھر پہلے ہو چکا تھا، اولاد کوئی نہیں تھی، بھتیجوں کو اولاد سمجھتے رہے، جن کو اپنی نگرانی میں تعلیم دلائی، ان کے حقیقی بھائی کا قیام راما بھاری میں ہے، جہاں ان کا خاندان صدیوں سے آباد ہے۔

ظفر صاحب نے تعلیم مسلم یونیورسٹی میں پائی، ان کا قیام میکڈانلڈ ہوسٹل میں تھا، تعلیم کے بعد سیتاپور میں وکالت شروع کی ان کا شمار وہاں کے کامیاب وکیلوں میں تھا ۴۷ء سے پہلے مسلم لیگ سے وابستہ رہے، تبلیغی کاموں سے بھی شغف رکھا، لیکن جب قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم نے ۵۹ء میں بستی میں بچوں کی تعلیم کے سلسلہ میں کنونشن کیا اور وہاں یہ فیصلہ ہوا کہ اس سلسلہ میں مستقل کام کی ضرورت ہے، تو حضرت

مولانا علی میاں صاحب کے ایماء پر ظفر صاحب نے اپنی کامیاب وکالت چھوڑ دی اور دینی تعلیمی کونسل کے کاموں کے لئے اپنے کو وقف کردیا، پھر ان کو ایسی لگن پیدا ہوئی کہ اپنے کھانے پینے کی فکر زیادہ نہ کرتے، خود ہی اسٹوو پر کوئی چیز تیار کر لیتے اور روٹی بازار سے منگالیتے، اسی کو کھا کر اکتفا کرلیتے، صبح کی چائے بھی خود ہی تیار کرلیتے اور اپنے مہمانوں کی بھی اس سے ضیافت کرتے، اپنی ان دشواریوں کا اظہار کبھی کسی سے نہیں کیا، اس طرح انھوں نے ۲۱ سال جس بے نفسی، جاں فشانی، فرض شناسی اور دل سوزی سے وقت گزارا اس کی مثال ملنی مشکل ہے، جناب شفیق الرحمٰن ایڈوکیٹ نے ان کو پیش کش کی کہ اگر وہ لکھنؤ میں کمشنری کے مقدمات لے لیا کریں تو معقول آمدنی ہوجایا کرے گی، انھوں نے معذرت کی کہ جو چیز چھوڑ دی اس کو پھر اختیار کرنا صحیح نہیں، کونسل میں بڑھتی ہوئی گرانی کی وجہ سے ان کے الاؤنس میں اضافہ کا مسئلہ آیا تو انھوں نے اپنے جذبہ ایثار سے اضافہ منظور نہیں کیا۔

وہ اپنے اوقات کے بہت پابند تھے، عشا کے بعد فوراً سوجاتے، تہجد کے سختی سے پابند رہے، سفر ہو یا قیام، بیماری ہو یا صحت، جلسے ہوں یا کنونشن، ہر حال میں اس کی پابندی کرتے، ذکر سے بھی شغل رکھتے، صبح کو ہلکے سے ناشتہ کے ساتھ چائے پی کر اخبار پڑھتے، تعلیمی سلسلہ کی کوئی بات اخبار میں پڑھ لیتے تو اسی وقت قلم برداشتہ ایک مضمون لکھ ڈالتے، ان کا خط اچھا نہیں تھا، اکثر کہتے کہ میں خود اپنا لکھا مشکل سے پڑھ رہا ہوں، انگریزی اور اردو زبانوں میں لکھنے پر یکساں قدرت رکھتے، عبارت آرائی بالکل نہیں کرتے، لیکن ٹھوس حقائق سے مسئلہ کو واضح کرتے، دینی تعلیمی کونسل اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے متعلق اہم لٹریچر ان ہی کا تیار کیا ہوا ہے، ۶۵ء کے بعد علی گڑھ کے جتنے معاملات اٹھے ان کا وہ گہرا مطالعہ کرتے رہے مرتے دم تک وہ اس محاذ پر بڑی مردانگی اور پامردی سے جمے رہے، حکومت نے مسلم یونیورسٹی سے متعلق جو بھی قانون بنایا، اس کی موشگافیوں میں انھوں نے ہندوستان کے چوٹی کے ماہرین قانون سے ٹکر لی اور کبھی کسی موقع پر آنکھ نہیں جھپکائی، علی گڑھ سے متعلق کوئی چیز ان کے مشوروں کے بغیر مرتب نہیں ہوتی تھی، سب کو ان پر مکمل اعتماد تھا، مسلم یونیورسٹی کے اولڈ بوائے ہونے کی حیثیت سے اس کے لئے وہ جس طرح سینہ سپر رہے، وہ اس یونیورسٹی کی نئی نسل کے لئے ایک اعلیٰ نمونہ ہے، انھوں نے اس کے لئے برابر جہاد باللسان اور جہاد بالقلم کیا، اس سے متعلق حکومت کی پر پیچ حکمت عملی کو واشگاف کرنے میں ان کو بڑی مہارت تھی، ان ہی کی تحریروں کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمان یونیورسٹی کے مسئلہ کو اس کے اصلی اور حقیقی پس منظر میں سمجھتے رہے۔

وہ دارالعلوم ندوہ کے بھی قانونی مشیر تھے، مسلم پرسنل لا بورڈ، مسلم مجلس مشاورت، مسلم مجلس، دینی تعلیمی کونسل، مسلم مائنارٹیز ایسوسی ایشن، ہر جگہ ان کی قانونی مہارت سے فائدہ اٹھایا جاتا، شفیق الرحمٰن صاحب ایڈوکیٹ کنوینر مسلم یونیورسٹی ایکشن کمیٹی نے ان کی ان صلاحیتوں سے متاثر ہوکر ان کا نام مجلس شوریٰ کا صدر رکھ دیا تھا، وہ خود کم بولتے مگر بولتے تو حقائق ہی بولتے، نمایاں ہونے کی کوشش نہیں کرتے، عمر میں ان سے کوئی چھوٹا بھی اگر معقول رائے دیتا تو اسے فوراً قبول کرلیتے، وکیل تھے لیکن زیادہ بحث پسند نہیں کرتے، مقرر تو نہیں تھے، لیکن اپنی تقریروں میں بچے تلے الفاظ میں اپنی باتیں پیش کردیتے، شعر و شاعری کا ذوق نہیں تھا، لیکن اچھے شعر کا لطف لیتے اور برمحل شعر بھی پڑھ جاتے، چہرہ پر شب بیداری کی رونق اور سرخی دکھائی دیتی، ہونٹوں پر پان کی سرخی جمی رہتی، دعوتوں میں ان کے بے تکلف دوست ان کو میٹھا ٹکڑا کھانے پر اصرار کرتے لیکن وہ انکار کرتے، مگر دوستوں کے اصرار پر لطف و لذت سے کھانے پر آمادہ ہوجاتے، ان کو آم اور جامن بھی پسند تھے، وہ غلہ گھر ہی سے منگاتے، ایک مرتبہ ان کا دلیا چارپائی پر دھوپ میں سوکھ رہا تھا، گائے آکر کھا گئی، انھوں نے اپنی معصومیت میں اس کا ذکر اپنے دوستوں سے کیا تو یہ مستقل موضوع بنا رہا، سفر میں شفیق الرحمٰن صاحب کا ان کا ساتھ ہوتا تو جونیر ہونے کے ناطے سارے فرائض ان ہی کو انجام دینے پڑتے۔ چائے، پان، حقہ اور اخبار وغیرہ کی فراہمی کا انتظام ان کے ذمہ ہوتا، شفیق الرحمٰن صاحب کی ڈانٹ ڈپٹ بھی جاری رہتی، مگر یہ دو پیاروں کی باتیں ہوتیں، دونوں میں بے حد محبت تھی، دونوں صبح شام ملتے، شفیق الرحمٰن صاحب ان کا محاسبہ کرتے ہوئے کہتے کہ اپنی قیمتی رائے گھوڑے پر ڈال دیتے ہو، ظفر صاحب ہنس کر جو جواب دیتے اس میں اخلاص اور محبت کے آبدار موتی چمکتے ہوئے نظر آتے، یہ پر کیف اور بے تکلف مجلسیں اب اشکبار آنکھوں کے ساتھ یاد آئیں گی، ظفر صاحب نے شفیق الرحمٰن صاحب کو تھرڈ کلاس میں کہہ کر سفر کرانا شروع کیا کہ ملت کا کام کرنا ہے تو تھرڈ کلاس میں سفر کرنا پڑے گا اور مسجد کی چٹائی پر لیٹنا ہوگا، میں ان کو مجسم تقویٰ کہتا، جب کبھی ان کے ساتھ سفر کیا تو ان کی کفایت شعاری کا سارا منظر دیکھنے میں آتا، سفر کے بعد فوراً حساب پیش کردیتے، کنجی ان کے ازار بند میں بندھی ہوتی، سفر میں ان کا جھولا ساتھ ہوتا تھا، جس میں ماہرین قانون کی رائے، قانون کی کتابیں، ڈبیا، بٹوہ، اور ضرورت کا سارا سامان ہوتا، چند منٹ کے نوٹس پر وہ سفر پر روانہ ہوسکتے تھے، دو مرتبہ پہلے بھی فالج کا اثر ہوچکا تھا، علاج سے ٹھیک ہوگئے تھے، میں نے سفر سے منع کر رکھا تھا، لیکن مسلم یونیورسٹی کے مسئلے میں بے تاب ہوکر اچانک دہلی کا سفر کیا، پھر جو پڑے تو سنبھلے تو ضرور لیکن بائیں ہاتھ اور بائیں پاؤں پر مستقل اثر رہا، اور رفتہ رفتہ معذور ہوگئے، ذہن آخر تک کام کرتا رہا لیکن صحت گرتی رہی۔

مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں ان کی خدمت گنانے کے لئے ایک پوری کتاب درکار ہے، اقلیتی کردار کی اصطلاح ان ہی کی ایجاد ہے، جسے پورے ملک نے قبول

کرلیا، طلبہ انہیں ظفر چچا کہتے، ان کی باتیں تسلیم کرنے میں تامل نہ کرتے، ایک بار مسلم یونیورسٹی میں ایک اسٹرائیک ہوئی، اخبار میں خبر پڑھتے ہی ہم دونوں وہاں پہنچے، طلبہ نے ہماری مداخلت سے اسٹرائیک ختم کردی، ظفر صاحب نے یونین میں جو تقریر کی اس سے طلبہ بالکل مطمئن تھے، مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں شروع سے ہم لوگوں کی یہ کوشش رہی کہ تحریک علی گڑھ شہر اور مسلم یونیورسٹی کیمپس کے اندر نہ رہے بلکہ ملک کے دوسرے حصوں میں چلائی جائے تاکہ یونیورسٹی کو نقصان نہ پہنچے، بیگ کمیٹی کے مشہور رپورٹ کو مرتب کرنے میں ظفر صاحب کا بہت بڑا حصہ ہے، مسلمانوں کے تعلیمی مسائل اور تعلیمی جائزہ کے سلسلہ میں انھوں نے متعدد کتابچے، پھر اردو انگریزی میں بکثرت مضامین لکھے، وہ جب یاد آئیں گے تو ان کا خلوص، ان کے بے پایاں ایثار، ان کی بے نفسی، ملت کے لئے ان کی تڑپ اور دردمندی آنکھوں کے سامنے متحرک نظر آئے گی، وہ اپنے پیچھے بے لوث اور بے غرض خدمات کی ایک مثال چھوڑ گئے ہیں، جو کم از کم مسلم یونیورسٹی کی نئی نسل کے لئے مشعل راہ بن سکتی ہے، جناب عدیل عباسی کے فوراً بعد ان کا انتقال پوری ملت کا بہت بڑا سانحہ ہے، لیکن جن مضبوط بنیادوں پر انھوں نے اس تحریک کی بنیاد رکھی ہے، امید ہے کہ وہ قائم رہے گی نیا خون ملتا رہے گا، اور یہ کام برابر برگ و بار لاتا رہے گا، ظفر صاحب نے اپنی مخلصانہ خدمات کی جو مثال چھوڑی ہے، اللہ تعالیٰ مسلم یونیورسٹی اور دینی تعلیمی کونسل کے خدمت گزاروں میں اس جذبہ کو دوام عطا کرے، اور ان کو آخرت میں اس کا بہترین اجر دے، آمین ثم آمین۔

معارف: جناب ظفر احمد صدیقی صاحب آج کل کی اصطلاح کے لحاظ سے تو بہت بڑے آدمی نہیں ہوسکے لیکن ان میں جو بے نفسی، بے غرضی اور ایثار پسندی تھی، اس لحاظ سے ان کی شخصیت میں بڑے پن کے پورے اوصاف تھے، مسلم یونیورسٹی کا ایسا جانثار مردمجاہد مشکل سے کوئی ملے گا، جس لگن اور ایثار کے ساتھ انھوں نے اس یونیورسٹی کی خدمت کی وہ اپنی مثال آپ ہے، مگر دکھ کی بات ہے کہ اس یونیورسٹی کے لوگوں نے ان کی وہ قدر نہیں کی جس کے وہ واقعی مستحق تھے، ان کی علالت کے زمانہ میں راقم کو جناب محترم نواب عبیدالرحمٰن خان شیروانی کی معیت میں ان کی عیادت کرنے کا کئی بار اتفاق ہوا، دینی تعلیمی کونسل کے دفتر کے ایک معمولی کمرہ میں ان کو جس طرح پایا اس کو دیکھ کر انتہائی تکلیف ہوئی، بجلی کا بہت ہی معمولی پنکھا ان کے سامنے ہوتا، ان کی راحت کا سامان اس سے بھی زیادہ معمولی تھا، خیال آیا کہ مسلم یونیورسٹی کے اس مردمجاہد کے لئے وہاں کے طلبہ اور اساتذہ کو اپنی ہر چیز ان پر نچھاور کردینا چاہئے تھی مگر یہ لوگ لکھنؤ آتے تو شاید ان کی عیادت کی بھی تکلیف گوارا نہ کرتے، اس کا بھی احساس ہے کہ اگر علی گڑھ کے لوگ ان کی مالی امداد کرنا بھی چاہتے تو وہ اپنی خودداری اور عزت نفس میں اس کو قبول کرنا پسند نہیں کرتے، مگر علی گڑھ کے طلبہ و اساتذہ اپنے نفس کا محاسبہ کریں کہ اپنے اس جان نثار مجاہد کے لئے ان کو کیا کرنا چاہئے تھا، اور کیا نہیں کیا، ان کی وفات کے بعد، ان کی خدمات کا صلہ شاید یہی ملا ہوگا کہ وہاں کے ڈرائنگ روموں کے صوفوں پر اور دوسری تفریحی باتوں کے سلسلہ میں چندلمحوں کے لئے ان کا بھی ذکر آگیا ہوگا، اس سے ہم کو اپنی ملت کی نفسیات کا اندازہ کرنا چاہئے، ہم میں آج کل اچھی قیادت نہیں ابھر رہی ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنے مخلص کارکنوں اور رہنماؤں کی وہ قدر نہیں کرتے جس کے وہ واقعی مستحق ہوتے ہیں۔ (نومبر ۱۹۸۰ء)

عرشی، امتیاز علی خان، مولانا

مولانا امتیاز علی خان عرشی

۲۴/۲۵/فروری ۱۹۸۱ء کی درمیانی شب میں مولانا امتیاز علی خان عرشی کا حرکتِ قلب بند ہوجانے سے رام پور میں انتقال ہوگیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ وہ ممتاز اہل قلم، غالبیات کے ماہر اور رضا لائبریری رام پور کے ڈائرکٹر تھے، ان کی وفات علمی دنیا کا بڑا حادثہ ہے۔

عرشی صاحب کا خاندانی تعلق افغانستان کے یوسف زئی قبیلہ کی ایک شاخ حاجی خیل سے تھا، ان کے دادا مولانا اکبر علی خان محدث پیشہ آباسپہ گری چھوڑ کر علم و فضل کے کوچہ میں وارد ہوئے، ان کی علمی جانشینی ان کے ایک فرزند مولانا جعفر علی خاں کے حصہ میں آئی، اور سب سے چھوٹے صاحبزادے مختار علی خاں صاحب کی کم سنی ہی میں ان کا انتقال ہوگیا، اس لیے یہ تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے، مگر ان ہی کے صاحبزادے مولانا امتیاز علی خان عرشی اس خاندان کے گل سرسبد ہوئے۔

امتیاز علی خان صاحب کی پیدائش ۸/دسمبر ۱۹۰۴ء کو ہوئی، انھوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد عربی قواعد اور فارسی کی درسی کتابیں مدرسہ مطلع العلوم میں پڑھیں اس زمانہ میں پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات کا بڑا چرچا تھا، ہونہار طلبہ ملک کے گوشہ گوشہ سے امتحانات دینے کے لیے لاہور جاتے تھے، عرشی صاحب نے ۱۹۲۳ء میں مولوی اور عالم کے امتحانات میں اول درجہ میں کامیابی حاصل کی، اس کے بعد مولوی فاضل کے امتحان کی تیاری کے لیے اورنٹیل کالج لاہور میں داخلہ لیا، یہاں مولانا نجم الدین، مولانا سید طلحہ اور مولانا عبدالعزیز میمن جیسے ہندوستان گیر شہرت رکھنے والے استاذوں کا طوطی بول رہا تھا، مولانا سید طلحہ کا تعلق حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کے دودمانِ عالی سے تھا، عرشی صاحب کا خاندان سید صاحبؒ کا معتقد اور رام پور میں ''وہابیت'' کے لیے بدنام تھا، اس لیے وہ مولانا طلحہ سے زیادہ مانوس اور قریب ہوئے اور مولانا بھی اُن پر خاص شفقت فرماتے تھے۔

لاہور سے واپسی کے بعد انہوں نے مدرسۂ عالیہ رام پور میں داخلہ لیا اور مولانا فضل حق رامپوری سے معقولات کا درس لیا جو امام معقولات...... مولانا فضل حق خیرآبادی کے شاگرد خاص تھے، پھر پنجاب یونیورسٹی لاہور سے منشی فاضل کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور ۱۹۲۶ء میں صرف انگریزی میں انٹرنس کا امتحان دیا۔

تعلیم کا سلسلہ ختم ہوا تو ندوۃ العلماء لکھنؤ کی سفارت کی خدمت انجام دی، مگر جلد ہی اس سے دل برداشتہ ہوگئے، ڈاکٹر سید عبدالعلی ناظم ندوۃ العلما ان کے کام سے مطمئن تھے۔ انہوں نے بااصرار روکا مگر عرشی صاحب نے استعفا واپس نہیں لیا۔

رامپور کا عظیم الشان کتب خانہ وہاں کے ریاستی حکمرانوں کی قابل فخر یادگار ہے جب ۱۹۳۲ء میں عرشی صاحب کو اس کی نظامت سپرد کی گئی، تو پھر وہ اسی کے ہو کر رہ گئے، اور اس کی خدمت، ترقی اور توسیع کے لیے اپنی زندگی ہی وقف کردی، انھوں نے اپنی سلیقہ مندی سے کتب خانہ کی تزیین و آرائش اور جدید انداز پر اس کی ترتیب و تشکیل کر کے اسے ایسا ادارہ بنادیا جس سے ان کے بعد بھی لوگ مستفیض ہوتے رہیں گے، ان کو کتب خانہ سے ایسی دلچسپی ہوئی کہ انہوں نے پھر کسی جانب نگاہ اٹھانا بھی پسند نہیں کیا، ایک دفعہ ڈھائی ہزار ماہوار پر ایران و افغانستان کی ثقافتی سفارت انھیں پیش کی گئی، جس کو انہوں نے قبول نہیں کیا، اور کتب خانہ سے ملنے والے ڈھائی سو مشاہرہ ہی پر قانع رہے، وہ اس کے لیے اپنے مزاج کے خلاف دوسروں سے سوال کرنے میں بھی عار محسوس نہیں کرتے تھے، کرنل بشیر حسین زیدی صاحب مدتوں ریاست کے چیف منسٹر رہے، وہ فرماتے ہیں ''جب سے میں چیف منسٹر ہوا ہوں کسی افسر شعبہ نے مجھے اتنا دق نہ کیا ہوگا، مجھ سے اتنے مطالبے نہ کئے ہوں گے جتنے عرشی صاحب نے، مگر سب کتب خانے کے لیے، اپنی ذات کے لیے ایک بھی نہیں''۔

اس ایثار و قربانی اور کتب خانہ کی بے لوث خدمت نے ان کو شہرت کے بام عروج پر پہنچا دیا، پورے ملک میں ان کا علمی وزن محسوس کیا جاتا تھا، ان کو بڑے بڑے اعزاز و انعام سے نوازا گیا، ساہتیہ اکاڈمی کے علاوہ پریسیڈنٹ ایوارڈ بھی ملا، ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں یادگاری مجلّے پیش کئے گئے، وہ ملک کی اہم علمی کانفرنسوں میں مدعو کئے گئے، اور بیرونِ ملک بھی تشریف لے گئے۔

غالبیات عرشی صاحب کی بحث و تحقیق کا خاص موضوع ہے، ۱۹۳۷ء میں انھوں نے مکاتیب غالب شائع کرکے اردو کے محققین اور غالبیات کے ماہرین کی صف اول میں اپنی جگہ بنالی اور تمام اصحاب علم و نظر کو اپنی طرف متوجہ کرلیا، اس میں انھوں نے مرزا غالب کے ان خطوط کو جمع کیا تھا، جو نواب یوسف علی خاں ناظم اور ان کے جانشین نواب کلب علی خان وغیرہ کے نام لکھے گئے تھے، عرشی صاحب کے مبسوط مقدمہ اور حواشی نے غالب کے خطوط میں چار چاند لگادیئے ہیں، ''انتخابِ غالب'' کی اشاعت بھی ان کا اہم ادبی و تحقیقی کارنامہ ہے، غالب نے ۱۸۶۶ء میں نواب کلب علی خاں کی فرمائش پر اپنے اردو فارسی کلام کا انتخاب کیا تھا، جو عرشی صاحب کے مقدمہ اور محققانہ حواشی کے ساتھ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا، فرہنگ غالب میں مختلف زبانوں کے لفظوں کی وہ تشریحات درج ہیں، جو خود غالب نے اپنی کتابوں میں کی تھیں یہ ۱۹۴۷ء میں چھپی ۱۹۵۸ء میں انہوں نے غالب کا تمام اردو کلام شایع کر کے ان کے قدر دانوں کو بیش قیمت علمی سوغات دی یہی دیوان غالب نسخۂ عرشی کہلاتا ہے، اس میں غالب کے تقریباً تمام اردو اشعار آگئے ہیں، یہ تین حصوں پر مشتمل ہے: (۱) گنجینۂ معنی، (۲) نوائے سروش، (۳) یادگار نالہ۔

وہ زندگی بھر غالب کے متعلق تحقیق و جستجو کرتے رہے، اور ان پر درجنوں مضامین بھی لکھے اُن کی غالبؔ سے متعلق متعدد کتابیں اور تحریریں ابھی شائع نہیں ہوئی ہیں۔

عرشی صاحب کا موضوع غالبؔ ہی تک محدود نہ تھا، وہ شعر و ادب، سیر و تراجم، تاریخ و مذہب اور فلسفہ ہر چیز میں برق تھے، اور ان کا اشہبِ قلم اردو، فارسی اور عربی میں رواں دواں رہتا تھا، عربی میں ان کا مہتم بالشان کارنامہ امام سفیان ثوری کی تفسیر کی دریافت و اشاعت ہے، اس کے عالمانہ مقدمہ اور محققانہ حواشی سے ان کی غیر معمولی کدو کاوش کا پتہ چلتا ہے، اس کے علاوہ بعض عربی دواوین اور ابوعبید قاسم بن سلام ہردی صاحب کتاب الاموال (م ۲۲۴ھ) کا رسالہ اجناس بھی انہوں نے ایڈٹ کر کے شائع کیا تھا، فارسی میں وقائع عالم شاہی، تاریخ محمدی اور تاریخ اکبری وغیرہ کو منظر عالم پر لانے کا سہرا ان ہی کے سر ہے، ان کے تحقیقی کاموں میں ایک اہم چیز ''نادرات شاہی'' ہے، یہ خاندان مغلیہ کے آخری دور کے بادشاہ جلال الدین شاہ عالم ثانی کے فارسی، اردو اور ہندی کلام کا مجموعہ ہے، اس کی اشاعت سے پہلی دفعہ لوگوں کو اس مظلوم بادشاہ کی سخن سنجی اور ادب نوازی کا علم ہوا۔ عرشی صاحب نے مقدمہ میں اس کے حالات اور شاعرانہ کمالات پر مفید گفتگو کی ہے۔

آخر میں رضا لائبریری رام پور کے عربی مخطوطات کی انگریزی میں فہرست مرتب کر کے چھ جلدوں میں شایع کیا انکی غیر مطبوعہ کتابوں کی تعداد بے شمار ہے، طالب علمی کے زمانہ میں جب وہ لاہور میں مقیم تھے تو وہاں کے مشہور تاجر کتب شیخ مبارک علی کی فرمائش پر انہوں نے ایف۔اے اور بی۔اے کے کورس کی عربی کتابوں کا اردو ترجمہ کیا تھا، اسی سلسلہ میں ان کو حضرت عمرؓ کے خطوط، خطبات اور حکیمانہ اقوال بھی جمع کرنے کا خیال ہوا، اس کے لیے زندگی بھر مواد فراہم کرتے رہے مگر یہ کتاب نامکمل رہ گئی۔

شعر بھی موزوں کر لیتے تھے، عرشی تخلص تھا لیکن شعر و سخن میں اُن کا ذوق اتنا لطیف اور معیار اس قدر بلند تھا کہ اپنا کلام پسند نہ آتا تھا، اور وہ اسے اساتذہ کے کلام سے بہت کمتر سمجھتے تھے اس لیے اس کی اشاعت کی نوبت نہ آنے دی۔

مخطوطات کی تحقیق و دریافت، ان کی تلاش وجستجو اور ان کو محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ ایڈٹ کر کے شائع کرنا عرشی صاحب کا خاص امتیاز ہے، وہ متن کی تصحیح وتحشیہ کے کام سے اُس وقت تک مطمئن نہ ہوتے جب تک کہ اس کے تمام نسخوں کو ملاحظہ نہ کر لیتے اس کے لیے ان جگہوں کا سفر کرتے تھے جہاں ان کے نسخے موجود ہوتے یا ان کی نقلیں مہیا کرتے ان کی تحریروں میں عالمانہ وقار وسنجیدگی کے ساتھ ہی سادگی، لینت، سلامت روی اور دلآویزی ہوتی تھی۔

ان کی شخصیت باوقار تھی اور وہ بڑے وجیہہ وشکیل اور جامہ زیب تھے، چہرہ بشرہ ہر چیز سے متانت اور سنجیدگی ظاہر ہوتی تھی راقم کو دارالمصنفین کی طلائی جوبلی کے موقع پر ان سے شرف ملاقات حاصل ہوا تھا، وہ گفتگو بہت شائستہ، نرم اور شیریں انداز میں کرتے تھے، خالص علمی گفتگو اس قدر پُرلطف اور دلچسپ انداز میں کرتے کہ سننے والے کو اکتاہٹ نہ ہوتی، ان کا خط بہت پاکیزہ تھا، ان کی نفاست اور نظافت پسندی کا اندازہ ان کی تصنیفات سے ہوتا ہے جو بہت اچھی اور عمدہ چھپتی تھیں۔

عرشی صاحب ممتاز عالم ومحقق تھے لیکن وہ نہ دوسروں کو اپنے علم وکمال سے مرعوب کرنے کی کوشش کرتے اور نہ خود کسی سے مرعوب ہوتے تھے، رام پور کی لائبریری میں اہلِ علم کے علاوہ اکثر وزرا، سرکاری حکام اور عمائد بھی آتے رہتے تھے، مگر وہ ان سے اس طرح ملتے کہ علم کی آن بان میں فرق نہ آنے دیتے بلکہ آنے والے خود ان کے علمی وقار اور ذاتی وجاہت وشرافت سے متاثر ہوتے تھے، وہ بہت متوازن اور عالی ظرف تھے، بڑے بڑے انعام واعزاز پاکر بھی نہ آپے سے باہر ہوئے اور نہ کسی قسم کی رعونت اور پندار میں مبتلا ہوئے۔

ان کی زندگی بہت سادہ اور تکلف وتصنع سے بری تھی، اُن میں خودنمائی اور خودستائی کا مرض نہ تھا، کبھی ایسی بات نہ کہتے جس میں اظہار فضیلت کا شائبہ ہوتا، اپنے علمی کاموں کی تعریف وتحسین اور دوسروں کی شکایت و مذمت سے اپنی زبان آلودہ نہ کرتے خوردوں کی حوصلہ افزائی کرتے اور ہمسروں کے قابل قدر کاموں کی داد دینے میں بخل سے کام نہ لیتے علمی وتحقیقی کام کرنے والوں کی مدد کرنے میں ان کو بہت لذت ملتی تھی کتب خانہ سے استفادہ کرنے کے لیے جو لوگ آتے ان کا پرتپاک خیر مقدم کرتے ان کا علم و مطالعہ بہت وسیع تھا، اس لیے ہر ایک کے مطلب کی کتابوں کی نشاندہی کر کے اس کی اکثر مشکلات حل کر دیتے اور اس کو متعدد کتابوں کی ورق گردانی کی زحمت سے بچا لیتے۔

ان کو دارالمصنفین سے بڑا تعلق تھا، اس کے علمی کاموں کے مداح اور قدردان تھے معارف میں وقتاً فوقتاً مضامین بھی لکھتے تھے، مولانا سید سلیمان ندوی سے خط و کتابت بھی تھی، ماہنامہ ریاض کراچی کے اپریل ۱۹۵۴ء کے شمارہ میں ان کے خطوط انہ من سلیمان [النمل: ۳۰] کے عنوان سے اپنے حواشی کے ساتھ شائع کئے تھے اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے زمانہ میں دارالمصنفین کی، گولڈن جوبلی میں شرکت کے لیے رام پور سے تشریف لے آئے، جناب مالک رام صاحب نے ان کی اکسٹھ ویں سالگرہ کے موقع پر ان کا ایک یادگاری مجلّہ پیش کیا تھا اس میں موجودہ ناظم دارالمصنفین جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا عرشی صاحب پر ایک پُرمغز مقالہ شامل ہے۔

عرشی صاحب کا اوڑھنا بچھونا علم تھا اور بقول شیخ سعدی ع پئے علم چوں شمع باید گداخت کے مصداق تھے، اب ان کی طرح خاموشی اور سچی لگن کے ساتھ صلہ وستایش کی تمنا کئے بغیر علم کی خدمت کرنے والے کم یاب ہیں اللہ تعالیٰ ان کو عالم آخرت کے بلند مدارج عطا فرمائے، آمین! ("ض"، مارچ ۱۹۸۱ء)

فیضی، آصف علی اصغر علی

جناب اے۔اے۔اے فیضی

گزشتہ مہینہ بمبئی کے جناب اے۔اے۔اے فیضی کی وفات ہوگئی، وہ ۱۹۱۹ء سے دارالمصنفین کے لائف ممبر تھے، اپنی نظروفکر میں جدید کاری اور ترقی پسندی کے باوجود آخر وقت تک علامہ شبلیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، دارالمصنفین اور معارف کے بڑے قدردان رہے، بمبئی جب جانے کا اتفاق ہوا تو وہ ایک شفیق بزرگ ہی کی طرح ملے، ان کے مذہبی اور فقہی خیالات کا احتساب تو وہاں ہوگا جہاں اب دائمی طور پر پہنچ گئے ہیں، مگر ان میں بعض شریفانہ خوبیاں تھیں جن کو ان کے معاصر دوست اور ملنے والے مدتوں یاد کریں گے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی کوئی ادا پسند آجائے جس سے ان کی مغفرت کا سامان ہوجائے، آمین۔ ("ص۔ع"، نومبر ۱۹۸۱ء)

آصف علی اصغر علی فیضی مرحوم

(سید شہاب الدین دسنوی)

۲۲/اکتوبر ۱۹۸۱ء کو آصف علی اصغر علی فیضی، بمبئی کے بریچ کینڈی اسپتال میں انتقال کرگئے، ان کی وفات سے ایک بلند پایہ دانشور اور محقق اور اچھے مقرر کی جگہ خالی ہوگئی۔

اپنے مزاج کے لحاظ سے فیضی صاحب نہایت خوش اخلاق، ہنس مکھ، وضعدار اور مہذب انسان تھے، ان کے پہلو میں حساس دل تھا جو کبھی اپنی ملت پر نالہ زن ہوتا، اور کبھی انسانیت کی گھٹتی ہوئی قدروں پر سوگوار۔ قانون بالخصوص مروجہ محمڈن لا پر ان کی گہری نگاہ تھی، وہ بیرسٹر تو تھے، مگر پریکٹس بہت کم کی، ان کا محبوب مشغلہ تنقید اور تحقیق تھا، انگریزی بہت اچھی لکھتے اور بولتے تھے، ان کے تبصرے اکثر ٹائمس آف انڈیا اور

دوسرے موقر انگریزی اخبار اور رسالوں میں شائع ہوتے جو قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے۔

فیضی صاحب نے بمبئی اور کیمبرج یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی، گورنمنٹ لا کالج بمبئی میں پروفیسر اور پرنسپل کی حیثیت سے کام کیا، بمبئی ریاست پھر یونین پبلک سروس کمیشن کے ممبر تھے، مصر میں ہندوستان کے سفیر اور کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے، پھر ریٹائرڈ ہوکر بمبئی میں مقیم ہوگئے۔

۱۹۳۳ء میں اسماعیل یوسف کالج کے پرنسپل ڈاکٹر محمد بذل الرحمٰن، پروفیسر ڈاکٹر داؤد پوتھا اور پروفیسر نجیب اشرف ندوی کے ساتھ مل کر فیضی صاحب نے اسلامک ریسرچ ایسوی ایشن کی بنیاد ڈالی، مشہور روسی نژاد محقق اور مستشرق پروفیسر ادا نوادر فیضی صاحب نے مل کر اس ادارے کے تحت اسماعیلی اور فاطمی عقائد سے متعلق کئی نادر مخطوطات ایڈٹ کر کے شائع کئے، اس کام کے لیے سابق آغا خاں کی طرف سے ایک معقول رقم بہ طور گرانٹ ملی، ۱۹۳۲ء میں بمبئی یونیورسٹی کی دعوت پر علامہ سید سلیمان ندویؒ نے عربوں کی جہازرانی پر جو خطبے دیئے تھے انھیں اسلامک ریسرچ ایسوی ایشن نے کتابی صورت میں شائع کیا تھا اسی ادارے کی دسویں سالگرہ کے جلسہ میں علامہ سید سلیمان ندوی نے بمبئی میں ایک خصوصی خطبہ ''ادب اور تعمیر ملت'' کے عنوان سے دیا تھا۔

فیضی صاحب نے قاضی نعمان کی اہم تصنیف ''دعائم الاسلام'' کا ایک مستند اور عمدہ ایڈیشن کئی سالوں کی محنت کے بعد تیار کر کے 'دارالمعارف' مصر سے شائع کیا، اور انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ بھی کیا، یہ ان کا سب سے بڑا تحقیقی کارنامہ ہے جس پر انھیں بجا طور پر ناز تھا۔

مذہبی امور میں فیضی صاحب کے خیالات بعض معاملات مثلاً عائلی قوانین کے بارے میں ہمارے علماء کے خیالات سے کچھ حد تک جدا تھے، وہ ان میں زمانے کے تقاضوں کے لحاظ سے ترمیم چاہتے تھے، دراصل وہ اسلام میں جدیدیت کی تحریک دیکھنا چاہتے تھے، جس کا ثبوت ان کی تصنیف A Modern Approach to Islam سے ملتا ہے، مگر فیضی صاحب کو جنھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، وہ یہ جانتے ہیں کہ ہمارے علمائے کرام کے وہ دل سے قدردان تھے اور ان کی بڑی عزت کرتے تھے، دارالمصنفین اور شبلی اسکول کے محققین کی تعریف کرتے تھے، ایک ہزار روپیہ دے کر وہ دارالمصنفین کے لائف ممبر بنے، دارالمصنفین کی مجلس منتظمہ کا جلسہ بمبئی میں ہونا طے پایا تو موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے راقم نے فیضی صاحب کے مشورے سے اسلامک ریسرچ ایسوی ایشن کے تحت شرکائے جلسہ میں سے بعض کی تقریروں کا انتظام کیا، ناسازی طبع کے باوجود فیضی صاحب ان نشستوں میں شریک ہوئے، جس احترام سے انھوں نے مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا شاہ معین الدین ندویؒ، سید صباح الدین عبدالرحمٰن وغیرہ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا، اس سے خود یہ بزرگ بھی متاثر ہوئے، اپنے مضمون سفر بمبئی (صدق جدید) میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اس کا ذکر فرمایا ہے۔

فیضی صاحب کی دو خصوصیات کا بیان ضروری معلوم ہوتا ہے، ایک تو وہ انتہائی اصول پسند واقع ہوئے تھے، اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ یونین سروس کمیشن ممبری کے دوران میں ایک مسلمان نوجوان آئی۔اے ایس کے انٹرویو کے لیے کمیشن کے سامنے پیش ہونے والے تھے، ان کے والد صاحب فیضی صاحب سے تعلقات کی بنیاد پر انٹرویو کی صبح فیضی صاحب کے گھر پہنچے اور باتوں باتوں میں بتا دیا کہ ان کا بیٹا انٹرویو میں جا رہا ہے، فیضی صاحب دفتر جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے، ان صاحب کے چلے جانے کے بعد انھوں نے اپنے دفتر خط لکھ بھیجا کہ ان کے ایک دوست اپنے لڑکے کے انٹرویو کے سلسلہ میں ان سے مل چکے ہیں، اس لیے یہ مناسب نہ ہوگا کہ اس دن انٹرویو میں وہ کمیشن کے ساتھ شریک ہوں، انھوں نے یہ بھی احتیاط برتی کہ نہ تو امیدوار اور نہ ان کے والد کا نام ظاہر کیا، نتیجہ نکلنے پر لڑکا کامیاب رہا، فیضی صاحب نے مبارکباد لکھ بھیجی۔

دوسری خصوصیت فیضی صاحب کی یہ تھی کہ علمی اور تحقیقی کاموں میں وہ رواداری برتنے کے قائل نہ تھے، تحقیق کے معاملہ میں ان کا مزاج پوری طرح مغربی انداز میں ڈھلا ہوا تھا، الفاظ کی چھان بین، حوالے اسناد، معتبر یا غیر معتبر، ہر ایک بات میں حد درجہ احتیاط برتنا، ان کی تنقید نگاری میں اکثر مغربی طرز کا خشک طنز پایا جاتا تھا، ایک بار کسی تحقیقی کتاب پر انھوں نے پہلے تو اس کے اغلاط کی نشاندہی کی، پھر لکھا کہ اس کتاب سے ریسرچ کرنے والوں کو البتہ ایک بڑا فائدہ یہ پہنچے گا کہ انہیں معلوم ہوجائے گا کہ تحقیق کس طرح نہیں کرنی چاہئے۔

فیضی صاحب کتابوں کے قدردان تھے، وہ کتابیں جمع کرنا ہی نہیں بلکہ انھیں سلیقہ اور احتیاط سے رکھنا بھی جانتے تھے، ۱۹۵۷ء میں کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے تو اپنی بیشتر کتابیں مطبوعہ کتابیں اس یونیورسٹی کے کتب خانے کو دے دیں، اس سے چند سال قبل اپنے ذخیرے سے انھوں نے اسماعیلی مذہب سے متعلق ایک سو چھیاسی مخطوطات اور دیگر تیئیس مخطوطات بمبئی یونیورسٹی کی لائبریری کو نذر کر دیئے، ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر ایم گوربا والا نے ان مخطوطات کی فہرست مرتب کر کے شائع کی، جو چند فقہ سے متعلق مخطوطات ان کے پاس بچ رہے، ان کی فہرست خود فیضی صاحب نے اکتوبر ۱۹۷۰ء میں شائع کی۔

اردو سے فیضی صاحب کو بڑی محبت تھی، وہ ادیب تو نہ تھے، مگر اپنے علم و دانش کی بدولت جو کچھ لکھتے وہ تحریر خاصی دلچسپ ہوا کرتی تھی ان کی اہلیہ سلطانہ فیضی (قاضی کبیرالدین کی صاحبزادی) اچھا لکھتی تھیں، ان کی کئی کتابیں عروس نیل، چڑیاں وغیرہ چھپ کر خاصی مقبول ہوئیں۔

بدقسمتی سے فیضی صاحب کا آخری زمانہ بڑی عسرت اور ذہنی کوفت میں گزرا،

راقم کی ان سے آخری ملاقات یکم جون کو ہوئی جب وہ اپنے لاعلاج مرض کو صحت یابی کے بجائے موت کی طرف لے جانے کے خواہشمند تھے، اس کے باوجود وہ یورپ کے سفر کی تیاری کررہے تھے، جہاں انھیں ایک انسٹی ٹیوٹ آف اسماعیلی اسٹڈیز قائم کرنے کی دعوت موصول ہوئی تھی، وہ لندن پہنچے بھی مگر جلد ہی صحت سے مجبور ہوکر واپس آگئے، بمبئی کے مشہور بریچ کینڈی اسپتال میں داخل ہوئے اور وہیں انتقال فرمایا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

فیضی صاحب بدرالدین طیب جی مرحوم کے نواسے تھے، مسلک کے لحاظ سے سلیمانی بوہرہ جماعت سے تعلق رکھتے تھے اور اس جماعت کے اکثر افراد کی طرح وسیع القلب اور بڑے فراخ دل تھے، عام مسلمانوں کے ساتھ نماز ادا کرنے میں کبھی عذر نہیں کیا، خود راقم کو فیضی صاحب کے گھر پر کبھی مغرب کی نماز پڑھنے کا موقع ملا تو فیضی صاحب کبھی تو شریک ہوئے اور کبھی یہ کہتے ہوئے معذرت چاہی ''میں آپ کے ساتھ نماز میں شریک ہوتا مگر پیروں میں تکلیف کی وجہ سے بیٹھ کر پڑھتا ہوں، اس لئے اجازت دیں تو دوسرے کمرے میں پڑھ لوں''۔

ان کے ذخیرے میں کلام پاک کے کئی خوبصورت اور قدیم نسخے تھے جنھیں وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔

اللہ تعالی ان کی کوتاہیوں کو معاف کرے اور ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔

(فروری ۱۹۸۲ء)

چھتاری، نواب

نواب صاحب چھتاری

ان سطروں کو لکھتے وقت جناب نواب صاحب چھتاری کی رحلت کی خبر ملی، ان کی کتاب زندگی کے خاتمہ پر جاہ، ثروت، رتبہ، وزن، وقار، دینداری، وضعداری، فراخدلی، رواداری، سیرچشمی اور ہردلعزیزی کا ایک صحیفہ بھی ختم ہوگیا، اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا کی تمام نعمتوں سے سرفراز رکھا، دعا ہے کہ آخرت میں بھی وہ برکت خداوندی کے کوثر و تسنیم سے سیراب ہوتے رہیں، آمین۔ (''ص۔ع''، جنوری ۱۹۸۲ء)

حسنی، محمد ثانی

محمد ثانی حسنی

ان سطروں کے لکھتے وقت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے عزیز بھانجے جناب محمد ثانی حسنی کی وفات حسرت آیات کی اندوہناک خبر ملی، ان کو مولانا علی میاں اپنے فرزند کے برابر سمجھتے رہے، وہ اپنی متانت، سنجیدگی اور خاموشی کی وجہ سے اپنے حلقہ میں بڑی قدر کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، بڑے اچھے اہل قلم بھی تھے، ان کی کتابوں میں ایمانی حرارت وحمیت جلوہ گر رہتی تھی، ان کی وفات سے دارالمصنفین بھی سوگوار ہے، اس لیے بھی کہ یہاں جو سیمینار ہورہا ہے اس کے روح رواں مولانا علی میاں اور ان کے دست و بازو مولانا رابع ندوی تھے، جو مرحوم کے منجھلے بھائی تھے، ان کی سوگواری سے ہمارے سیمینار کی فضا بھی غم ناک رہے گی، دعا ہے کہ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نعیم اور ان کے سوگوار ماموں، بھائیوں اور بچوں کو صبر جمیل عطا ہو۔ (''ص۔ع''، فروری ۱۹۸۲ء)

راشدی، سید حسام الدین

جناب سید حسام الدین راشدی

شروع اپریل میں پاکستان ریڈیو سے یہ خبر نشر ہوئی کہ جناب سید حسام الدین راشدی اللہ کو پیارے ہوئے، یہ خبر راقم حروف کے لئے بڑی جانکاہ تھی۔

وہ دارالمصنفین کے بڑے قدردان اور پرستار رہے، انھوں نے اتنی کتابیں لکھیں کہ ان کا شمار کرنا آسان نہیں، مگر کہتے کہ خدا کی قسم میں نے دارالمصنفین کی کتابوں ہی سے لکھنا سیکھا، وہ علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کے بڑے مداح تھے، دارالمصنفین سے جو بھی کتاب شائع ہوتی اس کو ضرور منگواتے اور اپنی الماری میں نمایاں جگہ دیتے اس ادارے سے غیر معمولی محبت کی وجہ سے ۱۹۴۷ء کے بعد کراچی میں اس کے لئے زمین کا ایک بڑا پلاٹ خرید لیا تھا کہ وہ اس کو وہاں منتقل کرالیں، لیکن یہ وہاں کیوں منتقل ہوتا، آخر میں وہ برابر کہتے رہتے کہ یہ ہندوستان ہی میں رہ کر بہتر کام کرسکتا ہے، اور اس کو اسی سرزمین میں رہنا چاہئے جہاں قائم ہوا ہے، تقسیم ہند کے بعد پاکستان کے ناشرین نے اس ادارہ کی مطبوعات کو چھاپ کر جو نقصان پہنچایا، اس سے وہ بہت رنجیدہ رہے، ان کے خلاف قانونی کاروائی کے لئے ایک کمیٹی بنائی، جب یہ موثر نہ ہوسکی تو وہاں کے تمام انگریزی اور اردو کے اہم اخبارات میں مضامین لکھے کہ حکومت پاکستان اس ادارہ کی مطبوعات کا حق طباعت و اشاعت خرید کر اس کو گراں قدر معاوضہ دے، یہ اخباری مہم ایسی مفید ثابت ہوئی کہ اس خاکسار کو حکومت پاکستان نے اسلام آباد بلایا اور ایک طویل مدت کی دفتری کاروائی کے بعد پندرہ لاکھ روپے دارالمصنفین کو دے کر اس کی مطبوعات کا حق طباعت و اشاعت اپنے ایک ادارہ نیشنل بک فاؤنڈیشن کے سپرد کردیا۔

اس کے لیے دارالمصنفین زیادہ تر جناب سید حسام الدین راشدی کا شکر گزار رہا، اس سلسلہ میں اس عاجز راقم کو جب جب کراچی جانا پڑا تو ان کی صحبت کی صبح حسین، شام رنگین اور رات عنبر آفریں رہی، وہ اپنے بے پایاں کرم و محبت کی بناء پر کراچی کے اہل علم کو اپنی آراستہ وپیراستہ کوٹھی میں پرتکلف کھانے پر مدعو کرتے اور اس

دعوت کو اپنی بذلہ سنجیوں، علمی پھلجھڑیوں اور پر کیف قہقہوں سے زعفران زار بنا دیتے، کبھی تنہائی میں ان کی نوشت وخواند کے پرسکون گوشہ عافیت میں جا بیٹھتا تو پھر اس میں علم وفن کی مہتابی چھٹکی نظر آتی، ہم دونوں محسوس کرتے کہ ہماری زندگی کے بہترین لمحات گزر رہے ہیں، کراچی سے واپس آکر معارف کے صفحات پر لطف ولذت کے ساتھ ان کا ذکر کرنے میں قلم بالکل نہیں تھکتا۔ وہ فرماتے کہ اگر وہ دارالمصنفین کی زیارت اپنی زندگی میں کرلیں گے تو پھر چین کی ابدی نیند سوئیں گے، یہاں کے بین الاقوامی سیمنار میں ان کو مدعو کیا تو فوراً جواب دیا کہ اس میں ان کی شرکت اس لئے ہوگی کہ وہ اپنے ذہنی قبلہ کا طواف کرلیں گے، مگر ان کے بعض خطرناک آپریشن ہونے والے تھے، جس کی کامیابی کی امید خود ان کو نہ تھی، وہ یہاں آنے کے بجائے وہاں پہنچ گئے جہاں ایک روز سب کو جانا ہے، ان چند تعزیتی سطروں کو لکھ کر مجھ پر ان کا جو حق ہے وہ ادا نہ ہو سکے گا، میرا بس چلتا تو ان پر ایک ضخیم کتاب لکھتا، ان شاء اللہ معارف کی کسی اشاعت میں ان پر ایک طویل مضمون ہوگا، ان کی وفات علمی تحقیق، علمی محنت، علمی ریاضت، علمی موشگافی، علمی نکتہ پروری کے ساتھ علم دوستی، دوست پروری، اخلاص کی رعنائی، اخلاص کی دلاویزی اور پرانی قدروں کی دلربائی کی بھی موت ہے، دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی خوبیوں کی بدولت ان کو اپنی آغوش رحمت میں لے کر کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا کرے، آمین۔ (''ص۔ع''، اپریل ۱۹۸۲ء)

پھلواروی، سید محمد جعفر شاہ، مولانا

مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی

ان کی وفات کے ساتھ مولانا سید محمد شاہ پھلواروی ندوی کی رحلت کی بھی خبر ملی، وہ ہندوستان کے مشہور بزرگ، عالم اور واعظ اور ندوۃ العلماء کے بڑے مربی مولانا شاہ سلیمان پھلرواویؒ کے فرزند ارجمند تھے، ندوہ سے سند حاصل کرکے کپورتھلہ کی جامع مسجد کے امام ہوئے تو اسی امامت سے ان کی شہرت کا آغاز ہوا اور جب پاکستان بنا تو ایک جید عالم ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ اور ممتاز مصنف کی حیثیت سے مشہور ہوئے، بہت دنوں تک لاہور کے ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ رہے، بہت سی کتابوں کے مصنف ہوئے جن میں سے کچھ کے نام یہ ہیں: الدین میر، ریاض السنہ، پیغمبر انسانیت، ازدواجی زندگی کے لئے قانونی تجاویز، مسئلہ تعداد ازدواج، تحدید نسل، اجتہادی مسائل، زیردستوں کی آقائی اور ترجمہ الفخری وغیرہ، قدیم وجدید طرز فکر کے امتزاج کے خواہاں تھے، اس کی ترویج کرتے رہے کہ شریعت کو غیر مبتدل نہ سمجھا جائے بلکہ اس میں جو توسع اور تیسر رکھا گیا ہے اسے آج بھی باقی رکھ کر اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، ان کی بعض تحریروں سے دینی حلقوں میں ہلچل پیدا ہوتی رہی، مگر وہ جہاں پہنچ جاتے اپنی شیریں بیانی سے اپنے ہم نشینوں کو اپنا گرویدہ بنالیتے، اچھے مقرر اور واعظ بھی تھے، کلام پاک کی آیتیں خوش الحانی اور اشعار ترنم سے پڑھ کر بڑی کیفیت پیدا کردیتے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی تربت پر اپنی رحمتوں اور برکتوں کی بارش فرماتے رہیں، آمین۔ (''ص۔ع''، پریل ۱۹۸۲ء)

جوشؔ ملیح آبادی

جوشؔ ملیح آبادی

پاکستان ہی میں اردو کے مشہور شاعر جوش ملیح آبادی کی وفات ہوئی، انھوں نے اردو شاعری کی صنف نظم گوئی کو بڑی ترقی دی، غزل کے بجائے نظم گو کی حیثیت سے زیادہ مقبول ہوئے، ان کے مداح ان کے فن اور شاعرانہ مہارت کے بڑے قدردان رہے، مگر ان کے کچھ ناقد ایسے بھی ہیں، جو ان کی شاعری ہی میں خیالات کی بلندی اور پاکیزگی کے بجائے صرف گھن گرج اور چیخ و پکار زیادہ پاتے ہیں، دینی حلقوں میں تو اپنے ملحدانہ اور رندانہ طرز فکر کی وجہ سے اچھی نظر سے نہیں دیکھے جاتے، مگر جب کبھی اردو شاعری کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس میں ان کے شاعرانہ فن کی وجہ سے ان کو نمایاں جگہ دی جائے گی۔ (''ص۔ع''، اپریل ۱۹۸۲ء)

فراقؔ گورکھپوری

فراقؔ گورکھپوری

آج کل رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری پر بھی ماتم بپا ہے وہ اس دار فانی سے رخصت ہوئے تو اپنے ساتھ اردو شاعری کی بہت سی رعنائیاں اور جلوہ سامانیاں بھی ساتھ لیتے گئے، فانیؔ، اصغرؔ، جگرؔ اور حسرتؔ کے بعد اردو شاعری کے لال قلعہ کے تخت طاؤس پر بیٹھ کر وہی شاہجہانی کرتے رہے، زبان کی زور آوری، فن کی ہمہ گیری، احساسِ جمال کی مرقع آرائی، رومانیت اور کلاسکیت کی ہم آہنگی غزل گوئی کی آئندہ ساخت و پرداخت میں رہبری، کیفیت وحلاوت کی رنگ آمیزی اور اردو زبان کی بے پناہ محبت کی فراوانی میں وہ یگانہ روزگار رہے، وہ خود کہہ گئے ہیں:

کچھ درد دے گیا ہوں زمانے کو اے فراقؔ
یہ سوچ کر کہ بعد میں یہ کام آئیں گے

(''ص۔ع''، اپریل ۱۹۸۲ء)

بیدلؔ، عبدالمنان

جناب عبدالمنان بیدلؔ

پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے سابق پروفیسر جناب عبدالمناف بیدل کی

وفات گزشتہ اپریل میں ہوگئی، انھوں نے تقریباً نوے سال کی عمر پائی اور اس لحاظ سے خوش نصیب تھے کہ اپنی زندگی میں اپنے شاگردوں کو علم و ادب میں بڑی شہرت حاصل کرتے دیکھا، بڑے شفیق استاد تھے، اس خاکسار کو بھی ان کی شاگردی کی سعادت نصیب ہوئی، اپنے زمانہ میں فارسی کی نصابی کتابیں انگریزی لباس پہن انگریزی زبان میں پڑھاتے وقت اس مشرقی زبان میں مغربی رنگ پیدا کردیتے، بڑے اچھے شاعر بھی تھے، بیدلؔ تخلص کرتے، مشاعروں میں اپنے ترنم سے اپنی شاعری میں دلنوازی، دل ربائی اور دل نشینی کی ساری کیفیت پیدا کردیتے، آخر عمر میں مذہبی رنگ بھی زیادہ غالب ہوگیا تھا، زائرین حج کی خدمت مختلف حیثیتوں سے کرتے رہے، استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے سفر حج میں ساتھ تھے، سلیمان نمبر میں ان کا ایک پرکیف مضمون ''سفر حجاز کے تاثرات'' کے عنوان سے شائع ہوا، گزشتہ اگست میں ان کو حکومت ہند کی طرف سے فارسی کی سند کا ایوارڈ بھی ملا، لیکن حکومت کی یہ جوہر شناسی اس وقت ہوئی جب ان کے بہت سے شاگردوں کو ان سے پہلے اس اعزاز سے نوازا جاچکا تھا، اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو ان کی نیکیوں اور خوبیوں کی بدولت کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا فرمائیں، آمین۔ (''ص ۔ ع''، مئی ۱۹۸۲ء)

<u>سہارنپوری، محمد زکریا، مولانا</u>

مولانا محمد زکریا محدث سہارنپوری

یکم شعبان <u>۱۴۰۲ھ</u> کو حضرت مولانا محمد زکریا محدث سہارنپوری کا وصال ستاسی سال کی عمر میں مدینہ منورہ میں ہوگیا، جہاں شیدائیوں اور فدائیوں کے بے پناہ ہجوم نے ان کے جنازہ کی نماز پڑھی اور اسی مقدس سرزمین میں سپرد خاک کئے گئے، جس کی آرزو زندگی بھر فرماتے رہے۔

وہ چودھویں صدی ہجری میں علمائے سلف کی ایک بے مثال یادگار تھے، ان کی تدفین کے ساتھ اسلام کے اس دور کی ایک بے قرار عبقریت کی نظر حکیمانہ، اسرار محرمانہ، جذب عارفانہ اور پھر دینی علوم کی پشتیبانی، عالی استعداد کی جلوہ سامانی، تحریر کی صاعقہ پاشی اور قلم کی برق دستی بھی تہ خاک ہوگئی، اب جب وہ آغوش رحمت الٰہی میں ہیں، ان کو ان کے معتقدین، ملک العلماء، سلطان الفضلاء، منہاج المتقین، مہبط الانوار اور شمس الفقراء کی حیثیت سے یاد کرکے ان کی دائمی جدائی پر آنسو بہائیں گے، ان کے جلوہ صدرنگ پر آئندہ بہت کچھ لکھا جائے گا، وہ دینی اور روحانی علوم کے دریا میں کبھی مثل موج ابھر کر کبھی اس کے ساحل سے گزر کر کبھی اس کے سینے میں اتر کر ان کے رازکو جس طرح فاش تر کرتے رہے، اس پر معلوم نہیں کیا کچھ قلم بند ہوتا رہے گا، انھوں نے خدا جانے کتنے اوراق پر اسرار الٰہی کے حقائق اور انوار الٰہی کے دقائق کو آشکار کیا، ان کی ان گنت تصانیف کی روحانی، مذہبی، نظری، فکری، اخلاقی اور دعوتی تعلیمات سے برابر عبرت و بصیرت کے درس حاصل ہوتے رہیں گے۔

تعلیم مظاہر العلوم سہارنپور میں پائی اور وہیں ایک عرصہ تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا، اپنے والد بزرگوار سے مجتہدانہ دماغ پایا تھا، اسی لئے طالب علمی ہی کے زمانے سے قرآن مجید حدیث مقدس اور فقہ کا مجتہدانہ مطالعہ کرتے رہے، قرآن پاک کو سمجھنے اور سمجھانے میں ان کی جو نظر لغت، نحو، صرف، اشتقاق، علم سان، علم بدیع قرأت، علم عقائد اور شان نزول آیات کریمہ پر رہی، وہ کم علماء کی رہی ہوگی، اسی طرح حدیث کو سمجھنے کے لئے فرماتے کہ محدثیت اور مشیخت کے بجائے سلف صالحین کی جانکاہی کی ضرورت ہوتی ہے انھوں نے خود اس جانکاہی کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کیا، بہت بڑے محدث ہوئے حدیث کا درس دینے میں یگانہ روزگار تسلیم کئے گئے، عربی میں ترمذی موطا اور بخاری شریف کی مختلف جلدوں میں جو شرحیں لکھی ہیں وہ اسلامی ممالک میں بھی شمع ہدایت بنی ہوئی ہیں، وہ بہت بڑے فقیہ بھی تھے، وہ اس کے قائل تھے کہ فقہ کا ماخذ قرآن پاک، سنت مطہرہ، اجماع اور قیاس ہے اس لئے ایک فقیہ کے لئے ان چیزوں کو معلوم کرنا ضروری ہے جو قرآن مجید اور حدیث پاک میں ہے۔

ان علوم کے حصن حصین میں بیٹھ کر وہ سلوک و طریقت کی طرف بھی مائل ہوئے، حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ کی صحبت میں تقویٰ حاصل کیا، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے فکر حکیمانہ، اخذ کی، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے مجاہدہ کا درس لیا، حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ سے تواضع و انکسار سیکھا، اپنے چچا حضرت مولانا محمد الیاسؒ سے مذہبی مراسم کی نگہبانی کی وراثت ملی، اور اپنے مرشد حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ سے فن حدیث سے شغف و انہماک کے علاوہ عشق الٰہی، محبت رسول سوزگداز صدق، صفا، زہد، توکل، محبت، خود انکاری، اور ایثار کی دولت پائی، یہ وہ بزرگان دین تھے جن کے بارے میں خود حضرت مولانا کا خیال تھا کہ: ع

انہی کے اتقا پر ناز کرتی ہے مسلمانی، رشد وہدایت کی مسند پر متمکن ہوتے تو انابت ہو یا، عبادت زہد ہو یا ریاضت، مجاہدہ ہو یا تفکر، استغنا ہو یا قناعت، بے نیازی ہو یا اخلاص، عشق الٰہی ہو یا محبت رسول ان سب کے مدارج طے کرکے اٹھتے بیٹھتے اور سوتے جاگتے، باری تعالیٰ کی قدرت کاملہ کو دیکھ کر محو اور متحیر ہوئے، اور دنیا کو اپنی انگلیوں کے حلقہ ہی میں دیکھنا پسند کیا، ایسے ہی بزرگان دین کے لئے اقبال نے کہا ہے:

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللٰہی

ان کی خدمت بابرکت میں رشد و ہدایت کے لئے جو بھی حاضر ہوا، اس نے محسوس کیا کہ:

جنھیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے ظلمت خانہ دل کے مکینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدبیضا لئے بیٹھے ہیں، اپنی آستینوں میں

اور وہ خود اپنے مریدوں کو بس یہی تعلیم دیتے رہے:

؎ دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

وہ سہارنپور میں رہتے یا مدینہ منورہ میں رہ کر گنبد خضراء کے دیدار سے مشرف ہوتے، یاڈربن پہنچ کر اپنے مشتاقوں کے دیدار کی تشنگی بجھاتے یا لندن میں قیام کر کے اپنی فقر کی دولت کر عام کرتے، یا ابوظہبی جا کر اخلاق نبوی، افعال نبوی اور اقوال نبوی کی تعلیم دیتے، ہر جگہ بالالتزام ذکر الٰہی کی مجلس گرم رکھتے، وہ روحانی منظر کیسا ایمان پرور ہوتا جب وہ خود جلوہ افروز ہوتے، ان کے اردگرد ان کے حلقہ بگوشوں کی ایک باوقار اور سرشار جماعت ہوتی جس کے دل کے اندر سے لا الٰـہ الا اللّٰہ کی نغمہ زیرصدا بلند ہوتی، اس وقت ایسا معلوم ہوتا کہ: نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللّٰہ۔

اس کم سواد راقم کے لئے ان کے گوناگوں کمالات پر کچھ بھی لکھنا اس کے بس کی بات نہیں:

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچیں بہار تو ز داماں گلہ دارد

وہ ایک بلند پایہ اور باکمال محدث ہونے کے باوجود عوام وخواص میں قدوۃ السالکین ہی کی حیثیت سے مشہور ہوئے، اب وہ عالم بالا میں تشریف فرما ہیں، وہاں اگر محدثین کے جلو میں نظر آرہے ہوں گے، تو اقطاب الاسلام سلاطین الطریقت، سراج الاولیاء تاج الاصفیاء کی صف میں بھی دکھائی دے رہے ہوں گے، قدوۃ السالکین کی حیثیت سے وہ پیام چھوڑ گئے ہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ احسان کیا چیز ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو کہ جیسے اس کو دیکھ رہے ہو، اسی احسان کا ایک نام طریقت یا سلوک یا تصوف ہے، اللہ تعالیٰ کی رضامندی میں بالکلیہ مصروف ہوجانے، علم دین پر قوت یقین رکھنے اور جو کچھ حدیث میں ہے اس پر عمل کرنے نام اخلاق تصوف ہے۔

اسی پر عمل کر کے ان کے معتقدین کو ان کی روح پرفتوح کو خوش رکھنا ہے، گویہ یقین کامل ہے کہ ان کی دینی فضیلت، روحانی عظمت، تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کی وجہ سے ان کے مرقد مبارک پر انوار الٰہی اور تجلیات ایزدی کی بارش برابر ہوتی رہے گی، آمین ثم آمین۔ (’’ص۔ع‘‘، جون ۱۹۸۲ء)

<u>عبداللہ، شیخ</u>

شیخ عبداللہ

کشمیر کی گل پوشی وادی کے شیر شیخ عبداللہ اس دارفانی سے کوچ کر کے اب وہاں ہیں جہاں ایک روز سب کو جا کر بارگاہ ایزدی میں اپنا اپنا اعمال نامہ پیش کرنا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت بے پایاں سے سرفراز فرمائیں، آمین۔

نجی مجلسوں میں اکثر یہ گفتگو رہتی ہے کہ ہندوستان میں انیسویں صدی میں جتنی عظیم اور قدرآور شخصیتیں پیدا ہوئیں، اتنی بیسویں صدی میں نہ ہوسکیں، مگر اس صدی میں جو چند عظیم المرتبت شخصیتیں پیدا ہوئیں، ان میں شیخ عبداللہ بھی تھے، ان کی زندگی شروع سے فعال، متحرک اور ہنگامہ پرور رہی، اپنی جوانی میں مہاراجہ کشمیر کی استبدادیت سے ٹکر لی اور جیل گئے، پاکستان کی تحریک اور اس کے قیام کے بعد محمد علی جناح سے بھی تصادم مول لیا، ۱۹۴۷ء کے بعد کشمیر کا الحاق ہندوستان سے کر کے اپنے سیکولرزم کا ثبوت دیا، اور پاکستان سے جنگ بھی کی، لیکن پھر کشمیر کی مخصوص حیثیت کی خاطر، اپنے دوست پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی ان کی وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں سیاسی اور دستوری نبردآزمائی کی جس کے نتیجہ میں اپنی جوانی کے بہترین ایام قید اور نظربندی کی صورتوں میں گزارے، حکومت ہند سے ان کی معرکہ آرائی الف لیلیٰ کی داستان سے کم نہیں، جھپٹے، پلٹے، پلٹ کر جھپٹے، جھپٹ کر پلٹے، کشمیر کے عوام کے استصواب رائے، حق خوداختیاری اور سرزمین کشمیر کی آزادی کے نعرے بلند کرتے رہے، مگر جب یہ فضا میں صرف گونج کر رہ گئے، تو پھر حکومت سے مصالحت کرلی، کشمیر کے وزیراعظم تو نہیں، لیکن وزیراعلیٰ بن گئے، اور اسی حیثیت سے ان کی وفات بھی ہوئی، اور جنازہ بھی اٹھا، جس کے بے پناہ ہجوم سے کشمیر میں ان کی محبوبیت کا اندازہ ہوا۔

وزیراعلیٰ کی حیثیت سے ان کا زریں کارنامہ یہ ہے کہ کشمیر میں یونیورسٹی تک تعلیم مفت کردی، اردو کو اپنی ریاست کی سرکاری زبان بھی بنایا، گو ان کی مادری زبان کشمیری تھی، لیکن کشمیری زبان سے اپنی محبت بھی برقرار رکھی اور ان ہی کی سرپرستی میں یہ ترقی کر کے ایک اچھی علمی زبان بن گئی ہے، وہی پھر ریاست کی ڈگری اور لداخی زبانوں کو فروغ دینے میں ہر قسم کی سہولتیں فراہم کیں جو ان کے سیکولرزم کی مزید مثال ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت کرنے والا کوئی نہیں رہا تو شیر کشمیر کی جری اور بہادر شخصیت کی طرف نظر اٹھی تھی لیکن وہ مولانا محمد علی جوہر اور نہ مولانا ابوالکلام آزاد بن سکے، شائد طویل قید وبند کی صعوبتوں سے تھک چکے تھے، یا انھوں نے صرف کشمیر ہی کے لئے جام حیات نوش جاں فرمانا طے کرلیا تھا، اپنی وزارت کے زمانہ میں بہت کم باہر نکلے، ہندوستان کے چھوٹے بڑے وزیر کسی بہانہ سے ممالک غیر کی سیر

کراتے ہیں، مگر شیخ صاحب نے تو اپنے علاج کے لئے کشمیر سے باہر جانا بھی پسند نہیں کیا، ان کو وہاں کی حسین اور رنگین وادی اور اس کی وزارت اعلیٰ کے گوشہ عافیت میں جو ذہنی اور سیاسی سکون ملا ان کو شائد کہیں اور ملنے کی امید نہ تھی، اسی لئے وہ اپنی زبان حال سے یہ کہتے رہے،

قدم ز نقطۂ کشمیر برنمی گیریم
مقیم مرکز عیشیم و جائے ما اینجا ست

اور ان پر یہ اندرونی جذبہ کارفرما رہا:

کشمیری ستانم از حق بجائے جنت
امانمی ستانم جنت بجائے کشمیر

(''ص ۔ ع''، اکتوبر ۱۹۸۲ء)

دانش، احسان

احسان دانش

کچھ عرصہ سے اس برصغیر کی اردو شاعری کے آسمان پر سیاہ بادل برابر چھائے ہوئے ہیں، فراق گورکھپوری اور جوش ملیح آبادی کے بعد احسان دانش، حفیظ جالندھری اور اب نشور واحدی اللہ کو پیارے ہوئے۔

ان کی رحلت سے اردو شعر و ادب کے قصر کی رنگارنگی میں بڑی کمی پیدا ہوگئی ہے، احسان دانش نے اپنی زندگی ایک پریشان حال مزدور کی حیثیت سے شروع کی، لیکن اپنی وفات سے پہلے اردو شاعری کے ایک تاجدار تسلیم کرلیے گئے تھے، ۱۹۴۷ء سے پہلے وہ اعظم گڑھ کے مشاعروں میں برابر آتے رہے، اس وقت تک ان کے کلام کے مجموعوں میں نفیر فطرت، جادہ نو، چراغاں، درد زندگی، نوائے کارگر، آتش خاموش حدیث ادب اور گورستان وغیرہ چھپ چکے تھے، مشاعرہ کے اسٹیج پر آتے تو ان کے چہرہ سے ان کی زندگی کی سادگی اور پریشانی ظاہر ہوتی، مگر کلام سناتے تو ان کے خیالات کی پرکاری اور رعنائی سے سامعین متاثر ہوکر محسوس کرتے کہ وہ اپنی شاعری میں جادو نو پر چل رہے ہیں، غزلیں سناتے تو تغزل کا چراغاں کرکے درد زندگی کے راز پنہاں کو عیاں کرتے، ان کی زندگی زیادہ تر پریشانیوں میں گزری، مگر وہ آتش خاموش بن کر ایک شاعر کا حق ادا کرتے رہے، اسی لیے ان کی سخنوری نوائے کارگر اور حدیث ادب بنی رہی، ان کی مشق سخن کی کہانی ان ہی کی زبانی یہ ہے کہ جب ان پر جذبہ شاعری طاری ہوتا وہ اپنی روح میں التہاب پاتے اور جب شعر سپرد قلم کردیتے تو محسوس کرتے کہ الفاظ میں، کاغذ پر، دائروں، لفظوں، مرکزوں اور پیوندوں کے نیچے ان کی روح دبتی چلی جارہی ہے، اور جب کوئی نظم پایہ تکمیل کو پہنچ جاتی تو اپنی روح کو سبک اور آرام طلب پاتے، پھر وہ میٹھی نیند سوجاتے۔

وہ اردو کے نظم گویوں کی صف اول میں آگئے تھے، تصویر خیالی ہو، نیرنگ تصور ہو، حسن نظر ہو، اثرات رباب ہوا، متھرا کی چاندی رات ہو، سب میں ان کی نظم گوئی کی جلوہ طرازیاں ہیں، وہ مزدوروں کے شاعر کی حیثیت سے بھی مشہور ہوئے، فاقہ کشی کے الم پرور مناظر، سرمایہ داری کے خونچکاں مرقعے اور پامال انسانیت کے درد انگیز خاکے بڑے موثر انداز میں پیش کرتے رہے، یہ محض جگ بیتی نہیں تھی، بلکہ آپ بیتی بھی تھی، مگر وہ کسی لمحہ بھی اشتراکی نہیں ہوئے، راسخ العقیدہ مسلمان رہ کر اپنے مالک حقیقی سے جاملے، ان کی یہی راسخ العقیدگی آخرت میں زاد راہ ہوگی، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی فطرت سلیم کے بدلے ان کو کوثر وتسنیم سے سیراب کرے، آمین۔ (''ص ۔ ع''، فروری ۱۹۸۳ء)

حفیظ جالندھری

حفیظ جالندھری

ابوالاثر حفیظ جالندھری اردو شاعری کے مرصع کارستون بنے رہے، اپنے آغاز شباب میں مناجات تہجد لکھی تو خواجہ حسن نظامی نے اس کو شائع کرکے لکھا کہ اگر میں دولت مند ہوتا تو اس مناجات کے ہر شعر کے معاوضہ میں ایک اشرفی نذر کرتا، کچھ دنوں وہ مزدوروں اور کسانوں کی دلسوزی کا بھی راگ الاپتے رہے، ہندو، مسلمانوں کو پریت کا گیت بھی سنایا، ''ہندوستان ہمارا'' میں تاریخ ہند کو نظم کرکے بچوں کے دلوں میں مطالعہ تاریخ کا ذوق پیدا کرنے کی بھی کوشش کی، مناظر فطرت کی مصوری بھی کی، جوانی کے جذبات کی ہنگامہ آرائی میں وہ نظم لکھی، جس کا عنوان ہے ''ابھی تو میں جوان ہوں'' اور یہ اب بھی بہت مقبول ہے، رومانی گیت لکھنے میں بھی مہارت رکھتے تھے، یکایک ان کا ذوق بدلا تو اس ملی شاعری کی طرف چل پڑے جس کی جوت ظفر علی خان اور اقبال نے جگائی تھی۔

راقم کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ۱۹۳۴ء میں ان کا کلام ان کی زبانی سننے کا اتفاق ہوا تھا، وہاں طلبہ کی یونین میں مدعو تھے، جوان کی آمد پر اوپر سے نیچے تک بھر گیا تھا، وہ اس وقت تک شاہنامہ اسلام کے شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوچکے تھے، طلبہ ان سے اردو شاعری کے فردوسی کی حیثیت سے مل رہے تھے، انھوں نے شاہنامہ اسلام کا کچھ ٹکڑا اپنے خاص ترنم میں سنایا، تو ایسا محسوس ہوا کہ وہ واقعی ابوالاثر ہیں، شاہنامہ کی پہلی جلد ہی شائع ہوسکی، جس میں جنگ بدر تک کے حالات ہیں، اس زمانہ میں اعلان ہوا تھا کہ اس کی دوسری جلد میں غزوات نبویؐ کی تفصیل ہوگی، پھر تیسری جلد میں خلفائے راشدینؓ اور اسلامی فتوحات کی باری آئے گی، اردو شاعری کے اس فردوسی کو ایک محمود کی سرپرستی حاصل نہ ہوسکی، اس لیے یہ ایمان پرور کام پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا جو

خود مسلمانوں کی حرماں نصیبی ہے۔

وہ اپنے پیچھے اپنے کلام کے مجموعوں میں نغمہ زار، سوز و ساز، تلخابہ شیریں اور چراغِ سحر چھوڑ گئے ہیں، بچوں کے لیے جو نظمیں لکھیں ان کے بھی کئی مجموعے ہیں، ان کی ایک پرکیف نظم "سلام" بھی ہے جس کو سن کر ایمانی حرارت پیدا ہوتی ہے، پاکستان کا قومی ترانہ بھی ان ہی سے لکھوایا گیا، مگر ان کی اصلی قدر و منزلت شاہنامۂ اسلام ہی کی وجہ سے رہی اور رہے گی، اور عالم بقا میں وہ شاید اسی صف میں دکھائی دیں، جہاں نبی آخرالزماں ﷺ کے فدائی اور شیدائی ہوں گے، آمین۔ ("ص۔ع"، فروری ۱۹۸۳ء)

نشورؔ واحدی

نشورؔ واحدی

ہندوستان میں فراق گورکھپوری کا ماتم ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ نشور واحدی بھی داغِ مفارقت دے گئے، ان کا کلام ان کی دلکش اور مترنم آواز میں اعظم گڑھ کے مشاعروں اور دارالمصنفین کی نجی مجلسوں میں ان سے برابر سننے میں آیا، متین، سنجیدہ اور پرانی تہذیب کے حامل تھے، بلیا وطن تھا، مگر زندگی حلیم کالج کانپور میں ایک استاد کی حیثیت سے گذاری، شروع میں تعلیم دائرہ رفیع الزماں الہ آباد کے بزرگ شاہ شفاء اللہ سے پائی جن سے فلسفۂ اسلام، فلسفۂ خودی اور مولانا روم کے افکار کے بہت سے رموز و نکات کو اچھی طرح سمجھا ان کا خوش گوار اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا، ان کے کلام کے کئی مجموعے آتش و نم، شورِ نشور، صہبائے ہند اور فروغِ جام کے نام سے شائع ہوئے، اصغر، حسرت، فانی، جگر اور فراق گورکھپوری کی صف کے بعد جو شعراء کھڑے نظر آئے، ان میں نشور واحدی اپنے شاعرانہ کمال کی گل پیرہنی، مشاقگی اور شیریں بیانی، پھر فکر و فن کے رنگ و آہنگ کی جلوہ گری میں کسی سے کم نہیں نظر آئے، بلکہ بعض حیثیتوں سے اپنے معاصروں میں قد آور دکھائی دیئے۔

۱۹۴۰ء میں جناب شاہ معین الدین احمد ندوی (سابق ناظم دارالمصنفین) نے ان کے مجموعۂ کلام "صہبائے ہند" کے شروع میں ایک مختصر تبصرہ میں لکھا تھا کہ ان کی شاعری میں تغزل کی رنگینیاں بھی ہیں، قوم و وطن کے لئے پیامِ زندگی بھی، مذہب و ملت کا درس بھی، الفاظ کی سلاست بھی، بیان کی لطافت بھی، معتدل شوخی بھی، اور جوش و سرمستی کے نمونے بھی ہیں، اپنی ان شاعرانہ خوبیوں کو انھوں نے آخر وقت تک قائم رکھا، نثر میں ان کی ایک کتاب اسلام میں فلسفۂ خودی پر بھی ہے، دعا ہے کہ ان کا اسلامی جذبہ بارگاہ ایزدی میں مقبول و مبرور ہو، آمین۔

("ص۔ع"، فروری ۱۹۸۳ء)

صدیقی، نیاز احمد

آہ! جناب نیاز احمد صدیقی

اسی مہینہ یعنی مارچ ۱۹۸۳ء میں جناب نیاز احمد صدیقی تقریباً ۸۴ سال کی عمر میں اللہ کو پیارے ہوئے، وہ کوئی ادیب شاعر، نقاد اور مصنف نہ تھے، شروع سے آخر تک انگریزی زبان کے قابل قدر استاذ رہے، وطن مریاہو ضلع جونپور تھا، اردو زبان کے مایہ ناز ادیب اور نقاد جناب رشید احمد صدیقی کے چھوٹے بھائی تھے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایم اے، ایل ایل بی اور بی ٹی کی ڈگریاں حاصل کرکے شبلی اسکول اعظم گڑھ میں انگریزی کے استاد ہوئے، پھر جب یہ اسکول انٹر اور ڈگری کالج بنا، تو اس کے انگریزی کے لکچرر مقرر کئے گئے، آخر میں محمد حسن انٹر کالج کے پرنسپل بنے، وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں کچھ دنوں انگریزی پڑھاتے رہے، یہی ان کی زندگی کی مختصر روداد ہے، مگر وہ ان چند شریف انسانوں میں تھے، جو حدیث سوز و ساز زندگی کے حامل، اخوت کے بیان اور محبت کی زبان بن کر اپنے گھر والوں، دوستوں اور معاصروں کے ساتھ رہے، اپنی اس طویل زندگی کے سولہ برس دارالمصنفین کے احاطہ میں گزارے اور اس کے شب و روز کو پرکیف بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، کوئی مسئلہ ہوتا، کوئی نازک وقت آتا، یا کوئی تقریب ہوتی، تو ہر موقع پر اپنے مخلصانہ، مشفقانہ اور ناصحانہ مشوروں سے سب کی دل داری، دلنوازی اور رہنمائی کرتے، وہ یہاں کی زندگی کے جزو لاینفک ہوگئے تھے، اپنے شریفانہ برتاؤ، اخلاقی بلندی اور روزمرہ کی زندگی کے لین دین کی طہارت اور صاف باطنی میں قرونِ اولیٰ کی روایت کو تازہ کرتے، ان کی پاک اور طاہر زندگی پر اس وقت رشک آتا جب دارالمصنفین کے احاطہ کے اندر بعض لوگوں کی زبان سے یہ سننے میں آتا کہ ایک صحابی کی زندگی ایسی ہی رہی ہوگی۔

اس احاطہ میں کوئی بھی بیمار پڑجاتا تو اس کی تیمارداری کرنے میں مریض پر احسان کیا کرتے بلکہ مریض کے احسان کے بار سے دبے جاتے کہ اس نے ان کو خدمت کرنے کا موقع دیا، اس کے لئے رات کو چپکے چپکے جاگتے رہتے، اگر انہیں اسکی آنکھ کھل جانے کا ذرا بھی اندیشہ ہوتا تو آنکھ موند کر بظاہر سو جاتے کہ کہیں اس کو اس خیال سے تکلیف نہ ہو کہ وہ اس کے لئے جاگ رہے ہیں، وہ دوستوں کے لئے تحفے لاتے اور ان کے بستر کے سرہانے میں اس طرح رکھ دیتے کہ پتہ چلانا مشکل ہوجاتا کہ یہ کس نے لاکر رکھا ہے، تہجد کی نمازیں برابر پڑھتے رہے، اگر گھر کے لوگ یا ان کا کوئی ہمراز یا ہمدم ان کو رات کے آخری پہر میں تہجد پڑھتے کبھی دیکھ لیتا تو وہ سوگوار ہوجاتے کہ ان کی عفت مآبی، عصمت پروری اور دل کی پاکی پر حرف آگیا، باتیں کرتے

تو نرم دم گفتگو کی اعلیٰ مثال پیش کرتے، دوستوں کی صحبت میں بیٹھتے تو ان کی ہر ادا دلفریب نظر آتی، رشتہ داروں کے ساتھ ہوتے تو ان کی ہر نگاہ دلنواز معلوم ہوتی، مشورے دیتے تو ان کا ہر مشورہ کارآفریں، کارکشا، اور کارساز ہوتا، وہ اپنے بڑے بھائی رشید احمد صدیقی کے پاس مودب بیٹھتے تو جناب رشید احمد صدیقی محسوس کرتے کہ ان کو سامنے محبت واخلاص کی ایک جوئے شیر بہہ رہی ہے۔

شبلی اسکول کو انٹر کالج اور ڈگری بنانے میں اس کے پرنسپل جناب بشیر احمد صدیقی مرحوم کی ہم نفسی، دم سازی اور غمخواری کا جو حق ادا کیا، وہ اس زمانہ کی ایک اعلیٰ مثال تھی، پھر جونپور کے محمد حسن انٹر کالج کو حسن ظاہری اور معنوی خوبیوں سے اپنے رفقائے کار سے مل کر آراستہ کیا، وہ اس کی تاریخ کا زریں باب رہے گا، کوئی طالب علم بھی ان کی خشمگیں آنکھوں اور قہرناک باتوں کا شاکی نہیں ہوا، طلبہ اپنی ناروا اور نازیبا حرکتوں کے بعد ان سے ملتے تو ان کو اپنے سامنے جلیل اور جمیل پاتے، وہ جھک کر سربلند ہوتا اور مفتوح ہو کر فاتح بنا جانتے تھے۔

وہ جا چکے، مگر ایک شفیق شوہر ایک دلنواز باپ، ایک جان نثار بھائی، ایک چہیتے بزرگ، ایک بے مثال استاد اور ایک انتہائی شریف النفس دوست کا اعلیٰ نمونہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے، خدا جانے اپنی کن کن باتوں کے عطر مجموعہ سے اپنی یادوں کی شامہ نوازی کرتے رہیں گے، اللہ تبارک تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا کریں، آمین۔

(''ص۔ع''، مارچ ۱۹۸۳ء)

<u>وجدؔ، سکندر علی</u>

آہ! سکندر علی وجد

(عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی)

۱۶؍ مئی ۱۹۸۳ء کو اردو کے مشہور شاعر سکندر علی وجد کا انتقال ہوگیا۔ عمر ستر سال کی تھی، وہ ۲۲؍ جنوری ۱۹۱۴ء کو دیجاپور ضلع اورنگ آباد میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم اورنگ آباد ہی میں ہوئی، اور وہیں ۱۹۳۰ء میں ان کی شاعری کا آغاز ہوا، اور اسی سال کالج میگزین ''نورس'' کے ایڈیٹر مقرر ہوگئے تھے، ۱۹۳۵ء میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن سے بی اے کی ڈگری لی، ۱۹۳۷ء میں حیدرآباد سول سروس کے امتحان مقابلہ میں کامیابی کے بعد عہدہ منصفی پر ان کا تقرر ہوا، ۱۹۵۲ء میں ریاست حیدرآباد کے ضلع سنگاریڈی میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی رہے، پھر ۱۹۵۶ء میں سیشن جج کے عہدے پر فائز ہوئے اور اسی سال ملک کی تنظیم جدید میں مہاراشٹر منتقل ہوئے، ۱۹۶۴ء میں قبل از وقت پنشن لی اور انجمن ترقی اردو مہاراشٹر کے صدر منتخب ہوئے، ۱۹۷۰ء میں انھیں ''پدم شری'' کا اعزاز ملا۔ ۱۹۷۲ء میں مہاراشٹر سے انھیں راجیہ سبھا کا ممبر بنایا گیا۔

وہ ۱۹۷۵ء میں مہاراشٹر اردو اکاڈمی کے نائب صدر منتخب ہوئے، غالب اکاڈمی دہلی نے ان کو ۱۹۷۷ء کا اکاڈمی ایوارڈ دیا، اسی سال اترپردیش اردو اکاڈمی نے ان کے مجموعہ کلام ''بیاض مریم'' پر تین ہزار کا انعام دیا، ان کی گوناگوں ادبی خدمات کی بناء پر انھیں ۱۹۸۱ء میں ترقی اردو بورڈ کا نائب صدر نامزد کیا گیا، وہ دارالمصنفین کے لائف ممبر بھی تھے۔

جب انھوں نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو تھوڑے ہی عرصہ میں ان کی شاعری کی دھوم مچ گئی، سروجنی نائیڈو، سر عبدالقادر، خواجہ حسن نظامی، جعفر علی خان اثر، قاضی عبدالغفار اور جگر مرادآبادی نے ان کی رعنائی خیال، حسن بیان اور رفعت فکر کی دل کھول کر داد دی اور بہت جلد وہ اردو کے ممتاز شاعروں میں شمار ہونے لگے، وہ مشاعروں کے شاعر نہ تھے، لیکن جب کبھی کسی عظیم مشاعرہ میں کلام اپنے مخصوص انداز میں سناتے تو دل کے تار بول اٹھتے تھے، ان کے ترنم میں بلا کا سوز اور وجدانی کیفیت ہوتی، ان کی دو نظموں ''ایلورا'' اور ''اجنتا'' کو بڑی شہرت حاصل ہوئی، واقعہ یہ ہے کہ جس طرح ایلورا اور اجنتا ہندوستانی بت تراشی اور مصوری کی حیرت انگیز یادگاریں ہیں، اسی طرح وجد صاحب کی ان پر کہی ہوئی نظمیں بھی اردو شاعری میں خوبصورت اور قیمتی اضافہ ہیں، ''اجنتا'' ان بندوں سے شروع ہوتی ہے:

جہاں خون جگر پیتے رہے اہل ہنر برسوں — جہاں گلنار رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں
جہاں کھنچتا رہا پتھر پہ عکس خیر و شیر برسوں — جہاں قائم رہے گی جنت قلب و نظر برسوں
جہاں نغمے جنم لیتے ہیں، رنگینی برستی ہے
دکن کی گود میں آباد وہ خوابوں کی بستی ہے
جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقش لاثانی — تصدق جن کے ہر خط پہ تحیر خانۂ مانی
مشکل ہے شباب و حسن میں تخیل انسانی — تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوق عریانی
گلستانِ اجنتا پر جنوں کا راج ہے گویا
یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

اسی طرح ان کی نظم ''ایلورا'' کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

مئے خیال ہے سنگین آبگینوں میں — دلوں کا سوز نہاں پتھروں کے سینوں میں
چھپائے نور ازل بت ہیں آستینوں میں — حیات جذب ہے ان بے شکن جبینوں میں
یہاں جو سیر کو فکر رسا نکلتی ہے
وفور شوق میں پربت کی سانس چلتی ہے

ان شاہکار نظموں کے علاوہ 'تاج محل'، 'علی ساگر'، 'اورنگ آباد'، 'گہوارہ مسیح'، وغیرہ نظمیں بھی ان کی قوت مشاہدہ اور ان کی غیر معمولی فصاحت بیان کے نمونے ہیں۔

وہ سرکاری ملازم تھے، لیکن ابتدا ہی سے حب الوطنی اور آزادی کے جذبات سے

سرشار تھے، اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں ''کسان'' اور ''ترانہ دکن'' جیسی نظمیں لکھیں۔ اپنے دل کی دھڑکنوں کو تحریک آزادی کے ولولہ انگیز نعروں کے ساتھ ہم آہنگ کیا، اپنی نظم ''آفتاب تازہ'' میں وطن کی آزادی کا بڑے خوبصورت انداز میں خیر مقدم کیا ہے، ''کاروان زندگی'' بھی ان کی ایک بڑی اہم نظم ہے، جس میں انھوں نے ماضی، حال اور مستقبل کے ساتھ ساری دنیا کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے، اور نہایت دلآویز انداز میں اقوام عالم کی آزادی کی بشارت دی ہے، ۱۹۴۲ء میں ان کی نظم ''نیا گیت'' اور ''بشارت'' خاص طور سے مرکز توجہ بن گئیں۔

ان کا پہلا مجموعہ کلام ''لہو ترنگ'' ۱۹۴۴ء میں دوسرا ''آفتاب تازہ'' ۱۹۵۲ء میں تیسرا ''اوراق مصور'' ۱۹۶۳ء میں اور چوتھا، ''بیاض مریم'' ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئے، چوتھے مجموعہ کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ انہی کے لکھے ہوئے مسودے کا عکس لے کر مکتبہ جامعہ نے شائع کیا ہے، ان کو نظم اور غزل دونوں اصناف سخن یکساں ماہرانہ قدرت حاصل تھی، نظموں میں اگر فکر دل کا حسین امتزاج، متنوع اور اثر انگیزی ملے گی تو غزلوں میں کلاسیکی رنگ و آہنگ کی دلکشی اور تازگی پائی جاتی ہے۔

وہ اورنگ آباد سے تعلق رکھتے ہیں، اورنگ آباد کے دو نامور غزل گو شاعر ولی اور سراج ہیں، ان کی نسبت فرماتے ہیں:

دس برس میں وجد، سراج و ولی کے بعد　　اٹھے ہیں جھومتے ہوئے خاک دکن سے ہم

جو تغزل اور روحانی کیف ان قدیم غزل گو شعراء کے یہاں پایا جاتا ہے، وہ وجد کے کلام میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے، بلکہ رنگ و آہنگ میں ان سے کہیں زیادہ لطافت اور شیرینی سے معمور ہے۔

مرحوم نہایت پرگو ہونے کے علاوہ باوقار، بلند نظر اور ہر دل عزیز انسان بھی تھے، تہذیب و شرافت، حسن اخلاق اور مشرقی وضعداری کے نمونہ تھے، جن لوگوں کو ان سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ ان کے شیوہ گفتار ہی کے نہیں بلکہ حسن کردار سے بھی متاثر ہوئے ہیں، ان کی صحبت میں بیٹھ کر ادب اور شاعری کے نکات کے ساتھ فارسی شعراء کی نازک خیالیوں کے بہت سے گوشوں کی سیر ہوجاتی، وجدان صحیح اور ذوق سلیم سے پوری طرح بہرہ ور تھے، اس لئے کبھی کبھی ان کی پاکیزہ ظرافت سے محفل احباب زعفران زار ہوجاتی، وہ دل درد آشنا بھی رکھتے تھے، اور دیدہ بینا بھی ان کے پاس زبان خوشنوا بھی تھی اور طرز دلربا بھی، ان کے اٹھ جانے سے اردو ادب کو عظیم نقصان پہنچا، اردو شاعری کی ایک دلکش آواز خاموش ہوگئی۔ ان ہی کا شعر ہے:

جانے والے کبھی نہیں آتے　　جانے والوں کی یاد آتی ہے

وہ اب دنیا میں نہیں رہے لیکن ارباب ذوق جب بھی ان کا کلام پڑھیں گے وہ برابر یاد آتے رہیں گے، وہ اردو کے ان شعراء میں تھے، جو اپنی انفرادیت رکھتے ہیں، ان کے کلام میں جو کیف و مستی، سوز و گداز اور بانکپن ہے، وہ دامن دل کو کھینچتے رہیں گے۔

(جولائی ۱۹۸۳ء)

طیب، محمد، مولانا قاری

آہ! مولانا قاری محمد طیب

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ذکریاؒ کی وفات کا غم ابھی فراموش نہ ہوا تھا کہ ایک اور آفتاب علم و ہدایت غروب ہوگیا، یعنی مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے ۱۷/ جولائی ۱۹۸۳ء کو اس جہانِ فانی کو الوداع کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ ممتاز عالم دین تھے، ان کی شہرت سے یہ برصغیر ہی نہیں، پوری اسلامی دنیا گونج رہی تھی، ان کی وفات سے ہماری ملی، دینی، علمی اور تعلیمی عمارت کا بہت بڑا ستون گر گیا، اور جماعت دیوبند کی ایک قدیم اور اہم یادگار مٹ گئی، وہ اس قافلہ کے آخری مسافر تھے جس آغاز خاندان ولی اللّٰہی سے ہوکر حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے خلفاء اور دارالعلوم دیوبند کے اکابر تک پہنچا تھا، افسوس اب علم و عرفان کی وہ شمع گل ہوگئی جس سے دارالعلوم نصف صدی سے جگمگا رہا تھا، والبقاء للہ وحدہ۔

وہ دارالعلوم کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پوتے اور مولانا حافظ محمد احمدؒ کے صاحبزادے تھے، جو دارالعلوم دیوبند کے پانچویں مہتمم اور چار برس تک ریاست حیدرآباد دکن کی عدالت عالیہ کے مفتی تھے، قاری صاحب کی پرورش و پرداخت اسی مقدس خانوادہ اور دارالعلوم کے اس عہد زریں میں ہوئی، جو علمی، تعلیمی، دینی اور روحانی حیثیت سے بے مثال تھا، اور جب اس کا آسمانِ علم و کمال متعدد مہر و ماہ سے جلوہ فگن تھا، ان کی ولادت ۱۳۱۵ھ/ ۱۸۹۷ء میں ہوئی، تاریخی نام مظفر الدین تھا، سات برس کی عمر میں دارالعلوم میں داخل کئے گئے، شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور دوسرے نامور فضلاء کی موجودگی میں مکتب نشینی اور بسم اللہ کی تقریب عمل میں آئی، دو ہی برس میں قرآن مجید تجوید و قرات کے ساتھ حفظ کرلیا، پانچ برس درجہ فارسی میں رہے، اس کے بعد عربی شروع کی، آٹھ برس میں درسیات سے فارغ ہوکر ۱۳۳۷ھ/ ۱۹۱۸ء میں دارالعلوم سے سند فضیلت حاصل کی، اور وہیں مسند درس پر متمکن ہوگئے، جس کا سلسلہ آخر تک جاری رہا، تفسیر و حدیث اور علم اسرار الدین کی کتابیں خصوصاً حجۃ اللہ البالغہ ہمیشہ ان کے زیر درس رہتیں، بزرگوں کی جوہر شناسی سے ۱۳۴۳ھ میں دارالعلوم کے نائب مہتمم اور چند ہی برس بعد مہتمم بنادیئے گئے، جس کے وہ پوری طرح اہل ثابت ہوئے۔

مولانا محمد طیب صاحب تقریباً ساٹھ برس تک دارالعلوم کے مہتمم رہے، اس طویل مدت میں بڑے نازک دور آئے، مگر انہوں نے دارالعلوم کو ہر خطرہ سے بچایا اور اس پر کوئی آنچ نہ آنے دی، ان کے دور میں اس کی شہرت و عظمت میں چار چاند لگ

گئے، اور وہ ترقی کے بام عروج پر پہنچ گیا، انہوں نے اس کا آوازہ شہرت پوری دنیائے اسلام اور ایشیا، یورپ، امریکہ اور افریقہ کے ملکوں تک پہنچا دیا، وہ دارالعلوم کے مقصد و مسلک کی اشاعت اور دین کی تبلیغ کے لیے برابر سفر کرتے رہتے تھے، اس کی وجہ سے دارالعلوم کا حلقہ اثر بہت وسیع ہوگیا، اور ہر جگہ کے خواص تو درکنار عوام بھی اس سے اچھی طرح روشناس ہوگئے، اور وہ ایک عالمگیر اور بین الاقوامی ادارہ بن گیا، اسے جامع ازہر پر بھی اس حیثیت سے برتری حاصل ہے کہ حکومت کی اعانت اور سرپرستی کے بغیر محض توکل علی اللہ اور مسلمانوں کے عام چندے سے چل رہا ہے۔

تقریر و تحریر کا اچھا ملکہ تھا، بڑے خوش بیان واعظ تھے اور اس میں ان کا طوطی بولتا تھا، پورے ملک میں ان کی خطابت کی دھوم تھی، اس کے لیے بیرون ملک سے بھی دعوت نامے آتے، وہاں بھی ان کی تقریریں پسند کی جاتی تھیں، دو دو تین تین گھنٹے تک انشراح و نشاط کے ساتھ مسلسل تقریر کرتے اور بات میں بات پیدا کرکے پورا سماں باندھ دیتے، دقیق موضوع پر بھی بولتے تو ان کا نکتہ آفریں دماغ اور مواج ذہن معلومات کا دریا بہادیتا، تقریریں اتنی موثر اور دل پذیر ہوتیں کہ سننے والے کو کوئی اکتاہٹ اور گھبراہٹ نہ ہوتی، حقائق و اسرار کا بند قُفل کھول دینے اور مشکل مضامین کی تفہیم پر بڑی قدرت تھی، اس حیثیت سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی مقبول تھے، وہ بھی ان کے حکیمانہ و متکلمانہ اسلوب سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، ان کی تصنیفات میں بھی یہی رنگ غالب تھا، جو جدید طبقہ کے شکوک و شبہات کا ازالہ کردیتا، تحریر کی مشق بھی طالب علمی ہی کے زمانہ میں ہوگئی تھی، ابتدا میں "القاسم" میں مضامین لکھتے، عموماً تصنیف و تالیف اور مقالہ نگاری کا کام دوران سفر میں انجام دیتے، وہ شاعر بھی تھے، مگر ان کے شاعرانہ کمال پر پردہ پڑا رہا، "عرفان عارف" کے نام سے ان کے کلام کا ایک مجموعہ بھی چھپا تھا۔

وہ پہلے شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ سے بیعت ہوئے، مگر چند ماہ بعد ہی ان کا انتقال ہوگیا، تو وقت کے نامور شیخ طریقت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے متوسل ہوگئے، اور ۱۳۵۰ھ میں ان سے خلافت بھی پائی، ان کے سرچشمہ فیض سے بھی ہزاروں تشنگانِ معرفت سیراب ہوئے۔

نام کی طرح شکل و صورت اور سیرت و کردار کے بھی طیب تھے، ظاہری نفاست اور حسن و جمال کے ساتھ پاک دل اور پاک طینت بھی تھے، ان کے مخالف بھی ان کی نیکی، شرافت، تحمل، نرم خوئی اور عفو و حلم کے معترف تھے، اپنے خلق عظیم اور لطف عمیم کی وجہ سے ہر مسلک کے لوگوں میں مقبول تھے، اور ان کی ذات اختلافات سے بالاتر سمجھی جاتی تھی چنانچہ ابتدا ہی سے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے متفق علیہ صدر رہے۔

مولانا قاری طیب اور دارالعلوم دیوبند ایک ہی اسم کے دو مسمّٰی تھے، مگر زندگی کے آخری دنوں میں انہیں دارالعلوم کی جدائی کا صدمہ اٹھانا پڑا، وفات سے دو ماہ پہلے بستر علالت سے لکھے ہوئے ایک خط میں دارالعلوم کے لیے اپنی تڑپ، بے قراری اور تشویش کا اس طرح اظہار فرماتے ہیں: "نہ اپنی ذات کا غم ہے نہ اپنے عزیزوں کا غم بلکہ غم دارالعلوم کا ہے، جماعت جو ۱۱۶ برس تک اوروں کے لیے ہدایت، تقویٰ اور توحید کی علامت تھی بکھر کر رہ گئی ہے، یہی میرے بیماری ہے، زندگی کی آخری آرزو اور آخری دعا یہ ہے کہ دارالعلوم کا پہلا رنگ جس میں روحانیت تھی، خلوص تھا اور سب ایک تھے اور فیصلے ایک رائے سے ہوتے تھے پھر بحال ہوجائے"۔ کاش ان کی دعا قبول ہوتی اور وہ یہ حسرت لیکر دنیا سے نہ جاتے، دارالعلوم اور مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی سب سے قیمتی متاع ہیں جن سے وہ فقیری میں بھی امیر ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ انہی کی ناعاقبت اندیشی ان دونوں کی تباہی کا موجب بن جائے۔

بارالہا! دین اور علم دین کے خادم، شریعت و طریقت کے محرم، علوم و معارفِ قاسمی کے امین اور مسلکِ دیوبند کے شارح و ترجمان کی تربت کو اپنے انوارِ رحمت سے منور اور جنت الفردوس کے پھولوں سے معطر فرما۔ اللّٰھمّ صبّ علیہ شآبیب رَحمتکَ وَرضوانکَ یا اَرحمَ الراحمین۔ ("ض"، اگست ۱۹۸۳ء)

حارث، معین الدین

معین الدین حارث

(سید شہاب الدین دسنوی)

۳۱/ جولائی ۱۹۸۳ء کو ممبئی میں معین الدین حارث کا انتقال ہوگیا۔ ان کا ماتم سیاسی، تعلیمی اور سماجی حلقوں میں منایا گیا۔ دلی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی درسگاہیں بند ہوگئیں۔ شریف آف ممبئی نے شہریوں کی جانب سے تعزیتی جلسہ طلب کیا۔ سابق وزیر اعظم مرارجی ڈیسائی، اشوک مہتا، ایس۔ پی۔ گودریج، پروفیسر مدھو ڈنڈوتے، میر آف ممبئی اور دوسرے مقررین نے خارج عقیدت پیش کیا۔ ممبئی میونسپل کارپوریشن اور کئی دوسرے اداروں نے تعزیتی قرارداد منظور کرکے اپنے اجلاس ملتوی کردیے۔ جہاں تک انجمن اسلام کا تعلق ہے (جس کے حارث صاحب کئی سال سے صدر ہوتے چلے آرہے تھے) اس پر تو گویا یتیمی چھاگئی۔ یہ سب کچھ ایک ایسے آدمی کے لیے ہوا۔ جس نے زندگی بھر دوسروں کو دیا۔ خود کچھ نہیں لیا۔

معین الدین حارث ممبئی کے مضافاتی علاقہ نالا سُپارہ کے رہنے والے تھے، جہاں کوکنی مسلمانوں کی اچھی خاصی آبادی ہے۔ بچپن سے سیاسی تحریک سے دلچسپی رہی سرکاری اسکول کی تعلیم ترک کرکے قوم کی طرف سے کھولے گئے اسکول میں داخل ہوئے اور جب جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوئی تو وہاں چلے گئے اور ۱۹۲۷ء میں بی، اے

کیا۔خوش قسمتی سے انھیں مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر سید عابد حسین، مولانا، اسلم جیراجپوری، مولانا سواتی، خواجہ عبدالحئی فاروقی اور کیلاٹ صاحب جیسے مخلص، بلند کردار اور علم وفضل کے درخشندہ ستارے استاد ملے، جن کی تعلیم اور اعلیٰ اخلاق کا رنگ ان پر ایسا چڑھا کہ تادم حیات قائم رہا۔

بی۔اے کر لینے کے بعد حارث صاحب نے ممبئی میں اجمل پریس قائم کیا اور روزنامہ اجمل جاری کیا جو سالہا سال ان کی ادارت میں چلتا رہا۔

ممبئی میں میونسپل کارپوریشن لیجسلیٹو کونسل، مرکزی حج کمیٹی، ممبئی یونیورسٹی کی سینٹ اور کئی دوسرے اہم اداروں کے رکن رہے اور ان کے جلسوں میں پابندی سے حصہ لیتے رہے۔ وہ ان کاموں کو عبادت سمجھ کر کرتے تھے۔

حارث صاحب کو دارالمصنفین سے قلبی لگاؤ تھا۔ یہاں کے کاموں کی وہ بڑی قدر کرتے تھے، ۱۹۷۲ء میں دارالمصنفین کی مجلس منتظمہ کا جلسہ ممبئی میں منعقد ہوا تھا، اُن دونوں دارالمصنفین کی مالی پوزیشن کافی کمزور ہوگئی تھی۔ لیکن یہ گوارانہ تھا کہ اہل ثروت کے سامنے دست سوال پھیلایا جائے۔ اس کے بجائے یہ طے پایا کہ ادارے کے دستور کے مطابق اس کے قدردانوں سے ایک ہزار روپے لے کر ان کو رکن دوامی بننے کی ترغیب دی جائے، تاکہ کچھ رقم یکمشت جمع ہوسکے اور رسالہ معارف اور یہاں کی مطبوعات ان ارکان کو تاحیات ملتی رہیں۔ مجلس منتظمہ کے اجلاس کے دوسرے دن دارالمصنفین سے آئے ہوئے مہمانوں کو لنچ کی دعوت دی گئی، اس میں شہر ممبئی کے اہل علم اور دانشور بھی موجود تھے، راقم نے اپنی تقریر میں رکن دوامی کی تجویز اور دارالمصنفین کی ضرورتوں پر روشنی ڈالی۔ اپیل پر لبیک کہنے والوں میں معین الدین حارث پیش پیش تھے۔ اور اس طرح دارالمصنفین ایک دشوار گذار موڑ سے نکل آیا۔

حارث صاحب نے اپنی ساری زندگی ملک وملت کی خدمت میں صرف کی، ان کی سادگی اور زندگی کے علائق سے بے نیازی، حیرت انگیز درجے تک پہنچی ہوئی تھی۔

وہ اردو، انگریزی، مراٹھی اور گجراتی زبانوں میں بڑی روانی سے تقریر کرتے جوش اور ولولے کے ساتھ وہ اپنے اعلیٰ خیالات اور افکار سے سامعین کو متاثر کرتے تھے۔

حارث صاحب بے باک صحافی اور نڈر سیاسی مجاہد تھے، جو اپنی صاف گوئی کو مصلحت کے پردے میں چھپانا نہیں جانتے تھے بچپن سے قومی تحریکوں سے منسلک رہے۔ کانگریس، خلافت سوشلسٹ پارٹی۔ پی۔ ایس۔ پی ان سب میں ان کا کردار پر وقار رہا۔ عمر کے آخری حصے میں علمی سیاست سے کنارہ کش ہوگئے تھے اور اپنا سارا وقت تعلیمی اور سماجی خدمتوں میں صرف کرتے رہے۔

ان کی موت بھی کچھ غیر معمولی طور پر واقع ہوئی۔ ایک دوست کے گھر کسی تقریب میں شریک ہوئے، وہاں احباب اور عزیزوں کے ساتھ ہنستے بولتے رہے، تھوڑی تھکان محسوس ہوئی تو کمرے میں جا کر لیٹ رہے۔ مغرب کی نماز کے لیے لوگ انھیں اُٹھانے گئے تو وہ اپنے معبود حقیقی کے پاس پہنچ چکے تھے۔ (اگست ۱۹۸۳ء)

انصاری، سعید، ڈاکٹر

ڈاکٹر سعید انصاری

افسوس ہے کہ ۲۶/جنوری کو ڈاکٹر سعید انصاری کا دہلی میں کینسر کے موذی مرض میں انتقال ہوگیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، وہ دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے قدیم رکن تھے۔ ("ص۔ع"، فروری ۱۹۸۴ء)

ڈاکٹر سعید انصاری

قارئین معارف کو گزشتہ شمارہ سے جناب سعید انصاری کے انتقال کی خبر معلوم ہوچکی ہے، ان کا وطن اعظم گڑھ ہی تھا، اپنے محلّہ اور شہر کے قدیم مدرسہ اسلامیہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے مشن اسکول میں داخلہ لیا، یہ بڑا پرآشوب دور تھا، ملک کے گوشہ گوشہ میں خلافت، اور ترک موالات کی تحریک کے اثر سے انگریزوں کے خلاف ہیجان برپا تھا۔

تحریک کے پروگرام میں سرکاری اسکولوں اور کالجوں کا مقاطعہ بھی تھا، سعید انصاری صاحب نے اس سے متاثر ہوکر اسکول چھوڑ دیا اور بنارس جا کر کاشی ودیا پیٹھ سے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کیا، انٹرمیڈیٹ میں بارہ روپے ماہوار وظیفہ ملا مگر جامعہ اسلامیہ کی کشش انھیں علی گڑھ کھینچ لائی، ۱۹۲۴ء میں وہ طلبہ کی انجمن اتحاد کے سکریٹری اور ان کے ہم سبق ڈاکٹر یوسف حسین خان مرحوم نائب صدر ہوئے، ۱۹۲۵ء میں بی۔اے کیا اور ۱۹۲۶ء میں جامعہ میں استاد کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا، اس زمانہ میں اس کی مالی حالت نہایت خراب تھی، کئی کئی مہینے تک استادوں کو تنخواہیں نہیں ملتی تھیں، جامعہ کے امنا (ٹرسٹیز) اسے بند کردینے کے لئے آمادہ ہوگئے تھے مگر انجمن تعلیم ملی کے ارکان نے بیس برس تک جامعہ کی خدمت کرتے رہنے اور ڈیڑھ سو سے زیادہ مشاہرہ نہ لینے کا عہد کیا تھا، ابتداء میں گیارہ استاد اس کے حیاتی رکن تھے جن میں سعید انصاری مرحوم بھی تھے۔

وہ اپنی علمی وتعلیمی استعداد بڑھانے کے لئے پہلے شانتی نکیتن گئے، پھر ۱۹۳۴ء میں امریکہ گئے اور کولمبیا یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی، ان کی واپسی کے بعد جامعہ میں ٹریننگ کالج (استادوں کا) قائم ہو، جس کے یہ پرنسپل مقرر کئے گئے، انھوں نے اپنی سوجھ بوجھ اور کفایت شعاری سے اس مدرسہ کو خود کفیل بنادیا تھا۔

ہری پور کانگریس کے سالانہ اجلاس میں گاندھی جی اور ذاکر صاحب کی "قومی

بنیادی تعلیم'' کی اسکیم منظور ہوئی تو اسے جامعہ کے استادوں کے مدرسہ میں رائج کیا گیا، سعید انصاری صاحب نے اسکیم کو چلانے اور کامیاب بنانے میں سرگرم حصہ لیا، ذاکر صاحب نے ثانوی مدرسہ کے لئے انفرادی طریقۂ تعلیم رائج کرنے کی تجویز سوچی تو ان کی تعلیمی مہارت اور دلچسپی کی وجہ سے یہ کام بھی انہی کے ذمہ کیا، جس کو انھوں نے محنت، کامیابی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

تصنیف و تالیف سے بھی انہیں دلچسپی تھی، جامعہ میں اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا تو وہ رفیق کی حیثیت سے اس سے وابستہ ہوئے، طالب علمی کے زمانہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کے چھوٹے بھائی محمود حسین خان صاحب کے اشتراک سے ایک علمی رسالہ ''الرشید'' کے نام سے نکالا بعد میں انھوں نے اس کا نام بدل کر مولانا محمد علی کے تخلص کی نسبت سے ''جوہر'' کردیا، اپریل ۱۹۲۶ء میں ''پیام تعلیم'' کا اجرا ہوا، چند ماہ بعد اس کی ادارت سعید انصاری صاحب کو تفویض کی گئی، کچھ دنوں تک مولانا محمد علی کے روزنامہ ہمدرد کے ادارۂ تحریر میں شریک رہے، ابتدا میں معارف کے لئے بھی انھوں نے بعض انگریزی مضامین کے ترجمے کئے، رسالہ جامعہ کے تو وہ خاص مضمون نگار تھے، الناظر (لکھنؤ) میں بھی ان کے مضامین شائع ہوئے بلکہ اسی کے ایک مضمون سے ان کی علمی شہرت کا آغاز ہوا، اس کے اڈیٹر مولانا ظفر الملک علوی نے اردو کے عناصر اربعہ پر ایک کل ہند انعامی مقابلہ کا اعلان کیا، جس میں مختلف اہل قلم نے حصہ لیا، یہ اس وقت بی۔اے کے طالب علم تھے مگر ان کا مضمون ''مولانا شبلی اردو کے بہترین انشا پرداز'' انعام کا مستحق قرار دیا گیا جو رسالہ میں چھپنے کے علاوہ اسی زمانہ میں کتابی صورت میں مولانا عبدالماجد کے دیباچہ کے ساتھ بھی شائع ہوا۔

ان کا اصلی موضوع تعلیم اور اس کی تاریخ تھا، اس پر اور بچوں کے موضوعات پر انھوں نے کئی کتابیں لکھیں، جن کے نام یہ ہیں اور (۱) بچوں کی نظمیں (۲) بچوں کے اسماعیل (۳) بھولا بچہ (۴) ایک بچہ کی کہانی (۵) تعلیم و سماج (۶) ہندوستانی تعلیم کے مسائل (۷) زندگی کا رخ (۸) اکابر تعلیم (۹) گاندھی جی کے تعلیمی خیالات۔

طالب علمی کے زمانہ میں انھوں نے ٹیگور کے ایک رسالہ کا ہندوستانی تعلیم کا مرکز کے نام سے اردو ترجمہ کیا پھر جان اسٹوورٹ مل کی کتاب لبرٹی کا آزادی کے نام سے ترجمہ شائع کیا، حال میں ترقی اردو بورڈ نے ان سے دو کتابوں کے ترجمے کرائے ایک ''تعلیم ہندوستان کے اسلامی عہد میں'' اور دوسری ''عصری تعلیم''۔

دارالمصنفین سے ان کا تعلق بہت پرانا ہے، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی کے زمانے سے اب تک کے ہر ہر فرد سے حسب حیثیت ان کے تعلقات تھے، وہ جب بھی وطن آتے تو دارالمصنفین ضرور آتے، اس معمول میں زندگی بھر کوئی فرق نہیں آنے دیا، حضرت سید صاحب کے دور ہی میں وہ اس کی مجلس انتظامیہ کے ممبر ہوگئے تھے اور پابندی سے اس کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے، ندوۃ العلماء سے بھی انہوں نے ہمیشہ اخلاص و ہمدردی کا تعلق قائم رکھا اور اس کی مجلس انتظامیہ کے بھی ممبر تھے۔

وہ ہمیشہ قوم پرور اور ملک کی آزادی کی تحریک سے وابستہ رہے، ان کی ابتدا خلافت اور نان کوآپریشن تحریک سے ہوئی تھی، اسی زمانہ سے کھدر پہننے لگے تھے، جسے آخری تک نہ چھوڑا۔

دین و مذہب سے غیر معمولی شغف تھا انھیں موجودہ جامعہ سے یہ شکایت تھی کہ وہ اپنی اصل خصوصیات اور دینی کردار سے منحرف ہوگئی ہے، آخر عمر میں انھوں نے جامعہ کی خوبصورت مسجد تعمیر کرائی اور اپنے مکان میں ایک نرسری اسکول کھولا، ان صدقات جاریہ کا ثواب انھیں ہمیشہ ملتا رہے گا۔

بڑے سادگی پسند اور کفایت شعار تھے، ان میں نمود، نمائش اور ظاہر داری نہ تھی، ان کی نظر لوگوں کی خامیوں پر زیادہ پڑتی تھی، اور اس کا وہ صفائی اور بے تکلفی سے اظہار بھی کردیتے تھے، جو لوگ ان کی افتاد طبع سے واقف نہ تھے وہ ان کی فقرے بازی کا برا مان جاتے مگر انہیں کینہ کپٹ نہ تھا، وہ ہمیشہ صحتمند رہے اور بیمار بہت کم ہوئے، ۸۰ برس سے متجاوز ہونے کے باوجود ضعف اور بڑھاپے کا کوئی اثر ظاہر نہ ہوتا تھا مگر دفعتہً معلوم ہوا کہ ان کی آنتوں میں کینسر ہوگیا ہے، بیماری کے زمانہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب سے ملنے کے بہت آرزومند تھے، مولانا سے تو ملاقات ہوگئی مگر سید صباح الدین صاحب سے ملاقات کی تمنا پوری نہیں ہوسکی، انھوں نے قابل رشک موت پائی، دو ماہ تک مرض کی شدتوں کا صبر سے مقابلہ کرنے کے بعد خندہ روئی سے موت کا خیر مقدم کیا:

نشانِ مرد مومن باتو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس نصیب کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ (''ض''، مارچ ۱۹۸۴ء)

احمد، کلیم الدین، پروفیسر

پروفیسر کلیم الدین احمد مرحوم

(عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی)

گزشتہ سال کے آخر میں اردو دنیا کو جس حادثۂ فاجعہ سے دو چار ہونا پڑا وہ مشہور نقاد پروفیسر کلیم الدین احمد کا انتقال پر ملال ہے، ان کی شخصیت ایک جلوہ صدرنگ تھی، وہ پروفیسر بھی رہے اور اڈمنسٹر بھی ناقد بھی تھے اور ماہر تعلیم بھی، محقق بھی تھے اور

شاعر بھی اور ان سب سے بلند ایک شریف انسان بھی۔

ان کی شخصیت میں جہاں گوناگوں صلاحیتیں جمع ہوگئی تھیں وہاں وہ بڑی متنازعہ فیہ بھی رہی، ان کی رایوں سے اختلاف بھی ہوا اور اتفاق بھی، اردو شعر و ادب کے ایوان میں ان کی آواز سب سے جداگانہ اور منفرد تھی، ان کی تحریریں کچھ ایسی انتہاپسندانہ اور سخت تھیں کہ ایک بڑا طبقہ ان سے ناراض ہوگیا، مگر ان کی رایوں سے اختلاف کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کے قلم سے اردو کے سرمایہ میں اضافہ ہوا اور تاریخ ادب اردو میں اپنا ایک خاص مقام بناگئے، جس کی وجہ سے وہ کبھی فراموش نہیں کئے جاسکتے۔

کلیم الدین احمد ۱۹۰۸ء میں پٹنہ کے ایک علمی و دینی گھرانے میں پیدا ہوئے، ان کے والد ڈاکٹر عظیم الدین احمد عربی و فارسی کے فاضل اور پٹنہ یونیورسٹی میں صدر شعبہ تھے۔ ان کے پرنانا حکیم عبدالحمید پریشاںؔ نہ صرف اعلیٰ درجہ کے طبیب، علامۂ وقت بلکہ اردو، فارسی، عربی کے ممتاز و قادر الکلام شاعر تھے، یہ حکیم عبدالحمید وہ بزرگ تھے جن کے والد مولانا احمد اللہ صادقپوری ممتاز اہلحدیث عالم اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک سے وابستہ تھے، مجاہدین کے خلاف جو مقدمہ قائم ہوا، اس میں انھیں بھی حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا ملی تھی اور جزیرہ انڈمان میں انھوں نے وفات پائی، ان کی ساری جائداد بھی ضبط کر لی گئی تھی۔

کلیم الدین احمد بچپن ہی سے پڑھنے لکھنے کے شوقین تھے اور اسی شوق نے ان کو تنہائی پسند اور گوشہ نشین بنادیا دیا تھا، ان میں ذہانت خداداد تھی اور وہ خود نہایت محنتی طالب علم بھی رہے، بی۔اے آنرز اور ایم۔اے دونوں میں فرسٹ کلاس اور فرسٹ پوزیشن حاصل کی، جس کی وجہ سے ان کو اعلیٰ تعلیم کے لئے سرکاری وظیفہ ملا، اور تعلیم کے لئے انگلستان گئے اور کیمبرج یونیورسٹی سے انھوں نے انگریزی ادب اور فرانسیسی زبان و ادب میں اعزاز حاصل کیا۔ ۱۹۳۳ء میں انگلستان سے واپسی پر پٹنہ کالج میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے، اپنے عمدہ اوصاف، محنت اور اعلیٰ قابلیت سے اپنے شعبہ میں سارے اعلیٰ مدارج طے کر لئے اور شعبہ انگریزی کے صدر بھی ہوئے۔ اپنی علمی و تعلیمی دلچسپی کی وجہ سے بہار سکنڈری اگزامینیشن بورڈ کے چیرمین بھی رہے۔ پٹنہ یونیورسٹی کی تشکیل کے بعد فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین منتخب ہوئے، پھر پٹنہ کالج کے پرنسپل ہوئے، کچھ دنوں بھاگلپور یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے اور آخر میں حکومت بہار کے ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن یعنی ناظم تعلیمات کے عہدہ پر فائز ہوکر سبکدوش ہوئے، وہ جس عہدے پر بھی رہے، ان کے کاموں کا ریکارڈ قابل قدر اور شاندار رہا۔ ان کی کامیابی کا راز ان کی معاملہ فہمی، منصف مزاجی اور دوسروں پر اعتماد کرنے کی عادت تھی، وہ دوسروں کے تجربے، محنت اور ایمانداری کی قدر کرتے اور ان کی عمدہ کارکردگی کی جی کھول کر حوصلہ افزائی کرتے، ہر معاملے میں بے لاگ اور غیر جانبدار طرز عمل اختیار کرتے، زبان سے کم بولنے کے باوجود ترقی کے تمام منصوبوں کو کامیابی کے ساتھ علمی جامہ پہناتے، اپنی علمی صلاحیت، پڑھانے کی استعداد، ہوشمندانہ طرز عمل اور قوت تحریر سے طلبہ اور پروفیسروں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

ان کی بڑی خوبی تھی انتھک محنت اور مسلسل گھنٹوں کام کرنا۔ وہ پڑھے لکھے بے روزگار لوگوں کی مدد کے لئے ہمیشہ تیار رہتے اور انھیں اخلاقی مدد پہنچاتے، وہ نیک، شریف اور بامروت انسان تھے، ان کی ان خوبیوں کے ان کے مخالف بھی معترف تھے اور اس کا برابر ذکر کرتے رہتے تھے۔

ان کی دلچسپی زیادہ تر مغربی ادبیات سے رہی، وہ انگریزی زبان میں بھی لکھتے تھے، ایک کتاب انگریزی میں بھی ہے، وہ اردو کی دنیا میں اچانک وارد ہوئے، جس سے ہلچل مچ گئی، ۱۹۳۱ء میں اپنے والد ڈاکٹر عظیم الدین احمد کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کو جمع کر کے ایک مجموعہ ''نغمۂ گل'' کے نام سے شائع کیا، ۱۹۴۰ء میں جدید اصول تنقید کے مطابق ''اردو شاعری پر ایک نظر'' کے نام سے اپنی کتاب شائع کی، جس سے ادبی حلقوں میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ اس کتاب میں انھوں نے مغرب کی عینک سے اردو شاعری کو دیکھنے کی کوشش کی اور مغربی اصول تنقید کے معیار پر مشرقی ادب کو جانچنے کی سعی فرمائی، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود اور ان کی کتاب بھی ہدفِ ملامت بن گئی۔ ۱۹۴۱ء میں دائرہ ادب کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم کی اور رسالہ ''معاصر'' جاری کیا۔ دائرہ کے صدر اور رسالہ کے ایڈیٹر ان کے والد ڈاکٹر عظیم الدین احمد بنائے گئے۔ کلیم الدین مرحوم معاصر کے لئے مسلسل مضامین لکھتے رہے، سترہ اٹھارہ سال میں انھوں نے جو مضامین لکھے، ان ہی کے مجموعے ''اردو کی تنقید پر ایک نظر''، ''سخن ہائے گفتنی''، ''عملی تنقید'' اور ''فن داستان گوئی'' وغیرہ کے نام سے شائع ہوئے، انھوں نے تحقیق کی طرف بھی توجہ کی، ان کا تحقیقی شوق اتنا بڑھا کہ اردو کے تقریباً سارے مطبوعہ تذکرے جمع کر لئے اور غیر مطبوعہ کی نقلیں حاصل کرلیں۔ انھوں نے پٹنہ کالج لائبریری میں مخطوطات و نایاب کتابوں کا شعبہ قائم کیا۔ تذکرہ شورش، تذکرہ عشقی، دیوان جہان، تذکرہ عمدہ منتخبہ، تذکرہ عیار الشعراء اور مجمع الانتخاب خود اپنے ہاتھ سے نقل کئے، ان میں بعض شائع بھی ہوگئے، وہ شاعر بھی تھے، اور ان کی نظموں کے دو مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ انسان کی شخصیت اس کے کمالات کے ساتھ اس کی کمزوریوں سے بھی نمایاں ہوتی ہے، یہ بات بڑی حد تک پروفیسر کلیم الدین احمد کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے ان کی تصانیف اور مضامین کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بعض جگہ نہ اردو شاعری کے ساتھ انصاف کرسکے ہیں اور نہ اردو کے تنقیدی سرمایہ سے۔ وہ بلاشبہ کثیر المطالعہ اور بڑے باصلاحیت انسان تھے لیکن غلو، انتہاپسندی اور عدم توازن نے ان کی کتابوں کے وزن کو کم کردیا ہے، وہ جہاں تنقید کے گہرے مسائل سے بحث کرتے

ہیں اورحسن وقبح کے اعلیٰ معیار کو سامنے رکھتے ہیں، وہاں مشرق کے مزاج، ماحول، فضا اوراس کے تدریجی تسلسل کونظر انداز کر جاتے ہیں، ان پر مغربی ادب کا رعب اس قدر طاری ہے کہ اسی معیار پر مشرقی ادب کو بھی جانچنے لگتے ہیں، جس کی وجہ سے مشرقی تہذیب، روایات اوراس کی خصوصیات ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوجاتی ہیں، ان کا یہ فیصلہ کہ ''غزل ایک نیم وحشی صنف سخن ہے''، حد درجہ مضحکہ خیز ہے، ان کے نزدیک میر، سودا، غالب، مومن اس لئے اعلیٰ درجہ کے شاعر نہ تھے کہ وہ مغربی ادبیات سے واقف نہ تھے، اقبال کی اعلیٰ درجہ کی نظمیں بھی ان کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتیں، انھوں نے ''اردو شاعری پر تنقید'' میں جس طرح اردو کے شعری کارناموں پر بحث کی ہے، اس سے شعری سرمایہ بے وزن ہوکر رہ جاتا ہے۔

کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب ''اردو تنقید پر ایک نظر'' میں لکھا ہے کہ ''اردو میں تنقید کا وجود فرضی ہے، اقلیدس کا خیالی نقطہ اور معشوق کی موہوم کمر ہے''۔ ان کا یہ خیال صحت سے بعید اور حقائق سے چشم پوشی ہے، انھیں اردو کے ہر دور کے ناقدوں میں یہی کمی نظر آتی ہے کہ وہ انگریزی ادب سے ناواقف تھے، انگریزی تنقید کے اصولوں کو سمجھنے سے قاصر تھے اور اردو شاعری کے تجزیہ کے لئے اپنے مشرقی معیار سے باہر نہ جاسکے، ان کی نگاہ میں محمد حسین آزاد، حالی، مولانا شبلی اور مولوی عبدالحق کوئی صحیح معنوں میں نقاد نہ تھا۔ ان کے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا گیا اور بڑی شدت کے ساتھ ان کی مخالفت کی گئی۔

ان کے متعلق ایک کتاب ''حیات کلیم'' شائع ہوئی تو معارف کے صفحات میں اس پر مکمل تنقید کی گئی، اس لئے ہم اس موقع پر مزید کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتے، اگر ان کی تنقیدوں میں توازن اور اعتدال ہوتا تو یقیناً بڑے اعلیٰ درجہ کے نقاد ہوتے اور نہایت احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے، بہرحال اپنی خامیوں کے باوجود انھوں نے اردو کے ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا ہے اور اردو کا حلقہ انھیں کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، آمین۔

(فروری ۱۹۸۴ء)

عبدالودود، قاضی

قاضی عبدالودود

(عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی)

پروفیسر کلیم الدین احمد کے انتقال کے بعد اردو دنیا کو دوسرا بڑا صدمہ مشہور محقق قاضی عبدالودود کی وفات سے پہنچا، قاضی صاحب نے ۲۵؍ جنوری ۱۹۸۴ء کو پٹنہ میڈیکل کالج میں ۸۸ برس کی عمر میں رحلت فرمائی۔ وہ بھی ایک علمی و دینی خاندان کے چشم و چراغ تھے، میر زاہد پر حاشیہ لکھنے والے ملا غلام یحییٰ بہاری آپ کے اجداد میں تھے، ملا غلام یحییٰ کے بیٹے قاضی کمال الحق شعروسخن کا ذوق رکھتے تھے اور ناصرعلی کے پیرو تھے۔ ان کے پوتے قاضی اکرام الحق حضرت سید احمد شہیدؒ کے مریدوں میں تھے، ان کے بھائی واعظ الحق ان علماء میں سے تھے، جو شورش کے زمانہ میں نظر بند کئے گئے، قاضی اسمٰعیل قاضی اکرام الحق کے بیٹے اور موزوں طبع شخص تھے جو اردو اور فارسی دونوں میں شاعری کرتے تھے، ان کے بیٹے قاضی عبدالحمید قاضی عبدالودود کے دادا تھے اور والد قاضی عبدالوحید عالم دین تھے، مگر ان میں تبدیلی آئی اور عقائد میں بریلوی ہوگئے، اس لئے انھوں نے اپنے عقائد و خیالات کی تبلیغ کے لئے ایک ماہانہ رسالہ ''تحفہ'' نکالا تھا، وہ شاعر بھی تھے اور وحید الہ آبادی کی صحبت پائی تھی، ان کا اردو کلام گلدستوں میں ملتا ہے، ان کی وفات ۱۳۲۶ھ میں ہوئی۔

قاضی عبدالودود ۱۸۹۶ء میں پٹنہ کے اندر پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم پرانے طریقہ پر پائی۔ انگریزی شروع کرنے سے پہلے قرآن مجید حفظ کیا، پھر عربی صرف ونحو اور منطق میں متوسطات تک کی کتابیں پڑھیں، اس کے بعد وہ پٹنہ کے محمڈن اسکول میں داخل ہوئے، اس اسکول میں سال ڈیڑھ سال رہنے کے بعد میجر سید حسن بلگرامی ٹیوٹوریل کالج علی گڑھ گئے، وہاں ان میں کتب بینی کا شوق بڑھا۔ بے شمار کتابوں اور رسالوں کو پڑھا۔ پھر پٹنہ واپس آ کر کلکتہ یونیورسٹی کے میٹریکیولیشن میں بیٹھے، اسے پاس کرکے پٹنہ کالج میں داخل ہوئے اور چار برس میں بی اے کرلیا۔ مگر انہی دنوں سیاسی تحریکوں سے دلچسپی پیدا ہوگئی اور تحریک خلافت سے وابستہ ہوگئے، اب تعلیم کا سلسلہ بند ہوگیا اور کانگریس سے بھی تعلق پیدا ہوگیا، جس کے مختلف اجلاس میں سرگرمی کے ساتھ شریک ہوئے پھر کچھ دنوں کے بعد تعلیم کی طرف توجہ ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے مارچ ۱۹۲۳ء میں انگلستان گئے، کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لیا، اقتصادیات اور قانون کی تعلیم حاصل کی، بارایٹ لا ہوئے، لیکن غیر معمولی علمی دلچسپی کی بناء پر بیرسٹری کا پیشہ اختیار نہیں کیا، قدرت کو منظور تھا کہ قانون اور اقتصادیات کے بجائے علمی وادبی تحقیق کے میدان میں ان کا جوہر کمال چمکے، تمام عمر وہ اپنے طبعی رجحان کے مطابق کتب خانوں کی خاک چھانتے رہے، ان کا حافظہ اور قوت یادداشت غیر معمولی تھی، وہ اپنے بے مثال حافظہ کی بدولت تاریخ ادب کے ایسے ایسے حوالے دیتے تھے جو بہتوں کو برسوں کی تلاش وجستجو کے بعد بھی میسر نہیں ہوتے۔ ادب، عروض، قافیہ، تاریخ، تذکرہ اور ان سے متعلق مطبوعات اور مخطوطات سے گہری واقفیت تھی۔

وہ اردو، فارسی، عربی، انگریزی کے علاوہ فرانسیسی اور جرمن بھی جانتے تھے، لیکن ان کو شغف اردو و فارسی ہی سے رہا اور زندگی بھر اس کے نامعلوم گوشوں کی تلاش میں سرگرم عمل رہے، پچھلے پچاس برس کے اندر انھوں نے اردو کے دامن کو مالا مال کیا اور

ادبی تحقیق کے رہ نوردوں کی تربیت کی۔

ان کی کتاب ''عیارستان'' اور ''اثر سوزن'' ان کی علمی بصیرت اور گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہیں، ''دیوان جوشش''، ''دیوان رضا''، ''قطعات دلدار'' کی تدوین میں انھوں نے جس محنت اور کاوش سے کام لیا ہے، اس سے ان کے تحقیقی مرتبے کا اندازہ ہوتا ہے، تذکرہ ابن طوفان متنی تحقیق کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

انھوں نے غالب اور میر سے متعلق جو معلومات ان کی زندگی اور کلام کی صحت کے بارے میں بہم پہنچائی ہیں وہ ہمارے ادب کا قیمتی حصہ ہے، انھوں نے دراصل ادب کے ایسے گوشوں کو روشناس کرایا جو تحقیق کے مستحق تھے، ''جہانِ غالب'' ان کا بڑا اہم کارنامہ ہے۔ ''آوارہ گرد اشعار'' کے بارے میں بڑی نادر معلومات فراہم کی ہیں، قدیم شعراء کے بارے میں ان کی واقفیت بے نظیر تھی۔

ان کے مضامین سے اردو کے مشہور مصنفوں کی غلطیوں کا پتہ چلا۔ ''آب حیات کا تحقیقی جائزہ''، ''میر حیات وشاعری''، ''فائز دہلوی''، ''لکھنو کا دبستان شاعری'' عبدالحق بحیثیت محقق اور ''بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء'' جیسے مضامین میں نکتہ چینی کے ساتھ بہت سی نئی معلومات ملتی ہیں، صداقت وحقیقت بے نقاب ہوکر سامنے آجاتی ہے۔

وہ تحقیق کے سلسلے میں نہ کسی سے مرعوب ہوئے اور نہ اپنی رائے کے اظہار میں رورعایت کی، ہر بات بے لاگ اور دوٹوک طریقے پر کہنے کے عادی تھے اور اسی بناء پر بہت سے لوگ ان سے خوش نہ تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اردو تحقیق کو ترتیب مقدمات اور فکری تنظیم سے آشنا کیا، ان کی خوبی یہ تھی کہ وہ مقدمات اور نتائج میں ایک منطقی ربط وترتیب تلاش کرتے اور جہاں انھیں یہ ربط نہیں ملتا وہاں بے رحمی سے اس بے ربطی کو بے نقاب کردیتے تھے، ان کی تحریروں سے اردو تحقیق کے مبادیات، اصول، ضابطے اور طریق کار کے بارے میں بڑی رہنمائی ملتی ہے، جس سے تحقیقی کام کرنے والوں کو آئندہ بڑی مدد ملے گی، انھوں نے اردو میں تحقیق وتنقید کا معیار ہی بلند نہیں کیا، بلکہ ہر اہل قلم کو زیادہ احتیاط، زیادہ محنت اور زیادہ علمی دیانت داری کی ضرورت کا احساس دلایا ہے، ان کا اردو میں تحقیقی رسالہ ''معیار'' اہم رسالوں میں تھا، ان سے بہتوں کو تحقیق کا سلیقہ آیا۔

قاضی صاحب نثر میں انداز بیان کی وضاحت، منطقی ربط اور سادگی کے قائل تھے، ان کے نزدیک نثر کا حسن سادگی اور وضاحت میں مضمر ہے، جس قدر صاف اور مدلل طریقے پر نثر اپنے مضمون کو ادا کرسکے گی، اسی قدر وہ معیاری کہلانے کی مستحق ہوگی۔

قاضی صاحب نے آزادی سے قبل سیاسی تحریکوں میں عملاً حصہ لیا تھا اور اپنی تعلیمی زندگی کو حب وطن کی خاطر خیرباد کہہ دیا تھا، اس لئے ہندوستان کے مقتدر سیاسی لیڈر انھیں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان سے گہرے مراسم رکھتے تھے، قاضی صاحب نے اپنی خودنوشت کہانی میں اس کا تذکرہ کیا ہے، اردو زبان کے سلسلے میں گاندھی جی، راجندر پرشاد اور مولوی عبدالحق کے درمیان جو تاریخی بات چیت ہوئی اور معاہدہ طے پایا تھا وہ قاضی صاحب کی قیام گاہ پٹنہ میں ہی ہوا تھا، گو اس معاہدے پر عمل نہ ہوسکا لیکن اردو کی تاریخ اسے کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

قاضی صاحب طبعاً حلیم، شریف النفس، وضعدار اور خلیق انسان تھے، مذہبی لحاظ سے ان کے عقائد کے بارے میں لوگ مشکوک رہے، لیکن انھوں نے اپنی تحریروں میں اس کا اظہار نہیں کیا، ان کی شخصیت اس لحاظ سے بڑی اہم تھی کہ انھوں نے زندگی کا بڑا حصہ زبان و ادب کی خدمت میں بسر کیا، ان کے علمی اور تحقیقی کارناموں کی بناء پر حکومت ہند نے پدم شری اور صدر جمہوریہ کے سرٹیفکیٹ سے نوازا، غالب انسٹی ٹیوٹ دلّی نے غالب ایوارڈ دیا اور اردو اکیڈمیوں نے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا، لیکن قاضی صاحب ان سب باتوں سے کہیں بلند تھے، وہ اردو ادب کی تاریخ میں لازوال نقوش چھوڑ گئے ہیں، جو کبھی مٹائے نہیں جاسکتے۔ (فروری ۱۹۸۴ء)

عتیق الرحمٰن، مولانا مفتی

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن

۱۲؍مئی ۸۴ء کو ہندوستان کے نامور عالم مولانا مفتی عتیق الرحمٰن فالج کے موذی مرض میں ایک طویل مدت تک مبتلا رہ کر ۸۴ سال کی عمر میں اس دارفانی سے رحلت گرائے عالمِ جاودانی ہوئے۔

ان کے اس مرض کی المنا کی دارالمصنفین سے بھی بڑی حد تک وابستہ ہے، اس لئے اس ادارہ کے خدام ان کی وفات حسرت آیات سے بہت سوگوار ہیں، فروری ۱۹۸۲ء میں یہاں ''اسلام اور مستشرقین'' پر جو سیمینار ہوا تھا، اس میں وہ شرکت کے لئے تشریف لائے تھے، تین روز یہاں بہت ہنسی خوشی سے گذارے، اس کے ایک اجلاس کی صدارت بھی کی، خوش خوش یہاں سے اور شرکاء کے ساتھ روانہ ہوئے تو ریل ہی میں بارہ بنکی کے پاس ان پر فالج کا سخت حملہ ہوا، ان کے ہم سفر مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور مولانا سجاد حسین نے ان کو کسی طرح لکھنؤ کے ہسپتال میں داخل کیا، ان کی طبیعت کچھ سنبھلی تو پھر دہلی لے جائے گئے، اس وقت سے اپنی وفات تک تقریباً سوا دو سال تک بستر ہی پر رہے، خیال ہوتا ہے کہ وہ دارالمصنفین کا سفر نہ کرتے تو اس موذی مرض میں مبتلا نہ ہوتے، مگر مشیت ایزدی یہی تھی، راقم ان کی عیادت کے لئے کئی بار ان کی خدمت میں حاضر ہوا ان کا جسم تو بیکار ہوچکا تھا، مگر دماغ بیدار رہا، گفتگو میں وہی روانی اور شیرینی ہوتی جو ان کی طبیعت کا مخصوص رنگ تھا، ہر قسم کے مسائل پر گفتگو کرتے، مگر زیادہ تر دارالعلوم دیوبند کے قضیۂ نامرضیہ پر اظہار خیال کرتے، ایسا معلوم

ہوتا کہ وہاں کا المیہ پیش نہ آتا تو اس مرض میں مبتلا نہ ہوتے اور ہوتے بھی تو اتنے دنوں تک بستر علالت پر پڑے نہ رہتے، دارالعلوم دیوبند سے ان کا لگاؤ فطری تھا، کیونکہ ان کے جدامجد مولانا فضل الرحمٰن اس کے بانیوں میں سے تھے۔

ان کی زندگی ان کے گونا گوں مشاغل سے معمور رہی، دارالعلوم دیوبند کے ان علماء میں شمار کئے جاتے جن پر بجاطور سے اس کو فخر ہوسکتا ہے، دیوبند اور ڈابھیل کے مدرسوں میں کچھ دنوں درس و افتاء کی خدمت انجام دی، پھر کلکتہ کی کولوٹولہ اسٹریٹ کی بڑی مسجد کے خطیب رہے، جہاں اپنے درس قرآن سے بھی لوگوں کو مستفیض کیا، وہاں سے دہلی آکر ندوۃ المصنفین قائم کیا اور اس کو حرز جاں بنا کر اپنی پوری زندگی گزار دی۔

سیاست میں بھی برابر حصہ لیتے رہے بڑے خوش بیان مقرر تھے، ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑنے کے لئے انڈین نیشنل کانگریس کے جانباز سپاہی بنے تو اپنی وضع داری میں آخری وقت تک اس کے ساتھ ہی رہے، مگر وہ ان کانگریسی مسلمان رہنماؤں میں نہ تھے، جو ہندوؤں اور حکومت میں تو بہت سمجھے جاتے ہیں، لیکن اپنے ہم مذہبوں میں معتوب ہوتے ہیں، ان کا سیاسی ذہن بہت صاف تھا، اس لئے غیر کانگریسی رہنماؤں سے بھی ان کا میل ملاپ رہا، ان سے اپنے تعلقات کے آبگینے میں کسی قسم کی ٹھیس لگنے کو پسند نہ کرتے، اونچے خاندان کے چشم و چراغ تھے، اس لئے خاندانی وراثت میں جو اوصاف پائے تھے، ان کو اپنی سیاسی زندگی میں بھی برقرار رکھا، اپنے معاصروں سے بہت ہی محبانہ طور پر ملتے، خواہ ان کا سیاسی مسلک کچھ بھی ہوتا، اپنے چھوٹوں سے مربیانہ انداز کی گفتگو کرکے ان کے دلوں کو موہ لیتے، اپنے ناقدوں بلکہ مخالفوں سے بھی شریفانہ برتاؤ رکھتے، ان کی ان خوبیوں کی وجہ سے مجلس مشاورت کے ارباب حل وعقد نے ان کو اس کا صدر بنایا، تو آخر وقت تک وہ اس منصب پر قائم رہے، مگر ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمان کچھ ایسے غیر متحرک ہوگئے ہیں کہ ان کا جمود ختم ہوتا نظر نہیں آتا، اس لئے مجلس مشاورت میں بھی وہ حرکت پیدا نہ ہوسکی جس کی توقع کی جاسکتی تھی، اس کا افسوس عام مسلمانوں کے ساتھ خود مولانائے مرحوم کو بھی رہا۔ ان پر جہاں عام مسلمانوں کو اپنے ملی معاملات میں اعتماد رہا، وہاں حکومت ہند کو بھی ان کے وطنی جذبہ پر پورا بھروسہ رہا، ملک کے دینی مدرسوں، علمی انجمنوں اور علمی تحریکوں میں ان کی رکنیت اور شمولیت باعث فخر سمجھی جاتی، اسی طرح حکومت کی بعض اہم کمیٹیوں کے بھی رکن رہے اور کبھی بیرونی وفود میں حکومت کی نمائندگی بھی کی، دینی، علمی اور سیاسی مجلسوں میں اپنی خطیبانہ شان سے اثر انداز ہوتے اور ان کے مخلصانہ مشوروں کی قدر کی جاتی۔

ان کا زندہ جاوید کارنامۂ ندوۃ المصنفین ہے جس کی تاسیس انھوں نے ملک کے مشکل حالات اور اردو زبان کے صبر آزما ماحول میں ۱۹۳۸ء میں کی، اس وقت سے اب تک اس کی طرف سے تقریباً دوسو کتابیں، مذہب، تفسیر، حدیث، تاریخ، سیاست اور دوسرے علوم وفنون پر دیدہ زیب کتابت اور طباعت بڑی اچھی جلد اور گرد پوش سے شائع ہوچکی ہیں، ان سے اردو لٹریچر میں بڑا وزن اور وقار پیدا ہوگیا ہے۔ نشر واشاعت کا ادارہ قائم کرنا اور اس کے معیار کو برقرار رکھ کر مقبول عوام وخواص بنانا صبح کرنا شام کا لانا جوئے شیر کا، مگر مولانائے مرحوم نے اس جوئے شیر کو رواں رکھنے میں اپنی پوری زندگی گذار دی، اردو کے علم وفن کی تاریخ میں ان کا یہ کارنامہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

وہ خود تو بہت سی کتابوں کے مصنف نہیں ہوئے، انھوں نے شروع میں علامہ ابن تیمیہ کی **الکلم الطیب** پر تشریحی نوٹ لکھے اور علامہ ابن جوزی کی **صیدالخاطر** کا ترجمہ بھی اردو میں کیا، قرآن مجید کی مختصر تفسیر دو جلدوں میں لکھنی چاہتے تھے لیکن لکھ نہ سکے، ان کی ریڈیائی تقریروں کا ایک مجموعہ ''منارصدا'' کے نام سے شائع ہوا ہے، وہ جیسی میٹھی گفتگو کرتے ویسی ہی میٹھی تحریر بھی لکھتے، اپنے سیاسی مشاغل اور ندوۃ المصنفین کے اہتمام کے خرخشوں کی وجہ سے خود تو بہت سی کتابوں کے مصنف نہ بن سکے لیکن مصنف گر ضرور ہوئے، ان کے ادارہ کی وجہ سے بہت سے اہل قلم مصنف بن گئے اور ان کی ادبی صلاحیتیں ابھریں، ورنہ یہ دبی رہ جاتیں تو علوم وفنون کا کتنا بڑا نقصان ہوتا۔

ندوۃ المصنفین کا ترجمان مجلّہ برہان ہے، جو جولائی ۱۹۳۸ء سے اب تک ہرمہینہ بڑی پابندی سے نکل رہا ہے، اس کی قلمی گل کاریوں، ادبی زمزمہ سنجیوں، مذہبی موشگافیوں، علمی نکتہ آفرینیوں اور اس کے مختلف مضامین کی مشاطہ گری کی کاوشوں کا زریں سہرا تو مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے سرضرور ہے لیکن اس کی کتابت، طباعت ٹھیک وقت پر اشاعت اور اس کے مالی ذرائع کی کمی کو پورا کرنے کی محنت و ریافت کا جو نمونہ مولانائے مرحوم کے ذریعہ سے عمل میں آیا وہ عملی اور تعمیری سرگرمیوں کی ایک قابل تقلید مثال ہے۔

وہ اب وہاں ہیں جہاں ایک روز سب کو جانا ہے، مگر جن لوگوں کو ان کے ساتھ کام کرنے، یا ان سے ملنے جلنے کا موقع ملا وہ ان کی بھلمنساہت، مرنجاں مرنج انداز طبع، اختلاف کے موقع پر شریفانہ برتاؤ، مسلمانوں کی سیاسی مصیبتوں کے وقت ان کے اندرونی مضطربانہ جذبات اور ان کے سیاسی مستقبل کو سنوارنے کی خاطر ان کے فکری رجحانات کو یاد کرکے دل سے دعائیں کریں گے، کہ ان کی زندگی کے روشن کارنامے ان کے لئے توشۂ آخرت بنیں، اور وہ بارگاہ ایزدی میں کہہ رہے ہوں، ربّ اغفر وارحم وانت خیر الراحمین۔ (''ص۔ع''، جون ۱۹۸۴ء)

گاندھی، اندرا، شریمتی

شریمتی اندرا گاندھی

شریمتی گاندھی اب اس دنیائے فانی میں نہیں رہیں، کچھ نادان، وطن دشمن اور

ناعاقبت اندیش مردوں کے پستول اور اسٹن گن سے نہیں، بلکہ ان کی بے رحمی، بے دردی اور سفا کی کی گولیوں کا نشانہ بنیں اور امر ہوکر سب سے رخصت ہوگئیں۔

دومردوں نے ایک ۶۷ سالہ عورت کو اپنی بائیس گولیوں کا نشانہ نہیں بنایا بلکہ دنیا کے تمام مردوں کے مردانہ پن کی تذلیل کی، انسانیت کی گردن شرم سے جھکادی اور وطن کی ناموس خاک میں ملادی، مگر خود شریمتی اندرا گاندھی کی عظمت، جلالت اور صولت میں چار چاند لگادیا، ان کی وفات اپنی فطری موت سے ہوتی تو ان کی عزت، مقبولیت اور محبوبیت میں اتنا اضافہ نہ ہوتا جتنا کہ اب ہوا، گلابوں اور سورج مکھیوں سے لدی ہوئی ان کی ارتھی بحری، ہوائی اور برّی لشکریوں کے دستوں کی معیت اور لاکھوں عقیدت مندوں کے جلو میں روانہ ہوئی، تو ایسا معلوم ہورہا تھا کہ پنڈت جواہر لال نہرو کی لاڈلی، ہندوستان کی بیٹی اور سیاست کی دیوی اپنے میکے سے فنا کی سہاگن بنی ہوئی بے پناہ آنسوؤں کا جہیز لے کر وداع ہورہی ہے، سو سے زیادہ ملکوں کے ممتاز نمائندے ان کے احترام میں جھکے ہوئے تھے، مردوں اور عورتوں کا بے پناہ سوگوار ہجوم زبان حال سے کہہ رہا تھا کہ ہندوستان کی فضا پر جب تک سورج کی روشنی چمکتی رہے گی، چاند کی چاندنی پھیلتی رہے گی اور شبنم کے قطرے یہاں کے پھولوں کو تازہ اور شاداب کرتے رہیں گے، ہندوستان کی تاریخ میں شریمتی اندرا گاندھی کا نام باقی رہے گا۔

کچھ سیاسی شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو زمانہ کے سپرد ہوجاتی ہیں، مگر کچھ سیاسی شخصیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے سپرد زمانہ ہوجاتا ہے، اندرا گاندھی کی شخصیت ایسی تھی جس کے سپرد خود زمانہ ہوگیا تھا، ان کے سر پر وزارت عظمیٰ کا تاج رکھا گیا تھا تو پورے ہندوستان کا دل دھڑک رہا تھا کہ معلوم نہیں وہ اس تاج کی لاج کس طرح برقرار رکھیں گی، مگر اقبال خود ان کی وزارت عظمیٰ کی مانگ پر افشاں چھڑکتا رہا، کامیابی خود بڑھ کر ان کی سیاست کے پاؤں میں چھاگل بنی رہی، عزم بالجزم ان کی قوت فیصلہ کا سہارا لے کر ان کی سیاست کے گلے میں مرصع کا ہار پہناتا رہا، اور اب جبکہ ان کی سیاسی زندگی کا افسانہ ختم ہوگیا ہے، مورخوں کو یہ لکھنے میں تامل نہیں ہوگا کہ ایسی سرگرم، متحرک، محنتی، جواں ہمت، حوصلہ مند، نڈر، وطن کے کونے کونے کی خاک چھاننے والی، لاکھوں کے مجمع کو اپنی طرف کھینچنے والی دنیا کی سیاست پر اثر انداز ہونے والی، اپنے مخالفوں سے صبروسکون کے ساتھ نبرآزما ہونے والی، اپنی ناکامی کے باوجود ازسرنو ابھرنے والی اور طرح طرح کے مسائل میں مبتلا رہ کر ان کو حل کرنے کی کوشش کرنے والی حکمراں خاتون دنیا کی تاریخ میں شائد پیدا نہیں ہوئی۔

رومن امپائر میں کلیوپیٹرا، تھیوڈرا، زو، برولناٹ اور ایبرین اپنے زمانے کی سیاست پر چھائی رہیں، فرانس میں میری انٹونایٹ اور کیتھرائن اپنے ملک کی سیاست میں بہت نمایاں ہوئیں، انگلستان میں ایلزبتھ، میری اور وکٹوریہ نے اپنی حکمرانی میں بڑا نام پیدا کیا، ہندوستان کے اندر رضیہ سلطانہ، حبہ خاتون، بیگم ماہم، نور جہاں، درگاوتی اور تارا بائی کو اپنے زمانہ میں بڑی شہرت ہوئی، مگر ان تمام حکمراں خواتین کی سیاسی سرگرمیاں محلوں اور درباروں تک رہیں، اس کے برخلاف اندرا گاندھی کی سیاست پارلیمنٹ کے ایوانوں، مخالف جماعتوں کی شدید مخالفتوں، انتخابات کے ہنگاموں، سڑکوں، گلیوں اور کوچوں کے طوفانی دوروں میں ابھری، اس لحاظ سے وہ ان تمام خواتین حکمرانوں پر فوقیت رکھتی ہیں، ان کی معاصر سیاسی خواتین میں اسرائیل میں گولڈامائر، سری لنکا میں مسز بندرا نائکے اور انگلستان میں مسز تھیچر وزارت عظمیٰ پر ضرور فائز رہیں، ان کے ملکوں کا رقبہ اور ان کی آبادی بھی زیادہ نہیں، مگر اس کے باوجود وہ اپنے اپنے ملک پر اس طرح حاوی نہ ہوسکیں، جس طرح اندرا گاندھی ستر کروڑ آبادی والے ملک کے الجھے ہوئے صبرآزما اور ہمت شکن مسائل پر رہیں، اس لحاظ سے بھی ان کی معاصر حکمراں خواتین ان کی شہرت کے آگے ماند رہیں۔

تاریخ کی عظیم شخصیتوں کا جائزہ لینے میں جہاں عقیدت ومحبت کے پھول نچھاور کیے جاتے ہیں، وہاں تنقید وتنقیص کی چنگاریاں بھی برسائی جاتی ہیں، اندرا گاندھی کے کارناموں کا بھی آئندہ جائزہ لیا جائے گا، مگر ہندوستان کی تاریخ عظمت کا ہار پہنا کر ان کو شہرت کے بقائے دوام کے دربار میں جو مقام دے چکی ہے، اس سے ان کا بڑے سے بڑا ناقد اور مخالف بھی ہٹا نہیں سکتا۔

ان کی بڑی آرزو تھی کہ ان کے لڑکے راجیو گاندھی ان کے جانشین ہوں، ان کی المناک موت سے یہ آرزو پوری ہوگئی، اب راجیو گاندھی کی طرف سارے ہندوستان کی نظر اٹھی ہوئی ہے کہ اس بھاری ذمہ داری سے وہ کس طرح عہدہ برآ ہوتے ہیں، حکومت آرڈی ننس کے ذریعہ سے بھی کی جاتی ہے، یہ پولیس کے ذریعہ سے بھی امن و امان قائم کرالیتی ہے، فوج کے سہارے فسادات پر بھی قابو پالیتی ہے، ایسی حکمرانی تو بہت آسان ہے، مگر دلوں کی تسخیر کرکے لوگوں پر حکومت کرنا آسان نہیں بلکہ مشکل ہے، ایک حکمراں کا اصلی کارنامہ تو یہ ہے کہ وہ جھک کر قدآور ہو، مفتوح بن کر فاتح ہو، مغلوب ہوکر غالب ہو، راجیو گاندھی کی وزارت عظمیٰ کی آزمائش اس میں ہے کہ اس ملک کے ہر فرقہ بلکہ ہر آدمی کے لیے ان کے دل میں محبت کی گنگا اور اخلاص کی جمنا کس طرح بہتی ہے، یہ قانون یا کاغذی تحریروں یا زبانی تقریروں سے نہیں بہہ سکتی، بلکہ لوگ محسوس کریں کہ ان کے سربراہ کی واقعی مخلصانہ، دردمندانہ اور ہمدردانہ حکمت عملی کی وجہ سے اس کے لیے ان کے دلوں کے اندر شیفتگی اور وارفتگی کے شہد کی نہر بہہ رہی ہے۔

دارالمصنفین شریمتی اندرا گاندھی کی حسرتناک موت سے اس لیے بھی سوگوار ہے کہ ان کے خاندان سے اس ادارہ کا گہرا تعلق رہا، ان کے دادا پنڈت موتی لال نہرو اور ان کے والد بزرگوار پنڈت جواہر لال نہرو اس کو اپنی تشریف آوری اور کرم سے برابر

نوازتے رہے، خود انھوں نے بھی اس روایت کو برقرار رکھا، اس لیے ان کی وفات کو یہ ادارہ اپنا بہت بڑا سانحہ سمجھتا ہے، اس سوگواری کے عالم میں اس کی خوشی ہے کہ ہندوستان کی وزارت عظمیٰ اس فخر روزگار خاندان میں پھر آگئی، راجیو گاندھی کو پیام تعزیت بھیجنے کے ساتھ ادارہ ان کے اس عہدۂ جلیلہ کے لیے مبارکباد بھی پیش کرتا ہے۔

(''ص ۔ ع''، نومبر ۱۹۸۴ء)

ندوی، ابوالجلال، مولانا

آہ! مولانا ابوالجلال ندوی مرحوم

کراچی سے یہ دکھ بھری خبر ملی کہ مولانا ابوالجلال ندوی، گزشتہ مہینہ ۱۰ محرم ۱۴۰۵ھ کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی آغوش رحمت کے سپرد ہوگئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ وہ دارالمصنفین کے علمی خدمت گزاروں میں تھے، ان کا آبائی وطن تو اعظم گڑھ ہی کا ایک گاؤں محی الدین پور تھا، تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء میں پائی، وہاں کے بڑے لائق اور ذی استعداد طلبہ میں شمار ہوتے تھے، ان کی طرف حضرت استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کی نظر اٹھی تو ان کو دارالمصنفین میں رفیق کی حیثیت سے بلا لیا، اور وہ یہاں ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۸ء تک رہے، انھوں نے یہاں رہ کر ہر قسم کے علوم وفنون میں بڑی گہری نظر پیدا کی، قرآن مجید، تفسیر، حدیث، رجال، فقہ، تاریخ اور ادب کے علاوہ وید، گیتا، اپنشد اور اس قسم کی ہندوؤں کی مذہبی کتابوں پر بھی ان کو بڑی دسترس حاصل تھی، وہ شاعر بھی تھے، اور کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیا کرتے تھے، دارالمصنفین کے قیام میں معارف کے لیے حسب ذیل مضامین لکھے عربی زبان کا فلسفہ لغت (ستمبر ۱۹۲۳ء)، سر اکبر اپنشد داراشکوہ کا ترجمہ (دسمبر ۱۹۲۴ء، جنوری ۱۹۲۵ء)، اسلامی شمسی قمری سال نومبر ۱۹۲۵ء، دروزیوں کا مذہب (اپریل ۱۹۲۶ء) مستدرک حاکم کا مطبوعہ نسخہ (جولائی اگست ۱۹۲۶ء)، ان کو علم اشتقاق پر کتاب لکھنے کے لیے کہا گیا تھا، لیکن اس کو وہ پورا نہ کرسکے، ان کی طبیعت میں بڑا انتشار تھا، اسی لیے ان کا علمی فضل بھی منتشر رہا، جن کو وہ اس طرح سمیٹ نہ سکے، جیسا کہ ان کو کرنا چاہیے تھا، وہ دارالمصنفین سے مدراس چلے گئے، جہاں جمالیہ کالج کے لائق مدراس شمار کئے جاتے تھے، وہاں بھی ان کا بہت دنوں تک قیام نہیں رہا پھر ایک ہفتہ وار اخبار نکالا، اس کے ایڈیٹر ہونے کی حیثیت سے بھی بڑی مقبولیت حاصل کی، مگر اس اخبار سے بھی زیادہ دنوں تک وابستہ نہیں رہ سکے، مدراس میں متفرق کام کرتے رہے اور وہاں کے لوگوں نے ان کی علمی صلاحیتوں سے پورا استفادہ کیا۔

۱۹۴۶ء میں دارالمصنفین پھر بلالئے گئے، اس وقت تک ان کے علم میں بڑی وسعت اور گہرائی پیدا ہوچکی تھی، جس موضوع پر بولتے سننے والوں پر اپنی غیر معمولی علمی، تاریخی، ادبی اور مذہبی معلومات کا گہرا اثر پیدا کرتے، بعض اوقات جی چاہتا کہ وہ بولتے رہتے اور ہم لوگ سنتے رہتے، ان کی گفتگوئیں قلم بند کرلی جاتیں تو وہ علمی جواہر ریزے ہوجاتے، وہ اپنے مافی الضمیر کو تو بڑی خوبی سے بولتے وقت ادا کردیتے اور اس کے لیے ان کے پاس الفاظ کے ہر طرح کے ذخیرے ہوتے، لیکن یہ علم وفن کی بڑی محرومی رہی کہ جب وہ کسی موضوع پر لکھنے بیٹھتے تو لکھتے چلے جاتے، اور ان کے قلم کی روانی کہیں نہیں رکتی، یہاں تک کہ ایک موضوع پر وہ ڈھائی سو صفحے تک لکھ جاتے جس میں اپنی بے پناہ معلومات کی بنا پر موضوع سے ہٹ کر بہت سی غیر متعلق باتیں آجاتیں، وہ جو کچھ لکھتے اس سے خود غیر مطمئن رہتے، پھر اس میں کانٹ چھانٹ کرنے لگتے، یہاں تک کہ اپنے دو سو صفحوں کی تحریروں کو چالیس پچاس صفحوں میں قلم بند کردیتے یہ اختصار بھی ان کو پسند نہ آتا اور خود کہتے کہ یہ اتنا مختصر ہوگیا کہ بہت سی مفید باتیں اس میں نہیں آسکیں۔ اس سے بددل ہوکر، ان صفحات کو ادھر اُدھر ڈال دیتے جو بعد میں تلاش کرتے تو ان کو خود نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کہاں رکھے ہوئے ہیں، اس طرح معلوم نہیں ان کی کتنی علمی تحریریں ضائع ہوگئیں، دارالمصنفین کے قیام میں کبھی ایسا بھی موقع آیا کہ وہ جو کچھ لکھتے ان کو لیکر پھر سے مرتب کردیا جاتا اور وہ معارف میں شائع ہوجاتا، ان کے ذہن کی اس انتشار پسندی اور قلم کے بے پناہ کاوہ پن کی وجہ سے وہ کسی موضوع پر کوئی خاص کتاب نہ لکھ سکے، لیکن ان کی جو بھی تحریر معارف میں شائع ہوتی اس پر اہل فن کی نگاہ ضرور اٹھتی معارف میں ان کے ایک مضمون کو پڑھ کر پیرس سے ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھ بھیجا تھا کہ دارالمصنفین کے علمی افق پر یہ کہاں سے درخشندہ ستارہ طلوع ہوا ہے۔

دارالمصنفین کے دوبارہ قیام کے زمانہ میں معارف میں ان کی حسب ذیل تحریریں نکلیں معجزہ شق القمر کا ذکر قرآن مجید میں (نومبر ۱۹۴۶ء)، احادیث عاشورا (اگست ۱۹۴۷ء)، ذوالکفل (جولائی ۱۹۴۸ء)، بکہ مبارکہ (اگست ۱۹۴۸ء)، الروم (جنوری ۱۹۴۹ء)، اسامری (جولائی ۱۹۴۹ء)، حضرت ایوبؑ (اگست وستمبر ۱۹۴۹ء)، سنگ شیام (اکتوبر۔ نومبر ۱۹۴۹ء)، تاریخ یمن کی ایک سطر (دسمبر ۱۹۴۹ء)، کتبات حصن غراب (مئی ۱۹۵۰ء)، تاریخ بابل (جولائی ۱۹۵۰ء)، ہاروت و ماروت (اگست ۱۹۵۰ء)، تاریخ یمن کا ایک ورق (اکتوبر ونومبر ۱۹۵۰ء)، داستان خلیل بائبل قدیم سے ایک صحیفہ کی روایت (مارچ ۱۹۵۱ء)، اصحاب الاخدود (جولائی ۱۹۵۱ء)، اصحاب الفیل کا واقعہ اور اس کی تاریخ (اکتوبر۔ نومبر ۱۹۵۱ء)، اسی زمانہ میں حضرت سید صاحب نے ان کو اعلام القرآن پر ایک کتاب لکھنے کو کہا، لیکن وہ مکمل نہ کرسکے، اسی میں سے کچھ حصے مذکورہ بالا مضامین کی شکل میں شائع ہوئے، ان کو کتبات پڑھنے میں غیر معمولی مہارت حاصل تھی، کتبہ کسی زبان کا اور کتنا ہی پیچیدہ اور گنجلک ہوتا اس کو ضرور پڑھ لیتے، اسی سلسلہ میں عبرانی اور دوسری زبانوں میں بھی دسترس حاصل کی، ان کے اس وصف پر لوگ متحیر رہتے، اور اس وصف کی بنا پر وہ اس برصغیر میں کیا، بلکہ پوری دنیا میں بڑا نام حاصل

کر سکتے تھے، مگر نام و نمود کی فکر ان کو بالکل نہیں رہی، دنیا کے ہنگاموں سے دور، ایک گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر خود ہی اپنے علم و فضل سے لذت اٹھاتے رہے، اور اس کی ان کو کبھی فکر لاحق نہیں ہوئی کہ ان کو کیا ہونا چاہئے تھا اور کیا نہیں ہو سکے، طبیعت میں بڑی خودداری تھی، کردار میں بڑی پختگی رہی، جو رائے قائم کر لیتے اس سے دنیا کی کوئی قوت ان کو ہٹا نہیں سکتی تھی، ہندوستان میں جب تک رہے، آل انڈیا نیشنل کانگریس کی تحریکوں کے مداح رہے، اور اپنی اس مداحی کی بنا پر نقصانات بھی اٹھائے لیکن وہ سود و زیاں سے بالاتر ہو کر زندگی بسر کرنے کے عادی ہو گئے تھے، اس لیے لوگ ان کو کیا سمجھتے ہیں، اس سے کبھی پریشان نہیں رہے، اپنی دنیا الگ بنا کر اسی میں آباد رہ کر خوش رہے۔

ان کی تین لڑکیاں تھیں، ایک اولادِ نرینہ بھی تھی، ان لڑکیوں کی شادی کراچی میں ہو گئی، تو وہ بھی کراچی منتقل ہو گئے جہاں وہ کبھی کبھی علمی رسائل میں مضامین لکھا کرتے تھے، موہن جوڈارو کے تقریباً دو ہزار کتبات پڑھ کر وہاں کے لوگوں کی مدد کی، لیکن وہاں کی سرزمین سے اپنے علم و فضل کا کوئی فائدہ نہیں اٹھایا، یہ خاکسار جب کراچی جاتا تو ان کی خدمت میں حاضر ہوتا، اور ان کی علمی گفتگو سے استفادہ کرتا، کوئی موضوع چھیڑ دیا جاتا تو وہ بولتے چلے جاتے، رکنے کا نام نہیں لیتے، گزشتہ اپریل میں ان کی خدمت میں ان کی رہائش گاہ پر حاضر ہوا تھا، آنکھوں کی بینائی بہت ہی کم ہو گئی تھی، لکھنے پڑھنے سے بالکل معذور ہو چکے تھے، ان کی بڑی تمنا تھی کہ کوئی ایسا آدمی مل جاتا کہ جو کچھ ان کے سینہ میں تھا، اس کو بول کر سفینہ میں منتقل کر دیتے، لیکن ان کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی، یہ خاکسار جب ان کے پاس پہنچا تو اثنائے گفتگو میں کلام پاک کی ایک آیت کا ذکر آ گیا تو اس کی تفسیر بیان کرنے لگے، اس کو سن کر یہ خیال ہوا کہ یہ ان کے خیالات کے جواہرات قلمبند ہونے کی وجہ سے ضائع ہو کر رہ جائیں گے، کراچی کے لیاقت کالج کے پرنسپل جناب سید فخر الحسن صاحب نے ان کو قلمبند کرنے کی کوشش کی، لیکن ان کی گفتگو کی روانی کا ساتھ جناب سید فخر الحسن کا قلم نہ دے سکا، ان سے رخصت ہوا تو خیال آیا کہ علم، فضل، فن اور بصیرت کا ایک مجموعہ کراچی کے ایک گمنام گوشۂ تنہائی میں مقید ہو کر رہ گیا، اور ان کے بعد وہ ساری چیزیں بھی ان کے ساتھ سپردِ خاک ہو جائیں گی، اور جب ان کی وفات کی خبر ملی تو ان کی آخری ملاقات برابر یاد آ رہی ہے، اور بار بار خیال آتا ہے کہ دنیا سے کیا ہو کر ان کو رخصت ہونا چاہئے تھا، اور کیا ہو کر رخصت ہوئے، دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن پاک اور حدیثِ مقدس میں ان کی نکتہ وری اور دیدہ وری کی بدولت، ان کو اپنی آغوشِ رحمت میں لے کر کروٹ کروٹ جنت نعیم عطا فرمائے، آمین!

(''ص۔ع''، نومبر ۱۹۸۴ء)

عبداللطیف، ڈاکٹر

ڈاکٹر عبداللطیف مرحوم

کراچی سے جناب ظفر اللہ صاحب کا ایک تار ملا کہ ان کے والد بزرگوار جناب ڈاکٹر عبداللطیف اللہ کو پیارے ہو گئے اس خبر سے انتہائی دکھ ہوا کہ شرافت، اخلاق، مروت، اخلاص مہمان نوازی اور کارِ خیر کا ایک مجسمہ اب وہاں ہے جہاں ایک روز سب کو جانا ہے، ان کا آبائی وطن تو مدھیہ پردیش تھا، مگر تقسیم ہند کے بعد وہ پاکستان چلے گئے، پیشہ کے لحاظ سے وہ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ڈاکٹر تھے، پاکستان سے وہ کویت چلے گئے، جہاں تقریباً پچیس ۲۵ سال مقیم رہے، اور اپنے طبی فن کی وجہ سے بڑی ناموری حاصل کی، اور خدا جانے کتنی دولت پیدا کی، دولت سے تو ان کو لگاؤ کم رہا، لیکن کارِ خیر کرنے سے بڑی محبت رہی، وہ جتنا زیادہ کماتے، اس سے زیادہ اس برصغیر کیا، بلکہ دنیا کے مختلف حصوں کے دینی مدرسوں اور اداروں کی خدمت کرتے، اور جتنی زیادہ خدمت کرتے، اتنی ہی زیادہ ان کی دولت میں برکت ہوتی، کارِ خیر کرنے میں ان کو جو لذت ملتی وہی ان کا سرمایۂ زندگی بنتی رہی، علامہ شبلی نعمانیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ اور دارالمصنفین کی مطبوعات اور معارف کے بڑے قدرداں رہے، دارالمصنفین کی ساری کتابیں اپنے یہاں جمع کر رکھی تھیں، اور ان کا مطالعہ بڑے ذوق و شوق سے کرتے، معارف پہنچنے میں تاخیر ہوتی تو بے چین ہو جاتے، اور کسی مہینہ نہیں پہنچتا تو تار بھیج کر منگواتے، کراچی میں بڑی عالی شان کوٹھیاں بنا رکھی تھیں، لیکن خود ان کی ذاتی زندگی بڑی سادہ رہی، سادہ لباس پہنتے، اور اپنی گفتگو میں اس کا اظہار نہ ہونے دیتے کہ وہ کیا ہیں، عجز، انکسار، تواضع، خلق، سخاوت اور فیاضی کا مجسمہ بن کر زندگی گزار دی، مذہبی کتابیں پڑھتے، اور مذہبی باتیں سننے کے لیے بے چین رہتے، یہ خاکسار جب جب کراچی گیا، تو قیام گاہ پر آ کر بڑی شفقت و محبت سے ملتے، اپنے دولت کدہ پر بلاتے اور دیر تک بیٹھائے رکھتے، اپنے ملنے والوں کو بھی بلا لیتے اور دیر تک مذہبی گفتگو کو موضوع بنائے رکھنے میں اپنی زندگی کا راس المال سمجھتے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں اور کارِ خیر کے بے پناہ جذبات کی بدولت ان کو اپنی رحمتوں کے کوثر اور برکتوں کی تسنیم سے سیراب کرے، آمین ثم آمین!

(''ص۔ع''، نومبر ۱۹۸۴ء)

پھلواروی، نصر احمد، شاہ

آہ! شاہ نصر احمد پھلواروی مرحوم

معارف کا یہ رسالہ چھپ رہا تھا کہ اخبار کے ذریعہ شاہ نصر احمد کی انتہائی المناک وفات کی خبر ملی اس سانحہ کی خبر سننے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا، ان کی عمر مشکل سے تیئس (۲۳) چوبیس (۲۴) سال رہی ہوگی، یہ تحریر لکھتے وقت ان کا چہرہ یاد آ رہا ہے جس پر

معصومیت، طہارت، مذہبیت، محبت، مروت اور اخلاق کے جتنے آثار ہوسکتے تھے، ان سب کے انوار ان پر جھلکتے نظر آتے تھے، وہ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کے جناب مولانا شاہ عون احمد قادری کے بڑے صاحبزادے تھے، اس تعلق کے علاوہ وہ دارالمصنفین میں بھی آکر دو سال رہے، اپنی نیکی اور اخلاص کا جو نقش یہاں کے لوگوں پر چھوڑ گئے ہیں، وہ مدت مدید تک یاد رہے گا، وہ یہاں اس غرض سے آئے تھے کہ یہاں رہ کر کچھ سیکھیں، لیکن اپنی کم سنی کے زمانہ میں انھوں نے معارف میں امام الحرمین پر تین قسطوں میں جو مضمون لکھا، اس پر برصغیر کے تمام ارباب فن کی نظر اٹھی، اور ان کا خیال تھا کہ یہ کسی تجربہ کار اہل قلم اور دیدہ ور عالم کا لکھا ہوا ہے، لیکن جب ان کو بتایا جاتا کہ اس کے لکھنے والے کی عمر کیا ہے، تو ان کو یقین نہیں آتا، اس مضمون سے اندازہ ہوگیا تھا کہ آئندہ علم کی ایک بے پناہ قوت، ہندوستان کی علمی دنیا میں ابھر کر رہے گی، لیکن ان کو خود خیال رہا کہ ان میں ابھی بہت کچھ کمی رہ گئی ہے، اس لیے اس کو پورا کرنے کے لیے وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء مزید تعلیم کے لیے چلے گئے، جہاں انھوں نے تین سال رہ کر وہاں کی تعلیم کی تکمیل کی اور ادب میں تخصص کیا، اسی زمانہ میں ان کی شادی بھی ہوئی تھی، اور جب وہ گلشن علمی میں نسیم نو بہاری بن کر ہر طرف پھیلتے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی مصلحت کی بنا پر ان کو اپنے پاس بلالیا، وہ اپنی نیکیوں اور خوبیوں کی بدولت جنت الفردوس کی سیر ضرور کریں گے، لیکن ان کے لیے پھلواری شریف کا پتہ پتہ، بوٹا بوٹا، خدا جانے کب تک سوگوار رہے گا ان کے والدین پر اس سانحہ سے جو کچھ گزر رہا ہوگا، اس میں دارالمصنفین کے رفقاء بھی ہر طرح شریک غم ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو صبر جمیل کی توفیق دے، اور مرحوم کو اعلیٰ علیین میں وہ ساری نعمتیں حاصل ہوں، جو اللہ تعالیٰ کے نیک اور پاکیزہ بندوں کو حاصل ہوا کرتی ہیں، آمین! ("ص ـ ع، نومبر ۱۹۸۴ء)

قادری، محمد ایوب، ڈاکٹر

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

(شمس بدایونی)

ڈاکٹر محمد ایوب قادری سے میری دیرینہ ملاقات تھی، جب جب کراچی جانے کا موقع ملا، وہ بہت ہی عزیزانہ طور پر ملے، ہر ملاقات میں پہلے سے زیادہ اپنی بھلمنساہت، شرافتِ طبع، عجز اور انکسار کا ثبوت دیتے، بہت سی کتابوں کے مصنف ہوئے، جیسا کہ حسب ذیل مضمون سے ظاہر ہوگا، ان کے قلم میں بڑی برق وشی تھی، کسی کتاب کو لکھنا یا ترجمہ کرنا شروع کرتے تو بڑی کم مدت میں یہ کام ختم کردیتے، وہ جس بلند مرتبہ کے مصنف تھے، اپنے عجز و انکسار کی بدولت اس سے اپنے کو کم ہی ظاہر کرتے، وہ اپنی ہر کتاب دارالمصنفین ضرور بھیجتے اور اس کو یہ راقم شوق سے پڑھتا، جب انھوں نے کراچی کے قیام میں شاہنواز خاں کی تصنیف مآثر الامراء کی تین جلدوں کے ترجمے ہدیہ کیے، تو یہ تینوں جلدیں میری میز پر برابر رہیں، اور جب کبھی ان میں سے کسی اقتباس کو اصل فارسی سے ملایا، تو ان کو ہر طرح صحیح، سلیس اور فصیح پایا، اس سے ترجمہ کرنے میں ان کی مہارت اور قدرت کا معترف ہوا، جب وہ طبقات اکبری کا ترجمہ کررہے تھے تو ان سے یہ گفتگو آئی کہ اکبرنامہ کا ترجمہ ایک انگریز نے انگریزی میں کردیا ہے، لیکن یہ بڑی ندامت اور شرم کی بات ہے کہ اب تک اس کا اردو میں ترجمہ نہیں ہوسکا، گویہ بہت مشکل کام ہے، لیکن جب اس کا ترجمہ انگریزی میں ہوسکتا ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ اردو میں نہ ہوسکے، جناب ایوب قادری صاحب نے کہا کہ طبقات اکبری کے ترجمہ کے بعد انشاء اللہ اکبرنامہ کی جلدوں کا ترجمہ کرکے لوگوں کی ندامت کو دور کردوں گا، اس سے مجھ کو بڑی خوشی ہوئی، گزشتہ نومبر میں میرے قیام کراچی ہی میں ان کی المناک وفات ہوئی، وفات سے ایک روز پہلے ان کا ٹیلی فون آیا کہ ہم ان کے ساتھ رات کو کھانا کھائیں، جس روز یہ دعوت طے تھی، اسی روز خبر ملی کہ وہ اللہ کو پیارے ہوئے، اس عظیم سانحہ سے بڑا دکھ ہوا، پاکستان کے تمام اخباروں میں ان کا بڑا ماتم ہوا، تمام مشاہیر کے تعزیتی بیانات شائع ہوئے، ان پر اخباروں میں اچھے اچھے مضامین بھی لکھے گئے، جس سے پتہ چلا کہ وہ اپنے علمی رتبہ کی وجہ سے وہاں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، ان سے جو علمی تعلقات تھے، اس بناء پر برابر خیال رہا کہ ان پر ایک طویل مضمون لکھوں، لیکن اپنی مشغولیت کی وجہ سے یہ حق ادا نہ کرسکا، جس کا بڑا افسوس ہے، لیکن وہ برابر یاد آتے ہیں اور اکثر یاد آتے رہیں گے، ان کے چھوٹے بھائی جناب نعمت اللہ قادری عرف ابومعاویہ صاحب کو بھی دارالمصنفین سے بڑا قلبی لگاؤ رہا، انہوں نے تو اس کی زیارت کرنے کے لیے یہاں آنے کی زحمت بھی گوارہ کی، وہ اس کی مطبوعات کے بڑے قدردان تھے، اور اس کی اشاعت کے لئے برابر فکرمند رہتے، ان کی وفات بھی سڑک ہی پر ہوئی، موٹر سائیکل کے حادثہ میں وہ جاں بحق ہوئے، دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دونوں بھائیوں کو اپنی بے پایاں رحمتوں اور برکتوں سے سرفراز کرے، آمین! ("ص، ع")

ہندو پاک میں مستند علمی اور تحقیقی کام کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہے، اور اس قلیل تعداد میں بھی ہر ایک عالم و محقق پر تکیہ نہیں کرسکتے، بلکہ ان میں بھی بعض اعلیٰ اور بعض اعلیٰ تر ہیں، انہی ہستیوں میں ایک نام ڈاکٹر محمد ایوب قادری کا بھی ہے، جو ۲۵/ نومبر ۱۹۸۳ء سے مرحوم کے اضافہ کے ساتھ لکھا اور بولا جانے لگا ہے۔

ڈاکٹر محمد ایوب قادری کا نام اردو دنیا میں ایک ممتاز محقق، مولف اور مترجم کی حیثیت سے متعارف ہے، انہوں نے بعض ایسے علمی موضوعات کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا جو ارباب علم نظرانداز کیے ہوئے تھے، اور بعض ایسی کتابوں کو اردو دنیا سے متعارف کرایا جو نادر و کمیاب تھیں۔

قادری مرحوم کا موضوع تاریخ، سوانح، ادب، فن اسماء الرجال اور حوالہ جاتی ادب تھا، اس میں وہ شبلی اسکول سے بڑی حد تک قریب نظر آتے ہیں، ان موضوعات کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے، ان پر وہی قلم اٹھائے گا جس نے خود کو علم و ادب کے لیے وقف کردیا ہو یا تلاش و جستجو جس کا مزاج ہو اور جس کی زندگی کا مقصد و مدعا بھی محض علم و ادب کی خدمت ہو، مشفق خواجہ لکھتے ہیں:

''قادری صاحب گزشتہ ربع صدی سے علم و ادب کی خدمت کررہے ہیں، ان کی علمی لگن کو دیکھ کر وہ علمائے سلف یاد آجاتے ہیں، جنھوں نے ہر طرح کی آسائیشوں سے بے نیاز ہوکر خدمت علم ہی کو اپنا اصل کام سمجھا، قادری صاحب سے میرے مراسم تقریباً چھبیس برسوں سے ہیں، میں نے اس دوران میں انہیں علمی و ادبی موضوعات کے علاوہ کبھی کسی دوسرے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے نہیں دیکھا، وہ جب بھی ملے کسی نہ کسی علمی کام کی لگن میں سرشار ملے، کبھی کسی قدیم مطبوعہ کتاب کا ذکر ہے، تو کبھی کسی مخطوطے کا، کبھی کسی گمنام مصنف کے حالات کی تلاش ہے، تو کبھی کسی معروف مصنف کے کم معروف پہلو پر روشنی ڈالی جارہی ہے، خدا انہیں تادیر سلامت رکھے کہ ان سے مل کر یہ خوشی ہوتی ہے کہ ہمارا معاشرہ ان ''دیوانوں'' سے ابھی خالی نہیں ہوا جو ہمیشہ ''بکارِعلم'' ہشیار رہتے ہیں''۔ (مشفق خواجہ، دیباچہ کاروان رفتہ، کراچی ۸۳ء)

قادری مرحوم کے موضوعات تحقیق یوں تو بہت کچھ تھے، لیکن انھوں نے بحیثیت کیفیت و کمیت ''حوالہ جاتی ادب'' اور علمائے ہند و پاک کے مستند سوانح، مسلم تاریخوں اور علماء کی مستند مگر غیر معروف کتابوں پر جس انداز سے دادِ تحقیق دی ہے، وہ ان کے خاص موضوعات کہے جاسکتے ہیں، اس ضمن میں انھوں نے کثیر سرمایہ چھوڑا ہے۔

قصبہ آنولہ ضلع بریلی کا ایک تاریخی قصبہ ہے، بجز قنوج کے اس کی تاریخی قدامت کی ہمسری اترپردیش کا کوئی شہر نہیں کرسکتا، یہ حکومت روہیلہ کا پہلا دارالحکومت تھا، اور اس حکومت کے پہلے فرماں روا نواب علی محمد خاں (ف ۱۷۴۹ء) تھے، ان کی وفات کے بعد حافظ رحمت خاں ان کے جانشین ہوئے، جنھوں نے بریلی میں سکونت اختیار کرلی، نواب علی محمد خاں اور حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے ابتدائی عہد میں روہیل کھنڈ کا صدر مقام آنولہ ہی رہا اور اس دور میں یہاں غیر معمولی ترقی ہوئی، مولوی حکیم عبدالغفور لکھتے ہیں:

''روہیلوں کے زمانے میں شہر آنولہ علماء، فضلاء، شعراء، حکماء اور اہل اللہ کا مرکز بن گیا، نواب علی خاں کے فرزند نواب محمد یار خاں امیر کے دربار سے قدرت اللہ شوقؔ، مصحفیؔ، قائمؔ چاند پوری اور فدویؔ لاہوری، جیسے مشاہیر شعراء وابستہ تھے، مصحفیؔ نے آنولہ کی یاد بڑی دردمندی سے کی ہے، چنانچہ وہ اپنے تذکرے ''ہندی گویاں'' میں قائم کے ذکر میں لکھتے ہیں ''واللہ کہ یادآں صحبت داغ ناکامی بردل دردمندی گزارد''۔ ۱

حکیم نجم الغنی خاں رام پوری لکھتے ہیں:

''آنولہ نواب علی محمد خاں کے عہد میں دارالاسلام تھا، اور نواب ممدوح نے بڑی کوشش کے ساتھ اس کی آبادی میں ترقی دی تھی، قلعہ اور مسجدیں تعمیر کرائی تھیں، آنولہ کی دینداری پر بلاد اسلام کو رشک تھا''۔ ۲

حافظ رحمت خاں کے بریلی منتقل ہونے اور اس کے شجاع الدولہ کے ہاتھوں تاخت و تاراج ہونے پر بھی اس کی رونق اور عظمت رفتہ کے کچھ نقوش نصف صدی تک قائم رہے، جن کی طرف ڈبلیو فرینکل نے ''ہسٹری آف شاہ عالم'' میں اشارہ کیا ہے۔

یہی وہ تاریخی قصبہ ہے، جو ایوب قادری کا آبائی وطن تھا، ان کے مورث اعلیٰ روہیلوں کے عہد میں آنولہ آئے، نواب علی محمد خاں والی روہیل کھنڈ نے حضرت شاہ نوری غازیؒ کی زیارت کے بعد جو بڑی اراضی وقف کی تھی، اس کے متولی حکیم احمد اللہ تھے، جو اپنے دور کے نامور عالم اور خطیب تھے، ان کے صاحبزادے حکیم حبیب اللہ تھے، جو علم و فضل میں ممتاز تھے، ان کے فرزند حکیم عظیم اللہ قادری تھے جو علم الفرائض اور تجوید میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے، معارف المیراث، کاشف الحقایق تفسیر سورۃ العصر ان سے یادگار ہیں، انھوں نے بعض کتابوں پر حواشی بھی لکھے، ۱۲۸۴ھ میں وفات پائی۔ ۳

حکیم عظیم اللہ قادری کے چار صاحبزادے حکیم الٰہی بخش، حکیم سعید اللہ، میاں وحید اللہ اور حافظ امام الدین تھے، حکیم سعید اللہ ۱۸۲۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۷ء میں وفات پائی، خاندانی پیشہ طب کرتے تھے، ۱۸۵۷ء میں خان بہادر خان، نبیرہ حافظ الملک حافظ رحمت خاں کی فوج میں بھرتی ہوکر ککرالہ ضلع بدایوں اور کنپلہ فرخ آباد میں انگریزی فوج سے مقابلہ کیا، انھوں نے کئی کتابیں لکھیں اور بعض کتابوں پر قیمتی حواشی بھی لکھے ہیں ۴ حکیم سعید اللہ کے ایک فرزند مولوی رحیم بخش (۱۸۵۷ء، ۱۹۲۰ء) تھے، جنھیں فن خطاطی میں کمال حاصل تھا، ان عربی کا خاص مطالعہ کیا تھا، عربی ادب پر بھی گہرہ نظر تھی، ان کے ایک فرزند مولوی مشیت اللہ (۱۸۸۹ء، ۱۹۵۹ء) تھے، اور یہ قادری مرحوم کے والد ماجد تھے، فارسی میں بہت اچھی قابلیت تھی، تاریخ اور انساب پر بڑی گہری نظر تھی ۵ ڈاکٹر معین الدین عقیل ان کے متعلق رقمطراز ہیں:

''تبلیغ دین اور مناظرہ سے خاص دلچسپی تھی، مختلف مقامات پر خصوصاً بمبئی

۱۹۲۶ء سے ۱۹۳۳ء کے دوران قیام میں مناظرے کیے، تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف رہے اور کئی غیر مسلموں کو مسلمان کیا، تحریک پاکستان کے زبردست مؤید تھے، ۱۹۵۰ء میں ہجرت کرکے پاکستان آئے، دادو (سندھ) میں مقیم ہوئے اور وہیں انتقال کیا، تاریخ، انساب اور ردّ آریہ اور ردّ شیعہ میں ان سے بعض کتابیں یادگار ہیں، پروفیسر قادری کے علاوہ عبدالقیوم، عنایت اللہ اور نعمت اللہ ان کے فرزند ہیں''۔ [۶]

اس خاندانی تفصیل کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ قادری مرحوم کا خاندان شروع سے علم و ادب کا گہوارا رہا ہے، تاریخ، انساب اور علوم دینیہ سے دلچسپی اس کا نمایاں وصف رہا ہے اور قادری مرحوم کو یہ چیزیں علمی وراثت میں ملیں۔

محمد ایوب نام قادری نام کا جزو ہے، ۲۸/ جولائی ۱۹۲۶ء، ۱۷/ ذی الحجہ ۱۳۴۴ھ بروز بدھ قصبہ آنولہ میں پیدا ہوئے، قصبہ کے ایک بزرگ مولوی حکیم عبدالغفور (ف ۱۹۶۴ء) نے ان کے کان میں اذان دی اور ''چراغ علم'' سے تاریخ پیدائش نکالی، رواج کے مطابق ابتدا قرآن مجید حافظ عبدالاحد اور حافظ عبدالغنی سے پڑھا، پھر مدرسہ تعلیم المومنین، آنولہ میں مکتبی تعلیم پائی، ۱۹۳۹ء میں پرائمری کے امتحان میں درجۂ اول میں کامیاب ہوئے، اور وظیفہ کے مستحق قرار پائے، ۱۹۴۲ء میں مڈل کے امتحان میں بھی درجۂ اول میں کامیاب ہوئے، ۱۹۴۷ء میں الہ آباد بورڈ سے میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا، اسی دوران میں انھوں نے فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں اپنے والد ماجد سے پڑھیں، فارسی کی کچھ کتابیں مولوی اسد علی خان اور حکیم عبدالغفور سے پڑھیں، ۱۹۵۰ء میں انٹر اسلامیہ کالج بدایوں سے کیا، اواخر اپریل ۱۹۵۱ء میں ان کے والد ماجد نے پاکستان کو ہجرت کی، قادری مرحوم سے والد کی جدائی برداشت نہ ہوئی، چنانچہ وہ بھی مئی ۱۹۵۱ء میں پاکستان پہنچے، ابتداً والد کے ساتھ دادو (سندھ) میں ہی قیام کیا، تلاش روزگار میں کراچی پہنچے اور پھر تادم زندگی وہیں کے ہو رہے۔

ستمبر ۱۹۵۱ء سے سپلائی اینڈ ڈولپمنٹ (وزارت صنعت محکمہ رسد و ترقیات) سے ملازمت کا آغاز کیا، جو مئی ۱۹۵۷ء تک قائم رہی، اس دوران میں تعلیمی سلسلہ بھی جاری رہا، ۱۹۵۶ء میں اردو کالج کراچی سے بی۔اے کیا۔

جناب سید الطاف علی بریلوی نے ہندوستان سے ہجرت کرکے کراچی میں سکونت اختیار کی اور آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی، ایک سہ ماہی رسالہ ''العلم'' بھی جاری کیا، اسی دوران میں سید صاحب کی ملاقات قادری مرحوم سے ہوئی انھوں نے ان کے جوہر ذاتی کو پرکھ لیا، ''العلم'' کے لیے ان سے کثرت سے مضامین لکھوائے اور شائع کیے، ۱۹۵۷ء میں قادری مرحوم کی پہلی تصنیف ''مولانا فیض احمد بدایونی'' شائع ہوئی، جو اگرچہ بہت مختصر تھی، لیکن اس سے ان کی تحقیقی و تصنیفی صلاحیتوں کا اندازہ ہوا، ہسٹاریکل سوسائٹی کے معتمد ڈاکٹر معین الحق نے اپنے ادارہ میں معاون تحقیق اور ریسرچ افسر کی حیثیت سے بلالیا، ملازمت کا یہ سلسلہ مئی ۱۹۵۷ء سے ۱۹۶۳ء تک قائم رہا، پروفیسر حبیب اللہ خاں غضنفر کے مشورہ پر جن کا ساتھ ہسٹاریکل سوسائٹی میں رہا تھا، انھوں نے ۱۹۶۲ء میں کراچی یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کیا، اور یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن حاصل کی، ایم۔اے کی ڈگری سے ان کو یہ فائدہ ہوا کہ ہسٹاریکل سوسائٹی کی ملازمت کے ساتھ ساتھ ان کو اردو کالج کراچی میں جزوقتی لکچرار کی حیثیت سے رکھ لیا گیا، ستمبر ۱۹۶۲ء سے ۴/ مارچ ۱۹۶۳ء تک انھوں نے اس طرح تدریسی خدمت انجام دی، ۵/ مارچ ۱۹۶۳ء سے اسی کالج میں مستقل لکچرر کی حیثیت سے وابستہ ہوگئے، کچھ دنوں بعد صدر شعبہ کے منصب پر فائز کردیئے گئے، ڈاکٹر معین الدین عقیل لکھتے ہیں:

''اس عرصہ میں انھوں نے اپنی علمی و تدریسی حیثیت کے سبب ۱۹۷۵ء میں اردو کالج کی جانب سے ''ہلال اردو تمغہ'' کالج ٹیچرز ایسوسی ایشن کی طرف سے ۱۹۷۶ء میں ''اکیڈمک ایوارڈ مڈل'' اور اعلیٰ ثانوی تعلیمی بورڈ کی جانب سے، اسی سال قائداعظم کی صدسالہ تقریبات کے تعلق سے ''تمغہ قائداعظم'' حاصل کیے، پھر اس عرصہ میں انھوں نے متعدد قومی اور بین الاقوامی مذہبی، تاریخی اور ادبی کانفرنسوں میں بھی مندوب کی حیثیت سے شرکت کی''۔ [۷]

۱۹۸۰ء میں انھوں نے کراچی یونیورسٹی سے اردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کیا، ان کے تحقیقی مقالہ کا موضوع ''اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ'' (شمالی ہند میں ۱۸۵۷ء تک) تھا۔

افسوس ۲۵/ نومبر ۱۹۸۳ء کو ایک کار ایکسیڈنٹ میں وہ اپنے مالک حقیقی سے جاملے، قادری مرحوم بحیثیت انسان بڑی خوبیوں کے مالک تھے، سادہ مزاج تھے، اور نام و نمود سے بے نیاز صاف دل اور صاف گو ہونے کے ساتھ ساتھ وہ مخلص بھی تھے، مصلحت کوشی، زمانہ سازی اور مذہب بیزاری سے کوسوں دور علماء کی عزت اور اہل فن کی قدر کرنا، ان کا شعار تھا، یہی وہ خوبیاں تھیں، جنھوں نے ہر چھوٹے بڑے کے دل میں ان کا احترام پیدا کردیا تھا، بقول شاعر:

صرف باتوں سے تو ہوتی نہیں عزت دل میں
آنکھ کچھ دیکھتی ہے تب وہ ادب کرتی ہے

قادری مرحوم نے تصنیفات و تالیفات اور تراجم وغیرہ کی ایک بڑی تعداد اپنے پیچھے چھوڑی ہے۔

تصانیف: (۱) مولانا فیض احمد بدایونی: مولانا فیض احمد رسوا ۱۸۵۷ء کے مجاہدین میں تھے، انھوں نے قوت سیف و قلم دونوں سے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے، کبھی وہ پادری فنڈر سے مناظرہ کرتے نظر آتے، اور کبھی بہادر شاہ ظفر کی عدالت کے حاکم، کبھی

انگریزوں سے برسرپیکار رہے، کبھی شعروادب سے شغل کرتے۔ غرض ان کی خدمات گونا گوں تھیں، قادری مرحوم نے اس کتاب میں ان کی متنوع شخصیت اور گونا گوں خدمات کا تعارف تاریخ وتحقیق کی روشنی میں کرایا ہے، یہ کتاب پاک اکیڈمی کراچی سے ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی۔

(۲) مخدوم جہانیاں جہاں گشت: یہ کتاب تحقیقی انداز پر ترتیب دی گئی ہے، حضرت مخدومؒ کو ایک مافوق الفطرت ہستی کی حیثیت سے پیش کرنے کے بجائے انہیں ایک عالم باعمل کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، کتاب ۳۰۴ صفحات پر مشتمل ہے جسے ادارۂ تحقیق وتصنیف کراچی نے ۱۹۶۳ء میں شائع کیا، اس ادارہ کی بنیاد مارچ ۱۹۶۲ء میں رکھی گئی تھی، ایوب قادری اس کے بنیادی رکن اور معتمد اعزازی تھے، اس ادارہ کی طرف سے شائع ہونے والی یہ پہلی کتاب تھی۔

(۳) مولانا محمد احسن نانوتوی: یہ کتاب ۲۸۰ صفحات پر مشتمل روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی کراچی سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی۔

(۴) ارباب فضل وکمال بریلی: ۱۹۷۰ء میں کراچی سے شائع ہوئی۔

(۵) تبلیغی جماعت کا تاریخی جائزہ: ۱۵۲ صفحات پر مشتمل مکتبہ معاویہ کراچی سے ۷۱ء میں شائع ہوئی۔

(۶) جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں: یہ کتاب قادری مرحوم کی وقیع کتابوں میں شمار کی جاتی ہے، ۱۹۷۶ء میں پاک اکیڈمی، کراچی سے شائع ہوئی۔

(۷) غالب اور عصر غالب: یہ کتاب غالب سے متعلق نو تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے، مضامین کے عنوانات یہ ہیں: نواب الٰہی بخش خاں معروف کا غیر مطلوبہ کلام، غالب اور سرسید احمد خاں، غالب اور غیاث اللغات، غالب سے معاصرین کی ادبی چھیڑ چھاڑ، غالب اور مارہرہ، غالب کے چند شاگرد، غالب اور روہیل کھنڈ، مطائبات غالب، قطعات تاریخ انتقال مرزا غالب، یہ مضامین غالبیات میں مفید اور وقیع اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں، ان مضامین سے نہ صرف یہ کہ غالبیات بلکہ کلاسیکی ادب کی تاریخ وتہذیب کے چند نئے باب بھی وا ہوتے ہیں، تعارف ڈاکٹر معین الدین عقیل نے لکھا ہے، ۱۹۸۲ء میں کراچی سے شائع ہوئی۔

(۸) کاروان رفتہ: چھبیس شخصی اور سوانحی مضامین پر مشتمل ہے، یہ مضامین مرحومین سے متعلق ہیں، جن میں علمی وادبی اور مذہبی شخصیات شامل ہیں، ۱۹۸۳ء میں مکتبہ اسلوب کراچی سے شائع ہوئی، دیباچہ جناب مشفق خواجہ نے لکھا ہے۔

ترجمے:

(۱) تذکرۂ علمائے ہند: جناب مولانا رحمان علی صاحب کی تصنیف ہے، اس کا ترجمہ ۱۹۶۱ء میں پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے شائع کیا۔

(۲) مجموعۂ وصایا اربعہ: حضرت شاہ ولی اللہ کی تصنیف ہے، اس کا ترجمہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد سے ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔

(۳) مآثر الامراء: صمصام الدولہ شاہنواز خاں کی تصنیف کردہ تین جلدوں کا ترجمہ مرکزی اردو بورڈ لاہور سے بالترتیب ۱۹۶۸ء، ۶۹ء، ۷۰ء میں شائع ہوا، یہ ترجمے قادری مرحوم کی محنت وصلاحیت کے غماز ہیں، تقریباً تین ہزار صفحات پر مشتمل ضخیم کتاب کی طرف متوجہ ہونا اور پھر فارسی سے اردو کا جامہ پہنانا ان ہی کا حصہ تھا۔

(۴) فرحت الناظرین: محمد اسلم انصاری پسروی کی کتاب کا ترجمہ ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا۔

(۵) سیدالعارفین: شیخ فضل اللہ جمالی کی مشہور تصنیف ہے، اس کا ترجمہ ۱۹۷۶ء میں اشاعت پذیر ہوا۔

ترتیب وحواشی: حسب ذیل کتابوں کو مرتب کیا اور ان پر حواشی لکھے:

(۱) علم وعمل (وقایع عبدالقادر خانی)، (۲) جلد دوم (وقایع عبدالقادر خانی)، (۳) تواریخ عجیب عرف کالا پانی، (محمد جعفر تھا تیسری)، (۴) عہد بنگش کی سیاسی علمی اور ثقافتی تاریخ (تاریخ فرخ آباد مولفہ مفتی ولی اللہ فرخ آبادی، (۵) مقالات یوم عالمگیر، (۶) تذکرہ نوری (مفصل حالات ابوالحسین نوری مارہروی، (۷) مرقع شہابی (حالات مفتی انتظام اللہ شہابی، (۸) آصف الدولہ نواب رامپور (خلیفہ محمد معظم عباسی)۔

ان کاوشوں کے علاوہ بعض کتابوں میں وہ شریک مولف بھی رہے ہیں، اس قسم کی کتابوں میں ''خط وخطاطی''، ''علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں'' اور ''نقوش سیرت'' خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

ان مستقل تصنیفات وتالیفات کے علاوہ انہوں نے تقریباً سو سے زیادہ علمی و تحقیقی مقالے لکھے، جو ہندوپاک کے معیاری رسائل میں شایع ہوئے، تقریباً تیس کتابوں پر مقدمے لکھے۔

علمی وادبی صحافت میں بھی ان کا دخل رہا، سہ ماہی ''بصائر (کراچی) کے اعزازی مدیر اور ماہنامہ ''سرحد'' کے نگراں رہے، اردو کالج کراچی کے مجلّہ ''برگ گل'' کے بھی ایک عرصہ تک نگراں رہے، ان کی نگرانی میں اس مجلّہ کے کئی اہم نمبر شائع ہوئے، سرسید نمبر، تعلیمی پالیسی نمبر، قائداعظم نمبر، محمد علی جوہر نمبر وغیرہ، ''العلم'' کراچی کا غالب نمبر بھی انہوں نے ترتیب دیا تھا، یہ تمام کاوشیں گو ماضی کا سرمایہ ہیں، لیکن مستقبل کے لیے یہ ایک ورثہ کے طور پر محفوظ رکھی جاسکتی ہیں۔

راقم الحروف کے ان سے بڑے تعلقات تھے، اکثر خط وکتابت رہتی تھی، خطوط میں اپنی سرگرمیوں پر بھی کبھی کبھی روشنی ڈال دیتے تھے، چنانچہ ۸۱ء میں انھوں نے

مجھے لکھا:

''مغلیہ عہد کے ایک مورخ نظام الدین احمد بخشی کی ضخیم تاریخ ''طبقات اکبری'' سے عنقریب فارغ ہوا ہوں، مرکزی اردو بورڈ لاہور سے شائع کرے گا''۔

ایک اور خط میں تحریر کیا تھا کہ ''غزنوی عہد کے ایک عربی نژاد قبیلہ ''بجلیم'' پر ایک کتاب چل رہی ہے''، خدا کرے کہ یہ کتابیں بھی جلد شائع ہوں۔

قادری مرحوم نے اپنے پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ غالباً اشاعت کے لیے زندگی ہی میں کسی پبلشر کے سپرد کردیا ہوگا، اس کا موضوع ''اردو نثر کے ارتقا میں علماء کا حصہ'' (شمالی ہند میں ۱۸۵۷ء تک) تھا، اس کے متعلق انھوں نے اپنے ایک اخباری انٹرویو میں بتایا کہ اردو نثر کی عام تاریخ فورٹ ولیم کالج سے شروع ہوتی ہے، پھر اس کے بعد خطوط غالب کا ذکر آتا ہے، جن کا آغاز ۱۸۵۰ء میں ہوا، ۸؎ اس کے بعد ۱۸۵۷ء میں نثر کا سلسلہ شروع ہوا، جس کو سرسید احمد خاں نے تقویت بخشی، فورٹ ولیم کالج اور غالب کے درمیانی دور میں اردو نثر پر کافی کام ہوا، اس دور میں دینی اور دینوی تعلیم کی حدود آج کی طرح علیحدہ نہیں تھیں، اس لیے علماء نے اس میدان میں خاصا کام کیا، اور علماء کی تصانیف نے اردو نثر کے دامن کو خاصا مالا مال کیا، مگر سوئے اتفاق کہ ادبی مورخین نے علماء کے کام کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی، وہ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے فورٹ ولیم کالج سے ابتدا کرتے ہیں، اور پھر غالب سے جست لگا کر سرسید احمد خاں پر پہنچ جاتے ہیں، اور یوں اردو نثر کی عمارت کی تاریخ اس مثلث پر قائم ہے، اسی بناء پر مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ علماء کی نثری تصانیف کا اس اعتبار سے جائزہ لینا چاہئے، چنانچہ میں نے اس موضوع پر مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ علماء نے اردو نثر کے میدان میں انتہائی دقیق کارنامے سرانجام دیئے ہیں، اور میرے خیال کے برعکس یہ میدان بہت وسیع معلوم ہوا، حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کے خلیفہ شیخ مراد علی سنبھلی کی تصنیف (تفسیر مرادیہ) ۱۷۷۱ء کی تالیف ہے اور وہ اردو نثر کا سہل اور سلیس نمونہ ہے۔

مقالے میں اکیاسی علماء کی ایک سو باون تصانیف میری تحقیق کا موضوع رہی ہیں، جن میں سے پچاس خطی کتابیں، بقیہ مطبوعہ کتابیں (جو گرچہ نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں) ہیں۔

یہ مقالہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے، اس کا پہلا باب شاہ ولی اللہ دہلوی کے صاحبزادگان اور ان کے ہمعصر علماء کی تصانیف سے متعلق ہے، اس باب میں آٹھ علماء کی گیارہ تصانیف ہیں، ان میں شاہ عبدالقادرؒ، شاہ رفیع الدینؒ اور حکیم شریف خاں کا نام تو ادبی تاریخ میں مل جاتا ہے، باقی حضرات کے نام اور ان کی تصانیف انکشاف کی حیثیت رکھتی ہیں۔

دوسرے اور تیسرے باب میں احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء کے نثری کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے، سید احمد شہیدؒ کو ہم نے اردو نثر کے مصنف کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے، سید صاحب کے رفقاء میں مولوی سید عبداللہ بن بہادر علی حسینی کی علمی سرگرمیوں کا خاص طور سے تعارف کرایا ہے، کہ انھوں نے کلکتہ میں مطبع احمدی قائم کرکے اردو زبان کی نشر واشاعت کا بڑا کام کیا ہے۔

ان دونوں ابواب میں چودہ علماء کی سینتالیس تصانیف پر اظہار خیال ہے، ان میں تقویۃ الایمان اور تنبیہ الغافلین کا تو ادبی تاریخوں میں ذکر ملتا ہے، باقی مصنفین اور کتابیں ایک نوع سے پہلی مرتبہ متعارف ہوئی ہیں۔

چوتھا باب شاہ اسحٰق دہلوی کے تلامذہ اور رفقاء کی تصنیفات پر مشتمل ہے، اس میں تیرہ علماء کی پچیس کتابوں پر بحث کی گئی ہے، ان میں مفتی صدرالدین آزردہ، نواب قطب الدین خاں، مفتی عنایت احمد، شاہ احمد سعید، مولوی محمد شاہ اور قاری عبدالرحمٰن جیسے علماء حکیم نصراللہ خاں وصال، ظہور علی ظہور جیسے شاعر اور مولوی شیخ عبداللہ جیسے مبلغ شامل ہیں۔

پانچواں اور چھٹا باب علمائے روہیل کھنڈ کی تصنیفات کے جائزہ پر مشتمل ہے، ان دونوں ابواب میں پچیس علماء کی چالیس تصانیف کا جائزہ لیا گیا ہے، اس جائزہ میں سید شاہ حقانی کی ''تفسیر حقانی'' ۱۷۹۲ء کی تالیف ہے، اسی طرح مولوی شاہ عبدالمجید بدایونی نے ۱۸۱۶ء میں ''سیرت رسول'' پر ایک کتاب ''محافل الانوار'' اردو نثر میں سب سے پہلے لکھی۔

ساتواں باب علمائے اودھ کی علمی کاوشوں پر مشتمل ہے، ان میں تیرہ علماء کی سترہ تصانیف کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

آٹھویں اور آخری باب میں بنگال اور بہار کے علماء کی کتابوں کو متعارف کرایا گیا ہے، اس باب میں چھ علماء کی گیارہ تصانیف پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

(نومبر ۱۹۸۴ء)

۱؎ اخبار الصنادید، بحوالہ سوانحات المتاخرین

۲؎ سوانحات المتاخرین آنولہ، ص: ۴۶، ۴۷ ۳؎ ایضاً

۴؎ ایضاً، ص: ۴۹، ۵۰

۵؎ سوانحات المتاخرین آنولہ، ص: ۱۲ (قلمی مملوکہ راقم الحروف) مولف مولوی حکیم عبدالغفور (مرحوم)

۶؎ ڈاکٹر معین الدین عقیل، تعارف غالب اور عصر غالب، کراچی ۱۹۸۲ء

۷؎ ڈاکٹر معین الدین عقیل، تعارف غالب اور عصر غالب (کراچی ۱۹۸۲ء)

۸؎ ۱۸۵۰ء غالباً سہو کاتب ہے، کیونکہ یہ بات محقق ہوچکی ہے کہ غالب کی خطوط نگاری کا آغاز ۱۸۴۷ء سے ہوتا ہے، اور قادری مرحوم اس سے ناواقف نہ ہوں گے، واللہ اعلم، شمس بدایونی۔

پرواز اصلاحی، عبدالرحمٰن، مولانا

آہ! مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی

''مولانا عبدالرحمٰن پرواز مرحوم دارالمصنفین آئے اور تقریباً ساڑھے تین سال کے بعد یہاں کے لوگوں کے دلوں میں اپنی سیرت کی نیکی اور پاکیزگی، اخلاق کی طہارت و شرافت کی جوت جگا کر اچانک دائمی جدائی اختیار کرلی، وہ ہم لوگوں کے درمیان آکر بیٹھتے تو ان کے خوبصورت چہرے سے عیاں ہوتا کہ لوگوں کی دلآزاری اور ایذارسانی کیا بلکہ ان کی دل شکنی کا دسوسہ بھی ان کے دل میں پیدا نہ ہوتا ہوگا، ان کی نورانی داڑھی سے ان کا علم و فضل ظاہر ہوتا رہتا تھا، انھوں نے راہ طریقت کے ایک سچے سالک کی طرح اس دنیا میں باہمہ و بے ہمہ کا مسلک اختیار کرکے پوری زندگی گذار دی، ان کا بڑا وصف یہ رہا کہ وہ اپنے نفس کو دبا کر بلکہ اپنے اوپر تکلیف اٹھا کر اپنے گھر والوں اور ملنے جلنے والوں کو آرام پہنچانے ہی میں اپنی راحت و مسرت محسوس کرتے تھے، انھوں نے ممبئی کے قیام میں مخدوم علی مہائمی اور مفتی صدرالدین آزردہ کے نام سے دو کتابیں لکھی، جو علمی حلقوں میں بڑے شوق سے پڑھی گئیں، وہ دارالمصنفین آئے تو انھوں نے خود مفسرین ہند پر ایک کتاب لکھنے کی خواہش ظاہر کی، خیال تھا کہ یہ کتاب تیار ہوگی تو ان کی مذکورۂ بالا دونوں کتابوں کی طرح علمی حلقے میں شوق سے پڑھی جائے گی، مگر مصلحت خداوندی سے یہ ادھوری رہ گئی، ان کی اچانک وفات سے یہاں جو سوگواری اور غمناکی کی فضا پیدا ہوئی ہے، اس سے یہ خاکسار متاثر ہوکر ان پر خود مضمون لکھنا چاہتا تھا، لیکن مولوی ضیاء الدین اصلاحی ان کے ہم وطن ہیں اور ایک ہی درسگاہ کے پڑھے ہوئے ہیں یہ ان کی زندگی سے بہت قریب تر رہے، اس لیے خیال ہوا کہ وہی ان پر اچھا تعزیتی مضمون لکھ کر ہم لوگوں کے غمناک جذبات کی صحیح ترجمانی کریں گے۔ اس لیے ان کی یہ تحریر میری تحریر تصور کی جائے، مرحوم جاچکے لیکن وہ یہاں کی مجلسوں میں یاد آئیں گے، اکثر اور برابر یاد آئیں گے۔ اور دل سے یہ دعائیں نکلتی رہیں گی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی نیکیوں اور خوبیوں کی بدولت ان کی روح کو اپنی رحمتوں کے پھولوں اور برکتوں کی خوشبوؤں سے ہمیشہ ہمیشہ معطر رکھے۔ آمین! (''ص - ع'')

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ ۳/۴ دسمبر ۱۹۸۴ء کی درمیانی شب میں دو بجے مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال کرگئے۔ **اناللہ وانا الیہ راجعون۔**

وہ بظاہر بالکل ٹھیک تھے، اور انھوں نے دن بھر کے اپنے سارے معمولات بھی انجام دیے، اس لیے یہ سانحہ غیر متوقع طور پر پیش آیا جس کی وجہ سے دارالمصنفین کی فضا بہت غمناک ہوگئی۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ انتقال کے وقت وہی تنہا دارالمصنفین میں موجود تھے، راقم الحروف اور بعض دوسرے رفقا محترمی جناب سید صباح الدین الرحمٰن صاحب ناظم دارالمصنفین کی معیت میں یہاں اردو اکاڈمی کے دعوت نامہ پر اس کے زیر اہتمام ہونے والی علامہ سید سلیمان ندویؒ کی صد سالہ تقریبات ولادت میں شرکت کے لیے پٹنہ گئے ہوئے تھے، اس لیے ہم سب اپنی غیر حاضری اور ان کی تجہیز و تدفین میں شرکت سے محروم رہ جانے پر سخت ملول و نادم اور دوہرا غم محسوس کررہے تھے۔

دو برس قبل انھیں ہائی بلڈ پریشر کی شکایت ہوئی تھی مگر ہومیوپیتھی کے علاج سے افاقہ ہوگیا تھا، اس کے بعد جناب سیٹھ عبدالعزیز انصاری صاحب کے اصرار پر وہ چیک اپ کے لیے بمبئی تشریف لے گئے، وہاں سے آنے کے بعد ان کے ساتھ ہم لوگ بھی مطمئن تھے، ۳۰/ نومبر کو جب ہم لوگ پٹنہ کے لیے روانہ ہورہے تھے، تو انھوں نے خندہ پیشانی کے ساتھ سب کو رخصت کیا، میں نے کاتب کو دینے کے لیے ایک مضمون ان کے حوالہ کیا، اس وقت انھوں نے مجھ سے کہا ''مجھے ایک ضرورت سے گھر جانا تھا، مگر دارالمصنفین بالکل خالی ہوجائے گا، اس لیے میرا یہاں سے ہٹنا مناسب نہیں، میں سب لوگوں کی واپسی کے بعد ہی گھر جاؤں گا''۔ کیا پتہ تھا کہ یہ اُن سے آخری گفتگو ہورہی ہے اور اب ہم ان سے اس عالم ناسوت میں ملنے کے بجائے ان کی قبر پر باچشم نم حاضر ہوں گے۔

پٹنہ میں کئی حضرات نے ان کی خیریت دریافت کی، بمبئی سے ان کے دوست جناب شیخ فرید برہانپوری اور ڈاکٹر خورشید نعمانی تشریف لائے تھے، دونوں نے ان کو بار بار یاد کیا، اور تاکید سے کہا کہ ان کا سلام ان سے کہہ دیا جائے، خدابخش خاں لائبریری کے ڈائرکٹر جناب عابد رضا بیدار نے ہم لوگوں کے ذریعہ ایک دعوت نامہ بھی ان کے پاس بھیجا مگر کیا خبر تھی کہ اس نامہ و پیام کے درمیان موت حائل ہوجائے گی۔

ان کا وطن اعظم گڑھ ضلع کا ایک گاؤں سیدھا سلطان پور ہے، جو یہاں کے مشہور اور قدیم قصبہ سرائے میر سے تین چار میل کے فاصلہ پر شمال مشرق میں واقع ہے، ان کا شجرۂ نسب محفوظ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے مورث اعلیٰ پٹھانوں کے یوسف زئی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے، جو سلطان بہلول لودھی کے زمانہ میں

افغانستان سے ہندوستان آئے، جونپور کی شرقی سلطنت پر جب بہلول لودھی نے حملہ کیا تو دادشجاعت دینے والوں میں اس خاندان کے سالارخاں پیش پیش تھے، اس کے صلے میں انھیں تیس ۳۰ گاؤں پیش کئے گئے، اسی بنا پر پہلے یہ گاؤں ''سی دہ'' کہلاتا تھا، جو آگے چل کر سیدھا سلطان پور کے نام سے موسوم ہوا، اس گاؤں کی بڑی آبادی انہیں سالارخاں کی نسل سے ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن پرواؔز اسی گاؤں کے ایک متوسط درجہ کے کھاتے پیتے خاندان میں ۱۷/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے تھے، ان کا خاندان پیشہ زراعت کے علاوہ علمی و دینی حیثیت سے بھی ممتاز تھا، ان کے والد بزرگوار مولانا محمد شفیع مرحوم ایک جید عالم اور متورع ومقدس بزرگ تھے، جن کی تعلیم داناپور پٹنہ کے ناریل گھاٹ کے ایک بڑے اہلحدیث مدرسہ میں ہوئی تھی، جہاں ان کے چچا حافظ قادر بخش مرحوم ایک مدت سے تعلیمی خدمات پر مامور تھے، مولانا شفیع صاحب نے یہاں مولانا سخاوت علی جونپوری کے تلمیذ رشید مولانا فیض اللہ مئوی سے درس لیا جو علامہ شبلی نعمانیؒ کے بھی استاد تھے، اس کے بعد دہلی جاکر میاں سید نذیر حسین صاحب دہلوی محدث سے بھی حدیث کے چند اسباق پڑھے۔

مولانا محمد شفیع صاحبؒ درسیات کی تکمیل کرنے کے بعد اپنے وطن واپس آئے تو انھوں نے مسلمانوں کی معاشرتی، اصلاح اور شرک وبدعات کے انسداد کے لیے انجمن اصلاح المسلمین کی داغ بیل ڈالی جس کے کاموں کا دائرہ آگے چل کر بہت وسیع ہوگیا، چنانچہ اسی سلسلہ میں انھوں نے علم دین کی اشاعت وفروغ کے لیے مدرستہ الاصلاح قائم کیا، اور مدۃ العمر اس کی خدمت کرتے رہے، انہی کی درخواست پر علامہ شبلیؒ نعمانی اور مولانا حمید الدین فراہیؒ نے بھی اس مدرسہ کی جانب توجہ کی اور مولانا فراہیؒ کی بدولت مدرسہ نے بڑی ترقی کی، اور اس سے مسلمانوں کو بڑا فیض پہنچا، اور اب بھی پہنچ رہا ہے۔

مولانا محمد شفیع مرحوم کے پانچ صاحب زادے تھے، سب سے چھوٹے ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم ریڈر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تھے، مولانا عبدالرحمٰن پرواز ان سے بڑے، اور باقی تین بھائیوں سے چھوٹے تھے، بڑے چاروں بیٹوں کی تعلیم مدرسہ الاصلاح میں ہوئی مولانا عبدالرحمٰن پرواز ۱۹۴۰ء میں مدرسہ سے فارغ ہوئے، اس کے بعد وہ درس وتدریس کے مشغلہ میں لگ گئے، ۱۹۴۶ء میں مشہور شاعر جناب احسان دانش مرحوم کی دعوت پر وہ لاہور چلے گئے، مگر ایک برس بھی یہاں نہیں گذرے تھے کہ تقسیم کی خبر سن کر وطن واپس آگئے اور تھوڑے ہی عرصہ بعد دارالعلوم احمدیہ سلفیہ دربھنگہ میں درس وتدریس کی خدمت پر مامور ہوگئے، یہاں سے ''الہدیٰ'' کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار نکلتا تھا، جس کے ایڈیٹروں میں ان کا نام بھی تھا، وہ ۱۹۵۸ء میں بمبئی آگئے اور انجمن اسلام کے مختلف اسکولوں میں عربی کے استاد ہوئے، آخر میں احمد سیلر ہائی اسکول ڈمٹکر روڈ سے وابستہ ہوئے اور یہیں سے ریٹائر ہوکر دارالمصنفین آئے۔

وہ بمبئی کے قیام کے زمانہ میں مختلف اردو اخباروں سے بھی وابستہ رہے، روز نامہ ہندوستان، آشکار، اردو ٹائمز اور انقلاب وغیرہ میں عرصہ تک مذہبی علمی اور تاریخی کالم لکھتے رہے، گاندھی میموریل ریسرچ سینٹر سے بھی ان کا تعلق رہا، میں ایک دفعہ ان سے ملنے کے لیے یہاں گیا تو بہت خوش ہوئے اور اس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عبدالستار دلوی اور حامد اللہ ندوی وغیرہ سے ملایا۔

اردو زبان وادب اور اس کی تاریخ پر ان کی اچھی نظر تھی، ان کے والد اپنے تمام بچوں کو ادبی کتابوں کے مطالعہ کی تلقین کرتے تھے، پرواؔز صاحب نے ان کی ترغیب سے غالبؔ کے خطوط اور سرسیدؔ، آزادؔ، نذیر احمؔد، حالؔی اور مولانا شبلؔی کی اکثر تصانیف کا مطالعہ کیا اور مسدس حالی سبقاً سبقاً ان سے پڑھی، کہتے تھے کہ اس کے تقریباً نصف اشعار مجھے زبانی یاد ہوگئے تھے ان کی فارسی کی استعداد بھی اچھی تھی، میں اس کی مشکلات میں جب ان سے رجوع کرتا تو وہ تشفی کردیتے اس کا ذوق بھی ان کے والد صاحب کی تربیت کا نتیجہ تھا۔

وہ مدۃ العمر درس وتدریس کے مشغلہ سے وابستہ رہے، مگر تحریر وتصنیف کی جانب ہمیشہ ان کا رجحان رہا، مضمون نگاری کا شوق بچپن سے تھا، اور طالب علمی ہی کے زمانہ سے ان کے مضامین اخباروں اور رسالوں میں چھپنے لگے تھے، مختلف وقتوں میں ان کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہوئیں۔

۱۔مزدور اور اسلام ۲۔مومن، حیات وشاعری ۳۔علم وہدایت کے چراغ ۴۔نظام حق کے معمار ۵۔حضرت مخدوم علی مہائمی: حیات، آثار وافکار ۶۔مفتی صدرالدین آزردہ، بمبئی کے قیام کے زمانہ میں انھیں پڑھنے لکھنے کا زیادہ موقع ملا، موخرالذکر دونوں کتابیں یہیں لکھی گئیں، اور یہ ان کی تلاش وتحقیق اور محنت وکاوش کا نتیجہ ہیں، ان میں سے ایک میں کوکن کے مشہور اور بڑے صوفی و عالم حضرت مخدوم علی مہائمی کے حالات وواقعات زندگی کے علاوہ شروع میں ان کے وطن ماہم اور خاندان نوایط کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے اور ان کے علمی کمالات تصنیفات اور افکار ونظریات پر مبسوط بحث وگفتگو کی گئی ہے، اور تفسیر، فلسفہ اور تصوف میں ان کا امتیاز دکھایا گیا ہے، مخدوم صاحب کے صوفیانہ افکار کی وضاحت کے ضمن میں نظریہ وحدت الوجود پر مفید اور اچھی بحث کی ہے، یہ موضوع بڑا نازک ہے مگر مصنف اس مرحلہ سے اعتدال وسلامت روی کے ساتھ گذرے ہیں، اور اس کی اچھی وضاحت بھی کی ہے، اس کتاب کی وجہ سے وہ بمبئی میں پورے طور پر متعارف ومقبول ہوگئے تھے، اور علمی حلقوں میں بھی ان کا

وزن محسوس کیا جانے لگا تھا۔

دوسری کتاب بھی علمی وتحقیقی حیثیت سے بلند پایہ اور اردو کے سوانحی ذخیرہ میں ایک اضافہ ہے، اس میں مغلیہ سلطنت کے دور زوال کے نامور فاضل مفتی صدرالدین آزردہ کے بارے میں، پہلی مرتبہ اس قدر محنت وکاوش سے مواد ومعلومات جمع کیے گئے ہیں جس سے ان کے خاندانی وذاتی حالات تفصیل سے معلوم ہوجاتے ہیں، اس میں ان کے فضل وکمال وغیرہ کے متعلق ان کے معاصرین کی شہادتیں بھی نقل کی گئی ہیں، اوران کی قومی و مذہبی خدمات بھی بیان کی گئی ہیں، اور مصنف نے ان کی فارسی وعربی تحریروں اور اردو، فارسی اور عربی کلام کے نمونے بھی دیئے ہیں، اوران کی تصنیفات کا تعارف دیدہ ریزی سے کرایا ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن پرواز نے مداحِ رسول حضرت حسان بن ثابتؓ کے حالات اور شاعری پر بھی ایک کتاب لکھی تھی، جس کے بعض اجزا ماہنامہ برہان میں عرصہ ہوا چھپے تھے، مگر یہ کتاب ابھی تک شائع نہیں ہوسکی دو اور کتابیں بھی زیر ترتیب تھیں، ایک حضرت امیر خسرو پر اور دوسری حضرت شاہ وجیہ الدین گجراتی پر ہے۔

دارالمصنفین میں انھوں نے ہندوستانی مفسرین کے موضوع پر کام شروع کیا تھا جس کے لیے وہ اپنا مطالعہ مکمل بھی کرچکے تھے، اور وہ اس کا تقریباً نصف حصہ مرتب بھی کرچکے تھے، اگر ان کی عمر وفا کرتی تو غالباً چند ماہ میں اسے مکمل کرلیتے۔

شعر وسخن کا ذوق خاندانی تھا، ان کے والد بزرگوار کو بھی عنفوانِ شباب میں شعر و شاعری سے دلچسپی تھی، اور وہ شاہ محمد اکبر ابوالعلائی داناپوری سے مشورۂ سخن بھی کرتے تھے، ان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی تو موجودہ معیار کے بلند پایہ شاعر خیال کئے جاتے ہیں، پرواز صاحب نے بھی موزوں طبیعت پائی تھی، بچپن ہی میں مشق سخن کرنے لگے تھے، اوران کا کلام بھی اخباروں اور رسالوں میں چھپتا تھا، نجی محفلوں میں اشعار سناتے بھی تھے، مگر مشاعروں میں پڑھنے کے عادی نہ تھے، البتہ کبھی کبھی مشاعروں کی صدارت کرتے تھے، اُن کی نظمیں اورغزلیں نہایت پاکیزہ ہوتی تھیں، اور ان میں اسلامی احساسات وجذبات کی ترجمانی ہوتی تھی، مگر اب شعر وشاعری سے زیادہ رغبت نہیں رہ گئی تھی، تاہم ایک دیوان یادگار چھوڑا ہے، جو طبع نہیں ہوسکا۔

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر سے ان کو بڑا تعلق واخلاص تھا، یہ ان کے والد مرحوم کی یادگار بھی ہے، اوران کی از اول تا آخر میں تعلیم بھی ہوئی تھی، اس لیے وہ اس کی ہر خدمت کے لیے مستعد اور سرگرم رہتے تھے، اوراس کی ترقی کے لیے برابر فکر مند بھی رہتے تھے، کئی برس سے وہ اس کی مجلس انتظامیہ کے ممبر بھی ہوگئے تھے، اور پابندی سے مجلس کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے، اوراس کی کاروائی اور مدرسہ کی تعمیر وترقی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لیتے تھے، ان کی دلچسپی کی وجہ سے مدرسہ کی نظامت بھی پیش کی گئی مگر انھوں نے قبول کرنے سے انکار کردیا، بمبئی میں مدرسہ کی ایک موقوفہ جائداد میں اس کے متولی عرصہ سے بیجا تصرف اور ناجائز خرد برد کررہے تھے، بالآخر پرواز صاحب نے اس مسئلہ میں پوری دلچسپی لی اور منشی عبدالعزیز انصاری صاحب، مولانا مستقیم احسن اعظمی اور دوسرے خیرخواہانِ مدرسہ کے تعاون سے اسے ان کے تصرف سے نکالنے میں غیر معمولی جدوجہد کی، حال میں مجلس انتظامیہ کے ارکان نے قرآن مجید کے موضوع پر ایک بین الاقوامی سمینار منعقد کرنے کا فیصلہ کیا تھا، اور مدرسہ سے ان کی غیر معمولی دلچسپی کی بنا پر انھیں اجلاس کا ناظم مقرر کیا تھا، انھوں نے اس کے لیے ابتدائی تگ ودو بھی شروع کردی تھی کہ خود ان کا وقت آخر آگیا۔

ملی، قومی اور سیاسی سرگرمیوں سے انھیں نہ زیادہ دلچسپی تھی اور نہ وہ ان میں کوئی عملی حصہ لیتے تھے تاہم مفید اور نیک کاموں میں تعاون سے دریغ بھی نہ کرتے تھے، ان کے گاؤں میں عیدگاہ کی تعمیر کا مسئلہ اٹھا تو انھوں نے اس میں نمایاں حصہ لیا، حال میں شہر کے بعض لوگوں نے ایک مسلم ہاسپٹل کی اسکیم بنائی ہے، وہ اسے قوم وملت کی ایک بڑی اور اہم ضرورت خیال کرتے تھے، اس لیے مسلم ہاسپٹل کے کارکنوں سے برابر رابطہ رکھتے اور انھیں مفید مشورے بھی دیتے۔

ان کے والد بزرگوار اپنے دور کے مشہور صاحب دل بزرگ حضرت چاند شاہ ٹانڈویؒ (متوفی ۱۳۱۷ھ) سے پہلے بیعت ہوئے، ان کے انتقال کے بعد یادگار سلف حضرت مولانا سید محمد امین نصیرآبادی رائے بریلوی (متوفی ۱۳۴۹ھ) کی جانب رجوع کیا اور حضرت سید صاحب سے خلافت واجازت بھی حاصل کی، مولانا عبدالرحمٰن پرواز کو بھی ان سے بڑی عقیدت تھی، چند برس قبل وہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے ملنے رائے بریلی گئے تو اپنے والد کے مرشد کے وطن اور مسکن کی زیارت کے لیے نصیرآباد بھی تشریف لے گئے۔ ان کو تصوف سے محض نظریاتی دلچسپی نہ تھی، بلکہ وہ اس راہ کے سالک بھی تھے، آٹھ، دس برس قبل وہ اس دور کے نامور شیخ طریقت مولانا محمد احمد پرتاب گڑھی کی خدمت میں حاضر ہوکر باقاعدہ ان سے بیعت ہوئے، اس کے متعلق جب میں نے ان سے دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ اصلاح باطن، تزکیۂ نفس اور نسبت مع اللہ پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے۔ ان میں تقشف، اور گروہی عصبیت نہ تھی، طبیعت میں بڑا اعتدال اور توسع تھا، ہر طبقہ کے لوگوں سے ان کے تعلقات تھے۔

وہ طبعاً خاموش، سنجیدہ، حلیم، بردبار، بے ضرر اور مرنجاں مرنج شخص تھے، نہ کسی کی ٹوہ میں رہتے اور نہ کسی کی غیبت وتنقیص کرتے، مردم آزاری اور ایذارسانی کا ان میں کوئی مادہ ہی نہ تھا، طبیعت میں نرمی، مروت، ملاطفت اور شرافت تھی، کسی کے رویے سے تکلیف اوراس کے طرزعمل سے شکایت بھی ہوتی تو ضبط وتحمل سے کام لیتے، اور غصہ وبرہمی کا اظہار نہ کرتے، ان میں تواضع وخاکساری تھی، ان کی کسی ادا سے رعونت و

برتری کا پتہ نہ چلتا تھا، انھیں خودنمائی اور خودستائی کی مطلق عادت نہ تھی، کبھی کوئی ایسی بات نہ کرتے جس سے علو و پندار ظاہر ہوتا، نام و نمود نمایش ظاہر داری اور بناوٹ سے نفرت تھی، خودغرضی یا منافقت اور رشک وحسد سے ان کا دل پاک وصاف تھا، ان کی زندگی نہایت سادہ اور تکلفات سے بری تھی، بڑے قناعت پسند تھے، جو کچھ میسر ہوتا اسی کو کافی سمجھتے اور اسی میں ہنسی خوشی گذر بسر کرلیتے، نہ کسی چیز کی ہوس ہوتی اور نہ کسی اعزاز و اکرام کی طلب، اس معاملہ میں ان کا مزاج بالکل صوفیانہ اور درویشانہ تھا، طبیعت میں غیرت وخودداری تھی، اس لیے دوسروں سے کوئی کام لینا اور کسی چیز کو طلب کرنا گوارا نہ تھا، اپنا ضروری کام بھی خود ہی کرلیتے تھے، خود تکلیف اٹھاتے مگر دوسروں کو آرام پہنچانے کی فکر رہتی، اللہ تعالیٰ نے انھیں کوئی اولاد نہ دی تھی، مگر اپنے عزیزوں اور متعلقین کی خبر گیری سے غافل نہ رہتے، اپنے ایک عزیز کی بچی کی پرورش کی، جو کچھ کمایا اس پر اور اس کے بال بچوں پر صرف کردیا اور اپنے لیے کچھ بھی باقی نہ رکھا۔

نہایت وجیہہ وشکیل، شائستہ اور باوقار شخص تھے، چہرہ بڑا پُرنور تھا، اس سے متانت، سنجیدگی، طہارت، پاکیزگی اور معصومیت بھی ظاہر ہوتی تھی، سادہ لوحی اور معصومیت کی بنا پر بعض معاملات کی گہرائی تک نظر نہ جاتی، اور خودغرض قسم کے لوگ ان سے اپنا مطلب حاصل کرلیتے۔

کسی قدر جذباتی بھی تھے، اور چونکہ لاگ لپیٹ اور رورعایت کے عادی نہ تھے، اس لیے وقتی طور پر طبیعت میں اشتعال بھی پیدا ہوجاتا مگر نہ اس کا اثر دیرپا ہوتا، اور نہ کسی سے کینہ وکدورت رکھتے۔

اپنی نیکی، شرافت اور اخلاق وسیرت کی پاکیزگی کی بنا پر جہاں بھی رہے مقبول اور ہردلعزیز رہے، نہ کسی کو ان سے اور نہ ان کو کسی سے کوئی شکایت ہوئی، خداوندا اپنے اس نیک اور مقبول بندے کی مغفرت فرما اور اسے اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ آمین!!

مولانا عبدالرحمٰن پرواؔز کے مخلص دوست حکیم عبدالباقی ناؔمی اعظمی کو ان کے انتقال پر بڑا ملال ہوا۔ اور انھوں نے حسب ذیل قطعہ تاریخ وفات کہا۔

صد حیف جو پرواؔز اپنا بے تکلف دوست تھا
اب چھوڑ کر یہ عالمِ رنج و محن جاتا رہا
جس سے قائم شام کا تھا لطفِ صحبت آہ وہ
اک ہمدمِ دیرینہ درچشم زدن جاتا رہا
برپا نہ کیوں ہو حشرِ غم اب انجمن در انجمن
ہیہات جو تھا رونقِ صدر انجمن جاتا رہا
اب بزمِ علم وفن نظر آئے نہ کیوں بے نورسی
جس سے روشن تھا چراغِ علم وفن جاتا رہا
بیتاب ناؔمی نے کہا یوں مصرعِ سالِ وفات
اب عالمِ دیں، رونقِ افزائے سخن جاتا رہا

("ض"، دسمبر ۱۹۸۴ء)

مجیب، محمد، پروفیسر

پروفیسر محمد مجیب

ان سطروں کے لکھتے وقت پروفیسر محمد مجیب، سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ دہلی کے انتقال پر ملال کی خبر ملی، ان کی وفات ایک ایثار پسند محبّ وطن، ایک بہت ہی قابلِ قدر مصنف، اردو زبان و ادب کے ایک بہت ہی لائق عزت اور جاںثار اہلِ قلم، جامعہ ملیہ کے ایک بہت ہی شفیق اور محبوب وائس چانسلر، ایک بہت اچھے انسان، علم دوست و علم پرور کی رحلت ہے، سرِ دست ان کے لیے دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو اپنی بے پایاں رحمتوں اور برکتوں سے سرفراز فرمائے۔ آمین۔ ("ص۔ ع"، فروری ۱۹۸۵ء)

اکبرآبادی، سعید احمد، مولانا

مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی رحلت

(ڈاکٹر محمد اسلم)

علم وحکمت کا وہ آفتاب جو گذشتہ نصف صدی سے برصغیر پاک وہند کو منور کررہا تھا، مورخہ ۲۴ رمئی مطابق ۳ ررمضان المبارک بروز جمعہ افطار سے تھوڑی دیر پہلے غروب ہوگیا، یعنی حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی عالم فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ فرماگئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا کی علالت کا سلسلہ طویل رہا، گذشتہ سال مئی کے وسط میں حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کا انتقال ہوا تو ان پر اس سانحہ کا بڑا اثر ہوا، اس کے دو ماہ بعد ان کے بڑے بیٹے عمر سعید آناً فاناً وفات پاگئے، ان کی طبیعت پر اس کا بھی بڑا اثر ہوا، بیٹے کی وفات کے روز انھوں نے ان کو کسی وجہ سے خوب ڈانٹا تھا، وہ گولیاں کھا کر سونے کے عادی تھے، مولانا کا خیال ہے کہ اس روز آزردہ ہوکر انھوں نے مقررہ مقدار سے زائد گولیاں کھالیں، اور اس لحاظ سے وہ اپنے آپ کو قصوروار سمجھنے لگے تھے، گذشتہ اگست میں میرے قیام علی گڑھ کے دوران میں انھیں کتے نے کاٹ لیا، ڈاکٹر نے ان کے شکم میں متعدد انجکشن لگائے، لیکن چند روز بعد وہ جگہ متورم ہوگئی، اور انھیں بخار آنے لگا، ڈاکٹروں نے ملیریا بخار کی تشخیص کی اور انھیں کونین کھلانا شروع کردیا، ضرورت سے زیادہ کونین کے استعمال سے ان کا جگر خراب ہوگیا، اور خون پیدا ہونا بند ہوگیا، خرابی جگر سے یرقان ہوگیا، علی گڑھ یونیورسٹی کے ہسپتال میں بغرض علاج داخل ہوگئے، لیکن افاقہ

نہ ہوا، حکیم افہام اللہ خان صاحب اور حکیم عبدالحمید صاحب کے ہی زیر علاج رہے، لیکن کمزوری دن بہ دن بڑھتی چلی گئی، ان کی علالت بڑھتی گئی ان کی بیٹی مسعودہ سعید کراچی سے علی گڑھ پہنچیں اور ہفتہ عشرہ میں تمام انتظامات کر کے انہیں اپنے ساتھ کراچی لے آئیں کراچی میں ڈاکٹروں کے ایک بورڈ نے ان کا معائنہ کیا، حکیم محمد سعید صاحب نے تمام رپورٹیں ملاحظہ کر کے سرطان کا خدشہ ظاہر کیا، ان کے مثانے میں پتھری پیدا ہوچکی تھی اور متاثرہ جگہ پر سرطان نمودار ہوگیا تھا جسمانی کمزوری اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ مرحوم آپریشن کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے، میں وسط اپریل میں ان کی عیادت کے لیے کراچی گیا، چھ روز ان کے پاس ٹھہرا، لوٹتے وقت دل میں بار بار یہی خیال آرہا تھا کہ کہیں یہ ان کے ساتھ آخری ملاقات نہ ہو۔

۲۴ رمئی کو افطار سے قبل موصوف غسل خانے سے وضو کر کے اپنے کمرے کی طرف جارہے تھے کہ راستہ ہی میں حرکت قلب بند ہوگئی، لاہور میں یہ اطلاع عشاء سے قبل ملی، بھاگ دوڑ اور سفارشوں کے بعد ہوائی جہاز میں ایک سیٹ مل سکی، میری اہلیہ ان کے آخری دیدار کے لیے پہلے ہی کراچی پہنچ چکی تھیں۔

۲۵ رمئی کو دوپہر کے وقت ان کے جنازہ کی نماز ہوئی جس میں کراچی کے علماء اہل علم اور عمائدین نے شرکت کی، گورنر سندھ کی نمائندگی ان کے اے ڈی سی نے کی اور ان کی طرف سے پھولوں کی چادر چڑھائی۔

ان کو دارالعلوم کورنگی میں حضرت مفتی محمد شفیع دیوبندیؒ کے ذاتی احاطہ قبور میں ان کے قریب ہی ابدی آرام کے لیے جگہ ملی ہے، اس مختصر سے قبرستان میں صرف علماء وصلحاء ہی کی قبریں ہیں۔

ان کی وفات کے ساتھ تاریخ کا ایک زریں باب ختم ہوگیا، ۱۹۳۸ء میں مرحوم ندوۃ المصنفین کی تاسیس میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے ساتھ شریک تھے، سینتالیس برس تک برہان کی ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے، برعظیم کے علمی حلقوں میں ان کے اداریے کی بڑی قدر کی جاتی تھی، اور ان کی ذات گرامی کی وجہ سے ندوۃ المصنفین اور دارالعلوم دیوبند کا علمی وزن قائم تھا۔

مولانا اب جہاں پہنچ گئے ہیں، وہاں صرف ہماری دعائیں ہی ان کے کام آسکتی ہیں، میرے خیال میں ان کی مغفرت کے لیے صدیق اکبرؓ اور عثمان ذوالنورینؓ جیسی بلند پایہ تصانیف ہی کافی ہیں۔

وہ آخری سانس تک فرائض شریعت کی ادائیگی میں کوشاں رہے، آخر وقت کمزوری اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ گھر سے باہر نہیں جاسکتے تھے، بلکہ گھر میں ہی بمشکل چلتے پھرتے تھے، اس کے باوجود نماز کھڑے ہوکر ہی ادا کرتے تھے، میرے استفسار پر فرمایا کہ ان دنوں ظہر وعصر اور مغرب وعشاء ملا کر نمازیں پڑھتا ہوں، امام ابن تیمیہؒ نے مریض کے لیے بھی مسافر کی طرح جمع صلوٰۃ کے جواز کا فتویٰ دیا ہے، اور اسی پر ان کا عمل ہے اللہ اللہ کیا لوگ تھے۔ (جون ۱۹۸۵ء)

مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی یاد میں

آہ! جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں

مولانا سعید احمد اکبرآبادی دنیا کے بکھیڑوں، زندگی کے ہنگاموں اور اپنے جھمیلوں سے آزاد ہوکر اب وہاں ہیں جہاں اکرامِ الٰہی کی سلسبیل سے کوئی سیراب ہوجائے تو پھر اس کے لیے وہاں مغفرت کے مینا اور رحمت کے ساغر چھلکتے رہتے ہیں، بارگاہ ایزدی میں ان کے اعمال کی کتاب کھولی جائے گی تو یقین کرنے کو جی چاہتا ہے کہ عدل خداوندی کی میزان میں ان کی نیکیوں اور نیکوکاریوں کا پلڑا بھاری رہے گا، اس جہاں فانی میں ان کی رحلت پر علم سوگوار ہوا، فضل غمناک ہوا اور وہ لمحات بھی مغموم ہوئے جن میں وہ اپنے قلم کی سیاہی سے اپنے داغ دل کو داغ لالہ بنادیتے تھے، میری طرح ان کے بہت سے قدردان ان کو اب یاد کر کے اپنے خشک آنسوؤں کے ساتھ بے چین ہوں گے اور آئندہ ان پر بہت کچھ لکھا جائے گا:

دریں آشوبِ غم عذرم بنہ گرنالہ زن گریم
جہانے را جگر خون شد ہمیں تنہا نہ من گریم

دل کے اس شیون کے ساتھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی یادوں کا جلوس کہاں سے شروع کر کے کہاں ختم کیا جائے، اپنی کج مج بیانی حائل ہورہی ہے، پھر بھی جو سطریں یہاں پر لکھی جارہی ہیں، وہ محض ایک دیرینہ نیازمند اور عقیدت مند کے بارغم کو ہلکا کرنے کے لیے ہیں۔

ان کی پیدائش ۱۹۰۸ء میں آگرہ میں ہوئی، ان کا آبائی وطن بچھرایوں ضلع مرادآباد تھا، ان کے والد بزرگوار ڈاکٹر تھے، اپنی سرکاری ملازمت کی وجہ سے ان کا آخری زمانہ آگرہ میں گذرا تو وہیں سکونت پذیر ہوگئے، اور یہیں مولانا سعید احمد کی ولادت ہوئی، اسی مناسبت سے اکبرآبادی لکھتے تھے، ان کے نام کے اس جز کے ساتھ پرانے اکبرآباد کی بہت سی روایتیں ان کی طبیعت اور روزمرہ زندگی میں پیوست ہوگئی تھیں، اکبرآباد کی تاریخ کی طرح ان کی زندگی میں بھی بڑی رنگارنگی رہی۔

اپنی ابتدائی تعلیم کے بعد دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، وہاں سے سند حاصل کر کے دہلی یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم پائی، پھر اسی کے اسٹیفن کالج میں عربی کے استاد مقرر ہوئے، یہاں ان کی مختلف صلاحیتوں کا اندازہ لگایا گیا، تو کلکتہ کے مدرسۂ عالیہ کے پرنسپل مقرر ہوئے، وہاں ان کی شہرت کو اور چار چاند لگے تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے صدر کی حیثیت سے بلا لیے گئے، یہاں سے ریٹائر

ہوئے تو ہمدرد نگر تغلق آباد نئی دہلی میں ان کی علمی خدمات حاصل کی گئیں، وہیں سے ترقی پوتی یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے بلالیے گئے، پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اسلامک اسٹڈیز میں بھی کچھ دنوں پروفیسر رہے، آخر میں دارالعلوم دیوبند کی شیخ الہند اکادمی کے ڈائرکٹر تھے، اس اثنا میں ان کا علمی سفر کینیڈا، نیویارک، پرنسٹن، لندن، مصر، سعودی عرب اور جنوبی افریقہ وغیرہ کا بھی ہوتا رہا، پاکستان تو خدا جانے کتنی بار وہاں کی علمی کانفرنسوں میں بلائے گئے، ہندوستان کی کوئی اہم علمی کانفرنس ایسی نہ ہوتی جس میں وہ مدعو نہ ہوتے، پھر اپنے سیاسی ذوق کی وجہ سے آل انڈیا مسلم کنونشن کے صدر بھی منتخب ہوئے ان کو جمہوریہ ہند کے صدر کی طرف سے عربی میں سند اعزاز بھی ملا کلکتہ کی ایک ادبی انجمن کی طرف سے دس ہزار کا انعام بھی پیش کیا گیا۔

وہ جہاں رہے، گل رعنا بن کر رہے، کسی علمی کانفرنس میں شرکت کرتے تو اس کے گل سبد بن جاتے، کسی سے ملتے تو گل نیلوفر کی طرح کھلے ہوئے نظر آتے، مجلس میں بیٹھ کر باتیں کرتے تو علم فضل، شعر اور ادب کا گلدستہ بنے ہوئے دکھائی دیتے۔

اس برصغیر کے بڑے اچھے مقرروں میں شمار کیے جاتے، تقریر کرتے وقت اپنی علمیت زبان کی فصاحت، طرز ادا کی بلاغت اور خطابت کی پوری شان دکھاتے، مگر اس میں الفاظ کی بہتات اور خطابت کا تصنع نہ ہوتا، بلکہ ان کو سنتے وقت ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی اہل علم اپنی بصیرت سے اپنے سامعین کے ذہن میں ضیاء پاشی کر رہا ہے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اپنے فن خطابت سے وہاں کے اساتذہ اور طلبہ کو برابر متاثر رکھا، وہ اردو، عربی اور انگریزی تینوں زبانوں کے مقرر تھے، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی اس وقت دنیا کے بہترین خطیبوں اور مقرروں میں شمار کیے جاتے ہیں، لیکن مولانا سعید احمد اکبر آبادی جب کبھی دارالعلوم ندوۃ العلماء پہنچ جاتے تو ان کی تقریر کو سننے اور سنانے کے لیے ضرور کوئی مجلس منعقد کراتے، وہ بولتے تو حضرت مولانا کے چہرے سے ظاہر ہوتا کہ وہ ان کی قوت گویائی سے متاثر ہو رہے ہیں اور تحسین بھری نظروں سے حاضرین کو بھی دعوت دے رہے ہیں کہ وہ بھی حظ اٹھائیں۔

گذشتہ مارچ میں وہ سندھ کے ایک سمینار میں تشریف لے گئے، یہ راقم بھی اس میں مدعو تھا، اس کا افتتاح کراچی میں جنرل ضیاء الحق نے کیا، بڑا اچھا مجمع تھا، پورا ہال اکابر سے بھرا ہوا تھا، مولانا اس مجلس کے مہمان خصوصی بنائے گئے، اس میں ان کو سندھ کی علمی اور ثقافتی حیثیت پر کچھ اظہار خیال کرنا تھا، جب وہ بولنے لگے تو سارا مجمع متاثر نظر آیا، مختصر بولے مگر بہت ہی پیارے انداز میں بولے، جنرل ضیاء الحق کے ساتھ ہر شخص کی زبان پر تھا کہ ایسی پیاری تقریر بہت دنوں کے بعد سننے میں آئی۔

پاکستان میں ان کی مقبولیت راقم نے اپنی آنکھوں سے دیکھی، ۱۹۸۰ء میں پندرہویں صدی ہجری کے آغاز پر اسلام آباد میں ایک بہت بڑی بین الاقوامی کانفرنس تھی، وہ وہاں بلائے گئے تھے یہ خاکسار بھی مدعوئین میں تھا، اس کا افتتاح جنرل ضیاء الحق نے کیا جس کے بعد چائے کا وقفہ ہوا تو جنرل ضیاء الحق کی نظر مولانا پر پڑی، بہت بے تکلفانہ انداز میں ان سے مخاطب ہو کر بولے حضرت آپ کا ایک شاگرد آپ کے سامنے کھڑا ہے، اس کو اسٹیفن کالج میں آپ کی شاگردی کی سعادت حاصل ہوئی تھی، خود مولانا کو اس وقت کے ضیاء الحق کی صورت یاد نہ تھی، دونوں نے بڑی گرم جوشی سے معانقہ کیا، مجمع اس قران اسعدین سے محظوظ ہو رہا تھا، جنرل ضیاء الحق نے رخصت ہوتے وقت ان سے وعدہ لیا کہ وہ ان کے یہاں آکر کچھ دنوں مہمان رہیں گے۔

۱۹۸۴ء کے مارچ میں سندھ کے مذکورۂ بالا سیمینار میں بھی جنرل ضیاء الحق کی نظر مولانا پر پڑی تو بڑی محبت سے ان کو ڈائس پر بلا کر اپنے بغل میں بٹھایا، اور پھر اپنی تقریر میں ان کی تعلیم و تربیت کا بھی ذکر کیا، اس مرتبہ بھی مولانا کو اسلام آباد میں اپنے یہاں مدعو کیا۔

پاکستان میں ان کے ساتھ ایک دلچسپ لیکن عجیب و غریب علمی سفر کی یاد بھی اس وقت بے اختیار آرہی ہے ۱۹۷۶ء میں وہاں کی پہلی بین الاقوامی سیرت کانفرنس میں ہم دونوں مدعو تھے، جب اس کی ایک نشست کراچی میں ہوئی تو حیدرآباد سندھ سے کچھ لوگ مولانا قاری محمد طیب مرحوم سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کو اپنے یہاں کے سیرت کے جلسہ میں مدعو کرنے آئے تو مولانا سعید احمد اکبر آبادی کو بھی دعوت دی، پھر مجھ سے بھی شرکت کرنے کو کہا گیا، میں تو جانے کے لیے تیار نہیں ہوا کیونکہ سیرت کی کانفرنس میں مقالے تو پڑھ لیتا ہوں، مگر کوئی لمبی تقریر کرنے کا عادی نہیں ہوں، وہاں جانے سے انکار کیا، لیکن مولانا نے یہ کہہ کر چلنے پر مجبور کیا کہ مولانا قاری محمد طیبؒ کا وعظ اتنا لمبا ہوجائے گا کہ ہم لوگوں کے بولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا ان کی اس ضمانت پر چلنے کو تیار ہوگیا، دوسرے دن موٹر ہم لوگوں کو لے کر مولانا قاری محمد طیبؒ کی قیام گاہ پر پہنچی تو انھوں نے جانے سے معذرت کی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی پریشان ہوئے، اور میری سراسیمگی کی تو کوئی حد نہ تھی ہم لوگ واپس بھی نہیں ہوسکتے تھے، پریشانی میں جلسہ گاہ پہنچے تو ہزاروں کا مجمع دیکھا جو مولانا طیبؒ کو سننے کے لیے بے چین تھا، نعرۂ تکبیر کی بار بار صدا بلند ہو رہی تھی، ہم لوگوں کے پہنچتے ہی جلسہ شروع کردیا گیا، مولانا مائک پر بلائے گئے، موٹر کے لمبے سفر سے ہم لوگ بالکل تھکے ہوئے تھے، مولانا پر بھی تکان کا اثر تھا، وہ بولنے کے لیے تیار ہو کر بھی نہیں آئے تھے، انھوں نے مجبوراً تقریر شروع کردی، لیکن یہ جم نہیں رہی تھی، میں پریشان تھا کہ اتنے بڑے مجمع میں میرا تو بولنا اور بھی مشکل ہوگا یکایک ایک صاحب میرے پاس آئے، وہ میری کتاب بزم صوفیہ پڑھ چکے تھے، میرے کان میں کہنے لگے کہ صوفیائے کرام کے واقعات سے مجمع کا رنگ بدل جائے گا، کیونکہ یہاں کے لوگ ان کے واقعات بہت شوق سے سنتے ہیں، جب مائک

پر پہنچا تو ان بزرگان دین کی باتیں یاد آتی گئیں، دو چار واقعات سنائے ہوں گے کہ تکبیر کے نعرے بلند ہونے لگے، میرا حوصلہ بڑھا اور مجمع کے ذوق کے مطابق ان بزرگوں کے واقعات دیر تک سناتا رہا، تائید ایزدی بھی ساتھ دیتی رہی، جب بول کر مولانا کے پاس بیٹھا تو انھوں نے یہ کہہ کر گلے لگا لیا کہ ہندوستان کی اچھی نمائندگی ہوگئی، مگر میں نے عرض کیا کہ آپ نے تو یہاں لاکر تختہ دار پر چڑھا دیا تھا، خیریت ہوئی کہ اس پر سے صحیح سالم اتر آیا۔

وہ ایک بہت ممتاز اہل قلم کی حیثیت سے بھی مشہور ہوئے ان کی زبانی بارہا سنا کہ وہ شروع سے مولانا شبلیؒ اور دارالمصنفین کی تصانیف سے متاثر رہے، دیوبند کی طالب علمی کے زمانے میں ان کے پاس ان کتابوں کو دیکھ کر وہاں کے طلبہ اور اساتذہ کو تعجب ہوتا تھا، اور یہ کہنے میں تامل نہیں کہ ان کی ذات اور ان کی تحریروں پر دبستان شبلی کا بڑا اثر رہا، جس کا ایک کھلا ہوا ثبوت یہ بھی ہے کہ جب دہلی میں مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن نے مل کر ایک ادارہ قائم کیا اور اس کی تاسیس میں ان کی بھی شرکت ہوئی تو دارالمصنفین ہی کی تقلید میں اس کا نام ندوۃ المصنفین رکھا گیا اور ہم پھر ان کی ادارت میں رسالہ ''برہان'' ندوۃ المصنفین سے نکلنا شروع ہوا تو اس میں معارف ہی کی طرح خاص خاص عنوانات رکھے گئے، ان کا بس چلتا تو ندوۃ المصنفین کو دارالمصنفین ہی کی طرح ایک علمی ادارہ بنا دیتے مگر بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر یہ اشاعتی ادارہ بن کر رہ گیا۔ پھر بھی اس کی طرف سے اب تک جتنی کتابیں شایع ہوئی ہیں ان سے اردو زبان کے مذہبی اور تاریخی لٹریچر میں بڑا قابل قدر اضافہ ہوا ہے، مولانا کا رسالہ ''برہان''، اس کے لیے اس حیثیت سے مفید رہا کہ اس کی وجہ سے یہ علمی ادارہ ہی سمجھا جاتا رہا۔

مولانا نے اس رسالہ کی ادارت کے فرائض جس شان سے انجام دیئے وہ اردو زبان کی تاریخ میں جلی حروف سے لکھے جائیں گے، ان کا کوئی معاون نہیں رہا، وہ خود ہی اس کے مضامین کے حک و اصلاح اور ترتیب میں لگے رہتے، اس کے لیے لمبے لمبے مضامین بھی لکھتے، اس میں ریویو کے لیے جو کتابیں آتیں، ان پر ریویو بھی قلمبند کرتے، البتہ اس کی کتابت اور طباعت کی ذمہ داری مولانا مفتی عتیق الرحمٰن پر ہوتی، ورنہ سینتالیس (۴۷) سال کی طویل مدت تک ادارت کا سارا کام تنہا ان ہی کے ذریعہ سے انجام پاتا رہا، کسی مہینہ اس کی اشاعت نہیں رکی، جو ان کا زبردست علمی کارنامہ ہے اس میں ''نظرات'' کے عنوان سے ان کی ادارتی تحریریں ہوتیں جن میں ملک کے ہر قسم کے مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کر کے اپنے قلم اور علم کا جوہر دکھاتے رہے، اس کی طرف پورے علمی حلقہ کی نظر اٹھتی رہی بعض اوقات اپنی رائے کا اظہار بڑی جرأت اور بے باکی سے کرتے، نظری حیثیت سے وہ نیشنلسٹ مسلمان تھے، لیکن حق بات میں ان کی نیشنلزم ان کے قلم پر روک نہیں لگاتی، نظرات میں کبھی وہ اپنے مذہبی خیالات کے مروارید بکھیرتے، کبھی اپنے جذبات کے تلاطم سے اپنی تحریر کو پُرشور کر دیتے، کبھی علمی نکتہ آفرینیوں سے اپنے ناظرین کو محظوظ کرتے، کبھی مشاہیر کی وفات پر اپنے غمناک تاثرات کا اظہار کر کے دوسروں کو بھی اپنا شریک غم بنا لیتے، کبھی اس میں ادب و انشا کا سحر دکھا کر اپنی تحریر سے مسحور کرتے، اگر ان کے نظرات کتابی صورت میں مرتب کیے جائیں تو یہ بہت سی جلدوں میں منتقل ہو کر نظر، فکر، روشن ضمیری، خود اعتمادی اور تبحر علمی کے قیمتی راس المال ثابت ہوں گے۔

وہ بہت سی کتابوں کے مصنف بھی ہوئے، جن میں کچھ یہ ہیں، فہم قرآن، غلامان اسلام، وحی الٰہی، صدیق اکبر، مسلمانوں کا عروج و زوال، چار (۴) مقالات، تفشۃ المصدور اور ہندوستان کی شرعی حیثیت، مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے ناقد، حضرت عثمان غنی ذی النورینؓ اور خطبات اقبال پر ایک نظر، ان کی تمام تصانیف پر ایک مستقل کتاب لکھ کر ان کے تصنیفی اور علمی کارناموں کو خراج عقیدت پیش کرنے کی ضرورت ہے، یہاں پر ہم ان کی دو (۲) تصانیف وحی الٰہی اور صدیق اکبر کی کچھ جھلکیاں دکھانے پر اکتفا کریں گے، وحی الٰہی میں وحی کی ضرورت، وحی کی مختلف صورتیں، قرآن اور وحی، خدا کی صفات، وحی اور محققین یورپ، تسلسل وحی اور نزول جبرئیل، قرآن مجید وحی الٰہی کیوں ہے؟ قرآن مجید کا اسلوب بیان اور بعض عیسائی مصنفین پر ان کے جو مباحث ہیں، ان کو پڑھ کر ان کی علمی فضیلت اور جلالت کا بڑا اثر پڑتا ہے، جس ایمانی حرارت اور مذہبی راسخ العقیدگی سے یہ لکھی گئی ہے اس کے بعض مباحث بارگاہ ایزدی میں بھی ضرور مقبول ہوئے ہوں گے، اس کی وجہ تصنیف جس دلچسپ انداز میں بتائی گئی ہے اس کو پڑھ کر اس کتاب کی نوعیت کا نہ صرف اندازہ ہوگا، بلکہ ناظرین کے ایمان میں نور اور ذہن میں سرور پیدا ہو کر ان کے بہت سے شکوک و شبہات کافور ہو جائیں گے، لکھتے ہیں:

''دنیا میں سیکڑوں سوالات ہیں جن کے جواب میں انسان سب کچھ کہنے کے بعد آخر میں ایک ایسے مرحلے پر پہنچتا ہے کہ پھر اس کے لیے جواب کی کوئی گنجائش نہیں رہتی ہاتھی اس قدر فربہ اور توانا کیوں ہے؟ چیونٹی کیوں اتنی نحیف وزار ہے، آم کے درخت پر آم ہی کیوں لگتے ہیں، جامنیں کیوں نہیں پیدا ہوتیں؟ غم سے رونا اور خوشی سے ہنسنا ہی کیوں آتا ہے؟ اس کے برعکس کیوں نہیں ہوتا؟ یہ اور اس کی طرح سیکڑوں سوالات ہیں جن کے جواب کا آخری رتبہ یہ ہے کہ ان تمام اشیاء کے طبعی خواص اور ان کی نوعی مختصات پر محمول کر دیا جائے، پھر اگر اس کے بعد بھی یہ سوال کیا جائے کہ اس شے کی یہ طبعی خاصیت کیوں ہے؟ اور یہی کیوں ہے؟ اور چیز کیوں نہیں، تو اس کے جواب میں ایک ملحد کہے گا کہ مادہ کی ترکیب اسی طرح ہوئی ہے، لیکن موحد جواب دے

گا کہ خدا نے ہر شے کی صورت نوعیہ میں ایک الگ خاصیت رکھی ہے، جواب دونوں کے مختلف ہوں گے، لیکن ہر ایک کا یہ جواب ایک آخری جواب ہوگا اگر اس کے بعد میں سائل کیوں سے سوال کرے تو اس کے جواب میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

وحی کا مسئلہ اسی طرح کے مسائل میں سے ہے، اس کی حقیقت کے سمجھانے میں ہم بتاسکتے ہیں کہ خدا کلام کرتا ہے، خاص خاص انسان (انبیاء) اس کا کلام سنتے اور سمجھتے ہیں، اور ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان دو دعوں پر جو عقلی اعتراضات کیے جائیں ان کو رفع کردیں، لیکن اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص ایسا ہی کیوں ہوتا ہے؟ کہہ کر ہم سے سوال کرے گا تو اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ اچھا پہلے تو ہمارے ہزاروں کیوں کا جواب دے دو، پھر ہم بھی تمھیں سمجھا دیں گے کہ خدا انبیاء میں ہی کیوں کلام ربانی کو سمجھنے کی استعداد رکھتا ہے؟ ہمہ شما میں کیوں یہ صلاحیت نہیں ہوتی؟ زیرنظر کتاب میں وحی الٰہی پر جو بحث کی گئی ہے اس کا مقصد ان ہی سوالات کا جواب دینا ہے جو واقعی ایک طالب تحقیق کے دل میں اس مسئلہ پر غور کرنے کی راہ میں پیدا ہوسکتے ہیں، ان کے علاوہ جو لوگ ازراہ بغض وعناد اپنے کیوں کا سلسلہ کہیں ختم نہیں کرتے وہ اس کے مخاطب نہیں''۔

مولانا کی اس پرکیف تحریر کو پڑھنے کے بعد اس کے ناظرین کے بہت سے مذہبی خیالات میں جلا پیدا ہوسکتی ہے۔

ان کی کتاب صدیق اکبرؓ بہت مقبول ہوئی، انھوں نے اس کے دیباچہ میں اس کے ماخذوں پر جو بحث کی ہے اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا کہ اس کی تدوین کرنے میں کیسی محنت شاقہ کی گئی ہے، پھر جس دلنشین پیرایہ میں یہ شروع سے آخر تک لکھی گئی ہے، وہ اس کی اصلی خوبی ہے، اس میں ان کے ابرقلم کے جو رشحات ہیں ان کے دو چار نمونے یہاں پر پیش کرنے کو جی چاہتا ہے، تاکہ ناظرین میری طرح تھوڑی دیر کے لیے ان کے اسلوب اور طرز بیان سے بھی لطف اٹھائیں، حضرت ابوبکرؓ کی سیرت پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''تاریخ کا ایک طالب علم کہہ سکتا ہے کہ دنیا میں سکندر اعظم، ہنی بال، چنگیز خان، تیمور اور بھی بڑے بڑے فاتح گذرے ہیں، جنھوں نے نہایت عظیم الشان فوجی کارنامے انجام دیے، لیکن سوال یہ ہے کہ دنیا میں کوئی عظیم الشان فاتح ایسا بھی گذرا ہے جس نے دنیا کی تاریخ کا ورق الٹ دیا، لیکن اس کے باوجود اس کے سر پر تاج زرفشاں ہو اور نہ اورنگ سلطانی ہو، معمولی سے معمولی آدمیوں کی طرح رہتا سہتا ہو، اس میں اور دوسرے لوگوں میں شان وشوکت اور وجاہت وسطوت کے اعتبار سے کوئی فرق نہ ہو، وہ محلّہ کی بکریوں کا دودھ بھی دوہ دیتا ہو، رات کے وقت چھپ چھپ کر نابینا عورت کے گھر کا سارا کام بھی کرآتا ہو، معمولی کپڑے پہنتا ہو، موٹا جھوٹا کھاتا ہو، اس کے پاس نہ خدم و چشم ہوں اور نہ محلات وقصور، نہ خزانے ہوں، اور نہ زر وسیم کے انبار، نہ چوکیدار، نہ دربان، ملٹری گارڈ اور نہ پولیس کا حفاظتی دستہ، ایک معمولی سے معمولی انسان بھی برملا اس کو سرراہ ٹوک سکتا ہو، ایک ادنی حیثیت کا شخص بھی بھرے مجمع میں اس سے باز پرس کرسکتا ہو''۔

کیسی موثر اور باوقار تحریر ہے، اس کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب وہ اپنی فوج کو کسی مہم پر روانہ کرنے کے لیے دور تک مشایعت کے لیے جاتے تو اس شان سے کہ وہ خود پاپیادہ ہوتے اور اس کا نوعمر ونوجوان امیر فوجی گھوڑے پر سوار ہوتا، اس کی بیٹی اپنے شوہر کے گھوڑوں کا دلیہ خود دلتی ہو اور پھر نو نو میل اسے سر پر رکھ کر پیدل چلتی ہو، اور خود اس کا اپنا حال یہ ہو کہ وہ کپڑوں کا گٹھرا اپنے سر پر رکھ کر بازار میں پھرتا ہو، بتاؤ فوجی وحربی کامگاری کے ساتھ جمہوریت اور یہ مساوات و برابری، یہ تواضع وفروتنی پوری تاریخ عالم میں کہیں اور بھی نظر آتی ہے؟ اس میں شبہہ نہیں کہ جمہوریت اور مساوات کی جو مثال حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں قائم کی وہ اپنی جگہ بے نظیر ہے، لیکن حضرت ابوبکرؓ کی اس بےنفسی اور انتہائی سادگی کو دیکھ کر حضرت عمرؓ بھی کہہ پڑے، اے ابوبکر! تم نے اپنے بعد میں آنے والوں کے لیے بڑی مشکلات پیدا کردیں، یعنی تمھارے نقش قدم پر چلنا کسی کے بس کی بات نہیں''۔

حضرت ابوبکرؓ کی سیرت کو نمایاں کرنے کے لیے جس دلنواز طرز ادا کی ضرورت تھی اس کو مولانا نے اپنی تحریر کے ذریعہ سے فراہم کیا، پھر ان کو یہ سب کچھ لکھنے میں ایسی لذت ملی کہ ان کا قلم روکے نہیں رُکا، بےساختہ طور پر ان کے قلم سے یہ تحریر بھی نکل پڑتی ہے:

''پھر فاتحین وکشورکشایان عالم میں کتنے ہیں جن کے لشکروں نے شہروں کو نہ اجاڑا ہو، آبادیوں کو ویرانہ میں تبدیل نہ کردیا ہو، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں پر ترس کھایا ہو، کھیتوں کو آگ نہ لگائی ہو، درختوں کو نہ کاٹا ہو، لیکن یہاں کیا عالم تھا، فوج روانہ ہوتی تھی تو بڑی تاکید سے ان امور کی نسبت ہدایات دی جاتی تھیں، اور کسی کی مجال نہ تھی کہ فرمان خلافت سے ذرا سرتابی کرسکے، ان سب چیزوں کا اثر یہ تھا کہ جو لوگ میدان جنگ میں شمشیر آزما بن کر آتے تھے، جب ہوا کا رخ پلٹتا تھا تو ان ہی کی زبانیں فاتحین کے لیے دعائیں کرتی تھیں، جنگ کے ختم ہونے کے بعد جنگ کی ہولنا کیوں کا نام، نشان جنگ سے باہر نہیں نظر آتا تھا، اور ملک میں پہلے سے زیادہ خوشحالی اور آسودگی پیدا ہوجاتی تھی''۔

جو باتیں اوپر لکھی گئی ہیں، وہ کچھ ایسی نئی نہ تھیں جو پہلے کبھی نہ لکھی گئی تھیں، لیکن

مولانا نے ان کو اپنے قلم کی جس گرمی سے لکھا ہے وہی اس تحریر کی جان ہے، ان کو حضرت ابوبکرؓ سے جو والہانہ عقیدت تھی، اس کو والہانہ انداز ہی میں اپنی تحریر میں منتقل کردیا ہے، اور جب وہ یہ لکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ لکھ نہیں رہے ہیں بلکہ بول رہے ہیں اور کانوں میں امرت گھول رہے ہیں:

''جو کام آنحضرت ﷺ کی زندگی میں تکمیل کو نہ پہنچا تھا، خلیفہ اول کے ہاتھوں اس کی تکمیل ہوئی، پوری عرب قوم کو متحد کرنے کے علاوہ قرآن مجید کو جمع کرنا اور اس کو ضیاع سے بچالینا بے شبہ ایک پیغمبرانہ کارنامہ ہے جس کی وجہ سے خود اللہ تعالیٰ کا وعدہ ان علینا جمعہ [القیامۃ:۱۷] پورا ہوا قرآن جس پر اسلامی شریعت کی اساس قائم ہے، اس کو جمع کرکے ہمیشہ کے لیے محفوظ کردینا، زکوٰۃ و صدقات کے احکام کی تبلیغ و اشاعت اور ان کی تفصیل و تشریح، جیش اسامہ کی روانگی، مرتد اور باغیوں کی سرکوبی، مدعیان نبوت کا استیصال، ایران اور روم کی ان کے اسلام دشمن منصوبوں کی بنا پر گوشمالی، اسلام کی تبلیغ و اشاعت، قبائل عرب کا باہمی اتحاد و اتفاق، اسلام کا عربوں کے لیے قومی مذہب بن جانا، یہ سارے اہم کام جو کل سوا دو برس کی مدت میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئے ان سب کو سامنے رکھو اور بتاؤ کہ کیا ان سے صاف طور پر ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت ابوبکرؓ پیغمبر نہیں تھے اور نہ ہو سکتے تھے لیکن ان کے کارنامے پیغمبرانہ تھے، چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ نے ایک مرتبہ فرمایا، اگر ابوبکرؓ نہ ہوتے تو خدا کی عبادت نہ کی جاتی، گویا ثانی اثنین اذھما فی الغار [التوبۃ: ۴۰] کہہ کر پیغمبر آخر الزماںؐ کے ساتھ جس کی جسمانی معیت و رفاقت پر مہر تصدیق ثبت کی تھی، ازل میں اس کے لیے یہ سعادت بھی مقدر کردی گئی تھی کہ جسمانی رفاقت کے ساتھ معنوی اشتراک عمل اور باطنی رفاقت کا بھی اس سے مظاہرہ ہو''۔ (صدیق اکبرؓ، شایع کردہ ندوۃ المصنفین، دہلی ۷۸، ۴،۴۷۷)

اس ایک پیراگراف میں حضرت ابوبکرؓ کے سارے کارنامے سامنے آجاتے ہیں، مولانا نے جس بے ساختگی کے ساتھ ان کو قلمبند کیا ہے اس کی داد ان کو کیسے نہیں مل سکتی ہے، ان ہی ساری باتوں کا اطناب اس کتاب میں ملے گا، اردو میں حضرت ابوبکرؓ پر اتنی مفصل اور سیر حاصل کتاب پہلی دفعہ لوگوں کے ہاتھوں میں آئی، جس میں اس دور کے اہم دینی، سیاسی، فقہی اور تاریخی واقعات اور کوائف پر بڑی جامعیت کے ساتھ مفید مباحث بھی ہیں۔

ان کی یہ کتاب ان کے دستار علم کی ایک بہت ہی تابدار اور زریں کلغی ہے۔

مولانا سے جو عقیدت رہی اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ ان کی تمام کتابوں پر کچھ نہ کچھ لکھ کر لطف اٹھاتا، مگر زیر نظر تحریر تو محض تعزیتی اور تاثراتی ہے، اس لیے اس میں اس کی گنجایش نہیں، اوپر کی کچھ باتیں غیر ارادی طور پر قلم سے نکل پڑی ہیں ان کے عام طرز تحریر کا جب تجزیہ کیا جائے گا تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس میں جہاں ادب و انشا کا جمال ہے، وہاں ان کے اسلوب میں عالمانہ وقار، منطقیانہ وزن اور ماہرانہ استدلال کی متانت بھی ہے، وہ عالم بھی تھے، انگریزی تعلیم یافتہ بھی تھے، اس لیے قدیم و جدید رنگ کی آمیزش سے ان کا قلم بعض اوقات اس مصور کا موئے قلم ہوجاتا جو مختلف رنگوں کے حسین امتزاج سے اپنے آرٹ کو دیدہ زیب اور جاذب نظر بنادیتا ہے ان کو قرآن مجید، احادیث اور فقہ کا ادراک و فہم حاصل تھا، اکابر اسلام سے بے پناہ عقیدت تھی مسلمانوں کے ماضی کی عظمت کا احساس تھا، اس لیے ان کے قلم میں ایمانی حرارت بھی ہوتی، تب و تاب زندگی بھی، دعوتِ اصلاح بھی، درس عمل بھی، سلف صالحین کی قدروں کا احترام اور موجودہ دور کی حریت فکر بھی، روشن ضمیری بھی، اور تھمے ہوئے جذبات کی لہریں بھی، ان اجزائے ترکیبی سے ان کی تحریریں جہاں کہیں بھی چھپی ہوئی دکھائی دیتیں ممکن نہ تھا کہ وہ پڑھی نہ جاتیں، اس طرح ان میں مقناطیسیت بھی تھی۔

راقم سے ان کے ملنے ملانے کی روداد بڑی طویل ہے، پہلی بار ان سے دہلی میں مولانا مفتی عتیق الرحمٰن کے یہاں ملاقات ہوئی، کلکتہ میں جب وہ مدرسہ عالیہ کے پرنسپل ہوئے تو اس بنگلہ میں بھی حاضری دی جہاں ان سے پہلے بہت سے انگریز پرنسپل رہ چکے تھے، وہ علی گڑھ آئے تو جب جب وہاں گیا ان کے دردولت پر یا ان کے شعبہ میں جاکر ان سے ضرور ملا، ۱۹۶۵ء میں وہ دارالمصنفین کی طلائی جوبلی کے موقع پر اعظم گڑھ تشریف لائے، ۱۹۶۹ء میں یہاں علی گڑھ کے اسلامک اسٹڈیز کی ایک کانفرنس ہوئی، تو اس میں بھی شرکت کی، ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین پر یہاں جو سمینار ہوا تو اس موقع پر بھی آکر اس کی رونق بڑھائی، ایک بار اعظم گڑھ کے قصبہ بلریا گنج کے مدرسہ کے طلبائے قدیم کو مخاطب کرنے گئے، تو یہاں بھی تشریف لاکر ہم لوگوں کی عزت افزائی کی، وہ کہتے کہ اور لوگ تو دارالمصنفین پاؤں کے بل آتے ہیں، مگر وہ یہاں اپنی پلکوں کے بل آتے ہیں، اس برصغیر کی علمی کانفرنسوں میں تو برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے سالانہ جلسہ میں یا اس کی کسی اور تقریب میں لکھنؤ آتے تو یہ راقم بھی موجود ہوتا، ہم دونوں جب اور جہاں ملتے تو وہ دیکھتے ہی ایسی تواضع کرتے جو قلاقند سے زیادہ شیریں ہوتی، شاداں وفرحاں ہوکر گفتگو شروع کرتے تو معلوم ہوتا کہ ان کی بذلہ سنجیوں کی مے ارغوانی،

چھلک رہی ہے، اچھل رہی ہے، پیئے ہوئے ہیں پلارہے ہیں

معارف کے کسی مضمون یا شذرات کا ذکر خیر کرنے لگتے تو کہتے کہ تم اپنی نثر میں شاعری کرتے ہو، میں عرض کرتا کہ کاش میں آپ کی طرح ملک الشعرائی کرتا، کبھی کہتے کہ تم جیسے جیسے بوڑھے ہورہے ہو تمھاری تحریر جوان ہوتی جارہی ہے، میں جواب دیتا

کہ لکھتے وقت آپ کی عمر رفتہ کو آواز دیتا رہتا ہوں، کبھی کہتے کہ میری نواسیاں تمھاری تحریر کو میری تحریر سے زیادہ پسند کرتی ہیں، میں کہتا اس لیے کہ آپ نے اپنے پُرتکلف دسترخوان پر ان کو اپنے یہاں کے مرغ مسلم کو دال برابر سمجھنے کی تربیت دی ہے۔

پھر کہتے کہ کیا یہ تصور کرنا صحیح نہیں کہ ہم دونوں کو علم کے دربار عام میں بقائے دوام حاصل ہوگی میں عرض کرتا کہ کہ اس میں تو آپ کے لیے ولادت باسعادت سے پہلے ہی جگہ متعین کردی گئی ہے، میری زندگی میں بہت سی محرومیاں رہی ہیں، یہ محرومی بھی پہلے سے مقدر ہوچکی ہے، وہ اپنی اس قسم کی باتوں کو میری تصانیف پر رسالۂ برہان میں تبصرہ کرتے وقت لکھ بھی جاتے۔

اب وہ نہیں ہیں تو ان کی تمام باتوں کو اپنی یادوں کے شیش محل میں فانوس فروزاں کی طرح برابر جگمگاتا ہوا دیکھتا رہوں گا۔

ان کی استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ سے بڑی گہری عقیدت رہی، وہ جب دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پا رہے تھے تو ان کی خواہش تھی کہ دو تین سال ان کے زیر تربیت رہ کر اپنے تصنیف و تالیف کے ذوق کی تکمیل کریں، لیکن یہ ممکن نہ ہوسکا تو مراسلت کے ذریعہ سے استفادہ کرتے رہے ایک بار اپنی ایک نظم معارف میں چھپنے کے لیے ان کے پاس بھیجی تو انھوں نے اس کو واپس کرتے ہوئے یہ تحریر فرمایا کہ آپ اس نظم نویسی کے چکر میں کہاں پڑ گئے، آپ کے رتبہ سے گری ہوئی چیز ہے، کچھ محنت کیجیے اور مقالہ نویسی پر توجہ کیجیے، قوم کو آپ سے اسی کی توقع ہوسکتی ہے، اور یہی ہونی چاہیے، اس تحریر کا اثر ان کے ذہن پر گہرا پڑا، اور انھوں نے اس کے جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا:

کون ہوں، کیا ہوں، کہاں ہوں، سب حقیقت کھل گئی
تونے وہ ٹھوکر لگائی چشمِ علّت کھل گئی

وہ حضرت سید صاحب کے اعلیٰ رتبہ اور بلند پایہ کے بڑے قائل تھے، اور جب ان کی وفات کے بعد معارف کا سلیمان نمبر نکلا تو اس کے لیے بڑی دلسوزی کے ساتھ ایک بہت ہی عمدہ مضمون لکھا، جس کی ابتداء انھوں نے اس طرح کی ہے:

''مولانا سید سلیمان ندویؒ کی نسبت یہ کہنا کہ وہ ایک بہت بڑے محقق، نامور مصنف بلند پایہ عالم اور صاحبِ طرز انشا پرداز تھے، ایک عام اور معمولی پیرائیہ بیان ہے جس سے مولانا کا اصل مقام اور رتبہ متعین نہیں ہوتا، اور نہ ان کا صحیح حق ادا ہوتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی میں ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے ذہن وفکر اور یہاں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں خواہ وہ طرز قدیم کا ہو یا طرز جدید کا، نصف صدی کے اندر مذاق تصنیف و تالیف، طریق فکر واستدلال اور تہذیبی امیال وعوامل کے اعتبار سے جو عظیم الشان انقلاب ہوا ہے، مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور ان کے علمی و عملی کارناموں کو اس میں بڑا دخل ہے''۔

مولانا کی اس تحریر کی روشنی میں حضرت سید صاحبؒ پر بڑا کام کیا جاسکتا ہے، ان کو دارالمصنفین سے جو لگاؤ رہا اس کا اظہار اپنی ایک تحریر میں اس طرح کیا:

''دارالمصنفین اعظم گڑھ، برصغیر انڈو پاک کا ایک مشہور اور نہایت وقیع ادارہ ہے، جو گذشتہ نصف صدی سے اردو زبان میں اسلامی علوم وفنون کی اہم خدمات انجام دے رہا ہے، اس ادارہ نے سیرت، اسلامی تاریخ، شعر وادب، فلسفہ وتصوف اور تذکرہ وتراجم پر جو کتابیں شایع کی ہیں، وہ مواد، ترتیب اور زبان و معانی کے لحاظ سے کسی بھی زبان کے ادب کے لیے سرمایہ فخر بن سکتی ہیں، آج ہندو پاک میں اسلامی علوم وفنون پر ریسرچ اور تحقیق کا جو سنجیدہ ذوق پایا جاتا ہے، کوئی شبہہ نہیں کہ اس کی آبیاری میں اور چیزوں کے ساتھ ادارہ کی کوششوں کا بھی بڑا دخل ہے، اس ادارہ نے خود کام کیا اور دوسروں کو کام کرنے کی راہ دکھائی اور اس کا ہی یہ نتیجہ ہے کہ آج اردو زبان میں اسلامیات پر ایسا قیمتی اور وسیع لٹریچر پیدا ہوگیا ہے کہ اب کسی اسلامی موضوع پر ریسرچ اردو زبان کے جانے بغیر مکمل ہی نہیں ہوسکتی''۔ (برہان، اکتوبر ۱۹۶۴ء)

پھر اس گہرے لگاؤ کی وجہ سے اس کے ہر فرد سے بڑی محبت کرتے تھے، جناب شاہ معین الدین احمد ندوی سابق ناظم دارالمصنفین کی وفات ہوئی تو بہت ہی دلگیر ہوکر لکھا:

''ان کی وفات کی خبر اچانک سنی تو قلب و دماغ پر بجلی گر پڑی، شاہ صاحب ندوۃ العلماء کے گل سرسبد، نہایت پختہ قلم مصنف، تاریخ اسلام کے وسیع النظر محقق، اردو زبان کے ادیب، اور سو باتوں کی ایک بات یہ کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے صحیح جانشین اور ان کے قائم مقام تھے، اور اس میں شک نہیں کہ تقسیم ہند کے بعد سے ابتک انھوں نے دارالمصنفین کے علمی وقار اور مرتبہ کو قائم رکھا، اور ملک کے نہایت سخت طوفانی دور میں بھی اس باغیچہ علم و ادب کی جس طرح حفاظت کی اور دل و جان سے اس کی آبیاری کی وہ ان کی قبائے فضل و کمال کا تکمۂ زریں ہے علم وفضل اور تحقیق وتصنیف کے علاوہ اخلاق وعادات اور کردار عمل کے اعتبار سے بھی وہ سلف صالحین کا نمونہ تھے، نہایت مخلص، بے لوث، عابد زاہد، خندہ جبین، شگفتہ طبع، ملنسار متواضع اور مرنجاں مرنج تھے''۔ (برہان، جنوری ۱۹۷۵ء)

ان کے دل میں حضرت سید صاحبؒ، دارالمصنفین، اور یہاں کے لوگوں کے لیے جو انتہائی نرم گوشہ تھا اس کے بعد ان کی ذات گرامی کی طرف کیوں نہ کشش ہوتی، وہ محبوب بھی تھے اور حبیب بھی، دلبر بھی اور دلربا بھی:

تصور چاہیے رونے میں اس کے روئے خنداں کا

جب میری کوئی کتاب شایع ہوتی تو اس کو اصرار کر کے ضرور منگواتے اور رسالۂ برہان میں اس پر تبصرہ کرتے، میری حقیر تصانیف بزم تیموریہ، بزم صوفیہ، ہندوستان کے عہد وسطٰی میں فوجی نظام، ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، غالبؔ مدح وقدح کی روشنی میں، اور صوفی امیر خسرو پر اس رسالہ میں جو کچھ لکھ دیا ہے، اس سے ان کے وزن اور اہمیت میں ضرور اضافہ ہوگیا ہے، لیکن بعض اوقات ایسی باتیں لکھ جاتے جن کا مستحق اپنے کو نہ سمجھتا، مثلاً میری کتاب ہندوستان کے عہد وسطٰی کے فوجی نظام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اردو تو اردو کسی زبان میں بھی اس خاص موضوع پر اس قدر عظیم مواد اور وہ بھی اس ترتیب کے ساتھ کہیں یکجا نہ ملے گا، مولانا سید سلیمان ندویؒ کی کتاب عرب و ہند کے تعلقات کے بعد اس پایہ کی دوسری کتاب ہے، جو تاریخ ہند کے ایک بالکل نئے موضوع پر اردو میں پہلی مرتبہ شایع ہوئی ہے اور جس نے اردو لٹریچر کو چار چاند لگا دیے ہیں''۔

(رسالہ بُرہان، دسمبر ۱۹۶۳ء، ۳۸۳)

اس کو پڑھ کر اس حیثیت سے انقباضی کیفیت پیدا ہوئی کہ میری اس کتاب کا ذکر حضرتؒ الاستاذ کی بے مثال تصنیف کے ساتھ نہ کیا جاتا، اس کے بعد مولانا سے فوراً ہی ملاقات ہوئی تو میں نے ان سے احتجاجاً کہا کہ خاک کو عالم پاک سے کیا نسبت جو آپ نے یہ لکھ دیا ہے، کہنے لگے کہ ان پر جو اثر ہوا وہ لکھ دیا ہے، لیکن اپنے متعلق ان کی ایسی تحریروں سے کوئی غلط فہمی یا خوش فہمی کبھی پیدا نہیں ہوئی، البتہ ان کی کریم النفسی اور قلمی فیاضی کے بار سے دبا رہا۔

نومبر ۱۹۸۴ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی طرف سے حضرت سید صاحبؒ پر ایک سیمینار تھا، جس نشست میں مجھ کو اپنا مقالہ پڑھنا تھا اس کی صدارت مولانا ہی نے کی، اپنی صدارتی تقریر میں میرے مقالہ پر اپنی محبت میں بہت کچھ کہہ رہے تھے کہ یکا یک رک گئے، پھر ہنسے اور ہنس کر اپنی تقریر کا رخ دوسری طرف موڑ دیا، جیسے کوئی خاص بات ان کی نوک زبان پر آ گئی تھی، وہ کہنا چاہتے تھے، لیکن کہہ نہ سکے، جلسہ ختم ہوا تو تنہائی میں مجھ سے کہا کہ تمھارے متعلق ایک دلچسپ جملہ زبان پر آ گیا تھا لیکن کہنا مناسب نہیں سمجھا، پوچھا وہ کون سا جملہ تھا؟ برملا کہہ دیا، وہ بھی ہنسے، مجھ کو بھی ہنسی آ گئی، لیکن میں نے اپنی بے تکلفی میں ان سے عرض کیا کہ وہ یہ کہہ دیتے تو میں اس وقت صدارت کی کرسی کے پاس پہنچ کر گریبان گیر ہونے کی جرات تو نہ کرتا لیکن دامن گیر ضرور ہو جاتا۔

اس کے دوسرے دن اپنے گھر پر مدعو کیا، جو علی گڑھ میں ایک بہت ہی آرام دہ بنگلہ بنالیا تھا جس کو اپنی خوش سلیقگی سے سجائے رکھتے تھے، وہ بڑی اچھی رہائش کے عادی رہے، اپنے خورد ونوش کا بھی بڑا اہتمام کرتے، کھانے پر مدعو کرتے تو ان کے دسترخوان کی آرایش دیکھنے کے لایق ہوتی، ان کا بس چلتا تو کھانے کے تمام اقسام سے اس کو سجا دیتے، بہت عمدہ باورچی اپنے یہاں ملازم رکھتے، ان کی دعوت قبول کرنے میں ہچکچاتا، ان کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر اپنے کام و دہن کی لذت کی تسکین تو خوب ہو جاتی، لیکن ان کو اس کے لیے جھمیلوں کا جو سامنا کرنا پڑتا اس کو سوچ کر تردد ہوتا، مگر ان کی زندگی کی ایک بڑی لذت یہی تھی کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھ کر اچھا وقت گزاریں۔

یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی، اس موقع پر ان کی باتوں میں پہلے جیسی شگفتگی اور رعنائی نہ تھی، کچھ عرصے پہلے ان کی رفیقۂ حیات کی رحلت ہوگئی تھی، ان کی دائمی جدائی پر برہان کے نظرات میں جو اپنے غم ناک جذبات ظاہر کیے تھے وہ سوگوارانہ رومانی ادب کا ایک شہ پارہ ہے، ان کے بڑے لڑکے کی وفات بھی ہوگئی تھی، ان کے ہمدم اور غم گسار مفتی عتیق الرحمٰن بھی حال ہی میں ان سے جدا ہو گئے تھے، پھر وہ یکا یک یرقان میں مبتلا ہو گئے، ایک کتے نے بھی ان کو کاٹ لیا تھا اور ان امراض سے وہ جان بر تو ہو گئے تھے، لیکن صحت گر رہی تھی، اپنی ایک لڑکی کی پریشانیوں سے بھی پریشان تھے، مگر دلگیر اور دل فگار ہونے کے باوجود اپنی خوش طبعی کا کچھ نہ کچھ اظہار کرتے رہے، ان کی دو نواسیاں یونیورسٹی میں تعلیم پا رہی تھیں، وہ وہاں سے واپس آئیں تو ان کو دیکھتے ہی پکارا کہ آؤ! معارف کے شذرات یہاں بیٹھے ہیں، ان سے مل لو، ان سب کے ساتھ میں بھی ہنس پڑا۔

کچھ دنوں کے بعد خبر ملی کہ وہ اپنے علاج کے لیے پاکستان چلے گئے ہیں، ان کی خیریت ان کے داماد ڈاکٹر محمد اسلم شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے معلوم کرتا رہا، ۲۴ مئی ۱۹۸۵ء کو یکا یک ریڈیو سے سننے میں آیا کہ وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔

اس خبر کو سنتے ہی آنکھوں کے سامنے فلمی پردہ کی طرح وہ آتے جاتے رہے، وہ آ رہے ہیں، وہ جا رہے ہیں، قدم قدم پر نئے نئے گل کھلا رہے ہیں، سمینار میں بول رہے ہیں، کانفرنس میں مقالہ پڑھ رہے ہیں، اپنے دسترخوان پر طرح طرح کی چیزیں کھلا رہے ہیں، آہ! ان کی ملاقاتیں کیسی پرکیف ہوتیں، ان میں گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح رنگینی اور عطر مجموعہ کی طرح شامہ نوازی ہوتی، ان کے قہقہے، چہچہے، برجستہ اشعار، علمی فکاہات، ادبی مطائبات اور دلچسپ مذاکرات اب کہاں سننے میں آئیں گے۔ ان کے ساتھ جو ساعتیں گذریں اب وہ کسی اور جگہ کہاں میسر ہوں گی، مگر اب ان کی یادوں کی جو تربت میرے دل میں بن گئی ہے، اس کے لوح تعویذ پر ان کی ساری باتیں کندہ ضرور نظر آئیں گی۔

آہ! ان کے بربط ہستی کا سرود اب خاموش ہے، علم کا ایک طائر ملکوتی عالم بقا کی

فضائے بسیط میں پرواز کرگیا، اس برصغیر کا علمی حلقہ ایک باوقار اہل علم، ایک شگفتہ قلم اور ایک باوزن انداز بیان سے محروم ہوگیا، معاشرہ سے ایک خاص آب و رنگ کی شخصیت کی دلآویزی اور رعنائی چھین لی گئی، ان کے دوستوں کی بزم سے ان کے تفردات کی شیوہ بیانی اور شیریں گفتاری ختم ہوگئی، ان کے ہم جلیسوں پر ان کی قربت کا جو نشاط تھا، وہ جاتا رہا، ان کی جبیں پر ان کی شگفتگی جو ہنستی رہتی، وہ اب ان کے ملنے والے کہاں دیکھیں گے، سلام علیک و رحمته الی یوم التلاق۔

اے ذوالجلال والاکرام! ان کی علمی خدمات کی بدولت جس سے انھوں نے بعض اسلامی رویات کو سربلند کرنے کی کوشش کی، ان کے دینی جذبات کی خاطر جن سے وہ کبھی بے حد مضطرب اور بے چین رہے، ان کی بے نفسی اور پاک طینتی کے بدلے میں جن سے وہ اپنے معاصروں میں مقبول رہے ان کو اپنی عاطفت کے سایے میں لے کر وہی جگہ عطا فرما جہاں تیری بے پناہ رحمت کا لازوال نور تاباں اور درخشاں رہتا ہے، آمین ثم آمین۔ (''ص۔ع''، جولائی ۱۹۸۵ء)

پھلواروی، امان اللہ، مولانا شاہ

آہ! حضرت مولانا شاہ امان اللہ پھلوارویؒ

یہ خبر نہایت غم و الم سے سنی گئی کہ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ کے سجادہ نشین حضرت مولانا شاہ امان اللہؒ ۲۵ رشعبان کو دن گذار کر شب جمعہ کو دو بجے عالم جاودانی کو سدھارے، ان کے خاندان، خانقاہِ مجیبیہ پھلواری شریف، پوری ریاست بہار، بلکہ اس سے باہر ان کے جاننے والے حلقوں میں غمنا کی اور سوگواری کی جو کیفیت چھاگئی اس کا صحیح اندازہ ہے، وہ ہزاروں کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنے ہوئے تھے، جو بھی ان سے ملا ان کی نیک نفسی اور پاک باطنی کا نقش اپنے دل پر بنا کر اٹھا، ان کے مریدین تو ان میں ان کے بزرگوں کے زہد و اتقاء کی ساری نشانیاں پاتے، خانقاہ مجیبیہ کی وجہ سے پھلواری شریف کی بڑی اہمیت ہوگئی ہے، یہ پٹنہ ہی کا ایک محلّہ ہے، بہار شریف پہلے پٹنہ ہی ضلع میں تھا، اب نالندہ کا صدر مقام ہے، یہاں بڑے بڑے اولیائے کرام مدفون ہیں، ان کی روحوں کی برکتوں سے پوری ریاست کے مسلمان اب بھی سیراب ہورہے ہیں، پھلواری شریف موجودہ دور کا بہار شریف بنتا جارہا ہے، یہاں کے بزرگوں کی روحیں بھی بہار کے مسلمانوں کی دینی حمیت اور ایمانی غیرت کی ضامن بنی ہوئی ہیں، ان ہی روحوں میں اب جناب مولانا شاہ امان اللہ کی روح شامل ہوگئی ہے، بہار کے لوگ معلوم نہیں ان کی کن کن باتوں کو یاد کرکے کب تک غمزدہ رہیں گے۔

یاد آتا ہے کہ تقریباً ۳۹ سال پہلے دارالمصنفین کے احاطہ میں ایک صاحب چکن کی شیروانی زیب تن کیے سر پر ایک خوشنما ٹوپی، پاؤں میں سلیم شاہی جوتے پہنے اور جوانی نہیں بلکہ نوجوانی کی رعنائی بکھیرتے ہوئے داخل ہوئے ان کی آنکھیں سرگیں تو نہیں، لیکن شرگیں ضرور تھیں، چہرہ کا رنگ گوری چنبیلی کا سا تھا، اس سے درویشانہ جمال عیاں ہورہا تھا، وہ خراماں خراماں بلکہ معطر معطر بڑھتے چلے آرہے تھے، تو آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ حسن کا نور پیکر بن کر متحرک ہے، جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم سابق ناظم دارالمصنفین کا مسکن سامنے تھا، وہ اس کے برآمدہ میں داخل ہوئے تو ان کے ساتھ ایک شخص نے کہا یہ ہیں خانقاہِ مجیبیہ پھلواری شریف کے جناب مولانا شاہ امان اللہ صاحب، اس وقت وہ سجادہ نشین نہیں ہوئے تھے، ہم لوگوں نے ان کی مخلصانہ تواضع کی، دامن دل ان کی طرف بہ صد کرشمہ و ناز کھنچتا چلا جارہا تھا۔

ان کے خانوادہ سے دارالمصنفین والوں کا بڑا لگاؤ رہا، ہم سب کے استاد محترم حضرت مولانا سید سلیمانؒ ندوی نے کچھ دنوں اپنی ابتدائی تعلیم اس خانقاہ میں حاصل کی حضرت مولانا شاہ محی الدینؒ کے زیر تربیت رہے، ان سے بعض کتابیں بھی پڑھیں، نجی صحبتوں میں ان کا جب ذکر آجاتا تو ان کا تذکرہ بڑی محبت اور احترام سے کرتے، ان کی وفات پر اپنے تعزیتی مضمون میں لکھا کہ مجھے خانقاہ (خانقاہ مجیبیہ) میں خاص حضرت شاہ صاحب مرحوم کے قریب قیام اور ایک ساتھ طعام کی اور زیرِ درس کتابوں میں شاگردی کی جو سعادت حاصل ہوئی مجھے اس نسبت پر فخر اور انہیں اس پر مسرت تھی، انہیں جب دیکھتا تھا عہد اول یاد آجاتا تھا اور ان کو بھی خوشی ہوتی تھی، افسوس کہ اس بزرگانہ تبسم کا منظر اب ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے پنہاں ہوگیا۔ (یادرفتگاں، ص ۳۴۸)

مولانا شاہ امان اللہ ان ہی کے اکلوتے صاحبزادے تھے، وہ دارالمصنفین آئے تو ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، ہم لوگ ایک دوسرے سے اس طرح مل رہے تھے جیسے ایک خاندان کے لوگ ملا کرتے ہیں، وہ مل کر چلے گئے تو برابر خیال رہا کہ ان کے ساتھ اچھے لمحات گذرے، گو ہم لوگوں سے عمر میں بہت چھوٹے تھے۔

استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے مولانا شاہ محی الدین پھلوارویؒ پر اپنے درد و غم کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہاں یعنی خانقاہ مجیبیہ میں ظاہر و باطن اور علم و عمل دونوں کے سرچشمے آکر ملتے ہیں، شروع سے اس کے سجادنشین علم شریعت و طریقت دونوں کے جامع رہے ہیں، یعنی ہر صاحب سجادہ صوفی صافی ہونے کے ساتھ علم دین بھی ہوتے آئے ہیں، دستار فضیلت اور خرقہ مشیخت دونوں یہاں ایک جسم پر آراستہ ہے، (یادرفتگاں ص: ۳۹۳) مولانا شاہ امان اللہ میں بھی یہ سارے اوصاف تھے، پھلواری شریف میں تعلیم پانے کے علاوہ اعظم گڑھ، فرنگی محل اور اجمیر شریف جاکر بھی تحصیل علم کی، سند حاصل کرنے کے بعد خانقاہ مجیبیہ کے مدرسہ میں درس بھی دیتے رہے، چار چار حج بیت اللہ کے شرف سے مشرف ہوئے، رسالہ ''المجیب'' میں بھی کچھ نہ کچھ تحریر فرماتے رہتے اپنے حلقہ میں مذہبی استفسارات کے

جوابات بھی دیتے رہتے، دارالمصنفین سے علمی خط و کتابت برابر کرتے رہے، اس راقم کی حقیر تالیف بزم صوفیہ شایع ہوئی تو اس کو خاص طور سے منگوایا، اس میں حضرت جلال الدین جہانیان جہان گشت کے ملفوظات کے ایک مجموعہ سراج الہدایہ کا ذکر تھا، یہ غیر مطبوعہ ہے، اس کو خاص طور سے نقل کرا کے اپنے لیے منگوایا۔

یہ راقم ۱۹۶۷ء میں ایک آپریشن کے لیے پٹنہ کے محلّہ راجندر نگر کے ایک نرسنگ ہوم میں داخل ہوا، جناب شاہ صاحب کو اس کی خبر ہوئی تو پہلے اپنے صاحبزادہ کو بہت سے پھلوں کے ساتھ عیادت کے لیے بھیجا پھر ان کے چچا اور خسر حضرت مولانا شاہ نظام الدینؒ اور ان کے بعد محبّ مکرم مولانا شاہ عون احمد عیادت کے لیے تشریف لائے، اس عزت افزائی سے یقین ہوتا گیا کہ میرا آپریشن کامیاب رہے گا، اور واقعی رہا، خانقاہ مجیبیہ کے آداب میں ہے کہ اس کے سجادہ نشین معمولی ضرورتوں کے لیے باہر نہیں جاتے، اس لیے حضرت شاہ صاحب نے خود تو قدم رنجہ نہیں فرمایا مگر اپنے عزیزوں کو بھیج کر ہر قسم کی کرم فرمائی اور عنایت گستری کرتے رہے، میرے لیے دعائیں بھی جاری رکھیں، یہ پیام بھی برابر پہنچتا رہا کہ آپریشن کے بعد میری حاضری خانقاہ میں ضرور ہو، آپریشن کے بعد چلنے پھرنے کی اجازت ملی تو قدم بوسی کے انتہائی جذبہ شوق کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا، وہاں ان سے ملنے ملانے کے بڑے آداب وضوابط ہیں، مگر انھوں نے فوراً اپنے حجرہ میں طلب کیا، جہاں ایک تخت پر مصلّی رکھا ہوا تھا، فضا معطر ہو رہی تھی، چاروں طرف کتابوں کا انبار تھا، اندازہ ہوا کہ اس مصلّی اور ان کتابوں کے ساتھ تزکیہ نفس اور طہارت طبع کے لیے معلوم نہیں کیا کیا منزلیں طے ہو چکی ہوں گی اور اسی حجرہ میں ان کے بزرگوں نے انوار ایزدی کے سہارے حقیقت و معرفت کے کیا کیا جلوے نہ دیکھے ہوں گے، ان کے چہرے پر نظر پڑی تو ان میں پہلے سا جمال یوسفی نہ تھا، مگر عبادت کے تب و تاب اور ریاضت کی گرم نفسی سے ان کی داڑھی سے تقدس اور چہرے سے درویشانہ بزرگی کے پورے آثار عیاں تھے وہ گذشتہ بیس (۲۰) سال سے اپنے والد بزرگوار کی مسند پر بیٹھ کر خاندانی روایات کو سینے سے لگائے ہوئے تھے، اپنی عمر سے کچھ زیادہ معلوم ہوئے، شاید فغان نیم شبی اور آہ سحر گاہی کا اثر ہو، کچھ اونچا بھی سننے لگے تھے ان کے پاس مودب ہو کر بیٹھنے پر مجبور تھا، باتیں شروع ہوئیں تو عرض کیا کہ بزم صوفیہ کے حقیر مصنف ہونے کے باوجود دل جاری نہ ہو سکا، جہاں پہلے تھا اب بھی وہی ہوں، آپ کی نظر کیمیا اثر کی بھیک مانگنے آیا ہوں، جو جواب ملا اس سے قلب میں تلاطم پیدا ہو گیا، فرمایا اس کی طلب فضول ہے، وہ اس گدی پر بٹھا دیے گئے ہیں اس لیے بیٹھ گئے ہیں، ورنہ اپنے میں نظر کیمیا اثر کہاں، اب جو کچھ حاصل ہوتا ہے اپنی محنت سے ہوتا ہے، گفتگو کچھ آگے بڑھی تو اپنے خانوادہ کا ایک درود شریف عطا کیا، فرمایا اس کو باوضو روزانہ بلا ناغہ پڑھا جائے، یہاں تک کہ سوا لاکھ کی تعداد ہو جائے، تو شاید دل جاری ہو جائے، عرض کیا کہ دعاء فرمائیں کہ اس درود کی توفیق ہو، گفتگو میں دیر ہو رہی تھی تو خادم نے خبر دی کہ دستر خوان لگا دیا گیا ہے، وہاں پہنچا تو یہ بہت پر تکلف تھا، پھلواری شریف کی مخصوص روٹیوں اور مٹھائیوں سے سجا تھا، کھانے کے بعد جناب مولانا شاہ نظام الدین اور جناب مولانا شاہ عون احمد سے مل کر رخصت ہوا تو ایسا محسوس ہوا کہ زندگی کہ بہترین ساعتیں یہاں گذریں۔

پٹنہ جب جاتا تو خانقاہ مجیبیہ میں ضرور حاضری دیتا، اگر بے وقت پہنچتا تو حضرت شاہ صاحب اپنے حجرے میں طلب کر لیتے، وہ نماز باجماعت کے لیے حجرے سے نکلتے تو خدام اور حاضرین دو رویہ باادب کھڑے ہو جاتے، نقیب مسجد میں ان کی تشریف آوری کی صدا دیتے، مسجد میں ان کی مخصوص جگہ بنی تھی، نماز باجماعت ادا کرتے، پھر حجرے میں واپس ہو جاتے، عصر کی نماز کے بعد مغرب تک ایک مخصوص جگہ پر آ کر بیٹھ جاتے، تسبیح پڑھتے رہتے، مریدین، معتقدین اور مستفیدین اس وقت رجوع کرتے، اور معلوم نہیں اپنے دل و دماغ کے لیے کتنے تحفے اور سوغات لے جاتے، کبھی یہ عاجز عصر کے وقت پہنچ جاتا تو اسی مسجد میں ان سے فیض حاصل کرتا، بے تکلفی میں کچھ کہہ جاتا تو ہنس دیتے، جس سے ان کی پان سے آلودہ عقیقی رنگ کی بتیسی کھل جاتی، اس میں بھی ایک خاص کیفیت ہوتی۔

ابھی کچھ دنوں پہلے ان کے چچا اور خسر جناب مولانا شاہ نظام الدینؒ کی وفات ہوئی، جس سے حضرت شاہ صاحب بہت متاثر تھے، ان کے متحرک فیوض و برکات سے پورا بہار فیض یاب ہو رہا تھا، درویشانہ اخلاق و صفات کے اعلیٰ نمونہ تھے، ان کا غم غلط نہ ہوا تھا کہ جناب شاہ عون احمد کے بڑے لڑکے مولوی نصر احمد ندوی جوانی کے عالم میں اللہ کو پیارے ہو گئے، ان سے ہم لوگوں کا عزیزانہ تعلق اس لیے بھی ہو گیا تھا کہ وہ دارالمصنفین آ کر یہاں تین (۳) سال تک رہے، اپنی کم عمری کے باوجود غیر معمولی علمی صالحیت اور اچھی مضمون نگاری کا ثبوت دیا، معارف میں ان کا مضمون ''امام الحرمین'' پر شایع ہوا تو لوگوں کو یقین نہیں آیا کہ کسی کمسن لڑکے کا لکھا ہوا ہے، اس کم عمری میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے جوار رحمت میں لے لیا۔ ۴/ دسمبر ۱۹۸۵ء کو راقم رفقائے دارالمصنفین کے ساتھ ان کی تعزیت کے لیے خانقاہ مجیبیہ میں حاضر ہوا تھا، تو جناب مولانا شاہ عون احمد کے علاوہ حضرت شاہ صاحبؒ سے بھی ملنے کا شرف حاصل ہوا تھا، عصر کی نماز کے بعد اپنے مصلّے پر فروکش تھے، ان کے پاس جا کر بیٹھا تو جب جب ان کی طرف نظر اٹھی، بنوع دیگر اٹھی، کیا معلوم تھا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہے۔

عزیزی نصر احمد کی جوانمرگی کا غم حضرت شاہ صاحبؒ کے دل سے ابھی دور نہ ہوا تھا کہ خود نہ صرف اپنے خاندان کے لوگوں بلکہ خدا جانے کتنے مداحوں اور عقیدت مندوں کو بسمل کی طرح تڑپنے کے لیے چھوڑ کر عالم جاودانی کو سدھارے، رحلت کے وقت ان کی

عمر عیسوی سنہ کے لحاظ سے ۶۴ سال تھی، ان کی ولادت مسعود ۱۹۲۱ء میں ہوئی تھی۔

ان کا حجرہ سونا ہوگیا، ان کے خدام ان کو حجرہ سے نکل کر مسجد میں آتے نہ دیکھ سکیں گے، ان کے متبعین اور خانقاہ کے زائرین عصر کی نماز کے بعد مسجد میں ایک مصلّٰی پر بیٹھا ہوا دیکھ کر اپنے دلوں کو سرور نہ پہنچا سکیں گے، بہار ایک پاکیزہ اخلاق رکھنے والے شیخ سے محروم ہوگیا، لیکن انھوں نے اپنی درویشانہ صفات کی بدولت اپنے خاندانی بزرگوں کی روایت، عزت اور وقار کو قائم رکھ کر اپنے خرقہ طریقت کا وزن جس طرح قائم رکھا، اس کی یاد آئے گی اور اکثر آئے گی، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو اپنی رحمت کے کوثر اور مغفرت کی تسنیم سے اعلیٰ علیین میں سیراب رکھے، اور ان کے غمزدہ اور سوگوار پسماندگان کو اپنی نصرت بیکراں سے سرفراز کرے، آمین، ثم آمین۔ (''ص۔ع''، جون ۱۹۸۵ء)

محمود الحسن، مولوی

آہ! مولوی محمود الحسن

اس مہینہ کے معارف کی طباعت ختم ہو رہی تھی کہ یکایک خبر ملی کہ مولوی محمود الحسن ناظم انجمن تعلیمات دین، اپنے بچوں، عزیزوں اور قدر دانوں کو چھوڑ کر اب وہاں ہیں جہاں نیکوں، پاکبازوں، صفاکشوں کو سرور جاودانی اور حیات ابدی ملتی ہے، ان کی دائمی جدائی پر کچھ آنکھیں نمناک اور اشکبار ہوں گی، لیکن انجمن تعلیمات دین کے کارکنوں اور ہمدردوں کی آنکھوں سے خون کے آنسو بھی جاری ہوں گے تو اس سے ان کی دائمی رحلت کی غم ناکی اور دردناکی دور نہ ہو سکے گی، ان کی وفات کچھ ایسا ہی جاں گسل سانحہ ہے۔

وہ انجمن تعلیمات دین کے بانیوں میں سے تھے، ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد چند مردان خدا کی بدولت یہ انجمن قائم ہوئی تو زبان حال سے یہ کہہ رہی تھی:

یہ دور اپنے ابراہیمؑ کی تلاش میں ہے

اس انجمن نے اترپردیش میں جو کام انجام دیے ہیں، وہ مسلمانوں کی ملی تاریخ کا ایک زریں کارنامہ ہے، اس کے ذریعہ سے بے شمار دینی مکاتب قائم ہوئے، جن سے اترپردیش کے مسلمان بچوں کی دینی حمیت اور ایمانی غیرت کے ثبات ویقین کا سامان فراہم ہوا، جناب عدیل عباسی مرحوم نے اس کارواں کے یکہ تاز بن کر جس طرح رجز خوانی کی، اس سے انجمن کا کام بہت آگے بڑھا، ان کے یمین ویسار میں مولوی ظفر احمد صدیقی مرحوم وکیل اور مولوی محمود الحسن رہے، جس سے اس کے کام کو غیر معمولی فروغ ہوا، مصلحت خداوندی سے جناب عدیل عباسی مرحوم اور جناب ظفر احمد صدیقی مرحوم، مولوی محمود الحسن کو تنہا چھوڑ گئے، مگر وہ اس کے لیے عمل پیہم اور یقین محکم بلکہ سوز دروں، درد پنہاں اور روح جاں گسل بنے رہے، وہ کسی مجلس میں بیٹھ جاتے تو معلوم ہوتا کہ انجمن تعلیمات دین بیٹھی ہے، وہ بولتے تو انجمن بولتی دکھائی دیتی، سفر کرتے تو انجمن ہی متحرک نظر آتی، ان کی کبرسنی، صحت کی کمزوری، سفر کی دشواری، ان کے عزم بالجزم میں رکاوٹ کبھی نہیں رہی، وہ ہر جگہ پہنچتے، للّٰہیت ان کی راہ نما ہوتی، اخلاص ان کے جلو میں ہوتا، ان کی حرکی قوتیں ان کا ساتھ دیتی رہتیں، جہاں گئے کامران اور کامیاب بن کر واپس ہوئے، ان کے بعد انجمن کی نرگس اپنی بے نوری پر ضرور روئے گی، لیکن اس کے موسسوں کی پاکیزہ نیت، مخلصانہ جذبہ اور خود اس کی افادیت، اس کے کام کو برقرار رکھنے کی ضامن ہے، اور اسی سے اس کے کارکنوں کو نیا حوصلہ ملتا رہے گا، جس سے امید ہے کہ یہ انجمن اپنی پرانی روایات کے ساتھ پہلے ہی کی طرح سرگرم عمل رہے گی، اس کی آواز ویسی ہی اذان بن کر رہے گی، جس سے دل کہسار ہل جاتا ہو، انجمن تعلیمات دین کی جب تاریخ قلمبند کی جائے گی تو مولوی محمود الحسن کی بھی تاریخ لکھی جائے گی، جنھوں نے لالۂ صحرائی بن کر اپنی۔

؎ خاموشی و دل سوزی و سرمستی و رعنائی

کے ساتھ اس کی خدمت کی، وہ بستی کے ایک معزز خاندان سے تھے، جناب عدیل عباسی کے سگے بہنوئی تھے، مگر ان کی اصلی سوانح عمری یہ ہے کہ وہ انجمن تعلیمات دین کے لیے زندہ رہے، اس کے لیے وفات پائی، اب وہ نہیں رہے، مگر ان کی نیکیوں کی بدولت ان کی ابدی خوابگاہ پر کرم الٰہی کا ابر برابر چھایا رہے گا، ان کے کاموں کی نوعیت، مغفرت کے پھول ان پر نچھاور کرتی رہے گی، آمین، اور ان کی یادیں اس وقت تک باقی رہیں گی، جب تک انجمن کا کام جاری رہے گا۔ (''ص۔ع''، نومبر ۱۹۸۵ء)

سلطان، شوکت

آہ! شوکت سلطان

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

۸/۹ جنوری ۱۹۸۶ء کو دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں اسلامی ادب پر ایک بین الاقوامی سیمینار تھا، جس میں ہندوستان کے علاوہ عرب ممالک کے علماء اور فضلاء بھی کافی تعداد میں شریک تھے، وہیں جناب سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے یہ اندوہ ناک خبر دی کہ شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج کے سابق پرنسپل جناب شوکت سلطان کی وفات ہوگئی، یہ خبر سننے کے لیے تیار نہ تھا، اعظم گڑھ سے ۶/ جنوری کو لکھنؤ گیا تھا، اس وقت تک ان کی کسی علالت کی کوئی اطلاع نہ تھی وہ اپنی بڑی لڑکی سے ملنے علی گڑھ گئے ہوئے تھے، اعظم گڑھ سے لکھنؤ ان کی وفات کی کوئی خبر نہیں تھی، بے حد پریشان اور ملول ہوا، خیال ہوا کہ علی گڑھ سے ان کی میت اعظم گڑھ ضرور

آئے گی، اورشبلی منزل کے احاطہ ہی میں ان کی ابدی آرام گاہ بنائی جائے گی، نہایت پریشانی میں لکھنؤ سے اعظم گڑھ روانہ ہوا، کہ شاید جنازہ میں شرکت ہوجائے، یہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ ۳۰/دسمبر ۱۹۸۵ء کو اپنی اہلیہ کے ساتھ لڑکی سے ملنے کے لئے للت پور گئے، ۵/جنوری کو فجر کی نماز کے لیے اٹھے، وضو کا پانی مانگا تو کچھ تکلیف محسوس کی، چارپائی پر لیٹ گئے تو پھر ابدی نیند سو گئے، وہیں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کی آغوش میں سپرد کردیے گئے، اس سانحہ کی خبر ۸/جنوری کی شام کو اعظم گڑھ پہنچی، میں ۱۰/جنوری کو دارالمصنفین پہنچا تو جمعہ کی نماز کے بعد اسی کے احاطہ میں ان کے جنازہ کی غائبانہ نماز پڑھی گئی، اس میں شریک تو ہوگیا، مگر یہ خیال اب تک چھایا ہوا ہے کہ جہاں ان کی زندگی پروان چڑھی، جہاں کے لوگوں کے دلوں میں انھوں نے جگہ بنائی تھی، جہاں کی تاریخ میں ان کے روشن کارناموں کی یاد برابر باقی رہے گی، وہاں سے دور ایک دیارِ غیر میں ان کی آخری آرام گاہ بننے میں کیا مصلحتِ خداوندی ہے، ان کے وطن میں ان کا جنازہ دھوم سے اٹھتا، یہاں کے قابل ذکر ہندو مسلمان میں شاید ہی کوئی ایسا ہوتا جو اس میں شریک نہ ہوتا، اور ان کے کارنامے کا ذکر ان کی نوک زبان پر نہ ہوتا، اس فانی دنیا کی زمین کا ہر خطہ تو اللہ تعالیٰ ہی کا ہے، وہ جس جگہ سپرد خاک کیے گئے وہ بھی رب العالمین ہی کی ہے، مگر یہ اعظم گڑھ کی سرزمین کی محرومی ہے کہ اس کے ایک نامور فرزند کی تربت اس کے یہاں کے بجائے اس نیلے فام آسمان کے نیچے کہیں اور بن گئی۔

ان کا سال پیدائش ۱۹۱۳ء تھا، بہتر (۷۲) سال کی زندگی گذار کر ۵/جنوری ۱۹۸۶ء کو اپنے اہل وعیال، عزیزوں اور قدر دانوں کو اپنی یاد میں آنسو بہانے کے لیے چھوڑ گئے، ان کی اچانک موت انسانی زندگی کے لیے یہ پیام ہے کہ زندگی کیا ہے محض ایک طائر ہے جو، شاخ پر بیٹھا، کوئی اور چہچہایا، اڑ گیا

ان کی زندگی طوفانی ہنگاموں کی تو نہ تھی، لیکن تعمیری کاموں سے ضرور معمور رہی، وہ اعظم گڑھ کے ایک بہت ہی سربرآوردہ خاندان سے تھے، ان کے دادا جناب مرزا محمد سلیم نے دیوبند میں تعلیم پائی، مگر وکالت کا پیشہ اختیار کیا، علامہ شبلی نعمانی نے اپنے باغ میں دارالمصنفین قائم کیا تو جناب مرزا محمد سلیم نے اسی سے ملحق اپنے باغ کی زمین بھی اس کے لیے وقف کی، ان کے فرزند ارجمند جناب مرزا سلطان احمد اپنے زمانہ کے بڑے نامی گرامی سرکاری عہدیدار تھے، پہلے ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر فائز ہوئے، پھر ترقی کرکے کلکٹر ہوگئے، آخر میں بورڈ آف ریونیو کے ممبر بن کر پنشن پائی، وہ اپنی شرافت اخلاق کے لیے بھی مشہور رہے، ان کا دل ہیرے کی طرح صاف اور شفاف تھا، وہ دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے بھی رکن رہے، ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی جناب مرزا احسان احمد نے بھی اس ادارہ کی مجلس انتظامیہ کا رکن بننا منظور کیا، وہ بڑے اچھے شاعر اور ادیب کی حیثیت سے بھی مشہور تھے، جگر مرادآبادی کو ان ہی نے شعر و ادب کی دنیا میں روشناس کیا، جناب شوکت سلطان، جناب مرزا سلطان احمد کے بڑے لڑکے اور مرزا احسان احمد کے بھتیجے تھے، ان کی شادی علامہ شبلی نعمانیؒ کی منجھلی پوتی سے ہوئی تھی، دارالمصنفین سے ان کے خاندانی تعلقات کی وجہ سے اس کی مجلسِ انتظامیہ و مجلس ارکان کے رکن بھی بنائے گئے۔

انھوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔اے اور ایل۔ایل بی بھی کیا، اعظم گڑھ میں کچھ دنوں وکالت کرنے کے بعد شبلی نیشنل کالج میں فارسی کے لکچرار ہوگئے، جس کے بعد وہ اس کالج کے لیے لازم وملزوم بن گئے، یہ کالج ۱۹۴۰ء تک محض ایک ہائی اسکول تھا، مگر اس کی اہمیت اس لیے تھی کہ علامہ شبلی نعمانیؒ نے اس کو ۱۸۸۴ء میں قائم کیا تھا، جب جناب بشیر احمد صدیقی مرحوم اس کے ہیڈ ماسٹر ہوئے تو انھوں نے اپنی مساعی جمیلہ سے اس کو ۱۹۴۰ء میں انٹر کالج بنایا جو اس ضلع میں پہلا انٹر کالج تھا، اس لیے اس کے معرض وجود میں آنے پر غیر معمولی خوشی منائی گئی، جناب بشیر احمد صدیقی ہی کی کوشش سے یہ انٹر کالج ۱۹۴۶ء میں ڈگری کالج ہوگیا، اور جب وہ یہاں سے ۱۹۵۰ء میں پاکستان جانے لگے تو انھوں نے جناب شوکت سلطان کو اپنا جانشین بنایا۔

پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہونے کے بعد انھوں نے اپنی دانا، بینا اور توانا شخصیت کو بہت ہی متحرک، جاندار، بارسوخ اور بااثر بنادیا، تعلیم کے کسی محکمہ میں پہنچ جاتے تو مشکل سے مشکل کام اپنی خواہش کے مطابق کرالیتے، یہ کالج پہلے آگرہ یونیورسٹی سے ملحق تھا، پھر گورکھپور یونیورسٹی سے منسلک ہوگیا، ان دونوں یونیورسٹیوں کے کسی جلسہ میں شریک ہوتے تو ان کی موثر شخصیت ان کے جلو میں ہوتی، کسی بھی دفتر کے قلم کو اپنی پاٹ دار آواز کی تلوار سے کاٹ کر رکھ دیتے، وہ کسی منطقیانہ نتیجہ کو ثابت کرنے میں صغریٰ کو کبریٰ اور کبریٰ کو صغریٰ بنانے میں ماہر تھے، وہ جب کسی سے باتیں کرتے تو اپنی آواز کی کڑک اور گرج سے اپنے مخاطب کو سرنگوں ہونے پر مجبور کردیتے۔

وہ کالج میں پرنسپل کے کمرہ میں ہوتے تو اس کے در و دیوار بھی ان کے سامنے جھکتے نظر آتے، وہ اس کمرے سے نکل پڑتے تو معلوم ہوتا کہ کوئی ضیغم اپنے کچھار سے نکل پڑا ہے، اساتذہ، طلبہ اور تمام ملازمین اپنی اپنی جگہوں پر ساکت و صامت دکھائی دیتے، اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں مشغول ہوجاتے، یو۔پی کے ڈگری یا پوسٹ گریجویٹ کالجوں کے نامور پرنسپلوں کی جب کبھی تاریخ مرتب کی جائے گی تو اس میں ان کا ذکر خیر جلی حرفوں سے کیا جائے گا، ان کا ایک بہت بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اس کالج کو یہاں کے لوگوں کی تعلیمی امیدوں کا مرغزار اور ان کی زندگی کی امنگوں کا سمن زار بنادیا، جب یہ ڈگری کالج بنا تھا تو خیال تھا کہ یہ مشکل سے اپنی زندگی کے مراحل طے کرسکے گا، مگر انھوں نے اپنی غیر معمولی کارکردگی سے اس میں پہلے لا کلاس، پھر بی ایڈ کلاس کھلوائے، اور پھر بہت جلد سوشیالوجی، اردو، ہندی، سائیکولوجی، جغرافیہ،

فزکس، کیمسٹری، زولوجی، بوٹونی اور میتھمیٹکس کے لیے ایم۔اے کلاسز کھلوانے میں کامیاب ہوئے، وہ اپنی اس کامیابی پر بجا طور سے ناز کرسکتے تھے، ضلع کے لوگ بھی برابر ان کو یاد کرکے ان کی ذات پر فخر کریں گے کہ ان کی وجہ سے گھر گھر اعلیٰ تعلیم پھیلی، اب تک اس کالج کی بدولت خدا جانے کتنے وکیل ہوچکے ہیں، بی ایڈ کی ڈگری کی وجہ سے سینکڑوں خاندانوں کی پرورش ہورہی ہے، بہت سے طلبہ سائنس کی تعلیم پاکر ملک کے مختلف حصوں میں برسرروزگار ہوگئے ہیں، وہ اگر ریٹائر نہ ہوتے تو شاید انجینئرنگ اور میڈیکل کالج قائم کرکے اس کو یونیورسٹی بھی بنادیتے، ان کے زمانہ میں بڑی بڑی عمارتیں بھی تعمیر ہوئیں، وہ اس کے احاطہ میں گھومتے تو اس کو دیکھ کر ایسے ہی خوش ہوتے جیسے ایلورا اور اجنتا کے مصوروں کو اپنی مصوری دیکھ کر خوشی ہوتی ہوگی، اس کے در و دیوار ان کو یاد کرکے برابر کہتے رہیں گے۔

؎ یاد سے تیری دلِ درد آشنا معمور ہے

کالج کے نظم و نسق میں وہ فولاد کی طرح سخت رہے، اس کی خاطر ان کی زبان بھی فولادی بن جاتی، مگر ان کا دل حریر دیبرینان کی طرح نرم رہا، ان کے والد بزرگوار ہی کی طرح ان کا دل ہیرے کی طرح صاف اور آبدار تھا، اپنی پرنسپلی کے زمانہ میں کسی کو مالی نقصان نہیں پہنچایا، ان کے ماتحت ازکاررفتہ یا مفلوج ہی کیوں نہ ہوجاتے، ان کو کسی نہ کسی طرح کالج کی ملازمت سے وابستہ رکھتے۔

ان کی نجی زندگی بڑی پاکیزہ رہی دو (۲) مرتبہ حج بیت اللہ کا شرف حاصل کیا، صوم وصلوٰۃ کے بڑے پابند رہے، شاید ہی کبھی رمضان شریف کے روزے چھوڑے ہوں، نماز باجماعت کا بڑا اہتمام کرتے، فجر کی نماز کے بعد تلاوت کلام پاک ضرور کرتے، ریل کے سفر میں بھی پلیٹ فارم پر بیٹھے تلاوت کرتے دکھائی دیتے، رمضان شریف میں کبھی بارہ تیرہ ختم قرآن کرتے، اشراق، چاشت اور اوابین کے بھی پابند ہوگئے تھے، بزرگان دین کی خدمت میں بھی حاضر ہونے کا شوق تھا، کبھی کبھی رمضان شریف کے آخری عشرہ کے کچھ دن ان کے یہاں گذارتے، غیبت سے سخت نفرت کرتے، کسی کو کچھ کہنا ہوتا تو برملا اس کے منہ پر کہہ دیتے، اس کی غیبت کرنا یا سننا پسند نہ کرتے، غریبوں کی مدد کرنے میں پیش پیش رہتے، زکوۃ پابندی سے ادا کرتے، موت سے بالکل نہیں ڈرتے، ان کو شاید یہ خیال کبھی نہیں آیا کہ

؎ موت اک چبھتا ہوا کانٹا دلِ انسان میں ہے،

اپنی آخر زندگی میں وہ اس کا ذکر کرتے تو معلوم ہوتا کہ

؎ موت سے ہورہے ہیں نازو نیاز

وہ للت پور پہنچے تو ایک روز گھومتے ہوئے وہاں کے قبرستان پہنچ گئے، اس کو دیکھتے ہی بولے بڑی خوبصورت جگہ ہے، کیا معلوم تھا کہ ان کے حسن انتخاب کی داد ان کو فوراً ہی مل جائی گی، ان کو سفر کرنے کا بڑا شوق رہا، حضر سے زیادہ ان کو سفر پسند تھا، کھانے اور کھلانے کا بھی ذوق رہا، بہت کم کھاتے، مگر دعوتوں میں شریک ہوکر بہت لطف اندوز ہوتے۔ دارالمصنفین سے ان کو بڑا قلبی لگاؤ رہا، اس کی تعمیر اور ترقی کے مشوروں میں برابر شریک رہے، اعظم گڑھ میں اس ادارہ کے باوقار قدردانوں اور باوزن ہمدردوں کا جو پرانا حلقہ تھا، اس میں زیادہ تر اس دار فانی سے رخصت ہوچکے ہیں، مرزا سلطان احمد، مرزا احسان احمد، مرزا مرتضےٰ بیگ، اقبال سہیل، شاہ محمد اسحاق وکیل، شاہ علاء الحق وکیل، محمد صابر مختار، ظہور احمد مختار، قاضی محمد صادق وکیل، صلاح الدین وکیل، ضیاء الدین وکیل، حکیم محمد اسحٰق، مبین احمد ڈپٹی کلکٹر صاحبان دارالمصنفین سے جو مخلصانہ تعلقات رکھتے تھے اس کی یادوں کی جوت سے ذہن اب بھی جگمگا اٹھتا ہے، شوکت سلطان صاحب اپنی وضعداری اور محبت میں اسی زریں سلسلہ کی ایک کڑی تھے، اجل نے اس کے ایک اور مہربان کو اس سے چھین لیا۔

وہ دنیا سے اس لحاظ سے خوش اور مطمئن گئے کہ ان کے تینوں لڑکے اچھے اچھے عہدوں پر مامور ہیں اور ان کے تینوں داماد بھی اچھی اچھی ملازمتوں پر فائز ہیں، وہ اپنی تمام اولاد کی زندگیوں کی بہاریں دیکھ کر گئے، البتہ ان کی اہلیہ اب ان کی یادوں کے سوز پنہاں کا مزار اپنے دل کے اندر بنائے رکھیں گی، ہاں یادش بخیر ان کی ساس یعنی علامہ شبلی نعمانیؒ کی بہو ابھی بقید حیات ہیں، اس سے پہلے اپنے بڑے اور منجھلے داماد کی وفات پر خون کے آنسو، بہا چکی ہیں، اس سانحہ کے بعد ان کے دیدۂ گریاں اور دلِ بریاں کی جو کیفیت ہوگی اس کا صرف اندازہ کیا جاسکتا ہے، دعا ہے کہ اس خاندان کو صبر جمیل عطا ہو، آمین۔

مرحوم سے میری ملاقات ۱۹۳۵ء میں ہوئی، جب ان کا مستقل قیام اعظم گڑھ میں رہنے لگا تو روز بروز ان سے قریبی تعلقات بڑھتے گئے، خدا جانے کتنے مسائل اور معاملات میں ان کا تعاون حاصل رہا، ایسا بھی ہوا کہ وہ کبھی تیز اور گرم گفتگو کرجاتے، مگر ان کی بڑی خوبی یہ تھی کہ تھوڑی ہی دیر میں یہ محسوس کرادیتے کہ جیسے کوئی گفتگو ہی نہیں ہوئی، اس لیے ہم دونوں کے تعلقات میں کبھی ناخوشگواری اور دوری پیدا نہیں ہوئی، بلکہ ان کے اخلاص اور محبت پر مکمل اعتماد رہا۔

جانے والے تو جا چکا، جا! الوداع! خدا حافظ، تجھ کو سلام، ہزاروں سلام، تجھ پر لاکھوں سلام، ہر بنِ مو سے یہ دعا نکل رہی ہے کہ تیری لحد میں رحمت الٰہی تیری ہم آغوش ہو، برکتِ خداوندی تجھ سے ہم کنار ہو، اور بارگاہِ ایزدی میں اس کے بے پایاں اکرام کی کوثر اور بے انتہا الطاف کی تسنیم سے تو برابر سیراب ہوتا رہے، آمین ثم آمین۔

("ص ۔ ع"، جنوری ۱۹۸۶ء)

امین الدین

پیارے امین الدین صاحب!

اٹھ گئیں سامنے سے کیسی کیسی صورتیں
روئیے کس کس کو اور کس کا ماتم کیجئے

جناب شوکت سلطان کی وفات پر دل بے انتہا پژمردہ اور افسردہ تھا کہ دارالمصنفین کے ایک اور انتہائی ہمدرد، مونس اور غم گسار کی رحلت پر آنکھیں پھر اشکبار ہوئیں، اور وہ جناب امین الدین صاحب تھے، وہ کوئی صاحب قلم نہ تھے، شاعر بھی نہ تھے، علی گڑھ کے ایم۔اے، ایل۔ایل۔بی تھے، وکالت شروع کی، تو شہر میں مقبول بہت ہوئے، کچھ دنوں حکومت ہند کے آرڈنینس محکمہ میں بھی ملازم رہے، وہاں سے مستعفی ہوکر آئے۔تو آنریری مجسٹریٹ ہوئے، پھر ریونیو افسر ہوگئے اور آخر میں شبلی نیشنل کالج میں قانون کے استاد اور اس کے شعبہ کے صدر ہوگئے۔ وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد خوش لباس، خوش رہائش، خوش کلام اور خوش باش بن کر بقیہ زندگی گزاری اور بالآخر ایک طویل علالت کے بعد ۳۱/جنوری ۱۹۸۶ء میں تقریباً ۸۵ برس کی عمر میں اپنے مالک حقیقی سے جاملے، اناللہِ وَاِنّا اِلیہ رَاجعُونَ۔بس یہی ان کی زندگی کی مختصر روداد رہی ہے، مگر انھوں نے ۱۹۳۰ء سے دارالمصنفین سے جس اخلاص، وضعداری اور محبت سے اپنے تعلقات کا سونا پگھلایا تھا وہ اس ادارہ کے لئے بیش قیمت سرمایہ رہا، وہ اس کے کسی قسم کے عہدیدار بھی نہ تھے، اس کی کسی مجلس کے رکن بھی نہ ہوئے لیکن ہر لمحہ اس کے دمساز رہے، وہ اس کے پھاٹک میں داخل ہوتے ہی اپنی محبت کے پھول بکھیرتے نظر آتے، اپنی بذلہ سنجیوں، لطیفہ گوئیوں اور شیریں بیانیوں سے ہم میں سے ہر شخص کو شاداں وفرحاں اور یہاں کی مجلس کو زعفران زار کردیتے، یہاں کی دعوتوں میں شریک ہوتے تو دسترخوان کو اس کے کھانوں سے زیادہ اپنی گفتار کی شیرینی سے لذیز تر بنادیتے، وہ فانی کے بڑے قدرداں رہے، ان کے اشعار کو کبھی برجستہ سنا کر ان کے کلام کی لذت کو دوبالا کردیتے، مجلس آرائی کے بڑے شوقین رہے، ہر وقت ان کے یہاں ان کے دوستوں اور ملنے والوں کا مجمع رہتا، اور گھنٹوں ان سے مہرومحبت اور لطف ولذت کی باتیں کرتے، خود بھی محظوظ ہوتے اور دوسروں کو بھی مسرور کرتے، ان کی اہلیہ کی وفات اس وقت ہوئی جب ان کی عمر ۳۲-۳۳ برس کی رہی ہوگی۔مگر ان کی یاد میں پوری زندگی گزار دی، ان سے ان کے ایک لڑکی تھی، اس کی پرورش کرتے رہے اور جب اس کی شادی اپنے ایک بہت ہی لائق اور سعادت مند عزیز جناب اختر انیس سے کردی تو ان کو ایسا معلوم ہوا کہ ان کو کونین کی ساری دولت مل گئی ہے، ان کے داماد بینک کے ایک بڑے عہدیدار بن کر لندن میں رہنے لگے، ان کی بیگم بھی ان کے ساتھ رہنے لگیں، جن سے دو بچے ہوئے، ایک لڑکی اور ایک لڑکا، جناب امین الدین صاحب اپنی بیٹی، نواسی اور نواسے سے ملنے لندن بھی جاتے رہے، جب وہاں ہوتے تو انگریزی پوشاک اتنے آداب کے ساتھ پہنتے کہ خود وہاں کے متمول انگریز اتنا اہتمام نہ کرتے ہوں گے، اس کو پہن کر وہ جوان رعنا ہوجاتے، وہ فطری طور پر اپنے رہنے سہنے، کھانے پینے، ملنے ملانے میں بہت ہی شائستہ اور مہذب تھے، ان کی زندگی کا سب سے بڑا سانحہ اس وقت ہوا جب ان کی اکلوتی پیاری بیٹی کا انتقال لندن میں ہوگیا، پھر ان کا دل جوان کی شگفتہ بیانی کی وجہ سے گلزار بنا رہتا، ان کے داغ دل کا لالہ زار بن گیا، اپنی نواسی اور نواسہ اور اپنے انتہائی نیک اور سعید داماد کو دیکھ کر بقیہ زندگی گزارتے رہے۔

ان کو اپنے چھوٹے بھائی جناب مبین الدین صاحب سے بھی بڑی محبت رہی، وہ ڈپٹی کلکٹر ہونے کے بعد کواپریٹو سوسائٹی کے رجسٹرار بن کر ریٹائر ہوئے، پنشن پانے کے بعد ان ہی کے ساتھ رہنے لگے، پھر تو دونوں سرخاب کے جوڑے بنے ہر جگہ دکھائی دیتے۔ جناب مبین الدین صاحب کو بھی دارالمصنفین سے بڑی محبت رہی، دونوں بھائی یہاں کے ہر قسم کے مسائل کو سلجھانے اور بڑی سے بڑی تقریبات کو انجام دینے میں یہاں کے لوگوں کے ساتھ آخر وقت تک برابر شریک رہے، دونوں کی محبت اور یگانگت بھی مشہور رہی، جناب مبین الدین صاحب ۳۱/مئی ۱۹۸۵ء کو اللہ کو پیارے ہوئے، خود امین الدین صاحب بستر علالت پر تھے، خیال تھا کہ اس صدمہ کو برداشت نہ کرسکیں گے، ان کے بھتیجے افضال مبین کراچی سے آئے اور ان کو اپنے ساتھ وہاں لے گئے تاکہ ان کا وہاں علاج بھی ہوسکے لیکن ان کا وہاں جی نہ لگا، اور جلد واپس آگئے۔اعظم گڑھ سے شاید اپنے مرقد اور مدفن کی تلاش میں اپنے آبائی گاؤں سلطانپور چلے گئے، جہاں کچھ دنوں رہ کر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی اور جب ہم لوگ ان کو سپرد خاک کرنے کے لیے وہاں پہنچے تو ان کی طویل علالت کے بعد ان کی میت کو دیکھا تو ایسا معلوم ہوا کہ:

موت کی نیند آگئی بیمار کو
غیب سے سامانِ شفا ہوگیا

اور جب اپنے مرقد میں لٹائے گئے تو آنسو کے قطرے گررہے تھے کہ ایک دیرینہ ہمدم ایک وضعدار دوست، ایک مخلص دمساز اور غمگسار، ایک عندلیب شیوا بیان اللہ کی رحمتوں اور برکتوں سے ہم آغوش ہورہا ہے، وہ برابر یاد آتے رہیں گے، اور جب یاد آئیں گے تو محسوس ہوگا کہ:

؎ سینے میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے

ان کے لیے دل سے دعا ہے کہ ان کو بشری کمزوریوں کو اللہ تعالیٰ اپنے بے نیاز عفو وکرم سے معاف فرمائیں اور ان کی خوبیوں کی بدولت ان کو اپنے سایۂ عاطفت میں

لے کر نوازیں۔ (آمین) وہ نماز کے بڑے پابند تھے، خوش عقیدہ بھی رہے، بزرگان دین سے محبت کرتے، ان کی باتوں کو بڑی توجہ سے سنتے اور پھر اپنی زندگی میں جو ایک مثال پیش کی، وہ ہندوستان کے ہندو مسلم دونوں کے لئے قابل تقلید ہے۔

وہ جب ریونیو افسر تھے، تو ان کے ماتحت ایک اہل کار ہرندر سنگھ تھے، جو اپنی ایمانداری کے لیے پوری کچہری میں مشہور تھے۔ جناب امین الدین صاحب ان کے کچھ ایسے گرویدہ ہوئے کہ ان کی یہ گرویدگی برابر قائم رہی، ان کی ریونیو افسر کی ملازمت ختم ہوگئی، تب بھی ہرندر سنگھ ان کی زندگی کے ضروری جز بنے رہے، ہرندر سنگھ نے اپنی ایمانداری کی وجہ سے ان کی ریونیو افسری کے زمانے میں کوئی مالی منفعت حاصل نہیں کی، پھر بھی اپنی ٹھکرائیت کی آن بان کے ساتھ ان کی ہمدمی کرتے رہے۔ دونوں پنشن پا کر ریٹائر ہوئے۔ تب بھی ایک دوسرے کی وضعداری قائم رہی، ہرندر سنگھ ہر جگہ خصوصاً دفتری اور سرکاری حلقوں میں بڑے مقبول تھے، اس لئے اپنی مقبولیت کی وجہ سے امین الدین صاحب اور ان کے بھائی مبین الدین صاحب کا ہر مشکل کام انجام دے کر ان کو خوش کرتے رہتے، کبھی یہ دونوں بھائی ان کی کچھ مالی مدد کرنا چاہتے تو ان کا احسان مند ہونا اپنی ٹھکراہیت کی شان کے خلاف سمجھتے، وہ سیاسی حیثیت سے...... اس کے کارکن بلکہ مقامی طور پر اس کے رہنما بھی بن گئے تھے، مگر اپنے سیاسی عقیدہ کی وجہ سے دونوں بھائیوں کے تعلقات میں فرق نہیں آنے دیا، وہ منظر بڑا ہی سبق آموز ہوتا جب یہ دونوں بھائی طویل علالت میں مبتلا ہوئے، تو ہرندر سنگھ صبح و شام دونوں وقت ان کے یہاں حاضری دیتے اور ان کی ضروریات کو پورا کرتے۔

امین الدین صاحب کی علالت کے آخری دنوں میں ہرندر سنگھ ہی ان کے سارے پسماندہ سرمائے کے امین ہوگئے تھے، بینک میں اپنے نام سے اچھی خاصی رقم رکھ چھوڑی تھی، بینک کے پاس بک میں مشترکہ نام اپنے کسی عزیز کے بجائے ہرندر سنگھ ہی کا رکھوایا، وہی بینک سے ان کے لیے رقمیں نکالا کرتے تھے، اور جب بالکل آخر زمانے میں وہ اپنے گاؤں چلے گئے تو ہرندر سنگھ کو معلوم ہوا کہ ان کی بیماری اور بے چارگی سے فائدہ اٹھا کر ان کے ہریجن ملازمین ان کی تقریباً تین لاکھ کی زمین اپنے نام لکھانا چاہتے ہیں۔ تو ہرندر سنگھ وہاں پہنچ گئے۔ اور سارے کاغذات اپنے قبضہ میں کرلئے اور اعلان کیا کہ تھوڑی سی زمین تو ان ہریجنوں کو دی جاسکتی ہے، بقیہ امین الدین صاحب کے وارثوں کی ہوگی، ان کے اس فیصلہ کو کوئی قوت بدل نہیں سکتی تھی، وہ کچھ ایسے مقبول اور بااثر تھے کہ سرکاری حکام بھی وہی کرتے جو وہ چاہتے اور جب امین الدین صاحب سپرد خاک کردیے گئے تو اسی وقت ہرندر سنگھ ان کے دوستوں اور عزیزوں سے کہہ رہے تھے کہ بینک میں جو ان کی رقم ہے وہ ان کی وصیت کے مطابق کچھ تو خیرات کی جائے گی اور بقیہ ان کو دی جائے گی۔ جن کے لیے وہ کہہ گئے ہیں، یہ سن کر جو آنکھیں امین الدین صاحب کی موت پر آنسو بہا رہی تھیں، وہی آنکھیں ان کے گاؤں کے بنگلہ کی فضا میں ہرندر سنگھ کی وفاداری، دیانت داری، تعلقات کی وضعداری اور مہر و محبت کی پاسداری کا پرچم لہراتا ہوا دیکھ رہی تھیں اور یہی فضا زبان حال سے یہ بھی کہہ رہی تھی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ہر ہندو ہرندر سنگھ اور ہر مسلمان ہندوؤں کے لئے امین الدین ہوجائے تو اس کی دھرتی پر باہمی مہر و محبت کی گنگا اور اعتماد و اخلاص کی جمنا برابر بہتی دکھائی دے۔

؎ جو دلوں کو فتح کرے وہی فاتح زمانہ

(''ص۔ع''، فروری ۱۹۸۶ء)

احمد، ابوسلمہ شفیع، مولانا

آہ! مولانا ابوسلمہؒ

(پروفیسر مسعود حسن)

۲۲/ دسمبر کی دوپہر کو کلکتہ کے مسلمان ایک بڑے المناک سانحہ سے دوچار ہوئے، یہ سانحہ حضرت مولانا ابوسلمہ شفیع احمد صاحبؒ کی رحلت ہے، جو ۴-۵ ماہ کی طویل اور صبر آزما علالت کے بعد ۷۳ سال کی عمر میں اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔ اناللہ و انا الیہ راجعون، دوسرے دن صبح ۱۲:۳۰ بجے ان کے ہزاروں عقیدت مندوں اور جان نثاروں نے ان کے جسد خاکی کو پارک سرکس سے متصل ایک قبرستان میں جس کا نام ہم 'گور غریباں' ہے، یہ کہہ کر سپرد خاک کیا کہ:

اے تیرہ خاک خاطر مہماں نگاہ دار
کیں نورچشم ماست کہ در بر گرفتہ ای
نوراللہ مرقدہٗ و برداللہ مضجعہ

مولانا مرحوم کے نام اور مقام سے مجھے بہت پہلے سے واقفیت تھی، البتہ باقاعدہ نیاز اور تقریب ۱۹۵۹ء میں حاصل ہوا، جب مجھے مدرسۂ عالیہ کلکتہ کی پرنسپلی تفویض ہوئی اور میں مدرسہ پہنچا، مولانا مدرسہ کے ممتاز ترین اساتذہ میں تھے، تفسیر اور حدیث ان کے خاص موضوع تھے اور ان دونوں فنون کی بیشتر متداول کتابوں پر ان کی گہری نظر تھی، وہ مدرسہ کی اونچی جماعتوں میں درس دیتے تھے اور بڑی عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ میں مدرسہ میں کم وبیش ۵ سال رہا۔ اس پوری مدت میں میرے ان کے تعلقات مخلصانہ رہے اور جب میں وہاں سے رخصت ہوا تو اس کے بعد بھی ان کا اخلاص برابر جاری رہا۔ وہ اکثر میرے غریب خانہ پر تشریف لاتے، گھنٹوں بیٹھتے تھے۔ راقم الحروف بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا، ان ملاقاتوں میں اکثر علمی گفتگو ہوا کرتی تھی، کبھی کبھی حالات حاضرہ پر بھی تبصرہ ہوا کرتے تھے، مولانا ان مجلسوں میں

علم وحکمت کے موتی بکھیر دیتے تھے۔

مولانا کو لکھنے پڑھنے اور تصنیف کا شوق اوائل عمر ہی سے تھا۔ چنانچہ سب سے پہلے انھوں نے ۱۹۴۸ء میں امام بیہقیؒ متوفی ۴۵۸ھ کی ۱؎ کی معرفۃ السنن والآثار کی پہلی جلد بہت محنت سے تصحیح کرکے شائع کی۔ ان کا دوسرا اہم کام ابن حزم الاندلسی (متوفی ۴۵۶ھ) کی اسماء الصحابہ والرواۃ کا پہلا ایڈیشن ہے، جسے دائرۃ ترجمہ وتالیف کلکتہ نے ۱۹۸۳ء میں شائع کیا۔ اس کتاب پر مولانا نے مفید حواشی بھی لکھے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی کتابت مولانا نے خود اپنے قلم سے کی ہے۔ ۱۹۷۲ء میں انھوں نے ایک ادارہ ادارہ ترجمہ وتالیف کے نام سے قائم کیا، جس کے اغراض ومقاصد میں سیرۃ کے موضوع پر نایاب مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کا شائع کرنا بھی تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں انھوں نے ابن قتیبہ کی مشہور تصنیف کتاب المعارف کا وہ حصہ جس کا تعلق سیرت سے ہے، اپنے چھوٹے صاحبزادے مولوی طلحہ بن ابوسلمہ ندوی سے اردو میں ترجمہ کرایا اور اسے بڑے اہتمام سے چھپوایا۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی، النبی الخاتم جسے علامہ سید سلیمان ندوی صاحبؒ بہت پسند فرماتے تھے۔ عرصہ سے نایاب تھی، ادارہ نے اسے بھی بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ مولانا کو کتابیں جمع کرنے کا بھی بڑا شوق تھا۔ وہ اپنی قلیل آمدنی کا بڑا حصہ اسی پر صرف کرتے تھے۔ ان کی زندگی ہمیشہ عسرت میں گذری۔ خصوصاً سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد پنشن ملنے میں کئی سال کی دیر ہوئی اور وہ سخت مالی دقتوں میں گرفتار ہوگئے تھے۔ مگر اس زمانے میں بھی وہ کتابوں پر بے دریغ روپے خرچ کرتے تھے، راقم الحراف نے ان کے کتب خانے کے ذخیرے کا بڑا حصہ دیکھا ہے اور بلاخوف تردید کہہ سکتا ہے کہ کلکتہ میں کسی ذاتی کتب خانہ میں عربی مطبوعات کا اتنا بڑا ذخیرہ موجود نہیں ہے۔ وہ خود فرماتے تھے کہ مکہ معظمہ کی تاریخ پر کوئی ایسی مستند چھپی ہوئی کتاب نہیں ہے جو میرے کتب خانے میں موجود نہ ہو۔ وہ چار مرتبہ حج کے لیے تشریف لے گئے۔ ان موقعوں پر وہ حج کے معمولات ادا کرنے کے بعد مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کے مختلف کتب خانوں میں پابندی سے جاتے تھے۔ اور کتب فروشوں کی دکانوں پر بھی گھنٹوں بیٹھتے اور اپنی پسند کی کتابیں خریدتے تھے۔ حج کے آخری سفر میں مکہ معظّمہ کے کسی کتب خانے میں ان کی نظر تیسری صدی کے مشہور لغوی ابن درید کی جمہرۃ اللغۃ پر پڑی جو حال ہی میں مصر سے شائع ہوئی تھی۔ مولانا کو اس کا مقدمہ بہت اہم معلوم ہوا۔ اور انھوں نے اس کو نقل کرنا شروع کیا۔ اتفاقاً کتب خانے کے مہتمم کی نظر پڑی تو اس نے مقدمے کی عکسی نقل فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ مولانا جب ہندوستان واپس ہوئے تو یہ عکسی نقل اپنے ساتھ لائے۔ واپسی کے بعد راقم الحروف سے پہلی ملاقات ہوئی تو انھوں نے مقدمہ اسے پڑھنے کے لیے عنایت کیا۔ مولانا اس کے بعد سخت بیمار ہوگئے۔ مگر اپنے مرض الموت میں بھی وہ اس کتاب کو بھولے نہیں اور ہسپتال اور نرسنگ ہوم میں اس کے متعلق دریافت کرتے رہے۔ ۱۹/دسمبر کو یعنی وفات سے تین دن پہلے جب میں نرسنگ ہوم میں ان کو دیکھنے گیا تو ان کو بہت نحیف اور کمزور پایا، انھیں سخت زکام ہوگیا تھا اور کھانس بھی رہے تھے۔ آواز بھرآئی ہوئی تھی۔ میں کچھ فاصلہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ انھوں نے مجھے اشارے سے قریب بلایا۔ اور کچھ بولے آواز صاف نہیں تھی۔ اس لئے کتاب اور ایک آدھ لفظ کے علاوہ میں کچھ سمجھ نہیں سکا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جمہرۃ اللغۃ ہی کے متعلق کچھ دریافت کررہے تھے۔ میں انھیں کچھ بتانا چاہتا تھا۔ مگر ان کے تیمارداروں نے مجھے روکا اور ڈاکٹروں کی ہدایت کا ذکر کیا اور میں خاموش رہا۔ اس طرح جمہرۃ اللغۃ کے متعلق کچھ حاصل کرنے کی حسرت مولانا کے دل میں اور انھیں کچھ ضروری باتیں اس کتاب کے متعلق بتانے کی حسرت میرے دل میں رہ گئی۔

مولانا ایک خوش بیان اور کہنہ مشق مقرر بھی تھے، قدرت نے انھیں بلند آواز بھی عطا کی تھی۔ اسی بنا پر کلکتہ میدان میں عیدین کی نماز کی امامت کے لیے ایک مناسب خطیب اور عالم کی ضرورت پیش آئی تو نظر انتخاب مولانا ہی پر پڑی۔ کلکتہ میدان میں نماز عیدین کی جماعت کلکتہ کی سب سے بڑی جماعت ہوتی ہے، چند سال پہلے اس کی امامت امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد فرمایا کرتے تھے۔ جب مولانا آزاد اس سے دست بردار ہوئے تو ان کی جگہ پر مولانا ابوسلمہ مقرر ہوئے۔ اور تاحیات یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ اس موقع پر ان کے خطبات کلکتہ کے روزناموں میں رسالوں کی شکل میں چھپتے تھے۔ اور دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے۔ اسی امامت کی بنا پر مولانا بعد میں پورے ملک میں ''امام عیدین'' کے لقب سے مشہور ہوئے۔

مگر مولانا کا اصلی میدان تبلیغ وارشاد تھا۔ وہ ساری عمر زبان اور قلم سے اشاعت اسلام اور مسلمانوں کی دینی اور اخلاقی اصلاح کا کام انجام دیتے رہے۔ انھوں نے شہر کے مختلف حصوں میں درس قرآن کے حلقے قائم کئے جن میں وہ خود قرآن مجید کی تعلیمات کی وضاحت کرتے اور مسلمانوں کو شریعت کے احکامات سے روشناس کراتے تھے۔

شہر کے تمام مذہبی جلسوں میں شرکت کرتے اور ان میں نمایاں حصہ لیتے۔ تبلیغ کے لئے بہار، اڑیسہ اور مغربی بنگال کے دور افتادہ مقامات کا سفر کرتے۔ اکثر میلوں پیدل چلتے۔ ریل کے ڈبے میں بھیڑ کی وجہ سے کبھی کبھی گھنٹوں کھڑے کھڑے سفر کرتے۔ جلسوں میں بہت رات گئے تک بیٹھے رہتے، جو ملتا اور جب ملتا کھالیتے۔ مسجد میں بھی سورہتے، جوانی اور کہولت میں ان کی عام صحت قابل رشک تھی۔ مگر ان بے اعتدالیوں نے ضعیفی میں ان کی صحت پر برا اثر ڈالا اور وہ بیمار رہنے لگے۔ اخیر زندگی میں ان پر یرقان کا حملہ ہوا جس سے وہ جانبر نہ ہوسکے۔

تبلیغ کے کاموں کو مزید وسعت دینے کے لیے انھوں نے ''ادارۂ ترجمہ و

تالیف‘‘ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ اس میں وہ تنہا کام کرتے تھے۔ اس ادارہ سے جیسا کہ راقم السطور نے اوپر بیان کیا ہے۔ سیرت پر متعدد چھوٹے بڑے رسالے شائع ہوئے۔ جو ملک میں بے حد مقبول ہوئے۔ مقامی ضرورتوں کے پیش نظر وقتاً فوقتاً پوسٹر اور ہینڈ بل بھی شائع کرتے، قرآن و حدیث کے منتخب ارشادات جلی حروف میں کپڑے پر لکھوا کر مسلماں محلوں کی مرکزی جگہوں پر آویزاں کرتے۔

مرحوم علم و عمل اور وضع و اخلاق میں علماء سلف کی یادگار تھے۔ وہی زہد و تقویٰ، وہی فقر و استغنا، وہی عبادت و ریاضت، وہی ذکر و فکر، وہی جوش عمل، وہی اللہ کی خشیت، وہی ہر کام میں للّٰہیت جو ان بزرگوں کی خصوصیات تھیں۔ مولانا کی زندگی کا طرۂ امتیاز تھیں۔ ہمیشہ گاڑھے کا کرتہ، گاڑھے کا پاجامہ اور گاڑھے ہی کی دوپلیا ٹوپی زیب تن فرماتے۔ زیادہ تر پیدل چلتے اور جب ضرورت پیش آتی سستی سواریوں مثلاً بس اور رکشے پر اکتفا کرتے۔ چنانچہ اکثر بھری بس یا ٹرام میں ان کی جیب کتر جاتی۔ آل رسولؐ اور اصحاب رسولؐ سے ایسے محبت اور شیفتگی تھی کہ گھر میں کسی بچے کا نام رکھنا ہوتا تو ان ہی کے نام ذہن میں آتے۔ چنانچہ اس وقت ان کے خاندان میں ماشاء اللہ طلحہ، عروہ، خزیمہ، قتادہ، اُسامہ، ہریرہ، حذیفہ سبھی موجود ہیں۔ چار مرتبہ حرمین کی زیارت سے مشرف ہوئے آخری بار ۱۹۸۵ء میں حج کے لیے تشریف لے گئے۔ روانگی سے پہلے یرقان کا حملہ ہوگیا تھا۔ مکہ معظمہ پہنچے تو مرض نے شدت اختیار کرلی مشکل سے مناسک حج ادا کرسکے۔ کلکتہ واپس ہوئے تو مرض نے ایسی خطرناک شکل اختیار کی اور ان کو ہسپتال میں داخل کرنا پڑا اور پھر آخرت کا سفر پیش آیا۔

مرحوم نے بستر علالت سے ایک خط مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو لکھا تھا۔ اس کے ایک ایک لفظ سے مولانا مرحوم کی جسمانی تکلیف و اذیت اور قوم کی زبوں حالی پر ان کا روحانی کرب اور اضطراب ظاہر ہوتا ہے۔ اس خط کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:

’’.... شفا خانے کی کوٹھری نما کمرے میں محبوس ہوکر رہ گیا ہوں۔ جملہ مشاغل یک قلم موقوف ہیں۔ امت مرحومہ کی موجودہ زبوں حالی بالخصوص مسلم پرسنل لاء پر دشمنوں کے رکیک حملے اور ہماری تہی دستی و بے بسی پر دل کڑھتا ہے۔ مگر مجبور محض ہوکر رہ گیا ہوں یہ چند سطور جو دراصل اپنی غم خواری اور دلسوزی کا برملا اظہار ہیں۔ وقت کی اہم ضرورت سمجھتے ہوئے لکھوا رہا ہوں‘‘۔

مولانا مرحوم کے اساتذہ میں حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا عبداللہ محمد بن یوسف السورلی اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جن بزرگوں کا ذکر خیر وہ اکثر کیا کرتے تھے ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا حبیب الرحمٰن خانؒ شروانی اور علامہ سید سلیمان ندویؒ، مجھے اچھی طرح یاد ہیں، سید صاحبؒ سے انھیں والہانہ عقیدت تھی۔ جب سید صاحب گرمیوں میں دیسنہ تشریف لاتے تو مولانا بالالتزام ہر سال ان سے ملنے کے لیے بہار شریف سے دیسنہ جاتے اور دو تین دن ان کے مہمان رہتے۔ راقم الحروف سے انھوں نے سید صاحب سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر جو پٹنہ جنکشن اسٹیشن پر ہوئی تھی کئی بار مزہ لے لے کر کیا۔ دیسنہ کی ان مجلسوں کا ذکر بھی لطف لے کر کرتے تھے، جن میں سید صاحب اپنے باغ کے آم خود کاٹ کاٹ کر لوگوں میں پیش کرتے تھے۔ مولانا سید صاحب کے منتخب مطبوعہ مضامین کتابی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر صرف ایک مجموعہ شائع کرسکے۔ جو مکتبۂ علم و حکمت، بہار شریف کے زیر اہتمام طبع ہوا۔ پھر انھوں نے ان کے دو پرانے مضامین رسول وحدت اور ایمان رسالوں کی شکل میں ادارۂ ترجمہ و تالیف کلکتہ سے شائع کئے، اوپر جن بزرگوں کے نام مذکور ہیں ان میں سے اکثر سے ان کی خط و کتابت تھی اور چند کے خطوط مولانا کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ شاگردوں کی ایک کثیر تعداد برصغیر ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں علمی و تعلیمی خدمات انجام دے رہی ہے۔

مولانا کی وفات کے بعد میں اپنی زندگی میں ایک خلا محسوس کررہا ہوں۔ ان کی خوش گفتاری، ان کا زور خطابت ان کا اخلاص اور ان کی علمی صحبتیں یاد آتی ہیں تو آنکھیں اشکبار ہوجاتی ہیں، مگر مولانا ایسی جگہ پہنچ گئے ہیں جہاں سے لوگ واپس نہیں آتے! ع

عرفی اگر بہ گریہ میسر شدے وصال   صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

(مارچ ۱۹۸۶ء)

۱؎ یہ کتاب اور اس کے علاوہ موارد الظمان الی زوائد ابن حبان (مولف حافظ نورالدین ہیثمی اور کتاب الزامات علی الصحیح البخاری (المسلم مولفہ امام ابوالحسن علی دارقطنی) کی مولانا ابوسلمہ شفیع احمد نے اپنے خوشخط قلم سے کتابت کی تھی اور یہ تینوں نسخے انھوں نے دارالمصنفین کو عنایت فرمائے)۔

عارفی، عبدالحئی، ڈاکٹر

ڈاکٹر عبدالحئی عارفیؒ

مارچ ۱۹۸۶ء کی آخری تاریخوں میں ہم لوگ مولانا سید ابوالحسن ندوی کے ساتھ مدینہ منورہ میں تھے، تو ایک صاحب نے کراچی میں ڈاکٹر عبدالحئی کی رحلت کی خبر دی، جس کو سن کر سب ہی ملول اور افسردہ ہوئے، مولانا علی میاں نے تو فوراً تعزیت کا تار لکھوا کر کراچی بھجوایا۔ میری نظروں میں ڈاکٹر صاحب کا وہ چھریرا جسم، منور چہرہ اور مطہر آنکھیں گھومنے لگیں، جب ان کو ۱۹۴۴ء میں پہلی دفعہ جونپور میں دیکھا تھا، اس زمانہ میں استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے منجھلے داماد برادرم سید حسین

وہاں ڈپٹی کلکٹر تھے، ان کے کرایہ کا مکان ٹھیک ڈاکٹر صاحب مرحوم کے وسیع اور کشادہ مکان کے سامنے تھا، وہیں حضرت سید صاحبؒ ان سے ملنے گئے ہوئے تھے، میں بھی وہاں دو چار روز کے لیے پہنچ گیا تھا، عصر کی نماز کے بعد حضرت سید صاحبؒ کی نشست ڈاکٹر صاحب مرحوم کے گھر پر ہوتی، دونوں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلفاء میں تھے، ڈاکٹر صاحب مرحوم حضرت سید صاحبؒ سے تقریباً پندرہ سال چھوٹے تھے، اس لئے ان کے ملنے کا انداز بالکل خوردانہ اور عزیزانہ تھا، مگر جس روحانی رشتے میں دونوں منسلک تھے، ان میں لطف وکرم، مہر ومحبت، اور یگانگت وموانست کی نکہت بیزی اور شامہ نوازی کے سوا اور کیا ہوسکتی تھی، یہ خاکسار بھی ان نشستوں میں شریک رہتا، اس کے تھوڑے دن پہلے حضرت تھانویؒ کے بڑے مشہور خلیفہ مولانا محمد عیسیٰؒ کی وفات جونپور ہی میں ہوئی تھی، اس موقع پر امداد غیبی سے حضرت تھانویؒ کے اور خلفائے مجازین جنازہ میں شرکت کی غرض سے جس محبت سے پہنچ گئے تھے، اس کا ذکر زیادہ تر ان نشستوں میں ہوتا کہ کس طرح ایک نے غسل دیا، دوسرے نے نماز جنازہ پڑھائی اور دو نے قبر میں اتارا، اور گفتگو اس پر بھی ہوتی کہ وہ سلوک وطریقت، مسلک و مشرب، صورت وسیرت، حتیٰ کہ نشست وبرخاست اور خط وکتابت میں اپنے مرشد کے کامل نمونہ تھے، حضرت سید صاحبؒ نے اپریل ۱۹۴۴ء کے معارف میں ان پر ایک تعزیتی تحریر لکھ کر اپنے رنج وغم کا بھی اظہار کیا ہے۔ جونپور کے اسی قیام میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی سیرت وصورت کا جواثر پڑا وہ آخر وقت تک قائم رہا، پھر ۱۹۴۴ء میں دو چار روز ایسا معلوم ہوا کہ حضرت تھانویؒ کا برج خلافت دارالمصنفین میں منتقل ہوگیا ہے، حضرت تھانویؒ کے چہیتے اور محبوب خلیفہ جناب خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوبؔ اپنے پیر بھائی مولانا محمد حسن امرت سری کے ساتھ یہاں جلوہ افروز ہوئے تو فتح پورتال نرجا سے مولانا وصی اللہ تشریف لے آئے، مولانا عبدالغنی پھول پوری بھی آگئے، مولانا ابرار الحق ہردوئی سے آپہنچے، پھر ڈاکٹر عبدالحئی جونپور سے آکر اس محفل میں شریک ہوئے، سید صاحب مجاز بیعت اور مولانا مسعود علی ندوی مجاز صحبت تو میزبان ہی رہے، تین چار روز کی محفل میں حضرت مجذوب ہی چھائے رہے، وہ اپنی نظمیں سناتے غزلیں سامعہ نواز کرتے، اور اپنے خاص ترنم سے سب کو مسحور اور محظوظ کرتے رہے، کسی کو کچھ بولنے کا موقع نہ دیتے، اور جب ان کے نغمے سب کے فردوس گوش ہورہے تھے، تو کوئی کیوں کچھ بول کر محفل کی پرکیف اور روحانی فضا میں خلل انداز ہوتا، خواجہ صاحب کے ایسا غضب کا حافظہ کسی اور میں نہ پایا گیا، اشعار سناتے کیا بلکہ ان کا سیلاب بہاتے، کہیں نہیں اٹکتے جھوم جھوم کر اپنا کلام پڑھتے، سامعین سے زیادہ خود ہی اس سے لطف لیتے، شعر گوئی کی اصل تعریف یہ ہے کہ بانسری بجانے والے کی طرح شاعر خود ہی اپنے کلام سے مست ہوتا رہے۔ ڈاکٹر عبدالحئی بھی اور سامعین کی طرح اس محفل میں ساکت وصامت ہی رہے، مگر ان کی ذات گرامی زبان حال سے کہتی رہی کہ اس محفل کو منور کرنے میں وہ بھی برابر کے شریک وسہیم ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں جو غیر معمولی سیاسی انقلاب آیا، تو اس میں تھانہ بھون کے برج خلافت کے بعض سیارے کراچی منتقل ہوگئے، حضرت سید صاحبؒ کے علاوہ مولانا محمد شفیع، مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا عبدالغنی پھول پوری اور ڈاکٹر عبدالحئی وہاں کیا پہنچے کہ اس شہر کی دھرتی کو اپنے زہد وورع، سلوک وطریقت اور مقامات مستجاب الدعوات اور واردات صحیحہ سے سرفراز کرنے میں لگ گئے، حضرت سید صاحبؒ کی وفات ہوئی تو ڈاکٹر عبدالحئی مرحوم ہی نے ان کے جنازے کی نماز پڑھائی، جس سے ان کی ذات گرامی سے اور لگاؤ پیدا ہوگیا۔

کراچی برابر جانے کا اتفاق ہوا، جونپور اور اعظم گڑھ کے بعد وہاں ان سے شرف نیاز حاصل ہوا، تو کافی مدت کا وقفہ ہوچکا تھا، اس عرصہ میں ان میں پیر طریقت کی خوبیاں اچھی طرح پیدا ہوچکی تھیں، چہرہ پہلے سے زیادہ منور ہوچکا تھا، پیشانی پر ایک خاص قسم کی چمک تھی، زیر لب تبسم میں پہلے سے زیادہ اضافہ تھا، حضرت سید صاحبؒ کے تعلق سے بڑی محبت سے ملے، باتیں عارف باللہ ہی جیسی کیں، کراچی کے ایک اور سفر میں مسلم کمرشل بینک کے وائس پریسیڈینٹ جناب عابد حسین زبیری کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا، تو اپنا رسالہ معمولات یومیہ ومختصر نصاب اصلاح نفس پڑھنے کو دیا، اس میں زندگی اور عاقبت سنوارنے کی بہت سی دعائیں جمع کردی گئی ہیں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تصوف کی جو تعریف بیان کی تھی وہ بھی اس میں نمایاں طور پر درج ہے، اور وہ یہ ہے۔

> ''وہ ذراسی بات جو حاصل ہے، تصوف کا یہ ہے، کہ جس طاعت میں سستی محسوس ہو سستی کا مقابلہ کرکے اس طاعت کو کرے، اور جس گناہ کا تقاضا ہو، تقاضے کا مقابلہ کرکے اس گناہ سے بچے، جس کو یہ بات حاصل ہوگئی اس کو پھر کچھ بھی ضرورت نہیں، کیونکہ یہی بات تعلق مع اللہ پیدا کرنے والی ہے، یہی اس کی محافظت ہے، اور یہی اس کو بڑھانے والی ہے۔''

جس سادگی اور گہرائی سے یہ بات کہی گئی ہے، وہ منکرین تصوف کے لئے قابل غور اور لائق مطالعہ ہے۔

ایک بار ڈاکٹر صاحب کی ایک مجلس میں بھی شریک ہوا جو ہفتہ میں ایک بار ان کے یہاں ہوتی تھی، ان کا اثر کراچی کے بڑے بڑے سرکاری عہدیداروں، متمول لوگوں اور تاجروں میں برابر بڑھتا جارہا تھا، انھوں نے اپنے مرشد سے جو کچھ پایا تھا، وہ دوسروں تک پہنچاتے رہے، اسی لئے مآثر حکیم الامت، بصائر حکیم الامت اور معارف حکیم الامت کو ترتیب دے کر زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی، اسوۂ

رسول اکرم ﷺ اور اصلاح المسلمین کے نام سے بھی ان کی تصانیف ہیں، ان کی زندگی اس لحاظ سے قابل رشک رہی کہ وہ کسی دینی مدرسہ کے باضابطہ سند یافتہ عالم نہ تھے بلکہ علی گڑھ اور لکھنؤ میں انگریزی تعلیم پاکر وکیل ہوئے۔ دس سال تک وکالت کی، اس پیشہ سے برگشتہ ہوئے، تو ہومیوپیتھی کی ڈاکٹری شروع کی، اور اسی حیثیت سے مشہور ہوئے، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ان کو متروک الوکالت ہونے کے بجائے تارک الوکالت پایا تو ۱۹۳۵ء میں مجازین بیعت میں داخل فرمالیا، پھر وہ مدارج حاصل کیے جو بڑے سے بڑے عالم دین کو ہوسکتا ہے، وہ شاعر بھی تھے، تخلص عارفی تھا، ان ہی کا یہ شعر ہے،

عارفی پیر مغاں نے ایسی کچھ ڈالی نظر
میری ہستی مظہر اعجاز ہو کر رہ گئی

۱۸۹۸ء میں ان کی ولادت شاید کانپور میں ہوئی تھی، ۱۹۸۶ء میں وفات پائی، کل عمر تقریباً اٹھاسی سال کی ہوئی، جس میں تقریباً اکاون سال مسند رشد وہدایت پر بیٹھ کر خواص وعوام کو مستفیض کیا، اللہ اللہ اتنی طویل دینی اور روحانی خدمت کی سعادت کم بزرگوں کو حاصل ہوئی ہوگی، معلوم ہوا کہ وہ کل تین دن علیل رہے، اور ۲۶/ مارچ ۸۶ء مطابق ۲۴/ رجب المرجب ۱۴۰۶ھ کو ان کی پاک روح قفس عنصری سے پرواز کرکے اعلیٰ علیین کو پہنچ گئی کراچی میں مولانا محمد شفیع کے دارالعلوم کے قبرستان میں ان ہی کے سرہانے اپنی ابدی خوابگاہ میں لٹائے گئے، اس طرح تھانہ بھون کی کتاب کے مزید ایک اہم باب خاتمہ ہوگیا، آئندہ نسل یاد کرے گی کہ تھانہ بھون کے فیوض کی تسنیم اور برکات کی کوثر کی مضطرب موجیں اور بے چین لہریں دور دور تک پھیلیں اور ان ہی سے روحانی جام ومینا پُر کرکے جویائے حق اپنی روحانی تشنگی بجھاتے رہے، ان بزرگان دین کی وجہ سے مختلف......علاقوں میں ایمان کی جو بہاریں آتی رہیں، ان کے صلہ میں معلوم نہیں بارگاہ ایزدی میں وہ کن کن رحمتوں سے سرفراز ہوتے رہیں گے، دعا ہے کہ ان کی تربتوں پر فضل الٰہی کی پھوہاریں برابر پڑتی رہیں، آمین۔ (''ص۔ع''، جون ۱۹۸۶ء)

نعمانی، انور

انور نعمانی مرحوم

علامہ شبلیؒ نعمانی نے اپنے بھائی مولوی محمد اسحاق مرحوم وکیل الہ آباد ہائی کورٹ کی موت پر اپنے ایک پُردرد نوحہ میں یہ فرمایا تھا۔

مرنے والے کو نجات ابدی کی ہو نوید
خوش و خرم رہے چھوٹا یہ مرا بھائی جنید

ان ہی جناب جنید نعمانی کے مرحوم کے اکلوتے بیٹے انور نعمانی مرحوم تھے، جنھوں نے لگ بھگ اسّی ۸۰ سال کی عمر میں کراچی میں مئی ۱۹۸۶ء کے آخری ہفتہ میں وفات پائی، مرحوم اپنے والد بزرگوار کے سایۂ عاطفت میں بڑے لاڈ پیار اور ناز ونعمت سے پلے، تعلیم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پائی، گھر میں دولت تھی، اس لئے ان کو نوکری کرنے کی ضرورت نہیں پڑی، کچھ دنوں مرزا پور میں فارم کیا، چھوٹی موٹی تجارت بھی کی، پھر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ مولانا عبدالغنی پھولپوری کے ایسے گرویدہ اور فریفتہ ہوئے کہ وہ نقل وطن کرکے کراچی چلے گئے تو یہ بھی اپنا گھربار سب کچھ چھوڑ کر ان ہی کے ساتھ وہاں رہنے لگے، جب تک اعظم گڑھ میں رہے دارالمصنفین والوں کے یار وفادار اور غم گسار بن کر ان کے لئے اپنی محبت کا دم بھرنا زندگی کا شعار بنائے رکھا۔ کراچی میں ان کے اکلوتے لڑکے سرکاری نوکر ہیں، اچھے حال میں ہیں، پھر ان کے اور قریبی اعزہ بھی وہاں بہت خوش حال ہیں، مگر انھوں نے کسی کے یہاں رہنا پسند نہیں کیا، اپنے مرشد کی ایک پسندیدہ مسجد سے ملحق ایک کٹیا ان ہی کے نام پر ایک عبادت گاہ کے گوشے میں رہ کر اپنی بقیہ زندگی گذار دی، کراچی جب جب گیا، ان سے جاکر ضرور ملا، اور ان کی پرانی زندگی کی یادوں کی قندیل روشن کی، کسی زمانے میں صاحب کی طرح زندگی بسر کرنے والے کو ان کی آخری زندگی میں زہد و اتقاء قناعت واستغنا اور شریعت وطریقت کا ایسا نمونہ پایا کہ ان کی زندگی پر بڑے سے بڑے زاہدوں اور عابدوں کو رشک آسکتا ہے۔

مرنے والے کو نجات ابدی کی ہو نوید

(''ص۔ع''، جون ۱۹۸۶ء)

طفیل، محمد

جناب محمد طفیل

ادھر گذشتہ تین مہینے میں اس برصغیر میں چار موتیں ہوئیں جن سے علمی حلقے کو بڑا صدمہ پہنچا، ان کی یادیں برابر آتی رہیں گی۔ جناب محمد طفیل اڈیٹر نقوش لاہور اپنے کسی کام سے اسلام آباد آئے، رات کو خوش خوش سوئے تو اپنی میٹھی نیند ہی میں ۵/ جولائی ۱۹۸۶ء کو اللہ کو پیارے ہوئے، اور اپنے بے شمار قدردانوں کو سوگوار چھوڑ گئے، انھوں نے نقوش کو اپنی ادارت میں ایک علمی فیکٹری بنا رکھا تھا، جس طرح کسی فیکٹری سے مشینیں ڈھل کر نکلتی ہیں، اسی طرح نقوش سے طرح طرح کے علمی و ادبی نمبر نکلتے رہے، غزل نمبر، افسانہ نمبر، مکاتیب نمبر، خطوط نمبر، شخصیات نمبر، طنز ومزاح نمبر، منٹو نمبر، پطرس نمبر، لاہور نمبر، آپ بیتی نمبر، ادب آلعالیہ نمبر، ادبی معرکہ نمبر، غالب نمبر، میرتقی میر نمبر، شوکت تھانوی نمبر، میر انیس نمبر اور اقبال نمبر کے علاوہ آخر میں تیرہ جلدوں میں رسول نمبر نکالا، اور قرآن نمبر نکالنے کی فکر میں تھے کہ خود وہاں پہنچ گئے جہاں سے یہ

مقدس صحیفہ نازل ہوا تھا۔

یہ سارے نمبر علمی، ادبی اور تاریخی، انسائیکلوپیڈیا بن گئے ہیں، اس لحاظ سے وہ خوش نصیب تھے کہ ان کا خاتمہ بالخیر رسول نمبر پر ہوا، اس کی تیرہ (۱۳) جلدیں دینی فیوض اور ملی برکات کا سرچشمہ بنی رہیں گی، یہ بیسویں صدی میں اردو زبان کا ایسا شاندار کارنامہ ہے جو مدت مدید تک یاد رکھا جائے گا، وہ اپنی دنیاوی زندگی میں لوگوں کو علمی کوثر، ادبی تسنیم اور دینی سلسبیل کے جام پر جام پلاتے رہے، دعا ہے کہ اب جہاں وہ پہنچ گئے ہیں وہاں برکت اخروی کی کوثر، مغفرت الٰہی کی تسنیم اور رحمت ایزدی کے سلسبیل سے سیراب ہوتے رہیں، آمین، وہ اپنے پیچھے یہ درس چھوڑ گئے ہیں کہ عزم، محنت اور حوصلہ ہو تو سرمایہ کی کمی کے باوجود بڑے سے بڑا علمی کام انجام دیا جاسکتا ہے۔

(''ص۔ع''، ستمبر ۱۹۸۶ء)

شہاب، قدرت اللہ

قدرت اللہ شہاب

جناب محمد طفیل کی وفات کے کچھ ہی روز بعد جناب قدرت اللہ شہاب کی رحلت کی خبر ملی، وہ برطانوی حکومت کے زمانہ کے آئی۔سی۔ایس تھے، ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان کے بڑے بڑے عہدوں پر مامور رہے، وہ جب پاکستان کے گورنر جنرل جناب غلام محمد صاحب کے سکریٹری تھے، تو پہلی بار ۱۹۵۵ء میں ان سے دارالمصنفین کے دفتری کام کے سلسلہ میں ملا، ایک روز گورنر جنرل ہاؤس میں دوپہر کا کھانا ہوا تو وہ بھی شریک ہوئے لیکن خاموش بیٹھے رہے، ان سے کھانا شروع کرنے کے لیے کہا گیا تو بولے آج شعبان کی پندرہویں تاریخ ہے، وہ نفل روزے سے ہیں، ان کی اس مذہبیت کا اثر دسترخوان کے تمام شرکاء پر رہا۔

۱۹۵۵ء سے پاکستان کا سفر برابر کرتا رہا، ان سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں، دارالمصنفین کی مطبوعات کا جب باضابطہ حق طباعت و اشاعت حکومت پاکستان کو دیا جارہا تھا تو انھوں نے اس کی دفتری کارروائی کرنے میں بڑی سہولتیں پہنچائیں جس کے لیے دارالمصنفین ان کا بڑا ممنون ہوا، ان میں سرکاری افسر کی رعونت بالکل نہ تھی، ہر موقع پر بڑے متین، سنجیدہ اور بااخلاق نظر آئے، بولتے بہت کم تھے مگر سنتے سب کی تھے، اور حتیٰ الامکان مدد کیا کرتے تھے، ان کو انگریزی اور اردو لکھنے میں بڑی مہارت تھی، اردو ادب کا بڑا عمدہ مذاق رکھتے تھے لیکن اس کا اظہار اپنی گفتگوؤں میں نہ ہونے دیتے، ادبی حلقوں میں اپنی اردو تحریروں کے لیے مقبول تھے، دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی نیکیوں، لوگوں کے ساتھ کرم گستریوں اور روز مرہ زندگی میں ان کی خوبیوں کی بدولت ان کو اپنی آغوش عفو وکرم میں لے کر وہی جگہ عطا فرمائیں جو نیک بندوں کو اس کی بارگاہ میں ملا کرتی ہے، آمین۔

(''ص۔ع''، ستمبر ۱۹۸۶ء)

مسلم، محمد

محمد مسلم

اگست ۱۹۸۶ء کے شروع میں جناب محمد مسلم صاحب سابق ایڈیٹر روزنامہ ''دعوت'' دہلی کی وفات بھی ان کے جاننے والوں کے لیے ایک المناک سانحہ ہے، ان سے تقریباً پون صدی تک برابر ملتا رہا، ہر ملاقات میں ان کی شرافت اخلاق سے متاثر ہوا، ان کا نسبی تعلق سالار مسعود غازی سے تھا، ان کا خاندان دہلی میں آکر آباد ہوا، ۱۸۵۷ء میں ان کے خاندان والے انگریزوں کی نظروں میں معتوب ہوئے، تو وہ بھوپال منتقل ہوگئے، وہیں محمد مسلم صاحب کی پیدائش ہوئی، نوجوانی میں اپنے اسلامی جذبہ کی بنا پر خاکسار تحریک سے متاثر ہوئے، پھر جماعت اسلامی میں شریک ہوگئے، اس حلقہ میں اپنی سوجھ بوجھ کی وجہ سے بڑے قابل قدر سمجھے جانے لگے، جب روزنامۂ دعوت کے ایڈیٹر ہوئے تو صحافت نگاری میں اپنی اصابت رائے کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کی، بیرونی ممالک کے سفر پر بھی گئے، اور جب ڈاکٹر سید محمود سابق مملکت امور خارجہ حکومت ہند نے مجلس مشاورت قائم کی تو ان کو جناب محمد مسلم کی سیاسی بصیرت پر بڑا اعتماد رہا، انھوں نے بھی اس میں اپنی مخلصانہ سیاسی سرگرمیوں سے یہ ثابت کردکھایا کہ وہ سچے مسلمان بھی ہیں اور سچے محبّ وطن بھی، اس کی تفریق کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ پہلے کیا ہیں؟ مسلمان یا ہندوستانی، یا ہندوستانی پہلے اور مسلمان بعد میں، سچا مسلمان ہی سچا محبّ وطن ہوسکتا ہے، ایک طویل علالت کے بعد دہلی میں وفات پائی، انھوں نے جو پاک دل، پاک باطن اور پاک نفس پایا تھا، ان کی بدولت امید ہے کہ وہ مغفرت الٰہی سے ضرور نوازے جائیں گے، آمین۔ (''ص۔ع''، ستمبر ۱۹۸۶ء)

عبداللہ، سید، ڈاکٹر

ڈاکٹر سید عبداللہ

ڈاکٹر سید عبداللہ ۱۴/اگست ۱۹۸۶ء کو لاہور میں اس عالم فانی کو چھوڑ کر عالم جاودانی کو سدھارے، اس خبر کو سن کر دل کو ویسی ہی چوٹ لگی جیسے اپنے خاندان کے کسی عزیز فرد کی دائمی جدائی سے لگ سکتی تھی، ان کی رحلت سے علم وادب کی ایک زمردیں مسند خالی ہوگئی، وہ علمی حلقوں میں عربی زبان کے قدرشناس، فارسی شعر وادب کے رمز شناس، اردو کے عناصر خمسہ اور شعراء کے اداشناس، علامہ محمد اقبال کے جوہر شناس، اور اپنی نظر وفکر کے نکتہ شناس کی حیثیت سے یاد کیے جائیں گے، پاکستان میں اردو کو قومی زبان بنانے میں شاہین اور عقاب بن کر جس طرح جھپٹے، پلٹے اور پلٹ کر جھپٹے، اس کی

یادیں بھی لوگوں کے دلوں کو گرماتی رہیں گی، ان کی تصانیف سے یونیورسٹی کے اساتذہ نے اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو سمجھ کر جس طرح طلبہ کو سمجھایا، اس کی عنبریں یادیں بھی زریں حروف سے لکھی جائیں گی، اور پھر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی تکمیل کر کے لوگوں کی دیرینہ آرزوؤں کے ریگ زار کو جس طرح شاداب مرغزار بنادیا، اس کی یادوں کے کنول بھی ہمیشہ کھلے رہیں گے، اور کس کو اس سے انکار ہوسکتا ہے کہ وہ علم وفن کے سیاروں میں عطارد بن کر رہے، اور ساٹھ ۶۰ سال کی علمی خدمت کے بعد اسی حیثیت سے رخصت ہوئے۔

میری یادوں کی شبستان میں وہ اس طرح دکھائی دیں گے کہ وہ مجھ سے مل رہے ہیں، گلے لگارہے ہیں، اور کہہ رہے ہیں کہ میں تو اپنے کو مولانا سید سلیمان ندویؒ کا فرزند معنوی سمجھتا ہوں، ان ہی کی تحریروں سے تحقیق کرنا سیکھا ہے، میں تم سے ملتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ سگے بھائی سے مل رہا ہوں ان کی یہ باتیں فردوس گوش بنی ہوئی ہیں، ان پر آیندہ ایک مفصل مضمون لکھ کر اپنا غم ہلکا کروں گا، ابھی تو ہر بن مو سے ان کی مغفرت کے لیے دعائیں نکل رہی ہیں۔ (''ص۔ع''، ستمبر ۱۹۸۶ء)

آہ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ

(شیخ نذیر حسین)

پاکستان کے ممتاز عالم نامور ادیب اور معروف نقاد اور اردو زبان کے محسن ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے ۱۴/ اگست ۱۹۸۶ء کو ۸۰ برس کی عمر میں اس عالم فانی کو الوداع کہا۔ ان کی وفات سے پنجاب یونیورسٹی اور اورینٹل کالج کی وہ علمی روایت اختتام کو پہنچی جس کا آغاز مولوی فیض الحسن [۱] سہارنپوری اور مفتی محمد عبداللہ [۲] ٹونکی کی علم پرور مساعی سے ہوا تھا اور اس کو مولوی محمد شفیع، سید اولاد حسین شادان بلگرامی رام پوری، مولوی عبدالعزیز میمن اور حافظ محمود شیرانی مرحومین نے پروان چڑھایا تھا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ ۱۹۰۶ء میں قصبہ منگلور تحصیل وضلع مانسہرہ صوبہ سرحد میں پیدا ہوئے، وہ گورنمنٹ ہائی اسکول ایبٹ آباد کی نویں جماعت میں زیر تعلیم تھے کہ تحریک خلافت کا غلغلہ بلند ہوا، اور وہ علی گڑھ جا کر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخل ہوگئے، علی گڑھ میں ان کا دل نہ لگا تو وہ چند ماہ کے بعد لاہور چلے آئے اور اہل حدیث کے مشہور مدرسہ مسجد چینیان والی میں درس نظامی کی تحصیل میں مصروف ہوگئے اور کافیہ اور مشکوٰۃ تک یہیں تعلیم پائی۔ اس اثناء میں وہ قید بھی ہوئے، پھر اورینٹل کالج کی مولوی عالم کلاس میں جا شامل ہوئے، جہاں ان کے مشہور استاد مولوی عبدالعزیز میمن سبعہ معلقہ اور ادب کی دوسری کتابیں پڑھاتے تھے، ساتھ ہی وہ مولوی احمد علی صاحب (انجمن خدام الدین، لاہور) کے درس قرآن میں شریک رہتے تھے، مرحوم سے انھوں نے حجۃ اللہ البالغہ پڑھی، اور غالباً صحیح مسلم بھی، مولوی احمد علی صاحب کی دینی خدمات اور ان کی زاہدانہ زندگی کا اثر ان پر آخر آخر تک رہا۔ فرماتے تھے کہ ایک دفعہ مولوی صاحب نے اپنا ہاتھ میرے سینے پر رکھا تھا اور اس کی ٹھنڈک آج تک محسوس ہورہی ہے، ۱۹۲۳ء میں منشی فاضل، ۱۹۲۵ء میں ایم۔اے (فارسی) ۱۹۳۲ء میں ایم۔اے (عربی) کے امتحانات پرائیوٹ طور پر پاس کئے اور ۱۹۳۵ء میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔

سید صاحب نے مختلف حیثیتوں میں ساٹھ برس تک پنجاب یونیورسٹی کی لگا تار خدمت کی جو ایک شاندار ریکارڈ ہے، وہ ۱۹۲۶ء میں عربی و فارسی مخطوطات کے فہرست نگار مقرر ہوئے، ۱۹۳۴ء میں شعبہ عربی پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے نگراں ہوئے، جہاں پانچ برس تک کام کرتے رہے، اس زمانے میں یونیورسٹی لائبریری کے بیشتر فارسی اور عربی مخطوطات ان کے مطالعے میں آئے، جن پر ان کے حواشی ثبت ہیں، ۱۹۳۸ء میں وہ جونیر لیکچرار فارسی اورینٹل کالج مقرر ہوئے۔ تقسیم ہند کے پرآشوب زمانے میں انھوں نے جس طرح پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی حفاظت کی وہ ان کے احساس ذمہ داری کی بہترین مثال ہے۔ ۱۹۵۳ء میں یونیورسٹی پروفیسر اردو ہوئے اور ۱۹۵۴ء-۱۹۶۶ء پرنسپل رہے، اور ۱۹۶۶ء میں اردو دائرۃ معارف اسلامیہ کے صدر شعبہ متعین ہوئے اور اپنی وفات اگست ۱۹۸۶ء تک فائز رہے۔

وہ ۸/ مارچ ۱۹۸۶ء کو دفتر میں کام کررہے تھے کہ ان پر اچانک فالج کا حملہ ہوا اور وہ ہسپتال پہنچائے گئے، تین ہفتوں کے بعد تھوڑا افاقہ ہوا تو وہ ۲۰/ اپریل ۱۹۸۶ء کو گھر گئے، علالت کے ایام میں گورنر پنجاب مخدوم محمد سید سجاد حسین قریشی دو دفعہ ان کی عیادت کو آئے اور علاج معالجہ کے اخراجات کے لیے ایک لاکھ روپے کا چیک پیش کیا۔ صدر پاکستان جناب جنرل ضیاء الحق صاحب نے اپنا خصوصی معالج بھیجا، لیکن وہ بہترین طبی امداد کے باوجود ۱۴/ اگست ۱۹۸۶ء کو حج بیت اللہ کے دن اپنے خالق حقیقی سے جاملے، جب میدان عرفات لبیک اللھم لبیک کی صداؤں سے گونج رہا تھا۔

ڈاکٹر عبداللہ کی زندگی مسلسل جدوجہد اور عمل پیہم سے عبادت تھی، پڑھنا اور لکھنا ان کا اوڑھنا اور بچھونا تھا۔ انھوں نے جس کلام میں ہاتھ ڈالا اس کو پورا کر کے دکھایا، مخالفوں کی مخالفت کی انھوں نے کبھی پروانہیں کی۔ وہ صبر وسکون سے اپنے کام میں لگے رہتے تھے اور ان کے حریف بالآخر میدان سے بھاگ جاتے، وہ نہ کبھی تھکے نہ مایوس ہوئے۔

سید صاحب وسیع النظر، وسیع الخیال اور وسیع القلب تھے، ان کا حلقہ احباب بڑا وسیع تھا، مساجد کے خطیب سے لے کر صحافی، وکیل اور بڑے بڑے نامور ادیب و دانشور اور اعلیٰ عہدہ دارانِ حکومت ان کی بزم ادب میں بلاروک ٹوک اور بلاتکلف آتے رہتے تھے، ان کی مجلسیں بزرگوں کے سبق آموز حالات، قومی تحریکات کے ذکر،

سیاسی حالات پرلطیف تبصرے اور لطائف وظرائف اور شعروشاعری کے تذکرے سے معمور رہتی تھیں، سید صاحب کو عربی، فارسی اور اردو کے ہزاروں، اشعار یاد تھے، ان کی کتاب اخلاق کا سنہری باب ان کی بردباری، معتدل مزاجی، نرم خوئی اور خندہ روئی ہے، اگرچہ وہ عقائد اور اعمال میں اکابر علمائے دیوبند کے ہم خیال تھے لیکن ان کے شیعہ، سنی، اہل حدیث اور بریلوی علماء سے بھی یکساں تعلقات تھے، وہ غلو اور شدت پسندی سے نفور تھے، اور کہا کرتے تھے کہ میرا مسلک، مسلک محبت ہے، وہ بزرگوں کے ادب شناس تھے، اسی میانہ روی کا نتیجہ یہ تھا کہ انھوں نے کسی دینی یا سیاسی رہنما کی تنقیص یا توہین نہیں کی، وہ عوام وخواص میں مقبول اور ایوان حکومت میں معزز ومحترم تھے، حکومت پاکستان نے ان کوکئی اعزازت سے نوازا ہے۔

سید صاحب کی قوت تدریس حیرت انگیز تھی، وہ ایک دن میں مختلف کلاسوں یعنی ایم۔اے (عربی)، ایم۔اے (فارسی) اور ایم۔اے (اردو) کو پڑھا دیتے تھے، وہ اپنے شاگردوں سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے، ہونہار اور محنتی طلبہ جلد ہی ان کی توجہ کا مرکز بن جاتے تھے، غریبوں اور ضرورت مندوں کی مدد کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے، ان کی سعی اور سفارش سے پچاسوں بے روزگار نوجوانوں نے ملازمت حاصل کی۔

سید صاحب، اردو زبان کے شیدائی وفدائی تھے، انھوں نے اپنے جسم وجان اور صحت کو اردو کی ترویج اور اشاعت کے لیے وقف کر رکھا تھا، فرمایا کرتے تھے کہ پاکستان کو دو چیزیں متحد رکھ سکتی ہیں، اسلام اور اردو زبان، اردو کو قومی زبان بنانے کے لئے انھوں نے جلسے کئے، جلوس نکالے اور کانفرنسیں منعقد کیں، بازاروں میں جاکر دوکانداروں کو اردو میں سائن بورڈ لکھوانے کی تاکید اور چوراہوں میں کھڑے ہوکر کار والوں کو روک کر پلیٹ کا نمبر اردو میں لکھوانے کی تلقین کی۔ اردو سے غیر معمولی شغف کی بنا پر انھیں بعض اوقات ارباب اقتدار کی ناراضی اور برہمی کا بھی سامنا کرنا پڑا، لیکن ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی، فرمایا کرتے تھے کہ عربی رسم الخط ایک قسم کا شارٹ ہینڈ اور اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ اور اتحاد اسلام کی اساس ہے، وہ مسلم ممالک جنھوں نے عربی، فارسی رسم الخط کو چھوڑ کر کوئی دوسرا رسم الخط اختیار کرلیا ہے، اسلام کی عالمگیر برادری سے منقطع اور اسلام کے چودہ سوسالہ علمی ورثے کے فیوض و برکات سے محروم ہوگئے ہیں، اس بارے میں وہ جدید ترکی کی مثال دیا کرتے تھے۔

اردو زبان سے غیر معمولی شغف کا دوسرا مظہر مغربی پاکستان، اردو اکیڈمی کا قیام ہے، اس کا مقصد سائنسی علوم کو اردو میں منتقل کرنا ہے، چنانچہ سید صاحب کے دور نظامت میں اردو اکیڈمی نے مختلف سائنسی موضوعات، جوہری توانائی، نباتیات، حیوانیات، نفسیات اور نظریۂ اضافیت پر ساٹھ کتابیں شائع کرکے اردو زبان کو جدید سائنسی معلومات سے مالا مال کردیا ہے۔

تصانیف: سید صاحب علمی اور تعلیمی زندگی میں مولوی محمد شفیع اور حافظ محمود شیرانی سے زیادہ متاثر اور عمر بھر ان دونوں کے علمی نظریات اور روایات کے امین اور علمبردار رہے، انھوں نے تیس بتیس کتابیں لکھیں، جن میں اہم ترین یہ ہیں:

تحقیقی کتابیں: (۱) لطائف نامہ فخری امیر علی شیر کی کتاب مجالس النفائس (ترکی) کا فارسی ترجمہ، جو فخری بن امیر نے کیا تھا، اور سید صاحب کی تحقیق اور تحشیہ سے اورینٹل کالج میگزین میں شائع ہوتا رہا۔ (۲) تذکرہ مردم دیدہ (فارسی) عبدالحکیم لاہوری نے معاصر شعرائے فارسی کا تذکرہ مرتب کیا تھا، جو سید صاحب نے تصحیح کے بعد چھپوایا۔ (۳) نوادر الالفاظ اور ہندوستان کے آخری دور کے عظیم محقق سراج الدین علی خان آرزو کی فارسی میں اردو زبان کی لغت جو سید صاحب نے متعدد قلمی نسخوں سے مقابلے کے بعد ایڈٹ کی اور انجمن ترقی اردو کراچی نے شائع کی۔

۲۔فکری کتابیں: مباحث (طبع دوم) (مختلف علمی، ادبی اور تاریخی مضامین کا مجموعہ) جس کے دو ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔ (۲) ولی سے اقبال تک (اردو کے نامور شعراء پر مضامین)۔ (۳) نقد میرؔ۔ خدائے سخن میر تقی میر کے حالات اور اس کی شاعری پر تبصرہ۔ (۴) وجہی سے عبدالحق تک (اردو نثر کی تاریخ اور مشہور نثر نگاروں کی تخلیقات کا ناقدانہ جائزہ) کتاب کے ایک باب بعنوان ''ابوالکلام آزاد اور امام عشق و جنون'' کے تحت مولانا آزاد کی شخصی اور مزاجی کیفیات کا تجزیہ جس عمدگی سے کیا ہے، اور ان کے علم و فضل کے جلوہ ہائے صدرنگ کی جس چابکدستی اور خوبصورتی سے مصوری کی ہے، وہ خاصے کی چیز ہے اور انشائے عالیہ کا بہترین نمونہ ہے۔ (۵) اشارات تنقید و نقد الادب کی تاریخ، یورپ کے تنقید نگاروں اور اسلامی دور کی تنقید کا تذکرہ، تنقید کے دور جدید اور اس کے مختلف تصورات کا بیان۔ (۶) سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء کی نثر کا فکری جائزہ طبع چہارم، لاہور (سرسید اور ان کے نامور رفقاء کی علمی اور تصنیفی سرگرمیوں کا جائزہ) اردو ادب پر ان کے اثرات و احسانات کا تذکرہ)۔ (۷) ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ طبع دوم، انجمن ترقی ادب، لاہور۔ ہندوؤں میں فارسی زبان کی ترویج و اشاعت کی تاریخ، فارسی گو ہندو شاعروں کا تذکرہ، ہندو فضلا کی لکھی ہوئی تاریخوں، تذکروں، کتب نصاب اور قواعد لغت کی تصانیف کا تفصیلی تعارف، یہ وقیع کتاب ان کے نام اور کام کو ہمیشہ زندہ رکھے گی، یہ کتاب سید صاحب نے سب سے پہلے انگریزی میں لکھی تھی، جس پر پنجاب یونیورسٹی نے انھیں ڈی لٹ کی ڈگری دی تھی، بعد میں اس کا اردو ترجمہ انجمن ترقی اردو دہلی نے شائع کیا۔

(۸) سہل اقبال۔ (۹) مسائل اقبال (علامہ اقبال کی شاعری کے مختلف

موضوعات پر مضامین کا مجموعہ)۔ (۱۰)فارسی زبان و ادب (طبع مجلس ترقی ادب، لاہور) فارسی شاعری کے مختلف ادوار کی تاریخ، مشاہیر شعرائے فارسی کا تذکرہ، نئی فارسی شاعری کی خصوصیات، ایران جدید کی علمی وادبی سرگرمیوں کا ناقدانہ جائزہ۔

(۱۱) سید عبداللہ صاحب نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی عربی، فارسی اردو وغیرہ کی قلمی کتابوں کی مشرح فہرست بھی مرتب کی جو پہلے انگریزی اور پھر اردو میں منتقل ہوئی، مذکور کتابوں کے علاوہ سید صاحب نے دو ڈھائی سو مضامین مختلف ادبی، دینی اور قومی موضوعات پر لکھے ہیں، ستر کے قریب کتابوں پر ان کے مقدمے اور تبصرے ہیں، انھوں نے کئی کتابوں کے مسودے بھی چھوڑے ہیں، جن میں عزیز ومحترم قابل ذکر ہے، اس میں بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کے متعلق شخصی تاثرات ہیں۔

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کی علمی و تصنیفی زندگی کا زندہ جاوید کارنامہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی تکمیل ہے، ان کے پیش رو مولوی محمد شفیع مرحوم کے زمانے میں اگرچہ انگریزی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لائیڈن کی تمام جلدوں کا منقح ترجمہ ہو چکا تھا، اور اس کی دو جلدیں بھی شائع ہو چکی ہیں، لیکن اس کی حقیقی تکمیل کا سہرا ڈاکٹر سید عبداللہ کے سر ہے، انھوں نے اس میں دینی اور قومی روح پھونک دی ہے، خود بھی ایک سو کے قریب مقالات لکھے اور بیرونی فضلاء سے بھی سینکڑوں مقالات لکھوا کر اس کو مستقل حیثیت عطا کردی ہے، اسی زمانے میں عربی، فارسی اور ترکی انسائیکلوپیڈیا کے بعض اجزاء بھی اشاعت پذیر ہوئے تھے لیکن پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکے اور ان کی حکومتوں نے اس بھاری پتھر کو چوم کر رکھ دیا تھا، عربی انسائیکلوپیڈیا، جس میں مصر کے مشہور محقق عالم قاضی احمد محمد شاکر کے مختصر سے ذیلی حواشی ہیں، حرف ''ص'' سے آگے نہ بڑھ سکا۔

اس کے مقابلے میں اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی بیس جلدیں شائع ہو چکی ہیں، اور دو زیر طباعت ہیں، جن کے بعد اصل کام دو ڈھائی سالوں میں مکمل ہو جائے گا، انشاء اللہ تعالیٰ کویت اور جامع ازہر نے اس کو عربی میں منتقل کرنے کی اجازت طلب کی ہے، سید صاحب نے اپنے پیچھے سینکڑوں شاگرد چھوڑے ہیں، جو ان کی فروزاں کی ہوئی شمع علم وعرفان کی روشنی میں اپنا علمی سفر طے کررہے ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین وادب کی خدمت کے صدقے میں مرحوم کے درجات بلند کرے، اور انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔

بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں (ستمبر ۱۹۸۶ء)

۱؎ مولوی فیض الحسن سہارنپوری ۱۸۸۷ء عربی زبان کے مشہور ادیب و شاعر، دیوان الحماسہ اور سبعہ معلقہ کے نامور شارح۔

۲؎ مفتی محمد عبداللہ ٹونکی (م ۱۹۳۰ء) اورینٹل کالج سے ریٹائر ہو کر پہلے دارالعلوم ندوۃ العلماء اور پھر کلکتہ مدرسہ میں مدرس رہے، اردو میں اقلیدس کا ترجمہ اور دیوان ابوالعتاہیہ کی شرح ان کی علمی یادگار ہیں۔

الازہری، محمد عمران خان ندوی، مولانا

آہ! مولانا محمد عمران خان ندوی الازہری

۲۲/اکتوبر ۸۶ء کو یکایک خبر ملی کہ مولانا حافظ محمد عمران خان ندوی ازہری اپنے خاندان والوں کو دل فگار اور اپنے جاننے والوں کو دلگیر چھوڑ کر تہتر (۷۳) سال کی عمر میں اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو سدھارے، اس خبر سے جسم و دماغ پر ایک بجلی گر پڑی۔

ان کی موت ایک خاص قسم کی قوت عمل، عزم، ادارہ، خوش انتظامی، خوش سلیقگی، خوش فکری، اور خوش وضعی کی موت ہے، وہ اپنے پیچھے ایک درس چھوڑ گئے کہ عمل پیہم اور یقین محکم سے کس طرح اہم اور بڑے سے بڑا، کام انجام دیا جاسکتا ہے، بے سروسامانی میں کیسے کیسے سازوسامان پیدا کیے جاسکتے ہیں، یاس کے عالم میں مخلص کارکنوں کی جماعت کی تنظیم کیسے کی جاسکتی، اور ناداری کے عالم میں بھی وہ کام انجام دیا جاسکتا ہے جو بڑی دولت کے ذریعہ سے نہیں کیا جاسکتا۔

وہ بھوپال کے رہنے والے تھے، ۱۹۴۷ء کے بعد جب بھوپال کا فرماں روا خاندان بھوپال چھوڑ کر دوسری جگہ پناہ گزین ہوگیا تھا تو مولانا عمران خان ندوی نے اپنی قوت ارادی کو بروئے کار لاکر بھوپال کے لوگوں کے دلوں پر اپنی فرماں روائی شروع کردی اور یہ نمونہ پیش کیا کہ تاج وتخت کے بغیر بھی اخلاص کی پاکیزگی، نیت کی طہارت اور عمل کی پختگی کے ساتھ فرماں روائی ہوسکتی ہے۔

انھوں نے تاج المساجد کی تعمیر جس طرح ازسرنو کی اور اس کی زینت و آرایش میں جس طرح اضافہ کیا، اور پھر اس کے ذریعہ سے جو دینی حمیت اور ایمانی حرارت پیدا کی، وہ ایسا کارنامہ ہے کہ دنیا کی بڑی مسجدوں کی تعمیر کی جب تاریخ لکھی جائے گی تو ان کا نام نامی بھی اس تاریخ میں ضرور لکھا جائے گا، بڑی مسجدیں تو شاہی خزانوں اور حکومت کی مالی امداد سے بنتی رہیں، لیکن تاج المساجد کی تعمیر مولانا عمران خان ندوی کے کاسۂ گدائی سے انجام پائی، یہ اس کی مثال ہے کہ کاسۂ گدائی کو جام جمشید کس طرح بنایا جاسکتا ہے تاج المساجد کو بھوپال کا فرماں روا خاندان اپنے خزانہ سے نہ بنا سکا، لیکن مولانا عمران خان نے اس کو پایہ تکمیل تک پہنچا کر یہ مثال پیش کی کہ عمل پیہم ہو تو آسمان ہُن برسا سکتا ہے اور زمین دولت اُگل سکتی ہے، انھوں نے تاج المساجد کے اردگرد اتنی مختلف قسم کی عمارتیں بنوادی ہیں کہ یہ مسجد کے لیے شاہی خزانہ سے زیادہ مفید ثابت ہوں گی، ان عمارتوں کے کرایہ سے جو آمدنی ہوگی وہ شاید تاج المساجد کے اخراجات

کے لیے کافی ہو، مرحوم کی مساعی جمیلہ سے اس مسجد کے ساتھ ایک عربی اور دینی مدرسہ بھی دارالعلوم تاج المساجد کے نام سے قائم ہے جس کی شہرت اس وقت تمام ملک میں پھیل چکی ہے، وہ اس کے امیر جامعہ تھے، انھوں نے اپنے شفیق استاد حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی یاد میں ایک ''بزم سلیمانی'' کی بھی تاسیس کی ہے جو شاید آگے چل کر ایک اہم علمی ادارہ ہوجائے، ان ہی کی سرپرستی میں پندرہ روزہ جریدہ "نشان منزل" شایع ہوتا رہا جو دارالعلوم تاج المساجد کا ترجمان ہے۔

دارالمصنفین سے ان کا تعلق تقریباً چھپن ۵۶ سال تک رہا، وہ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے عزیز شاگرد تھے اپنی شاگردی کا حق انھوں نے حضرت سید صاحبؒ پر ایک سیمینار منعقد کر کے اور ''مطالعہ سلیمانی'' کی دلآویز جلد شایع کر کے ادا کیا، وہ مولانا مسعود علی ندوی کے بڑے معتمد علیہ تھے، ان کے خاندان والوں سے آخر وقت تک بڑی وضعداری اور محبت سے ملتے رہے، ملازمت ندوہ کے مہتمم کی حیثیت سے شروع کی، تاج المساجد کی خاطر بھوپال چلے گئے، لیکن ندوہ کو حرز جاں بنائے رکھا اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ مل کر ندوہ کے تمام مسائل کو حل کرنے میں برابر کے شریک رہے، دارالمصنفین کے ہر چھوٹے بڑے جلسہ میں اس کی مجلس انتظامیہ کے رکن کی حیثیت سے برابر شرکت کر کے اس کی رہنمائی کرتے رہے۔

وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں اپنی فقیری میں امیری، اپنی بے سروسامانی میں میر سامانی اور اپنی تنگدستی میں کشادہ دستی کے لیے مشہور رہے، ان کے جسم پر لباس بہت ہی سادہ رہتا، لیکن اس سادگی میں ان کی عزیمت کی چمکاری نظر آتی، وہ پرانے بزرگوں کی طرح اپنی وضعداری کے لیے ہر جگہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے، وہ اپنے معاصروں اور دوستوں سے اختلاف کرتے تو اس میں بھی ان کی مروت اور شرافت اخلاق کے موتی جھلملاتے رہتے وہ اپنے ماتحتوں کو ڈانٹتے تو ان کی ڈانٹ میں اخلاص ہوتا اور ان کی پھٹکار میں کریم النفسی چھپی رہتی، ان کے گھر میں بڑا خوش ذائقہ کھانا پکتا جس کو وہ بہت ہی خوش سلیقگی سے کھاتے اور کھلاتے، وہ منبر پر وعظ کہنے یا تقریر کرنے بیٹھتے تو اپنی بذلہ سنجیوں کے پھولوں کو سامعین پر نچھاور کرتے رہتے جس میں وہ ایمان کی شامہ کی نکہت بیزی محسوس کرتے۔

ان کی موت سے ان کا خاندان ایک شفیق باپ، دارالعلوم ندوہ ایک نامور فرزند، تاج المساجد ایک بے مثال نگہبان، تبلیغی جماعت ایک انتہائی متحرک رہنما، بھوپال ایک جلیل القدر شہری اور ملک ایک معزز شخصیت سے محروم ہوگیا، ان کی اولاد اپنے آنسوؤں کے موتیوں کی لڑیوں کے ساتھ ان کی شفقت و محبت کو یاد کرتی رہے گی، دارالعلوم ندوہ دعا گو رہے گا کہ ان کا ثانی پھر پیدا ہوجائے، تاج المساجد کے چپہ چپہ پر چشم بینا ان کا نام منقش دیکھے گی، اس مسجد میں جو سالانہ تبلیغی اجتماع ہوگا تو اس کے تمام حاضرین ان کی خوش انتظامی کو اپنی نم آنکھوں سے یاد کر کے ان کے ایصال ثواب کے لیے دعائیں کرتے رہیں گے، ملک کے برادران وطن جوان سے ملتے رہے وہ بھی ان کو اس حیثیت سے یاد کرتے رہیں گے کہ ان کے ایسا اخلاص ملک کے تمام لوگوں میں پیدا ہوجائے تو ان کی دھرتی سونے کی ہوجائے۔

جانے والے جا! رخصت، الوداع! تیری تربت مغفرت الٰہی کی خوشبوؤں سے معطر رہے، تیری ابدی آرام گاہ انوار الٰہی سے منور ہو، سلام، لاکھوں سلام۔

وہ مجددی سلسلہ کے مشہور بزرگ اور کامل طریقت حضرت شاہ محمد یعقوب عرف ننھے میاں قدس سرہٗ العزیز سے بیعت ہوکر زیر تربیت بھی رہے اور ان کے بہت ہی محبوب اور چہیتے مرید اور مجاز بیعت تھے، ان ہی کی ہدایت پر تاج المساجد کے کھنڈر کی ازسرنو تعمیر شروع کی، اس خانقاہ کے موجودہ سجادہ نشین حضرت شاہ سعید میاں کو بہت ہی عزیز رکھتے تھے، اور حضرت سعید میاں ان کی رحلت سے ایسے ہی مغموم اور ملول ہوں گے جیسے اپنے خاندان کے کسی شفیق بزرگ کی وفات سے ہوتے، اسی تعلق کی بنا پر مرحوم کی ابدی خوابگاہ ان کے مرشد کے پہلو میں ہے، حالانکہ ان کی ابدی نیند کی اصلی جگہ تاج المساجد کے کسی گوشہ ہی میں ہونی چاہیے تھی، مگر شاید خود ان کو اپنے مرشد کی قربت زیادہ عزیز تھی۔

مرحوم کا جنازہ بڑی دھوم سے اٹھا، ان کی میت کے پیچھے بھوپال کے ایک لاکھ لوگ سوگوار اور گریہ کناں تھے، وہ بھوپال کے عاشق تھے اور اس عاشق کا جنازہ اسی دھوم سے نکلنا چاہیے تھا۔

وہ عالم بقا کو جا رہے تھے لیکن ان کی میت کی غمناک فضا ان کی طرف سے لوگوں سے یہ کہہ رہی تھی:

رفتم و از رفتن عالمے تاریک شد
من گر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم

(''ص۔ع''، نومبر ۱۹۸۶ء)

اصلاحی، ابوالحسن علی فراہی، مولوی

مولوی ابوالحسن علی فراہی اصلاحی

مولوی ابوالحسن علی فراہی اصلاحی ناظم مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کئی ماہ سے بیمار تھے۔ علاج کے باوجود مرض بڑھتا گیا۔ بالآخر ۳۱ / جنوری ۱۹۸۷ء کو وقت موعود آپہنچا اور رحلت کرگئے، اناللہ و انا الیہ راجعون۔

وہ ترجمان القرآن مولانا حمیدالدین فراہیؒ کے حقیقی پوتے تھے، ان کی تعلیم مدرسۃ الاصلاح کے علاوہ شبلی نیشنل اسکول و کالج میں ہوئی تھی، گھر کے خوش حال تھے،

اس لئے کوئی ملازمت کرنے کے بجائے زمین اور زمینداری کی دیکھ بھال کرتے رہے، لیکن قومی وملی کاموں سے دلچسپی تھی، تقسیم کے زمانہ میں جمعیۃ علماء کانگریس کے پرجوش حامی تھے، تقسیم کے بعد صوبہ کانگریس کے ممبر بھی ہوئے، پھر پرانے کانگریسیوں کی طرح اس سے دل برداشتہ ہوکر لوک دل میں چلے گئے مگر اس سے بھی نباہ نہ کرسکے اور اب سیاسی جھمیلوں سے الگ ہوکر صرف مدرسۃ الاصلاح کی خدمت کے لئے وقف ہوگئے تھے، جس سے اپنے دادا کی یادگار ہونے کی بناء پر ہمیشہ بہت تعلق رکھا، پہلے اس کے نائب ناظم ہوئے اور اب کئی برس سے ناظم ہوگئے تھے۔

وہ جس اخلاص، ایثار وقربانی سے کسی معاوضہ کے بغیر مدرسہ کی خدمت انجام دے رہے تھے، اس کی مثال کسی دینی مدرسہ میں کم ہی ملے گی، ان کے دور میں مدرسہ میں کئی عمارتیں تعمیر ہوئی، بعض مفید کام بھی انجام پائے، یہاں ان کے دادا کی یاد میں دائرہ حمیدیہ قائم ہوا تھا جس کو متحرک بنانے کے بڑے خواہشمند تھے، مرحوم کو دارالمصنفین سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ ان کے دادا مولانا حمیدالدین فراہیؒ کی سرپرستی میں اس کا آغاز ہوا تھا، ان کے بعد ان کے چھوٹے بھائی مولوی حاجی رشیدالدین فراہی کو بھی اس ادارہ سے بڑی دلچسپی اور ہمدردی رہی۔

مرحوم مرنجان مرنج شخص تھے، طبیعت میں سادگی، قناعت اور انکسار کے ساتھ بڑا صبر وتحمل اور بردباری تھی، اپنی ان خوبیوں کی وجہ سے مقبول اور ہردلعزیز تھے، جس کا اندازہ ان کے جنازے سے بھی ہوا جس میں بے شمار مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم بھی شریک تھے، اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

(''ض''، فروری ۱۹۸۷ء)

<u>اہلیہ ندوی، سید سلیمان</u>

اہلیہ محترمہ مولانا سید سلیمان ندویؒ

کراچی کے ایک مکتوب سے یہ المناک خبر ملی کہ استاذی المعظم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی اہلیہ محترمہ ۲۳/ جولائی ۱۹۸۷ء کو اپنی اولاد کو آنسوؤں کے سیل رواں میں چھوڑ کر عالم جاودانی کو سدھاریں۔ اِنَّا للہ وَاِنَّا اِلیہ راجعون۔

یہ تعزیتی تحریر دارالمصنفین کے احاطہ میں اس گھر میں لکھی جارہی ہے جہاں حضرت استاذی المحترم نے اپنی زندگی کے بہترین بلکہ بہار آفریں اور مشک آگیں دور گزارے ہیں، وہ یہاں کے کتب خانہ میں اپنی میز پر سیرۃ النبیؐ، معارف کے شذرات، علمی، مذہبی اور ادبی مضامین میں اپنے علم وعرفان کے مروارید، نظر وفکر کے زمرد اور ادب وانشا کے درشا ہوار بکھیر کر داخل ہوتے تو پہلے اپنی سب سے چھوٹی اولاد کو اپنی آغوش شفقت میں لیتے، پھر ان کی اور اولادیں ان کے یمین ویسار میں سما جاتیں، جس کے بعد علمی میز پر ان کو جو تکان ہوتی وہ یکا یک دور ہوجاتی، اور ان کے چہرے پر بشاشت، ان کی ہر ادا میں نزہت اور ان کی بزرگی میں روحانیت دکھائی دیتی، وہ اپنے بچوں کے شگفتہ چہروں کو دیکھتے تو ان کی آنکھیں جنت بن جاتیں، ان کی معصوم باتوں کو سنتے تو ان کے کان فردوس گوش بن جاتے، پھر فضا میں پدری مہر ومحبت کی کوثر وسلسبیل نظر آتیں، اسی فضا میں ان کی اہلیہ محترمہ نے بھی زندگی گزاری، اس گھر میں وہ تقریباً ۱۰ برس رہیں۔

سید صاحب اپنی گھریلو زندگی میں بہت ہی نفاست پسند تھے، ان کی ہر چیز بہت سلیقہ، صفائی اور ستھرائی سے رہتی، مرحومہ بھی فطری طور پر بہت ہی سلیقہ مند، مہذب، عبادت گزار اور باوقار تھیں، جس سے سید صاحب کو اپنی زندگی میں بڑی مدد ملتی رہتی، دارالمصنفین کی قلیل آمدنی میں دونوں کی زندگی نہ صرف صاف ستھری بلکہ کیف وسرور سے معمور رہی۔ سید صاحبؒ کے ساتھ بھوپال بھی گئیں، پھر کراچی منتقل ہوگئیں، لیکن آخر وقت تک فرماتی رہیں کہ جو مسرت اور انبساط بھری زندگی دارالمصنفین گزری وہ کہیں اور نہیں ملی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو چار بیٹیوں اور ایک بیٹے سے نوازا، سید صاحب کی پہلی اہلیہ محترمہ مرحومہ سے ایک بیٹا ابوسہیل خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں، مرحومہ اپنی محبت بھری وضعداری میں جب کبھی کوئی خط لکھتیں تو آخر میں والدہ ابوسہیل ہی لکھ کر اس کو ختم کرتیں، ان کے فرزند ارجمند عزیزی ڈاکٹر سلمان ندوی نے اپنا نام علمی دنیا میں اونچا کیا ہے، لیکن عالی ظرفی میں والدہ سلمان لکھنے کے بجائے زیادہ تر والدہ ابوسہیل ہی لکھنا پسند کرتیں۔

وہ اپنی تمام اولاد کو اپنی زندگی میں آباد، خوش اور خرم دیکھ کر اس دنیا سے رخصت ہوئیں، اپنے نواسے، نواسیوں اور پوتی کی زندگی کی بہاریں بھی دیکھیں، ایک خوش نصیب ماں کی حیثیت سے اس دارفانی سے رخصت ہوئیں، البتہ اپنے اور ہردلعزیز شوہر کی وفات کے بعد تقریباً ۳۴ سال بیوگی کی زندگی گزاری، مگر ان کی یادوں کی جوت جگا کر ہر طرح شاکر رہنے کی کوشش کی، ان کی وفات کے ۱۶ برس کے بعد حکومت پاکستان نے ان کے لئے ایک وظیفہ مقرر کردیا تھا، یہ کوئی بڑی رقم نہ تھی، مگر قناعت، توکل، صبر اور رضا کو اپنی نسوانی زندگی کا زیور اور ہنسی خوشی کے موتیوں کو اپنے گلے کا ہار بنا کر بچوں کے ساتھ اپنی زندگی گزاری۔

یہ راقم ۱۹۳۵ء سے ان کی زندگی کے آخری لمحات تک ان کی مخلصانہ شفقت کی تسنیم سے سیراب ہوتا رہا، ایک ماں کی مہر ومحبت کی جتنی ضیاء باری ہوسکتی ہے، وہ ایک حقیقت بن کر میری زندگی کے ذرہ ذرہ میں چمکتی رہی، میری جوانی ایک اندوہ ناک سانحہ سے بالکل برباد اور تباہ ہونے کو تھی، لیکن انھوں نے دستگیری کی، اور اس کو سنوار کر ازسرنو بسر کرنے میں فرشتۂ رحمت بن گئیں، ۱۹۵۵ء سے کراچی برابر جاتا رہا ہوں، یہ

شہر میری نگاہوں میں اس لیے جاذب ہے کہ یہیں استاذی المحترم کا مزار پر انوار ہے، پھر جب وہاں پہنچ کر مرحومہ کی خدمت میں حاضر ہوتا، تو ایسا معلوم ہوتا کہ مہر مادری کی مہتابی چھٹکی ہوئی ہے، اور میں گلشن محبت کی خوشبوؤں سے معطر ہو رہا ہوں، گزشتہ مہینہ پاکستان کے سفر میں ۳/ جولائی ۱۹۸۷ء کو ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ اپنی تشویش ناک علالت کی وجہ سے نیم بے ہوشی کے عالم میں تھیں، ان کی آنکھ کھلیں تو پہچانا، ہاتھ پکڑ کر بولیں بیٹا! اچھا ہوا تم آ گئے، آخری ملاقات ہوگئی، اب دنیا سے رخصت ہو رہی ہوں، ان پر موت کا کوئی ہراس طاری نہ تھا مجھ کو دیکھ کر ان کی اگلی سی توانائی آ گئی، زندگی کی بزم رفتہ کی کہانی شروع کردی، اس وقت ایسا معلوم ہوا کہ وہ قضاء کی دلہن بنی ہوئیں ہیں، ۱۶/ جولائی تک ان کی عیادت کے لئے برابر حاضر ہوتا رہا۔

حضرت سید صاحبؒ کی سیرۃ النبیؐ جلد ہفتم پر پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے ایک لاکھ روپے کے انعام کا اعلان کیا تھا، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے یہ طے فرمایا تھا کہ اس میں سے ۵۰ ہزار روپے کی رقم مرحومہ کی خدمت میں پیش کی جائے، اور بقیہ ۵۰ ہزار دارالمصنفین کو ملے، کوشش تھی کہ یہ رقم مرحومہ کی زندگی میں ان کے پاس پہنچ جائے، ان کو کم از کم یہ تسلی ہو کہ ان کو بھی اپنے نامور شوہر کی علمی ناموری سے کچھ نہ کچھ مادی اور مالی فائدہ پہنچا، مگر یہ رقم ان کے پاس اس وقت پہنچی، جب وہ کائنات کی ساری دولت سے بے نیاز ہو چکی تھیں۔

حضرت سید صاحب کے روحانی خلیفہ جناب مولانا غلام محمد نے اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا:

"وقعت الواقعة [الواقعة: ۱] کل بروز پنج شنبہ ۲۶، ذی قعدہ ۱۴۰۷ھ/ ۲۳، جولائی ۱۹۸۷ء کو صبح کے ٹھیک ۷ بجے علیا پیرانی صاحبہ رحلت کر گئیں، بڑے سایۂ شفقت اور بڑی دعاؤں کی پشت پناہی سے ہم سب محروم ہو گئے، اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت کرے، اور درجات عالیہ عطا فرمائیں، آخری وقت تک وہی بے ہوشی کی سی کیفیت رہی، نماز جنازہ جامع مسجد بیت المکرّم گلشن اقبال میں نماز عصر کے فوراً بعد پڑھی گئی، امامت کی سعادت سلمان میاں اور سب اہل خانہ کے اصرار پر راقم حقیر ہی کے حصہ میں آئی، ماشاء اللہ! پیرانی صاحبہ پر سکینت کا یہ عالم تھا کہ جیسے ہی جنازہ کے قریب آیا، محسوس ہوا کہ کسی نے میرے سینہ میں برف رکھ دی، جنازہ میں اہل اخلاص و محبت کا خاصا اجتماع رہا، مولانا ناظم ندوی، پروفیسر فخر الحسن، حاجی علی محمد صاحب، مولانا عبدالشکور، جناب نومی والا اور آپ کے داماد ڈاکٹر راشد مصطفےٰ وغیرہ شریک تھے، بیت المکرّم کے وسیع رقبہ میں سات بڑی صفیں ہوگئی تھی، الحمدللہ ریڈیو پر بھی اطلاع نشر ہوئی، اخباروں میں بھی خبر چھپی، گورنر سندھ اور عمائدین حکومت کی طرف سے اخبارات میں تعزیتی بیانات چھپے، ملک پلانٹ سے متصل قبرستان میں ایک صاف ستھری جگہ پر ایک نیم کے سایہ دار درخت کے نیچے مرحومہ کی ابدی خواب گاہ بنی ہے۔ رحمہما اللہ تعالیٰ رحمۃ دائما۔ یوں تو گھر کا ہر فرد وفور غم میں مبتلا تھا، مگر میری اہلیہ بتا رہی تھیں کہ منجھلی اور چھوٹی صاحبزادیوں کا حال بہت ہی برا تھا، مگر ہمت سے کام کر رہی تھیں، پیرانی صاحبہ کو غسل خود صاحبزادی نے اپنے ہاتھوں سے دیا، ماں کی کیسی خوش نصیبی اور بیٹیوں کی کتنی بڑی سعادت اندوزی ہے"۔

وہ وہاں جا چکیں، جہاں ایک روز سب کو جانا ہے، اپنے جلیل القدر شوہر کی ناموس اور عظمت کو اپنی بیوگی میں جس زہد و عبادت سے برقرار رکھا، پھر جس سے ملیں اس کو اپنی بزرگانہ محبت سے جس طرح سرشار اور اپنے پیچھے اپنے آن بان کی جو روایتیں چھوڑ گئی ہیں، ان کی یادوں کی شمع روشن کر کے، ان کی اولاد ان کی خوبیوں کے جلووں سے اپنی خلوتیں آباد کرتی رہے گی، ان کے جاننے اور ملنے والوں میں کون ہے، جو یاد کر کے سوگوار نہ ہوگا، میرے لیے ان کی یاد کی بے کلی مخزن تسکین بنی رہے گی، حضرت سید صاحب کے سایہ عاطفت اور مرحومہ کی شفقت مادری کے جلو میں دارالمصنفین کے احاطہ کی زندگی میں جو کشش، یہاں کی جو دلکشی، یہاں کی شام میں جو دل فریبی اور یہاں کی رات میں جو دل افروزی پائی، ان کی یادوں کے غم کو آغوش میں چشم اشک آگیں کے ساتھ بقیہ زندگی گزرے گی، دعا ہے کہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک طینت اور پاک صفات مصنف کی شریک حیات کی تربت کو اللہ جل شانہ اپنی رحمتوں اور برکتوں کے پھولوں سے ہمیشہ نکہت بیز رکھے، آمین ثم آمین۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَام.

[الرحمن: ۲۶-۲۷]

("ص۔ع"، اگست ۱۹۸۷ء)

<u>عبدالرحمٰن، سید صباح الدین</u>

آہ! سید صباح الدین عبدالرحمٰن!!

مسند شبلی و سلیمان اجڑ گئی

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن ناظم دارالمصنفین و اڈیٹر معارف ہم سب کو چھوڑ کر اب خدائے رحمان کے آغوش رحمت میں چلے گئے، گذشتہ ماہ ۱۸/ نومبر کو ٹیلیفون اور ریڈیو سے دن میں دو ڈھائی بجے کے درمیان ان کی المناک شہادت کی خبر دارالمصنفین میں بجلی بن کر گری اور ان کے متعلقین و وابستگان دارالمصنفین کی امیدوں اور آرزوؤں کے خرمن کو خاک و سیاہ کر گئی، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالسلام ندویؒ اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ کے بعد دارالمصنفین کی بزم علم و ادب اسی

چراغ سے روشن تھی لیکن افسوس کہ بادحوادث کے جھونکوں نے اسے بھی گل کردیا:

صبح تک تو نے نہ چھوڑی وہ بھی اے باد صبا
یادگار گل شمع تھی کل تک جو پروانے کی خاک

وہ بالکل ٹھیک تھے، ۱۰؍نومبر کولکھنؤ روانہ ہونے سے پہلے فجر بعد ہی مجھے نومبر کے معارف کے شذرات دیے اور ۹ بجے دن میں انھیں کاتب کے حوالے کرنے کی تاکید کی اور عین روانگی کے وقت فرمایا کہ ۱۹؍نومبر کے بعد واپس ہوں گا، میں ان کی مشایعت کے لیے ان کے پیچھے ہوگیا تو مڑکر میری جانب دیکھا اور فرمایا کہ بیٹھیے! میں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو انھوں نے مصافحہ کرتے ہوئے خدا حافظ کہا اور آگے بڑھ گئے، میری طبیعت نہ مانی اور میں ان کو رخصت کرنے کے لیے پھاٹک تک گیا، وہاں دوسرے رفقاء اور وابستگان دارالمصنفین بھی ان کو رخصت کرنے کے لیے پہلے سے موجود تھے، سب سے رخصت ہوکر وہ رکشہ پر بیٹھ کر روانہ ہوگئے، ۲۰؍نومبر کو جمعہ تھا، جمعہ چھوٹ جانے کے اندیشہ سے وہ اس دن سفر نہیں کرتے، اس لیے خیال تھا کہ ۲۱؍نومبر کو واپس تشریف لائیں گے مگر کیا معلوم تھا کہ دارالمصنفین کے افق علم پر مسلسل باون برس سے چمکنے والا سورج اب غروب ہونے والا ہے اور اس عالم ناسوت میں ہم اس کی دید سے محروم ہوجائیں گے۔

۱۸؍نومبر کو ناشتہ سے فارغ ہوکر وہ ندوۃ العلماء سے اپنے عزیز و ہم وطن جناب سید شہاب الدین دسنوی کے ہم راہ مولانا مفتی محمد رضا انصاری سے ملنے کے لیے ان کے دولت کدہ پر جارہے تھے مگر ڈالی گنج کے پل ہی پر جان لیوا حادثہ پیش آگیا۔ دسنوی صاحب فوراً انھیں میڈیکل کالج لے گئے مگر ڈاکٹر نے بتایا کہ اللہ کو پیارے ہوچکے ہیں، وہ نہ بیمار پڑے، نہ سکرات الموت کی شدتیں جھیلیں، نہ کسی سے کوئی بات کی اور نہ کسی کو اپنی خدمت کا کوئی موقع دیا، بلکہ اپنے مستقر سے دوری اور عزیزوں سے مجبوری کے عالم میں جان جان آفریں کے سپرد کردی اور دارالمصنفین کے در و دیوار کو روتا اور تڑپتا ہوا چھوڑ گئے، یہ ان کی خوش نصیبی تھی کہ لکھنؤ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے ان کے جنازہ کی نماز پڑھائی، رات ہی میں نعش دارالمصنفین پہنچی اور دس بجے دن میں ان کی وصیت کے مطابق مسجد کے سامنے علامہ شبلیؒ کے پہلو میں ان کی تدفین ہوئی، ان کو علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ سے والہانہ تعلق تھا، ان کے خلاف ایک لفظ سننا پسند نہ کرتے تھے، اور اگر کوئی ان کے خلاف کچھ لکھ دیتا تھا تو وہ ہمیشہ کے لیے ان کی نگاہ میں گرجاتا تھا، وہ ان سے بڑا کسی کو ادیب، انشاء پرداز، محقق اور مصنف ماننے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے، یہ عجیب اتفاق ہے کہ مولانا شبلیؒ ہی کی طرح ان کے اس عاشق و شیدائی کی وفات بھی اسی چہارشنبہ ۱۸؍نومبر کو ہی ہوئی اور وہ ان ہی کے پہلو میں دفن بھی ہوا ع پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

وہ ۱۹۱۱ء میں صوبہ بہار کی اس مردم خیز بستی دیسنہ میں پیدا ہوئے جس کو ان کے استاد محترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کے مولد ہونے کا شرف حاصل ہے، ان کی ولادت سے قبل ہی ان کے والد جناب سید محی الدین کا انتقال ہوچکا تھا اور سات برس کے ہوئے تو والدہ ماجدہ بھی اللہ کو پیاری ہوگئیں، مگر ان کے دوسرے عزیزوں کی پرورش و پرداخت نے انھیں کبھی اپنے یتیم ہونے کا احساس نہ ہونے دیا، ان کے خاندان میں کئی پشتوں سے انگریزی تعلیم کا رواج تھا، اس لیے انھوں نے بھی انگریزی تعلیم شروع کی اور پٹنہ یونیورسٹی سے بی۔اے اور ایم۔اے کیا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ٹریننگ کالج سے بھی ڈگری لی، اور جامعہ ملیہ میں بھی کچھ مدت گزاری، پھر مولانا سید سلیمان ندویؒ کی نگاہ انتخاب ان پر پڑی اور ۱۹۳۵ء میں وہ دارالمصنفین آگئے، یہاں تصنیف و تالیف کے کام سے ایسی دلچسپی اور مناسبت پیدا ہوئی کہ مرنے کے بعد ہی اس سے تعلق منقطع ہوا، ان کی غیر معمولی صلاحیت و قابلیت کی وجہ سے ناممکن تھا کہ کوئی ادارہ، یونیورسٹی اور انسٹی ٹیوٹ ان کا خیر مقدم نہ کرتا، جب کبھی بیش قرار تنخواہوں اور بڑے عہدوں کی پیشکش کی گئی تو انھوں نے یہ کہہ کر مسترد کردیا کہ:

بردایں دام برمرغ دگرنہ   کہ عنقارا بلند است آشیانہ

کیا کیا انقلابات رونما ہوئے، مشکلات اور دشواریاں بھی پیش آئیں، کتنے رفقاء آئے اور گئے، مگر وہ ثبات و استقلال کی چٹان بنے رہے اور دارالمصنفین کے قلیل مشاہرہ پر قانع ہوکر اسی سے وابستہ اور علم و فن کی خدمت پر خوش و خرم رہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے اس ایثار و قربانی کا صلہ دیا، مرکزی حکومت نے ان کے علم و فضل کا اعتراف فارسی میں سند اور خلعت عطا کرکے کیا، اس سلسلہ میں ان کو پانچ ہزار سالانہ وظیفہ ملتا تھا، ان کو دوسرے ایوارڈ بھی ملے، بعض اداروں اور اردو اکیڈمیوں نے بھی ان کی قدردانی کی۔ وہ جب دارالمصنفین تشریف لائے تو یہ اس کے عروج و شباب کا زمانہ تھا، اس وقت اس کے سپہر علم و ادب پر مولانا سید سلیمان ندویؒ آفتاب اور مولانا عبدالسلام ندویؒ ماہتاب بن کر ضوفشاں تھے، ان کے گرد مختلف سیارے بھی حلقہ زن ہوکر اپنی چمک دمک دکھارہے تھے، سید صباح الدین صاحب نے بھی ان سیاروں میں شامل ہوکر اپنا علمی سفر شروع کیا، اور تاریخ ہند کو اپنا خاص موضوع بنایا، انھوں نے اس کا ایسا گہرا مطالعہ کیا کہ اس کے ماہر اور اتھارٹی ہوگئے اور اس میں مضامین و تصنیفات کا انبار لگا دیا، تصوف، شعر و ادب اور تنقید و تحقیق کے میدان میں بھی ان کا اشہب قلم رواں دواں رہتا تھا، بالآخر وہ دارالمصنفین کے سربراہ شبلی و سلیمان کی مسند پر متمکن ہوئے تو انھوں نے اس کا بھی اپنے کو پوری طرح اہل ثابت کردیا اور دارالمصنفین کی گذشتہ علمی عظمت اور قدیم روایات کو برقرار رکھنے میں اپنی ساری صلاحیتیں اور توانائیاں صرف کردیں اور اپنی سعی بلیغ سے دارالمصنفین کے معیار و وقار، اس کی نفاست و آرائش اور خوش انتظامی

اورخوش سلیقگی میں کوئی فرق محسوس نہ ہونے دیا۔

دارالمصنفین کے علمی پروگرام میں ہندوستان کی تاریخ کا سلسلہ بھی شامل تھا، یہ کام یہاں کے دوسرے رفقاء ومصنّفین نے بھی انجام دیا، لیکن سید صباح الدین صاحب نے ہندوستان کے عہد وسطیٰ اور مسلمانوں کے دور حکومت کے گوناگوں پہلوؤں پر جومحققانہ اورمہتم بالشان کام انجام دیا، اس کی مثال اردولٹریچر میں مشکل ہی سے ملے گی، انھوں نے سلسلۂ تاریخ ہندکو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے متعدد جلدیں لکھیں جو ان کے گہرے علم و مطالعہ کا نچوڑ ہیں، ہندوستان کے مملوک اور تیموری سلاطین کی رزمیہ داستانیں تو تمام ہی مورخین سناتے رہے ہیں مگر ان کے علمی و ادبی کارناموں کونمایاں کرنے اورعلوم ومعارف کی بزم آراستہ کرنے کا سہراان کے سر ہے، دارالمصنفین کے سلسلہ تاریخ ہند کا خاص مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلم فرماں رواؤں کے متعلق انگریزوں اور دوسرے فتنہ پرداز مورخین نے جوشبہات اور بدگمانیاں پیدا کردی ہیں ان کو دور کرکے ان کے زریں اور درخشاں کارناموں کواس طرح پیش کیا جائے کہ ملک کے مختلف فرقوں اورطبقوں میں اتحاد وہم آہنگی، محبت اور خیرسگالی کے جذبات فروغ پائیں اور تفریق، اختلاف، نفرت، کشمکش اور تصادم کی فضا کو ختم کیا جائے، ڈاکٹر ذاکرحسین مرحوم نے دارالمصنفین کے جشن طلائی کے خطبۂ صدارت میں اس کی تاریخ نگاری کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ اس مکتب فکر کے مصنفوں نے جہاں کہیں اسلامی تہذیب کے تعلقات قدیم یونانی، ایرانی، ہندی تہذیب سے دکھائے ہیں وہاں فصل کے بجائے وصل کے پہلو کو ابھارا ہے اور قصۂ سکندر دارا سنانے پر حکایت مہر و وفابیان کرنے کوترجیح دی ہے..... جب کہ ہمارے اکثر مورخ قرون وسطیٰ کے ہندوستان کوایک سحرطوفان خیز بنا کر پیش کرتے تھے جس میں اسلامی تہذیب اور ہندوتہذیب کے دھارے ایک دوسرے سے الجھتے اور ٹکراتے رہتے تھے، دارالمصنفین کے مورخوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ ان دونوں کا ملنا تصادم نہیں بلکہ امتزاج ''سنگھرش نہیں بلکہ سنگم تھا''، انھوں نے تصانیف کے علاوہ اپنے مضامین اور معارف کے شذرات میں بھی ملک کی وحدت وسالمیت کو برقرار رکھنے، یہاں کی مختلف قوموں میں میل جول اوراتحاد و یک جہتی کو قائم رکھنے اور تصادم، نفرت بعد اور بیگانگی کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔

انھوں نے تصوف کا گہرا مطالعہ کیا تھا، اس میں ان کی علمی نظر وسیع تھی، وہ اس کی تاریخ، اکابرصوفیہ کے حالات و واقعات، ان کے اقوال وملفوظات اور ان کے سلاسل سے بخوبی آگاہ تھے، ان مسائل پر جب گفتگو کرتے تو ان کی باخبری کا پورا اندازہ ہوتا، ہندوستان کے صاحب تصانیف اور اکابرصوفیہ پرایک ضخیم کتاب لکھ کر ان سے محبت وعقیدت کا حق بھی ادا کیا ہے، صوفیہ اور علمائے ربانی کے خلاف اگر ناروا اعتراضات کیے جاتے تو ان کا بہت مدلل جواب دیتے، جب ایک انگریزی کتاب ''سولہویں صدی میں شمالی ہند میں مسلمان مجددوں کی تحریکیں'' شائع ہوئی جس کا اصل مقصد حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خلاف زہرافشانی کرنا تھا تو اس کا معارف کے کئی نمبروں میں محققانہ جواب لکھا جس کو علمی حلقہ میں بہت پسند کیا گیا، تصوف کے بعض مراکز سے بھی ان کا رابطہ تھا، اپنے وطن جاتے تو پھلواری کے مشہور علمی و دینی خانوادے کے بزرگوں سے ملتے، وہ ان کے سلسلہ کے بعض اذکار واشغال کے پابند بھی تھے، مولانا سید ابوالحسن ندوی سے ہمیشہ ہی تعلق رہا، ان کی معیت میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کی خدمت میں بھی تشریف لے گئے اور ان سے باقاعدہ بیعت ہوئے۔

شعر وادب، تحقیق وتنقید سے بھی ان کو شغف رہا، ابتدا ہی میں انجمن ترقی اردو سے دیوان فغاں مرتب کرکے اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا، بزم تیموریہ اور بزم مملوکیہ بھی ان کے ادبی وتحقیقی ذوق کا ثبوت ہیں، ''غالب مدح وقدح کی روشنی میں'' لکھ کر اپنی تنقیدی بصیرت کا ثبوت دیا، اقبال کے افکار ونظریات اور فلسفہ شاعری پر بڑے باوزن مضامین لکھے اور مختلف اردوشعراء کے کلام پر بھی ان کی نگارشات معارف میں شائع ہوئیں، فارسی شعر وادب پر ان کی اچھی اور گہری نظر تھی، امیرخسرو ان کے محبوب شعراء میں تھے، ان پر کئی کتابیں لکھیں جوآج علمی وتحقیقی کام کرنے والوں کا اچھا ماخذ ہیں۔

وہ برابر سفر بھی کرتے رہتے تھے، لیکن ان کے اکثر سفر علمی ہوتے تھے، مختلف علمی وادبی انجمنوں اور تعلیمی وتحقیقی اداروں کے ممبر تھے، آئے دن علمی مذاکروں، اہم کانفرنسوں اور بین الاقوامی سیمناروں کے دعوت نامے ان کو موصول ہوتے تھے، ہندوستان اور پاکستان کے مختلف علاقوں کے علاوہ لندن اور امریکہ کے سیمناروں میں بھی شریک ہوئے، ان کی شرکت سے علمی جلسوں کی رونق بڑھ جاتی اور سیمناروں میں جان پڑجاتی تھی، جب بحث ومباحثہ میں حصہ لیتے تو سب پر چھا جاتے، اس وقت ان کی گل افشانی گفتار دیکھنے کے لائق ہوتی، تحریر وتقریر دونوں کشوروں میں یکساں ان کا سکہ رواں تھا، وہ جب کسی علمی کانفرنس کی روداد معارف میں لکھتے تو وہ اس قدر جامع، مکمل، موثر اور دلچسپ ہوتی کہ پڑھنے والا محسوس کرتا کہ وہ خود اجلاس میں شریک ہے، خود ان کے زیراہتمام دارالمصنفین کی گولڈن جبلی منائی گئی، آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس ہوئی اور ''اسلام اور مستشرقین'' کے موضوع پرایک بین الاقوامی سیمنار منعقد ہوا جن میں ملک و بیرون ملک کے علماء ودانشور، اسلامی ملکوں کے سفراء اور ارباب دول اور ارکان حکومت بھی شریک ہوئے، اور یہ ساری تقریبات بخیر وخوبی انجام پائیں اور ہر اعتبار سے کامیاب رہیں۔

۳۵ء ہی سے معارف میں ان کے مضامین نکلنے لگے جن کا سلسلہ آخر دم تک

قائم رہا، اس عرصہ میں گوناگوں مسائل و مباحث پر انھوں نے جو کچھ لکھا وہ لطف و لذت سے پڑھا گیا، اپنے احباب اور معاصر مشاہیر وفضلاء کی رحلت پر جوغم ناک اور اثر انگیز مضامین لکھے وہ سب ان کے مخصوص اور دلچسپ طرز تحریر کی وجہ سے مقبول ہوئے، جن کے دو مجموعے بھی چھپ چکے ہیں، معارف میں نکلنے والے ان کے شذرات بھی بہت پسند کیے جاتے تھے، کبھی کبھی ان میں بعض ایسے سلسلہ وار مضامین لکھے جو مستقل رسالہ کی حیثیت رکھتے ہیں، چودھویں صدی کے اختتام اور پندرھویں صدی کے آغاز کی مناسبت سے جو شذرات لکھے وہ دراصل گذشتہ صدیوں کی ملی تاریخ کا مرقع اور مسلمانوں اور ان کی حکومتوں کے عروج و زوال کی داستان ہے، ''بابری مسجد'' کی داغ بیل بھی معارف کے شذرات ہی میں پڑی تھی، اس کتاب میں نہایت محنت، جانفشانی، تلاش اور تحقیق سے تمام واقعات وحقائق کو بے کم وکاست پیش کیا گیا ہے، اور یہ اس موضوع پر مستند وثیقہ اور معتبر علمی و تاریخی دستاویز ہے۔

ان میں غیر معمولی قوت عمل تھی اور وہ دھن اور ارادے کے بڑے پکے تھے، جس کام کا بیڑا اٹھالیتے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچائے بغیر دم نہ لیتے تھے، تھکنا، ہمت ہارنا اور گھبرانا جانتے ہی نہ تھے، مسلسل محنت کرتے اور شب و روز علمی اشغال میں لگے رہتے، لکھنے پڑھنے بیٹھ جاتے تو اٹھنے کا نام نہ لیتے، سفر میں بھی ان کا علمی انہاک جاری رہتا، دفتری و انتظامی امور کو بھی بڑے شوق اور دلچسپی سے انجام دیتے تھے، دارالمصنفین کے نازک اور پیچیدہ مسائل میں الجھے رہنے اور سراسر غیر علمی کاموں میں لگے رہنے کے باوجود ان کے نشاط اور تازگی میں کمی نہ آتی تھی اور اس کے بعد بھی وہ پوری دلجمعی سے کاموں میں مشغول ہوجاتے، بڑھاپے میں بھی وہ جس قدر شوق و محنت سے دارالمصنفین کے علمی و انتظامی کاموں کو انجام دیتے تھے، اسے دیکھ کر جوانوں کو رشک ہوتا تھا، ان کو قدرت نے علمی ذوق کے ساتھ انتظامی سلیقہ بھی بخشا تھا، یہ دونوں متضاد اوصاف کم ہی لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔

ملک کی تقسیم کے بعد دارالمصنفین موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہوگیا تھا، مولانا سید سلیمان ندوی جاچکے تھے، اور مولانا مسعود علی ندوی حالات کی شدتوں سے بددل اور اپنی علالت اور پیرانہ سالی کی وجہ سے معذور ہوگئے تھے، ایسے نازک دور مین ان کی مخفی صلاحیتیں وفعتہً بیدار ہوگئیں، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی نے انھیں سراپا متحرک و سرگرم عمل بنادیا اور وہ دارالمصنفین کے بچانے سنبھالنے اور اس کی ساکھ کو باقی رکھنے میں کامیاب ہوگئے، اس کی علمی سرگرمیاں بھی بدستور جاری رہیں اور تعمیری و انتظامی کام بھی خوش اسلوبی سے انجام پاتے رہے، شاہ صاحب کی وفات کے بعد سارا بوجھ تنہا ان کے کندھوں پر آگیا مگر وہ تازہ دم رہے اور ان کا حوصلہ پست نہ ہوا، ان کی دماغ سوزی نے دارالمصنفین کا لہو گرم رکھا اور وہ علمی، انتظامی اور تعمیری لحاظ سے ترقی کرتا رہا، انھوں نے اس کو مالی حیثیت سے بھی مضبوط و مستحکم رکھا۔

وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے، سنن ونوافل بھی التزام سے ادا کرتے، روزانہ کلام پاک کی تلاوت ضرور کرتے، سفر میں بھی اس میں ناغہ نہ ہوتا، عمرہ اور خانہ کعبہ کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے تھے، ان کی نجی زندگی صاف ستھری اور پاکیزہ تھی، طبیعت میں شرافت، مروت، لینت اور دلنوازی تھی، ان میں مذہبی و دینی حمیت اور قومی و ملی غیرت بھی تھی، ملت کے افتراق و انتشار اور تحزب کو سخت ناپسند کرتے تھے، مسلمانوں کی نئی نسل کی دینی تعلیم سے محرومی اور اردو زبان سے ناواقفیت پر اکثر اظہار افسوس کرتے، کسی کو تکلیف میں دیکھتے تو پریشان ہوجاتے، ان کی سعی و سفارش سے بہت سے لوگوں کے کام ہوگئے اور انھیں ملازمت اور وظائف مل گئے، طلبہ اور ریسرچ اسکالروں کو ان کی ذات سے بڑا فیض پہنچتا تھا، ان میں ضبط وتحمل اور عفو وحلم تھا، باوجود قدرت کے نہ کسی سے انتقام لیتے اور نہ اسے نقصان پہنچاتے، مہمانوں کی ضیافت میں ان کو خاص لطف ملتا تھا، دارالمصنفین میں جب کوئی مہمان آتا تو بہت خوش ہوتے اور اس کے آرام وراحت کا پورا خیال کرتے۔

ان کی وفات دارالمصنفین کے لیے واقعی جانکاہ حادثہ اور ناقابل تلافی نقصان ہے، وہ اس وقت جس آزمائش میں مبتلا ہے، اس میں ان کی رہنمائی اور سربراہی کی بڑی احتیاج تھی، مگر مصلحت خداوندی کو کون جانتا ہے، وہ عمر طبعی کو ضرور پہنچ گئے تھے مگر ان کی قوت کار، جوش عمل، قلم کی تازگی وشگفتگی اور تحریر کی رعنائی و دلکشی پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئی تھی، اور وہ مزید سرگرمی و جانفشانی سے اس کے علمی و انتظامی کاموں کو انجام دے رہے تھے، ان کی ذات دارالمصنفین کے لیے بڑا سہارا تھی، آج دارالمصنفین کا چپہ چپہ ان کی جدائی پر اشکبار اور ماتم گسار ہے۔

بارالٰہا! اپنے اس نیک بندہ اور دارالمصنفین کے بے لوث خدمت گزار کو اپنے دامن رحمت سے ڈھانک لے، اور اس کی تربت کو پرانوار کر۔ اللّٰھمّ صبّ علیہ شآبیب رحمتک و رضوانک یا ارحم الراحمین۔

اے کاروان شبلی کے مسافر الوداع! اے مملکت سلیمان کے تاجدار الفراق!!

(''ض''، دسمبر ۱۹۸۷ء)

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(ڈاکٹر عبدالمغنی)

علامہ شبلیؒ نے ایک خواب دیکھا، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اس کی تعبیر نکالی،

دارالمصنفین قائم ہوگیا۔ اس نے اتنی ترقی کہ علم و ادب کی اجتماعی کوششوں کا ایک نمونہ بن گیا اور اس کی مثال دی جانے لگی۔ کیا تصنیف و تالیف، کیا کتابت و طباعت، دارالمصنفین نے اردو کتب و رسائل کی اشاعت کا ایک معیار دنیا کے سامنے پیش کیا، اس کے مکتبے سے جو کتابیں شائع ہوئیں انھوں نے تاریخ بنائی اور وہ تاریخیں لکھیں جنھوں نے مغرب کی ذہنی دست برد کے مقابلے میں مشرق کے حوصلے بلند کردیے اور متعدد ان موضوعات کا فیصلہ مشرق کے حق میں کردیا جن کے متعلق اہل مغرب کے اس کم علم و کم نظر طبقے نے جسے مستشرقین کہا جاتا ہے طرح طرح کی غلط فہمیاں دانستہ یا نادانستہ بلکہ دونوں طور پر خود اہل مشرق کے جدید تعلیم یافتہ افراد کے درمیان پیدا کردی تھیں۔ چنانچہ ان افراد نے دارالمصنفین کے اس عظیم الشان کارنامے کا احسان مانا اور برملا اس کا اقرار کیا، اپنے وقت کے سب سے بڑے مغربی تعلیم یافتہ، ڈاکٹر علامہ سید سلیمان ندویؒ کو جوئے اسلام کا فرہاد بھی کہا اور خیام پر ان کی تصنیف کو اپنے موضوع پر تمام مباحث کا خاتم بھی قرار دیا۔

دارالمصنفین اعظم گڑھ اس لحاظ سے بھی منفرد و ممتاز ہے کہ اسے مصنفین ہی نے قائم کیا، اور ترقی دی، جب کہ عام طور پر ایسا ادارہ یا تو کسی حکومت کی سرپرستی میں چلتا ہے یا سرمایہ داروں کے بل پر۔ پھر یہ ادارہ ایک غلام ملک اور سامراجی دور میں تشکیل پاکر اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گیا۔ اس کا ارتقاء وقت کے عام رجحان کے خلاف ہوا اور اس نے رجحان زمانہ کو بدل دیا۔ علمی سطح پر یہ ایک بے نظیر انقلاب آفرینی تھی جو عہد آفرین ثابت ہوئی۔ وقعہ یہ ہے کہ بیسویں صدی میں سیاسی، معاشی اور صنعتی تقاضوں کے برخلاف مشرق کی محیرالعقول نشاۃ ثانیہ کا ایک اہم ترین نشان دارالمصنفین اعظم گڑھ ہے، لیکن برصغیر کی آزادی اور تقسیم کے وقت اس کی بقا ایک سوالیہ نشان بن گئی۔ اس بحرانی دور میں اس کے بانی علامہ سید سلیمان ندوی، اس کے تحفظ کا ابتدائی سامان کرکے دنیا سے رخصت ہوگئے اور ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا جس کا پرکرنا محال نظر آنے لگا۔

اس امر محال کو ممکن بنانے کے لیے سب سے پہلے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم سامنے آئے اور کتابوں کی اشاعت سے ''معارف'' کی ادارت تک انھوں نے دارالمصنفین کی مسلسل زندگی اور ترقی کی توقعات پیدا کیں۔ لیکن وہ بھی جلد دنیا سے رخصت ہوگئے اور یہ سوال پھر پیدا ہوگیا کہ اب کیا ہوگا۔ کون جانشین ہوگا اور طوفان حوادث میں کشتی کی ناخدائی کرکے اسے ساحل مقصود کی طرف کون لے جائیگا؟ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم اس سوال کا جواب بن کر سامنے آئے۔ وہ اپنے پیش رودوں کی طرح سند یافتہ عالم دین اور عربی و فارسی تو کیا، اردو کے بھی فارغ التحصیل نہیں تھے، انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے تاریخ میں ایم۔اے کیا تھا۔ علامہ سید سلیمان ندوی کے ہم وطن تھے اور ان کے زیر تربیت تصنیف و تالیف میں مشغول لیکن جب انھوں نے معارف کی ادارت سنبھالی اور اس کے شذرات لکھنے لگے تو محسوس ہوا کہ دارالمصنفین کا آسمان ابھی ستاروں سے خالی نہیں ہوا۔

ایک طرف بزم تیموریہ سے بزم صوفیہ تک جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی تصنیفات و تالیفات اور دسری طرف ان کے قلم سے ہر ماہ نکلنے والے معارف کے شذرات نے اردو دنیا کو یقین دلا دیا کہ نہ تو شبلیؒ کا خواب گم ہوا ہے، نہ سید سلیمان ندویؒ کی تعبیر ختم ہوئی ہے، نہ شاہ معین الدین احمد ندوی کی کوششیں رائیگاں گئی ہیں۔ چنانچہ دارالمصنفین کا نظام شمسی اب سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی ذات سے وابستہ ہوکر گردش کرنے لگا۔ ماہ و سال گزرتے رہے، بیسویں صدی اپنی آخری دہائی کی طرف بڑھتی رہی اور دارالمصنفین اپنے منصوبہ و مقدر کی تعمیل و تکمیل کرتا رہا۔ اس عظیم الشان ادارے کا وقار برقرار رہا۔ اس کی سرگرمیاں جاری رہیں، اس کی خدمات کا تسلسل قائم رہا۔

پچھلے دس ۱۰ سال میں راقم السطور کو مرحوم سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع بار بار اور مختلف جہتوں سے ملا۔ اکثر و بیشتر ان سے ملک کے علمی و ادبی جلسوں میں ملاقاتیں ہوتی رہیں اور بعض وقت تھوڑی دیر کے لیے ساتھ سفر کرنے کا اتفاق بھی ہوا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ پٹنہ آئے یا یہاں سے گزرے تو بالعموم ملے۔ اور بارہا دیر تک ساتھ رہے، باتیں کیں بحثیں کیں، کچھ معاملات کے سلسلے میں ان کے خطوط بھی آتے رہے خاکسار کے چند مضامین معارف میں شائع کیے اور خاص کر اس کی دو کتابوں پر مبسوط تبصرے کیے جن میں ایک ''اقبال کا نظام فن'' پر پورا تنقیدی مقالہ بن گیا۔ جس میں بہت زیادہ توصیف و تحسین کے ساتھ کچھ ''چھیڑ چھاڑ'' بھی تھی، لیکن جب اس چھیڑ کا قدرے مفصل جواب مصنف نے دیا تو ایک مکتوب میں مدیر معارف نے ایسے تفہیم کی کہ اشاعت پر اصرار نہ کیا جائے۔

ان باتوں سے محسوس ہوکہ جناب سید صباح الدین عبدالرحمان مرحوم ایک بہت حساس، رقیق القلب، مخلص اور گرم جوش انسان ہیں۔ بزرگوں کے نہایت عقیدت مند ہیں اور عزیزوں کے ساتھ حد درجہ شفیق، گفتگو میں اپنا نقطہ نظر پورے زور سے پیش کرتے ہیں۔ اور بعض وقت چبھتا ہوا انداز اختیار کرتے ہیں۔ جس سے محفل میں ایک تاثر پیدا ہوتا ہے اور لوگ اس نکتے کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں جو اٹھایا گیا ہے۔ مرحوم کے مضامین میں ثقاہت اور بشاشت کا وہی امتزاج ہے جو دبستان شبلی کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے۔ اس دبستان کے بانی سے مرحوم کی عقیدت ۲؍ستمبر ۱۹۸۷ء کے اس خط سے بھی آشکارا ہے جو راقم السطور کے نام دارالمصنفین میں شبلی کی تنقید نگاری پر توسیعی لکچر کا دعوت نامہ ہے۔

''میرا خیال ہے کہ آپ مولانا شبلی بحیثیت نقاد کے موضوع پر مقالہ لکھیں تو زیادہ بہتر ہو، لیکن یہ مقالہ ایسا ہو کہ ایک چھوٹے سے رسالہ میں شائع بھی کیا

جاسکے یعنی مختصر نہ ہو۔ پھر یہ واضح رہے کہ دارالمصنفین کا پلیٹ فارم ہوگا۔ اس لیے اس میں کوئی ایسی بات نہ ہو جو مولانا شبلی کی علمی و ادبی شان کے خلاف ہو۔ ظاہر ہے کہ آپ اس کا خود خیال رکھیں گے''۔

جس چیز نے مجھے یہ دعوت قبول کرنے پر آمادہ کہ کیا وہ اقتباس کا آخری جملہ ہے۔ جس سے مکتوب الیہ پر اعتماد اور اس کے ساتھ خلوص کا اظہار ہوتا ہے، ورنہ مرحوم نے مجھ سے خود اپنی آخری ملاقات میں، جو جناب سید شہاب الدین دسنوی کے مکان پر پٹنہ میں ہوئی تھی، بتایا کہ اردو کے ایک بزرگ ترین نقاد شاید ''مولانا شبلیؒ کی علمی و ادبی شان کے خلاف'' کچھ نہ کہنے کی پابندی پر گویا، اتنے خفا ہوئے کہ انھوں نے دعوت نامے کا جواب نہیں دیا۔ بہر حال، جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے الفاظ۔ مولانا شبلی کے ساتھ ان کی عقیدت میں غلو کے باوجود، اشارہ کرتے ہیں کہ مرحوم نے کس محبت اور محنت کے ساتھ اپنے وقت میں دارالمصنفین اور اس کے مکتبہ فکر کی حفاظت و حمایت اور خدمت کی، پوری نصف صدی تک اپنی تمام ذہنی وجسمانی قوت مشرق کے اس مایہ ناز ادارے کی آبیاری و شادابی پر صرف کرتے رہے اور مر کر بھی اسی کی خاک میں دفن ہوئے۔ یقیناً یہ ایک ایسے جنون عشق کا انداز ہے جو اقبالؔ کے لفظوں میں عقل کے چاک بھی سیتا اور کارساز ہوتا ہے۔ اپنے ایسے مجنوں کی رحلت پر دارالمصنفین کا مستقبل ایک بار پھر سوال کر رہا ہے:

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق؟
لب ساقی پہ مکر رہے صلا میرے بعد! (غالب)

(فروری ۱۹۸۸ء)

بروہی، اے۔ کے

اے۔ کے۔ بروہی

ہندوستان اور پاکستان کے علمی حلقوں میں یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ بین الاقوامی شہرت کے قانون داں اور عالم جناب اے۔ کے۔ بروہی جن کا پورا نام اللہ بخش بروہی تھا، گزشتہ ستمبر میں عارضہ قلب میں انتقال فرما گئے، ان کی میت لندن سے کراچی لائی گئی، ان کی عمر ۷۲ سال کی تھی، مرحوم کے بارے میں یہ بالکل درست ہے کہ پیشہ کے لحاظ سے وہ قانون داں تربیت کے لحاظ سے فلسفی اور مزاج کے لحاظ سے دیندار تھے، ان کی قوت گویائی اعلیٰ درجہ کی تھی، ۱۹۶۰ء میں وہ پاکستان کے ہائی کمشنر ہوکر ہندوستان آئے، ان ہی دنوں ایک انڈو پاک کلچرل کانفرنس دلی میں منعقد ہوئی، جس میں پاکستان کے چوٹی کے ادیب، شاعر اور دانشور بھی آئے ہوئے تھے، افتتاحیہ جلسہ میں وزیر اعظم جواہر لال نہرو شریک تھے، وہ بہت تھکے تھکے معلوم ہو رہے تھے لیکن جب بروہی صاحب تقریر کرنے لگے تو وہ ہمہ تن گوش ہوگئے۔

بروہی صاحب نے اسلام آباد میں انٹرنیشنل یونیورسٹی قائم کی جس کے وہ پہلے ریکٹر ہوئے، پاکستان کی نیشنل ہجرۃ کونسل کے چیرمین تھے، جس کی وجہ سے حکومت نے انھیں سفیر کا درجہ دے رکھا تھا، وہ انگریزی میں کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ نیشنل ہجرۃ کونسل کے چیرمین کی حیثیت سے وہ اسلام سے متعلق ایک سو اعلیٰ معیار کی کتابیں مرتب کرانے میں مصروف تھے، ان کتابوں کے انتخاب کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی ہے، جس کے ایک رکن مرحوم سید صباح الدین عبدالرحمٰن بھی تھے۔ (''ض''، جنوری ۱۹۸۸ء)

خان، عبدالغفار، خان

خان عبدالغفار خاں

خان عبدالغفار خاں کی موت سے پورا ملک گہرے رنج و غم میں ڈوب گیا، وہ ہندوستان کے ان عظیم لیڈروں کی آخری یادگار تھے، جنھوں نے قوم کی بے لوث خدمت اور وطن کی آزادی کے لیے اپنے سروں پر کفن باندھ لیے تھے، ان کی پوری زندگی خدمت، جدوجہد خلوص، جوش عمل، سرگرمی، ایثار، قربانی، سرفروشی، استقامت اور نوع انسانی سے محبت و ہمدردی کا ایک نمونہ تھی، وہ ہمیشہ امن و آشتی اور عدم تشدد کے علمبردار رہے اور فرقہ واریت اور تنگ نظری کے خلاف ہمت، جرأت، اولوالعزمی اور بہادری سے لڑتے رہے۔

ان کے والد بہرام خاں پشاور کے ایک گاؤں اتمان زئی کے خوش حال زمین دار تھے، خان عبدالغفار خاں کا بچپن ناز و نعم میں بسر ہوا، ابتدائی تعلیم پشاور کے ایک مشنری اسکول میں ہوئی، ایک سال کے لیے علی گڑھ بھی آئے، یہاں سے واپس ہوکر انھوں نے تعلیمی حیثیت سے اپنے پس ماندہ علاقے میں آزاد قومی اسکول قائم کرنے کی مہم شروع کی، اسی اثنا میں مولانا ابوالکلام آزادؒ کے اخبار الہلال اور دوسرے قوم پرور اخبارات زمیندار لاہور اور مدینہ (بجنور) نے ان کا رخ قومی و سیاسی سرگرمیوں کی جانب موڑ دیا، شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ سے بھی ان کا ربطہ رہا اور وہ ریشمی رومال تحریک میں بھی شامل ہوئے، ۱۹۱۹ء میں گاندھی جی نے رولٹ ایکٹ کے خلاف ملک گیر تحریک شروع کی، خان عبدالغفار خاں نے بھی اپنے وطن کے ایک جلسہ عام میں ایکٹ کی مذمت ریزویشن منظور کیا، اس جلسہ میں نوے ۹۰ برس کے ان کے بوڑھے باپ بھی شریک تھے، ۱۹۲۰ء میں دہلی کی آل انڈیا خلافت کانفرنس میں شریک ہوئے جس میں ایک پر جوش نوجوان نے ہجرت کی تجویز پیش کی تھی، اس کے نتیجہ میں اٹھارہ ہزار پختون کابل چلے گئے، اور یہ بھی ایک بڑی جماعت لے کر گئے۔

پختونوں کی مذہبی و معاشرتی اصلاح کے لیے پہلے انجمن اصلاح الافغانیہ کی

تشکیل کی، پھر خدائی خدمت گار تنظیم اور افغان جرگہ قائم کیا، ان تحریکوں سے قبائلیوں میں سیاسی بیداری بھی پیدا ہوئی اور پشتو زبان و داب کی ترقی بھی ہوئی، خدائی خدمت گار تنظیم کو پہلے سول نافرمانی کی تحریک سے وابستہ کیا اور پھر اسے کانگریس کی ایک رضا کار شاخ بنادیا، ۱۹۳۱ء میں وہ گاندھی ارون معاہدے کے تحت گجرات جیل سے رہا ہونے کے بعد کانگریس کے سرگرم کارکن ہوگئے تھے، اسی سال وہ پہلی بار گاندھی جی سے ملے، اس کے بعد ان سے اتنا تعلق بڑھا کہ یہ خود سرحدی گاندھی کہلانے لگے بہشت نگر کے پختونوں نے خاں عبدالغفار خاں کی بے لوث خدمت کی وجہ سے ایک دن مسجد کے پاس جمع ہوکر انہیں اپنا بادشاہ بنالیا، گاندھی جی بھی انھیں شفقت سے بادشاہ خاں کہنے لگے، پھر یہی نام بچے بچے کی زبان پر چڑھ گیا، وہ واقعی پٹھانوں کے بے تاج کے بادشاہ تھے، انھوں نے سرحد کے پٹھانوں جیسے تشدد پسند لوگوں کو امن و عدم تشدد کا خوگر بنادیا، ۱۹۳۴ء میں انھیں کانگریس کی صدارت پیش کی گئی، تو کہہ کر اسے رد کر دیا کہ ''میں سپاہی ہوں اور سپاہی کی طرح مرنا چاہتا ہوں''۔

خان عبدالغفار خاں متعدد بار جیل گئے، اور انھوں نے جلا وطنی کی زندگی بھی گذاری، آزادی سے پہلے وہ پندرہ ۱۵ برس جیل میں رہے اور آزادی کے بعد بھی اتنا ہی عرصہ جیل میں گذارا مگر نہ کبھی ان کے عزم و ارادہ میں کوئی تبدیلی آئی اور نہ ملک کی تقسیم اور دوقومی نظریے کو ماننے کے لیے وہ تیار ہوئے اس بارے میں خود کانگریس کے سرکردہ لیڈروں سے ان کا اختلاف رہا، آزادی کے بعد معمولی درجہ کے لیڈر بھی مسند اقتدار پر فائز ہوتے رہے، مگر یہ خدائی خدمت گار اور صف اول کا مجاہد آزادی جیل کی صعوبتیں برداشت کرتا رہا، وہ چاہتا تو اسے ہر قسم کا عیش و آرام مل جاتا، مگر وہ اپنے اصولوں پر اٹل رہا اور جن لوگوں کے ساتھ اس نے زندگی گذاری تھی انھیں بے یار مدد گار چھوڑنا گوارا نہ کیا، آزادی کے بعد وہ چار بار ہندوستان آئے اور ہر بار ان کا نہایت پرجوش خیر مقدم کیا گیا پہلے ''نہرو امن ایوارڈ'' اور پھر ملک کا سب سے بڑا اعزاز ''بھارت رتن'' دیا گیا، مگر یہ قدر و منزلت دیکھ کر بھی ان کے دل میں یہاں مستقل رہائش کا خیال نہ ہوا بلکہ وہ ملک میں تشدد، فرقہ پرستی، علاقائیت اور انتشار کے بڑھتے ہوئے رجحان کے خلاف احتجاج ہی کرتے رہے، کاش ان کی آؤ بھگت کرنے والے ان کے اصولوں کی بھی قدر کرتے، وہ بڑے سچے اور نیک مسلمان تھے، اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ (''ض''، فروری ۱۹۸۸ء)

فرنگی محلی، محمد ہاشم میاں، مولانا

مولانا محمد ہاشم میاں فرنگی محلی

مولانا محمد ہاشم میاں فرنگی محلی کی وفات ایک بڑا سانحہ ہے، وہ ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئے اور اکہتر (۷۱) برس کی عمر میں ۴ فروری کو اللہ کو پیارے ہوگئے، فرنگی محل لکھنو کے ممتاز علمی و دینی خانوادے سے ان کا تعلق تھا، اور وہ مولانا صبغۃ اللہ فرنگی محلی کے فرزند اکبر تھے، جو عربی ادب میں مہارت اور اپنی لطافت آمیز تحریر و تقریر کے لیے مشہور تھے، یہ خصوصیت مولانا ہاشم میاں کو بھی ان سے وراثتاً ملی تھی، وہ بھی اچھے واعظ و خطیب تھے، اور ان کی تقریریں لطافت و ظرافت اور ان کے مخصوص انداز کی وجہ سے بہت دلنشیں ہوتیں، اور پسند کی باتیں، بڑے خوش پوش، جامہ زیب لکھنؤ کی قدیم روایت و تہذیب اور اپنی خاندانی وضعداری اور شرافت کا نمونہ تھے، وہ بہت باغ و بہار شخص تھے، ان کی بذلہ سنجی، خوش طبعی اور خوش گفتاری مشہور تھی۔

مولانا محمد ہاشم لکھنؤ کے مختلف مذہبی، علمی اور تعلیمی اداروں سے وابستہ تھے، دینی تعلیم اور اردو کے فروغ کے لیے غیر معمولی جدوجہد کی، شروع ہی سے اترپردیش دینی تعلیمی کونسل کے اہم رکن تھے، مسلم پرسنل لا بورڈ کے بھی ممبر تھے، سماجی اور سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے تھے، ایک زمانہ میں ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی مرحوم کے ساتھ مل کر بابو ترلوکی سنگھ کی پرجا سوشلسٹ پارٹی کو بڑی مدد پہنچائی، مگر جلد ہی اس میدان سے کنارہ کش ہوگئے، وہ اپنی نیکی، شرافت، تواضع خوش خلقی اور وسعت قلبی کی وجہ سے نہ صرف مسلمانوں کے ہر طبقہ و جماعت بلکہ غیر مسلموں میں بھی مقبول تھے اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے۔ (''ض''، فروری ۱۹۸۸ء)

بیگ، نیاز احمد، مرزا

مرزا نیاز احمد بیگ

افسوس ہے کہ ۷/فروری کو دارالمصنفین کے ایک قدیم رکن مرزا نیاز احمد بیگ بھی رحلت فرما گئے، وہ اعظم گڑھ کے ممتاز اور کامیاب وکیل اور شہر کے عمائد میں تھے، مولانا شبلیؒ اور ان سے نسبت رکھنے والے تمام اداروں سے ان کو بڑا تعلق تھا، شبلیؒ نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج کی مجلس انتظامیہ کے برسوں رکن اور نائب صدر رہے، اب ان کی تمام تر توجہ دارالمصنفین کی طرف مرکوز ہوگئی تھی جس کی مجلس انتظامیہ کے وہ آخر دم تک رکن رہے، دارالمصنفین کے نازک اور بحرانی دور میں ان کے مفید قانونی مشوروں سے اس کو بڑا فائدہ پہنچا، اب وہ اپنے ایک سچے بہی خیر خواہ اور مخلص ہمدرد سے محروم ہوگیا، وہ صوم وصلوٰۃ کے ہمیشہ سے پابند رہے، حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے، آخر عمر میں ان کی دینداری زیادہ بڑھ گئی تھی، علماء وصلحاء سے بھی تعلق رکھتے تھے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے خاص عقیدت تھی، اللہ تعالےٰ ان کی بشری لغزشوں سے درگذر فرمائے۔ اور انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

(''ض''، فروری ۱۹۸۸ء)

نقوی، سید علی نقی، مولانا

مولانا سید علی نقی نقوی

اس وقت اس برصغیر میں مولانا سید علی نقی نقوی کا ماتم بپا ہے، انھوں نے اپنے وطن لکھنؤ میں طویل علالت کے بعد ۱۸؍مئی کو وفات پائی، گوناگوں علمی کمالات اور عملی خوبیوں کے جامع اور فرقۂ شیعہ کے ممتاز علماء و مجتہدین میں تھے، مدرسہ ناظمیہ اور سلطان المدارس میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے فاضل ادب کا امتحان دیا، پھر پانچ برس تک نجف میں تعلیم حاصل کی اور لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ علوم مشرقیہ میں درس دیا، ۱۹۵۹ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ دینیات سے وابستہ ہوئے اور ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی ہوکر سبکدوش ہوئے، تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، فلسفہ، منطق، نحو، لغت، تاریخ اور جغرافیہ کے علاوہ اردو فارسی اور عربی ادب پر بھی ان کی نظر گہری اور وسیع تھی اور عربی کے صاحب دیوان شاعر تھے، عربی، فارسی اور اردو میں تین سو کتابیں یادگار چھوڑیں، ان میں بعض کو شہرت نصیب ہوئی اور بعض کے ترجمے دوسری زبانوں میں ہوئے، وہ بڑے اچھے مقرر اور خطیب بھی تھے۔

مولانا نقن میاں اپنی شرافت، منکسر المزاجی اور حسن خلق کی وجہ سے ہر طبقہ میں مقبول تھے، رواداری اور صلح کل ان کا مسلک تھا اور وہ اتحاد بین المسلمین کے حامی تھے، ان کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز تھی، ان میں ہر فرقہ کے لوگ شامل تھے اور سب کے لئے ان کا فیض عام تھا، وہ دوسرے فرقہ کی مذمت سننا گوارا نہ کرتے تھے، ان کی کتاب ''شہید انسانیت'' پر خود ان کے فرقہ کے لوگ برہم ہوگئے تھے، مگر وہ سچائی اور حق گوئی سے باز نہیں آئے، اللہ تعالیٰ ان سے عفو و درگزر کا معاملہ فرمائے اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ (''ض''، جون ۱۹۸۸ء)

انیس، اختر

جناب اختر انیس

ناظرین معارف کو یہ خبر سن کر بہت رنج ہوگا کہ جناب اختر انیس سینئر جنرل منیجر بی۔سی۔آئی نے لندن میں انتقال کیا، ان کا وطن اعظم گڑھ تھا اور وہ دارالمصنفین کے سب سے زیادہ حاضر باش جناب امین الدین صاحب مرحوم کے خویش تھے، اختر انیس مرحوم بڑے متین و سنجیدہ شخص تھے، بڑے عہدہ پر ہونے کے باوجود ان میں غرور و تمکنت نام کو بھی نہ تھی۔ ان کی وفات سے دارالمصنفین اپنے ایک بہت مخلص ہوا خواہ سے محروم ہوگیا، اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس عطا فرمائے، آمین۔

(''ض''، جولائی ۱۹۸۸ء)

مجنوں گورکھپوری

مجنوں گورکھپوری

افسوس ہے کہ پروفیسر احمد صدیق مجنوں گورکھپوری نے کراچی میں ۴؍جون کو داعی اجل کو لبیک کہا، اس سے پہلے بھی ان کی وفات کی خبر آئی تھی جو غلط تھی۔

مجنوں صاحب ۱۰؍مئی ۱۹۰۴ء کو ضلع بستی کے ایک غیر معروف گاؤں پلدہ عرف ملکی جوت میں پیدا ہوئے، مگر ان کی نشوونما اسی ضلع کی تحصیل خلیل آباد کے ایک گاؤں منجھریا میں ہوئی، جس کی یاد میں انھوں نے یہ شعر بھی کہا تھا:

تیرا ہر گوشہ کہ منزل گاہ الہامات ہے
مکتب عرفاں ہے یا گہوارۂ جذبات ہے

۱۴؍برس کی عمر میں وہ گورکھپور آئے، جہاں ان کے والد محمد فاروق دیوانہ گورکھپوری قیام پذیر تھے، جو اچھے شاعر و مصنف ہونے کے علاوہ مولانا محمد علی جوہر کے اخبار ہمدرد کے سب ایڈیٹر بھی رہ چکے تھے۔ یہ ۳۶ء سے ۵۲ء تک مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کے ممبر بھی رہے۔

مجنوں گھورکھپوری کی پرورش اسی علمی و ادبی ماحول میں ہوئی، وہ اپنے والد کے سب سے بڑے بیٹے اور نہایت ہونہار تھے، بچپن ہی سے ان کو پڑھنے کا بہت شوق تھا، پندرہ سولہ برس کی عمر میں شعر کہنے لگے تھے، انھیں ہزاروں کی تعداد میں اساتذہ کے فارسی اور اردو اشعار یاد تھے، پہلے تخلص کی پابندی سے آزاد رہنا چاہتے تھے، مگر جب دیکھا کہ سرسید جیسا شخص بھی اس سے بے نیاز نہیں ہے اور آہیؔ تخلص کرتا ہے تو انھیں بھی اس کی جستجو ہوئی، اور اپنے مزاج کی مناسبت سے مجنوںؔ تخلص اختیار کیا، یہ حسن اتفاق ہے کہ ان کے والد کا تخلص دیوانہؔ تھا، دونوں کے تخلص میں جو مناسبت ہے وہ ظاہر ہے۔

انگریزی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا تو مشن اسکول سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا، انٹرمیڈیٹ علی گڑھ سے کیا، سینٹ انڈریوز کالج گورکھپور سے بی۔اے کرنے کے بعد آگرہ یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم۔اے کیا بعد میں کلکتہ یونیورسٹی سے اردو میں بھی ایم۔اے کیا، ۳۵ء میں یہیں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔

اسی عرصہ میں انھوں نے ایک رسالہ ''ایوان'' جاری کیا، اور ''ایوان اشاعت'' کے نام سے ایک مکتبہ بھی قائم کیا، لیکن اس سے ان کے گذر بسر کا سامان نہ ہوا تو درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کرلیا، اور ۳۲ء سے ۵۸ء تک وہ گورکھپور کے دو کالجوں میں انگریزی اور اردو کے معلم رہے، جب گورکھپور یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کھلا تو یہ اس کے سربراہ مقرر ہوئے لیکن ریڈرشپ نہ ملنے کی وجہ سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی چلے آئے اور ریڈر کی حیثیت سے معلّمی کے فرائض انجام دیئے، ۶۳ء میں اس عہدہ سے سبکدوش ہوئے

تو دہلی کی ساہتیہ اکیڈمی نے ان کو تاریخ ادب اردو لکھنے کی خدمت تفویض کی، مگر وہ اس کو نامکمل چھوڑ کر بعض اسباب کی وجہ سے ۶۸ء میں پاکستان چلے گئے، اور کراچی یونیورسٹی میں دس برس تک آنریری پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا، اور ۷۸ء میں ریٹائر ہوگئے۔

ان کی ادبی زندگی کا آغاز شعر گوئی سے ہوا، مگر اس چمن کی گلگشت سے جلد ہی ان کی طبیعت سیر ہوگئی، اور ان کا قلم نثر کے وسیع میدان میں گلکاریاں کرنے لگا، پہلے افسانہ نگاری کی جانب متوجہ ہوئے اور جلد ہی اچھے افسانہ نگار کی حیثیت حاصل کرلی۔

ان کے متعدد افسانوی مجموعے شائع ہوئے، ۲۲ء کے معارف میں ان کے ایک افسانوی مجموعۂ خواب وخیال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا گیا:

''مجنون ان افسانہ نگاروں میں ہیں جو اپنے سامنے مقصد رکھتے ہیں، افسانہ نگاری میں جناب مجنون کا حسن ذوق مسلم ہے''۔

''سوگوار شباب''، ٹامس ہارڈی کے ایک ناول سے متاثر ہوکر لکھا گیا تھا جس کو ان کے قلم کی رنگ آمیزی نے اور دلکش بنادیا تھا، اس صنف ادب پر مجنون صاحب نے ایک مستقل کتاب لکھی تھی۔

وہ پندرہ برس تک افسانے لکھتے رہے، اس کے بعد اس سے بھی ان کی طبیعت اچاٹ ہوگئی، اب وہ ترجمہ نگاری کی طرف مائل ہوئے، اور انگریزی کے کئی ڈراموں کو اردو میں منتقل کیا، گو ان کی قابل قدر کتاب ''تاریخ جمالیات'' ترجمہ ہی ہے، مگر اس میں اس درجہ سلاست، روانی اور شگفتگی ہے کہ طبع زاد تصنیف معلوم ہوتی ہے: ترجمہ کے میدان میں وہ افسانہ گاری سے بھی زیادہ کامیاب تھے، مگر دراصل شعر وافسانہ اور صحافت وترجمہ وغیرہ کی حیثیت ان کی ادبی زندگی کے سفر میں ارتقائی مراحل کی ہے، ان کی اصلی اور آخری منزل تنقید نگاری ہے، جس میں ان کے جوہر خوب چمکے، اور اسی کی بدولت اردو ادب میں ان کو نمایاں اور بلند درجہ نصیب ہوا۔

تنقید میں انھوں نے بڑی ژرف نگاہی اور بالغ نظری سے کام کرکے لازوال نقوش یادگار چھوڑے ہیں، انھوں نے مارکس اور اینگلز کی تحریروں کا مطالعہ دقت نظر سے کیا تھا، اسی لیے ان کی تنقیدی تحریروں میں مارکسی نظریات کی گہری چھاپ ہوگئی تھی، اس کی وجہ سے کہیں کہیں شگفتگی وسلاست میں کمی آگئی ہے، جو ان کی تحریر کا خاص امتیاز ہے۔

مجنون گھورکھپوری ادب میں جدید عناصر کی کارفرمائی ضرور دیکھنا چاہتے تھے، لیکن وہ ماضی سے رشتہ قائم رکھنا اور خیال واسلوب میں روایتی آداب وتہذیب کا شامل کرنا بھی ضروری خیال کرتے تھے، اس لحاظ سے وہ ترقی پسندی کے داعی ہونے کے ساتھ اس کے مصلح بھی تھے، ان کا خیال تھا کہ ادب انسانیت کی تہذیب وتحسین کا وسیلہ ہے جس کو اسلاف کے کارنامے تازگی، توانائی اور ولولہ عطا کرتے ہیں۔

مغربی ادب کے ساتھ فارسی اور اردو کے ادب عالیہ پر بھی ان کی گہری اور وسیع نظر تھی، چنانچہ جہاں وہ مغرب کے اہل فکر ونظر کا ذکر کرتے ہیں وہاں مولانا حالی، علامہ شبلیؒ، مہدی افادی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالسلام ندوی اور نیاز فتح پوری کا نام بھی لیتے ہیں، علامہ شبلیؒ کو بامذاق شاعر ونقاد اور فاضل انشاء پرداز اور مولانا عبدالسلام ندوی کو بالغ نظر وہمہ گیر مورخ اور جامع القلم لکھا ہے، ان کو یہ بھی اعتراف تھا کہ فارسی شاعری پر شعر العجم سے زیادہ محقق اور مدلل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی، اپنی عبارت کو سنوارنے کے لیے اکبر واقبال کے اشعار سے بھی کام لیتے رہے، اور اقبال کا یہ شعر ان کی زندگی اور ادب دونوں کا دستور العمل تھا:

دلم بدوش ونگاہم بہ عبرت امروز   شہید جلوۂ فرداو تازہ آئینم

اردو کے مشہور مگر نہایت نکتہ چین اور عیب جو نقاد کو بھی تسلیم ہے کہ ''مجنون کا مطالعہ وسیع ہے، شاید ہی علم کا کوئی شعبہ ہو جس کے متعلق وہ کافی معلومات نہ رکھتے ہوں''۔ اردو کے قدیم اور کلاسیکل ادب پر ان کی گہری نظر کا اندازہ ان مضامین سے ہوتا ہے جو میرؔ، نظیرؔ، قائمؔ، میر اثرؔ، مصحفیؔ نیز ریاضؔ اور آسیؔ غازی پوری پر انھوں نے لکھے تھے، ان کے مضمون ''شعر اور غزل'' کا مطالعہ ادب کے ہر طالب علم کے لیے مفید ہے، اسی کے ساتھ ان کی کتاب ''ادب اور زندگی'' سے ظاہر ہے کہ ادب کے جدید رجحانات اور لحہ بہ لحہ تغیر پذیر افکار کے بھی وہ قدر شناس تھے۔

گورکھپور میں مجنون صاحب کی رہائش گاہ کا نام ''گلستان'' تھا، ان کی وفات سے گلستانِ اردو اداس ہوگیا ہے:

؎ مجنون جو مر گیا تو ''گلستان'' اداس ہے

(''ع۔ص''، جولائی ۱۹۸۸ء)

ضیاء الحق، جنرل

آہ! جنرل ضیاء الحق

گزشتہ مہینہ کا معارف اشاعت کے آخری مرحلہ میں تھا کہ اس اذیت ناک خبر نے ہوش وحواس پراگندہ کردیا کہ پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق ایک ہوائی حادثہ میں جاں بحق ہوگئے، اِنـاللّٰہ وَ اِنـا اِلیـہ رَاجِعُونَ۔ ان کے ساتھ امریکی سفیر، پاکستانی فوج کے تقریباً ایک درجن اعلیٰ افسر اور دوسرے کئی افراد بھی چشم زدن میں ہلاک ہوگئے، جنرل ضیاء الحق کی اس غیر متوقع اور اچانک شہادت سے پاکستان میں کہرام مچ گیا، ساری دنیائے اسلام میں ماتم بپا ہوگیا اور ان لوگوں کو بڑا دھکا لگا جو سمجھتے تھے کہ مرحوم دنیا کی امامت کا بار اٹھانے کے لیے امت مرحومہ کو پھر شجاعت وعدالت کا سبق پڑھنے کی تلقین فرمارہے تھے، وہ ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے، والد کی تربیت اور ماحول کے اثر سے ان میں بھی دینداری اور عقیدہ وعمل کی پختگی رچ بس گئی تھی، جس

کا مظاہرہ ان کی ذاتی اور نجی زندگی سے لے کر قومی و بین الاقوامی ہر سطح پر ہوتا رہتا تھا، وہ جس درجہ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے، اسی درجہ ان کی زندگی اور سیرت پاکیزہ تھی، وہ دن میں امور مملکت کی گتھیاں سلجھاتے اور رات کا آخری پہر تسبیح وتہلیل، دعاء ومناجات اور توبہ واستغفار میں گزارتے اور رمضان المبارک کے آخری ایام حرمین شریفین کے لیے وقف رکھتے ؂

تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز　　اس کے دنوں کی تپش، اس کی شبوں کا گداز

جب پاکستان کی زمام کاران کے ہاتھوں میں آئی تو انھوں نے اسے ان خطوط پر چلانے کا مصمم ارادہ کرلیا جن کے لیے یہ وجود میں آیا تھا، ہر قسم کی دشواریوں کے باوجود اسلام کا بول بالا اور احکام شریعت کا نفاذ ان کی جدوجہد کا خاص محور رہا، شریعت کی بالادستی قائم کرنے اور اسلامی طرز حیات کو رائج کرنے کے لیے انھوں نے مختلف آرڈی ننس جاری کیے اپنے ان جلیل مقاصد اور عظیم عزائم کی بناء پر وہ ان تمام لوگوں کی امیدوں کا مرکز بن گئے تھے، جو دنیا کی پریشانی اور انسانیت کے دکھوں کا مداوا اسلام ہی کو خیال کرتے ہیں، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، نے ایک باران کے متعلق فرمایا تھا، ع　ترکش مارا خدنگ آخریں۔

پاکستان کے گزشتہ اور موجودہ ارباب سیاست اور حکمرانوں میں وہ اس حیثیت سے علانیہ ممتاز تھے کہ اسلام کا نام لینے میں ان کو کبھی کوئی گھبراہٹ اور ہچکچاہٹ نہیں ہوتی تھی، وہ جہاں جاتے، جس مجمع میں ہوتے، ہر جگہ اسلام کا گن گاتے اور اپنی تقریروں میں اس کی عظمت و برتری کو واضح کرتے، اس میں کسی سیاسی مصلحت کو دخل نہ ہوتا، بلکہ یہی ان کے دل کی آواز ہوتی تھی، وہ بین الاقوامی اجتماعات میں بھی اسلام کی صداقت وحقانیت کا اعلان کرنے سے باز نہیں رہتے تھے، ۸۰ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں پندرہویں صدی ہجری کے آغاز کی مناسبت سے ان کی جو تقریر ہوئی، اس میں دنیا کے اکثر ملکوں کے سربراہ موجود تھے، اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ حجۃ الوداع کے حوالہ سے بتایا کہ اسلام ہی ساری دنیا کے لیے خیر وبرکت کا ضامن ہے، وہ رنگ ونسل کی تفریق مٹا کر وحدت، اخوت اور محبت کی تعلیم دیتا ہے، اس سے نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا کو درپیش مسائل حل ہوسکتے ہیں۔

صدر ضیاء الحق نے پاکستان کو فلاحی ریاست بنانے کے لیے عدل ومساوات کو فروغ دینے اور ملک میں پھیلی ہوئی بے راہ روی اور بدعنوانی کو دور کرنے کی طرف پوری توجہ کی، انھوں نے فوجی واقتصادی حیثیت سے پاکستان کو مضبوط ومستحکم کرکے اور دنیا میں اس کا وقار بلند کرکے عوام کا دل جیت لیا تھا، ان کے طویل دور حکومت میں نہ کوئی بڑا ہنگامہ وانتشار رونما ہوا اور نہ کوئی فتنہ سر اٹھا سکا، جو مسائل پیدا ہوئے، ان کے تدبر اور ہوش مندی سے حل ہوگئے، وہ اپنی سوجھ بوجھ دور اندیشی اور فراست سے نازک مراحل طے کرلینے اور پاکستان کو بحران سے بچانے میں ہمیشہ کامیاب رہے، حکومت کی خوبی کا معیار جمہوریت ہی تو نہیں ہے جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے۔

ضیاء الحق کی عملی زندگی کا آغاز ایک فوجی کی حیثیت سے ہوا، مگر سربراہ مملکت ہونے کے بعد وہ اچھے مدبر، کامیاب اور ماہر سیاست داں بھی ثابت ہوئے، اسلامی ملکوں سے تو ان کا برادرانہ رشتہ ہی تھا، دوسرے ملکوں سے بھی انہوں نے خوشگوار تعلقات قائم رکھے، ہندوستان سے تعلقات میں اتار چڑھاؤ ضرور رہا مگر وہ ہمیشہ اچھے تعلقات کے لیے فکرمند رہے، ان کا حلم وتدبر ان کے جوش وجذبہ پر غالب ہوتا، اس لیے دونوں ملکوں میں کبھی جنگ کی نوبت نہیں آئی، بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیڈر مسٹر اٹل بہاری باجپئی نے مرحوم ضیاء الحق کے جنازہ میں شرکت سے واپس آنے کے بعد کہا: ''جنرل ضیاء الحق کی ذاتی زندگی نہایت صاف ستھری تھی، وہ ایک بڑے سیاست داں تھے اور ان کا شمار دنیا کے بڑے سیاستدانوں میں تھا، وہ ہندوستان سے کسی حال میں بھی لڑائی مول لینا نہیں چاہتے تھے''۔

جنرل ضیاء الحق ایک شریف النفس انسان تھے، ان میں فخر وغرور کا شائبہ نہ تھا، وہ اپنی تواضع، انکسار اور خوش خلقی سے اپنے مخالفین کا دل موہ لیتے تھے اور ان کی مخالفانہ سرگرمیوں کو بھی ضبط وتحمل سے انگیز کرتے تھے، ان کی زندگی صاف ستھری اور بے داغ تھی، ان پر بدعنوانی، کنبہ پروری اور اپنے عہدہ کے بیجا استعمال کا الزام نہیں لگا، وہ سادہ زندگی گزارنے کے عادی تھے، صدر ہونے کے بعد بھی اس عالیشان قصر صدارت میں منتقل نہیں ہوئے جو ان سے پہلے ایک کروڑ کی لاگت سے تعمیر کرایا گیا تھا، وہ مضبوط قوت ارادی کے مالک تھے، بعض بڑی طاقتوں کی مخالفت کے باوجود افغان مجاہدین کے پشت پناہ بنے رہے اور عالمی رائے عامہ کے دباؤ کے باوجود مسٹر بھٹو کے معاملہ میں عدالت کے فیصلہ پر عمل درآمد سے باز نہ آئے، وہ اپنے اساتذہ کا بڑا احترام کرتے، مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم ان کے استاد تھے، ان کے لیے بچھ جاتے تھے، علماء کے بھی قدردان تھے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا بڑا اعزاز کرتے، مولانا امین احسن اصلاحی سے ملاقات کے لیے ان کی قیام گاہ پر پہنچ جاتے تھے، دارالمصنفین سے اچھی طرح واقف تھے، جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم سے بعض کانفرنسوں میں ملاقات ہوئی تو ان کی جانب بڑا اعتناء کیا، مولانا سید سلیمان ندویؒ کی سیرۃ النبی جلد ہفتم ان کو اتنی پسند آئی کہ اس کی بیس ہزار جلدیں خرید کر تقسیم کرائیں اور اس پر ایک لاکھ کا انعام بھی دیا۔

اسلام آباد میں فیصل مسجد کی تعمیر بڑے ذوق وشوق سے کرائی تھی، یہی ان کی آخری آرام گاہ بنی، اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے خلاء کو پر کرے، ان کی شخصیت کسی قدر متنازع فیہ ضرور رہی مگر اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے نہایت خلوص،

ایمانداری اور دیانتداری سے اپنے ملک کی بے لوث خدمت کی، جس کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ (''ض''، ستمبر ۱۹۸۸ء)

نشتر، عبدالرحمٰن خان

جناب عبدالرحمٰن خان نشتر

جناب عبدالرحمٰن خان نشتر کی وفات نے پورے اتر پردیش کو سوگوار بنادیا ہے، وہ اس صوبہ کے ایک مقبول اور ہر دلعزیز لیڈر تھے، ان پر دو بار دل کی بیماری کا حملہ ہو چکا تھا، ۱۷/ اکتوبر کو بریلی کے ایک مشاعرہ میں نعتیہ کلام سماعت فرمارہے تھے کہ پھر حملہ ہوا اور جاں بحق ہوگئے، اِنّاللّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہ رَاجِعُون، انھوں نے پہلے کان پور میں تجارت شروع کی، پھر قوم و وطن کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کردی وہ کانگریس پارٹی کے سرگرم اور مخلص کارکن تھے، مختلف تنظیمی عہدوں پر فائز رہنے کے علاوہ وزیر بھی رہے، اقلیتوں کے مسائل اور قومی یکجہتی کے پروگرام سے دلچسپی کی بناء پر کانگریس کے اقلیتی سیل کے صدر اور ریاستی قومی یکجہتی کونسل کے نائب صدر مقرر کیے گئے، جو بھی عہدہ اور ذمہ داری انھیں سپرد کی جاتی، اسے محنت، قابلیت اور دیانت داری سے انجام دیتے اور نیک نامی حاصل کرتے۔

نشتر صاحب ایک خوش عقیدہ مسلمان اور بزرگان دین کے بڑے معتقد تھے، مزاروں پر بھی حاضری دیتے، صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے، تلاوت قرآن میں ناغہ نہ کرتے، حج کا فریضہ بھی ادا کیا تھا، گزشتہ سال لکھنو کی تقدس حج کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے انھوں نے جو پرمغز اور دلنشین تقریر کی اس سے لوگ بہت متاثر ہوئے، اس سے ان کی گہری مذہبیت کا بھی اندازہ ہوا، مسلمانوں کے مخصوص مسائل سے بھی دلچسپی لیتے اور اس کے لیے جرأت و بے باکی سے آواز بلند کرتے، وہ اپنی نیکی، شرافت، وضعداری اور انسانیت دوستی کی وجہ سے ہر طبقہ میں مقبول تھے، دوسروں کی مدد کر کے خوش ہوتے، بڑے عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود عوام سے بھی برابر رابطہ قائم رکھتے، راقم سے ملاقات ہوتی تو بڑے تپاک سے ملتے اور شفقت فرماتے، دارالمصنفین کے بڑے خیرخواہ اور قدردان تھے، جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب مرحوم کی وفات کے بعد تعزیت کے لیے یہاں تشریف لاکر بڑے اخلاص اور گہرے تعلق کا ثبوت دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔ (''ض''، اکتوبر ۱۹۸۸ء)

انصاری، عبدالعزیز، منشی

منشی عبدالعزیز صاحب انصاری

دارالمصنفین کے خیرخواہوں اور خدمت گزاروں کو یہ خبر سن کر بڑا رنج وغم اور سخت ملال ہوا کہ اس کی مجلس انتظامیہ کے ایک معزز، سرگرم، مخلص اور قدیم رکن جناب منشی عبدالعزیز صاحب انصاری یکم دسمبر کو بمبئی میں وفات پاگئے، اِنّاللّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہ رَاجِعُون، یہاں سے ان کا تعلق حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے دور میں قائم ہوا، جو بعد میں محکم سے محکم تر ہوتا گیا، وہ بمبئی میں رہتے تھے، لیکن ان کا وطن اعظم گڑھ ہی تھا، اس لیے دارالمصنفین سے ان کا بڑا گہرا قلبی اور جذباتی تعلق تھا۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ اس نے ہماری عزت وشہرت میں چار چاند لگادیا ہے، اس سرزمین پر وہ لوگ چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں جنھوں نے اس کو علم وفن کا لالہ زار بنادیا ہے، وہ اس کی مجلس انتظامیہ کے جلسوں میں نہایت پابندی سے تشریف لاتے، ان کے قیمتی مشوروں سے دارالمصنفین کو بڑا فائدہ پہنچتا، مشکل وقتوں میں اس کے لیے سینہ سپر رہتے، دارالمصنفین کو مالی اعانت کی ضرورت ہوتی تو اس کے کارکنوں کو بمبئی بلاتے اور اپنے یہاں دعوتوں پر اصحاب ثروت کو مدعو کر کے اس کی امداد کرنے پر آمادہ کرتے، شبلی کالج سے بھی خاص تعلق رکھتے اور اس کی ترقی سے بڑی دلچسپی لیتے، تقریباً چالیس برس سے اس کی مجلس انتظامیہ کے صدر تھے، ان کا انتخاب ہمیشہ بلا مقابلہ ہوتا تھا۔

ان کی رسمی تعلیم زیادہ نہ تھی، لیکن بڑے علم دوست اور اردو فارسی کا اچھا ذوق رکھتے تھے، وہ بمبئی میں ٹرانسپورٹ کا کاروبار کرتے تھے، جہاں ایک سے بڑھ کر ایک تاجر تھے مگر جو عزت، نیک نامی اور قدر ومنزلت انھوں نے حاصل کی وہ کم کسی کو نصیب ہوئی، وہ مہمانوں کے لیے ہر وقت بچھے رہتے تھے، ان کی ساری کمائی ان ہی کے لیے وقف رہتی، ان کا گھر اعظم گڑھ اور اس کے قرب وجوار کے لوگوں کا بے تکلف مہمان خانہ تھا، لوگ مہینوں قیام کرتے مگر ان کی پیشانی پر بل نہ آتا، وہ خود بڑی سادہ زندگی بسر کرتے، اپنی ذات پر کچھ خرچ کرنے میں ان کو بڑا تکلف ہوتا، مگر دوستوں، عزیزوں اور ضرورت مندوں کی مدد کر کے ان کو بڑا سرور ملتا، ان کی ذات شرافت، مروت اور اخلاص، محبت اور دل جوئی کی چلتی پھرتی تصویر تھی، ان کی وفات سے دارالمصنفین اپنے ایک بہت ہی مخلص اور غم گسار رکن سے محروم ہوگیا، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ (''ض''، دسمبر ۱۹۸۸ء)

احمد، اقبال، منشی

منشی اقبال احمد

افسوس ہے کہ ۶/ دسمبر کو منشی اقبال احمد صاحب بھی حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال کر گئے، وہ ماہر کاتب تھے، اپنی پوری زندگی دارالمصنفین کی خدمت میں گزاری، اس کی اکثر کتابیں ان ہی کے خط سے نکلی ہیں، اپنی خوشنویسی کی وجہ سے اتر پردیش اردو اکاڈمی سے انعام بھی حاصل کیا، اب بصارت کی کمزوری کی بناء پر کتابت ترک کردی

تھی، ان میں غرور وگھمنڈ نہ تھا، اپنی نرم اور شیریں گفتگو سے لوگوں کا دل موہ لیتے، اللہ تعالیٰ ان کی بشری لغزشوں سے درگزر کرے اور انھیں اپنے سایہ رحمت میں جگہ دے۔

(''ض''، دسمبر ۱۹۸۸ء)

ندوی، ابوالعرفان خان، مولانا

مولانا ابوالعرفان خاں ندوی صاحب مرحوم

جناب مولانا ابوالعرفان خاں ندوی صاحب ۱۷ر نومبر کو تقریباً ساڑھے تین بجے شب میں اپنے رب کے حضور پہنچ گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

عالِم کی موت کو عالَم کی موت سے تعبیر کیا جاتا ہے، مولانا مرحوم کی وفات ہوئی تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ علوم کا ایک جہان ویران ہوگیا ہے، ان کے احباب و رفقاء اور متعلقین و تلامذہ ہی خوب جانتے ہیں کہ کیسی مجموعۂ فضائل ہستی کو انھوں نے سپرد خاک کردیا۔

مولانا مرحوم کا وطن شیراز ہند دارالخیور جونپور تھا، لیکن جونپوری کی نسبت محض ایک وطنی نسبت نہیں تھی، ان کی شخصیت میں علم و ادب، فلسفہ و کلام، وقار و استغناء تواضع، منکسر المزاجی، مہمان نوازی بلکہ دلنوازی کی وہ تمام روایات مجتمع تھیں جن کے لیے خطہ جونپور کبھی رشک ہرات و نیشاپور تھا اور جن کی وجہ سے صاحبقران بادشاہ شاہجہاں نے کہا تھا کہ پورب شیراز ماست۔

وہ جونپور کے ایک علمی خانوادہ میں پیدا ہوئے ان کے والد جناب مولانا دین محمد صاحب اس علاقہ کے مشہور عالم دین تھے اور مولانا حافظ عبداللہ غازیپوریؒ کے خاص شاگرد تھے جو اتباع سنت اور زہد و ورع میں بھی ممتاز تھے۔

والد ماجد سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں زیر تعلیم رہے، دارالعلوم دیوبند میں بھی داخلہ لیا، مگر جلد ہی ۳۹ء میں ندوہ آگئے اور یہیں تعلیم مکمل کی، فراغت کے بعد دارالمصنفین میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کی رہنمائی میں فلسفہ و کلام اور تاریخ کی کتابوں کا مطالعہ کیا، اس کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں درس و تدریس کی خدمت پر مامور ہوئے اور دم واپسیں تک ندوہ سے ان کا رشتہ استوار رہا، ۶۷ء میں شیخ عبداللہ مرحوم کی دعوت پر کشمیر کے ایک تعلیمی ادارہ سے بھی وابستہ رہے لیکن جلد ہی ندوہ واپس تشریف لے آئے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سابق مہتمم مولانا حافظ محمد عمران خاں ندوی مرحوم کے بھوپال میں مستقل قیام پذیر ہونے کے بعد مولانا ابوالعرفان خاں ندوی نے ۵۷ء سے ۶۷ء تک ان کی جانشینی کی۔

وہ معقولات کے متبحر عالم تھے، منطق، فلسفہ، کلام اور بلاغت و معانی کے فن پر ان کو عبور حاصل تھا، نقلی علوم میں بھی ان کا پایہ بلند تھا، خصوصاً تفسیر، تاریخ اور شعر و ادب میں اچھی دستگاہ تھی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم تحریر فرماتے ہیں ''مولانا ابوالعرفان ندوی اچھا تاریخی ذوق رکھتے ہیں، ہندوستان کی تاریخ سے ان کو خصوصی دلچسپی ہے'' ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے سب سے بڑے حکیم و فلسفی ملا محمود جونپوری صاحب شمس بازغہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے فلسفہ میں ادب کی اور ادب میں فلسفہ کی شان پیدا کی تھی، ان کے چار سو سال بعد شیراز ہند ہی کے اس نامور فرزند اور ملا صاحب کے ایک ہم وطن مولانا ندوی کے متعلق بھی یہی کہا جاسکتا ہے۔ عربی اشعار ان کے نوک زبان رہتے تھے، اردو شاعری کا بھی اچھا ذوق تھا، کلام اقبال کے تو گویا وہ حافظ تھے۔

علوم جدیدہ سے واقف تھے، عصری افکار و نظریات اور جدید تعلیمی تقاضوں سے بھی باخبر تھے، اس لیے کئی یونیورسٹیوں کے تعلیمی شعبوں اور نصاب کمیٹیوں کے ممبر بنائے گئے، لکھنؤ کے بورڈ آف اورینٹل اسٹڈیز عربی و فارسی کے وہ ۶۸ء سے رکن تھے، یونیورسٹی گرانٹس کمیشن ان سے وقتاً فوقتاً مشورے لیتا تھا۔ بعض سرکاری وفود میں بھی وہ شریک کیے گئے، درحقیقت وہ تحریک ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد کے ترجمان اور ان کا علمی نمونہ تھے، قدیم بنیادوں پر استوار وہ ایسی مستحکم عمارت کی مانند تھے جس پر جدید رنگ و روغن کی میناکاری نہایت دلکش و دلآویز منظر پیش کرتی تھی۔

مدارس دینیہ کی طرح جدید دانش گاہوں کی علمی مجالس میں وہ خاص طور پر مدعو ہوتے، سمیناروں میں ان کے غور و فکر پر مبنی مقالے اپنے توازن و اعتدال اور متانت و وقار کے سبب اہل علم کی نظر میں باوزن قرار پاتے تھے، کئی برس قبل ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ دہلی نے فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے موضوع پر سیمینار کیا تھا اس میں انھوں نے ''فکر اسلامی کی تشکیل جدید، ضرورت و اہمیت'' کے عنوان سے جو مختصر مقالہ پڑھا وہ بڑا پر مغز تھا۔

دارالمصنفین سے ان کے روابط دیرینہ تھے، وہ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے فیض یافتہ تھے، دارالعلوم تاج المساجد بھوپال میں سید صاحبؒ پر ایک سمینار ہوا تو اس میں انھوں نے ''دیدوشنید'' کے عنوان سے حضرت سید صاحبؒ کے چند افادات پیش کئے جن سے طالب و مطلوب کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے، دارالمصنفین سے ان کی کتاب ''اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں'' شائع ہوئی جو مولانا حکیم سید عبدالحیٔ سابق ناظم ندوۃ العلماء کی کتاب الثقافۃ الاسلامیہ فی الھند کا ایسا سلیس و شگفتہ ترجمہ ہے جس پر اصل کا گمان ہوتا ہے، دارالمصنفین سے ان کا تعلق ہمیشہ قائم رہا، وہ یہاں کی علمی ترقیوں کے لیے برابر مشورے دیتے، وقت نکال کر تشریف بھی لاتے اور نئے رفقاء کی رہنمائی و حوصلہ افزائی بھی فرماتے، وہ معارف کی مجلس ادارت کے رکن تھے۔

مولانا مدۃ العمر درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے اس لیے تصنیف و

تالیف کی جانب توجہ نہیں کر سکے، تاہم ان میں ایک کامل الفن کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں، مکتبہ جامعہ نے ان کی ایک مختصر کتاب ''ائمہ اربعہ'' شائع کی تھی جو اوسط درجہ کے اردو خواں قارئین کے لیے لکھی گئی تھی، مگر معلومات اور اسلوب کے لحاظ سے وہ ہر طبقہ کے لیے مفید ہے، سمیناروں کے مقالوں کے علاوہ مختلف رسائل و جرائد میں ان کی تحریریں وقتاً فوقتاً شائع ہوئی ہیں، اگر ان کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ مضامین کا مجموعہ شائع کیا جائے تو یہ مفید علمی خدمت ہوگی۔

نجی زندگی میں مرد قلندر کی طرح سادہ و آزاد تھے، ان میں علم کے پندار و تفوق کا کوئی شائبہ نہ تھا، ان کی سادگی دیکھ کر یقین نہ آتا کہ اس پرسکون سمندر کی تہہ میں علم کے بیش قیمت موتی بھی موجود ہوں گے، وہ بارعب اور وجیہہ تھے مگر اپنے شاگردوں اور نیاز مندوں کے سامنے بھی شاخ ثمر بار کی مانند خم ہو جاتے، چہرہ متبسم رہتا، ان کی گل افشانی گفتار دیکھنے سے تعلق رکھتی، باتوں سے گلوں کی خوشبو آتی، عمدہ کھانوں کے شوقین تھے، لیکن اس سے زیادہ کھلانے کا شوق تھا۔

ان کی وفات سے علماء کی جماعت میں جو کمی ہوئی ہے وہ برسوں محسوس کی جائے گی وہ ہماری جماعت کے اہم رکن تھے، خاص طور سے ندوہ کے لیے یہ بڑا جانکاہ حادثہ ہے اس کے حلقہ تدریس میں مولانا محمد اویس ندوی نگرامی مرحوم کے بعد یہ دوسرا بڑا خلا پیدا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو پر کرے اور ان کے پسماندگان اور ہم سب کو اس حادثہ فاجعہ پر صبر کی توفیق دے، ان کی نیکیوں کو قبول کرے اور اعلیٰ علیین میں بلند سے بلند درجات سے سرفراز فرمائے، آمین۔ (''ع۔ص''، دسمبر ۱۹۸۸ء)

حسین، سید، پروفیسر

پروفیسر سید حسن مرحوم

افسوس کہ ۱۸/نومبر ۸۸ء کی صبح ۸:۳۰ بجے اردو اور فارسی کے نامور معلم محقق جناب پروفیسر سید حسن کا پٹنہ میڈیکل کالج میں انتقال ہوگیا، انا للہ و انا الیہ راجعون۔ چند دنوں پہلے ان پر فالج کا حملہ ہوا تھا، انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً ۸۷ برس کی تھی۔

وہ ۱۹۱۱ء میں اپنے ننہالی گاؤں شیخ پورہ ضلع مونگیر میں پیدا ہوئے، اسی ضلع کا الہرہ گاؤں ان کا آبائی وطن تھا، یہاں کے سادات کا تعلق حضرت سید احمد جاجنیریؒ سے ہے، پروفیسر سید حسن کا خاندان بھی جاجنیری تھا، والدہ کا سلسلہ نسب حضرت مخدوم شیخ شعیبؒ برادر عم زاد حضرت شیخ شرف الدینؒ احمد یحییٰ منیری سے ملتا ہے، جب وہ ۷/۸ سال کے تھے تو ان کے والد کا انتقال ہوگیا، لیکن ماں کی شفقت و تربیت نے یتیمی اور محرومی کا احساس نہ ہونے دیا اور نامساعد حالات کے باوجود وہ تعلیمی مراحل طے کرتے رہے اور مڈل، میٹرک، انٹر اور پھر گریجویشن کے سارے امتحانات میں اول آئے، ۳۵ء میں اردو میں ۳۷ء میں فارسی میں ایم اے کیا، ۳۶ء میں انھوں نے ایجوکیشن میں ڈپلوما بھی لیا، بعد میں ۱۹۰۶ء میں انھوں نے دانش گاہ تہران ایران سے فارسی جدید، زبان پہلوی اور فارسی قدیم میں ڈپلوما حاصل کیا، طہران میں ڈاکٹر نذیر احمد اور پروفیسر سید امیر حسن عابدی وغیرہ بھی ان کے ساتھ تھے۔ تعلیم ختم ہونے کے بعد ان کے مشغلہ تدریس کا آغاز ہوا، ۳۷ء میں بہار نیشنل کالج میں وہ فارسی اردو کے لکچرر مقرر ہوئے، ۷ سال کے بعد ۴۴ء میں پٹنہ کالج میں لکچرر مقرر ہوئے اور اسی کالج میں وہ ۵۰ء میں اسسٹنٹ پروفیسر اور چھ سال کے بعد ترقی کر کے ۶۱ء تک پروفیسر رہے، اسی عرصہ میں حکومت بہار نے عربی و فارسی میں مطالعہ و تحقیق کا انسٹیٹیوٹ قائم کیا تو وہ اس میں منتقل ہوگئے اور اس کے ڈائرکٹر ہوئے، ۶۴ء میں وہ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے صدر ہوئے اور ۷۲ء تک اسی عہدہ پر کام کرتے رہے پھر ۷۸ء تک یو جی سی کے پروفیسر کی حیثیت سے تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔

فارسی زبان کے معلم کی حیثیت سے ان کی خدمات بڑی قابل قدر ہیں، وہ صدر شعبہ ہوئے تو محنت، دیدہ ریزی و جاں کاہی کی ایک مثال قائم کردی، ان کی نگرانی میں کم از کم ایک درجن شاگردوں نے پی، ایچ، ڈی کی سند حاصل کی اور شعبہ کے دوسرے اساتذہ بھی علمی و تحقیقی کاموں کی طرف راغب ہوئے، بہترین طالب علموں کے لیے ایرانی سفارت خانوں کے مالی تعاون سے طلائی تمغے جاری کئے، دوسرے ذرائع سے بھی کوشش کر کے وظائف جاری کرائے، ان کے شاگردوں میں ڈاکٹر شرف عالم، ڈاکٹر عبدالغفار انصاری، ڈاکٹر سمیع الحق، ڈاکٹر سید انوار اور سید صفی وغیرہ علمی و تدریسی مشاغل میں مصروف ہیں اور نیک نام ہیں۔

ان کی علمی صلاحیتوں کو فروغ دینے میں پروفیسر عبدالمنان بیدل، پروفیسر حافظ شمس الدین احمد منیری اور ڈاکٹر عظیم الدین احمد جیسے نامور اہل علم و قلم کی توجہ کو بڑا داخل رہا، شروع میں سید حسن مرحوم نے افسانہ نویسی پر بھی توجہ دی، ان کے افسانے مخزن، ادبی دنیا، ندیم اور معاصر وغیرہ رسائل میں شائع ہوئے لیکن یہ ان کا طبعی ذوق نہ تھا، پھر مکروہات دنیا کی الجھنوں میں وہ ایسے گرفتار ہوئے کہ ایک عرصہ تک کچھ نہ لکھ سکے، ایران جانے سے قبل انھوں نے پھر اپنی ادبی سرگرمیوں کا آغاز کیا اور فارسی اور اردو ادبیات سے متعلق ان کے مضامین و مقالے نگار، شاہکار اور نوائے ادب میں شائع ہوئے، معارف میں بھی ان کی کئی تحریریں چھپیں، جب وہ خواجہ عبداللہ انصاریؒ ہروی پر ایک سمینار میں شرکت کے لیے افغانستان گئے تو ان کا مفید و دلچسپ سفرنامہ معارف کے دو شماروں میں سر مقالہ کی حیثیت سے شائع ہوا، خواجہ عبداللہ ہروی پر ان کا فاضلانہ مضمون بھی معارف کے صفحات کی زینت بنا۔

دارالمصنفین اور معارف کے وہ بڑے قدر شناس تھے، بقول مولانا عبدالسلام

قدوائی ندوی مرحوم پروفیسر سید حسن صاحب دارالمصنفین سے گہرا تعلق رکھتے ہیں اور اس کی خدمت میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں، جناب سید صباح الدین، عبدالرحمٰن مرحوم ان کے بچپن کے ساتھی تھے، بچوں کے رسالہ غنچہ بجنور سے دونوں نے مضمون نگاری کا آغاز کیا تھا، کالج میں بھی یہ ساتھ ساتھ رہے، بچپن کی یہ دوستی اور بے تکلفی آخر تک باقی رہی، ایک سفر میں مجھے بھی ان دونوں ناموروں کی اس پاک اور سادہ دنیا دیکھنے کا اتفاق ہوا جہاں عمر، علم، عزت اور عہدوں کے حجابات اٹھ جاتے ہیں اور صرف ماضی کی معصوم یادوں کے نقوش روشن ہوتے جاتے ہیں، سید صباح الدین صاحب جب ان کو خط لکھتے تو وہ بھی بے تکلفی اور قدیم ربط و محبت کا نمونہ ہوتے، ایک خط میں لکھا کہ ''تم میری طالب علمی کے ہیرو رہے ہو اس لیے جب تم یاد آتے ہو تو اسی حیثیت سے جلوہ گر ہوتے ہو''۔ عجب اتفاق ہے کہ ۱۸؍ نومبر، سید صباح الدین صاحب کے سب سے بڑے علمی ممدوح علامہ شبلیؒ کی تاریخ وفات بھی ہے، گزشتہ سال اسی تاریخ کو سید صاحب کا حادثہ وفات پیش آیا اور اس سال عین اسی تاریخ کو ان کے اس ہیرو نے حیات جاودانی کی راہ اختیار کی۔

پروفیسر سید حسن کی تالیفات میں حافظ شیرازی کے ہمعصر فارسی شاعر رکن صاین ہروی کے دیوان کو خاص اہمیت ہے جس پر انھوں نے ایک عمدہ مقدمہ تحریر کیا ہے، اس کے علاوہ بہار کے صوفی اور فارسی شاعر مولانا برہان الدین مظفر شمس بلخی کے مجموعہ اشعار کو شمس الدین فقیر دہلوی کی مشہور مثنوی والہ و سلطان کو مرتب کر کے شائع کیا، اردو میں ان کے تحقیقی مضامین کے دو مجموعے سلک کلک اور چند تحقیقی مقالے کے نام سے شائع ہوئے، اکبر الہ آبادی مرحوم کے اشعار کا ایک عمدہ انتخاب اشعار اکبر کے نام سے کیا، اس میں انھوں نے اکبر مرحوم کے سوانح، ان کے کلام کے خصائص بیان کئے اور ہمعصر شعراء سے ان کا موازنہ بھی کیا، یہ کتاب ان کے حسن ذوق کی آئینہ دار ہے، انھوں نے بہار کا اردو اسٹیج اور ڈرامہ کے نام سے ایک کتاب لکھی جو اپنے موضوع پر محققانہ شان رکھتی ہے، اس پر اردو اکیڈمی یوپی نے تین ہزار روپے کا انعام بھی دیا تھا، شعر گوئی کا ذوق بھی تھا، سرمد تخلص کرتے تھے، اعتبار نغمہ ان کا شعری مجموعہ ہے، انگریزی میں ایک کتاب، اسٹڈیز ان پرشین لٹریچر زیر ترتیب تھی، بعض مقالے انڈو ایرانیکا جرنل میں بھی چھپے تھے۔

وہ نماز روزے کے پابند تھے، سلسلہ چشت سے روحانی تعلق تھا، جب تک والدہ زندہ رہیں، ان کی غیر معمولی خدمت کرتے رہے، اپنی دنیوی کامیابیوں کو وہ ماں کی دعاؤں کی برکت اور ثمرہ سمجھتے تھے، نہایت سادہ پاکیزہ زندگی گزاری، ان کے دوست پروفیسر سید محمد محسن سابق صدر شعبہ نفسیات کے بقول ''مکمل پذیرائی ایک رنگ محبت اور خلوص ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں عنصر ہیں، رضا و رنجش میں ملاوٹ کا کہیں نام نہیں''۔ دنیا میں وہ اعزازوں سے محروم نہیں رہے، صدر جمہوریہ ہند نے ۷۵ء میں ان کو سند قابلیت سے سرفراز کیا، ۸۱ء میں انہیں غالب ایوارڈ ملا، ہندوستان کے علاوہ ایران و افغانستان وغیرہ ملکوں میں وہ علمی مجالس میں بلائے گئے، اکادمیوں نے انعام دیئے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی نیکیوں کے صلہ میں ان کو آخرت کے اصل انعام سے نوازے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (''ع۔ص''، دسمبر ۱۹۸۸ء)

حسین، اطہر، سید

سید اطہر حسین آئی۔اے۔ایس

جناب سیٹھ عبدالعزیز انصاری صاحب کا غم ابھی تازہ ہی تھا کہ دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے ایک اور بہت معزز اور باوقار رکن جناب سید اطہر حسین صاحب آئی۔اے۔ایس بھی رحلت فرما گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

وہ یکم مارچ ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے اعلیٰ تعلیم کے لیے الہ آباد یونیورسٹی میں داخل ہوئے، اور ایم۔ایس۔سی کی ڈگری لینے کے بعد ۱۹۴۲ء میں سرکاری ملازمت میں آ گئے، ڈپٹی کلکٹری سے ترقی کر کے آئی۔اے۔ایس ہوئے اور حکومت اتر پردیش کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے، تقریباً سات برس تک مرکزی حکومت سے وابستہ رہے، ملازمت کے دوران مصر و امریکہ کے سفر بھی کیے، آخر میں ریاستی حکومت کے سکریٹری کی حیثیت سے ریٹائرڈ ہو کر فیض آباد میں مستقل طور پر قیام پذیر ہو گئے تھے کہ یہیں ۲۰ دسمبر کو قلبی عارضہ میں انتقال ہو گیا، والبقاء للہ وحدہ۔

جناب سید اطہر حسین صاحب نے سرکاری ملازمت کی گوناگوں مشغولیتوں کے باوجود تحریر و تصنیف کا مشغلہ بھی جاری رکھا، اور انگریزی اور اردو میں اسلام کے مختلف پہلوؤں پر چھوٹی بڑی درجنوں کتابیں یادگار چھوڑیں، شعر و سخن کا بھی عمدہ ذوق تھا، اس کی ابتداء رفیقہ حیات کی غمناک موت سے ہوئی، وہ بڑے زود گو تھے، بہت جلد ان کی غزلوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے، پھر نعتیہ اور مذہبی شاعری کی طرف متوجہ ہوئے، بڑے اچھے مترجم بھی تھے، متعدد اہم دینی کتابوں کے ترجمے انگریزی میں کئے، انتقال سے ایک ماہ قبل جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کی کتاب ''اسلام میں مذہبی رواداری'' کا انگریزی ترجمہ مکمل کر کے دارالمصنفین بھیجا، ان کو ترجمہ پر حیرت انگیز قوت تھی، ۸۲ء میں وہ کسی سرکاری کام سے دہلی گئے تھے، اسی زمانہ میں ہمدرد نگر میں بین الاقوامی قرآن کانگریس ہو رہی تھی، اپنی دلچسپی کی وجہ سے اس میں بھی شریک ہوئے، وہ کوئی مقالہ لکھ کر نہیں لے گئے تھے، مگر جب انھیں بلایا گیا تو انھوں نے میرے مقالہ ''قرآن مجید کا تصور توحید'' کے ضروری حصوں کا انگریزی ترجمہ فی البدیہہ کر کے سنا دیا جو اسی جلسہ میں چند منٹ پہلے پڑھا گیا تھا۔

جناب سید اطہر حسین صاحب نے اپنی دیانت داری، ایمان داری، اصول

پسندی اور خوش انتظامی کی وجہ سے بڑی نیک نامی اور اچھی شہرت حاصل کی، سرکاری حلقوں میں وہ مسلمانوں کے معاملات کے بڑے واقف کار سمجھے جاتے تھے، اور مسلمانوں کے بارے میں حکومت ان سے صلاح ومشورہ کرتی تھی، مسلمانوں کوبھی ان پر اعتماد تھا، جناب سید صدیق حسن صاحب مرحوم کے بعد وہ مسلمان عہدہ داروں میں اس حیثیت سے ممتاز تھے، اوقاف کی اصلاح وتنظیم میں انھوں نے نمایاں جدوجہد کی، فیض آباد میں ان کی کوششوں سے انیسؔ وچکبست لائبریری قائم ہوئی اور لکھنو میں مسلم مسافر خانہ کی تعمیر بھی ان کا کارنامہ ہے، وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے، سرکاری ملازمت کے زمانہ میں اپنے چیمبر میں ظہر کی نماز ادا کرتے، اس پر بعض لوگوں کو اعتراض ہوا مگر انھوں نے کوئی پروانہیں کی، سرکاری ملازمت کے سلسلہ میں مصر گئے تو موقع نکال کر عمرہ بھی کیا اور روضہ اطہر کی زیارت بھی کی، اپنی آپ بیتی ''ایک سویلین کی سرگزشت'' میں اس کا ذکر بہت والہانہ انداز میں کیا ہے، ان کو دارالمصنفین سے بڑا تعلق تھا، اور وہ اس کے بڑے متحرک اور سرگرم ممبر تھے، ان کی وفات دارالمصنفین کے لیے ایک بڑا سانحہ ہے، اللہ تعالیٰ انھیں غریق رحمت کرے، اور ان کے اعزہ ومتوسلین کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ (''ض''، جنوری ۱۹۸۹ء)

اویس، مشہود

مشہود اویس صاحب

افسوس ہے کہ ۱۸؍رمضان المبارک کو دارالمصنفین کے پرانے اور مخلص خدمت گذار مشہود اویس صاحب نے داعئ اجل کو لبیک کہا، ان کے والد مولوی محمد اویس صاحب دارالمصنفین کے ابتدائی معماروں میں تھے، جو عرصہ تک اس کے دفتر اور پریس کے انچارج بھی رہے، مشہور اویس بھی آخر دم تک دفتری کاموں کو انجام دیتے رہے، انتقال کے روز بھی دفتر آئے تھے، وہ بڑے خوش مزاج تھے، دوسروں کا کام کرکے خوش ہوتے، ان کی صحت برسوں سے خراب تھی، دمہ کا عارضہ تھا، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، اور متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ (''ض''، مئی ۱۹۸۹ء)

ندوی، عبدالقدوس ہاشمی، مولانا

مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی

معاصر امپیکٹ انٹرنیشنل لندن مورخہ ۹؍مارچ سے یہ افسوسناک خبر ملی کہ ۶؍جنوری ۸۹ءکو کراچی میں مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی کا انتقال ہوگیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

وہ ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے، ان کا آبائی وطن بہار کے ضلع گیا کا ایک گاؤں مخدوم پور ہے جو حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے وطن دیسنہ سے صرف سولہ سترہ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

۱۹۲۲ء میں جب وہ گیارہ برس کے تھے تو اپنے والد مولانا اوسط حسین صاحب کے سایہ شفقت سے محروم ہوگئے، اسی سال ان کو مئو کے مدرسہ عالیہ میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے سپرد کردیا گیا جو میاں سید نذیر حسین محدث دہلویؒ کے شاگرد اور ان کے والد کے ہم سبق تھے، مدرسہ عالیہ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ ۲۶ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل ہوئے اور ۲۹ء میں سند تکمیل حاصل کی۔

بچپن سے نیک اور سعید تھے، مئو میں جب وہ تعلیم حاصل کررہے تھے تو ان کی عمر ۱۲-۱۳ سال کی تھی، اسی زمانہ میں وہاں تحریک ترک موالات کا ایک جلسہ ہوا اس میں جب ہزاروں کے مجمع میں انھوں نے تقریر کی تو تمام لوگوں نے اسے حیرت ومسرت سے سنا حضرت سید صاحبؒ اس جلسہ کے صدر تھے، انھوں نے بھی حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی، مولانا ہاشمی عمر بھر اس دست شفقت کی گرمی کو محسوس کرتے اور حضرت سید صاحبؒ کی عنایات وہدایات سے مستفید ہوتے رہے، ندوہ میں سید صاحبؒ نے ان کے درجہ میں تاریخ اسلام پر کئی لکچر دیے، سید صاحبؒ وفد خلافت کے رکن کی حیثیت سے حجاز گئے، واپس تشریف لائے تو ندوہ کے اساتذہ وطلبہ کی طرف سے ایک استقبالیہ جلسہ ہوا، اس میں مولانا ہاشمی نے ایک قصیدہ پیش کیا، طالب علمی کے دور کا یہ قصیدہ بعد میں وہ خود بھی بھول گئے مگر یہ دو شعر ذہن میں محفوظ رہ گئے تھے۔

بر سر اوج ما ابر خراماں آمد
مژدہ اے بلبل شیدا کہ بہاراں آمد
سید آمد بہ وطن روح بہ گردید بہ تن
گل رفتہ زچمن باز بہ بستاں آمد

ان کی علمی صلاحیت اور استعداد کو دیکھ کر سید صاحبؒ نے ان کو دارالمصنفین میں بلانا چاہا مگر اتفاق سے اسی زمانہ میں ان کو رام پور کے کتب خانہ میں مخطوطات پر کام کرنے کی دعوت بھی ملی جس کے لیے وہ پہلے سے رضامند ہوچکے تھے، اس لیے دارالمصنفین تشریف نہ لاسکے مگر وہ سید صاحبؒ کی خدمت میں برابر حاضری دیتے رہے کچھ عرصہ بعد وہ حیدرآباد دکن چلے گئے جہاں نواب بہادر یار جنگ نے مجلس اتحاد المسلمین کی بنیاد رکھی تھی اور دارالسلام کی عمارت میں ایک قومی کتب خانہ، ایک اسلامی دارالاقامہ اور علوم مشرقیہ کی ایک چھوٹی سی درسگاہ بھی قائم کی تھی، اپنے سیاسی ومذہبی خیالات کی آبیاری کے لیے نواب بہادر یار جنگ کی نظر انتخاب مولانا ہاشمی پر پڑی، چنانچہ ان اداروں کی سربراہی ان کو سونپ دی گئی، حضرت سید صاحب اس انتخاب پر بہت خوش ہوئے اور بعد میں ایک موقع پر بطور فخر وشکر یہ لکھا کہ ''ندوہ کے لیے یہ شکر کا مقام ہے کہ دین ودنیا کی جامعیت کے ساتھ جب کہیں کوئی کام شروع ہوتا ہے تو اس

کے فرزند اس کے لیے بہترین اہل ثابت ہوتے ہیں، مولوی عبدالقدوس جو تکمیل کے بعد ہمیشہ علمی مشاغل میں مصروف رہے، نواب بہادر جنگ کی رفاقت کے بہترین رفیق ثابت ہوئے''۔

حیدرآباد میں ندوہ کے لیے جو کوششیں ہوئیں ان کا ذکر سید صاحبؒ نے مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کے نام ایک خط میں اس طرح کیا۔

''......اس دفعہ حیدرآباد میں ندوی برادری نے بھی کام کیا دائرۃ المعارف والوں نے دوسو اور تنہا عزیزی عبدالقدوس ہاشمی نے جو نواب بہادر یار جنگ کے دست راست ہیں آٹھ سو پورے کیے''۔

مولانا ہاشمی جہاں بھی رہے، سید صاحب سے ربط و تعلق میں کوئی کمی نہیں آئی انھوں نے علامہ محمود حسن خاں ٹونکی کی نگرانی میں معجم المصنفین کی تالیف میں بھی حصہ لیا ایک مصنف احمد طغرل بک کے حالات تلاش کرنے میں دشواری ہوئی تو انھوں نے یورپ کے جن مشاہیر مشترقین کو خطوط لکھے ان میں پروفیسر مارگولیوتھ نے جو جواب دیا اس سے وہ مطمئن نہیں ہوئے، اپنے شبہات کے اظہار کے ساتھ انھوں نے سید صاحبؒ کی خدمت میں پروفیسر موصوف کا جواب بھیج دیا اور رائے بھی مانگی، سید صاحبؒ نے جو جواب دیا اس کو وہ ہمیشہ حرز جان بنائے رہے، درحقیقت یہ تلاش و تحقیق کرنے والوں کے لیے ایک عمدہ ہدایت ہے، سید صاحبؒ فرماتے ہیں:

''......دوسرے علماء اور مستشرقوں کی تخفیف نہ کیا کرو، یہ طریقہ اہل علم کی شان سے بعید ہے، دوسروں کی تخفیف و تغلیط میں جو وقت صرف کیا جاتا ہے، ضایع ہوجاتا ہے، جب تک خود تحقیق نہ کرلو کچھ نہ لکھو، دوسروں کی تحقیق کو اس وقت تک کے لیے قبول کرو جب تک خود تحقیق نہ کرلو''۔

سید صاحبؒ سے وہ اسی طرح فیض اٹھاتے رہے، کراچی میں سید صاحبؒ دارالمصنفین کی طرح کا ایک تحقیقی ادارہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس کی نظامت کے لیے ان کی نظر مولانا ہاشمی پر پڑی مگر نامساعد حالات نے یہ خواب شرمندہ تعبیر ہونے نہیں دیا، ابھی چند برس پہلے دائرۃ السلیمانیہ کے نام سے کراچی میں ایک بڑے علمی ادارہ کا پروگرام مرتب ہوا تو اس کے سرپرستوں میں مولانا ہاشمی کا نام سرفہرست تھا۔

سید صاحب ان کی صلاحیتوں کے جس قدر معترف تھے، اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب دستور پاکستان کی ترتیب کے متعلق سید صاحبؒ نے جلسہ منعقد کیا اور اس میں مولانا مودودی، مولانا بنوری، مولانا عبدالحامد بدایونی اور مختلف فکر و مسلک کے جو ۳۲ علماء شریک ہوئے ان میں ایک مولانا ہاشمی بھی تھے۔

طالب علمی کے زمانہ ہی میں ان کی جس صلاحیت کو سید صاحب کی نگاہ جوہر شناس نے دیکھا تھا، اس کا ظہور برابر ہوتا رہا، پاکستان میں وہ معزز علمی عہدوں پر فائز ہوئے، ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد قائم ہوا تو اس کے کتب خانہ کے وہ ناظم ہوئے، بیرون پاکستان ان کی پذیرائی یوں ہوئی کہ وہ موتمر عالم اسلامی کے شعبہ تحقیقات کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے، رابطہ عالم اسلامی کی مجمع الفقہی کے وہ اہم ممبر تھے، انھوں نے اس کثرت سے بیرونی ممالک کے سفر کیے کہ ان کو علم و تحقیق کا جہانیاں جہاں گشت کہا جاسکتا ہے۔

معاصر امپیکٹ نے لکھا ہے کہ وہ تقریباً چالیس ۴۰ کتابوں کے مصنف تھے ان کا ایک مختصر رسالہ مستشرقین اور تحقیقات اسلامی کے نام سے بہت مقبول ہوا، کئی برس پہلے اس رسالہ کی تلخیص راقم الحروف نے معارف میں پیش کی تھی، ان کی تحقیقی کاوشوں کا ایک نمونہ کتاب تقویم تاریخی (قاموس تاریخی) کی شکل میں سامنے آیا جو ہجری اور عیسوی سنین کا ایک تقابلی تقویم ہے، مزید فائدہ کے لیے اس میں انھوں نے مشاہیر اسلام کے وفیات اور تاریخ اسلامی کے مشہور واقعات کی توقیت بھی کردی ہے۔

پاکستان کے رسالہ فکر و نظر میں ان کے مضامین اہل نظر بڑی دلچسپی سے پڑھتے، قمری تقویم، ہجری رویت ہلال کی حقیقت، صفہ اور اصحاب صفہ، نظام خانقاہی تربیت گاہ نفس انسانی، سیرت طیبہ کا مطالعہ، اسلام میں اجتہاد و قیاس کا مقام، تعمیر بیت اللہ الحرام اور سیرت انبیاء کمال انسانیت وغیرہ مضامین اہم ہیں، سیرت انبیاء کمال انسانیت تو اسلوب و طرزِ نگارش کے لحاظ سے خطبات مدراس کا ایک جز معلوم ہوتا ہے۔

ان کو صحافت سے بھی تعلق رہا ہے، حیدرآباد دکن سے ایک ہفتہ وار اخبار تاجر کے نام سے نکالا تھا۔ گیاسے رسالہ ندیم جاری ہوا تو وہ بھی عملاً اس کی ادارت میں شریک رہے رسالہ فکر و نظر کے بھی وہ کچھ عرصہ تک مدیر رہے۔

دارالمصنفین سے ان کو بڑی عقیدت تھی، جب وہ یہاں آتے تھے تو بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب مرحوم کو جب پاکستان جانے کا اتفاق ہوتا تو ان سے خاص طور پر ملاقات کرتے تھے اور معارف میں بڑے کیف و لذت سے پرلطف صحبتوں کا ذکر کرتے، ایک بار لکھا کہ ''مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی تو علم و فن کے بلبل ہزار داستان ہیں۔ مذہبی، فقہی، تاریخی، علمی اور ادبی موضوعات پر ان سے زیادہ فاضلانہ اور پرمغز گفتگو کرنے والا میں نے کہیں نہیں دیکھا''۔

دارالمصنفین میں جب اسلام اور مستشرقین پر ۸۲ء میں ایک بین الاقوامی سمینار ہوا تو وہ ادارہ تحقیقات اسلامی کے موقر وفد کے ساتھ باوجود پیرانہ سالی کے تشریف لائے اور اس کو زندہ تابندہ دیکھ کر باغ باغ ہوئے، سمینار میں اپنی سادگی، لہجہ کے خلوص اور علمی شان کی وجہ سے وہ مرکز کشش بنے رہے، ان کا تعارف کراتے ہوئے سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب مرحوم نے فرمایا تھا کہ ''اگر فقہی، مذہبی، تاریخی، سیاسی اور دنیا بھر کے معلومات کا پیکر بنایا جائے تو وہ مولانا عبدالقدوس ہاشمی کی ذات ہوگی''۔

افکار و خیالات میں توسع کے باوجود دین کے بنیادی عقائد میں وہ مداہنت پسند نہیں کرتے تھے، بینک کے سود کو حرام سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ تو فرض ہے کہ مسلمان جہاں اور جس ملک میں طاقت رکھتے ہوں وہاں کے معاشی اور اقتصادی نظام کو ربولی آلودگیوں سے پاک رکھیں، البتہ جہاں وہ اقلیت میں ہیں ان کے لیے بینک کے سود کو بعض حدود قیود کے ساتھ جائز سمجھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ ان کی دینی خدمات اور نیک اعمال کو شرف قبولیت بخشیں اور اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائیں، آمین۔ (''ع۔ص''، مئی ۱۹۸۹ء)

خمینی، آیت اللہ

علامہ آیت اللہ روح اللہ خمینی

یہ سطریں زیر تحریر تھیں کہ اسلامی جمہوریہ ایران کے بانی علامہ آیت اللہ روح اللہ خمینی کے انتقال کی خبر ملی، وہ اسلامی نظام کے علمبردار ہونے کی بنا پر قید اور جلاوطن کیے گئے، ایران سے شہنشاہیت کا خاتمہ اور جمہوریت کا قیام نیز اسے مغربی ملکوں کی گرفت سے نکال کر اسلام کے راستہ پر ڈال دینا ان کا اہم کارنامہ ہے، اپنی آخری وصیت میں انھوں نے ساری دنیا کے مسلمانوں کو امریکی و روسی تسلط سے چھٹکارا حاصل کر کے باہم متحد ہونے، اپنے دست و بازو پر بھروسہ کرنے اور بتان رنگ و بو کو چھوڑ کر اخوت اسلامی کے رشتہ میں منسلک ہوجانے کی دعوت دی ہے، مگر اسلامی انقلاب کے بعد ایران میں خون خرابہ ہوا، عراق سے آٹھ برس تک جنگ ہوتی رہی، حرم میں شورش بپا ہوئی، اس لیے ایران کے انقلاب کو نسلی و قومی سمجھا جانے لگا، مگر انھوں نے امریکی سفارتخانہ کو یرغمال بنانے کا اعلان کر کے ساری دنیا کو دم بخود کر دیا۔

سلمان رشدی کے قتل کے فتوے سے وہ عام مسلمانوں میں بہت محبوب ہو گئے تھے، ایرانی انقلاب نے پھر ثابت کر دیا کہ علماء اور مذہبی رہنما بھی قوموں کی تاریخ موڑ دینے کا کام انجام دیتے رہے ہیں، آج اسلامی ممالک مغربی حکومتوں کی کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں لیکن مرحوم خمینی کی جڑیں عوام میں بہت گہری تھیں، اس لیے بڑی طاقتیں ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکیں، وہ انقلاب کے روز ہی کی طرح وفات کے دن تک عوام میں مقبول رہے، ان کی وفات بڑا سانحہ ہے، اللہ تعالیٰ لغزشوں کو معاف کرے اور مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ (''ض''، جون ۱۹۸۹ء)

چند عرب فضلا کی موت

دمشق کے مجلّہ مجمع اللغة العربيه کے سال گزشتہ کے شمارے ہم کو حال ہی میں ملے تو ان سے معلوم ہوا کہ علوم اسلامی کے کئی عرب محقق و ادیب گزشتہ دنوں مسند علم سونی کر گئے، اِنا للہِ وَ اِنا اِلَیہِ رَاجِعُون۔ ان مرحومین میں استاذ محمد احمد دہمان، ڈاکٹر احمد عبدالسلام الجواری اور ڈاکٹر صبحی المحمصانی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

دہمان، محمد احمد، استاذ

استاذ محمد احمد دہمان

استاذ محمد احمد دہمان کا شمار دمشق کے ان علماء میں ہوتا ہے، جنہوں نے عربی زبان و ادب کی نشاۃ ثانیہ کے لیے اپنے کو وقف کر دیا تھا، وہ ۱۸۹۹ء میں دمشق میں پیدا ہوئے، ان کے والد شیخ احمد دہمان بھی ایک مشہور قاری و عالم تھے، محمد احمد دہمان کی تعلیم و تربیت دمشق میں ہوئی، ان کے اساتذہ میں شیخ ابوالخیر میدانی متوفی ۱۹۶۱ء اور شیخ محمد قطب متوفی ۱۹۲۷ء بھی ذی علم اور صاحب فضل و کمال تھے لیکن وہ سب سے زیادہ متاثر شیخ عبدالقادر بدران کی شخصیت سے ہوئے جو ایک وسیع النظر عالم اور مصلح قوم تھے، انہوں نے ابن عساکر کی شہرہ آفاق تاریخ دمشق کی ترتیب و تدوین کے علاوہ منادمة الاطلال و سامرة الخيال کے نام سے ایک اہم کتاب بھی تالیف کی تھی، شیخ محمد قطب مظلوم طبقہ کے حامی تھے اور ان کے لئے عدل و انصاف کی آواز بھی بلند کرتے تھے جس کی وجہ سے انہیں مصائب و آلام سے دو چار ہونا پڑا۔ علم و عمل کی اس جامع شخصیت نے استاذ دہمان کو بہت متاثر کیا۔ چنانچہ ان کے عہد شباب میں جب مدارس کے مقاطعہ اور تعلیم کو ترک کرنے کی ایک تحریک چلی تو انہوں نے اس کی سخت مزاحمت کرنے کے لیے ایک رسالہ ''المصباح'' جاری کیا، بعد میں ان کے بلند پایہ مضامین مجله التمدن الاسلامی اور مجله مجمع العلمی العربی میں برابر چھپتے رہے، انہوں نے مدرسہ عادلیہ میں اسلامی علوم کا شعبہ قائم کیا، جہاں دوسرے اہل فکر و نظر کے علاوہ وہ خود بھی عربی ادب اور اسلامی تہذیب و تمدن کے موضوع پر مقالے پیش کرتے رہے، مقصد یہ تھا کہ نوجوان نسل فرانسیسی اور یورپی علم و تہذیب سے مرعوب نہ ہونے پائے۔ علوم اسلامی خصوصاً تاریخ پر گہری نظر تھی، تاریخ میں بھی ان کو دمشق کی تاریخ سے خاص شیفتگی تھی اور اس سے متعلق کئی قدیم کتابوں کو انہوں نے سلیقہ اور محنت سے مرتب کیا اربلی کی مدارس دمشق، ابن کنان کی المروج السندسيه، ابن طولون کی القلائد الجوهريه فی تاريخ الصالحيه، اعلام الوریٰ اور رحلة الاميريشبک الدوادار وغیرہ ان کی مورخانہ دیدہ روی اور محققانہ ژرف نگاہی کا ثبوت ہیں، جامع اموی پر انہوں نے خود بھی ایک کتاب لکھی، عہد ممالک کی تاریخ کا انہوں نے بڑی دقت نظر سے مطالعہ کیا تھا، اس موضوع پر ان کی تالیف ولاة دمشق فی عهد المماليک قابل ذکر ہے، ان کی ایک کتاب فی رحاب دمشق میں دمشق کے علمی اور تمدنی جلوے دکھائے گئے ہیں، وہاں کے آثار قدیمہ، مساجد و معابد، مدارس و کتب خانوں اور اس کے تاریخی پہاڑ جبل قاسیون کے متعلق جو کتابیں لکھی ہیں ان میں

موضوع کی خشکی کو رنگینی و دلفریبی میں تبدیل کردیا ہے، ان کو دمشق سے اپنی والہانہ محبت کا احساس تھا، چنانچہ لکھتے ہیں: "**کانت دمشق و مازالت کل دنیای**" (پہلے اور آج بھی میرے لیے تو دمشق کل جہان ہے) دمشقیات کے علاوہ انہوں نے ابن جزری کی کتاب **النشر فی القراء لت العشر** ابن قدامہ مقدسی کی مختصر القاصدین، محمد بن وضاح قرطبی کی کتاب **البدع و النہی منہا**، ابوعمرو عثمان بن سعید الدانی کی کتاب **المقنع فی مرسوم مصاحف اھل الامصار** اور **سنن دارمی** کو مرتب کرکے شائع کیا، تاریخ و رجال میں انہوں نے ابن حجر عسقلانی کی کتاب **ابناء الغمر بانباء العمر** کی پہلی جلد کو بڑے اہتمام سے شائع کیا، ان کی ساری کتابیں تحقیق و کاوش اور محنت و دیدہ ریزی کا بہترین نمونہ ہیں، ان کو اپنی قدیم روایات نہایت عزیز تھیں، تحقیق میں وہ عجلت و سہولت پسند نہیں کرتے تھے، انہوں نے **العقائد الجوھریہ** کی تحقیق و تدقیق میں دس برس صرف کرنے کے بعد یہ نادر تحفہ علمی دنیا کے سامنے پیش کیا، تاریخی الفاظ کی ایک معجم بھی بڑی محنت سے مرتب کی جس میں عہد ممالیک میں رائج الفاظ کے اصول و ماخذ کا جائزہ لسانیات کے جدید طرز و انداز پر لیا ہے۔ رضوان بن محمد ساعاتی کی کتاب **علم الساعات و العمل بھا** کو ایڈٹ کیا تو اس میں گھڑی کی صنعت اور فن کے متعلق ارشمیدس اور دوسرے علماء کے مقالات بھی شامل کئے اور سو صفحات کا خود ایک مقدمہ بھی لکھا جس میں عرب اور مسلمان ماہرین فن اور کاریگروں کی اختراعات پر سیر حاصل تبصرہ کیا، علمی حلقوں میں ان کی کتابوں کے مقدمے اور حواشی ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

ان کی نجی زندگی بھی قابل تقلید اور مثالی نمونہ تھی، وہ عزم و صبر کا پیکر تھے، نامساعد حالات میں بھی ان کا دل امید و حوصلہ سے معمور رہتا تھا، وہ اکثر بیمار رہتے، اضعف بصر میں مبتلا تھے لیکن ان کی علمی جدوجہد میں یہ چیزیں کبھی رکاوٹ نہ بنیں اور وہ خاموش اور سرگرمی کے ساتھ علم و ادب کی خدمت انجام دیتے رہے۔ دوشنبہ ۷/ مارچ ۱۹۸۸ء کو ان کا انتقال ہوا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، آمین۔ ("ع۔ص"، ستمبر ۱۹۸۹ء)

الجواری، عبدالستار، ڈاکٹر

ڈاکٹر عبدالستار الجواری

عربی زبان کے عاشق شیدائی اور اسلامی علوم خصوصاً قرآنیات کے خادم کی حیثیت سے ڈاکٹر احمد عبدالستار الجواری کا نام عرب کے علمی حلقوں میں تعارف کا محتاج نہیں۔ ۲۲/ جنوری ۸۸ء کو وہ نماز جمعہ کی تیاری کر رہے تھے کہ اچانک ان کا پیمانہ عمر لبریز ہوگیا، انتقال کے وقت ان کی عمر ۶۲، ۶۳ سال تھی اور وہ علم کے بام عروج پر پہنچے ہوئے تھے۔

وہ ۱۹۲۵ء میں بغداد کے قدیم تاریخی محلّہ کرخ میں پیدا ہوئے، اس محلّہ کے خانوادے اور گھرانے آج بھی قدیم عربی روایات و خصوصیات کے حامل ہیں، ڈاکٹر احمد نے بھی ایک شریف و معزز خاندان میں آنکھیں کھولیں، بی اے تک کی تعلیم بغداد میں حاصل کی اور طہ الراوی، مہدی البصیر، عبدالوہاب عزام اور زکی مبارک جیسے ممتاز اساتذہ سے استفادہ کیا، بعد میں قاہرہ سے ایم اے کیا وہاں ان کو طہ حسین، احمد امین، احمد الشائب، مصطفیٰ السقا اور امین الخولی جیسے مشاہیر فضلا کی عنایات بھی حاصل رہیں۔ تعلیم کے بعد وہ عراق کی مختلف اعلیٰ تعلیمی و انتظامی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے رہے، ۱۹۷۹ء تک وہ کئی محکموں کے وزیر بھی رہے لیکن یہ انتظامی سرگرمیاں ان کی علمی و تحقیقی راہ میں کبھی حائل نہ ہوئیں، عالم عرب کے اہم سمیناروں اور باوقار علمی مجلسوں میں برابر شریک ہوتے رہے۔ ان کے مقالوں اور خطبوں میں عموماً اسلامیات اور امت عربی کے مسائل زیر بحث آتے جو علمی متانت و سنجیدگی کی وجہ سے بڑی توجہ سے سنے جاتے۔ ان علمی خدمات کے اعتراف میں ۶۵ء میں ان کو عراق کی **المجمع العلمی** کا رکن بنایا گیا، بعد میں وہ دمشق اور قاہرہ کی علمی اکیڈمیوں کے بھی رکن مقرر ہوئے، ۶۹ء میں عرب کی یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اساتذہ کی انجمن اتحاد معلمین عرب کے صدر منتخب ہوئے۔

ان کے قلم سے کئی عمدہ کتابیں نکلیں، مضامین کے مجموعے چھپے، کئی امہات کتب کی تحقیق اور مختلف علوم کی مصطلحات کی ترتیب میں وہ بعض دوسرے محققین کے ساتھ شریک رہے، بقول ڈاکٹر عدنان خطیب ان کی تمام کتابیں مفید و وقیع اور بلند پایہ ہیں، جن سے ان کی دقت نظر، وسعت فکر، ایمان و یقین کی پختگی اور علمی جرأت کا اندازہ ہوتا ہے، ان کی ایک کتاب '**نحوا القرآن**' خاص طور سے قابل ذکر ہے جس میں انہوں نے قرآنی آیات اور عبارتوں کی نحوی اور لغوی خوبیوں بلکہ قرآنی اسلوب کے اعجاز پر ماہرانہ بحث کی ہے۔ وہ علمائے نحو کو یہ حقیقت اپنے پیش نظر رکھنے کی تلقین کرتے ہیں کہ قرآن مجید کے اصول ان کے قواعد و کلیات کی کسوٹی سے زیادہ اہم ہیں۔ اس لئے اصل محور اسی کو بنانا چاہئے۔ اس کتاب میں انہوں نے علم نحو کے گیارہ پیچیدہ مسائل پر گفتگو کی ہے۔ سب سے عمدہ بحث '**حذف القول**' کی ہے جس کے نظائر و شواہد قرآن مجید میں بکثرت ملتے ہیں، انہوں نے الفاظ کی رمزیت، کنایہ کے زور، اجمال و تفصیل اور سیاق کلام کی معنویت و تاثیر کے متعلق بڑی لطیف اور عالمانہ بحث کی، امام زمخشری کے اس قول کہ "**ان ھٰولاء محکی بعد قول مضمر**" کی تشریح میں لکھا کہ "اس خوبصورت اسلوب میں تعبیر کے کئی دلکش فنی مظاہر ہیں، جس میں حذف نحوی 'ایجاز' 'فصل' وغیرہ شامل ہیں"۔ عام نحوی اصولوں پر بھی ان کی محققانہ بحث پڑھنے کے لائق ہے۔

ان کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب ذکر مبین کے لئے جس زبان کو شرف انتخاب بخشا اس کی حفاظت ایک دینی فریضہ ہے اور اس کی حمایت کے لئے سینہ سپر ہونا،

راہ شہادت پالینے کے مترادف ہے، اللہ تعالیٰ ان کے جذبہ ایمانی کے طفیل میں انہیں عالم آخرت میں اپنی رضا وخوشنودی سے سرفراز فرمائے۔ (''ع۔ص''، ستمبر ۱۹۸۹ء)

المحمصانی، صبحی، ڈاکٹر

ڈاکٹر صبیحی المحمصانی

ڈاکٹر صبیحی المحمصانی عالم عرب میں شریعت اسلامی اور اس کے جدید ملکی و بین الاقوامی قوانین کے مرجع اور سند سمجھے جاتے تھے، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں پر ان کو یکساں عبور تھا، ان کا انتقال پیرس میں ستمبر ۱۹۸۶ء میں ہوا، لیکن مجمع اللغة العربیه اکتوبر ۸۸ء کے شمارہ میں ان کی شخصیت پر تعزیتی مضمون تاخیر سے شائع ہوا، ان کی قابل قدر علمی زندگی خصوصاً قانون کے موضوع پر ان کے اہم اور یادگار کارناموں کی وجہ سے ان کی وفات کا غم آج بھی تازہ ہے۔

وہ ۱۹۰۶ء میں بیروت میں پیدا ہوئے، اعلیٰ تعلیم کے لئے فرانس گئے۔ ۱۹۳۲ء میں ڈاکٹریٹ کیا، ۳۵ء میں لندن یونیورسٹی سے بھی ڈگری لی، دوران تعلیم ان کے خاص مضامین قانون اور معاشیات تھے، تعلیم کے بعد لبنان میں اعلیٰ قانونی عہدوں پر فائز ہوئے، ۶۶ء میں وہ لبنان کے وزیر اقتصادیات بھی ہوئے، لیکن سیاسی زندگی کی شورشیں اور بکھیڑے ان کے مزاج کے مطابق نہیں تھے اس لیے اس سے کنارہ کش ہوکر علمی اور تدریسی سرگرمیوں میں مشغول ہوئے اور پھر تصنیف و تالیف کے لئے یکسو ہوگئے، وہ ۷۷ء میں دمشق کی مجمع العلمی کے رکن بنے، مسلم ممالک میں اسلامی قانون کے نفاذ کے سلسلہ میں انہوں نے کئی اہم کانفرنسوں میں خصوصی مدعو کی حیثیت سے شرکت کی۔ ان کی تصنیفات کا زیادہ حصہ اسلامی قانون سے متعلق ہے، ان کی ایک کتاب فلسفة التشریع فی الاسلام بہت مقبول ہوئی، انگریزی اور فارسی میں اس کے ترجمے ہوئے، اردو میں بھی اس کا ترجمہ لاہور سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ النظریات العامه للموجبات و العقود فی الشریعة الاسلامیة، الاوضاع التشریعیه فی الدول العربیه، المبادی الشرعیه و القانونیه، مقدمه فی احیاء علوم التراث، القانون و العلاقات الدولیه فی الاسلام، الدعائم الخلفیه للقوانین الشرعیه، ارکان حقوق الانسان فی الشریعة الاسلامیه، الاوزاعی و تعالیمه القانونیه والانسانیة، المجتهدون فی القضاء، تراث الخلفاء الراشدین فی الفقه وغیرہ کتابوں کی اہمیت ان کے نام سے ہی ظاہر ہے۔ اول الذکر کتاب کو نقادوں نے اپنے موضوع پر بہترین کتاب قرار دیا ہے، اس میں مستند فقہی مصادر سے اخذ واستدلال کے بعد یورپ کے قانونی ماخذ سے ان کا موازنہ خالص علمی انداز میں کیا گیا اور پھر فقہ اسلامی کی برتری ثابت کی گئی ہے، امام ابو یوسف اور علامہ ابن قیم کے فقہی اور اجتہادی کارناموں پر بھی انہوں نے کتابیں لکھیں، التشریع اللبنانی میں انہوں نے لبنان کے مختلف مذاہب اور فرقوں کے لئے یکساں سول کوڈ کی وکالت کی اور اس کے لئے شریعت اسلامی کے قوانین کو جامع ثابت کیا، ان کی ایک کتاب المجاهدون فی الحق ـ تذکارات من مالک الی السنهوری میں امام مالک سے لے کر ڈاکٹر عبدالرزاق سنہوری تک کے نامور فقہاء اور قانون دانوں کا ذکر ہے، کتاب کا خاتمہ انہوں نے علامہ اقبال کے ذکر پر کیا، وہ علامہ اقبال کے فلسفہ احترام آدمیت اور ان کے عالمگیر اسلامی جذبہ اخوت کے بڑے معترف تھے، انہوں نے کلام اقبال کے دوررس اثرات کا بڑی خوبی سے تجزیہ کیا ہے۔

اپنے وطن لبنان کے خون آشام واقعات سے وہ ملول تھے، ان کا کہنا تھا کہ اجتماعی و معاشرتی سکون صرف روحانی انقلاب سے مل سکتا ہے اور یہ روحانی انقلاب ہمارے عظیم دینی واخلاقی ورثہ سے ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو شرف قبولیت بخشیں اور جنت نعیم میں جگہ عطا فرمائیں۔ (''ع۔ص''، ستمبر ۱۹۸۹ء)

عباسی، سید محامد علی

سید محامد علی عباسی

افسوس ہے کہ دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے ایک معزز مخلص رکن جناب سید محامد علی عباسی ائی۔اے۔ایس ۱۵ر ستمبر کو حیدرآباد میں وفات پاگئے، اِنا للہ وَ اِنا اِلَیه رَاجِعُون، یہ اطلاع بہت تاخیر سے ان کے ہم وطن مولوی معین احمد علوی کاکوروی کے مکتوب گرامی سے ملی۔ ان کی زندگی حیدرآباد میں بسر ہوئی، دارالمصنفین کے بڑے قدرداں تھے، وہ نظام ٹرسٹ کے بہت بااثر رکن تھے، اس سے دارالمصنفین کو سالانہ گرانٹ دلائی اور اس کے لئے سفر کی صعوبت برداشت کرکے یہاں تشریف بھی لائے، بڑی خوبیوں کے مالک تھے، اونچے عہدوں پر فائز رہنے کے باوجود متواضع تھے، اپنی دیانت داری، حسن خدمت اور قابلیت کی وجہ سے نیک نامی حاصل کی اور بڑا عروج پایا، ان کی شخصیت باوقار، پرکشش اور قدیم شرافت وتہذیب کا دلکش نمونہ تھی، گزشتہ برس ہمدردنگر میں ہونے والے دارالمصنفین کے جلسہ میں شرکت فرمائی، کیا خبر تھی کہ اس عالم ناسوت میں یہ ان سے آخری ملاقات ہے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور اعزہ متوسلین کو صبر جمیل عطا کرے۔ (''ض''، نومبر ۱۹۸۹ء)

اہلیہ ندوی، سید ابوالحسن علی

اہلیہ سید ابوالحسن علی ندوی

۱۵ دسمبر کو مجلسِ عاملہ کے صدر، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی اہلیہ محترمہ کا

انتقال ہوگیا، جو بڑی نیک بخت اور عابدہ، زاہدہ خاتون تھیں......اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرمائے اور حضرت مولانا کے غم واندوہ کو زایل کرے، آمین۔

("ض"، جنوری ۱۹۹۰ء)

فرنگی محلی، محمد رضا انصاری، مفتی حافظ

مولانا مفتی حافظ محمد رضا انصاری فرنگی محلی

افسوس ہے کہ مولانا مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی کا ۵ فروری کو لکھنؤ میں انتقال ہوگیا، عمر تقریباً ۷۰ برس کی تھی، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

خانوادہ فرنگی محل گذشتہ تین سو برس سے ہندوستان میں علم وعمل کی شمع روشن کیے ہوئے ہے، اس خاندان میں علم کی دولت جس طرح محفوظ رہی اور نسلاً بعد نسل اس میں جس قدر اضافہ ہوتا گیا، ہندوستان میں چند خاندانوں کے علاوہ اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، ملا قطب الدین شہید ان کے فرزند استاذ الہند ملا نظام الدین محمد بانی درس نظامیہ کے بعد ملا حیدر، ملا مبین، ملا حسن، مولانا عبدالعلی بحرالعلوم، مولانا عبدالحیؒ اور مولانا عبدالباری اسی خاندان کے سلسلۃ الذہب کی روشن مثالیں ہیں، بقول علامہ شبلیؒ لکھنؤ کا فرنگی محل، علم وفن کا معدن بن گیا، آج جہاں علوم عربیہ کا نام ونشان باقی ہے، اسی خاندان کا پرتو فیض ہے، ہندوستان کے کسی گوشہ میں جو شخص تحصیل علم کا احرام باندھتا ہے اس کا رخ فرنگی محل کی طرف ہوتا ہے۔

ہمارے عہد میں مفتی محمد رضا انصاری مرحوم اپنے اسی نامور خاندان کی علمی و تہذیبی روایتوں کے وارث تھے، ان کے والد مولوی محمد سخاوت اللہ، مدرسہ عالیہ نظامیہ میں ریاضی کے استاد تھے، بعد میں وہ حیدر آباد دکن میں محکمہ امور عامہ میں ملازم ہوئے،، ان کی عدم موجودگی میں مفتی صاحب مرحوم کی تعلیم وتربیت ان کے رشتہ کے چچا مفتی محمد عبدالقادرؒ کی زیرنگرانی ہوئی جو علم وعمل میں اپنے اسلاف کرام کا نمونہ تھے اور جن سے شاہ معین الدین ندوی مرحوم نے بھی مختصر المعانی کا درس لیا تھا۔

مفتی صاحب مرحوم کی بسم اللہ مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ نے کرائی تھے، خاندانی روایت کے مطابق سب سے پہلے حفظ قرآن کی دولت سے سرفراز ہوئے، پھر معقولات ومنقولات کا علم مفتی محمد عنایت اللہ، مولانا محمد قطب الدین، مولانا محمد صبغتہ اللہ شہید، مولانا سید علی زینبی، مولانا سید علی نقی مجتہد اور ڈاکٹر مصطفیٰ حسن علوی کاکوروی وغیرہ سے حاصل کیا۔

لکھنؤ میں اردو صحافت کا آغاز ہوا تو فرنگی محل کے خانوادہ نے بھی اس سے دلچسپی لی، مفتی صاحب کی زندگی کی ابتدا بھی صحافت سے ہوئی، ۱۹۳۸ء میں ماہنامہ نیا ادب لکھنؤ سے شایع ہوا تو اس کی مجلس ادارت میں سید سبط حسن، مجاز اور علی سردار جعفری کے ساتھ وہ بھی شریک تھے، بعد میں ۱۹۴۳ء میں فرنگی محل سے نیا ادب کے انداز پر ایک رسالہ منزل نکالا، ۱۹۴۶ء میں وہ روز نامہ ہمدم سے متعلق ہوئے، ۱۹۴۷ء میں یہ بند ہوا تو ۱۹۴۸ء میں وہ روز نامہ قومی آواز سے وابستہ ہوئے اور تقریباً بیس ۲۰ برس تک اس سے وابستہ رہے، اس میں جدید مطبوعات پر تبصرے ان ہی کے قلم سے شائع ہوتے تھے جو علمی و ادبی حلقوں میں بہت پسند کیے جاتے تھے، ۱۹۷۰ء میں وہ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات میں استاد مقرر ہوئے، وہاں سے سبکدوش ہوئے تو کچھ عرصہ کے لیے یوپی اردو اکیڈمی کے چیرمین بھی رہے۔ گو ان کی زندگی کا زیادہ تر حصہ صحافت وتدریس میں گذرا لیکن اس میں بھی وہ تصنیف وتالیف کے لیے وقت نکال لیتے تھے، ۱۹۴۶ء میں انجمن ترقی اردو نے ان کی کتاب "ادب جاہلی"، شایع کی جو ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب الادب الجاہلی کا ترجمہ ہے، ۱۹۵۷ء میں ان کی کتاب "مجذوبؔ اور ان کا کلام" شایع ہوئی جس کے حسن ترتیب اور خوش سلیقگی کی بڑی داد ملی، شاہ معین الدین مرحوم نے اسے "انتخاب لاجواب"، قرار دیا، ۱۹۶۵ء میں اپنے مربی ومشفق چچا مولانا مفتی عبدالقادر فرنگی محل کے فتاویٰ کا مجموعہ مرتب کر کے فتاویٰ فرنگی محل موسوم بہ فتاویٰ قادریہ، کے نام سے شائع کیا، اس سے پہلے انھوں نے مفتی عبدالقادر مرحوم کی یاد میں، "مفتی صاحب" کے نام سے ایک کتاب بھی شایع کی تھی، ۱۹۶۵ء میں ان کو فریضۂ حج کی سعادت نصیب ہوئی، واپس ہوئے تو قومی آواز میں اپنا سفرنامہ لکھا، بعد میں یہ "حج کا سفر" کے نام سے کتابی صورت میں طبع ہوا، جولائی ۱۹۷۰ء سے مارچ ۱۹۷۱ء تک ملا نظام الدین محمد پر ان کا مقالہ معارف میں مسلسل شایع ہوا، اس سلسلہ کو مرتب کر کے انھوں نے "بانی درس نظامی" کے نام سے ۱۹۷۳ء میں شایع کیا یہ کتاب تحقیق، ترتیب، محنت اور دیدہ ریزی کا عمدہ نمونہ ہے، معارف میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا گیا کہ "لایق مصنف نے اپنے خاندان کی محفوظ دستاویزوں، قدیم یادداشتوں اور مخطوطات کے علاوہ بعض دوسرے مآخذ کی مدد سے یہ کتاب سلیقہ سے مرتب کی ہے۔ واقعات کی تحقیق اور چھان بین میں بڑی کاوش سے کام لیا گیا ہے، اس کے لیے وہ مشرقی علوم کے قدر دانوں کے شکریہ کے مستحق ہیں"، معارف میں ان کے اور مضامین بھی شایع ہوئے جن میں مولانا محمد یوسف فرنگی محلی اور علمائے فرنگی محل کے شجرۂ نسب پر ایک نظر، علمی حلقہ میں قدر کی نظر سے دیکھے گئے، ان کی آخری تصنیف وتذکرہ حضرت سید صاحب بانسویؒ، کی بھی بڑی پذیرائی ہوئی، خاندان فرنگی محل تین صدیوں سے سید شاہ عبدالرزاق بانسویؒ کے سلسلہ عالیہ قادریہ رزاقیہ سے وابستہ رہا ہے۔ مفتی صاحب مرحوم نے لکھا کہ "علمائے فرنگی محل کی تین سو سالہ تاریخ کا آغاز اگرچہ بظاہر استاذ الہند ملا نظام الدین فرنگی محلی اور ان کے مرتبہ درس نظامی سے ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس خاندان کی علمی سربلندی اور تدریسی سربراہی کا سرچشمہ ایک "امی سید زادہ والا تبار" کے

آستانہ سے پھوٹا ہے'' پوری کتاب اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ان کو شعر و ادب کا اچھا اور ستھرا ذوق تھا، ابتدا میں ترقی پسند تحریک سے بھی ان کا تعلق رہا، نقوش کے شخصیات نمبر میں مجذوب اور ''انتخاب کلام حسرت موہانی'' میں حسرت موہانی پر ان کے مضامین سے ان کے عمدہ وشستہ ادبی ذوق کی جھلک صاف نمایاں ہے۔

حسن اخلاق، شرافت، مروت، دردمندی، سادگی اور زندہ دلی میں وہ فرنگی محل اور لکھنؤ کی دیرینہ تہذیب کے نمایندہ اور نمونہ تھے، عقیدہ وعمل میں متقشف نہیں تھے لیکن دینی شعائر کا احترام ان کے ہر عمل سے ظاہر تھا، فتاوٰی قادریہ کا مقدمہ انھوں نے سفر حج کے دوران لکھا تو بڑے جذب وکیف کے ساتھ یہ تحریر سپرد قلم کی کہ ''عجب خوش بختی ہے کہ جس وقت یہ سطریں لکھی جارہی ہیں حرم نبویؐ کا خوش الحان موذن جمعہ کی اذان کہتے ہوئے اشھد ان محمد رسول اللہ کی صدا بلند کر رہا ہے:

جان رگ رگ سے کھنچی آتی ہے کانوں کی طرف
کس قیامت کی کشش اف تری آواز میں ہے''

دارالمصنفین سے ان کا بڑا گہرا تعلق تھا علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور دونوں کے علمی پایہ سے بخوبی واقف تھے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی بیشتر تعلیم فرنگی محل میں ہوئی تھی اس لحاظ سے یہاں کے تمام لوگوں سے ان کے تعلقات تھے، وہ مفتی صاحب مرحوم سے بھی عزیزانہ تعلق رکھتے تھے اور ان کے مضامین کو معارف میں دلچسپی سے شایع کرتے تھے وہ یہاں جب بھی آتے ہر شخص پر اپنی محبت کے نقوش چھوڑ جاتے، سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم ان سے خاص تعلق اور معاملہ شفقت رکھتے تھے، وہ لکھنؤ جاتے تو وقت نکال کر فرنگی محل ان سے ملنے ضرور جاتے، سید صاحب مرحوم کا سفر آخرت بھی ندوۃ العلما سے فرنگی محل جاتے ہوئے ہوا، ان کے ہمراہ سید شہاب الدین وسنوی صاحب بھی تھے کہ ڈالی گنج کے پل پر وفات کا حادثہ پیش آیا، اس سے ایک ہی روز قبل مفتی صاحب مرحوم پاکستان کے لیے روانہ ہوئے تھے اور ابھی وہ دلّی ہی میں تھے کہ ان کو یہ خبر ہوئی اپنے تعزیت نامہ میں لکھا کہ ''ایسے شفیق بزرگ کا ان حالات میں ہمارے درمیان سے اٹھ جانا کس قدر ولخراش صدمہ ہے، میرے لیے ایک اور ایک ہی ایسا بزرگ اٹھ گیا جو محبوب بھی تھا اور شفیق بھی'' اس قحط الرجال میں مفتی صاحب مرحوم جیسے صاحب علم وکمال کا اٹھ جانا ایک بڑا سانحہ اور مذہب، علم اور تہذیب کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے، فرنگی محل میں ان کی کمی عرصہ تک محسوس کی جائے گی، اب سے تقریباً سو سال پہلے علامہ شبلیؒ نے ملا نظام الدینؒ کے اسی آستانہ کی زیارت کی تھی تو فرمایا تھا کہ ''اللہ اکبر! ہمارے ہندوستان کا کیمبرج یہی ہے، یہی خاک ہے جس سے عبدالعلی بحرالعلوم اور ملا کمال پیدا ہوئے، افسوس اب یہ کعبہ ویران ہوتا جاتا ہے''، مفتی صاحب کی وفات سے اس کعبہ علم کی ویرانی اور بڑھ گئی، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مفتی صاحب مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور فرنگی محل کے کعبہ علم وفن کو پھر سے آہوان علم نبوت سے آباد کردے، آمین۔

(''ع۔ص''، مارچ ۱۹۹۰ء)

ندوی، محمد منصور نعمانی، مولوی حافظ

آہ! جناب مولوی حافظ محمد منصور نعمانی ندوی مرحوم

دارالعلوم تاج المساجد بھوپال کے استاد جناب مولوی سید شرافت علی ندوی کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ دارالمصنفین کے سابق رفیق مولوی منصور نعمانی ندوی صاحب کا اچانک حرکت قلب بند ہوجانے سے ۱۶؍فروری کو بھوپال میں انتقال ہوگیا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

ان کا سانحہ وفات ان کے والدین، اعزہ اور احباب کے لیے نہایت سخت اور اندوہناک ہے، بظاہر وہ توانا، متحرک، چاق و چوبند اور صحت مند تھے، بیماری دل کا تو شبہہ بھی نہ تھا، اپنے خانگی مسائل سے فکر مند ضرور تھے مگر کسے پتہ تھا کہ رخت سفر سمیٹنے میں ایسی عجلت کریں گے:

آہ کتنی مشکل زندگی ہے! کس قدر آساں ہے موت

وہ ندوہ کے باصلاحیت فرزندوں میں تھے، تعلیم کے دوران ہی ان کی صلاحیتیں ظاہر ہونے لگی تھیں، چنانچہ اسی زمانہ میں ان کے مراسلے صدق جدید میں بار پانے لگے تھے، وہ ندوہ کی انجمن الاصلاح کے ناظم ہوئے تو ان کے دور نظامت میں رشید احمد صدیقی مرحوم نے وہ اہم توسیعی خطبہ دیا جسے عزیزان ندوہ کے نام سے شایع کیا گیا حصول تعلیم کے بعد وہ تاج المساجد میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے لگے، ساتھ ہی نشان منزل کے عملاً مدیر بھی رہے ان کی سعی اور تدبیر سے اسکا معیار بلند ہوا، ۱۹۷۷ء میں وہ دارالمصنفین کے رفیق کی حیثیت سے تشریف لائے یہاں انھوں نے حافظ سخاوی، شیخ عبدالقادر عیدروس اور حافظ سخاوی کی تصانیف جیسے علمی مقالے سپرد قلم کیے، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند کی بعض اہم فروگذاشتوں پر انھوں نے جس وقت نظری سے توجہ دلائی اس کا وزن محسوس کیا گیا، بعض اسباب کی وجہ سے وہ یہاں زیادہ دنوں قیام نہ کرسکے اور تلاش معاش میں سعودی عرب چلے گئے، وہاں سے واپس آنے کے بعد بھوپال میں ہی مستقل قیام رہا، رہین ستم ہائے روزگار ہونے کے باوجود انھوں نے قلم و قرطاس سے اشتغال قائم رکھا مقامی اخبارات میں برابر لکھتے رہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ پر بھوپال میں جو سمینار ہوا، اس میں انھوں نے بڑی محنت کی، اور ایک نہایت کامیاب شعری نشست کا انعقاد کیا، بھوپال کے عالموں، ادیبوں اور شاعروں سے ان کے اچھے روابط تھے، ادھر بھوپال میں نواب سید صدیق حسن خاں کی

علمی یادگار قائم کرنے کے لیے فکرمند تھے، وہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے، خوش دل اور خوش مزاج تھے، طبیعت میں تواضع، انکسار اور حد درجہ سادگی بلکہ بھولا پن تھا، دوسروں کی خدمت میں لذت محسوس کرتے، مہمان نوازی تو ان کے پورے خاندان کا نمایاں وصف ہے، مگر وہ اس میں کچھ سوا ہی تھے، تحفے تحائف دینے میں بھی بڑی فیاضی کا ثبوت دیتے، ابھی ٹھیک ایک مہینہ قبل جب ان سے رخصت ہوکر آیا تھا تو کسے خبر تھی کہ اس سراپا پیکر اخلاص کی اس عالم ناسوت میں یہ آخری دید ہے، زندگی انھوں نے حوصلہ سے گذاری، ان کی موت بھی قابل رشک رہی جمعہ کے دن ٹھیک نماز جمعہ سے پہلے مسجد میں وہ سنتیں ادا کررہے تھے عین اسی حالت میں وہ وصال رب سے ہمکنار ہوئے، ان کی جواں مرگی ان کی اہلیہ، چھوٹے چھوٹے بچوں، والدہ اور خاص طور سے ان کے والد ماجد مولانا محمد نعمان خاں ندوی مدظلہ، کے لیے یقیناً جاں گسل صدمہ ہے لیکن جس آن سے وہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے وہ باعث تسکین بھی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے اس معصوم صفت بندہ کے درجات بلند فرمائے، زندگی کی دشوار گذار راہوں میں ان کی اہلیہ اور بچوں کی اپنے فضل خاص سے دستگیری فرمائے جن کے پاس ع اک متاع دیدۂ تر کے سوا کچھ بھی نہیں۔ (''ع۔ص''، مارچ ۱۹۹۰ء)

مشیر الحق، پروفیسر

جناب پروفیسر مشیر الحق مرحوم

دارالمصنفین اور پوری علمی دنیا میں جناب پروفیسر مشیر الحق مرحوم وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی کے سانحہ قتل کی خبر نہایت رنج وغم کے ساتھ سنی گئی، ان کو یرغمال بنائے جانے کی خبر ہی باعث تشویش اور اضطراب تھی، لیکن یہ امید نہ تھی کہ ایک حلیم الطبع، نرم شائستہ و شگفتہ مزاج انسان کے خرمن ہستی کو آتش چنار اس طرح جلا کر خاک کردے گی۔

ان کی زندگی ماہ و سال کے لحاظ سے بہت زیادہ نہیں ہے لیکن محنت، صبر، استقلال عزم اور مقصد کی یافت کے لحاظ سے یہ حیات مختصر بڑی قابل قدر اور قابل رشک رہی۔ ان کے علمی سفر کا آغاز دارالعلوم ندوۃ العلماء کی طالب علمی سے اور اختتام کشمیر یونیورسٹی کی وائس چانسلری پر ہوا، حق یہ ہے کہ قدیم وجدید کے خوشگوار اور متوازن امتزاج کی یہ دلکش مثال ہے۔

وہ غازی پور یوپی کے قصبہ بحری آباد میں پیدا ہوئے، کم عمری میں والد کے سایہ عاطفت سے محروم ہوگئے، تعلیم کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ آئے، یہاں سے عالمیت کی سند لی، انھوں نے انگریزی تعلیم پر بھی توجہ کی اور بڑے نامساعد حالات اور سخت معاشی پریشانیوں کے باوجود انھوں نے علم وفن کی تحصیل جاری رکھی ان کے علمی شوق و ذوق کو ان کے محبوب و مشفق استاذ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کبھی کم نہ ہونے دیتی، جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بی اے اور علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم اے کیا، ۶۱ء میں انھوں نے کناڈا کی میک گل یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند بھی حاصل کی، دوران تعلیم ان کے قلب و نظر پر مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، پروفیسر محمد مجیب، پروفیسر سید عابد حسین اور پروفیسر الفریڈ کینٹویل اسمتھ کے نقوش خاص طور پر مرتسم ہوئے۔

پٹیالہ اور مسلم یونیورسٹی میں کچھ عرصہ تک تدریسی ذمہ داریاں انجام دینے کے بعد وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبہ اسلامیات وعرب ایرانین اسٹڈیز کے صدر ہوئے۔ ۸۷ء میں وہ کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔

ان کی زندگی کا زیادہ حصہ درس و تدریس میں گزرا لیکن اس کے باوجود وہ تصنیف و تالیف کے لیے بھی وقت نکال لیتے تھے، شروع میں انھوں نے مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم کی زیرنگرانی بچوں کے لیے صحابہ کرامؓ کے حالات بڑے موثر انداز میں تحریر کیے تھے جو ادارۂ تعلیمات اسلام لکھنؤ سے شائع ہوئے، یہیں سے ۴۸ء میں مولانا قدوائی مرحوم نے پندرہ روزہ تعمیر جاری کیا، جس کے مدیروں میں ان کے اور مولانا ابوالحسن ندوی صاحب کے علاوہ مشیر صاحب کا نام بھی تھا جس میں وہ مضامین کے علاوہ افسانے بھی لکھتے تھے، جامعہ ملیہ اور پھر میک گل یونیورسٹی نے ان کے فکر و نظر کو مزید وسعت دی، ۷۲ء میں ان کی کتاب 'امریکہ کے کالے مسلمان' شائع ہوئی جو مختصر ہونے کے باوجود اپنے موضوع پر اردو میں پہلی کتاب تھی، ۷۳ء میں ان کی ایک اور کتاب 'مسلمان اور سیکولر ہندوستان' شائع ہوئی، اس میں مذاہب، سیکولرزم دینی تعلیم، دینی رہنمائی، قانون اور شریعت جیسے موضوعات پر انھوں نے دعوت غور و فکر دی ہے لیکن اس میں ظاہر کیے گئے بعض خیالات سے سنجیدہ علمی و دینی حلقوں کو اختلاف رہا، ۷۷ء میں 'مذہب اور جدید ذہن' کے نام سے جب ان کے چند مضامین کا ایک مجموعہ طبع ہوا تو اس سے بھی اصحاب علم و دین نے مکمل طور پر اتفاق نہیں کیا وہ بظاہر جمود پسند ذہنوں میں ہلچل پیدا کرنے کے لئے اس قسم کے مضامین لکھتے تھے، لیکن اہل علم ان کے ضرر رساں پہلوؤں کو بھانپ لیتے تھے ان کو بھی معروضیت میں غلو تھا، سیمناروں میں ان کی موجودگی ضروری خیال کی جاتی، ان کے مقالوں پر مباحثہ و مناقشہ زیادہ ہوتا، لیکن وہ اپنے خیالات کو تسلیم کیے جانے پر کبھی اصرار نہیں کرتے اور اپنے نرم لہجہ، متبسم چہرہ اور کسی تیکھے جملہ سے مجلس میں جان پیدا کردیتے۔

۸۲ء میں دارالمصنفین میں ہونے والے مستشرقین پر بین الاقوامی سمینار میں وہ بھی شریک ہوئے اور اپنے استاد اور مشہور مستشرق کینٹویل اسمتھ کے حالات میں ایک مقالہ پڑھا، جس پر خاصی بحث ہوئی، جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے سمینار کے روداد میں ان کے متعلق بڑی محبت سے لکھا کہ ''ڈاکٹر مشیر الحق ندوی ابھی

جوان ہیں ان کے مقالہ نگاری میں جوانی کی ساری ترنگیں اور امنگیں ہوتی ہیں''۔

ان کے بعض علمی و مذہبی خیالات محل نظر ہوسکتے ہیں، لیکن ان کی شرافت، مروت، دل نوازی اور نرم خوئی مسلم تھی، وہ بڑی بے ساختہ اور بے تکلف گفتگو کرتے تھے جس سے نہ عہدہ منصب کی بڑائی کا اندازہ ہوتا تھا اور نہ کسی قسم کی رعونت کا اظہار ہوتا تھا، دینوی وجاہت کے مدارج طے کرنے کے بعد بھی انھوں نے اپنے قدیم بزرگوں اور دوستوں سے ربط و تعلق میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔

گزشتہ دسمبر میں غالب اکیڈمی دہلی میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کی یاد میں ایک سیمینار ہوا تو اس کی صدارت کے لیے وہ خاص طور پر کشمیر سے آئے اور دن بھر سیمینار کی نشستوں میں موجود رہے، دارالمصنفین سے ان کی گہری واقفیت اور غیر معمولی اخلاص و تعلق کا علم اس دن کی ان کی تقریر سے ہوا، جس کی لذت آج تک فراموش نہیں ہوسکی ہے۔

ادھر کشمیر میں سیاسی بے چینی بڑھتی جارہی ہے، کشمیریوں کے ایک طبقہ کا عرصہ سے یہ احساس ہے کہ،

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہل نظر کہتے تھے ایران صغیر

مگر اس کے لیے مشیر صاحب کے خون ناحق کا وبال لینا سراسر نادانی ہے، حکومت کشمیر کا رویہ بھی بعض حلقوں میں مستحسن نہیں سمجھا گیا، ایک قیمتی جان کو بچانے کے لیے جس ذمہ داری کی ضرورت تھی اس کو خاطر خواہ پورا نہیں کیا گیا، بہرحال قضا و قدر کا فیصلہ یہی تھا، وہ اب اپنے رب کے حضور میں ہیں، رمضان المبارک کے مہینہ میں مظلومیت و بے کسی کے عالم میں انھوں نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی، اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے اور ان کی اہلیہ، صاحبزادیوں اور دوسرے تمام اعزہ و احباب کو صبر کی توفیق دے، آمین۔ جامعہ ملیہ کے گورغریباں میں ڈاکٹر انصاری مرحوم کی لوح مزار پر کندہ یہ آیت ان کو بہت پسند تھی، کیا عجب آج ان کی قبر سے یہی صدا آتی ہو: یالیت قومی یعلمون بما غفرلی ربی وجعلنی من المکرمین۔[یٰسین:۲۶۔۲۷] (''ع۔ص''، اپریل ۱۹۹۰ء)

خالد، غلام، شاہ

شاہ غلام خالد

ادھر کسی سال ناغہ نہیں جاتا کہ دارالمصنفین کو اپنے ارکان و مخلصین کی جدائی کا صدمہ نہ اٹھانا پڑے، ۲؍اگست کو اس کی مجلس انتظامیہ کے ایک پر جوش، سرگرم، فعال اور مخلص رکن جناب شاہ غلام خالد صاحب نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا، اناللہ وانا الیہ راجعون، وہ اعظم گڑھ کے ممتاز اور کامیاب وکیل تھے، ان کی نانہال مولانا شبلی مرحوم کے خاندان میں تھی، ان سے اور ان سے نسبت رکھنے والے تمام اداروں سے مرحوم کو قلبی لگاؤ تھا، مدت دراز تک شبلی نیشنل کالج کے سرگرم ممبر اور اسسٹنٹ بلکہ عملاً سکریٹری رہے، انھوں نے بڑی جانفشانی سے اسکول اور کالج کو ترقی دی اور ان کے علمی و تعلیمی معیار اور ڈسپلن کو قائم رکھا، وہ بڑے دلیر اور دبنگ تھے کوئی بڑے اقدام کرنے میں ان کو ہچکچاہٹ نہیں ہوتی تھی، اب ان کی سرگرمی اور دلچسپی کا خاص مرکز دارالمصنفین ہوگیا تھا جس کے لیے مرتے دم تک سینہ سپر رہے، اور بڑے نازک اور بحرانی دور میں انھوں نے اس کی پوری مدد کی، اس موقع پر ان کا رعب و دبدبہ، جرأت و ہمت اور مقامی اثر و رسوخ بہت کام آیا، ان میں بڑی قوت عملی اور غیر معمولی صلاحیتیں تھیں جن سے دارالمصنفین اور اس کے کارکنوں کو بڑا فائدہ پہنچا، وہ گذشتہ کئی برس سے پیہم آفات و حوادث کا نشانہ بنے ہوئے تھے جس کا اثر ان کی صحت پر بھی پڑا، گذشتہ سال قلبی دورہ پڑا، بالآخر اسی بیماری دل نے کام تمام کردیا، اللہ تعالیٰ انھیں جنت نعیم عطا کرے اور متعلقین کو صبر جمیل دے۔ آمین!! (''ض''، اگست ۱۹۹۰ء)

منیر، سراج

سراج منیر

لاہور سے پروفیسر محمد اسلم، صدر شعبہ تاریخ، پنجاب یونیورسٹی نے اطلاع دی ہے کہ ادارۂ ثقافت اسلامی کے سربراہ اور المعارف کے مدیر اعلیٰ جناب سراج منیر اچانک حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال کرگئے، اللہ تعالیٰ ادارہ کو ان کا نعم البدل عطا کرے اور مرحوم کی مغفرت فرمائے، دارالمصنفین ان کے اعزہ و ادارۂ ثقافت کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ (''ض''، اکتوبر ۱۹۹۰ء)

مدراسی، محمد یوسف کوکن، مولانا حافظ

حافظ محمد یوسف کوکن

افسوس ہے کہ ۶ اکتوبر کو دارالمصنفین کے سابق رفیق اور اس کی مجلسِ انتظامیہ کے فاضل رکن افضل العلماء مولانا حافظ محمد یوسف کوکن مدراسی نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ (''ض''، اکتوبر ۱۹۹۰ء)

افضل العلماء حافظ محمد یوسف کوکن مرحوم

تار کے ذریعہ یہ افسوسناک خبر ملی کہ دارالمصنفین کی انتظامیہ کے رکن اور مدراس یونی ورسٹی کے سابق صدر شعبہ عربی و فارسی، افضل العلماء حافظ محمد یوسف کوکن کا انتقال ۶؍اکتوبر کو مدراس میں ان کے گھر پر ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

انہوں نے سرزمین مدارس میں مشرقی و دینی علوم کی قابل قدر خدمت جس خاموشی، محنت اور انہاک سے انجام دی اس کی وجہ سے برسوں ان کی کمی محسوس کی جائے گی۔ وہ ۴/نومبر ۱۹۱۵ء مدراس سے تقریباً ۹۵ میل دور ایک مردم خیز قصبہ مینمبور میں پیدا ہوئے یہ قصبہ مشہور قلعہ جنجی سے متصل ہے، اس مضبوط قلعہ کو مسلمان فاتحین نے کئی بار اپنے قبضہ میں لیا، آخری بار نواب سعادت اللہ خاں نے ۱۱۲۵ھ میں اس پر قبضہ کیا، چونکہ ان کا تعلق نوائط سے تھا اس لیے اکثر اہل نوائط وہاں جا کر آباد ہوئے، مینمبور قصبہ کی ساری آبادی نائط مسلمانوں کی ہے جو اپنے حسب نسب، عزوشرف، دینی اور دنیوی وجاہت اور اپنے بعض مخصوص رسم و رواج کی وجہ سے جنوبی ہند میں امتیازی شان رکھتے ہیں، یہ لوگ شافعی المسلک ہوتے ہیں لیکن مینمبور کے نوائط عام طور سے حنفی ہیں، کوکن خاندان بھی حنفی المسلک ہے، گو یہ خاندان عرصہ سے مدراس میں آباد ہے لیکن اس کی مادری زبان اردو ہے اور نصف صدی قبل اس کی علمی زبان فارسی تھی۔

کوکن مرحوم نے جامعہ دارالسلام عمرآباد میں تعلیم حاصل کی، بعد میں انہوں نے گورنمنٹ مسلم کالج مدراس سے افضل العلماء اور منشی فاضل کی سند حاصل کی، دارالسلام عمرآباد کے مقاصد میں یہ بات بھی تھی کہ جامعہ کے طلبہ میں عربی اور فارسی کے ساتھ اردو کا اعلیٰ ذوق اور تصنیف و تالیف کا سلیقہ و ملکہ پیدا ہو، اسی مقصد سے کوکن مرحوم کو مزید تربیت حاصل کرنے کے لیے دارالمصنفین بھیجا گیا، یہاں وہ ۳۵ء سے ۴۰ء تک مولانا سید سلیمان ندویؒ کی نگرانی میں بحیثیت رفیق علمی کاموں مشغول رہے، اس عرصہ میں معارف میں ان کے کئی اہم مضامین مثلاً حافظ ابن القیم، امام ذہبی، نویری کی نہایۃ الارب، مسلمانوں کے مستعمل سنہ وغیرہ شائع ہوئے، یہاں کے قیام میں ان کا بڑا کارنامہ یہ بھی تھا کہ آہستہ آہستہ انہوں نے قرآن مجید کو حفظ کرنا شروع کیا اور دو تین برسوں میں مکمل حافظ بن کر دارالمصنفین کی مسجد میں محراب بھی سنائی، سید صاحبؒ نے خوش ہوکر معارف کے شذرات میں خاص طور پر اس کا ذکر کیا، انہوں نے ان کے ذوق و مناسبت طبع کے پیش نظر ان کے لیے سوانح ابن تیمیہؒ کا موضوع تجویز کیا، امام ابن تیمیہؒ کی حقیقی عظمت و منزلت سے اردو داں طبقہ کو سب سے پہلے روشناس کرانے والے علامہ شبلیؒ تھے، انہوں نے ۱۹۰۸ء کے الندوہ میں امام ابن تیمیہؒ کو سب سے بڑا مجدد اور اصل رفارمر ثابت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ مجددیت کی اصل خصوصیتیں جس قدر امام ابن تیمیہؒ کی ذات میں پائی جاتی ہیں اس کی نظیر بہت کم ملتی ہے، سید صاحبؒ کی خواہش کے مطابق کوکن مرحوم نے دو سال میں امام ابن تیمیہ کے سوانح، خدمات و تالیفات پر خاصا مواد فراہم کرلیا تھا مگر اسی عرصہ میں وہ جدید تعلیم حاصل کرنے کے لیے اپنے وطن مدراس واپس تشریف لے گئے تاہم وہ اپنے موضوع سے کبھی غافل نہیں رہے اور برابر نئے معلومات جمع کرتے رہے سید صاحب انہیں کتاب کی اشاعت کے لیے بار بار توجہ بھی دلاتے رہے، بالآخر یہ کتاب ۵۹ء میں طبع ہوئی، ۶۷۲ صفحات کی یہ ضخیم کتاب امام ابن تیمیہ کے سوانح کا بالاستیعاب احاطہ ہے اور اپنے موضوع پر اب تک نہایت جامع و مکمل ہے۔

انگریزی تعلیم کا شوق دامن گیر ہوا تو انہوں نے مدراس یونیورسٹی سے ایم۔اے کیا، اس کا شعبہ عربی و فارسی ہمیشہ ممتاز اور اپنے لایق اساتذہ کی وجہ سے نیک نام رہا ہے، ایک زمانہ میں مولوی محمد حسین صدیقی محوی لکھنوی وغیرہ اس سے وابستہ رہے ہیں، یونیورسٹی سے کوکن مرحوم کا طالب علمانہ رشتہ ختم ہوا تو جلد ہی تدریسی ربط قائم ہوگیا، اس ماحول میں ان کی علمی صلاحیتوں کو مزید جلا ملی۔ انہوں نے جنوبی ہند اور خاص طور پر مدارس و کرناٹک کے کتب خانوں میں موجود اہم قدیم مخطوطات کی ترتیب و تدوین کو زیادہ لائق توجہ سمجھا، چنانچہ ۵۴ء میں انہوں نے میر محمد اسماعیل خاں ابجدی ملک الشعرائے دربار والا جاہی کی کلیات ابجدی کو بڑے اہتمام اور فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ شایع کیا، ۶۶ء میں ابجدی کی فارسی مثنوی ہفت جوہر بھی شائع کی، بعد میں مولوی غلام عبدالقادر ناظر مدراسی کی فارسی تصنیف بہار اعظم جاہی کو فارسی اور انگریزی مقدمہ و حواشی کے ساتھ شایع کیا، فن تصوف میں سید شاہ عبدالقادر مہرباں فخری مدراسی کی ایک ضخیم اور اہم غیر مطبوعہ عربی تالیف **اصل الاصول فی بیان مطابقة الكشف بالمعقول والمنقول** کو بڑی محنت سے حواشی و تعلیقات سے مزین کر کے شایع کیا، اس کے علاوہ ملا جلال الدین دوانی کی **شواكل الحورنی شرح هيكل النور** اور باقر آغا کی مقامات کو بھی فاضلانہ مقدموں اور حواشی کے ساتھ طبع کرایا، عربی میں انہوں نے چند درسی کتابیں مثلاً العرب وادبہم، القرآۃ العربیہ وغیرہ تیار کیں، امیر خسروؒ پر بھی ایک کتابچہ لکھا ۷۵ء میں وہ حکومت ہند کے وظیفہ پر ایک سال کے لیے قاہرہ یونیورسٹی گئے، وہاں ڈاکٹر طہٰ حسین، ڈاکٹر سہیر قلماوی اور ڈاکٹر شوقی ضیف سے براہ راست استفادہ کے نتیجہ میں ان کو جدید عربی ادب کے تغیرات اور رجحانات سے واقفیت ہوئی، بعد میں کالی کٹ یونیورسٹی میں انہوں نے اسی موضوع پر خطبات دیے جن کی تین جلدیں **اعلام النثر والشعر فی العصر الحدیث** کے نام سے شایع ہوچکی ہیں، پہلی جلد میں محمد علی، شیخ رفاعۃ رافع طہطاوی سے امیر شکیب ارسلان تک ڈیڑھ سو برس کے ۳۳ نامور ادباء و شعراء کا ذکر ہے، دوسری جلد میں ۵۲ مہجرین ادباء و شعراء اور تیسری جلد میں احمد لطفی السید سے ڈاکٹر شوقی ضیف تک ۴۶ ادیبوں کے حالات ہیں۔ جدید عربی ادب کے مطالعہ کے لیے یہ نہایت مفید کتاب ہے، اردو میں انہوں نے نواب غلام اعزالدین خاں بہادر مستقیم جنگ کی مثنوی نوبہار عشق کو مرتب کیا، ان کی شاہکار تصنیف تو امام ابن تیمیہ ہے لیکن خانوادہ قاضی بدرالدولہ بھی ان کی نہایت عمدہ تالیف ہے، یہ کتاب امام العلماء قاضی بدرالدولہ مرحوم اور ان کے خاندان کے بعض باکمال

اہل علم وقلم کے تذکرہ پر مشتمل ہے، لیکن درحقیقت یہ جنوبی ہند میں عربی، فارسی اور اردو کے علوم ومعارف کی ایک مکمل اور جامع تاریخ ہے، انگریزی میں ان کی ایک وقیع کتاب Arabic and Persian in Carnatic ہے، اصلاً یہ ایم لٹ کا مقالہ ہے جسے انہوں نے ۶۵ء میں تیار کیا تھا۔

وہ ترجمہ کے فن پر بھی قدرت رکھتے تھے، چنانچہ ڈاکٹر الیکسس کارل کی مین دی ان نون کا ترجمہ نامعلوم انسان اور مورلینڈ اور چٹرجی کی اے شارٹ ہسٹری آف انڈیا کا ترجمہ مختصر تاریخ ہند کے نام سے شایع کیا۔

ان کی زندگی کا بیشتر حصہ علم وحکمت کے جواہر ریزوں کو خاموشی سے چننے سمیٹنے اور لڑیوں میں پرونے میں گزرا، تاہم کبھی کبھی وہ اپنے گوشہ عافیت سے باہر بھی نکلتے تھے، مصر وشام، لبنان و ایران اور سرزمین حجاز کی سیاحت و زیارت بھی کی، وہ دارالمصنفین اور ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے ممبر تھے لیکن صلاح ومشورہ کا ربط زیادہ تر خطوط کے ذریعہ رہا، کئی برس پہلے وہ اپنی اہلیہ محترمہ کے ساتھ ایک جلسہ میں شرکت کے لیے تشریف لائے تو اپنی شرافت، نیکی اور فروتنی کا نقش ہر دل پر ثبت کرگئے، شہر میں اپنے بعض پرانے احباب کے گھر بھی گئے، آئندہ کے لیے آنے کا وعدہ کرگئے مگر دو برس پہلے ایک حادثہ میں وہ صاحب فراش ہوگئے، اسی زمانہ میں اتفاقاً مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب مدراس پہنچے تو ان کی عیادت کے لیے بھی گئے مرحوم بڑے لطف وشفقت سے پیش آئے اور علالت ومعذوری کے باوجود بڑا پرتکلف کھانا کھلایا، اب یہ خبر سن کر نہایت ملال ہوا کہ وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جاملے، حیات دنیوی کی نعمت و امانت کو انہوں نے بڑی ایمانداری سے استعمال کیا اور با مقصد اور کامیاب زندگی بسر کی، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو آخرت کی اصل اور ابدی زندگی میں بھی انعام واکرام سے نوازے اور ان کی اہلیہ محترمہ اور تمام متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ دارالمصنفین کے لیے بھی ان کی موت ایک سانحہ ہے۔ (''ع۔ص''، نومبر ۱۹۹۰ء)

ابواللیث، مولانا

آہ! مولانا ابواللیث صاحب

قارئین کو اخباروں سے جماعت اسلامی ہند کے سابق امیر مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی کی المناک وفات کی خبر مل چکی ہوگی، موت سے کسی کو مفر نہیں لیکن مسلمانوں میں پہلے ہی سے قحط الرجال ہے، بے غرض، بے ریا اور اخلاص سے کام کرنے والوں کا فقدان ہے، وہ بڑے نازک اور پُرآشوب دور سے گذر رہے ہیں، ان کی مشکلات اور دشواریاں سوا ہوتی جارہی ہیں، ان کے مسائل کی پیچیدگی اور الجھاؤ میں برابر اضافہ ہورہا ہے، اور قومی وملی زندگی کے ہر شعبہ میں نہ پر ہونے والا خلا بڑھتا جارہا ہے، ان حالات میں صف اول کے ایک صائب الرائے، تجربہ کار، معتدل مزاج، پرخلوص اور دردمند رہنما کا اٹھ جانا کس قدر حسرتناک ہے، اس کا جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے، جماعت کے باہر کے لوگ بھی ان کی فہم وفراست، شرافت وسلامت روی، دوراندیشی اور معاملہ فہمی کے پوری طرح معترف تھے۔

امارت کے منصب سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ اپنے گاؤں چاند پٹی (اعظم گڑھ) میں رہنے لگے تھے، یہیں یکم دسمبر کو فجر کی نماز جماعت سے ادا کرنے کے بعد حسب معمول ٹہلنے نکلے، تھوڑی دور جانے کے بعد تکلیف اور کمزوری محسوس کی اس لیے گھر لوٹ آئے، مقامی ڈاکٹروں کے علاج سے آرام نہ ہوا تو اسی روز شب میں اعظم گڑھ لائے گئے، دو رات اپنے عزیز ڈاکٹر فرقان احمد کے گھر پر گذار کر ۳؍دسمبر کو ان کے نرسنگ ہوم میں داخل ہوئے، میں صبح وشام دیکھنے جاتا، صرف ایک روز کچھ بات چیت ہوئی، بڑا شدید قلبی درد تھا، بس یہی کہتے ''اے اللہ رحم فرما'' آخر ۵؍دسمبر کو ۱۰ بجے دن اللہ نے ان پر رحم کیا اور اپنے یہاں بلا لیا، اسی دن ۴:۳۰ بجے شام ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں پیوند خاک ہوگئے، مِنھَا خَلَقنکم وفیھَا نعید کم ومنھا نخرجکم تارۃً اخریٰ۔[الطّور: ۵۵]

تعلیم کی تکمیل ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہوئی لیکن اس سے پہلے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں رہے، جس سے ان کا تعلق ہمیشہ گہرا رہا، ۱۹۳۳ء میں فراغت کے بعد وہ ندوہ ہی میں تدریس کی خدمت انجام دینے لگے، اس تابناک دور میں شیخ تقی الدین ہلالی مراکشی کی خدمات بھی ندوہ کو حاصل ہوگئی تھیں جن سے استفادہ کرنے والوں میں یہ بھی پیش پیش رہے، شیخ کے فیض سے عربی بولنے اور لکھنے کی جو اچھی مشق ہوگئی تھی وہ آخر تک باقی رہی، اسلام اور مستشرقین پر دارالمصنفین کے بین الاقوامی سیمینار کے لیے انہوں نے عربی زبان ہی میں اپنا مقالہ لکھا تھا، اسی زمانہ میں ندوہ سے مولانا سید سلیمان ندوی اور ہلالی صاحب نے ایک عربی رسالہ ''الضیاء'' کے اجراء کا فیصلہ کیا، مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم تو ایڈیٹر ہی تھے، دوسرے گنے چنے مضمون نگاروں میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا محمد ناظم ندوی کے علاوہ ان کا نام بھی تھا، اس کے لیے انہوں نے متعدد اچھے اور مفید مضامین بھی لکھے اور حضرت سید صاحبؒ کے مضمون ''ہندوستان میں علم حدیث'' کا عربی ترجمہ بھی کیا۔

۳۵ء میں وہ بجنور تشریف لے گئے اور مشہور قوم پرور اخبار مدینہ بجنور کے شریک ادارت ہوئے، یہیں سے ان کی ادارت میں ایک علمی و دینی ماہنامہ ''فاران'' نکلا، ۳۶ء میں مولانا شبلیؒ اور مولانا حمید الدینؒ فراہی کے خلاف غوغائے تکفیر بپا ہوا، اور ایک صاحب کا رسالہ ''علامہ سید سلیمان ندویؒ کی قرآنی غلطیاں'' شائع ہوا تو انہوں نے اس میں ان کے مدلل جواب لکھے، ۳۶ء میں مولانا امین احسن اصلاحی کی ادارت

میں ''الاصلاح'' نکلا جس کے خاص مضمون نگاروں میں مولانا ابواللیث بھی تھے، اس میں ان کا ایک اہم مضمون ''قرآن مجید میں تکرار کی نوعیت اور قصہ آدم'' کئی نمبروں میں شائع ہوا، بجنور سے وہ مدرسۃ الاصلاح آگئے اور ''الاصلاح'' بند ہونے پر اس سے ہلکا پھلکا رسالہ ''اصلاح'' ان کی ادارت میں شائع ہوا مگر وہ شعلہ مستعجل نکلا۔

ندوۃ العلماء ہی میں ان پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی متکلمانہ تحریروں کا اثر ہونے لگا تھا، خود ان کے مضامین بھی ترجمان القرآن میں چھپتے تھے، جماعت اسلامی کے قیام کے بعد اس میں شامل ہوئے اور اب انتقال کے بعد ہی اس سے علیحدہ ہوئے، اس راہ میں قید و بند اور ہر طرح کی صعوبتیں جھیلیں، ملک کی تقسیم کے بعد ۴۸ء میں ہندوستان کی جماعت کے امیر ہوئے درمیان کے چند برسوں کو چھوڑ کر قیادت مسلسل ان ہی کے پاس رہی، جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ اتنے طویل عرصہ تک مسلمانوں کی کسی جماعت کا امیر بنے رہنا معجزہ ہی ہے، انہوں نے قومی کارزار میں جب قدم رکھا تھا تو کسی کو وہم و گمان بھی نہ رہا ہوگا کہ وہ اس خوش اسلوبی کے ساتھ جماعت کو انتشار سے بچا کر اسے وسعت و ترقی دیں گے لیکن ان کے تدبر اور انتظامی قابلیت کے جوہر اسی وقت کھلے، دراصل اس کے لیے جس پختہ سیرت، اعتدالِ طبع اور اولوالعزمی کی ضرورت ہے وہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھی، امارت کے زمانہ میں ملک و ملت کے مسائل پر ان کے مفید خیالات ''زندگی'' رام پور میں شایع ہوئے اور بعض کتابیں بھی لکھیں۔

ان کی وسعتِ اخلاق نے ان کو تمام حلقوں مس مقبول بنا دیا تھا، جماعت کے مخالفین بھی ان کا لحاظ و احترام کرتے تھے، وہ مہر و مروت کے پتلے، ہر شخص کے ہمدرد اور مرنج و مرنجان شخص تھے، اپنے نیاز مندوں اور خوردوں سے بھی خوش اخلاقی اور بشاشت سے پیش آتے اور نہایت بے تکلفی سے باتیں کرتے تھے، ان میں نخوت و رعونت کا کوئی شائبہ بھی نہ تھا، سادگی، اخلاص، دردمندی، خاکساری اور فروتنی ان کی سیرت کی ممتاز خصوصیتیں تھیں جو ہر شخص کو متاثر کر لیتی تھیں، ان کا رتبہ بڑا تھا مگر انہوں نے کبھی نہ اپنے کو بڑا سمجھا اور نہ یہ ظاہر کیا کہ وہ مسلمانوں کی بہت منظم اور بااثر جماعت کے امیر ہیں، دوسروں کی تحقیر اور در پردہ اپنی بڑائی کا اظہار ان میں نہ تھا، نام و نمود سے بڑی نفرت تھی، دنیاوی جاہ و مال کی کبھی ہوس نہ کی، ان کی ساری عزت و شہرت اور نیک نامی ان کی ذاتی لیاقت، محنت اور خلوص کے ساتھ کام کرنے کی وجہ سے تھی، دراصل یہی بڑائی پائیدار ہوتی ہے۔

دارالمصنفین سے ان کو ہمیشہ بڑا تعلق رہا، وہ حضرت سید صاحبؒ کے عزیز شاگرد تھے، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن سے ان کے بڑے مخلصانہ روابط تھے، مجھ پر غیر معمولی شفقت فرماتے تھے، وہ جب اعظم گڑھ آتے تو دارالمصنفین ضرور آتے، اللہ تعالیٰ ان کے مراتب و درجات بلند کرے، آمین۔

(''ض''، دسمبر ۱۹۹۰ء)

حسین، قاضی سجاد، مولانا

مولانا قاضی سجاد حسین

(پروفیسر مختار الدین)

علمی و دینی حلقوں میں یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ اواخر دسمبر ۱۹۹۰ء میں قاضی سجاد حسین دہلی میں رحلت فرما گئے۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے اور انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔

قاضی صاحب اپنے وطن کرت پور ضلع بجنور میں ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ متوسطات کی تعلیم حاصل کر کے وہ دارالعلوم دیوبند گئے جہاں ۱۹۲۸ء میں ۱۸ سال کی عمر میں انھوں نے علوم اسلامی کی تکمیل کی۔ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان بھی دیا اور اعزاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔ فراغت کے بعد ان کا تعلق مدرسہ عالیہ عربیہ فتحپوری دہلی سے ہوا جہاں وہ ۴۵ سال تک تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ انھوں نے تقریباً تیس ۳۰ سال تک اسی مدرسے میں شیخ الحدیث کے فرائض انجام دیے۔ وہ عرصے تک اس مدرسے کے صدر مدرس رہے ان کے تلامذہ کی تعداد ہزاروں تک پہنچے گی۔ ۱۹۶۷ء میں حکومت ہند نے ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں انھیں پریسیڈنٹ ایوارڈ تفویض کیا۔

تالیف و تصنیف و ترجمے کا شوق انھیں ابتدا ہی سے تھا۔ ان کی پہلی تصنیف جو راقم الحروف کی نظر سے گزری وہ ''التوشیحات علی السبع المعلقات'' تھی۔ سبعہ معلقہ کی اردو میں ان کی یہ شرح عرصہ ہوا شایع ہوئی تھی، اب عام طور پر نہیں ملتی۔ قاضی صاحب کی دوسری تصانیف حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ترجمہ گلستان سعدی — سب رنگ کتاب گھر، دہلی، ۱۹۵۳ء

۲۔ ترجمہ بوستان سعدی — سب رنگ کتاب گھر، دہلی، ۱۹۶۱ء

۳۔ حاشیہ مالا بدمنہ مصنفہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی (متوفی ۱۲۲۵ھ) اس کے آخر میں کلمات الکفر منقول از فتاوائے برہانی، وصیت نامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی، احکام اضحیہ و وجوب آں اور رسالۂ احکام عقیقہ از مولانا عبدالغفار لکھنوی بھی بطور ضائم شامل ہیں۔ سب رنگ کتاب گھر، دہلی ۱۹۵۶ء

۴۔ ترجمہ دیوان حافظ — سب رنگ کتاب گھر، دہلی، ۱۹۶۳ء

۵۔ ترجمہ مثنوی مولانا روم (دفتر اول تا ششم) سب رنگ گھر، دہلی ۱۹۷۴ء-۱۹۷۸ء

ان کے علاوہ قاضی صاحب نے دو فارسی و عربی متون مرتب کر کے شایع کیے ہیں:

۶۔ سراج الہدایہ (ملفوظات مخدوم جہانیاں جہاں گشت ۷۰۷ھ، ۷۸۵ھ) یہ پروفیسر سید نورالحسن کی توجہ سے انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ، نئی دہلی سے ۱۹۸۳ء میں شایع ہوئی، کتاب کا تعارف پروفیسر سید نورالحسن کے قلم سے ہے۔

۷۔ قاضی صاحب مرحوم ومغفور کی زندگی کے آخری پانچ سات سال، آٹھویں صدی ہجری کے ممتاز حنفی عالم وفقیہ شیخ عالم بن العلاء، الانصاری الاندرپنی الدھلوی (متوفی ۷۸۶ھ/۱۳۸۴ء) کی ضخیم کتاب الفتاویٰ التاتارخانیہ کی تصحیح و اشاعت میں گزرے۔ عہد فیروز شاہ (۷۵۲ھ/۷۹۰ھ) کے اس مصنف نے تقریباً تیس ۳۰ فقہی مصادر سے (جن میں متعدد اب مفقود ہیں) یہ ضخیم کتاب مرتب کی تھی۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ جب اس کتاب کی ترتیب کی خبر فیروز شاہ تغلق (متوفی ۷۹۶ھ) کو ملی تو اس نے مصنف سے خواہش ظاہر کی کہ وہ یہ کتاب اس کے نام پر فتاوائے فیروز شاہی رکھیں۔ مصنف نے خدا ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے بادشاہ وقت کی خوہش کا احترام نہ کرتے ہوئے اس کے ایک سردار تاتارخاں کے نام پر اپنی کتاب کا نام رکھا۔ ہرچند نزھة الخواطر میں اس کا نام ''زادالسفر'' یا ''زادالمسافرین'' لکھا ہے (ممکن ہے پہلے مصنف کے ذہن میں یہی نام ہو) لیکن یہ کتاب ''الفتاویٰ التاتارخانیہ'' ہی کے نام سے مشہور ہوئی۔

ڈاکٹر زبید احمد مرحوم نے اس کے نسخہ قاہرہ، پیشاور، رام پور، حیدرآباد، بانکی پور کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ہے۔ قاضی صاحب کے پیش نظر چار نسخے رہے جن میں دو تو یہی آصفیہ حیدرآباد اور کتب خانہ خدا بخش کے نسخے ہیں لیکن انھیں دو نئے نسخے بھی حاصل ہوگئے۔ ایک مفتی عبدالشکور کے کتب خانہ خاص میں اور دوسرا متحف سالار جنگ حیدرآباد میں۔ آخر الذکر دونوں نسخوں کا اکتشاف بعد کو ہوا اس لیے ڈاکٹر زبید احمد کی کتاب ان کے ذکر سے خالی ہے۔ قاہرہ کا نسخہ راقم کی نظر سے گذرا ہے، بہت اچھا نسخہ ہے، میں نے قاضی صاحب کو مشورہ دیا تھا کہ اس کا بھی عکس منگوالیں لیکن اس کی طرف توجہ کا انھیں موقع نہ مل سکا۔ بہرحال نسخہ سالار جنگ مکمل نسخہ ہے جو ۹ جلدوں میں تمام ہوا ہے اور بہت اچھی حالت میں ہے، اس سے مرتب کو بہت مدد ملی ہوگی۔

فتاویٰ کی ضخامت کے پیش نظر نویں صدی ہجری میں اس کی تلخیص کا کام ہوا، مولانا سید مناظر احسن گیلانی مرحوم نے ''ہندوستانی مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت'' میں لکھا ہے کہ علمائے حلب میں ایک عالم ''ابراہیم بن محمد'' نے اس کی تلخیص الفوائد المنتخبہ، کے نام سے کی ہے۔ وہ بظاہر مصنف کی تشخیص نہ کرسکے کہ یہ کون بزرگ ہیں۔ ابراہیم بن محمد سے تو کوئی کچھ نہیں سمجھ سکتا۔ یہ اس صدی کے مشہور عالم و مصنف اور محدث سبطا ابن العجمی (متوفی ۸۴۱ھ) ہیں جن کا نام برہان الدین ابواسحاق ابراہیم بن محمد بن خلیل سبط ابن العجمی تھا۔ یہ صاحب تصانیف کثیرہ ہیں اور ان کی چند کتابیں شایع بھی ہوچکی ہیں۔ متعلقات حدیث پر ان کے تین رسالوں کے نسخے جو مصنف کی نظر سے گزر چکے ہیں اور جن پر ان کی ترمیمات و اضافات ہیں۔ راقم اشاعت کے لیے مرتب کررہا ہے۔

خدا جزائے خیر دے پروفیسر سید نورالحسن کو جو ہندوستان کے عہد وسطی کی تاریخ کے ماہروں میں ہیں اور جنھیں فیروز شاہ کے عہد سے خاص دلچسپی ہے، جب انھوں نے وزارتِ تعلیمات کا قلم دان سنھبالا تو ''الفتاویٰ التاتارخانیہ'' کی اہمیت کے پیش نظر اس کی ترتیب وتصحیح کی طرف قاضی سجاد حسین کو متوجہ کیا اور اس کی تصحیح وترتیب و اشاعت کے لیے لاکھوں روپے حکومت ہند سے منظور کرائے۔

پروفیسر سید نورالحسن نے جب وہ علی گڑھ میں صدر شعبۂ تاریخ تھے ایک بار مجھ سے فرمایا کہ فقہی اہمیت تو اس کتاب کی ظاہر ہے لیکن اس کی تاریخی و معاشرتی اہمیت بھی ہے، اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ عہد فیروز شاہ میں کس قسم کے مسائل سے لوگوں کا سامنا تھا اور کس قسم کے استفسارات، عوام وخواص مفتیانِ دین سے کیا کرتے تھے، فتاوائے تاتارخانیہ سامنے آجائے تو ان مسائل پر روشنی پڑسکتی ہے۔

''الفتاویٰ التاتارخانیہ'' کی طباعت کا اہتمام مطبع دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد میں ہوا، اس کی جلد اول و دوم ۱۹۸۴ء میں تیسری جلد ۱۹۸۶ء میں اور چوتھی ۱۹۸۷ء میں شایع ہوئی۔ ممکن ہے ایک آدھ جلد اور چھپی ہو لیکن وہ میری نظر سے نہیں گزری۔ خدا کرے قاضی صاحب مغفور نے بقیہ مجلدات کی ترتیب وتصحیح کا کام مکمل کرلیا ہو اور کسی دن پوری کتاب زیور طبع سے آراستہ ہوجائے۔

قاضی سجاد حسین کی وفات دہلی میں ۵/ جمادی الآخر ۱۴۱۱ھ مطابق ۲۴/ دسمبر ۱۹۹۰ء کو ہوئی۔ دوسرے دن اینگلو عربک اسکول میں نماز جنازہ ہوئی اور حوض رانی دہلی میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ رحمه الله رحمة واسعة۔ (فروری ۱۹۹۱ء)

ضروری تصحیح: معارف (فروری) میں قاضی سجاد حسین کی وفات پر ایک نوٹ شایع ہوا ہے، اس میں مرحوم کی سات تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے، اس عرصے میں ان کی ایک کتاب اخلاق محسنی (مترجم) میرے کتاب خانے میں نکل آئی جسے انھوں نے دہلی میں ۳۰/ مئی کو مجھے اپنی دوسری تصانیف کے ساتھ مرحمت فرمایا تھا، یہ ۳۰۳ صفحوں کی کتاب ہے فارسی کی ہر سطر کے نیچے اردو ترجمہ درج ہے، سال طبع درج نہیں لیکن قمر سنبھلوی کے قطعۂ تاریخ سے ۱۲۸۴ھ کے اعداد مستخرج ہوتے ہیں اور اس کتاب پر جو شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم، رفیق دارالمصنفین اعظم گڑھ کا پیش لفظ ہے وہ ۲۵/ اگست کا لکھا ہوا ہے۔ سال طباعت ۶۴ء سمجھنا چاہئے۔

دوسری کتاب پندنامہ (محشیٰ) ہے، یہ پہلی کتاب سے کچھ پہلے چھپی اس لیے کہ

اخلاق محسنی کے آخر میں اس کا اشتہار درج ہے۔ دونوں کتابیں قاضی صاحب مرحوم ہی کے ادارے سب رنگ کتاب گھر، گلی قاسم جان دہلی سے شائع ہوئی ہیں۔ اس طرح قاضی سجاد حسین مرحوم کی تصانیف کی تعداد ۹ تک پہنچتی ہے۔ اس لیے کہ اخلاق محسنی کے آخر میں اس کا اشتہار درج ہے، دونوں کتابیں قاضی صاحب مرحوم ہی کے ادارے سب رنگ کتاب گھر، گلی قاسم جان دہلی سے شائع ہوئی ہیں۔ اس طرح قاضی سجاد حسین مرحوم کی تصانیف کی تعداد ۹ تک پہنچتی ہے۔

(۲) معارف ص ۱۵۳۔ ابراہیم بن محمد نام کے دو مصنف حلب میں گزرے ہیں، ایک محمد بن ابراہیم تو یہی سبط بن العجمی (متوفی ۸۴۱ھ) ہیں، دوسرے ابراہیم بن محمد، متاخر العہد ہیں اور ملتقی الابحر اور غنیة المستملی کے مصنف جو بحیثیت عالم و مصنف مقدم الذکر کے مقابلے میں شہرت نہیں رکھتے۔ انھوں نے استانبول میں ۹۵۶ میں وفات پائی۔ فتاوی التاتارخانیہ کی تلخیص الفوائد المنتخبہ انہی بزرگ کی کی ہوئی ہے، برہان الدین ابراہیم بن محمد سبط ابن العجمی کی نہیں۔

(''مختار الدین احمد''، اپریل ۱۹۹۱ء)

امینی، محمد تقی، مولانا حافظ

مولانا حافظ محمد تقی امینی

ڈاک کا نظام اس قدر ابتر ہے کہ مہینوں سے دارالمصنفین میں اردو کا کوئی اخبار نہیں آرہا ہے، اس لیے ضروری اور اہم خبروں کا بھی علم نہیں ہوتا، پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے جن کے گرامی نامہ سے دارالمصنفین کے ایک مخلص کرم فرما مولانا حافظ محمد تقی امینی کی حسرتناک وفات کی اطلاع تاخیر سے ملی۔

مولانائے مرحوم مسلمانوں کے قدیم و جدید دونوں طبقوں میں مقبول اور ہر دلعزیز تھے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں انھوں نے بڑی نیک نامی اور عزت حاصل کی، وہ ایک عالم دین اور اسلامیات کے فاضل و محقق اور مصنف کی حیثیت سے پورے ملک میں مشہور تھے، دینی علوم میں بلند پائیگی کے ساتھ ساتھ وہ اخلاص، عمل، للّٰہیت، بےنفسی اور زہد و اتقا میں بھی ممتاز تھے، ان کی وفات سے علمی و دینی حلقوں میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پر ہونا مشکل ہے۔

۱۹۵۰ء میں میں عربی کا متبدی تھا اور اسی زمانے سے معارف کی ورق گردانی کرتا تھا، اس کے جن مضمون نگاروں کے نام لوح دل پر ثبت ہوگئے تھے ان میں مولانا کا نام بھی تھا کیونکہ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد برابر ان کے مضامین معارف میں شائع ہوتے رہتے تھے، سنہ تو یاد نہیں لیکن ان سے پہلی ملاقات دارالمصنفین میں اس وقت ہوئی جب وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے ناظم ہو چکے تھے اور گرمیوں میں مطالعہ و کتب بینی کے لیے اعظم گڑھ تشریف لائے تھے۔

وہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم سابق ناظم دارالمصنفین کے مہمان تھے جن کے ساتھ ہی میرا کھانا پینا بھی ہوتا تھا، شاہ صاحب نے مولانا کا پلنگ میرے کمرے میں لگوا دیا تھا اس طرح تقریباً ایک ماہ تک ہر وقت میرا ان کا ساتھ رہا اور مجھے ان سے فیض یاب ہونے اور ان کے مخلصانہ مشوروں سے فائدہ اٹھانے کا پورا موقع ملا۔ مولانا بڑے خوش طبع اور باغ و بہار شخص تھے، اپنی دلچسپ باتوں اور لطائف و ظرائف سے معمور گفتگو سے مجلس کو زعفران زار بنا دیتے تھے ان کی صحبت میں بہت جی لگتا اور یہ چند روز بڑے پرکیف اور نہایت خوش گوار گزرے۔

چہ مبارک سحرے بود و چہ فرخندہ شبے
آں شب قدر کہ تازہ براتم دادند

اس ملاقات کے بعد مولانا سے خلوص و محبت کا جو رشتہ قائم ہوا وہ اب ان کی وفات کے بعد ہی ختم ہوا، میں جب علی گڑھ جاتا تو ان سے ضرور ملاقات کرتا، وہ بہت خوش ہوتے اور میں بھی ان سے ملنے کو ملاقات مسیحا و خضر سے بہتر خیال کرتا، کسی جلسہ اور سیمینار میں ملتے تو برابر اپنے ساتھ رکھتے اور فرماتے:

ع '' غنیمت جان لو مل بیٹھنے کو ''

وہ خطوط کم لکھتے تھے مگر جب کبھی ان کو جواب طلب خط لکھا تو اس کا جواب فوراً دیا، ان کی کوئی کتاب چھپتی تو ضرور بھجواتے اور خط لکھ کر تبصرے کا تقاضا کرتے، فرماتے کہ اب دو ہی ایک رسالوں میں کتاب پڑھ کر تبصرہ ہوتا ہے، معارف کے بعد مجھے کسی کے تبصرے کا انتظار نہیں رہتا۔ میری کوئی تحریر پسند آجاتی تو خط لکھ کر حوصلہ افزائی فرماتے، معارف کی ادارت کا بار گراں میرے دوش ناتواں پر آیا تو ایک شمارے ملاحظہ فرمانے کے بعد جو ہمت افزا خط لکھا اس سے مجھے بڑی تقویت ملی۔ حال ہی میں میرا ایک تبصرہ ان کی نظر سے گزرا تو بہت پسند کیا اور فوراً مبارک باد کا خط لکھا جس میں یہ اصرار بھی تھا کہ ان کا خط معارف میں شائع کر دیا جائے۔ جب ملاقات ہوئی تو پھر داد دی اور خط شائع نہ کرنے کے میرے فیصلے سے اتفاق فرمایا۔

مولانا کی ولادت صبیحہ (ضلع بارہ بنکی) میں ۱۹۲۶ء میں ہوئی، یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرسہ الٰہیات کان پور میں داخلہ لیا، لیکن تعلیم کی تکمیل مولانا مفتی محمد کفایت اللہ شاہجہاں پوری کے سایہ عاطفت میں مدرسہ امینیہ دہلی میں ہوئی۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا اور وقتاً فوقتاً مختلف مدارس سے وابستہ رہے، دارالعلوم معینیہ اجمیر کے صدر مدرس بھی رہے، اسی زمانہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء کی دعوت پر موجودہ دور کے اہم پیچیدہ اور نازک مسائل کا متفقہ حل تلاش کر کے مسلمانوں کی مناسب رہنمائی کے لیے

مجلس تحقیقات شرعیہ کا قیام عمل میں آیا، اس مجلس کی ذمہ داری مولانا محمد تقی امینی کو تفویض کی گئی، یہ کام ان کے ذوق اور دلچسپی کا تھا جس کو انھوں نے خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ میں چند برس قیام کرنے کے بعد وہ ۱۹۶۴ء میں علی گڑھ آئے اور مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات میں لکچرر اور ناظم سنی دینیات مقرر ہوئے، اور ترقی کر کے صدر شعبہ سنی دینیات اور ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی ہوئے اور ۸۹ء میں ریٹائر ہوئے۔ علی گڑھ کو انھوں نے اپنا وطن ثانی بنالیا تھا۔ وفات کے بعد اسی کی خاک کا پیوند ہوئے اور یونیورسٹی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

مولانا کا اصلی کارنامہ ان کی تصنیفات ہیں، ان میں تصنیف و تالیف کا ذوق فطری تھا، علی گڑھ کی علم پرور فضا میں ان کا یہ جوہر زیادہ کھلا مختلف موضوعات پر انھوں نے ایک درجن سے زیادہ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جن کے نام یہ ہیں، (۱) کائنات میں انسان کا مقام، (۲) عروج و زوال کا الٰہی نظام، (۳) لامذہبی دور کا تاریخی پس منظر، (۴) اسلام کا زرعی نظام، (۵) فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر، (۶) مسئلہ اجتہاد پر تحقیقی نظر، (۷) احکام شرعیہ میں حالات و زمانہ کی رعایت، (۸) تہذیب کی تشکیل جدید، (۹) انشورنس کی شرعی حیثیت، (۱۰) امت مسلمہ کی رہنمائی حضرت عمرؓ کی تعلیمات کی روشنی میں، (۱۱) مقالات امینی، (۱۲) حدیث کا درایتی معیار، (۱۳) خطبات عیدین، (۱۴) مراسلات، (۱۵) حکمت القرآن، (۱۶) ہدایت القرآن (نامکمل تفسیر قرآن)۔

ان کتابوں کی اہمیت کی وجہ سے عربی و انگریزی میں بعض کے ترجمے ہوئے جن لوگوں نے ان کا بغور مطالعہ کیا ہے وہ مولانا کی علمی و دینی پختگی اور وسعت نظر کی شہادت دیں گے۔

اس زمانہ میں احکام و مسائل اور فقہی جزئیات پر نظر رکھنے والے اشخاص کی کمی نہیں ہے لیکن مسائل پر پھیل کر سوچنے اور غور کرنے والے مفقود ہیں مولانا کی تصنیفات میں جن مسائل کا ذکر ہے فقہ کی قدیم کتابیں ان سے خالی ہیں اور موجودہ لوگوں نے بھی ان کی جانب کم توجہ کی ہے اور جنھوں نے کی ہے ان کے اور مولانا کے انداز فکر میں نمایاں فرق ہے، ان کا تعلق اس صاحب نظر طبقہ سے تھا جو اسلامی فقہ کے جمود و تعطل کو ختم کر کے اجتہاد کا بند دروازہ کھولنا چاہتا تھا، اس سلسلہ میں ان کا رسا ذہن اور دقیقہ بیں نظر جہاں اور جن گوشوں تک پہنچی ہے وہاں تک رائے عام سے مرعوب اور شذوذ و تفرد کے اندیشوں میں گرفتار لوگ نہیں پہنچ سکے، مولانا کو زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور شرعی احکام کی نزاکتوں دونوں کا پورا احساس ہے، اس لیے انھوں نے ٹھیٹ مذہبی حلقوں کو اپنا انداز فکر و نظر بدلنے اور اجتہاد کا بند دروازہ کھولنے کی دعوت دی ہے اور نئی جلوہ گاہوں کے مدہوشوں کو ہوش و حواس درست کرنے اور اجتہاد کے نشیب و فراز سے واقف ہونے کا مشورہ دیا ہے آج چاہے ان کی رائے کو شک و شبہہ کی نظر سے دیکھا جائے لیکن جلد ہی اس کا وزن محسوس کیا جائے گا، انھوں نے بہت پہلے شورائی اجتہاد کو اس دور کے لیے مناسب بتایا تھا اب اس کی اہمیت عام طور پر تسلیم کی جانے لگی ہے، غور وفکر، اجتہاد و اختراع اور تفریع و استنباط اس امت کا خاص وصف و امتیاز تھا مسلمانوں کے اس تاریخی کردار اور کارنامہ کو مولانا نے اپنی تصنیفات میں تفصیل سے قلمبند کیا ہے۔

جس طرح مولانا امینی کو اسلامی فقہ و قانون کی تشکیل جدید اور از سر نو تدوین کی ضرورت کا شدید احساس تھا اسی طرح ان کو احادیث کی از سر نو تدوین و تبویب کی ضرورت کا بھی احساس تھا، وہ اس پر غور وفکر تو برابر کرتے رہے مگر فقہ اسلامی کی طرح اس کے متعلق اپنے خیالات کو تو پیش کرنے کا انہیں موقع نہیں ملا، یا وہ یہ سمجھتے تھے کہ ابھی لوگ ان کے ان خیالات کے متحمل نہیں ہوسکیں گے۔

جس طرح فقہ کی نئی تدوین و تشکیل کا مقصد قدیم فقہا کی خدمات اور کارناموں پر پانی پھیرنا نہیں ہے، اسی طرح حدیث کی نئی ترتیب و تدوین اور اس کے لیے نئے اصول روایت و درایت وضع کرنے کا مقصد بھی احادیث نبوی کا انکار اور قدیم محدثین کے کارناموں کو نظر انداز کرنا نہیں ہے مگر یہ عجیب بات ہے کہ قدما نے جس انداز پر کتب حدیث مرتب کی ہے اب اس سے سر مو انحراف کو وہ لوگ حدیث کی مخالفت سمجھتے ہیں جو ہر قسم کی تقلید کو ناروا خیال کرتے ہیں۔

مولانا تقی امینی نے حدیث کا روایتی معیار کے نام سے جو کتاب لکھی ہے اس میں یہ واضح کیا ہے کہ صحیح و غلط حدیثوں میں امتیاز کے لیے محدثین نے روایت کی طرح درایت کے بھی اصول وضع کیے تھے لیکن اصول روایت کے مقابلہ میں اصول درایت پر کم توجہ کی گئی خصوصاً اردو میں تو اس موضوع پر بہت کم کام ہوا ہے، مصنف نے درایت کا مفہوم اور قرآن مجید، احادیث نبویؐ اور اقوال صحابہ سے اس کی اہمیت اور ثبوت پیش کر کے اس بارے میں محدثین کی کوششوں کا جائزہ لیا ہے، فن روایت میں سند حدیث یعنی راویوں کے حالات کی چھان بین کی جاتی ہے، مولانا کے نزدیک یہ خارجی نقد حدیث ہے اور فن درایت میں روایت کے مضمون و متن پر نقد و جرح کر کے اس کی قوت وضعف کا فیصلہ کیا جاتا ہے، مولانا اسے داخلی نقد حدیث کہتے ہیں۔ ان دونوں میں ٹکراؤ کے وقت اولاً تو تطبیق کی کوشش کرنی چاہئے لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو داخلی (درایت) کو خارجی (روایت) پر ترجیح حاصل ہوگی۔

اس کتاب میں مولانا نے حدیث کی معرفت و درایت کے قدیم اصول وضوابط کو منضبط کر کے ان کی تشریح اس لیے کی ہے تاکہ درایت کے نئے قواعد و قوانین مرتب کرنے کی راہ ہموار ہو۔ اس کے شروع میں ذات نبوی ﷺ پر مختلف حیثیتوں سے جو بحث کی گئی ہے، وہ بڑی اہم ہے، اور اس کا مقصد نبوت و رسالت کی اہمیت اور نبی و

رسول ﷺ کی عظمت کو واضح کرنا ہے، مولانا کے نزدیک شعورِ نبوت کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اس کی وضاحت انھوں نے اپنی مختلف کتابوں میں کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ نبی کو من جانب اللہ علم و ادراک، فہم و بصیرت اور حکمت و نورانیت عطا ہوتی ہے اور امور دین سے متعلق رسول اکرم ﷺ کے تمام ارشادات وحی الٰہی سے مستنبط ہوتے ہیں، منصب نبوت، پیغمبرانہ خصوصیات اور نبی کے علم وفہم اور حکمت وشعور کی یہ مبسوط اور فاضلانہ تشریح اس لیے کی گئی ہے کہ نبوت کے سرچشمہ فیض سے جاری ہونے والی حدیثوں کی خصوصیت، عظمت اور نوعیت پوری طرح سامنے آجائے۔

جس طرح فقہ و اجتہاد میں مولانا کے بعض خیالات کو شذوذ وتفرد پر محمول کیا گیا اسی طرح حدیث کے درایتی معیار پر جب ان کی محققانہ کتاب کے بعض حصے معاف میں چھپے تو طرز کہن پر اڑنے والے بعض لوگوں کو ناگواری ہوئی۔ مولانا کے نزدیک ثقہ راویوں سے منقول متند کتب حدیث کی روایتیں بھی شان نبوت کے منافی ہونے کی صورت میں قابل رد ہوں گی، لیکن تاویل و توجیہہ کے گورکھ دھندے میں پڑنے والے لوگوں کو یہ بات عجیب معلوم ہوئی جو قبول روایت کا مسلمہ اصول ہے، ان حضرات کو نسخ کے بارے میں بھی مولانا کے اس خیال پر شرح صدر نہ ہوا ہوگا کہ اس کا تعلق قدیم کتب آسمانی سے ہے نہ کہ قرآن مجید سے، وہ قرآن مجید کے احکام میں ردوبدل کا تعلق ذات سے نہیں اوصاف سے بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے حضرت عمرؓ کے بعض فیصلوں کی نوعیت و حکمت لوگوں پر واضح نہیں ہوسکی اور انھوں نے اسے قرآن کے احکام میں ردوبدل پر محمول کردیا۔

مولانا تہذیب کی تشکیل جدید کے داعی و حامی تھے اور اس بارے میں بھی ان کے خیالات عام سطح سے بلند اور مختلف تھے، وہ جوہر انسانیت کے تربیتی پروگرام کے اس خاکہ کی وضاحت اپنی تحریروں میں کرتے ہیں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کے کلیات پر غور کر کے مرتب کیا تھا، انھوں نے عروج و زوال کے الٰہی نظام اور کائنات میں انسان کے مقام و مرتبہ کی تشریح بھی اسی لیے کی ہے۔ قرآن مجید کے خزانہ علم و حکمت کے لعل و گہر کا سراغ لگانے کی کوشش حکمت القرآن میں کی گئی ہے، یہی حکمت بشریت اور تہذیب انسانی کا اصلی تمغا ہے، دراصل مولانا دین اور حکمت دین سے واقفیت کے لیے ممتاز تھے اور وہ دین کی اصل حقیقت و روح اور اس کی حکمت و نورانیت کو سمجھانا چاہتے تھے لیکن وجدانی مسائل کی تشریح و وضاحت بہت نازک کام ہے اس لیے ان کی بعض چیزیں عام لوگوں کی فہم سے بالاتر ہوتی تھیں جن کی قدر اہل علم ہی کرسکتے تھے، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا عبدالباری ندوی وغیرہ مولانا کے بڑے قدرداں تھے۔

مولانا تقی امینی نے ''احتساب'' کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار بھی ادارۂ علم وعرفان علی گڑھ سے نکالا تھا، لیکن اس کی حیثیت عام اخباروں جیسی نہیں تھی بلکہ اس میں مولانا کے اہم اور دقیق خیالات پر مشتمل مضامین شائع ہوتے تھے، اسی میں مختلف استفسارات کے عالمانہ جواب بھی شائع ہوتے تھے جن کا ایک علیحدہ مجموعہ ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا تھا جس میں اور مفید باتوں کے علاوہ جماعت اسلامی ہند کے ایک سوالنامہ کا بڑا حقیقت پسندانہ جواب دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو قومی زندگی سے علیحدہ اور الگ تھلگ رکھنے کی پالیسی درست نہیں ہے۔

ابتداء میں مولانا کو مناظرہ سے بھی شغف تھا مگر جلد ہی وہ اس سے کنارہ کش ہوگئے البتہ وعظ و تقریران کا معمول بن گیا تھا، مسلم یونیورسٹی کی جامع مسجد میں جمعہ اور عیدین کے خطبے اہتمام اور پابندی سے دیتے تھے جو بہت مفید اور پرمغز ہوتے تھے، عیدین کے خطبوں کا ایک مجموعہ مکتبہ جامعہ دہلی نے ۱۹۸۳ء میں شائع کیا تھا، وہ پیشہ ور مقرر نہیں تھے لیکن کبھی کبھی جلسوں میں شرکت کے لیے سفر بھی کرتے تھے۔

فراخدلی، وسیع المشربی، مروت، شرافت، سادگی، اخلاص، دردمندی، اور عفو و درگزر ان کی سیرت و اخلاق کا نمایاں جوہر تھا، وہ بڑے مرنج و مرنجان شخص تھے، سب سے محبت، گرم جوشی اور بے تکلفی سے ملتے تھے اس کی وجہ سے ہر شخص ان کا گرویدہ ہوجاتا تھا، ان کی سادگی اور بے تکلفی کی وجہ سے سن و سال اور علم و مرتبہ میں کمتر لوگ بھی ان سے شوخ اور گستاخ ہوجاتے تھے، وہ چھوٹوں پر بڑی شفقت فرماتے، ان کی دل جوئی اور حوصلہ افزائی میں بخل سے کام نہ لیتے، اگر ان کی غلطیوں پر متنبہ کرنا ہوتا تو اس کے لیے حکیمانہ انداز اختیار کرتے، بات کرنے میں لاگ لپیٹ سے کام نہ لیتے، ہمیشہ صاف اور کھری باتیں کرتے تھے، ان میں بڑی جرأت اور خود اعتمادی تھی، حق بات کہنے میں کسی کی رورعایت نہ کرتے، اس کی وجہ سے بعض لوگ ناراض ہوجاتے مگر وہ اس کی پروا نہ کرتے۔

انھوں نے بڑی نرم اور گداز طبیعت اور دردمند دل پایا تھا۔ وہ ہر ایک کے درد و دکھ کو اپنا درد و دکھ سمجھتے تھے، کسی کو مصیبت میں دیکھتے تو بے قرار ہوجاتے اور اس کی پریشانی دور کرنے کی فکر کرتے، ایک برس پہلے یونیورسٹی میں ایک داخلہ کے سلسلہ میں میں کافی پریشان رہا میرا کام تو نہیں ہوا لیکن مولانا اور سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر نے میری مدد کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔

مولانا جب دارالمصنفین میں میرے ساتھ قیام پذیر تھے تو ایک روز رات میں دس بجے ایک صاحب تشریف لائے جن سے ہم لوگ واقف نہ تھے، میں ان کے سونے کا انتظام کرنے میں لگ گیا، اتنے میں مولانا کو معلوم ہوا کہ نووارد بھوکے ہیں، انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ پہلے ان کے کھانے کا انتظام ہونا چاہئے، اگر یہاں ممکن نہ ہو تو چلو ہم دونوں بازار سے کھانا لائیں، میں نے عرض کیا اس وقت بازار میں کھانا نہیں ملے گا۔

اس وقت یہ صرف چائے اور بسکٹ پر اکتفا کرلیں مولانا نے برہم ہوکر فرمایا اگر ان کی جگہ میں اور تم ہوتے تو ہمارا کیا حال ہوتا، میں لاجواب ہوگیا، تھوڑی دیر کے بعد خیال ہوا کہ محترمی سید صباح الدین عبدالرحمان صاحب کے یہاں جو اہل وعیال کے ساتھ رہتے تھے بچا کھچا کھانا ہوگا مولانا مجھے لے کر فوراً ان کے یہاں پہنچے، تھوڑی دیر کے بعد کھانا آگیا اور جب ان صاحب نے کھالیا تو مولانا کی پریشانی اور بے چینی دور ہوئی۔

ان کے نیک اور پاک دل میں کسی کی دلآزاری کا کبھی خیال بھی نہیں آیا ہوگا، چند برس پہلے میں قصبہ صبرحد ضلع جون پور کے مدرسہ فاروقیہ کے سالانہ جلسہ میں گیا تو معلوم ہوا کہ مولانا ابھی بھی تشریف لانے والے ہیں اور ڈاکٹر محمد صابر نائب مدیر فکر ونظر علی گڑھ کے گھر پر مولانا ہی کے ساتھ میری رہائش کا بھی انتظام کیا گیا ہے، میں نے مذاق میں کہا اب معلوم ہوا کہ علالت کا عذر محض بہانہ ہوتا ہے، آپ یہاں تک چلے آئے اور بیماری مانع نہ ہوئی، فرمایا کہ ڈاکٹر صابر کے اصرار کے سامنے میری کچھ نہ چلی، یہ بیچارے مجھ سے محبت کرتے ہیں ان کی دل شکنی کیسے کرتا۔

ان کی زندگی ریاونمود اور نمائش و بناوٹ سے خالی تھی، غیبت اور دوسروں کی عیب جوئی سے ان کو نفرت تھی ان میں کبر ونخوت اور علو وپندار کا شائبہ بھی نہ تھا کہیں سے اپنی عظمت اور بڑائی ظاہر نہیں ہونے دیتے، اگر ان کو کبھی اس کا احساس ہوجاتا کہ ان کی کسی بات سے دوسرے کو تکلیف پہنچی ہے تو وہ بے تکلف اس سے اسی وقت معافی مانگ لیتے، اپنی غلطی سے رجوع کرلینے میں ان کو تامل نہیں ہوتا تھا۔

ایثار، صبر اور قناعت ان کا شیوہ تھا، اپنے حال میں مست رہتے اور صبر وشکر سے گزر بسر کرتے، ان کی خانگی زندگی خوشگوار نہ تھی، اہلیہ کو دماغی فتور تھا مگر کبھی وہ حرف شکایت زبان پر نہ لاتے۔

مولانا عرصہ سے علیل تھے، نقرس کی تکلیف کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہوگئے تھے، لکھنے کا سلسلہ بھی موقوف ہوگیا تھا، میں نے اور لوگوں کی طرح ان سے بھی مضمون کی فرمائش کی تو جواب دیا کہ اب اسے بھول جاؤ، اللہ تعالیٰ کو جو کام لینا تھا وہ لے چکا۔ بالآخر ۲۱؍جنوری کو پیام اجل آگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعونْ۔

اس قحط الرجال میں مولانا جیسے صاحب علم ونظر اور بلند پایہ عالم دین کا اٹھ جانا قوم وملت کا بڑا خسارہ ہے، اللہ تعالیٰ اس کی تلافی کرے، مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ (''ض''، مارچ ۱۹۹۱ء)

رحمانی، سید منت اللہ، مولانا

مولانا سید منت اللہ رحمانی مرحوم

دارالمصنفین میں یہ خبر نہایت غم و ندوہ کے ساتھ سنی گئی کہ امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ کے امیر، مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری، مسلم مجلس مشاورت کے بانی ممبر، دارالعلوم دیوبند و ندوہ کی مجلس انتظامیہ کے رکن اور خانقاہ رحمانی کے سجادہ نشین مولانا سید منت اللہ رحمانی کا انتقال ۳ رمضان المبارک ۱۹؍مارچ کی شب میں ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ان کا مرثیہ صرف ایک عالم کا نہیں بلکہ ایک عالم کا ماتم ہے، ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ان جیسی ستودہ وصفات ہستیاں اس دور قحط الرجال میں نعمت سے کم نہیں اور اس نعمت کے چھن جانے سے حرمان ونقصان کی کیفیت اور شدید ہوجاتی ہے۔

انھوں نے ایسے ماحول میں آنکھیں کھولیں جو علم ومعرفت اور شریعت وطریقت کی دولت سے مالا مال تھا ان کے والد ماجد مولانا سید محمد علی مونگیریؒ، شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادیؒ سے تعلق، رد عیسائیت، تحریک ندوۃ العلماء اور ردقادیانیت میں اپنے کارناموں کے سبب نمونہ سلف اور طبقہ علماء ومشائخ میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے، ان کی اقامت کانپور میں تھی لیکن ہدایت وارشاد کے لیے وہ مونگیر اور اس کے اطراف میں برابر تشریف لے جایا کرتے تھے، جب وہاں قادیانیت کا فتنہ زیادہ سنگین ہوا تو اس کا مکمل قلع قمع کرنے کے لیے ۱۳۲۰ھ میں انھوں نے مستقل طور پر مونگیر میں اقامت اختیار کی، مولانا منت اللہ رحمانی ۱۳۳۲ھ میں پیدا ہوئے، اپنے بھائیوں میں وہ سب سے چھوٹے تھے، مولانا مونگیریؒ کے انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً دس برس تھی، ان سے بیعت تو حاصل ہوئی لیکن استفادہ کا زیادہ موقع نہ ملا، انھوں نے بعد میں دیوبند اور ندوہ میں بھی تعلیم حاصل کی، ندوہ میں وہ اپنے بھائی مولانا نوراللہ صاحب کے ساتھ آئے اور تقریباً چار سال قیام کیا، انکے زمانہ طالب علمی کے رفقاء میں مولانا محمد عمران خاں ندوی ازہری مرحوم بھی تھے، جن کی اولوالعزمی اور شاہانہ حوصلہ نے تاج المساجد بھوپال کی تعمیر کی تکمیل پوری کردکھائی تو مولانا منت اللہ صاحب نے بڑے پرلطف انداز میں فرمایا کہ اور کچھ ہو نہ ہو عمران خان صاحب نے اپنی جنت تو پکی کرلی۔

ان کے اساتذہ میں مولانا حفیظ اللہ اعظمی، مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی، مولانا شبلی فقیہ، مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی جیسے ارباب فضل وکمال تھے، دیوبند میں مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابراہیم بلیاوی، مولانا اعزاز علی، مولانا سید اصغر حسین اور مفتی محمد شفیع سے استفادہ کیا، حاجی محمد شفیع بجنوری خلیفہ مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی کی خدمت میں پانچ سال رہے، بعد میں وہ اپنے والد ماجد کے خلیفہ مولانا محمد عارف ہرسنگھ پوری سے مجاز خلافت بھی ہوئے اور اپنے برادر اکبر مولانا لطف اللہ صاحب کے انتقال کے بعد خانقاہ رحمانی کی مسند ارشاد پر فائز ہوئے۔

ملک وملت کی خدمت کا جذبہ ابتدا ہی سے تھا، خوش قسمتی سے ان کو مولانا ابوالحاسن محمد سجاد کی توجہ بھی حاصل ہوگئی جو ایک دقیقہ رس عالم وفقیہ تھے اور جن کا

خمیر امت کے لیے پیہم عمل، سوز و ساز، درد و داغ، جستجو و آرزو اور بے کلی و بیقراری اور ایک اضطراب مسلسل سے تیار ہوا تھا، ان کے متعلق مولانا سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے کہ ''وہ اکیلے تھے لیکن لشکر تھے، پیادہ تھے مگر برق رفتار تھے، وہ قال نہ تھے سراپا حال تھے'' ان کی سرپرستی میں مولانا منت اللہ رحمانی ۱۹۳۶ء میں سہرسہ سے بہار اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے، لیکن مولانا محمد سجاد کی زندگی کا سب سے اہم کارنامہ امارت شرعیہ کا قیام تھا، جو دراصل ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد مسلمانوں کی زبوں حالی انتشار، احساس شکست اور قنوطیت کے خلاف نئی بیداری اور نئی شیرازہ بندی کا پیام تھی، علماء و مفکرین اس کی ضرورت سے باخبر تھے، چنانچہ ۱۸ء کے معارف میں مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس خیال کو پیش کیا، یورپ سے واپسی کے بعد پھر انھوں نے اس ساز کو چھیڑا لیکن ان کے بقول ''اس عہد کے جدید تعلیم یافتہ علمبرداروں نے اس کو کسی طرح نہ چلنے دیا''۔ تاہم مخالفتوں کے باوجود مولانا سجاد کی قوت عمل نے بہار میں اس کو وجود کا قالب بخش دیا، سید صاحبؒ نے اسے ان کی سب سے بڑی کرامت سے تعبیر کیا کہ زمین شور میں سنبل پیدا کرنا اور بنجر علاقہ میں لہلہاتی کھیتی کھڑی کر لینا ہر ایک کا کام نہیں، نظام شرعی کے قیام کی نیت کی برکت تھی کہ اس تحریک کو ملک کے علماء و مشائخ کی تائید حاصل ہوئی، چنانچہ اپنے عہد کے جنیدؒ و شبلیؒ، مولانا شاہ بدرالدین پھلواروی اور پھر بعد میں مولانا شاہ محی الدین پھلواروی، شاہ قمرالدین پھلواروی کے علاوہ مولانا مونگیری، مولانا آزاد اور مولانا عبدالصمد رحمانی اس تحریک کی قیادت و سرپرستی فرماتے رہے۔

مولانا منت اللہ رحمانی امارت شرعیہ کے چوتھے امیر تھے، ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اسلاف کی اس میراث و روایت کو اپنے علم و فضل رسوخ فی الدین، استقامت، فہم و فراست، اعتدال و توازن اور اعتماد و تعاون سے صرف قائم ہی نہیں رکھا بلکہ اسے مزید ترقی و وسعت بھی دی، گویا ان کی تنہا ذات میں پھلواروی شریف کے بزرگوں اور مولانا مونگیری و مولانا سجاد کی برکات جمع ہو گئی تھیں، امیر منتخب ہونے کے بعد انھوں نے اپنی ایک تقریر میں ''ہندوستان میں آزاد اسلام'' کی جرأت مندانہ بات کہی تو مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا کہ ''وہ اپنے اس مومنانہ اقدام کے لیے مستحق تبریک و تحسین ہیں''۔ آج امارت شرعیہ کے شعبہ دارالقضاء شعبہ افتاء، بیت المال وغیرہ اپنے امیر کی کامیاب قیادت کے نقیب و شاہد ہیں۔

ان کا دوسرا روشن اور نہایت اہم کارنامہ مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام ہے، یکساں سول کوڈ کے مطالبہ نے جب زور پکڑ لیا تو اس خطرہ کی شدت و سنگینی کو محسوس کرنیوالوں میں وہ پیش پیش تھے، ان کی مساعی کی بدولت ۷۲ء میں ممبئی کے ایک بڑے اجلاس میں مسلمانوں کے مختلف حلقۂ فکر کے رہنما ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے اور انھوں نے بورڈ کی تشکیل کی جس نے شاہ بانو کیس کے سلسلہ میں بڑا قابل قدر اور موثر کردار ادا کیا۔ مولانا کی یادگاروں میں جامعہ رحمانی بھی ہے جسے انھوں نے ۴۵ء میں قائم کیا تھا۔ جامعہ نے فقہ و افتاء کے شعبہ میں ممتاز اور قابل ذکر علماء پیدا کئے، اس کے کتب خانہ کو بھی انھوں نے بڑی وسعت دی۔

ندوہ سے ان کو خاص تعلق تھا، اپنے والد مولانا مونگیری سے اس کے رشتہ کو انھوں نے ہمیشہ ملحوظ رکھا، ندوہ کے ناظم اور دارالمصنفین کے روح رواں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے بھی ان کا بڑا لگاؤ اور مخلصانہ روابط تھے اکثر قومی و ملی مسائل میں دونوں کو ایک دوسرے کا تعاون اور اشتراک عمل حاصل رہتا تھا ندوہ کا عظیم الشان ۸۵ سالہ جشن منایا گیا تو اس کے آخری اہم اجلاس کی صدارت انھوں نے کی اور انہی کی دعا پر یہ جشن ختم ہوا، دارالمصنفین، علامہ شبلیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ اور معارف کے وہ قدر شناس تھے، علامہ شبلیؒ کے متعلق ایک جگہ لکھا کہ ''وہ عالم اسلام کے مشہور عالم، ادب و تاریخ کے امام اور قدیم و جدید کے سنگم تھے'' انھوں نے مولانا گیلانی کا یہ قول بھی نقل کیا کہ ''بلاشبہ مولانا شبلیؒ قدیم و جدید علمی طبقہ کے درمیان ایک برزخی وجود کا مقام حاصل کیے ہوئے تھے'' اختلاف مسلک کو انھوں نے کبھی وجہ تلخی نہیں بنایا مکاتیب گیلانی کے ایک حاشیہ میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے متعلق ان کی چند سطریں کئی بڑے مضامین پر بھاری ہیں۔

انھوں نے مقالات و مضامین کثرت سے لکھے، وقتی مسائل پر انکے رسائل بھی ہیں، گو مولانا کو تصنیف و تالیف کا بھی اچھا سلیقہ تھا مگر قومی و ملی زندگی کی مصروفیتوں نے انہیں اس جانب متوجہ نہیں ہونے دیا کچھ عرصہ پہلے انھوں نے مولانا مناظر احسن گیلانی کے خطوط کا ایک مجموعہ مکاتیب گیلانی کے نام سے مرتب کر کے شایع کیا تھا اس میں انھوں نے مکتوب الیہ کا مختصر حال تحریر کرنے کے علاوہ مفید حواشی و تعلیقات بھی لکھے ہیں، اس سے مولانا کے حسن ذوق کا اندازہ ہوتا ہے مولانا گیلانی کا ہر خط عمدہ معلومات پر مشتمل ہوتا تھا اس لیے مولانا منت اللہ صاحب نے ان منتشر جواہر پاروں کو شایع کر کے بڑی مفید علمی و دینی خدمت انجام دی ہے، فاضل مرتب نے قارئین کی سہولت کے لیے ہر مکتوب کی مفصل فہرست بھی شایع کی ہے۔

مولانا کی زندگی اپنے کارہائے نمایاں کی وجہ سے اگر قابل رشک رہی تو ان کی مبارک موت بھی حسن خاتمہ اور حسن قبول کی بشارت لائی، ۳ رمضان المبارک کو عشاء اور تراویح کی ابتدائی چند رکعات کے بعد وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے، اللہ تعالیٰ ان کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے، ان کے پسماندگان خصوصاً ان کے صاحبزادہ مولانا محمد ولی رحمانی اور تمام متعلقین کو صبر و رضا کی توفیق دے اور قوم و ملت اور امارت شرعیہ کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے، آمین۔ (''ع۔ص''، اپریل ۱۹۹۱ء)

نوٹ: مولانا سید منت اللہ رحمانی مرحوم پر مولوی عمیر الصدیق صاحب کا مضمون بہت اچھا ہے مگر وہ ایک بات لکھنی بھول گئے، یعنی مرحوم کانگریس کی کسی تحریک میں گرفتار ہوکر قید و بند سے بھی دوچار ہوئے تھے۔ (''شیخ نذیر حسین''، مئی ۱۹۹۱ء)

میکش اکبر آبادی

میکشؔ اکبر آبادی

میکشؔ اکبر آبادی اردو کے پختہ مشق شاعر اور اچھے اہل قلم تھے، انھوں نے درس نظامی کی تکمیل مدرسہ عالیہ آگرہ میں کی، نظم و نثر میں متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں، ادبی رسالوں میں ان کی نگارشات برابر شائع ہوتی تھیں، اقبالؔ و غالبؔ بھی ان کی دلچسپی کے موضوعات تھے، ان کا میلان تصوف کی طرف تھا، جس کا اثر ان کی نظم و نثر دونوں پر تھا، اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، آمین۔ (''ض''، مئی ۱۹۹۱ء)

سجادؔ میرٹھی، زین العابدین، مولانا قاضی

مولانا قاضی زین العابدین سجادؔ میرٹھی

گزشتہ ماہ مولانا قاضی زین العابدین سجادؔ میرٹھی اور جناب میکشؔ اکبر آبادی رحلت فرماگئے، قاضی صاحب میرٹھ کے ایک علمی و دینی خاندان کے فرد اور دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فضلا میں تھے، وہ عرصہ تک جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ دینیات و تاریخ اسلام کے صدر رہے، تحریر و تصنیف کا ذوق مولانا تاجور نجیب آبادی کی صحبت میں پیدا ہوا، ابتدا میں مصطفیٰ منفلوطی کے عربی افسانوں کا اردو ترجمہ کیا، کئی برس تک میرٹھ سے ''الحرم'' نکالتے رہے، جس کے کئی خاص نمبر شایع ہوئے اردو عربی لغت میں بیان اللسان اور قاموس القرآن ترتیب دی، ندوۃ المصنفین دہلی کی کتاب ''تاریخ ملت'' کے بعض حصے مرتب کیے، دو تین برس قبل ان کی کتاب ''شہید کربلا'' شایع ہوئی، جمعیۃ علمائے ہند اور دارالعلوم دیوبند کی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے رہے، کئی برس سے بیمار تھے ۸۸ء میں آخری بار دہلی کے مدنی سیمینار میں ملاقات ہوئی تو بہت کمزور ہوگئے تھے، طبیعت میں نفاست تھی، خوش وضع، خوش پوش اور خلیق و ملنسار شخص تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ (''ض''، مئی ۱۹۹۱ء)

مدنی، عبدالمالک جامعی، مولانا

آہ! مولانا عبدالملک جامعی مدنی

(مولانا افتخار فریدی)

یہ خبر انتہائی رنج اور صدمہ کے ساتھ سنی گئی کہ مہاجر مدینہ مولانا عبدالملک جامعی، مدینہ منورہ میں انتقال فرماگئے۔ ان کی ذات گرامی گوناگوں خصوصیات کی حامل تھی۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابقین اولین میں تھے اور اس کے کئی شعبے ان کی صلاحیتوں سے پروان چڑھے۔ مولانا، مولانا محمد علی جوہرؔ کے فدائی اور خادم اور سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے محبوب شاگردوں میں سے تھے، حق بات کہنے میں کبھی ان کو تامل نہیں ہوتا تھا۔ اپنے استاد ذاکر صاحب سے بھی اس وقت کے امر کی ایک بات کہی تھی جس سے ذاکر صاحب رات بھر روتے رہے۔

مولانا عبدالملک کا بچپن اپنے والد منشی عبدالقیوم صاحب کیساتھ جو مشہور خطاط تھے بجنور میں گزرا جہاں سے مشہور زمانہ اخبار ''مدینہ'' نکلتا تھا۔ یہاں وہ کئی عبقری صحافیوں اور ہمدردان ملت کی خاص شفقتوں کے مورد رہے۔ لے وہیں سے مولانا نے تحریک خلافت میں بھی حصہ لیا، مولانا کے والد محترم نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ کلکتہ میں رہ کر ''ترجمان القرآن'' کی کتابت بہت ہی بے کسی کے عالم میں کی اور اسے مدینہ پریس بجنور میں طبع کرایا۔ دوسرا ایڈیشن لاہور میں طبع کرایا اور دونوں کا منافع مولانا آزاد کو پہنچایا۔

مولانا عبدالملک صاحب، مولانا محمد علی جوہرؒ کے فدائی اور عاشق تھے اور ساری ایمان افروز تربیت انہیں سے حاصل کی تھی۔ فرمایا کرتے تھے مولانا محمد علی بیسویں صدی کے مرد مومن ہیں۔ ان کا تعلق مولانا کے خاندان کے ہر ہر فرد سے تھا۔ کراچی میں بھی ان کے نواسوں سے بڑی محبت کیا کرتے تھے۔

مولانا مرحوم نے تقریباً ۵۰ سال مدینہ منورہ میں قیام فرمایا اور حفظ قرآن کا نظام چلاتے رہے۔ مولانا کی زندگی بہت ہی بے کسی اور غربت میں گزری اور کبھی کوئی دنیاوی منفعت حاصل نہیں کی حتیٰ کہ مدینہ کے پچاس سالہ قیام کے دوران وہاں کی شہریت حاصل کرنے کے لیے کبھی کسی سے سفارش نہیں کی جبکہ وہ چاہتے تو یہ کام انتہائی آسان تھا، دعوت تبلیغ کے اہم ترین کام کا درد ہمیشہ ان پر غالب رہا اور سخت سے سخت حالات اور صحت کی خرابی کے باوجود اس کی فکر فرماتے رہے۔ وفات سے چند ہفتہ قبل مرحوم نے راقم کو جو خط تحریر فرمایا تھا اس میں اس کی بشارت دی تھی کہ روس چین اور ہندوستان کے ایک علاقے کو ہدایت ملے گی۔

مولانا مرحوم نے مدینہ اور اس کے اطراف میں حفظ قرآن کو فروغ دیا اور تحفیظ القرآن کے نام سے ایک ادارہ کی منظوری سعودی حکومت سے ایک ایسے وقت میں کرائی جبکہ حفظ قرآن کا نظام وہاں بے حد کمزور ہوگیا تھا۔ اب الحمدللہ اس ادارہ کی برکت سے مدینہ منورہ میں ایک لاکھ سے زیادہ قرآن مجید کے حفاظ موجود ہیں۔ خدا مولانا مرحوم کی قبر کو نور سے بھر دے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مرتبہ سے سرفراز فرمائے، آمین۔ (مئی ۱۹۹۱ء)

گاندھی، راجیو، مسٹر

آہ! مسٹر راجیو گاندھی!!

کانگریس آئی کے صدر اور سابق وزیر اعظم ہند مسٹر راجیو گاندھی کا وحشیانہ اور بے رحمانہ قتل ملک و قوم کا بڑا المناک سانحہ ہے، اس کی جس قدر مذمت کی جائے کم ہے، وہ مدراس کے انتخابی دورہ کے سلسلہ میں ۲۱ مئی کو دس بجے کے بعد رات میں سری پرمبو دور کے ایک انتخابی جلسہ میں خطاب کرنے جارہے تھے تو کسی درندہ صفت، شقی القلب اور لئیم نے ان کی زندگی کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل کردیا، ان کی اس اذیت ناک موت نے ایک بار پھر ان کی والدہ مسز اندرا گاندھی اور قوم و ملک کے محسن گاندھی جی کی یاد تازہ کردی، اور ہر انسان دوست اور محبِّ وطن شخص یہ سوچنے لگا کہ گوتم بُدھ اور گاندھی کے اس دیس میں کب تک راون اور ناتھورام گوڈ سے ہنسا اور تشدد کی ریت قائم و دائم رکھیں گے۔

راجیو گاندھی ۱۹۴۴ء میں پیدا ہوئے تھے، دون اسکول میں ابتدائی و ثانوی تعلیم پانے کے بعد لندن گئے اور میکنکل انجینئرنگ کا کورس کیا، ہندوستان واپس آکر ہوائی جہاز چلانے کی ٹریننگ لی، اور انڈین ایرلائنز سے وابستہ ہوئے، وہ ایک کامیاب پائلٹ تھے لیکن اپنے چھوٹے بھائی سنجے گاندھی کے ہوائی حادثہ میں ہلاک ہونے کے بعد انھیں اپنی والدہ کی مدد کے لیے سیاست میں آنا پڑا، ۱۹۸۱ء میں پہلی بار پارلیمنٹ کے ممبر ہوئے اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری بھی مقرر کیے گئے، ۱۹۸۴ء میں اندرا گاندھی کے قتل کے بعد وہ وزیر اعظم ہوئے، اسی سال انھوں نے قبل از وقت انتخاب کرایا اور پانچ برس تک وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز رہے، ۱۹۸۹ء کے الیکشن میں تو ان کی پارٹی کو سب سے زیادہ سیٹیں ملیں تاہم انھوں نے حکومت کی تشکیل نہ کرکے اپوزیشن میں رہنا پسند کیا، ابھی ڈیڑھ برس بھی انہیں ہوئے تھے کہ پھر نئے انتخاب کی نوبت آگئی جس کے دوران ہی میں انھیں بم سے اڑا دیا گیا، دنیا کی جس زندگی پر انسان پھولا نہیں سماتا اس کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا یہی حال ہے۔

مسٹر راجیو گاندھی کی ابھی عمر ہی کیا تھی، وہ اس ملک کے سب سے کم سن وزیر اعظم تھے ع فتی سادالعشیرۃ امردا۔ ان کے سر پر وزارت عظمیٰ کا تاج رکھا گیا تو پورے ہندوستان کا دل دھڑک رہا تھا، مگر کم سنی اور طویل سیاسی تجربہ نہ ہونے کے باوجود وہ اس بھاری ذمہ داری سے عہدہ برآ اور ملک اور پارٹی کا اتحاد برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے، ان کی قیادت میں ہونے والے پہلے انتخاب میں انھیں زبردست کامیابی ہوئی، ۱۹۸۹ء کے انتخاب میں واضح اکثریت نہ ملنے کے باوجود انھوں نے پارٹی کو انتشار سے بچایا، ان کی حکومت کے دونوں رخ ہیں، لیکن یہ ان کی بڑائی تھی کہ غلطی کے احساس کے بعد انھیں اس کا اعتراف کرلینے میں تامل نہیں ہوا، خیال تھا کہ دوبارہ برسر اقتدار آنے پر وہ پچھلی غلطیوں سے سبق لیں گے اور ان کی تلافی کریں گے، اقلیتوں کے معاملہ میں فراخدلانہ رویہ اختیار کریں گے، جن کی تصویر ملک میں روز بروز بگڑتی ہی جارہی ہے، لیکن یہ ساری توقعات خاک میں مل گئیں اور ملک کے مستقبل پر ان کی موت سے دھند اور غبار چھا گیا۔

اس سنگدلانہ حادثہ کے پس پردہ جن لوگوں کا واقعی ہاتھ ہے ان کا سراغ لگنا مشکل ہے، اس سے پہلے دنیا کے بعض ملکوں کے سربراہوں کو اسی طرح لقمۂ اجل بنادیا گیا، لیکن ان کے قتل کا راز سربستہ ہی رہا، کیونکہ اس قسم کے قتل کا رخ غیر متعلق لوگوں کی جانب اس طرح موڑ دیا جاتا ہے کہ صحیح صورت حال سامنے نہ آئے، بہر حال یہ سوچی سمجھی گہری سازش ہے، جس میں بیرونی ملکوں کا ہاتھ بھی ہوسکتا ہے لیکن اس صورت میں بھی ملک کے بدباطن لوگوں کا اس میں ملوث ہونا یقینی ہے، یہ سانحہ جمہوریت اور ملک کے امن و استحکام کے لیے بھی ایک چیلنج ہے، سیاست پر سماج دشمن اور جرائم پیشہ لوگوں کے اثر و نفوذ بڑھ جانے کی وجہ سے آج جو انجام راجیو گاندھی کا ہوا ہے وہی دوسروں کا بھی ہوسکتا ہے، اس لیے تمام سیاسی پارٹیوں اور ملک کے سنجیدہ اور دردمند لوگوں کو اس کی روک تھام کے لیے کمربستہ ہوجانا چاہیے ورنہ ملک تباہ ہوجائے گا۔

تھوڑے سے وقفہ کو چھوڑ کر ۱۹۴۷ء سے اب تک ملک کی باگ ڈور نہرو خاندان ہی میں رہی، راجیو گاندھی کے بچے ابھی چھوٹے ہیں جن کے سیاست میں آنے کا کوئی سوال نہیں، اس وقت وزارت عظمیٰ کے دعویدار تو بہت ہیں مگر ملک بڑے بحرانی دور سے گذر رہا ہے، ایک طرف مذہبی اور فرقہ وارانہ جنون حد سے بڑھ گیا ہے، دوسری جانب مہنگائی، گرانی، رشوت، چور بازاری اور کرپشن نے ملک کی چولیں ہلادی ہیں اور اس کی وحدت و سالمیت خطرے میں آگئی ہے، ایسے بحرانی وقت میں صاف ستھری اور مدبرانہ قیادت ہی ملک کو اس بحران و انتشار سے بچاسکتی ہے۔ دارالمصنفین کو راجیو گاندھی کی حسرت ناک موت کا دوہرا غم ہے، ان کے ننھیال سے اس ادارہ کا گہرا تعلق رہا ہے، ان کے پرنانا پنڈت موتی لال نہرو اور نانا پنڈت جواہر لال نہرو اس کو اپنی تشریف آوری اور کرم سے برابر نوازتے رہے، موخر الذکر دارالمصنفین کے بڑے محسن اور لائف ممبر تھے، مسز اندرا گاندھی نے اپنے بزرگوں کی روایت برقرار رکھی، دارالمصنفین راجیو گاندھی کے سوگوار خاندان کے غم میں شریک ہے۔ (''ض''، جون ۱۹۹۱ء)

ندوی، عبدالمجید، مولانا

آہ! مولانا عبدالمجید ندوی

افسوس ہے کہ ۲۳ مئی کو مولانا عبدالمجید ندوی صدر مدرس مدرستہ الاصلاح سرائے

میر ایک حادثہ میں جاں بحق ہوگئے، اناللہ و انا الیہ راجعون۔

وہ ایک تقریب میں شرکت کے لیے جارہے تھے، رانی کی سرائے میں کوئی بچہ ان کی گاڑی کی زد میں آ گیا، مگر ڈرائیور کی ہوشیاری سے وہ بالکل بچ گیا اور اسے کوئی چوٹ نہیں آئی، اس کے باوجود بعض شر پسند لوگوں نے پتھراؤ کیا۔ جس سے مولانا کے دماغ پر ضرب شدید آ گئی اور اعظم گڑھ اسپتال میں انھوں نے دم توڑ دیا۔

مدرستہ الاصلاح میں متوسطات تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ ندوۃ العلما لکھنؤ میں داخل ہوئے، فراغت کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا، پھر بی۔ ایڈ کے لیے شبلی کالج اعظم گڑھ میں داخلہ لیا۔ ندوہ کی آخری جماعت میں تفسیر کا درس مولانا عبدالباری ندوی فلسفی سے لیا۔ جن کی تعلیم و تربیت کا خاص اثر ان پر پڑا، وہ کئی برس تک ان کے ساتھ ہی ان کے مکان میں رہے، اس سے ان کو بڑا علمی و دینی فائدہ پہنچا مگر باقاعدہ بیعت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ سے ہوئے۔

اعظم گڑھ میں وہ میرے ساتھ رہتے تھے، ان کے دینی ذوق و رجحان، مذہبی حمیت، شعائر دین اور ارکان اسلام کے احترام خصوصاً نماز کی پابندی اور اہتمام کی بنا پر مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ان کی بڑی قدر کرتے تھے اور شاہ صاحب نے دارالمصنفین میں لائبریرین کی حیثیت سے ان کا تقرر بھی کیا مگر وہ اپنے بعض مشاغل کی وجہ سے یہاں زیادہ دنوں تک قیام نہیں کر سکے۔ اس کے بعد مختلف وقتوں میں مدرستہ الاصلاح، جامعۃ الرشاد اور شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی سے وابستہ ہوئے، ادھر چند برس سے وہ مدرستہ الاصلاح کے مہتمم تھے۔ ان میں لکھنے پڑھنے کی اچھی صلاحیت تھی مگر اس کے لیے جس یکسوئی اور دل جمعی کی ضرورت ہے وہ انہیں میسر نہیں ہوسکی۔

ان میں اچھی انتظامی صلاحیت بھی تھی اور وہ ہر کام کو بڑے سلیقہ اور پوری ذمہ داری سے انجام دیتے تھے، نظم و نسق کے معاملہ میں کسی کے ساتھ بھی رورعایت نہ کرتے، اپنے اعزہ کو بھی کوتاہی کرنے پر معاف نہیں کرتے تھے، اس کی وجہ سے بعض لوگ ان کے شاکی رہتے تھے مگر وہ کبھی کسی کی شکایت اور ناراضگی کی پروا نہ کرتے اپنی سخت گیری، ایمانداری، اصول پسندی، ہر ایک کے ساتھ یکساں برتاؤ اور انتظامی لیاقت کی بنا پر اداروں کے منتظمین اور ذمہ داروں میں بہت مقبول تھے، ان کی صحت بہتر نہیں تھی۔ مگر ابھی پچاس برس سے زیادہ عمر نہیں رہی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے آمین۔ (''ض''، جون ۱۹۹۱ء)

یوسف، محمد، مولانا

مولانا محمد یوسف صاحب مرحوم

افسوس کہ مولانا محمد یوسف صاحب سابق امیر جماعت اسلامی ہند کا ۴ جولائی کو دن میں ۲ بجے رامپور میں انتقال ہوگیا، اناللہ و انا الیہ راجعون۔

ان کی وفات سے ملک وقوم کے دردمند و ہوشمند اور مخلص اور فعال رہنماؤں کی صف اور سونی ہوگئی۔

جماعت اسلامی سے ان کا تعلق بڑا دیرینہ تھا، ۱۹۴۸ء میں منقسم ہندوستان میں جماعت کی تشکیل نو کے وقت وہ جماعت کے قیم مقرر کیے گئے، ۱۹۷۲ء تک وہ اس منصب پر فائز رہنے کے بعد امیر جماعت منتخب کیے گئے ۱۹۸۰ء تک اس پر فائز رہے۔ جماعت کے کئی اور اداروں جیسے بورڈ آف اسلامک پبلیکیشنز، دعوت ٹرسٹ اور اشاعت اسلام ٹرسٹ وغیرہ کے بھی وہ چیئرمین تھے، پیرانہ سالی اور عوارض و اعذار کی وجہ سے ادھر کئی برسوں سے وہ گوشہ گیر ہوگئے تھے مگر ملی و قومی مسائل سے باخبر اور ان کے متعلق فکرمند رہا کرتے تھے، گوانکے دور امارت میں جماعت کو ابتلا و آزمایش کا سامنا کرنا پڑا تاہم انھوں نے اس کو ترقی و استحکام کی راہ پر گامزن رکھا، ملک کے دوسرے اسلامی اداروں اور اشخاص سے بھی ان کا تعاون و اخلاص کا معاملہ رہا، مسلم مجلس مشاورت، مسلم پرسنل لابورڈ اور دینی تعلیمی کونسل کے وہ رکن رکین تھے، قومی و ملکی مسائل پر ان کی وسعتِ نظر، فراخدلی اور اشتراک عمل کے جذبہ کی قدر کی جاتی تھی، وہ جماعت کے اہم اجتماعات میں دوسرے مکاتب فکر کے افراد کو بھی اظہار رائے کے لیے مدعو کرتے، ان کی تقریریں اور خطبات عام طور سے نہایت متوازن، جامع اور بامقصد ہوتے، گفتار کے علاوہ کردار کے میزان میں بھی وہ پورے اترے ۱۹۷۵ء میں ایمرجنسی کے دور ابتلاء میں انھوں نے قید و بند کی صعوبتوں کو برداشت کرکے اور پس دیوار زنداں اسلام کے پیام کو اپنے قول و عمل سے پیش کر کے۔ اسوۂ یوسفی کو تازہ کردیا، جب ۱۹۷۹ء میں پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی سزائے موت کے نتیجہ میں جماعت اسلامی کے خلاف ہندوستان کے بعض حلقوں میں بڑی برہمی ہوگئی تھی تو انھوں نے نہایت دردمندانہ انداز میں ایک رسالہ **ویالیت قومی یعلمون**، [یٰسین: ۲۶] کے بلیغ و برمحل عنوان سے شایع کیا جس کا خاطرخواہ اثر ہوا۔ عالمی مساجد کونسل اور موتمر عالم اسلامی کے رکن کی حیثیت سے انھوں نے بیرون ملک جماعت اسلامی کے وقار میں اضافہ کیا، ان کے دور امارت کی ایک یادگار ۱۹۸۱ء کا اجتماع حیدرآباد بھی ہے، اس میں عالم اسلام کی بعض نمایاں و مقتدر ہستیوں کی شرکت سے اس کی حیثیت ایک عالمی اجتماع کی سی ہوگئی، شکل و صورت اور وضع قطع کی مانند اپنے گفتار و کردار میں بھی پاکیزہ اور خوش اطوار تھے، جو لوگ ان کے قریب رہے وہ ان کی دینداری، سادگی، فروتنی، اخلاص، ایثار اور شیریں کلامی کے مداح و معترف ہیں۔ دارالمصنفین کے سابق شریک ناظم مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کے حادثہ وفات پر انھوں نے جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کے نام تعزیتی خط میں لکھا تھا کہ ''ایک دن تو ہر ایک کو جانا ہے،

آج وہ تو کل ہماری باری ہے، وہ لوگ خوش نصیب ہیں جو کامیابی کے ساتھ مراحل حیات طے کرکے اپنی ابدی جائے قرار کے لیے روانہ ہوگئے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو مرحوم سے حوض کوثر پر اس دن ملائے جس دن ہر مومن بندہ اپنے بچھڑے ہوؤں کو پالے گا اور پھر جدائی کا کوئی سوال نہ ہوگا''۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کے طفیل میں ان کو جام کوثر وتسنیم سے سیراب کرے اور انکے پسماندگان ظاہری ومعنوی کو صبر و رضا کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ (''ع۔ص''، اگست ۱۹۹۱ء)

ندوی، سید ابراہیم، ڈاکٹر

ڈاکٹر سید ابراہیم ندوی مرحوم

ماہ جون میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے شعبہ عربی کے صدر اور ندوۃ العلماء کے ایک لائق فرزند ڈاکٹر سید محمد ابراہیم ندوی کے انتقال کی خبر بھی علمی و دینی حلقوں میں بڑے رنج وغم کے ساتھ سنی گئی، ابھی ان کی عمر تقریباً پچاس برس تھی۔

ان کا اصل وطن استھانواں ضلع پٹنہ ہے، یہاں انکا خاندان اپنے علم وفضل کی وجہ سے نمایاں تھا، ان کے دادا مولانا محمد احسن استھانوی اپنے وقت کے اچھے اہل علم و قلم تھے اور ان کے والد مولانا سید ہاشم ندوی بھی ذی علم بزرگ تھے جو تلاش معاش کے لیے حیدرآباد گئے اور وہیں دائرۃ المعارف سے وابستہ ہوئے، تاریخ کامل ابن اثیر حصہ دوم کا ترجمہ ان کی محنت وکاوش کا نتیجہ ہے جس کو دارالترجمہ نے ۲۷ء میں شایع کیا، عرصہ تک دائرۃ المعارف کی عربی کتابیں ان کی تصحیح وحواشی کے ساتھ چھپتی رہیں جس کے آخر میں وہ ناظم بھی ہوگئے تھے، ابن ورید کی المجتنیٰ شایع ہوئی تو اس میں صاحب کتاب کے سوانح انھوں نے دیدہ ریزی سے لکھے جس کی تحسین مولانا سید سلیمان ندویؒ نے کی، انھوں نے اپنے فرزند سید ابراہیم کو دارالعلوم ندوۃ العلما میں تعلیم کے لیے بھیجا جنھوں نے بعد میں ایم۔ اے، پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی اور عثمانیہ یونیورسٹی میں صدر شعبہ عربی کے عہدہ تک ترقی کی مگر ان کی عالمانہ وضع قطع میں فرق نہیں آیا، اپنی پاک وصاف زندگی کی وجہ سے انھوں نے اپنے خاندان اور ادارہ کے نام نیک میں اضافہ ہی کیا، رابطہ ادب اسلامی کے رکن کی حیثیت سے انھوں نے استنبول ترکی کے ایک اہم اجتماع میں شرکت کی، یونیورسٹی کی جانب سے بھی وہ مذاکروں اور مباحثوں میں شریک ہوتے رہے، صدر جمہوریہ ہندنے ان کی عربی قابلیت کے اعتراف میں سند اعزاز بھی عطا کیا حیدرآباد کے علمی و ادبی حلقوں میں بھی وہ مقبول رہے، وہاں کے مشہور روزنامہ سیاست کے ادبی کالموں میں ان کے مراسلات بڑی دلچسپی سے بڑھے جاتے، اللہ تعالیٰ ان کے مراتب و درجات بلند کرے اور ان کے متعلقین و پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ (''ع۔ص''، اگست ۱۹۹۱ء)

ندوی، محمد سلمان خاں بھوپالی، مولانا

مولانا محمد سلمان خاں بھوپالی ندوی مرحوم

ندوۃ العلما کے ایک اور لائق فرزند اور مولانا محمد عمران خاں بھوپالی ندوی مرحوم کے برادر خورد جناب مولانا محمد سلمان خاں ندوی مرحوم کی وفات حسرت آیات کی خبر بہت تاخیر سے ان کے صاحبزادے مولوی حافظ کلیم خاں ندوی کے ایک خط سے ملی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ دارالعلوم تاج المساجد کے سابق مہتمم تھے، لیکن ان کا سب سے روشن کارنامہ تاج المساجد کی تعمیر نو ہے۔ مولانا محمد عمران خاں ندوی مرحوم نے جس شاہانہ اولوالعزمی سے اس عظیم الشان مسجد کی تعمیر وتکمیل کا خاکہ بنایا تھا اس کو مولانا سلمان خاں صاحب نے حقیقتاً رنگ و روغن عطا کیا، جن لوگوں نے مسجد کی تعمیر وتکمیل میں ان کی شبانہ روز کی محنت، جانفشانی اور لگن دیکھی ہے وہ جانتے ہیں کہ اس تعمیر میں ان کا لہو تک شامل ہوگیا ایک عالم کی اس معمارانہ اور مہندسانہ مہارت پر بڑے بڑے انجینئر اور آرکیٹیکٹ بھی حیران رہ گئے، طبعاً وہ نہایت شریف، متین، کم سخن اور مہمان نواز انسان تھے، اپنے تمام بیٹوں کو انھوں نے حفظ قرآن مجید کی دولت سے بہرہ یاب کیا اور سب کو ندوہ ہی میں تعلیم دلائی، وہ خود بڑے دیندار تھے متعدد بار حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں اور دینی خدمات کو قبول کرے اور جنت نعیم میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔ (''ع۔ص''، اگست ۱۹۹۱ء)

کنون، عبداللہ

اُستاد عبداللہ کنون

معاصر مراکشی عالم، مورخ اور ادیب

(شیخ نذیر حسین)

عصر حاضر کے ممتاز مراکشی مصلح، عالم، ادیب اور مورخ استاد عبداللہ کنون نے ۹/جولائی ۱۹۸۹ء کو بیاسی برس کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کی ساری زندگی تعلیم و تدریس، تصنیف وتالیف اور دعوت وتجدید میں گزری۔ وہ ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء میں فاس میں پیدا ہوئے، انھوں نے دینی اور روحانی ماحول میں پرورش پائی۔ جب مراکش پر فرانسیسی سیادت قائم ہوگئی تو ان کے والد عبدالصمد طنجہ (Tangier) کے بین الاقوامی شہر میں چلے آئے۔ اس کے بعد وہ ہجرت کرکے مدینہ منورہ جانا چاہتے تھے، لیکن پہلی جنگ عظیم کے باعث وہ اپنے خاندان سمیت طنجہ ہی میں ہمیشہ کے لیے مقیم ہوگئے۔

استاد عبداللہ کنون نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد اور اعلیٰ تعلیم مراکش کے مشاہیر علماء سے پائی۔ بیس برس کی عمر میں وہ تعلیم وتدریس کے علاوہ اخباروں اور رسالوں میں

مضامین لکھنے لگے۔ اس وقت سرکاری مدارس میں فرانسیسی زبان کا چلن تھا اور عربی زبان خارج از نصاب تعلیم تھی، اس لیے استاد عبداللہ کنون نے مسلمان بچوں اور بچیوں کی تعلیم کے لیے طنجہ اور تطوان میں آزاد مدارس کھولے، جہاں ذریعہ تعلیم عربی زبان تھی۔

۱۹۵۳ء میں فرانسیسیوں نے سلطان محمد خامس کو معزول کر کے ایک غیر مقبول شخصیت کو مراکش کے تخت پر بٹھادیا تو سارا ملک سراپا احتجاج بن گیا۔ سلطان کی بحالی کی تحریک میں استاد عبداللہ کنون نے قائدانہ کردار ادا کیا۔ جب سلطان محمد خامس مراکش کے تاج و تخت پر دوبارہ متمکن ہوئے تو انھوں نے عبداللہ کنون کو طنجہ کا حاکم اعلیٰ مقرر کیا۔ اس کے بعد جب طنجہ کے بین الاقوامی علاقے کا مراکش میں انضمام ہوا تو وہ سیاسی اور مالی معاملات طے کرنے کے لیے دول یورپ اور حکومت مراکش کے درمیان رابطہ آفیسر کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔

استاد عبداللہ کنون سیاست میں شروع سے دلچسپی رکھتے تھے۔ جب امیر عبدالکریم (ریف) نے فرانس اور اسپین کے خلاف اعلان جہاد کیا اور اس کے نتیجہ میں مراکش میں مکمل آزادی کے لیے جمعیۃ الوطنیہ قائم ہوئی تو انھوں نے اس کے قیام میں سرگرم حصہ لیا۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ سیاست دانوں سے مخلصانہ تعلقات کے باوجود وہ اپنے مخصوص افکار و نظریات سے کبھی بھی دست بردار نہ ہو سکے۔

استاد عبداللہ کنون کی سرگرمیوں کا اصلی میدان صحافت اور تصنیف و تالیف تھا۔ وہ بیک وقت عالم، مورخ، ادیب اور صحافی تھے۔ ڈاکٹر محمد تقی الدین الہلالی نے تطوان سے ایک ماہ نامہ **لسان الدین** کے نام سے جاری کیا۔ (۱۹۴۶ء) تو ہلالی صاحب کے پاکستان اور جرمنی چلے جانے کے بعد وہ آٹھ نو سال تک **لسان الدین** کی ادارت کرتے رہے۔ اس رسالے میں علمی، ادبی اور سیاسی مقالات ہوتے تھے اور زبان کی صحت و صفائی کے باعث علمی و دینی حلقوں میں بہت پسند کیا جاتا تھا، لسان الدین کی بندش کے بعد وہ **رسالۃ الانوار** اور **المیثاق** اور **رسالۃ الاحیاء** میں بھی کام کرتے رہے۔

استاد عبداللہ کنون اندلس کی تاریخ کے علاوہ المغرب (طرابلس، تونس، الجزائر اور مراکش) کی علمی، ادبی، دینی اور سیاسی تاریخ کے بڑے واقف کار اور ماہر تھے، چنانچہ ان کی تصانیف کا محور یہی موضوع ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اسلام کے دفاع میں بہت سے مضامین لکھے ہیں، دشمنان اسلام کے اعتراضات کا جواب دیا ہے اور بہت سے نوادر تحقیق کے بعد شائع کئے ہیں، انھوں نے مستقل علمی کتابوں کے علاوہ بہت سے رسائل اور کتابچے بھی شائع کئے تھے جو وقتی مسائل پر لکھے گئے ہیں۔ ان کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم ان کی اہم کتابوں کا ذیل میں ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ **النبوغ المغربی**: یہ المغرب کی ادبی تاریخ ہے، جس کا تیسرا ایڈیشن تین جلدوں میں ۱۹۷۴ء میں بیروت سے شائع ہوا ہے اور علمی حلقوں میں بہت مقبول ہوا ہے۔ اس کا انگریزی و ہسپانوی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، میڈریڈ یونیورسٹی (اسپین) نے مصنف کو ڈاکٹریٹ دی ہے۔

۲۔ **ذکریات مشاهیر رجال المغرب**: المغرب کے مشاہیر علماء، ادباء، صلحاء کے حالات میں چالیس چھوٹے چھوٹے رسائل ہیں۔

۳۔ **احادیث عن الادب المغربی الحدیث**: معہد دراسات العربیۃ العالیہ، قاہرہ میں مصنف نے موجودہ ادب المغربی پر ایک لیکچر دیا تھا۔ (قاہرہ ۱۹۶۴ء)

۴۔ **القاضی عیاض بین العلم و ادب**: فخر مغرب عربی قاضی عیاض کے حالات میں ایک کتابچہ۔ (ریاض ۱۹۸۴ء)

۵۔ **مدخل الی تاریخ المغرب**: مغرب عربی کی تاریخ عہد اسلام سے لے کر عصر حاضر تک۔ (تطوان ۱۹۵۸ء)

۶۔ **شرح مقصورہ المکودی**: عبدالرحمٰن المکودی (م ۸۰۷ھ) کے مقصورہ کی لغوی اور ادبی تشریح جو مدارس عربیہ کے طلبہ کے لیے لکھی گئی ہے۔

۷۔ **نظرۃ فی منجد الادب و العلوم**: لبنان کے عیسائی فاضل لوئیس معلوف نے عربی لغت کو منجد کے نام سے ابجدی ترتیب سے شائع کیا تھا، جو اپنی تسہیل کی وجہ سے بے حد مقبول ہوئی ہے اور اس کے بیسیوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، لیکن علمی و دینی حلقوں میں اس پر بہت سے شبہات بھی ظاہر کیے جا رہے ہیں۔ قرآن اور احادیث کے لغات کی تشریح کے لیے اس پر مطلقاً اعتماد نہیں کیا جا سکتا، چنانچہ استاد عبداللہ کنون نے المنجد کی فروگزاشتوں کی نشاندہی کی ہے اور اسماء اور اعلام اور انساب کے بیان میں اس کی غلطیوں کی اصلاح کی ہے۔ (قاہرہ ۱۹۷۳ء)

۸۔ **ادب الفقہاء**: بعض ادبی حلقوں میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ اکثر علمائے دین کی کتابوں میں سلاست اور شگفتگی نہیں ہوتی اور وہ ادبی لطافت سے خالی ہوتی ہیں، اس تاثر کو دور کرنے کے لئے انھوں نے **ادب الفقہا** لکھی ہے، جس میں علمائے اسلام کی جاندار تحریروں کے اقتباس پیش کئے ہیں۔

استاد عبداللہ کنون عمر بھر اسلام کا دفاع کرتے رہے اور مسلمانوں کو صحیح اسلام کی طرف دعوت دیتے رہے۔ اس ضمن میں انھوں نے بے شمار دینی اور اصلاحی مضامین اخباروں اور رسالوں میں لکھے تھے، جو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں:

(۱) **مفاهیم الاسلامیہ** (طبع بیروت و دار البیضاء)، (۲) **اسلام رائد** (طبع رباط، ۱۹۷۸ء)، (۳) **تحرکات اسلامیہ** (مطبوعہ دار البیضاء)، (۴) **علیٰ درب الاسلام** (تطوان، ۱۹۷۲ء)، (۵) **شئون اسلامیہ** (مطبوعہ دار البیضاء)، (۶) **جولات فی الفکر الاسلامی** (تطوان ۱۹۸۰ء)، (۷) **منطلقات اسلامیہ**

(طنجہ ۱۹۸۰ء)، (۸) الاسلام اهدی (دارالبیضاء، ۱۹۸۴ء)، (۹) معسکر الایمان یتحدیٰ (طنجہ ۱۴۱۰ھ)۔

مذکورہ بالا کتب میں وہ حیرت سے مسلمانوں سے پوچھتے ہیں کہ اہل یورپ اپنے الحاد اور بے دینی کے باوجود اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت پر کمربستہ ہیں لیکن مسلمان اس کے برعکس یورپ والوں کی ہر ادا پر مرمٹے ہیں اور ان کی ہر بات کو تصدیق اور تحقیق کے بغیر مان لیتے ہیں۔ علی درب الاسلام میں ان کی مخاطب مسلم خواتین ہیں اور ان کو قرآن اور اسلام کی طرف دعوت دی گئی ہے بعض مضامین میں عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں اور ان کے انسداد کا ذکر ہے۔ انھوں نے بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے عربی ریڈرین بھی لکھی ہیں۔

استاد عبداللہ کنون نے مذکورہ کتابوں کے علاوہ بہت سے نوادر تحقیق اور بڑی محنت سے شائع کیے تھے، جن میں اہم ترین یہ ہیں۔

(۱) رسائل سعدیه: مراکش میں سعدی خاندان کے سرکاری مراسلات کا مجموعہ۔

(۲) قواعد اسلام (قاضی عیاض): یہ مختصر سا رسالہ لسان الدین میں شائع ہوا تھا۔

(۳) تلقین الولید الصغیر (عبدالحق اشبیلی): یہ رسالہ بھی لسان الدین میں چھپ کر شائع ہوا۔

(۴) شرح الاربعین الطبیہ: چالیس طبی احادیث کا مجموعہ جو علامہ عبداللطیف بغدادی نے سنن ابن ماجہ سے منتخب کی تھیں اور ان کی تہذیب و ترتیب شیخ محمد بن یوسف البرزالی نے کی تھی۔

(۵) مناهل الصفاء فی اخبار الملوک و الشرفاء (عبدالعزیز القشتالی)

(۶) المنتخب من شعرابی ذاکور (مطبوعہ طنجہ و قاہرہ)

(۷) دیوان ملک غرناطه یوسف الثالث (تطوان ۱۹۵۸ء)

(۸) عجالة المبتدی و فضالة المنتهی فی النسب (چھٹی صدی کے ماہر نسب ابوبکر الحازمی کی تصنیف مطبوعہ قاہرہ ۱۹۷۳ء)۔

استاد عبداللہ کنون بہت اچھے شاعر بھی تھے، چنانچہ ان کے کلام کے دو تین مجموعے رباط وغیرہ سے شائع ہو چکے ہیں۔ عبداللہ کنون کے تمام عالم اسلامی کے مشاہیر سے مخلصانہ تعلقات تھے اور یہ اکابر ان کو مختلف مسائل پر خطوط لکھتے رہتے تھے، چنانچہ ان کے بعض تلامذہ اور مداحین ان خطوط کو کئی جلدوں میں مرتب کر رہے ہیں۔

استاد عبداللہ کنون عالم عرب کی بہت سی علمی اور ادبی مجالس کے رکن تھے، جہاں ان کی آراء وتجاویز کو بڑی قدر و وقعت سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ مجمع العلمی العربی (دمشق)، مجمع اللغة (قاہرہ)، مجمع اللغة (اردن) کے علاوہ رابطہ اسلامیہ، مکہ مکرمہ کے بھی سرگرم ممبر تھے۔ مصر، تیونس اور مراکش کی حکومتوں نے انہیں سرکاری انعامات اور خطابات سے بھی نوازا تھا، چنانچہ جب ۹/ جولائی ۱۹۸۹ء کو ان کا انتقال ہوا تو وہ سرکاری اعزاز و اکرام سے دفن کیے گئے۔ رحمة الله علیه رحمة واسعة۔

(مجله مجمع اللغة، دمشق) (ستمبر ۱۹۹۱ء)

پرتاب گڑھی، محمد احمد، مولانا

آہ! مولانا محمد احمد پرتاب گڑھی

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ میں رشد و ہدایت اور اصلاح وارشاد کی وہ شمع فروزاں بجھ گئی جس کو حضرت مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی نے روشن کیا تھا یعنی حضرت مولانا محمد احمد پرتابگڑھی اپنے ہزاروں مسترشدین اور عقیدتمندوں کو سوگوار اور اشکبار چھوڑ کر رفیق اعلیٰ سے جا ملے، رحمه الله رحمة واسعة۔

وہ اس دور کے شیخ کامل، عارف باللہ اور ''در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق'' کا مصداق تھے۔

راقم الحروف کو چند بار حضرت کی خدمت میں حاضری اور ان کے اشغال و معمولات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ان کی زندگی زہد و ورع اور سادگی و اخلاص میں سلف صالحین کا نمونہ اور خلق نبوی ﷺ کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ ان کو سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں نسبت حاصل تھی اور وہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے مسترشد مولانا شاہ بدرعلی صاحب رائے بریلوی کے خلیفہ تھے اس لیے وہ ہمیشہ طریقت پر شریعت کو مقدم رکھتے تھے اور اتباعِ سنت ان کا شعار تھا۔

تواضع و انکسار ان کی سرشت میں داخل تھا، کہیں سے اپنی برتری اور کمال کو ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے، ہر شخص سے لطف و محبت کا برتاؤ کرتے، ان کی شفقت و دلجوئی، اخلاص و بے نفسی سادگی و بے تکلفی، خورد نوازی اور مظاہر سے بے پروائی کی وجہ سے لوگ خود ان کے گرویدہ ہو جاتے تھے، جن لوگوں کو خانقاہی نظام کے رسوم و آداب سے واقفیت اور مناسبت نہیں ہوتی تھی وہ بھی ان کی دلنوازی و بے تکلفی کی وجہ سے ان سے مانوس ہو جاتے تھے، راقم الحروف سے وہ بڑا مخلصانہ تعلق رکھتے تھے اس لیے مجھے بھی ان سے بڑی انسیت ہو گئی تھی، میرے ایک بزرگ مولانا محمد عاصم اصلاحی مرحوم کے روابط ان سے بڑے مخلصانہ تھے اور وہ برابر اپنی اصلاح کے لیے ان کی خدمت میں تشریف لے جاتے تھے اور جب واپس آتے تو حضرت کا سلام و پیام مجھ کو پہنچا کر محجوب کرتے۔

ان کی مجلس میں نہ کسی کی غیبت و دلآزاری ہوتی اور نہ کسی پر تنقید، وہ صرف توحید و اخلاص کا درس دیتے، سنت کے اتباع اور بدعت سے اجتناب کی تلقین فرماتے اور اہل اللہ کا تذکرہ کر کے لوگوں کے ایمان و یقین میں اضافہ فرماتے۔

انہیں نام و نمود اور شہرت و جاہ سے نفرت تھی، اگر وہ بھی عام مشائخ اور ارباب

طریقت کا انداز اختیار کرتے تو پورے ملک میں ان کا غلغلہ مچ سکتا تھا لیکن ان کے دردیشانہ مزاج نے انہیں گوشہ گمنامی سے باہر نہ آنے دیا اس کے باوجود سالکین وطالبین کا رجوع ان کی ذات کی جانب بہت بڑھ گیا تھا اور خصوصیت سے مشرقی اتر پردیش کے لوگوں کو ان سے بڑا فیض پہنچا۔

مولانا شریعت وطریقت کے جامع تھے، ان کی دکان معرفت سے دردمندوں کی دوائے دل ہر وقت ملتی تھی، نفوس کی اصلاح وتزکیہ اور مسترشدین کی ہدایت وتربیت ہی ان کا اصل مشغلہ تھا، پیشہ ورانہ تقریر وتحریر کی نہ ان کو فرصت تھی اور نہ ان سے مناسبت تھی، اپنے حلقہ بگوشوں کے سامنے جو وعظ وارشاد فرماتے وہ نہایت دل پذیر اور موثر ہوتا بعض حضرات نے اس کو مرتب کر کے ''روح البیان'' کے نام سے دو حصوں میں شایع کیا تھا، اس میں رضائے الٰہی کے حصول، آخرت کے استحضار، کتاب وسنت کے اتباع، ذکر، تلاوت وعبادت کی فضیلت، اخلاق ومعاملات کی صفائی، تزکیۂ قلب، اخلاص نیت، اصلاحِ عمل اور اہل اللہ سے محبت وتعلق وغیرہ کی تاکید کی گئی ہے۔

مولانا کو شعر وسخن سے طبعی مناسبت تھی اور اس کا عمدہ اور ستھرا ذوق رکھتے تھے ان کی محفل ارشاد وہدایت ان کے پرسوز اور عشق ومستی سے معمور کلام کی وجہ سے ہمیشہ نہایت پراثر اور پرکیف ہوتی تھی ان کا مجموعہ کلام ''عرفان محبت'' کے نام سے شایع ہوا ہے یہ اسم بامسمّٰی اور سلوک ومعرفت کا لائحہ عمل ہے، مولانا کے نزدیک راہ سلوک کی سب سے بڑی دولت محبت ہے، اسی کو وہ اپنے مسترشدین میں لٹانا چاہتے تھے کیونکہ اس سے تمام اسرار وحقائق منکشف ہوجاتے ہیں، اسی لیے وہ خود بھی آتش عشق ومحبت میں مر کر جینا اور بسمل کی طرح تڑپنا پسند کرتے تھے ان کا یہ مجموعہ عشق ومحبت اور جوش ومستی کے انہی حقایق واسرار کی کیفیتوں اور لذتوں کی شرح وتعبیر اور لاہوتی ترانوں اور سرمدی نغموں سے معمور ہے، مولانا کا کلام زلف وگیسو، رخ وعارض اور گل وبلبل کی حکایت اور ہجر ووصال کی داستان کے بجائے ان کے قلبی واردات اور باطنی کیفیات کا آئینہ دار ہے اور یہ عشق کی مستی وسرشاری، محبت کی گرمی وشعلہ نوائی، جذبات کی لطافت وپاکیزگی اور خیالات کی معنویت وبلندی کا حامل اور بادۂ معرفت کا چھلکتا ہوا جام ہے۔

مولانا کا اصلی کمال یہ ہے کہ عشق ومستی اور جذب وکیف کے عالم میں بھی ان کا ہوش وحواس بجا رہتا ہے، اور وہ بندگی کی لذت کے مقابلہ میں حال وقال کی لذتوں کو ہیچ سمجھتے ہیں، مولانا کا کلام صوفیانہ عاشقانہ شاعری میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے اور یہ سلوک وتصوف کا ایک صحیفہ ہے۔ ان کا دل دینی حمیت اور اسلام کی محبت وحمایت کے جذبہ سے سرشار تھا یہ بھی ان کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت ہے وہ مسلمانوں کی طرح دنیا کے بگڑے ہوئے حالات کی اصلاح کا دلولہ بھی رکھتے تھے ایک موقع پر مسلمانوں کو معمارِ جہاں بن جانے کی اس طرح تلقین فرماتے ہیں ؎

رحمت کا ابر بن کے جہاں بھر میں چھائیے

عالم یہ جل رہا ہے برس کر بجھائیے

کاش مسلمان اپنا یہ فراموش شدہ سبق یاد کرلیں۔ (''ض''، نومبر ۱۹۹۱ء)

عمر، صباح الدین

صباح الدین عمر

افسوس ہے کہ اردو کے ایک عاشق وشیدائی جناب صباح الدین عمر کا انتقال ہوگیا، وہ لکھنؤ کی روایات کے بڑے دلدادہ اور اس کی تہذیب وثقافت کا نمونہ تھے، وہ سرکاری ملازم تھے، یوپی کے محکمہ اطلاعات کے اردو ماہنامہ ''نیادور'' کے ایڈیٹر بھی رہے، اتر پردیش اردو اکادمی کے قیام کے بعد اس کے سکریٹری ہوئے اور اس کا رسالہ اکادمی ان کی ادارت میں شائع ہوا، ریٹائرڈ ہونے کے بعد اردو اکادمی اور فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے برابر رکن رہے اور ان کو اپنے مشوروں اور تجربوں سے بڑا فائدہ پہنچایا، طبعاً شریف اور مخلص تھے، دوسروں کی مدد کرکے خوشی محسوس کرتے تھے، اللہ تعالیٰ اردو کے اس عاشق وخادم کی مغفرت فرمائے، آمین!! (''ض''۔ دسمبر ۱۹۹۱ء)

النمر، عبدالمنعم، ڈاکٹر

ڈاکٹر عبدالمنعم النمر

(مولانا قاضی اطہر مبارکپوری)

اس دور میں مصر کے دو ازہری عالموں نے ہندوستان کی اسلامی تاریخ اور یہاں کی علمی و دینی خدمات وشخصیات سے خصوصی اعتنا کیا ہے اور اس موضوع کے بارے میں عالم عرب اور عالم اسلام کے لیے بیش بہا معلومات فراہم کیں، ایک سابق وزیر اوقاف ڈاکٹر عبدالمنعم النمرؒ اور دوسرے مدیر کلیہ شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالعزیز عزت حفظہ اللہ وسلمہ، اس وقت شیخ عبدالمنعم النمر کا ذکر مقصود ہے، جنھوں نے ۲۷ ماہ ہندوستان میں رہ کر عربی زبان و ادب اور ثقافت کی تعلیم دینے کے ساتھ کشمیر سے مالابار تک سیاحت کر کے یہاں کے اسلامی آثار وتواریخ کا بغور مطالعہ کیا اور کتابیں لکھیں، نیز مولانا ابوالکلام آزاد پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور استاذ عبدالعزیز عزت نے یہاں کی متعدد کتابوں کا عربی میں ترجمہ شایع کیا، یہ دونوں عالم جامع ازہر اور موتمر اسلامی کی طرف سے ہندوستان میں مبعوث تھے، شیخ النمر کے ذکر سے پہلے استاذ عزت کا مختصر تعارف مناسب معلوم ہوتا ہے۔

استاذ عبدالعزیز عزت نے جامع ازہر میں تعلیم حاصل کی اور اسی میں اردو زبان سیکھی اردو کی کتابیں اور اخبارات و رسائل بے تکلف پڑھتے اور سمجھتے ہیں البتہ بات

چیت میں عربی اردو بولتے ہیں جس طرح یہاں کے علماء عربی کتابیں پڑھتے پڑھاتے ہیں اور گفتگو میں ہندی عربی بولتے ہیں اور دونوں کے لیے یہ عیب کی بات نہیں ہے بلکہ اس سے سننے والے اہل زبان کو لطف آتا ہے، وہ جامع ازہر اور موتمر اسلامی کی طرف سے بمبئی میں عربی زبان کی تعلیم کے لیے مبعوث ہوئے اور تقریباً چار سال کے بعد ۱۹۶۵ء میں واپس ہوئے، اس درمیان میں میرے ان کے تعلقات عزیزانہ انداز کے ہوگئے اس کے بعد وہ پاکستان میں مبعوث ہوئے اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی سیرۃ النبیؐ جلد سوم پر تحقیقی مقالہ لکھ کر کراچی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، نیز سید صاحب مرحوم کی کتاب ''عربوں کی جہاز رانی'' کا عربی میں ترجمہ ''الملاحۃ عند العرب'' کے نام سے شایع کیا جس کا مقدمہ پاکستان میں مصر کے سفیر سید علی ابوالفضل خشبہ نے لکھا ہے، موصوف نے مصر میں ایک ملاقات میں بتایا کہ اس کا مسودہ اسکندریہ یونیورسٹی کے استاد بحریات نے مطالعہ کے لیے طلب کیا اور تقاضا کے باوجود واپس نہیں کیا مگر بعد میں کسی طرح اس کو حاصل کر کے شایع کیا، موصوف نے میری کتاب ''عرب و ہند عہد رسالت میں'' کا ترجمہ ''العرب والهند فی عهد الرسالة'' کے نام سے کر کے ۱۹۷۳ء میں قاہرہ کی ''الهيئة المصرية العامة للكتاب'' سے شایع کیا، اور ''ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں'' کا ترجمہ ''الحکومات العربية فی الهند والسند'' کے نام سے مکتبہ آل مداللہ الکبر یہ ریاض سے شایع کیا، وہ فی الحال مجمع البحوث الاسلامیہ کے رکن رکین اور مدیر مکتبہ شیخ الازہر ہیں۔

شیخ عبدالمنعم النمر اگست ۱۹۱۳ء میں مصر کے مشہور شہر دسوق میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم مقامی درسگاہ میں حاصل کر کے جامع ازہر میں داخل ہوئے اور ۱۹۳۹ء میں کلیۃ اصول الدین سے عالمیت کی سند پائی، پھر وہیں سے ۱۹۴۱ء میں ماہر تعلیم کی سند حاصل کر کے جامع ازہر اور مصر کے دیگر معاہد و جامعات میں تعلیمی خدمت انجام دی، ۱۹۵۶ء میں جامع ازہر اور موتمر اسلامی نے ان کو دارالعلوم دیوبند بھیجا جہاں انھوں نے ۲۷ ماہ رہ کر عربی ادب و ثقافت کی تعلیم دی اور ہندوستان کی سیاحت کر کے یہاں کی اسلامی تاریخ و آثار کے متعلق معلومات جمع کیں، ان کے ساتھ شیخ عبدالعال العقباوی بھی استاد و معلم کی حیثیت سے تھے، ۱۹۶۵ء میں کویت کے مجلّہ الوعی الاسلامی کے رئیس التحریر ہوئے، اور مختلف علمی و فقہی موضوعات پر پُرمغز مضامین و مقالات لکھے، اسی دوران امارت عربیہ متحدہ سے مجلّہ المنار جاری کیا، ۱۹۷۸ء میں جامع ازہر کے وکیل بنائے گئے اور مدیر البعثات الازہریہ کی حیثیت سے مفوضہ خدمات بوجوہ احسن انجام دیں، ۱۹۷۹ء میں وزیر اوقاف بنائے گئے اور ۱۹۸۶ء میں حکومت مصر کی طرف سے ان کی علمی، تحقیقی اور دوسری مختلف خدمات کے اعتراف کے طور پر توصیفی سند پیش کی گئی اور مئی ۱۹۹۱ء (اواخر ذوقعدہ ۱۴۱۱ھ) میں قاہرہ میں انتقال کیا، رحمتہ اللہ علیہ۔

شیخ عبدالمنعم النمر کی شخصیت بڑی طرح دار تھی، وہ قدیم و جدید کے جامع اور متوازن ذہن و مزاج کے عالم تھے، علمی و تحقیقی اور تعلیمی و تصنیفی مشاغل کے ساتھ عالم اسلام کے مسائل و معاملات سے عملی تعلق رکھتے تھے، اسلامی و سیاسی موتمرات میں اپنی باوزن شخصیت اور صائب رائے کے ساتھ حصہ لیتے تھے، بہترین خطیب تھے، اپنی مختلف الجہات صلاحیت کی وجہ سے دینی و علمی اور سیاسی حلقوں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور اپنے اخلاق کریمانہ کی وجہ سے ہر طبقہ میں مقبول تھے۔

ایک موقع پر ان کے شیخ الازہر ہو جانے کا امکان پیدا ہو رہا تھا، راقم کی ان سے پہلی ملاقات اکتوبر ۱۹۵۶ء میں جمعیۃ علمائے ہند کے اجلاس سورت میں ہوئی اسی سال وہ دارالعلوم دیوبند تشریف لائے تھے، ہندوستان کی اسلامی تاریخ ان کی طرح میرا بھی خاص موضوع تھا، اس لیے دونوں میں اچھا خاصا تعارف و تعلق ہوگیا، بعد میں مکہ مکرمہ کے مجلّہ الحج میں انھوں نے المسلمون فی الهند کے عنوان سے مقالات لکھے جس میں بعض باتیں میرے حوالہ سے نقل کیں اور تقریباً دو ہفتہ تک ان سے تفصیلی ملاقات ۱۹۵۸ء میں بمبئی میں ہوتی رہی جب کہ وہ واپس جا رہے تھے، پہلی بار میرے کمرے میں آئے، اور اندر قدم رکھا تو بے ساختہ کہا یا سلام تاهلت بالکتب والکتابة، اس وقت چٹائی پر کتابیں اور اخبارات بکھرے ہوئے پڑے تھے، ان کا یہ جملہ میرے لیے سند کی حیثیت رکھتا ہے، اس وقت رجال السند والهند مطبع حجازیہ بمبئی میں چھپ رہی تھی، اس پر اپنی رائے لکھی اور مطبوعہ فرمے اپنے ساتھ لیتے گئے۔ اس کے بعد وہ تین بار بمبئی، دیوبند اور دہلی تشریف لائے اور اتفاق سے ہر بار ان سے ملاقات ہوتی رہی اور سب سے زیادہ ملنا جلنا قاہرہ میں ۱۹۷۸ء میں ہوا جب وہ مدیر البعثات الازہریہ تھے، اور میں عرب و افریقہ کے علمی سفر میں تھا۔

جس زمانہ میں ڈاکٹر صاحب الوعی الاسلامی کویت کے رئیس التحریر تھے، ایک لکھے پڑھے آدمی کو جو بمبئی آ رہا تھا، مجھ سے ملاقات کرنے اور سلام پہنچانے کی تاکید کی تھی، وہ صاحب عشاء کے وقت میرے کمرے میں آئے مغربی لباس میں تھے، حسب معمول کمرے میں چٹائی اور چادر بچھی ہوئی تھی وہ کھڑے رہے، میں نے تشریف رکھنے کو کہا، انھوں نے کہا کہ میں تاج محل ہوٹل کے فلاں کمرے میں ہوں، آپ وہیں آ جائیں، یہ کہہ کر وہ چلے گئے اور میں نہیں گیا، موجودہ دور کے مصر و عرب کے فضلا و مشائخ سمجھ نہیں سکتے کہ ہندوستان کے بوریہ نشین علما کس طرح دینی و علمی خدمت کرتے ہیں، انھوں نے ہندوستان سے واپس جا کر قاہرہ میں ہندوستان کے متعلق تین کتابیں تصنیف کیں: ۱۔تاریخ الاسلام فی الہند ۲۔کفاح المسلمین فی تحریر الہند ۳۔سبعۃ و عشرون شہراً فی الہند اور مولانا ابوالکلام آزاد پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی، تاریخ الاسلام فی الہند ۱۳۷۸ھ (۱۹۵۹ء) میں شایع ہوئی اور ۲۱/اپریل ۱۹۶۰ء کو

موصوف نے میرے پاس بھیجا، اس کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ جب جامع ازہر اور موتمر اسلامی نے مجھے ہندوستان بھیجنے کا ارادہ کیا تو میں بڑی کشمکش میں پڑ گیا کیونکہ اس ملک کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کو محمد بن قاسم ثقفی اور سلطان محمود غزنوی نے فتح کیا ہے اور یہاں کے لوگ ہاتھی پر سواری کرتے ہیں، اسی وجہ سے یہاں کی اسلامی تاریخ کی تلاش وتحقیق کا خیال پیدا ہوا اور یہاں آکر تدریس و تعلیم کی مشغولیت میں کشمیر سے مالا بار تک مختلف تقریبوں سے سفر کیے اور ہر جگہ مختلف ذرائع سے معلومات حاصل کی۔

مرحوم نے تاریخ الاسلام فی الہند کے ساتھ جو خط مجھے لکھا اس سے ان کی اسلامی ہند کی تاریخ سے گہری دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے، لکھتے ہیں کہ آپ کے پاس یہ کتاب بھیج رہا ہوں، مجھے امید ہے کہ اس میں آپ کے لیے خوش کن باتیں ہوں گی، نیز یہ کہ آپ مجھے اس کتاب کے بارے میں اپنی رائے لکھیں گے اور جو کمی ہو اس کی نشاندہی کریں گے تاکہ طبع ثانی میں اس استفادہ کروں، مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کی کتاب رجال السند والہند کی پہلی جلد شایع ہوچکی ہے، مجھے ایک نسخہ بھیج دیں اس طرح میں ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں ایک کتاب لکھ چکا ہوں جس میں ہندوستان کی تحریک آزادی سے قیام پاکستان تک مسلمانوں کی جدوجہد کی تفصیل بیان کی ہے، اس موضوع کے بارے میں اگر کوئی خاص بات معلوم ہو تو لکھیں تاکہ اس سے مدد لوں، اس سال (۱۹۶۰ء) قاہرہ کے ہندوستانی سفارت خانہ نے صوت الہند کے نام سے جریدہ شایع کیا ہے میں نے اس میں ایک طویل مقالہ "**النشاط العلمی و الاجتماعی للمسلمین فی الھند**" کے عنوان سے تحریر کیا ہے اور انجمن خدم النبی بمبئی اور اس کے ارکان کے بیان پر ختم کیا۔ یہ جریدہ عالم عربی میں تقسیم کیا گیا ہے، موسم حج کی مناسبت سے شایع کیا گیا ہے، اور حجاز میں بھی تقسیم کیا جائے گا۔

میری کتاب مترجمہ ڈاکٹر عبدالعزیز عزت **الحکومات العربیۃ فی الھند و السند** پر ڈاکٹر عبدالمنعم النمر مرحوم نے ۱۸/ اگست ۱۹۸۰ء کو نہایت شاندار مقدمہ لکھا ہے، مرحوم سے میرے آخری ملاقات گذشتہ سال دہلی میں ہوئی تھی جب وہ سرکاری مہمان کی حیثیت سے مولانا ابوالکلام آزاد صدی تقریبات میں آئے تھے، ان کی طلب پر میں نے **العقد الثمین فی فتوح الھند** پیش کیا اور کہا کہ آپ اب بوڑھے ہوگئے ہیں انھوں نے اس کے جواب میں کہا، و انت ایضاً۔ (جنوری ۱۹۹۲ء)

عطاء اللہ، منشی

منشی عطاء اللہ صاحب

افسوس ۲ر فروری کو دارالمصنفین کے مخلص اور قدیم کارکن منشی عطاء اللہ صاحب نے داعی اجل کو لبیک کہا، ان کا اصلی وطن کیرانہ ضلع مظفر نگر تھا، ۱۹۱۶ء میں دارالمصنفین میں پریس قائم ہوا تو ان کے بڑے بھائی منشی عبدالحفیظ صاحب مرحوم نے اس کے انصرام کی ذمہ داری قبول کی، ان ہی کے ساتھ یہ بھی اعظم گڑھ آکر شعبۂ طباعت سے وابستہ ہوئے، جب کبرسنی کی وجہ سے ملازمت ترک کرنی چاہی تو سید صباح الدین صاحب مرحوم کا شدید اصرار اس میں مانع ہوا، پھر اپنے سعادت مند فرزند ڈاکٹر محمد نعیم ندوی کے اصرار سے گھر پر آرام کرنا منظور تو کرلیا لیکن ان کا دل دارالمصنفین ہی میں لگا رہتا تھا، اس لیے جب تک قوت رہی برابر دوسرے تیسرے روز یہاں آتے رہے، وہ طبعاً نیک، صلح پسند اور دیندار تھے، اپنی دینداری کی وجہ سے اپنے اکلوتے بیٹے ڈاکٹر محمد نعیم ندوی کو حفظ کرانے کے بعد ندوہ میں داخل کیا، جو فراغت کے بعد دارالمصنفین کے رفیق رہے اور اب ابوظبی کے محکمۂ شرعیہ سے وابستہ ہیں، منشی عطاء اللہ صاحب اپنی نیکی، بھلمنساہت اور ملنساری کی وجہ سے شہر میں مقبول تھے، اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

("ض"، فروری ۱۹۹۲ء)

کیرانوی، محمد شمیم، مولانا

مولانا محمد شمیم کیرانوی

افسوس ہے کہ شعبان المعظم کے آخری ہفتہ میں مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کے ناظم مولانا محمد شمیم کیرانوی وفات پاگئے۔ اس مدرسہ کی داغ بیل ترکوں کے دور میں اس وقت پڑی تھی، جب حجاز میں مدرسوں کی تعداد بہت کم تھی، پہلے اس کی زمام کار مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے سنبھالی جن کا خاص مشن ردمسیحیت تھا۔ اظہار الحق کی تصنیف اور مشہور پادری فنڈر کو عبرتناک شکست دینا ان کا بڑا کارنامہ تھا۔

مولانا محمد شمیم کے والد بزرگوار مولانا محمد سلیم کیرانوی کی نظامت کے زمانہ میں مدرسہ صولتیہ نے بڑی ترقی کی۔ ان کی وفات کے بعد مولانا محمد شمیم صاحب نے مدرسہ کے لیے اپنی خدمات وقف کردی تھیں، انھوں نے اپنے والد ماجد کی روایات کو باقی رکھا۔ ہندوستان سے حج و زیارت کے لیے تشریف لے جانے والے علماء مشائخ کے آرام و آسائش کا وہ بڑا خیال رکھتے اور ان کو ہر قسم کی مدد اور سہولت بہم پہنچاتے۔ معارف اور دارالمصنفین کے بھی قدردان تھے اور کبھی کبھی خطوط لکھ کر ان سے اپنے تعلق کا ثبوت دیتے۔ مولانا کی عمر ابھی کچھ زیادہ نہیں تھی لیکن ان کی حیات مستعار کے دن پورے ہوچکے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور مدرسہ کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے، آمین۔

("ض"، اپریل ۱۹۹۲ء)

الاعظمی، حبیب الرحمٰن، مولانا

محدث العصر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی

محدث العصر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی عرصہ سے موت و حیات کی کشمکش میں گرفتار تھے، راقم ۲۳؍فروری کو مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کے امیر مولانا مختار احمد ندوی حفظ اللہ کی دعوت پر کلیۃ فاطمۃ الزہرا کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لیے مئو گیا تو مولانا الاعظمی کی عیادت کے لئے بھی حاضر ہوا لیکن ڈاکٹروں نے ملنے جلنے پر سخت پابندی لگا رکھی تھی، میری خواہش پر صاحب زادہ محترم مولانا رشید احمد صاحب نے دید و زیارت کا موقع مہیا کردیا لیکن اس وقت محدث کبیر نہ بات چیت کرتے تھے اور نہ آنکھیں کھولتے تھے، چند روز بعد مولانا رشید احمد صاحب نے خط سے اطلاع دی کہ اب بھی وہی کیفیت ہے بلکہ صحت مزید خراب ہوتی جارہی ہے، میں پھر عیادت کے لیے جانا چاہتا تھا کہ ۱۱؍رمضان المبارک کو حادثۂ جانکاہ کی اطلاع آگئی، اناللہ وَ انا الیہ رَاجعُون۔

محدث العصر نے طویل عمر پائی اور مصروف علمی زندگی گزاری، وہ ۱۳۱۹ھ میں پیدا ہوئے، اختر حسن تاریخی نام تھا۔ گھریلو تعلیم کے بعد انھوں نے مئو سے ملحق قصبہ بہادر گنج کے مدرسہ میں داخلہ لیا جہاں مولانا عبدالغفار عراقی کے بھائی مولانا ابوالحسن عراقی سے کسب فیض کرنے کے بعد مظہر العلوم بنارس میں داخلہ لیا، حصول تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند کا سفر دوبارہ کیا مگر دونوں بار طبیعت خراب ہوجانے کی وجہ سے واپس چلے آئے اور دارالعلوم مئو ہی میں مولانا کریم بخش سنبھلی کی خدمت میں رہ کر دورہ حدیث مکمل کیا، فراغت کے بعد یہیں درس و تدریس کی خدمت پر مامور ہوگئے، پھر مئو کے دوسرے بڑے مدرسہ جامعہ مفتاح العلوم سے وابستہ ہوئے اور اس کے صدر مدرس بھی رہے، یہاں سے علیحدہ ہوئے تو خود **المعهد العالی مرقاۃ العلوم** کی داغ بیل ڈالی جو اب مئو کے بڑے مدرسوں کی صف میں آگیا ہے۔

مولانا کا اصل مشغلہ درس و تدریس تھا، ان کے بے شمار تلامذہ اس برصغیر میں پھیلے ہوئے ہیں جن میں مولانا محمد منظور نعمانی ایڈیٹر الفرقان اور مفتی ظفیر الدین صاحب بھی ہیں۔ تاہم تحریر و تصنیف کا کام بھی وہ برابر انجام دیتے رہے اور انہیں اس کا اچھا سلیقہ اور عمدہ ذوق تھا، حدیث و اسماء الرجال ان کا خاص فن تھا اور اس پر ان کی نظر بڑی گہری تھی، مخطوطات سے بھی انہیں بڑا شغف تھا، ان کا مہتم بالشان کارنامہ احادیث کی بہت سی ان نادر کتابوں کی اشاعت ہے جو مخطوطہ ہونے کی بناء پر اہل علم کی دسترس سے باہر تھیں، مولانا نے ان کو ان کے مختلف نسخوں کی مدد سے مقابلہ، تصحیح و تعلیق اور مفید حواشی کے ساتھ شائع کرکے اصحاب علم و تحقیق پر بڑا احسان کیا، انھوں نے جن کتابوں کو ایڈٹ کیا ہے ان پر عالمانہ مقدمے بھی لکھے ہیں جن میں مصنف کے حالات و کمالات کے علاوہ ان موضوعات پر پہلے اور بعد میں لکھی جانے والی کتابوں کا تذکرہ کرکے زیر اشاعت کتاب کی اہمیت و عظمت دکھائی ہے، حواشی و تعلیقات میں مختلف نسخوں کے فرق و اختلاف اور متن میں درج آیتوں اور حدیثوں کی تخریج، رجال و اسناد کی تحقیق، مشکل و غریب الفاظ اور مشکلات حدیث کی تشریح کی گئی ہے، دوسری مشہور و متداول کتابوں کی حدیثوں سے زیر نظر کتابوں کی مطابقت یا اختلاف کو ظاہر کرکے ان کی صحت و خطا کا فیصلہ کیا ہے، شروع میں مخطوطہ کے بعض صفحوں کا عکسی فوٹو اور متعدد فہرستیں دے کر استفادہ و مراجعت کو آسان کردیا ہے، اس طرح کی جو کتابیں مرتب کی ہیں ان کے نام یہ ہیں:

مسند حمیدی، مصنف: ابن ابی شیبہ، مصنف: عبدالرزاق، کتاب السنن (حافظ سعید بن منصور) کتاب الزہد والرقائق (عبداللہ بن مبارک) مجمع بحار الانوار (ملا محمد بن طاہر پٹنی) **الحاوی علی رجال الطحاوی** وغیرہ۔

آخرالذکر رجال طحاوی پر خود مولانا کی بلند پایہ علمی و تحقیقی تصنیف ہے۔

اردو میں بھی مولانا کی متعدد تصانیف ہیں جو اکثر ردو مناظرہ میں ہیں ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں: (۱) **اعیان الحجاج** (دو جلدیں) (۲) **نصرۃ الحدیث** (۳) **الاعلام المرفوعه** (۴) **رکعات تراویح**۔

مولانا سلیس، شگفتہ، پرمغز اور حشو و زوائد سے پاک اردو لکھتے تھے جو **ماقل و مادل** کا نمونہ ہوتی تھی۔

مستقل کتابوں کے علاوہ انھوں نے معارف اور برہان میں متعدد محققانہ مضامین بھی لکھے ہیں، ان میں سے اکثر میں کسی مصنف یا مقالہ نگار کی فروگزاشتوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور یہ بڑے بیش قیمت ہیں جن سے علمی و تحقیقی کام کرنے والے بے نیاز نہیں ہوسکتے اس لیے معارف میں چھپنے والے ان کے مضامین کی ایک فہرست دی جاتی ہے۔

جوادساباط (جلد۲۱ عدد۴) دو متبرک اجازت نامے (جلد۴۰ عدد۶) **تخریج زیلعی** (جلد۴۶ عدد۱) **الدرایه فی تخریج احادیث الهدایه** (جلد۶۶ عدد۲) **مبارق الازهار** کس کی تصنیف ہے (جلد۷۳ عدد۱) پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں (جلد۷۵ عدد۴ و۵) قاضی رشید بن زبیر غسانی، اسوانی مصری مصنف الذخائر والتحف (جلد۸۷ عدد۶) دینور و مشائخ دینور (جلد۹۶ عدد۴) ابوعبید کی غریب الحدیث (جلد۱۰۰ عدد۴) غریب الحدیث (جلد۱۰۱ عدد۲) فہرست مخطوطات عربیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور (جلد۱۲۳ عدد۴)۔

مولانا متبحر عالم اور بلند پایہ محدث تھے اور اس حیثیت سے ہندوستان ہی نہیں بلکہ عرب ملکوں میں بھی وہ بے نظیر تھے، فقہ حنفی پر بھی ان کی وسیع نظر تھی جس کی تائید و حمایت میں پیش پیش رہتے تھے۔

لگن اور خاموشی سے علم و مذہب کی خدمت ہی مولانا کا مشن تھا اور اسی سے ان کو طبعاً مناسبت بھی تھی لیکن ان کا رجحان آزادی و اتحاد کی تحریک کی طرف رہا اور وہ کانگریس اور جمعیۃ علمائے ہند سے عملاً وابستہ بھی تھے، ۱۹۵۲ء میں مئو کے حلقہ سے کانگریس نے انہیں اسمبلی کے لئے اپنا امیدوار بنایا جس میں وہ کامیاب ہوئے اس زمانہ میں اسمبلی کی ممبری باوقار سمجھی جاتی تھی تاہم مولانا جیسے علمی آدمی کو اس سے کوئی مناسبت نہیں تھی اس لیے ان کا زیادہ وقت ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں گزرتا تھا اس سے فائدہ اٹھا کر ندوہ کے ارکان نے انہیں درس حدیث کی خدمت تفویض کردی جس کو وہ بلا معاوضہ انجام دیتے رہے۔ مگر دوبارہ انتخاب میں امیدوار ہونا پسند نہیں کیا، مولانا کی طویل علمی و تحقیقی خدمات کے صلہ میں حکومت ہند نے ۱۹۸۴ء میں انہیں صدر جمہوریہ کا ایوارڈ عطا کیا تھا۔

سیاست میں مولانا حسین احمد مدنیؒ کے مسلک سے قریب ہونے کی بناء پر مولانا اسعد مدنی سے بھی ان کو عزیزانہ تعلق تھا، چند برس قبل امارت شرعیہ ہند نے ان کو امیر الہند منتخب کیا تھا، بیعت و اجازت کا تعلق حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے تھا، مولانا محمد احمد پرتاب گڑھیؒ سے بھی ان کے دوستانہ تعلقات تھے اور دونوں بزرگ ایک دوسرے کے فضل و کمال کے معترف تھے، دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے رکن تھے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ان کے بڑے عظمت شناس تھے، دارالمصنفین آتے تو مولانا سے ملاقات کے لیے مئو بھی تشریف لے جاتے۔ شروع ہی سے مولانا اعظمی کا تعلق دارالمصنفین سے بھی تھا جو آخر تک قائم رہا، حضرت سید صاحب ان پر بڑا اعتماد کرتے تھے اور اپنی بعض تحریروں کو اشاعت سے پہلے ان کے پاس بھیجتے اور ان کے مشورے کے مطابق ان میں ردوبدل بھی فرماتے۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم بھی ان کا بڑا اکرام کرتے۔ چند برس قبل ان کو دارالمصنفین کی وقف کمیٹی کی رکنیت پیش کی گئی تو انھوں نے اس کو بخوشی منظور کرلیا۔

مولانا اس برصغیر ہی نہیں پوری اسلامی دنیا میں اپنے علمی و دینی کارناموں کی وجہ سے مشہور مقبول تھے، انھوں نے کئی مسلم ملکوں کا علمی سفر بھی کیا تھا۔ عرب ممالک کے ممتاز فضلا سے ان کے روابط تھے، شیخ عبدالفتاح غدہ ان کے بڑے مداح تھے، شیخ نذیر حسین مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا لاہور بھی ان کے بڑے قدرداں تھے، ایک دفعہ وہ دارالمصنفین تشریف لائے تو مولانا سے ملنے مئو بھی گئے۔

اپنے وطن میں مولانا کو جو مقبولیت حاصل تھی اس کا اندازہ ان کے جنازہ سے ہوا جس میں شرکت کے لیے دارالمصنفین سے راقم اپنے رفیق کار مولوی محمد عارف عمری اور مولوی احتشام علی ندوی کے ساتھ گیا تھا، مئو کے ہر گلی کوچہ میں آدمی دکھائی دیتے تھے، ہم لوگ بڑی زحمت سے مولانا کی قیام گاہ (پٹھان ٹولہ) پہنچے لیکن دید و زیارت کا شرف حاصل نہ کرسکے۔ ریلوے کے بڑے اور وسیع میدان میں جنازہ کی نماز کا اہتمام کیا گیا تھا، مولانا ہی کے ایک ہم نام اور اپنے اہل تعلق مولوی حبیب الرحمٰن ندوی کی معیت میں ریلوے میدان گئے، جہاں اتنے لوگوں نے نماز جنازہ ادا کی جن کی تعداد کا کوئی اندازہ نہیں ہوسکا البتہ بعض لوگوں کو جب یہ کہتے سنا کہ مئو میں ابھی تک کسی کے جنازہ میں نہ اتنا بڑا مجمع ہوا تھا اور نہ آئندہ اس کی توقع ہے تو ہم نے بھی اپنے دل میں کہا یہ اس عہد کے امام زیلعی اور ملا علی قاری کا جنازہ ہے جن کی زبان و قلم ہمیشہ احادیث کی شرح و ترجمانی اور ان کی مشکلات و غوامض کو حل کرنے میں مصروف رہے ہیں اور جن کا وجود گرامی علوم نبوی ﷺ کی خدمت و فروغ اور نادر و نایاب کتب احادیث کی طبع و اشاعت کے لیے وقف رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ عالم آخرت میں علم و دین اور احادیث نبویؐ کے اس خادم کے مراتب و درجات کو بلند کرے، آمین۔ (''ض''۔ اپریل ۱۹۹۲ء)

زیدی، بشیر حسین، کرنل

کرنل بشیر حسین زیدی

ابھی مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی موت سے آنسو خشک نہیں ہوئے تھے کہ ۲۹ / مارچ کو کرنل بشیر حسین زیدی بھی اللہ کو پیارے ہوگئے، ان کا خاندان سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں ہندوستان آیا اور پنجاب کے علاقہ کلانور میں قیام پذیر ہوا، شہاب الدین غوری کی افواج کے سپہ سالار قطب الدین ایبک نے دہلی کو اپنا پایۂ تخت بنایا تو درباری روابط کی بنا پر اس خاندان کے لوگوں نے بھی دارالحکومت کے قریب ضلع مظفر نگر میں موضع سنبھل ہیڑہ اور اس کے آس پاس کے مواضعات میں توطن اختیار کیا، اسی خانوادے کے ایک بزرگ سید عمر نے موضع ککرولی کو آباد کیا، زیدی صاحب ان کی بارہویں پشت میں تھے۔

یہ خاندان سادات بارہہ (روشن) کے نام سے مشہور ہوا جو تبدیل ہوکر سادات بارہہ ہوگیا، یہ لوگ اپنے علوئے نسب اور مکارم اخلاق کے علاوہ ہر دور میں شجاعت و بہادری کے لیے بھی ممتاز سمجھے جاتے تھے، مغلوں کے زمانے میں سادات بارہہ بلند مناصب پر فائز ہوئے اور اپنی سیاسی طاقت کی وجہ سے اورنگزیب کے بعد کے طوائف الملوکی دور میں بادشاہ گر کہلاتے تھے، بلگرام کے سادات بھی اسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جن کو حیدرآباد میں بڑا عروج نصیب ہوا۔

سید بشیر حسین زیدی کی ولادت ۳۰ / جولائی ۱۸۹۸ء کو قصبہ چھانسا (ضلع دہلی) میں ہوئی جہاں ان کے والد سید شوکت حسین بحیثیت سب انسپکٹر پولیس ملازم تھے، زیدی صاحب اسکول اور کالج کی تعلیم دہلی میں حاصل کرنے کے بعد ۱۹۱۹ء کے اواخر

میں کیمبرج گئے، ۲۳ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کرکے گھر آنے لگے تو حج بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل کی۔

وطن پہنچ کر انھوں نے میرٹھ میں وکالت کرنے کا ارادہ کیا جس کے بہت کچھ انتظامات بھی کرلیے تھے لیکن انگلستان کے قیام میں وہ صاجزادہ آفتاب احمد خاں کے بہت قریب ہوگئے تھے جو اس زمانہ میں وہیں تھے اور اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، زیدی صاحب ان سے اپنے آئندہ کے پروگرام کے بارے میں کچھ مشورے کے لیے علی گڑھ آئے تو انھوں نے ان کے علی الرغم انہیں علی گڑھ یونیورسٹی اسکول کی ہیڈ ماسٹری کا تقرری نامہ تھمادیا۔

مارچ ۱۹۳۰ء میں اسکول کی ذمہ داری سے سبکدوش ہوکر پھر انھوں نے وکالت کرنے کا ارادہ کیا لیکن رضا علی خاں والی رامپور نے ان کو اپنی ہائی کورٹ کا جج مقرر کردیا، ۳۶ء میں وہ ریاست کے مستقل طور پر چیف منسٹر ہوئے جس پر اس کے انڈین یونین سے انضمام ۴۹ء تک برقرار رہے۔

دوسری جنگ عظیم میں اور ریاستوں کی طرح رامپور نے بھی حکومت ہند کو فوجی امداد دی لیکن دوسری ریاستوں کے برخلاف رامپور بٹالین کا خرچ بھی ریاست کے خزانے سے ادا کیا گیا، اسی زمانے میں زیدی صاحب ریاست کی فوج میں اعزازی کرنیل بنائے گئے اور دوران جنگ انگلستان کی حکومت نے انہیں سی۔آئی۔ای کا اعزاز بھی دیا۔

۱۹۳۷ء میں بیگم قدسیہ سے ان کی شادی ہوئی جو زندگی بھر ان کی ہمدم وہم ساز اور شریک ومشیر بنی رہیں۔

۴۶ء میں زیدی صاحب حکومت ہند کی دستور ساز اسمبلی کے رکن مقرر ہوئے اور ریاست کے نمائندے کی حیثیت سے پارلیمنٹ کے رکن ہوئے ۵۱ء میں مجلس اقوام متحدہ میں ہندوستانی وفد کے رکن کی حیثیت سے گئے اور ۵۲ء میں کانگریس کے ٹکٹ پر ہردوئی سے لوک سبھا کے ممبر چنے گئے، ۵۶ء میں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے۔ اکتوبر ۶۲ء میں اس عہدہ سے سبکدوش ہونے کے بعد نظام ٹرسٹ کے ٹرسٹی مقرر کیے گئے اور ۶۴ء میں راجیہ سبھا کے ممبر ہوئے، اسی سال حکومت نے ایک خیر سگالی وفد مسلم ممالک بھیجا جس کی سربراہی زیدی صاحب نے کی۔ ۷۰ء تک راجیہ سبھا کے ممبر رہے، اسی زمانہ میں جامعہ نگر میں انھوں نے نجی مکان تعمیر کرایا اس وقت سے یہی گھر ان کا مسکن تھا کہ پیام اجل آگیا اور اب جامعہ ملیہ کے قبرستان میں ڈاکٹر انصاری مرحوم کے بغل میں مجیب صاحب اور عابد صاحب کے ساتھ محوخواب ہیں۔

زیدی صاحب کی پوری زندگی قومی خدمت اور سیاسی، تعلیمی، ثقافتی اور سماجی سرگرمیوں میں گزری، ان کے دل میں قوم و ملک کی خدمت کا جذبہ شروع ہی سے موجزن تھا، اسکول اور کالج کی طالب علمی کے زمانہ ہی میں بعض قومی رہنماؤں سے ان کی قربت ہوگئی تھی، ۱۸ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس دہلی میں پنڈت مدن موہن مالویہ کی صدارت میں ہوا تو یہ اس میں رضا کار تھے۔

کالج کے استادوں میں پروفیسر گھوش کے جذبہ خدمت سے متاثر ہوکر انھوں نے خدمت خلق کو اپنا وظیفہ حیات بنالیا تھا، طالب علمی ہی میں اپنے ہم جماعت رگھونندن سرن سے مل کر سوشل سروس لیگ قائم کی، ایک شبینہ اسکول کھولا جس میں غریبوں اور مزدوروں کے بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی، ایک ہاسپٹل وزیٹنگ گروپ اور ایک ریلوے اسٹیشن وزیٹنگ گروپ بھی قائم کیا تاکہ مریضوں کی تیمارداری اور تیسرے درجہ کے مسافروں کی مدد کی جائے۔

زیدی صاحب نے رامپور ریاست کے چیف منسٹر کی حیثیت سے اس کی فلاح و بہبود کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیئے، ان کے دور میں مستاجری کی ظالمانہ اور غیر منصفانہ لعنت ختم ہوئی، اس کی تنسیخ پر جو ہنگامے اور مظاہرے ہوئے انہیں زیدی صاحب نے اپنے تدبر اور خوش انتظامی سے ختم کردیا اور ریاست میں صنعت وحرفت کو فروغ دے کر خوش حالی اور فارغ البالی لادی۔

تعلیمی اصلاحات کی غرض سے خواجہ غلام السیدین کو ریاست کا تعلیمی مشیر مقرر کیا، اس میں صرف ایک ہائی اسکول تھا، زیدی صاحب کی کوشش سے ایک اور ہائی اسکول، ایک ڈگری کالج اور ایک گرلز ہائی اسکول قائم ہوگیا، تو دیہاتوں میں دوسو کے قریب پرائمری اسکول کھلے، رضا لائبریری کو بھی ترقی دینے اور کارآمد بنانے کی تدبیریں کیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ان کو شروع ہی سے لگاؤ تھا، ریاست رامپور نے اس کی ترقی میں جس قدر بھی حصہ لیا وہ انہی کی دلچسپی کا نتیجہ تھا، ۴۶ء میں اس کی سلور جوبلی ہوئی تو اس کے مصارف کے لیے زیدی صاحب نے ریاست سے ایک لاکھ روپے نقد دلائے، تنبو، قناتیں اور سارے سازوسامان بھی وہیں سے آئے تھے، جامعہ سے تعلق ہی کی بناء پر اس کے قرب میں اپنا مکان بنوایا۔

مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے انھوں نے اپنے تدبر اور حسن انتظام کے خوب جوہر دکھائے اور ان کے دور میں مختلف مفید اور تعمیری کام انجام پائے، مڈیکل کالج کی تجویز پرانی تھی مگر اس کو بروئے کار لانے کا سہرا انہی کے سر ہے، شعبہ دینیات کو موثر اور فعال بنانے کی تدبیریں بھی کیں، عمارتوں کی تعمیر سے ان کو بڑی دلچسپی تھی اور وہ علی گڑھ کے شاہجہاں کہلاتے تھے۔ مولانا آزاد لائبریری، پولی ٹکنک، اسٹاف کلب، فزکس لیباریٹری، جیولوجی لیباریٹری، آرٹس، فیکلٹی، کشمیر ہوسٹل، وائس چانسلر لاج اور کنیڈی ہال کی خوبصورت اور عالی شان عمارتیں ان کی یادگار ہیں، انہیں شجرکاری سے بھی دلچسپی تھی، شاندار عمارتیں اور تناور درخت لگوا کر انھوں نے یونیورسٹی کو گل وگلزار بنادیا۔

زیدی صاحب کو دوسرے علمی و تعلیمی اداروں سے بھی سروکار رہا، دارالمصنفین کے نہایت بہی خواہ اور مخلص کارکن تھے، اپنی دور اندیشی اور وسیع تجربات کی بناء پر نہایت مفید اور صحیح مشورے دیتے تھے، ہمیشہ اسے فائدہ پہنچانے کی فکر میں رہتے، پیرانہ سالی کے باوجود دارالمصنفین کے جلسوں میں شوق سے تشریف لاتے۔

زیدی صاحب کو فرقہ ورانہ تنگ نظری سے نفرت تھی، وہ ہندو مسلم اتحاد کے برابر حامی رہے، خود شیعہ تھے اور اپنے مذہبی خیالات میں پختہ تھے اور صوم صلوٰۃ کے پابند تھے۔ لیکن شیعہ سنی اور ہندو مسلم کی تفریق کو پسند نہیں کرتے تھے، ان کے دوستوں میں ہر فرقہ و مذہب سے تعلق رکھنے والے ہوتے تھے ان کے دوست رگھونندن سرن ایک ہوئی حادثے میں فوت ہوگئے تو ان کے بچوں کے ساتھ سگے بھائیوں کی اولاد جیسے سلوک کیا، ان کے ملازمین میں ہندو مسلمان دونوں تھے اور وہ ہر ایک کے ساتھ یکساں سلوک کرتے تھے، مسلم یونیورسٹی کے ہندو طلبہ کا خیال مسلمان طلبہ سے زیادہ رکھتے تھے۔

زیدی صاحب حکومت میں مقبول تھے ان کو بہت سے انعامات عطا کئے گئے اور مختلف کمپنیوں اور اداروں کے رکن بنائے گئے، پدم وبھوشن کا خطاب بھی حکومت نے دیا۔

زیدی صاحب ہر ایک سے لطف و شفقت کے ساتھ پیش آتے اور اس کے دکھ درد میں اس کی دلجوئی کو اپنا فرض خیال کرتے، بیوی، بچوں اور عزیزوں کے حقوق ادا کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے تھے، بیوی پر پورا اعتماد کرتے گھر کی ساری ذمہ داری انہیں سونپ دی تھیں، ریاست کے معاملات میں بھی ان سے مشورے کرتے تھے، انھوں نے بیوی کو برابری کا درجہ دے رکھا تھا اور ان کی آزادی میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرتے تھے، زیدی صاحب کا نام علی گڑھ کے وائس چانسلر کے لیے تجویز ہوا تو بیوی کو اس سے شدید اختلاف تھا اور وہ اپنی مشغولیتوں کی وجہ سے وہاں جانے کے تیار نہیں تھیں، تاہم زیدی صاحب نے ملک وقوم کی خدمت سمجھ کر یہ ذمہ داری قبول کر لی مگر بیوی پر علی گڑھ جانے کے لیے کسی طرح کا دباؤ نہیں ڈالا۔

زیدی صاحب کا حلقہ احباب وسیع تھا جس میں مخلصین کے علاوہ خودغرض قسم کے لوگ بھی شامل تھے، جنھیں صرف اپنے مطلب سے کام ہوتا مگر زیدی صاحب سب سے خلوص اور اپنائیت سے پیش آتے تھے، وہ دوسروں کی خدمت اور دوستوں کی مدد کر کے خوش ہوتے تھے اور کبھی کسی کو یہ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ اس پر کوئی احسان کر رہے ہیں بلکہ اسے اپنی سعادت سمجھتے کہ انہیں خدمت کا موقع ملا۔

زیدی صاحب کو کسی کی مخالفت کا خیال بھی دل میں نہیں آتا، بغض و عناد اور کینہ کپٹ سے ان کی طبیعت نا آشنا تھی، جو لوگ ان کی دشمنی اور عداوت پر کمربستہ رہے ان کو بھی انھوں نے معاف کردیا، رام پور کے چیف منسٹر کی حیثیت سے انھوں نے جو اصلاحات کی تھیں ان سے ایک طبقہ میں بڑی برہمی تھی انڈین یونین سے ریاست کے انضمام میں ان کا بڑا ہاتھ تھا، اس کی بناء پر ان لوگوں کو ان پر غصہ اتارنے کا موقع ملا، انھوں نے زیدی صاحب کے بھائی اور عزیزوں کا مکان لوٹا، نذر آتش کیا اور عزیزوں کو زدوکوب بھی کیا، اس بدامنی اور انتشار کو دور کرنے کے لیے انہیں فوج کی مدد لینی پڑی، مگر انھوں نے یہ سب انگیز کیا، کچھ ہی عرصہ بعد ملک میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے اور انہی مخالفین کے پانچ ہزار آدمی دہلی میں گھر گئے یہ لوگ فریاد کرتے ہوئے زیدی صاحب کے پاس آئے وہ اپنی جان پر کھیل کر دہلی گئے اور اسپیشل ٹرین کا انتظام کر کے انہیں واپس لائے حالانکہ اس وقت دہلی میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جارہی تھی، بیگم نے بہت منع کیا مگر وہ نہ مانے اور کہا مجھے ان سے بدلہ لینا ہے، وہ بولیں یہ کیسا بدلہ ہے، کہنے لگے کہ سیدوں کا بدلہ ایسا ہی ہوتا ہے۔

زیدی صاحب کے ملازمین ان کے گھر ہی کے افراد معلوم ہوتے تھے وہ ان کی ہر ضرورت و آسائش کا پورا خیال رکھتے، بعض ملازمین ان کی نرمی و مروت سے گستاخ ہوجاتے اور گھر گرہستی کے معاملہ میں ان کو فریب بھی دے دیتے مگر اس کی وجہ سے ان کے ساتھ زیدی صاحب کے رویے میں فرق نہیں آتا۔

زیدی صاحب ہماری قدیم تہذیب و روایت اور شرافت و وضعداری کی یادگار تھے، اب ایسے بامروت، خلیق، ملنسار، شائستہ اور باوقار لوگ معدوم ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی بشری لغزشوں کو معاف کرے اور ان کی مغفرت فرمائے، آمین!!

("ض"۔اپریل ۱۹۹۲ء)

تصحیح: معارف اپریل ۹۲ء میں کرنل بشیر حسین زیدی کے متعلق پر غلطی سے دارالمصنفین کا کارکن چھپ گیا ہے۔ وہ دارالمصنفین کے بہت معزز رکن تھے۔ ("ض"۔ جون ۱۹۹۲ء)

شروانی، عبیدالرحمٰن خان، مولوی

آہ! فرزند حبیب شبلی

قفانبک من ذکریٰ حبیب و منزل

نواب الحاج مولوی عبیدالرحمٰن خان شروانی کئی برس سے علیل تھے۔ ان کی زندگی کے معمولات میں فرق آ گیا تھا، کمیٹیوں میں شرکت کے لیے سفر سے معذور ہوگئے تھے۔ بڑھاپے اور عمر طبعی کو پہنچ جانے کی وجہ سے ضعف و نقاہت میں اضافہ ہورہا تھا۔ راقم کو گذشتہ سال دو بار عیادت و زیارت کی سعادت میسر آئی تھی۔ اور دونوں دفعہ بڑھتی ہوئی کمزوری اور معذوری کو دیکھ کر خیال ہوا تھا کہ یہ چراغ سحر بجھا ہی چاہتا ہے۔ بالآخر ۸ مئی کو صاحبزادہ والاتبار پروفیسر ریاض الرحمٰن خان شروانی کے تار سے یہ المناک خبر آ ہی گئی جس نے پھر اس ارشاد ربانی کی ایک بار تصدیق و توثیق کردی کہ کل من علیھا

فان[الرحمن: ۲۶]۔

دارالمصنفین کی بنا و تاسیس میں علامہ شبلیؒ اور ان کے متعدد اعزہ کی طرح نواب مولوی عبیدالرحمٰن خان شروانی کے خاندان کا بھی بڑا حصہ تھا۔ ان کے والد ماجد نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی مرحوم علامہ شبلی کے حبیب لبیب تھے۔ جب علامہ کے دل و دماغ پر دارالمصنفین ہی کا خیال چھایا رہتا تھا تو اس کے متعلق سب سے زیادہ انھی سے مراسلت و مکاتبت رہتی تھی۔ علامہ شبلی کی وفات کے بعد یہی رابط و تعلق دارالمصنفین کی جانب منتقل ہوگیا تھا جس کے مدۃ العمر وہ رکن رکین اور صدرنشین رہے، دارالمصنفین کے پہلے صدر جسٹس مولوی کرامت حسین اور دوسرے نواب عماد الملک اور تیسرے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی ہوئے، مولانا حمیدالدین فراہی کی وفات کے بعد ۱۹۳۰ء میں وہی اس کی مجلس ارکان کے بھی صدر بنے، دوسروں سے علامہ کے تعلقات میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہا لیکن ایک نواب صدر یار جنگ ہی کی ایسی ذات تھی جن سے عمر بھر اخلاص و مودت میں کمی نہیں آئی، ایک دفعہ مولوی عبیدالرحمٰن خاں شروانی نے فرمایا تم اندازہ نہیں کرسکتے کہ مولانا شبلی مرحوم سے میرے والد مرحوم کے کتنے گہرے اور مخلصانہ تعلقات تھے گویا متمم بن نویرہ کے بقول:

وکنا کندمانی جذیمة حقبة

من الدھر حتی قیل لن یتصدعا

علی گڑھ کا ممتاز و معزز شروانی خاندان بہلول خاں لودی کے دور میں ہندوستان آیا اور سپہ سالاری کے منصب پر فائز ہوا، اسی زمانہ میں اس خاندان کے دو اشخاص علی گڑھ میں آباد ہوئے جن کی اولاد مدت تک زمیندار رہی، درمیان میں جاٹ گردی کی وجہ سے زمینداری چھوڑ کر جلا وطن رہنا پڑا لیکن کچھ عرصہ بعد اسی خاندان کے ایک بزرگ باز خان صاحب اپنی آبائی ریاست پر قبضہ کرکے بھموری میں آباد ہوئے ان کو بڑا عروج نصیب ہوا، ان کے پیر و مرشد نے انہیں دوبارہ بھیکم پور میں متوطن ہونے کا حکم دیا، ان کے ایک بیٹے خاں زماں صاحب کے بیٹے محمد تقی خان صاحب مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کے والد بزرگوار تھے، باپ نے بیٹے کے نام پر حبیب گنج کو آباد کیا جو بھیکم پور سے کچھ فاصلہ پر واقع ہے، یہیں ربیع الاول ۱۳۱۵ھ مطابق اگست ۱۸۹۷ء میں نواب عبیدالرحمٰن خاں شروانی پیدا ہوئے جو نواب صدر یار جنگ کے خلف الرشید تھے۔ وکفی بہ فخراً۔

نواب عبیدالرحمٰن خاں شروانی حصول تعلیم کے لیے مدرستہ العلوم کے اسکول میں داخل ہوئے اور ۱۷ء میں عربک کالج دہلی سے انٹرنس پاس کیا ۱۸ء میں ایف اے میں علی گڑھ میں داخلہ لیا مگر والد ماجد کے حیدرآباد تشریف لیجانے کی وجہ سے ریاست اور خاندان کی ذمہ داری انہیں سنبھالنی پڑی اس لیے تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا، عملی زندگی میں قدم رکھتے ہی ان کو گونا گوں ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا پڑا کئی برس تک آنریری اسپیشل مجسٹریٹ رہے، ۲۳ء میں صوبہ کی آئین ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور پھر مسلسل ممبر منتخب ہوتے رہے ۴۵ء میں پہلی دفعہ انہیں الیکشن میں مقابلہ کرنا پڑا تو مخالف امیدواروں کی ضمانتیں ضبط ہوگئیں، ان سے زیادہ طویل عرصے تک شاید ہی کوئی اسمبلی کا ممبر رہا ہو، ان کی قومی خدمات کی بنا پر ۱۹۲۸ء میں حکومت نے انہیں خان بہادر کا خطاب دیا، مسلم لیگ کی آل انڈیا ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی رہے اور صوبہ کی زمیندار ایسوسی ایشن کے نائب صدر اور علی گڑھ کی زمیندار اسمبلی کے صدر چنے گئے، صوبہ کے بورڈ آف اکانمک انکوائری کی پلاننگ کمیٹی اور پبلک اکاونٹس کمیٹی کے ممبر اور صدر مقرر ہوئے چھ سال تک انٹرمیڈیٹ اور ہائی اسکول کے تعلیمی بورڈ کے اور تین سال تک یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے ممبر رہے۔

شروانی صاحب کی دلچسپی اور سرگرمی کا خاص محور مسلم یونیورسٹی تھی، جس سے ان کا ذمہ دارانہ تعلق ۱۸ء ہی میں قائم ہوگیا تھا جو اب وفات کے بعد جا کر ختم ہوا ہے، پہلے وہ اس کے فاؤنڈیشن کمیشن کے رکن ہوئے، ۲۳ء میں کورٹ اور ایگزیکٹیو کونسل کے رکن منتخب ہوئے، چار بار وائس چانسلر اور تین بار خازن مقرر ہوئے، ۸۴ء سے اب تک انھوں نے پرو چانسلر کے عہدے کو زینت بخشی، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے بھی وہ برابر وابستہ رہے، اس کے اسٹینڈنگ کمیٹی کے ممبر اور خازن رہے، کانفرنس کے کئی جلسوں کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر ہوئے ۴۹ء میں اپنے والد مرحوم کی جگہ اس کے سکریٹری مقرر ہوئے، چند برس تک ان کی ادارت میں کانفرنس گزٹ شایع ہوتا رہا، یونیورسٹی سے کبھی انھوں نے ایک حبہ کا بھی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اس کے لیے ہمیشہ اپنی دولت، محنت، وقت اور قابلیت کی قربانی دی، ۳۵ء میں وہ یونیورسٹی کے خازن ہوئے، اس وقت اس عہدہ کی تنخواہ پانچ سو روپے ماہوار تھی مگر انھوں نے یہ کام حسبۃً للہ انجام دیا۔

مرحوم کو یونیورسٹی سے غیر معمولی جذباتی لگاؤ تھا، وہ اس کو ہندوستانی مسلمانوں کا سب سے بڑا سرمایہ اور قیمتی متاع سمجھتے تھے، ان کے خیال میں یونیورسٹی نے مسلمانوں میں تعلیم کو فروغ دیکر ملک میں ان کے وزن و وقار میں اضافہ کیا ہے، وہ فرماتے تھے کہ اس کے لیے سرسید علیہ الرحمہ کو بہت کچھ طعن و تشنیع سننا پڑی، یہاں تک کہ ان کی تکفیر بھی کی گئی لیکن آج انہی لوگوں کی نسلیں اس سے فائدہ اٹھا رہی ہیں، یونیورسٹی سے ان کو ایسا عشق تھا کہ اس پر جب بھی کوئی آنچ آئی تو وہ بیقرار ہوگئے، اس کو مجروح کرنے کی جو کوشش و سازش کی گئی اسے وہ ناکام بنانے میں لگ گئے، یہاں شرپسند لوگ کوئی فتنہ و ہنگامہ برپا کرتے تو وہ کرب و اذیت میں مبتلا ہوجاتے، جب اس کا اقلیتی کردار ختم کیا گیا تو اس کو بحال کرنے کی مہم میں پیش پیش رہے۔

علی گڑھ کے بعد ان کو دارالمصنفین اور دارالعلوم ندوۃ العلما سے خاص لگاؤ تھا، دونوں کے رکن رکین تھے اور بڑی پابندی سے ان کے جلسوں میں شرکت کے لیے تشریف لاتے تھے، وہ دارالمصنفین کی متعدد کمیٹیوں کے ممبر تھے اور اسے اپنے تجربات اور بزرگانہ مشوروں سے پورا فائدہ پہنچاتے، ان کی رائے کا بڑا وزن محسوس کیا جاتا تھا، کبرسنی کی وجہ سے جب یہاں آنے میں ان کو دشواری ہونے لگی تو ان کی سہولت کے خیال سے جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب لکھنؤ اور دہلی میں جلسے کرتے اور کبھی کبھی ان کو لینے کے لیے آدمی بھی بھیجتے، دارالمصنفین سے ان کو ایسا والہانہ تعلق تھا کہ جب بھی ملاقات ہوتی تو یہاں کے ایک ایک شخص کی خیریت دریافت کرتے اور اس کی سرگرمیوں کے بارے میں واقفیت حاصل کرتے، اگر اس کے بارے میں کوئی ناخوشگوار بات سنتے تو بہت بے چین ہوجاتے، ادھر اس کی ایک تشویشناک بات سے بہت پریشان اور متردد رہتے تھے، دارالمصنفین کے لیے ان کا وجود بڑا سہارا تھا افسوس اب وہ ختم ہوگیا اور دارالمصنفین اپنے ایک بہت مخلص ہوا خواہ سے محروم ہوگیا، مولانا شبلیؒ سے فرط تعلق کی بنا پر شبلی کالج کو بھی بہت عزیز رکھتے تھے، انہیں مسلمانوں کے تمام اداروں سے ہمدردی تھی اور وہ سب کی مدد بھی کرتے تھے، دارالعلوم دیوبند، اسلامیہ کالج اٹاوہ، مزمل اسلامیہ انٹر کالج سکندرہ راؤ اور جامعہ اردو علی گڑھ وغیرہ سے ان کا باضابطہ تعلق تھا۔

مرحوم صوم وصلوٰۃ اور اورادو وظائف کے پابند اور مخیّر شخص تھے، سفر میں بھی تلاوت قرآن، شب بیداری اور سحر خیزی کے معمول میں فرق نہ آنے دیتے، جوانی ہی میں حج وزیارت کی سعادت حاصل کر چکے تھے، تدین، تقویٰ اور دینی غیرت وحمیت ان میں بدرجہ اتم تھی، اخلاص، بے لوثی، ہمدردی، دردمندی، شفقت و مروت، نرمی و ملاطفت، عفو وحلم، ضبط وتحمل، خوش خلقی، مہمان نوازی، تواضع اور انکساری ان کی سرشت میں داخل تھا تہذیب وشرافت، سنجیدگی وشائستگی، متانت و وقار، وضعداری رکھ رکھاؤ اور سیرت کی پختگی واستواری کا مجسم نمونہ تھے بڑے مرتب، ہر کام میں اعتدال پسند، نہایت چاق وچوبند اور وقت کے بہت پابند تھے، بے سلیقگی اور نظم وضبط کی خلاف ورزی، کو پسند نہیں کرتے تھے وہ رئیس تھے اور امارت وتنعم میں ان کی پرورش ہوئی تھی لیکن رعونت، نخوت، تمکنت اور گھمنڈ کا شائبہ بھی ان میں نہ تھا اور کسی کو اپنی ریاست وامارت کا حساس نہیں ہونے دیتے تھے، فروتنی کا یہ حال تھا کہ اپنے ملازمین اور صاحبزادگان کو بھی آپ کہہ کر مخاطب کرتے تھے، طبیعت میں بڑی خودداری اور استغنا تھا، مال و جاہ کی ہوس کبھی دامنگیر نہیں ہوئی خود نمائی، خودستائی اور شہرت ونمود سے نفرت تھی، گھر پر خدمت گزاروں کی کمی نہیں تھی لیکن اپنا ضروری کام خود ہی کر لیتے تھے، اپنے خوردوں کو بھی اپنی خدمت کا موقع نہیں دیتے تھے، بڑھاپے اور معذوری کے باوجود کسی سے کام لینا گوارا نہیں تھا، ہر طبقہ کے لوگ ان سے ملنے آتے تھے اور سب سے بشاشت سے ملتے اور یکساں انداز سے پیش آتے نہ کسی کی بڑائی سے مرعوب ہو کر اس کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے اور نہ کسی کو چھوٹا سمجھ کر اس کی تحقیر اور دلآزاری کرتے، بڑے معاملہ فہم تھے، بہت جلد ہر مسئلہ کی گہرائی میں پہنچ جاتے اور اس کا حل ڈھونڈ لیتے، نہایت مردم شناس تھے کوئی شخص ان کو دھوکا دے کر نہ ان سے غلط کام لے سکتا تھا اور نہ ناجائز سفارش کراسکتا تھا، وہ خود بھی علی گڑھ یونیورسٹی کے معزز عہدوں پر متمکن رہے لیکن اپنے اعزہ اور خاص متعلقین کو بھی ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں دیا، کسی نظام میں خلل انداز ہونا اور کسی شخص پر غلط دباؤ ڈالنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔

شروانی صاحب نے اپنی خاندانی روایات کو قائم رکھنے اور اپنے والد مرحوم کے متروکات کو ان کی اصلی حالت میں باقی رکھنے کے لیے سعی بلیغ کی اور حسن تدبیر سے اپنی زمین جائداد اور مکانات کو بھی بچایا، ان میں بھی اپنے والد ہی کی طرح ایسی صحیح مذہبیت اور راسخ العقیدگی تھی جس میں تعصب اور نفرت کا شائبہ نہ تھا، ان کو بھی مختلف الجہات اور متضاد خیالات رکھنے والے افراد سے تعلقات کو نبھانے کا اچھا سلیقہ تھا، جس سے جس نوعیت کا تعلق قائم ہوجاتا وہ پتھر کی لکیر بن جاتا، اختلاف خیال اور اختلافِ مذاق سے ہرگز اس میں کمزوری نہ پیدا ہونے دیتے، صبح کی تفریح میں جہاں جانے اور بیٹھنے کا معمول بن جاتا اس کو پختگی سے قائم رکھتے، مرحوم اعظم گڑھ تشریف لاتے تو صبح کی واک کے بعد میری قیام گاہ پر تشریف لاکر ہلکا ناشتہ اور چائے پیتے، وہ جب بھی اعظم گڑھ آئے تو اس معمول کے مطابق انھوں نے میری عزت افزائی فرمائی، دراصل وہ اپنے والد مرحوم کی سیرت و اخلاق کی تمام خوبیوں اور کمالات کی جیتی جاگتی تصویر اور الولد سر لابیہ کی مکمل مثال تھے، میں علی گڑھ جا کر اگر کبھی ان کے دولت کدہ پر قیام نہ کرتا تو ان کو تکلیف ہوتی جس کو کبھی کبھی ظاہر بھی کردیتے، افسوس اب وضعداری، شرافت، تہذیب اور شائستگی کا یہ نمونہ کبھی دیکھنے کو نہیں ملے گا، بارالٰہا تو نے اپنے اس نیک بندے کو دنیا میں جو عزت ومقبولیت بخشی تھی، عالم آخرت میں بھی اسے وہی اعزاز و کامرانی بخش اور اس کی نیکیوں کے بدلے میں اسے جنت نعیم عطا فرما آمین۔ برحمتک یا ارحم الراحمین۔ ("ض"، جون ۱۹۹۲ء)

زبیری، محمد مجید

محمد مجید زبیری

افسوس ۲۳ مئی کو شبلی کالج کے سابق استاد جناب محمد مجید زبیری کا علی گڑھ میں انتقال ہوگیا، ریٹائر ہونے کے بعد وہ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کے اصرار پر دارالمصنفین کے شعبۂ انصرام سے وابستہ ہوئے، اپنی نیکی، بھلمنساہت، صلح

پسند طبیعت اور ایمانداری و دینداری کی وجہ سے ہر طبقہ میں مقبول و محترم تھے، صحافی و شاعر بھی تھے تقریباً دو سال قبل سخت بیمار ہوئے، علاج کے لیے اپنی صاحبزادی کے پاس علی گڑھ چلے گئے اور وہیں سے سفر آخرت اختیار کیا، اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر و رضا کی توفیق دے، آمین۔ (''ض''، جون ۱۹۹۲ء)

حسن، مسعود، پروفیسر

پروفیسر مسعود حسن

(پروفیسر مختار الدین احمد)

علمی و ادبی دنیا میں یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ ۲۷؍مئی ۱۹۹۲ء کی شب کو عربی و فارسی کے مشہور استاد اور اردو کے ممتاز ادیب پروفیسر مسعود حسن طویل علالت کے بعد کلکتہ میں وفات پاگئے۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔

مسعود حسن ۵؍نومبر ۱۹۲۰ء کو اپنے وطن کھگول (دانا پور) ضلع پٹنہ کے ایک ممتاز اہلحدیث خاندان میں پیدا ہوئے جو وہاں کئی پشتوں سے آباد تھا اور اپنے مذہبی اور علمی خدمات کی وجہ سے مشہور تھا۔ ان کے والد منشی غلام قادر نے انہیں ان کے حقیقی ماموں حکیم مولانا محمد حسن (۱۸۸۰ء۔۱۹۶۱ء) کے سپرد کردیا جن کے سایۂ عاطفت میں ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی، متوسطات کی تعلیم مدرسۂ فیض عام مئوناتھ بھنجن ضلع اعظم گڑھ میں پاکر وہ ۱۹۳۳ء میں مدرسۂ اسلامیہ شمس الہدیٰ میں داخل ہوئے جہاں مدرسہ اکزامنیشن بورڈ سے ۳۳ء میں انھوں نے ''مولوی'' اور ۱۹۳۵ء میں ''عالم'' کے امتحانات میں کامیابی حاصل کی وہاں کے اساتذہ میں مولانا محمد سہول عثمانی، اصغر حسین بہاری، مولانا سید دیانت حسین دربھنگوی، مولانا ظفر الدین قادری (۱۸۸۵ء۔۱۹۶۲ء)، مولانا سید شاہ عبید اللہ (متوفی ۱۵ جمادی الاخریٰ ۱۳۵۸ھ)، مولانا عبدالشکور آہ مظفر پوری اور مولانا سید عبدالسبحان دسنوی کے نام یاد آتے ہیں۔ مولانا محمد سہول، مولانا اصغر حسین اور مولانا عبدالشکور مدرسۂ دیوبند کے تعلیم یافتہ تھے اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے شاگرد، مولانا دیانت حسین نے مدرسۂ عالیہ رام پور میں تعلیم حاصل کی تھی اور وہ معقولات میں مولانا فضل حق خیر آبادی اور مولانا حکیم برکات احمد بہاری ثم ٹونکی کے اہم تلامذہ میں تھے۔ مولانا ظفر الدین قادری، مولانا احمد حسن کانپوریؒ کے شاگرد تھے وہ مدرسۂ منظر اسلام بریلی کے فارغ التحصیل اور مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلویؒ (۱۲۷۲ھ۔۱۳۴۰ھ) کے تلمیذ خاص اور ان کے مجاز و خلیفہ تھے، مولانا شاہ عبید اللہ نے الجھر اور دوسرے مقامات کے علماء سے علمی فیض حاصل کئے تھے۔ جب کہ مولانا سید عبدالسبحان ندوۃ العلما کے تعلیم یافتہ تھے۔ مسعود حسن ایک دینی مدرسے سے تعلیم حاصل کر کے آئے تھے اس لیے ان کی علمی استعداد مضبوط تھی۔ عربی ادب سے ان کی خاص دلچسپی تھی، عربی لکھنے پر قدرت رکھتے تھے، ان کی شرح دیوان حماسہ دہلی سے شایع ہوئی تھی اور بہار کے دینی مدارس میں مروج تھی۔ مقامات حریری کے دس مقامات انہیں حفظ تھے اور اس کے فقرات و تراکیب اپنی عربی تحریر میں خوبصورتی سے استعمال کرتے تھے، اس لیے مولانا عبدالسبحان جو عربی ادب پڑھاتے تھے ان پر خاص طور پر شفقت فرماتے تھے۔

مدرسۂ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے دوستوں میں عبدالاحد شرف الدین پوری (جو بعد کو طبیہ کالج پٹنہ میں پروفیسر اور اس کے پرنسپل ہوئے) حفیظ الرحمٰن اوجؔ شمسی (جو تعلیم سے فراغت کے بعد اسی مدرسے میں استاد، پھر اس کے پرنسپل مقرر ہوئے)، عبدالقیوم مہجور شمسی سہسرامی (۱۹۱۵ء۔۱۹۷۴ء) اور حافظ ظہیر احمد مجروحؔ عظیم آبادی مرحوم کے نام اس وقت یاد آرہے ہیں۔ میں ان سے عمر میں چھوٹا تھا لیکن مجھ سے اس زمانے میں بھی ان کا برتاؤ دوستانہ رہا اور بعد کو جوان سے گہرے تعلقات قائم ہوئے وہ ہمیشہ استوار رہے۔

وہ مدرسے کی تعلیم کے بعد ۱۹۳۶ء میں اپنے بھائی ڈاکٹر محمود حسن کے پاس کلکتہ چلے گئے جو بعد کو وہاں کے ایک طبی ماہر اور سماجی کارکن کی حیثیت سے مشہور ہوئے ان کی وفات کلکتہ ہی میں ۷؍نومبر ۱۹۶۷ء کو ہوئی، مسعود حسن نے ان کے زیر سایہ رہ کر انگریزی کی تعلیم مکمل کی۔ انہوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے ۱۹۴۳ء میں عربی میں اور بعد کو فارسی میں بھی ایم اے کیا۔ دونوں امتحانات میں وہ فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوئے ان کے اساتذہ میں پروفیسر محمد زبیر صدیقی (المتوفی ۱۸؍مارچ ۱۹۷۶ء پروفیسر محمد محفوظ الحق (ولادت ۷؍جنوری ۱۹۰۰ء۔ وفات ۱۰؍جون ۱۹۴۶ء پروفیسر محمد اسحٰق (۱۲؍ستمبر ۱۹۶۹ء)، مولانا فضل الرحمٰن باقیؔ اور مولانا محمد اکبر ندوی (۱۵؍رمضان المبارک ۱۴۰۰ھ) تھے۔ ڈاکٹر صدیقی اور ڈاکٹر محمد اسحٰق کے طبائع میں بڑا فرق تھا اور ان کا طریقۂ کار بھی ایک دوسرے سے بہت مختلف، لیکن مسعود حسن کے تعلقات دونوں سے ہمیشہ استوار رہے، وہ اپنے اساتذہ میں مولانا فضل الرحمٰن باقیؔ (۱۸۹۷۔۱۹۶۳) کے تبحر علمی کے خاص طور پر قائل تھے اور ان کے اخلاق حمیدہ سے بہت متاثر۔ وہ ابن ربن الطبری (۱۶۵ھ۔قبل از ۲۴۶ھ) کی فردوس الحکمۃ (برلن ۱۹۲۸ء) مرتبہ پروفیسر محمد زبیر صدیقی پر ان کے تنقیدی مضمون کو تحقیق و تنقید کا بہت اچھا نمونہ سمجھتے تھے جو مولوی عبداللہ دہلوی کے فرضی نام سے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے اخبار ہند کلکتہ میں کئی قسطوں میں شایع ہوا تھا۔

انھوں نے اپنی ملازمت کا آغاز پٹنہ کالج سے کیا جہاں وہ ۱۹۴۶ء۔۱۹۴۷ء میں عربی کے لکچرر رہے۔ یہ عارضی جگہ غالباً وہاں کے لکچرر حافظ عبدالقدوس کے تحقیقی کاموں کے لیے انگلستان چلے جانے پر خالی ہوئی تھی۔ وہ ایک سال کے بعد ہی واپس آگئے تو مسعود حسن کلکتہ واپس چلے گئے، ۱۹۴۸ء میں ان کا تقرر عربی، فارسی اور اردو

کے لکچرر کی حیثیت سے ہوگلی محسن کالج ہوگلی میں ہوگیا، جہاں وہ ۱۹۵۲ء تک ان شعبوں کے صدر رہے۔ اسی سال وہ سنٹرل کلکتہ کالج کلکتہ میں عربی و فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۹ء میں وہ کلکتہ مدرسہ (سابق مدرسۂ عالیہ) کے پرنسپل بن کر آئے اور ۴؍جنوری ۱۹۶۴ء کو کوئی چھ سال کے بعد مدرسے سے سبکدوشی کے بعد وہ مولانا آزاد کالج کلکتہ میں اپنی سابقہ ملازمت پر واپس آگئے۔ یہاں وہ عربی فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر تھے۔ وہ ۱۹۶۷ء میں پروفیسر مقرر ہوگئے، جہاں وہ دس سال تک عربی و فارسی کے صدر رہے۔ ۱۹۷۷ء میں ان کی خدمات پبلک سروس کمیشن مغربی بنگال نے حاصل کرلی، وہ پانچ سال تک کمیشن میں اپنے فرائض بحسن وخوبی انجام دے کر ۱۹۸۲ء میں متقاعد ہوئے۔ وہ تقریباً بیس سال تک کلکتہ یونیورسٹی میں عربی و فارسی کے جزوقتی لکچرر کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔

مسعود حسن کے علمی وادبی ذوق کے بارے میں اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ کم عمری ہی میں جب وہ مدرسے کے طالب علم تھے ان کے افسانے، دوسری ادبی تحریریں اور عربی سے ترجمے، مسعود حسن دانا پوری، کے نام سے ادبؔی دنیا، ہمایوںؔ، ساقؔی اور موقر ادبی رسالوں میں شایع ہوتے تھے، جب وہ کلکتہ یونیورسٹی میں ایم اے کے طالب علم تھے انھوں نے اپنا ایک مضمون علامہ سید سلیمان ندویؒ کو معارف میں اشاعت کے لیے بھیجا۔ یہ جولائی ۱۹۴۲ء میں شایع ہوا، پھر معارف میں ان کے متعدد مضامین شایع ہوئے۔ پروفیسر محمد زبیر صدیقی (کلکتہ یونیورسٹی) (مئی ۱۹۷۶ء) مولانا محمد اکبر ندوی (معارف ستمبر ۱۹۸۰ء) اور مولانا ابوسلمہ شفیع احمد (معارف مارچ ۱۹۸۶ء کی رحلت پر ان کے جو مضامین ''وفیات'' کے عنوان کے تحت چھپے وہ اکثر قارئین معارف کو یاد ہوں گے۔

اردو کے مشہور انشا پرداز ل۔ احمد (لطیف الدین احمد ۱۸۸۵ء۔ ۱۹۸۰ء) اکبر آبادی مقیم کلکتہ سے ان کے گہرے تعلقات تھے، وہاں کی انجمن ''سخن زار'' نے جشن احمد منانے کا منصوبہ بنایا تو مسعود حسن جو انجمن اور جشن کمیٹی کے اہم رکن تھے۔ وہ ان مضامین کو ایک مجموعے کی شکل میں شایع کرنا چاہتے تھے۔ کلکتہ میں اس کی اشاعت کا کوئی انتظام نہ ہوسکا تو انھوں نے اس مجموعے کے لیے جو مضامین لکھوائے تھے وہ مالک رام صاحب کو بھیج دیے جو اس زمانے میں ل۔ احمد پر رسالہ تحرؔیر (ادبی مجلس دہلی) کا ایک خصوصی نمبر شایع کررہے تھے۔ یہ مضامین تحرؔیر جلد ۸۔ ۳ (جولائی ۱۹۷۴ء) میں شایع ہوئے، جس میں ان کا بھی ایک مضمون شریک اشاعت ہے۔ ان کے ایک خط سے معلوم ہوا تھا کہ وہ سخن شعرا کے مصنف عبدالغفور نساخ (۱۸۳۴ء۔ ۱۸۸۹ء) کی خود نوشت سوانح حیات (نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال) مرتب کررہے ہیں اور اس پر مفصل مضمون بھی لکھ رہے ہیں۔

۱۹۳۲ء سے انھوں نے مضمون نگاری شروع کی، اگر ان کی علالت کے آخری پانچ سال نکال بھی دیے جائیں تو پچاس پچپن سال میں انھوں نے جو کچھ لکھا انہیں جمع کیا جائے تو یہ تحریرات دو تین جلدوں میں آئیں گی۔ ضرورت ہے کہ ان مضامین کا انتخاب مرتب کر کے شایع کر دیا جائے۔ ان کے احباب وتلامذہ اور مغربی بنگال اردو اکیڈمی کو اس طرف خاص طور پر توجہ کرنی چاہیے۔

مسعود حسن اردو نثر تو اچھی لکھتے ہی تھے، انہیں انگریزی زبان پر بھی قدرت حاصل تھی۔ اسلامک کلچر (حیدرآباد) جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال انڈوایرانیکا (کلکتہ) انڈین لٹریچر (ساہتیہ اکیڈمی دہلی) السٹرٹیڈ ویکلی (بمبئی)، اسٹیٹسمین (کلکتہ) وغیرہ میں شایع شدہ مضامین اس کے گواہ ہیں۔

پھلواری شریف (پٹنہ) کے ایک قدیم فارسی گوشاعر شاہ ابوالحسن فرؔد (ولادت ۱۰؍رجب ۱۱۹۴ھ، وفات ۲۴؍محرم ۱۲۶۵ھ) کے ضخیم دیوان کا مطالعہ کر کے انھوں نے ایک تفصیلی مضمون انگریزی میں لکھ کر انڈو۔ ایرانیکا جلد ۸ شمارہ ۲ (۱۹۵۵ء) کلکتہ میں شایع کرایا تھا۔ یہ کتابچے کی شکل میں سوسائٹی سے اب بھی ملتا ہے، عباسی شہزادی علیہ بنت المہدی (۱۶۰ھ۔ ۲۱۰ھ) کی زندگی اور شاعری پر ان کا مضمون اسلامک کلچر (حیدرآباد) میں چھپا جس میں انھوں نے مختلف قدیم مصادر سے اس کے اشعار بھی تلاش کر کے جمع کردیے ہیں۔ ابن حزم اور اس کی جمہرۃ الانساب پر ان کا مقالہ جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (جلد ۱۲: ۱) میں ۱۹۴۷ء میں شایع ہوا۔ انڈو۔ ایرانیکا میں بھی ان کے کچھ مضامین چھپے ہیں لیکن وہ شمارے اس وقت پیش نظر نہیں۔ میرزا انیسؔ پر ان کا ایک بہت اچھا مضمون خوشونت سنگھ اور قرۃ العین حیدر کے دورادارت میں السٹرٹیڈ ویکلی (بمبئی) میں چھپا تھا۔ جسے انیسؔ کے قدردانوں نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ ساہتیہ اکیڈمی کے انگریزی رسالے انڈین لٹریچر میں ل۔ احمد پر ان کا مقالہ شایع ہوا تھا ان کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ''ہندوستانی ادب کے معمار سیریز'' کے لیے انگریزی میں احمد پر ایک کتاب لکھ رہے تھے۔ انھوں نے جناب مالک رام صاحب سے جو اس وقت اکیڈمی کے جنرل کونسل کے ممبر اور اردو سیکشن کے سکریٹری تھے، دہلی جا کر اس کی اشاعت کے سلسلے میں بات بھی کرلی تھی۔

عربی واسلامیات سے ان کی دلچسپی گہری تھی۔ ۱۹۵۱ء میں وہ عہد عباسی کے غزل گوشاعر عباس بن الاحنف (متوفی ۱۹۲ھ) پر ایک مقالہ لکھ رہے تھے۔ دیوان العباس بن الاحنف کا ایک پرانا اڈیشن مطبع الجوائب، قسطنطنیہ کا ۱۲۹۸ھ کا چھپا ہوا ان کے پیش نظر تھا، میں نے انہیں مشورہ دیا کہ اپنے کام کی بنیاد اس جدید علمی اڈیشن پر رکھیے جسے ڈاکٹر عاتکۃ الخزرجی نے متعدد نسخوں سے مرتب کر کے قاہرہ سے ۱۹۵۲ء میں شایع کیا ہے۔

ابن حزم اندلسی (۳۸۴ھ۔ ۴۵۶ھ) ان کے محبوب مصنفوں میں تھے مراتب

الاجماع کا ایک قلمی نسخہ ان کے ذخیرۂ کتب میں تھا، کتب خانۂ خدابخش کے نسخے کی مدد سے انھوں نے اس کا متن مرتب کرنا شروع کیا اور اس پر ایک سیر حاصل مضمون لکھا، جس کا اختصار راقم الحروف نے اپنے دور ادارت میں علی گڑھ کے مجلّہ علوم اسلامیہ جلد ۱:۲ (دسمبر ۱۹۶۰ء) میں شایع کیا۔ کچھ اضافوں کے بعد یہ مقالہ انھوں نے دارالمصنفین اعظم گڑھ کی اسلامک اسٹڈیز کی کانفرنس میں پیش کیا۔ انھوں نے مراتب الاجماع کے مرتب کردہ متن سے حمد ونعت اور کتاب الطہارۃ کے ابتدائی حصے کا متن بھی مجلّہ علوم اسلامیہ میں اشاعت کے لیے بھیجا تھا، میں نے انہیں لکھا کہ یہ کتاب مکتبۂ قدسی قاہرہ سے ۱۳۵۷ھ میں شایع ہوئی ہے اسے بھی پیش نظر رکھیے اور مکمل کتاب ایک ساتھ شایع کیجیے۔

ابن حزم کی دوسری کتاب جس کی ترتیب وتصحیح کی فکر میں وہ برسوں رہے، جمھرۃ انساب العرب ہے، اس کا بہت اچھا نسخہ کتاب خانۂ خدابخش میں محفوظ ہے۔ جب وہ پٹنہ کالج میں عربی کے لکچرر تھے، ان کی نگاہ سے یہ نسخہ گزرا اور مصنف سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ جب وہ کچھ دنوں کے بعد کلکتہ واپس گئے تو انھوں نے عزم کرلیا کہ وہ اس نادر مخطوطے کو جو اب تک شایع نہیں ہوا تھا، پروفیسر محمد زبیر صدیقی (صدر شعبۂ عربی و فارسی و اسلامیات کلکتہ یونیورسٹی) کی نگرانی میں اڈٹ کرکے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے پیش کریں گے۔ انہیں خدابخش اور ذخیرۂ شاہ احسن اللہ سندھی کے نسخوں کا علم تھا۔ انھوں نے استاذ مرحوم علامہ عبدالعزیز المیمنیؒ سے جمہرہ کے دوسرے نسخوں کے بارے میں اطلاعات طلب کیں انھوں نے اطلاع دی کہ اس کے نسخے قاہرہ، استانبول وغیرہ میں ہیں، ایک نسخہ جو شاہ احسان اللہ سندھی کے ذخیرے میں سندھ میں محفوظ ہے۔ بہت بعد کا مکتوبہ ہے اور اس کی اہمیت نہیں لیکن نسخ خدابخش ورام پور جو علی الترتیب ۹ ویں اور ۱۰ ویں صدی ہجری کے لکھے ہوئے ہیں بہت اچھے ہیں۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ فی الحال ان دونسخوں کی بنیاد پر کام کرکے ڈاکٹریٹ کے لیے پیش کردیجیے، اس عرصے میں مصر وترکی کے نسخوں کی مائکروفلم یا عکس حاصل کیجیے اور اشاعت کے وقت ان سے مدد لیجیے، آپ ان کے حصول کے انتظار میں ابھی سے رہے تو کام میں تعویق ہوگی۔ وہ میرے مشورے پر عمل نہ کرسکے اور اگر کام انھوں نے کچھ کیا تھا تو اسے اتمام تک نہ پہنچا سکے۔

اس سے پہلے استاذ مرحوم کی نگرانی میں علی گڑھ کے ایک ریسرچ اسکالر مزمل حسین جمھرۃ انساب العرب کو بانکی پور، رام پور اور استانبول کے نسخوں کی مدد سے مرتب کررہے تھے، لیکن افسوس ہے کہ تکمیل سے پہلے وہ وفات پاگئے، ۱۹۳۶ء میں جرمن مستشرق اوٹو اشپیز جو یہاں شعبۂ عربی میں دوسال (۱۹۳۲ء۔۱۹۳۴ء) بہ حیثیت استاد مامور رہے تھے جاتے وقت مزمل حسین مرحوم کا مرتب کردہ متن اور مصورۂ استانبول اپنے ساتھ بغرض اشاعت جرمنی لیتے گئے وہ شاید جرمن اورینٹل سوسائٹی سے شایع کرانا چاہتے ہوں گے، جہاں سے بیسوں قدیم عربی مخطوطات شایع ہوئے ہیں اور اب بھی ہورہے ہیں لیکن کسی وجہ سے یہ کتاب شایع نہ ہوسکی۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں جب پروفیسر اشپیز سے میں بون یونیورسٹی میں ملا تو وہ عدم اشاعت کی کوئی وجہ بتانے سے قاصر رہے، بیس سال پہلے کی بات انہیں اچھی طرح یاد بھی نہ تھی۔ مزمل حسین کا مرتب کردہ نسخہ میں نے ان کے شعبے میں تلاش کیا، موجود نہ تھا میرا خیال ہے انھوں نے جرمن اورینٹل سوسائٹی کو مائنز (مغربی جرمنی) بھیج دیا ہوگا جہاں ان دنوں اس کا دفتر تھا، وہاں کسی وجہ سے یہ کتاب شایع نہ ہوسکی۔

ڈاکٹر عظیم الدین احمد (۱۸۸۰ء۔۱۹۴۹ء) سابق صدر شعبۂ عربی وفارسی واردو پٹنہ یونیورسٹی اور علامہ ابوعبداللہ محمد بن یوسف السورتی (۱۸۸۹ء۔۱۹۴۳ء) بھی کسی زمانے میں جمہرہ کی اشاعت کی فکر میں تھے۔ مولانا سورتی نے تو نسخۂ رامپور کی نقل تیار کراکے کتب خانۂ خدابخش کے نسخے سے اس کا مقابلہ بھی کرلیا تھا، وہ دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد سے اسے شایع کرانا چاہتے تھے، لیکن نامعلوم وجوہ کی بنا پر ان کا مرتب کردہ متن بھی اشاعت پذیر نہ ہوسکا، ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی بھی ایک زمانے میں اس کی ترتیب واشاعت کی فکر میں تھے۔

جمھرۃ نساب العرب لابن حزم کی اشاعت کسی ہندوستانی اسکالر مولانائے سورتی، ڈاکٹر عظیم الدین احمد، مزمل حسین، ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی، مسعود حسن کسی کی قسمت میں نہ تھی، فرانس کے مشہور مستشرق لیفی پروفنشال (پیرس یونیورسٹی) نے اسے مرتب کیا اور دارالمعارف قاہرہ نے ۱۹۴۸ء میں اس درّ بے بہا کو شایع کرکے اس سے استفادہ عام کردیا۔ اب اس کا بہت اعلیٰ علمی اڈیشن مرتبہ الاستاذ عبدالسلام محمد ہارون قاہرہ سے ۱۹۶۸ء میں شایع ہوگیا ہے۔

ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے کتابخانے میں ابوبکر محمد بن احمد الصنوبری الضبی (متوفی ۳۳۴ھ) کے دیوان کا ایک نسخہ محفوظ ہے (رقم ۲۰۲) جو اپنی ندرت کی وجہ سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ۱۹۶۳ء میں انھوں نے مجھے لکھا کہ دیوان الصنوبری کے مخطوطے کے بہت سارے حصے وہ دیکھ چکے ہیں، اب نقل کرنا باقی ہے۔ حالات زندگی کے سلسلے میں بہت سی معلومات انھوں نے جمع کرلی تھیں اور راغب الطباخ نے (اعلام النبلاء بتاریخ حلب الشہباء اور الروضیات (حلب ۱۹۳۲ء) میں جو اشعار الصنوبری کے درج کیے ہیں.....ان کا مقابلہ وہ دیوان کے مخطوطے سے کررہے تھے کہ انھیں اطلاع ملی کہ اس نسخے کی فلم دمشق کے کسی عالم نے منگوائی ہے اور وہاں بھیجنا منظور کرلیا گیا ہے اس خبر نے انہیں بالکل مایوس وافسردہ کردیا۔

اسی زمانے میں مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی (استاد تفسیر کلکتہ مدرسہ) عربی

زبان و ادب کے معروف عالم و محقق جن کے تحقیقی مضامین عربی رسالوں میں شایع ہوتے رہتے ہیں، دیوان الصنوبری مرتب کرنے پر آمادہ تھے، اس سلسلے میں ان سے میری خط و کتابت بھی رہی، میں سمجھتا تھا کہ معصومی صاحب کم وقت میں بہتر کام کرسکیں گے لیکن اس اطلاع پر کہ ایک شامی عالم اسے شایع کرنے والے ہیں، انھوں نے اپنا کام روک دیا۔ شاید اس لیے بھی کہ نشر و اشاعت کی جو آسانیاں عرب فضلاء کو حاصل ہیں وہ ہمیں میسر نہیں۔ میرے خیال میں جن اصحاب نے اب تک اس مخطوطے کی ترتیب میں دلچسپی لی، مولانائے معصومی اس دیوان کی ترتیب کے لیے ان سبھوں میں سب سے زیادہ موزوں تھے اور ان کا مرتب کردہ دیوان شام سے شایع شدہ اڈیشن سے ہر لحاظ سے بہتر ہوتا، دمشق سے اگر کوئی اڈیشن نکلا تو وہ میری نظر سے نہیں گزرا لیکن ایشیاٹک سوسائٹی کے اسی نسخے پر مبنی اڈیشن ڈاکٹر احسان عباس، استاد ادب عربی بیروت یونیورسٹی نے جواب مجث العلمی جامعہ اردن (عمان) کے ڈائریکٹر ہیں دیوان الصنوبری مع اضافات و استدراکات بیروت سے ۱۹۷۰ء میں شایع کردیا ہے، یہ بہت اچھا علمی و تنقیدی اڈیشن ہے۔

مسعود حسن کوئی تیس سال تک پٹنہ کالج، محسن کالج ہوگلی، سنٹرل کالج (موجودہ آزاد کالج) کلکتہ مدرسہ اور کلکتہ یونیورسٹی میں عربی و فارسی اور اسلامیات کی تعلیم دیتے رہے۔ اس عرصہ میں ہزاروں طالب علم ان سے فیضیاب ہوئے ہوں گے۔ اور ان میں سے کتنے حکومت کے اچھے عہدوں پر سرفراز ہوں گے اور کتنے ایسے ہونگے جو کالجوں، اسکولوں اور مدرسوں میں استاد کے فرائض انجام دے رہے ہونگے اور نئی نسل کو اپنے علمی فیوض سے سیراب کررہے ہوں گے۔

ان کا تعلق کلکتہ کے مختلف اداروں سے رہا۔ وہ ایران سوسائٹی کے لائف ممبر تھے، عرصے تک اس کی کونسل کے رکن اور مجلّہ انڈو ایرانیکا کے مقامی اڈیٹروں میں رہے، وہ ایشیاٹک سوسائٹی کے رکن تھے اور دس سال تک اس کے جوائنٹ فیلولوجیکل سکیریٹری رہے۔ وہ مولانا ابوسلمہ شفیع احمد کے ادارۂ ترجمہ و تالیف (کلکتہ) کے بڑے سرگرم کارکن تھے جہاں سے متعدد مفید کتابیں شایع ہوئیں۔

مسعود حسن خلیق اور متواضع تھے۔ وہ کم آمیز اور کم سخن تھے، خاموش طبیعت رکھتے تھے اور نرم لب و لہجے کے آدمی تھے۔ میں نے کبھی انہیں اونچی آواز میں بات کرتے نہیں سنا نا مناسب بات سن کر بھی وہ عام طور پر خاموش رہتے۔ اگر کسی مسئلے میں اختلاف ضروری ہوا تو وہ نہایت شایستہ لہجے میں اپنے خیالات کا اظہار کردیتے، نہ اپنی بات پر زیادہ اصرار کرتے اور نہ اسے منوانے کے لیے زیادہ جوش خروش کا اظہار کرتے۔ یہ ان کی زندگی کا عام رویہ تھا، خاص مواقع اور خاص مسائل پر ان کا انداز ضرور مختلف ہوتا تھا جو ایک فطری بات تھی۔ وہ عام طور پر جھگڑوں میں پڑنے سے گریز کرتے تھے اور اختلاف سے بچتے تھے، لیکن ان کی رایوں میں استحکام و صلابت ہوتی تھی اور جب وہ کوئی فیصلہ کرلیتے تھے تو اس پر مضبوطی سے قائم رہتے تھے، زندگی میں انھوں نے غلط فیصلے بھی اور اس کی پاداش بھی انہیں بھگتنی پڑی۔ میرے ناقص خیال میں کلکتہ مدرسہ میں پرنسپل ہوکر جانے کا فیصلہ کچھ صائب نہ تھا۔ وہاں کے اساتذہ سے (جن میں کچھ اہم اور لایق علما بھی تھے) اگر وہ اپنے تعلقات استوار رکھتے اور اپنے لطف و کرم، اپنی نرم گفتاری، خوش اخلاقی سے ان کے دل جیتنے میں کامیاب ہوجاتے تو وہ اس ذہنی کشمکش و ابتلا میں نہ پڑتے جس میں ان کی زندگی کے کئی قیمتی سال ضایع ہوگئے ان کے اس زمانے کے خطوط سے جو انھوں نے مجھے لکھے اندازہ ہوتا ہے کہ کیسی ذہنی کیفیت اور کیسے کرب میں مبتلا ہیں۔ اس نامناسب فضا نے ان کی کارکردگی کو خاصہ متاثر کیا اور ان کا ذہنی سکون درہم برہم کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو علمی منصوبے ان کے ذہن میں تھے انہیں بروے کار نہ لاسکے۔

مسعود حسن تنہائی پسند تو نہ تھے ہاں کم آمیز تھے۔ وہ زیادہ لوگوں سے تعلقات بڑھانے کے حق میں نہ تھے لیکن جن سے ان کے تعلقات ایک بار قائم ہوگئے، ہمیشہ قائم رہے۔ وہ دوستوں سے دوستی نبھانے کا سلیقہ رکھتے تھے، کلکتہ کے دوستوں میں جسٹس خواجہ محمد یوسف، پروفیسر جگدیش نرائن سرکار، پروفیسر عطا کریم برق، پروفیسر شاہ مقبول احمد، ڈاکٹر محمد صابر خاں، مولانا ابوسلمہ شفیع احمد (متوفی ۲۲/دسمبر ۱۹۸۵ء) سے ان کے دیرینہ مراسم تھے کچھ اور احباب بھی ہوں گے، ان کے مدرسہ شمس الہدیٰ کے دوستوں میں پروفیسر حکیم عبدالاحد اور راقم الحروف کے تعلقات کا زمانہ پچاس سال کو محیط ہے اس عرصے میں کتنے انقلابات آئے، حالات زیر و زبر ہوئے لیکن ان کی محبت اور ان کا خلوص ہمیشہ خوشبو بکھیرتا رہا۔

مرحوم اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا بڑا خیال رکھتے تھے چنانچہ انہیں بہت اچھی تعلیم دی اور ان کی بہت اچھی تربیت کی۔ خان بہادر مولانا ابونعیم محمد مبارک کریم سپرنٹنڈنٹ اسلامک اسٹڈیز حکومت بہار کے صاحبزادے مولانا محمد تبارک کریم فاضل شمسی (مقیم حیدرآباد) کی بیٹی ان کے عقد میں تھیں، یہ پانچ تعلیم یافتہ اور ہونہار بیٹے اپنی نشانی چھوڑ کر ۱۵/اپریل ۱۹۶۸ء کو رحلت کرگئیں۔ بڑے بیٹے سعید حسن تعلیم کی تکمیل کے بعد مرکزی حکومت میں ریلوے بورڈ میں اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ رشید حسن میکانیکل انجینئر ہیں اور کلکتہ کی ایک اہم فرم میں ملازم ہیں۔ وحید حسن ایک کامیاب ڈاکٹر ہیں اور کلکتہ ہی میں پریکٹس کرتے ہیں، حمید حسن نے اپنی تعلیم مکمل کرلی ہے اور فرید حسن بی کام کررہے ہیں۔ مرحوم کی دوسری شادی اپنے قریبی عزیزوں میں ہوئی، ان کے بیٹے لبید حسن اور ولید حسن چھوٹے ہیں اور اسکول میں تعلیم پارہے ہیں، خدا ان سبھوں کو خوش و خرم رکھے اور دینی و دنیوی سعادتوں سے مالا مال کرے۔

مسعود حسن مرحوم نے متعدد علما کی رحلت پر رسالہ معارف میں ''وفیات'' کے تحت پُر معلومات تحریریں شایع کرائی ہیں آج اسی عنوان ''وفیات'' کے تحت مرحوم پر یہ صفحات شایع ہورہے ہیں۔ (ستمبر ۱۹۹۲ء)

اعظمی، عین الحق، الحاج مولوی

الحاج مولوی عین الحق اعظمیؒ

افسوس ہے کہ ۹ر اگست کو الحاج مولوی عین الحق اعظمی کانپور میں رحلت فرماگئے، اناللہ و انا الیہ راجعون۔ وہ ۱۵ر فروری ۱۹۱۳ء کو اعظم گڑھ کے ایک گاؤں میں جواب ضلع مئو میں ہے پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی مولوی کرنے کے بعد انٹرنس پاس کیا اور ۱۹۳۴ء سے اعظم گڑھ میں چمڑے کی تجارت شروع کی جس میں اللہ نے برکت دی مگر ان کی حوصلہ مند طبیعت اس پر قانع نہیں ہوئی اور ۱۹۵۹ء سے کانپور بھی ان کی جولانیوں کا مرکز ہوگیا، یہاں جاجمئو میں انھوں نے نیولائٹ ٹینری کی داغ بیل ڈالی اور جب کاروبار میں زیادہ وسعت و ترقی ہوئی تو ۱۹۶۷ء میں یہیں توطن اختیار کرلیا، اب یہ کاروبار اتنا بڑھ گیا ہے کہ ان کے پانچ بیٹے شب و روز اسی میں لگے رہتے ہیں۔

علم و تعلیم سے ان کو بڑا شغف تھا، اکثر دینی مدارس کی مالی امداد کرتے تھے خود مدرسۃ الاسلام کے نام سے اپنے گاؤں میں ایک مدرسہ قایم کیا، جس کے سالانہ جلسوں میں مولانا امین احسن اصلاحی اور دوسرے مشاہیر شریک ہوتے تھے، جاجمئو میں انھوں نے لڑکیوں کی تعلیم کے لیے جامعۃ الزہرا قائم کیا۔

دارالمصنفین کے علاوہ اعظم گڑھ میں علامہ شبلیؒ کی یادگاریں مدرستہ الاصلاح سرائمیر اور شبلی کالج بھی ہیں، تینوں اداروں اور ان کے ذمہ داروں سے حاجی صاحب مرحوم کے روابط تھے، دارالمصنفین میں ان کی آمد و رفت ۱۹۳۵ء سے شروع ہوگئی تھی انھوں نے اس کی فصل بہار دیکھی تھی، علامہ سلیمان ندویؒ اور مولانا عبدالسلام ندویؒ کی مجلس علم و ادب میں بھی وہ باریاب رہ چکے ہیں، کانپور میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد بھی جب وہ اعظم گڑھ آتے تو یہیں قیام کرتے مجھ پر ان کا خاص لطف و کرم رہتا، جب طبیعت ٹھیک رہتی تو ہر ہفتہ ان کا خط آتا میں بھی کانپور جاتا تو ان سے ضرور ملتا، اس سال رمضان سے پہلے وہ عمرہ کے لیے جارہے تھے تو مجھے تار دیکر بلوایا، کیا خبر تھی کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہے۔

دارالمصنفین میں باہر سے جو مہمان آتے یا اسکی مجلس انتظامیہ کے معزز ارکان تشریف لاتے تو شہر کے دوسرے عمائد کی طرح وہ بھی ان اکابر سے ملنے دارالمصنفین آتے اور اپنے یہاں چائے یا ناشتے پر مہمانوں کو مدعو کرتے وہ بھی دارالمصنفین کی دعوتوں میں مدعو ہوتے تھے۔

مولانا مسعود علی ندوی مرحوم اور حکیم محمد اسحاق صاحب مرحوم کانگریس اور جمعیۃ علمائے ہند کے سرگرم رکن تھے، دونوں سے خاص تعلق کی بنا پر حاجی صاحب بھی ان تحریکوں میں عملی حصہ لیتے، یہ اعظم گڈھ کی جمعیۃ کے سکریٹری بھی رہے۔

حاجی صاحب صوم و صلوٰۃ کے بچپن سے عادی تھے، صبح سویرے اٹھ جانے کا معمول تھا فجر سے پہلے تہجد پڑھتے اور تلاوت کرتے اور فجر بعد اوراد و ظائف میں مشغول رہتے، متعدد بار حج و زیارت سے مشرف ہوئے، زکوٰۃ تو نکالتے ہی تھے اسکے علاوہ بھی غریبوں اور ضرورت مندوں پر بہت کچھ خرچ کرتے رہتے تھے، علماء و صلحا سے برابر تعلق رکھا، حضرت مولانا علی میاں سے خاص تعلق تھا ان کی خدمت میں اکثر جایا کرتے، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ سے بیعت و ادارت کا تعلق تھا۔

برسوں سے صحت اچھی نہیں تھی اور موتواقبل ان تموتوا کی تفسیر بن گئے تھے، اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس نصیب کرے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین!

(''ض''۔ ستمبر ۱۹۹۲ء)

حسین، معظم، ڈاکٹر

ڈاکٹر معظم حسین

(پروفیسر مختار الدین احمد)

عربی و اسلامیات کے ایک جلیل القدر عالم، ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے سابق صدر اور وہاں کے سابق وائس چانسلر کی وفات کی خبر بنگلہ دیش سے مجھے بہت تاخیر سے ملی، ہندوستان کے اخبارات و رسائل میں تو اس سانحۂ علمیہ کا ذکر بھی نہیں آیا۔

پروفیسر ڈاکٹر سید معظم حسین، متحدہ ہندوستان میں عربی ادب اور علوم اسلامی کے اہم علماء میں تھے، وہ مشہور مستشرق پروفیسر مارگولیوتھ (متوفی ۱۹۴۰ء) اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے صدر کے نامور تلامذہ میں تھے، وہ ڈھاکہ یونیورسٹی سے امتیاز کے ساتھ عربی میں ایم اے کرنے کے بعد بنگال کی حکومت سے وظیفہ پاکر عربی زبان و ادب کے تنقیدی مطالعے کے لیے انگلستان گئے اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخل ہوکر کئی سال تک پروفیسر مارگولیوتھ کی نگرانی میں علمی تحقیقات میں مصروف رہے۔

مارگولیوتھ، اسلام کے خلاف جس قسم کے تعصّبات کے شکار تھے ان سے دنیائے اسلام اچھی طرح واقف ہے، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ عربی ادب کی خدمات میں وہ اپنے معاصرین میں بہت ممتاز رہے ہیں۔ عربی مخطوطات کی ترتیب و تہذیب سے ان کی گہری دلچسپی تھی۔ ہمیں ان کا احسان بھولنا نہیں چاہیے کہ تراث اسلامی کی تلاش بازیافت اور ان کی تصحیح و اشاعت کے کارناموں میں انھوں نے مکمل حصہ لیا۔ قدیم مسلم مصنفین کی متعدد تصانیف انھوں نے خود مرتب کر کے یا اپنے احباب اور تلامذہ سے

مدون کراکے انہیں ضایع ہونے سے بچالیا۔ یاقوت الحموی کی **معجم الادباء** اور متعدد علمائے عرب کی تصانیف نے ان کی بدولت نئی زندگی پائی، ان کے تلامذہ میں ہندوستانی طلباء میں افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق (مدراس) ڈاکٹر عابد احمد علی (علی گڑھ) ڈاکٹر محمد عبدالحق (حیدرآباد) کے نام یاد آتے ہیں۔ اول الذکر سے انھوں نے دیوان ابن سناء الملک مرتب کرایا، دوسرے سے ابن السکیت کی اصلاح المنطق اور تیسرے سے اسلامی عہد کے ایک شاعر پر کام کرایا۔ ڈاکٹر معظم حسین کے ذمے انھوں نے **المفضل الضبی** کی **المفضلیات** اور الاصمعی کی **الاصمعیات** کا انتخاب **کتاب الاختیار بن منسوب بابن السکیت** کی تصحیح وتحشیے اور انگریزی ترجمے کا کام سپرد کیا۔ مکمل کتاب تو اب کہیں نہیں ملتی، اس کی جلد دوم کا نسخہ فریتس کرنیکو کے پاس تھا جسے ۱۹۱۳ء میں انڈیا آفس کی لائبریری کے لیے حاصل کرلیا گیا تھا، یہ جلد ۱۱۶ قصیدوں پر مشتمل ہے جن میں ۲۳ **المفضلیات** میں اور ۲۱ **الاصمعیات** میں موجود ہیں۔ ۷۲ قصیدے ایسے ملے جو ان دونوں کتابوں میں موجود نہ تھے۔ ڈاکٹر معظم حسین نے دو قصیدے خالد بن الصقعب النہدی اور جبیہاء الاشجعی کے ایسے دریافت کیے جن کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ کتاب الاختیارین کے گم شدہ حصے کے ہیں، انھوں نے اس طرح ۷۴ قصیدوں کے متن کی تصحیح کی، ان پر حواشی لکھے اشعار کی تخریج کی اور سارے قصیدوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور ایک مفصل مقدمہ تحریر کیا۔ اکتوبر ۱۹۲۸ء میں انھوں نے اپنا کام مکمل کر کے یونیورسٹی میں داخل کیا جس پر انہیں ڈاکٹریٹ تفویض ہوئی۔

اپنے تحقیقی کام کے دوران انھوں نے یورپ کے بعض ممالک ترکی اور مصر کا علمی سفر کیا اور اہم اور نادر مخطوطات سے مستفید ہوئے۔ انگلستان سے ڈھاکا واپسی پر وہ شعبۂ عربی میں لکچرر پھر بعد کو پروفیسر اور صدر شعبہ بنے اور آخر میں ترقی کر کے اسی یونیورسٹی کے جس کے کبھی وہ طالب علم رہے تھے، وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ اس عہدۂ جلیلہ پر وہ متقاعد ہونے تک اپنے فرائض منصبی بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔

تصانیف:

ڈاکٹر معظم حسین نے عربی کے دو اہم مخطوطات پہلی مرتبہ مرتب کر کے شایع کیے۔

۱۔ **نخبة من کتاب الاختیارین للاخفش الاصغر: المفضل** الضبی (متوفی ۱۶۴ھ) نے قدیم اور اہم عربی شعرا کے قصائد کا ایک انتخاب تیار کیا، یہ المفضلیات کہلایا۔ عبدالملک بن قریب الاصمعی (متوفی ۲۱۶ھ) کے جمع کیے ہوئے قصائد الاصمعیات کے نام سے مشہور ہوئے، یہ مختارات بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھے گئے اور انکی متعدد شرحیں لکھی گئیں۔ الاخفش الاصغر (۲۳۵ھ۔ ۳۱۵ھ) نے دونوں مجامیع شعری سے کچھ اہم قصائد کا انتخاب مرتب کیا اور ان کی شرح لکھی۔ اس انتخاب نے کتاب الاختیارین کے نام سے شہرت پائی، عجیب اتفاق ہے کہ چوتھی اور پانچویں دوصدیوں تک یہ کتاب مفقودالخبر رہی، اس عہد کا کوئی مصنف اس کا ذکر نہیں کرتا۔ ابن خیر الاشبیلی پہلا مصنف ہے جو اس کتاب کا ذکر کرتا ہے لیکن یہ چھٹی صدی ہجری کی بات ہے۔ اس کے بعد یہ کتاب پھر گم ہوجاتی ہے اور تقریباً ۸۰۰ سال تک کسی مصنف کے یہاں اس کا ذکر نہیں پایا جاتا اور نہ کسی کتابخانے میں اس کے وجود کی اطلاع ملتی ہے، عربی زبان وادب کے نامور عالم اور یورپ کے مشہور مستعرب فریتس کرنیکو (۱۸۷۶ء۔ ۱۹۵۳ء) جو اسلام کی طرف مائل ہونے کے بعد اپنی عربی تحریروں میں اپنے کو سالم الکرنکوی لکھنے لگے اور جن کا دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے گہرا تعلق رہا، پہلے اسکالر ہیں جن سے ۱۳۲۵ھ میں ہمیں کتاب الاختیارین کا نام سننے میں آیا، انھوں نے اسی نادر کتاب سے جس کا نسخہ منحصر بفرد ان کے پاس تھا، طفیل بن عوف الغنوی کا، ۷۷ شعروں پر مشتمل قصیدۂ بائیہ نقل کر کے رایل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے جرنل میں ۱۹۰۷ء میں شایع کیا۔ جب انھوں نے ۱۹۲۷ء میں لندن سے دیوان طفیل الغنوی شایع کیا تو کتاب الاختیارین ان کے اہم مصادر میں تھی۔

اپریل ۱۹۷۶ء میں میں ایک عالمی کانفرنس میں شرکت کے لیے سوریہ گیا ہوا تھا جہاں جامعۂ حلب میں اس کے جلسے ہورہے تھے، وہاں ڈاکٹر فخرالدین قبادہ سے ملاقات ہوئی جو اس وقت جامعہ میں مدرس نحو وادب تھے۔ دوران گفتگو انھوں نے علامہ عبدالعزیز المیمنی اور ڈاکٹر معظم حسین کی خیر وعافیت دریافت کی۔ میں نے کہا افسوس ہے کہ یہ دونوں مشاہیر اب ہندوستان میں نہیں ہیں۔ میمن صاحب کراچی میں مقیم ہیں اور معظم حسین صاحب کا وطن ڈھاکا ہے جو اب بنگلہ دیش میں ہے اور وہ وہیں سکونت پذیر ہیں۔ ڈاکٹر قبادہ نے اطلاع دی کہ ڈاکٹر معظم حسین نے کچھ منتخب قصائد مرتب کئے تھے میں نے کتاب الاختیارین کی اہمیت کے پیش نظر اس کے جزو دوم کا مکمل متن اپنے حواشی وتعلیقات کے ساتھ ابھی حال میں دمشق سے شایع کیا ہے۔ انھیں صنعاء (یمن) میں اس کا ایک اور نسخہ مل گیا ہے، لیکن وہ بھی صرف دوسری جلد کا، پہلی جلد اب بھی مفقود ہے۔ انھوں نے دلچسپ اطلاع دی کہ کتاب الاختیارین ابن السکیت کی تالیف نہیں جیسا کہ کرنیکو اور معظم حسین سمجھتے ہیں، بلکہ یہ انتخاب الاخفش الاصغر کا کیا ہوا ہے، انھوں نے اس کے دلائل بھی دیے جو مجھے تشفی بخش معلوم ہوئے، میں نے کہا اصل بات یہ ہے کہ کرنیکو کو کتاب کی صرف دوسری جلد ملی، پہلی جلد کے سرورق پر دیباچے یا ترقیمے میں جامع کتاب کا نام ہوسکتا تھا، لیکن یہ جلد اب بھی مفقود ہے۔ بعض قیاسات کی بنا پر کرنیکو ڈاکٹر معظم حسین نے ابن السکیت کو اس کا جامع ٹھہرایا تھا، الاستاذ فخرالدین قبادہ نے معظم حسین کے شایع کردہ متن، اس کے حواشی اور مقدمے سے استفادے کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے: "**افادنی کثیراً فی تصویب بعض العبارات وزیادۃ بعض الابیات**"۔

نخبة من کتاب الاختیارین کوڈاکٹر معظم حسین نے ڈھاکا یونیورسٹی کے خرچ پر مطبع لطیفیہ دہلی سے ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۶ء میں شایع کیا۔ اس کا انتساب انھوں نے اپنے شفیق استاذ پروفیسر مارگولیتھ کے نام کیا ہے۔ الاستاذ فخر الدین قبادہ کا مرتب کردہ ایڈیشن مجمع اللغۃ العربیہ دمشق نے ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء میں شایع کیا ہے، جلد اول اب بھی کہیں مل جائے تو اس کا امکان ہے کہ اصل جامع کتاب کا معاملہ طے پا جائے۔ ویسے فی الحال یہ مان لینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ یہ انتخاب الاخفش الاصغر کا کیا ہوا ہے۔

۲۔ کتاب معرفة علوم الحدیث للحاکم النیسابوری:

یہ الامام الحاکم ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ الحافظ النیسابوری (۳۲۱ھ۔۴۰۵ھ) کی مشہور تصنیف ہے۔ ان کی کتاب المستدرک نے بہت شہرت پائی، عرصہ ہوا یہ دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد سے شایع ہوگئی ہے۔ المدخل الی علم الصحیح شیخ محمد راغب الطباخ نے حلب سے ۱۳۵۱ھ میں شایع کردی ہے، اس وقت معرفة علوم الحدیث شایع نہیں ہوئی تھی، ڈاکٹر معظم حسین نے اپنے آکسفورڈ کے کام سے فارغ ہونے کے بعد ۱۹۲۹ء میں اپنے ہاتھ سے برٹش میوزیم کے نسخے کی نقل تیار کی، پھر یورپ، ترکی، شام اور مصر میں انہیں اس کے مزید سات نسخے ملے، جن سے حتی المقدور انھوں نے مقابلہ متن و تصیح کلمات میں فائدہ اٹھا کر اس کا متن مرتب کیا اور ڈاکٹر کرنیکو کے مشورے پر دائرۃ المعارف حیدرآباد کو اشاعت کے لیے بھیج دیا۔ حسن اتفاق سے اس کتاب کے مزید تین نسخے کتب خانہ خدابخش، ذخیرۂ حبیب گنج علی گڑھ اور مکتبۂ آصفیہ حیدرآباد میں مل گئے۔ نسخۂ خدابخش کا تو انھوں نے پٹنہ جا کر اپنے تیار کیے ہوئے نسخے سے خود مقابلہ کیا، بقیہ دو نسخوں سے سید محمد ہاشم ندوی مدیر دائرۃ المعارف کی نگرانی میں دائرے کے مصحیحین نے مقابلہ کیا، یہ کتاب دائرۃ المعارف کے اخراجات پر مطبع دارلکتب المصر یہ قاہرہ میں ۱۳۵۶ء/۱۹۳۷ء میں چھپی۔ اس کا دوسرا اڈیشن مطبع دائرۃ العارف حیدرآباد سے ۱۳۸۵ھ/۱۹۶۶ء میں شایع ہوا۔

۳۔ اشعار سراقة بن مرداس البارقی:

سراقہ بن مرداس الازدی البارقی اموی عہد کا ایک قدیم شاعر ہے جو جریر و فرزوق کا معاصر تھا۔ طبقات الشعر للجھی، الموتلف والمختلف للآمری اور العقدالفرید لابن عبد ربہ میں اس کا مختصر سا ذکر ہے۔ کتاب الاغانی جیسی ضخیم کتاب میں اس کے صرف دو مقطوع درج ہیں اور وہ بھی کثیر اور جریر کے حالات کے ضمن میں، نقائص جریر و فرزدق اور بعض مصادر میں جریر و سراقہ کی مہاجات کے سلسلے میں بعض اطلاعات ملتی ہیں، طبری اور دوسرے مورخین کے یہاں اگر اس کا نام آیا ہے تو مختار بن عبید الثقفی سے آویزش کے سلسلے میں۔

سراقہ کی زندگی کے حالات پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ سال ولادت کیا سال وفات تک نہیں معلوم۔ بس اس قدر معلوم ہے کہ وہ ۶۶ھ میں مختار سے برسر پیکار تھا۔ اس جنگ میں وہ گرفتار ہوا لیکن اپنی مداہنت اور شاعری کی بنا پر وقتی طور پر اس نے نجات حاصل کرلی، ابن کثیر کی البدایۃ والنہایۃ میں ۷۹ء کے حوادث و واقعات کے ذیل میں اس کا نام متوفین میں ملتا ہے، امالی الزجاجی سے بھی (مات فی حدود ثمانین من الھجرة) اس کے سال وفات کی تعین میں مدد ملتی ہے۔

سراقہ کا مکمل دیوان (اگر کبھی مرتب ہوا تھا تو وہ) مفقود ہے۔ ابن الندیم کی کتاب الفھرست اور عبدالقادر البغدادی کی خزانتہ الادب میں اس کا ذکر نہیں۔ ڈاکٹر معظم حسین کو دیانا (آسٹریا) کے قومی کتب خانے میں اس کے اشعار کا ایک مختصر سا مجموعہ دست یاب ہوا۔ جسے فروری ۱۹۰۴ء میں غالباً کسی مستعرب نے برلن کے شاہی کتب خانے کے نسخے سے نقل کیا تھا۔ معلوم ہوا برلن کا نسخہ خود دارلکتب المصر یہ قاہرہ کے ایک جدید العہد نسخے (مکتوبہ ۱۲۷۹ھ) سے منقول ہے۔ ڈاکٹر مرحوم کو حسن اتفاق سے ترکی میں کتب خانہ عاشر آفندی میں اسکے اشعار کے ایک مجموعے پر نظر پڑی لیکن یہ بھی ناقص تھا اور درمیانی اوراق غائب تھے۔ اسی زمانے میں قاہرہ کے دوران سفر انہیں دارالکتب میں متعدد شعرائے عربی کے کلام پر مشتمل ایک مجموعہ علامہ الشنقیطی کے ہاتھ کا لکھا ہوا (مکتوبہ ۱۲۹۳ھ) ملا جس میں سراقہ کے کچھ ایسے اشعار بھی درج تھے جو ویانا اور ترکی کے مقدم الذکر نسخوں سے غیر حاضر تھے۔ ڈاکٹر معظم حسین نے ان تینوں مخطوطات (جن میں نسخۂ عاشر آفندی سب سے اہم ہے) کو پیش نظر رکھ کر سراقہ کے قصائد و مقطوعات کو بہت محنت، دیدہ ریزی اور نہایت احتیاط سے مرتب کیا، جن مصادر میں یہ اشعار ملے ان سے ان کا مقابلہ کیا اور متن کی تصحیح میں ان سے مدد لی، انھوں نے اسے جرنل آف دی رائل ایشاٹک سوسائٹی لندن کے دو شماروں (جولائی، اکتوبر ۳۶ء) میں ۳۵ صفحات پر شایع کیا۔ اس میں سراقہ کے اہم قصائد و مقطوعات ہیں بعض قصائد طویل ہیں اور ۱۵۷ اور ۱۷۹ ابیات پر مشتمل اور بعض مقطوعات دو دو تین تین اور چار چار شعروں کے ہیں، موضوع کے لحاظ سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس میں دو قطعے عبدالرحمٰن بن مخنف اور انکے بھائی محمد بن مخنف کے مرثیے میں ہیں، دو مختصر قطعات ابراہیم بن الاشتر پر ہیں اور دو جریر اور ایک فرزدق کی ہجو میں ہے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ قصائد و مقطوعات ہیں۔

تقریباً چالیس سال کے بعد ڈاکٹر حسین نصار نے دیوان سراقة البارتی، لجنة التالیف والترجمة والنشر قاہرہ کی طرف سے شایع کیا، ان کے سامنے وہی نسخے تھے جن سے ڈاکٹر معظم حسین استفادہ کر چکے تھے، اس فرق کے ساتھ کہ مرحوم کے پیش نظر ترکی کا اصل نسخہ کتب خانہ عاشر آفندی کا تھا اور ڈاکٹر حسین نصار کے سامنے اس

سے تیار کی ہوئی ایک نقل نویس کی نقل۔

مرتب نے ابتدا میں ایک تفصیلی بر معلومات مقدمہ لکھا ہے اور متن پر بہت محنت سے تفصیلی حواشی لکھے ہیں، اتنے تفصیلی کہ القینة (الامة مغنية كانت اوغير مغنية)، القطا (نوع من الطير)، المبين (الواضح)، اليفاع (المرتفع من الارض)، السمهرية (القناة الصلبة)، هزبر (الاسد)، الليث (الاسد)، المدامة (الخمر)، الطرف (الغين)، البيداء (الصحراء)، الفكاهة (المزاح)، الهيجاء (الهرب) جیسے مشہور لفظوں کے بھی معانی درج کیے ہیں جن سے عربی مدرسوں کے ابتدائی درجے کے لڑکے بھی واقف ہوں گے، انھوں نے حسان بن ثابتؓ، الاعشی، لبید، مصعب بن لازبیر، ابن الاعرابی، محمد بن حبیب البغدادی اور السکری وغیرہ ہم پر بھی سوانحی نوٹس تحریر فرمائے ہیں جو معروف اشخاص ہیں۔

دیوان مطبوعہ کے آخری صفحے (۱۰۶) پر سراقہ کے یہ دو شعر ہیں:

قالوا سراقة عنين" فقلت لهم

اللّه يعلم انى غير عنين

فان ظننتم بى الشى الذى زعموا

فقربونى من نبت ابن ياسين

ذیلی حاشیے میں مرتب نے العنین کی تشریح کی ہے: الذى لايقدر علىٰ اتيان النساء اولا يشتهى النساء لیکن یہ نہیں لکھا کہ یہ نبت ابن یاسین (یا بنت ابن یامین) کون ہے۔ یہ اطلاع ہمارے لیے مفید ہوتی۔ خاتمہ دیوان پر اصل نسخے میں یہ سطریں درج ہیں: "هذا آخر ماوجدته بخط الحسين بن على النمرى، يقول هذا آخر ماوجدته بخط السكرى، يقول هذا آخر ماوجدته فى كتاب ابن حبيب والحمدلله. و وجدت بخط الشيخ ابى احمر بعد ذلک: قابلت بجميع مامضىٰ، واعلمت عليه، وكتبت مالم يكتب فيه فى الحواشى"۔

مرتب دیوان نے ابواحمد پر دس سطروں کا نوٹ لکھا ہے۔ ان کے خیال میں یہ ابو احمد، مصنف کتاب التصحیف، ابو احمد الحسن بن عبداللہ العسکری اللغوی (۲۹۳ھ۔ ۳۸۲ھ) ہیں۔ یہ قرین صواب نہیں۔ یہ ابوالعلاء المعری کے دوست ابواحمد عبدالسلام البصری خازن دارالعلم بغداد (متوفی ۴۰۵ھ) ہیں۔ ابوعبداللہ الحسین بن علی النمری مصنف کتاب الملمع کی وفات ۳۸۵ھ میں ہوئی اور ابواحمد العسکری کی تاریخ وفات ۳۸۲ھ ہے۔ یعنی النمری کی وفات سے تین سال پہلے العسکری وفات پا چکے تھے۔ ابواحمد مذکور کو ۳۸۵ھ کے بعد کا ہونا چاہیے۔ یہ ابواحمد عبدالسلام الخازن ہی ہو سکتے ہیں۔

مرتب دیوان نے ڈاکٹر معظم حسین کی علمی کوشش، نسخوں کی تلاش، اس کے قابل قدر مقدمے اور حواشی کا ذکر نہیں کیا۔ اپنے مقدمۂ دیوان کی آخری سطور میں صرف یہ لکھنے پر اکتفا کیا کہ س: م۔ حسین الہندی نے مجلة الجمعية المكية الاسيويه لندن میں ۱۹۳۶ء کے دو شماروں میں اسے نشر کیا ہے اور یہ کہ ہمارے اڈیشن سے پہلے دیوان سراقہ مستقل کتابی صورت میں طبع نہیں ہوا۔ یہ مناسب اور علمی طریقہ نہیں۔ انھوں نے یہ نہیں لکھا کہ انھوں نے اس سے فائدہ اٹھایا یا نہیں۔ دیوان کی ترتیب جدید کے وقت ڈاکٹر مرحوم کا کام ان کے پیش نظر ضرور رہا ہوگا اور اس سے انھوں نے استفادہ بھی کیا ہوگا۔ لیکن پوری کتاب میں مرحوم کا کہیں ذکر نہیں۔ اگر طبع معظم حسین انھوں نے پیش نظر نہیں رکھا تو بھی یہ بات قابل اعتراض ہے۔ کسی قلمی نسخے کی ترتیب واشاعت کے وقت حتی الامکان سارے مخطوطات اور اگر کتاب چھپ گئی ہو تو مطبوعہ اڈیشن بھی سامنے رکھنا شرق وغرب کے علماء کا دستور رہا ہے۔ ڈاکٹر معظم حسین کا مرتب کردہ دیوان کا متن دنیا کے ایک مشہور رسالے میں شایع ہوا تھا جس سے استفادہ مشکل نہ تھا۔

یورپ، ترکی اور شرق اوسط کے قیام وسفر کے دوران ڈاکٹر معظم حسین کو عربی کے اہم مخطوطات کے مطالعے کے بڑے مواقع ملے کچھ کے عکسی نقول وہ ساتھ لائے ہوں تو عجب نہیں۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ منتهى الطلب من اشعار العرب لابن ميمون البغدادى سے ان کی گہری دلچسپی تھی۔ انھوں نے اس پر انگریزی میں ایک مضمون بھی لکھا تھا اور اس کتاب سے ایک قصیدہ انھوں نے شایع بھی کیا تھا۔ اس بات کا خاصا امکان ہے کہ انھوں نے مکمل کتاب نہ سہی اس کا ایک حصہ مرتب کیا ہو لیکن شایع نہ کر سکے ہوں۔

ڈاکٹر معظم حسین کی ایک تحریر مورخہ اکتوبر ۱۹۲۸ء سے جو آکسفورڈ میں لکھی گئی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ الاصمعیات کا مکمل اڈیشن مرتب کر کے شایع کرنا چاہتے تھے، اس اڈیشن کی تکمیل اور اس کی اشاعت کے بارے میں پھر کوئی اطلاع نہیں ملی۔ الاصمعیات کا وہ اڈیشن جو مستعرب آلوردنے برلن سے ۱۹۰۲ء میں شایع کیا تھا، غیر مکمل تھا۔ ڈاکٹر معظم حسین کے سامنے اس کا وہ قلمی نسخہ تھا جو کتب خانہ کوپرولو میں محفوظ ہے۔

ڈاکٹر معظم حسین کے اعزہ وتلامذہ اور ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے اساتذہ اگر ان کے ذخیرۂ کاغذات میں منتھی الطلب اور الاصمعیات کے سلسلے مسودات تلاش کر سکیں تو یہ ایک مفید علمی خدمت ہوگی، ہر چند کہ اب الاصمعیات کا بہت اچھا اڈیشن قاہرہ سے نکل آیا ہے اور منتھی الطلب کے کچھ اجزا اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔

مقالات:

ڈاکٹر معظم حسین نے زیادہ تر مقالات انگریزی میں لکھے ہیں۔ ان کا عربی میں ایک مقالہ جو دمشق میں چھپا تھا میری نگاہ سے گزرا ہے، ممکن ہے انھوں نے اور بھی لکھے ہوں۔

۱۔ الخيل والابل فى الشعر الجاهلى (مجلة المجمع العلمى العربى،

دمشق (جلد۲۲ص ۱۲۱۔۱۲۹) میں شایع ہوا)

۲۔ ایک غیر معروف قدیم عربی قصیدہ (روداد اجلاس ششم آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس میں چھپا، ۱۹۳۰ء)

۳۔ بنگال میں اسلامی تعلیمات (مطبوعہ اسلامک کلچر، حیدرآباد، ۱۹۳۴ء)

۴۔ قدیم عربی شاعری کا ایک غیر معروف مجموعہ (روداد اجلاس ہشتم آل انڈیا اورینٹل کانفرنس، ۱۹۳۵ء)

۵۔ اشعار سراقۃ بن مرداس البارقی (جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن، ۱۹۳۶ء)

۶۔ تلبیات الجاھلیۃ مطبوعہ روداد اجلاس نہم، (آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس، ۱۹۳۷ء)

۷۔ عہد سلطنت دہلی (۱۲۰۶ء۔۱۳۷۰ء) میں اہل الذمہ (مطبوعہ اسٹڈیز ان اسلام شمارہ۴، ۱۹۶۷ء)

۸۔ اسلام میں تعزیرات پرتوبہ کا اثر (مطبوعہ اسلامک اسٹڈیز شمارہ ۸، ۱۹۶۹ء)

میرا خیال ہے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے جرنل اور بنگلہ دیش کے علمی انگریزی رسالوں میں بھی انکے مضامین ضرور شایع ہوئے ہوں گے، لیکن وہ میری نظری سے نہیں گزرے اس کا بھی امکان ہے کہ عربی ادب اور اسلامیات پر ان کے مضامین بنگلہ زبان کے رسائل میں اشاعت پذیر ہوئے ہوں۔

ڈاکٹر معظم حسین اور الاستاذ عبدالعزیز المیمنی میں گہرے علمی روابط قائم تھے، قدیم عربی شاعری کا مطالعہ ان دونوں کا مشترک موضوع تھا۔ مرحوم کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ متن کی تصحیح اور قدیم مصنفین وشعرا کے حالات کے متعلق جب بھی انہیں مشکلات پیش آئیں تو انھوں نے بغیر کسی تکلف کے الاستاذ المیمنی کی طرف رجوع کیا، الاستاذ نے ایک تحریر مجھے لکھ کر دی تھی جس میں ان سے مستفید ہونے والوں میں نام تھے، یورپ، شرق اوسط اور ہندوستان کے بعض جلیل القدر علماء کے ساتھ ڈاکٹر معظم حسین مرحوم کا بھی نام ثبت تھا، ڈاکٹر معظم حسین بھی نئی اور اہم مخطوطات کے بارے میں الاستاذ کو اطلاع دیتے رہے تھے منتھی الطلب لابن میمون کی دریافت ڈاکٹر معظم حسین کی کوششوں کا نتیجہ ہے، انھوں نے دریافت کرتے ہی الاستاذ کو اسکی اطلاع دی اور ان کی طلب پر شعرا اور ہزار قصیدوں کی مکمل فہرست انہیں بھیج دی۔ یہ فہرست شعرا وقصائد اب میرے ذخیرۂ مخطوطات میں ہے۔

افسوس ہے کہ ایسے جلیل القدر عالم سے مجھے شرف ملاقات حاصل نہ ہوسکا۔ اگرچہ تعلقات قائم ہوئے اور ہمیشہ استوار رہے۔ ایک موقع ایسا آیا تھا کہ میں ڈھاکا جاکر وہیں کا اورانہی کا ہوجاتا۔ لیکن قضا وقدر کے فیصلے کچھ اور تھے۔ ۱۹۴۹ء کے اوائل میں ڈاکٹر معظم حسین نے الاستاذ کو لکھا کہ یہاں برنداین کالج اور ڈھاکا یونیورسٹی میں عربی کے ایک لکچرر کی ضرورت ہے، اپنے شاگردوں میں کسی ممتاز اور مستعد شخص کا نام بھیج دیجئے کہ تقرر کے لیے مناسب کاروائی کی جائے، الاستاذ نے میرا نام تجویز کیا اور ڈھاکا میں اسے منظور بھی کرلیا گیا، لیکن اس زمانے میں تقسیم ہند کی وجہ سے حالات غیر مستقیم تھے، پھر میں الاستاذ کی نگرانی میں ان کے خاص موضوع پر ریسرچ کرنی چاہتا تھا، اس لیے ڈھاکا کی لکچررشپ پر علی گڑھ کی طالب علمی کو ترجیح دی۔ میں علی گڑھ ہی میں رہا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔

اگست ۱۹۹۱ء میں ڈھاکا یونیورسٹی نے مجھے یونیورسٹی کے ایک کام سے مدعو کیا تھا، وہاں عربی، اسلامیات، فارسی اور اردو کے سارے اصحاب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ڈاکٹر معظم حسین سے ملنے کی خواہش کا ذکر کیا، ان کے شاگرد اور رفیق شعبہ پروفیسر سراج الحق سابق صدر شعبۂ عربی واسلامیات نے کہا ان سے اس وقت ملنا مناسب نہ ہوگا وہ سخت علیل ہیں، پھر کبھی آیئے تو ملاقات کراؤں گا، اب اطلاع ملی کہ وہ طویل علالت کے بعد ڈھاکا میں رحلت کرگئے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ واسکنہ فسیح بناتہ جزاء مابذل من جھد جاھد فی خدمۃ لسان تنزیلہ العزیز۔ (نومبر ۱۹۹۲ء)

دریابادی، عبدالقوی، حکیم

آہ! جناب حکیم عبدالقوی دریابادی مرحوم

جناب حکیم عبدالقوی دریابادی کے انتقال کی خبر دارالمصنفین میں نہایت غم و اندوہ کے ساتھ سنی گئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

وہ جنوری ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے تھے، اب ۷۹ برس کی حیات مستعار کے بعد جب انھوں نے رخت سفر باندھا تو محسوس ہوا کہ علم، ادب، صحافت اور طبابت ہی نہیں شرافت، مروت، وضعداری، سادگی، فروتنی اور عجز وانکسار کا ایک پیکر مجسم رخصت ہوگیا۔

مرحوم دریاباد کے اس معزز قدوائی خاندان کے چشم و چراغ تھے، جس کو دینداری، علم وفضل اور طب وحکمت میں غیر معمولی امتیاز حاصل تھا، اس خانوادے کے جد امجد خواجہ محمد آبکشؒ، مفتی مظہر کریم اسیر انڈمان وصاحبِ فتاویٰ مظہریہ ومترجم مراصد الاطلاع اور شفاء الملک محسن طب حکیم عبدالحسیب دریابادی کے سلسلۃ الذہب کی سب سے روشن وتابدار کڑی مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی ذات گرامی تھی جو اردو ادب کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکے، حکیم صاحب مولانا مرحوم کے داماد اور ان کے بڑے بھائی عبدالمجید صاحب مرحوم ڈپٹی کلکٹر کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے، ڈپٹی صاحب نیک نام سرکاری عہدیدار ہونے کے علاوہ علم وادب اور شعر وسخن کا بھی ستھرا اور اعلا ذوق رکھتے تھے۔

حکیم صاحب والد سے زیادہ اپنے نامور عم محترم کی تربیت اور سایۂ عاطفت میں

رہے، دس برس کی عمر میں حفظ قرآن مجید کی نعمت سے بہرہ ور ہونے کے بعد عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی، عربی ادب کی تعلیم انھوں نے مولانا خلیل عرب سے حاصل کی جو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بھی استاذ تھے، دونوں بزرگوں کے درمیان رشتہ اخوت و محبت کا آغاز اسی ہمدرسی کے زمانہ میں ہوا جو تمام عمر اس طرح استوار رہا کہ حکیم صاحب کی نماز جنازہ مولانا مدظلہ نے ہی پڑھائی، حکیم صاحب نے پنجاب اور لکھنؤ یونیورسٹی سے منشی فاضل، مولوی فاضل، عالم اور بی، اے کی سندیں بھی حاصل کیں، ابتداً شفاء الملک، حکیم عبدالحسیب، حکیم شمس الدین اور ڈاکٹر عبدالعلی حسنی وغیرہ سے طب وحکمت کا درس لیا پھر حکیم اجمل طبیہ کالج دہلی سے فاضل الطب والجراحت کی سندلی۔

حکیم صاحب طب میں ذی کمال تھے ان کی صداقت ومسیحائی کا اعتراف مریضوں کے علاوہ ناموراہل فن کو بھی تھا، مدۃ العمر طب کے پیشہ سے وابستہ رہنے کے باوجود حکیم صاحب نے اس کو کبھی وسیلہ معاش نہیں بنایا، ان کا اصل شغل بلکہ پیشہ صحافت تھی، مسلم لیگ کے اخبار تنویر کے مدیر ہونے کے علاوہ حق، قائد، ندائے ملت اور سیاست جدید کے اداریے برابروہی لکھتے رہے، ملک وملت کے علاوہ بین الاقوامی مسائل پر ان کے اداریے اور تعلیقات بہترین صحافت کا نمونہ ہوتے تھے، ان اخباروں کے متعدد کالم اور صفحات انہی کی تحریروں سے مزین رہتے تھے مگر اس میں بھی وہ پیشہ ور صحافیوں سے ممتاز تھے، نہ نام ونمود اور شہرت کے کبھی طالب ہوئے اور نہ اپنے حق المحنت کا کبھی مطالبہ کیا، واجبات پر انھوں نے کبھی توجہ نہیں کی، حرص وآز کے اس دور میں مالی حساب وکتاب سے ایسی بے نیازی کی مثال کہاں ملے گی، ان کی اصل تگ ودو کا مرکز ''صدق'' تھا جس کی طباعت واشاعت اور اہتمام وانصرام سے لے کر صدق بک ایجنسی کے تمام مسائل وامور کو وہ تنہا انجام دیتے تھے، مراسلت، اخبار کی کتابت، پریس اور ڈاکخانہ کے دشوار گزار مراحل ہفتہ وار اخبار کی متعین وقت پر اشاعت اور ان سب کے ساتھ بلاناغہ ہر جمعہ کو دریاباد جاکر ہفتہ کی صبح کو لکھنؤ واپس آنے کا معمول حکیم صاحب جس خاموشی اور استقلال کے ساتھ نبھاتے رہے اس کا یقین ان کے جیسے بظاہر کمزور، نحیف اور خاموش وجود کو دیکھتے ہوئے کسی شخص کو مشکل ہی سے آئے گا۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے انتقال ۱۹۷۷ء کے بعد صدق کی ادارتی ذمہ داری بھی ان پر آگئی اور جب تک خود ان کی شامِ زندگی کے دھند لکے گہرے نہیں ہوگئے وہ خوش اسلوبی سے صدق کی روایت ووراثت کو زندہ کیے رہے، اپنے عم محترم مولانا دریابادی کے مخصوص طرز ادب وانشا کو اپنانے میں گو وہ پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے تاہم انہی کی طرح اسلام اور اسلامی تہذیب وثقافت سے عشق وشیفتگی اور مغرب ومغربی تہذیب سے بیزاری اور نفرت ان کی بھی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی اور مولانائے مرحوم کی طرح مشرقی تہذیب وتمدن کی برتری کے اعتراف میں کبھی مداہنت سے کام نہ لیتے، حق کی حمایت اور باطل کے ردو احتساب میں وہ مولانا کا ثنی تھے، مولانا کی زندگی ۱۹۷۵ء ہی میں حکیم صاحب کے قلم سے پہلی بار سچی باتیں نکلیں جو اللہ اکبر کے دولفظی فقرہ کی معنویت وتاثیر سے متعلق تھیں، اگر ان کا نام درج نہ ہوتا تو ان سچی باتوں اور مولانا مرحوم کی سچی باتوں کے طرز تحریر کا فرق دشوار ہوجاتا، ان کے چھوٹے چھوٹے شذرات وتعلیقات کے عنوان بھی خالص ماجدی رنگ کے ہوتے جنکی رعایت لفظی اور ضلع جگت اکثر بڑی پُرلطف ہوتی، مثلاً ڈاک کے ڈاکو، زنانہ ڈاکخانہ، زن راہزن، شراب نذر آب، ملاوٹ کی گراوٹ، ویٹ نام کی جنگ خون شام، شب قدر کی قدر وغیرہ، ایک بار خبر آئی کہ اب لکھنؤ کی سڑکوں پر تانگے نہیں چلیں گے، اس پر انھوں نے تبصرہ کرتے ہوئے سرخی دی ''تانگے بھی چلے'' کسی مسلمان کا انتقال اگر نماز پڑھتے یا حج کرتے یا کوئی اور عمل خیر انجام دیتے ہوئے ہوتا تو وہ ضرور اس کے حسنِ خاتمہ، خوش نصیبی اور عاقبت بخیر ہونے کا ذکر کرتے، سچی باتوں کے علاوہ کتابوں پر انکے تبصرے، ان کے وسیع، مطالعہ کے غماز ہوتے۔ صحافتی زندگی نے ان کو تصنیف وتالیف کے لیے مطلوب یکسوئی اور وقت نہیں دیا۔ تاہم اپنے والد کے حالات پر انھوں نے ایک چھوٹی سی کتاب ذکر مجید مرتب کی۔ ادارۂ فروغ اردو نے جس کے ترجمان رسالہ فروغ اردو کے بھی وہ مدیر رہے ان کی کچھ کتابیں شایع کیں لیکن ان کی حیثیت نصابی کتابوں کی شرح کی سی ہے جیسے شرح ترانہائے خیام، شرح مفتاح العربیہ، شرح سلک گہر وغیرہ، علامہ اقبال کے وہ شیدائی تھے، چنانچہ ایک کتاب فلسفہ اقبال لکھی، علی گڑھ کے رسالہ تہذیب الاخلاق کے نومبر کے شمارہ میں ان کی ایک تحریر شایع ہوئی ہے جو شاید ان کی سب سے آخری تحریر ہو، یہ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کے متعلق ہے اور عنوان ہی ہے ''جن سے میں نے اردو سیکھی'' اس میں انھوں نے بڑی صراحت سے لکھا کہ فلسفہ اقبال کا بیشتر حصہ ''اقبال کامل'' سے مستعار ہے، ''اقبال کامل'' کو وہ اقبال کی شاعری پیام اور فلسفہ پر حرف آخر سمجھتے تھے۔ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم اور علامہ شبلیؒ سے ان کو بڑی عقیدت تھی اور دارالمصنفین کے ہر ہر فرد سے محبت کرتے تھے اور اس سے شایع ہونے والی کتاب کو پسند کرتے تھے، اپنے عم محترم کے ساتھ وہ یہاں کئی بار آئے، ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین پر سمینار ہوا تو خرابی صحت کے باوجود اپنے بھائی جناب حبیب احمد قدوائی کے ساتھ تشریف لائے اور صدق کے دونمبروں میں اپنا سفرنامہ لکھا، جس کی سطر سطر سے ان کی محبت وشفقت کی خوشبو آتی ہے، انتقال سے شاید کچھ ہی دن پہلے ان کا والا نامہ جناب ضیاء الدین صاحب کے نام آیا جس میں ''سوئے حرم'' کے متعلق لکھا کہ وہ اسے بڑی دلچسپی سے پڑھ رہے ہیں، ادھر عرصہ سے ان کی خواہش تھی کہ محمد علی ذاتی ڈائری کو دارالمصنفین پھر سے شایع کرے۔

کثرت مطالعہ اور کتب بینی سے ان کو خاص شغف تھا، چند ماہ قبل لکھنؤ ان کی

خدمت میں آخری بار حاضر ہوا تو معارف کے ایک مضمون کے علاوہ مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کی نئی کتاب سانحہ کربلا پر وہ دیر تک گفتگو فرماتے رہے، ادھر خدابخش لائبریری نے طلسم ہوش ربا کا جدید ایڈیشن کئی جلدوں میں شایع کیا ہے، انھوں نے ضعفِ بصارت کے باوجود اس کے مطالعہ کے لیے محترم الحاج منظور علی لکھنوی کو کلکتہ لکھا کہ یہ جلدیں ان کو بھیج دی جائیں، جس دن یہ کتابیں ان کی خدمت میں روانہ کی جانے والی تھیں اسی دن وہ خود اس طلسم آب وگِل سے نکل چکے تھے۔

وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، انڈین بورڈ آف یونانی میڈیسن اور انجمن اصلاح المسلمین کی انتظامی مجالس کے رکن بھی تھے، یوپی اردو اکادمی کے بھی وہ ممبر رہے۔

نماز روزہ کے پابند تھے، حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے، سیاست جدید میں ان کا سفرنامہ حج مستقل شایع ہوتا رہا، ان کی اہلیہ محترمہ نے ایک عمدہ سفرنامۂ حج لکھا جو خواتین کے رسالہ حریم لکھنؤ میں شایع ہوا، قرآن مجید بہت اچھا یاد تھا، عرصہ تک وہ تراویح میں قرآن مجید سناتے رہے، حفظ کی برکت سے ان کا حافظہ بھی قوی تھا، برسوں پرانے واقعات اور سنین ان کو اچھی طرح یاد رہتے اور انہیں وثوق کے ساتھ بیان کرتے، وہ ایک معصوم اور فرشتہ صفت انسان معلوم ہوتے تھے، ان کا عرفی اور گھریلو نام آفتاب تھا اور حق یہ ہے کہ وہ شرافت، مروت، خدمت اور استغناء کا مجسم آفتاب تھے، ایسے بے غرض، بے ریا، بے ضرر اور مکارم اخلاق سے آراستہ انسان کو دیکھنے کے لیے اب آنکھیں ترسیں گی۔ صبر وتحمل کا پیکر تھے، ان کو بعض شدید مالی اور ذہنی صدمے پہنچے مگر انہیں خاموشی سے برداشت کرلیا اور زبان پر حرف گلہ یا اپنوں اور غیروں کسی کے سامنے اس کا ذکر بھی نہ آنے دیا، خوراک و پوشاک میں ان کی سادگی اور بے پروائی ضرب المثل کی حد تک مشہور ہوئی، سفر میں ان کی شیروانی ہی ان کا اوڑھنا بچھونا بن جاتی، سفر انھوں نے کثرت سے کیے جس میں راہ کی صعوبتیں کبھی مانع نہ ہوئیں۔ چند کتابیں اور اخبارات ہی ان کا زادِ سفر ہوتا، میزبانوں کے لیے ان سے زیادہ عافیت بخش مہمان ملنا مشکل ہے، چائے ان کے لیے آب حیات سے کم نہ تھی، ایک اور شوق کرکٹ کا تھا، نوجوانی میں کھیلنے کا اور بعد میں دیکھنے کا، ٹسٹ میچ دیکھنے کے لیے وہ ایک بار لاہور بھی گئے، اس برصغیر کے کرکٹ کے مشہور کھلاڑی جہانگیر خاں، صدق اور مدیر صدق کے بڑے قدرداں تھے، حکیم صاحب نے ایک بار بتایا کہ انھوں نے اپنے بیٹے کا نام عم مرحوم کے نام پر ماجد خاں رکھا، یہی ماجد خاں بعد میں بڑی شہرت کے مالک ہوئے، اپنے ادارتی کالموں میں وہ کرکٹ کے اہم میچوں پر ضرور تبصرہ کرتے جس سے اس کھیل کی باریکیوں اور اس کے ہر ہر پہلو سے ان کی واقفیت کا اندازہ ہوتا۔

پس ماندگان میں ان کی اہلیہ محترمہ کے علاوہ تین بھائی حبیب احمد قدوائی، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی سابق ایم پی اور عبدالعلیم قدوائی ہیں، لاولد تھے لیکن بھتیجوں اور بھانجوں کو موجودگی نے اس محرومی کا احساس کبھی نہ ہونے دیا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو صبر جمیل کی توفیق دے اور اپنے اس فرشتہ خصلت بندہ کو جنت الفردوس میں اپنی قربت کی نعمت سے نوازے۔ ("ع۔ص"، دسمبر ۱۹۹۲ء)

غازی، حامد الانصاری، مولانا

آہ! مولانا حامد الانصاری غازی

(مولانا مستقیم احسن اعظمی)

۱۶/ اکتوبر ۱۹۹۲ء کو مولانا حامد الانصاری غازی نے داعی اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ جمعیۃ علمائے ہند کی تنظیم سے وابستہ اور گذشتہ ۴۲ برسوں سے بمبئی میں رہ کر علم، دین، ادب اور صحافت کی خدمت میں مصروف تھے۔

غازی صاحب کا وطن دیوبند تھا اور وہ ایک ممتاز علمی و دینی گھرانے کے چشم و چراغ تھے، ان کے دادا مولانا عبداللہ انصاری، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دیوبند کے داماد اور علی گڑھ محمڈن اینگلو کالج میں شعبۂ دینیات کے ناظم تھے، ۱۸۹۲ء میں ندوۃ العلما کی تحریک کا غلغلہ بلند ہوا تو انھوں نے اس میں بھی حصہ لیا، ان کے چھوٹے صاحبزادے مولانا محمد میاں منصور غازی تحریک آزادی کے پُر جوش مجاہد اور شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ان ارشد تلامذہ میں تھے جو ریشمی رومال کی تحریک میں پیش پیش رہے اور جب شیخ الہند کے ایما سے صوبہ سرحد میں آزاد ہندوستان کی جلاوطن حکومت قائم ہوئی تو یہ اس کے وزیر داخلہ بنائے گئے، اس حکومت کے صدر مہارانا پرتاب سنگھ، وزیر اعظم مولانا برکت اللہ بھوپالی اور وزیر خارجہ مولانا عبیداللہ سندھیؒ تھے۔

مولانا محمد میاں منصور نے تحریک کی ناکامی کے بعد بھی افغانستان کی سکونت ترک نہیں کی اور اسی کی خاک کا پیوند ہوئے۔ ان کی اولاد و احفاد نے بھی افغانستان میں مستقل بود و باش اختیار کرلی، صرف مولانا حامد الانصاری ہندوستان میں متوطن ہوئے اور بمبئی کو اپنی جد وجہد کا میدان بنایا۔

غازی صاحب کا سلسلۂ نسب میزبان رسول حضرت ابو ایوبؓ انصاری سے ملتا ہے، ہندوستان میں ان کے مورث اعلیٰ شیخ الاسلام عبداللہ انصاری ہروی تھے، جن سے خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم کا بھی خاندانی تعلق تھا۔

مولانا حامد الانصاری کی ولادت ۱۹۰۷ء میں دیوبند میں ہوئی، ابتدائی تعلیم دارالعلوم معینیہ اجمیر میں ہوئی اور فراغت دارالعلوم دیوبند سے ہوئی، ان کے اساتذہ میں مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا محمد ابراہیم بلیاوی اور مولانا اعزاز علی صاحب جیسے ممتاز اصحاب علم وفن شامل ہیں، مولانا سید حسین احمد مدنی سے گو رسماً تعلیم نہیں پائی تاہم ان سے بھی بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ غازی صاحب نے پنجاب

یونیورسٹی لاہور سے منشی فاضل کا امتحان بھی پاس کیا تھا۔

ان کی طبیعت کا میلان صحافت کی جانب تھا جس کا چسکہ بچپن ہی سے لگ گیا تھا، طالب علمی کے زمانہ میں کئی قلمی رسالے نکالے، دیوبند سے ان کی ادارت میں بعض ہفت روزہ اخبار بھی نکلے مگر صحافت کے مطلع پر وہ اس وقت زیادہ چمکے جب دیوبند سے باہر قدم نکالا، پہلے الجمعیۃ دہلی اور مدینہ بجنور سے منسلک ہوئے، کچھ دنوں تک مولانا تاجور نجیب آبادی کے ماہنامہ ''ادبی دنیا'' سے بھی وابستہ رہے، پھر مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کے ترجمان ندائے حرم دہلی کے مدیر ہوئے، ۱۹۴۵ء میں مدینہ بجنور کی ادارت دوبارہ سنبھالی اور چیف اڈیٹر ہوئے، ۱۹۵۰ء میں جمہوریت کے اڈیٹر ہوکر بمبئی تشریف لائے جو ۱۹۵۶ء تک روزنامہ اور اس کے بعد ۱۹۶۲ء تک ہفتہ وار رہا، بمبئی سے جب روزنامہ اردو ٹائمز جاری ہوا تو شروع میں اسکے اداریے انہیں نے لکھے، اس کا یہ نام انہی کا تجویز کیا ہوا تھا، بمبئی سے بعض اور اخبار اور رسالے بھی ان کی نگرانی اور سرپرستی میں شایع ہوئے، ندوۃ المصنفین سے شایع ہونے والا ماہنامہ برہان دہلی بھی ان کی نگارشات سے متمتع ہوتا رہا ہے اس کے علاوہ بھی متعدد اخبار اور رسالوں میں ان کے مضامین چھپے، ان کی صحبت و تربیت میں رہ کر جن لوگوں کے صحافتی جوہر چمکے ان کی طویل فہرست ہے۔

غازی صاحب مرحوم ندوۃ المصنفین دہلی کے اعزازی رفیق تھے جہاں سے ان کی کتاب ''اسلام کا نظام حکومت'' شایع ہوئی جو اپنے موضوع پر اردو زبان میں ایک منفرد کتاب ہے، پتہ چلا ہے کہ ان کے صاحبزادے طارق غازی صاحب نے اسکا انگریزی ترجمہ بھی کیا ہے، جو عنقریب طبع ہونے والا ہے، غازی صاحب کی چند اور کتابوں کے نام یہ ہیں۔ خلق عظیم (سیرت میں) جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ، تجرید البخاری، تذکرہ مولانا انور شاہ کشمیری۔

غازی صاحب مدۃ العمر جمعیۃ علمائے ہند سے وابستہ رہ کر دین وملت اور قوم و وطن کی خدمت کرتے رہے، ایک مدت تک دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن بھی رہے۔ پورٹ حج کمیٹی بمبئی اور حکومت ہند وحکومت مہاراشٹر کی بعض کمیٹیوں کے رکن رہے۔ آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے بنیادی ارکان میں تھے، انجمن خیر الاسلام بمبئی، مہاراشٹر کالج بمبئی اور کئی تعلیمی اداروں سے بھی ان کا تعلق تھا، بمبئی کی جس بزم میں وہ پہنچ جاتے اس میں رونق محفل وہی ہوتے، تحریر کی طرح تقریر کا بھی ان کو اچھا ملکہ تھا۔ دوسرے مقررین ان کے بعد مائک پر آنے میں گھبراتے تھے۔

غازی صاحب کی پہلی بیوی میمونہ خاتون سے عابد الانصاری غازی تولد ہوئے جو شکاگو یونیورسٹی میں پروفیسر اور اقرا فاونڈیشن کے نام سے اسلامک مشن چلا رہے ہیں، دوسری بیوی ہاجرہ نازلی، مولانا محمد طیب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کی صاحبزادی اور اردو کی ناول نگار ہیں، ان کے بطن سے چار بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئیں۔ ان میں طارق غازی اردو انگریزی کے اچھے صحافی اور سعودی گزٹ جدہ کے مدیر ہیں، خالد غازی، راشد غازی اور سلمان غازی بھی اچھی ملازمتوں پر فائز ہیں، صاحبزادی شہناز کنول کا میلان اپنی والدہ کی طرح ناول نگاری کی طرف ہے۔ یہ سب اپنے علمی و خاندانی روایات کو اپنائے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مولانا حامد الانصاری غازی کو جنت الفردوس نصیب کرے آمین۔ (دسمبر ۱۹۹۲ء)

ندوی، نور عظیم، مولوی

آہ! مولوی نور عظیم ندوی

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لائق فرزند اور ہونہار استاد مولوی نور عظیم ندوی چند ماہ کی علالت کے بعد وفات پاگئے، اِنَاللّٰہ وَ اِنا اِلَیہ رَاجِعُون۔

وہ دارالعلوم سے فراغت کے بعد مزید تعلیم کے لیے مصر گئے، اردو کی طرح عربی لکھنے اور بولنے کی اچھی مشق تھی اور درس وتدریس کے ساتھ ہی تقریر وتحریر میں بھی اپنا جوہر دکھاتے تھے، جلسوں کی نظامت بڑی خوبی اور سلیقہ سے کرتے تھے، جس سمینار کی کارروائی وہ چلاتے وہ ضرور کامیاب ہوتا۔

پڑھنے لکھنے کا اچھا ذوق تھا اور اسی میں ان کا سارا وقت گزرتا، ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والے اردو اور عربی جرائد میں ان کے مضامین وقتاً فوقتاً چھپتے تھے۔ ایک زمانہ میں ندائے ملت کے عملاً وہی اڈیٹر تھے، تعلیم اور دوسرے موضوعات پر اس کے خاص نمبر بھی نکالے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی سرپرستی میں رابطہ ادب اسلامی کا قیام عمل میں آیا تو اس کے روح رواں مولانا سید محمد رابع ندوی کے یہی دست راست اور رابطہ کے ترجمان کے ایڈیٹر بھی تھے۔ ان کے پاس بعض اشخاص اور اکیڈمیوں کے مسودے تبصرے یا اصلاح کے لیے آتے تھے جن کو بڑے غور وتوجہ سے پڑھتے، تحریر کی خوبیوں اور خرابیوں پر ان کی نظر فوراً پڑتی۔ اس معاملہ پر مولانا علی میاں مدظلہ بھی ان پر اعتماد کرتے تھے۔

ان کا وطن ضلع بستی تھا اور وہ مسلکاً اہل حدیث تھے لیکن ندوۃ العلماء میں شیر وشکر کی طرح گھل مل گئے تھے، بڑے خاموش طبع، کم سخن، خلیق اور متواضع تھے، ان کی عمر پچاس (۵۰) کی رہی ہوگی، آئندہ ان سے بڑی توقعات وابستہ تھیں لیکن ابھی اپنی چمک دمک بھی نہیں دکھانے پائے تھے کہ وقت موعود آگیا۔

؎ خوش درخشید ولے شعلہ مستعجل بود

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے، آمین! (''ض''۔ فروری ۱۹۹۳ء)

علی، شوکت، مفتی

مفتی شوکت علی

۱۵/ اپریل کو تھوڑے وقفوں سے اردو کے تین اہل قلم کی وفات ہوگئی، جناب مالک رام صاحب پر اسی شمارہ میں مفصل مضمون دیا جارہا ہے۔ مفتی شوکت علی فہمی کا اصل وطن میرٹھ تھا۔ وہاں سے میٹرک پاس کرنے کے بعد تحریک عدم تعاون سے متاثر ہوئے اور انگریزی تعلیم چھوڑ کر دہلی چلے آئے اور ''دین دنیا'' کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی اور متعدد دینی و تاریخی کتابیں لکھیں جو زیادہ معیاری تو نہیں ہیں لیکن ان سے بڑا فیض پہنچا۔ (''ض''۔ مئی ۱۹۹۳ء)

متل، گوپال

گوپال متل

جناب گوپال متل اردو کے مشہور ادیب شاعر اور صحافی و مترجم تھے، ۱۹۴۷ء کے بعد مغربی پنجاب سے ترک وطن کر کے دلی میں آبسے تھے۔ یہیں سے ماہنامہ تحریک جاری کیا جو ۲۷ برس تک پابندی سے نکلتا رہا۔ ان کی تصانیف میں ''لاہور کا جو ذکر کیا'' اور ''صحرا میں اذان'' وغیرہ مقبول ہوئیں، متل صاحب نے اشتراکیت کی تردید میں درجنوں کتابوں کے ترجمے کیے اور دوسروں سے کرائے جن بدولت اردو کی تاریخ میں ان کا نام ثبت رہے گا۔ (''ض''۔ مئی ۱۹۹۳ء)

رام، مالک

ذکر مالک رام

اردو کے مشہور عالم و فاضل، نامور محقق و مصنف اور غالب و ابوالکلام کے عارف وشیدائی جناب مالک رام کی وفات پر پوری اردو دنیا سوگوار اور اشکبار ہے، ان سے راقم کے جو گہرے اور مخلصانہ تعلقات تھے اس کی بنا پر اس کے لیے بھی ان کی جدائی بہت شاق ہے۔

وہ پھالیہ ضلع گجرات میں جواب مغربی پنجاب (پاکستان) کا حصہ ہے، ۲۲/ دسمبر ۱۹۰۶ء کو بوبچہ کھتریوں کے ایک خاندان میں پیدا ہوئے، ان کے والد لالہ نہال چند فوج کے محکمہ سپلائی میں ملازم تھے، لیکن مالک رام ابھی بارہ دن ہی کے تھے کہ والد کے سایہ شفقت سے محروم ہوگئے، والدہ نے پرورش و پرداخت کی، چار برس کی عمر سے تعلیمی سلسلہ شروع ہوا جو ایم۔ اے اور ایل ایل بی کرنے کے بعد ۱۹۳۳ء میں منقطع ہوا، اس سے قبل ۱۹۳۱ء میں ان کی شادی ہوگئی تھی۔

مضمون نگاری اور رسالوں کے مطالعہ کا چسکہ بچپن سے تھا، ابتدا میں شعر و شاعری سے بھی کچھ دلچسپی رہی، ان کا پہلا باقاعدہ مضمون نیرنگ خیال لاہور میں چھپا، یہ ٹیگور کی گیتا نجلی کے بعض ٹکڑوں کا ترجمہ تھا، اس کے بعد ۱۹۲۶ء کے نگار میں ''ذوق اور غالب'' کے عنوان سے ان کا مضمون شایع ہوا جس میں آگے چل کر ماہر غالبیات ہونے والے نے غالبؔ پر ذوقؔ کو ترجیح دی تھی، لوہر میں قیام کی بنا پر نیرنگ خیال کے مدیر حکیم محمد یوسف حسین سے مالک رام کے تعلقات ہوگئے تھے، ۱۹۳۰ء میں ان کی خواہش پر ساٹھ روپے ماہوار پر نیرنگ خیال کی مجلس ادارت میں شامل ہوگئے، پھر لاہور ہی سے شائع ہونے والے ''آریہ گزٹ'' سے متعلق ہوئے، اس سے علیحدگی کے بعد ۱۹۳۶ء میں روزنامہ ''بھارت ماتا'' سے منسلک ہوئے، یہ بند ہوگیا تو دلی کا رخ کیا اور ہوم ڈیپارٹمنٹ کے محکمہ اطلاعات عامہ سے وابستہ ہوئے پھر جالندھر کی ایک فرم میں بھی ملازمت کی۔

پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خاں سے مالک رام کی اچھی یاد اللہ تھی۔ ان کی کوشش سے یکم اپریل ۱۹۳۹ء کو حکومت ہند کے محکمہ تجارت میں ان کا تقرر ہوگیا، تین مہینے کی ٹریننگ کے بعد یکم اگست ۱۹۳۹ء کو انڈین گورنمنٹ ٹریڈ کمشنر کے دفتر میں سپرنٹنڈنٹ ہوکر اسکندریہ چلے گئے اور آزادی کے بعد جب انڈین فارن سروس کی تشکیل ہوئی تو اس میں لے لیے گئے اور مصر، عراق، ترکی اور بلجیم وغیرہ میں رہے، سرکاری طور پر ان کو شام فلسطین، سوڈان، افغانستان، فرانس، سوئٹزرلینڈ، جرمنی، ہالینڈ اور انگلینڈ جانے کا بھی اتفاق ہوا اور بعد میں روس اور ایران کا بھی سفر کیا، سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ساہتیہ اکاڈیمی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیفات کی ترتیب و تدوین کی خدمت پر مامور ہوئے اور اردو سیکشن کے انچارج ہوئے، اکاڈیمی سے ضابطہ کا تعلق ختم ہوجانے پر دلی سے ایک تماہی رسالہ ''تحریر'' کے نام سے نکالا جو بڑا معیاری اور بلند پایہ تھا، لیکن جب اس نے بھی دم توڑ دیا تو جالندھر موٹر ایجنسی لمیٹڈ کے مینیجنگ ڈائرکٹر ہوگئے۔

اردو کے فروغ وترقی کے لیے جو سرکاری وغیر سرکاری کمیٹیاں بنیں، ان میں ان کی شمولیت ضروری سمجھی جاتی تھی، انجمن ترقی اردو ہند اور غالب اکیڈمی کے وہ برابر ممبر رہے اور انجمن کے کئی برس تک صدر بھی رہے، گجرال کمیٹی اور اردو یونیورسٹی کمیٹی کے بھی وہ رکن تھے اور جامعہ اردو علی گڑھ کے ممبر کے علاوہ پروچانسلر بھی تھے، اردو کی مدۃ العمر خدمت کرنے کی وجہ سے اس کے تعلق سے ان کو بڑے سے بڑا اعزاز ملا اور ان کی کتابوں پر مختلف اداروں نے انعام دینے میں فخر محسوس کیا، دراصل ان کی ذات اعزاز و انعام سے بالاتر تھی۔

مالک رام صاحب مطالعہ کے بڑے حریص اور شوقین تھے، کتب بینی کی عادت بچپن ہی سے تھی، جس میں سرکاری ملازمت کی مشغولیت بھی مانع نہیں ہوئی، مطالعہ میں

کثرت اور انہماک کی وجہ سے بصارت کمزور ہوگئی تھی اس لیے میگنیفائنگ گلاس استعمال کرتے تھے، میری آمدورفت ان کے یہاں اس وقت شروع ہوئی جب وہ بوڑھے ہوگئے تھے مگر جب بھی انکے کمرے میں داخل ہوا تو پڑھتے لکھتے ہی پایا، کرسیوں اور میزوں پر کتابوں کا انبار لگا رہتا تھا۔

پنجابی مادری زبان تھی اور اردو سے ان کو عشق تھا، فارسی، عربی، انگریزی اور فرانسیسی پر بھی عبور حاصل تھا، غالباً ہندی اور بنگالی سے بھی واقفیت تھی اس لیے ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور چونکہ حافظہ بھی اچھا تھا اس لیے جو کچھ پڑھتے تھے اسے مستحضر رکھتے تھے، طبیعت میں سلامت روی، اعتدال اور بے تعصبی تھی اور اصل مقصود علم کی طلب و جستجو تھا اس لیے کسی زبان و مذہب سے متعلق کتاب بھی ہوتی، وہ اس کا مطالعہ کرکے اپنی علمی تشنگی بجھاتے، کالج کی طالب علمی کے زمانہ میں انہیں قرآن مجید کے مطالعہ کا شوق ہوا تو عربی سیکھی اور ایک صاحب سے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھنا شروع کیا، معلم کی مشغولیت کی وجہ سے اس کا سلسلہ جاری نہیں رہ سکا تو شوقین متعلم نے خود ترجمہ قرآن کی مدد سے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ عرب ملکوں میں رہنے کی وجہ سے عربی میں ان کی استعداد بہت اچھی تھی اور وہ عربی بولنے پر بھی قادر ہوگئے تھے، قرآن مجید میں غور و فکر کا سلسلہ آخر عمر تک قائم رہا۔

تاریخ و ادبیات پر ان کی گہری نظر تھی اور مذاہب کا تقابلی مطالعہ ان کا دل پسند مشغلہ تھا۔ غالب و ابوالکلام پر وہ اتھارٹی سمجھے جاتے تھے۔ اپنی ملازمت کے سلسلے میں انہیں کئی ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا، جہاں جاتے وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کرتے اور عجائب گھروں کی سیر کرتے۔ مالک رام کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا اور تصنیف و تالیف سے ان کا اشتغال ہمیشہ قائم رہا اس لیے ان کی قلمی فتوحات کا دائرہ وسیع ہے لیکن تحقیق کا میدان ان کی اصل جولان گاہ رہا ہے اور اس میں ان کے کارنامے ناقابل فراموش ہیں، اگست ۶۷ء میں ماہنامہ آجکل دہلی کا ''اردو تحقیق'' نمبر شائع ہوا، جس میں اردو تحقیق کے چار ستونوں کے ساتھ ان کی بھی تصویر چھپی تھی اور اسی نمبر میں جناب علی جواد زیدی نے ان چاروں ستونوں کو یہ خراج عقیدت پیش کیا تھا:

''جہاں تک تحقیق کے میدان میں رہنمائی کا تعلق ہے، ہمارے سامنے ہندوستان میں چار محققین کے نام بیک وقت آتے ہیں، قاضی عبدالودود، مالک رام، امتیاز علی عرشی، سید مسعود حسین رضوی ادیب''۔

اور اردو ادب کے میر کارواں پروفیسر آل احمد سرور نے خطوط غالب کے دیباچہ میں لکھا ہے:

''اردو کے محققوں میں مالک رام صاحب کئی حیثیتوں سے امتیاز رکھتے ہیں، وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں، اس کے ہر پہلو کا غائر مطالعہ کرتے ہیں، تمام ضروری مواد مہیا کرتے ہیں اور نہایت سلجھے ہوئے اور شگفتہ انداز میں یہ مواد پیش کردیتے ہیں، ان کے یہاں جذباتیت سرے سے نہیں بلکہ ہمدردی کے باوجود ایک معروضی نظر کی کوشش ہے''۔

اردو تحقیق کے تین ستون تو کب کے گر چکے تھے اور اب یہ چوتھا ستون بھی زمیں بوس ہوگیا ع افسوس کہ از قبیلہ مجنوں کسے نہ ماند۔

مالک رام صاحب کے علمی، تصنیفی اور تحقیقی کاموں میں بڑی وسعت، تنوع اور رنگارنگی ہے، ان کی ہر تصنیف علمی، ادبی اور تحقیقی حیثیت سے معیاری اور بلند پایہ ہے، غالب ان کی تلاش و تحقیق کا خاص موضوع تھا اور اسی کو ان کے سب کاموں میں اولیت و فضیلت حاصل ہے، غالب پر ۵۰ سے زیادہ مضامین انھوں نے لکھے ہوں گے، جن کے دو مجموعے عیار غالب اور فسانہ غالب چھپ گئے ہیں، ۱۹۳۷ء میں پہلی مرتبہ غالب کی کتاب ''سبد چین'' ایڈٹ کرکے شائع کی، جس میں مرزا کا وہ کلام دیا ہے جو ان کی زندگی میں چھپنے والے کلیات میں شامل ہونے سے رہ گیا تھا، اسی کتاب کے مقدمہ کے لیے انھوں نے غالب کے حالات لکھنا شروع کیا جو اس قدر پھیل گیا کہ ۱۹۳۸ء میں ''ذکر غالب'' کے نام سے اسے علیحدہ کتابی صورت میں شائع کیا۔ اس کتاب کو بڑی مقبولیت نصیب ہوئی اور اس کے ۵ اڈیشن نکلے، ہر اڈیشن نئی تحقیقات پر مشتمل ہوتا تھا، غالب پر جو دو چار اچھی اور مستند کتابیں لکھی گئی ہیں انہی میں اس کا بھی شمار ہوتا ہے بلکہ حسن تالیف و ترتیب میں یہ زیادہ بڑھی ہوئی ہے، اس کا ہندی ترجمہ بھی ہوا، متعلقاتِ غالب میں ان کی تصنیف تلامذہ غالب ایک معیاری اور مستند کتاب ہے، اس کے پہلے اڈیشن میں ۱۴۶ اور دوسرے میں لگ بھگ پونے دوسو تلامذہ غالب کے حالات و انتخاب کلام درج ہے، متون کے سلسلہ میں دیوان غالب، خطوط غالب، دستنبو اور گل رعنا کو شائع کیا، موخر الذکر میں غالب کے اردو فارسی کلام کا انتخاب ہے جو انھوں نے خود کلکتہ کے مولوی سراج الدین احمد کی فرمائش پر کیا تھا، اس کو ڈھونڈ نکالنا اور عالمانہ مقدمہ و حواشی کے ساتھ شائع کرنا مالک رام صاحب کا عظیم الشان کارنامہ ہے، لیکن اول الذکر دونوں کتابوں کے سلسلے میں اہل نظر کو ان سے بعض بجا شکایتیں رہیں۔ تاہم غالب پر ان کے سارے کام مجموعی حیثیت سے بہت اہم اور بڑی قدر و قیمت کے حامل ہیں جس کا اندازہ پروفیسر گوپی نارنگ کے اس تجزیہ سے بخوبی کیا جاسکتا ہے:

''غالبیات کے سلسلے کا ایک وقیع نام ہے مالک رام کا، پچھلی نصف صدی سے جن کا ایک ایک لمحہ غالب کے لیے وقف رہا ہے اور جن کے لیے غالب اور اردو ایک ہی حقیقت کے دو رخ بن گئے ہیں، مالک رام تقریباً پچاس کتابوں کے مصنف و مولف و مرتب ہیں، ان کی تحقیقات کا دائرہ خاصا وسیع ہے، ان کی خدمات کا اعتراف صرف یہ کہہ دینے سے نہیں ہوجاتا کہ انھوں

نے ''ذکر غالب'' یا ''تلامذۂ غالب'' یا ''فسانہ غالب'' لکھیں یا غالب کی بعض تصانیف کو مرتب کیا یا غالب کے معاصرین، ممدوحین درفقا پر مضامین قلم بند کئے بلکہ یہ کہ غالبیات کی موجودہ مہتم بالشان روایت میں ان کا کام اس بنیادی نوعیت کا ہے کہ اگر اسے الگ کر دیا جائے تو ہیں اس میں بہت کمی محسوس ہوگی، مالک رام کا کام اس پائے کا ہے کہ اسے زندگی بھر کی لگن اور انہماک کی مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے، اس بات کی پوری معنویت غالبیات کی، اعلاعلمی روایت کو نظر میں رکھے بغیر واضح نہیں ہوسکتی''۔

انھوں نے کلیات غالب فارسی کی ترتیب کا کام بھی کرلیا تھا مگر اس کی اشاعت نہ ہوسکی۔

غالب کی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کے علوم و معارف کی تحقیق و تدوین نے بھی مالک رام صاحب کی عظمت میں چار چاند لگا دیا ہے، ساہتیہ اکاڈیمی نے ترجمان القرآن کی جو چار جلدیں شائع کی ہیں، ان کی ترتیب و تدوین کے کام میں دوسروں کے ساتھ ان کی شرکت بھی رہی ہے لیکن غبار خاطر، تذکرہ اور خطبات آزاد کے متون کی تصحیح وتحقیق کا کام انھوں نے تن تنہا انجام دیا ہے، علامہ سیوطی نے جمع الجوامع کے نام سے احادیث کا جو مجموعہ مرتب کیا تھا شیخ علی متقی کی کنزالعمال اسی کی ترتیب و تنقیح ہے، لیکن اہل علم کا خیال ہے کہ ''سیوطی نے اپنی کتاب لکھ کر دنیا والوں پر احسان کیا اور شیخ علی متقی نے کنزالعمال لکھ کر خود سیوطی پر احسان کیا'' یہی بات اگر اس موقع پر بھی کہی جائے تو بیجا نہ ہوگا چنانچہ مولانائے مرحوم کے ایک بڑے قدرداں جناب ابوسلمان شاہجہاں پوری رقمطراز ہیں:

''غبار خاطر مولانا کی بہترین علمی وفنی تحریروں کا مجموعہ ہے لیکن اس کے افادہ و فیضان کا دائرہ مکمل نہ تھا، اس دائرے کی تکمیل جناب مالک رام صاحب کے حواشی سے ہوتی ہے، نادر الوجود اشعار کی طرح جو مولانا نے اس میں استعمال کیے ہیں، سیکڑوں اشخاص و کتب تھیں جن کے وجود و کمال پر کوئی روشنی نہ پڑتی تھی، اور بے شمار منقولات تھے جن کی صحت کا یقین تھا لیکن عین الیقین نہ تھا، فاضل مرتب کی تحقیق نے ہمیں ان کے وجود کمال سے آشنا کیا ہے اور منقولات کی صحت کو عین الیقین کے مقام پر پہنچا دیا ہے''۔

تحقیق وتحشیہ کے کام میں بعض نقائص اور غبار خاطر سے اجمل خاں صاحب کے ضروری مقدمہ کو حذف کر دینے کے باوجود حق یہ ہے کہ یہ کام مالک رام صاحب سے بہتر شاید کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے متعلقات پر مالک رام نے متعدد وقیع مقالے بھی لکھے ہیں جن کا ایک مجموعہ ''کچھ ابوالکلام آزاد کے بارے میں'' ۱۹۸۹ء میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی نے شایع کیا ہے، یہ گیارہ مضامین پر مشتمل ہے۔

متون کی تہذیب، تدوین اور تحقیق کے سلسلے میں انھوں نے اور بھی گوناگوں کام انجام دیے ہیں جن میں کربل کتھا بڑا اہم ہے، اس کو پروفیسر مختار الدین احمد کے اشتراک سے مرتب کر کے شائع کیا ہے۔

مالک رام صاحب کی دلچسپی اور تحقیق کا ایک میدان مذہب اسلام بھی ہے، مولانا ابوالکلام آزاد کے علوم و معارف کی تدوین و تحقیق کا کام اس اعلیٰ اور بلند معیار پر وہ اسی لیے انجام دے سکے ہیں کہ انہیں اسلامیات پر عبور تھا، وہ عربی زبان سے بخوبی واقف تھے اور انھوں نے قرآن مجید اور احادیث نبوی کا مطالعہ براہ راست کیا تھا اس لیے اسلام کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ذاتی مطالعہ وتحقیق اور معروضی نقطہ نظر کا نتیجہ ہے، انہیں دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں مذہب اسلام سے زیادہ دلچسپی تھی، خصوصاً عورتوں کے بارے میں وہ اسلامی تعلیم و ہدایت سے زیادہ متاثر تھے، ان کی کتاب ''عورت اور اسلامی تعلیم'' اسی تاثر کا نتیجہ ہے جو ان کی برسوں کی محنت، مطالعہ اور تحقیق کا نچوڑ ہے، ''اسلامیات'' بھی ان کی محققانہ کتاب ہے جو اسلام کے بارے میں چھ اہم مفید مضامین کا مجموعہ ہے، بعض خامیوں سے قطع نظر یہ دونوں کتابیں مصنف کی غیر جانبداری، بےتعصبی اور مذہب اسلام سے ہمدردی کا ثبوت ہیں، ان میں جو حقائق بیان کیے گئے ہیں ان پر مسلمان فضلا کی نظر بھی شاید ہی گئی ہو ؎

سرّ خدا کہ عارف و سالک بکس نہ گفت
در میر تم کہ بادہ فروش از کجا شنید

انہی خوبیوں کی بنا پر مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

''صراحت کے ساتھ اگر اپنا نام ہر بار نہ لکھتے رہیں تو کوئی شخص بھی ان مالک رام اور عبدالمالک کی تحریروں میں فرق و امتیاز کر ہی نہیں سکتا''۔

خاکہ نگاری میں بھی ان کو کمال حاصل تھا، وہ لوگوں کا سراپا بیان کرنے اور اشخاص کی تصویر کشی میں بڑی مہارت رکھتے تھے، ان کی کتاب ''وہ صورتیں الٰہی'' خاکہ نگاری اور مرقع آرائی کا اچھا نمونہ ہے۔ تذکرہ نگاری سے بھی ان کو خاص مناسبت تھی، ذکر غالب اور تلامذہ غالب اسی ضمن میں آتی ہیں لیکن اس سلسلہ میں ان کا زیادہ اہم کارنامہ تذکرہ معاصرین ہے جس کی چار جلدیں شایع ہوچکی ہیں اور ایک جلد کے بقدر مواد چھپنے سے رہ گیا ہے، ''تذکرہ ماہ و سال'' کی اہمیت بھی مسلم ہے، ان کی کتابوں میں بعض غلطیاں بھی راہ پاگئی ہیں لیکن علی جواد زیدی کے بقول:

''ان تمام تذکروں اور خاکوں کا جمع ہونا معمولی بات نہیں، اس جاں سوز کام کے لیے مالک رام ستائش کے مستحق ہیں، تذکرہ معاصرین کا سلسلہ دور حاضر کے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں بے حد مواد مہیا کرتا ہے، اس سلسلے

میں تذکرہ نویسی ایک نئے اور ترقی یافتہ روپ میں ظاہر ہوتی ہے جس لگن اور خلوص سے مالک رام نے اپنے زمانے کے ادیبوں، شاعروں اور بعض صحافیوں کے حالات یکجا کردیے ہیں، اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کرسکتے ہیں جنھیں اس طرح کے معلومات کی فراہمی سے سابقہ پڑا ہے''۔

اردو میں یادگار صحیفوں کی اشاعت کی روایت مالک رام صاحب ہی نے قائم کی ہے، اس کی بدولت نذر عرشی، نذر ذاکر، نذر عابد، نذر زیدی اور نذر حمید جیسی باوقار کتابیں شایع ہوئیں، یہ صحیفے اس عہد کے بڑے ممتاز اصحاب علم کی نگارشات سے مزین ہیں، اتنے سارے مضامین کو مالک رام صاحب ہی حاصل بھی کرسکتے تھے لیکن انھوں نے اسی پر اکتفانہیں کیا ہے بلکہ جن موقر اصحاب کمال کو یہ مضامین نذر کیے گئے ہیں ان کے حالات وکمالات کا پورا مرقع بھی پیش کیا ہے، اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی انھوں نے ''نذر'' کے مجموعے شایع کیے ہیں اور غالب اور حالی پر انگریزی میں کتابچے لکھے ہیں۔

جس طرح مالک صاحب نے دوسروں کی خدمات علم وادب کے اعتراف میں یہ یادگار صحیفے شایع کیے، اسی طرح خود ان کے کمالات کے اعتراف کے لیے ارمغان مالک کی دوجلدیں شایع ہوئیں، جن کو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے منتخب اہل علم کے ایک بورڈ کے تعاون سے مرتب کرکے ۱۹۷۱ء میں شایع کیا تھا، انگریزی میں یادگار صحیفے کو علی جواد زیدی صاحب نے ایڈٹ کیا تھا، وہی ''مالک رام ایک مطالعہ'' کے بھی مرتب ہیں جو ۱۹۸۶ء میں شایع ہوئی ہے، اس میں ان کے مبسوط مقدمہ کے علاوہ غالبیات، اسلامیات، تذکرہ نگاری، تحقیق، مرقع نگاری، نثر نگاری اور تدوین ابوالکلام کے زیر عنوان دو درجن سے زیادہ مضامین شامل ہیں۔ مالک رام صاحب کسی ادارہ اور اکیڈمی سے وابستہ نہیں تھے حیرت ہوتی ہے کہ سرکاری ملازمت کے علم وادب کش ماحول میں رہ کر انھوں نے تن تنہا یہ سارے علمی، ادبی اور تحقیقی کام کس طرح انجام دیے؟

کون ہوتا ہے حریف مے مردافگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

مالک رام صاحب اردو کے بہت اچھے نثر نگار تھے، اب ایسی سلیس، صحیح اور خوبصورت نثر لکھنے والے بہت کم لوگ رہ گئے ہیں۔ انہیں قدرت نے تصنیف وتالیف کا خاص سلیقہ اور بڑا عمدہ ذوق عطا کیا تھا اس لیے ان کی تحریریں خوبی ودلکشی اور رعنائی و بانکپن سے معمور ہوتی ہیں، سادگی اور اصلیت کے باوجود ان کی نثر میں شگفتگی، سلاست، روانی، برجستگی اور پرُکاری ہوتی ہے جو حشو وزوائد، طوالت تکرار، اینچ پیچ اور ژولیدہ بیانی سے پاک ہوتی ہے، الفاظ اور جملے نپے تلے اور موقع ومحل کے اعتبار سے ہوتے ہیں، کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ بات کہنے کا ہنر وہ خوب جانتے تھے، مختصر ہونے کے باوجود ان کی تحریریں جامع پرُمغز، بلیغ اور جاندار ہوتی ہیں، ان کے موضوعات خشک علمی وتحقیقی ہوتے تھے اس کے باوجود وہ تحریر کی دلآویزی اور اثر انگیزی کو قائم رکھتے اور شگفتگی، بے ساختگی اور برجستگی میں کمی نہ آنے دیتے، ان کی عالمانہ، باوقار اور سنجیدہ تحریریں لطافت وحلاوت سے معمور ہوتی تھیں، کبھی کبھی طنز ومزاح کی لطیف آمیزش سے بھی ان کی نثر میں بڑی کیفیت وجاذبیت پیدا ہوگئی ہے، مواد ومعلومات کو سمیٹ کر اچھے ڈھنگ اور خاص سلیقے سے پیش کرنے میں مالک رام صاحب کو بڑی مہارت ہے، ان کی ساری کتابیں مواد ومعلومات سے پرُ اور مناسب وموزوں ترتیب وتبویب کا اچھا نمونہ ہیں۔

اپنے دور کے اکثر اکابر اور نامور فضلا ومشاہیر سے ان کے اچھے روابط تھے، دارالمصنفین سے ان کے روابط بہت قدیم تھے، جس زمانے میں انھوں نے علمی میدان میں قدم رکھا اس زمانے میں دارالمصنفین اور مولانا سید سلیمان ندوی کے آوازۂ شہرت سے پورا ملک گونج رہا تھا، اس لیے مالک رام صاحب کی نگاہ بھی ان کی جانب اٹھی، غالب کے خطوط میں جب ''سبدچیں'' کا ذکر پڑھا تو ان کو اس کی تلاش ہوئی اور مولانا سید سلیمان ندوی کو خط لکھ کر اس کے متعلق دریافت کیا، انھوں نے بتایا کہ کتب خانہ حبیب گنج میں اس کا نسخہ موجود ہے۔ اس کے لیے نواب صدریار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی سے رجوع کیا جائے، معارف میں مالک رام صاحب کے مضامین بھی چھپتے تھے اس کے سلیمان نمبر میں بھی ان کا مضمون شامل ہے، اور ان کی جب بھی کوئی کتاب شایع ہوتی تو اسے دارالمصنفین کو ضرور بھیجتے، یہ معمول آخر تک قائم رہا، اپنی کتاب ''عورت اور اسلامی تعلیم'' کو پریس کے حوالے کرنے سے پہلے مولانا سید سلیمان ندوی کے پاس بھیج کر مشورہ واصلاح کے طالب ہوئے، ان کے خلاف جب مولانا امداد صابری نے مقدمہ دائر کیا تو مالک رام صاحب نے نواب سائل دہلوی مرحوم کے ذریعہ سے صلح وصفائی کی پیش کش کی جس میں ان کو کامیابی ہوئی۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور جناب صباح الدین عبدالرحمٰن صاحبان سے ہمیشہ ان کے خوشگوار تعلقات اور برابر خط وکتابت رہی، انھوں نے نذر کے نام سے جو صحیفے شایع کیے اور خود ان کو جو صحیفہ نذر کیا گیا ان سب کی مجلسِ ارکان میں شاہ صاحب کا نام اور حصہ مقالات میں صباح الدین صاحب کے مضامین شامل ہیں، مجھے یاد نہیں کہ پہلی مرتبہ کب میرے کان میں مالک رام صاحب کا نام پڑا لیکن فروری ۱۹۶۵ء میں دارالمصنفین کی گولڈن جبلی بہت دھوم سے منائی گئی جس میں اربابِ دُول کے ساتھ ملک کے گوشہ گوشہ سے آئے ہوئے مشاہیر علماء وفضلاء بھی شریک ہوئے، اسی موقع پر مولانا امتیاز علی خاں عرشی اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے ساتھ جب انہیں پہلی مرتبہ دیکھا تو ان کی پاکیزہ صورت اور پرُکشش شخصیت نے اپنی جانب متوجہ کرلیا،

مجھ پر ان کی قابلیت اور وسعتِ علم ونظر کا سکہ اس سے پہلے ہی سے بیٹھا ہوا تھا، مئی ۱۹۶۱ء کے معارف میں مقریزی اور ان کی خطط پر میرا ایک مضمون شائع ہوا، اس میں میں نے مقریزی کی کسی تصنیف کو غیر مطبوعہ بتایا تھا، یہ مضمون مالک رام صاحب کی نظر سے گزرا تو انھوں نے اس وقت کے اڈیٹر معارف مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کو لکھا کہ مقریزی کی یہ کتاب طبع ہوچکی ہے، شاہ صاحب نے جب ان کے گرامی نامہ کا مجھ سے تذکرہ کیا تو مجھے پسینہ آ گیا مگر شاہ صاحب نے میری دلجوئی کے لیے فرمایا کہ تمھیں خوش ہونا چاہیے کہ اتنے بڑے آدمی نے تمہارا مضمون پڑھا۔

ساہتیہ اکاڈیمی سے مالک رام صاحب نے جب غبار خاطر کا محقق و محشیٰ اڈیشن شایع کیا تو راقم نے معارف میں اس کا تعارف کراتے ہوئے لکھا کہ ''حواشی میں فاضل مرتب سے بعض اغلاط سرزد ہوگئے ہیں'' اسے پڑھ کر انھوں نے پھر شاہ صاحب کو تحریر فرمایا کہ ''اغلاط سے مبّرا ذات تو صرف اللہ تعالیٰ کی ہے، اگر ان کی نشاندہی کردی جائے تو آئندہ اڈیشن میں تصحیح کردی جائے گی، شاہ صاحب نے ان کا گرامی نامہ میرے حوالے کرتے ہوئے فرمایا'' مالک رام صاحب بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں اس لیے اغلاط کی دو چار مثالیں ضرور دینی چاہیے تھی، میں نے عرض کیا کئی غلطیاں ہیں، معارف کے مختصر تبصرے میں ان کی صراحت کی گنجائش کہاں ہوتی ہے، شاہ صاحب نے فرمایا اب تم خود ان کو خط لکھو جس میں غلطیوں کی نشاندہی کردو، محترمی سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب بھی موجود تھے، انھوں نے فرمایا کہ میں بھی کچھ اغلاط کی نشاندہی کرتا ہوں، انہیں بھی اپنے خط میں شامل کرلینا اس طرح ان کے تعاون سے تقریباً ۵۰ غلطیاں قلم بند کر کے ان کی خدمت میں بھیجی گئیں جن کو ملاحظہ فرمانے کے بعد انہوں نے مجھے شکریے کا خط لکھا اور یہ بھی تحریر فرمایا کہ اکثر سے مجھے اتفاق نہیں ہے لیکن جن سے اتفاق ہے آئندہ اڈیشن میں ان کے مطابق صحت کردی جائے گی۔

اس خط سے میرے دل میں ان کی بڑائی جاگزیں ہوگئی اور اس کے بعد ان سے برابر خط و کتابت کا سلسلہ قائم ہوگیا۔ کبھی کبھی سنین وغیرہ کی تحقیق اور بعض دوسرے امور دریافت کرنے کے لیے وہ مجھ ہیچ مداں کی جانب رجوع بھی فرمانے لگے۔ ۱۹۸۲ء میں ہمدرد نگر نئی دہلی میں بین الاقوامی قرآن کانگریس کا انعقاد ہوا جس میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کے ساتھ میں بھی شرکت کے لیے گیا تھا، کانگریس کے اجلاس پانچ چھ روز تک ہوتے رہے، مالک رام صاحب تقریباً روزآنہ شرکت کے لیے اپنے دولت کدہ سے جو ڈیفنس کالونی میں تھا، تشریف لایا کرتے تھے اور ان سے متعدد علمی امور و مسائل پر گفتگو رہتی ان صحبتوں سے ان کے عجز و انکسار، شرافت، شائستگی، بے تعصبی، رواداری، فراخدلی، عالمانہ شان اور تحقیقی مزاج کا اچھی طرح اندازہ ہوا۔

(مئی ۱۹۹۳ء)

(۲)

۱۹۸۶ء میں جناب علی جواد زیدی نے ان کی متنوع علمی، تحقیقی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک یادگار صحیفہ شایع کیا، اس کے لیے غالبًا انہی کے ایما سے عورت اور اسلامی تعلیم پر مجھے بھی اظہار خیال کی دعوت دی گئی حالانکہ ان کو علم تھا کہ اس کے بعض مندرجات سے مجھے اتفاق نہیں ہے، میں اس فرمائش کو مسترد نہیں کرسکا اور اپنے حقیر معروضات بے تکلف پیش کردیئے مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ مضمون کے معترضانہ حصے انھوں نے اور زیدی صاحب نے جوں کا توں شایع کردیا، بعد میں ان سے اس پر گفتگو ہوئی تو انھوں نے فرمایا کہ ہر تبصرہ نگار کا حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی رائے بے کم و کاست ظاہر کرے۔ اس سے اختلاف تو کیا جاسکتا ہے لیکن اس میں تصرف کا کسی کو حق نہیں۔

مالک رام سے میرے تعلقات بڑھے تو انہوں نے اصرار کیا کہ دلی آؤں تو ان سے مل لیا کروں یا انہیں اپنی قیام گاہ کا پتہ بتادوں تو وہ خود مل لیا کریں گے، دلی میں میرا قیام عموماً اپنے ایک عزیز کے یہاں ہوتا تھا وہاں انہیں کیا زحمت دیتا، میں نے خود ان سے ملاقات کو اپنا معمول بنالیا، اگر کبھی جلدی میں اس کا موقع نہیں ملتا اور انہیں میرے دلّی جانے کا پتہ چل جاتا تو اشارتاً اس کا ذکر کردیتے، ایک دفعہ میں اپنے بزرگ کرم فرما مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی مرحوم سے ملنے ان کی جماعت کے دفتر گیا تو وہیں سے مالک رام صاحب کو فون کیا کہ آپ جس وقت گھر پر موجود رہیں اس وقت میں ملاقات کے لیے حاضر ہوجاؤں، انھوں نے دریافت کیا تم کہاں سے فون کررہے ہو، جب میں نے بتایا تو انھوں نے یہ مصرع پڑھا

؎ تری آواز مکے اور مدینے

پھر مولانا کی خدمت میں سلام پیش کرنے اور اپنے لیے دعا کی درخواست کرنے کو کہا۔ ایک دفعہ نواب مولوی عبیدالرحمٰن خاں شروانی مرحوم ہمدرد نگر میں جناب اوصاف علی صاحب کے یہاں سے انہیں فون کررہے تھے، میں نے نواب صاحب سے عرض کیا کہ میرا سلام پیش کردیں تو مالک رام صاحب نے فرمایا کہ صرف سلام سے کام نہیں چلے گا، ممکن ہو تو ملاقات بھی کریں۔

اس سال انجمن ترقی اردو ہند نے جنوری میں ان کا یوم ولادت منانے کا پروگرام بنایا تھا، ڈاکٹر خلیق انجم نے مجھے اس میں شریک ہونے اور ان پر کوئی مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی، میرے لیے یہ بڑے فخر و سعادت کی بات تھی، لیکن ڈاکٹر صاحب کا پہلے خط آیا کہ اب پروگرام فروری میں ہوگا پھر ملک کے حالات کی وجہ سے اس وقت بھی اسے ملتوی کرنا پڑا، ''محقق و ماہر غالبیات مالک رام'' کے عنوان سے میں مقالہ تیار کرچکا تھا، خیال تھا کہ اسے مالک رام صاحب کے پاس ملاحظہ کے لیے بھیج

دوں مگر چند مہینے حیص بیص میں گزر گئے اور مالک رام صاحب اپنے مالک و داتا کے پاس پہنچ گئے، دنیا کی زندگی بھی کتنی ناپائدار ہے۔

ایک مرتبہ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب دہلی کے کسی سمینار میں شریک ہوکر دارالمصنفین واپس آئے تو شاہ معین الدین صاحب سے اس کی روداد بیان کرتے ہوئے کہنے لگے کہ مالک رام صاحب نے مجھے دیکھ کر فرمایا کہ میں نے اپنے مضمون میں آپ کے جدامجد کی خبر لی ہے، اس پر صباح الدین صاحب مرحوم کو بڑی ناگواری تھی اور اس کی وجہ سے مجھ پر بھی بہت دنوں تک یہ اثر رہا کہ مولانا شبلی کے بعض معاندین کی طرح انہیں بھی ان سے عناد ہے لیکن جب ان سے تعلقات ہوئے تو محسوس ہوا کہ بعض امور میں اختلاف کے باوجود وہ مولانا کے پورے عظمت شناس ہیں، دراصل مالک رام صحیح معنوں میں عالم تھے اس لیے وہ دوسروں سے علمی اختلاف بھی رکھتے تھے لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ وہ ان کے قدرداں اور عظمت شناس نہیں تھے، درست نہیں ہے۔

تنقید اور نکتہ چینی کو برداشت کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے، اچھے اچھے لوگ ایسے موقع پر چراغ پا ہوجاتے ہیں لیکن مالک رام صاحب کو میں نے اس معاملہ میں بڑا عالی ظرف پایا، ان سے اگر اختلاف کیا جاتا تھا تو اپنی عالمانہ شان اور تحقیقی مزاج کی بنا پر وہ کبھی اس کا برانہیں مانتے تھے، بڑے مصنفین کی طرح ان کی شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو جس پر اعتراضات نہ کیے گئے ہوں، قاضی عبدالودود وغیرہ سے لے کر ہر درجہ کے لوگوں نے ان سے جا و بیجا اختلاف کیا ہے مگر وہ اس پر چیں بر جبیں نہیں ہوئے، اعتراض درست ہوتا تو معترض کے شکر گذار ہوتے اور فوراً اسے قبول کر لیتے لیکن غلط اعتراض کا جواب دینے میں اپنا وقت ضائع نہ کرتے، اپنی کتاب ''تلامذہ غالب'' پر ہونے والی تنقیدوں کا ذکر کرتے ہوئے خود لکھتے ہیں:

''ان ۲۵ برسوں میں تلامذۂ غالب سے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے، اس کتاب سے متعلق بھی اور بعض شاگردوں سے متعلق انفرادی طور پر بھی ان میں سب سے مفید اور مفصل مضمون ڈاکٹر حنیف نقوی (بنارس ہندو یونیورسٹی) کا تھا، میں نے کم و بیش سب مضامین سے استفادہ کیا ہے اور میں ان اصحاب کا احسان مند ہوں، اگرچہ افسوس ہے کہ ان کے سب مشورے قبول نہ کرسکا''۔

علامہ شبلیؒ کی طرح بعض لوگوں نے ان کی بھی خوبیوں کو نظر انداز کرکے صرف لغزشوں اور فروگزاشتوں ہی کی طرف اپنی توجہ مبذول کی، یہاں تک کہ ان کے خلاف ایک کتاب بھی شائع کی گئی مگر مالک رام صاحب کو نہ اس سے کوئی پریشانی ہوئی اور نہ انھوں نے ایسے لوگوں کی شکایت سے اپنی زبان آلودہ کی، علی جواد زیدی صاحب نے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"علامہ شبلیؒ کی طرح مالک رام کے لیے بھی یہ شرف مخصوص ہوا کہ ان کے مثبت اکتسابات کے مقابلے میں ان کی لغزشوں اور فرد گذاشتوں کی طرف زیادہ توجہ کی گئی اور ایک خاصی کتاب وجود میں آگئی، مجھے یقین ہے کہ انہیں اس احساس سے تسکین ہوئی ہوگی کہ ایسے شرف اچھے ادیبوں اور محققوں کی قسمت ہی میں لکھ دیے گئے ہیں، آزاد اور شبلیؒ کے پرستاروں سے زیادہ اسے کون محسوس کرسکتا ہے کہ اعتراضات کی مسلسل بوچھاڑ کا مخاطب بننے کے لیے بھی بلند پائیگی کی راہوں سے گزرنا پڑتا ہے''۔

مالک رام صاحب حسن صورت و حسن سیرت کے جامع تھے، وہ وجیہہ و شکیل اور جامہ زیب بھی تھے اور خلیق، ملنسار، متواضع، وسیع المشرب اور انسان دوست بھی، ان کا دل شرافت، مروت، ہمدردی اور خلوص و محبت کا گہوارہ تھا، ان کی زندگی تکلف سے بری اور نمود و نمائش سے خالی تھی، حرص و طمع کے بجائے قناعت پسند تھے، بڑے سرکاری افسر اور اردو کے صف اول کے اہل قلم میں بھی ممتاز ہونے کے باوجود ان میں نہ غرور تھا نہ تمکنت، جھوٹ اور مکاری سے نفرت، وعدے کے سچے اور پکے تھے، بڑے اصول پسند تھے، بے اصولی کو پسند نہیں کرتے تھے، خود بھی قاعدے اور ضابطے کی پابندی کرتے اور دوسروں سے بھی اسی کی توقع رکھتے، ہمیشہ مستعد اور چاق و چوبند رہتے، ہر وقت اپنے کام میں منہمک اور دھن میں مست رہتے، نہ کبھی فضول باتوں اور لایعنی کاموں میں اپنا وقت ضایع کرتے اور نہ دوسروں کی شکوہ شکایت اور غیبت کرتے، اسی اصول پسندی اور وقت کی قدر کرنے کے نتیجہ میں انھوں نے کمیت و کیفیت دونوں اعتبار سے گوناگوں علمی و تحقیقی کام انجام دیتے ہے۔

مالک رام صاحب نے بڑی مرنجاں مرنج طبیعت پائی تھی، کسی سے بغض و کینہ نہیں رکھتے، اپنے مخالفین کے معاملہ میں بھی عفو و درگزر سے کام لیتے، کبھی غضب و اشتعال میں آکر صبر و ضبط، نرمی اور اعتدال پسندی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑتے، صلح کل ان کا مزاج تھا، دوسروں کے درمیان بھی صلح و آشتی کرادیتے، اپنے سے چھوٹے لوگوں پر بھی شفقت فرماتے اور برابر ان کی حوصلہ افزائی کرتے، ان میں ضد اور ہٹ دھرمی نہیں تھی، اپنی کسی غلطی پر اصرار نہیں کرتے، جو لوگ ان کی غلطیوں سے انہیں مطلع کرتے ان کے احسان مند ہوتے۔

ان سے کوئی غلط کام کرانا آسان نہ تھا وہ نہ کسی کی حق تلفی کرتے اور نہ بیجا رو رعایت کرتے، صاف گوئی اور دوٹوک بات کہنے کے عادی تھے، دیانت کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ ان سے کلکتے کی کسی بڑی کمپنی کے مالک کے امپورٹ لائیسنس کے لیے جناب دوارکاداس شعلؔہ نے سفارش کی، مالک رام صاحب کی نظر میں کمپنی کے مالک واقعی اس کے مستحق تھے اس لیے انھوں نے ان کا کام کردیا، کچھ عرصے کے بعد انھوں

نے اپنے ایک نمائندے کے ذریعہ دوارکا داس کے پاس چھ ۶ بڑے کوزے رس گلوں کے بھجوائے اور کہا کہ کچھ مالک رام صاحب کو بھی پہنچا دیے جائیں، دوارکا داس ایک کوزہ لے کر مالک رام کے پاس گئے، ان کو جب صورت حال کا علم ہوا تو انھوں نے رس گلے لینے سے انکار کردیا اور کہا ان صاحب سے میرا کوئی واسطہ نہیں، میں نے ان کا کام اس لیے کیا تھا کہ وہ مستحق تھے اگر وہ واقعی مستحق نہ ہوتے تو میں صاف کہہ دیتا کہ یہ میرے بس کا روگ نہیں، اگر اس قسم کے مستحق لوگ اور بھی تمھارے پاس آئیں تو بلاتکلف انہیں میرے پاس بھیج دو، ان کی جو خدمت مجھ سے ممکن ہوگی ضرور کروں گا۔

دوسروں کا کام کردینے میں انہیں بڑی لذت ملتی تھی، ایک مرتبہ میں دلی گیا اور ان سے ملنے کے لیے حاضر ہوا تو برسبیل تذکرہ کہا کہ اس دفعہ میں نے صرف اپنے لڑکے محمد طارق کے داخلہ کے لیے سفر کیا، مجھے خیال بھی نہیں تھا کہ وہ اس کام میں کسی قسم کا دخل دیں گے اور میرا تعاون کریں گے مگر انھوں نے اپنے امکان بھر ہر طرح مدد کی اور بڑی دلچسپی لی۔

بڑے منکسر المزاج اور وضعدار شخص تھے حق دوستی نبھانے کے لیے خود طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کرتے، دلّی کی ایک اردو کانفرنس میں دوارکا داس کو لے کر گئے، مالک رام کے پاس دعوت نامہ موجود تھا، وہ چاہتے تو اسٹیج پر فروکش ہوتے مگر دوارکا داس کے پاس دعوت نامہ نہیں تھا، اگر یہ کسی کو اشارہ کردیتے تو انہیں بھی دعوت نامہ مل جاتا مگر مالک رام صاحب نے یہ احسان لینا گوارہ نہیں کیا، اور دوارکا داس کی مروت میں جاڑے کے دنوں میں کھلی جگہ گھاس پر بیٹھ کر ٹھنڈک کھاتے رہے۔

مالک رام صاحب کی انسان دوستی کی راہ میں ہندو مسلمان کی تفریق حائل نہیں ہوتی تھی، جناب محمد باقر سابق پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور ان کے بچپن کے بے تکلف دوست تھے، دونوں ایک دوسرے کے گھر برابر آیا جایا کرتے تھے، مالک رام صاحب کے ڈی اے وی کالج لاہور میں داخلہ لینے کے بعد باقر صاحب لاہور جاتے تو وہ انہیں زبردستی اپنے ہوسٹل میں لے آتے، حالانکہ ان دنوں کالج کے ہوسٹل میں کسی مسلمان کو ٹھہرانا سنگین جرم تھا مگر مالک رام صاحب خطرہ مول لے کر انہیں اپنے ساتھ ٹھہراتے، اتفاق سے ایک دفعہ وہ ہوسٹل میں بیمار ہوگئے تو مالک رام صاحب نے ہندو ڈاکٹر سے ان کا غلط نام بتا کر دوا لی، اگر کہیں یہ راز فاش ہوجاتا تو مالک رام صاحب کو ہوسٹل خالی کرنا پڑتا۔

مذاہب کے تقابلی مطالعہ نے مالک رام کو بڑا وسیع نظر بنا دیا تھا اور وہ ہر مذہب و ملت اور ہر طبقہ و مشرب کے لوگوں سے اچھے تعلقات رکھتے تھے، اپنی رواداری اور بے تعصبی کی بنا پر انھوں نے اسلام اور اسلامی علوم مسائل کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اعتدال و انصاف کو ملحوظ رکھا ہے اور اسلام کی جن خوبیوں اور صداقتوں کو محسوس کیا ہے، انہیں بے خوف و خطر بیان کیا ہے، ان کی طبیعت اور مزاج پر اسلام کا بڑا اثر تھا اور وہ اس کی اکثر تعلیمات کے مداح تھے، انھوں نے اپنے صاحبزادوں کے نام آفتاب و سلمان اور ایک صاحبزادی کا نام بشریٰ رکھا تھا، حقیقت کا علم تو خدا کو ہے لیکن ایک دفعہ وہ مجھ سے کہنے لگے بعض لوگ مجھے قادیانی اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں، خیر مجھے بھی اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ وہ میری بخشش کرے گا۔ وہ ہماری قدیم شرافت، وضعداری اور ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کا ایک دلکش نمونہ تھے، ان خوبیوں کے لوگ عنقا ہوگئے ہیں:

مت سہل انہیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نمایاں ہوتا ہے

(''ض''، جون ۱۹۹۳ء)

عبدالباری، مولوی

مولوی عبدالباری

افسوس ہے کہ دارالمصنفین کے قدیم اور مخلص خدمت گذار مولوی عبدالباری صاحب ۳۰/ جون کو وفات پاگئے، ان کی عمر ۹۰ سال سے متجاوز تھی، دارالمصنفین کے ابتدائی دور میں حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ نے انہیں تصحیح اور کتب خانہ کی نگرانی کے کام پر مامور کیا تھا جس کو دو برس پہلے تک وہ انجام دیتے رہے، دارالمصنفین کے عروج کا دور دیکھنے والے اب تنہا وہی رہ گئے تھے، ان کی تعلیم مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں ہوئی تھی اور وہ مولانا امین اصلاحی مدظلہ، کے ہم سبق تھے، دارالمصنفین سے وابستگی کی وجہ سے انہیں مضمون نگاری کا چسکہ لگ گیا تھا، ابوعلی اثری اور ابوعلی اعظمی کے نام سے مدۃ العمر اخباروں اور رسالوں میں مضامین لکھتے رہے، علامہ شبلیؒ کے بڑے مداح اور سید صاحب کے نہایت عقیدت مند تھے، ان کا ذکر برابر لطف و لذت سے کرتے تھے ان پر اور مولانا ابوالکلام آزاد پر بے شمار مضامین لکھے، دونوں بزرگوں پر ان کے مضامین کے ایک ایک مجموعے ضیاء اللہ کھوکھر صاحب (گوجرانوالہ، پاکستان) نے شایع کیا تھا، اپنی خودداری کی وجہ سے کسی کا منت کش ہونا گوارا نہیں کیا اور قناعت پسندی کی بنا پر ایک قلیل مشاہرہ پر پوری زندگی گذار دی، اللہ تعالیٰ ان کی بشری لغزشوں کو معاف فرمائے اور جنت نعیم میں جگہ دے، آمین۔ (''ض''، جولائی ۱۹۹۳ء)

نورالحسن، پروفیسر

پروفیسر نورالحسن کی رحلت

ملک کے مشہور مورخ و عالم اور مغربی بنگال کے گورنر پروفیسر نورالحسن کی طبیعت

عرصہ سے خراب تھی، وہ علاج کے لیے امریکہ جانے والے تھے کہ مرض میں شدت ہوگئی اور ۱۶/ جون کو ایس۔ایس۔ایم اسپتال کلکتہ میں داخل ہوئے جہاں ۱۲/ جولائی کو ۷۲ سال کی عمر میں رحلت فرماگئے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

پروفیسر نورالحسن کا دادھیال اور ننھیال کو علمی، تعلیمی اور دنیاوی حیثیت سے بڑی وجاہت حاصل تھی، ان کا اصل آبائی وطن فیض آباد تھا، ان کے والد عبدالحسن مرحوم وہاں کے ڈپٹی کلکٹر بھی تھے، حسن خدمت کی بنا پر برطانوی حکومت نے ان کو خان بہادر کا خطاب دیا۔ وہ صوبائی سکریٹریٹ کے مختلف شعبوں میں جوائنٹ سکریٹری بھی رہے اور ریٹائرمنٹ کے بعد ریاست رام پور میں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائز ہوئے، پھر شیعہ سنٹرل وقف بورڈ اترپردیش کے صدر مقرر ہوئے۔ نورالحسن مرحوم کا ننھیال جونپور میں تھا وہ سروزیر حسن کے نواسے اور سید علی ظہیر اور سید سجاد ظہیر وغیرہ کے حقیقی بھانجے تھے، بعد میں ننھیالی اور دادھیالی عزیز لکھنؤ میں متوطن ہوگئے، یہیں ۲۶/ دسمبر ۱۹۲۱ء کو نورالحسن صاحب پیدا ہوئے تھے۔

ان کی تعلیم الٰہ آباد میں ہوئی، طالب علمی کے زمانے ہی سے تقریر میں وہ اپنا جوہر دکھلانے لگے تھے، اکثر تقریری مقابلوں میں انہیں فرسٹ پرائز ملتی۔ بعد میں وہ بہت اچھے مقرر ہوئے، وہ اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ممبر اور الٰہ آباد یونیورسٹی یونین کے سکریٹری بھی رہے۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے برطانیہ گئے، ان کا خاص موضوع تاریخ تھا جس کے وہ ماہر و محقق تھے، ۱۹۵۰ء میں آکسفورڈ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔

مرحوم کی عملی زندگی کا آغاز درس و تدریس سے ہوا، پہلے وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں درس و تدریس کی خدمت پر مامور ہوئے پھر علی گڑھ اور دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر رہے۔ سائنس اور صنعتی ریسرچ کی کونسل کے نائب صدر بھی رہے، جس کی صدر مسز اندرا گاندھی تھیں۔ کونسل کی جانب سے کئی بین الاقوامی سیمینار ہوئے جس میں اس غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا کہ ہندوستان میں ۱۲۰۰ء سے ۱۸۰۰ء تک سائنس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔

پروفیسر صاحب کی علمی لیاقت کی طرح انتظامی صلاحیت، حب الوطنی اور سیکولر پسندی بھی مسلم تھی، اس لیے حکومت کی نظر بھی ان کی جانب اٹھی، وہ پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے ممبر ہوئے، ۱۹۷۲ء میں تعلیم، سماجی بہبود و ثقافت کے مرکزی وزیر مقرر ہوئے اور ۱۹۷۷ء تک اس منصب پر فائز رہے، اس کے بعد تین سال تک سابق سوویت یونین میں ہندوستان کے سفیر رہے، ان کی کوششوں سے دونوں ملکوں کے تعلقات مزید استوار ہوئے اور اس عرصہ میں انہوں نے روسی جمہوری ریاستوں خاص طور پر مسلم ایشیائی ریاستوں کا دورہ کیا، دو مرتبہ ہندوستانی وفد کے ایک ممبر کی حیثیت سے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اپنے ملک کی نمائندگی کی اور یونسکو کی جنرل کانفرنسوں میں انہیں ہندوستانی وفد کی قیادت کرنے کا موقع بھی ملا۔ آخر میں وہ مغربی بنگال کے گورنر مقرر کیے گئے اور اس حیثیت سے بہت مقبول اور نیک نام رہے، اس منصب پر دو مرتبہ فائز کیے گئے، پہلے ۸۶ء سے ۸۹ء تک اور دوبارہ ۹۰ء میں پھر مغربی بنگال کے گورنر ہوئے اور مرنے کے بعد ہی اس سے سبکدوش ہوئے، درمیان میں تھوڑی مدت کے لیے اڑیسہ کے گورنر بنائے گئے مگر ان کا دل کلکتہ ہی میں اٹکا ہوا تھا اور غالب کی طرح ان کی رگ و پے میں بھی اس کی محبت سرایت کیے ہوئے تھی۔

کلکتہ کا جو ذکر کیا تونے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

ریاستی اور مرکزی حکومتوں سے ان کے تعلقات اچھے تھے اور انہوں نے ان کو ٹکراؤ سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی جس کا اعتراف مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ مسٹر جیوتی باسو نے ان لفظوں میں کیا ہے:

"وہ گورنر اور متعدد یونیورسٹیوں کے چانسلر کی حیثیت سے ہمارے لئے ایک دانش مند مشیر تھے"۔

وہ ریاست کے عوام میں گھل مل گئے تھے اور ان سے بڑی محبت کرتے تھے، عوام کے ہر طبقہ میں انہیں پسند کیا جاتا تھا، ملک وقوم کی فلاح و بہبود کے مسائل اور خاص طور پر اپنی ریاست کی تعمیر و ترقی اور خوش حالی سے انہیں بڑی دلچسپی تھی۔

نورالحسن مرحوم کا میلان شروع میں کمیونزم کی جانب ہوگیا تھا، اس میں اس کا بھی اثر رہا ہوگا کہ وہ طالب علمی ہی کے زمانے میں جواہر لال نہرو کے گھر برابر جاتے تھے اور لکھنؤ یونیورسٹی سے جب ان کا تعلق ہوا تو کمیونسٹ تحریک سے وابستہ متعدد اشخاص وہاں موجود تھے جن میں ان کے ماموں سجاد ظہیر بھی تھے۔ اس زمانے میں یہاں سے ایک اخبار نکلتا تھا جس کی حیثیت کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان کی تھی۔ اپنی عالی نسبی اور خاندانی امارت کے باوجود پارٹی سے ان کے اخلاص وتعلق کا یہ حال تھا کہ اخبار کی کاپیاں سائیکل کے ہینڈل پر رکھ کر فروخت کرتے تھے۔

عرصہ تک اس تحریک سے وابستہ رہنے کے باوجود خاندانی شرافت و وضعداری گھر کی تربیت اور ماحول کے اثر سے ان میں مسلمان گھرانوں کی روایات اور اودھ کی تہذیب و شائستگی کی خوبو ہمیشہ باقی رہی اور وہ اشتراکیت کو سیکولرازم اور رواداری کے قریب لانے کا کام بھی کرتے رہے اور آخر میں تو انہوں نے اس سے پوری طرح چھٹکارا پا ہی لیا تھا گویا ع پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

کلکتہ کے جسٹس خواجہ محمد یوسف ۲۲/ جون کو ان کی عیادت کے لیے اسپتال گئے تو ان سے تنہائی میں فرمایا کہ میں آپ کو اپنا گواہ مقرر کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ میری طرف سے شہادت دے سکیں، میرے متعلق بہت سی باتیں اُڑائی گئی ہیں کہ میں بدعقیدہ ہوں، یہ جھوٹ ہے، میں مسلم گھرانے میں پیدا ہوا، ہمیشہ مسلمان رہا، آج بھی مسلمان

ہوں، اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان ہے اور انشاء اللہ کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہوں گا، اس کے بعد انہوں نے باآواز بلند کلمۂ شہادت پڑھا اور پھر خواجہ صاحب سے کہا کہ آپ گواہ رہیں (آزاد ہند کلکتہ)۔

اردو زبان سے ان کو سچا عشق تھا، وہ اسی تہذیب کے پروردہ تھے، ملک میں اردو کا رواج کم ہونے سے بھی کڑھتے رہتے تھے، ان کے نزدیک یہ کسی خاص فرقہ و مذہب کی زبان نہیں ہے بلکہ اس کا رشتہ ملک کی قدیم تہذیب و ثقافت سے جڑا ہوا ہے، اس لیے اردو کا خاتمہ دراصل اس مشترکہ تہذیب و ثقافت کا خاتمہ ہے۔

طلبہ کی موجودہ بے راہ روی اور بدعنوانی بھی ان کے اضطراب کا باعث بنی ہوئی تھی، وہ موجودہ نظام تعلیم کی خرابیوں سے واقف تھے مگر اپنی مجبوری و بے بسی کو بھی سمجھتے تھے، اردو ہی نہیں فارسی کی تعلیم کو وہ اسی لیے ضروری خیال کرتے تھے کہ اس کے بغیر طلبہ میں شرافت، شائستگی، بھلمنساہت، انسان دوستی اور اخلاقی اقدار پیدا نہیں ہوسکتیں، ایک مرتبہ ایک طالب علم کو خاص طور پر تاکید کی کہ ''بیٹا فارسی ضرور پڑھنا کیونکہ فارسی پڑھے بغیر اخلاق نہیں آسکتا اور اخلاق ہی زندگی کا جوہر ہے''۔ اسی لیے علمی و تعلیمی مجلسوں اور اردو اداروں کی تقریبات میں معذوری اور علالت کے باوجود شریک ہونے کی کوشش کرتے اور بڑی مناسب اور برمحل تقریریں کرتے، اس طرح کی تقریروں میں وہ کارکنوں کی ہمت افزائی بھی فرماتے اور ان کی توجہ ان گوشوں کی جانب مبذول کراتے جن کو نظر انداز کردیا جاتا تھا۔

ان میں قوم و ملت کا درد تھا اس لیے ان کی زبوں حالی پر بے چین رہتے تھے خاص طور پر مسلمانوں کی علمی و اقتصادی پس ماندگی اور ان کے موجودہ ابتر حالات کا انہیں ملال رہتا تھا، وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو ملک کے دوسرے طبقوں کے دوش بدوش اپنے وطن کی تعمیر و ترقی کے کاموں میں حصہ لینا چاہئے اور وہ جس منصب پر فائز ہوں اسے محنت اور ذمہ داری سے انجام دیں تاکہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ مسلمان بڑے عہدوں کے اہل نہیں ہیں، ملک میں سیاست اور اخلاق کے گرتے ہوئے معیار سے وہ بہت زیادہ کبیدہ خاطر رہتے تھے، موجودہ سیاست کو وہ کوئلے کی دوکان کہتے تھے کہ جو اس میں گیا اس کے کالک لگ گئی۔ انہوں نے اپنے کو اس کی آلودگی سے بچائے رکھنے کی پوری کوشش کی۔

پروفیسر نورالحسن مرحوم ایک باغ و بہار، خوش مزاج، خوش گفتار اور خوش اخلاق شخص تھے۔ ہر شخص کے لیے ان کے دل میں شفقت و محبت کا جذبہ موجزن رہتا تھا، اپنے عمدہ برتاؤ اور اچھے سلوک سے وہ لوگوں کا دل جیت لیتے تھے اور کبھی کسی کو کسی طرح کی شکایت کا موقع نہیں دیتے تھے، ان میں عجب و غرور اور خودنمائی نہ تھی، سچائی، خلوص، ایمانداری، حقیقت پسندی اور غیر جانبداری کو اپنا وطیرہ بنالیا تھا، وہ اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے، اگر انہیں کسی سے اختلاف بھی ہوتا تو اس پر نہ ناگواری ظاہر کرتے اور نہ اس سے اپنی بات زبردستی منواتے، لیکن اپنی رائے وثوق و اعتماد سے ضرور بیان کردیتے، لوگوں کی خوبیوں کی جہاں داد دیتے وہاں ان کی غلطیوں کی جانب بھی مناسب انداز میں اس کو متوجہ کردیتے، ہر شخص سے نباہ کرلینے کا سلیقہ انہیں معلوم تھا، بڑے عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود انہوں نے اپنے عزیزوں، اہل تعلق اور پڑوسیوں کو ہمیشہ یاد رکھا جن میں امیر و غریب دونوں طرح کے لوگ ہوتے تھے، دراصل وہ بڑے شائستہ، وضعدار اور ملنسار شخص تھے اور ان کی زندگی لکھنوی نفاست و شرافت اور ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کا نمونہ تھی۔

مہمان نوازی میں ان کو لطف ملتا تھا، گورنر ہاؤس میں اکثر پُرتکلف دعوتیں کرتے، رمضان میں بالالتزام افطار پر لوگوں کو مدعو کرتے، گورنر ہاؤس کی بالائی منزل پر مغرب کی اذان و نماز کا اہتمام ہوتا، افطار میں وہاں کے مسلم ملازمین بھی سب کے ساتھ افطار کرتے، عیدالاضحیٰ کے دن خاص احباب کو قربانی کا گوشت بھجواتے، خود بھی کھانے کے شوقین تھے، ان کا خاص باورچی لکھنؤ کا تھا، کھانے کے انواع و اقسام کے بارے میں ان کے معلومات وسیع تھے۔

ان میں عصبیت، تنگ نظری اور جانبداری نہ تھی، مسلمانوں کے اختلاف، تخرب اور فرقہ آرائی کو ناپسند کرتے تھے، خود شیعہ تھے لیکن سنیوں اور غیر مسلموں سے بھی ان کے اچھے تعلقات تھے اور سب کا احترام کرتے تھے، اپنے بیٹے اور بیٹی کی شادی سنیوں سے کی تھی۔

وہ ایک بڑے عالم اور اہل علم کے قدرداں تھے، ان کی تحقیق اور تلاش، جستجو اور علم کی طلب و تحصیل کا سلسلہ آخر دم تک قائم رہا، وہ ہمیشہ اپنے کو طالب علم ہی سمجھتے تھے اور فرماتے تھے کہ وہی آدمی عالم ہے جو طلب علم میں مصروف رہے، ان کی مجلس اہل علم و اصحاب کمال سے معمور ہوتی تھی، ان کی دعوتوں میں ان لوگوں کی موجودگی ضروری تھی۔ علم سے ان کی دلچسپی کا یہ حال تھا کہ جب روس کے سفیر ہوئے تو مسلم ایشیائی ریاستوں کا دورہ کیا اور وہاں کے کتب خانے کھنگھالے، عہد وسطیٰ کے فارسی مسودوں کا بغور مطالعہ کیا اور اپنے ساتھ ان کی فوٹو کاپیاں لائے، بعض کو ایڈٹ کرکے شایع بھی کرنا چاہتے تھے مگر سرکاری مشغولیتوں کی وجہ سے اس کا موقع نہیں ملا۔

صحت کی خرابی کے باوجود علمی پروگرام میں حصہ لیتے، ایران سوسائٹی کے سرپرست تھے، اس کی تقریبات میں موجود رہتے، ایشیاٹک سوسائٹی کو بہتر بنانے میں بھی دلچسپی لی، مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے خاص عقیدت تھی، مولانا آزاد انسٹی ٹیوٹ آف ایشین اسٹڈیز کے قیام کا سہرا انہی کے سر بندھتا ہے۔

موجودہ قحط الرجال میں ایسے عالم، مدبر اور منتظم شخص کا اٹھ جانا ایک قومی نقصان

ہے، اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں کو معاف فرمائے اور ان کے ساتھ رحم و شفقت کا معاملہ کرے۔ (''ض''۔اگست ۱۹۹۳ء)

جیراجپوری، محمد معظم، ڈاکٹر

آہ! ڈاکٹر محمد معظم جیراجپوری

دارالمصنفین کی مجلس عاملہ و انتظامیہ کے رکن ڈاکٹر معظم جیراجپوری بھی ۱۴/ جولائی کو دہلی میں انتقال کرگئے اور وہیں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔ ان کا وطن اعظم گڑھ کا معروف گاؤں جیراج پور ہے، یہیں ۱۹۲۰ء میں وہ پیدا ہوئے تھے، ان کا خاندان علمی، تعلیمی، اور دینی حیثیت سے ممتاز تھا، ان کے دادا مولانا سلامت اللہ جیراجپوری مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی کے ارشد تلامذہ میں تھے، وہ نواب صدیق حسن خاں کی دعوت پر بھوپال تشریف لے گئے اور ریاست کے مدارس کے اہتمام کی خدمت پر مامور ہوئے، وہ جمعیۃ اہل حدیث کے سرخیل تھے ان کے اثر سے اعظم گڑھ میں اس مسلک کی ترویج و اشاعت ہوئی۔ ڈاکٹر محمد معظم کے والد مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری انہی کے لائق فرزند اور ملک کے مشہور عالم و مصنف تھے جو مدۃ العمر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تاریخ اسلام و دینیات کے استاد رہے، ڈاکٹر محمد معظم کی تعلیم بھی جامعہ میں ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے طب کی تحصیل کی۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے اعظم گڑھ میں اپنا مطب کھولا۔ اپنی اصول پسندی، محنت، پیشہ میں یکسوئی و انہماک اور مریضوں کے علاج میں نہایت دلسوزی کی وجہ سے بہت جلد کامیابی نے ان کے قدم چومے اور وہ پورے ضلع میں ایک اچھے معالج کی حیثیت سے مشہور ہوگئے، صبح و شام کو مریضوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔

علم، ادب اور شعر و سخن سے دلچسپی کی بنا پر شام کے وقت ان کے مطب میں ادیب و شاعر، شبلی کالج کے اساتذہ اور دارالمصنفین کے رفقاء کی نشست ہوا کرتی تھی، بڑے باغ و بہار آدمی تھے اپنی دلچسپ اور پُرلطف باتوں سے مجلس کو زعفران زار بنادیتے تھے، خود بھی شعر کہتے تھے اور اعظم گڑھ کی نشستوں میں پابندی سے شریک ہوکر اپنا کلام بھی سناتے تھے۔

شروع ہی سے دارالمصنفین سے ان کا ربط وضبط تھا، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب سے ان کے گہرے تعلقات تھے، راقم سے عزیز داری کا تعلق تھا اس لیے بڑی شفقت فرماتے تھے اور جب بھی ملاقات ہوتی تو دارالمصنفین ہی کے بارے میں گفتگو کرتے اور اس کی مشکلات کے حل کی صورتیں بتاتے۔

چند برس قبل قلبی دورہ پڑا جس کے بعد صحت میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا تھا، بالآخر وقت موعود آگیا، ادھر سال ڈیڑھ سال سے برابر دہلی ہی میں اپنی صاحبزادی کے پاس رہتے تھے، ان کی اہلیہ کا انتقال بہت پہلے ہوگیا تھا، ان کے بڑے بیٹے ڈاکٹر محمد شمیم جیراجپوری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں زوالوجی کے شعبہ کے صدر ہیں وہ گورنمنٹ آف انڈیا کے زوالوجیکل سروے آف انڈیا کے ایڈوائزر بھی رہے اور اپنے فن میں ماہر ہونے کی بنا پر یورپ کے ملکوں میں بھی ان کی شہرت ہے، چھوٹے صاحبزادے محمد سلیم جیراجپوری اعظم گڑھ کے ایک بڑے ڈاکٹر ہیں۔

ڈاکٹر محمد معظم کی زندگی خدمت خلق میں بسر ہوئی، وہ صوم وصلوٰۃ کے بھی پابند تھے، اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کے غم کو زائل کرے، آمین۔ (''ض''، اگست ۱۹۹۳ء)

بھٹا چاریہ، شانتی رنجن

شانتی رنجن بھٹا چاریہ

جناب شانتی رنجن بھٹا چاریہ کے انتقال سے اردو زبان اپنے ایک مخلص خادم اور زبردست شیدائی سے محروم ہوگئی وہ موجودہ بنگلہ دیش کے ضلع جیسور میں پیدا ہوئے تھے اور ان کی تعلیم حیدرآباد میں ہوئی تھی مگر کلکتہ ان کی سرگرمیوں کا مرکز رہا وہ عرصہ تک مغربی بنگال کے محکمۂ اطلاعات سے اور کچھ عرصہ تک مرکزی وزارت اطلاعات ونشریات سے بھی وابستہ رہے، جناب شانتی رنجن بنگالی اور اردو دونوں کے ماہر اور اردو کے ممتاز مصنف تھے۔ انہوں نے بنگلہ ادب کی تاریخ کے علاوہ بنگالی ناولوں کے ترجمے سے بھی اردو کے سرمایہ میں اضافہ کیا، وہ انجمن ترقی اردو کی مجلس عام اور اردو یونیورسٹی کمیٹی کے رکن بھی تھے، بنگال میں اردو کے فروغ اور مغربی بنگال اردو اکیڈمی کے قیام میں ان کا بڑا دخل تھا، ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں میر اکیڈمی لکھنؤ اور ساہتیہ اکیڈمی دہلی سے انہیں ایوارڈ بھی ملے، شانتی رنجن جی ہماری مشترکہ تہذیب کے عاشق اور صحیح معنوں میں سیکولر تھے، ہر شخص سے خوش اخلاقی اور گرم جوشی سے ملتے، راقم سے بھی دوبار ملاقات ہوئی تو اپنے خلوص ومحبت کا نقش دل پر بیٹھا گئے۔ (''ض''۔ اکتوبر ۱۹۹۳ء)

غلام مصطفےٰ، ڈاکٹر حافظ

ڈاکٹر حافظ غلام مصطفےٰ

(پروفیسر مختارالدین احمد)

دوشنبہ ۲۷/ دسمبر ۱۹۹۳ء کو حافظ غلام مصطفے سابق ریڈر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی طویل علالت کے بعد علی گڑھ میں وفات پاگئے۔ تدفین یونیورسٹی کے قبرستان میں عمل میں آئی۔ ان کی ولادت الٰہ آباد میں ۱۹۱۹ء میں ہوئی۔ حفظ قرآن اور ابتدائی تعلیم کے

بعد انھوں نے انگریزی تعلیم کی طرف توجہ کی۔ انھوں نے نجی طور پر تعلیم حاصل کر کے الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی اے، آگرہ یونیورسٹی سے اردو اور فارسی میں اور علی گڑھ سے عربی میں ایم اے کیا۔ ۱۹۵۴ء میں پروفیسر عبدالعلیم مرحوم کی صدارت کے عہد میں وہ شعبہ عربی میں لکچرر مقرر ہوئے۔ انہی کی نگرانی میں عہد جاہلی کی عربی شاعری میں مذہبی رجحانات کے موضوع پر انھوں نے ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ کچھ دنوں کے بعد وہ ریڈر مقرر ہوئے اور ۲۵ سال شعبے میں تدریسی فرائض انجام دے کر ۱۹۷۹ء میں متقاعد ہوئے۔

ان کی مطبوعہ تصانیف حسب ذیل ہیں:

(1) Religious Trend in Pre-Islamic Arabic Poetry,

(مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۶۸ء)

(۲) ابن الفارض: عربی صوفیانہ شاعری کی ایک منفرد شخصیت، علی گڑھ ۱۹۷۳ء۔

(۳) **اخبار الکرام باخبار المسجد الحرام**، مصنفہ الشیخ شہاب الدین احمد بن محمد الاسدی المکی الشافعی (متوفی ۱۰۶۶ھ) بنارس ۱۹۷۶ء۔

ان کتابوں کے علاوہ انگریزی، عربی اور اردو میں ان کے مضامین متقدر رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔

اولاد میں دو بیٹیاں اور تین بیٹے یادگار چھوڑے ہیں۔ سب تعلیم یافتہ ہیں اور برسر روزگار، صفیہ جاریہ نے علی گڑھ سے فارسی میں ایم اے اور ۱۹۷۵ء میں پی ایچ ڈی کیا ہے۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا: ''داستان یوسف زلیخا در شعر فارسی'' فارسی زبان و ادب سے متعلق متعدد مقالات برہان، تحریر اور دوسرے رسالوں میں شائع ہوئے ہیں وہ آج کل شعبہ فارسی میں ریسرچ ایسوسیٹ ہیں۔ میمونہ جاریہ کیمیا میں ایم ایس سی اور پی ایچ ڈی کر کے اسی شعبہ میں لکچرر مقرر ہوگئی ہیں، غلام مرسلین نے عربی میں ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کیا ہے۔ ایم فل کا مقالہ انھوں نے مولانا عبدالحئی لکھنوی فرنگی محلی پر لکھا تھا جو کتابی شکل میں شائع ہوگیا ہے۔ علامہ مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ کتاب کو مرتب کر کے انھوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ وہ آج کل ویسٹ ایشین اسٹڈیز کے شعبے میں لکچرر ہیں۔

حافظ غلام مصطفےٰ مرحوم کے رفیق اور دوست پروفیسر محمد اقبال انصاری سابق صدر شعبہ اسلامیات کی توجہ سے ان کی انگریزی اور اردو کتابیں شائع ہوئیں جب کہ عربی کتاب ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کے اہتمام میں مکتبہ سلفیہ بنارس سے اشاعت پذیر ہوئی۔ اگر علی گڑھ کا شعبہ عربی مرحوم کے مضامین بھی جمع کر کے شائع کر دے تو یہ ایک مفید علمی خدمت ہوگی۔

(جنوری ۱۹۹۴ء)

ندوی، محبّ اللہ لاری، مولانا

مولانا محبّ اللہ لاری ندوی

افسوس ہے کہ مولانا محبّ اللہ ندوی مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، ۳۰ رنومبر ۹۳ء کو رحلت فرماگئے، ان کی عمر ۸۸ برس تھی اور وہ نحیف و کمزور بھی ہوگئے تھے لیکن ندوۃ العلماء کے دور کمال کی ایک یادگار تھے اور ان کا وجود ندوۃ العلماء خصوصاً اس کے ناظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کے لیے باعث تقویت تھا جن کے مرحوم ہم سبق تھے۔

ان کا وطن لار تھا، یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ عربی تعلیم ندوۃ العلماء لکھنو اور انگریزی تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پائی اس کے بعد وہ چاہتے تو اچھی سی اچھی ملازمت مل جاتی مگر انھوں نے فراغت کے بعد کانپور میں اپنی انڈسٹری کر لی۔

کاروبار میں لگ جانے کے بعد بھی انھوں نے ندوۃ العلماء اور اس کے فضلا سے اپنا تعلق باقی رکھا اور اس کی مجلس انتظامیہ کے برابر رکن رہے۔ ۶۹ء میں بعض خاص حالات کی بناء پر انہیں دارالعلوم کے اہتمام کی ذمہ داری سپرد کی گئی جس کو کم و بیش ۲۵ برس تک وہ انجام دیتے رہے اور وفات کے بعد ہی اس سے سبکدوش ہوئے۔

دینداری، تقویٰ اور خشیتِ الٰہی ان کا شعار تھا، طبیعت میں اعتدال، سلامت روی سادگی اور انکسار تھا۔ اپنے اخلاص، مروت، شرافت اور حسن خلق کی بناء پر طلبہ، اساتذہ اور منتظمین کے حلقے میں مقبول رہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے اس نیک بندے کی مغفرت فرمائے، آمین۔

اب مولانا سید محمد رابع ندوی صاحب نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اہتمام کی ذمہ داری سنبھال لی ہے، جن کا انتخاب ان کے طویل تجربہ اور دیرینہ خدمات کی بنا پر بہت مناسب ہوا ہے۔ (''ض''۔ جنوری ۱۹۹۴ء)

احمد، اسلام

جناب اسلام احمد

دسمبر کا مہینہ ختم ہونے کے قریب تھا کہ جناب اسلام احمد ریٹائرڈ۔ آئی۔ جی کے انتقال کی خبر ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے نشر ہوئی۔ وہ علامہ شبلیؒ مرحوم کے ہم خاندان اور خاص عزیز تھے، ان کے والد بزرگوار شیخ محمد اقبال الٰہ آباد ہائی کورٹ میں چیف جسٹس تھے، جن کے مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی سے مخلصانہ روابط تھے۔ اسلام احمد صاحب بھی اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے اور آخر میں آئی جی ہو کر ریٹائر ہوئے۔

وہ لکھنؤ میں متوطن ہوگئے تھے لیکن اپنے وطن اعظم گڑھ سے انہیں ہمیشہ بڑا تعلق رہا، ان کی تدفین بھی بندول میں ان کے آبائی قبرستان میں ہوئی، یہاں کے لوگوں سے بلا تفریق مذہب و ملت بڑی محبت، خلوص اور گرم جوشی سے ملتے اور ان کی خاطر مدارات

میں کمی نہ کرتے۔ ان کی اہلیہ بڑی نیک بخت خاتون تھیں، اللہ تعالیٰ ان کی بشری لغزشوں کو معاف کرے اور ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔ (''ض''۔ جنوری ۱۹۹۴ء)

عزیز الرحمٰن، مولوی

مولوی عزیز الرحمٰن صاحب

مولوی عزیز الرحمٰن صاحب کوئر یاپار اعظم گڑھ کے ایک شریف و نجیب خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اردو کے مشہور ادیب و نقاد جناب شمس الرحمٰن فاروقی ان کے حقیقی بھتیجے تھے، جو اور اس خاندان کے دوسرے اشخاص بھی بڑے سرکاری عہدوں پر فائز ہیں۔ علمی و دنیاوی وجاہت کی طرح دینداری میں بھی یہ خانوادہ ممتاز تھا۔

مولوی عزیز الرحمٰن صاحب کی تعلیم مدرسہ الٰہیات کانپور میں ہوئی تھی اور انھوں نے الٰہ آباد بورڈ کے امتحانات بھی اچھے نمبروں سے پاس کئے تھے، ۱۹۲۵ء میں وہ شبلی نیشنل ہائر سکنڈری اسکول میں تدریس کی خدمت پر مامور ہوئے اور ۶۶ء میں ریٹائر ہوئے۔

مولوی صاحب کو قومی و ملی اشغال سے بھی سروکار رہا اور جمعیۃ علمائے ہند اور کانگریس پارٹی سے وابستہ رہے، اعظم گڑھ کے نسواں اسکول کے جواب گریجویٹ کالج ہوگیا ہے، بانی ارکان میں تھے، برسوں اس کے صدر بھی رہے۔

ملازمت کے ابتدائی زمانے سے دارالمصنفین آنے کا معمول بنالیا تھا۔ اس وضع داری کو اس وقت تک نباہا جب تک پیروں میں قوت رہی، انہیں مولانا سید سلیمان ندوی صاحبؒ اور مولوی مسعود علی ندوی کی مجلس میں باریاب ہونے کا شرف حاصل تھا، شاہ معین الدین احمد اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحبان اور دوسرے رفقا اور کارکنوں سے نہایت بے تکلف تھے، اس ناچیز پر بھی بہت شفقت فرماتے تھے۔

دو تین برس سے بالکل معذور اور خانہ نشین ہوگئے تھے، بالاخر ۲۸/ اور ۲۹/ دسمبر کی درمیانی شب میں واصل بحق ہوگئے، اللہ ان کے درجات بلند کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ (''ض''۔ جنوری ۱۹۹۴ء)

رحمانی، ابوالحسن عبیداللہ، مولانا

شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی

شیخ الحدیث مولانا ابوالحسن عبیداللہ رحمانی ۵/ جنوری کو رحلت فرماگئے، انا للہ و انا الیہ راجعون۔ ان کے نام سے میں بچپن ہی میں آشنا ہوگیا تھا، میرے والد مسلکاً اہل حدیث ہیں، وہ جریدۂ اہل حدیث (امرتسر) اور رسالہ محدث اور اس مسلک کے بعض دوسرے رسالوں کے خریدار تھے، محدث مولانا نذیر احمد رحمانیؒ کی ادارت میں دارالحدیث رحمانیہ دہلی سے شایع ہوتا تھا، اس میں فتاویٰ اور مضامین مولانا عبیداللہ رحمانی کے بھی برابر چھپتے تھے، میں ۱۹۴۷ء میں پرائمری درجات میں پڑھتا تھا، اس وقت ''محدث'' میری سمجھ میں کیا آتا؟ تاہم اسے پڑھنے کی کوشش ضرور کرتا، ایک روز والد صاحب نے اسے الٹتے پلٹتے دیکھا تو فرمایا کہ ''میں تمھیں اسی مدرسہ میں پڑھنے کے لیے بھیجوں گا جہاں سے ''محدث'' شایع ہوتا ہے''۔ مگر افسوس

؎ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

جس سال میں مدرسۃ الاصلاح کے درجہ چہارم عربی میں پڑھتا تھا اس سال میرے درجہ میں ایک نئے طالب علم داخل ہوئے جن کی طرف ہمارے استاد مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم بڑا اعتنا کرتے تھے، جب یہ کسی تعطیل کے بعد اپنے گھر سے مدرسہ آتے تو مولانا ان کے والد کی خیریت ضرور دریافت فرماتے، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ان کا بڑا احترام کرتے تھے، اس کی وجہ سے میرے دل میں بھی ان کے والد کی عزت وعظمت کا نقش ثبت ہوگیا تھا۔ ہمارے یہ نئے رفیقِ درس مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری تھے اور ان کے والد محترم کا نام شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی تھا جو خود بہت ممتاز عالم اور سیرت البخاری کے مصنف مولانا عبدالسلام مبارکپوریؒ کے صاحبزادے اور ترمذی شریف کی مشہور و مقبول شرح **تحفۃ الاحوذی** کے مصنف مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری نور اللہ مرقدہٗ کے خاص تربیت یافتہ تھے، **وکفیٰ به فخرا**۔

مولوی عبدالرحمٰن صاحب چوتھے درجہ کے بعد ہی دوسرے مدارس میں چلے گئے اور میں مدرسۃ الاصلاح میں تعلیم مکمل کر کے دارالمصنفین آگیا، اس وقت مولانا عبیداللہ رحمانی صاحب **مشکوٰۃ المصابیح** کی شرح **مرعاۃ المفاتیح** لکھ رہے تھے، اسی دینی، علمی اور تحقیقی کام کے سلسلے میں وہ کتابیں دیکھنے کے لیے اپنے وطن مبارکپور سے کبھی کبھی دارالمصنفین بھی تشریف لاتے تھے، یہیں جب ان سے ملاقات ہوئی تو محسوس ہوا کہ میں ایک باوقار مگر نہایت خلیق و متواضع عالم و محدث اور بڑے متبع سنت اور صاحب ورع و تقویٰ بزرگ سے مل رہا ہوں۔

مولانا بڑے متبحر عالم تھے، وہ دینی علوم میں مکمل دستگاہ رکھتے تھے، لیکن ان کا خاص میدان فن حدیث تھا جس کے مسائل و مباحث کی تحقیق و تدقیق میں ان کی عمر گزری تھی، مجھے بھی صاحبِ تصانیف محدثین پر کام کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً ان سے استفادہ کا موقع ملا، مولانا شمس الحق ڈیانویؒ کی تصنیف **عون المعبود شرح سنن ابی داؤد** کے بارے میں بعض تحقیق طلب امور کے متعلق خاص طور پر ان سے رہنمائی کا طالب ہوا جس کا ذکر میں نے اپنے ایک مضمون ''عون المعبود کا مصنف کون ہے'' میں کیا ہے۔

مبارکپور میں میرے لیے کشش کا باعث مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کی ذات گرامی بھی ہے، جن کی دعوت پر اکثر وہاں جانے کا اتفاق ہوتا ہے، اس کی وجہ سے بھی

حضرت شیخ الحدیث کی خدمت میں حاضری اور استفادہ کا موقع مل جاتا تھا۔

مولانا عبیداللہ صاحب نے فارسی کے علاوہ متوسطات تک کی عربی کتابیں بھی اپنے والد بزرگوار ہی سے پڑھی تھیں لیکن درسیات کی تکمیل دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں کی جس سے فراغت کے بعد ہی ان کی ذہانت واستعداد دیکھ کر شیخ عطاء الرحمٰن صاحب مہتمم نے ان کو دارالحدیث رحمانیہ میں درس و تدریس کی خدمت پر مامور کردیا، اور جب تک یہ مدرسہ رہا وہ اس ذمہ داری کو خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے، کئی برس بعد بنارس میں اسی کا ثانی جامعہ سلفیہ قائم ہوا تو وہ اس کی سرپرستی فرماتے رہے۔

درس و تدریس کے علاوہ تحریر و تصنیف سے بھی انہیں سروکار رہا، اردو اور عربی میں لکھنے پر پوری قدرت تھی، ان کی اردو تحریریں شستہ، پُرمغز اور حشو و زوائد سے پاک ہیں، گو اردو میں کم لکھتے تھے مگر جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کے وسیع علم و مطالعہ، دقتِ نظر اور استحضار کا پتہ چلتا ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ نے آخر عمر میں ضعفِ بصر کی وجہ سے **تحفة الاحوذی** کی تکمیل کے لیے مولانا عبیداللہ صاحب کو اپنا معاون بنالیا تھا جس سے ان کو بڑا فائدہ ہوا اور ان کی نظر میں وسعت پیدا ہوئی اور غالباً اسی بنا پر انہیں بھی **مشکوٰۃ المصابیح** کی شرح لکھنے کا خیال ہوا ہوگا جو ان کا عظیم الشان کارنامہ ہے، مگر افسوس ہے کہ یہ شرح پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی جس میں بڑا دخل ان کی خرابی صحت، پیری اور دوسرے عوارض کو تھا، ہندوستان میں **مشکوٰۃ المصابیح** کو بڑا حسن قبول حاصل ہوا اور یہاں کے اہلِ علم نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا، اردو فارسی اور عربی میں اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں، **مرعاۃ المفاتیح** اسی سلسلہ کی کڑی ہے جو اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر بہت ممتاز اور قدما کی شرحوں کے ہم پایہ ہے۔

وہ علم و فضل سے زیادہ عمل، اخلاص، للّٰہیت، بے نفسی، قناعت، زہد و تقویٰ اور سیرت و کردار کی پختگی میں فائق و برتر تھے، بڑی پاکیزہ، محتاط، سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے، اپنی عسرت اور پریشانی کسی کو محسوس نہیں ہونے دیتے تھے۔ عجز و انکسار، خاکساری و فروتنی ان کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھی۔ انھوں نے اپنا کام شاید ہی کسی سے لیا ہو لیکن دوسروں کی خدمت کرنے میں ان کو لطف ملتا تھا، اپنے مہمانوں کی تکریم و مدارات میں بچھے رہتے تھے، خوردوں سے بھی جس انداز سے پیش آتے تھے اس سے انہیں بڑی شرمندگی ہوتی تھی۔

اپنے مسلک میں پختگی کے باوجود دوسرے مسلک کے لوگوں کو برا بھلا نہ کہتے بلکہ انکے ذی علم اصحاب کے ادب و احترام کا پورا لحاظ رکھتے تھے، دینی حمیت کے باوجود غصہ، برہمی اور جھنجھلاہٹ کا اظہار نہ کرتے لیکن نرمی اور ملاطفت سے صحیح اور سچی بات کہہ دیتے، نہ کسی کو ان کی زبان اور ہاتھ سے کوئی تکلیف پہنچی ہوگی اور نہ کسی کی شکایت اور غیبت سے انکی زبان آلودہ ہوئی ہوگی، عصبیت اور فرقہ بندی کے اس دور میں ایسے معتدل اور پختہ سیرت کے اشخاص مشکل سے ملیں گے۔

شرم و حیا کا یہ حال تھا کہ ع برہنہ نہ دیدہ تنم آفتاب۔ سخت گرمی اور خلوت میں بھی ساتر لباس زیب تن رہتا۔ بڑے نظافت پسند تھے، لباس سادہ مگر صاف پہنتے اور اپنے مکان کو بھی بہت صاف ستھرا رکھتے۔

وہ طبعًا نہایت خاموش اور گوشہ نشین قسم کے آدمی تھے، نہ بلا ضرورت بات کرتے اور نہ فضول کاموں میں وقت ضایع کرتے، جلسے جلوس، ہنگاموں اور ہر قسم کی سرگرمیوں سے الگ رہ کر صرف علمی کاموں میں مشغول رہتے، نام و نمود کا شائبہ بھی ان میں نہ تھا خود نمائی ظاہر داری اور تکلف و تصنع سے نفرت تھی، کبھی اپنے کو نمایاں اور ممتاز کرنے کا خیال بھی دل میں نہ آیا ہوگا، اسی لیے عام لوگوں کو ان کے نام سے بھی واقفیت نہیں تھی مگر ہندوستان ہی نہیں اسلامی ملکوں کے خواص کو بھی ان کے علمی کمالات کا اعتراف تھا، ان کے وطن کے ہر فرقہ و مذہب کے لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔ چنانچہ جنازے میں آدمیوں کا جم غفیر تھا، دوسرے ضلعوں اور صوبوں کے لوگ بھی آگئے تھے۔

اس قحط الرجال میں ایسے عالم باعمل کا اُٹھ جانا نہ صرف جمعیۃ اہلحدیث بلکہ ملت اسلامیہ کا خسارہ ہے۔ گو وہ عمر طبعی کو پہنچ گئے تھے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ فن حدیث کی مشکلات و غوامض میں اب کون رہنمائی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ علمِ دین اور حدیثِ نبویؐ کے اس خادم اور اپنے مقبول بندے کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے آمین!! (''ض''۔ فروری ۱۹۹۴ء)

<u>**غلام محمد، ڈاکٹر**</u>

ڈاکٹر غلام محمد

مشہور صاحب علم و قلم پروفیسر محمد اسلم پنجاب یونیورسٹی (لاہور) کے گرامی نامہ سے مولانا ڈاکٹر غلام محمد صاحب کے انتقال کی اندوہ ناک خبر ملی، ان کا وطن حیدرآباد دکن تھا اور وہ جامعہ عثمانیہ کے گریجویٹ تھے، تقسیم کے بعد کراچی تشریف لے گئے اور بالآخر اسی کی خاک کا پیوند ہوئے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی رہنمائی میں تصوف و سلوک کے مراحل طے کئے اور خود علم و عرفان اور شریعت و طریقت کے جامع ہوگئے، اپنے مرشد عالی مقام سے ان کو والہانہ تعلق تھا، اس کا ثبوت ان کی تصنیف ''تذکرۂ سلیمان'' اور وہ مضامین ہیں جو وقتاً فوقتاً حضرت سید صاحبؒ پر وہ لکھتے رہے ہیں، ان سے فرط تعلق کی بنا پر انہیں دارالمصنفین سے بھی عشق تھا اور وہ برابر اس کی بقا و تحفظ کے لیے دعا فرماتے تھے، انہی کی کوشش سے ان کے ایک مسترشد جناب محمد یحییٰ صاحب نے پاکستان میں معارف کی

ترسیل کی ذمہ داری قبول فرمائی۔

راقم کو ان سے ملاقات کا شرف تو حاصل نہیں ہوا لیکن گذشتہ دس بارہ سال سے مراسلت کا سلسلہ قائم تھا۔ جس کا باعث بھی حضرت سید صاحبؒ کی ذات گرامی ہوئی۔ ۸۳-۱۹۸۲ء میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر راقم نے بہار اردو اکاڈمی کے سیمینار کے لئے سیرۃ النبیؐ جلد سوم پر ایک مضمون لکھا، اس کے تتمہ میں اس جلد پر کیے گئے اعتراضات کے جواب میں خاص طور پر معجزات کے تعلق سے ایک مشہور عالم و محدث کی ایرادات زیر بحث آئی تھیں، اس پر فرنگی محل کے ایک بزرگ کو کسی قدر ناگواری ہوئی تھی مگر مولانا غلام محمد صاحب نے اسے ملاحظہ فرمانے کے بعد مجھے پہلی مرتبہ خط لکھا کہ ''آپ نے اہل ندوہ اور حضرت سیدی و مولائی کے وابستگان دامن کی جانب سے فرض کفایہ ادا کردیا''۔ میں نے معارف میں مولانا آزاد اور ربوبیت الٰہی اور بابری مسجد کے انہدام پر جو شذرات لکھے ان کی تحسین فرما کر بھی حوصلہ افزائی فرمائی۔

مرحوم کا علم و مطالعہ وسیع تھا، فلسفہ و تصوف کے علاوہ تفسیر و قرآنیات پر بھی اچھی نظر تھی، اردو بہت سلیس لکھتے اور تحریر ماقل و مادل ہوتی، سچے عالم کی طرح خطا و تقصیر کے اعتراف میں انہیں تامل اور تنقید و اعتراض پر کبیدگی نہیں ہوتی تھی، اپریل ۹۳ء کے معارف میں ان کی کتاب ''رموز سورۂ یوسف'' کے تبصرے میں اس کی بعض فروگزاشتوں کی جانب توجہ دلائی تو پہلے مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلما نے اپنے گرامی نامہ میں اس کی تحسین فرمائی پھر خود صاحبِ تصنیف نے اپنی فروگذاشتوں کا اعتراف کرتے ہوئے اظہار تشکر فرمایا۔

پروفیسر محمد اسلم کا گرامی نامہ قدرے طویل ہے اس لیے اس کے بعض اقتباسات ہی کی نقل پر اکتفا کیا جاتا ہے:

جناب من زید مجدکم، سلام مسنون!

۱۸ر دسمبر کو ہم پر قیامت گزر گئی۔ بزم اشرفؒ کا ایک روشن چراغ بجھ گیا یعنی ہمارے مخدوم و محترم ڈاکٹر غلام محمد صاحب اس روز علی الصبح کراچی میں امراضِ قلب کے ہسپتال میں انتقال فرما گئے، اسی شام ہزاروں عقیدت مندوں نے ان کا جسد خاکی پنجابی سوداگران کے قبرستان مسمّی بہ شفیق پورہ میں سپرد خاک کردیا، انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ گذشتہ ماہ جولائی میں کراچی میں ان کے ساتھ کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ ان دنوں ڈاکٹر سید سلمان ندوی کراچی تشریف لائے ہوئے تھے، انھوں نے چند احباب کو رات کے کھانے پر مدعو کیا، ان میں میرے علاوہ قبلہ ڈاکٹر غلام محمد مرحوم بھی تھے، تین گھنٹے خوب محفل جمی اس کے بعد سلمان صاحب ہمیں اپنی قیام گاہوں تک پہنچانے گئے۔ دو تین روز کے بعد ڈاکٹر صاحب نے عشاء سے قبل مجھے اپنے دولت کدہ پر بلایا، نو بجے روہیل کھنڈ سوسائٹی لے گئے، ایک مکان کی چھت پر فرش بچھا ہوا تھا۔ اندازاً تیس (۳۰) بتیس (۳۲) افراد وہاں موجود تھے، ڈاکٹر صاحب نے نماز کے بعد پون گھنٹے تک ذکر کرایا۔ اس کے بعد کھانے کا اہتمام تھا، میں ان کے برابر بیٹھا ہوا تھا، موصوف اپنے دست مبارک سے میری پلیٹ میں بریانی ڈالتے رہے، کھانے کئی قسم کے تھے لیکن انھوں نے مجھے صرف بریانی ہی کھلائی، کھانے سے فراغت کے بعد دعا ہوئی اور مرحوم مجھے میری قیام گاہ پر چھوڑنے آئے۔

میں نے اپنی کتاب ''سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کا ذوق موسیقی'' ڈرتے ڈرتے ان کی خدمت اقدس میں ارسال کی، انھوں نے کتاب کے مندرجات کی دل کھول کر تعریف فرمائی اور یہ بھی تحریر فرمایا کہ ایک زمانے میں انہیں بھی اس موضوع سے دلچسپی رہی ہے، ڈاکٹر صاحب اپنے گھر میں ہومیوپیتھک مطب چلاتے تھے، میں نے ایک روز عرض کیا کہ اس میں کیا راز ہے کہ حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہ کے کئی خلفاء اور آگے ان کے خلفاء اور مریدین ہومیوپیتھ ہیں، کراچی میں حضرت عبدالحیٔ عارفی بڑے کامیاب ہومیوپیتھ ڈاکٹر تھے۔ مجذوبؔ بھی غالباً اس فن سے واقف تھے، کیا حضرت تھانوی نے بھی اس طریقۂ علاج سے استفادہ کیا ہے۔ فرمانے لگے کہ ہاں ایک بار جب حضرت تھانوی دوا لینے لگے تو حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ اس میں نشہ آور اجزا بھی ملائے جاتے ہیں۔ اس پر فرمایا ''میاں! ہم اتنے پرہیز گار کہاں ہیں؟'' یہ کہتے ہوئے انھوں نے وہ پُڑیا منہ میں انڈیل لی۔ خود سید سلیمان ندوی مرحوم کراچی میں حضرت عبدالحیٔ عارفی کے زیر علاج رہے تھے۔

ڈاکٹر غلام محمد صاحب چھوٹوں کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ خط کے لفافے پر مرحوم نام کے ساتھ جو القاب لکھتے انہیں پڑھ کر مجھے شرم آجاتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب سول سکریٹریٹ کراچی کی مسجد میں خطبہ جمعہ بھی ارشاد فرماتے تھے، اکثر پڑھے لکھے لوگ وہیں نماز جمعہ ادا کرتے تھے۔ افسوس کہ میں کراچی جا کر بھی کبھی ان کا خطبہ نہ سن سکا۔

والسلام، غم زدہ، محمد اسلم

مولانا کے مسترشد خاص جناب محمد یحییٰ صاحب کی حالت اس حادثہ کی وجہ سے اس قابل نہیں تھی کہ فوراً خط لکھتے۔ یکم جنوری کا لکھا ہوا ان کا والا نامہ ۱۵ر جنوری کو ملا، وہ علالت و وفات کی تفصیل بیان کرنے کے بعد آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

''کیا عرض کروں؟ قیامت گزر گئی...... اس احقر کا تعلق حضرت اقدس سے اٹھارہ (۱۸) برس سے تھا، حضرت والا کی جدائی کے صدمہ کی کیفیت کچھ ایسی ہے کہ ہر آنے والا دن پہلے سے زیادہ غم اور دکھ دے رہا ہے...... میرے دردِ

دل کو آپ یقیناً محسوس فرمائیں گے کیونکہ آپ سے تعارف کا ذریعہ بھی تو شیخ محروم ہی تھے، دفتر پابندی سے نہیں آرہا تھا، آج ذرا ہمت ہوئی ہے تو آپ کو خط لکھ رہا ہوں، آپ سے درخواست ہے کہ حضرت اقدس کے لیے خصوصی دعا فرمائیں آمین، فقط محمد یحییٰ''۔

اللہ تعالیٰ اپنے اس صاحب علم و معرفت بندے کو جنت الفردوس نصیب کرے اور اعزہ و متوسلین کے غم کو زائل فرمائے آمین۔ (''ض''، فروری ۱۹۹۴ء)

مجددی، عبدالرحیم، مولانا شاہ

مولانا شاہ عبدالرحیم مجدّدیؒ

دینی حلقوں میں مولانا عبدالرحیم مجددی صاحب کی وفات کی خبر بڑے رنج و غم کے ساتھ سنی جائے گی، ان کے جدامجد حضرت مولانا شاہ ہدایت علی صاحبؒ سلسلہ نقشبندیہ مجدّدیہ کے ایک بڑے شیخ طریقت تھے جن کی ذات سے جے پور (راجستھان) میں مدتوں رشد و ہدایت کا چراغ روشن رہا، وہ صاحب تصانیف بھی تھے، حضرت مجدّد الف ثانیؒ کے مکتوبات کا اردو ترجمہ ''درلاثانی'' کے نام سے کیا تھا، انہی کے سایہ عاطفت میں مولانا عبدالرحیم صاحب کی پرورش و پرداخت ہوئی۔ مولانا مفتی محمد رضا انصاری مرحوم اور دوسرے علمائے فرنگی محل سے درسیات کی تکمیل کی سلوک و تصوف کی منزلیں اپنے بزرگوار کی رہنمائی میں طے کرکے خود بھی شیخ کامل ہوئے اور جب ان کے انتقال کے بعد ان کی مسندِ ارشاد پر متمکن ہوئے ان کا فیض بہت وسیع اور عام ہوگیا۔

مولانا کی تعلیم و تربیت قدیم طرز پر ہوئی تھی اور وہ ایک صاحب ورع و تقویٰ بزرگ اور شریعت و طریقت کے جامع شخص تھے مگر ان میں ایجاد و اختراع کی قابلیت بھی تھی اور وہ زمانے کے حالات و مسائل اور وقت کی ضرورتوں اور تقاضوں سے بھی واقف تھے، علاوہ ازیں وہ مخلص اور بڑے عملی شخص تھے، انھوں نے اپنے دادا کے کاموں کو وسعت و ترقی بھی دی اور ان میں اضافہ بھی کیا، ان کا سب سے بڑا کارنامہ جـــامعۃ الھـدایۃ کا قیام ہے، جس کو وہ قدیم و جدید تعلیم اور عصری علوم سائنس اور ٹکنالوجی کا مرکز بنانا چاہتے تھے۔ اپنی اسی خصوصیت کی وجہ سے انھوں نے اپنی اولاد کو دارالعلوم ندوۃ العلما میں داخل کیا۔

دسمبر ۱۹۸۵ء میں مولانا عبدالرحیم صاحب نے جامعۃ الہدایۃ کے افتتاح کی تقریب بڑے اہتمام سے منائی تھی جس کا دعوت نامہ ازراہِ کرم مجھے بھی بھیجا تھا، اس موقع پر میں نے جو مقالہ پڑھا تھا اس کی تحسین فرما کر میری حوصلہ افزائی بھی کی۔ ابھی اکتوبر ۱۹۹۳ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کا اجلاس بھی وہیں ہوا جس کا دعوت نامہ بورڈ اور جامعہ دونوں کی طرف سے جب مجھے ملا تو بہت خوش ہوا کہ اسی بہانے حضرت کی زیارت اور جامعہ کو دوبارہ دیکھنے کا موقع ملے گا مگر عین وقت پر طبیعت خراب ہوجانے سے اجلاس کی شرکت سے محروم رہا جس کا بہت افسوس ہوا۔

اتفاق سے اسی زمانے میں مولانا بھی علیل ہوگئے، درمیان میں کسی قدر افاقہ بھی ہوا مگر ۵/جنوری کو صبح نو بجے بمبئی ہاسپٹل میں رشد و ہدایت کا یہ چراغ ہمیشہ کے لیے بجھ گیا، اور مولانا ہدایت علی صاحب کی مسند اجڑ گئی۔ اللہ تعالیٰ انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور عزیزوں اور عقیدت مندوں کو صبر و قرار بخشے۔

مولانا کی زندگی ہی میں ان کی پیری، علالت اور ضعف کی وجہ سے ان کے صاحبزادگان مولانا فضل الرحیم اور مولانا ضیاء الرحیم جامعہ کے کام انجام دینے لگے تھے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہمت و قوت اور اخلاص و استقلال عطا فرمائے تاکہ ان کے والد مرحوم کا لگایا یہ باغ سرسبز و شاداب رہے۔ (''ض''، فروری ۱۹۹۴ء)

عرفان، محمد، حافظ

حافظ محمد عرفان

افسوس ہے کہ ۱۴/رمضان المبارک کو علامہ شبلیؒ کے حقیقی نواسے حافظ محمد عرفان صاحب وفات پاگئے، ان کا وطن بندول تھا مگر قیام اعظم گڑھ میں تھا، وہ دارالمصنفین برابر آتے اور جمعہ کی نماز بھی یہیں پڑھتے، انہیں قرآن مجید بہت اچھا یاد تھا اور ہر سال تراویح میں اسے سناتے، اس سال بھی ضعف و علالت کے باوجود روزے چھوڑنے کے لیے کسی طرح آمادہ نہ تھے، رمضان کے مقدس مہینہ میں وفات ان کے حسن خاتمہ کا ثبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ پس ماندگان کو صبر و قرار عطا کرے۔ آمین! (''ض''، مارچ ۱۹۹۴ء)

نیازی، کوثر، مولانا

مولانا کوثر نیازی

گذشتہ ماہ اخباروں سے یہ معلوم کرکے بڑا صدمہ ہوا کہ پاکستان کے مشہور عالم و مصنف، ادیب و شاعر اور سیاست داں مولانا کوثر نیازی کا انتقال دماغ کی شریان پھٹ جانے سے ہوگیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

وہ ۱۹۳۴ء میں میانوالی پنجاب میں پیدا ہوئے، طالب علمی کا زمانہ پریشانی میں گزرا مگر ان کے حوصلے بلند رہے، تعلیم سے فراغت کے بعد قومی اشغال سے ان کا شغف بڑھا، ایک زمانے میں جماعت اسلامی کے سرگرم رکن رہے۔ اس سے علیحدگی کے بعد جناب ذوالفقار علی بھٹو سابق وزیر اعظم پاکستان کی پیپلز پارٹی میں شامل ہوئے اور ۱۹۷۰ء میں سیالکوٹ سے قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے، ۱۹۷۲ء میں وزیر اعظم مسٹر بھٹو نے انہیں امور مذہبی و اطلاعات و نشریات کا وزیر بنایا۔ موجودہ وزیر اعظم مسز بے

نظیر بھٹو نے انہیں اسلامی کونسل کا چیرمین مقرر کیا تھا۔

صحافت وخطابت کے میدان میں بھی وہ اپنے جوہر دکھاتے رہے۔ بڑے اچھے مقرر اور خطیب تھے، کئی برس تک لاہور، سے ہفت روزہ ''شہاب'' نکالتے رہے اور کئی علمی و دینی کتابیں یادگار چھوڑیں۔ ان کی کتابوں، اسلام ہمارا دین، بصیرت، بنیادی حقیقتیں اور آئینۂ تثلیث کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، آخر الذکر کتاب اس وقت لکھی گئی جب پاکستان میں عیسائی مشنریاں ناواقف مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں سرگرم تھیں، یہ کتاب دراصل اسلام کی عیب جوئی کرنے والے عیسائی مبلغین کے لیے ایک آئینہ ہے جس میں عیسائیت کے اصلی خط و خال نمایاں ہوگئے ہیں۔ بھٹو حکومت کے خاتمہ کے بعد انھوں نے ''اور لائن کٹ گئی'' کے نام سے جو کتاب لکھی تھی اس میں اس کا ذکر ہے کہ فوجی انقلاب کیسے آیا؟ مولانا کی تحریر و تصنیف کی ایک خوبی روانی اور شگفتگی بھی ہے۔

مولانا کوثر نیازی ہندوستان اور پاکستان میں اچھے تعلقات کے متمنی تھے، ابھی چند برس پہلے دونوں ملکوں میں خیر سگالی کے جذبات کو فروغ دینے کے لیے انھوں نے ہندوستان کا دورہ بھی کیا تھا۔ دارالمصنفین سے بھی ان کو تعلق خاطر تھا۔ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم ان کا ذکر خیر کیا کرتے تھے، پاکستان کے بعض ناشر دارالمصنفین کی مطبوعات کو غیر قانونی طور پر چھاپ کر اس کو غیر معمولی نقصان پہنچا رہے تھے، اس کے تدارک کے لیے پاکستان کی وزارت تعلیم کے ماتحت نشر و اشاعت کے ایک اہم ادارے نیشنل بک فاؤنڈیشن اور دارالمصنفین کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اس میں مرحوم صباح الدین صاحب کو مولانا کوثر نیازی سے بھی بڑی مدد ملی تھی جس کا اعتراف انھوں نے ان لفظوں میں کیا ہے:

> ''انھوں (جناب سید حسام الدین راشدی) نے دارالمصنفین کی فریاد پاکستان کے وزیر امور مذہبی مولانا کوثر نیازی تک پہنچائی جو بڑے لائق اور فاضل اہل علم ہونے کے ساتھ بڑے علم نواز اور علم دوست بھی ہیں، انھوں نے بڑی کشادہ دلی سے اس مسئلہ کی طرف جناب ذوالفقار علی بھٹو وزیر اعظم پاکستان کی توجہ دلائی جنھوں نے اپنی معارف شناسی اور ہندوستان سے خیر سگالی کی خاطر اس سے اپنی پوری ہمدردی کا اظہار کیا۔ مولانا کوثر نیازی نے پاکستان کے وزیر تعلیم جناب عبدالحفیظ پیرزادہ پر بھی اس معاملہ کی نوعیت کو اچھی طرح واضح کیا جنھوں نے اپنی فراخ دلی سے پاکستانی ناشروں کی بدعنوانی پر اظہار افسوس کر کے اپنی علم پروری کا ثبوت دیا''۔

معارف برابر مولانا کے مطالعہ میں رہتا تھا اور انہیں اس کا انتظار رہتا تھا، انتقال کی خبر ملنے سے دو تین روز پہلے ان کے یہاں سے جو خط ملا تھا اس میں معارف کی تحسین اور اس کا شکوہ تھا کہ پابندی سے نہیں ملتا۔

مولانا کو اسلام آباد کی فیصل مسجد میں سپرد خاک کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔ (''ض''، اپریل ۱۹۹۴ء)

احمد، ودود، شاہ

شاہ ودود احمد

قارئین کو یہ خبر سن کر بھی بڑا ملال ہوگا کہ رمضان المبارک کے دوسرے عشرہ میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم سابق اڈیٹر معارف کے صاحبزادے شاہ ودود احمد کا انتقال حرکت قلب بند ہوجانے سے کراچی میں ہوگیا۔ اپنے والد بزرگوار ہی کی طرح وہ بھی بڑے نیک طینت اور شریف النفس انسان تھے، ان کی تعلیم شبلی کالج میں ہوئی اور تقسیم کے بعد پہلے ڈھاکہ پھر کراچی گئے جہاں پیام اجل آگیا۔ اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے اور تمام پس ماندگان خصوصاً ان کی بیوہ، بیٹے اور بیٹی کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ (''ض''، اپریل ۱۹۹۴ء)

خان، اکبر علی، میر

سابق گورنر میر اکبر علی خاں

اتر پردیش اور اڑیسہ کے سابق گورنر میر اکبر علی خاں کی وفات ملک و ملت کا اہم حادثہ ہے، وہ تحریک خلافت اور آزادی کی جدوجہد میں شریک رہے، اسی زمانے سے مولانا سید سلیمان ندوی سے ان کے تعلقات تھے، وہ علامہ شبلیؒ اور سید صاحبؒ کے قدرداں اور دارالمصنفین سے بڑا اخلاص رکھتے تھے، جب اتر پردیش کے گورنر ہوئے تو اسے میزبانی کا شرف بھی بخشا اور ایک بڑی رقم مرحمت کی جس سے ایک بڑا ہال تعمیر ہوا، مرحوم ہماری پرانی تہذیب و شرافت کا نمونہ اور سچے مسلمان تھے، صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے، دارالمصنفین میں ان کی تشریف آوری جمعہ کے دن ہوئی تھی، یہیں کی مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کی، جب وہ اڑیسہ کے گورنر تھے تو اس زمانے میں ایک دفعہ میں کلکتہ گیا، گورنر ہاؤس میں عصرانہ تھا، جس میں وہ بھی شریک تھے، میں ملا تو بڑی شفقت و محبت سے پیش آئے اور دارالمصنفین کا ذکر خیر فرماتے رہے، اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس نصیب کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ (''ض''، جولائی ۱۹۹۴ء)

حیات، سلطانہ، بیگم

بیگم سلطانہ حیات

افسوس ہے کہ اردو کی ایک عاشق وفدائی اور اتر پردیش میں اردو تحریک کی قائد بیگم سلطانہ حیات صاحبہ ۷/ جون کو رحلت فرماگئیں، وہ تقریباً نصف صدی تک اردو کے فروغ کے لیے سرگرم عمل رہیں، ۵۵ء میں انجمن ترقی اردو ہند نے اردو کو اتر پردیش

میں علاقائی زبان تسلیم کرانے کے لیے دستخطی مہم چلائی جس کو کامیاب بنانے میں انھوں نے اور ان کے شوہر جناب حیات اللہ انصاری نے غیر معمولی دلچسپی لی اور اتر پردیش کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا، وہ اس وفد میں بھی شامل تھیں جو ۲۲ لاکھ دستخطوں کے ساتھ میمورنڈم لے کر اس وقت کے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کے پاس گیا تھا، انھوں نے ''تعلیم گھر'' کے نام سے ایک ادارہ بھی قائم کیا تھا، اس نے اتر پردیش میں اردو کے کئی اسکول قائم کیے جن سے ہر سال سینکڑوں طلبہ فیضیاب ہوتے تھے، وہ طبعاً نیک، شریف اور دردمند خاتون تھیں، اللہ تعالیٰ اردو کی اس مجاہدہ اور خادمہ کی مغفرت فرمائے، آمین۔ (''ض''، جولائی ۱۹۹۴ء)

اصلاحی، نجم الدین، مولانا

مولانا نجم الدین اصلاحی

۱۴؍ اگست کو حافظ مولانا نجم الدین صاحب اصلاحی نے تقریباً ۹۴ برس کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

انھوں نے اپنے جد بزرگوار ملا قدرت علی مرحوم سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور اپنے گاؤں ہی کے ایک دوسرے بزرگ حافظ عبدالرحیم مرحوم کی خدمت میں رہ کر قرآن مجید حفظ کیا، مزید تعلیم مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں ہوئی، اس وقت مدرسہ میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحبِ تدبر قرآن اور مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم سابق مہتمم مدرسۃ الاصلاح بھی زیر تعلیم تھے۔ فارسی میں مولانا نجم الدین صاحب کی اچھی اور پختہ استعداد ان کے ہم وطن مولوی محمد مصطفےٰ صاحب کے فیض تلمذ کا نتیجہ تھی۔ جو مدرسۃ الاصلاح میں فارسی کے بہت اچھے اور لائق معلم تھے۔ اس زمانے میں مولانا شبلی متکلم ندوی مدرسۃ الاصلاح سرائمیر کے مہتمم تھے، وہ علامہ شبلیؒ کے تلمیذ رشید اور اس مجلس اخوان الصفاء کے ایک رکن تھے جو علامہ مرحوم کی وفات کے بعد ان کے ناتمام کاموں کی تکمیل کے لیے مولانا حمیدالدین فراہیؒ کی سربراہی میں قائم ہوئی تھی۔ مولانا شبلی متکلم معقولات اور اسرار شریعت کی کتابوں کا درس اس شان سے دیتے تھے کہ طلبہ کو مطالب بخوبی ذہن نشین ہوجاتے تھے۔ مدرسہ کا معیارِ تعلیم بلند اور بہتر بنانے کے لیے ان کو دوبارہ مدرسہ کی خدمت کی زحمت دی گئی تو بڑھاپے میں بھی ان کے درس کا وہی رنگ رہا، اس کی شہادت مولانا نجم الدین صاحب نے اس طرح دی کہ وہ چپکے سے جنگلے کے پاس جاکر درس سنا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی، مولانا حکیم محمد لہراوی اور دوسرے اساتذہ سے بھی درسیات کی تکمیل کی، ۱۹۱۷ء میں جب مولانا حمیدالدین فراہیؒ دارالعلوم حیدرآباد کی پرنسپلی سے استعفا دے کر مدرسۃ الاصلاح کے بوریائے فقر پر فروکش ہوئے تو وہ اپنے نہج پر یہاں کے اساتذہ اور منتہی طلبہ کو قرآن مجید پڑھاتے تھے، مولانا نجم الدین صاحب ان کے درس میں شریک ہوتے اور حافظ ہونے کی بنا پر قرأت بھی کرتے تھے۔ اس وقت اس نواح کے ممتاز اور نامور عالم مولانا ماجد علی مانوی جونپوری کے درس حدیث کی بڑی شہرت تھی، مولانا نجم الدین صاحب اس سے فیضیاب ہوئے۔

رسمی تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے مدرسۃ الاصلاح میں تدریس کی خدمت انجام دی، وہ ہونہار اور ذہین طلبہ کی بڑی حوصلہ افزائی کرتے تھے، جماعت اسلامی کے مشہور اہل قلم مولانا صدرالدین اصلاحی کی تربیت میں ان کا بڑا ہاتھ تھا، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی سابق امیر جماعت اسلامی ہند نے بھی ان سے بعض کتابیں پڑھی تھیں۔

۱۹۴۳ء میں وہ سدھاری اعظم گڑھ تشریف لائے اور پھر یہیں کے ہو رہے، مگر ۱۹۷۱ء میں کبرسنی کی وجہ سے وہ اپنے گھر ہی پر رہنے لگے۔

مولانا نجم الدین صاحب کا گھرانہ دیندار تھا اور خود ان کا رجحان بھی شروع سے صلحا و اتقیا کی جانب تھا، ان کے بچپن اور جوانی میں مولانا سید محمد امین نصیر آبادی اپنے اصلاحی و تبلیغی مشن کے سلسلے میں اعظم گڑھ تشریف لاتے تھے اور یہاں کے قصبوں اور دیہاتوں میں ان کا وعظ ہوتا تھا، اس کی وجہ سے یہاں ان کے ہزاروں معتقدین و مریدین تھے، راجہ پور سکروران کا خاص تبلیغی مرکز تھا اور وہ یہاں کئی کئی روز قیام کرتے تھے، مولانا نجم الدین صاحب ان کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ ''یادگار سلف'' کے نام سے ایک کتاب تالیف کی جس کے پڑھنے سے آج بھی ایمانی حرارت پیدا ہوتی ہے، مولانا سید امین صاحب کی ذات گرامی ان کے لیے اس بنا پر بھی نہایت پرکشش تھی کہ وہ حضرت سید احمد شہیدؒ کے دودمان عالی سے تعلق رکھتے تھے جس کے ہر ہر فرد سے وہ غیر معمولی عقیدت رکھتے تھے، اپنی یہ کتاب اسی مقدس خانوادہ علم و ارشاد کے ایک قابل احترام بزرگ مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی ندوی سابق ناظم ندوۃ العلماء کے نام سے معنون کی تھی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے جوان سے سن و سال میں چھوٹے تھے عقیدت و احترام کا یہی معاملہ تھا، مولانا بھی ان کا بڑا اکرام کرتے تھے اور اعظم گڑھ تشریف لاتے تو ان کے گھر بھی جاتے۔

مولانا نجم الدین صاحب دارالمصنفین سے بھی بڑا تعلق رکھتے تھے، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مسعود علی ندوی اور تمام رفقائے دارالمصنفین سے ان کے اچھے تعلقات تھے، مولانا سید سلیمان ندوی کے علم و فضل کے بڑے معترف تھے، جب تک قوت رہی برابر دارالمصنفین تشریف لاتے رہے، انتقال سے چند برس پہلے مجھے خط لکھا کہ تم سے ملنے کا بہت جی چاہتا ہے لیکن میرے پیروں میں طاقت نہیں رہی، میں حاضر ہوا تو بڑی محبت و شفقت سے پیش آئے اور دو تین گھنٹوں کی صحبت میں ماضی کے اوراق

اٹھتے رہے۔

اس صدی کی چوتھی دہائی میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے متکلمانہ اور دل و دماغ کو جھنجھوڑ دینے والے موثر مضامین نے بھی ان کو اپنی جانب مائل کیا، مولانا نے انہی کی دعوت پر سرائمیر کا سفر کیا اور ان کے گھر بھی تشریف لے گئے، اسی زمانے میں انھوں نے **دلائل السنن و الآثار** کے نام سے ایک اہم مضمون لکھا جو مولانا مودودی کے رسالہ ترجمان القرآن کے کئی نمبروں میں شائع ہوا اور بعد میں کتابی صورت میں بھی چھپا لیکن رفتہ رفتہ مولانا سے ان کے تعلقات کم ہوتے گئے اور وہ ان کی جماعت کی مخالفت میں پیش پیش رہنے لگے۔

مولانا نجم الدین صاحب کی عقیدت و نیاز کا اصل مرکز مولانا حمید الدین فراہیؒ اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی تھے، جن کو تدین و تقویٰ اور سیرت و اخلاق میں وہ صحابہ کرام کا نمونہ کہتے تھے، اول الذکر ان کے استاد تھے اور ان کے زہد و اتقا کی طرح علم و فضل کے بھی بڑے معترف تھے اور موخر الذکر سے بیعت و ارشاد کا تعلق تھا، ان دونوں بزرگوں کا ذکر کرتے تو ان پر عجیب کیفیت طاری ہوجاتی، ایک مرتبہ کہنے لگے ان دونوں سے زیادہ پاکیزہ اور حسین زندگی نہیں دیکھی۔

مولانا مدنی پر ان کے متعدد مضامین شائع ہوئے اور انھوں نے کئی برسوں کی محنت شاقہ کے بعد ان کے مکاتیب جمع کرکے اپنے مفید حواشی کے ساتھ چار جلدوں میں شائع کیا جو ان کا بڑا کارنامہ ہے، چند برس پہلے ان کی آخری کتاب ''سیرت شیخ الاسلام'' چھپی تھی، مولانا مدنی کی یادگار میں دیوبند سے ''ماہنامہ تذکرہ'' کا اجرا ہوا تو اس کی ادارت انہی کو سپرد کی گئی۔

مولانا مدنیؒ بھی اپنے مسترشد کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ان کی دعوت پر راجہ پور سکرور تشریف لاتے اور اہل قریہ اور قرب و جوار کے لوگوں کو مستفیض فرماتے، مولانا ہی کے ایما سے حکومت نے ان کا ماہانہ وظیفہ جاری کردیا تھا، وہ کہتے تھے کہ مجھے جب کبھی سدھاری چھوڑنے کا خیال ہوتا تو حضرت کا اشارہ نہ پاکر اپنا ارادہ تبدیل کردیتا تھا، یہ دعائے مدنی کا فیض ہے کہ اللہ نے اس اچھے حال میں کردیا۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ سے بھی ان کو خاص تعلق رہا، اور ان کے ایما سے مولانا روم کی رباعیات کا ایک انتخاب شائع کیا جس کے شروع میں ان کے حالات بھی فارسی میں لکھے تھے۔

ان کی بعض کتابیں رسائل و ذرائع کی کمی کی بنا پر تکمیل و اشاعت سے محروم رہیں، دلائل القرآن کے بعض حصے برہان دہلی میں شائع ہوئے، وہ تفسیر ابن جریر کا ملتقط بھی شائع کرنا چاہتے تھے، جس کا کچھ حصہ مجلّہ الحج مکہ میں چھپا تھا، لیکن غالباً مکمل نہیں ہوسکا، ایک مرتبہ کہنے لگے کہ استاذ امام مولانا فراہیؒ نے فرمایا تھا کہ تفسیر ابن جریر سے اگر ''اولیٰ الاقوال عندی'' کو جمع کردیا جائے تو ایک بہترین تفسیر ہوجائے گی۔

مولانا نجم الدین صاحب مدۃ العمر علم و دین کی خدمت اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے، ان کی زندگی سادہ اور فقیرانہ تھی، صبر و قناعت کے خوگر اور حرص و طمع سے دور رہتے، دینی حمیت کی وجہ سے غیر مشروع اعمال و اشغال پر برہم ہوجاتے۔ جن چیزوں کو صحیح سمجھتے تھے ان کا اظہار بے باکی سے کردیتے اور حکمت و مصلحت اور موقع و محل کی پروانہ کرتے، زود رنج تھے، اختلاف رائے کو انگیز نہیں کرسکتے تھے۔ مزاج میں شدت و انتہاپسندی اور طبیعت میں طیش و اشتعال تھا اس لیے غصے میں بے قابو ہوجاتے اور اعتدال پر قائم نہیں رہتے، جو کچھ زبان پر آتا یہاں تک کہ ناروا اور ناگفتنی بھی کہہ دیتے تھے، تحریر بھی بے اعتدالی سے خالی نہیں ہوتی تھی، اس لیے اکثر لوگوں سے ان کی ان بن ہوجاتی تھی مگر خود ان کا غصہ دیرپا نہ ہوتا تھا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور بشری لغزشوں کو معاف کرے۔ (''ض''، ستمبر ۱۹۹۴ء)

دہلوی، سید اخلاق حسین، مولانا

مولانا سید اخلاق حسین دہلوی

افسوس گزشتہ ماہ مولانا سید اخلاق حسین دہلوی کی رحلت سے علم و ادب اور دلی کی تہذیب و شرافت کا ایک روشن نقش بھی مٹ گیا۔

وہ ۱۹۰۶ء میں دہلی کے ایک معزز سادات عالیات کے خاندان میں پیدا ہوئے، ان کے پردادا سید علی بغدادی محمد شاہ کے زمانہ میں بغداد سے دہلی تشریف لائے، ان کے پوتے اور مرحوم کے والد ماجد محمد ابراہیم حسین کا شمار دلی کے نامور شرفاء میں ہوتا تھا، سید احمد دہلوی صاحب فرہنگ آصفیہ ان کے رشتہ کے چچا تھے اور مولانا دہلوی کے بھائی حکیم سید حسین دہلوی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ دلی کی تہذیب و معاشرت کے شاید آخری کامل نمونہ تھے۔ ان کا انتقال کچھ عرصہ قبل ہوا۔ پہلے عرب سرائے، دلی کے شرفاء کی قابل احترام بستی تھی، گردشِ روزگار سے جب یہ اپنے مکینوں سے خالی ہوئی تو اس کے آثار و باقیات کو سخت حالات کے باوجود ان دونوں بھائیوں نے قائم رکھنے کی سعی کی اور اس کے قبرستان و مساجد کی تولیت ان ہی کے ہاتھوں میں رہی۔

خاندان کے علمی ماحول کے اثر سے سولہ برس کی عمر ہی میں مولانا اخلاق دہلوی کے قلم سے ایک کتاب نکلی۔ کچھ عرصہ تک انہوں نے میرٹھ کے قصبہ بڑوت کے ایک کالج میں تدریسی فرائض بھی انجام دیے، اسی زمانے میں انھوں نے درسیات کا سلسلہ شروع کیا جیسے مضمون نگاری، میزان سخن، خلاصہ مصباح القواعد اد رشمیم بلاغت وغیرہ۔ اردو کالج دہلی کے طالب علموں کی سہولت کے لیے مولانا امام بخش صہبائی کی کتاب حدائق البلاغت کی تلخیص روح بلاغت کے نام سے کی، یہ سب کتابیں مقبول ہوئیں اور

طلبہ کے علاوہ عام اردوخواں طبقہ کو بھی اس سے فائدہ پہنچا، مولانا کی علمی وتحقیقی کاوشوں کا موضوع خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے سوانح اور مشائخ چشت کے ملفوظات ہیں۔ حضرت امیر خورد سید محمد کرمانی کی سیرالاولیاء میں الحاق وتحریف کا احساس اہل نظر کو تھا لیکن حقایق سے روشناس کرانے کی سعادت علامہ مرحوم کے حصہ میں آئی اور اہل علم نے اسے نگاہِ تحسین سے دیکھا، بعد میں انہوں نے حیات طیبہ حضرت محبوب الٰہی کے نام سے ایک کتاب لکھی جو مستند ہونے کے علاوہ مولف کے جذبہ، خلوص اور شائستہ وشستہ انداز تحریر کا نمونہ ہے، اس میں ایک جگہ انہوں نے سیرالاولیاء کے متعلق لکھا کہ ''اسلوب بیان سبحان اللہ کیسا سادہ پُرو پکار ہے کہ داد نہیں دی جاسکتی، طرز ادا شائستہ اور بیان سلجھا ہوا ہے، روانی اور بے ساختگی سے مالا مال، مطالب کا یہ عالم ہے کہ مونہہ سے پڑے بول رہے ہیں جیسے موتیاں کی لڑیاں اور لفظ ڈھلکتے ہوئے موتی ہیں، معرفت کی رنگ آمیزی سے اسلوب کا رنگ جو چپا اٹھا ہے''۔ حق یہ ہے کہ یہی تعریف ان کی کتاب پر بھی صادق آتی ہے، پوری کتاب ایسے ہی حسین اور دلکش جملوں سے آراستہ ہے۔ مثلاً ایک جگہ امیر التبلیغ مولانا محمد یوسف کے متعلق لکھا کہ ''نفوذ وہبی کا یہ عالم ہے کہ کٹر سے کٹر بھی دو چار ملاقات میں گرویدہ ہوجاتا ہے''۔ ایک جگہ سجادہ نشین و آستانہ نشین کے فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھا کہ ''خلاصہ کلام یہ ہے کہ سجادہ نشینی اور آستانہ نشینی میں زمین و آسمان کا فرق ہے بلکہ وہی فرق ہے جو نانی اور جانی میں ہے، سجادہ نشین فرزند جانی ہوتا ہے، دونوں میں امتیاز نہ کرنا کھلا جہل ہے''۔ اس کتاب کے حواشی سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو دلی کے قدیم خانوادوں کو تاریخ پر کس درجہ عبور حاصل تھا۔ ان کا سب سے بڑا علمی کارنامہ ''آئینہ ملفوظات'' ہے، خواجگان چشت کے ملفوظات کے متعلق جب ایک حلقہ میں یہ بحث شروع ہوئی کہ وہ جعلی والحاقی ہیں تو وہ کبیدہ خاطر ہوئے اور پھر معارف ۷۹ء کی کئی قسطوں میں انہوں نے ''مطالعہ ملفوظات خواجگان چشت کے مبادیات'' کے نام سے ایک بلند پایہ تحریر سپرد قلم کی، بعد میں یہ کتابی شکل میں بھی شائع ہوئی ان کے علم ومطالعہ حسن استدلال اور زبان و بیان کی صفائی کا یہ بہترین نمونہ ہے، خود ان کو بھی اس کا احساس تھا کہ ''اگرچہ معاندین کے تحقیر آمیز اشتعال پیدا کرسکتے تھے لیکن میں نے دلی کی قدیم تہذیبی روایات کو سررشتہ ہاتھ سے چھوڑا نہیں اور ترکی بہ ترکی جواب نہیں دیا، یہی آئین تصوف کا اقتضاء بھی ہے''۔

آخر عمر میں انہوں نے ''ویدک دھرم اور اسلام'' کے نام سے ایک مختصر کتاب لکھی، اس میں انہوں نے ویدک دھرم کے آسمانی مذہب ہونے اور ویدوں اور شاستروں کی تاریخی و مذہبی حیثیت پر دلچسپ بحث کی، معارف میں تبصرہ کے لیے یہ کتاب آئی لیکن افسوس ہے کہ ان کی زندگی میں اس پر تبصرہ نہیں آسکا۔

معارف اور دارالمصنفین کے وہ قدرداں تھے اور محبت کا تعلق رکھتے تھے، ایک بار ایک خط میں بڑی اپنائیت سے لکھا کہ ''معارف کی کتابت وطباعت کا وہ معیار نہیں رہا جو تھا، کاتب صاحب احتیاط سے کام لیں، قلم جما کر لکھیں اور اشکال صحیح بنائیں، نوک پلک کا بھی خیال رکھیں، مشین میں صاحب روشنائی میں وارنش کی آمیزش گوارا کریں تو معیار پرآجائے گا، بقول مہدی افادی پیکر جمیل بہ لباس حریرہی دل کو بھاتا اور لبھاتا ہے''۔

اب دلی کی ٹکسالی منجھی اور صاف زبان لکھنے والے ایک ایک کر کے رخصت ہوگئے، مولانائے مرحوم ان کی آخری یادگار تھے۔ ان کو دیکھنے والے ان کی تہذیب و شرافت، زندہ دلی اور مجسم اخلاق ہونے کے گواہ ہیں۔

۴۷ء کی غارت گری کے زمانہ میں ان کا کل اثاث البیت لٹ گیا، گھر پر غیر ہی قابض ہوگئے، لیکن جس سرمایہ کے لٹنے کا غم ان کو آخر تک رہا وہ انکے بزرگوں کا اندوختہ اور صدیوں کے بیش بہا نوادر کا ذخیرہ اور ان کی زندگی کا آسرا ان کا کتب خانہ تھا، یہ ایسا برباد ہوا کہ پھر ایک پرزہ بھی دستیاب نہ ہوسکا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی روح پر اپنے فضل وکرم کی ردائے خاص کا سایہ کرے، آمین۔ (''ع۔ص''، اکتوبر ۱۹۹۴ء)

عبدالرحمٰن، حاجی

حاجی عبدالرحمٰن

شذرات لکھے جاچکے تھے کہ راقم (ضیاء الدین اصلاحی) کے والد حاجی عبدالرحمٰن صاحب وفات پاگئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ۱۱/نومبر کو جمعہ کی نماز کے بعد تجہیز و تکفین ہوئی۔ قارئین معارف سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

(''ض''، نومبر ۱۹۹۴ء)

رشید الظفر، پروفیسر

پروفیسر رشید الظفر مرحوم

گزشتہ ماہ یہ افسوسناک خبر ملی کہ جامعہ ہمدرد دہلی کے لائق وائس چانسلر پروفیسر رشید الظفر کا انتقال ایک حادثہ میں ہوگیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ وہ سعودی عرب کے سفر پر تھے، جہاں ریاض اور ظہران کی شاہراہ پر ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آیا اور اس طرح یہ سفر ان کے لیے سفر آخرت بن گیا۔

وہ مسلم یونیورسٹی کے قابل فخر طالب علم تھے، ان کے والد پروفیسر حفیظ الرحمٰن بھی اسی یونیورسٹی کے شعبہ قانون کے ممتاز اساتذہ میں تھے، انہوں نے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی، خاص مضمون اسٹرکچرل انجینئرنگ تھا، اس میں بیرون ملک کی دانش گاہوں سے بھی استفادہ کیا اور اعلیٰ سندیں حاصل کیں، معلم ومتعلم کی حیثیت سے ان کی زندگی قابل رشک اور مثالی رہی، صرف ۳۱ سال کی عمر میں وہ مسلم یونیورسٹی میں

سول انجینئرنگ کے پروفیسر ہوگئے، بعد میں انہوں نے اس موضوع پر بین الاقوامی شہرت ومقبولیت حاصل کی، چنانچہ ظہران کی پیٹرولیم یونیورسٹی میں جہاں عالم اسلام کے ممتاز ترین ماہرین فن کو یکجا کرنے کی سعی کی جاتی ہے ان کا بحیثیت پروفیسر تقرر ہوا اور وہاں انہوں نے برسوں نہایت خوبی سے تعلیم وتدریس کے فرائض انجام دیے، چند برس قبل جب دہلی میں ہمدرد یونیورسٹی کی شکل میں محترم جناب حکیم عبدالحمید دہلوی کا خواب شرمندہ تعبیر ہوا تو حکیم صاحب کی جوہرشناس نگاہ ان پر پڑی اور وہ اس جامعہ کی وائس چانسلری کے عہدہ پر فائز ہوئے اور اپنی جانکاہی و جاں سوزی، خاموش خدمت اور مسلسل جہد وعمل سے نہایت قلیل مدت ہی میں بڑی نیک نامی حاصل کی، اپنی مادر علمی مسلم یونیورسٹی کے اعلیٰ مقاصد سے ہمیشہ خاص ربط وتعلق رکھا اور جب بھی اس پر کوئی آنچ آئی تو وہ سینہ سپر ہوگئے، ۱۹۷۲ء میں مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ کی وجہ سے جب اس کے بنیادی کردار کو ختم کرنے کی سازش کی گئی تو انہوں نے نہایت وقا و پامردی سے اس کی مخالفت کی، پاداش میں وہ زیر عتاب بھی آئے لیکن بالآخر کامیاب و کامران ہوئے، دوسرے معاملات میں بھی ان کا یہی حال تھا، انہوں نے ذاتی مفاد وحصول منفعت کے لیے مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کو قربان کرنا کبھی پسند نہیں کیا مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے کے لیے برابر سرگرم عمل رہتے تھے اور اس سلسلہ میں ہر تعلیمی وعلمی ادارہ کے متعلق باخبر اور فکرمند رہتے تھے۔

دارالمصنفین کے قدرداں تھے، اس ادارہ سے جناب حکیم عبدالحمید کے دیرینہ تعلق اور اس کے مسائل سے ان کے شغف کی وجہ سے بھی وہ یہاں کے ذمہ داروں سے نہایت خلوص ومحبت سے پیش آتے، ایک مرتبہ اس کو دیکھنے لیے تشریف لائے تو بہت مسرور ہوئے۔

بڑے عہدوں پر فائز ہونے، بین الاقوامی شہرت کے حامل ہونے اور بے شمار علمی اعزازات پانے کے باوجود وہ علمی پندار اور احساس تفوق میں مبتلا نہ ہوئے، ان کے حسن اخلاق، جذبہ ایثار و ہمدردی اور پاکیزہ نفسی کا تاثر ہی دلوں پر قائم ہوتا رہا، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے نیک اعمال کو قبول فرمائیں اور اپنے جوار رحمت کی نعمت سے سرفراز فرمائیں۔ ("ع۔ص"، دسمبر ۱۹۹۴ء)

صدیقی، ابواللیث، ڈاکٹر

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی مرحوم

گزشتہ ستمبر میں اردو کے نامور استاد محقق و نقاد اور ماہر لسانیات جناب ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کا کراچی میں ۸۰ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا، اِناللہ وَاِنا اِلَیہ رَاجِعُون۔ وہ بدایوں میں پیدا ہوئے، علی گڑھ یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی، رشید احمد صدیقی اور مولانا احسن مارہروی وغیرہ سے اکتساب فیض کیا اور رشید صاحب کی زیر نگرانی لکھنؤ کے دبستان شاعری پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے یہ اعزاز حاصل کرنے والے وہ پہلے شخص تھے، بعد میں یہ مقالہ کتابی شکل میں متعدد بار شائع ہوا اور یہی ان کی شہرت کا اصل سبب بھی بنا، مضمون نگاری کا شوق زمانہ تعلیم سے تھا چنانچہ اسی زمانہ میں ان کے مضامین معارف کے علاوہ دوسرے رسالوں میں بھی شائع ہوئے، درس وتدریس کا سلسلہ بھی مسلم یونیورسٹی سے شروع ہوا، جہاں وہ شعبہ اردو میں لکچرر مقرر ہوئے بعد میں پاکستان بننے کے بعد وہ کچھ عرصہ لاہور کے اورینٹل کالج میں اور پھر کراچی یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے استاد ہوئے، ترقی اردو بورڈ کراچی کے معتمد ہوئے اور ریٹائر ہونے کے بعد کراچی یونیورسٹی میں پروفیسر ایمریٹس ہوئے، مضامین کثرت سے لکھے اور متعدد کتابیں بھی لکھیں۔ معلوم ہوا کہ انہوں نے خودنوشت سوانح بھی لکھے تھے جو رسالہ تہذیب میں قسط وار چھپتے رہے ہیں لیکن غالباً ابھی کتابی شکل میں طبع نہیں ہوئے، "سرسید احمد خاں کی اسباب بغاوت ہند" کو بھی حواشی وتعلیقات کے ساتھ کراچی سے شائع کیا، ان کے حسب ذیل مضامین معارف میں بھی شائع ہوئے۔ میر کا فارسی کلام، میرحسن کی ایک نادر مثنوی رموز العارفین، محسن کاکوروی اور ان کی خصوصیات اور مناقب ذوالنورین المعروف بہ بہارستان سخن وغیرہ، متانت اور سلاست کے علاوہ ان کی تحریریں وسعت مطالعہ منطقی استدلال اور اعتدال کا نمونہ ہیں، قدیم مصادر ادب سے وہ واقف تھے اور ان سے متاثر بھی، علامہ شبلی کے طرز تحریر کا اثر بھی ان پر تھا اور وہ ان کی تحریروں سے استفادہ بھی کرتے تھے، پروفیسر کلیم الدین احمد کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں "کلیم صاحب نے مغربی ادب سے استفادہ کیا ہے، لیکن ان خیالات کو آئے ہوئے اردو میں زمانہ گزرا، مولانا شبلی شعرالعجم کی جلد چہارم میں انہی مباحث کو تشریح اور تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں" "ایک جگہ لکھا کہ" بار بار مولانا شبلی کا حوالہ ممکن ہے ناظرین پر بار گزرے اس لئے اس مرتبہ حالی کی طرف رجوع کرتے ہیں" میرتقی میر پر ان کی تحریریں مطالعہ میؔر کے لیے نہایت مفید ہیں، میؔر کے وہ مرتبہ شناس تھے، لیکن اس کے باوجود ان کا خیال تھا کہ خدائے سخن کے لقب کے مستحق میر سے بڑھ کر اقبال ہیں، اقبالیات میں ان کی دو کتابیں اقبال اور مسلک تصوف اور ملفوظات اقبال نمایاں ہیں، ان کا ایک اور بڑا کارنامہ چھ جلدوں میں اردو لغت کی تدوین ہے جس کے متعلق جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے معارف میں لکھا تھا کہ یہ ایک ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے جس پر نہ صرف اردو زبان بلکہ علم وادب کو بھی ناز ہوسکتا ہے، کاش یہ سلسلہ وہ مکمل کردے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں دنیا کی طرح آخرت میں بھی کامیابی وسرخروئی عطا فرمائیں، آمین۔ ("ع۔ص"، جنوری ۱۹۹۵ء)

کاکوروی، معین احمد علوی

جناب معین احمد علوی کاکوروی

چند دنوں پہلے خبر ملی کہ ۴؍ جنوری کو کاکوری میں جناب معین احمد علوی وفات پاگئے، انـــاللہ، وہ ستر برس کے تھے اور درس و تدریس کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اپنے وطن میں ایک ذاتی مدرسہ کے ذریعہ تعلیم کی دولت عام کرنے میں کوشاں تھے، ان کی زندگی نسبتاً خاموشی و گمنامی کی تھی لیکن ان کے مقالات و مضامین اہل نظر میں قدر کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، معارف میں ان کے متعدد مضامین شائع ہوئے وہ دارالمصنفین اور اس کے خدمت گزاروں سے بڑا تعلق رکھتے تھے اور یہاں کی کتابوں سے اپنے ذاتی کتب خانہ کو مزین بھی کیا تھا، بہرائچ کے قیام میں انہوں نے سالار مسعود غازی کے سوانحی ماخذ اور سید امیر ماہ بہرائچی کے متعلق مضامین لکھے ان کا ایک اور عمدہ مضمون سلاسل و طبقات تصوف میں ایک مخطوطہ مـراۃ الاسـرار کے متعلق بھی معارف میں شائع ہوا، وہ اس دور میں کاکوری کی علمی و دینی روایتوں کے امین تھے اور اس مشہور مردم خیز قصبہ کی شرافت و مروت کی روایتوں کے وارث بھی تھے، مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی مرحوم کے حقیقی ماموں زاد بھائی تھے، اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے، آمین۔

(''ع۔ص''، جنوری ۱۹۹۵ء)

شوؔر، منظور حسین، پروفیسر

پروفیسر منظور حسین شوؔر صاحب

(ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان)

شور صاحب (اللہ بخشے) میرے دیرینہ کرم فرما تھے۔ ان کا بچپن کا نام منظور علی تھا جیسا کہ میں نے ان کے مکان پر ایک کتاب میں لکھا ہوا دیکھا تھا۔ بعد میں ان کا نام منظور حسین ہوا۔ دوھیال ایلچپور کی تھی اور ننھیال اکولہ کی تھی۔ یہ دونوں شہر برار میں ہیں، وہ امراؤتی (برار) کی شہر پناہ کے ناگپوری دروازے کے قریب ایک آبادی میں جو سادات کی تھی دسمبر ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ والد ضامن علی صاحب جو بعد میں کراچی آکر ۱۹۶۸ء میں فوت ہوئے، تھانیدار تھے۔ بہت سیدھے سادے تھے، امراؤتی میں بارہا ان سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا تھا، شور صاحب کی ابتدائی تعلیم امراؤتی ہی کے محمڈن اسکول میں ہوئی، اس زمانے میں میٹرک کی گیارہویں جماعت ہوا کرتی تھی، یہ اسکول جس کا نام اب تبدیل کردیا گیا ہے مال ٹیکری کے قریب ہے۔ اور اب اس ٹیکری پر شیواجی کا مجسمہ نصب کردیا گیا ہے۔ شور صاحب نے ۱۹۲۸ء میں وہاں سے میٹرک پاس کیا۔ پھر علی گڑھ تشریف لے گئے۔ وہاں میرس ہوسٹل میں ان کا قیام تھا۔ ناگپور کے مونس حسین ان کے خاص دوست تھے، علی گڑھ کے انٹرمیڈیٹ کالج میں اس وقت نویں دسویں گیارہویں اور بارہویں جماعتیں تھیں، میرس ہوسٹل، ارون سرکل یانیوسرکل کے چار ہوسٹلوں میں سے ایک تھا۔ اس کے علاوہ منٹو سرکل میں ان طلبہ کے لیے چار ہوسٹل تھے اور وہاں دو ہوسٹلوں (اے۔بی) میں تعلیم بھی ہوا کرتی تھی۔ ڈے اسکالر اور سیمی بورڈ ان کے علاوہ تھے۔ مولانا احسن مارہروی مرحوم کی وجہ سے طلبہ میں شعر و شاعری کا ذوق زیادہ پیدا ہوگیا تھا۔ وہ طرحی مشاعرے بھی منعقد کراتے تھے اور کل ہند مشاعرے بھی انہی کے دم سے قائم ہوئے تھے۔ شور صاحب کی شاعری کا شور اسی زمانے میں ہوا اور مولانا مرحوم ان کی شاعری سے بہت خوش تھے۔ اس زمانے میں شور صاحب کی یہ غزل بہت مشہور ہوئی۔

دیدہ و دانستہ دھوکا کھا گئے　　　ہم فریبِ زندگی میں آگئے

نظم بھی اسی زمانے میں انہوں نے شروع کی تھی اور اکثر شعر گوئی میں مصروف رہتے تھے ۱۹۳۰ء میں انہوں نے انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ پھر بی اے اور ایم اے (فارسی) نیز ایل ایل بی کے زمانے میں وہ کچی بارک میں رہنے لگے تھے، اسی کو پختہ ہونے کے بعد S.M.EAST ہوسٹل کہا جاتا تھا، اسی ہوسٹل میں ریاست ریواں کے اختر حسین نظامی (جو بعد میں تاریخ کے پروفیسر ہوئے) اور سیہور (ضلع جبل پور، کے غلام احمد انصاری بھی شور صاحب کے احباب میں سے تھے ۱۹۳۴ء کے شروع میں سی پی گورنمنٹ کے ہوم منسٹر رگھوندرا راؤ کے ساتھ ناگپور کے نواب صدیق علی خاں مرحوم علی گڑھ تشریف لائے تو وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے ان کی دعوت کی اور سی پی دبرار کے طلبہ کو بھی مدعو کیا۔ شور صاحب اور تامدار خان صاحب ان طلبہ میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔

۱۹۳۴ء ہی میں شور صاحب نے ایم اے فائنل (فارسی) کا امتحان دیا۔ اسٹریچی ہال میں امتحان تھا اور ساتھ ہی بی اے فارسی کا امتحان بھی وہیں تھا۔ ایم اے کے پرچے کا رنگ نیلا ہوتا تھا اور بی اے کے پرچے کا رنگ سبز ہوتا تھا۔ ایم اے کے پرچے میں اخلاق جلالی اور چہار مقالہ کے اقتباسات ترجمہ و تشریح کے لیے تھے اور انہی دونوں کتابوں کے کچھ اقتباسات بی اے کے پرچے میں بھی تھے۔ شور صاحب نے بی اے کا پرچہ لے لیا اور تین گھنٹے تک اسی کو حل کرتے رہے، وقت ختم ہونے پر غلام احمد مدنی صاحب کے ساتھ راقم الحروف بھی شور صاحب کے پرچے کے متعلق پوچھنے گیا، ان کے ہاتھ میں بی اے کا پرچہ تھا، ہم سب گھبرا گئے کہ اب کیا ہوگا غلام احمد مدنی صاحب فوراً اپنے والد نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب کے پاس دوڑتے گئے۔ نواب صاحب اس زمانے میں وہاں ٹریزرر (خازن) تھے۔ وہ بنفس نفیس تشریف لائے اور شور صاحب کو ہال کے اندر لے جاکر ایم اے کا پرچہ دیا، کھانا کھلایا تسلی دی۔ اس طرح انہوں نے ایم اے کا پہلا پرچہ حل کیا۔

۱۹۳۴ء میں شور صاحب ایم اے (فارسی) پاس کر کے وطن پہنچے۔ اس وقت کسی کالج میں جگہ خالی نہیں تھی۔ اس لیے ناگ پور کے انجمن اسلامیہ اسکول میں مدرس ہوگئے اور قریب ۳ سال تک وہیں رہے۔ اسی زمانے میں انہوں نے ناگپور یونیورسٹی سے ایک ایم اے اور پاس کیا۔ راقم الحروف ان سے ایک سال پیچھے تھا۔ ۱۹۲۵ء میں فارسی میں اور ۱۹۳۶ء میں اردو میں (ایل ایل بی بھی) علی گڑھ سے ایم اے پاس کر کے اپنے وطن جبل پور واپس ہوا۔ چند ماہ کے بعد پبلک سروس کمیشن نے کنگ ایڈورڈ کالج امراوتی (برار) میں اردو کے استاد کے لیے اشتہار دیا۔ اس زمانے میں ۲۵ سال عمر کی سخت قید تھی کمیشن نے انٹرویو کے لیے مجھے طلب کیا لیکن شور صاحب کی عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کو طلب نہیں کیا ۱؎ جولائی ۱۹۳۷ء میں میرا تقرر ہوگیا۔ پھر جب کانگریس کی ڈھائی سالہ حکومت قائم ہوئی تو شور صاحب کے والد صاحب کے ایک دوست ڈاکٹر پٹ وردھن ۲؎ کی کوشش سے ۱۹۳۸ء میں ان کو Morris College میں فارسی کا لکچرر بنادیا گیا۔

راقم الحروف کنگ ایڈورڈ کالج میں تھا۔ قریب ڈھائی سال کے بعد ناگپور یونیورسٹی نے مجھے صدر شعبۂ اردو بنادیا۔ پھر جب ۱۹۴۳ء میں سید رفیع الدین صاحب مارس کالج میں عربی کے لکچرر ہوئے تو شور صاحب کے ساتھ ہم لوگ ''اتحاد ثلاثہ'' کی حیثیت سے یونیورسٹی کے مرہٹہ اور ہندی کے دو گروپ کے لیے Balancing Power بن گئے اور اللہ کی شان کہ دونوں گروپ ہم لوگوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ۱۹۴۴ء میں شور صاحب کا تبادلہ مارس کالج ناگپور سے کنگ ایڈورڈ کالج ہوگیا۔ وہاں کالج کے ایک بنگلے میں ان کا قیام تھا۔ اپنے والد صاحب سے ملنے کے لیے وہ شہر گئے ہوئے تھے۔ بچے بھی ساتھ تھے چوروں نے موقع پا کر تمام قیمتی سامان غائب کردیا اور بڑے اطمینان کے ساتھ کھانا پکایا اور چائے بنا کر پیتے رہے۔ بڑا افسوس ہوا۔

کالج میں ہر سال بڑے پیمانے پر ادبی موضوع پر مباحثہ ہوا کرتا تھا۔ کالج کے اساتذہ اور شہر کے وکلاء بھی حصہ لیتے تھے۔ سالانہ مشاعرہ بھی منعقد ہوتا تھا۔ باہر سے کسی بڑے شاعر کو دعوت دی جاتی تھی۔ کالج کے طلبہ بھی معمول کے مطابق کچھ اپنی غزلیں کچھ غیر معروف شعراء کی غزلوں میں اپنا تخلص ڈال کر سُنایا کرتے تھے۔ لوگ حسب معمول بغیر سمجھے ہوئے واہ واہ کرتے تھے۔ لیکن اچھا خاصہ اجتماع ہوجاتا تھا۔ پھر شور صاحب کے آجانے سے اس اجتماع میں اضافہ ہونے لگا۔ وہاں دسمبر کے آخری ہفتے میں قدیم اور موجودہ طلبہ بھی جمع ہوتے تھے وہ Reunion Days کہلاتے تھے۔ مختلف کھیلوں اور تقریبوں میں وہ سب شرکت کرتے تھے اور مختلف زبانوں میں تقریریں بھی ہوا کرتی تھیں۔ یعنی ہندی، اردو، مرہٹی اور سنسکرت میں طلبہ تقریر کرتے تھے۔ شور صاحب سے کہا گیا کہ فارسی میں طلبہ سے تقریر کرائیں۔ وہ فکرمند ہوئے۔ میں نے کہا کہ آپ کچھ فکر نہ کریں۔ میں انتظام کیے دیتا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ تقریروں کے لیے جج صاحبان ایسے ہوں گے جو عربی اور فارسی سے بالکل نابلد ہوں گے۔ میں نے طلبہ کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ تم کو قرآن پاک کی کتنی کتنی سورتیں یاد ہیں؟ چار پانچ طلبہ ایسے تھے جن کو دس دس بارہ بارہ سورتیں یاد تھیں، میں نے کہا کہ ہال میں کھڑے ہو کر ہاتھ ہلا ہلا کر سورتیں پڑھ دینا۔ جج صاحبان آئے۔ طلبہ نے اسی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر سب کو خطاب کرتے ہوئے سورتیں پڑھنی شروع کیں۔ تمام سامعین ہنستے رہے اور قہقہوں سے ہال گونج اٹھا۔ جج صاحباں مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا بات ہے۔ میں نے کہا کہ بعد میں بتاؤں گا۔ بہر حال ان طلبہ کو انعامات ملے اور جج صاحبان نے ان کی ''فاضلانہ'' تقریروں پر داد بھی دی۔

۱۹۴۷ء میں مجھے کنگ ایڈورڈ کالج سے مارس کالج ناگپور بھیج دیا گیا، تقسیم ہند سے جو قیامت برپا ہوئی وہ چنگیز اور ہلاکو کی سفاکی سے بھی زیادہ ہوگی، بے شمار جانیں بھینٹ چڑھ گئیں۔ پشتہا پشت کی میراث یک لخت چھوڑنی پڑی۔ سی پی اور برار میں تباہی کم ہوئی تھی، لیکن دوسری جگہوں کے خونچکاں واقعات سن کر وہاں کے مسلمان بھی خائف ہوئے اور لاکھوں کی تعداد میں اس صوبے کو چھوڑنے پر آمادہ ہوئے۔ بہت سے لوگ حیدرآباد (دکن) چلے گئے۔ وہاں ان کی معاش کے ذرائع بہم پہنچائے گئے اور وہاں کے امرا نے مہاجروں کے قیام و طعام کا بہت معقول انتظام کیا۔ جو لوگ پاکستان آنا چاہتے تھے وہ بمبئی پہنچنے لگے۔ وہاں کے مسلمانوں نے بھی دل کھول کر مہمان نوازی کی اور ہر طرح کا آرام پہنچایا۔ راقم الحروف کے دو بچے بڑے بھائی صاحب کے ساتھ کراچی آچکے تھے۔ اس لیے مجھے بھی کالج سے رخصت لے کر (اہلیہ اور شیرخوار بچے کے ساتھ) کراچی کا رخ کرنا پڑا، ۷؍نومبر کو وہاں پہنچا ۲۴؍نومبر کو بچہ فوت ہوگیا اور ۲۸؍نومبر کو اس کی والدہ بھی چل بسیں۔ ناگپور سے پروفیسر رفیع الدین صاحب نے مجھے لکھا کہ واپس ناگپور آجاؤ اور مارچ تک کام کر کے اپریل سے تین ماہ کی تعطیل میں کراچی چلے جانا۔ ان کے اصرار پر دسمبر میں ہوائی جہاز سے بمبئی پہنچا اور وہاں سے ریل میں ناگپور پہنچ گیا۔ دسمبر کے آخری ہفتے میں جو چھٹیاں ہوئیں تو میں حیدرآباد (دکن) چلا گیا۔ وہاں میرے بہت سے اعزا تھے۔ ایک دن بازار سے گزرا تو وہاں شور صاحب سے ملاقات ہوئی۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں ان کو جگہ مل گئی تھی۔ لیکن بقول ان کے ''وہاں میں نے ابھی پڑھایا بھی نہیں تھا، ایک سیشن پورا کہ fall ہوگیا''۔ ۳؎ یہ ۱۹۴۹ء کا واقعہ ہے سقوط حیدرآباد کے بعد وہ امراوتی واپس آئے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد کراچی پہنچ گئے۔ وہاں کوئی مناسب جگہ نہیں تھی تو پرنسپل تاج محمد خیال نے زمیندار کالج گجرات میں ان کو فارسی کا سینئر لکچرر مقرر کرادیا۔ قریب ڈیڑھ سال کے بعد اسلامیہ کالج لائل پور فیصل آباد میں اسسٹنٹ پروفیسر (فارسی) مقرر

ہوئے، ۱۹۵۱ء میں پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے پاس کیا اور فیصل آباد کے کالج میں انگریزی بھی پڑھائی۔ ایک سال کے بعد ۱۹۵۲ء میں گورنمنٹ کالج لائل پور میں فارسی کے پروفیسر بنادیے گئے۔ لیکن ۱۹۶۱ء میں جب اس کالج میں ایم اے (اردو) کا شعبہ قائم ہوا تو اردو اور فارسی کے شعبے میں صدر بنادیے گئے اور ۱۹۶۹ء میں ریٹائر ہوکر کراچی واپس آگئے۔ ۲/ جولائی ۱۹۹۴ء کو ان کی اہلیہ کا انتقال ہوا اور پانچ دن کے بعد ۷/ جولائی کو ان کی وفات ہوئی۔ شور صاحب جب گجرات اور فیصل آباد میں تھے تو حیدر آباد کے مشاعروں میں شرکت کے لیے تشریف لاتے تھے۔ یہاں حافظ مبارک علی مرحوم کے مکان میں ان کا قیام رہتا تھا لیکن مجھ سے ملنے کے لیے یونیورسٹی میں ضرور قدم رنجہ فرماتے تھے۔ ۴

یہاں تک تو ان کے عام حالات عرض کیے گئے۔ ان کے بچپن اور نوعمری کی چند باتیں بھی عرض کرنا بےمحل نہ ہوگا۔ وہ بہت نازک اندام اور نازک مزاج تھے۔ ذرا میں خوش اور ذرا میں ناراض ہوجاتے تھے۔ اپنے بچپن کے دوست عبدالرحمٰن خالدی (جو بعد میں علی گڑھ میں کیمسٹری میں پی ایچ ڈی ہوئے) اور علاؤالدین قاضی (جو بعد میں امراؤتی کے مشہور وکیل ہوئے) ان سے دور ہوگئے تھے۔ کالج میں بھی پروفیسر سنہا (جونیر) ان سے گھبراتا تھا۔ وہ نہایت خلوص اور محبت سے باتیں کرتے کرتے شعر گوئی میں استغراق کی وجہ سے ایک دم خاموش ہوجاتے تھے۔ عزیزی ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے ۱۹۸۴ء میں ان کے متعلق لکھا تھا کہ ''پروفیسر منظور حسین شور اپنی شخصیت اور زندگی کی ظاہری صورتوں میں نہ صرف اپنے گردوپیش سے بلکہ کبھی کبھی اپنی ذات و صفات سے بھی لاتعلق سے معلوم ہوتے ہیں، وہ کسی عالم میں بھی ہوں عموماً اپنے ہی عالم میں رہتے ہیں۔ چنانچہ بھری محفل میں اکثر تنہا نظر آتے ہیں......''

شور صاحب نے بچپن ہی میں شاعری (بلکہ عاشقی) شروع کی تھی، موسیقی بھی سیکھی تھی۔ خوب لکھتے تھے اور خوب پڑھتے تھے۔ میں نے دیکھا ہے کہ بعض مشاعروں میں وہ کئی کئی گھنٹے اپنا کلام زبانی سُناتے تھے۔ ملک کے مختلف شہروں کے مشاعروں میں شرکت کرتے تھے اور نیاز فتح پوری کے رسالۂ نگار کے لیے اپنی غزلیں اور نظمیں برابر بھیجا کرتے تھے۔ ان کے کلام کے مجموعے یہ ہیں۔

نبض دوراں (۱۹۵۹ء)، دیوارابد (۱۹۶۹ء)، یہ مجموعہ انہوں نے راقم الحروف کے نام (اقبال کے ایک شعر کے ساتھ) معنون کیا تھا۔ سوادسیم تناں (۱۹۸۳ء)، صلیب انقلاب (۱۹۸۵ء)، میرے معبود (طویل نظم ۱۹۸۴ء)۔

زیرطبع مجموعے:

حشر مرتب (غزلیات)، ذہن وضمیر (رباعیات)، ۵ انگشت نیل (تنقید)، افکار واعصار (نثری ادب)، اندر کا آدمی (نفسیاتی مضامین)......

اللہ بخشے عجیب خوبیاں تھیں.......

ان کا ایک ہی خط محفوظ رہ گیا ہے۔ اس کا عکس پیش کیا جاتا ہے۔

۲۴/۹۱۷ فیڈرل بی ایریا، کراچی

۳۰/ دسمبر ۱۹۸۴ء

برادر محترم ڈاکٹر صاحب زاد الطافکم

اسلام علیکم!

ماسٹر عثمان صاحب کی وساطت سے نگارش عالیہ ''ہمارا علم و ادب'' کی ایک جلد موصول ہوئی، ایک شخص نے میرے مطبوعہ تین شعری مجموعات سے جمالیاتی مزاج کی منظومات کو ایک جگہ جمع کر کے کتاب کی شکل دے دی۔ اس کتاب میں آتش کی جوانی سے لے کر کل تک جمالیاتی مزاج کی نظمیں بڑی تعداد میں ایک جگہ جمع ہوگئی ہیں، ہر چند یہ نگارش اس قابل نہیں کہ آپ کو پیش کی جائے، تاہم ع ہر کہ خواند دعا طمع دارم کہتے ہوئے ''سوادسیم تناں'' کی ایک جلد ارسال خدمت کررہا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ آپ کو صحت اور درازی عمر عطا فرمائے، آمین۔

آپ کا بھائی، منظور حسین شور

(فروری ۱۹۹۵ء)

---

۱ گورنمنٹ کالج لائل پور (فیصل آباد) میں شور صاحب ۱۹۶۹ء میں (یعنی ۶۰ سال کی عمر میں) ریٹائر ہوئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ سرٹیفکیٹ میں ان کی عمر کیا رہی ہوگی۔

۲ شور صاحب نے کسی موقع پر اشتارے وکیل کو اپنا ہمدرد کہا ہے طلوع افکار کے مخاطبے میں نسیان کی وجہ سے کئی باتیں انہوں نے صحیح نہیں کہیں۔ اس وکیل نے مسلمانوں کے خلاف مرہٹوں کی فوج ۱۹۳۹ء میں تیار کی۔ اس کا سردار خود بنا۔ گھوڑے پر سوار ہوا۔ اس کی بیوی نے اس کی پوجا کی اور اسے رخصت کیا۔ دور سے ایک مسلمان بڑے میاں نے رسی کی منجنیق سے ایک پتھر اس کی ناک پر رسید کیا تو وہ گھوڑے سے گر پڑا اور اس کی فوج بھاگ گئی۔

۳ طلوع افکار، کراچی، جولائی ۱۹۹۴ء، ص ۱۷

۴ راقم الحروف کراچی آکر ۱۹۴۸ء میں اسلامیہ کالج میں اور ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۶ء تک اردو کالج میں (اور یونیورسٹی کی بھی ایم اے کلاس) پڑھاتا رہا۔ پھر ۱۹۵۶ء سے ۱۹۷۲ء تک سندھ یونیورسٹی میں پروفیسر اور صدر شعبہ رہا۔ ریٹائر ہونے کے بعد چار سال کی توسیع ملازمت بھی ہوئی۔

۵ محترم ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب نے ہماری زبان (دہلی ۱۵ نومبر ۱۹۹۴ء) میں ''کچھ داغ اور بجھے'' کے عنوان سے ایک مضمون شایع کیا ہے جس میں شور مرحوم کی تصانیف کا بھی ذکر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذہن وضمیر ان کی آخری کتاب ہے جو ۱۹۹۱ء میں شایع ہوگئی ہے۔

نا بھوی، رام لعل

جناب رام لعل نا بھوی

قارئین معارف اور اردو کے شیدائیوں کو جناب رام لعل نا بھوی کے انتقال کی خبر سن کر بڑا دکھ ہوگا، وہ ہندوؤں کی اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جو اردو کو اپنی زبان اور مسلمانوں سے زیادہ اس پر اپنا حق سمجھتی تھی، وہ کہتے تھے کہ نہ زبان کا کوئی مذہب ہے اور نہ اس پر کسی قوم اور گروہ کی اجارہ داری ہے۔

؎ پروانہ چراغِ دیر و حرم نہ داند

رام لعل صاحب بڑے زود نویس تھے مگر ان کا قلم پختہ اور منجھا ہوا تھا اور وہ موزوں طبع بھی تھے خاکہ و مزاح نگاری میں ان کو زیادہ کمال حاصل تھا لیکن ان کا اصل میدان تلاش و تحقیق تھا، پچھلے کئی برسوں سے معارف میں ان کے مضامین برابر شایع ہورہے تھے، اپنی اس کدوکاوش سے وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ ہندوؤں کے پُرکھوں نے اردو ہی نہیں فارسی اور عربی کی بھی مفید خدمت انجام دی ہے اور مسلمانوں کے بزرگوں کی خدمات برج بھاشا اور سنسکرت میں کم نہیں ہیں۔

ہندو مذہب میں راسخ العقیدگی کے باوجود وہ مسلمانوں سے بغض و نفرت نہیں کرتے تھے، دوسرے شریف ہندوؤں کی طرح انہیں بھی بابری مسجد مسمار کیے جانے پر بڑا دکھ تھا مگر وہ کہتے تھے کہ بعض مسلمانوں نے بھی مندر توڑے ہیں اس لیے ان واقعات کو بار بار دہرانے سے زخم ہرا ہوگا۔

دل میں دردمندی، طبیعت میں شرافت، مروت اور انکسار تھا، ایک بار لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تو ان کی ان خوبیوں اور علم و ادب سے شغف و انہماک کا اندازہ ہوا، مجھے لے کر کئی کتب خانوں اور کتابوں کی دوکانوں پر گئے اور جلدی جلدی کچھ نوٹ تیار کیا، اس پر متاسف تھے کہ وقت کی تنگی کی وجہ سے میرے ساتھ ندوہ کا کتب خانہ دیکھنے نہ جاسکے۔

ان کے صاحبزادے امریکہ میں رہتے تھے وہ اپنی ماں کو بھی اپنے ساتھ لیتے گئے صاحبزادی اپنے گھر رہتی تھیں، اصرار کے باوجود ان کے یہاں جانا گوارا نہیں تھا، اپنے گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر قرطاس و قلم سے واسطہ رکھتے، پڑھنے لکھنے میں ایسا محو ہو جاتے کہ دن دن بھر کھانے کا خیال نہ ہوتا صحت کب تک ساتھ دیتی آخر کینسر کا مرض جان لیوا ثابت ہوا۔ (''ض''، اپریل ۱۹۹۵ء)

کاندھلوی، انعام الحسن، مولانا

مولانا انعام الحسن کاندھلوی مرحوم

امیر التبلیغ مولانا انعام الحسن کاندھلوی شنبہ ۱۰؍ جون بروز عاشورہ محرم اپنے مالک حقیقی سے جاملے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اس دور قحط الرجال میں ان کی وفات قوم و ملت کا بڑا جانکاہ حادثہ ہے، وہ کاندھلہ ضلع مظفر نگر کی مردم خیز بستی کے صدیقی شیوخ کے اس مشہور خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس میں کئی پشتوں سے اہل علم و فضل اور اصحاب رشد و ہدایت پیدا ہوتے رہے ہیں، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نامور و محبوب شاگرد مفتی الٰہی بخش اسی خاندان کے جد امجد تھے، اس خانوادے کے افراد حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد و احیائے اسلام میں بھی پیش پیش رہ چکے ہیں، علم و عمل کی اسی جامعیت اور بلند نظر و علوئے ہمت کی خاندانی روایت نے اس خاندان کو مولانا محمد الیاسؒ اور ان کے صاحبزادے مولانا محمد یوسفؒ کے سے داعیانِ حق بخشے جو اسلام کی تبلیغ و اشاعت، خلوص وللّٰہیت اور تقویٰ و بے نفسی میں نمونہ سلف صالحین تھے۔

مولانا انعام الحسن صاحب مرحوم نے مولانا محمد الیاسؒ کے دامن عاطفت میں تربیت پائی، ان کے والد مولوی اکرام الحسن صاحب مرحوم نے جو مولانا الیاسؒ کے حقیقی بھانجے تھے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے گریجویشن اور قانون کی سند حاصل کی تھی، وہ ایک کامیاب وکیل تھے، لیکن اس پیشہ کو ترک کر کے انہوں نے مدرسہ مظاہر العلوم کی خدمت کو اپنا مشغلہ بنالیا، مولانا انعام الحسن صاحب ان کے اکلوتے صاحبزادے تھے یہ ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوئے اور خاندانی روایت کے مطابق پہلے کمسنی ہی میں قرآن مجید حفظ کیا اور اسی کمسنی میں وہ اپنے والد کے ہمراہ دلی، مولانا الیاسؒ کی خدمت میں آگئے، اپنے مربی سے مشکوٰۃ اور مولانا احتشام الحسن کاندھلوی مولف حالات مشائخ کاندھلہ سے جلالین پڑھی، پھر مظاہر العلوم کے اساتذہ خصوصاً شیخ الحدیث مولانا محمد ذکریا سے صحاح اربعہ کا درس لیا، مولانا محمد یوسفؒ شروع سے ان کے ہم درس رہے، مظاہر العلوم سے واپسی کے بعد دونوں حضرات نے صحاح ستہ کی باقی کتابیں ابن ماجہ اور نسائی نیز اور کتب حادیث مولانا محمد الیاسؒ سے پڑھیں، جن سے بیعت وارادت کا تعلق بھی تھا۔ مظاہر العلوم کی طالب علمی کے زمانے ہی میں دونوں رفیقان درس کی شادی شیخ الحدیث مولانا محمد ذکریا کی صاحبزادیوں سے ہوئی۔

مولانا انعام الحسن صاحب دلی میں بنگلہ والی مسجد کے مدرسہ میں تدرس و تدریس کے فرائض انجام دینے کے ساتھ اپنے مربی و مرشد کی تحریک اصلاح و تبلیغ سے وابستہ رہے، مولانا محمد الیاسؒ جب دیار عرب میں اپنی تحریک کو وسعت دینے کی غرض سے ۱۹۳۷ء میں سفر حج پر روانہ ہوئے تو ان کے مختصر قافلہ میں یہ بھی شامل تھے، مولانا الیاس صاحب کو ان کی صلاحیت و اہلیت پر اس قدر اعتماد تھا کہ وفات کے وقت انہوں نے جن چند حضرات کے نام امارت کے لیے تجویز کیے ان میں مولانا انعام الحسن کا نام بھی تھا، ان کی معاملہ فہمی اور اصابت رائے کے سب ہی لوگ معترف تھے اسی لیے مولانا محمد یوسفؒ صاحب جب جماعت کے امیر منتخب ہوئے تو وہ ان کے مشوروں سے پورا فائدہ

اٹھاتے رہے اور تبلیغی اسفار میں بھی انہیں اپنے ساتھ رکھتے تھے اور جب آخر میں مولانا یوسفؒ نے پاکستان کا سفر کیا جو ان کا سفرِ آخرت بھی ثابت ہوا تب بھی مولانا انعام صاحب ان کے ساتھ تھے، مرض الموت میں مولانا یوسفؒ نے فرمایا کہ ''بھائی ہماری منزل تو پوری ہوچکی'' یہ سن کر مولانا انعام الحسن صاحب نے فرمایا کہ ''ابھی کہاں ابھی تو آپ کو چین، روس، امریکہ وغیرہ میں اسلام پھیلانا ہے''۔ اس پر مولانا یوسفؒ نے کہا کہ ''پالیسی مکمل ہوچکی، اب کرنے والے کرتے رہیں گے''۔ ممکن ہے یہ اشارہ غیبی رہا ہو کہ اب یہ بڑی ذمہ داری ان پر آنے والی ہے جو کوئی آسان کام نہیں تھا، مگر اس عالمگیر تحریک کی قیادت کے لیے جو علمی وعملی اوصاف وکمالات ناگزیر تھے وہ مولانا انعام صاحب میں بھی بدرجہ اتم موجود تھے اسی لیے مولانا یوسفؒ صاحب کی جانشینی اور تبلیغی جماعت کی امارت کے لیے لوگوں کی نظر ان ہی کی جانب اٹھی اور وہ تیس سال تک اس ذمہ داری کو خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے، ایک زمانہ میں کہا جاتا تھا کہ ''جماعت کا دل اگر مولانا یوسفؒ ہیں تو دماغ مولانا انعام الحسن صاحب ہیں''۔ مگر بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ ان کے دل میں بھی درد وسوز تڑپ اور بے چینی کی ہی لہریں موجزن تھیں جو سیرت یوسفی کا طغرائے امتیاز تھیں، چنانچہ انہوں نے اپنی امارت کے زمانہ میں جماعت کو اس کی خصوصیات وروایات پر قائم رکھتے ہوئے اسے اس عالمی مقام پر پہنچا دیا جو تحریک کے بانی اور ان کے خلف الصدق کے تصور وخیال میں رہا ہوگا، وہ مولانا یوسفؒ کے ہم زلف تو پہلے ہی سے تھے مگر تحریک کو وسعت وترقی دیکر ان کے ہم سر بھی ہوگئے۔

ان کے سانحہ انتقال پر ہم ان کی اسی تلقین کو یاد کریں گے جو انہوں نے مولانا محمد یوسفؒ کے انتقال پر کی تھی کہ ''ان کا ہمارے درمیان سے اُٹھ جانا ظاہری طور پر صورت پریشانی ہے، لیکن حق تعالیٰ شانہ پر اعتماد اور حضور ﷺ کے دین کی محبت ان ظاہری صورتوں کا نعم البدل اور بدل حقیقی ہے''۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی قبر پر رحمتوں کی بارش فرمائے اور ان کے صاحبزادۂ والا تبار مولوی زبیر الحسن اور دوسرے متعلقین وپس ماندگان نیز پوری ملت کو صبر ورضا کی توفیق دے، آمین۔ (''ع۔ص''، جولائی ۱۹۹۵ء)

ندوی، محمد اسحاق سندیلوی، مولانا

مولانا محمد اسحاق سندیلوی ندوی مرحوم

پاکستان سے یہ افسوسناک خبر بہت تاخیر سے ملی کہ مولانا محمد اسحٰق سندیلوی ندوی کا نوے ۹۰ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا کی تعلیم مدرسہ فرقانیہ اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہوئی، عرصہ تک وہ دارالعلوم میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، جب مولانا محمد اویس نگرامی ندوی، ندوہ کے شیخ التفسیر تھے اس وقت مولانا سندیلوی شیخ الحدیث تھے اور ان دونوں جید اساتذۂ فن کی موجودگی ندوہ میں قران السعدین کا منظر پیش کرتی تھی، وہ ندوہ کے مہتمم بھی رہے اور وہاں کی مجلس اشاعت اور تحقیقات شرعیہ کے ناظم بھی۔

درس وتدریس کے ساتھ ان کا تصنیفی ذوق اور تحریری مذاق اعلیٰ درجہ کا تھا، تاریخ وفقہ اسلامی پر ان کی نظر وسیع وعمیق تھی، ۱۹۴۷ء سے قبل مسلم لیگ کے ذمہ داروں کو خیال ہوا کہ متوقع اسلامی حکومت کا ایک قانون اساسی، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مرتب کیا جائے تو اس کے لیے یوپی مسلم لیگ نے نظام اسلامی کے نام سے ایک مجلس کی تشکیل کی جس کے ارکان میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریا بادی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا آزاد سبحانی جیسے جید علماء شامل تھے، مجلس کے روح رواں حضرت سید صاحب کی جو ہر شناس نظر اس اسلامی قانون کے خاکہ و دستور کی ترتیب وتیاری کے لیے مولانا اسحٰق سندیلوی ہی پر رکی، جنھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے ایک ضخیم کتاب تیار کی جو بعد میں دارالمصنفین سے اسلام کا سیاسی نظام، کے نام سے شایع ہوکر مقبول ہوئی اس میں انہوں نے نظریہ خلافت، قانون، حکومت، خلیفہ، مجلس تشریعی، رعایا، بیت المال، افتا، احتساب، حرب ودفاع، صوبائی حکومتیں، خارجی معاملات پر دور جدید کے سیاق وسباق میں فاضلانہ بحث کی اور سیاست کے غیر اسلامی نظریات کی خوبیوں اور خامیوں پر بھی عالمانہ تبصرہ کیا۔ کتاب کی اہمیت کا اندازہ مولانا دریابادی کے ان الفاظ سے ہوتا ہے کہ تحقیق، تفصیل وجامعیت کے لحاظ سے اس وقت اپنی نظیر وہ آپ ہی ہے، یہ کتاب کلامی وفقہی دونوں حیثیتوں کی حامل ہے لیکن فقہی پہلو زیادہ غالب ہے جس سے مولانا کو زیادہ شغف تھا۔ تحقیقات شرعیہ کی نظامت کے زمانے میں انہوں نے انشورنس اور رویت ہلال جیسے مسائل پر دعوتِ فکر دی اور کئی رسالے شایع کیے، ان کے مضامین ملک کے مختلف دینی وعلمی رسائل میں بھی شائع ہوتے رہے۔ پاکستان تشریف لے جانے کے بعد کراچی کو وطن ثانی بنایا، کچھ مدت تک مولانا یوسف بنوری کے مدرسہ میں درس دیا، لیکن قلم سے ان کا رشتہ آخر تک برقرار رہا، چند مہینے قبل ان کی مشہور کتاب ''اظہار حقیقت'' کے تین حصے معارف میں تبصرہ کے لیے موصول ہوئے، ان کی یہ کتاب خلافت وملوکیت کے رد میں شایع ہوئی اور بہت مقبول ہوئی جس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں، اس کتاب میں انہوں نے مشاجرات صحابہؓ اور حضرت عثمان وعلی ومعاویہ رضی اللہ عنہم اور حادثہ جمل وصفین کے بعض پہلوؤں کی وضاحت نہایت دیدہ ریزی ودیدہ وری سے کی، علامہ خمینی کے انقلاب ایران کے بعد انہوں نے خلافت وملوکیت کے چند مباحث کا ازسرنو جائزہ لے کر اس کی تیسری جلد بھی مرتب کی۔ قادیانیت اور سبائیت کے رد وابطال کے لیے بھی ان کا قلم وقف رہتا تھا اور

اس سے ان کی اسلامی حمیت اور حضرات صحابہ کرامؓ سے غیر معمولی عقیدت وعظمت کی عکاسی ہوتی ہے، ان کتابوں کے علاوہ متعدد علمی رسائل لکھے، عربی اور انگریزی پر بھی دسترس تھی اوران زبانوں میں بھی ان کی بعض کتابیں شایع ہوئیں، ان کو حضرت مولانا تھانوی سے بیعت وارادت کا شرف بھی حاصل تھا اور مولانا عبدالشکور صاحب سے بھی خاص عقیدت تھی، شاہ وصی اللہ صاحب سے بھی بڑا تعلق رکھتے تھے، ان بزرگوں کا اثر ان کے خیالات اور زندگی سے عیاں تھا۔

ذاتی لحاظ سے وہ شرافت اور مکارم اخلاق کا نمونہ تھے، ان کی پُر وقار شخصیت، دلنواز گفتگو، متبسم چہرہ اور نرم لب ولہجہ ندوہ کے ہر طالب علم کے لیے سرچشمۂ لطف وکرم تھا، ندوہ میں ان کی موجودگی کا خاص احساس وہاں کی مسجد میں ان کی امامت سے ہوتا تھا، وہ سند یافتہ قاری تھے، فجر کی نماز میں جب وہ پُر سوز ومعتدل آواز میں تلاوت کرتے تو اس میں محض تجوید کا فن نہیں ہوتا بلکہ اس شبنم کی ٹھنڈک اور تازگی کا احساس ہوتا ہے جو لالہ کے جگر کو خنکی بخشتی ہے۔ ان کے تقویٰ وللّٰہیت کا چرچا آج بھی ان کے شاگردوں کی زبان پر ہے، ان کے باطن کا نور ان کے ظاہر سے بھی جھلکتا تھا، دراز قد کے ساتھ ان کی کشیدہ قامتی اور ان کا سُرخ وسفید چہرہ اور اس پر دلآویز زلفوں کی لٹ ہمیشہ ان کی یاد دلاتی رہے گی، اللہ تعالیٰ علم ودین کے اس خادم کو بلند درجات سے سرفراز فرمائے۔ (''ع۔ص''، دسمبر ۱۹۹۵ء)

سلیمانی، محمد اشرف خاں، مولانا پروفیسر

مولانا پروفیسر محمد اشرف خاں سلیمانی مرحوم

دارالمصنفین میں یہ خبر بھی نہایت رنج وافسوس کے ساتھ سُنی گئی کہ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے عاشق صادق اور ان کے مرید وخلیفہ مولانا محمد اشرف خاں ستمبر کے مہینہ میں اس دارفانی سے رخصت ہوگئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

وہ پشاور یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے صدر، ایک عربی مدرسہ کے ناظم، خطیب اور مصلح ومرشد اور حضرت سید صاحب کے خاص فدائی تھے، سید صاحب کے جلوہ ہائے حسن جاناں کو انہوں نے کچھ اس طرح جذب کرلیا تھا کہ انہیں کو سب پکار اٹھیں گزر جائیں جدھر ہوکر۔ اسی لیے اپنے نام کے ساتھ نسبت سلیمانی لکھنے کا التزام کیا اور اپنی قیام گاہ کو سلیمان اکاڈمی کا نام دیکر خود کو علوم ومعارف سلیمانی کا فیض عام کرنے کے لیے وقف کردیا، اس کا ثبوت ان کی کتاب ''سلوک سلیمانی یا شاہراہ معرفت'' ہے، یہ پہلے ۵۶۔۵۵ء میں معارف میں مضمون کی صورت میں چھپی جس کی داد اہل نظر نے دی تو اسی کو مزید تفصیل واضافہ کے بعد کتابی شکل میں شایع کیا جس کے بارے میں مولانا دریابادی نے لکھا کہ ''کتاب صحیح نمونہ ماقل ودل ہے......سلوکِ سلیمانی بلکہ سلوک اشرفی کا ایک جامع دستور العمل......لطیف، سلیس، شگفتہ اور انداز ہ بیان دلچسپ و پُرمزہ'' ان کے اس البیلے اور شگفتہ طرز کی داد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے یہ لکھ کردی کہ ''مولانا اشرف خاں صاحب کا فطری جوہر کہیے یا سید صاحب کی ارادت وصحبت کا فیض کہ تحریر کی شگفتگی اور شیرینی کہیں ساتھ نہیں چھوڑتی یہ دراصل علامہ شبلی کی وہ میراث ہے جس سے نہ مولانا عبدالباری ندوی اپنی کامل اشرفیت وتقشّف کے باوجود آزاد ہوسکے اور نہ سید صاحب اپنی کامل فنائیت اور طبیعت کی افسردگی کے باوجود''۔

معذوری کے باوجود سید صاحب سے بے پناہ عقیدت ان کو سینکڑوں میل کا فاصلہ طے کر کے پشاور سے دو بار اعظم گڑھ کھینچ لائی، ان کو دیکھ کر یقین نہ آیا کہ اس حالت میں کوئی اتنے طویل سفر کی ہمت بھی کرسکتا ہے، ان کا نصف زیریں حصہ بالکل مفلوج تھا، پہیوں والی کرسی ہمہ وقت انکے ساتھ رہتی یا پھر ان کے شاگرد اور مسترشد ان کو گود میں لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے، اس کے باوجود انہوں نے دارالمصنفین کے در ودیوار کو اور سید صاحب کے آثار وباقیات کو جن آنکھوں سے دیکھا اور مس کیا اس کا مشاہدہ ناقابل فراموش ہے، اب وہ وہاں ہیں جہاں ان کی روح اپنے محبوب ومرشد کی روح سے ہمکنار ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پاک روحوں پر اپنے لطف عمیم کا سایہ دارز فرمائے معلوم ہوا کہ ان کی نماز جنازہ میں لاکھوں کا ہجوم تھا جو ان کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ (''ع۔ص''، دسمبر ۱۹۹۵ء)

مظاہری، سید محمد مرتضٰی، مولانا

مولانا سید محمد مرتضٰی مظاہری مرحوم

ندوۃ العلماء کے کتب خانہ شبلی کے ناظر مولانا سید محمد مرتضٰی مظاہری بھی ۳؍اور ۴؍نومبر کی درمیانی شب میں لکھنؤ میں انتقال فرماگئے، وہ قریباً چالیس برس تک ندوہ کے کتب خانہ کی ترقی وتزئین کے لیے وقف رہے، لائبریری سائنس کی کسی مروجہ عصری سند کے بغیر انہوں نے جس طرح اس کتب خانہ کو ملک کا بہترین کتب خانہ بنایا وہ اپنی مثال آپ ہے، انہوں نے عرصہ تک ندوہ کے مدرسہ ثانویہ اور دارالاقامہ سلیمانیہ میں اتالیق ومربی کے فرائض بھی انجام دیے ندوہ اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے ان کو عشق تھا، ندوہ کے لیے انہوں نے کثرت سے سفر کئے، نہایت مرنجاں مرنج خوش اخلاق، ہنس مکھ اور خلیق وشفیق تھے دارالمصنفین سے بھی ان کو خاص تعلق تھا، سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم جب بابری مسجد مرتب کررہے تھے تو مولانا نے بڑی دلچسپی سے ان کو ضروری مخطوطات وکتابیں مہیا کیں جن کا اعتراف کتاب کے مقدمہ میں کیا گیا ہے، گزشتہ مہینہ جب دارالمصنفین میں رابطہ ادب اسلامی کے سمینار کا اعلان ہوا تو وہ اس میں شریک ہونے والے تھے، لیکن قضاوقدر نے اس سے پہلے ہی ان کو اپنے خالق حقیقی

کے حضور میں بلالیا، اللہ تعالیٰ پس ماندگان کو صبر جمیل اور مولانا مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔ ("ع۔ص"، دسمبر ۱۹۹۵ء)

طاہر، محمد، ڈاکٹر

ڈاکٹر محمد طاہر

یکم جنوری کو ۸ بجے شب دارالمصنفین کے ایک بڑے ہمدرد اور ہر وقت کے حاضر باش ڈاکٹر محمد طاہر صدر شعبۂ اردو شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج انتقال کرگئے، ابھی ان کی عمر ۵۰ برس ہی کی رہی ہوگی لیکن انہوں نے اپنی صلاحیت و ذہانت کے جو نمونے چھوڑے وہ برابر یاد کئے جائیں گے، انہیں تحریر و تقریر دونوں کا ملکہ تھا، پہلی مرتبہ علامہ شبلی کی تاریخ ولادت کا تعین اپنے ایک مضمون میں کیا جو "نیا دور" لکھنؤ میں شائع ہوا، مگر ان کی زیادہ توجہ انتظامی امور کی طرف ہوگئی تھی جس کا انہیں بہت اچھا سلیقہ تھا، اب ان کی سرگرمیوں کا خاص میدان سرسید انٹر کالج صبرحد تھا جس کو پہلے ہائی اسکول اور پھر انٹر کالج بنوایا، اسے ڈگری کالج بنانے کے لئے جان توڑ کوشش کررہے تھے کہ وقتِ موعود آگیا، دارالمصنفین کے ہر کام میں آگے آگے رہتے تھے، اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر یہاں ہونے والے بین الاقوامی سیمینار کے شرکاء کے طعام کی ذمہ داری جس حسن وخوبی سے انجام دی اس کا اعتراف جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم برابر کرتے تھے، ان سے اور شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کے علاوہ اس خاکسار سے بڑا مخلصانہ تعلق رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کی بشری لغزشوں کو معاف کرے اور ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے اعزہ خصوصاً بیوہ اور دونوں کم سن بچوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین! ("ض"، جنوری ۱۹۹۶ء)

احمد، نعیم، ڈاکٹر

ڈاکٹر نعیم احمد

افسوس ہے کہ گذشتہ ماہ پروفیسر ڈاکٹر نعیم احمد، صدر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی انتقال کرگئے، وہ بڑے خلیق، ملنسار اور مرنجاں مرنج شخص تھے۔ ابھی وسط نومبر میں انھوں نے اپنے شعبہ میں توسیعی خطبہ دینے کے لیے مجھے مدعو کیا تھا مگر میں نے اپنی مشغولیت کی بنا پر اس وقت معذرت کردی تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ ("ض"، فروری ۱۹۹۶ء)

طیب جی، بدرالدین

بدرالدین طیب جی

یہ خبر نہایت رنج وغم سے سنی جائے گی کہ ۲۸/دسمبر کو بدرالدین فیض حسن طیب جی نے نئی دہلی کی اپنی رہائش گاہ میں داعی اجل کو لبیک کہا، ان کا تعلق بمبئی کے ایک متمول خاندان اور سلیمانی بوہرہ جماعت سے تھا، یہ خاندان گجرات کے ساحلی علاقے کامبے سے منتقل ہوکر انیسویں صدی کے اوائل میں بمبئی میں آباد ہوا، بدرالدین طیب جی (۱۸۴۴ء-۱۹۰۶ء) نے اس خاندان کی عظمت و وقار میں بڑا اضافہ کیا، وہ بمبئی ہائی کورٹ کے جج بمبئی لیجلسیٹو کونسل کے ممبر، انجمن اسلام بمبئی ایسوسی ایشن اور انڈین نیشنل کانگریس کے بانیوں میں تھے، ۱۸۸۷ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا تیسرا اجلاس مدراس میں ہوا تو انہوں نے اس کی صدارت کی، غرض وہ اپنی اصلاحی، تعلیمی، سیاسی اور قومی خدمات کی بناء پر ملک کے ہر فرقہ و مذہب میں مشہور و مقبول تھے۔

بدرالدین فیض حسن طیب جی انہی نامور دادا کے نامور پوتے تھے، ان کی ولادت ۱۹۰۷ء میں ہوئی، سینٹ زیویز کالج بمبئی کے بعد وہ حصول علم کے لئے آکسفورڈ گئے ۱۹۳۲ء میں انڈین سول سروس میں شامل ہوئے اور مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ۱۹۶۷ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے، وہ ایک کامیاب اور نیک نام آئی۔ سی۔ ایس افسر تھے۔ وزارت خارجہ اور کامن ویلتھ کے سکریٹری اور انڈونیشیا، بلجیم، جرمنی، ایران اور جاپان وغیرہ میں ہندوستان کے سفیر بھی رہے۔

۱۹۶۲ء میں وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ یہ بڑا نازک اور سخت بحران کا دور تھا مگر طیب جی نے تین برس تک یہ عظیم اور بھاری ذمہ داری بڑے تدبر اور ہوش مندی سے انجام دی، وہ بڑے معاملہ فہم، اصول و ضابطہ کے پابند تھے، اپنی سخت گیری، نظم و ضبط کی پابندی اور یونیورسٹی میں گوناگوں اصلاحات کی وجہ سے وہ عام مسلمانوں ہی میں نہیں بلکہ طلبہ میں بھی مقبول تھے، چنانچہ طلبہ نے بڑے جذباتی انداز سے علی گڑھ ریلوے اسٹیشن سے انہیں رخصت کیا اور کئی باران کی گاڑی روک لی، اس کے بعد بھی جب وہ علی گڑھ آتے تو طلبہ ان سے بہت عقیدت و محبت سے ملتے، ایک دفعہ وہ کسی تقریب میں شرکت کے لیے یہاں تشریف لائے تو کنیڈی ہال سے باہر نکلنے پر طلبہ نے انہیں اس طرح گھیر لیا کہ ان کی صاحبزادی جو ان کے ساتھ تھیں، ان سے جدا ہوگئیں اور تلاش کے بعد ملیں۔ وائس چانسلر کی حیثیت سے ان کی کامیابی کا تذکرہ کرتے ہوئے اس وقت کے مدیر معارف مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم نے یہ شذرہ تحریر فرمایا:

> "مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نئے وائس چانسلر مسٹر بدرالدین طیب جی توقع سے زیادہ یونیورسٹی کے لیے مفید ثابت ہورہے ہیں، چند دنوں کے اندر انہوں نے جو اصلاحات کی ہیں اور آئندہ جو اصلاحات اور علمی و تعلیمی منصوبے ان کے پیش نظر ہیں، ان سے نہ صرف یونیورسٹی کا تعلیمی معیار بلند ہوجائے گا بلکہ وہ اسلامیات اور علمی تحقیقات کا بھی بڑا مرکز بن جائے گی اور پورے ملک میں

اس کا علمی و تعلیمی وقار قائم ہو جائے گا، مسلم یونیورسٹی محض شاندار عمارتوں، وسیع سبزہ زاروں، خوش نما کوٹھیوں، خوش لباس طلبہ اور جامہ زیب پروفیسروں کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کی اصلی روح علمی و تعلیمی اور اس کی امتیازی خصوصیت اس کی اسلامیت ہے اور یہ امر قابل اطمینان ہے کہ وائس چانسلر صاحب کی نظر ان سب پہلوؤں کی جانب ہے وہ اس کی اسلامیت کے اظہار سے گھبراتے نہیں، بلکہ اپنی تقریروں میں برملا اس کا اعلان کرتے ہیں اور اس کو قائم کرنا چاہتے ہیں، اس لیے توقع ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں یونیورسٹی میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں اور وہ جس غلط راستہ پر جارہی تھی، اس کی پوری اصلاح و تلافی ہوجائے گی اور وہ ملک و وطن اور دین وملت سے متعلق اپنے فرائض بھی پوری طرح ادا کرے گی''۔ (معارف، مئی ۶۳ء، ص ۳۲۴ عدد ۵، جلد ۹۱)

طیب جی ایک آئی۔سی۔ایس افسر اور حکومت کے اعلیٰ عہدیدار ہونے کے علاوہ اچھے عالم، مصنف اور دانشور بھی تھے، ان کا مطالعہ وسیع تھا اور انگریزی زبان پر انہیں غیر معمولی قدرت تھی، انہوں نے کئی کتابیں بھی یادگار چھوڑی ہیں جن میں ایک ان کی خودنوشت سوانح عمری بھی ہے، جو اس لحاظ سے بڑی دلچسپ اور پر از معلومات ہے کہ یہ ان کے عہد کے معاشرتی و سیاسی حالات کا مرقع ہے، ان کی دوسری تصنیفات بھی بلند پایہ ہیں۔

طیب جی کی پرورش و پرداخت جس ماحول میں ہوئی تھی، اس پر مغربیت چھائی ہوئی تھی۔ ان کی تعلیم بھی آکسفورڈ میں ہوئی اور وہ مدۃ العمر اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے اس لیے ان پر بھی مغربی تہذیب وتمدن کا زیادہ اثر تھا۔ وہ بڑے رعب داب کے آدمی تھے اور افسرانہ آن بان سے رہتے تھے۔

اپنے خاندان کی طرح یہ بھی فرقہ وارانہ سیاست اور مسلم لیگ کے دوقومی نظریے کے ہمیشہ مخالف اور متحدہ ہندوستانی قومیت کے تصور کے حامی رہے، سیکولرازم اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر ان کا عقیدہ مستحکم تھا اسی لیے اپنے ہم پیشہ دوسرے افسروں کی روش کے برخلاف ان کے دل میں ہندوستان چھوڑنے کا خیال بھی نہیں آیا۔

بدرالدین طیب جی عوام سے زیادہ خواص کے آدمی تھے، اس لیے عملی سیاست کے جھمیلوں سے دور رہتے۔ تاہم اپنے خاندان کی طرح کانگریس کی حمایت اور قوم پروری کو اپنا شعار بنائے رہے، لیکن جب پنڈت جواہر لال نہرو کے بعد کانگریس میں خودغرض اور فرقہ پرست عناصر کا غلبہ ہوگیا تو ان کو کانگریس سے بڑی مایوسی ہوئی، اسی زمانے میں وہ ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی مرحوم کے قریب ہوگئے تھے اور مسلم مجلس کے لیے انہوں نے شمالی ہند کے مختلف شہروں کا دورہ کیا اور خود بھی حیدرآباد سے پارلیمنٹ کے لیے امیدوار ہوئے مگر کامیاب نہیں ہوئے جس کے بعد وہ سیاست سے بہت دل برداشتہ ہوگئے اور ڈاکٹر فریدی مرحوم کے اصرار کے باوجود اس میں آنا پسند نہیں کیا۔

بدرالدین طیب جی اپنی نیکی، شرافت، خاندانی وجاہت، ذاتی خوبیوں اور انتظامی صلاحیتوں کے لحاظ سے بہت ممتاز تھے، ان کی وفات ایک بڑا قومی وملی حادثہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔ (''ض''، فروری ۱۹۹۶ء)

فاروقی، خواجہ احمد، پروفیسر

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

جنوری کا معارف مرتب ہوچکا تھا کہ یہ اندوہ ناک خبر ملی کہ اردو کے مشہور محقق و نقاد صف اول کے ادیب اور صاحب طرز انشاء پرداز پروفیسر خواجہ احمد فاروقی ۳۱ر دسمبر کو رحلت فرماگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

خواجہ صاحب کا خاندان علم وفضل اور سلوک وتصوف میں ممتاز تھا، انھیں انگریزی تعلیم دلائی گئی مگر اس کے باوجود بھی وہ شرافت، وضع داری اور اپنی دیرینہ خاندانی روایات کے حامل تھے۔

۱۹۱۷ء میں وہ بچھراؤں ضلع مرادآباد میں پیدا ہوئے، ۱۹۲۷ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول ہردوئی کی پانچویں جماعت میں داخلہ لیا، یہاں ان کے والد سررشتہ دار تھے، ۱۹۳۲ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے میرٹھ کالج میں داخل ہوئے، تعلیم مکمل کرنے کے بعد معلّمی کے پیشہ سے وابستہ ہوئے جس کا آغاز مسلم یونیورسٹی اسکول میں کیمسٹری کے استاد کی حیثیت سے کیا، پھر بعض کالجوں سے وابستہ رہنے کے بعد ۱۹۴۶ء میں دہلی کے اینگلو عربک کالج میں اردو کے لکچرر ہوئے، جس کے بعد دہلی ہی میں بودوباش اختیار کرلی، خود رقمطراز ہیں:

''اس وقت سے کہ چالیس سال ہوگئے ہیں، دلی کا روڑا ہوں اور یہ دلی کی گلیاں کسی طرح نہیں چھٹتیں''۔

حزیں از پائے رہ پیما بسے سرگشتگی دیدم
سرشوریدہ بربالین آسایش رسید ایں جا

۱۹۴۸ء میں دلی میں چاروں طرف آتش زنی، غارتگری اور قتل عام مچا ہوا تھا اور موج خوں سروں سے گزر رہی تھی، مگر خواجہ صاحب اس قلزم خون کے شناور بنے رہے۔

وہ بچپن ہی میں مطالعہ اور کتب بینی کے عادی ہوگئے تھے اور تقریر وتحریر کی مشق بھی شروع کردی تھی، ہردوئی ہائی اسکول میں جب زیر تعلیم تھے تو غنچہ (بجنور) اور پھول (لاہور) کے لیے مضامین لکھتے رہتے تھے۔ اسی زمانے میں اپنے ایک ہم جماعت کے اشتراک سے ایک قلمی رسالہ ''نوبہار'' بھی نکالا۔ میرٹھ کالج انگریزی میگزین کے لیے بھی مضامین لکھے اور اس کے اڈیٹر اور کالج کی لٹریری ایسوسی ایشن کے سکریٹری بھی

منتخب ہوئے۔

مضامین کی اشاعت سے حوصلہ بڑھا تو یہ تمنا بھی ہوئی کہ مشہور اور بڑے رسالوں میں بھی مضامین شائع ہوں، جو برآئی اور عالمگیر (لاہور) میں ان کا ایک مضمون ''مشرق اور مغرب کے طریقۂ ازدواج'' کے عنوان سے چھپا۔ ان کا پہلا باقاعدہ مضمون ۱۹۳۹ء کے نگار میں چھپا، اس کے بعد وہ اس میں اور سہ ماہی اردو میں برابر مضامین لکھنے لگے، ۱۹۴۱ء سے ان کی توجہ تنقید کے آداب و اصول سمجھنے اور انتقادی مضامین لکھنے کی جانب ہوگئی اور نگار و اردو کے علاوہ نقوش (لاہور)، ہمایوں (لاہور)، جامعہ (دہلی)، برہان (دہلی)، کتابی دنیا (دہلی)، آج کل (دہلی)، معارف (اعظم گڑھ) اور شاعر (بمبئی) وغیرہ بھی ان کے ادبی تنقیدی، تحقیقی اور تاریخی و سوانحی مضامین سے مزین ہوئے۔

خواجہ صاحب کا اصل کارنامہ ان کی تصنیفات ہیں جن کی فہرست طویل ہے اور ان کے موضوعات بھی متنوع ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے شعر و ادب، تنقید و تحقیق، تاریخ و سوانح اور خاکہ نگاری کے میدان میں اپنے جوہر خوب دکھائے ہیں، ان کی بلند پایہ تصنیفات سے سرسری گزر جانا مناسب نہیں، اگر موقع ملا تو ان پر ان کے شایان شان ریویو کیا جائے گا۔

خواجہ صاحب عمر بھر گیسوئے اردو کو تابدار کرتے رہے، ان کی خدمات اور کاوشوں کے دائرہ میں تحریر و تصنیف کی طرح درس و افادہ بھی شامل ہے، بلکہ اس میدان میں شائد ہی اردو کا کوئی استاد ان سے گوئے سبقت لے گیا ہو، وہ اردو کے معلم اور صاحب قلم ہی نہیں تھے بلکہ اس کی خدمت کا پرجوش ولولہ بھی رکھتے تھے، ۱۹۴۷ء میں اردو کے سب سے بڑے مرکز دہلی میں اردو تعلیم کا تقریباً خاتمہ ہو رہا تھا کہ خواجہ صاحب غیب سے برآمد ہوئے اور اردو تعلیم کو فروغ دینے کے لیے پوری طرح جٹ گئے، جب دلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی زمامِ کاران کے ہاتھ میں آئی تو انہوں نے اس کی عظمت میں چار چاند لگا دیا اور اعلیٰ سطح تک اردو تعلیم کا باقاعدہ انتظام کرایا، اس زمانے میں اردو، فارسی اور عربی کا شعبہ مشترک تھا، انہوں نے تینوں کے شعبے الگ کرائے اور شعبہ اردو کو بھی دو حصوں میں کر دیا، ایک حصہ اردو کی تعلیم و تدریس کے لئے مخصوص ہوگیا اور دوسرا تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت کا مرکز بن گیا جس سے بہت سی نادر و نایاب کتابیں شائع ہوئیں اور ''اردوئے معلیٰ'' کے نام سے ایک معیاری اور بلند پایہ سہ ماہی رسالہ نکلا جس کے بہت سے یادگار اور جریدہ عالمِ اردو پر ثبت رہنے والے خاص نمبر شائع ہوئے۔ اس طرح شعبہ اردو کو خواجہ صاحب نے اپنے خون جگر اور افکارِ تازہ سے جو تب و تاب اور توانائی و درخشانی بخشی وہ شپرۂ چشم ہی سے اوجھل رہ سکتی ہے۔

خواجہ صاحب کی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کا دائرہ دہلی یونیورسٹی ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ ہندوستان کی کئی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں شعبہ ہائے اردو کے قیام و توسیع میں ان کا براہ راست یا بالواسطہ حصہ رہا ہے اور یہ بات تو ان کے اولیات میں شمار کیے جانے کے لائق ہے کہ وہ اردو کے سفیر بن کر ہندوستان کے باہر دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں گئے اور وہاں اردو تعلیم کا انتظام کیا۔

خواجہ صاحب کے حسنات اردو میں افراد کی تربیت اور مردم سازی بھی شامل ہے، ان کے فیض تربیت سے اردو کے اچھے استادوں، اہل قلم اور خدمت گزاروں کی ایک ٹیم تیار ہوئی۔

دراصل خواجہ صاحب فطری ادیب و انشا پرداز تھے اس لیے ان کی کوئی تحریر حسن ولالہ کاری، ادب و انشا کی رعنائی و دلفریبی اور انداز بیان کی لطافت و دلکشی سے خالی نہیں ہوتی، شعرالعجم کے مصنف کو یہ حسرت تھی کہ ''کاش مہدی افادی کے جیسی دو چار سطریں لکھنا انہیں بھی آجائے، میں نے بھی ایک بار اپنی اسی حسرت کا خواجہ صاحب سے ذکر کیا تھا کہ کاش آپ کے جیسی دو چار سطریں لکھنا مجھے بھی آجائے۔

خواجہ صاحب کی تحریروں کی خوبصورتی، نفاست، شوکت وعظمت میں ان کی ریاضت ان کے غور و فکر بلکہ خون جگر کو بڑا دخل تھا، وہ کوئی کام عجلت میں کرنے کے عادی نہیں تھے بلکہ اس پر سوچنا اور غور و فکر کرنا ضروری سمجھتے تھے، اس سوچ میں ہفتے اور مہینے لگ جاتے، ان کے لیے لکھنا ایک مرکزی نقطے کی تلاش یا ایک لے اور ایک سر کے دریافت کرنے کے مترادف تھا اور جب ان کے کام کا آغاز ہو جاتا تو اس کے کرنے میں خاص خوشی محسوس ہوتی، پہلا مسودہ جلد تیار ہو جاتا لیکن اس کے بعد آرائش اصلاح میں کئی کئی مہینے لگ جاتے خود رقمطراز ہیں:

> ''میں اپنی تحریروں سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا، ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو رہتی ہے اور ''چیزے فزوں کند'' کا مطالبہ باقی رہتا ہے..... میرتقی میر پر میں نے بے اندازہ محنت کی ہے، لیکن اب بھی جی چاہتا ہے کہ وہ دوبارہ لکھی جائے''۔

ان کی سحر طرازی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ان کو اردو فارسی کی طرح انگریزی پر بھی عبور تھا اور ان سب زبانوں کے حسن و دلکشی کو انہوں نے اپنی تحریروں میں سمو لیا تھا، اسی لیے ان کے اسلوب میں قدیم و جدید کی آمیزش ہے، پروفیسر خلیق احمد نظامی رقمطراز ہیں ''ان کے وہاں فارسی کی رنگینی، انگریزی کی پرکاری اور اردو کی سادگی اور گھلاوٹ موجود ہے جو دل پر اثر کرتی ہے''۔

خواجہ صاحب نے اردو کے لئے بڑی قربانی دی، اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کا صلہ بھی دیا اور اردو کی بدولت وہ بڑے بڑے انعام و اکرام سے نوازے گئے، اردو کی بے چارگی اور مظلومی کے اس دور میں ان کے جیسے اردو نواز کا اٹھ جانا ایک حادثۂ جانکاہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔ (''ض''، فروری ۱۹۹۶ء)

علوی، محمد رضوان، پروفیسر

پروفیسر محمد رضوان علوی

پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد رضوان علوی چند روز کی شدید علالت کے بعد ۲۰ر جنوری کو لکھنو میں انتقال کرگئے، ان کا آبائی وطن کاکوری تھا جو ضلع لکھنو کا ایک مردم خیز قصبہ ہے۔ کاکوری کا علوی خاندان علمی، دینی اور ادبی حیثیت کے ساتھ ہی دنیاوی وجاہت میں بھی ممتاز تھا، یہاں بہت سے اہل علم وکمال پیدا ہوئے۔ اردو کے مشہور نعت گو شاعر محسن کاکوروی اور مولوی نورالحسن نیر صاحب نوراللغات اسی آسمان کے مہر وماہ تھے۔

پروفیسر محمد رضوان علوی کے والد ماجد مولانا مصطفےٰ حسن علوی فاضل دیوبند تھے۔ ان کا علمی و ادبی ذوق بھی پختہ تھا۔ وہ اردو کے مصنف و شاعر اور لکھنو یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے صدر تھے، رضوان صاحب بھی تعلیم مکمل کرنے کے بعد پہلے یہیں شعبہ عربی میں لکچرر اور پھر مدت مدید تک صدر شعبہ رہے۔ ان کے زمانے میں شعبہ نے بڑی ترقی کی اور کئی نئے کورس کا اضافہ بھی ہوا۔

رضوان صاحب یونیورسٹی کے اچھے اور کامیاب استاد تھے، انہیں طلبہ کی صحیح رہنمائی کرنے، ان میں علمی مذاق پیدا کرنے اور ان کی صلاحیتوں کونشوونما دینے سے بڑی دلچسپی تھی۔ شوقین اور ذہین طلبہ کی خاص طور پر ہمت افزائی کرتے، ان کی نگرانی میں درجنوں طلبہ نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

ان کو درس وتدریس کے ساتھ تحریر وتصنیف کا بھی ملکہ تھا، اردو عربی اور انگریزی تینوں زبانوں پر قدرت تھی۔ ان کی کتابوں میں ''علوم وفنون عہد عباسی میں'' اور ''دمشق اسلامی تہذیب کا گہوارہ'' مقبول ہوئیں۔ ان کی علمی خدمات کی بنا پر صدر جمہوریہ ہند نے انہیں توصیفی سند بھی عطا کی تھی۔

لکھنو کی علمی، تعلیمی اور ادبی سرگرمیوں سے بھی سروکار رکھتے تھے۔ ان میں علمی و انتظامی دونوں طرح کی صلاحیتیں تھیں، اس لئے جو کام اپنے ہاتھ میں لیتے اسے خوبی اور سلیقہ سے انجام دیتے تھے، اسلامیہ انٹر کالج لکھنو کو پروان چڑھانے میں ان کا بڑا حصہ تھا، یہ انہی کی کوششوں سے ڈگری کالج ہوا۔

فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کی تاسیس وترقی میں ان کا خاص دخل تھا، جس کے وہ کئی برس تک چیرمین رہے، ۷۷ء۔ ۷۸ء میں میں اتر پردیش اردو اکیڈمی کا ممبر اور وہ اس کے چیرمین تھے، یونیورسٹیوں کے اردو اساتذہ کو ان کا چیرمین ہونا بہت گراں گزرا اور انہوں نے ان کے اور اکیڈمی کے صدر پروفیسر معزز علی بیگ کے خلاف ایک محاذ قائم کرلیا، اس اختلاف وانتشار کی وجہ سے وہ کوئی اہم اور بڑا کام نہ کرسکے۔

علوی صاحب بڑے وجیہہ وشکیل، باوقار پرکشش، جامہ زیب اور خوش لباس تھے، مزاج میں نفاست ونظافت تھی۔ جس مجمع میں ہوتے لوگوں کا مرکز توجہ بن جاتے، حسن صورت کے ساتھ اللہ نے حسن سیرت بھی دی تھی، خوش اخلاق، وسیع القلب اور روادار تھے، ہر مسلک ومشرب کے لوگوں سے ان کے اچھے تعلقات تھے، طبعیتاً نیک، شریف، بامروت اور دوسروں کے ہمدرد تھے، وضع دار، ملنسار اور لکھنوی تہذیب و روایات کے حامل تھے۔ خاکساری وفروتنی ان کی سرشت بن گئی تھی، غرور وتمکنت اور نمائش کا شائبہ بھی ان میں نہ تھا، اپنی ان ذاتی خوبیوں اور اچھے اوصاف کی وجہ سے بڑے مقبول اور ہردلعزیز تھے۔

اس عاجز پر بڑی شفقت تھی۔ مجھے اپنے شعبہ کے زبانی امتحانات لینے کے لئے بلاتے، پی۔ ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مقالے اور فخرالدین علی احمد کمیٹی کو موصول ہونے والے مسودے تبصرے کے لئے اکثر بھیجتے۔

ان کی تدفین کاکوری میں ہوئی، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔

(''ض''، مارچ ۱۹۹۶ء)

شرف الدین، عبدالصمد، مولانا

مولانا عبدالصمد شرف الدین

یہ خبر بڑے افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں مولانا عبدالصمد شرف الدین نے داعی اجل کو لبیک کہا، اِنا للہ وَاِنا اِلیہ رَاجِعونَ۔

راقم نے جب عربی پڑھنی شروع کی تھی تو اس وقت اکثر عربی کتابوں پر شرف الدین الکتبی او لادہ لکھا دیکھا، معلوم یہ ہوا کہ یہ عربی کتابوں کے بہت بڑے تاجر ہیں جن کا مکتبہ بھنڈی بازار بمبئی میں محمد علی روڈ پر ہے، اس سے اس زمانے کے تمام عربی خواں بلکہ مبتدی بھی واقف تھے۔

مولانا عبدالصمد انہی مولانا شرف الدین الکتبی کے صاحبزادے تھے جو بمبئی سے بھیونڈی آکر کتابوں کا کاروبار کرنے لگے تھے، مولانا کی ابتدائی تعلیم بمبئی کے کسی انگلش میڈیم اسکول میں ہوئی تھی، اس کی وجہ سے انہیں انگریزی پر پوری قدرت ہوگئی تھی اور عربی تو ان کے گھر ہی کی زبان تھی، عربی زبان وادب کی کتابیں انہوں نے عربی کے مشہور ادیب وفاضل مولانا محمد سورتی سے پڑھیں، اس طرح عربی اور انگریزی میں انہیں اردو سے زیادہ مہارت حاصل تھی۔

مولانا خود اور ان کے والد بزرگوار بھی عربی کتابوں کی تجارت واشاعت کا کام کرتے تھے، اس کے سلسلے میں ان لوگوں کی آمدورفت برابر عرب ملکوں میں رہتی تھی اس لیے ان کی اکثر رشتہ داریاں بھی وہیں تھی اور ان کے خاندان کے بعض افراد عرب ملکوں ہی میں آباد ہوگئے ہیں۔

۱۹۹۲؁ء میں ان سطور کے راقم کو حج بیت اللہ کی سعادت میسر آئی تھی، اسی موقع پر رابطہ عالم اسلامی کے اس وقت کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا، میں ڈاکٹر صاحب کو اردو سے بالکل ناواقف سمجھ کر ان سے ٹوٹی پھوٹی عربی میں بات چیت کرنے لگا، بعد میں جب معلوم ہوا کہ وہ اردو سمجھ اور بول لیتے ہیں اور مولانا عبدالصمد صاحب کے حقیقی بھانجے ہیں تو مجھے عربی بولنے پر شرمندگی ہوئی۔

حج کے سفر میں رابطہ کے مہمان خانہ میں میرا قیام تھا، یہاں ایک صاحب کو بہت پیش پیش دیکھا، راقم پہلے سے ان سے متعارف نہیں تھا، مگر وہ مجھ پر بڑے مہربان اور ہر موقع پر مدد کے لیے تیار رہتے تھے، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ مولانا عبدالصمد صاحب کے صاحبزادے عبدالماجد صاحب ہیں۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے۔

مولانا کا بڑا کارنامہ الدار القیمہ کا قیام ہے جو بھیونڈی میں عربی کتابوں کا بڑا اور اہم علمی مرکز تھا، اس کو عالمگیر شہرت نصیب ہوئی اور اس سے بڑا فیض پہنچا۔ اب بھی مولانا کی اس یادگار کو ان کی اولاد و احفاد نے باقی رکھا ہے، مولانا عبدالصمد شرف الدین نے یہاں سے متعدد مفید علمی و دینی کتابیں شائع کیں جن میں علامہ مزی کی **تحفۃ الاشراف بمعرفۃ الاطراف** (۱۲ جلدیں) اور **المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی** بھی ہیں۔

مولانا کا خاندان سلفی المسلک تھا جو توحید و دین خالص پر استقامت، حمیت اسلامی اور اتباع سنت میں بہت ممتاز تھا، مولانا بھی اپنی خاندانی خصوصیات و روایات کے حامل تھے، شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ اور ان کے شاگرد رشید حافظ ابن قیمؒ کے بڑے عاشق و گرویدہ تھے، اسی تعلق سے انہوں نے اپنے ادارہ کا نام الدار القیمہ رکھا تھا، بڑے صاف گو اور نہایت جری تھے۔ حق بات کہنے میں موقع و محل کی رعایت اور کسی طرح کی مصلحت مانع نہیں ہوتی تھی، بڑے سے بڑے آدمی کے سامنے بھی سچی اور کھری باتیں بے تکلف کہہ دیتے تھے، سنت سے انحراف کسی حال میں گوارا نہیں کرتے، نماز کا بڑا اہتمام کرتے اور نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ طویل نماز پڑھتے، اس کی وجہ سے اکثر لوگ ان کی اقتدار میں نماز پڑھنے سے گھبراتے تھے۔ مولانا نے ۹۵ برس کی طویل عمر پائی، آخر میں ہوش و حواس بجا نہیں رہ گئے تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ (”ض“، اپریل ۱۹۹۶ء)

اصلاحی، بدرالدین، مولانا

آہ! بدر کامل غروب ہوگیا

افسوس اور سخت افسوس ہے کہ ۱۹؍ جون کو مولانا بدرالدین صاحب اصلاحی ناظم مدرسۃ الاصلاح و دائرہ حمیدیہ رحلت فرماگئے، **اناللہ و انا الیہ راجعون**۔

کئی برس سے انہیں درد پا کی شکایت تھی، اس کے علاج کے لیے بمبئی تشریف لے گئے مگر تکلیف کم ہونے کے بجائے بڑھتی گئی، آمد و رفت کا سلسلہ اور ساری سرگرمیاں منقطع ہوگئیں۔ تاہم دل و دماغ کام کررہا تھا، مشکلات اور پیچیدہ مسائل میں رہنمائی بھی فرماتے تھے۔

۱۶؍ جون کو مدرسۃ الاصلاح کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ تھا، وہیں ان کی شدید علالت کی خبر ملی ۱۸؍ جون کو عیادت کے لیے گیا تو گردش روزگار کا یہ عجیب منظر دیکھ کر بدحواس ہوگیا کہ بلبل ہزار داستاں کی طرح چہکنے، اپنی گل افشانی گفتار سے مجلس کو زعفران زار بنانے اور اپنی خطابت اور خوش بیانی سے مسحور کرنے والے کی زبان گنگ ہوگئی ہے اور میں یہ حسرت ہی لیے رہ گیا کہ ع بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقریر تھا۔ شاید اشارے سے کچھ کہا ہو مگر میں سمجھ نہیں سکا، ہوش و حواس بھی اچھی طرح بجا نہیں تھے۔ جسم گل کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا، واپسی میں راستے بھر اور رات کو بھی بڑی دیر تک عجیب خلش اور بے چینی رہی، یہ کرب و اضطراب اس لیے تھا کہ مدرسۃ الاصلاح کے اغراض و مقاصد کا حقیقی مبلغ اور ”فکر حمید“ کا اصلی شارح و ترجمان دنیا سے رخصت ہونے والا ہے، اور اس کا کوئی بدل اور جانشین نہیں ع افسوس کہ از قبیلہ مجنوں کسے نہ ماند۔

دوسرے ہی دن ۱۲؍ بجے متوقع حادثہ کی اطلاع بھی آگئی ساڑھے پانچ بجے جنازہ اٹھا تو جم غفیر ساتھ تھا، قرب و جوار کے لوگوں، مدرسۃ الاصلاح کے اساتذہ وطلبہ اور دوسرے بے شمار قدردانوں نے مدرسہ کے سب سے مایہ ناز فرزند اور علوم و معارف فراہی کے سب سے بڑے ہندوستانی واقف کار کو سپرد خاک کردیا۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم اور فارسی کتابیں گھر پر پڑھیں، ان کی عربی تعلیم مدرسۃ الاصلاح میں ہوئی۔ مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا اختر احسن اصلاحی اور بعض دوسرے حضرات سے بھی کتابیں پڑھیں لیکن ان کی اصل تعلیم و تربیت علامہ شبلیؒ کے خاص شاگرد مولانا شبلی متکلم ندوی کے سایہ عاطفت میں ہوئی، مدرسہ کا ہشت سالہ کورس انہوں نے اپنی ذہانت و ذکاوت کی وجہ سے چند برسوں ہی میں مکمل کرلیا۔

مولانا بدرالدین اصلاحی ایک خوش حال زمیندار گھرانے کے فرد اور اپنے والد کے بڑے چہیتے تھے، گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ تھا اس لیے انہوں نے ملازمت یا درس و تدریس سے ان کا وابستہ ہونا پسند نہیں کیا۔ اسی زمانے میں رنگون (برما) میں کچھ دیندار اور صاحبِ ذوق لوگوں نے ایک حلقہ قرآن قائم کیا جس کی نگرانی و رہنمائی کے لیے انہیں ایک مناسب اور خوش بیان شخص کی تلاش ہوئی تو مدرسۃ الاصلاح کے ذمہ داروں کو خط لکھا، سب کی نظر انتخاب مولانا بدرالدین صاحب پر پڑی مگر ان کے والد انہیں اپنے سے جدا کرنا پسند نہیں کرتے تھے، تاہم مولانا شبلی متکلم وغیرہ کے شدید اصرار

پر بادل ناخواستہ راضی ہوگئے، برما میں ان کی بڑی پذیرائی ہوئی اور ان کے درس قرآن میں بڑا مرجوعہ ہونے لگا۔ لیکن ابھی سال بھر نہیں گذرا تھا کہ والد کی علالت کی خبر پاکر گھر واپس لوٹ آئے، والد کا وقت پورا ہو چکا تھا، ان کے بعد زمین اور جائداد کے مسائل میں ایسا الجھے کہ برما سے مسلسل خطوط آنے کے باوجود گھر چھوڑنا ممکن نہیں ہوا۔

ایسے غیر علمی ماحول میں جہاں ہر وقت مزدوروں سے سابقہ اور آئے دن زمین اور جائداد کے جھگڑے دردسر بنے رہتے تھے علم وفن سے اشتغال اور کتب بینی اور مطالعہ کا شوق باقی رہ جانا حیرت انگیز ہے، ان سے جب جب گفتگو ہوتی تو اندازہ ہوتا کہ اکثر اہم اور ضروری چیزیں ان کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔ میں طالب علمی کے زمانے میں طلبہ کی انجمن کا سکریڑی تھا، وہ عموماً ہفتہ میں ایک بار مدرسہ ضرور تشریف لاتے تھے، آنے کے ساتھ ہی نئے رسالے اور کتابیں طلب کرتے، معارف، برہان، جامعہ، ترجمان القرآن اور صدق جدید پابندی سے پڑھتے تھے اور ان کے اچھے مضامین کی نشاندہی بھی فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ جامعہ میں پرفیسر ضیاء الحسن فاروقی کا ایک مضمون ''فرض کفایہ'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا اس کو بہت پسند کیا اور مجھ سے بھی کہا کہ اسے ضرور پڑھو، اچھا اور فکر انگیز مقالہ ہے، کتابوں پر کہیں کہیں نوٹ اور حاشیے بھی لکھ دیتے تھے۔

ایک مرتبہ میں طالب علمی کے زمانے میں ان کے بڑے صاحبزادے کے اصرار پر ان کے دولت کدہ پر گیا، ہم لوگ پہنچے تو مولانا موجود نہیں تھے، موقع پاکر مچھلیوں کا شکار کرنے چلے گئے، رات گئے لوٹے تو مولانا لالٹین کی روشنی میں گیتا کے مطالعہ میں غرق تھے، ہم لوگوں کے آنے کی آہٹ ہوئی تو فرمایا کہ مچھلی پکی ہے، بکنے آئی تھی، میں نے گھر میں بھجوا دیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد کہنے لگے گیتا میں اللہ تعالیٰ کی صفت حکمت کا ذکر نہیں ملتا۔

علم وفن سے اشتغال ہی کی بنا پر وہ بعض رسالوں میں کبھی کبھی مضامین بھی لکھتے تھے، ۱۹۳۶ء میں ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تصنیفات اور ان کے اردو ترجمے کی اشاعت کے لئے دائرہ حمیدیہ کا قیام عمل میں آیا جس کی طرف سے الاصلاح کے نام سے ایک ماہوار علمی وتحقیقی رسالہ مولانا امین احسن اصلاحی کی ادارت میں نکلا جو گوشعلہ مستعجل کی طرح اپنی چمک دمک دکھا کر بہت جلد غائب ہوگیا تاہم اس نے مختلف موضوعات خصوصاً قرآنیات پر جو بلند پایہ اور فکر انگیز مضامین شائع کئے وہ آج بھی قرآن مجید کے طالب علموں کے مطالعہ میں آنے کے لائق ہیں۔ الاصلاح کے گنے چنے مضمون نگاروں میں ایک اہم نام مولانا بدرالدین صاحب کا بھی ہے۔ ان کے حسب ذیل مضامین اس میں شائع ہوئے۔

علامہ شبلی پر فتوائے کفر (اگست ۱۹۳۶ء) پاداش عمل (ستمبر ۳۶ء) مصدقا لمابین یدیہ [المائدۃ: ۴۶] کی صحیح تاویل (نومبر ۳۶ء) حروف مقطعات (اکتوبر ۱۹۳۷ء) لفظ آلاء کی تحقیق (نومبر ۳۷ء) واخر متشابھات (دسمبر ۳۷ء)۔

یہ سب مضامین ملک کے صاحب علم و ذوق طبقے میں بہت پسند کئے گئے، مصدقا لمابین یدیہ پر ان کا معرکتہ الآرا مضمون شائع ہوا تو ایک بزرگ مولوی حافظ سید محمد طہٰ اشرف امتھوی نے اس پر کچھ اشکالات وارد کئے، اس کے جواب میں جون و جولائی ۳۷ء میں انہوں نے بہت مدلل مضمون لکھ کر انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

نگار لکھنو اور صدق جدید لکھنو بھی ان کی قلمی جولان گاہ رہے ہیں، موخر الذکر میں اکثر مراسلے شائع ہوتے تھے، مولانا کا ادبی ذوق بھی اچھا اور رچا ہوا تھا، خصوصاً فارسی کا مذاق بلند تھا، وہ سخن فہم تو تھے ہی۔ میرا خیال ہے کہ مشق سخن بھی کی ہوگی۔ ابتداء میں وہ اپنا نام بدؔر ہی لکھتے تھے۔

مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم اپنی وفات کے وقت اپنے استاذ مولانا فراہیؒ کے علمی متروکات اور مسودات مولانا بدرالدین اصلاحی کو سپرد کرگئے تھے، اس بیش بہا متاع کی نہ صرف یہ کہ انہوں نے حفاظت کی بلکہ ہمیشہ اس کی ترتیب و اشاعت کے لئے فکر مند بھی رہے، انہوں نے مولانا کی متعدد مطبوعہ کتابوں کو جو دستیاب نہ تھیں، دوبارہ طبع کرایا اور کئی غیر مطبوعہ تصنیفات کو اپنے فاضلانہ عربی مقدمے کے ساتھ شائع کیا، ان کے فارسی کلام کو بھی ازسرنو شائع کیا اور اس پر فارسی زبان میں بیش قیمت مقدمہ تحریر کیا۔

ان کے محققانہ اردو مضامین اور عربی و فارسی کے عالمانہ مقدمے دیکھ کر کوئی شخص یہ باور نہیں کرے گا کہ وہ ایک گاؤں کے علم و ادب کش ماحول میں جہاں نہ کتابیں میسر تھیں اور نہ کوئی کتب خانہ تھا، بیٹھ کر لکھے گئے ہیں۔

تقریر وخطابت کا ملکہ خداداد تھا، جو لوگ ان کے اس جوہر سے واقف تھے وہ بڑے اصرار سے انہیں تقریر کے لیے مدعو کرتے تھے لیکن اپنی کم آمیزی اور طبعی بے نیازی کی وجہ سے وہ اکثر لوگوں کو ٹال دیتے تھے، تاہم حکیم محمد اسحاق صاحب مرحوم، مولوی حاجی عین الحق صاحب مرحوم، جناب شوکت سلطان مرحوم سابق پرنسپل شبلی کالج، مولوی عبدالرزاق مرحوم بکھرا اور بعض دیہاتوں کے خاص اہل تعلق کا اصرار کبھی کبھی ان کے انکار پر غالب آجاتا تو پھر ان کی گل افشانی گفتار دیدنی ہوتی۔ راقم کو کئی بار ان کی تقریریں سننے کا اتفاق ہوا، مدرسہ کے ایک جلسہ میں جس کے تین اجلاس ہوئے اصل اور تنہا مقرر وہی تھے، رات کے جلسے میں تقریباً چار گھنٹے تک مسلسل نہایت مربوط، مدلل اور عالمانہ تقریر کرتے رہے، نہ خیالات کے تموج میں کبھی فرق آیا اور نہ الفاظ کا خزانہ کبھی خالی ہوتا دکھائی دیا۔

ان کی گفتگو بھی بڑی موثر، دل نشین اور دل پذیر ہوتی، بات کرتے تو خیال ہوتا

کہ: ؎ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

ان کو کسی کے سامنے گفتگو کرنے میں کبھی جھجک نہیں ہوتی، بحث و مباحثہ میں ان سے پیش پانا ناممکن تھا، کوئی کتنی ہی شدید مخالفت پر آمادہ ہوتا اور بعض لوگ بڑی برہمی سے بہت نامناسب لب و لہجہ میں اعتراضات کرتے مگر وہ ضبط و تحمل کا پیکر بن جاتے اور بڑی خندہ جبینی اور متانت سے ایک ایک بات کا مدلل جواب دے کر انہیں مطمئن اور ٹھنڈا کردیتے، ایک مرتبہ بعض لوگوں نے دائرہ حمیدیہ اور مدرسہ کے تعلق سے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کو ان کی جانب سے کچھ بدظن کردیا تھا، شاہ صاحب نے سرائے میر جاکر جب ان سے رودررو باتیں کیں تو ہر طرح مطمئن ہوگئے۔

حقیقت یہ ہے کہ قدرت ان پر جس قدر فیاض تھی، اسی قدر وہ بے نیاز واقع ہوئے تھے، مجھے ہمیشہ اس کا ملال رہے گا کہ ان کی غیر معمولی علمی و دماغی قابلیت سے دنیا کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا اگر انہوں نے اپنے اعلیٰ دل و دماغ اور حیرت انگیز لیاقت و صلاحیت سے کام لیا ہوتا تو مولانا حمید الدین فراہیؒ کا خزانہ علم و فکر اور متاع گرانمایہ اس کس مپرسی کی حالت میں نہ ہوتی۔

مولانا بدرالدین صاحب کی خدمت کا خاص میدان مدرسۃ الاصلاح تھا، اس کو انہوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا، اس کے لیے انہوں نے جس ایثار و قربانی سے کام لیا اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ مولانا فراہیؒ کے چھوٹے بھائی اور ناظم مدرسہ مولوی حاجی رشید الدین انصاری نے اپنی معذوری اور پیرانہ سالی کی بنا پر جب اپنی معاونت اور نیابت کے لیے ان کا انتخاب کیا تو یہ مدرسہ کا بڑا بحرانی دور تھا، اس کی مالی حالت اس قدر سقیم ہوگئی تھی کہ نہ اساتذہ کو تنخواہیں ملتی تھیں اور نہ طلبہ کو کھانا ملتا تھا، مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا مسعود عالم ندوی کے نام اپنے ایک مکتوب میں اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے "مدرسہ سرائے میر اور جون پور گیا تھا، کل واپس آیا ہوں، سرائے میر سخت مالی مشکلات میں ہے آٹھ ہزار کا مقروض ہے" (مکاتیب سلیمان ص ۱۵۶) لیکن مولانا بدرالدین مرحوم نے جب نائب ناظم کی ذمہ داریاں سنبھالیں تو ان کی مسلسل محنت، خوش انتظامی اور حسن تدبر سے مدرسہ کے تمام قرض ادا ہوگئے، مطبخ اور دفتر کی خراب حالت درست ہوگئی، اساتذہ اور کارکنوں کو ماہ بہ ماہ تنخواہیں اور طلبہ کو وقت سے کھانا ملنے لگا، تعلیم و تربیت کا نظام بہتر ہوگیا اور مدرسہ مالی حیثیت سے بھی مستحکم ہوگیا، حاجی صاحب کے انتقال کے بعد ناظم کی حیثیت سے ان کا انتخاب عمل میں آیا، اس وقت سے ایک دو برس چھوڑ کر انتقال کے وقت تک وہی اس منصب پر فائز رہے۔ گویا وہ ایک کامیاب ناظم تھے اور انہوں نے مدرسہ کو بڑی ترقی و وسعت دی اور اس کی شہرت، عظمت، وقار اور استحکام میں اضافہ بھی کیا تاہم جب انہوں نے مدرسہ کا نظم و نسق درست کرنے کے لیے اصلاحات شروع کیں، ڈھیلے ڈھالے نظام کو چست کرنا چاہا اور مدرسہ کے اصول و مقصد اور مفاد کو ہر چیز پر مقدم رکھا تو بعض لوگ اس کی زد میں آئے اور ان کا ذاتی مفاد بھی متاثر ہوا، اس کی وجہ سے ان کو سخت شکایتیں پیدا ہوئیں اور وہ مدرسہ کو بھی نقصان پہنچانے کے درپے ہوئے مگر اللہ تعالیٰ کی مدد سے مولانا ہر بحران سے مدرسہ کو نکالنے میں کامیاب رہے، انہوں نے ہر قسم کی زحمت اور تکلیف خود برداشت کی مگر اپنے بزرگوں کی اس یادگار پر کوئی آنچ نہیں آنے دی، برابر اس کی حفاظت اور پاسبانی کرتے رہے، ان کے بزرگ، احباب اور رفقا ایک ایک کر کے مدرسہ کو چھوڑتے گئے، یہاں تک کہ ایک قافلہ سالار کے بارے میں علامہ سید سلیمان ندوی کے قلم سے یہ شکایتی جملہ نکل گیا "افسوس ہے کہ مجامع کے مقابلہ میں مدارس کی افادی حیثیت پر نظر نہیں پڑتی" (مکاتیب سلیمان ص: ۱۵۷) مگر انہوں نے اور مولانا اختر احسن اصلاحی نے مدرسہ کی خدمت کا جو عہد و پیمان باندھا تھا، اسے عمر بھر نباہا، مولانا اختر احسن اصلاحی کی وفات کے بعد وہ گو اکیلے رہ گئے تھے مگر زندگی بھر مدرسہ کی عزت و آبرو بنے رہے۔

مولانا بدرالدین صاحب بڑے خلیق، متواضع، ملنسار، خوش مزاج اور باغ و بہار شخص تھے، افسردہ سے افسردہ آدمی بھی ان کے پاس پہنچ کر ہشاش بشاش ہوجاتا اور اپنے غم و اندوہ کو بھول جاتا، صبر حلم اور ضبط و تحمل کا پیکر تھے، انتقام پر عفو و درگذر کو ترجیح دیتے، بڑے سے بڑے غم کو پی جانا ان کی عادت ثانیہ تھی، سخت مشکلات اور مسائل میں گھرے ہوتے مگر چہرے بشرے سے اپنی پریشانی ظاہر نہ ہونے دیتے، غصہ ہونا اور برہم ہونا جانتے ہی نہیں تھے، سخت کلامی اور دشنام سن کر بھی آزردہ اور چیں بہ جبیں نہ ہوتے، بڑے مہمان نواز اور وانی لعبد الضیف مادام نازلا کے مصداق تھے، علو، گھمنڈ اور پندار کی ذرا بھی خو بو نہ تھی۔

وہ مدرسۃ الاصلاح اور دائرہ حمیدیہ کے واقعی بدر کامل تھے جس کے غروب ہونے سے وہاں تاریکی چھاگئی ہے، اللہ تعالیٰ عالم آخرت میں ان کے درجات و مراتب بلند فرمائے، آمین! ("ض"، جولائی ۱۹۹۶ء)

مولانا بدرالدین اصلاحی سے ایک ملاقات

(رفیق احمد انصاری)

مولانا بدرالدین اصلاحی ناظم مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ کی مردم خیز اور علم پرور سرزمین کے ایک مایہ ناز فرد تھے، وہ ۱۹/ جون ۱۹۹۶ء کو اس دنیا سے کوچ کرگئے، اناللہ وَاِنَّا اِلیہ رَاجعُونَ۔ اللہ تعالیٰ انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے، آمین۔

تین سال قبل شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج میں انٹرویو دینے کی غرض سے اعظم گڑھ جانے کا موقع ہاتھ آیا۔ عرصہ سے اس مرکز علم و ادب کو دیکھنے کا بڑا اشتیاق

تھا۔ انٹرویو سے فارغ ہونے کے بعد اپنے دو دوستوں (طارق ایوب اور انیس الرحمٰن) کے ساتھ مدرستہ الاصلاح پہنچا وہاں اساتذہ کرام سے ملا۔ اس کے بعد مولانا نجم الدین اصلاحی کے مستقر پر حاضری دی جو کہ علامہ حمیدالدین فراہیؒ کے شاگردِ رشید تھے مولانا سے کافی دیر تک گفتگو کر کے میں اپنی علمی پیاس بجھاتا رہا۔ اس کے بعد مولانا بدرالدین اصلاحی صاحب سے ملنے کا شوق پیدا ہوا۔ میں اپنے دونوں دوستوں کے ہمراہ موضع نیاوج جہاں مولانا کی رہائش تھی روانہ ہوا۔ مولانا طویل علالت کے باعث بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ ہم لوگ سلام کر کے بغل میں پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ مولانا بستر سے اٹھنا چاہتے تھے میں نے چاہا کہ ان کو اٹھنے کے لیے سہارا دوں مگر انہوں نے بڑی بے تکلفی سے منع کر دیا۔ کہنے لگے رہنے دیجئے۔ ''اس سے اعتماد مجروح ہوتا ہے''۔ یہ حکیمانہ جملہ میرے قلب و ذہن پر ہمیشہ کے لئے نقش ہو گیا اور زندگی کے ہر لمحے میں مشعل راہ ثابت ہوا۔ مولانا نے بہت ہی پرتکلف ناشتہ کا انتظام کروایا اور جب تک ناشتہ ختم نہ ہو گیا بار بار کھانے کے لیے اصرار کرتے رہے۔ ہم لوگ تقریباً تین گھنٹے تک مولانا کی صحبت سے فیض یاب ہوتے رہے۔ ہم کو ایک لمحہ کے لیے بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ اس وقت مولانا کے ہاتھ میں ''خطبات اصلاحی'' کا ایک نسخہ تھا جس کی ورق گردانی میں مصروف تھے۔ میں نے مولانا امین احسن اصلاحی کے متعلق کچھ دریافت کیا۔ ان کا نام میری زبان پر آیا ہی تھا کہ مولانا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد کہنے لگے ہندوستان سے ان کے چلے جانے سے جو خلا پیدا ہوا وہ آج تک پر نہیں کیا جا سکا ہے اور جو دھکا مجھے لگا ہے اس کے اظہار کے لیے الفاظ ناکافی ہیں۔ پھر کچھ بھرائی ہوئی آواز سے کہنے لگے میں مولانا مودودیؒ کو کبھی معاف نہیں کروں گا وہ انہیں اچک لے گئے...... اس پر کچھ دیر گفتگو ہوتی رہی تھوڑی دیر بعد میں نے ایک سوال کیا کہ مولانا یہ بتایئے کہ دور جدید میں نئے اذہان کے لیے قرآن کی کون سی تفسیر زیادہ مناسب رہے گی جو تریاق ثابت ہو۔ مولانا خاموش ہو گئے تھوڑی دیر بعد گویا ہوئے، کہنے لگے صاحبزادے تم نے مشکل سوال کر دیا ہے اور پھر خاموش ہو گئے۔

میں نے علامہ حمیدالدین فراہیؒ کے متعلق گفتگو شروع کی تو معلوم ہوا کہ مولانا فکر فراہی کے رمز شناس ہیں جبکہ ان کی تحریر کو سمجھنا جوئے شیر لانا ہے۔ پھر میں نے مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم کا نام لیا تو مولانا بے قابو ہو گئے۔ رقت طاری ہوئی اپنے استاذ سے ایک شاگرد کی اس قدر والہانہ محبت میں نے پہلی بار دیکھی تھی۔

مولانا بدرالدین ایک شریف النفس اور مسلم الطبع انسان تھے وہ نہایت ذہین صاحب علم اور عبقری شخص تھے، قرآن و حدیث، فقہ اور تاریخ پر اچھی نظر تھی، سادگی اور منکسر المزاجی میں بے مثال تھے۔ ان کے سادہ طرز گفتگو سے ان کے علم کا اندازہ نہیں ہوتا تھا، مگر جب کسی مسئلہ پر سنجیدگی سے گفتگو کرتے تو دلائل و براہین کا انبار لگا دیتے۔

علامہ اقبال کا یہ شعر ان پر صادق آتا ہے:

کھلتے نہیں اس قلزم خاموش کے اسرار
جب تک تو اسے ضرب کلیمی سے نہ چیرے

ان جیسے صاحب فضل و کمال ذہین و ذی استعداد شخص کے لیے عظمت و شہرت حاصل کر لینا ناممکن نہ تھا مگر انہوں نے گوشہ گمنامی ہی میں پڑے رہنے کو پسند کیا، ممکن ہے استاذ امام علامہ فراہی کا یہ قطعہ ان کے پیش نظر رہا ہو:

گویند کہ گمنام بدن از جامی است
آوازہ د نام جوکہ خوش غیر جامی است
درپیش فراہی اے نکو اندیشاں
ایں جستن نام بدترین بدنامی است

ترجمہ: لوگوں کے خیال میں گمنام رہنا بحث کی بات ہے، شہرت و ناموری تلاش کرو کہ آدمی کی خوش ایجابی یہی ہے۔ فراہی کے نزدیک تو اے بہی خواہو یہ ناموری کی خواہش بدترین بدنامی ہے۔

مولانا کی شخصیت بہار آفریں اور اتنی دلآویز تھی کہ لوگ چند لمحے میں ان کے گرویدہ ہو جاتے تھے وہ اپنی ظرافت و شگفتہ مزاجی اور رعنائی بیان سے لوگوں کو مسحور کر لیتے جب ہم لوگ مولانا کے پاس سے رخصت ہونے لگے تو وہ آبدیدہ ہو گئے، علالت و معذوری کے باوجود ایک چھڑی کے سہارے کافی دور تک بھیجنے آئے، اپنا دست شفقت میرے سر پر رکھا اور دعائیں دیتے ہوئے رخصت کیا۔ مجھے مولانا سے گہری الفت و انسیت پیدا ہو گئی تھی، جو ان کی پرکشش سیرت اور مشفقانہ رویہ کی بنا پر تھی۔ مولانا کی بصیرت افروز اور مشفقانہ باتوں کو میں ان کی زندگی میں بار بار یاد کرتا رہا ہوں اور دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد مولانا کے ساتھ بیتے ہوئے لمحے نظروں کے سامنے گردش کرنے لگے ہیں:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

(ستمبر ۱۹۹۶ء)

مبارکپوری، اطہر، مولانا قاضی

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

گذشتہ مہینہ سفر میں جب مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کے انتقال کی خبر ملی تو بڑا دھکا لگا، مجھے ان کی تجہیز و تکفین میں شرکت سے محرومی کا ہمیشہ بہت ملال رہے گا۔

اعظم گڑھ کے متعدد علماء کو بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی خود مبارکپور کے جو

اعظم گڑھ کا مشہور قصبہ اور علم وتعلیم اور صنعت وحرفت کا بڑا مرکز ہے، مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری صاحب **تحفۃ الاحوذی** اور مولانا عبیداللہ رحمانی شارح **مشکوٰۃ المصابیح** کا آوازہ شہرت عالم اسلام میں بلند ہے، انہی لوگوں کی صف میں مولانا قاضی اطہر مبارکپوری نے بھی اپنی جگہ بنالی تھی، مگر افسوس کہ دست اجل نے انہیں ہم سے چھین لیا، یہ بڑا علمی سانحہ ہے اور قاضی صاحب کا خلا پر ہونا آسان نہیں۔

ان کی ولادت ۱۹۱۶ء میں ہوئی، ان کے نانا مولانا احمد حسین رسولپوری عربی زبان وادب کے ماہر اور صاحب تصانیف کثیرہ تھے، قاضی صاحب نے ان کا عربی دیوان مرتب کر کے شائع کیا تھا، انہوں نے عرصہ دراز تک ڈھاکہ میں مسند درس کو رونق بخشی۔ انہی سے قاضی صاحب نے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں تھیں پھر مبارکپور کے مشہور مدرسہ جامعہ احیاء العلوم میں درسیات کی تکمیل کی اور جامعہ قاسمیہ مراد آباد میں مولانا فخر الدین، مولانا سید محمد میاں اور مولانا سید اسماعیل سنبھلی سے صحاح ستہ کا درس لیا۔

طالب علمی کے زمانے میں ان کو شعر وسخن سے دلچسپی تھی، اور خود بھی سخن فرماتے تھے، یہ تحریک آزادی کے شباب کا زمانہ تھا، قاضی صاحب کو سیاست اور ہنگامہ آرا قومی جدوجہد سے کبھی سروکار نہیں رہا، تاہم آزادی کا جادو ہر شخص پر چل گیا تھا، قاضی صاحب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے، مبارکپور میں ہر قسم کے مذہبی وسیاسی جلسے برابر ہوتے تھے جن کے لیے وہ نظمیں کہتے تھے، مگر قدرت نے ان کو اس سے اعلاو ارفع کاموں کے لیے پیدا کیا تھا، جب علم وفن سے ان کا اشتغال بڑھا تو شاعری کا کوچہ خود بخود چھوٹ گیا۔

صغرسنی ہی سے مضمون نگاری بھی کرنے لگے تھے، تعلیم سے فراغت کے بعد صحافت کے پیشہ سے وابستہ ہوئے، آزادی سے پہلے زمزم لاہور سے نکلتا تھا جو اس دور کا مشہور قوم پرور اخبار تھا، قاضی صاحب اس کے اور دوسرے اخباروں کے شعبہ ادارت سے منسلک رہے، یہاں ''زندہ دلان پنجاب'' کی صحبت میسر آئی جس سے زبان کے نوک پلک درست کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی اور لکھنا پڑھنا ہی زندگی کا معمول بن گیا۔

ملک کی تقسیم کے بعد انہوں نے بمبئی کا رخ کیا جو ہندوستان کا سب سے بڑا اور مشہور تجارتی شہر ہے، لوگ یہاں مادی منفعتوں کی طلب اور اپنے کاروبار کو فروغ دینے کے لیے آتے ہیں لیکن قاضی صاحب اپنے علم وفن کی دوکان سجانے کے لیے یہاں آئے تھے۔

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالؔی نے دکاں سب سے الگ

یہی ہنگامہ خیز شہر ان کی علمی، قلمی اور تصنیفی جولان گاہ بنا، اس کے ایک حجرہ میں بیٹھ کر انہوں نے اپنے علم و ہنر کا تازہ جہاں آباد کیا شب و روز مطالعہ میں مستغرق رہتے، نہ اپنے آرام وراحت کا خیال، نہ کھانے پینے کی پروا، نہ سونے جاگنے اور اٹھنے بیٹھنے کا کوئی وقت، بمبئی کے ہنگاموں اور لوگوں کے ملنے جلنے سے محترز رہ کر صرف علم کی خدمت واشاعت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالینا اور علم کے لئے اپنے وجود کو گھلا ڈالنا آسان نہ تھا مگر انہوں نے یہ سب کر دکھایا اور ع پئے علم جوں شمع باید گداخت کا نمونہ پیش کیا۔ جس کا آج کل کے آرام طلب اور تن آسان لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے۔

یہاں بھی صحافت ہی سے وابستہ رہے، مختلف اخباروں میں مخصوص کالم لکھتے رہے، انقلاب میں کالم لکھنے کا سلسلہ بمبئی چھوڑنے کے بعد بھی جاری رہا، یہاں انجمن اسلام کے اسکولوں میں طلبہ کو دینیات کا درس بھی دیا انجمن خدام النبی نے جب البلاغ کے نام سے ایک علمی، دینی اور حج سے متعلق معلوماتی رسالہ نکالا تو گو اس پر دوسرے لوگوں کے نام بھی ہوتے تھے، مگر اصلاً اس کی ترتیب وادارت کا کام وہی تنہا انجام دیتے تھے، اور اس کے اکثر مضامین بھی انہی کے قلم سے ہوتے تھے، اس کے ایک مستقل کالم 'مطالعات وتعلیقات' میں اپنے مہینہ بھر کے مطالعہ کا نچوڑ پیش کرتے تھے، جس کے بعض مفید حصے کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے۔ ۱۹۵۵ء میں انہوں نے البلاغ کا ایک خاص شمارہ تعلیمی نمبر نکالا جو ایک علمی دستاویز بن گیا اور بہت پسند کیا گیا۔

وہ بڑے زود نویس تھے، اس زمانے میں بھی ان کی بعض کتابیں اور رسالے شائع ہوئے مگر شروع میں ان پر صحافت کا رنگ غالب تھا، بمبئی میں جب علمی انہماک بڑھا اور تحقیق وجستجو کے عادی ہوئے تو ان کا طرز تحریر بھی بدلا اور تحریر میں بھی پختگی پیدا ہوگئی، وہ علامہ شبلی مرحوم کے ہمیشہ عقیدت مند رہے، ان کے نزدیک اردو انشا پردازی کا بہترین اور اعلاترین نمونہ انہی کا طرز تحریر تھا، اس لیے انہوں نے اسی انداز انشا کی تقلید کی۔ اسی زمانے میں معارف میں ان کے علمی وتحقیقی مضامین نکلنے لگے جس کا سلسلہ مدۃ العمر قائم رہا۔

۱۹۵۸ء میں ان کی کتاب **رجال السند والہند** شائع ہوئی تو ملک وبیرون ملک کے علمی حلقوں میں اس کی بڑی پذیرائی ہوئی، یہ ساتویں صدی سے قبل ہندوستانی و سندھی اصحاب علم وکمال کا تذکرہ ہے، ۱۹۷۸ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن بڑے اضافوں کے ساتھ دو حصوں میں شائع ہوا پہلے حصہ میں ان اشخاص کا تذکرہ جو یا تو ہندوسندھ میں پیدا ہوئے اور یہیں وفات پائی یا جن کا اصل تعلق اس سرزمین سے تھا مگر ان کی ولادت اور سکونت باہر رہی، دوسرے حصہ میں باہر سے یہاں آکر واپس چلے جانے یا باہر سے آکر یہاں قیام پذیر اور یہیں کی خاک کا پیوند ہونے والوں کا تذکرہ ہے، سیر، تاریخ، رجال، تراجم اور طبقات کی سینکڑوں کتابوں کو کنگھال کر یہ معلومات جمع کئے گئے ہیں، اس طرح یہ کتاب ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی تاریخ اور عربی طبقات وتراجم میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے۔

بمبئی میں انہوں نے اپنی تصنیفی زندگی کا باقاعدہ نظام بنایا تو ہندوستان کے ابتدائی قدیم عہد کی اسلامی تاریخ ان کا خاص موضوع بن گیا۔ دراصل اردو میں سب سے پہلے علامہ شبلی نے اپنے بعض مضامین میں اس موضوع پر بحث کی، پھر مولانا سید سلیمان ندوی نے عرب و ہند کے تعلقات اور عربوں کی جہاز رانی لکھ کر اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے راہ ہموار کردی، دارالمصنفین کی کتاب ''تاریخ سندھ'' اور ''ہندوستان عربوں کی نظر میں'' بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، قاضی صاحب نے اس موضوع کو اپنایا تو اس کو مزید وسعت دی جس سے اس کے بعض نئے گوشے اور پہلو سامنے آئے، اس سلسلہ کی کتابوں کے نام یہ ہیں۔

عرب و ہند عہد رسالت میں، ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں، اسلامی ہند کی عظمت رفتہ، خلافت راشدہ اور ہندوستان، خلافت امویہ اور ہندوستان، خلافت عباسیہ اور ہندوستان۔

گو یہ ساری کتابیں ایک ہی طرز کی ہیں مگر قاضی صاحب کی محنت و کاوش سے میر انیس کے بقول ان کا حال یہ ہوگیا ہے کہ ع

اک پھول کا مضمون ہو تو سو طرح سے باندھوں

یہ ساری کتابیں بہت مقبول ہوئیں اور ان کے عربی ترجمے بھی شائع ہوئے، بعض کتابوں کا ترجمہ مصر کے ڈاکٹر عبدالعزیز عزت عبدالجلیل نے کیا ہے۔

ہندوستان میں پورب کا علاقہ جو پہلے سرکار جون پور میں شامل تھا بڑا زرخیز اور شیراز ہند کہلاتا ہے، شرقی سلاطین کی علوم و معارف پروری نے اس کے ہر قریہ کو فردوس کے مانند اور ہر قصبہ کو شیراز و اصفہان کا ہم سر بنا دیا تھا، قاضی صاحب نے دیار پورب کی علمی تاریخ کو بھی اپنا موضوع بنایا اور یہاں کے قعر گمنامی میں پہنچ جانے والے علما کو اس سے نکالا، مضامین کے علاوہ اس موضوع پر ان کی کتابیں ''دیار پورب میں علم و علما'' اور ''تذکرہ علمائے مبارکپور'' بھی اہم ہیں۔ تدوین سیر و مغازی، آثر و معارف اور بنات اسلام کی علمی خدمات بھی بڑی کدوکاوش کا نتیجہ ہیں۔

ان کی ایک کتاب ''علی و حسین'' بھی ہے جو جناب محمود احمد عباسی کی کتاب ''خلافت معاویہ و یزید'' کا جواب ہے، اس میں قاضی صاحب نے دکھایا ہے کہ عباسی صاحب نے اپنے نظریات کو ثابت کرنے کے لیے یا تو کمزور تاریخی روایتوں کا سہارا لیا ہے یا روایتوں میں کتر بیونت کی ہے، یہ خیال بجا ہے لیکن دوسری طرف حضرت معاویہ و یزید بلکہ بنی امیہ کے مثالب میں جو روایتیں پیش کی جاتی ہیں وہ بھی ضعف، وہن اور نکارت سے خالی نہیں ہیں، ضرورت ہے کہ کوئی صاحب علم و نظر اس دور کی دونوں طرح کی روایات کی چھان پھٹک کرکے دودھ اور پانی کو الگ الگ کردے، ہمارے خیال میں ہمارے فاضل دوست پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی ندوی یہ کام بہتر انداز سے کرسکتے ہیں۔

قاضی صاحب نے ان دو نادر و نایاب کتابوں کے متون تحقیق و تحشیہ کے بعد شائع کئے ہیں۔

جواہر الحدیث فی علم حدیث الرسول اور دیوان احمد (قاضی صاحب کے نانا کا کلام) ان کی کئی کتابیں شائع ہونے سے رہ گئی ہیں، ان میں ''مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر پیشہ میں علم و علما'' بڑی اہم اور اچھوتی ہے۔

جب بمبئی چھوڑ کر اپنے وطن میں فروکش ہوئے تو مختلف اداروں نے ان کو اپنے یہاں بلانا چاہا مگر کبرسنی اور عائلی زندگی کے لطف و لذت کو چھوڑ کر کہیں جانا پسند نہیں کیا، تاہم دارالمصنفین کا اعزازی رفیق اور اس کی وقف کمیٹی کا ممبر بننا قبول کرلیا۔ ماہنامہ برہان دہلی کے اعزازی مدیر اور شیخ الہند اکیڈمی کے ڈائرکٹر بھی ہوگئے تھے۔ جہاں سے ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ وہ بہت سے علمی و تعلیمی اداروں کے ممبر بھی تھے، جن میں دارالعلوم تاج المساجد بھوپال، دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنو اور دارالعلوم دیوبند قابل ذکر ہیں۔

قاضی صاحب کی بے لوث علمی خدمت اور غیر معمولی جاں فشانی کی بنا پر انہیں علمی و دینی وجاہت کی طرح دنیاوی وجاہت اور مادی فارغ البالی بھی حاصل ہوئی۔ ان کی عربی خدمات اور علمی و تحقیقی کاموں کے اعتراف کے طور پر سابق صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ نے انہیں توصیفی سند عطا کی۔ جنرل ضیاء الحق کے زمانے میں پاکستان گئے تو وہاں بھی علمی خدمات کی بنا پر انعام و اکرام سے نوازے گئے، قاضی صاحب نے سندھ پر جو قابل قدر کام کیا ہے اس کی بدولت وہاں ان کی پانچ کتابوں کے افتتاح کی تقریب ہوئی جس کی صدارت اس وقت کے وزیر اعلیٰ سندھ نے کی اور ''محسن سندھ'' کا خطاب بھی دیا۔

قاضی صاحب بڑے متواضع، منکسر المزاج اور خلیق تھے، وہ خلوص و محبت اور درد مندی کا پیکر تھے۔ لوگوں کی حاجت روائی اور ان کے کام کردینے میں ان کو لذت ملتی تھی۔ کسی کو ضرر پہچانا یا ایذا دینا ان کا شیوہ نہ تھا۔ ان کی زندگی بڑی سادہ اور ہر قسم کے تکلف و تصنع سے بری تھی، اپنی وضع قطع اور ملنے جلنے کے انداز سے اپنی عظمت اور بڑائی ظاہر نہ ہونے دیتے، طبیعت میں غیرت و خودداری تھی، کسی کا احسان مند ہونا گوارا نہیں کرتے تھے، وہ کسی کے عہدہ و منصب اور جاہ و تمول سے نہ کبھی مرعوب ہوتے اور نہ اس سے دب کر اور جھک کر ملتے، اہل علم کی بڑی قدر کرتے، ان کے سامنے مصنوعی اور خود ساختہ بڑوں کو ہیچ و حقیر خیال کرتے، علم کی توہین کسی حال میں نہ ہونے دیتے، اصحاب علم کو دولت مندوں اور امراء کی خوشامد کرتے دیکھتے تو غضب ناک ہوجاتے، بڑے صاف گو تھے، ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا، لاگ لپٹ، رورعایت، ظاہرداری اور مصلحت پسندی انہیں نہیں آتی تھی، ناگوار باتوں اور غلط کاموں کو دیکھ کر چپ رہنے یا

چشم پوشی کر لینے کو پسند نہ کرتے تھے اور صحیح بات بے جھجک برملا کہہ دیتے تھے۔

حرص و آز اور تملق سے نفرت تھی، غرور و تمکنت اور رعونت و نخوت کا کوئی شائبہ بھی ان میں نہ تھا، وہ خودستائی اور خودنمائی کے بالکل عادی نہ تھے، کوئی ایسی بات نہ کرتے جس سے ان کی فضیلت و برتری ظاہر ہوتی، ان کی دینداری ریا و نمائش سے خالی تھی، وہ نام و نمود کے بجائے خاموش خدمت کو پسند کرتے۔

ہر ایک سے بشاشت اور گرم جوشی سے ملتے، ان کا آئینہ دل بغض اور کینہ و کدورت سے زنگ آلود نہ تھا، تعصب، تنگ نظری اور جماعتی عصبیت کو سخت ناپسند کرتے تھے، ہر گروہ و مسلک کے لوگوں سے ان کے تعلقات تھے، ان کے جنازہ میں بڑا اژدحام تھا جس میں ہر مسلک و مشرب اور ہر فرقہ و گروہ کے لوگ شامل تھے۔ اپنے خوردوں سے بھی نہایت بے تکلفی سے ملتے اور محبت و شفقت کا برتاؤ کرتے، ان کی حوصلہ افزائی کے لیے ان کے معمولی اور ادنیٰ کاموں کی داد دیتے، اپنے بزرگوں اور برابر کے لوگوں سے ہمیشہ عزت و اکرام کا معاملہ کرتے بڑے مہمان نواز تھے علماء کو اکثر اپنے گھر آنے کی دعوت دیتے اور جب وہ پہنچ جاتے تو ان کو بڑی خوشی ہوتی اور خوب خاطر مدارات کرتے۔

اللہ تعالیٰ علم و دین کے اس خادم کی مغفرت فرمائے اور اعزہ و متوسلین کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین! ("ض"، اگست ۱۹۹۶ء)

فاروقی، ضیاء الحسن، پروفیسر

آہ! پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کے انتقال کی خبر یکم اگست کو ۱۲ بجے شب میں سنی تو یقین نہیں ہوا، علی الصباح جناب عبداللطیف اعظمی کو فون کیا گیا تو انہوں نے بتایا کہ یہ حادثہ جاں کاہ ۳۰؍ جولائی کی شب میں پیش آیا اور ۳۱؍ کو دوپہر بعد تدفین ہوئی، میرے لیے یہ خبر ناقابل برداشت تھی، اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے ان کے دونوں صاحبزادوں کو خطوط لکھے، اس پر بھی تاب لائے نہ بنی تو ۸؍ اگست کو دہلی ان کے دولت کدہ پر تعزیت کے لیے حاضر ہوا، لیکن اب بھی تسکین دلِ محزوں نہیں ہو رہی ہے اور بے چینی اور اضطراب کا وہی عالم ہے۔

مجھ سے پوچھو نہ مزاج دل ناشاد ابھی
میرے نغموں میں ہے کچھ تلخی فریاد ابھی

ابھی ۱۸؍ جولائی کو مجلس تحقیقات و نشریات لکھنو کے جلسے میں ان سے ملاقات ہوئی تھی تو میں نے عرض کی تھی کہ اعظم گڈھ تشریف لے چلیں، پہلے تو حسب عادت مسکرائے پھر کہا ۲۰؍ کو دہلی واپسی کا ریزرویشن کرا چکا ہوں، میں ڈھائی بجے دن میں ان سے رخصت ہونے لگا تو یہ کہہ کر مجھے روکنا چاہا کہ "ارے بڑی سخت دھوپ ہے"۔

ٹھہر بھی جا در ساقی پہ دو گھڑی کے لیے
تمام عمر پڑی ہے رداروی کے لیے

مگر میں یہ اشارہ غیبی نہ سمجھ سکا کہ چند روز بعد کبھی نہ واپس ہونے والے سفر سے ان کا ریزرویشن ہو چکا ہے اور اپنی دھن میں روانہ ہو گیا، مجھے کیا خبر تھی کہ ع انیس دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ۔ اور بس عالم ناسوت میں یہ ان سے آخری ملاقات ہے، اس کے بعد ان کا روئے روشن اور رخِ زیبا دیکھنا نصیب نہ ہوگا، اور صرف حسرت ہی حسرت رہ جائے گی۔

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر نہ دیدم بہار آخر شد

وہ ۲؍ مئی ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی وطن اعظم گڑھ سے متصل ضلع فیض آباد کا مشہور صنعتی قصبہ ٹانڈہ تھا، جو علمی و تعلیمی حیثیت سے بھی امتیاز رکھتا تھا، یہاں کی خانقاہوں سے چلنے والے علم و عرفان اور رشد و ہدایت کے جھونکے اعظم گڑھ کے مغربی قصبوں اور دیہاتوں میں بھی پہنچ رہے تھے، ٹانڈہ میں شیوخ و سادات کے بعض خاندان آباد تھے، جو علمی، دینی اور دنیاوی وجاہت کے مالک تھے، ضیاء الحسن فاروقی صاحب کا خاندانی تعلق فاروقی شیوخ سے تھا جس کی قرابت سادات کے خاندانوں میں بھی تھی، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے حقیقی بھتیجے مولانا وحید احمد صاحبؒ کی صاحبزادی ان کے عقد میں تھیں، ان کے خاندان میں دین داری تھی، خود فاروقی صاحب میں بھی دین داری رچ بس گئی تھی، جس میں عمر کے ساتھ برابر ترقی ہوتی رہی۔ وہ صوم و صلاۃ اور اوراد و وظائف کے پابند تھے، جماعت سے نماز پڑھتے اور صف اول میں شامل ہوتے، تہجد اور شب خیزی کے عادی تھے، صبح سویرے قرآن مجید کی تلاوت معمول میں داخل تھی، رمضان میں تراویح میں قرآن مجید سننے کا التزام تھا، ان کے خاندان کا دینی تعلق تو حضرت مدنیؒ اور ان کے خاندان سے رہا ہوگا مگر وہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ سے بیعت تھے اور خوش تھے کہ:

دامن پکڑ لیا ہے شب دراز کا

تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوئی، اس وقت ان کے معاشی حالات بہتر نہ تھے، کوئی اور ہوتا تو پڑھنا لکھنا چھوڑ دیتا۔ مگر وہ اولوالعزم، حوصلہ مند، محنتی اور جفاکش تھے، مشقتیں اور صعوبتیں جھیل کر اور سرد و گرم حالات کا مقابلہ کر کے تعلیم مکمل کی۔

مجھے ان کے نام سے واقفیت اپنی طالب علمی کے زمانے میں ہوئی، اس وقت وہ مدینہ بجنور کے شعبہ ادارت سے منسلک تھے، اسی زمانے میں میری مضمون نگاری کی ابتدا ہوئی تھی اور بعض مضامین مدینہ اور غنچہ میں بھی شائع ہوئے تھے، صاحب سلامت کی

نوبت ۱۹۶۵ء میں آئی جب وہ دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی کی گولڈن جبلی میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے، اس میں انہوں نے اپنا مقالہ بھی پڑھا تھا، اس کے بعد دارالمصنفین سے ان کے روابط بڑھے اور غالباً ۶۷ء یا ۶۸ء میں وہ اس کے کتب خانے سے استفادے کے لیے یہاں آئے تو تقریباً ایک ماہ قیام پذیر رہے، اس عرصہ میں مجھے ان کے علمی شغف اور مطالعہ میں استغراق و انہماک کا اندازہ ہوا، شام کو چائے پر مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کے ساتھ ان کی پر لطف صحبت رہتی جس میں علمی، ادبی اور سیاسی مسائل پر دلچسپ باتیں ہوتیں، میں بھی ان صحبتوں میں شریک رہتا اور علمی و ادبی نکتوں سے لطف اندوز ہوتا۔

۱۹۷۷ء میں وہ دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے ممبر ہوئے تو اس کے مسائل و معاملات سے انہیں ایسی دلچسپی ہوئی کہ وہ جلد ہی اس کی مجلس عاملہ کے بھی ممبر ہوگئے اور جو ذیلی کمیٹیاں تشکیل پاتیں ان کے ایک ممبر وہ بھی ضرور ہوتے تھے، بڑی پابندی سے دارالمصنفین کے جلسوں میں تشریف لاتے اور اس کو برابر یاد رکھتے، اعظم گڑھ کا کوئی آدمی ان کو مل جاتا تو اس کے اور اس کے کارکنوں کے بارے میں ضرور دریافت کرتے، وہ کسی حال میں ہوتے دارالمصنفین کا خیال ان کو ضرور رہتا۔

قید میں بھی ترے وحشی کو رہی زلف یاد

راقم الحروف کو ان کے مفید مشوروں اور وسیع تجربوں سے بڑی مدد اور رہنمائی ملتی، دارالمصنفین کے سرد و گرم حالات اور نازک اور پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں بڑی دماغ سوزی سے کام لیتے، اب ایسا مخلص اور ہمدرد آدمی کہاں ملے گا؟ ادھر کئی برسوں سے ان کی حیثیت دارالمصنفین کے علمی و انتظامی مشیر کی ہوگئی تھی، سال میں ایک یا دو بار وہ ضرور تشریف لاتے، ماہ ڈیڑھ ماہ قیام کرتے، اپنے علمی کاموں کے علاوہ دارالمصنفین کے رفقاء و کارکنوں کی رہبری بھی کرتے اور یہاں کا چھوٹا بڑا ہر کام شوق و دلچسپی سے انجام دیتے، اتفاق سے بابری مسجد کی شہادت کے زمانے میں وہ یہیں موجود تھے، عجیب خوف و دہشت کا ماحول تھا، ان کی وجہ سے بڑی تقویت تھی، میں نے دسمبر ۹۲ء کے معارف کا اداریہ لکھا تو کتابت کے لیے دینے سے پہلے ان کو اور رفقا کو دکھلایا، انہوں نے دو ایک جگہ حذف و ترمیم کا مشورہ دیا، مسجد کے سلسلے میں کانگریس کے رویے کے بارے میں میرے نوک قلم پر ایک شعر آگیا تھا۔ ع

مری میت پہ اب آیا ہے ظالم بال بکھرائے

کہو یہ شکل جیتے جی دکھا دیتا تو کیا ہوتا

اس پر وہ بھڑک اٹھے اور دریافت کیا کس کا شعر ہے، مگر میں بتا نہ سکا۔

ان کی فراغت، علمی ترقی اور ادبی فتوحات کا دور اس وقت شروع ہوا جب وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ ہوئے، یہاں وہ جامعہ کالج کے پرنسپل، فیکلٹی آف ہومینٹیز اینڈ لینگویجز کے ڈین، شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے پروفیسر، ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈائرکٹر اور قائم مقام وائس چانسلر رہے، روس کا سفر کیا، رسالہ جامعہ کا دوبارہ اجرا ہوا تو عبداللطیف اعظمی صاحب کے تعاون سے اس کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی اور اس کے متعدد خاص نمبر شائع کئے جو مستقل تصنیفات سے بڑھ کر تھے، ۱۹۶۹ء میں ڈاکٹر سید عابد حسین کی سرکردگی میں ''اسلام اینڈ دی ماڈرن ایج سوسائٹی'' کا قیام عمل میں آیا، اس کی طرف سے عابد صاحب کی ادارت میں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ''اسلام اور عصر جدید'' اور ''اسلام اینڈ ماڈرن ایج'' کے نام سے سہ ماہی علمی رسالے نکلے، عابد صاحب کی وفات کے بعد ان دونوں رسالوں کی ادارت بھی ضیاء الحسن فاروقی صاحب کو سپرد ہوئی، اپنے شعبہ کی سربراہی کے ساتھ تین تین رسالوں کی ادارت کا بار اٹھا لینا اور اچھی طرح نباہ لینا ان کے جیسے غیر معمولی شخص ہی کا کام ہوسکتا ہے۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

اپنے شعبہ کی جانب سے انہوں نے بڑے پیمانے پر کئی سیمینار بھی کرائے، ''فقہ اسلامی کی تشکیل جدید'' کے عنوان سے جو سیمینار ہوا تھا اس کے مضامین کا مجموعہ انہوں نے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔

تصنیف و تالیف ان کا خاص ذوق تھا اردو اور انگریزی دونوں میں تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں، فارسی شعر و ادب کا عمدہ مذاق تھا اور اردو کے بہت اچھے، مشاق اور صاحب فکر مصنفین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

اسلامی علوم، عہد حاضر کی اسلامی سیاست اور اس دور کے ان مسلم رہنماؤں سے فاروقی صاحب کو خاص دلچسپی تھی جنھوں نے مفید دینی، اصلاحی اور تعلیمی خدمات انجام دیں اور جن کا مسلمانوں کی موجودہ قومی و سیاسی بیداری میں خاص حصہ رہا ہے، مذہب، تصوف اور قومی تحریک سے ان کی دلچسپی مولانا مدنیؒ کے اثر کا نتیجہ رہی ہوگی، لیکن علمی و فکری حیثیت سے وہ مولانا آزاد کے زیادہ قریب رہے، ان کے دینی و سیاسی تصورات کا رنگ ان پر آخر تک چھایا رہا، دوقومی نظریے اور بعض مسلم جماعتوں کے وہ ہمیشہ خلاف رہے اور اپنے مضامین اور تحریروں میں ان کے طرز فکر کی کجی و خامی کی نشاندہی بھی کرتے، اس سلسلہ میں ان کی کتاب ''اسلام اور بدلتی دنیا'' بڑی اہم ہے جو ان اداریوں کا مجموعہ ہے، جو انہوں نے سہ ماہی اسلام و عصر جدید (اردو) کے لیے لکھے تھے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر حالات کی نزاکتوں اور دین کے تقاضوں پر یکساں ہے، اس میں انہوں نے عالم اسلام کے واقعات اور مسلمانوں کو درپیش دینی و سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اخلاقی مسائل کے نتائج و عواقب کا جائزہ لیا ہے اور اسلامی تعلیمات کی روشنی ہی عقل و تدبر سے کام لے کر انہیں حل کرنے کی دعوت دی ہے،

انہوں نے خاص طور پر بعض دینی جماعتوں اور ہندوستان اور اسلامی ملکوں کے بعض مصلحین کی علمی، فکری، دعوتی اور اصلاحی خدمات پر اس طرح بحث وتبصرہ کیا ہے کہ ان کی خوبیوں اور ان کے مفید پہلوؤں کے ساتھ ان کی خامیاں اور کوتاہیاں بھی سامنے آگئی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہندوستان اور دنیائے اسلام کے بعض ملکوں میں اسلامی بیداری کے آثار اور اسلام کو مضبوط و مستحکم کرنے کی خواہش تو نمایاں ہے مگر ان میں معاشرتی و معاشی اصلاح اور سچی اسلامی زندگی کے قیام کے بنیادی کام کو نظر انداز کر کے سیاسی طاقت اور حکومتی اقتدار حاصل کر کے اسلامی قوانین نافذ کرنے کی کوشش ہورہی ہے۔

''افکار واشخاص'' بھی ان کی اسی طرح کی کتاب ہے، یہ بھی مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں سرسید، مولانا شبلی، مولانا آزاد، جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، رشید رضا ضیا، گوکلپ اور لطف اللہ کے اصلاحی افکار وخیالات کا تجزیہ کیا گیا ہے، وہ کچھ عرصہ کے لیے پروفیسر ڈاکٹر ذاکر حسین چیئر پر بھی رہے اور ذاکر صاحب کی مبسوط سوانح عمری لکھنے کا کام ان کے سپرد ہوا۔ یہ کام ان کے ذوق اور دلچسپی کا تھا لیکن ظاہر ہے ذاکر صاحب جیسی ہمہ گیر اور پہلودار شخصیت پر محدود وقت میں کتاب لکھنا آسان نہیں تھا مگر انہوں نے بڑی تلاش وجستجو اور محنت شاقہ سے ''شہید جستجو'' کے نام سے ان کی ایک ضخیم اور مکمل داستانِ زندگی مرتب کردی، اس کی تیاری میں انہوں نے جو غیر معمولی جانفشانی کی ہے اس کا اندازہ ان کی اس تحریر سے ہوتا ہے:

> ''ذاکر صاحب کی اس بایوگریفی کے تیار کرنے میں نہ معلوم کتنے ہفت خواں طے کرنے پڑے کتابیں، مضامین، ریکارڈ کئے ہوئے ابتدائیہ، انٹرویوز، ذاکر صاحب اور دوسروں کے خطوط، پرائیوٹ پیپرز اور خود ذاکر صاحب کی وہ تحریریں جن تک میری رسائی ہوسکی، بیسیوں اشخاص سے ملاقاتیں اور نہ جانے کیا کیا''۔

بایوگریفی کے موجودہ معیار اور تحقیق کے لیے طریقوں کو مدنظر رکھ کر انہوں نے ذاکر صاحب کی جو وقیع اور معتبر لائف مرتب کی ہے اس سے بہتر ممکن نہیں تھی، یہ آئندہ کام کرنے والوں کے لیے مستند ماخذ کا کام دے گی۔

شہید جستجو کی ترتیب کے درمیان انہیں ذاکر صاحب کی ایک بیاض دستیاب ہوئی جس میں ان کے پسندیدہ فارسی اشعار درج تھے ''نگار معنی'' کے نام سے اس کا ایک اچھا انتخاب مرتب کر کے اپنے مفید مقدمہ کے ساتھ شائع کیا، اس سے دونوں حضرات کے فارسی شعر وادب کے اچھے ذوق کا پتہ چلتا ہے۔

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی طرف سے ۱۹۸۷ء میں انہوں نے ذاکر صاحب کی ۹۰ ویں سال گرہ کے موقع پر ''ذاکر صاحب اپنے آئینہ لفظ ومعنی میں'' مرتب کر کے شائع کیا جو ذاکر صاحب کی بعض اہم انگریزی تحریروں کے اردو ترجموں اور بعض کامیاب اردو تحریروں اور تقریروں اور چند نہایت اہم غیر مطبوعہ خطوط کا مجموعہ ہے، مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کے نام کے خطوط کا واقعاتی پس منظر بیان کرنے کے لیے مرتب نے ''الفت موج وکنار'' کے عنوان سے دلچسپ اور پرمغز ابتدائیہ لکھا ہے۔

اسی طرح کی ایک کتاب ''مجیب صاحب کے احوال وافکار'' کے نام سے مجیب صاحب کی ۸۲ ویں سال گرہ کے موقع پر شہاب الدین انصاری اور جناب عبداللطیف اعظمی کے اشتراک سے مرتب کی تھی جس کے پہلے حصہ ''احوال'' میں ان کے اور دوسروں کے مضامین ہیں اور دوسرا حصہ ''افکار'' خود مجیب صاحب کی منتخب تحریروں کا مجموعہ ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کو ذہنی ہم آہنگی بھی تھی اور غیر معمولی عقیدت بھی۔ مولانا پر انہوں نے کئی فاضلانہ مقالے لکھے، آج کل وہ انگریزی میں مولانا کی سیاسی سوانح پر کام کررہے تھے، جس کی پہلی جلد پریس کے حوالے کرچکے تھے اور دوسری جلد کی تالیف میں ہمہ تن مشغول تھے۔

تصوف کا ذوق انہیں وراثتاً ملا تھا، اس سے علمی وعملی وابستگی تھی، اسی مناسبت سے انہوں نے طبقہ صوفیہ کے سرخیل حضرت جنید بغدادیؒ کی شخصیت وتصوف پر بھی ایک کتاب لکھی تھی، اس کے پہلے حصہ میں ان کے حالات، تصوف وشخصیت، نظریہ توحید و صحو اور تصنیفات پر بحث کی ہے اور جنید بغدادی کی مشہور کتاب ''معالی الھمم'' میں مذکور علماء وصلحا کا حال لکھا ہے۔ اور دوسرا حصہ اس کتاب کے اردو ترجمہ پر مشتمل ہے۔

صوفیانہ مشرب سے دلچسپی کی بنا پر انہوں نے فوائد الفواد کا انگریزی ترجمہ بھی کیا۔ انگریزی میں کئی اور کتابیں بھی لکھیں۔ تعلیم کے موضوع پر بھی ان کی کتابیں ہیں۔

جس طرح ان کی شکل وصورت پاکیزہ، پرکشش اور چہرہ پرنور تھا، اسی طرح ان کے دل اور ان کی سیرت وکردار میں بھی پاکیزگی، دلکشی اور جاذبیت تھی، مہر ومحبت، علم و انکسار، رحم ومروت، اخلاص ونیک نیتی اور اعتدال وسلامت روی ان کی سیرت و شخصیت کا خاص جوہر تھا، بڑے مرنجاں مرنج تھے، ہر شخص سے بڑی میٹھی اور نرم گفتگو کرتے، شکوہ، شکایت، غیبت، بدگوئی اور خودستائی سے پرہیز کرتے، چھوٹے بڑے، ادنا واعلا ہر ایک سے تعلق رکھتے اور سب سے بشاشت اور تپاک سے ملتے دارالمصنفین کے ایک ایک آدمی سے گھل مل گئے تھے، سب کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتے اور اظہار ہمدردی کرتے۔ وقت کے بڑے پابند تھے، فضول کاموں اور خواہ مخواہ کی بحث وتکرار میں وقت ضائع نہ کرتے، ہر قسم کی دلچسپیاں ترک کردی تھیں اور صرف مفید بامقصد کاموں میں وقت صرف کرتے۔

قاعدہ وضابطہ کے نہایت پابند تھے، اصول وقانون شکنی کو سخت ناپسند کرتے۔

جامعہ میں وہ بڑے ذمہ دارنہ عہدوں پر متمکن رہے، عزل ونصب کے اختیارات بھی ان کو حاصل تھے، اس کی اور اصول وضابطہ پسندی کی وجہ سے ممکن ہے بعض لوگوں کو ان سے شکایتیں رہی ہوں، جو اس لیے بیجا تھیں کہ رحم و مروت ہی کی طرح عدل وانصاف کے تقاضے پورا کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔

ان کی وفات کی اطلاع دیتے ہوئے پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شیروانی نے یکم اگست کو جو گرامی نامہ مجھے تحریر فرمایا تھا وہ ان کے حالات وسوانح کا مختصر خاکہ ہے ملاحظہ ہو:

پرسوں پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے داغ مفارقت دیا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ بال بال مغفرت فرمائے اور درجات بلند کرے۔ [1]

میرے ان سے ۱۹۴۴ء سے روابط تھے، کلاس میں مجھ سے دو سال پیچھے تھے اور عمر میں ایک سال چھوٹے تھے، اتحاد کے رشتے گوناگوں تھے، مذہبی، علمی، ادبی، سیاسی اور سماجی اختلاف رائے کی نوبت بہت کم آتی تھی، اس لئے یہ حادثہ ذاتی طور پر میرے لئے بہت شدید ہے۔

زمانہ طالب علمی میں ان کی مالی حالت کمزور تھی اور شادی جلدی ہوگئی تھی یعنی ۱۹۴۶ء میں انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد۔ جس کی وجہ سے مالی مشکلات میں اضافہ ہوگیا تھا، لیکن شروع سے بہت محنتی اور پابند اوقات آدمی تھے، اس لیے بڑی حد تک مالی مشکلات پر قابو پالیا تھا، رقم کی فراہمی کے لئے بار بار گھر جاتے تھے اور پرائیوٹ ٹیوشن بھی پڑھاتے تھے تاہم امتحان میں ہمیشہ اچھے نمبروں سے کامیابی حاصل کرتے تھے، بہت مرنجاں مرنج اور دھیمے مزاج کے آدمی تھے، اور اس مناسبت سے اس زمانہ میں ہم انہیں ''گاندھی جی'' کہہ کر پکارتے تھے۔

۱۹۴۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔اے کرنے کے بعد الٰہ آباد چلے گئے تھے۔ جہاں ڈپلومیسی کے نام سے ایک نیا نصاب رائج ہوا تھا، اس میں ایم۔اے کیا، لیکن جیسا کہ معلوم ہے بعد میں علمی ذوق اسلامیات میں تبدیل ہوگیا، اس مضمون میں میکگل سے دوسرا ایم۔اے کیا اور ایم۔اے کی ضرورت کے پیش نظر ''دیوبند اسکول اور مطالبہ پاکستان'' کے زیر عنوان مقالہ لکھا جو بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔

درمیان میں ''مدینہ'' بجنور اور ''مسیح'' نئی دہلی کے نہایت کامیاب مدیر رہے جامعہ اسلامیہ سے وابستہ ہوجانے کے بعد جامعہ، اسلام اور عصر جدید اور اسلام اینڈ ماڈرن ایج کی ادارت بہت قابلیت سے انجام دی، جامعہ ملیہ سے ان کی وابستگی بہت متنوع تھی، جامعہ کالج کے پرنسپل بشریات کی فیکلٹی کے ڈین۔ اسلامک اسٹڈیز کے پروفیسر اور جامعہ ملیہ کے قائم مقام وائس چانسلر۔ ان کے علمی کاموں کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم پر مختلف نوعیت کے کام کئے، مولانا ابوالکلام آزاد پر متعدد گراں قدر مقالات لکھے۔ آج کل انگریزی میں ان کی سیاسی سوانح لکھ رہے تھے، جس کی پہلی جلد (جو ۱۹۴۰ء کا احاطہ کرتی ہے) پریس میں ہے، تصوف بھی ان کی دلچسپی کا موضوع تھا اور اس پر بھی لکھتے رہے ہیں۔

دارالمصنفین سے جو شغف تھا اور اس کے کاموں میں جو عملی دلچسپی لیتے تھے اس سے آپ مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔

غم گین: ریاض الرحمٰن شروانی

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے آمین۔

(''ض''۔ ستمبر ۱۹۹۶ء)

---

[1] آمین، (معارف)

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی مرحوم

(عبداللطیف اعظمی)

''پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی پر میرا حقیر مضمون پہلے شائع ہو چکا ہے، جناب عبداللطیف اعظمی نے جامعہ کے تعلق سے ان کے بارے میں جو معلومات بیان کئے ہیں ان کا میرے مضمون میں ذکر نہیں تھا''۔ (ض)

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی مرحوم میرے مخلص اور بے تکلف دوستوں میں سے تھے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو سے عالم کی سند حاصل کرنے کے بعد ۱۹۳۶ء میں میں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے درجہ خاص میں داخلہ لیا۔ یہ درجہ خاص عربی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ کے لیے مخصوص تھا، تاکہ وہ ایف اے اور بی اے کے امتحانات میں شرکت کے لیے ضروری علوم حاصل کرسکیں۔ چونکہ ندوے کے نصاب میں جدید علوم پہلے سے داخل تھے اس لیے کم سے کم مدت میں ۱۹۴۱ء میں میں نے بی اے کرلیا۔ اس کے بعد اسی سال ستمبر میں جامعہ کے ایک تصنیفی اور اشاعتی ادارہ مکتبہ جامعہ کے شعبہ تصنیف و تالیف میں بحیثیت انچارج میرا تقرر ہوگیا۔ اس کے بعد جامعہ کے مختلف اداروں میں کام کرتا رہا۔ ۱۹۴۸ء میں جب شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوکر علی گڑھ چلے گئے تو نائب شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے شیخ الجامعہ کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ ۱۹۵۵ء میں انہوں نے مجھے اپنا پرنسپل مددگار مقرر کیا۔ ۱۹۷۲ء میں شیخ الجامعہ کے سکریٹری کی جگہ خالی ہوئی تو اس عہدے پر میرا تقرر ہوگیا۔ ۱۹۷۹ء تک میں اس عہدے پر کام کرتا رہا، یہاں تک کہ حسب قاعدہ میں ریٹائر ہوگیا۔

شیخ الجامعہ صاحب نے بطور خاص دو ڈھائی سال کی ایک ساتھ میری خدمات میں توسیع منظور کی۔ اسی زمانے میں جب شیخ الجامعہ کے سکریٹری کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہا تھا تو جناب انوار قدوائی صاحب شیخ الجامعہ کی حیثیت سے تشریف لائے۔ ابھی تھوڑی ہی مدت میں نے قدوائی صاحب کے ساتھ کام کیا تھا کہ جامعہ کالج کے پرنسپل اور ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ کے اعزازی ڈائرکٹر پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ تم دفتر شیخ الجامعہ میں وقت کیوں ضائع کر رہے ہو تمہاری اصل جگہ ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ میں ہے۔ واقعی میرے لیے وہاں کوئی خاص کام نہیں تھا اس لیے خوشی سے تیار ہوگیا۔ چنانچہ ان کی کوشش سے میری خدمات ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ میں منتقل ہوگئیں اور اسسٹنٹ ایڈیٹوریل کی حیثیت سے ۱۹۷۹ء میں میں وہاں کام کرنے لگا۔ وہاں کا کام میری پسند اور ذوق کا تھا اور میرے ساتھ ضیاء صاحب کا سلوک قابل تعریف تھا۔ وہ میری کتنی عزت اور کتنا احترام کرتے تھے اس کا اندازہ آپ اس سے کرسکتے ہیں کہ جب اردو میں ان کی دونوں کتابیں شائع ہوئیں تو انہیں مجھے عنایت کرتے ہوئے پہلی کتاب: شہید جستجو پر لکھا: ''محبّ مکرم جناب عبداللطیف اعظمی کی خدمت میں ہدیۂ مولف''۔ دستخط کے نیچے تاریخ ہے: ۸۳-۴-۲۸ دوسری کتاب مولانا ابوالکلام آزاد پر لکھا: ''برادر بزرگ جناب عبداللطیف اعظمی کی خدمت میں خلوص ومحبت کے جذبے کے ساتھ''۔ دستخط کے نیچے تاریخ ہے: ۹۵-۳-۴۔

نیز مجھے ہر طرح کی آزادی تھی جو جامعہ کا طرہ امتیاز ہے، جس کا میں شروع سے عادی رہا ہوں۔ صرف ایک بات سے میں پریشان تھا۔ وہ یہ کہ ماہنامہ جامعہ کی ترتیب و اشاعت کی وجہ سے قید ہو کر رہ گیا تھا۔ اتنا وقت نہیں ملتا تھا کہ دہلی سے باہر جاسکوں اور مختلف علمی و ادبی حلقوں میں کچھ وقت گزار سکوں اور دوست احباب کی صحبتوں سے لطف اٹھا سکوں۔ نیز مجھے تصنیف و تالیف سے جو غیر معمولی دلچسپی تھی اس کے لیے ذرا بھی وقت نہیں ملتا تھا۔ اس کمی کو میں اس طرح پوری کرتا تھا کہ ماہنامہ جامعہ کے خصوصی شمارے نکالتا اور ان کی زائد کاپیاں چھپواتا اور انہیں اپنے نام سے کتابی صورت میں شائع کرتا۔ مگر یہ بات ضیاء صاحب کو پسند نہیں تھی۔ لیکن میری وجہ سے خاموش رہتے۔

ایک صورت حال اور میرے لیے انتہائی تکلیف دہ تھی۔ وہ یہ کہ قدوائی صاحب بنیادی طور پر کسی کی ملازمت میں توسیع کے سخت خلاف تھے۔ وہ کسی کو ایک دن کی بھی توسیع منظور نہ کرتے اور یہاں یہ حال تھا کہ میری سال بہ سال توسیع ہوتی رہتی تھی، میری ضروریات یا خوشنودی میں نہیں بلکہ ضیاء صاحب اپنی مجبوری میں کرتے تھے، ان کا خیال تھا کہ میں جو ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہوں وہ کوئی اور شخص انجام نہیں دے سکتا۔ مجھے معلوم نہیں کہ شیخ الجامعہ صاحب کو وہ کیا لکھتے تھے مگر اس کا مجھے احساس تھا کہ یہ مسلسل توسیع ان کو سخت ناپسند ہے۔ اس لیے میرے اصرار پر ضیاء صاحب نے مختلف اخبارات میں دو مرتبہ میری جگہ کے لیے اشتہارات شائع کروائے، ان کے جواب میں متعدد امیدوار آئے مگر سلکشن کمیٹی میں جب انہوں نے کام کی نوعیت اور تفصیلات سنیں تو اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اس کے بعد ضیاء صاحب مجھ سے فرماتے تھے کہ تم اپنی جگہ کے لیے کسی شخص کو تیار کرلو تو جاسکتے ہو۔ اتفاق سے ایک دوست نے ایک صاحب کی سفارش کی کہ میں انہیں اپنے کاموں میں شریک کرلوں۔ وہ صاحب جامعہ کے شعبہ تاریخ میں ایم اے کا امتحان دے رہے تھے، نیز ان کی اردو اور فارسی کے ادب پر گہری نظر تھی۔ علاوہ ازیں کتابت وطباعت کا بھی اچھا تجربہ تھا۔ اس پر مجھے بے حد خوشی ہوئی اور جونہی وہ امتحان سے فارغ ہوئے نتیجے کا انتظار کئے بغیر اپنی جگہ پر ان کا تقرر کروا کر میں نے اطمینان کا سانس لیا اور خوشی خوشی وہاں سے رخصت ہوگیا۔

میرے اور مرحوم کے باہمی تعلقات میں ایک اہم پہلو ایسا ہے جو رواروی میں نظر انداز ہوگیا۔ وہ یہ کہ جب وہ کالج کے پرنسپل تھے اور خاکسار شیخ الجامعہ کا سکریٹری تو اکثر میں ان کے ان بلوں پر اعتراض کیا کرتا تھا جن کی ادائیگی اس بجٹ سے ہوتی تھی جو شیخ الجامعہ کے اختیار میں تھا۔ علاوہ ازیں اس زمانے میں افسران جامعہ کو سرکاری ضروریات کے لیے صرف شیخ الجامعہ کی کار تھی جو راقم الحروف کے اختیار میں تھی۔ اس کی وجہ سے بہت سے افسران جامعہ کو مجھ سے شدید شکایات تھیں۔ ان میں ضیاء الحسن فاروقی مرحوم بھی شامل تھے۔ یہ دور کتنی ابتلا و آزمائش کا تھا اس کا اندازہ آج کے زمانے میں نہیں کیا جاسکتا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ شیخ الجامعہ پروفیسر مجیب صاحب کو مجھ پر بے حد اعتماد تھا۔ اس لیے لوگوں کی شکایات کا مجھ پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ اس کا اندازہ آپ ایک مثال سے کرسکتے ہیں۔ کار کے سلسلے میں بیگم مجیب کو بھی مجھ سے سخت شکایت تھی۔ دراصل وہ ایسی نیک اور بے ہمہ اور باہمہ تھیں کہ انھیں کار کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ مگر ان کی ایک بڑی بہن تھیں جو ان کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ وہ معمولی معمولی کام کے لیے اکثر کار کا مطالبہ کیا کرتی تھیں۔ اس طرح دوسرے لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ میں حتی الوسع ٹال مٹول کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ مجیب صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ آپ کو اندازہ نہیں کہ بیگم صاحبہ سے میں آپ کی کتنی حمایت کیا کرتا ہوں۔ وہ جب بھی کار مانگیں آپ ان کو دے دیا کیجئے اور میرے نام اس کا بل بنوا دیجئے جو میری تنخواہ سے ادا ہوجائے گا۔ میں نے انتہائی ادب سے عرض کیا کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کی کتنی تنخواہ ہے اور کٹ کٹا کر کتنی ملتی ہے، اگر یہ سختی میں نہ کروں تو یہ رقم بھی آپ کو نہ ملے گی۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ خود بیگم صاحبہ کو کار کی بالکل ضرورت نہیں ہوتی ورنہ میں ان کی ضروریات کو کسی نہ کسی طرح پورا کردیتا۔ یہ دوسرے لوگ ہیں جو ان کی نیکی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس پر وہ بالکل خاموش ہوگئے۔

مذکورہ بالا تحریر کو لکھتے وقت نہ جانے کیوں اپنے وطن کے مقبول ترین اور عظیم

ترین شاعر حضرت اقبال سہیل مرحوم کا حسب ذیل شعر بار بار یاد آتا رہا۔ آپ بھی سنیے!

نکہت گل کی طرح عمر بسر کی اقبال   راحت اغیار کو دی آپ پریشان ہوکر

اس مختصر گزارش کے بعد انتہائی اجمال کے ساتھ مرحوم ضیاء الرحمٰن فاروقی صاحب کے بارے میں ان کی پرسنل فائل سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں۔ جن کی خوبی یہ ہے کہ یہ خود ان کے قلم کے مرہونِ منت ہیں۔ گویا ایک طرح سے ان کی حیثیت خودنوشت حالات زندگی کی ہے۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ تاریخ وار ہیں۔ ایک وضاحت اور کردوں کہ ان خطوط یا مراسلات میں شیخ الجامعہ کو ان کے عہدے کے نام سے خطاب کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ کسی کا نام شامل نہیں ہے۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ جامعہ میں ان کا تقرر پروفیسر محمد مجیب مرحوم کے عہد میں ہوا تھا۔ ان کے بعد شیخ الجامعہ کی حیثیت سے پروفیسر مسعود حسین خان تشریف لائے، پھر جناب انور جمال قدوائی صاحب۔ ان ہی کے زمانے میں ضیاء صاحب ریٹائر ہوئے۔

زیر تذکرہ اقتباسات سے پہلے ضیاء صاحب مرحوم کے مختصر ترین الفاظ میں ان کا سوانحی خاکہ ملاحظہ ہو:

۱۔ ۲/مئی ۱۹۲۵ء کو ٹانڈہ (ضلع فیض آباد۔ یوپی) میں پیدا ہوئے۔

۲۔ ۱۹۴۴ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔

۳۔ ۱۹۴۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے سکنڈ ڈویزن میں ایم اے کیا۔ خصوصی مضامین ڈپلومیسی اور بین الاقوامی سیاسیات تھے۔

۴۔ ۲۱/مئی ۱۹۵۰ء کو سہ روزہ مدینہ (بجنور۔ یوپی) کی مجلس ادارت میں شامل ہوئے اور ۲۸/جون ۱۹۵۳ء تک اس میں کام کیا۔

۵۔ اس کے بعد جمعیۃ علمائے ہند دہلی کی جانب سے انگریزی میں ایک ہفتہ وار اخبار دی میسیج شائع ہوا تو سہ روزہ مدینہ چھوڑ کر اس کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔

۶۔ اسی زمانے میں جامعہ ملیہ میں ایک جگہ نکلی تو ۲۵/جولائی ۱۹۵۳ء کو اس جگہ کے لیے شیخ الجامعہ پروفیسر مجیب کو ضیا صاحب نے لکھا: ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ جامعہ کالج کو تاریخ وسیاسیات کے ایک استاد کی ضرورت ہے۔ میں اس جگہ کے لیے اپنی خدمات پیش کرتا ہوں۔ تاریخ و سیاسیات میرے خاص مضمون رہے ہیں۔ شیخ الجامعہ صاحب نے موصوف کی اس درخواست کو منظور کرلیا۔

۷۔ مرحوم راک فیلر فاؤنڈیشن کناڈا میں اعلیٰ تعلیم کے لیے تشریف لے گئے۔

۸۔ ۱۲/نومبر ۱۹۵۹ء کو موصوف نے شیخ الجامعہ صاحب کو اطلاع دی کہ میں کناڈا میں اپنی تعلیم ختم کرکے واپس آگیا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آج ۲۴/نومبر ۱۹۵۹ء سے کالج میں اپنا کام شروع کردوں۔ براہ کرم مجھے اس کی اجازت دی جائے، حسب قاعدہ اجازت دی گئی۔

۹۔ ۲۲/اگست ۱۹۶۳ء کو ضیاء صاحب نے جامعہ کالج کے پرنسپل کے عہدے کے لیے درخواست دی جو منظور کرلی گئی۔

۱۰۔ ۶/جولائی ۱۹۷۶ء کو ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے اپنے مراسلے میں شیخ الجامعہ صاحب کو لکھا کہ: ''میں نے اپنی انتظامی ذمہ داریوں کے باوجود اپنی مجوزہ کتاب: مسلم ایجوکیشنل سسٹم ان انڈیا (بزبان انگریزی) کا مواد جمع کرلیا ہے۔ مجھے محض لکھنا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کام کے لیے مجھے سب بی ٹیکل (Sabbitical) رخصت منظور کی جائے۔ حسب قاعدہ منظور کی گئی''۔ (موصوف کی مطبوعہ کتابوں میں یا ان کے مسودات میں اس کتاب کا کوئی ذکر نہیں ہے، اعظمی)

۱۱۔ یکم جولائی ۱۹۸۵ء کو فاروقی صاحب ریٹائر ہوگئے۔ مگر ری امپلائمنٹ کے تحت تین سال کی مدت ملازمت میں مزید اضافہ ہوا۔

۱۲۔ ۲۷/ستمبر ۱۹۸۸ء کو میں نے اپنی آنکھوں کی بینائی کی کمزوری اور موتیابند کی وجہ سے آنکھوں کے آپریشن کے سلسلے میں آپ سے گفتگو کی تھی اور یہ عرض کیا تھا کہ مجھے یکم نومبر ۱۹۸۸ء سے ذاکر انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی اعزازی ڈائرکٹری اور ماہنامہ جامعہ۔ اسلام اور عصر جدید اور اسلام اینڈ دی موڈرن ایج کی ایڈیٹری کی خدمت سے سبکدوش فرمایا جائے۔ آپ نے میری معذوری کے پیش نظر میری اس تجویز سے اتفاق فرمایا تھا۔ شیخ الجامعہ صاحب نے موصوف کی جمع شدہ رخصت استحقاتی ۲۸ یوم کے ساتھ موصوف کو سبکدوش فرمایا۔

۱۳۔ مرحوم کی چھوٹی موٹی کتابوں کی تعداد ویسے تو بہت سی ہیں مگر ان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ مضمون کی ہے۔ اردو میں ان کی اہم کتابیں صرف دو ہیں۔ پہلی شہید جستجو۔ ڈاکٹر ذاکر حسین جو حجم اور معیار دونوں لحاظ سے ان چند کتابوں میں سے ہے جو آزادی کے بعد کی مطبوعات میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ مطبوعہ اگست ۱۹۸۸ء۔ حجم ۶۰۷ صفحات۔ اس کو لکھ کر مرحوم نے اپنی مطبوعات کی کمی کی تلافی کردی۔ دوسری مولانا ابوالکلام آزاد۔ فکر ونظر کی چند جہتیں۔ یہ مختلف مطبوعہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ مطبوعہ: دسمبر ۱۹۹۴ء۔ حجم ۱۵۵ صفحات۔ انگریزی میں میری معلومات کے مطابق مرحوم کی دو کتابیں ہیں، پہلی: ''دی دیوبند اسکول اینڈ دی ڈیمانڈ فار پاکستان''۔ مطبوعہ: ۱۹۶۳ء۔ کتابی سائز پر حجم صرف ۱۴۵ صفحات۔ دوسری حضرت نظام الدین اولیاء کے مشہور ملفوظات: فوائد الفواد کا انگریزی ترجمہ جسے موصوف نے اپنے ریٹائرمنٹ کے بعد ترجمہ کیا اور شائع کروایا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی سوانح حیات پر انگریزی میں ایک کتاب اپنی وفات سے پہلے موصوف نے مکمل کرلی تھی۔ جو ان کے ارشاد کے مطابق اس وقت ناشر کے پاس ہے جو امید ہے کہ انشاء اللہ جلد چھپ جائے گی۔ چونکہ مولانا ابوالکلام آزاد ہم دونوں

کے مشترک موضوع ہیں اس لیے وہ اکثر مجھ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ ان کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ مولانائے مرحوم پر اب تک برصغیر ہندوپاک میں جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں یہ کتاب ان میں سب سے بہتر ہوگی۔

اولاد کے لحاظ سے بھی مرحوم بڑے خوش قسمت تھے۔ کل چار اولاد ہیں۔ دو لڑکے اور دو لڑکیاں۔ خدا کے فضل سے سب کی سب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ ڈاکٹر عمادالحسن آزاد فاروقی، جامعہ اسلامک اسٹڈیز کے پروفیسر ڈاکٹر حسین انسٹی ٹیوٹ کے اعزازی ڈائرکٹر اور ماہنامہ جامعہ کے علاوہ ان تمام رسائل کے مدیر جن کے ان کے والد مرحوم تھے۔

۲۔ ڈاکٹر علاء الحسن آباد، سائنٹسٹ سنٹرانسٹی ٹیوٹ آف میڈیسن اینڈ اسٹمیک پلانٹ، لکھنؤ۔

۳۔ ڈاکٹر مسز عطیہ روحی، بی۔ یو۔ ایم۔ ایس علیگ۔ مقیم چاند پور (یوپی)۔

۴۔ ڈاکٹر مسز عارفہ عرفی، علیگ۔ گولڈ میڈلسٹ۔ مقیم فیض آباد (یوپی)۔

(دسمبر ۱۹۹۶ء)

تصحیح: دسمبر ۱۹۹۶ء کے معارف میں پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی مرحوم سے متعلق عبدالطیف اعظمی صاحب کے مضمون میں بعض تسامحات جگہ پاگئے ہیں۔

۱۔ ضیاء صاحب نے ۱۹۴۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم، اے نہیں بی اے کیا تھا۔ ایم، اے انہوں نے ۱۹۵۰ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے کیا اور ڈپلومیسی اور بین الاقوامی سیاسیات وہیں ان کے مضامین تھے۔

۲۔ جب جامعہ ملیہ اسلامیہ میں عبدالغفار خاں چیئر اور ذاکر حسین چیئر قائم ہوئیں تو ضیاء صاحب کا تقرر ذاکر حسین چیئر پر ہوا اور وہ دو سال اس پر فائز رہے۔ عبدالغفار خاں چیئر پر محترمہ قرۃ العین حیدر کا تقرر ہوا تھا۔

۳۔ ضیاء صاحب نے انگریزی میں مولانا ابوالکلام آزاد کی جو سوانح لکھی ہے اور اس وقت زیر اشاعت ہے وہ مکمل نہیں ہے بلکہ پہلی جلد ہے جو مولانا کی ۱۹۴۰ء تک زندگی کا احاطہ کرتی ہے۔ دوسری جلد لکھنے سے قبل افسوس ہے کہ ضیاء صاحب کی وفات ہوگئی۔

نیازمند: ریاض الرحمٰن خاں شروانی (جنوری ۱۹۹۷ء)

لعل، رام

جناب رام لعل

اردو دنیا میں اس وقت جناب رام لعل کا ماتم بپا ہے، وہ اردو کے اچھے اہل قلم اور ممتاز افسانہ نگار تھے، ان کا آبائی وطن مغربی پنجاب میں میانوی تھا، لاہور میں تعلیم ہوئی اور یہیں سے ان کی ادبی وتحریری زندگی کا آغاز ہوا۔ تقسیم ہند کے بعد ہندوستان آئے اور ریلوے میں ملازم ہوئے، کچھ عرصہ دہلی میں گزرا پھر لکھنؤ آئے اور اندرانگر میں مستقل بودوباش اختیار کرلی۔ وہ لکھنؤ کی ہر ادبی وتہذیبی سرگرمی کا جز ہوگئے تھے۔ افسانہ نگاری ان کا خاص میدان تھا، انہوں نے پاکستان اور بعض مغربی ملکوں کا سفر بھی کیا جن کے سفرنامے بھی لکھے۔ ''زرد پتوں کی بہار'' اور ''خواب خواب سفر'' اردو کے مقبول سفرنامے سمجھے جاتے ہیں۔ رام لعل صاحب کو ادبی خدمات کے صلے میں قومی سطح کے متعدد اعزاز حاصل ہوئے۔ پاکستان سے ملنے والے ایوارڈ کی رقم پاکستانیوں کو نذر کردی۔ وہ قرطاس وقلم سے ہی سروکار نہیں رکھتے تھے بلکہ بڑے عملی شخص بھی تھے۔ ان ہی کی دعوت پر لکھنؤ میں غیر مسلم اردو مصنفین کی عظیم الشان کانفرنس ہوئی۔ کل ہند اردو رابطہ کمیٹی کا قیام ان کی جدوجہد کا نتیجہ تھا، جس کے وہی صدر تھے، اس کے لئے انہوں نے پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کے ساتھ پورے صوبے کا دورہ کیا اور اردو کو دوسری زبان بنانے کی کامیاب مہم چلائی۔ اردو اکادمی اترپردیش کے وائس چیرمین اور فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے چیرمین بھی رہے، رام لعل جی اردو کی ہر مہم میں شریک رہتے اور اسے قوت پہنچاتے۔ اردو کے ایسے محسن کی موت اس کا بہت بڑا سانحہ ہے۔

(''ض''، نومبر ۱۹۹۶ء)

ابوریحان

ابوریحان

قارئین معارف نے ۱۲؍نومبر کو ہونے والے بھیانک ہوائی جہاز حادثے کی خبر اخباروں میں پڑھی ہوگی، اس حادثہ میں راقم کے خویش ابوریحان بھی جاں بحق ہوگئے جو ایک صالح اور صوم وصلوٰۃ کے پابند نوجوان اور مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ صاحب تدبر قرآن کے پوتے تھے۔ ہزار ضبط کے باوجود میرا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا اور اپنے ذاتی حادثہ کی اطلاع دینے کے لئے مجبور ہونا پڑا، مرحوم کی جسمانی یادگار تین بچیاں ہیں جو ابھی دس برس کی بھی نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے، معصوم بچیوں پر رحم فرمائے اور ان کے اور حادثہ میں ہلاک ہونے والے سب ہی لوگوں کے غم زدہ اعزہ کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین!

(''ض''، نومبر ۱۹۹۶ء)

عباسی، محمد جلیل، قاضی

قاضی محمد جلیل عباسی

افسوس ہے گزشتہ مہینے میں دو دنوں کے وقفے سے ملک وملت اور علم ودین کے

دو خادم ہم سے جدا ہوئے، جناب قاضی محمد جلیل عباسی نے طویل علالت کے بعد ۷/ نومبر کو لکھنؤ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ وہ مشہور قومی و ملی کارکن، اردو تحریک کے ممتاز رہنما اور دینی تعلیمی کونسل کے بانی قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم کے چھوٹے بھائی تھے۔ دونوں بھائیوں نے اپنے وطن بستی (سدھارت نگر) کی ترقی و خوش حالی کے لئے گوناگوں مفید کام کئے، قاضی جلیل عباسی بھی اپنے بڑے بھائی کی طرح فرقہ ورانہ سیاست سے دور اور کانگریس سے وابستہ رہے، ان کی زندگی قومی خدمت کے لئے وقف تھی۔ ایک زمانے میں ریاستی وزیر اور پھر پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے۔ شرافت، ہم دردی، بے لوث خدمت کے ساتھ ان کا تعلق دین و مذہب سے بھی ہمیشہ رہا، اللہ تعالیٰ قوم وملت کے اس خادم کی مغفرت فرمائے، آمین۔ (''ض''، دسمبر ۱۹۹۶ء)

محی الدین، سید غلام

سید غلام محی الدین

دوسرا حادثہ جناب سید غلام محی الدین کی وفات کا ہے، جو بڑے خاموش، متین، متواضع اور ذی علم شخص تھے۔ مولانا آزاد میموریل اکیڈمی لکھنؤ کے روح رواں اور اس کے انگریزی جرنل کے ایڈیٹر تھے، وہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ کے بھی نہایت سرگرم رکن اور انگریزی کے اچھے اہل قلم تھے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ سے بڑا مخلصانہ تعلق رکھتے تھے، ان کے دینی ودعوتی کاموں میں ان کے معاون بھی تھے، ان کی متعدد کتابوں اور مضامین کا انگریزی ترجمہ کیا، مولانا ان کی خاموش خدمت اور علمی صلاحیت کے معترف تھے، عرصہ سے تنفس کا مرض لاحق ہوگیا تھا۔ بالآخر ۹/نومبر کو وقت موعود آگیا، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔ (''ض''، دسمبر ۱۹۹۶ء)

غزنوی، امجد علی

امجد علی غزنوی

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینے میں ہمارے ضلع اور شہر کے مشہور قومی کارکن، کامیاب وکیل اور اچھے شاعر جناب امجد علی غزنوی کا انتقال ہوگیا۔ انھیں اقبال سہیل اور مرزا احسان احمد سے مشورہ سخن کا شرف حاصل تھا۔ ان کے گھر پر اکثر نشستیں ہوتی تھیں اور انھوں نے بعض بڑے مشاعرے بھی کرائے۔ ان کا مجموعہ کلام ''صہبائے خودی'' بھی زیر کتابت تھا، تعلیمی کاموں سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ اپنے وطن محمد پور میں ایک دینی مدرسہ اور انٹر کالج ان کی یادگار ہے۔ شبلی کالج کی مجلس انتظامیہ کے ممبر اور ایک زمانے میں سینئر نائب صدر تھے۔ دارالمصنفین سے بھی تعلق تھا، یہاں برابر آتے تھے۔ مولانا مسعود علی ندوی کی سفارش پر کانگریس نے ۱۹۶۲ء میں انھیں ٹکٹ دیا تو صوبائی اسمبلی کے ممبر ہوئے۔ مگر اب سیاست کے گرے ہوئے معیار اور خود کانگریس کے رویے سے خوش نہیں رہتے تھے۔ بڑے باغ و بہار شخص تھے۔ دوسروں کی خدمت اور مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کر کے خوش ہوتے تھے۔ قدرت نے انھیں دردمند دل اور بے چین طبیعت بخشی تھی۔ خود کہتے ہیں ؎

اک دل درد آشنا و اک نگاہِ حق نگر
اور کیا اس کے سوا امجدؔ سے دیوانے میں ہے

(''ض''، جنوری ۱۹۹۷ء)

سندیلوی، شجاعت علی، ڈاکٹر

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

دسمبر کے آخری عشرے میں اردو کے ایک بڑے عاشق و مجاہد، اچھے استاد اور صاحب قلم ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی چل بسے۔ وہ ۱۹۱۶ء میں اودھ کے مشہور قصبہ سندیلہ کے ایک علمی خانوادے میں پیدا ہوئے، ان کے والد مولوی عنایت علی صدیقی بھی ذی علم شخص تھے۔

شجاعت صاحب کا اصل مشغلہ درس و تدریس تھا۔ ممتاز ڈگری کالج اور لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو کی تدریسی خدمات دے کر سبکدوش ہوئے تو اپنے گھر پر اور اردو اکاومی میں طلبہ کو اردو پڑھاتے رہے۔

انہوں نے ''حالی بحیثیت شاعر'' کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی، ان کا یہ مقالہ کتابی صورت میں چھپ کر مقبول ہو چکا ہے جو حالی پر مستند اور معیاری کام ہے، اس کے علاوہ بھی متعدد ادبی، تنقیدی اور تحقیقی کتابیں یادگار چھوڑیں۔ اردو اور ہندی کی بعض نصابی کتابیں بھی ترتیب دیں۔ وہ اردو کی مختلف تنظیموں سے وابستہ تھے۔ انجمن ترقی اردو اور اتر پردیش انجمن اساتذہ اردو کے سرگرم ممبر تھے۔ ادارہ فروغ اردو سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ اس کے ماہانہ رسالہ فروغ اردو کے خاص نمبروں کی ترتیب و تدوین میں ان کا بھی حصہ تھا۔

مرحوم اودھ کی روایتی شرافت، وضع داری، تواضع اور اخلاق کا نمونہ اور بڑی پاکیزہ اور دلکش شخصیت کے حامل تھے، راقم کو ان سے دو ایک بار ہی ملنے کا اتفاق ہوا مگر ان کے خلوص، انکسار، شرافت اور شائستگی کا نقش اب تک دل میں بیٹھا ہوا ہے۔

اردو کے اس بحرانی دور میں اس کے ایسے مخلص اور سراپا عمل خدمت گزار کا اٹھ جانا بڑا حادثہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے پس ماندگان خصوصاً چھوٹے بھائی شفاعت علی صدیقی صاحب کو صبر وشکیب عطا فرمائے۔ یہ سطریں تحریر کی جا چکی تھیں کہ شفاعت صاحب پر بھی شدید قلبی دورہ کی خبر ملی، اللہ تعالیٰ انہیں صحت یاب

کرے، آمین۔ (''ض''، جنوری ۱۹۹۷ء)

اختر، وحید، ڈاکٹر

ڈاکٹر وحید اختر

افسوس ہے مشہور شاعر و نقاد ڈاکٹر وحید اختر بھی وفات پاگئے، ان کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم اورنگ آباد میں ہوئی۔ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے فلسفہ میں ایم۔اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آئے اور پروفیسر، صدر شعبہ فلسفہ اور ڈین ہوئے۔

خواجہ میر درد پر بہت کم کام ہوا ہے، ان کی کتاب ''خواجہ میر درد۔ تصوف اور شاعری'' سے اس کمی کی تلافی ہوگئی جس کی علمی و ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی۔ فلسفہ، ادبی تنقید اور غالب وغیرہ پر انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ قدر و قیمت کا حامل اور ان کے اچھے ادبی و تنقیدی ذوق کا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر وحید اختر کے متعدد شعری مجموعے بھی شایع ہوئے ہیں، انہیں نظم و غزل دونوں پر قدرت تھی۔ ان کی شاعری مسائل عصر کی ترجمانی ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی بشری لغزشوں سے درگزر فرمائے اور ان کے ساتھ رحم و مغفرت کا معاملہ فرمائے۔ (''ض''، جنوری ۱۹۹۷ء)

ابوغدہ، عبدالفتاح، شیخ

شیخ عبدالفتاح ابوغدہ

افسوس ہے کہ گزشتہ ماہ مشہور فاضل شیخ عبدالفتاح ابوغدہ ریاض میں انتقال فرماگئے، ان کی تدفین مدینہ منورہ کے معروف قبرستان جنت البقیع میں ہوئی، شیخ کا وطن شام کا مشہور شہر حلب تھا، ابتدائی تعلیم شام میں اور اعلیٰ تعلیم جامعہ ازہر مصر میں پائی۔ ایک عرصہ تک شام ہی میں درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، ۱۹۶۴ء میں محمد بن سعود یونیورسٹی ریاض میں پروفیسر مقرر ہوئے تصنیف و تالیف سے مدۃ العمر سروکار رہا، حدیث و رجال پر انکی بڑی وسیع اور گہری نظر تھی، فقہ، تاریخ و ادب سے بھی دلچسپی تھی، مولانا عبدالحئی فرنگی محلی سے خاص شغف تھا، ان کی متعدد کتابیں ایڈٹ کیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کے علمی تبحر اور وسعت نظر کے بڑے معترف تھے، ممتاز عالم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے ان کے مخلصانہ روابط تھے جن کی دعوت پر وہ کئی بار دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ تشریف لائے اور اس کے اور ہندوستان کے دوسرے کتب خانوں سے استفادہ کیا، ان کے تلامذہ کا حلقہ وسیع تھا، جن میں ہندوستانی فضلا بھی شامل ہیں، شیخ ابوغدہ کی وفات بڑا علمی سانحہ ہے، اللہ تعالیٰ دین و علم کے اس خادم کی مغفرت فرمائے۔ (''ض''۔ مارچ ۱۹۹۷ء)

ادہمی، عثمان، پروفیسر

پروفیسر عثمان ادہمی

یہ خبر بڑے رنج و غم کے ساتھ سنی جائے گی کہ ۱۵/ مارچ کو دہلی میں پروفیسر عثمان ادہمی کا انتقال ہوگیا ان کا آبائی وطن بستی تھا مگر انہوں نے علی گڑھ میں اپنا مکان تعمیر کرالیا تھا، وہ مسلم یونیورسٹی میں حیاتیات کے پروفیسر تھے۔ ان کی علمی اور تنظیمی صلاحیتوں کا اس وقت زیادہ اندازہ ہوا جب وہ سید حامد صاحب کی وائس چانسلری کے زمانے میں پراکٹر تھے اور غالباً انہی کی تحریک اور جناب حکیم عبدالحمید صاحب کی خواہش پر ادہمی صاحب یونیورسٹی سے سبکدوش ہوکر ہمدرد اسٹڈی سرکل کے ڈائریکٹر ہوئے، ان کی اور سید صاحب کی مشترکہ جدوجہد سے اس کوچنگ سنٹر سے گزشتہ چھ برسوں میں ستر (۷۰) آئی۔اے۔ایس منتخب ہوئے جو ایک بڑا کارنامہ ہے، وہ مولانا آزاد میموریل اکادمی کے صدر بھی تھے جو ایک زمانے میں ان کی جدوجہد سے سرگرم رہی، ادہمی صاحب ایک شریف انسان اور قوم و ملت کے خاموش اور مخلص خادم تھے، وہ نام و نمود اور صلہ و ستائش سے ہمیشہ بے پرواہ رہے۔ ان کی ذاتی زندگی بھی صاف اور پاکیزہ تھی۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، متعلقین کو صبر جمیل دے اور ہمدرد اسٹڈی سرکل اور قوم کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین! (''ض''، اپریل ۱۹۹۷ء)

نعمانی، محمد فاروق

محمد فاروق نعمانی

افسوس ہے کہ ۲۶ و ۲۷/ اپریل کی درمیانی شب میں جناب محمد فاروق نعمانی نے الہ آباد میں داعی اجل کو لبیک کہا، وہ مولانا شبلی کے برادرزادہ اور مولوی محمد اسحٰق صاحب وکیل ہائی کورٹ کے صاحبزادے تھے، جو اعظم گڑھ میں مولانا کے علمی و تعلیمی اور خاندانی جائداد اور زمینداری کے کاموں میں ان کے خاص دست و بازو تھے، ان کے انتقال پر مولانا نے ایسا پُر درد مرثیہ لکھا جو اردو کی عزائیہ شاعری میں بے مثال ہے، فاروق صاحب اس وقت کم سن تھے، اس کی طرف مولانا نے اس شعر میں اشارہ کیا ہے۔ ؎

لاڈلے ہیں کہ کسی اور کے بس کے بھی نہیں
اس کے بچے ابھی سات آٹھ برس کے بھی نہیں

فاروق صاحب شبلی کالج کے پرجوش اور سرگرم ممبر تھے، دارالمصنفین سے بھی ان کو گہرا اور جذباتی تعلق تھا، یہاں کی دعوتوں اور مجلسوں میں شریک رہتے، صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے، لاگ لپیٹ ان کو نہیں آتا تھا۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ (''ض''۔ مئی ۱۹۹۷ء)

نعمانی، محمد منظور، مولانا

مولانا محمد منظور نعمانی

گزشتہ مہینے کا معارف اشاعت کے مرحلے میں تھا کہ یہ افسوسناک خبر ملی کہ مولانا محمد منظور نعمانی ۴،۵؍مئی کی درمیانی شب میں انتقال فرماگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس قحط الرجال میں مولانا جیسے حکمت دین سے واقف صاحب فہم وبصیرت اور مدبر عالم، قوم کے دردمند مصلح اور ملت کے ہمدرد وغم گسار کا اٹھ جانا کس قدر المناک سانحہ ہے۔

مولانا ایک عالم ومصنف اور صاحب سلوک وعرفان بزرگ ہی نہ تھے بلکہ زمانے کے نبض شناس، وقت کے تقاضوں اور حالات سے باخبر اور عاقبت بیں بھی تھے جن کا عمل اس پر تھا کہ:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دل گیری

وہ مذہبی، اصلاحی، قومی، ملی، تعلیمی اور اجتماعی جدوجہد کے ہر محاذ پر سرگرم اور متحرک دکھائی دیتے تھے، انہیں مسلمانوں کی موجودہ پستی و زبوں حالی کا پوری طرح احساس بھی تھا اور وہ اس کے ازالے کے لیے نہایت فکر مند بھی رہتے تھے، آزاد ہندوستان میں جن مسائل نے مسلمانان ہند کی زندگی تلخ اور مکدر کررکھی ہے، ان پر شور و غوغا مچانے لچھے دار باتیں اور دھواں دار تقریریں کرنے اور پُر جوش تحریریں لکھنے والے تو بہت سارے لوگ ہیں لیکن ان پر مولانا کی طرح تڑپنے، بے چین ہوجانے، درد و کرب خلش واضطراب میں مبتلا ہونے والے بہت کم لوگ ہیں، وہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے دعا ومناجات میں بھی مصروف رہتے تھے اور ملک کے گوشے گوشے کی خاک بھی چھانتے رہتے تھے، ان کے گریہ شب اور دعاہائے سحر گاہی سے گھبراکر ابلیس بھی یہ کہتا رہا ہوگا کہ ؎

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشک سحرگاہی سے جو ظالم وضو

ایسے بیدار مغز وہوش مند عالم کی وفات مسلمانوں کی بدنصیبی، قوم وملت کا زیاں اور علم ودین کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔

مولانا محمد منظور نعمانی مرادآباد ضلع کے قصبہ سنبھل میں ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ یہیں اردو، فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، دارالعلوم مئو میں بھی درسیات کی تحصیل کی اور آخر کے دوسال دارالعلوم دیوبند میں گزارے۔ اس وقت مولانا انور شاہ کشمیری صدرالمدرسین اور شیخ الحدیث تھے، ان سے اور دوسرے اساتذہ فن سے درس لیا، شاہ صاحب کے تلمذ پر ان کو ہمیشہ فخر رہا اور اپنے تمام اساتذہ میں ان ہی سے سب سے زیادہ محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔ ان سے بیعت بھی ہوئے۔ حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری سے بیعت اس کے بعد ہوئے تھے۔

مولانا نے تعلیم سے فراغت کے بعد چند برس تک بعض عربی مدارس میں تدریس کی خدمت انجام دی، اس زمانے میں بعض داخلی وخارجی فتنوں کا بڑا زور تھا، ان فتنوں سے اسلام کے عقیدہ توحید ورسالت کی بیخ کنی اور شرک وبدعت کے فروغ کے علاوہ علمائے دیوبند کی ذات ومسلک بھی مجروح ہورہا تھا، اس لیے مولانا طالب علمی ہی کے زمانے سے ان کی سرکوبی کی تیاری کرنے لگے تھے اور اب تدریسی ذمہ داریوں کے ساتھ ہی ان کے خلاف محاذ آرائی میں حصہ لینا شروع کیا، چنانچہ ان کی ابتدائی زندگی بعض فرقوں کے مقابلوں اور ان سے مناظروں کے لیے وقف رہی اور اس میں وہ بڑے کامیاب رہے۔

اسی سلسلے میں انہیں اپنے مخالفوں کے نظریات کے ابطال کے لیے ایک علمی و دینی ماہنامہ رسالہ نکالنے کا خیال بھی آیا جو محرم ۱۳۵۳ھ/ ۱۹۳۴ء سے اب تک ان کے انتقال کے بعد بھی الفرقان کے نام سے برابر شایع ہورہا ہے اور وہ ملک کا مشہور علمی، دینی اور اصلاحی رسالہ خیال کیا جاتا ہے۔

مولانا کی یہ جرات وہمت بھی قابل داد ہے کہ انہوں نے شروع میں رسالہ ایسی جگہ سے شایع کیا جو ان کے حریفوں کا خاص مرکز تھی۔ ان کی مہم جو اور حوصلہ پسند طبیعت کو ہمیشہ اپنی سرگرمی عمل کے لیے نئے میدانوں اور خوب سے خوب تر راہوں کی تلاش و جستجو رہتی تھی، عمر کی پختگی اور بعض تجربوں کے بعد جب وہ مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی دینی تحریک سے متوسل ہوگئے تو مسلمانوں کی اصلاح کے اس محدود تصور پر قائع نہیں رہ سکے جس کی بنا پر بعض طبقوں کی اعتقادی وعملی غلطیوں کی بحث وتمحیص اور ان کے افراط وتفریط کی تغلیط وتردید الفرقان کا خاص موضوع بن گیا تھا بلکہ یہی دینی دعوت ان کے دل ودماغ پر چھا گئی اور وہ ان کی زندگی اور ان کے اعمال کا خاص محور اور الفرقان کی اصل دعوت بن گئی۔

الفرقان کے متعدد خاص نمبر بھی شایع ہوئے جو بہت مقبول ہوئے لیکن حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ پر اس کے خاص نمبر بڑی اہمیت ومنفعت کے حامل ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کی ان مایہ ناز ہستیوں اور عظیم داعیوں کے اصلاحی وتجدیدی کارناموں اور ان کی دعوت وتعلیم کو جس بہتر انداز میں ان میں پیش کیا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ اور صاحب الفرقان کا عظیم الشان کارنامہ ہے، اس کے حج نمبر سے حاجیوں کو بڑا فائدہ پہنچا۔

تبلیغی ودعوتی اسفار اور الفرقان کی ادارت کے ساتھ ساتھ مولانا ہمیشہ تصنیف و

تالیف میں بھی مشغول رہتے جس کا انہیں اچھا ذوق، خاص سلیقہ اور خداداد ملکہ تھا، اردو کے بہت اچھے اہل قلم تھے۔ ان کی تحریریں نہایت سلیس، شگفتہ اور رواں ہوتی ہیں۔ جن کی زبان آسان اور بڑی عام فہم ہوتی اور پیش کرنے کا انداز اتنا موثر اور دلنشیں ہوتا تھا کہ عام آدمی کو بھی ان کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی، وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے تھے اس پر ان کی مکمل گرفت ہوتی تھی اس لیے اپنے مدعا و مقصود کو کسی اینچ پیچ کے بغیر اچھی طرح واضح کر دیتے تھے۔

مولانا کی چھوٹی بڑی بے شمار تصنیفات ہیں اور وہ سب اس قدر مقبول ہوئیں کہ ان کے درجنوں ایڈیشن بھی نکلے اور ملک کی مختلف زبانوں کے علاوہ انگریزی اور عربی وغیرہ میں ترجمے بھی ہوئے، ان کی جن کتابوں کا فیض بہت عام ہوا ان کا تذکرہ کر دینا مناسب ہوگا۔

اسلام کیا ہے؟ یہ کتاب ۱۹۴۷ء کے بعد کے خاص حالات میں لکھی گئی ہے، اس میں ایک عام مسلمان کے لیے مکمل دین کو آسان اور موثر دعوتی زبان میں پیش کیا ہے تاکہ یہ رسالہ مسلمانوں کے لیے رجوع الی اللہ کا ذریعہ بنے اور غیر مسلموں میں بھی اسلام کی اصل صورت واضح ہوجائے۔

دین وشریعت: اس کا موضوع بھی وہی ہے مگر یہ کسی قدر اونچی سطح کے لیے لکھی گئی ہے۔

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟ اس میں قرآن مجید کی عمومی دعوت کا خلاصہ بڑے موثر اور دل نشین انداز اور آسان و عام فہم زبان میں مرتب کیا گیا ہے۔

آپ حج کیسے کریں؟ اس کو لکھنے کا دو خاص مقصد تھا، ایک تو یہ کہ معمولی خواندہ آدمی کو بھی حج کے مناسک و ارکان ادا کرنے میں سہولت ہو، دوسرا مقصد یہ تھا کہ حج کے اعمال کو ادا کرنے کے وقت جن دینی جذبات سے حاجی کو سرشار ہونا چاہیے ان کی تحریک کا سامان کیا جائے۔ ان مقاصد کے لحاظ سے یہ کتاب بہت کامیاب ہوئی۔

آسان حج: اس میں وہی مضمون مزید مختصر اور آسان کر کے لکھا گیا ہے، راقم کو حج بیت اللہ کے سلسلے میں مولانا کے ان رسالوں سے بڑا فائدہ پہنچا۔

کلمہ طیبہ کی حقیقت: اس میں کلمہ کی حقیقت و مفہوم بہت سادہ اور آسان زبان اور عام فہم انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

نماز کی حقیقت: اس میں آسان زبان اور دل نشیں انداز میں نماز کی روح بتائی گئی ہے، یہ رسالہ بھی بہت نفع بخش ہے۔

معارف الحدیث: یہ مولانا کی سب سے اہم اور مفید کتاب ہے جو اردو کے علمی و حدیثی ذخیرہ میں ایک بہت قیمتی اضافہ ہے، اس کو بڑی شہرت و قبولیت نصیب ہوئی، اس کی سات جلدیں خود مولانا نے مرتب کر کے شایع کی ہیں۔ آٹھویں جلد ان کے برادر زادہ مولوی محمد ذکریا استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو مرتب کر رہے ہیں، یہ کتاب دور حاضر کے خاص حالات اور ایک عام پڑھے لکھے شخص کی ضرورت کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہے، یہ دراصل حدیث نبوی کے ضخیم دفتر سے ایک انتخاب ہے جو ترجمے کے ساتھ ایسی سادہ اور مختصر تشریح پر مبنی ہے جس سے حدیث کا اصل مغز و مدعا اچھی طرح ذہن نشین ہوگیا ہے اور یہ کتاب انسان کی عملی و روحانی ترقی و اصلاح کا ذریعہ بھی بن گئی ہے، گو اس میں فنی مسائل اور مہمات امور سے براہ راست تعرض نہیں کیا گیا ہے، تاہم اس سے احادیث کی بہت سی علمی و فنی گرہیں صاف طور پر حل ہوگئی ہیں، حدیثوں کے فقہی پہلو اور فقہا کے اختلافات کا تذکرہ بقدر ضرورت اس طرح کیا گیا ہے کہ افتراق باہمی کے رجحان کی ہمت شکنی ہو۔ اس لحاظ سے یہ کتاب اہل علم اور طلبہ حدیث کے لیے بھی بہت کارآمد ہے۔ ان کتابوں سے مسلمانوں کو بڑی رہنمائی اور تقویت ملی اور ان کی حیثیت دراصل صدقہ جاریہ کی ہے۔

مولانا کا شمار اس عہد کے ممتاز صف اول کے علماء میں ہوتا تھا، دینی علوم میں ان کو بڑا رسوخ اور پختگی حاصل تھی۔ تفسیر، فقہ، کلام اور کتب معقولات پر ان کی وسیع اور گہری نظر تھی۔ لیکن حدیث سے ان کو زیادہ شغف اور مناسبت تھی جس کی تحصیل ہندوستان کے مشہور و نامور اور نابغہ روزگار محدث مولانا محمد انور شاہ کشمیری سے کی تھی اور کئی برس تک خود بھی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں کتب حدیث کا درس دیا، ان کی کتاب معارف الحدیث بھی حدیث میں ان کی ژرف نگاہی کا ثبوت ہے۔

کم لوگوں کو تحریر و تقریر دونوں پر قدرت ہوتی ہے، مگر مولانا کو تقریر کی بھی اچھی مشق تھی، مناظروں میں ان کی کامیابی میں اس کو بھی بڑا دخل تھا، تبلیغی جماعت کے اجتماعات اور دوسری ملی و دینی تحریکوں میں بھی وہ اپنی تقریروں کی اثر انگیزی اور دل پذیری کی بنا پر مدعو کیے جاتے تھے، آخر میں وہ مختصر تقریریں کرنے کے عادی ہوگئے تھے، راقم کو ایک مرتبہ انجمن تعلیمات دین کے جلسہ میں ان کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا جو مختصر ہونے کے باوجود واضح، مدلل اور دل نشین تھی۔

مولانا قوم، ملک اور ملت کے مسائل سے کبھی بے تعلق اور بیگانہ نہیں رہے تقسیم کے بعد مسلمانوں کو جس بحران اور پیچیدگی کا سامنا کرنا اور آئے دن جن نت نئے مسائل سے دوچار ہونا پڑا ان کے حل کے لیے جو مخلصانہ کوششیں اور تدبیریں ہوئیں، ان میں ان کا بھی بڑا عمل دخل رہا۔ ۵۹ء میں دینی تعلیمی کونسل اترپردیش کا قیام عمل میں آیا تو جو سرکردہ علماء اس میں پیش پیش رہے اور اس کے لیے مختلف جگہوں کے انہوں نے دورے کیے ان میں یہ بھی تھے اور آخر تک اس سے ان کا گہرا تعلق رہا۔

اس زمانے میں انہوں نے اپنے بعض رفقاء کے تعاون سے ایک ہفت روزہ اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا تا کہ آئے دن کے فسادات کے نتیجے میں مسلمانوں میں جو مایوسی انتشار، پست ہمتی اور احساس کمتری پیدا ہورہا تھا اسے ختم کر کے ان کی صحیح رہنمائی کی جائے ہفت روزہ ندائے ملت کا اجرا اسی احساس کا نتیجہ تھا جس نے بڑی حد تک مسلمانوں کو قوت، جرأت اور ہمت عطا کی، اب بھی یہ اخبار ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی کی سرکردگی میں نکل رہا ہے، اور مفید خدمت انجام دے رہا ہے۔

۱۹۶۴ء میں جمشید پور اور راوڑ کیلا وغیرہ کے فسادات نے ملت کے دردمندوں کو گہری تشویش اور سخت اضطراب میں مبتلا کردیا، اس کے نتیجہ میں ڈاکٹر سید محمود کی رہنمائی میں مسلم مجلس مشاورت قائم ہوئی۔ اس کے قیام میں مولانا منظور صاحب کا بھی مکمل تعاون رہا اس کے وفود میں شامل ہوکر انہوں نے بھی ملک کے اکثر مقامات کا دورہ کیا جس سے بڑی اچھی فضا بنی مگر بدقسمتی سے یہ اتحاد بہت عرصہ تک برقرار نہ رہ سکا۔ اس کی وجہ سے ڈاکٹر سید محمود بہت ملول و متفکر ہوئے، ایک مرتبہ انہوں نے اس صورت حال کا درد وحسرت کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے بعض حضرات کے رویے کی شکایت کی مگر مولانا منظور نعمانی اور مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی کی سیاسی بصیرت، اصابت رائے اور معاملہ فہمی کا اعتراف کیا۔

۱۹۷۲ء میں مسلم پرسنل لابورڈ کی تشکیل میں بھی وہ شریک رہے اور اس کی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا اور اپنی تحریروں اور الفرقان کے ذریعہ اس تحریک میں جان و قوت پیدا کی۔

مولانا حالاتِ حاضرہ اور گرد و پیش کے واقعات سے پوری طرح باخبر رہتے، اخباروں کا مطالعہ پابندی سے کرتے، سیاسی اشخاص اور ملی رہنماؤں کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی ان کے یہاں رہتا، وہ مسلمانوں کے مسائل کی ترجمانی کے لیے انگریزی اخبار کی اشاعت ضروری سمجھتے تھے اور اس کے لیے اپنی جیسی کوشش بھی کی مگر ابھی تک یہ بیل منڈھے نہیں چڑھی۔

مولانا ہندوستان کے دو سب سے بڑے اور بین الاقوامی تعلیمی اداروں دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنو کے رکن رکین تھے اور بعض نازک موقعوں پر ان کی خداداد ذہانت وصلاحیت اور بروقت قوت فیصلہ سے ان تعلیم گاہوں کے الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے میں بڑی مدد ملی۔ وہ رابطہ عالم اسلامی کے بھی ممبر تھے اور جب تک ان کی صحت اچھی رہی اس کے جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے اور اسی بہانے حج وعمرہ اور زیارت حرمین کا ثواب بھی لوٹتے رہے۔

دارالمصنفین سے بھی مولانا کا تعلق تھا، مولانا سید سلیمان ندوی سے بعض مسائل میں استفسارات کرتے، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم سے بھی ان کا مخلصانہ ربط وتعلق تھا، اس کے موجودہ صدر محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے تو وہ ''رفیق مکرم'' ہی تھے، الفرقان نے شیخ الحدیث مولانا محمد ذکریا کاندھلوی پر اپنا خاص نمبر شایع کرنے کا اعلان کیا تو اس خاکسار نے بھی حضرت سے عقیدت کی بنا پر ایک مضمون اس میں اشاعت کے لیے بھیجا جس کی وصولی کی رسید فوراً دیتے ہوئے مولانا نعمانی نے مضمون کی تحسین فرمائی جو میرے لیے مایہ فخر ہے۔

مولانا نے بڑی مصروف ومشغول زندگی گزاری، وہ مدۃ العمر دین وملت کی خدمت وسربلندی اور مسلمانانِ ہند کی اصلاح ورہنمائی کا فرض انجام دیتے رہے، مولانا زہد وتقویٰ حسنِ سیرت اور خوش خلقی سے متصف تھے، طبیعت میں دردمندی اور قلب میں رقت تھی، سریع الحس تھے اس لیے واقعات وحالات سے بہت جلد متاثر ہوجاتے۔ دینی مسائل میں ان کا ذہن کھلا ہوا تھا، جزئیات میں متوسع تھے، شرعی امور میں تشدد و تصلب کے بجائے سہولت تخفیف وعافیت پیدا کرنے کو بہتر سمجھتے تھے۔

اس دور کے اکثر اکابر علماء ومشائخ سے ان کے تعلقات تھے اور وہ بالالتزام ان کے یہاں حاضری دیتے تھے۔ ان کی سبق آموز زندگی کے واقعات وحالات سے خود بھی فائدہ اٹھاتے اور انہیں قلم بند کرکے دوسروں کو بھی ان سے مستفید ہونے کا موقع دیتے۔ اس ضمن میں ان کی یہ خوبی قابل ذکر ہے کہ جن اکابر کی وہ بڑی عزت اور خاص احترام کرتے تھے ان کی کمزوریوں اور کمیوں پر بھی ان کی نظر پڑتی تھی اور کسی نہ کسی پیرایے میں بے جھجک وہ اس کا اظہار بھی کردیتے تھے، اس طرح یا تو وہ بزرگ اپنی کمی وکوتاہی کی اصلاح وتلافی فرمالیتے یا اگر خود مولانا کو کسی وجہ سے غلط فہمی ہوگئی ہوتی تو وہ دور ہوجاتی اور ان کی تسلی وتشفی کا سامان ہوجاتا۔

مولانا کی سیرت کا یہ پہلو بھی قابل ذکر ہے کہ وہ جس کام کو ٹھیک اور بہتر سمجھتے تھے اس میں تن من دھن سے لگ جاتے لیکن جیسے ہی اس کی غلطی ان پر منکشف ہوتی وہ اس سے فوراً اور بے تکلف کنارہ کش ہوجاتے، اس میں نہ انہیں اپنی سبکی کی پروا ہوتی اور نہ اپنے قدیم رفیقوں اور دوستوں کی خفگی کا خیال ہوتا۔

پچھلے دس برسوں سے وہ علیل تھے، بالآخر وقت موعود آگیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر وشکیب عطا کرے، آمین۔ (''ض''، جون ۱۹۹۷ء)

الحسینی، محمد زاہد، مولانا قاضی

مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی

(حافظ نثار احمد الحسینی)

یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی گئی ہے کہ ۶ر محرم الحرام ۱۴۱۸ھ مطابق ۱۴ر مئی ۱۹۹۷ء کو ممتاز عالم دین ومصنف مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی رحلت فرماگئے۔

قاضی صاحب کا خاندان علوم دینیہ کی خدمت میں مشہور ہے۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ حضرت باز گل مرحوم حضرت سید گیسو درازؒ کی اولاد سے تھے اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے قافلۂ جہاد میں شامل تھے۔ بالاکوٹ کے سقوط کے بعد ہزارہ سے نقل مکانی کر کے پنجاب کے مشہور علمی خطہ علاقہ چھچھ کے موضع شمس آباد تشریف لے آئے۔ قاضی صاحبؒ کے دادا قاضی نادر دینؒ اپنے وقت میں پنجابی کے مشہور شاعر اور مصلح دین تھے۔ ان کے والد مولانا مفتی قاضی غلام جیلانی مرحوم مناظر اور صاحب قلم عالمِ دین تھے۔ تقریباً پچاس اصلاحی کتابیں لکھیں۔ سلسلۂ نقشبندیہ میں خانقاہ موسیٰ زئی شریفؒ کے سجادہ نشین حضرت مولانا سراج الدینؒ سے مجاز طریقت تھے۔ متنبّی قادیان مرزا قادیانی کا مقابلہ تحریر وتقریر اور مناظرہ سے کیا۔ "تیغ غلام جیلانی برگردن قادیانی" آپ کی مشہور تصنیف ہے۔ ۱۹۲۸ء میں اپنے آبائی گاؤں شمس آباد میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔

مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی ۶ ربیع الاول ۱۳۳۱ھ مطابق یکم فروری ۱۹۱۳ء بروز ہفتہ پیدا ہوئے۔ قرآن پاک اور ابتدائی عربی فارسی تعلیم گھر ہی میں حاصل کی ۱۹۲۸ء میں شمس آباد سے مڈل پاس کیا۔ ۱۹۲۸ء میں آپ منیة المصلی اور ہدایت النحو وغیرہ ابتدائی کتابیں پڑھ رہے تھے کہ والد گرامی کا سایہ سر سے اٹھ گیا لیکن داغ یتیمی آپ کے شوق اور حصولِ علم کی ہمت کو کم نہ کرسکا۔ علاقہ چھچھ میں اس وقت شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور مولانا عبدالحئی لکھنوی کے تلامذہ موجود تھے ان سے تحصیل علم کرنے کے بعد ۱۹۳۰ء میں مظاہر العلوم سہارنپور میں داخلہ لیا اور وہاں کے جید اساتذہ سے استفادہ فرمایا، پھر محدث العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری سے استفادہ کے لیے ڈابھیل تشریف لے گئے، طالب علمی ہی کے زمانے میں فلسفہ کی مشہور کتاب صدرا کی شرح البــــدر الحل الصدر لکھی جس کی تحسین حضرت مدنی نے بھی فرمائی ہے۔

"یہ کتاب خدا کے فضل و کرم اور مولف کی عرق ریزی اور کمالات علمیہ کی وجہ سے مستقل کتاب اور صدرا کی شرح بن گئی ہے، مجھ کو قوی امید ہے کہ اس کتاب سے شائقین علوم عقلیہ کو بہت زیادہ فائدہ پہنچے گا"۔

۱۹۳۲ء میں دارالعلوم دیوبند کے دورہ حدیث شریف میں داخلہ لیا اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی سے بخاری اور ترمذی پڑھی، حضرت مدنی کی اردو تقریر کو آپ دوران سبق ہی عربی میں قلمبند فرماتے رہے۔ مسلم شریف مولانا رسول خان ہزاروی سے، ابوداؤد شریف مولانا میاں اصغر حسین سے، طحاوی شریف مولانا محمد ابراہیم بلیاوی سے، شمائل ترمذی مولانا اعزاز علی سے اور موطا امام محمد مفتی محمد شفیع سے پڑھی۔

آپ کے دور طالب علمی میں ایک مرتبہ مشہور شاعر اور زمیندار کے اڈیٹر مولانا ظفر علی خان دارالعلوم دیوبند تشریف لائے، ان کے اعزاز میں دارالحدیث میں تقریب استقبالیہ منعقد ہوئی۔ اساتذہ اور طلباء نے نظم ونثر میں انہیں خوش آمدید کہا۔ اس موقع پر قاضی صاحب نے اپنی نظم میں مرزا قادیانی کے خلاف اکابر دیوبند کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ع انہی کی ذاتِ اقدس سے بشیر الدین نالاں ہے۔

اس نظم سے متاثر ہوکر مولانا ظفر علی خان نے فی البدیہ دیوبند کی شان میں مشہور نظم کہی جس کا پہلا شعر مندرجہ ذیل ہے:

شاد باد و شاد ذی اے سرزمین دیوبند
ہند میں تونے کیا اسلام کا پرچم بلند

صوفیانہ مسلک: قیام سہارنپور کے زمانہ میں حضرت مدنی سے عقیدت پیدا ہوگئی جو بالآخر حضرت مدنی کے دامنِ فیض سے وابستگی کا سبب بنی،، حضرت قاضی صاحب خود اس کی تفصیل میں فرماتے ہیں:

"حضرت (مدنی) کانگرس یا جمعیت العلماء کی دعوت پر سہارنپور تشریف لاتے اور درگاہ میں تقریر فرماتے۔ اسی وقت سے آئینہ دل میں حضرت کا نقش اسی طرح ثبت ہوگیا کہ آج تک باقی ہے اور انشاء اللہ باقی رہے گا۔ مگر زیادہ قرب دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کے داخلہ پر نصیب ہوا۔ کئی بار (بیعت) کی درخواست کی مگر یہی جواب ملا کہ استخارہ کرلیا جائے۔ ایک رات سید دو عالم ﷺ کی طرف سے بیعت کا حکم ملا۔ وہ پورا خواب لکھ کر ارسال کردیا تو جواب فرمایا کہ ملاقات پر انشاء اللہ بیعت کرلی جائے گی۔ آخر وہ سعادت آفرین گھڑی آ گئی کہ مورخہ ۲۶/شعبان ۵۵ھ، ۱۳/نومبر ۳۲ء بروز جمعرات نماز مغرب کے بعد اسی مسجد میں چند دیگر سعادت مندوں کے ساتھ بیعت کا شرف حاصل ہوگیا"۔

قاضی صاحب کی باطنی ترقیات دیکھ کر حضرت مدنی نے سلسلہ چشتیہ کے اذکار و اشغال کی تلقین کی اجازت عنایت فرمادی۔

۱۹۳۲ء میں جب حضرت مدنی کی زیارت کے لیے دیوبند تشریف لے گئے تو وہاں سے واپسی پر حضرت مدنی نے حضرت لاہوری ؒ کے نام آپ کو دستی رقعہ عنایت فرمایا۔ جس میں آپ کے متعلق بھی ایک جملہ لکھا "علمی اور عملی حالت ماشاء اللہ قابلِ اطمینان ہے"۔ اب حضرت لاہوری کے ہاں بھی آپ کا آنا جانا شروع ہوگیا۔ ۱۹۳۹ء میں جب پہلی مرتبہ حج بیت اللہ کو جارہے تھے تو حضرت لاہوری نے آپ کو اپنے قلمی دستخطوں سے مزین اپنا ترجمہ قرآن پاک عنایت فرمایا یہ محض ایک تحفہ نہ تھا بلکہ حضرت لاہوری نے بقول آپ کے اپنا فیض قرآنی آپ کو منتقل فرمادیا۔ ۱۹۶۱ء میں جب حضرت لاہوری ایبٹ آباد تشریف لائے تو ازخود فرمایا "میں چاہتا ہوں کہ سلسلۂ قادریہ میں آپ کی تکمیل کرادوں"۔ ابتدائی اسباق بھی تلقین فرمائے۔ ۱۵/مئی ۱۹۶۱ء

ایبٹ آباد تشریف آوری پر آپ کو اپنا مجاز فرمایا۔

حضرت لاہوری نے آپ کی تصنیف معارف القرآن کی تقریظ میں لکھا۔ ''محترم المقام حضرت مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی صاحب موجودہ دور کے ان علمائے کرام میں سے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے کتاب و سنت کے سمجھنے کے لیے ایک خصوصی ملکہ عطا فرمایا ہے''۔

تدریسی خدمات: دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہونے کے بعد ۱۹۳۲ء میں اپنے آبائی گاؤں شمس آباد میں ''مدرسہ محمدیہ'' کی بنیاد رکھی جس میں طلبہ دور دور سے آتے تھے۔ یہاں آپ نے بخاری سے لے کر کافیہ تک علوم و فنون کی تمام کتب پڑھائیں، تعلیم و تدریس کے ساتھ علاقہ کی مذہبی ضروریات کا خیال رکھا۔ ۱۹۳۵ء میں کامرہ میں مشہور شیعہ مناظر شبیر احمد فاضل لکھنؤ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق کی صداقت پر مناظرہ کیا اور اسے شکست فاش دی۔ ۱۹۴۱ء میں مولانا اعزاز علی کے فرمانے پر ڈالواں ضلع جہلم تشریف لے گئے اور قادیانیوں کے خلاف سرگرم عمل رہے۔ ۱۹۴۹ء میں اٹک کی جامع مسجد میں خطابت کے فرائض انجام دیے اسی دوران جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک میں بخاری شریف اور ترمذی شریف پڑھائی۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ارشاد پر ۱۹۵۱ء میں اٹک کالج میں عربی اور اسلامیات کے پروفیسر ہوئے اور ۱۹۷۲ء میں ریٹائرڈ ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں مدینہ مسجد کی بنیاد رکھی تھی۔ ریٹائرڈ ہونے کے بعد زندگی کی آخری ساعتوں تک یہیں مدینہ مسجد میں علوم اسلامیہ کی نشر و اشاعت اور تصوف و سلوک کی خدمت اور مخلوق خدا کی رہنمائی فرمائی۔

درس قرآن مجید سے خصوصی شغف: دوسرے علمائے دیوبند کی طرح قاضی صاحب کو بھی قرآن مجید سے شغف تھا اور اس کے مختلف پہلوؤں پر متعدد کتابیں مرتب فرمائیں، درس قرآن مجید معمول بن گیا تھا، اس میں کبھی ناغہ نہ ہوتا، ایبٹ آباد کے قیام میں دن میں تین تین مقامات پر عرصہ تک درس دیتے رہے۔

تنظیمی اور ملی خدمات: گو آپ کا خاص مشغلہ درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور ارشاد و ہدایت تھا تاہم قومی و ملی مسائل سے بھی یک گونہ سروکار رکھتے۔ ۱۹۳۲ء میں جمعیت علمائے اٹک کی بنیاد رکھی۔ جس نے گرانقدر دینی خدمات انجام دیں۔ بعض مذہبی مسائل پر علماء کے اختلاف رائے کی وجہ سے مذہبی انتشار پیدا ہوجاتا تھا۔ اس کے لیے آپ نے مجلس تنقیح فتویٰ قائم کی اور علماء کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کردیا۔

۱۹۴۷ء میں نواب زادہ لیاقت علی خاں کے زیر صدارت ایک اسلامی کانفرنس ہوئی جس میں آپ نے پورا حصہ لیا۔ دوسری دینی و ملی تنظیموں میں بھی حصہ لیا اور مختلف وقتوں میں ہفتہ وار اخبار اور رسالے بھی نکالے۔

تصنیفی خدمات: اللہ تعالیٰ نے آپ کو تحریر و تصنیف کا ملکہ بھی عنایت فرمایا تھا اور آپ کا ذوق بڑا متنوع تھا اس لیے مختلف موضوعات پر درجنوں چھوٹی بڑی کتابیں لکھیں۔

۱۵/اگست ۱۹۸۹ء کو آپ کو دل کا شدید دورہ پڑا دوبارہ پھر پڑا اور ڈاکٹروں کی ممانعت کے باوجود علمی و عملی اشغال کا سلسلہ جاری رکھتے، بالاخر وقت موعود آگیا اور عین تہجد کے وقت دو سوا دو بجے تین مرتبہ اللہ، اللہ، اللہ، فرمایا اور جان جانِ آفرین کے سپرد کردی۔

اولاد: اللہ تعالیٰ نے آپ کو تین بیٹے اور چار بیٹیاں عنایت فرمائیں۔ سب آپ کے حسنِ تربیت سے نیک صالح، متقی پرہیزگار اور حافظ و قاری اور عالم فاضل ہیں۔ بڑے صاحبزادے مولانا قاضی محمد ارشد الحسینی جامعہ اشرفیہ سے فاضل ہیں، منجھلے صاحبزادے مولانا قاضی محمد راشد الحسینی اور چھوٹے صاحبزادے مولانا قاضی محمد ابراہیم ثاقب الحسینی دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے فاضل ہیں۔

تیرہ خوش نصیبوں کو آپ نے اپنا مجاز فرمایا جن کے اسم گرامی درج ذیل ہیں:
۱۔ مولانا صاحبزادہ قاضی محمد ارشد الحسینی اٹک، ۲۔ مولانا ڈاکٹر سید سعید اللہ جان پشاور ۳۔ مولانا قاری محمد سلیمان ٹیکسلا، ۴۔ مولانا محمد زمان بنور، ۵۔ جناب کرنل محمد جمیل کرک کوہاٹ، ۶۔ مولانا مفتی محمد حسین شور کوٹ، ۷۔ حافظ نثار احمد الحسینی حضرو، ۸۔ حاجی عبدالعزیز ایبٹ آباد، ۹۔ صاحبزادہ مولانا قاضی محمد راشد الحسینی اٹک، ۱۰۔ صاحبزادہ مولانا محمد ابراہیم ثاقب الحسینی اٹک، ۱۱۔ مولانا قاری غلام نبی افغانی، ۱۲۔ حافظ عطاء اللہ وہاڑی، ۱۳۔ مولانا قاری محمد ادریس اسلام آباد۔ (جولائی ۱۹۹۷ء)

ل معارف: غالباً مولانا احمد علی لاہوری مفسر قرآن مراد ہیں۔

بخاری، سید محمد فاروق، ڈاکٹرؒ

ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری

مئی کے آخر یا جون کے شروع میں جناب شوکت حسین کینگ مدیر ماہنامہ **الاعتقاد** سری نگر کے ایک مکتوب سے یہ معلوم کر کے بڑا دُکھ اور سخت افسوس ہوا کہ ریاست کشمیر کے مشہور صاحبِ علم و قلم پروفیسر ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری طویل علالت کے بعد ۱۹/ ذی الحجہ ۱۴۱۷ھ/ ۲۷/ اپریل ۱۹۹۷ء کو رحلت فرماگئے، یہ اطلاع خود ہی تاخیر سے ملی تھی اور باوجود کوشش کے جون کے معارف میں ان پر نوٹ شایع کرنے کی گنجائش نہیں نکلی۔

بخاری صاحب کی عمر ابھی زیادہ نہ تھی اور ان سے بڑی توقعات وابستہ تھیں مگر موت کا وقت معین ہے، اس میں تقدیم و تاخیر نہیں ہوتی، فاروق صاحب ۲۷/ جون ۱۹۴۹ء کو پیدا ہوئے تھے، ان کا خاندان علمی، دینی اور روحانی فضیلت کا حامل تھا، ان کے والد بزرگوار مولانا سید محمد قاسم بخاری کو جو ابھی خدا کے فضل سے بقید حیات ہیں

مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ موصوف انجمن تبلیغ الاسلام جموں وکشمیر کے صدر اور حنفی عربی کالج سری نگر کے بانی مہتمم ہیں، کشمیر کے اس بخاری خانوادے کا نسبی سلسلہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے ملتا ہے مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔

ڈاکٹر مولوی فاروق بخاری کی تعلیم کی ابتدا کشمیر میں ہوئی اور کشمیر یونیورسٹی ہی سے انہوں نے مولوی فاضل کیا، لیکن عربی میں ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی۔ موصوف کا خاص مشغلہ درس وتدریس تھا اور اب وہ امر سنگھ کالج سری نگر میں شعبۂ عربی کے ہیڈ آف ڈپارٹمنٹ تھے۔ لیکن تصنیف و تالیف کا بھی ان کو اچھا ملکہ تھا۔ کشمیر کی علمی، ادبی، ثقافتی اور مذہبی تاریخ ان کا خاص موضوع تھا اور اس پر ان کا مطالعہ وسیع تھا، اس موضوع اور اس کے متعلقات پر ان کے مضامین برابر شایع ہوتے تھے اور حسب ذیل کتابیں بھی شایع ہوئیں۔

ا۔کشمیر میں اسلام کی اشاعت، ۲۔کشمیر میں شعروادب کی تاریخ، ۳۔کشمیر میں عربی علوم کی اشاعت، ۴۔کشمیر میں اسلامی ثقافت کے تاریخی مراحل۔

ان میں سے بعض کتابیں راقم کی نظر سے گزری ہیں، جن سے مصنف کی تلاش، محنت اور تحقیق کے علاوہ موضوع پر ان کی اچھی دسترس کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی دوسری کتابوں کے نام یہ ہیں:

۵۔البصائر، ۶۔سیرت شیخ نجم الدین احمد الکبریٰؒ، ۷۔سیرت حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانیؒ، ۸۔سیرت حضرت میر محمد ہمدانیؒ، ۹۔سیرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، ۱۰۔علامہ انور شاہ اور ان کے تذکرہ نگار، ۱۱۔دینیات (دو حصے)۔

کشمیر کی طرح تصوف بھی ان کی دلچسپی کا خاص موضوع تھا۔

ڈاکٹر صاحب دارالمصنفین کے بڑے قدرداں تھے، اس کی مطبوعات آرڈر دے کر منگاتے تھے، معارف بھی شوق اور پابندی سے پڑھتے تھے اور ایک عرصہ سے اس میں ان کے مضامین بھی چھپتے تھے۔ وہ دینی حمیت اور اسلامی جذبہ سے سرشار تھے جس کا اندازہ ان کی تحریروں سے ہوتا تھا۔ کشمیر کے موجودہ حالات سے بڑے شکستہ خاطر رہتے تھے، چند برس پہلے انھوں نے اس کے متعلق ایک طویل اور غمناک خط بھی مجھ کو لکھا تھا جو معارف میں شایع ہوا تھا۔ راقم سے اکثر خط وکتابت رہتی تھی، ادھر عرصہ سے ان کا کوئی خط نہیں آرہا تھا، جس کی وجہ سے بڑی خلش تھی۔ کئی بار خیال ہوا کہ میں خود خط لکھ کر مزاج پرسی کروں اور مضمون کی فرمایش کروں، مگر اس کی نوبت نہیں آئی اور وہ سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت کاملہ سے نوازے اور اعزہ و متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے، آمین! ("ض"۔ جولائی ۱۹۹۷ء)

ملا، آنند نرائن، پنڈت

پنڈت آنند نرائن ملا

۱۲/جون کو اردو تحریک کے قائد پنڈت آنند نرائن ملا چل بسے، وہ ۱۹۰۱ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے، جہاں ان کے والد پنڈت جگت نرائن ملا چوٹی کے وکیل تھے، آنند نرائن ملا بھی تعلیم سے فارغ ہوکر وکالت کے پیشے سے وابستہ ہوئے، پھر الہ آباد ہائی کورٹ کے جج اور سینئر جسٹس ہوئے، ۱۹۶۱ء میں ریٹائر ہوئے تو سپریم کورٹ میں وکالت شروع کی، لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے ممبر بھی منتخب ہوئے لیکن ان کی اصل وجہ شہرت و امتیاز کا باعث یہ ہے کہ وہ اردو کے ایک بڑے شاعر، نقاد، ادیب، سیکولر، انسان دوست اور گنگا جمنی تہذیب کا نمونہ تھے، اردو کی محبت ان کے رگ و پے میں رچی بسی ہوئی تھی اور وہ اس کے اپنی مادری زبان ہونے پر فخر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ "میں مذہب چھوڑ سکتا ہوں لیکن مادری زبان نہیں چھوڑ سکتا"۔

ان کا شعر ہے:

آنجھ کو گلے لگا کے مٹتی اردو
اک آخری گیت گا لیں تو چلیں

منظوم تصنیفات کے علاوہ بعض نثری تصنیفات بھی یادگار ہیں نظم وغزل دونوں پر قدرت تھی، روایت کی پاسداری کے باوجود کلام میں فرسودگی نہیں۔ مشاعرہ کے شاعر نہ تھے مگر اس میں شرکت کرتے تھے۔ دارالمصنفین کی گولڈن جبلی کے مشاعرہ کی صدارت کی تھی۔ اب غیر مسلموں میں اردو کے ایسے عالم، دانشور اور اس سے گہرا لگاؤ رکھنے والے عنقا ہورہے ہیں اس اعتبار سے ان کی وفات اردو کا واقعی ناقابل تلافی نقصان ہے۔ ("ض"، جولائی ۱۹۹۷ء)

قدر، انجم، پرنس / عباسی، علی حماد، میجر

پرنس انجم قدر / میجر علی حماد عباسی

آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے صدر پرنس انجم قدر کی وفات ملک وملت کا بڑا حادثہ ہے، سنیوں سے بھی ان کے روابط تھے، وہ دونوں فرقوں میں اتحاد و مفاہمت کے بڑے حامی تھے اور مشترکہ ملی مسائل کے حل کے لیے سنیوں کے ساتھ ہر جدوجہد میں شریک رہتے تھے۔ مسلم پرنسپل لا بورڈ، مسلم مجلس مشاورت اور بابری مسجد تحریک سے ان کا گہرا تعلق تھا، دوسرا حادثہ میجر علی حماد عباسی کی اچانک وفات ہے۔ وہ شبلی کالج میں انگریزی کے استاد اور آخر میں پرنسپل ہوئے، پڑھنے لکھنے کا اچھا ذوق تھا اور مشرقی و مغربی ادب پر خاصی نظر تھی۔ وقتاً فوقتاً طنزیہ ومزاحیہ اور ادبی وتنقیدی مضامین لکھتے تھے جن کے بعض مجموعے چھپ گئے ہیں، طالب علمی کے زمانے ہی سے دارالمصنفین برابر آتے تھے جس

کا سلسلہ آخر تک قائم رہا۔ پروفیسر مجیب الحسن کی کتاب کشمیر انڈر سلطانز کا اردو ترجمہ ''کشمیر سلاطین کے عہد میں'' کے نام سے کیا جو دارالمصنفین سے شائع ہوا۔

(''ض''، ستمبر ۱۹۹۷ء)

باندوی، سید صدیق احمد، قاری

قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی

۲۸/ اگست ۱۹۹۷ء کو مشہور عالم ربانی اور مرجع خلائق بزرگ قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی نے رحلت فرمائی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

وہ ضلع باندہ کے ایک گاؤں ہتھورا کے رہنے والے تھے جو علمی و تمدنی حیثیت سے بہت پس ماندہ تھا، انہوں نے مظاہر العلوم سہارنپور میں تعلیم حاصل کی اور مولانا اسعد اللہ صاحب خلیفہ حضرت تھانویؒ سے بیعت ہوئے اور اجازت و خلافت حاصل کی، تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے وطن سے قریب فتح پور میں مفتی ظہور الاسلام صاحب کے مدرسہ میں مدرس مقرر ہوئے مگر کچھ ہی دنوں بعد ان کے گاؤں ہتھورا اور اس کے گردونواح میں ارتداد کی لہر پھیل گئی۔ چنانچہ قاری صاحب نے اپنے گاؤں میں بڑی بے سروسامانی کے عالم میں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے سرگرم عمل ہوگئے، ان کی یہ اصلاحی کوشش بارآور ہوئی اور جو خطہ ارتداد کی لپیٹ میں آچکا تھا اب وہ مرکز علم و رشد بنا ہوا ہے، جہاں دور دراز سے طلبہ اور علوم نبوت کے شائقین رختِ سفر باندھ کر آتے ہیں۔

قاری صاحب اچھے معلم و مدرس ہی نہ تھے بلکہ ایک داعی و مصلح بھی تھے، اس کی وجہ سے علوم دینیہ کی تحصیل کے لیے آنے والوں کے علاوہ ہر وقت طالبین و سالکین کا جمگھٹ ان کے یہاں لگا رہتا تھا اور ہر ایک بقدرِ استعداد ان سے فیضیاب ہوتا تھا۔ مشرقی اضلاع کے لوگوں کو ان کی تذکیر و ہدایت سے خاص طور پر بڑا فائدہ ہوا۔

راقم الحروف جامعہ عربیہ ہتھورا میں حاضری کے موقع پر ان کی مشغول زندگی کا خود مشاہدہ کر چکا ہے، نماز فجر کے بعد سے ظہر تک طلبہ کی ایک جماعت ان سے سبق پڑھ کر جاتی تو خالی گھنٹے میں پچاسوں کی تعداد میں لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوجاتے اور یہ سلسلہ دوسرے طلبہ کی آمد تک مسلسل قائم رہتا، اسی کے ساتھ وہ ملک کے مختلف مقامات کا سفر بھی کرتے رہتے تھے، مگر اس میں بھی اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ طلبہ کا تعلیمی نقصان نہ ہونے پائے۔

حیرت ہوتی ہے کہ ان متنوع مشاغل کے باوجود وہ لکھنے پڑھنے کے لیے کس طرح وقت نکال لیتے تھے، فن تجوید و قرأت اور علم منطق سے ان کو خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ طلبہ کی سہولت کے لیے انہوں نے ان فنون پر چند مختصر رسالے لکھے جو بعض مدارس کے نصاب میں داخل ہیں۔

قاری صاحب ہر طبقہ و جماعت میں یکساں محبوب اور ہر دلعزیز تھے، اکثر دینی درسگاہوں سے ان کو تعلق رہا اور ہر طبقہ کے علماء و مشائخ سے بھی ان کے روابط تھے، ان کی ذات مسلمانوں کی طرح غیر مسلموں کے لیے بھی نفع بخش تھی، وہ بلاتفریق مذہب و ملت ہر ضرورت مند اور پریشان حال کی مدد کرتے، ان کے یہاں مسلم و غیر مسلم کی کوئی تمیز نہ تھی۔

طبعاً حلیم، نرم خو، منکسر المزاج اور سادگی پسند اور بڑے مہمان نواز تھے، خوردوں کے ساتھ شفقت و محبت اور بزرگوں کا احترام ان کی طبیعت ثانیہ تھی، شرافت، مروت اور اخلاق حسنہ کے مثالی پیکر تھے اور انہی خوبیوں کی بنا پر وہ مرجع خلائق بن گئے تھے۔ اور مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی ان کے حد درجہ گرویدہ تھے۔

مسلسل محنت و ریاضت نے قاری صاحب کو قبل از وقت بہت کمزور اور ناتواں کر دیا تھا، بلڈ پریشر کی شکایت اور دل کا عارضہ لاحق ہوگیا تھا، ڈاکٹروں کی سخت تاکید اور ہدایت تھی کہ محنت کم کردیں، مگر ان کی روح مضطرب اور بے چین دل کو سکون کہاں مل سکتا تھا، بالآخر ۲۸/ اگست ۱۹۹۷ء کو عمر بھر کی بیقراری کو قرار آگیا اور اپنی خدمات کا صلہ لینے کے لیے رب العالمین کے حضور میں جا پہنچے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور ان کے اعزہ و متوسلین کو صبر کی توفیق بخشے اور ان کی قائم کردہ یادگار جامعہ عربیہ ہتھورا کو قائم و دائم رکھے، آمین۔

(''ع۔ع''، اکتوبر ۱۹۹۷ء)

یوسف، سید

یا اسفٰی علی یوسف

افسوس ہے کہ جناب سید یوسف صاحب سکریٹری جماعت اسلامی ہند کا مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

وہ جماعت اسلامی ہند کے پُرجوش اور فعال رکن تھے، جماعت کے سکریٹری ہونے کے ساتھ انگریزی ہفتہ وار اخبار ''ریڈینس'' بھی ان کی ادارت میں نکلتا تھا۔ جماعت اسلامی نے جب ''فورم برائے جمہوریت و فرقہ وارانہ ہم آہنگی'' کے نام سے ایک مشترکہ سیکولر پلیٹ فارم قائم کیا تو اس کی کامیابی کے لیے انہوں نے بڑی سرگرمی دکھائی اور مسلسل سفر بھی کیے۔ نہایت سادہ، متواضع اور خلیق آدمی تھے، ہر طبقہ و مسلک کے لوگوں سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے جلتے تھے، ابھی صرف انسٹھ برس کی عمر ہوئی تھی اور جماعت اسلامی ہند کو بجا طور پر ان سے بڑی توقعات وابستہ تھیں مگر ۳۰/ ستمبر کو رب حقیقی سے جاملے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور تمام متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔

(''ع۔ع''، اکتوبر ۱۹۹۷ء)

اصلاحی، امین احسن، مولانا

مولانا امین احسن اصلاحی

۱۶؍دسمبر ۱۹۹۷ء کو جامعۃ الفلاح بلریا گنج میں یہ اندوہ ناک خبر سنی کہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی وفات ہوگئی، اناللہ و انا الیہ راجعون۔

ادھر سال بھر سے اس کا کھٹکا لگا ہوا تھا کہ علم و کمال کا یہ مہر جہاں تاب غروب ہونے والا ہے۔ اور قرآن و حدیث کے بحر کا شناور اور غواص، علامہ حمید الدین فراہیؒ کا جانشین و ترجمان، ان کے علوم و معارف کا وارث و امین، حکمت قرآنی کا شارح و مبین، دین حق کا داعی و مبلغ، اسرار دین کا عارف و آشنا، شرک و توحید اور تقویٰ و نماز کا رمز و حقیقت شناس اپنے ہزاروں شاگردوں اور قدر دانوں کو مغموم، اداس اور سوگوار چھوڑ کر جلد ہی سفر آخرت پر روانہ ہونے والا ہے۔

ابھی مولانا بدرالدین اصلاحی ناظم مدرسۃ الاصلاح و دائرہ حمیدیہ کا غم تازہ ہی تھا کہ مدرسہ کا یہ گل سرسبد اور فکر حمید کا سب سے بڑا حامل و شیدائی بھی رخصت ہوگیا۔

کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم اندھیر ہے
پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

مولانا امین احسن اصلاحی صاحبؒ اعظم گڑھ شہر سے پورب میں واقع ایک گاؤں ''بمہور'' کے متوسط زمیندار گھرانے میں ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد حافظ محمد مرتضےٰ صاحب ایک دیندار، متبع سنت اور تہجد گزار شخص تھے، وہ اپنے فرزند کو دینی تعلیم دلانا چاہتے تھے، اپنی اس تمنا کا ذکر انھوں نے اپنے ہم وطن دوست مولانا شبلی متکلم ندوی سے کیا جو علامہ شبلیؒ کے عزیز شاگرد اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے منصبِ اہتمام پر فائز تھے۔ انھوں نے اسی مدرسہ میں مولانا امین احسن صاحب کا داخلہ کرادیا، جہاں انھوں نے ان سے اور دوسرے اساتذہ سے دینی علوم کی تحصیل کی، ان کو اپنی طالب علمی کے زمانے میں سب سے زیادہ فیض مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی سے پہنچا۔

مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی بڑے لائق و فاضل تھے۔ علامہ شبلی نے انھیں جوہر قابل سمجھ کر ان کی تربیت سے بڑی دلچسپی لی۔ وہ اپنے ساتھ انھیں بعض جلسوں میں لے جاتے۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے دوسرے سالانہ اجلاس میں بھی جو ۱۹۱۰ء میں ہوا تھا، علامہ ان کو اپنے ہمراہ لائے وہ اس وقت بہت کم عمر تھے، ایک بچہ کی زبان سے ایسے اچھے خیالات اور ایسی سنجیدہ تقریر سن کر لوگ حیرت میں پڑ گئے، یہی تقریر ندوہ سے فراغت کے بعد سرائے میر میں ان کے آنے کی تقریب بن گئی، اور یہیں سے ان کی تدریسی زندگی کا آغاز ہوا۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

''تعلیم سے فارغ ہوکر مرحوم (مولانا نگرامی) بھی وابستگان شبلی کی جماعت میں داخل ہوگئے اور چار برس تک مدرسہ سرائے میر میں رہ کر درس و تدریس کا فرض انجام دیا، اور مدرسہ میں زیر تربیت چند اچھے لڑکے پیدا کیے جن میں سے ایک آج مولانا امین احسن کے نام سے مشہور ہیں''۔ (یادِ رفتگاں)

یہاں کے قیام کے زمانے میں انھوں نے مولانا حمید الدین فراہیؒ کے زیر سایہ قرآن پاک کا فیض حاصل کیا۔ اور مشرقی اضلاع میں ان کی اصلاحی تقریریں بھی مقبول ہورہی تھیں۔ مگر جب مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے جامع مسجد کلکتہ میں مدرسہ اسلامیہ قائم کیا تو ان کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے۔ اس کے بند ہوجانے پر ۱۹۲۳ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ادب و تفسیر کے استاذ ہوکر آئے۔ لیکن جلد ہی علالت کا سلسلہ شروع ہوگیا اور ۱۹۲۶ء میں عین شباب میں وفات ہوگئی۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کو مولانا نگرامیؒ سے ایسا والہانہ تعلق تھا کہ ''سچ'' اخبار سے وابستگی کے زمانے میں وہ امین آباد سے روزانہ پیدل چل کر ندوہ ان سے ملنے آجایا کرتے تھے، اس اخبار سے پہلے وہ ''مدینہ'' بجنور کے بھی ایڈیٹر رہے۔ مگر جلد ہی صحافت کا کوچہ چھوڑ دیا اور مدرسۃ الاصلاح کی کشش ان کو سرائے میر کھینچ لائی جس کے بوریائے فقر پر اس وقت ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ فروکش ہوکر وہاں کے اساتذہ کو اپنے خاص نہج پر قرآن مجید کی تعلیم دے رہے تھے۔ ان کے درس سے وہ اور ان کے ہم سبق مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم نے پورا استفادہ کیا۔ ان دونوں کا شوق و رغبت اور استعداد و قابلیت دیکھ کر مولانا فراہیؒ نے بھی ان کو اپنی توجہ و عنایت کا خاص مورد بنایا۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ رقمطراز ہیں:

''اواخر عمر میں مرحوم (مولانا فراہیؒ) کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ وہ چند مستعد طلبہ کو اپنے مذاق کے مطابق تیار کریں۔ چنانچہ کم از کم دو طالب علموں کی خاص طور سے انھوں نے دماغی تربیت کی''۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے فخر و امتیاز کے لیے یہ کافی ہے کہ انھیں مولانا فراہیؒ کی جانشینی کا شرف حاصل ہوا۔ اور وہی ان کے سب سے ممتاز شاگرد کی حیثیت سے مشہور ہوئے جس کا حق بھی انھوں نے خاطر خواہ طور پر ادا کیا۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ کا بیان ہے کہ ''بعض مستعد طلبہ نے مولانا فراہیؒ کے اس درس سے پورا فائدہ اٹھایا جن میں قابل ذکر مولوی امین احسن صاحب اصلاحی ہیں۔ ہماری آئندہ توقعات ان سے بہت کچھ وابستہ ہے''۔

اپنے استاذ کا نام روشن کرنے اور ان کے افکار و نظریات کی اشاعت و ترجمانی کو انھوں نے اپنی زندگی کا مشن بنالیا۔ جب کسی جانب سے مولانا فراہیؒ پر کوئی اعتراض ہوتا تو وہ ان کی حمایت کے لیے سینہ سپر ہوجاتے۔ ان کے اس قسم کے مضامین ''الاصلاح'' اور ''معارف'' دونوں میں چھپے ہیں۔ ایک زمانے میں ان کے استاذ علامہ

فراہیؒ اور استاذ الاستاذ علامہ شبلیؒ کے خلاف غوغائے تکفیر بپا ہوا تو وہی ان مظلوم ''امامین ہمامین'' کی مدافعت اور ان کی یادگار مدرستہ الاصلاح کو شر پسندوں سے بچانے کے لیے یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے:

بیاورید گر ایں جا بود سخندانے
غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

مولانا امین احسن اصلاحیؒ قرآنیات اور عربی زبان و ادب ہی کے متبحر عالم نہ تھے بلکہ اکثر دینی اور جدید علوم پر بھی ان کی اچھی اور مجتہدانہ نظر تھی۔ اپنے استاذ علامہ فراہی سے قرآن مجید، ادب عربی اور نحو و بلاغت کے علاوہ فلسفۂ جدیدہ کی بھی تحصیل کی تھی۔ ان کے والد بزرگوار سلفی المسلک اور مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری صاحبِ تحفۃ الاحوذی کے عقیدت مند اور ان کی علم پرور مجلسوں کے حاضر باش تھے، والد کی خواہش پر مولانا اصلاحی نے فن حدیث کی امہاتِ کتب از سرِ نو ان سے پڑھیں اور اس میں بڑا کمال حاصل کیا۔ وہ اپنے جن استاذوں کا اکثر تذکرہ کرتے اور جن کے وہ بہت ممنون احسان تھے ان میں مولانا فراہیؒ اور مولانا نگرامیؒ کے ساتھ مولانا مبارکپوریؒ کا نام بھی لیتے۔

مولانا فراہیؒ کے انتقال کے بعد ان کے افکار و تصانیف کی اشاعت کے لیے مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی سربراہی میں دائرۂ حمیدیہ قائم ہوا جس نے مولانا کی عربی تصانیف کے متون اور ان کے سلیس و شگفتہ اردو ترجمے شائع کیے۔ یہ ترجمے مولانا اصلاحی نے اتنی خوبی اور قابلیت سے کیے ہیں کہ ان پر اصل کا دھوکا ہوتا ہے۔ دائرۂ حمیدیہ کی طرف سے ان کی ادارت میں ایک بلند پایہ علمی ماہنامہ ''الاصــــلاح'' بھی جاری ہوا۔ مگر ناقدری کی بنا پر یہ چار برس ہی میں بند ہوگیا۔ تاہم اس میں قرآنیات پر ایسے محققانہ مضامین شائع ہوئے کہ آج تک لبِ ساقی پر یہ مکرر صدا جاری ہے۔

؎ کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگن عشق

جس زمانے میں وہ مدرستہ الاصلاح سرائے میر میں درس و تدریس کی خدمت پر مامور رہ کر مولانا فراہیؒ کی تصنیفات کی ترتیب و اشاعت اور اپنی بعض کتابوں کی تحریر و تسوید میں مشغول تھے اسی زمانے میں ماہنامہ ترجمان القرآن کے دعوتی و انقلابی مضامین اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی موثر و دلنشین متکلمانہ تحریروں کا غلغلہ بلند ہوا جن سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے علاوہ وہ علماء بھی متاثر ہوئے جو وقت کے تقاضوں اور زمانے کے حالات سے کسی قدر باخبر تھے، لیکن مولانا امین احسن اصلاحی نے شروع میں ان کا کوئی اثر قبول نہیں کیا، کیونکہ ان پر اس وقت تک اپنے استاذ مولانا عبدالرحمٰن نگرامیؒ کے زیر اثر ترکِ موالات اور تحریکِ خلافت اور مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے سیاسی خیالات کا اثر تھا۔ اس کے علاوہ وہ خود جس فکر کے حامل تھے اس کے اپنے خاص تقاضے اور مطالبے تھے۔ اس کے ساتھ دوسرے افکار اور تحریکوں کا میل نہیں ہوسکتا تھا۔ اسی لیے غالباً وہ اس سے قریب نہیں ہوسکے، مولانا مودودیؒ کی کتاب ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش'' پر ''الاصلاح'' کے کئی نمبروں میں تنقید لکھی۔

جب مولانا مودودیؒ نے اپنے خیالات کی اشاعت اور اپنا حلقۂ اثر بڑھانے کے لیے بعض جگہوں کا سفر کیا تو وہ سرائے میر بھی تشریف لائے اور بالآخر فکر حمید کے سب سے بڑے داعی و شارح بھی ان کے مکمل ہم نوا ہوگئے، اور وہ وقت بھی آپہنچا کہ استاد کا آستانہ چھوڑ کر پٹھان کوٹ جو اس زمانے میں مولانا مودودیؒ کا مرکز و مستقر تھا، جا پہنچے۔ جب مدرستہ الاصلاح کے حدود سے وہ باہر نکل رہے ہوں گے تو کارکنانِ قضا و قدر نے یہ صدا ضرور بلند کی ہوگی کہ ''تیری شان ان مشاغل سے بالاتر ہے''۔

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو
تو کجا بہر تماشا می روی

مگر ایسے جوش کے عالم میں ہوش کی باتوں پر کون کان دھرتا ہے جلد ہی انھوں نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے مولانا مودودیؒ کے بعد جماعت میں اپنی سب سے اہم اور نمایاں جگہ بنالی۔ ترجمان القرآن پر نام تو مولانا مودودیؒ کا ہوتا تھا لیکن عملاً وہی اس کے مدیر ہوگئے تھے۔ اسی لیے جب ملک تقسیم ہوا تو جماعت کا نظام سنبھالنے اور اس کی امارت و سربراہی کا بار اٹھانے کے لیے مولانا مودودیؒ نے انھیں ہندوستان بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس سے بہر حال مدرستہ الاصلاح میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن تقسیم کے بعد ایسی قیامت برپا ہوئی اور فسادات کی آگ اتنی سخت بھڑک اٹھی کہ جو جہاں تھا وہیں دم بخود رہ گیا۔ مولانا امین احسن صاحبؒ بھی لاہور سے سرائے میر کے خرابے میں چراغ آرزو جلانے تشریف نہیں لاسکے۔

پاکستان بننے کے بعد وہاں جماعت کی طرف سے اسلامی نظام کا مطالبہ بڑے زور وشور سے بلند ہوا۔ اس کی وجہ سے مولانا مودودیؒ، مولانا اصلاحیؒ اور دوسرے سرکردہ قائدین کو قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں۔ پھر انتخابات کا مرحلہ آیا۔ جس میں جماعت نے پوری سرگرمی سے حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو مولانا اصلاحی اور ان کے بعض رفقاء نے محسوس کیا کہ اب جماعت کی ساری توجہ حصولِ اقتدار کی جانب مرکوز ہوگئی ہے اور وہ اصلاح و دعوت اور افراد سازی کے اپنے اصل موقف سے منحرف ہوگئی ہے۔ بہر حال یہ اور اسی طرح کے بعض دوسرے اختلافات کی بنا پر وہ اس جماعت سے علیحدہ ہوگئے جس کے برسوں سے سب سے اہم اور برتر رکن تھے جس کے لیے اپنی ساری قوت و توانائی اور ذہنی و دماغی قابلیت و صلاحیت صرف کردی تھے۔

جماعت سے علیحدگی کے بعد مولانا امین احسن صاحب نے حلقۂ تدبر قرآن قائم کیا جس کی اطلاع جب ان کے بعض قدیم کرم فرماؤں مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی وغیرہ کو ہوئی تو انھوں نے اس پر بڑی مسرت ظاہر کی۔ اس

کے زیر اہتمام انھوں نے بعض ذی استعداد طلبہ اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو قرآن مجید و احادیث نبویؐ کا درس دینا شروع کیا اور اپنے خیالات و مقاصد کے اظہار و اشاعت کے لیے رسالہ ''میثاق'' جاری کیا۔ بعد میں اس رسالے پر ان کے ایک شاگرد ڈاکٹر اسرار احمد قابض ہوگئے۔

جماعت سے الگ ہونے پر انھیں یک سوئی میسر ہوگئی تھی اس لیے وہ اپنے اصل اور بنیادی کام کی طرف متوجہ ہوئے اور قرآن مجید کی جس میں برسوں سے غور و خوض ان کی زندگی کا سب سے محبوب مشغلہ تھا، تفسیر ''تدبر قرآن'' کے نام سے لکھنی شروع کی جو ''میثاق'' میں بالاقساط شائع ہوئی اور پھر نو جلدوں میں کتابی صورت میں چھپی۔ اردو میں یہ اپنی نوعیت کی منفرد تفسیر تھی اس لیے بہت مقبول ہوئی۔ پاکستان میں اس کے کئی ایڈیشن نکلے۔ اور ہندوستان میں بھی یہ تاج کمپنی دہلی سے چھپ گئی ہے اور ہر جگہ دستیاب ہے۔

مولانا حمید الدین فراہیؒ نے اواخر قرآن کی بعض مختصر سورتوں کی تفسیر لکھی تھی، باقی سورتوں کے متعلق کچھ نوٹ اور متفرق اشارات ہی لکھ سکے تھے۔ ضرورت تھی اور عرصہ سے مولانا فراہیؒ کے قدردانوں کا اصرار بھی تھا کہ ان کے اصول و متعینہ خطوط کے مطابق مکمل قرآن مجید کی تفسیر لکھی جائے۔ ظاہر ہے یہ کام مولانا کے تلامذہ میں ان کے علاوہ کوئی اور نہیں کرسکتا تھا۔ انھوں نے یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے کیا جو واقعۃً ان کا بڑا کارنامہ اور ع ایں کار از تو آمد و مرداں چنیں کنند کے مصداق ہے۔ مولانا شاہ معین الدین ندوی تحریر فرماتے ہیں:

> ''ہمارے فاضل دوست مولانا امین احسن صاحب اصلاحی، ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کے ارشد تلامذہ میں ہیں۔ تفسیر کے درس و تعلیم میں انھوں نے تمام تر ان ہی سے استفادہ اور برسوں خود بھی اس پر غور و فکر کیا ہے۔ اس لیے ان کو تفسیر لکھنے کا حق تھا اور حق یہ ہے کہ انھوں نے اس کا پورا حق ادا کیا ہے۔ اور بڑی دقت و وسعت نظر اور ایمانی جذبہ سے یہ تفسیر لکھی گئی ہے جو ان کی برسوں کی محنت اور غور و فکر کا نتیجہ اور ہر حیثیت سے جامع و مکمل ہے......اور مصنف کا بڑا کارنامہ ہے۔ اس سے اردو تفسیر کے ذخیرہ میں بیش بہا اضافہ ہوا اور وہ ہر پڑھے لکھے مسلمان کے مطالعہ کے لائق ہے''۔ (معارف عدد۳، جلد۱۰۴، ستمبر ۱۹۶۹ء)

یہ صحیح ہے کہ ''تدبر قرآن'' میں مولانا فراہیؒ کے اصولِ تفسیر مدنظر رکھے گئے ہیں اور اس میں ان کے افکار و خیالات سے مکمل استفادہ بھی کیا گیا ہے، اسی لیے اسے فراہی اسکول کی مستند تفسیر کا درجہ حاصل ہوگیا ہے، مگر اصلاً یہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی محنت و جانفشانی، برسوں کے مطالعہ و تحقیق اور مسلسل غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ اور اس میں کہیں کہیں انھوں نے صراحۃً اپنے استاذ سے اختلاف بھی کیا ہے۔

میثاق کے بعد ان کی نگرانی اور ان کے خاص فیض یافتہ جناب خالد مسعود صاحب کی ادارت میں رسالہ ''تدبر'' نکلا جو ابھی تک نکل رہا ہے۔ مولانا اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' مکمل کرچکے تو ''تدبر حدیث'' کی تکمیل میں لگ گئے۔ موطا امام مالک اور صحیح بخاری کی حدیثوں کی شرح و ترجمانی سے متعلق حصے رسالہ ''تدبر'' میں شائع ہو رہے ہیں۔ تدبر حدیث کا یہ سلسلہ بھی مولانا کے زریں کارناموں میں ہے۔

جو لوگ تقلید پر قانع اور قدماء کی روش پر چلنے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں اور فنون و علوم اسلامیہ کے معروضی اور غیر جانبدارانہ مطالعہ کے عادی نہیں ہیں، یا جو لوگ اپنے مزعومہ متفقہ عقائد و خیالات کے خلاف نہ کوئی سنجیدہ اور معقول بات سننے کو تیار ہوتے ہیں اور نہ اپنے حلقوں کے سوا کسی اور حلقہ کی کوئی بات اپنے کانوں میں پڑنے دینا چاہتے ہیں، ان کے لیے مولانا کی تفسیر، تشریح احادیث اور بعض تصنیفات کے کچھ مقامات نامانوس اور ناقابل قبول ہوسکتے ہیں۔ اس طرح کے لوگوں نے اس قسم کے بعض مسائل کو لے کر حسبِ عادت شور و غوغا بھی مچایا، مگر مولانا اجماعِ عام کے ان کے دعوے سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ اپنے اس خیال کو پوری جرأت کے ساتھ پیش کرتے رہے جسے وہ صحیح اور کتاب و سنت کے مطابق سمجھتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا امین احسن اصلاحی جیسے بلند پایہ محقق، وسیع النظر عالم اور قرآن و حدیث کے ماہر سے جمہور کے تمام خیالات و آرا کی پابندی کا مطالبہ کرنا اور نہ کرنے پر سب و شتم اور تکفیر و تضلیل کا محاذ گرم کردینا بڑی زیادتی اور انتہائی تنگ نظری ہے۔ ہر دور کے نابغۂ روزگار علماء کے یہاں مجتہدانہ خیالات اور تفردات ملتے ہیں۔ ان کی بنا پر انھیں مطعون کرنا اور ان پر کفر و زندقہ کا الزام عائد کرنا علمی کم مائیگی اور عدم تدبر کا نتیجہ ہے۔ متقدمین اور دور حاضر میں بھی ایسے متعدد علماء گزرے ہیں جن کی سطح اپنے معاصرین سے بلند تھی اس لیے وہ اپنے عہد کے مزعومات اور تقلیدی رجحانات کا ساتھ نہیں دے سکے۔ اس لیے ابنائے زمانہ کے طعن و تشنیع کا نشانہ بنے۔ حالانکہ ایسے موقع پر بے صبری اور عجلت کے بجائے توقف و تامل اہل حق اور اصحاب علم کا شیوہ رہا ہے۔

مولانا امین احسن صاحب کی رگ و پے میں علامہ شبلیؒ کی صہبائے علم و ادب رقص کررہی تھی۔ اور وہ ان کے طرز تحریر کو اردو انشاء پردازی کا اعلیٰ ترین نمونہ سمجھتے تھے۔ ان کی تحریروں کی رعنائی اور دلکشی اور دلآویزی کا یہی سبب ہے لیکن اب ان کی پختگی اور مشاقی سے ان کا اپنا الگ اور جداگانہ رنگ و آہنگ بھی ہوگیا تھا، جس میں سادگی کے باوجود پُرکاری ہوتی تھی۔ طبقۂ علماء میں ایسی صاف، شُستہ، سلیس، شگفتہ اور رواں اردو لکھنے والے کہاں ملیں گے۔ ان کو عربی لکھنے پر بھی قدرت تھی۔ ''الضیاء'' (لکھنؤ) میں ان کے بعض عربی مضامین شائع ہوئے۔

مولانا کی قلمی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا تھا اور تصنیفی زندگی کی بسم اللہ کلمہ لاالہ اللہ کی تشریح سے ہوئی، پہلے حقیقت شرک لکھی۔ پھر حقیقت توحید، باقی تصنیفات کے نام یہ ہیں، حقیقت نماز، حقیقت تقویٰ، اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل، تدوین قانونِ اسلامی، تزکیۂ نفس، دعوتِ دین اور اس کا طریقۂ کار، قرآن میں پردے کے حکام، مبادی تدبر قرآن، مبادی تدبر حدیث، مولانا حمیدالدین فراہیؒ، اسلامی معاشرے میں عورت کا مقام، عائلی کمیشن کی رپورٹ پر تبصرہ، فلسفے کے بنیادی مسائل قرآن حکیم کی روشنی میں، تفہیمِ دین، مقالات اصلاحی (جلد اول)۔

ان مستقل تصنیفات کے علاوہ مولانا فراہیؒ کی متعدد تصنیفات و رسائل کا اردو ترجمہ کیا۔ آخر میں تدبر قرآن کی نو جلدیں لکھیں اور تدبر حدیث پر کام کر ہی رہے تھے کہ پیام اجل آگیا، ع خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا۔

مولانا نے بڑی مشغول علمی زندگی گزاری، انھوں نے طویل عمر پائی جو درس و تدریس، تصنیف و تالیف، اشاعتِ علم اور خدمتِ دین کے لیے وقف رہی، مدرستہ الاصلاح میں درس و تدریس کا جو مشغلہ شروع کیا تھا وہ کسی نہ کسی شکل میں تاعمر جاری رہا۔

مجھے ان سے ملاقات کا شرف صرف ایک بار اس وقت حاصل ہوا جب وہ اپنے والد کی علالت کی خبر سن کر ۱۹۵۲ء میں ہندوستان اپنے آبائی وطن تشریف لائے تھے مگر ان کے پہنچنے سے پہلے ہی ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا، اس وقت دونوں ملکوں کے تعلقات بہت کشیدہ تھے، پھر ان کا تعلق جس جماعت سے تھا اس کی وجہ سے انھیں گاؤں سے کہیں باہر جانے کی اجازت نہیں تھی، میں ان سے وہیں ملنے گیا تو بڑے لطف و محبت سے پیش آئے۔ میرے بڑے بھائی مولوی قمرالدین اصلاحی کے بارے میں دریافت کیا جن کا قلمی و ادبی نام قمر اعظمی ہے اور جن کو انھوں نے پڑھایا تھا۔ جب بھائی کے بارے میں انھیں معلوم ہوا کہ ان کا مشغلہ علمی نہیں ہے تو انھیں بڑا افسوس ہوا اور میرے ذریعہ سے انھیں یہ پیغام بھیجا کہ آخر ان کے علم، ان کی ذہانت و صلاحیت سے ان کی قوم و ملت اور ملک کو کیا فائدہ پہنچا۔

میری موجودگی میں مغرب کے بعد ان سے ملنے کے لیے مولانا قاضی اطہر مبارکپوری اپنے دو تین ساتھیوں کے ساتھ آئے اور عشاء سے پہلے واپس جانے لگے تو مولانا نے فرمایا کہ اس وقت رات میں کیوں جا رہے ہیں؟ قاضی صاحب نے کہا! ہم لوگ قریب کے ہیں۔ ابھی پہنچ جائیں گے۔ مولانا نے فرمایا کہ قریب کے لوگوں کو ہی روکا جاتا ہے، قاضی صاحب نے ہنس کر کہا، نہیں! اجازت دیجئے ہم لوگ بس نیاز حاصل کرنے آئے تھے، مولانا نے فرمایا: اجی حضرت! میں تو خود ہی نیاز مند ہوں۔

میری ان سے یہی پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ البتہ ان سے کبھی کبھی خط و کتابت رہتی تھی۔ ''میثاق'' کے لیے ان کی طلب پر میں نے چند مضامین لکھے، وہ میرے عزیز بھی ہو گئے تھے۔ ان کے ایک سگے پوتے عزیزی ابوریحان جو افسوس ہے کہ دادری کے ہوائی حادثہ میں ۱۲/نومبر ۱۹۹۶ء کو جاں بحق ہو گئے ان سے میری لڑکی شاہین منسوب تھی، میں نے جب اپنی طرف سے اس رشتہ اور مولانا بدرالدین اصلاحی مرحوم کے نکاح پڑھانے کی انھیں اطلاع دی تو اس پر خوشی ظاہر کرتے ہوئے لکھا کہ تمھارا خط بہت مختصر تھا، اب جب خط لکھو تو دارالمصنفین اور مدرستہ الاصلاح کا مفصل حال لکھو اور دونوں جگہ میرے جو ملنے اور جاننے والے لوگ موجود ہیں ان کا ذکر کرو۔ اور ان سے میرا سلام کہو، چنانچہ تعمیل حکم میں جب میں نے بڑا مفصل خط لکھا تو بہت خوش ہوئے اور جواب میں تحریر فرمایا کہ دراصل میں اسی طرح کا خط چاہتا تھا۔ اسی گرامی نامہ میں یہ بھی تحریر فرمایا تھا ''میرا جی چاہتا ہے کہ ایک بار پھر وہاں آؤں، چاہے میرے جاننے والے ہوں یا نہ ہوں، مدرستہ الاصلاح کے در و دیوار تو ہوں گے، ان ہی سے لپٹ کر اچھی طرح رو لوں گا''۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں مدرستہ الاصلاح سے جو ان کے استاذ کی یادگار ہے کتنا جذباتی تعلق تھا اور وہ اس کی ترقی و استحکام کے کس قدر آرزومند رہتے تھے۔ وہ پاکستان میں ضرور تھے، لیکن ان کا دل یہاں اور یہاں کے لوگوں میں بھی اٹکا رہتا تھا، اور جب یہاں کے کسی شخص کو پا جاتے تھے تو فرطِ تعلق سے لپٹ جاتے تھے اور جو جو یاد آتا سب کا حال دریافت فرماتے۔

راقم کے ایک استاذ مولوی قمرالزمان صاحب اصلاحی مرحوم جو مولانا امین احسن صاحب کے عزیز تھے جس سال حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے اسی سال مولانا اصلاحی بھی پاکستان سے حج کے لیے آئے ہوئے تھے، وہ ان سے ملنے گئے تو ان کے پاس کئی ملکوں کے اہم اور معزز اشخاص بیٹھے ہوئے تھے لیکن ان کو دیکھتے ہی باغ باغ ہو گئے اور ان کی ساری توجہ کا مرکز یہی ہو گئے۔

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم ایک دفعہ ان سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے تو اعزاز میں ایک بڑی لمبی اور شاندار دعوت کا اہتمام کیا۔ سید صاحب فرماتے تھے کہ مجھے ایسی پُرتکلف اور شاندار دعوت کھانے کا اتفاق بہت کم ہوا تھا۔ وہ مولانا اصلاحی کے گرم جوشی سے ملنے اور خلوص و محبت کا اکثر ذکر فرماتے اور کہتے کہ جو لوگ ان کی یہاں موجودگی کے وقت دارالمصنفین کے کسی شعبہ سے وابستہ تھے ان سب کا نام لے کر ایک ایک شخص کے بارے میں دریافت کرتے رہے۔

دراصل دارالمصنفین سے بھی ان کو بڑا تعلق تھا، مولانا سید سلیمان ندویؒ اور مولانا عبدالسلام ندوی سے ملاقات کے لیے یہاں برابر آتے رہتے تھے اور خود سید صاحب بھی سرائے میر برابر تشریف لے جاتے تھے، اور مولانا امین احسن صاحبؒ کی صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے۔

مولانا حکیم محمد مختار اصلاحی ان کے عزیز شاگرد ہیں۔ ایک دفعہ ان کے بڑے صاحبزادے حکیم محمد فیاض صاحب پاکستان گئے اور ان سے ملے تو بڑی پذیرائی کی اور کہنے لگے مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو، اگر کبھی بمبئی کے راستہ سے آیا تو تمھارے یہاں قیام کروں گا اور دہلی سے آنے پر عبداللطیف اعظمی صاحب کے یہاں قیام کروں گا۔ یہ بھی ان کے چہیتے شاگرد ہیں۔

مولانا امین احسن صاحبؒ کھانے پینے کے جتنے شوقین تھے اس سے زیادہ دوسروں کو کھلا کر انھیں خوشی ہوتی تھی۔ ان کے یہاں اکثر دعوتیں ہوتی تھیں۔ اعظم گڑھ میں حکیم محمد اسحاق صاحب اپنی حذاقتِ فن، شرافت نفس اور جامع صفات حسنہ ہونے کی بنا پر ہر طبقہ میں بہت مقبول و محبوب تھے۔ مدرستہ الاصلاح اور اس کے ذمہ داروں سے بھی ان کے اچھے تعلقات تھے۔

مولانا امین احسن صاحبؒ ان کے بڑے بے تکلف اور خاص دوست تھے، حکیم صاحب کے نورتنوں میں مشہور شاعر جناب یحییٰ اعظم اور دارالمصنفین کے رفقاء و وابستگان بھی تھے۔

ان سب کو مولانا اصلاحی سال میں دو مرتبہ اپنے دولت خانے پر مدعو کرتے۔ ایک تو جاڑے میں، جب ہرے مٹر اور گنا تیار ہوتا۔ اور دوسرے آموں کے موسم میں حکیم صاحب کا سفر عموماً کشتی سے ہوتا تھا۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کو بھی ان دعوتوں میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا تھا۔

مولانا اصلاحیؒ بڑے پُرکشش، وجیہ و شکیل، جامہ زیب، بارعب اور نظافت پسند شخص تھے۔ انھیں صفائی بہت پسند تھی، کبھی ان کے جسم پر میلے کچلے کپڑے نہیں دیکھے گئے۔ لباس سفید پہنتے تھے جس پر کہیں داغ دھبہ نہیں ہوتا تھا۔ لباس ہی کی طرح ان کا کمرہ بھی چمکتا اور جگمگاتا رہتا تھا، ان کی پڑھنے لکھنے کی میز بہت مرتب اور صاف ہوتی۔ ان کی ہر ہر چیز سے حسن، نفاست اور سلیقہ مندی ظاہر ہوتی تھی اور کہیں سے بدذوقی اور بے ڈھنگے پن کا پتہ نہیں چلتا تھا۔

ان میں حد درجہ غیرت، خودداری، استغنا اور بے نیازی تھی کبھی کسی کا احسان مند ہونا گوارا نہیں کرتے تھے۔ وہ جس پایہ اور رتبہ کے شخص تھے، چاہتے تو ہر بڑا عہدہ اور اعزاز ان کو مل سکتا تھا، لیکن ان کے نزدیک ان چیزوں کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی، ان کا قیام رحمٰن پورہ میں تھا۔ جس کی حیثیت ایک گاؤں جیسی تھی، صدر ضیاء الحق مرحوم نے بہت چاہا کہ ان کے لیے لاہور یا جس بڑے شہر میں وہ پسند کریں اچھا مکان تعمیر کرادیں۔ مگر وہ اس کے لیے کسی طرح آمادہ نہیں ہوئے۔

وہ عام لوگوں سے بڑی تواضع اور انکسار سے پیش آتے تھے لیکن امراء اور ذی جاہ و حشمت اشخاص سے کبھی جھک کر نہیں ملتے۔ طبیعت شاہانہ پائی تھی ہمیشہ اچھی اور قیمتی چیزیں استعمال کرتے تھے کوئی ادنی اور معمولی چیز ان کی نگاہ میں جچتی ہی نہیں تھی، ہمیشہ سیکنڈ اور فرسٹ کلاس میں سفر کرتے، تانگے پر اکیلے سوار ہوتے، کشادہ دست تھے، پس انداز کرنے کی کبھی عادت نہیں رہی جو پاس ہوتا بے دریغ خرچ کر ڈالتے، سائل کو اپنی حیثیت سے زیادہ دیتے تھے حرص و ہوس کا کوئی شائبہ بھی انہیں نہیں تھا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو جن اعلیٰ و برتر مقاصد کے لیے پیدا کیا تھا انھی میں شب و روز منہمک رہتے، گھر گرہستی کے کاموں سے کوئی سروکار نہ رکھتے۔ ان کی ضرورتوں کا سامان ان کے عزیز اور احباب مہیا کرتے تھے جن سے کہا کرتے کہ انتم اعلم بامور دنیاکم۔

جب کسی پر غصہ آتا اور بہت برہم ہوجاتے تو بعض اوقات کچھ سخت سست اور ناگفتنی بھی کہہ جاتے لیکن جلد ہی ان کا غصہ فرو ہوجاتا، کسی سے کینہ کدورت نہ رکھتے۔

مولانا امین احسنؒ اصلاحی کو تحریر کی طرح تقریر کا بھی خداداد ملکہ تھا۔ ان کا یہ جوہر طالب علمی ہی کے زمانے میں کھل گیا تھا، مولانا عبدالرحمٰن نگرامی کی صحبت میں اسے مزید ترقی ہوئی، وہ خلافت اور مولانا مدنی کے ساتھ جمعیۃ کے جلسوں میں شریک ہوتے اور اپنی جادو بیانی کا سکہ جمادیتے بعض ثقہ مشاہدین نے مجھے بتایا کہ ان کی تقریروں کے سامنے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی تقریریں پھیکی ہوجاتی تھیں۔

جماعت اسلامی سے وابستہ ہوئے تو اس حلقہ کے سب سے بڑے مقرر وہی تھے۔ وہ کئی کئی گھنٹے تک بولتے مگر تسلسل اور حسن بیان میں فرق نہیں آتا، وہ مدرستہ الاصلاح کے توگل سرسبد تھے ہی حق یہ ہے کہ پورے برصغیر میں اس پایہ کے عالم، خطیب اور مصنف کم ہی لوگ ہوں گے ان کی کتابوں کی تعداد بعض مصنفین کے مولفات و رسائل کی طرح چاہے سینکڑوں نہ ہوں لیکن جن لوگوں کی کمیت کے بجائے کیفیت پر بھی نظر رہتی ہے وہ یہی کہیں گے:

بغاث الطیر اکثرھا فراخا
وام الصقر مقلاۃ نزور

مولانا امین احسن اصلاحی کی موت علم و دین کا بڑا خسارہ ہے جس کی تلافی کا بظاہر امکان نہیں، ان کے بعض تلامذہ خصوصاً جناب خالد مسعود صاحب سے ہماری بڑی توقعات وابستہ ہیں، ان سے گزارش ہے کہ مولانا نے جو مشن برپا کیا تھا اسے جاری رکھیں۔

اللہ تعالیٰ علم و دین کے اس خادم کی مغفرت فرمائے اور عزیزوں اور اہل تعلق کو صبر جمیل مرحمت فرمائے۔ اللھم صبب علیه شآبیب رحمتک و برد مضجعه واجعل الجنة مثواه۔

("ض"۔ جنوری ۱۹۹۸ء)

نظامی، خلیق احمد، پروفیسر

پروفیسر خلیق احمد نظامی کی یاد میں

(پروفیسر اصغر عباسی)

''نظامی صاحب بلند پایہ عالم اور ملک کے ممتاز مورخ اور دارالمصنفین کے رکن رکین تھے، ان پر بعض مشہور اہل قلم سے جن کو ان سے گہری واقفیت تھی، مضمون لکھنے کی فرمایش کی گئی ہے، اس مضمون میں ان کی زندگی کے ایک خاص پہلو ہی سے گفتگو کی گئی ہے''۔ (ض)

خلیق احمد نظامی صاحب کے نام نامی سے میں علی گڑھ آنے سے پہلے ہی واقف ہو چکا تھا لیکن ملاقات ۱۹۶۸ء میں ہوئی جب راقم الحروف سرسید ہال کا طالب علم تھا اور وہ اس کے پرووسٹ مقرر ہوئے تھے۔

نظامی صاحب متوسط قد کے تھے لیکن ان کا جسم ایسا تھا کہ ہر لباس خواہ ہندوستانی ہو یا انگریزی ان پر خوب پھبتا تھا، ان کا رنگ گندمی تھا جس کی وجہ سے ان کے سفید بالوں کی جو قدرے لمبائی لیے ہوئے تھے سپیدی کا احساس بڑھ جاتا تھا۔ ان کی آنکھیں بڑی نہیں تھیں لیکن نہایت روشن تھیں جن میں ایک خاص چمک تھی، ان کے چہرے سے رعب عیاں ہوتا تھا لیکن خوف بالکل نہیں معلوم ہوتا تھا۔

نظامی صاحب مجسم علم تو تھے ہی لیکن ان کے سرتاپا عمل ہونے کا عقدہ اس وقت کھلا جب انہوں نے پہلی بار یونیورسٹی میں انتظامی عہدہ سنبھالا اور سرسید ہال میں پرووسٹ ہوکر آئے، ان کے زمانے میں ہال نے بڑی ترقی کی۔ میں اس کا عینی شاہد ہوں کہ وہ ہال کے دفتر میں حساب کا ایک ایک رجسٹر دیکھتے، مددگاروں کو انتظامات کی ایک ایک جزئی باتیں سمجھاتے انہیں راستہ بھی دکھاتے اور ایک ایک کام کی تاکید بھی کرتے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہال کے در و دیوار سے لے کر اس کے سبزہ زار تک سب سرسبز اور شاداب ہوگئے۔ دراصل ہال کی ہمہ جہت ترقی کا راز ان کی تجلیلی اور تخیلی فکر میں تو تھا ہی، سونے پر سہاگہ ان کا کڑھا ہوا ذوق نفاست تھا جن کی وجہ سے ہال کی ہر شے چمک گئی۔ یہ ہال کا سنہرا زمانہ تھا ان کا خیال تھا کہ اقامتی ہال کے سربراہ کو صرف وقتی مسائل کو نپٹانے اور ہال کا خزانہ معمور کرنے ہی کا خیال نہیں رکھنا چاہیے بلکہ اسے اولین ترجیح ہال کی علمی اور زندگی سے معمور فضا اور طلبہ کی ذہنی اور علمی نشوونما پر دینی چاہیے، وہ کہتے کہ بیشتر ذی استعداد اور ہونہار نوجوان مناسب اور معقول رہنمائی نہ ملنے سے مایوسی اور بے زاری کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ ہال سے طلبہ کا رشتہ استوار کرتے اور بتاتے کہ اس ہال کے تم کسی گوشے میں چلے جاؤ تاریخ تمہیں زندہ حقیقت معلوم ہوگی یہ ہال تاریخی کارناموں اور یادوں سے لبریز ہے، اس ہال کے مکینوں نے ماضی اور حال کے درمیان ایک پل بنا دیا تھا اور اسی ہال کے رہنے والوں نے ایک نئی مشرقیت کی طرح بھی ڈالی تھی وہ اکثر دوران گفتگو نظیری نیشاپوری کا یہ شعر پڑھتے ؎

این کعبہ را بنا نہ بباطل نہادہ اند
صد معنی و جمال دریں گِل نہادہ اند

شعر پڑھتے ہوئے ان پر ایک کیفیت طاری ہوجاتی اور ان کی آنکھوں میں چمک آجاتی۔ وہ ہال کے طلبہ میں اسکالر پرووسٹ کے نام سے مشہور ہوئے۔

نظامی صاحب سرسید ہال کے طلبہ میں خاصے مقبول تھے، لڑکے ان کی بات ٹالتے نہیں تھے، ان کا احترام کرتے، اکثر جب نظامی صاحب ہال میں داخل ہوتے اور طلبہ جس جذبۂ اختیار شوق سے ان کا استقبال کرتے وہ مناظر اب تک بھولتے نہیں۔ طلبہ پر ان کے اثرات کا اندازہ اس سے کیجیے کہ جب ایس۔ کے۔ بھٹناگر جو غالب کے شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کے خاندان سے تھے اور مشہور سائنسداں شانتی سروپ بھٹناگر کے قریبی عزیزوں میں تھے۔ انہوں نے علی گڑھ کالج کی تاریخ لکھی تھی جس میں سرسید کے حسن خیال اور حسن عمل کے ذکر کے علاوہ علی گڑھ کالج کے قیام اور اس کے یونیورسٹی میں تبدیل ہونے کی تاریخ تھی اس کتاب کا مسودہ عرصہ تک ان کے پاس پڑا رہا اور چھپنے کی کوئی سبیل نہ نکلی۔ رشید احمد صدیقی صاحب سے جب یہ بات پروفیسر خلیق احمد نظامی کو معلوم ہوئی تو انہوں نے ہال کے طلبہ سے اس کتاب کی اشاعت کے لیے اپیل کی اور ایک ہفتہ کے اندر سرسید ہال کے طلبہ کے مالی تعاون سے اسکی اشاعت کا سامان مہیا ہوگیا۔

۱۶/ اکتوبر ۱۹۶۸ء کی شام تھی جب سرسید ہال کے لان پر جو حد نگاہ تک یونیورسٹی کے فضلاء اور طلبہ سے بھرا ہوا تھا نظامی صاحب کا لکھا ہوا اور ان کی ہدایت میں ایک شیڈو پلے ہال کے طلبہ نے پیش کیا تھا۔ جس میں جدید ہندوستان کے معمار سرسید کی فقید المثال تہذیبی خدمات کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ یہ تمثیل بہت مقبول ہوئی بار بار اسے اسٹیج کیا گیا اور بعد میں ''سرسید ایک تعارف'' کے عنوان سے شایع ہوئی۔

اس زمانے میں نظامی صاحب صبح و شام اس فکر میں رہتے کہ کون سے وسائل اختیار کیے جائیں جن سے طلبہ میں سائنٹفک انداز فکر اور مہم جوئی کا جذبہ بیدار ہو، اسی مقصد کے تحت ۱۹۶۹ء کے یوم آزادی کے موقع پر سائنٹفک سوسائٹی کی تجدید کی گئی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی تحریک کی ناکامی کے بعد جب اندھیرا اور گہرا ہوا تو سرسید نے ۱۸۶۴ء میں سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے ایک چراغ روشن کردیا۔ یہ ہندوستان میں اپنی نوعیت کی پہلی تنظیم تھی، اس کے مقاصد اور طریق کار ہماری زندگی کا فتح الباب تھے۔ اسی سوسائٹی کے کاموں کے دوران مجدد قوم نے علی گڑھ تحریک کا خواب دیکھا۔ نظامی صاحب کا خیال تھا کہ سوسائٹی کے پلیٹ فارم پر ہال کے طلبہ آپس میں تبادلہ

خیال کریں گے تو فکر ونظر کے نئے نئے سانچے تیار ہوں گے۔

اس زمانے میں ہال میں علمی اور تہذیبی سرگرمیوں کا سلسلہ قائم ہو گیا تھا۔ آئے دن ملک اور بیرون ملک کی اہم علمی اور تہذیبی شخصیتیں آتی رہتی تھیں، یاد آتا ہے کہ خان عبدالغفار خان بھی آئے تھے۔ وہ تقریر کے فن سے تو بے نیاز تھے لیکن ان کی باتوں کا طلبہ نے بہت اثر لیا تھا۔

نظامی صاحب کے زمانے میں ان کی کوششوں سے ہال میں سرسید میموریل لکچر کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلا سرسید یادگاری لکچر جلیل القدر عالم اور مورخ ڈاکٹر تاراچند نے دیا تھا۔ اس روز اسٹریچی ہال نور سے معمور تھا اور سیاہ شیروانیوں میں ملبوس طلبہ سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تقریباً سوا گھنٹے تک ڈاکٹر تاراچند اپنا لکچر دیتے رہے اور باوجود اس کے کہ ہم میں سے بہت سے طالب علم ان کی بصیرت افروز باتوں اور مورخانہ ژرف نگاہی کو نہ سمجھے ہوں گے لیکن مجمع بڑا شائستہ تھا اور اب تک ذہن سے محو نہیں ہوتا۔

اسی زمانے میں سرسید سے ان کے فرزندان معنوی کا ذہنی رابطہ قائم کرنے کے لیے نظامی صاحب کا مرتب کردہ رسالہ ''سرسید اسپیکس ٹوڈے'' سرسید ہال کی جانب سے شایع ہوا۔ یہ رسالہ بھی بار بار چھپا۔ جب اسے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے دیکھا تو نظامی صاحب کو لکھا سرسید کے اہم خیالات کو خود انہیں کے الفاظ میں پیش کر کے آپ نے پڑھنے والوں پر احسان کیا ہے۔ میں اسے بار بار دیکھوں گا۔ نظامی صاحب کے ان کاموں سے طلبہ میں علی گڑھ کے تہذیبی نصب العین سے تعلق خاطر شروع ہوا اور اقبال کی یہ شکایت کی ''مسلمانانِ ایشیا اب تک سرسید کی ذہنی کاوش کو سمجھنے کے قابل نہ ہوسکے ہیں''۔ سرسید ہال کے طلبہ کی سطح پر کچھ کم ہونا شروع ہوئی لیکن بعد میں اس سلسلہ کی سطح وہ نہیں رہی جو نظامی صاحب کے دور میں تھی۔ علی گڑھ سرسید کی رہائش گاہ انیسویں صدی میں غالباً سب سے زیادہ طوفان آزمودہ عمارت تھی یہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا سمبل بن کر ابھری تھی، علامہ شبلیؒ کی ذہنی تربیت بھی اسی کے سائے میں ہوئی تھی، وہ ایک عرصے تک اس عمارت کے ایک حصے میں فروکش رہے تھے۔ اقبال کے استاد آرنلڈ علی گڑھ کالج کے پرنسپل تھیوڈر وبک انگریزی کے مشہور صاحب قلم سر والٹر ریلے بابائے اردو مولوی عبدالحق، عورتوں کی تعلیم کے سالار کارواں شیخ عبداللہ کے علاوہ نہ جانے اور کس کس کے لیے یہ عمارت بوسہ گاہ بنی ہوئی تھی لیکن زمانے کی بوقلمونی سے یہ عمارت عرصے تک محکمہ کسٹوڈین کے قبضے میں رہی جس کی وجہ سے اس کے در و دیوار شکستہ ہوگئے اور زاغ وزغن کا مسکن بن گئی۔ نظامی صاحب کو اس کی زبوں حالی کا احساس ہوا اور انہوں نے سرسید ہال کی پرووسٹی کے دوران اس عمارت کو از سرنو تعمیر کرنے کا خواب دیکھا، بالآخر ان کی غیر معمولی جدوجہد کے بعد ۱۹۷۴ء میں اتر دیش کے گورنر اور علی گڑھ کے اولڈ بوائے نواب اکبر علی خاں نے اس عمارت کا افتتاح کیا۔ اس عمارت میں سرسید اکیڈمی قائم ہوئی۔ نظامی صاحب اس کے پہلے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ اس اکیڈمی کے لیے سرسید کے شایان شان ان کے پیش نظر کئی منصوبے تھے۔ انہیں اس کا بڑا ملال تھا کہ اس اکیڈمی کو انہوں نے جہاں چھوڑا تھا اس پر ایک اینٹ کا اضافہ نہ ہوسکا۔

سرسید ہال کے طلبہ سے نظامی صاحب شفقت سے پیش آتے ان کے مطالبات سنتے وہ چاہتے کہ نوجوانوں کی خفتہ صحت مند صلاحیتیں بیدار ہوں اور جب کبھی کوئی ایسی بات دیکھتے جو سرسید ہال کے طلبہ کے شایان شان نہ ہوتیں تو گرم ہوجاتے اور بار بار سرسید کا یہ جملہ دہراتے کہ ''جدید تعلیم نے ہمارے نوجوانوں کو گھوڑے کے بجائے خچر بنا دیا ہے''۔ جس درد اور برہمی سے یہ جملہ دہراتے آج بھی ذہن میں یہ جملہ گونج رہا ہے۔

نظامی صاحب کی روزمرہ زندگی میں ایک مشین کی سی باقاعدگی تھی، اسی وجہ سے انہوں نے کم وبیش پچاس کتابیں تصنیف وتالیف اور مرتب کیں تقریباً دوسو سے زاید ان کے مضامین ملک اور بیرون ملک کے وقیع جرائد میں شایع ہوئے ہیں۔ وہ سحر کے وقت بیدار ہوجاتے اور اپنے علمی کاموں میں لگ جاتے اور جب صبح کی ٹھنڈی ہوا اپنے آنے کی خبر دیتی تو وہ لمبی سیر کو نکل جاتے۔ تو وہ اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں والہانہ انہماک سے کام لیتے۔ انہوں نے شعبہ تاریخ کے زمانہ صدارت میں بھی ہمیشہ پہلا پیریڈ لیا۔ علی گڑھ کی پرووائس چانسلری اور وائس چانسلرشپ کے دوران بھی ان کے اس معمول میں فرق نہ آیا۔

نفاست اور لطافت نظامی صاحب کی طبیعت کا لازمی جز تھا۔ ان کا ذاتی کتب خانہ ان کے علمی شوق کے علاوہ ان کے ذوق جمال کا بھی مظہر ہے۔ انہوں نے اپنی لائبریری کو بڑے تکلف سے آراستہ کیا تھا۔ ایس معلوم ہوتا تھا کہ ان کے کتب خانے کی ہر کتاب لباسِ حریر میں ملبوس ہے، اس کے علاوہ خوشنما تاریخی تصویروں، نادر کتابوں، نایاب مخطوطات کا بڑا اچھا ذخیرہ ہے اور پھر ایسے نفیس فانوس اور خوبصورت لیمپ کہ جن پر نگاہ پڑ جائے تو ہٹانے کو جی نہ چاہے۔ میرا تو خیال ہے کہ اگر ان کا کتب خانہ کوئی عامی بھی دیکھ لے تو اس میں پڑھنے لکھنے کا شوق بیدار ہوجائے۔

نظامی صاحب بنیادی طور پر تاریخ کے عالم تھے اور تاریخ کے حوالے سے ان کی نظر مختلف علوم وفنون پر تھی۔ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ اردو کے علمی سرمائے کو خاصا مالا مال کیا ہے۔ وہ شعر وادب کا بھی کڑھا ہوا ذوق رکھتے تھے۔ اقبال کے مداح تھے کبھی موڈ میں ہوتے تو بہت ڈوب کے ان کے اشعار پڑھتے۔ ان کے کتب خانے میں اقبال پر خاصی کتابیں ہیں جن میں بعض کمیاب ہیں، انہوں نے اقبال کی بعض نادر تحریریں بھی دریافت کی تھیں۔ جن کا علم اردو دنیا کو اب تک نہیں ہے۔ ان سب کو شایع کرنے کا ان کا منصوبہ تھا۔

نظامی صاحب کو اچھے کھانے کا شوق تھا۔ وہ خوش خور تھے مگر پُر خور نہیں تھے۔ اکثر ان کے یہاں دعوتوں کا اہتمام ہوتا جس میں الوان نعمت کی نہایت نفاست اور سلیقے کے ساتھ فراوانی ہوتی۔ انہیں یونیورسٹی کے بہت سے اعلیٰ مناصب ملے، وہ شعبۂ تاریخ کے پروفیسر اور صدر رہے، ڈین اسٹوڈینٹ ویلفیئر رہے، پرووسٹ رہے، پرووائس چانسلر رہے، وائس چانسلر رہے، سرسید اکیڈمی کے بانی ڈائریکٹر رہے، بعد میں شام میں ہندوستان کے سفیر رہے لیکن جہاں بھی رہے شان سے اور آن بان سے رہے۔

سرسید ہال کے قیام کے زمانے ہی سے نظامی صاحب راقم الحروف سے بڑی محبت وشفقت سے پیش آتے۔ انہوں نے اپنی بیشتر تصانیف دیں جن پر ان کے دستخط ثبت ہیں۔ ان میں ان کا مرتب کردہ سرسید البم بھی ہے جو خاصا گراں ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ان کی شفقت کریمانہ کی شاید یہ وجہ رہی ہو کہ ہم دونوں سرسید کی تاریخ آفریں خدمات اور ان کی سیرت اور شخصیت کا بڑا احترام کرتے۔ میں سرسید ہال کا ان کے زمانے میں ایک جونیر طالب علم تھا۔ سینیر نہیں تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے مجھے اپنی انگریزی کتاب ''سید احمد خاں'' اردو میں منتقل کرنے کے لیے دی اور انہیں کی ایما سے اس کتاب کو حکومت ہند نے شایع کیا۔ اس اردو کتاب کے کئی کئی ہزار کے کئی ایڈیشن نکلے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب نے میری زندگی کا رخ متعین کردیا۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی برصغیر کے سرآمد مورخین میں ہیں۔ ان کے علمی کاموں کی وجہ سے علمی دنیا میں علی گڑھ یونیورسٹی کا نام روشن ہوا۔ ان کے علمی اور تاریخی کارناموں پر تنقید اور تبصرہ کا یہ موقع نہیں ہے لیکن یہ کہے بغیر بھی نہیں رہا جاسکتا کہ انہوں نے ہندوستان کے دور وسطیٰ کی تاریخ کو کھنگالا اور مختلف واقعات اور کوائف سے اس دور کے مزاج اور انداز فکر کو اس طرح مصفا کیا کہ وہ موجودہ دور کے آئینے میں دکھائی دینے لگا۔ دورِ وسطیٰ کی تاریخ کے سلسلے میں انہوں نے خاصا دقیع سرمایہ چھوڑا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بین الاقوامی سطح پر ان کی تحریریں سرمہ اہل نظر بنی ہوئی ہیں۔

علی گڑھ میں نظامی صاحب کا وسیع وعریض دولت خانہ میرے غریب خانے سے چند قدموں کے فاصلے پر ہے اس لیے اکثر ایسا ہوتا کہ جمعہ کی نماز کے بعد ہم دونوں مسجد سے ساتھ نکلتے اور باتیں کرتے راقم ان کے دولت سرا کے دروازے تک جاتا۔ ۵ دسمبر جمعہ کا دن تھا میری ملاقات مسجد میں ان سے حسب معمول ہوئی میں ان کے ساتھ ان کے آستانے تک گیا، قدرت نے ان کو توانائی کا جو خزانہ ودیعت کیا تھا وہ اس روز بھی موجود تھا، وہی بلند آہنگی، رفتار میں سرعتِ زندگی سے لبریز باتیں کچھ دیر ان کے دروازے پر ہم باتیں کرتے رہے، میں نے ان سے مصافحہ کیا اور رخصت ہوا۔ شام کو معلوم ہوا کہ یکا یک قلب کی حرکت بند ہوجانے سے ان کا انتقال ہوگیا۔ یقین نہیں آیا۔ پھر تیس سال کی ملاقاتوں کی تصویر یکے بعد دیگرے آنے لگیں۔

۶/دسمبر ۱۹۹۷ء کی شام کو جب سورج لحظہ بہ لحظہ اوٹ میں چھپ رہا تھا اور ماتمی جلوس نظامی صاحب کے جسد خاکی کو آخری آرام گاہ کی طرف لے جارہا تھا ہزارہا آدمیوں کی دعاؤں کے ساتھ یونیورسٹی کے قبرستان میں انہیں سپرد خاک کردیا گیا اور اسی کے ساتھ سرسید کا ایک شیدائی علی گڑھ کی علمی زندگی کی آبرو اور ہندوستان کے دور وسطیٰ کی تاریخ کا آفتاب بھی غروب ہوگیا کل ۱۲/دسمبر اور جمعہ کا روز تھا، میری آنکھیں انہیں مسجد کی صفوں میں تلاش کرتی رہیں:

پھر نہ آئے جو ہوئے خاک میں جا آسودہ
غالباً زیر زمیں میؔر ہے آرام بہت

(جنوری ۱۹۹۸ء)

قاسمی، عثمان احمد، مولانا

آہ! مولانا عثمان احمد قاسمی چل بسے

۴/رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ کو راقم الحروف کے ایک کرم فرما اور دارالمصنفین کے ہمدرد مولانا عثمان احمد قاسمی اللہ کو پیارے ہوگئے، اس کی اطلاع موصوف کے حقیقی بھانجے ڈاکٹر محمد اسامہ کے ایک خط سے ہوئی جو انتقال کے دو ہفتے بعد ملا، یہ خبر سخت تکلیف دہ تھی اور جنازہ کی شرکت سے محرومی کا تو ہمیشہ ملال رہے گا۔

شاہ گنج اور جونپور کے وسط میں پختہ سڑک کے قریب ہی غوری النسل لوگوں کی مشہور بستی پسری ان کا آبائی وطن تھا۔ ان کے جدامجد حضرت سلطان شاہ، ٹانڈہ کے مشہور صاحبِ دل بزرگ حضرت چاند شاہ کے اجل خلفاء میں تھے جو نقشبندی سلسلے سے منسلک تھے اور فیض آباد ہی نہیں اعظم گڑھ، جونپور اور سلطانپور وغیرہ کے لوگوں کو بھی ان سے بڑا فیض پہنچا۔

پسری کا یہ خاندان علمی، دینی اور دنیاوی لحاظ سے فائق تھا۔ مولانا عثمان احمد قاسمی کے جد بزرگوار کے حسبِ ذیل تین صاحبزادے تھے، مولانا عبدالغفور صاحب، مولانا دین محمد صاحب، مولانا شاہ سعید احمد صاحب، موخرالذکر کے پانچوں بیٹے دینی تعلیم سے بہرہ ور ہوئے، ان میں بڑے مولانا جمیل احمد فخرِ خاندان تھے اور سب سے چھوٹے یہی مولانا عثمان احمد تھے، مولانا دین محمد صاحب بھی عالم، اچھے استاد اور نہایت باغ وبہار شخص تھے، یہ مولانا ابوالعرفان ندوی سابق مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء کے پدر بزرگوار تھے، علم ودین کی اشاعت ان کی زندگی کا خاص مشغلہ تھا، جونپور کی اٹالہ مسجد کا مدرسہ ان کے اہتمام کے زمانے میں بڑی رونق پر تھا۔

مولانا دین محمد صاحب کی جدوجہد سے شاہ گنج کی جامع مسجد میں بھی ایک دینی مدرسہ بدرالاسلام کے نام سے قائم ہوا، جس کے وہی سارے انتظامات اور تعلیمی

خدمات انجام دیتے رہے مگر جب ان کے برادر زادہ اور خویش مولانا جمیل احمد صاحب دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے تو مدرسہ کا اہتمام تعلیمی نگرانی اور جامع مسجد کی امامت ان کے سپرد ہوگئی، اور مولانا دین محمد صاحب مدرسہ کے مالی استحکام کی طرف متوجہ ہوگئے، مولانا جمیل احمد نے اس علاقہ میں بڑی عزت، شہرت اور نیک نامی حاصل کی۔ ان کے اخلاص، عزم، استقلال، جوش عمل اور حسنِ تدبر کی وجہ سے مدرسہ کو بڑی ترقی ہوئی، ابھی تک مسجد ہی تعلیم گاہ کا کام دیتی تھی، انہوں نے اس کی شاندار دومنزلہ عمارت تعمیر کرائی اور متوسطات تک اسباق کا سلسلہ جاری کیا۔ ہر سال کئی طالب علم دورۂ حدیث اور تکمیل کے لیے دارالعلوم دیوبند جانے لگے۔

مولانا عثمان احمد کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، پھر اسی مدرسہ میں داخل ہوکر اپنے برادر بزرگ مولانا جمیل احمد صاحب کی خاص نگرانی میں تعلیم و تربیت کے مراحل طے کیے اور ۱۹۵۳ء میں تکمیل کے لیے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے اور مولانا حسین احمد مدنیؒ اور دوسرے مشہور اساتذہ سے کسب فیض کیا، مولانا جمیل احمد صاحب بھی حضرت مدنیؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے اور ان سے بیعت بھی تھے، اس پورے خاندان کو ان سے بڑا انس اور خاص تعلق تھا۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد مولانا عثمان احمد اپنے مربی اور سرپرست بھائی کی رہنمائی میں مدرسہ بدرالاسلام میں درس و تدریس کی خدمت انجام دینے لگے۔

۱۹۶۳ء میں مولانا جمیل احمد صاحب کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے اور مولانا عثمان کے بڑے بھائی مولانا احمد کو ان کی جان نشینی کا شرف حاصل ہوا تو مولانا عثمان ان کے خاص دست و بازو بنے اور جب ان کا بھی انتقال ہوگیا تو مدرسہ کی ساری ذمہ داریاں مولانا عثمان کے کاندھوں پر آگئیں، انہوں نے اپنی ہمت، جانفشانی اور تدبر سے مدرسہ کو بڑی خوش اسلوبی سے چلایا اور اس کے رکھ رکھاؤ میں کسی طرح کا فرق نہیں آنے دیا۔ انہوں نے مدرسہ کو ترقی و استحکام بھی بخشا اور فیض جمیل لائبریری کی تاسیس بھی کی، بازار میں علمی کتاب گھر قائم کیا تاکہ لوگوں کو سستے دام پر کتابیں فراہم کرسکیں۔

مولانا جمیل احمد صاحب کے زمانے ہی سے مدرسہ میں علماء و مشائخ کی آمد و رفت برابر رہتی تھی، دارالعلوم دیوبند اور جمعیۃ علمائے ہند کے اکثر اکابر یہاں تشریف لاتے رہے ہیں اور جن لوگوں کو آنے کا موقع نہ رہتا اور مولانا کو اطلاع ہوجاتی تو وہ خود اپنے اساتذہ وطلبہ کو لے کر اسٹیشن پہنچ جاتے اور ملاقات کرتے، مولانا عثمان صاحب نے بھی اس روایت کو برقرار رکھا، اس طرح مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا قاری طیب، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا سید محمد میاں، مولانا اسعد مدنی وغیرہ سب یہاں تشریف لاچکے ہیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ بھی دارالمصنفین تشریف لاتے تو کچھ دیر مدرسہ میں قیام فرماتے اور اب کئی برس سے پیرانہ سالی کی بنا پر یہاں استراحت فرمانا ان کا معمول ہوگیا ہے، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی بھی اپنے وطن ردولی اور لکھنؤ وغیرہ جاتے آتے مدرسہ میں قیام کرکے بڑا سکون محسوس کرتے، خود اس ناچیز کو بھی اس کا اتفاق کئی بار ہوا ہے۔

اخلاص، استغنا، سیرچشمی، مخلصانہ اور بے غرض خدمت اس خاندان کی نمایاں خصوصیت تھی، مولانا عثمان احمد میں بھی یہ خوبیاں بدرجہ تم پائی جاتی تھیں، بڑے مزاج شناس تھے، سب کے ساتھ حسبِ حال اچھا برتاؤ کرتے، فرق مراتب اور دوسروں کے حقوق کا پاس ولحاظ رکھتے تھے، ان کے سب بھائیوں میں باہم جو خلوص، یگانگت، شیفتگی اور سچی محبت تھی اس کے نمونے اب بالکل دیکھنے کو نہیں ملتے۔

شعر وسخن سے دلچسپی اور اس کا ستھرا ذوق بھی اس خاندان کا امتیاز تھا، مولانا جمیل احمد صاحب کے بعد مولانا عثمان احمد میں یہ وصف زیادہ بڑھا ہوا تھا، انہوں نے بڑی موزوں طبیعت پائی تھی، مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ بات بات میں ارتجالاً بہت برمحل اور موقع کے مناسب شعر کہتے تھے، اساتذہ کے بکثرت اشعار یاد تھے اور دور جدید کے شعراء کا کلام بھی ان کی نظر سے گزرتا رہتا تھا، اپنی مجلسوں کو قدیم و جدید شعراء کا کلام سنا کر زعفران زار بنا دیتے تھے۔ میں بھی ایک دفعہ رات کے کھانے میں شریک تھا کھانے کے درمیان اور اس کے بعد دیر تک شعر و شاعری کا سلسلہ چلتا رہا، وہ اشعار سنانے کے ساتھ ہی ان کا پس منظر بھی بیان کرتے جاتے تھے، جنگ عظیم کے زمانے میں اتحادیوں کی پسپائی سے خیال ہونے لگا تھا کہ ہندوستان بھی اب تب زد میں آجائے گا، اسی موقع کا کہا ہوا نذیر بنارسی کا یہ شعر سُنایا ؎

برق گرے گرا کرے، چمن جلے چلا کرے
جس کا چمن میں کچھ نہ ہو فکر چمن وہ کیا کرے

اردو نثر لکھنے کا اچھا سلیقہ تھا، اپنے برادر اکبر کے حالات و کمالات پر ''ذکر جمیل'' کے نام سے ایک کتاب مرتب کی۔ ان کا مجموعہ کلام ''فکر جمیل'' کے نام سے شایع کیا، مدرسہ بدرالاسلام کی تاریخ لکھی، گو ان کا سارا وقت درس و تدریس اور مدرسہ کے انصرام میں صرف ہوتا تھا، تاہم لکھنے پڑھنے کا ذوق فطری تھا، چھوٹی بڑی ایک درجن سے زیادہ کتابیں لکھیں جن میں بعض مکاتب کے نصاب میں داخل ہیں۔

دارالمصنفین سے والہانہ تعلق تھا، معارف کے بڑے قدرداں تھے، اس کا مطالعہ پابندی سے کرتے، شاہ معین الدین احمد صاحب سے عقیدت مندانہ تعلق تھا، شاہ صاحب بھی ان سے بڑے لطف و شفقت کا معاملہ فرماتے تھے، اس عاجز سے بھی بڑا گہرا تعلق تھا۔ اب عرصہ سے بیماری کی وجہ سے کہیں آنا جانا موقوف ہوگیا تھا تو اپنے عزیز شاگرد عبدالمعبود نادان بستوی کو برابر بھیج کر تعلق و محبت کا اظہار فرماتے رہتے تھے۔ دو برس قبل ان پر شدید قلبی دورہ پڑا مجھے معلوم ہوا تو عیادت کے لیے حاضر ہوا،

اس وقت جس تپاک اور گرم جوشی سے ملے تھے اس کی یاد ابھی تک قائم ہے، میں نے اپنی بچی کے عقد میں بلایا تو بیماری کی وجہ سے خود نہیں تشریف لاسکے مگر اپنے ایک صاحبزادے کو بچی کے لیے مترجم قرآن مجید دے کر بھیجا۔

وہ تو چلے گئے مگر لطف و محبت کی بے شمار یادیں چھوڑ گئے، اب عمر بھر یہی کہتے رہنا ہے:

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

پس ماندگان میں اہلیہ تین صاحبزادے اور پانچ صاحبزادیاں ہیں، اللہ تعالیٰ ان سب کا غم زائل کرے اور مولانا کو ان کی نیکیوں اور خوبیوں کے سبب جنت الفردوس عطا کرے، آمین!! (''ض''، فروری ۱۹۹۸ء)

بھوپالی، محمود خان، مولوی حافظ

مولوی حافظ محمود خاں بھوپالی

یہ سطریں زیرِ تحریر ہی تھیں کہ دارالعلوم تاج المساجد کے استاد مولوی عبدالسبحان صاحب تشریف لائے، ان سے یہ معلوم کر کے سخت صدمہ ہوا کہ مولانا حافظ محمد نعمان خاں کے صاحبزادے اور مولانا حافظ محمد عمران خاں کے بھتیجے حافظ محمود خاں بھوپالی نے ۲۰؍رمضان لمبارک کو داعیِ اجل کو لبیک کہا وہ ہمارے سابق رفیق مولوی حافظ محمد منصور نعمانی مرحوم کے حقیقی بھائی تھے، پہلے دارالعلوم کے کتب خانہ کے ناظر تھے اب اس کے نائب مہتمم اور ڈاکٹر محمد حسان خاں امیر دارالعلوم کے خاص دست و بازو ہوگئے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور مولانا نعمان صاحب اور دوسرے اعزہ کو صبر جمیل عطا کرے۔ (''ض''، فروری ۱۹۹۸ء)

ندوی، حبیب الحق، پروفیسر

پروفیسر حبیب الحق ندوی

فروری کا معارف چھپ چکا تھا کہ پروفیسر حبیب الحق ندوی کے انتقال کی اندوہ ناک خبر ملی۔ وہ باڑھ (پٹنہ) کے سادات کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے، مدرسۃ الاصلاح سرائمیر میں میری طالب علمی کے زمانے میں ان کے دو چھوٹے بھائی بھی تعلیم حاصل کر رہے تھے جن سے ملنے کبھی کبھی حبیب الحق صاحب بھی آجاتے تھے، وہ خود بھی یہاں زیرِ تعلیم رہ چکے تھے، پھر پاکستان چلے گئے اور عرصہ سے جنوبی افریقہ کی ڈربن یونیورسٹی سے وابستہ تھے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ سے بیعت تھے، ان سے ملنے لکھنؤ آتے رہتے تھے، اسی سلسلے میں ایک دفعہ بے سان و گمان دارالمصنفین بھی پہنچے، لکھنؤ سے اعظم گڑھ کا یہ سفر بڑا مشقت طلب رہا مگر دارالمصنفین کو دیکھتے ہی ان کی ساری کلفت دور ہوگئی، سرائمیر جانے کی خواہش کی جہاں کی سادگی اور اپنے زمانہ کے استاذوں کے ایثار و قناعت کے بڑے مداح تھے۔ ایک اور دفعہ ندوۃ العلماء میں روس کی آزاد مسلم ریاستوں کے بارے میں میں نے ان کا پُر از معلومات خطبہ سُنا تو انہیں اعظم گڑھ آنے کی دعوت دی یہاں بھی ان کی تقریر بہت پسند کی گئی جس سے ان کے علم و مطالعہ کی وسعت، حالاتِ حاضرہ سے باخبری اور ملی درد کا اندازہ ہوتا ہے۔ دارالمصنفین سے ان کو قلبی لگاؤ تھا، معارف پابندی سے پڑھتے، اس میں ان کے مضامین اور خطوط بھی شایع ہوتے تھے، اپنا سہ ماہی انگریزی رسالہ اور تمام کتابیں یہاں بھیجتے، ادھر عرصہ سے ان کا حال معلوم نہیں ہوا تھا، دفعتہً ان کے ارتحال کی خبر آگئی۔ اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے اور متعلقین کو صبر و شکیب بخشے، آمین۔ (''ض''، مارچ ۱۹۹۸ء)

احمد، عتیق، منشی

منشی عتیق احمد

فروری ہی میں دارالمصنفین کے پریس کے منصرم منشی عتیق احمد صاحب نے لکھنؤ میں داعی اجل کو لبیک کہا، ان کے والد بزرگوار منشی صدیق احمد صاحب بھی جو مولانا مسعود علی ندوی مرحوم کے حقیقی بھانجے تھے، پریس کے انچارج رہ کر عرصہ تک دارالمصنفین کی خدمت کرتے رہے، منشی عتیق کو دمہ کا موذی مرض تھا جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوا، دارالمصنفین میں وہ مولانا مسعود علی ندوی کے خاندان کی آخری یادگار تھے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ (''ض''، مارچ ۱۹۹۸ء)

خان، ایم۔ حبیب

ایم۔ حبیب خاں

یہ سطریں زیرِ تحریر تھیں کہ معلوم ہوا کہ جناب ایم حبیب خاں بھی رحلت فرما گئے وہ انجمن ترقی اردو ہند کے اسسٹنٹ سکریٹری اور جناب خلیق انجم جنرل سکریٹری کے دست راست تھے، نیک طبع اور شریف انسان تھے، جب بھی ملاقات ہوتی تو اپنے خلوص و محبت کا نقش دل پر بٹھا دیتے، دارالمصنفین سے بھی لگاؤ رکھتے، گزشتہ برس لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تو دیر تک اس کے مسائل پر تبادلہ خیال کرتے رہے، مدت دراز سے انجمن سے وابستہ تھے، ادب و تنقید ان کا خاص موضوع تھا، اس پر ان کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں، ۶۴/۶۵ برس عمر رہی ہوگی اور صحت اچھی تھی مگر دو ماہ قبل جگر کے کینسر کا عارضہ ہوا اور چل بسے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کاملہ سے نوازے۔

(''ض''، مارچ ۱۹۹۸ء)

احمد، مقبول، پروفیسر

پروفیسر مقبول احمد

یہ سطریں زیرِ تحریر تھیں کہ ایک بڑے عالم و فاضل اور محقق پروفیسر مقبول احمد کی وفات کی خبر ملی، اِنـاللہ وَ اِنـا اِلَیـہ رَاجِعُون ۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ عربی و اسلامیات سے برسوں وابستہ رہے، انھی کی کوششوں سے یونیورسٹی میں ویسٹ ایشین اسٹڈیز کا شعبہ قائم ہوا، پھر کشمیر چلے گئے اور کشمیر یونیورسٹی میں سینٹرل ایشین اسٹڈیز کا سینٹر اور اسلامی کتب و نوادر کا میوزیم قائم کیا، شاہ حسین کی دعوت پر مشیر تعلیم کی حیثیت سے اردن گئے ۔ مغربی ممالک کی سیاحت بھی کی برسوں آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کے جنرل سکریٹری رہے، جس کے باوقار سیمینار ملک بھر میں ہوتے تھے، حکومت ہند کے عربی مجلّہ ثـقـافـة الهند کے مدیر اور ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ کے سہ ماہی رسالہ ''اسلام و عصر جدید'' کی ادارت سے بھی منسلک رہے، ریٹائرڈ ہونے کے بعد پروفیسر ایمرٹس ہوئے، تصنیف و تالیف سے برابر اشتغال رہا اور مختلف علمی و تحقیقی کام انجام دیئے، شریف ادریسی کی شہرہ آفاق تصنیف نـزهة الـمشتـاق فـی اختـراق الآفـاق کے ہندوستان سے متعلق حصے کی اشاعت ان کا بڑا کارنامہ ہے، جس کو ان کے عالمانہ مقدمہ، انڈکس اور محققانہ حواشی نے چار چاند لگا دیا ہے، اللہ تعالیٰ عالم آخرت میں بھی ان کے درجات بلند کرے، آمین !!

(''ض''، اپریل ۱۹۹۸ء)

دسنوی، سید شہاب الدین

آہ! سید شہاب الدین دسنوی!

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی میں اس کے معتمد جناب سید شہاب الدین دسنوی کی وفات کی خبر نہایت رنج و افسوس کے ساتھ سنی گئی ۔ ۱۰/ اپریل کو ان کے صاحبزادے جناب امتیاز دسنوی کا یہ تار آیا کہ ''میرے ابا جان ۳۰/ مارچ کو انتقال فرما گئے'' ۔ انـاللہ و انـا الیـہ راجعون ۔ اس کی مزید تصدیق اور تعزیت کے لیے اسی روز ان کے گھر فون کیا گیا ۔ اپریل کا معارف عیدالاضحیٰ کی وجہ سے پہلے ہی لکھا اور مرتب کیا جا چکا تھا ۔ اس لیے اس میں اس حادثہ فاجعہ کی اطلاع دینے کی بھی گنجائش نہیں تھی ۔

وہ ۶/ جولائی ۱۹۱۳ء کو بہار کے مردم خیز گاؤں دسنہ میں پیدا ہوئے، شرفا و سادات کی یہی بستی علامہ شبلیؒ کے بے تکلف دوست شاہ تجمل حسین، ان کے خاص عقیدت مند مولوی عبدالحکیم اور شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی کا بھی وطن تھی اور دارالمصنفین کے وابستگان میں مولوی سید ابوظفر ندوی، پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن بھی اسی سرزمین کے لعل و گہر تھے ۔

سید شہاب الدین دسنوی صاحب کی ابتدائی تعلیم دسنہ کے مدرسہ الاصلاح میں ہوئی، مونگیر سے میٹرک کیا ۔ وہاں ان کے والد بزرگوار جناب سید ارادت حسین صاحب سرکاری ملازم تھے، بہار نیشنل کالج پٹنہ سے انٹرمیڈیٹ اور سینٹ زیویرس کالج کلکتہ سے بی ۔ ایس ۔ سی کیا، اس وقت ان کے ماموں سید نجیب اشرف صاحب اسمٰعیل کالج بمبئی میں اردو کے لکچرر تھے، ان کے ایک صاحبزادے کو ٹائیفائڈ ہوگیا تو انہوں نے ان کی تیمارداری کے لیے تار دے کر اپنے بھانجے کو بمبئی بلایا، یہ بمبئی گئے تو پھر وہیں کے ہو رہے اور اپنا علم و ہنر اور لیاقت و قابلیت سب اسے نثار کر دیا، پہلے انجمن اسلام ہائی اسکول میں ٹیچر پھر اس کے پرنسپل ہوئے اور آٹھ نو برس بعد صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ کے پرنسپل ہوگئے اور عرصہ دراز تک انجمن کے اعزازی جنرل سکریٹری رہے، صابو صدیق کی از سر نو تنظیم کر کے اسے زیادہ مفید اور موثر بنانے کی جدوجہد کرتے رہے، ان کے زیر اہتمام ۱۹۶۱ء میں اس کی سلور جبلی دھوم دھام سے منائی گئی ۔ غرض ان کی محنت، کارگزاری، خوش انتظامی اور سلیقہ مندی نے ان اداروں کو بڑا متحرک اور انہیں بہت نیک نام بنا دیا تھا ۔ ۱۹۶۱ء میں حکومت ہند کی وزارت تعلیم نے منتخب اساتذہ کو نیشنل ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا تو مہاراشٹر کی فہرست میں مسلمانوں میں تنہا ان کا نام تھا ۔ اس کے ۵۰۰ روپے انہوں نے انجمن ہی کو نذر کر دیئے تھے، کیونکہ اسی کی بدولت یہ اعزاز ملا تھا، ۱۹۸۶ء میں انجمن کی صد سالہ تقریب کے موقع پر اس کی تاریخ لکھنے کا کام انہیں سپرد ہوا، جس کے وہ بڑے واقف کار تھے ۔

ان میں بڑی قوت عمل تھی اور وہ اچھی تنظیمی صلاحیت کے مالک تھے، پروگرام اور منصوبوں کی تشکیل، جلسوں کے ایجنڈے، نظام الاوقات کی ترتیب اور اداروں کے بجٹ بنانے وغیرہ کے ماہر تھے، ان کا یہ جوہر طالب علمی ہی کے زمانے سے کھلنے لگا تھا ۔ پٹنہ بی ۔ این کالج میں ''بزم اردو'' قائم کی اور ایک اچھا اور بڑا مشاعرہ کرایا، اسی زمانے سے تقریری مقابلوں میں بھی حصہ لیتے تھے ۔ سینٹ زیویرس کالج کلکتہ میں اردو لٹریری سوسائٹی قائم کی جس کے ماتحت تحریری و تقریری مقابلے کراتے، کلکتہ میں مسلمانوں کے ادبی و ثقافتی مرکز مسلم انسٹی ٹیوٹ کے اورینٹل سیکشن کے ناظم ہوئے اور اس کے جلسہ میلاد میں مولانا ابوالکلام آزاد کو تقریر کے لیے مدعو کیا ۔ ان کی باقاعدہ عملی زندگی اور سرگرمیوں کا آغاز بمبئی میں ہوا، یہاں کی اکثر ادبی و ثقافتی تقریبات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے ۔ اکثر ادبی، تعلیمی اور ثقافتی کمیٹیوں کے رکن بھی تھے اور اپنی تنظیمی اور منصوبہ سازی کی صلاحیت کی وجہ سے نیم مردہ اداروں اور تحریکوں میں جان ڈال دیتے تھے، تعلیم بالغان کی غیر سرکاری کمیٹی کے وہ ۱۹۵۳ء میں ممبر ہوئے تو مدرسین کے سامنے بالغوں کی نفسیات اور طریقہ تعلیم پر لکچر دینے اور وقتاً فوقتاً کلاسوں کا معائنہ کرنے کا کام ان کو سپرد ہوا، اس کے لیے اردو کا قاعدہ لکھا، ایک پندرہ روزہ اخبار ''رہبر'' بھی اس مہم کو کامیاب بنانے کے لیے جاری ہوا، جس کی عملاً ادارت انہوں نے اپنے رفیق کار

عبدالرزاق قریشی مرحوم کے تعاون سے انجام دی۔ ۵۹ء میں ریاستی حکومت نے ٹکنیکل اداروں کے ملازمین کی تنخواہوں کے گریڈ اور ان کے لیے قواعد وضوابط مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی جس کے وہ چیرمین تھے، آزادی کے بعد جمعیۃ علمائے ہند کے زیر اہتمام مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے بمبئی میں آل انڈیا تعلیمی کنونشن کرایا تو اس میں بھی پیش پیش رہے، جمعیۃ کے کل ہند اجلاس سورت میں بھی شریک ہوئے اور مفید تجویزیں پیش کیں، بمبئی کی انتخابی اور سیاسی سرگرمیوں سے بھی سروکار رکھتے، انجمن کے عہدہ دار ہونے کے وجہ سے کسی خاص پارٹی سے وابستہ ہونا ان کے لیے ممکن نہیں تھا تاہم اچھے اور مناسب امیدواروں کی انتخابی مہم کی ساری ذمہ داری اپنے سر لے لیتے تھے۔ ایک بار وہ خود بھی بمبئی میونسپل کارپوریشن کے ایک ضمنی الیکشن میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہوئے اور کامیاب ہوئے، دوبارہ پھر انتخابی دنگل میں کودے اور پورے پانچ برسوں کے لیے ممبر منتخب ہوئے، اس عرصہ میں کارپوریشن کی تعلیمی کمیٹی اور ریسرچ یونٹ کے ممبر کی حیثیت سے مفید خدمات انجام دیں۔

ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ ان کے کانوں میں دارالمصنفین کا نام گونجنے لگا تھا، مولانا سید سلیمان ندوی ناظم دارالمصنفین اور ان کے ماموں سید نجیب اشرف ندوی کے علاوہ ان کے ہم وطن، مولانا سید ابوظفر ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب اس سے وابستہ تھے، سید صاحب کے خواجہ تاشوں میں مولانا عبدالسلام ندوی اور مولوی مسعود علی ندوی بھی خاص موقعوں پر دسنہ جایا کرتے تھے اس لیے دارالمصنفین سے ان کو بڑا تعلیمی لگاؤ تھا اور کبھی کبھی یہاں تشریف بھی لاتے تھے، بعد میں وہ اس کی مجلس انتظامیہ کے بڑے سرگرم ممبر بھی ہوگئے، ان کی اور بعض دوسرے قدردانوں کی دعوت پر سید صاحب نے بمبئی میں ''عربوں کی جہاز رانی'' پر لکچر دیا۔ ۱۹۶۵ء میں دارالمصنفین کی گولڈن جوبلی منائی گئی، اس کے اخراجات کی فراہمی کے لیے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحبان نے بمبئی کا سفر کیا تو انہوں نے اور خصوصاً منشی عبدالعزیز انصاری رکن دارالمصنفین نے اس وفد کی بڑی پذیرائی کی۔ ۷۲ء میں دارالمصنفین کی مالی حالت بہتر بنانے کے لئے اس کا جلسہ انتظامیہ بمبئی میں ہوا، اس موقع پر بھی ان کی اور منشی جی مرحوم کی کوششوں سے متعدد حضرات دارالمصنفین کے لائف ممبر بنے، شہاب صاحب انجمن سے سبکدوش ہوئے تو صباح الدین صاحب نے چاہا کہ وہ دارالمصنفین کے انتظامی امور کو سنبھال لیں، ان کی زندگی میں تو وہ اس کے لیے اپنے کو فارغ نہیں کرسکے مگر ان کی وفات کے بعد ۸۷ء میں وہ اس کے انتظامی امور کے معتمد مقرر ہوئے تو چندے دن یہاں قیام کیا مگر جلد ہی اپنی پیرانہ سالی اور خانگی ضرورتوں کی وجہ سے جناب عبدالمنان ہلالی کو اپنا قائم مقام بنا کر پٹنہ چلے گئے، ادھر کئی برس سے ان کی معذوری اتنی بڑھ گئی تھی کہ سفر کرنا ممکن نہ تھا، اس لیے دارالمصنفین کے جلسوں میں شریک ہونا اور اعظم گڑھ آنا جانا موقوف ہوگیا تھا۔ تاہم خط وکتابت اور فون سے ہم لوگوں کا رابطہ قائم رہتا اور ہم ان کے تجربوں، مشوروں اور ہدایات سے فائدہ اٹھاتے، ان کی موجودگی بڑی تقویت کا باعث اور سہارا تھی، افسوس اب یہ سہارا بھی ختم ہوگیا۔

ان کی دلچسپی اور سرگرمی کا ایک میدان انجمن ترقی اردو بھی تھا، اس کی وجہ سے وہ پوری اردو دنیا میں روشناس تھے، ان کی اور بعض دوسرے مخلصین کی کوشش سے ۱۹۴۴ء میں انجمن کی شاخ بمبئی میں قائم ہوئی جس کے وہ جنرل سکریٹری چنے گئے، انہوں نے انجمن کو سرگرم بنانے کے لیے اردو کانفرنس اور آل انڈیا مشاعرہ کا انعقاد کرایا، ۱۹۵۱ء میں انجمن ترقی اردو ہند کا دفتر علی گڑھ میں تھا اور قاضی عبدالغفار مرحوم اس کے سکریٹری تھے، اسی زمانے میں ان کا اس سے تعلق ہوا، وہ اس کے حیاتی رکن اور متعدد ذیلی کمیٹیوں کے ممبر تھے۔ انجمن کے موجودہ جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم کے وہ خاص دست راست تھے۔ مالیاتی کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے وہی انجمن کا سالانہ بجٹ بنا کر مجلس عام میں پیش کرتے، ۱۹۸۳ء میں وہ اس کے نائب صدر ہوئے، انجمن سے اتنا گہرا تعلق تھا کہ اس کے جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے اور کبھی ناغہ نہیں کرتے۔

انہوں نے کئی بیرونی ملکوں کی سیاحت بھی کی، کہیں لکچر دینے اور کہیں مقالہ پڑھنے کے لیے مدعو کیے گئے، ۱۹۵۲ء میں امریکا کا تعلیمی سفر کیا، واشنگٹن جاتے ہوئے طہران، قاہرہ، ایتھنس، روم، سوئزرلینڈ، پیرس، لندن اور نیویارک کی بھی سیاحت کی۔ ۷۹ء میں آسٹریلیا گئے اور میلبورن میں اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر کچھ لکچر دیئے، اسی ضمن میں میلبورن یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات وعربی میں بھی اسلام پر لکچر دیا۔ ۸۵ء میں ترکی کا سفر کیا اور استنبول کے ایک سمینار میں مقالہ لکھا، اپنے بعض اعزہ، اکلوتی بہن اور بیٹی سے ملنے پاکستان گئے، ۱۹۷۰ء میں حج وزیارت کے لیے حرمین شریفین میں حاضری دی۔

بمبئی کو خیرباد کہہ کر دسنوی صاحب مستقل رہائش کے لیے پٹنہ آئے تو یہاں کی تعلیمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا لازمی جز ہوگئے، میں خدا بخش لائبریری پٹنہ کے سیمیناروں میں جاتا تو وہاں ان سے ضرور ملاقات ہوتی، بہار اردو اکاڈمی کے وائس چیرمین ہوئے تو دسمبر ۸۴ء میں فخر بہار علامہ سید سلیمان ندوی پر ایک اچھا اور باوقار سیمینار کرایا، بعض دوسرے ادیبوں اور شاعروں پر بھی سیمینار کرائے، اس سے کچھ پہلے انہوں نے حکیم عبدالحمید صاحب متولی ہمدرد دواخانہ کی خواہش پر ہمدرد کے ایڈمنسٹریری کی ذمہ داری قبول کرکے اس کی خدمت کی۔

دسنوی صاحب کا زیادہ وقت علمی وتعلیمی کاموں کی نگرانی اور تعلیم گاہوں اور اداروں کے انتظام وانصرام میں گزرا، اس لیے انہیں تصنیف وتالیف کا موقع کم ملا لیکن

علم ومطالعہ سے شغف اور تقریر وتحریر کا اچھا سلیقہ تھا، وقتاً فوقتاً اردو اور انگریزی اخباروں میں مضامین لکھتے، درس وتدریس کے پیشہ سے وابستگی کی وجہ سے انہوں نے چند درسی کتابیں لکھیں، جن میں ’’بچوں کا قاعدہ‘‘ اور ’’ہمارا دین‘‘ بہت مقبول ہیں، یہ کتابیں بڑی محنت اور دماغ سوزی سے لکھی گئی ہیں۔ اول الذکر مہاراشٹر کے پرائمری اسکولوں میں داخل نصاب تھی اور موخر الذکر کو ہمدرد فائونڈیشن کراچی نے شائع کیا اور مراٹھی اور گجراتی میں اس کے ترجمے ہوئے۔ کانجی دوار کا داس نے ہندوستان کی جنگ آزادی پر انگریزی میں دو جلدوں میں ایک کتاب لکھی تھی، دسنوی صاحب نے اس کے ان حصوں کو بہت مربوط طریقے سے یکجا کرکے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ جو محمد علی جناح سے متعلق تھے، ’’کیمیا کی کہانی‘‘ اور ’’آئن اسٹائن کی کہانی‘‘ معلومات افزا اور عام فہم کتابیں ہیں۔ ’’شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں‘‘ لکھ کر انھوں نے شبلوی ہونے کا حق ادا کیا ہے، انجمن کے سو سال، سیرت لکچر (انگریزی) کے علاوہ ’’دیدہ وشنیدہ‘‘ کے نام سے اپنے خودنوشت حالات لکھے ہیں جو دلچسپ اور سبق آموز ہیں، ان کے چھ افسانوں کا مجموعہ ’’پہلو بہ پہلو‘‘ بھی چھپا ہے، ان میں سے اکثر کتابوں پر ایوارڈ بھی مل چکا ہے، وہ بڑی سلیس، شگفتہ اور حشو وزوائد سے پاک اردو لکھتے تھے۔

شہاب الدین صاحب ایک باغ وبہار اور مرنجان مرنج شخص تھے، شکل وصورت بڑی پاکیزہ تھی، نکلتا قد، گورا رنگ، پہلی ہی نظر میں آدمی ان سے متاثر ہوجاتا، گفتگو بہت میٹھے بہت نرم اور دھیمے لہجے میں کرتے اور اس میں بڑی تاثیر اور جاذبیت ہوتی، تحریر وتقریر دونوں میں اپنا مدعا بڑی خوبصورتی اور سلیقہ سے پیش کرتے، جلسوں اور میٹنگوں میں اپنے خیالات نپے تلے انداز میں مناسب طور سے رکھتے، انہیں دوسروں کو متاثر کرنے اور اپنی باتیں منوا لینے کا خاص ملکہ تھا، وہ بااصول آدمی تھے، اس معاملہ میں رورعایت نہ کرتے، اس کی اور ذمہ دار عہدوں پر فائز رہنے کی وجہ سے ان کے بعض ماتحتوں کو ان سے شکایت رہتی تھی، ان کی نشست وبرخواست ہر طرح کے لوگوں کے ساتھ رہتی تھی۔ مذہبی لوگوں کی طرح ادیبوں، شاعروں اور ترقی پسندوں سے بھی گھلے ملے رہتے تھے، چنانچہ مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم لکھتے ہیں، ’’یہ شہاب صاحب آدمی بڑے کارگزار ہیں اور ہر طبقہ میں صاحب رسوخ ادھر آرٹ نوازوں میں شامل، ادھر ہم دقیانوسی سے واصل۔ باما شراب خود وبہ زاہد نماز کرد کو اپنا دستور العمل بنائے‘‘، بعض خشک اور متقشف لوگوں کو ان کی یہ رعنائی خیال پسند نہیں تھی اور وہ ان پر نکتہ چینی کرتے تھے، ان کا مذہبی مطالعہ وسیع تھا، دینی لٹریچر اور قرآن مجید کے اردو اور انگریزی ترجمے ہمیشہ ان کے مطالعہ میں رہتے تھے، اکثر ان مسائل پر سوالات اور گفتگو بھی کرتے تھے، صوم وصلوٰۃ کے بڑے پابند تھے، حج بیت اللہ کی سعادت بھی میسر آئی تھی، مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے بڑے مداح تھے، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سے بھی قربت تھی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بڑے غالی معتقد تھے، ان میں بڑا ضبط و تحمل بھی تھا۔ اپنے اوپر تنقید کو برداشت کرلیتے، کوئی سخت سست کہتا تب بھی غضب ناک اور مشتعل نہ ہوتے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور بشری لغزشوں سے درگزر کرے، آمین!! (’’ض‘‘، مئی ۱۹۹۸ء)

قادری، عون احمد، مولانا شاہ

مولانا شاہ عون احمد قادری

مولانا شاہ عون احمد قادری کی وفات کی خبر تاخیر سے ملی، ان کا تعلق پھلواری کے ایک مشہور علمی ودینی خانوادے سے تھا۔ ہندوستان کے جو مراکز اور خانقاہیں ہدایت و ارشاد اور سلوک وعرفان کے ساتھ ہی علم وفضل میں بھی شہرت وامتیاز رکھتی ہیں، ان میں ایک خانقاہ مجیبیہ بھی ہے، جس کے مولانا شاہ عون احمد ایک بزرگ اور باوقار حامل شریعت وطریقت اور ممتاز عالم وفقیہ تھے، وہ جہاں دعوت وتبلیغ اور اصلاح وارشاد کا فریضہ انجام دیتے تھے اور اس کے لیے ملک وبیرون ملک کے سفر بھی کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کے مریدین اور معتقدین کا وسیع حلقہ تھا، وہاں مسلم تنظیموں اور مسلم اداروں سے بھی وابستہ رہتے تھے اور مسلمانانِ ہند کی مشترکہ ملی واجتماعی جدوجہد میں بھی حصہ لیتے تھے۔

جمعیۃ علمائے ہند سے برابر ان کا تعلق رہا، عرصہ تک وہ جمعیۃ علمائے بہار کے صدر اور مرکزی جمعیۃ علماء کے نائب صدر رہے، مسلم پرسنل لابورڈ کے رکن تھے، فقہ وافتا میں امتیاز کی وجہ سے امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے قاضی رہے اور برسوں قضا کی خدمت انجام دی، کئی مقامی علمی وتعلیمی اداروں کے علاوہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے بھی رکن تھے۔

شاہ صاحب نے اجمیر کے مدرسہ معینیہ میں تعلیم کی تکمیل کی، اس سے پہلے فرنگی محل لکھنو میں بھی تحصیل علم کرچکے تھے، ان کے اساتذہ میں معقولات ودرسیات کے مشہور فاضل مولانا حکیم محمد شریف مصطفےٰ آبادی، اعظم گڑھی بھی تھے جو ان کے جدامجد مولانا شاہ بدرالدین کے مرید خاص تھے، مولانا عون احمد صاحب کو اپنے عم بزرگوار مولانا شاہ محی الدین قادری امیر شریعت ثانی صوبہ بہار واڑیسہ سے بیعت وخلافت ملی تھی۔

مولانا عون احمد کو قوت بیان کی طرح قوت تحریر بھی عطا ہوئی تھی۔ جب خانقاہ مجیبیہ کا رسالہ ’’المجیب‘‘ شائع ہوتا تھا تو اس میں ان کے دینی واصلاحی مضامین اور تحریریں بھی چھپتی تھیں، اپنے مرشد ومربی مولانا شاہ محی الدین قادری کے سوانح ’’محی الملت والدین‘‘ کے نام سے لکھے تھے، ایک اور کتاب ’’نعمت کبریٰ‘‘ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات دائمی کو ثابت کیا ہے، شعر وشاعری سے بھی مناسبت تھی، فارسی کے اچھے شاعر تھے۔

خانقاہ مجیبیہ کے بزرگوں کا تعلق دارالمصنفین سے بھی تھا اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کی تعلیم پھلواری میں بھی ہوئی تھی۔ یہاں کے لوگوں سے ان کے اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کے خاص مراسم تھے، بنارس، اعظم گڑھ اور عظمت گڑھ وغیرہ میں مولانا عون احمد صاحب کے مریدین کی بڑی تعداد تھی، ان کی تربیت و تزکیہ کے لیے جب تشریف لاتے تو دارالمصنفین میں بھی قدم رنجہ فرماتے، اپنے ایک صاحبزادے مولوی شاہ نصر احمد کو تصنیف و تالیف کی تربیت حاصل کرنے کے لیے یہاں بھیجا جو بڑے سنجیدہ، شائستہ، سعادت مند، حلیم اور صالح نوجوان اور اپنے والد بزرگوار کی تربیت کا نمونہ تھے، معارف میں ان کا ایک مضمون کئی قسطوں میں امام الحرمین پر نکلا تو اہل علم نے اسے بہت پسند کیا، مگر عین جوانی میں وفات پاگئے، ہم لوگ تعزیت کے لیے گئے تو شاہ عون احمد صاحب صبا وشکور کی عملی تفسیر بنے ہوئے تھے، دراصل ان کی ذات شرافت، حسن خلق، لطف وشفقت، مہمان نوازی، خاکساری، سادگی، اخلاص، نیکی، دینداری اور زہد واتقا کا بے مثال نمونہ تھی۔

ادھر کئی برس سے ان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی، معذوری بڑھتی جاتی تھی بالآخر ۶/اپریل کو داعی اجل کا پیام آگیا، اللہ تعالیٰ علم و دین کے اس خادم اور پیکر حلم وشرافت کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ (''ض''، مئی ۱۹۹۸ء)

اصلاحی، ابوبکر، مولانا

مولانا ابوبکر اصلاحی

افسوس ہے کہ ۲/مئی کو جماعت اسلامی کے ایک ذمہ دار بزرگ اور اعظم گڑھ کے اطراف کے مشہور عالم مولانا ابوبکر اصلاحی صاحب نے داعی اجل کو لبیک کہا، مدرسۃ الاصلاح سے فراغت کے بعد انہوں نے ضلع بستی میں دینی تعلیم کی اشاعت اور درس و تدریس کی خدمت انجام دی، ۱۹۴۶ء میں مدرسۃ الاصلاح آئے۔ راقم نے صرف ونحو اور فقہ کی بعض کتابیں ان سے پڑھیں، وہ جماعت کے بڑے سرگرم رکن تھے، اس لیے مدرسہ سے سبکدوش ہوکر اس کے تنظیمی کاموں میں لگ گئے، ان کی اچھی کارگزاری کی بنا پر جب جامعۃ الفلاح قائم ہوا تو اس کی ترقی واستحکام کا کام انہیں سپرد کیا گیا اور وہ عرصہ تک اس کے نیک نام ناظم وصدر مدرس رہے۔ اب علالت و معذوری کی وجہ سے سرائمیر میں اپنے گھر ہی رہتے تھے۔

دارالمصنفین بھی تشریف لاتے تھے، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی سے تعلق خاطر تھا۔ مولانا ابوبکر صاحب کی وفات سے جماعت اسلامی اپنے ایک اچھے اور مخلص کارکن سے محروم ہوگئی، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین! (''ض''، مئی ۱۹۹۸ء)

ندوی، حسن مثنیٰ، مولانا شاہ

مولانا شاہ حسن مثنیٰ ندوی

یہ بھی پھلواری کے علمی و دینی خانوادے کے چشم و چراغ اور مولانا شاہ سلیمان پھلواروی کے پوتے تھے جو ہندوستان کے مشہور عالم و واعظ اور تحریک ندوۃ العلماء کے خاص رکن تھے، تقسیم کے بعد شاہ حسن مثنیٰ صاحب پاکستان چلے گئے اور وہاں سے مہرنیمروز کے نام سے ایک مذہبی و ادبی رسالہ نکالا، اس میں وہ ''چہ دلاورست وزدے کہ بکف چراغ دار'' کے عنوان سے ایک مستقل کالم لکھتے جس میں ادیبوں کی چوریوں کا ذکر ہوتا جو بہت پسند کیا جاتا، ادب سے ان کو بڑا شغف تھا اور ان کے ادبی و تنقیدی مضامین ان کے جوہر قابل ہونے کے غماز تھے۔ ان کا انتقال مارچ ہی میں ہوگیا تھا، لیکن پاکستان کی خبریں یہاں دیر سے پہنچتی ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت کاملہ سے نوازے، آمین! (''ض''، مئی ۱۹۹۸ء)

حنیف، محمد، منشی

منشی محمد حنیف صاحب

بمبئی کے خطوط سے منشی محمد حنیف صاحب کے انتقال کی خبر معلوم کر کے بڑا صدمہ ہوا، ان کی جوانی مدرسۃ الاصلاح سرائمیر کی خدمت میں گزری، پھر بمبئی گئے، اللہ نے کاروبار میں بڑی برکت دی۔ ہر طرح کی فارغ البالی کے باوجود نہ دین سے شغف میں کمی آئی اور نہ مدرسۃ الاصلاح کی محبت میں فرق آیا۔ اس کی ترقی وفلاح کے لیے برابر فکرمند رہتے۔ دارالمصنفین سے بھی خاص لگاؤ تھا، اس کے لائف ممبر تھے، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب سے بڑے مخلصانہ روابط تھے، ان حضرات کی بمبئی اور اپنے گاؤں آندھی پور میں پرتکلف دعوتیں کرتے، مجھ پر بھی بڑی شفقت فرماتے۔ اب ایسے شریف، بامروت، وضع دار اور مخلص لوگ نایاب ہوتے جارہے ہیں، اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے اور متعلقین واعزہ کا غم زائل کرے!! (''ض''، مئی ۱۹۹۸ء)

عبدالرحمٰن، مولانا

امیر شریعت خامس کی رحلت

امیر شریعت خامس مولانا عبدالرحمٰن کی وفات ہندوستان خصوصاً بہار واڑیسہ کے مسلمانوں کا نقصان عظیم ہے۔ قوم وملت اپنے ایک بزرگ رہنما عالمِ دین اور عارف باللہ سے محروم ہوگئی۔ وہ واقعی عالم باعمل اور اس دور میں زہد واتقا، عمل واخلاص اور اتباعِ

سنت میں منفرد و یگانہ تھے۔ ان کی زندگی دین کی خدمت و اشاعت دعوت و تبلیغ، وعظ و ارشاد، نفوس کی اصلاح و تزکیہ اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود میں گزری اور ان سے بے شمار لوگوں کو فیض پہنچا۔

حضرت امیر شریعت کی علالت کا سلسلہ کئی ماہ سے چل رہا تھا، افاقہ نہ ہونے کی بنا پر مدرسہ حمیدیہ گودنا (چھپرہ) سے پھلواری شریف لائے گئے اور سجاد میموریل اسپتال کے علاج سے کسی قدر حالت بہتر ہوئی مگر پھر مرض نے شدت اختیار کرلی تو حی کلینک پٹنہ میں داخل کئے گئے مگر وقتِ موعود آگیا اور یہیں ۲۹/ستمبر ۹۸ء کو رشد و ہدایت کا یہ چراغ ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔

۳۰/ستمبر کو ۱۱ بجے دن میں قائم مقام امیر شریعت نے پھلواری میں جنازہ کی نماز پڑھائی جس میں مختلف اضلاع کے ہزاروں سوگواروں نے شرکت کی۔ اسی روز جسد مبارک مدرسہ حمیدیہ گودنا (چھپرہ) لایا گیا جہاں عصر بعد نماز جنازہ ہوئی اور متعدد اضلاع سے آئے ہوئے ہزاروں عقیدت مندوں کی موجودگی میں مسجد کے قریب ان کی تدفین ہوئی۔

مولانا نے ۹۵ برس کی طویل عمر پائی، ان کی ولادت ضلع دربھنگہ کے ایک گاؤں میں ۱۹۰۳ء میں ہوئی تھی۔ مختلف دینی مدارس میں تعلیم پانے کے بعد مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے فضیلت کی سند لی، وہ ایک اچھے اور ذہین طالب علمی تھے، فضیلت کے امتحان میں پورے بہار میں اول آئے۔ ابتدا ہی سے طبیعت طاعت و زہد کی طرف مائل تھی، تحصیلِ علم ہی کے زمانے سے سلوک و عرفان سے مناسبت پیدا ہوگئی تھی، بالآخر ایک شیخِ وقت مولانا ریاض احمد صاحب کے دامنِ فیض سے وابستہ ہوئے اور خلافت سے سرفراز ہوئے۔ اپنے شیخ و مرشد کے ایما سے ۱۹۴۲ء میں مدرسہ حمیدیہ گودنا میں قیام پذیر ہوگئے، جہاں درس و تدریس کے ساتھ عام لوگوں کی اصلاح و تربیت بھی فرماتے رہے۔

امارت شرعیہ سے اس کے روز تاسیس ۱۹۲۱ء ہی سے ان کا تعلق قائم ہوگیا تھا اس کے بانی مولانا ابوالمحاسن سجادؒ کی خدمت میں باریابی کا شرف بھی حاصل کیا تھا۔ ان کی جدوجہد سے چھپرہ میں امارت کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ امارت کے تنظیمی شعبہ سے ان کا ہمیشہ گہرا تعلق رہا، جس کو وہ ریڑھ کی ہڈی کہا کرتے تھے۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب اپنے پیش رو چاروں امیر شریعت کے جلسۂ انتخاب میں شریک رہے اور ان کے ہاتھوں پر بیعت کی، مولانا عبدالصمد رحمانی نائب امیر شریعت کے انتقال کے بعد اس منصب کے لیے ان کا انتخاب عمل میں آیا اور ۱۹۹۱ء میں امیر شریعت رابع مولانا منت اللہ رحمانی کی وفات کے بعد وہ امارت کے اس سب سے بڑے عہدہ پر فائز کیے گئے۔ گو مولانا عبدالرحمٰن صاحب کی امارت کا دور سات آٹھ برس کے قلیل زمانے کو محیط ہے تاہم یہ بڑا زریں عہد تھا جس میں امارت کے مختلف شعبوں میں بڑی وسعت و ترقی ہوئی، مالی و انتظامی حیثیت سے بھی یہ دور مستحکم رہا۔ کئی اہم دینی تعلیمی اور فلاحی ادارے وجود میں آئے، سماجی خدمت، ریلیف اور راحت رسانی کے متعدد کام انجام پائے تبلیغ و دعوت دین کا کام بڑے پیمانے پر ہوا، علمی، تعلیمی اور تربیتی نظام بہتر رہا۔ بہت سے دینی مکاتب قائم ہوئے، عصری و دینی درسگاہوں کا نظام مستحکم ہوا، تکنیکی تعلیم کے شعبے کھلے۔ مولانا سجاد اسپتال کو وسعت و ترقی ملی۔ مولانا منت اللہ رحمانی ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ، **المعهدالعالی للتدریب فی القضا والافتا** اور **وفاق المدارس الاسلامیه** بہار وغیرہ کا قیام عمل میں آیا۔

مولانا ملک کی آزادی و اتحاد کی تحریک کے شیدائی بھی رہے اور جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس راہ میں ان کو بڑی صعوبتیں اور مشقتیں بھی جھیلنی پڑیں۔

راقم الحروف کو گو مولانا کی زیارت و ملاقات کی کبھی سعادت میسر نہیں آئی تاہم ان کے بعض اہل تعلق سے ان کی مقدس اور پاکیزہ زندگی، سیرت و کردار کی بلندی، ذکر و شغل اور ریاضت و مجاہدہ کی کثرت کے بارے میں جو کچھ سنا ہے اس سے ان کی عظمت و فضیلت کا نقشہ قلب پر مرتسم ہوگیا ہے۔ وہ بڑے ذاکر و شاغل، تہجد گزار، صوفی منش بزرگ اور نہایت متواضع اور منکسر المزاج شخص تھے، ان کی زندگی سادہ اور درویشانہ تھی، کم سخن اور نرم گو تھے، خلوت و تنہائی زیادہ پسند کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ اپنے اس مقبول بندے کی مغفرت فرمائے اور ان کے خلا کو پُر کرے، آمین۔

بہار و اڑیسہ میں امارت شرعیہ کا نظام اٹھہتر (۷۸) برس سے قائم ہے، اس سے وہاں کے مسلمانوں کو اسلامی شریعت کے مطابق زندگی گزارنے میں بڑی مدد مل رہی ہے، دنیا سرائے فانی ہے، یہاں موت سے کسی کو دستگاری نہیں۔ اب اس مفید و بابرکت نظام کی سربراہی کے لیے مولانا نظام الدین صاحب کا انتخاب عمل میں آیا ہے جن کو امارت کے کاموں کا دیرینہ تجربہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے اور بہار و اڑیسہ کے مسلمانوں کو سمع و طاعت کا اظہار کرتے ہوئے پورے اتحاد، ہم آہنگی اور اخلاص سے ان کے تعاون کی توفیق دے، آمین! ("ض"، نومبر ۱۹۹۸ء)

فریدی، افتخار احمد، مولانا

مولانا افتخار احمد فریدی

دینی حلقوں میں یہ خبر افسوس اور رنج کے ساتھ سنی جائے گی کہ ۲۴/اکتوبر ۱۹۹۸ء کو ایک پُرجوش اور سرگرم داعی و مبلغ مولانا افتخار احمد فریدی انتقال فرماگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم کا وطن مراد آباد تھا، ایک زمانے میں ان کے ہاتھوں میں وہ پرچم بغاوت تھا جس کو سرفروشان وطن نے برطانوی جبر و استبداد کے خلاف بلند کیا تھا مگر پھر ع

پھاڑ کر جیب و آستین کر علم جنوں بلند۔ انہیں حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی دینی دعوت سے عشق ہوگیا جس کے لیے وہ ملکوں ملکوں کی خاک چھانتے رہے، کسی حادثہ میں ان کا ایک پیر کاٹ دیا گیا مگر وہ بیساکھیوں کے سہارے ملک کے وطول وعرض کا دورہ کرتے رہے، سفرحج میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کا ساتھ ہوگیا تو ان کی بڑی خدمت کی اور ہرطرح کا آرام پہنچایا۔ ایک دفعہ وہ اپنے ایک تبلیغی دورے میں اعظم گڑھ آئے تو شاہ صاحب نے ان کی بڑی پذیرائی کی۔ جناب سید صباح الدین صاحب سے مخلصانہ تعلق رکھتے تھے اور راقم سے بھی خط وکتابت رہتی تھی۔

کئی برسوں سے تبلیغی دوڑ دھوپ کا سلسلہ موقوف ہوگیا تھا، لیکن اسی جذبے سے اصلاحی ودعوتی رسائل اور مواعظ وملفوظات کے مجموعے شائع کرتے تھے، وہ غیر مسلموں میں بھی اسلام کی تبلیغ واشاعت کرتے رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی بشری لغزشوں سے درگزرفرمائے اور انہیں جنت نعیم میں جگہ دے۔ آمین! (''ض''، نومبر ۱۹۹۸ء)

سعید، محمد، حکیم

حکیم محمد سعید

حافظ حکیم محمد سعید کے وحشیانہ اور بے رحمانہ قتل پر کون ہے جو تڑپا اور بے قرار نہ ہوا ہوگا، وہ بین الاقوامی شخص، مملکتِ خداداد کے ہمدرد ومسیحا، پاکستان کے معمار، اس کا مقدر چمکانے اور بنانے کے لیے فکر مند، ہمدرد فاؤنڈیشن کے سربراہ اور مدینۃ الحکمت کے بانی، عالم، مصنف، مدبر، عالی دماغ، سچے اور پکے مسلمان، قوم وملت کے بے لوث خادم، مخالف ہوا میں طب کا چراغ روشن کرنے، علم کو فروغ دینے، حکمت ومحبت کا خزانہ لُٹانے والے، غریبوں اور مصیبت زدوں کے درد وغم میں شریک، پہلو میں درد مند دل رکھنے، پاکستان کے تشویش انگیز حالات سے بے چین اور پریشان رہنے والے کو چند دقیقوں میں جن لوگوں نے موت کے گھاٹ اُتارا وہ بڑے خوں خوار، درندہ صفت اور انسانوں کے بھیس میں وحوش سے بھی بدتر لوگ تھے۔ آخر اس فرشتہ صفت، پاک دل، پاک باز، رحم ومروت کے پیکر، مجسم شرافت اور اخلاقی خوبیوں سے منور انسان کا قصور کیا تھا، ذوق مرحوم کے شاگرد محمد مظفر خاں کرّم رامپوری کا وہ قطعۂ تاریخ وفات یاد آگیا جو نواب شمس الدین خاں مرحوم کو پھانسی دیے جانے پر کہا گیا تھا ؎

یہ دست درازیِ ستم کس سے بیاں ہو
بے جرم و گنہ مسند نواب کو الٹا
تاریخ معمے میں نئی طرز سے لکھ، کرّم!
کیا چرخ نے ''نوابی سہراب'' کو الٹا

جو مملکت اُس اسلام کے نام پر وجود میں آئی تھی جو سراپا امن وسلامتی ہے اور جس کے آئین میں خون خرابہ اور قتل و دہشت گردی کی کوئی گنجایش نہیں اور جس کے ماننے والے (مسلم) ساری دنیا کے لیے سراپا رحمت ہوئے ہیں، آج وہی مملکت جہنم کا نمونہ بنی ہوئی ہے، کراچی مقتل میں تبدیل ہوگیا ہے، پاکستان کے گلی کوچوں میں خونِ مسلم کی ارزانی ہے، وہاں کے در و دیوار سے تشدد و دہشت گردی پھوٹی پڑ رہی ہے، امن چین عنقا ہوگیا ہے، پُر امن شہریوں کی جان پر بن آئی ہے، خوف و دہشت کا یہ حال ہے کہ دن میں بھی لوگ اپنے گھروں سے نہیں نکلتے ؎

این چہ شوریست کہ درعہد قمری بینم
ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شرمی بینم

شروع ہی سے پاکستان میں انتشار، جارحیت اور سفاکی کی جو بادسموم چل رہی ہے اب اتنی تیز وتند ہوگئی ہے کہ حکیم محمد سعید جیسے شریف النفس اور بے ضرر انسان کو بھی خاک کے مانند اُڑا لے گئی، لیاقت علی خاں سے لے کر جنرل ضیاء الحق تک کتنے بے گناہ لوگ اسی کی نذر ہوچکے۔ اپنے محسنوں اور بے گناہ شہریوں کو تہہ تیغ کر دینا اگر کسی قوم کا معمول بن جائے تو وہ کس طرح اپنی آزادی کو باقی رکھ سکے گی اور خود کب تک محفوظ رہے گی۔

شنبہ ۱۷/اکتوبر کو حافظ حکیم محمد سعید فجر کی نماز کے بعد حسب معمول آرام باغ کراچی کے اپنے مطب میں تشریف لے گئے تو اندھا دھند ان پر فائرنگ ہونے لگی اور وہ اپنے دو ساتھیوں سمیت شہید کردیے گئے۔ وہ روزے سے تھے، ہر شنبہ و یکشنبہ کو روزہ رکھنا ان کا معمول تھا، یہ خبر سُنتے ہی سکتہ میں آگیا اور حکیم صاحب کا سراپا نگاہوں کے سامنے رقص کرنے لگا، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان کے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید مدظلہٗ جو لقمان وقت اور کوہِ ضبط وتحمل ہیں اور دوسرے عزیزوں کی تعزیت کس طرح کی جائے۔ حافظ حکیم محمد سعید کا آبائی وطن دہلی مرحوم تھا، یہیں ۹/جنوری ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے وہ اپنے پانچ بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے اور ابھی طفل خورد سال ہی تھے کہ ۲۲/جون ۱۹۲۲ء کو ان کے والد بزرگوار حافظ حکیم عبدالمجید صاحب سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئے، ان کی پرورش و پرواخت ان کی والدہ ماجدہ اور بڑے بھائی حکیم عبدالحمید نے بڑی توجہ اور دلسوزی سے کی جو ان سے عمر میں ۱۳ سال بڑے تھے، حکیم محمد سعید اس کا اعتراف بڑی احسان مندی اور فخر سے کرتے تھے، اپنی والدہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ہم سب کی ذمہ داری ابتداً ہماری آپا (والدہ مرحومہ) پر رہی اور انہیں کی تربیت نے ہمیں وہ بنادیا جو آج ہم ہیں، یہ خاتونِ محترم رابعہ ہندی تھیں.....ابا جان سے انہوں نے تربیت اولاد کا گُر سیکھا تھا اور اس کا انتہائی صحیح استعمال کیا، انہوں نے کبھی اخلاق کی کسی کوتاہی کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا، اس بات میں وہ بڑی سخت گیر تھیں.....توازن ان کا ہنر تھا، وہ اس توازن اور عدل کی وجہ سے

پورے خاندان پر حکمراں تھیں، اگر ان میں عظمتیں اور صلاحیتیں نہ ہوتیں تو ابا جان کے انتقال کے بعد ہمدرد باقی کہاں رہ سکتا تھا، ابا جان کی زندگی میں ہمدرد کے لیے آپا مرحومہ نے کیا کیا پاپڑ نہیں بیلے..... دیانت داری کی بات یہ ہے کہ میں نے اپنی آپا کی کوئی دوسری مثال آج تک نہیں دیکھی ہے''۔

اپنے ''بھائی جان'' کے تاعمر ممنون اور نیاز مند رہے، اپنے کو ان کی تربیت کا ثمرہ سمجھتے تھے ان کے سامنے بہت مودب رہتے، جب وہ دارالمصنفین تشریف لائے اور حکیم عبدالحمید صاحب قبلہ کے کمرہ میں ان کی چارپائی بھی بچھائی گئی، تو انہوں نے فرمایا کہ میں بھائی صاحب کے ساتھ کیسے رہوں گا، ایک جگہ لکھتے ہیں:

''عظمت ہمدرد کے لیے حکیم عبدالحمید نے ایک بڑا کام یہ بھی کیا کہ مجھے انسان و ہمدرد بنادیا، انہوں نے سرمایہ اسے قرار دیا کہ ہمدرد کے لیے ایسے لوگ تیار کیے جائیں جو ہمدرد کو ہر حال میں سربلند اور سرفراز کرسکیں اور اس کو بقائے دوام دے سکیں میں ان کا چھوٹا بھائی ضرور ہوں لیکن انہوں نے مجھے انسان سمجھا اور انسان کی تمام خوبیاں مجھ میں پیدا کرنے کے لیے خود بڑی سے بڑی قربانی دے دی۔ اس اعتبار سے میرا رواں رواں ان کے زیر احسان ہے''۔

وہ ساڑھے چھ برس کی عمر میں قرآن کریم ختم کرچکے تھے اور نو سال کی عمر میں اس کے حافظ بھی ہوگئے تھے۔ اردو مادری زبان تھی، تیرہ برس کی عمر میں عربی فارسی سیکھ چکے تھے، سن نے اور تجاوز کیا تو انگریزی کی شُد بُد بھی ہوگئی تھی۔

حکیم صاحب نے چودہ برس کی عمر تک پوری دلچسپی اور انہماک سے علم کی تحصیل کی اور کبھی پڑھنے لکھنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی مگر کھیل کود میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مرغ بازی، کبوتر بازی، گھوڑ سواری، موٹر سائیکل دوڑ، گلی ڈنڈے، شطرنج، فٹ بال، کشتی رانی، پہاڑوں پر چڑھنے، اکھاڑوں اور دنگلوں میں کشتی لڑنے کا بڑا شوق ہوگیا تھا مگر حکیم عبدالحمید صاحب نے اس موڑ پر ان سے سوال کیا کہ ''اب کھیلنا ہے یا مزید کچھ پڑھ لکھ کر ہمدرد کے لیے کام کرنا ہے'' اس سے چوکنا ہوکر انہوں نے تمام کھیل کود فی الفور بند کردیے، ان کا رجحان طبع صحافت کی جانب تھا تاکہ اس میدان کی بے راہ روی دور کرکے کچھ نئے نقش قدم قائم کریں مگر ان کے بھائی جان کا فیصلہ تھا کہ ''خاندان میں ہمدرد کا مقام اور مشن خدمت خلق بذریعہ طب ہے، لہٰذا تعلیم طب لازم ہے'' اس کے سامنے سر تسلیم خم کرکے انہوں نے ۱۹۳۶ء میں طبیہ کالج دہلی میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۹ء میں اس سے فارغ ہوئے۔

تحصیل طب کے زمانے ہی سے وہ اپنے بھائی جان کی رہنمائی میں ہمدرد کے کاموں کی تربیت حاصل کرتے رہے۔ ابتدائی مرحلے میں دواخانے میں عطاروں کی مددگاری پھر عطاری، نسخہ بندی اور دواشناسی کی تربیت حاصل کی، دوا سازی کی تربیت کے لیے بھٹیوں میں لکڑیاں اور کوئلے جھونکے، ہمدرد کی ڈاک، پارسل، پیکٹ تیار کرنے کی تربیت ان کاموں کو انجام دینے والوں سے لی۔ طبیہ کالج سے فراغت کے بعد وہ صبح سے شام تک ہمدرد کے مختلف دفاتر اور شعبوں میں کام کرتے اور شام کو اسی دواخانے میں بیٹھ کر مطب کرتے تھے، جہاں عطاری کی تربیت حاصل کی تھی۔

ان مراحل سے گزرنے کے بعد ان کے بھائی جان نے بتدریج انہیں اختیارات منتقل کرنا شروع کیا اور ۱۹۴۱ء میں انہیں سیاہ و سفید کا مالک بنادیا، اب وہ رات دن کام کرتے تھے، چھ مہینے تک ہمدرد کی عمارت کے باہر نہیں نکلے، اس طرح بقول انکے میری پوزیشن یہ تھی کہ ادارۂ ہمدرد کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جہاں میں انتہائی مہارت سے کام نہیں کرسکتا ہوں۔ دواؤں کی پیکنگ میں جب بیٹھتا تو بڑے سے بڑے ماہر کارکن کو ہرا دیتا تھا، ہمدرد صحت ایک لاکھ چھپتا تھا، ہمدرد صحت کی ریپ کرنے بیٹھتا تو بڑے سے بڑے دفتری مجھ سے ہار مان جاتے تھے، اردو ٹائپ کرنے بیٹھتا تو طوفان میل بن جاتا تھا...... ان کاموں میں اگر میں نے شکست کبھی کھائی ہے تو صرف بھائی جان قبلہ سے، وہ خود ہمدرد کا ہر کام اسی طرح کرسکتے ہیں اور کرتے رہے ہیں''۔

۱۹۴۱ء میں ان کا شعور پختہ اور ذہن بالغ ہوگیا تھا اور وہ صنعت و تجارت کے اصول سے جو دیانت و اخلاق میں مضمر ہے واقف ہوگئے تھے جس سے ان کے بھائی جان نے انہیں دور نہ ہونے دیا۔

۱۹۳۷ء ہی سے ہمدرد صحت کی ادارت بھی ان کو تفویض کی جاچکی تھی جس سے ان کے بھائی جان کو عشق تھا اور جو اس سے پہلے اس کے مدیر بھی رہے تھے، مگر حکیم محمد سعید نے ۱۹۴۱ء میں اسے مکمل طور پر اپنے ہاتھ میں لے کر چار چاند لگادیا۔ ۱۹۴۷ء میں عارضی طور سے وہ بند ہوگیا مگر ۱۹۴۸ء میں انہوں نے کراچی سے اسے جاری کیا۔

۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک حکیم محمد سعید اپنے بھائی جان کی سرکردگی میں ہمدرد کی عظمتوں میں اضافہ کرتے رہے، ان کا عزم یہ تھا کہ وہ فن طب کی آواز دنیا بھر میں پہنچا دیں۔ ملک کی تقسیم کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان کی حکومت کا وہ دل سے احترام نہ کرسکیں گے، اس لیے دیانت و امانت کا تقاضا سمجھ کر وہ ۹ جنوری ۱۹۴۸ء کو دلی کی گلیاں چھوڑ کر پاکستان چلے گئے، ان کے جانے کا سب سے زیادہ ملال ان کے بھائی جان کو تھا جنھیں دلاسا دیتے ہوئے حکیم محمد سعید کے شفیق استاد قاضی سجاد حسین صاحب نے فرمایا ''حکیم صاحب آپ آزردہ نہ ہوں، جب پاکستان میں مشکلات کے پہاڑ ٹوٹیں گے تو میاں سعید ضرور آجائیں گے'' شفیق استاد کے یہ جملے ان کے لیے چیلنج بن گئے، بڑی بے سروسامانی اور فلاکت کے باوجود وہ کراچی میں ہمدرد کا جھنڈا گاڑنے میں کامیاب ہوگئے، حکیم عبدالحمید نے ۱۹۳۵ء میں انہیں حفاظت طب اور ہمدرد کے لیے کام کرنے کی جو ذمہ داری سپرد کی تھی اسے کراچی پہنچ کر پوری ذمہ داری سے انجام

دینے کا تہیہ کیا، ان کا خود بیان ہے کہ ”پاکستان کا ہمدرد اس انداز سے شروع ہوا کہ میں ۹/جنوری ۱۹۴۸ء سے جون ۱۹۴۸ء تک کراچی کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا رہا اور دو وقت کھانے کو نہ تھا، لیکن ان کی مسلسل تگ و دو، عزم و حوصلہ اور غیر معمولی قوت عمل نے ہندوستان کے ہمدرد کی طرح پاکستان کے ہمدرد کو بھی عالمی شہرت کا حامل اور طبی و اسلامی تحقیقات کا عظیم الشان ادارہ بنادیا“۔

حکیم محمد سعید نے طب کے احیاء و ترقی اور دنیا بھر میں اس کی آواز پہنچانے کے لیے دنیا بھر کے اتنے سفر کیے کہ لوگ کہتے تھے کہ ان کے برابر ہوائی اور بحری و بری سفر تاریخ میں کسی طبیب نے نہیں کیا ہے، وہ اپنی تحریروں میں اپنے سفر کی کثرت کا بار بار ذکر کرتے ہیں:

”گزشتہ کم از کم دس سال سے میری زندگی کا یہ عالم ہے کہ نچلا نہیں بیٹھا ہوں رات دن سفر میں ہوں صبح پاکستان میں ہوں تو دن کو جرمنی میں، شام کو پیرس میں۔ میں کبھی لندن میں ہوتا ہوں کبھی واشنگٹن میں، شام کو اگر ماسکو میں اٹھتا ہوں تو صبح تہران میں داخل ہوتا ہوں، ابھی میکسیکو میں ہوں تو دوسرے دن پورٹ اوف اسپین میں۔ نیویارک سے اڑا تو صبح میڈرڈ میں داخل ہوگیا کبھی بغداد اور مکہ، مدینہ میں ہوں تو اس سے اگلے دن حلب اور دمشق میں یا بغداد میں“۔

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

”اب یہ حال ہے کہ میں ایک مہینے میں کئی کئی سفر کرتا ہوں، لاکھوں میل جاتا ہوں، دنیا کا کونا کونا میں نے چھان لیا ہے۔ دنیا کو کف دست بنا کر رکھ دیا ہے“۔

یہ سارے سفر وہ لطف و تفریح کے بجائے اپنے عظیم طبی مقصد اور مقدس مشن کی تکمیل کے لیے کرتے تھے۔ لکھتے ہیں ”مگر میں نے ہر سفر احیائے طب کے مقصد عظیم کے لیے کیا ہے اور بھائی جان کے فیصلے کے عین احترام میں کیا ہے اور بالآخر میں نے اپنے مشن میں جو درحقیقت میرے عظیم بھائی کا مشن ہے، کامیابی حاصل کرلی۔ آج دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں کی خبر میں نے نہ لی ہو اور جہاں طب پر تحقیقی کام نہ ہو رہا ہو، الحمدللہ“۔

سال گزشتہ میں فن لینڈ میں ایک کشتی لے کر کوئی آٹھ دن وہاں کے ہزار ہا جزیروں میں گھومتا رہا، تلاش یہ تھی کہ بڑے بڑے شہروں سے دور دراز جزیروں میں گم انسان اپنا علاج کن جڑی بوٹیوں سے کرتے ہیں، پھر بلغاریہ پہنچا تاکہ وہاں مفردات کے تحقیقی کام کو دیکھوں، ماسکو گیا کہ وہاں سرطان اور جڑی بوٹیوں پر کام ہو رہا ہے، واشنگٹن میں اس موضوع کا جائزہ لیا۔

۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۶ء میں انہوں نے اپنے بھائی جان کے ساتھ جنوب مشرقی ایشیا اور یورپ کے ملکوں کے بھی مطالعاتی اور تجرباتی سفر کیئے ۱۹۵۶ء کا سفر کثیر المقاصد تھا، یورپ میں یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ طب و سائنس میں اس نے کیا پیش رفت کی ہے، دوا سازی میں کیا انقلابی کام ہو رہے ہیں، علمی سطح پر اہل علم و ادب کس انداز سے مصروف کار ہیں، عبادت گاہوں کا مقام یورپ میں کیا ہے وغیرہ۔ ان کے کثرتِ سفر اور مقاصد سفر کے بارے میں ان کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

”۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۰ء تک میں نے دنیا کے اکثر ممالک کا مطالعاتی سفر کیا ہے، ان سفروں کی تعداد اتنی ہے کہ میں خود بھی یاد نہیں کرسکتا۔ میں نے ان سفروں میں خصوصیت کے ساتھ سائنس کے میدانوں میں شخصی روابط پیدا کیے ہیں اور ان کی تعداد چار ہزار سے زیادہ ہے، میرے اکثر و بیشتر سفر طب کے لیے ہوئے ہیں جس کے احیاء و ترقی کی ذمہ داری ۱۹۳۵ء میں بھائی جان نے مجھے سونپ دی تھی اور میں نے اس ذمہ داری کو انتہائی حد تک پورا کر کے بھائی جان کے سامنے سرخ روئی حاصل کرنے کا فخر حاصل کیا ہے، یورپ میں طب کو تسلیم کرانے اور موضوع فکر بنانے اور آخرکار عالمی ادارہ صحت سے طب کو تسلیم کرانے میں، میں نے دس سال مسلسل جدوجہد کی ہے، میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے فن طب اور صحت عالم کے لیے ایسا کام کردیا ہے جس کے اثرات دوررس ہوں گے، انشاء اللہ العزیز الحکیم“۔

شریعت و طریقت کی اصل روح خدمت ہے، حکیم عبدالحمید کی طرح حکیم محمد سعید کی زندگی کا یہی مشن تھا، اس کے لیے انہوں نے میدان طب و حکمت میں قدم رکھا تھا اور اپنی سعی بلیغ سے اسے نئی زندگی دے کر عالمی سطح پر اسے باوقار بنادیا، لیکن ان کی سرگرمیاں ہمدرد فاؤنڈیشن اور مدینۃ الحکمت اور ان کے مختلف و متعدد شعبوں کے قیام تک ہی محدود نہیں تھیں وہ ایک عالم، دانشور اور صاحب کمال مصنف بھی تھے، اردو اور انگریزی میں بے شمار کتب ان کی یادگار ہیں۔ کم لوگوں کو تحریر و تقریر دونوں کا ملکہ ہوتا ہے۔ حکیم صاحب میں تقریر و خطابت کا ملکہ خداداد تھا۔ وہ اردو، عربی اور انگریزی زبانوں سے واقف تھے اور سب میں دل پذیر اور موثر تقریریں کرتے تھے۔

حکیم صاحب کی طبیعت میں بڑی بوقلمونی اور عجیب رنگارنگی تھی، ایک طرف تو وہ احیائے طب کا بیڑا اٹھائے ہوئے تھے اور اس کے لیے ملک ملک کی خاک چھانتے رہتے تھے، مگر ان کی یہ جہاں گردی اور بادیہ پیمائی اور ہمہ تن مشغولیت قلم و قرطاس اور تصنیف و تالیف میں مانع نہ بنتی، انہوں نے سینکڑوں کتابیں لکھیں جن میں کئی سفرنامے ہیں۔ ۱۹۳۶ء ہی سے روزنامچہ لکھنے کا معمول تھا، ہمدرد صحت کی ادارت کی ذمہ داری اس پر مستزاد، نونہال کی ادارت ان کے معتمد جناب مسعود احمد برکاتی کے سپرد تھی مگر اس کے صفحات پر بھی وہ موجود ہوتے، ہر شمارے میں پاکستان کے نونہالوں کو جاگنے اور جگانے کی تلقین بھی وہی کرتے تھے، افسوس ہے کہ ایسے جاگنے اور جگانے والے کو بھی

بے رحموں نے ہمیشہ کے لیے سلا دیا۔

حکیم صاحب ایک فولادی انسان تھے جو برابر متنوع اور مختلف قسم کے کام کرتے رہتے تھے، وہ کبھی کام کرنے سے نہ تھکتے اور نہ گھبراتے تھے۔ بڑے اصول پسند اور مرتب شخص تھے، کھانے پینے کے معاملے میں نہایت محتاط تھے، ان کے مستعد، چاق و چوبند، کارگزار صحت منداور تندرست ہونے کا سبب یہی تھا۔ اوقات و معمولات کے پابند تھے اسی لیے ان کے کاموں میں بڑی برکت ہوئی اور قدرت نے ان سے مختلف النوع کام لیے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ایک بار میں بھائی جان کے ساتھ تھانہ بھون گیا حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کے قدموں میں بیٹھنے کا شرف حاصل کیا۔ ان کے بارے میں سُنا تھا کہ وہ اس قدر پابند اوقات ہیں کہ لوگ انکے آنے جانے پر اپنی گھڑیاں ملالیتے ہیں، میں نے یہ بات گرہ میں باندھی، پھر جب سے میں عملی زندگی میں داخل ہوا ہوں تو اب میرا یہ حال ہے کہ میری نقل وحرکت پر لوگ واقعی اپنی گھڑی درست کرلیتے ہیں، یہ بھائی جان محترم کی اعلیٰ تربیت کا ثمرہ ہے اور میں نے اس سے بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کی ہیں''۔

حکیم صاحب بڑے پاک طینت، شریف النفس، پاکیزہ صورت اور پاکیزہ سیرت تھے، دیانت، امانت اور راست بازی ان کی سرشت تھی، خوش خلق، وضع دار، ملنسار، اور تکلف سے بری تھے، نہایت ہنس مکھ اور باغ و بہار شخص تھے، لوگوں سے تپاک اور گرم جوشی سے ملتے، بڑوں کا احترام کرتے اور چھوٹوں پر شفقت فرماتے، جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم سے مخلصانہ تعلقات تھے، ان کی محبت انہیں دارالمصنفین بھی کھینچ لائی، ان کے بھائی جان حکیم عبدالحمید صاحب اس کے رکن رکین ہیں، اس لیے بھی اس سے بڑا تعلق رکھتے اور اپنی ایک ایک کتاب یہاں بھیجتے تھے، یہیں ان سے پہلی بار ملاقات ہوئی، پھر ہمدرد نگر کے ایک بین الاقوامی سمینار میں ملا تو دیکھتے ہی پہچان گئے، سمینار کئی روز تک چلتا رہا، جب جب ملاقات ہوتی تو سلام میں سبقت لے جاتے، بڑی دل جوئی کرتے، باتیں اتنی دلچسپ کرتے کہ افسردہ اور ملول شخص بھی خوش ہوجاتا۔ حرص و ہوس زر، زمین و جائداد کی محبت کبھی ان کے دل میں گھر نہیں بنا سکی، کراچی میں انہوں نے اپنے لیے ایک انچ زمین نہ بنائی، بڑے پختہ عزم و ارادے کے انسان تھے جس کام کو ٹھان لیتے وہ کرکے چھوڑتے ؎

اذاھم القی بین عینیہ عزمہ

ونکب عن ذکر العراقب جانبا

ان میں غرور، گھمنڈ اور پندار نام کو بھی نہ تھا، وہ بڑی شہرت وعظمت کے مالک تھے، ان کو بڑے سے بڑے اعزاز ملتے رہے، پاکستان کے ممتاز ترین ایوارڈ ''ستارۂ امتیاز'' سے نوازے گئے، سندھ کے گورنر ہوئے اور صدر مملکت جنرل ضیاء الحق کے مشیر بنے مگر کبھی نہ آپے سے باہر ہوئے اور نہ ان میں رعونت وتمکنت پیدا ہوئی، بلکہ جتنا بڑا عہدہ ملتا وہ ان کے انکسار اور فروتنی میں اور اضافہ کردیتا۔ اللہ تعالیٰ ان کی بخشش فرمائے اور ان پر اپنے رحم وکرم کی بارش کرے۔ آمین!! (''ض''، نومبر ۱۹۹۸ء)

اصلاحی، صدرالدین، مولانا

مولانا صدرالدین اصلاحی

افسوس ہے کہ ۱۳/ نومبر ۱۹۹۸ء کو ہندو پاک کے مشہور عالم ومصنف، جماعت اسلامی کے ممتاز رہنما اور مدرستہ الاصلاح کے مایہ ناز فرزند مولانا صدرالدین اصلاحی انتقال فرماگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ عرصہ سے بیمار اور موتوا قبل ان تموتوا کی تفسیر بن گئے تھے۔

ان کی ولادت ۱۹۱۶ء میں ہوئی، ان کا تعلق اعظم گڑھ کے ایک گاؤں سیدھا سلطان پور سے تھا، جہاں افغانستان کے زئی قبیلہ کے پٹھان آباد ہیں، مولانا محمد شفیع بانی مدرستہ الاصلاح کا تعلق بھی اسی خاندان اور گاؤں سے تھا۔

علامہ شبلیؒ کے وطن بندول میں ان کی نانہال تھی۔ یہیں رہ کر انہوں نے بلریا گنج سے مڈل پاس کیا، پھر عربی تعلیم کے حصول کے لیے مدرستہ الاصلاح میں داخل ہوئے، طالب علمی کے زمانے میں وہ اور ان کے ایک دوست مولانا محمد عاصم اصلاحی جوان سے ایک درجہ آگے تھے، اپنی ذہانت وصلاحیت کی وجہ سے پورے مدرسہ میں ممتاز تھے، تعلیم مکمل کرنے کے بعد اول الذکر پٹھان کوٹ اور موخرالذکر دارالعلوم دیوبند چلے گئے مگر ان کی آمد ورفت ایک دوسرے کے ہاں ہوتی رہتی تھی، بعد میں ان کی راہیں مختلف ہوگئی تھیں، اسی لیے جب ملتے تو خوب طنز وتعریض اور فقرے بازی ہوتی، طالب علمی میں یہ دونوں حضرات اپنے استاد مولانا نجم الدین اصلاحی کے بڑے چہیتے تھے، انہوں نے اپنی کتاب ''یادگار سلف'' میں دونوں کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے، مولانا صدرالدین صاحب کے متعلق لکھتے ہیں:

''ان میں سے ایک عزیز محترم مولوی صدرالدین اصلاحی سلمہ کی ذات ہے جو اپنی خداداد ذہانت اور فطری صلاحیت کے اعتبار سے (چشم بددور) آپ اپنی نظیر ہیں اور جن کی عزت ومحبت میرے دل کی گہرائیوں میں ہے اور آیندہ زندگی میں عزیز موصوف سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں، عزیز کے متعلق بعض اکابر نے ابتدا ہی میں مضامین وغیرہ دیکھ کر خوش آئند مستقبل کی بشارت دی تھی، چنانچہ جب ۱۹۳۷ء میں مدرسہ سے فارغ ہوچکے تو متکلم اسلام مولانا سید

ابوالاعلیٰ مودودی مدظلہ مدیر ترجمان القرآن کی جوہر شناس نظر نے دارالاسلام پٹھان کوٹ پنجاب بلالیا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ علم، عمل اور زندگی کے پاک مقاصد میں کامیاب فرماکر نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام عالم اسلامی کے لیے باعث فخر بنائے''۔ (ص: ۸)

آخری درجہ کے سالانہ امتحان میں حجتہ اللہ البالغہ کا پرچہ علامہ سلیمان ندوی نے بنایا تھا، وہ مولانا صدرالدین صاحب کے جوابات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کی کاپی پر ''لائق تربیت'' تحریر فرمایا۔

انہوں نے مولانا نجم الدین اصلاحی کے علاوہ مولانا شبلی متکلم ندوی، مولانا حکیم محمد احمد لہراوی، مولانا محمد سعید ندوی، مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا اختر احسن اصلاحی وغیرہ سے بھی درس لیا۔

طالب علمی کے زمانے ہی سے ان کے مضامین ترجمان القرآن اور دوسرے رسالوں میں چھپنے لگے تھے، یہی ان کے پٹھان کوٹ جانے کی تقریب بنے، وہاں انہوں نے تفسیر، حدیث اور فقہ کی امہات کتب اور علامہ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم اور شاہ ولی اللہ صاحب کی تصنیفات کا مطالعہ بڑی محنت و جاں فشانی سے کیا اور ترجمان القرآن کے لیے بڑے معرکتہ الآراء مضامین لکھے جو بعد میں کتابی صورت میں طبع ہوئے، یہاں ان کے قیام کے زمانے میں جماعت اسلامی کی تاسیس ہوئی اور وہ اسی وقت اس کے رکن ہوئے اور تاعمر پوری استقامت کے ساتھ اس سے وابستہ رہے۔

پٹھان کوٹ کی آب وہوا راس نہ آنے کی وجہ سے وہ رنگون (برما) تشریف لے گئے، ۱۹۴۶ء میں مدرستہ الاصلاح میں درس و تدریس کی خدمت پر مامور ہوئے، ۱۹۴۹ء میں امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث صاحب نے ان کو رام پور بلالیا، وہاں جانے سے قبل راقم نے سورۂ حدید تا حشر کا ترجمہ اور کلیلہ دمنہ کے بعض ابواب ان سے پڑھے، رام پور میں تعلیمی و انتظامی کاموں کے ساتھ ہی تصنیف و تالیف کا کام بھی ان کے سپرد ہوا، پھر علی گڑھ میں جماعت کے زیر اہتمام ادارہ تصنیف و تالیف قائم ہوا تو اس کی صدارت انہیں تفویض کی گئی، اس عرصہ میں خود تصنیف و تالیف کے علاوہ بعض طلبہ کو اس کی تربیت دی اور ایک علمی و تحقیقی سہ ماہی رسالہ ''تحقیقات اسلامی'' جاری کیا۔ لیکن صحت کی خرابی سے یہاں کا قیام ترک کر کے اعظم گڑھ کے قصبہ پھول پور میں قیام پذیر ہوگئے جہاں ان کے صاحب زادے ڈاکٹر افتخار احمد پریکٹس کرتے تھے، بالآخر یہیں خاتمہ بالخیر ہوا۔

قرآن مجید پر ان کی اچھی اور گہری نظر تھی، وہ گفتگو بھی کرتے تھے تو اکثر موقع و محل کے مناسب آیتیں پڑھتے جاتے، انہیں ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہی سے براہ راست استفادہ کا موقع نہیں ملا لیکن بالواسطہ ان پر ''فکر حمید'' ہی کی چھاپ تھی۔ تصنیف و تالیف کا خداداد اور فطری ملکہ تھا، ان کی تصنیفات کے نام یہ ہیں۔

معرکۂ اسلام و جاہلیت، فریضہ اقامت دین، اساس دین کی تعمیر، قرآن مجید کا تعارف، دین کا قرآنی تصور، اسلام ایک نظر میں، اسلام اور اجتماعیت، مسلمان اور امامت کبریٰ، تحریک اسلامی ہند، حقیقت نفاق، حقیقت عبودیت، اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ، راہ حق کے مہلک خطرے، نکاح کے اسلامی قوانین، یکساں سول کوڈ اور مسلمان، اسلامی نظام معیشت، دین کا مطالعہ، مسلم پرسنل لا دینی و ملی نقطۂ نگاہ سے، مسلمان اور دعوت اسلام، تلخیص تفہیم القرآن۔

یہ کتابیں جماعت کے علاوہ دوسرے حلقوں میں بھی پسند کی گئیں اور متعدد کے ترجمے ہندی اور دوسری ملکی زبانوں میں ہوئے، غیر مسلموں کو اسلام سے روشناس کرانے میں جماعت اسلامی کو علانیہ ترجیح حاصل ہے، اس نے اپنے ضروری اور اہم لڑیچر کے ترجمے کے علاوہ ہندی اور ملک کی مختلف زبانوں میں طبع زاد کتابیں بھی شائع کی ہیں، شروع میں ہندی میں قرآن مجید کے ترجمہ کا پروگرام بنا تو مولانا صدرالدین صاحب نے اردو میں تیسیر القرآن لکھنے کا آغاز کیا جس کے کچھ حصے ان کے استاد مولانا اختر احسن اصلاحی کے ملاحظے کے بعد ماہنامہ ''زندگی'' میں شائع ہوئے مگر پھر یہ سلسلہ موقوف ہوگیا اور اس کا ہندی ترجمہ بھی نہیں چھپا۔

مولانا صدرالدین صاحب کو مدرستہ الاصلاح اور جامعتہ الفلاح سے خاص تعلق تھا، وہ ان کی انتظامی و تعلیمی مجالس کے رکن اور موخر الذکر کے ناظم بھی تھے، ان اداروں کو ان کے تجربہ، دوراندیشی، اصابت رائے اور تدبر سے بڑا فائدہ پہنچا، آخر میں جلسوں میں شرکت سے معذوری کے باوجود ان کے حالات سے باخبر اور ان کے لیے فکرمند رہتے، ان کی وفات سے یہ ادارے اپنے ایک بڑے سرپرست سے محروم ہوگئے، ان کی وفات جماعت اسلامی کا بھی ناقابل تلافی خسارہ ہے، اب جماعت میں اس پایہ کا مدبر، صاحب فراست اور ذی بصیرت عالم نظر نہیں آتا۔

مولانا تدبر و تفکر کے عادی، خاموش، سنجیدہ اور باوقار شخص تھے، جلوس، سطحی، ہنگامی اور عام دلچسپی کے کاموں سے ان کو کوئی مناسبت نہ تھی، سستی شہرت اور نام و نمود سے بیزار تھے، ان کے تعلقات بھی زیادہ وسیع نہ تھے، عام تو درکنار خاص لوگوں سے بھی زیادہ اختلاط پسند نہ کرتے کیونکہ علمی اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے یہی چیزیں بڑی تباہ کن ہوتی ہیں، وہ خاموشی سے علم و دین کی خدمت کو اپنا مقصد حیات بنائے ہوئے تھے، تاہم متقشف اور خشک آدمی نہ تھے، اپنے ہم مذاق دوستوں سے بڑی بے تکلفی سے ملتے اور نہایت دلچسپ اور پرلطف باتیں کرتے، ایسے موقعوں پر ان کی ذہانت و ظرافت طبع کے خوب نمونے دیکھنے میں آتے۔

اللہ تعالیٰ علم و دین کے اس خادم کی مغفرت فرمائے، ان کے اعزہ اور اہل تعلق کو

صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ (''ض''، دسمبر ۱۹۹۸ء)

اسلم، محمد، پروفیسر

پروفیسر محمد اسلم مرحوم

یہاں بڑی تاخیر سے یہ افسوس ناک خبر ملی کہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے سابق استاد پروفیسر محمد اسلم ۶/ اکتوبر کو اچانک حرکتِ قلب بند ہوجانے سے اس دنیا سے رخصت ہوگئے، انالله و انا الیه راجعون۔

ان کا خاص موضوع تاریخ ہند تھا، عہد سلطنت و دور مغلیہ کے حکمرانوں اور اس عہد کے مشائخ کے متعلق ان کے مقالات اور کتابوں کو علمی و تحقیقی حلقوں میں قدر و ستایش سے دیکھا گیا اور ان کی بڑی پذیرائی بھی ہوئی۔

طالب علمی کے زمانہ سے ہی تاریخ سے ان کو خاص لگاؤ رہا، پنجاب یونیورسٹی سے اسی مضمون میں انہوں نے ایم۔ اے کیا، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے علاوہ انہوں نے برطانیہ میں ڈرہم، مانچسٹر اور کیمبرج یونیورسٹیوں سے بھی اکتساب علمی کیا۔ لاہور میں ڈاکٹریٹ کے لیے انہوں نے شاہجہاں کی مذہبی پالیسی کا عنوان منتخب کیا تھا، لیکن اس کی تکمیل سے پہلے ان کو یورپ جانے کا موقع ملا جس کی وجہ سے غالباً یہ مقالہ مکمل نہ ہوسکا۔

ان کی تحریری صلاحیتوں سے متاثر ہوکر شیخ محمد اکرام نے ان کو تحقیقی مضامین لکھنے پر آمادہ کیا، ۱۹۶۷ء سے یہ سلسلہ شروع ہوا تو برصغیر کے اکثر ممتاز رسائل و مجلّات میں ان کی تحریریں شایع ہوتی رہیں، خاص طور پر رسالہ برہان دہلی کے صفحات پر ان کی نگارشات کثرت سے نظر آتی ہیں جن میں مقالات، تنقید و تقریظ اور تعزیتی مضامین وغیرہ شامل ہیں۔ معارف میں بھی ان کے کئی مضامین چھپے، دین الٰہی اور اس کا پس منظر، شاہان مغلیہ کا ذوق موسیقی، مسلمانوں کی جغرافیائی خدمات، فتوحات فیروز شاہی، مسجد قبا سے تاج محل تک، عربوں کے عہد میں سندھ میں علم و ادب، ہیر وارث شاہ کی تاریخی اہمیت، سلاطین دہلی، ہندو تہذیب اور ادب اور داراشکوہ کے مذہبی رجحانات وغیرہ مقالات سے ان کی وسعتِ مطالعہ، ذوق تحقیق، دقتِ نظر اور تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے، دین الٰہی اور اس کا پس منظر جب کتابی شکل میں شائع ہوئی تو ان کے استاد اور تاریخ کے مشہور معلم پروفیسر شیخ عبدالرشید نے لکھا کہ اس سے زیادہ مستند کتاب آج تک نہیں لکھی گئی۔ یہ کلمات محض حوصلہ افزائی کے لیے نہیں بلکہ حقیقت پر مبنی ہیں، اس کتاب کی تالیف میں ایسے مخطوطات سے بھی استفادہ کیا گیا تھا جو محققین کی نظروں سے اب تک پوشیدہ تھے۔

تذکرۂ مشائخ اور مطالعۂ ملفوظات میں انہوں نے پروفیسر خلیق احمد نظامی کا تتبع کیا اور درر نظامی، حضرت مجدد الف ثانی اور جہانگیر، ملفوظاتِ خواجہ بندہ نواز گیسودراز، خواجہ محمد ہاشم کشمی، داتا گنج بخش کی لاہور میں آمد جیسے وقیع، بلند پایہ اور پراز معلومات مقالات سپرد قلم کئے، ان مضامین کے مجموعے انہوں نے لاہور میں اپنے قائم کردہ ادارہ ندوۃ المصنفین سے ''تاریخی مقالات'' اور ''سرمایۂ عمر'' کے نام سے شایع کئے، ان کی دیگر تصنیفات میں شیخ احمد سرہندی، شاہ فتح الله شیرازی، تاریخ پاک و ہند، تاریخ پاکستان اور دنیائے اسلام بھی شامل ہیں، ان کے علاوہ فضل الله روز بہان اصفہانی کی سلوک الملوک کا انہوں نے مسلم کنڈکٹ آف اسٹیٹ کے نام سے انگریزی میں ترجمہ بھی کیا، ان کی ایک اور اہم کتاب وفیاتِ مشاہیر پاکستان کو مقتدرہ قومی زبان پاکستان نے ۱۹۹۰ء میں اہتمام سے شایع کیا، یہ ۱۴/ اگست ۱۹۴۷ء سے ۱۴/ اگست ۱۹۸۷ء تک وفات پانے والے مشاہیر کا مفصل اشاریہ ہے، یہ کتاب اصلاً وفیات نگاری و آثار شناسی کی اس روایت کی تجدید ہے، جس کی ابتدا اردو میں آثار الصنادید کے ذریعہ سرسید احمد خاں نے کی تھی، پروفیسر محمد اسلم مرحوم کے ذوق تاریخ نے آثار شناسی میں اپنی نوعیت کی پہلی اور انوکھی تحقیقی کاوش کی جانب ان کو متوجہ کیا، چنانچہ انہوں نے مشاہیر کے مزاروں کے الواح و کتبات کی نقل حاصل کرنے کا اہتمام کیا اور جب الواح الصنادید کے نام سے ان کی یہ کاوش برہان و معارف کے صفحات پر منتقل ہوئی تو قدردانوں کے لیے یہ دلچسپی اور افادیت کا سامان ثابت ہوئی، اندازہ ہوتا ہے کہ الواع مزار سے ان کا یہ شغف شروع سے تھا، کیوں کہ ۱۹۶۸ء میں جب وہ برہان پور میں شیخ محمد ہاشم کشمی کے مزار پر گئے تھے تو اس وقت بھی لوح مزار کی عبارت نقل کرلی تھی، الواح الصنادید کے حصول کے شوق کے نتیجہ میں خفتگانِ خاک لاہور اور خفتگانِ کراچی جیسی کتابیں تیار ہوئیں، جواب جدید فن رجال و تذکرہ اعلام میں مستند مرجع و ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ان کی تمام تحریروں میں سب سے نمایاں خوبی تلاش و تحقیق میں سخت محنت اور اصل مصادر تک رسائی ہے، اس راہ میں انہوں نے یورپ اور برصغیر کے اکثر کتب خانوں سے براہ راست استفادہ کیا، ہندوستان وہ کئی بار آئے ۱۹۶۷ء میں علی گڑھ آئے تو صاحب برہان مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم کی صاحبزادی سے عقد ہوا، ان کا تعلق پنجاب کے ایک معزز خاندان سے تھا، اپنے جد امجد حاجی عمر الدین آف پھلور کے لیے انہوں نے اپنا مجموعۂ مضامین ''سرمایۂ عمر'' کے نام سے نذر کیا، ان کے والد چودھری طفیل محمد بھی نیک نام و شریف بزرگ تھے، خود بھی خاکِ پنجاب کے طبعی حسن و صحت کا نمونہ تھے، ظاہر کے مانند باطن بھی محاسن سے آراستہ تھا، سادہ دل اور تکلفات سے عاری تھے اور اس کا اظہار بھی کرتے تھے کہ ''ہم لوگ پنجاب کے رہنے والے ہیں اس لیے تکلفات میں نہیں پڑتے''، پنجاب یونیورسٹی سے وظیفہ یابی کے بعد سرسید سوسائٹی سے وابستہ ہوگئے تھے اور اس کے ترجمان رسالہ تہذیب الاخلاق لاہور کے مدیر بھی ہوگئے تھے۔

دارالمصنفین سے تعلق رکھتے تھے، اپنی کتابیں معارف میں تبصرہ کے لیے ضرور

بھجواتے، جناب شیخ نذیر حسین صاحب مدیر اردو انسائکلو پیڈیا آف اسلام کے خطوط سے ان کی خیریت مل جاتی تھی، مگر ادھر عرصہ سے ان کی کوئی خبر نہیں ملی تھی، ان کی اولاد میں فواد زفر کا نام معلوم ہوسکا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے تمام پس ماندگان کو صبر و رضا کی توفیق دے اور ان کی نیکیوں کو قبول فرما کر اعلیٰ مدارج سے سرفراز فرمائے۔

(''ع۔ص''، دسمبر ۱۹۹۸ء)

احمد، قیام الدین، پروفیسر

پروفیسر قیام الدین احمد صاحب مرحوم

(ڈاکٹر جاوید علی خاں)

پروفیسر قیام الدین احمد مرحوم ملک کے ممتاز مورخ اور مشہور عالم و محقق تھے، ۲۷/اگست ۱۹۹۸ء کو ان کا انتقال اچانک حرکت قلب بند ہوجانے کی وجہ سے ہوا، اس وقت وہ خدا بخش لائبریری پٹنہ کے ایک سیمینار کے لیے اپنا مقالہ ٹائپ کر رہے تھے جو آزادی کی گولڈن جبلی تقریبات کے سلسلے میں جامعہ ہمدرد دہلی میں ہونے والا تھا۔

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ اور انیسویں صدی کا ہندو مسلم معاشرہ ان کا خاص موضوع تھا، اس پر ان کی نظر وسیع تھی۔ بہار میں ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ نویسی کی روایت کی بنیاد شاد عظیم آبادی اور ونا یک پرشاد نے ڈالی تھی جس کو سرجدو ناتھ سرکار نے پروان چڑھایا اور پدم شری پروفیسر سید حسن عسکری نے نقطۂ عروج تک پہنچایا، پروفیسر قیام الدین اسی سلسلہ کی آخری کڑی تھے، ان کی وفات سے جو خلا ہوا ہے اس کا پُر ہونا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

ملک و قوم کی بے لوث خدمت اور آزادی وطن کی تحریک میں علمائے صادق پور کے کارنامے اظہر من الشمس ہیں، مرحوم قیام الدین کا تعلق اسی عظیم اور مقدس خانوادے سے تھا، حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک اصلاح و جہاد میں بھی اس خاندان کے بزرگوں نے بڑے جوش و خروش اور نہایت عزم و استقلال سے حصہ لیا تھا۔

مرحوم کے اجداد میں مولانا احمد اللہ صاحب اور کئی لوگوں کو انبالہ مقدمات کے سلسلہ میں کالے پانی کی سزا ہوئی۔ موجودہ صدی کے اوائل میں اس خاندان کے افراد کا رجحان مغربی تعلیم کی طرف ہوگیا۔ پروفیسر قیام الدین احمد صاحب کے دادا ڈاکٹر عظیم الدین احمد عربی کے مشہور فاضل اور اردو کے معروف شاعر و نقاد تھے، انہوں نے سر محمد اقبال کے ساتھ جرمنی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری لی اور پٹنہ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو فارسی و عربی کے صدر رہے۔ مرحوم قیام الدین صاحب کے والد جناب علیم الدین احمد پٹنہ کالج میں تدریس کی خدمت پر مامور ہوئے، ان کے عم محترم پدم شری کلیم الدین احمد جو عالمگیر شہرت کے حامل تھے، پٹنہ یونیورسٹی میں انگریزی ادبیات کے استاد اور اردو کے ماہر فن نقاد کی حیثیت سے غیر معمولی شہرت حاصل کی، پروفیسر قیام الدین اسی عظیم خاندان کے چشم و چراغ تھے۔

پروفیسر قیام الدین احمد کی ولادت ۱۹۳۰ء میں خواجہ کلاں پٹنہ سٹی میں ہوئی تھی انہوں نے ابتدائی تعلیم محمڈن اینگلو عربک اسکول میں حاصل کی جس کو ان ہی کے اجداد نے سر سید احمد کی تحریک سے متاثر ہوکر ۱۸۸۴ء میں قائم کیا تھا۔ اس اسکول میں مرحوم سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے بھی ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ اپنی وفات کے وقت قیام الدین احمد صاحب اس اسکول کی انتظامیہ کے سکریٹری بھی تھے۔

۱۹۵۰ء میں انہوں نے تاریخ میں ایم۔اے کیا اور ۱۹۵۲ء میں بہار ایجوکیشن سروس سے وابستہ ہوئے اور کاشی پرشاد جیسوال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ایک ریسرچ فیلو کی حیثیت سے اپنی علمی زندگی کا آغاز کیا۔ اس ابتدائی دور میں وہ مشہور مورخ کے۔کے دتا کے ساتھ دو اہم کتابوں کی ترتیب و تدوین میں ان کے معاون رہے (''بایوگرافی آف کنور سنگھ اینڈ امر سنگھ اینڈ بہار تھرو دی ایجیز'')۔

انہوں نے اپنے تحقیقی مقالے کا موضوع سید احمد شہید کی تحریک کو بنایا جسے بدنام کرنے کے لیے وہابی تحریک کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس پر ۱۹۹۲ء میں انہیں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری سے نوازا گیا اسی زمانہ سے مرحوم سید حسن عسکری، اے۔ایس۔ آر ٹیکاز فصیح الدین بلخی اور پروفیسر رام شرن شرما جیسے مشہور عالموں سے ان کی قربت بڑھی اور انہوں نے ان سے بڑا استفادہ کیا۔ ۱۹۹۴ء میں اپنے استاد رام شرن شرما کے اصرار سے جو ابھی باحیات ہیں، پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ سے وابستہ ہوگئے اور علمی و تحقیقی کاوشوں میں مرتے دم تک مشغول رہے ۱۹۹۲ء میں تدریسی کاموں سے سبکدوش ہوگئے۔ ادھر کچھ عرصہ سے وہ اور پروفیسر سریندر گوپال صاحب پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے اصرار پر دوبارہ ہفتہ میں دوبار تدریس کا کام انجام دینے لگے تھے۔

قیام الدین صاحب کو تحریر و تصنیف کا اچھا سلیقہ تھا، انہوں نے ایک درجن سے زیادہ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جن میں بعض کو انہوں نے ایڈٹ کیا ہے اور بعض ترجمے ہیں۔ ان کے مضامین کی تعداد ۱۵۰ سے متجاوز ہوگی جو زیادہ تر انگریزی زبان میں ہیں۔ ان کے اردو مقالے اور مضامین پٹنہ کے مشہور رسالۂ معاصر، میں طبع ہوئے ہیں۔ یہ مقالے وہابی تحریک، ہندو مسلم معاشرہ بہار کے علاقائی تاریخ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ و ثقافت، تحریک آزادی، تاریخی دستاویز، قلمی نسخے، شخصیات اور دیگر موضوعات سے متعلق ہیں۔ ان کی تلاش و جستجو سے بہار کی کتنی نایاب اور مفقود کتابیں منظر عام پر آئیں۔ دربھنگہ اور تبیاراج کے قیام کے متعلق اہم ترین دستاویز اور فرامین بھی شائع کیے۔ چند ماہ قبل انہوں نے نالندہ ضلع میں ہلسا کے قریب واقع اساڑھی میں سولھویں صدی کے بادشاہ اکبر کے ایک ہمعصر صوفی بزرگ شاہ سلطان کے مزار کو دریافت کیا

تھا۔ اسی کے قریب واقع تلہاڑہ میں انہوں نے ایک سنگی مسجد کی تاریخی حیثیت کو نمایاں کیا اس انکشاف کے بارے میں راقم کو پچھلی ملاقات میں تفصیل سے بتایا تھا۔ یہ مسجد بہار کی قدیم ترین مسجد ہے۔ اس کی تعمیر بختیار خلجی کی آمد کے زمانے میں ہوئی تھی۔

ان کی اہم ترین کتاب ''وہابی موومنٹ آف انڈیا'' ہے۔ دوسری اہم کتاب ''کارپس آف عربک اینڈ پرشین انسکرپشن آف بہار'' ہے۔ دیگر کتابوں میں قومی تحریک کے اہم قائد بیرسٹر مظہرالحق کی سوانح عمری انہوں نے لکھی۔ البیرونی کی شہرۂ آفاق تصنیف کتاب الہند کو ایڈٹ کیا، چند اہم تواریخ کی کتابوں کا انہوں نے اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ مثلاً سید نورالحسن کی کتاب ''سم تھاٹس آف ایگریرین ریلیشن ان مغل انڈیا'' اور پروفیسر محمد حبیب وخلیق احمد نظامی کی ایڈٹ کی ہوئی معروف کتاب ''دی دلی سلطنت''۔

آل انڈیا ریڈیو سے انگریزی، ہندی اور اردو میں ان کی تقریریں اور مقالے برابر نشر ہوتے رہتے تھے۔ دوردرشن (رانچی) کے چوپال پروگرام میں قومی یکجہتی کے موضوع پر انہوں نے اپنے خیالات ظاہر کیے۔ ایس۔ کے۔ سنہا (موجودہ گورنر آسام) کے ساتھ انہوں نے پاٹ لی پتر سے پٹنہ تک دستاویزی فلم بنائی جو ۱۹۹۷ء کے پاٹلی پتر مہوتسو میں دکھائی گئی۔ وہابی تحریک پر بھی ایک دستاویزی فلم بنائی جو عنقریب پیش ہونے والی ہے۔

پروفیسر قیام الدین مختلف مذاکروں، سمیناروں اور علمی مباحثوں میں بھی شریک ہوا کرتے تھے، مئی ۱۹۸۵ء میں وہ اسلام اور عیسائیت کے مابین بین الاقوامی مکالمہ میں بھی شامل ہوئے تھے اور اس موقع پر روم میں انہوں نے پوپ جان دوم سے بھی ملاقات کی تھی۔

پروفیسر قیام الدین مختلف سرکاری، نیم سرکاری اداروں، انجمنوں اور اکیڈمیوں کے رکن تھے۔ بعض کے سکریٹری اور سرپرست بھی تھے، ان میں ساہتیہ اکیڈمی (نئی دلی) پبلیکیشن ڈویژن (بھارت سرکار) بیورو فار انفارمیشن آف اردو (بھارت سرکار) N.C.E.R.T (این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی نئی دلی) انڈین ہسٹوریکل ریویو، انڈین کونسل آف ہسٹوریکل ریسرچ، بہار اتہاس پریشد، خدابخش لائبریری شامل ہیں وہ چند صوبائی پبلک سروس کمیشنوں کے رکن بھی تھے۔

راقم کو ایسے قابل ولایق دانشور سے تلمذ کا شرف حاصل ہے جس پر اس کو ہمیشہ ناز رہے گا، ان کو ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۳ء سے بہت قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا، ان کی عظیم عالمانہ اور محققانہ شخصیت ان کے چہرے سے ہی عیاں ہوتی تھی، وہ نہایت ہی کم سخن لیکن اصول وضابطے کے بڑے پابند تھے۔ جب میں یونیورسٹی میں پڑھتا تھا تو دوسرے شعبوں کے طلباء بھی اکثر ان کے لکچر سُننے کے لیے آیا کرتے تھے۔ وقت کے نہایت ہی پابند تھے۔ میں جب بھی ان سے ملنے جاتا اس بات کا خاص لحاظ رکھتا تھا۔

علمی مباحثوں اور جلسوں میں ان کا انداز بیان ہمیشہ پُر لطف اور متین ہوتا تھا، وہ کوزے میں سمندر کو سمو دیتے تھے، ہمارے استاد محترم پروفیسر سمنت نیوگی موجودہ صدر شعبہ تاریخ پٹنہ یونیورسٹی ایسے موقع پر اکثر کہا کرتے تھے کہ ''او مائی گاڈ! ہی از سمپل اکسیلنٹ''۔

بہت سے انگریز پروفیسر بھی ان کی اس خصوصیت کی تعریف کرتے تھے میں نے انہیں کی نگرانی میں اپنی پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری مکمل کی، اس کے موضوع ''اردو تاریخ نویسی'' پر کافی خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ افسوس اور سخت افسوس ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئے۔ (انا للہ و انا الیہ راجعون) اور ان سے بہت کچھ حاصل کرنے کی تمنا دل ہی میں رہ گئی۔ (دسمبر ۱۹۹۸ء)

عبدالرشید، جی

جناب جی۔ عبدالرشید صاحب

میں ۱۹۸۸ء کے آخر میں پہلی مرتبہ مدراس گیا تھا، اس کی اطلاع اپنے کرم فرما اور دارالمصنفین کے سابق رفیق افضل العلماء الحاج مولانا محمد یوسف کوکن عمری کو پہلے کردی تھی، ان کے پیر میں چوٹ آگئی تھی اور صاحب فراش تھے، اس لیے انہوں نے نیو کالج کے عربی کے لکچرر جناب جی۔ عبدالرشید صاحب کو بھیجا کہ وہ اپنے ہمراہ مجھے ان کے دولت خانہ پر لے آئیں، گیا تو کوکن صاحب نے دوسرے روز کھانے پر بلایا۔ چنانچہ عبدالرشید صاحب کے ساتھ وہاں گیا، اب وہ میرے ساتھ سایہ کی طرح ہوگئے۔ اپنے یہاں کھانے پر بھی مدعو کیا، مدراس کے تمام قدیم وجدید تعلیمی اداروں، قابل دید مقامات اور ساحل سمندر کی سیر کرائی۔ معارف کے خود خریدار بنے اور مزید خریدار بنانے کا وعدہ کیا۔ مدراس اسٹیشن چھوڑنے آئے۔

عبدالرشید صاحب سے گاہے ماہے خط وکتابت رہتی تھی۔ ابھی نومبر میں دارالسلام عمرآباد جانے کا پروگرام بنا تو انہیں اور جناب عبیداللہ صاحب کو خطوط لکھے کہ آپ لوگوں سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے، عبدالرشید صاحب نے جواباً تحریر فرمایا:

''خوشی ہوئی کہ مدت دراز کے بعد آپ سے ملنے کا موقع مل رہا ہے آپ مدراس تشریف لائیں اور ملاقات نہ ہو؟ نیو کالج میں ہفتے میں دو دن دینیات کے کلاس منعقد ہوتے ہیں جس میں صوم وصلوٰۃ واخلاقیات کے موضوع پر درس دیا جاتا ہے، اس سال اس کورس پر دو کتابیں انگریزی میں شائع ہوئی ہیں۔ کالج کی تعطیلات کے بعد دسمبر پہلی تاریخ کو کھل رہا ہے انشاء اللہ ۲/ تاریخ کی صبح ان کتابوں کی اجرا کے لیے ایک جلسہ صبح میں منعقد کیا گیا ہے۔ آپ کی شرکت اس جلسے میں ہمارے لیے باعث برکت ہوگی اور کتابوں کا اجرا آپ کریں باعث سعادت ہوگا''۔

ان کا گرامی نامہ میری روانگی کے بعد آیا اس لیے اس تقریب میں شریک نہیں

ہوسکا تاہم عبدالرشید صاحب اور عبیداللہ صاحب اسٹیشن پر موجود تھے اور طے پایا کہ رات کا کھانا عبدالرشید صاحب کے یہاں ہوگا، وہاں پہنچا تو پورا گھر فرش راہ بنا ہوا تھا، اپنے صاحبزادوں اور بھائی وغیرہ سے ملایا اور بڑے لطف ومحبت سے پیش آئے۔

عبدالرشید صاحب بڑے نیک طبع، شریف، متواضع، مخلص، دیندار اور دردمند شخص تھے، علم وفن کے دلدادہ اور اہل علم سے بڑا تعلق رکھتے تھے پہلے کیمسٹری کے لکچرر تھے مگر عربی زبان اور اسلامی علوم سے شیفتگی کی بنا پر مسلم یونیورسٹی سے عربی میں ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کیا اور اب اسی شعبہ سے وابستہ تھے اور اسی سال ریٹائر ہونے والے تھے۔ دارالمصنفین سے والہانہ تعلق تھا، خیال تھا کہ کسی موقع سے ان کو یہاں بلایا جائے لیکن دفعتہً عبیداللہ کا یہ خط ملا کہ:

''یہ افسوس ناک خبر دی جاتی ہے کہ الحاج محمد عبدالرشید صاحب لکچرار عربی نیو کالج مدراس پچھلی رات انتقال فرماگئے۔ آج ۴ بجے شام شہر مدراس کے مشہور صوفی حضرت دستگیر صاحب کے احاطہ قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

۱۹/جنوری کے دن مدرسہ محمدی باغ دیوان صاحب میں ظہر کی نماز کے وقت ملاقات ہوئی تھی، آپ کے روانہ کردہ مکتوب کا ذکر کیا تھا، ساتھ ہی ساتھ معارف ماہ دسمبر بھی طلب کیا تھا، مرحوم ۲۱/جنوری تین بجے اپنے ایک پڑوسی کے جنازہ میں شریک ہوئے شام اپنے ایک عزیز کے جنازہ میں شرکت کے لیے شہر سے ۲۰ کلومیٹر پر روانہ ہوئے، واپسی میں بے چینی محسوس کی، مکان پہنچے تو سینہ میں شدت پیدا ہوئی، اسی وقت سرکاری دواخانہ لے گئے ڈاکٹروں نے تصدیق کی کہ انتقال کرگئے''۔

یہ خط پڑھ کر صدمہ ہوا لیکن مشیت ایزدی میں کس کو دخل ہے اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین! (''ض''، فروری ۱۹۹۹ء)

انصاری، حیات اللہ

جناب حیات اللہ انصاری

افسوس ہے کہ ۱۸/فروری کو جناب حیات اللہ انصاری کا انتقال ہوگیا، وہ مشہور صحافی ادیب، افسانہ نگار اور اردوتحریک کے رہنما تھے، ۱۹۱۱ء میں ان کی ولادت لکھنؤ میں ہوئی، فرنگی محل کے مشہور علمی و دینی خانوادے سے ان کا تعلق تھا، یہیں کے مدرسہ نظامیہ میں فارسی وعربی پڑھی اور درسیات کی تکمیل کی، اپنے والد مولانا وحیداللہ کے انتقال کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے فاضل ادب کیا۔ انٹرنس پاس کرکے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور بی۔اے کیا۔

۳۷ء میں کانگریس کا ہفت روزہ اخبار ''ہندوستان'' ان کی ادبی وصحافتی سرگرمیوں کی جولان گاہ بنا۔ اب تو اس کا نام بھی کم ہی لوگ جانتے ہیں لیکن اس وقت کے اکثر ممتاز ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات اس میں چھپتی تھیں، یہ ۱۹۴۲ء کے ہنگامی دور میں بند ہوگیا اور ۱۹۴۵ء میں ''قومی آواز'' جاری ہوا تو اس کی ادارت حیات اللہ صاحب نے اس طرح سنبھالی کہ وہ اور قومی آواز لازم ملزوم سمجھے جانے لگے، وہ اس کے بانی مدیر تھے، انہوں نے اس کا معیار و وقار بہت بلند کیا اور اس کے لیے بڑی قربانیاں دیں، اس کے ذریعہ انہوں نے اردو اور مسلمانوں کی مذہبی وثقافتی خدمت انجام دی اور ہندو مسلم فرقہ پرستی کے خلاف لڑائی بھی لڑی۔ قومی آواز کی بدولت بہت سے لوگ اچھے صحافی بن گئے، ۳۰ برس بعد ۷۵ء میں وہ ریٹائر ہوئے، ان کے بعد بھی یہ اخبار نکلتا رہا، مگر اب ساقی تو موجود ہیں لیکن آں قدح بشکست قومی آواز سے الگ ہونے کے بعد بھی ان کو صحافت کا چسکا لگا رہا، کچھ عرصہ تک دہلی سے ہفتہ روزہ ''سب ساتھ'' نکالا۔

اردو شروع ہی سے ان کی دلچسپی اور سرگرمی کا محور رہی، وہ زندگی بھر اس کے فروغ، اس کی ترقی اور تعلیم و اشاعت کے لیے جدوجہد کرتے رہے، علی گڑھ کے قیام کے زمانے میں انہوں نے اردو میں تقریر کی مہم چلائی اردو اڈیٹرس کانفرنس کے قیام اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل میں ان کا حصہ رہا، ۴۷ء کے بعد اردو پر بڑا سخت وقت آیا، اس زمانے میں قاضی عبدالغفار اور قاضی محمد عدیل عباسی کے دوش بدوش وہ بھی اردو کی قانونی اور دستوری لڑائی کے لیے اس کے ہراول دستہ میں شامل رہے۔ آزادی سے پہلے پرانے لکھنؤ میں زور شور سے ''تعلیم بالغان'' کا کام شروع کیا اور آزادی کے بعد بالغوں کو ۱۰ روز میں اردو لکھنا پڑھنا سکھانے کے لیے حیات اللہ قاعدہ یعنی ''دس دن میں اردو'' تیار کیا، اسی سلسلے میں ''دس دن میں ہندی'' بھی لکھی۔ اس سے اردو والوں کو ہندی سیکھنے میں بڑی آسانی ہوئی۔

حیات اللہ صاحب نے کچھ عرصہ گاندھی جی کے ساتھ سیوا گرام آشرم میں گزارا، وہاں بھی لوگوں کو اردو تعلیم دی، گاندھی جی کی واردھا اسکیم کے تحت اردو لیٹری تحریک کی بنیاد رکھی تاکہ کم وقت اور کم پیسے میں گھر گھر میں اردو کا رواج ہو۔ پرائمری اسکولوں میں اردو پڑھانے کا سلسلہ بند کردیا گیا تو انہوں نے ایک ہزار سے زیادہ مقدمے قائم کئے، اس کی وجہ سے پھر ان میں اردو پڑھائی جانے لگی۔ پرائمری سے ایم۔اے تک اردو نصاب تیار کرنے اور اردو ٹرینڈ ٹیچر کی کمی پوری کرنے کے لیے بھی ان کی کوششیں بار آور ہوئیں۔

مرکزی وریاستی انجمن ترقی اردو سے ان کا خاص تعلق تھا، ریاستی انجمن تو ان کی اور ان کی بیگم سلطانہ حیات ہی کی نسبت سے جانی جاتی تھی، وہ مرکزی حکومت کے ترقی اردو بورڈ کے چیئرمین بھی رہے، اترپردیش میں اردو کو علاقائی زبان تسلیم کرانے کے لیے انہوں نے دستخطی مہم چلائی اور ۲۰ لاکھ دستخط جمع کرکے صدر جمہوریہ کو پیش کیا۔

ان کے افسانے برصغیر کے معیاری رسالوں میں چھپتے تھے جن کے کئی مجموعے

شایع ہوئے، ان کے ناول بھی مقبول ہوئے ''لہو کے پھول'' ان کا بڑا ضخیم ناول ہے۔ ان کو ان کی گوناگوں خدمات کی بنا پر مختلف اعزاز بھی عطا کئے گئے، حال ہی میں ہریانہ اردو اکادمی نے ایک لاکھ روپے پر مشتمل ''حالی ایوارڈ'' دیا تھا۔

سیاست ان کی گھٹی میں داخل تھی، آزادی کی تحریک اور کانگریس سے ان کی عملی وابستگی تھی، رفیع احمد قدوائی، جواہرلال نہرو اور گاندھی جی سے بڑے قریب تھے، نیشنلزم، سوشلزم اور گاندھیائی تصورات کی ان پر گہری چھاپ تھی اور وہ عمر بھر ان نظریات کی تبلیغ کرتے رہے، کئی برس تک یوپی لیجسلیٹو کونسل کے اور دوبار راجیہ سبھا کے ممبر رہے، کئی ملکوں کا سفر بھی کیا۔

وہ ایک مذہبی گھرانے کے فرد تھے اور مذہبی تعلیم بھی حاصل کی تھی، ان کی تحریروں کے منطقیانہ انداز اور طریقۂ استدلال سے بھی معقولات کے اچھے فاضل ہونے کا پتہ چلتا ہے، لیکن شروع میں ان کا رجحان کیمونزم کی طرف ہوگیا تھا اور وہ مذہب سے بھی برگشتہ ہوگئے تھے، بعد میں کیمونزم سے منحرف اور خدا کے قائل ہوگئے تھے مگر اس وقت بھی نیشنلزم اور گاندھی جی کے افکار ان کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے، مذہبی جماعتوں خصوصاً جماعت اسلامی کے شدید مخالف تھے، متعدد ممتاز علماء سے ان کا ہمیشہ اختلاف رہا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی سے اکثر نوک جھونک رہتی، حیات اللہ صاحب کے ناول ''لہو کے پھول'' خصوصاً اسکی ضخامت پر مولانا کا تبصرہ اور قومی آواز سے ان کے ریٹائر ہونے پر مولانا کا نوٹ اب بھی لوگوں کے ذہن میں ہوگا جس کا عنوان یہ مصرعہ تھا:

لذت عشق گئی غیر کے مرجانے سے

حیات اللہ صاحب لکھنؤ کے دلکش تہذیبی رکھ رکھاؤ کا نمونہ تھے، ہمیشہ لکھنوی لباس زیب تن ہوتا تھا، لیکن لکھنو کی شاعری کے زیادہ معتقد نہیں تھے، البتہ میر انیس کا لوہا مانتے تھے، یہاں کی مشہور ''شیعہ سنی کشمکش'' سے ان کا کوئی واسطہ نہ تھا، وہ دونوں فرقوں کے اکابر کا احترام کرتے تھے اور دونوں کی تقریبات میں مدعو کئے جاتے تھے۔

مرحوم بڑے اچھے صحافی اور بہت مشاق اہل قلم تھے، اس کا اور ان کی طویل اردو خدمات کا اعتراف ان کے مخالفین کو بھی تھا۔ ان کی وفات اردو دنیا کا بڑا سانحہ ہے، دارالمصنفین اور شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم سے ان کا بڑا تعلق تھا۔ اللہ تعالیٰ ان سے لطف و کرم کا معاملہ کرے۔ آمین!! (''ض''، مارچ ۱۹۹۹ء)

عبدالعزیز بن باز، شیخ

شیخ عبدالعزیز بن باز

گزشتہ ماہ علامہ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز نے ۸۸ برس کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ وہ مملکت سعودیہ کے جلیل القدر عالم، مفتی اعظم، علمائے کبار کی سپریم کونسل نیز دارالافتاء اور مجلس بحوث علمیہ کے سربراہ رابطہ عالم اسلامی، **الجمع الفقھی الاسلامی** اور اس نوع کی متعدد عالمی سطح کی علمی و تحقیقی، دعوتی اور فلاحی انجمنوں اور اداروں کے اساسی رکن تھے۔ دارالمصنفین میں شیخ کی وفات کی خبر بڑے رنج و غم سے سنی گئی اور تعزیت کے لیے برقیہ بھی بھیجا گیا۔

شیخ عبدالعزیز بن باز کتاب و سنت کے متبحر عالم، تقویٰ و طہارت، للّٰہیت اور سادگی اور خلوص و خدمت کا مجسم پیکر تھے، ان کی وفات دنیائے اسلام کا بڑا سانحہ ہے اس سے پیدا ہونے والا خلا پُر نہیں ہوسکتا۔ **ولکنه بنیان قوم تهدما**۔

شیخ ابن باز نہایت کم عمری میں آنکھوں کی بصارت سے محروم ہوگئے، مگر اپنی غیر معمولی علمی و فقہی بصیرت کی بنا پر مملکت سعودیہ کے اہم مذہبی مناصب پر فائز ہوئے الجامعۃ الاسلامیہ (مدینہ یونیورسٹی) کے پہلے وائس چانسلر کی حیثیت سے ان کا انتخاب ہوا۔ مملکت کے مفتی عالم شیخ محمد ابراہیم کے انتقال کے بعد ان کے جانشین مقرر ہوئے۔

مملکت سعودیہ میں ان کو غیر معمولی عزت و احترام حاصل تھا، سربراہان مملکت بھی ان کے ساتھ نہایت عزت و تکریم کے ساتھ پیش آتے۔ ان کے جنازہ میں فرماں روائے مملکت شاہ فہد، اعیان مملکت اور شاہی خانوادہ کے علاوہ لاکھوں افراد نے شرکت کی۔

غرباء پروری اور مہمان نوازی ان کی گھٹی میں تھی، ان کی قیام گاہ پر ہمیشہ مہمانوں اور ضرورت مندوں کا جمگھٹ لگا رہتا اور وہ نہایت بشاشت کے ساتھ ان کی میزبانی کرتے اور حاجت روائی کرتے تھے، راقم الحروف کو صرف ایک مرتبہ ان سے مسجد نبوی میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ وضع قطع اور لباس کی سادگی سے قرن اول کے مسلمانوں کا نمونہ معلوم ہوتے تھے۔

شیخ ابن باز مدۃ العمر مملکت سعودیہ کے حدود سے باہر نہیں نکلے۔ مگر پورے عالم اسلام کے حوادث و مسائل سے باخبر رہتے تھے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح کے لیے ہمیشہ فکر مند اور کوشاں رہتے۔ دنیا کے کسی بھی خطہ میں کوئی فاسد عقیدہ رونما ہوتا یا کوئی فتنہ سر اٹھاتا تو وہ اس کی بیخ کنی کے لیے کمربستہ ہوجاتے اور اتمام حجت کی ہر ممکن کوشش کرتے، چنانچہ ہندوستان میں بابری مسجد کی شہادت کے المیہ اور مسلمانوں سے تعلق رکھنے والے دوسرے معاملات پر آواز بلند کرتے اور حکومت اور عام لوگوں کے جارحانہ رویے پر اپنے رنج و الم کا اظہار فرماتے، ان کی اسلامی خدمات کے اعتراف میں عالم اسلام کا عظیم ایوارڈ ''جائزۃ الملک فیصل'' ان کو پیش کیا گیا جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔

اخباری اطلاعات کے مطابق تقریباً بیس لاکھ مسلمانوں نے ان کے جنازہ میں شرکت کی، مسجد حرام میں نماز جنازہ ادا ہوئی اور قبرستان العدل میں تدفین ہوئی، علامہ ابن قیم کا جنازہ بھی اسی شان سے اٹھا تھا اور اس وقت کے ابن تیمیہ کو بھی یہ سعادت

حاصل ہوئی۔

اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو شرف قبولیت سے نوازے اور مملکت سعودیہ کو ان کا بدل عطا فرمائے، آمین۔ (''ع۔ع''، جون ۱۹۹۹ء)

جون پوری، عبدالحلیم، مولانا شاہ

مولانا شاہ عبدالحلیم جون پوری

گزشتہ دنوں ضلع جون پور اور اس کے نوح کے مشہور شیخ طریقت اور ممتاز عالم ربانی مولانا شاہ عبدالحلیم صاحب جونپوری رحلت فرماگئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانائے مرحوم ۱۹۰۷ء میں ضلع فیض آباد کے ایک گاؤں دیوریا میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم مدرسہ عین العلوم ٹانڈہ میں ہوئی۔ مظاہرالعلوم سہارنپور سے سند فراغت حاصل کی۔ ابتداً مظاہرالعلوم ہی میں مدرس مقرر ہوئے مگر طبیعت کی خرابی کی بنا پر جلد ہی اپنے وطن واپس آگئے، یہاں مسلمان بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لیے ایک مکتب قائم کیا پھر ترک سکونت کرکے ضلع جونپور کے قدیم مردم خیز قصبہ مانی کلاں میں مستقل بود وباش اختیار کی۔ اور یہیں کے قدیم مدرسہ میں درس وتدریس پر مامور ہوگئے۔ ۱۹۳۷ء میں مانی کلاں کو خیرباد کہہ کر اس کے قریب ہی لب سڑک واقع موضع گورینی میں ایک مدرسہ ریاض العلوم کی بنیاد رکھی، جس نے مولانائے مرحوم کی سرپرستی ونگرانی میں بڑی ترقی کی۔

مولانا کی طبیعت کا رجحان ہمیشہ رشد واصلاح کی طرف رہا، اس نواح میں ان کی ذات سے لوگوں کو بڑا فیض پہنچا، وہ شاہ وصی اللہ فتح پوریؒ اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کے مسترشد اور خلیفہ تھے، جونپور اور اعظم گڑھ کے علاوہ بمبئی اور گجرات وغیرہ میں بھی ان کے مریدین کا بڑا حلقہ تھا، ان کی سرپرستی میں مدرسہ کے احاطہ میں کئی تبلیغی اجتماعات بھی منعقد ہوئے۔ مولانا عبدالحلیم بڑے متواضع، ملنسار اور مقدس بزرگ تھے، ایک مدت سے مختلف عوارض کا شکار تھے، راقم الحروف کو عرصہ سے ان سے نیازمندی کا شرف حاصل تھا۔ متعدد بار ان کی مزاج پرسی اور عیادت کے لیے حاضر ہوا، مگر کبھی ان کی زبان سے کسی طرح کا شکوہ وشکایت نہیں سننے میں آئی۔ ہر حال میں صابر وشاکر اور ہمیشہ ذکر الٰہی میں سرشار پایا۔ مولانا کی طبیعت میں شگفتگی تھی۔ ان کا وعظ بڑا موثر ہوتا جو مختصر ہونے کے باوجود پُرمغز اور جامع ہوتا۔

دوسروں کی مدد بھی کرتے، ان کی زندگی تصنع وتکلف سے بری تھی۔ مدرسہ ریاض العلوم کو اپنے خون جگر سے سینچا تھا، اس کی تعمیر وترقی کے لیے عمر بھر جدوجہد کرتے رہے، ان کا تعلق دوسرے مدارس سے بھی تھا، دارالعلوم دیوبند، مظاہرالعلوم سہارنپور اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ رشد واصلاح اور دعوت وتذکیر ان کا خاص میدان تھا۔ جس میں ان کی وفات سے بڑا خلا پیدا ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے۔ (''ع۔ع''، جون ۱۹۹۹ء)

محبّ الحسن، پروفیسر

پروفیسر محبّ الحسن مرحوم

گزشتہ مہینے ملک کے ممتاز مورخ اور مشہور معلم جناب پروفیسر محبّ الحسن کا انتقال ۹۰ برس کی عمر میں ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم نے تاریخ ٹیپو سلطان کے مصنف کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کی وہ اس موضوع پر سند کا درجہ رکھتے تھے، ان کی کتاب ''کشمیر سلاطین کے عہد میں'' بھی کشمیر کی تاریخ میں بڑی وقیع خیال کی جاتی ہے۔ انہوں نے اگرچہ کم لکھا تاہم اپنی بلند پایہ کتابوں اور اہم تحریروں کی وجہ سے وہ نامور اور اچھے مصنفوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

پروفیسر محبّ الحسن نے لکھنؤ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد لندن یونیورسٹی سے تاریخ میں بی اے آنرز کیا، وہاں سے واپسی کے بعد ان کی طویل زندگی کا آغاز کلکتہ یونیورسٹی سے ہوا جہاں انہوں نے ۴۲ء سے ۵۶ء تک اسلامی تاریخ وتہذیب کا درس دیا۔ ۵۶ء سے ۶۳ء تک وہ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے ریڈر رہے۔ پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پروفیسر اور شعبہ تاریخ کے صدر کی حیثیت سے ۷۰ء تک سرگرم عمل رہے اور آخر میں وہ کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے صدر مقرر ہوئے اور ۷۴ء تک وہاں درس وتدریس میں مشغول رہے۔

ان کے وسیع علمی وتعلیمی تجربات سے مختلف اداروں اور تنظیموں کو بڑا فائدہ پہنچا۔ بنگال کی ریجنل ریکارڈ سروے کمیٹی کے وہ اہم رکن تھے۔ آثار قدیمہ کی ایک اہم کمیٹی سے بھی ان کا تعلق رہا۔ حکومت ہند نے ایک وفد امریکہ اور برطانیہ میں تعلیم عامہ کے جائزہ کے لیے روانہ کیا تھا، اس کے آٹھ رکنی وفد میں بھی شامل تھے۔ انہوں نے انڈین ہسٹری کانگریس اور پنجاب ہسٹری کانگریس کے شعبہ قرون وسطیٰ کی صدارت بھی کی۔ کلکتہ کی ایران سوسائٹی کے وہ اساسی رکن تھے، اس کے نائب صدر اور سوسائٹی کے مشہور مجلّہ انڈوایرانیکا کی مجلس ادارت میں بھی برسوں شامل رہے۔ ایران سوسائٹی کے بانی ڈاکٹر محمد اسحاق سے ان کو خاص تعلق تھا، جو ان کی وفات کے بعد ایران سوسائٹی کی طرف منتقل ہوکر برابر قائم واستوار رہا۔ ان کی کتابوں میں ہسٹری آف ٹیپو سلطان، کشمیر انڈر دی سلطانس، بابر فاؤنڈر آف دی مغل ایمپائر ان انڈیا اور کشمیر ان ٹرموائل اور متعدد اہم مقالے ہیں جو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام اور انڈوایرانیکا میں شایع ہوتے رہے، ان کی ایک تصنیف ہندوستانی دور وسطیٰ کے مورخین بھی ہے جو اصلاً انگریزی میں تھی اس کا ترجمہ ترقی اردو بیورو نئی دہلی نے شایع کیا۔ ان کی دو اور اہم کتابوں کے ترجمے تاریخ سلطان ٹیپو اور کشمیر سلاطین کے عہد میں، کے نام سے ہوئے۔ ہسٹری آف ٹیپو سلطان

۵۱ء میں کلکتہ سے شایع ہوئی تھی، اس کا ترجمہ حامد اللہ افسر اور عتیق صدیقی نے کیا اور ترقی اردو بیورو کی جانب سے یہ ۱۹۷۲ء میں شایع ہوا، ٹیپو سلطان کی یہ پہلی مکمل اور جامع تاریخ ہے جو مصنف کی محنت اور جانفشانی کا نتیجہ ہے یہ اصل مصادر کی روشنی میں لکھی گئی ہے، اس میں یورپی مورخوں کی غلط بیانیوں اور سلطان کے متعلق بعض بے سروپا الزامات کی مدلل تردید کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ متعصب، مغلوب الغضب اور مذہباً شدت پسند کے بجائے ایک فراخ دل اور روشن خیال حکمراں تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کو اعلیٰ منصب عطا کئے، پوجا پاٹ کی مکمل آزادی دی، مندروں اور برہمنوں کو معافیاں دیں، حتیٰ کہ بت تراشنے کے لیے بھی رقمیں دیں اور ایک موقع پر مندر تعمیر کرنے کا حکم بھی دیا، اس کتاب پر علامہ شبلی کی کتاب عالمگیر کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ تاریخ نگاری میں ان کا زاویہ نظر دارالمصنفین کے مکتب فکر سے قریب تھا جس کا اعتراف جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے اس کے دیباچے میں کیا ہے اسی لئے کشمیر انڈ دی سلطانس کا اردو ترجمہ دارالمصنفین نے ان کی اجازت سے ۶۷ء میں شایع کیا۔ انگریزی کتاب ایران سوسائٹی نے ۱۹۵۹ء میں شایع کی تھی۔ اردو ترجمہ منیجر علی حماد عباسی مرحوم نے کیا تھا۔ دارالمصنفین کے مکتب فکر سے متاثر ہونے کے باوجود محبّ الحسن صاحب نے اپنی تصنیف ''ہندوستانی دور وسطیٰ کے مورخین'' کے مقدمہ میں ہندوستانی تاریخ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے علامہ شبلی کے بارے میں تحریر فرمایا کہ وہ ایک جانب دار مورخ بن جاتے ہیں اور تاریخ نگاری کے سائنٹفک انداز اور معروضی اصولوں پر کاربند نہیں رہتے، لیکن ان کی اس رائے کی تردید خود ان کی کتابوں سے ہوجاتی ہے۔ ان کی وفات سے ملک ایک اچھے مورخ سے محروم ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے اور بہشت بریں میں جگہ دے۔ آمین!! (''ع۔ص''، جون ۱۹۹۹ء)

سلفی، سید عبدالحفیظ، ڈاکٹر

ڈاکٹر سید عبدالحفیظ سلفی

افسوس ہے کہ ۸/ جون کی شب میں ڈاکٹر سید عبدالحفیظ سلفی کا انتقال ہوگیا، مجھے ذاتی طور پر اس کا بڑا صدمہ ہے، میں بچپن ہی سے ڈاکٹر صاحب کے نام نامی سے واقف تھا، میرے والد مرحوم اہلِ حدیث کے بعض اکابر کے ساتھ ان کا تذکرہ بھی کرتے تھے اس لیے اسی زمانے سے ان کی عقیدت دل میں جاگزیں ہوگئی تھی۔

زیارت اور ملاقات کا شرف تو دو ہی ایک بار حاصل ہوا تاہم ان کی محبت، شفقت، حسنِ خلق، خلوص، دردمندی، نیکی، شرافت اور دینداری کا اثر ابھی تک قلب پر باقی ہے، ایک بار کسی کانفرنس میں ان کا عالمانہ خطبہ سننے کا اتفاق ہوا جو قرآن وحدیث کے حوالوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک بار ان کے ایک صاحب زادے ڈاکٹر عبدالعزیز سلفی اپنے استاد اور ہمارے سابق رفیق مولانا عبدالرحمان پرواز اصلاحی مرحوم سے ملنے دارالمصنفین تشریف لائے تو مجھ سے بہت گھل مل گئے، ان سے اور مولانا پرواز مرحوم سے جو کچھ عرصہ دارالعلوم احمد یہ سلفیہ لہریا سرائے اور بھنگہ سے بھی وابستہ رہے، ڈاکٹر سید عبدالحفیظ صاحب کے بارے میں جو کچھ سنا اس سے ان کے مردمومن ہونے کا راز آشکار اور ان کے ''دنوں کی تپش'' اور ''شبوں کے گداز'' کا اندازہ ہوا، وہ واقعی ایک موحد، عالم باعمل، داعی اور متبع سنت تھے۔ گزشتہ سال اسی زمانے میں ڈاکٹر عبدالعزیز سلفی سے ندوۃ العلما لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تو لپٹ گئے، ڈاکٹر صاحب کی خیریت دریافت کرنے پر بتایا کہ بہت کمزور ہوگئے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبدالحفیظ مرحوم عامل بالحدیث تھے، ایک زمانے میں آل انڈیا جمعیۃ اہل حدیث کے امیر بھی تھے، عقیدہ ومسلک میں پختگی کے باوجود ان میں عصبیت نہ تھی، وہ مسلمانوں کے اجتماعی مسائل میں دوسرے فرقہ کے لوگوں کے ساتھ کام بھی کرتے تھے۔ ندوۃ العلماء کے ممتاز رکن تھے۔ شروع ہی سے آل انڈیا مسلم پرسنل بورڈ سے گہرا تعلق تھا، اس کے نائب صدر بھی رہے۔ اپنی سلامت روی اور معتدل روش کی وجہ سے دوسرے فرقوں میں بھی پسند کیے جاتے تھے۔

علمی وتعلیمی کاموں سے طبعی مناسبت تھی۔ متعدد علمی وتعلیمی اداروں کے بانی اور سرپرست بھی تھے۔ جامعہ اسلامیہ احمد یہ سلفیہ کو انہوں نے بڑی ترقی دی اور اپنے ایثار، حسن عمل اور نیک نامی کی بنا پر تاعمر اس کے صدر رہے۔ دینی تعلیم کی طرح عصری تعلیم کو بھی ناگزیر خیال کرتے تھے، چھوٹے بچوں کے لیے سلفیہ جونیر ہائی اسکول اور اعلیٰ تعلیم کے لیے ملت کالج قائم کیا۔ ان کی کوششوں سے سلفیہ یونانی طبیہ کالج کی بنیاد پڑی جس کا فیضان عربی درسگاہوں کے طلبہ کے لیے بھی عام ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی پوری زندگی ملی، تعلیمی اور سماجی خدمت میں گزری۔ وہ لوگوں کی خدمت کرکے خوش ہوتے تھے، ان کی فیض رسانی کا ایک مظہر طبابت اور ڈاکٹری کا پیشہ بھی تھی۔ انہوں نے اس پیشے کا وقار ہمیشہ قائم رکھا اور اسے حصول دولت کے بجائے خلق کی راحت رسانی کا ذریعہ بنایا۔ اپنے صاحب زادوں کو بھی ڈاکٹری کی اعلا تعلیم دلائی تاکہ لوگوں کو فیض پہنچے۔

دعوت وتبلیغ واشاعتِ دین اور ازالۂ شرک وبدعت ان کی زندگی کا اصل مشن تھا، ان کا دردمند دل قوم وملک کی فلاح وترقی اور مسلمانوں کی عزت وبلندی کے لیے برابر فکرمند رہتا تھا۔ لہریا سرائے دربھنگہ کا نام سنتے ہی ڈاکٹر صاحب کا خیال بھی ذہن میں آجاتا، یہیں ان کی وفات ہوئی مگر تدفین محلّہ چک زہرہ کے آبائی قبرستان میں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے اس نیک اور مقبول بندے کے مراتب و درجات عالم آخرت میں بلند فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین!

(''ض''، جولائی ۱۹۹۹ء)

عبدالحمید، حکیم

’’ملک وملت کا مسیحا نہیں رہا‘‘

بالآخر وہی ہوا جس کا کھٹکا مہینوں سے لگا تھا اور اس مسیحا نفس نے اپنی جان جان آفریں کو سپرد کردی، جس کی مسیحائی سے لاکھوں نے زندگی پائی تھی، حق یہ ہے کہ حکیم عبدالحمید کی وفات پر بھی وہی الفاظ دہرائے جائیں جو مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں کی وفات پر مولانا سید سلیمان ندویؒ نے تحریر فرمائے تھے حکیم صاحب کی وفات خاندان کا ماتم نہیں، دلی کا ماتم نہیں، قوم کا ماتم ہے، فضل وکمال کا ماتم ہے، اخلاق وشرافت کا ماتم ہے، سنجیدگی ومتانت کا ماتم ہے، عقل ورزانت کا ماتم ہے، آزادی وحریت کا ماتم ہے، اخلاق وایثار کا ماتم ہے، ہندوستان اور مسلمانان ہند کے طالع وبخت کا ماتم ہے۔

؎ مرثیہ ہے ایک کا اور نوحہ ساری قوم کا

حکیم عبدالحمید کا دائرہ فیض وخدمت بہت وسیع تھا، ان سے پورا ملک مستفیض ہورہا تھا۔ ہمدرد کی دوائیں سکہ رائج الوقت کی طرح گھر گھر پھیلی ہوئی ہیں اس لیے آج سب ہی اس محسن اعظم کی جدائی پر اشک بار اور ماتم کناں ہیں۔

؎ عمت فواضلہ فعم مصابہ

حکیم صاحب جس بدنصیب ملت کے فرد فرید تھے اس میں بڑا قحط الرجال ہے، وہ تنہا اپنی ذات سے ایک انجمن، ایک ادارہ، ایک جماعت اور ایک قوم تھے، ان جیسے پیکر صدق واخلاص اور سراپا خدمت وعمل کا اٹھ جانا عجب سانحہ اور ملت اسلامیہ کا زبردست خسارہ ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی تلافی کیسے ہوگی اور اس غم کا مداوا کیا ہوگا۔ بلاشبہ وہ اس عہد کے مسیح الملک، ابن سینا اور رازی تھے۔

حکیم عبدالحمید کا خاندان تجارت پیشہ تھا۔ یہ چینی ترکستان کے شہر کاشغر سے پشاور، ملتان، دہلی، پانی پت اور پیلی بھیت ہوتا ہوا ان کے دادا کے زمانے میں دہلی میں آباد ہوا، حکیم صاحب کے پدر بزرگوار حکیم عبدالمجید کی ولادت پیلی بھیت میں ہوئی تھی مگر پرورش وپرداخت دہلی میں ہوئی، بڑی مشکلات جھیلنے کے بعد وہ ہمدرد کی داغ بیل ڈالنے میں کامیاب ہوئے تھے، لیکن ابھی چالیس ہی کے پیٹے میں تھے اور ہمدرد کو بلند دواخانہ بنانے کی جدوجہد کررہے تھے کہ ۲۱/ مارچ ۱۹۲۲ء کو ان کا وقت آخر آگیا، ان کے بڑے صاحب زادے عبدالحمید اس وقت ۱۴ سال کے تھے اور طبیہ کالج میں زیر تعلیم تھے، یہ ۱۴/ ستمبر ۱۹۰۸ء کو پیدا ہوئے تھے، پیدائش کے وقت فضا ڈاکٹر اقبال کے ان شعروں سے گونج اٹھی ہوگی۔

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور
خود گرے خود شکنے ، خود نگرے پیدا شد

والد کی وفات کے بعد نہایت روح فرسا اور ولولہ شکن حالات کا سامنا کرنا پڑا مگر انہوں نے جلد ہی حالات پر قابو پالیا اور اپنی ساری قوت وتوانائی صرف کرکے ہمدرد کو بام عروج پر پہنچا دیا اور ان کی فطری اور خداداد صلاحیتوں نے اسے والد کے تصور خیال سے بھی بہت آگے بڑھا دیا۔

حکیم عبدالحمید کی یادگار اگر تنہا ہمدرد دواخانہ ہی ہوتا تو وہ ان کی عظمت، شہرت، نیک نامی اور ہندوستانی قوم کے فخر کے لیے کافی ہوتا مگر ان کی ہمت عالی نے دریا بھی قبول نہیں کیا اور ان کی قوت پرواز نے ستاروں سے آگے اور جہاں بھی تلاش کرلیے۔ چنانچہ ہمدرد وقف لیبورٹریز دہلی کے ماتحت مختلف سوسائٹیاں اور انسٹی ٹیوٹ قائم کردئے۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ، ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن انڈیا، ہمدرد طبی کالج، مجیدیہ ہسپتال، ہمدرد کالج آف فارمیسی، جامعہ ہمدرد، غالب اکیڈمی، ہمدرد انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل ریسرچ سینٹر فار ساؤتھ ایشین اسٹڈیز، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف فیڈرل اسٹڈیز، بزنس اینڈ امپلائمنٹ بیورو، ہمدرد ایجوکیشنل سوسائٹی، ہمدرد پرائمری اسکول، ہمدرد پبلک اسکول، ہمدرد اسٹڈی سرکل، رابعہ گرلس اسکول، رفیدہ نرسنگ اسکول، ہمدرد کوچنگ سینٹر وغیرہ ان کی کوہ کنی اور خارا شگافی نے تغلق آباد کے کھنڈروں پر ایک نیا جہاں آباد کردیا، یہیں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی شاندار لائبریری، حسین وجمیل مسجد، کنونشن سینٹر ہاسٹل، اسکالر ہاؤس، اسٹاف کوارٹرس، گیسٹ ہاؤس، کینٹین سب ہیں۔ اتنے سارے شعبے کئی کئی افراد اور ادارے تو درکنار حکومتیں بھی نہیں قائم کرسکتیں جو تن تنہا حکیم عبدالحمید کی سعی پیہم سے وجود میں آگئے ہیں۔

حکیم عبدالحمید کا خاص میدان عمل فن طب تھا۔ جس کی تجدید، احیا اور نشاۃ ثانیہ ان کا مشن تھا، وہ ہندوستان کے طبیب اعظم اور اس فن کے مجدد تھے، شریفی اور عزیزی خاندانوں کے اہل کمال کے خاتمے کے بعد آزاد ہندوستان میں ان ہی کی فراست ذہانت اور حذاقت نے مخالف ہوا میں بھی طب یونانی کا چراغ روشن رکھا، ان کے مجتہدانہ دماغ نے دور حاضر کے معیار و مذاق اور ضرورتوں و تقاضوں کے مطابق سائنٹفک دوائیں ایجاد کرکے طب یونانی کو موجودہ دور سے ہم آہنگ کردیا۔ ان کے عزم واستقلال، جوش خدمت، مطب کی پابندی، فن کے ساتھ دیانت وایمانداری، صفائی اور صحت وزن کے ساتھ اعلیٰ ادویہ کی تیاری اور خوش معاملگی نے ان کو کامیابی سے ہم کنار کیا۔ طب کے فروغ کے لیے خود بھی طبی ادارے اور تحقیقاتی مراکز قائم کئے اور ملک کے کسی گوشے میں اس کے جو ادارے قائم ہوئے، وہ ابھی ان کی توجہ کا مرکز

رہے، گوناگوں مشغولیتوں اور کبرسنی کے باوجود ان اداروں کے پروگرام میں شریک ہوتے اور کارکنوں کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ ۱۹۵۲ء سے وفات تک آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے صدر رہ کر بھی طب کی ترقی کا سامان کرتے رہے۔ سنٹرل کاؤنسل آف ریسرچ ان یونانی میڈیسین اور بہت سے میڈیکل اداروں کی مسند صدرارت کو بھی اسی لیے رونق بخشی، ان کو طبیہ کالج کے فارغین کا یہ طرز عمل پسند نہیں تھا کہ وہ یونانی طریقہ علاج چھوڑ کر ایلوپیتھک میں پریکٹس کریں۔

تعلیم کا فروغ بھی حکیم صاحب کی جدوجہد اور سرگرمی کا ایک میدان رہا ہے، جناب سید حامد کا یہ خیال بجا ہے کہ انفرادی طاقت تعلیم اور صحت سے بنتی ہے، ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے صدر نے پہلے صحت کی طرف دھیان دیا اور بعد میں تعلیم کی طرف، یونانی طب کو جو روبہ زوال تھی طاقت پہنچائی اور یونانی دواؤں کو جن کی دستیابی اور تیاری دونوں دشوار ہوچکی تھیں معیار بندی اور تجدید سے اعتبار عطا کیا، دواؤں کی فروخت سے جو یافت ہوئی اس کا بیشتر حصہ تعلیم اور روزگار کی مدوں میں لگادیا۔ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی دور کرنے اور دوسرے ہم وطنوں کی طرح انکو آگے کرنے کے لیے حکیم صاحب نے مختلف منصوبے اور اسکیمیں بنائیں۔ ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی عصری درس گاہوں کے ہونہار طلبہ کو قرض وظیفے دیتی ہے۔ ہمدرد کوچنگ سینٹر میں سول سروسز کے امتحان کی تیاری کا سلسلہ شروع کیا تاکہ مسلمان طلبہ کے لیے بھی ملازمتوں کے در کھلیں، ایجوکیشن سروے اعداد وشمار کی فراہمی کرکے مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی ختم کرنے کے لیے وجود میں آیا تھا۔ حکیم صاحب قدیم علوم کے وارث اور مشرقی تہذیب کے پروردہ ہونے کے باوجود جدید سائنس کے علمبردار تھے، ان کا ذہن روشن اور فکر وسیع تھا، وہ نہ مشرق سے بیزار تھے اور نہ مغرب سے حذر کرتے تھے، ان سے دینی اداروں اور جدید تعلیم گاہوں دونوں کو فیض پہنچا مگر وہ دینی مدارس کی اس روش "آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ چلنا" سے مطمئن نہیں تھے وہ ان کو جامعۃ الہدایت جے پور کے تجربے سے فائدہ اٹھانے کا مشورہ دیتے تھے۔

مختلف طبی، علمی اور تعلیمی اداروں سے حکیم صاحب کا گہرا تعلق تھا اور ہر ایک کو انہوں نے فائدے بھی پہنچائے، ۱۹۶۶ء میں الیکشن کے بغیر متفقہ طور پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چانسلر کی حیثیت سے ان کا انتخاب عمل میں آیا جو بڑے فخر واعزاز کی بات ہے۔ شروع ہی سے ان کو دارالمصنفین سے بڑا لگاؤ تھا، وہ اس کی مجلس انتظامیہ کے معزز رکن تھے، کبھی کبھی اس کے جلسوں میں بھی تشریف لاتے تھے، دو ایک بار ان کی سہولت کے خیال سے ہمدرد نگر ہی میں اس کا جلسہ ہوا، آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کا چھٹا اجلاس ۳۰،۳۱/دسمبر ۱۹۶۹ء کو دارالمصنفین میں ہوا، اس کی صدارت کے لیے ان کا نام تجویز کیا گیا تو دارالمصنفین سے تعلق کی بنا پر منظور کرلیا جیسا کہ فرماتے ہیں "اس صدارت سے آپ کو کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو مجھے یہ سعادت ضرور حاصل ہوگئی کہ اس بہانے اعظم گڑھ حاضر ہونے کا موقع مل گیا جو علوم اسلامیہ کی تحقیق کا ایک پرانا اور اہم مرکز ہے، جو علامہ شبلی نعمانی جیسے فاضل روزگار کا وطن اور ان کی علمی اور تحقیقی سرگرمیوں کا ایک میدان رہا ہے اور جو دارالمصنفین جیسے ادارہ کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے جسے مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنے خون جگر سے سینچا ہے اور جواب بھی بہت سے علماء وفضلا کا مرکز ہے، مجھے دارالمصنفین میں حاضری سے اس لیے بھی خوشی ہوئی ہے کہ اس کی مطبوعات سے مجھے ۱۹۲۴ء سے ہی دلچسپی رہی ہے، معارف کے پرانے پرچے میں نے اسی سال یہاں سے منگوا کر مجلد کرائے تھے اور اس وقت سے اب تک میرا اس ادارہ سے تعلق ہے"۔ اس خطبہ میں اعظم گڑھ سے بھی والہانہ تعلق اور بہت سی مفید باتوں کا ذکر ہے جس کو بہت پسند کیا گیا تھا۔

غیر علمی مشاغل میں شب و روز منہمک رہنے کے باوجود حکیم صاحب علم وفن کے دل دادہ اور مطالعہ و کتب بینی کے مریض تھے، ہوش سنبھالتے ہی انہوں نے ہاتھ میں کتاب وقلم پکڑلیا تھا، علم وادب اور مطالعہ وتحقیق ان کی گھٹی میں شامل تھے، ہر قسم کی چیزیں طب، سائنس، ادب و اسلامیات، تاریخ و تذکرہ کی کلاسیکل اور تازہ ترین تصانیف اور تحقیقی رسائل ان کے مطالعہ میں رہتی تھیں اور وہ مشرق ومغرب کی جدید طبی و علمی تحقیقات سے برابر باخبر رہتے تھے، بڑھاپے میں بھی ان کی تحقیق وجستجو میں کمی نہیں آئی تھی، ہر وقت جاننے اور سیکھنے کی امنگ رہتی تھی۔ یورپ کے کئی سفر اس کے لیے اور وہاں کے نوادر دیکھنے کے لیے کئے تھے۔ صبح سویرے ملک کے قومی سطح کے انگریزی اور اردو اخبارات اور ملکی وغیر ملکی رسائل اور میگزین کا مطالعہ کرتے تھے اور ان کے مخصوص مضامین اور خبروں پر نشانات لگا کر متعلقہ شعبہ کو ان کے تراشے کاٹنے کے لیے بھیج دیتے اور یہ ہدایت بھی فرمادیتے کہ یہ تراشے کس نام کے فائل میں رکھے جائیں۔ اس طرح ملک اور مسلمانوں کے اہم مسائل کے متعلق مختلف عنوانات پر سینکڑوں ضخیم فائلیں تیار ہوگئیں جو سنہ وار مرتب ہوکر جامعہ ہمدرد کی مرکزی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ میری ایک کتاب قرآنیات جو پاکستان سے شائع ہوئی تھی، میں نے یہ جاننے کے باوجود کہ حکیم صاحب کو مطالعہ کا موقع کہاں ملتا ہوگا انہیں پیش کی تھی، چند روز بعد ڈاک سے ان کا گرامی نامہ ملا جس میں میری حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے ایسی باتیں تحریر تھیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے پوری کتاب ملاحظہ فرمالی ہے۔ میں نے اپنے مخدوم بزرگ جناب مالک رام صاحب سے عرض کیا کہ آخر حکیم صاحب کب پڑھتے لکھتے ہیں انہوں نے بتایا کہ ان کے مطالعہ کے مخصوص دن ہیں، ان دنوں میں کسی سے ان کی ملاقات نہیں ہوسکتی۔ خواجہ حسن نظامی ثانی صاحب ایک روز ان سے ملنے لال کنویں والے دفتر پہنچے وہ اس وقت تنہا چھت پر ایک چھوٹے سے تپتے ہوئے سائبان کے نیچے لکڑی کے

ایک معمولی سے تخت پر بیٹھ کر جس پر ایک ٹاٹ کی بوری بچھی ہوئی تھی محومطالعہ تھے۔

حکیم صاحب کے تحریری و تصنیفی کاموں میں ابن سینا کی شہرہ آفاق کتاب القانون فی الطب ہے جس کا صحیح نسخہ تیار کر کے تحقیق و تدوین کے بعد شائع کیا، اس پر ان کا عربی مقدمہ ہے، یہ پانچ جلدوں میں ہے، چھٹی جلد میں مصطلحات و لغات کا تذکرہ ہے، ایک جلد کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کرایا، ابن سینا کی دوسری اہم طبی تصنیف الادویۃ القلبیۃ کے ایک نسخہ کو بنیاد بنا کر انگریزی میں اس کا ترجمہ کرایا۔ اس کے شروع میں طب یونانی کے پس منظر پر بعض اہل قلم سے محققانہ مقالات لکھوائے۔ آل انڈیا طبی کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے ۵۲ء سے ۹۴ء تک جو صدراتی خطبات دیئے تھے انہیں ڈاکٹر خاور ہاشمی نے ''خطبات حمید'' کے نام سے مرتب کیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مکتوبات تصوف (فارسی) کا اردو ترجمہ ایک صاحب کو اعزازیہ دے کر کرایا۔ متعدد انگریزی کتابیں بھی تالیف کیں یا اپنی نگرانی میں کرائیں، ان کا ایک تحریری میدان طبی و سائنسی صحافت بھی تھا۔ ہمدرد صحت کے وہ برسوں مدیر رہے، جس کے کئی اہم خاص نمبر نکالے، پندرہ روزہ ہمدرد بھی ان کی ادارت میں نکلا، کئی انگریزی میگزین بھی شائع کئے جن میں سہ ماہی اسٹڈیز ان ہسٹری آف میڈیسین اینڈ سائنس اور اسٹڈیز ان اسلام زیادہ مشہور ہیں۔ حکیم صاحب کی تحریر ماقل و مادل ہوتی تھی۔ وہ کم سے کم لفظوں میں اپنا مدعا پوری طرح واضح کردیتے تھے۔ حکیم صاحب نے صلہ و ستایش سے بے پروا ہو کر علم و فن کی جو عظیم الشان خدمات انجام دیں ان کے اعتراف میں انہیں پدم شری اور پدم بھوشن کے قومی اعزاز عطا کئے گئے۔ سویٹ روس سے ابن سینا اوارڈ، ہمدرد یونیورسٹی کراچی نے اعزازی اوارڈ اور ڈی لٹ دیا اور ایرانی نیشنل اکیڈمی آف سائنس کے اعزازی ممبر تھے۔ اردو کے مشہور اہل قلم مالک رام نے ان کی خدمات کے اعتراف میں ''نذر حمید'' مرتب کی۔

حکیم صاحب دین دار اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے لیکن ان میں توسع اور وسیع المشربی تھے، ہر مسلک و عقیدہ اور ہر مذہب و ملت کے لوگوں سے ان کے تعلقات تھے اور وہ مسلمانوں کے تمام طبقوں میں مقبول اور غیر مسلموں کے بھی معتمد تھے، ان کی سیرت کا سب سے اعلیٰ جوہر خلق خدا کی خدمت اور نفع رسانی تھا، بڑی دلکش صفات و خصائل کے مالک تھے، دولت کی فراوانی اور سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ان میں بلا کی سادگی اور انکسار تھا۔ ان کی اپنی ذات پر ۱۰۰ روپے ماہوار سے زیادہ خرچ نہ ہوتا لیکن دوسروں پر خرچ کرنے میں حاتم تھے، قومی اور تعلیمی امور پر بے دریغ خرچ کرتے، صبر و قناعت کے خوگر تھے، بناوٹ اور تکلفات سے ان کی زندگی بری تھی، لباس، رہن سہن اور کھانے پینے میں بڑی سادگی تھی، کمرے میں نہ دری نہ چاندنی اور نہ ایرکنڈیشنر لگایا۔ پنکھے کے بھی عادی نہ تھے، سخت ٹھنڈک میں ہیٹر نہ استعمال کرتے، صبح ٹھنڈے پانی سے نہاتے، ۸۰ برس کی عمر میں سید شہاب الدین دسنوی صاحب نے اس کے لیے کہا تو فرمایا کہ بوڑھا ہوں گا تو گرم پانی سے نہاؤں گا، کپڑے میں پیوند لگے ہوتے، اپنا رومال، بنیان اور موزے وغیرہ خود ہی دھولیتے، بہت پرانے کپڑے اور جوتے ان کے استعمال میں رہتے۔ عرصے سے نئے کپڑے اور جوتے نہیں خریدتے تھے کہ جو ہیں وہی عمر بھر کام دے دیں گے۔ کبر و غرور، فخر و تعلّی اور ریا و نمود کا شائبہ بھی ان میں نہ تھا، اپنے حیرت انگیز اور عظیم الشان کارناموں کی تحسین کے کبھی متوقع نہیں ہوئے، بلکہ ان کو اس کے تذکرے سے بھی وحشت اور گھبراہٹ ہوتی تھی اور جب کوئی داد و تحسین دیتا تو بڑی عاجزی اور ناگواری سے اسے سن لیتے۔ حکیم صاحب کی زبان پر کبھی نازیبا اور تہذیب سے گرا ہوا لفظ نہیں آیا، انہیں کسی کو برا کہتے ہوئے نہیں سنا گیا، جو لوگ دق کرتے اور پریشانی کا موجب بنتے ان پر بھی غصہ نہ ہوتے، ضبط، تحمل اور برداشت میں بے مثال تھے، کبھی کسی کی سرزنش نہ کرتے۔ ہمیشہ عفو و درگزر سے کام لیتے اور انتقام کا خیال بھی دل میں نہ لاتے، کہتے تھے کہ انتقام لینے سے پہلے اس پر غور کرلینا چاہئے کہ شاید یہ ہمارے امکان میں نہ ہو یا ہم اس کی طاقت نہ رکھتے ہوں، لیکن عفو و درگزر بہرحال ہمارے بس کی بات ہے اور ہم اس پر پوری قدرت رکھتے ہیں، ہم عفو و درگزر کرکے شاید قتل کے بغیر دشمن کو مغلوب کرسکتے ہیں۔

سستی اور کاہلی ان کے قریب بھی نہ پھٹکتی، نہایت تیزی سے کام کرتے، ان کی تیز رفتاری کا کوئی ساتھ نہیں دے سکتا تھا، تاہم مردم سازی ان کی خصوصیت تھی اس لیے اپنے مقصد کے افراد تیار کرلیتے، وہ لوگوں کی اصلاح و تربیت زبان کے بجائے عمل سے کرتے، دوسروں سے کام لینے اور کام کرنے کا فن بھی جانتے تھے، حکیم صاحب کی دوربینی لوگوں کی صلاحیتوں کا اندازہ کرلیتی۔ لیکن ان کی لینت و مروت کی وجہ سے بہت سے بے صلاحیت لوگ بھی ان سے چپکے رہتے جن کو وہ اپنے حکمت عملی سے کسی نہ کسی درجہ میں کارآمد بنالیتے، اس طرح کے بعض لوگ نقصان پہنچانے کے درپے رہتے مگر حکیم صاحب کے دریائے کرم کا بہاؤ ان کی جانب بھی رہتا اور وہ برخواست نہ کئے جاتے، وہ تقلیل کلام، تقلیل طعام اور تقلیلِ منام پر ہمیشہ عمل پیرا رہے۔ نہایت کم سخن تھے، بس ہاں ہوں میں جواب دیتے، ایک مرتبہ ان کو اور بشیر حسین زیدی صاحب کو اعظم گڑھ سے بابت پور کے لیے نکلنے میں دیر ہوگئی، اندیشہ تھا کہ جہاز چھوٹ جائے گا، میں ساتھ میں تھا، زیدی صاحب راستہ بھر پریشانی اور گھبراہٹ ظاہر کرتے رہے مگر حکیم صاحب بالکل خاموش تھے، ان پر کسی طرح کی گھبراہٹ نہ تھی جب پہنچے تو جہاز آنے میں کچھ تاخیر تھی، زیدی صاحب نے فرمایا کہ حکیم صاحب میں آپ کی کرامت کا قائل ہوگیا۔ غذا بہت کم تھی، صبح ناشتہ اور رات کو ہلکا کھانا کھاتے، روغنی غذاؤں سے پرہیز کرتے، چائے، پان اور سگریٹ کو کبھی منھ نہیں لگایا۔ دوسروں کو پرتکلف کھانا کھلاتے، مجھے ان کی

بعض دعوتوں میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا ہے، وہ مہمانوں کی خاطر سے بیٹھے رہتے مگر خود کچھ نہ کھاتے، کم خفتن پر بھی عمل تھا، رات میں جلد سوجاتے اور فجر سے بہت پہلے بیدار ہوجاتے، دن میں آرام نہ کرتے وقت اور معمولات کے پابند تھے، ان کا ایک لمحہ بھی رائگاں نہ جاتا، تفریح اور مجلس آرائی سے ہمیشہ دور رہے، ایک صاحب کو اپنے دفتر میں چھ بجے کا وقت دیا، وہ پہلے ہی آگئے اور حکیم صاحب کو نہ پا کر سخت برہم ہوئے، جب چھ بجا تو حکیم صاحب آگئے، معمولات کی پابندی کا یہ حال تھا کہ صبح میلوں پیدل ٹہلنے کے عادی تھے، آندھی ہو، مینہ برسے، طوفان آئے صبح کے ٹہلنے میں ناغہ نہ کرتے۔

بے حد مشغول رہنے کے باوجود حکیم صاحب لوگوں سے تعلق بھی رکھتے تھے، ہر چھوٹے بڑے سے انتہائی خلوص، خوش اخلاقی اور تواضع سے پیش آتے، ان کی شادی، غمی اور رنج و راحت میں شریک رہتے، میں ایک دفعہ آصف علی روڈ کے مطب میں ان سے ملنے گیا، مریضوں کا تانتا لگا تھا وہاں سے نکلنے کے بعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک جنازے میں شریک ہوگیا، عین وقت پر حکیم صاحب بھی تشریف لائے اور مجھے دیکھ کر فرمایا ابھی یہیں ہیں۔ احباب سے ملاقات کے لیے جاتے۔ مہمانوں اور عزیز و اقارب کی خاطر داری کرتے اور دوسرے ضروری کاموں کے لیے بھی وقت نکال لیتے، دلی کی ادبی و ثقافتی تقریبات میں بھی شریک ہوتے، اپنے چھوٹے بھائی حکیم محمد سعید سے غیر معمولی محبت تھی، وہ ۴۸ء میں پاکستان جانے لگے تو انہیں بڑا صدمہ تھا، ایسے شیر و شکر اور ایک جان دو قالب بھائی تلاش کرنے پر بھی نہیں ملیں گے، ان کے بے رحمانہ قتل نے ان کو نڈھال کردیا تھا اور زیادہ دنوں تک ان کی جدائی برداشت نہیں کرسکے حالانکہ وہ مضبوط قوت ارادی کے مالک تھے۔

ان کی زندگی کا ایک بڑا تابناک کارنامہ ان کی تعمیرات ہیں، وہ اس عہد کے شاہ جہاں تھے، انہوں نے تغلق آباد کے خرابے کی نوے ایکڑ زمین پر خوبصورت اور سربفلک عمارتوں کا ایک شہر ہمدرد نگر کے نام سے بسادیا، عمارتوں کے نقشوں کو آخری منظوری وہ خود دیتے تھے۔ تغلق آباد کی پرشکوہ عمارتیں، آصف علی روڈ پر ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن اور تعلیم آباد میں ہمدرد پبلک اسکول کی عمارتیں ان کے اعلیٰ ذوق کا نمونہ ہیں جو دلی کا حسن دوبالا کرتی ہیں۔ غرض حکیم صاحب ایک تاریخ ساز اور عہد آفریں شخص تھے، وہ بیسویں صدی کے عظیم ترین اور نابغہ روزگار انسان تھے جو قدرت کی بے اندازہ فیاضیوں کا مظہر بن کر عالم وجود میں آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں بہشت بریں عطا کرے، آمین!

جان کر من جملہ خاصان میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

("ض"، اگست ۱۹۹۹ء)

طنطاوی، علی، شیخ

شیخ علی طنطاوی

گزشتہ ماہ عربی زبان کے نامور ادیب مشہور واعظ و مصلح علامہ شیخ علی طنطاوی کا انتقال ہوگیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

وہ کافی معمر اور ضعیف ہوچکے تھے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر سو برس سے تجاوز تھی۔ مسجد حرام میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور بلد حرام میں مدفون ہوئے۔

ان کی نسبت سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا آبائی وطن طنطا مصر تھا، مگر وہ ایک مدت تک شام میں مقیم رہے اور وہاں منصب قضا پر بھی فائز رہے، شام میں فوجی انقلاب کے بعد غالباً وہ وہاں سے سعودیہ عربیہ منتقل ہوگئے اور عمر کا بقیہ حصہ یہیں بسر کیا۔

سعودی ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر ان کی مذہبی تقریریں اور علمی سوال و جواب کا سلسلہ کافی مقبول ہوا۔ وہ عربی کے بلند پایہ ادیب اور انشا پرداز تھے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ سے ان کے گہرے علمی روابط تھے، چنانچہ مولانا کی کئی کتابوں پر انہوں نے پیش لفظ لکھا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء بھی تشریف لائے اور اس کے متعلق والہانہ جذبات کا اظہار کیا۔ ندوہ کے عربی رسالہ "البعث الاسلامی" میں ان کے مضامین برابر نقل کئے جاتے تھے۔

شیخ طنطاوی کا خاص مشن عرب نوجوانوں کی مذہبی اصلاح تھا، وہ خاص طور پر ان کو دینی حمیت و غیرت اور مغرب سے عدم مرعوبیت کی دعوت دیتے تھے، ان کی تقریروں اور تحریروں کے متعدد مجموعے شایع ہوچکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول کرے اور مغفرت فرمائے۔ آمین!!

("ع۔ع"، اگست ۱۹۹۹ء)

زرقاء، محمد مصطفیٰ، ڈاکٹر

ڈاکٹر محمد مصطفیٰ زرقاء

گزشتہ دنوں عالم عرب کے ممتاز ماہر فقہ ڈاکٹر محمد مصطفیٰ زرقاء نے بھی اس جہان فانی کو خیر باد کہا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ڈاکٹر صاحب اسلامی فقہ وقانون میں سند کا درجہ رکھتے تھے، ان کی کتاب المدخل الفقهي العام اصول فقہ میں نہایت بلند پایہ خیال کی جاتی اور مرجع و ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے، وہ اپنی غیر معمولی فقہی بصیرت کی بنا پر شام میں وزیر انصاف کے عہدہ پر بھی فائز ہوئے۔ ان کے عالمانہ ومحققانہ مضامین کے اردو رسالوں میں ترجمے برابر چھپتے رہتے تھے معارف کو بھی ان کے مضامین کے ترجموں کی اشاعت کا فخر حاصل ہے۔ مجلہ البعث الاسلامی لکھنو میں ان کے متعدد مضامین شایع ہوئے ہیں۔ فقہ کے علاوہ دوسرے اسلامی علوم خصوصاً تفسیر و حدیث سے بھی ان کو خاص مناسبت تھی۔

الولدسر لابیه کے مصداق ان کے فرزند ارجمند ڈاکٹر محمد انس زرقا بھی فقہ اسلامی کے ممتاز اسکالر ہیں جن کے بعض مضامین کا ترجمہ معارف میں شایع ہوچکا ہے۔ اللہ تعالیٰ علم و دین کے اس خادم کی مغفرت فرمائے۔ آمین!! ("ع۔ع"، اگست ۱۹۹۹ء)

خلیل الرب

جناب خلیل الرب صاحب

گزشتہ مہینے جناب خلیل الرب صاحب وفات پاگئے، وہ پھولپور (الہ آباد) کے رہنے والے تھے، محکمہ تعلیمات میں ملازم تھے، اس سلسلے میں اعظم گڑھ برسوں قیام رہا شبلی منزل برابر تشریف لاتے، اردو سے عشق تھا۔ ادب و تنقید پر چند کتابیں بھی لکھیں، یوپی اردو اکیڈمی اور مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر تھے، باغبانی اور چمن آرائی کا عمدہ ذوق تھا، دارالمصنفین کی گولڈن جوبلی کے موقع پر ان ہی نے چمن بندی کی تھی جس کو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے بہت پسند کیا تھا اور ان سے گلاب کی بعض قسمیں دہلی منگائی تھیں۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ آمین!! ("ض"، اگست ۱۹۹۹ء)

مجذوب، محمد، شیخ

شیخ محمد مجذوب

یہ خبر سن کر بڑا ملال ہوا کہ عالم عرب کے ایک فاضل اور اچھے اہل قلم استاد شیخ محمد مجذوب جون ۱۹۹۹ء میں وفات پاگئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

وہ شام کے رہنے والے تھے۔ مگر ان کی زندگی کا زیادہ حصہ دوسری جگہوں میں بسر ہوا، عرصہ تک جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں درس و تدریس کی خدمت پر مامور رہے۔ سبکدوش ہونے کے بعد بھی مدینہ منورہ کے انوار و برکات سے متمتع ہونے کے لیے انہوں نے یہیں قیام پذیر رہنا پسند کیا۔

مجذوب صاحب کی پوری زندگی علم و دین کی خدمت و اشاعت میں گزری، تصنیف و تالیف کا شغل مدۃ العمر جاری رہا، ہندوستان کا سفر بھی کیا اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی دعوت پر ۱۹۸۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلبہ کے سامنے علمی، دینی اور دعوتی موضوعات پر کئی لکچر دیئے۔ دارالمصنفین کی عظمت و شہرت سے واقف تھے اس لیے زحمتِ سفر برداشت کر کے مولانا سعیدالرحمٰن الاعظمی اڈیٹر البعث الاسلامی کے ہمراہ اعظم گڑھ بھی تشریف لائے اور دو روز قیام کیا۔ کتب خانہ اور دارالمصنفین کے دوسرے شعبے دیکھ کر خوش ہوئے۔

آرام و تفریح کے خیال سے موسم گرما میں شام کے شہر لاذقیہ گئے ہوئے تھے کہ داعی اجل کا پیام آ گیا والبقاء للہ وحدہ۔ عمر ۹۰ سال رہی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ علم و دین کے اس خادم کی مغفرت فرمائے۔ آمین!! ("ض"، ستمبر ۱۹۹۹ء)

نعمانی، محمد عبدالرشید، مولانا

مولانا محمد عبدالرشید نعمانی

اگست کے آخری عشرہ میں پاکستان سے یہ اندوہ ناک خبر آئی کہ مولانا محمد عبدالرشید نعمانی جے پوری کا کراچی میں انتقال ہوگیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا کی نظر دینی علوم تفسیر، حدیث اور رجال پر اچھی اور گہری تھی۔ ان کی تعلیمی زندگی کا کچھ زمانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں بھی بسر ہوا۔ ملک کی تقسیم سے پہلے اور بعد میں بھی ان کا تعلق ندوۃ المصنفین دہلی سے رہا۔ یہیں سے ان کی کتاب لغات القرآن شایع ہوئی جو ایک مفید قرآنی خدمت ہے، یہ حروف معجم پر مرتب کی گئی ہے اور چھ جلدوں میں مکمل ہوئی ہے۔ شروع کی چار جلدیں جو الف سے شروع ہوکر ع پر ختم ہوئی ہیں مولانا نعمانی کے قلم سے ہیں اور آخری دونوں جلدیں مولانا سید عبدالدائم جلالی نے مرتب کی ہیں، پہلی جلد کے شروع مولانا عبدالرشید نعمانی کا بسیط مقدمہ ہے جس میں کتاب کی نوعیت اور اس کی ترتیب میں ملحوظ رکھے جانے والے امور کے علاوہ اپنی محنت و جاں فشانی وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ دہلی میں قیام کے زمانے میں ماہنامہ برہان میں ان کے مضامین بھی شایع ہوئے۔

تقسیم کے چند برس بعد وہ کراچی میں متوطن ہوگئے تھے، یہاں انہوں نے امام ابن ماجہ پر جو عالمانہ و محققانہ کام انجام دیا وہ ان کا بڑا کارنامہ ہے، جس سے حدیث کا کوئی طالب علم مستغنی نہیں رہ سکتا، اردو میں ان کی کتاب "امام ابن ماجہ اور علم حدیث" اور عربی میں "ماتمس الیه الحاجة لمن یطالع سنن ابن ماجه" نور محمد اصح المطابع وکارخانہ تجارت کتب کراچی نے شایع کی۔ یہ دونوں تصانیف نہ صرف امام ابن ماجہ کے حالات و کمالات اور ان کی سنن کی خصوصیات کا مرقع ہیں بلکہ ان میں فن حدیث کی تاریخ و تدوین اور اکابر محدثین کے متعلق گوناگوں معلومات تحریر کیے گئے ہیں۔ اردو میں اشاریے اور نقشے بھی دیے گئے ہیں۔ اس کے آخر میں مولانا نے یہ بالکل بجا لکھا ہے:

"کہنے کو یہ امام ابن ماجہ کی سوانح عمری ہے، لیکن درحقیقت یہ تدوین حدیث کی تفصیلی تاریخ ہے اور مسلمانوں کی ان جانفشانیوں کا مرقع ہے جو انہوں نے خدا کے آخری پیغمبر جناب محمد مصطفیٰ ﷺ کی تعلیمات کے ایک ایک حرف کو محفوظ کرنے کے لیے اٹھائی ہیں تاکہ امانت وحی کی ذمہ داری میں جو اس امت کے سپرد کی گئی تھی کسی قسم کا رخنہ نہ آنے پائے اور اللہ کی حجت تمام اہل عمل وادیان پر تمام ہوجائے"۔

اس کا اطلاق عربی کتاب پر بھی ہوتا ہے، یہ دونوں کتابیں بڑی تلاش و محنت سے لکھی گئی ہیں اور علمی حلقوں میں بہت پسند کی جارہی ہیں، ان سے مولانا کے اچھے

علمی ذوق اور تصنیفی سلیقے کا پتہ چلتا ہے۔ راقم کی نظر سے مولانا کی یہی تصنیفات گزری ہیں اور ان سے اس نے فائدہ بھی اٹھایا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ لطف و شفقت کا معاملہ فرمائے اور متعلقین کو صبر جمیل مرحمت کرے آمین! (''ض''، ستمبر ۱۹۹۹ء)

ندوی، محمد معین اللہ، مولانا قاضی

مولانا قاضی محمد معین اللہ ندوی

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نائب ناظم مولانا قاضی معین اللہ ندوی اپنے وطن اندور میں انتقال فرماگئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی سربراہی اور سرپرستی میں ان کے معاصرین کے ندوے جانے کے بعد اس کے علمی، تعلیمی اور انتظامی کاموں کو سنبھالنے کے لیے جو جماعت آگے بڑھی ان میں مولانا قاضی معین اللہ ندوی کا نام زیادہ ممتاز ہے، ندوہ کے تعلیمی مراحل طے کرنے کے بعد وہ یہیں استاذ مقرر کئے گئے۔ اسی زمانے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بلاد اسلامیہ کی سیاحت کے لیے نکلے تو ان کے رفقائے سفر میں مولانا معین اللہ صاحب بھی تھے۔ اس سفر کا انہیں فائدہ ہوا۔ چنانچہ جب ندوہ کے ذمہ داروں کو قدیم نظام تعلیم میں داخل عربی صرف ونحو اور ادب کی کتابوں کے نقائص کا شدت سے احساس ہوا تو انہوں نے نحو وصرف کی فارسی کتب کے بجائے اردو میں سہل کتابوں کی اشاعت کا پروگرام بنایا، اس کے لیے ان کی نظر دارالعلوم کے ان معلمین پر پڑی جو ابتدائی درجوں میں زبان وصرف ونحو کی تعلیم میں مشغول تھے، اس کے علاوہ مصر میں عربی زبان وادب کی ترقی و اشاعت کے لیے اس کے اصول وقواعد کی از سرنو تدوین اور طرزِ تعلیم میں اصلاح وتجدید کی جو کوششیں ہورہی تھیں اس سے بھی یہ لوگ واقف تھے اس بنا پر ان سے مبتدیوں کی مشق وتمرین کے لیے نحو وصرف اور ادب وانشا کی کتابیں لکھنے کی فرمایش کی گئی۔ مولانا معین اللہ صاحب نے اس سلسلے کی تکمیل میں **تمرین الصرف** لکھ کر ہاتھ بٹایا جو جدید طرز پر صرف کی ایک مشقی کتاب ہے۔

مولانا معین اللہ صاحب میں انتظامی صلاحیتیں بدرجۂ اتم تھیں، اس کا اندازہ مولانا علی میاں کو بہ خوبی تھا، اس لیے مولانا محمد عمران خاں کے ندوے سے جانے کے بعد انہوں نے مولانا معین اللہ صاحب کو تعمیرات کے شعبے کا ذمہ دار بنایا اور پھر انہیں نائب ناظم کے عہدہ پر فائز کیا۔

وہ اپنی انتظامی صلاحیتوں کی وجہ سے مولانا علی میاں کے دست راست ہوگئے تھے، مولانا ان پر بڑا اعتماد کرتے تھے اور ان کی دل جوئی بھی کرتے تھے، عموماً انتظام اور ذمہ داری کا کام انجام دینے والے اشخاص سے لوگوں کو شکایتیں رہا کرتی ہیں جو عموماً بے جا اور خود غرضی پر مبنی ہوتی ہیں، مولانا معین اللہ صاحب کے متعلق جب کبھی اس طرح کی چہ میگوئیاں ہوتیں اور وہ بدل ہوتے تو مولانا علی میاں ان کے اخلاص اور حسن نیت کی وجہ سے ہمیشہ آڑے آجاتے۔

مولانا معین اللہ صاحب خلقتاً نحیف اور کمزور تھے، عرصے سے ان کی صحت خراب چل رہی تھی، عمر بھی ۸۰ برس سے تجاوز ہوگئی تھی، آخر وقت موعود آگیا۔ ان کے انتقال سے ندوۃ العلماء اپنے ایک فعال اور مخلص خدمت گزار سے محروم ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ اس کی تلافی فرمائے، انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور اعزہ ومتوسلین کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ آمین!! (''ض''، ستمبر ۱۹۹۹ء)

پیرزادہ، شمس

جناب شمس پیرزادہ

افسوس ہے کہ جولائی کے اوائل میں جناب شمس پیرزادہ ممبئی میں حرکتِ قلب بند ہوجانے سے انتقال کرگئے، وہ کلیان میں ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوئے تھے، یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انجمن اسلام بمبئی سے ہائی اسکول پاس کیا، بعض اساتذہ سے عربی بھی سیکھی۔ اس طرح مراٹھی، اردو، عربی اور انگریزی کئی زبانوں سے ان کو اچھی واقفیت تھی۔

جماعت اسلامی مہاراشٹر کے سربراہ کی حیثیت سے راقم ان کے نام سے بہت پہلے سے واقف تھا، لیکن ان کی علمی لیاقت اور تصنیف وترجمہ کی صلاحیت کا اندازہ اس وقت ہوا جب وہ ۱۹۷۷ء میں ایمرجنسی کے بعد بعض اختلافات کی بنا پر جماعت اسلامی سے الگ ہوئے اور ادارۂ دعوۃ القرآن قائم کیا جہاں سے ان کی متعدد کتابیں شایع ہوئیں۔

قرآن مجید، احادیثِ نبویؐ اور فقہ اسلامی کا مطالعہ انہوں نے دقت نظر سے کیا تھا۔ دعوۃ القرآن کے نام سے کئی جلدوں میں عام فہم اور آسان زبان میں ایک تفسیر لکھی جو بہت مقبول ہوئی، حدیث میں ان کی کتاب جواہر الحدیث کو بھی قبولیت نصیب ہوئی، فقہ کے جدید مسائل پر انہوں نے متعدد رسائل لکھ کر اپنی فقہی و دینی بصیرت کا ثبوت دیا، ان کا تعلق اسلامی فقہ اکیڈمی سے بھی تھا جس کے سمیناروں میں وہ برابر شریک ہوتے اور ان کی رائے کا لحاظ بھی کیا جاتا تھا۔ پہلی بار میری ملاقات ان سے ہمدرد نگر دہلی کے سمینار میں ہوئی تھی، پھر بمبئی میں ملے تو اپنا ادارہ دیکھنے کی دعوت دی، وہاں گیا تو بڑی محبت وشفقت سے پیش ہوئے اور نہایت شوق سے ادارہ دکھایا۔

انہیں عربی سے اردو ترجمے کا اچھا ملکہ تھا، ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی دو ضخیم عربی کتابوں **الحرام والحلال** اور **رفقہ الزکوۃ** کا سلیس وشگفتہ اردو ترجمہ کیا تھا خود ان کی متعدد کتابوں کے بھی ترجمے عربی، انگریزی، ہندی، مراٹھی اور گجراتی میں ہوئے۔

پیرزادہ صاحب کا تعلق جس گھرانے سے تھا وہ عقیدہ و مسلک میں اس کے ہم نوا نہ تھے بلکہ اصحابِ حدیث وسلفیہ کے مسلک پر کار بند تھے مگر اس میں ان کا غلو و تعصب نہ تھا وہ بڑے نحیف اور کمزور تھے، لیکن ایمان وعقیدہ میں پختہ تھے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا کرے، آمین!! (''ض''، ستمبر ۱۹۹۹ء)

خان، مقصود علی، میر

میر مقصود علی خاں

یہ خبر بھی بڑے افسوس کے ساتھ سُنی جائے گی کہ بنگلور سے نکلنے والے روزنامہ سالار کے اڈیٹر و مالک جناب میر مقصود علی خان کی وفات ہوگئی۔ ایک زمانے میں سیاسی سرگرمیوں سے ان کا بڑا تعلق تھا۔ ریاستی اسمبلی کے دو بار رکن منتخب ہوئے، راجیہ سبھا کے ممبر بھی رہے۔ ۶۲ء میں نجلنگپا کی کابینہ میں وزیر ہوئے۔ لیکن اب ادب و صحافت کی جانب ان کی توجہ مرکوز ہوگئی تھی۔ وہ کرناٹک پتریکا اکادمی کے رکن تھے۔

دین سے طبعاً لگاؤ تھا۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے، مولانا علی میاں سے عقیدت تھی۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے رکن تھے، اس کے جلسوں میں ان سے برابر ملاقات رہتی، بڑی محبت اور خوش خلقی سے ملتے۔ دارالمصنفین اور معارف کے بڑے قدرداں تھے۔ یہ ان کے مطالعہ میں بھی رہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت کرے اور پس ماندگان کو صبرجمیل عطا کرے۔ آمین!! (''ض''، ستمبر ۱۹۹۹ء)

برق، عطا کریم، ڈاکٹر

ڈاکٹر عطا کریم برق

ڈاکٹر عطا کریم برق ۴/اکتوبر کو وفات پاگئے تھے، لیکن ان پر گنجایش نہ نکلنے کی وجہ سے کچھ لکھا نہیں جاسکا تھا، وہ نہ صرف کلکتہ بلکہ ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کے ممتاز عالم و محقق اور کامیاب استاذ تھے، ان کا شمار ملک کے ان دانشوروں میں ہوتا ہے جو اپنی فارسی دانی کے لیے ہندوستان ہی نہیں ایران میں بھی مقبول تھے۔

ڈاکٹر عطا کریم مونگیر (بہار) کے ایک معزز اور تعلیم یافتہ گھرانے کے فرد تھے، ان کی ولادت ۱۹۱۸ء میں ہوئی، اردو فارسی اور دینیات کی ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہوئی۔ اعلا تعلیم کے لیے کلکتہ آئے اور ۱۹۴۶ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم، اے کیا، اپنے استاذ و مربی ڈاکٹر محمد اسحاق کی کوشش سے ۱۹۴۹ء میں اسکالرشپ پر ایران تشریف لے گئے جہاں سے ایم۔ لٹ کی ڈگری لے کر ۱۹۵۳ء میں ہندوستان واپس آئے اور جنوری ۱۹۵۴ء میں کلکتہ یونیورسٹی کے شعبہ عربی و فارسی سے وابستہ ہوئے اور ترقی کے مراحل طے کرتے ہوئے آسوتوش پروفیسر آف اسلامی کلچر کے عہدے تک پہنچے۔

ڈاکٹر برق نے فارسی ادبیات کی تحقیق کو اپنا موضوع بنایا اور اپنے علمی، ادبی اور تحقیقی کاموں میں ڈاکٹر محمد اسحاق کے علاوہ ڈاکٹر زبیر صدیقی جیسے فاضل سے بھی رہنمائی حاصل کی، ۱۹۶۷ء میں انہوں نے ''نفوذ و آثارِ فارسی در زبان و ادبیات بنگالی'' کے عنوان سے اپنا تحقیقی مقالہ دو جلدوں میں مکمل کیا، جس پر تہران یونیورسٹی نے ان کو ڈی لٹ کی ڈگری تفویض کی۔ ان کی دوسری کتاب ''درجستجوئے احوال و آثار صفی علی شاہ'' ایران سے ۱۹۷۱ء میں شایع ہوئی، اس میں صفی کے حالات اور کارناموں پر سیر حاصل بحث کی ہے، مشہور ایرانی فاضل سعید نفیسی نے اس پر عالمانہ مقدمہ تحریر کیا تھا۔ انہوں نے بہار کے ایک صوفی بزرگ شیخ آمون کے دو رسالوں **تحقیق المعانی** اور **مطلوب المبارک** کی تدوین کی اور اے۔ سی۔ بوس کی ''رباعیات خیام'' کے انگریزی ترجمے کو ایڈٹ کیا۔ کورس کی متعدد کتابیں لکھیں، ان کی کئی کتابیں ابھی تک طبع نہیں ہوئی ہیں، تصانیف کے علاوہ اردو، فارسی اور انگریزی میں سینکڑوں مضامین لکھے جو ایران اور ہندوستان کے اہم جرائد و مجلات میں شایع ہوئے۔

برق صاحب کو شعر و سخن کا اچھا ذوق تھا، اردو فارسی دونوں میں دادِ سخن دیتے تھے، آخر میں یہ کوچہ چھوڑ دیا تھا، طالب علمی کے زمانے میں افسانے بھی لکھے تھے۔

ڈاکٹر عطا کریم کو فارسی زبان و ادب پر عبور تھا، ایران میں قیام کے زمانے میں وہاں کے دانشوروں سے ملاقات و استفادہ کر کے جدید فارسی میں بھی مشق و مہارت بہم پہنچائی۔ اس زبان سے نسبت رکھنے والے اکثر اداروں اور انجمنوں سے ان کا تعلق تھا، کل ہند انجمن استادان فارسی کے بانیوں اور سرگرم ممبروں میں تھے، ۱۹۴۶ء میں کلکتہ میں ایران سوسائٹی قائم ہوئی تو اس کے موسس ڈاکٹر محمد اسحاق کے کاموں میں ہاتھ بٹایا اور ہمیشہ اس سے گہرا تعلق رکھا۔ وہ اس کے تاحیات رکن ہی نہیں ایک زمانے میں صدر بھی رہے۔ ڈاکٹر محمد اسحاق کے انتقال کے بعد انڈو ایرانیکا کے فارسی سیکشن کی ادارت بھی سنبھالی اور اس کے اداریے لکھے، سوسائٹی کی ذمہ داری جب خواجہ محمد یوسف کو سپرد کی گئی تو برق صاحب ان کے بھی معتمد رہے۔ ان کی فارسی خدمات کے صلے میں صدر جمہوریہ نے انہیں انعام و خلعت سے سرفراز کیا۔

ڈاکٹر عطا کریم صوم وصلوٰۃ اور اوراد و وظائف کے پابند اور بزرگانِ دین سے گہری عقیدت رکھتے تھے، ان کی وصیت کے مطابق ان کی لاش کلکتہ سے بہار لائی گئی اور شیخ آمون کے پہلو میں دفن کئے گئے۔

برق صاحب میں قوم و ملت کا درد بھی تھا، کلکتہ کے قومی و ملی کاموں میں شریک رہتے، ان میں شجاعت اور دلیری تھی، فسادات کے زمانے میں بڑی ہمت و جرأت سے کام لیتے اور خطرات کے باوجود اپنا گھر چھوڑ کر محفوظ جگہوں میں منتقل نہ ہوتے۔

وہ ایک مرنجان مرنج اور نرم دل شخص تھے، گفتگو میں شیرینی اور حلاوت ہوتی،

راقم سے جب ملتے تو اپنی محبت، شرافت اور اخلاص کا نقش دل پر چھوڑ جاتے، وضع داری، انکساری، سادگی، بے تکلفی اور دردمندی ان کی سیرت کا خاص جوہر تھا۔

کئی برس سے دماغی امراض میں مبتلا تھے، ادھر تنفس کی تکلیف بہت بڑھ گئی تھی، ہوش و حواس بجا نہ رہتے، یادداشت ختم ہوگئی تھی آخر رفیقِ اعلیٰ سے جاملے اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور اعزہ واحباب کو صبر جمیل عطا کرے، آمین!! (''ض''، دسمبر ۱۹۹۹ء)

رحمانی، عبدالرؤف، مولانا

مولانا عبدالرؤف رحمانی

مضمون بالا کی کتابت ہو رہی تھی کہ ۳۰/ نومبر کو ملک کے مشہور عالم اور جمعیۃ اہلِ حدیث کے ممتاز مصنف مولانا عبدالرؤف رحمانی کی وفات کی خبر آئی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وہ اس صدی کے پہلے دہے میں پیدا ہوئے تھے، ابتدائی اور کسی قدر عربی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں داخلہ لیا جو غیر منقسم ہندوستان میں جمعیۃ اہلِ حدیث کا سب سے بڑا اور ممتاز تعلیمی ادارہ تھا، ان کا تعلق موجودہ ضلع سدھارتھ نگر کے ایک خوش حال زمیندار گھرانے سے تھا۔ مگر انہوں نے گھر کے آرام و تعیش پر دینی و علمی خدمت کو ترجیح دیا اور زمین و جائداد کے جھگڑوں میں پڑنے کے بجائے علم کی اشاعت اور دین کی دعوت کا کام انجام دینے میں مصروف ہوگئے، ان کے دیندار والد حاجی نعمت اللہ خاںؒ نے اپنے پس ماندہ علاقے میں علم و دین کو فروغ دینے کے لیے ایک مدرسہ سراج العلوم قائم کیا تھا اور اسے اخراجات کے معاملے میں خودکفیل بنانے کے لیے نیپال کے ایک موضع کی اپنی آراضی اس پر وقف کردی تھی، مولانا عبدالرؤف صاحب کی محنت اور دماغ سوزی سے اسے بڑی ترقی نصیب ہوئی اور اب نیپال کے علاوہ بستی، گونڈہ، دیوریا، گورکھپور اور دوسرے مقامات کے تشنگانِ علم اس سے سیراب ہورہے ہیں۔

مولانا اسی مدرسے کے ایک گوشہ میں بیٹھ کر تحریر و تصنیف کا کام بھی برابر انجام دیتے رہے، ان کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد ۵۰ ہوگی۔ جن میں دلائل توحید باری تعالیٰ، صیانۃ الحدیث، نصرۃ الباری، فضائل سیدالانبیاء، حقوق و معاملات، خلافتِ راشدہ اور ایمان و عمل وغیرہ مشہور ہیں۔ اکثر دینی رسالوں میں ان کے مضامین بھی برابر چھپتے رہتے تھے۔ خود ان کی سرپرستی میں جامعہ سراج العلوم سے ایک دینی ماہنامہ السراج پابندی سے شایع ہو رہا ہے۔

مولانا شیریں بیان واعظ و خطیب اور سحر بیان مقرر تھے۔ ملک کے مختلف خطوں سے تقریر کے لیے وہ مدعو کیے جاتے تھے اور لوگ دور دور سے ان کی تقریر سننے کے لیے آتے تھے۔ وہ اپنی علمی، تعلیمی اور دینی و دعوتی خدمات کی بنا پر ہندو نیپال ہی نہیں عالمِ عربی میں بھی روشناس تھے۔ اسی لیے نیپال کی جانب سے رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے ممبر مقرر ہوئے تھے۔

وہ اپنے اعتدال کی بنا پر ہر طبقہ و مسلک کے لوگوں سے تعلق رکھتے تھے، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ اور مولانا علی میاں مدظلہ سے ان کے مخلصانہ روابط تھے، مجھ پر بھی ان کی شفقتیں تھیں اور کبھی کبھار خط و کتابت بھی رہتی تھی۔ ایک مرتبہ میں گونڈہ اور ڈومریا گنج گیا تو مولوی عبدالمبین ندوی کے ہم راہ مولانا کی خدمت میں جھنڈا نگر بھی حاضر ہوا، بڑی محبت سے پیش آئے اور بڑا اعزاز کیا، فجر بعد طلبہ و اساتذہ سے خطاب کرنے کا موقع بھی عنایت فرمایا۔

مولانا کی طویل عمر علمی، دینی اور دعوتی کاموں میں بسر ہوئی، اللہ تعالیٰ علم و دین کے اس خادم کو بہشت بریں میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ (''ض''، دسمبر ۱۹۹۹ء)

حسینی، زماں، مولانا حکیم

مولانا حکیم زماں حسینی

افسوس ہے کہ ۲۳/ دسمبر کو کلکتہ کے مشہور و باوقار عالم مولانا حکیم زماں حسینی وفات پاگئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

وہ علم و عمل میں پختگی و استقامت، زہد و اتقاء میانہ روی اور ذاتی وجاہت کی بناء پر کلکتہ کے علمی و دینی حلقوں میں بہت مقبول تھے، ان کا تعلق کلکتہ سے تھا مگر اپنی علمی و دینی وجاہت متوازن شخصیت، پاکیزہ سیرت، اصابتِ رائے اور معاملہ فہمی کی وجہ سے پورے ملک میں باوزن اور قابل اعتماد سمجھے جاتے تھے۔ ان کے دل میں قوم و ملت کا درد تھا، اس لیے مسلمانوں کی موجودہ تباہی اور زبوں حالی سے بہت بے چین رہتے تھے، کلکتہ کے علمی و تعلیمی اداروں کے علاوہ وہ ہندوستان کے بھی ممتاز دینی و تعلیمی اداروں اور قومی و ملی تنظیموں سے وابستہ تھے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو اور دارالعلوم دیوبند جیسے عالمگیر شہرت کے حامل اداروں کے عرصے سے اہم رکن تھے اور ان کے جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ امارت شرعیہ بہار واڑیسہ اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے بھی سرگرم ممبر تھے۔ دارالمصنفین سے مخلصانہ تعلق رکھتے تھے، ہم لوگوں میں سے کوئی اگر کلکتہ پہنچ جاتا تو بہت خوش ہوتے اور لطف و مدارات سے پیش آتے۔

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے، ان سے غیر معمولی عقیدت ہی کی بنا پر اپنے نام کے ساتھ حسینی لکھتے تھے، دینی علوم میں اچھی دستگاہ تھی، فن تفسیر سے زیادہ مناسبت تھی، مفسر قرآن کہلاتے تھے، قدرت نے حسن بیان اور تاثیر کی نعمت بخشی

تھی، ان کے درس قرآن کی شہرت تھی، برسوں کولوٹولہ کی مسجد میں قرآن پاک کی تفسیر بیان کی، روزنامہ آزاد ہند کے ہفت وار ایڈیشن میں ان کی تفسیر برابر شایع ہوتی تھی۔ ان کو حکمت و اسرار دین سے بھی اچھی واقفیت تھی جس کا اندازہ ان کی گفتگو اور تحریر سے ہوتا تھا۔

وہ بڑے حاذق طبیب تھے، حذاقت کی وجہ سے ان کے مطب میں کثرت سے مریض آتے تھے، طب و حکمت کی مصروفیت اور قومی و ملی اشغال سے تعلق کے باوجود مطالعہ و تصنیف کا مشغلہ بھی جاری تھا، بعض جرائد و رسائل میں ان کے مضامین چھپتے تھے، جن کا ایک مجموعہ ''مقالات شریعت و حکمت'' کے نام سے کتابی صورت میں شایع ہوا تھا۔ چند اور رسائل بھی شایع ہوئے، ان کے قلم سے سب سے اہم اور بیش قیمت تحریر ''سیرت شیخ ابن سینا کے بعض پہلو اور القانون فی الطب کا مطالعاتی جائزہ'' کے نام سے نکلی، یہ دراصل ان کا وہ مبسوط مقالہ تھا جو ایشیاٹک سوسائٹی کے سمینار کے لیے لکھا گیا تھا۔ مولانا حکیم زماں صاحب اگرچہ کم لکھتے تھے مگر جو کچھ لکھتے تھے غور و فکر اور مطالعہ کے بعد لکھتے تھے اس لیے ان کی تحریریں پرمغز ہوتی تھیں۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا، علمی و دینی رسالے اور نئی مطبوعات برابر پڑھتے تھے، میں غالباً ۱۹۷۶ء میں پہلی مرتبہ ان سے کلکتہ میں ملا تو فرمایا کہ ''میں تمہارے مضامین برابر پڑھتا رہا ہوں، سمجھتا تھا کہ تم معمر ہوگے''۔ وہ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کے انتقال کے بعد رسالہ برہان کے نگراں ہوگئے تھے۔

حکیم صاحب قدیم تہذیب و شرافت کی یادگار اور اسلاف کی علمی و دینی روایتوں کے امین تھے، اللہ تعالیٰ دین و ملت اور علم و حکمت کے اس خادم کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین! (''ض''، جنوری ۲۰۰۰ء)

سنبھلی، محمد اسحاق، مولانا

مولانا محمد اسحاق سنبھلی

۷/ جنوری کو مولانا اسحاق سنبھلی کی رحلت ہوگئی، وہ ایک عالم دین، جنگ آزادی کے مجاہد جمعیۃ علمائے ہند اور ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن تھے اور برسوں ریاستی قانون ساز کونسل اور پارلیمنٹ کے ممبر بھی رہے۔

مولانا کی زندگی جہد و جہاد سے عبارت تھی، عوام کی خدمت ان کا نصب العین تھا، لوگوں کا کام کر کے خوش ہوتے تھے، بڑے خلیق اور ملنسار تھے۔

آزادی سے پہلے انہوں نے استخلاص وطن کے لیے قربانی دی اور آزادی کے بعد فرقہ پرستوں اور رجعت پسندی کے خلاف صف آرا رہے، ان کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کو بے نقاب کیا، مولانا کی زندگی اقلیتوں کے حقوق کی بازیابی کے لئے جدوجہد اور سیکولرازم، انصاف اور جمہوریت کا پرچم بلند کرنے میں بسر ہوئی۔ وہ حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار تھے، جس طرح جمعیۃ علماء کے زیر قیادت مسلمانوں کی فلاح و بہود کے کام میں حصہ لیتے تھے، اسی طرح وطن عزیز کی سالمیت اور استحکام کے لیے بھی ہمیشہ ساعی رہتے۔

مولانا اردو تحریک کے قائدین میں تھے، اس کے خلاف ہونے والی زیادتیوں اور ناانصافیوں کے خلاف ہمیشہ لڑتے رہے۔ عرصہ تک ریاستی انجمن کے جنرل سکریٹری تھے۔

مولانا اسحاق سنبھلی دارالمصنفین کے کاموں کے بڑے قدرداں تھے، چند برس پہلے اپنی پارٹی کے کام سے اس نواح میں آئے تو وقت نکال کر یہاں بھی تشریف لائے اور دارالمصنفین کے تمام شعبوں کو دیکھ کر اپنی مسرت ظاہر کی۔

موجودہ لیڈروں اور قومی کارکنوں کی طرح ان میں مصلحت پسندی اور نام و نمود کی ہوس نہ تھی، جس بات کو صحیح سمجھتے تھے اسے بے دھڑک کہہ دیتے تھے، افسوس ہے کہ ملک سے ایسے مخلص، بے غرض، جرأت و ہمت والے اور نام و نمود سے بے زار لیڈر ایک ایک کر کے رخصت ہوئے جارہے ہیں اور ان کی جگہ پر نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ مولانا کی بے لوث قومی و ملی خدمات کا صلہ دے اور ان کی مغفرت فرمائے آمین!

(''ض''، جنوری ۲۰۰۰ء)

ندوی، حامد اللہ، ڈاکٹر

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی کے انتقال کی افسوس ناک خبر تاخیر سے ملی، انہوں نے ۱۹/ اکتوبر ۹۹ء کو سنگاپور میں داعی اجل کو لبیک کہا، ان کا وطن تامل ناڈو کی مشہور ریاست آرکوٹ (نارتھ) کا ایک قصبہ چروتاپور تھا۔ یہیں وہ ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا، ندوہ سے فراغت کے بعد پونے یونیورسٹی سے فارسی اور اردو میں ایم۔اے کیا۔

درس و تدریس کا آغاز بمبئی کے مشہور تعلیمی ادارے انجمن اسلام سے ہوا، اس کے ریسرچ سنٹر سے بھی وابستہ رہے اور عرصہ تک مہاتما گاندھی میموریل سنٹر کی ہندوستانی پرچار سبھا سے منسلک رہے، جس کے ڈائریکٹر پروفیسر عبدالستار دلوی تھے۔ اسی زمانے میں ہمارے سابق رفیق مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی کا تعلق بھی اس سنٹر سے تھا، انہی کے ہم راہ راقم نے پہلی بار ان دونوں حضرات سے ملاقات کا شرف حاصل کیا، دونوں دارالمصنفین کے بڑے قدرداں اور خیر خواہ تھے اس لیے مجھ سے بڑے اخلاص، محبت اور گرم جوشی سے ملے اور توقع سے زیادہ میری پذیرائی کی۔

آخر میں ڈاکٹر حامد اللہ ندوی کا تعلق بمبئی یونیورسٹی کے شعبہ عربی سے ہوگیا، اس سے وظیفہ یاب ہونے کے بعد بمبئی کی ہنگامہ خیز زندگی سے الگ رہ کر وہ خاموشی سے

علمی، ادبی اور تحقیقی کاموں میں مشغول رہتے تھے جس سے ان کو بڑا شغف تھا۔ تحریر و تصنیف کا بھی اچھا ذوق اور خاص سلیقہ تھا جس کا ثبوت ان کی تصنیفات ہیں جو تلاش، تحقیق اور محنت وجستجو سے لکھی گئی ہیں۔

ان کی کتاب ''لکھنؤ کی لسانی خدمات'' شایع ہوئی تو علمی حلقوں میں اس کی بڑی پذیرائی ہوئی، دوسری کتابیں ''اردو کی چند نایاب مثنویاں'' اردو کے چند نامور ادیب اور شاعر ''ہندوستان اور مشرق وسطیٰ کے تجارتی تعلقات'' اور ''کتب خانہ جامع مسجد بمبئی کے اردو مخطوطات'' بھی ان کی تلاش وتفحص کا نتیجہ ہیں۔ حال ہی میں ان کی کتاب ''انجمن کے چند روشن چراغ'' شایع ہوئی تو بمبئی کے علمی وادبی حلقوں میں اس کو پسند کیا گیا۔

ڈاکٹر حامد اللہ متین، سنجیدہ اور خاموش طبع شخص تھے، اپنے کام سے سروکار رکھتے، دوسروں کا شکوہ وشکایت نہ کرتے، ان کی وفات سے اردو اپنے ایک عاشق و شیدائی اور لایق عالم ومحقق سے محروم ہوگئی، اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس نصیب کرے اور اعزہ ومتعلقین کو صبر وقرار بخشے، آمین! (''ض''، جنوری ۲۰۰۰ء)

ندوی، احتشام علی، مولوی

مولوی احتشام علی ندوی

افسوس ہے کہ ۲۰؍ رمضان المبارک کو مولوی احتشام علی ندوی اچانک چل بسے، ان کی تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہوئی، وہ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم کے چہیتے شاگردوں میں تھے، انہی کے ایما سے جامعہ ملیہ میں داخلہ لیا، مولانا عبدالسلام صاحب نے لکھنؤ میں ادارۂ تعلیمات اسلام کی داغ بیل ڈالی تو اس کی تشکیل میں یہ بھی ان کے معاون رہے اور ان کی نگرانی میں صحابہ کرام کے حالات میں مختصر اور عام فہم بعض کتابچے لکھے۔

دارالمصنفین سے ان کا تعلق دو بار رہا، پہلی دفعہ وہ مولانا عبدالسلام قدوائی کے ساتھ آئے اور محاسب کی ذمہ داری سنبھالی، ان کے انتقال کے بعد انہوں نے بھی یہاں سے تعلق منقطع کرلیا، تاہم دارالمصنفین سے ان کے لگاؤ میں کمی نہیں آئی جناب سید صباح الدین صاحب مرحوم کے انتقال کے بعد پھر وہ دارالمصنفین تشریف لائے اور پریس کی نگرانی اور دوسرے انتظامی امور ان کو سپرد کیے گئے لیکن اس دفعہ ان کی صحت خراب رہنے لگی۔ دو تین برس سے کمزوری بہت بڑھ گئی تھی اور ضعف بصر کی شکایت بھی ہوگئی تھی۔ ان کا انتقال دارالمصنفین ہی میں ہوا، مگر تدفین ان کے وطن رحیم آباد میں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ درجات بلند کرے اور اہلیہ واعزہ کو صبر جمیل عطا کرے آمین!

(''ض''، جنوری ۲۰۰۰ء)

ندوی، سید ابوالحسن علی، مولانا

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

داعی الی اللہ کی وفات

افسوس اور سخت افسوس ہے کہ محفلِ دوشیں کا وہ چراغ سحر جو پچھلے برس ہی سے ضعف ومرض کے جھونکوں سے بجھ بجھ کر سنبھل جاتا تھا بالآخر ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔ یعنی اس دور کے بہت مقبول ومقدس بزرگ، دنیائے اسلام کے محبوب ومحترم عالم، عرب و عجم کی سرمایہ افتخار ونازش ذات، شرق وغرب کی موقر ومکرم ہستی، ہر فرقہ و مذہب کے معزز ومعتمد شخص، انسانیت کے پیام رساں اور علمبردار، مسلمانوں کے راہبر ورہنما، دین و مذہب کے عاشق وشیدائی، اسلام کے داعی ونقیب، ایمان و یقین کے حامل ومبلغ، عزیمت و جہاد کے پیکر، خانہ کعبہ کے کلید بردار، ہندوستان میں سرمایہ ملت کے نگہبان، ندوۃ العلماء کے ناظم، دارالمصنفین کے روح رواں، مسلم پرسنل لا بورڈ اور دینی تعلیمی کونسل کے صدر، رابطہ عالمِ اسلامی اور مدینہ یونیورسٹی کے تاسیسی رکن، رابطہ ادب اسلامی کے بانی وصدر اسلامی سینٹر آکسفورڈ یونیورسٹی کے چیرمین اور ہندو بیرونِ ہند کے مختلف اداروں اور انجمنوں کے سربراہوں اور سرپرست حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ۲۲؍ رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ، ۳۱؍ دسمبر ۱۹۹۹ء کو اس سرائے فانی کو الوداع کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون، اور اپنے لاکھوں عقیدت مندوں، قدردانوں، رفیقوں اور عزیزوں کو غم زدہ اور سوگوار چھوڑ کر زبان حال سے یہ کہتے ہوئے موت کی آغوش میں چلے گئے۔

اضاعونی وای فتی اضاعوا
لیوم کریھة و سداد ثغر

بیسویں صدی کے اختتام سے ایک برس پہلے جب شمسی سال کے ختم ہونے میں ایک دن رہ گیا تھا تو یہ المناک اور دل دوز خبر بجلی بن کر گری۔

نعی الرکب اوفی حین آبت رکابھم
لعمری لقد جاؤ ابشر فاوجعوا
نعوا باسق الا فعال لا یخلفونه
تکاد الجبال الصم منه تصدع

عین نصف النہار کے وقت وہ آفتاب عالم تاب غروب ہوگیا جس سے ہندوستان اور پوری دنیائے اسلام منور تھی، اس وجود مقدس کا خاتمہ ہوگیا جس کے ذکرِ جمیل سے مسجدیں، خانقاہیں، مدارس، جدید تعلیم گاہیں، یونیورسٹیاں اور سیاست و حکومت کے ایوان پرشور رہتے تھے، وہ برگزیدہ ہستی معدوم ہوگئی جس کے ایک ہاتھ

میں جامِ شریعت اور دوسرے میں سندانِ عشق تھا، وہ خیر کارواں رخصت ہوا جس کا شغل ذکر کے ساتھ فکر اور جس کا معمول تسبیح و مناجات کی طرح وسعتِ افلاک میں تکبیر مسلسل تھا۔ وہ نہ ملت کے جوانوں کی طرح نخچیر زمانہ تھا اور نہ پیرانِ کہن سال کی طرح بیگانہ ایام۔ یہی وہ چراغ تھا جس سے علم و عرفان اور شریعت و طریقت کی بزم روشن تھی، اس کے فیض سے ایمان کی باد بہار چل رہی تھی، معرفت و یقین کی دوکان آراستہ تھی، دریائے علم رواں اور دوائے دل ارزاں تھی، اس کی ذات لکھنؤ اور رائے بریلی میں فضل و کمال، محبت و معرفت، یقین و نگاہ اور رشد و ہدایت کی شمع فروزاں تھی، اس کی ہستی سیرت و خلق محمدی، شاہ علم اللہ کے زہد و ریاضت، سید احمد شہید کے جہد و جہاد اور مولانا عبدالحئی کے علم و دانش کا مجموعہ تھی اور اس کی ذات میں اسلاف اور اپنے بزرگ اجداد کی بہت سی روایات و خصوصیات اکٹھا ہوگئی تھیں، ارشاد و ہدایت، وعظ و نصیحت، درس و تدریس، تلاش و مطالعہ، تحریر و تصنیف اور دین و ملت کی راہ میں جاں فروشانہ جذبہ اور مجاہدانہ اخلاص۔

ولیس علی اللہ بمستنکر

ان یجمع العالم فی واحد

۲۲/رمضان المبارک کو جمعہ کی نماز پڑھ کر بعض اعیانِ شہر کے ساتھ اپنی رہائش گاہ کے سامنے صحن میں بیٹھا تھا کہ شہر کے ایک صاحب کے فون سے اس حادثہ فاجعہ کی اطلاع ملی۔ تصدیق اور تدفین کا وقت معلوم کرنے کے لیے لکھنؤ اور رائے بریلی فون کرایا مگر پتہ نہیں چلا، خبر پھیلی تو دارالمصنفین کے احاطہ کے لوگ، شبلی کالج کے اساتذہ اور شہر کے بعض حضرات میری قیام گاہ پر جمع ہوگئے، ڈاکٹر مسیح الرحمٰن لکچرر شبلی کالج نے لکھنؤ میں اپنے بڑے بھائی مولانا سعید الرحمٰن اعظمی کے یہاں فون کرایا تو خبر کی تصدیق ہوگئی اور ۴:۳۰ بجے میں ان کے اور اپنے رفقا، عزیزوں اور ڈاکٹر سلمان سلطان رکن مجلس انتظامی دارالمصنفین کے ساتھ روانہ ہوا، مگر تکیہ سے ۳ کلومیٹر پہلے ہی گاڑی روک دی گئی، ہم لوگ پیدل چل پڑے، راستے میں آدمی ہی آدمی تھے، کچھ تو نماز جنازہ اور تدفین میں شریک ہوکر واپس آرہے تھے اور کچھ بے تابانہ تدفین میں شریک ہونے جارہے تھے ہم لوگوں کو جنازے کی سعادت سے محروم رہ جانے پر بڑا قلق ہوا، دو تین گھنٹے گزار کر بہ مشکل مولانا کے خواہر زادگان مولانا سید محمد رابع اور مولانا سید واضح سے ملاقات کرکے ۸ بجے صبح اعظم گڑھ واپس اس حال میں آئے۔

اذا ما دعوت الصبر بعدک والبکا

اجاب البکا طوعا ولم یجب الصبر

کئی روز تک گم صم رہا، کسی کام میں جی نہیں لگتا تھا، قلم اٹھانے کا یارانہ تھا، حیص بیص میں دن بیت گئے، ہفتے گزر گئے، جنوری کے آخری عشرے میں مولانا مستقیم احسن نے بمبئی سے فون کیا، ''ابھی تک معارف نہیں پہنچا، مولانا پر مضمون کا شدید انتظار ہے'' حکیم محمد مختار اصلاحی اور پروفیسر خورشید نعمانی ردولوی اور دوسرے قدردانِ معارف کی طرف سے بھی ماتمی تحریر کے لیے بے قراری ظاہر کی گئی۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی

دوانہ مرگیا آخر کو زمانے پہ کیا گزری

اس پیہم تقاضے اور شدید اصرار نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا مگر اسی اثنا میں اعظم گڑھ میں فساد کی آگ بھڑک اٹھی جس کی زد سے دارالمصنفین بھی محفوظ نہیں رہا، نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا ظلمات بعضها فوق بعض [النور:۴۰] کا منظر تھا۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی وفات نہ تنہا ان کے عزیزوں اور نیاز مندوں کا حادثہ ہے اور نہ دارالمصنفین اور ندوۃ العلماء کی دنیا ویران ہوئی ہے، بے شمار ادارے تنظیمیں اور انجمنیں بے رونق ہوگئی ہیں، امتِ مرحومہ کا سرمایہ اعتماد جاتا رہا، عالم اسلام کا سہارا ختم ہوگیا، تباہ و خستہ حال ہندوستان کا غم خوار چلا گیا، آہ وہ پُر درد آواز خاموش ہوگئی جو نصف صدی تک ہندوستان اور دنیائے اسلام کے ہر سانحہ پر صدائے صور بن کر بلند ہوتی تھی، واحسرتا وہ بے قرار دل ساکت ہوگیا جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت پر تڑپتا اور تڑپاتا تھا، وااسفاوہ اشک آلود آنکھیں بند ہوگئیں جو دین و ملت کے ہر غم میں خوں بار رہتی تھیں، ہائے اس پر جوش سینہ کا تلاطم ختم ہوگیا جو آلام و مصائب کے پہاڑوں کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جاتا تھا، ہم کس کس چیز کا ماتم کریں اور کس کس کے لیے روئیں، وہ ایک فرد نہیں ایک قوم، ایک شخص نہیں ایک ملت اور تنہا نہیں مجموعہ صفات و کمالات تھا۔

وما کان قیس هلکه هلک واحد

ولکنه بنیان قوم تهدما

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا پدری سلسلہ حضرت امام حسنؓ پر اور مادری سلسلہ حضرت امام حسینؓ پر منتہی ہوتا ہے۔ حضرت امام حسنؓ کے صاحب زادے حسن مثنیٰ سے امام حسینؓ کی چھوٹی دختر فاطمہ صغریٰ منسوب تھیں، اس لیے ان کے خاندان کو حسنی حسینی کہا جاتا ہے، اس خاندان کے پہلے بزرگ جو مدینہ منورہ سے ہندوستان تشریف لائے وہ امیر قطب الدین محمد المدنی تھے جو شیخ عبدالقادر جیلانی کے بھانجے اور جلیل القدر ولی تھے، انہوں نے کڑا مانک پور اور اس کے نواح کو نور اسلام سے منور کیا۔ کڑا میں ان کی اولاد تقریباً ایک صدی تک عزت اور نیک نامی کی زندگی بسر کرتی رہی، جب اس خانوادے کے ایک بزرگ میر سید قطب الدین محمد ثانی کو جائس کا قاضی مقرر کیا گیا تو وہ وہاں منتقل ہوگئے، ان کے بیٹے سید علاء الدین نصیر آباد کے قاضی ہوکر وہاں جا بسے ان کے ایک پوتے قاضی سید احمد تھے جن کے فرزند سید محمد معظم کے دو نامور فرزند تھے، سید

محمد فضیل اور سید محمد اسحٰق۔ اول الذکر حضرت سید آدم بنوریؒ کے جلیل القدر خلیفہ اور ممتاز عارف باللہ حضرت شاہ علم اللہ کے والد بزرگوار تھے جن کی پانچویں پشت میں مردِ حق آگاہ اور مجاہد کبیر حضرت سید احمد شہیدؒ پیدا ہوئے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی موخر الذکر کی نسل سے تھے جن کی نوائے حق اور نالہ درد سے عرب و عجم گونج رہا ہے ؎

سالہا گوشِ جہاں زمزمہ زا خواہد شد
زیں نواہا کہ دریں گنبد گردوں زدہ ام

خاندان قطبی کی دونوں شاخوں میں اتنے اولیاء، علماء اور مشائخ پیدا ہوئے کہ کم خاندانوں میں ہوئے ہوں گے، مولانا علی میاں کے جدا مجد مولوی حکیم سید فخر الدین خیالؔی علمی باطنی کمالات سے مالا مال تھے، فارسی، اردو خاص کر بھاشا کے اچھے اور صاحبِ دیوان شاعر تھے، ان کی اکثر تصنیفات تلف ہوگئیں لیکن جو محفوظ رہ گئی ہیں وہ بھی کم نہیں ''مہر جہاں تاب'' بڑی عجیب اور اہم ہے جس کے حصہ اول کا تیسرا دفتر عربی، فارسی، اردو اور بھاشا کے شاعروں کا تذکرہ ہونے کی بنا پر اردو کے ناقدوں اور محققوں کا بھی مرکزِ توجہ ہے، ان کے فرزند اور مولانا علی میاں کے پدر بزرگوار مولانا حکیم سید عبدالحئی سابق ناظم ندوۃ العلماء نے عربی میں نزهة الخواطر اور الثقافة الاسلامية في الهند اور اردو میں ''گل رعنا'' یادگار چھوڑیں جو ہمیشہ حوالے اور مرجع کا کام دیں گی۔ مولانا علی میاں کا ننھیال بھی علمائے کبار اور اولیائے عظام سے معمور تھا۔

ایں سلسلہ از طلائے ناب است
ایں خانہ تمام آفتاب است

سید محمد فضیل کے فرزند حضرت شاہ علم اللہ حرمین شریفین کے مستقل قیام کے ارادے سے نصیر آباد سے روانہ ہوئے اور رائے بریلی میں جہان آباد پہنچے تو ایک بزرگ مجذوب کے کہنے سے ارادہ تبدیل کردیا اور جنگل میں دریائے سئی کے کنارے مٹی اور پھوس کا ایک مکان اور مٹی ہی کی مسجد تعمیر کر کے طرحِ اقامت ڈال دی، قریب کے ایک گاؤں لوہانی پور کے زمیندار دولت خاں نے پختہ دس بیگھ زمین نذر کی۔ جو آگے چل کر دائرۂ شاہ علم اللہ یا تکیہ کے نام سے موسوم ہوئی۔ شاہ علم اللہ کے بنی اعمام نصیر آباد ہی میں سکونت پذیر رہے، جب یہاں کے مولانا سید عبدالعلی نصیر آبادی کی شادی مولانا سید محمد ظاہر کی جو حضرت شاہ علم اللہ کی پانچویں پشت میں تھے دو صاحب زادیوں سے یکے بعد دیگرے ہوئی تو وہ نصیر آباد سے ترکِ سکونت کر کے دائرۂ شاہ علم اللہ رائے بریلی منتقل ہوئے، اسی مقتدر خاندان میں آگے چل کر مولانا علی میاں کی ولادت ہوئی اور دائرۂ شاہ علم اللہ یا تکیہ ان کا مولود و منشا بنا۔

بلاد بهاتمت علی تمائمی
واول ارض مس جلدی ترابها

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تسمیہ خوانی تکیہ رائے بریلی میں ہوئی اور مکتبی تعلیم امین آباد لکھنؤ کے محلّہ بازار جھاؤلال کی مسجد نوازی کے مکتب میں پائی، یہ محلّہ اب محمد علی لین کہلاتا ہے، یہاں ان کے والد کا مکان اور مطب تھا۔ ابھی وہ نو دس برس ہی کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا اس لیے اس کو چھوڑ کر تکیہ آنا پڑا مگر جلد ہی ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی سابق ناظم ندوۃ العلماء نے بھی اسی محلّہ میں اپنا مطب شروع کیا تو ان کو بھی لکھنو بلالیا اور بڑی شفقت اور دل سوزی سے ان کی سرپرستی اور تربیت کی۔ مولانا کو اردو کا اچھا ذوق اور شعر فہمی کی صلاحیت یہیں پیدا ہوئی، انہوں نے لکھنو یونیورسٹی سے فاضل ادب اور فاضل حدیث کے امتحانات دئے، اپنے پھوپھا مولانا سید محمد طلحہ پروفیسر اورینٹل کالج لاہور سے صرف ونحو کی مشق کی، دارالعلوم ندوہ سے استفادے کا آغاز ہوا، مولانا شبلی جیراجپوری سے فقہ اور مولانا حیدر حسن خاں سے حدیث کی کتابیں پڑھیں، ۲۹ء میں لاہور کا سفر کیا، مولانا سید محمد طلحہ کے ہم راہ علامہ اقبال اور دوسرے ناموروں سے ملاقات کا شرف حاصل کیا اگلے برسوں میں پھر جا کر مولانا احمد علیؒ سے مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے طرز تفسیر و فکر کے مطابق قرآن مجید اور حجۃ اللہ البالغہ کا درس لیا، اس طرز میں اس سے پہلے ان کے خواجہ تاش خواجہ عبدالحئی فاروقیؒ استاد تفسیر جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بھی اپنے گھر پر قرآن شریف کی بعض سورتیں پڑھ چکے تھے، ۳۲ء میں مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے درسِ حدیث میں شرکت کے لیے دیوبند تشریف لے گئے، ان سے بعض قرآنی مشکلات میں رہنمائی کے بھی طالب ہوئے۔

برصغیر میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی عربی کے سب سے ممتاز انشا پرداز اور مصنف تھے، اس کی تعلیم کا آغاز ۱۹۲۴ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر مولانا خلیل عرب کے گھر پر ہوا اور عربی بولنے اور لکھنے کی مشق بھی یہیں ہوئی، طلبہ کے لیے عربی بولنا لازمی تھا، اردو بولنے پر جرمانہ ہوتا تھا۔ اس زمانے میں عربی اخباروں اور رسالوں کے مطالعہ کا چسکہ لگا جو ان کے بڑے بھائی اور مربی ڈاکٹر سید عبدالعلی کے یہاں آتے تھے، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ان کے مطالعہ کا مزید موقع ملا، مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کی دوستی اور رفاقت سے اس ذوق میں جلا پیدا ہوئی، مولانا کے مضامین مصر کے رسالوں میں چھپنے لگے، ستمبر ۳۰ء میں علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی ندوہ میں ادبِ عربی کے اعلیٰ استاد ہو کر آئے تو یہاں عربی ادب کے نئے دور کا آغاز ہوا، ان سے مولانا علی میاں نے بھی فائدہ اٹھایا، مولانا سید سلیمان ندوی اور ہلالی صاحب کی نگرانی اور مولانا مسعود عالم ندوی کی ادارت میں مئی ۳۲ء میں الضیاء کا اجرا ہوا، جس کے مولانا مستقل مضمون نگار تھے، یہ رسالہ تین سال بعد بند ہوگیا، اس کے تخم سے البعث الاسلامی اور الرائد نکلے جن کے مولانا سرپرست اور نگراں تھے، عربی تحریر و تقریر سے ان کا شغف مدۃ العمر قائم رہا، ۱۹۵۶ء میں وہ دمشق یونیورسٹی کے وزیٹر پروفیسر ہوئے۔

یہاں کی المجمع العلمی کے رکن بھی تھے۔ عربی میں ان کے مضامین و کتب اتنی کثیر تعداد میں ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے، اپنی اس خصوصیت کی بنا پر وہ عرب ملکوں کے ہر پروگرام میں مدعو ہوتے تھے اور وہاں کے اکثر اداروں اور انجمنوں کے ممبر بھی تھے، ان سے زیادہ کسی ہندوستانی نے عرب ملکوں کا سفر نہیں کیا، ان کی اردو کتابوں کے عربی ترجمے بھی شایع ہوئے، وہ عرب ملکوں کے موجودہ فضلاء اور اہل قلم سے کسی اعتبار سے کم پایہ نہ تھے، اپنی اسی شہرت و مقبولیت اور دینی عظمت و وجاہت کی بنا پر کلید کعبہ ان کے حوالے کی گئی تھی، وکفیٰ بہ فخراً۔

مولانا علی میاں نے بیس سال کی عمر حصول تعلیم میں گزاری، ۳۴ء میں ندوۃ العلماء میں تفسیر و ادب کے استاد مقرر ہوئے، درس تیاری، محنت اور مطالعہ کے بعد دیتے تھے، اس ضمن میں ندوہ کی سفارت، اس کے تعارف اور اس کے مقاصد کی اشاعت کے لیے سفر بھی کیا، ۴۰ء مولانا سید سلیمان ندوی کی نگرانی اور ان کی اور مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کی ادارت میں الندوہ پھر جاری ہوا اور فروری ۴۲ء میں بند ہوگیا، دعوتی ذوق کی بنا پر بعد میں بھی صحافت سے دلچسپی رہی، ۴۸ء میں مولانا عبدالسلام قدوائی کے اشتراک سے پندرہ روزہ اخبار تعمیر نکالا اور اس کے لیے متعدد فکر انگیز مضامین لکھے ہفتہ وار ندائے ملت کے اجراء میں بھی ان کی مساعی شامل تھیں، ان کی سرپرستی میں پندرہ روزہ تعمیر حیات شایع ہوا جو اب بھی جاری ہے۔ ان کو اپنے تدریسی دور میں عربی زبان و ادب کے نصاب کی اصلاح کا خیال ہوا، اس کے لیے مختارات، القراۃ الراشدہ اور قصص النبیین وغیرہ خود لکھیں اور اپنے عزیزوں اور شاگردوں سے متعدد ریڈریں لکھوائیں، ان کو کورس کی کتابوں کی ترتیب کا خاص سلیقہ تھا، ۳۸ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کے لیے بی۔اے کلاس کی ایک کتاب تیار کی جس کا معاوضہ ۵۰۰ روپے ملا اور مولانا سید سلیمان ندوی نے مبارکباد بھی دی۔ انہوں نے دارالعلوم کے طلبہ میں دینی روح پھونکی اور ندوہ کے مقاصد سے دلچسپی پیدا کی۔ دوسرے دینی مدارس سے اس کا ربط بڑھایا، تبلیغ و دعوتِ دین کے کام سے مولانا کو زیادہ مناسبت تھی، اس میں انہماک بڑھا تو تدریس سے ضابطہ کا تعلق ختم کرلیا، لیکن ندوۃ العلماء سے ان کا خاندانی و موروثی تعلق تھا، اس کی محبت ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اور یہی آیندہ ان کا اوڑھنا بچھونا ہوگیا تھا، ۴۸ء کے وسط میں اس کی مجلسِ انتظامی کے رکن منتخب ہوئے اور جنوری ۴۹ء میں انہیں نائب معتمد بنایا گیا اور مولانا سید سلیمان ندوی کے انتقال کے بعد ۵۴ء میں معتمد ہوئے، ۶۱ء میں اپنے بھائی و مربی کی وفات کے بعد ناظم ندوۃ العلماء بنائے گئے، ان کے زمانے میں اس کو عالم گیر شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی، علمی تعلیمی، دینی اور روحانی حیثیت سے ترقی ہوئی، عمارتوں میں بہ کثرت اضافے اور توسیع ہوئی، گوناگوں شعبے اور دفاتر قائم ہوئے، مالی حیثیت سے مستحکم ہوا، مختلف شہروں میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں، پچاس سالہ جشن منایا گیا، بین الاقوامی سمینار ہوئے، جلسے، اجتماعات اور تقریبات آئے دن کا معمول ہوگئے ہیں، غرض انہوں نے ندوۃ العلماء کے چپہ چپہ پر اپنے لازوال نقوش چھوڑے ہیں۔

لعمرک ماواری التراب فعاله

ولکنها واری ثیابا واعظما

ہندوستان اور عالمِ اسلام کے بے شمار اداروں سے ان کا تعلق تھا، ہر ادارہ ان سے اپنی نسبت کو باعثِ فخر سمجھتا تھا، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی سے ان کو گہرا اور مخلصانہ لگاؤ تھا، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی سے عقیدت مندانہ تعلق کی بنا پر وہ اس کے کاموں میں پیش پیش رہتے اور پوری دلچسپی لیتے، اس کی ترقی و کامیابی سے خوش ہوتے، وہ اور ان کے بڑے بھائی اس کی مختلف مجالس کے رکن تھے، مولانا عبدالماجد دریابادی کے انتقال کے بعد ان کو مجلس عاملہ کا صدر بنایا گیا، ان کے، ڈاکٹر سید محمود اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے انتقال کے بعد وہی اس کے روح رواں تھے، بڑی پابندی سے دارالمصنفین کے جلسوں میں تشریف لاتے، اس کے جشن طلائی اور اسلام و مستشرقین پر بین الاقوامی سمینار کو کامیاب بنانے میں انہوں نے پوری سرگرمی دکھائی، یہاں سے ان کے والد بزرگوار کی کتاب گلِ رعنا اور الثقافتہ الاسلامیہ فی الہند کا اردو ترجمہ شایع ہوا، خود ان کی کتاب ''تاریخ دعوت وعزیمت'' کے شروع کے دونوں حصوں کا پہلا ایڈیشن یہیں سے نکلا۔ معارف پابندی سے پڑھتے، کسی مہینے میں تاخیر ہوتی تو شکایت کرتے ابھی جلد ہی ان سے پوچھا گیا کہ آپ کا پسندیدہ رسالہ کونسا ہے تو جواب دیا معارف۔ دارالمصنفین کو مالی فائدہ بھی پہنچاتے۔ یو۔پی کے وزیر اعلیٰ مسٹر بہوگنا نے ندوۃ العلماء کو ایک لاکھ روپے دیئے تو اسے دارالمصنفین کی طرف منتقل کرادیا، مولانا سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبی حصہ ہفتم کا مقدمہ انہوں نے لکھا تھا، یہ کتاب جنرل ضیاء الحق مرحوم کو بہت پسند آئی اور انہوں نے مولانا کو ایک لاکھ روپے نذر کرنا چاہا تو فرمایا میں اس کا مستحق نہیں۔ دارالمصنفین اور سید صاحب کی بیگم ہیں۔ چنانچہ نصف نصف رقم دونوں کو ملی، حال ہی میں ابوظہبی اور برونائی کی حکومتوں سے ان کو خطیر رقم ملی، اسے انہوں نے مدارس میں تقسیم کردیا۔ اس موقع پر بھی دارالمصنفین کا خیال رکھا۔ ان کی سفارش سے اسے رابطہ عالمِ اسلامی سے ایک اچھی رقم سالانہ ملتی تھی، مگر عرصے سے وہ بند ہوگئی۔

تقریر وتحریر کا ملکہ خداداد تھا، اردو اور عربی دونوں کے ممتاز خطیب اور نامور مصنف تھے، ان کے معاصرین میں ان سے زیادہ شاید ہی کسی نے تقریریں کی ہوں اور تحریری ذخیرہ چھوڑا ہو، ان کا طغرائے امتیاز یہ بھی تھا کہ انہوں نے اپنے اس جوہر کا صحیح استعمال کیا، ان کی ہر تقریر وتحریر کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ اور اسلام کی سربلندی ہوتا،

ان کی طبیعت کا سوز اور دل کی دردمندی تقریروں اور تحریروں کو اس قدر موثر بنادیتی تھی کہ ان کو سننے اور پڑھنے والے پر رقت طاری ہوجاتی تھی، تقریر و بیان پر معجزانہ قدرت کی وجہ سے ۴۳ء میں جب مولانا عبدالسلام قدوائی نے ادارۂ تعلیمات اسلام قائم کیا اور اس کے زیر اہتمام ان پر قرآن مجید اور حدیث شریف کے درس کی ذمہ داری ڈالی تو اس میں لکھنو کے تعلیم یافتہ طبقہ، اعلیٰ عہدیداروں اور دین دار مسلمانوں کا بڑا مجمع ہونے لگا، اس خصوصیت کی بنا پر نوعمری ہی میں وہ بڑے بڑے جلسوں میں تقریر کے لیے بلائے جاتے اور ندوہ کے نمائندے ہوکر اہم علمی اجتماعات میں مقالے پڑھنے کے لیے مدعو کئے جاتے ۳۶ء میں علی گڑھ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی جبلی میں شرکت کی اور ۳۸ء میں اس کے پٹنہ کے اجلاس میں شریک ہوئے، ۴۲ء میں جامعہ ملیہ کے شعبہ اسلامیات کی دعوت پر ''مذہب وتمدن'' کے عنوان سے مقالہ پڑھا جو بعد میں کتابی صورت میں چھپا، ادب وانشا سے فطری دلچسپی تھی، اس کا بانکپن ان کی ہر تقریر و تحریر میں نظر آتا، کبرسنی کے باوجود ان کے زور واثر اور حسن بیان میں کوئی فرق نہیں آیا۔ سیرت سید احمد شہید، مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا، ارکانِ اربعہ، نبی رحمت المرتضیٰ اور تاریخ دعوت وعزیمت وغیرہ سے اگر ان کی تلاش و تحقیق، کدوکاوش، محنت و دیدہ ریزی وقت آفرینی اور نکتہ سنجی کا پتہ چلتا ہے تو دوسری تصانیف سے فکر وخیال کی بلندی، رعنائی بیان، زورِ قلم، تازگی، آمد، روانی اور بے ساختگی کا اندازہ ہوتا ہے، ان کی تمام تصنیفات کو حسنِ قبول حاصل ہوا اور جو اردو میں لکھی گئیں ان کے عربی اور عربی کے اردو ترجمے ہوئے، اکثر کے انگریزی اور دوسری زبانوں میں بھی ترجمے ہوئے۔ ان کی عظیم الشان دینی ودعوتی خدمات اور گوناگوں تصنیفات کی وجہ سے ۸۰ء کا فیصل ایوارڈ ملا، اور اس کے بعد کے ایوارڈ سے ملنے والی ساری رقم اسلام کے مفاد اور دینی خدمات کے میدان میں صرف کردی اور اپنے لیے ایک حبہ بھی نہ رکھا۔

نہ تخت و تاج میں نے لشکر و سپاہ میں
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

مولانا شروع سے محبّ وطن اور تحریک آزادی کے حامی تھے، انگریزوں سے نفرت کے جراثیم موروثی تھے، ۸ برس کی عمر میں وہ تحریک خلافت کا جوش وخروش اور پھر ۳۰/ مارچ ۲۴ء کا وہ منحوس دن دیکھ چکے تھے جب انگریزوں کی سازش سے کمال اتاترک نے بیک جنبشِ لب اس کا خاتمہ کردیا تھا، دیوبند کے قیام اور حضرت مدنیؒ کی صحبت نے اس رنگ کو اور چوکھا کردیا تھا، اپنے تجربہ ومطالعہ سے ایک انگریز ہی کیا سارے یورپ کے الحادی و مادی نظریات کو وہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے سُمِّ قاتل سمجھتے تھے، عملی سیاست سے کنارہ کش رہنے کے باوجود ان کا اور ان کے گھرانے کا رجحان جمیعۃ العلماء اور مجلسِ احرار کی طرف تھا، ۴۲ء میں کانگریس نے ''ہندوستان چھوڑو'' کی تجویز منظور کی تو ان علماء کے طرز عمل کو پسند کیا جو جنگ آزادی اور استخلاصِ وطن کی تحریک میں شریک تھے، مگر آزادی کے بعد جب حکومت کے کارپردازوں کا رنگ بدلا اور مسلمان احساسِ کمتری اور مایوسی کا شکار ہونے لگے تو وہ جارحیت کے سامنے سپر انداز نہیں ہوئے، ۴۸ء میں ان کی دعوت پر ندوۃ العلماء میں ایک ملی اجتماع ہوا جس میں نشانِ راہ اور لائحہ عمل تجویز ہوا، یورپ کی سیاسی وتہذیبی تاخت، عقائدی ارتداد اور فکری و اخلاقی انتشار کا مقابلہ کرنے کے لیے مجلسِ تحقیقات ونشریات اسلام قائم کیا، مشرکانہ عقائد اور دیومالائی تصورات کے انسداد کے لیے دینی تعلیمی کونسل کی رہنمائی کی مسلمانوں میں نئی دینی، فکری اور جرأت مندانہ قیادت کے خلا کو پُر کرنے کے لیے ندائے ملت جاری کیا، ۶۴ء میں کلکتہ جمشید پور اور راوڑکیلا کے ہولناک فسادات کی سنگینی دیکھ کر ان کو خیال ہوا کہ تمام تعلیمی وتعمیری کاموں سے پہلے اس مسئلہ کی طرف توجہ کرنے اور اس کو موثر بنانے کے لیے اکثریتی فرقہ کے جاں باز اور سرفروش قائدین کو بھی اس میں شامل کرنے کی ضرورت ہے، اسی غرض سے مولانا محمد منظور نعمانی کی معیت میں ونوبا بھاوے اور جے پرکاش نرائن سے ملے، ڈاکٹر سید محمود کی قیادت میں ندوۃ العلماء میں مسلم مجلس مشاورت قائم ہوئی تو اس میں سرگرم حصہ لیا، ملک کو زوال اور اخلاقی بحران سے نکالنے اور ہندو مسلم خلیج پاٹنے کے لیے ''پیامِ انسانیت'' کی تحریک چلائی، عائلی قوانین کے تحفظ کے لیے مسلم پرسنل لا بورڈ کی سربراہی کی۔ بابری مسجد کے انہدام پر خون کے آنسو بہائے۔ غرض ان کا بے قرار اور دردمند دل ہر نازک موڑ پر برادرانِ وطن کو درس حقیقت اور مسلمانوں کو شجاعت وعدالت کا سبق پڑھا کر اس کی تلقین کرتا رہا کہ،

ع معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز

مولانا ایک داعی و مصلح تھے، دعوت وعزیمت اور دینی غیرت وحمیت ان کی امتیازی شان تھی ان کا گھرانا عقائد ومسلک میں حضرت سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید کا سختی سے پیرو اور ولی اللّٰہی فکر کا حامل تھا، ان کا محلّہ بازار جھاؤلال بھی صحیح العقیدہ لوگوں سے آباد تھا، وہ شعائر اللہ کی توہین، دین واخلاق اور انسانیت کی پامالی کو برداشت نہیں کرسکتے تھے، اسلام کی سربلندی اصلاح و دعوت اور دین کی تبلیغ و اشاعت میں ہمیشہ منہمک رہے، ۳۵ء میں ۲۱ برس کی عمر ہی میں ایک موقع پر ڈاکٹر امبیڈکر کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے بمبئی کا سفر کیا، وہ عمر بھر مسلمانوں کو مادی تمدن کے دریا کے خلاف تیرنے اور اس کا دھارا موڑنے اور اپنے باطل افکار و خیالات اور غلط رسوم و عادات کی قربانی دینے کے لیے آمادہ کرتے رہے، ندوۃ العلماء میں معلّمی کے زمانے میں ان کے ذوق و رجحان میں تبدیلی آئی، اب ان کی پرواز مدرسہ کی چار دیواری تک محدود نہیں رہنا چاہتی تھی اور وہ کسی صالح تحریک و دعوت سے وابستہ ہونے کے لیے فکر مند رہتے، اس زمانے میں مولانا مودودیؒ کے مضامین سے بہت متاثر ہوئے اور چند

برس تک حلقہ لکھنو کی جماعتِ اسلامی کے ذمہ دار بھی رہے، پھر مولانا محمد الیاسؒ کی دینی دعوت سے ان کا ربط و تعلق بڑھا اور عرصہ تک اس میں مشغولیت اور سرگرمی رہی وہ اپنی اصلاح، تربیت اور تزکیہ نفس سے بھی غافل نہ تھے، اس کے لیے مشائخ و اولیاء کی خدمت میں برابر حاضری دیتے، مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ سے بیعت ہوئے، ان کے سوانح اور مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ کا تذکرہ لکھا، چند بار مولانا تھانویؒ سے بھی ملے، مولانا مدنیؒ سے برابر تعلق رکھتے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ سے اکثر ملتے مولانا شاہ وصی اللہؒ، مولانا محمد احمد پرتاب گڑھیؒ اور حضرت شاہ یعقوب مجددیؒ کی خدمت میں بھی باریاب ہوتے، موخرالذکر کے ملفوظات مرتب کر کے شائع کیا، سیرت و کردار، اخلاق و عادات اور اوصاف و محامد میں اسلاف اور اپنے اجداد کا نمونہ اور اقبال کے مردِ مومن کا آئینہ تھے، ان کی کوئی جسمانی یادگار نہ تھی، شادی ۱۹۳۴ء میں ہوگئی تھی، اپنے برادر و خواہرزادگان کو اپنی اولاد سے زیادہ مانتے تھے، معنوی اولاد اور نیازمندوں کی تعداد حدوشمار سے باہر ہے جن کے غم واندوہ کا کون اندازہ کرسکتا ہے، **تدمع العین ویحزن القلب ولا نقول الا مایرضی ربنا وانا بفراقک لمحزونون. اللھم صبب علیہ شأبیب رحمتک واغفرلہ برحمتک یا ارحم الراحمین۔**

("ض"، فروری ۲۰۰۰ء)

ندوی، محمد ناظم، مولانا

جناب مولانا محمد ناظم ندوی

اخباروں سے یہ افسوس ناک خبر ملی کہ ماہ جون ۲۰۰۰ء مین مشہور عالم اور عربی زبان و ادب کے قابل ادیب و شاعر جناب مولانا محمد ناظم ندوی کا پاکستان میں انتقال ہوگیا۔ انا للہ وَانا الیہ رَاجعونْ۔

وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اس روشن دور کی آخری نشانی تھے جو حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی سرپرستی اور مولانا حیدرحسن خاں ٹونکی اور علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی کی تربیت و محنت سے سب سے زیادہ فیضیاب ہوا، گزشتہ صدی کی تیسری، چوتھی دہائی میں مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی، مولانا محمد عمران خاں ندوی اور مولانا محمد اویس ندوی رحمہم اللہ جیسے سیارگان علم و فضل ایک ہی وقت میں برج سلیمانی میں جمع ہوگئے تھے، مولانا محمد ناظم ندوی بھی اس مجموعہ نجوم کے تابناک ستارے تھے۔ انہوں نے خاص طور پر علامہ ہلالی مراکشی سے استفادہ کیا۔ اس باب میں وہ مولانا مسعود عالم ندوی اور مولانا سید ابوالحسن ندوی کے بعد ثالث ثلثہ ہوئے۔

بہار کا مردم خیز خطہ مونگیر ان کا وطن تھا، گھر اور پٹنہ کے مدرسہ شمس الہدیٰ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ انیس بیس سال کی عمر میں دارالعلوم ندوہ میں اعلیٰ تعلیم کے لئے داخل ہوئے، فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ ڈابھیل کی اس درس گاہ میں درس و تدریس کے لئے منتخب کئے گئے جو اس وقت مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا محمد یوسف بنوری جیسے جلیل القدر علماء کی موجودگی سے مرکز نگاہ بنی ہوئی تھی، کئی سال گزارنے کے بعد وہ حضرت سید صاحب کی خواہش پر ندوہ میں عربی زبان و ادب کے استاد کی حیثیت سے واپس تشریف لائے اور تقسیم ہند تک یہیں رہے، پاکستان بنا تو انہوں نے وطن کو خیرباد کہہ کر وہاں کی سکونت اختیار کی اور مشہور جامعہ بھاول پور کے شیخ الجامعہ مقرر ہوئے وہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے وابستہ ہوئے، اس طرح ان کی زندگی کا زیادہ حصہ عربی زبان و ادب کی خدمت میں گزرا، ان کو خاص طور پر عربی ادب، شعر و لغت اور نحو سے دلچسپی تھی، حافظہ اس قدر قوی تھا کہ برجستہ سینکڑوں عربی اشعار ان کی زبان پر آجاتے، خود بھی عربی میں شاعری کرتے، ان کا ایک دیوان ان کی اس زبان پر غیرمعمولی قدرت کی یادگار ہے۔

عربی تحریر و تصنیف میں بھی ان کو ملکہ حاصل تھا، ندوہ کے مشہور عربی رسالہ **الضیاء** سے ان کے سلیقہ تحریر کو جلا ملی، بعد میں انہوں نے **المنہج الجدید الدراسۃ اللغۃ العربیہ** کے نام سے چار جلدوں میں ایک وقیع کتاب بھی سپرد قلم کی۔

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی خطبات مدراس کا شہرہ ہوا اور انگریزی زبان میں اس کا ترجمہ ہوا، حضرت سید صاحب کی خواہش تھی کہ وہ خود اس کو عربی میں منتقل کریں لیکن یہ عمل کثرت مشاغل سے آسان نہ تھا، چنانچہ اس کے لئے سید صاحب کی نظر انتخاب مولانا محمد ناظم ندوی پر پڑی، جنھوں نے اس کو بڑی خوشی سے قبول کیا، حضرت سید صاحب کے الفاظ میں "**فاستجاب لذلک الاخ الصالح الادیب الفاضل محمد ناظم الندوی**" یہ الفاظ مولانا مرحوم کے لئے بڑی سند کا درجہ رکھتے ہیں، ان کا ترجمہ **الرسالۃ المحمدیہ** کے نام سے طبع ہوا اور عالم عرب میں بے حد مقبول ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے حضرت سید صاحب کی ایک اور مایۂ ناز کتاب سیرت عائشہ کو عربی میں منتقل کیا، اب اس کے شایان شان طبع جدید کی کوشش ہورہی ہے۔

اردو میں بھی وہ وقتاً فوقتاً لکھتے رہتے، ۴۶ء کے معارف میں باب التقریظ والانتقاد کے تحت انہوں نے **مجمع فواد الاول للغۃ العربیہ** پر دوقسطوں میں ایک نہایت بلند پایہ تبصرہ کیا، انہوں نے اس کے مضامین اور مجمع کے اصول وضوابط کا جس مہارت و بصیرت سے جائزہ لیا وہ آج بھی اس لائق ہے کہ اہل علم خصوصاً عربی کے اونچے درجات کے طالب علم اس سے استفادہ کریں۔

وہ معارف اور دارالمصنفین کے محبّ و قدرداں رہے، اس تعلق میں ان کے جلیل القدر استاذ حضرت سید صاحب سے محبت کا جذبہ فطری تھا، اس کا اظہار جناب سید

صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کے پاکستان کے سفر ناموں سے ہوتا ہے، ہر سفر میں سید صاحب سے ان کی ملاقات ہوتی اور وہ ان سے قریبی عزیزوں کی طرح ملتے، علمی نشستوں کے علاوہ نجی محفلوں میں بھی وہ باوجود پیرانہ سالی کے شریک رہتے، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی شریک ناظم دارالمصنفین ان کے خاص دوستوں میں تھے، ان کا انتقال ہوا تو ان کا تعزیت نامہ معارف میں شائع ہوا، جس میں انہوں نے اپنے دیرینہ تعلقات اور مولانا قدوائی کی شرافت نفس، تواضع، انکسار، دوست نوازی اور ان کی علمی خوبیوں کا بڑا موثر اظہار کیا۔

پاکستان جانے کے بعد وہ اپنے وطن اصلی کم ہی آئے، ۸۱ء میں وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک بین الاقوامی سمینار میں اپنے محبّ صادق اور رفیق دیرینہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی دعوت پر تشریف لائے، اسی سمینار میں ڈاکٹر فتحی عثمان نے جب حضرت سید صاحب اور دارالمصنفین کی خدمات کا شاندار الفاظ میں ذکر کیا تو انہوں نے اٹھ کر ڈاکٹر صاحب کو گلے لگالیا۔ سمینار کے بعد جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کی دعوت پر وہ دارالمصنفین بھی تشریف لائے۔ ان کے انتقال سے دنیائے علم خصوصاً ندوہ و دارالمصنفین اور عربی زبان وادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا، اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں اور اعمال حسنہ کو شرف قبولیت بخشے، آمین۔ (''ع۔ص''، جولائی ۲۰۰۰ء)

جعفری، سید علی سردار

اردو کا سردار چلا گیا

مدت سے اردو کا گلشن صیادوں اور گل چینوں کے نرغے میں ہے، بادِ حوادث بھی اس میں خاک اڑا کر اسے ویرانے میں تبدیل کرنے کے درپے ہے، اردو کے پرانے بادہ کش اٹھتے جارہے ہیں۔ ابھی مجروحؔ سلطان پوری کے غم میں آنسو تھمے نہیں تھے کہ یکم اگست کو اردو کا بہت ممتاز اور قدر آور شخص بین الاقوامی شہرت کا حامل انقلابی شاعر، وسیع النظر ادیب ونقاد، اچھا مقرر وخطیب اور ترقی پسند تحریک کا میر کارواں، سید علی سردار جعفری بھی چل بسا۔ جس کے جانے سے اردو کی دلکش اور رنگارنگ گنگا جمنی تہذیب کا خاتمہ ہوگیا اور اردو دنیا میں ویرانی اور تاریکی چھاگئی، اردو والے بے قرار ہوکر کہہ رہے ہیں:

ع اس غم کی تلافی کیا ہوگی ، اس درد کا درماں کیا ہوگا

جناب سید علی سردار جعفری کے بزرگ ریاست بلرام پور میں اونچے عہدوں پر فائز تھے۔ اس لئے ان کا خاندان آگرہ سے بلرام پور چلا آیا تھا۔ یہیں نومبر ۱۹۱۳ء میں سردار کی ولادت ہوئی اور اعلیٰ تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوئی، وہ طلبہ کے لیڈر بھی رہے اس وقت ملک میں قومی اور سیاسی سرگرمیاں عروج پر تھیں، ہر طرف سرفروشان وطن نے انگریزوں کے خلاف پرچم بغاوت بلند کر رکھا تھا اور پورا ملک انقلاب کے نعروں اور آزادی کے ترانوں سے گونج رہا تھا۔ سردار بھی اقبال سہیل کا یہ رجز پڑھتے ہوئے، آزادی کے دیوانوں کے لشکر میں جاملے۔

لعنتِ بندگی کے ساتھ صورت زندگی نہ دیکھ قید غلامی وحیات ننگ ہے، ننگ کائنات
عشق کے میر کارواں پرچم خسروی نہ دیکھ پھاڑ کے جیب وآستیں کر علمِ جنوں بلند

ابتدا ہی سے وہ مارکس کے خیالات سے متاثر تھے جو برابر ان کی شاعری پر بھی چھائے رہے، ۱۹۳۶ء میں منشی پریم چند کی سربراہی میں ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑی تو وہ اس میں شامل ہوگئے اور اپنی انقلابی شاعری سے مجاہدین آزادی کے دلوں میں فرنگیوں کے خلاف نفرت کا جذبہ بھڑکاتے رہے، وہ ترقی پسند تحریک کو جنگ آزادی ہی کا ایک بازو سمجھتے تھے، اس کے زیر اثر ان کے انقلابی خیالات اور انگریزوں کے خلاف باغیانہ جذبات میں مزید شدت پیدا ہوئی اور وہ عمر بھر اس تحریک کو قوت وتوانائی دیتے اور اس کے ادبی سرمائے کو مالا مال کرتے رہے۔ ''ترقی پسند ادب'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اس کی اشاعت اور سجاد ظہیر کے انتقال کے بعد ترقی پسند تحریک کی نظریاتی باگ دوڑ عملاً انہی کے ہاتھ میں آگئی تھی، ان کے خیال میں ترقی پسند تحریک میں سوویٹ یونین کے زوال کے بعد بھی کوئی بکھراؤ نہیں ہوا، البتہ تحریک کے ابتدائی دور میں جس پائے کے شاعر اور افسانہ نگار پیدا ہوئے، بعد کی نسل میں اس پائے کے لوگ نہیں پیدا ہوسکے مگر اس کو وہ اس عجیب وغریب تاریخی عمل کا نتیجہ بتاتے ہیں جس میں بہار کے بعد خزاں اور خزاں کے بعد بہار آتی ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں ادب اور معاشرہ خزاں کے دور سے گزر رہا ہے جو نئی بہار کی آمد کا اعلان ہے۔

وہ ۱۹۴۲ء میں ممبئی گئے اور وہیں کے ہوکر رہ گئے، چنانچہ جوہو قبرستان ان کا مدفن بنا۔ ممبئی میں وہ فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے اور متعدد فلموں کے لئے گیت، مکالمے اور منظرنامے لکھے۔ مگر اس کی چمک دمک سے ان کی نگاہیں خیرہ نہیں ہوئیں، انہوں نے شعر وادب کا وقار اور رکھ رکھاؤ قائم رکھا۔

سردار اردو کے ادبی افق پر نصف صدی سے زیادہ عرصے تک چھائے رہے، نظم ونثر میں یکساں ان کا قلم رواں رہا، جس زمانے میں شعر گوئی شروع کی اسی زمانے میں نثرنگاری شروع کی اور افسانے اور ڈرامے لکھے، ان کا پہلا افسانہ ''عالم گیر'' میں اور پہلا ڈرامہ طالب علمی کے زمانے میں ''علی گڑھ میگزین'' میں شائع ہوا۔ متعدد ادبی، تنقیدی اور سوانحی مضامین بھی لکھے، شاعری کی طرح اپنی نثری نگارشات سے بھی ترقی پسند تحریک کو تب وتاب عطا کی، نثرنگاری کا انہیں اچھا سلیقہ تھا، وہ بڑی اچھی اور خوب صورت نثر لکھتے تھے، ان کا خاص اور منفرد اسلوب نگارش تھا، ان کی کتاب ''لکھنؤ کی پانچ راتیں'' ان کی نثر کا دلآویز نمونہ ہے، ان کی پہلی نثری کتاب افسانوں پر مشتمل تھی

جو ''منزل'' کے نام سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی، میر، غالب، میرابائی اور کبیر کے انتخابات اردو اور ہندی دونوں میں اپنے مقدمات کے ساتھ شائع کئے جو بعد میں ''پیغمبران سخن'' نام کی کتاب میں شامل ہوئے۔ اس سے ان کی تنقیدی ژرف نگاہی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ حافظ، رومی، غالب اور اقبال کے عاشق تھے، ان کے اکثر اشعار ان کو یاد تھے، ''اقبال شناسی'' ان کی مشہور کتاب ہے، ترقی پسند اور تاریخی اہمیت کی حامل کتاب ہے، جس کے حوالے کے بغیر ترقی پسند ادبی تحریک کی کوئی تاریخ نہیں لکھی جاسکتی۔ انہوں نے دوسرے اہل قلم اور مصنفین کی کتابوں پر جو دیباچے اور مقدمے لکھے ہیں وہ بھی ان کے حسن اور سلاست و برجستگی کے دلکش نمونے ہیں۔

نثر کے مقابلے میں ان کی طبیعت کا رجحان شاعری کی طرف زیادہ رہا، غزل میں بھی فکرسخن کی، مگر ان کا جوہر نظموں میں زیادہ کھلتا تھا، زبان و بیان پر پوری قدرت تھی اور فن کی نزاکتوں اور باریکیوں سے اچھی طرح واقف تھے، ان کی نظمیں اپنے جلال و جمال کی وجہ سے اردو شاعری میں جاوداں ہیں۔ ان میں انسان دوستی اور انسان سے محبت، عام لوگوں کے دکھ، درد، امن اور صلح وآشتی کو اصل موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کی شاعری سامراجیت، جبرواستبداد اور طبقاتی امتیاز کے خلاف ایک للکار معلوم ہوتی ہے جس سے وہ ہندوستان ہی نہیں ایشیا بلکہ دنیا کی پسماندہ تمام اقوام کو بیدار کرنا چاہتے تھے اور غریب، مزدور، محنت کش طبقہ اور دبے کچلے عوام کے دلوں میں انقلاب کی شمع روشن کرکے ان کو ہمت وحوصلہ اور وقت و جرأت عطا کرنا چاہتے تھے۔

ان کی شاعری کا ایک نمایاں پہلو حسین پیکر تراشی بھی ہے، ''نئی دنیا کو سلام''، ''پتھر کی دیوار'' اور ''اودھ کی خاک حسین''، جیسی نظمیں پیکر تراشی کے کامیاب نمونے ہیں۔

جعفری صاحب ظلم و ناانصافی، فرقہ پرستی اور تنگ نظری کے خلاف نبرد آزما رہنے کے علاوہ کمزور اور پس ماندہ لوگوں اور اقلیتوں کے حقوق و مفاد کے لئے زندگی بھر جدوجہد کرتے رہے، ملک کی تقسیم، بابری مسجد کے انہدام اور ان دونوں واقعات کے بعد ہونے والے فسادات سے وہ بہت دل گیر اور دل شکستہ تھے، بابری مسجد کے انہدام کے خلاف بڑی جرأت و بے باکی سے اپنے غم وغصہ کا اظہار کیا اور اس پر نظم بھی لکھی۔

ہندوپاک کی دوستی ان کی شاعری کا اہم موضوع تھا، اپنی مشہور نظم ''سرحد'' میں بتایا ہے کہ سرحد مصنوعی اور انسان کی خودساختہ ہے، اس سے ہمیں کیا غرض؟ ہمارا تو پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔ ۹۸ء میں وزیراعظم باجپائی بس سے لاہور گئے تو اس نظم کو بھی اپنے ساتھ لے گئے، اس میں سردار کہتے ہیں:

اسی سرحد پہ کل ڈوبا تھا سورج ہو کے دو ٹکڑے   اسی سرحد پہ کل زخمی ہوئی تھی صبح آزادی
یہ سرحد جو لہو پیتی ہے اور شعلے اگلتی ہے   میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبح فردا کا

ہندوپاک دوستی کے موضوع پر ان کی کئی نظمیں ہیں، جن میں ''صبح فردا'' اور ''دشمن کون''، وغیرہ بہت مشہور ہوئیں۔ ایک نظم ''گفتگو بند نہ ہو'' بھی ہے۔

گفتگو بند نہ ہو بات سے بات چلے
صبح تک شامِ ملاقات چلے
ہنستی ہوئی یہ تاروں بھری رات چلے

۹۸ء میں دونوں ملکوں میں ایٹمی دھماکے ہوئے تو ان کی امن وآشتی پسند طبیعت کو بڑا دھکا لگا اور انہوں نے اس کی شدید مذمت کی۔

رعنائی خیال اور ذوق جمال کی کارفرمائی کے باوجود ان کی غزلیں حسن وعشق کی فرسودہ داستان نہیں بلکہ انسانی زندگی کے مسائل و مشکلات کی ترجمان ہیں، انہوں نے اردو کی کلاسیکل روایات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان میں اپنے انقلابی افکار کو بڑی خوبصورتی سے سمودیا ہے۔

سردار جعفری کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہوئے اور بہت مقبول ہوئے ان کی نظموں کا سب سے پہلا مجموعہ ۱۹۴۳ء میں ''پرواز'' کے نام سے چھپا، ملک کے علاوہ دنیا کی کئی بڑی زبانوں میں ان کے کلام کے ترجمے کئے گئے، اسی لئے وہ دنیا کے اکثر ملکوں میں روشناس تھے اور اردو کی طرح دوسری زبان والوں میں بھی محبوب ومقبول تھے، انہوں نے کئی بیرونی ملکوں کے سفر بھی کئے اور ہندوستان کے بڑے شاعروں کی طرح ترکی اور یورپ کے ملکوں کے شعراء سے متاثر بھی تھے، اردو اور ہندی کو قریب لانے کے لئے انہوں نے جو کوششیں کیں، ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، قرۃ العین حیدر کے ساتھ مل کر غالب کے اردو کلام کا انگریزی ترجمہ بھی کیا تھا۔

سردار کئی زبانوں سے واقف تھے اور غالباً ہندی اور سنسکرت پر عبور رکھتے تھے، مگر ان کی تگ وتاز کا اصل میدان ان کی مادری زبان اردو ہی تھی جس سے ان کو عشق تھا، اسی زمین میں وہ تاعمر گل بوٹے کھلاتے رہے اور اس وقت وہ اس زبان کے سب سے بڑے شاعر سمجھے جاتے تھے، وہ اس کی خدمت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے، زندگی کے آخری لمحے تک اسے وقار و افتخار عطا کرنے میں برابر سرگرم، متحرک اور فعال رہے۔ اردو ہی کی طرح طویل عرصے تک گوناگوں خدمات کی بناء پر ان کو بڑے بڑے اعزازات سے نوازا گیا، پدم شری خطاب ملا، اردو اکیڈمیوں، ریاستی و مرکزی حکومتوں اور مختلف اداروں کے کئی درجن ایوارڈ کے علاوہ حکومت کے سب سے بڑے ایوارڈ گیان پیٹھ سے سرفراز کئے گئے۔ ۶۷ء میں سوویٹ لینڈ نہرو ایوارڈ ملا، ۷۷ء میں پاکستان میں اقبال میڈل پیش کیا گیا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری سے نوازا۔

آزادی کے بعد اردو کے ساتھ جو معاندانہ رویہ اختیار کیا گیا اس کی انہیں بڑی تکلیف تھی اور وہ اس کی بقا و ترقی کی جانب سے فکرمند رہنے لگے تھے، ان کے خیال

میں تعلیمی نظام اور نظم ونسق سے الگ ہوجانے کے بعد یہ ایک تفریح بن کر رہ گئی ہے، اردو رسالے، بیشتر کتابیں، مشاعرے، ریڈیو اور ٹی۔وی وغیرہ اس حقیقت کے گواہ ہیں، وہ کہتے تھے کہ دوسری زبانوں میں جو آہنگ اور موضوع ہے، وہ اردو میں باقی نہیں رہ سکا ہے، اب کتابیں بھی پانچ سو اور چھ سو کی تعداد میں شائع ہوتی ہیں۔ غالباً اردو کے بقا اور ارتقا کے مسئلے میں تشویش ہی کی وجہ سے ایک دفعہ انہوں نے اردو رسم الخط کے معاملے میں ایک متنازعہ بیان دے دیا تھا، جس میں ان کی بدنیتی تو نہیں تھی مگر اس سے رسم الخط بدلنے والوں نے فائدہ اٹھایا۔

مرکزی حکومت نے کئی برس پہلے اردو کو فروغ دینے کے لئے گجرال کمیٹی کی تشکیل کی، اس کی سفارشات پر نظر ثانی کے لئے جعفری کمیٹی بنی، مگر اس کی سفارشات پر نہ سیکولر حکومتوں کے دور میں عمل ہوا اور نہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے۔ سردار کے محبّ وطن اور سیکولر ہونے کا اعتراف ان کے دوست اندر کمار گجرال اور سماج وادی پارٹی کے رہنما امر سنگھ کی طرح وزیراعظم اٹل بہاری باجپائی اور وزیر اطلاعات ارون جیٹلی کو بھی ہے۔ جعفری صاحب کو بہترین خراج عقیدت یہ ہے کہ حکومت ان کی محبوب زبان کی بقا و ارتقا کا سامان کرے اور اس کے معاملے میں فراخ دلی سے کام لے۔

سردار جعفری بڑی وجیہ اور دلکش شخصیت کے مالک تھے، ان کی سیرت کا اصل جوہر ان کی شرافت، محبت، دل نوازی، انسان دوستی اور حسن اخلاق تھا، میری ان کی ملاقات چند بار ہی کی ہے مگر ابھی تک اس کے لطف ولذت سے سرشار ہوں۔ وہ دل کو موہ لینے والی باتیں کرتے تو جی چاہتا تھا کہ ع وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔

اللہ تعالیٰ اردو کے اس شیدائی، باکمال شاعر و ادیب اور شریف انسان کے ساتھ رحمت ومغفرت کا معاملہ فرمائے، آمین!! (''ض''، اگست ۲۰۰۰ء)

۱؎ افسوس ہے کہ ابھی تک معارف میں ان پر کوئی تحریر شائع نہیں ہوسکی۔ ان کی غزل گوئی پر مفصل مضمون لکھنے کا خیال تھا جس کے لئے فرصت کا منتظر ہوں۔ (''ض'')

سلامؔ سندیلوی، عبدالسلام، ڈاکٹر

ڈاکٹر عبدالسلام سلامؔ سندیلوی

افسوس ہے ۱۶؍ستمبر کی شب میں معروف محقق ونقاد اور شاعر ڈاکٹر عبدالسلام سلامؔ سندیلوی کا انتقال ہوگیا، وہ ہردوئی ضلع کے مردم خیز قصبہ سندیلہ میں ۲۵؍فروری ۱۹۱۹ء کو پیدا ہوئے تھے، لکھنؤ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی، ان کو اردو فارسی کے علاوہ ہندی اور سنسکرت پر بھی عبور تھا، اردو میں پی۔ایچ۔ڈی اور ڈی۔لٹ کی اور ہندی میں وشارد اور ساہتیہ سدھاکر کی ڈگریاں حاصل کیں، مضمون نگاری اور شعر وشاعری کا چسکا طالب علمی کے زمانے میں لگ گیا تھا، شعر وادب اور تحقیق وتنقید ان کا خاص موضوع تھا، ان میں درجنوں تصنیفات یادگار چھوڑیں۔ اردو رباعیات، اردو شاعری میں نرگسیت اور اردو شاعری میں منظر نگاری بڑی اہم تصانیف ہیں، اول الذکر پر پی۔ایچ۔ڈی اور ثانی الذکر پر ڈی۔لٹ کی ڈگری ملی، ۱۹۵۹ء میں گورکھ پور یونیورسٹی سے وابستہ ہوئے اور پھر یہیں کے ہوگئے۔ وظیفہ یاب ہونے کے بعد بھی قلم وقرطاس سے تعلق باقی رہا، مگر کئی برس سے بینائی چلی گئی تھی اس لئے معذور اور خانہ نشین ہوگئے تھے، ڈاکٹر صاحب کی تصنیفات کمیت وکیفیت کے لحاظ سے اہم تھیں، لیکن اعزاز اور عہدے کے لئے بھاگ دوڑ ان کو پسند نہ تھی، اس لئے ان کو خاطر خواہ شہرت نہیں ملی، اس سال ان جیسے مستحق کو اتر پردیش اردو اکادمی کا مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ دیا جانا قابل ستایش اقدام تھا، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر وقرار بخشے۔ آمین!! (''ض''، اکتوبر ۲۰۰۰ء)

ہاشمی، نورالحسن، پروفیسر

پروفیسر نورالحسن ہاشمی

افسوس ہے کہ اردو کے بلند پایہ ادیب ومحقق اور لکھنؤ یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر نورالحسن ہاشمی ۲۸؍نومبر کو وفات پاگئے، اردو کے علاوہ ان کو ہندی، اودھی، انگریزی اور فارسی زبانوں پر بھی پوری دسترس تھی، اردو کی کئی کلاسیکل کتابیں تحقیق وتدوین کے بعد شائع کیں جن میں نوطرز مرصع، بکٹ کہانی، کلیات ولی اور قدیم روزنامچہ قابل ذکر ہیں، ان کی سب سے اہم علمی، ادبی اور تحقیقی کتاب ''دلی کا دبستان شاعری'' ہے، انہوں نے غالب کے کلام کا اودھی میں منظوم ترجمہ بھی کیا تھا اور ''اندرونم'' کے نام سے ان کا مجموعہ کلام بھی شائع ہوا تھا، مرحوم نیک اور خاموش طبع تھے اس لئے علمی قابلیت کے باوجود زیادہ شہرت نہیں حاصل کرسکے، اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے، آمین۔ (''ض''، دسمبر ۲۰۰۰ء)

عزمیؔ خیرآبادی

جناب عزمیؔ خیرآبادی

''جناب عزمی خیرآبادی کا ۱۳؍جنوری کو انتقال ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ تعالیٰ غریق رحمت کرے آمین۔ مرحوم اس عاجز سے بڑی محبت کرتے تھے اور معارف کے نہایت قدرداں تھے، ان کا یہ والا نامہ فروری کے شروع یا جنوری کے آخر میں ملا تھا، اس مہینہ میں اس کے لئے جگہ نہیں نکل سکی، دنیا کی زندگی کتنی ناپائدار ہے کہ مکتوب الیہ کے خط کی اشاعت ان کی وفات کے بعد ہورہی ہے''۔ (معارف)

مکرمی! سلام مسنون

دسمبر کا معارف آج ۳۰/ دسمبر کو ملا۔ نگارشات حسب معمول شاندار ہیں۔ شذرات پڑھ کر یہ شعر یاد آ گیا۔ پتہ نہیں کس کا شعر ہے۔ ؎

نہ کیا ذبح گیا چھوڑ کے بسمل قاتل
دہن زخم پکارا کیا قاتل قاتل

تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ آپ صرف اشارہ کردیتے ہیں کہ فلاں فلاں جلسہ میں گیا۔ تقریر کی۔ مگر اس کی تفصیل معارف میں نہیں ہوتی۔ میں کئی مرتبہ لکھ چکا ہوں کہ آپ ان مجالس میں جو تقریر کرتے ہیں ان کو من وعن شائع بھی کردیا کریں تاکہ ان سے ہم جیسے دیہات میں بسنے والے لوگ بھی مستفید ہوسکیں۔ لیکن آپ کو ہماری بسملیت پسند ہے۔

آخری چہار سطری شذرہ باجپئی جی سے ''منسوب'' ہے۔ ارے صاحب، ؎ یہ بازو مرے آزمائے ہوئے ہیں

شعر ملاحظہ ہو:

ان بتوں سے وفا کی امیدیں
تم بھی عزمیؔ کمال کرتے ہو

یہ وہی باجپئی جی ہیں جنھوں نے بابری مسجد کے انہدام کو شرمناک بتایا تھا اور آج فرمارہے ہیں کہ رام مندر کی تعمیر قومی جذبات کی آئینہ دار ہے۔

ہندو ایک بھولی بھالی معصوم اور مخلص قوم ہے۔ یہ صرف چند سرپھرے فرقہ پرست ہیں جو نفرت کی ہوائیں چلا رہے اور بغض و نفرت کے بیج بو رہے ہیں اور ہندوستان کی تباہی کا سامان مہیا کررہے ہیں۔ خدا رحم کرے۔

''امام محمد بن الحسن الشیبانی'' مولانا عبدالحلیم چشتی کا مضمون بہت پسند آیا۔

پروفیسر نذیر احمد کا مضمون ''ہندوستان کے مشرقی کتاب خانے...... بہت اچھا اور معلوماتی مضمون ہے۔ ملحوظ خاطر رہے کہ انہوں نے کتاب خانے لکھا ہے۔ کتب خانے نہیں جو آج کل کے اکثر ادیب استعمال کرتے ہیں۔ صحیح لفظ کتاب خانہ ہی ہے۔

محمد بدیع الزماں صاحب کا مضمون ''اقبال کے کلام میں...... صفحہ ۴۴۰ پر شائع ہوا ہے۔ اس میں تلمیح کی یوں تعریف کی ہے:

''تلمیحات کے معنی یہ ہیں کہ کم از کم الفاظ سے بلاغت پیدا کی جائے......''

حالانکہ تلمیح کے معنی ہیں ''اشارت کردن بہ قصہ مشہور'' اس لئے

خشت اول چوں نہد معمار کج | تاثریا می رود دیوار کج!

تعجب ہے کہ آپ کی نظر اس پر نہیں گئی......

محترم سید سبط محمد نقوی کا مکتوب دیکھا، آپ کے اس نوٹ نے طبیعت خوش کردی اور مجھے اس پر کچھ لکھنے سے بچالیا۔

''مکتوب نگار کے الفاظ میں کوئی ترمیم نہیں کی گئی....'' جو میں بیس پچیس سطروں میں کہتا وہ آپ نے ایک سطر میں کہہ دیا۔ اسے کہتے ہیں بلند ایجاز نگاری۔ مبارک باد۔

قمر سنبھلی کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے لیکن ان کی یہ نظم ''اے ارض فلسطین'' کوشش کے باوجود ہضم نہیں کرسکا۔ کسی بہت عمدہ شاعر کے یہ شعر ملاحظہ کریں:

دیکھ رضواں ترے مہمان کہاں لیٹے ہیں | دامن قدس میں اردن کے جواں لیٹے ہیں
جن کو تربت نہ ملی جن کا جنازہ نہ اٹھا | یہ شہیدان محبت ، یہ شہیدان وفا
ان کو مرعوب نہ ہتھیاروں کی کثرت نے کیا | نرغہ غیر میں اپنوں نے جنھیں چھوڑ دیا
بے خطر کود پڑے آگ میں دیوانے تھے | عقل کی گھات میں آئے نہیں دیوانے تھے

الفاظ کی ہم آہنگی نے اشعار کو وہ حسن عطا کیا ہے کہ باید وشاید۔ غالباً معارف کو شعر وسخن سے دلچسپی نہیں ہے۔

عمیر الصدیق صاحب کے تبصرے خوب ہوتے ہیں، وہ کتاب کا عرق نکالتے پھر اس سے عطر کشید کرتے اور پھر اسے قارئین معارف کے سپرد کرتے ہیں اور دہن زخم کا پکارتا رہ جاتا ہے...... قاتل...... قاتل۔ والسلام مع الاکرام۔

(خادم: عزمیؔ خیرآبادی)

(مارچ ۲۰۰۱ء)

احمد، ریاض الدین

جناب ریاض الدین احمد صاحب

علمی اور تعلیمی حلقوں میں جناب ریاض احمد صاحب کی وفات سے جو خلا ہوا ہے اس قحط الرجال میں اس کا پُر ہونا مشکل ہے۔ ان کا اصل وطن غازی پور تھا۔ لیکن وہ الہ آباد میں متوطن ہوگئے تھے۔ انہوں نے مجیدیہ اسلامیہ انٹر کالج کے نیک نام اور کامیاب پرنسپل کی حیثیت سے بڑی شہرت وعزت حاصل کی وہ طلبہ کی ذہنی و دماغی اور علمی تربیت بڑی دلسوزی سے کرتے تھے، ان کے زمانے میں کالج کا معیار تعلیم بہت بلند تھا، ان سے فیض حاصل کرنے والے طلبہ کی تعداد بے شمار ہے۔

ریاض الدین احمد صاحب کا خاص مشغلہ درس و تدریس تھا لیکن انہیں علم سے شغف اور تحریر وتصنیف کا اچھا ذوق تھا، طلبہ کی درسیات کے لیے متعدد کتابیں لکھیں جو مقبول ہوئیں، سائنس ان کا خاص موضوع تھا، اس پر جو کتابیں لکھیں وہ مدارس کے طلبہ کے لئے خاص طور پر مفید ہیں، قرآن مجید کے درس وتعلیم کا اچھا منصوبہ بنایا تھا۔ ان میں بڑی دینی و ملی غیرت تھی، مسلمان بچوں کو اپنے عقیدہ و مذہب پر استوار اور ملی شناخت باقی رکھنے کے لیے انہوں نے ایمانی پرائمر وغیرہ کے نام سے کئی مفید کتابیں لکھیں۔

قدرت نے انہیں دردمند دل اور بے چین طبیعت عطا کی تھی، وہ قوم وملت کی فلاح کے ہر کام میں پیش پیش اور مسلمانوں کی ترقی و سربلندی کے لیے برابر فکرمند رہتے مجلس مشاورت اور دینی تعلیمی کونسل سے شروع ہی سے وابستہ رہے، دینی تعلیمی کونسل کے جلسوں اور کانفرنسوں میں دلچسپی سے شریک ہوتے تھے، ایک دفعہ اس کی ایک بڑی کانفرنس اعظم گڑھ میں ان کی صدارت میں ہوئی، ان کا خطبہ صدارت اور قاضی محمد عدیل عباسی کی اہم تقریر کو لوگوں نے بہت پسند کیا۔ وہ اقلیتی تعلیمی اداروں کی ایسوسی ایشن کے عرصے تک جنرل سکریٹری رہے اور اب اس کے نائب صدر تھے۔

مرحوم کی عمر نوے ۹۰ برس کی تھی، ان کے ایک بیٹے ڈاکٹر انور عبداللہ امریکہ میں تھے جن کے یہاں آتے جاتے رہتے تھے، ادھر چند ماہ سے ان کے پاس امریکہ کے شہر رچمنڈ میں مقیم تھے، وہیں ۱۵؍فروری ۲۰۰۱ء کو داعی اجل کا پیغام آگیا اور دین وملت کا یہ بے لوث خادم ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگیا اللہ تعالیٰ غریقِ رحمت کرے اور اعزہ و متعلقین کو صبر وشکیب عطا کرے۔ آمین!! (''ض''، اپریل ۲۰۰۱ء)

<u>ندوی، محمد یونس نگرامی، پروفیسر</u>

پروفیسر محمد یونس نگرامی ندوی

یہ خبر سن کر بڑا صدمہ ہوا کہ ۴؍مارچ کو پروفیسر محمد یونس نگرامی کا انتقال ہوگیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ادھر مہینوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، لکھنؤ آنے جانے والوں سے ان کی علالت کی خبر ملتی تھی مگر یہ خیال نہیں تھا کہ وہ اتنی جلد رختِ سفر باندھ لیں گے۔

ان کی پیدائش لکھنؤ ضلع کے مردم خیز قصبہ نگرام میں ۱۹۴۱ء میں ہوئی تھی، ان کا خاندان علمی و دینی حیثیت سے ممتاز تھا، درس و تدریس، تالیف و تصنیف اور وعظ و ارشاد اس کا طرۂ امتیاز تھا۔ ان کے والد مولانا محمد اویس نگرامی ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں شیخ التفسیر تھے۔ وہ دارالمصنفین کے رفیق اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کے محبوب تلامذہ میں تھے، ان کی صحبت میں مولانا کے تفسیر و قرآنیات کے ذوق کو بڑی جلاملی، بعد میں وہ دارالمصنفین کی مجلس انتظامی کے رکن بھی ہوئے۔

پروفیسر محمد یونس نگرامی نے اپنے والد ماجد کے زیر سایہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم پائی۔ پھر جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ گئے، لکھنؤ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی، پہلے یونیورسٹی کے شعبہ عربی میں لکچرر اور اب کئی برس سے پروفیسر ہوگئے تھے۔

ان کا تحقیقی مقالہ ''ہندوستان میں عربی زبان وادب'' کے موضوع پر تھا، ان کی دوسری کتب و رسائل کے نام یہ ہیں۔ تھوڑی دیر اہل حق کے ساتھ، خیالات، مثالی خواتین، نماز کیسے پڑھیں، تذکرہ مولانا محمد اویس نگرامی، تقدس حج، خلیجی جنگ وغیرہ۔

ندوہ اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں تعلیم پانے کی وجہ سے عربی لکھنے کی ان کو اچھی مشق ہوگئی تھی، ندوۃ العلماء کے جریدہ الرائد میں ''نافذة على الهند'' و (ہندوستان کے دریچے سے) کا مستقل کالم ان ہی کے قلم سے ہوتا تھا، البعث الاسلامی میں بھی ان کے مضامین چھپتے تھے، ان کی عربی زبان وادب کی خدمات کے اعتراف میں انہیں ۱۹۹۲ء میں صدراتی ایوارڈ تفویض کیا گیا تھا۔

لکھنؤ کے اکثر علمی و تعلیمی اداروں کے رکن تھے اور ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے بڑے سرگرم ممبر تھے، ان کا حلقہ اثر بڑا وسیع تھا علماء و مشائخ سے بھی تعلق رکھتے تھے اور قومی و سیاسی رہنماؤں سے بھی، مولانا علی میاں سے برابر عقیدت مندانہ تعلق رہا۔ ان کے اثر و رسوخ سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچتا تھا۔

وہ دو بار اتر پردیش اردو اکاڈمی کے چیرمین رہے اس زمانے میں انہوں نے اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے متعدد شبینہ اسکول قائم کئے، ان سے قبل اکاڈمی کے سیمینار اور انعامات ایک خاص طرح کے ادیبوں اور یونیورسٹی کے اساتذہ ہی کے لیے مخصوص رہتے تھے، مگر انھوں نے اکاڈمی کا سب سے بڑا ایوارڈ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو دلایا، اسی طرح مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا حکیم سید عبدالحئیؒ پر سیمینار کرایا اور نکتہ چینیوں کی پروانہیں کی۔

پروفیسر محمد یونس نگرامی کی شہرت ہندوستان ہی تک محدود نہیں تھی، وہ دنیائے اسلام میں بھی متعارف تھے، رابطہ عالم اسلامی نے ہندوستان میں ان کو اپنا مشیر بنایا، اس کی وجہ سے انہوں نے کئی اسلامی ممالک اور کولمبو، ٹوکیو، لندن اور امریکہ کے سفر کئے۔

آل انڈیا مسلم انٹلکچول قائم کیا، جس کے زیر اہتمام اپنوں نے حرمین شریفین کے تحفظ و تقدس، مسجد اقصیٰ کی بازیابی اور کویت پر عراق کے حملے کی مذمت کے لیے سیمینار کرائے۔

ان کی سفارش پر رابطہ عالم اسلامی کی جانب سے متعدد لوگوں کو حج و زیارت کی سعادت نصیب ہوئی، اس ناچیز سے بھی وہ بڑا تعلق رکھتے تھے اور ان ہی کی بدولت مجھے بھی یہ زریں موقع ملا۔

گزر چکی ہے یہ فصل بہار ہم پر بھی

پروفیسر یونس نگرامی کے خاندان میں وعظ و ارشاد، اصلاح معاشرت، شرک و بدعت اور غلط رسموں کے انسداد کے لیے جو کوششیں عرصے سے ہو رہی تھیں انہوں نے بھی اس روایت کو باقی رکھا، بعض نئے مدارس و مکاتب قائم کئے اور بعض پرانے مدرسوں کو نئی زندگی بخشی، وہ اصلاحِ معاشرت کے جلسوں میں بھی شریک ہوتے اور اس کے لیے لکھنؤ، سلطان پور، بارہ بنکی اور رائے بریلی کے ان گاؤں کا سفر کرتے جہاں ان کے والد مرحوم جایا کرتے تھے۔

پروفیسر محمد یونس صاحب بڑے متحرک اور فعال آدمی تھے، ابھی ان کی عمر زیادہ نہیں تھی مگر انہوں نے بہت سے مفید اور اہم کام انجام دیئے، ان سے بڑی توقعات وابستہ تھیں، مگر خدا کی مشیت و مصلحت سب پر غالب ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت نعیم اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین!! (''ض''، اپریل ۲۰۰۱ء)

رضا، کالی داس گپتا

جناب کالی داس گپتا رضا

افسوس ہے کہ اردو کے مشہور محقق اور غالبیات کے ماہر جناب کالی داس گپتا رضا ۲۱/ مارچ ۲۰۰۱ء کو چل بسے، وہ راشٹر پتی بھون میں اعزازات کی تقریب میں شرکت کے لیے دہلی تشریف لائے تھے اور ہوٹل میں قیام پذیر تھے کہ اچانک دل کا شدید دورہ پڑا، وہاں سے اسپتال جارہے تھے کہ راستے ہی میں انتقال ہوگیا۔

کالی داس صاحب ۲۵/ اگست ۱۹۲۵ء کو مکند پور ضلع جالندھر (پنجاب) میں پیدا ہوئے، بچپن میں ہی طبیعت شعر و سخن کی طرف راغب ہوگئی تھی اور تلمیذِ داغ پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی سے کلام پر اصلاح لینے اور مشورہ سخن کرنے لگے، میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ کاروباری سلسلے میں نیروبی (جنوبی افریقہ) چلے گئے لیکن اردو زبان کی محبت گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ اسی زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات منشی کامل و منشی فاضل اور سینئر کیمبرج بیرسٹری کے امتحانات دئے، ان کی تعلیم زیادہ نہیں تھی مگر اپنی محنت و مطالعہ سے انہوں نے نصابی تعلیم کی کمی کی پوری تلافی کرلی تھی۔

گپتا رضا صاحب افریقہ سے واپسی کے بعد بمبئی میں متوطن ہوگئے تھے، کاروباری مصروفیات کے باوجود علم و فن، شعر و ادب اور تحقیق و تنقید کو وہ اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رہے، تحقیق سے ان کو عشق تھا، غالبیات ان کی دلچسپی کا خاص موضوع تھا، اس کے ماہرین میں شمار کئے جاتے تھے، نو دس گھنٹے روزآنہ وہ تحقیق اور مطالعہ کتب میں گزارتے، ان کے ذاتی کتب خانے میں چالیس ہزار سے زیادہ کتابیں اور رسالے تھے، مخطوطات سے بڑا شغف تھا کوئی مخطوطہ مل جاتا تو ہر قیمت پر اسے خرید لیتے، ان کے کتب خانے میں پانچ سو سے زیادہ قلمی کتابیں تھیں، غالبیات پر اتنا بڑا ذخیرہ اور کسی کتب خانے میں نہیں ہوگا۔

گپتا رضا صاحب کی تصنیفات کی تعداد تیس سے زیادہ ہے جن میں تقریباً دو درجن غالبیات سے متعلق ہیں آٹھ شعری مجموعے ہیں، چکبست اور جوش ملسیانی پر بھی ان کا تحقیقی کام ہے، غالبیات میں ان کی نت نئی تحقیقات سے اردو کے ذخیرے میں برابر اضافہ ہورہا تھا، ان کا ایک بڑا کارنامہ دیوان غالب کامل کی ترتیب و تدوین ہے جس میں انہوں نے غالب کے اردو کلام کو بہ لحاظ زمانہ ترتیب دیا ہے، اردو کے اکثر معیاری اور بلند پایہ رسالوں میں ان کے مضامین برابر شایع ہوتے تھے کبھی کبھی معارف بھی ان کی نگارشات سے مزین رہتا تھا، مجھے مفتخر اپنے کرم ناموں سے بھی مفتخر فرماتے تھے۔

گپتا رضا صاحب نے اپنے گوناگوں علمی و تحقیقی کارناموں کی بنا پر پوری اردو دنیا میں بڑی شہرت، عزت، نیک نامی اور مقبولیت حاصل کی اور وہ اردو کے صف اول کے دانشوروں اور محققوں میں شمار ہوتے تھے، اردو کا بڑا سے بڑا ادبی اعزاز انہیں تفویض کیا گیا، اکثر اکادمیوں نے انعامات سے نوازا، ۸۹ء میں غالب ایوارڈ ملا، دو برس پہلے مجلس فروغ اردو قطر کی جانب سے اس کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ دیا گیا، اس سال یوم جمہوریہ کے موقع پر حکومت ہند کی طرف سے ان کی ادبی خدمات پر پدم شری کے اعزاز دئے جانے کا اعلان ہوا تھا جسے لینے کے لیے دہلی گئے تھے کہ وقت موعود آگیا، معارف ان کے پس ماندگان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ (''ض''، مئی ۲۰۰۱ء)

نجم الاسلام، پروفیسر

پروفیسر نجم الاسلام

پروفیسر نجم الاسلام ۱۳/ فروری ۲۰۰۱ء کو لطیف آباد سندھ حیدرآباد میں وفات پاگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم کی پیدائش ۱۹۳۳ء میں بجنور میں ہوئی تھی۔ میرٹھ کالج سے بی۔اے کیا اور یہیں سے حفیظ میرٹھی وغیرہ کے اشتراک سے ''معیار'' کے نام سے ایک ادبی ماہنامہ نکالا جس نے چند برسوں کے بعد دم توڑ دیا مگر تعمیری ادب کے نقوش چھوڑ گیا۔ انھوں نے اس میں چھپنے والے افسانوں اور ڈراموں کا ایک انتخاب ''ابھرتی کرنیں'' کے نام سے شائع کیا تھا۔

پاکستان جانے کے بعد انہوں نے سندھ یونیورسٹی سے ایم۔اے کیا اور ''شمالی ہند کی قدیم اردو نثر'' کے موضوع پر اردو فارسی کے مشہور فاضل اور ممتاز محقق پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ کی نگرانی میں ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا، ان کے ریٹائر ہونے کے بعد نجم الاسلام صاحب شعبہ اردو کے سربراہ مقرر ہوئے۔

سندھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی جانب سے ۱۹۶۱ء میں انھوں نے ''صریر خامہ'' کے نام سے ایک ادبی مجلّہ جاری کیا، ۱۹۸۷ء میں ان کی ادارت میں اسی شعبہ سے ایک معیاری اور بلند پایہ مجلّہ ''تحقیق'' نکلا، جس نے ہندوستان و پاکستان کے بعض ممتاز محققین کے گوشے بھی شائع کئے، اس مجلّہ میں راقم اپنے بعض پرانے مضامین دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وہ کہاں کہاں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر مضامین شائع کرتے تھے۔

خدا کرے یہ بلند پایہ مجلّہ ان کے بعد بھی جاری رہے، مرحوم کی کئی کتابیں بھی

چھپی ہیں ''مطالعات'' ان کے تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے، آمین! (''ض''، مئی ۲۰۰۱ء)

العثیمین، محمد بن صالح، علامہ

علامہ محمد بن صالح العثیمین

پچھلی صدی عیسوی کا اختتام عالم اسلام کی متعدد مایہ ناز شخصیات کی المناک وفات پر ہوا تھا، علامہ عبدالعزیز بن باز، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، شیخ ناصرالدین البانی اور شیخ محمد عمر فلاتہ جیسے آسمان علم وفضل کے آفتاب و ماہتاب اس کے کہر میں چھپ گئے تھے۔ اب اس صدی کا آغاز بھی ایک متواضع، منکسرالمزاج اور درویش عالم کی اندوہ ناک وفات سے ہوا، جو علمی حلقوں میں ابن عثیمین کے نام سے مشہور و متعارف تھے۔

مرحوم سعودی عرب کے ایک قدیم معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے، صوبہ قصیم کے شہر عنیزہ میں ان کی ولادت ہوئی، شیخ عبدالرحمٰن السعدی اور مشہور مفسر شیخ محمد امین شنقیطی سے اکتساب فیض کیا، شیخ السعدی ان کے ہم وطن اور ان کے ابتدائی استاد تھے اس لیے وہ ان سے زیادہ متاثر ہوئے اور ان کے انتقال کے بعد ان کے علمی جانشین مقرر ہوئے۔

مدۃالعمر عنیزہ میں تدریس، وعظ وارشاد اور تصنیف رسائل میں مشغول و منہمک رہے، سعودی عرب میں شیخ ابن باز کے انتقال کے بعد علماء اور طلبہ علوم دینیہ کا مرکز وہی بن گئے تھے مگر شیخ ابن باز کی جدائی ان کو گوارا نہ ہوئی، ان کی وفات کو ابھی دو برس بھی نہیں گزرے تھے کہ شیخ عثیمین نے بھی رخت سفر باندھا اور ان سے افادہ و استفادہ کا سلسلہ موقوف ہوگیا۔

جدہ کے ایک اسپتال میں ان کا انتقال ہوا، مکہ مکرمہ میں ان کی نماز جنازہ پڑھی گئی اور مقبرہ العدل میں شیخ ابن باز کے پہلو میں مدفون ہوئے۔ تقریباً پانچ لاکھ نفوس نے ان کے جنازہ کی مشایعت کی جن میں سربراہان مملکت بھی شامل تھے جو ان کی مقبولیت کا بین ثبوت ہے۔

علامہ مرحوم بڑے خلیق، متواضع اور سادگی پسند شخص تھے، انہوں نے کبھی بھی دنیا کی آرائش و زیبائش کی طرف مڑکر نہیں دیکھا ہمیشہ درس و تدریس، وعظ و افتاء اور تصنیف و تالیف سے سروکار رکھا، سرکاری مناصب کی پیشکش بھی ہوئی تو انہوں نے اپنے محبوب مشغلہ تدریس سے جدا ہونا پسند نہیں کیا، ان کی وفات صرف ایک ملک کا سانحہ نہیں ہے بلکہ پوری دنیائے علم کا ناقابل تلافی خسارہ ہے، مشغلہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین!!

(''ع۔ع''، مئی ۲۰۰۱ء)

صدیقی، محمد امین مسعود

محمد امین مسعود صدیقی

(ریاض الرحمٰن شروانی)

حبیب منزل، میرس روڈ، علی گڑھ،

۲۷-۳-۲۰۰۱ء۔

مکرمی و محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

لکھنؤ سے کل ۲۵/ مارچ کا ''جدید مرکز'' آیا تو اس میں محمد امین مسعود صدیقی صاحب کی اچانک وفات کی خبر پڑھ کر دلی صدمہ ہوا، اخبار میں اس خبر کی سرخی ''مولانا آزادؒ کے عاشق تھے مسعود صدیقی'' چھپی ہے اور اس سے بہتر سرخی کوئی اور نہیں ہوسکتی تھی۔ کیا عجیب عشق تھا کہ چاہتے تھے ہر فرد، ہر اخبار اور رسالہ اور ہر ادارہ اس عشق میں ان کا شریک ہوجائے۔ ہر ممکن طریقے سے مولانا آزادؒ کے پیغام کی اشاعت کے لئے سرگرداں رہتے تھے۔

ان میں اور بھی بہت سی خوبیاں تھیں، بہت دین دار، مخلص، متحرک اور بے نفس انسان تھے، میرا بہت لحاظ کرتے تھے۔ میں کسی معاملے میں ان سے اختلاف کرتا تھا تو خاموش ہوجاتے تھے، کبھی بحث نہیں کرتے تھے۔ مولانا آزادؒ پر کہیں کوئی چیز ان کی نظر سے گزرتی تھی تو اس کی فوٹو کاپی مجھے بھیج دیتے تھے۔ میں لکھنؤ جاتا تو انہیں مطلع کردیتا اور میرا جہاں کہیں قیام ہوتا وہ وہاں آکر مجھ سے ضرور ملتے تھے۔ مجھے ان کا آخری خط جو ۲۵/فروری کا لکھا ہوا تھا، ۲۸/کو ملا تھا۔ اس میں انہوں نے لکھا تھا: ''معارف کا فروری ۲۰۰۱ء کا شمارہ آپ کو مل گیا ہوگا۔ اس میں اس ناچیز کا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے۔ اس مراسلے پر حواشی میں جو باتیں تحریر فرمائی گئی ہیں۔ اس (کذا) سے نفس کی اصلاح کا موقع ملا ہے''۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے کس طرح اپنی کوتاہی کا اعتراف کیا ہے۔ میں نے کچھ غلط تو نہیں لکھا کہ کیسے بے نفس انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور درجات بلند کرے۔ بہت جلدی چلے گئے۔

امید ہے آپ کا مزاج بفضلہ بعافیت ہوگا۔

نیازمند: ریاض الرحمٰن شروانی

معارف: محمد امین مسعود صدیقی مرحوم سے راقم کے بھی مخلصانہ تعلقات تھے، میں بھی لکھنؤ جاتا تو وہ ملاقات کے لئے ضرور تشریف لاتے اور مجھے کہیں جانا ہوتا تو اپنے اسکوٹر سے پہنچا دیتے۔

مولانا آزاد اور دوسرے مسائل کے تعلق سے اخباروں کے تراشے مجھے بھی بھیجتے تھے۔ مولانا آزاد پر میری حقیر کتاب انہی کے اصرار سے چھپی تھی اور ان کی تحریک سے

اس کے مصارف گاندھی۔آزادفورم نے برداشت کئے تھے۔

مولانا آزادؒ کے وہ واقعتاً عاشق وشیدائی تھے، ان کے خلاف کچھ سننا پسند نہیں کرتے تھے، مکتوب بالا میں ان کے جس مراسلے کا تذکرہ ہے، اسے بھیجنے کے بعد ٹیلی فون سے اس کی وصولی کے بارے میں دریافت کیا تھا، میں نے انہیں بتایا کہ انشاء اللہ آپ کا مراسلہ فروری کے شمارے میں میرے نوٹ کے ساتھ کسی قدر قطع و برید کے بعد شائع ہوگا، مجھے ان کے ردعمل کا انتظار تھا کہ ۱۹/ مارچ ۲۰۰۱ء کے راشٹریہ سہارا اردو میں ان کے انتقال کی خبر پڑھی اور تڑپ کر رہ گیا، اخبار میں ان کا نام صحیح نہیں لکھا تھا، ڈوبتے کو تنکے کا سہارا، اسی وقت ان کو یہ خط لکھا کہ ''اپنی خیریت سے فوراً مطلع فرمائیں''۔ آپ کے والانامہ سے یہ امید بھی ختم ہوگئی اور اب اپریل کے آخری ہفتے میں ان کی والدہ ماجدہ کا یہ پوسٹ کارڈ ملا کہ ''میں والدۂ مسعود بہت دکھ کے ساتھ اطلاع دے رہی ہوں۔۱۷/مارچ کو اچانک مسعود کا انتقال ہوگیا''۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے آغوش رحمت میں جگہ دے اور ان کی بوڑھی ماں اور دوسرے عزیزوں کو صبر جمیل عطا کرے، آمین!! (مئی ۲۰۰۱ء)

عرفان، عبدالرّب، ڈاکٹر

آہ ڈاکٹر عبدالرّب عرفان!

قارئین معارف کو یہ سن کر بڑا افسوس ہوگا کہ ڈاکٹر عبدالرب عرفان ۳۰/ اپریل کو انتقال کرگئے، وہ معارف کے بڑے قدر دانوں اور خاص مضمون نگار اور دارالمصنفین شبلی اکیڈمی سے گہرا تعلق رکھتے تھے، اردو، فارسی کے عالم اور ان زبانوں کی ادبیات کی تاریخ سے اچھی واقفیت رکھتے تھے، ہندوستان کے عہد اسلامی کی تاریخ پر ان کی نظر تھی، اس عہد کے سلاطین ومشائخ اور علماء وفضلاء کے حالات وتراجم سے ان کو بڑی دلچسپی تھی اور اس پر ان کے مضامین ملک کے بلند پایہ رسالوں میں شائع ہوتے تھے مگر معارف پر ان کی نظر عنایت زیادہ تھی۔اس شمارے میں بھی ان کا ایک مضمون شامل ہے اور ابھی دو ایک اور مضامین میری فائل میں ہوں گے۔

میری ان کی ملاقات کبھی نہیں ہوئی مگر خط وکتابت رہتی تھی، ان کے خطوط سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے دل میں میری کتنی قدر ومحبت اور معارف سے ان کو کیسا والہانہ لگاؤ تھا۔ مجھے ان کے حالات زندگی سے کوئی واقفیت نہیں تھی ان کے ایک ہم وطن جناب فیروز حیدری کے خط سے معلوم ہوا کہ انہوں نے کامٹی کے ایم۔ایم ربانی ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان امتیازی نمبر سے پاس کیا تھا۔ اور مارس کالج ناگپور سے بی۔اے کیا تھا۔ پھر فارسی زبان وادب میں ایم۔اے میں امتیازی نمبر ہی نہیں بلکہ گولڈ میڈل کے بھی حق دار قرار پائے تھے، ۱۹۶۱ء میں ودبھ مہاودیالیہ امراوتی میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا اور بہت جلد شعبہ فارسی کے صدر بنائے گئے، ۱۹۸۲ء میں ان کا تبادلہ ناگپور میں وسنت راؤ نائک گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز (سابق مارس کالج) ہوگیا۔ ڈاکٹر عبدالرب عرفان طبعاً شریف، سادہ مزاج، صاف گو، مخلص اور کم آمیز تھے، ان میں کبر وغرور کا شائبہ نہ تھا۔ مرحوم کی عمر ۶۵ برس رہی ہوگی، قلب کی بیماری پہلے سے تھی اور یہی جان لیوا ثابت ہوئی، اللہ تعالیٰ بشری لغزشوں سے درگزر فرمائے اور اپنی رحمت کاملہ سے نوازے، آمین!! (''ض''، جون ۲۰۰۱ء)

قتیلؔ شفائی

قتیلؔ شفائی کی رحلت

اورنگ زیب خاں قتیلؔ شفائی کی وفات سے اردو کے شعری وادبی حلقے میں بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے، وہ ۲۴/دسمبر ۱۹۱۹ء کو ہری پور ضلع ہزارہ پنجاب (پاکستان) میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول میں ہوئی، ۳۲ء سے شعر کہنے لگے، راولپنڈی وغیرہ کے مشاعروں میں شریک ہوتے، غزلیں پڑھتے تو سماں بندھ جاتا، کلام کی خوبی و دلکشی اور جادو بھری آواز سے عجیب کیفیت پیدا کردیتے تھے، اس لئے دوسری جگہوں کے مشاعروں میں بھی بلائے جاتے۔

کچھ عرصے وہ ہری پور میونسپلٹی میں ملازم رہے، پہلی مرتبہ لاہور کے مشاعرے میں شرکت کے لئے آئے جہاں کے مشہور ادبی مجلّے ''ادب لطیف'' میں ان کا کلام پہلے سے شائع ہوکر ادبی حلقوں سے خراج تحسین وصول کرنے لگا تھا، لاہور آنے پر جب ''ادب لطیف'' کے دفتر گئے تو چودھری نذیر احمد نے اس کی ادارت کی پیش کش کی، لاہور میں ان کا تعلق فلمی دنیا سے ہوا جس میں بڑی شہرت حاصل کی، تاہم اس سے ادبی حلقوں میں ان کی پذیرائی میں کمی نہیں ہوئی۔

شعر کے معائب ومحاسن میں قتیلؔ شفائی کی گہری نظر تھی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی روایت ہے کہ ممبئی کے ایک مشاعرے میں جوش ملیح آبادی صاحب نے اپنی نظم میں ایک مصرع پڑھا، ع کیا گلبدنی گلبدنی گلبدنی ہے تو قتیلؔ نے مصرع کو غلط بتایا، آزاد صاحب نے وجہ پوچھی تو کہا تینوں جگہوں پر ''گلبدنی'' سے پہلے ''کیا'' آنا چاہیے اور جرأت کا مصرعہ پڑھا،

ے کیا بات ہے، کیا بات ہے، کیا بات ہے واللہ

ایک بار جگن ناتھ آزاد نے ان کو اپنی ایک غزل سنائی جس کا یہ شعر قتیلؔ کو بہت پسند آیا ے

تہذیبِ کہنہ میری شرافت پہ ناز کر
دھوکا دیا ہے دوست نے شرما رہا ہوں میں

کچھ مدت کے بعد آزاد صاحب کو جوش ملیح آبادی مرحوم کے کسی مجموعہ کلام میں یہ شعر نظر

آیا:

کوئی حد ہے آخر احترام آدمیت کی
بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں

ملاقات ہونے پر آزادصاحب نے جب قتیل سے کہا کہ جوش صاحب کے یہاں اسی مضمون کا شعر موجود ہے تو انہوں نے کہا نہیں تمھارا شعر مختلف ہے، جوش نے دشمن کی بات کی، تم نے دوست کا ذکر کیا، ان کے کہنے سے آزاد صاحب نے اپنی غزل سے یہ شعر خارج نہیں کیا۔

نظموں اورغزلوں کے علاوہ مثنوی اور گیت بھی کہتے تھے اوران سب کے متعدد مجموعے شائع ہوئے، پہلا مجموعہ ''مغرب زدہ'' ۱۹۴۲ء میں چھپا جو مثنوی ہے، کلیات تین جلدوں میں رنگ، خوشبو اور روشنی کے نام سے شائع ہوا، ان کے کلام کا انتخاب بھی شائع ہو چکا ہے۔

قتیل شفائی کی مقبولیت اس سے ظاہر ہے کہ ان کی زندگی ہی میں بعض ادبی رسالوں نے ان پر خاص نمبر شائع کئے اور مختلف ملکوں میں ان کا جشن منایا گیا اور حکومت پاکستان نے ''تمغۂ حسن کارکردگی'' دے کر ان کی قدردانی اور عزت افزائی کی۔

قتیل نے افسانے بھی لکھے جو ''ساقی'' وغیرہ میں شائع ہوئے، ''ادب لطیف'' کے علاوہ بعض دوسرے ادبی رسالوں کی ادارت بھی کی، لاہور ان کا وطن ثانی تھا اور یہی ان کا مدفن بھی بنا، ۱۱؍ جولائی کو طویل علالت کے بعد انتقال کیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے دامنِ عفو میں جگہ دے، آمین!! (''ض''، اگست ۲۰۰۱ء)

اعزاز رسول، قدسیہ، بیگم

بیگم قدسیہ اعزاز رسول کی وفات

یہ خبر رنج وغم کے ساتھ سنی جائے گی کہ یکم اگست کو بیگم قدسیہ اعزاز رسول کا طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا، ان کا آبائی وطن مالیر کوٹلہ تھا، ان کے والد یہاں کے معزز اور بڑے بااثر شخص تھے، ان کی شادی نواب اعزاز رسول سے ہوئی جو سندیلہ کے بڑے تعلقہ دار تھے۔

بیگم صاحبہ کی زندگی قومی، سیاسی، سماجی اور تعلیمی سرگرمیوں کے لئے وقف رہی۔ آزادی سے پہلے وہ اوران کے شوہر مسلم لیگ سے وابستہ رہے، نواب صاحب یو۔ پی مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری تھے جن کا کئی برس پہلے ہی انتقال ہو چکا ہے۔

بیگم قدسیہ کا شمار کانگریس کے سرکردہ لوگوں میں ہوتا ہے، وہ ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کی رکن تھیں اوراب اس کی یہی ایک ممبر رہ گئی تھیں، ان کی وفات سے یہ یادگار بھی ختم ہوگئی۔

وہ عبوری پارلیمنٹ اور راجیہ سبھا کی رکن رہیں اور کئی بار سندیلہ اسمبلی حلقے سے کانگریس کے ٹکٹ پر یو۔پی اسمبلی کی ممبر منتخب ہوئیں اور وزیر بھی مقرر کی گئیں۔

بیگم صاحبہ اتر پردیش اقلیتی کمیشن کی چیرمین اور برسوں آل انڈیا ویمنس ہائی ایسوسی ایشن کی صدر رہیں، انہوں نے سندیلہ اور لکھنؤ کے کئی علمی وتعلیمی اداروں کی سرپرستی اورنگرانی بھی کی۔

وہ قدیم تہذیب وشرافت کا نمونہ اورقوم وملت کی پرانی روایات واقدار کی حامل تھیں، اب قومی رہنماؤں میں بہت کم لوگ ہی ایسے رہ گئے ہیں۔ دارالمصنفین سے بھی لگاؤ تھا، اقلیتی کمیشن کے سربراہ کی حیثیت سے اعظم گڑھ تشریف لائیں تو یہیں اس کی میٹنگ رکھی اور اقلیتی نمائندوں سے تبادلۂ خیال کیا، اللہ تعالیٰ عالم آخرت میں قوم وملک کی اس خدمت گزار کے درجات بلند کرے، آمین!! (''ض''، اگست ۲۰۰۱ء)

لاجپوری، سید عبدالرحیم، مولانا مفتی

مولانا مفتی سید عبدالرحیم لاجپوری

علمی حلقوں میں یہ خبر بڑے افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ ۱۸؍نومبر ۲۰۰۱ء کو مولانا عبدالرحیم لاجپوری رحلت فرماگئے، وہ گجرات ہی نہیں اس برصغیر کے ممتاز اور جید عالم دین تھے، فقہ وفتاویٰ پر ان کی نظر بڑی گہری اور وسیع تھی، علم راسخ اور فقہ وافتا میں کامل الفن ہونے کے ساتھ ورع وتقویٰ اور سیرت واخلاق کی پاکیزگی میں بھی سلف صالحین کا نمونہ تھے۔

مفتی صاحب ایک سید گھرانے کے چشم و چراغ تھے، ان کا سلسلہ نسب ستائیسویں پشت میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے جاملتا ہے، ان کا آبائی وطن گجرات میں لاجپور تھا لیکن ان کی پیدائش ضلع گجرات کے مشہور شہر بلسار کے قصبہ نوساری میں دسمبر ۱۹۰۳ء؍شوال ۱۳۲۱ھ میں ہوئی، اپنے دادا مولانا سید ابراہیم صاحب سے تعلیم شروع کی تھی کہ ان کا انتقال ہوگیا، جس کے بعد والد مولانا سید عبدالکریم صاحب اور چچا حافظ سید حسام الدین صاحب سے حفظِ قرآن کی تکمیل کی، قرأت وتجوید میں بڑا کمال حاصل کیا، قرآن مجید بہت اچھا پڑھتے تھے، آواز میں بڑی تاثیر اور لہجہ نہایت دلکش تھا، اس لیے طالب علمی ہی کے زمانے میں نوساری کی جامع مسجد کے امام ہوگئے لیکن جلد ہی قدردانوں نے راندیر بلالیا اور وہاں کی جامع مسجد کا امام مقرر کردیا۔

مدرسہ محمدیہ عربیہ جامعہ حسینیہ راندیر میں درسیات کی تکمیل کی اور یہیں درس و تدریس کی خدمت پر مامور ہوئے، طالب علمی میں فقہ وافتا سے خاص شغف ہوگیا تھا اور اسی زمانے سے اپنے اساتذہ کی رہنمائی میں فتاویٰ لکھنا شروع کردیا تھا، جس کا سلسلہ مدۃ العمر جاری رہا۔ اس کی وجہ سے ملک میں معتبر فقیہ ومفتی کی حیثیت سے مشہور

ہوئے اور کئی جلدوں میں ان کے فتووں کے مجموعے شائع ہوکر مقبول ہوئے۔

ان کے فتوے پہلے گجراتی کے ایک ماہنامہ ''پیغام'' میں بارہ سال تک چھپے اور ان کے مجموعے پہلے گجراتی میں پھر اردو میں فتاوی رحیمیہ کے نام سے کئی جلدوں میں شائع ہوئے اور ان کے کئی کئی ایڈیشن نکلے، جو مفتیوں کے لیے مرجع اور حوالہ کا کام دیتے ہیں۔ ''فتاوی رحیمیہ'' مولانا مفتی عبدالرحیم صاحب کا بڑا اہم کارنامہ ہے جو فقہ و افتا کے ذخیرے میں ایک اچھا اضافہ ہے، عام فتوؤں کی طرح اس کی زبان خشک، بے کیف اور فنی اصطلاحات سے بوجھل نہیں ہے۔ ان کے مطالعہ سے مفتی صاحب کی فقہی بصیرت، حکمتِ دین سے واقفیت، علمی پختگی اور طبیعت کے اعتدال کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے ہر مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر گہری نظر ڈال کر مدلل، محققانہ اور تشفی بخش جواب دیا ہے، جواب میں اتنی تفصیل و تنقیح کی ہے کہ مسئلہ کے تمام متعلقات اور سارے گوشے سامنے آگئے ہیں۔ کتابوں کے حوالے کے ساتھ اصل عبارتیں بھی نقل کی ہیں اور فقہی کتابوں کے علاوہ قرآن و سنت اور صحابہ کا تعامل بیان کیا ہے اور اس کے نظائر پیش کئے ہیں۔

مفتی صاحب علمی بلند پائیگی کے باوجود نہایت خاکسار و متواضع تھے، شہرت و نام و نمود سے نفرت تھی، روایتی جلسے جلوس سے دور رہتے، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بیعت تھے، جمعیۃ علمائے ہند سے تعلق تھا اس کے نظام امارت شرعیہ گجرات کے امیر رہے۔ اللہ تعالیٰ جنت الفردوس نصیب کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ (''ض''، جنوری ۲۰۰۲ء)

ہاشمی، سید احمد، مولانا

مولانا سید احمد ہاشمی

افسوس ہے کہ گزشتہ مہینے ممتاز عالم دین اور سرکردہ ملی و قومی رہنما مولانا سید احمد ہاشمی سابق ممبر پارلیمنٹ نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ وہ عرصے سے موذی امراض میں مبتلا تھے۔ ۴؍نومبر ۲۰۰۱ء کو ان پر دل کا شدید دورہ پڑا اور اسپتال جاتے ہوئے مالکِ حقیقی سے جاملے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا غازی پور کے ایک شریف خانوادے سے تعلق رکھتے تھے، ان کے والد حافظ محمد شفیع صاحب نے دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ میں اس زمانے میں تعلیم پائی تھی جب وہاں مولانا سید سلیمان ندوی بھی زیر تعلیم تھے اس لیے دونوں کے اچھے روابط تھے، مولانا ہاشمی بچپن ہی میں والدین کے سایہ شفقت سے محروم ہوگئے ان کی پرورش ان کے بڑے بھائی حافظ سید محمد ہاشمی نے کی، نانہال دربھنگہ سے غازی پور لاکر یہاں کی مشہور دینی درس گاہ مدرسہ دینیہ میں ان کا داخلہ کرایا، عربی کی پانچویں جماعت تک تعلیم دلانے کے بعد انہیں کلکتہ لے گئے اور مدرسۂ عالیہ میں داخلہ کرایا جہاں سے ''ممتاز المحد ثین'' کی ڈگری لی پھر دارالعلوم دیوبند میں مولانا سید حسین احمد مدنی سے دورہ حدیث کی تکمیل کی۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد چند دن دہلی میں رہے اور پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات دیئے، اسی زمانے میں مولانا محمد حفظ الرحمان سیوہاروی ناظم جمعیۃ علمائے ہند کی صحبت اور قربت نصیب ہوئی۔

دہلی میں مختصر قیام کے بعد وہ کلکتہ واپس آگئے، ان کے بڑے بھائی چاہتے تھے کہ اب وہ کوئی کاروبار کریں لیکن اس وقت تو وہ بورڈ کے مدرسہ ''ندائے اسلام'' میں مدرس مقرر ہوئے مگر شروع سے دین و ملت اور قوم و وطن کی خدمت کی جانب ان کی طبیعت کا رجحان تھا اس لیے اسی مشغلے میں ان کی زندگی گزری۔

کچھ عرصہ صحافت کے پیشے سے وابستہ رہے اور اپنا ایک ہفتہ وار اخبار ''ارمغان'' کے نام سے نکالا جو چل نہ سکا، دوسرے اخباروں سے بھی وابستہ رہے۔ ایک دفعہ پرجا سوشلسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کا الیکشن لڑے گو مولانا کا حلقہ اثر وسیع تھا اور وہ بڑے مقبول بھی تھے مگر سیاست کی پرخار وادی میں بھی انہوں نے درویشی اور عالمانہ وقار کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا، اس لیے ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا، ایک بار وہ غازی پور سے لوک سبھا کی سیٹ کے لیے کانگریس کے امیدوار ہوئے اور بہت کم ووٹوں سے ہارے مگر اس سے ان کا حوصلہ کم نہ ہوا اور بہ دستور ملی و سیاسی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔

مولانا شروع سے جمعیۃ علمائے ہند کی تنظیم سے وابستہ تھے اپنے اساتذہ اور مدرسہ دینیہ کے بانیوں مولانا عمر فاروق اور مولانا ابوالحسن صدیقی کی طرح تحریک آزادی اور جمعیۃ علما کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے وہ مغربی بنگال کی جمعیۃ کی شاخ کے جنرل سکریٹری ہوئے۔ مولانا میں بڑی تنظیمی صلاحیت تھی جس کا اعتراف ان کے مخالفین کو بھی تھا، انہوں نے جمعیۃ کے سکریٹری اور راجیہ سبھا کے ممبر ہونے کی حیثیت سے بڑی جرأت، ہوش مندی اور تدبر سے مسلمانوں کی قیادت کی اور فسادات اور مسلم مسائل پر کھل کر اظہار خیال کیا، مولانا ملی اور اجتماعی مفاد کے سامنے اپنے ذاتی اور گروہی مفاد کی بالکل پروا نہ کرتے، ان میں بڑی دوراندیشی اور اچھی سوجھ بوجھ تھی، ان کی رائے معقول اور نپی تلی ہوتی تھی۔ ۱۹۶۴ء میں کلکتہ میں بڑا ہولناک فرقہ وارانہ فساد ہوا، اس میں ریاستی جمعیۃ کے تحت ریلیف اور بچاؤ کا کام نہایت خوبی اور بڑی مستعدی سے انجام دیا جس کے نتیجے میں انہیں مرکزی جمعیۃ علمائے ہند کی طلب پر دہلی جانا پڑا اور جلد ہی آل انڈیا جمعیۃ کے جنرل سکریٹری بنادئے گئے، ۱۹۸۸ء میں انہوں نے ملی جمعیۃ علما قائم کی جس کے وہی جنرل سکریٹری ہوئے، مسلم پرسنل لا بورڈ کے اساسی رکن تھے، مسلم مجلس مشاورت اور تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند سے بھی ان کا گہرا تعلق تھا، ہر

ایک کے جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ دہلی وقف بورڈ کے ممبر اور چیرمین بھی ہوئے۔ ۱۹۷۴ء سے ۱۹۸۶ء تک دوبارہ راجیہ سبھا کے ممبر بنے اور متعدد پارلیمانی وفود کے ساتھ غیر ملکی دورے کئے جن میں روس، چیکوسلواکیہ، یوگوسلاویہ، سعودی عرب، کویت وغیرہ شامل ہیں۔

دہلی جانے کے بعد بھی کلکتہ سے ان کا تعلق منقطع نہیں ہوا، یہاں برابر تشریف لاتے اور اپنے ایک ایک شناسا سے ملتے، یہاں کے متعدد تعلیمی اداروں اور انجمنوں سے بھی ان کا تعلق آخر تک رہا، وہ بڑے اچھے مقرر تھے، انتخابی جلسوں میں ان کا یہ جوہر خوب کھلتا، وہ انتخابی مہم میں زور وشور سے حصہ لیتے تھے۔

الیکشن کے زمانے میں اکثر اعظم گڑھ بھی تشریف لاتے، یہاں کے پارلیمنٹ کے مشہور ممبر چندر جیت یادو سے سیاسی ہم آہنگی کی وجہ سے بڑی گہری دوستی تھی۔ ان کی انتخابی مہم میں حصہ لینا ان کا معمول ہوگیا تھا، کانگریس سے علیحدہ ہونے کے بعد دونوں نے اپنی ایک الگ نئی پارٹی بنائی تھی۔ رمضان المبارک میں چندر جیت جی کے گھر پر اکثر افطار پارٹی ہوتی تھی اس میں کبھی کبھی مولانا ہاشمی بھی آجاتے تھے وہ ہوتے تو ہم لوگ ان ہی کی اقتدا میں مغرب کی نماز ادا کرتے۔ اس طرح راقم سے بھی ان کے اچھے تعلقات ہوگئے تھے لیکن اس میں اضافہ اور زیادہ بے تکلفی اس وقت ہوئی جب میں دسمبر ۸۷ء میں دہلی گیا اور حکیم عبدالحمید صاحب مرحوم نے اپنے لال کنواں کے مکان پر کھانے کے لئے بلایا تو وہاں اور حضرات کے ساتھ مولانا بھی اپنے ایک صاحب زادے کے ساتھ تشریف لائے تھے جن سے ملاتے ہوئے فرمایا کہ تم دہلی آکر چلے جاتے ہو اور کبھی ملاقات نہیں ہوتی، عرض کیا میں بہت کم آتا ہوں پھر میرے جیسے راستہ بھولنے والے شخص کے لیے تنہا دہلی کی گلیوں میں آپ کو ڈھونڈ لینا بہت مشکل ہے انھوں نے فرمایا کہ اپنی قیام گاہ کا پتا بتادو میں خود آکر مل لوں گا، میں شرم سے پانی پانی ہوگیا۔ چنانچہ اسی سفر میں یا اس کے بعد اپنے ایک عزیز کو لے کر ان سے ملنے گلی قاسم جان میں ان کے گھر پہنچا تو بہت مسرور ہوئے لیکن کہنے لگے کہ آپ کو بڑی زحمت ہوئی ہوگی میں نے عرض کیا آپ سے مل کر جو خوشی ہورہی ہے اس کے سامنے وہ زحمت ہیچ تھی۔ میں انشاء اللہ اب جب دہلی آؤں گا تو آپ سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ ایک حد تک میں نے اس وعدہ کو نباہا بھی۔ اس سال ۱۱ر نومبر کو مولانا آزاد ڈے میں شرکت کے لیے دہلی جانے کا پروگرام بہت پہلے سے بن گیا تھا اور خیال تھا کہ ۱۲ر نومبر کو رک کر مولانا اور اپنے بعض دوسرے کرم فرماؤں سے ملاقات کروں گا مگر،

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

سابق ریلوے وزیر الحاج سی۔ کے۔ جعفر شریف صاحب سے مولانا کے بڑے خوش گوار اور مخلصانہ روابط تھے، وہ جب ریلوے کے وزیر ہوئے تھے تو مولانا کو مسافروں کی سہولتوں سے متعلق کمیٹی (PAC) کا ممبر اور پھر چیرمین بنایا، اتفاق سے اسی زمانے میں میرا دہلی جانا ہوا تو مولوی مسعود خاں ممبر راجیہ سبھا کے یہاں قیام کیا، وہاں سے مولانا کو فون کیا تو انہوں نے فرمایا کل کہیں اور کا پروگرام نہ بنانا، میں ۱۰-۱۱ بجے کے درمیان مسعود صاحب کے یہاں آکر تمہیں لے لوں گا اور اپنے آفس ریل بھون لے جاؤں گا، ایک مرتبہ وہ جعفر شریف صاحب سے ملانے کے لیے مجھے ان کے بنگلے پر بھی لے گئے۔

جعفر شریف صاحب اعظم گڑھ میں بڑی لائن کے افتتاح کی تقریب میں یہاں آئے تو جمعہ کا دن تھا انہوں نے اطلاع کی کہ وہ شبلی منزل میں قیام کریں گے اور جمعہ کی نماز اس کی مسجد میں پڑھیں گے، مولانا بھی ان کے ہم راہ تشریف لائے تھے اور انکار کے باوجود ہم لوگوں کے اصرار پر نماز جمعہ پڑھائی، ایک مرتبہ چندر جیت یادو کی انتخابی مہم کے دوران بھی وہ جمعہ کے روز مجھ سے ملنے شبلی منزل آئے، اور الیکشن اور دوسرے موضوعات پر گفتگو فرماتے رہے اور جمعہ کی اذان کو جب چند منٹ رہ گئے تو جانے لگے میں کہا ابھی آپ کو دو کام کرنے ہیں (۱) جمعہ پڑھانا اور (۲) ماحضر تناول فرمانا، فرمانے لگے مسافر پر جمعہ نہیں اور آپ کے ناشتے سے دوسرا کام بھی ہوگیا۔

مولانا بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے، ان کی ساری زندگی قومی و سیاسی جھمیلوں میں گزری لیکن اپنی قلندرانہ شان ہمیشہ باقی رکھی اور سیاست کی کثافت اور سیاسی زندگی کی آلایش سے ان کا دامن آلودہ نہیں ہوا، ان کا شمار ملک کے مشہور قائدین میں ہوتا تھا مگر وہ اپنی عظمت اور بڑائی کو محسوس نہیں ہونے دیتے تھے، نہایت خلیق و متواضع، وضعدار اور شریف انسان تھے، بڑے تپاک اور خندہ پیشانی سے ملتے تھے اور بلا اختلافِ مذہب و ملت ہر ایک کا کام کرتے تھے۔ اگر کوئی مصیبت زدہ شخص کوئی کام لے کر ان کے پاس آجاتا تو وہ جس حال میں بھی ہوتے اس کا کام کرنے کے لیے تیار ہوجاتے اور اپنی بیماری اور تکلیف کی پروا نہ کرتے مظلوموں کی دادرسی اپنا فرض سمجھتے اور اس کے لیے فساد زدہ جگہ اور کرفیو زدہ علاقے میں بے خوف و خطر پہنچ جاتے۔ مسلمانوں کو درپیش موجودہ مشکلات و مسائل سے بے چین اور بے قرار رہتے اور ان کے حل کے لیے برابر فکر مند رہتے، غیظ و غضب کے موقع پر بھی وہ مشتعل نہیں ہوتے، اپنے مخالفین کے خلاف ناروا الفاظ ان کے منھ سے نہ نکلتے، جن لوگوں سے ان کا اختلاف ہوتا ان کے بھی درپے آزار نہ ہوتے۔ ان کی وفات قوم و ملت کا بڑا حادثہ ہے اللہ تعالیٰ اس کی تلافی فرمائے اور مولانا کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور ان کے اعزہ کو صبر وسکون عطا کرے۔

("ض"، جنوری ۲۰۰۲ء)

شاہد، خواجہ حمید الدین، پروفیسر

پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد

پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد نے ۲۲/ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو ۵ بجے شام کراچی میں وفات پائی، وہ اردو کے مشہور ادیب، محقق، صحافی اور شاعر تھے، پاکستان جانے سے پہلے وہ ''ادارۂ ادبیات اردو'' حیدرآباد کے تمام کاموں میں پیش پیش اور ادارے کے روح رواں ڈاکٹر سید محی الدین قادری کے دست راست رہے، عرصے تک ماہ نامہ ''سب رس'' کے مدیر بھی رہے۔

مرحوم نے عثمانیہ یونیورسٹی کے مختلف کالجوں میں اردو کے استاد کی حیثیت سے بھی نمایاں خدمات انجام دیں، اردو میں انہوں نے جو تصانیف یادگار چھوڑی ہیں ان میں ''ارمغان امجد''، ''مثنوی تصویر جاناں'' مصنفہ لچھمی نرائن شفیق ''اردو میں سائنسی ادب''، ''رسالہ محمود خوش وہاں'' اور ''حیدرآباد کے شاعر'' قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۴۰ء میں ادارۂ ادبیات اردو کی دس سالہ سرگرمیوں کی مبسوط تاریخ ''سرگذشت ادارہ'' کے نام سے مرتب کی تھی جو وہاں سے شائع ہوچکی ہے، اس کے علاوہ رسالوں میں ادبی و تحقیقی مضامین بھی لکھتے رہے، شاعر بھی تھے لیکن کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔

پاکستان منتقل ہونے کے بعد بھی حیدرآباد اور ادارۂ ادبیات اردو ان کے دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا۔ اپنے مکان کا نام ''ایوان اردو'' رکھا اور کراچی سے ماہنامہ ''سب رس'' جاری کیا اور اس کا ''زورنمبر'' کا اور حیدرآباد کی طرح کراچی میں بھی وہ اردو کی خدمت اور فروغ کے لیے سرگرم عمل رہے، بہادر یار جنگ اکیڈمی سے بھی تعلق تھا۔ اللہ تعالیٰ اردو زبان وادب کے اس مخلص خادم کی مغفرت فرمائے اور ان کے اعزہ واقربا کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ (''ض''، جنوری ۲۰۰۲ء)

عبدالقیوم، الحاج

الحاج عبدالقیوم

۱۵/ نومبر ۲۰۰۱ء کو الحاج عبدالقیوم صاحب کا انتقال ہوگیا، وہ کلکتہ کے ایک مشہور ہوٹل کے مالک تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں دولت کے ساتھ، قوم وملت کا درد، دین داری اور ہر طبقے میں مقبولیت عطا کی تھی، کلکتہ ہی نہیں ملک کے بھی علمی و تعلیمی اداروں کو ان سے بڑا فیض پہنچتا تھا۔

یتیم خانہ اسلامیہ کلکتہ کے عرصے تک صدر رہے، اس زمانے میں یتیموں کی پرورش اور کفالت میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا، اسلامیہ ہسپتال کے بھی برسوں صدر رہے کلکتہ کے مسلمانوں کے سب سے قدیم ادارہ انجمن مفید السلام کے اصل کرتا دھرتا جناب سید محمد صلاح الدین صاحب تھے جو جناب سید صباح الدین عبدالرحمان صاحب کے حقیقی چچا تھے، ان کے کلکتہ چھوڑنے کے بعد انجمن کے حالات درہم برہم ہوئے تو الحاج عبدالقیوم صاحب نے اس کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اپنے رفیق الحاج غلام رسول صاحب کی معاونت سے اس کے حالات درست کئے، وہ ۱۹۹۲ء تک انجمن کے صدر رہے، اور اپنے بعد کلکتہ کے ایک مقبول اور ہر دل عزیز شخص جسٹس خواجہ محمد یوسف کو انجمن کا صدر بنوایا۔

ہندوستان کے جن علمی و تعلیمی اداروں سے ان کا زیادہ تعلق تھا ان میں دارالمصنفین، ندوۃ المصنفین اور دارالعلوم ندوۃ العلما خاص طور سے قابل ذکر ہیں، مولانا مفتی عتیق الرحمان صاحب کے وہ بڑے قدرداں تھے اور ندوۃ المصنفین کی اعانت اور سرپرستی فرماتے تھے، دارالعلوم ندوۃ العلما کی بھی امداد فرماتے، دارالمصنفین کے سابق ناظم جناب سید صباح الدین عبدالرحمان مرحوم بھی الحاج عبدالقیوم صاحب کے بڑے مداح تھے اور کلکتہ تشریف لے جاتے تو جن لوگوں سے التزاماً ملاقات کرتے ان میں یہ اور حاجی غلام رسول مرحوم بھی تھے۔

عبدالقیوم صاحب اہل علم کے بڑے قدرداں تھے علما اور دانش وروں کی بڑی خاطر مدارات اور مہمان نوازی کرتے، پروفیسر خلیق احمد نظامی مرحوم کلکتہ تشریف لے جاتے تو الحاج عبدالقیوم صاحب ان کی ضیافت کا خاص اہتمام کرتے، خواجہ یوسف صاحب سے ان کے بہت مخلصانہ تعلقات تھے وہ کلکتہ ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے تو ان کے اعزاز میں بڑا پرتکلف عشائیہ دیا۔ کلکتہ کی ایران سوسائٹی کے وہ لائف ممبر تھے اور اس کے ہر ہر پروگرام میں بڑی دلچسپی سے حصہ لیتے تھے، ان کو اچھا علمی ذوق اور شعر و سخن سے مناسبت تھی۔ انگریزی سے بھی اچھی واقفیت تھی، اخبار اور رسالے ان کے مطالعے میں رہتے، علمی ذوق ہی کی بنا پر ان کے پاس کتابوں کا بھی اچھا ذخیرہ ہوگیا تھا۔

۱۹۶۵ء میں ہندوستان و پاکستان میں جنگ چھڑی تو حکومت نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا اس وقت بنگال میں پی۔ سی۔ سین کی حکومت تھی اس نے کلکتہ کے خاص طور پر سربرآوردہ مسلمانوں پر بڑا قہر ڈھایا۔ الحاج عبدالقیوم صاحب بھی اس موقع پر گرفتار کرلیے گئے تھے، ان کی وفات سے کلکتہ ایک مقبول، مخیرّ، دین دار اور علم وادب نواز شخص سے محروم ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ عالم آخرت میں ان کے درجات بلند کرے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، آمین۔

(''ض''، جنوری ۲۰۰۲ء)

سہالوی، عبدالمجیب

عبدالمجیب سہالوی

افسوس ہے کہ ۲/ نومبر ۲۰۰۱ء کو مشہور مزاحیہ نگار اور صحافی عبدالمجیب سہالوی کا

انتقال ہوگیا ان کا وطن ضلع بارہ بنکی کا قصبہ سہالی تھا جو درس نظامی کے بانی ملا نظام الدین کا وطن ہونے کی بنا پر عالم گیر شہرت رکھتا ہے۔ مرحوم عبدالمجیب سہالوی کی تعلیم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہوئی پھر انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے وکالت کی ڈگری لی مگر صحافت کے پیشہ سے وابستہ رہے۔

ان کو ادب کی مخصوص صنف طنز و مزاح سے دلچسپی تھی، ایک زمانے میں لکھنو سے نکلنے والا مشہور روزنامہ قومی آواز پورے اتر پردیش میں چھایا ہوا تھا، مگر پچھلے کئی برسوں سے وہ یہاں سے تو غائب ہوگیا مگر اس کو اور اس کے فکاہی کالم ''گلوریاں'' کو ابھی تک لوگ بھولے نہیں ہیں۔ یہ کالم سہالوی صاحب ہی لکھتے تھے اور اس کی وجہ سے ان کو بڑی شہرت ملی۔ لکھنؤ کی شستہ و شیریں زبان اور طنز و مزاح کا کالم سونے پر سہاگا ہوتا تھا۔

ان کے دلچسپ فکاہی مضامین کا ایک مجموعہ ''مفلسی میں آٹا گیلا'' کے نام سے عرصہ ہوا شائع ہوا تھا جو بہت پسند کیا گیا۔ انھوں نے طویل عمر پائی لیکن عرصے سے ان کا نام سننے میں نہیں آرہا تھا گویا موتوا قبل ان تموتوا کی تفسیر ہوگئے تھے، اللہ تعالیٰ ادب و صحافت کے اس خادم کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو تسلی عطا کرے، آمین۔ (''ض''، جنوری ۲۰۰۲ء)

فارق، خورشید احمد، ڈاکٹر

ڈاکٹر خورشید احمد فارق

(مختار الدین احمد)

دوشنبہ، ۱۸؍شعبان المعظم ۱۴۲۲ھ مطابق ۵؍نومبر ۲۰۰۱ء کی صبح کو عربی زبان و ادب کے استاد، تاریخ اسلام کے ماہر اور ممتاز مصنف ڈاکٹر خورشید احمد فارق کوئی ۸۵ سال کی عمر میں طویل علالت کے بعد دہلی میں وفات پاگئے۔

وہ ۱۹۱۶ء میں بریلی میں پیدا ہوئے۔ فارسی و عربی کی متداول کتابیں انھوں نے گھر پر اپنے والد ماجد سے پڑھیں۔ کالج کی تعلیم انھوں نے بریلی میں حاصل کی۔ ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے کیا۔ ریسرچ کے دوران وہ شعبہ عربی میں کچھ کلاسیں بھی لیتے رہے۔ ۱۹۴۳ء کے اواخر میں وہ اینگلو عربک کالج دہلی میں لکچرر، ۱۹۵۳ء کے اواخر میں دہلی یونیورسٹی میں ریڈر مقرر ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۵۶ء میں حکومت ہند کے ایک وظیفے پر ایک سال کے لیے وہ مصر گئے۔ وہاں دارالکتب المصریہ کے مخطوطات کے مطالعے کا انھیں اچھا موقع ملا۔ ریاض الرحمٰن خاں صاحب شروانی اور عبدالحلیم ندوی صاحب کو بھی اسی سال یہ وظیفہ ملا تھا۔ قاہرہ میں ان تینوں کا خوب ساتھ رہا۔ فروری ۱۹۶۹ء میں وہ دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر اور صدر شعبہ مقرر ہوئے۔ جولائی ۱۹۸۵ء میں وہ متقاعد ہوکر علی گڑھ آگئے اور سرسید نگر میں اپنے تعمیر کردہ مکان ''بانس کلی'' میں مقیم ہوکر علمی و ادبی کاموں میں مصروف ہوگئے۔ آخر عمر میں وہ اپنے بچوں کے پاس دہلی چلے گئے تھے، وہیں ان کی وفات ہوئی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

ڈاکٹر فارق نے اردو، انگریزی اور عربی میں عربی اور تاریخ اسلام کے موضوعات پر متعدد کتابیں لکھیں اور کثرت سے مضامین سپرد قلم کیے جو زیادہ تر رسالہ ''برہان'' دہلی میں شائع ہوئے۔ ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

قاضی شریح اور دیگر مضامین (دہلی ۱۹۵۵ء)، حضرت ابوبکرؓ کے سرکاری خطوط (دہلی ۱۹۶۰ء)، حضرت عمرؓ کے سرکاری خطوط (دہلی ۱۹۵۹ء)، تاریخ ہند پر نئی روشنی (دہلی ۱۹۶۰ء)، تاریخ ردّہ، اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں (دہلی ۱۹۶۲ء)، قرن اول کا ایک مدبر (دہلی ۱۹۶۱ء)، عربی لٹریچر میں قدیم ہندوستان، خلافت راشدہ کا اقتصادی جائزہ (دہلی ۱۹۷۷ء)، تاریخ اسلام (خلافت راشدہ، بنی امیہ) مطبوعہ جمال پرنٹنگ پریس دہلی، جائزے (تاریخی، تمدنی، جغرافیائی، قانونی، ادبی، نحوی) حصہ اول (علی گڑھ ۱۹۸۷ء)، جائزے (تاریخی، تمدنی، اقتصادی، جغرافیائی، ادبی) حصہ دوم (علی گڑھ ۱۹۸۴ء)، بعد کو اس کتاب کے مزید حصے شائع ہوئے۔ یہ سب کتابیں اردو میں ہیں۔

عربی میں ان کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں: تاریخ الردہ مقتبس از کتاب الاکتفا، مصنفہ الکلاعی البلنسی (دہلی ۱۹۷۰ء) الرسائل الرسمیّۃ لعمر بن الخطاب، اور کتاب المنمق لابن حبیب البغدادی (دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد ۱۹۶۴ء)۔

زیاد بن ابیہ (بمبئی ۱۹۶۶ء)، تاریخ ادب عربی (دہلی ۱۹۷۹ء)، ایک عرب سیاسی شاطر کی کہانی (دہلی ۱۹۶۷ء) انگریزی میں شائع ہوئی ہیں۔

خورشید احمد فارق صاحب کو میں نے پہلی بار اکتوبر ۱۹۴۳ء میں علی گڑھ میں دیکھا۔ ''سیدنا'' ملا طاہر سیف الدین (۱۸۸۴-۱۹۶۵ء) کے بنوائے ہوئے کمروں میں سے ایک کمرے میں جو سرسید ویسٹ سے ملحق ہے اور جس میں اس زمانے میں شعبہ عربی تھا، انھیں اکثر کلاسیں لیتے ہوئے دیکھتا تھا۔ وہ اور ڈاکٹر سید محمد یوسف دونوں جو علامہ عبدالعزیز میمن (۱۸۸۸-۱۹۷۸ء) کے شاگرد تھے، بی۔اے کی کلاسیں لیتے تھے اس لیے مجھے ان کی کلاسوں میں جانے کا موقع نہیں ملا۔ میری کلاسیں مولانا بدرالدین علوی (۱۸۹۳-۱۹۷۵ء) لیتے تھے۔ خوب یاد ہے وہ ابن درید (متوفی ۳۲۱ھ) کی کتاب المجتنیٰ پڑھاتے تھے۔

مولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھی کے عزیز ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری میرے ہوسٹل کے وارڈن تھے۔ ان سے ملنے ڈاکٹر محمد یوسف برابر آتے تھے میری ان سے اکثر ملاقات ہوجاتی تھی لیکن فارق صاحب سے برسوں ملنا نہ ہوسکا۔ وہ بہت کم آمیز تھے۔

گفتگو میں خود پہل نہیں کرتے تھے، کسی نے کچھ پوچھا تو آنکھیں بند کر کے دو ایک جملے میں جواب دے دیا اور پھر خاموش ہوگئے۔ ایک آدھ بار شعبے میں ان کے پاس حاضر ہوا، کلاس مین فارغ تنہا بیٹھے تھے۔ میں نے انھیں بتایا کہ علی گڑھ آنے سے پہلے پٹنہ میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ زیاد بن ابیہ پر کام کررہے ہیں۔ خاموش رہے۔ نہ یہ پوچھا کس نے کہا اور نہ کسی قسم کی خوشی یا دلچسپی کا انھوں نے اظہار کیا۔ میں ایک آدھ بات کر کے اُٹھ آیا۔ ان سے ملاقاتیں کئی سال کے بعد ۱۹۴۸ء میں شروع ہوئیں جب میں ایم۔اے کا طالب علم تھا۔ سرسیدؒ کے ایک قرابت مند ڈاکٹر سید عابد احمد علی جنھوں نے آکسفرڈ سے پروفیسر مارگولیتھ کی نگرانی میں مشہور نحوی عالم ابن السکّیت (۱۸۶۔۲۴۴ھ) کی ''اصلاح المنطق'' اڈٹ کر کے ڈاکٹریٹ حاصل کی تھی، ایم۔اے کی کلاس لیتے تھے۔ ان کے ذمہ تنقید اور تاریخ اسلام کا پرچہ تھا۔ سید صاحب تعطیلاتِ گرما میں لاہور گئے تو تقسیم ہند کے شاخسانے میں مہینوں وہیں رک گئے۔ یہاں تعلیم کا نقصان ہونے لگا تو میمن صاحب نے خورشید احمد فارق صاحب کو علی گڑھ آنے پر آمادہ کرلیا۔ وہ وہاں دہلی یونیورسٹی میں نہیں اینگلوعربک کالج میں ملازم تھے۔ وہ اپنی مادر درسگاہ کی خدمت پر آمادہ ہوگئے اور ہم لوگوں مسعود صدیقی (بھوپال)، حافظ خورشید حسین (سنبھل) اور راقم الحروف کو تنقید کا پرچہ پڑھانے لگے۔ جو ڈاکٹر عابد علی پڑھایا کرتے تھے، عابد علی صاحب کے ذمے تاریخ اسلام کا پرچہ بھی تھا۔ مورخ اسلامی (محمد بن عفیفی الباجوری الفخری) کی تاریخ الامم الاسلامیۃ کورس میں تھی، میمن صاحب نے فیصلہ سنایا کہ اسے کسی استاد سے سبقاً سبقاً پڑھنے کی ضرورت نہیں اسے آپ لوگ خود تیار کریں، اسے ہم لوگوں نے خود پڑھا اور شاید سب سے زیادہ نمبر اسی میں حاصل کیے۔ تنقید کے پرچے میں فارق صاحب پھر ''نقد النثر'' پڑھانے لگے جو اس وقت تک قدامۃ بن جعفر الکاتب البغدادی (م ۳۳۷ھ) کی تصنیف سمجھی جاتی تھی (نقد الشعر قدامۃ کی تصنیف تھی تو یہ فرض کرلیا گیا کہ ''نقد النثر'' بھی اسی کی لکھی ہوئی ہوگی) بعد کو ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اس خیال کی تردید کی اور ثابت کیا کہ اس کا اصل مصنف قدامہ بن جعفر نہیں ہے فارق صاحب اسے تنقید کی کتاب کے طور پر نہیں عہد عباسی کی قدیم عربی نثر کی تصنیف کی حیثیت سے بہت توجہ اور محنت سے پڑھاتے تھے۔ اس زمانے میں عربی بھی انگریزی میں پڑھائی جاتی تھی اور طالب علموں کو جواب بھی انگریزی میں دینا ہوتا تھا اس لیے شاگرد اور استاد دونوں کو خاصی محنت کرنی ہوتی تھی۔ میں نے فارق صاحب کو بااصول، ایماندار اور محنتی پایا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ مقرر وقت میں کتاب ختم نہیں ہوسکتی تو انھوں نے سہ پہر کو بھی اپنی قیام گاہ پر بلا کر پڑھانا شروع کیا۔ وہ اس زمانے میں محمودہ بیگم (اہلیہ جسٹس سید محمود مرحوم) کے ایک کواٹر میں رہتے تھے۔ ان کی بیگم صاحبہ روزانہ شام کی چائے ہمارے لیے باہر بھجوا دیتی تھیں۔ یاد نہیں آتا کہ ڈاکٹر صاحب ہماری چائے میں شریک ہوتے تھے یا نہیں۔ غالباً اسے مضرِ صحت سمجھ کر شریک نہیں ہوتے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے چائے مُدِر ہے اور جو چیز مُدِر ہے وہ مضر ہے۔ اب وہ ظروف یاد نہیں کہ سیشن کے اختتام کے بعد وہ کیوں دہلی واپس چلے گئے۔

استاد فقید علامہ عبدالعزیز میمن ایڈورڈ کالج پشاور، اورینٹل کالج لاہور میں برسوں استاد رہے پھر ۱۹۲۵ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (۱۸۶۷۔۱۹۳۰ء) کے عہد میں وہ علی گڑھ آئے کوئی پچیس سال وہ یہاں درس دیتے رہے۔ پھر برسوں وہ کراچی اور پنجاب کی جامعات کے عربی کے شعبے میں بحیثیت پروفیسر کے کام کرتے رہے، لیکن اس پورے عرصے میں ان کی نگرانی میں پی۔ایچ۔ڈی کرنے والے ان کے صرف تین شاگرد ہیں جنھوں نے اپنا کام مکمل کر کے ڈاکٹریٹ حاصل کی اور یہی تینوں علی گڑھ کے ہیں۔

سرفہرست ڈاکٹر سید محمد یوسف (۱۹۱۶۔۱۹۷۸ء) ہیں میمن صاحب کے بہترین شاگرد جو اپنے استاد سے بے حد محبت کرتے تھے اور استاد بھی ان پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ یوسف صاحب نے تاریخ اسلام کے ممتاز جنرل مہلّب بن ابی صفرۃ الأزدی پر انگریزی میں مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ حاصل کی، ان کے ممتحن ڈاکٹر عظیم الدین احمد (۱۸۸۰۔۱۹۴۹ء) صدر شعبہ عربی و فارسی و اردو پٹنہ یونیورسٹی تھے۔ جنھوں نے اس مقالے کی بہت تعریف کی تھی۔ افسوس ہے ایسا قابل قدر مقالہ آج تک شائع نہ ہوسکا۔ صرف اسکے چند ابواب ''اسلامک کلچر'' حیدرآباد میں شائع ہوئے تھے۔ مقالہ نہ علی گڑھ میں محفوظ ہے نہ ان کی بیگم صاحبہ کے پاس کراچی میں۔ یوسف صاحب علی گڑھ، قاہرہ اور سیلون کی جامعات میں برسوں درس دیتے رہے۔ پھر کراچی یونیورسٹی سے منسلک ہوگئے جہاں وہ پروفیسر صدر شعبہ کی حیثیت سے متقاعد ہوئے۔ وہ متعدد عربی و اردو کتابوں کے مصنف ہیں۔ میرے خیال میں ان کا سب سے اہم علمی کام خالدی برادران ابوعثمان سعید الخالدی (متوفی ۳۵۰ تقریباً) ابوبکر محمد الخالدی (م۳۸۰ھ) الأشباہ و النظائر (حماسۃ الخالدیّین) اور ابومحمد الحسن بن عبداللہ بن سعید العسکری (۲۹۳۔۳۸۲ھ) کی کتاب التصحیف والتحریف کی تصحیح وتہذیب ہے۔ یہ کتابیں علی الترتیب قاہرہ اور دمشق سے شائع ہوئی ہیں۔

ان کے دوسرے شاگرد ڈاکٹر خورشید احمد فارق (۱۹۱۶۔۲۰۰۱ء) ہیں جو آج موضوعِ سخن ہیں۔ انھوں نے تاریخ اسلام کے ایک بطل جلیل عراق کے گورنر زیاد بن اَبیہ (م۵۳ھ) پر علمی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ یہ مقالہ The Story of an Arab Diplomat کے عنوان سے شائع ہوچکا ہے۔ فارق صاحب جیسا کہ لکھا جاچکا ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے پرفیسر اور صدر تھے۔ ان کی تصانیف کی فہرست اوپر درج ہوئی۔

میمن صاحب کی نگرانی میں پی۔ایچ۔ڈی کرنے والا تیسرا شاگرد راقم الحروف ہے جس نے تاریخ اسلام کے بجائے عربی ادب کے کسی موضوع پر ریسرچ کرنے پر اصرار کیا جس پر استاذ مرحوم نے صدر الدین علی بن ابی الحسن بن ابی الفرج البصری (م ۶۵۶ھ) کی ''الحماسته البصریته'' کی تصحیح وتحشیے کا کام اس کے سپرد کیا۔اسے ۱۹۵۲ء میں ڈاکٹریٹ تفویض ہوئی۔ مقالے کے ممتحن مشہور جرمن مستشرق پروفیسر فنیتس کرینکو (۱۸۷۶۔۱۹۵۲ء) مقیم کیمبرج تھے۔ اسے دو جلدوں میں دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد نے ۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن بیروت سے ۱۹۷۵ء کے لگ بھگ نکلا ہے۔ راقم جنوری ۱۹۵۳ء میں شعبہ عربی میں لکچرر، ۱۹۵۸ء میں انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز میں ریڈر اور ۱۹۶۸ء میں پروفیسر عبدالعلیم (۱۹۰۵ء۔ ۱۹۷۶ء) کے وائس چانسلر ہونے پر ادارے کا ڈائرکٹر مقرر ہوا۔ اسی سال شعبہ عربی میں پروفیسرشپ اور شعبے کی صدارت تفویض ہوئی۔۱۹۸۴ء میں سبکدوش ہوا۔ یونیورسٹی نے مزید چار سال کے لیے ملازمت میں توسیع دی جواب تک صرف پروفیسر محمد حبیب اور ڈاکٹر ہادی حسن کو ملی تھی۔

ڈاکٹر خورشید فارق نے طویل عمر پائی۔ ان کی پوری زندگی درس و تدریس اور تالیف وتصنیف میں گزری۔ انھوں نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ ان کی صاحبزادی عربی میں ایم۔اے ہیں۔ دہلی میں حکومت کے ایک ادارے میں عربی پڑھاتی ہیں۔ ان کے دو صاحبزادے ڈاکٹر رفیع العماد فینان اور احمد فرحان ہیں۔ ڈاکٹر رفیع العماد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے شعبہ عربی میں پروفیسر ہیں اور صاحب تصانیف ہیں۔ خدا ان سبھوں کو خوش وخرم رکھے اور مرحوم کی مغفرت فرمائے اور جوار رحمت میں جگہ دے، آمین۔ (جنوری ۲۰۰۲ء)

---

۱ نقد الشعر قدامہ بن جعفر بغدادی کی مشہور کتاب ہے اور نقد النثر عربی کی Prose Criticism کی کتاب ہے جو کورس میں رہی ہے، یہ بھی ایک زمانے تک قدامہ کی تصنیف سمجھی جاتی رہی، ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے ۱۹۳۳ء کے لگ بھگ اور الاستاذ المغنی نے کچھ پہلے قدامہ کی طرف اس کتاب کی نسبت مشکوک ٹھہرائی، ایک عرصے کے بعد ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر نے یہ کتاب چسٹر بیٹی کے کتب خانے (ڈبلن۔ آئرلینڈ) میں دریافت کی جس سے معلوم ہوا کہ اس کتاب کا اصل نام البرھان فی وجوہ البیان ہے اور اس کے مصنف ابوالحسین اسحاق بن ابراہیم بن وھب الکاتب ہیں۔

سلامت اللہ، ڈاکٹر

ڈاکٹر سلامت اللہ

مشہور ممتاز ماہر تعلیم ڈاکٹر سلامت اللہ کا انتقال ۹۰ برس کی عمر میں ۲۳/جنوری ۲۰۰۲ء کو دہلی میں ہوا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں تدفین ہوئی، جامعہ سے عمر بھر ان کا گہرا تعلق رہا، وہ اس کے شعبہ تعلیم (استادوں کے مدرسہ) کے معماروں اور قومی سطح کے ماہرین تعلیم میں تھے۔ رسالہ جامعہ کے شعبہ ادارت سے منسلک تھے اور اس میں ان کے مضامین بھی چھپتے تھے، انہوں نے اردو اور انگریزی میں متعدد کتابیں لکھیں جن میں تعلیم اور اس کا سماجی پس منظر، تعلیم، فلسفہ تعلیم اور سماج، بنیادی استاد کے لئے، ہم کیسے پڑھائیں: Education of Muslims in thought or Basic اور Secular India can Education do it Education وغیرہ قابل ذکر ہیں، وہ عمر بھر علمی وتعلیمی خدمت میں مصروف رہے، ان کی وفات علمی وتعلیمی دنیا کا بڑا حادثہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، آمین!! (''ض''، اپریل ۲۰۰۲ء)

سرور، آل احمد، پروفیسر

پروفیسر آل احمد سُرور

۹/فروری ۲۰۰۲ء کو اردو کے بزرگ استاذ، اردو تحریک کے معمر قائد، اردو کے سب سے بڑے ادیب ونقاد، اچھے شاعر، نامور اہل قلم، غالب واقبال کے پایہ شناس اور علی گڑھ اور سرسید احمد خاں کے عاشق وشیدائی پروفیسر آل احمد سرور رحلت فرماگئے، انا للہ و انا الیہ راجعون اور پوری اردو دنیا کو مغموم، سوگوار اور اداس چھوڑ گئے ع
مجنوں جو مرگیا ہے تو جنگل اداس ہے۔

اردو کی اس کسمپرسی کے دور میں اس کے ایک نہایت ممتاز عالم اور دانشور کا اُٹھ جانا حادثہ جاں کاہ اور اردو کا بڑا زیاں اور خسارہ ہے۔

موت وحیات کا سلسلہ ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا لیکن برسوں کی گردش فلک کے بعد سرور صاحب جیسا مایۂ ناز انسان پردہ خاک سے نکلتا ہے، ان ہی کا شعر ہے ؎

ستارے کتنے یہاں ڈوبتے ابھرتے ہیں
کبھی کبھی ہی نکلتا ہے آفتاب کوئی

ان کا خلا کیسے پُر ہوگا اور اردو زبان، ادب اور تنقید کے نقصان کی تلافی کیسے ہوگی،

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

پروفیسر آل احمد سرور ۱۹۱۱ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے، ابتدائی اور ثانوی تعلیم پیلی بھیت اور غازی پور میں حاصل کی، آگرہ سے بی۔ایس۔سی کیا، ۱۹۳۲ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۴ء میں انگریزی میں ایم۔اے کرکے اسی کے استاد ہوگئے۔ اردو ان کی محبوب مادری زبان تھی، ۱۹۳۶ء میں اس میں ایم۔اے کرکے انگریزی سے اردو شعبہ میں منتقل ہوگئے اور اسی زبان سے پیمانِ وفا باندھ لیا، چاہتے تو

کوئی اعلا سرکاری عہدہ مل جاتا لیکن انہیں اپنی زبان اور اپنی تہذیب زیادہ عزیز تھی اس لیے سائنس اور انگریزی جیسے سکہ رائج الوقت کو بھنانے کے بجائے اردو کی گلی کوچے کی خاک چھاننے میں ان کو شاہانہ لطف و لذت ملی ؎

کہ گزارم من گدائے کوئے تو
بادشاہی زیں گدائے یافتم

۱۹۴۶ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ریڈر ہو کر آئے، اس وقت لکھنو میں شعر و ادب کی نئی بساط بچھ چکی تھی اور ترقی پسند تحریک کے زیر اثر اس کے سپہر علم و ادب پر نئے ستارے جلوہ فگن ہو رہے تھے، لیکن طرز کہن کے دل دادگان اور ''یادگارِ زمانہ لوگ'' بھی ابھی تک ضوفشاں تھے اور افقِ ادب پر نمودار ہونے والے نئے شاعروں اور ادیبوں میں بھی ایک رکھ رکھاؤ تھا اور سب کی بزم آرائی کا مرکز ''دانش محل'' تھا، سرور صاحب دونوں حلقوں میں گھلے ملے رہے۔

باما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد

مگر جلد ہی مادر علمی کی کشش انہیں پھر علی گڑھ کھینچ لائی اور شعبہ اردو کے سربراہ ہوئے، وظیفہ یاب ہونے کے بعد کشمیر کی دل فریبی اور جاذبیت نے اپنی طرف کھینچا اور اقبال انسٹیٹیوٹ سری نگر کے ڈائریکٹر بنائے گئے۔ ۱۹۹۰ء میں علی گڑھ کے شعبہ اردو میں پروفیسر ایمریٹس ہوئے۔

غرض گھوم پھر کر زندگی کا زیادہ حصہ علی گڑھ میں گزارا، داخلہ لینے کے بعد ہی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ یونین کے نائب صدر اور علی گڑھ میگزین کے اڈیٹر مقرر ہوئے، ایس، ایس، ہال کے پرووسٹ، اسٹاف ایسوسی ایشن اور شعبہ اردو کے صدر، آرٹ فیکلٹی کے ڈین اور پروفیسر ایمریٹس رہے، ایگزیکیٹو کونسل اور یونیورسٹی کورٹ کے رکن بھی ہوتے رہے اور اپنے علم، تجربہ اور سوجھ بوجھ سے یونیورسٹی کو فائدہ پہنچاتے اور اس کا نام روشن کرتے رہے، علی گڑھ ہی میں مستقل سکونت کے لیے دارالسرور بھی تعمیر کرایا۔ گو ان کا انتقال دہلی میں ہوا تھا مگر ابدی آرام گاہ یہی سرزمین بنی۔

علی گڑھ کی طرح اردو بھی ان کی زندگی کا محور رہی، عمر بھر وہ اس کے گیسو کو سنوارتے اور تاب دار کرتے رہے، گو تدریسی زندگی کا آغاز انگریزی کی معلّمی سے ہوا تھا۔ لیکن پھر ساری عمر اردو ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہو گئی تھی اور اس کی تدریس پر مامور رہ کر اور اس میں مضامین اور تصنیفات کا انبار لگا کر اس کا وقار و اعتبار فزوں تر کرتے رہے۔

اردو تحریک کی قیادت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں ایسے وقت آئی تھی جب ایوان حکومت میں اسے ختم کر دینے کی سازشیں ہو رہی تھیں اور تنگ اور متعصب حکمراں اسے مٹا دینے پر متفق ہو گئے تھے، ایسے نازک دور میں اردو کی روحِ مضمحل میں نئی روح پھونکنے کے لیے جو مسیحا نفس اور سرفروش سامنے آئے ان میں آل احمد سرور بھی تھے، انہوں نے انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے اردو کے تحفظ و ترقی کے لیے نا قابل فراموش خدمات انجام دیں۔ اسی زمانے میں بائیس لاکھ دستخطوں کے محضر کے ساتھ ملک کے پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کو یادداشت پیش کی گئی تھی۔

حکومت اردو دانوں کو بہلانے اور پھسلانے کے لیے برابر دام بچھا کر اس میں دانے پھینکتی رہی ہے، اردو کے فروغ و ترقی اور اس کی تعلیم کو رائج کرنے کے نام پر وقتاً فوقتاً جو کمیٹیاں قائم ہوئیں ان میں گجرال کمیٹی کا غلغلہ عرصے تک بلند رہا مگر اس کی تجویزیں اور سفارشات سرد خانے میں ڈال دی گئیں، شور ہونے پر جعفری اور سرور کمیٹیاں تشکیل کر کے زبان بندی کی گئی بہرحال سرور صاحب نے اپنا کام بخوبی انجام دیا اور گجرال کمیٹی کی سفارشات کی نشاندہی کر کے ان کا نچوڑ پیش کیا۔ مگر یہ سب بے سود رہا اور سرور صاحب کی دلیل و حجت بھی متعصب لوگوں کے بگڑے ذہن نیت کی اصلاح نہ کر سکی۔

سرور صاحب اس امر کو نہایت شدت سے محسوس کر رہے تھے کہ پرائمری اور ثانوی سطح پر اردو تعلیم کے بغیر اس زبان کا فروغ نہیں ہو سکتا، اردو پڑھنا پڑھانا بند کر کے اس پر جو تیشہ چلایا گیا ہے اسے کند بنانے کے لیے اس کی تعلیم کو رواج دینا ضروری ہے، فرماتے ہیں:

> ''تعلیمی اور تہذیبی اور قومی نقطۂ نظر سے مادری زبان میں ابتدائی تعلیم ایک ایسا پتھر ہے جس کے بغیر ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی ساری عمارت کجی کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے، جب تک زبان کی بنیاد مستحکم نہ ہو ادب کا فروغ ممکن نہیں، اس لیے جب تک اردو زبان کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا کماحقہ انتظام نہیں ہوتا اس وقت تک یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ اردو زبان و ادب ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ اگر اردو دوستوں کو واقعی اپنی زبان سے محبت ہے تو انہیں بڑے پیمانے پر ایک ایسی مہم چلانی ہوگی جس سے پہلے مرحلے پر اردو میں ابتدای تعلیم کا انتظام ہو اور دوسرے مرحلے پر ثانوی تعلیم میں سہ لسانی فارمولے کے ذریعے اردو تعلیم کو آگے بڑھایا جا سکے''۔

انجمن کے پلیٹ فارم سے انہوں نے معیاری کتابیں شائع کر کے اردو کے ذخیرے میں جو خطیر اضافہ کیا ہے اس کا کچھ ذکر آگے آئے گا۔

سرور صاحب محنت، مطالعہ اور مسلسل کام کرنے کے عادی تھے، بچپن ہی سے مطالعہ کے شوقین تھے، کم عمری میں اردو کے معیاری رسالے ان کے مطالعہ میں رہتے تھے، ادبی لٹریچر سے زیادہ دلچسپی تھی، اس لیے شروع ہی سے اردو شاعری اور نثر کی کتابوں کو جمع کرنے لگے تھے، بعض مفید اور دلچسپی کی کتابوں کا بار بار مطالعہ کرتے تھے، مطالعہ کا یہ ذوق تاعمر رہا، پروفیسر، صدر شعبہ، ڈین، یونیورسٹی کے مختلف اعزازی عہدوں

پر فائز، انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری، اور دو رسالوں کے اڈیٹر ہونے کے بعد ان کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی تھیں، مگر ان مشغولیتوں میں بھی وہ مطالعہ کے لیے وقت نکال لیتے تھے اور لکھنے کا کام جاری رکھتے تھے، بڑھاپے اور علالت کے زمانے میں بھی مطالعہ کی عادت نہ چھوٹی، جب بینائی کم ہوگئی اور بیماری کی وجہ سے پڑھنے لکھنے میں زحمت ہوتی تھی تو دوسروں سے پڑھواکر سنتے اور خود لکھنے کے بجائے املا کراتے تھے۔

ضعف وعلالت کے زمانے میں ایک دفعہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کے جلسے میں ان سے ملاقات ہوئی تو میں نے عرض کیا ''آپ کے ذمہ دارالمصنفین کا ایک قرض چلا آرہا ہے وہ کب ادا کریں گے'' فرمایا ''مجھے مولانا شبلی کی تنقیدی نگاری پر اپنی شرط کے مطابق لکچر دینا ہے، یہ قرض ادا کروں گا''۔ مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ جب جب ان کے آنے کا پروگرام بنتا تو کوئی مانع پیش آجاتا، اس زمانے کے ان کے خطوط سے پتہ چلتا تھا کہ وہ مقالہ مکمل کرچکے تھے، میرا ارادہ تھا کہ ان سے مل کر لے لوں گا، مگر علی گڑھ گیا تو کبھی تو خیال ہی نہ آیا اور کبھی آیا تو وہ وہاں موجود نہیں تھے، اگر یہ مقالہ ان کے کاغذات میں موجود ہو تو ان کے وارثین سے درخواست ہے کہ اسے یہاں بھیج دیں۔

سرور صاحب کو علامہ شبلی اور دارالمصنفین سے بڑا تعلق تھا۔ علامہ شبلی کے ادب و انشاء اور شاعری کے خاص طور پر معترف تھے، شاہ معین الدین احمد صاحب اور سید صباح الدین صاحب سے بھی روابط تھے، ایک دفعہ وہ اور پروفیسر احتشام حسین مرحوم شبلی کالج کے شعبہ اردو کی دعوت پر اعظم گڑھ تشریف لائے تو دارالمصنفین میں قیام کیا۔

ان کا مطالعہ صرف اردو کتابوں تک محدود نہ تھا، فارسی اور انگریزی ادبیات کا مطالعہ بھی وسیع تھا، انگریزی ادب وتنقید کی جو تازہ بہ تازہ کتابیں شائع ہوتی تھیں وہ برابر ان کے مطالعہ میں رہتی تھیں، ان کی مدد سے وہ مغربی اور عالمی ادب پر بھی گہری نظر رکھتے تھے، انہوں نے اپنی کتابوں اور مضامین میں بہ کثرت انگریزی کتابوں اور مغربی نقادوں کے حوالے دئے ہیں۔

اردو ادب وتنقید کے علاوہ دوسرے علوم وفنون کی کتابیں بھی ان کے مطالعہ میں رہتی تھیں اور جدید ادب کی طرح کلاسیکی لٹریچر پر بھی ان کی نظر گہری تھی، اس طرح مشرقی ادب وتنقید کی روایتوں اور مغربی ادب وتنقید کی خصوصیات اور ادب وتنقید کے نئے رجحانات سے وہ بہ خوبی واقف تھے۔ وہ ادبی مسائل پر برابر غور وخوض کرتے رہتے تھے اور ان پر اپنے دوستوں اور شاگردوں سے تبادلۂ خیال بھی کرتے تھے، طلبہ کو اکثر اس کی تاکید کرتے تھے کہ وہ صرف اردو کتابوں کے مطالعہ کو کافی نہ سمجھیں بلکہ ادب و تنقید کے نئے رجحانات اور رویے سے واقف ہونے کے لیے انگریزی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کی ادبی وتنقیدی کتابیں پڑھیں، اپنے مطالعہ کو وسیع کریں اور اپنی فکر کو آگے بڑھائیں۔

علم وادب کی روایت کو آگے بڑھانے اور چراغ سے چراغ جلتے رہنے کے لیے ضروری ہے کہ نئی نسلوں میں علم وادب سے شغف پیدا کیا جائے اور جدید ادب کے ساتھ کلاسیکل ادب سے بھی ان کی دلچسپی باقی رکھی جائے، سرور صاحب نئی پود میں یہی روح پھونکنا چاہتے تھے، وہ اپنی تقریر وتحریر کے ذریعہ جہاں طلبہ کو علم وکمال کے حصول کی ترغیب دلاتے تھے، وہاں ان کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لیے بھی فکرمند رہتے تھے یہی وجہ ہے کہ اردو کے اساتذہ وطلبہ کو سب سے زیادہ ان سے فیض پہنچا اور انہوں نے اکثر ادیبوں اور نقادوں کو متاثر کیا۔

مضمون نگاری بھی کم سنی میں شروع کی تھی اور پھر مسلسل عمر بھر لکھتے رہے، ان کا اصل میدان ادبی تنقید تھا جس میں وہ اپنے ہم عصروں سے علانیہ ممتاز تھے، انہوں نے نظم ونثر دونوں پر جو تنقیدی مضامین لکھے وہ اردو میں بہترین تنقید کا نمونہ ہیں، شاعری میں مختلف اصناف سخن کے شعراء نے ان کو اپنی جانب متوجہ کیا، نثری تنقیدی مضامین میں بھی بڑا تنوع ہے، افسانہ ناول، تنقید، ترقی پسند تحریک، جدیدیت، متعدد اہل فن اور اشخاص پر بے شمار تنقیدی مضامین لکھے، اردو کی کئی اہم کتابوں پر ناقدانہ نظر ڈالی، مکتوب نگاری بھی ان کی دلچسپی کا ایک موضوع تھا، ان کا مضمون ''خطوط میں شخصیت'' بڑی اہمیت کا حامل ہے، مہدی افادی اور اقبال کی مکتوب نگاری پر بھی قابل قدر مضامین لکھے اور غالب کے اردو خطوط کا ایک اچھا انتخاب ''عکس غالب'' کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا۔

اقبال اور غالب کو وہ اردو کا بڑا شاعر مانتے تھے، ان پر خود بھی متعدد مضامین لکھے جو ان کے مضامین کے متعدد مجموعوں میں شامل ہیں، غالب کے خطوط کا انتخاب اور ان پر مختلف نقادوں کے مضامین کا ایک مجموعہ مرتب کیا جو شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے شایع ہوا۔ امتیاز علی عرشی کا مرتبہ دیوان غالب، مولوی مہیش پرشاد اور مالک رام صاحب کے مرتب کردہ خطوطِ غالب اور مختار الدین احمد صاحب کے مرتب کردہ مجموعہ مضامین ''احوال غالب'' اور ''نقد غالب'' انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کئے۔ ''ہماری زبان'' اور ''اردو ادب'' میں ان پر اور اقبال پر متعدد مضامین شائع کئے اور مختلف موقعوں پر خود بھی ان میں مضامین لکھے۔

اقبال پر متعدد تنقیدی مقالے اس وقت لکھے جب ان کا نام لینا ہندوستان میں جرم سمجھا جاتا تھا، اقبال انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر ہوکر سری نگر گئے تو ان پر کئی سمینار کرائے جن میں پڑھے جانے والے مضامین کے مجموعے اور اقبالیات کے ماہرین کے مقالات کے دوسرے مجموعے بھی انسٹی ٹیوٹ سے شائع کئے اور ان پر متعدد عالمانہ خطبات دیئے۔

اس سے اندازہ ہوا ہوگا کہ اردو تنقید میں ان کے کارنامے کمیت وکیفیت دونوں حیثیتوں سے اہم ہیں اور غالب شناسی اور اقبال فہمی میں ان کا پایہ بلند تھا۔

صحافت سے بھی ان کا تعلق رہا، اس کی ابتدا طالب علمی کے زمانے میں ہوئی جب علی گڑھ میگزین کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی تھی، انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ہوئے تو ہفت روزہ ''ہماری زبان'' اور سہ ماہی ''اردو ادب'' کی ادارت ان کے سپرد ہوئی جس کو برسوں نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا، اردو ادب کے کئی اہم خاص نمبر بھی نکالے۔

اردو کی ترقی پسند تحریک کا آغاز سرور صاحب کے عنفوانِ شباب میں ہوا اور جب وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں تھے تو اس تحریک کے شباب کا زمانہ تھا، ان کے تمام ترقی پسند ادیبوں سے گہرے روابط تھے۔ اسی لیے ان کا شمار ترقی پسند مصنفین اور ادیبوں کے زمرے میں کیا جاتا ہے بلکہ بعض ترقی پسند ادیبوں نے انہیں مارکسی نظریہ سے متاثر نقاد کہا ہے، لیکن جب یہ تحریک اضمحلال کا شکار ہوئی یا ''جدیدیت'' کے غلغلہ کے بعد اس کا زور واثر کم ہوا تو سرور صاحب نے جدیدیت کا خیر مقدم کیا اور اس کے زیر اثر مضامین لکھے، اس موضوع پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں سمینار کرایا اور ''جدیدیت اور اردو ادب'' کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کیا، جس میں مغرب میں جدیدیت کی روایت اور اس تحریک کے اہم پہلوؤں کا عالمانہ جائزہ لیا ہے اس میں ''ادب میں جدیدیت کا مفہوم'' کے عنوان سے ان کا بھی ایک مبسوط مقالہ شامل ہے، مگر جدیدیت کی تحسین و وکالت کے باوجود وہ اس ادبی نظریے سے پوری طرح مطمئن نہیں تھے اور ترقی پسند تحریک کی طرح اس سے بھی کلی مفاہمت نہ کرسکے۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ وہ ترقی پسند تحریک سے بیزار تھے نہ انہوں نے جدیدیت سے حذر کیا بلکہ انہیں ادب وتنقید کے مختلف النوع نظریات اور تحریکات سے اپنے کو ہم آہنگ کرلینے کا سلیقہ آتا تھا اور درمیانِ قعرِ دریا تختہ بند ہوکر دامن کو تر ہونے سے بچالینے کا ہنر معلوم تھا ان کے مزاج وطبیعت میں اعتدال وتوازن تھا، وہ ہر ایک سے مفاہمت کے باوجود کسی کے اندر ضم نہیں ہوتے تھے، بلکہ اپنی الگ پہچان اور علاحدہ شناخت بنائے رکھتے تھے، وہ جن افکار ونظریات سے متاثر ہوتے تھے، ان سے مغلوب اور پسپا نہیں ہوتے تھے، وہ ادبی فوضویت اور انتشار سے بچنے کی تلقین کرتے تھے، مگر ادب میں گروہ بندی اور ادیب ونقاد کے مختلف خانوں میں منقسم ہونے اور جدید وقدیم میں محصور ہوکر حقائق سے صرف نظر کرلینے کو پسند نہیں کرتے تھے، ان کا یہ شعر اسی صورتِ حال کا ترجمان ہے ؎

کس کو سمجھائیں آج تسلسل حیات کا
دیکھو جسے اسیر جدید و کہن میں ہے

ادب وتنقید کے علاوہ دوسرے موضوعات بھی ان کے قلم کی جولان گاہ رہے ہیں، علی گڑھ اور ہندوستانی مسلمان، مسلمان اور اسلام، اسلامی معاشرہ اور تہذیب پر بھی انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کا اصل کمال ان کی تحریر کی دلکشی و دل آویزی ہے، موضوع کی خشکی کے باوجود وہ سلاست وشگفتگی اور روانی کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے، ان کی تحریر ایچ پیچ اور تعقید واغلاق سے پاک ہوتی تھی، موضوع کوئی ہوتا ان کی تحریر اور انداز بیان میں جلال و جمال موجود رہتا تھا۔

نقاد کی حیثیت سے سرور صاحب کو ایسی غیر معمولی شہرت نصیب ہوئی کہ اس کے سامنے ان کی دوسری حیثیتیں بالکل دب گئیں، حالانکہ وہ بڑے اچھے شاعر تھے، دس گیارہ برس کی عمر ہی سے شعر کہنے لگے تھے، سینٹ جانس کالج آگرہ میں ان کو شاعرانہ ماحول ملا، اس وقت آگرہ شعر و ادب کا مرکز تھا، بعض اساتذہ شعراء موجود تھے، اس ماحول نے ان کے شعری ذوق کو جلا بخشی، وہ مشاعروں میں شریک ہونے لگے اور ان کا کلام چھپنے لگا، علی گڑھ میں بھی ان کو شاعرانہ ماحول ملا، یہیں ۱۹۳۵ء میں ان کے کلام کا پہلا مجموعہ ''سلسبیل'' کے نام سے چھپا بعد میں ان کے دو مجموعے ''ذوق جنون'' اور ''خواب وخلش'' شائع ہوئے۔

سرور صاحب نے غزلیں اور اشخاص و واقعات پر نظمیں کہی ہیں، وہ اپنے کو ذات وکائنات کا شاعر کہتے تھے، لیکن وہ شاعری سے بڑے کاموں کے لیے پیدا ہوئے تھے، چنانچہ جب ان کی مشغولیتیں بڑھیں اور تنقیدی مباحث کی جانب ان کو زیادہ توجہ کرنی پڑی تو شاعری کے لیے زیادہ وقت نہیں نکال سکے، مشاعروں میں جانا اور رسالوں میں کلام بھیجنا کم کردیا، ورنہ جس زور وشور سے وہ شاعری کے کوچے میں وارد ہوئے تھے اگر یہ قائم رہ جاتا اور وہ شعر وسخن کو اپنا مشغلہ بنالیتے تو جس طرح ادب و تنقید کو نیا انداز اور نیا لہجہ عطا کرکے اپنی عظمت کا لوہا منوایا ہے، اسی طرح اس میدان میں بھی گوئے سبقت لے جاتے، تاہم ان کی شاعری کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، کچھ نمونے پیش کیے جاتے ہیں ایک غزل کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

شانِ شہی نہ زلفِ شکن در شکن میں ہے
وہ بانکپن جو منصبِ دار ورسن میں ہے
دشت و دمن میں پھول کھلائے تو بات ہے
یہ کیا بہار ہے جو مقید چمن میں ہے
میرا لہو بھی کام کچھ آہی گیا ضرور
شوخی بلا کی آج ترے پیرہن میں ہے
ہم انقلاب چاہیں تو بڑھ جائے کچھ جمود
فتنہ گری نئی یہ سپہر کہن میں ہے
عرفان و آگہی کے تقاضے بدل گئے
جادو عجیب اس نگۂ سحر فن میں ہے

پگھلے گی اے سرورؔ ہمالہ کی برف بھی
طوفاں تلاشِ گنگ و جمن میں ہے

ان اشعار کے تیور دیکھئے:

یہ لہو جس میں تب و تابِ نفس سے تیرے
دیکھ ایوانِ حکومت میں چراغاں نہ بنے
لوگ ہر شمع کو فانوس بنادیتے ہیں
شعلہ اپنا بھی چراغِ تہ داماں نہ بنے
اگ ہرسنگ میں جو لعل و گہر بنتا تھا
وہ شرارہ بھی کہیں شمع شبستاں نہ بنے
موج جو کرتی تھی ہر گام پہ طوفاں تخلیق
کسی گلزار کی اک جوئے خراماں نہ بنے

چند اور شعر واں کی معنویت اور شاعر کے احساس و تخیل کی بلندی پر غور کیجئے۔

ہند کے جلوۂ صدرنگ کا ہے پاس ضرور
اس میں سوزِ عرب و حسنِ عجم یاد رہے
کارواں منزلِ نو کے لیے ہو سرگرمِ سفر
اپنی تہذیب کا بھی نقشِ قدم یاد رہے
چمنِ علم و ادب میں نئی کلیوں کے حضور
میر و غالب کے شگوفوں کا بھرم یاد رہے

علی گڑھ سرور صاحب کا خاص مرکزِ عقیدت تھا اُس سے اُن کا رشتہ صرف ملازمت کا نہیں تھا بلکہ اس سے ان کو ذہنی وجذباتی لگاؤ تھا، وہ اس سے وابستہ افراد سے یہ چاہتے تھے کہ اس کے مفاد پر اپنا مفاد قربان کردیں اُسے صرف جاہ ومنزلت کا ذریعہ نہ بنائیں، اس سے صرف لینے کی فکر میں نہ رہیں بلکہ اسے دینے کے لئے بھی آمادہ ہوں، جو لوگ یونیورسٹی کے ذمہ دارانہ مناصب پر فائز ہوں وہ اس کے عظمت شناس، اس کی روایات وخصوصیات سے واقف، تعلیم کے ماہر اور تعلیمی مسائل کو سمجھنے والے ہوں۔

وائس چانسلر محمد حامد انصاری کے بقول ”سرور صاحب ان ہستیوں میں تھے جن کی وجہ سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو پہچانا جاتا تھا“۔ علی گڑھ کے نام ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

اے کہ کرنوں سے تری اپنے سیہ خانے میں
چاند کا نور ستاروں کی چمک باقی ہے
لالہ کاروں سے تری بادِ خزاں کے باوصف
اپنے ویرانے میں پھولوں کی مہک باقی ہے
کون سمجھے ترے پُرسوز تخیل کے سوا
اب بھی برفاب میں شعلوں کی لپک باقی ہے

وہ سرسید کو عظیم وجلیل شخص سمجھتے تھے اور اس سے متفق نہیں تھے کہ سرسید کو مغرب کی ہر چیز اچھی اور اپنی ہر چیز بدتر دکھائی دیتی تھی، انہیں اپنا مذہب عزیز تھا، اس پر حملہ ہوتا تو تڑپ اٹھتے، وہ اس سے متفق نہ تھے کہ سرسید انگریزوں کے آلہ کار تھے، ان کا کام مسلمانوں کو غلامی پر راضی کرنا تھا بلکہ وہ وقت کی نبض کو پہچانتے تھے اور دیکھتے تھے کہ مغرب ہر چیز کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتا تھا، وہ اس سے واقف تھے کہ مغرب نے سائنس کی مدد سے علمی سرمائے میں اضافہ کیا ہے، وہ مغرب کے تہذیبی کارناموں سے آنکھیں بند کرنے کے بجائے ان سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔

سرور صاحب شریف، وضع دار اور خلیق انسان تھے، ان کی طبیعت میں دردمندی ضبط وتحمل اور حلم وبردباری کے ساتھ شگفتگی اور زندہ دلی تھی، جلدی طیش واشتعال میں نہ آتے ان کو کسی سے عداوت اور نفرت نہ تھی، اپنے مخالفین کی باتیں سُن کر پی جاتے اور غصہ نہ ہوتے، شاہ معین الدین صاحب کہتے تھے کہ انجمن ترقی اردو کے جلسوں میں بعض لوگ بڑے سخت اور ناگوار لب ولہجہ میں جا وبے جا اعتراضات کرتے تھے مگر غصہ تو درکنار ان کی پیشانی پر شکن بھی نہیں آتی تھی اور جب موقع آتا تو نرم وشیریں انداز سے سارے اعتراضات کا ایسا جواب دیتے کہ سب لوگ ٹھنڈے ہوجاتے۔

چھوٹوں سے بڑی شفقت کا برتاؤ کرتے، کبھی ان کی دل شکنی نہ کرتے، اپنے شاگردوں کی ہمیشہ دل جوئی اور حوصلہ افزائی کرتے، ان کی تحریروں کی تحسین کرکے ان کی ہمت بڑھاتے مگر بڑے اصول پسند اور قاعدے ضابطے کے پابند تھے، وظائف اور داخلوں کے معاملے میں کوئی رورعایت نہیں کرتے تھے، کسی طالب علم کا نمبر بڑھانے یا کسی شخص کے تقرر کے معاملے میں وہ کسی کی سعی وسفارش قبول نہیں کرتے تھے۔ صرف اہلیت وصلاحیت ہی کو معیار بناتے تھے، بعض لوگ امیدوار یا داخلے کے خواہش مند کی غربت یا مذہب وقومیت کا حوالہ دے کر اس کے لیے ہمدردی کے طالب ہوتے تھے، مگر وہ بلاتامل معذرت کردیتے تھے۔

اوقات ومعمولات کے پابند تھے، کثرتِ کار اور مشاغل کی زیادتی کی بنا پر ان کو بزم وانجمن آرائی کے لیے وقت نہ ملتا تھا، رات اور صبح کا وقت مطالعہ وتصنیف کے لیے وقف تھا، اس میں اگر کوئی آجاتا اور خلل انداز ہوتا تو بڑی ناگواری ہوتی تھی۔

سرور صاحب کی گوناگوں علمی ادبی اور تنقیدی خدمات کی بڑی پذیرائی ہوئی، مختلف ریاستوں کی اردو اکیڈمیوں نے انہیں اپنے سب سے بڑے اعزاز سے نوازا، ساہتیہ اکاڈمی اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے اعزاز بھی ان کو ملے۔ حکومت ہند نے پدم بھوشن اور صدر پاکستان نے طلائی تمغہ دے کر ان کی عزت افزائی کی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ انہیں عالمِ آخرت کے بلند مدارج عطا کرے۔
آمین! (''ض''، اپریل ۲۰۰۲ء)

ڈیسائی، ضیاء الدین، ڈاکٹر

ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی مرحوم

(ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی)

۲۴/ مارچ ۲۰۰۲ء کو آثارِ قدیمہ وعلمِ کتبات کے ماہر اور مرکزی حکومت کے ادارے برائے کتبہ شناسی ناگ پور کے سابق ڈائریکٹر ڈاکٹر ضیا الدین ڈیسائی نے ۷۷ سال کی عمر میں احمد آباد میں داعیِ اجل کو لبیک کہا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

وہ کئی ماہ سے علیل اور احمد آباد کے ایک اسپتال میں داخل تھے، ان کی وفات کی اطلاع اس لیے تاخیر سے ملی کہ ان دنوں احمد آباد بلکہ گجرات میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جاری تھی جس میں ہزاروں انسان زندہ جلادئے گئے اور لاکھوں بے خانماں اور برباد ہوکر اپنے ہی وطن میں بے وطن ہوکر رہ گئے۔ خود ڈیسائی صاحب مرحوم کے صاحبزادے کی دوا کی دکان بھی شرپسندوں نے جلادی تھی، چنانچہ اس ہولناک قتل عام کی وجہ سے اورخبریں دب گئیں اور ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی کے حادثہ انتقال کی خبر بھی نہ لگ سکی اور وہ کرفیو کے دوران سپرد خاک کردئے گئے۔

ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی مرحوم احمد آباد کے رہنے والے تھے۔ ۱۸/مئی ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم بمبئی میں ہوئی تحصیلِ علم کے بعد وہ درس و تدریس سے وابستہ ہوگئے کچھ دنوں تک اسمٰعیل یوسف کالج بمبئی اور دھرمندر سنگھ کالج راج کوٹ سے بطور لکچرر وابستہ رہے۔ ۱۹۵۳ء میں آرکیالوجیکل سوسائٹی آف انڈیا ناگ پور کے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ برائے کتبات مقرر ہوئے پھر سپرنٹنڈنٹ ہوئے اور آخر میں ترقی کر کے ڈائریکٹر برائے کتبات کے عہدہ پر فائز ہوئے اور اسی عہدہ سے ۱۹۸۰ء میں سبکدوش بھی ہوئے۔

ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی مرحوم ملک کے ممتاز عالم ومحقق تھے۔ تاریخ وآثار اور کتبات ان کا خاص موضوع تھا، ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ فارسی زبان وادب میں بھی صاحب کمال تھے، لیکن ان کا امتیازی وصف کتبہ شناسی تھا جس میں انہیں یدطولیٰ حاصل تھا، ان کی اس مہارت کا اعتراف ملک نے بھی کیا اور ماہر کتبات کی حیثیت سے انہوں نے بین الاقوامی شہرت بھی حاصل کی۔

ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی مرحوم تصنیف وتالیف کا عمدہ مذاق رکھتے تھے۔ اپنے موضوع پر انہوں نے کئی اہم اور معرکۃ آرا کتابیں انگریزی میں لکھیں، ان کی ایک کتاب ''اپی گرفیا انڈیکا آرکیا لوجیکل سروے آف انڈیا'' ہے، جسے ۱۹۶۷ء میں منیجر پبلی کیشنز دہلی نے شائع کیا۔ یہ دراصل مجموعہ مقالات ہے جس کو ڈیسائی صاحب نے مرتب کر کے شائع کیا ہے، دوسرے اہل قلم کے مقالات کے علاوہ اس میں ڈیسائی صاحب کے تین قیمتی اور گراں قدر مقالات شامل ہیں، ایک مقالہ میں رضیہ سلطانہ کے عہد کے کتبات کا ذکر ہے، دوسرے میں مملوک سلاطین کے عہد کے کتبات کا ذکر ہے، جب کہ تیسرے مقالہ میں غیاث الدین تغلق کے عہد کے کتبات کی تفصیل ہے۔ یہ کتبات اترپردیش کے مختلف اضلاع وقصبات سے دریافت ہوئے تھے، ان میں مہوبہ اور ظفرآباد وغیرہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

دوسری کتاب ''اپی گرافیا انڈیکا عربک اینڈ پرشین'' ہے جس میں عربی وفارسی کے کتبات کو موضوعِ تحقیق بنایا گیا ہے۔ تیسری کتاب ''ملفوظات: ایز اے سورس آف پالیٹیکل سوشل اینڈ کلچرل ہسٹری آف گجرات اینڈ راجستھان'' ہے۔ یہ کتاب ان کا ایک بڑا تحقیقی کارنامہ ہے، اس میں انہوں نے گجرات اور راجستھان کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی تاریخ کے ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت سے ادب کا جائزہ لیا ہے اور ادب کو تاریخ کے ایک ماخذ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

ایک کتاب ہند اسلامی طرز تعمیر ہے جسے پبلی کیشنز ڈیویزن نے شائع کیا ہے۔ اسی ادارہ نے ان کی ایک اور کتاب ''ہندوستان میں اسلامی علوم کے مراکز'' بھی شائع کی ہے، ان دونوں کتابوں کو علی الترتیب اختر الواسع اور بہار برنی نے اردو کا جامہ پہنایا ہے، اس سلسلہ کی ان کی ایک گراں قدر تصنیف ''ہندوستان کی مسجدیں'' بھی ہے اور اسے بھی پبلی کیشنز ڈیویزن ہی نے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا۔ اس میں اولاً اسلام میں مسجد کے مقام و مرتبہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کے آغاز وارتقاء، ہندوستان میں مساجد کی تعمیر، اولین مساجد اور طرز تعمیر وغیرہ کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ اس سلسلہ میں مختلف صوبوں مثلاً بنگال، جون پور، گجرات، مالوہ، دکن اور کشمیر وغیرہ کی مساجد اور ان کے طرز تعمیر، کا عہدہ وار جائزہ پیش کیا ہے، چند منفرد اور ممتاز مساجد کی تصاویر بھی دی گئی ہیں۔

یہ کتاب اپنے موضوع پر عمدہ کاوش قرار دی جاتی ہے اور بلاشبہ یہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کا ایک بڑا اور قابلِ قدر کارنامہ ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ انہوں نے متعدد اہم مقالات بھی سپرد قلم کئے جو مجلّہ انڈو ایرانیکا وغیرہ اور موقر علمی رسائل میں شائع ہوئے، انڈو ایران سوسائٹی اور کئی دوسری علمی انجمنوں کے وہ ممتاز رکن رہے، علماء ومحققین سے بڑا تعلق رکھتے تھے، دارالمصنفین سے ان کو عشق تھا، معارف کے بڑے قدرداں تھے۔ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب مرحوم سے ان کے مخلصانہ روابط تھے، موجودہ مدیر معارف سے بھی محبت کرتے تھے۔

علم وتحقیق کی دنیا میں اور خاص طور سے کتبہ شناسی کے میدان میں ان کی کمی برسوں محسوس کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور متعلقین کو

صبر جمیل عطا فرمائے، آمین!! (مئی ۲۰۰۲ء)

ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی

(پروفیسر سید عبدالرحیم)

''ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی ملک کے مایہ ناز فاضل ماہر کتبہ شناس اور دارالمصنفین کے بڑے قدرداں تھے، ان پر گزشتہ اشاعت میں ایک تعزیتی تحریر شائع ہوچکی ہے پروفیسر سید عبدالرحیم ڈاکٹر صاحب مرحوم کے رفیق اور معتمد علیہ تھے، ان کا یہ مضمون مفصل ہے جو ان کے شکریے کے ساتھ معارف میں شائع کیا جاتا ہے۔(''ض'')

گجرات پچھلے دو ماہ سے فسادات کی آگ میں جل رہا ہے سیکڑوں معصوم جانیں نذر آتش ہوگئیں۔ ایسے ہی پُر آشوب دور میں ایک اور عظیم سانحہ علم و ادب کی دنیا میں رونما ہوا اور وہ گجرات کی ایک بلند پایہ علمی شخصیت ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی سابق ڈائرکٹر محکمہ آثار قدیمہ کے سانحہ ارتحال کا ہے، ۲۴/ مارچ ۲۰۰۲ء کی دوپہر کو ڈاکٹر صاحب نے خورشید پارک احمد آباد میں اپنی جان جان آفرین کے سپرد کردی، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

علالت و وفات: گجرات کے حالیہ فسادات کے دوران وہ زیادہ بیمار ہوگئے تھے، انہیں قلب کا عارضہ تو پہلے ہی سے تھا کئی بیماریاں لاحق ہوگئی تھیں۔ موصوف کو ایک خانگی دواخانہ کرناوتی میں داخل کیا گیا تھا، شہر میں کرفیو چل رہا تھا اس وجہ سے گھر کے لوگ بھی کماحقہ تیمارداری کے لیے نہیں پہنچ سکے۔ بالآخر ڈاکٹر ہی کے مشورے سے انہیں گھر پر منتقل کردیا گیا۔ سانس لینے میں تکلیف ہورہی تھی جس کی وجہ سے گھر پر آکسیجن لگانا پڑتا تھا۔ ڈاکٹر ڈیسائی صاحب کے قیام گاہ کے قریب پروفیسر محبوب حسین صاحب عباسی کا مکان ہے وہ ان کے آخری ایام کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ہمارے سرخیز کے علاقے میں ۲۱-۲۲ مارچ کی شب میں بڑا ہنگامہ ہوا اور کرفیو نافذ کردیا گیا۔ میں ڈیسائی صاحب سے آخری بار ۲۱/ تاریخ کی صبح ملا تو آکسیجن لگا ہوا تھا پھر بھی اچھی طرح بات چیت کی۔ کچھ وقت پہلے امریکہ کے Prof. Dr. John Seyller کے ایک مقالہ پر نوٹس لکھے تھے اس کی کاپی مجھے دی اور امریکہ روانہ کرنے کے لیے کہا، ان کا پتہ خود انہوں نے ڈائری سے تلاش کرکے مجھے لکھوایا، اس وقت بھی ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ اتنی جلد آخری وقت آجائے گا۔ ۲۴/ مارچ کو سخت کرفیو تھا میں دوپہر ڈیڑھ بجے گھر پر ہی ظہر کی نماز ادا کررہا تھا کہ ڈیسائی صاحب کے بھتیجے ایک شناسا ڈاکٹر محسن حسنی کو لے کر ڈیسائی صاحب کے مکان پر جاتے ہوئے میرے یہاں آئے اور دروازے پر خبر دے گئے کہ حالت نازک ہے، نماز سے فارغ ہوا ہی تھا کہ ڈیسائی صاحب کے لڑکے طارق کا فون آیا اور انتقال کی خبر دی، اب باہر تو کرفیو تھا، بڑی سڑک پر تو جا نہیں سکتے تھے، لہٰذا ہماری سوسائٹی کے پیچھے ایک کچے راستے سے خورشید پارک کے عقب میں پہنچا اور ایک پلاٹ کی کمپاؤنڈ کی دیوار پر چڑھ کر وہاں داخل ہوسکا کرفیو کی وجہ سے خورشید پارک کے رہنے والوں میں سے چند لوگ آگئے تھے فوراً غسال کو طلب کیا اور چار بجے تک غسل اور کفن سے فارغ ہوکر جنازہ تیار کرلیا گیا، اس وقت مسجد کے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ اعلان کیا گیا تو قریب کی سوسائٹیوں سے تقریباً ۵۰ افراد جمع ہوگئے پونے پانچ بجے مسجد کے صحن میں نماز جنازہ ادا کی گئی، امامت کی ذمہ داری بھی مجھ پر ڈالی گئی، جنازے کو ایک ٹرک میں رکھا گیا کچھ لوگ ساتھ ہی سوار ہوگئے، پولس نے اجازت دی تھی اس لیے سہولت کے ساتھ جوہا پورہ کے عام قبرستان میں تدفین ہوئی، قریب ساڑھے پانچ بجے فارغ ہوگئے''۔

ڈاکٹر صاحب کی موت علمی دنیا کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے، وہ نہ صرف ایک ماہر کتبہ شناس، سکہ شناس، تاریخ دان، محقق، مترجم، عہد اسلامی کے فن تعمیر کے رمز شناس، علوم دینیہ اور مرکز اسلامیہ کی تاریخ کے واقف کار بلکہ ہندوستان اور بیرون ہند کے کتب خانوں کے مخطوطات پر گہری نظر رکھنے والے اور فہرست ساز تھے ایسی علمی و ادبی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ راقم الحروف کو چالیس سال سے ان کی شاگردی اور رفاقت کا شرف حاصل ہے، میں نے اپنی مختصر زندگی میں ان سے زیادہ محنتی، فرض شناس، علم دوست اور فنافی العلم شخص نہیں دیکھا۔

پیدائش اور تعلیم: ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی ۱۷/ مئی ۱۹۲۵ء میں دھندوکا میں پیدا ہوئے جو احمد آباد کے مضافات میں ایک قصبہ ہے، وہ بہت ذہین طالب علم تھے، اسکول اور کالج میں ہر جماعت میں اول نمبر کامیاب ہونے پر انہیں گورنمنٹ میرٹ اسکالرشپس ملتی رہیں، ۱۹۴۶ء میں بمبئی یونیورسٹی سے بی۔اے (آنارس) کی ڈگری حاصل کی اور پوری یونیورسٹی میں امتیازی حیثیت حاصل کرنے پر آر۔ایچ۔ مودی پرائز حاصل کیا۔ ۱۹۴۸ء میں اسی یونیورسٹی سے فارسی میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی اور یونیورسٹی میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے پر چانسلر میڈل اور جعفر قاسم موسیٰ میڈل حاصل کئے۔

ملازمت: ۱۹۴۷ء میں ان کا تقرر فارسی کے لکچرر کی حیثیت سے ہوا۔ احمد آباد بمبئی اور راج کوٹ میں لکچرر رہے۔ ۱۹۵۳ء میں آثار قدیمہ ہند دہلی کے فارسی عربی کتبہ شناسی کے شعبہ میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے، ۱۹۵۸ء میں فارسی عربی کتبہ شناسی کا دفتر دہلی سے ناگپور منتقل ہوگیا۔ ۱۹۶۱ء میں وہ سپرنٹنڈنگ اپی گرافسٹ اور ۱۹۷۷ء میں ڈائرکٹر بنادئے گئے اور ۱۹۸۳ء میں اسی عہدے سے وظیفہ یاب ہوئے۔ وظیفہ پانے کے بعد ڈاکٹر صاحب ۱۹۹۲ء تک انڈین کونسل فار ہسٹارکل ریسرچ نئی دہلی کے

سینئر ریسرچ فیلو اور ۱۹۹۲ء سے ۱۹۹۸ء تک امریکن انسٹی ٹیوٹ آف انڈین اسٹیڈیز نئی دہلی کے جائنٹ چیف کالوبوریٹر رہے محکمۂ آثار قدیمہ ہند کی ملازمت کے دوران ۱۹۵۷ء میں حکومت کی جانب سے ایران بھیجے گئے، جہاں ایک سال قیام کیا اور فیضی کی نل دمن پر تحقیقی مقالہ پیش کر کے تہران یونیورسٹی سے فارسی میں ڈی لٹ کی ڈگری تحسین کے ساتھ حاصل کی۔

اعزازات:

۱۔اپی گرافیکل سوسائٹی آف انڈیا کی جانب سے ۱۹۸۲ء میں ان کو سرٹیفکٹ آف آنر "تامرپتر" دیا گیا۔

۲۔فارسی کی مسلمہ قابلیت اور خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند نے ۱۹۸۳ء میں صدراتی ایوارڈ دیا۔

۳۔۱۹۸۴ء میں ڈاکٹر آئی بی تیسی توری گولڈ میڈل ملا۔

۴۔۱۹۹۳ء میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی جانب سے سرجدوناتھ سرکار گولڈ میڈل دیا گیا۔

۵۔۱۹۹۳ء میں وڈودرہ سے سنسکار ایوارڈ ملا۔

۶۔۱۹۹۵ء میں گجرات اردو اکادمی کا ایوارڈ ملا۔

۷۔۱۹۹۹ء میں تحقیقی و تنقیدی خدمات کے اعتراف میں ایوان غالب دہلی کی جانب سے فخرالدین علی احمد ایوارڈ دیا گیا۔

اسفار: ملازمت کے دوران اور وظیفہ پانے کے بعد وہ حکومت ہند کی جانب سے اس کے نمائندہ کی حیثیت سے روس، امریکہ، عراق، افغانستان، پاکستان اور بنگلہ دیش تشریف لے گئے، ہند و بیرون ہند کی مختلف کمیٹیوں کے وہ رکن رہے ہیں۔

علمی خدمات اور تصنیفات: انگریزی زبان پر ڈاکٹر صاحب کو بڑی قدرت حاصل تھی اس لیے ان کی بیشتر تصنیفات اور مضامین انگریزی میں شائع ہوئے ہیں۔

انگریزی کے علاوہ اردو، ہندی، گجراتی اور فارسی میں بھی آپ کے مضامین موقر رسائل میں شائع ہوئے۔ چونکہ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اس وجہ سے ان کے مضامین اور کتابوں میں بے شمار حوالہ جاتی نوٹس نظر آتے ہیں۔ جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کا حق ادا کردیا۔ میں اولاً ان مضامین کی فہرست درج کرتا ہوں جو اردو میں لکھے گئے ہیں۔ بعض مضامین ان میں بہت طویل ہیں، انہیں یک جا شائع کیا جائے تو دو جلدیں مرتب کی جاسکتی ہیں۔

(۱) گفتار ملک محمود گجراتی۔ نوائے ادب بمبئی، اپریل ۱۹۵۵ء

(۲) شغل طوبی۔ نوائے ادب بمبئی، اکتوبر ۱۹۵۵ء

(۳) کچھ دیوان قاسم مینجا کے متعلق۔ مجلّہ علوم اسلامیہ علی گڑھ، دسمبر ۱۹۶۳ء

(۴) خیر المجالس اور گجرات۔ خلیق احمد نظامی میموریل والیوم علی گڑھ

(۵) اکبر کا بعد از مرگ لقب عرش آشیانی یا عرش آستانی، نذر مختار۔ نئی دہلی ۱۹۸۸ء

(۶) سترہویں صدی کے آگرہ کے ایک عارف و خطاط شاعر میر عبداللہ مشکیں قلم، معارف اعظم گڑھ ۱۹۹۱ء

(۷) مہریں ترقیمے عرض دیدے اور یادداشتیں۔ خدا بخش لائبریری جرنل پٹنہ ۱۹۹۸ء

(۸) ہندوستانی آثار قدیمہ۔ تحریر دہلی ۱۹۷۲ء

(۹) غالب کے منظوم کتبے۔ غالب نامہ نئی دہلی ۱۹۸۶ء

(۱۰) ہندوستان کے عہد اسلامی کے سکے۔ تحریر دہلی، جنوری مارچ ۱۹۷۵ء

(۱۱) دسویں صدی ہجری کا ایک اردو کتبہ۔ تحریر دہلی ۱۹۶۷ء

(۱۲) بارہویں صدی ہجری کی ایک دکنی نظم۔ تحریر دہلی ۱۹۶۸ء

(۱۳) شعراء کے سنین وفات۔ استدراک۔ تحریر دہلی ۱۹۷۷ء

(۱۴) وودربھ کی تاریخی عمارتیں۔ تذکرہ مشاہیر برار، حیدرآباد ۱۹۸۲ء

(۱۵) غالب کے دو معاصر۔ غالب نامہ ۱۹۸۴ء

(۱۶) دبستان شیرانی کا ایک محقق۔ سابر نامہ احمد آباد ۱۹۹۰ء

(۱۷) خان خاناں اور عرفی کی مکاتبت کا ایک صفحہ۔ مجلّہ علوم اسلامیہ علی گڑھ دسمبر ۱۹۶۳ء

"آثار قدیمہ ہند" (اے گوش کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ)

"تقویم ہجری وعیسوی" انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کے زیر اہتمام شائع شدہ تقویم ہجری وعیسوی کی تالیف میں ڈاکٹر صاحب نے نمایاں حصہ لیا۔ چنانچہ ابوالنصر خالدی صاحب اور مولوی محمود احمد خاں صاحب کے ساتھ مرتبین تقویم میں ان کا نام بھی شامل ہے۔

"عربی، فارسی اور اردو مخطوطات کی وضاحتی فہرست" حضرت پیر محمد شاہ درگاہ شریف احمد آباد کے کتب خانے کے مخطوطات کی فہرست ان کی نگرانی اور سرپرستی میں شائع ہوئیں۔ اس فہرست کی چھ جلدیں شائع ہوچکی ہیں۔

ہندوستان کی مسجدیں۔

انگریزی زبان میں لکھی ہوئی تصنیفات کی فہرست درج ذیل ہے:

(1) Mosques of India: New Delhi 1967,1971,1980

اس کتاب کا اردو ترجمہ "ہندوستان کی مسجدیں" شائع ہوگیا۔

(2) Centres of Islamic learning in India New Delhi- 1979

اس کتاب کا ہندی ترجمہ شائع ہوچکا ہے۔

(3) Indo Islamic Architecture, New Delhi, 1977, 1986

(4) Published Muslim Inscriptions of Rajasthan, Jaipur, 1971

(5) Life and works of Faidi - Calcutta 1961

(6) Corpus of Inscriptions stored in the Museum of Gujrat, 1987

(7) Catalogue of Muslim Gold Coins stored in the Baroda Museum and Picture Gallery, Vadodara - 1995.

(8) Taj Mahal (in joint authorship with H.K. Kaul) 1982.

(9) Perso-Arabic Epigraphy of Gujrat M.S. University Baroda, 1982.

(10) Daftar Vidya (Archival science in Gujrati, Ahmedabad) 1986.

(11) A Topographical list of Arabic Persian and Urdu Inscriptions of south India, New Delhi - 1989.

(12) Fatehpur Sikri, Source Book (Co-author) Combridge Mass, U.S.A. 1985.

(13) Muslim Monumentai Calligraphy of India (collaboration) Lowa, city U.S.A. 1985.

(14) Shah Jahan Nama of Inayat Khan English Translation, revised and edited (In collaboration with Dr. W.E.Begley) Lowa city, U.S.A. our New Delhi -1989.

(15) Taj Mahal : An Illumined Tomb (in Collaboration with Dr. W.E.Begley) Washington D.C. U.S.A. 1990.

(16) Malfuz Literature as a source for the 13th -14th Century History of Rajasthan and Gujarat Patna,

(17) English Translation of Dhakhiratul Khawanin of Shaikh Farid Bhakkari. Part-I New Delhi - 1992. (Part II and III unpublished).

(18) Arabic and Persian Manuscripts in The Khuda Baksh Library, Vol. I Corrections and Additions, Patna. 1995.

(19) Arabic Persian and Urdu Inscriptions of Western India Topographical List, New Delhi - 1999.

(20) Catalogue of Paintings Albums and Illustrated Manuscripts in the Raza Library, Rampur - New Delhi - 2001.

(21) Catalogue for the Specimen of Islamic Calligraphy in Sarabhai Foundation Museum, Ahmedabad.

(22) History of Shah Jahan Vol. I - III in joint authorship with Prof. Dr. W.E.Begley.

محکمہ آثار قدیمہ ہند کے سرکاری مجلّہ Epigraphia Indica, Arabic and Persian Supplient کے ڈاکٹر صاحب ایڈیٹر رہے۔ ان کی ایڈیٹر شپ میں اکیس شمارے شائع ہوئے۔ ان میں سب سے زیادہ مضامین ڈاکٹر صاحب ہی کے نظر آتے ہیں۔ ہندوستان اور بیرون ہند کے رسائل میں اب تک تقریباً ۲۵۰ تحقیقی مضامین چھپ چکے ہیں۔

اخلاق و عادات: ایمانداری، خلوص، خوف خدا، سچائی، پاسِ نفس، بےنفسی، پاکبازی، غیرت اسلامی، بےخوفی، حق گوئی، محنت، لگن اور نہ جانے کتنے صفاتی اور کمالاتی جواہر ڈاکٹر صاحب کی سیرت میں تابندہ نظر آتے تھے۔ صحبت ناجنس سے گریز، علمی وتحقیقی کاموں میں انہاک، پے درپے اسفار اور کم آمیزی نے آپ کو بالکلیہ یک سو کر رکھا تھا۔ وہ زندگی کے ایک ایک لمحے کی قدر و قیمت جانتے تھے۔ ان کے نزدیک کام کا انعام واعزاز صرف کام ہے، قدردانی صلہ وستائش محض اضافی چیزیں ہیں پاکستان میں ڈاکٹر صاحب کا مختصر قیام رہا۔ وہاں کے ایک متبحر عالم پیر حسام الدین راشدی صاحب سے ملاقات ہوئی جو تقریباً پچاس کتابوں کے مصنف ہیں، راشدی صاحب نے مالک رام صاحب کو ڈاکٹر صاحب سے اپنی ملاقات کا حال لکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے متعلق لکھا کہ ''ایک عرصے کے بعد ایک فنافی العلم شخص سے ملاقات ہوئی''۔ پروفیسر نور الحسن، پرفیسر خلیق احمد نظامی اور ہارون خاں شیروانی ان کی تاریخ دانی کے بے حد مداح تھے۔ ڈاکٹر صاحب جن ادیبوں اور اہل علم حضرات سے بالخصوص متاثر تھے ان میں قاضی عبدالودود صاحب، ڈاکٹر نذیر احمد صاحب، حافظ محمود خاں شیرانی، پرفیسر محمد ابراہیم ڈار صاحب اور پروفیسر نجیب اشرف ندوی صاحب قابل ذکر ہیں۔ علماء میں مولانا ابوالوفا افغانی، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور حضرت سید ابوالحسن علی ندوی مرحوم کی بہت تعریف کرتے۔ ڈاکٹر صاحب کو اللہ تعالیٰ نے حج کی سعادت بھی نصیب فرمائی تھی۔ نماز کے بہت پابند تھے۔ بیماری کی حالت میں بھی بیٹھ کر اور اشاروں سے نماز ادا کرتے۔ وہ اپنی زندگی میں کئی بڑے حادثوں (Accident) سے دوچار ہوئے۔ ان حادثوں کا موصوف نے نہایت صبر وشکر کے ساتھ استقبال کیا، گویا قدرت بھی چاہتی تھی کہ ڈاکٹر صاحب کچھ تو آرام کریں، لیکن اسپتال میں پڑے پڑے بھی وہ اپنے علمی کاموں میں مشغول رہے۔ وہ نام ونمود سے بیزار تھے۔ موت کے وقت بھی ان کا یہ جذبہ کام آیا کہ شہر میں کرفیو تھا۔ گجرات میں کئی دفعہ فسادات ہوئے۔ مسلمانوں کی زبوں حالی دیکھ کر بہت افسوس کرتے۔ ایک موقع پر مجھے لکھا کہ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے لکھنا پڑھنا بند کردیا ہو۔ لیکن حالیہ فسادات سے میں اتنا متاثر ہوں کہ دو ماہ ہوگئے نہ کچھ لکھا اور نہ پڑھا۔

عظیم شخصیتیں بھی کمزوریوں سے مبرا نہیں ہوتیں۔ یہ لازمہ بشریت ہے۔ ڈاکٹر صاحب مزاجاً سخت گو اور سخت گیر تھے۔ جو بات نرمی سے کہی جاسکتی تھی اور اس کا حل آسانی سے نکل سکتا تھا اسے بھی وہ سخت لہجے میں کہتے جس کے نتیجے میں ماحول کی فضا مکدر ہوجاتی۔ جو لوگ ان کے مزاج سے واقف تھے وہ تو کچھ برا نہیں مانتے، لیکن نئے لوگ ان سے دور ہوجاتے۔ برخلاف اس کے ان کا دل بالکل پاک تھا۔ فوراً ان کو احساس ہوجاتا اور وہ معافی مانگ لیتے۔

۱۴/اکتوبر ۲۰۰۱ء کو درگاہ حضرت پیر محمد شاہ ریسرچ سنٹر احمد آباد کے سمینار میں شرکت کا موقع ملا۔ اس وقت وہ بیماریوں کی وجہ سے بالکل لاغر ہوگئے تھے اور مزاج میں تیزی اور بڑھ گئی تھی۔ سمینار کے بعد جب ہم ان سے رخصت ہو رہے تھے تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ ہم سے اپنی سخت کلامی پر معافی مانگ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی تمام کوتاہیوں کو معاف فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عنایت فرمائے، آمین!! (جون ۲۰۰۲ء)

قاسمی، مجاہد الاسلام، مولانا

مولانا مجاہد الاسلام قاسمی

افسوس اور سخت افسوس ہے کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر آل انڈیا ملی کونسل اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے بانی اور جنرل سکریٹری، امارت شرعیہ بہار، اڑیسہ اور جھارکھنڈ کے قاضی القضاۃ و نائب امیر شریعت اور ملک و بیرون ملک کے متعدد علمی و تعلیمی اور مذہبی اداروں کے رکن مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب ۴/اپریل ۲۰۰۲ء کو وفات پاگئے۔ **انا للہ و انا الیہ راجعون۔**

اس قحط الرجال اور پُر آشوب دور میں جب امت مسلمہ پر ہر طرف سے یلغار ہو رہی ہے، اس کی مشکلات اور دشواریاں روز بروز بڑھتی جاری ہیں اور اس کے مسائل کی پیچیدگی اور الجھاؤ میں برابر اضافہ ہو رہا ہے، قاضی صاحب جیسے راہبر و مجاہد کا اسے چھوڑ کر چلا جانا اس کی کتنی بڑی بدنصیبی ہے ؎

آج شبیر پر کیا عالم تنہائی ہے ظلم کی چاند پہ زہرا کے گھٹا چھائی ہے

ابھی ان کی عمر زیادہ نہیں تھی اور طوفان حوادث میں گھری ہوئی ان کی قوم و ملت کو ان کی سخت ضرورت تھی، مگر مشیتِ ایزدی میں کس کو دخل ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ہولناک سناٹے میں جب نہ کہیں بوئے دم ساز اور کوئی آواز آتی ہے کون حریف مئے مرد افگن عشق ہوگا۔

وہ ضلع دربھنگہ (بہار) کے قصبہ جالہ میں ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے تھے، اسلامی عہد میں ان کا خاندان عہدۂ قضا پر فائز تھا۔ ان کے والد بزرگوار مولانا عبدالاحد صاحب ممتاز عالمِ دین اور شیخ الہند مولانا محمود حسن کے ارشد تلامذہ میں تھے، قاضی صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، اپنے ضلع کے بعض مدارس میں عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے دارالعلوم مئو میں داخلہ لیا، ۱۹۵۱ء میں دارالعلوم دیوبند پہنچے اور اس وقت کے اکابر علما سے کسب فیض کیا، ۱۹۵۵ء میں وہاں سے فراغت کے بعد جامعہ رحمانی مونگیر میں درس و تدریس کی خدمت انجام دینے لگے۔

مولانا منت اللہ صاحب نے ہونہار دیکھ کر انہیں اپنی تربیت میں لے لیا اور ۱۹۶۲ء میں پھلواری شریف لے آئے اور امارت شرعیہ کے کاموں میں لگا دیا۔ یہاں ان کی صلاحیتوں کے جوہر خوب چمکے اور انہوں نے اس کے پلیٹ فارم سے خدمتِ خلق، اصلاح معاشرت، مسلمانوں کے تحفظ وغیرہ کے گوناگوں قومی و ملی کام انجام دئے اور اپنی زندگی دین و علم کی اشاعت اور قومی و ملی و اصلاحی خدمت کے لیے وقف کردی، پہلے شعبۂ قضا کا نظام سنبھالا اور اسے بڑی وسعت و ترقی دی، مختلف جگہوں پر دارالقضا قائم کئے، گاؤں گاؤں کا دورہ کر کے مکاتب کے جال بچھائے، باہمی نزاعات کا تصفیہ کیا، فساد زدہ علاقوں میں جا کر ریلیف کا کام کیا، مظلوموں اور آفت رسیدہ لوگوں کی مالی، اخلاقی، سیاسی اور قانونی مدد کی، امارت سے ان کا تعلق مدۃ العمر رہا اور قاضی القضاء اور نائب امیر شریعت جیسے اہم عہدوں پر فائز ہوئے۔

قاضی صاحب کی تحریک سے مولانا سجاد اسپتال امارت کے زیر نگرانی قائم ہوا۔ جس سے غریب لوگوں کو طبی سہولتیں میسر آرہی ہیں۔ انہوں نے قضا کے نظام کو بہتر اور موثر بنانے اور مناسب افراد تیار کرنے کے لیے امارت شرعیہ کے زیر اہتمام "**المعهد العالی لتدریب القضا و الافتاء**" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جو اب تربیتِ قضا و افتا کے لئے پورے ملک میں مشہور ہے۔

اسی سلسلے میں اسلامک فقہ اکیڈمی کی تشکیل کا خیال بھی ان کے ذہن میں آیا جس کے بہت اعلیٰ پیمانے پر نہایت کامیاب بیسیوں سمینار ان کی سرکردگی میں ہوئے جن کے کئی جلدوں پر مشتمل مجلّات شائع ہوئے۔ قاضی صاحب نے اس کے ذریعہ مدارس وغیرہ میں فقہ و افتا کی خدمت پر مامور علماء و مفتیان کو ان کے زاویوں سے نکال کر نئے پیش آمدہ مسائل کا حل ڈھونڈنے اور فقہی مقالات لکھنے پر آمادہ کیا۔ مدارس کے ہونہار طلبہ و فضلاء کو بھی اس طرح کے کام کرنے کی امنگ بخشی، اس طرح علمی و فقہی مباحث پر لکھنے والے نوجوانوں کی ایک جماعت تیار کردی۔

قاضی صاحب کے خاص مربی مولانا منت اللہ رحمانی کی کوششوں سے ۱۹۷۲ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جیسا باوقار ادارہ وجود میں آیا، جس کی تشکیل کے وقت ہی سے قاضی صاحب ان کے دست راست کی حیثیت سے اس کی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیتے رہے، وہ شروع سے بورڈ کے تاسیسی اور مجلس عاملہ کے رکن رہے، شاہ بانو کیس کا معاملہ گرم ہوا تو مسلم پرسنل لا بورڈ کے نقطہ نظر کی وضاحت اور رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لیے انہوں نے ملک کا گوشہ گوشہ چھان ڈالا مسلم پرسنل لا کے تمام گوشوں اور نکات پر ان کی جیسی نظر کسی کی نہ تھی اور قدرت نے گویائی اور تعبیر و بیان کا جو ملکہ انہیں عطا کیا تھا وہ بھی دوسروں میں مفقود تھا، اس لیے بورڈ کے پہلے صدر مولانا قاری محمد طیب صاحب اور دوسرے صدر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے زمانے میں وہ بورڈ کے وکیل اور سفیر بن کر اس کی نہایت کامیاب ترجمانی کرتے رہے۔ قاضی

صاحب کی قابلِ رشک صلاحیتوں اور شاندار خدمات ہی کی بنا پر بورڈ کے تیسرے صدر کی حیثیت سے ان کا انتخاب عمل میں آیا۔ لیکن انہیں کم موقع ملا اور وہ مسلسل موذی امراض میں مبتلا رہے۔ تاہم بورڈ کو موثر اور فعال بنانے پر پوری توجہ کی اس کے مرکزی دفتر کو اپ ٹو ڈیٹ بنایا اور عصری سہولتوں سے آراستہ کیا، اس کی لائبریری قائم کی، مسلم پرسنل لا سے متعلق فقہی و قانونی کتابیں اور دستاویز جمع کیے، فقہی موسوعہ شائع کرایا۔

۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر سید محمودؒ کی مساعی جمیلہ سے آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کا قیام عمل میں آیا جس کی اٹھان بہت شاندار تھی، مگر ڈاکٹر صاحب کی زندگی ہی میں وہ اختلافات و تعطل کا شکار ہوگئی اور اب تو اس کے ٹکڑے بھی ہوگئے ہیں۔ قاضی صاحب جیسے فعال اور متحرک شخص نے یہ صورتِ حال دیکھ کر ۱۹۹۲ء میں آل انڈیا ملی کونسل قائم کی، کونسل کی اصل توجہ ملی اتحاد و اشتراک اور مسلمانوں کے انتشار اور پراگندگی دور کرنے کی جانب رہی، اس نے دینی و عصری تعلیم اور سیاسی مذہبی مسائل کو بھی اپنے ہاتھ میں لیا مگر ملی کونسل کو مسلم مجلس مشاورت جیسا مشترکہ اور باوقار پلیٹ فارم بنانے میں کامیابی نہیں ہوئی۔

قاضی صاحب دینی تعلیم کا معیار بہتر بنانے، اس کے نظام تعلیم و تربیت کی اصلاح و ترقی، اور اس کے تحفظ اور انہیں حکومت کی یورش سے بچانے کے لیے برابر فکر مند رہتے تھے، بہار و اڑیسہ کے متعدد مدارس کے وہ سرپرست تھے۔ مولانا منت اللہ رحمانی کی سربراہی میں غیر سرکاری مدارس کے نصاب و نظام تعلیم میں ہم آہنگی پیدا کرنے اور ان کا معیار بلند کرنے کے لیے آزاد دینی مدارس بورڈ قائم ہوا قاضی صاحب نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، ان کی کوشش سے مدارس اسلامیہ کونسل کا قیام عمل میں آیا، وہ وفاق المدارس الاسلامیہ کے صدر بھی تھے۔

جدید اور عصری تعلیم کے فروغ کی جانب بھی ان کی توجہ رہی، اپنے وطن جالہ میں ایک ایجوکیشنل کیمپس قائم کیا جس میں پرائمری اسکول سے ڈگری کالج اور ٹیچرس ٹریننگ کالج تک ہر سطح کی تعلیم کا انتظام کرنا چاہیے تھے، اس وقت ایک اقامتی انگلش میڈیم ہائی اسکول وہاں چل رہا ہے، امارت شرعیہ کے زیر انتظام اس کے مرکز اور بعض دوسرے اضلاع میں جو کئی ٹکنیکل ادارے قائم ہوئے ان کے قیام اور ان کے لیے وسائل و ذرائع کی فراہمی میں انہوں نے بڑی دلچسپی لی۔ ان میں خطابت اور تقریر کا ملکہ خداداد تھا، اس میں وہ دوسروں سے علانیہ ممتاز تھے، وہ اپنی موثر اور دل نشین تقریروں سے مجمع کا رخ موڑ دیتے تھے، اگر انتشار کی کیفیت ہوتی یا مذاکروں اور مباحثوں میں اختلاف ناگواری کی صورت اختیار کرلیتا تو وہ اپنی خداداد صلاحیت سے اسے صحیح رُخ پر لانے میں کامیاب ہوجاتے، قاضی صاحب کی تقریروں میں بڑی بے ساختگی روانی اور سراپا آمد ہوتی، آورد اور تصنع کا نام بھی نہ ہوتا، جو بات کہتے حسب حال اور حسبِ موقع ہوتی، الفاظ کے استعمال اور موضوع کے انتخاب میں مجمع اور مخاطب کی رعایت ملحوظ رکھتے، ان کی تڑپ، دردمندی اور سوز و گداز کی بنا پر ان کی تقریریں جادو کا کام کرتی تھیں۔

فقہ و افتا کے ماہر اور دین و شریعت کے مزاج شناس تھے لیکن دوسرے تمام علوم دینیہ بھی ان کی دست رس میں تھے اور سب پر نہایت خود اعتمادی سے گفتگو کرتے تھے، انہوں نے ہر علم و فن کی تحصیل دیدہ ریزی سے کی تھی، ان کا مطالعہ وسیع اور علم متحضر تھا، عام علماء و مدرسین کی طرح وہ صرف درسی اور مذہبی کتابوں ہی سے اشتغال نہیں رکھتے تھے بلکہ جدید خیالات و رجحانات سے بھی باخبر تھے۔ اسلام پر مستشرقین کے اعتراضات سے واقف تھے، اسلامی تاریخ کو انگریز اور ہندو مورخین نے مجروح کرنے کی جو کوششیں کی ہیں وہ ان کی نگاہ میں تھیں اور موقع بہ موقع ان کا جواب بھی دیتے تھے۔

اسلام کی طرح دوسرے مذاہب و افکار اور نظریات کا بھی انہوں نے مطالعہ کیا تھا انگریزی زبان اور جدید علوم سے بھی واقف تھے، جب ان پر گفتگو کرتے تو ان علوم کے ماہرین کو حیرت زدہ کردیتے، پریس کانفرنس میں اپنی ذہانت، حاضر جوابی، منطقیانہ استدلال اور تجزیہ و تنقیح سے صحافیوں کو عاجز کردیتے، بین الاقوامی حالات و مسائل، سیاسی تبدیلیوں اور مد و جزر پر گہری نظر رکھتے تھے۔ قاضی صاحب کا اصل ذوق علمی و تحقیقی تھا، تصنیف و تالیف کی صلاحیت ان میں بدرجۂ اتم تھی مگر ان کے کاموں کا دائرہ بہت وسیع اور پھیلا ہوا تھا، بہ کثرت سفر کرنا پڑتا تھا، اس لیے جم کر اور یکسوئی کے ساتھ انہیں تصنیف و تالیف کا موقع نہیں ملتا تھا، تاہم انہوں نے متعدد عالمانہ تصانیف اور محققانہ حواشی اردو اور عربی میں لکھ کر اس میدان میں بھی اپنا لوہا منوایا ہے بعض فتاویٰ کے مجموعوں پر تعلیقات بھی قلم بند کی ہیں۔ ان کی ادارت میں نکلنے والا سہ ماہی ''بحث و نظر'' ان کی تحریری صلاحیت فقہی بصیرت اور علمی دقتِ نظر کا غماز ہے۔

قاضی صاحب بڑے اعتدال پسند تھے، وہ تصادم اور ٹکراؤ سے بچ کر اتحاد و اشتراک کا راستہ اختیار کرتے تھے وہ مختلف الخیال افراد اور جماعتوں کو ساتھ لے کر چلنے کے عادی تھے، ان میں سب کو جوڑے رکھنے اور مطمئن کردینے کی صلاحیت تھی، کسی کو شکایت کا موقع نہ دیتے وہ جماعتی عصبیت اور تنگ نظری سے دور رہتے تھے ان میں یہ وسعت نظر تھی کہ حنفی مذہب کے جو مسائل اس زمانے سے ہم آہنگ نہیں ہیں یا ناقابل عمل ہوگئے ہیں، ان میں دوسرے مذاہب کو اختیار کرنے میں قباحت نہیں محسوس کرتے تھے، وہ نہ تقلید جامد کے قائل تھے اور نہ اجتہاد کا دروازہ مسدود سمجھتے تھے۔ مختلف فیہ اور نئے پیش آمدہ مسائل میں اہل علم اصحاب افتا سے مشورے اور تبادلہ خیال کے بعد اجتماعی رائے سے فتویٰ دیتے تھے، جس پر بعض جامد قسم کے لوگ معترض بھی ہوتے تھے، مگر عام طور سے ان کی اس فکری و ذہنی کشادگی کو پسند کیا جاتا تھا اور موافق و مخالف ہر ایک ان کی

علمی وفقہی بصیرت کا اعتراف کرتا تھا۔ قاضی صاحب نے اپنے مجتہدانہ ذوق سے فقہ اکیڈمی تشکیل کر کے فقہی جمود کو توڑنے کی جو کوشش کی وہ ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ گزشتہ برس انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز دہلی نے تفقہ واجتہاد میں ان کے کمال کا اعتراف کر کے انہیں شاہ ولی اللہ ایوارڈ دیا تھا۔

قاضی صاحب کی ایک نمایاں خوبی ان کی معاملہ فہمی ہے وہ بہت جلد مسائل کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے، اس کی وجہ سے انہیں استنباط واستخراج اور نتائج اخذ کرنے میں بڑی آسانی ہوتی تھی، علمی وفقہی مسائل کی طرح تجارتی اور معاشرتی نیز ہر قسم کے معاملات کی گہرائی تک پہنچ کر ان میں اختلاف ونزاع کا تصفیہ کر دیتے تھے۔

قاضی صاحب کی علمی عظمت، انتظامی صلاحیت اور فقہی تبحر کی شہرت ملک و بیرون ملک میں تھی مختلف اداروں اور تنظیموں سے ان کا تعلق تھا، متعدد کمیٹیوں اور اداروں کے وہ ممبر تھے، ہندوستان کے مختلف علاقوں کے علاوہ وہ پاکستان، بنگلہ دیش، ملیشیا، عرب امارات، مصر، سعودی عرب، امریکہ، برطانیہ اور جنوبی افریقہ وغیرہ کے اجتماعات میں تقریریں کرتے اور کانفرنسوں میں مقالات پڑھتے۔

قاضی صاحب بڑے متواضع اور خاکسار تھے، ان میں کبر ونخوت اور عجب و پندار نہ تھا، انہوں نے دردمند دل پایا تھا اور وہ بڑے نرم گفتار اور نرم دل تھے، ان کی زندگی دینی وعلمی کاموں کے لیے وقف تھی، ہر شخص کا کام کرنے کے لیے تیار رہتے، سب سے گرم جوشی اور خندہ پیشانی سے ملتے، میں نے کبھی انہیں غصے اور طیش میں یا کسی پر برہم ہوتے نہیں دیکھا، ان پر نکتہ چینی کی جاتی تو اس سے ان کی پیشانی پر شکن نہ پڑتی، اعتراض واختلاف سے وہ نہ گھبراتے تھے اور نہ آزردہ ہوتے تھے۔ غرض ایک میر کارواں کے لیے جو رختِ سفر درکار ہوتا ہے یعنی نگہ بلند، سخن دل نواز اور جان پرسوز، وہ ان کے پاس مہیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور مسلمانوں کو ان کا بدل نصیب کرے۔ آمین!! (''ض''، مئی ۲۰۰۲ء)

والی آسی

والی آسی

۱۴/اپریل کو اردو کے ایک خوش گو اور خوش فکر شاعر والی آسی کا انتقال ہوگیا، انہیں شاعری اور اردو زبان کی خدمت کا ولولہ اپنے نامور والد، مولانا عبدالباری آسی مرحوم سے وارثت میں ملا تھا۔ والی مرحوم کی تعلیم ممتاز اسکول اور امیر الدولہ اسلامیہ کالج لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ جناب ساجد لکھنوی سے ان کی دوستی تھی، دونوں نے لاٹوش روڈ پر مکتبہ دین ودنیا قائم کیا، جہاں سے متعدد مجموعے شائع کئے، دونوں نے مل کر نعتیہ کلام کا ایک مجموعہ "ارمغانِ نعت" کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا تھا، جو بہت مقبول ہوا۔

والی مرحوم شریف، ملنسار مگر خود دار شخص تھے، صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے ان کی شاعری فکر و خیال کی مہارت اور اسلامی رنگ کی حامل ہوتی تھی، ان کے دو مجموعے ''شہد'' اور ''موم'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں، رسالوں میں بھی ان کا کلام چھپتا رہتا تھا، مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے، ان کا ترنم بہت اچھا تھا مگر اکثر تحت اللفظ پڑھتے تھے، آواز اتنی پاٹ دار ہوتی تھی کہ سامعین خود بہ خود متوجہ ہو جاتے تھے، اپنے جان دار کلام کی وجہ سے ملک کے علاوہ دوحہ، قطر، مسقط، جدہ، دبئی، لندن، اور نیویارک کے مشاعروں میں بھی مدعو کئے جاتے تھے، ان کے شاگردوں کا وسیع حلقہ تھا، جن میں مشہور شاعر منور رانا بھی ہیں، وہ بڑے یار باش تھے، امین آباد میں ان کی دکان پر دوست شاعروں کا جمگھٹ رہتا تھا۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں، جو آزادی کے پچاس ۵۰ برس گزرنے کی مناسبت سے کہے گئے ہیں:

کبھی کیا نہ کسی سے بیاں پچاس برس
کہ ہم نے کیسے گزارے یہاں پچاس برس
یہ چاہتے تھے قصیدہ ترا لکھیں لیکن
لہو میں ڈوبی رہیں انگلیاں پچاس برس
درخت کاٹے گئے اور سر بھی کاٹے گئے
مگر کھلی نہ کسی کی زباں پچاس برس
خود اپنی جان بچانے کی چکر ہی میں رہے
ڈرے ڈرے سے میرے پاسباں پچاس برس

اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور اعزہ کو صبر جمیل مرحمت فرمائے۔ (''ض''، مئی ۲۰۰۲ء)

ندوی، شہاب الدین، مولانا

مولانا شہاب الدین ندوی

قارئین معارف کو اس اطلاع سے نہایت رنج ہوگا کہ ان کے محبوب اور معارف کے خاص مضمون نگار مولانا شہاب الدین ندوی ۱۹/اپریل ۲۰۰۲ء کو سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وہ کئی برس سے موذی امراض میں مبتلا تھے اور چند ماہ سے موت وحیات کی کشمکش میں گرفتار تھے جس کی تفصیل مجھے ۳۱/دسمبر ۲۰۰۱ء کو اپنے والا نامہ میں اس طرح لکھی تھی۔

''طبیعت بہت زیادہ خراب اور نڈھال رہتی ہے، کئی کئی دن بستر پر پڑا رہتا ہوں، علاج ومعالجے سے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے کئی قسم کے امراض میں

مبتلا ہوں اور ڈاکٹر ان کی تشخیص نہیں کر پا رہے ہیں، ایک بیماری ذرا دبتی ہے تو دوسری ابھر کر سامنے آجاتی ہے ان جان لیوا بیماریوں سے تنگ آچکا ہوں اور مزید طرفہ یہ کہ اب آنکھوں کی بینائی بھی مسلسل ضائع ہوتی جارہی ہے۔ داہنی آنکھ کا آپریشن ہوا مگر بینائی بڑھنے کے بجائے گھٹ رہی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اب میں صرف چند دن کا مہمان ہوں لیکن طبیعت جب کبھی ذرا سنبھلتی ہے تو جم کر لکھنے اور اپنے مسودات صاف کرنے بیٹھ جاتا ہوں''۔

آخر وہی ہوا، خط لکھنے کے ساڑھے تین مہینے بعد وقت موعود آگیا اور مولانا کی ساری دینی، علمی اور تحقیقی سرگرمیاں ہمیشہ کے لیے بند ہوگئیں۔

مولانا کا وطن بنگلور تھا۔ میٹرک کی تعلیم یہیں ہوئی اور دینی تعلیم کی تکمیل دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں کی۔ طالب علمی ہی کے زمانے سے ان کی طبیعت کا رجحان قرآنی علوم اور سائنس کی جانب ہوگیا تھا اور وہ ان میں تطبیق اور ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتے تھے اسی لیے لکھنؤ کے بعض کالجوں کے سائنس کے اساتذہ سے ان کا ربط وضبط ہوگیا تھا، دارالعلوم سے فراغت کے بعد وہ اپنے وطن واپس آئے تو دوسروں کے سہارے اور سرپرستی کے بغیر تنہا اپنے بل بوتے پر بڑی خاموشی مگر صبر و استقلال سے اپنی دنیا آپ تعمیر کرنے میں مصروف ہوگئے، جس کے لیے اپنی ساری دلچسپیاں اور لذتیں ترک کی، مجلس آرائی اور دوستوں کی صحبتوں کا لطف چھوڑا، جلسوں اور سمیناروں کی واہ واہ سے کان بند کئے، شادیوں اور جنازوں میں جانا بند کیا، تب جاکر انہوں نے علم و ہنر کے تازہ جوہر چمکائے میری ان کی پہلی ملاقات ۱۹۷۵ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے پچاسی سالہ جشن میں ہوئی تھی، اس وقت میں نے ان کو جس حال میں دیکھا تھا، اس کے بعد ہی سے یہ خیال ہوگیا تھا کہ کسی عظیم وجلیل مقصد کے لیے بڑے ایثار و قربانی سے کام لینا پڑتا ہے، بڑی محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے، اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ کاٹنا پڑتا ہے، راتوں کی نیند حرام کرنی پڑتی ہے، دن کے ہنگاموں سے بے تعلق رہنا پڑتا ہے، شب و روز مطالعے میں غرق رہنا پڑتا ہے، پڑھنے لکھنے میں صحت اور آنکھوں کی بینائی کھونی پڑتی ہے، مولانا کو یہ سب کچھ کر کے ہی ان کا گوہر مراد ہاتھ آیا تھا اور فرقانیہ اکیڈمی قائم ہوئی تھی جس سے ان کی کئی اور درجن کتابیں شائع ہوئیں جن کی منفرد نوعیت کی بنا پر اہل علم کو ان کا لوہا ماننا پڑا تھا ؎

جل گیا، خاک ہوا، خاک بھی برباد ہوئی
تب کہیں نام چلا عشق میں پروانے کا

مولانا میں بڑی انرجی اور غیر معمولی صلاحیت تھی، برابر مضامین نو کے انبار لگاتے رہتے تھے، وہ مجھ سے اس کے خواہش مند رہتے تھے کہ معارف کا کوئی شمارہ ان کے مضمون سے خالی نہ رہے، اگر کبھی ناغہ لمبا ہوجاتا تو شکایت کے خطوط آنے لگتے تھے، ان کو اس کی بڑی تکلیف تھی کہ ان کے مضامین اور کتابوں کا کوئی قدردان نہیں، کوئی بھی بہ طور ہمت افزائی دو بول تک بولنے کا روادار نہیں۔ ان کے جس والا نامہ کا ذکر پہلے آیا تھا، اس میں بڑے کرب سے علماء کے بارے میں تحریر فرمایا تھا:

''مجھے سب سے زیادہ شکایت علماء سے ہے جو قرآنی حقائق و معارف کو اجاگر کرنے کے بجائے انہیں دبانے اور نوع انسانی کو اندھیرے میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں انہیں مدرسے چلانے کے لئے صرف چندے کی فکر رہتی ہے اور انہوں نے قرآنی تقاضوں کو پس پشت ڈال دیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ ایک تلخ حقیقت ہے جو خون کے آنسو رلانے والی ہے آج اگر یہ امت متحرک ہوتی تو اس کی زبوں حالی کا یہ وقت کبھی نہ آتا، اسے ہماری ملت کا ایک المیہ نہ کہا جائے تو پھر کیا کہا جائے''۔

ان کی یہ شکایت بے جا نہیں تھی، گو قوم نے معارف میں چھپنے والے ان کے مضامین کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی تاہم ان کی تصنیفات کو قبولیت حاصل ہوئی اور وہ اہم اور باوقعت ضرور خیال کی گئیں، وہ خود اپنے اسی والا نامہ میں رقم طراز ہیں:

''ناچیز کی اردو، عربی اور انگریزی کتابیں مسلسل شائع ہوکر تقریباً سارے عالم اسلام میں پہنچ چکی ہیں اور خاص کر پاکستان میں بغیر اجازت ایک ایک کتاب کو کئی کئی ناشرین نے بیک وقت شائع کیا ہے، کچھ نئی کتابیں بذریعہ رجسٹری ارسال خدمت کی جارہی ہیں، آپ سے گزارش ہے کہ ان کتابوں پر خصوصی اور مفصل تبصرہ فرمائیں اور کسی کتاب پر باب التقریظ و الانتقاد میں مفصل تعارف کرائیں۔ اگر آپ یہ تبصرہ خود فرمائیں تو زیادہ بہتر ہوگا جس طرح کہ آنجناب نے تازہ معارف میں مولانا حمید الدین فراہی کی تفسیر سورۂ بقرہ پر فرمایا ہے''۔

مولانا اپنے مضامین و تصنیفات سے یہ بتانا چاہتے تھے کہ قرآن مجید جدید علوم اور سائنس و ٹکنالوجی کے خلاف نہیں ہے بلکہ ان سے قرآنی افکار و نظریات کی تائید و تصدیق ہوتی ہے، مغربی فکر و فلسفہ سے مسلمان مرعوب ہونے کے بجائے قرآن مجید کی تعلیم و ہدایت دنیا کے سامنے پیش کریں۔ ان کی نشاۃ ثانیہ اسی طرح ہوسکتی ہے کہ وہ اسلام پر کاربند رہ کر نئے علوم وفنون اور سائنس اور ٹکنالوجی کی تحصیل کریں تاکہ اسلام کی ابدی صداقت آشکار ہو، مولانا قرآن مجید کی روشنی میں نیا فلسفہ و کلام اس لیے مرتب کرنا چاہتے تھے کہ معاندین و منکرین کے باطل نظریات اور ملحدانہ خیالات کا رد و ابطال کرسکیں۔ اسے وہ وقت کا ضروری اور مقدم کام سمجھتے تھے، ان کے نزدیک اس کے بغیر نہ نوع انسانی کی اصلاح و ہدایت کا کام انجام پاسکتا ہے اور نہ اس کو گمراہی و تاریکی سے نجات مل سکتی ہے جس کا مواخذہ مسلمانوں سے ہوگا جو خلق کی اصلاح و ہدایت پر مامور

کئے گئے ہیں، ان کی تگ و دو کا حاصل یہ تھا کہ سائنس، ٹکنالوجی اور علوم جدیدہ کا رشتہ دین حق سے جوڑا جائے اور آفاق و انفس میں پنہاں دلائلِ قدرت کو آشکارا کر کے سائنس کو مسلمان بنا دیا جائے مولانا کی چند تصنیفات کے نام یہ ہیں:

(۱) چاند کی تسخیر قرآن کی نظر میں۔ (۲) قرآن اور نظام فطرت۔ (۳) اسلام اور جدید سائنس۔ (۴) اسلام کی نشاۃِ ثانیہ قرآن کی نظر میں۔ (۵) قرآن مجید اور دنیائے حیات۔ (۶) تخلیق آدم اور نظریۂ ارتقاء۔ (۷) جدید علم کلام قرآن اور سائنس کی روشنی میں۔ (۸) قرآن حکیم اور علم نباتات۔ (۹) اسلامی اور جدید عالمی نظام۔ (۱۰) اسلامی شریعت علم اور عقل کی میزان میں۔ (۱۱) عورت اور اسلام۔ (۱۲) اسلام کا قانون نکاح۔ (۱۳) اسلام کا قانون طلاق۔ (۱۴) تعداد ازدواج پر ایک نظر۔ (۱۵) جہیز ایک غیر اسلامی تصور وغیرہ۔

مولانا کی اکثر کتابوں کے عربی اور انگریزی میں ترجمے بھی ہوئے ہیں۔

مولانا شہاب الدین صاحب نے ۱۹۷۰ء میں فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ قائم کی جو اسلامی علوم، فلسفہ و کلام، جدید علوم و فنون اور جدید مسائل و موضوعات کی کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہے۔ جنوبی ہند میں تن تنہا اتنا بڑا علمی و تحقیقی مرکز اور عظیم الشان کتب خانہ قائم کر دینا ان کا بڑا کارنامہ ہے، اس سے ان کے پُرخلوص جذبے، پختہ عزم و ارادے اور سچی اور پکی دھن کا اندازہ ہوتا ہے۔ اب یہ اکیڈمی ترقی کے جو مراحل طے کر چکی ہے، اس کا حال خود مولانا نے اپنے محولہ گرامی نامہ میں یہ بیان کیا ہے:

> ''آج کل فرقانیہ اکیڈمی ترقی کے منازل طے کر رہی ہے، الحمد للہ اکیڈمی کی نئی عالی شان سہ منزلہ عمارت ابھی ابھی بن کر تیار ہوگئی ہے اور اس میں اکیڈمی کی عظیم الشان لائبریری منتقل کی جا چکی ہے جو لگ بھگ چالیس ہزار مراجع کی کتابوں پر مشتمل ہے اور اس گلشن کو پچھلے ۴۰ سے ۵۰ سالہ عرصے میں اپنے خونِ جگر سے سینچ کر اسے فروغ دیا ہے، اس نئی عمارت کا افتتاح عنقریب ہونے والا ہے، انشاء اللہ اس تقریب کے موقع پر آنجناب کو بھی مدعو کیا جائے گا''۔

افسوس ہے کہ ان کا یہ ارمان پورا نہیں ہوا اور ان کی زندگی میں اکیڈمی کی نئی عمارت کا افتتاح نہیں ہوسکا۔ ایک زمانے میں انہوں نے فرقانیہ اکیڈمی سے ''تعمیر ملت'' کے نام سے ایک رسالہ بھی نکالا تھا جس کو ناقدری کی بنا پر بند کرنا پڑا۔

مولانا دراصل سلف میڈ تھے، انہوں نے اکیلے اپنی ہمت جفاکشی اور محنت سے گوناگوں عظیم الشان کام انجام دئے۔ ان کے صاحبزادگان کو جو فارغ التحصیل ہیں، اس علمی میراثِ پدر کے تحفظ و بقا اور مزید فروغ و ترقی کا سامان کرنا چاہئے، خدائے تعالیٰ ان کو جنت الفردوس نصیب کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین۔

(''ض''، جون ۲۰۰۲ء)

صہباؔ لکھنوی

جناب صہباؔ لکھنوی

صہبا لکھنوی مدت سے بیمار تھے، وہ خلقتاً بھی نحیف اور کمزور تھے، اس کے باوجود افکار کی ترتیب و ادارت اور اس سے متعلقہ کاموں کی نگرانی کرتے تھے، بالآخر ۳۱/ مارچ ۲۰۰۲ء میں پیامِ اجل آگیا، مرحوم ''افکار'' کے بانی مدیر تھے اور صحافیوں کی اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جو صلہ و ستائش سے بے پروا ہوکر ادب پروری اور صحافت و ادب کے فروغ کے لیے صحافت کے پیشے سے وابستہ ہوتی تھی۔

صہبا صاحب کا اصل نام سید شرافت علی تھا، ان کا آبائی وطن لکھنؤ تھا، مگر وہ ۲۵/ دسمبر ۱۹۱۹ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے تھے، تقسیم سے پہلے یہیں رہایش پذیر تھے اور ۱۹۴۵ء میں یہیں سے ماہنامہ افکار جاری کیا اور اپنی ساری قوت و توانائی اسی میں لگا دی، ان میں شعر و ادب اور نقد و نظر کی جو صلاحیتیں اور قابلیتیں پنہاں تھیں۔ ان کو افکار کے لیے قربان کر دیا اور اپنے نوک خامہ سے دوسرے ارباب قلم کی تحریریں چمکاتے اور افکار میں شایع کر کے ان کی ہمت و حوصلہ بڑھاتے اور ان کی عزت افزائی کرتے، انہوں نے بڑے بڑے ادیبوں کی تحریروں کے معاملے میں اپنا حقِ ادارت محفوظ رکھا اور ان کی کوئی رو رعایت نہیں کی۔

تقسیم کے بعد کراچی آئے تو افکار نے یہاں سے دوسرا جنم لیا، صہبا صاحب مالی مشکلات اور دوسری پریشانیوں سے دوچار ہوئے اور لوگوں کی نکتہ چینی کا نشانہ بنے مگر افکار کی خدمت و ترقی میں ہمہ تن منہمک رہے، رات دن اٹھتے بیٹھتے اور چلتے پھرتے افکار ہی ان کے دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا، ان کے پاس زیادہ سرمایہ نہ تھا لیکن جو کچھ اور جس قدر تھا سب افکار کی نذر کر دیا۔ اپنے بعد بھی اس کو جاری رکھنے کے لیے افکار فاؤنڈیشن قائم کیا، وہ اور افکار لازم ملزوم تھے، انہوں نے اس کا دائرہ بہت وسیع کر دیا، ہر جگہ کے لکھنے والوں نے ان کا تعاون کیا، اب برصغیر ہی نہیں بیرونی ملکوں میں بھی اردو کی نئی بستیاں ہوگئی ہیں، اور ان میں اردو کے مرکز قائم ہو رہے ہیں، ان سب جگہوں کے ممتاز اہل قلم افکار کی محفل میں شریک رہتے ہیں، اس طرح افکار کا تعلق پوری ادبی دنیا سے تھا اور وہ مختلف خطوں کے ادب کو روشناس اور ہر جگہ کے ادیبوں کے رابطے کا کام کر رہا تھا، وہ قید مقام سے آزاد اور ادبی معیار و اقدار کو برقرار رکھ کر وسیع المشربی، انسان دوستی اور بے تعصبی کا درس دیتا تھا، صہبا صاحب کا یہ کمال تھا کہ نصف صدی سے زیادہ عرصے تک ایک ادبی رسالے کو پابندی وقت سے نکالتے رہے اپنی ذہنی جدت و اختراع کی بنا پر زندہ ادیبوں اور شاعروں پر افکار کے متعدد خصوصی نمبر نکالے اور اس میں بہت سے ادبی سلسلے شروع کئے، ادبی و تہذیبی رجحانات پر مباحثوں کا آغاز

کیا، سمیناروں اور رپورتاژوں کا سلسلہ چلایا مقتدر ادبی شخصیتوں کی آپ بیتی اور مہمان مدیروں کے اشاریے کی روایت قائم کی، زندہ اور تازہ ادب کو فروغ دے کر افکار کو شہرت و اعتبار بخشا، اسی بنا پر انہیں عہد ساز مدیروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

افکار کے عشق نے ان کو صرف اسی کی زلف کا اسیر بنا دیا تھا اور ان کا سارا وقت اسی کو بنانے اور سنوارنے میں گزرتا تھا، اس ادھیڑ بن میں ان کو خود کچھ کہنے اور لکھنے کا موقع نہیں ملتا تھا، مجاز مرحوم کہتے تھے ''صہبا نے اوروں کے گریبان سی ڈالے مگر اپنا گریبان بھول گئے'' لیکن خود افکار کا ہر شمارہ بھی تو ان کی ایک تصنیف ہوتا تھا انہوں نے اس کے جو خاص نمبر نکالے اور جو اردو کی ادبی تاریخ کا قیمتی اثاثہ بنے وہ مستقل تصانیف سے بڑھ کر ہیں، اس طرح دوسروں کا گریباں رفو کرنا اپنا ہی گریباں سینا تھا بقول اصغر ؎

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا

گو افکار کے اجرا کے بعد وہ ادب نواز، ادیب گر اور مبصر بن گئے تھے اور دوسروں کے فکر و فن کو فروغ دینے کے لیے اپنے وجود اور بظاہر اپنی ادبی ہستی کو مٹا دیا تھا جو ان کا زبردست ایثار اور قربانی ہے تاہم ادبی افق پر وہ ایک ادیب و شاعر کی حیثیت سے نمودار ہوئے تھے، ان کا پہلا شعری مجموعہ ''ماہ پارے'' بھوپال سے شائع ہوا تھا اور دوسرا مجموعہ اس کے بعد ''خاک'' کے نام سے چھپا۔ ''میرے خوابوں کی سرزمیں'' ان کا سفر نامہ ہے ''اقبال اور بھوپال'' تحقیقی کتاب ہے، ''منٹو ایک کتاب''، ''مجاز ایک آہنگ'' اور ''رئیس امروہوی فن اور شخصیت'' بھی ان کی تصانیف ہیں۔

صہبا صاحب اردو کی ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے، اسے فعال تنظیم بنانے میں انہوں نے عملاً حصہ لیا اور افکار کے ذریعہ ترقی پسند خیالات کی اشاعت کی عقیدہ و مذہب کے اختلافات سے تعرض کئے بغیر زندگی کے حقائق و تجربات اور تہذیبی و معاشرتی مسائل کو ادب میں جگہ دی، انجمن ترقی پسند مصنفین کی روداد اور تحریک کی سرگرمیوں سے متعلق چیزوں کا افکار میں ذکر کرتے۔

خوش خلق اور باوقار انسان تھے، اخلاق، وضع داری، خاکساری، ملنساری اور مستقل مزاجی ان کی سیرت کا خاص جوہر تھا، انتظامی، مالی اور دوسری طرح کی شدید مشکلات کے باوجود افکار کو نصف صدی سے زیادہ عرصے تک جاری رکھنا ان کے عزم و استقامت اور قوتِ خود ارادی کی مثال ہے، اسے محنت اور لگن سے مرتب کر کے پابندی وقت سے شائع کرنا اپنا ادبی و اخلاقی فریضہ سمجھتے تھے۔ صلح کل پر عمل پیرا تھے، خورد نواز تھے کسی کی دل شکنی اور ہمت شکنی نہ کرتے لیکن اصولوں اور افکار کی پالیسی کے بارے میں کوئی سمجھوتا نہیں کرتے تھے اور اس میں بڑی بے باکی اور صاف گوئی سے کام لیتے تھے، جوڑ توڑ سے کام لینے کے بجائے ہمیشہ خلوص اور لگن سے کام کرتے تھے اور کسی صلہ و ستایش کی توقع نہ رکھتے، وہ ارادے اور دھن کے پکے تھے، جس کام کی ٹھان لیتے اسے کر کے ہی دم لیتے۔

دین دار اور سادگی پسند تھے، نماز کے پابند تھے، قرآن مجید کی تلاوت ان کے معمول میں داخل تھی، اسلامی شعار و اقدار کو عزیز رکھتے تھے، مولانا حسرت موہانی کی طرح ان کی ترقی پسندی ان کے اچھا مسلمان ہونے میں مانع نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ علم و ادب کے اس شیدائی کی مغفرت فرمائے۔ آمین!! (''ض''، جون ۲۰۰۲ء)

سحر، ابومحمد، ڈاکٹر

ڈاکٹر ابومحمد سحر

ڈاکٹر ابو سحر ۲۹/ اپریل ۲۰۰۲ء کو شب میں بھوپال میں انتقال کر گئے، دوسرے دن صبح سیفیہ کالج بھوپال سے ملحقہ قبرستان میں تدفین ہوئی، وہ اردو کے مشہور ادیب و شاعر تھے، انہوں نے الہ آباد یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کیا اور آگرہ یونیورسٹی سے امیر مینائی پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ بعد میں یہی مقالہ ترمیم و اضافے کے بعد ''مطالعۂ امیر'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔

مرحوم سحر صاحب کو اردو شاعری کی صنف قصیدہ نگاری سے بڑی دلچسپی تھی ان کی سب سے پہلی کتاب اسی موضوع پر اردو میں قصیدہ نگاری کے نام سے ۱۹۵۸ء میں چھپی، یہ مختصر ہونے کے باوجود موضوع کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے، اس میں قصیدہ سے متعلق بڑی محنت و تحقیق سے مفید و مستند معلومات جمع کئے گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی دلچسپی کا ایک موضوع غالبیات بھی تھا، زبان و لغت و املا اور اس کی اصلاح کے متعلق بھی تحریری نقوش چھوڑے ہیں، اردو میں قصیدہ نگاری اور مطالعہ امیر کے علاوہ ان کی یہ یادگاریں بھی ہیں، تنقید و تجزیہ، انتخاب قصائد اردو مع مقدمہ و حواشی، غالبیات کے چند مباحث اردو املا اور اس کی اصلاح، زبان اور لغت۔

شاعری کی جانب جناب سحر کا طبعی میلان تھا۔ اسی راہ سے وہ ادب کے میدان میں داخل ہوئے تھے، ان کی شاعری کا آغاز نظم نگاری سے ہوا، پھر غزلیں، قطعات اور رباعیاں بھی کہیں، ابتدائی کلام محفوظ نہیں، رکھا آخر میں شعر کہنے کی رفتار سست ہوگئی تھی تاہم شعر کہنے کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا اور ''برگِ غزل'' کے نام سے شعری مجموعہ بھی چھپا۔

ابومحمد سحر کم آمیز، کم سخن سنجیدہ اور باوقار شخص تھے، شورش و ہنگامے سے دور رہتے تھے گوشہ نشینی پسند کرتے تھے، شہرت اور نام و نمود سے دلچسپی نہ تھی، اس کے اور اعزاز و انعام کے لیے نہ پریشان ہوتے اور نہ بھاگ دوڑ کرتے ان کی دنیا اپنے حلقے تک محدود تھی، درس و تدریس کے علاوہ اپنے گوشے میں بیٹھ کر علمی و ادبی کام انجام دیتے، اللہ تعالیٰ عالمِ آخرت میں ان کے درجات بلند کرے۔ آمین!! (''ض''، جون ۲۰۰۲ء)

اعظمی، عبداللطیف

جناب عبداللطیف اعظمی کی وفات

(سبط محمد نقوی)

آج ۱۸ مئی کو لکھنؤ کے ایک اردو روزنامے میں رضا لائبریری رامپور میں منعقدہ ایک تعزیتی جلسے کی کاروائی نظر سے گزری، اس میں تین ادیبوں کی وفات پر اظہارِ غم دالم کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک نام محبّ محترم عبداللطیف اعظمی صاحب مرحوم کا بھی ہے۔ ان کے ایسے مستند دانشور کے فقدان کا جو صدمہ ہوا وہ اپنی جگہ پر ہے۔ اس کا ملال مستزاد ہے کہ وہ بہت چپ چپاتے رخصت کردیئے گئے۔ ریڈیو پر بھی یہ خبر اذیت اثر سننے کو ملی۔ لکھنؤ کے ان تین اردو اخباروں میں نظر سے گزری جو ہمارے یہاں آتے ہیں۔

مرحوم جامعہ ملیہ اسلامیہ کے انتظامی عملے میں تھے لیکن تعلیمی دور سے لے کر سبکدوشی کے بعد تک مرحوم کا قلم گل افشاں رہا۔ مولانا شبلی نعمانی مرحوم کے دفاع میں ان کا جہاد اور ماہنامہ جامعہ کے احیاء میں ان کی سعی مشکور۔ ان کے عدیم النظیر تاریخی کارنامے ہیں۔

مرحوم سے ملاقات کے موقع تو بس تین چار بار آئے مگر خط وکتابت کافی رہی۔ آخر میں میرے کسی فقرے سے بددل ہوکر مراسلت کا سلسلہ قطع کردیا تھا، پھر بھی کسی بات کے سلسلے میں ہیچ مداں کے معلومات جاننا چاہے تھے تو یاد فرمایا تھا۔

مجھے نہایت خوش اخلاق، مہمان نواز اور کریم النفس انسان لگے۔ ان سے آخری ملاقات جب ہوئی تو برادرم ضیاء الحسن فاروقی صاحب بھی وہیں تشریف فرما تھے۔ یہ ملاقات ان دونوں حضرات سے آخری تھی۔ افسوس ہے کہ وہ نسل بھی اب اٹھتی جاری ہے، جس نے بزرگان پیشیں کے دور کا ادراک کیا تھا۔ میں ان دونوں کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہوں۔ فقط والسلام: سبط محمد نقوی۔ (جون ۲۰۰۲ء)

جناب عبداللطیف اعظمی

افسوس ہے کہ ۱۰ مئی ۲۰۰۲ء کو اردو کے ممتاز اہل قلم اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے عاشق وشیدائی جناب عبداللطیف اعظمی کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وہ عرصے سے بیمار تھے گزشتہ سال نومبر میں ان کی عیادت کے لیے گیا تو گردشِ روزگار کا یہ عبرت ناک منظر دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ بلبلِ ہزار داستان کی طرح ہر وقت چہکنے والا صم بکم بنا ہوا ہے، بیگم صاحبہ نے بڑی کوشش کی کہ کچھ بولیں مگر وہ ایک چپ ہزار چپ تھے۔

عبداللطیف اعظمی صاحب کی پیدائش یکم مارچ ۱۹۱۷ء کو ہوئی، ان کا آبائی وطن بندی کلاں ہے جو مسلمان روسا اور زمینداروں کے مشہور قصبہ محمد آباد گہنہ سے چار پانچ کلومیٹر جنوب مشرق میں واقع ہے، پہلے تو یہ گاؤں اور قصبہ ضلع اعظم گڑھ ہی میں شامل تھے مگر چند برس قبل یہ ضلع مئو کا حصہ ہوگئے، اس کے بعد ان سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے کہا اب آپ کہاں اعظمی ہیں؟

جناب عبداللطیف اسی گاؤں کے ایک کھاتے پیتے زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شیخ عبدالصمد ان کی پیدائش سے پہلے ہی انتقال کرگئے تھے، چار پانچ برس کے ہوئے تو ان کی والدہ نے بھی جنت کی راہ لی۔ ان کی تعلیم وتربیت اور کفالت ان کے چچا شیخ حاجی عبدالحئی مرحوم نے اسی طرح کی کہ ان کو اور ان کے دونوں بڑے بھائیوں یوسف امام مرحوم اور حاجی لطف الرحمان صاحب کو جو ابھی زندہ اور ہلدوانی (نینی تال) میں قیام پذیر ہیں اپنی یتیمی کا احساس نہیں ہوا۔

قدیم رواج کے مطابق مکتب کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ۷؍ جولائی ۱۹۲۷ء کو انھوں نے اعظم گڑھ ضلع کی قدیم اور مشہور دینی درس گاہ مدرستہ الاصلاح سرائے میر میں عربی کے پہلے درجہ میں داخلہ لیا پھر وہ ندوۃ العلماء لکھنؤ چلے گئے وہاں سے فارغ التحصیل ہوکر ۲۹؍ اگست کو جامعہ ملیہ جاکر فرسٹ ایر میں داخلہ لیا۔ اس زمانہ میں جامعہ قرول باغ میں تھی ۱۹۴۱ء میں بی اے کرکے وہ مکتبہ جامعہ کے شعبہ تصنیف وتالیف وطباعت کے انچارج ہوئے اس کے بعد ان کی ذمہ داریاں تبدیل ہوتی رہیں مگر نہ جامعہ نے ان کو چھوڑا اور نہ انہوں نے جامعہ کو چھوڑا ایک مدت گزرنے کے بعد ۵۵ء تا ۵۷ء میں انہوں نے مسلم یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے کیا اور پھر طویل عرصے کے بعد ۷۳ء تا ۷۵ء میں انہوں نے جامعہ سے اردو میں ایم اے کیا، اس کے بعد پی۔ ایچ۔ ڈی کے تحقیقی مقالے میں لگے مگر اسے مکمل کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

اعظمی صاحب کو مدرستہ الاصلاح سے بڑا تعلقِ خاطر تھا، وہ جب وطن آتے تو کئی کئی روز یہاں گزارتے، لکھنے پڑھنے کا ذوق یہیں کی طالب علمی کے زمانے میں ہوا، اس وقت یہاں مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کا طوطی بولتا تھا، وہ بہت اچھے مقرر اور ممتاز اہل قلم تھے، عبداللطیف صاحب یہاں کے تمام استادوں میں ان سے زیادہ قریب تھے اور مولانا بھی ان سے بہت مانوس تھے مولانا ہی کی صحبت میں عبداللطیف صاحب کو بولنے اور لکھنے کی اچھی مشق ہوئی، آگے چل کر ان کا یہ جوہر خوب نکھرا۔

مولانا کی سربراہی میں دائرۂ حمیدیہ قائم ہوا اور ۱۹۳۶ء میں اس کا ترجمان الاصلاح نکلا اور پریس قائم ہوا تو ان سب کاموں میں دور رہ کر بھی عبداللطیف صاحب نے بڑی دلچسپی لی، الاصلاح میں ان کے کئی مضامین اور تحریریں شائع ہوئیں، ۳۹ء کے آخر میں الاصلاح بند ہوا تو انہوں نے دائرہ کی ایک شاخ قرول باغ میں قائم کی، جہاں سے اپنے اہتمام میں مولانا اصلاحی کی کتاب ''حقیقت نماز'' پہلی بار شائع کی اس

کے دیباچے میں مولانا نے عبداللطیف صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کے لیے یہ دعا بھی کی کہ ''اللہ تعالیٰ انہیں میرے دینی خیالات میں بھی میرا اہم نوا بنادے''۔

مولانا امین احسن صاحب سے ان کے گہرے تعلق ہی کی بنا پر مولانا ابواللیث صاحب نے مرض الموت میں مجھ سے فرمایا کہ آج کل میں اپنے نام کے خطوط مرتب کررہا تھا، مولانا امین احسن صاحب کے خطوط مرتب کر کے ان پر حواشی لکھ چکا ہوں، تم لطیف ا خط لکھ دو کہ وہ ان کی طباعت کا انتظام کردیں میں نے اسپتال سے واپس آنے کے بعد ہی عبداللطیف صاحب کو خط لکھا مگر دوسرے ہی دن مولانا ابواللیث صاحب سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئے۔

ندوۃ العلماء میں بھی وہ تقریر وتحریر میں اپنا جوہر دکھاتے رہے، یہاں طلبہ کی انجمن الاصلاح کے سکریٹری بھی تھے، جامعہ ملیہ میں تو ان کی گل افشانی گفتار دیدنی ہوتی تھی، تحریری مشغلہ بھی زور شور سے جاری تھا، بی اے کی ڈگری کے لیے ''شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں'' کے عنوان سے ڈاکٹر عابد حسین کی نگرانی میں ایک مقالہ تحریر کیا جس کو بعد میں عابد صاحب کے پیش لفظ اور پروفیسر آل احمد سرور کے مبسوط مقدمے کے ساتھ شائع کیا، تو اسے بہت پسند کیا گیا، سرور صاحب نے بھی اس کی بڑی داد دی تھی، اس کی اہمیت اس بنا پر بھی تھی کہ اس وقت تک مولانا شبلی پر بہت کم لکھا گیا تھا، خود عبداللطیف صاحب بھی اسے بہت پسند کرتے تھے۔

طالب علمی کی اسی مشق اور شوق نے آگے چل کر انہیں اچھا اہل قلم، کامیاب مصنف ومؤلف اور ادیب، محقق اور نقاد بنایا، جامعہ آکر انہوں نے اردو ادب وتحقیق کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا، تحقیق میں وہ بڑی دقت نظر، خاص باریک بینی بلکہ نہایت موشگافی سے کام لیتے تھے، جزئیات پر پوری نظر رکھتے اور تفصیلات فراہم کرنے میں کوئی گوشہ اوجھل نہ ہونے دیتے، تحقیق میں اتنی محنت و دیدہ ریزی سے اسی لیے کام لیتے تھے تاکہ حقیقت وصداقت تک پہنچ کر اپنی نپی تلی رائے دے سکیں۔

آخر عمر میں وہ مشاہیرِ علم وادب کی پیدائش ووفات اور واقعات وحوادث کی صحیح تاریخیں لکھنے پر بڑا زور دیتے تھے اور خود ہر وقت اسی چھان بین میں لگے رہتے تھے، وہ اپنی تحقیق میں تاریخوں کو بنیادی اور مرکزی حیثیت دینے کی وجہ یہ بتاتے تھے کہ ''اردو ادب میں تاریخوں کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی ہے، اولاً تاریخوں کی طرف بالعموم توجہ نہیں کی جاتی اور اگر کسی نے کچھ توجہ کی بھی تو صرف سنہ لکھ دینا کافی سمجھتے ہیں، اس کے علاوہ سنہ ہو یا تاریخ صحت کا بہت کم لحاظ رکھا جاتا ہے''۔

ایک دفعہ میں نے مرحوم سید صباح الدین صاحب کے حوالے سے کہا کہ اگر کسی کی تاریخ پیدائش ووفات کچھ آگے پیچھے ہوجائے تو اس سے کیا قیامت آجائے گی، انہوں نے فوراً صباح الدین صاحب کی سنین کی بعض غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ مولانا علی میاں نے کہیں اپنا سنہ پیدائش ۱۹۱۳ء اور کہیں ۱۹۱۴ء لکھا ہے، پھر مدلل طور پر اس کے گوناگوں نقصانات بتائے۔

عبداللطیف صاحب نے ''مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں'' کے علاوہ مندجہ ذیل کتابیں لکھیں:

(۲) سوشلزم (۳) امریکی عدالت عالیہ کے شاندار کارنامے (۴) بھارت آج اور کل (پنڈت جواہر لال کی کتاب کا ترجمہ) (۵) بابائے اردو مولوی عبدالحق (۶) ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت وشخصیت (۷) جواہر لال نہرو۔ایک مطالعہ (۸) گاندھی جی اور ان کے خیالات (۹) سرسید احمد خان اور ان کی معنویت موجودہ دور میں۔ (۱۰) مولانا محمد علی۔ ایک مطالعہ (۱۱) مشاہیر کے خطوط اور ان کے مختصر حالات (۱۲) اقبال دانائے راز (۱۳) ڈاکٹر راجندر پرشاد۔عظیم رہنما اور پہلے راشٹر پتی (۱۴) تیسرے راشٹر پتی ڈاکٹر ذاکر حسین (۱۵) اردو ڈائرکٹری۔ موخرالذکر کتاب پروفیسر گوپی چند نارنگ کے اشتراک سے لکھی گئی ہے، کچھ کتابیں انہوں نے بچوں کے لیے بھی لکھی تھیں، ''اقبال دانائے راز'' بڑی کدوکاوش اور تلاش وتحقیق کا نتیجہ اور اقبالیات میں اہم اضافہ ہے، خطوط پر ان کی کتاب بہت مقبول ہوئی۔

عبداللطیف صاحب ایک تجربہ کار اور مشاق صحافی بھی تھے، دراصل ادب کے کوچے میں اس راہ سے داخل ہوئے تھے، ممکن ہے کہ مدرستہ الاصلاح اور ندوۃ العلما کی طالب علمی کے زمانے میں انہوں نے قلمی رسالے نکالے ہوں لیکن وہ طلبائے جامعہ کے رسالے ''جوہر'' کے مدیر رہے۔ ان کی محنت وتوجہ سے اس کے بعض اعلیٰ معیار کے خصوصی نمبر نکلے۔ اس کے عبدالحق نمبر کی ملک میں بڑی پذیرائی ہوئی، ۴۳۔۱۹۴۴ء میں ماہنامہ جامعہ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہوئے، ۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر عابد حسین کی ادارت میں ہفتہ وار ''نئی روشنی'' نکلا تو اس کے اسسٹنٹ ومینیجنگ ایڈیٹر مقرر ہوئے، یہ بند ہوا تو ۵۲ء میں ماہنامہ جامعہ ہمدرد خود ان کی ادارت میں نکلا، ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۷ء تک وہ انجمن ترقی اردو ہند کے معیاری رسالے ''صبح'' کے مدیر رہے۔

رسالہ جامعہ ۱۹۴۷ء میں بند ہوگیا تھا، عبداللطیف صاحب کی تگ ودو سے وہ دوبارہ جاری ہوا۔ نومبر ۱۹۶۰ء میں جامعہ کے جشن چہل سالہ کے موقع پر دور ثانی کا پہلا شمارہ انہیں کی ادارت میں نکلا، چند برس تک وہ تن تنہا بڑی محنت اور لگن سے اسے مرتب کرتے رہے، اس عرصے میں انہوں نے اس کے بعض خاص نمبر بھی نکالے، ان کی کاوش سے ملک کے کئی مشہور اہل قلم اس کے قلمی معاونین میں شامل ہوئے لیکن جب ضیاء الحسن فاروقی صاحب کناڈا سے واپس آئے تو وہ اس کے مدیر اور اعظمی صاحبؒ نائب مدیر ہوئے، فاروقی صاحب اکثر بیان کرتے تھے کہ وہ نہ ہوتے تو میرے لیے رسالہ نکالنا بہت مشکل ہوتا، وہی ساری بھاگ دوڑ کرتے، خط وکتابت کرکے مضمون

نگاروں سے مضامین حاصل کرتے، میں اسی لیے انہیں جوڑے ہوئے ہوں، ان کے بغیر رسالہ وقت سے نہیں نکل سکتا۔

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ وہ اچھے مقرر تھے، ان کی طالب علمی کے زمانے میں مدارس اور دانش گاہوں میں ڈبیٹ کا بہت رواج تھا، لطیف صاحب مقرر ہونے کے ساتھ ساتھ ڈبیٹر بھی تھے، اس حیثیت سے بھی ان کو یاد رکھا جائے گا، بحث ومباحثہ ان کی سرشت میں داخل تھا، اس میں ان سے پیش پانا اور انہیں شکست دینا بہت مشکل تھا، وہ جب کسی موضوع پر بولنے لگتے تو چپ ہونے کا نام نہ لیتے، بعض بعض موضوعات پر ہفتوں اور مہینوں بول سکتے تھے، ان کی بحثیں تقریر ہی تک محدود نہیں رہتی تھیں، بلکہ تحریروں میں بھی لوگوں سے ان کی نوک جھونک رہا کرتی تھی، رسالوں اور اخباروں میں مراسلے بازی ان کا محبوب مشغلہ تھا، وہ کہتے تھے کہ اردو اخباروں میں کچھ نہیں ہوتا، میں صرف مراسلوں کی وجہ سے انہیں دیکھتا ہوں، اکثر میں تو یہ کالم ہی نہیں ہوتا، اور جن میں ہوتا ہے وہ نہایت کمزور اور پھس پھسا، جاندار مراسلے انگریزی اخباروں کے ہوتے ہیں۔

مولانا آزاد کے انتقال کے بعد پروفیسر ہمایوں کبیر نے انڈیا ونس فریڈم شائع کی تو مولانا کے ایک مسترشد اور خاص عقیدت مند مولانا غلام رسول مہر نے اسے مولانا کی تصنیف ماننے سے انکار کیا، انہوں نے دو ایک مضمون لکھے ہوں گے، لیکن ان کے جواب میں لطیف صاحب نے مضامین اور مراسلوں کا اتنا انبار لگا دیا کہ مہر صاحب چاہے لاجواب نہ ہوئے ہوں، لیکن انہیں چپ ضرور ہو جانا پڑا۔ ایک مرتبہ اردو کے مشہور محقق رشید حسن خاں نے کسی کتاب کو ایڈٹ کرتے ہوئے عش عش کو اش اش کر دیا اور اسی کو صحیح املا قرار دیا تو عبداللطیف صاحب عرصے تک جامعہ اور ہماری زبان میں ان سے الجھے رہے، جامعہ ملیہ، ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر مجیب، لطیف صاحب کی کمزوری ہیں، ان تینوں سے ان کو بلا کی عقیدت تھی، اس لئے جہاں کسی نے اس پر نکتہ چینی کی وہ فوراً اس سے بحث وتکرار شروع کر دیتے، مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ ان تینوں پر اکثر ہفتہ وار ''صدق جدید'' میں اپنے مخصوص تنقیدی انداز میں نوٹ لکھا کرتے تھے۔ جن کا نہ ذاکر صاحب نے کبھی جواب دیا اور نہ مجیب صاحب نے، مگر لطیف صاحب ان کی محبت میں ان کے علی الرغم مولانا کے سن وسال اور مرتبہ وعظمت کی پروا کئے بغیر مراسلے لکھتے رہتے تھے، وہ جب مراسلے بازی پر آتے تو غالباً اسی وقت خاموش ہوتے ہوں گے۔ جب خود اخبار والے گھبرا کر مراسلے چھاپنا بند کر دیتے ہونگے، ان کے مراسلے اگر جمع کر کے شائع کئے جائیں تو ایک دلچسپ کتاب ہو جائے گی۔

عبداللطیف اعظمی صاحب پکے نیشنلسٹ اور کٹر کانگریسی تھے، یہ مدرسۃ الاصلاح، ندوۃ العلماء اور جامعہ ملیہ کی تعلیم کا فیض ہوگا، کیوں کہ یہ تینوں ادارے اس وقت قومی تحریک اور آزادی کی جدوجہد کا مرکز تھے، اور ان کے اکثر وابستگان کا تعلق کانگریس سے تھا، شروع میں چاہے وہ اپنے بزرگوں اور استاذوں کے اثر سے کانگریسی رہے ہوں مگر بعد میں علی وجہ البصیرت اس راہ پر گامزن ہوئے اور اس سے کبھی منحرف ہونا پسند نہیں کیا۔

لطیف صاحب علمی کی طرح عملی آدمی بھی تھے، وہ جس قدر انہماک سے تصنیف وتالیف کا کام کرتے تھے، اسی قدر توجہ اور دلچسپی سے انتظامی اور دفتری کام بھی انجام دیتے تھے، جامعہ میں ان کا تعلق ہمیشہ انتظامیہ سے رہا، اور وہ مختلف انتظامی شعبوں سے وابستہ رہے، آخر میں وہ شیخ الجامعہ کے پرسنل مددگار اور پھر سکریٹری مقرر ہوئے، لیکن یہ مشاغل اور ذمہ داریاں ان کے تصنیف وتالیف کے کام میں حارج نہیں ہوئیں، وہ اپنے گھر، دفتر اور کتب خانے میں ہمیشہ کتابوں اور رسالوں میں گھرے رہتے تھے اور کوئی نہ کوئی علمی، تحقیقی اور ادبی گتھی سلجھانے میں لگے رہتے تھے۔

۱۹۶۵ء میں دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی کی گولڈن جبلی کے انعقاد کا اعلان ہوا تو ان کی انتظامی صلاحیت کی بنا پر جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے انہیں کچھ پہلے ہی یہاں بلالیا تھا، اس وقت انہوں نے واقعی ان کا بڑا تعاون کیا، اور اپنے حسنِ انتظام کی دھاک بیٹھا دی، اس لیے ۱۹۸۲ء میں ''اسلام اور مستشرقین'' کے سمینار کے انتظام کے لیے بھی انہیں کچھ پہلے بلایا گیا، مگر اس دفعہ میں نے دیکھا کہ صبح سے شام تک وہ کتابوں کی نمائش کے کمرے میں معارف کی جلدوں کے سامنے بیٹھ کر ان سے نوٹ تیار کرتے رہتے تھے، کبھی کبھی، جب سید صباح الدین صاحب ادھر آ کر انہیں اس انہماک سے پڑھنے لکھنے میں مشغول دیکھتے تو کہتے جناب والا اس وقت علم وتحقیق کا لبادہ اتار کر صرف سمینار کی کامیابی کی فکر کیجئے، مگر وہ ہوں ہاں کہہ کر اپنے کام میں مشغول رہتے، اس لحاظ سے دیکھئے تو ان میں بڑی جامعیت تھی، وہ اچھے مقرر اور اچھے لکھنے والے بھی تھے، لائبریری اور دفتر کا کام بھی سلیقے سے کرتے تھے، شیخ الجامعہ کے اچھے پرسنل اسسٹنٹ اور سکریٹری بھی تھے اور اچھے صحافی اور پبلک ریلیشنز افسر بھی تھے اور پریس اور مکتبہ کے کام بھی خوش اسلوبی سے کر لیتے اور اپنے منصبی کاموں کے ساتھ دوسرے گوناگوں کام بھی کرتے رہتے تھے، وہ کئی برس تک انجمن ترقی اردو ہند کی جامعہ نگر شاخ کے سکریٹری تھے، اور اسی حیثیت سے رسالہ ''صبح'' کے برسوں مدیر رہے۔

عبداللطیف صاحب بڑے چاق، چوبند، مستعد، تر وتازہ اور شگفتہ رہتے تھے، ان کی امنگ اور حوصلہ ونشاط میں کبھی کمی نہیں دکھائی دیتی تھی، عزم، ارادے اور دھن کے پکے تھے، ساٹھ ستر برس کی عمر میں نہایت جوش وولولہ سے کام کرتے رہتے تھے اور ان پر کبھی تھکن اور اضمحلال طاری نہیں ہوتا تھا، ان کی زندگی سادہ اور تکلفات سے بری تھی، ایک خوش حال گھرانے سے ان کا تعلق تھا اور ان میں بڑی صلاحیتیں تھیں، لیکن اپنی علمی دوستی کی بنا پر انہوں نے جامعہ کی فقیرانہ زندگی اور بوریہ نشینی کو ترجیح دیا، انہوں

نے اپنے بعض اساتذہ کی طرح یہاں بڑی سخت زندگی گذاری مگر ہر حال میں خوش وخرم اور اپنے کام میں مگن اور منہمک رہے۔

فرائضِ منصبی کے علاوہ جو کام اپنے شوق و ذوق سے کرتے تھے، اس کے صلہ و معاوضہ کے خواہش مند نہ ہوتے، حرص وطمع کے بجائے طبیعت میں استغنا اور بے نیازی تھی، خودداری اور غیرت کا یہ حال تھا کہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے میں بڑا عار محسوس کرتے تھے، طالب علمی میں گھر والوں سے اخراجات طلب کرنے میں بڑا تکلف وتامل ہوتا تھا، بی اے کرنے کے بعد کسی ملازمت کے لیے ذاکر صاحب سے ملنے سے انکار کردیا۔

لطیف صاحب کا حلقہ تعارف بڑا وسیع تھا، جامعہ اور دہلی والوں کی طرح پورے ملک کے علمی و ادبی حلقوں سے ان کا رابطہ رہتا تھا مگر ان تعلقات کو انہوں نے کبھی فرائض منصبی میں حائل نہیں ہونے دیا، وہ جامعہ میں جن عہدوں پر فائز تھے، چاہتے تو اپنے عزیزوں اور اہل تعلق کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے تھے، وہ تین وائس چانسلروں سے منسلک رہے، لیکن نہ کبھی خود فائدہ اٹھایا اور نہ دوسروں کو فائدہ اٹھانے دیا، وہ کسی کی سفارش تک نہیں کرتے تھے، حالانکہ وائس چانسلر حضرات ان پر پورا اعتماد کرتے تھے مگر انہوں نے ان کے اعتماد کو نبھایا اور اس سے فائدہ اٹھانے کو ایمان داری اور دیانت کے خلاف سمجھا ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ نہ جامعہ کا مفاد پس پشت ہو اور نہ اہل جامعہ سے تعلقات خراب ہوں، اس کے باوجود جامعہ کے اساتذہ، طلبہ اور کارکنوں کو اس کی شکایت رہتی تھی کہ وہ شیخ الجامعہ کے سکریٹری کی حیثیت سے نہایت سخت گیر تھے، ان سے کسی کو ملنے نہیں دیتے تھے، اپنی بیوی اور مجیب صاحب کی بیوی کو بھی ان سے دفتر میں ملنے نہیں دیا، ممکن ہے ان روایتوں میں بہت کچھ مبالغہ ہو، تاہم یہ لطیف صاحب کے اصول پسند ہونے کا ثبوت ہے، اگر وہ سخت گیری سے کام نہ لیتے تو ہر کس و ناکس وائس چانسلر کو تنگ کرتا، وہ یہ سخت رویہ اسی لیے اختیار کرتے تھے کہ شیخ الجامعہ پوری یکسوئی اور انہماک سے اپنے فرائض انجام دے سکیں، علاوہ ازیں اس کے بغیر مجیب صاحب نے اپنی وائس چانسلری کے زمانہ میں جو مضامین اور کتابیں لکھی ہیں اور جن کو وہی لکھ سکتے تھے، کیسے لکھ سکتے تھے۔

ان میں تکلف اور بناوٹ نام کو بھی نہ تھی، جن لوگوں سے ملنے جلنے کا جو انداز پہلے تھا، وہی ہمیشہ رہا، وہ اپنے خوردوں سے بھی بے تکلفی سے ملتے تھے، اس کی وجہ سے وہ ہر طبقے میں مقبول تھے، کسی کو نفرت وحقارت کی نظر سے نہ دیکھتے، ان میں فخر وغرور کا شائبہ نہ تھا، ہمیشہ صبر وقناعت کے خوگر رہے، جامعہ کی قلیل تنخواہ میں بڑی صاف ستھری اور سلیقے کی زندگی گزارتے تھے، کفایت شعار تھے، فضول خرچی کو پسند نہیں کرتے تھے، عموماً پوسٹ کارڈ پر خط لکھتے تھے کہ جب پوسٹ کارڈ سے کام چل جاتا ہے اور اسی میں ساری باتیں آجاتی ہیں تو لفافے لے کر زیادہ پیسے کیوں خرچ کیے جائیں ان کا خط بہت اچھا اور پاکیزہ ہوتا تھا۔

دہلی میں وہ ہمیشہ بسوں پر سفر کرتے تھے، حالانکہ وہاں بس کا سفر سب کے بس کی بات نہیں، لیکن وہ طویل العمری میں بھی بس پر بے تکلف سوار ہوکر اس کے ہر گلی کوچے کی خاک چھانتے تھے، ان کو دہلی اور نئی دہلی کے سب ہی ادبی، علمی اور ثقافتی جلسوں اور تقریبوں میں شریک ہونا پڑتا تھا، اپنے دفتری اور خانگی کاموں سے بھی جامعہ نگر سے باہر نکلنا پڑتا تھا، اس لیے پاس بنوالیا تھا، ایک دفعہ ان سے اس پر بات ہو رہی تھی تو کہنے لگے کہ کسی دن سنوگے کہ بس سے چڑھتے اترتے میری موت ہوگئی۔ ایک دفعہ انجمن ترقی اردو کے کسی سمینار میں ملے تو میں نے عرض کیا، آج آپ کے ساتھ میں بھی بس میں جامعہ نگر جاؤں گا، انہوں نے کہا آج تو میں شاہد علی خاں صاحب منیجر مکتبہ جامعہ کی گاڑی سے جاؤں گا، میں نے کہا، یہ خلاف معمول کیسے؟ کہنے لگے، شاہد صاحب کے اصرار کو ٹال نہ سکا۔ ایک مدت تک وہ دہلی میں کرائے کے مکان میں رہے، آخر عمر میں گاؤں کی کچھ زمین نکال کر وہاں ایک مکان تعمیر کرایا، جواب مہمانوں سے بھرا رہتا تھا، وہ بڑے مہمان نواز تھے، مجھ سے کئی بار کہا کہ میرے یہاں کیوں نہیں رکتے، کسی روز دن میں ملنے جاتا تو اصرار کرکے دوپہر کا کھانا کھلاتے۔

وہ بے ضرر شخص تھے، کسی کو نقصان پہنچانے کی صلاحیت ان میں نہ تھی، اپنے بدخواہوں کا بھی برا نہ مناتے، ہر شخص سے ان کی بحث وتکرار ہوتی جس میں ناگفتنی اور سخن گسترانہ باتیں بھی ہوتی تھیں، لیکن وہ خفا نہ ہوتے اور اگر کبھی بگڑ بھی گئے تو سنبھلنے میں دیر نہ لگتی، وہ دیر تک نہ کسی سے ناراض رہتے تھے اور نہ کینہ کپٹ رکھتے جن لوگوں سے چوکھی لڑائی رہتی تھی، ان کا ذکر کبھی نامناسب انداز میں نہ کرتے۔

اللہ تعالیٰ ان کی بشری لغزشوں کو معاف کرے اور انہیں اپنی رحمت کاملہ سے نوازے (آمین)۔ (''ض''، جولائی ۲۰۰۲ء)

۱؎ مولانا اپنے خوردوں کو عموماً ''تم'' سے مخاطب کرتے تھے، عبداللطیف صاحب بھی عمر میں ان سے چھوٹے تھے، وہ جب ندوہ میں استاد تھے تو اعظمی صاحب اس وقت وہاں کے طالب علم تھے۔ عبداللطیف نے صاحب کو وہ لطیف ہی کہتے تھے اور جب سامنے ہوتے تو ''تم'' سے خطاب کرتے اس میں بے تکلفی سے زیادہ ان کے لطف وشفقت کا دخل بھی تھا۔

تاریخی غلطی: اعظمی صاحب کی تاریخ وفات ۱۱/مئی ۲۰۰۲ء بروز شنبہ، بوقت ۲ بجے دن ہے اور آپ نے ۱۰/مئی ۲۰۰۲ء لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ براہِ کرم تصحیح فرمالیں، ممنون رہوں گا۔ (''عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی''، اکتوبر ۲۰۰۲ء)

تصحیح: جولائی ۲۰۰۲ء کے معارف میں وفیات کے تحت عبداللطیف اعظمی صاحب مرحوم پر آپ کا نوٹ مبسوط اور جامع ہے اور ان کی شخصیت کی بہت اچھی عکاسی کرتا ہے، اس میں صرف ایک بات اصلاح طلب ہے۔آپ نے تحریر فرمایا ہے۔۔۔۔ ۵۵ء تا ۵۷ء میں انھوں نے مسلم یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے کیا، یہ درست نہیں ہے وہ یہاں ایم اے (عربی) کے طالب علم رہے تھے لیکن اس کی تکمیل نہیں کر سکے تھے، درمیان ہی میں اپنی بیگم کی علالت کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے دہلی واپس چلے گئے تھے۔

(''ریاض الرحمٰن شروانی''، اکتوبر ۲۰۰۲ء)

کیفی اعظمی

جناب کیفی اعظمی

مشہور و مقبول ترقی پسند اور اردو کے انقلابی شاعر جناب کیفی اعظمی ۱۰رمئی کو صبح ساڑھے چھ بجے ممبئی کے جس لوک اسپتال میں انتقال کر گئے جہاں سانس کی تکلیف کی وجہ سے دو ماہ پہلے داخل ہوئے تھے، ۱۱رمئی کو اندھیری ویسٹ کے چار بنگلہ قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔

کیفی صاحب ۱۹۱۸ء میں اعظم گڑھ کی تحصیل پھول پور کے ایک گاؤں مجواں کے زمین دار شیعہ گھرانے میں پیدا ہوئے، ان کے والد جناب سید فتح حسین رضوی اودھ کی ریاست بلہرا میں تحصیل دار تھے۔کیفی صاحب کا اصلی نام سید اطہر حسین رضوی تھا، یہ سات بھائی بہن تھے، بڑے بھائیوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی تھی، ان کو ان کے والد بزرگوار نے عربی تعلیم دلانے کے لیے فرقہ شیعہ کی مشہور درس گاہ سلطان المدارس لکھنؤ میں داخل کرایا مگر ان کا جی یہاں نہیں لگا، غالباً مدرسے کی سخت گیری اور مذہبی شدت پسندی سے گھبرا کر انہوں نے تعلیم ہی نہیں چھوڑی بلکہ مذہب سے بھی برگشتہ ہوگئے، اور غالباً آخر تک رہے، تاہم مدرسہ کی تعلیم کو خیر باد کہنے کے باوجود انہوں نے لکھنؤ اور الٰہ آباد کی یونیورسٹیوں سے مشرقی امتحانات دیئے اور اپنی ذاتی محنت و مطالعہ سے اپنی استعداد بڑھائی، اردو فارسی کے علاوہ غالباً وہ عربی، ہندی اور سنسکرت سے بھی واقف تھے۔

کیفی اعظمی کا طرۂ امتیاز ان کی شاعری ہے جس کو اس کے مخصوص لب و لہجہ، باغیانہ تیور اور انقلابی افکار و خیالات کی بنا پر بہت پسند کیا گیا، ان کے گھر میں پہلے ہی سے شعر و سخن کا چرچا تھا، اردو ہی نہیں فارسی کا ذوق بھی عام تھا، ان کے تینوں بڑے بھائی بھی شاعری کا مذاق رکھتے تھے اور صاحب بیاض تھے، خاندانی کتب خانے میں اردو، فارسی اور عربی شعرا کے دواوین تھے جو بچپن ہی سے ان کے مطالعے میں رہتے تھے، اس شاعرانہ ماحول میں وہ ۱۱ برس کی عمر ہی سے شعر کہنے لگے تھے، شاعری میں انہوں نے کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی، ان کا ذوق ہی ان کا اصلی رہبر تھا، تاہم لسان القوم حضرت صفی لکھنوی کی ادب پرور صحبتوں سے انہوں نے بہت کچھ سیکھا تھا، کیفی صاحب نے ابتدا روایتی شاعری سے کی، شروع میں حسن و عشق اور گل و بلبل کے قصوں میں الجھے مگر جب وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوئے تو ان کی شاعری کا رنگ و آہنگ تبدیل ہوگیا اور روایتی شاعری کا کوچہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔

عنفوانِ شباب میں وہ کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن ہوگئے تھے، وہ کچھ عرصے کان پور میں بھی رہے تھے، جہاں مزدور سبھا کے کارکنوں کا ساتھ ہوگیا تھا، ان لوگوں نے چوری چھپے انہیں کمیونسٹ پارٹی کا لٹریچر دینا شروع کیا، خود کیفی صاحب کا بیان ہے کہ ''انہیں اب وہ رستہ مل گیا جس پر انہوں نے زندگی کا سفر طے کیا ہے اور باوجود مفلوج ہوجانے کے اب تک اسی راستے پر چل رہا ہوں، ایک دن اسی راستے پر گروں گا اور سفر ختم ہوجائے گا، منزل پر یا منزل کے قریب'' کمیونزم پر ان کا اعتقاد اس قدر مستحکم اور راسخ تھا کہ سوویت روس کے بکھرنے کے بعد بھی اس میں تزلزل پیدا نہیں ہوا، وہ عمر بھر اشتراکیت کے مبلغ رہے اور اس کے لیے ہر قسم کی قربانیاں دیں، ان کے اثر سے ان کا پورا خاندان بیوی بچے سب ہی اس تحریک کا دم بھرتے تھے، ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں حصہ لینے کی بنا پر دو بار جیل گئے۔

اردو کی ترقی پسند تحریک سے بھی ان کا گہرا تعلق تھا اور وہ اس کے اہم ستون خیال کئے جاتے تھے۔

اشتراکیت اور ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے بعد ان کی شاعری عارض و کاکل کی حکایت اور گل و بلبل کا تذکرہ نہیں رہی بلکہ وہ اپنے دردمند دل کی داستان سنانے اور زندگی اور سماج کے پیچیدہ مسائل کی گتھیاں سلجھانے اور اس طرح کے غزلیہ اشعار کہنے لگے۔

میں ڈھونڈتا ہوں جسے وہ جہاں نہیں ملتا
نئی زمین نیا آسماں نہیں ملتا
نئی زمین نیا آسماں تو مل جائے
نئے بشر کا کہیں کچھ نشاں نہیں ملتا

ان کے نزدیک زندگی جدوجہد بن گئی۔

زندگی جہد میں ہے صبر کے قابو میں نہیں
نبضِ ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں

اب انہیں غزل کی تنگ دامانی کا احساس ہونے لگا، اس لیے سیاسی سماجی اور انقلابی نظمیں لکھ کر قوم میں باغیانہ اور احتجاجی خیالات کی پرورش کرنے لگے، ان کی نظموں میں بڑی گھن گرج، جوش و خروش اور رحم دلی تھی، ان کے پڑھنے کا انداز بھی بڑا

انوکھا اور منفرد تھا، جس سے وہ عجیب ڈرامائی کیفیت پیدا کر کے سامعین کو مرعوب و مسحور کر دیتے تھے، راقم کو مشاعروں میں بھی انہیں سننے کا کئی بار اتفاق ہوا اور دارالمصنفین کی مخصوص صحبتوں اور نشستوں میں بھی، ان کی آواز میں غضب کا جادو اور لہجہ میں بڑا رعب واثر تھا، ان کی شاعری دردوگداز اور سوز واثر کا مرقع ہوتی تھی۔

اب ان کا قلم مجبوروں، مظلوموں اور مراعات سے محروم طبقوں کے لیے وقف ہوگیا تھا، ان کی شاعری مساوات، ہمدردی اور قومی ایکتا، انصاف، جمہوریت اور انسان دوستی کا پیغام بن گئی غریبی، مفلسی، فرقہ پرستی اور فسطائیت کے خلاف احتجاج کرنا ان کا شیوہ ہوگیا تھا اور وہ مزدوروں، کسانوں، کمزوروں کے وکیل اور ترجمان ہوگئے تھے۔

کیفی صاحب کی شعری تصانیف کے نام یہ ہیں:

جھنکار، آخرِ شب، آوارہ سجدے، سرمایہ، میری آواز سنو (فلمی نغموں کا مجموعہ) ابلیس کی مجلس شوریٰ (دوسرا اجلاس)

ان کی جن نظموں کو بڑی شہرت وقبولیت نصیب ہوئی ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

اندیشے، زندگی، ایک لمحہ، ابن مریم، بہروپنی، عورت، رام کا بن باس، تلنگانہ، مکان وغیرہ موخرالذکر کے یہ دوشعر ملاحظہ ہوں:

آج کی رات بہت گرم ہوا چلتی ہے
آج کی رات نہ فٹ پاتھ پہ نیند آئے گی
سب اٹھو میں بھی اٹھوں، تم بھی اٹھو، تم بھی اٹھو
کوئی کھڑکی اسی دیوار میں کھل جائے گی

ان کے بعض اور اشعار بھی دیکھئے:

اعلانِ حق میں پھنس گیا دار و رسن تو کیا
لیکن سوال یہ ہے کہ دار و رسن کے بعد
انساں کی خواہشوں کی کوئی انتہا نہیں
دو گز زمیں بھی چاہئے دو گز کفن کے بعد
دستور کیا یہ شہرِ ستم گر کے ہوگئے
دیکھا جو مڑ کے ہم نے وہ پتھر کے ہوگئے
شور یوں ہی نہ پرندوں نے مچایا ہوگا
کوئی جنگل کی طرف شہر سے آیا ہوگا

جناب کیفی کو نثر نگاری کا بھی اچھا سلیقہ تھا، وہ بڑی خوبصورت اردو نثر لکھتے تھے، شروع میں کمیونسٹ پارٹی کے اردو روزنامہ "جنگ" میں کام کیا تھا، ایک زمانے میں ہفتہ وار "بلٹز" ممبئی میں "نئی گلستان" کے عنوان سے طنزیہ ومزاحیہ کالم لکھتے تھے، جن میں موجودہ سیاسی وسماجی مسائل کا تذکرہ ہوتا تھا، ان کا لکھا ہوا کالم دیوناگری میں دو جلدوں میں چھپ گیا ہے، آخر عمر میں وہ کبیر پر بھی کام کررہے تھے، جب مجواں تشریف لاتے تو اس کے مواد کی تلاش میں دارالمصنفین بھی آتے، کبیر پر ہندوستانی اکیڈمی کی کتاب کو وہ استفادے کے لیے دارالمصنفین سے کئی بار اپنے گھر لے گئے، وہ اچھے ڈرامے بھی لکھتے تھے۔

کیفی صاحب میں تقریر کا ملکہ خدا داد تھا، بڑے اچھے مقرر تھے، مجمع کو قابو میں کرلینے میں ان کو ملکہ حاصل تھا، ایک مرتبہ صبرحد کے سرسید انٹر کالج کے جلسے میں وہ اور میں دونوں مرحوم ڈاکٹر محمد طاہر لکچرار شبلی کالج کی دعوت پر گئے تھے، ان کی طبیعت خراب تھی، منتظمین کو اندیشہ تھا کہ وہ تشریف نہیں لاسکیں گے مگر کیفی صاحب وعدے کے پکے تھے، علالت کے باوجود تشریف لائے، معذرت کی کہ انہیں زحمت نہ دی جائے مگر لوگ کہاں ماننے والے تھے، ان سے پہلے میری تقریر ہوئی، میں نے اپنی تقریر جلد ہی ختم کرتے ہوئے کہا کہ کیفی صاحب کی موجودگی میں مجھے لمبی گفتگو کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا، اس لیے میں آپ کے اور ان کے درمیان حائل نہیں ہونا چاہتا، اس سے ان کو تھوڑی آزردگی ہوئی مگر وہ حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائے اور بیماری اور طبیعت کی بے کیفی کے باوجود بڑی وجد آفرین اور پراثر تقریر کی۔

فلم سے تعلق کی بنا پر بھی انہیں پورے ملک میں شہرت ملی، ہندوستانی فلموں کو انہوں نے دل ودماغ کو مسحور کردینے والی اپنی گیتوں سے مالا مال کیا، انہوں نے اپنے وقت کی بعض کامیاب فلموں کے لیے جو گانے لکھے، ان سے اب تک لوگ لطف اندوز ہورہے ہیں۔

ہندوستانی فلموں کے گانوں کا معیار بہت پست اور بازاری ہے، لیکن کیفی اور ان کے معاصر نغمہ نگاروں شکیل بدایونی، مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی اور جاں نثار اختر وغیرہ کی فلمی دنیا سے وابستگی سے چاہے ان کی شاعری کا نقصان ہوا ہو لیکن انہوں نے فلمی نغموں میں سوقیت اور ابتذال کو نہیں آنے دیا کیوں کہ انہوں نے کم درجہ کے شعر اور گیت لکھنے والوں کی طرح فلم بینوں کے ذوق اور پسند وناپسند کو معیار بنانے کے بجائے ان کے ذوق وپسند کو اپنے اعلا مذاق سے ہم آہنگ بنایا اور اپنے بلند معیار کو چھوڑنا گوارا نہیں کیا۔

کیفی صاحب کی ادبی خدمت کا ایک میدان ڈرامہ نگاری بھی ہے، انہیں اس سے بڑی دلچسپی تھی اور اس کا بہت ملال تھا کہ آغا حشر کے سوا کسی نے اس فن کی جانب زیادہ توجہ نہیں کی، وہ انڈین پیوپلو تھیٹر ایسوسی ایشن کے تاسیسی اور فعال رکن تھے اور بعد میں اس کے صدر بھی ہوگئے تھے اس سوسائٹی کی طرف سے پرتھوی تھیٹر میں اچھے اور مقبول ڈرامے اسٹیج کئے گئے اور انہوں نے خود بھی اس کے تحت ''آخری شمع'' کے عنوان

سے مرزا غالب کے کردار پر ایک ناٹک لکھا تھا۔

کیفی صاحب نے اردو شعر و ادب اور زبان کی گوناگوں خدمت انجام دی، ان کی خدمات کا پورا اعتراف کیا گیا، بڑے بڑے مشاعروں اور ادبی و تعلیمی جلسوں میں وہ مدعو کئے جاتے تھے، اور ان کی بڑی پذیرائی کی جاتی تھی، اکثر ریاستوں کی اردو اکیڈمیوں نے اپنے بڑے سے بڑے انعامات دیئے، دلی سرکار اور اردو اکادمی کا ملینیم ایوارڈ ابھی حال میں ان کو ملا تھا جو گیارہ لاکھ روپئے کا تھا، غالباً اس سے بڑا ایوارڈ ابھی تک اردو کے کسی شاعر یا اہل قلم کو نہیں ملا ہے، حکومت کے پدم شری اعزاز کو اس کے اردو کے ساتھ معاندانہ ومتعصّبانہ رویے کی بنا پر احتجاجاً قبول نہیں کیا۔

کیفی صاحب بڑے ظریف و طباع، نہایت شریف، خوش خلق، ملنسار اور ہمدرد و غم گسار شخص تھے، وہ کمزور طبقوں کے دکھ درد سے تڑپ اٹھتے تھے ان کی شاعری مزدوروں کسانوں اور سماج کے دبے کچلے طبقوں کے احساسات و کیفیات کا مرقع ہوتی تھی، سماجی و فلاحی کاموں سے شغف تھا، بمبئی کی اکثر تحریکوں سے وابستہ رہے، اپنے گاؤں سے ان کا تعلق کبھی منقطع نہیں ہوا، زندگی کے آخری ایام اکثر یہیں گزارے اور گاؤں کی فلاح و بہبود اور ترقی کے گوناگوں کام انجام دیئے، اپنے بنگلہ کے علاوہ باغ، سڑک اور اسکول قائم کیا، اپنی تمام کتابیں اس کے لیے نذر کردیں، ملینیم ایوارڈ کی زیادہ رقم گاؤں کی ترقی میں لگادی۔

وہ عزم و استقامت کا پیکر تھے، جس نظریے سے وابستہ تھے، اس پر ہمیشہ مضبوطی سے قائم رہے ناموافق حالات میں بھی اس سے ان کا رشتہ کمزور نہیں ہوا، ان کی قوتِ ارادی غضب کی تھی، کبھی پست ہمت اور کم حوصلہ نہ ہوتے، پچیس تیس برس سے مفلوج ہوگئے تھے، اس کے باوجود وہ مسلسل سفر کرتے رہتے تھے، کسی تقریب اور پروگرام کی شرکت میں ان کی معذوری و مجبوری حائل نہ ہوتی، ملک بھر کے مشاعروں میں بے تکلف پہنچ جاتے، لکھنے پڑھنے کا کام برابر جاری رہتا تھا، مشکل سے مشکل کام اپنے ذمہ لے لیتے اور اس کے لیے بھاگ دوڑ کرتے رہتے، اعظم گڑھ سے بمبئی کے لیے گاڑی چلانے اور اپنے گاؤں کے قریبی اسٹیشن پھول پور میں اسے رکوانے میں بڑی جدوجہد کی۔

کیفی صاحب کی ذات سے کبھی کسی کو تکلیف یا نقصان نہیں ہوا ہوگا، وہ ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے لیکن طالب علمی کے زمانے ہی میں انہیں مذہب سے توحش ہوا اور اپنے قلب و روح کی تسکین کا سامان کمیونزم میں ملا جس پر ان کی استواری آخر تک رہی مگر اپنی طبعی شرافت کی بنا پر وہ مذہبی لوگوں سے بھی راہ و رسم رکھتے تھے اور کبھی ان کی دل آزاری نہیں کرتے تھے، تعجب ہوتا ہے کہ ان جیسے ذہین اور دیدہ ور شخص پر اصل حقیقت منکشف نہیں ہوئی، کاش وہ مزید غور و فکر سے کام لیتے تو گوہر مراد ضرور ان کے ہاتھ آجاتا مگر جگر مرادآبادی نے سچ کہا ہے:

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کی بات نہیں
فیضانِ محبت عام سہی عرفانِ محبت عام نہیں

(''ض''، جولائی ۲۰۰۲ء)

۱؎ کیفی صاحب ۱۹۴۷ء میں ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے حیدرآباد گئے اور مشہور ترقی پسند جناب اختر حسن مدیر ''پیام'' کے یہاں قیام کیا۔ یہیں ان کی سالی شوکت خانم سے کیفی صاحب کی ملاقات ہوئی اس کے بعد جلد ہی وہ ان کے حبالہ عقد میں آگئیں اور زندگی بھر ان کی ہم نوا اور دم ساز بنی رہیں۔

خان، محمد مسعود، مولوی

مولوی محمد مسعود خاں

افسوس ہے کہ ۳؍ جولائی ۲۰۰۲ء کو مشہور قومی کارکن مولوی محمد مسعود خاں ایک سڑک حادثے میں دہلی میں وفات پاگئے، وہ ایک دین دار گھرانے کے فرد تھے، ان کے بڑے بھائی مولانا محمد سعید خاں شبلی نیشنل اسکول میں ہڈ مولوی اور سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے شیخ طریقت تھے، جن کی ذات سے لوگوں کو بڑا فیض پہنچا، مسعود خاں صاحب نے شروع میں دینی تعلیم حاصل کی، پھر بی۔اے ایل ایل بی کر کے اعظم گڑھ کی کلکٹری کچہری میں وکالت شروع کی۔

قوم و ملت کی خدمت کی جانب ان کا طبعی میلان تھا، اس لیے وکالت کے ساتھ اپنے جدید وطن منگراواں کے مکتب کو عربی مدرسہ کی شکل دے دی، ہر سال گرمیوں میں اس کے جلسے کراتے جن میں جمعیۃ علمائے ہند کے جنرل سکریٹری مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ بھی تشریف لاتے تھے۔

جمعیۃ علما سے تعلق کے باوجود وہ کانگریس سے اس کے متعصّبانہ اور مسلم دشمن رویے کی بنا پر سخت بیزار تھے، اس لیے مسلم مجلس میں شامل ہوگئے تھے، لیکن ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کے انتقال کے بعد اس کے حصے بخرے ہوگئے، تو انہوں نے چودھری چرن سنگھ کی پارٹی کا انتخاب کرلیا اور وفات تک اسی کے ساتھ تھے، اس وقت لوک دل (اجیت) کی ریاستی شاخ کے صدر تھے، ان میں بڑی تنظیمی صلاحیت تھی اور وہ ایک ایمان دار اور عملی آدمی تھے، اس کی وجہ سے پارٹی میں ان کا وزن تسلیم کیا جاتا تھا، اس کے ٹکٹ پر وہ کئی بار یو۔پی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے، پھر راجیہ سبھا کے ممبر ہوئے، اس وقت بھی یوپی کونسل کے ممبر تھے۔

۱۹۷۷ء میں مسٹر رام نریش یادو کی سربراہی میں اترپردیش میں جنتا پارٹی کی حکومت بنی تو مسعود خاں پی۔ڈبلو۔ڈی منسٹر ہوئے اور گوناگوں سماجی اور فلاحی کام کئے

اور پوری ریاست میں سڑکوں کا جال بچھا دیا، وہ علمائے دین اور بزرگوں سے بھی تعلق رکھتے تھے، وزیر ہونے کے بعد جب پہلی دفعہ مولانا علی میاں سے ملاقات کے لیے گئے تو کہا کہ خدمت کا کوئی موقع دیجئے، مولانا نے فرمایا کہ کئی آدمیوں سے کہا کہ رائے بریلی سے تکیہ کلاں میری قیام گاہ تک آنے والی سڑک بنوادیں، سب لوگ ہاں ہاں کر کے چلے جاتے ہیں مگر ابھی تک وہ نہیں بنی، آپ سے بھی اسی کی درخواست ہے، مسعود صاحب نے کہا آپ کب رائے بریلی جائیں گے، مولانا نے کوئی تاریخ بتائی تو انہوں نے کہا انشاء اللہ اس وقت تک بن جائے گی، چنانچہ واقعی بن گئی۔

ان کی وزارت کے زمانے میں ایک دفعہ میں ان کے آفس میں ملا، اس ملاقات کی یہ بات اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے، ''یہاں آنے کے بعد اندازہ ہوا کہ پورا ہندوستان بے ایمان ہوگیا ہے''۔

میرے علم و واقفیت کے مطابق دریا میں رہتے ہوئے بھی ان کا دامن تر نہیں ہوا اور نہ ان پر بدعنوانی اور کنبہ پروری وغیرہ میں ملوث ہونے کا الزام لگا، وہ لوگوں کے ایسے ذاتی کام کرنے سے گریز کرتے تھے، جن میں دوسروں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا تھا، اس کی وجہ سے وہ لوگ ان کی بڑی شکایت کرتے تھے جو اپنے ذاتی مفاد اور مخصوص اغراض سے ان سے چمٹے رہتے تھے، اس طرح جن کاموں میں دھاندلی اور بدعنوانی کا مرتکب ہونا پڑتا ہے، وہ خواہ ان کے عزیز اور دوست ہی کا کام کیوں نہ ہو اس میں نہیں پڑتے تھے، وزیر ہوتے ہوئے نہ انہوں نے خود ناجائز فائدے اٹھائے اور نہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو اس کا موقع دیا، خود بدعنوانیوں سے بچنا آسان ہے مگر وہ اپنے دائرہ اختیار کے لوگوں کو بھی ان کا مرتکب نہ ہونے دیتے تھے، ان کے مدرسہ کے سفرا یا وہ خود ملک یا بیرون ملک جاتے اور انہیں ہدایا و تحائف ملتے تو اسے مدرسہ ہی کے کھاتے میں رکھواتے تھے، معلوم ہوتا ہے احادیث میں ابن اللتیہ کا جو واقعہ ہے وہ ان کے پیش نظر ہوتا تھا۔

تعلیمی میدان میں پہلے انہوں نے لڑکوں اور لڑکیوں کے الگ الگ عربی مدرسے قائم کئے جن کے طلبہ الہ آباد بورڈ کے امتحانات دیتے ہیں، پھر جدید تعلیم کے لیے ایک انٹرمیڈیٹ کالج قائم کیا، چند برس پہلے ڈگری کالج کی منظوری بھی مل چکی ہے اور بی۔اے کی کلاسیں بھی چل رہی ہیں، دو تین برس سے بڑی تیزی سے کالج کی عمارتیں بن رہی تھیں، اللہ تعالیٰ غیب سے تکمیل کا سامان کردے۔

وہ اعظم گڑھ کے متعدد علمی و تعلیمی اداروں کے رکن تھے، ایک زمانے میں شبلی کالج کی انتظامیہ کے بڑے سرگرم رکن تھے، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے بھی وہ سرگرم ممبر تھے، اپنے اثر و رسوخ اور مفید مشوروں سے اس کو بڑا فائدہ پہنچاتے تھے، مولانا بدرالدین اصلاحی کے انتقال کے بعد جب میرا نام نظامت کے لیے تجویز ہوا تو میں کسی طرح اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہو رہا تھا مگر وہ اڑ گئے کہ جب پورا ہاؤس اس پر متفق ہے تو آپ کیسے انکار کرسکتے ہیں، انکار کرتے ہیں تو کوئی ایسا نام پیش کریں جس پر سب لوگ متفق ہوجائیں۔

جن مدرسوں سے ان کا تعلق نہیں ہوتا تھا ان کو بھی فائدہ پہنچاتے، ان میں جامعۃ الرشاد کا نام سرفہرست ہے، ہر انسان میں کمزوریاں بھی ہوتی ہیں، ان سے بھی خدا اور بندگان خدا کے حقوق میں کمی اور کوتاہی ہوئی ہوگی، وہ بڑے اچھے منتظم تھے، مگر گفتگو میں ان کا طرز تخاطب اور لب و لہجہ اچھا نہیں ہوتا تھا، قول حسن کی قرآن مجید اور احادیث میں بڑی تاکید کی گئی ہے، لیکن وہ ایمان دار، دیانت دار اور بڑی خوبیوں کے انسان تھے، ان کی وفات ایک قومی و ملی حادثہ ہے، وہ اعظم گڑھ کے لیے مایۂ فخر تھے، ان کی جیسی قدر کرنی چاہئے تھی نہیں کی گئی، آئندہ ان کی کمی بہت محسوس کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔ (''ض''، جولائی ۲۰۰۲ء)

صدیقی، نعیم

جناب نعیم صدیقی

یہ خبر رنج و افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ جماعت اسلامی پاکستان کے قدیم رکن اور برصغیر کے ممتاز صاحبِ علم و قلم اور اچھے شاعر و ادیب جناب فضل الرحمان نعیم صدیقی نے ۲۵ رستمبر کو داعی اجل کو لبیک کہا، انتقال کے وقت ان کی عمر ۸۵ برس تھی۔

نعیم صاحب جماعت کے تاسیسی ارکان اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے تربیت یافتہ اور معتمد لوگوں میں تھے، جس زمانے میں ترجمان القرآن پٹھانکوٹ سے شائع ہوتا تھا، اس زمانے سے ان کی نگارشات اس میں چھپ رہی ہیں، مولانا امین احسن اصلاحیؒ وغیرہ کی جماعت سے علاحدگی کے بعد جو لوگ مولانا مودودی کے ساتھ رہ گئے تھے ان میں یہ علمی و ادبی حیثیت سے زیادہ فائق تھے اور مولانا کے بعد سب سے زیادہ تحریری سرمایہ اور لٹریچر ان ہی نے یادگار چھوڑا ہے، جن سے جماعت کا ذہن اور مزاج بنانے میں بڑی مدد ملی۔

معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم میں قیادت کا مادہ اور تنظیمی صلاحیت خاطر خواہ نہیں تھی اس لئے وہ نہ جماعت کے عہدوں پر فائز ہوئے اور نہ انہیں تنظیمی ذمہ داریاں سپرد کی گئیں لیکن ان کا شمار جماعت کے فکری رہنماؤں میں ہوتا ہے ان کا ذوق متنوع تھا اور وہ علمی و ادبی ہر طرح کے مضامین لکھتے تھے ایک زمانے میں ترجمان القرآن کا شاید ہی کوئی شمارہ ان کے مضامین سے خالی رہتا رہا ہو، مولانا مودودیؒ کی زندگی میں ان کی حیثیت ترجمان القرآن کے نائب مدیر کی تھی۔ اس کی وجہ سے اور ان کی علمی و تصنیفی قابلیت کی بنا پر خیال تھا کہ مولانا کے بعد وہی رسالہ کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالیں

گے اورشروع میں یہ ذمہ داری ان کے سپرد بھی ہوئی تھی۔

نعیم صدیقی صاحب کوشعر وادب سے زیادہ مناسبت تھی، اس میدان میں انہوں نے اپنے خوب جوہر دکھائے ہیں، راقم نے سب سے پہلے ان کی ادبی کتاب ''ذہنی زلزلے'' ہی پڑھی تھی۔ مدت سے ان کی ادارت میں ''سیارہ'' نکل رہا ہے جو پاکستان کا ایک مقبول ادبی رسالہ ہے اس کے کئی خاص نمبر بھی شائع ہوئے جن میں ''اقبال نمبر'' زیادہ مشہور ہے۔ ترجمان قرآن میں کتابوں پر تبصرے انھیں کے قلم سے ہوتے تھے، اخباروں میں بھی برابر مضامین لکھتے تھے۔ ملک کے مشہور صحافی ملک نصر اللہ خاں عزیز کی ادارت میں نکلنے والے کوثر وتسنیم میں ان کے مضامین اکثر شائع ہوتے تھے، ان کی تعلیم کا حال معلوم نہیں، تاہم انگریزی اور عربی کی استعداد اچھی اور مطالعہ وسیع تھا مولانا مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی صحبتوں سے بھی ان کو فیض پہنچا ہوگا، اسی لیے دینی مسائل و موضوعات میں بھی ان کا قلم رواں رہتا تھا ان کی اکثر کتابیں تحریکی اور جماعتی نقطہ نظر سے لکھی گئی ہیں لیکن یہ سب کے مطالعہ میں آنے کے لائق ہیں ان کی سب سے مقبول کتاب ''محسن انسانیت'' ہے، یہ بھی تحریکی نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے لیکن اپنے انوکھے انداز اور مشمولات کے لحاظ سے یہ سیرت کی اہم اور مفید کتابوں میں خیال کی جاتی ہے۔ مرحوم اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے۔ غزلیں اور نظمیں دونوں کہتے تھے متعدد شعری مجموعے چھپے ہیں جن میں نعت اور منقبت کا مجموعہ بھی ہے، ان کی شاعری ان کے دینی احساسات و جذبات کی ترجمان اور ہر قسم کے باطل اور غلط افکار و رجحانات کا رد ہوتی تھی، مصر میں اخوان مسلمون کے رہنما سید قطب کو پھانسی دی گئی تو انہوں نے ''یہ کون ہے کس کا خون بہا؟'' کے عنوان سے بڑی پردرد نظم کہی جوان کے اسلامی جوش وجذبہ اور شدتِ تاثر کی بنا پر بہت مقبول ہوئی ان کی ایک اور نظم ''خدا دیکھ رہا ہے'' کو مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ نے اتنا پسند کیا کہ اپنے اخبار ''صدق جدید'' میں بڑا پر اثر نوٹ قلم بند کیا۔

اللہ تعالیٰ علم و دین کے اس شیدائی کو اپنی رحمت کاملہ سے نوازے، آمین۔

(''ض''، نومبر ۲۰۰۲ء)

رحمانی، اکبر، پروفیسر

پروفیسر اکبر رحمانی

جناب اکبر رحمانی کی وفات ایک قومی و ملی حادثہ ہے، وہ درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ تھے، اس کے باوجود بڑی سرگرمی سے تعلیمی، ادبی اور علمی خدمات بھی انجام دے رہے تھے، لیکن وظیفہ یاب ہونے کے بعد وہ محض علمی مشاغل اور تصنیف و تالیف کے لیے وقف ہوگئے تھے، اس کی وجہ سے خیال تھا کہ اب قوم کو ان کی ذہنی و دماغی قابلیت سے زیادہ بہرہ یاب ہونے کا موقع ملے گا، مگر دستِ اجل نے ان کو ہم سے چھین لیا۔ اور ۱۷ ستمبر کو وہ جوارِ رحمت میں پہنچ گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

وہ ذیابیطس اور کئی موذی امراض میں مبتلا تھے، گردے بھی خراب ہوگئے تھے، دو سال پہلے حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے تھے وہیں گینگرین کے سبب سے دائیں پاؤں کا انگوٹھا کاٹنا پڑا۔ اور ہندوستان واپس آنے کے بعد گھٹنے تک دایاں پاؤں کاٹ دیا گیا مگر ایک بندۂ مومن کی طرح وہ ان آزمائشوں کا صبر وشکر سے مقابلہ کرتے اور ہمہ تن اپنے تحریری اور تصنیفی کام انجام دیتے رہے کہ یکایک ان کی وفات کی خبر نے سب کو تڑپا دیا۔

مرحوم کا اصل نام اکبر خاں اور والد کا رحمان خاں تھا ان دونوں کے امتزاج سے انہوں نے اپنا قلمی نام ''اکبر رحمانی'' رکھ لیا تھا اور اسی سے روشناس تھے۔

اکبر صاحب کا خاندانی تعلق لودھیوں سے تھا ان کے آباواجداد ابراہیم لودھی کے زمانے میں ہندوستان آئے، آبائی وطن گنگا پور (اورنگ آباد دکن) تھا ۱۷ اکتوبر ۱۹۴۱ء کو پیدا ہوئے، ابتدائی و ثانوی تعلیم جلگاؤں میں حاصل کی، اعلیٰ تعلیم پونا اور بمبئی کی یونیورسٹیوں میں پائی، اردو کے علاوہ فارسی، انگریزی، ہندی اور مراٹھی زبانوں سے واقف تھے، ہندی اور مراٹھی کے مضامین اور کہانیوں کے اردو ترجمے برابر کرتے رہتے تھے، افکار کراچی میں بھی ان کے ترجمے چھپتے تھے، برسوں روزنامہ انقلاب بمبئی کا ہفتہ وار کالم ''مراٹھی اخبارات کی جھلکیاں'' اور اردو ٹائمز بمبئی کا ''ہندی اخبارات کی جھلکیاں'' لکھا اور ہندی میں بعض کتابیں بھی لکھیں۔

وہ درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ تھے اس لیے تعلیم و تدریس اور ان سے متعلقہ مسائل پر برابر مفید مضامین لکھتے رہتے تھے، اسی مقصد سے ایک تعلیمی رسالہ ''آموزگار'' نکالا تھا۔ جو اپنی نوعیت کا منفرد رسالہ ہے، فرقہ وارانہ اور تنگ نظر ذہن کے لوگ درسی و غیر درسی خصوصاً تاریخ اور نصابی کتابوں میں جو زہر بھرتے رہتے تھے یا اردو یا اقلیتوں کے ساتھ جس طرح کی زیادتیاں اور ناانصافیاں ہو رہی تھیں ان کا تدارک کرنا انہوں نے اپنا فرض بنالیا تھا، اپنے وسیع تعلیمی تجربات کی بنا پر وہ سرکاری اور غیر سرکاری متعدد تعلیمی اور نصابی کمیٹیوں کے ممبر تھے، کئی درسی کتابوں کی تدوین کا کام بھی انجام دیا۔

اکبر رحمانی صاحب نے درجنوں مفید کتابیں لکھیں جن میں حسب ذیل چھپ گئی ہیں:

(۱) بچوں کی کہانیاں اول و دوم (۲) تحقیقات و تاثرات (۳) قومی یک جہتی اور نصابی کتابیں (۴) اقلیتوں کے تعلیمی حقوق و مسائل (۵) اردو میں ادبِ اطفال ایک جائزہ (۶) تاریخ خاندیش کے بکھرے اوراق (۷) آموزگار اقبال (۸) اردو مدارس کے معیار تعلیم کا مسئلہ (۹) علی گڑھ سے دیو بند تک (۱۰) سخن ہائے گفتنی (۱۱) اورنگ زیب کی داستانِ معاشقہ۔ افسانہ یا حقیقت (۱۲) مراٹھی نامہ وغیرہ۔

ابھی متعدد کتابیں شائع نہیں ہوسکی ہیں، خاندیش کی تاریخ بڑی محنت و تحقیق سے لکھی تھی اور غالباً اب چھپ بھی گئی ہو مگر افسوس خود وہ اسے مطبوعہ صورت میں نہ دیکھ سکے۔

اکبر رحمانی صاحب اپنی گوناگوں علمی و تعلیمی خدمات کی وجہ سے کئی اداروں اور علمی و تعلیمی کمیٹیوں کے ممبر تھے، انھوں نے اپنے علاقے میں اردو تحریک کی قیادت بھی کی، انجمن ترقی اردو ہند کی ضلعی شاخ کے صدر تھے، مہاراشٹر اردو اکادمی کے بھی برابر رکن نامزد کئے جاتے تھے، اپنے علاقے میں مقبول اور ہر دل عزیز تھے، وہاں کی متعدد انجمنوں کی سربراہی کی، مساجد و مقابر اور دوسری ٹرسٹوں کے صدر، سکریٹری اور ممبر منتخب کئے جاتے تھے۔

رحمانی صاحب نے اپنے قلم کا ہی لوہا نہیں منوایا بلکہ وہ تقریر و خطابت کے بھی مرد میدان تھے، اچھی تقریریں کرتے تھے، ان میں الجھے مسائل اور پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے کی اچھی صلاحیت تھی۔

مختلف اداروں نے ان کی خدمات اور قابلیت کی بنا پر اعزاز اور ایوارڈ سے نوازا، سیمیناروں اور کانفرنسوں میں وقتاً فوقتاً شریک ہوتے تھے ان سے میری پہلی ملاقات جنوب مشرقی ایشیائی سیمینار خدابخش لائبریری پٹنہ، بہار میں ہوئی جہاں انھوں نے بعض تعلیمی امور و مسائل کے متعلق مجھ سے کچھ سوالات کئے جن کا جواب ریکارڈ کر لیا تھا اور بعد میں اسے ''آموزگار'' میں شائع کیا۔ اس کے بعد میرے ان سے بڑے روابط ہوگئے تھے، اکثر خط و کتابت رہتی تھی۔ وہ تعلیمی کارواں کے ساتھ جس کے قافلہ سالار جناب سید حامد تھے دارالمصنفین تشریف لائے اسی طرح جامعۃ الفلاح میں بھی کسی پروگرام کے تحت آئے تو کئی روز یہاں قیام کیا، اس عرصے میں ان کا زیادہ وقت دارالمصنفین کے کتب خانہ میں گزرتا تھا، ہر وقت کتابوں کے مطالعہ میں منہمک رہتے تھے۔

وقتاً فوقتاً معارف میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے، ادھر ڈاکٹر اقبال خصوصاً ان کے مکاتیب رحمانی صاحب کی دلچسپی اور تحقیق کا خاص موضوع ہوگیا تھا، اس سے متعلق ان کے کئی مضامین شائع ہوئے، لمعہ حیدرآبادی پر بھی، ان کا کام تھا، انھوں نے ان کے نام کے ڈاکٹر صاحب کے بعض خطوط کی نشاندہی کی تو بعض حضرات خصوصاً ماسٹر اختر صاحب (بھوپال) کو اس سے شدید اختلاف ہوا۔ اس کی وجہ سے دونوں میں بڑی نوک جھونک رہی۔

ڈاکٹر اکبر رحمانی کی زندگی علم و ادب کی خدمت اور تحقیق و تنقید میں گزری، تعلیمی محاذ پر انھوں نے بے مثال کام کیا تا عمر غیر مسلم متعصب اہل قلم اور میڈیا کے زہر کا تریاق مہیا کرتے رہے۔ مسلمانوں میں اس طرح کے علمی و تعلیمی کام خاموشی اور خلوص سے انجام دینے والے اب بہت کم رہ گئے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں غریقِ رحمت کرے اور پس ماندگان کو صبر و قرار نصیب کرے۔

مرحوم کے بڑے صاحب زادے سہیل اختر حوصلہ مند معلوم ہوتے ہیں، لیکن ابھی لائق تربیت ہیں۔ تاہم وہ اپنے والد بزرگوار کے کاموں کو جاری اور ناتمام کو مکمل کرنا چاہتے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں اس کی ہمت و توفیق دے آمین۔ (''ض''، نومبر ۲۰۰۲ء)

حمیداللہ، محمد، ڈاکٹر

آہ! فاضل گرامی ڈاکٹر محمد حمیداللہ رحلت فرما گئے

افسوس صد افسوس کہ وہ فرزند اسلام نہیں رہا، جس کی اذانِ توحید سے مغرب کی وادیاں گونج رہی تھیں اور ہزاروں نفوس ایمان و اسلام کی دولت سے بہرہ ور ہو رہے تھے، وہ سرچشمہ ہدایت بند ہوگیا جس سے مریضانِ کفر و ضلالت شفایاب ہو رہے تھے، واحسرتا کہ دین و دانش کا وہ آفتاب غروب ہوگیا جس سے مشرق و مغرب دونوں ضیابار تھے اور تاریکیوں میں بھٹکنے والے راہ یاب ہو رہے تھے، علم کا وہ بے کراں سمندر راکد ہوگیا جس سے اسلام کا درخت سرسبز و شاداب تھا، دریائے تحقیق کا وہ شناور اور غواص چلا گیا جو یورپ کے کتب خانوں میں اپنے آبا کی موجود کتابوں سے علم کے جواہر نکالتا تھا، وہ پیکرِ علم و فن روپوش ہوگیا جو ابر نیساں بن کر پون صدی سے موتی لٹا رہا تھا، حکمت و معرفت کا وہ مجمع البحرین دنیا سے رخصت ہوگیا جو مشرق کے علمی میخانوں سے بھی سرشار تھا اور مغرب کے میکدہ حکمت سے بھی مخمور تھا، وہ ہستی نہیں رہی جس کے فیض و کمال کا سکہ بلادِ مشرق اور عالمِ اسلام ہی میں نہیں، یورپ و امریکہ میں بھی چل رہا تھا، حیف صد حیف اس ذات گرامی کا خاتمہ ہوگیا جس کا دماغ نادر معلومات کا خزینہ اور سینہ علومِ نبوی کا سفینہ تھا، جس کا قلم دشمنانِ اسلام کی علمی خیانتوں اور عیاریوں کو بے نقاب کرتا تھا اور اسلام اور اسلامی تعلیمات کی حقانیت و صداقت کو آشکار کرتا تھا، آہ ثم آہ کہ وہ سراپا علم و تحقیق روپوش ہوگیا جو تاریخ اسلام اور سیرت نبوی کے اولین مصادر اور مسلمانوں کے نایاب اور گم شدہ علمی اندوختوں کو ڈھونڈ نکالتا تھا، وہ وجودِ مقدس خاموش ہوگیا جس نے پیرس میں بھی آداب سحر خیزی نہیں چھوڑے، جس کے راسخ العقیدگی کو مغرب کے فسق و فجور نے اور پختہ کر دیا تھا اور فحاشی و معصیت کی طغیانی نے اس کے ایمان و یقین میں مزید اضافہ کر دیا تھا، وادریغا کہ وہ کامل الایمان اور راسخ العقیدہ غایب ہوگیا جس کے پائے استقامت و عزیمت کو کفر و الحاد کی بادِ صرصر کبھی متزلزل نہیں کر سکی، جس کی متاع دین و تقویٰ کو حسن و عشرت کی جلوہ گاہیں غارت نہ کر سکیں اور جس کے دامن عفت و طہارت پر دنیا کی رعنائیاں اور دل فریبیاں کوئی داغ و دھبا نہ ڈال سکیں یعنی شہرہ آفاق عالم و محقق، نامور مصنف و فاضل، اسلام کے جاں نثار و فدائی اور اس کے مخلص داعی و مبلغ، نکتہ داں سیرت نگار، دیدہ ور مورخ، اسلامی فقہ و قانون کے ماہر، علوم دینیہ میں یگانہ اور جدید علوم میں فخر روزگار ڈاکٹر محمد حمیداللہ نے ۹۴ برس کی عمر میں

۱۷؍دسمبر ۲۰۰۲ء کو داعی اجل کو لبیک کہا، اناللہ وانا الیہ راجعون، جن کی پاکیزہ زندگی اور مطہر شخصیت قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا نمونہ تھی اور جو اس عہد کے ابن سعد وطبری، بلاذری ویعقوبی، ابن اسحاق وابن ہشام، ابن اثیر وابوالفدا اور شمس الائمہ سرخسی اور علامہ ابن عابدین تھے، ان کی موت سے عالم اسلام ویران ہوگیا، دنیائے علم میں خاک اڑنے لگی، اہل علم، اصحابِ نظر اور محققین، سراپا درد وحسرت بنے ہوئے یہ کہہ رہے ہیں:

آفاقہا گردیدہ ام، مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام اما تو چیزے دیگرے

ڈاکٹر محمد حمید اللہ ۱۶؍محرم الحرام ۱۳۲۶ھ، ۱۹؍فروری ۱۹۰۸ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے، ان کا تعلق ارکاٹ (مدراس) کے مشہور عالم قاضی بدرالدولہ کے خاندان سے تھا جو ایک شریف ومعزز عربی النسل نوائطی خاندان کی شاخ تھا، ان کے خاندان کو پشتینی علمی ودینی وجاہت حاصل تھی، ڈاکٹر صاحب کے والد مفتی خلیل اللہ صاحب علوم دینیہ میں ممتاز تھے، اس طرح ڈاکٹر صاحب کا علمی ودینی شغف فطری ہی نہیں موروثی بھی تھا، جامعہ نظامیہ سے فراغت کے بعد جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے فقہ واصولِ فقہ میں ایم۔اے کیا، پھر ایل۔ایل۔بی، ایل۔ایل۔ایم اور پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں، اس کے بعد ان کی حوصلہ مند طبیعت نے جرمنی اور فرانس کا رخ کیا اور بون یونیورسٹی (جرمنی) سے 'اسلام کے بین الاقوامی تعلقات' پر ڈی فل کی اور سوربون یونیورسٹی پیرس سے 'عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں اسلامی سفارت کاری' کے موضوع پر ڈی لٹ کی سند لی، اس کے بعد وطن آکر جامعہ عثمانیہ میں قانون بین الملکی کے پروفیسر کی حیثیت سے درس وتدریس کی خدمات انجام دیں، سقوط حیدرآباد کے زمانے میں حیدرآباد سے گئے تو واپس نہیں لوٹے اور ۱۹۴۸ء میں فرانس میں پناہ گزیں ہوئے اور اورینٹل اسٹڈیز ریسرچ سینٹر کے وظیفے پر پچیس برس گزارے، فرانس کے نیشنل سینٹر آف سائنٹفک ریسرچ سے بھی بیس سال تک وابستہ رہے، اس کے بعد پیرس ہی میں رہ کر تحقیق وتبلیغ اور اسلام پر مختلف زبانوں میں تصنیف وتالیف کا کام کرتے رہے اور یہی دراصل ان کی زندگی کا اصل مشن تھا، اس عرصے میں انہوں نے یورپ وایشیا کی متعدد جامعات میں اہم موضوعات پر توسیعی خطبات دیے، اس سلسلے میں انقرہ، استنبول (ترکی)، کوالالپور (ملیشیا)، قاہرہ (مصر) اور یورپ کے بعض ملکوں میں ان کے لکچر ہوئے جن میں اسلام کے بارے میں جدید ذہنوں میں پیدا ہونے والے شکوک اور غلط فہمیوں کا ازالہ کیا، پاکستان کی نوزائیدہ اسلامی مملکت کی آئین سازی اور نظام تعلیم کا خاکہ تیار کرنے میں بھی ہاتھ بٹایا جس میں بعض ممتاز علما کے علاوہ علامہ سید سلیمان ندوی بھی شامل تھے، مگر جلد ہی ڈاکٹر صاحب کو حکومت کی بدنیتی کا اندزہ ہوگیا تو وہ اسلامی نظریاتی کونسل سے الگ ہوگئے، ڈاکٹر صاحب کی حیات مستعار کا زیادہ حصہ پیرس میں تنِ تنہا گزارا، آخر میں طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو اپنے بھائی کی پوتی سدیدہ شفق صاحبہ کے یہاں فلوریڈا (امریکہ) چلے گئے، بالآخر بہت مشغول علمی وتحقیقی زندگی گزار کر ۱۷؍دسمبر ۲۰۰۲ء کو خالق حقیقی سے جاملے، سدیدہ صاحبہ کے والد محترم اور ڈاکٹر صاحب کے برادر زادہ جناب عطاء اللہ صاحب کے خط ہی سے مجھے ان کی وفات کی دل دوز خبر ملی، ۱۸؍دسمبر کو جب ان کا جنازہ اٹھا ہوگا تو یہ غیبی صدا ضرور بلند ہوئی ہوگی کہ:

رفتم و از رفتن من عالمے تاریک شد
من مگر شمعم چوں رفتم بزم برہم ساختم

ڈاکٹر محمد حمید اللہ مدت العمر تصنیف وتالیف میں مشغول رہے، بحث وتحقیق کا ذوق ان میں فطری تھا اور تلاش وجستجو کی طرف ان کا طبعی میلان تھا، وہ فنا فی العلم تھے، ان کی زندگی کا کوئی لمحہ جستجوئے علم وتحقیق سے خالی نہیں گزرتا تھا، اس لیے جو کچھ لکھا وہ عالمانہ، محققانہ، بحث وتحقیق کا شاہکار، محنت وجاں فشانی اور کدوکاوش کا نتیجہ ہے، ان کا تحریری سرمایہ وافر ومتنوع ہونے کے باوجود جدت وابتکار سے خالی نہیں، انہوں نے تصنیف وتالیف میں اپنی راہ الگ نکالی تھی، ان کا پسندیدہ موضوع سیرت نبوی تھا، اس کے بہتر ان کے نزدیک کوئی اور مشغلہ نہیں تھا، مگر ان کی تمام تصنیفات سیرت کے پامال، فرسودہ اور روایتی انداز سے ہٹ کر لکھی گئی ہیں، اردو کی اکثر تصنیف اسی موضوع پر ہیں اور سب نرالی اور اچھوتی ہیں مثلاً رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی، عہد نبوی میں نظام حکمرانی، عہد نبوی کا نظام تعلیم، عہد نبوی کے میدان جنگ، مکتوبات نبوی، امام ابوحنیفہؒ کی تدوین قانون اسلامی، اسلامی ریاست، سیرت طیبہ کا پیغام عصر حاضر کے نام، عرب حبش تعلقات، اسلام کے قانون بین الممالک کے اصول اور نظیریں، ان میں معلومات کا جو خزانہ ہے اسے ڈاکٹر صاحب جیسا کثیر العلم، وسیع المطالعہ اور جویائے تحقیق ہی جمع کرسکتا تھا، ان کے بعض معلومات تو انکشاف کا درجہ رکھتے ہیں، اردو میں ایک مہتم بالشان کتاب ''خطبات بھاولپور'' ہے، جو ۱۹۸۰ء میں بھاولپور یونیورسٹی میں کسی تحریری یادداشت اور نوٹ کے بغیر دیے گئے ۱۲ لکچروں کا مجموعہ ہے، ان میں قرآن، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ واجتہاد، قانون بین الممالک اور مملکت نظم ونسق کی تاریخ، دین (عقائد، عبادات، وتصوف) دفاع وغزوات، تعلیم، تشریع وعدلیہ، مالیہ و تقویم کے نظام اور تبلیغ اسلام اور غیر مسلموں سے برتاؤ کے متعلق ڈاکٹر صاحب کی عمر بھر کے مطالعہ وتحقیق کا نچوڑ آگیا ہے جو بہت مدلل، پرمغز، بصیرت افروز اور عہد حاضر کے مذاق ورجحان کے مطابق ہے، ان خطبوں میں پیش کیے گئے حقایق انکشاف کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے اولیات میں شمار کیے جانے کے لائق ہیں، انہوں نے دائرۃ المعارف الاسلامیہ (اردو انسائیکلو پیڈیا) لاہور کے لیے جو ۲۲ اہم مقالات لکھے ہیں وہ بھی ان کے علمی تبحر اور دینی بصیرت کے حامل ہیں، مشہور فرانسیسی مستشرق گارساں دی

تاسی کی دو کتابوں کے ترجمے، مقالات گارساں دی تاسی اور خطبات گارساں دی تاسی کے نام سے انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کیے تھے، ڈاکٹر صاحب نے جب ان کا مقابلہ اصل فرانسیسی نسخہ سے کیا تو اس میں اغلاط نظر آئے، ان کے نظر ثانی کیے ہوئے، تصحیح شدہ نسخے کو مولوی عبدالحق صاحب نے جب انجمن ترقی اردو پاکستان سے شائع کیا تو ایک ایک جلد کی دونوں کتابیں دو دو جلدوں میں ہوگئیں۔

ڈاکٹر صاحب کو بنیادی اور اصلی مصادر و ماخذ کی تلاش و جستجو سے بڑی دلچسپی تھی، قدما کی نادر و نایاب کتابوں کو ڈھونڈ نکالنا اور ان کو ایڈٹ کر کے شائع کرنا ان کا عظیم الشان کارنامہ ہے، عربی زبان کی کئی بنیادی اور اہم کتابیں ان کی دریافت اور سعی و کوشش سے شائع ہوئیں، حدیث شریف میں صحیفہ ہمام بن منبہ کا مخطوطہ برلن سے حاصل کر کے اپنے حواشی و تعلیقات کے ساتھ بیروت سے شائع کیا، سیرت کے ابتدائی مصادر میں **مجموعة الوثائق السياسية للعهد النبوی و الخلافة الراشدة** کو بھی بیروت سے شائع کیا، یہ عہد نبوی اور خلفائے راشدین کے دور کی تین سو سے زیادہ دستاویزوں پر مشتمل ہے، سیرت ابن اسحاق جیسے نایاب اور اولین ماخذ کو دریافت اور ایڈٹ کر کے رباط سے شائع کیا، مسلمانوں کے قدیم علم سیر کو قانون بین الممالک (انٹرنیشنل لا) کے طور پر متعارف کرایا، اس کی طرف فقہ کے ابواب السیر کی وجہ سے ان کی توجہ مبذول ہوئی تھی، امام محمد بن حسن شیبانی کی کتاب السیر الکبیر کو حیدر آباد سے انہوں نے طبع کرایا، امام ابوحنیفہؒ کے ایک اور شاگرد امام ابراہیم فزاری کی اسی موضوع کی ایک کتاب کا اس کی اہمیت کی بنا پر یونسکو نے ڈاکٹر صاحب سے فرانسیسی ترجمہ کرایا تھا، اس سلسلے کی اور کتابوں کے نام یہ ہیں انساب الاشراف بلاذری، کتاب الانواء ابن قتیبہ، **کتاب الردو نبذة من فتوح العراق** واقدی، الذخائر والتحف قاضی رشید بن زبیر، کتاب النبات ابوحنیفہ دینوری اور مقدمہ فی علم السیر یا حقوق الدول فی الاسلام فی احکام اہل الذمہ، **نزهته المشتاق**، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے قرآن مجید کے تین قدیم ترین نسخوں کا پتا لگا کر ان کا تقابلی مطالعہ کیا تھا، ان میں ایک تاشقند (ازبکستان) دوسرا استنبول (ترکی) اور تیسرا انڈیا آفس لائبریری لندن میں تھا، ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ تینوں ایک ہی قسم کے چمڑے پر ہیں، ترکی والے نسخے پر خون کے نشانات بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ شہادت کے وقت اس کی تلاوت فرما رہے تھے، یہ نسخے کوفی رسم الخط میں تھے، ڈاکٹر صاحب نے سمرقند کے نسخے کو مصحف قرآن عثمانی کے نام سے جدید عربی خط میں نقطوں اور اعراب کے ساتھ مرتب کر کے فلاڈلفیا (امریکہ) سے ۱۹۸۵ء میں شائع کیا تھا۔

ڈاکٹر حمیداللہ ایک دو نہیں درجنوں زبانیں جانتے تھے، اردو ان کی مادری زبان تھی لیکن فارسی، عربی، ترکی، انگریزی، فرنچ، جرمنی، اطالوی اور یونانی زبانوں پر عبور تھا، فرنچ اور انگریزی میں اردو عربی ہی کی طرح متعدد تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، اسلام کی اشاعت و تبلیغ اور اس کے مخالفین کا جواب دینے کے لیے انہوں نے تصنیف و تالیف کے لیے خاص طور پر یورپین زبانوں کا انتخاب کیا تھا، سب سے مفید و مبارک کام فرنچ زبان میں ترجمہ قرآن کی اشاعت ہے جس کے ۲۰ سے زیادہ ایڈیشن نکل چکے ہیں اور کوئی ایڈیشن ۲۰ ہزار سے کم کا نہ تھا، اسلام کے تعارف کے لیے جو کتاب لکھی اس کے ۲۰ سے زیادہ زبانوں میں ترجمے ہوئے، دو جلدوں میں سیرت نبوی پر ایک کتاب لکھی، دنیا کی ۱۲۰ زبانوں کے قرآنی تراجم کی ایک ببلوگرافی اور تصحیح ترجمہ بوسکائی لصحیح البخاری تیار کی، پیغمبر اسلام کے چھ سیاسی خطوط فرنچ میں پیرس سے شائع کیا، اس کے کئی زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے، مختلف مذاہب کا اٹلس پیرس سے شائع کیا، روزے پر بھی فرنچ میں کتاب لکھی، فرنچ انسائیکلوپیڈیا کے لیے اسلامی موضوعات پر متعدد مقالے لکھے، انگریزی زبان میں بھی متعدد کتابیں تالیف کیں، ان کی تصانیف کی تعداد ڈیڑھ سو سے زیادہ ہے اور ہر تصنیف متعدد بار چھپی اور نہایت مقبول ہوئی، اس میں ان کی کدوکاوش اور محنت و تحقیق سے زیادہ ان کے حسن نیت اور خونِ جگر کا دخل تھا جس کے بغیر معجزہ فن کی نمود نہیں ہوتی، تصنیف و تالیف سے ان کا اصل مقصد احقاق حق و ابطال باطل، اسلام کا اثبات و اظہار اور مستشرقین کی ہرزہ سرائیوں کا جواب تھا اور یہ ان کے لیے اس بنا پر آسان تھا کہ ان کو اسلام کے اصلی مصادر کی طرح یورپین زبانوں سے بھی براہ راست واقفیت تھی، اس کی وجہ سے وہ مخالفین کے اعتراضات کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے اور مدلل جواب دے کر انہیں قائل کر دیتے تھے، چنانچہ ان کی کوشش سے ہزاروں لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے، جن میں سفرا، پروفیسر اور معزز پیشوں سے وابستہ لوگ بھی ہوتے تھے، ان کی تصنیفات شایستہ، متین اور سلجھی ہوئی ہوتی ہیں، ان کی تحریر پُرمغز، سادہ، سلیس، عام فہم، دل نشین اور حشو و زواید اور اینچ پیچ سے خالی ہوتی ہے، اس میں لفاظی، مبالغہ آرائی اور جذباتی لب و لہجہ نہیں ہوتا، بلکہ ہر بات مدلل و مربوط ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب مسلکاً شافعی تھے، مگر متعدد مسائل میں وہ بڑی بالغ نظری اور مجتہدانہ بصیرت سے کام لیتے تھے، ان جیسا صاحب علم و نظر کسی ایک ہی فقہی گروہ سے وابستہ نہیں رہ سکتا تھا، وہ تمام ائمہ اسلام کے فضل و کمال اور عظمت کے معترف تھے، امام ابوحنیفہؒ، ان کے اصحاب اور اس مسلک فقہ کے کبار علما و اساطین کا ذکر بڑے احترام سے کرتے ہیں اور ان کی تحقیقات سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں تاہم اپنی تحقیق و جستجو اور دلائل سے جس کو صواب سمجھتے تھے اور جس پر ان کو شرح صدر ہوتا تھا اسی کو مانتے اور اختیار کرتے تھے، گہرے علم و مطالعہ کی بنا پر ان کے یہاں بعض تفردات بھی پائے جاتے ہیں، کیوں کہ رسوخ فی العلم والدین کی بنا پر ان کے لیے روایتی اور مروجہ طریقوں کو اختیار کرنا اور رسم ورہِ آباد پر قانع ہو جانا ممکن نہیں تھا، اس میں مغرب سے مرعوبیت کو

بھی دخل نہ تھا،انھوں نے یورپ میں رہ کر اسلام کی جو عظیم الشان خدمت کی ہے وہ بڑے بڑے علما اور ادارے بھی نہیں کرسکے، ان کا عمل ہمیشہ عزیمت پر ہوتا تھا اور وہ اتباع سنت میں کسی سے پیچھے نہیں تھے،ایک جرمن خاتون پردے کے اہتمام کے ساتھ ان سے ملنے آئیں مگر چہرہ کھلا ہوا تھا، ڈاکٹر صاحب دوسری طرف رخ کرکے ان سے باتیں کرتے اور ان کے سوالات کا جواب دیتے رہے،فوٹو کھنچوانے میں بھی محتاط تھے، ایک صاحب نے نکاح کی سنت پر عمل نہ کرنے کی وجہ پوچھی تو فرمایا میں سخت گناہ گار ہوں، خدا سے دعا کریں کہ وہ مجھے معاف فرمائے، میں یتیم تھا جب وقت تھا تو کسی نے توجہ نہ دی پھر جب میں نے علم کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا تو اس طرف توجہ نہیں ہوئی، اللہ تعالیٰ میری کوتاہی کی مغفرت فرمائے، میں ترکِ سنت پر سخت نادم ہوں، ڈاکٹر صاحب کو سرکار دو عالم ﷺ سے عشق تھا، اردو کے مشہور اہل قلم اور ممتاز شاعر جناب جگن ناتھ آزاد جمہور نامہ کے نام سے دنیا کی منظوم تاریخ لکھ رہے تھے، اس کے ایک باب میں ظہور رسالت کا ذکر تھا جو معارف دسمبر ۱۹۵۹ء میں 'ولادت باسعادت۔ ساقی نامہ' کے عنوان سے چھ صفحے میں چھپا تھا، ڈاکٹر صاحب عشقِ رسول میں سرشاری کی بنا پر اس کا فرنچ ترجمہ کرنا چاہتے تھے، اس کی اطلاع مجھے دی تو میں نے جگن ناتھ صاحب سے ذکر کیا، ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی، ڈاکٹر صاحب کا پتا مجھ سے لے کر انہیں شکریے کا خط لکھا۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی زندگی کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل کی عملی تفسیر تھی، ان کا وطن حیدرآباد تھا لیکن ریاست کے انڈین یونین میں انضمام کے بعد علم کے غازی اور تحقیق کے مجاہد کو پردیس ہی میں رہنا پڑا، پیرس میں قیام کے باوجود نہ وہاں کی شہریت اختیار کی اور نہ کسی اور ملک کی نیشنلٹی ان کے پاس تھی، پیرس میں قیام عیش وعشرت کے لیے نہیں، علمی وتحقیقی اداروں اور کتب خانوں کی وجہ سے اختیار کیا تھا، ایسے ماڈرن شہر میں فقیرانہ اور درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے، دو کمروں کے جس فلیٹ میں رہتے تھے، وہ چوتھی منزل پر تھا، لفٹ نہیں تھی، کئی زینے طے کرنا ہوتا تھا، کمرے میں آسایش وزیبایش کے سامان کے بجائے کتابیں بھری ہوئی تھیں، اکیلے رہتے تھے نہ کوئی ملازم تھا اور نہ کوئی عزیز، سارے کام خود کرتے تھے، بازار سے سودا خود ہی جا کر لاتے، کھانا بھی خود پکاتے، غذا بہت سادہ تھی، حلال ذبیحہ ہونے کے باوجود ۳۰۔۴۰ برس سے گوشت کھانا چھوڑ دیا تھا، ابلی سبزی ترکاری، دودھ اور اس سے تیار کی گئی چیزیں، انڈے اور پھل ان کی خوراک تھی، کپڑے بھی خود دھوتے تھے اور غالباً دو ہی ایک جوڑے کپڑے ان کے پاس رہتے تھے، ایک مرتبہ اسلام آباد گئے تو ان کا مختصر سامان دیکھ کر لوگ محوِ حیرت ہوگئے یعنی دو جوڑے کپڑے ایک جوڑا جوتا، چند کتابیں اور رشتہ داروں کے لیے کچھ تحائف، ع

سبک سار مردم سبک تر روند

سادہ زندگی ہی کی وجہ سے وہ ہمیشہ صحت مند، تندرست اور چاق و چوبند رہے اور اتنے سارے علمی کام کر ڈالے۔

زہد واتقا، صبر وقناعت اور توکل واستغنا ان کا شعار تھا ان میں حرص و ہوس کا کوئی شائبہ نہیں تھا، دنیا کے جاہ واقبال، مال و دولت، شہرت وعزت اور نام ونمود سے ہمیشہ بے نیاز رہے، ایک صاحب ان سے انٹرویو لے رہے تھے تو وہ صرف علمی سوالات کا جواب دیتے تھے، اپنی ذات اور کارناموں سے متعلق سوالات کا کوئی جواب نہ دیتے، ان کی گوناگوں خدمات کے اعتراف کے طور پر ۱۹۹۴ء میں انہیں شاہ فیصل ایوارڈ دیا گیا تو اسے لینے سے انکار کردیا، کئی پاکستانی حکمرانوں نے بھی داد و دہش کرنی چاہی تو ان کا شکریہ ادا کرکے عاجزی سے معذرت کردی، ان کی ساری کتابیں بہت مقبول ہوئیں اور ناشروں نے ان سے خوب کمایا مگر دولت سے بے نیازی کی وجہ سے وہ کتابوں کی رائلٹی نہیں لیتے تھے اور اگر کسی نے اصرار سے اس کے نام پر کچھ دیا تو اسے غربا، یتیم اور بیوہ عورتوں میں تقسیم کردیا، خوش اخلاق نرم گفتار اور شگفتہ مزاج تھے، ان میں کبر وغرور اور رعونت نہ تھی، سادگی، تواضع اور عاجزی وفروتنی میں بے مثال تھے۔ ان کی تحریروں سے بھی ان کے اخلاص وانکسار اور طالب علمانہ تواضع وخاکساری کا پتہ چلتا ہے، خود تو کبھی کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کیا مگر دوسروں کی خدمت وتکریم کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے، مہمانوں کی بڑی خاطر مدارات کرتے کوئی ان سے ملنے کے لیے آتا تو اسے لینے کے لیے ہوائی اڈے پہنچ جاتے اور اس کے لیے بچھے رہتے، سیر وتفریح کراتے، وضع داری اور شرافت ان کا طرۂ امتیاز تھا۔

دارالمصنفین سے ڈاکٹر صاحب کا بہت پرانا اور گہرا تعلق تھا، شروع سے وہ اس کے قدرداں اور بڑے کرم فرما تھے، علامہ شبلی اور مولانا شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی سے والہانہ تعلق رکھتے تھے، اسی اخلاص اور محبت کی بنا پر ایک دفعہ حضرت سید صاحب سے ملنے کے لئے دارالمصنفین تشریف لائے تھے، ان کے بعد بھی اس سے ان کا مخلصانہ تعلق برابر قائم رہا، معارف کے پرانے مضمون نگار تھے، اس میں ان کے مضامین اور خطوط بڑے فخر سے شائع کیے جاتے تھے، ایک مرتبہ میں نے ان سے مضمون کی فرمائش کی تو جواب دیا کہ ''میں معارف کو دنیا کا سب سے بڑا رسالہ سمجھتا ہوں، کوئی چیز تیار ہوتی ہے تو پہلے اسی کو بھیجتا ہوں'' جناب سید صباح الدین عبدالرحمان مرحوم ایک بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کے لیے لندن تشریف لے گئے، وہاں سے پیرس جانے کا اتفاق بھی ہوا، لیکن ڈاکٹر صاحب کی ملاقات سے محروم رہ جانے کا بہت افسوس تھا، لکھتے ہیں ''خواہش تھی کہ یہاں آکر دنیائے اسلام کے مشہور محقق اور عالم ڈاکٹر حمید اللہ کی بھی زیارت کروں، لندن سے ان کو ایک عریضہ بھیجا تھا کہ پیرس آکر ان کی دست بوسی کے لیے حاضر ہوں گا مگر ان کا خط موصول ہوا کہ میرا ان کے پاس پہنچنا مشکل ہے، اس

لیے کے ان کے یہاں ٹیلیفون نہیں اور وہ جس مکان میں رہتے ہیں وہاں تک پہنچنے کے لیے ایک سوبیس زینے چڑھنے ہوتے ہیں، اس لیے انہوں نے لکھا کہ میں جہاں قیام کروں وہاں وہ خود آجائیں گے، چند گھنٹے کے قیام میں کہیں ٹھہرنے کا سوال نہیں تھا، ٹیلیفون سے رابطہ ممکن نہ تھا، کچھ لوگوں کو ان کا پتا دکھایا وہ بتا نہ سکے اور کچھ بولے بھی تو ہم سمجھ نہ سکے، مایوس ہوکر ہوائی اڈے چلے آئے، ان سے نیاز نہ حاصل کرنے کا افسوس زندگی بھر رہے گا'' ڈاکٹر صاحب کی وفات دارالمصنفین کے لیے ایک بڑا حادثہ ہے، وہ اس کے اور معارف کے علمی محتسب، مخلص کرم فرما اور بڑے ہمدرد تھے، وہ دنیا کے صف اول کے ممتاز علما و محققین میں تھے، اسلامی علوم پر اتنی وسیع و عمیق نظر رکھنے والے اب بہت کم لوگ ملیں گے، وہ بڑی خاموشی اور اخلاص سے علمی و دینی خدمات انجام دیتے تھے، بارالہا! تو اپنے اس مقبول بندے اور علم و دین کے خادم کی مغفرت فرما اور اسے بہشت بریں سے سرفراز کر اور اس کے اعزہ و متعلقین کو صبر و قرار نصیب کر اللھم صبب علیه شآبیب رحمتک واغفرله وارحمه یا ارحم الراحمین۔

(''ض''، مارچ ۲۰۰۳ء)

ندوی، سید ضیاء الحسن، پروفیسر

پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی

سخت افسوس ہے کہ پروفیسر سید ضیاء الحسن ندوی ۲۰/ جنوری ۲۰۰۳ء کو حرکت قلب بند ہوجانے سے وفات پاگئے، انا للہ وانا الیه راجعون، وہ دارالعلوم ندۃ العلما کے بڑے لائق اور ہونہار فرزندوں میں تھے، ندوہ سے فراغت کے بعد انہوں نے جدید تعلیم حاصل کی پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ عربی میں لکچرر ہوئے اور ترقی کر کے پروفیسر اور صدر شعبہ ہوئے، اس وقت فیکلٹی آف ہیومینیز اینڈ لینگویجز کے ڈین بھی تھے، جدید اور ماڈرن عربی میں ان کو مکمل دست گاہ تھی، ''مہجری ادب'' پر ان کی ایک کتاب بھی شایع ہوئی ہے اور بیرون ملک کے جراید و رسائل میں ان کے مضامین بھی چھپتے تھے، عربی زبان پر اچھی قدرت ہی کی وجہ سے انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنس کے سہ ماہی عربی رسالہ ثقافته الھند کے اڈیٹر مقرر کیے گئے تھے اور اس کا ایک ضخیم اور شان دار نمبر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی پر نکالا تھا۔

مولانا علی میاں اور دارالعلوم ندوۃ العلما سے ان کا بڑا گہرا تعلق تھا، دارالعلوم کے کاموں میں نہایت سرگرم اور پیش پیش رہتے تھے، اس کی مختلف کمیٹیوں کے ممبر بھی تھے، عالمی رابطہ ادب اسلامی کے بھی رکن تھے، اس کے اجلاس میں بڑے شوق اور دلچسپی سے شریک ہوتے تھے اور اس کے لیے متعدد بیرونی ملکوں میں بھی تشریف لے گئے، مولانا سید محمد رابع ندوی ناظم ندوۃ العلما کو ان پر بڑا اعتماد تھا، ان سے اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا سید محمد واضح ندوی سے بہت گھلے ملے رہتے تھے، علمی صلاحیتوں کے ساتھ ان میں انتظامی خوبیاں بھی تھی۔

مرحوم بڑے مرنجاں مرنج، وسیع المشرب اور طبعاً شریف اور خوش مزاج تھے، ہر ایک سے خندہ روئی سے ملتے، اپنی نیکی، وضع داری، اخلاص اور علم دوستی کی بنا پر بہت مقبول اور ہر دل عزیز تھے، بڑے عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود ان میں غرور اور گھمنڈ نہ تھا، راقم سے وہ اور ان کے بڑے مولانا ڈاکٹر محمود الحسن ندوی بڑی محبت کرتے تھے اور بعض موقعوں پر مدد بھی کی، ان کی مقبولیت کا اندازہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے سابق صدر شعبہ فارسی کے ایک مکتوب کی ان سطور سے ہوگا:

> ''میں تقریباً ۲۵ سال ان کا رفیق شعبہ، فیکلٹی اور پڑوسی بھی رہا ہوں، ان کی علمی صلاحیت، انتظامی خوبیوں اور بے ریا اخلاص نے ان کو بہت مقبول بنادیا تھا چنانچہ اتنا بڑا جنازہ، تدفین، تعزیتی جلسہ جامعہ ملیہ کے تمام سابقہ رکارڈ توڑ گیا، دیگر یونیورسٹیوں، اساتذہ، اشخاص اور انجمنوں کی تعزیتی قرار داریں آج بھی روزناموں کا جز ہیں، خداوند تعالیٰ ان کو اپنی رحمتوں سے نوازے''۔

کیا معلوم تھا کہ اس قدر جلد رخصت ہوجائیں گے، ابھی ان کی عمر زیادہ نہیں تھی مگر ان المنایا للرجال بمرصد (موت لوگوں کی گھات میں رہتی ہے) اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، بال بچوں پر رحم کرے اور بڑے بھائی اور سب پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ (''ض''، مارچ ۲۰۰۳ء)

حمیدہ سلطان احمد، بیگم

بیگم حمیدہ سلطان احمد

یہ خبر بہت افسوس سے سنی جائے گی کہ ۱۹/ جنوری ۲۰۰۳ء کو مشہور علم و ادب نواز اور اردو کی ادیبہ بیگم حمیدہ سلطان احمد کا دہلی میں انتقال ہوگیا، وہ دہلوی تہذیب اور اردو ثقافت کی آخری یادگار تھیں۔

وہ ۱۷/ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو پیدا ہوئی تھیں، دہلی کے محلّہ گلی قاسم جان میں نواب احمد بخش والی فیروز پور جھرکہ لوہارو کے چھوٹے صاحب زادے نواب مرزا ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کی حویلی میں ان کی پیدائش ہوئی، ددھیال اور ننھیال دونوں طرف سے ان کا خاندان بڑا معزز تھا، بیگم صاحبہ کا ننھیالی تعلق نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب سے تھا، مرزا صاحب نے اپنی بیوی امراؤ بیگم کی بڑی بہن بنیادی بیگم کے ایک صاحبزادے زین العابدین خاں عارف تھے جن کو مرزا غالب نے متبنّیٰ بنالیا تھا، ان کے ایک صاحبزادے باقر علی خاں کی چھوٹی صاحب زادی رقیہ بیگم حمیدہ سلطان احمد کی والدہ تھیں، ددھیال کا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے، مغل بادشاہوں کے

زمانے میں اس خاندان کے لوگ دہلی آئے تھے، اورنگ زیب کی فوج جب آسام کی مہم پر روانہ ہوئی تو اس خاندان کے ایک بزرگ بھی فوج کے ساتھ وہاں پہنچے اور ضلع سب ساگر کے ایک گاؤں میں آباد ہوگئے، ان ہی کی نسل کے لیفٹیننٹ کرنل ذوالنور علی احمد سے جو ایک بہت کامیاب ڈاکٹر تھے رقیہ بیگم کی شادی ہوئی تھی، یہی ذوالنور علی احمد صاحب حمیدہ سلطان احمد مرحومہ اور ان کے بڑے بھائی اور سابق صدر جمہوریہ ہند فخرالدین علی احمد صاحب کے والد بزرگوار تھے۔

حمیدہ سلطان صاحبہ کی شخصیت کی تشکیل اور ذہنی تربیت میں ان کے خاندان کے علمی و ادبی ماحول کا کافی اثر تھا، انہوں نے آزادی کے بعد اردو تحریک کی قیادت سنبھالی اور اس کے تحفظ کے لیے بڑی قربانی دی، وہ انجمن ترقی اردو کی دہلی شاخ کی برابر سکریٹری رہیں اور اس کے لیے ''علی منزل'' کے نام سے ایک عمارت حاصل کی جس کے ایک حصہ میں خود بھی رہتی تھیں، یہاں وہ انجمن کے زیر اہتمام ادبی محفلیں اور مشاعرے کراتی تھیں، اس کی وجہ سے وہاں بڑے ادیبوں اور شاعروں کی آمد و رفت رہا کرتی تھی۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کے قیام میں بھی ان کا عمل دخل رہا، وہ ہر سال غالب کی وفات ۱۵ر فروری کو مرزا غالب پر تعزیتی جلسہ بھی کراتی تھیں، غالب کے خاندان سے اپنے خاندانی تعلق کا حق ادا کرنے کیلئے انہوں نے خاندان لوہارو کے شعرا کے نام سے ایک مستند کتاب بھی لکھی تھی، جس میں پہلے خاندان کی تاریخ اور حالات درج ہیں پھر اس کے شعرا کا تذکرہ ہے، مرحومہ نے کئی دلچسپ سماجی ناول بھی لکھے اور ان کے منتخب افسانوں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا تھا، ان کی ان کتابوں پر دہلی اور اترپردیش وغیرہ کی اکیڈمیوں نے انعامات دیے مگر انھوں نے قبول نہیں کیا، اور کہا کہ ''جب تک حکومت اردو کو اس کا جائز حق نہیں دے گی، میں اس طرح کا کوئی انعام قبول نہیں کروں گی''۔

مرحومہ ایک مہذب، شائستہ اور شریف گھرانے کی فرد ہی نہیں تھیں بلکہ خود بھی دیانت دار اور پرانے ادبی و تہذیبی ورثے کی امین اور اخلاقی روایات و اقدار کی پاسباں تھیں، اللہ تعالیٰ انھیں غریق رحمت کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔

(''ض''، مارچ ۲۰۰۳ء)

شمل، انامری، پروفیسر

پروفیسر انامری شمل

پروفیسر انامری شمل کی وفات علمی دنیا کا بڑا سانحہ ہے، ۲۷ر جنوری کو اپنے گھر میں گر جانے کی وجہ سے ان کی وفات ہوگئی، وہ اس عہد کے ممتاز مستشرق تھیں، یورپ کی متعدد زبانوں کے علاوہ اردو، فارسی، عربی اور ترکی کی بھی ماہر تھیں، عربی میں ایک رسالہ بھی نکالا تھا اور قریباً ۵۰ کتابیں لکھیں۔

انہوں نے اپنی تمام عمر تحقیق اور علمی کاموں کے لیے وقف کر دی تھی، مشرقی اور اسلامی علوم پر ان کی اچھی نظر تھی، ہندوستان کئی بار تشریف لائیں اور یہاں کے اصحاب علم و ذوق کو ان سے استفادے کا موقع ملا، اورینٹل اسٹڈیز میں انہوں نے جہاں مختلف مشرقی زبانوں پر کام کیا تھا وہاں اردو، غالب اور اقبال بھی ان کے مرکز توجہ رہے، ان کی وفات سے مشرقی زبانوں اور اردو کا بڑا نقصان ہوا، اس خلا کا پُر ہونا مشکل ہے۔

(''ض''، مارچ ۲۰۰۳ء)

قاسمی، نسیم احمد، مولوی مفتی

مولوی مفتی نسیم احمد قاسمی

یہ خبر سن کر بڑا افسوس ہوا کہ امارتِ شرعیہ بہار، جھارکنڈ اڑیسہ کے ناظم مولوی مفتی نسیم احمد قاسمی نے ۳۰ر جنوری کو داعی اجل کو لبیک کہا، وہ مولانا قاضی مجاہد الاسلام کے خاص تربیت یافتہ تھے، فقہی اور ملی مسائل پر ان کے اچھے مضامین لوگوں کو ان کی طرف متوجہ کر رہے تھے، امارت کے کاموں میں بھی بڑے مستعد، کارگزار اور چاق چوبند رہتے تھے، ان کی وفات سے اسے بڑا دھکا پہنچا۔

ابھی ان کی عمر ۳۷ برس تھی، یہ بھی کوئی جانے کے دن تھے مگر مشیت ایزدی میں کس کو دخل ہے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، پس ماندگان کو صبر جمیل دے اور امارت کو ان کا بدل مہیا کرے، آمین۔ (''ض''۔ مارچ ۲۰۰۳ء)

صدیقی، ظہیر احمد، پروفیسر

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی

افسوس ہے کہ ۱۷ر فروری ۲۰۰۳ء کو پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے داعی اجل کو لبیک کہا، ان کی پیدائش ۱۹۲۹ء میں بدایوں میں ہوئی تھی اور وہ مولانا ضیاء بدایونی سابق صدر شعبہ فارسی کے صاحبزادے تھے، علی گڑھ میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد یہیں استاذ ہوئے، مگر جلد ہی دہلی کالج اور پھر دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ ہوئے اور پروفیسر اور ڈین کے عہدے پر فائز ہوئے۔ حکیم مومن خاں مومن سے ان کی دلچسپی موروثی تھی، ان کی شخصیت اور فن پر ایک کتاب لکھی تھی، خواجہ میر درد، مولانا حالی اور فانی بدایونی پر بھی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، فکری زاویے اور احساس و ادراک ان کے مجموعہ مضامین ہیں، انجمن ترقی اردو ہند سے ان کا گہرا تعلق تھا، وہ اس کے نائب صدر تھے، اردو کے اچھے استاذ، ادیب، نقاد اور مصنف ہونے کے علاوہ بڑے خلیق اور شریف انسان تھے، ہر شخص سے خلوص و محبت سے پیش آتے تھے، وظیفہ یاب ہونے کے بعد علی گڑھ میں سکونت اختیار کر لی تھی، یہیں کی خاک کا پیوند بھی ہوئے، اللہ تعالیٰ غریق

رحمت کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ ("ض"۔ اپریل ۲۰۰۳ء)

اختر، سید ہاشم علی

جناب سید ہاشم علی اختر صاحب

افسوس ہے کہ ۱۴/ جون ۲۰۰۳ء کو جناب سید ہاشم علی اختر شکاگو میں وفات پاگئے، اناللہ و انا الیہ راجعون۔

وہ جامعہ عثمانیہ کے مایہ ناز فرزند، حیدرآباد کے نام ور شخص اور ملک کے بڑے دانشور تھے، ان کو ملک کی دو شہرہ آفاق یونیورسٹیوں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہونے کا فخر بھی حاصل ہوا۔

جناب ہاشم علی اختر کی پیدائش ۶/ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو حیدرآباد میں ہوئی تھی، شروع کی تعلیم مدرسوں میں ہوئی، ۱۹۳۸ء میں انہوں نے جامعہ عثمانیہ سے بی ایس سی اور ۱۹۴۴ء میں ایم ایس سی کیا، ان کی طبیعت کا رجحان علم وتعلیم کی طرف تھا، اس لیے شروع میں درس و تدریس ہی کے پیشے سے وابستہ ہوئے، پہلے سٹی ہائی اسکول میں مدرس ہوئے پھر سٹی کالج میں جونیئر لکچرر ہوئے، مگر ان میں نظم ونسق کی صلاحیت بھی بہ درجہ اتم تھی، اس لیے جلد ہی انتظامی شعبے سے ان کا تعلق ہوگیا اور ۱۹۴۶ء میں وہ حیدرآباد سیول سروس کے لیے منتخب ہوگئے، اس کے بعد آئی۔اے۔ایس کے لیے ان کا انتخاب ہوا اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر تقرر ہوا جس سے ترقی کرتے ہوئے پرنسپل سکریٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔

ہاشم صاحب کو نظم ونسق کا اچھا سلیقہ تھا، ایک کامیاب اور نیک نام آئی اے ایس آفیسر کی حیثیت سے ان کو بڑی عزت وشہرت ملی، سکریٹریٹ کی اچھی کارکردگی اور خوش انتظامی ہی کی وجہ سے سبکدوش ہونے کے بعد حکومت نے ۱۹۸۲ء میں انہیں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کا وائس چانسلر مقرر کردیا، ابھی اس کی میعاد مکمل نہیں ہوئی تھی کہ ۱۹۸۵ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے لیے ان کا انتخاب ہوگیا۔

وائس چانسلر کی حیثیت سے ان کی کارکردگی بہت اچھی رہی، علی گڑھ میں ان سے پیش تر جناب سید حامد وائس چانسلر تھے جو ایک بحرانی دور تھا لیکن انہوں نے حالات درست کرنے کے لیے اپنی پوری طاقت لگادی، ان کے اصلاحی اقدامات اور عمل جراحی سے فریاد واحتجاج کی آوازیں بھی بلند ہوئیں اور آپریشن کی وجہ سے کراہ اور چیخیں بھی سنائی دیں، ہاشم صاحب اس بہتر اور درست ماحول کو قائم رکھنے میں کامیاب رہے اور جہاں کور کسر اور فاسد مادے رہ گئے تھے ان کو بھی ٹھیک کیا، ان کا دور بڑا پرسکون اور پرامن رہا اور ان سے شاید ہی کسی کو شکایت ہوئی ہو، وہ ایک لائق شخص اور اچھے منتظم تھے، اس لیے ۱۹۸۹ء میں جب اس منصب سے سبکدوش ہوئے تو انہیں مختلف عہدے پیش کئے گئے مگر انہوں نے معذرت کردی۔

گو ان کو انتظامی امور سے زیادہ سروکار رہا تاہم قلم وقرطاس سے ابھی ان کا شغل برابر قائم رہتا تھا، وہ اردو اور انگریزی کے اچھے اہل قلم تھے، انگریزی میں بعض کتابیں بھی لکھیں، ان کا مطالعہ وسیع تھا، مطالعہ سے ان کی دلچسپی تاعمر باقی رہی، ہندوستان کے حالات ومسائل سے باخبر رہتے تھے، ان حالات سے مسلمان کس طرح عہدہ برآ ہوں، اردو زبان کا تحفظ و بقا کیسے ہو، مشترکہ قومی تہذیب اور ہندوستان کا سیکولر مزاج کیسے باقی رہے، جدید عہد کے چیلنج کا مقابلہ کس طرح کیا جائے، موجودہ حالات میں اسلام کو پیش کرنے کا کیا سائنٹفک انداز اور اس کی شرح وتعبیر کا کون سا منطقی طریقہ کار اختیار کیا جائے، یہ اور اس طرح کے دوسرے امور ومسائل ہمیشہ ان کے زیر غور رہتے تھے اور ان کے متعلق کبھی کبھی وہ اپنے نتائج فکر قوم کے سامنے پیش بھی کرتے تھے جن سے اختلاف بھی کیا جاتا تھا مگر اس میں غلط فہمیوں کا زیادہ دخل ہوتا تھا، ایک مرتبہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری میں اردو رسم الخط کے متعلق کچھ باتیں انہوں نے کہیں تو غلط فہمی کی بنا پر اس کے خلاف بہت کچھ کہا اور لکھا گیا۔

ہاشم صاحب نے کئی ادیبوں اور بعض ارباب سیاست پر مضامین اور خاکے بھی لکھے جن کو پسند کیا گیا، اکثر ان کے خطوط بھی ماہنامہ "سب رس" میں شایع ہوتے تھے جن سے ان کے علم ومطالعہ کی وسعت، خیالات کی پختگی، تجربات ومشاہدات کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے، ان کا علمی و ادبی ذوق پختہ اور منجھا ہوا تھا، وہ خاص حیدرآباد کی پیداوار اور پروردہ تھے اس لیے اردو کا ذوق بہت بلند تھا اور بڑی شگفتہ اور سلیس زبان لکھتے تھے، ان کی تحریر جامع اور پرمغز ہوتی تھی، ان سے میری پہلی ملاقات دارالعلوم تاج المساجد بھوپال کے علامہ سید سلیمان ندوی سمینار میں ہوئی تھی، میں اس کے جس سشن میں اپنا مضمون پڑھنے والا تھا، اس میں وہ میرے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے، میں مقالہ پڑھ کر جب اپنی جگہ پر ان کے پاس بیٹھا تو انہوں نے مقالے کی اور خاص طور پر اس کی زبان و بیان کی تحسین فرمائی، وہ اس وقت علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، مجھ سے فرمایا کہ وہاں آنا ہو تو ملاقات ہونی چاہیے، چنانچہ ان کی موجودگی میں جب علی گڑھ جاتا تو ان سے ضرور ملتا، پہلی دفعہ اکیلے جانے میں جھجک ہورہی تھی تو اپنے خاص کرم فرما مولانا حافظ محمد تقی امینی مرحوم سابق ناظم سنی دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو لے کر گیا جو وائس چانسلر صاحب سے بہت بے تکلف تھے، وہ مجھ سے بھی بڑی محبت وشفقت سے پیش آتے اور مختلف مسائل کے علاوہ دارالمصنفین پر بھی ہمدردانہ گفتگو فرماتے، ان ملاقاتوں سے میرے دل پر ان کی شرافت، اخلاص، نیکی، لطف وکرم اور حسن خلق کا نقش بیٹھ گیا، وہ طبعاً شریف اور متواضع تھے، کبھی اپنی بڑائی اور عظمت کا احساس نہ ہونے دیتے، جو بات ان سے کہی جاتی غور وتوجہ سے سنتے، اگر کرنے کے لائق کام ہوتا تو

کردیتے، لیکن اگران کے امکان میں نہ ہوتا تو لگی لپٹی باتیں کرنے کے بہ جائے صفائی سے معذرت کردیتے، اپنی شرافت اور دل نوازی کی وجہ سے حیدرآباد کے علمی و ادبی حلقوں میں بہت مقبول تھے، وہاں کی باوقار مجلسوں میں شریک بھی ہوتے تھے، ان کی شرکت سے مجلس کی رونق بڑھ جاتی تھی اور جو بات کرتے اس کا وزن محسوس کیا جاتا تھا۔

علمی و ادبی اور اردو اداروں سے بھی ان کا تعلق تھا، دارالمصنفین سے بھی ان کو ہمدردی تھی، حیدرآباد کے مشہور ادارۂ ادبیات سے ان کا برابر گہرا تعلق رہا، اس کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے، ۱۹۷۵ء میں اس کے معتمد منتخب کیے گئے اور ۱۹۸۲ء میں نائب صدر مقرر کیے گئے اور ۱۹۸۹ء میں اس کے صدر منتخب کیے گئے اور ۱۹۹۴ء میں امریکہ جانے سے قبل تک اس عہدے پر فائز رہے، یہ ادارے کا بڑا سنہرا دور تھا، اس میں اس کے کئی اہم کام انجام پائے، ادارے کے میوزیم کے لیے حکومت ہند سے گرانٹ ملی جس سے میوزیم کی ازسرنو تنظیم میں بڑی مدد ملی، یوم محمد علی قطب شاہ اور یوم محی الدین قادری زور کی سالانہ تقاریب دھوم دھام سے منائی جاتی تھیں ''سب رس کتاب گھر'' کا قیام عمل میں آیا اور ادارے کے مختلف شعبوں کا احیا اسی دور میں ہوا جس سے اس کی کارکردگی میں بڑا اضافہ ہوا، امریکہ جانے سے قبل ہاشم صاحب نے ایوان اردو کے بالائی ہال کی تعمیر کے لیے اپنی جیب سے دس ہزار روپے دیے اور کتب خانے کو اپنی پانچ سو کتابیں بھی مرحمت فرمائیں۔

امریکہ چلے جانے کے بعد گو ادارے سے ان کا ضابطے کا تعلق ختم ہوگیا تھا تاہم ادارے اور حیدرآباد میں ان کا دل اٹکا ہوا تھا، ہر وقت ان کی یاد تڑپاتی رہتی تھی، خطوط سے اس کے حالات معلوم کرتے اور حیدرآباد کے لوگوں کی خیریت دریافت کرتے، ادارے کی سرگرمیوں سے واقف ہوتے اور اس کی ترقی کے لیے اپنے مفید مشورے پیش کرتے رہتے تھے۔ ہاشم صاحب کو حیدرآباد اور اس کی مخصوص تہذیب سے عشق تھا، اسے چھوڑنا گوارا نہیں تھا مگر اہلیہ محترمہ کی وفات کے بعد بالکل ٹوٹ گئے تھے، یہاں بالکل تنہا رہ گئے تھے اس پر پیری اور بیماری، مجبوراً شکاگو دو صاحبزادیوں کے پاس چلے گئے، صاحبزادے لاس اینجلس میں تھے، باپ کی بیماری کی خبر سن کر شکاگو آگئے، ہاشم صاحب کی علالت کا سلسلہ عرصے سے چل رہا تھا بالآخر وقت موعود آگیا وما تدری نفس بای ارض تموت [لقمان: ۳۴]، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کاملہ سے نوزے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ (''ض''، اگست ۲۰۰۳ء)

ابن فرید، ڈاکٹر

ڈاکٹر ابن فرید

۸؍مئی ۲۰۰۳ء کو اردو کے ممتاز ادیب و نقاد اور اچھے افسانہ و ناول نگار ڈاکٹر ابن فرید کا انتقال ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ڈاکٹر ابن فرید کا اصل نام محمود مصطفےٰ صدیقی تھا، وہ ضلع بارہ بنکی میں سترکھ کے قریب کے ایک گاؤں ظفرپور میں ۲۸؍اکتوبر ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے تھے لیکن ان کی زندگی کا زیادہ حصہ علی گڑھ میں گزرا، آخر میں رام پور میں متوطن ہوگئے تھے، بیمار ہونے پر علی گڑھ میڈیکل کالج میں داخل کیے گئے، یہیں پیامِ اجل آگیا، وہاں سے ان کا جسد خاکی ان کے وطن ظفرپور لایا گیا، ۹؍مئی کو نماز فجر کے بعد اپنے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کردیے گئے۔

ان کے گھر کے حالات بہتر نہیں تھے، ہائی اسکول کرنے کے بعد تعلیم چھوڑ کر رائل انڈین ایرفورس میں ملازمت کرلی، یہ سلسلہ ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء تک جاری رہا، یافت کے لحاظ سے ملازمت اچھی تھی مگر ان کو پسند نہیں تھی، وہ اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتے تھے، ٹیوشن سے کام چلاتے، تعلیم کا شوق انہیں علی گڑھ لے گیا، نفسیات میں داخلہ لیا، اس میں، انگریزی اور عمرانیات میں ایم۔اے کیا، ۱۹۷۶ء میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری لی۔

علمی ذوق کی وجہ سے معلّمی کے پیشے سے وابستہ ہوئے، مرکزی درس گاہ اسلامی رام پور سے تدریس کا آغاز کیا، پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ تعلیمات و عمرانیات میں لکچرر ہوئے، ملک عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ میں بھی درس و تدریس کی خدمت پر مامور رہے، ریٹائر ہونے کے بعد سکوتو یونیورسٹی نائجیریا اور بین الاقوامی یونیورسٹی ملیشیا نے ان کی خدمات حاصل کرنی چاہی مگر اپنی اور اہلیہ کی صحت کی خرابی کی وجہ سے معذرت کردی۔

مرحوم کا تعلق جماعت اسلامی ہند سے تھا، اس تحریک سے وابستگی کی وجہ سے ان کے ذہن و دماغ میں اسلامی روح و فکر رچ بس گئی تھی اور تقریباً نصف صدی تک ان کا قلم اسلامی فکر و رجحان کی ترویج و اشاعت اور جماعت اسلامی کے ادبی محاذ کو قوت اور فیضان پہنچاتا رہا، وہ ادارۂ ادب اسلامی کے تاسیسی رکن اور ایک مدت تک اس کے صدر رہے، انہوں نے جو کچھ لکھا اس پر اسلامی افکار و تصورات کی چھاپ رہی، کبھی خدا بیزار، خالص مادی، مغرب زدہ اور فحش و عریاں لٹریچر ان کو اپنی جانب نہیں کھینچ سکا اور نہ وہ اشتراکی کوچہ گردوں کے پھندے میں پھنسے بلکہ ستایش و صلہ کی تمنا سے بے پروا ہوکر ادب میں طہارت اور پاکیزگی کے تصور کو فروغ دیا۔

ڈاکٹر ابن فرید نے مختلف اصناف ادب میں اپنے نقوش چھوڑے ہیں، بچوں اور خواتین کا ادب ان کی توجہ کا خاص مرکز رہا ہے، تنقید و تحقیق میں بھی انہوں نے اپنا جوہر دکھایا ہے لیکن ان کا اصل رجحان افسانہ و ناول نگاری کی طرف تھا، اس میدان میں بڑی لالہ کاری کی ہے، ابھی حال میں گجرات کے فسادات سے متاثر ہوکر انہوں نے اپنے افسانوں کا ایک مجموعہ ''خوں آشام'' کے نام سے شایع کیا تھا۔

اردو کی طرح انگریزی پر بھی قدرت تھی، دونوں زبانوں میں چھوٹی بڑی درجنوں کتابیں لکھی ہیں، ان کی بعض اردو کتابوں پر اتر پردیش اردو اکادمی اور میر اکیڈمی لکھنو نے ایوارڈ بھی دیا ہے۔

ابن فرید صاحب کی ادبی خدمت کا ایک میدان صحافت بھی تھا، ان کی ادارت میں متعدد رسالے نکلے جو اپنے دور کے ممتاز ادبی رسالوں میں شمار کیے جاتے تھے اور جن سے اسلامی ادبی تحریک کو بڑی توانائی ملی، معیار (میرٹھ) اور دانش کے شریک مدیر تھے، لیکن نئی نسلیں (لکھنو) اور ادیب (علی گڑھ) کے وہ چیف اڈیٹر تھے۔

بعض انگریزی رسالوں کی بھی ادارت انہیں سپرد کی گئی، انڈین جنرل آف سوشل سسٹم کے شریک مدیر تھے اور ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۵ء تک انگریزی جنرل آف آبجکٹیو اسٹڈیز کے فاونڈر اڈیٹر تھے۔

ان کی اہلیہ ام صہیب نے جن کا اصلی نام احمدی خاتون تھا، خواتین کے لیے ماہنامہ حجاب نکالا، آخری ایام میں ابن فرید صاحب بھی اس کے ادارتی و انتظامی امور میں اپنی اہلیہ کا ہاتھ بٹاتے تھے، ان کا انتقال ہوگیا تو ابن فرید صاحب نے اسے بند کردیا۔

ادیب کو وہ برسوں بڑی محنت سے ایڈٹ کرتے رہے، یہ جامعہ اردو علی گڑھ کا رسالہ تھا جس میں اس کے نصاب وغیرہ سے متعلق زیادہ مضامین ہوتے تھے تاہم یہ ادبی نگارشات پر بھی مشتمل ہوتا تھا، اس کے کئی خاص نمبر بھی شایع ہوئے جن میں ”شبلی نمبر“ بہت اہم اور ایک یادگار چیز ہے جو حوالے کا کام دیتا ہے، انہوں نے اس کے لیے اس زمانے کے اکثر مشاہیر کے مضامین حاصل کیے تھے اور خود بھی بہت اچھا مضمون ”شبلی چوں بہ خلوت می روند“ لکھا تھا جو اگرچہ غیر جانب دارانہ اور معروضی تھا مگر مولانا شبلیؒ کے خاص نکتہ چیں شیخ محمد اکرام جب لاہور سے ہندوستان آئے اور علی گڑھ گئے تو وہ ابن فرید صاحب سے ملنے ان کی قیام گاہ پر پہنچ گئے اور مضمون کے بعض نکات کے متعلق بعض وضاحتیں طلب کیں۔

میری ان کی ملاقات اس زمانے کی ہے جب ۱۹۷۸ء میں ہم دونوں اتر پردیش اردو اکادمی کے ممبر تھے، میری نظر سے ان کے ادبی وتنقیدی مضامین گزرتے تھے، وہ صالح ذہن رکھنے والے اچھے ادیب، نقاد اور افسانہ نگار تھے، لیکن اس کی وجہ سے اور عام ادبی دھارے اور گروہ بندی سے الگ تھلگ رہنے کی وجہ سے رائج الوقت ادیبوں نے ان سے کوئی خاص اعتنا نہیں کیا، تاہم اپنے حلقۂ فکر کے ادیبوں میں مقبول تھے اور اس حلقے میں ان کا ادبی وزن تسلیم کیا جاتا تھا، اب وہ وہاں جاچکے ہیں جہاں صرف اچھے اعمال کا ذخیرہ ہی کام دیتا ہے، اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے اور ان کے اعزہ واحباب کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ (”ض“، اگست ۲۰۰۳ء)

سحر، ابوالفیض

جناب ابوالفیض سحر

اردو کے ایک اور اچھے شاعر و ادیب اور تحریک کے خاموش مگر سرگرم اور مخلص خدمت گزار جناب ابوالفیض سحر ۲۲/ جون کی شب میں حرکت قلب بند ہوجانے سے وفات پاگئے اور ۲۳/ جون کو ۱۱ بجے دن میں بستی حضرت نظام الدین میں واقع قبرستان میں دہلی کے شعرا وادبا اور متعلقین کی کثیر تعداد کی موجودگی میں سپرد خاک کردیے گئے۔

وہ بالکل ٹھیک تھے، انتقال کے روز نوئیڈا میں جناب رفعت سروش کے گھر ایک تقریب میں شرکت کے لیے گئے تھے، شام کو واپس آئے تو کچھ بے چینی محسوس کی، رات تک طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو اسپتال میں داخل کیے گئے جہاں روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی، ان کی صحت بہتر رہتی تھی مگر اس سے پہلے بھی ایک بار دل کا دورہ پڑچکا تھا، یہ دوسرا دورہ جان لیوا ثابت ہوا۔

سحر صاحب مارن پیٹ ضلع محبوب نگر (آندھراپردیش) میں ۱۹/ فروری ۱۹۳۷ء کو ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے تھے محبوب نگر ہائی اسکول کے اردو میڈیم اسکول سے میٹرک کیا، مزید تعلیم کے لیے حیدرآباد گئے، چادرگھاٹ کالج سے انٹر کیا اور کالج میگزین کے اڈیٹر ہوئے، پھر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے آرٹس کالج سے بی۔اے کیا، ٹیوشن سے تعلیمی اخراجات پورا کرتے تھے، بی۔اے کرنے کے بعد حیدرآباد کے ایک قدیم اور مشہور اسکول اشرف المدارس میں ٹیچر ہوگئے مگر جلد ہی یہ ملازمت چھوڑ کر ایم۔اے کرنے کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ لیا، مجلّہ عثمانیہ کے اڈیٹر بھی ہوئے، اسی زمانے میں انہیں ماہر لسانیات پروفیسر مسعود حسین خاں سے تلمذ کا فخر حاصل ہوا، جو سحر صاحب کو ان کے اخلاص اور اردو سے دلچسپی کی بنا پر بہت عزیز رکھتے تھے، باگا ریڈی صاحب سے بھی سحر صاحب ان کی اردو دوستی کی وجہ سے بہت قریب ہوگئے تھے، ایم۔اے کرنے کے بعد سحر صاحب باگا ریڈی کے قائم کردہ اردو میڈیم اسکول میں ٹیچر ہوگئے مگر ان کے شفیق استاد مسعود حسین خاں کو ان کی استعداد اور اچھی صلاحیت کی بنا پر یہ ملازمت پسند نہیں تھی، ان کی کوشش سے سحر صاحب کو دلی میں یونین پبلک سروس کمیشن میں اردو مترجم کی جگہ مل گئی، لیکن اردو سے دلچسپی کی بنا پر انہیں خود ملازمت پسند نہیں تھی، چنانچہ جب مرکزی حکومت نے اردو کی ترقی کے لیے ترقی اردو بیورو قائم کیا جو اب قومی کونسل برائے فروغ اردو کہلاتا ہے تو اس میں ملازمت کرلی اور ترقی کرکے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے اور اسی سے سبکدوش ہوئے، اس تقریب سے وہ حیدرآباد چھوڑ کر دلی آئے تو اسی کو اپنا وطن بنالیا اور یہیں کے ہوکر رہ گئے لیکن حیدرآباد بھی آتے جاتے رہتے تھے۔

جناب ابوالفیض کو اردو زبان سے عشق تھا، طالب علمی کے زمانے ہی سے وہ اردو تحریکوں سے وابستہ رہتے تھے انجمن ترقی اردو سے والہانہ تعلق تھا، اس کی ہر تقریب اور پروگرام میں شریک ہوتے اور اس کے کاموں میں بہت پیش پیش رہتے، انجمن کے صدسالہ جشن کو کامیاب بنانے میں انہوں نے رات دن ایک کردیا تھا، اس کے آخری جلسے میں شکریے کی رسم بھی ادا کی، انجمن کے ذمہ داروں کے ہر کام میں ان کا ہاتھ بٹانے اور اس سے غیر معمولی خلوص اور دلچسپی کی بنا پر وہ اس کے رکن منتخب کرلیے گئے تھے، میری ان کی ملاقات انجمن کے سیمیناروں ہی میں ہوتی تھی۔

ان کی پوری زندگی اردو زبان و ادب کی بے لوث خدمت اور ادبی سرگرمیوں میں گزری، وہ اردو کے مختلف اداروں کی خدمت اعزازی طور پر انجام دیتے تھے، ہر کام بڑے خلوص، دلچسپی، خاموشی اور محنت و جاں فشانی سے کرتے تھے، شہرت، مقبولیت اور صلہ وستایش کی تمنا سے بے نیاز ہوکر اسے اپنا فریضہ سمجھتے تھے، طبیعت میں بہت انکسار تھا اس لیے کبھی اس کا فخریہ ذکر کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔

جناب ابوالفیض اردو کے صحافی، مترجم، ادیب اور نقاد تھے، تحقیق و تنقید و تبصرہ میں وہ تعصب اور جانب داری کو پسند نہیں کرتے تھے، ان کا رویہ معقول، حق پسندانہ اور معتدل و متوازن ہوتا تھا، خوش کلام شاعر بھی تھے، نثر نگاری کے کمال سے ان کی شاعری دب گئی تھی، سرکاری مصروفیت کے باوجود انہوں نے کئی کتابیں لکھیں، خلا میں پہلا ہندوستانی، تناظر اور تجزیے، تیشۂ نظر، فن اور فنی مباحث اردو دنیا میں مقبول ہوئیں، ان کے بعض تنقیدی کام مرکز توجہ بنے، مرحوم ظ۔انصاری کے ساتھ مل کر ''خسرو شناسی'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس کے کئی ایڈیشن نکلے، وہ برصغیر کے مختلف رسالوں اور اخباروں میں مضامین بھی لکھتے تھے، تیلگو اور انگریزی زبانوں میں بھی مضامین لکھے۔

سحر صاحب اچھے مقرر تھے، زمانہ طالب علمی سے ان میں تقریر کی اچھی صلاحیت پیدا ہوگئی تھی، اکثر ادبی جلسوں اور تقریبات میں شریک ہوتے، سمینار میں مقالے تو پڑھتے ہی ان کی نظامت بھی کرتے، انہوں نے خود بھی کئی بڑے سمینار کرائے، حیدرآباد جاتے تو ان کے اعزاز میں نشستیں ہوتیں اور وہ تقریر کرتے۔

اردو کے اکثر ادبا، شعرا مذہب سے بے تعلق اور بے گانہ ہوتے ہیں، انہیں قومی و ملی کاموں سے بھی سروکار نہیں ہوتا، لیکن جناب ابوالفیض سحر صوم و صلاۃ کے پابند تھے، متعدد سرکاری و نیم سرکاری اداروں سے وابستہ ہونے کے باوجود آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے بھی ممبر تھے اور اس کے پلیٹ فارم سے قومی و ملی مسائل حل کرنے کے لیے فکرمند رہتے تھے۔

جناب ابوالفیض سحر خلوص و محبت کا پیکر، ایک شریف، نیک نفس، خلیق اور ملنسار انسان تھے، اپنے دوستوں اور ملنے جلنے والوں کی مدد کے لیے ہر وقت تیار رہتے، انہیں کبھی شکایت کا موقع نہ دیتے، کبھی کسی کی دل شکنی نہ کرتے، ہنسی اور بے تکلفی کی بات بھی کرتے تو دوسروں کے جذبات کا خیال رکھتے اور کوئی تکلیف پہنچانے والی بات نہ کرتے۔ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی انکساری تھی، دوسروں کے ادب واحترام اور عزت نفس کے خیال میں مجسم انکسار اور متواضع بن جاتے، اپنی فضیلت و برتری کا کبھی اظہار نہ کرتے، ان میں کبر اور گھمنڈ کا شائبہ نہ تھا، ان کی ذات میں حیدرآباد اور دلی دونوں کی تہذیب و شرافت اور وضع داری جمع ہوگئی تھی، وہ اپنی پاکیزہ سیرت و شخصیت، صاف اور بے داغ زندگی کی وجہ سے دلی اور حیدرآباد دونوں جگہ مقبول اور ہردل عزیز تھے، اللہ تعالیٰ جنت الفردوس نصیب کرے اور اعزہ و احباب کو صبر و تسلی بخشے، آمین۔

(''ض''، اگست ۲۰۰۳ء)

خسرو، علی محمد، پروفیسر

پروفیسر علی محمد خسرو

سخت افسوس ہے کہ ۲۴/ اگست کی شب میں ساڑھے گیارہ بجے مشہور مسلم دانشور، ملک کے ممتاز ماہر اقتصادیات اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور چانسلر پروفیسر سید علی محمد خسرو نے داعی اجل کو لبیک کہا، اناللہ و انا الیہ راجعون۔

۷/ اگست کو دل کا شدید دورہ پڑا تو اسپتال میں داخل کیے گئے لیکن مرض بڑھتا گیا اور آخر دنوں میں حالت اتنی خراب ہوگئی تھی کہ خود سے سانس نہیں لے سکتے تھے اور آلہ تنفس کا سہارا لینا پڑا بلڈ پریشر بہت لو ہوگیا تھا بالآخر ۷۹ برس کی عمر میں وقت موعود آ گیا، پس ماندگان میں ایک صاحبزادے اور ایک صاحبزادی ہیں۔

۲۵/ اگست کو غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین کے قریب عرس محل میں عصر بعد نماز جنازہ ادا کی گئی اور درگاہ عمادالدین فردوسی کے پاس خسرو باغ میں تدفین ہوئی۔

موت تو ہر ایک کو آنی لابد ہے لیکن خسرو صاحب کی موت ایک بڑا قومی و ملی سانحہ ہے، وہ ملک کے مایہ ناز فرد، قومی اہمیت کے حامل اور زرعی و مالی اقتصادیات میں عالم گیر شہرت کے مالک تھے اور جس ملت سے ان کا تعلق تھا اس میں بڑا قحط الرجال ہے، اس کے یہاں جو جگہ خالی ہوتی ہے وہ پر نہیں ہوتی، خسرو صاحب جیسے بلند پایہ، عالی دماغ، کامل الفن اور یگانہ شخص کی خالی جگہ بھی پر ہوتی نظر نہیں آتی۔

سید علی محمد خسرو کا تعلق حیدرآباد کے ایک ممتاز خاندان سے تھا، وہ یہیں ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے تھے، مدرسہ عالیہ اور نظام کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد لندن چلے گئے اور لیڈز یونیورسٹی سے معاشیات میں ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کیا، وطن واپس آنے کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی میں درس و تدریس کی خدمت انجام دی، ۳۱ برس کی عمر میں وہ دہلی کے انسٹیٹیوٹ آف اکنامکس سے وابستہ ہوئے اور براہ راست پروفیسر

بنادیے گئے، بدرالدین طیب جی کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں وائس چانسلر کا منصب سنبھالا، بعد میں چانسلر بھی بنائے گئے، جرمنی میں ہندوستان کے سفیر رہے، وزیراعظم کی معاشی کونسل کے رکن نامزد کیے گئے، پلاننگ کمیشن کے بھی رکن ہوئے، ریزرو بینک کے ڈائرکٹر بنائے گئے، فنانشل اکسپریس کے مدیر مقرر ہوئے، آغا خاں فاؤنڈیشن کے ہندوستانی دفتر کی سربراہی کی، گیارہویں مالیاتی کمیشن کے چیرمین ہوئے، ملک کے باہر جانے والے کئی ہندوستانی کمیشنوں کی قیادت کی اور بعض ملکوں میں وزیٹنگ پرفیسر کی حیثیت سے بھی ان کو مدعو کیا گیا۔

خسرو صاحب کی زندگی علمی و تعلیمی جدوجہد میں گزری، وہ مدۃ العمر اداروں اور تنظیموں سے وابستہ رہے، کئی کمیشنوں اور منصوبوں کی سربراہی کی، ریٹائر ہونے کے بعد بھی ملک میں ان کی بڑی مانگ تھی، ہاتھوں ہاتھ لیے جارہے تھے اور ان کی پذیرائی میں کوئی کمی نہیں ہورہی تھی لیکن دست اجل نے اس جوہر قابل کو ہم سے چھین لیا۔

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہم ہی سو گئے داستاں کہتے کہتے

خسرو صاحب کے کمالات اور خدمات کا بڑا اعتراف کیا گیا اور گوناگوں اعزازات سے نوازے گئے۔ خسرو صاحب کی سرگرمیوں کا ایک خاص محور علم کا فروغ اور درس و افادہ تھا، اسی سے ان کی عملی زندگی کا آغاز ہوا تھا اور اسی دشت کی سیاحی میں ساری عمر گزاری تھی، انہوں نے زندگی بھر علمی و تعلیمی اداروں کی سربراہی کی، ان کے تلامذہ کی تعداد کثیر ہے، معاشیات ان کا خاص موضوع تھا اس میں وہ اتھارٹی کا درجہ رکھتے تھے، بعض کتابیں بھی لکھی تھیں، برابر معاشی اسکیموں اور منصوبوں کی رہنمائی کرتے رہے، ملک کی معاشی گتھیاں سلجھانے میں حکومت کبھی ان کی خدمات کو نظرانداز نہیں کرسکی اور برابر ان کے مشوروں اور تجربوں سے فائدہ اٹھاتی رہی، اس میدان میں ان کی مہارت سے ملک وقوم کو بڑا فیض پہنچا۔

وہ سیاست کی خارزار سے کبھی نہیں الجھے اور نہ کسی سیاسی جماعت سے وابستہ ہوئے مگر ان میں سیاسی بصیرت بدرجۂ اتم تھی اور وہ ملکی و عالمی سیاست پر گہری نظر رکھتے تھے، ان میں نظم و انصرام کی غیر معمولی صلاحیت تھی، ذہین و طباع بھی تھے، حکومت ہند نے ان کی بالغ نظری، فراست، تدبر اور انتظامی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں جرمنی جیسے ترقی یافتہ ملک کا سفیر بنایا تھا اور اس حیثیت سے انہوں نے اپنے ملک کا نام بھی روشن کیا اور اپنی نیک نامی کا سامان بھی کیا۔

خسرو صاحب نے اعتدال اور حقیقت پسندی کی بنا پر بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود اپنی ملی شناخت باقی رکھی اور اپنی قوم وملت سے اپنا رشتہ کبھی منقطع نہیں ہونے دیا، وہ مسلمانوں کے پروگرام، ان کی کانفرنسوں اور اجتماعات میں بڑے شوق سے شریک ہوتے اور کھل کر اپنی رائے دیتے، مسلمانوں کے مسائل سے ان کو خاص دلچسپی تھی اور ان کے حل میں معاونت کے لیے ہر وقت تیار رہتے، وہ انہیں اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے روح عصر سے ہم آہنگ ہونے قوم وطن کی سرگرمیوں میں حصہ لینے اور ملک میں ہونے والی ترقیات اور موقع سے فائدہ اٹھانے، اپنی معاشی حالت بہتر بنانے کی تلقین کرتے رہتے تھے، ان کو مسلمانوں کے روزگار کے مسئلے سے بڑی دلچسپی تھی اور وہ اوقاف کو ان کا بیش بہا اثاثہ اور ان کی ترقی کا اہم وسیلہ خیال کرتے تھے۔

مولانا سید احمد ہاشمی مرحوم سابق ناظم جمعیۃ علمائے ہند کے یہاں کی ایک مجلس میں جس میں علما اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کے لوگ شریک تھے، سود کے مسئلے پر اپنی یہ رائے دی کہ ''شریعت نے اس سود کو ناجائز قرار دیا ہے جس میں غریب اور ضرورت مند افراد کو قرض دے کر ان کا استحصال کیا جاتا تھا، بینکوں کے سود میں اس طرح کا کوئی معاملہ نہیں ہوتا، یہ بینکوں کے منافع کا ایک حصہ ہوتا ہے، اس کو نفع، منافع یا اضافہ کے دائرے میں رکھا جاسکتا ہے، اس کو سود کا نام دے دینے یا سود ماننے اور کہے جانے کی وجہ سے مسلمان اس رقم سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہتا ہے''۔

ایک مرتبہ ان سے پوچھا گیا کیا حکومت کی ناانصافی اور زیادتی کے خلاف احتجاج گاندھی جی کی طرح مسلمانوں کو بھی ترک موالات اور عدم تعاون کا راستہ اختیار کرنا چاہیے، خسرو صاحب نے ارشاد فرمایا کہ ''دونوں وقتوں کے حالات میں زمین آسمان کا فرق ہے، اس وقت کے حکمراں غیر ملکی تھے، ان کے مفادات اور ملک کے مفادات میں ٹکراؤ تھا، گاندھی جی کا سودیشی اور کھادی کا پروگرام ملک کے مفاد کے مطابق تھا، وہ حربہ کامیاب ہوگیا، اب حکمراں ہندوستانی ہیں، ان سے اقتصادی عدم تعاون ناممکن ہے، اگر اس طرح کی کوئی کوشش کی گئی تو اس سے مسلمانوں کا زیادہ نقصان ہوگا، سیاسی عدم تعاون کا فیصلہ سیاسی لیڈروں کو کرنا چاہیے، میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کو تعلیم اور اقتصادی مواقع کی طرف پوری توجہ دینی چاہیے''۔

خسرو صاحب مسلمانوں کے تعلیمی واقتصادی فروغ کے لیے برابر تگ ودو کرتے رہے، سیکولرازم پر ان کا پختہ یقین تھا، وہ جدید تعلیم کے پروردہ تھے، ان کا تعلق بھی جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے زیادہ رہا مگر مشرقی اور ہنداسلامی تہذیب کے دامن سے ہمیشہ چمٹے رہے، علما اور قدامت پسند لوگوں سے ملنے ملانے اور ان کی مجلسوں اور جلسوں میں جانے سے احتراز نہ کرتے، وہ دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنو کے پچاسی سالہ جشن میں بھی شریک ہوئے تھے، یہیں میں نے ان کو پہلی بار دیکھا تھا، دارالمصنفین سے اچھی طرح واقف تھے، اس کے کاموں کے مداح تھے، لیکن یہاں کبھی تشریف نہیں لاسکے جس کی ان کو حسرت رہی، وہ بڑے اچھے مقرر تھے، ایک دفعہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی کورٹ کے جلسے میں مجھے ان کی تقریر بہت پسند آئی، جلسے کے بعد اس کی داد دیتے ہوئے ان سے

عرض کیا کہ آپ کی مبارک زبان سے ایسی ہی پیاری تقریر دارالمصنفین اعظم گڑھ میں سننا چاہتا ہوں، فرمایا تو بسم اللہ میں تیار ہوں مجھے بھی دارالمصنفین دیکھنے کا بڑا اشتیاق ہے میں انشاء اللہ ضرور حاضر ہوں گا، لیکن آج کل میں منصوبہ بندی کمیشن کی رپورٹ تیار کررہا ہوں، اس کی وجہ سے بڑی مشغولیت ہے، پھر اپنا وزیٹنگ کارڈ مجھے دیتے ہوئے کہا کہ اکتوبر تک خط لکھ کر دریافت کیجیے، میں نے خط لکھا مگر اس وقت کسی اور مصروفیت کی بنا پر عذر کیا، اس کے بعد بھی کئی بار متوجہ کیا مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیش آتی رہی، دو برس پہلے یوم سرسید کا شاندار جلسہ انجمن اسلام ممبئی میں ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا اور جناب رضوان اعظمی کے زیر اہتمام ہوا تھا جس میں سرسید کے افکار و خیالات کے شارح و ترجمان کی حیثیت سے وہ مدعو کیے گئے تھے، میں اس وقت وہیں تھا اور محمد اسحاق صاحب صدر انجمن اسلام اور رضوان اعظمی صاحب کی دعوت پر جلسے میں شریک ہوا اور ان کی تقریر سے محظوظ ہوا، اس کے بعد پھر ان سے کہیں ملاقات نہیں ہوئی۔

خسرو صاحب کی تقریر بڑی دلکش اور سحر انگیز ہوتی، اردو اور فارسی کے سینکڑوں اشعار انہیں یاد تھے، انہیں برمحل پڑھ کر وہ اپنی تقریر میں بڑا اثر اور کشش پیدا کردیتے تھے، کبھی کبھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کے جلسے میں بڑی گرمی گرما ہوتی اور کسی رائے پر اتفاق نہ ہوتا تو وہ چانسلر کی حیثیت سے تقریر کرنے کھڑے ہوتے، ان کی دل نواز مسکراہٹ ہی سے سکون پیدا ہوجاتا اور چاہے لوگوں کے دل نہ مطمئن ہوتے رہے ہوں لیکن ان کی تقریر سب کو خاموش ضرور کردیتی تھی، وہ بڑے باغ و بہار آدمی تھے، جس محفل میں ہوتے اپنی خوش طبعی، زندہ دلی، بذلہ سنجی اور حسن گفتار سے اسے زعفران زار بنادیتے، ان کو علم وادب کا بھی اچھا ذوق تھا، اردو شاعری سے عشق تھا، شعر بھی کہتے تھے۔

خسرو صاحب خلیق، وضع دار، ملنسار اور شریف النفس انسان تھے، اقتصادیات کے ماہر ہونے کے باوجود طبیعت میں خشکی نہ تھی، بڑے شگفتہ مزاج اور تہذیب و شائستگی کا نمونہ تھے، بڑے عہدوں پر متمکن رہنے کے باوجود کم ظرف افسروں کی طرح ان میں رعونیت، غرور، ضد اور اکڑپن نہ تھا بلکہ عاجزی و انکسار کا پیکر تھے، وہ گفتار کے نرم مگر رفتار کے گرم تھے، ضرر رسائی تو درکنار کبھی کسی پر غصہ بھی نہ ہوتے، وہ کسی انسان کے استحصال کو پسند نہ کرتے، اسی لیے پیدل چل لیتے مگر رکشہ کی سواری نہ کرتے۔

اللہ تعالیٰ عالم آخرت میں ان کے درجات بلند کرے اور متعلقین کو صبر جمیل مرحمت فرمائے، آمین۔ (''ض''، اکتوبر ۲۰۰۳ء)

قریشی، محمد اشتیاق حسین، ڈاکٹر

ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی

پروفیسر سید علی محمد خسرو کے انتقال کے دو ہی دن بعد ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی نے بھی ۲۶/ اگست کو رختِ سفر باندھا اور رحلت فرماگئے۔ اناللہ و انا الیہ راجعون۔

ڈاکٹر قریشی لکھنو کے مشہور و مقبول معالج، ہومیوپیتھی کے حاذق ڈاکٹر، دینی تعلیمی کونسل کے روح رواں، اس کے اولین کارواں کے آخری مسافر اور مختلف اصلاحی، دینی، قومی، ملی، تعلیمی اور اجتماعی تحریکوں اور تنظیموں کے ہم دم و دم ساز تھے، ان کی وفات سے جو خلا ہوا ہے، اس کا پر ہونا مشکل ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا وطن پرتاپ گڑھ تھا، نیشنل ہومیوپیتھک کالج میں لکچرر ہوکر لکھنو تشریف لائے تو یہیں کے ہوکر رہ گئے، شدہ شدہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے تعلق ہوگیا جو اتنا بڑھا کہ سفر وحضر ہر جگہ ان کے ساتھ رہتے، ۱۹۶۲ء میں مولانا جنیوا، لندن اور اسپین وغیرہ کے سفر پر گئے تو انہیں بھی اپنے ہم راہ لے گئے، ایک عرصے تک وہ مولانا سے ایسا گھل مل کر رہتے تھے کہ ان ہی کے خاندان کے فرد معلوم ہوتے تھے، مولانا کے برادر اکبر ڈاکٹر سید عبدالعلی سابق ناظم ندوۃ العلما کی بیماری کے زمانے میں بڑی دل سوزی سے ان کی خدمت کی اور وفات کے بعد ان ہی کے مطب میں پریکٹس شروع کی مگر بعد میں نخاس میں اکبر گیٹ کے پاس اپنا ذاتی مطب کھولا اور دیکھتے دیکھتے مریضوں کا ایسا تانتا بندھنے لگا کہ ظہر کی نماز کے لیے بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔

وہ مجھ سے اکثر شکایت کرتے کہ لکھنو آکر چلے جاتے ہو نہ خود ملتے ہو، نہ ملنے کا موقع دیتے ہو، ایک مرتبہ گیارہ بارہ بجے گیا تو ہجوم دیکھ کر گھبرا گیا، کسی طرح اطلاع کرائی تو فوراً تشریف لائے اور اوپر لے گئے اور کہا آرام کرو، ظہر کا کھانا اور عصر کی چائے سے پہلے نہیں جاسکتے، میں نے کہا میں تو آپ کی شکایت دور کرنے آیا تھا مجھے اور بھی کام ہیں، کہنے لگے میں بھی کام ہی سے روک رہا ہوں، بعد میں انجمن تعلیمات دین اور قوم و ملک کے دوسرے مسائل پر بڑی مفصل گفتگو کرتے رہے۔

اپنے پیشہ میں ڈاکٹر صاحب بہت کامیاب تھے لیکن ان پر ایسا گہرا دینی رنگ چڑھ گیا تھا کہ دین وملت کے لیے ہر وقت تڑپتے اور فکرمند رہتے تھے، پیشے کی عزت و شہرت اور اس کے ذریعہ ملنے والی یافت، ہر چیز ضمنی اور ہیچ ہوگئی تھی، اپنے وجود کو دینی، اجتماعی اور ملی اداروں اور تحریکوں کے لیے وقف کردیا تھا۔

پھاڑ کر جیب و آستیں کر علمِ جنوں بلند
عشق کے میر کارواں پرچم خسروی نہ دیکھ

مسلم مجلس مشاورت اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے نہایت سرگرم ممبر رہے، یو۔پی کے مخصوص حالات کی بنا پر ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی مرحوم نے مسلم مجلس قائم کی تو اس کے بھی فعال رکن اور فریدی صاحب کے معتمد رہے اور اس کے ٹکٹ پر سیتاپور سے پارلیمنٹ کی ممبری کے لیے الیکشن میں کھڑے ہوئے مگر کامیاب نہیں ہوئے، مولانا علی میاں سے متعلقہ اداروں دارالعلوم ندوۃ العلما، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام اور تحریک

پیام انسانیت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور مدتوں ان سے وابستہ رہے۔

ڈاکٹر صاحب کی تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہوئی تھی اور اس کے لیے ان کے دل میں بڑا درد تھا، وہ اسے ملت اسلامیہ کا سرمایہ سمجھ کر اس کی پاسبانی تا عمر کرتے رہے، وہ متعدد بار کورٹ کے ممبر بھی رہے، جب اس کا اقلیتی کردار سلب کیا گیا تو وہ نہایت متفکر اور پریشان ہوئے اور اس کی بحالی کرا کے ہی دم لیا، حالات معمول پر آنے کے بعد بھی وہ اس کے امتیازات وخصوصیات کے بقا وتحفظ کے لیے برابر جدو جہد کرتے رہے، ان کے لیے یونیورسٹی کا اپنے مقاصد سے منحرف ہوجانا اور سرسید کے خوابوں کی تعبیر نہ بننا کسی حال میں بھی گوارا نہ تھا۔

مدت سے ڈاکٹر صاحب کی فکر وتوجہ کا سب سے بڑا مرکز دینی تعلیمی کونسل بن گئی تھی، اس تحریک کے اصل بانی قاضی محمد عدیل عباسی مرحوم تھے، انہوں نے مولانا سید ابوالحسن علیؒ کی سرپرستی میں اسے کامیاب بنانے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا مگر ان کے اور ان کے رفقائے کار جناب ظفر احمد صدیقی، مولانا محمود الحسن عثمانی اور جناب ریاض الدین صاحب کے ایک ایک کرکے اٹھ جانے کے بعد جب ہر طرف سناٹا ہوگیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے پردہ غیب سے ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی کو نمودار کیا۔

ع مردے ازغیب بروں آید وکارے بکند

انہوں نے اپنی ساری قوت وقابلیت دینی تعلیمی کونسل میں لگادی اور حالات کی نامساعدت، وسائل کی کمی اور صحت کی کمزوری کے باوجود اس کا دائرہ مزید وسیع کردیا اور اپنا وقت، اپنی کمائی، اپنی صحت اور اپنی پریکٹس سب کچھ اس کے لیے قربان کردیا، انہوں نے دینی تعلیمی کونسل اور مائنارٹیز ایجوکیشن انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری کی حیثیت سے عظیم الشان کارنامے انجام دے کر اپنی ملت پر بڑا احسان کیا، ان کے لیے حکمرانوں اور بددیانت ومتعصب سرکاری افسروں سے لڑائیاں لڑیں، عدالتوں کے در کھٹکھٹائے اور خود اپنی بے حس ملت کو جھنجھوڑ کر اس بنیادی اور ضروری کام کی اہمیت سے آگاہ کیا۔

ڈاکٹر صاحب کے ایثار وقربانی، جرأت و بیباکی، قوت عمل اور ملی دردمندی و اخلاص کا ایک مظہر ہفتہ وار ندائے ملت بھی تھا جسے عرصہ دراز سے وہ دینی تعلیم کے فروغ، اقلیتی مسائل کی ترجمانی اور تعلیمی ہی نہیں مسلمانوں کے ساتھ دوسرے دائروں میں ہونے والی ناانصافیوں اور زیادتیوں کے تدارک کے لیے خسارے سے نکالتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک بچوں سے زیادہ بچیوں کی تعلیم کا مسئلہ اہم ہے کیوں کہ ان کی کوکھ سے آئندہ وہ نونہال تیار ہوں گے جس کے ارتداد اور ان کے دین وایمان پر قزاقی کے لیے دیومالائی نصاب تعلیم کے ذریعہ پورا سامان کیا جارہا ہے، اگر مائیں دینی تعلیم سے بہرہ ور نہ ہوں گی تو آئندہ نسلوں کے ایمان وعقیدے کی سلامتی کی کیا ضمانت ہوسکتی ہے، اسی لیے انہوں نے پہلے اپنے گھر ہی میں بچیوں کی تعلیم وتربیت کا انتظام کیا اور جب خدائے کارساز نے وسعت وفراخی عطا کی تو لکھنو کے مضافات میں مہپت مئو میں جامعہ نورالاسلام نسواں قائم کیا جس میں اب کمپیوٹر سنٹر بھی قائم ہوگیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی اصل خوبی ان کی دیانت، دین داری، دینی غیرت حمیت اور تڑپ تھی، ان کا دل خوف وخشیتِ الٰہی سے معمور تھا، انہیں دیکھنے اور ان سے ملنے والا ان کے تقویٰ واخلاص سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، وہ اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لیے بے قرار رہتے، مگر وہ بڑے کھرے اور صاف گو تھے، حق بات کہنے میں ان کو جھجھک نہ ہوتی، ان میں کسی طرح کی بناوٹ اور تصنع نہ تھا، ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا، اس کی وجہ سے وہ لچک اور مصلحت بینی کو پسند نہیں کرتے تھے اور نہ مداہنت یا مفاہمت کو برداشت کرتے، علمائے کبار ومشائخ عظام کی زندگیوں میں تضاد اور دورنگی دیکھ کر برافروختہ ہوجاتے کہ ع اب کسے رہنما کرے کوئی۔ دین کا دم بھرنے اور دینی کام کرنے والوں میں اگر اخلاص وتقویٰ کی کمی یا ان کے ظاہر و باطن میں تفاوت دیکھتے تو اس پر لب کشائی سے باز نہیں رہتے، اپنی اس حق گوئی کا انہیں خمیازہ بھی بھگتنا پڑا کہ جن لوگوں سے مدت مدید سے گہرے تعلقات تھے ان سے دوری اور کشیدگی ہوگئی ؎

اک عمر کی بربادی ، اک عمر کی تنہائی
اک جرم محبت کی کیا کچھ نہ سزا پائی

ڈاکٹر صاحب کی وفات علم وتعلیم اور دین وملت کا بڑا خسارہ ہے، اللہ تعالیٰ غیب سے اس کی تلافی فرمائے، انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل سے نوازے، آمین۔ (''ض''، اکتوبر ۲۰۰۳ء)

مسعود، خالد

آہ جناب خالد مسعود!!

یہ خبر علمی و دینی خصوصاً ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کے قدردانوں اور ان کے علوم و افکار کے شیدائیوں کے لیے بڑی غم ناک اور روح فرسا ہے کہ یکم اکتوبر ۲۰۰۳ء کو رسالہ تدبر لاہور کے مدیر جناب خالد مسعود صاحب کا انتقال ہوگیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

وہ مولانا امین احسن اصلاحی کے شاگرد رشید اور علمی وارث و جانشین تھے، انہوں نے اپنی زندگی فکر فراہی کی شرح وترجمانی اور اس کی ترویج واشاعت کے لیے وقف کردی تھی، ان کی وفات سے ہم قرآن وحدیث کے ایک بڑے خدمت گزار سے محروم ہوگئے۔

مرحوم کو جگر کی بیماری تھی، خون کی رگ بار بار پھٹ جاتی تھی اور خون کی قے ہونے لگتی تھی، آخر اس بیماری نے ان کا کام تمام کردیا۔

خالد مسعود صاحب ضلع جہلم کے ایک گاؤں ''للہ'' ۱۶/ دسمبر ۱۹۳۵ء کو پیدا

ہوئے، یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور ۱۹۵۱ء میں نوشہرہ سے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک اور ۱۹۵۵ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے فرسٹ ڈویژن میں بی۔ایس۔سی کیا، ۱۹۵۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے کیمسٹری میں ایم۔ایس۔سی کیا، ۱۹۵۸ء میں انڈسٹریل ریسرچ لیبارٹریز سے وابستہ ہوئے پھر مزید تعلیم کے لندن گئے اور ۱۹۵۹ء میں وہاں کے کنگز کالج سے کیمیکل انجینئرنگ میں ڈپلوما حاصل کیا، واپسی کے بعد ۱۹۷۴ء میں پنجاب یونیورسٹی سے علوم اسلامیہ میں ایم۔اے کیا، ۱۹۸۵ء میں قائداعظم لائبریری میں ملازمت کی، اس سے وابستگی کے زمانے میں بچوں کے لیے آسان زبان میں متعدد مفید اور معلوماتی کتابیں تحریر کیں، جو بہت مقبول ہوئیں اور بعض پر ان کو ایوارڈ بھی ملا، گو ان کتابوں میں فلکی طبعیات کی جدید ترین تحقیقات کے نتائج اور کائنات کے بارے میں نئے افکار و نظریات پیش کیے گئے ہیں تاہم اسلامی نقطہ نظر کو اوجھل نہیں ہونے دیا ہے۔

وظیفہ یاب ہونے کے بعد انہوں نے متعدد انگریزی کتابوں کو اردو کا جامہ پہنایا جن کو مقتدرہ قومی زبان اور اردو سائنس بورڈ وغیرہ نے شایع کیا۔

خالد مسعود صاحب نے گو جدید تعلیم حاصل کی تھی تاہم ان کو شروع ہی سے دین و مذہب سے شغف تھا اور دین دار گھرانے سے ان کا تعلق تھا، ان کی طبیعت میں سلامت روی کے ساتھ تلاش و تحقیق کا داعیہ تھا، اس لیے وہ روایتی اور خاندانی مسلمان بن کر نہیں رہنا چاہتے تھے بلکہ عربی زبان کی تحصیل کر کے براہ راست دین کو اس کے اصل مآخذ سے سمجھنا چاہتے تھے اور علی وجہ البصیرت مسلمان رہنا چاہتے تھے، فضل ربانی اور توفیق الٰہی نے یاوری کی اور ۱۹۵۸ء میں خوش قسمتی سے ان کی ملاقات دور حاضر کے سب سے بڑے قرآنیات کے عالم مولانا امین احسن اصلاحی سے ہوئی تو گویا گوہر مراد ان کے ہاتھ آ گیا اور پھر مولانا کو چھوڑ کر انہوں نے کسی اور طرف نگاہ نہیں اٹھائی کہ

ع کس چیز کی کمی ہے خواجہ تری گلی میں

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند

وندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند

مولانا نے بھی ان کو ہونہار سمجھ کر اور ان کا ذوق دیکھ کر انہیں اپنے آغوش شفقت میں لے لیا، پہلے عربی زبان کی تعلیم دی جب اس کی استعداد پختہ ہوگئی تو مسلم شریف پڑھائی اور قرآن مجید کو سبقاً سبقاً پڑھایا، اس کے بعد وہ اپنے استاد کے علمی کاموں میں ان کا ہاتھ بٹانے لگے اور حوالے و مراجع کی تلاش میں بھی استادگرامی کی مدد کرنے لگے، اس طرح مولانا کی تربیت نے ہیرے کو چمکا دیا اور خالد مسعود صاحب میں عربیت اور قرآن فہمی کا عمدہ ذوق پیدا ہو گیا، مولانا نے جب نوجوان طلبہ پر مشتمل حلقہ تدبر قرآن قائم کیا تو اس میں یہ بہت پیش پیش رہے، گو یہ حلقہ قائم نہیں رہ سکا مگر اس کے قیام پر اس وقت کے مشہور فضلا مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اور مولانا عبدالباری ندویؒ نے ان کو داد دی تھی۔

جناب خالد مسعود کا جوش و حوصلہ، محنت و ریاضت اور اخلاص و طلب صادق دیکھ کر مولانا امین احسن صاحب نے ان کی رہنمائی میں بخل سے کام نہیں لیا، ان کے پاس جو کچھ تھا سب اس جوہر قابل کے حوالے کر دیا اور مولانا حمیدالدین فراہی سے قرآن مجید میں فکر و تدبر کے جو طریقے سیکھے تھے انہیں ان کو بھی سکھایا اور علم و معرفت اور حکمت کا جو خزانہ انہیں بارگاہ حمید سے ملا تھا اسے اور مولانا فراہیؒ کے مسودات بھی ان کے سپرد کر دیے، چنانچہ جب مولانا نے میثاق نکالا اسی زمانے سے اس کا مستقل باب افادات فراہی خالد مسعود صاحب کے ذمہ ہو گیا تھا، جس میں وہ برابر مولانا کے افکار و خیالات کی ترجمانی کر رہے تھے۔

۱۹۸۰ء میں حلقہ تدبر قرآن کو ادارۂ تدبر قرآن و حدیث کا نام دیا گیا اور اس کے زیر اہتمام رسالہ تدبر جاری کیا گیا تو چند شماروں کے بعد اس کی ادارت کی ساری ذمہ داری ان ہی کے سپرد کر دی گئی، مولانا امین احسن صاحب پیرانہ سالی کی وجہ سے درس قرآن دینے سے معذور ہو گئے تو اس میں بھی ان کی قائم مقامی کا شرف ان ہی کو حاصل ہوا، غرض فکر فراہی ان کے دل و دماغ میں پوری طرح رچ بس گیا تھا، ۱۹۹۹ء میں مولانا اصلاحی پر سرائے میر میں جو سمینار ہوا، اس میں ان کے آجانے سے اس کا وزن و وقار بہت بڑھ گیا تھا۔

خالد مسعود صاحب کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مولانا فراہیؒ اور مولانا اصلاحی کے بعض غیر مرتب اور نامکمل کاموں کو مرتب و مکمل کیا اور ان میں حسب ضرورت اور وقت کے اقتضا کے مطابق توسیع و اضافہ بھی کیا اور مولانا اصلاحی کے بعض امالی کو بھی ترتیب و تہذیب کے بعد شایع کیا، اس سلسلے میں تدبر حدیث کے نام سے مؤطا و بخاری کی شروح کئی جلدوں میں شائع کیں، ان کی تفسیر کی تلخیص اور ترجمے کو تفسیر سے الگ کر کے ترجمہ قرآن کے نام سے شایع کیا، اس کے ساتھ خود اپنے تصنیفی کام بھی برابر انجام دیتے رہے، انتقال سے چند مہینے پہلے سیرت پر ان کی عظیم الشان کتاب ''حیات رسول امی'' شایع ہوئی تھی، اس کے بعض حصے میں نے رسالہ تدبر میں جب پڑھے تو مجھے اس میں ان کا انفرادی رنگ صاف نظر آیا اور ۱۹۹۹ء میں جب ملاقات ہوئی تو میں نے اپنا یہ تاثر ان سے بیان کیا غالباً اسی لیے کتاب چھپتے ہی انہوں نے میرے پاس بھیجی، میں اس پر تبصرے کے لیے فرصت و اطمینان کا منتظر تھا، مجھے کیا پتا کہ وہ اتنی جلدی رخصتِ سفر باندھ لیں گے۔

خالد مسعود صاحب کا علم و مطالعہ وسیع تھا، ان کو اردو، عربی، فارسی اور انگریزی پر عبور تھا جن سے انہوں نے اپنے مضامین اور کتابوں میں خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔

ان کا جو حلیہ اور سراپا میرے ذہن میں تھا میں نے ان کو اس کے بالکل برعکس

پایا، ان کا چہرہ بڑا نورانی اور وہ خالص دینی وضع قطع کے شخص تھے، اپنے علم وفضل کی طرح تقویٰ وطہارت میں بھی ممتاز اور عابد وزاہد اور شب بیدار تھے، بڑے خوش مزاج وخوش اخلاق تھے، غرور ونخوت کا شائبہ بھی ان میں نہ تھا، اہل علم اور علمائے حق کی طرح ان کی طبیعت میں بڑا انکسار، تواضع اور فروتنی تھی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔

وہ اس مشن کے علم بردار تھے جس کے علم بردار ان کے استاد مولانا امین احسن صاحب تھے، مولانا اصلاحی کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے اپنے استاد مولانا حمید الدین فراہیؒ اور ان کے فکر سے اہل علم کو متعارف کرایا، ان کے بعد یہی کام ان کے لائق شاگرد جناب خالد مسعود انجام دے رہے تھے، اب ان کے رفقا خصوصاً جناب جاوید غامدی وغیرہ پر یہ بڑی ذمہ داری آگئی ہے، دعا ہے کہ یہ تمام حضرات مولانا فراہیؒ واصلاحی اور جناب خالد مسعود کے نورِ بصیرت کو عام کرتے رہیں تاکہ ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلتا رہے۔

(''ض''، دسمبر ۲۰۰۳ء)

مجیبی، سید رضوان اللہ قادری، مولانا شاہ

مولانا سید شاہ رضوان اللہ قادری مجیبی

افسوس ہے کہ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ کے سجادہ نشین مولانا سید شاہ رضوان اللہ قادری مجیبی ۳۱/دسمبر ۲۰۰۳ء کو وفات پاگئے، اِنا للہ وَاِنا اِلیہ رَاجعونُ۔

ابھی عمر کی جس منزل میں وہ تھے، یہ جانے کے دن نہیں ہوتے لیکن مشیت الٰہی میں کس کا دخل؟ موت کا تو وقت مقرر ہے، فَاِذَا جَآءَ اجلُھُمْ لَا یستأخِرُونَ سَاعة وَّلَا یستَقْدِمُونَ۔[الاعراف:۳۴]

خانقاہ مجیبیہ کا علمی وروحانی فیض مدت دراز سے جاری ہے، شاہ صاحب اس کی قدیم روایات اور اپنے عالی مقام اسلاف کی خصوصیات اور خوبیوں کے حامل تھے اور خود بھی ایک صاحب فیض عالم اور ذاکر وشاغل بزرگ تھے، ان کی ذات سے ہزاروں طالبین وسالکین فیض یاب ہو رہے تھے مگر اب تزکیہ واصلاح اور ارشاد کا یہ سرچشمہ بند ہوگیا۔

ان کو تقویٰ واخلاص، صوم وصلوٰۃ کی پابندی، سادگی ودرویشی اور خوش مزاجی وخوش خلقی ورثے میں ملی تھی، راقم کو دو تین بار ان کی خدمت میں حاضری اور ان کی پاکیزہ سیرت اور مطہر زندگی کے جلوے دیکھنے کا اتفاق ہوا، ہر بار نہایت خندہ پیشانی سے ملے اور لطف وکرم سے پیش آئے، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔

(''ض''، فروری ۲۰۰۴ء)

اقبال احمد ردولوی، شاہ

شاہ اقبال احمد ردولوی

افسوس ہے کہ ۲۴/مئی ۲۰۰۴ء کو شاہ اقبال احمد ردولوی کا انتقال ہوگیا، اِنـا للہ وَاِنا اِلَیـہ رَاجِعُون۔ دارالمصنفین کے سابق ناظم مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کا وطن بھی ردولی تھا، وہ وہاں کے شرفا کے ادبی ذوق، تہذیبی شائستگی اور نفاست کا ذکر برابر کرتے تھے، اس سے ردولی کے خاص معیار، رکھ رکھاؤ اور وہاں کے لوگوں کی شرافت، وضعداری اور خوش مذاقی کا نقش دل پر ثبت ہوگیا تھا۔

شاہ معین الدین احمد صاحب معارف میں کبھی کبھی اقبال صاحب کا کلام شائع کرتے تھے، ادہر پھر ان کا کلام معارف میں چھپتا تھا اور جب تک قومی آواز لکھنو بند نہیں ہوا تھا، اس کے سنڈے اڈیشن میں بھی ان کا کلام نظر سے گزرتا تھا، اس کی وجہ سے ان کے کمال فن کا اندازہ تھا اور گزشتہ ۱۵ برس سے ان سے برابر خط وکتابت رہتی تھی، دس بارہ برس پہلے مجھے عرق النسا کا عارضہ ہوا، لوگوں سے ان کی ''فقیری دوا'' کی اطلاع ملی تو پروفیسر علی حماد عباسی مرحوم سابق پرنسپل شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڑھ میرا خط لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دوا لے آئے، اس کے بعد شہر کے متعدد لوگوں نے مجھ سے خطوط لکھوا کر ان سے دوا منگوائی، میں خط کے پتے پر اگر ان کا نام شاہ اقبال احمد لکھ دیتا تو وہ آزردہ ہوکر مجھے لکھتے کہ میرا ادبی نام اقبال ردولوی ہے، یہی نام پتے اور معارف میں ہونا چاہئے لیکن ان کا اصل نام شاہ اقبال احمد صابری قدوسی تھا اور ان کا خاندانی تعلق حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ سے تھا، ددھیال کلیر شریف میں تھا اور اس کے سجادہ نشین شاہ عبدالرحیم صاحب ان کے دادا تھے، ننھیال ردولی میں تھا جس کے سجادہ نشین حیات احمد صاحب مرحوم ان کے نانا تھے۔

شاہ اقبال احمد کی عمر ۱۸ مہینے ہی کی تھی کی ان کی والدہ نے جنت کی راہ لی اور ۷ برس کے ہوئے تو والد شاہ مسعود احمد کا کام ایک پاگل شخص نے تمام کر دیا، اس لیے ان کی پرورش ننھیال ردولی میں ان کے نانا شاہ حیات احمد مرحوم کے سایہ عاطفت میں ہوئی، وہ ردولی کے شرفا میں تھے، ان کی ذات اودھ کی شرافت وتہذیب اور ردولی کی وضع داری اور شائستگی کا عطر مجموعہ تھی، بڑے خوش خلق، مہمان نواز اور وسیع المشرب تھے، شاہ اقبال احمد بھی ان کے اوصاف وکمالات کا پرتو، ردولوی تہذیب کا نمونہ، خدمت خلق میں بے مثال، خوش اطوار، وسیع القلب اور فراخ دل تھے۔

شاہ اقبال احمد کو زبان وادب کا ستھرا ذوق اپنے نانا سے ورثہ میں ملا تھا، صحت زبان کا بڑا خیال رکھتے تھے، زبان وبیان کی معمولی لغزش پر بھی ان کی نظر پڑ جاتی تھی، مطالعہ کے عادی تھے، نئی کتابیں حاصل کر کے پڑھتے رہتے تھے، ان کا کتب خانہ قدیم

وجدید دونوں قسم کی کتابوں سے بھرا ہوا تھا،مشہور رسالوں کے خاص نمبر بھی ان کے پاس ہوتے تھے، لکھتے بہت کم تھے، اعلا درجہ کے شاعر تھے مگر شعر بھی کم کہتے تھے،لیکن جو کچھ کہتے تھے اچھا کہتے تھے۔تغزل سے بڑی مناسبت تھی اوراس کا ذوق بہت رچا ہوا تھا، ان کی شاعری میں کلاسکیت اور جدید فکر کا بڑا خوبصورت امتزاج ہوتا تھا، غزلوں میں پانچ یا سات شعر ہی ہوتے تھے اور وہ سراپا انتخاب ہوتی تھیں، چھپنے کا شوق نہ تھا، میری نظر سے ان کا کوئی مجموعہ کلام نہیں گزرا، ان کی ایک غزل عرصے سے میری فائل میں پڑی ہوئی تھی، اسے آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں معارف میں چھپی ہوئی بعض غزلوں کے اشعار بہ طور نمونہ نقل کیے جاتے ہیں، ان میں روانی و شگفتگی کے علاوہ درد و کسک، سوز واثر اور حقیقت ومعرفت کے جلوے بھی نظر آئیں گے:

اہل جنوں کو اہل خرد کی ہوا لگی　　میں سوچتا ہوں کون کہے گا خدا لگی
کس کی نگاہ ناز کے مارے ہوئے ہیں لوگ　　خلقت تمہارے شہر کی درد آشنا لگی
وہ خوف وہ ہراس تھا بس کچھ نہ پوچھیے　　مقتل کی طرح شہر کی ہم کو فضا لگی
ضبط غم کا جو ہنر رکھتے ہیں　　وہ قیامت کا جگر رکھتے ہیں
گردِ ہر راہ گزر جسم پہ ہے　　بس یہی رختِ سفر رکھتے ہیں
ان سے ملتے رہو اقبال کہ جو　　دولتِ دیدۂ تر رکھتے ہیں

اور یہ غزل فیض کی نذر ہے:

وہ سوے یار چلے ہوں کہ سوے دار چلے　　جدہر کی راہ چلے ہم تو باوقار چلے
جہاں سے لے کے سکوں ساری کائنات چلی　　وہیں سے ہم جو چلے کتنے بےقرار چلے
بنی نہ بات تو اقبال صاحبان خرد　　ہماری وضعِ جنوں کرکے اختیار چلے

سخن سنجی کے ساتھ ہی ان میں شعر فہمی کا ملکہ اور نقد سخن کا اچھا سلیقہ بھی تھا، اردو شاعری پر ان کی نظر وسیع تھی، ممتاز شعرا اور ان کی شاعری کے بارے میں ان کی رائے بہت باوزن ہوتی تھی، اپنے ایک گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''معارف ملا، قتیل شفائی پر آپ کی تحریر دیکھی مگر آپ نے خمار بارہ بنکوی کے انتقال پر کچھ نہیں لکھا، خمار بڑے مخلص، وضع دار، شریف، خلیق اور محبت والے انسان تھے، انہوں نے کلاسیکل غزل کے فن کو، اس کے تغزل کو، اس کی خوشبو کو، اس کی لطافت ونزاکت کو، اس کی نغمگی کو برقرار رکھا، ترقی پسندوں نے غزل کو نظر انداز کیا اور غزل کے خلاف ایک طوفان برپا کردیا مگر خمار نے غزل سرائی نہیں ترک کی، ایسا نہیں ہے کہ ان کے یہاں روح عصر نہ ہو، روح عصر ہے مگر غزل کی زبان میں، محبت کی زبان میں۔غزل کو جگر کے بعد مقبول بنانے میں خمار کا بڑا ہاتھ رہا ہے، ایسے شاعر پر آپ کو ضرور لکھنا چاہئے تھا، خمار پروپگنڈے سے دور تھے اور کسی گروہ میں شامل نہیں تھے، مجروح اور سردار جعفری پر بھی آپ نے کچھ نہیں لکھا، یہ مانا کہ آپ کو ان لوگوں کے نظریات سے اختلاف ہے، ترقی پسند تحریک انتہا پسندی کا شکار ہوگئی''۔

خمار کے متعلق مکتوب نگار کی رائے بالکل درست ہے، اس وقت ان کا یہ شعر زبان پر آگیا:

چراغوں کے بدلے مکاں جل رہے ہیں　　نیا ہے زمانہ، نئی روشنی ہے

خمار پر میں نے اپنے سے بہتر ایک صاحب سے مضمون لکھنے کی فرمائش کی تھی مگر نہ وہی لکھ سکے اور نہ افسوس کہ میں ہی لکھ سکا، مجروح کو بھی میں بہت اچھا غزل گو شاعر مانتا ہوں، ان سے ملاقات بھی تھی، ایک دفعہ وہ آٹھ، نو بجے سے ڈھائی بجے رات تک ہم لوگوں کو اپنی غزلیں سناتے رہے، ان کا مجموعہ کلام نہ ملنے کی وجہ سے ان پر مضمون نہ لکھ سکا، جعفری صاحب سے متعدد بار مل چکا ہوں ان پر مفصل مضمون لکھا تھا، میرے خیال میں نظریات کے اختلاف کو اعتراف کمال میں مانع نہیں ہونا چاہئے۔

اقبال صاحب کے ایک اور گرامی نامہ کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''معارف میں آپ کا مضمون علامہ شبلی کی شعر فہمی اور شعر العجم کا ایک مطالعہ بہت پسند آیا، واقعہ یہ ہے کہ حضرت شبلی کی شعر فہمی اور لطافت ذوق کا قایل ہونا پڑتا ہے، جس طرح شاعری اللہ کی عطا ہے، اسی طرح سخن فہمی بھی اللہ کی عطا ہے، علامہ شبلی اپنی ذات سے ایک انجمن تھے، ایک ادارہ تھے، وہ علم کا بحر بےکراں تھے۔

ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر صاحبہ نے تحریر فرمایا ہے کہ ''شیخ محمد قدیر اٹھارہویں صدی میں کشور گنج میں پیدا ہوئے، انہوں نے ایک مثنوی بدیا سندر اردو میں تحریر فرمائی، میر حسن دہلوی کی گلزار نسیم سے متاثر ہوکر انہوں نے یہ مثنوی لکھی'' مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ گلزار نسیم دیاشنکر نسیم کی مثنوی ہے، میر حسن کی مثنوی کا نام سحر البیان ہے''۔

اقبال ردولوی ایک نکتہ سنج ادیب وشاعر، اودھ کی قدیم شرافت و وضعداری اور ردولی کی اس تہذیب اور ادبی وراثت کی یادگار تھے جس میں وقار اور بانکپن تھا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے اعزہ واحباب کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔

یہ تحریر لکھی جاچکی تھی کہ پروفیسر خورشید نعمانی کا یہ خط ممبئی سے ملا:

''ایک افسوس ناک اطلاع دے رہا ہوں، آج (۱۴؍مئی) صبح ۸ بجے میرے چھوٹے بھائی حارث نعمانی نے اطلاع دی کہ اقبال میاں (شاہ اقبال ردولوی) کا آج صبح ۵ بجے انتقال ہوگیا، اِناللہ وَ اِنا اِلَیہ رَاجِعُون، وہ میرے ہم دم دیرینہ اور آپ کے بڑے چاہنے والے تھے، معارف میں ادبیات کے کالم میں ان کی غزلیں اکثر چھپتی تھیں، میں نے اپنی کتاب (تاریخ دارالمصنفین) کے دوسرے حصے میں ادبیات کے متعلق لکھتے ہوئے ان کی ایک غزل شامل کی تھی، افسوس کہ ان کی زندگی میں نہ چھپ سکی، دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔

اقبال میاں حضرت شیخ علاء الدین صابر کلیری کے خاندان کے چشم و چراغ تھے اور شیخ احمد عبدالحق نوشہ ردولوی کے سجادہ نشین شاہ حیات احمد احمدی کے نواسے اور شاہ آفاق احمد مرحوم کے بھانجے تھے، علم و ادب میں یکتا، روایات کے پاس دار اور بڑی محبت کے آدمی تھے۔

ان کی بے وقت موت میرے لیے حادثۂ جاں کاہ ہے اور ناقابل تلافی نقصان ہے، اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین''۔ (''ض''، جون ۲۰۰۴ء)

لاری، مقبول احمد

جناب مقبول احمد لاری

جناب مقبول احمد لاری ۱۷ رمئی کو لکھنؤ میں وفات پاگئے، وہ ایک علم دوست، ادب نواز اور اردو کے مجاہد تھے، وہ مئی ۱۹۱۶ء میں ضلع دیوریا کے قصبہ لار میں پیدا ہوئے تھے، گورکھ پور اور الٰہ آباد وغیرہ میں تعلیم حاصل کی، بی اے کرنے کے بعد ۱۹۴۲ء میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا تو گھر اور کاروبار کی ساری ذمہ داریاں ان پر آگئیں، اس کی وجہ سے وہ مدتوں نیپال میں قیام پذیر رہے اور یہاں کے اہل علم و دانش، سربرآوردہ اشخاص اور امرا و اعیان دولت میں اپنی اچھی ساکھ بنائی، وہ پہلے ہندوستانی تاجر تھے جس کی گولڈن جوبلی نیپال اور دیگر ممالک کے سرکردہ اشخاص کی مشترکہ کمیٹی نے رفاہ کلب لکھنؤ میں منائی، کھٹمنڈو کی تربھون یونیورسٹی نے ۱۰ سال کے لیے سینٹ کا ممبر منتخب کیا، نیپال کی حکومت نے ان کو اپنے شاہی خطاب ''سوپربل گروکھاد کھشتر یاہو'' (یمین السلطنت گورکھا) سے نوازا اور حکومت ہند نے بھی ان کی رفاہی خدمات کے لیے انہیں پدم شری کے اعزاز سے نوازا۔

۱۹۵۳ء میں بچوں کی تعلیم کے لیے وہ لکھنؤ تشریف لائے اور سٹی اسٹیشن کے قریب راجہ صاحب محمود آباد کا محل خریدا جس میں اپنے ذوق کے مطابق حسب ضرورت ترمیم کرکے رہائش اختیار کی، ایک زمانے میں گونڈہ کے ایک وکیل اور صحافی جناب نیاز قومی لاری منزل میں قیام پذیر تھے، ان کے بہنوئی جناب عبدالقوی خاں انجینئر کے ساتھ ان سے ملنے گیا تو دونوں حضرات نے مقبول لاری صاحب سے ملایا، پہلی ہی ملاقات میں ان کے علم و مطالعہ سے شغف، اردو زبان و ادب سے شیفتگی، علم دوستی، ادب نوازی، سادگی، تواضع، اصول پسندی، خوش خلقی، محبت اور خلوص سے متاثر ہوا، لاری صاحب نے عشائیہ میں شریک ہونے کے لیے کہا لیکن میرے میزبان انجینئر صاحب نے معذرت کردی، انہوں نے دوسرے دن پھر آنے اور کھانے کی دعوت دی، عرض کی کہ کل واپسی ہے مگر اس کے بعد کئی بار لاری منزل میں قیام کرنے اور وہاں کی پرتکلف دعوتوں میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا، یہ دعوتیں بہت وسیع اور بے مثال تھیں جن میں لکھنؤ کے مختلف طبقوں کے مشاہیر کے علاوہ ملک کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے اصحاب علم و ذوق موجود ہوتے تھے۔

مقبول لاری صاحب ایک بڑے صنعت کار اور تاجر تھے، خدا نے انہیں بہت نوازا تھا مگر اس کے باوجود ان میں کبر و غرور کا شائبہ بھی نہ تھا، وہ چھوٹے بڑے خصوصاً اہل علم و ادب اور اردو کے شیدائیوں سے بڑے انکسار سے ملتے تھے اور کسی کو اپنی بڑائی اور مالی برتری کو محسوس نہیں ہونے دیتے تھے، ان کی دولت کسی غلط مصرف کے بجائے ہمیشہ فلاحی اور تعمیری کاموں کے لیے وقف رہتی تھی، ان سے بے شمار علمی و تعلیمی اور قومی و ملی ادارے فیض یاب ہوتے تھے، مدتوں آل انڈیا میر اکادمی کے ذریعہ وہ ادیبوں، شاعروں اور مصنفوں کو اعزاز و اکرام سے نوازتے رہے، اردو رابطہ کمیٹی کے سارے اخراجات ان کے ذمہ ہوتے تھے، لاری کارڈیالوجی سینٹر کا قیام ان کی خدمت خلق کا بڑا نمونہ تھا جو لکھنؤ کے میڈیکل کالج میں دل کے مریضوں کے علاج معالجے کا ایک مرکز تھا۔

آل انڈیا میر اکادمی کا قیام لاری صاحب کا بڑا کارنامہ اور ان کی میر کی عظمت شناسی کا ثبوت ہے، اس کی جانب سے انہوں نے متعدد ارباب علم و دانش کے مضامین یکجا کرکے ''حدیث میر'' کے نام سے اردو اور ہندی رسم الخط میں شائع کیا، یہاں سے اور بھی متعدد بلند پایہ کتابیں طبع ہوئیں، ان کے قدردانوں نے ان کے خطبات اور تقریروں کا ایک مجموعہ ''نوائے مقبول'' شائع کیا، جناب نیاز قومی نے خود ان پر بھی ایک کتاب مرتب کرکے شائع کی تھی جس میں مختلف طبقوں اور پائے کے ۱۲۵ معاصرین کے تاثرات اور خراج عقیدت شامل ہیں، یہ لاری صاحب کی مقبولیت، ہر دل عزیزی اور حلقہ تعارف کی وسعت و ہمہ گیری کا ثبوت ہے۔

مقبول لاری صاحب کو اردو سے عشق تھا، اس کے ہر کام میں وہ پیش پیش رہتے تھے، وہ اردو کی حمایت محض زبانی نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے لیے انہوں نے قربانیاں دیں، احتجاج اور دھرنوں میں شریک رہتے تھے، انجمن ترقی اردو، اردو رابطہ کمیٹی اور اردو محافظ دستہ وغیرہ کی تائید میں سرگرم بھی رہے اور مالی تعاون بھی دیا، حکومت کے عتاب سے بے پروا ہوکر اس کے اردو دشمن رویے پر نکتہ چینی کرتے تھے، ایک دفعہ مجھ سے اترپردیش حکومت کی اردو کشی کے واقعات بڑے افسوس کے ساتھ بیان کیئے، ان کے نزدیک اردو کا بنیادی مسئلہ اس کی تعلیم و تدریس کا ہے، ان کا خیال تھا کہ سرکاری اسکولوں میں آٹھویں جماعت تک اردو کی تعلیم لازمی ہونی چاہئے، ۱۹۷۳ء میں اترپردیش اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا اور ان کو اس کی کاؤنسل کا رکن نامزد کیا گیا تو انہوں نے اردو کی ترقی و ترویج کے لیے متعدد مفید تجویزیں بہ راہ راست اترپردیش حکومت کو پیش کیں، وہ اردو اکیڈمیوں کے متعلق کہتے تھے، یہ اردو والوں کو کھلونے

دے کر بہلانے کے لیے ہیں۔

لاری صاحب کا گھرانا مذہبی تھا، وہ خود بھی صوم وصلات کے پابند ہوگئے تھے، ان کے یہاں پردے کا بڑا اہتمام تھا، اسی لیے لڑکیوں کو جدید اسکولوں میں تعلیم دلانا پسند نہیں کرتے تھے، ایک مرتبہ ان کی ایک بیٹی کو ان کی اہلیہ نے پرائیوٹ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد کسی انٹر کالج میں داخل کردیا، اس پر لاری صاحب اتنا ناراض ہوئے کہ اس سے بات کرنا ترک کردیا، آخر مجبور ہوکر اس نے اپنا نام کالج سے کٹوادیا، حالانکہ وہ جدید تعلیم کے حامی تھے، اپنے صاحب زادے مظفر لاری کو اعلیٰ تعلیم دلائی، لڑکیوں نے بھی پرائیوٹ امتحانات دیئے، ان کی بعض بچیاں اردو کی اہل قلم اور شاعرہ ہیں اور صاحب زادے کا اردو ادب وتنقید پر کام ہے۔

لاری صاحب سخاوت، فیاضی اور مہمان نوازی کے لیے مشہور تھے، قومی، ملی، علمی، تعلیمی، سماجی اور فلاحی کاموں پر بے دریغ خرچ کرتے تھے لیکن پیشہ ور سائلوں کو کچھ نہ دیتے تھے، کہتے تھے کہ دس بیس روپے کی بھیک دینا قوم وملت کے افراد کو ناکارہ بنانا ہے، وہ خود اور گھر کے سارے لوگ زکات نکالتے تھے مگر کوشش کرتے تھے کہ مستحق لوگوں ہی کو صدقہ وخیرات دیں، ان کی ایک صاحب زادی ڈاکٹر رخسانہ نکہت لاری (ام ہانی) رمضان میں منی آرڈر سے کچھ روپے مجھے بھیجتی تھیں کہ جو مستحق زکات ہوں ان کو دے دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ اپنے اس مخیّر اور فیاض بندے کے درجات عالم آخرت میں بلند کرے اور ان کے عزیزوں کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ (''ض''، جون ۲۰۰۴ء)

آزاد، جگن ناتھ، پروفیسر

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

ایک شریف اور باکمال انسان

۲۴؍اگست ۲۰۰۴ء کو ملک کے مایہ ناز شاعر وادیب، مشہور محقق ونقاد، اقبالیات کے ماہر اور اس کے پایہ شناس جناب جگن ناتھ آزاد اردو دنیا کو سوگوار اور مغموم چھوڑ کر چلے گئے، وہ اردو، اردو ثقافت، ملک کی گنگا جمنی تہذیب، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، رواداری، وسیع المشربی اور بھائی چارگی کے علم بردار تھے، ان کی وفات پر کن کن چیزوں کا نوحہ وماتم کیا جائے۔

جگن ناتھ آزاد صاحب ۱۵؍دسمبر ۱۹۱۸ء کو مغربی پنجاب (پاکستان) کے شہر عیسیٰ خیل میں پیدا ہوئے جو ضلع میاں والی کی ایک تحصیل تھا، ان کے والد پنڈت تلوک چند محروم پیشے کے اعتبار سے معلم تھے مگر خاندانی شرافت اور کمال کے ساتھ ایک صاحب ذوق اور بڑے قادر الکلام شاعر تھے، ان کا شمار اردو کے استاد شعرا میں ہوتا تھا، آزاد صاحب کو علم وادب کا فطری ذوق تھا جس کو ان کے والد کی صحبت وتربیت نے بہت چمکا دیا تھا، ان کی ابتدائی تعلیم عیسیٰ خیل میں ہوئی، میانوالی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا، ۱۹۳۵ء میں ڈی اے وی کالج راولپنڈی سے انٹرمیڈیٹ کیا اور ۱۹۳۷ء میں گارڈن کالج راولپنڈی سے بی اے کیا، ۱۹۴۴ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے فارسی میں ایم، اے کیا۔

وہ شروع ہی سے صحافت سے وابستہ رہے جب وہ انٹر کر رہے تھے تو کالج میگزین کی ادارت ان کو سپرد کی گئی، اسی زمانے سے مضامین بھی لکھنے لگے تھے، نظم گوئی کی ابتدا اس سے بھی پہلے ہوچکی تھی، ان کا پہلا مقالہ ''اقبال کی منظر نگاری'' کے عنوان سے میاں بشیر احمد کے مشہور ادبی ماہنامہ ''ہمایوں'' لاہور میں چھپا، ۱۹۴۱ء میں ماہنامہ ''ادبی دنیا'' لاہور کی مجلس ادارت میں شامل ہوئے، ۱۹۴۶ء میں اردو روزنامہ ''جے ہند'' کے اسسٹنٹ اڈیٹر مقرر ہوئے۔

۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم ہوئی تو وہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ دہلی میں متوطن ہوگئے، پہلے روزنامہ ملاپ کے اسسٹنٹ اڈیٹر ہوئے پھر پبلی کیشن ڈویژن گورنمنٹ آف انڈیا میں اسسٹنٹ اڈیٹر ہوئے، ۱۹۶۶ء منسٹری آف ورکس اینڈ ہاؤسنگ میں انفارمیشن آفیسر مقرر ہوئے، جنوری ۱۹۶۸ء میں پریس انفارمیشن بیورو میں ڈپٹی انفارمیشن آفیسر ہوگئے اور ۱۹۷۳ء میں انفارمیشن بیورو میں ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے، ۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۰ء تک جموں یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پروفیسر اور صدر شعبہ رہے اور ۱۹۸۲ء میں پروفیسر ایمریٹس ہوئے۔

جن ہندو اہل قلم سے میرے تعلقات اور خط وکتابت رہی ان میں جناب جگن ناتھ آزاد کا نام سرفہرست ہے، اب ان کی وفات کے بعد گزشتہ پچاس برس کے واقعات ذہن میں تازہ ہوگئے، بچپن ہی سے ہر قسم کے جلسوں اور مشاعروں میں شریک ہونے میں مجھے بڑا لطف ملتا تھا، اس کا فائدہ چاہے کچھ نہ ہوا ہو مگر اسی بہانے بعض بڑے خطیبوں اور شاعروں کو دیکھا اور ان کے خطبے اور کلام سننے اور بہت سے اشعار یاد ہوگئے۔

یہ دلچسپ بات ہے کہ ۱۹۵۰ء کی دہائی میں جب اتر پردیش میں اردو کشی کی مہم شباب پر تھی اور پنڈت گووند ولبھ پنت اور ڈاکٹر سمپورنانند کی حکومتوں نے اردو کا گلا گھونٹنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھی تو اس کے باوجود یہاں اردو مشاعرے بہت دھوم سے ہوتے تھے، داخلے کے لیے ٹکٹ اور پاس ہوتے تھے مگر سامعین کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی، یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اردو کے شدید مخالف اور اسے ہندو کی شیلی کہنے والے ڈاکٹر سمپورنانند بھی ان مشاعروں میں اپنی غزلیں سناتے تھے اور آنند تخلص کرتے تھے، اسی زمانے کے اپنے گردونواح کے کسی مشاعرے میں شریک ہوا تو جگر مراد آبادی، روش صدیقی، انور صابری وغیرہ کے ساتھ پہلی بار جگن ناتھ آزاد کو بھی دیکھا جن

کے پڑھنے کا دلکش انداز اور پرسوز آواز کی لذت اب تک محسوس ہورہی ہے، وہ اپنا کلام سنا کر بیٹھنا ہی چاہتے تھے کہ ہر طرف سے لوگوں نے کہنا شروع کیا، اپنی وہ نظم سنائیے جو آپ نے پاکستان میں پڑھی تھی۔

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
میں اپنے آپ کو مانند مہماں لے کے آیا ہوں

مجھے اخبار و رسائل کی ورق گردانی کا شوق بھی بچپن ہی سے تھا، جو اخبار اور رسالہ مل جاتا اسے چاہے سمجھوں یا نہ سمجھوں پڑھنے لگتا تھا اور اگر اس میں کہیں جگن ناتھ آزاد کی غزل اور نظم ہوتی تو اسے زیادہ شوق اور دلچسپی سے پڑھتا جب کچھ کچھ سخن فہمی کی استعداد پیدا ہوئی تو غالباً ۱۹۵۱ء کے آخر میں روزانہ الجمعیۃ کے ہفتہ وار اڈیشن میں جگن ناتھ آزاد کی مشہور نظم ''بھارت کے مسلماں'' پڑھی جس نے قلب کو گرمایا بھی اور روح کو تڑپایا بھی، یہ نظم بہت مقبول ہوئی اور ہندو پاک کے اکثر اخباروں اور رسالوں میں شایع ہوئی اور دونوں جگہوں کے مسلم شعرا نے جگن ناتھ کے احسان و ممنونیت کا اعتراف و تشکر بھی کیا، ملک کی تقسیم کے زخم خوردہ ایک ہندو کی اسلام اور اسلامی تاریخ و تہذیب سے یہ واقفیت دیکھ کر اور اس کے مخلصانہ پند و موعظت اور اسلامی و ایمانی جذبات سے مملو اشعار سن کر میری طرح ہر شخص محو حیرت تھا، یحییٰ اعظمی نے کہا:

سنا تھا جسے حامل قرآں کی زباں سے
وہ درس ملا اس کو ترے سوز فغاں سے

تاریخ و سنہ یاد نہیں غالباً ۱۹۶۰ء کے آس پاس کی بات ہوگی، ایک روز میں معمولاً جناب شاہ معین الدین احمد ندوی کے برآمدے میں ان کے ساتھ عصر بعد چائے پی رہا تھا کہ کمیونسٹ پارٹی کے ایک ممبر اور اعظم گڑھ کے وکیل مسٹر رام دھن کے ساتھ جو بعد میں کانگریس کے ٹکٹ پر کئی بار پارلیمنٹ کے ممبر ہوئے جناب جگن ناتھ آزاد شاہ صاحب سے ملنے آگئے، شاہ صاحب نے ان کا بڑا پرتپاک استقبال کیا اور چائے سے تواضع کی، کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں پھر آزاد صاحب نے شاہ صاحب سے کہا میں جناب یحییٰ اعظمی سے ملنے کا خواہش مند ہوں، چنانچہ میں انہیں لے کر یحییٰ صاحب کے گھر گیا، مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ اس طرح کچھ دیر ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔

۱۹۶۵ء میں دارالمصنفین کی گولڈن جبلی میں ملک کے دیگر اکابر کی طرح وہ بھی تشریف لائے تو پھر تجدید ملاقات ہوئی، اسی موقع پر انہوں نے مشہور فاضل مالک رام صاحب سے بھی ملایا، دونوں فضلا سے مل کر جو خوشی ہوئی اسے یاد کرکے اب بھی جھوم اٹھتا ہوں۔

دسمبر ۱۹۷۴ء میں شاہ صاحب کا انتقال ہوا تو وہ تعزیت کے لیے دارالمصنفین تشریف لائے، اسی زمانے میں بھوپال سے مولانا محمد عمران خاں صاحب بھی تعزیت کے لیے دارالمصنفین تشریف لائے تھے، کھانے، ناشتے اور دوسری مجلسوں میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب سے ان حضرات کی جو گفتگو ہوتی اس میں بھی شریک رہتا اور لطف اندوز ہوتا، اس کے بعد سید صباح الدین صاحب اپنی ذاتی اور دارالمصنفین کی ضرورتوں سے پاکستان تشریف لے گئے اور کئی مہینے ان کو وہیں کام کرنا پڑا، اسی اثنا میں آزاد صاحب کا مضمون ''علامہ اقبال اور مغربی مفکرین'' معارف میں اشاعت کے لئے آیا، اس کی رسید دیتے ہوئے میں نے ان کو لکھا کہ ابھی موصوف پاکستان ہی میں ہیں، آزاد صاحب نے جواب میں لکھا وہ سعی لا حاصل میں لگے ہوئے ہیں، اس کے بعد سے ان سے گاہے ماہے خط کتابت رہتی اور وہ صباح الدین صاحب کو بھی خط لکھتے تو مجھے سلام لکھتے۔

ایک دفعہ لکھنو میں مقبول احمد لاری صاحب کے یہاں ملاقات ہوئی تو دارالمصنفین اور مختلف علمی و ادبی مسائل پر دیر تک باتیں ہوتی رہیں، اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' کا ذکر آیا تو کہنے لگے ہندوستان کی مسجدوں میں دو مینار ہوتے ہیں، اس کی وجہ سے نظم کا یہ مصرعہ ع ''اس کا منارۂ بلند عرش گہہ جبریل'' میرے لیے باعث خلجان تھا کہ واحد ''منارہ'' کا استعمال ضرورت شعری یا کس بنا پر کیا ہے، میں اسپین گیا تو اسی خلجان کو دور کرنے کے لیے مسجد دیکھنے گیا، جس کا ایک ہی منارہ تھا۔

دہلی میں بھی بعض سمیناروں میں ملتے تو بڑی محبت اور خلوص سے پیش آتے، مولانا آزاد یونیورسٹی نے مولانا کے یوم پیدائش پر ایک پروگرام دہلی میں کیا تھا جس میں ترجمان القرآن کے حوالے سے میں نے اپنے مضمون میں مولانا آزاد کی مذہبی رواداری دکھائی تھی جس کی داد انہوں نے اور خواجہ حسن نظامی ثانی نے خاص طور پر دی تھی۔

ان سے تعلقات فزوں ہوئے تو ان کی جو کتاب چھپتی یا کوئی اور ان پر کتاب شایع کرتا تو معارف میں تبصرے کے علاوہ اس کا ایک نسخہ میرے لیے بھی بھیجتے، ایک بار حاجی ادریس دہلوی ان پر کوئی کتاب مرتب کررہے تھے تو انہوں نے اس کے لیے مجھ سے بھی مضمون کی فرمائش کی پھر آزاد صاحب کا بھی خط آیا کہ حاجی صاحب کی فرمائش پوری کروں، اب میرے لیے فرار مشکل ہوگیا اور میں نے ''جگن ناتھ آزاد کا رنگ حرم'' کے عنوان سے مضمون لکھا، جسے آزاد صاحب نے بہت پسند کیا، اس طرح ان سے اخلاص و مودت کا رشتہ بڑھتا رہا جو اب ان کی وفات کے بعد منقطع ہوگیا ہے تو میرے لیے ان جیسے پُرخلوص کی جدائی کا صدمہ ناقابل برداشت ہورہا ہے۔

جگن ناتھ آزاد نے اردو دنیا میں پہلے ایک شاعر کی حیثیت سے اپنا سکہ جمایا، انہوں نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے، غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت تھی، رباعیات، قطعات اور بچوں کے لیے بھی نظمیں کہی ہیں، نظموں کے موضوعات میں بڑا تنوع ہے، قومی نظمیں اور مرثیے بھی کہے ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد

انداز کے ہیں، ان کی ایک طویل نظم جمہور نامہ اس میں ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک دنیا کی سرگزشت بیان کی گئی ہے، اس کا ایک حصہ رسول اکرم ﷺ کی ولادت باسعادت اور بعثت وغیرہ سے متعلق ہے، بڑا موثر اور دل کش ہے، یہ جب معارف میں چھپا تو اسلامی علوم کے فاضل یگانہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کو بہت پسند آیا اور انہوں نے اس کا فرانسیسی ترجمہ شایع کیا، آزاد صاحب کامیاب غزل گو بھی ہیں مگر نظم نگار کی حیثیت سے ان کا پایہ زیادہ بلند ہے۔

جگن ناتھ آزاد اردو کے اچھے مصنف، دیدہ ور نقاد اور بلند پایہ محقق تھے، ان کی متعدد نثری تصانیف نے بھی ان کی عظمت میں چار چاند لگائے ہیں جو سوانح، خود نوشت حالات شخصی خاکوں، تنقید اور سفرناموں پر مشتمل ہیں مگر ان کا خاص موضوع اقبالیات ہے جس سے ان کو شروع ہی سے بڑا شغف تھا، اس موضوع پر انہوں نے مضامین اور تصنیفات کے انبار لگا کر اپنے کو اقبال کا سب سے بڑا عارف ومبصر ثابت کردیا اور ان کے افکار وخیالات کی ترجمانی واشاعت کا حق ادا کرکے ہندوستان میں ان کے بارے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ ہی نہیں کیا بلکہ ان کی عظمت کا لوہا بھی منوایا، اقبالیات سے متعلق ان کی متعدد نثری تصانیف ہیں جن میں اقبال اور مغربی مفکرین معرکے کی کتاب ہے، اقبال پر انگریزی میں بھی دو کتابیں لکھی ہیں ان کی ہر دور کے علاوہ ان کے اہل خاندان کی تصویروں کا ایک البم ''مرقع اقبال'' کے نام سے شایع کیا تھا۔

جگن ناتھ آزاد کی تصانیف نظم ونثر کی تعداد قریباً ۶۰ ہے، حیرت ہوتی ہے کہ سرکاری اور دفتری کاموں میں مشغولیت اور فرایض منصبی ادا کرنے کے باوجود انہوں نے اتنے سارے علمی کام کس طرح انجام دیے، وہ اردو کے واحد ایسے خوش قسمت ادیب وشاعر ہیں جن کی شخصیت اور فن پر ان کی زندگی ہی میں درجنوں کتابیں اور بعض رسالوں کے خاص نمبر شایع ہوئے جن میں متعدد پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے بھی ہیں، ان کی متعدد کتابوں کے مختلف زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے، ان کو بین الاقوامی شہرت نصیب ہوئی، وہ بیرون ملک کے مشاعروں، سمیناروں اور کانفرنسوں میں برابر جایا کرتے تھے، اردو کے شاید ہی کسی اہل قلم اور مصنف کی ایسی پذیرائی ہوئی ہو اور اسے اتنا حسن قبول ملا ہو، ان سے زیادہ اعزاز اور ایوارڈ بھی کسی اور کے حصے میں نہیں آیا ہوگا۔

غرض جگن ناتھ آزاد کے تصنیفی وتحقیقی کارناموں اور شعری وادبی فتوحات کے حدود بہت وسیع تھے لیکن اس سے بڑھ کر ان کے اخلاق وکردار کی جہاں گیری تھی، وہ ایک نیک طینت اور شریف النفس انسان تھے اور ان کا دل اخلاق وسیرت کی عظمت و بلندی کی جلوہ گاہ تھا، ان کے دل کی دردمندی اور سیرت کی پختگی نے ہر شخص کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا، ان کے تعلقات کا دایرہ بہت وسیع تھا، جس میں علم وادب کے ہر طبقے ودرجے کے لوگ شامل تھے مگر ان کی مروت وشرافت اور دل نوازی نے سب کی تسخیر کرلی تھی، ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے ستائے اور مغربی پنجاب کے ایک بے خانماں ہندو ہونے کے باوجود ان کا آئینۂ قلب تعصب، تنگ نظری اور فرقہ وارانہ نفرت کی گرد وغبار سے صاف تھا، وہ زندگی بھر انسانی اخوت ومحبت کی تلقین اور حق وانصاف کی آواز بلند کرتے رہے، احترام آدمیت، انسان دوستی، روشن خیالی، وسیع النظری، رواداری اور بے تعصبی کی روایتیں ان کو اپنے والد اور خانوادے سے وراثتاً ملی تھیں، ان کو برابر آگے بڑھاتے رہے، وہ ہمارے ملک کی مشترکہ تہذیب اور گنگا جمنی کلچر کے مجسم نمونہ تھے، آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو اور مسلمان خاص طور پر مظالم اور زیادتیوں کا نشانہ بنائے گئے، جگن ناتھ دونوں کو ان کا جائز حق دلانے کے لیے سرگرم رہے، اردو تحریک کے وہ ہمیشہ فعال رکن رہے اور آخر میں انجمن ترقی اردو ہند کے صدر بھی ہوئے، فرقہ وارانہ فسادات ہوں یا بابری مسجد کا انہدام سب نے ان کو رلایا اور تڑپایا، فرقہ واریت کے استیصال، ظلمت کدہ ہند کو بقعہ نور اور پرفتن دور کو پرامن بنانے کے ہمیشہ آرزومند رہے، جامع مسجد دہلی کو مخاطب کرکے کہتے ہیں ؎

ممکن ہو تو اس دور کے انداز بدل دے
انساں کا ذرا ذوق تگ و تاز بدل دے

مگر یہ حسرت لے کر وہ دنیا سے چلے گئے تاہم ان کی شاعری جن شریفانہ اور اسلامی جذبات پر مشتمل ہے وہ اس کا ثبوت ہے کہ تعصب اور تنگ نظری کے اس دور میں بھی انسانیت کا چراغ روشن ہے۔

انقلاب کی آندھی انہیں پاکستان سے ہندوستان اڑا لائی تھی مگر ان کا دل برابر پاکستان میں اٹکا رہتا تھا اور اس میں کبھی اس کی بدخواہی کا خیال نہیں آنے دیا، تاعمر وہاں کے اپنے استادوں، بزرگوں اور دوستوں کو اپنی محبت وعقیدت کے نذرانے پیش کرتے رہے، پاکستان کے شہروں، دریاؤں اور دوسرے مناظر کا ذکر ہمیشہ درد وحسرت سے کرتے تھے، وہ ہندوستان سے زیادہ پاکستان میں مقبول رہے، وہاں کی تقریبات میں بڑے اصرار سے بلائے جاتے تھے، علامہ اقبال پر ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس کی صدارت کرکے ہندوستان کو بھی عزت وافتخار بخشا، جناب اسد ملتانی نے ان کی مشہور نظم ''بھارت کے مسلماں'' پر ان کے احسان کا اعتراف کرتے ہوئے بالکل صحیح کہا ہے:

جس دور میں نازاں ہوں تعصب پہ زن و مرد
جس دور میں ہر راہ سے نفرت کی اٹھے گرد
جس دور میں دل مہر و محبت سے ہوئے سرد
اس دور میں موجود ہوں تجھ ایسے بھی ہم درد
ہوں دیر میں یہ رنگِ حرم دیکھ کے حیراں ہمدرد مسلماں

(''ض''، ستمبر ۲۰۰۴ء)

احمد، مقبول، ڈاکٹر

آہ! جناب ڈاکٹر مقبول احمد مرحوم

دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے رکن اور کلکتہ کے مشہور سرجن پروفیسر ڈاکٹر مقبول احمد قریب دو ڈھائی سال سے کناڈا میں مقیم تھے، وہاں ان کی صحت بگڑتی گئی اور آخر ۱۰/اکتوبر کو فون سے ان کی وفات کی اندوناک خبر ملی، اناللہ وانا الیہ راجعون، اس طرح ایک ایسی ہستی کی کتاب زیست کا ورق تمام ہوا جس کا ہر باب وصفحہ ایک خالص عبد مومن کی تصویر اور جس کا ہر نقش تابندہ اور رشک وتقلید کے لایق ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی پیدایش ۱۹۲۴ء میں بنارس میں ہوئی جہاں ان کے زمین دار جدامجد، اعظم گڑھ کے گاؤں راجہ پور سکرور سے منتقل ہوگئے تھے لیکن تعلیم، ملازمت، مستقل بودوباش اور میدان عمل کے لحاظ سے ڈاکٹر صاحب کا وطن کلکتہ ہی ہے، اس شہر مہاجراں کو مختلف علاقوں کی جن مذہبی، علمی اور ادبی شخصیتوں نے اپنے وجود کی برکتوں سے مثل قرطبہ وغرناطہ بنایا، ان کی فہرست میں ڈاکٹر صاحب کا نام مختلف حیثیتوں سے ہمیشہ نمایاں رہے گا۔

کلکتہ میڈیکل کالج سے سند حاصل کرنے کے بعد وہ انگلینڈ اور فرانس گئے، ایف آرسی ایس کیا، وطن واپس آئے تو اسی کالج میں معلم ہوئے جہاں پہلے متعلم تھے، بچپن سے تعلیم تک کی تکمیل کی یہ کہانی انہوں نے دل چسپ تفصیل سے اپنی کتاب ''صدائے جرس'' میں بیان کردی ہے، سرجری کے فن میں ان کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی اور علم الجراحت میں ان کی چند نئی تحقیقات یورپ کے رسایل میں شایع ہوئیں تو بین الاقوامی سطح پر ان کا اعتراف کیا گیا، کلکتہ میں ان کے دست شفا اور مسیحائی کی دھوم تھی لیکن یہ ان کی زندگانی مقبول کا صرف ایک باب ہے، اس فن کو انہوں نے مال و منفعت کے حصول تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اس کو ملک و ملت کی خدمت کا ایک بہترین وسیلہ بنایا، انہوں نے مرض اور مریض کو قریب سے دیکھنے، اصل سبب جاننے اور درد میں شریک ہونے کو اپنا شعار بنایا، ان کی یہی عادت ان کی زندگی کی فطرت ثانیہ بن گئی۔ جس کا ظہور ملک وقوم کی اصلاح کی شکل میں ہوا، خصوصاً مسلمانوں کی تعلیمی، سماجی، معاشرتی اور سیاسی زبوں حالی بلکہ بربادی پر انہوں نے ایک حاذق، مخلص اور درد مند معالج کی حیثیت سے نظر کی اور ہر اس کام میں پیش پیش رہے جس سے قوم کا مزاج وقوام درست ہو، اس راہ میں انہوں نے اپنے وقت اور مال کی جس فیاضی وفراخی سے قربانی دی اس کی مثال شائد ہی ملتی ہے۔

۶۴ء میں مسلم مجلس مشاورت قائم ہوئی تو پیہم فسادات اور مایوسی ومحرومی کی ماری مسلم قوم کو کچھ امید وراحت کا احساس ہوا، ڈاکٹر صاحب کے مزاج وطریقہ کار کے لیے یہ مجلس موزوں تھی چنانچہ انہوں نے مجلس سے رشتہ استوار کیا اور آخر تک بڑی وضع سے اسے نباہا، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی سے سید شہاب الدین تک مجلس مشاورت پر کیسے کیسے زمانے گزرے، مرکز میں یہ محض نام کے لیے رہ گئی لیکن ڈاکٹر صاحب کی قیادت میں مغربی بنگال میں یہ ہمیشہ سرگرم عمل اور نیک نام رہی اور صرف مجلس مشاورت ہی کیا ان کے درد کی سوغات تو ہر اس ادارے کے لیے تھی جو ان کی ملت کے لیے کسی شکل اور کسی درجے میں متحرک ہو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی کورٹ کے وہ گویا مستقل ممبر تھے، وہاں کی ڈیوٹی سوسائٹی اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے احیا میں ان کے انفاس گرم کی تاثیر بھی شامل تھی، مغربی بنگال کے چوبیس پرگنہ ضلع میں سوسائٹی فار اسلامک ایجوکیشن کے وہ روح رواں رہے، اس سوسائٹی کے تحت ایک رہایشی اسکول کا وہ بڑے فخر سے ذکر کرتے کہ اس کی مثالی تعلیم سے شاید ان کی تمنا پوری ہو کہ سائنس، ٹکنالوجی اور آئی اے ایس جیسے مقابلوں میں مغربی بنگال کے مسلمان بچے بھی آگے آئیں، خود کلکتہ میں خدا جانے کتنے ایسے چھوٹے بڑے ادارے ہیں جن کی وہ بڑی خاموشی سے دست گری بلکہ سرپرستی کرتے تھے، کلکتہ میں امام حرم کا استقبال ہو، افغانستان پر روسی حملے کے خلاف احتجاج ہو، شاہ بانو کیس کے معاملے میں بے مثال اجتماع ہو، ڈاکٹر صاحب ہر محاذ پر عملاً موجود رہتے اور قلم کے ذریعہ تو وہ برابر مسلمانوں کے مسائل خصوصاً تعلیم اور معاش کے متعلق بڑی دردمندی سے اظہار خیال کرتے رہتے، خاص طور پر روزنامہ آزاد ہند میں ان کے یہ مضامین ہر صاحب درد کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتے، ان کے ان مضامین کا مجموعہ جب کتابی شکل میں شایع ہوا تو اپنے نام کی طرح مقبول ہوا اور ارباب نظر نے بھی اس کی یہ کہہ کر داد دی کہ ''فکر وفن میں بہ یک کمال ایک عطیہ ربانی ہے جو مبدء فیاض کی طرف سے اس شخص کو عطا ہوتا ہے جو دل دردمند، نگاہ بے داغ اور فکر بلند رکھتا ہو''، اس کا انگریزی ترجمہ MAQBOOL'S DISSERTATIONS کے نام سے جناب رضوان اللہ نے کیا اور یہ کلکتہ سے شایع ہوا، اس سلسلہ مضامین کا دوسرا حصہ بھی انہوں نے تیار کرلیا تھا، نقوش راہ کے نام سے اس کی کتابت بھی ہوچکی ہے، افسوس اس کی اشاعت کی خوشی ان کو اس زندگی میں نہیں ملی لیکن صدقۂ جاریہ کی شکل میں اس کا اجر بہرحال یقینی ہے، حیرت ہوتی ہے کہ علاج ومعالجہ کی مصروف ترین زندگی میں وہ کس طرح لکھنے پڑھنے کے لیے وقت نکال لیتے تھے، اقبال کی شکوہ جواب شکوہ ان کی محبوب نظم تھی، یورپ وامریکہ کے سفروں میں ان کو شدت سے احساس ہوا کہ ان ملکوں میں آباد برصغیر کے باشندوں کی آیندہ نسل اردو سے ترک تعلق کے بعد قومی احساسات کو بھی خیرباد نہ کہہ دے، اس کے لیے انہوں نے اس نظم کے ترجموں میں جناب الطاف حسین سابق اڈیٹر ''ڈان'' کے ترجمے کو پسند کیا جو کبھی شایع ہوکر اب گویا نایاب تھا، ان کی صاحبزادی سے اخلاقاً اس کی طباعت نو کی اجازت لی اور اردو اور رومن رسم الخط میں اس کو بڑے اہتمام سے شایع کرایا، علامہ اقبال سہیل ان کے

سسرالی عزیز اور پسندیدہ شاعر تھے، ان کے اشعار اکثر وہ دہراتے رہتے کہ،

مجھ میں فریاد جو پنہاں ہے سناؤں کس کو
تپش شوق کا نظارہ دکھاؤں کس کو

ان کی ایک کتاب مسئلہ سود پر بہت پہلے ۳۵، ۳۰ کے آس پاس شایع ہوئی، اس کا ایک بوسیدہ نسخہ ان کو ملا تو مباحث و مشمولات کی وجہ سے ان کو موجودہ حالات میں اس کی اہمیت کا احساس ہوا، مسئلہ سود پر عام رائے کے برخلاف اس میں چند مجتہدانہ خیالات تھے، اس لیے ڈاکٹر صاحب نے سب سے پہلے اس کو مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب مدیر معارف کے سپرد کیا اور علما سے رابطہ قائم کیا اور جب انشراح ہوا تب انہوں نے اس کی طباعت و اشاعت میں پہل کی، دہلی سے یہ کتاب ''ربوا کیا ہے'' کے نام سے بڑے سلیقے سے شایع ہوئی اور بعد میں اس کا انگریزی و عربی ترجمہ بھی شایع ہوا لیکن ان کی سب سے مفید و سبق آموز دلکش اور موثر کتاب ان کی خود نوشت سوانح حیات ''صدائے جرس'' ہے جس کے متعلق کہا گیا کہ ''یہ اس سرگرم، مشغول، پاکیزہ اور قابل ستایش زندگی کی کہانی ہے جو اپنے اندر عبرتوں اور بصیرتوں کا لازوال خزانہ رکھتی ہے''۔

دارالمصنفین سے ان کا تعلق غیر معمولی تھا، وہ اس کی ترقی و بہتری کے لیے ہمیشہ فکر مند رہتے، اس کی مجلس انتظامیہ کے وہ رکن تھے، ادھر علالت کی وجہ سے اس کی سالانہ نشستوں میں وہ شریک نہیں ہو پائے تو ان کو بڑا ملال رہا، ایک بار تو یہ کہہ کر استعفا بھیج دیا کہ علالت کی وجہ سے جب کچھ کر نہیں سکتا تو رکنیت کا حق کیسے ادا ہو، کناڈا میں جب بھی ان کی طبیعت ذرا بہتر ہوتی تو وہ فون کے ذریعہ یہاں کے ہر شخص اور کام کے بارے میں پوچھتے، جب ان کو معلوم ہوا کہ ایک لائبریری ہال کی تعمیر ہو رہی ہے تو خوش ہو کر اس کی تکمیل کی دعا کی، دارالمصنفین کی کسی ناگزیر ضرورت کے بارے میں ان کو خبر ملتی تو جلد سے جلد اس کو پورا کرنے کے لیے بے قرار ہو جاتے، اپنی تمام کتابوں کی طباعت و آمدنی کا حق بھی انہوں نے دارالمصنفین کو دے دیا، ان کی مثالی شخصیت علامہ جمال الدین افغانی کی تھی، ان کی خواہش تھی کہ علامہ افغانی پر ایک عمدہ اور دارالمصنفین کے معیار کے مطابق کتاب شایع ہو، اس کے لیے بھی انہوں نے مالی معاونت فرمائی، دارالمصنفین کی مالی مشکلات کے بارے میں وہ بے چین رہتے، کناڈا جاتے وقت بھی ان کی زبان پر یہی جملہ تھا کہ وہاں جا کر کسی مستقل آمدنی کی فکر کروں گا، دارالمصنفین سے اس محبت کے بارے میں کہتے کہ اس میں وطنی نسبت بھی شامل ہے، ایسے محبّ و مشفق کا سانحہ ارتحال دارالمصنفین کے ہر فرد کے لیے سخت ذاتی المیے سے کم نہیں، آہ ایسی شرافت، معصومیت، سادگی اور انکسار کے مجسمے اب کہاں؟ کلکتہ میں ان کا دولت کدہ ایک عرصے سے کلکتہ کے عمائد بلکہ ملک کے مشاہیر کا زیارت خانہ تھا، ڈاکٹر صاحب ان سب کے لیے وقت نکالتے، وقت کی قدر جیسی ان کے یہاں دیکھنے کو ملی، کہیں اور مشکل سے ملتی ہے، معمولات میں وقت کی سختی سے پابندی ان کی کامیاب زندگی کا بڑا سبب ہے اور یہ جوہر ان کو نماز سے حاصل ہوا، نمازوں کی یہ پابندی بڑی قابل رشک ہے، تلاوت قرآن مجید میں بھی شائد ہی کبھی ناغہ ہوا ہو، قرآن مجید سے خاص تعلق تھا، ان کی ذاتی لائبریری اردو، انگریزی ترجموں اور تفسیروں سے پر ثروت تھی، عزت نفس اور خودداری ان کی شخصیت کے نمایاں جوہر تھے، ان کی ان خوبیوں کا عکس ان کی خانگی زندگی پر بھی نظر آتا ہے، ان کی اہلیہ اور بچوں نے ہر جگہ اسلامی تشخص اور ماحول کی نمایندگی کی، ان کے دونوں صاحبزادے محمد طارق و محمد عارف اس وقت امریکا اور کناڈا میں اعلا عہدوں پر فائز ہیں، ان کی دونوں صاحبزادیاں بھی اعلا تعلیم یافتہ ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ایک مومن کی حیثیت سے زندگی گزاری، عقیدہ کی پختگی اور عمل کے اخلاص والوں کو ان لوگوں میں شمار کیا گیا ہے جن کی دوستی اللہ سے ہوتی ہے اور جن کو خوف و حزن کی انفعالی کیفیتوں سے ہمیشہ نجات ملتی ہے، ڈاکٹر صاحب کی زندگی کو قریب سے دیکھنے والے کہہ سکتے ہیں کہ دنیوی زندگی ان کے لیے بشری والی نعمت تو تھی ہی آخرت میں بھی ان کے لیے خوش خبری ہی ہے، ڈاکٹر صاحب کی تمنا تھی کہ ''اللہ میاں ایسی موت دیں کہ کلمہ طیبہ زبان اور دل دونوں پر ہو'' ان کی دعا تھی کہ ''اے اللہ موت کے وقت یہ دل آپ کی محبت میں بے قرار اور تڑپتا ہوا ہو، وہی تڑپ، پرسرور تڑپ جو قطرے کو سمندر سے ملنے کے وقت حاصل ہوتی ہے، اپنے رب کے دیدار کا شوق ایسا غالب آجائے کہ ایک عالم مدہوشی ہو اور اسی عالم میں جب روح نکل رہی ہو تو لبوں پر ہلکا سا تبسم آجائے کیوں کہ سنا ہے کہ یہی مرد مومن کی علامت ہے''، فون سے معلوم ہوا کہ وقت آخر یہی عالم تھا، ڈاکٹر صاحب کے ہونٹوں پر بلند آواز سے کلمہ کا زمزمہ جاری تھا، یقین ہے کہ ان کے چہرے پر وہی تبسم رہا ہوگا جس کی تمنا انہوں نے کی تھی، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے سائے میں پناہ دے کر اس جنت کے انعام سے نوازے جس کو اس نے اپنے ان بندوں کے لیے بنایا جو صرف اس کی ذات پر ایمان رکھتے ہیں، ڈاکٹر صاحب کے مرد مومن ہونے میں کس کو شبہ ہے، اللھم اغفرلہ وارحمہ۔ (''ع۔ص''، نومبر ۲۰۰۴ء)

القاسمی، محمد رضوان، مولانا

مولانا محمد رضوان القاسمی مرحوم

مولانا محمد رضوان القاسمی کے انتقال سے حیدرآباد دکن کی ریاست علم و ادب ہی سونی نہیں ہوئی ہندوستانی علما کی صف سے ایسی جگہ بھی خالی ہوئی جو روایت و جدیدیت

کی جامعیت کی عمدہ مثال تھی اور جس سے مستقبل میں ملک کی قیادت اسلامی کو بڑی توقعات تھیں۔

ایک مہینہ قبل جب حیدرآباد سے یہ خبر ملی کہ مولانا کو ہیمبرج ہوا تو یقین نہیں آیا، گزشتہ سال بھوپال میں رابطہ ادب اسلامی کے ایک جلسہ میں ان کی زیارت ہوئی تو وہ ہمیشہ کی طرح ہشاش بشاش، متحرک اور زندگی سے لبریز نظر آئے، ان کی سرگرمی اور ہمہ وقت جدوجہد اور تگ و دو، دیکھنے کے لائق تھی، دیوبند سے جب وہ حیدرآباد گئے اور ایک مدرسہ سے وابستہ ہوئے تو شاید کسی نے سوچا بھی نہ ہو کہ ایک دن یہ انجان اور گم نام فارغ دیوبند، حیدرآباد کے آسمان علم و ادب پر سب سے روشن ستارے کی شکل میں ظاہر ہوگا، حیدرآباد کے علاقہ عابد شاپ میں مسجد عامرہ سے ان کی صلاحیتوں کا سورج طلوع ہوا اور دارالعلوم سبیل السلام اس سفر سعادت کا مرحلہ عروج ثابت ہوا، مولانا رضوان القاسمی نے اپنے اخلاق، رکھ رکھاؤ، عالمانہ متانت و رزانت اور خداداد انتظامی صلاحیت سے اس ارض دکن کو اس طرح فتح کیا کہ اب حیدرآباد اور وہ لازم و ملزوم کی حیثیت اختیار کر گئے، وہاں کے مقتدر اخباروں میں ان کے دینی و ادبی کالموں کا انتظار ہزاروں قارئین کو شدت سے رہتا، اللہ تعالیٰ نے خطابت کے ساتھ قلم کا سلیقہ بھی فیاضی سے ودیعت فرمایا، ان کے قلم کی شگفتگی، شائستگی اور شستگی کی داد اہل نظر نے دی، ان کا زاویہ نظر مستقیم اور طرز ادا بہت معتدل تھا اور اس میں ان کی اپنی شخصیت کی بھی کارفرمائی تھی، حیدرآباد میں ان کو جو امتیاز و وقار حاصل ہوا وہ واقعی قابل رشک ہے، بارکس کی ایک وادی میں انہوں نے سبیل السلام کی شکل میں جس طرح ایک شہر علم آباد کیا وہ حیرت انگیز ہے۔ ان کی وفات سے ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے اللہ تعالیٰ ان کی مساعی جمیلہ کو قبول فرمائیں اور اس خوش نودی سے نوازیں جس سے بڑھ کر کچھ نہیں ورضوان من اللہ اکبر، اصل کامرانی و سرخ روئی یہی ہے۔ (”ع۔ص“، نومبر ۲۰۰۴ء)

زیدی، علی جواد

علی جواد زیدی کی رحلت

افسوس ہے کہ ۶؍ دسمبر ۲۰۰۴ء کو جناب سید علی جواد زیدی لکھنو میں رحلت فرما گئے، ان کی وفات علمی و ادبی دنیا کا سخت حادثہ ہے، ان سے راقم کا ذاتی تعلق تھا اور وہ دارالمصنفین کے بڑے قدرداں اور اس کے نہایت مخلص خیر خواہ تھے، مرحوم تقریباً نوے برس کے ہوگئے تھے، عرصے سے بیمار تھے، کئی بار قلبی دورہ بھی پڑ چکا تھا لیکن اس پیری اور بیماری میں بھی ان کے ولولے اور حوصلے جوانوں کی طرح بلند تھے، کتنے ارمان اور کیسے کیسے علمی و ادبی منصوبے ان کے ذہن میں پرورش پاتے رہتے تھے، جب بھی ملاقات ہوتی تو ان کا ذکر دلچسپی سے کرتے تھے، اب شمع علمی کے ایسے پروانے، تلاش، تحقیق اور جستجو کے دیوانے اور شعر و ادب کے متوالے، فضل و کمال کی تحصیل میں سرگرداں اور تحریر و تقریر میں کامل الفن کہاں ملیں گے جن کو اردو، فارسی، عربی، انگریزی اور ہندی پر عبور اور سنسکرت سے واقفیت ہو اور وہ ملک کی گنگا جمنی تہذیب کا دلکش نمونہ، قوم وطن کی محبت میں سرشار اور اپنی مذہبی و اخلاقی قدروں کے پاسباں ہوں، دراصل وہ سانچا ہی ٹوٹ گیا جس میں علی جواد جیسے ذہین وطباع، صائب الرائے، معاملہ فہم، عظمت و شرافت کے حامل، مہر و محبت کے پتلے، حلم و مروت کے پیکر اور وضع داری رکھ رکھاؤ اور انکسار کے مجسمے ڈھلا کرتے تھے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

علی جواد زیدی شاعر، ادیب، محقق، نقاد، خاکہ نگار، صحافی، عالم، دانشور، سیاست داں، مجاہد آزادی، فرض شناس اور ایمان دار افسر اور مختلف علوم و فنون میں دست گاہ رکھتے تھے، فلسفہ، تاریخ، اقتصادیات، سماجیات، لسانیات، ادبیات اور اسلامیات ہر میدان ان کی جولان گاہ تھا اور وہ گوناگوں اوصاف کے حامل، پروقار اور دل آویز شخصیت کے مالک تھے، ان کی سیرت کے جلوے گوناگوں اور رنگا رنگ تھے، وہ پاک دل، پاک باز، خوش طبع، خوش اطوار، نیک طینت، نیک نہاد، متواضع، خلیق و شریف النفس اور دردمند، محبِّ وطن اور انسان دوست تھے، افسوس ہے کہ متانت، شائستگی، دل داری اور دل نوزی کا یہ پیکر ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نمایاں ہوتا ہے

وہ ۵؍ جمادی الاولیٰ۔ ۱۶؍ مارچ ۱۹۱۶ء کو اپنے نانہال کرہاں میں پیدا ہوئے تھے جو ان کے دادھیال محمد آباد گہنہ سے چند میل کے فاصلے پر تھا، یہ دونوں بستیاں پہلے اعظم گڑھ میں اور اب ضلع مئو میں شامل ہیں، احمد آباد سنی اور شیعہ شرفا کی قدیم آبادی ہے، زیدی صاحب کے نانہال اور دادھیال کا تعلق سادات کے زمین دار گھرانے سے تھا، ان کا خاندان شرقی سلاطین کے زمانے میں جون پور میں آباد ہوا، اسے جون پور اور اعظم گڑھ کی سرحد پر واقع بجولی کے نوح میں ۲۲ گاؤں جاگیر میں ملے تھے، زیدی صاحب کے مورثِ اعلا حضرت سید کمال صاحب کشف بزرگ تھے، یہ جون پور میں قضا کے منصب پر فائز تھے مگر دنیا سے طبیعت اچاٹ ہوگئی تو بجولی میں اقامت اختیار کر لی اور عبادت و ریاضت میں اپنی زندگی گزار دی، ان کی وفات کے بعد خاندان کے لوگ بجولی کے قریب اعظم گڑھ کے موضع کیدلی پور میں آباد ہوگئے لیکن زیدی صاحب کے جداعلا سید عبدالعلی صاحب کیدلی سے محمد آباد گہنہ چلے آئے، کچھ عرصے بعد نانہال کے مورث اعلا میر شمس الدین عرف میر شمس محمد آباد چھوڑ کر کرہاں کے جنگل میں سکونت

اختیار کر کے رشد و ہدایت میں مصروف ہوئے۔

زیدی صاحب کے خاندان کو شریعت و طریقت میں مرجعیت کے علاوہ علمی اور دنیاوی وجاہت بھی حاصل تھی، شعر و شاعری کا ذوق اور علم و فن سے وابستگی کئی پشتوں سے چلی آرہی تھی، نانہال اور دادھیال دونوں جگہ کے لوگوں کے پاس ذاتی کتب خانے تھے، مذہبی تقریبات، میلاد کے جلسے، مجلسیں، مقاصدے، مسالمے اور مشاعرے برابر ہوتے تھے، جن میں یہ بھی شریک ہوتے، اسی وجہ سے زیدی صاحب کو بچپن ہی سے شعر و سخن کا ذوق، علم و ادب سے شغف اور مطالعے کا چسکا لگ گیا تھا، ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، مولوی سید محمد تقی صاحب سے درسی کتابوں، آمد نامہ، گلزار دبستاں، کریما، گلستاں بوستاں اور دیوان حافظ وغیرہ کا درس لیا اور عربی نحو و صرف میں میزان، منشعب، صرف و نحو میر، پنج گنج، هداية النحو، کافیہ، صغری، کبری اور دینیات بھی ان ہی سے پڑھیں، ان کے والد تجارت کرتے تھے، اسی لیے ریاضی اور ہندی بھی اسی زمانے میں سیکھ لی تھی۔

باقاعدہ عربی پڑھنے کے لیے جامعہ ناظمیہ لکھنو میں داخلہ لیا لیکن ابھی یہ ۱۳ برس ہی کے تھے کہ والد بزرگوار سید علی امجاد افسر کا انتقال ہوگیا تو ان کے ایک عزیز حاجی سید علی جواد مرحوم انہیں ریاست محمود آباد (سیتاپور) جہاں وہ برسر منصب تھے لے آئے اور ۱۹۳۰ء میں کالون اسکول میں داخل کردیا جہاں سے ۱۹۳۵ء میں ہائی اسکول پاس کیا، ۱۹۳۷ء میں گورنمنٹ جوبلی انٹر کالج لکھنو سے انٹر کیا، پھر لکھنو یونیورسٹی سے ۱۹۳۹ء میں بی۔اے اور ۱۹۴۲ء میں ایل ایل بی کی ڈگری لی۔

لکھنو آکر پہلے تو وہ طلبہ سیاست میں الجھے پھر ملک کی سیاست میں بھی سرگرم حصہ لیا، ان کی شاعری کا آغاز وطن ہی میں ہوگیا تھا، شیخ ابوالحسن جرم محمد آبادی سے جو آرزو لکھنوی کے شاگرد تھے، زیدی صاحب کو شعری اسقام اور محاسن شعری کا علم ہوا، گیارہ برس کی عمر میں ان کے ماموں سید محمد رسؔا کو ان کے بعض اشعار سن کر بڑی حیرت ہوئی، اس لیے علی میاں کامل محمد آبادی کی غزل کا یہ مصرع طبع آزمائی کے لیے دیا تا کہ ان کا امتحان ہوجائے ع شامیانہ بن گیا جب سر پہ چادر تان لی۔

زیدی صاحب نے چار پانچ شعر کہہ کر پیش کیا جن میں یہ شعر پسند کیا گیا:

ہے مرے بازار کی داد و ستد کچھ اور ہی
جان دی اس پر ہمیشہ جس نے اپنی جان لی

۱۲ سال کی عمر میں ایک نعتیہ قصیدہ کہا اور والد اور چچا کی موجودگی میں مقاصدہ میں اسے برسر منبر پڑھا جس پر ان کو خوب داد ملی مگر چچا نے ناگواری ظاہر کی اور کہا کہ شعر و شاعری کے چکر میں پڑ کر برباد ہوجائیں گے، یہ قصیدہ اس وقت ہفت روزہ المصطفی جون پور میں شایع بھی ہوا۔

محمود آباد آئے تو گھر کی پابندیاں ختم ہوگئی تھیں اور یہاں شعری و ادبی سرگرمیوں کے لیے اور وسیع میدان مل گیا تھا، علمی و ادبی حلقوں سے شناسائی ہونے لگی، یہاں سے لکھنو بھی آنا جانا ہوتا تھا، وہاں کے اہل علم اور کبار شعرا سے ملاقات اور استفادہ کرتے، گورنمنٹ جوبلی انٹر کالج میں داخلہ لیا تو شعر و ادب سے شغف دیکھ کر انہیں کالج کی انجمن ادب اردو کا سکریٹری بنایا گیا، انجمن کے مشاعروں میں انعام حاصل کیا اور مشاعروں کی تاریخی اہمیت پر مضمون لکھا جو نیرنگ خیال لاہور میں چھپا، اس سے بڑا حوصلہ ملا، اب ان کے جراید و رسائل کے اڈیٹروں سے بھی تعلقات ہوگئے، منشی دیانراین نگم کے مشہور رسالہ زمانہ کان پور میں مضامین لکھے جن کا معاوضہ ملا، منشی جی نے انہیں ہونہار دیکھ کر کان پور سے بی اے کرنے اور اپنے اخبار ''آزاد'' میں معاونت کرنے کی دعوت دی جس کو زیدی صاحب نے منظور کرلیا، یہاں کوئی تکلیف نہیں تھی، بی اے میں داخلہ بھی لے چکے تھے مگر لکھنو جیسا علمی و ادبی ماحول نہیں تھا، اس لیے ان کا جی نہیں لگا اور وہ لکھنو آکر بی اے کرنے لگے۔

اس وقت لکھنو میں ترقی پسند تحریک کا بڑا زور تھا اور لکھنو یونیورسٹی میں خاص طور پر اس کا غلغلہ بلند تھا، ''نیا ادب'' اس تحریک کا ترجمان تھا، علی جواد زیدی بھی ترقی پسند مصنفین کی انجمن کے رکن ہوگئے، ان کے احباب نے ان کے احتجاج کے باوجود انہیں لکھنو اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا صدر چن لیا، پھر آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جوائنٹ سکریٹری اور ۱۹۴۱ء کے پٹنہ اجلاس میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سکریٹری منتخب کر لیے گئے، اس وقت دوسری جنگ عظیم چھڑی ہوئی تھی اور نوجوانوں اور طالب علموں کو گرفتار کیا جارہا تھا، جنگ کی ابتدا میں تمام سیاسی پارٹیاں اسے سامراجی جنگ تسلیم کر کے اس کے خلاف آواز بلند کررہی تھیں، ہر طرف جلسے جلوس، نعرے اور پرجوش نظمیں اور تقریریں ہورہی تھیں کہ اب برطانوی سامراج کی ریڑھ کی ہڈی توڑنے اور اس پر آخری وار کرنے کا وقت آگیا ہے، اتفاق سے اسی زمانے میں لکھنو یونیورسٹی کے کسی شعبے کا افتتاح کرنے کے لیے ہندوستان کی فیڈرل کورٹ (سپریم کورٹ) کے چیف جسٹس اور دلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر آئے، ان کے خلاف زبردست مظاہرہ ہوا، اس میں اور اس وقت کی ہر سیاسی سرگرمی میں زیدی صاحب، علی سردار جعفری اور جلیل عباسی مرحوم پیش پیش ہوتے تھے، چنانچہ ان لوگوں کے خلاف وارنٹ جاری ہوا مگر طلبہ کے ہیجان اور دلی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی بدنامی کے باعث گرفتاری رک گئی مگر کچھ ہی عرصے بعد ان کی قیادت میں طلبہ کی زبردست اسٹرایک اور جلسہ عام ہوا، اس دفعہ پھر ان کے خلاف وارنٹ جاری ہوا مگر طے پایا کہ طلبہ کی سالانہ کانفرنس تک جو ناگ پور میں ہونے والی تھی، یہ گرفتاری دینے سے بچیں چنانچہ اِدھر اُدھر چھپتے پھرے، اسی زمانے میں ان کی شادی ہونے والی تھی مگر اسے

ملتوی کرادیا اور ناگپور کانفرنس میں شریک ہوئے اور برطانوی سامراج کے خلاف لہک لہک کر نظمیں پڑھیں، آخر گرفتار کر کے لکھنو لائے گئے، مجسٹریٹ ان کے چچا کا دوست تھا، اس کے اصرار کے باوجود یہ مقدمہ کی پیروی کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوئے اور عدالت میں بیان دیا کہ وہ برطانوی عدالت کو تسلیم نہیں کرتے، ان کے انکار پر انہیں چھ ماہ کی سزا ہوئی اور لکھنو سے بنارس سنٹرل جیل بھیج دیے گئے جہاں سردار جعفری اور مرحوم جلیل عباسی پہلے سے موجود تھے، جیل جانے سے ان کا یہ تعلیمی سال ضایع گیا اور ۱۹۴۲ء میں لا کر سکے۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد جرمنی نے روس پر جب حملہ کردیا تو کمیونسٹوں نے جنگ کو سامراجی ماننے سے انکار کردیا اور اسے عوامی کہنا شروع کیا، یہیں سے ان کے اور غیر کمیونسٹ لوگوں کے راستے الگ الگ ہوگئے، اس کی وجہ سے اسٹوڈنٹس فیڈریشن بھی دو حصوں میں بٹ گیا، علی جواد زیدی صاحب سوشلسٹ اور قوم پرور گروہ کے سکریٹری تھے جس کے اکثر ارکان گرفتار ہوچکے تھے مگر انہوں نے گرفتاری سے بچنے کی حکمت عملی اختیار کی اور پورے ملک کا خفیہ دورہ کیا ۱۹۴۵ء میں اسٹوڈنٹس فیڈریشن اسٹوڈنٹس کانگریس کے نام سے موسوم ہوئی، اب زیدی صاحب طالب علم نہیں رہے اس لیے طلبہ سیاست سے علاحدہ ہوگئے، چنانچہ ذریعہ معاش کی تلاش ہوئی سزایافتہ ہونے کی وجہ سے سرکاری ملازمت نہیں مل سکتی تھی، اپنے وطن اعظم گڑھ میں اس وقت کے نامور وکیل اور مشہور قومی شاعر اقبال سہیل مرحوم کی رہنمائی میں وکالت شروع کی، کامیابی نہیں ملی تو غازی پور میں پریکٹس شروع کی، یہاں وکالت تو چلی مگر ادبی و سیاسی ماحول نہ ہونے کی وجہ سے ان کا جی نہیں لگ رہا تھا، اب ملک آزاد ہوچکا تھا، ایک روز غازی پور میں ان کے دوست اور کانگریسی لیڈر کیشو دیومالویہ ملے جو اس وقت پارلیمنٹری سکریٹری تھے، وہ اپنے ساتھ زیدی صاحب کو لکھنو لائے، چند ماہ بعد اترپردیش حکومت نے انہیں اردو جرنلسٹ سکشن کا آفیسر انچارج مقرر کردیا اور وہ محکمہ اطلاعات سے منسلک ہوگئے، ان کو صحافت کا اچھا تجربہ پہلے سے تھا، ملک کے اکثر اخباروں اور رسالوں میں ان کے مضامین چھپتے رہتے تھے، لکھنو کے کئی اخباروں میں اور بعض انگریزی اخباروں میں کام بھی کرچکے تھے، ان کے یہی تجربے اس ملازمت کے باعث بنے اور ترقی کر کے پبلی کیشنز آفیسر، اسسٹنٹ ڈائرکٹر اور ڈپٹی ڈائرکٹر کے عہدوں پر فائز ہوئے۔

یہاں ان کی ادارت میں ''اطلاعات'' نکلا جس میں صرف پریس نوٹ چھپتے تھے، اسے انہوں نے ''نیا دور'' کا نام دے کر ایک معتبر ادبی رسالہ بنادیا، جنوری ۱۹۵۶ء میں وہ گورنمنٹ آف انڈیا کے یونین پبلک سروس کمیشن کے لیے منتخب ہوئے اور ۱۹۵۷ء میں ڈیپوٹیشن پر ریاست جموں و کشمیر چلے گئے اور اس وقت کے وزیراعلا کشمیر بخشی غلام محمد کے پی آر او ہوئے، ان کی کوششوں اور بخشی غلام محمد صاحب کی دلچسپی سے یہاں اکیڈمی آف آرٹس کلچر اینڈ لینگویجز کا قیام عمل میں آیا جس سے انہوں نے ایک اچھا ادبی رسالہ ''شیرازہ'' نکالا، کشمیر میں قیام کے زمانے میں وہ اس کی اکثر ادبی و ثقافتی سرگرمیوں میں دخیل رہے اور خود بھی گوناگوں مفید اور اہم علمی و تحقیقی کام انجام دیے۔

۱۹۶۲ء میں پھر وہ دلی آگئے اور ۱۹۶۷ء میں ڈھائی برس کے لیے بمبئی میں ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن آفیسر برائے مہاراشٹرا، گجرات و گوا رہے۔ پھر دلی آکر ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل نیوز آل انڈیا ریڈیو ہوئے، اسی زمانے میں گجرال کمیٹی کے ممبر جوائنٹ سکریٹری کی حیثیت سے اردو کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے پورے ہندوستان کا دورہ کیا۔

جون ۱۹۷۵ء سے جولائی ۱۹۷۸ء تک وہ آل انڈیا ریڈیو کے خصوصی نمائندے کی حیثیت سے مغربی ایشیا میں رہے، ان کا ہیڈکواٹر تہران تھا مگر افغانستان، کویت، بحرین، عمان، قطر، شارجہ، دوبئی، ابوظہبی، لبنان، سعودی عربیہ اور یمن بھی جانا ہوا، اس سے پہلے حکومت ہند کے ایک وفد کے ساتھ بھی افغانستان گئے تھے، طالب علمی کے زمانے میں جزایر انڈومان و نکوبار اور جزایر لکشادیپ کا دورہ کیا تھا، ۱۹۷۰ء میں امریکہ، فرانس، انگلستان، کناڈا، جاپان، ہانگ کانگ اور سنگاپور جانے کا اتفاق ہوا تھا۔

۱۹۷۸ء میں ریٹائرڈ ہوئے اور ۱۹۸۱ء میں اترپردیش اردو اکادمی کے صدر منتخب کیے گئے، ان کے دور میں اکادمی نے ترقی کی اور مختلف نئے کام انجام پائے، دو ماہی ''اکادمی'' کا اجرا ہوا، اس کے بعد وہ لکھنو ہی میں رہ کر خاموشی اور یکسوئی سے علمی و تحقیقی مشاغل میں مصروف رہے لیکن ۱۹۹۱ء میں بمبئی مستقل قیام کے ارادے سے گئے اور زینیہ انسٹی ٹیوٹ کے دوماہی رسالے ''العلم'' کے اعزازی مدیر رہے، ۱۹۹۵ء میں پھر لکھنو آکر گومتی نگر میں اپنے ذاتی مکان میں مستقل رہایش اختیار کی اور بالآخر لکھنو کی خاک کا پیوند ہوگئے۔

علی جواد زیدی کا اصل کارنامہ ان کی تصنیفات ہیں جن کا سلسلہ طالب علمی ہی کے زمانے میں شروع ہوگیا تھا اور آخر آخر تک جاری رہا، حیرت ہوتی ہے کہ سرکاری ملازمت کے جھمیلوں میں رہتے ہوئے انہوں نے کس طرح یہ بیش بہا سرمایہ تیار کرنے کے لیے وقت نکالا، تصانیف کے علاوہ وہ ملک کے اکثر موقر رسایل و جراید میں برابر علمی و تحقیقی مضامین بھی لکھتے رہتے تھے اور کئی رسالوں کی ادارت بھی کی بلکہ بعض کے بانی مدیر بھی تھے، ان کی تصانیف و مقالات کے موضوعات بھی نہایت متنوع اور گوناگوں ہیں، ان کا شمار ملک کے صف اول کے اردو اہل قلم اور بلند پایہ شعرا میں ہوتا ہے، انہیں نظم و غزل پر یکساں قدرت تھی، حسب ذیل شعری مجموعے چھپ گئے ہیں:

۱۔ رگ سنگ، ۲۔ میری غزلیں، ۳۔ دیار سحر، ۴۔ انتخاب علی جواد زیدی، ۵۔ نسیم دشت آرزو، (۶) تیشۂ آواز، ۷۔ سلسلہ

علمی وادبی تحقیق کے موضوع پر یہ کتابیں شایع ہوئی ہیں:

۸۔ہندوستان میں اسلامی علوم کے مراکز، ۹۔قصیدہ نگاران اترپردیش، ۱۰۔مثنوی نگاری، ۱۱و۱۲۔دہلی مرثیہ گوجلد اول ودوم، ۱۳۔میرانیس، ۱۴۔تاریخ مشاعرہ

مطبوعہ تنقیدی کتابوں کے نام یہ ہیں:

۱۵۔تعمیری ادب، ۱۶۔تاریخ ادب اردو کی تدوین، ۱۷۔دو ادبی اسکول، ۱۸۔فکر وریاض، ۱۹۔کمال ابوالکلام

جو کتابیں مرتب و مدون کرکے شایع کی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۲۰۔ پیام آزادی، ۲۱۔نغمہ آزادی، ۲۲۔اردو میں قومی شاعری کے سوسال (۱۸۵۷ء سے ۱۹۵۷ء تک)، ۲۳۔انوار ابوالکلام، ۲۴۔دیوان غنی کاشمیری، ۲۵۔انیس کے سلام، ۲۶۔انتخاب رند، ۲۷۔سرودہم سایہ، ۲۸۔رباعیات انیس، ۲۹۔مالک رام ایک مطالعہ

خاکہ نگاری میں دو کتابیں چھپی ہیں: ۳۰۔آپ سے ملئے، ۳۱۔ہم قبیلہ

ہندی میں: ۳۲۔نغمہ آزادی اور ۳۳۔غالب ایک پریچے اور انگریزی میں دس کتابیں لکھیں۔

مطبوعہ کے علاوہ متعدد کتابیں ابھی طبع نہیں ہوئی ہیں جن میں بعض غالباً نامکمل ہیں، اردو میں رام کتھا اور یادوں کی رہ گزر کو مکمل کرچکے تھے، اردو اور انگریزی میں جو مضامین لکھے ہیں وہ کئی جلدوں میں آئیں گے، دوتین برس قبل جناب سبط محمد نقوی نے ان کے مضامین کا ایک مجموعہ شایع کیا تھا، ان کی کتابوں اور مقالات سے علمی وتحقیقی کام کرنے والوں کو ہمیشہ فیض پہنچتا رہے گا۔

زیدی صاحب کی کتابوں کی بڑی پذیرائی بھی ہوئی، ان پر مرکزی اور بعض ریاستی حکومتوں اور اردو اکیڈمیوں اور اداروں نے انہیں ایوارڈ سے نوازا، اترپردیش کے سابق وزیر اعلا ہیم وتی نندن بھوگنا نے ۱۹۷۲ء میں ان کو تامراپترا سے نوازا اور حکومت ہند نے پدم شری کا خطاب دیا۔

ان کے قدر دانوں نے ایک بار انہیں ایک یادگار صحیفہ نذر کرنے کے لیے ایک تہنیتی کمیٹی بنائی، جب ان سے اس کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے ان قومی نظموں کا انتخاب شایع کرنے کا مشورہ دیا، جنہیں برطانوی حکومت نے ضبط کرلیا تھا، چنانچہ ''ضبط شدہ نظمیں'' کے نام سے کتاب شایع کی گئی جسے اس وقت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے اپنے ہاتھوں سے زیدی صاحب کو دیا۔

علی جواد زیدی کا حلقہ تعارف بڑا وسیع تھا، ملک کے ہر طبقہ ومسلک اور ہر مذہب وملت کے لوگوں سے ان کے تعلقات تھے، ان میں اصحاب علم وفضل ہی نہیں تھے بلکہ مشاہیر ارباب سیاست قومی رہنما اور وزرا اور اعلا حکام بھی تھے، ان کو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں جانے اور چیدہ لوگوں سے ملنے کے مواقع ملے، وہ جہاں جاتے اپنی خوش طبعی، شرافت اور دل نوازی کا نقش چھوڑ جاتے اور سب کو اپنا گرویدہ بنالیتے، ان کے تعلقات کا دایرہ چوٹی کے لوگوں یا بزرگوں اور ہم سروں ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ خوردوں اور کم تر درجے کے لوگوں سے بھی بڑی گرم جوشی سے ملتے، ان کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کرتے اور ان سے اپنے علمی وتحقیقی کاموں میں مدد لیتے، اعظم گڑھ ان کا وطن اور لکھنو وطن ثانی تھا، دونوں جگہوں کے اکثر قابل ذکر لوگوں سے ان کے تعلقات تھے ''یادوں کی رہ گزر'' سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید ہی کوئی شاعر وادیب ہو جس سے افادہ واستفادہ کا تعلق نہ رہا ہو، مولانا سہیل سے وکالت میں تلمذ کا شرف حاصل ہوا تو انہیں برابر یاد رکھا، ان پر مضمون لکھا جو ان کی کتاب ''آپ سے ملئے'' میں شامل ہے، ''قومی شاعری کے سوسال'' میں ان کی اور یحییٰ اعظمی مرحوم کی نظمیں شامل کیں۔

دارالمصنفین سے قلبی تعلق تھا، اعظم گڑھ میں قیام کے زمانے میں یہاں برابر آتے، کتب خانے کے علاوہ مولانا عبدالسلام ندویؒ سے خاص طور پر استفادہ کرتے، ان کی کتابوں کے حوالے اپنی کتابوں میں دیے ہیں، شبلی ڈے کے موقع پر تقریریں کرتے شاہ معین الدین احمد ندویؒ اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم سے بڑے مخلصانہ روابط تھے، اپنے وطن محمد آباد آتے تو یہاں ضرور تشریف لاتے اور عموماً ایک روز و شب دارالمصنفین میں قیام بھی کرتے۔

جناب صباح الدین صاحب بھی لکھنو جاتے تو ان سے ضرور ملاقات کرتے، میرا بھی یہ معمول بن گیا تھا، زیدی صاحب کہتے تھے کہ میں تو جب بھی محمد آباد جاتا تھا تو میرے لیے دارالمصنفین کی حاضری لازمی ہوتی تھی، میں نے عرض کیا کہ میں بھی لکھنو آکر آپ سے نہیں ملتا تو بڑی خلش رہتی ہے، زیدی صاحب کا مطالعہ بہت وسیع اور علم مستحضر تھا، ان کی گفتگو علمی اور پراز معلومات مگر بہت دلچسپ ہوتی، اسے سن کر بہت سی گرہیں کھل جاتیں، وہ مجھ جیسے حقیر کا بڑا اعزاز کرتے اور دوسروں سے اتنا شاندار تعارف کراتے کہ میں شرم سے پانی پانی ہوجاتا، جس زمانے میں وہ اکادمی کے صدر تھے، میں ان سے ملنے بلہرا ہاؤس گیا تو انہیں مطالعہ میں مستغرق پایا، مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے، میں نے کہا میری وجہ سے آپ کا سارا انہماک ختم ہوگیا، اسی اثنا میں ڈاکٹر محمود الٰہی آگئے، وہ اس وقت اکادمی کے چیرمین تھے، زیدی صاحب نے ان سے میرا تعارف کرنا چاہا تو انہوں نے کہا، آپ ان کا تعارف مجھ سے کرائیں گے یا میں آپ سے ان کا تعارف کراؤں گا۔

وہ بہت کھلے اور روشن دماغ شخص تھے، ہمیشہ نیشنلسٹ اور سیکولر رہے لیکن عقیدتاً پکے مسلمان اور صوم وصلاۃ کے پابند تھے۔ البتہ فرسودہ رسوم وظواہر، تعصب اور کورانہ تقلید کے خلاف تھے، رواداری اور انسان دوستی کی بنا پر ہر مذہب وملت کا احترام کرتے

تھے، فرقہ وارانہ جھگڑوں سے نفرت تھی، اختلاف اور الجھاؤ کی باتوں سے دور رہتے، ہر فرقہ و جماعت کے لوگوں سے تعلق رکھتے، ان کی زبان سے کبھی نفرت اور تعصب کی بات سننے میں نہ آتی، ہندو مسلم اختلافات، شیعہ سنی جھگڑوں اور اردو کے مسائل کو وہ وسیع پس منظر میں دیکھتے تھے، جذباتی اور سطحی باتیں کرنے کے بجائے ان کا رویہ حقیقت پسندانہ ہوتا تھا۔

اپنی رواداری اور بے تعصبی کی بنا پر اردو رام کتھاؤں پر کام کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا، دو تین برس پہلے ایک روز فون کیا کہ رام لعل نابھوی کے اردو فارسی رامائینوں پر جو مضامین معارف میں شائع ہوئے تھے، اس کے کچھ شمارے میرے پاس محفوظ نہیں، انہیں جلد بھیج دو، میں نے کہا میں نیا دور میں ''یادوں کی رہ گزر'' بہت شوق اور دلچسپی سے پڑھ رہا ہوں مگر یہ تو بتائیے کہ کیا لکھنو ہی کی یادوں کا ذکر ہوگا یا اس کے باہر کی بھی یادیں قلم بند ہوں گی، کہنے لگے ہاں ایک صاحب نے اور شکایت کی کہ ع کہی حکایت ہستی تو درمیاں سے کہی۔ اسے ابتدا تا انتہا پہنچانے کا ارادہ ہے۔

میں ان سے بے تکلف ہوگیا تھا، صباح الدین صاحب کے انتقال سے پہلے یا بعد میں ایک دفعہ وہ دارالمصنفین آئے، کھانے پر وہی اور میں تھا، میں نے کہا اعتراضاً نہیں بلکہ اپنی واقفیت کے لیے دریافت کررہا ہوں کہ کیا اہل تشیع کے یہاں قرآن مجید چالیس پاروں میں تھا، انہوں نے فرمایا کہ مجھے تو یہ معلوم ہے کہ مابین الدفتین جو ہے وہی قرآن مجید ہے، میں نے کہا مولانا حمید الدین فراہیؒ نے سورۂ قیامہ کی تفسیر میں جمع قرآن پر بحث کرتے ہوئے محققین علمائے شیعہ کا یہی خیال بتایا ہے، پاروں اور رکوع کی تقسیم تو عجمیوں نے کی ہے، قرآن مجید تو اصلاً سورتوں اور آیتوں میں منقسم ہے، اگر اس کا کچھ حصہ ضایع ہوجاتا تو یہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت قرآنی کے وعدے کے خلاف ہوتا، میرے سوال کا مقصد یہ تھا کہ کیا متاخرین علمائے شیعہ میں کسی نے یہ بات لکھی ہے، انہوں نے کہا میرے علم میں نہیں۔

وہ بہت اصول پسند تھے، ان کے اوقات بہت منضبط تھے، وہ دفتری اوقات میں کسی سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے، دفتر میں شعر و ادب پر بھی بحث و گفتگو نہ کرتے اگر کوئی عزیز آجاتا یا شاعر آکر کچھ سنانا چاہتا تو اسے روک دیتے اور معذرت کرلیتے، زیدی صاحب میں بڑی خودداری تھی، خوشامد اور تملق کو پسند نہیں کرتے تھے، ان کے تعلقات وزرا اور اعلا عہدہ داروں سے تھے لیکن ملازمت میں آنے کے بعد وہ ان سے ملنے سے احتراز کرتے تھے، چاہتے تو اپنے لڑکوں اور عزیزوں کو اچھی اور بڑی ملازمتیں دلا سکتے تھے، سروجنی نائیڈو سے ان کی اچھی شناسائی تھی اور وہ ان کی شاعری کو بہت پسند کرتی تھیں، جب یوپی کی گورنر ہوکر آئیں تو اپنی بے نیازی اور بے غرضی کی وجہ سے ان سے ملنے کے روادار نہیں ہوئے، ایک روز گورنر صاحبہ نے خود انہیں چائے پر بلایا تب ہی گئے اور ملاقات کی لیکن اس میں غرور اور گھمنڈ کو دخل نہ تھا، اپنی علمی برتری اور دنیاوی وجاہت کے باوجود ان میں فخر و غرور کا کوئی شائبہ نہ تھا، ان کے جیسی بے نفسی اور فروتنی مجھے بہت کم لوگوں میں نظر آئی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور اعزہ کو صبر جمیل عطا کرے۔ (''ض''، فروری ۲۰۰۵ء)

خواجہ مشفق

جناب مشفق خواجہ

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ کراچی میں ۲۱، ۲۲/ فروری کی درمیانی شب میں جناب مشفق خواجہ صاحب کا انتقال ہوگیا، وہ اردو کے ممتاز محقق، نقاد، کالم نویس اور مزاح نگار تھے، خواجہ صاحب کو دل کی بیماری تھی، گزشتہ برس اس کا کامیاب آپریشن ہوا تھا، مگر پھر گردے کی تکلیف شروع ہوگئی جو بڑھتی گئی، انتقال سے ۳-۴ روز قبل طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تو وہ اسپتال میں داخل کیے گئے جہاں انتقال ہوگیا، خواجہ صاحب کو علم و ادب سے بڑا شغف تھا، انہوں نے اپنی ادبی، تنقیدی اور تحقیقی نگارشات سے اردو ادب میں اہم جگہ بنالی تھی، وہ بہت اچھے مزاح نگار بھی تھے۔ خامہ بگوش کے نام سے اس فن میں اپنا جوہر خوب دکھاتے تھے، مرحوم کو دارالمصنفین سے بڑا لگاؤ تھا، ابھی دو برس پہلے اس کی اکثر کتابیں منگائی تھیں، معارف بھی برابر ان کے مطالعہ میں رہتا تھا، ہندوپاک میں زرمبادلہ کی دشواری سے اہل علم کو بڑی پریشانی ہوتی ہے، معارف نہ ملنے سے خواجہ صاحب بھی بہت پریشان رہتے، اس کا علم جناب عبدالوہاب خاں سلیم صاحب کو ہوا تو وہ ان کا چندہ بھیجنے لگے اور تاکید کی کہ پیسے کی وجہ سے ان کا معارف نہ بند کیا جائے، اللہ تعالیٰ خواجہ صاحب کی مغفرت فرمائے۔

(''ض''، مارچ ۲۰۰۵ء)

کوئی دوسرا مشفق نہیں ہے

(ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی)

انسان اپنی خلقت اور سرشت میں گوناگوں آرزوؤں، خواہشوں اور تمناؤں کا مرقع ہے اور اس کی پوری زندگی ان ہی تمناؤں اور آرزوؤں کی تکمیل و تزئین میں گزر جاتی ہے، خاک کا یہ پتلا بالعموم خواہشات نفس کا اسیر رہتا ہے اور حیات مستعار کی پوری نقدی کھیل تماشوں میں صرف کردیتا ہے، زر و مال کی طلب اور اس کی محبت نفس خواہشیں، نام و نمود اور شہرت کی تمنا، جاہ و منصب کی حرص اور مجموعی طور پر ایک خوش حال اور مال و متاع سے پر، ایک اونچے ''معیار زندگی'' کے لیے جدوجہد بیشتر انسانوں کو ایک کرب مسلسل میں مبتلا رکھتی ہے، یہی وہ اسلوب حیات (Life Style) ہے

جسے قرآن حکیم میں ''خُسران'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔(انَّ الانِسَانَ لَفِی خُسر[العصر: ۲])

خوش بخت ہیں وہ معدودے چند لوگ جو خواہشات نفس کے اس طغیان سے بچ بچا کر صحیح سلامت ساحل تک پہنچ جاتے ہیں، جناب مشفق خواجہ جنہیں مرحوم کہتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے، ایسے ہی معدودے چند لوگوں میں شامل تھے، (یہیں سمجھ میں آتا ہے کہ ''کلیجہ منہ کو آنا'' کسے کہتے ہیں اور اس میں کتنا رنج وغم، کتنا ہجر وفراق اور کتنی محرومی پوشیدہ ہے)۔

خواجہ صاحب ایک مہذب، مستغنی اور شایستہ انسان تھے، انہوں نے اس درجہ اپنی تہذیب نفس کرلی تھی کہ وہ ہر طرح سے نام ونمود، جاہ ومنصب اور مال ومنال کی ہر خواہش سے بے نیاز ہوچکے تھے، علامہ اقبال کا یہ مصرع ان پر صادق آتا ہے:

ایام کا مرکب نہیں ، راکب ہے قلندر

ادب کی دنیا میں اعتراف (recognition) آج کے ادیب اور شاعر کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور ہم سب الا ماشاء اللہ اسی انسانی کمزوری کا شکار ہیں، جو کچھ ہم لکھتے ہیں، اس پر ہمیں داد ملنی چاہئے اگر کتاب چھپے (اور کیوں نہ چھپے بلکہ اگر ہر سال ایک نئی کتاب چھپے تو کیا خوب ہے!) فلیپ پر تعریفی کلمات، ایک تحسینی دیباچہ، چند توصیفی تقریظیں۔ پھر اخبارات ورسائل میں کچھ تبصرے۔ ایک دو شہروں میں بلکہ اگر ہوسکے تو بیرون ملک اردو کی نئی بستیوں میں تقریبات اجرائی ورونمائی، صاحب کتاب کے بارے میں کسی ادبی رسالے کا خاص نمبر یا گوشہ ہی سہی، اگر صاحب کتاب شاعر ہیں تو ان کا بلند پایہ کلام ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے نشر بھی ہونا چاہئے، اب صاحب کتاب کو اس کتاب پر کوئی ادبی ایوارڈ بھی ملے اور ''صدارتی تمغائے حسن کارکردگی'' کی خواہش تو بالکل فطری ہے، مشفق خواجہ ان سب باتوں سے بے نیاز تھے۔

ہماری بعض جامعات میں زندہ شخصیات ادب پر سندی مقالے لکھوانے کی روایت موجود ہے، خواجہ ہر اعتبار سے اس کا استحقاق رکھتے تھے کہ ان کے علمی وادبی کارنامے کو موضوع مقالہ بنایا جائے، مگر وہ اسے پسند نہیں کرتے تھے کہ ان پر کچھ لکھا جائے باوجود اس کے کہ علمی وتحقیقی کام کرنے والوں کے وہ قدردان تھے اور کام کرنے والوں کی ممکنہ حد تک اور خوش دلی کے ساتھ مدد کرتے، اپنے معاملے میں وہ کسی طرح کا تعاون کرنے سے صاف انکار کردیتے تھے، میرے علم میں ہے کہ پروفیسر تحسین فراقی صاحب نے اپنے ایک شاگرد حافظ محمد قاسم (متعلم ایم اے اردو، اورینٹل کالج لاہور) کے تحقیقی مقالے کا موضوع تجویز کیا، ''مشفق خواجہ بہ طور مدون'' جب خواجہ صاحب تک یہ خبر پہنچی تو انہوں نے اسے ناپسند کیا اور فراقی صاحب سے بھی خفا ہوئے، فراقی صاحب نے تو یہ موضوع میرٹ پر تجویز کیا تھا، خواجہ صاحب بہرحال اس کا استحقاق رکھتے تھے، مگر خواجہ صاحب کا خیال تھا کہ لوگ اسے ''حق دوستی'' پر محمول کریں گے، (یہ معلوم ہے کہ خواجہ صاحب فراقی صاحب کو بہت عزیز رکھتے تھے اور اس مقالے کے نگراں اورنگ زیب عالم گیر صاحب سے بھی خواجہ صاحب کو خاص تعلق خاطر تھا) بایں ہمہ مقالہ نگار نے اپنا کام جاری رکھا۔

ڈاکٹر اورنگ زیب عالم گیر صاحب نے خواجہ صاحب کے برادر بزرگ خواجہ عبدالقیوم اور بعض دیگر عزیزوں سے رابطہ قائم کیا تاکہ مقالے کے باب اول کے لیے خواجہ صاحب کے کچھ سوانحی حالات معلوم کیے جائیں، خواجہ عبدالقیوم صاحب اپنے چھوٹے بھائی کے مزاج سے واقف تھے، اس لیے انہوں نے ازراہ احتیاط معلومات فراہم کرنے سے پہلے مشفق خواجہ صاحب سے بات کی تو انہوں نے منع کردیا، چنانچہ عالم گیر صاحب مقالہ نگار کو خواجہ صاحب کے سوانحی اور شخصی حالات کے ضمن میں کوئی نئی بات یا مزید معلومات نہ مل سکیں، مقالہ بہرحال مکمل ہوگیا، طالب علم کو ڈگری بھی مل گئی، کچھ عرصے کے بعد شعبہ اردو کے مجلّہ ''بازیافت'' (مدیر: تحسین فراقی) میں ''کلیات یگانہ'' پر مذکورہ طالب علم کا تبصرہ شائع ہوا تو خواجہ صاحب نے پھر تحسین صاحب سے خفگی کا اظہار کیا، فی الحقیقت وہ خلوص دل سے سمجھتے تھے کہ عالم اور شاعر وادیب کے لیے شہرت اور نام ونمود مہلک ہے، ایک بار راقم الحروف کو خط میں لکھا: ''ہوس، دولت و شہرت کی ہو، نفس امارہ کی یا کتابوں کی، اس کی کوئی انتہا نہیں، الحمدللہ میں ہر معاملے میں قناعت پسند ہوں''۔

ڈاکٹر طاہر مسعود کی روایت ہے: ''وہ مجھ سے کہا کرتے تھے، آدمی اپنے کام سے پہچانا جاتا ہے، لہٰذا اصل اہمیت کام کی ہے، نام میں کیا رکھا ہے، شیطان سے زیادہ مشہور کون ہوگا، آپ کتنی ہی کوشش کرلیجئے شیطان سے زیادہ مشہور تو نہیں ہوسکتے''۔ (قومی زبان، کراچی، مارچ ۲۰۰۵ء، ص ۲۳)

مشفق خواجہ کی شخصیت کا ایک نہایت لائق تحسین پہلو یہ تھا کہ وہ اپنے نیاز مندوں، اساتذہ اور باصلاحیت طلبہ کو علمی وادبی، تحقیقی وتنقیدی سرگرمیوں کے لیے آمادہ وتیار کرتے، کام کے موضوعات تجویز کرتے، جو جس لائق ہوتا اسے ویسا ہی کام تجویز کرکے سونپ دیتے، کسی کتاب یا مخطوطے کی تدوین کا فیصلہ ہوتا تو خود فوٹو کاپی بنوا دیتے، متعلقہ موضوع پر جس قدر لوازمہ اور مواد ان کی دست رس میں ہوتا، بلاتامل مہیا کرتے اور جو چیز ان کے پاس نہ ہوتی، اس کی نشاندہی کردیتے، راقم اپنی فہم و دانست کے مطابق کسی نہ کسی علمی کام میں مصروف رہتا مگر جب بھی خواجہ صاحب سے ملاقات ہوتی تو وہ میرے لیے تدوین کا کوئی کام تجویز کردیتے، ایک بار انہوں نے مجھے کا (ا) دیوان فوٹو کرا کے بھیج دیا کہ اسے مدون کرو، میں نے معذرت کی، یہ کام میرے بس کا نہیں ہے کیوں کہ مجھے عروض میں مہارت حاصل نہیں اور اس کے بغیر شاعری کی

تدوین ناقص ہوگی، انہوں نے اس سے اتفاق کیا، اب انہوں نے عبدالرزاق کانپوری کی ''یادِ ایام'' کا عکس بھیج دیا اور ساتھ ہی تدوین اور املا تک کے لیے ہدایات بھی لکھ بھیجیں، اسی طرح خواجہ صاحب نے تحسین فراقی صاحب کے لیے کئی علمی کام تجویز کیے، ان میں سے کچھ پایۂ تکمیل کو پہنچے، جیسے ''عجائبات فرنگ'' کی تدوین یا مقالہ ''اردو تنقید کے دس سال'' اور کچھ ناتمام رہ گئے جیسے ''مسیر طالبی'' کا ترجمہ یا ''عبرت الغافلین'' کی تدوین وغیرہ۔

ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب سے انہوں نے ''گلشن ہمیشہ بہار'' مرتب کرایا، ڈاکٹر اورنگ زیب عالم گیر صاحب کو وہ خواجہ محمد شفیع دہلوی کی آپ بیتی ریکارڈ کرنے پر اکساتے رہے، انہیں ایک خط میں لکھا: ''یہ کام بہت اہم ہے، اسے آپ دوسرے تمام کاموں پر ترجیح دیجیے، کسی نشست میں ان کے خاندانی حالات ٹیپ کر لیجیے، کسی میں دہلی کی ثقافتی زندگی کی تفصیلات، خواجہ صاحب کا وسیع حلقہ ارباب تھا، پہلے ان کے نام پوچھ لیجیے، پھر فرداً فرداً ہر ایک کی شخصیت کے بارے میں ان کے تاثرات، خواجہ صاحب نے ۴۷ء کا زمانہ نہایت پریشان کن حالات میں گزارا تھا، ہجرت کے حالات تفصیل سے پوچھیے، بمبئی میں فلمی دنیا کے حالات تو وہ خود ہی مزے لے لے کر بیان کریں گے، غرض کہ بات سے بات نکلتی آئے گی''۔ (۶/جون ۱۹۸۶ء)

مقتدرہ قومی زبان نے ڈاکٹر جمیل جالبی کے زمانہ صدر نشینی میں ''قومی انگریزی اردو لغت'' شائع کی تھی، دوسرا منصوبہ ''قومی اردو انگریزی لغت'' کا تھا، جس کے مدیر اعلا جناب مظفر علی سید مقرر ہوئے تھے، اس سلسلے میں خواجہ صاحب نے انتخاب الفاظ کا کام ڈاکٹر عالم گیر صاحب سے کرایا تھا (آخر میں کچھ شمولیت محمد احسن خاں صاحب نے بھی کی) مگر یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی کیوں کہ اردو سے انگریزی ترجمے کا کام جن اصحاب کے سپرد کیا گیا، انہوں نے تھوڑا تھوڑا کام کرنے کے بعد اس بھاری پتھر کو چوم کر رکھ دیا۔

خواجہ صاحب ایک بے لوث، بے غرض اور نیک نفس انسان تھے، علمی و ادبی منصوبے تیار کرنا اور ایسے منصوبوں میں مصروف تحقیق کاروں اور عالموں کی فراخ دلی سے مدد و اعانت کرنا ان کا شیوہ تھا، اپنی اس خوبی کی وجہ سے وہ ادبی دنیا کے تمام گروہوں، دھڑوں اور حلقوں میں یکساں طور پر مقبول تھے، اکا دکا بر خود غلط قلم کاروں کو چھوڑ کر وہ ہر ایک کی ضرورت تھے، دوست دشمن (اگرچہ وہ کسی کو اپنا دشمن خیال نہیں کرتے تھے، ہاں، کسی نے خود کو ان کا ''دشمن'' فرض کر لیا ہو تو اس کی قسمت) ہر ایک کو ان کا تعاون میسر رہتا اور یہ کام، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، وہ کسی دنیاوی غرض کے لیے نہیں کرتے تھے، کیوں کہ ان کے بہ قول ''نیکی کا اجر خدا ہی دے سکتا ہے، بندے کے بس کی بات نہیں''۔ (مکتوب بنام اورنگ زیب عالم گیر، ۶/دسمبر ۱۹۹۷ء)

علم و ادب کا ایسا پرخلوص اور بے لوث خدمت گزار، اب ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا، شاید ہمیں اندازہ نہیں کہ طاہر مسعود کے بہ قول ''کیسا قیمتی اور نادر روزگار آدمی ہمارے درمیان سے اٹھ گیا ہے''۔ (قومی زبان، مارچ ۲۰۰۵ء، ص ۲۵)

مشفق خواجہ خود ایک باکمال، کھرے ادیب، مزاح نگار، شاعر اور محقق تھے، تخلیق اور تحقیق دونوں میں انہوں نے قدر اول کی چیزیں یادگار چھوڑی ہیں، ہمارے لیے ان کی شخصیت اور ادبی کارناموں میں کیا سبق پوشیدہ ہے؟ یہ کہ ستایش کی تمنا کی پروا کیے بغیر اپنا کام محنت اور کاوش اور دیانت داری کے ساتھ کیے چلے جاؤ، عزت، احترام، محبت اور شہرت بھی اگر حاصل ہوگی تو کام ہی کی بہ دولت حاصل ہوگی۔

ان کی شخصیت کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ وہ اسلام، پاکستان اور اقبال کے ساتھ ایک غیر متزلزل وابستگی رکھتے تھے اور یہ وابستگی انہیں اپنے والد خواجہ عبدالوحید سے ورثے میں ملی تھی، وہ اپنے مخصوص شگفتہ اسلوب میں اشتراکیت، اباحیت، الحاد، آمریت پر تنقید کرتے، علمی و ادبی دنیا میں جعل سازی اور بناوٹی رویوں پر خوب خوب چوٹ کرتے اور شہرت کی ہوس میں مبتلا اہل قلم پر اپنے مخصوص انداز میں کچھ ایسی لطیف طنز کرتے کہ مخالف بلبلا اٹھتا مگر لطف بھی لیتا، یہی وہ خوبی تھی جس کی بنا پر نہ صرف پاکستان کے تمام ادبی حلقوں بلکہ بھارت میں بھی مقبول تھا اور وہاں کے متعدد رسالوں اور اخباروں میں نقل کیا جاتا تھا، خامہ بگوش کی کالم نگاری میں وقفے بھی آتے رہے، چنانچہ ان کا تازہ کالم میسر نہ آتا تو بعض رسائل اپنے قارئین کے تفنن طبع کے لیے پرانے کالم ہی شایع کرتے رہتے تھے۔

۲۱/فروری ۲۰۰۵ء کو مشفق خواجہ کی وفات پر راقم الحروف نے (''نوائے وقت'' کے لیے) اپنے فوری تاثر کا اظہار اس طرح کیا تھا:

''مشفق خواجہ کی رحلت موجودہ صدی میں پاکستان کی علمی و ادبی اور تحقیق و تنقید کی دنیا کا سب سے بڑا سانحہ ہے، وہ ایک ایسی جامع الصفات ادبی شخصیت تھے، جس کی کوئی مثال، اردو کی معاصر ادبی دنیا میں نہیں ملتی، میرے ایک مرحوم دوست کو یہ ماننے میں تامل ہوا مگر آج ایک برس بعد بھی مجھے اپنے اس تاثر میں تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، اس ایک برس میں مشفق خواجہ پر بہت کچھ لکھا گیا اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے مگر نہیں کہا جاسکتا کہ اس پیکر خلوص و دانش کی شخصیت کے سارے پہلو ہمارے سامنے آگئے ہیں یا اس کی علمی و ادبی مہارت، دنیائے علم و تحقیق کے سامنے پوری طرح منکشف ہوگئی ہے۔

اس عرصے میں جس سے بھی ملاقات ہوئی، جہاں بھی مشفق خواجہ کا ذکر آیا اور جو کچھ ان پر چھپا، ایک دو حضرات کے سوا سب کو ان کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان پایا، وہ انسان تھے، ان میں کمزوریاں بھی تھیں مگر یہ

قول جمیل الدین عالی ''ان کی خوبیاں، ان کی کمزوریوں کے مقابلے میں کئی ہزار گنا زیادہ تھیں''۔ (قومی زبان، مارچ ۲۰۰۵ء، ص۱۰۰)

میں دعا گو ہوں کہ خدا ان کی کمزوریوں، عمل کی کوتاہیوں اور لغزشوں کو معاف کرے، ان کی مغفرت کرے اور ان کے درجات بلند کرے، آمین۔

مشفق خواجہ اول و آخر اور سرتا پیر ایک علم دوست شخص تھے، علم و ادب ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا، ان سے مل کر، ان کے پاس بیٹھ کر، ان کی باتیں کرکے اور ان سے تبادلہ خیال کرکے اندازہ ہوتا تھا کہ ''علم و ادب بہ طور اوڑھنا بچھونا'' کیا مفہوم رکھتا ہے؟ راقم کو ان سے بارہا ملنے اور ان کی صحبت میں کئی کئی گھنٹے گزارنے کا موقع ملا، بلکہ دو ایک بار تو ناظم آباد کراچی میں، ان کے ہاں چند دن مقیم رہنے کا موقع بھی ملا، میں تو دن بھر ان کے کتب خانے کی سیر کرتا، کتابیں دیکھتا، نوٹس لیتا اور شام کو ہم روزانہ لمبی سیر کرتے، کسی جگہ کھانا کھاتے اور دنیا جہاں کی باتیں کرتے، لیکن ہر ملاقات یا صحبت کے اختتام پر تشنگی باقی رہتی اور یہ خواہش بھی کہ کچھ اور موقع ملے، باتیں ہوں، کچھ اور استفادہ کیا جائے۔

خوش بخت ہیں کراچی کے وہ ادیب، شاعر، دانش ور اور اہل قلم جو مشفق خواجہ ایسی نعمت سے مستفیض ہوتے رہے، اب وہ اس نعمت سے محروم ہوگئے ہیں، لیکن یہ محرومی صرف کراچی والوں کی نہیں پوری اردو دنیا اور دنیائے علم و ادب کی محرومی ہے۔

مرحوم ''اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں''، یہ ایک روایتی جملہ ہے لیکن یہ جملہ اگر کسی پر صادق ہوتا ہے تو مشفق خواجہ پر، انہوں نے اپنی دیگر مصروفیات کے باوجود تن تنہا ایسے بلند پایہ اور معیاری و مثالی تحقیقی کام انجام دیے جو اداروں کے کرنے کے تھے، اس کے باوجود یہ ایک سفاک حقیقت ہے کہ کارِ دنیا کسے تمام نہ کرد، ابھی کتنے ہی کام مشفق خواجہ کے پیش نظر تھے، جو وہ انجام دینا چاہتے تھے، مکمل کرنا چاہتے تھے، بسے گفتنیہا کہ ناگفتہ ماند، مرحوم اس آرزوئے ناتمام کے ساتھ عالم جاودانی کو رخصت ہوئے ہوں گے کہ کچھ اور مہلت ملے تو اپنے علمی منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچادوں، مگر رہے نام اللہ کا، ان کی بہت سی تحریریں، بہت سے مضامین، بہت سے تبصرے غیر مدون ہیں، یہ سب کئی جلدوں میں سمائیں گے۔

مشفق خواجہ کی شخصیت اور ان کی علمی نہاد و افتادِ طبع کو سمجھنے کے لیے ان کے مکاتیب ایک بڑا قیمتی اور اہم ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں، جناب محمد عالم مختار حق نے اپنے نام مرحوم کے خطوط حواشی کے ساتھ مرتب کردیئے ہیں، یہ کتاب بہت جلد آنے والی ہے، راقم کے نام مکاتیب مشفق خواجہ کا مجموعہ بھی تیار ہے، چند خطوط ''مخزن'' میں چھپے ہیں اور ایک بڑی تعداد ''الزبیر'' اور ''مکالمہ'' میں آنے والی ہے، جو اصحاب مشفق خواجہ سے قربت و محبت اور ''با ما آشنا بود'' کا دعویٰ رکھتے ہیں، اس محبت و تعلق کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے اپنے نام مرحوم کے خطوط، مختصر توضیحات کے ساتھ شائع کردیں اور اس کارِ خیر میں تاخیر نہ کریں، رہا ان کی تحریروں کی تدوین کا کام یا ان کے ناتمام علمی و ادبی منصوبوں کی تکمیل تو وہ سارے علمی و ادبی ادارے جن کے مشفق خواجہ رکن رکین رہے، جن کی مختلف مجلسوں اور کمیٹیوں میں شریک ہوکر اپنا قیمتی وقت دے کر، وہ انہیں مشورے دیتے اور ان کی رہبری کرتے رہے، ان پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ خواجہ صاحب کے ناتمام علمی منصوبوں کی تکمیل اور ان کی تحقیقات ادبی کی تدوین کا اہتمام کریں، یہ ان کے ذاتی منصوبے نہیں تھے، اردو زبان و ادب کے ترقیاتی اجتماعی منصوبے تھے، جنہیں بروے کار لانا اور پایۂ تکمیل تک پہنچانا، ان اداروں پر ایک طرح سے قرض ہے، ان میں انجمن ترقی اردو، مقتدرہ قومی زبان، اکادمی ادبیات اردو، مجلس ترقی ادب اور اقبال اکادمی جیسے ادارے شامل ہیں جو سب باوسائل ہیں اور بخوبی ایسا کرسکتے ہیں، ضرورت صرف احساس، نیت اور عزم کی ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ اپنی گوناگوں مصروفیات اور مشاغل کے باوجود انہوں نے ایسے پہاڑ کام کیوں کر انجام دیئے؟ میں سوچتا ہوں شاید اس لیے کہ وہ وقت کو اور زندگی کے ایک ایک لمحے کو خدا کی امانت سمجھتے تھے اور اس امانت کو انہوں نے دیانت اور احساس ذمہ داری کے ساتھ استعمال کیا، اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ ''ہر گزرا ہوا لمحہ ہی انسان کا اصل نامہ اعمال ہوتا ہے، اگر یہ لمحہ بے کار گزرا ہے تو نامہ اعمال پر ایک سیاہ نقطے کا اضافہ ہوجائے گا''۔ (مکتوب بنام محمد حمزہ فاروقی، ''مخزن'' نمبر ۱۰، ص ۳۶) جو لوگ انہیں جانتے ہیں وہ گواہی دیں گے کہ مشفق خواجہ نے اپنے قلب شفاف کو سیاہ نقطوں سے آلودہ نہیں ہونے دیا۔

وہ ایک بے مثال شخص تھے، اپنے اصول و نظریات اور آدرشوں کے ساتھ، اسلام، پاکستان، اردو اور ادب کے ساتھ ان کی وفاداری اور تعہد (Commitment) نہایت محکم، مستحکم اور استوار تھا، وہ ایک مخلص اور بے ریا انسان تھے، سچائی، راستی اور خیر کے قدردان اور علم بردار تھے، شہرت، نمود و نمایش، تصنع اور بناوٹ کو سخت ناپسند کرتے تھے اور انہیں گوارا نہ تھا کہ کوئی شخص خصوصاً ادیب، شاعر یا محقق یہ طرزِ عمل اختیار کرے۔

پاکستان ہی میں نہیں، بھارت ہی میں نہیں، پوری دنیا میں جہاں جہاں اردو زبان و ادب کا چرچا ہے:

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

کے مصداق مشفق خواجہ کا نام زندہ رہے گا اور وہ اردو ادب، اردو تحقیق و تدوین اور اردو طنز و مزاح کے ایک قابل فخر سپوت کی حیثیت سے یاد رکھے جائیں گے اور بقائے دوام کے دربار میں ان کے نام کا ڈنکا بجتا رہے گا۔

میرے عزیز دوست سجاد میر نے کیا عمدہ بات کہی ہے کہ ''ادبی تحقیق کے میدان میں بڑے نام ہیں، مگر سچ کہتا ہوں، کوئی دوسرا مشفق خواجہ نہیں ہے.....ان جیسا کوئی دوسرا نہیں ہے، اس شہر ہی میں نہیں، اس ملک میں بھی اور پورے برصغیر میں بھی بلکہ جہاں جہاں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے، وہاں وہاں تک''۔ (نوائے وقت، لاہور، ۲۴/ فروری ۲۰۰۵ء) (مئی ۲۰۰۶ء)

(۱) کذا؟ مقالہ نگار نے صاحب دیوان کا نام نہیں لکھا۔

یوسف، خواجہ محمد، جسٹس

جسٹس خواجہ محمد یوسف

سخت افسوس ہے کہ جسٹس خواجہ محمد یوسف ۹/ دسمبر ۲۰۰۶ء کو میڈی ویو نرسنگ ہوم میں وفات پاگئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

وہ کلکتہ کے بہت محبوب اور ہر دل عزیز شخص تھے، مہینوں سے موت و زیست کی کشمکش میں گرفتار تھے، چند ماہ قبل برلا ہارٹ ریسرچ سنٹر میں ان کے دل کا آپریشن ہوا تھا، اس کے بعد ہی سے کچھ نہ کچھ تکلیف رہتی تھی، انتقال سے پندرہ روز پہلے بیماری بڑھ گئی تو نرسنگ ہوم میں داخل ہوئے، ڈاکٹروں کی نگرانی میں امبولنس اور اسٹریچر پر تھوڑی دیر کے لیے ایران سوسائٹی میں تشریف لائے جہاں ۸/ دسمبر کو ان کے بڑے صاحبزادے خواجہ جاوید یوسف کی شادی ہورہی تھی اور نکاح ہوتے ہی نرسنگ ہوم واپس چلے گئے، ۹/ دسمبر کی صبح کو اچانک طبیعت زیادہ خراب ہوگئی مگر دوپہر تک سنبھل گئی تو کھانا تناول فرمایا اور سوگئے، شام کو پھر طبیعت خراب ہوئی اور ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی مالک حقیقی سے جاملے۔

میت گھر پر آئی تو تعزیت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھ گیا، دوسرے دن غسل اور کفن کے بعد دیدار کے لیے جسد خاکی گھر سے متصل اسکول کے ہال میں رکھا گیا تو خلقت ٹوٹ پڑی اور جمعہ بعد جب جنازہ ایک نمبر گوبرا قبرستان لے جانے کے لیے اٹھا تو اس کے ساتھ مسلمانوں کے تمام طبقوں کے علاوہ سکھ، عیسائی، پارسی، ہندو اور بنگالی ہر مذہب وملت کا ازدحام تھا جو زبان حال سے کہہ رہا تھا۔

چل ساتھ کہ حسرتِ دلِ محروم سے نکلے
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

خواجہ صاحب کی موت ملک وملت خصوصاً کلکتہ اور مغربی بنگال کے مسلمانوں کے لیے بڑا دردانگیز سانحہ ہے، ان کا وجود ان کے لیے رحمت ونعمت تھا، اس کے چھن جانے پر آج تک وہ سوگوار اور اشک بار ہیں، یہ ماہر قانون داں اس کا سزاوار ہے کہ اس کے غم میں نہ آنسو تھمیں اور نہ شور گریہ کم ہو، یہ دردمند، دوراندیش اور صایب الرائے مستحق ہے کہ سینہ افلاک سے بھی آہ سوزناک اٹھے اور بطن گیتی سے بھی نالہ شرربار اٹھے۔

ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں ، حسرت بھری ہے داستاں میری

آہ! قوم وملت کے نازک اور پیچیدہ مسائل کی گتھیاں سلجھانے والا نہیں رہا، وہ جاں نثار چلا گیا جو اپنی خدمات قوم کو نچھاور کررہا تھا، وہ غم گسار رخصت ہوگیا جو سب کے غم کو اپنا غم سمجھ کر سینہ سپر رہتا تھا، بنگال کا وہ مسیحا نفس باقی نہیں رہا جو اس میں روح حیات پھونک رہا تھا، وہ روشن خیال اور عالی دماغ مصلح دنیا سے اٹھ گیا جو کلکتہ کے مسلمانوں میں تعلیمی بیداری لارہا تھا اور ان کی معاشرتی، سماجی، معاشی اور ذہنی ودماغی اصلاح وتربیت کے لیے فکرمند اور سرگرم رہتا تھا، اس کے مرجانے سے قوم یتیم ہوگئی، کلکتہ اجڑ گیا اور مغربی بنگال میں سناٹا چھا گیا۔

گلشن میں کہیں بوئے دم ساز نہیں آتی
اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

خواجہ صاحب ستمبر ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے، ۱۹۵۷ء میں قانون کے پیشہ سے وابستہ ہوئے، پہلے کلکتہ ہائی کورٹ میں وکالت شروع کی، حکومت مغربی بنگال نے ان کی قانونی مہارت اور اعلا ذہنی ودماغی قابلیت دیکھ کر انہیں جلد ہی گورنمنٹ ایڈوکیٹ بنادیا اور ۱۹۸۷ء میں کلکتہ ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا، ۱۹۹۲ء میں سبک دوش ہونے پر بھی انہیں چھٹی نہیں ملی، وکیل اور جج کی حیثیت سے انہوں نے جو غیرمعمولی کارنامے انجام دیے ان کی بنا پر ریٹائرڈ ہوتے ہی حکومت نے ۱۹۹۲ء میں ان کو یوسف کمیشن آف انکوائری کا چیرمین نامزد کیا، اس کی رپورٹ مکمل کرچکے تو تری پورہ گورنمنٹ نے انہیں دو کمیشنوں کا سربراہ مقرر کردیا، اسی درمیان حکومت مغربی بنگال نے ۱۹۹۹ء میں وہاں کے اقلیتی کمیشن کا چیرمین بھی بنادیا۔

خواجہ محمد یوسف غیرمعمولی دل ودماغ کے آدمی تھے اور ان میں بڑی قوت عمل تھی، وہ کلکتہ اور بنگال ہی نہیں ملک کے بھی متعدد سرکاری وغیرسرکاری، قومی، ملی، اصلاحی، فلاحی اور علمی وتعلیمی اداروں سے منسلک رہے، ویسٹ بنگال فیڈریشن آف یونائیٹڈ ایسوسی ایشن اور اے۔آر قدوائی مدرسہ ایجوکیشن کمیٹی کے نائب صدر، ہند عرب سوسائٹی، ایران سوسائٹی، انجمن مفید الاسلام اور ہمایوں کبیر انسٹی ٹیوٹ کے صدر، گھلو انسٹی ٹیوٹ اور غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے ٹرسٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور بردوان یونیورسٹی کورٹ اور جامعہ ہمدرد کے ممبر، انڈین میوزیم کولکاتا، مولانا ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ آف ایشین اسٹڈیز کے بورڈ آف ٹرسٹی کے مرکزی حکومت کے نامزد کردہ رکن،

مغربی بنگال اردو اکیڈمی اور مولانا آزاد انسٹی ٹیوٹ کے تاسیسی رکن تھے۔

خواجہ صاحب کا سب سے زیادہ گہرا تعلق ایران سوسائٹی سے تھا، اسے وہ بہت عزیز رکھتے تھے، اس بین الاقوامی ادارے کے اصل بانی ڈاکٹر محمد اسحاق تھے جو ایک شہرہ آفاق شخص تھے، خواجہ صاحب نے اس کا پرچم سرنگوں نہیں ہونے دیا، اس کا اعلا معیار اور اس کی بین الاقوامی ساکھ قائم رکھنے کے جان کی بازی لگا دی اور نئے حالات کے لحاظ سے اسے بڑی ترقی دی، اپنے رفیق کار اور سوسائٹی کے جنرل سکریٹری جناب ایم۔اے مجید صاحب کے اشتراک سے اس میں چار چاند لگا دیا اور اسے ایک خود کفیل ادارہ بنا دیا، اس کے آرگن ''انڈوایرانیکا'' کی ادارت وہ بڑی خوبی اور سلیقے سے انجام دیتے تھے، اس کے اداریے نہایت محنت و جاں فشانی سے لکھتے تھے، ان کی سربراہی میں ایران سوسائٹی نے فارسی زبان و ادب کو فروغ دینے کے ساتھ ہی قومی یک جہتی اور سیکولر رجحانات کی اشاعت بھی کی اور ملک کی گنگا جمنی تہذیب اور بنگالی کلچر کے تحفظ کا سامان بھی کیا، ان کو فارسی زبان سے عشق تھا، سوسائٹی کے وسیلے سے انہوں نے اس زبان کی لازوال خدمت کی، یہاں اکثر سمینار کراتے، ان میں اور دوسری تقریبات میں ملک و بیرون ملک اور خصوصاً ایران کے فضلا اور دانش وروں اور وہاں کے وزرا اور سفرا کو مدعو کرتے، خواجہ صاحب نے اپنے خلوص و محنت سے سوسائٹی کو اتنا کارگزار اور متحرک اور ایسا باوقار ادارہ بنا دیا تھا کہ ہر شخص یہاں آنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔

خواجہ صاحب ایک اعلا درجے کے قانون داں تھے، مسلم پرسنل لا میں اختصاص رکھتے تھے، قانون کے میدان میں ان کا جوہر خوب چمکا، وکیل کی حیثیت سے بھی کامیاب اور نیک نام تھے اور جج کی حیثیت سے بے لاگ فیصلے کرتے تھے، اس پیشے میں ہمیشہ دیانت داری اور ایمان داری کو اپنا شیوہ بنایا، جب ایک خبیث اور بدباطن شخص چاند مل چوپڑا نے ہائی کورٹ میں قرآن مجید پر پابندی عاید کرنے کا مقدمہ دایر کیا تو بایاں محاذ کی حکومت نے ان کی اور جنرل سوہانشو اچاریہ کی مدد سے اس کو کامیابی کے ساتھ لڑکر خارج کرا دیا، یہ مقدمہ بڑی اہمیت کا حامل اور پوری دنیا کا مرکز توجہ ہو گیا تھا، اس کی وجہ سے خواجہ صاحب کی شہرت اسلامی دنیا تک جا پہنچی تھی، چشم دید لوگوں کا بیان ہے کہ ان دنوں ان پر جذب کی کیفیت طاری تھی، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے بس قرآن ہی کا ذکر کرتے ع ہر روز یہی چرچے ہر رات یہی باتیں۔ لگتا تھا کہ باریک قانونی نکات ان پر غیب سے القا ہو رہے ہیں، اس کے بعد ہائی کورٹ کے جج ہوئے تو عدل و انصاف کا ترازو ہمیشہ بلند رکھا اور معرکہ آرا فیصلے کرکے دھوم مچادی۔

وہ دو ٹرم اقلیتی کمیشن کے چیرمین رہے، اس حیثیت سے بھی ان کی خدمات گوناگوں اور اہم ہیں، انہوں نے اقلیتوں بالخصوص مسلم اقلیت کے لیے حق و انصاف حاصل کرنے پر پوری توجہ دی اور ان کے ساتھ ظلم و زیادتی کا تدارک کیا اور بہت سے الجھے مسئلے سلجھا دیے، انہیں حل کرنے کے لیے مفید اور مناسب سفارشات پیش کیں، قبرستان، اذان اور وقف بورڈ کے بارے میں ان کے سنجیدہ خیالات اور مخلصانہ رائے کا وزن حکومت اور خود مسلم حلقوں نے بھی تسلیم کیا، ان کی ایمان داری اور غیر جانب داری کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، اقلیتی کمیشن کے چیرمین کی حیثیت سے ان کا دور بڑا شان دار اور یادگار رہا، انہوں نے یوسف کمیشن تری پورہ کے دو انکوایری کمیشنوں کے سربراہ کی حیثیت سے بھی اپنا فرض نہایت ذمہ داری اور ایمان داری سے انجام دے کر اچھا اثر قائم کیا۔

خواجہ صاحب کو مسلمانوں کی سماجی اصلاح اور ان کی دینی و تہذیبی اور ملی شناخت کے بقا و تحفظ کا ہمیشہ خیال رہا، وہ ان کا وزن اور وقار بڑھانے اور ان میں تعلیمی بیداری لانے کے لیے بہت سرگرم رہتے، انگریزی میں برابر اردو میں کبھی کبھی اس کے لیے مضامین لکھتے، انگریزی پر ان کو بڑی دست رس اور مکمل عبور تھا، اردو بھی اچھی اور شگفتہ لکھتے تھے، جن تعلیمی اداروں سے ان کا تعلق تھا ان کا معیار تعلیم بلند کرنے کے لیے برابر جدوجہد کرتے تھے اور ان کے کارکنوں کے اختلافات کو دور کرانے کی سعی بھی فرماتے تھے، جن یونیورسٹیوں کے کورٹ کے ممبر تھے ان کے طلبہ کو سہولتیں بہم پہنچانے اور اساتذہ و ملازمین کی پریشانیاں دور کرنے کی طرف ذمہ داروں کی توجہ مبذول کراتے، اکثر یونیورسٹیوں کے سربراہوں اور علمی و تعلیمی اشخاص سے ان کے تعلقات تھے، یہ لوگ جب کلکتہ آتے تو خواجہ صاحب ان سے ملاقات کرتے اور انہیں ایران سوسائٹی میں مدعو کرتے، ان کے اعزاز میں جلسے کرتے، تعلیمی امور سے متعلق گفتگو اور تقریر کے ضمن میں یونیورسٹی کے مسائل اور بالخصوص مشرقی شعبوں کی خراب حالت کو درست کرنے کی ترغیب دلاتے، مدرسہ تعلیم پر قدوائی کمیٹی کے وایس چیرمین کی حیثیت سے خواجہ صاحب نے رپورٹ اور سفارشات تیار کرنے میں بڑی محنت و جاں فشانی سے کام لیا۔

خواجہ صاحب کو دارالمصنفین سے بھی محبت تھی، اس کے ناظم جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم سے ان کے بہت اچھے تعلقات تھے، وہ انہیں ''پیارے پیارے خواجہ صاحب'' کہا کرتے تھے، ان کی کشش سے عرصہ ہوا وہ ایک بار دارالمصنفین تشریف لائے تو مجھے بھی نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا، صباح الدین صاحب ایران سوسائٹی کے سمیناروں میں برابر تشریف لے جاتے تھے، اگر کسی اور پروگرام سے بھی جانا ہوتا تو خواجہ صاحب انہیں ایران سوسائٹی میں ضرور مدعو کرتے، دو ایک بار مجھے بھی ان کے ہم راہ ایران سوسائٹی کے جلسے میں جانے کا اتفاق ہوا، ان کے انتقال کے بعد میں ایک بار مسلم پروگریسیو سوسائٹی کی دعوت پر کلکتہ گیا اور گریٹ ایسٹرن ہوٹل میں قیام کیا تو سوسائٹی کے اعزازی سکریٹری جناب زین العابدین سے کہا کہ جناب احمد سعید ملیح آبادی اڈیٹر آزاد ہند کو میرے آنے کی اطلاع کردیں، اگر وہ اپنے گھر بلائیں تو مجھے

ان سے ملادیجیے ملیح آبادی صاحب نے خواجہ صاحب اور مغربی بنگال حکومت کے وزیر جناب کلیم الدین شمس صاحب کو بھی میری آمد کی خبر کردی چنانچہ سب سے پہلے خواجہ صاحب تشریف لائے اور مختلف مسائل پر بڑی دلچسپ گفتگو فرماتے رہے، تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ یہ کہتے کہ ابھی تک احمد سعید صاحب کا ورودِ مسعود نہیں ہوا، یکا یک گھڑی پر ان کی نظر پڑی تو کہنے لگے اب میں چلتا ہوں، مجھے کورٹ جانا ہے، آپ ایران سوسائٹی کب آرہے ہیں، میں نے عرض کیا کہ میرے پاس کوئی وقت نہیں بچا، انہیں بڑا افسوس ہوا اور افسوس کرتے ہوئے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ملیح آبادی صاحب اور شمس صاحب نے کرم فرمایا اور دونوں کو بڑا ملال ہوا کہ ہم لوگ خواجہ صاحب کی موجودگی میں نہیں آسکے۔

دوسری دفعہ مرحوم ڈاکٹر مقبول احمد صاحب کے یہاں اپنے علاج کے لیے گیا تو انہوں نے مجھ سے ملانے کے لیے احمد سعید صاحب کو ایک وقت کھانے پر بلایا، احمد سعید صاحب نے خواجہ صاحب کو اطلاع کردی، خواجہ صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو فون کیا کہ میں تین بجے تیار رہوں، وہ کسی کو بھیج کر مجھے ایران سوسائٹی لے جائیں گے، چنانچہ اردو کے مشہور شاعر اور اہل قلم الحاج علقمہ صاحب کو مجھے لینے کے لیے بھیجا، وہاں پہنچا تو ایک جلسہ اور پرتکلف عصرانے کا اہتمام تھا، یہ علقمہ شبلی صاحب وہی ہیں جن کو خواجہ صاحب نے اپنے جنازے کی نماز پڑھانے کی وصیت کی تھی۔

صباح الدین صاحب کے انتقال کے بعد ان سے گہرے تعلق اور علمی اداروں سے خواجہ صاحب کے شغف کو دیکھ کر میں نے ان کا نام دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کی رکنیت کے لیے پیش کیا جسے مجلس نے منظور کرلیا اور خواجہ صاحب کی منظوری بھی آگئی، مگر یہ وہی زمانہ تھا جب وہ یوسف انکوائری اور تری پورہ انکوائری کمیشنوں میں بہت مشغول رہتے تھے، چنانچہ جس زمانے میں یہاں جلسے کی تاریخیں مقرر کی جاتی تھیں اسی زمانے میں ان کے کمیشنوں کی تاریخیں بھی ہوتی تھیں اس لیے وہ خطوط لکھ کر نہ آنے کی معذرت کردیتے اور آخر میں بہت افسوس کے ساتھ استعفاء دے دیا۔

خواجہ صاحب دین دار اور صوفی منش شخص تھے، بزرگانِ دین سے ان کو بڑی عقیدت تھی، صوم وصلاۃ کے پابند اور متبع سنت تھے، سنت کی پیروی کی وجہ سے کسی مسلمان کی دعوت مسترد نہ کرتے، عبادت سمجھ کر اپنے فرائض اور ذمہ داریاں بڑی ایمان داری سے انجام دیتے، ان میں بڑی دینی و ایمانی حمیت بھی تھی، اسی بنا پر قرآن مجید کا مقدمہ بڑی دلچسپی سے لڑا، اس کے باوجود وہ روشن خیال اور سیکولر ذہن رکھتے تھے، دوسرے مذاہب کا بڑا احترام کرتے تھے، مسلم مسائل میں ان کا رویہ حقیقت پسندانہ ہوتا تھا، وہ کہتے تھے ہمارے نوجوان اپنے اندر صلاحیت پیدا کریں تو ملازمت اور عہدہ چل کر ان کے پاس آئے گا۔

خواجہ صاحب کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا اور ان میں ہر مذہب و مشرب کے لوگ شامل تھے، وہ صرف مسلمانوں کی تقریبات ہی میں شریک نہیں ہوتے بلکہ ہندو، سکھ، پارسی اور عیسائی ہر ایک کے یہاں کی تقریب کی رونق بڑھاتے تھے، علمی دینی، ادبی اور قومی جلسوں کی طرح دکانوں کے افتتاح اور پوجا پنڈال میں بھی پہنچ جاتے اور اپنے کو ہر مجلس میں فٹ کرلیتے، جلسہ کسی طرح کا ہو، ہر ایک میں اپنی خطابت کا جادو جگاتے، مقرر بہت اچھے تھے، جب تقریر شروع کرتے تو مجمع پرسکون ہوجاتا اور لوگ محویت و استغراق سے ان کی باتیں سنتے تھے۔

وہ بڑے مرنجاں مرنج شخص تھے، اس لیے ہر طبقے اور ہر فرقہ و مذہب کے لوگوں میں مقبول و محبوب تھے، ان کی پوری زندگی خدمت خلق میں بسر ہوئی، اس معاملے میں مذہب و ملت کی تفریق نہ کرتے، ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے، ان کا تعلق کسی سیاسی و مذہبی جماعت سے نہیں تھا مگر ہر جماعت ان پر اعتماد کرتی اور ان کا احترام کرتی، حکام رس تھے اور حکومت میں بڑا اثر و رسوخ رکھتے تھے، مغربی بنگال کے وزرا اور وہاں کے اکثر گورنروں سے ان کے اچھے مراسم تھے اور اس طرح بھی وہ اپنی قوم اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کے کام آتے، انسان دوستی، حسنِ خلق، فیض رسانی، اخوت، محبت، مروت اور ملن ساری ان کی سرشت میں داخل تھی۔

اللہ تعالیٰ عالم آخرت میں بھی ان کے درجات بلند کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ ("ض"، مارچ ۲۰۰۵ء)

فاروقی، نثار احمد، پروفیسر

پروفیسر نثار احمد فاروقی

دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی میں ۲۹/نومبر ۲۰۰۴ء کو علامہ شبلی سیمینار کا چوتھا اجلاس ہورہا تھا کہ یہ افسوس ناک خبر ملی کہ جید عالم اور اردو کے محقق، نقاد اور ادیب جناب نثار احمد فاروقی ۲۷ و ۲۸ نومبر کی درمیانی شب میں انتقال کرگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، ان کی لاش دہلی سے امروہہ لائی گئی اور ۲۸/نومبر کو اپنے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کردیے گئے۔

وہ بڑے صحت مند تھے مگر پچھلے کئی برس سے طبیعت خراب رہنے لگی تھی، گزشتہ سال جنوری کے آخر میں ان کے گھر ملاقات کے لیے گیا تو مجھے بہت مضمحل معلوم ہوئے، دریافت کرنے پر بتایا کہ رات ہی بمبئی سے آیا ہوں، وسط مارچ میں رام پور رضا لائبریری کے سیمینار میں ملے تب بھی کچھ سست اور بجھے بجھے دکھائی دیے تاہم ان کی تقریر اب بھی کانوں میں گونج رہی ہے، دلی سے ان کا جاننے والا کوئی آتا تو وہ بھی ان کی علالت کا ذکر کرتا، دارالمصنفین کے سیمینار میں اسی لئے شروع میں ان کو زحمت دینے میں تامل ہورہا تھا مگر ان کو مجھ سے اور دارالمصنفین سے جو لگاؤ تھا، اس کی وجہ سے

طبیعت نہ مانی اور دعوت نامہ بھیج دیا، اسی دوران اخباروں میں پڑھا کہ وہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کے ہم راہ دوحہ (قطر) ایوارڈ لینے گئے ہیں، اس لیے ایک عزیز کو دستی خط دے کر اصرار کیا کہ آپ تشریف لاکر مفتخر فرمائیں، خطوط کا جواب وہ فوراً دیتے تھے مگر اس دفعہ کسی خط کا جواب نہیں آیا، جب سمینار میں دہلی اور دوسری جگہوں سے لوگ آنے لگے تو جناب شعیب اعظمی نے جو بٹلہ ہاؤس میں ان کے قریب ہی میں رہتے ہیں بتایا کہ وہ سخت بیمار ہیں، آنے کے لائق نہیں ہیں، آخر یہ جاں گسل اطلاع آہی گئی، اسی وقت دعائے مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھ گئے بعض لوگوں نے تاثراتی تقریریں کیں اور تعزیتی قرارداد منظور کی گئی۔

زندگی انسان کی ہے مانند مرغ خوش نوا
شاخ پر بیٹھا، کوئی دم چہچہایا، اڑ گیا

نثار احمد فاروقی ۲۹؍ جون ۱۹۳۴ء کو امروہہ کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے تھے، ان کا سلسلہ نسب بابا فرید گنج شکرؒ سے ہوتا ہوا امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ تک جا پہنچتا ہے، یہ خاندان پہلے پنجاب میں آباد ہوا، فیروز شاہ تغلق نے مراد آباد کا یہ وسیع علاقہ بابا صاحب کی اولاد کو بہ طور معافی دیا تھا، دنیاوی وجاہت کے ساتھ یہ خاندان صوفی مشرب اور طریقت میں ممتاز تھا، مولانا نسیم احمد فریدی نثار صاحب کے حقیقی چچا اور پروفیسر خلیق احمد نظامی کے پھوپھی زاد بھائی تھے مگر نثار صاحب کو شروع میں مشکل اور صبر آزما دور سے گزرنا پڑا، کم عمری میں والد کے فاتر العقل ہونے کی وجہ سے ان کی اور ان کے دوسرے بھائی بہنوں کی پرورش ان کے نانا شاہ سلیمان احمد چشتی نے کی، ان ہی سے فارسی اور عربی شروع کی، پھر حیدرآباد اور امروہہ کے مدارس میں زیر تعلیم رہے، گردش روزگار نے دہلی پہنچا دیا، پہلے صحافت کے پیشے سے وابستہ ہوئے پھر دہلی یونیورسٹی کی لائبریری میں ملازمت ملی، کچھ آسودگی نصیب ہوئی تو حصول علم کا داعیہ موجزن ہوگیا، پہلے ہائی اسکول اور انٹر کے امتحانات پاس کیے، پھر اور مشرقی و مغربی امتحانات دے کر یونیورسٹی کے شعبہ عربی میں تدریسی خدمت پر مامور ہوئے اور پروفیسر اور کئی بار صدر شعبہ ہوکر وظیفہ یاب ہوئے۔

ذہانت کے ساتھ وہ بڑے محنتی تھے اس لیے راہیں خود بہ خود کھلتی گئیں، مطالعہ کا شوق تو تھا ہی، دلی یونیورسٹی کی لائبریری کے اردو سیکشن کے انچارج ہوئے تو سیکڑوں کتابیں پڑھ ڈالیں اور ہزاروں کے نام سے واقف ہوگئے، اس کی وجہ سے ان کی علمی استعداد اپنے ہم سروں سے بہت بڑھی ہوئی تھی، ان کے استحضار، کثرت علم و مطالعہ اور وسیع معلومات کی بنا پر طالب علمی ہی کے زمانے سے ان کے دوست احباب انہیں ''علامہ'' کہنے لگے تھے، رسمی تعلیم منقطع ہونے کے بعد بھی وہ برابر پڑھتے لکھتے اور علم کے شیدائی بنے رہے اور زندگی کے کسی موڑ پر بھی ان کی کدوکاوش، تلاش و جستجو اور تحقیق وتدقیق کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔

علم کی دیوانگی نے ان کو آرام و راحت سے بے نیاز کردیا تھا اور پڑھنا لکھنا ہی ان کا اوڑھنا بچھونا ہوگیا تھا، ان کا قلم برابر رواں دواں رہتا اور کبھی رکنے کا نام نہ لیتا، ان کی مضمون نگاری کی ابتدا بچپن ہی میں ہوگئی تھی اور انہوں نے ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا جن کی وجہ سے وہ جلد ہی اہل علم کا مرکز توجہ بن گئے، وہ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی پر اچھی دست رس رکھتے تھے اور ہندی سے بھی واقف تھے، طبع زاد تصانیف کے علاوہ کئی کتابوں کے ترجمے بھی کیے ادب، تحقیق، تنقید، تاریخ، سیر، تذکرہ، مذہبی علوم اور تصوف میں زندگی بھر ان کا قلم گل کاریاں کرتا رہا، ان کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کے مختلف ادبی دھاروں سے الگ رہ کر اپنی دنیا آپ پیدا کرتے رہے۔

اصلاً ان کا کام اردو میں ہے اور اس میں ادب وتصوف اور تاریخ وسیر سے ان کا خاص لگاؤ تھا، ان کی تصنیفات سے ان کے بلند ادبی ذوق اور تحقیقی وتنقیدی ژرف نگاہی کا اندازہ ہوتا ہے، اردو شاعری کے اساطین میرؔ، غالبؔ اور مصحفیؔ پر ان کا کام بڑی اہمیت کا حامل ہے، سب سے پہلے انہوں نے ذکر میرؔ کا اردو ترجمہ کیا جو ۱۹۵۷ء میں میرؔ کی آپ بیتی کے نام سے شایع ہوا، اس میں یہ انکشاف کیا ہے کہ ذکر میر سراج الدین علی خاں آرزوؔ کی ''چراغ ہدایت'' کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے اور میر کے عہد کی ایک بیاض سے ثابت کیا ہے کہ ع ''کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو'' میرؔ ہی کے اشعار ہیں، ۱۹۶۳ء میں جب وہ ایم۔اے کررہے تھے تو دلی کالج کا ضخیم میرؔ نمبر ان کی ادارت میں نکلا اور بعد میں اپنے مضامین کا مجموعہ ''تلاش میرؔ'' کے نام سے شایع کیا۔

غالبیات ان کی تحقیق و کاوش کا خاص محور تھا ''تلاش غالب'' ان کی مشہور کتاب ہے، اس میں غالب کے خطوط اور تحریروں سے ان کی سوانح عمری مرتب کی ہے اور غالب کے بعض غیر مطبوعہ خطوط بھی شامل کیے ہیں، ایک خط سرسید مرحوم کے نام بھی ہے، غالب سے متعلق لکھے گئے مضامین کا اشاریہ ''غالب نما'' کے نام سے مرتب کیا، دیوان غالب نسخہ امروہہ کی تدوین بیاض غالب کے نام سے کی، اسے دیوان غالب کی اولین روایت کہا جاتا ہے جسے توفیق احمد امروہوی نے بھوپال سے دریافت کیا تھا، نثار صاحب نے مالک رام صاحب کی ذکر غالب کا ہندی ترجمہ بھی کیا تھا۔

اردو کے مشہور زود گو اور قادر الکلام شاعر میر غلام ہمدانی مصحفی کی کلیات دیوان اول، ودوم شایع کرکے ان سے ہم وطنی کا حق ادا کیا، اس میں متن کی صحت کا بڑا خیال رکھا ہے اور مشکل الفاظ کے معانی بھی لکھے ہیں، مقدمہ میں ان کے سوانح، شاعرانہ کمالات اور تلامذہ کے حالات دیے ہیں، شعرائے اردو کے تذکروں پر بھی ان کا کام اہمیت رکھتا ہے، ان کا مرتب کردہ تذکرہ قدرت اللہ شوق مجلس ترقی ادب لاہور نے ۱۹۶۶ء میں شایع کیا، ۱۹۶۸ء میں اس کی اور گل رعنا اور مجمع الانتخاب کی تلخیص تین

تذکرے کے نام سے دہلی سے شایع کیا، اپنے مضامین میں ایک درجن سے زیادہ تذکروں کا تعارف کرایا۔

تصوف تو ان کے گھر کی چیز تھی، ان کے نانا ایک بزرگ صوفی اور سجادہ نشین تھے، ان کی پاکیزہ زندگی دیکھ کر انہیں تصوف سے بڑی رغبت ہوگئی تھی اور اس کی مخالفت میں ایک لفظ سننا پسند نہیں کرتے تھے، اس کا مطالعہ بڑی دقت نظر سے کیا تھا، ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے تصوف کو جدید انداز میں پیش کر کے اس کی قدر و قیمت اور معنویت دکھائی ہے، ''نقد ملفوظات'' اور ''چشتی تعلیمات اور عصر حاضر میں ان کی معنویت'' اور ''تذکرہ خواجہ معین الدین چشتی'' اسی نوعیت کی کتابیں ہیں، انہوں نے تصوف کی قدیم کتابوں کو عصری رنگ اور اسلوب میں پیش کیا ہے، اس سلسلے میں فارسی متون کی تدوین اور ایڈیٹنگ کی اور ان پر محققانہ مقدمے لکھے جیسے مولانا تھانوی کی امداد المشتاق اور مرقومات امدادیہ، تذکرہ روضۃ الاولیا (غلام علی آزاد) قوام العقاید (خواجہ نظام الدین اولیا کے حالات) مقاصد العارفین (عضدالدین جعفری چشتی) تذکرہ مقالات الشعرا (قیام الدین حیرت اکبرآبادی) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

خواجہ نظام الدین اولیا اور ان کے سلسلے سے ان کو بڑا شغف تھا، ان کے اور دوسرے صوفیہ کی سیرت وسوانح اور تعلیمات پر انہوں نے بہت کچھ لکھا ہے، ''منادی'' کا کوئی شمارہ ان کے مضامین سے خالی نہیں ہوتا تھا، صوفیہ کے پیغام کو عام کرنے کے لیے ان کے عرس میں سمینار کرانے کی روایت قائم کی۔

فارسی کی کئی کتابوں کو اردو کا جامہ پہنایا جیسے شاہ عبدالہادی کے مجموعہ ملفوظات ''مفتاح الخزائن'' (سید نثار علی بریلوی) میاں نور محمد چشتی کا مجموعہ ملفوظات ''خلاصۃ الفوائد'' ملفوظات خواجہ زین الدین شیرازی ''ہدایت القلوب'' مرزا مظہر جان جاناں کے خلیفہ شاہ غلام علی نقشبندی کے ملفوظات ''درالمعارف'' ورسالہ وحدت الوجود ''یقظۃ النائمین'' (شاہ حامد ہرگامی) اور تاج الدین محمود کے فارسی رسالہ **غایۃ الامکان فی درایۃ المکان** کا انگریزی ترجمہ کیا۔

عربی زبان میں ان کی خدمات بھی قابل قدر ہیں، دلی یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے مدتوں سربراہ رہے اور انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کے عربی رسالہ ثقافۃ الہند کے برسوں اڈیٹر رہے، آزاد بلگرامی کی عربی کتاب ''شفاء العلیل'' کا متن ایڈٹ کر کے شایع کیا، ڈاکٹر جواد علی کی کتاب کا اردو ترجمہ تاریخ طبری کے مآخذ کا تحقیقی وتنقیدی مطالعہ کے نام سے کیا، ایک مختصر رسالہ ''اهمية السيرة الطيبه للعالم البشرى'' کے نام سے لکھا جس کا اردو ترجمہ ''عالم بشریت کے لیے سیرت طیبہ کی اہمیت'' کے نام سے کیا، آنحضرتؐ کے منتخب مکتوبات کا اردو ترجمہ کیا۔

ان کے علمی وتحقیقی بعض مجموعہ مقالات کا ذکر پہلے آچکا ہے ''دید و دریافت'' اور ''دراسات'' کے نام سے بھی مجموعے چھپے، ہندی میں ذکر غالب کے علاوہ مولوی عبدالحق کی چند ہم عصر کا ترجمہ کیا۔

ان کی گوناگوں علمی خدمات کا بڑا اعتراف کیا گیا، ان کی کتابوں پر مختلف اداروں اور اردو اکیڈمیوں نے ایوارڈ دیے، دہلی اردو اکیڈمی نے ان کی، مجموعی ادبی خدمات پر ایوارڈ دیا، عربی زبان کی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۸۵ء میں انہیں صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا اور سب سے آخر میں گوپی چند نارنگ نے بزم ادب دوحہ (قطر) کا ایوارڈ دلایا، مختلف یونیورسٹیوں کے اکزامنر اور ان کی ڈین فیکلٹیوں اور متعدد اداروں اور کمیٹیوں کے ممبر رہے۔

نثار صاحب نے اپنے بارے میں خود لکھا ہے کہ وہ عہدوں کے حصول کے لیے کبھی سرگرداں نہیں رہے، خوددار تھے، خود بینی اور خود نمائی، خوشامد، تملق، سخن سازی، ریشہ دوانی اور مطلب برآری کے لیے داؤں پیچ کے فن سے ناآشنا تھے، لگی لپٹی بات نہیں کرتے، صاف گوئی سے کام لیتے تاہم مغلوب الغضب اور تنک مزاج تھے، بہت جلد برہم ہوجاتے تھے، اسی لیے اپنے دوستوں سے اکثر ان کی ان بن ہوجاتی تھی، کہا جاتا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں اپنے قصبے اور دلی میں مسلمان گھرانوں کی جو حالت دیکھی تھی، اس کی تلخی ان کے رگ و ریشے میں سرایت کرگئی تھی، اس کی وجہ سے مزاج میں حدت آگئی تھی، گو بہ ظاہر کھور معلوم ہوتے تھے مگر اندر سے نرم تھے۔

انہیں دوسروں کا کام کر کے اور لوگوں کی مدد کر کے خوشی ہوتی تھی اور جب کسی کو پریشانی میں دیکھ کر اس کی مدد کرنے میں بے بس رہتے تو انہیں بڑی جھنجھلاہٹ ہوتی، ان کے دریائے علم کا بہاؤ کبھی رکتا نہیں تھا اور سب کے لیے ان کا فیض عام رہتا تھا، طالب علموں کی رہنمائی کرنے میں کبھی بخل سے کام نہ لیتے، تھیسس لکھنے میں ان کی پوری معاونت کرتے، مذہب و مسلک کے معاملے میں زیادہ متشدد نہ تھے، ہر مسلک و مشرب کے لوگوں سے ان کے تعلقات تھے، صوفیہ سے ان کو زیادہ عقیدت وشیفتگی تھی، اپنے تجربے کی بنا پر کہتے تھے کہ ''انسان دوستی، دردمندی، حسن اخلاق، بے طمعی، پاکیزگی فکر اور اطمینان قلب صرف ایک سچے درویش کے پاس ہوتا ہے، باقی لوگ اس سے محروم ہیں، اس لیے خوار ہوتے ہیں''، نثار صاحب کا عقیدہ مسلک اور عمل جو بھی رہا ہو، عام ادیبوں کی طرح وہ اپنے مذہب وملت سے کبھی بے زار اور برگشتہ نہیں رہے، اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت کاملہ سے نوازے، آمین۔ (''ض''، مارچ ۲۰۰۵ء)

<u>صدیقی، عتیق احمد، پروفیسر</u>

آہ! پروفیسر عتیق احمد صدیقی

۱۷ردسمبر کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سابق صدر پروفیسر عتیق احمد

صدیقی نے داعی اجل کو لبیک کہا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم کا وطن دیوبند تھا، ان کی تعلیم دوسرے اداروں میں ہوئی تھی لیکن علی گڑھ تحریک اور سرسید احمد خاں مرحوم کے عاشق تھے، ان دونوں کی کشش انہیں علی گڑھ کھینچ لائی اور یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں درس و تدریس کی خدمت پر مامور ہوئے اور ترقی کر کے پروفیسر، صدر شعبہ اردو اور آرٹس فیکلٹی کے ڈین ہوئے، وہ سرسید ہال کے پرووسٹ بھی رہے، سرسید اکیڈمی کے اڈیٹر کی حیثیت سے ان پر بعض سمینار کرائے، ایک سمینار میں مجھے بھی شرکت کا موقع بخشا، جامعہ اردو کے نایب شیخ الجامعہ ہوکر اسے بڑا فیض پہنچایا۔

عتیق صاحب نے سودا کے قصاید پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی، ان کی مرتب کردہ اور ترجمہ کی ہوئی کتابوں کے نام یہ ہیں:

انتخاب مضامین سرسید، بازیافت، مراسلات سرسید، انتخاب الٰہی بخش معروف، انتخاب مضامین زمین دار، اشاریہ تنقید، مولانا سید سلیمان ندوی (سمینار میں پڑھے گئے مضامین کا مجموعہ)، اسلام اور امن عالم، اسلام اکیسویں صدی میں، آخری دونوں کتابیں ترجمہ ہیں۔

قدرت نے مرحوم کو دردمند دل اور دینی مزاج عطا کیا تھا، نماز جماعت سے ادا کرتے، دہلی مسجد کے امام بھی تھے، قوم کی فلاح و بہبود اور مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح اور تعلیمی ترقی کے بڑے آرزومند تھے، ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد علم و تعلیم کے فروغ اور اصلاح معاشرت کے لیے اپنی زندگی وقف کردی تھی، رابطہ کمیٹی یو۔پی کے اہم عہدیداروں میں تھے، اس کے معاشرتی اور تعلیمی کارواں کے ساتھ ملک کے اکثر علاقوں کا دورہ کیا، ایک بار یہ کاروان جناب سید حامد کی قیادت میں اور دوسری بار ان کی قیادت میں اعظم گڑھ آیا تو انہوں نے دارالمصنفین میں قیام کیا، اس وقت ان کے نیک احساسات و خیالات، حسن خلق و عمل، اصول پسندی، فرض شناسی، مرتب اور صاف ستھری زندگی کا پورا اندازہ ہوا۔

عتیق صاحب بڑے وجیہ، سلیقہ مند، جامہ زیب اور کشیدہ قامت تھے، تقریر موثر اور ٹودی پوائنٹ کرتے جس میں فضول باتیں اور سخن سازی نہ ہوتی، طبعاً نہایت شریف، خلیق اور بھلے آدمی تھے، مجھے دو ایک بار ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تو بڑے لطف و شفقت سے پیش آئے۔

جمعہ کے دن مغرب کی نماز کے لیے وضو کررہے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلاوا آگیا، یہ ان کی مغفوریت و مقبولیت کی دلیل ہے، ان کی وفات سے قوم اپنے ایک مخلص اور بے لوث خادم سے محروم ہوگئی، اللہ تعالیٰ انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ (''ض''، مارچ ۲۰۰۵ء)

جذبی، معین احسن

جناب معین احسن جذبی

۱۳/فروری ۲۰۰۵ء کو اردو کے معمر ادیب اور مشہور ترقی پسند شاعر جناب معین احسن جذبی نے داعی اجل کو لبیک کہا، وہ اعظم گڑھ کے مشہور صنعتی قصبہ مبارک پور کے مضافات میں ۲۱/اگست ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے اور علی گڑھ میں جابسے، یہاں ۱۹۴۱ء میں آئے، ۱۹۴۵ء میں مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں لکچرر ہوئے، اس سے قبل ''آج کل'' کی ادارت سے بھی منسلک رہے، ۱۹۷۴ء میں ریڈر کے منصب سے ریٹائر ہوئے۔

جذبی صاحب نے نظم و نثر میں کئی کتابیں یادگار چھوڑیں، ''حالی کا سیاسی شعور'' کے نام سے ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا جو اردو کی اہم تنقیدی و تحقیقی کتاب ہے، آخر میں اپنے خودنوشت حالات لکھ رہے تھے مگر یہ کتاب نامکمل رہی، ان کے تین شعری مجموعے بھی شایع ہوئے، فروزاں، سخن مختصر اور گدازشب۔

مرحوم کا شمار صف اول کے ترقی پسند شعرا میں ہوتا ہے، وہ مخدوم، سردار جعفری اور مجاز کے ہم عصر تھے، ترقی پسند تحریک سے ان کا تعلق برابر رہا مگر ان کی شاعری اس کی عام بے اعتدالیوں سے محفوظ اور اپنی بعض الگ خصوصیات رکھتی تھی، وہ اپنی شاعری کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے اس میں برابر حک و اصلاح کرتے اور نقد و احتساب کی نظر ڈالتے رہتے تھے اور جب خود پوری طرح مطمئن ہوجاتے تب ہی کسی کو شعر سناتے یا منظر عام پر لاتے۔

جذبی صاحب نے ۹۳ برس کی طویل عمر پائی، مدتوں درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ رہنے کی وجہ سے ان کے تلامذہ کی تعداد زیادہ ہے، کئی یونیورسٹیوں میں ان پر تحقیقی مقالے لکھے گئے، کئی اردو اکیڈمیوں کے علاوہ غالب ایوارڈ اور اقبال سمان بھی ان کو ملا۔

وہ بڑے انسان دوست تھے، اپنے طالب علموں اور خوردوں پر بہت شفقت فرماتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کی بشری خطاؤں کو معاف فرمائے اور اپنی رحمت کاملہ سے نوازے، متعلقین کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ (''ض''، اپریل ۲۰۰۵ء)

نقوی، سبط محمد، چودہری

آہ! جناب چودہری سبط محمد نقوی

۱۸/فروری ۲۰۰۵ء کو جناب چودہری سبط محمد نقوی بھی داغ مفارقت دے گئے، وہ ۷۹ برس کے تھے، انتقال سے چند ہفتے پہلے سڑک کے ایک حادثے میں شدید زخمی ہوگئے تھے، علاج کے لیے لکھنو میڈیکل کالج میں داخل ہوئے اور کسی قدر شفایاب ہوئے تو لکھنو میں اپنی رہایش گاہ پر آگئے، ایام عزا شروع ہونے سے پہلے عشرہ مجالس میں شرکت کے لیے اپنے آبائی وطن اکبر پور چلے آئے، ایک رات اچانک طبیعت زیادہ

خراب ہوگئی اور دسویں محرم آنے سے پہلے ہی انتقال فرماگئے۔

مرحوم کی تعلیم و تربیت لکھنو میں فرقہ امامیہ کی درس گاہوں میں ہوئی تھی، وہ اس فرقہ کے اکثر معروف و ممتاز خاندانوں سے بہ خوبی واقف تھے، اکثر عماید و مشاہیر علما کے صحبت یافتہ تھے، لکھنو اور اودھ کے اکثر علمی، تعلیمی، دینی، ادبی اور سیاسی حلقوں میں وہ مقبول و متعارف تھے، اہل تسنن سے بھی ان کے تعلقات تھے اور ان کے اصحاب علم کے قدر شناس تھے، مرحوم کی نماز جنازہ دونوں فرقوں کے اماموں نے پڑھائی، مولانا شبلیؒ کے بڑے مداح اور عظمت شناس تھے، مولانا نے موازنہ انیس و دبیر لکھا تو شیعوں اور سنیوں کا بھی ایک طبقہ ان سے بہت برہم ہوا لیکن مرحوم سبط محمد صاحب مولانا کے ہم نوا تھے جس کا برملا اظہار اپنی تحریروں اور ملاقاتوں میں کرتے تھے، دارالمصنفین سے بھی والہانہ تعلق رکھتے تھے اور اس کے معتدل روش کو بہت پسند کرتے تھے، جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم، مولوی حافظ عمیر الصدیق اور راقم سے بہت مخلصانہ تعلق رکھتے تھے، اپنے علمی و تحقیقی کاموں کے سلسلے میں یہاں تشریف بھی لاتے تھے، ۱۹۷۰ء کی دہائی میں غالباً پہلی بار یہاں تشریف لائے تو قریباً ایک ماہ قیام کیا اور جانے کے بعد ماہنامہ جامعہ دہلی میں ایک مضمون لکھا جس میں دارالمصنفین کی عظمت اور اس کے کارناموں کا اعتراف بڑی فراخ دلی سے کیا اور کتب خانے سے وابستہ تمام لوگوں کا ذکر نہایت اخلاص و محبت سے کیا۔

اور بھی کئی بار یہاں تشریف لائے، یہ ناممکن تھا کہ وہ اعظم گڑھ سے گزریں اور دارالمصنفین نہ تشریف لائیں، راقم بھی لکھنو جاتا تو ان سے ملاقات کرتا اور وہ بڑے تپاک سے ملتے، کبھی کبھی ان کو میری آمد کی خبر ہوجاتی تو خود بھی زحمت فرماکر میری قیام گاہ پر ملنے کے لیے آجاتے اور اگر کبھی اتفاقاً میں ان سے ملے بغیر چلا آتا تو فوراً خط آتا کہ ہم سے کیا خطا ہوئی جو یہاں تشریف نہیں لائے، وہ دارالمصنفین کے ہر کام کے لیے تیار رہتے، کئی بار خود اپنی سواری سے مجھے لے جاکر متعلقہ لوگوں سے ملاکر پرزور سفارش بھی کی، ایک مرتبہ میرا منجھلا لڑکا محمد طارق لکھنو اسٹیشن پر گاڑی چل جانے کے بعد اس پر سوار ہونے کی کوشش کررہا تھا کہ گر پڑا اور پاؤں ٹوٹ گیا، ریلوے پولیس نے بلرام پور اسپتال میں داخل کردیا، یہ خبر سن کر میں اپنے بڑے لڑکے محمد عامر کو لے کر وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ دارالمصنفین سے غالباً مولوی عمیر صاحب نے ندوہ فون کیا تھا اور مولانا سید محمد رابع ندوی کے ایما سے مولانا مفتی محمد ظہور ندوی اس کی عیادت کے لیے تشریف لائے تھے، اس کی وجہ سے مجھے خیال ہوا کہ اپنے بعض کرم فرماؤں کو فون سے مطلع کرکے آگے کی کاروائی ان کے مشورے سے کروں، مجھے یاد آتا ہے کہ اطلاع ملتے ہی سب سے پہلے مرحوم اور عبدالقوی خاں صاحب آگئے، مرحوم نے اس وقت یہ ظریفانہ فقرہ بھی کہا ''یہ بہت دوڑ باگ کرتے تھے، بارگاہ الٰہی سے حکم ہوا کہ کچھ دنوں آرام کریں'' وہ لڑکے سے بہت بے تکلف تھے۔

مرحوم عالم، دانشور، ادیب اور اہل قلم ہونے کے ساتھ ہی سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے تھے، ان کا شمار سرکردہ سوشلسٹ لیڈروں میں ہوتا تھا، مشہور سوشلسٹ لیڈر ڈاکٹر رام منوہر کے خیالات سے بہت متاثر تھے، ان ہی کے اثر سے انگریزی کے بھی بڑے خلاف اور دیسی زبانوں کی ترویج کے پرجوش حامی تھے، اردو ان کی مادری اور اصلی زبان تھی لیکن اس کے خلاف اترپردیش کی حکومتوں اور سرکاری ملازمین کا رویہ ہمیشہ بڑا معاندانہ تھا، اس لیے اردو میں لکھے ہوئے خطوط محکمہ ڈاک ضایع کردیتا تھا، مرحوم چودہری صاحب اپنے خطوط پر مکتوب الیہ کا نام ہمیشہ اردو میں لکھتے تھے اور جگہوں کے نام وغیرہ انگریزی سے نفرت کی وجہ سے التزاماً ہندی میں لکھتے تھے، تمام سوشلسٹ لیڈروں بالخصوص اترپردیش کے وزیر اعلا بابو ملایم سنگھ یادو سے ان کے اچھے تعلقات تھے، ان کے فرقے کے بعض لوگوں کا جھکاؤ بی جے پی کی جانب رہتا تھا، اس کی کاٹ کے لیے ملایم سنگھ کی خواہش اور ایما سے وہ سماج وادی پارٹی کی کنویسنگ کے لیے اکثر شیعہ آبادیوں کا انتخابی دورہ کرتے تھے، اس طرح کے دورے میں وہ کئی بار اعظم گڑھ کے قصبہ مبارک پور آئے تو دارالمصنفین کو بھی میزبانی کا شرف بخشا، ملایم سنگھ یادو جب پہلی بار اترپردیش کے وزیر اعلا بنے تو سبط محمد صاحب کی حسن خدمت کے صلے میں انہیں اقلیتی مالیاتی کمیشن کا چیرمین بنایا اور جب زخمی ہوئے تو ان کی عیادت کے لیے اسپتال تشریف لائے، وہ اکبر پور میونسپلٹی کے بھی چیرمین رہے۔

جناب سبط محمد نقوی اچھے صحافی اور کالم نگار تھے، قومی آواز اور لکھنو کے دوسرے اخباروں میں ان کے مضامین اور مراسلے برابر شایع ہوتے تھے، ان کا قیام پہلے اپنے آبائی وطن اکبر پور ہی میں تھا جہاں اپنی جائداد اور سیر کی دیکھ بھال میں مصروف رہتے تھے، اس کے باوجود لکھنے پڑھنے کا کام بھی کرتے رہتے تھے، ادھر کئی برس سے لکھنو چلے آئے تھے اور امام باڑہ غفران تاب میں اقامت پذیر ہوگئے تھے، یہاں سے ان کی ادارت میں اردو اور ہندی میں دو ہفتہ وار اخبار ''توحید میل'' اور ''ہماری توحید'' کے نام سے نکلتے تھے جن کے اکثر صفحات فرقہ امامیہ سے متعلق مضامین اور خبروں کے لیے مختص ہوتے تھے، تاہم دوسرے علمی و ادبی مضامین، اداریے، خبریں، مراسلے اور ان کے جواب بھی خاصے کی چیز ہوتے تھے، ان سے ان کے پختہ مشق صحافی، منجھے ہوئے قلم اور رچی ہوئی تحریر کا اندازہ ہوتا ہے۔

وہ ذی علم اور لایق شخص تھے، اودھ کی شستہ زبان لکھتے اور بولتے تھے اور خود اودھ کی قصباتی شایستہ تہذیب کا نمونہ تھے، زبان و ادب کا بڑا اچھا اور لطیف ذوق تھا، ایک مرتبہ معارف میں اشاعت کے لیے ان کا ایک مضمون آیا تو خط لکھا کہ میں ''لفظ'' کو مونث بولتا اور لکھتا ہوں اس پر خط نسخ پھیر کر مذکر بنانے کی زحمت نہ اٹھائیں۔

ان کا قد دراز، جسم بھاری بھرکم اور آواز مہیب تھی، بہ ظاہر سختی اور درشتی سے بات کرتے لیکن دل کے بھلے اور نرم تھے، دوسروں کے درد وغم کو اپنا درد وغم سمجھتے اور سب کی مدد اور غم گساری کے لیے برابر تیار رہتے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ (''ض''، اپریل ۲۰۰۵ء)

ضیف، شوقی، ڈاکٹر

ڈاکٹر شوقی ضیف

۱۴، ۱۵؍ مارچ ۲۰۰۵ء کو شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ''دوسری جنگ عظیم'' کے بعد ''عربی ادب کے نئے رجحانات'' کے عنوان سے ایک نیشنل سمینار ہوا جس کی روداد اپریل کے معارف میں شایع ہوچکی ہے، اس کے لیے راقم نے ''ڈاکٹر شوقی ضیف: افضل العلما مولانا محمد یوسف کوکن کی نظر میں'' کے عنوان سے مضمون لکھا تھا جس کو ۱۵؍ مارچ کو سمینار کے صبح کے اجلاس میں پڑھا، اسی روز شام کو پہلا اجلاس پروفیسر سلیمان اشرف (دہلی) کی صدارت میں شروع ہوا تو انہوں نے یہ افسوسناک اطلاع دی کہ ابھی خبر ملی ہے کہ ۱۱؍ مارچ بہ روز جمعہ ڈاکٹر شوقی ضیف کا انتقال ہوگیا، اسی وقت تاثراتی تقریریں ہوئیں، تعزیتی تجویز منظور کی گئی اور ڈاکٹر صاحب کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔

سمینار کے مندوبین کو شعبہ کی جانب سے جو کتابیں دی گئی تھیں ان میں ''مجلة المجمع العلمي الهندي'' کا تیئیسواں شمارہ بھی تھا، اتفاق سے اس میں بھی ڈاکٹر صاحب پر ایک مقالہ شامل تھا، اس سے اپنے مضمون میں کسی قدر اضافہ کر کے معارف کے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر شوقی ضیف بیسویں صدی کے عربی زبان کے مشہور مصنف اور بلند پایہ محقق و نقاد تھے، وہ جنوری ۱۹۱۰ء میں مصر کے ایک گاؤں ''اولا دحمام'' میں پیدا ہوئے، ان سے پہلے ان کے دو بڑے بھائی ایام شیر خوارگی ہی میں فوت ہوگئے تھے، اس لیے جب یہ پیدا ہوئے تو ان کے والدین کو بڑی خوشی ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب کا پورا نام احمد شوقی عبدالسلام ضیف تھا، ضیف ان کے خاندان کا لقب اور عبدالسلام والد کا نام تھا، ان کا اصلی نام احمد شوقی تھا مگر وہ اختصار کے خیال سے اپنے کو صرف شوقی ضیف لکھتے تھے، یہی ان کا قلمی نام تھا اور اسی سے ان کو شہرت ملی۔

بچپن میں وہ بیمار ہوگئے تھے، اس کی وجہ سے ان کی بائیں آنکھ میں تکلیف ہوگئی تھی، جس کا مناسب علاج نہ ہونے کی بنا پر اس کی بینائی بہت کم ہوگئی مگر داہنی آنکھ صحیح اور سلامت تھی اور اس کی روشنی تیز تھی۔

ڈاکٹر شوقی ضیف کی تعلیم گاؤں ہی میں شروع ہوگئی تھی لیکن جب وہ نو برس کے ہوئے تو ان کے والد اپنے کنبے کے ساتھ دمیاط چلے آئے، یہیں ڈاکٹر شوقی نے ایک برس سے بھی کم عرصے میں قرآن مجید حفظ کیا، جس دن انہوں نے حفظ مکمل کیا تھا، وہ دن ان کے گھر والوں کے لیے بڑی خوشی کا تھا، اس دن ان کے والد نے ایک جلسہ کیا اور ان کے استاذ کو ہدایا وتحایف سے نوازا۔

پہلے مرحلے کی تعلیم دمیاط ہی میں ہوئی، ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۸ء میں وہاں سے باہر جا کر دینی مدرسے میں دوسرے مرحلے کی تعلیم حاصل کی، اس زمانے میں روزنامے اور ہفتہ وار مجلّے ان کے مطالعے میں آئے جن سے ان کا تعلیمی رخ تبدیل ہوا اور ان مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا جہاں ریاضی، طبیعیات اور کیمیا وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی، اس کے لیے کسی استاد کی رہنمائی کے بغیر ہی انہوں نے تیاری شروع کی اور ٹسٹ میں کامیاب ہوئے، دو برس تک اعدادی درجے میں رہے، ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء میں قاہرہ یونیورسٹی کے کلیۃ الآداب کے شعبہ عربی لغت میں ان کا داخلہ ہوا، یہاں ان کی اصلی زبان انگریزی اور ثانوی فرنچ تھی۔

۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء کے تعلیمی سال میں انہوں نے سریانی اور فارسی زبان پڑھی اور اس کے ساتھ ہی عربی ادب وتنقید اور نحو کا درس بھی لیا، فارسی کے استاد عبدالوہاب عزام تھے، ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۴ء میں وہ شیخ مصطفےٰ عبدالرزق کے لکچروں میں شریک ہوئے جو اسلامی فلسفہ پڑھاتے تھے، ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی وجہ سے انہوں نے یہاں داخلہ لیا تھا، ان سے نقدالنثر اور موازنہ ابی تمام بحتری وکا درس لیا اور ان ہی سے مشہور فرانسیسی مورخ وفلسفی ٹین (Taine) کی تصنیف انگریزی ادب کی تاریخ کا مقدمہ بھی پڑھا، استاذ احمد امین سے علم الاخلاق کی کتابیں پڑھیں۔

۲۶ برس کی عمر میں ۱۹۳۵ء میں انہوں نے امتیازی نمبروں سے بی اے پاس کیا اور پہلی پوزیشن حاصل کی، اس کے بعد ایم اے میں داخلہ لیا، اس وقت کلیۃ الآداب کے سربراہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین تھے، ان کے مقالے کا عنوان ''ابوالفرج اصبہانی کی کتاب الاغانی میں نقد ادب'' تھا، یہی اہم کتاب ۱۲ جلدوں پر مشتمل ہے اور جاہلی اور اسلامی دور کی تین ابتدائی صدیوں کی شاعری اور شعرا کا مرجع ہے، اس کی تیاری میں ۱۹۳۸ء و ۱۹۳۹ء میں وہ بہت مشغول رہے، جب اس کا مناقشہ ہوا اور انہیں ڈگری مل گئی تو انہوں نے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ انہیں اپنی علمی زندگی کے آغاز ہی میں عربی شعر وشعرا کے اس سب سے بڑے اور اہم ماخذ کے مطالعہ کا موقع میسر آیا۔

ایم اے کر چکے تو ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا موضوع ''چوتھی صدی ہجری میں عباسی دور کی شاعری'' تجویز کیا، کئی برس کی محنت ومطالعہ کے بعد انہوں نے اپنا مقالہ مکمل کیا اور مناقشے کے بعد ۱۹۴۲ء میں شرف وامتیاز کے ساتھ ڈگری حاصل کی۔

ڈاکٹریٹ کے بعد انہیں قاہرہ یونیورسٹی کے کلیۃ الاداب کے شعبہ عربی لغت میں تدریس کی خدمت سپرد کی گئی، وہ طلبہ پر نہایت شفیق و مہربان تھے اور ان سے ان کے بڑے مخلصانہ روابط اور تعلقات تھے، ۱۹۴۸ء میں وہ معاون استاذ مقرر ہوئے اور ۱۹۶۸ء میں صدر شعبہ ہوئے، ۱۹۷۰ء میں اس عہدہ سے سبک دوش ہونے کے بعد بھی اس خدمت کو ۵ برس تک انجام دیتے رہے اس کے بعد بھی اس شعبہ میں استاذ متفرغ کی حیثیت سے وہ برقرار رہے۔

ڈاکٹر صاحب اپنے علمی کمالات کی وجہ سے ملک و بیرون ملک کے مختلف علمی، ادبی اور تحقیقی اداروں، اکیڈمیوں اور کمیٹیوں کے رکن بنائے گئے، ۱۹۸۸ء سے وفات تک وہ **مجمع اللغة العربیه** قاہرہ کے جنرل سکریٹری رہے، ان کی کئی کتابوں پر مصر کی علمی و ادبی اکیڈمیوں اور انجمنوں اور خود حکومت نے بھی ان کو ایوارڈ عطا کیے، ۱۹۸۲ء میں ان کو عربی ادب کا سب سے بڑا فیصل ایوارڈ ملا۔

۱۹۴۵ء میں ۳۶ برس کی عمر میں ان کی شادی بلقیس خانم سے ہوئی جو قاہرہ یونیورسٹی کی کلیۃ الآداب میں ان کی شاگرد رہ چکی تھیں، ان سے ایک صاحب زادے عاصم اور صاحبزادی رندہ پیدا ہوئیں، صاحبزادے قاہرہ یونیورسٹی سے انجینئرنگ کرنے کے بعد انجینئرنگ کالج میں استاذ ہیں اور صاحبزادی میڈیکل کالج سے فارغ ہونے کے بعد اس میں استاذ ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے تلامذہ کی تعداد کثیر ہے، ان میں مصر ہی نہیں کئی اور ملکوں فلسطین، شام، اردن، عراق اور سوڈان کے بھی شاگرد ہیں، ہندوستان کے مولانا محمد یوسف کوکن مدراسی کو بھی ان سے شرف تلمذ حاصل تھا، انہیں ۱۹۵۷ء۔ ۱۹۵۸ء میں حکومت ہند کے وظیفے پر قاہرہ یونیورسٹی جانے کا اتفاق ہوا تو ڈاکٹر شوقی ان کے استاذ اور تحقیقی مقالے کے نگراں ہوئے، مولانا یوسف مرحوم ایک سامع طالب علم کی حیثیت سے ان کی کلاسوں میں حاضر ہوکر ان سے استفادہ کرتے تھے، جب مولا یوسف نے ان سے اپنے اس ارادے کا ذکر کیا کہ وہ مولانا باقر آگاہ ویلوری مدراسی (م ۱۲۲۰ھ/ ۱۸۰۵ء) یا مولانا غلام علی آزاد بلگرامی (م ۱۲۰۰ھ/ ۱۷۸۵ء) پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھنا چاہتے ہیں تو انہوں نے فرزدق اور اس کے شعر و ادب پر مقالہ لکھنے کا مشورہ دیا، چنانچہ موصوف نے پانچ مہینوں میں فرزدق پر بہت سارا مواد اکٹھا کیا لیکن اس کے بعد مصر چھوڑنے کا وقت آگیا اور وہ اپریل ۱۹۵۸ء میں ہندوستان واپس آگئے، مصر سے روانگی کے وقت ڈاکٹر صاحب نے انہیں یہ تحریر مرحمت کی:

''قاہرہ یونیورسٹی کی کلیۃ الآداب اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ سید محمد یوسف کوکن استاذ اردو مدراس یونیورسٹی ہندوستانی حکومت کے مبعوث ہوکر یہاں آئے اور مارچ ۱۹۵۷ء سے مارچ ۱۹۵۸ء کے اوایل تک شعبہ عربی کے بی اے اور ایم اے درجات میں استاذوں کی درس میں مسلسل شریک ہوکر مستفید ہوئے اور ڈاکٹر شوقی ضیف استاذ ادب عربی کی نگرانی میں عربی ادب میں بحث و تحقیق کا کام بھی کرتے رہے، انہوں نے اموی عہد کے مشہور شاعر فرزدق کے بارے میں مفید اور عمدہ تحقیقات کی ہیں اور بڑی باریک بینی سے فرزدق کے مطبوعہ دیوان کا عالمانہ مقابلہ ان قلمی نسخوں سے کیا ہے جو قاہرہ کے مصری کتب خانے میں موجود تھے، اس کے علاوہ فرزدق کے اشعار میں جن اشخاص و اعلام کا ذکر ہے ان کی تحقیق اور چھان بین بھی کی ہے، ان کی بحث و تحقیق عربیت سے ان کی واقفیت کی دلیل اور نصوص و متون کی تحقیق و تدوین میں مہارت کا ثبوت ہے، انہیں اپنی تحقیق و مطالعہ کا کام برابر جاری رکھنا چاہیے''۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب کا دستخط اور مہر ثبت ہے جس پر ۳/ مارچ ۱۹۵۸ء کی تاریخ درج ہے مگر مولانا محمد یوسف صاحب ہندوستان آنے کے بعد درس و تدریس اور دوسرے علمی و تصنیفی کاموں میں ایسا مشغول ہوئے کہ فرزدق اور اس کی شاعری پر اپنے ادھورے کام کو مکمل نہیں کرسکے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ۱۹۸۲ء میں ڈاکٹر شوقی ضیف کو فیصل ایوارڈ ملا، اسی سال ان کے اس ہندوستانی شاگرد کو عربی کی مسلمہ قابلیت کا پریسیڈنٹ آف انڈیا کا ایوارڈ ملا۔

ڈاکٹر صاحب کے استاذوں کا ذکر ہم پہلے کرچکے ہیں، ان میں ڈاکٹر طہٰ حسین، ڈاکٹر احمد امین، ڈاکٹر مصطفےٰ عبدالرزاق اور ڈاکٹر عبدالوہاب عزام سے وہ زیادہ متاثر تھے، قدما میں ثعالبی کے بھی مداح تھے اور اپنے اسلوب تحریر کو جاحظ کے طرز و اسلوب جیسا بتاتے تھے۔

گو وہ ڈاکٹر طہٰ حسین کے زیادہ عقیدت مند تھے تاہم کہیں کہیں ان سے ان کو اختلاف بھی تھا، امیر الشعرا احمد شوقی پر طہٰ حسین کی رائے پر نقد کیا ہے۔

ڈاکٹر شوقی ضیف کثیر التصانیف اور کبار مصنفین میں تھے، ان کی تالیف و تصنیف کا آغاز طالب علمی کے زمانے ہی میں ہوگیا تھا، ۱۳/۱۴/ برس کی عمر میں ابن ہشام کی نحو کی کتاب **قطر الندی و بل الصدی** کا ملخص تیار کیا تھا اور ۱۹ برس کی عمر میں تفسیر **مجموعة من اجزاء القرآن** کے نام سے دوسری کتاب لکھی جو کشاف و بیضاوی کا التقاط ہے۔

طالب علمی ہی کے زمانے میں انہوں نے مقالہ نگاری بھی شروع کردی تھی، ان کا پہلا مضمون مجلّہ الرسالہ میں ۸/ جنوری ۱۹۳۴ء کو ''**الوضوح والغموض فی الشعر**'' کے عنوان سے چھپا، یہ مصر کا اہم ہفتہ وار ادبی مجلّہ تھا، اس میں جب ڈاکٹر صاحب نے ڈاکٹر طہٰ حسین، عقاد اور احمد امین جیسے اہل قلم کے ساتھ اپنا نام چھپا ہوا دیکھا تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی، اس سے ان کا حوصلہ اتنا بڑھا کہ فوراً دوسرا مضمون ''**ماهیة الشعر**'' کے نام سے لکھا جو اسی مجلّے کے اگلے شمارے میں ۱۵/ جنوری کو چھپا،

اس کے بعد اور بھی مضامین لکھے اور ان کا اور کتابوں کا تاعمر انبار لگاتے رہے، ذیل میں ان کی اہم تصنیفات کے نام اور کچھ مزید اطلاعات پیش کی جاتی ہیں، ڈاکٹر صاحب کی سب سے اہم اور معرکہ آرا کتاب تاریخ الادب العربی ہے جو نو جلدوں اور کئی ہزار صفحات پر مشتمل ہے، ہر ہر جلد کی الگ الگ تفصیل ملاحظہ ہو:

۱۔ جلد اول: اس میں جاہلی عہد کا ذکر ہے، یہ پہلی دفعہ قاہرہ کے دارالمعارف سے ۱۹۶۰ء میں شایع ہوئی تھی اور پھر وہیں سے ۱۹۹۷ء میں اس کا انیسواں اڈیشن نکلا ہے جو ۴۳۶ صفحوں پر مشتمل ہے۔

۲۔ جلد دوم: اس میں اسلامی عہد کا ذکر دو حصوں میں کیا گیا ہے، پہلے حصے میں اسلام کے ابتدائی دور یعنی عہد رسالت اور خلافت راشدہ کی ادبی تاریخ قلم بند کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں اموی دور کا تذکرہ ہے، اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۶۳ء میں دارالمعارف قاہرہ سے نکلا تھا اور وہیں سے ۱۹۹۷ء میں سترہواں اڈیشن نکلا، یہ ۴۶۱ صفحے ہے۔

۳۔ جلد سوم: اس میں خلافت عباسیہ کے دور اول کی ادبی تاریخ بیان کی ہے، جس کا پہلا اڈیشن دارالمعارف قاہرہ سے ۱۹۶۶ء میں نکلا اور ۱۹۹۷ء میں وہیں سے چودھواں اڈیشن نکلا، اس کے صفحے ۵۷۶ ہیں۔

۴۔ جلد چہارم: یہ خلافت عباسیہ کے دوسرے اور آخری دور کی ادبی تاریخ ہے، اس کا پہلا اڈیشن دارالمعارف قاہرہ سے ۱۹۷۳ء میں اور نواں اڈیشن وہیں سے شایع ہوا، صفحوں کی تعداد ۶۶۰ ہے۔

۵۔ جلد پنجم: اس کا نام عصر الدول و لامارات رکھا اور یہ بجائے خود کئی جلدوں میں ہے، اس حصے میں جزیرۂ عرب، عراق و ایران کی مختلف ریاستی حکومتوں اور سلطنتوں کے دور میں عربی ادب کی تاریخ کا تذکرہ ہے، اس کا پہلا حصہ ۱۹۸۰ء میں اور تیسرا ۱۹۹۷ء میں دارالمعارف قاہرہ سے شایع ہوا اور ۶۸۸ صفحوں پر مشتمل ہے۔

۶۔ جلد ششم: یہ بھی عصر الدول والامارات ہی کا حصہ ہے اور اس میں شام و مصر کے عربی ادب کی تاریخ ہے، اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۸۲ء میں اور تیسرا ۱۹۹۷ء میں دارالمعارف قاہرہ سے نکلا، اس کے صفحات ۸۴۶ ہیں۔

۷۔ جلد ہفتم: یہ بھی سلسلۂ دول و امارات کی کڑی اور اندلس کی تاریخ ادب عربی ہے، اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۸۹ء اور دوسرا ۱۹۹۷ء میں دارالمعارف قاہرہ سے نکلا اور ۵۵۲ صفحوں پر مشتمل ہے۔

۸۔ جلد ہشتم: یہ دول و امارات کے سلسلے کی چوتھی جلد ہے جس میں لیبیا، تونس اور صقلیہ کی تاریخ ادب عربی تحریر کی گئی ہے، اس کا پہلا اڈیشن دارالمعارف قاہرہ سے ۱۹۹۲ء میں نکلا تھا جو ۴۴۶ صفحوں پر مشتمل ہے۔

۹۔ جلد نہم: یہ بھی اسی سلسلے کی تاریخ ادب ہے، جس میں الجزائر، مغرب اقصی، موریتانیا اور سوڈان کا ذکر ہے، اس کا پہلا اڈیشن دارالمعارف قاہرہ سے ۱۹۹۵ء میں نکلا اور ۴۰۶ صفحے کا ہے۔

مولانا محمد یوسف کوکن کی نظر سے ڈاکٹر شوقی ضیف کی تاریخ ادب عربی کی صرف ۵ جلدیں گزری تھیں، ان کا مبسوط تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ عربی ادب کی جو تاریخیں لکھی گئی ہیں، ان میں اس سے زیادہ مفید اور بہتر کوئی کتاب نہیں، مواد و معلومات کی کثرت کے لحاظ سے یہ ان سب سے فایق ہے۔

۱۰۔ فصول فی الشعر و نقده: پہلی مرتبہ دارالمعارف قاہرہ سے ۱۹۷۱ء میں چھپی اور وہیں سے تیسری بار ۱۹۸۸ء میں شایع ہوئی اور ۳۶۸ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں مختلف پہلوؤں سے عربی شاعری کا تحلیلی نقد کیا ہے جیسے عربی ورثہ کی قدر و قیمت، عربی شاعری کی غنائیت و موسیقی، شاعری کے مضامین و ہیئت، عباسی دور کے شعرا کی جدتیں، متنبّی کی شاعری میں عربیت، ابوالعلا کی شاعری میں فلسفیانہ تفکر، عربی شاعری کی تاریخ میں اندلس کا تشخص و امتیاز، ابن سناء الملک کی شاعری میں مصری روح، ابن الفارض کے روحانی مجاہدات، بوصیری کی نعتوں میں حقیقت محمدی، گزشتہ صدی کی مصری شاعری میں صنایع، نئی عربی شاعری کے تغیرات، آزاد شاعری میں وزن کی شکست و ایقاع، حال کی شاعری کا ماضی سے رشتہ، جدید عربی شاعری میں شوقی کا درجہ و مرتبہ، حافظ کی شاعری کا تاریخی مطالعہ۔

۱۱۔ دراسات فی الشعر العربی: اس کا پہلا اڈیشن قاہرہ کے مکتبہ خانجی سے ۱۹۵۳ء میں نکلا اور ساتواں دارالمعارف قاہرہ سے ۱۹۹۷ء میں طبع ہوا، یہ ۲۹۲ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں مندرجہ ذیل کو موضوع بنایا ہے:

حافظ ابراہیم کی شاعری میں وطنیت، اسماعیل صبری کے تغزل میں رقت و گداز، احمد محرم کی اسلامی الیڈ، رصافی کی شاعری میں انسانیت اور انسان دوستی، زہاوی کی شاعری کا علمی رنگ، عقاد کی "عابر سبیل" (مسافر) میں روزمرہ کے مسایل و موضوعات، عبدالرحمان شکری کی شاعری میں بدشگونی، خلیل مطران کی شاعری میں آزادی کے نغمے، شابی کے اشعار میں احساس درد و الم کی شدت، ابوشبکہ کی نظم "افاعی الفردوس" میں چیخ کی لذت، ایلیا ابی ماضی کی شاعری میں فال، علی محمود طہٰ کے یہاں چیخنے اور گونجنے والے الفاظ، میخائیل نعیمہ کی "ھمس الجفون" میں نفسیاتی تاملات، ابوریشہ کی شاعری میں پیکر تراشی، امریکی مہجری شاعری میں مشرقیات کی جھلک۔

۱۲۔ البلاغة تطور و تاریخ: اس کا پہلا اڈیشن دارالمعارف قاہرہ سے ۱۹۶۵ء میں طبع ہوا اور ۱۹۹۷ء میں وہیں سے نواں اڈیشن نکلا، یہ ۳۸۴ صفحے کی کتاب ہے، اس میں جاہلی اور اسلامی دور میں فن بلاغت کی نشو و ارتقا اور عہد بہ عہد ترقی دکھائی ہے اور فن کے اور ممتاز اہل کمال کا تذکرہ کیا ہے۔

۱۳۔الفن و مذاهبه فی النثر العربی: اس کو پہلی مرتبہ لجنتہ التالیف والترجمہ والنشر قاہرہ نے ۱۹۴۶ء میں اور آخر میں بارہواں اڈیشن دارالمعارف قاہرہ نے ۱۹۹۷ء میں شایع کیا، یہ ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

۱۴۔الفن و مذاهبه فی الشعر العربی: اس کی پہلی اشاعت قاہرہ کی لجنتہ التالیف والترجمہ والنشر نے ۱۹۴۳ء میں کی تھی اور دارالمعارف قاہرہ سے بارہواں اڈیشن ۱۹۹۷ء میں نکلا، یہ ۵۲۴ صفحے کی کتاب ہے، یہ ان کے ڈاکٹریٹ کا مقالہ تھا، جس پر جامعہ قاہرہ نے جو اس وقت جامعہ فواد قاہرہ کہلاتا تھا، شرف و امتیاز کے ساتھ ڈگری عطا کی تھی اور جب یہ کتاب ۱۹۴۳ء میں شایع ہوئی تو مجمع اللغۃ العربیہ نے ۱۹۴۷ء میں انہیں انعام بھی دیا۔

۱۵۔الادب العربی المعاصر فی مصر: پہلا اڈیشن ۱۹۵۷ء دارالمعارف قاہرہ سے اور وہیں سے ۱۹۹۵ء میں گیارہواں اڈیشن نکلا، یہ کتاب ۳۱۰ صفحے کی ہے، اس میں ۱۸۵۰ء سے ۱۹۵۰ء یعنی سو برس تک کے مصری شعرا اور شعری موثرات و عوامل کا تذکرہ ہے، اس میں مذکور چند مشاہیر شعرا کے نام یہ ہیں، بارودی، حافظ ابراہیم، شوقی، مطران، عبدالرحمان شکری، عباس محمود عقاد، ابراہیم ناجی اور علی محمود طہ، نثر نگاروں کے نام یہ ہیں: محمد عبدہ، منفلوطی، مویلحی، لطفی السید، مازنی، ہیکل، طہٰ حسین، توفیق الحکم اور محمود تیمور۔

۱۶۔شوقی شاعر العصر الحدیث: اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۵۳ء میں اور تیرہواں اڈیشن ۱۹۹۷ء میں دارالمعارف قاہرہ سے نکلا جو ۲۸۶ صفحوں میں ہے۔

۱۷۔البارودی رائد الشعر العربی الحدیث: طبع اول ۱۹۶۴ء میں اور طبع خامس (پنجم) ۱۹۷۱ء میں دارالمعارف قاہرہ سے نکلا جو ۲۳۲ صفحوں میں ہے۔

۱۸۔البحث الادبی۔ طبیعته و مناهجه و اصوله و مصادره: دارالمعارف قاہرہ سے پہلا اور ساتواں اڈیشن ۱۹۷۲ء اور ۱۹۹۷ء میں نکلا، یہ کتاب ۲۸۰ صفحے کی ہے۔

۱۹۔الشعر وطوابعه الشعبیة علی مر العصور: دارالمعارف قاہرہ سے پہلا اڈیشن ۱۹۷۶ء میں اور دوسرا ۱۹۸۴ء میں نکلا، صفحات ۲۵۶ ہیں۔

۲۰۔تجدید النحو: دارالمعارف قاہرہ سے پہلا اڈیشن ۱۹۸۲ء میں اور چوتھا اڈیشن ۱۹۹۷ء میں نکلا، صفحوں کی تعداد ۲۸۲ ہے۔

۲۱۔النقد العربی: دارالمعارف قاہرہ سے پہلی دفعہ ۱۹۶۲ء میں اور آٹھویں دفعہ ۱۹۹۷ء میں چھپی، یہ ۲۵۰ صفحوں پر مشتمل ہے۔

۲۲۔المدارس النحویه: دارالمعارف قاہرہ سے پہلی بار ۱۹۶۸ء میں اور ساتویں بار ۱۹۹۷ء میں چھپی، ۳۷۸ صفحے کی کتاب ہے، اس میں نحو کے مختلف اسکولوں کے خصائص بیان ہوئے ہیں اور مشاہیر نحویوں کا تذکرہ ہے۔

۲۳۔التطور والتجدید فی الشعر الاموی: پہلا اڈیشن لجنتہ التالیف والترجمہ والنشر قاہرہ سے ۱۹۵۲ء میں اور دسواں اڈیشن دارالمعارف قاہرہ سے ۱۹۹۷ء میں نکلا، یہ ۳۴۰ صفحے کی کتاب ہے۔

۲۴۔الشعر والغناء فی المدینة و مکة لعصر بنی امیه: اس کا پہلا اڈیشن دارالمعارف قاہرہ سے ۱۹۵۲ء میں اور وہیں سے ۱۹۹۷ء میں پانچواں اڈیشن بھی نکلا، یہ ۳۳۶ صفحے پر مشتمل ہے۔

۲۵۔المقامه: یہ ۱۰۸ صفحات پر مشتمل ہے، پہلی مرتبہ ۱۹۵۴ء اور پانچویں مرتبہ ۱۹۸۰ء میں دارالمعارف قاہرہ سے طبع ہوئی۔

۲۶۔مجمع اللغة العربیة فی خمسین عاما: پہلی بار ۱۹۸۴ء میں قاہرہ کی مجمع اللغتہ العربی سے شایع ہوئی اور ۲۱۲ صفحوں پر مشتمل ہے۔

۲۷۔تیسیر النحو التعلیمی (قدیما وحدیثا مع نهج تجدیده): ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے پہلی بار ۱۹۸۶ء میں اور دوسری بار ۱۹۹۷ء میں دارالمعارف قاہرہ سے شایع ہوئی۔

۲۸۔تحریفات العلمیة للفصحی: دارالمعارف قاہرہ سے پہلی بار ۱۹۹۴ء میں شایع ہوئی اور ۲۰۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

۲۹۔الوجیز فی تفسیر القرآن الکریم: پہلا اڈیشن دارالمعارف قاہرہ سے ۱۹۹۶ء میں نکلا اور ۱۰۵۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

۳۰۔تیسیرات لغویة: ۱۹۹۶ء میں دارلمعارف قاہرہ سے پہلی بار طبع ہوئی اور ۲۰۰ کی ہے۔

۳۱۔الحضارة الاسلامیة من القرآن والسنة: ۳۳۴ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۹۹۷ء میں دارالمعارف قاہرہ سے پہلی بار طبع ہوئی۔

۳۲۔سورة الرحمان وسور قصار: اس میں اپنے سورہ رحمان اور مختصر سورتوں کے مطالعہ کا حاصل پیش کیا ہے جو پہلی دفعہ ۱۹۷۱ء میں اور چوتھی دفعہ ۱۹۹۷ء میں دارالمعارف قاہرہ سے چھپی تھی، صفحات کی تعداد ۴۰۶ ہے۔

ان کی جو تصنیفات کسی سلسلے میں داخل ہیں، ان سے جن کے نام معلوم ہوسکے، وہ حسب ذیل ہیں:

۳۳۔ابن زیدون: ۱۲۴ صفحے پر مشتمل ہے دارالمعارف قاہرہ سے پہلی دفعہ ۱۹۵۴ء میں اور گیارہویں دفعہ ۱۹۸۱ء میں طبع ہوئی۔

مذکورہ بالا کتاب سلسلۂ اعلام العرب کی ہے، فنون الادب العربی کے سلسلے کی مندرجہ ذیل کتابوں کے نام ملاحظہ ہوں:

۳۴۔النقد: ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے، یہ دارالمعارف قاہرہ سے پہلی بار ۱۹۵۵ء میں اور پانچویں بار ۱۹۸۴ء میں شایع ہوئی۔

۳۵۔ الرثاء: یہ بھی اسی سلسلے کی کتاب ہے اور ۱۱۲ صفحے پر مشتمل ہے، پہلی دفعہ ۱۹۵۵ء میں اور چوتھی دفعہ ۱۹۸۷ء میں دارالمعارف قاہرہ سے شایع ہوئی تھی۔

۳۶۔ الترجمة الشخصية: یہ پہلی دفعہ ۱۹۵۶ء میں اور چوتھی دفعہ ۱۹۸۷ء میں دارالمعارف قاہرہ سے چھپی اور ۱۲۸ میں ہے۔

۳۷۔ الرحلات: یہ بھی سلسلہ فنون ادب عربی میں شامل اور ۱۲۸ صفحے کی ہے جو ۱۹۵۶ء میں پہلی بار اور ۱۹۸۷ء میں چوتھی بار دارالمعارف قاہرہ سے طبع ہوئی تھی۔

حسب ذیل کتابیں سلسلہ اقرأ میں داخل ہیں:

۳۸۔ الفكاهة فى مصر: دوبار ۱۹۵۸ء اور ۱۹۸۵ء میں دارالمعارف قاہرہ نے شایع کی ہے اور ۲۰۸ صفحوں پر مشتمل ہے۔

۳۹۔ مع العقاد: پہلا اڈیشن ۱۹۶۴ء میں اور پانچواں ۱۹۸۸ء میں دارالمعارف قاہرہ سے نکلا اور ۱۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

۴۰۔ البطولة فى الشعر العربى: یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۶۹ء میں اور دوسری مرتبہ ۱۹۸۴ء میں دارالمعارف قاہرہ سے شایع ہوئی اور ۱۶۰ صفحے کی ہے، اس میں وہ قصاید و قطعات نقل کیے گئے ہیں جو جاہلی، اسلامی، رومی، صلیبی اور مغلوں کی جنگوں یا موجودہ دور میں حصول آزادی کے معرکوں میں کہے گئے تھے۔

۴۱۔ معی، ج۔۱: اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۸۱ء میں اور دوسرا ۱۹۸۵ء میں قاہرہ کے دارالمعارف سے نکلا، یہ ۱۳۲ صفحے کا رسالہ ہے۔

۴۲۔ معی، ج۔۲: اس کا پہلا اڈیشن دارالمعارف قاہرہ سے ۱۹۸۸ء میں نکلا جو ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

جو کتابیں تحقیق و تحشیہ کے بعد ایڈٹ کر کے شائع کیں وہ یہ ہیں:

۴۳۔ تحقيق كتاب الرد على النحاة لابن مضاء القرطبى: اس کا پہلا اڈیشن دارالفکر العربی قاہرہ سے ۱۹۴۷ء میں نکلا اور تیسرا اڈیشن دارالمعارف قاہرہ سے ۱۹۸۸ء میں نکلا، یہ ۱۵۲ صفحے پر مشتمل ہے۔

۴۴۔ تحقيق خريدة القصره وجريدة العصر للعماد الاصفهانى الكاتب (قسم شعراء مصر): اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۵۱ء میں قاہرہ کی لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر نے شایع کیا جو ۲۹۶ پر مشتمل تھا۔

۴۵۔ رسايل الصاحب بن عباد: ۱۹۴۷ء میں پہلی دفعہ دارالفکر العربی سے چھپا اور اب بازار سے غایب ہے۔

۴۶۔ المغرب فى حلى المغرب (الجزه الاول) لابن سعيد الاندلسى: دارالمعارف قاہرہ سے پہلی بار ۱۹۵۱ء میں اور اخیراً چوتھا اڈیشن ۱۹۹۷ء میں طبع ہوا اور ۴۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

۴۷۔ ایضاً (الجزء الثانی): یہ حصہ پہلی بار مطبع جامعہ قاہرہ سے ۱۹۵۳ء میں چھپا اور اخیراً چوتھا اڈیشن دارالمعارف قاہرہ سے ۱۹۹۷ء میں نکلا اور ۵۷۲ صفحوں پر مشتمل ہے۔

یہ کتاب بلاد مغرب کی تاریخ ہے جو ابن سعید علی مغربی (۶۱۲ھ۔ ۶۸۶ھ/ ۱۲۱۴ء۔ ۱۲۸۶ء) کی تصنیف ہے، مصنف مورخ اور شاعر تھے، وہ غرناطہ کے مضافات میں پیدا ہوئے اور تونس میں وفات پائی، ادب و تاریخ سے شغف تھا، اشبیلیہ میں تعلیم حاصل کی، حج بیت اللہ کیا اور حلب، دمشق، موصل، بصرہ، ارمینیا گئے اور اسکندریہ اور تونس میں اقامت پذیر ہوئے، فاتح ہلاکو سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔

۴۸۔ نقط العروس فى تواريخ الخلفاء لابن حزم الاندلسى: یہ کئی جلدوں میں ہے، جزء ثانی ۱۹۵۱ء میں مطبع جامعہ فواد قاہرہ سے طبع ہوا تھا۔

۴۹۔ تاريخ آداب اللغة العربيه لجرجى زيدان: اصل کتاب چار حصوں میں ہے، ڈاکٹر شوقی ضیف نے چاروں پر تعلیقات لکھ کر شایع کیا، اس کا پہلا اڈیشن دارالہلال قاہرہ سے ۱۹۵۷ء میں شایع ہوا۔

۵۰۔ الدرر فى اختصار المغازى والسيرلا بن عبدالبر: پہلا اڈیشن ۱۹۶۶ء میں اور تیسرا اڈیشن ۱۹۹۷ء میں دارالمعارف قاہرہ سے نکلا اور ۳۵۶ صفحوں پر مشتمل ہے۔

۵۱۔ التراث والشعر واللغة: دارالمعارف قاہرہ سے پہلی دفعہ ۱۹۸۷ء میں چھپی اور ۲۸۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

("ض"، مئی ۲۰۰۵ء)

عبدالرحیم، سید، پروفیسر

پروفیسر سید عبدالرحیم

پروفیسر سید عبدالرحیم کچھ دنوں سے کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہوگئے تھے بالآخر ۱۶؍فروری ۲۰۰۵ء کو ناگ پور میں اپنے مالک حقیقی سے جاملے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم کا آبائی وطن ایلچ پور تھا، لیکن وہ اپنے نانہال "بھی گاؤں" ضلع امراوتی میں ۱۴؍اپریل ۱۹۳۲ء کو پیدا ہوئے، ایلچ پور میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور وہیں کے رحمانیہ اردو ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا، ۱۹۵۴ء میں ناگ پور یونیورسٹی سے بی اے اور ۱۹۵۶ء میں فارسی میں ایم اے کیا، ۱۹۴۶ء میں اردو میں ایم اے کیا اور کلکتہ یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے کیا، ۱۹۷۷ء میں "ارادت خاں" پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ناگ پور یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔

کچھ عرصے تک انجمن ہائی اسکول کھام گاؤں میں درس کی خدمت انجام دی پھر محکمہ آثار قدیمہ سے وابستہ ہوئے جس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ڈیسائی مرحوم تھے، ان کی رہنمائی میں ان کو بھی تحقیق اور تلاش و جستجو کا چسکا لگا اور کتابت و مخطوطات

شناسی سے دلچسپی پیدا ہوئی۔

عبدالرحیم صاحب ۱۹۶۸ء میں وسنت راؤ نایک انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز میں اردو فارسی اور عربی کے لیکچرر مقرر ہوئے اور ۱۹۷۷ء میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے، ۱۹۸۸ء میں کالج کو انسٹی ٹیوٹ کا درجہ دیا گیا تو یہ ڈایرکٹر مقرر کیے گئے اور ۱۹۹۲ء میں اسی عہدے سے سبک دوش ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب مہاراشٹر اور گجرات کی مختلف علمی، تعلیمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں سے وابستہ تھے اور کئی اداروں اور اکیڈمیوں کے ممبر اور بعض کے چیرمین بھی رہے، ان کی نگرانی میں متعدد لوگوں نے علمی و تحقیقی کام انجام دیے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی، ان کا ایک بڑا کارنامہ تذکرہ مشاہیر برار ہے، جس کا پہلا حصہ ۱۹۸۱ء میں چھپا اور دوسرا حصہ ان کے انتقال سے کچھ ہی پہلے شایع ہوا، ان کی ایک کتاب ''ذکر میر غلام احمد حسن'' ابھی زیرطبع ہے، ''کلیات'' اور ''تذکرہ حضرت شاہ سید بدرالدین عرف دادا حیات قلندر'' بھی ان کی تصانیف ہیں، دینی مدارس کی مسلم بچیوں کے نصاب کے لیے بہشتی زیور کا انتخاب مرتب کیا تھا اور عربی سکھانے کے لیے ''عربی سیکھئے'' لکھی، انگریزی میں کیٹلاگ آف عربک پرشین اینڈ اردو انسکرپشن آف سنٹرل انڈیا لکھی۔

ڈاکٹر صاحب کی مرتب کی ہوئی کتابوں میں ''جنگ نامہ شاہ دولہا رحمٰن غازی'' منظوم، تاریخ برار از عبدالرزاق ذاکر وغیرہ ہیں، حضرت پیر محمد شاہ لائبریری کے عربی، فارسی اور اردو مخطوطات کی جو چھ جلدیں شایع ہوئی ہیں، ان کے مرتبین میں ان کا نام بھی ہے، ان کی بعض کتابیں ابھی شایع نہیں ہوسکی ہیں جیسے آثار برار، ارادت خاں واضح اور مکتوبات شاہ غلام حسن ایلچ پوری۔

پروفیسر عبدالرحیم کو فارسی زبان و ادب کی نمایاں خدمات کے صلے میں صدر جمہوریہ کی جانب سے ایوارڈ بھی ملا تھا۔

انہیں علم و ادب اور تاریخ سے بڑا شغف تھا، برار کے علمی ورثے، وہاں کے علمی خانوادوں اور اشخاص و مقامات پر ان کی گہری نظر تھی، وہ خود بھی برار سے متعلق تحقیق و جستجو میں مصروف رہتے تھے اور دست یاب کتب کی ترتیب و تدوین کا کام دلچسپی سے انجام دیتے رہتے تھے اور اپنے تلامذہ کو بھی اس کی تلقین فرماتے رہتے تھے۔

مرحوم سے میری واقفیت ان کے مضامین کی وجہ سے تھی جو معارف میں چھپے، احمد آباد میں ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی مرحوم نے خاص طور سے ان سے ملایا اور پھر درگاہ پیر محمد شاہ کے سمیناروں میں برابر ان سے ملاقات ہوتی، جن میں وہ پابندی سے شریک ہوتے تھے، ڈاکٹر ڈیسائی ان سے بہت مانوس تھے اور وہ بھی ڈاکٹر صاحب کا بڑا اعزاز و اکرام کرتے تھے، سمینار کے مقالات کے جلسے نئے تعمیر شدہ ہال میں اوپر ہوتے تھے جہاں پہنچنے کے لیے کئی زینے طے کرنے پڑتے تھے، ایک دفعہ ضیاء الدین صاحب کا یہ پیام مجھے اوپر کے ہال میں ملا کہ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے میں صبح افتتاحی جلسے میں نہیں آسکا، معلوم ہوا کہ تم آئے ہو تو ملنے کے لیے آگیا مگر اوپر چڑھنا میرے بس میں نہیں، میں نیچے عبدالرحیم صاحب کے کمرے میں بیٹھا ہوں، اگر آجاتے تو ملاقات ہوجاتی، میں ان سے ملنے آیا تو دیکھا کہ عبدالرحیم صاحب بہت مودب اور سراپا نیاز بنے ڈیسائی صاحب کی ہر فرمایش پوری کررہے ہیں، میری جانب ڈیسائی صاحب کا التفات سوا دیکھ کر عبدالرحیم صاحب کا التفات بھی بہت بڑھ گیا تھا اور جب ملتے تو بڑے انشراح سے ملتے۔

پروفیسر عبدالرحیم صاحب ایک صوفی منش بزرگ تھے، شکل وصورت بڑی پاکیزہ اور نورانی تھی، چہرے بشرے سے تقدس، تقویٰ، خشیت، زہد، کثرت عبادت اور گداز قلب کا اندازہ ہوتا تھا، تبلیغی تحریک سے تعلق تھا، نماز اوراذکار کا بڑا اہتمام کرتے، فجر کی نماز کے لیے بہت پہلے مسجد جاتے اور تہجد و تلاوت میں مصروف رہتے، اخلاص، بے نفسی، سادگی، انکسار، تواضع، متانت اور کم سخنی ان کا طرۂ امتیاز تھا، اللہ تعالیٰ بہشت بریں میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل بخشے، آمین۔ (''ض''، مئی ۲۰۰۵ء)

صدیقی، امیر احمد

آہ جناب امیر احمد صدیقی

یہ خبر بھی بڑے افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ ۲۳/ مارچ کو مشہور ادبی ماہ نامہ ''نیا دور'' لکھنو کے سابق مدیر جناب امیر احمد صدیقی نشاط گنج میں اپنی رہایش گاہ پر وفات پاگئے، ان کا آبائی وطن لکھنو کے مضافات میں اجریاوں تھا، وہیں تدفین ہوئی، ان کی عمر ۸۲ سال تھی۔

وہ ۱۹۴۸ء میں محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش سے اس وقت منسلک ہوئے تھے جب جناب علی جواد زیدی، صباح الدین عمر، فرحت اللہ انصاری اور خورشید احمد صاحب اس سے وابستہ تھے، اب اس دور کی تنہا یہی یادگار رہ گئے تھے، آخر وہ بھی چل بسے۔

مرحوم مختلف وقتوں میں محکمہ اطلاعات میں افسر اطلاعات، فیچر رایٹر، جوائنٹ اڈیٹر، اڈیٹر نیا دور اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر اردو رہے اور اپنے رفقائے کار میں تنہا ان ہی کو ملازمت میں ڈھائی سال کی توسیع ملی تھی:

نیا دور ہی کے وسیلے سے ان سے میرے تعلقات کی ابتدا ہوئی، میں نے جب اس میں مضامین لکھنا شروع کیا تو اس وقت یہ اس کے جوائنٹ اور خورشید احمد صاحب چیف اڈیٹر تھے، مضامین کی وصولی کی رسید اکثر ان ہی کی جانب سے آتی تھی اور جب یہ اڈیٹر ہوئے تو برابر خط وکتابت رہتی اور فرمایش کرکے مضامین طلب کرتے تھے، امیر احمد صاحب کے دور ادارت کا اصلی امتیاز نیا دور کے خاص نمبر ہیں جو بڑی تعداد میں

نکلے اور بہت مقبول ہوئے، کئی خاص نمبروں میں ان ہی کے اصرار کی وجہ سے میں نے مضامین لکھے۔

کسی تقریب یا اردو اکیڈمی کے سیمناروں میں جاتا اور وہ موجود ہوتے تو بڑے تپاک سے ملتے، اپنے گھر بھی مدعو کرتے، ان کو معلوم ہوجاتا کہ میں آیا ہوں تو میری قیام گاہ کا پتہ لگا کر فون کرتے اور اپنے آفس بلاتے اور کہتے کہ گھر کے مقابلے میں یہاں آنا آسان ہے۔

صدیقی صاحب بہت خوش خط تھے، ان کی اردو اور انگریزی تحریریں بڑی خوش نما اور پاکیزہ ہوتی تھیں، انگریزی کی ڈرافٹنگ بہت اچھی کرتے تھے، آج کل دفاتر والے کئی کئی بار بلکہ کئی کئی دن دوڑائے بغیر کام نہیں کرتے مگر وہ ضرورت مندوں کے کام کرنے میں ٹال مٹول اور انہیں دق نہیں کرتے تھے، ادہر لوگوں سے ملتے جلتے اور باتیں بھی کرتے رہتے تھے اور اُدہر ضروری دفتری کام بھی نپٹاتے جاتے تھے، زبان اور املے کی غلطیاں ان کی نظر سے اوجھل نہیں رہتی تھیں، ''نیا دور'' میں تلاش کے باوجود مجھے کبھی کوئی غلطی نہیں ملتی تھی، ایک بار میں نے ان سے مذاقاً کہا کہ تصحیح کی مکمل کوشش کے باوجود معارف اور دارالمصنفین کی کتابوں میں غلطیاں رہ جاتی ہیں، آخر آپ کے پاس کون سا جادو منتر ہے، وہ ہمیں بھی بتادیجیے، تو خوب ہنستے رہے اور کہنے لگے اصلاحی صاحب اس جادو کا نام توجہ، غور، دھیان اور غلطیوں کی پرکھ کی صلاحیت ہے۔

ادہر بہت دنوں سے ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، اب اچانک اخبار میں ان کے انتقال کی خبر پڑھی تو بڑا صدمہ ہوا اور ان کا بھولا بھالا اور خلوص و محبت سے بھرا پیکر نظر کے سامنے پھرنے لگا، مرحوم بڑے خلیق، خاموش طبع اور منکسر المزاج تھے، ان کی زندگی تکلف و تصنع سے بری اور غرور و گھمنڈ کے شایبے سے پاک تھی، وہ اہل علم و ادب کے قدرداں، اپنی تہذیب اور اپنی زبان کے عاشق و شیدائی تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور اعزہ کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ (''ض''، مئی ۲۰۰۵ء)

حقی، ابرارالحق، مولانا شاہ

آہ! حضرت مولانا شاہ ابرارالحق حقیؒ

افسوس کہ مشہور عالم، مصلح و مربی مولانا شاہ ابرارالحق کا انتقال ہردوئی میں ۱۶/ مئی کی شب میں ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون، قریب ۹۰ سال کی عمر پائی، ان کی وفات سے دینی و علمی خصوصاً اصلاح و ارشاد کے حلقوں میں جو ماتم برپا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی رحلت سے قوم و ملت کو کس درجہ نقصان و حرمان کا احساس ہے۔

وہ حکیم الامت مولانا تھانویؒ کی بزم دوشیں کی آخری شمع تھے، مولانا تھانویؒ سے براہ راست اکتسابِ فیض کی نسبت ان کی دینی و اصلاحی خدمات کی عظمت و وسعت اور فیض یافتگان کی بے مثال کثرت میں ہمیشہ برکت کا سبب بنی رہی، مولانا تھانویؒ کے متعلق اہلِ دل کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے ان کے زمانے کے باصلاحیت لوگوں کو ان کے گرد جمع فرما دیا تھا''، اس کی تصدیق واقعتاً حضرت تھانویؒ کے سینکڑوں خلفا اور ہزاروں مریدوں کے جایزے سے ہوتی ہے جن میں ہر شخص آفتاب و ماہتاب تھا، مولانا ابرارالحق صاحب خانقاہ تھانہ بھون سے بیعت کی اجازت پانے والوں میں سب سے کم عمر تھے، مولانا تھانویؒ کی مشہور اصول پسندی اور صحبت و بیعت کی اجازت کے باب میں شدت احتیاط کے باوجود ایک نوعمر کو خلافت و اجازت عطا کیے جانے سے کم سن مرید کی صلاحیت و عظمت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں جس کی بعد کی زندگی کے ہر نقش نے ثابت کیا کہ نگاہ مرشد کیسی جوہر شناس تھی۔

مولانا ابرارالحق سے قبل ان کے والد ماجد مولوی محمود الحق حقی بھی مولانا تھانویؒ کے دست گرفتہ اور مجاز صحبت تھے، مولانا تھانویؒ نے ایک بار اپنے ملفوظات میں معاملات کو دین سے الگ سمجھنے اور رکھنے کی بابت فرمایا کہ ''لوگوں نے تو معاملات کو دین سے الگ ہی سمجھ لیا ہے حتیٰ کہ علما تقریریں کرتے ہیں، وعظ کرتے ہیں لوگوں کو دین کی تعلیم کرتے ہیں مگر کہیں معاملات کا ذکر نہیں آتا'' اس ضمن میں انہوں نے مولوی محمود الحق حقی کا حوالہ دیا کہ وہ ہردوئی سے آئے اور کہنے لگے ہیں آج کل تصانیف دیکھتا ہوں، ان میں نماز روزے کے تو مسائل ہوتے ہیں مگر معاملات کی صفائی کا ذکر نہیں، اس کی وجہ میری سمجھ میں یہی آتی ہے کہ جن کے معاملات خود صاف ہوں وہ دوسروں کو بھی تعلیم کرنے کی ہمت کرسکتے ہیں، آج کل کے لوگ جو دوسروں کو اس کی تعلیم نہیں کرتے تو اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ خود ان کے معاملات صاف نہیں، مولوی محمود الحق کی عقیدت اس سے بھی ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنی اہلیہ محترمہ کے اصرار کے علی الرغم صاحبزادہ ابرارالحق کی شادی حضرت تھانویؒ کی منشا و مرضی کے مطابق ڈاکٹر احمد علی شاہ کی صاحبزادی سے کردی۔

مولوی محمود الحق خود معاملات کی صفائی اور حقوق العباد کا خاص خیال رکھنے کے لیے شہرت رکھتے ہیں، وہ ایم اے او کالج کے تعلیم یافتہ اور ہردوئی کے مشہور اور کامیاب وکیل تھے، اپنے پیشے کی مصروفیت کے باوجود دینی اور فلاحی اور تعلیمی کاموں میں پیش پیش رہتے، انہوں نے ہردوئی میں انجمن اسلامیہ کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا تھا اور اسی وجہ سے وہ ہردوئی کے سرسید کہلاتے تھے، ایسے پاکیزہ ماحول میں مولانا ابرار الحق کی تربیت ہوئی، مولانا تھانویؒ ان کے گھر تشریف بھی لایا کرتے تھے، ۱۹۱۵ء میں ایک سفر میں مولانا تھانویؒ کے ایک مجاز بیعت شیخ ثامن علی سندیلوی کی پہلی ملاقات شیخ تھانویؒ سے یہیں ہوئی تھی، مولانا کے والد نے ہردوئی میں توطن اختیار کرلیا تھا، حالانکہ وہ میرٹھ میں پیدا ہوئے تھے لیکن مولانا ابرارالحق صاحب کا مستقل قیام یہیں تھا، ان کے

ایک خاص مقرب و مسترشد جناب مولانا تقی الدین ندوی مظاہری کا خیال ہے کہ ان کے خانوادہ کا تعلق شیراز ہند جون پور سے بھی تھا، مولانائے ہردوئی کا سلسلہ نسب حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ سے جاملتا ہے، حقی کی نسبت اسی سبب سے ہے۔

مولانا ابرارالحق کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہی ہوئی، اس کے بعد وہ مظاہر علوم سہارن پور میں داخل ہوئے، ان کے اساتذہ میں مولانا مفتی محمود حسن کا نام بھی ملتا ہے جو ان کے اور قاری صدیق احمد باندویؒ کے استاذ تھے، ان میں طالب علمی کے زمانے سے ہی سعادت اور صالحیت کے آثار نمایاں تھے اور مدرسہ کے طلبہ کے علاوہ اساتذہ بھی ان کے طرز اور طور طریق سے متاثر تھے، والد ماجد کے تعلق اور اس سے زیادہ اپنی طبعی اور ذہنی مناسبت کی وجہ سے وہ ہر ہفتے سہارن پور سے تھانہ بھون پابندی سے جاتے، خصوصاً تعطیل کی فرصت میں وہ اپنا سارا وقت خانقاہ تھانہ بھون ہی میں گزارتے، ان کے احوال ظاہری و باطنی اپنی جانب مولانا تھانوی کی توجہ اور عنایت کو مبذول کرانے میں بہت معاون ثابت ہوئے، ۱۹۴۳ء میں مولانا تھانوی کا جب انتقال ہوا تو ان کی عمر تیس سال کے قریب تھی اور اس وقت وہ مولانا تھانویؒ کی خلافت و اجازت سے سرفراز ہوچکے تھے، تعلیم سے فراغت کے بعد وہ درس و تدریس کی خدمت میں مصروف ہوگئے اور اس کا آغاز فتح پور ہنسوہ کے مدرسہ اسلامیہ سے ہوا اور ایک روایت کے مطابق ان کو نامہ خلافت یہیں ملا تھا لیکن ان کی تمام دینی، اصلاحی اور تعلیمی سرگرمی کا مرکز ان کا آبائی وطن ہردوئی ہی رہا، یہیں انہوں نے مدرسہ اشرف المدارس کی بنیاد رکھی اور بعد میں اس مجلس دعوۃ الحق کا احیا کیا جو اصلاً ان کے پیرومرشد کی قائم کردہ تھی، اللہ تعالیٰ نے تقوی کی بنیاد پر قائم ان اداروں کو غیر معمولی مقبولیت عطا کی، مدرسہ کی شہرت ملک گیر ہوئی اور مجلس کے اثرات خیر تو عالم گیر ہوئے، قرآن مجید کی تلاوت و تجوید میں صحت کا نہایت التزام ان کے مدرسے کا امتیاز تھا، مولانا کی تعلیمی و اصلاحی کاوشوں میں قرآن مجید سے تعلق اور تلاوت سے تفہیم تک ہر مرحلے پر خاص اہتمام سب سے نمایاں ہے اور اس تعلق بلکہ شیفتگی کا سررشتہ بھی حضرت تھانویؒ سے ملتا نظر آتا ہے جن کے حسن صوت اور فن تجوید میں مہارت سے وابستگان تھانہ بھون ناآشنا نہیں اور جو قرآن مجید کے ترجمے کو محقق استاذ کے ذریعہ اور بغیر کسی تفسیر کی مدد کے براہ راست پڑھنے کو مستقل مقصود قرار دیتے تھے، مولانا ابرارالحق نے عام اور مروجہ نورانی قاعدہ کو اسی لیے بڑی اہمیت دی، اس میں چند اصلاحات بھی فرمائیں، بنیاد پر اس قدر توجہ دینے کا ثمرہ یہ ہوا کہ ان کے مدرسہ کے فارغین اب اس باب میں بجائے خود سند کا درجہ رکھتے ہیں، قرآن مجید کے غیر معمولی اہتمام کے بعد شریعت و سنت کی حفاظت اور تتبع، حیات ابرار کا سب سے نمایاں باب ہے، انہوں نے کثرت سے سفر کیے، ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگوں نے ان سے فیض حاصل کیا، مریدین و مرشدین کی اس درجہ کثرت کی مثال کم ہی نظر آئے گی، سنت کی اس قدر پاسداری اور اس کی ترویج و اشاعت کی فکر کا سرچشمہ بھی دراصل مولانا تھانویؒ کا وہ معمل ہے جہاں ساری توجہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت و اطاعت پر تھی اور جہاں سنت کی کامل پیروی کا نسخۂ کیمیا بڑی حکمت سے تیار کیا جاتا تھا، مولانائے ہردوئی کی صفات میں وقت کی اہمیت، نظافت و نفاست، اصول وضوابط کی شدت اور علما کی قدر و منزلت کا خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے اور یہی محاسن سوانح حکیم الامت کے بھی روشن عناوین ہیں اپنے شیخ کا ایسا عکس جمیل خود مرید کی شفافیت کی دلیل ہے اور اصلاً یہ مصلح اعظم اور دانا و مولائے کل ﷺ کا اعجاز فیض ہے جو سیرت طیبہ اور سنتِ کاملہ کے ہر جویائے صادق کے لیے ہمیشہ جاری و ساری ہے، اولیا اللہ کی قرآنی پہچان یہی ہے کہ وہ ایمان اور تقوی یعنی عمل صالح کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ مولانائے ہردوئی کے بارے میں یہ شہادت ایک خلقت کی زبان سے ادا ہورہی ہے اس لیے اس یقین میں شک نہیں کہ جس طرح حیات دینوی میں بشری کی نعمت ان کے لیے ظاہر ہوئی، حیات اخروی میں بھی یہ بشارت و مژدہ ان کے لیے ہے، وما عنداللہ خیر للا برار۔ [النساء:۱۹۸]

("ع۔ص"، جون ۲۰۰۵ء)

سلیمان سیٹھ، ابراہیم، الحاج

الحاج ابراہیم سلیمان سیٹھ

افسوس ہے کہ الحاج ابراہیم سلیمان سیٹھ ۲۷/اپریل کو دل کا دورہ پڑنے سے بنگلور میں وفات پاگئے اور وہیں ۲۸/اپریل کو ان کی تدفین ہوئی، اس وقت مسلمانوں کے جو گنے چنے سیاسی قاید اور ملی رہنما رہ گئے تھے، ان میں ابراہیم سلیمان بڑے مخلص اور قدآور تھے۔

تقسیم ہند کے بعد جب پورے ملک میں مسلمان شکستہ خاطر اور پست حوصلہ ہورہے تھے تو اس وقت الحاج مولوی محمد اسماعیل مرحوم نے انڈین یونین مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی اور مصالح و حالات کے تقاضے سے اس کا دائرۂ عمل کیرالا تک محدود رکھا، بعد میں دوسرے صوبوں میں بھی اس کو وسعت دینے کی کوشش کی گئی مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی تاہم کیرالا میں انڈین یونین مسلم لیگ نے مسلمانوں کی ہمت و حوصلہ بلند کیا اور ان کا وزن و وقار باقی رکھا، یہاں اس کا زور و اثر اتنا بڑھا کہ کوئی حکومت اس کے اشتراک کے بغیر نہیں چل سکتی۔

الحاج ابراہیم سلیمان سیٹھ شروع ہی سے مولوی محمد اسماعیل مرحوم کے معتمد اور قریب ترین رفیق تھے، ان کی زندگی ہی میں سیٹھ صاحب مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری ہوگئے تھے اور ان کی وفات کے بعد اس کی مسند صدارت کو رونق بخشی، ان کی قیادت میں مسلم لیگ بڑی متحرک اور سرگرم رہی، اس کی کامیابی اور اترپردیش میں مسلم مسائل

سے کانگریس کی سرد مہری اور متعصّبانہ رویہ دیکھ کر مرحوم ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کو یہاں بھی مسلم مجلس قائم کرنے کا خیال ہوا لیکن ڈاکٹر صاحب کی بے وقت موت، اترپردیش کے سیاسی حالات کی پیچیدگی اور خود مسلم مجلس کی تقسیم در تقسیم کی وجہ سے مسلم مجلس کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکی۔

یہ مسلمانوں کی بڑی بدنصیبی ہے کہ جب ان کی کوئی تنظیم برگ و بار لاتی ہے تو وہ اپنوں کے عدم اخلاص و انشقاق اور اغیار کی سازشوں سے متفرق اور پراگندہ ہوجاتی ہے، سیٹھ صاحب جیسے مخلص اور بے لوث رہنما کو بھی آخر عمر میں یہی صدمہ اٹھانا پڑا اور وہ انڈین نیشنل لیگ قائم کرنے کے لیے مجبور ہوئے جس کے تاعمر وہی صدر رہے۔

ابراہیم سلیمان سیٹھ کے تعلقات اختلاف کے باوجود کانگریس کے لوگوں سے اچھے تھے اور وہ بھی سیٹھ صاحب کو سچا محبّ وطن سمجھتے تھے مگر ۱۹۹۲ء میں جب بابری مسجد کا انہدام ہوا تو وہ کانگریس سے سخت متنفر ہوگئے اور جب وزیراعظم نرسمہاراؤ کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش ہوئی تو مسلم لیگ کے ایک گروہ نے ووٹنگ میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کیا مگر سیٹھ صاحب نے حکومت کے خلاف ووٹ دیا، ان کی ایمانی حمیت اور ملی غیرت اصولوں اور مسلم مفادات پر کبھی کوئی سمجھوتا کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوئی، ان کی پوری پارلیمانی زندگی مسلمانوں کے آئینی و دستوری حقوق و مفادات کے تحفظ میں گزری، صاف گوئی اور حق گوئی ان کا طرۂ امتیاز تھا، وہ ایک جری اور بے باک قاید تھے، پارلیمنٹ میں مسلم مسائل اور مسلمانوں کے خلاف ہونے والی ناانصافیوں پر ہمیشہ نہایت پرزور آواز بلند کرتے رہے۔

ان کی پارلیمانی زندگی کا آغاز راجیہ سبھا کی ممبری سے ہوا، پھر وہ مسلسل سات آٹھ بار لوک سبھا کے لیے منتخب ہوتے رہے جو اپنے آپ میں ایک مثال اور سیٹھ صاحب کی مقبولیت کا ثبوت ہے، وہ مسلمانوں کی مختلف دینی، ملی اور سماجی اداروں اور تنظیموں کے متحرک اور فعال رکن تھے، اپنی طویل سیاسی، سماجی اور ملی خدمات کی وجہ سے پورے ملک اور خاص طور پر کیرالا میں بڑی قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

ان سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی مرحوم کے ساتھ مسلم مجلس کے تعارف و توسیع کے لیے اترپردیش کا دورہ کرتے ہوئے دارالمصنفین اعظم گڑھ تشریف لائے، دوسری بار ان کا دورہ مسلم لیگ کی شاخیں قائم کرنے کے لیے ہوا تو اعظم گڑھ بھی آئے اور شہر میں جلسہ عام ہوا لیکن پریس کانفرنس کا پروگرام دارالمصنفین میں تھا، اس وقت ان کے زورتقریر، حاضر جوابی، قوم و وطن اور مسلمانوں کے مسائل سے ان کی گہری واقفیت اور سیاسی سوجھ بوجھ کا پورا اندازہ ہوا، تیسری بار ۱۹۹۲ء میں حج بیت اللہ میں ان کا ساتھ ہوا، رابطہ عالم اسلامی کی دعوت پر یہ سفر ہوا اور مسجد خیف کے پاس پہاڑی پر رابطہ کے منیٰ میں ان کے ساتھ ہی مقیم تھا، یہاں شب و روز ان کا ساتھ رہا، نمازوں، ارکان حج کی ادائیگی اور کھانے پینے میں برابر ساتھ رہتا، وہ بڑھاپے میں ہم لوگوں سے زیادہ چاق و چوبند اور عبادت میں مستعد تھے، اخباری نمائندے اور ریڈیو والے آتے اور فرداً فرداً سب سے سوالات کرتے، ہم لوگ اپنی جان بچانے کے لیے سیٹھ صاحب کو آگے کردیتے، مکہ میں مقیم کیرالا کے مختلف طبقوں کے لوگ بھی بڑی تعداد مین ان سے ملنے اور ان کے سیاسی اثر و رسوخ کی وجہ سے اپنے نجی معاملات میں مدد کے طالب ہوتے، اس سے بھی ان کی مقبولیت کا پتا چلتا تھے۔

سیٹھ صاحب بڑے باغ و بہار، شگفتہ مزاج اور بے تکلف شخص تھے، اس سفر میں ان کی ایمانی و ملی حمیت و غیرت، شرافت، دردمندی، حسن خلق، منکسر المزاجی، ایثار اور اخلاص کے جو جلوے دیکھے ان کی چمک سے دل اب تک روشن اور گرم ہے، ان کی وفات سے ملی و سیاسی میدان میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پُر ہونا مشکل ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ملک و قوم کو ان کا بدل عطا کرے، آمین۔ (''ض''، جولائی ۲۰۰۵ء)

ندوی، شرف عالم، مولانا شاہ

مولانا شاہ شرف عالم ندوی

۳؍جون کو مولانا سید علی احمد شاہ شرف عالم ندوی نے داعی اجل کو لبیک کہا وہ خانقاہ پیردمڑیا خلیفہ باغ بھاگل پور کے سجادہ نشین تھے، ۸؍ مارچ ۱۹۲۶ء کو اپنے ننہال لکھنو میں پیدا ہوئے، آبائی وطن بھاگل پور میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور قرآن مجید حفظ کیا، دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنو سے علوم عربیہ کی تحصیل کی، اس کی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے، میری ان کی ملاقات یہیں ہوتی تھی، ان کے ساتھ ایک جم غفیر ہوتا تھا، وہ دارالمصنفین کے قدرداں اور معارف کے خریدار تھے، قرآن مجید اچھا پڑھتے تھے، خانقاہ کی مسجد میں امامت اور رمضان میں قرآن سناتے تھے، مریدین کی اصلاح و تربیت پر پوری توجہ دیتے، طبیعت میں اعتدال تھا، ہر شخص سے بشاشت سے ملتے تھے، اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ (''ض''۔ جولائی ۲۰۰۵ء)

فہد بن عبدالعزیز، ملک

آہ! پاسبان حرم ملک فہد

یکم اگست کو دنیائے اسلام پر یہ خبر بجلی بن کر گری کہ ملک فہد بن عبدالعزیز سعودی حکومت کا تاج و تخت چھوڑ کر اس ملک الملوک کی بارگاہ کبریا میں پہنچ گئے جس کے ملک و سلطنت کو کبھی زوال نہ ہوگا اور وہ ہمیشہ قائم و باقی رہے گا، **کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام**۔ [الرحمٰن: ۲۶-۲۷]

وہ ۱۹۹۵ء ہی سے بیمار چل رہے تھے، ان کی معذوری کی وجہ سے حکومت کا

کاروبار بڑی حد تک ان کے بھائی اور ولی عہد عبداللہ بن عبدالعزیز انجام دینے لگے تھے، اس سال ملک فہد کی بیماری نے شدت اختیار کرلی تو ۲۷/مئی ۲۰۰۵ء کو ریاض کے خاص شاہ فیصل اسپتال میں علاج کے لیے داخل ہوئے، مرض میں تخفیف و اضافہ ہوتا رہتا تھا، آخر یکم اگست بروز دوشنبہ داعی اجل کا پیغام آگیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

عالم اسلام اور پوری دنیا کے مسلمان ان کے انتقال سے غم زدہ اور سوگوار ہیں، ان کی ذات بڑی فیض بخش تھی، اوران کے دریائے کرم اور جودوسخا کی بارش عام تھی، اس لیے ان کے غم میں سب کی آنکھیں اشک بار ہیں، ع عمت فواضلہ فعم مصابہ

اب ان کے بھائی عبدالعزیز نے حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی ہے، اور لوگوں نے ان سے بیعت کرلی ہے، انہوں نے اپنے بھائی سلطان بن عبدالعزیز کو ولی عہد مقرر کیا ہے جو اس وقت تک دفاع اور سیاحت کے وزیر تھے، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی بھاری ذمہ داری اٹھانے کی قوت دے اور ان کی مدد کرے، ملک فہد کی تدفین منگل کے روز ۲/ اگست کو ہوئی جس میں دنیا کے اکثر ملکوں کے سربراہوں اور نمائندوں نے شرکت کی، ہندوستان سے بھی ایک وفد جنازے میں شریک ہوا تھا۔

ملک فہد ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے، ۲۷ برس کی عمر میں حکومت کے بعض عہدے اور ذمہ داریاں ان کو سپرد کی گئیں، ۱۹۵۳ء میں انہیں سعودی عرب کا پہلا وزیر تعلیم بنایا گیا، اس سے پہلے ملک کی تعلیمی حالت بہتر نہیں تھی، انہوں نے ہمہ گیر نظام تعلیم قائم کر کے اپنی غیر معمولی لیاقت و قابلیت اور خوش انتظامی کا ثبوت دیا، محکمہ تعلیم میں متعدد اصلاحات کیں، تعلیم کو فروغ دیا، عصری اور پروفیشنل تعلیم کو رواج دیا، جن سے دوسرے ممالک کے طلبہ بھی مستفید ہورہے ہیں، پہلے درس گاہوں کی تعداد بہت کم تھی، ان کے دور میں ۷ یونیورسٹیاں ۸۳ کالج اور ۱۸ ہزار اسکول قائم ہوئے، جن میں ۳۵ لاکھ طلبہ تعلیم پارہے ہیں، شہروں کی طرح دیہاتوں کے لوگوں کو بھی زیور تعلیم سے آراستہ کیا۔

۱۹۶۲ء میں انہیں وزارت داخلہ سپرد کی گئی، ۱۹۷۵ء میں ملک فیصل کے بے رحمانہ قتل کے بعد جب ملک خالد سربراہ مملکت ہوئے تو یہ ولی عہد مقرر کئے گئے ۱۹۸۲ء میں ملک خالد کی وفات کے بعد ملک کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں آگئی، ڈپٹی پرائم منسٹر بھی رہے، بیچ بیچ میں وزارت کی ذمہ داریاں بھی انجام دیں اور بعض ملکوں میں ہونے والی تقریبات اور میٹنگوں میں سعودی عرب کی نمائندگی کی۔

ملک فہد کی حکومت کے زمانے میں سعودی عرب تیل کی دولت سے مالا مال تھا، انہوں نے اس کے اور بعض دوسرے رونما ہونے والے واقعات اور پیچیدہ مسائل کی گتھیاں ہوش مندی اور تدبیر سے سلجھائیں، ان کے دور میں ملک میں خوش حالی آئی، تعمیر وترقی اور رفاہ عام کے گوناگوں کام انجام پائے، سفر کی سہولت کے لیے وسیع اور کشادہ سڑکوں کا جال بچھا دیا، ٹریفک کی وجہ سے زمین دوز راستے اور سرنگیں تعمیر کرائیں، عرب جیسے بے آب و گیاہ ملک میں بجلی اور پانی کی ایسی فراوانی ہے کہ ہندوستان میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، ٹرانسپورٹ اور مواصلات کا نظام بہتر سے بہتر کرادیا، علاج کے لیے شفاخانے تعمیر کرائے، ملک کی معیشت کو ٹھوس اور بہتر بنانے کے لیے متعدد مفید اقدامات کئے، کرنسی کو گرنے اور افراط زر کا اثر نہیں آنے دیا، انڈسٹریاں قائم کیں، بینکنگ سسٹم کو رائج کیا، زراعت وتجارت کو فروغ دیا، تیل کی پیداوار میں اضافہ کیا، ملک کو خوش حال، ترقی یافتہ، پرامن اور فلاحی اسٹیٹ بنانے کے لیے مختلف منصوبے اور اسکیمیں بنائیں، اس کا دفاعی اور حفاظتی نظام مستحکم کیا، شہروں کی تزیین و آرائش کا اہتمام کیا، جدہ کو بہت خوبصورت شہر اور ایسا مارکیٹ بنایا جہاں ضرورت کی ہر چیز مناسب قیمت پرمل سکتی ہے، غرض سعودی عرب کو مشرقِ وسطیٰ کا سب سے ترقی یافتہ اور جدید طرز کا ملک بنانے کی ہر ممکن کوشش کی۔

ملک فہد کا سب سے زریں کارنامہ حرمین شریفین کی تعمیر میں توسیع وتزیین ہے، حرم کی توسیع دوبارہ کراچکے تھے، اور اب تیسری بار بھی ان ہی کے حکم سے توسیع کا کام شروع ہوا ہے، حرمین کی صفائی، ستھرائی اور نظافت کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ کہیں ایک تنکا بھی نظر نہیں آتا، حجاج کو راحت وسہولت بہم پہنچانے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھتے تھے، ان کی سہولت کے لیے قرآن مجید کے نسخے اور ٹھنڈے آبِ زمزم کے برتن مناسب جگہوں پر بڑے سلیقے سے رکھے ہوئے ہیں، عالم اسلام کے بہت سارے لوگوں کو سعودی عربیہ اور اس کے مختلف اداروں کی جانب سے حج کرانے کے لیے مدعو کرتے اور انہیں اپنا میزبان بناتے، اکثر ممتاز لوگوں کی ضیافت شاہی محل میں کراتے اور انہیں ملاقات کا شرف بخشتے۔

ملک فہد کا ایک بڑا کارنامہ قرآن مجید کے نسخوں کی عمدہ اور خوب صورت طباعت اور مختلف زبانوں میں ان کے ترجموں کی اشاعت ہے، جن کو ہر ہر ملک میں تقسیم کرانے کا اہتمام کیا، خوب صورت اور پاکیزہ مسجدیں بھی پورے سعودی عرب اور بلاد اسلامیہ میں تعمیر کرائیں، ان کی توجہ سے خاص طور پر مغربی ملکوں میں اذانوں کی آوازیں گونجنے لگیں، مغربی ملکوں اور اکثر دوسرے ملکوں کے مدارس کی وہی سرپرستی فرماتے تھے، اور ان کے اخراجات کے متکفل ہوتے تھے، دنیا کا کوئی ملک قدرتی آفات میں مبتلا ہوتا تھا تو وہ اس کی دل کھول کر مدد کرتے تھے، خدمت خلق میں ان کو لطف ملتا تھا، نہ صرف سعودی عرب بلکہ دنیا بھر کے ملکوں کے غریب اور نادار مسلمانوں کے لیے ان کا دریائے کرم ہمیشہ بہتا رہتا تھا۔

ملک فہد پر آئندہ کتابیں لکھی جائیں گی تو ان کی سیرت وکردار کی عظمت اور تدین اور پاک بازی کے جلوے بھی سامنے آئیں گے، حکومت کے ذمہ دارانہ عہدوں پر فائز ہونے سے پہلے ممکن ہے ان میں شاہانہ خوبو رہی ہو مگر حکومت کا کاروبار سنبھالنے

کے بعد شاہانہ جاہ و جلال اور رعونت کا کوئی اثر ان کی زندگی میں نہیں دکھائی دیتا، وہ نہایت متواضع اور عجز و انکسار کے خوگر تھے، اپنے کو خادم الحرمین الشریفین کہلانا پسند کرتے تھے، عام بادشاہوں کی طرح ان میں مطلق العنانی بالکل نہیں تھی، صرف مملکت کی فلاح و بہبود، سعودی عرب کے عوام کی خدمت اور نفع رسانی اور دنیا بھر کے مسلمانوں کی امداد و اعانت ان کے پیش نظر رہتی تھی، وفات کے بعد بھی ان کا کوئی سوگ نہیں منایا گیا، معمولی آدمیوں کی طرح عام قبرستان میں دفن کئے گئے۔

ملک فہد اور آل سعود دین داری، عقاید کی پختگی، تصور توحید کی صحت، کفر و شرک کی بیزاری اور بدعات و محدثات سے اجتناب کے لیے مشہور ہیں، محمد بن سعود کا تعلق مشہور مصلح و داعی شیخ عبدالوہاب نجدی سے تھا، شیخ نے جس زمانے میں توحید خالص اور احیائے سنت کی تحریک شروع کی، اس زمانے میں نجد کے امیر محمد بن سعود تھے، انہوں نے شیخ کی اصلاحی تحریک کا پورا ساتھ دیا اور جب تمام عرب ان کے زیر اقتدار آگیا تو توحید خالص اور دین صحیح کا وہاں غلغلہ مچ گیا، شرک و بدعت کے تمام مظاہر و علامات مٹادی گئیں، پختہ قبریں منہدم کردی گئیں، اور اب سعودی حکم رانوں اور دوسرے بڑے لوگوں کی قبریں بھی سادے انداز کی بنائی جانے لگیں، چنانچہ ملک فہد بھی عام قبرستان میں دفن کئے گئے۔

سیاسی محاذ پر بھی ان کی حکمت عملی اور سیاسی بصیرت سے ان کے پورے ملک کو فائدہ پہنچا اور بعض مشکل مسائل کو حل کرنے میں وہ کامیاب رہے، عرب و اسرائیل اختلافات ختم کرانے اور فلسطین کا قضیہ حل کرانے میں انہوں نے بڑی جدوجہد کی، کویت کو عراق کے جارحانہ قبضے سے آزاد کرانے میں ان کا حصہ بہت نمایاں تھا۔

ملک فہد کے زمانے میں عراق و ایران کی برادرانہ جنگ کا جس میں امریکہ ہی کا ہاتھ بتایا جاتا ہے، بعد از خرابی بسیار اختتام ہوا، اس میں سعودی عرب اور بعض دوسرے عرب ملکوں نے دل کھول کر عراق کی مدد کی تھی، جس کا صلہ صدام حسین نے یہ دیا کہ کویت پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کرلینا چاہا جس کو امریکہ نے ناکام کردیا تھا، لیکن اب عراق کا خطرہ مستقل ہوگیا تھا، اس کی وجہ سے سعودی عرب کو ارض مقدس میں امریکی افواج کے قیام کی اجازت دینے کے لیے مجبور ہونا پڑا، اس کی اس مہمان پروری کا نتیجہ یہ نکلا کہ ع جو بلا باہر سے آئی وہ مقامی ہوگئی۔

یہ دنیا کے مسلمانوں کی خلش اور بے چینی کا باعث ہوئی، ان کے خیال میں تثلیث کے فرزندوں نے میراث خلیل کو ہتھیا لینے کے لیے یہ سازش رچی ہے، اس کے بعد ہی سے القاعدہ اور اسامہ بن لادن کا نام دفعتہً سنائی دینے لگا، نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی کوئی حقیقت بھی ہے یا میڈیا کے بل بوتے پر ان کی حقیقت تسلیم کرائی جارہی ہے تاکہ مسلم ممالک کو ایک ایک کر کے تاراج کردیا جائے چنانچہ دو مسلم ملکوں کو زیر و زبر کرنے کے بعد اب ''امن عالم'' کے سب سے بڑے ٹھیکہ دار کے نشانے پر تیسرا اسلامی ملک آگیا ہے۔

ابھی تک سعودی عرب امریکی دست درازی اور تعدی سے محفوظ ہے، لیکن یہ عارضی ہے یا پایدار یہ تو وقت بتائے گا، مگر دفاع و تحفظ کے نام پر امریکی فوجوں کی موجودگی ایک مستقل مسئلہ بن گیا ہے، جس کا اثر خاص طور پر مملکت کی معیشت پر دکھائی دیتا ہے، اخراجات اتنے بڑھتے جارہے ہیں کہ عوامی مفاد کے بہت سے ضروری اور ترقیاتی کام اور رعایتیں ختم کردی گئی ہیں، ملک و بیرون ملک کے مختلف نوعیّتوں کے کام انجام دینے والوں کی تعداد میں تخفیف ہوتی جارہی ہے، اس کی وجہ سے امریکی افواج کی موجودگی کو نہ عرب عوام نے پسند کیا اور نہ دنیا کے مسلمانوں نے ان کی ناراضگی اور بے چینی کا اظہار بھی وقتاً فوقتاً ہوا ہے، وہ خود بھی امریکہ کے بڑھتے ہوئے اثر کو ناپسند کرتے تھے، اس نے افغانستان اور عراق کو تہس نہس کر کے جس طرح وہاں اپنا مستقل مسکن بنالیا ہے اور عراق کے تیل کے کنوؤں پر اپنا پنجہ گاڑ دیا ہے، اس سے وہ گھٹن محسوس کرتے تھے، امریکہ دونوں ملکوں میں شیعہ سنی اختلافات بھڑکا کر اور دوسرے گروہوں میں بھی انتشار پیدا کر کے وہاں اپنی فوجوں کے قیام کی گنجائش نکالے ہوئے ہے، یہ سب شاہ کی طبیعت پر بھی بار بن گیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ امریکہ کے خلاف عراق و افغانستان میں جو نفرت اور بیزاری پائی جاتی ہے یا وہاں کے لوگ جس تشدد پر آمادہ دکھائی دیتے ہیں اس کے ختم ہونے کی صورت یہی ہے کہ امریکہ اپنی جارحیت سے باز آئے اور عراق و ایران اور مسلم ملکوں سے اپنی فوجیں واپس بلالے اور انہیں آزادی اور اپنی مرضی سے رہنے دے۔

تاہم فرماں روائے عرب اور پاسبان حرم کی وفات دنیا کا بڑا حادثہ اور امت مسلمہ کا سخت خسارہ ہے، ان کی دینی و اصلاحی خدمات گوناگوں تھیں، وہ قرآن مجید کے خادم اور متبع سنت تھے، ان کو دین و شریعت کے نفاذ، کتاب و سنت کی نشر و اشاعت، علم دوستی، علما نوازی، خدمتِ خلق، غربا پروری اور اہل اسلام کی ہم دردی و اعانت کے لیے ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل دے، سعودی عرب اور دنیائے اسلام کو ان کا بدل عطا کرے، ارض حرم کو محفوظ رکھے اور ملک فہد پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے۔ اللھم صبب علیه شآبیب ورحمتک واغفرله۔ (''ض''، ستمبر ۲۰۰۵ء)

زکریا، رفیق، ڈاکٹر

آہ! ڈاکٹر رفیق زکریا

افسوس ہے کہ ۹؍ جولائی کو ڈاکٹر رفیق زکریا نے ممبئی میں داعی اجل کو لبیک کہا،

انا لله وانا الیہ راجعون۔ وہ مشہور عالم، دانشور اور ممتاز مصنف اور اسکالر تھے، ان کا شمار مسلمانوں کے لائق، قابل، صاحب کمال مدبر اور عالی دماغ لوگوں میں ہوتا تھا، وہ بڑے غور وفکر کے بعد بالغ نظری سے حالات و واقعات اور مسائل کا تجزیہ کر کے صحیح رخ اور سمت کا تعین کرتے تھے، ان کے استنباط اور بحث کے نتائج سے اختلاف کرنے والے بھی ان کی بصیرت، دیدہ وری، دقت نظر اور باخبری کا اعتراف کرتے تھے، ان کی وفات کے بعد ان کا خلا شدت سے محسوس کیا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر رفیق زکریا پر دل کا شدید دورہ پڑا تھا، جس سے سخت بے چینی اور سینے اور کمر میں بڑی تکلیف تھی، ابھی اسپتال لے جانے کی تیاری ہی ہو رہی تھی کہ وقت موعود آ گیا، ان کا آبائی وطن اورنگ آباد تھا، یہاں وہ اپریل ۱۹۲۶ء میں پیدا ہوئے تھے، یہ تقسیم سے پہلے ریاست حیدرآباد کا حصہ تھا، لسانی جارحیت اور اردو دشمنی نے ریاست حیدرآباد کے تمام اضلاع کو انڈین یونین کی کئی ریاستوں میں اس طرح منقسم کر دیا کہ اردو کا کوئی مخصوص علاقہ نہ بننے پائے، چنانچہ اورنگ آباد اب مہاراشٹر میں شامل ہے، مرحوم کو ان کی وصیت کے مطابق یہیں ان کے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔

اورنگ آباد میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ممبئی یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور چانسلر گولڈ میڈل حاصل کیا، ڈاکٹریٹ کی ڈگری لندن یونیورسٹی سے حاصل کی اور بارایٹ لا لنکنز ان سے کیا، واپس آ کر وکالت شروع کی، طالب علمی ہی کے زمانے میں سیاست کی خارزار سے الجھ گئے اور طلبہ کے لیڈر بن کر ابھرے، ۱۹۴۲ء میں ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک میں طلبہ کی قیادت کی اور گرفتار کئے گئے، پھر باقاعدہ کانگریس میں شامل ہوئے اور سرگرم سیاست میں حصہ لیا، اس کے ٹکٹ پر اورنگ آباد سے برابر صوبائی اسمبلی کے ممبر ہوتے رہے، ۲۵ برس تک مہاراشٹر کابینہ کے رکن اور مختلف وزارتوں پر فائز ہوئے، چار برس تک راجیہ سبھا کے ڈپٹی چیرمین رہے، اپنی خداداد قوت گویائی، سیاسی بصیرت اور اصابت رائے کی بنا پر کئی بار اقوام متحدہ میں ہندوستان کی نمائندگی کی۔

ڈاکٹر رفیق زکریا لکھنے پڑھنے میں اچھے اور مطالعہ کے شوقین تھے، قومی، سیاسی اور سماجی سرگرمیاں ان کے مطالعہ وتحقیق میں مانع نہیں ہوئیں اور صحافت، علم وادب اور مطالعہ سے ان کا اشتغال قائم رہا، آخر میں سیاست کے گرتے ہوئے معیار اور اس میں بڑھتی ہوئی بدعنوانی دیکھ کر وہ سرگرم سیاسی زندگی سے کنارہ کشی کر کے علمی وتحقیقی کاموں ہی کے لیے وقف ہو گئے اور ان کی تصانیف اور عالمانہ مقالے اصحاب نظر سے خراج تحسین وصول کرنے لگے۔

ڈاکٹر رفیق زکریا کی شناخت ایک سیکولر اور روشن خیال مسلمان صاحب علم ونظر کی ہے، وہ واقعات وحالات کو ان کے اصل پس منظر میں دیکھنے کے عادی تھے، ان کی بحث ونظر کا انداز معروضی ہوتا تھا، وہ جب اہل مغرب اور متعصب ہندوستانی مورخین کو اسلام اور مسلمانوں کی غلط ترجمانی اور اصل رنگ میں پیش نہ کرنے کا جواب دیتے اور صحیح پس منظر سامنے لا کر اسلامی کی اصلی اور حقیقی تصویر پیش کرتے تو کہا جاتا کہ انہوں نے جنت میں اپنی جگہ بنالی، چنانچہ رسوائے زمانہ سلمان رشدی کا ناول ''شیطانی آیات'' شایع ہوا، جس میں واقعات کو توڑ مروڑ کر رسول اکرم ﷺ اور ازواج مطہرات کی شان میں نہایت بے ہودہ اور نازیبا باتیں کہی گئی ہیں تو ڈاکٹر صاحب نے خالص علمی اور معروضی انداز میں اس کا نہایت مدلل جواب ''محمد اور قرآن'' کے نام سے لکھا، اور رشدی کے پیش کردہ واقعات ونتائج کو اصل ماخذ سے مقابلہ کر کے اس کے جعل و فریب کا پردہ چاک کر دیا، اسی طرح انہوں نے اقبال کو فرقہ پرست کہنے والوں کا بہت مدلل اور عالمانہ جواب دیا۔

اس طرح کی کتابوں کی وجہ سے وہ اسلامی اسکالر اور اسلامیات کے ماہر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں اور کچھ لوگ ان کی بڑی قدر ومنزلت کرتے ہیں، لیکن جب وہ گزشتہ صدی میں مسلمانوں کی قومی وملی فکر اور تحریکوں اور سیاسی زندگی کے نشیب وفراز کے جائزے کو اپنا موضوع بناتے ہیں اور مسلمانوں کی سیاسی و قومی زندگی کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی نشان دہی کرتے ہیں تو مسلمانوں کا وہ طبقہ جس کی گہری نظر گزشتہ حالات و مسائل پر نہیں ہے، اور جو حقایق و واقعات سے قطع نظر کر کے محض جذباتی انداز میں بحث وتجزیہ کا عادی ہے، وہ ڈاکٹر صاحب کو تجدد پسند قرار دے کر ان کی تنقیص کرتا ہے اور ان کی باتوں کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا، مثلاً ۱۹۹۶ء میں آل انڈیا ریڈیو کی دعوت پر ''سردار پٹیل اور ہندوستانی مسلمان'' کے عنوان سے انہوں نے دہلی کے نیشنل میوزیم آڈیٹوریم میں جو لکچر دیئے اور جن کا اردو ترجمہ بھی چھپ گیا ہے تو اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا، کیوں کہ سردار پٹیل کی زیادہ شہرت مسلم دشمن کی ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب نے اپنے منطقی ومعروضی انداز میں ان کی تصویر کے دونوں رخ پیش کئے ہیں، انہوں نے جہاں یہ دکھایا ہے کہ سردار پٹیل نے بہت سے کام مسلمانوں کے مفاد میں کئے ہیں، وہ تحریک خلافت کے حامی تھے، بابری مسجد کے معاملے میں ان کا رویہ فرقہ پرستانہ نہیں تھا، لیکن جب دوسرا پہلو بیان کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے معاملے میں ان کا موقف سخت تھا، وہ ان پر طعنہ زنی کرتے تھے، کانگریس کا ساتھ نہ دینے کو ناقابل معافی سمجھتے تھے، مسلم لیڈروں سے بے تکے سوالات کرتے تھے، اور بے رحمانہ انداز اختیار کرتے تھے اور اس کی توجیہ یہ کرتے ہیں کہ سردار دوقومی نظریہ اور تقسیم کے شدید مخالف تھے، ان کو تقسیم کے وقت مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کا صحیح اندازہ نہیں تھا، اسلام سے ان کی واقفیت واجبی تھی۔

یہ دونوں رخ پیش کر کے وہ کہتے ہیں کہ پٹیل ایک سیکولر اور اصول پسند شخص تھے، اگر مسلم دوست نہیں تو مسلم دشمن بھی نہیں تھے، بعض دوسرے لیڈروں کی طرح ان

کا یہ خیال تھا کہ ''جواہر لال کے مقابلے میں سردار پٹیل اچھے وزیر اعظم ہوتے، مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اس معاملے میں اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا تھا'' اب چاہے کسی کو ان کے اس نتیجے سے اتفاق ہو یا اختلاف لیکن انہوں نے تجزیہ کرنے میں معروضی اور غیر جانب دارانہ طریقہ اختیار کیا ہے۔

حال ہی میں ان کی ایک اور کتاب ''ہندوستانی مسلمان: انہوں نے کہاں کہاں غلطی کی ہے'' شایع ہوئی ہے اس میں بتایا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے جذبات میں آکر تقسیم کا نعرہ بلند کیا جو تاریخی غلطی ہے اور جس کا خمیازہ وہ بھگت رہے ہیں، لیکن اب انہیں حقایق کا سامنا کرنا، ان سے ہم آہنگ ہونا اور اپنی دنیا آپ بنانا چاہئے، اس کتاب کا مقصد بھی واقعات وحقایق پیش کر کے لوگوں کو صحیح نتائج اخذ کرنے کا موقع فراہم کرنا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سیکولر مسلمان اور حقیقت پسند شخص تھے۔

وہ ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی وہم آہنگی کے قایل تھے، مسلمانوں کو اپنی پہچان بنائے رکھنے کے ساتھ ہی اپنے اندر روشن خیالی اور وسیع النظری پیدا کرنے اور قومی زندگی سے کنارہ کش نہ رہنے کی تلقین کرتے تھے، اور رجعت پسندوں اور فرقہ پرستوں کی جانب سے ان پر جو ناروا اور غیر ذمہ دارانہ اعتراضات کئے جاتے تھے، ان کا مسکت جواب بھی دیتے تھے، اسلام، اسلامی تاریخ، ہندوستانی اور مسلم سیاست پر ان کی گہری نظر تھی، اس لیے ان کے جواب میں بڑا وزن ہوتا تھا۔

اوپر جن کتابوں کا ذکر آیا ہے ان کے علاوہ بھی انہوں نے کئی اہم اور قابل قدر کتابیں لکھیں، رضیہ سلطان اور انڈین نیشنل کانگریس کی صد سالہ تاریخ پر ان کی کتابوں کو اعتبار حاصل ہوا، نہرو، جناح اور بے نظیر بھٹو کی شخصیتوں کا مطالعہ وتجزیہ بھی پیش کیا، فرقہ واریت اور ہندو مسلم منافرت کے وہ ہمیشہ مخالف رہے، ان کی کتاب The Widening Divide اس کا ثبوت ہے جس کا اردو ترجمہ ''بڑھتے فاصلے'' کے نام سے ہوا ہے، ایک کتاب میں گجرات فسادات کے بعد بڑھتے ہوئے فرقہ وارانہ جذبات اور نظریات کا جائزہ لیا ہے اور اس پر تشویش ظاہر کی ہے، ابھی حال میں لال کرشن اڈوانی نے پاکستان کے دورے میں مسٹر جناح کی تعریف میں جو بیان دیا تھا، اس پر برہمی ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ اس سے مسٹر اڈوانی نے دو قومی نظریے، ہندوستان کی تقسیم اور اس کے بعد ہونے والے تشدد کی حمایت کی ہے۔

ڈاکٹر رفیق زکریا کو انگریزی میں بڑی مہارت تھی، ان کی اصل تصنیفی زبان یہی تھی، اردو میں بھی کتابیں لکھیں ان کی تمام کتابیں ان کے عمیق مطالعہ وتحقیق اور علم ونظر کی وسعت کا ثبوت ہیں، اسی لیے اکثر انگریزی کتابوں کے اردو ترجمے بھی ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب منجھے ہوئے اور مشاق اہل قلم ہی نہیں تھے، بڑے اچھے اور خوش بیان مقرر بھی تھے، اردو اور انگریزی دونوں میں پرمغز اور معلومات افزا تقریریں کرتے تھے، اکثر اداروں اور سمیناروں میں تقریروں کے لیے مدعو کئے جاتے اور اپنا جوہر دکھاتے، راقم کو بھی دوبار ان کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا، غالباً ۱۹۹۰ء میں سابق وزیر اعظم مسٹر وشوناتھ پرتاپ سنگھ نے منڈل کمیشن پر اظہار خیال کے لیے دانشوروں کی ایک میٹنگ بلائی تھی، اس میں پہلی بار ان سے ملاقات ہوئی اور ان کی بصیرت افروز تقریر سنی، دوبارہ ممبئی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے علامہ شبلی سمینار میں "علامہ شبلی کے عہد، اس کے تقاضوں کے لحاظ سے ان کا طریقہ عمل اور سرگرمیاں" پر ان کی مبسوط تقریر ہوئی جس سے اس عہد کی تاریخ پر ان کی گہری نظر کا اندازا اور یہ معلوم ہوا کہ وہ علامہ شبلی اور دارالمصنفین سے اچھی طرح واقف اور ان کی خدمات اور کارناموں کے قدرداں تھے، اس تعلق کی بنا پر انجمن اسلام ممبئی کے صدر ڈاکٹر محمد اسحاق جم خانہ والا کی دعوت پر ۲۰۰۰ء میں حارث سیرت لکچر دینے گیا تو انہوں نے خواہش کی کہ یہ کم مایہ رشدی کے جواب میں ان کی کتاب کے اجرا کی رسم ادا کرے، وہ اپنی علالت کی وجہ سے تقریب میں شرکت نہیں کر سکے تھے، ورنہ عرض کرتا کہ:

غبار راہ کو بخشا گیا ہے ذوق جمال
خرد بتا نہیں سکتی کہ مدعا کیا ہے

ڈاکٹر رفیق زکریا کا تعلق جامعہ اردو سے گہرا تھا اور انہوں نے اردو اور تعلیم کے فروغ کے لیے سعی بلیغ کی، اسکول کے علاوہ ۱۵ کالج قائم کیے، ان کے ذریعے غریب اور پس ماندہ طبقے کے بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا، ان کا گھرانا بھی اعلا تعلیم یافتہ تھا، ان کی بیگم فاطمہ صحافی اور سنڈے ٹائمز آف انڈیا کی اڈیٹر تھیں، ایک صاحبزادے فرید امریکہ کے ایک وقیع رسالہ نیوز ویک انٹرنیشنل کے اڈیٹر ہیں، دوسرے بیٹے ارشد امریکہ کے ایک بڑے مالیاتی ادارے کے چیف اگزیکیوٹیو ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے خیال میں اس زمانے میں عصری تقاضوں کو نظر انداز کر کے اسلام کی تعبیر وترجمانی کا حق ادا نہیں ہوسکتا، آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمان جن سیاسی، سماجی اور تعلیمی مسائل سے دوچار تھے، اس سے وہ پوری طرح باخبر تھے اور اس میں وہ ان کی فکری رہنمائی برابر کرتے تھے، اور ملک کے دوسرے باشندوں کو بھی وہ ان کے حالات ومسائل سے واقفیت بہم پہنچاتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کی بشری لغزشوں سے چشم پوشی کرے، انہیں جنت الفردوس نصیب کرے اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین!! (''ض''، ستمبر ۲۰۰۵ء)

ندوی، عبدالحلیم، پروفیسر

پروفیسر عبدالحلیم ندوی

افسوس ہے کہ اردو اور عربی زبان کے صاحب علم وقلم پروفیسر عبدالحلیم ندوی ۱۲/

اکتوبر ۲۰۰۵ء کو دہلی کے اپولو اسپتال میں انتقال فرما گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی تدفین جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قبرستان میں ہوئی، مرحوم کئی سال سے مسلسل علیل ہونے کی بنا پر گوشہ نشین اور موتوا قبل ان تموتوا کی عملی تفسیر ہوگئے تھے۔

پروفیسر عبدالحلیم کا وطن صاحب گنج دیوریا تھا جہاں ۱۹۲۶ء میں ان کی ولادت ہوئی مگر اب دہلی ہی کے ہوگئے تھے، عربی کی اعلا تعلیم کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا، وہاں سے فراغت کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ میں عصری تعلیم کی تحصیل کی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی، پھر قاہرہ یونی ورسٹی سے بھی کسب فیض کیا۔

مصر سے واپسی کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تدریس کی خدمت پر مامور ہوئے، پھر سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لینگویجز حیدرآباد سے وابستہ ہوئے اور پروفیسر، صدر شعبہ اور فیکلٹی کے ڈین ہوئے، وظیفہ یاب ہونے کے بعد کچھ دنوں جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی سے متعلق رہے اور ۱۹۸۳ء میں دمشق یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر ہوئے اور جامعہ ملیہ دہلی میں پروفیسر ایمرٹس مقرر ہوئے، وہ ایک اچھے اور کامیاب استاد کی حیثیت سے نیک نام اور طلبہ میں مقبول تھے۔

ڈاکٹر سید عابد حسین نے ذاکر انسٹی ٹیوٹ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے سہ ماہی ''اسلام اور عصر جدید'' کے نام سے ایک باوقار علمی رسالہ نکالا تو پروفیسر عبدالحلیم کو اس کا نائب مدیر مقرر کیا، مرحوم کو اردو اور عربی دونوں زبانوں میں تحریر وتقریر کا ملکہ تھا، اردو میں تاریخ ادب عربی کی تین جلدیں لکھیں اور عربی میں ہندوستان کے عربی مدارس پر المراکز التعلیمیة العربیة فی الهند لکھی، یہ دونوں کتابیں مقبول ہوئیں اور حوالے کے کام آرہی ہیں، عربی میں ان کی تصنیف منهج النویری فی کتابه نهایة الارب فی فنون الادب دمشق سے شائع ہوئی اور اسے بھی حسن قبول نصیب ہوا، ان کی عربی خدمات کے اعتراف میں صدر جمہوریہ ہند نے انہیں صدارتی ایوارڈ سے نوازا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ (''ض''، دسمبر ۲۰۰۵ء)

حقی، شان الحق

جناب شان الحق حقی

اردو کے بڑے ممتاز شاعر و ادیب، محقق و مترجم اور لغت نویس جناب شان الحق حقی نے ۱۱؍اکتوبر ۲۰۰۵ء کو کناڈا میں داعی اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم ایک برس سے پھیپھڑے کے کینسر میں مبتلا تھے، ان کی پیدائش ۱۵؍ستمبر ۱۹۱۷ء کو دہلی میں ہوئی، ان کا خاندانی تعلق شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ سے تھا جن کی ذات سے ہندوستان میں علم حدیث کا بڑا فروغ ہوا، علی گڑھ سے انہوں نے بی اے کیا تھا اور دہلی کے سینٹ اسٹیفن کالج سے ۱۹۴۱ء میں انگریزی میں ایم اے کیا، اس کے بعد ''آج کل'' دہلی کے نائب مدیر ہوئے، پھر شملہ میں مترجم کی حیثیت سے کام کیا۔

۱۹۴۷ء میں وہ دہلی سے پاکستان چلے گئے، ۱۹۵۳ء میں لندن سے ذرائع ابلاغ عامہ کا کورس کیا، عرصے تک ترقی اردو بورڈ پاکستان کے اعزازی سکریٹری رہے اور اس کے مجلّہ کے شعبہ ادارت سے بھی منسلک رہے۔

دہلی سے تعلق کی بنا پر ان کی تحریر یہیں کی ڈھلی ہوئی شستہ زبان کا نمونہ تھی، ان کو ٹکسالی زبان اور محاوروں اور ضرب الامثال پر قدرت کاملہ حاصل تھی، وہ زبان کی صحت کا بڑا خیال رکھتے تھے اور اس کے نوک پلک اور الفاظ کے محل استعمال سے بخوبی واقف تھے، ان کی اس طرح کی تحریروں اور مضامین سے اہل ذوق بہت محظوظ ہوتے تھے۔

نثر و نظم دونوں پر یکساں قدرت تھی، تار پیراہن اور حرف دل رس وغیرہ ان کے شعری مجموعے ہیں، نثر میں افسانہ، ڈرامہ تنقید، ترجمہ اور لغت نویسی ہر ایک میں اپنے جوہر دکھائے ہیں، بچوں کے ادب سے بھی شغف تھا، ان کے لیے پہیلیوں، کہہ مکرنیوں اور نظموں کی متعدد کتابیں لکھیں، لغت نویسی اور ترجمے میں ان کی خدمات بے مثال ہیں، کئی منظوم ترجمے ان کی یادگار ہیں، ۲۰۔۲۵ برس کی عمر میں شیکسپیئر کے ڈرامے انٹونی قلوپطرہ، کوٹلیا کے ارتھ شاستر کے ترجمے کیے، عالمی ادب کی منتخب نظموں اور بھگوت گیتا کے منظوم ترجمے کیے، مرحوم اچھے افسانہ نگار بھی تھے، اپنی ان گوناگوں خدمات اور معیاری ادبی کاموں کی بنا پر حکومت پاکستان نے انہیں تمغۂ قائداعظم اور ستارۂ امتیاز سے سرفراز کیا۔

حقی صاحب نرم مزاج، خوش اخلاق اور مہمان نواز تھے، شائستگی اور نفاست ان کی فطرت میں رچ بس گئی تھی، اللہ تعالیٰ اردو کے اس مخلص خدمت گزار اور شریف انسان کو اپنی رحمتِ کاملہ سے نوازے اور ان کے متعلقین کو صبر جمیل مرحمت فرمائے، آمین۔ (''ض''، دسمبر ۲۰۰۵ء)

خان، غلام مصطفےٰ، ڈاکٹر

آہ! ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

(رفیق احمد خان)

''جناب مشفق خواجہ کا غم ابھی تازہ ہی تھا کہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان اور ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے بھی داغ مفارقت دیا، یہ دونوں بزرگ علم و ادب کے آسمان پر مہر و ماہ بن کر ضوفشاں تھے، یقیناً قارئین معارف رفیق احمد خاں صاحب کے ممنون ہوں گے کہ انہوں نے ان دونوں مقتدر علمی و ادبی

شخصیتوں پر مقالہ سپرد قلم کیا، عتیق جیلانی صاحب کے بھی ہم ممنون ہیں کہ انہوں نے بھی ڈاکٹر غلام مصطفےٰ صاحب پر اپنے مضمون سے قارئین معارف کو متمتع ہونے کا موقع بخشا، قارئین معارف کو مشفق خواجہ صاحب پر بھی کسی پاکستانی صاحب قلم کے مضمون کا انتظار رہے گا''۔ (ض)

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب (م ۲۵ ستمبر ۲۰۰۵ء) کے بارے میں کچھ عرض کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، وہ کسی تعریف یا تعارف کے محتاج نہیں، ڈاکٹر صاحب کی شخصیت قدر و منزلت کے اعتبار سے کئی پہلو رکھتی ہے، تاہم دو پہلو صاف، واضح اور روشن ہیں، ایک ''محقق'' دوسرے ''مذہبی اور روحانی عالم''۔

تحقیق کے اصل اور حقیقی تقاضوں سے محققین وفضلا ہی آگاہ ہوتے ہیں اور وہی جانتے ہیں کہ انہیں کیوں کر نبھایا جاتا ہے، تحقیق ایک خاص طرز زندگی کا مطالبہ کرتی ہے، ڈاکٹر صاحب نے ایک مقام پر لکھا ہے ''ہم کہہ سکتے ہیں کہ تحقیق کو بہ طور ایک طرز زندگی اپنانا ہی اولین اور بنیادی اور لازمی شرط ہے''۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ اسی خاص انداز سے گزار کر اس جہانِ فانی سے دائم آباد کو رخصت ہوئے، ان کی زندگی ہمارے لیے قابل فخر اور لائق تقلید ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی متعدد خوبیوں میں سے صرف دو کا تذکرہ کرنا نہایت ضروری سمجھتا ہوں کہ انہیں بنیادی اور اساسی حیثیت حاصل ہے، یعنی ''احتیاط'' اور ''احترام'' جس طرح ''سچ'' کی تلاش کو تحقیق کا لازمی عنصر قرار دیا گیا ہے، اسی طرح ''احتیاط'' کو بھی اس کا جز ولاینفک تسلیم کیا گیا ہے، بہ حیثیت محقق ڈاکٹر صاحب تمام زندگی سچ اور احتیاط کا دامن تھامے رہے۔

بہ حیثیت مذہبی اور روحانی عالم ڈاکٹر صاحب بلا امتیاز عمر اور علم، زبان، رنگ، نسل اور قومیت ہر ایک کا حد درجہ احترام کیا کرتے تھے، یہ انہی کا روحانی تصرف ہے کہ آج ان کے حلقۂ ارادت میں ہر زبان کے بولنے والے اور ہر طبقۂ فکر کے اشخاص یک جا اور یک جان ہیں اور ڈاکٹر صاحب سے عقیدت و محبت میں یکساں جذبات کے حامل ہیں۔

اس امر سے کون آگاہ نہیں کہ احتیاط اور احترام کے اختیار کرنے میں بلا کے حوصلے، برداشت اور استقلال کی ضرورت ہوا کرتی ہے، ہمیں اپنی زندگی میں کیسے کیسے مرحلے اور مواقع پیش آتے ہیں کہ صبر، حوصلے اور ہمت کا دامن چھوٹ جاتا ہے اور اس احتیاط اور احترام کے برتنے میں کیسی کیسی لغزشیں اور کوتاہیاں سرزد ہوتی ہیں، یقیناً ڈاکٹر صاحب کے یہ دو وصفِ خاص بھی مثالی اور استثنائی شان رکھتے ہیں اور پیروی و تقلید کی دعوت دیتے۔

ڈاکٹر صاحب کے تلامذہ کی تعداد بھی خاصی ہے اور قابل تعریف بات یہ ہے کہ بڑی تعداد ان تلامذہ کی ہے جو اب فضلا کے درجے پر فائز ہیں، انہوں نے اپنے نام سے اپنے استاد گرامی کے نام کی لاج رکھی اور سر فخر سے بلند کیا۔

بہ حیثیت محقق ڈاکٹر صاحب کے کام اور طرز زندگی کی پیروی وتقلید ان کے عزیز ترین شاگرد ڈاکٹر نجم الاسلام مرحوم (مدیر رسالہ تحقیق) نے سب سے زیادہ اختیار کی اور ویسے ہی نامور ہوئے اور برصغیر پاک و ہند میں استاد اور شاگرد کے مثالی رشتے کی یاد تازہ کردی۔

ڈاکٹر صاحب کے روحانی رنگ کو ان کے ایک اور عزیز ترین شاگرد ڈاکٹر مسعود احمد خاں صاحب نے قبول و مقبول کیا، وہ بھی اپنے استاد محترم کی طرح ارادت مندوں کے ایک بڑے حلقے کے مرکز محور ہیں، ان کے فیوض و برکات کا سلسلہ ہنوز جاری ہے، اللہ تعالیٰ سلامت با کرامت رکھے۔

اب میں ڈاکٹر صاحب کے چند اختصاصات و اولیات کا ذکر کرنا بھی ناگزیر سمجھتا ہوں:

۱۔ ڈاکٹر صاحب نے پہلی مرتبہ جامعات میں ایم۔اے کی سطح پر اسلامیات، اقبالیات، فارسی اور عربی زبانوں کو نصاب میں داخل کیا۔

۲۔ نعتیہ شاعری کو بی۔اے کے نصاب میں نعتیہ مشاعروں کو ہم نصابی سرگرمی کے طور پر پہلی مرتبہ متعارف کروایا۔

۳۔ ڈاکٹر صاحب نے شعبۂ اردو جامعہ سندھ میں بہ حیثیت صدر شعبہ سب سے زیادہ مدت (۷۶۔۱۹۵۶ء) کے لیے خدمات انجام دیں۔

۴۔ برصغیر میں ڈاکٹر صاحب پہلے استاد ہیں جن کی نگرانی میں زیادہ پی ایچ ڈی اسکالرز نے اپنے کام مکمل کیے۔

۵۔ پی ایچ ڈی کی سطح پر اردو اور قرآن کے حوالے سے مربوط و منضبط کام بھی سب سے زیادہ ڈاکٹر صاحب ہی کی نگرانی میں ہوئے۔

۶۔ ڈاکٹر صاحب وہ پہلے شخص ہیں جن کی زندگی میں پاکستان میں ان پر پی ایچ ڈی ہوا۔

۷۔ سندھی ادبی بورڈ کے مخطوطات کے ایک بڑے اور نادر و قیمتی ذخیرے کے کیٹالاگنگ کی جانب ڈاکٹر نجم الاسلام کو توجہ اور رہنمائی فراہم کرنے کا امتیاز بھی ڈاکٹر صاحب ہی کو حاصل رہا۔

۸۔ ڈاکٹر نجم الاسلام مرحوم کو ابیات شاہ کریم (اکتوبر ۱۹۸۷ء) اور ابیات سندھی (جنوری ۱۹۹۹ء) کے اردو منظوم ترجمے کی ترغیب بھی ڈاکٹر صاحب ہی کا امتیازی وصف ہے۔

اپنے علم کے مطابق اور بہت قلیل وقت میں، میں نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے چند اختصاصات کا تذکرہ کردیا ہے، حقیقتاً ڈاکٹر صاحب کی خوبیوں اور کمالات کا نہ ہمیں

صحیح علم ہے اور نہ ہم ان کو حیطۂ تحریر و بیان میں لانے کی قدرت وصلاحیت رکھتے ہیں، ''اللہ تعالیٰ ان پر لاکھوں کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے'' اور ہمیں ان کی تقلید کا انہی جیسا شوق، جذبہ اور طاقت عطا فرمائے۔

علامہ اقبال نے اپنی والدہ سے شدید محبت کا اظہار ایک نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' کیا تھا، ڈاکٹر صاحب کو علامہ اقبال اور ان کے خیالات سے بڑی محبت تھی، میں علامہ کی اسی نظم سے چند اشعار ڈاکٹر صاحب کی یاد میں پیش کرتا ہوں اللہ تعالیٰ آخرت میں انہیں اعلا درجات سے سرفراز فرمائے اور مجھ عاجز کو ان قلبی جذبات اور تعلق خاطر کے عوض نجات اخروی عطا ہو۔

یاد سے تیری دلِ درد آشنا معمور ہے
جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے
زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثل ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہ بانی کرے

(جنوری ۲۰۰۶ء)

''گھنے سایہ دار پیڑ''

(عتیق احمد جیلانی)

اس جلتی دھوپ میں یہ گھنے سایہ دار پیڑ
میں اپنی زندگی انہیں دے دوں جو بن پڑے (مجید امجد)

دھوپ کی بے رحم تمازت اپنے سروں پہ سہ کر خلق خدا کو سکون اور سایہ دینے والے یہ پیڑ قدرت کی کتنی بڑی نعمت ہیں، اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں جنہیں زندگی کے جلتے بلتے راستے میں کسی پیڑ کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں میسر آئی ہو۔ کیسے دکھ کی بات ہے کہ نصف صدی سے لاکھوں بندگان خدا سائے کے لیے جس برگد پر تکیہ کیے ہوئے تھے، آج وہ ان کے درمیان نہیں رہا۔

آج ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں جسمانی لحاظ سے ہمارے ساتھ نہیں مگر ان کی علمی یادگاریں اور ان کا روحانی فیضان تا قیامت باقی رہے گا، ان کی ساٹھ سے زائد علمی و ادبی تصانیف کا ایک ایک لفظ سرچشمۂ فیض اور نورِ ہدایت ہے، ان کے سچے پیرو کاروں کی ایک بڑی جماعت ان کی زندگی کا ثبوت ہے، ان کی محبت میں دھڑکتے لاکھوں دل پکار پکار کر کہہ رہے ہیں ''رفتید و لے نہ از دل ما''۔

اہل عشق خودی کے اس درجے پر ہوتے ہیں کہ بہ قول اقبالؔ:

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

اور حافظ شیراز نے ایسے ہی کاملین کو پیش نظر رکھ کر یہ بصیرت افروز اور دل کشا شعر کہا تھا کہ:

ہر گز نمیرد آن کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است ہر جریدۂ عالم دوام ما

خطۂ سندھ کے باشندوں پر ڈاکٹر صاحب کی ذات گرامی اللہ کا خاص انعام ہے، انہوں نے عرصۂ دراز تک اللہ کے بندوں میں محبتیں تقسیم کیں، وہ سراپا شفقت وعنایت تھے، ان کی شخصیت جلال سے زیادہ جمال کی آئینہ دار تھی، وہ اخلاق جمالی کا بہترین نمونہ تھے، فی زمانہ ان کی ذات علما و اولیا وصلحائے سلف کے کمالات کی عمدہ مثال تھی، وہ بے غرضی، بے ریائی، استغنا، ہمدردی، خلوص اور عفو و درگذر کا پیکر تھے، ان ہی اوصاف کے سبب ان کی شخصیت میں خاص و عام کے لیے بے پناہ جاذبیت ہے اور بلالحاظ رنگ ونسل بے شمار لوگ ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہیں۔

وہ ہر ملنے والے پر بے پایاں توجہ اور بے انتہا محبت کی چھتری تان دیتے تھے، ہر شخص کو یہی محسوس ہوتا کہ وہی ان کے زیادہ نزدیک ہے، حسن سلوک اور خیر خواہی کا نورانی ہالہ ہر ملاقاتی اور ہر مہمان کو اپنے حصار میں لیے رہتا، دعاؤں کی بارش برستی ہی چلی جاتی، لطف اور توجہ کا چراغ تاریک ذہنوں اور بے نور دلوں کو منور کرتا چلا جاتا، گفتگو سماعتوں کے قفل توڑتی اور خاموشی دلوں کے دریچے کھولتی۔

ڈاکٹر صاحب نے کلام اقبالؔ کا گہرا مطالعہ کیا تھا، یہ اختصاص دوسرے بہت سے اہل علم کو بھی حاصل ہے مگر ڈاکٹر صاحب کا کمال یہ ہے کہ ان کی زندگی بھی افکار اقبال کے سانچے میں ڈھل چکی تھی، اقبالؔ کے معروف تصورات عشق، خودی، فقر، استغنا، مومن، شاہین وغیرہ کو ذہن میں لائیے اور پھر عملی مثال تلاش کیجیے تو بغیر کسی تردد کے زبان پر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کا نام آجاتا ہے۔

ان کی بہت سی صفات میں استغنا کی صفت نمایاں ترین تھی، انہوں نے کبھی دنیا کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا اگرچہ دنیا ہر سمت سے ان کی طرف ملتفت رہی، یہ بے غرضی کوئی معمولی خوبی نہیں، اس مقام تک پہنچنے کے لیے فضل الٰہی کے ساتھ ساتھ مسلسل ریاضت اور گہری بصیرت بھی درکار ہوتی ہے، دنیا کی محبت میں سرتاپا آلودہ ہم جیسے ناشناسانِ حقیقت کیا جانیں کہ:

دو عالم سے کرتی ہے بے گانہ دل کو

عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

ڈاکٹر صاحب جیسے مردمومن کی خوبیاں اپنے الفاظ میں بیان کرنے کے بجائے میں کلام اقبالؔ سے مدد لینا چاہوں گا، غور فرمائیے کہ ایک ایک لفظ کس طرح ڈاکٹر صاحب کی دل آویز شخصیت پر چسپاں ہوتا چلا جا رہا ہے:

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کار کشا، کار ساز
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب اس کی نگہ دل نواز
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

اس تاثراتی تحریر کے اختتام پر یہی عرض کروں گا:

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے این فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

(جنوری ۲۰۰۶ء)

ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان

(فیروزالدین احمد فریدی)

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان ایک نابغۂ روزگار شخصیت اور قرونِ اولیٰ کی یادگار تھے، وہ ۲۳؍ستمبر ۱۹۱۲ء کو جبل پور مدھیہ پردیش میں پیدا ہوئے اور ۹۳ برس بعد ۲۵؍ستمبر ۲۰۰۵ء کو اس منزل کی جانب روانہ ہوگئے جہاں سب کو ایک نہ ایک روز جانا ہے۔

ڈاکٹر صاحب تین برس کی عمر میں پکے نمازی تھے اور قرآن ختم کر چکے تھے، اپنی ۴۲ برس پہلے لکھی ہوئی کتاب ''تاریخ اسلاف'' میں انہوں نے لکھا ہے کہ مجھے بچپن سے مسلسل بخار رہا کرتا تھا، گھر میں پیسے کی تنگی تھی، علاج نہیں ہو پارہا تھا، ایک دن والدہ نے کہا کہ بیٹا! تم قرآن پڑھو، اللہ نے چاہا تو اچھے ہوجاؤ گے، بڑے بھائی نے پہلا پارہ پڑھایا، اس کے بعد میں ہر روز ربع پارہ خود ہی پڑھتا رہا، ایسی برکت ہوئی کہ چند دنوں میں ٹھیک بھی ہوگیا اور قرآن پاک بھی مکمل ہوگیا، ایک دن بیمار والد نے نماز کی ترکیب لکھادی، ان کی دعا ایسی لگی کہ میں کسی کے کہے سنے بغیر نماز پڑھنے لگا، شاید تین سال کا ہوں گا کہ نماز اور قرآن سے اس تعلق کی وجہ سے میرے چھوٹے چچا نے میرا نام ملاجی رکھ دیا اور محلے والے بھی مجھے اسی نام سے پکارنے لگے، پھر یہ ہوا کہ حصولِ تعلیم کے اسی شوق میں ایک دن میں خود ہی اسکول میں داخلہ لینے چلا گیا، وہاں کے استاد مجھے حیرت سے دیکھنے لگے۔

اس تین سالہ ملاجی نے جو داخلے کے لیے خود ہی اسکول پہنچ گیا تھا، بعد میں علی گڑھ یونیورسٹی سے فارسی اور اردو میں ایم اے، ایل ایل بی اور پی ایچ ڈی کیا، ناگپور یونیورسٹی نے انہیں ''ڈی لٹ'' کی اعزازی سند دی جس کی ایک وجہ ڈاکٹر صاحب کی اچھوتی تحقیق ''فارسی پر اردو کا اثر'' تھی، سندھ یونیورسٹی نے انہیں تاحیات پروفیسر امریطس کے منصب پر فائز کیا، اردو پر فارسی کے اثر کا ذکر تو سب نے سنا ہے لیکن یہ خیال ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کے ذہن رسا کو ہی آیا کہ فارسی پر اردو کا اثر ایک مکمل تحقیق طلب موضوع ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے ورثے میں تقریباً ایک سو کتابیں اور کئی سو عالم چھوڑے جو ان کے طالب علم رہے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں، ان کتابوں میں ''اقبال اور قرآن'' شامل ہے جس پر انہیں حکومت پاکستان سے لے کر مختلف ممتاز اداروں اور انجمنوں نے متعدد اعزازات دیئے جو ڈاکٹر صاحب کو ملنے پر زیادہ معتبر ہوگئے، ان کے سیکڑوں طلبا میں پاکستان کی سپریم کورٹ کے جج اور چیف الیکشن کمشنر نعیم الدین اور پاکستان کے نامی گرامی ادیب ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی اور ابن انشا شامل ہیں۔

علم، معلّمی، ادب، تحقیق اور اعزازات اپنی جگہ لیکن جس آب حیات نے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان کو امر کردیا وہ ان کی فاتحِ زمانہ روحانی شخصیت تھی، یہ ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی، پروفیسر امریطس اور ڈی لٹ فردِ فرید پاکستان کے ضلع بہاول پور کے ایک غیر معروف قصبے ''خیر پور ٹامی والی'' کے ایک بزرگ زوار حسین شاہ صاحب کا مرید اور خلیفہ تھا، بھلا سوچئے کہاں علی گڑھ؟ ناگپور؟ حیدرآباد (سندھ)؟ کراچی؟ اور کہاں خیر پور ٹامی والی؟ خدا کی باتیں خدا ہی جانتا ہے، **ویرزقہ من حیث لا یحتسب**۔[الطلاق:۳]

ڈاکٹر صاحب سے میری پہلی ملاقات دس برس پہلے، ۱۲؍ربیع الاول ۱۴۱۶ھ بمطابق ۱۰؍اگست ۱۹۹۵ء کو حیدرآباد (سندھ) میں ان کے گھر پر ہوئی، ملاقات کا ظاہری سبب میرا وہ کتابچہ بنا جو میں نے چند ماہ قبل ''فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کی ایک جھلک'' کے عنوان سے لکھا تھا، ڈاکٹر صاحب صحن میں ایک چارپائی پر بیٹھے تھے، ٹانگیں نیچے لٹک رہی تھیں، انہوں نے کتابچے پر بابا فریدؒ کا نام پڑھا تو اسے بہت احترام سے اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا، بابا فریدؒ پر گفتگو شروع کی اور چند منٹ بعد ایسا لگا کہ وہ کہیں

اور ہیں انہوں نے اپنے میٹھے اور دھیمے لہجے میں پاک پتن میں اپنی پہلی حاضری کی روداد سنائی، یہ روداد ان کی کتاب ''تاریخ اسلاف'' میں درج ہے جو ۶۴-۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی تھی اور پھر یہی روداد ان کی اہم اور مختصر کتاب ''فضل کبیر'' میں بھی دہرائی گئی ہے جو ڈاکٹر صاحب کی حیات میں ۱۹۹۹ء میں طبع تو ہوگئی تھی لیکن ان کی ہدایت کے بہ موجب، اس کی تقسیم ان کے انتقال کے بعد کے لیے موخر کردی گئی تھی۔

۱۰/اگست ۱۹۹۵ء کو ڈاکٹر صاحب نے پاک پتن کی پہلی حاضری کے بارے میں جو کہا وہ ''فضل کبیر'' میں مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

''ایک مرتبہ حضرت شاہ زوار حسین صاحب کی خدمت میں خیر پور ٹامی والا حاضر ہوا، میرے ساتھ علی گڑھ کے ہم جماعت دوست عبدالغنی اور کراچی کے سیٹھ عبدالغفار بھی تھے، وہاں سے ہم لوگ پاک پتن شریف حاضر ہوئے اس زمانے میں مزار شریف میں مغرب کی طرف ایک کھڑکی تھی، میں وہاں کھڑا ہوکر فاتحہ پڑھنے لگا تو باباصاحبؒ نے ایک نظر مجھ پر ڈالی، میں تڑپ گیا اور لوٹ پوٹ ہوگیا، میں ''اللہ اللہ'' کہہ کر شور کرتا رہا، اپنے قابو میں نہ تھا، بہت سے لوگ جمع ہوگئے لیکن میرا شور کم نہ ہوا، پھر جمعے کی اذان ہونے لگی تو طبیعت قابو میں آئی، ہم لوگ وضو کرکے اگلی صف میں بیٹھ گئے، عبدالغنی صاحب میرے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے وہ روحانیت کے قائل نہیں تھے لیکن اب جوں ہی انہوں نے مجھے پکڑا، ان پر بھی کیفیات طاری ہوگئیں اور وہ بھی بے قابو ہوگئے اور کہنے لگے کہ بھائی! آج مجھے روحانیت کا قائل ہونا پڑا''۔

۱۰/اگست ۱۹۹۵ء کو جب ڈاکٹر صاحب یہ روداد سنا رہے تھے تو ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور موٹے موٹے آنسو ٹپ ٹپ ان کی بڑی بڑی اور انتہائی روشن آنکھوں سے ان کے بھرے ہوئے رخساروں پر گر رہے تھے، سب حاضرین پر رقت طاری ہوگئی، میں اس وقت ملازمتِ سرکار میں تھا، میں نے درخواست کی کہ اگر وہ کچھ وقت نکال سکیں تو بابا فریدؒ کے بارے میں میرے اس کتابچے کے پہلے اڈیشن میں پائی جانے والی غلطیوں کی نشان دہی کردیں اور متن کے بارے میں رہنمائی کریں، ڈاکٹر صاحب اس وقت ۸۳ سال کے پیٹے میں تھے، ہر روز دعا کے طالبوں اور علم اور روحانیت کے طلب گاروں کا ازدحام لگا رہتا تھا جو رات تک جاری رہتا، اللہ کے اس دوست نے اپنی عدیم الفرصتی، پیرانہ سالی اور کمزوری کے باوجود، صرف ایک دو روز میں کتابچے کا ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک حرف، کمال محبت اور محنت سے پڑھ کر ایک ایک شوشے اور نقطے تک کی جس عرق ریزی سے اصلاح کی اور کتابچے کے متن کے بارے میں مجھے جن بیش بہا مشوروں سے نوزا، اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔

۱۹۹۵ء کے بعد اس کتابچے کے مزید اڈیشن شائع ہوئے، ہر نیا اڈیشن نکلنے کے موقع پر میں ڈاکٹر صاحب سے درخواست کرتا کہ اپنے ارشادات سے نوازیں اور ان کے یہ ارشادات ہر نئے اڈیشن کا جھومر بنتے اور اسے برکت دیتے، ڈاکٹر صاحب نے مجھے جو چند خطوط لکھے، اس میں یہ فقرہ، ان کی پاکیزہ تحریر میں، خط کے آخر میں ہوتا تھا: ''یقین جانیئے آپ کے لیے ہر روز دعا کرتا رہتا ہوں''، ایک دفعہ میں نے انہیں لکھا تھا کہ اپنی والدہ کے گزر جانے کے بعد میں سوچتا تھا کہ اب دنیا میں کون راتوں میں میرے لیے دعائیں کرے گا، میں بھی کتنا بے خبر تھا؟۔

ڈاکٹر صاحب سے میری آخری ملاقات یکم جنوری ۲۰۰۵ء کو اسی گھر میں ہوئی جہاں ۱۰/اگست ۱۹۹۵ء کو پہلی حاضری ہوئی تھی، تب گرمیاں اپنے جوبن پر تھیں اور اب سردیاں عروج پر تھیں، ڈاکٹر صاحب صحن کی بجائے ساتھ والے کمرے میں پلنگ پر بیٹھے تھے، ٹانگیں نیچے لٹک رہی تھیں، میں نے اس بار ڈاکٹر صاحب کی یادگار تصنیف ''تاریخ اسلاف'' پیش کی اور درخواست کی کہ اگر زحمت نہ ہو تو اس پر اپنے دستخط کردیں، انہوں نے مجھ سے میرا قلم لیا اور دستخط کئے اور نیچے ۱-۱-۲۰۰۵ء لکھا، یہ تحریر دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ ایک انتہائی ضعیف، بیمار اور ۹۲ سالہ شخص کی تحریر ہے جس کا آخری وقت آن پہنچا تھا۔ ۲۵/دسمبر ۲۰۰۵ء کو مغرب کے وقت، حیدرآباد (سندھ) سے چند کلومیٹر دور ان کے مقام تدفین پر ہزاروں مرد، عورتیں، بچے اور بوڑھے جمع تھے جو نہ صرف حیدرآباد (سندھ) بلکہ کراچی، اندرون سندھ اور پنجاب سے آئے تھے لگتا تھا کہ جس نے جب اور جہاں یہ خبر سنی وہ اسی حال میں اٹھا اور سیدھا حیدرآباد کی طرف چل دیا، کراچی سے حیدرآباد جانے والی ہائی وے کے دونوں جانب، تاحدِ نگاہ، بسوں، ویگنوں اور کاروں کی قطاریں صف باندھے کھڑی تھیں، پولیس نے لاکھ کوشش کی لیکن اس رات اس قومی شاہراہ پر ٹریفک گھنٹوں معطل رہی۔

وہ آفتاب عالم تاب جو ۹۳ برس پہلے جبل پور میں طلوع ہوا تھا، آج ۴۰-۱۲۔ بعد از دوپہر حیدرآباد میں غروب ہوگیا تھا، مغرب کی نماز کے بعد ان کا پاک جسم ان کی معطر لحد میں اتار دیا گیا، نوّے برس پہلے ایک ماں نے اپنے تین سالہ بیمار بیٹے سے کہا تھا: ''میرے بچے! قرآن پڑھو، اللہ نے چاہا تو ٹھیک ہوجاؤ گے''، آج اس معصوم روح کو اس کے پالن ہار نے اپنے جوار رحمت میں جگہ دے دی۔ (جنوری ۲۰۰۷ء)

معین الرحمٰن، سید، ڈاکٹر

مرگیا غالب آشفتہ نوا.....

بہ یادِ سید معین الرحمٰن

(رفیق احمد خان)

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن ایک طرح سے میرے خواجہ تاش تھے، مرزا غالب اور رشید احمد صدیقی سے میرا عشق روحانی، جذباتی اور زبانی ہے اور ان کا عشق شخصی، روحانی،

فکری، ادبی اور تحقیقی اوصاف کا مرقع، ان کی تن دہی، سخت کوشی، برداشت، نفاستِ طبع اورحسن آرائی وحسن آفرینی اس کی شہادتیں۔

میں اپنے احباب سے ان کی خوش اخلاقی، خوش اطواری، شائستگی اور روایتی وضع داری سے متعلق باتیں سن ہی چکا تھا، ان کی شگفتہ ومرصع اور پرمغز و پراثر نثر دل میں گھر کرچکی تھی اور ان کی سرکشیدگی اور بلند قامتی بھی میرے دل ونظر میں ایک مقام ومرتبہ وضع کرچکی تھی، خط وکتابت کا آغاز ہوا تو میرے خیالات وتصورات کو یک گونہ تقویت حاصل ہوئی، میں اپنے اندر ان کے لیے اپنائیت محسوس کرنے لگا اور یوں نیاز حاصل کرنے کی تمنا جی میں سر اٹھانے لگی۔

اس قلبی لگاؤ کا نتیجہ تھا کہ جب کبھی ان کے خلاف کوئی زہر آلودہ تحریر پڑھی تو طبیعت مکدر ہوگئی اور ان کی قدر ومنزلت میں کسی طرح کی بھی کمی محسوس نہیں کی بلکہ اس میں اضافہ ہی محسوس کیا، ''دیوانِ غالب، نسخۂ خواجہ'' کے حوالے سے خواہ کچھ بھی کہا گیا یا لکھا گیا ہو مگر غالب سے غیر معمولی شیفتگی اور غالب کی طرف داری کا اس سے اچھا اور بڑا عملی ثبوت ادبی دنیا میں کم دیکھنے میں آئے گا، اس سے ہٹ کر دیکھیے تو پیش کش میں حسن اور سلیقے کا حسین امتزاج بھی کیا لائق تحسین نہیں، میر تقی میر کا یہ مصرع صادق آتا ہے: ع

کس خوش سلیقگی سے جگر خوں کروں ہوں میں

۲۰۰۳ء میں انجمن ترقی اردو، پاکستان کی صدی منائی گئی، سرسید یونیورسٹی، کراچی کے پائین باغ میں انجمن ترقی اردو پاکستان، علی گڑھ اولڈ بوائز اور سرسید یونیورسٹی، کراچی کے اشتراک سے تقریبات کا اہتمام کیا گیا، ایک روز مجھے بھی شرکت کا اعزاز حاصل ہوا، میرے علم میں تھا کہ لاہور سے نمایاں طور پر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن اور ڈاکٹر تحسین فراقی مدعو ہیں، جاتے ہی میری مشتاق نظروں نے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کو تلاش کرلیا، میں نے بڑھ کر سلام کیا، انہوں نے جواب دیا اور سینے سے لگایا، خیریت دریافت کی، ان کا تپاک سے ملنا اور دیر تک خوش دلی سے باتیں کرنا بھلایا نہیں جاسکتا۔

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں

جلسہ گاہ میں میرے پہنچنے سے قبل ہی ڈاکٹر صاحب اپنے زریں خیالات کا اظہار فرما چکے تھے، شومی قسمت کہ میری سماعت متمتع ہونے سے محروم رہی، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن سے میری یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی جسے میں بجاطور پر ایک یادگار ملاقات کہہ سکتا ہوں، دورانِ گفتگو میں نے ڈاکٹر صاحب سے ان کی ایک کتاب ''شخصیات و ادبیات'' سے اپنی دل چسپی ظاہر کی، انہوں نے لاہور پہنچتے ہی رجسٹر ڈاک سے میرے شوق کوتسکین کا سامان مہیا کیا، اسی دوران نہایت سلیقے سے لفافے میں ملفوف ایک مکتوب بھی عنایت فرمایا، اس مکتوب کو ایک طرح سے اطلاع نامہ کہا جاسکتا ہے، مناسب خیال کرتا ہوں کہ بہ جائے تلخیص کے مکمل مکتوب برائے مطالعہ پیش کیا جائے، ملاحظہ کیجیے:

جنابِ مکرم ۲؍نومبر ۲۰۰۲ء

میں محکمہ تعلیم سے اڑتیس (۳۸) اور ''جی سی'' سے کوئی بائیس برس منسلک رہنے کے بعد ۴؍نومبر ۲۰۰۲ء کو ریٹائر ہورہا ہوں۔ فروری ۱۹۸۱ء میں سینئر پروفیسر اور شعبۂ اردو، پنجابی کے سربراہ کے طور پر ''جی سی'' سے وابستہ ہوا، یہ میرا اعزاز ہے، میرے زمانہ تدریس کا بیشتر حصہ جی سی میں گزرا؛ اسے آپ کی اور ادارے کے دوسرے احباب اور بزرگوں کی عنایت اور خدا کا احسان جانتا ہوں۔

جی سی میں آیا تو یہاں اردو میں صرف انٹر اور بی۔اے تک کی کلاسز تھیں، بائیس برس کی عملی وابستگی کے بعد جارہا ہوں تو اطمینان ہے کہ مجھے پوسٹ گریجویٹ ڈیپارٹمنٹ بنانے کا امتیاز حاصل ہوا، ایم۔اے (اردو) کے علاوہ ایم فل اور پی ایچ ڈی تک کے پروگرام رائج کرانے اور نصابات وضع کرنے اور منظور کرانے میں کامیابی پائی۔

اس تمام عرصے میں خود کسی قدر تصنیفی، علمی اور تحقیقی کام کرسکا، جسے ملک اور بیرون ملک کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں جگہ ملی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ اطمینان اور افتخار کہ میں اپنے رفقا اور تلامذہ کو کارِ علمی میں مصروف رکھ سکا۔

مجھے ایم۔اے (اردو) کے ایک سو سے زیادہ تھیسس دیکھنے؍کرانے کا موقع ملا، پی ایچ ڈی کے آٹھ دس کاموں کی نگرانی، رہنمائی اور تکمیل کی خوشی پائی، اب بھی متعدد اسکالرز پی ایچ ڈی کی سطح پر میرے ساتھ کام میں مصروف ہیں، کچھ ابتدائی مرحلے میں ہیں اور کچھ حدِ آخر کے قریب۔

خدا کا شکر ہے کہ محکمۂ تعلیم حکومت پنجاب نے بھی عزت افزائی میں کوئی کسر نہ چھوڑی، مجھی BS-21 میں لیے جانے والے ''پہلے پروفیسر'' کا غیر معمولی امتیاز حاصل ہوا، اس تمام عرصے میں مختلف انتظامی عہدوں کے لیے مجھ سے کہا جاتا رہا سکریٹری ایجوکیشن تک کے منصب کی پیش کش ہوئی، اسے میں نے عزت افزائی جانا لیکن تدریس سے وابستہ رہنے کو ترجیح دی۔ نتیجتاً مجھے علمی کاموں میں یکسوئی نصیب رہی اور میں اپنے میدان کار میں کچھ کرسکا، میرے ایک مہربان دوست کا شعر ہے کہ:

''یہ آنے والا زمانہ بتائے گا تم کو!
مرا وجود زمیں پر خدا کا احساں تھا''

مجھے اپنے بارے میں اس طرح کا تو کوئی گمان ہرگز نہیں لیکن کسی قدر یقین سا ہے کہ اس نواح میں ''اچھا برا، کچھ اپنا اثر چھوڑ جاؤں گا''۔

جی سی کے زمانہ قیام میں آپ نے مجھے جو عزت اور محبت دی، اس کا

شکریہ تو ادا کرنا ممکن ہی نہیں بہرنوع آپ کے التفات کے لیے ممنون ہوں اور آپ کی دعاؤں کا طالب رہوں گا۔ (دستخط از سید معین الرحمٰن)

میں اسے خلاف موقع سمجھتا ہوں کہ اس مکتوب کے ذریعے مکتوب نگاری کی تحلیل نفسی کی جائے یا مکتوب کے مندرجات سے بحث کی جائے مگر اتنا ضرور ہے کہ وہ اپنی زندگی، اپنے کام اور اپنے دوستوں کے رویوں سے مطمئن اور خوش تھے، یہ ان کی اعلاظرفی تھی کہ انہوں نے اپنے تلخ، تکلیف دہ اور جان لیوا لمحات اور حادثات کا تذکرہ اس مکتوب میں نہیں کیا۔

۱۹۹۶ء میں، میں نے ان کی ادارت میں شائع ہونے والے گورنمنٹ کالج لاہور کے مجلّے ''تحقیق نامہ'' پر تبصرہ کیا جو سہ ماہی ''انشا'' حیدرآباد سندھ میں شائع ہوا، میرے ایک دوست شاہ انجم بخاری نے انہیں اس کی اطلاع دی، ''غالب نامہ'' کی صورت میں الوقار پبلی کیشنز سے شائع ہونے پر میں نے انہیں خط لکھ کر چند نسخے دوستوں کے لیے قیمتاً طلب کیے تو وہ بہت خوش ہوئے، یوں خط کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔

ڈاکٹر نجم الاسلام (م ۱۳؍فروری ۲۰۰۱ء) کی وفات حسرت آیات پر انہوں نے بعض اخبارات اور پاکستان اور بیرون پاکستان بعض حضرات کو اس سانحے کی اطلاع دی، روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور میں یہ خبر ۱۵؍فروری ۲۰۰۱ء کو شائع ہوئی جس میں اعتراف کیا گیا کہ ''ڈاکٹر نجم الاسلام کی وفات کی خبر گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبۂ اردو کے سربراہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے دی تو لاہور کے علمی اور ادبی حلقوں میں صفِ ماتم بچھ گئی''، مخدومی ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کے نام ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کا تعزیتی مکتوب ''گوشۂ نجم الاسلام''، رسالۂ سہ ماہی انشا حیدرآباد سندھ ۲۰۰۲ء کی زینت بنا، جب کہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کا جوابی مکتوب بہ نام ڈاکٹر سید معین الرحمٰن اور ڈاکٹر مختار الدین احمد اور ڈاکٹر نذیر احمد کے نام ان کے مکتوب اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا جوابی مکتوب ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے نام سہ ماہی انشا حیدرآباد سندھ کے ''ڈاکٹر نجم الاسلام نمبر'' (حصہ اول) مارچ ۲۰۰۲ء میں شائع ہوئے۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کے نام ان کا مکتوب محررہ ۱۳؍فروری ۲۰۰۱ء سے اقتباس دیکھیے:

''دل پر ایک قیامت گزرگئی۔ آپ کے فیضِ تربیت سے متمتع ہونے والوں میں وہ ارشد اور ارفع ترین تھے، ہمارے عہد اور اپنے ہم عمروں میں حد درجہ محتاط اور معتبر بے حد صاحب نظر، انتھک اور بہت خاموش اور کارگزار''۔

کم لفظوں میں سلیقے سے پرتاثیر بات کہنے اور خاکہ کھینچنے کا یہ فن جہاں مبدٔ فیض کی فیاضیوں کا ایک کرشمہ اور غالبؔ اور رشید احمد صدیقی سے تعلق خاطر کی ایک زندہ مثال ہے، وہاں ان کے شوق، محنت اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا آئینہ دار بھی ہے،

مکتوب کے اس اقتباس کو پڑھ کر رشید احمد صدیقی کے خاکے ''مولانا محمد علی'' کی یاد تازہ ہوجاتی ہے، رشید احمد صدیقی کا ایک ایک لفظ ایک ایک فقرہ مولانا کی محبت سے سرشار ہے، دفاع کرتا ہوا، داد دیتا ہوا، سینہ سپر بھی اور سینہ کوب بھی، دل شاد بھی اور دل فگار بھی، ان میں آنے والوں کے لیے عبرت کا سامان تھا، مگر: ع

بے کسی ہائے تمنا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق

وہ فقرے آج پھر ایک محمد علی، اس کے ماحول، اس کے دوستوں اور دشمنوں کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتے ہیں:

''محمد علی کا قلب حزیں تھا لیکن روح تابندہ تپاں۔ محمد علی پر دولت و شہرت کی بارش ہوئی، محمد علی نے ان دونوں کو سیلاب کی طرح بہا دیا، دونوں نے مفارقت کی، بدنامی اور مفلسی سے بھی سابقہ پڑا لیکن یہ چیزیں جسم و جاں کی تھیں، ان کی روح پاک تھی طاہر محمد علی کی ذہانت اور فطانت اب کہاں ملے گی، وہ ایک شیر کی مانند تھے جس کو شیروں سے نہیں، لومڑی اور بھیڑیوں سے سابقہ ہو، محمد علی کے باب میں بعض کہتے ہیں کہ وہ بڑے تھے لیکن ان کا کوئی کارنامہ نہیں ہے، یہ تنگ ظرفوں کا خیال ہے، محمد علی میں کم زوریاں بھی تھیں لیکن ان کی کمزوریاں ایک اچھے شعر کی کم زوریاں تھیں جن سے شعر کے لطف و بے ساختگی میں کوئی فرق نہیں آتا، محمد علی کی آغوش میں رحمت تھی، مرحوم آج خود ہماری آنکھوں سے خون بن کر ٹپک رہے ہیں''۔ (گنج ہائے گراں مایہ)

۲۷؍جولائی ۲۰۰۱ء کو ان کے ایک اور محبت نامے سے نظریں پر تسکین اور دل شادکام ہوا۔

''عزیز گرامی رفیق احمد خاں صاحب، سلام و سپاس

ڈاکٹر نجم الاسلام مرحوم کے ایک خط اور ایک 'پس نوشت' تحریر کا عکس آپ کی نذر ہے، اس خط کو میں نے فورٹ ولیم کالج، سے متعلق سید وقار عظیم کی کتاب کے تازہ اڈیشن میں محفوظ کردیا ہے، کتاب آپ کے لیے الگ رجسٹرڈ پیکٹ سے روانہ کرچکا ہوں، اسی پیکٹ میں 'معاصر' کا نیا شمارہ بھی رکھا ہے جس میں ''نسخہ خُواجہ'' کے بارے میں مضمون ہے، یہی مضمون آپ کی تحویل میں بھی ہے، ''انشا'' میں اگر آپ کوئی ''مطبوعہ'' تحریر شامل نہیں کرتے تو فبہا اور اگر ''قند مکرر'' کی روایت ہوتو سبحان اللہ! خیر طلب''۔ (دستخط: سید معین الرحمٰن)

یہ مضمون ''دیوان غالب نسخۂ خواجہ'' آغا امیر حسین، مدیر ماہنامہ ''سپوتنک''، لاہور کے قلم سے نکلا اور مارچ ۲۰۰۱ء کے شمارے میں شائع ہوا، جب کہ سہ ماہی انشا حیدرآباد سندھ کے شمارہ: ۳۱ جولائی تا ستمبر ۲۰۰۱ء میں شامل ہوا، انشا شمارہ: ۱۸؍جنوری تا جون ۱۹۹۸ء میں ڈاکٹر صاحب کا ایک مضمون ''اعلامدارج میں مطالعۂ غالب'' کے

عنوان سے شائع ہو چکا تھا، مرحوم نے ''سپوتنک'' کے تین شمارے میرے ذوق مطالعہ کی تسکین کے لیے مرحمت فرمائے، مارچ ومئی ۲۰۰۱ء یہ شمارہ ماہر غالبیات کالی داس گپتا رضا کی یاد میں ''راضی بہ رضا'' کے عنوان سے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے مرتب کیا تھا، اس میں ان کے نام گپتا رضا کے پندرہ عدد مکمل اور پانچ عدد مکتوبات کے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں اور گپتا رضا کی دو غیر مطبوعہ تالیفات پر ان کا مضمون شائع ہوا ہے، علاوہ ازیں گپتا رضا کے شعری مجموعے ''احترام'' پر تبصرہ بھی شامل اشاعت ہے، تیسرا شمارہ مئی ۲۰۰۲ء کا ہے جو آل احمد سرورؔ پر خاص نمبر ہے، اسے ''سرورابدی'' کے عنوان سے مرحوم نے مرتب کیا تھا، یہ شمارہ ۱۶۰ صفحات کو محیط ہے، ''حرف چند..... بیادسرور'' کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب نے آل احمد سرور سے متعلق اپنی یادوں کے مرقع نذر قارئین کیے ہیں۔

ڈاکٹر نجم الاسلام کی وفات کے فوراً بعد سہ ماہی انشا حیدرآباد سندھ کے تازہ شمارے میں ''گوشۂ ڈاکٹر نجم الاسلام'' شائع کیا گیا، اس کی وصول یابی کی رسید انہوں نے اس طرح دی:

''انشا'' کے دو شماروں پر مبنی پیکٹ وصول پایا، دلی شکریہ، احباب کو بھی پیش کر دیا ہے، آپ کی سعی بڑی قابل قدر ہے۔
نجم الاسلام صاحب کا غم بڑا شدید ہے.....مکتوبات کی جمع آوری بڑا مفید کام ہوگا مزید خط بھیجوں گا تحقیقی کام کے ارادے پر مستحکم رہیے گا''۔
(لاہور، محررہ: ۲/مئی ۲۰۰۱ء)

میں نے علمی وادبی اور تحقیقی حلقوں میں خطوط لکھے کہ سہ ماہی انشا حیدرآباد کی جانب سے ڈاکٹر نجم الاسلام نمبر نکالا جائے گا، آپ حضرات اپنے قیمتی خیالات سے مرحوم کی زندگی اور خدمات پر روشنی ڈالیے، بہ حمد اللہ ہم کامیاب ہوئے، اسی دوران میں نے ایک مطبوعہ مکتوب کے ذریعے یہ اطلاع بھی دی کہ راقم مرحوم کے مکتوب جمع کر رہا ہے جن حضرات کی ان سے مراسلت رہی ہو وہ مکتوبات کی عکسی نقول ارسال فرمائیں تاکہ انہیں کتابی صورت میں شائع کیا جائے، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن غالباً اپنی مصروفیت کی وجہ سے کوئی مضمون تو تحریر نہیں کر سکے تاہم میری دل جوئی اور دل آسائی کی غرض سے ڈاکٹر نجم الاسلام کے چار عدد مکتوب بہ ذریعہ ڈاک ارسال فرمائے، بے حد افسوس ہے کہ وہ میرے اس منصوبے کو عملی صورت میں نہ دیکھ سکے، دیکھتے تو کتنا دل بڑھاتے، کن کن لفظوں سے میرے کام کی قدر کرتے اور سراہتے۔

مضمون کے اختتام پر ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے نام ڈاکٹر نجم الاسلام کے دو مکتوبات سے اقتباس پیش کرتا ہوں:

''خوبصورت تحفہ، آپ کا مرتبہ ''دیوان غالب'' موصول ہوا، اس عمدہ تدوین اور پیش کش پر مبارک باد پیش کرتا ہوں، آپ کی تعارفی تحریر شوق اور دلچسپی سے پڑھی، ''توضیحات وتعلیقات'' سے بھی مستفید ہوا، کس خوبی اور اخلاص کے ساتھ آپ نے اپنے ان بزرگوں کو یاد کیا ہے جن سے آپ مستفیض ہوتے رہے ہیں، یہ آپ کی سلامت طبع پر دال ہے اور پھر غالب وغالبیات سے آپ کی گہری وابستگی ہے اور قلبی تعلق ہے، وہ بھی بہ خوبی ظاہر و باہر ہے''۔ (محررہ: ۹/دسمبر ۱۹۹۸ء)

''آج کی ڈاک سے دیوان غالب نسخہ خواجہ کا ڈیلکس اڈیشن ملا، تہہ دل سے اس گراں قدر تحفے کا شکریہ ادا کرتا ہوں، الوقار پبلی کیشنز نے حسن طباعت کو درجۂ کمال پر پہنچا دیا ہے، اس دل کش نسخے کے آئینے میں آپ کے ذوق ترتیب وتدوین کا جمال پہلے سے بھی زیادہ نکھر کر سامنے آیا ہے، خدا نظرِ بد سے بچائے اور سلامت بہ کرامت رکھے''۔ (محررہ: ۴/جنوری ۲۰۰۱ء)

ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کے قلم سے نکلا ہوا ایک برجستہ فقرہ ملاحظہ فرمائیے:

''صحت خستہ، فرصت کم اور کام بہت نتیجہ معلوم''۔

(مالک رام کے غیر مرتب قلمی خط، از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، مشمولہ ''الماس''، ۷، ۰۵-۲۰۰۴ء) درحقیقت یہ ایک چھوٹا سا فقرہ ان کی اخیر زندگی کی تصویر پیش کرتا ہے، اس میں انہوں نے کس طرح اپنی صحت کی خستگی، عدیم الفرصتی، کثرت کار اور انجام سے باخبر ہونے کو ظاہر کیا ہے، یہ زندگی کے دو قطبین ہیں جن میں صبح وشام سمٹ کر آگئے ہیں، انجام سے آگاہ ہونے کے باوجود اپنی بھر قوت سے مصروف کار رہنا اور رفقا اور تلامذہ کو کار علمی میں مصروف رکھنا بجائے خود ایک بہت بڑا کام ہے اور کسی طرح بھی نظر انداز کیے جانے کے لائق نہیں بلکہ قابل تقلید ہے۔

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم
گھبرا گئے ہیں بے دلی ہم زباں سے ہم

مشفق خواجہ کے اس دنیا سے اٹھ جانے کے بعد اردو دنیا کے لیے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی وفات اس سال ۲۰۰۵ء کا دوسرا بڑا سانحہ ہے جو کسی طرح بھی قیامت سے کم نہیں کہ یہ دنیا اردو کے دو ایسے محسنوں سے خالی ہوگئی جو ایک عمر سے گل زار اردو کی آب یاری اور چمن بندی کی محنت اٹھانے میں ہمہ تن مصروف ومشغول تھے، جب تک جیے نگارِ اردو کے گیسو سنوارتے رہے اور نوع بہ نوع ستاروں سے اس کے فلکِ بے نظیر کو مزین کرتے رہے۔

''یہ آنے والا زمانہ بتائے گا تم کو!
مرا وجود زمیں پر خدا کا احساں تھا''

(جنوری ۲۰۰۶ء)

ندوی، عبداللہ عباس، مولانا

آہ! مولانا عبداللہ عباس ندوی مرحوم

۱۰ ردسمبر کے ''تعمیر حیات'' سے معلوم ہوا کہ مولانا عبداللہ عباس ندوی اب روبہ صحت ہیں، اسی شمارے میں پروفیسر عبدالحلیم ندوی مرحوم کے متعلق خود مولانا کا ایک تعزیتی مضمون بھی نظر سے گزرا جس میں انہوں نے لکھا کہ پروفیسر مرحوم ان سے ایک سال سینئر اور مولانا معین اللہ ندوی کے ہم درس تھے، ساتھ میں مولانا ظہور پرتاب گڑھی، مولانا عبدالغفار ندوی اور مولانا ابوالعرفان خاں ندوی بھی تھے، ان احباب کو یاد کرتے ہوئے لکھا کہ اب شائد ہی کوئی اس گروہ میں باقی رہا ہو، جو زندہ ہیں وہ کشتہ تیغ حیات ہیں، ان سطروں کو پڑھتے وقت کیا خبر تھی کہ کشتگان تیغ اجل کی مرثیہ خوانی کرنے والے کا ماتم اس قدر جلد کیا جائے گا، مولانا عرصے سے بیمار تھے اور ایک دن مخدوم گرامی مولانا تقی الدین ندوی کے فون سے معلوم ہوا کہ اب حالت بڑی تشویش ناک ہے، دو روز بعد وہ جنوری کے اخباروں میں ان کی وفات کی خبر آگئی اور اس طرح قریب اسّی (۸۰) سال پر محیط ایک اہل دل، صاحب اخلاص، دیدہ ور اور دردمند انسان کی داستان مکمل ہوگئی، اِناللہ وَانا الیہ رَاجعونْ۔

پھلواری شریف ان کا مولد ہے، ابتدائی تعلیم کے بعد وہ ندوے آگئے، جہاں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور شاہ حلیم عطا جیسے اکابر کی سرپرستی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی توجہات نے ان کے مستقبل کی راہوں اور منزلوں کو متعین کردیا، فراغت کے بعد ندوے میں قرآن مجید اور لغت قرآن کریم کی تعلیم و تدریس سے ان کے علمی سفر کا آغاز ہوا، بعد میں وہ ندوے کے ادیب اول ہوئے، برطانیہ میں لیڈس یونیورسٹی سے لسانیات میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی، سعودی عرب میں نشریات کے ادارے سے وابستہ ہوئے، رابطہ عالم اسلامی کے مشیر اور مکہ مکرمہ کی معروف جامعہ ام القریٰ میں استاد مقرر ہوئے، اردو، عربی، انگریزی اور فرانسیسی میں ان کی صلاحیتوں کو دیکھ کر رابطہ عالم اسلامی کے امین عام شیخ صالح التزاز نے ان کو رابطہ کے انگریزی ترجمان کی ادارت بھی سپرد کی، وہ کیمبرج یونیورسٹی کی لنگوسٹک سوسائٹی کے رکن بھی بنائے گئے، ترقی درجات کی یہ خبریں ہندوستان کی ملت اسلامیہ کے لئے فخر کے قابل تھیں، مکہ مکرمہ میں عربی زبان وادب کی درس وتدریس اور ایک عالمی انگریزی مجلّہ کی ادارت، ندوے کے بانیوں کے اس خواب کی خوبصورت تعبیر تھی کہ یہ ادارہ قدیم وجدید کا متوازن نقطہ اتصال ثابت ہو، جامعہ ملک عبدالعزیز سے مولانا کا رشتہ بڑا دیرپا ثابت ہوا، وہ وہیں کے ہوکر رہ گئے، اہل وعیال بھی سعودی شہری ہوئے لیکن ملازمت ہجرت اور ترک وطن کے اس طویل عرصے میں وہ اپنوں سے بے گانے کبھی نہ ہوئے، ندوے سے ان کا رشتہ ہمیشہ قائم رہا، خصوصاً مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے ان کا غیر معمولی تعلق، مرشد و مسترشد کے ان رشتوں کی یاد تازہ کرتا رہا جن سے ہمارے اکابر کی سیرتیں لبریز ہیں، اپنے استاد ومربی سے محبت بلکہ فدائیت کی ایسی مثالیں کم ملتی ہیں، وہ برابر ندوے آتے رہے اور مولانا ندوی کی نسبت سے مولانا کے اعزہ واحباب و تلامذہ بلکہ ندوے کے ذرے ذرے سے اخلاص ومحبت کی داستانیں رقم کرتے رہے، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کے انتقال کے بعد وہ ندوے کے معتمد تعلیمات ہوئے اور اپنے مشوروں، تجربوں اور اثر ورسوخ سے وہ ندوے کی ہمہ گیر ترقی کے لئے مسلسل کوشاں رہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جب تک میر کارواں تھے، مولانا عبداللہ عباس کی حدی خوانی کا آہنگ قدرتاً بلند تھا لیکن میر کارواں کے رخصت ہونے کے بعد بھی ان کے جوش وجذبہ میں ذرا کمی نہ آئی، مولانا سید محمد رابع ندوی ناظم ندوۃ العلماء کو انہوں نے مولانا علی میاں ندوی کے نہ ہونے کا احساس نہیں ہونے دیا، ہندوستان میں رابطہ ادب اسلامی کے جلسوں اور سمیناروں میں وہ برابر شامل ہوتے رہے، اس کے لیے انہوں نے صحت اور موسم کے شدائد کی پروانہ کی، آخری بار ان کو جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ کے حضرت شیخ الحدیث سمینار میں مقالہ پیش کرتے ہوئے دیکھا، درس وتدریس اور دوسرے ضروری مشاغل اور کثرت کار کے باوجود قلم وقرطاس سے ان کا رشتہ توانا رہا، ان کا علمی اور تحریری ذخیرہ خاصا ہے لیکن اصل سرمایہ قرآنیات ہی ہے، عربی اور انگریزی زبانوں میں **تعلیم اللغۃ القرآن، مذاهب المنحرفین فی التفسیر، ترجمات معانی القرآن وتطور فهم عندالعرب، النکت فی اعجاز القرآن** خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان تصنیفات کے علاوہ قرآنیات سے متعلق انہوں نے کثرت سے مضامین لکھے، دیکھا جائے تو ان کی علمی و دینی خدمات کی داستان کا سرعنوان ہی خدمت قرآن ہے، پھلواری شریف کے مولانا مفتی محمد عباس نے جب اپنے نومولود بیٹے کو عبداللہ کا نام دیا تھا تو کیا خبر تھی کہ اس اسم ظاہر کی معنویت کا اثر ایسا ہوگا کہ اسلام کی علمی تاریخ کے یکتائے عصر خصوصاً علوم القرآن میں بحر زخار کی حیثیت سے سب سے نمایاں نام کی کچھ برکتیں دور جدید کے اس عبداللہ بن عباس میں بھی نمایاں ہوکر رہیں گی، اردو میں بھی ان کی کتاب ''قرآن کریم تاریخ انسانیت کا سب سے بڑا معجزہ'' قریب دو سال پہلے دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد سے شائع ہوئی، اس کتاب کی تالیف میں یہ احساس کارفرما تھا کہ اعجاز القرآن کے اعتراف میں عربی زبان میں علمائے بدیع وبلاغت نے اپنی زندگیاں صرف کردیں مگر اردو میں خاص اس موضوع پر کتابیں نہیں ہیں، اس اظہار کے بعد ان کا یہ جملہ بڑا پرلطف تھا کہ ''وجود سے انکار نہیں اپنی بے بضاعتی کا اقرار ہے''، حیدرآباد ہی سے ان کی ایک عمدہ کتاب ''تاریخ تدوین سیرت'' بھی شائع ہوئی، جس کے متعلق اہل نظر نے لکھا کہ یہ سیرت نبوی ﷺ کی ایک نئے ڈھنگ کی کتاب

ہے، سیرت اور صاحب سیرت سے عقیدت و فدائیت مولانا مرحوم کی کتاب حیات کا نمایاں عنوان ہے، جب نام تر الیچو چشم میں آنسو بھر آوے کی عملی کیفیت کا مشاہدہ مولانا کے قریب رہنے والوں کو بارہا ہوا، ان کی آرزو تھی کہ مداحان سرور کائنات ﷺ کے پائیں میں اذن باریابی ان کو بھی مل جائے ''ردائے رحمت'' اور ''آداب و فضائل درود و سلام'' کی شکل میں ان کی یہ آرزو بھی پوری ہوئی، ان دونوں کتابوں میں حرف حرف، جذبے کے خلوص بلکہ سوز دروں سے بیتاب و بے قرار نظر آتا ہے۔

مولانا عربی کے ادیب تھے لیکن اردو ادب میں ان کی نثر کم نہیں تھی، مولانا عبدالماجد دریا بادی ان کی تحریروں کے بڑے مداح تھے، صدق جدید میں انہوں نے لیڈس سے لکھے ہوئے ان کے خطوط اہتمام سے شائع کیے، ''تعمیر حیات'' میں اکثر اداریے ان کے قلم سے ہوتے، موضوعات کے تنوع کے باوجود ان کی ادبی شان ہمیشہ نمایاں رہی، انہوں نے دہلی سے ۸۰ کی دہائی میں رسالہ ذکر وفکر بھی جاری کیا، اس میں ان کی ادارتی تحریریں مذاکرات کے عنوان سے بہت مقبول ہوئیں، قومی وملی مسائل پر ان کی گہری نظر اور پکڑ کا اندازہ ان اداریوں سے بہ خوبی کیا جاسکتا ہے، فتنہ استشراق، یہودیت، عیسائیت، عرب قومیت، فرقہ وارانہ ذہنیت، مدارس اور اردو جیسے مسائل پر ان کی یہ تحریریں بڑی وقیع ہیں، ان کی تحریروں کا ایک مجموعہ پروفیسر محسن عثمانی نے نگارشات کے نام سے مرتب کیا ہے لیکن ضرورت ہے کہ ان کے تمام متفرق مقالوں اور مضامین کے مجموعے شائع کیے جائیں۔

مولانا مرحوم نے اپنے استاد و مرشد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے سوانح بھی ''میر کارواں'' کے نام سے مرتب کیے، حضرت مولانا علی میاں کی خودنوشت ''کاروان زندگی'' کے بعد یہ کتاب اپنے موضوع پر سب سے بہتر شمار کی جاتی ہے۔

''دارالمصنفین'' اور ''معارف'' سے بھی ان کا رشتہ پرانا اور مستقل رہا، وہ یہاں کئی بار تشریف لائے اور اپنے قیام کے دوران اپنی محبتوں کی چاندنی بکھیرتے رہے، ان کا عقیدہ تھا کہ علامہ شبلی نے اسلامیات کا ربط ادبیات سے قائم کیا اور دین کو ادب کے قالب میں پیش کرنے کا رواج ڈالا، انہوں نے کہا اور لکھا بھی کہ دبستان شبلی کا اردو ادب پر یہ احسان ناقابل فراموش ہے کہ اس نے تاریخ کو داستان گوئی کی سطح سے بلند کر کے تحقیقات علمیہ کا درجہ دیا اور اسلامی علوم کو مواعظ کے گوشے سے نکال کر بحث و استدلال کا وسیع میدان عطا کیا، علامہ شبلی سے اپنی ہم آہنگی اور اثر پذیری اور سید صاحب، شاہ معین الدین ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن سے ان کے روابط میں یہی جذبہ کارفرما تھا کہ ان سب نے توسط و اعتدال کی راہ اور قدیم و جدید کے درمیان طریق وسط کے اصول کی تشریح کی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی تحریروں خصوصاً ان کی شذرات نگاری کی داد انہوں نے یہ کہہ کر دی کہ ان میں شبلی کا جاہ و جلال، سید صاحب کی امانت علمی اور توازن کا امتزاج تھا، دارالمصنفین سے ایک عمر کے تعلق کا نتیجہ تھا کہ وہ اس کی ترقی اور کامرانی کے لیے فکرمند رہتے، مدیر ''معارف'' مولانا ضیاالدین اصلاحی سے ان کا یہ تعلق اسی طرح قائم رہا حتی کہ یہاں کے اصاغر کو بھی وہ بڑی عزت و محبت سے نوازتے، ان کی خدمت میں حاضری کا آخری موقع گزشتہ سال ندوے کے مہمان خانے اور اس سے متصل ان کی قیام گاہ پر ملا، اس وقت وہ اس خبر سے کبیدہ خاطر تھے کہ اعظم گڑھ سے منسوب ایک مشہور فن کارہ نے دارالمصنفین کی مالی اعانت کی پیش کش کی ہے، یہ کبیدگی محض ان کی ایمانی غیرت کے سبب تھی لیکن جب حقیقت حال سے وہ واقف ہوئے تو یہ تکدر فی الفور رفع ہوگیا، وہ یقیناً فرقہ زہاد سے اٹھے تھے لیکن کامل ہوکر ندوے کے مذہبی اور لکھنؤ کے تہذیبی ماحول نے خوش فکری، خوش گوئی اور خوش سلیقگی کو اور دلکش بنا دیا تھا، انکسار و تواضع کی لکھنوی روایات کے ساتھ ان کی وضع قطع بھی لکھنؤ کے قدیم شرفا کی یاد تازہ کرتی تھی، زندگی میں بھی وہ مقبول عام و خاص تھے، انتقال کے بعد جس طرح ان کا ماتم ہوا وہ ان کے نیک کاموں کی قبولیت کا مظہر ہے، یہ رشک کی بات ہے لیکن ان کی زندگی تو اسی وقت رشک کے قابل ہوگئی تھی جب ان کو مہبط قرآن کا جوار نصیب ہوا اور قیامت تک کے لیے آخری آرام گاہ بھی اسی رشک کائنات خطے میں مقدر ہوئی، اللھم اغفرلہ وارحمہ۔ (''ع ۔ ص''، فروری ۲۰۰۶ء)

مدنی، سید اسعد، مولانا

مولانا سید اسعد مدنیؒ

افسوس صد افسوس کہ ۶؍ فروری کو مولانا اسعد مدنی نے داعی اجل کو لبیک کہا، اناللہ وانا الیہ راجعون، ان کی وفات قوم وملت کا بڑا خسارہ ہے۔

راقم نے انہیں کئی بار دیکھا اور اس حال میں دیکھا جب وہ صحت مند، توانا، تروتازہ، متحرک اور جوش عمل سے سرشار تھے لیکن ملاقات کا شرف دو تین بار ہی حاصل ہوا، مارچ ۱۹۸۸ء میں ان کے والد بزرگوار مولانا سید حسین احمد مدنیؒ پر مسجد عبدالنبی نئی دہلی میں سمینار ہوا تھا جس کے کنوینر ڈاکٹر رشید الوحیدی مرحوم تھے، اس میں پہلی بار ان سے شرف نیاز حاصل ہوا، بڑی بشاشت اور گرم جوشی سے ملے، آخری بار ۱۹۹۲ء میں سعودی سفارت خانے سے حج بیت اللہ کا ویزا لینے گیا تو دفعتاً ان پر نظر پڑی، لپک کر ملا، دریافت کرنے پر اپنے کو بتایا تو قریب کی کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا اور کچھ دیر تک باتیں کیں، غالباً بیماریوں کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا، اس لیے مجھے بہت مضمحل اور بجھے بجھے سے نظر آئے۔

مولانا اسعد صاحب ۵؍ نومبر ۲۰۰۵ء کو وہیل چیئر سے گر گئے، سر اور دماغ میں چوٹ آئی، عصر کی نماز کی تیاری کر رہے تھے کہ بے ہوش ہوگئے اور دہلی کے اپولو اسپتال میں

داخل کیے گئے جہاں تین ماہ تک موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد ۶ فروری کو ہزاروں لاکھوں عقیدت مندوں کو سوگوار اور اشک بار چھوڑ کر رفیق اعلا سے جا ملے۔

اس وقت مسلمان بڑی ابتلا اور کشمکش کے دور سے گزر رہے ہیں، ملی قیادت کا میدان مولانا حفظ الرحمان مرحوم کے بعد ہی سے خالی چلا آرہا تھا، مولانا اسعد کی جرأت و بے باکی سے اس کی تلافی ایک حد تک ہوئی مگر ان کے اٹھ جانے سے پھر خلا ہو گیا اور مسلمانوں کی قومی بنیاد متزلزل ہو گئی۔

مولانا کے آبا و اجداد کا اصل وطن ٹانڈہ ضلع فیض آباد تھا لیکن مولانا اسعد صاحب کی پیدائش ۲۷/اپریل ۱۹۲۸ء کو دیوبند میں ہوئی، اعلا تعلیم دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی، فراغت کے بعد چند برس مدینہ منورہ میں قیام پذیر رہے، پھر دارالعلوم دیوبند میں درس و تدریس کی خدمت پر مامور ہوئے، ان کو قوم و وطن کی خدمت کا جذبہ وراثتاً ملا تھا، قدرت نے قیادت کی صلاحیتیں بھی بخشی تھیں، ۱۹۶۰ء میں جمعیۃ علمائے اترپردیش کے صدر مقرر ہوئے، یہ بڑا پر آشوب دور تھا، سرکاری درس گاہوں خصوصاً پرائمری اسکولوں میں مشرکانہ عقاید و توہمات، ہند و میتھالوجی اور دیومالائی قصے کہانیاں نصاب تعلیم میں داخل کر دی گئی تھیں جن کو پڑھ کر مسلمان بچوں کا اپنے عقیدہ و مذہب پر قایم رہنا اور دین و ایمان کو سلامت رکھنا ناممکن تھا، اس کے پیش نظر ۵۹-۶۰ء میں مرحوم قاضی عدیل عباسی نے بستی میں ایک دینی تعلیمی کانفرنس منعقد کی جس میں مسلمانوں کے ہر مکتب فکر کے لوگ شامل تھے، اسی وقت دینی تعلیمی کونسل کا قیام عمل میں آیا تھا، کانفرنس میں مولانا حفظ الرحمان ناظم عمومی جمعیۃ علمائے ہند بھی شریک تھے لیکن ۱۹۶۲ء میں ان کا انتقال ہو گیا، جمعیۃ کے زیر اہتمام ایک اور متوازی تحریک ''دینی تعلیمی بورڈ'' وجود میں آئی دونوں تنظیموں سے بڑا فائدہ ہوا اور گاؤں گاؤں میں مکاتب قائم ہو گئے مگر بعد میں جمعیۃ کے تعلیمی بورڈ کی سرگرمیاں کم ہو گئیں لیکن الحمدللہ دینی تعلیمی کونسل اب بھی سرگرم ہے اور مکاتب کے قیام کے علاوہ نصابی کتابوں کے زہر کا تریاق بھی بہم پہنچا رہی ہے۔

اترپردیش میں مولانا اسعد مدنی کی قوت عمل اور قائدانہ جوہر کو دیکھ کر ۱۹۶۳ء میں انہیں آل انڈیا جمعیۃ کا ناظم عمومی مقرر کیا گیا اور ۱۹۷۳ء میں وہ آل انڈیا جمعیۃ کے صدر منتخب کیے گئے اور وفات تک وہی صدر رہے، مولانا حبیب الرحمان اعظمی کے انتقال کے بعد وہ امیر الہند بھی بنائے گئے۔

مولانا حفظ الرحمان شروع سے لوک سبھا کے ممبر منتخب ہوتے تھے، ان کے انتقال کے بعد جمعیۃ کا کوئی نمائندہ پارلیمنٹ کا ممبر نہیں رہ گیا تھا مولانا اسعد ۱۹۶۸ء میں پہلی بار راجیہ سبھا کے ممبر منتخب کیے گئے اور پھر وقفہ وقفہ سے تین بار ممبر چنے جاتے رہے، اس طرح ۱۸ برس تک وہ راجیہ سبھا کے ممبر رہے، اس عرصے میں ایوان کے اندر اور باہر بھی وہ بہت کھل کر کانگریس کی غلطیوں اور فرقہ وارانہ رویے کی مذمت کرتے تھے اور فرقہ وارانہ فسادات اور مسلم مسائل پر بڑی جرأت و ہمت سے بے دھڑک آواز بلند کرتے تھے اور مسلمانوں کو باعزت مقام دینے اور ان کے جایز حقوق دلانے کے لیے جدوجہد کرتے تھے، مرارجی ڈیسائی وزیراعظم ہوئے تو مولانا نے ملک و ملت بچاؤ تحریک شروع کی تھی۔

مولانا عرصے تک کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہے، اس کے علاوہ ملک و بیرون ملک کی جن تنظیموں اور اداروں سے ان کی وابستگی رہی، ان کے نام یہ ہیں:

راجیہ سبھا کی ضوابط کمیٹی۔ سرکاری یقین دہانی کمیٹی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کورٹ۔ رابطہ عالم اسلامی مکہ۔ شوریٰ دارالعلوم دیوبند۔ مرکزی وقف کونسل۔ ہمدرد ٹرسٹ دہلی۔ مرکزی حج کمیٹی۔ مجمع البحوث الاسلامیہ قاہرہ۔ موتمر اسلامی تیونیسیا۔ موتمر فقہی ریاض۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ۔ آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت وغیرہ۔

مولانا اسعد مدنی کو بہت سی خوبیاں اپنے والد ماجد سے موروثی طور پر ملی تھیں، تصوف و سلوک کے مراحل ان کی رہنمائی اور تربیت میں طے کیے تھے، ان ہی کی طرح ذکر، عبادت، ریاضت اور اوراد وظائف کی پابندی کرتے اور اسمیں کبھی ناغہ نہ کرتے، والد کی وفات کے بعد اس میدان میں ان کی جانشینی بھی کی اور بیعت و ارشاد کا سلسلہ جاری رکھا، گوناگوں مشغولیتوں کے باوجود ارادت مندوں اور مسترشدین کی تعلیم و تربیت میں کوتاہی نہ کرتے، مہمان نوازی، سخاوت اور فیاضی میں اپنے پدر بزرگوار ہی کی طرح حاتم طائی تھے، وہ روپے پیسے کو ہیچ سمجھتے تھے لیکن ان پر دولت کی بارش ہوتی تھی، ان کا کوئی کام پیسے کی وجہ سے نہیں رکتا تھا، ہر شخص کی ضرورتیں پوری کرتے، اس کے کام آتے اور مدد کرتے، کسی سائل کو محروم نہ کرتے، والد ہی کی طرح دسترخوان بہت وسیع تھا اور اس خوان یغما پر دوست اور دشمن کی تفریق نہ ہوتی، رمضان میں اعتکاف کے لیے لوگوں کا تانتا لگ جاتا، پہلے دیوبند کی مدنی مسجد میں پھر دارالعلوم کی رشید مسجد میں اعتکاف کرتے، معذوری کے زمانے میں بھی معتکف مہمانوں کی خاطر مدارات کے لیے بے چین رہتے، وہیل چیئر پر بیٹھ کر جایزہ لیتے اور ہر ایک کا خیال رکھتے والد ہی کی طرح مہمانوں کے لیے ہمیشہ بچھے رہتے۔

وانی لعبد الضیف مادام نازلا
وماشیمة لی غیر هاتشبه العبدا

مولانا حسین احمد مدنیؒ اپنی تمام تر مشغولیتوں کے باوجود بہ کثرت سفر کرتے، مولانا اسعد کی جولان گاہیں اس برصغیر ہی تک محدود نہیں تھیں بلکہ عرب، افریقہ اور یورپ کے ملکوں کا سفر بھی برابر کرتے رہتے اور ملک کا تو ایک ایک گوشہ ان کا چھانا ہوا تھا، ابھی ایک سفر سے واپس نہیں آتے کہ دوسرا شروع ہو جاتا تھا

وما آب من سفر الا الی سفر

سال کے گیارہ مہینے سفر کے لیے وقف تھے مگر وہ جہاں بھی ہوتے رمضان سے قبل دیو بند پہنچ جاتے، شدید ضرورت بھی ہوتی تو رمضان میں سفر نہ کرتے۔

مولانا اسعد میں غیر معمولی قوت عمل اور خود ارادی تھی، وہ جس کام کو ٹھان لیتے اسے کر گزرتے، اس میں کوئی مشکل رکاوٹ نہیں بنتی تھی اور نہ سستی اور کاہلی ان کے قریب پھٹکتی تھی، نکتہ چینیوں کی پروا نہ کرتے مصلحت و احتیاط بھی مانع نہ ہوتی، حماسی شاعر کے بہ قول ؎

اذا ھم القی بین عینیہ عزمہ
ونکب عن ذکر العواقب جانبا

جمعیۃ علما کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں آئی تو اسے متحرک اور فعال بنانے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی، قوم و ملت کے مفاد کے لیے نئے نئے مشکل منصوبے بناتے اور بے خطر ان کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیتے، دوسرے لوگ حیص بیص میں سوچتے ہی رہ جاتے تھے، مولانا کی تیزی، سرعت اور قوت کار کا ساتھ دینا سب کے لیے آسان نہیں تھا، وہ سب کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے، غالباً اسی سے لوگوں کو شکایت ہوجاتی اور وہ اپنی نئی راہیں تلاش کرنے لگتے، ایسے مراحل ان کی زندگی میں کئی بار آئے، بہت سے آزمودہ، تجربہ کار اور منجھے ہوئے لوگ جن کی زندگیاں جمعیۃ اور دارالعلوم کی خدمت میں گزری تھیں کنارہ کش ہوجانے اور اپنی راہ الگ نکالنے کے لیے مجبور ہوگئے۔

جمعیۃ مسلمانوں کا ایک مشترکہ پلیٹ فارم تھا اور ان کے تمام طبقے اس میں شریک تھے، اس کی تاریخ شان دار اور ماضی تاب ناک ہے، گو اس میں علمائے دیو بند کا غلبہ ہمیشہ سے رہا لیکن دوسرے طبقوں اور جماعتوں سے وہ کبھی خالی نہیں رہی مگر آہستہ آہستہ وہ اس سے کنارے ہوتے گئے اور اب تو خود علمائے دیو بند بھی اس سے کنارہ کش ہوگئے ہیں اور اس کا دایرہ بہت محدود اور سمٹ گیا ہے۔

گو یہ سب مقدرات ہیں تاہم سب کو ساتھ لے کر چلنا وہ بھی دردمندوں اور مخلصوں کو بڑی خوبی ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ مولانا اسعد بڑے متحرک، فعال اور عزم و خود ارادی کا پیکر تھے، وہ جب جمعیۃ علما کے قائد ہوئے تو اس کے صف اول کے اکثر قائدین وفات پاچکے تھے اور جو رہ گئے تھے وہ اس سے الگ تھلگ ہوگئے تھے، ان حالات میں جب کہ آئے دن ملک میں فساد اور مسلمانوں کی جان و مال کا اتلاف ہو رہا تھا، اکیلے اپنی جان اور عواقب و نتایج کی پروا کیے بغیر ہول ناک فرقہ واریت کے دہکتے شعلوں میں کود پڑنا اور فسادات اور قدرتی آفات میں لٹے پٹے، تباہ حال لوگوں کی مدد، راحت رسانی اور باز آبادکاری کے کاموں میں جٹ جانا وہ رتبہ بلند ہے جو کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے، یہی ان کے صاحب عزیمت اسلاف کا شیوہ تھا۔

اکیلے اور تنہا ہو کر بھی انہوں نے جمعیۃ علما کو اس کی خصوصیات کے ساتھ نہ صرف باقی رکھا بلکہ اپنی تنظیمی صلاحیتوں اور محنت و جاں فشانی سے بعض حیثیتوں سے اسے ترقی بھی دی، ان سے پہلے جمعیۃ کا دفتر پرانی دہلی کی تنگ و تاریک گلی قاسم جان میں تھا، اسے وہ نئی دہلی کی مسجد عبدالنبی میں لائے اور دفتر کو اس عظمت رفتہ کی حامل جماعت کے شایان شان اور ویران مسجد کو آباد کردیا، اس کے آس پاس کی زمینیں بھی دوڑ دھوپ اور سعی و محنت سے حاصل کر کے شان دار مدنی ہال، محمودیہ لائبریری اور دوسری عمارتیں تعمیر کرائیں اور ایک سنگلاخ وادی پرخار کو گل وریحاں سے آراستہ کردیا۔

اسی طرح ان کے ہاتھ میں آنے کے بعد دارالعلوم کی سرگرمیاں بھی بڑھ گئیں اور ان کی بہ دولت بہت سے تعمیری و رفاہی کام انجام پائے جن میں وسیع و عریض مسجد رشید سب سے نمایاں ہے۔

مولانا اسعد نے بڑی مشغول اور مجاہدانہ زندگی گزاری، عقاید و شعائر اسلام کا تحفظ، خلق خدا کو فیض رسانی، دین و ملت اور قوم و ملک کی خدمت ان کا نصب العین تھا، وہ ملک میں مسلمانوں کو باعزت زندگی اور ان کے جایز حقوق دلانے کے لیے ہمیشہ سرگرم اور فکرمند رہے، اللہ تعالیٰ ان کی ان دینی و قومی خدمات کو قبول فرمائے اور بہشت بریں میں جگہ دے، پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین!

مولانا کی تدفین میں شرعی حکم کے مطابق بڑی تعجیل کی گئی پھر بھی ڈیڑھ لاکھ آدمی جنازے میں شریک ہوئے جو ان کی مقبولیت کی دلیل ہے، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔
(''ض''، مارچ ۲۰۰۶ء)

خان، رشید حسن

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی

(ڈاکٹر شمس بدایونی)

۲۶؍فروری بروز اتوار صبح کے سات بجے تھے، میں سفر کے لیے تیار ہو کر پورٹیکو کے قریب پہنچ چکا تھا، معاً فون کی گھنٹی بجی، میں واپس ہوا، ریسیور اٹھایا اُدھر سے آواز آئی ''میں حنیف نقوی۔ رشید حسن خاں صاحب کا رات انتقال ہوگیا آپ ان کی تدفین میں شریک ہوسکتے ہیں''۔ میں کسی اہم وجہ سے اپنے سفر کو ملتوی نہیں کرسکا اور تدفین میں شریک ہونے سے معذور رہا، مگر اس دن ایک اضمحلال کی کیفیت طاری رہی، ان سے ملاقاتیں اور فون پر کی گئی باتیں یاد آتی رہیں، ان کی اعتماد و یقین سے بھرپور آواز، کاٹ دار جملے، بے تکلف لہجہ، کچھ خاص تکیہ کلام، ہاں بھائی، ارے بھئی، دیکھئے، یہ جو ہیں نا، ہاں بس ان کے لہجے اور بیان کا طنطنہ ساعت پر بار بار دستک دیتا رہا، میں کبھی محظوظ ہوتا رہا اور کبھی ملول، اب یہ آواز سننے کو کہاں ملے گی؟ کون اس طرح دوٹوک انداز میں پکارے گا؟۔

۱۔ ”ہیلو۔ارے بھئی! آپ کہاں ہیں؟ ایک ماہ ہوگیا آپ کا کوئی فون نہیں آیا دیکھئے شمس صاحب! کم از کم مہینے میں ایک بار ضرور فون کیجیے۔ یا پھر تعلق منقطع کر لیجیے“۔

۲۔ ”ہیلو جی میں شمس بول رہا ہوں۔ ہاں بھئی شمس صاحب کیسے ہیں آپ؟ آپ کے بچے کیسے ہیں؟ کیسی ہے ہماری بہو؟ اور ہمارے لطیف صاحب ٹھیک ہیں! کاروبار کیسا چل رہا ہے آپ کا؟ کیا لکھ رہے ہیں آج کل آپ؟۔

دیکھئے شمس صاحب میں برابر سن رہا اور پڑھ رہا ہوں کہ آپ لگا تار سیمناروں میں شرکت کررہے ہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے، آپ کو جم کر سنجیدگی کے ساتھ کسی موضوع پر تین چار سال کام کرنا چاہیے، بس اگر آپ یہ نہیں کریں گے تو خود کو ضائع کردیں گے، ارے بھائی، میں یہ سب اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں آپ سے کچھ بہتر توقعات رکھتا ہوں، باقی ”آپ کی مرضی“۔

۳۔ ”ہاں شمس صاحب، وہ جوفلاں صاحب ہیں نا، وہ تو فرقہ ملامتیہ سے متعلق معلوم ہوتے ہیں، ان کی تحریروں میں معائب کے کیڑے بری طرح بلبلا رہے ہیں اور آپ لکھتے ہیں کہ وہ عالم وفاضل ہیں، بھائی یہ سب کیا ہے؟ کیا آپ بھی اوروں کی طرح دنیا ساز بن گئے؟ دیکھئے شمس صاحب ایک بات سمجھ لیجیے، تحقیق شرک کو گوارا نہیں کرتی، آپ اگر کسی کو ناراض نہیں کرسکتے تو قلم رکھ دیجیے۔ دنیا میں بہت سے کام کیے جاسکتے ہیں کیا ضروری ہے کہ آپ تحقیق ہی کریں“۔

۴۔ ہیلو۔ کہیے شمس صاحب کیسے ہیں آپ؟ جی، میں ایک مضمون نواب محمد یار خاں امیرؔ پر لکھنا چاہتا ہوں، مواد اکٹھا کرلیا ہے، رکیے شمس صاحب، کیا آپ نے ناظم رام پوری کا یہ شعر سنا ہے:

غلطی غیر گفتار کی دیکھی ناظمؔ

جب میں جاتا ہوں تو کہتا ہے نواب آتے ہیں

سمجھ گئے نا؟۔ جی میں سمجھ گیا صحیح تلفظ تو اب ہے۔ ہاں اب بتائیے، کیا امیرؔ کے حالات وکلام یکجا کرنا ٹھیک ہوگا؟..... سنیے شمس صاحب، امیر ادب میں صرف اپنے ایک شعر:

شکست و فتح میاں اتفاق ہے لیکن

مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

کی وجہ سے مشہور ہیں اور مشہور رہیں گے بس، اس سے زیادہ ان کی اہمیت نہیں، آپ ان پر اتنی محنت کیوں کرتے ہیں؟ دیکھئے موضوع کی ترجیح کو ذہن میں ضرور رکھا کیجیے، قاضی عبدالودود نے رضا عظیم آبادی پر تحقیق کی، بلا شبہ اعلا درجہ کا کام کیا، رضاؔ بے چارے کو کیا ملا؟ وہ آج بھی غیر معروف اور غیر اہم شاعر ہے، آپ کو ابھی بہت کچھ کرنا ہے اپنا وقت ایسے ویسے کاموں میں برباد نہ کیجیے، صرف ڈھنگ کے کام کیجیے، جیسے آپ پہلے بھی کر چکے ہیں۔

دن بھر میں ان کی آواز کی قید میں رہا، وہ مجھے مخاطب کرتے رہے اور میں ایک نیاز مند کی طرح سنتا رہا، رات کو جب گھر واپس لوٹا تو گیارہ بجے شب ان کے بیٹے خورشید حسن خاں کو میں نے فون کیا، تب معلوم ہوا کہ ۲۵/اور ۲۶/فروری کی درمیانی شب دو بج کر چالیس منٹ پر ان کو دل کا دورہ پڑا اور روح پرواز کر گئی، ۲۶/فروری کی شام پانچ بجے باڑوزئی پشاوری قبرستان میں ان کی تدفین ہوئی۔

یہ یاد نہیں کہ رشید صاحب سے میرے تعلق کی ابتدا کب ہوئی تاہم اتنا ضرور یاد ہے کہ ۱۹۸۸ء میں جب میری کتاب ”اردو نعت کا شرعی محاسبہ“ شائع ہوئی تو اس پر انہوں نے غالب نامہ دہلی (جنوری ۱۹۸۹ء) میں تبصرہ لکھا تھا، اس وقت تک میرے اور ان کے بیچ شناسائی کا رشتہ قائم نہیں ہوا تھا، یہ میری خوش نصیبی تھی کہ انہوں نے میری طلب وخواہش کے بغیر محض موضوع کے بدیع ونادر ہونے کے سبب تبصرہ لکھا اور خوب لکھا۔

۱۹۹۵ء میں جب میرا علمی مقالہ ”نظامی بدایونی اور نظامی پریس کی ادبی خدمات“ چھپ کر منظر عام پر آیا تو اس کی ایک کاپی خاں صاحب کو بھی ارسال کی گئی، خاں صاحب نے ۹/جون کو مجھے ایک طویل خط لکھ کر مقالے کی خوب داد دی، میرے دل میں خاں صاحب کے علم وفضل، احتساب وسخت گیری کا جو رعب ودبدبہ تھا اس خط کو پڑھ کر وہ احساس ان سے نیاز مندی اور ان کی محبت میں تبدیل ہوگیا، اس وقت وہ دہلی میں تھے، اسی خط میں انہوں نے یہ اطلاع بھی دی تھی کہ آج کل وہ مثنویات شوق مرتب کررہے ہیں اور اس سلسلے میں انہیں مثنوی ”زہرعشق“ کے نسخہ نظامی (بدایوں) کی تلاش تھی، جس کا طبع ثانی شمس الرحمٰن فاروقی سے مل گیا لیکن طبع اول ۱۹۱۹ء نہیں مل سکا، اسی خط میں انہوں نے لکھا کہ:

”آپ کے نظامی صاحب نے مجھے بہت پریشان کر رکھا ہے، آج کل زہر عشق کا نسخہ نظامی میرے پاس نہیں تھا، بارے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے بھیج دیا اور ایک نسخہ بدایوں سے آ گیا، اس میں مرحوم نے تنسیخ ممانعت کے آرڈر کا نمبر بھی لکھا ہے مگر حسب معمول ادھوری بات لکھی ہے اور انداز بیان بڑا مبہم ہے، کچھ بھی واضح نہیں ہوتا، میں نے الٰہ آباد آرکائیوز میں اس نمبر کے آرڈر کو نکلوانا چاہا، معلوم ہوا کہ وہاں ۱۸۵۷ء تک کے کاغذات ہیں، بعد کے کاغذ لکھنؤ میں ہیں، اب لکھنؤ آرکائیوز کے لیے دو حضرات کو لکھا ہے، دیکھئے کیا رہتا ہے، مرحوم اگر ذرا سی وضاحت کردیتے تو اس قدر پریشانی نہ ہوتی، قطعہ تاریخ کا بھی احوال یہی ہے، شوق کی عمر اس وقت ۷۷ برس کی تھی اور ذاکر ۲۷ برس کے تھے، اس کو معاصرت اور مصاحبت کیسے کہیں گے؟ پھر حوالہ حسب معمول ادھورا

بلکہ مجہول، اب اس کی تصدیق کے لیے سرگرداں ہوں، ہاں آپ یہ پتہ لگا سکتے ہیں کہ ذاکر مرحوم لکھنؤ میں کس زمانے میں تھے اور کیا کرتے تھے؟ ہے کوئی صورت''۔ (خط مکتوبہ ۹/جون ۱۹۹۵ء)

اسی سلسلے کی بعض باتیں اور بھی تھیں جو بعد کے کئی خطوط میں زیر بحث آئیں، مثلاً ایک خط میں انہوں نے مجھے لکھا:

''کتاب میں ص ۱۴۷ پر ذاکر بدایونی کا قطعہ تاریخ مشمولہ زہر عشق درج کیا گیا، اس میں تین باتیں ایسی ہیں جن سے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں، (۱) آخری مصرعے کے آخر میں ''کذا'' ہے، یہ کیوں آیا ہے؟ اس کا تعلق پورے مصرعے سے ہے یا کسی خاص لفظ سے؟ (۲) ''آپی'' لکھا گیا ہے، مگر اصل نسخے (زہر عشق طبع ۱۹۲۰ء) میں ''آئی'' ہے، اسے کیوں بدلا گیا، جب کہ بہ قول اساتذۂ فن تاریخ ''آئی'' کے ۲۱ عدد ہوتے ہیں اور وہی یہاں مراد لیے گئے ہیں، (۳) چوتھے مصرعے میں ''رہنمائی'' ہے مگر اصل نسخے میں اس کی جگہ ''رونمائی'' ہے، اسے کیوں بدلا گیا؟

''میں نے ازراہ احتیاط (نہ کہ ازراہِ اعتراض) یہ باتیں پوچھی ہیں کہ شاید طبع اول (۱۹۱۹ء) میں اسی طرح ہو، وہ اشاعت یعنی طبع اول مجھے نہیں ملی، دوسری اشاعت (۱۹۲۰ء) میرے سامنے ہے''۔ (خط مکتوبہ ۷/فروری ۱۹۹۶ء)

خطوط کے مذکورہ اقتباسات سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ متن کے اجزا کو کتنی باریک بینی سے دیکھا کرتے تھے اور ان کے تحریری اختلافات کو آخری حد تک حل کرنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔

رشید حسن خاں جن دنوں مثنویات شوق مدون کر رہے تھے، انہوں نے اس کے طویل مقدمے کے بعض حصے مختلف مضامین کی صورت میں ہم عصر رسائل میں شائع کرائے، جولائی ۱۹۹۶ء کے آج کل (دہلی) میں ان کا ایک مضمون ''مثنویات شوق منع اشاعت'' شائع ہوا، جس میں انہوں نے مثنویات یا ان میں سے کسی ایک مثنوی کی اشاعت پر حکومت کے ذریعے لگائی گئی پابندی کی روایت کو بعض دلائل کی بنیاد پر قطعی طور پر رد کردیا اور نظامی بدایونی (ف ۱۹۴۷ء) کے تنسیخ ممانعت اشاعت کے آرڈر اور اس کے نمبر و تاریخ کے اندراج کو بھی فرضی قرار دیا، اس مضمون پر کاظم علی خاں (لکھنؤ) اور بعض دوسرے اہل قلم نے آج کل میں خطوط لکھ کر خاں صاحب کے نتائج و خیال کی تردید کی، راقم الحروف نے اس سلسلے میں خاں صاحب کو خط لکھا، جس کے جواب میں انہوں نے لکھا:

''نظامی کا آرڈر نمبر ہو یا مولانا حالی، سید ضامن علی اور ایسے ہی دوسرے بزرگوں کی روایتیں جب تک ان کا قابل قبول ثبوت نہ ملے، یہ قابل استدلال نہیں ہوسکتیں، ہمارے بزرگ بہت زود یقین اور خوش گمان تھے، اس لیے ہمیں ان کی تحریروں سے استفادہ ضرور کرنا چاہیے مگر آداب تحقیق کے تحت، آپ کے انداز نگارش سے مجھے یہ محسوس ہوا کہ مولانا نظامی ہیرو بن گئے ہیں، دیکھئے ہیرو ورشپ درست انداز فکر نہیں، نسخہ نظامی میں پانچ شعر الحاقی ہیں تو کیا انہیں مان لیا جائے گا؟ اس طرح مت سوچا کیجیے، ایوان اردو کے حالیہ شمارے میں جو تحریریں شائع ہوئی ہیں اس میں الحاقی اشعار کا کچھ بیان آگیا ہے، مجھے قاضی عبدالودود صاحب کا یہ قول ہمیشہ یاد رہتا ہے کہ مردوں کا حق ہم پر زندوں سے زیادہ نہیں، راوی مرحوم ہو یا زندہ ایک ہی طریق کار اختیار کیا جائے گا، قبول روایت میں''۔ (خط مکتوبہ ۱۳/جولائی ۱۹۹۶ء)

اسی سلسلے کا ایک مضمون ایوان اردو دہلی (اپریل ۱۹۹۸ء) میں بہ عنوان ''مثنویات شوق۔لکھنوی معاشرت کے آئینے میں'' شائع ہوا تھا جو بڑا ہنگامہ پرور ثابت ہوا، اس مضمون میں خاں صاحب نے شرر کی گذشتہ لکھنؤ اور حکیم نجم الغنی خاں کی تاریخ اودھ کے حوالے سے لکھنؤ کی عیش و نشاط کی زندگی کا ایک خاص انداز میں تذکرہ کیا تھا اور اس معاشرے میں طوائف کے کردار کو جزوِ زندگی دکھایا تھا، معاشرے کے سوادِ اعظم پر ارباب نشاط کے تسلط کو شوق کے اشعار کا پس منظر قرار دیتے ہوئے شوق کی مثنویات کو لکھنوی معاشرت کا آئینہ دار بتایا تھا، بعض حلقوں نے اس مضمون کو اہالیان لکھنؤ کی تذلیل سمجھا، چنانچہ پروفیسر نیر مسعود نے اس کا جواب ایک مراسلے نما مضمون کی صورت میں دیا جو ''بہ نام رشید حسن خاں'' کے عنوان سے ایوان اردو (دہلی) کی جولائی ۱۹۹۸ء کی اشاعت میں شامل ہوا، یہ بڑا سخت جواب تھا جس میں رسمی آداب واخلاق کو بھی بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا، میں اس مضمون کو پڑھ کر لرز گیا اور کئی مرتبہ میرے لبوں پر یہ مصرعہ آگیا:

مشکل بڑی پڑے گی برابر کی چوٹ ہے

لیکن خاں صاحب نے خاموشی اختیار کرلی، دونوں قلم کار ذی علم وذی احترام، میں نے مدیر ''ایوان اردو'' کو ایک خط لکھا جو ستمبر ۱۹۹۸ء کے شمارے میں شائع ہوا، خط حسب ذیل ہے:

''ایوان اردو کے تازہ شمارے میں پروفیسر نیر مسعود صاحب کا مراسلہ نما مضمون نظر سے گزرا، نیر صاحب اور رشید حسن خاں صاحب، دونوں میرے کرم فرما ہیں اور دونوں بزرگوں کا بڑا احترام ان کی علمی خدمات اور ایک خاص ذہنی معیار کے سبب میرے دل میں ہے، لیکن ان کے مضمون کے تیور دیکھ کر مجھے سخت صدمہ ہوا، ایک معاصر دوسرے معاصر کے لیے کیسے رطب اللسان ہوتا ہے، اس کا نمونہ نیر صاحب کے تبصرہ فسانۂ عجائب مرتبہ رشید حسن خاں مشمولہ کتاب

نما (دہلی) میں دیکھا تھا اور ایک معاصر اپنے معاصر کے لیے کیسے دل آزار بن جاتا ہے، اس کا یہ دوسرا نمونہ ہے، ایک ہی قلم سے بہت مختصر سے وقت کے اندر دو متضاد تحریروں نے مجھے تذبذب میں ڈال دیا، بڑے لوگوں سے بڑے اخلاق کے مظاہرے کی توقع کی جاتی ہے، میری مودبانہ گزارش ہے کہ نیر صاحب نے اگر اپنے خیالات پیش کرنے میں عجلت اور جذباتیت سے کام لیا ہے تو جناب رشید حسن خاں ایسا نہ کریں، اگر اس علم و فضل کے لوگ ایک دوسرے کے لیے ادب واحترام کی تمام حدیں توڑ دیں گے تو ہم جیسے ادب کے طالب علم کس کو اپنا آئیڈیل بنائیں گے''۔

اسی شمارے میں پروفیسر عبدالحق (دہلی) اور لطیف صدیقی (لکھنؤ) کے مضامین شائع ہوئے جس میں انہوں نے نیر صاحب کی تحریر کو جذباتی، غیر سنجیدہ اور غیر علمی اسلوب کا حامل بتایا، دونوں مضمون نگاروں نے یہ تاثر بھی دیا کہ دراصل خاں صاحب کو یوپی اردو اکیڈمی کے آزاد ایوارڈ ملنے سے لکھنؤ کے بعض حلقے رنجیدہ ہیں اور شاید یہ مضمون اسی رنجیدگی کے آنسوؤں سے لکھا گیا ہے۔

اس سلسلے میں خاں صاحب نے مجھے جو خط لکھا اس کا کچھ حصہ یہاں نقل کردینا ضروری سمجھتا ہوں، انہوں نے لکھا:

''میں ۲۷؍ستمبر (۱۹۹۸ء) کو دو ماہ کے بعد واپس آسکا، یہاں آپ کا خط محفوظ تھا، مطبوعہ خط پہلے ہی پڑھ چکا تھا، اس کا شکریہ، متعدد لوگوں نے مجھ سے نیر صاحب کے لب و لہجے کی شکایت کی، انہوں نے اپنا ہی نقصان کیا ہے، میرا کچھ نہیں بگڑا، علمی مسائل تبرائی زبان میں زیر گفتگو نہیں آسکتے، آپ محمد شاہ رنگیلے کی خرابیوں کو بیان کیجیے کوئی دہلی والا برا نہیں مانے گا، یہ نہیں سمجھے گا کہ دہلی کی تہذیب کو برا کہا جارہا ہے، اس کے برخلاف لکھنؤ کے کسی مسخرے حکمراں (نصیر الدین حیدر یا واجد علی شاہ) کی واقعی خرابیوں پر کچھ کہیے، سمجھا جائے گا کہ پورے لکھنؤ، لکھنوی تہذیب اور پوری شیعہ کمیونٹی پر حملہ کیا گیا ہے، یہ وہی اقلیت کی نفسیات ہے جس میں لسانی یا مذہبی اقلیتیں اکثر مبتلا رہتی ہیں''۔

بہ ہر طور اس کے بعد سے بھی مجھ سے ان سے مراسلت حسب سابق برقرار ہے، ادھر پرسش احوال کے دو خط یکے بعد دیگرے آئے ہیں، مشیر لکھنوی کی ہرسیہ گوئی مشہور ہے، میرے بھائی نے نثری ہرسیہ لکھا ہے، خیر یہ ان کا معاملہ ہے، وہ جانیں، ایوان اردو میں لطیف صدیقی کی تحریر آپ نے پڑھی ہوگی، ان کا خط بھی میرے پاس آیا تھا، میں نے مزید کچھ لکھنے سے منع کردیا، غیر علمی باتیں جس قدر کم ہوں اتنا ہی اچھا ہے، مرحوم سید مسعود حسن رضوی ادیب، مولانا نجم الغنی خاں کو ''تخم الغبی'' کہا کرتے تھے، یوں کہ انہوں نے پوست کندہ حالات لکھے ہیں تاریخ اودھ میں۔

ہاں! کتاب نما کے حالیہ شمارے میں جن صاحب کا تبصرہ مثنویات شوق پر پڑھا، اصلاً یہ سارا معاملہ اس مولانا آزاد ایوارڈ کا تھا، اکبر حیدری صاحب نے کراچی کے طلوع افکار میں بھی کچھ گل افشانی فرمائی ہے، انعام کا اعلان ہوتے ہی یہی تحریر انہوں نے قومی آواز میں چھپوائی تھی، لب لباب یہ تھا کہ بڑے غیر مستحق شخص کو اب کے یہ انعام دیا گیا ہے، انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ روزانہ نیر مسعود صاحب کے یہاں جاتے ہیں، خیر حیدری صاحب کو میں غیر مکلّف مانتا ہوں بہ لحاظ تحقیق، یوں وہ کیا اور ان کی بات کیا''۔ (خط مکتوبہ ۴؍اکتوبر ۱۹۹۸ء)

سطور بالا میں جو کچھ مذکور ہوا اس کا تعلق یا تو فون پر کی گئی گفتگو سے ہے یا نصف ملاقات یعنی مراسلت سے، ان سے بالمشافہ ملاقاتیں بہت کم ہوئیں، باوجود اس ذہنی قربت، ہم خیالی اور محبت کے ملاقات کے مواقع بہت کم حاصل ہوئے، ایک خط میں اس بات کو انہوں نے کس خوب صورت پیرائے میں لکھا ہے:

''بریلی آنا نہیں ہوپاتا، یوں کہ بہت قریب ہے، قربت کے یہ کرشمے اکثر دیکھنے میں آتے رہتے ہیں، آدمی اپنے سے قریب بھی اسی لیے نہیں ہوپاتا کہ وہ اپنے سے دور نہیں ہوتا، اسی لیے تصوف میں عرفان ذات پر بہت زور دیا گیا ہے، بہ ہرصورت کبھی تو توفیق رفیق ہوگی''۔ (خط مکتوبہ ۱۴؍اگست ۱۹۹۶ء)

خاں صاحب سے پہلی ملاقات دسمبر ۱۹۹۵ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی میں سہ روزہ سمینار (۲۲،۲۳،۲۴؍دسمبر) کے دوران ہوئی، اس ملاقات میں انہوں نے محبت و شفقت کے جتنے جام تھے سبھی لنڈھا دیے، انہوں نے سمینار میں مجھے خود سے علاحدہ نہیں ہونے دیا، دوپہر کا کھانا بھی ساتھ ہی کھایا، میں مرغ و بریانی کے مزے لے رہا تھا، انہوں نے محض سبزیوں کے سلاد پر قناعت کرلی تھی، سمینار کے مختلف اجلاسوں میں بھی وہ مجھے اپنے پاس بیٹھنے کی تاکید کرتے رہے، گفتگو کے دوران وہ میری ذہنی سطح، مطالعے اور مشاہدے، مزاج ونفسیات کو ماہرانہ انداز میں جانچتے اور آنکتے رہے، انہوں نے متعدد علمی موضوعات پر گفتگو کی، اس وقت وہ دہلی یونی ورسٹی کے گوائر ہال میں رہتے تھے، سمینار کے اجلاسوں میں وہ شریک ہوتے اور شام کو واپس چلے جاتے۔

۲؍فروری ۱۹۹۶ء کو وہ تمام اسباب لے کر دہلی سے شاہ جہاں پور آگئے اور یہیں انہوں نے اپنے گھر پر لکھنے پڑھنے کی بساط بچھادی، اس دوران ان سے مراسلت کا سلسلہ جاری رہا۔

۷؍اکتوبر ۱۹۹۷ء کو میں ملاقات کے لیے شاہ جہاں پوران کے دولت کدے پر حاضر ہوا، بہت خوش ہوئے اور بڑی تواضع کی، چلتے وقت تین کتابیں نذر کیں، مثنوی زہر عشق جدید تحقیق وتبصرہ کی روشنی میں از عشرت رحمانی، مقالات صدیقی (ج،۱) از عبد الستار صدیقی اور **نجوم الفرقان فی اطراف القران**، موخر الذکر کتاب قران کریم

کے الفاظ کا اشاریہ ہے جو ۱۸۹۸ء کا مطبوعہ ہے۔

خاں صاحب کا گھر سادہ سا بنا ہوا تھا، جس کمرے میں میں بیٹھا تھا، اس کی نوعیت ڈرائنگ روم کم ریڈنگ روم کی سی تھی، چاروں طرف کتابیں سلیقے کے ساتھ لگی ہوئی تھیں، سینٹر ٹیبل کے پاس ہی کسی چھوٹی ٹیبل یا اسٹول پر ادبی رسائل سلیقے سے رکھے ہوئے تھے، کمرے میں ایک طرف ایک ریڈنگ ٹیبل بھی تھی جو ضخیم لغات کی جلدوں سے لدی ہوئی تھی، اسی ٹیبل پر پین اسٹینڈ میں بہت سے پین اور داہنی طرف ایک ٹیپ ریکارڈر اور بہت سے کیسٹ رکھے ہوئے تھے، میں نے بڑی حیرت اور استعجاب سے پوچھا جناب ٹیبل پر ٹیپ ریکارڈر کا موجود ہونا آپ کا اس سے غیر معمولی شغف ظاہر کرتا ہے، کہنے لگے ہاں بھئی لکھتے پڑھتے وقت ہلکی میوزک سننے کا عادی ہوں، اس سے تکان نہیں ہوتا، میں نے کہا میوزک آپ کے مطالعے یا تحریر میں خلل انداز نہیں ہوتی، کہنے لگے بالکل نہیں یہ میری عادت ہے۔

۱۹۹۷ء میں ایک مرتبہ پھر غالب انسٹی ٹیوٹ کے سمینار میں ملاقات ہوئی، اس مرتبہ وہ شاہجہاں پور سے دہلی تشریف لے گئے تھے، ایک اجلاس میں ان کی صدارت اور میری نظامت تھی، اجلاس کے اختتام کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا، آپ نے نظامت اچھی کی، الفاظ کی ادائیگی ٹھیک تھی مگر ایک لفظ کا تلفظ وہ نہیں ہے جو آپ نے ادا کیا، بھائی صحت تلفظ کا بھی خیال رکھیے۔

جولائی ۱۹۹۸ء میں رضا لائبریری رام پور کے سمینار میں بھر پور ملاقات ہوئی، اسی ملاقات میں یہ طے پایا کہ ماہ بہ ماہ ایک نشست بریلی میں رکھی جائے اور خاں صاحب اس میں بہ طور خاص شریک ہوں، چنانچہ وہ میری دعوت پر ۸/نومبر ۱۹۹۸ء کو بریلی تشریف لائے اور میرے غریب خانے پر دن گزار کر شام کو شاہجہاں پور کے لیے واپس ہوگئے، اس موقع پر وہ میرے لیے اپنی تین تصانیف بھی لائے تھے، میں نے ان کی ذہنی ضیافت کے لیے چند مقامی ادیبوں ڈاکٹر لطیف حسین ادیب، محمد عرفان، ڈاکٹر مصطفیٰ حسین نظامی، قنبر سعید اور چند اردو دوستوں کو مدعو کرلیا تھا، اچھی نشست رہی، تقریباً دو گھنٹے کی اس نشست میں املا، تلفظ اور زبان کے بہت سے مسائل زیر گفتگو آئے، رشید صاحب کی گل افشانیِ گفتار دیکھنے کی تھی۔

ان سے جب سے تعلق قائم ہوا تب سے انہوں نے اپنی ہر نئی کتاب دستخط کر کے مجھے ضرور بھیجی اور میری حقیر رائے جاننے کے بھی خواہش مند رہے، میں نے ان کی دو کتابوں ''مثنویات شوق'' اور ''زٹل نامہ'' پر تبصرہ لکھے جو بالترتیب ہماری زبان دہلی (اگست تا اکتوبر ۱۹۹۸ء) اور شاعر ممبئی (نومبر ۲۰۰۴ء) میں شائع ہوئے، اول الذکر تبصرے کو انہوں نے پسند فرمایا اور جی بھر کر دعائیں دیں لیکن دوسرے تبصرے کو پڑھ کر وہ کچھ کبیدہ خاطر ہوگئے اور کچھ دن فون پر ہاں ٹھیک ہوں تک گفتگو محدود رہی، پھر وہ گفتگو بھی بند ہوگئی، اس تبصرے میں میرے درج کردہ تسامحات ان کی رنجیدگی کا باعث نہیں تھے بلکہ رنجیدگی کا باعث وہ عبارت تھی جس میں میں نے لکھا تھا کہ رشید صاحب نے طویل بیماری کے سبب یہ کام بہت عجلت میں کیا ہے اور ان کے دوسرے تدوینی کاموں سے یہ فروتر ہے۔

آخر آٹھ نو ماہ بعد ان کا فون آیا، شمس صاحب میں رشید حسن خاں بول رہا ہوں، آپ تو اسلام کی نشاۃ ثانیہ پر ایمان رکھتے ہیں، سچ سچ بتائیے آپ مجھ سے ناراض کیوں ہے؟ میں نے کہا قبلہ میں آپ سے ناراض ہونے کی جسارت کیسے کرسکتا ہوں، آپ تو میرے بزرگ ہیں، محسن ہیں، کہنے لگے دیکھئے منافقانہ باتیں نہ کیجیے، سچ سچ بتائیے آپ اب فون کیوں نہیں کرتے؟ میں نے کہا جانے بھی دیجیے۔

میری ان کی کوئی لڑائی ہے
اب چلا جاؤں اب صفائی ہے

کہنے لگے خیر جانے دیا لیکن رابطہ ضرور رکھیے، میرے دل میں آپ کی بڑی قدر ہے، دل کے معاملات تھوڑے بہت آپ بھی جانتے ہی ہوں گے؟ آج کل کیا لکھ رہے ہیں؟

(۲)

رشید حسن خاں کی حیات، شخصیت اور تحقیقی وتنقیدی کام ہر طرح کے پیشہ وارانہ تصور سے خالی تھا، انہوں نے تحقیق کے جو پیمانے بنائے تھے، ان پر سود وزیاں سے بالا ہوکر تحقیقی کام نہایت تحمل اور صبر وضبط کے ساتھ کرتے رہے، انہوں نے جو کام بھی کیا ہے، وہ ہماری تاریخ ادب کا زریں باب ہے، سطور ذیل میں ان کی حیات وخدمات کا مختصر تعارف پیش کیا جارہا ہے:

اضلاع روہیل کھنڈ میں شاہجہاں پور، بریلی اور رام پور میں پٹھانوں کے خیل (گروہ) کثرت سے آباد ہوئے، اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی میں روہیلوں کے عروج اور ان کی ریاست کے قیام کے زمانے میں افغانستان اور صوبہ سرحد سے کافی تعداد میں پٹھان ان علاقوں میں وارد ہوئے اور یہیں بس گئے، رشید حسن خاں بھی بہ قول ان کے بیٹے خورشید حسن خاں نسباً یوسف زئی تھے اور اپنے طور وطریق سے مکمل پٹھان تھے، وہ پٹھانوں کی فطرت سے بہ خوبی آشنا تھے جس کا ذکر بھی نہایت دلچسپی سے کرتے تھے، ان کے والد کا نام امیر حسن خاں تھا جو محکمہ پولیس میں داروغہ تھے، انگریزوں اور انگریزی تعلیم کو برا سمجھتے تھے، انہوں نے تحریک عدم تعاون کے زمانے میں نوکری سے استعفیٰ دے دیا تھا۔

خاں صاحب کی تاریخ پیدایش از روئے تعلیمی اسناد ۱۰/جنوری ۱۹۳۰ء تحریر کی گئی ہے (رشید حسن خاں اطہر فاروقی، دہلی ۲۰۰۲ء، ص۹) جو غلط معلوم ہوتی ہے کیوں کہ

۱۹۳۹ء میں انہوں نے شاہجہاں پور کی آرڈی نینس فیکٹری میں ملازمت کا آغاز کیا تھا، ظاہر ہے ۹ سال کی عمر میں تو ان کو ملازم نہیں رکھا گیا ہوگا۔

خاں صاحب یکم اگست ۱۹۹۸ء کو ممبئی علاج کے لیے گئے تھے، اسی زمانے میں روزنامہ انقلاب ممبئی کے لیے ڈاکٹر صاحب علی نے ان سے انٹرویو لیا تھا، اس انٹرویو (مطبوعہ ۱۳/ اکتوبر ۱۹۹۸ء) میں خاں صاحب کے تعارف میں ادارے کی طرف سے جو نوٹ دیا گیا ہے، اس میں خاں صاحب کی تاریخ پیدایش دسمبر ۱۹۲۵ء دی گئی ہے، اخبار کا تراشہ خاں صاحب نے خود مجھے بھیجا تھا، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اخبار میں شائع کردہ تاریخ خاں صاحب کی فراہم کردہ تھی، اگر یہ غلط ہوتی تو خاں صاحب اس کو قلم زد کرتے یا اس سے مطلع کرتے، لہٰذا یہ طے ہے کہ ان کی صحیح تاریخ پیدایش دسمبر ۱۹۲۵ء ہی ہے، اس سال پیدایش سے ان کی ملازمت کے آغاز کا سنہ بھی درست قرار پاجاتا ہے، یعنی وہ بہ وقت ملازمت ۱۴ سال کے تھے۔ [1]

خاں صاحب کی تعلیم کو بھی باضابطہ نہیں کہا جاسکتا، ان کا داخلہ شاہجہاں پور کے عربی مدرسے بحرالعلوم میں کرایا گیا تھا لیکن وہ درس نظامی مکمل نہیں کرسکے اور معاشی حالات اچھے نہ ہونے کی وجہ سے ملازمت پر مجبور ہوئے، انہوں نے پرائیوٹ طور پر اردو، عربی، فارسی کے امتحانات پاس کیے، لکھنؤ یونی ورسٹی سے دبیر کامل اور الہ آباد بورڈ سے مولوی کا امتحان پاس کیا اور کثرت مطالعہ سے اپنے علم میں برابر اضافہ کرتے رہے، باضابطہ یونی ورسٹی ایجوکیشن سے محروم رہے، ۱۹۴۷ء میں آرڈی نینس فیکٹری کی ملازمت سے برطرف کردیے گئے، ملازمت سے برطرف کیے جانے کا سبب خاں صاحب کا مزدور یونین بنانے میں حصہ لینا اور اس یونین میں جوائنٹ سکریٹری کا عہدہ قبول کرنا تھا، اس فیکٹری میں تیس ہزار سے زائد آدمی کام کرتے تھے۔

ملازمت سے برطرف ہوجانے کے بعد بالترتیب مدرسہ فیض عام اور اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول شاہجہاں پور میں مدرس مقرر ہوئے، [2] اگست ۱۹۵۹ء میں شعبہ اردو دہلی یونی ورسٹی میں ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر ان کا تقرر عارضی تھا، ۱۹۶۴ء میں اسے کل وقتی منظوری حاصل ہوگئی، تقریباً تیس سال ملازمت کرنے کے بعد ۳۱/ دسمبر ۱۹۸۹ء کو وہ اسی عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

سبکدوش ہونے کے بعد ایک مدت تک وہ یہ فیصلہ نہیں کرسکے کہ انہیں دہلی میں رہنا چاہیے یا واپس اپنے وطن لوٹ جانا چاہیے، آخر ۲/ فروری ۱۹۹۶ء کو وہ دہلی سے مستقل طور پر شاہجہاں پور آگئے اور لکھنے پڑھنے کے مشاغل میں مصروف ہوگئے، چند سال پیشتر ان کو ذیابطیس کا مرض لاحق ہوگیا تھا جس کے زیر اثر انجائنا کا شکار ہوئے، ادبی کام اس حال میں بھی جاری رکھا، سمیناروں میں شرکت بند کردی تھی، متقاعد زندگی گزار رہے تھے۔

مارچ ۲۰۰۳ء میں ان کی اہلیہ نے وفات پائی، اس صدمہ کا انہوں نے کسی سے ذکر بھی نہیں کیا، بالآخر ۲۶/ فروری ۲۰۰۶ء کو ان کا بھی وقت موعود آپہنچا، پس ماندگان میں انہوں نے دو بیٹے خورشید حسن خاں، خالد حسن خاں اور بیٹی نادرہ بیگم زوجہ مقصود حسن خاں یادگار چھوڑیں، خاں صاحب کے دونوں بیٹے اردو ٹیچر ہیں۔

خاں صاحب نے ایک محتاط اندازے کے مطابق تقریباً ۳۲ کتابیں لکھیں، ۱۳ کتابیں مکتبہ جامعہ کے لیے تیار کیں جن میں سے چند دستیاب نہیں ہوسکیں، مطبوعہ کتب کے اسما مع سنین ومقام اشاعت حسب ذیل ہیں:

مقدمہ شعر و شاعری (دہلی ۱۹۶۹ء) انتخاب نظیر اکبر آبادی (دہلی ۱۹۷۰ء) انتخاب شبلی (دہلی ۱۹۷۱ء) انتخاب مراثی انیس ودبیر (دہلی ۱۹۷۱ء) دیوان خواجہ میر درد (دہلی ۱۹۷۱ء) انتخاب سودا (دہلی ۱۹۷۲ء) انتخاب کلام ناسخ (دہلی ۱۹۷۲ء، کراچی ۱۹۹۶ء) اردو املا (دہلی ۱۹۷۴ء) اردو کیسے لکھیں (دہلی ۱۹۷۵ء) زبان اور قواعد (دہلی ۱۹۷۶ء، ۱۹۸۳ء) ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ (دہلی ۱۹۷۸ء، لکھنؤ، لاہور ۱۹۸۹ء) تلاش وتعبیر (دہلی ۱۹۸۸ء) فسانہ عجائب (دہلی ۱۹۹۰ء، لاہور ۱۹۹۰ء، دہلی ۱۹۹۶ء) باغ و بہار (دہلی ۱۹۹۲ء، لاہور ۱۹۹۲ء) تفہیم (دہلی ۱۹۹۳ء) انشاء اور تلفظ (دہلی ۱۹۹۴ء) عبارت کیسے لکھیں (دہلی ۱۹۹۴ء) انشائے غالب (دہلی ۱۹۹۴ء، کراچی ۲۰۰۱ء) مثنوی گلزار نسیم (دہلی ۱۹۹۵ء) مثنویات شوق (دہلی ۱۹۹۸ء، کراچی ۱۹۹۸ء) تدوین، تحقیق، روایت (دہلی ۱۹۹۹ء) املائے غالب (دہلی ۲۰۰۰ء) مثنوی سحرالبیان (دہلی ۲۰۰۰ء) مصطلحات ٹھگی (دہلی ۲۰۰۲ء) زٹل نامہ (دہلی ۲۰۰۳ء) کلاسیکی ادب کی فرہنگ ج/۱ (دہلی ۲۰۰۳ء)۔

ان کا آخری تدوینی کام لفظیات غالب ہے، جسے انہوں نے "گنجینہ معنی کا طلسم" نام دیا ہے، یہ دو جلدوں پر مشتمل ہوگا، تقریباً ۱۵۰۰ صفحات پر، غالب کے اردو کلام میں مستعمل الفاظ کے نوعیتِ استعمال پر بحث کی گئی ہے، جلد اول جس کی کتابت ہوچکی ہے، جلد ہی انجمن ترقی اردو ہند شائع کرے گی۔

تین کتابیں غرائب اللغات، امراؤ جان ادا اور قصائد سودا کی تدوین بھی ان کے پیش نظر تھی، اس سلسلے کا مواد وہ برابر اکٹھا کررہے تھے لیکن ان پر کام کرنے کی نوبت نہیں آسکی۔

خاں صاحب کے پسندیدہ موضوع ادبی تحقیق اور تدوین رہے ہیں لیکن ادب میں ان کا اختصاص ادبی تحقیق اور تدوین متن کے ساتھ ساتھ املا، لغت، زبان وقواعد کے مسائل اور عروض بھی رہے ہیں، ان کی جملہ تصانیف ان موضوعات میں سے کسی نہ کسی کا احاطہ کرتی نظر آتی ہیں۔

خاں صاحب نے ہندو پاک کی مختلف جامعات میں اصول تحقیق وتدوین اور

مشرقی شعریات پر تقریباً دو درجن لکچر دیے، املا پر متعدد ورکشاپ کنڈکٹ کیں، شعبہ اردو جموں یونی ورسٹی اور شعبہ اردو بمبئی یونی ورسٹی میں بہ حیثیت وزیٹنگ فیلو متعینہ مدت میں لکچر دیے۔

خاں صاحب کو ملک اور بیرون ملک کے تقریباً ایک درجن انعامات واعزازات سے نوازا گیا، مثلاً دہلی ساہتیہ کلا پریشد ایوارڈ ۱۹۷۷ء، غالب ایوارڈ ۱۹۷۹ء، نیاز فتح پوری ایوارڈ (کراچی) ۱۹۸۹ء، محمد طفیل ادبی ایوارڈ (لاہور) ۱۹۹۰ء، کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ ۱۹۹۱ء، ابوالکلام آزاد ایوارڈ ۱۹۹۷ء۔

میری نظر میں ان کو اب تک کا سب سے بڑا اعزاز و اکرام انجمن ترقی اردو ہند دہلی نے دیا تھا، انجمن کی نشر و اشاعت کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ خاں صاحب کی کسی بھی کتاب کے مسودے کو اشاعت کی منظوری حاصل کرنے کے لیے کمیٹی کے سامنے نہ رکھا جائے بلکہ مسودہ موصول ہوتے ہی بغیر کسی تاخیر کے شائع کردیا جائے، انجمن کی تاریخ کا شاید یہ سب سے انوکھا فیصلہ تھا جو ہر لحاظ سے مفید مطلب ثابت ہوا، ایک مصنف کی کتاب اگر اشاعت سے محروم رہے یا اس کی اشاعت میں توقف یا التوا پیدا ہوجائے تو اس کے آیندہ کے تصنیفی منصوبے متاثر ہوجاتے ہیں، خاں صاحب اس معنی میں خوش نصیب مصنف تھے کہ ان کی ہر نئی کتاب تصنیف و تکمیل کے دوران ہی اشاعت کے مراحل طے کرنے لگتی تھی، خاں صاحب کو اشاعت کے مراحل سے بے نیاز کرنے اور ان کے خاص اختیار کردہ املا، توقیف نگاری، اعراب نگاری کو برقرار رکھنے کی انجمن نے جو مثال قائم کی، اس کے لیے وہ تمام اردو حلقے کے شکریے کی مستحق ہے، دو مصرعوں پر اپنی بات کو ختم کرتا ہوں:

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں

(اپریل ۲۰۰۶ء)

---

۱ ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب نے راقم کو خاں صاحب کی وفات کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا تھا "مجھ سے چار چھ سال بڑے تھے، عمر ۸۲، ۸۴ برس کی ہوگی"۔ (مکتوب ۲۸/ فروری ۲۰۰۶ء)

۲ ادیب صاحب کے محولہ مکتوب گرامی میں یہ بھی تحریر ہے کہ "میں ان کو اس وقت سے جانتا تھا جب کہ وہ اپنی نوجوانی کے ایام میں بریلی میں مقیم تھے"۔ (بنام ضیاء الدین)

ندوی، مجیب اللہ، مولانا

آہ! مولانا مجیب اللہ ندوی

افسوس ہے کہ دارالمصنفین کے سابق رفیق، جامعۃ الرشاد کے بانی و ناظم مولانا مجیب اللہ ندوی نے داعی اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وہ ان علما میں تھے جو اسلامی علوم سے واقف ہونے کے ساتھ ہی زمانے کے حالات قوم و ملت کے مسائل اور اپنے ملک اور دنیائے اسلام کے واقعات سے بھی باخبر رہتے تھے، ان کا انتقال ۱۲/مئی ۲۰۰۶ء کو مغرب کے وقت لکھنو کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں ہوا، دوسرے روز صبح کو ان کی لاش اعظم گڑھ لائی گئی اور اسی دن سہ پہر کو جامعۃ ارشاد کے جس کمرے میں وہ رہتے تھے اسی سے متصل پورب کی طرف کے قبرستان میں ان کی تدفین ہوئی، مولانا بڑے چاق و چوبند اور چلت پھرت کے آدمی تھے، سفر کثرت سے کرتے تھے مگر گزشتہ دو تین برس سے طول عمر اور ضعف و علالت کے باعث جامعۃ الرشاد کے باہر نکلنا بند کردیا تھا مگر اس معذوری اور خانہ نشینی کے باوجود ان کا ذہن و دماغ پوری طرح کام کرتا تھا اور لکھنے پڑھنے کا مشغلہ بھی ایک حد تک جاری تھا شروع سے وہ نماز کا بڑا اہتمام کرتے تھے، سفر حضر ہر جگہ جماعت سے نماز ادا کرتے تھے مگر آخر میں ضعف اتنا بڑھ گیا کہ مسجد کی حاضری موقوف ہوگئی جس کا انہیں بڑا ملال رہتا تھا۔

انتقال سے کئی ہفتے پہلے ان پر غشی طاری ہوئی اور بات چیت بند ہوگئی اور بالآخر وہ وقت آپہنچا کہ ان کی جوش عمل سے سرشار، متحرک جدوجہد سے معمور اور ہردم رواں دواں رہنے والی زندگی کا خاتمہ ہوگیا اور قوم و ملت کا یہ ہم درد اور بہی خواہ اپنے مالک حقیقی سے جاملا۔

مولانا کا آبائی وطن غازی پور ضلع کا موضع کسمی خورد تھا لیکن ان کی پیدائش اعظم گڑھ میں ہوئی جہاں ان کے والد محکمہ پولیس میں ملازم تھے، مولانا کا بچپن یہیں کے قصبات میں گزرا اور بعد میں ان کی علمی و عملی، دینی و تعلیمی اور قومی و ملی سرگرمیوں کا خاص مرکز بھی یہی ضلع بنا اور وہ اسی کی خاک کا پیوند بھی ہوئے۔

ناظرہ، حفظ قرآن اور اردو فارسی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہیں عربی تعلیم حاصل کرنے کے لیے جامعہ مظہرالعلوم میں داخل کیا گیا جہاں کئی برس گزارنے کے بعد انہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلما میں داخلہ لیا اور مولانا شبلی فقیہ جیراج پوری، مولانا شاہ حلیم عطا، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا عبدالسلام قدوائی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد ناظم ندوی اور مفتی محمد سعید وغیرہ کے درس سے فیض یاب ہوئے اور ۱۹۴۵ء میں فراغت حاصل کی۔

یہ تحریک آزادی کے شباب کا زمانہ تھا، مولانا کی بے چین و بے قرار طبیعت کا رجحان کانگریس اور جمعیۃ علمائے ہند کی طرف تھا اور ان میں جوش و خروش سے حصہ لیا لیکن ان کا اصل مزاج دینی تھا، اس لیے جلد ہی سیاسی سرگرمیاں چھوڑ کر مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی دینی تحریک میں شامل ہوگئے اور تعطیل کے ایام میں تبلیغی جماعتوں کے ساتھ

گزارتے، پھر وہ جماعت اسلامی ہند میں شامل ہوئے اور ایک عرصے تک اس میں سرگرم رہے، وہ جس تحریک یا جماعت سے وابستہ ہوتے اس کے لیے رات دن ایک کردیتے اور اس میں اس قدر سرگرمی سے حصہ لیتے کہ سب کو پیچھے چھوڑ دیتے، اس سے ان کی غیر معمولی قوت عمل اور جوش و ولولہ کا اندازا ہوتا ہے۔

مولانا مجیب اللہ ندوی کی طالب علمی کے زمانے میں مولانا سید سلیمان ندوی ندوۃ العلما کے معتمد تعلیم تھے، سید صاحب وہاں جاتے تو کلاسوں میں جاکر طلبہ کو درس دیتے، اکثر منتہی اور فارغ طلبہ رمضان کی تعطیل میں اعظم گڑھ آجاتے اور سید صاحب انہیں اور رفقائے دارالمصنفین کو قرآن مجید اور حجۃ اللہ البالغہ کا درس دیتے، مولانا مجیب اللہ ہونہار بھی تھے اور حافظ قرآن بھی، سید صاحب کو ان کی صلاحیتوں کا اندازہ ہوگیا تھا اس لئے جس سال یہ آخری درجے میں تھے۔ سید صاحب نے انہیں رمضان المبارک میں دارالمصنفین آنے کی دعوت دی اور کہا، آپ مجھے تراویح میں قرآن مجید سنایئے اور میں آپ کو قرآن مجید پڑھاؤں، ان کی یہی آمد دارالمصنفین میں قیام کی تقریب بن گئی اور پھر وہی ہر سال تراویح پڑھانے لگے، شہر میں رہنے لگے تو قریب کی مسجد میں وہی امامت کرتے اور تراویح پڑھاتے تھے، میرا جب دارالمصنفین سے تعلق ہوا تو مجھے بھی اپنی مسجد میں تراویح پڑھنے کے لیے اصرار سے بلاتے اور میں نے کئی سال ان کی اقتدا میں پڑھا بھی، وہ قرآن بہت اچھا پڑھتے تھے، مجھے بڑا لطف ملتا تھا، جب تک ان میں قوت تھی، اپنی مسجد میں خود ہی تراویح پڑھاتے تھے۔

سید صاحب ۱۹۴۶ء میں قاضی القضاۃ ہوکر بھوپال تشریف لے گئے، اس لیے مولانا مجیب اللہ صاحب کو دارالمصنفین میں ان کے ساتھ زیادہ رہنے کا موقع نہیں ملا تاہم اس قلیل عرصے میں بھی وہ ان کی صحبتوں اور علمی مجلسوں میں شریک رہتے تھے اور ان کے علمی کاموں میں مراجع کی تلاش میں مدد کرتے تھے، کبھی کبھی سفر میں بھی ان کی رفاقت کی، ایک دفعہ پشاور کے سفر میں سید صاحب ان کو اپنے ساتھ لے گئے، مولانا محمد یوسف بنوری نے ان سے سوال کیا، بیضاوی کا متن کہاں ہے؟ یہ جواب نہ دے سکے تو سید صاحب نے فرمایا کہ وہ ان کے سینے میں ہے، ایک دفعہ مشہور اہل حدیث عالم مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی بہار جارہے تھے، انہوں نے سید صاحب کو اطلاع دی کہ میں فلاں ٹرین سے اعظم گڑھ آکر آپ سے ملنا چاہتا ہوں، کسی کو اسٹیشن بھیج دیجیے گا، سید صاحب نے یہ خدمت ان کے سپرد کی، مولانا سیالکوٹی تہجد گزار تھے، سویرے تہجد کے لیے مسجد گئے، مولانا مجیب اللہ صاحب فرماتے تھے کہ اس وقت فجر کی اذان میں یا مولانا مسعود علی صاحب دیتے تھے، اس روز مولانا سیالکوٹی نے غلس میں اذان دی اور قدرے انتظار کر کے تنہا غلس میں نماز ادا کرلی، یہ جب مسجد آئے تو انہوں نے کہا یہاں اسفار میں نماز ہوتی ہے، کیا جماعت سے نماز پڑھنا افضل ہے یا اپنے مسلک کے مطابق غلس میں، مولانا نے فرمایا میں مسافر تھا، مجھے وقت معلوم نہیں تھا، جماعت سے نماز پڑھنا ہی افضل ہے مگر یہ دیر تک بحث کرتے رہے، ناشتے کے وقت مولانا نے سید صاحب سے فرمایا کہ فجر کے وقت ان صاحب زادے نے مجھے کافی تنگ کیا، مولانا مجیب اللہ صاحب عمر بھر سید صاحب کی عقیدت کا دم بھرتے رہے، ان سے والہانہ تعلق کی بنا پر ان پر سمینار بھی کرایا تھا۔

راقم مولانا مجیب اللہ صاحب کے نام اور ان کی کتاب ''اہل کتاب صحابہ و تابعین'' سے اس وقت واقف ہوا جب مدرستہ الاصلاح میں زیر تعلیم تھا، اس وقت مولانا جماعت اسلامی کے سرگرم رکن تھے اور مدرسے میں بھی اس کا بڑا اثر تھا اور وہاں اس کے اکثر پروگرام بھی ہوتے تھے جن میں مولانا مجیب اللہ صاحب بھی تشریف لے جاتے تھے، یہاں ان کو دیکھنے کے باوجود ان سے ملاقات کا شرف حاصل نہ کرسکا مگر جب ۱۹۵۷ء میں میرا بھی دارالمصنفین سے تعلق ہوا تو ان سے میری قربت بہت بڑھ گئی وہ مجھے اکثر اپنے گھر بلاتے اور بڑی شفقت اور دل جوئی کرتے، میں ان سے ہر ہر معاملے میں مشورہ کرتا، میرے والد اور بھائیوں سے بھی ان کا بڑا تعلق ہوگیا تھا اور وہ ہم لوگوں کی دعوت پر دو ایک بار میرے گھر بھی تشریف لے گئے۔

اتفاقاً اسی زمانے میں مدرستہ الاصلاح کے ذمہ داروں نے جماعت کے بعض ارکان کا تعلق مدرسہ سے ختم کردیا، اس سے قدرتاً جماعت کے لوگ بہت برہم ہوئے، مولانا مجیب اللہ صاحب بھی بڑے طیش میں تھے اور وہ مجھے دیکھتے ہی اپنا غصہ ظاہر کرنے لگتے، حالاں کہ میرا کوئی ذمہ دارانہ تعلق اس وقت مدرسے سے نہ تھا، اسی موڑ پر انہیں جامعۃ الرشاد کے قیام کا خیال آیا اور بے سروسامانی کے باوجود ۱۹۶۲ء میں جامعۃ الرشاد قائم کردیا۔

شروع میں یہ مدرسہ شہر کی دفتری مسجد میں تھا جس کے مولانا امام تھے اور اسی کے قریب ان کی رہایش گاہ تھی، مدرسین اور طلبہ کی رہائش کے لیے بھی قریب ہی کرایے کا ایک مکان لے لیا جو چند کمروں، ایک برآمدے اور ایک صحن پر مشتمل تھا، شروع ہی میں ان کو اچھا اسٹاف اور کارکن اور طلبہ بھی مل گئے جن میں اکثر مدرستہ الاصلاح سے علاحدہ کئے گئے یا خود سے علاحدہ ہوجانے والوں پر مشتمل تھا، البتہ مالیات کی فراہمی میں کچھ زحمتیں اٹھانی پڑیں تاہم جماعت اسلامی کی تنظیم سے ان کو اس میں بھی بڑی مدد ملی، اس وقت مولانا جماعت سے وابستہ تھے مگر جب انہوں نے جامعہ کو جماعت کے حوالے نہ کرنے کا فیصلہ کیا تو جماعت کی تائید و ہم دردی ختم ہوگئی لیکن وہ ساری مشکلات پر قابو پاتے رہے اور مدرسہ بھی ترقی کے مراحل طے کرتا رہا، اسی زمانے میں وہ جماعت اسلامی سے علاحدہ ہوگئے اور مولانا شاہ وصی اللہ سے بیعت ہوئے اور ان کے انتقال کے بعد مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھی کی طرف رجوع ہوئے۔

جب ان کی ساری قوت مدرسے پر صرف ہونے لگی تو درالمصنفین کے اس وقت کے ذمہ داروں نے ان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ یا تو وہ یک سوئی سے مدرسے ہی کے لیے اپنے کو فارغ کرلیں یا اس کی نگرانی کسی اور کو سپرد کرکے عام نگرانی کی حد تک اس سے وابستہ رہیں مگر انہوں نے غور وفکر اور رائے مشورے کے بعد یہی فیصلہ کیا کہ وہ صرف مدرسہ کی خدمت میں مصروف رہیں گے کیوں کہ اس کا کام اتنا پھیل گیا تھا کہ اسے چھوڑ دینا مشکل تھا، اب اللہ پر بھروسہ کرکے اور اپنے بعض رفقا اور خاص معاونین کو لے کر انہوں نے جامعۃ الرشاد کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا، اس کے لیے بیرون ملک گئے، ایک وسیع زمین حاصل کی جس پر عالی شان اور مستحکم عمارتیں اور خوب صورت مسجد تعمیر کرائی اور بڑے صبر و استقلال سے جامعۃ الرشاد کو پایۂ تکمیل کو پہنچایا، اس سے ان کی مضبوط قوت ارادی اور آہنی عزم و ارادے کا پتا چلتا ہے، وہ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھے جب تک کہ جامعۃ الرشاد کی حالت اطمینان بخش نہ ہوگئی، اس زمانے میں انہوں نے اپنی ساری دلچسپیاں اور ہر طرح کے مشاغل کو خیر باد کہہ دیا تھا۔

مولانا مجیب اللہ صاحب میں گوناگوں علمی و عملی صلاحیتیں تھیں اور وہ بڑے متحرک اور فعال تھے، تصنیف وتالیف سے انہیں بڑی مناسبت تھی، دارالمصنفین سے ان کی دو کتابیں شائع ہوئیں ''اہل کتاب صحابہ وتابعین'' اور ''تبع تابعین'' اول الذکر کا مقدمہ بڑی دیدہ ریزی سے لکھا، دوسری کتاب میں امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کے حالات بھی بڑے تلاش وتفحص سے لکھے لیکن اس سے اہم چیز ان کے فقہی و اجتہادی کارناموں پر بحث وگفتگو ہے، اس کے علاوہ معارف کے لیے انہوں نے درجنوں عالمانہ ومحققانہ مضامین لکھے، ان کی فقہ پر بڑی گہری نظر تھی، ان کے اکثر فقہی مضامین کو اہل علم نے بہت پسند کیا اور ان کے ملک کی بعض زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے، ادب سے بھی شغف تھا مگر اس کی طرف کم توجہ کی۔

انہیں درس وتعلیم اور طلبہ کی ذہنی و دماغی اصلاح وتربیت سے بڑی دلچسپی تھی، جامعۃ الرشاد اسی ذوق کا مظہر ہے، جب اترپردیش میں دینی تعلیمی کونسل قائم ہوئی اور مکاتب کے قیام کی تحریک شروع ہوئی تو انہوں نے اعظم گڑھ اور اس کے ملحق اضلاع کا طوفانی دورہ کیا اور گاؤں گاؤں میں مکاتب کا جال بچھادیا۔

ان میں اچھی انتظامی صلاحیت تھی، جامعۃ الرشاد کو بڑے حسن وخوبی سے چلایا اور اس کے زیر اہتمام کئی کامیاب علمی و دینی پروگرام کیے۔

قومی وملی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، اعظم گڑھ میں مسلمانوں کے کسی علمی، تعلیمی، دینی اور ملی کام میں اس وقت تک جان نہ پڑتی جب تک وہ اس میں شامل نہ ہوتے، ہندوستان کے مسلمانوں پر آئے دن جو افتاد آتی رہتی ہے اس سے بہت کبیدہ رہتے تھے، ان کی مظلومی اور بے بسی دیکھ کر تڑپتے تھے، معاندین اسلام اور فرقہ پرستوں کے خلاف برابر علمی و عملی قلمی جہاد میں مصروف رہتے، اجودھیا کی بابری مسجد ہو یا مسلم کش فسادات اور پولس کی بربریت، ہر معاملے میں بے خطر کود پڑتے اور جان کی بازی لگادیتے، بڑی سی بڑی قربانی دیتے اور قید وبند کی صعوبتیں جھیلتے۔

ان کی دینی، علمی اور فقہی عظمت کا اعتراف پورے ملک میں کیا گیا، کبار علما اور اہل مدارس سے ان کے روابط تھے، ہر جگہ کی تقریبات اور پروگرام میں مدعو کیے جاتے تھے، ان کی اصلاحی، معاشرتی اور ملی خدمات کو مسلمانوں کی آل انڈیا تنظیمیں قدر وعظمت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں اور ان کے مشوروں اور تجربوں سے فائدہ اٹھاتی تھیں، وہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، ملی کونسل اور فقہ اکیڈمی کے موقر رکن تھے۔

جامعۃ الرشاد کے استحکام کے بعد وہ بڑی یک سوئی کے ساتھ تصنیف وتالیف کی طرف بھی متوجہ ہوئے اور اس کے لیے ندوۃ التالیف والترجمہ کا شعبہ قائم کیا اور وہاں سے اپنے پرانے مضامین کتابی صورت میں شائع کرنے کے علاوہ بعض ہلکے پھلکے رسالے اور کتب بھی شائع کیں اور ماہنامہ ''الرشاد'' نکالا، اس کے اداریے عموماً بہت پسند کیے جاتے تھے جن میں ملک وملت کے موجودہ مسائل پر بحث وتجزیہ کیا جاتا تھا، ''سیرۃ النبی ﷺ'' کا ساتواں حصہ جو معاملات پر مشتمل تھا، نامکمل رہ گیا تھا، وہ کہتے تھے میں اسے مکمل کروں گا اور غالباً اس سلسلے کے بعض مضامین لکھے بھی، اس میں شبہ نہیں کہ ان میں بڑی صلاحیتیں تھیں اور ان کی اٹھان بھی بہت شان دار تھی مگر دارالمصنفین سے وابستگی کے زمانے میں ان کے قلم سے جس معیار کی تحریریں شائع ہوئیں وہ معیار بعد کی تحریروں کا نہیں رہا، ان کی اصل جگہ دارالمصنفین تھی لیکن مزاج میں وارستگی اور طبیعت میں اتار چڑھاؤ تھا، کسی نظام کی پابندی اور دوسرے کی ماتحتی اور مداخلت پسند نہیں کرتے تھے۔

مولانا کے تعلقات ہر طبقے کے لوگوں سے تھے اور سب سے اچھا برتاؤ کرتے تھے لیکن اگر کسی کی بات یا کوئی ادا پسند نہیں آتی تو موقع بے موقع ٹوک دیتے تھے جس کے انداز میں بڑی شدت ہوتی تھی مگر بہت جلد سنبھل جاتے، کسی کے خلاف اپنے دل میں کینہ وکدورت نہ رکھتے، ان کی وفات بڑا حادثہ اور مسلمانوں کا شدید خسارہ ہے، اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس نصیب کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔

(''ض''، جون ۲۰۰۶ء)

اصلاحی، محمد مختار، مولانا حکیم

آہ! مولانا حکیم محمد مختار اصلاحی

مولانا حکیم محمد مختار اصلاحی کا انتقال ۱۱/ جون کو ہوا مگر کچھ پتا نہیں چلا، ممبئی کے اخبار یہاں نہیں آتے، وہاں سے آنے والوں نے بھی اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا، ان

کے عزیزوں اور صاحبزادوں کو اتنے جاں کاہ حادثے میں ان کے اس دور افتادہ قدرداں اور نیازمند کا خیال نہیں آیا، جولائی کا ترجمان اصلاحی ۱۱؍جولائی کو آ گیا تھا مگر اسی روز میری چھوٹی بہن نسیمہ اللہ کو پیاری ہوگئی تھی، کئی روز بعد گھر سے آنے پر اسے کھولا تو سرورق پر حکیم صاحب کی تصویر کے نیچے یہ مصرعہ درج تھا:

؎ آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

دل کا عجیب حال ہوگیا، بہن کا غم تازہ ہی تھا کہ اب اس مسیحانفس کی بات بھی گئی۔

موت برحق ہے، کسی کو اس سے مفر نہیں، حکیم صاحب تو عمر طبعی کو پہنچ گئے تھے مگر ان کے جیسے کرم فرما اور اپنے سے اس قدر ٹوٹ کر ملنے اور چاہنے والے کا صدمہ ناقابل برداشت تھا، ان کی یاد بھلائے نہیں بھولتی ؎

آئی جو یاد ان کی تو آتی چلی گئی
ہر نقش ما سوا دل سے مٹاتی چلی گئی

وہ ضلع جون پور کے مشہور مردم خیز قصبہ صبرحد میں ۱۵؍جون ۱۹۱۵ء کو ایک متوسط زمیں دار گھرانے میں پیدا ہوئے، ان کے والد ممبئی میں رہتے تھے، اردو اور فارسی کی تعلیم دادا کے زیرنگرانی گھر پر ہوئی، اعلا تعلیم مدرستہ الاصلاح سرائے میر میں حاصل کی، جہاں مولانا شبلی متکلم ندوی اور مولانا امین احسن اصلاحی وغیرہ سے درس لیا، جماعت اسلامی ہند کے سابق امیر مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی ان کے ہم سبق تھے۔

مدرستہ الاصلاح سے فراغت کے بعد علی گڑھ کے طبیہ کالج میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۹ء میں والد کے پاس ممبئی تشریف لے گئے اور پھر وہیں کے ہوگئے، محمد علی روڈ پر فینسی محل میں مطب شروع کیا اور اس کا نام اصلاحی دواخانہ رکھا، اب ان کے چھوٹے صاحبزادے حکیم محمد طارق اصلاحی وہاں بیٹھتے ہیں۔

ممبئی جیسے ہنگامہ خیز اور بڑے شہر میں جہاں ایک سے بڑھ کر ایک ڈاکٹر، طبیب، دواخانے اور اسپتال تھے، ان کی موجودگی میں بہت جلد شہرت و مقبولیت اور غیر معمولی کامیابی حاصل کر لینے اور اپنی حذاقت و مہارت کا سکہ جما لینے میں حکیم صاحب کے ملکۂ خداداد، ذہانت و قابلیت کے علاوہ ان کی محنت، جاں کاہی، باقاعدگی، اصول پسندی، استقلال، میانہ روی، یک سوئی، پیشے سے خلوص، مریضوں سے ہم دردی، فیض رسانی اور خدمت خلق کے جذبے کو بھی بڑا دخل تھا، اگر ان کا مقصد حصول زر ہوتا تو جدید طریقہ علاج یا کسی اور پیشے کو اختیار کرتے مگر انہوں نے مخالف ہوا میں بھی طب یونانی کا چراغ روشن رکھا جو ان کا بڑا کارنامہ ہے۔

حکیم صاحب بڑے عزم و حوصلے کے آدمی تھے، بڑھاپے میں بھی نہایت چاق و چوبند رہتے، کبھی ہمت نہ ہارتے، اپنی دھن میں لگے رہتے، اپنے اصل پیشے سے کبھی بے پروائی نہ برتتے، دوسرے کام ان کی نظر میں ضمنی اور ثانوی تھے، اصل توجہ طبابت پر ہوتی اور اس میں نئی جدت و اختراع کرتے رہتے، ان میں جوانوں سے زیادہ قوت عمل اور جوش تھا، انہوں نے جب مجھے بے تکلف بنالیا تو میں کہا کرتا تھا ”جس کی پیری میں ہے مانند سحر رنگ شباب“۔

حکیم صاحب کا دائرہ فیض ممبئی تک محدود نہ تھا، ان کا اصل مرکز تو ممبئی میں فینسی محل کا اصلاحی دواخانہ تھا مگر اس کی شاخیں دوسرے شہروں میں بھی پھیل گئی تھیں، نہرو نگر کرلا ایسٹ میں اصلاحی ڈرگ کے نام سے دواؤں کو جدید طرز پر تیار کرنے کے لیے ایک فیکٹری قائم کی گئی جس میں ہر قسم کے پیڑ پودے اور جڑی بوٹیاں مہیا کی گئی تھیں، دوارکا پوری کرلا ویسٹ میں اصلاحی یونانی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کھولا جس میں جدید طرز کے آلات اور مشینوں سے دوائیں تیار ہوتی تھیں، دہلی اور حیدرآباد میں بھی اصلاحی دواخانے کی شاخیں قائم ہوگئی تھیں، ان کے کاموں کے پھیلاؤ اور وسعت کی بنا پر ایک دفعہ میں نے ان سے کہا کہ آپ تو حکیم عبدالحمید ثانی ہیں۔

وہ کھانے پینے اور رہنے سہنے میں بڑے محتاط تھے، ان کی خوراک بہت کم اور سادہ تھی، مجھے ان کے یہاں کئی بار کھانا کھانے اور ناشتہ کرنے کا اتفاق ہوا، جس میں اور بھی لوگ مدعو ہوتے تھے، حکیم صاحب ہم لوگوں کے ساتھ بیٹھتے مگر خود کھانے کے بجائے دوسروں کی پلیٹ میں چیزیں ڈالتے رہتے، ایک دفعہ میں نے کہا آپ تو حکیم عبدالحمید ثانی معلوم ہوتے، میں ایک مرتبہ ہمدرد نگر میں اوصاف علی صاحب کے ساتھ قیام پذیر تھا، حکیم عبدالحمید صاحب نے لال کنواں کے پاس اپنے گھر کھانے کی دعوت کی، وہاں آٹھ دس آدمی اور رہے ہوں گے، حکیم عبدالحمید صاحب سب کے ساتھ بیٹھے مگر ایک لقمہ بھی نہیں لیا، دریافت کرنے پر بتایا کہ وہ رات میں کھانا نہیں کھاتے اور دن میں بھی دہی اور تھوڑا سا جوس ان کی غذا تھی، دارالمصنفین آتے تو اس کا انتظام کیا جاتا۔

حکیم محمد مختار صاحب صبح سویرے اٹھتے، ضروری کاموں سے فارغ ہوکر لوکل ٹرین سے دواخانے جاتے اور پھر عشاء کے وقت لوکل ٹرین ہی سے واپس آتے، آخر میں یہ معمول بدل گیا تھا، غالباً دو بجے دن میں واپس آجاتے، دوسرے وقت ان کے صاحبزادے مطب میں رہتے، ایک دفعہ میں نے ایک صاحب سے کہا کہ حکیم صاحب کو اللہ تعالیٰ نے وسعت اور کشادگی دی ہے، انہیں اپنی گاڑی سے مطب آنا جانا چاہیے، وہ خواہ مخواہ زحمت اٹھا کر ٹرین سے آتے جاتے ہیں، انہوں نے کہا یہ صحیح ہے کہ اپنی ذات پر زیادہ خرچ کرنا حکیم صاحب کے مزاج کے خلاف ہے مگر ممبئی میں لوکل ٹرینوں سے آنے جانے میں بڑا وقت بچتا ہے، اپنی گاڑی میں اس ہنگامہ خیز اور بھیڑ بھاڑ کے شہر میں بڑا وقت لگ جاتا ہے، بعد میں اس کا تجربہ خود مجھے بھی ہوا، ایک دفعہ میں مولانا مستقیم احسن اعظمی کے یہاں مدن پورہ میں تھا وہاں سے مجھے، انہیں اور ان کے گھر والوں کو حکیم صاحب کے یہاں دعوت میں آنا تھا، مولانا مستقیم صاحب نے گاڑی کر لی

مگر گھنٹوں تاخیر سے پہنچے۔

حکیم محمد مختار اصلاحی کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی تنہا ان کی طبی مہارت و حذاقت ہی کی بنا پر نہیں تھی بلکہ ان کے علم و وقار، شرافت و شائستگی، عالی ظرفی و وسیع القلبی، رکھ رکھاؤ، وضع داری، حسن اخلاق اور باہمہ و بے ہمہ رہنے کی وجہ سے بھی وہ ممبئی کے ہر طبقے میں معزز و محترم سمجھے جاتے تھے، جس مجلس میں پہنچ جاتے اس کی رونق بڑھا دیتے، ان کی رائے کا بڑا وزن محسوس کیا جاتا تھا، وہ اصلاً تو صرف اپنے پیشے اور فن سے سروکار رکھتے تھے تاہم معاشرتی اور قومی انجمنوں اور علمی و ادبی اداروں سے بھی ان کی وابستگی رہتی تھی مگر ان میں ایک حد تک اور بڑے اعتدال ہی سے حصہ لیتے تھے، مہاراشٹر کی جمعیۃ علما سے بھی ان کا تعلق تھا، طبیہ کالج، وقف بورڈ اور حج کی کمیٹیوں کے ممبر تھے، جن اداروں اور انجمنوں سے ان کا عملی تعلق نہیں ہوتا تھا ان کی بھی مالی مدد کرتے تھے، حکیم صاحب کو اللہ تعالیٰ نے بہت نوازا تھا مگر ان کی دولت ان کے آرام و تعیش کے بجائے ضرورت مندوں پر صرف ہوتی تھی، اپنے آبائی وطن صبرحد کے جامعہ فاروقیہ، سرسید انٹر کالج اور گرلس ہائی اسکول کی برابر مدد کرتے رہتے تھے، ہارون صاحب پرنسپل صابو صدیق نے مولانا عبدالسلام ندوی پر کامیاب سمینار کرایا تو ان سے کہا کہ اقبال سہیل صاحب پر بھی آپ سمینار کرائیں، اس کا نصف خرچ میں دوں گا، وہ جامعہ فاروقیہ صبرحد کے سالانہ جلسوں اور مشاعروں میں شرکت کے لیے ممبئی سے تشریف لاتے اور ان کے مصارف کے بہت کچھ وہی متکفل ہوتے تھے، مدرسۃ الاصلاح سے بھی ان کا بڑا تعلق تھا، اس کی مجلس عام کے سالانہ جلسوں میں بھی تشریف لاتے، ان ہی کی کوشش اور دلچسپی سے ''حکیم محمد مختار اصلاحی پالی ٹکنک کالج'' قائم ہوا۔

انہوں نے بڑی مشغول زندگی گزاری اور یہی ان کی کامیابی اور ترقی کا اصل راز ہے، مطب کی حد سے بڑھی ہوئی مصروفیت میں بھی ان کے لکھنے پڑھنے اور مطالعہ و تحقیق کا شوق کم نہ ہوا تحریر و تصنیف کا شغل جاری رہتا، ان کی ادارت میں ماہ نامہ ''تندرستی'' اور پندرہ روزہ ''مسیحا'' عرصے تک شائع ہوتے رہے جن سے طب اور اردو زبان دونوں کی خدمت ہوئی ''اطبا اور ان کی مسیحائی'' ان کی بڑی مفید اور پر از معلومات کتاب ہے، دوسری کتاب ''بری عادتیں۔ نقصانات اور تدارک'' اخلاقی اور طبی حیثیت سے بڑی مفید اور قابل قدر ہے۔

مرحوم حکیم صاحب کی زندگی بڑی سادہ مگر بہت مرتب تھی، وہ بڑے صفائی پسند تھے، ان کی کوئی چیز منتشر اور بے سلیقہ نہیں ہوتی تھی، کمرہ آرائش اور زیبائش کے سامان سے خالی ہوتا تھا مگر میز پر کاغذ، کتابیں، پنسل اور قلم اور الماریوں میں کتابیں بڑے مرتب طور سے سلیقے سے رکھی ہوتی تھیں، خط کتابت اور دوسری ضروری چیزوں کا ریکارڈ رکھتے تھے، لوگوں کے خطوط کی الگ الگ فائلیں بنالی تھیں۔

ممبئی کے ہر طبقے میں وہ معروف و متعارف تھے، ملک کے مشاہیر علما و اطبا سے ان کے تعلقات تھے، ممبئی کے لوگوں میں مولانا مختار احمد ندوی کے اس لحاظ سے بڑے مداح تھے کہ وہ برابر فلاح و بہبود کے کام کرتے رہتے ہیں، ملک کے ہر علاقے میں مساجد تعمیر کرائیں، الدار السلفیہ قائم کیا، بہت سی اہم کتابیں شائع کیں ''البلاغ'' کے نام سے اچھا رسالہ نکالا، مئو اور مالیگاؤں میں طلبہ و طالبات کے کالج قائم کیے اور ان کی شان دار عمارتیں بنوائیں، مالیگاؤں میں سائرا سپتال اور طبیہ کالج کھولے جس میں حکیم محمد مختار اصلاحی کا بھی بڑا تعاون تھا، کالج کے ابتدائی دور میں اپنے بڑے صاحبزادے حکیم محمد فیاض کو اس کا نظم و نسق درست کرنے کے لیے پرنسپل بنایا، ان کے دل میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی بڑی عزت تھی، وہ جب ممبئی آتے تو حکیم صاحب ان سے ملنے جاتے اور مولانا کو بھی اپنے یہاں مدعو کرتے، مولانا بھی ان کا بڑا خیال کرتے، ۱۹۷۵ء میں دارالعلوم کا پچاسی سالہ جشن منایا گیا تو اس میں حکیم صاحب کو بھی مدعو کیا اور وہ تشریف بھی لائے، مولانا امین احسن اصلاحی کے علم و فضل اور تقریر و تحریر کے بہت معترف تھے، ان سے خط کتابت بھی رہتی تھی، علامہ شبلی اور مولانا حمیدالدین فراہی سے غیر معمولی عقیدت تھی، ایک بار میں نے ان سے عرض کیا کہ دارالمصنفین کی جو کتابیں عرصے سے نہیں چھپ رہی ہیں ہم لوگوں نے ان کی دوبارہ اشاعت کا پروگرام بنایا ہے اس نئے بوجھ کا متحمل دارالمصنفین نہیں ہوسکتا، انہوں نے کہا میں تمہارا مطلب سمجھ گیا، مولانا شبلی کی کوئی کتاب ہو تو اسے میرے خرچ سے چھپوا دو عرض کیا سیرۃ النبی حصہ اول کی طباعت کے لیے علامہ کی پوتی صاحبہ رقم دے چکی ہیں، انہوں نے فرمایا حصہ دوم کے لئے مجھ سے ایک لاکھ روپے لے لیجئے، مولانا حمیدالدین صاحب کے متعلق فرمایا کہ ان سے تعلق جوڑنے کے لیے اپنی لڑکی کا رشتہ ان کے پوتے پروفیسر عبیداللہ فراہی سے کیا، ان دونوں حضرات کی یادگار مدرسۃ الاصلاح اور دارالمصنفین سے ان کو عشق تھا، مدرسۃ الاصلاح کو ان کی خاص دین حکیم مختار اصلاحی پالی ٹکنک کالج ہے، اس کی جو چھوٹی کمیٹی حکیم صاحب نے بنائی تھی اس میں فرط تعلق و اعتماد کی بنا پر میرا نام بھی رکھا تھا۔

دارالمصنفین سے بھی ان کا تعلق بڑا گہرا تھا، شاہ معین الدین احمد صاحب جامعہ فاروقیہ صبرحد کے جلسوں کی مستقل صدارت کرتے تھے پھر صباح الدین صاحب اور اس خاکسار کو بھی یہ عزت بخشی گئی، میں نے انہیں پہلی بار طالب علمی میں مدرسۃ الاصلاح کی مجلس عام کے سالانہ جلسوں میں دیکھا، پھر شاہ صاحب کی معیت میں جامعہ فاروقیہ صبرحد کے سالانہ جلسوں میں ملا، اس کے بعد ۱۹۷۳ء کے آخر میں میرے والدین حج بیت اللہ کے لیے جا رہے تھے تو میں انہیں چھوڑنے ممبئی گیا، اسی سلسلے میں ان کے مطب سے گزرا تو ان سے ملنے گیا، اپنا تعارف کرایا، انہوں نے آنے کا مقصد دریافت کیا، بتانے

پر فرمایا کہ میں تو بندرگاہ پر نہیں ملوں گا لیکن حکیم نورالدین اصلاحی جن کو تم جانتے ہو تمہاری مدد کریں گے، میں ان سے کہہ دوں گا۔ اب یہ خیال نہیں آتا کہ ان سے اتنے زیادہ تعلقات کب ہوئے کہ میں ممبئی جاؤں یا وہ ادہر آئیں تو دونوں کو ایک دوسرے سے ملے بغیر چین نہیں ملتا تھا، میں نے دارالمصنفین کی طرف ان کی غیر معمولی توجہ دیکھ کر اس کی مجلس انتظامیہ کی رکنیت کے لیے ان کا نام تجویز کیا تو ارکان نے بہ اتفاق منظور کرلیا مگر پہلے تو عدیم الفرصتی پھر ضعف کی وجہ سے کسی جلسے میں شریک نہیں ہوسکے، ان کو دارالمصنفین کی مالی حالت کے استحکام کی بڑی فکر رہتی تھی، اس کے لیے اکثر اپنی تجویزیں مجھے بھیجتے، ممبئی میں مولانا عبدالسلام ندوی پر جب سمینار ہونا طے پایا تو انہوں نے مجھے لکھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر تم لوگوں کا اجتماع یہاں کروں، ہم لوگوں نے کوشش کی مگر کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی البتہ انجمن اسلام ممبئی کے صدر ڈاکٹر اسحاق جم خانہ والا اعظم گڑھ آنے کے لیے تیار ہوگئے، حکیم صاحب کو پتا چلا تو وہ بھی آنے کے لیے آمادہ ہوگئے، سب نے ہوائی جہاز کے ٹکٹ بھی لے لیے مگر رضوان فاروقی صاحب کی شدید علالت کی وجہ سے یہ پروگرام منسوخ ہوگیا۔

چند برس سے حکیم صاحب خانہ نشین ہوگئے تھے، مطب جانا موقوف ہوگیا تھا، ان کا فلیٹ جامع مسجد کرلا کے سامنے ''نورجہاں'' بلڈنگ کی چوتھی منزل پر تھا، اس سے نیچے نہیں اترتے تھے، یہ کیفیت کئی برس سے تھی تاہم ان کی موجودگی ہی ان کے عزیزوں اور فرزندوں کے لیے بڑا سہارا تھی، مدرسۃ الاصلاح اور حکیم محمد مختار اصلاحی پالی ٹکنک کالج کے کارکنوں اور اس ناچیز کے لیے باعث تقویت تھی، افسوس اب یہ سہارا نہیں رہا، اللہ تعالیٰ ان کو اعلاعلیین میں جگہ دے، پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے اور ان کے قائم کردہ اداروں کا فیض باقی رکھے اور انہیں فروغ بخشے، آمین۔ (''ض''، اگست ۲۰۰۶ء)

خورشید الاسلام، پروفیسر

پروفیسر خورشید الاسلام

پروفیسر خورشید الاسلام ۱۸/ جون کو علی گڑھ کی خاک کا پیوند ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وہ جولائی ۱۹۱۹ء میں مرادآباد اور بجنور کی سرحد پر واقع ایک گاؤں امری میں پیدا ہوئے، یہ اور مشہور شاعر اختر الایمان گہرے دوست تھے اور فتح پوری ہائی اسکول میں ساتھ ہی پڑھتے تھے اور دونوں اسکول کے مشہور ڈبیٹر اور بہترین مقرر تھے، بی اے کرنے کے بعد خورشید الاسلام صاحب کچھ عرصے رسالہ ''آج کل'' کے سب اڈیٹر رہے اور ۱۹۴۳ء میں ایم اے کرنے کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آئے، یہاں پھر اختر الایمان کا ساتھ ہوا اور دونوں ۱۹۴۴ء میں یونیورسٹی کی نمائندگی کے لیے حیدرآباد گئے اور ہفت روزہ اردو کانگریس میں شریک ہوئے، خورشید الاسلام صاحب ۱۹۴۵ء میں ایم اے کرنے کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں لکچرر ہوگئے اور ۱۹۷۳ء میں پروفیسر ہوئے، اور جب پروفیسر آل احمد سرور سبکدوش ہوئے تو یہ صدر شعبہ ہوئے۔

مضمون نگاری شروع کی تو مولانا شبلی پر ہاتھ صاف کیا، مولانا پر ان کا یہ مضمون ان کی کتاب ''تنقیدیں'' میں شامل ہے، اس کا آغاز اس طرح کیا ہے ''شبلی پہلے یونانی تھے جو مسلمانوں میں پیدا ہوئے'' بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مضمون ان کی علمی شہرت کا باعث بنا اور مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کو بہت پسند کیا، ان کی سفارش پر خورشید صاحب کو لندن یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی مگر راقم نے سنا ہے کہ مولانا نے ان کے نام ہی کو غلط قرار دیا کہ اس میں مضاف و مضاف الیہ دو لسانی ہیں۔

بہرحال وہ لندن یونیورسٹی میں تدریسی خدمت پر مامور رہے اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے شائع ہونے والی اردو انگریزی لغت کے اڈیٹر بھی مقرر ہوئے، انہوں نے یونیسکو پروجیکٹ کے تحت ''غالب۔ حیات اور خطوط'' پر کام کیا علی گڑھ کے علمی و تحقیقی مجلّہ ''فکر و نظر'' کے مدیر بھی رہے۔

خورشید الاسلام صاحب اچھے استاد اچھے نثر نگار ناقد کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن ان کی شاعری بھی پر کشش ہے تین شعری مجموعے چھپ گئے ہیں، رگ جاں، خستہ خستہ اور شاخ نہال غم، عصری حیثیت کی حامل ایک غزل کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

رات بھی ہے کچھ سونی سونی ، دن بھی کچھ ویران سا ہے
پھول بھی ہیں کچھ سہمے سہمے ، باغ بھی کچھ حیران سا ہے
قریہ قریہ اوج پہ سر ہیں، نوک سناں سر سبز بھی ہے
خنجر جھمکیں لعل سے گویا ، گردن پر احسان سا ہے
دن سے جو بھی رات ملی ہے ، گریہ کہ دیوار سی ہے
رات سے جو بھی دن پایا ہے ، نوح کا طوفان سا ہے
بستی بستی آگ لگے اور گلیوں گلیوں خون بہے
قدرت کا یہ کھیل نہیں ہے ، قدرت کا فرمان سا ہے

اللہ تعالیٰ ان کی بشری لغزشوں سے درگزر فرمائے اور انہیں اپنی رحمت کاملہ سے نوازے، پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ (''ض''، اگست ۲۰۰۶ء)

سنبھلی، محمد عارف، مولانا

مولانا محمد عارف سنبھلی

دارالعلوم ندوۃ العلما کے تفسیر و عقائد کے استاد مولانا محمد عارف سنبھلی ۹/ جون ۲۰۰۶ء کو جمعہ کے دن دفعتاً وفات پاگئے، فجر کی نماز اور ضرورتوں سے فارغ ہونے کے

بعد یکایک ان پر کپکپی طاری ہوئی، گھر والوں سے کچھ اڑھانے کے لیے کہا مگر چند ہی سکنڈ میں ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

وہ عرصے سے ندوۃ العلما میں درس و تدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے اس سے پہلے دوسرے مدارس سے وابستہ تھے، ایک زمانے میں جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ سے منسلک تھے اور دارالمصنفین کے کتب خانے سے استفادے کے لیے مولوی حبیب اللہ رانچوی ندوی کے ساتھ یہاں آتے اور لوگوں سے ملنے جلنے کے بجائے سارا وقت مطالعہ میں گزارتے، مولوی حبیب اللہ سے میرا تعلق پرانا تھا ان ہی کے ساتھ میرے پاس آجاتے مگر وہ کم آمیز تھے اس لیے زیادہ کھل کر باتیں نہیں کرتے، ندوہ میں تو بڑی چہل پہل تھی مگر وہاں بھی کسی سے بہت بے تکلف نہیں دیکھا، عصر بعد مولانا علی میاں کی مجلس میں ضرور شریک رہتے مگر دوسروں کی طرح بڑھ چڑھ کر باتیں نہ کرتے خاموشی سے بیٹھے رہتے۔

مولانا عارف صاحب کا مطالعہ وسیع تھا، قرآنیات، کلام وعقائد سے شغف تھا، تفسیر و قرآنیات سے مناسبت کی بنا پر اترپردیش اردو اکادمی نے مولانا عبدالماجد سمینار کے ان مقالات کی ایڈیٹنگ ان کو سپرد کی تھی جو مولانا کی تفسیر پر تھے، ان میں میرا بھی مضمون تھا، اتفاق سے میں ندوہ گیا تو مجھ کو اپنے گھر لے گئے اور کہنے لگے کہ آپ کا مضمون مجھے بہت پسند ہے اور میں چاہتا ہوں کہ پورا چھپے مگر اکادمی کے ذمہ داروں کا اصرار ہے کہ یہ طویل ہے، آپ آگئے ہیں تو اس میں کچھ کمی کردیں، میں نے کہا مولانا مجھے اتنا موقع نہیں ہے آپ بے تکلف کمی بیشی کردیں، مجھے بالکل ناگواری نہیں ہوگی۔

مولانا محمد عارف مولانا محمد منظور نعمانی کے بھتیجے اور ان کے ساختہ پرداختہ تھے، اس لیے وہ بڑے صحیح العقیدہ تھے، توحید خالص میں کسی قسم کا کھوٹ اور اس میں ذرا بھی شرک و بدعت کی آمیزش پسند نہیں کرتے تھے، اسی بنا پر اس معاملے میں کوتاہ اور غیر محتاط لوگوں سے وہ بحث ومناظرہ کرتے، ان کے رد میں کتابیں لکھتے، اس سے متعلق ان کے مضامین ''الفرقان'' میں چھپتے، مولانا اچھے خطیب تھے، دینی جلسوں میں برابر شریک ہوتے ان میں عقائد حقہ کو بڑے موثر اور دل نشین انداز میں پیش کرتے، ان کی تقریر بہت پسند کی جاتی تھی، اپنے علم وفضل اور اچھے طریقہ درس کی بنا پر طلبہ میں بھی محبوب تھے۔

مولانا محمد عارف کا مزاج خالص علمی تھا، وہ صرف پڑھنے لکھنے سے سروکار رکھتے تھے، بڑے متواضع اور قانع تھے، بہت سادہ زندگی بسر کرتے، کھانے اور پہننے میں کوئی خاص اہتمام نہ کرتے، ہر قسم کے تکلف سے بری تھے۔

اللہ تعالیٰ علم و دین کے اس خادم کے درجات بلند کرے اور ان کے اعزہ کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ (''ض''، اگست ۲۰۰۶ء)

ندیم قاسمی، احمد

احمد ندیم قاسمی کی رحلت

مشہور ترقی پسند ادیب وشاعر جناب احمد ندیم قاسمی طویل عرصے سے اردو کے افقِ شعروادب پر ضوفشاں تھے، افسوس ہے کہ ۱۰؍جولائی کو وہ وفات پاگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

انہیں پھیپھڑے کی تکلیف اور تنفس کا عارضہ پہلے سے تھا، اس بار دل کی بیماری میں مبتلا ہوئے اور لاہور کے پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی میں بڑی نگہداشت والی یونٹ میں داخل کیے گئے تھے لیکن بیماری دل نے کام تمام کردیا اور اردو زبان نے اپنا ایک قد آور ادیب وشاعر، بڑا افسانہ نگار اور ممتاز صحافی اور کالم نگار کھودیا۔

ان کا اصل نام احمد شاہ تھا لیکن دنیائے شعر وادب میں احمد ندیم قاسمی کے نام سے معروف ہوئے، وہ مغربی پنجاب کی وادی سون سیکسر کے گاؤں انگہ ضلع خوشاب میں ۲۰؍نومبر ۱۹۱۶ء کو پیدا ہوئے تھے لیکن ان کے فکر وعمل کی جولان گاہ لاہور تھا اور یہی آخر میں ان کا مدفن بھی بنا۔

احمد ندیم قاسمی پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد جلد ہی صحافت کے میدان میں وارد ہوئے، اس میں ان کا جوہر خوب کھلا، ان کا تعلق درجنوں اخبار اور رسائل سے رہا، ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۵ء تک ''ادب لطیف'' سے منسلک تھے، ۱۹۴۷ء میں ''سویرا'' کی ادارت سنبھالی، نقوش میں بھی اپنا نقش چھوڑا، امتیاز علی تاج کے رسالے ''پھول'' اور ''تہذیب نسواں'' سے وابستہ ہوکر ادب اطفال اور نسائی ادب میں اپنا سکہ جمایا، ''امروز'' ترقی پسند تحریک کا آرگن تھا، اس میں ''پنج دریا'' کے نام سے فکاہی کالم لکھ کر اپنی خوش طبعی اور بذلہ سنجی کا ثبوت دیا اور کالم نگاری میں امتیازی درجہ حاصل کیا، وہ اس میں پنجاب کے مشہور صحافی عبدالمجید سالک کو اپنا استاد مانتے تھے، بعد میں وہ اس اخبار کے اڈیٹر بھی ہوگئے تھے لیکن ۱۹۶۰ء میں جنرل ایوب خاں نے اسے سرکاری انتظام میں کردیا تو وہ اس سے الگ ہوگئے مگر کالم نگاری کا سلسلہ جاری رکھا اور اس کا عنوان بدل کر ''عنقا'' کردیا۔ ''حریت'' کراچی کے بھی اس کالم کو زینت بخشی، ۱۹۶۳ء میں خود اپنا رسالہ ''فنون'' نکالا جس کا شمار بڑے معیاری ادبی رسالوں میں ہوتا ہے، وہ بہت عرصے سے لاہور کے مشہور ادبی ادارے ''مجلس ترقی ادب'' کے ڈائرکٹر چلے آرہے تھے۔

مرحوم ترقی پسند تحریک کے روح رواں تھے اور اسے تروتازگی اور طاقت وتوانائی دینے کے لیے ان کی زندگی وقف تھی، اس ادبی تحریک سے وابستگی کی بنا پر وہ اس کے حلقے میں بہت مقبول تھے، کچھ عرصے تک انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری بھی

رہے اور ۱۹۵۱ء میں انہیں پبلک سیفٹی کے تحت نظر بند کرلیا گیا تھا۔

مرحوم قاسمی صاحب کے کمالات کی اصلی تماشا گاہ ان کی شاعری اور افسانہ نگاری ہے، ان اصناف میں ان کا ادبی سرمایہ کمیت وکیفیت دونوں اعتبار سے باوزن اور اہم ہے، افسانے میں پریم چند کی طرح ان کا موضوع دیہات ہوتا تھا، ان کے افسانوں میں پنجاب کے دیہاتوں کی بڑی حقیقت پسندانہ عکاسی کی گئی ہے، اس لیے وہ بجاطور سے پنجاب کے پریم چند کہے جاتے تھے، ان کے افسانوں کے بے شمار مجموعے شائع ہوئے اور بعض افسانوں کو بڑی شہرت وقبولیت نصیب ہوئی جیسے ''ہیروشیما سے پہلے اور ہیروشیما کے بعد، الحمدللہ، کفن دفن، ست بھرائی، سناٹا، آتش گل، نمک حلال، کفارہ'' وغیرہ۔ شاعری میں بھی ان کی حیثیت مسلم ہے، نظم پر بڑی قدرت تھی اور دونوں میں متعدد مجموعے یادگار چھوڑے، ان کی نظموں میں بھی ایک افسانوی فضا ہوتی ہے جو گاؤں کی معصوم اور سادہ محبت کی دل کشی لیے ہوتی ہیں۔

احمد ندیم کی زندگی اور فکر وفن کا مشن امن، صلح وآشتی اور انسان دوستی تھا، ہند و پاک کو بھی وہ اخوت ومحبت کا درس اور نفرت و دشمنی چھوڑ دینے کا پیغام دے گئے ہیں، کہتے تھے کہ عام آدمی نہ لڑائی چاہتا ہے اور نہ دشمنی۔

قاسمی صاحب کے ادبی وتنقیدی مضامین کے دو مجموعے بھی چھپے ہیں ''ادب کی تعلیم کا مسئلہ'' اور ''تہذیب وفن''، انہوں نے لکھنے پڑھنے کا سلسلہ برابر جاری رکھا اور اخیر عمر تک اسے منقطع نہیں ہونے دیا، اس لیے ان کی ادبی خدمات گوناگوں اور متنوع ہیں، ۵۰ سے زیادہ کتابیں شائع ہوئیں جن کی بڑی پذیرائی ہوئی، پاکستان کے سب سے بڑے سویلین ایوارڈ ''نشان امتیاز'' اور ادب کے لیے ''صدارتی میڈل'' سے ان کی عزت افزائی کی گئی، اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے سوگوار خاندان کا غم والم زائل کرے، آمین۔ (''ض''، ستمبر ۲۰۰۶ء)

عبدالمغنی، پروفیسر

پروفیسر عبدالمغنی کی رحلت

۵/ستمبر کو اردو کے ممتاز ادیب ونقاد پروفیسر عبدالمغنی اپنے مالک حقیقی سے جاملے، ان کے دماغ پر فالج کا حملہ ہوا تھا، علاج کے لیے پٹنہ کے ایک اسپتال میں داخل کیے گئے تھے، وہیں صبح سات بجے داعی اجل کا پیغام آگیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

وہ صوبہ بہار کے ضلع اورنگ آباد کے ایک دینی گھرانے میں ۴/جنوری ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوئے تھے، ان کے والد ماجد مولانا عبدالرؤف اورنگ آبادی ندوی ایک ممتاز عالم تھے جن کے مضامین معارف میں چھپتے تھے اور ایک بھائی پروفیسر اقبال حسین مظفر پور یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر رہ چکے ہیں، عبدالمغنی صاحب نے ابتدائی تعلیم اورنگ آباد کے مدرسہ اسلامیہ میں حاصل کی تھی اور یہیں غالباً انہوں نے قرآن مجید بھی حفظ کیا تھا، عربی درسیات کی تکمیل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں کی تھی، پھر جدید تعلیم کے لیے انگریزی اسکولوں اور کالجوں کا رخ کیا، فراغت کے بعد پٹنہ یونیورسٹی کے کسی کالج میں انگریزی کے استاد ہوگئے، وہ ایک اچھے اور نیک نام استاد تھے، انگریزی میں چند کتابیں بھی لکھیں مگر ان کی اصل تصنیفی زبان اردو تھی، ان کا شمار اردو کے زود نویس اہل قلم اور مصنفین میں ہوتا ہے وہ قلم برداشتہ لکھتے تھے۔

مرحوم کو اپنی مادری زبان اردو سے عشق تھا، علاوہ کثرت تصنیف کے وہ اردو تحریک کے بڑے سرگرم مجاہد بلکہ بہار میں اردو تحریک کے صف اول کے قائد تھے اور مدت دراز تک انجمن ترقی اردو کی بہار شاخ کے صدر تھے، ان کی عملی قوت اور تنظیمی صلاحیت نے بہار کی انجمن ترقی اردو کو بہت متحرک و فعال اور دوسری ریاستی انجمنوں سے زیادہ کارگزار بنا دیا تھا، عبدالمغنی صاحب کی سعی و جاں فشانی سے ۱۹۸۰ء میں سب سے پہلے بہار کی ریاست میں اس وقت کے کانگریسی وزیر اعلا پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اردو کو علاقائی اور دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جس سے وہاں کے اردو دانوں کا فائدہ ہوا اور سرکاری ملازمتیں بھی ملیں اور ملک کی دوسری ریاستوں میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کا راستہ ہم وار ہوا لیکن دوسری ریاستوں میں سکنڈ لینگویج ہونے کے بعد بھی اردو زبان کا زیادہ بھلا نہیں ہوا، بعض ریاستوں میں اردو ٹیچر اور مترجم رکھے گئے تو اس میں ایسی بے ضابطگی، دھاندلی اور بدعنوانی کی گئی کہ اردو سے بالکل نابلد لوگ اردو ٹیچر اور مترجم مقرر کردیے گئے اور جن کو کسی قدر اردو کی شدھ بدھ بھی تھی تو ان سے اردو کا کوئی کام ہی نہیں لیا گیا، حکومتیں تو جھانسا دیتی ہی ہیں، اس پر نوکر شاہی کے کھیل الگ، اس کے لیے اردو والے بھی کم قصوروار نہیں ہیں۔

پروفیسر عبدالمغنی کا پایہ اردو ادب وتنقید میں بلند تھا، انہوں نے جب اس میدان میں قدم رکھا تھا تو اس وقت ترقی پسند تحریک کا بول بالا تھا اور اردو شعر وادب اور تنقید و تحقیق پر جن لوگوں کی اجارہ داری ہوگئی تھی ان کی بڑی تعداد خدا و مذہب بیزار تھی، مگر عبدالمغنی صاحب پر مذہب کی خاندانی چھاپ گہری تھی اس کے علاوہ ان پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور ڈاکٹر اقبالؒ کے خاص اثرات تھے اور وہ مولانا ابوالکلام آزادؒ کے دینی افکار سے بھی متاثر تھے، اس لیے ترقی پسند تحریک کے جلوے ان کی نگاہوں کو خیرہ نہیں کرسکے اور انہوں نے اس کے متوازی ادب اسلامی کی تحریک سے اپنا رشتہ جوڑا، خود ان کے وطن میں تنقید میں کلیم الدین احمد اور تحقیق میں قاضی عبدالودود کا طوطی بول رہا تھا، ان کی موجودگی میں بھی انہوں نے اپنی ایک حیثیت بنائی، یہ ان کا کمال تھا۔

اکثر ترقی پسند ادیبوں سے ان کی نوک جھونک رہتی تھی، میں نے بعض سمیناروں میں لوگوں کو ان پر آوازے کستے اور ان کی اسلام پسندی پر طنز واستہزا کرتے دیکھا مگر وہ

اس کی کچھ پروانہیں کرتے اور اپنی بات پوری قوت سے کہتے اور مخالف نقطہ نظر کی پرزور تردید کرتے جاتے، تحریر کی طرح ان کو تقریر کا بھی خدا داد ملکہ تھا، برجستہ تقریریں کرتے اور دیر تک بڑی روانی سے بولتے تھے۔

عبدالمغنی صاحب میں گوناگوں عجیب خصوصیات پائی جاتی تھیں، اردو کے بڑے مصنف و مقرر تو تھے ہی انگریزی کے بھی استاد اور مصنف و مقرر تھے، عربی کے منتہی اور انگریزی پر عبور تھا، ہندی سے بھی واقف تھے، سیاسی، مذہبی، ملی اور قومی ہر محاذ پر سرگرم رہتے تھے، مسلم مسائل، پرسنل لا، تعلیم، اردو، فرقہ وارانہ فسادات، مسلم یونیورسٹی، انتخابات وغیرہ پر ان کے مدبرانہ مضامین اور بیانات اکثر اخباروں میں چھپتے رہتے تھے، مذہبی جلسوں میں تقریریں کرتے، محلے کی مسجد میں نماز اور رمضان میں تراویح پڑھاتے، قرآن بہت اچھا پڑھتے تھے، سیاسی اور قومی جلسوں میں بھی اسٹیج پر رونق افروز ہوتے، علمی و ادبی سیمناروں میں شریک ہوتے اور مشاعروں کی صدارت کرتے۔

ان کی تصنیفات کے موضوعات بھی متنوع تھے، ان کا اصل موضوع ادب و تنقید تھا جس میں نقطہ نظر، جادۂ اعتدال، معیار و اقدار، فروغ تنقید، زاویے وغیرہ جیسی وزن دار کتابیں لکھیں، اقبالیات میں اقبال اور عالمی ادب، اقبال کا نظام فن اور اقبال کا نظریہ خودی اور تنویر ادب وغیرہ کو اعتبار حاصل ہوا، غالب، میر، فیضی، قرۃ العین حیدر اور برنارڈ شا کے فکر و فن سے بحث کی، مولانا مودودیؒ کی ادبی خدمات اور مولانا ابوالکلام کے اسلوب نگارش کو موضوع گفتگو بنایا، ہندوستان کے بعض بدنام مسلم سلاطین، اورنگ زیب عالم گیر، محمود غزنوی اور ٹیپو سلطان نے بھی انہیں اپنی جانب متوجہ کیا، مسلمانوں کی تعلیم، ہندوستان میں مسلم اقلیت کے مسائل اور دہشت پسندی اور اسلام پر کتابچے لکھے، قرآن مجید سے انہیں بڑا شغف تھا اور اس پر کئی مختصر کتابیں لکھیں، وہ ایک صحافی اور کالم نگار بھی تھے، اردو کے علاوہ انگریزی اخباروں میں بھی مستقل کالم لکھتے تھے، ''مریخ'' کے نام سے اپنا ایک ادبی رسالہ بھی نکالا جو وقفے وقفے سے مدتوں نکلتا رہا۔

عبدالمغنی صاحب کھرے ایمان دار اور بے داغ شخص تھے لیکن اس وقت ملک کے تمام شعبوں کی طرح محکمہ تعلیم میں بھی بدعنوانی سرایت کرگئی ہے، اکثر لوگ اسی کے خوگر اور عادی ہوگئے ہیں، اتفاق سے اگر ان میں کوئی پاک صاف آدمی پہنچ جاتا ہے اور وہ غلط کاموں میں نہ ان کا تعاون کرتا ہے اور نہ وہ انہیں ناجائز طریقوں سے نفع و استحصال کا موقع دیتا ہے تو لوگ اس کے دشمن ہوجاتے ہیں اور اس کے خلاف سازشیں کر کے اسے مختلف الزامات میں متہم کردیتے ہیں جس کے بعد یا تو وہ خود بھاگ کھڑا ہوتا ہے یا مقدمات کے جال میں پھنسا دیا جاتا ہے، علمی و تعلیمی ادارے بھی ان بدعنوانیوں اور بدعنوان لوگوں سے پاک نہیں رہ گئے ہیں، عبدالمغنی صاحب چند برسوں کے لیے جب متھلا یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنائے گئے تو غالباً اسی طرح کی سازش کے نتیجے میں وہ گرفتار کرلیے گئے تھے، ضمانت پر رہا ہوئے، کئی برس سے مقدمہ چل رہا تھا، ابھی اس کا تصفیہ بھی نہیں ہوا تھا کہ وقت موعود آگیا، وہ ضمانت پر جب رہا ہوئے تھے تو میں پٹنہ گیا ہوا تھا، وہاں ڈاکٹر خلیق انجم اور پروفیسر نثار احمد فاروقی بھی آئے تھے، طے ہوا کہ تینوں آدمی چل کر ان سے مل لیں، رضوان احمد نے جو اس وقت بہار اردو اکیڈمی کے سکریٹری تھے بتایا کہ وہ ملنے سے عموماً احتراز کرتے ہیں لیکن ہم تینوں گئے، معلوم ہوا کہ گھر پر موجود نہیں ہیں، ہم لوگ اپنا اپنا نام بتا کر چلے آئے۔

بشری لغزشوں سے کوئی شخص مبرا نہیں ہوتا، عبدالمغنی صاحب میں بھی انانیت، ترفع اور خودرائی تھی اور انہیں اپنی علمی فضیلت و برتری کا احساس بھی رہتا تھا جو اہل علم کو زیب نہیں دیتا تاہم ان کے علمی کمالات اور ادبی و تنقیدی خدمات مسلم ہیں، وہ مسلمانوں کی علمی، تعلیمی اور معاشی پس ماندگی دور کرنے اور ان کے گوناگوں پیچیدہ مسائل کے حل کے لیے فکرمند رہتے تھے، اللہ تعالیٰ عالم آخرت میں ان کے درجات بلند کرے اور عزیزوں کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ (''ض''، اکتوبر ۲۰۰۶ء)

غنی، عثمان

جناب عثمان غنی

افسوس ہے کہ مشہور صحافی اور قومی آواز کے لائق مدیر جناب عثمان غنی ۲۴؍اگست کی شب میں انتقال کرگئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم عرصہ سے بیمار اور کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھے، علاج کے لیے میڈیکل کالج میں داخل تھے، وہیں پیام اجل آگیا، ۲۵؍اگست کو جمعہ کی نماز کے بعد امین آباد کچہری روڈ کی مرکز والی مسجد میں ان کی پہلی نماز جنازہ مولانا متین میاں فرنگی محلی کی اقتدا میں ادا کی گئی اور دوسری جنازہ کی نماز عیش باغ کی مسجد میں عیدگاہ کے نائب امام مولانا خالد رشید فرنگی محلی نے پڑھائی اور عیش باغ کے قبرستان میں سپرد خاک کیے گئے۔

عثمان غنی صاحب کی تعلیم جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور لکھنو یونیورسٹی میں ہوئی تھی، ان کی صحافتی زندگی کا آغاز علی گڑھ ہی میں ہوگیا تھا جب انہوں نے اپنے بعض ساتھیوں سے مل کر یونیورسٹی ٹائمز نکالا تھا، پھر وہ اردو کے مشہور جریدہ ''قومی آواز'' سے اس وقت منسلک ہوئے جب وہ مرحوم حیات اللہ انصاری کی ادارت میں نکلتا تھا، ان کے اور جناب عشرت علی صدیقی کے دور ادارت کے بعد یہ اس کے چیف ایڈیٹر ہوئے لیکن اسی دور میں نامساعد حالات کی بنا پر اخبار بند ہوگیا، اس کے بعد عارضی طور پر انہوں نے ''قومی خبریں'' کی ادارت سنبھالی، اس کے بعد کسی اور اخبار کی ادارت کی پیش کش قبول نہیں کی۔

عثمان غنی مرحوم کے اداریے پرمغز اور متوازن ہوتے تھے، اردو اور انگریزی دونوں پر انہیں پوری قدرت تھی، سائنس، تاریخ، سیاست اور نئے علوم پر ان کی اچھی نظر تھی، وہ اصلاً سائنس کے طالب علم تھے لیکن ریاضی بھی ان کی دلچسپی کی چیز تھی، ہر موضوع سے متعلق ان کی معلومات تازہ ترین ہوتی تھیں، انہوں نے وزیر اعظم اندرا گاندھی کے ساتھ یورپ اور مشرق وسطیٰ کے کئی ملکوں کا سفر کیا تھا۔

مرحوم کا تعلق صحافیوں کی اس نسل سے تھا جب صحافت کا وقار و معیار بلند تھا اور وہ سچائی اور حقیقت کی ترجمان اور جانب داری اور سطحیت سے عاری ہوتی تھی، افسوس کہ اب اس کے نمونے ختم ہوتے جارہے ہیں اور نئی نسلوں کی بے راہ روی صحافت میں بھی اپنا رنگ دکھارہی ہے۔

ان سے میری ملاقات صرف دو تین بار ہوئی، جب بھی ان کے دفتر گیا وہ بڑی خاموشی سے اپنے کام میں منہمک ملے، ہر بار بڑے اخلاق، شرافت اور خلوص و ہمدردی سے ملے، میں نے انہیں بہت کم سخن، خاموش طبع، سنجیدہ اور متواضع پایا لیکن ان کے بے تکلف دوستوں کا بیان ہے کہ ان کو لطیفے اور چٹکلے خوب یاد تھے، اشعار بھی بے شمار یاد تھے، شاعروں اور ادیبوں کے دلچسپ جملے اور فقرے بڑے مزے سے بیان کرتے تھے، ان کی واقفیت اور معلومات کا دائرہ بھی بہت وسیع تھا، ان سب سے وہ اپنے قریب تر ساتھیوں کو محظوظ کرتے رہتے تھے۔

اللہ تعالیٰ اس شریف النفس انسان کو اپنے دامن عفو و رحمت میں جگہ دے اور اعزہ کو صبر و تسلی بخشے، آمین۔ (''ض''، اکتوبر ۲۰۰۶ء)

محفوظ، نجیب

نجیب محفوظ کا انتقال

۳۰؍اگست ۲۰۰۶ء کو مصر کے مشہور ادیب اور ناول نگار اور ادب کا نوبل انعام حاصل کرنے والے پہلے عرب مصنف نجیب محفوظ کا انتقال ہوگیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

وہ ۱۱؍دسمبر ۱۹۱۱ء کو قاہرہ کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے تھے، اس وقت ان کا خاندان محلّہ جمالیہ میں رہتا تھا، ۱۹۲۴ء میں یہاں کی سکونت ترک کر کے وہ نئے طرز کے محلّہ عباسیہ میں منتقل ہوگیا جہاں ان کا بچپن اور شباب گزرا، چالیس برس کی عمر میں ان کی شادی ہوئی تو یہاں کا مکان بھی چھوڑ دیا۔

ان کے والد پرجوش وطن پرست تھے اور مصر کے قوم و وطن پرست لیڈروں سے والہانہ تعلق رکھتے تھے، نجیب محفوظ گو خاموش طبع اور شورش و ہنگامہ سے دور رہتے تھے لیکن مصری قوم پرستی کی تحریک کے ہم نوا تھے، ان کو اپنے شہر سے ایسی محبت تھی کہ اس کی گلیوں اور محلوں کے نام پر کئی ناول لکھے۔

ابتدائی مرحلے کی تعلیم مکاتب اور اسکولوں میں حاصل کرنے کے بعد جامعہ فواد (قاہرہ یونیورسٹی) میں داخل ہوئے اور ۱۹۳۴ء میں بی اے کی ڈگری لی، فلسفہ ان کا خاص مضمون تھا۔

نجیب محفوظ زمانہ طفولیت سے ہی مطالعہ کے شوقین تھے، شروع میں قصے کہانی کی کتابیں پڑھتے تھے، عمر کچھ زیادہ ہوئی تو تاریخی ناولوں سے شغف ہوا، پھر اپنے عہد کے مشاہیر مصنفین طہٰ حسین، عباس محمود عقاد، سلامہ موسیٰ، مازنی، حسن زیات، ہیکل اور توفیق الحکیم وغیرہ کی نگارشات ان کے مطالعہ میں آئیں اور یہ ان کے خیالات سے متاثر ہوئے، سلامہ بن موسیٰ کا رنگ ان پر زیادہ چڑھا ہوا تھا، یہ ایک قبطی عیسائی ادیب تھا جو اپنی اباحیت پسندی کی وجہ سے مسلمانوں میں مبغوض تھا، سلامہ نے التربیة کے نام سے اپنے خودنوشت سوانح لکھے تھے جس کا انگریزی ترجمہ ہوچکا ہے۔

نجیب محفوظ ادب و تنقید کی کتابوں کی طرف متوجہ ہوئے تو قدما کی امہات کتب کا مطالعہ کیا اور جاحظ کی البیان والتبیین، ابوعلی قالی کی امالی اور ابن عبدربہ کی **العقد الفرید** پڑھیں، نثری تصنیفات سے ان کا رخ نظم کی جانب مڑ گیا تو خاص طور پر ابوالعلا معری، متنبّی اور ابن الردمی کی شاعری کا مطالعہ کیا اور ان پر اس کے بھی اثرات پڑے۔

انہوں نے انگریزی اور فرنچ زبانیں بھی سیکھیں اور یورپ کے ادب اور لٹریچر کا گہرا مطالعہ کیا، روسی، برطانوی اور فرانسیسی ادیبوں کی کتابیں برابر ان کے مطالعہ میں رہتی تھیں، ٹالسٹائی، دوستوفسکی، والٹر سکاٹ، برنارڈ شا اور شیکسپیر ان کے محبوب مصنفین تھے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد وہ جامعہ مصریہ کے انتظامی شعبے سے منسلک ہوئے، اس کے بعد ۱۵ برس تک وزارت اوقاف سے وابستہ رہے، مساجد کی نگرانی اور دوسرے انتظامی امور اسی وزارت سے متعلق تھے، اس لیے ان کو مختلف لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا، دینی حلقوں کے خیالات و رجحانات سے واقفیت ہوئی اور محکمہ کے کلرکوں، منشیوں اور اہل کاروں کی کام چوری، سست روی، تساہل پسندی، کاموں کو ٹالنے اور دیر سے نپٹانے کی ذہنیت کا اندازہ ہوا۔

۱۹۵۴ء میں ان کا تقرر وزارت ثقافت میں بہ طور ڈائرکٹر ٹیکنیکل ایجوکیشنل ہوا جس کا کام صنعتی اور ٹیکنیکل اسکولوں کی نگرانی تھی، اس کے بعد وہ سنیما تنظیم کے ڈائرکٹر ہوئے، ۱۹۷۱ء تک وہ ان سرکاری عہدوں پر فائز رہنے کے بعد سبک دوش ہوئے اور ''الاہرام'' کے ادبی سیکشن سے وابستہ ہوگئے۔

۱۹۲۵ء میں جب کہ وہ ابھی طالب علم تھے ان کے لکھنے کا آغاز ہوگیا تھا، شروع میں شعر بھی کہتے تھے، ملازمت کے زمانے میں بھی ان کے لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رہتا تھا، ابتدا میں چھوٹے افسانے لکھے، پہلا افسانہ ''فترة الشباب'' (زمانہ شباب) کے نام سے لکھا تھا، ۱۹۳۰ء میں نجیب محفوظ نے پہلا مقالہ ''احتضار معتقدات و

تولد معتقدات'' (اعتقادات کی شکست وریخت) کے نام سے لکھا جو سلامہ موسیٰ کے ہفتہ وار میگزین ''مجلة الاسبوعية الجديده'' میں شائع ہوا پھر اس کے اڈیٹر کی تحریک سے برابر افسانے لکھنے لگے اور ناول کا سلسلہ بھی شروع کیا جو روزنامہ اور ہفتہ وار اخباروں اور ماہناموں میں بالاقسط چھپتے تھے الاہرام میں بھی ان کے ناول اور افسانے برابر قسط وار شائع ہوتے تھے ان کے ناولوں کا پلاٹ اور تانا بانا الف لیلہ کی داستانوں سے ملتا جلتا ہے، ان میں قاہرہ کے قدیم محلوں کے رہنے والوں کی معاشرتی زندگی، ان کے رسم و رواج، ان کے احساسات و جذبات اور رجحانات و میلانات کی بڑی خوب صورتی کے ساتھ ترجمانی کی گئی ہے خود ان کے پرانے محلّہ جمالیہ کو بھی ان کے ناولوں میں مرکزی مقام حاصل ہے۔

طبع زاد ناولوں اور افسانوں کے علاوہ انہوں نے بہت سے ترجمے بھی کیے قدیم مصر پر جیمز بیلی کی ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ مصر القدیمہ کے نام سے کیا قوم پرستی کی تحریک سے وابستگی کی بنا پر نجیب محفوظ کو مصر کے فرعونی عہد کی تاریخ و تمدن سے بڑی دل چسپی تھی، ان کے ابتدائی تین ناول فراعنہ مصر کے عہد سے متعلق ہیں لیکن ان کے عام ناول اپنے عہد کے معاشرتی و تمدنی حالات کے عکاس ہیں۔

نجیب محفوظ کو غیر معمولی اور عالم گیر شہرت اپنے ناولوں کی بہ دولت ملی، ان کے کچھ مقبول ترین ناولوں کے نام یہ ہیں:

القاهرة الجديده، ثلاثية بين القصرين ۔ خان الخليلي ۔ زقاق المدق ۔ البدايه والنهايه ۔ بين القرين ۔ قعر الشوق ۔ اولاد حارتنا ۔ السكريه ۔ اللص و الكلاب ۔ ثرثرة فوق النيل ۔

''ثلاثية'' میں ایک مسلمان تاجر خاندان کی تین نسلوں کی روداد اس طرح بیان کی ہے جس سے قاہرہ کے ایک خاص خطے کی معاشرت سامنے آگئی ہے، ''خان الخليلي، السكريه، زقاق المدق، بين القصرين'' وغیرہ قاہرہ کے قدیم محلوں سڑکوں اور گلیوں کے نام ہیں، اس میں دکھایا ہے کہ ان کے باشندوں کے قدیم طور طریقوں اور رہن سہن پر آج بھی عہد مملوک کا سایا چھایا ہوا ہے، ''بدايه و نهايه'' میں مصر کی تحریک آزادی کی داستان ہے، ''اللص والكلاب'' میں ایک ایسے ڈاکو کا ذکر ہے جو بدعنوان معاشرے سے برہم اور بے زار ہو کر امرا کے یہاں چوری اور ڈاکہ زنی کر کے غریبوں اور ناداروں کی مدد کرتا ہے ''ثرثرة فوق النيل'' میں نیل پر آباد لوگوں کے معمولات اور رویے پر گفتگو ہے اور یہ اس نوجوان طبقے کا مرقع ہے جو اعلا تعلیم یافتہ، ذہین اور باشعور ہونے کے باوجود نشے کی عادت بد میں پڑ کر اخلاقی و روحانی بحران میں مبتلا ہوگیا ہے اور دریائے نیل پر اپنی علاحدہ دنیا بسالی ہے جو بہت جلد ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوجاتی ہے۔

غرض نجیب محفوظ کے ناولوں میں مصر خصوصاً وہاں کے شہروں کی معاشرت اور طرز زندگی کی مکمل عکاسی کی گئی ہے، وہ اس معاشرے کے نباض تھے، اس لیے اس کے خیالات، اس کے خلفشار، انتشار اور غیر یقینی کیفیات کا اظہار کرتے جن سے مصری معاشرہ روز مرہ کی زندگی میں دوچار رہا۔

نجیب محفوظ بڑے زود نویس اور کامیاب مصنف تھے، وہ برابر تصنیف و تالیف میں منہمک رہتے تھے، روزآنہ چار پانچ گھنٹے تحریر و تصنیف کا کام انجام دیتے تھے، انہوں نے ۵۰ سے زیادہ ناول، سیکڑوں افسانے اور ۵ ڈرامے لکھے، ان کی اصل خوبی حسن تحریر اور پختگی فن ہے، انہیں زبان و بیان پر بڑی قدرت تھی، عامی زبان لکھنے سے بچتے تھے، بعض نقادوں کا خیال ہے کہ ۱۹۵۲ء سے پہلے ان کی تحریروں میں بڑی واقعیت، حقیقت پسندی اور عہد و ماحول کی صحیح تصویرکشی ہوتی تھی اور وہ رموز و اشارات اور علامتوں سے خالی ہوتی تھیں لیکن ۱۹۵۲ء کے انقلاب کے بعد ان کے قلم کا انداز تبدیل ہوگیا اور وہ رمز و علامت اور اشارے کنایے کا سہارا لینے لگے تھے، اس زمانے کی تحریروں میں قدیم و جدید کی کشمکش، روایت و جدت کے تصادم اور رجعت پسندی اور ترقی پسندی کے ٹکراؤ کا تذکرہ رہتا تھا۔

نجیب محفوظ کے اکثر ناولوں کے انگریزی و فرانسیسی میں ترجمے ہوگئے ہیں اور یہ بہت مقبول ہیں، ''واکیروٹرائلوجی'' کو ان کا شاہ کار کارنامہ خیال کیا جاتا ہے، ''پیلس آف واک''، ''پیلس آف ڈیزائر اور شوگر سٹریٹ'' بھی مشہور ناولوں میں ہیں، ''ثرثرة فوق النيل'' کا انگریزی ترجمہ ''ایڈرفٹ آف دا نائیل'' کے نام سے ہوا۔ پاکستان میں نیر عباس زیدی صاحب نے اس کا اردو ترجمہ ''آب نیل پہ آوارگی'' کے نام سے کیا ہے، ان کی کتابوں کی مقبولیت کا یہ بھی ثبوت ہے کہ ان کے ۱۵ ناولوں پر فلمیں بن چکی ہیں۔

نجیب محفوظ کی عظمت و شہرت میں چار چاند اس وقت لگا جب ۱۹۸۸ء میں انہیں نوبل انعام سے نوازا گیا، یہ انعام سویڈن کے مشہور سائنس داں الفریڈ نوبل (م ۱۸۹۶ء) کے نام سے موسوم ہے، اس نے ڈائنامیٹ بم اور بہت سے دھماکہ خیز گولے ایجاد کیے تھے، اس کی ان ہلاکت خیز ایجادات کے صلے میں یورپ کے ملکوں نے اسے بہت سے گراں قدر انعامات سے نوازا، اس کے علاوہ باکو (روس) کے تیل کے کنوؤں میں اس کی شراکت داری بھی تھی، اس طرح اس نے بے حساب دولت جمع کی تھی اور اپنی زندگی میں ایک ٹرسٹ قائم کر کے کروڑوں پونڈ اس کی تحویل میں دے دیے تھے اور وصیت کی تھی کہ اس رقم کے منافع سے ہر سال سائنس میں نئی دریافت کرنے والے سائنس داں یا علم و ادب کی غیر معمولی اور نمایاں خدمت کرنے والے کو اس کے نام سے موسوم انعام دیا جائے جس کی مالیت اس زمانے میں دس ہزار پونڈ سے لے کر تیس ہزار پونڈ ہوتی تھی۔

یورپ کے فضلا اور ماہر سائنس دانوں کو برابر نوبل انعام ملتا رہتا ہے، متحدہ ہندوستان میں رابندر ناتھ ٹیگور اور چندرو ونکٹارامن (مدراس یونیورسٹی) بھی اس انعام سے سرفراز ہو چکے ہیں لیکن کوئی مسلمان ابھی اس کے قابل نہیں سمجھا گیا تھا، اس سے نصف صدی قبل طہٰ حسین کا نام بعض لوگوں نے پیش کیا تھا لیکن یہودی اور عیسائی کار پردازوں کے تعصب کی وجہ سے یہ تجویز رد ہوگئی تھی، نجیب محفوظ پہلے مسلمان اور عرب مصنف تھے جن کو یہ انعام عطا کیا گیا، کئی برس ہوئے ڈاکٹر عبدالسلام (پاکستان) کو بھی سائنس کا نوبل انعام ملا تھا اور اب اس سال ۲۰۰۶ء میں بنگلہ دیش کے ماہر اقتصادیات اور گرامین بینک کے بانی پروفیسر محمد یونس اور ان کے ساتھ ان کے گرامین بینک کو ملا ہے جو 4-1 ملین ڈالر ہے، نجیب محفوظ نے انعام پانے پر کہا تھا کہ مجھ سے پہلے یہ انعام طہٰ حسین، عقاد اور توفیق الحکیم کو ملنا چاہیے تھا، اس انعام سے پہلے مصری حکومت نے انہیں اپنا سب سے بڑا ایوارڈ قلادۃ النیل عطا کیا تھا۔

نجیب محفوظ کی جس کتاب پر یہ اعلاترین انعام انہیں عطا کیا گیا تھا، وہ ان کی ایک متنازع کتاب "اولاد حارتنا" (ہمارے محلے کے بچے) ہے، یہ ناول ۱۹۵۹ء میں لکھا گیا تھا، جس پر دینی حلقوں کو بڑا اعتراض تھا اور مصر میں اس پر پابندی لگادی گئی تھی لیکن جب نوبل انعام ان کو دیا گیا تو یہ پابندی ختم کردی گئی تھی، مذہبی طبقوں کے خیال میں اس میں رمزیت وایمائیت سے کام لے کر انہوں نے دینی عقائد وتصورات کا مذاق اڑایا ہے اور اللہ تعالیٰ اور انبیا کا نامناسب طور سے تمثیلی ذکر کیا ہے، وہ دین اور عقیدہ تقدیر کو مادی ترقی اور اصلاحات میں رکاوٹ خیال کرتے تھے، مجرم کو خطا کار نہیں سمجھتے تھے، ان کے خیال میں وہ جرائم کا ارتکاب اپنے اس ماحول کے ظلم کی وجہ سے کرتا ہے جس میں وہ زندگی گزارتا ہے، جب اس پرانی کتاب پر ان کو انعام دیا گیا تو لوگوں نے یہ بھی خیال کیا کہ دین کے استخفاف اور تمسخر ہی کی بنا پر وہ انعام کے مستحق قرار پائے ہیں، اس لیے اس وقت بھی ان کے خلاف بڑا ہنگامہ اور شورش برپا ہوئی اور ۱۹۹۴ء میں ایک شدت پسند شخص نے ان پر قاتلانہ حملہ کردیا جس میں وہ بچ تو گئے لیکن ان کا دایاں بازو بے کار ہوگیا اور وہ لکھنے سے معذور ہوگئے، ۲۰۰۵ء میں ان کی جو آخری کتاب شائع ہوئی تھی وہ ان کے مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔

یہی متنازعہ کتاب جس کی بنا پر ان کی ذات کو بڑی مخالفتوں اور تنقیدوں کا نشانہ بنایا گیا، انقلاب وتجدد پسندوں اور اشتراکیت و مارکسزم کے حامیوں میں اس کی بڑی پذیرائی ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ لی گئی، کیونکہ ان کے خیال میں یہ مارکس کے افکار سے ہم آہنگ ہے اور اس میں رجعت پسندانہ اور ترقی پسندانہ کشمکش کا تذکرہ ہے۔

نجیب محفوظ نے مخالفین کے جواب میں کہا ہے کہ یہ کتاب بہت پہلے کی ہے اب میں ان خیالات سے باز آگیا اور تائب ہو چکا ہوں، الحاد کی وادی سے نکل چکا ہوں، انعام لینے کے لیے سفر بھی نہیں کیا، میرے ناولوں میں کسی محلے کی تصویر کشی ہوتی ہے، لوگوں نے اس کا جو مفہوم سمجھا ہے وہ سرے سے میرا مقصود نہیں ہے۔

لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وہ ترقی پسند اور آزادی رائے اور روشن خیالی کے حامی تھے اور اس میں عام سطح سے آگے نکل جاتے تھے، مارکسزم کے اثرات بھی ان پر تھے، انہوں نے سلمان رشدی کی مدافعت کی اور جب امریکہ کے اشارے پر مصر اور اسرائیل کے درمیان کیمپ ڈیوڈ معاہدہ عمل میں آیا تو نجیب محفوظ نے اس کی حمایت کی، وہ عرب اسرائیل تعلقات کے بھی حامی تھے، اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے اور ان کی عاقبت بخیر کرے۔

نجیب محفوظ کی تدفین پورے قومی وفوجی اعزاز کے ساتھ ہوئی اور ان کے جسد خاکی کو مصر کے قومی پرچم میں لپیٹا گیا، مصر کے صدر حسنی مبارک، ان کے وزرا اور اعلا سرکاری عہدے دار ان کے جنازے میں شریک ہوئے اور جامع ازہر قاہرہ کے شیخ محمد سعید طنطاوی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ ("ض"، نومبر ۲۰۰۶ء)

مبارک پوری، صفی الرحمان، مولانا

مولانا صفی الرحمان مبارک پوری

بہ روز جمعہ یکم دسمبر ۲۰۰۶ء کو مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کے سابق امیر اور صاحب الرحیق المختوم مولانا صفی الرحمان مبارک پوری نے داعی اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ضلع اعظم گڑھ میں مبارک پور پارچہ بافی کی صنعت کے لیے ایک مشہور قصبہ ہے جو علمی وتعلیمی حیثیت سے بھی ممتاز ہے اور یہ بعض بڑے علما ومصنفین کا مولد ومسکن بھی رہا ہے، مبارک پور سے متصل جانب شمال میں حسین آباد کی بستی میں مولانا صفی الرحمان صاحب ۱۹۴۲ء میں پیدا ہوئے۔

انہوں نے جامعہ فیض عام مئو سے درس نظامی کی تحصیل کی اور اسی دوران الہ آباد بورڈ کے امتحانات مولوی اور عالم بھی پاس کیے، تعلیمی مرحلہ ختم کرنے کے بعد کئی مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیں، ۱۹۷۱ء کی ہند و پاک کی جنگ کے زمانے میں وہ جامعۃ الرشاد سے وابستہ تھے، اس زمانے میں دارالمصنفین اکثر آتے اور کتب خانے سے استفادہ کرتے، مجھ سے اور مولوی ابوعلی عبدالباری صاحب مرحوم سے بہت بے تکلف ہوگئے تھے اور مختلف علمی، دینی اور قومی وسیاسی مسائل پر گفتگو کرتے، اس سے ان کی ذہانت، قوت گویائی، اچھی صلاحیت اور مسائل حاضرہ سے باخبری کا اندازہ ہوتا، ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔

مگر جامعۃ الرشاد سے ان کا تعلق بہت کم عرصے تک رہا اور بالآخر وہ اپنی اصلی

جگہ پہنچ گئے یعنی جامعہ سلفیہ بنارس میں درس و تدریس کی خدمت انہیں تفویض کی گئی، یہاں ان کی مخفی صلاحیتیں جلا پانے لگیں، تقریر و خطابت کا ملکہ تو پہلے ہی سے ان میں نمایاں تھا، یہاں آکر قلم نے بھی گل کاریاں شروع کیں تو جامعہ کے ماہانہ رسالہ ''محدث'' کی ادارت کی ذمہ داری ان کو سپرد کی گئی جسے انہوں نے حسن و خوبی سے انجام دیا، بعض کتابوں کے ترجمے کئے، رد و مناظرہ میں رسائل بھی لکھے، اس سے پہلے انہیں عربی بولنے اور لکھنے کی مشق و ممارست نہ تھی، یہاں آکر عربی لکھنے اور بولنے پر بھی قدرت حاصل ہوگئی۔

مولانا صفی الرحمان مبارک پوری کی شہرت کا غلغلہ اس وقت مچا جب انہوں نے رابطہ عالم اسلامی مکہ معظمہ کے انعامی مقابلے کے لیے سیرت نبوی علی صاحبھا الصلوۃ والسلام پر ''الرحیق المختوم'' کے عنوان سے اپنا مقالہ سپرد قلم کیا جو دوسرے مقالوں سے فائق ہونے کی بنا پر پہلے انعام کا مستحق قرار پایا، پچاس ہزار ریال کا یہ انعام ۱۹۷۹ء میں انہیں ایک باوقار تقریب میں مکہ معظمہ میں اس کے نائب گورنر امیر سعود بن المحسن کے ہاتھوں دیا گیا۔

رابطہ کے انعام سے ان کا آوازۂ شہرت دوسرے ملکوں میں بھی بلند ہوگیا اور وہ امریکہ، برطانیہ، خلیج کی ریاستوں اور پاکستان میں بھی دعوتی اور تبلیغی تقریروں کے لیے مدعو کئے جانے لگے اور ہندوستان میں بھی کئی جگہوں کے دعوتی اسفار کئے، ان کی اہمیت بڑھی تو انہیں مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کا امیر منتخب کیا گیا مگر ملک سے باہر قیام کی وجہ سے وہ خود اس بڑے منصب سے جلد ہی سبک دوش ہوگئے۔

''الرحیق المختوم'' کی گراں مایہ تصنیف نے ان کے لیے سرزمین عرب میں قیام کی راہ ہموار کردی جو بڑی سعادت اور خوش نصیبی کی بات تھی، پہلے تو مدینہ یونیورسٹی کے شعبہ مرکز السنۃ والسیرۃ النبویہ میں ان کا تقرر ہوا، یہاں وہ سیرت نبویؐ سے متعلق تاریخ و حدیث کے مواد کی تحقیق و تنقیح کا کام انجام دیتے تھے، جب یہ معاہدہ ختم ہوا تو ریاض کے مکتبۃ السلام کے سربراہ مقرر کئے گئے اور مدۃ العمر اس سے تعلق باقی رکھا، دارالسلام سے ان کی شاہ کار تصنیف ''الرحیق المختوم'' کے ترجمے کئی زبانوں میں ہوئے یہیں انہوں نے اس کتاب کا اختصار ''روضۃ الانوار فی سیرۃ النبی المختار'' کے نام سے میٹرک تک کے طلبہ کے لیے کیا تھا اور خود ہی اس کا اردو ترجمہ ''تجلیات نبوت'' کے نام سے کیا تھا، یہ کتاب بھی مقبول ہوئی اور اسکولوں کے نصاب میں شامل کی گئی۔

دارالسلام کے ایک پروجیکٹ ''موسوعۃ الحدیث النبوی الشریف'' کے تحت صحاح ستہ کو ایک جلد میں شائع کرنے کا پروگرام بنا جس کے نگراں سعودی عرب کے وزیر مذہبی امور صالح بن عبدالعزیز آل الشیخ تھے تو انہیں اس کی تصحیح و مراجعت کا کام سپرد کیا گیا۔ مولانا نے احادیث کی بعض کتابوں کی شرحیں بھی لکھیں، مسلم شریف کی شرح **منۃ المنعم فی شرح مسلم** اور بلوغ المرام کی **اتحاف الکرام فی شرح بلوغ المرام** لکھی مولانا محمد سورتی نے عربی اشعار کا ایک منتخب مجموعہ ازھار العرب کے نام سے تیار کیا تھا اس کی بھی شرح لکھی تھی۔

انہوں نے کئی عربی کتابوں کے اردو ترجمے کئے تھے جیسے **المصابیع فی مسئلۃ التراویح للسیوطی، کتاب الاربعین للسنووی، الکلم الطیب لابن تیمیۃ، تذکرۃ الشیخ محمد بن عبدالوھاب النجدی للقاضی الشیخ احمد بن حجر**۔ ان کی بعض اردو تصانیف یہ ہیں:

صحف یہود و نصاریٰ میں آنحضرتﷺ کی بشارتیں، تاریخ آل سعود، قادیانیت اپنے آئینے میں، فتنہ قادیانیت اور مولانا ثناء اللہ امرت سری وغیرہ۔

مولانا کی صحت اچھی تھی، چند برس پہلے ان پر فالج کا حملہ ہوا مگر اس میں سنبھل گئے آخر وقت موعود آگیا، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ (''ض''، جنوری ۲۰۰۷ء)

انصاری، محمد ضیاء الدین، ڈاکٹر

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری میرے مخلص اور عزیز دوست تھے، مجھے ان کے انتقال کی خبر بہت دیر سے ملی، وہ علی گڑھ مولانا آزاد لائبریری میں ڈپٹی لائبریرین تھے، وہاں جاتا تو مطلوبہ کتابیں فوراً حاضر کرتے اور چائے سے خاطر تواضع کرتے، اصرار کرکے گھر بلاتے اور پرتکلف دعوت کرتے، خدابخش لائبریری کے ڈائریکٹر ہوکر وہ پٹنہ گئے تو اسے ترقی دینے کے لئے متعدد کام کئے اور کئی سیمینار کرائے جن میں مجھے مدعو کرتے، وہاں سے ریٹائر ہوکر علی گڑھ آئے تو مولانا حسین احمد مدنیؒ پر ایک سیمینار کا پروگرام بنایا مگر وہ نہ ہوسکا، ضیاء الدین صاحب کو علم و ادب سے بڑا شغف تھا اور وہ اچھے منتظم بھی تھے، کئی کتابیں لکھیں لیکن اشاریہ نگار کی حیثیت سے انہوں نے اپنا خاص سکہ جمایا، وہ بڑے شریف، نیک طینت، خوش خلق اور مرنجان مرنج شخص تھے، اللہ تعالیٰ انہیں جنت نعیم عطا کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔

(''ض''، اپریل ۲۰۰۷ء)

ندوی، مختار احمد، مولانا

مولانا مختار احمد ندوی

افسوس اور سخت افسوس ہے کہ راقم کے بڑے کرم فرما اور ملک کے ممتاز عالم دین مولانا مختار احمد ندوی ۹؍ستمبر ۲۰۰۷ء کو ممبئی میں انتقال فرماگئے، ان کی تدفین دوسرے

روز جوہو قبرستان میں ہوئی، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مئوشہر کے محلّہ وشوناتھ پورہ میں ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے تھے، ان کے والد کو جمعیۃ اہل حدیث کے سرخیل مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسریؒ سے بڑی عقیدت تھی اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ راقم کے والد بھی مولانا امرتسریؒ کے بڑے عقیدت مند تھے اور اکثر ان کا گن گاتے تھے، مولانا مختار احمد کے والد چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا بھی علم دین کی تحصیل کرکے دعوت و اشاعت دین کا کام کرے، ان کی یہ آرزو پوری ہوئی اور مولانا مختار احمد برابر دعوت و تبلیغ دین کی خدمت انجام دیتے رہے۔

مئو میں جمعیۃ اہل حدیث کے کئی بڑے مدارس ہیں، انہوں نے جامعہ عالیہ عربیہ اور فیض عام میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں داخلہ لیا اور پھر دارالعلوم ندوۃ العلما سے کسب فیض کیا، کچھ عرصے بنارس میں مولانا ابوالقاسم بنارسی کی خدمت میں رہ کر صحیحین کا درس لیا، اس کے بعد وہ دین و دعوت کے کام انجام دینے میں مصروف ہوگئے، پہلے کلکتہ جاکر وہاں کی جامع مسجد اہل حدیث میں خطیب و امام کی ذمہ داری سنبھالی، ۱۹۶۷ء میں ممبئی آگئے اور مومن پورہ کی جامع مسجد اہل حدیث میں خطابت و امامت کے فرائض انجام دینے لگے، اس کے بعد بنگالی مسجد مدن پورہ کو اپنا مرکز بنایا، بعد میں صرف جمعہ کی امامت کرتے اور خطبہ دیتے تھے، خوش بیان تھے، ان کا خطبہ سننے کے لیے لوگ دور دراز سے آتے، راقم کو بھی یہاں ایک دو بار ان کی اقتدا میں جمعہ کی نماز ادا کرنے کی سعادت میسر آئی۔

ممبئی میں مولانا مختار احمد صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ **الدار السلفیہ** کا قیام ہے جو عربی اور اردو کتابوں کا ایک بڑا اشاعتی مرکز ہے، حدیث کی کئی امہات کتب کو طباعت کے جدید معیار کے مطابق یہاں سے شائع کیا، اس ادارے سے کئی اہل علم وابستہ رہ کر تصنیف و تالیف اور عربی کتابوں کی تصحیح و ایڈٹ کا کام انجام دیتے تھے اور خود مولانا بھی تصنیف و تالیف میں منہمک رہتے تھے، یہاں سے ان کی سرپرستی میں ''البلاغ'' کے نام سے ایک مفید اصلاحی اور دینی ماہ وار رسالہ شائع ہورہا ہے جو ان کی محنت اور کدوکاوش سے ایک مفید اور باوقار رسالہ ہوگیا ہے، اس کے کئی کالم وہ خود لکھتے تھے اور اچھے لکھنے والوں سے بھی مضامین حاصل کرکے اس میں شائع کرتے تھے، اس میں ملک کے عام حالات، سیاسی واقعات پر تبصرہ و تجزیہ کے علاوہ متنوع قسم کی دینی معلومات پر مشتمل مضامین شائع ہوتے تھے جو اپنے انداز بیان کی خوبی کی وجہ سے شوق اور دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے ممبئی میں مولانا آزاد ہائی اسکول بھی مولانا کی دین ہے۔

مہاراشٹر کا مشہور صنعتی شہر مالیگاؤں ان کی سرگرمیوں اور قوت عمل کی خاص جولانگاہ تھا، یہاں شہر کے باہر ایک وسیع قطعہ آراضی میں انہوں نے علم و ہنر کا ایک تازہ جہاں آباد کیا تھا اور اس کا نام ''منصورہ'' رکھا تھا، اس میں طلبہ کے لیے جامعہ محمدیہ اور طالبات کے لیے کلیہ عائشہ قائم کیا تھا، مولانا کے نزدیک دینی تعلیم کے ساتھ عصری تعلیم بھی ناگزیر ہے، ان کے ان اداروں میں دینی علوم کے ساتھ عصری تعلیم بھی اس قدر دی جاتی تھی کہ مہاراشٹر بورڈ سے طلبہ و طالبات ہائی اسکول کرکے کالجوں میں داخلہ لیتے تھے، ان اداروں سے ملحق منصورہ میں ایک طبیہ کالج اور سائر اسپتال بھی قائم کیا تھا، طبیہ کالج سے جامعہ محمدیہ کے علاوہ دوسرے اداروں کے طلبہ بھی فیض یاب ہوتے تھے اور سائر اسپتال میں طلبہ کو عملی مشق کے مواقع فراہم کیے جاتے تھے۔

مولانا مختار احمد نے اپنے آبائی وطن مئو میں بھی عالیہ جنرل ہسپتال اور کلیہ فاطمہ زہرا قائم کیا تھا، یہاں بھی ایک طبی کالج قائم کرنا چاہتے تھے مگر یہ ادارہ عملی جامہ نہیں پہن سکا، بنگلور میں بھی انہوں نے اس طرح کے ادارے قائم کیے تھے اور ان میں بھی دینی و عصری تعلیم دلاتے تھے۔

مولانا کی ایک عظیم الشان دینی خدمت مسجدوں کی تعمیر ہے، انہوں نے ادارہ اصلاح المساجد کے زیر اہتمام ملک کے مختلف حصوں میں سیکڑوں مساجد تعمیر کرائی تھیں، ان کا تعمیری ذوق بہت عمدہ تھا، منصورہ مالیگاؤں میں ایک سے بڑھ کر ایک پرشکوہ اور عالی شان عمارتیں تعمیر کرائیں، ان کی تعمیر کردہ مسجدیں بھی خوب صورت اور پائدار ہیں۔

اصلاحی و دعوتی، دینی و تعلیمی اور ملی و سماجی کام کرنے میں ان کو بڑی لذت ملتی تھی، جمعیۃ اہل حدیث کے ہر کام میں پیش پیش رہتے تھے، مدتوں مرکزی جمعیۃ کے نائب امیر پھر قائم مقام امیر اور ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۷ء تک امیر رہے، مسلم پرسنل لا بورڈ کے بھی سرگرم ممبر اور برسوں اس کے نائب صدر تھے لیکن آخر میں ان کی توجہ کا اصل مرکز الدارالسلفیہ ہوگیا تھا، سفر بھی کم کرتے اور یک سوئی سے صرف تصنیف و تالیف اور لکھنے پڑھنے میں مشغول رہتے تھے، وہ اچھے خطیب و مقرر کی طرح اچھے اہل قلم بھی تھے، مختلف دینی موضوعات پر مفید رسائل و کتب عام فہم اور آسان زبان میں لکھے جن سے مسلمانوں کی ذہنی و فکری اصلاح کے علاوہ عقیدہ صحیحہ کی ترویج و اشاعت بھی ہوئی۔

مولانا مختار احمد ندوی دارالمصنفین کے مداح اور اس کی خدمت کے قدرداں تھے، جناب سید صباح الدین صاحب مرحوم سے ان کو بڑا لگاؤ تھا، سید صاحب بھی ان کی قوت عمل کے معترف تھے اور وہ جب دارالمصنفین آتے تو ان کی بڑی پذیرائی کرتے، مولانا مختار احمد کی مجھ پر بھی بڑی شفقت تھی، اکثر ٹیلی فون کرکے خیریت معلوم کرتے، مئو یا مشرقی اضلاع میں تشریف لاتے تو اس کا دعوت نامہ مجھے بھی بھجواتے اور اصرار کرکے بلاتے، کبھی دفعتاً مئو آجاتے اور وقت کم ہوتا تو خود دارالمصنفین آجاتے، میں ممبئی جاتا تو میری قیام گاہ کا پتا لگاکر فون کرتے اور گاڑی بھیج کر الدارالسلفیہ بلاتے اور گھنٹوں اپنے منصوبوں اور دوسرے علمی، ادبی اور دینی و ملی امور پر تبادلہ خیال کرتے، اب ایسی محبت کرنے والے لوگ کہاں ملیں گے۔

مولانا مختار احمد صاحب بڑے متحرک اور فعال تھے، انہوں نے گوناگوں دینی، تعلیمی اور قومی وملی خدمات انجام دیں، اللہ تعالیٰ دین وملت کے اس خادم کے درجات بلند کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ (''ض''، اکتوبر ۲۰۰۷ء)

پاریکھ، عبدالکریم، مولانا

مولانا عبدالکریم پاریکھ

یہ خبر بڑے رنج و افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ ممتاز عالم دین اور مشہور ملی رہنما مولانا عبدالکریم پاریکھ ۱۱؍ستمبر ۲۰۰۷ء کو ناگ پور میں وفات پاگئے، جہاں ان کا خاندان گجرات سے آکر آباد ہوگیا تھا، وہ ۱۵؍اپریل ۱۹۲۸ء کو اکولہ (مہاراشٹر) میں پیدا ہوئے تھے، ابتدائی تعلیم حاصل کر کے یہیں کولڈ ڈرنگ ہوٹل میں ملازمت اختیار کرلی، پھر اپنا کاروبار شروع کیا جس میں اللہ نے بڑی برکت دی اور جلد ہی وہ ناگ پور میں لکڑیوں کے بڑے تاجر شمار کیے جانے لگے۔

کاروباری مشغولیت کے ساتھ علم ومطالعہ اور دین سے بھی ان کو شغف رہا، اسی اثنا میں ان کا تعلق مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے ہوا جو روز بہ روز بڑھتا گیا یہاں تک کہ ان کے خلیفہ مجاز ہونے کا فخر حاصل ہوا، مولانا علی میاں ان کی بڑی قدر کرتے اور انہیں اپنے ساتھ جلسوں میں لے جاتے اور ان سے اصلاحی ودعوتی تقریریں کراتے۔

مولانا علی میاں نے پیام انسانیت کی تحریک شروع کی، جس کا مقصد اسلام کے بارے میں غیر مسلموں میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ اور یہ بتانا تھا کہ اسلام ساری انسانیت کے لیے دین رحمت ہے، اس کی تعلیم امن وآشتی، انسان دوستی، اخوت، بھائی چارگی اور اتفاق واتحاد کی ہے، فتنہ وفساد اور ظلم وجارحیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اس تحریک میں مولانا عبدالکریم پاریکھ حضرت مولانا کے دست راست ہوگئے تھے اور ان کی تقریروں سے غیر مسلموں کو بڑا فائدہ پہنچتا تھا۔

مولانا عبدالکریم پاریکھ کی جانب مولانا علی میاں کا اعتنا دیکھ کر ندوے کا ہر شخص ان کا گرویدہ ہوگیا تھا اور وہ ندوہ کے مختلف معاملات میں دخیل اور اس کی کئی کمیٹیوں کے ممبر بھی ہوگئے تھے، وہ مسلم پرسنل لابورڈ اور مسلم مجلس مشاورت کے بھی رکن رکین تھے۔

مولانا علی میاں کے فیض صحبت سے مولانا پاریکھ کی جہاں علمی و دینی استعداد میں اضافہ ہوا وہاں قرآن مجید سے بھی ان کا شغف بہت بڑھ گیا تھا، جس کا ایک مظہر ان کا ادارہ تعلیم القرآن ہے، اس ادارے سے انہوں نے قرآنیات پر اپنی کئی مفید کتابیں شائع کیں، جو عام فہم اور آسان زبان میں ہیں، ان کی کتاب "لغات القرآن" ہماری نظر سے بھی گزری ہے۔

مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب نے غیر مسلموں میں تبلیغ و دعوت دین کو اپنا خاص محور بنایا تھا، اسی لیے ان کے تعلقات غیر مسلموں سے بھی بہت اچھے تھے اور کسی، جھجک کے بغیر ان تنظیموں کے افراد سے بھی تعلق رکھتے تھے جن سے عام طور پر مسلمان کنارہ کش رہتے ہیں لیکن مولانا ان تک خدا کی باتیں پہنچاتے تھے اور غیر مسلموں کے سامنے بھی اسلامی دعوت پیش کرتے تھے، وہ کئی علاقائی اور ملکی زبانوں سے بھی واقف تھے، جن سے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینے میں انہیں آسانی ہوتی تھی، دعوتی، دینی واصلاحی کاموں کے سلسلے میں وہ ارباب اقتدار سے بھی ملتے رہتے تھے، ان کی وفات قوم وملت کا بڑا سانحہ اور خسارہ ہے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ (''ض''، اکتوبر ۲۰۰۷ء)

جین، گیان چند، پروفیسر

پروفیسر گیان چند جین

پروفیسر گیان چند جین کی وفات اردو دنیا کا بڑا سانحہ ہے، وہ اردو کے صف اول کے ادیب، محقق اور ماہر لسانیات تھے، ان کا انتقال ۱۷؍اگست ۲۰۰۷ء کو امریکہ میں ہوا، وہ ۱۹؍دسمبر ۱۹۲۳ء کو ضلع بجنور کے سیوہارہ قصبے میں پیدا ہوئے تھے، یہیں اور مرادآباد میں ابتدائی تعلیم ہوئی، پھر وہاں سے حصول تعلیم کے لیے آگرہ گئے اور ۱۹۴۵ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن میں ایم، اے پاس کیا، ۱۹۴۷ء میں ان کے تحقیقی مقالے ''اردو کی نثری داستانیں'' پر انہیں پی ایچ ڈی کی تفویض کی گئی۔

۱۹۵۰ء میں انگریزی روزنامہ ''پانیر'' کے معاون مدیر ہوئے لیکن اسی سال جولائی میں حمیدیہ کالج بھوپال میں اردو لکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا جس کے بعد وہ مدۃ العمر درس وتدریس ہی کی خدمت انجام دیتے رہے اور ایک لائق اور نیک نام استاد کی حیثیت سے شہرت پائی، انہوں نے ملک کی مختلف یونیورسٹیوں بھوپال، حیدرآباد، الہ آباد اور جموں وغیرہ میں پروفیسر اور صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے خدمت انجام دی، سبکدوش ہونے کے بعد حیدرآباد اور لکھنو یونیورسٹی میں یو جی سی فیلو ایمیریٹس کی حیثیت سے ان کی خدمات سے فائدہ اٹھایا گیا، لکھنو اندرانگر میں بودوباش اختیار کرلی تھی، اسی زمانے میں اپنے بعض تحقیقی کاموں کے سلسلے میں مجھے بھی خطوط لکھے تھے، ایک گرامی نامے میں یہ دریافت کیا تھا کہ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کی کتاب ''شعرالہند'' پہلی مرتبہ کب شائع ہوئی تھی، یہاں جب ان کی طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی تو وہ امریکہ چلے گئے تھے۔ جہاں ان کے بیٹے اور بیٹی رہتی تھیں۔

جین صاحب نے قلم وقرطاس سے ہمیشہ سروکار رکھا، امریکہ جانے کے بعد بھی ان کے مضامین اور تحریریں ''ہماری زبان'' دہلی کی زینت ہوتی تھیں، انہوں نے قریباً ۲۵ کتابیں لکھی تھیں جو اردو کے ادبی و تحقیقی ذخیرے میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں،

بعض کتابوں کے نام یہ ہیں:

اردو کی نثری داستانیں، تحریریں، اردو مثنویاں شمالی ہند میں، تفسیر غالب، لسانی مطالعے و تجزیے، شخصیات و مشاہدات، رموز غالب، ذکر و فکر، عام لسانیات، تاریخ ادب اردو (کئی جلدیں)، اردو کا اپنا عروض، کھوج، پرکھ اور پہچان، تحقیق کا فن، ابتدائی کلام اقبال وغیرہ۔

ناموں ہی سے کتابوں کی قدر و قیمت، اہمیت اور بلند پایگی ظاہر ہوتی ہے، ان پر وہ انعامات و اعزازات سے بھی سرفراز کیے گئے، ملک کی متعدد اردو اکیڈمیوں، آل انڈیا میر اکیڈمی لکھنو، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی اور ساہتیہ اکادمی دہلی نے ایوارڈ دیے۔

پروفیسر گیان چند جین اپنے ان اول درجے کے ادبی و تحقیقی کاموں کی وجہ سے اردو کے ایک کامل الفن اور بلند پایہ مصنف سمجھے جاتے تھے، وہ ان خوش قسمت لوگوں میں تھے جن پر ان کی زندگی ہی میں پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے گئے، کئی یونیورسٹیوں میں ان کی کتابیں داخل نصاب بھی رہیں لیکن ان کی آخری تصنیف ''ایک بھاشا، دو لکھاوٹ، دو ادب'' اردو حلقے میں بڑی متنازع بنی ہوئی ہے، اس کی تردید اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا اور ابھی تک لکھنے کا سلسلہ بند نہیں ہوا ہے لیکن جناب شمس الرحمان فاروقی اور مرزا خلیل احمد بیگ کے جواب بہت مدلل اور باوزن ہیں، موخر الذکر نے تو اس پر کتاب ہی لکھی ہے۔

مگر اس میں شبہ نہیں کہ جین صاحب ہماری زبان کے بڑے محقق و مصنف تھے، ان کے مقالے اور تصنیفات سے تحقیق کے طلبا اور محققین کو ہمیشہ رہنمائی ملتی رہے گی، وہ اپنے شاگردوں سے بڑی شفقت فرماتے اور خوردوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے جس کا اعتراف ان کے شاگردوں کو بھی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ جین صاحب سچے، کھرے اور صاف گو شخص تھے، اردو حلقے میں ان کی کمی مدتوں محسوس کی جاتی رہے گی۔

(''ض''، اکتوبر ۲۰۰۷ء)

حیدر، قرۃ العین

جناب قرۃ العین حیدر

اردو کی مشہور ادیبہ اور رجحان ساز افسانہ و ناول نگار محترمہ قرۃ العین حیدر ۲۱ر اگست ۲۰۰۷ء کو انتقال کر گئیں، ان کی پیدائش ۲۶ر جنوری ۱۹۲۶ء کو علی گڑھ میں ہوئی تھی جہاں ان کے والد سید سجاد حیدر یلدرم مسلم یونیورسٹی میں رجسٹرار تھے، مگر ان کی تعلیم لکھنو کے کرامت حسین گرلس کالج، آئی۔ ٹی کالج اور لکھنو یونیورسٹی میں ہوئی تھی۔

قرۃ العین کے والد اور والدہ نذر سجاد حیدر بھی اردو کے بڑے انشا پرداز تھے، جن کی روایت کو قرۃ العین نے بہت آگے بڑھایا، انہوں نے کم سنی ہی سے لکھنا شروع کیا تھا اور ناول، ناولٹ، افسانے، رپورتاژ، سفر نامے سب میں اپنے جوہر دکھائے، انہیں اردو ادب کی ورجینا وولف کہا جاتا ہے۔

ادبی دنیا میں ان کو جو شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی وہ کم لوگوں کو ملی، بعض رسالوں نے ان کی زندگی ہی میں ان کے گوشے نکالے تھے، انہوں نے ایک اچھی اور کامیاب مترجم کی حیثیت سے بھی شہرت حاصل کی، کئی کتابوں کے اردو سے انگریزی میں اور انگریزی سے اردو میں ترجمے کئے، ہنری جیمز کے ناول ''پورٹریٹ آف اے لیڈی'' کا ترجمہ ''ہمیں چراغ، ہمیں پروانے'' کے نام سے کیا تھا، شروع میں ان کا تعلق انگریزی صحافت سے بھی رہا، انہوں نے بی بی سی سے براڈ کاسٹ کے فرائض بھی انجام دیے۔

قرۃ العین کے ناولوں میں آگ کا دریا، آخر شب کے ہم سفر، کار جہاں دراز ہے، میرے بھی صنم خانے، چاندنی بیگم، سفینہ غم دل، گردش رنگ چمن اور افسانوی مجموعوں میں پت جھڑ کی آواز، ستاروں سے آگے اور شیشے کا گھر وغیرہ ہیں، آگ کا دریا اور آخر شب کے ہم سفر کو اردو ادب کا شاہ کار خیال کیا جاتا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد قرۃ العین اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان چلی گئی تھیں لیکن ۱۹۶۰ء میں وہ ہندوستان واپس آ گئیں، اس زمانے کے لکھے گئے ان کے ناولوں اور افسانوں میں تقسیم ہند کا درد و کرب بہت نمایاں ہے، انہوں نے اپنے افسانوں میں تقسیم وطن کو ''تہذیبی المیہ'' اور برصغیر کی ہزار سالہ ہند و مسلم روایت کی شکست کہا ہے، ان کے طبع زاد ناول افسانے ہوں یا ترجمے سب اچھے اور اعلا درجے کے ہیں، ان کے اسلوب میں ندرت اور انفرادیت تھی اور ادبی و فنی محاسن کی طرح ان میں تاریخی شعور بھی ملتا ہے، اس لیے ان کی تمام کتابیں مقبول ہوئیں اور ان پر وہ باوقار ادبی اعزاز سے نوازی گئیں، ساہتیہ اکادمی انعام ملا، گیان پیٹھ ایوارڈ سے مفتخر ہوئیں، سویت لینڈ نہرو ایوارڈ، غالب ایوارڈ اور اقبال سمان حاصل کیے، ملک و بیرون ملک کی کئی یونیورسٹیوں میں گیسٹ لکچرر رہیں، جامعہ ملیہ اسلامیہ میں وزیٹنگ پروفیسر رہیں، جامعہ کی اکزیکیٹو کونسل نے طے کیا ہے کہ اس کی ایک نئی عمارت ان کے نام سے موسوم ہوگی، ان کی یاد میں ایک سالانہ یادگاری خطبے کا انعقاد کیا جائے گا اور انہیں آنریری ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے پس از مرگ نوازا جائے گا اور ایک چیئر بھی قائم کی جائے گی۔

حکومت ہند نے ۱۹۸۵ء میں پدم شری اور ۲۰۰۵ء میں پدم بھوشن اعزاز دیے، وہ زندگی بھر مجرد رہیں، ان کی سکونت نوئیڈا میں تھی، کیلاش اسپتال میں زیر علاج تھیں کہ وقت موعود آ گیا اور جامعہ کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔

(''ض''، اکتوبر ۲۰۰۷ء)

برکاتی، سید فرید احمد، ڈاکٹر

ڈاکٹر سید فرید احمد برکاتی

ڈاکٹر سید فرید احمد برکاتی نے یکم جولائی ۲۰۰۷ء کو داعی اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ڈاکٹر صاحب کے جد امجد مولانا حکیم برکات احمد صاحب اپنے زمانے کے مشہور فاضل، یگانہ استاد اور علوم عقلیہ وحکمیہ میں سرآمد روزگار تھے، یہ بہار سے آکر ریاست ٹونک میں آباد ہوگئے تھے، ٹونک کے والی نے بڑی قدردانی کی اور اپنا خصوصی معالج مقرر کیا، علوم عقلیہ کی طرح طبابت بھی اس خانوادے کا امتیاز تھا، اس میں کئی نامور طبیب گزرے ہیں، ڈاکٹر فرید احمد کے والد بزرگوار شفاء الملک مولانا سید ظہیر احمد برکاتی بھی ایک حاذق طبیب اور ریاست کے نواب صاحب کے معالج خاص تھے۔

یادش بخیر حکیم محمد سعید بانی ہمدرد دواخانہ کراچی کے دست راست اور راقم کے مخلص کرم فرما جناب مسعود احمد برکاتی صاحب اسی خانوادے کے گوہر ناب ہیں، ڈاکٹر فرید احمد اپنی خاندانی ذہانت، علم وفضل، شرافت، ملنساری اور سخاوت کے حامل تھے، آٹھ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا، دارالعلوم خلیلیہ نظامیہ ٹونک سے ابتدائی اور دینی تعلیم حاصل کی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے عربی میں ایم اے کیا اور اول پوزیشن حاصل کی، پھر راجستھان یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کیا اور یہیں تدریسی خدمات انجام دے کر ۲۰۰۲ء میں سبک دوش ہوئے۔

ان کا تحقیقی مقالہ ''فرہنگ کلیات میر'' ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا تھا، اسی زمانے میں پورے ملک میں مولانا ابوالکلام آزاد صدی تقریبات منائی جارہی تھیں، راجستھان یونیورسٹی کے شعبہ اردو فارسی میں بھی مولانا پر سمینار ہوا تھا، اس میں شرکت کے لیے گیا تو ڈاکٹر فرید صاحب سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے اپنی کتاب معارف میں تبصرے کے لیے عنایت کی، اس سے ان کی محنت اور لغت میں مہارت کا اندازہ ہوا، سمینار میں ٹونک کے متعدد اہل علم اور برکاتی خاندان کے کئی بزرگوں سے ملاقات ہوئی، ان لوگوں کا شدید اصرار تھا کہ میں ٹونک چلوں اور ریاست کے کتب خانے اور قابل ذکر یادگاروں کو دیکھوں لیکن ریل کا ریزروٹکٹ وہاں جانے میں مانع ہوا جس کا ملال آج تک ہے۔

ڈاکٹر فرید احمد کی نظر عربی، فارسی اور اردو لغات اور لسانیات پر اچھی اور گہری تھی اور اس پر انہوں نے بہت سے علمی وتحقیقی مضامین لکھے، ان کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اپنے تلامذہ سے بھی انہوں نے فرہنگ اور لغات پر تحقیقی کام کرائے جیسے اقبال کے اردو کلام کی مبسوط فرہنگ، کلیات سودا کا تقابلی فرہنگ، کلیات میر حسن کی فرہنگ، فرہنگ نوآئین ہند، قرآن مجید کے اولین دو تراجم کا تاریخی ولسانی جائزہ وغیرہ، اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ (''ض''، اکتوبر ۲۰۰۷ء)

گاندھی، رام چندر

رام چندر گاندھی

رام چندر گاندھی ۱۳؍ جون کو نئی دہلی کے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر (IIC) میں انتقال کرگئے، یہ گاندھی جی کے پوتے، راج گوپال آچاریہ کے نواسے اور ہندوستان ٹائمز کے سابق اڈیٹر دیوداس گاندھی کے بیٹے تھے۔

ان کی تعلیم دہلی کے سنٹ اسٹیفن کالج میں ہوئی تھی جہاں وہ فلسفہ کے استاد بھی رہے، یہ ان کا خاص موضوع تھا اور اس میں دہلی یونیورسٹی اور آکسفورڈ دونوں جگہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی تھی، برطانیہ، امریکہ اور شانتی نکیتن میں بھی فلسفہ کے استاد تھے، اس میں کئی کتابیں لکھیں۔

انہیں بابری مسجد سانحہ کا بڑا دکھ تھا، اس پر ''سیتا کی رسوئی'' کے نام سے جو کتابچہ لکھا تھا، اس میں ثابت کیا ہے کہ جو جگہ مندر کی بتائی جاتی ہے وہاں قبائلی رہتے تھے۔

(''ض''، اکتوبر ۲۰۰۷ء)

حسین، نذیر، شیخ

شیخ نذیر حسین

(ڈاکٹر محمود الحسن عارف)

''محترم شیخ نذیر حسین صاحب بڑے عالم ومحقق اور علم وفن کے قدرداں تھے، ''معارف'' ان کا محبوب رسالہ تھا، اگر ان کی کوئی چیز تیار ہوجاتی تو اس میں اشاعت کے لیے بھیجتے، معارف میں کوئی مسامحت اور فروگذاشت ہوجاتی تو فوراً توجہ دلاتے، ایسے صاحب نظر اور دیدہ ور لوگ اب عنقا ہوگئے ہیں، جب تک وہ اچھے تھے شاید ہی کوئی مہینہ ناغہ جاتا ہو کہ ان کا خط نہ آتا ہو، ادہر علالت کی وجہ سے جب ان کے خطوط آنے بند ہوئے تو میں نے شعبہ اردو، دائرہ معارف اسلامیہ لاہور کو متعدد خطوط لکھے مگر ایک خط کا بھی جواب نہیں آیا کہ دفعتہً ۲۲؍ اکتوبر کو یہ تحریر اور منسلک خط موصول ہوا تو دھک سے رہ گیا، قارئین معارف سے درخواست ہے کہ ان کے لیے دعائے مغفرت کریں!

ربنا اغفرلنا و لا خواننا الذین سبقونا بالایمان.''[الحشر:۱۰] (ض)

پانچ سوا پانچ فٹ منحنی سا جسم، ابرؤوں کے بال موٹے اور بے ترتیب، کلین شیو، چہرہ اور کمر قدرے خمیدہ...... یہ تمام باتیں ذہن میں رکھیں تو اس سے فوراً شیخ نذیر حسین

صاحب کی شکل وصورت ذہن میں آتی ہے......وہ اپنی وضع قطع اور چہرے مہرے سے قطعاً کوئی عالمِ دین یا اسکالر نظر نہیں آتے تھے، بلکہ ایک عام سے فرد دکھائی دیتے تھے۔

۱۹۷۰ء کی دہائی کے آخری سالوں میں جب میں اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں پہلے پہل آیا......تو میں نے ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر سید امجد الطاف، پروفیسر عبدالقیوم کے ساتھ مذکورہ بالا...... چہرے مہرے کے ایک شخص......کو دیکھا تو مجھے ان کی وضع قطع کی بنا پر تعجب ہوا کہ یہ کون صاحب ہیں، پھر مجھ پر منکشف ہوا کہ یہ تو اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مدیر شیخ نذیر حسین ہیں جو ایک معروف اور مسلمہ علمی شخصیت کے مالک تھے، جن کی مولانا حبیب الرحمان الاعظمی، جناب سید صباح الدین عبدالرحمان وضیاء الدین اصلاحی سے خط وکتابت رہی اور جن کے خطوط باقاعدگی سے ''معارف'' میں چھپتے تھے۔

شیخ صاحب کا تعلق شیخ برادری کی ''قانون گو'' شاخ سے تھا اور وہ ہوشیار کے قصبے شام چوراسی کے رہنے والے تھے اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہاں بھی وہ شام نگر کے علاقے میں آ کر فروکش ہوئے، اس طرح ہندوستان میں بھی وہ ''شامی'' تھے اور پاکستان میں بھی وہ ''شامی'' ہی رہے۔

وہ ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد محکمہ انہار (یا کسی اور محکمہ) میں ملازم ہوئے، انہوں نے ۱۹۷۰ء میں اس محکمہ سے ریٹائرمنٹ لے لی اور بعد ازاں ۹/دسمبر ۱۹۷۱ء کو سید نذیر نیازی مرحوم کے جانے سے خالی ہونے والی سیٹ پر شعبہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں بہ طور مدیر (اڈیٹر) ملازم ہوگئے، یہ ملازمت بربنائے معاہدہ تھی اور ان کے معاہدۂ ملازمت میں دو سال کے بعد تجدید ہوتی تھی، اس طرح ان کے معاہدہ ملازمت میں آخری مرتبہ ۱۹۹۶ء کو دو سال کی تجدید ہوئی اور ۱۹۹۸ء میں ان کی بیماری کی بنا پر ان کے معاہدے میں تجدید نہ ہوسکی، اس طرح انہوں نے گویا ریٹائرمنٹ کے بعد ۲۷، ۲۸ برس شعبے کی خدمت کی ہے جو بہت طویل عرصہ ہے اور یہ گویا ڈبل ریٹائرمنٹ تھی جو انہیں ۱۹۹۸ء میں حاصل ہوئی، بعد ازاں وہ بستر علالت پر رہے اور ۲۲/دسمبر ۲۰۰۶ء کو انہوں نے انتقال کیا۔

بہ حیثیت ایک انسان شیخ صاحب بہت کم آمیز اور بہت کم گو تھے، زبان میں قدرے لکنت تھی، اس لیے تقریر نہیں کر سکتے تھے، اسی لیے میں نے انہیں کسی محفل میں تقریر کرتے یا مقالہ پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا، البتہ وہ ''تحریر'' کے ماسٹر تھے، ان کی تحریر شستہ سلیس اور ہلکی پھلکی تھی، وہ مشکل ترین مضمون کو آسان ترین الفاظ میں بیان کرنے کا گر جانتے تھے۔

کتابوں کے بارے میں ان کا علم بہت وسیع تھا، ہر نئی کتاب خصوصاً اردو اور عربی کی کتب کے بارے میں وہ ضرور علم رکھتے، اس سلسلے میں وہ ہر ہفتے کے آخری دن مولوی عبیدالحق کے ہاں مکتبہ علمی لیک روڈ ضرور جایا کرتے تھے، جہاں ان کے جانے کی غرض وغایت یہ ہوتی کہ وہ بیروت اور قاہرہ سے آنے والی نئی کتابوں کے بارے میں واقفیت حاصل کریں۔

مکتبہ علمیہ ہی کی طرح لاہور کے بعض دوسرے کتب خانوں سے بھی وہ اسی طرح کے روابط رکھتے تھے لیکن ان کتب خانوں کے ساتھ ان کا رابطہ محض علم کی حد تک تھا، کتب کی خریداری کو وہ ضروری خیال نہ کرتے تھے، غالباً اس کی ایک وجہ تو ان کی مالی حیثیت تھی کہ وہ اپنی محدود آمدنی میں اس کے متحمل نہ ہوسکتے تھے، دوسرے لاہور کے کئی ذاتی کتب خانوں کا انجام ان کے سامنے تھا جن میں مولوی محمد شفیع مرحوم کا ذاتی کتب خانہ بھی شامل ہے، جن کی قیمتی اور نایاب کتب ان کے صاحب زادے محمد رفیع نے ۱۰۰ روپے فی کتاب کے حساب سے فروخت کردیں، اسی لیے انہوں نے بہت کم کتب خریدی ہوں گی، دوست احباب سے البتہ اگر کوئی کتاب تحفتاً ملتی تو اسے بہت حفاظت کے ساتھ اور خوب سنبھال کر رکھتے، اس فہرست میں مولانا ابوالحسن علی ندوی مرحوم کی طرف سے ان کے دستخطوں کے ساتھ آنے والی کتب بھی شامل ہیں۔

شیخ صاحب کتب کی خریداری ہی کی طرح ''دوست بنانے'' کے معاملے میں بھی بہت محتاط واقع ہوئے تھے پورے شہر میں لے دے کے ان کے صرف دو یا تین دوست تھے ان کے ایک دوست مولوی عبیدالحق ندوی (مالک مکتبہ علمیہ، لیک روڈ لاہور) کا ذکر پہلے آچکا ہے، ان کے دوسرے دوست پروفیسر محمد اسلم مرحوم تھے جو شعبہ تاریخ میں تاریخ کے استاد اور اپنے شعبے میں صدر شعبہ اور پروفیسر کی مسند پر فائز رہنے والے ایک بلند پایہ عالم اور محقق تھے۔

پروفیسر محمد اسلم اور شیخ صاحب میں کئی باتیں قدر مشترک کے طور پر موجود تھیں، دونوں میں ایک وجہ اشتراک تو ''ندویت'' تھی، شیخ صاحب ندوۃ العلما کی علمی کاوشوں اور خدمات کے معترف ہی نہیں بلکہ ہمیشہ اس کے مدح خواں اور وکیل بھی رہے ان کے سامنے اگر کوئی شخص ''مولانا سید سلیمان ندوی'' یا ''علامہ شبلی نعمانی'' کے بارے میں کوئی نازیبا بات کہتا تو انہیں شدید طور پر غصہ آجاتا تھا، جب کہ پروفیسر محمد اسلم بھی ''ندوہ پسند'' تھے البتہ وہ ندویت کے ساتھ ساتھ مسلم لیگی ذہن بھی رکھتے تھے اور پاکستان اور تحریک پاکستان کے موقع پر قائداعظم اور مسلم لیگ کے کردار کے معترف تھے جب کہ شیخ نذیر حسین قدرے ''جمعیت علمائے ہند'' کے زیادہ قریب تھے اور علمائے دیوبند خصوصاً شیخ الہند مولانا محمود حسن کے بہت مداح تھے، انہوں نے شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی پر ایک مقالہ بھی سپرد قلم کیا ہے، جو دائرہ معارف اسلامیہ میں میم کی پٹی میں شامل طباعت ہوچکا ہے۔

اس کے علاوہ دونوں میں ایک اور ''قدر مشترک''، ''کلین شیو'' ہونا بھی تھا، پروفیسر محمد اسلم صاحب نے اپنی زندگی کے آخری سال عمرہ کیا تو داڑھی بڑھالی تھی، وہ

فرمایا کرتے تھے کہ انہوں نے اپنی اس داڑھی کو غلاف کعبہ کے ساتھ مس کیا ہے اور یہ عہد کیا ہے کہ وہ اب اس کو نہیں مونڈیں گے پھر اسی مومنانہ شکل وصورت کے ساتھ انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا، جب کہ شیخ صاحب اپنی ہٹ پر آخری تک قائم رہے، اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی ادارتی مجالس میں جب کبھی پروفیسر صاحب شریک ہوتے اور بات شیخ صاحب کی داڑھی تک ''بڑھ'' جاتی تو ایسے موقعوں پر پروفیسر محمد اسلم صاحب انہیں ''بھرپور کمک'' پہنچاتے اور فرماتے ''شیخ جی داڑھی نہ رکھنا'' ورنہ جو تھوڑا بہت آپ کا اعتبار ہے وہ بھی ختم ہوجائے گا، اس پر ایک زوردار قہقہہ پڑتا اور بات آئی گئی ہوجاتی، بہرحال دونوں میں یہ دوستی بہت گہری تھی اور شیخ صاحب اس دوستی کی بہت قدر کرتے تھے اور اکثر ''شب جمعہ'' اور پھر ''شب دوشنبہ'' ان کے ہاں جاتے اور دونوں کے مابین طویل مجلس قائم رہتی۔

شیخ صاحب بہ طور مؤلف: شیخ صاحب کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہیں بجا طور پر ''چھپے رستم'' کہنا چاہیے، وہ چہرے مہرے اور اپنی وضع قطع سے قطعاً علمی شخصیت نظر نہ آتے تھے، ان کی ابتدائی عمر تو ایک ٹیکنیکل محکمہ میں انگریزی کی اور پھر پاکستان کی نوکر شاہی کی خدمت کرتے ہوئے گزری تھی اور اس ابتدائی عمر میں انہوں نے شاید ہی کوئی علمی کام کیا ہو، البتہ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں سید نذیر نیازی مرحوم کے جانے سے جو سیٹ خالی ہوئی، اس پر ان کی تقرری ۱۹۷۱ء میں عمل میں آگئی اور یوں انہیں ایک علمی ادارے کی رفاقت نصیب ہوئی، جس نے ان کی زندگی میں خوبصورت تبدیلی پیدا کی اور کلیریکل نوٹ اور کلیریکل ورک کرنے والا قلم، علمی جولان گاہ میں دوڑنے لگا اور ان کے قلم سے کئی مقالات اور کئی کتب کے مسودات تصنیف وتالیف ہوئے۔

پھر کیا وہ مولف اور مصنف کے طور پر زیادہ بہتر تھے یا مترجم کے طور پر اچھے تھے؟ میرے لیے اگرچہ ان کی ان دونوں جہتوں میں سے کسی ایک کی تعیین کرنا اور اس کو دوسری جہت پر ترجیح بے حد مشکل ہے، تاہم میرا خیال یہ ہے کہ وہ مصنف اور مولف کے طور پر زیادہ قدر آور تھے، یہ الگ بات ہے کہ بہ طور مصنف ان کی صلاحیتوں کو اجاگر ہونے کا موقع نہیں ملا، انہوں نے جو کتابیں تصنیف وتالیف کیں، ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

ا۔مسلمانوں کا طریقہ تعلیم وتربیت۔ ۲۔تاریخ علوم اسلامیہ (دو جلد)

ان دونوں کتب کے سامنے لکھا ہے (زیر طباعت)۔ [۱]

یہ ۱۹۹۶ء کی بات ہے، ۱۹۹۸ء میں وہ اپنی علالت کے باعث دفتری ملازمت جاری نہ رکھ سکے، اس لیے معلوم نہیں کہ ان کی یہ دونوں کتب طبع ہوئیں یا نہیں، بہرحال یہ دونوں کتب نہایت اہم موضوع سے متعلق ہیں۔

اس کے علاوہ انہوں نے اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے لیے کئی مقالات تحریر فرمائے، جن میں قرآن کریم کی سورتوں سے لے کر اہم ترین مسلم شخصیات اور اسلامی موضوعات وغیرہ شامل ہیں، ان میں سے اہم مقالات کی تفصیل درج ذیل ہے:

ا۔سعد زغلول پاشا، [۲] (۲)الشابی، ابوالقاسم، [۳] (۳)شاد، [۴] (۴)شریف حسین بن علی، [۵] (۵)شکیب ارسلان (امیر)، [۶] (۶)شمس الحق ڈیانوی، [۷] (۷)طٰہٰ حسین، [۸] (۸)ظہران، [۹] (۹)علم منطق، [۱۰] (۱۰)تمہید علم طبیعیات، [۱۱] (۱۱)تمہید علم محاضرات، [۱۲] (۱۲)علی بن ربن الطبری، [۱۳] (۱۳)العثمانیہ، [۱۴] (۱۴)مسکوکات، [۱۵] (۱۵)فن متفرقات، [۱۶] (۱۶)(شاہ) فیصل، [۱۷] (۱۷)کرد، [۱۸] (۱۸)کرمۃ، [۱۹] (۱۹)مادیت، [۲۰] (۲۰)مالی، [۲۱] (۲۱)محمد انور شاہ (سید)، [۲۲] (۲۲)محمد جمال الدین القاسمی، [۲۳] (۲۳)محمد رشید رضا، [۲۴] (۲۴)محمد عبدہ (مفتی)، [۲۵] (۲۵)(مولانا) محمد قاسم نانوتوی، [۲۶] (۲۶) محمد کرد علی، [۲۷] (۲۷)محمود حسن، [۲۸] (۲۸)المدینۃ المنورۃ، [۲۹] (۲۹)مصر، [۳۰] (۳۰)مکۃ المکرّمہ، [۳۱] (۳۱)مورتانیا، [۳۲] (۳۲)النابغۃ الذبیانی، [۳۳] (۳۳)ناعورہ، [۳۴] (۳۴)نصر، [۳۵] (۳۵)نفیری علوی، [۳۶] (۳۶)ہارون الرشید۔ [۳۷]

اس فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ صاحب محترم کا مطالعہ جدید افراد اور جدید موضوعات پر بہت گہرا تھا اور یہ کہ جدید عربی اور اردو کتب پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔

بہ طور مترجم: شیخ صاحب عربی اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے میں بھی بے حد مہارت رکھتے تھے، وہ پاکستان کے ان چند اعلا پائے کے مترجمین میں سے تھے جو عربی اور انگریزی فنون کا موزوں ترین اور سہل ترین الفاظ میں ترجمہ کرسکتے تھے اور اس فن کی نزاکتوں اور باریکیوں سے خوب واقف تھے، ان کے ترجمہ میں سلاست اور مضمون کی روانی ایک ساتھ ہوتی تھی، انہوں نے درج ذیل کتب کو اردو کے قالب میں منتقل کیا:

ا۔مصلحین امت، ۲۔سیاحت نامہ روس، ۳۔سلطان صلاح الدین ایوبی، ۴۔سرگزشت حیات، ۵۔مختصر ترجمہ احیاء علوم الدین، ۶۔نثر عربی کی نگارشات، ۷۔امام عبداللہ بن مبارک [۳۸]

شیخ صاحب نے موخر الذکر کتاب کے متعلق لکھا ہے کہ وہ زیر اشاعت ہے، ان کی باقی کتب پہلے ہی زیور طباعت سے آراستہ ہوچکی ہیں۔ [۳۹]

علاوہ ازیں انہوں نے اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے ۷۰ سے ۸۰ تک مقالات انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیے، یہ تمام تراجم اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں طبع ہوچکے ہیں۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آمین! (نومبر ۲۰۰۷ء)

---

۱ کوائف شیخ نذیر حسین، مرتبہ شیخ نذیر حسین، ۱۹۹۶ء، ص:۱۔ ۲ ایضاً، ۱۱:۳۶۔ ۳ ایضاً، ۱۱:۵۴۸۔ ۴ ایضاً، ۱۱:۵۶۰۔ ۵ ایضاً، ۱۱:۱۹۷۔ ۶ ایضاً، ۱۱:۶۶۷۔ ۷ ایضاً، ۱۱:۹۷۷۔ ۸ ایضاً، ۱۲:۵۹۸۔ ۹ ایضاً، ۱۲:۶۲۸۔ ۱۰ ایضاً، ۱۴/۱:۲۴۸۔ ۱۱ ایضاً، ۱۴/۱:۲۶۱۔ ۱۲ ایضاً، ۱۴/۱:۳۲۱۔ ۱۳ ایضاً، ۱۴/۱:۵۰۹۔ ۱۴ ایضاً، ۱۴/۲:۸۷۔ ۱۵ ایضاً، ۱۴/۲:۵۳۶۔ ۱۶ ایضاً، ۱۵:۱۰۱۰۔ ۱۷ ایضاً، ۱۵:۱۰۰۲۔ ۱۸ ایضاً، ۱۵:۱۰۷۸۔ ۱۹ ایضاً، ۱۷:۱۶۲۔ ۲۰ ایضاً، ۱۷:۲۵۴۔ ۲۱ ایضاً، ۱۸:۲۵۶۔ ۲۲ ایضاً، ۴۵۳۔ ۲۳ ایضاً، ۱۹:۳۷۶۔ ۲۴ ایضاً، ۱۹:۴۰۹۔ ۲۵ ایضاً، ۱۹:۴۲۱۔ ۲۶ ایضاً، ۱۹:۴۴۷۔ ۲۷ ایضاً، ۱۹:۵۰۴۔ ۲۸ ایضاً، ۱۹:۵۱۲۔ ۲۹ ایضاً، ۲۰:۳۲۔ ۳۰ ایضاً، ۲۰:۲۲۸۔ ۳۱ ایضاً، ۲۱:۱۸۶۔ ۳۲ ایضاً، ۲۱:۴۹۴۔ ۳۳ ایضاً، ۲۱:۲۷۷۔ ۳۴ ایضاً، ۲۲:۴۔ ۳۵ ایضاً، ۲۲:۶۵۔ ۳۶ ایضاً، ۲۲:۳۱۰۔ ۳۷ ایضاً، ۲۲:۳۴۱۔ ۳۸ ایضاً، کوائف شیخ نذیر حسین، مرتبہ شیخ صاحب مرحوم۔ ۳۹ ایضاً

اصلاحی، ضیاء الدین، مولانا

آہ! مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ

دارالمصنفین کے ناظم اور معارف کے مدیر جناب مولانا ضیاء الدین اصلاحی ۲/ فروری ۲۰۰۸ء کی صبح کو اپنے خالق حقیقی کے حضور پہنچ کر اس کی رحمت سے جا ملے لیکن اپنے پیچھے دارالمصنفین کے ہر فرد بلکہ در و دیوار کو روتا، بلکتا چھوڑ گئے، شبلی و سلیمان کا یہ گلشن ویرانی کی تصویر بن گیا، اس جہاں علم و دانش کی روح بھی جیسے ان کی موت کے ساتھ رخصت ہوگئی اور سچ یہ ہے کہ علامہ شبلیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا شاہ معین الدین ندویؒ اور سید صباح الدین عبدالرحمانؒ کی قابل فخر روایات کی مسند اور بزم جس شمع سے روشن تھی، ایک حادثے نے اس کو گل کردیا، اِنا للہ وَاِنا اِلیہ رَاجِعونُ۔

مولانا اصلاحی ۳/ جنوری کو سفر حج سے واپس آئے تھے اور بالکل چاق چوبند اور صحت مند تھے، یکم فروری کو وہ اپنی اہلیہ کے ہمراہ ایک عزیز سے ملنے کے لئے سرائے میر کے قریب موضع کھریواں کے لئے قریب ساڑھے نو بجے صبح روانہ ہوئے، جمعہ کا دن تھا، خطبہ اور نماز پڑھانے کے لئے مجھے تاکید فرمائی، عین نماز جمعہ سے پہلے یہ خبر ملی کہ ان کی جیپ حادثہ کا شکار ہوگئی ہے اور وہ صدر اسپتال میں زخمی حالت میں لائے گئے ہیں، نماز کے فوراً بعد ان کے تمام متعلقین اسپتال پہنچے، وہ سراپا زخمی تھے، ان کی اہلیہ بھی زخمی تھیں، لیکن ہوش میں تھیں، مشورے کے بعد وہ ایک مقامی سرجن ڈاکٹر فرقان کے ہسپتال میں لائے گئے، خون بہت زیادہ نکل چکا تھا، خون دیا گیا اور پھر مناسب سمجھا گیا کہ ان کو فوراً بنارس کے بی ایچ یو ہسپتال میں منتقل کیا جائے، وہاں کچھ ضروری ٹسٹ ہوئے، دوائیں بھی دی گئیں لیکن افاقے کے آثار نہیں تھے، صبح کا انتظار تھا، صبح قریب ہوئی لیکن بیم و آس کے سورج کے طلوع سے پہلے ہی علم و فضل کا یہ ماہتاب روپوش ہوگیا، اس دن بھی طلوع شمس معمول کے مطابق ہوا لیکن ضیائے شمس سے محرومی کا احساس اس دن سے زیادہ شاید اور کبھی نہ ہوا، دن تمام سرکاری و قانونی کاروائی کی نذر ہوا، مغرب کے بعد ان کی نعش دارالمصنفین لائی گئی اور اگلے روز ساڑھے دس بجے شبلی ڈگری کالج کے وسیع میدان میں ہزاروں انسانوں نے مولانا سید محمد رابع ندوی ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء کی اقتدا میں نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد دارالمصنفین کے احاطے میں علامہ شبلی کے پہلو میں سپرد خاک کردیا، پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا، قریب دو گھنٹے تک، **منها خلقناكم** [الطور:۵۵] کے بادیدۂ نم اقرار کے ساتھ خاک پوشی کا عمل جاری رہا اور اس اثنا میں دارالمصنفین کی مسجد میں مولانا سید محمد رابع ندوی کے کلمات تعزیت بے قرار اور مغموم دلوں کے لیے شبنم افشانی کرتے رہے۔

مولانا کا وطن اعظم گڑھ شہر سے قریب ایک گاؤں سہریا ہے، ۱۹۳۷ء میں وہ اپنے نانہالی گاؤں جے راج پور میں پیدا ہوئے، ان کے والد شیخ عبدالرحمان ایک چھوٹے زمیں دار اور صاحب علم شخص تھے، اردو اور فارسی ادب کا عمدہ ذوق رکھتے تھے، دس سال کی عمر میں مولانا مدرسۃ الاصلاح میں داخل ہوئے، اس وقت مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا صدرالدین اصلاحی، مولانا اختر احسن اصلاحی اور مولانا جلیل احسن اصلاحی جیسے علماء کی موجودگی نے مدرسۃ الاصلاح کو خاص مرجعیت بخشی تھی، ان ارباب کمال سے تلمذ و استفادے کے بعد قریب بیس سال کی عمر میں وہ دارالمصنفین سے وابستہ ہوئے، اس عمر میں دارالمصنفین کی علمی رفاقت آسان نہیں تھی لیکن مولانا نے روز اول سے ظاہر کردیا کہ وہ اس عظیم علمی ادارے کے لیے عطیہ الٰہی ہیں، وہ اس دور میں رفیق ہوئے جب دارالمصنفین کو قحط الرجال کا شکوہ نہیں تھا، اس کے سپہر علم و ادب پر مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی جیسے آفتاب و ماہتاب تو روشن نہیں تھے لیکن ان حضرات سے براہ راست مستنیر شخصیتوں کی شکل میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمان اور مولانا مجیب اللہ ندوی دبستان شبلی کے نظام شمسی کے بجائے خود روشن سیارے ہوچکے تھے، ان کی موجودگی میں مولانا مرحوم کی ابتدائی تحریروں سے ان کے قلم کی اٹھان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، ان کا سب سے پہلا مضمون فروری ۱۹۵۵ء کے معارف میں چھپا ''امام اعظم کی فقہ'' (ترک حدیث کے جواب میں) کے عنوان سے، اس اولین مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۵۷ء میں دارالمصنفین آنے سے پہلے ہی وہ معارف کے ذریعہ متعارف ہوچکے تھے، ۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۶ء میں بھی ان کے چند مضامین چھپے اور یہ سب قرآنی موضوعات پر تھے، مارچ ۱۹۵۸ء سے مطبوعات جدیدہ کے تحت کتابوں پر ان کی تبصرہ نگاری کا آغاز ہوا۔

۱۹۵۷ء سے ۲۰۰۸ء تک قریب نصف صدی کے دارالمصنفین اور معارف کی

داستان میں وہ کسی نہ کسی شکل میں موجود رہے اور غالباً سید صباح الدین عبدالرحمان مرحوم کے بعد اس ادارے کے لیے سب سے زیادہ ماہ و سال وقف کرنے میں ان ہی کا نام ہے، مضامین کا آغاز قرآنیات اور فقہ کے موضوعات سے ہوا لیکن ان کی پہلی تصنیف ''ہندوستان عربوں کی نظر میں'' ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے، اس کتاب کی پہلی جلد ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی اور دو سال کے بعد دوسری جلد بھی آ گئی، جاحظ سے قلقشندی تک قریب اکیس عرب سیاحوں، جغرافیہ دانوں اور عالموں کی کتابوں میں ہندوستان کے متعلق جس قدر متنوع اور مفید معلومات تھے، مولانا اصلاحی مرحوم نے تالیف و ترجمہ کے ذریعہ اس کتاب میں جمع کر دیا، یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور حکومت ہند اور اس وقت کے وزیر ہمایوں کبیر نے اس کی قدر افزائی کی لیکن مولانا کا اصل کام ''تذکرۃ المحدثین'' کی تالیف و تصنیف ہے، صاحب تصنیف محدثین کے حالات کی تالیف، دارالمصنفین کے ذمہ داروں کے پیش نظر تھی، حضرت سید صاحب نے اس کی ابتداء کی تھی، ان کی خواہش تھی کہ اس سلسلے کو مکمل کیا جائے اور بالآخر اس کی تکمیل کا شرف مولانا اصلاحی مرحوم کو حاصل ہوا، انہوں نے تین ضخیم جلدوں میں اس عظیم تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر محققانہ اور مہتم بالشان کام انجام دیا، اردو میں بعض محدثین کرام کے حالات ضرور لکھے گئے تھے لیکن بعض حلقے جس طرح حدیث کے پورے ذخیرے کو مشکوک اور ناقابل اعتبار قرار دینے کی مہم میں مصروف تھے، اس کے پیش نظر ان جلدوں میں صرف تذکرہ ہی نہیں، تدوین حدیث کی تاریخ اور کتب حدیث پر نقد و تبصرہ نے اس کو اپنے موضوع پر بہترین مرجع و ماخذ بنا دیا، مولانا کے قلم سے ایک اور اہم کتاب ''مولانا ابوالکلام آزاد۔ مذہبی افکار، صحافت اور قومی جدوجہد'' کے نام سے نکلی، مولانا آزاد سے ان کو غیر معمولی عقیدت تھی اور یہ اس وقت سے تھی جب وہ مکتب میں زیر تعلیم تھے، مولانا آزاد سے عقیدت و شیفتگی کا معاملہ خود مرحوم کی زبان میں ''کچھ اور ہی تھا'' ہمہ شہر پر زخوباں منم و خیال ماہے۔ چہ کنم نگاہ کج بیں نہ کند بہ کس نگاہے یہ کتاب اسی عقیدت کا نتیجہ ہے لیکن اس کی تالیف میں یہ جذبہ بھی پنہاں تھا کہ مولانا آزاد کا جو تعلق علامہ شبلی، سید صاحب، مولانا عبدالسلام ندوی اور دارالمصنفین سے رہا، اس کا تقاضا تھا کہ اس تعلق کا حق یہاں ادا کیا جائے، شاہ صاحب نے معارف کا ایک خاص نمبر نکالنے کا قصد بھی کیا تھا جو کسی وجہ سے پورا نہ ہو سکا، مولانا اصلاحی مرحوم نے اس کتاب کے ذریعہ اس قرض کو ادا کر کے اپنے پیش رو اکابر کی روح کو شاداں کرنے کی سعی کی، مولانا کی تالیفات میں ''چند ارباب کمال''، ''انتخاب کلام اقبال سہیل'' اور ''مسلمانوں کی تعلیم'' بھی ہیں، آخر الذکر کتاب تو گذشتہ سال ہی شائع ہوئی تھی، ان کی ایک کتاب ''ایضاح القرآن'' پاکستان سے شائع ہوئی تھی، یہ ان کے قرآنی مقالات و مضامین کا مجموعہ ہے، ان کا خاص موضوع تاریخ حدیث و محدثین رہا لیکن اصل ذوق قرآنیات ہی کا تھا، مدرسۃ الاصلاح اور مولانا حمیدالدین فراہیؒ کے علوم سے تعلق اور اثر پذیری نے اس ذوق کو مستحکم کیا تھا، دارالمصنفین میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے بعد قرآنیات سے شغف میں غالباً وہ اور حضرات سے نمایاں ہیں، انہوں نے تفسیر کبیر اور امام رازی کے متعلق خاص طور سے بڑی مبسوط اور مدلل بحث کی، ان کا خیال یہ تھا کہ قدیم مفسرین کی خدمات کی عظمت کے باوجود ان کی تفسیروں پر کلی اعتماد اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں شاذ، غریب اور مرجوح اقوال اور بہ کثرت ضعیف و موضوع روایات بھی نقد و تبصرے کے بغیر ہی شامل کر لی گئی ہیں۔

مولانا کی ان تصنیفات کے علاوہ ان کی علمی خدمات کا اصل میدان رسالہ ''معارف'' رہا، ۱۹۵۵ء سے اس کے صفحات ان کی تحریروں سے مزین ہونا شروع ہوئے اور یہ نصف صدی پر محیط ہو گئے، مطبوعات جدیدہ کے ذریعہ انہوں نے بے شمار کتابوں پر تبصرہ کیا، ان کے تعزیتی مضامین بھی آتے رہے اور جب ۱۹۸۷ء میں سید صباح الدین عبدالرحمان مرحوم ایک حادثے میں اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے تو معارف کی ادارت ان کے سپرد ہوئی اور یہ ان کی کتاب زندگی کا سب سے درخشاں باب ہے کہ انہوں نے معارف کی ادارت اور شذرات لکھنے کی ذمہ داری غیر معمولی حسن و خوبی سے پوری کی اور معارف کے وقار و معیار کو قائم رکھا بلکہ اس میں اضافہ کیا، ملی اور ملکی اور علمی موضوعات پر ان کے شذرات نے سید صاحب، شاہ صاحب اور سید صباح الدین عبدالرحمان کی روایت کو زندگی ہی نہیں دی، اس کو نئی جلا بھی بخشی، اس کے لیے جس تصنیفی ذوق، مطالعہ کے شغف اور جگر کاوی کی ضرورت تھی، مولانا نے اس کا حق ادا کر دیا اور کہیں بھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ معیار و وقار میں کچھ فرق آیا ہے۔

معارف کی ادارت کے ساتھ انہوں نے دارالمصنفین کے عہدۂ نظامت کا بار بھی سنبھالا، وہ ۱۹۸۷ء سے تادم آخر اس عہدے پر فائز رہے، ان کو انتظامی معاملات سے زیادہ مس نہ تھا، اس ادارے کا نظم و نسق، مالی معاملات، حال و مستقبل کے اندیشے اور اداروں سے قطعی مختلف ہیں لیکن مولانا نے ان مراحل کو سکون اور تحمل سے پار کیا، مالی دشواریوں کا ذکر بھی کبھی کبھی وہ شذرات کے ذریعہ کرتے لیکن انہوں نے کبھی ادارے کی خودداری اور عزت نفس کا سودا نہیں کیا، پرانی کتابوں کی طباعت و اشاعت، تصحیح، حوالوں کی تحقیق مزید میں انہوں نے جس طرح اپنے آرام کو تج دیا، صحت کی پرواہ نہیں کی، اس کا بیان الفاظ میں ناممکن ہی ہے۔

کیا حوصلہ اور کیا ولولہ تھا کہ شبلی و سلیمان کی نسبت سے سمینار ہوں، علوم اسلامیہ پر لکچر ہوں، کتابوں پر مقدمے لکھنے ہوں، تقریظیں ہوں، تمام مصروفیات کے باوجود ان کا وقت سب کے لیے تھا، ان کی شرکت سے علمی مجلسوں کی رونق بڑھ جاتی اور سمیناروں میں جان پڑ جاتی، پی ایچ ڈی کے بیسیوں مقالات میں ان کی معاونت کا اعتراف ان

کے مقالہ نگاروں نے کیا اور یہ ساری تگ و دو محض اپنے عظیم المرتبت پیش رو بزرگوں کی روایت کے قیام اور دارالمصنفین کے علمی استحکام کے لیے تھی، ان کے زیرنگرانی رابطہ ادب اسلامی کا اور علامہ شبلی سمینار دارالمصنفین میں شان سے منعقد ہوا، توسیعی خطبات کا سلسلہ بھی انہوں نے جاری رکھا، پروفیسر عبدالمغنی، پروفیسر ریاض الرحمان خاں شروانی وغیرہ کے خطبات ان کے دور میں ہوئے اور فروری میں اسی سلسلے میں انہوں نے پروفیسر عبدالحق سے فرمائش کی تھی، دارالمصنفین میں تعمیرات کا اضافہ بھی ان کے دور میں ہوا، ان کاموں کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ حالات نامساعد اور دشوار تھے، ایسے میں نشاط اور تازگی کی گنجائش کم تھی، تاہم ربط و ارتباط، خط و کتابت اور گفت و شنید میں انہوں نے کبھی تھکن یا مایوسی کا اظہار نہیں ہونے دیا۔

ان کی قوت عمل کا ایک مظہر مدرسۃ الاصلاح سے گہرا تعلق بھی ہے، ۱۹۹۶ء میں اس مدرسہ کے ناظم ہوئے، اس کی تعلیم و تنظیم سے ان کو بڑی دلچسپی تھی، باقاعدگی سے وہاں کی میٹنگوں میں شریک ہوتے، ان کی نظامت کے عمدہ نتائج بھی سامنے آئے، اس کے علاوہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، دارالعلوم تاج المساجد بھوپال اور جامعۃ الفلاح کی مجالس انتظامیہ کے وہ رکن رکین اور مسلم یونیورسٹی کی کورٹ کے ممبر تھے، پابندی سے ان کے انتظامی جلسوں میں شریک ہوتے، یوپی اردو اکادمی، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد، مجلس تحقیقات و نشریات اسلامی لکھنؤ کے بھی رکن منتخب ہوئے، آکاش وانی گورکھ پور کی ایڈوائزر کمیٹی کے ممبر ہوئے، ان کے علم، عمل اور اخلاص کی قدر کی گئی، اردو اکادمی، میرا کادمی، نے ان کو انعامات سے نوازا اور ۱۹۹۵ء میں صدر جمہوریہ ہند نے ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں سند اعزاز سے سرفراز کیا۔

اعزازات اور بلند عہدوں کے باوجود فروتنی، انکسار اور تواضع کی مثال تھے، ان کی شخصیت سادگی اور بے ساختگی، دل نوازی اور ملن ساری کے عناصر سے مرکب تھی، اپنوں اور بیگانوں سے وضع داری تھی، بیس سال ناظم رہنے کے باوجود دارالمصنفین کے کسی کارکن اور ملازم کو ان کی زبان سے کسی سخت کلام یا انداز کی شکایت نہیں ہوئی، معمولی ملازم سے بھی بہت نرمی سے بات کرتے، صبر و تحمل کی خوبی ان کی بڑی صفت تھی، ان خوبیوں نے ان کی شخصیت کو ایک عجب کشش اور محبوبیت عطا کردی تھی، ذاتی زندگی میں انہوں نے کئی بڑے صدموں کو جس صبر و رضا سے برداشت کیا وہ ان کے راضی بہ رضا ہونے کی شہادت ہے، صوم و صلاۃ کے پابند تھے، خاص طور پر تلاوت قرآن پاک میں ہم نے ان کو سب سے زیادہ مشغول پایا، سفر حج کی سعادت پہلے ہی حاصل ہوچکی تھی لیکن اس سال انہوں نے اپنی استطاعت سے اہلیہ محترمہ کے ساتھ حج کیا، تین جنوری کو وہ اس مبارک سفر سے واپس تشریف لائے اور ابھی پورا ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا کہ یکم جنوری کو جس کے گھر کی مہمانی سے سرفراز ہوئے تھے اسی کے حضور اس طرح حاضر ہوئے کہ سرخ روہی نہیں سارا جسم شہید راہ وفا کی طرح لہولہان تھا، زبان حال سے کہہ رہے تھے کہ،

بڑی آرزو تھی گلی کی تری
سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے

زخموں سے چور تھے، سر، سینہ خوں فشاں تھا، ایسے عالم میں بھی ان کے ہونٹوں سے جو لفظ نکلا وہ ان کے خالق حقیقی کا اسم اعظم تھا ''اللہ۔اللہ'' ہی لب پر تھا، یہ اپنے مالک حقیقی سے قربت و استجابت کا اقرار تھا، **الذین استجابوا للّٰہ والرسول من بعد ما اصابھم القرح** [آل عمران:۱۷۲]، حسن خاتمہ ہر مسلمان کی تمنا ہے، جس اللہ نے ان کے لیے دنیا میں اعزاز مقدر فرمائے اسی نے شہادت کا سب سے بڑا اعزاز بھی ان کو عطا فرمایا، وہ شہادت کے درجہ بلند پر فائز ہوئے، جس کا صلہ ہی تب و تاب جاودانہ ہے۔

ان کے پس ماندگان میں ان کے برادر اور اکبر مولانا قمرالدین اصلاحی اور چھوٹے بھائی جناب امام الدین و جناب نجم الدین ہیں، تین بیٹیاں اور تین بیٹے محمد عامر، محمد طارق اور سلیم جاوید ہیں اور سب ماشاء اللہ صاحب اولاد ہیں، اہلیہ اب روبہ صحت ہیں، کامل شفا اور صحت اور صبر جمیل کے لیے قارئین سے دعاؤں کی درخواست ہے اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندے اور دارالمصنفین کے بےلوث خدمت گزار کو اپنی رحمتوں کے سایے میں لے کر عفو و مغفرت کی تمام نوازشوں سے نوازے، ان کی تربت کو ٹھنڈا رکھے، کاروان شبلی کے اس مسافر کو سکون و راحت کی منزل سے ہم کنار کرے، اللھم اغفرلہ وارحمہ۔ (''ع۔ص''، مارچ ۲۰۰۸ء)

خان، افغان اللہ، پروفیسر

پروفیسر افغان اللہ

یہ خبر افسوس ناک ہے کہ اردو کے ایک اور خدمت گزار پروفیسر افغان اللہ خاں صاحب نے بھی اچانک آخرت کا رخت سفر باندھ لیا، ایک سمینار میں شرکت کے لیے انہوں نے دہلی کا سفر کیا تھا لیکن کیا خبر تھی کہ یہ اس دنیا کے آخری سفر کی تیاری تھی، سمینار کے پہلے روز وہ پورے نشاط کے ساتھ مختلف نشستوں میں شریک رہے، دوسرے روز دل میں درد اٹھا جس نے دنیا کے ہر دکھ سے ان کو نجات دے دی، وہ گورکھ پور یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر تھے، سکونت بھی اسی شہر میں تھی لیکن رہنے والے اصلاً وہ اعظم گڑھ کے ایک گاؤں خالص پور کے تھے شروع سے ذہین تھے، فراق گورکھ پوری پر جناب محمود الٰہی کے زیرنگرانی پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی اور اس شان سے کہ موضوع پر یہ مقالہ خود سند بن گیا، کئی کتابیں سپرد قلم کیں، تاریخ ہند سے متعلق طراز ظہیری ان کی

آخری تالیف تھی، باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے، دارالمصنفین سے رشتہ اخلاص تھا، آخری بار وہ علامہ شبلی سمینار میں شرکت کی غرض سے یہاں آئے تھے، اتفاق ہے کہ مارچ کے معارف میں ان کا مضمون شائع ہوا، وہ ایک ہمدرد استاد، ہمدرد دوست اور ہمدرد انسان تھے، یوپی اردو اکیڈمی بھی ان کی سرگرمیوں کا مرکز تھی، گوشہ نشین اردو کے خادموں کی خدمت انہوں نے بے غرض ہو کر کی، صرف ۵۷ سال کی عمر میں ان کا اس طرح رخصت ہو جانا اردو کے لیے ہی نہیں، انسانیت اور شرافت کی دنیا کے لیے ایک بڑا حادثہ اور خسارہ ہے، خدا مغفرت فرمائے، آمین۔ (''ع۔ص''، اپریل ۲۰۰۸ء)

کشمیری، انظر شاہ، مولانا

جناب مولانا انظر شاہ کشمیریؒ

افسوس کہ مولانا انظر شاہ کشمیری قریب بیاسی سال کی عمر میں ۲۶/اپریل ۲۰۰۸ء کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے، اناللہ وانا الیہ راجعون، دارالمصنفین میں یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی گئی اور یہ احساس عام رہا کہ ملت علوم اسلامیہ کے ایک نامور ترجمان اور دارالعلوم دیوبند کی عظمت کے نشان اور سلف صالحین کی روایتوں کے پاسبان سے محروم ہوگئی۔

وہ دین و دانش کی دنیا کے مہر انور، مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ کے فرزند اصغر تھے، مولانا سید سلیمان ندوی نے شاہ کشمیریؒ کی وفات پر لکھا تھا کہ ''چین سے لے کر روم تک ان کے فیضان کا سیلاب موجیں لیتا رہا''، شاہ کشمیریؒ کے اوصاف میں کہا گیا کہ وہ معلومات کے دریا، حافظہ کے بادشاہ اور وسعت علمی کی نادر مثال تھے، الولد سر لابیہ اگر حق ہے تو مولانا انظر شاہ کشمیری کے بارے میں بھی ان ہی خوبیوں کا اعادہ کیا جاسکتا ہے، انہوں نے مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا اعزاز علی اور مولانا ابراہیم بلیاوی جیسے ارباب علم و فضل سے اکتساب فیض کیا، خانہ انور اور دارالعلوم دیوبند کے خمیر سے جس شخصیت کی تشکیل کی توقع کی جاسکتی ہے وہ ان کی شکل میں پوری ہوئی، قریب نصف صدی تک حدیث شریف کے درس و تدریس کی مبارک خدمت ان کے نصیب میں آئی اور بڑی بات یہ ہے کہ قلم سے بھی ان کا رشتہ استوار رہا، ان کی کتابوں میں ''فیض البخاری'' اور ''تراجم الابواب'' کے نام ملتے ہیں، اس کے علاوہ ان کی قلمی میراث میں ''تفسیر ابن کثیر، مدارک، جلالین'' وغیرہ کے ترجمے بھی ہیں، ان کے ذہن و فکر اور مطالعہ کی وسعت اور تنوع کا اندازہ اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ درس و تدریس، تصنیف و تالیف، دعوت و تبلیغ، خطابت و صحافت، سیاست ہر میدان میں نقوش انظر کا جلوہ ہر نظر میں رہا، اردو زبان و ادب میں بھی وہ علمائے دیوبند میں صاحب امتیاز تھے، ''نقش دوام''، ''تذکرۃ الاعزاز'' اور ''لالہ وگل'' ان کی شستہ و شگفتہ زبان کا نمونہ ہیں۔ ان کی تقریروں کے دو مجموعوں کا نام ''گل افشانی گفتار'' اور ''فروغ سحر'' ہے، ناموں کا یہ انتخاب ان کے طبعی ادبی ذوق کی دلیل ہے، کسی نے لکھا ہے کہ وہ علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی تحریر کے عاشق تھے، میں نے ان کی زیارت کی سعادت دہلی کے مولانا عبدالماجد دریابادی سمینار میں حاصل کی، افتتاحی تقریب میں وہ تشریف لائے تھے، ان کی برجستہ تقریر سے سامعین پر سحر کی سی کیفیت تھی، ان کی یہ تقریر انشائے ماجد کی دل کشی، لطافت اور لذت سے کسی طرح کم نہیں تھی، اس کا کیف و سرور اب تک باقی ہے اور شاید ہر سننے والے کی بھی یہی کیفیت ہو، انہوں نے عمر طبعی پائی، زندگی کی امانت کی قدر کی، ایسی جامع کمالات ہستی کے رخصت ہونے پر حرمان و خسران کا احساس اور بڑھ جاتا ہے، رحمہ اللہ رحمتہ واسعہ۔ (''ع۔ص''، جون ۲۰۰۸ء)

عبدالغنی، محتشم

جناب محتشم عبدالغنی مرحوم

جناب محتشم عبدالغنی مرحوم کا تعلق سرزمین بھٹکل سے ہے، ہندوستان کے مغربی ساحل پر بحر عرب کی موجوں کی بے تابی، نمی، خنکی، گہرائی اور گیرائی کے ہمہ وقت نظارے میں محو، بھٹکل کی یہ ساحلی زمین، مردم خیز رہی ہے، جناب محتشم عبدالغنی بھی اپنی دینی، تعلیمی اور سماجی خدمات کی وجہ سے بھٹکل کے قابل فخر فرزند تھے، نام و نمود سے دور رہنے اور خموشی کو ترجیح دینے اور تجارت میں مصروف رہنے کے باوجود ان کی ملت کے لیے دل سوزی اور مقاصد کے مطلوب سرمستی و رعنائی نے ان کو بڑی مقبولیت عطا کی تھی، دارالعلوم ندوۃ العلما کی مجلس انتظامیہ اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے وہ رکن اساسی تھے، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی کورٹ کے معزز ممبر بھی تھے، قوم و ملت کے اداروں کے لیے فکر مند اور عملاً ان کی بہبود و ترقی کے لیے کوشاں رہے لیکن ان کی جدوجہد، ایثار و قربانی کا سب سے حسین مرقع بھٹکل بلکہ گوا سے کیرلا تک پورا مغربی ساحل ہے، دینی، اخلاقی، تعلیمی، تجارتی اور سیاسی لحاظ سے یہ پورا خطہ دوسروں کے لیے قابل تقلید ہے، وہاں کے مسلمانوں کی اس بیداری میں بے شبہ محتشم عبدالغنی مرحوم کی خدمات سب سے نمایاں ہیں، بھٹکل میں ان کو قائد قوم کہا جاتا تھا، حق یہ ہے کہ ان کی قیادت کی ضرورت پوری ملت اسلامیہ ہندیہ کو تھی۔

راقم الحروف کو ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا، جسمانی لحاظ سے وہ قد آور اور وجیہ و شکیل تھے، دل بھی اتنا ہی پاک اور شفاف تھا، گفتگو کی دل کشی ان کے لہجے کی معصومیت سے اور سوا ہو جاتی تھی، وہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بڑے عقیدت مند تھے اور اسی عقیدت کی وجہ سے دارالعلوم ندوۃ العلما سے جذباتی تعلق تھا، دارالمصنفین کے بھی بڑے قدرداں تھے، یہاں کے احوال و مسائل سنتے تو تڑپ اٹھتے

اور اب اس کے استحکام کے لیے فکر مند تھے، یہاں آنے کی خواہش بھی ظاہر کی، افسوس کہ یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور انہوں نے آخری رخت سفر باندھ لیا، ۲۷/ مارچ کو عمر مستعار کے قریب ۷۳ سال اس دنیائے فانی میں گزار کر وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے، اللہ تعالیٰ جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔ (''ع۔ص''، جون ۲۰۰۸ء)

کلوروی، صابر، ڈاکٹر

ڈاکٹر صابر کلوروی مرحوم

شبلی ڈگری کالج اعظم گڑھ کے علامہ شبلی سمینار میں پاکستان کا ایک وفد جناب ریاض مجید کی قیادت میں آیا تھا، ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر اور محترمہ رابعہ سرفراز کے ساتھ ایک شخصیت ڈاکٹر صابر کلوروی کی تھی، متین، کم سخن لیکن کشش کے مالک، شبلی کی تنقید نگاری کے عنوان سے ان کے مقالے نے بڑی داد حاصل کی۔

دو دن کے مختصر قیام کے بعد جب وہ اور ان کے رفقا رخصت ہوئے تو رخصت کرنے والوں نے کہا کہ سرحد پار سے آنے والے اس دستۂ علم نے ایک بار پھر دلوں کو فتح کرلیا، علامہ شبلی اور ان کی یادگاروں خصوصاً دارالمصنفین سے ان کی غیر معمولی محبت کسی عقیدت مند زائر کے جوش وشوق کی عکاس تھی، وہ بادیدۂ نم رخصت ہوئے تھے اور کسے خبر تھی کہ اتنی جلد وہ اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوکر بے شمار پلکوں کو نم کر جائیں گے، ان کے انتقال کی خبر موقر رسالہ ''اخبار اردو'' اسلام آباد سے ملی، ۳۱/ اگست ۱۹۵۰ء سے شروع ہوکر ۲۲/ مارچ ۲۰۰۸ء کو ختم ہونے والا یہ سفر مختصر ہی کیا جائے گا لیکن کلوروی مرحوم نے اپنی صفت ولیاقت سے اس قلیل مدت کو پرثروت بنادیا، اقبالیات ان کی ادبی کاوشوں کا سرعنوان ہے، ''یاد اقبال، داستان اقبال، اشاریہ مکاتیب اقبال، اقبال کے ہم نشین، تاریخ تصوف''، کتابوں کے علاوہ ان کا اصل کارنامہ ان کی تھیسس ''باقیات شعر اقبال'' ہے ڈاکٹر عطش درانی اور دوسرے اہل قلم کی تحریروں سے اردو لسانیات میں ان کی منفرد اور امتیازی خوبیوں کا علم ہوا، مشفق خواجہ نے ان کو غریق تحقیق کہا تھا، اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے، معارف، پشاور یونیورسٹی میں ان کے کسی رفیق یا شاگرد سے ان کے متعلق ایک مفصل مضمون کی توقع کرسکتا ہے۔

(''ع۔ص''، جون ۲۰۰۸ء)

اقبال، افضل الدین، پروفیسر / بنات والا، غلام محمود

پروفیسر افضل الدین اقبال / غلام محمود بنات والا

افسوس ہے کہ گزشتہ دنوں ہماری علمی و ادبی اور سیاسی دنیا کا خلا کچھ اور بڑھا، حیدرآباد کے پروفیسر افضل الدین اقبال ۱۵/ مئی کو اس دنیا سے رخصت ہوئے، عثمانیہ یونیورسٹی کے صدر شعبہ اردو اور اس سے زیادہ دکنی ادب کے ماہر کی حیثیت سے ان کی شہرت تھی، جنوبی ہند کی صحافت، مدراس میں اردو ادب کی نشوونما، فورٹ سینٹ جارج کالج اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے علمی ادارے ان کی اہم کتابیں تھیں، دوسری اہم شخصیت غلام محمود بنات والا کی ہے، وہ پارلیمنٹ کے ممتاز اور پرانے ممبر تھے، ہندوستان میں مسلم لیگ کا نام زندہ رکھا اور اپنے کردار سے غیروں سے بھی عزت حاصل کی، ملت اسلامیہ ہندیہ کے مسائل پر بےباکی اور نہایت حکمت اور دانائی سے اظہار خیال کرتے، اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ مغفرت کا معاملہ فرمائے۔ (''ع۔ص''، جولائی ۲۰۰۸ء)

ندوی، سید محمد اجتباء، مولانا پروفیسر

آہ! مولانا پروفیسر سید محمد اجتباء ندوی مرحوم

افسوس کہ گذشتہ ماہ ہندوستان کی ملت اسلامیہ، ایک اور نمایاں اور قابل قدر ہستی کی خدمات سے محروم ہوگئی، خبر آئی کہ مشہور عالم، عربی اور اردو کے ممتاز صاحب قلم مولانا پروفیسر سید محمد اجتباء ندوی نے ۲۰/ جون کو دہلی میں داعی اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مرحوم ہمارے علما کے اس طبقے سے تھے جن کی تعلیم وتربیت خالص دینی بنیادوں پر استوار ہوئی لیکن جن کے فیضان نظر سے عصری تعلیم کے ادارے بھی بہرہ ور ہوئے اور جنہوں نے اپنے علم وعمل سے جدید دانش گاہوں میں صرف دینی اداروں کی عظمت وتوقیر میں ہی اضافہ نہیں کیا بلکہ اس مذہبی حمیت وغیرت اور خالص دینی تشخص کی پاسداری، بڑی استواری سے کی جس کا اولین سبق انہوں نے اپنے والد ماجد مولانا سید محمد مصطفی سے حاصل کیا تھا، ان کے والد ضلع بستی میں حضرت سید احمد شہیدؒ کی دعوت اور طرز تربیت میں اپنے جد امجد سید جعفر علی نقوی کے جانشین تھے جن کو امام شہیدؒ کی قربت ومعیت حاصل تھی، حضرت سید احمد شہیدؒ سے تعلق کا مبارک اثر ان کے پورے خاندان پر رہا، جس کی وجہ سے والدین نے بچپن ہی سے اسلامی واخلاقی کہانیاں سنا کر اور خود اپنے عمل سے ایسی ذہن سازی کی کہ آئندہ زندگی میں وہ جہاں بھی رہے، راہ حق وجادۂ اعتدال سے ذرا منحرف نہیں ہوئے، دارالعلوم ندوۃ العلما کے بعد انہوں نے دمشق یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے سندیں حاصل کیں اور طالب علمی کے بعد معلّمی کا دور جامعہ ملیہ اسلامیہ، کشمیر یونیورسٹی اور الہ آباد یونیورسٹی میں پورا کیا، پروفیسر ہوئے، صدر شعبہ ہوئے، اس کے علاوہ درمیان میں کچھ وقفہ مدینہ منورہ، ریاض وجدہ میں بھی گزارا، روایت اور جدیدیت کی عام کشمکش سے دوچار ہوئے لیکن وہ ہر حال میں ان ہی اقدار کے امین ومحافظ رہے جو ان کو پہلے گھر اور پھر دارالعلوم ندوۃ العلما سے حاصل ہوئی تھیں، دارالعلوم میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے ان کے تعلق میں

خاندانی پس منظر کے ساتھ خود حضرت مولانا کی غیر معمولی توجہ وشفقت ان کی داستان حیات کا سب سے روشن باب ہے حضرت مولانا ندویؒ پر ان کی عربی کتاب دارالقلم دمشق سے شائع ہوئی اور یہ مرشد ومسترشد کے رشتہ عقیدت کی بہترین ترجمان ہے، مصروف ترین تدریسی زندگی کے باوجود انہوں نے تصنیف وتالیف سے رشتہ ہمیشہ قائم رکھا۔ان کی کتابوں کی فہرست میں حضرت شاہ ولی اللہ کے علمی کارنامے،نواب صدیق حسن خاں علمی وادبی کارنامے،تاریخ فکر اسلامی،عورت اسلام کی نظر میں،حقوق انسانی اسلامی شریعت میں،جدید عربی شاعری،جدید معاصر،شامی ادب،التعبیر والمحادثۃ العربیہ اورنقوش تابندہ ان کے قلم کی روانی اوران کے ذہن وفکر کی جولانی کی شاہد ہیں،نقوش تابندہ میں انہوں نے انتساب ''ان تمام اسلام پسند حضرات،خواتین اور مراکز کے نام کیا جو دنیا کو ازسرنو اسلام کے زیر سایہ سکھ چین عطا کئے جانے کے لیے کوشاں ہیں'' اس انتساب میں ان کے دل کا تمام افسانہ سمٹ آیا،وہ اسلام کی سربلندی کے آرزومند اوراس کے لیے ہر جگہ کوشاں رہے۔

گذشتہ سال ماہ جون میں خوش قسمتی سے ان کے ساتھ بھٹکل میں ہفتہ عشرہ گزارنے کا موقع ملا اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی شخصیت کو دیکھنے،سمجھنے اور ان سے استفادے کی یہ فرصت بڑی بیش قیمت رہی،ان کے علم پر یقین تھا کہ وہ استاذ الاساتذہ تھے لیکن ان کے فضل پر دل سے ایمان وہیں نصیب ہوا،انکسار،فروتنی،سادگی،مروت، تحمل اور خوردنوازی کا ہر نقش کامل سے کامل تر نظر آیا،زندہ دلی اور بلند پایہ حس مزاح نے قدم قدم پر ان کے اخلاق کی بلندی وپاکیزگی کے نقوش ثبت کردیئے،انہوں نے بھٹکل کے اس سفر اور قیام کی روداد ''تعمیر حیات'' میں جس بے ساختگی سے لکھی وہ ان کے قلم کی جادو بیانی ہوگئی،قلم کے ساتھ ان کی خطابت بھی کم نہ تھی،سادہ،بے تکلف اور دل سے نکلی ہوئی بات،سیدھے سامعین کے دلوں تک جاپہنچتی،وہ ندوۃ العلما کی مجلس شوریٰ،جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ عربی کی مجلس تعلیمی اور رابطہ ادب اسلامی کے معزز رکن تھے،صدر جمہوریہ ہند نے ان کی عربی خدمات کے اعتراف میں صدارتی ایوارڈ سے نوازا تھا،حق یہ ہے کہ وہ ان اعزازات سے بھی بلند تر تھے،دارالمصنفین اور رسالہ ''معارف'' سے قلبی تعلق تھا،ان کے کئی مضامین رسالہ ''معارف'' کے صفحات کی زینت بنے،''عربی زبان کے ارتقا میں حدیث نبویؐ کا ارتقا'' اپنے موضوع پر بہترین مضمون تھا،ایسا ہی ایک مضمون ''ہندوستان میں عربی ادبیات'' کے عنوان سے تین قسطوں میں شائع ہوا،اپنے موضوع پر حددرجہ جامع مضمون اس لائق ہے کہ اس کو کتابی شکل میں شائع کیا جائے ان کی وفات سے جو علمی نقصان ہوا ہے دارالمصنفین اور معارف کو بھی اس کا احساس ہے،یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک سرشت بندے کی نیکیوں کو قبول فرما کر آخرت میں ان کے درجات بلند فرمائے گا،اس دنیا میں بہرحال ان کے قدرشناس مدتوں رویا کریں گے۔

فخلوا کلامی ان الح بی البکا
فان فراق الصالحین عسیر

(''ع۔ص''، جولائی ۲۰۰۸ء)

جم خانہ والا،محمد اسحاق،ڈاکٹر

آہ! ڈاکٹر محمد اسحاق جم خانہ والا مرحوم

انجمن اسلام ممبئی کے صدر ڈاکٹر محمد اسحاق جم خانہ والا عین شعبان ورمضان کے قرآن کے سایے میں اپنے رب کی رحمتوں سے جاملے،اناللہ وانا الیہ راجعون۔

ہندوستان میں جن چند اداروں کو مسلمانوں نے اپنے زوروزر سے قائم کیا اور جنہوں نے ترقی اور کامیابی کے سفر میں مسلسل نئی منزلیں طے کیں ان میں ایک نہایت نمایاں نام ممبئی کی انجمن اسلام کا ہے،قریباً یہی بات ڈاکٹر محمد اسحاق جم خانہ والا کے متعلق بھی صادق آتی ہے،جن کی کتاب زندگی کے بعض ابواب کی سرخیاں طب اور سیاست سے روشن ہیں،خلق خدا کی خدمت میں انہوں نے ایک حاذق اور شفیق معالج کی حیثیت سے شہرت پائی،سیاست میں بھی ایک حازم اور خلیق وزیر کی شکل میں ان کی شناخت ہوئی لیکن ان کی اصل خدمت،تعلیم کے میدان میں ممبئی ہی نہیں پورے مہاراشٹر کے مسلمانوں کے سامنے انجمن اسلام کی کارکردگی کو کارنامے میں بدلنا ہے۔

انجمن اسلام جب ۱۸۷۴ء میں قائم ہوئی تھی تو اس کے بانیوں خصوصاً اس کے پہلے صدر بدرالدین طیب جی کے سامنے یہ اذیت ناک سچائی تھی کہ ممبئی اور پونا کے اعلا تعلیمی اداروں اور مہاراشٹر کے ہائی اسکولوں میں مسلمانوں کی تعداد صفر کے برابر تھی، ۱۸۸۰ء میں ممبئی یونیورسٹی کے میٹرک میں پاس ہونے والے طلبہ کی تعداد ۱۵,۲۴۷ تھی جن میں مسلمان صرف ۴۸ تھے،انجمن اسلام کے قیام نے اس صورت حال کو کتنا بدلا، یہاں اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں لیکن اس کی قریب سو سال کی تاریخ میں بدرالدین طیب جی کے بعد متعدد نامور ہستیوں نے اس کی ذمہ داری لی،ان سب میں نسبتاً سب سے کم عمر ڈاکٹر محمد اسحاق مرحوم جب ۱۹۸۳ء میں اس انجمن میں آئے تو واقعی وہ شمع انجمن ثابت ہوئے،میڈیکل پریکٹس کو خیرباد کہہ کر،ان کے جوش عمل اور ولولہ وحوصلہ نے بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں انہوں نے دو یتیم خانوں،ایک کالج ایک پالی ٹیکنیک اور اٹھارہ ابتدائی اور ثانوی اسکولوں کی میراث کو قریب سو اداروں تک پھیلا دیا جن سے ایک لاکھ سے زائد طلبہ فیض یاب ہیں،یونانی میڈیکل کالج،کالج آف مینجمنٹ،انجینئرنگ،پالی ٹیکنیک وغیرہ جدید تکنیکی علوم کے یہ سرچشمے ان مسلمان طلبہ کے لیے سیرابی کا اہم ذریعہ بن گئے جن کی پیاس کے لیے تاحد نظر سراب تھے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کے جذبے،محنت اور سب سے بڑھ کر ان کے سوز دروں

نے ان کو سرسید ثانی کا لقب دیا اور یہ شاید اس لیے بے جا بھی نہیں کہ تعلیم کے ساتھ تہذیب وثقافت اور اخلاق و مذہب کی عظمت کا احساس بھی ہمیشہ رہا، اسی لیے انجمن اسلام کی نئی شکل میں تعلیمی رنگ ہی نہیں ثقافتی، سماجی اور سب سے بڑھ کر دین کا رنگ شامل رہا اور اس سے خوب صورت کون رنگ ہوسکتا ہے، تعلیم وتعمیر پر یکساں نظر رکھنے کی صلاحیت نے صرف جدید پروفیشنل کورسز تک تنگ و دومحدود نہیں رکھی، انہوں نے انجمن کے اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو بھی نئی توانائی عطا کی، اردو مراٹھی اشتراک کی عصری اہمیت کو بھی انہوں نے اہمیت دی اور سب سے قابل ذکر یہ کہ انجمن کے اس سلسلہ خطبات سیرت کو انہوں نے بڑی وسعت دی جس کا آغاز ۱۹۸۰ء میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے خطبے سے ہوا تھا، اس سلسلے کو ضیارالحسن فاروقی، نثار احمد فاروقی، شہاب الدین دسنوی، غلام احمد برہانی کالج وغیرہ کے خطبات نے سلسلہ زریں بنادیا، ان تقریبات میں جذب ومستی کی کیفیت، ڈاکٹر اسحاق مرحوم کی دین تھی اور یہ دولت ان کو ان کی فطرت سلیم سے حاصل ہوئی تھی، انہوں نے دین و مذہب کا ہمیشہ احترام کیا، مولانا عبدالعزیز بہاری سے تعلق اور مولانا شاہ وصی اللہ فتح پوری سے بیعت وارادت خود ان کی طلب صادق کی دلیل ہے۔

دارالمصنفین سے تعلق مخلصانہ اور والہانہ تھا، اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ انجمن کے قیام میں علامہ شبلیؒ کی ہم نوائی بدرالدین طیب جی کو حاصل تھی، علامہ شبلی ممبئ کے زمانہ قیام میں اس کے ماہانہ جلسوں میں شریک ہوتے اور تقریر بھی کرتے، انجمن اور دارالمصنفین کا یہ تعلق ہمیشہ قائم رہا، مولانا عبدالسلام ندویؒ پر جب ممبئ میں سمینار ہوا تو اس میں ڈاکٹر صاحب نے غیر معمولی دل چسپی لی، پورے سمینار میں وہ شریک رہے، المالطیفی ہال میں ان کی ہر ادا سے یہی ظاہر تھا کہ اس سمینار کی کامیابی گویا ان کی کامیابی تھی۔

وہ دارالمصنفین کے مسائل سے خوب واقف تھے اور مولانا ضیاء الدین مرحوم سے ان کی گفت وشنید اور خط وکتابت کا مرکزی موضوع اکثر یہی ہوتا، وہ دارالمصنفین آنے کے مشتاق تھے اور ایک بار تو جناب رضوان فاروقی کے ساتھ ان کا سفر بالکل طے تھا، ہم یہاں ان کے منتظر تھے کہ اچانک کسی، وجہ سے یہ سفر فسخ ہوا، ادھر کچھ عرصے سے ان کی ناسازی طبع کی خبریں ملتی تھیں، ان کے انتقال کی خبر اچانک ملی تو ان کی تصویر کے ساتھ ان کے پاک اعمال وعزائم بھی سامنے آگئے، ملت کو ایسے پاک نفس، بے غرض، باہمہ اور بے ہمہ رہنما کی کمی شدت سے محسوس ہوگی، اب ایسے صاحبِ جنوں کتنے ہیں جن کا ہر نقش پا، چراغ رہ گذر بن جاتا ہے۔

(''ع ۔ ص''، ستمبر ۲۰۰۸ء)

اویسی، صلاح الدین

جناب صلاح الدین اویسی مرحوم

جناب غلام محمود بنات والا کی فرقت کا صدمہ ابھی کم نہ ہوا تھا کہ مجلس اتحاد المسلمین کے قائد، فرزند دکن اور سالار ملت، سلطان صلاح الدین اویسی بھی اس دنیا سے رخصت ہوگئے، امت ایک اور ہوش مند، جرأت مند اور حوصلہ مند راہبر سے محروم ہوگئی، وہ عرصے سے صاحب فراش تھے، عمر مستعار کم نہ تھی، وقت موعود آیا اور رمضان المبارک کے نہایت مبارک اور آخری عشرے میں یعنی ۲۸/ رمضان کو وہ اپنے مالک حقیقی کی رحمتوں سے جاملے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

قریب ساٹھ ستر سال پہلے جب مجلس اتحادالمسلمین کے بانی نواب بہادر یار جنگ کا ۱۹۴۴ء میں انتقال ہوا تھا تو اس وقت مولانا سید سلیمان ندوی نے معارف میں ان کا ماتم کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''ان کا سا آدمی صدیوں میں پیدا ہوتا ہے اور جب پیدا ہوتا ہے تو انقلاب انگیز ہوتا ہے، ان کی ذات سے امت اسلامیہ کو بڑی بڑی امیدیں قائم تھیں اور خصوصیت کے ساتھ دکن کے مسلمانوں کے حق میں ان کا وجود آب حیات کا حکم رکھتا تھا''۔

۱۹۴۴ء اور ۲۰۰۸ء کا زمانی فرق، تغیرات احوال کے لحاظ سے زمین آسمان کا فرق ہے لیکن صلاح الدین اویسی مرحوم کی ہستی کے لیے ان الفاظ کی حقیقت میں ذرا فرق نہیں۔

سلطنت آصفیہ اسلامیہ میں مجلس اتحادالمسلمین کا قیام، قومی تخیل اور سیاسی جذبوں کو نئی زندگی دینے کے ساتھ مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشرتی ترقی کے لیے ہوا تھا، نصب العین تو ''وسیع تر، عظیم تر، بیرونی و اندرونی مداخلتوں سے پاک اور کامل آزاد حیدرآباد تھا'' اس وقت اس مجلس کے حوصلوں کو دیکھ کر کہا گیا تھا کہ دکن کے مسلمانوں نے صدیوں کے آرام کے بعد کروٹ لی ہے لیکن چند برسوں کے بعد تد اول ایام کی ایک اور تفسیر سامنے آئی، نہ سلطنت رہی نہ آصفی شان وشوکت، مسلم کی روایتی سادگی اور اوروں کی عیاری نے ساری بساط ہی پلٹ دی، سلطنت آصفیہ کی تباہی، زوال بغداد اور خلافت اسلامیہ کے سقوط سے کم تکلیف دہ نہیں تھی، احساس شکست وریخت نے قدرتاً سب سے زیادہ وہاں کے مسلمانوں کو ناتواں اور حیران وسرگرداں کیا مجلس بھی درہم برہم ہوئی، اس کے قائدین یا تو زندانی ہوئے یا پاکستانی، ایسے میں پاک نفس مولوی عبدالواحد اویسی ایڈوکیٹ نے جماعت کی جمعیت خاطر کی ہمت کی، شیرازہ بندی کی اس کوشش میں وہ پابند سلاسل ہوئے لیکن مجلس نے اپنے کردار کا احساس دلانا شروع کردیا، ۶۲ء میں عبدالواحد اویسی کے صاحبزادے صلاح الدین اویسی ریاستی اسمبلی

کے رکن منتخب ہوئے اور ۱۹۷۵ء میں والد کے انتقال کے بعد مجلس کی باگ دوڑ بھی ان کے ہاتھوں میں آگئی، اس کے بعد حیدرآباد کی تاریخ گویا مجلس کی تاریخ بلکہ گرداب بلا کی داستان ہے، قلی قطب شاہ کے محبوب شہر کو ظالموں نے قرطبہ وغرناطہ کی طرح تاریخ زوال کے صفحات میں گم کردینا چاہا لیکن یہ اویسی مرحوم کی ہوش مند قیادت تھی جس نے فرخندہ بنیاد حیدرآباد کو برباد نہ ہونے دیا اور ارض دکن میں ہمت حوصلہ اور اجتماعیت کی قابل تقلید مثال پیش کردی، حیدرآباد ہی کے شاعر کے دل پر خدا جانے کیا گزری کہ اس نے اپنے چارہ گر سے پوچھ لیا کہ اس کی زنبیل میں نسخہ کیمیائے محبت اور علاج و مداوائے الفت بھی ہے، چارہ گر نے مخدوم کے سوال کا جواب سلطان کی شکل میں پیش کردیا، اویسی مرحوم متعدد بار اور شاید مسلسل پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوتے رہے، یہ ان کی انتظامی صلاحیت سے زیادہ ان کے کاموں کی مقبولیت اور ان پر جمہور کے اعتماد کا مظہر ہے، حیدرآباد میں فکری ومسلکی اختلافات کے باوجود، یہ ان کی حکمت وبصیرت تھی جس نے اختلاف کو افتراق میں نہیں بدلنے دیا، وہ جسمانی لحاظ سے قدآور تھے اور سیاسی فہم و بصیرت میں بھی وہ بلند قامت رہے، حیدرآباد کا دارالسلام ہو یا دلی کا دارالعلوم، کلمہ حق کے بے باکانہ اور مدلل اور منطقیانہ اظہار کے لیے ان کی تقریریں اور باتیں اپنوں کے علاوہ غیروں نے بھی قدر واحترام سے سنیں، حیدرآباد کے لیے وہ خاص تھے لیکن ملت کے ملکی مسائل میں وہ مسلم پرسنل لابورڈ اور دوسری کل ہند تنظیموں کے ساتھ بھی تھے اور درحقیقت ان کی ضرورت ملکی پیمانے ہی کی تھی لیکن حیدرآباد کی تعلیمی و معاشی منصوبہ سازیوں کے ذریعہ شاید وہ دوسرے علاقوں کی مسلم قیادت کو میدان عمل میں آنے کی تلقین پر زیادہ یقین رکھتے تھے، موجودہ انتہائی جاں گسل حالات میں ان کے نہ ہونے سے محرومی کا احساس اور سوا ہوگیا ہے لیکن انہوں نے مجلس کی قیادت کے لیے لائق جماعت تیار کردی جس سے توقع ہے کہ وہ اتحاد کی اسی روش پر قائم رہے گی، جس کے لیے بہادر یار جنگ سے اویسی مرحوم کوشاں رہے نصف صدی کی محنت اور اس کے اثر و ثمر کو باقی رکھنا بجائے خود بڑا دشوار مرحلہ ہے، ہماری زمین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ قیامت کی نفاق وافتراق انگیز ہے، قیادت کی ذراسی غفلت سے یہ نفاق برگ وبار لاسکتا ہے اور اب امت شاید اس کی متحمل نہ ہوسکے، اویسی مرحوم کا جنازہ جس شان سے اٹھا وہ عندالناس ان کی مقبولیت کی علامت ہے، اصل قبول تو اللہ کے نزدیک ہے جس کا ایک اشارہ رمضان کے مبارک مہینے کی مبارک ترین ساعتوں میں ان کا اپنے رب سے جاملنا ہے:

فبشره بمغفرة واجر كريم۔ [یٰسین:۱۱]

("ع۔ص"، اکتوبر ۲۰۰۸ء)

لکھنوی، منظور علی، الحاج

جناب الحاج منظور علی لکھنوی مرحوم

دارالمصنفین میں الحاج منظور علی لکھنوی کی رحلت کی خبر بڑے افسوس کے ساتھ سنی گئی، ۲۸؍رمضان المبارک کو وہ اپنے خالق حقیقی کے جوار رحمت میں پہنچ گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وہ زندگی میں پاکیزہ اطوار رہے، آخری وقت بھی اس پاکیزگی کی شہادت کے لیے قدرت نے مقرر کردیا، وہ سیاسی رہنما تھے اور نہ عالم و فاضل لیکن ان کی زندگی قطرے سے گہر ہونے کی کہانی ہے، کلکتہ کے ہوٹل بزنس سے تعلق تھا، ان کا رائل انڈین ہوٹل کلکتہ کے مشہور ترین ہوٹلوں میں ہے، تمول کی آغوش میں آنکھیں کھولیں، عام امیر زادوں کا رنگ ڈھنگ ہونا قدرتی تھا، ایک وقت تھا کہ قیمتی پتھروں اور بیش قیمت خوشبوؤں کو جمع کرنے کا شوق تھا لیکن فطرت کی سلامتی اور سرشت کی پاک طینتی نے ایک دن ان کی زندگی کا رخ بدل دیا، ثروت کو اللہ کی دی ہوئی نعمت سمجھنے اور برتنے کی توفیق، باندازۂ ہمت ملی اور زندگی قابل رشک ہوگئی، دارالعلوم ندوۃ العلما کی مجلس انتظامیہ، مسلم پرسنل لابورڈ، ملی کونسل، امارت شرعیہ جیسے باوقار اداروں کی رکنیت اور سب سے بڑھ کر حجاج کرام کی پیہم خدمت نے ان کو اپنے طبقہ میں امتیاز کا شرف بخشا اور اس سے زیادہ کلکتہ میں ان کی وہ رفاہی خدمات ہیں جن کا علم بہ جز اللہ اور ان کے انتہائی قریبی لوگوں کے اور کسی کو نہیں معلوم، کمال کے شخص تھے مولانا عبدالماجد دریا بادی کو کبھی نہیں دیکھا لیکن ان کی تحریروں کے ایسے شیدائی ہوئے کہ ان کی کتابوں کی خوبصورت ترین اور نہایت دیدہ زیب طباعت و اشاعت کے لیے بغیر کسی تاجرانہ فائدے کے، اپنے مال کا بے دریغ استعمال کیا، ادارہ انشائے ماجد اسی نیت سے قائم کیا جس نے خطبات ماجد سے مکتوبات ماجدی تک مولانا کی دسیوں کتابیں بڑے اہتمام سے شائع کیں، مولانا دریابادی کی آرزو خود ان کی زبانی سننے میں آتی تھی کہ کاش ان کی کتابیں بھی مولانا علی میاں اور مولانا مودودی کی کتابوں کی طرح خوبصورت طباعت سے آراستہ ہوں، ان کی یہ تمنا ان کے نادیدہ مخلص نے جس طرح پوری کی وہ ادب ماجدی کے پرستاروں کے لیے مخفی نہیں، دارالمصنفین کے وہ خود لائف ممبر تھے اور ان کی مساعی سے کلکتہ کے متعدد قدردان علم بھی لائف ممبر ہوئے، وہ کلکتہ میں ایک عرصے سے دارالمصنفین والوں کے میزبان تھے، سید صباح الدین عبدالرحمان مرحوم نے کئی بار شذرات میں ان کی غیر معمولی ضیافت کے ساتھ ان کی بھلمنساہت، تواضع، شیریں کلامی اور مہمان نوازی کی خوبیوں کا ذکر کیا، مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم نے بھی ہمیشہ ان کی ان صفات کا اظہار اپنے شذرات میں کیا، کلکتہ میں ان کے شاندار مکان کی

سب سے شاندار خوبی ان کا کتب خانہ تھا، ادب عالیہ پر مشتمل ان کا یہ ذخیرۂ کتب صرف حسن انتخاب ہی نہیں بہترین نگہداشت کا نمونہ ہے، بہ قول سید صباح الدین عبدالرحمان جیسے کتابوں کا لالہ زار اور مینا بازار سجا ہو، وہ میرے والد ماجد مرحوم کے محبوں اور مخلصوں میں تھے، والد مرحوم کے انتقال کے بعد انہوں نے ہم کو باپ جیسی شفقت دی، اس کی داستان بڑی دراز ہے، عبادت وللّٰہیت میں وہ جس مقام پر فائز تھے، اس کی تربیت میں کلکتہ کے مشہور عالم، مفسر اور حکیم جناب مولانا محمد زماں حسینی کی نگاہ کا فیض بھی شامل تھا، علم اور دین کی طلب اور تڑپ کا اندازہ اس وقت ہوتا جب وہ قاسمی دواخانے میں حکیم صاحب کی مجلس میں نیازمندانہ حاضر ہوتے، یہی تعلق بعد میں حکیم صاحب کے لائق و نامور فرزند حکیم عرفان الحسینی سے بھی قائم رہا، ایسے علم نواز، وضع دار اور امت کے درد کو اپنے سینے میں سموئے انسان کا رخصت ہونا واقعی اسلامی معاشرے کا بڑا خلا اور خسارہ ہے، ان کے پس ماندگان میں ان کے صاحبزادوں کے علاوہ ان کے بھائی جناب مقصود علی لکھنوی ہیں اور وہ بھی سخت علیل ہیں، ان کی صحت اور تمام پسماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا ہے اور مرحوم کے لیے بھی کہ اللہ تعالیٰ ان کے حسنات کو قبول فرما کر فردوس بریں میں ان کو اپنا قرب عطا کرے، آمین۔

(''ع۔ص''، اکتوبر ۲۰۰۸ء)

احمد، نذیر، پروفیسر ڈاکٹر

پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد

(اشتیاق احمد ظلی)

پروفیسر نذیر احمد کے انتقال سے علم و دانش کے میدان میں بالعموم اردو فارسی زبان و ادب کے میدان میں بالخصوص جو خلاء پیدا ہوا ہے اس کا پر ہونا مشکل ہے۔ ان کے علمی اکتسابات اور تحقیقی فتوحات کی فہرست بہت طویل ہے اور اسی طرح ان اعزازات کی بھی جو انہیں تفویض کیے گئے۔ ایران، افغانستان، وسط ایشیا اور جنوبی ایشیا کے علاوہ یورپ و امریکہ کے علمی حلقوں میں ان کے نام اور کام کا بڑا احترام اور اعتراف پایا جاتا تھا۔ ان کی علمی اور تحقیقی دلچسپیوں کا میدان بہت وسیع تھا اور علم و فن کے کتنے ہی تاریک گوشے ان کی فکری کاوشوں سے روشنی میں آئے لیکن تدوین و تحقیق متن اور فرہنگ نویسی ان کے خاص موضوعات تھے جہاں ان کا علم و فن نئی بلندیوں پر نظر آتا ہے۔ دیوان حافظ کے دو قدیم ترین نسخوں کی تحقیق و تدوین کے علاوہ انہوں نے متعدد اہم متون کی بڑی ژرف نگاہی سے تدوین کی اور تحقیق متن کا ایک معیار قائم کیا۔ حافظ پر اپنی تحقیقات کی وجہ سے وہ حافظ شناس کے خطاب سے موسوم ہوئے۔ مصوری، خطاطی اور موسیقی جیسے مختلف النوع موضوعات پر ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور ان موضوعات پر انہوں نے بڑا وقیع تحقیقی سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔ ان کی شخصیت میں اتنے متنوع اور گوناگوں اوصاف اور کمالات جمع ہوگئے تھے کہ انہیں دیکھ کر علماء سلف کی یاد تازہ ہوجاتی تھی۔ علم وفضل اور شہرت و ناموری کے اتنے اونچے مرتبہ پر فائز ہونے کے باوجود ان کے مزاج میں بڑی سادگی، انکسار اور تواضع تھی۔ اپنے خوردوں سے بھی بڑی خندہ پیشانی اور تواضع سے پیش آتے۔ ان کے مقام و مرتبہ کا ادراک صرف اس وقت ہوتا تھا جب وہ کسی علمی موضوع پر اظہار خیال کرتے۔ دارالمصنفین سے ان کا بڑا دیرینہ اور قلبی تعلق تھا اور اس کے بارے میں فکرمند رہتے تھے۔ طویل عرصہ سے معارف کی مجلس ادارت کے رکن تھے۔ اس کے علاوہ ان کی تحقیقات معارف کے صفحات کی زینت بنتی رہی ہیں۔ راقم الحروف کو ذاتی طور پر ان کی شفقت طالب علمی کے زمانہ سے حاصل تھی اور وہ عزیز جہاں منزل میں مقیم تھے، اور نماز کے لیے ہمارے ہال کی مسجد میں آتے تھے۔ اپنی علمی عظمت و جلالت اور یونیورسٹی انتظامیہ میں اپنے بڑے مقام و منصب کے باوجود ایک طالب علم سے جس طرح ملتے تھے اس کی خوش گوار یاد دل میں ابھی تک تازہ ہے۔ بارگاہ رب العزت میں دعا ہے کہ اپنے فضل خاص سے ان کے درجات کو بلند فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ ان کی وفات پر ان کے دیرینہ رفیق پروفیسر مختارالدین احمد کے تاثرات اسی شمارہ میں شامل اشاعت ہیں۔

(نومبر ۲۰۰۸ء)

پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد

(ڈاکٹر مختارالدین احمد)

افسوس ہے کہ فارسی و اردو کے مشہور استاد، نامور محقق، بین الاقوامی شہرت کے ممتاز مصنف اور رسالہ ''معارف'' کے رکن ادارت پروفیسر ڈاکٹر نذیر احمد طویل علالت کے بعد یکشنبہ ۱۹/اکتوبر ۲۰۰۸ء کی صبح کو علی گڑھ میں وفات پاگئے، دوسرے دن مغرب کے بعد یونیورسٹی کے قبرستان میں ان کے دوستوں، عقیدت مندوں، تلامذہ اور اعزہ کی موجودگی میں ان کی تدفین عمل میں آئی، خدا ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔

نذیر احمد، ضلع گونڈا (اترپردیش) کے ایک گاؤں میں ۳/جنوری ۱۹۱۵ء کو پیدا ہوئے، تعلیم دانش گاہ لکھنو میں حاصل کی، انہوں نے ۱۹۴۰ء میں فارسی میں ایم۔اے کیا اور وہیں سے ۱۹۴۵ء میں فارسی زبان و ادب میں انہیں ڈاکٹریٹ تفویض ہوئی، ان کا مقالہ 'ظہوری کی حیات اور کارنامے' پر تھا جو انہوں نے پروفیسر مسعود حسن رضوی کی نگرانی میں لکھا تھا، ۱۹۵۰ء میں انہوں نے 'عادل شاہ کے عہد کے فارسی گویوں' پر مقالہ لکھ کر ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۵۶ء میں عادل شاہ کی تصنیف ''نورس'' کی ترتیب

وتحقیق پر اسی یونیورسٹی سے انہیں اردو میں ڈی لٹ کی ڈگری ملی، ۱۹۵۵ء میں حکومت ہند کے وظیفے پر وہ ایران گئے، تہران یونیورسٹی سے انہوں نے پہلوی اور جدید فارسی میں ڈپلوما حاصل کیا اور وہاں کے اہم اساتذہ سے انہوں نے علمی فیوض حاصل کئے۔

وہ ۱۹۵۰ء میں لکھنو یونیورسٹی کے شعبہ فارسی میں لکچرر مقرر ہوئے، ۱۹۵۷ء میں حکومت ہند کے ایک علمی منصوبے کے تحت اردو کی تاریخ زبان وادب کی ترتیب کے لیے پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ایما پر وہ علی گڑھ آئے اور اس منصوبے پر وہ ۱۹۵۸ء تک کام کرتے رہے، اسی سال وہ شعبہ فارسی میں ریڈر اور ۱۹۶۰ء میں پروفیسر مقرر ہوئے، دوسال تک وہ فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین رہے، ۱۹۶۰ء میں یونیورسٹی نے جب ''مجلّہ فکر ونظر'' شائع کرنا شروع کیا تو ڈاکٹر یوسف حسین خاں اس کے ایڈیٹر اور ڈاکٹر نذیر احمد سکریٹری اوران کے نائب مقرر ہوئے، ان کی چھ سال کی محنت اور توجہ سے ''فکر ونظر'' کا شمار اعلا درجے کے علمی وتحقیقی مجلّات میں ہونے لگا، وہ ۱۷ سال تک شعبہ فارسی کے صدر رہ کر ۱۹۷۷ء میں دوسال کی توسیع کے بعد سبک دوش ہوئے، سبک دوشی کے بعد بھی وہ علی گڑھ میں مقیم اور علمی اور ادبی کاموں میں بہ دستور مصروف رہے۔

ڈاکٹر نذیر احمد نے ایران، افغانستان، پاکستان، سعودی عرب، کویت، عراق، انگلستان، روس اور امریکا کے متعدد بار علمی سفر کئے اور وہاں کی متعدد بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی، وہ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے تاحیات ٹرسٹی رہے، ایک مدت تک وہ اس ادارے کے سکریٹری پھر اس کے نائب صدر، پھر صدر مقرر کیے گئے، وہ ایک عرصے تک فارسی و اردو کے تحقیقی وعلمی رسالے ''غالب'' کے ایڈیٹر رہے اور مجلّات انڈوایرانیکا (کلکتہ)، معارف (اعظم گڑھ)، بیاض (دہلی) کے ایڈیٹوریل بورڈ کے سرگرم رکن۔

انہوں نے بیجاپور کے بادشاہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کی شعری تصنیف اور قدیم دکنی اردو کی اہم دستاویز ''کتاب نورس'' متعدد مخطوطات کی مدد سے مرتب کر کے ۱۹۵۵ء میں شائع کی، اس کا ہندی انگریزی اڈیشن مع مقدمہ وترجمہ ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا، اس کا دوسرا ایڈیشن ڈاکٹر عبدالغفار شکیل کی تہذیب وتزئین کے بعد کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور نے ۱۹۹۸ء میں شائع کیا، اس کتاب کا کنٹری زبان میں ترجمہ پروفیسر عبدالحمید خاں نے کیا ہے جسے اکادمی نے بنگلور سے ۱۹۹۷ء میں شائع کیا ہے۔

ڈاکٹر نذیر احمد کی اہم تالیفات یہ ہیں:

''مکاتیب سنائی'' طبع اول، دانش گاہ اسلامی علی گڑھ ۱۹۶۲ء، طبع دوم کابل ۱۹۷۷ء، طبع سوم تہران ۱۳۶۴ شمسی، طبع چہارم زیر طبع، ''دیوان سراجی سگزی خراسانی'' طبع دانش گاہ اسلامی علی گڑھ ۱۹۷۲ء، ''نقد قاطع برہان'' طبع ایوان غالب، دہلی ۱۹۸۵ء، ''دیوان عمید لویکی'' نشر مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۸۵ء۔

انہوں نے دیوان حافظ کے بعض نادر واہم مخطوطات (نسخ آقائے ہاشم علی سبز پوش، گورکھپور نسخہ مورخہ ۸۲۴ھ (اس کے سات ایڈیشن نکل چکے ہیں) ایا صوفیہ ترکی، نسخہ مورخہ ۸۱۳ھ ونسخہ مورخہ ۸۱۸ھ) کے تنقیدی علمی عکس اڈیشن ایران سے شائع کئے۔

قدیم فارسی فرہنگوں سے ڈاکٹر نذیر احمد کی خاص دلچسپی تھی، انہوں نے فخرالدین مبارک شاہ قوس غزنوی کی مرتب کردہ فرہنگ قواس ۱۹۷۴ء میں، حاجب خیرات دہلوی کی دستورالا فاضل تہران سے اور بدر ابراہم کی تالیف فرہنگ زفان گویا و جہان پویا، کتاب خانہ خدا بخش پٹنہ سے دو جلدوں میں ۱۹۸۹ء و ۱۹۹۷ء میں شائع کی ہے، فیروز شاہ تغلق کے عہد (۷۵۳ھ۔۷۹۰ھ) کی فارسی فرہنگ لسان الشعرا ایران کلچرل ہاؤس، نئی دہلی سے ۱۹۹۵ء میں انطباع پذیر ہوئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے مقالات کے حسب ذیل مجموعے شائع ہوچکے ہیں:

۱۔تحقیقی مقالات، لکھنو ۱۹۵۴ء، ۲۔تاریخی وادبی مطالعے، علی گڑھ ۱۹۶۱ء، ۳۔تاریخی اور علمی مقالات (ترجمہ کبیر احمد جائسی)، ۴۔غالب آشفتہ، آرٹس فورم، ملتان ۱۹۹۶ء، ۵۔غالب پر چند مقالے، نشر ایوان غالب، نئی دہلی ۱۹۹۶ء، ۶۔غالب پر چند تحقیقی مطالعے، نشر ایوان غالب، نئی دہلی، ۱۹۹۶ء۔

ہندوستان، پاکستان، ایران، افغانستان اور امریکا کے مختلف مجلّات میں فارسی و اردو زبان وادب، لسانیات، تاریخ وتمدن، خطاطی وثقافت وموسیقی وغیرہ موضوعات پر اردو فارسی اور انگریزی زبانوں میں ان کے ایک ہزار سے زائد مقالات شائع ہوچکے ہیں، زبان وادب فارسی، تاریخ ایران و ہند اور نسخہ شناسی وکتاب شناسی کے موضوعات پر ان کے ۱۸ فارسی مقالات کا مجموعہ ڈاکٹر سید حسن عباس کی تلاش وجستجو سے ''قند پارسی'' کے عنوان سے تہران سے ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا ہے ان کے فارسی مقالات کا دوسرا مجموعہ موقوفات محمود افشار کے زیر اہتمام چھپ گیا ہے۔ ان کا مرتب کردہ دیوان مہندس لاہوری زیر طبع ہے وہ ایک عرصے تک کچھ دانش مندوں کی مدد سے ''اعجاز خسروی'' کے انگریزی ترجمے میں مصروف رہے جو امریکا سے شائع ہونے والا ہے۔

ڈاکٹر نذیر احمد کو ۱۹۸۷ء میں صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے ''پدم شری'' کا اعزاز، ۱۹۷۶ء میں، ایوان، غالب نئی دہلی کا فخرالدین علی احمد انعام اور ۱۳۶۸ شمسی میں زبان وادبیات فارسی کی تدریس وتحقیق کے صلہ میں انہیں تہران میں ''جایزہ ادبی و تاریخی ڈاکٹر محمود افشار'' تفویض ہوا اور اسی سال انہیں تہران یونیورسٹی سے فارسی پروفیسر کی اعزازی ڈگری عطا ہوئی، ایران میں اسلامی جمہوریت کے قیام کے بعد یہ پہلی اعزازی ڈگری ہے جو کسی ایرانی یا غیر ایرانی کو تفویض ہوئی ہے۔

(نومبر ۲۰۰۸ء)

اصلاحی، عبدالرحمٰن ناصر

عبدالرحمان ناصر اصلاحی

افسوس، مدرسۃ الاصلاح اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تعلق کی ایک اہم یادگار نہ رہی، مولانا عبدالرحمان ناصر اصلاحی جامعی کی قریب ایک صدی کی حیات مستعار پوری ہوئی، انــــاللہ، ان کی شخصیت کی طرح ان کا قلم بڑا شگفتہ تھا، پروفیسر عبداللطیف اعظمی کے ہم درس تھے اور ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر مجیب جیسے نامور اساتذہ سے اکتساب فیض کیا تھا، پروفیسر خلیل الرحمان اعظمی کے ہم وطن بھی تھے اور ہمدم وہم ساز بھی، جب تک صحت نے ساتھ دیا، دارالمصنفین آتے جاتے رہے، اب وہ اللہ تعالیٰ کے جوار رحمت میں ہیں، قارئین سے بھی مغفرت کی دعاؤں کی درخواست ہے۔ (''ع۔ص''، جنوری ۲۰۰۹ء)

فضؔا ابن فیضی

فضؔا ابن فیضی مرحوم

۱۷رجنوری کی شام لکھنو میں تھا کہ مئو سے ڈاکٹر شکیل اعظمی نے فضا ابن فیضی کے انتقال کی خبر دی، طبیعت ادہر عرصے سے ناساز ہی رہتی تھی، آخر بے قراری کو قرار آہی گیا اور ایک ایسا شاعر اس دنیا سے رخصت ہوگیا جس کی خوش کلامی اور خوش فکری عصائے دست غزل کا وقار رکھتی تھی۔

وہ خطہ اعظم گڑھ کی مردم خیز سرزمین مئو میں یکم جولائی ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے، گھرانہ علمی اور ذی عزت تھا، جدامجد مولانا محمد علی فیضی نامور عالم دین اور متعدد مذہبی کتابوں کے مصنف تھے، عربی، اردو اور فارسی میں یکساں قدرت کے ساتھ شعر کہتے تھے، دادا کی یہ میراث فضا کو بھی ملی اور انہوں نے تحدیث نعمت کے طور پر اور عربی رواج کے طرز پر والد کے بجائے دادا سے نسبت کو ترجیح دی، خالص عربی اور دینی تعلیم سے آراستہ فضا نے تجارت اور ملازمت کے ساتھ مشق سخن جاری رکھی، یہ محض طبیعت کا طرفہ تماشانہ تھا، طبیعت میں خودداری اور احساس کی شدت نے دنیا اور زمانے کے درد وکرب کا حساب کرنا سکھایا، ان کی شاعری کی اٹھان اسی لیے غضب کی رہی کہ خارجی زندگی کے مظاہر پر ان کی نظر، حقیقت کے متنوع پہلوؤں کو سمیٹ لینے والی تھی، ان جیسے اور ان سے پہلے کے اور ہم وطن شاعر خلیل الرحمان اعظمی نے اسی خاصیت کو بیان بھی کر ڈالا۔

فضا کی زودگوئی مشہور ہے، سفینہ زرگل، شعلہ نیم سوز، دریچہ سیم سمن، پس دیوار حرف، سبزہ معنی بیگانہ اور حمد ونعت کا مجموعہ سرشاخ طوبی کے ہزاروں اشعار، اس شہرت کی تائید کرتے ہیں، ان کے علاوہ غزال مشک گزیدہ، لوح آشوب آگہی اور آئینہ نقش صدا کے نام بھی ملتے ہیں، زودگوئی کا لازمی نتیجہ رطب و یابس کا امتزاج ہے، لیکن فضا کی شاعری میں فن کے خلوص، عصر کے شعور اور ذاتی تجربوں کے استادانہ اظہار نے یابس کا اندیشہ بھی نہیں ہونے دیا، انہوں نے اپنے پہلے مجموعہ کلام سے ناقدین کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ عصری ادب میں ان کو امتیازی حیثیت حاصل ہے، انہوں نے غزل، رباعی، نظم، ہر صنف میں طبع آزمائی کی، حمد ونعت کی سعادت بھی حاصل کی لیکن ان کی انفرادیت ہمیشہ ان کے ساتھ رہی، تخیل کی بلندی، الفاظ کی شوکت اور اس سے بڑھ کر فکر کی پاکیزگی اور اس سے زیادہ نئی نئی تراکیب کے کمال فن کا استعمال ان کو ہم عصروں میں فائق تر بناتا گیا، روایت کے خلاف بغاوت، پھر ترقی پسندی کے شور وشغف اور پھر اس کے زوال اور اس کی جگہ دوسرے ادبی وشعری نظریات یہ سارے منظر فضا کے سامنے گزرتے رہے اور فضا روایتی اقدار کو سینے سے لگائے اپنے عصر کی زبان سے جدت اور تازگی سے معمور نغمے فضا میں بکھیرتے رہے۔

گردش رنگ معنی ہے وہی
میرے لفظوں پہ گرانی ہے وہی
جس پہ قائم تھی حویلی اپنی
وہی بنیاد کا پتھر غائب

فن عروج پاتا گیا لیکن ناقدری اپنی پستیوں میں چھپی رہی، کرب ذات کا اظہار ہونا ہی تھا:

دیکھ کس کس زاویے سے امتحاں میرا ہوا
اس ہنرمندی میں سب کچھ رائگاں میرا ہوا
بس یہی خاکستر جاں ہے یہاں اپنی شناخت
ہوگیا سرا بدن جب راکھ تو چمکا ہنر

فضا کو حق تھا کہ سخن شناس ناقدان کو فیض وفراق کی صف میں شامل کرتے، وہ یقیناً صف اول کے ان شعرا میں تھے جن کی شاعری کو ساحری کا درجہ حاصل تھا، جس کی ہر بات حرف دگر تھی، جس کی آواز، شہ رگ جاں کے ٹوٹنے کی آواز تھی اور جس کا لہجہ سلگتے بجھتے شرر کے مانند تھا، ان کو خود احساس تھا کہ ان کے طرز ادا میں جذب اور مناجات کا گداز ہے، وہ پیکر تراش فکر اور علامت نگار ذہن ہیں لیکن یہ احساس بھی ان کو ہمیشہ رہا کہ:

بھرپور زندگی سے ہے لیکن مجھے وہ شخص
خاموش اُجڑے اُجڑے کھنڈر کی طرح لگے

میر ناصر کاظمی اور خلیل الرحمان اعظمی کا سارا درد جیسے ان کی شاعری میں سما گیا اور اس کے اظہار میں انہوں نے ان سب سے الگ راہ نکالی، یہ غیر معمولی جرأت ان ہی کے بس کی تھی، کسی تحریک کے سائبان کے بغیر وہ نادر استعاروں، تازہ لفظوں اور پیکر تراشیوں کے فن کا مظاہرہ کرتے رہے اور یہ اس لیے ممکن ہوا کہ بقول خواجہ احمد فاروقی ان کو اپنے فن پر اعتماد تھا، ڈاکٹر محمد حسن نے ان کی غزل کو یہ کہہ کر داد دی کہ یہ صرف دل کا مرثیہ نہیں، دور حاضر کے درد وداغ وجستجو وآرزو کی پوری داستان سے عبارت ہے،

فضا نے عصر حاضر میں غزل کی آبرو رکھی تو شمس الرحمان فاروقی کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوا کہ فضا غزل بہتر کہتے ہیں یا نظم، واقعی یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ دونوں فن کی کسوٹی پر یکساں کھرے ہیں۔

شعور و نظر کی طرح وہ عقیدہ عمل کے پیکر رہے، ان کی نوا کے صنم، آرزوں کے بس میں نہیں رہے، یہ وہ نعمت ہے جو ان کے قبیلے میں خال خال نظر آتی ہے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور اپنے قرب کی نعمت سے ہم کنار کرے۔ (آمین)

(''ع۔ص''، فروری ۲۰۰۹ء)

رامپوری، عبدالسلام خاں، مولانا

مولانا عبدالسلام خاں رام پوری مرحوموم

اخباروں سے یہ افسوس ناک خبر ملی کہ ۱۳/اپریل کو مولانا عبدالسلام خاں رام پوری نے اس دنیائے فانی کو الوداع کہہ دیا، اناللہ وَانا اِلَیہ رَاجِعُون۔

ان کے ساتھ ہی دارالسرور رام پور کی وہ امتیازی شناخت بھی رخصت ہوگئی جس کی وجہ سے رام پور کو بخارائے ہندی کہا جاتا تھا، رام پور کی ریاست کی علم پروری اور سخن نوازی کی داستانیں ہماری علمی و ادبی تاریخ کا بڑا دل کش حصہ ہیں لیکن فلسفہ و کلام و منطق جیسے علوم معقولات میں اس ریاست کی روایت کی بات ہی کچھ اور ہے، اٹھارہویں صدی کے اواخر میں نواب فیض اللہ خاں کے فیض سے جب وہاں مدرسہ عالیہ قائم ہوا اور اس کے پہلے صدر مدرس کی حیثیت سے مولانا عبدالعلی بحرالعلوم فرنگی محلی کا تقرر ہوا تو جیسے معقولات کی بہار آگئی، مولانا فضل حق خیرآبادی اور مولانا عبدالحق خیرآبادی جیسے ائمہ فلسفہ اسی فصل گل کی یادگار ہوئے، مولانا عبدالسلام خاں نے جب رام پور کی اس فضا میں ۱۹۱۷ء میں پہلی سانس لی تو گو پہلا سا رنگ نہیں تھا لیکن رونق اب بھی باقی تھی، ان کے ہم عصر ساتھیوں میں مولانا وجیہ الدین خاں، مولانا ابوالوفاء شاہ جہاں پوری، مولوی عبدالوہاب خاں، مولانا امتیاز علی عرشی جیسے اصحاب فضل و کمال کے نام ملتے ہیں، ان کے اساتذہ میں ایک نام جیراج پور اعظم گڑھ کے مولوی عبدالودود ندوی کا بھی ہے، مولانا عبدالسلام خاں کی غیر معمولی لیاقت ہی تھی کہ ان کو کم عمری میں اس مدرسہ عالیہ کا متولی یعنی پرنسپل بنایا گیا اور یہ ان کی صلاحیت تھی کہ وہ ۱۹۷۵ء تک یعنی قریب تیس سال تک اس عہدے پر فائز رہے لیکن ان کی اصل شہرت ان کے قلم کی رہین منت ہے جس نے فلسفہ و ادب کو اس خوبی اور گہرائی سے ہم آمیز کیا کہ ارباب نظر کی نظر میں وہ ایک خاص قدر و اعتبار کے لائق بن گئے، ''معارف'' میں ان کا پہلا مضمون ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا، اگست کے اس شمارے میں سید مبارز الدین رفعت، مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی اور مولوی محمد غوث (عثمانیہ) کے مقالات کے ساتھ ان کے مقالہ کا عنوان تھا ''مصحفی اور اس کے دیوان کا رام پوری نسخہ''، اس وقت ان کی عمر بیس سال کی تھی لیکن مولانا سید سلیمان ندویؒ نے خاص ان کے مضمون پر یہ نوٹ چڑھایا کہ ''اہل ادب کو ہمارے مضمون نگار کا ممنون ہونا چاہئے کہ انہوں نے پوری تحقیق اور کاوش سے اس شبہ کو یقین کے درجہ تک پہنچا دیا ہے اور معاملہ، آئینہ ناظرین کر دیا ہے''، شبہ یہ تھا کہ مصحفی کا جو انتخاب کلام، آئینہ ناظرین کے نام سے شائع ہوا تھا اس میں منشی مظفر علی خاں اسیر نے اپنے زمانہ کی زبان اور طرز ادا کا لحاظ کر کے اصلاحیں دی ہیں، بیس سالہ عبدالسلام نے ژرف نگاہی سے ثابت کیا کہ مصحفی کے کلام کی اس قسم کی تصحیح نہیں کی گئی جیسی بالعموم قدیم کتابوں کے مصححین میں مروج ہے بلکہ کلام کی استاذانہ اصلاح کر کے مصحفی کے طرز بیان اور اس کی زبان پر ایک زمانے تک کامیاب پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے، یہ مضمون آج بھی مصحفی کے باب میں وقیع ترین تحریروں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

معارف سے ان کا رشتہ استوار رہا، سید صاحب، شاہ معین الدین احمد ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمان اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی تک ان کے بیش قیمت مضامین شائع ہوتے رہے، ۱۹۷۰-۷۱ء میں ان کا مقالہ ''اقبال اور برگساں'' کے عنوان سے تین قسطوں میں چھپا، اس مقالے سے پہلی بار فلسفہ میں ان کے تبحر کا اندازہ ہوا، یہ بھی قابل ذکر ہے کہ صولت پبلک لائبریری رام پور میں انہوں نے جب یہ مقالہ پیش کیا تو اس نشست کے صدر، مولانا سید سلیمان ندوی ہی تھے، اس کے بعد اقبال کے اخلاقی تصورات، اقبال کی ریاست، اقبال کا فکری ارتقاء، اقبال کی ابن سینا کے مزعومہ فلسفہ عشق کی تشریح، اقبال تصوف اور عقلیت جیسے مقالات کئی کئی قسطوں میں شائع ہوئے، معارف میں ان کا آخری مضمون مارچ ۱۹۹۱ء میں ''مولانائے روم اور ان کی مثنوی معنوی'' کے عنوان سے شائع ہوا، اقبال اور فلسفہ اقبال ان کا خاص موضوع رہا، پہلے مضمون کا آغاز انہوں نے اس رائے کے اظہار سے کیا تھا کہ اقبال غالباً پہلا مسلمان فلسفی ہے جس نے مغربی فلسفہ کی بنیاد پر مشرقی خیالات کی عمارت کھڑی کی اور ایک مکمل نظام کی تشکیل کی، اس اقبالی نظام کی مکمل تشریح قریب نصف صدی گزرنے کے بعد ان کے مضمون اقبال تصوف اور عقلیت میں ہوئی، یہ مضمون دیکھا جائے تو خود مولانا عبدالسلام خاں کے فکری ارتقاء کی دلیل ہے، اقبال ان کے ممدوح تھے اور یہ مدح، حسن کلام سے زیادہ حسن پیام کا نتیجہ ہے، ان کا خیال تھا کہ اقبال کی مابعد الطبیعیاتی فکر بہت تجریدی، دقیق اور گہری ہے، اس کو مغربی آراء و افکار کو سامنے رکھے بغیر سمجھنا ممکن نہیں، بہ قول مولانا مرحوم ''اقبال کے ذاتی مطالعہ اور تقابلی مطالعہ کا جدا جدا مطالعہ ڈاکٹر ذاکر حسین کے ایماء سے ہوا اور ذاکر صاحب نے ان کو یہ مشورہ اسی وقت دیا تھا جب معارف میں ان کا مضمون ''اقبال اور برگساں'' پر چھپا تھا، بعد میں مولانا مرحوم کی ایک

کتاب افکار اقبال کے نام سے شائع ہوئی جس میں انہوں نے اقبال کی ذاتی زندگی کے علاوہ مابعد الطبیعیات، اخلاقیات، سیاسیات اور اقتصادیات جیسے موضوعات پر اقبال کے تعلق سے تحریریں سپرد قلم کیں، اقبال کے دقیق و عمیق مطالعہ کے لیے یہ کتاب ذخیرہ اقبالیات میں چند بہترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے، فلسفہ سے دلچسپی کی وجہ سے انہوں نے نٹشے کی کتاب کا ترجمہ ملفوظات زرتشت کے نام سے کیا، کمال یہ ہے کہ یہ کارنامہ بھی انہوں نے نوعمری میں انجام دیا تھا، فلسفہ کی چنان وچنیں نے بہتوں کی طرح ان کو خدا کی بات سے بیگانہ نہیں کیا، قرآن مجید سے ان کو ہمیشہ شغف رہا، مولانا عبدالوہاب خاں کی تفسیر کے دوڈھائی پاروں کوانہوں نے اپنے تشریحی حاشیوں کے ساتھ شائع کیا، اس کے علاوہ ان کے اور بھی مقالات اور کتابیں ہیں، فنافی العلم ہونے کے باوجود وہ شہرت سے دور رہے، ہمارے اسلاف کی تمام خوبیوں، تواضع، انکسار، خندہ جبینی اور نرم گفتاری کے بھی وہ مجموعہ اور نمائندہ تھے، گوشہ نشین تھے، اعزاز و مناصب کی خواہش سے دور گو کچھ سرکاری اعزازان کو ملے بھی لیکن ان کے علم وفضل کا اعتراف افسوس ہے شایان شان نہیں کیا گیا، ادہر عرصے سے ان کی کوئی خبر نہیں تھی، ان کو بھی جن پر خبر رکھنے کی ذمہ داری تھی، ان کے رخصت ہونے سے رام پور ہی کی نہیں ہندوستان کی ایک ایسی شخصیت سے محرومی کا احساس ہے، جس کا ثانی اس کے میدان میں مشکل سے نظر آتا ہے، سلام علی عبدالسلام۔ (''ع ۔ص''، مئی ۲۰۰۹ء)

رئیس، قمر، پروفیسر

پروفیسر قمر رئیس مرحوم

پروفیسر قمر رئیس بھی اپریل کی آخری تاریخوں میں اس دنیا سے رخصت ہوگئے، ایک مہینہ پہلے ''ایوان اردو'' کے خصوصی اداریہ میں جب انہوں نے چند جانے والوں، خاص طور پر فضا ابن فیضی کا ماتم کرتے ہوئے تمنا ظاہر کی تھی کہ اگر موت ایک ماندگی کا وقفہ ہے تو کاش یہ دینوی اور علامتی طور پر سچ ہوتی لیکن اردو کے درد و بام پر سوگ کا عالم طاری دیکھ کر بڑی حسرت سے کہا کہ یقین نہیں آتا کہ جانے والوں کی رحلت محض ایک ماندگی کا وقفہ ہے، افسوس یہ ماتم کرنے ولا چند دنوں بعد اسی کاروان رفتگان کا حصہ بن کر اردو دنیا کو ایک دیدہ ورصاحب دانش سے محرومی کا کرب دے گیا۔

ان کا وطن شاہ جہاں پور اور نام مصاحب علی خاں ہے لیکن قمر رئیس کی شہرت کی چمک میں اصل نام و وطن چھپ کر رہ گئے، علی گڑھ میں تعلیمی مراحل سے گزر کر تدریسی منزلیں طے کرتے رہے، اس راہ میں تاشقند و سمرقند سے بھی گزر ہوا لیکن شہرت کو بال و پروان کے قلم نے عطا کیے، ۱۹۳۲ء میں جب وہ پیدا ہوئے تو اردو کے ترقی پسندوں کی تحریک صرف ذہنوں میں تھی لیکن قمر رئیس کا عالم شباب آیا تو ترقی پسند تحریک کی مقبولیت بھی شباب پر آئی اور فطری طور پر عہد شباب کی بعض بے اعتدالیاں بھی ساتھ لائی، یہ کہنا بے احتیاطی نہیں کہ قمر رئیس کے ذہن کی سلامتی نے ان کو اس فکر سے محفوظ رکھا کہ ترقی پسند ادب کو قدیم ادب اور اس کی بہترین روایات کا منکر ہونا چاہئے، انہوں نے اردو تنقید کو اپنا موضوع بنایا تو اس اقرار کے ساتھ کہ تلاش وتفحص کا جذبہ ہی تنقید کا نقطہ آغاز ہے اور یہ کہ ادب کی حقیقت اور ماہیت کے بارے میں جستجو کا عمل جتنا گہرا، محیط اور متوازن ہوگا، اتنا ہی غور وفکر کے نتائج سچائی سے قریب تر ہوں گے، ان کی تنقید کو سماجیاتی تنقید کا نام دیا گیا جس سے وہ زیادہ متفق نہیں تھے، بعد کی زندگی میں انہوں نے پریم چند کو اپنے مطالعہ کے لیے خاص کیا ان کی کئی کتابیں پریم چند کے تعلق سے ہیں لیکن ان کا قلم صرف اسی کا پابند نہیں رہا، شعر و افسانہ پر بھی ان کی نگارشات نے اردو تنقید کے معیار کو بلند تر ہی کیا، ایک کتاب اقبال کے شعور وفن پر بھی ہے اور یہ ان کی تنقیدی تلاش وتوازن کا ثبوت بھی ہے، مطالعہ کی گہرائی اور تجزیہ میں اعتدال و توازن اور اسلوب میں شائستگی نے ان کو ان کے قبیلے میں واقعی امتیاز بخشا، ادعائیت اور کسی خاص مسلک کی متعصّبانہ ترسیل بلکہ تبلیغ کا داغ ان کے دامن تحریر پر شائد ہی نظر آئے، انہوں نے ترجمہ کا فن اور روایت کے نام سے ایک مجموعہ مضامین مرتب کیا، اس کتاب کا مقدمہ ان کی غیر معمولی نظر کا گواہ ہے۔

کتابوں کے علاوہ انہوں نے ادبی صحافت سے مسلسل تعلق رکھا، عصری آگہی اور نیا سفر کے بعد وہ دہلی کی اردو اکیڈمی کے رسالہ ''ایوان اردو'' سے وابستہ ہوئے، ایوان اردو کی مقبولیت میں ان کی وجہ سے بڑا اضافہ ہوا، وہ اردو اکیڈمی کے وائس چیرمین ہوئے تو سمیناروں اور مذاکروں کے ذریعہ اردو کے ایوان میں کئی شمعیں روشن کیں، گذشتہ سال انہوں نے علامہ شبلی کے تعلق سے ایک وقیع سمینار کا اہتمام کیا، اس موقع پر ان کی شبلی شناسی کے جوہر بھی کھلے، دارالمصنفین کے لیے ان کی ایک تحریر بھی بڑی اثر انگیز شائع ہوئی، ایوان اردو میں ان کے اداریوں کا لہجہ ترقی پسندی سے زیادہ حقیقت پسندی کی جانب مائل نظر آنے لگا تھا، فضا ابن فیضی کے بارے میں انہوں نے لکھا کہ ''ایک دین دار خانوادے سے تعلق کے باوجود ایک واضح، سیکولر اور مفکرانہ ذہن کے مالک تھے'' اگر وہ اور جیتے رہتے تو یہ اعتبار اور زیادہ ہوتا، طلبہ سے شفقت اور ان کی ہرممکن اعانت ان کی خاص خوبی تھی، زندگی میں ان کو کئی اعزاز ملے، دعا ہے کہ ان کی نیکیاں آخرت میں ان کے کام آجائیں۔ (''ع ۔ص''، مئی ۲۰۰۹ء)

معصومی، ابومحفوظ الکریم، مولانا

آہ! مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی مرحوم

علامہ ابومحفوظ الکریم معصومی نے ۱۷؍جون ۲۰۰۹ء کو اس عالم فانی کو الوداع کہا

اور کلکتہ کی زمین نے علم و تحقیق کے آسمان کو اپنی آغوش میں لے لیا، یقیناً ان کی وفات سے مطالعہ و تحقیق کی دنیا میں عرصے تک خلا محسوس کیا جائے گا، فنا فی العلم ہستیاں اب نایاب ہیں اور ان کے اٹھ جانے سے واقعی علم کے اٹھ جانے کا احساس ہوتا ہے۔

دارالمصنفین سے ان کا تعلق نصف صدی سے زیادہ کی مدت پر محیط ہے، وہ جب ڈھاکہ یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر تھے تو اس وقت یعنی ۱۹۴۸ء میں ان کا مضمون ''تفسیر طبری کی اہمیت'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا، یہ تعلق اس طرح قوی سے قوی تر ہوتا گیا کہ وہ آخری وقت تک رسالہ ''معارف'' کی مجلس ادارت اور دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے رکن رہے، اس لیے دارالمصنفین میں ان کے رحلت کی خبر اور بھی زیادہ غم واندوہ کے ساتھ سنی گئی۔

مولانا کی زندگی کا بیشتر حصہ بنگال میں گزرا لیکن اصلاً مولد و وطن صوبہ بہار کا نہایت مردم خیز قصبہ بہار شریف ہے، ان کے والد مولانا محمد امیر حسن نے کلکتہ اور ڈھاکہ میں مدۃ العمر تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دیئے لیکن وطن کی خاک ان کو بہار شریف کھینچ لائی، مولانا محمد امیر حسن کے دو صاحب زادے ہوئے اور دونوں علم و تحقیق کے آفتاب و ماہتاب نکلے، ایک تو ڈاکٹر محمد صغیر حسن معصومی، جنہوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے ابن باجہ اندلسی کی **کتاب النفس** کو مرتب کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی، ان کے بعض مقالے معارف میں شائع ہوئے، پاکستان بننے کے بعد وہ وہاں کے تعلیمی اداروں سے وابستہ ہوئے اور اسلام آباد میں ۱۹۹۶ء میں وفات پائی، ہمارے مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی ان سے چھوٹے تھے، ان کی تعلیم میں والد صاحب کے علاوہ صغیر حسین معصومی کی توجہ بھی شامل رہی، ان کے علاوہ ان کے اساتذہ میں مفتی عمیم الاحسان مجددی، سید ولایت حسین بیربھومی، مفتی محمد شفیع حجۃ اللہ فرنگی محلی انصاری، علامہ عبدالرحمان کاشغری جیسے نامور علماء بھی ہیں، تعلیم کی تکمیل کے ساتھ ہی مولانا معصومی نے مدرسہ عالیہ کلکتہ سے درس و تدریس کا آغاز کیا اور مسلسل اس محنت و دیانت سے معلّمی کے فرائض انجام دیئے کہ حکومت ہند نے ان کو عربی زبان کے بہترین استاذ کی سند سے نوازا، سبکدوش ہوئے تو مغربی بنگال کے وقف بورڈ اور اردو اکیڈمی کے چیرمین بنائے گئے اور ۱۹۹۱ء میں ان کو صدر جمہوریہ نے عربی زبان و ادب کی مجموعی خدمات کے اعتراف میں سند توصیف سے بھی سرفراز کیا، دنیاوی اعزاز و عہدے اور بھی ملے لیکن یہ اعزاز ہوں یا سرکاری ملازمت یا کلکتہ کے امام عیدین کا منصب کوئی بھی طلب علم اور تحقیق کی رہ نوردی میں حائل نہ ہوسکا، ان کی تحریروں کا بڑا حصہ عربی زبان میں ہے، اردو میں بھی ان کی نگارشات کا زیادہ تر موضوع عربی ادب ہی رہا، مخطوطات کی تحقیق، ترتیب اور تعلیق سے ہمیشہ دلچسپی رہی، **شرح الالفات لابن انباری**، **مسئلہ صفات الذاکرین والمتفکرین**، **القول المسموع فی الفرق بین الکوع و الکرسوع**، **ارجوزتان** مطبوعہ کتابیں ان کی مخطوطات شناسی کی شاہد ہیں، ان کے علاوہ معلوم ہوا کہ **نسب قریش** اور **کتاب التعلیقات والنوادر** اور دو مرتبہ مخطوطے، ابھی غیر مطبوعہ ہیں، ان کے عربی مقالات و مضامین کا ایک مجموعہ **بحوث وتنبیہات** کے نام سے دو جلدوں میں بیروت سے شائع ہوا ہے، ان کے تین عقیدت مند نوجوان فضلا ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی، محمد عزیز شمس اور مولانا ابوسحان روح القدس ندوی کو اس کی ترتیب اور طباعت و اشاعت کی سعادت ملی، اس میں ابوجعفر المصادی، ابوعلی الہجری، قدامہ بن جعفر، شرف الدین البوصیری، صدر الدین الشیرازی وغیرہ کے علاوہ خسرو و غالب کی شاعری کا عربی زبان میں تعارف کرایا ہے۔

مطالعہ کی وسعت اور مضامین کے استحضار اور نظر کی گہرائی کی وجہ سے علمی تسامحات پر ان کا نقد و تبصرہ بھی ان کی بڑی خصوصیت ہے، اردو میں بھی ان کے اس قسم کے مقالات و مضامین اگر شمار کیے جائیں تو شاید یہ سینکڑوں میں ہوں، ابن جریر طبری سے غالب تک ان مضامین سے ان کے علم کے بے کرانی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، یہاں ابن جریر طبری والے مضمون کے متعلق یہ کہنا بے محل نہیں کہ معارف میں ان کا یہ مضمون اس وقت چھپا جب وہ ۱۶-۱۷ سال کے تھے، اس نوعمری کے باوجود یہ مضمون اتنا مکمل تھا کہ مولانا عبدالماجد دریابادی اور دیگر اکابر نے ان کو خط لکھ کر مبارکباد دی، ۱۹۴۸ء میں تفسیر طبری کی اہمیت اور اپریل ۱۹۴۹ء میں **معانی القرآن للطبری** جیسے مقالات کے لکھنے والے کے متعلق یہ تصور بھی آج محال ہے کہ یہ کسی ۱۷-۱۸ سالہ طالب علم کے قلم سے ہیں، ان کو ترجمہ نگاری پر بھی پوری قوت تھی، معارف میں ان کے مضمون ''**کنثالث بلنثیا**'' کو مثال میں پیش کیا جاسکتا ہے، گذشتہ صدی میں اسپین کے اس نامور عرب شناس کو سب سے پہلے معصومی صاحب نے معارف کے ذریعے اردو دنیا سے روشناس کرایا۔

عربی اور اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی ان کے مضامین شائع ہوتے رہے، درس و تدریس اور دوسرے قومی امور کی انجام دہی کے ساتھ ان کے وقت اور کام میں یہ برکت واقعی غیر معمولی ہے، علمی و تعلیمی اداروں سے تعلق کو بھی وہ نباہتے رہے، دارالمصنفین کے ساتھ وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، مدرسۃ الاصلاح، ایشیاٹک سوسائٹی کے رکن تھے، ندوہ میں انہوں نے کئی لکچر دیئے، ان کی عبقریت تھی کہ وہ شعر و سخن کا نہایت اعلا ذوق رکھتے تھے، سخن گو تھے اور نثر کی طرح شعر بھی تینوں زبانوں یعنی عربی، فارسی اور اردو میں کہتے تھے، مولانا سید سلیمان ندویؒ کی مشہور نعت و مناجات کی انہوں نے جس طرح تخمیس کی وہ ان کی قدرت کلام کا بہترین نمونہ ہے۔

رسوخ فی العلم اور شرق و غرب میں مقبولیت، دنیوی اعزازوں کی کثرت کے ساتھ تواضع، کسر نفسی اور خاکساری کی دولت بھی خوب ملی تھی، اپنے چھوٹوں سے بھی وہ

شاخ ثمر بار کی طرح جھک کر ملتے اور اپنی خوش مزاجی وخوش گفتاری سے پندارعلم کے تمام حجابوں کو اٹھادیتے، اس خاکسار نے آخری بار کلکتہ میں ان کے دولت کدہ پر حاضری دی تھی، اس دولت کدے کا کیا حال بیان کیا جائے، ہمارے متقدمین وعلماء صوفیہ کے تذکروں میں، زہد، سادگی، استغنا اور دینوی زیب وزینت سے نفور کی ساری داستانیں ہم نے ان کے اس چھوٹے سے کمرے میں دیکھ اور پڑھ لیں، جہاں ایک معمولی چارپائی کے چاروں طرف صرف کتابیں تھیں، یہی دیوان خانہ اور یہی خواب خانہ بھی تھا۔

مولانا کی زندگی بیرون کی طرح اندرون میں بھی یکساں تھی، یہ جملہ بظاہر عام سا ہے لیکن جو مولانا مرحوم کو ذرا بھی قریب سے جانتے ہیں، ان کی نظر میں وہ سارے مصائب اور آزمائشیں بھی ہیں جن پر مولانا کے صبر کو شاید صبر ایوبی کہنا زیادہ مبالغہ نہیں، وہ مسلسل درد پر درد سہتے رہے لیکن ان کے چہرے اور گفتگو سے کرب کا اندازہ کم لوگوں کو ہوسکا، وہ یقیناً قیامت کے دن ان خوش بختوں میں ہوں گے جن کے صبر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور نوازشوں اور حقیقی راہ یابی کا وعدہ ہے، اولئک علیھم صلوات من ربھم ورحمة واولئک ھم المھتدون۔[البقرۃ:۱۵۷]

(''ع۔ص''، جولائی ۲۰۰۹ء)

ندوی، حبیب ریحان خان ازہری، مولانا

مولانا حبیب ریحان خاں ازہری ندوی

(اشتیاق احمد ظلی)

معارف کے لیے مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی کے سانحہ ارتحال کا غم ابھی کم نہ ہوا تھا کہ مولانا حبیب ریحان خاں ازہری ندوی بھی اپنے مالک حقیقی سے جاملے، انـاللہ۔ وہ علماء کے اس زمرے میں تھے جن کے رسوخ فی العلم میں کوئی شبہ نہیں، مطالعہ اور اس سے زیادہ فکر کی وسعت ان کی علمی شخصیت کی پہچان تھی۔ والد ماجد مولانا محمد عمران خاں بھوپالی ندوی کی تربیت اور ندوے اور جامعۃ الازہر کی تعلیم اور لیبیا میں تدریس نے فکر و نظر کے افق ان پر اور بھی روشن کردیے تھے، ان کی کتابوں کے موضوعات بھی ان کی مشکل پسند طبیعت کے غماز ہیں۔ مولانا محمد عمران خاں ندوی مرحوم کے وہ فرزند ہی نہیں تھے ان کی علمی و مذہبی وراثت کے امین بھی تھے۔ علامہ شبلی کے عاشق تھے اور اسی نسبت سے معارف اور دارالمصنفین سے بھی محبت کا تعلق تھا۔ ان کی وفات کی خبر اس وقت ملی جب میں اپنی والدہ کی وفات کی خبر سن کر گاؤں آیا تھا۔ غم دو چند ہونا تھا، تعزیت کے لیے پروفیسر مسعود الرحمان خاں ندوی کو فون کیا جو مرحوم کے برادر غم زاد سے زیادہ دوست اور رفیق کار رہے ہیں۔ تسلی کے کلمات کے بعد دعا یہی ہوتی ہے کہ آسمان ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے۔

(اگست ۲۰۰۹ء)

آہ! مولانا حبیب ریحان خاں ندوی مرحوم

مولانا حبیب ریحان خاں ازہری ندوی ۸/ اگست کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہوکر اپنے مالک حقیقی سے جاملے، انـاللہ وانا الیہ راجعون، علم وتحقیق اور فکر و نظر کے لیے ان کا اٹھ جانا بڑا اور سخت سانحہ ہے، علم وفکر کی نسبت جن شخصیتوں سے معتبر قرار پاتی ہے، مولانا ازہری ندوی کی شخصیت ان میں سے ایک اور نمایاں تھی۔

وہ بھوپال دارالاقبال کے اس خانوادے کے چشم و چراغ تھے جس نے ریاست بھوپال میں شروع سے دینی واصلاحی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا، مولانا محمد عمران خاں ازہری ندوی اس خاندان کے گل سرسبد تھے اور مولانا حبیب ریحان خاں ان کے فرزند ارجمند ہی نہیں بجا طور پر سر لابیہ تھے، ۱۳/ اگست ۱۹۳۶ء کو وہ بھوپال میں پیدا ہوئے، خاندانی روایات کے مطابق تعلیم کی تکمیل دارالعلوم ندوۃ العلما سے کی، فراغت کے بعد کچھ عرصے کے لیے ندوہ اور تاج المساجد میں تدریسی خدمات انجام دیں، پھر مزید تعلیم کے لیے مصر کا رخ کیا، قاہرہ یونی ورسٹی اور عرب لیگ کالج سے گریجویشن کرنے کے بعد جامعہ ازہر سے عربی زبان وادب اور پھر اس کے شعبہ دینیات سے تخصص بھی کیا، عربی زبان وادب پر قدرت اس درجہ حاصل ہوئی کہ لیبیا میں عربی زبان کے استاد ہوئے اور قریب پچیس سال تک یہ خدمت پوری نیک نامی سے انجام دیتے رہے لیکن ان کی یہ بڑی خوبی ہے کہ دیار غیر میں اردو ماحول سے دور رہ کر بھی وہ اردو میں برابر لکھتے رہے، ان کی تحریر شروع سے بڑی سادہ اور بیساختہ رہی، مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان کی تحریروں کی قدر افزائی کی، ان کے رسالہ صدق میں ان کے خطوط تک مولانا دریابادی اہتمام سے شائع کرتے، کسی نوعمر لکھنے والے کے لیے یہ اعزاز کی بات تھی، برہان اور دوسرے رسائل میں بھی ان کے مضامین شائع ہوتے رہے، معارف میں ان کا پہلا مقالہ ۱۹۶۵ء میں ''یہود کی تصویر، قرآن اور بائبل میں'' کے عنوان سے دوقسطوں میں چھپا اور اس کے بعد ان کے مقالات برابر معارف کے صفحات کی زینت بنتے رہے، مثلاً پوپ کا وثیقہ اور اس کا تحلیلی تجزیہ، سر کے بالوں کی شرعی حیثیت، مولانا محمد علی جوہر کا مرثیہ از احمد شوقی مصری، عقیدہ توحید، مغربی افکار کی یورش اور علامہ شبلی کا کارنامہ، زکوۃ کا انفرادی واجتماعی نظام، اقبال کی علمی جستجو، تورات وانجیل کی دو بشارتیں جن کے مصداق حضور ﷺ ہیں، محمد ﷺ انسانیت کے معالج بائبل کی دو بشارتوں کی روشنی میں، حرم نبوی کے واردات ومشاہدات، عالم اسلام کی جامعہ ازہر کا حال، معارف میں شائع شدہ ان مقالات کے عنوانات سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ علم کا دائرہ کتنا وسیع، کتنا متنوع اور کتنا سنجیدہ تھا، ان کے علم اور ان کے مطالعہ کی وسعت کا حقیقی اندازہ

صرف ان ہی کو ہوسکتا ہے جو ان سے قریب رہے، علم کا ایسا استحضار، کلام وفقہ کے ساتھ زبان و ادب میں اب شاید اور خال خال ہی نظر آئے، استحضار کی برکت تھی کہ ان کا اشہب قلم نہایت سرعت سے قرطاس وقلم کی وادیوں کو طے کر لیتا، ان کی کتابوں کی فہرست خاصی طویل ہے، ان میں مطبوعہ تو کم ہیں غیر مطبوعہ بہت زیادہ ہیں، مطبوعات میں تخلیق انسانی کا مقصد، مغربی تہذیب کا انحطاط وعلاج، مسلم پرسنل لاء، اسلام عقائد اور خصوصیات، جذبات شوق، موزوں پر مسح، قرآنی دعائیں وغیرہ ہیں، کتابوں کی اشاعت کے لیے انہوں نے خود اپنا تصنیفی ادارہ قائم کیا، ۷۲ء میں اس کی بنیاد ان کی کتاب تخلیق انسانی کی اشاعت سے مولانا محمد عمران خاں ندوی نے رکھی، اس وقت اس کتاب کی رسم اجرا کا منظر بھی بھوپال کی علمی تاریخ میں یادگار بن گیا کہ اس میں شہر کی تمام دینی علمی اور ادبی ہستیاں جمع تھیں، میں اس وقت ابتدائی درجات کا طالب علم تھا لیکن مولانا محمد عمران خاں ندوی کی یہ بے پناہ محبت تھی کہ حلقہ طلبہ میں سے انہوں نے میرا انتخاب کیا، آج بھی وہ سارے منظر سامنے ہیں بعد میں یعنی ۹۱ء میں اس تصنیفی ادارے کی جدید عمارت کا افتتاح حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے دست مبارک سے ہوا، یہیں سے اسلام، خصوصیات اور عقائد شائع ہوئی جو مصر کے مشہور عالم ڈاکٹر شیخ محمد یوسف موسیٰ کی ایک کتاب کا جزوی ترجمہ ہے اور اس سے فاضل مترجم کی ترجمہ نگاری کی خوبی بھی واضح ہوتی ہے، لیبیا سے آنے کے بعد بھوپال میں ان کی زندگی مسلسل عمل سے عبارت رہی تصنیف و تالیف کے علاوہ وہ دارالعلوم تاج المساجد کے معتمد تعلیم کی حیثیت سے سرگرم عمل رہے تو ساتھ ہی اخبار بھوپال ٹائمز کے پروپرائٹر واڈیٹر بھی رہے، بھوپال کے علاوہ پورے ملک میں ان کی لیاقت کا اعتراف رہا، رابطہ ادب اسلامی، فیکلٹی آف تھیالوجی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، مسلم مجلس مشاورت، ملی کاونسل کے وہ موقر رکن بنائے گئے، بیرون ملک وہ برطانیہ کے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور ملیشیا کے انٹرنیشنل اسلامک کیلنڈر پروگرام کے بھی رکن رہے، صدر جمہوریہ کی جانب سے ان کو عربی زبان کی خدمت کے لیے سند اعتراف کے اعزاز سے بھی نوازا گیا، دارالمصنفین سے ان کی عقیدت کے لیے یہی کافی ہے کہ انکی سب سے عمدہ تحریریں معارف کے لیے وقف ہوئیں، اصل یہ ہے کہ ان کو علامہ شبلی سے عجب والہانہ محبت تھی، اس کا اظہار ان کی نجی محفلوں میں تو ہوتا ہی تھا، انہوں نے اس محبت کو پائندہ اس طرح بنایا کہ ان کی ہر کتاب میں انتساب صرف علامہ شبلی کے نام ہوتا، یہ انتساب سرنامہ کی حیثیت سے ان کی کتابوں کی پہچان بن گیا جس میں انہوں نے اپنی عقیدت کے پھول اس طرح نچھاور کیے کہ ''دارالتصنیف والترجمہ کا انتساب ندوہ تحریک کے روح رواں اور معمار حقیقی، دارالمصنفین کے موسس، اردو کے لافانی ادیب وشاعر، علوم اسلامیہ کے محقق اور سیرت نگار رسول اعظمؐ ''شبلی'' کے نام کرتے ہوئے مجھے فخر ومسرت ہے، شبلی کے نام اور کام کا سایہ علم و ادب کا ابر کرم بن کر میری اور بے شمار علما و ادبا کی تحریری خدمات سیرابی بخشتا رہا ہے'' پورے ایک صفحے کے انتساب کا یہ صرف ایک حصہ ہے، افکار و خیالات کے اظہار اور احقاق حق میں انہوں نے کبھی مصلحت دیکھی نہ وقت کی نزاکت کی پرواہ کی، ان کے بعض خیالات سے ان کے مخلص ترین متعلقین کو اختلاف بھی رہا بعض مسائل میں ان کے تفردات کے جواز کے لیے کافی حیلوں اور دلیلوں کی ضرورت ہے لیکن ان کی سوچ کی پاکی اور ان کے لہجے کی بے ساختگی، کبھی تلخی نہیں پیدا ہونے دیتی تھی، ان کے اسی معروضی مزاج نے ان کو علمی سیمناروں میں بڑی مقبولیت بخشی سچ یہ ہے کہ علمی مجالس میں ان کی موجودگی سے رونق میں اضافہ ہوتا تھا، خاندانی وجاہت، مالی فراغت، علمی اعزازات کی نعمت سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس دنیا میں نوازا اور حق یہ ہے کہ انہوں نے ان نعمتوں کی قدر اس طرح کی کہ کبھی ان کے چہرے یا عمل کی کسی ایک شکن سے بھی غرور اور پندار کی ایک جھلک بھی نہ ظاہر ہوئی، بھوپال کی زندہ دلی کی وہ تصویر تھے، آہستہ آہستہ وہاں کے کوہ و کمر اپنے کلیموں سے خالی ہوتے جاتے ہیں، شعلہ سینائی کی تجلیاں معدوم کیوں نہ ہوں؟ اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے۔

(''ع۔ص''، ستمبر ۲۰۰۹ء)

<u>رضوی، شیما</u>

محترمہ شیما رضوی

(اشتیاق احمد ظلی)

یہ سطریں لکھی جاچکی تھیں کہ اترپردیش اردو اکیڈمی کی سابق چیرمین محترمہ شیما رضوی کے اچانک انتقال کی خبر بھی آئی، سیاسی نظریات سے قطع نظر وہ دارالمصنفین کی قدرداں تھیں، مولانا اصلاحی مرحوم سے عقیدت رکھتی تھیں، ان سے اردو والوں کو توقعات بھی تھیں۔ وزارت اور اہم عہدوں کے حصول کے بعد بھی، خاندانی شرافت اور تربیت کے زیور سے آراستہ رہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب سے مغفرت ورحمت کا معاملہ فرمائے، آمین۔ (اگست ۲۰۰۹ء)

<u>دہلوی، اخلاق حسین قاسمی، مولانا / مئوی، عزیز الرحمٰن، حکیم</u>

<u>ازہری، مقتدی حسن، ڈاکٹر</u>

مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی / حکیم عزیز الرحمان مئوی / ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری

افسوس ہے کہ گذشتہ دنوں ہماری مجلس علم و دانش کو مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی، حکیم عزیز الرحمان مئوی اور ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری جیسی اہم شخصیتوں سے محروم

ہونا پڑا، قرآن مجید اور علوم دینیہ کی تبلیغ، تفہیم اور توسیع میں ان کی خدمات لائق تحسین رہیں، دارالمصنفین سے ان حضرات کا تعلق اخلاص و تعاون کا تھا، معارف میں ان تینوں کی نگارشات آتی رہیں، افسوس ہے کہ اب ان کی جگہ لینے والے نظر نہیں آتے، اللہ تعالیٰ ان تمام مرحومین کے حسنات کو قبول کرے اور جنت الفردوس کی نعمت سے نوازے، معارف میں ان کا ذکر تفصیل سے آنا چاہیے، آئندہ شماروں میں شاید یہ ضرورت پوری کی جاسکے۔ (’’ع۔ص‘‘، نومبر ۲۰۰۹ء)

احمد، اسرار، پروفیسر

پروفیسر اسرار احمد

(اشتیاق احمد ظلی)

مشہور سائنس داں اور مسلم یونیورسٹی کے ہر دل عزیز استاذ پروفیسر اسرار احمد ۱۲/ اپریل کو ایک طویل بیماری کے بعد انتقال کر گئے۔ تدفین اگلے دن یونیورسٹی قبرستان میں ہوئی۔ اس طرح حیات مستعار کا جو سفر ۱۹/ دسمبر ۱۹۴۰ء کو اعظم گڑھ کے ایک گاؤں مہوارہ کلاں سے شروع ہوا تھا اپنے اختتام کو پہنچا۔ ان کے انتقال سے ہندوستان کے مسلم معاشرہ میں سائنس کے میدان میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پر ہونا مشکل ہے۔ اسرار صاحب نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے اسکول میں پائی، ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ پاس کی بستی بشپ نگر سے کیا۔ ۱۹۵۹ء میں شبلی نیشنل کالج سے بی۔ ایس۔ سی کیا اور گورکھپور یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اس طرح ان کے مستقبل کی عظمت کی اساس یہیں پڑی۔ انہیں اس کالج سے بڑا تعلق خاطر تھا۔ ۱۹۶۱ء میں مسلم یونیورسٹی سے فزکس میں ایم۔ ایس۔ سی کیا اور پہلی پوزیشن حاصل کی۔ اسی سال بحیثیت لکچرر ان کا تقرر ہوگیا اور زندگی کا بڑا حصہ مادر علمی کی خدمت میں گزرا۔ ۱۹۸۴ء میں پروفیسر ہوئے اور ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۱ء تک صدر شعبہ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ملک اور بیرون ملک کئی باوقار سائنسی تحقیقی اداروں کے ممبر رہے۔ اپنی تحقیقات کے سلسلے میں بارہا بیرون ملک کا سفر کیا اور سائنس کے اعلیٰ تحقیقاتی مراکز میں کام کیا۔ مرکز فروغ سائنس کے بانی ڈائریکٹر اور تہذیب الاخلاق کے مدیر رہے۔ ۱۹۹۸ء میں یونیورسٹی سے ریٹائرمنٹ لے کر کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی، جدہ منتقل ہوگئے تھے۔ جب تک صحت نے اجازت دی اپنی تحقیقی سرگرمیوں میں اور وہاں سائنس کی اساس پختہ کرنے میں مصروف رہے۔

اسرار صاحب کے مطالعہ وتحقیق کا موضوع Theoretical Nuclear Physics تھا۔ Quantum Scattering Theory کے میدان میں ان کی تحقیقات اساسی اہمیت کی حامل تصور کی جاتی ہیں۔ آزادی کے بعد ہندوستان میں جن مسلم اسکالرز نے سائنس کے میدان میں امتیاز حاصل کیا ان میں اسرار صاحب کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ عالمی سطح پر ان کی تحقیقات کا اعتراف کیا گیا۔ ان کے علمی اکتسابات نے مادر علمی کے وقار کو بلند کیا۔ ریسرچ سے ان کی شیفتگی اس حد تک پہنچ چکی تھی جہاں ایک دانش جو کو نہ تو اپنی بیماری اور بے آرامی کا خیال رہتا ہے اور نہ دوسرے مسائل کا۔ دردکش دوا سے وقتی آرام مل جاتا اور وہ پھر ایک نشاط تازہ کے ساتھ کام میں لگ جاتے۔ اس کے دردناک اثرات وعواقب کا ادراک ہوا تو تلافی کا وقت گزر چکا تھا۔

ان کے مرتبہ کے ایک سائنس داں کی ترجیحات اس کے اپنے موضوع اختصاص اور اپنی تحقیقات تک محدود ہوتی ہیں۔ لیکن ہر اصول کے کچھ مستثنیات ہوتے ہیں اور اسرار صاحب ان ہی مستثنیات میں شامل تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی زندگی میں سائنس کی اہمیت اور اولیت کے ساتھ ساتھ ملت اور معاشرہ کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کا شعور بھی تھا۔ مسلمانان ہند کی زبوں حالی کے گہرے تجزیہ سے ان کو یہ یقین ہوگیا تھا کہ جب تک مسلمانوں کے درمیان سائنس کی تعلیم عام نہیں ہوگی اور مسلم معاشرہ میں سائنسی مزاج نہیں پیدا ہوگا اس وقت تک ان کے حالات میں کسی بڑی تبدیلی کا امکان نہیں ہوسکتا۔ مسلمان بچوں کی بڑی اکثریت ابھی مدارس میں تعلیم پاتی ہے۔ اگر مدارس میں سائنسی مضامین نصاب تعلیم کا حصہ بن جائیں اور اس ذمہ داری سے بحسن وخوبی عہدہ برا ہونے کے لیے مدارس کے اساتذہ کی ضروری حد تک تربیت کی جاسکے تو ملت کے اندر سائنس کی تعلیم کی ضرورت کا احساس پیدا کیا جاسکتا ہے اس ضرورت کی تکمیل کے لیے ان کی کوششوں سے ۱۹۸۵ء میں یونیورسٹی میں مرکز فروغ سائنس (Centre for Promotion of Science) کی داغ بیل پڑی اور وہ اس کے پہلے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۹۱ء تک انہوں نے یہ ذمہ داری جس طرح سنبھالی اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے لیے جو غیر معمولی مساعی کیں اور مدارس پر اس کے جو اثرات مرتب ہوئے ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ البتہ مدارس کے نصاب تعلیم میں عصری علوم کو شامل کرنے کی تحریک جس کی صداء بازگشت اب ہر طرف سنائی دیتی ہے اور اب تک تسلیم شدہ حقیقت بن چکی ہے اس کا آوازہ پہلے پہل ان ہی نے بلند کیا۔ دور حاضر میں علی گڑھ تحریک کے مقاصد کی توسیع واشاعت کی یہ ایک بڑی نمایاں اور اہم کوشش تھی۔

سرسیدؒ نے مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح کے لیے، جس کے بغیر ان کی ترقی کا کوئی تصور نہیں کیا جاسکتا تھا، ایک رسالہ کے اجراء کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس مقصد سے انہوں نے انگلینڈ سے واپسی کے فوراً بعد اور کالج کی تاسیس سے کئی سال پہلے ’’تہذیب الاخلاق‘‘ کی اشاعت شروع کی۔ علی گڑھ تحریک کے مقاصد کی توسیع واشاعت اور اس کے حق میں رائے عامہ کی تشکیل اور اصلاح معاشرہ کے میدان میں تہذیب الاخلاق نے جو کلیدی کردار ادا کیا وہ اب تاریخ کا حصہ ہے۔ اس رسالہ کے بند ہونے کے ایک صدی بعد جناب سید حامد کی مساعی سے سرسید کی اس تاریخی یادگار کی ۱۹۸۱ء میں پھر

اشاعت شروع ہوئی۔ اسرار صاحب کی متنوع اور گوناگوں صلاحیتوں اور مسلم معاشرہ کی اصلاح کے تئیں ان کی گہری دلچسپی کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ انہوں نے اس رسالہ کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی اور کئی سال تک بحسن وخوبی اسے نبھایا۔ ان کے اداریے ملی مسائل کے سلسلہ میں ان کی گہری سوچ اور فکرمندی کے غماز ہوتے تھے۔ ان کی شستہ اردو تحریریوں کو دیکھ کر یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ یہ تھیوریٹکل نیوکلیر سائنٹسٹ کے قلم سے نکلی ہیں۔ انتظامی سطح پر اس رسالہ کی مضبوط بنیادیں فراہم کرنے کے باب میں انہوں نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔

اسرار صاحب کی شخصیت کی کئی جہات تھیں اور ان کی علمی دلچسپیاں متنوع اور گوناگوں تھیں۔ چونکہ دیانت داری اور اخلاص ان کی شخصیت کے عناصر ترکیبی میں شامل تھے اس لیے انہوں نے جو کام بھی کیا پوری طرح اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کی اور وہ اس میں کامیاب بھی رہے، البتہ اس ضمن میں یہ خیال ضرور آتا ہے کہ اگر ان کے موضوع اختصاص سے یکسر الگ ذمہ داریاں نہ سونپی گئی ہوتیں جن کی انجام دہی میں ان کو اپنی صلاحیت اور وقت کا معتد بہ حصہ صرف کرنا پڑا اور اس کے نتیجہ میں ان کو وہ یکسوئی اور دل جمعی بھی حاصل نہ رہی جو نظریاتی سائنس جیسے موضوع پر ریسرچ کے لیے ناگزیر تھی، تو انہوں نے اپنے موضوع پر اور بھی بہت کچھ گراں قدر تحقیقات یادگار چھوڑی ہوتیں۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ کام کرنے والوں سے توقع کی جاتی ہے کہ ہر کام وہی کریں۔ اس کے نتیجہ میں وقت اور صلاحیت کا جو ضیاع ہوتا ہے اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔

اپنے علمی اور تحقیقی کمالات اور اکتسابات سے قطع نظر اسرار صاحب ایک نہایت شریف النفس انسان تھے۔ شرافت، مروت اور وضع داری ان کی شخصیت کے امتیازی پہلو تھے۔ وہ دوستوں کے دوست تھے لیکن دشمن کسی کے بھی نہیں تھے۔ جن لوگوں سے ان کو تکلیف پہنچتی تھی ان کے ساتھ بھی وہ ہمیشہ اچھائی کا معاملہ کرتے ان سے فیض تو بہتوں کو پہنچا لیکن دانستہ انہوں نے نقصان شاید کسی کو بھی نہ پہنچایا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو غیرمعمولی قوت برداشت عطا کی تھی۔ دوسروں کا نقطہ نظر بڑی فراخ دلی سے سنتے اور اس کو مناسب وزن دیتے۔ بڑے ہر دل عزیز استاد تھے۔ طلبہ سے بڑی شفقت کا برتاؤ کرتے اور ان کی مدد کے لیے ہمیشہ تیار رہتے۔ طلبہ ان کی شاگردی کو قابل فخر تصور کرتے تھے۔ قحط الرجال کے اس دور میں ایک ایسی شخصیت کا اٹھ جانا ایک بڑا سانحہ ہے۔

ذاتی طور پر میرے لیے ان کی رحلت ایک بڑا سانحہ ہے۔ پانچ دہوں پر محیط عرصہ میں زندگی میں بہت سے نشیب وفراز ہوئے لیکن ان کی محبت اور شفقت ہمیشہ ویسے ہی حاصل رہی۔ شبلی کالج کے اس مایہ ناز فرزند کو شبلی کی علمی یادگار دارالمصنفین سے بڑا تعلق خاطر تھا۔ ان دونوں اداروں سے تعلق خاطر کے باعث وہ مشہور سائنس داں ڈاکٹر عبدالسلام کو، جن سے ان کے گہرے مراسم تھے، اعظم گڑھ لے گئے تاکہ مسلمانان ہند کے ان دو بڑے اداروں کو دیکھ سکیں۔ آخری دنوں میں بیماری کی شدید تکلیف کے باوجود انہوں نے دارالمصنفین کو یاد رکھا اور اس کی مدد کے لیے کچھ عملی اقدامات بھی کیے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی کمیوں سے درگزر فرمائے اور ان کے درجات کو بلند فرمائے۔ (مئی ۲۰۱۰ء)

آرزو، مختارالدین، پروفیسر

آہ! پروفیسر مختارالدین احمد آرزو مرحوم

دارالمصنفین اور دنیائے علم وتحقیق کے لیے یہ خبر بڑی اندوہ ناک رہی کہ ۳۰/جون ۲۰۱۰ء کو مشہور محقق، مدون اور عالم پروفیسر مختارالدین احمد آرزو نے اس جہاں فانی کو الوداع کہا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

وہ اس بزم دوشیں کے گویا آخری رکن تھے جس میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، امتیاز علی عرشی اور مالک رام جیسے اہم نام شامل ہیں، ۱۴/نومبر ۱۹۲۴ء میں ان کی زندگی کا سفر پٹنہ سے شروع ہوا جس کی آخری منزل علی گڑھ کی سرزمین قرار پائی، عمر بھر کی بے قراری کے لیے قرار یہیں مقدر تھا۔ ان کے والد مولانا ظفرالدین قادری خود جید عالم اور صاحب تصانیف کثیرہ اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے شاگرد رشید تھے، سلسلہ نسب شیخ عبدالقادر جیلانی تک پہنچتا ہے، اجداد میں سید ابراہیم نامی بزرگ، سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد میں ہندوستان آئے اور سپہ گری میں نمایاں حیثیت حاصل کی، بزرگوں کی اعلیٰ روایات کی پاسبانی نسل درنسل ہوتی رہی، ننہال بہار کی مشہور اور نیک نام بستی استھانواں میں تھا، پہلا نام غلام معین الدین رکھا گیا لیکن بعد میں وہ مختارالدین احمد ہوئے، والدہ کی آرزو تھی کہ بیٹا جامعہ ازہر تک جائے، یہ آرزو عالمی جنگ کی وجہ سے پوری نہ ہوئی لیکن علم وتحقیق کی طلب میں وہ خود مکمل آرزو بن گئے۔

والد بزرگوار سے تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا جو شمس الہدیٰ سے ہوتا ہوا مدرسہ بورڈ کے فاضل حدیث کی سند تک دراز ہوا، لیکن طلب علم کی آرزو کے لیے یہ کافی نہیں تھا، انھوں نے جدید تعلیم کے لیے مسلم یونیورسٹی کا رخ کیا، ڈاکٹریٹ کی سند لی، پی ایچ ڈی کے مقالے کی رہنمائی کے لئے عبدالعزیز میمن جیسی باکمال ہستی نصیب ہوئی، نتیجہ یہ ہوا کہ عربی زبان کی معلّمی وہیں ملی جہاں اب تک طالب علمی کی زندگی تھی لیکن یہ زندگی رکتی کہاں ہے، اسی سال وہ آکسفورڈ گئے، جہاں مشہور مستشرق پروفیسر گب سے تلمذ کا موقع ملا، واپس آئے تو مزید ترقیاں منتظر تھیں، شعبہ اسلامیات میں ریڈر ہوئے بعد میں شعبہ عربی میں پروفیسر ہوئے۔ صدر شعبہ بنے، ڈین بنے، وظیفہ یاب ہوئے لیکن ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہوئے۔ بہار میں مولانا مظہرالحق یونیورسٹی قائم ہوئی تو اس کے بجا طور پر پہلے چانسلر ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ تعلیم وتدریس کی مسلسل مصروفیت

کے باوجود تحقیق و تدوین کے لیے خدا جانے کہاں سے ان کے وقت میں برکت آئی کہ بقول مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم ''پوری علمی و تعلیمی زندگی میں اصل سروکار عربی زبان سے رہا اور مدت العمر اسی میں تصنیف و تالیف اور تحقیق و جستجو کرتے رہے''، یہ بات اس لحاظ سے بالکل درست ہے کہ **المجمع العلمی الهندی** کا قیام ہو یا اس کے مجلّہ کا اجرا ہو، **المختار من شعر ابن الدمینه، قصیدة الاعشی الکبیر فی مدح النبی** صلی اللہ علیہ وسلم جیسے نوادر مخطوطات کی تدوین ہو یا **الحماسة البصریه الصدر الدین علی بن ابی الفرج البصری، رسالة المبرد النحوی، کتاب مجالس المیمنی** اور **دیوان شعر الامیر موید الدوله اسامه بن منقذ الکنای الشیرازی** کی ترتیب و تعلیق ہو، ان کا زیادہ سروکار عربی زبان و ادب سے رہا، لیکن اردو میں بھی ان کا تحقیقی سرمایہ کم نہیں، خصوصاً نایاب مخطوطات کی تلاش اور پھر ان کی تدوین میں کربل کتھا، تذکرہ آزردہ، تذکرہ شعرائے فرخ آباد، دیوان حضور عظیم آبادی اور تذکرۂ حیدری ان کے کارناموں میں شامل ہیں، تذکرہ حیدری کا مخطوطہ ان کو کیسے حاصل ہوا، اس کی تفصیل دراصل ان کے ذوق جستجو کی صحیح تصویر ہے، پروفیسر گب نے ایک دن باڈلین لائبریری میں جب یہ نادر نسخہ ان کو پیش کیا تو یہ کہہ کر کہ ''تم اس کتاب کو دیکھنے کی ایسی سخت جدوجہد نہ کرتے تو غالباً یہ کتاب کسی گوشے میں اب بھی پڑی رہتی''، آرزو صاحب نے لندن جا کر برٹش میوزیم کے ایک نسخے سے اس کا مقابلہ کیا اور جب یہ ۱۹۶۶ء میں چھپی تو پہلی بار اردو دنیا کو معلوم ہوا کہ سید حیدر بخش دہلوی کا یہ کارنامہ کس شان کا ہے اور اس سے زیادہ آرزو صاحب کے حواشی کس قدر قیمتی ہیں۔

اردو کے اعلیٰ محققین کے لیے غالب ناگزیر ہیں، آرزو صاحب نے غالبیات میں دلچسپی لی تو ذکر غالب، نقد غالب اور احوال غالب جیسی کتابوں نے ان کو ماہرین غالب کی صف میں سرفراز کر دیا، احوال غالب دراصل اس علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر کے مضامین کی کتابی شکل ہے جس کو آرزو صاحب نے زمانہ طالب علمی میں مرتب کر کے اپنی شہرت کی بنیاد رکھی تھی، اس کے علاوہ نوادر غالب کے نام سے انہوں نے مرزا غالب کے وہ سارے رقعات و مکاتیب اپنے مفید حواشی سے جمع کیے جو کہیں اور مجموعی طور پر شائع نہیں ہوئے تھے بلکہ پرانے اخباروں، بیاضوں یا پھر قدیم مجموعوں میں شامل تھے، اکبر الہ آبادی کے مکاتیب کو بھی انھوں نے جمع کیا اور نور الحسن نقوی کی اطلاع کے مطابق عبدالحق (بابائے اردو؟) پر ان کی کتاب کا کئی زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا، ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں ذرا تھکتے نہیں تھے، اہل علم سے جتنی اور جیسی خط و کتاب ان کی رہی، اس کی مثال شاید ہی ملے، غالب نمبر کے لیے انہوں نے دتاتریہ کیفی، مالک رام، منشی مہیش پرشاد، قاضی عبدالغفار اور قاضی اختر جوناگڑھی جیسے مشاہیر سے زمانہ طالب علمی میں جس طرح مراسلت کی وہ ہمارے آج کے اسکالروں کے لیے قابل تقلید مثال ہے، پروفیسر محفوظ الحق کے نام ان کے خطوط ۱۹۳۹ء کے ہیں یعنی صرف پندرہ سال کی عمر میں انہوں نے دیوان صائب کے متعلق پروفیسر حق کو اس قدر متاثر کیا کہ انہوں نے خدابخش لائبریری میں کچھ کام کے لیے ان سے امداد کی درخواست کی، سترہ سال کی عمر میں انہوں نے مخطوطات کی نمائش اور وہ بھی بہار میں، یہ ۱۹۴۲ء کا ایک عجیب واقعہ ہے''، ان کے نام سے منسوب علامہ سید سلیمان ندویؒ کا ایک خط نقوش کے مکاتیب نمبر میں شامل ہے جس کا سن کتابت ۱۹۲۵ء ہے لیکن ۱۹۲۴ء میں پیدا ہونے والے کے نام یہ خط ممکن ہی نہیں، ۱۹۳۵ء مان لیا جائے تو محض گیارہ سال کی عمر میں سید صاحبؒ کا ان کو یہ کہہ کر خطاب کرنا کہ ''صدیقی الفاضل الاعزا الکریم'' حیرت انگیز ہے، لیکن یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا تعلق سید صاحبؒ سے بھی تھا اور شاید یہی وجہ ہے کہ دارالمصنفین اور معارف سے ان کا ربط و تعلق برابر قائم رہا، قصیدة الاعشی پر ان کا ایک مقالہ معارف میں ملتا ہے لیکن انہوں نے معارف کو کثرت سے خطوط لکھے، ایک بار مولانا گیلانی کا ایک نادر خط حاصل کر کے معارف کے قارئین کی نذر کیا، سید صاحبؒ سے اس خاکسار تک دارالمصنفین کی چار نسلوں سے ان کا یہ تحریری تعلق بجائے خود نہایت قدر کے لائق ہے اور ہوا بھی یہی کہ ان کو معارف کی مجلس ادارت میں شریک کیا گیا، مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم نے ان کی عربی و علمی تحقیقات کو شایان شان خراج عقیدت پیش کیا، یہ مقالہ مولانا کی وفات کے بعد ان کی آخری مطبوعہ تحریر کی شکل میں معارف کی دو قسطوں میں شائع ہوا جس سے آرزو صاحب کے علمی مرتبہ و مقام کا اصل تعین آسان ہو جاتا ہے، اور ایک فنافی العلم ایسی شخصیت کا ادراک ہوتا ہے جو ہندوستان ہی نہیں، دوسرے متعدد ملکوں کی خاک چھان کر علم و حکمت کے بکھرے ہیرے جمع کرتی رہی، مدت العمر کی اس جاں فشانی کی قدر ان کی زندگی میں اہم اعزازات سے کی گئی اور یقین ہے کہ قرآن مجید کی زبان کی خدمت کا بہترین صلہ اور رحمت حق کے جوار کا اعزاز بھی ان کو حاصل ہوگا، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ (''ع۔ص''، جولائی ۲۰۱۰ء)

ستمبر ۲۰۱۰ء

شعبہ مالیات کے امین

افسوس ہے کہ ۱۴؍ستمبر کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شعبہ مالیات کے امین و معتمد، دنیوی زندگی کی امانت کو ادا کرنے کے بعد اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، وہ استاذ الاساتذہ محمد سمیع صدیقی مرحوم کے صاحبزادے تھے جن کا تعلق ندوے سے مکانی ہی نہیں روحانی بھی ہمیشہ رہا، وہ ندوہ اور خصوصاً مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے عاشقوں میں تھے اور خود ایک باکمال اہل قلم تھے، ایسے باکمال کا اٹھ جانا بڑا سانحہ ہے، اللہ تعالیٰ

ان کے حسنات کو قبول فرما کر بلند درجات سے نوازے۔ (''ع۔ص''، ستمبر ۲۰۱۰ء)

خالدی، عمر، ڈاکٹر

ڈاکٹر عمر خالدی

(اشتیاق احمد ظلی)

ڈاکٹر عمر خالدی ۲۹؍نومبر کو بوسٹن میں ایک حادثہ میں جاں بحق ہوگئے۔ اِنا للہ وَ اِنا اِلیہ رَاجِعُون۔ ان کے انتقال سے ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر سنجیدہ علمی تحقیق کے میدان میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پر ہونا مشکل ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی صورت حال اور ان کو درپیش مسائل پر جس انداز اور معیار کا تحقیقی کام انہوں نے انجام دیا وہ غیر معمولی ہے۔ وہ ایک مدت سے ان مسائل سے بہت دور امریکہ میں مقیم تھے اور وہاں ایک باوقار ادارہ سے وابستہ تھے۔ مادی نقطہ نظر سے ایک پر مسرت اور مطمئن زندگی گزارنے کے لیے ان کو وہ سب کچھ حاصل تھا جس کی عام طور پر تمنا کی جاتی ہے لیکن اس آسودگی اور فارغ البالی کو انہوں نے زندگی کا مقصد اور مطمح نظر نہیں بنایا بلکہ دستیاب وسائل کو ایک بڑے مقصد کے حصول کے لیے استعمال کیا جو ان کو بہت عزیز تھا اور دراصل جس سے ان کی زندگی عبارت تھی۔ وطن عزیز میں مسلمانوں کی صورت حال پر ان کا دردمند اور حساس دل بے قرار رہتا تھا اور ان پر گزرنے والے نامہربان موسموں کی تپش وہ وہاں محسوس کرتے تھے۔ اس صورت حال پر کڑھنے اور زمانے کا شکوہ کرنے کے بجائے انہوں نے یہ طے کیا کہ دنیا کے سامنے ایک ایسا آئینہ رکھ دیا جائے جس میں ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل اور ان پر گزرنے والے آلام و مصائب کی صحیح تصویر نظر آجائے۔ چنانچہ انہوں نے اس مسئلہ کو اپنی تحقیق وجستجو کا موضوع بنایا اور یہ کام اس دیدہ ریزی اور ژرف نگاہی سے انجام دیا کہ اس سے زیادہ کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ ان کی تحقیقات پختہ اور ناقابل تردید دلائل وشواہد پر استوار ہوتی تھیں۔ یہ بڑا مشکل کام تھا لیکن وہ اس کے صبر آزما تقاضوں سے بڑی کامیابی سے عہدہ برا ہوئے۔ یہ ان کی دردمندی اور لیاقت دونوں کا ثبوت ہے۔ اس طرح ہندوستانی مسلمانوں سے متعلق ایک نیا لٹریچر سامنے آیا۔ اس کا پورا کریڈٹ عمر خالدی کو جاتا ہے۔

ڈاکٹر عمر خالدی ۱۹۵۳ء میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت سے پانچ سال سے پہلے ریاست حیدرآباد کا انڈین یونین میں انضمام ہوچکا تھا۔ پولیس ایکشن کے نتیجہ میں وہاں کی مسلم آبادی ابتلا و آزمائش کے جس دور سے گزری تھی اس کے اثرات ابھی وہاں کی فضا میں باقی رہے ہوں گے۔ اسی فضا میں انہوں نے احساس و شعور کی آنکھیں کھولیں اور ممکن نہ تھا کہ ان کا تاثر پذیر دل و دماغ اس سے متاثر نہ ہوتا۔ اپنی آئندہ زندگی میں انہوں نے جو کام کیے اور جن مقاصد کے لیے اپنی توانائیاں صرف کیں ان کو شاید کسی نہ کسی درجہ میں ان کے عہد طفولیت میں حیدرآباد میں پائی جانے والی فضا اور اس کے نتیجہ میں ان کے دل و دماغ پر مرتسم ہونے والے اثرات میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم حیدرآباد میں ہوئی اور اعلیٰ تعلیم امریکہ اور انگلینڈ میں۔ تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ دنوں کنگ سعود یونیورسٹی ریاض میں کام کیا پھر مستقل طور پر امریکہ منتقل ہوگئے اور میساچوسٹ انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی (MIT) سے وابستہ ہوگئے اور آخر تک وہیں رہے۔ علم و تحقیق کا ذوق والد ماجد سے ورثہ میں ملا۔ ان کے والد پروفیسر ابونصر محمد خالدی اسلامیات کے اچھے عالم اور عثمانیہ یونیورسٹی سے وابستہ تھے۔ ڈاکٹر عمر خالدی نے دو درجن سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں۔ خاص طور سے ہندوستانی مسلمانوں سے متعلق ان کی کتابوں نے بڑا قبول عام حاصل کیا اور ان کے اثرات وسیع پیمانہ پر محسوس کیے گئے۔ ان کی ابتدائی کتابیں حیدرآباد سے متعلق تھیں۔ ان میں اسٹیٹ آف حیدرآباد آفٹر دی فال (State of Hyderabad After the Fall) نے خاص طور سے بڑی شہرت حاصل کی۔ پولس ایکشن اور ریاست حیدرآباد کے انڈین یونین میں انضمام کے نتیجہ میں وہاں کی مسلم آبادی پر جو کچھ گزری اس کی داستان وقت کی گرد میں دب کر رہ گئی تھی اور منضبط انداز میں اس کی مکمل تصویر سامنے نہیں آسکی تھی۔ ڈاکٹر خالدی نے پنڈت سندرلال کمیشن کی رپورٹ کی روشنی میں پہلی بار اس کی تفصیلات سے دنیا کو آگاہ کیا۔ یہ کتاب ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ گو حیدرآباد سے ان کی دلچسپی آخر تک قائم رہی اور انہوں نے اس تعلق سے کئی کتابیں تصنیف کیں اور اسی وجہ سے انہیں حیدرآباد کے سوانح نگار (Chronicler of Hyderabad) کے نام سے موسوم کیا گیا، لیکن پھر ان کی دلچسپی کا دائرہ ہندوستانی مسلمانوں اور ان کے مسائل تک وسیع ہوگیا۔ اس سلسلہ میں ان کی پہلی کتاب فسادات میں آرمی، پولیس اور دوسرے پیراملٹری دستوں کے کردار کے بارے میں تھی۔ Khaki and Ethnic violence in India: Army, Police and Paramilitary Forces During Communal Riots. ۲۰۰۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل سے متعلق مطالعات اور تحقیقات کے میدان میں ایک بڑی پیش رفت تھی اور مدتوں بحث و مباحثہ کا موضوع اور ہندو انتہاپسند تنظیموں کی شدید تنقید کی ہدف بنی رہی۔ اس سلسلہ کی ان کی دوسری بہت اہم کتاب Muslims in Indian Economy جو ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئی اپنے موضوع پر ایک دستاویز کی حیثیت اختیار کرچکی ہے۔ ان کتابوں میں جو بات بھی کہی گئی ہے پختہ شواہد اور دلائل کی بنیاد پر کہی گئی ہے۔ مختلف حکومتی اداروں کے ذریعہ مسلمانوں کے خلاف جس طرح امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے ان کتابوں کے ذریعہ اس کی ایک نہایت واضح اور موثر تصویر سامنے آجاتی ہے۔ ان کتابوں کے اثرات وسیع پیمانے پر

محسوس کیے گئے۔ اگرچہ اس کا کھلے طور پر کبھی اعتراف نہیں کیا گیا لیکن یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ سچر کمیٹی کی طرف سے ملٹری میں ملازمت کرنے والے مختلف مذاہب کے پیروؤں کے عددی تناسب کے بارے میں جو معلومات دریافت کی گئی تھیں اس کی محرک دراصل ڈاکٹر عمر خالدی کی ثانی الذکر کتاب تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ فرقہ پرستوں کی زد پر رہے۔ انتقال سے کچھ دنوں پہلے آزادی کے بعد ملک میں اردو کے بارے میں پائی جانے والی صورت حال کے بارے میں برسوں کی محنت کے بعد ایک رپورٹ Urdu Report کے نام سے مرتب کی تھی۔ یہ رپورٹ انٹرنیٹ پر تو دستیاب کرادی گئی تھی لیکن ابھی شائع نہیں ہوسکی تھی۔ اس کتاب میں آزادی کے بعد سے اب تک اردو پر جو کچھ گزاری اس کی تفصیل کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں اردو کی تعلیم و تدریس کی صورت حال کا اعداد وشمار اور معتبر دستاویزی شواہد کی روشنی میں بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا گیا ہے۔

ان مسائل پر وہ جرائد اور اخبارات میں بھی برابر مضامین لکھتے رہتے تھے۔ ان خالص علمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ وہ امریکہ میں ہندوستانی مسلمانوں کی مختلف انجمنوں کے کاموں میں بھی پوری دلچسپی سے شریک ہوتے تھے۔ ابھی گزشتہ دنوں ۹، ۱۰/ اپریل ۲۰۱۰ء کو انہوں نے MIT میں Group Violence, Terrorism and Impunity - Challenges to Secularism and Rule of Law in India کے موضوع پر ایک کامیاب سمینار کا انعقاد کیا تھا۔ راقم حروف کا ان سے ۲۰۰۲ء سے ای۔میل اور فون کے ذریعہ رابطہ تھا۔ دارالمصنفین سے ان کو بڑا تعلق خاطر تھا۔ گزشتہ دنوں انہوں نے معارف کی پوری فائل منگوائی تھی۔ اس سلسلہ میں ان کے ذہن میں کوئی خاص منصوبہ تھا۔ ابھی جلد ہی کیمبرج یونیورسٹی کے اسلامی مخطوطات پروگرام (MITA) کے بورڈ آف ڈائرکٹرس پر ان کا تقرر ہوا تھا۔ اس منصوبہ کے تحت وہ دارالمصنفین میں محفوظ مخطوطات کی حفاظت اور دیکھ ریکھ کے لیے اس فنڈ سے گرانٹ منظور کرانے کے لیے کوشاں تھے۔ اگلے سال انہوں نے ملاقات کی ایک سبیل پیدا کی تھی لیکن اس سے پہلے ہی ان کی وقت موعود آگیا اور اب ان سے ملنے کی خواہش زندگی کی حسرتوں میں شامل ہوچکی ہے۔ الھم ارحمہ وادخلہ فسیح جناتک۔

(دسمبر ۲۰۱۰ء)

مرغوب الرحمٰن، مولانا

مولانا مرغوب الرحمٰن

گزشتہ دنوں کا ایک بڑا مذہبی اور تعلیمی حادثہ، دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مولانا مرغوب الرحمٰن کی وفات ہے، وہ ہمارے بزرگوں کی اس صف میں تھے جو اخلاص، تقویٰ، اللّٰہیت کی خوبیوں سے آراستہ تھی، اس کے ساتھ تدبیر اور نظم ونسق کی قوت میں بھی وہ ممتاز تھے، ان کی پیرانہ سالی اور امراض جسمانی کو دیکھا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ وہ دارالعلوم جیسے بڑے ادارے کے بارگراں کو کس طرح اٹھائے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ اعلیٰ علیین میں جگہ دے اب ایسے بزرگوں کا نعم البدل تو کیا بدل بھی مشکل سے ملے گا۔

(جنوری ۲۰۱۱ء)

غازی، محمود احمد، ڈاکٹر

ڈاکٹر محمود احمد غازی

ایک اور افسوس ناک خبر ڈاکٹر محمود احمد غازی کی وفات کی ہے، علوم اسلامیہ اور جدید عصری تقاضوں کی نزاکت واہمیت سے باخبری ان کی امتیازی خصوصیت تھی، ان کی اردو، عربی اور انگریزی کتابوں سے ان کی فکر ونظر نمایاں ہے، پاکستان میں وہ اعلیٰ علمی عہدوں پر فائز رہے لیکن ان کا تواضع و انکسار کبھی ان سے جدا نہیں ہوا، ۸۲ء میں ''اسلام اور مستشرقین'' سمینار میں تشریف لائے، اسلام آباد سے اعظم گڑھ تک اس راہ نوردی کو سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے دارالمصنفین سے والہانہ عشق سے تعبیر کیا تھا، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

(جنوری ۲۰۱۰ء)

ظفیر الدین، مولانا مفتی

مفتی ظفیر الدین مرحوم

افسوس کہ مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی اس دنیا سے ۳۱/ مارچ کو رخصت ہوگئے۔ ان کے انتقال سے ایک ایسی شخصیت سے محرومی کا احساس ہوا جس کی ساری زندگی علوم اسلامیہ کی تحصیل، ترویج اور تبلیغ کے لیے وقف رہی۔ مفتی کا لفظ گویا ان کے نام کا جزو ہوگیا، کیونکہ وہ دارالعلوم دیوبند کے دارالافتاء سے برسوں وابستہ رہے لیکن اصلاً وہ صاحب قلم عالم تھے، تصنیف و تالیف کی خوبی کہنا چاہئے ان میں بدرجۂ اتم موجود تھی، دیوبند کے فتاوی کی ایک درجن جلدوں کو انہوں نے بڑے سلیقے سے مرتب کیا لیکن علمی دنیا میں ان کی شناخت بلکہ اعتبار واعتماد، اسلام کا نظام عفت وعصمت، اسلام کا نظام مساجد، اسلام کا نظام امن، اسلامی نظام معیشت جیسی نہایت مفید اور معلومات سے لبریز کتابوں سے قائم ہوا۔ نظام مساجد کی تالیف میں ان کو مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہم اللہ کی توجہ اور رہنمائی حاصل ہوئی، انہوں نے جس سلیقے اور محنت سے یہ کتاب سپرد قلم کی اور معلومات کا قیمتی ذخیرہ اس میں جمع کیا اس کی داد مولانا گیلانی نے یہ کہہ کردی کہ ''عربی میں شام کے ایک عالم جمال الدین القاسمی کی کتاب اس باب میں مشہور تھی مگر خیال ہے

کہ احتواء واحاطہ میں مولانا ظفیر الدین کی کتاب کو دیکھ کر کم ترک الاول للاخرہ، کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، اسی طرح ان کی ایک کتاب حیات مولانا گیلانی پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے لکھا کہ فاضل مصنف کی اس کتاب پر پیش لفظ لکھنے میں سعادت وعزت کا جو احساس اور قلبی مسرت حاصل ہورہی ہے وہ کم مواقع پر حاصل ہوئی، مولف کی ایک کتاب امارت شرعیہ کے مقدمے میں حضرت مولانا علی میاں نے لکھا کہ امارت کی تاریخ نگاری مشکل اور نازک کام تھا اور اس کے لیے مفتی صاحب ہر طرح سے اہل ہیں۔ اسی میں یہ جملہ بھی ہے کہ ''اگر مجھے ہندوستان کے کسی صوبے پر رشک آتا ہے تو بہار پر اور اگر بہار پر رشک آتا ہے تو امارت شرعیہ کی وجہ سے'' مفتی صاحب کی کئی اور کتابیں ہیں، مستند ومعتبر حوالوں سے معلومات کی فراہمی اور اسلوب کی سادگی ان سب میں نمایاں ہے اور اس لحاظ سے وہ گویا دبستان شبلی وندوہ کے نمائندے تھے، عملاً وہ دیوبند وندوہ کے بزرگوں سے قریب تر رہے، دارالمصنفین سے بھی مخلصانہ تعلق رہا، ان کے کئی خطوط معارف میں چھپے اور مطبوعات جدیدہ میں ان کی کتابوں کا ذکر خیر رہا۔ ۱۹۲۶ء میں دربھنگہ کے ایک گاؤں پورہ نوڈیہا میں پیدا ہوئے یعنی قریب ۸۵ سال کی عمر میں جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو ان کا دل ضرور مطمئن ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی صلاحیتوں کو قبولیت و برکت عطا فرمائی۔ علم کے ساتھ وہ حسن عمل کا بھی نمونہ تھے، سادگی، تواضع اور انکسار نے ان کی شخصیت کو جاذبیت عطا کردی تھی۔ فقہ اکیڈمی کی صدارت، مسلم پرسنل لابورڈ کی تاسیسی اور امارت شرعیہ کی مجلس شوریٰ کی رکنیت ان کی قابلیت اور اہلیت کا اعتراف ہے، یقین ہے کہ حسن قبول کی یہ دولت بارگاہ الٰہی سے بھی ان کو عطا ہوگی، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔ (''ع۔ص''، اپریل ۲۰۱۱ء)

لاری، احمر، ڈاکٹر

ڈاکٹر احمر لاری مرحوم

۲۸/ فروری کو پروفیسر احمر لاری بیاسی برس کی عمر میں اپنے خالق حقیقی سے جاملے، اِنّا للہ وَاِنّا اِلَیہ رَاجِعُون۔ وہ گورکھپور یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے تعلق رکھنے والے قابل اور محنتی استاد تھے جن سے ان کا شعبہ، ملک میں معروف ہوا اور وہ خود پروفیسر محمود الٰہی جیسے لائق ترین صدر شعبہ کی سرپرستی و رہنمائی میں ملک کے اچھے لکھنے والوں میں شمار ہوئے۔ بظاہر نحیف ونزار بیمار نظر آتے لیکن قلم بڑا توانا تھا۔ حسرت موہانی ان کی تحقیق کا مرکز رہے، ان کا تحقیقی مقالہ جو بعد میں کتاب کی شکل میں شائع ہوا ان کی غیر معمولی محنت سے اپنے موضوع پر اسی طرح مصدر ومرجع بن گیا جیسا خود ان کے ایک رفیق پروفیسر افغان اللہ خاں مرحوم کا فراق پر مقالہ تھا، حسرت موہانی سے ان کا یہ تحقیقی تعلق، مستقل رشتے میں یوں بدلا کہ انہوں نے حسرت موہانی کے تذکرہ شعراء اور ارباب سخن کو بھی مرتب کرکے شائع کیا۔ ارباب سخن کا مقدمہ ان کی تنقیدی صلاحیت کا بڑا خوبصورت آئینہ ہے جس میں اردو تذکرہ نگاری کا انہوں نے جامع اختصار سے جائزہ لیا ہے۔

ان کی کتابوں میں گلدستۂ نازنیناں، نکات سخن، غالب اور غالبیات اور اردو تنقید کا ارتقاء، نام بھی آتے ہیں۔ انہوں نے مختصر تاریخ گورکھپور بھی مرتب کی۔ ان کا اصل قصبہ لار تھا لیکن انہوں نے پیمان وفا گورکھپور سے ایسا باندھا کہ بالآخر اسی کی خاک کا حصہ ہوئے۔ بیماری آزاری کے باوجود وہاں کی علمی وادبی مجلسوں میں ضرور شریک ہوتے، پروفیسر افغان اللہ خاں مرحوم کے بعد ان مجلسوں میں ان کے دم سے رونق تھی۔ افسوس ان کے جانے کے بعد ویرانی کا احساس اور زیادہ ہوگا کہ محض علم وادب کا ایک شیدائی ہی نہیں ایک ملنسار، غمگسار اور دیندار انسان بھی رخصت ہوگیا، دارالمصنفین اور معارف سے بڑا والہانہ تعلق تھا۔ وہ جب اعظم گڑھ آتے تو دارالمصنفین ضرور تشریف لاتے، جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم سے ہمیشہ مخلصانہ روابط رہے۔ اللہ تعالیٰ ہر طرح مغفرت فرمائے۔ (''ع۔ص''، اپریل ۲۰۱۱ء)

افشار، ایرج

جناب ایرج افشار کی رحلت

(رئیس احمد نعمانی)

پوسٹ بکس نمبر ۱۱۴،
علی گڑھ (ہند) ۲۰۲۰۰۱۔

برادر گرامی مراتب زید مناصبکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

۳/ مارچ ۲۰۱۱ء کو ایران کے معروف اسکالر اور پبلشر جناب ایرج افشار دنیا سے رخصت ہوگئے، ایک مخلص کی اطلاع اور فرمائش پر یہ قطعۂ تاریخ لکھا ہے، امید ہے اس کو ''معارف'' میں جگہ دینے کی زحمت فرمائیں گے۔

جویائے خیر
رئیس احمد نعمانی

تاریخ درگذشت دکتر ایرج افشار

دانشمند و پژوھشگر معروف ایران

یگانا مردِ دانا ایرج افشار — سخن گوی و سخن سنج و سخن یار
ادیبِ نامور، استادِ انشاء — چراغ بزمِ تحقیقات و جستار
رفیق رہروانِ راہ پارین — انیس ہمرہانِ تازہ رفتار
کتاب و نامۂ اہلِ ادب راہی — بودہ امین و ہم نگہدار

مہارت داشت در تالیف و تدوین | عَلَم گردیدہ ہم در چاپ آثار
عزیز خاطر دانا و نادان | ستودہ از زبانِ خویش و اغیار
چو دل برداشتہ از کارِ دنیا | رمیدہ از ہجوم شہرو بازار
ہستہ رختِ جان و تن ز منزل | جہانیدہ بہ سوی گور رہوار

بجستم سالِ فوتش وز دلِ من
صدا آمد: ''دریغا ایرج افشار''
۲۰۱۱ء
(۳ مارچ/۲۰۱۱ء)

(مئی ۲۰۱۱ء)

دسنوی، عبدالقوی، پروفیسر

پروفیسر عبدالقوی دسنوی مرحوم

افسوس، پروفیسر عبدالقوی دسنوی اس دنیا سے رخصت ہوئے، اِنـاللّٰہ وَاِنـا اِلَیہ رَاجِعُون۔ ۷/جولائی کو وہ بھوپال کی خاک میں آسودہ خواب ہوئے تو اردو کی دنیا صرف ایک شریف، متین اور نشیط صاحب قلم سے ہی محروم نہیں ہوئی، ایسے مخلص، فعال بلک مجاہد انسان کو کھوبیٹھی جس کا تعلق اس جنس سے تھا جس کو اب نایاب ہی کہا جاسکتا ہے۔

دیسنہ ان کا وطن تھا، سادات کا یہ گاؤں بہار کیا پورے ہندوستان میں ممتاز اور منفرد تھا کہ اکثر باشندوں نے تعلیم قدیم و جدید دونوں کو یکساں اہمیت دی۔ کم ایسی بستیاں ہیں جن کی خاک سے مولانا سید سلیمان ندوی، سید ابوظفر ندوی، سید نجیب اشرف ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن جیسی شخصیتیں اٹھیں اور علم و قلم کے بادل بن کر ملک کے مختلف خطوں کو سیراب کر گئیں۔

پروفیسر عبدالقوی بھی اسی سلسلہ ابروسحاب کا ایک حصہ تھے۔ بچپن، وطن میں ضرور گزرا جہاں مدرسۃ الاصلاح سے تعلیم کا آغاز ہوا، ۴۲ء میں وہ آرہ کے ہائی اسکول کی آٹھویں جماعت میں تھے لیکن پھر وہ بمبئی آگئے جہاں ان کے والد پروفیسر سید سعید رضا ندوی درس و تدریس کی ذمہ داریاں انجام دے رہے تھے، قوی صاحب نے بمبئی کے مشہور سینٹ زیویر اسکول میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی، بمبئی گویا وطن ثانی تھا لیکن قدرت نے ان کے لیے بھوپال دارالاقبال کی سرزمین اس طرح مقدر کی کہ ۶۱ء میں سیفیہ کالج کے شعبہ اردو کی خالی جگہ کے لیے ایک درخواست اور اس کی قبولیت نے ان کو ''بھوپال والے عبدالقوی دسنوی'' بنادیا، بمبئی کے ہنگامہ خیز اور پرشور ماحول سے نکلے تو کوہساروں، بیابانوں کے نشیب و فراز اور ان کے دامن میں بکھرے زندگی کے تازہ و شاداب جلوؤں اور پرسکون ماحول کو پاکر محسوس کیا کہ ''دیرینہ آرزو'' پوری ہوئی، ان کے الفاظ میں اس دیرینہ آرزو کی شرح تو نہیں ہوئی لیکن عملی طور پر یہ ضرور ظاہر ہوئی کہ انہوں نے اردو اور اس کے ذریعہ علم و ادب کی خدمت کے لیے یقیناً کسی نقشے، راستے اور منزل کا تعین کیا تھا، سیفیہ کالج اس کا ذریعہ بنا، سیفیہ کالج اور اس کا شعبہ اردو ظاہر ہے کوئی انوکھا اور جدا نہیں تھا، بڑی بڑی یونیورسٹیوں اور ان کے شعبہ ہائے اردو کی چمک دمک کے سامنے مقامی کالجوں کے دیوں کی بساط ہی کیا لیکن قوی صاحب کے عزم اور حوصلے نے وہ کر دکھایا جس کی توقع بھی عموماً نہیں کی جاتی، دیکھتے دیکھتے سیفیہ کالج کی شہرت اس کے شعبۂ اردو کی بلند پروازوں سے پورے ملک میں اس طرح پھیلی کہ اس کے خاص نمبروں، اس کی ادبی تقریبات اور اس کے ہونہار طالب علموں کا نام اور کام اہل نظر کی نظر میں آ گیا اور ان ساری فتوحات کے پس منظر میں قوی صاحب کے خون جگر کی سرخی دمکتی رہی، ایسا نہیں کہ حالات ہر طرح مساعد و معاون تھے، خود قوی صاحب نے لکھا کہ برسوں وہ خود کو اس طرح اجنبی محسوس کرتے رہے کہ نہ تو جذبات کے اظہار کا یارا تھا اور نہ اپنے محسوسات و نظریات کو کھل کر بیان کرنے کا حوصلہ تھا، لیکن فرض کو فرض سمجھ کر اس کو ادا کرنے کی ہمت تھی کہ آہستہ آہستہ راہیں ہموار ہوتی گئیں اور ایسے لوگ جو اپنے مفادات سے مجبور ہوکر راستے کی رکاوٹ بنتے ہیں، الجھنے اور الجھانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ آتے رہے اور ناکام و نامراد بھی ہوتے رہے۔ قوی صاحب کی فطری شرافت اس کریمانہ روش پر قائم رہی، جس کی سب سے بڑی خوبی لغو سے اعراض ہے، وہ اپنے ذمہ داروں کے لیے مخلص اور اپنے طلبہ کے لئے مشفق رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا شعبہ اردو ہر پہلو سے کامیابی کی ان منزلوں سے ہم کنار ہوا کہ گویا شعبہ اردو ہی سیفیہ کالج ہوگیا، حقیقت یہی ہے کہ اس شعبے نے سائنس، آرٹس اور کامرس کے دوسرے شعبوں کو مہمیز کیا جس کی وجہ سے ایک وقت اس کو ہندوستان کا سب سے اچھا اقلیتی کالج قرار دیا گیا۔ اس کامیابی میں قوی صاحب کا بڑا حصہ رہا اور اس کا اعتراف بھی کیا گیا، یہاں تک پروفیسر شبیہ الحسن نے جو لکھنو یونیورسٹی کے صدر شعبہ تھے ایک موقع پر کہا کہ ''سیفیہ کالج کے شعبہ اردو کو دیکھ کر میں نے سبق حاصل کیا کہ شعبہ کو کس طرح ترقی کی اعلیٰ منزلوں تک پہنچایا جاتا ہے، عبدالقوی دسنوی صاحب اپنی تحریروں میں صاحب اسلوب ہیں مگر وہ حسن انتظام اور ذوق اہتمام میں بھی قابل تقلید اسلوب کے مالک ہیں''۔

قوی صاحب اور سیفیہ کالج ایسا موضوع ہے جو بڑا تفصیل طلب ہے، جہاں چمن میں ہر طرف کسی ایک کی داستاں اور طرز فغاں بکھری ہو اس کے سمیٹنے کے لیے وقت چاہئے۔ حیرت ہوتی ہے کہ تعلیم اور تنظیم کی ہمہ وقت مصروف زندگی سے قوی صاحب کس طرح تحریر و تحقیق کے لیے وقت نکال لیتے تھے، لکھنے کا شوق تو تھا ہی، بھوپال آنے سے پہلے ان کا پہلا مضمون علی گڑھ کے سہ ماہی اردو ادب میں چھپا جو

مولانا ابوالکلام آزاد کے ماہنامہ لسان الصدق کے متعلق تھا، خدا جانے یہ ابتدا کس مبارک ساعت میں ہوئی کہ ان کی تصنیفی و تالیفی زندگی پر مولانا آزاد ہی سایہ فگن رہے، مضامین لسان الصدق، مطالعہ غبار خاطر، ماہنامہ لسان الصدق، یادگار آزاد، تلاش آزاد، ابوالکلام آزاد، ابوالکلام محی الدین آزاد، ہفتہ وار پیغام، معاصرین و متعلقات آزاد، جواہر آزاد جیسی کتابیں ساہتیہ اکادمی، مکتبہ جامعہ، خدابخش لائبریری، نسیم بک ڈپو اور یوپی، بہار، مہاراشٹر کی اردو اکادمیوں کی جانب سے شائع ہوتی رہیں، مولانا آزاد سے ان کے تعلق و تاثر کی وجہ تھی کہ ان کی نظر میں مولانا بے غرضی کی تصویر، بے باکی کے پیکر، جری، بے باک، محبِ وطن اور قومی اتحاد کے شیدائی تھے، ان کی علمی و ادبی عبقریت ان سب پر مستزاد، اسی عقیدت نے ان کو جب سینئر فیلوشپ دلائی تو انہوں نے اس احساس کے ساتھ کہ اب تک جامع ترین سوانح آزاد مرتب نہیں ہوئے انہوں نے حیات ابوالکلام آزاد کو بڑے اہتمام سے مرتب کر کے شائع کیا، ۹۱۲ صفحات پر مشتمل یہ کتاب واقعی ذخیرہ ابوالکلامیات میں موقر اضافہ ہے جس کے پانچ ابواب میں مولانا آزاد کی زندگی کا گویا ہر رخ سامنے آ گیا، مولانا آزاد کے سوانح میں علامہ شبلی کا ذکر تو آتا ہے لیکن دارالمصنفین سے مولانا آزاد کے دیرینہ اور مسلسل تعلق کی داستانیں کم سنائی جاتی ہیں، اس کتاب سے یہ تشنگی بھی دور ہوئی، ۲۰۰۱ء میں چھپی یہ کتاب دسنوی صاحب کے تصنیفی سفر کی معراج ہے، اتنی ضخیم کتاب کی اشاعت کے مصارف ان کے صاحب زادے علی نواز دسنوی نے برداشت کیے تو شفیق باپ نے ان کو یہی دعا دی کہ وہ اچھے انسان اچھے ہندوستانی اور اچھے مسلمان بننے میں کامیاب ہوں، یہ دعا ان کی اولاد حقیقی کے ساتھ اولاد معنوی کے لیے بھی رہی، ان کے شاگرد بے شمار ہوئے اور قابل فخر شاگردوں کی تعداد بھی کم نہیں، مظفر حنفی، ڈاکٹر محمد نعمان خاں، پروفیسر خالد محمود، اقبال مسعود ندوی، جاوید اختر، یعقوب یاور، غفران اعظم، اسلم شیر وغیرہ کی کامیابیوں میں قوی صاحب کی تربیت اور دعاؤں کی برکت کا بڑا اثر ہے۔

قوی صاحب کی کامیابی میں سب سے بڑا جذبہ اردو سے ان کی محبت کا ہے، بھوپال کے ریاست سے پردیش ہونے کا عمل، تہذیبوں اور زبانوں کے تصادم جیسا تھا، کل تک جو شہر اردو تہذیب و تمدن کا مرکز اور شعر و ادب کا گہوارہ تھا اور جہاں بقول راجیندر سنگھ بیدی ''آئے بغیر اردو کا ادیب صیقل نہیں ہوسکتا'' ملک کے دوسرے اردو مراکز کی طرح یہاں بھی اردو کشی کا خطرہ اور خدشہ تھا، قوی صاحب کے سامنے یہ حقیقت تھی اسی لیے وہ اس شہر اقبال کی عظمت کو اردو کے حوالے سے حتی المقدور قائم رکھنا چاہتے تھے، ان کی ایک کتاب ''میں اردو ہوں'' اردو سے ان کی محبت کا بڑا موثر نقش ہے، انہوں نے ہماری زبان دہلی اور دوسرے رسائل میں مسلسل اردو کے مسائل پر اظہار خیال کیا کہ اردو والے اپنی زبان کی اہمیت اور اس کی خدمت اور موجودہ حالت سے باخبر رہ کر لسانی طور پر باعزت رہیں۔

دارالمصنفین سے ان کا تعلق ہمیشہ اخلاص کا رہا، حضرت سید صاحبؒ اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور شہاب الدین دسنوی کے رشتوں نے اس کو مزید تقویت دی، حضرت سید صاحب کی صد سالہ تقریبات پیدائش کے موقع پر بہار اردو اکادمی نے سید صاحب کی حیات و خدمات پر ایک مفصل اشاریہ کی ضرورت محسوس کی تو اس اہم ذمہ داری کے لیے قوی صاحب سے درخواست کی گئی، اشاریہ سازی میں غیر معمولی مطالعہ کے ساتھ تحقیقی صلاحیت بھی مطلوب ہے، قوی صاحب کی یہ خوبی بھی ودیعت ہوئی تھی، انہوں نے غالب صدی میں ''غالبیات'' اور جشن انیس کے موقع پر ''انیس نما''، پریم چند صدی میں دھنپت رائے نواب رائے پریم چند اور اقبال صدی کے مناسبت سے ''ہندوستان میں اقبالیات'' جیسے کارآمد اور پراز معلومات اشاریے تیار کیے تھے، سید صاحب پر اشاریے کی درخواست تو ان کے دل کی آواز اور اس کی تیاری ان کے لیے بمنزلہ سعادت تھی، یہ اشاریہ انہوں نے بڑی محنت سے تیار کیا اور یہ یادگار سلیمان کے نام سے شائع ہوا۔ حضرت سید صاحب پر مولانا محمد عمران خاں ندویؒ نے تاج المساجد بھوپال میں ۸۵ء میں ایک باوقار اور یادگار سمینار کیا، اس موقع پر قوی صاحب ہر لحمہ مولانا ندوی کے ساتھ تعاون میں پیش پیش رہے، سید صاحب اور بھوپال کے تعلق سے مقالہ بھی پیش کیا، اسی سال نواب سلطان جہاں بیگم کا قصر سلطانی جہاں ریاست کے آخری حکمراں نواب حمید اللہ خاں کی ساری زندگی گزری، جہاں علامہ شبلی نے دارالمصنفین اور سیرۃ النبی کے منصوبوں سے سلطان جہاں بیگم کو واقف کرایا، جہاں علامہ اقبال اور سر راس مسعود نے اپنے قیمتی شب و روز گزارے وہی قصر سلطانی، سیفیہ کالج کا باقاعدہ حصہ بنا، سمینار کے مندوبین کے اعزاز میں وہاں عشائیہ کا اہتمام تھا، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور پروفیسر نثار احمد فاروقی کی تقریر و تاثرات نے اس عشائیہ کو ناقابل فراموش بنادیا اور اس کا سہرا صرف قوی صاحب کے سر رہا۔

گزشتہ سال بھوپال کا سفر ہوا تو برادر محترم پروفیسر حسان خاں کی معیت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، ایک طویل بیماری کے بعد وہ کمزور نظر آئے لیکن گفتگو میں دل نشینی اور محبت کی چاشنی پہلے جیسی تھی اس سال ۹/ جولائی کو مولانا محمد عمران خاں ندویؒ صد سالہ تقریبات کی مناسبت سے بھوپال میں ایک نشست تھی، دارالمصنفین کے مشاہیر کے خطوط بنام مولانا محمد عمران خاں کی رسم اجراء بھی تھی، خیال تھا کہ عبدالقوی صاحب سے ملاقات ہوگی اگر ان کو نشیط دیکھوں گا تو عرض کروں گا کہ حضرت سید صباح الدین صاحب کی صد سالہ یاددہانی کا بھی سال ہے، ان کی نہایت قابل قدر علمی، تاریخی، ادبی خدمات کا بھی کچھ حساب ہوجائے، لیکن کیا خبر تھی کہ وہ صرف دو روز پہلے اس دنیا سے رخصت ہوجائیں گے، سینٹ زیویر سے سیفیہ اور سیفیہ سے قصر سلطانی تک عروج کی

داستان، ملاءاعلیٰ سے لقاء پر مکمل ہوئی۔ ایک نہایت شائستہ اطوار، نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو ہستی کا نیستی ہونا واقعی بڑا نقصان ہے، نقصان کا یہ احساس اور سوا ہوجاتا ہے جب دل یہ کہتا ہے کہ،

اب یہ شکلیں نہ دکھائے گا زمانہ ہرگز

اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے اور ان کا بہتر سے بہتر بدلہ عطا فرمائے۔

(''ع۔ص''، اگست ۲۰۱۱ء)

اصلاحی، شرف الدین، ڈاکٹر

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی مرحوم

پروفیسر امیر حسن عابدی اور پروفیسر عبدالقوی دسنوی کا غم کم نہ تھا کہ جناب شرف الدین اصلاحی کے سانحہ ارتحال کی خبر دارالمصنفین اور پوری علمی دنیا کو سوگوار کرگئی۔ اِناللہ وَ اِنا اِلَیہ رَاجِعُون۔

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی اعظم گڑھ کی مردم خیز سرزمین سے اٹھے، ان کا مولد موضع سنجر پور ہے، مدرسۃ الاصلاح میں تعلیم حاصل کی، مدرسۃ الاصلاح کو اپنے جن فرزندوں پر ناز ہے اور یہ تعداد میں کم نہیں، ان میں ایک یقیناً شرف الدین اصلاحی مرحوم بھی تھے، الاصلاح کی تاریخ پر گہری نظر رکھنے والوں نے اس کے مختلف ادوار تقسیم کیے ہیں، اس میں عہد زریں کی نمائندگی کرنے والوں میں بھی اصلاحی مرحوم کا نام شامل ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اصلاحیوں میں ان کی ذہانت سب سے نمایاں تھی۔

سنجر پور اور اعظم گڑھ کے اس لائق فرزند کو گروش روزگار نے پاکستان پہنچا دیا، کراچی میں رہ کر اصلاحی مرحوم کی ذہانت کے ساتھ ان کی مشکل پسند طبیعت کا بھی ظہور اس طرح ہوا کہ انہوں نے لسانیات کے موضوع پر تحقیق کے لیے سندھی زبان کا انتخاب کیا، سندھی زبان سیکھی اور ذراسی مدت میں اردو سندھی کے روابط کے رموز و اسرار فاش کرنے کے لائق ہوگئے، پی ایچ ڈی کے لیے ڈاکٹر رضی الدین صدیقی اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی خواہش و فرمائش، اصلاحی صاحب کے لیے سخت آزمائش تھی، بقول ان کے ''لسانیات میرا خاص مضمون نہ تھا اور سندھی سے میں ناآشنائے محض تھا، اس حالت میں اردو سندھی کے لسانی روابط پر تحقیقی کام کا بیڑا اٹھانا بڑی جسارت کی بات تھی'' اصل بات یہ ہے کہ وہ چیلنجوں پر یقین کرنے والے تھے اور اپنی ہمت و محنت سے وہ بار عظیم کو اٹھانے میں کامیاب بھی ہوتے تھے، ہم ان کی زندگی سے زیادہ واقف نہیں لیکن ان کی ہمت و حوصلہ کی داستانیں کچھ سنی ہیں اور بعض چیزوں کا مشاہدہ بھی کیا ہے، مشاہدہ کی توفیق اس وقت ہوئی جب اصلاحی صاحب ذکر فراہیؒ کی تالیف کے سلسلے میں دارالمصنفین تشریف لائے اور کئی سال تک برابر ان کی آمد کا سلسلہ جاری رہا، اس وقت ان کی کتاب اردو سندھی کے لسانی روابط پاکستان کی مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد سے شائع ہوچکی تھی اور وہ غالباً اس وقت اسلام آباد کے موقر مجلّہ فکر و نظر کی ادارت کے فرائض بھی انجام دے رہے تھے مولانا حمیدالدین فراہیؒ کے حالات کی تلاش و تحقیق میں وہ جس طرح روز و شب ایک کرتے اور راستوں اور مسافتوں کو قطع کرتے رہے، وہ جذبہ ہمارے لیے حیرت انگیز تھا، ادارہ تحقیقات اسلامی پاکستان کی جانب سے ان کو یہ فراہی پروجیکٹ ملا اور اس شرط پر کہ یہ مدت صرف ایک سال کی ہوگی، اتنے بڑے پروجیکٹ کے لیے محض ایک سال کی یہ مدت یا تو اس کام کی اہمیت سے اغماض تھا یا پھر واقعی کوہ کن کی آزمائش تھی، کوئی اور ہوتا تو انکار کرتا یا پھر ایک سال میں خانہ پری کرکے مطمئن ہوجاتا لیکن شرف الدین مرحوم کی عزت نفس نے یہ گوارا نہ کیا وہ مسلسل کئی سال اپنے خرچ پر ہندوستان آئے اور دہلی سے کلکتہ تک جہاں جہاں کوئی نقش فراہی نظر آیا، تحقیق کی پیشانی خم کردی، دارالمصنفین بہرحال ان کی اس تحقیقی سرگرمی کا مرکز تھا، ۸۲ء کے بین الاقوامی اسلام اور مستشرقین سمینار میں بھی انہوں نے اپنا پرمغز مقالہ بعنوان ''مستشرقین، استشراق اور اسلام'' پیش کیا، ان کے قافلے میں ان کے ادارے کے ڈائریکٹر ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا اور مولانا عبدالقدوس ہاشمی کے علاوہ ڈاکٹر محمود احمد غازی، احمد خاں، حافظ محمد طفیل بھی موجود تھے، اس سمینار کی روداد بھی بڑے دلچسپ انداز میں لکھی، معارف میں ان کے چند مضامین بھی شائع ہوئے جیسے عہد نبوی میں اسلامی ریاست کا نظام تعلیم، اردو زبان و ادب میں قرآنی الفاظ کا استعمال وغیرہ، کچھ مضامین جو مولانا فراہیؒ کے تعلق سے ہیں وہ ذکر فراہی کی تحقیق و تدوین کے دور میں لکھے گئے، اصلاً ذکر فراہی وہ کتاب ہے جس کی وجہ سے شرف الدین مرحوم ہمیشہ زندہ رہیں گے، اس کتاب میں انہوں نے جس طرح گاؤں گاؤں جاکر روایتوں کی سماعت کی پھر ان کی صداقت و ثقاہت کے دلائل تلاش کیے، بقول شخصے اس سے علم رجال میں محدثین کی محنت کے واقعات پر یقین آگیا، لیکن اس سے زیادہ کرب و آزمائش سے وہ اس کتاب کی طباعت کے دوران گزرے، آزمائش ہی نہیں صدمے تھے، اتنے کہ ان ہی کے الفاظ میں ''میرا کمال یہی ہے کہ اب تک زندہ ہوں'' تفصیل ذکر فراہی کے دیباچے میں ہے، نسخہ ہائے وفا کی اس تالیف میں اپنوں کی بے وفائی اور سرد مہری سے ان کے دل پہ جو گزری اس کی کہانی وہ کچھ بیان کرگئے لیکن واقعتاً ان کا دل و دماغ جن اذیتوں سے گزرا یقین ہے کہ اب اس کے بدلہ میں راحتیں ان کے ساتھ ہوں گی۔

شہرت اور عزت سے وہ ہم کنار ہوئے لیکن یہ ان کی طبعی شرافت تھی کہ وہ اپنے سے بہت چھوٹوں سے بھی اس محبت سے ملتے کہ خود بخود اپنے بڑے کا احساس ہونے لگتا، باتیں کرتے اور خوب کرتے اور ہم ان کی معصومیت، سادگی اور بھولے پن کو دیکھتے رہ جاتے، عرصے سے ان کی کوئی خبر نہیں تھی، اب جو خبر ملی تو اس طرح، کاش کوئی

ان کے حالات تفصیل سے لکھ دے، معلوم تو ہو کہ،

دیوانہ مرگیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

اللہ تعالیٰ جوارِ رحمت میں جگہ دے، مغفرت کرے کہ بہرحال آزاد مرد تھے۔

(''ع۔ص''، اگست ۲۰۱۱ء)

فریدی، فضل الرحمٰن، پروفیسر

پروفیسر فضل الرحمٰن فریدی مرحوم

۲۶/ جولائی کے اخبار میں ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کے انتقال کی خبر کے ساتھ ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی کی وفات کی بھی خبر تھی، غم دوگنا ہوگیا، دنیائے علم کی ویرانی سی ویرانی ہے، اس کیفیت خزاں میں شجر زندگی کے اوراق زرد ہوتے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب شیراز ہند جونپور کے مردم خیز قصبہ مچھلی شہر میں پیدا ہوئے، الہ آباد اور علی گڑھ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی، معاشیات کے موضوع میں اختصاص کیا، پہلے مسلم یونیورسٹی اور بعد میں سعودی عرب کی ملک عبدالعزیز یونیورسٹی میں اسی کا درس دیا، اللہ نے قلب و ذہن کو پاکیزگی بخشی، اسلام کے نظریۂ معاشیات کو عصری نظام سرمایہ داری اور قمار و سود کی گرم بازاری میں یقین و اعتماد کے ساتھ پیش کرکے اس کی بہتری اور برتری ثابت کرنا، اس دور کا فرض کفایہ تھا جس کو پورا کرنے والوں میں فریدی مرحوم کا حصہ بڑا نمایاں ہے۔

تدریس کے ساتھ انہوں نے تصنیف و تالیف کا عمل جاری رکھا، جماعت اسلامی سے متاثر تھے اسی لیے جماعت کے انگریزی ترجمان ''ریڈینس'' کی ادارت اور دوسری انتظامی ذمہ داریاں بھی وقتاً فوقتاً انجام دیتے رہے، لیکن رسالہ ''زندگی نو'' ان کے افکار و نظریات کا سب سے موثر ترجمان رہا، وہ اس کے مدیر تھے اور اشارات میں ان کی ادارتی تحریریں اشارات سے زیادہ بینات کی صورت سامنے آتی رہیں۔ خصوصاً معاشی موضوعات پر نہایت معلومات افزا ہوتیں، ان کے افکار کی تہہ میں صرف یہ جذبہ پنہاں ہوتا کہ اسلام کی معاشی تعلیمات کی برکتوں کا اندازہ کرنے کے لیے موجودہ زمانہ کا ماحول سب سے سازگار ہے لیکن ہماری معلومات صرف روایتی مذہبی تعلیمات تک محدود ہیں، آئی ایم ایف جیسے مالیاتی اداروں کو ان کے اسلوب میں بتانے کی ضرورت ہے کہ قرضوں کی معیشت کے بالمقابل وہی معیشت مناسب ہے جس میں سرمایہ کاری کرنے والے اور تجارت اور استثمار کرنے والے دونوں شریک ہوتے ہیں، ایسے مسائل میں یہ پیغام بھی شامل رہتا کہ سرمایہ حیات، سود سے کہیں فزوں تر ہے، افسوس اب یہ نوائے درد خاموش ہوگئی، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

(''ع۔ص''، اگست ۲۰۱۱ء)

سروپ، شانتی، ڈاکٹر

ڈاکٹر شانتی سروپ

ڈاکٹر شانتی سروپ بڑی خاموشی سے اس دنیا سے رخصت ہوگئے، شخصیت پر نام اگر اثر انداز ہوتا ہے تو ڈاکٹر صاحب اس کا ایک سچا نمونہ تھے، سکوت و سکون کا پیکر، ہمیشہ ریشم و شبنم کی طرح بزم اور صہبا و نسیم کی مانند خراماں۔

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کے زمانہ میں وہ اکثر دارالمصنفین آتے، مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم سے بھی یہی تعلق رہا، کبھی کبھی وہ اس خاکسار کے کمرے میں بھی تشریف لاتے اور یہ صرف اس وضع داری کے پاس میں جس پر وہ برسوں سے عمل پیرا تھے، ہمارے یہ دونوں بزرگ ان کا جس عزت و محبت سے استقبال کرتے اس سے اندازہ ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب فضل و کمال کی نعمت سے مالا مال ہیں اور جب برسوں پہلے ان کو دارالمصنفین کا رفیق اعزازی بنایا گیا تو یہ احساس اور قوی ہوگیا کیوں کہ دارالمصنفین کی تاریخ میں وہ پہلے غیر مسلم تھے جن کو اس علمی اعزاز سے نوازا گیا۔

مدت سے ان کی آمد کا یہ سلسلہ موقوف رہا اور جب ان کی خبر ملی تو اس طرح کہ وہ اس دنیا میں چلے گئے جہاں سے اب کبھی واپس نہ آئیں گے۔

ان کا ذکر چلا تو معلوم ہوا کہ انہوں نے بڑی خاموشی سے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ علمی انہماک میں گزارا، خاص موضوع ہندوستان کی ثقافتی تاریخ تھا، جس میں انہوں نے کئی ایسی کتابیں مرتب کیں جو اپنے موضوع پر گہرے مطالعہ اور سچے تجزیے کی وجہ سے ہندوستان اور باہر کے ملکوں میں قدر و منزلت کے ساتھ قبول کی گئیں، جیسے آرٹس اینڈ کرافٹس آف انڈیا اینڈ پاکستان، ۵۰۰۰ برس آف انڈیا آرٹس اینڈ کرافٹس آف انڈیا اینڈ پاکستان، فلورا اینڈ فونا ان مغل آرٹ، مغل آرٹ اے اسٹڈی ان ہینڈی کرافٹس، اس کے علاوہ سری لنکا کی سنہالی انسائیکلوپیڈیا میں اسی موضوع پر ان کا مفصل مقالہ شائع ہوا، وکٹوریہ اینڈ رابرٹ میوزیم نے بھی ان کے ایک تحقیقی مقالہ کو بڑے اہتمام سے شائع کیا۔

ہندوستان کی قدیم ثقافت خصوصاً مسلم دور حکومت میں فنون کی ترقی اور تہذیب و ثقافت کے غیر معمولی ارتقاء کے متعلق یہ بات مخفی نہیں کہ مغربی خصوصاً انگریز اہل قلم نے اس پوری سیاسی اور ثقافتی تاریخ کو مسخ کرکے پیش کیا، برطانوی دور حکومت میں یہ احقاق حق آسان بھی نہیں تھا، لیکن آزادی ہند کے بعد غیر جانب داری اور انصاف کی نظر سے تاریخ ہند کا مطالعہ کا جو ماحول تیار ہوا، ڈاکٹر شانتی سروپ اس کی بہترین مثال بنے، تاریخ کی صداقتوں کے وہ متلاشی رہے، ۵۰۰۰ برس آف آرٹس اینڈ کرافٹس میں انہوں نے مبسوط و مفصل تحریر میں جہاں مجسمہ سازی، تعمیر، مصوری، رقص، موسیقی،

دستکاری وغیرہ موضوعات پر سیر حاصل بحث کی اور ہندوستان کے عہد قدیم سے مغل دور تک کی خصوصیات پر روشنی ڈالی، وہیں انہوں نے مسلمانوں کے دور حکومت کو ہندوستانی ثقافت کے ارتقاء میں اپنے عدیم المثال اثرات کی وجہ سے عظیم ترین سرمایہ قرار دیا، انہوں نے ثابت کیا کہ ہندوستانی فنون جمیلہ محض انفرادی ذوق کا آئینہ نہیں بلکہ ہر صاحب فن نے اپنے معاشرے کے نظریات وتخیلات اور اخلاقی اقدار و روایات کا احترام بھی ہمیشہ مدنظر رکھا، سلامت ذوق اصابت نظر کی یکسانی نے ہی غالبًا ان کو دارالمصنفین سے قریب کیا، بزم تیموریہ، بزم مملوکیہ اور تمدنی جلوؤں نے ان کو تہذیبی تاریخ کی تالیف میں فراخ دلی اور وسعت نظر کی وہ سوغات دی جس نے دارالمصنفین سے ان کی قربت کو ہمیشہ استوار رکھا اور خود ان کی شخصیت میں وہ جاذبیت اور کشش پیدا کی جس سے مشترکہ تہذیبی رویوں کی شناخت قائم و ظاہر ہو کر رہتی ہے۔ ویسے بھی وہ اعظم گڑھ کے اس معاشرے سے تعلق رکھتے تھے جس کو مشترکہ تہذیبی روایت نے انفرادیت بخشی تھی، ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے، ان کے والد وکالت کے پیشے سے وابستہ تھے اور اس وقت وکالت کے پیشے سے اعظم گڑھ کے معروف مسلم خاندانوں کے زیادہ تر افراد بھی وابستہ تھے، خود علامہ شبلی کے اہل خاندان کے لیے یہی پیشہ ذریعہ معاش تھا اور وسیلۂ شرف بھی۔ ڈاکٹر صاحب کے ایک چچا بھی نامور وکیل، دوسرے چچا ماہر تعلیم اور تیسرے زرعی سائنس داں تھے، ان کا دولت خانہ چندر بھون واقعی خانہ قمر تھا جہاں جواہر لال نہرو اور شیاما پرشاد مکرجی کا نزول ہوتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے اعلیٰ تعلیم، وکالت ہی کی حاصل کی، الہ آباد یونیورسٹی سے انہوں نے گرچہ تاریخ میں ایم اے کیا لیکن بالآخر انہوں نے ایل ایل بی کا کورس کیا، ۴۳ء میں انہوں نے وکالت شروع کی لیکن وہ خود کہتے تھے کہ وہ وکالت سے کبھی ہم آہنگ نہ ہوسکے، تاریخی مطالعات کے جس شوق کی آبیاری، رابندر ناتھ ٹیگور، سبھاش چندر بوس، راجندر پرشاد، امرتا شیر گل اور مولانا آزاد کے افکار و توجیہات سے ہوئی تھی، وہ پروان چڑھتا ہی رہا، ان کے مضامین مسلسل موقر انگریزی رسائل میں شائع ہوتے رہے اور ۷۵ء میں جب ان کی پہلی کتاب آرٹس اینڈ کرافٹس شائع ہوئی تو بین الاقوامی سطح پر اس کی ستائش ہوئی، ڈی اے وی کالج میں انہوں نے شعبہ تاریخ قائم کیا، ۶۲ء میں وہ صدر شعبہ ہوئے، اس کے باوجود علم بلکہ کمال کی طلب کا یہ عالم تھا کہ اکسٹھ سال کی عمر میں انہوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی، یہ مقالہ ۸۴ء میں فلورا اینڈ فونا ان مغل آرٹس کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا، مغلوں کے فنون لطیفہ میں مناظر فطرت سے شیفتگی کی بے شمار دلکش ترین مثالیں تعمیرات، مصوری، خطاطی میں موجود ہیں جن کا حسن واقعی مسحور کن ہے مگر شانتی سروپ صاحب نے محسوس کیا کہ ہندوستان کے مورخین فنون نے اس کے اظہار و اعتراف میں بخل سے کام لیا اسی احساس نے ان کو اس مقالہ اور کتاب کی ترغیب دی۔ یہ ان کی پاک نیت کا اثر اور ثمر تھا کہ ان کی کاوشوں کو قدر و قبول سے نوازا گیا، ان کو انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ کی باوقار فیلوشپ ملی، برٹش کونسل نے ان کو وزیٹنگ اسکالر کی حیثیت سے برطانیہ مدعو کیا، جہاں انہوں نے مغل آرٹ دے اسٹڈی ان ہینڈی کرافٹس جیسی بلند پایہ دستاویزی کتاب مرتب کی جو ۱۹۹۶ء میں شائع ہوئی، پیرانہ سالی میں مسلسل مطالعہ و تحقیق سے ان کی بینائی گویا جاتی رہی، ۹۹ء میں ان کی اہلیہ جو وائلن نواز ہونے کے ساتھ بڑی علم نواز اور شوہر کے علمی کاموں میں سچی شریک حیات تھیں اس دنیا سے رخصت ہوئیں تو شانتی سروپ صاحب بھی ٹوٹ کر رہ گئے، اعظم گڑھ میں قیام اہلیہ کی وجہ سے تھا، ایک بیٹا ارون سروپ دہلی میں ایک بیٹی شاچی رنجن ممبئی میں بس چکے تھے، شانتی سروپ کی زندگی ان دونوں دوریوں میں بٹ کر رہ گئی، اعظم گڑھ چھوٹ گیا لیکن اس کی یادیں زندہ رہیں، چند برس پہلے یاد وطن کی کشش ان کو ایک بار پھر اعظم گڑھ کھینچ لائی، آئے تو چندر بھون کے ساتھ شبلی منزل پر بھی الوداعی نظر ڈالی، رخصت ہوئے اور ۹۴ سال کی عمر میں یکم نومبر ۲۰۱۰ء میں اس دنیا کو بھی خیرباد کہہ دیا، زندگی خاموشی اور شانتی سے گزاری، موت بھی اسی شان سے آئی، بہتوں کو خبر بھی نہ ہوئی، جس ادارے کے وہ اعزازی رفیق ہوئے خود اسی کو علم و تحقیق کے اس نقصان کا احساس دیر سے ہوا، خودنمائی سے ان کے پرہیز کا یہ عالم تھا کہ ان کی کسی کتاب میں مختصراً بھی ان کی اپنی ذاتی زندگی کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی، برادر محترم پروفیسر جاوید علی خاں صدر شعبہ تاریخ شبلی کالج اور رفیق اعزازی دارالمصنفین کی توجہ سے ان کے حالات دستیاب ہوئے، یہ تحریر اس کے لیے ان کی مرہون منت ہے۔

(''ع۔ص''، اکتوبر ۲۰۱۱ء)

گوڑاس، راج بہادر، ڈاکٹر

ڈاکٹر راج بہادر گوڑاس

افسوس گذشتہ دنوں اردو کے شیدائی ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اس دنیا سے رخصت ہوگئے، سرزمین اردو حیدرآباد میں پیدا ہوئے، ساری عمر اپنے نظریات کی اشاعت کے لیے جدوجہد کرتے رہے لیکن اردو سے بچپن سے جو رشتہ قائم ہوا تادم آخر اس کی حفاظت کرتے رہے، دارالمصنفین سے محبت رکھتے تھے، کئی بار یہاں آئے اور خوش ہوکر گئے، ان کی شائستہ شخصیت مشرقی قدروں کا دلکش نمونہ تھی، افسوس ایسے لوگ کم ہوتے جاتے ہیں، افسوس اس کا بھی ہے کہ ہم نے اپنا غم اور اردو کے نقصان کا اظہار تاخیر سے کیا۔

(''ع۔ص''، جنوری ۲۰۱۲ء)

شروانی، رحمت اللہ، نواب

نواب رحمت اللہ خاں شروانی مرحوم

۱۰ر جنوری کی صبح علی گڑھ سے برادرم ڈاکٹر جمشید ندوی نے خبر دی کہ نواب رحمت اللہ خاں شروانی نے آخر شب قریب ساڑھے چار بجے داعی اجل کو لبیک کہا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

خودنمائیوں کی جستجو میں مصروف اس دنیا کو کیسے بتایا جائے کہ جانے والا کون تھا؟ کبھی ہمارے صاحب دل شاعر نے بزم دہلی کا نوحہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

ے یادگار بزم دہلی ایک حالی رہ گیا

افسوس اب علی گڑھ کی بزم دوشیں کی یہ یادگار بھی اٹھ گئی جس نے علم نوازی اور علم پروری کی ان روایات کو مدۃالعمر زندہ و تابندہ رکھا جن کا ذکر اب شاید ماضی کی داستانوں میں ملتا ہے۔

نواب صاحب نے قریب بیاسی سال کی عمر پائی، ۱۶ر فروری ۲۹ء میں پیدا ہوئے، بھیکم پور کی ریاست گومملکت نہ تھی تاہم ۳۶۵ قریوں اور قصبات کی ملکیت، نوابی کے تمام معروف مظاہر کے لیے کم بھی نہیں، لیکن شروانی خاندان نے حکومت و سطوت کی ظاہر علامتوں سے بیزاری پر اپنی قدروں کی استواری کو ترجیح دی، عمل داری رہی تو علم وحلم اور جود وسخاوت کی، رحمت اللہ شروانی مرحوم کی تربیت اسی ماحول میں ہوئی، تعلیم کے لیے وہ مشہور دون اسکول ضرور گئے لیکن صحت کی ناسازی کی وجہ سے یہ تعلیم تکمیل کے مراحل تک نہ پہنچ سکی، البتہ علم پرور ماحول نے ان کو علم شناسی کی ایسی دولت دی جس سے وہ ہمیشہ پرثروت رہے اور دوسروں کو بھی تونگر بناتے رہے، مال و زر کی جگہ بہترین کتابوں سے ان کا خزانہ بیش قیمت ہوتا رہا اور یہ دوسروں پر بھی نچھاور ہوتا گیا۔ان کے والد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ سرسید کی گود میں کھیل کر جواں ہوئے تھے، قدرتاً رحمت اللہ صاحب کا شمار ان میں تھا جن کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ علی گڑھ کے زمین وآسمان ان کے تھے۔اس آسمان پر خدا معلوم کتنے ستارے چمکتے اور ٹوٹ ٹوٹ کرگرتے رہے، نام ونمود کی خواہش ونمائش، ایسے منظر دکھاتی ہی رہتی ہے لیکن علم، جب عشق ہوجائے تو ایک مقام ایسا بھی آتا ہے کہ ع اے دردعشق اب نہیں لذت نمود میں نواب صاحب مرحوم کی زندگی اسی دردعشق کی تفسیر بن گئی، بھیکم پور کا مدرسہ، ذاکرحسین اسکول، جامعہ اردو اور مسلم یونیورسٹی تو اس سرچشمۂ فیض سے قریب تر تھے۔ کتنے ادارے ایسے ہیں جو ان کے جودوکرم کی رداؤں میں مستور ہوکر مشکور ہیں۔ جنہوں نے ان کو قریب سے دیکھا وہ شاہد ہیں کہ غریبوں کی دستگیری، نادار طلبہ کی ہرممکن مدد کو طبیعت ثانیہ بنانے والے ان جیسے نہیں دیکھے، غم گساری وغم خواری کے الفاظ کی معنویت کو نواب صاحب مرحوم نے جس طرح وقعت بخشی، آج کے دور میں اس کی اہمیت کا اندازہ کاش کیا جاسکے۔

اصل یہ ہے کہ یہ ساری صفتیں بلکہ نعمتیں غالباً اس دعائے پدری کی قبولیت کی علامت ہیں جس کی تلقین قرآن حکیم نے قرۃ اعین عطا کیے جانے کی درخواست میں کی ہے، وہ ایسے والد کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھے جو ہر نیک تحریک کے مددگار، ہر اچھے کام کے معاون اور ہر شخص کی ہر ضرورت پر کام آنے والے تھے، آج سے ساٹھ سال پہلے شروانی مرحوم کے والد بزرگوار نواب سرمزمل اللہ خاں کا انتقال ہوا تھا تو معارت میں مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ان کو صوبہ کا حاتم کہتے ہوئے لکھا تھا کہ ''کوئی علمی وتعلیمی ادارہ ایسا نہیں جو ان کے سرچشمہ فیض سے سیراب نہیں، بلکہ جمعیۃ العلماء اور کانگریس تک ان کے خوان نعمت سے مستفید تھے...... جو آیا وہ اپنے نصیب کا حصہ پا گیا''، نواب مزمل اللہ خاں اکثر یہ شعر پڑھتے تھے کہ

نہ کس می دہاند نہ کس می دہد خدامی دہاند خدامی دہد

دین و دنیا کی ان نعمتوں سے بہرہ اندوز ہونے والے سرمزمل اللہ خاں کو قرۃ اعین کی نعمت ملنی ہی تھی، حضرت سید ندویؒ کی تحریر کا عنوان اگر بدل کر حاتم یوپی نواب رحمت اللہ خاں کردیا جائے تو بغیر کسی مبالغے کے کہا جاسکتا ہے کہ کم وبیش مضمون وہی کا وہی آج بھی ہے۔

سرمزمل اللہ خاں دارالمصنّفین سے خاص محبت رکھتے تھے، خاص اس لیے کہ وہ علامہ شبلی کے دوستوں میں تھے، ندوۃ اور دارالمصنّفین سے یہ تعلق اسی نسبت سے تھے، حضرت سید ندویؒ نے لکھا کہ حیدرآباد اور بھوپال کی سرکاروں کے علاوہ اگر کسی محسن کے فیض سے مستفید ہوا تو وہ یہی بھیکم پور کے رئیس کی ذات تھی، رحمت اللہ شروانی مرحوم نے بھی اسی رشتہ کو برقرار رکھا، مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم سے تو ان کو بڑی محبت تھی، مولانا کی اچانک وفات سے ان کا دل بیٹھ گیا، ان کا تعزیت نامہ سب سے پہلے آیا، لکھا کہ ''یہ نقصان صرف میرا یا کسی فرد واحد کا نہیں بلکہ پوری ملت کا ہے جو بہ مشکل پورا ہو پائے گا''۔

وہ قریب چالیس پچاس رسائل کے خریدار تھے لیکن معارف کے لیے بے چین رہتے، ڈاکٹر جمشید ندوی کے الفاظ میں وہ معارف کا حرف حرف پڑھتے، معارف میں انہوں نے محترم عابد رضا بیدار کے اشتراک سے شعرالعجم کے متن کی تصحیح کی، یہ محنت انہوں نے اس جذبے سے کی کہ تنہا شعرالعجم وہ کتاب ہے جو بیسویں صدی اور اب اکیسویں صدی کے ہندوستان میں فارسی ادب کی زندگی بخشتی رہی ہے اور جس نے چار نسلوں کے ذہن و ذوق کی آب یاری کی ہے۔اس مضمون پر حاشیہ دیتے ہوئے مولانا اصلاحی مرحوم نے لکھا کہ ''محترم رحمت اللہ شروانی صاحب پشتینی دارالمصنّفین کے محسن

اور اپنی فارسی دانی اور شعر فہمی کے لیے ہندوستان میں اپنی آپ مثال ہیں''، فارسی سخن دانی وسخن شناسی کی یہ بے مثال صلاحیت بھی پشتینی ہی تھی، نواب مزل اللہ خان تو فارسی کے شاعر اور صاحب دیوان شاعر تھے، ان کی ایک دو غزلیں معارف میں چھپی بھی تھیں، رحمت اللہ شروانی مرحوم واقعی سرلابیہ کے مصداق تھے، فارسی اشعار کے وہ گویا حافظ تھے، فارسی کے ایسے اشعار جوضرب المثل کی شکل میں ہیں اور کم لوگ جانتے ہیں کہ ان کا شاعر کون ہے، ایسے قریب ۱۷۱ر اشعار کو حوالوں کے ساتھ انہوں نے جمع کیا اور آوارہ گرد اشعار کے نام سے شائع کر دیا۔

مال وزر اور علم وادب دونوں کی ریاست نے بہتوں کو **انما اوتیته علی علم عندی**[القصص:۷۸] کے بھرم میں ڈال دیا لیکن شروانی مرحوم ہمیشہ **والآخرة خیر وابقی**[الاعلیٰ:۱۷] کی حقیقت کے قائل ومعترف رہے، ان کے والد بزرگوار، زندگی کے اختتام اور کسی نیک عمل کے قبول کی حسرت ظاہر کرتے تھے، حضرت سید ندوی نے ایسے ہی ایک موقع پر تسلی دی کہ حاتم کی بیٹی دربار رسالت میں اپنے باپ کی فیاضی کی بدولت عزت کی مستحق ٹھہریں، پھر کوئی سبب نہیں کہ آپ کی تمام عمر کی فیاضی کے کام دربار الٰہی میں قبولیت کے مستحق نہ ٹھہریں، ہم بھی ان الفاظ کو یقین سے دہرا سکتے ہیں۔

شروانی مرحوم کے لیے حضرت سید ندویؒ نے دعا کی تھی کہ اس خورد سال جانشین کو عمر و اقبال اور توفیق خیر سے بہرہ مند فرمائے، اس دعا کو شرف قبولیت حاصل ہوا، معارف شروانی صاحب مرحوم کے صاحبزادے جناب مدحت اللہ خاں شروانی کے لیے اسی دعا کی تجدید کرتا ہے اور شروانی صاحب مرحوم کے لیے دعا ہائے مغفرت کا نذرانہ پیش کرتا ہے یہ کہتے ہوئے کہ

ے تھی تری موج نفس بادِ نشاط افزائے علم

(''ع۔ص''، جنوری ۲۰۱۲ء)

امام، مظہر/ شہریار، پروفیسر/ تبسم، مغنی، پروفیسر

مظہر امام / پروفیسر شہریار / پروفیسر مغنی تبسم

افسوس اس ماہ فروری میں اردو کے آسماں پر درخشاں، چند ستاروں کے چھپ جانے سے اردو دنیا کی رونق میں کمی آگئی، جناب مظہر امام، پروفیسر شہریار، پروفیسر مغنی تبسم یکے بعد دیگرے رخصت ہوئے، مظہر امام کی شناخت آزاد غزل کے حوالے سے ہے، کئی شعری اور تنقیدی کتابوں کے مصنف تھے، پروفیسر شہریار اور پروفیسر مغنی تبسم، ہندوستان کی دو ممتاز جامعات یعنی مسلم یونیورسٹی اور جامعہ عثمانیہ میں اردو کے کامیاب اور نامور استاد ہی نہیں، شعر و ادب کی دنیا میں صاحب مرتبہ و مقام بھی تھے، شہریار کی شہرت گو ان کی زندگی کے دور آخر میں خوشبو کی طرح عام ہوئی لیکن نشاط غم اور رنج شادمانی کے مختصر اور فانی لمحات کا ساتھ عمر بھر رہا، ان کی شہرت کے شہپر جب سمٹے ہوئے تھے اس وقت بھی انہوں نے اس خاموشی کو بلیغ معانی دیے تھے، خواب، رات، دیار، پرچھائیں، سفر، تشنہ لبی کے پردے میں وہ دیار دل اور بزم دوستاں تلاش کرتے رہے، مغنی تبسم شہریار کے پیشہ تدریس میں ہی شریک نہیں رسالہ شعر وحکمت میں بھی برابر کے سہیم تھے، وہ حیدرآباد کے دائرہ ادبیات اردو اور رسالہ سب رس سے مدتوں وابستہ رہے، فانی بدایونی پر تحقیق کی تھی، درجنوں کتابیں لکھیں، عجیب بات ہے کہ ادبی سفر میں مغنی تبسم اور شہریار ساتھ ساتھ رہے، ابدی سفر میں بھی یہ رفاقت قائم رہی، شہریار کے نام ایک خط میں مغنی تبسم نے لکھا تھا کہ ''شاعری تو ایسی چیز ہے جو خدا، انسان اور کائنات کے درمیان پچھلی راتوں کا دعائیہ بن جاتی ہے، کتنے لوگ ہیں جوان ساعتوں میں دست دعا دراز کرتے ہیں''، مغفرت کے لیے کوئی عمل یا کوئی قول کام آسکتا ہے، ہمارا دست دعا بھی اسی لیے دراز ہے۔ (''ع۔ص''، فروری ۲۰۱۲ء)

الحسینی، محمد عرفان، مولانا حکیم

مولانا حکیم محمد عرفان الحسینی

افسوس کہ کلکتہ کی معروف، متحرک اور مرنجاں مرنج شخصیت یعنی مولانا حکیم عرفان الحسینی گذشتہ اپریل میں دنیا کی اس بزم فانی سے رخصت ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ کلکتہ کے مشہور اور نہایت قابل احترام عالم، مفسر قرآن حکیم محمد زماں حسینی کے صاحبزادے تھے، قدیم تہذیب اور اسلاف کی دینی وعلمی روایتوں کی امانت ان کو ورثہ میں ملی اور انہوں نے اس کو نبھایا بھی بڑی خوبی سے، اپنے عظیم والد کے نقش قدم پر انہوں نے کلکتہ بلکہ پورے بنگال میں دیوبند، ندوہ، امارت شرعیہ جیسے اداروں کی نمائندگی بڑے اخلاص واستقامت سے کی، وہ ندوہ کی مجلس انتظامی کے اہم رکن رہے، مسلم پرسنل لا بورڈ میں بھی ان کی موجودگی اپنا احساس دلاتی، دارالمصنفین اور معارف سے تعلق خاندانی رشتوں کی طرح استوار و پائدار رہا، کلکتہ کی مصروف ترین زندگی میں وہ تحریر کے لیے وقت نکال لیتے، روزانہ آزاد ہند میں ان کا تفسیری اور مذہبی کالم بڑی پابندی سے آتا اور قارئین اس کے منتظر رہتے، ہم نے ان کو اس وقت دیکھا جب وہ بڑے صحت مند اور چاق و چوبند تھے، لیکن ادھر کئی برسوں سے عالم اس کے برعکس نظر آیا، آگ کے خاک ہونے کا منظر پرانا ہے لیکن ابتدا وانتہا کے فاصلے جب سمٹتے ہیں تو یہی منظر حیرانی کا سبب بن جاتا ہے، کلکتہ کے قاسمی دواخانہ کی رونق عرفان صاحب کے دم سے تھی، جس کی شکل میں مذہب، علم، ادب، شعر، حکمت اور کسی حد تک صحافت و سیاست کے سات رنگوں نے کلکتہ کے آسمان پر ایک قوس وقزح بکھیر دی تھی، مرحوم نے ان رنگوں کو پھیکا نہیں ہونے دیا، محبت کی گرمی اور گفتار کی گلفشانی، بھولنے کی چیز

نہیں، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے اور خاندان کو اور کلکتہ کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔
آمین! (''ع۔ص''، جون ۲۰۱۲ء)

شجاع الدین، امین الدین

امین الدین شجاع الدین

خبر آئی کہ مولانا امین الدین شجاع الدین بھی اپنے خالق و مالک حقیقی سے جاملے، یقین نہ آنے کے چند لمحوں کے بعد پھر اسی یقین کا اقرار کرنا پڑا کہ ہم سب اللہ ہی کے ہیں تو واپس اسی کے جوار رحمت میں جانا ہی ہے۔

وہ ابھی ایسے نہ تھے کہ نام کے ساتھ مرحوم لکھا جائے، خدا جانے کتنی صلاحیتیں تھیں جو اب بھی ظہور کی منتظر تھیں، ان کا نام اچانک تعمیر حیات اور بانگ حرا کے صفحات پر دلکش، پر اثر اور البیلی تحریروں کے ساتھ سامنے آیا، ان کے اداریے نظر شوق کو متوجہ کرتے، مقبولیت تھی کہ ان کے اداریوں کا ایک مجموعہ نقوش فکر و عمل کے نام سے مرتب ہوا، بھیونڈی کی زمین سے ندوہ کے آسمان تک کا سفر، تیز رفتار بھی رہا اور روشن بھی، کیا خبر تھی کہ یہ خوش درخشیدگی، شعلہ مستعجل کی مبتدا تھی، آخری ملاقات کب ہوئی یاد نہیں، لیکن ان کا تبسم اور محبت کی آنچ سے گداز ہاتھوں کا گرم جوش مصافحہ ضرور یاد ہے، وفیاتی مضامین کا مجموعہ ''ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم'' عنایت کیا، ابھی معارف میں اس کے ذکر کی فرصت بھی نہیں ملی کہ وہ خود اس کتاب کا عنوان بن گئے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے سالک رام تک خدا جانے دل کی دنیا میں آباد کیسے کیسے مکینوں کا نوحہ کہنے والے نگری نگری پھیرا لگا کر وہ اپنے سفر کی منزل پہنچ گئے، پس کارواں سخنوری کے ایسے نقوش قائم کرتے ہوئے جن کی چمک میں خون جگر کی آفرینش ہے، یہ نقوش تابندہ رہیں گے اور کبھی کبھی دبے الفاظ میں یہ بھی کہہ جائیں گے کہ

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

ندوہ کے ساتھ دارالمصنفین کے وہ عاشق تھے، وہ اور ان کے بھائی ڈاکٹر خلیل الدین شجاع الدین بھی جو سعودی عرب میں ہیں، مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ نے اپنے سفر حج میں ان کا ذکر کئی بار کیا، اللہ تعالیٰ ان کو اور تمام پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین! (''ع۔ص''، جون ۲۰۱۲ء)